DUE DATE

Cl. No. *Acc. No.*

Late Fine **Rs. 1.00** per day for first 15 days.
Rs. 2.00 per day after 15 days of the due date.
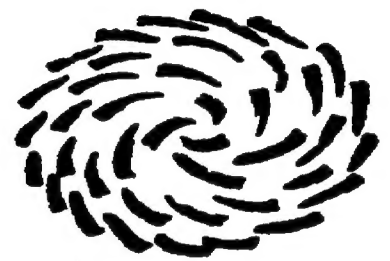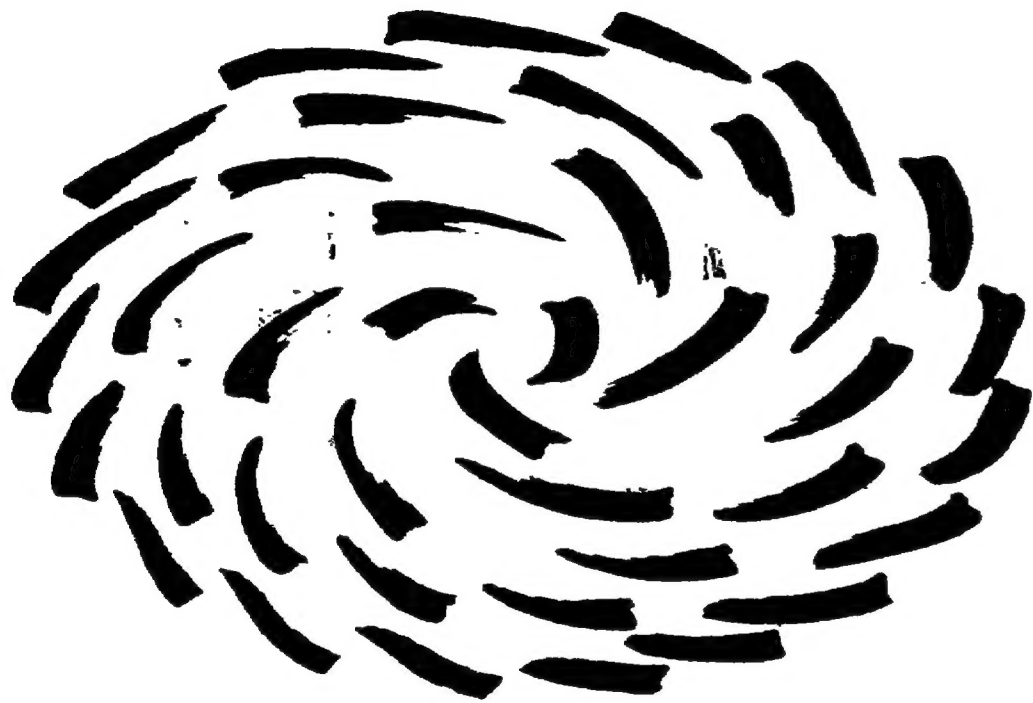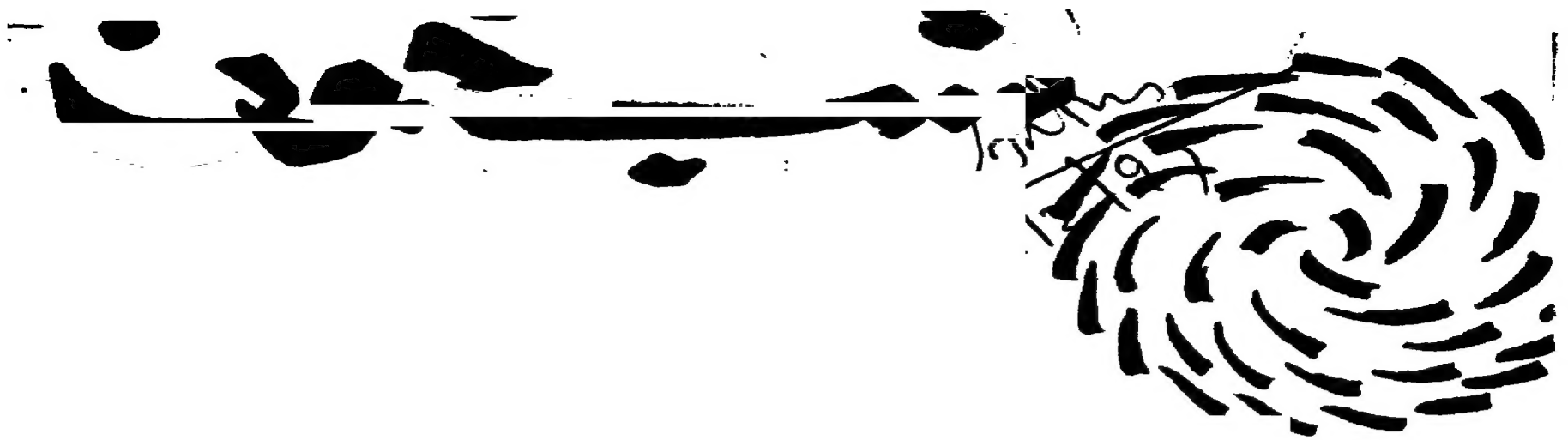
جدید اردو تنقید کا تجزیاتی مطالعہ

(شمس الرحمن فاروقی کے خصوصی حوالے سے)

ڈاکٹر نشاط فاطمہ

اثبات و نفی پبلی کیشنز

۵/۵۹، رپن اسٹریٹ، فرسٹ فلور، کلکتہ۔ ۷۰۰۰۱۶، (مغربی بنگال)

سوسیور پر تنقید از جان ہالووے JOHN HOLLOWAY

میں یہ ثابت کرنے کی کوشش نہ کروں گا، اور اس کی ضرورت بھی نہیں، کہ سوسیور کے نکالے ہوئے نتائج میں کوئی نتیجہ غلط بھی تھا۔ لیکن اگر سوسیور اپنے نتائج کو بے شک وشبہ ثابت نہ کر سکا تھا (جیسا کہ ہم جانتے ہیں) تو اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جن لوگوں نے اپنی تصنیفات کی بنیاد کلیتہً سوسیور پر رکھی ہے۔ ان کے نتائج غلط ہوں یا صحیح، لیکن وہ محتاج ثبوت ہیں۔ دوسرا یہ کہ اگر سوسیور کا استدلال درحقیقت قطعیت سے عاری تھا اور پھر بھی سوسیور کے پیروؤں نے پورے اعتماد کے ساتھ اور کسی بات کو معرض سوال میں لائے بغیر سوسیور کی باتوں پر پورا پورا بھروسہ کیا تو ایسے لوگوں کی صلاحیت استدلال کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں قائم ہو سکتی۔

"سوسیور کے پیروؤں نے جو وسیع وعریض تعمیرات اس کے سہارے قائم کی ہیں، ان کی حیثیت بہر حال مشکوک ہے۔ کیوں کہ سوسیور نے ادبی تصنیفات، حقیقت پسندی، سرمایہ داری، نظام افکار وغیرہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ سوسیور کے پیروؤں نے اس کے نتائج کو بے کھٹکے قبول کر لیا ہے اور ان کا ترجمہ اپنے لفظوں میں بیان کرنے پر قانع رہے ہیں اور ان کو وہ لطیف و وسیع تر نتائج کا نقطۂ آغاز بناتے رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے سوسیور کے کمزور پہلوؤں کو تلاش کرنے اور ان کی اصلاح کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ یہ بات ان کی اپنی منطقی صلاحیتوں اور قاری کو اپنا ہم خیال بنانے کی مہم میں دیانت داری برتنے کے بارے میں کوئی اچھا نتیجہ قائم کرنے میں ہماری مدد نہیں کرتی۔ (مثال کے طور پر سوسیور نے تصور CONCEPT اور اس کی ملفوظی شکل AUDITORY IMAGE کی بحث کرتے وقت کہا ہے کہ تصور کچھ نہیں ہے۔ صرف ایک قدر ہے، جس کا تعین اس کی طرح کی دوسری قدروں کے تعلق سے ہی ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کی معنویت کا وجود نہ ہو۔ یہاں وہ قدر VALUE اور معنویت SIGNIFICATION کو خلط ملط کر گیا ہے۔) ... سوسیور اس گتھی کو نہ حل کر سکا، تو پھر جو لوگ اس مسئلے کو اپنی فکر و استدلال کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں، ان کا کیا حال ہوگا؟

ماخوذ از : BEYOND STRUCTURALISM

مرتبہ : WENDELL HARRIS

(۱۹۹۶)

شب خون

جنوری ۱۹۹۷

مدیر، پرنٹر، پبلشر: عقیلہ شاہین — خطاط: افراح کمپیوٹر، دلی — جلد: ۳۱ شمارہ: ۲۰۲

فون نمبر: ۶۲۲۶۹۳، ۶۲۳۱۲۷ — سرورق: عادل منصوری — ترسیل زر کا پتہ: ۳۱۳۔ رانی منڈی، الٰہ آباد ۲۱۱

مطبع: بہار گو پریس الٰہ آباد — خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۱۳

فی شمارہ: پندرہ روپے — بارہ شمارے: ایک سو ساٹھ روپے — الٰہ آباد ۲۱۱۰۰۳

ترتیب و تہذیب

شمس الرحمٰن فاروقی

جیلانی بانو

ڈیفنس کالونی کا وہ ایک سربلند مکان تھا۔
خوبصورت، امپورٹیڈ سازوسامان سے سجا ہوا۔ اپنے مکینوں کی دولت اور اعلیٰ ذوق کا خوبصورت اظہار۔

میزبانوں کے کھلے دل اور بلند قہقہوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا سکہ وقت پر چلتا ہے۔ خوشیاں ان کے پیچھے دوڑتی ہیں۔

"آپ ٹھنڈا لیں گی یا کافی۔؟

"بادام لیجئے۔"

"چلغوزے کھائیے۔"

"مالٹے پسند ہیں یا سیب؟۔"

"آپ کے لئے میں نے سالم بکرے روسٹ کروائے ہیں۔ کابل سے ایک کوک آگیا ہے۔ ویسے پشاوری چپلی کباب اور لاہور کا چرغہ، کراچی کا کٹاکٹ۔۔۔ آپ اپنی پسند بتایئے نا۔۔۔ جائز کھانے پسند ہیں یا کانٹینینٹل ڈشیں۔۔۔" پیرس کے پرفیوم سے مہکتی، امریکن میک اپ سے چمکتی، پاکستانی خلوص سے دمکتی ہوئی ہماری میزبان ہماری رفیق نے پوچھا۔

"بس اب اور کچھ نہیں۔ میرا خیال اتنے کھانوں سے ایک بھوکے ہندوستانی کا پیٹ بھر جائے گا۔" سب ہنسنے لگے۔

"یہاں سے کلفٹن بہت قریب ہے۔ کھانے کے بعد آپ کو آئس کریم کھلانے وہاں لے جائیں گے۔" ایک مہمان خاتون نے بڑے خلوص سے میرے پاس آکر کہا۔ (اس محفل میں ہر مہمان ہمارا میزبان بنا ہوا تھا۔)

"اب آئس کریم کا پروگرام کسی اور دن پر رکھیں۔" میں نے گھبرا کے کہا۔

"لیکن کھانے کے بعد پان کھانے کے لئے تو آپ کو وہاں جانا ہی پڑے گا۔" ایک مشہور نقاد نے اپنے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے کہا۔

یہ پاکستان کے بڑے اہم ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی محفل تھی۔ ہر بات میں بے حد نفاست، سلیقہ، خلوص بھرا انداز، پر لطف گفتگو۔

تمام مہمانوں نے ہماری دعوتوں کے دن بانٹ لئے۔ ہماری تفریح کا پروگرام بنا لیا گیا۔

اتنا خلوص۔۔۔ کسٹم والے تو لئے بیٹھیں، تو ہرگز ساتھ نہ لے جانے دیں۔

شال میں لپٹے، اونی ٹوپی اوڑھے، ایک دھان پان سے بزرگ میرے قریب آبیٹھے۔

"آپ کلفٹن ضرور جایئے۔" انھوں نے اپنے تعارف کے بغیر مجھ سے کہا۔

"وہاں سے دور تک سمندر نظر آتا ہے۔ ایک جگہ تو ایسی ہے کہ ناک کی سیدھ میں انڈیا کا ساحل ہے۔ ریت پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہو جائیں تو ادھر کی موجیں پاؤں چھونے آجاتی ہیں۔"

اب میں ان کی طرف مڑ گئی۔

"آپ انڈیا سے یہاں کب آئے تھے۔؟"

اس عمر کے بوڑھے لوگ اپنے خوبصورت دن ادھر چھوڑ آئے تھے اور اب بھی موجوں میں ڈھونڈنے ساحل کے کنارے آجاتے ہیں۔

"ارے بی بی۔۔۔ جگ بیت گئے۔ اب تو کچھ یاد نہیں رہا۔ وقت نے سارے فاصلے دھندلا دیئے ہیں۔"

وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ بار بار کھانس رہے تھے۔ پیچھے کی طرف جھک جاتے۔

"ہارٹ پیشنٹ ہیں ہمارے فادر ان لا۔" ہماری میزبان ہما نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"جب سنا کہ حیدر آباد سے ایک رائیٹر آئی ہیں تو بستر سے اٹھ کر آگئے ہیں آپ سے باتیں کرنے کے لئے۔"

"آپ حیدر آباد میں رہتے ہیں۔؟"

"جی ہاں۔"

"آپ کا مکان جانتے کہاں ہوگا۔۔۔ نامپلی اسٹیشن کے آگے۔ باغ عام کے سیدھے ہاتھ پر ہماری کلچے کی دوکان کے پاس حکیم چندر بھان کا مطب تھا۔ اللہ نے اس حکیم کے ہاتھ میں بڑی شفا دی تھی۔"

بات کرنے میں وہ ہانپ جاتے تھے۔ کچھ باتیں اشاروں سے پوری

کردیتے۔

"ہاں ہاں' ابھی وہ دوکان ہے۔۔ میں اکثر حکیم صاحب کو دیکھتی ہوں۔"

"اچھا۔۔؟ آپ نے انھیں دیکھا ہے۔ وہ زندہ ہیں۔؟"

وہ میرے اور قریب سرک آئے۔ "اگر آپ کو بھی چندر بھان ملیں تو ان کو میرا حال بتانا۔ دل کے دورے پڑتے ہیں میرے کو۔ ڈاکٹروں کی دواؤں سے ٹھیک نہیں ہوتے۔ حکیم صاحب کو بولو میرے کو خمیرہ گاؤ زبان جواہر والا بھیج دو۔"

"آپ جایئے نا حیدر آباد۔ اپنا علاج بھی کروا لینا۔"

"نہیں نہیں۔ یاں ایسی باتاں نکو کرو بی بی۔" انھوں نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

"آپ لوگ کبھی انڈیا نہیں آتے۔۔؟" کھانے کے دوران میں نے رفیق صاحب سے پوچھا۔

"حیدر آباد دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ ابا جان کا وطن تھا مگر میں فوج میں ہوں اس لئے انڈیا کا ویزا ہمیں نہیں ملتا۔"

"ہم ابا جان سے کہتے ہیں آپ بھول جایئے حیدر آباد کو۔"

"پاگل ہے میرا بیٹا۔۔ انھوں نے اپنی چھڑی پر زور دے کر غصہ میں کہا۔ "میاں صاحبزادے۔! میرے پاس اب اپنے آپ کو بھلا دینے کے سوا' یاد کرنے کے لئے کچھ نہیں رہا۔"

سب چپ ہو گئے۔ رفیق صاحب نے میری طرف دیکھ کر اشارہ کیا کہ ان کے ابا کچھ ابنارمل سے ہیں۔

بڑی لمبی چوڑی انکوائری ہوتی ہے ہماری۔" ہما رفیق نے اپنے خوبصورت لہریئے دار بال جھٹک کر کہا۔ "ایک بار پیرس سے آتے ہوئے شاپنگ کے لئے میں ایک دن دلی میں ٹھہر گئی تو رفیق کو بڑی پریشانی ہوئی۔"

"یہاں آپ کے دوست رشتے دار ہونگے۔" میں پھر ان کے پاس جا بیٹھی۔

وہ ہنسنے لگے۔۔ "دوست بنانے' عشق کرنے' دل جلانے کی عمر میں پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ اب رفیق کا ایک شہر سے دوسرے شہر میں ٹرانسفر ہوتا ہے تو ہم ایک نئے کمرے میں جا کر لیٹ جاتے ہیں۔ ایر کنڈیشنر کی وجہ سے بدلتے موسم کا بھی پتہ نہیں چلتا ہمیں۔"

"ابا جان دس بج گئے ہیں۔ اب آپ سو جایئے۔" ان کی بہو نے مشورہ دیا۔

ایک نوکر انھیں اٹھانے آیا تو انھوں نے اس کا ہاتھ جھٹک کر مجھ سے پوچھا۔

"آپ پھر کب آئیں گے یہاں۔؟ میرے کو آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔"

"دو تین دن بعد اسی کالونی میں اپنی ایک دوست سے ملنے آؤنگی تو یہاں بھی آجاؤنگی۔"

"آپ اکیلی کہیں مت جایئے۔ ہم خود آکر آپ کو لے جائیں گے۔" کراچی کے ایک مشہور مشفق نقاد نے بڑے خلوص کے ساتھ کہا۔

"سنا ہے آج کسی نے لالو کھیت کی مارکیٹ میں آگ لگادی۔ ابھی تک بازار جل رہا ہے۔

"لوگ چٹکی بجاتے میں آگ لگا دیتے ہیں۔" وہ پھر غصے میں بپھر گئے "یہ آگ کب بجھتی ہے۔ کیسے بجھتی ہے۔ کوئی نہیں جانتا۔"

سب چپ ہو گئے۔

"آپ کے ابا جان یقیناً بہت اچھے شعر کہتے ہونگے۔ اب آؤنگی تو آپ سے شعر بھی سنوں گی۔"

"نہیں نہیں۔ میں شعر دیر نہیں کہتا۔ بکواس کرتا ہوں۔" وہ برا مان گئے۔

ایک ہفتے کے بعد بیگم ہما رفیق کا فون آیا۔ "بہت مصروف ہوں گی آپ۔ ہمارے قادر ان لا کی طبیعت خراب ہے۔ مگر بار بار اصرار کر رہے ہیں کہ آپ ان سے ملنے کب آئیں گی۔ فون کر کے پوچھو۔"

"آج۔۔ ابھی آرہی ہوں۔" میں نے بڑی شرمندگی کے ساتھ کہا۔

پورٹیکو میں ہما کھڑی تھیں۔

"معاف کیجئے۔ بے وقت آپ کو زحمت دی ہے۔ ڈاکٹر نے انھیں مکمل آرام کرنے کو کہا ہے مگر آپ کو بلانے کی ضد کر رہے تھے۔"

کمرے میں وہ کمبل اوڑھے لیٹے تھے۔ تخت پر جانماز تسبیح' رحل پر قرآن شریف رکھا تھا۔ شلف میں اردو فارسی شاعروں کے دیوان تھے۔ سرہانے قلی قطب شاہ کا دیوان رکھا تھا۔ دیوار پر چار مینار کے فوٹو والا ایک پرانا کلینڈر لگا تھا۔ اور سرہانے کی ٹیبل پر بے شمار دوائیں رکھی ہوئی تھیں۔

میں جانتی تھی کہ وہ مجھ سے صرف حکیم چندر بھان اور نامپلی بازار کی باتیں کرنا چاہتے ہیں مجھے دیکھتے ہی وہ خوشی کے مارے اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"میں حکیم صاحب سے آپ کا حال بتا کر خمیرہ گاؤ زبان ضرور بھیج دونگی۔" ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر میں نے کہا۔

"نکو بی بی۔ ایک بار دوا آگئی تو کیا ہوگا۔" انھوں نے ہاتھ اٹھا کر منع کیا۔

"قلی قطب شاہ بہت اچھا شاعر تھا۔۔" میں نے اب بات کرنے کے لئے دوسرا موضوع ڈھونڈا۔ وہ حسب توقع خوش ہو گئے۔

"اچھا! آپ کو معلوم پرانا پل کیوں بنا تھا۔۔؟"

"جی نہیں۔"

"قلی قطب شاہ جب شہزادہ تھا تو سب سے چھپ کر بھاگ متی سے ملنے راتوں کو جایا کرتا تھا۔ ایک بار بارش ہو رہی تھی۔ ندی پر چڑھاؤ لگا۔ گھوڑے پر سے ندی میں گر گیا۔ دوسرے دن بادشاہ نے حکم دئے کہ ندی پر جلدی سے ایک

پل ہٹادو۔"

"واہ دلچسپ کہانی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"یہ پرانے لوگوں کی باتاں ہیں بی بی۔" انھوں نے کتاب بند کرکے کہا۔

"جب بیچ میں ندی آجائے تو پل بنا کر جوڑ دیتے تھے۔ اب ایسے پلوں کو توڑ دیتے ہیں۔"

"میں یہاں آنے سے پہلے حکیم چندر بھان کی دوکان پر گئی تھی۔ میں نے پھر ان کی دلچسپی کا کوئی موضوع ڈھونڈا۔

"ابھی دوکان پر آتا ہے وہ۔ بہت بوڑھا ہوگیا ہوگا۔" پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ بہت سے لوگاں تھے وہ۔ بہت سے باتاں تھے۔ یاد کرو تو الجھے دھاگوں کی طرح پیروں سے لپٹ جاتی ہیں۔۔۔ نواب غفاست جنگ کی دیوڑھی تھی۔ تانگے والے سے بولو دیوڑھی کو جانا ہے تو وہ یہ نہیں پوچھتا تھا۔ دیوڑھی کہاں ہے۔؟"

"آپ کے دادا کی دیوڑھی تھی۔۔۔؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہمارے دادا۔۔؟ نہیں بی بی۔ ہمارے دادا صفت تو معمولی پیروکار تھے۔ غفاست جنگ کی جو نواسی تھی چاند پاشا۔۔۔ وہ ہماری پھوپو کی نند کی بیٹی تھی۔"

اب میں بڑی دلچسپی کے ساتھ اس بوڑھے کے چہرے پہ مچلتی ہوئی پرچھائیاں دیکھنے لگی۔

"بہوت خوبصورت تھی وہ بچی۔۔۔ مگر بہوت شریر تھی۔ ہمارے گھر آئی تو کچے پکے سوب انار توڑ کے پھینک دیتی تھی۔ میرے کو بولتی ناریل کے جھاڑ پر چڑھ کر ناریل توڑ کے لاؤ۔۔"

وہ ہنسنا چاہتے تھے مگر کھانسی روک دیتی۔۔۔ میں گم سم بیٹھی رہی۔

"نواب زادیوں کے نخرے۔۔۔ جس چیز کو دل چاہے وہ ضرور مل جاتا۔

میں نے جب بی۔ اے پاس کیا تو پولیس ایکشن کی مارا ماری شروع ہوگئی۔ ہمارا پورا خاندان پاکستان چلا گیا۔ بادا جان بولے چلو بیٹا۔ بوریا بستر سمیٹو یہاں سے۔ مگر چاند پاشا میرے سے بولے۔ تم یہاں سے نہیں جانا۔۔ اب کیا سناؤں آپ کو وہ قصہ۔؟ ہمارے بادا غفاست جنگ کے پاس پیغام لے کر گئے۔ بولے گھر داماد بنالو آپ میرے بیٹے کو۔۔"

میں دم سادھے بیٹھی تھی۔

"مگر۔۔۔ کاں محبوب علی، کاں پیازکی ڈلی۔۔۔" وہ نہیں رہے تھے۔ مگر ایسا لگا جیسے رو رہے ہیں۔ میں گھبرا گئی۔ مگر یہ نہیں پوچھا۔۔۔ہاں کیا ہوا۔۔۔؟

"پورا گھر خالی ہوگیا ہمارا۔ سب پاکستان چلے گئے۔۔۔ میں گھر میں آیا۔۔۔ کوئی آواز۔۔۔ کوئی یاد۔۔۔ سارے گھر میں کچھ نہیں تھا۔ اپنے قدموں کی آواز بہوت بن کر ڈرا رہی تھی۔ بس۔ میں تیزی سے اسٹیشن کی طرف بھاگا۔۔۔ ریل چھوٹ رہی تھی۔ چلتی ریل میں چڑھتے وقت میرا پاؤں پھسل گیا۔۔۔ میں پیچھے گر رہا تھا۔۔۔ کسی نے اوپر کھینچ لیا۔۔۔ بس۔۔۔ اس دن سے ایسا وہم ہوگیا ہے میرے کو جیسے میں پیچھے پھسل رہا ہوں۔ پھر کوئی اوپر کھینچ لیتا ہے۔۔۔ آدمی کسی ایک طرف ہو تو جینا پڑے نا۔۔۔۔؟"

سسکی کی آواز سن کر میں نے سر اٹھایا۔ ان کا دبلا پتلا بنگالی نوکر اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔ پاکستان میں صفائی کرنے والی ماسی اور کھانا بنانے والے لڑکے بنگالی ہوتے ہیں۔

"صاحب جی کہیں تو ہم دوسرے نام سے ان کا پاسپورٹ بنوا کر ویزا لگوادیں ہمارا سالا بمبیں بزنس کرتا ہے۔ دو ہزار روپیہ لگیں گے۔" بنگالی بابو نے جھک کر میرے کان میں کہا۔

"واہ۔۔۔ یہ تو بہترین آئیڈیا ہے۔" میں نے خوش ہو کر تالی بجائی۔

"اس ویزا پر آپ حیدر آباد آیئے۔ خوب تفریح کیجئے۔ پرانے پل سے غفاست جنگ کی ڈیوڑھی جایئے۔ اب تو حیدر آباد کی ہر چیز بدل گئی ہے۔ ہر اسٹیٹ کے لوگ آگئے ہیں۔ آپ کو اب وہاں کوئی نہیں پہچانے گا۔"

"میرے کو اب وہاں کوئی نہیں پہچانے گا۔۔؟" انھوں نے گردن جھکالی۔

ہمارے درمیان سے جانے کتنے لمحے دھک دھک کرتے گزر گئے۔

اب میرے پاس ان سے کہنے کے لئے شاید کچھ نہیں رہا تھا۔

بڑی دیر کے بعد شاید انھیں میری موجودگی کا احساس ہوا۔

"آپ کلفٹن کے بیچ پر گئے تھے۔۔؟"

"جی۔۔" میں صفا جھوٹ بول گئی۔

"اچھا۔۔؟ تو اونچی اونچی موجوں نے آپ کو شرابور کردیا ہوگا۔۔؟" وہ اچانک خوش ہوگئے۔

"جی۔۔ جی نہیں۔۔ وہ بات یہ ہوئی کہ۔۔ کہ۔۔"

"میں بھی کئی بار گیا۔۔۔ موجیں آگے نہیں بڑھیں۔۔۔ سوکھی ریت پہ کھڑا رہا میں۔۔" دل کا درد کم کرنے والی گولی انھوں نے زبان کے نیچے دبالی۔۔"

❖ ❖

کھلونے

وزیر آغا

کھلونے ہی کھلونے ہیں
کبھی بچوں کے ہاتھوں میں
کبھی بچوں کی صورت میں

کبھی جب ڈور مالا کی
معاً دو لخت ہوتی ہے
تو لمحے' دانہ دانہ دور تک
ہر سو بکھرتے ہیں
زماں کو دائرے کی قید سے آزاد کرتے ہیں
منور کہکشاں کے طشت میں
گھی کے دیے بن کر نکلتے ہیں
معطر روشنی تقسیم کرتے ہیں

کھلونے ہی کھلونے ہیں
دیے' لمحے' پتنگے' سرخ تارے
ابر کی قاشیں
تری آنکھوں کے اندر پتلیوں کا رقص
میرے دل میں پاگل دھڑکنوں کا شور
کیسا کھیل ہے نٹ کھٹ کھلونوں کا

کبھی جب رات ڈھلتی ہے
زمیں اور آسماں میں فاصلہ باقی نہیں رہتا
تو یوں لگتا ہے جیسے
ہست ---- اک ٹوٹا کھلونا ہے
سجا کر میں جسے' اپنی ہتھیلی پر
دکھاتا پھر رہا ہوں
نیستی کی بند آنکھوں کو

آخری دنوں کی ایک غزل

مظہر امام

ہمیں ہیں وہ کہ جنھیں بام و در سے رغبت تھی
کہ دربدر بھی اگر تھے تو گھر سے رغبت تھی

ہم اپنے حال دگرگوں کی اب خبر کیا دیں
خبر یہی ہے کہ اک بے خبر سے رغبت تھی

ڈھلی ڈھلائی ہوئی زندگی کو کیا معلوم
کہ اک چکور کو داغ قمر سے رغبت تھی

جبیں پہ خاک ندامت سجائے پھرتے ہیں
کہ رقص شعلہ، سرود شرر سے رغبت تھی

شکستہ پا ہی نہیں ہم، شکستہ خواب بھی ہیں
کہ قافلے سے، فضائے سفر سے رغبت تھی

اب اور کیا ہے بس اک کاسہ انا کے سوا
وہ دن کہ رقص گل کوزہ گر سے رغبت تھی

طویل ہونے لگا شام عمر کا سایہ
وصال صرف فراق شجر سے رغبت تھی

اب ایک منزل آخر کے منتظر ہیں ہم
وہ دن بھی تھے کہ کسی رہگذر سے رغبت تھی

غیاث متین

دھوپ اپنی' نہ سائباں اپنا
دے رہے تھے شجر یہاں اپنا

چل کے بیٹھیں کہیں پہ بات کریں
یہ جو لمحہ ہے پھر کہاں اپنا

آئینے صحن میں نہیں رکھتے
رمز سمجھا کرو' میاں اپنا

اک حوالہ' ہمارے پاس بھی ہے
کون لے گا مگر' یہاں اپنا

حادثوں سے کہو پلٹ جائیں
اس زمیں پر ہے آسماں' اپنا

اس میں اک دوسری ہی صورت ہے
آئینہ' آئینہ کہاں' اپنا

ان پرندوں کو کون سمجھائے
وقت ہوتا نہیں' یہاں اپنا

میری مٹھی میں کیا ہے پہچانو
وقت' جگنو' یقیں' گماں اپنا

کب سے یہ کھیل چل رہا ہے متین
آگ' ان کی ہے اور دھوپ' اپنا

حصار شہر سے آگے حصار' موسم کا
غبار جاں سے سوا ہے غبار' موسم کا

یہ پھول جیسے' پرندے' چراغ جیسے شجر
انھیں بھی رہتا ہے کیوں انتظار' موسم کا

کہیں صداؤں کی بارش' کہیں سکوت کی دھوپ
یہ کیا مزاج ہے پروردگار' موسم کا

ہمارے شہر میں اک اور شہر در آیا
یہ معجزہ بھی ہے آئینہ دار' موسم کا

شجر' پرندے' زمیں' وقت' آئینہ' چہرہ
بتاؤ کون نہیں ہے شکار' موسم کا

اس آئینے سے تو چنگاریاں نکلتی ہیں
ہمارے دل پہ نہیں اختیار' موسم کا

ہم ایک شام' ترے نام سے منائیں گے
چلے بھی آ کہ نہیں اعتبار' موسم کا

بیان دے کے مکرنا' ہمیں نہیں آتا
بیان دے کے مکرنا' شعار موسم کا

متین' موسم ہستی سے آنکھ حیراں ہے
خمار دیدۂ حیراں' خمار موسم کا

غیاث متین

سلامت بھیڑ میں پہچان رکھنا
ہتھیلی پر سجاکر جان رکھنا

جسے تم ٹوٹ کر چاہو، اسی سے
بچھڑ جانے کا بھی امکان رکھنا

بہت مہنگا پڑا، اس زندگی میں
مجھے، اے دیدۂ حیران رکھنا

گلوں کی یاد تڑپانے لگی ہے
اٹھاکر طاق میں گل دان رکھنا

وہ بت، نزدیک آتا جارہا ہے
خداوندا مرا ایمان رکھنا

خود اپنی کاٹ میں رہنا شب و روز
خود اپنے ہاتھ میں میزان رکھنا

شکاری سانس لینا بھول جائے
پروں میں اپنے اتنی جان رکھنا

کتابوں کی نمائش ہورہی ہے
وہاں اپنا بھی اک "دیوان" رکھنا

متین، آساں نہیں اس سے بچھڑ کر
خود اپنی ذات کا عرفان رکھنا

یہ مصرع رضا وصفی مرحوم کا ہے۔

وحشت کو چھوڑ کے گھر میں ہم تھے
کیسے آباد کھنڈر میں ہم تھے

کھول کر آنکھ نہ دیکھا اس نے
اپنے ہی دیدۂ تر میں ہم تھے

جس میں ملنا تھا بچھڑ جانا تھا
ایسے بے ہودہ سفر میں ہم تھے

جس عمارت کو گرایا تم نے
اس کی دیوار میں در میں ہم تھے

آئینہ ہم کو دکھانے والے
مدتوں، آئینہ گھر میں ہم تھے

کس کے ہاتھوں کی لکیروں میں رہے
کس کی باتوں کے اثر میں ہم تھے

دھوپ، کیوں ہم سے پریشاں تھی متین
کیا کسی شاخِ شجر میں ہم تھے

اب ہم کو کوئی دیکھنے والا نہیں ملتا
سب اپنے ہی ملتے ہیں پرایا نہیں ملتا

نیندوں سے مری اپنا پتہ پوچھنے والے
ٹوٹی ہوئی دیوار سے سایہ نہیں ملتا

وہ شخص، عجب شخص ہے آئینے کے آگے
روتا ہے، یہ کہتا ہے کہ چہرہ نہیں ملتا

دیکھے جو کہیں قتل، گواہی بھی دے، اس کی
اس شہر میں اک شخص بھی ایسا نہیں ملتا

جنگل کا سفر، رات، نہ جگنو، نہ ستارہ
خوشبو ہو تری ساتھ، تو رستہ نہیں ملتا

لہجے کو متین، اپنے، سنبھالو، کہ مری جان
آواز تو مل جاتی ہے، لہجہ نہیں ملتا

ثروت حسین

فلک سے گلستاں اترا زمیں پر
سلیماں نغمہ خواں اُترا زمیں پر

پری زادوں نے جب وہ تخت رکھا
تو ست رنگا دھواں اترا زمیں پر

کنیزیں کہہ رہی تھیں آؤ دیکھو
سفیر آسماں اترا زمیں پر

صحائف اور تحائف کے جلو میں
یمن کا میہماں اترا زمیں پر

فلک کے وشت سے حیران و ششدر
ہجوم کہکشاں اترا زمیں پر

کشش تھی اک جیسی خاکداں میں
کہ وہ ابر رواں اترا زمیں پر

بیاباں میں مجھے بے چین پاکر
فرشتہ ناگہاں اترا زمیں پر

ہوئی جب صبح تو وہ شخص ثروت
سنا کر داستاں، اترا زمیں پر

آدمی کو رہ دکھانے کے لیے موجود ہیں
کچھ ستارے جگمگانے کے لیے موجود ہیں

ابر، دیواریں، سمندر اور نادیدہ افق
رہروؤں کو آزمانے کے لیے موجود ہیں

کیوں گرفتہ دل نظر آتی ہے اے شامِ فراق
ہم جو تیرے ناز اٹھانے کے لیے موجود ہیں

دیکھتا رہتا ہوں اشیائے تصرف کی طرف
یہ کھلونے ٹوٹ جانے کے لیے موجود ہیں

پیش پا افتادہ قریے، سر برآوردہ شجر
سو بہانے دل لگانے کے لیے موجود ہیں

کون کر سکتا ہے ایسے میں کسی دریا کا رخ
جب وہ آنکھیں ڈوب جانے کے لیے موجود ہیں

میں درختوں سے مخاطب ہوں خدائے عزوجل
جو زمیں پر سر اٹھانے کے لیے موجود ہیں

غزلیں

ثروت حسین

دریچے ہوا دار تھے اس جگہ
کبھی شہر و بازار تھے اس جگہ

جہاں اڑ رہی ہے بیاباں کی ریت
گلستاں کے آثار تھے اس جگہ

بتاتی ہے رنگت در و بام کی
زمیں پر شفق زار تھے اس جگہ

کھڑا ہے جہاں سر جھکائے فلک
ستارے نمودار تھے اس جگہ

مگن اپنے خوابوں کی تعبیر میں
کبھی لوگ بیدار تھے اس جگہ

سمندر کو جاتے ہوئے راستے
میان گل و خار تھے اس جگہ

اڑا لے گئی ان کو ثروت ہوا
گلوں کے جو انبار تھے اس جگہ

پھر وہ برسات دھیان میں آئی
تب کہیں جان' جان میں آئی

پھول پانی میں گر پڑے سارے
اچھی جنبش چٹان میں آئی

روشنی کا اتا پتا لینے
شب تیرہ جہان میں آئی

رقص سیارگاں کی منزل بھی
سفر خاک دان میں آئی

آئینے سے نکل کے ایک پری
بازوؤں کی امان میں آئی

وہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی ثروت
ایک دن گلستان میں آئی

ثروت حسین

(ساقی فاروقی کے لیے)

وہیں پہ مرا سیم تن بھی تو ہے
اسی راستے میں یمن بھی تو ہے

بجھی روح کی پیاس لیکن تھی
مرے ساتھ میرا بدن بھی تو ہے

حسیں شام تیرہ سے مایوس میں
بیاباں کے پیچھے چمن بھی تو ہے

مشقت بھرے دن کے آخیر پہ
ستاروں بھری انجمن بھی تو ہے

مہکتی دہکتی لہکتی ہوئی
یہ تنہائی باغ عدن بھی تو ہے

باغ تھا مجھ میں اور فوارہ پھول میں تھا
منظر یہ سارے کا سارا پھول میں تھا

راتیں تمہارے ٹھہر گیا میں رستے میں
جیسے جنت کا نظارہ پھول میں تھا

تند ہوائیں لے گئیں اس کو ساتھ اپنے
ہاں یارو اک شخص ہمارا پھول میں تھا

جلتی آنکھ میں ریگ بیاباں اڑتی تھی
آنکھ لگی تو میں دوبارہ پھول میں تھا

میں نے اس کو چوم کے دیکھا تھا ثروت
برف برستی تھی انگارہ پھول میں تھا

اسی انجمن کی طرف جاؤں گا
یہاں سے یمن کی طرف جاؤں گا

بیاباں سے رنج سفر کھینچتا
بہار چمن کی طرف جاؤں گا

زمیں پر سنان و سپر چھوڑ کر
ترے پیرہن کی طرف جاؤں گا

زمانہ ہوا اس کو دیکھے ہوئے
کسی دن وطن کی طرف جاؤں گا

تلاش مسرت میں دیوانہ وار
میں کار سخن کی طرف جاؤں گا

غزلیں

ثروت حسین

نخلِ امید پہ ہم صبر کا پھل دیکھیں گے
آج گر دیکھ نہ پائیں گے تو کل دیکھیں گے

چشمِ نظارہ ملی ہے تو بہر صورت ہم
آدمِ خاک کو مصروفِ عمل دیکھیں گے

ورقِ زیست پہ لکھیں گے کہانی اپنی
نظمِ ہستی کو کسی روز بدل دیکھیں گے

ساتھ رکھیں گے اسے باغ کی تنہائی میں
اور فوارے سے گرتا ہوا جل دیکھیں گے

مدتوں بعد کوئی زمزمہ پرواز ہوا
آج ہم لوگ طلسمات غزل دیکھیں گے

لوٹ کر کوئی جہاں سے نہیں آتا ثروت
انھی راہوں پہ کسی وقت نکل دیکھیں گے

سحر ہوئی، تارے چلے جائیں گے
یہ ساتھی ہمارے چلے جائیں گے

کسی اجنبی سر زمیں کی طرف
کنارے کنارے چلے جائیں گے

سنو، شب کے بھیڑ چھٹ جائے گی
یہ عشاق سارے چلے جائیں گے

ترستی رہے گی زمیں دھوپ میں
کبھی ابر پارے چلے جائیں گے

وہ آئے نہ آئے مگر دوستو
اسے ہم پکارے چلے جائیں گے

تو کیا ان اندھیرے مکانوں میں ہم
یونہی دن گزارے چلے جائیں گے

آگ اور طرح کی ہے دھواں اور طرح کا
ہے کچھ مرے جلنے کا سماں اور طرح کا

یہ شہر ہے مٹی ہے یہاں اور طرح کی
یہ دشت ہے پانی ہے یہاں اور طرح کا

دیتے ہیں خبر خوش گزراں اور طرح کی
کرتے ہیں سخن دل زدگاں اور طرح کا

پَر مل گئے مٹی کو تو آنکھوں پہ کھلا یہ
منظر ہے سر کاہکشاں اور طرح کا

تعمیر کی بنیاد میں دل رکھا ہے یعنی
ہم لوگ اٹھائیں گے مکاں اور طرح کا

ثروت حسین

یک بارگی زمین ملی' آسماں چلا
ایسے میں اس کی آنکھ کا جادو کہاں چلا

ہاں زمزمہ سرائی کا اعجاز دیکھنا
جب میں چلا تو ساتھ مرے گلستاں چلا

باہر خزاں کی شام ہے' لب بستہ پیڑ ہیں
آئینے سے نکل کے ستارہ کہاں چلا

یہ دشت اپنی پیاس لیے منتظر رہا
کس شہر کی تلاش میں ابر رواں چلا

دروازے سے اترتی ہوئی سیڑھیوں کے پاس
ثروت گلاب رکھ کے کوئی نوجواں چلا

جب شام ہوئی میں نے قدم گھر سے نکالا
ڈوبا ہوا خورشید سمندر سے نکالا

ہر چند کہ اس رہ میں تہی دست رہے ہم
سودائے محبت نہ مگر سر سے نکالا

جب چاند نمودار ہوا دور افق پر
ہم نے بھی پری زاد کو پتھر سے نکالا

دہکا تھا چمن اور دم صبح کسی نے
اک اور ہی مفہوم گل تر سے نکالا

اس مرد شفق فام نے اک اسم پڑھا اور
شہزادی کو دیوار کے اندر سے نکالا

رکھ لیتے ہیں دل بیچ زباں پر نہیں لاتے
کچھ تیر ہیں ایسے جو کماں پر نہیں لاتے

ممکن ہی نہیں صبح بہاراں کا کھلے در
ایمان اگر شام خزاں پر نہیں لاتے

یاد رخ گل فام کو سینے میں چھپا رکھ
یہ جنس ہے نایاب دکاں پر نہیں لاتے

کیا جانیے کس دھن میں گرفتار ہیں ثروت
مدت سے وہ تشریف یہاں پر نہیں لاتے

دیکھی بھالی ہوئی ہر چیز یہاں لگتی ہے
دیکھنا یہ ہے مری آنکھ کہاں لگتی ہے

زرد ملبوس پہن کر وہ چمن میں آئی
وہ بھی من جملۂ تصویر خزاں لگتی ہے

آ گئے خاک نہادوں کو جگانے والے
دیکھیے آگ سر کنج اماں لگتی ہے

سبزہ و گل کی زمیں اتنی پرانی ثروت
سینۂ خاک پہ چلیے تو جواں لگتی ہے

ثروت حسین

صبح۔ اترتی ہے شہر میں

نقرئی گھنٹیاں بجاتی ہوئی صبح
اترتی ہے شہر میں
فوارے کی اوٹ سے
بھیگا ہوا شہسوار
دیکھتا ہے
بار بار
زرد سنہرا افق
جیسے فرشتہ کوئی
بکھیر رہا ہو زمین پر ورق

فوارے کی موت

گیت ختم کیا پانی کا
ریت نے اٹ گیا فوارہ
سوکھتے چلے گئے گل بوٹے
اب نہیں اترتے پرندے
کسی نے نہیں منایا سوگ
شاعر کے سوا......

دن نکلتا ہے......

دن نکلتا ہے کسی اجلے کبوتر کی طرح
آج کس نے میرے دل پر ہاتھ رکھا دھوپ کے پر کی طرح
گھنٹیاں بجنے لگیں
ایک دروازہ کھلا
آج میرے ہاتھ میں اک پھول ہے
لوگ اتریں گے پہاڑوں سے کسی دن شہد کے پیالے لیے
گھڑسواروں کے قدم سے جگمگائیں گے بھول
ہونٹ کھولیں گے رسول
شاعری کا ساتھ ہے
اک پری کا ہاتھ ہے
جس کی انگلی میں انگوٹھی جگمگاتی ہے کسی دل کی طرح
دل کی تہہ میں اک سمندر ہے جسے بیدار کرنا ہے مجھے
پار کرنا ہے مجھے
اس کنارے جاؤں گا
گیت اور امید لے کر آؤں گا
تم یہاں اس نہر کے پل سے مجھے آواز دینا
زندگی اک شور ہے بہتے ہوئے گھر کی طرح
دن نکلتا ہے کسی اجلے کبوتر کی طرح

سیب کے باغ میں خود کلامی

باغ کے اندھیرے میں
سیب توڑ کر دیکھوں
آئنہ شکستہ ہے
پھر سے جوڑ کر دیکھوں
دشت و کوہ کی خاطر
شہر چھوڑ کر دیکھوں

کھل اٹھے پھول تم

کھل اٹھے پھول تم
اپنی خوشبو میں گم
ہر دریچے میں دن مسکرانے لگا
وہ پرندہ جو عرصے سے خاموش تھا
چہچہانے لگا

ثروت حسین

سمندر سے روٹھا ہوا ایک ملاح

سمندر سے روٹھا ہوا ایک ملاح کل شام ساحل پہ یہ کہہ رہا تھا
فرشتو! مری بات مانو' سمندر کی جانب نہ جاؤ' یہیں ساحلی
شہر کے بام و در کو سجاؤ کہ اس رات کی دسترس میں ستارے
نہیں ہیں۔ کسی نے کہا: میں سمندر میں اتروں گا' موتی چنوں
گا کسی جل پری سے وہ نغمہ سنوں گا جو دل میں شگوفے
کھلاتا اترتا ہے پانی میں آغاز کرتا ہے اس حمد کا جو کسی نے
بلندی پہ روشن منارے کی صورت ابھاری ہے جس کے دریچے
کسی اور ہی آسماں کی طرف کھل رہے ہیں......

شاعری روٹھ گئی ہے مجھ سے

شاعری روٹھ گئی ہے مجھ سے
آسماں چپ ہے' زمیں بات نہیں کرتی ہے
بہتا پانی کسی امید پہ آمادہ نہیں
خوش نہیں آ کر کوئی لفظ کوئی دروازہ
کیسے بچھڑے ہوئے لوگوں کی خبر لاتے ہیں
کس طرح روٹھے ہوئے شخص کو گھر لاتے ہیں
شہد کی مکھیاں پھولوں کی طرف جاتی ہیں
ایک فوارے کے نزدیک شجر گنتا ہوں

ہوائے شب کے سامنے......

ہوائے شب کے سامنے دیا لیے ہوئے ترے مکان تک گیا' ورق ورق
گرے ہوئے تھے روشنی کے پھول دور تک زمین پر لکیری کھنچی ہوئی
فلک تلک چلی گئی تو میں رکا' دیے کو طاق پر رکھا' اتارا شاخ
سے گلاب اور دور کی دشاؤں کو سراہتا ہوا پیالہ بھر مسرتوں
کی کھوج میں نکل کھڑا ہوا......

کاٹ دو اس پیڑ کو

کاٹ دو اس پیڑ کو
جس کے سائے میں کوئی ماندہ مسافر
ایک پل سویا نہیں
کاٹ دو اس پیڑ کو
جس کے سائے میں کوئی عاشق کسی دن ٹوٹ کے
رویا نہیں

مصروف عورت

خالدہ حسین

میں ایک مصروف عورت ہوں :

اب میں آپ سے درخواست کروں گی کہ یہ لفظ (عورت) قوسین میں کر دیجئے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ مجھے صرف ایک مصروف وجود سمجھا جائے۔ چلئے اصولی طور پر نہیں تو صرف چند لمحوں کے لئے۔ ضرورتاً۔ عارضیاً۔ صرف اس کہانی کے لئے۔

تو میں ایک مصروف ہوں۔ یہ مجھے بار بار اس لئے نہیں کہنا پڑ رہا کہ خود مجھے اس حقیقت پر کسی قسم کا شک ہے۔ دراصل کبھی میں نے کہیں تھوڑی سی منطق پڑھ لی تھی۔ چنانچہ اب تک میری ہر بات خود بخود تین بیانات میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ذریعے میں کسی بھی قول محال کو نہایت آسانی سے ثابت کر سکتی ہوں۔ یوں کہ وقتی طور پر آپ اس کے سحر سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کر سکتے اس لمحے میں آپ کو نہ چاہتے ہوئے بھی میری بات پر یقین کرنا پڑے گا۔ گو بعد میں آپ لاکھ مجھے غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ دراصل شروع ہی سے مجھے یہ تربیت دی گئی تھی۔ پہلے ایک بات کو ثابت کرو پھر اس کو رد کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک میرا وجود ہونے نہ ہونے کی درمیانی سطح میں لٹکا ہے۔ میرے پیر و مرشد نے کہا تھا کہ جو شے تمہارے لئے چھت ہے کسی اور کے لئے فرش ہو سکتی ہے۔ تو پھر تم چھت اور فرش' زمین اور آسمان کی بلندی اور پستی کا تعین کس طرح کرو گے۔ خواب اور بیداری کا فیصلہ کیوں کر ہو گا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ اب ہم حالت خواب میں ہیں۔ مریں گے تو بیدار ہو جائیں گے۔ بات چھت اور فرش کی ہو رہی تھی۔ میں نے دو الٹا لٹکنے والوں کے بارے میں بہت غور و خوض کیا ہے۔ چمگادڑ ایسی بے کار' بے مصرف 'کمترین ہستی' اشاروں ہی اشاروں میں ہماری سمتیں سیدھی کرتی رہتی ہے۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتی ہے۔ وہ تو صرف سمتوں کے امکانات واضح کرتی ہے۔ اور امکانات تو ختم ہونے والی شے نہیں۔ دوسرے وہ بتیال کا بھوت ہے کہ کوئی کہانی میں ٹوک دے تو فوراً ہی درخت سے الٹا جا لٹکتا ہے پھر آپ اس کو لاکھ پکڑ پکڑ کے جھولے میں ڈالیں' قابو نہیں آتا۔

تو میں نے ان دونوں الٹا لٹکنے والوں کے بارے میں بہت تفکر کیا۔ ان کے نزدیک ان کی الٹی حالت ہی دراصل سیدھی حالت ہے۔ اور یقیناً اس حال میں وہ بہترین سوچ سوچتے ہیں۔ بتیال کی تمام کہانیاں اسی الٹی حالت میں اس کے ذہن میں جنم لیتی ہیں جنہیں سیدھا ہونے پر وہ سنا ڈالتا ہے مگر اگلی کہانی کے لئے اسے پھر الٹا لٹکنا پڑتا ہے۔ یہ محض اس کا فریب ہے کہ وہ سننے والے کے ٹوکنے پر ناراض ہو کر الٹا جا لٹکتا ہے۔ دراصل وہ اسی فکر میں ہوتا ہے کہ کہانی تو اختتام پر آگئی اب نئی کہانی کہاں سے آئے گی؟ اسے اپنا آپ خالی۔۔ بالکل خالی محسوس ہوتا ہے اور ایک تخلیقی وقفے کے لئے وہ کوئی ایسی انوکھی بات کہانی میں لا ڈالتا ہے کہ سننے والا بے چارہ بول اٹھتا ہے اور وہ موقع غنیمت پا کر اگلی کہانی کی فکر میں درخت سے الٹا جا لٹکتا ہے۔

دراصل بے حد مصروف ہستیوں کے لئے کام کے درمیانی وقفے سب سے زیادہ گمبھیر ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے تخلیق کاروں کے یہاں آپ کو ریاضت کے ایسے دور نظر آئیں گے۔ ایک مفروضہ ثابت کرتے ہی انہیں جب یہ احساس آن لیتا ہے کہ اب اس کے امکانات ختم ہوئے تو وہ نئے امکانات کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ اس تلاش سے پلٹ نہیں پاتے اور بے انتہا مصروف ہو جاتے ہیں۔ اپنی اصلی' فطری حالت میں مصروف۔ تو میں ایک مصروف وجود ہوں۔ مجھے بے حد ضروری کام کرنا ہیں۔ ان کی فہرست اتنی طویل ہے کہ ختم ہونے میں نہ آئے گی۔ ایک بار میں نے ان کی فہرست بنانے کی کوشش بھی کی تھی مگر پھر مجھ پر اس کوشش کے عبث ہونے کی حقیقت کھل گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ہر لمحے میں ایک نیا وجود ہو چکے ہوتے ہیں۔ ایک سے دوسرے تک عمر ایک لمحے بڑھ چکی ہوتی ہے اور بہت سے خلیوں کی توڑ پھوڑ ہمارے جسم کے اندر اور بہت سے تجربات کی ترمیم ہمارے باطن میں ہو چکنے پر ہم وہی نہیں رہتے جو پہلے تھے اور اسی لئے ہر لمحہ ہمارے لئے ایک نیا وجود ہے۔ ہر وقت ہماری نوعیت بدلتی رہتی ہے۔

گھبرایئے نہیں۔ میں نے کوئی غلط بات ثابت نہیں کی۔ اگر آپ کو کچھ شبہ ہے تو فی الحال ملتوی کیجئے۔ میں تو محض یہ بتا رہی تھی کہ مصروف آدمی کی مصروفیات کی فہرست مرتب کرنا بالکل ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے میں نے یہ طریق کار اپنایا کہ جو کام بھی سامنے آئے اس کو نمٹاتے چلے جاؤ۔ یہی وجہ ہے کہ اب میرے کام خود بخود نہایت آسانی سے ہوتے چلے جاتے ہیں بلکہ سب

لوگ میری اس کارکردگی پر حیران رہ جاتے ہیں۔ گو میرا پہلا اصول تو یہی ہے کہ ہر کام بغیر کسی ترتیب کے بنا سوچے سمجھے نمٹاتے چلے جاؤ۔ مگر اس کے لئے بھی ایک حربہ مجھے بہرحال اختیار کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ قدم قدم پر مجھے اپنی ذات کے حوالے بدلنے پڑتے ہیں۔

میرے گھر میں ایک خاموش تاریک کمرہ ہے۔ اس کی دیواروں میں نیچے سے اوپر تک طاق بنے ہیں۔ اور ان سب میں وہ چہرے دھرے ہیں جنہیں میں ایک ایک کرکے پہنتی ہوں۔ دن کے مختلف حصوں میں اپنے کام نمٹاتی چلی جاتی ہوں۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ ہر کام کے لئے مجھے مناسب "پرسونا" استعمال کرنا پڑتا ہے۔ بس میں ایک کے بعد ایک پرسونا پہن کر تمام کام کرتی چلی جاتی ہوں۔ کسی فلم کے فاسٹ موشن کی طرح۔ آپ پوچھیں گے آخر ان کاموں کے نمٹانے میں ایسی عجلت کیوں؟

تو اب میں اپنے اصل مسئلہ کی طرف آچکی ہوں۔ دراصل میں انتہائی عجلت میں ہوں۔ آج سے نہیں۔ ازل سے ـــ پہلی سانس سے میں بہت عجلت میں ہوں اس کام کی خاطر جو دراصل مجھے کرنا ہے۔ اسی لئے مجھے ہر کام عجلت میں کرنا پڑتا ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ پہلے تم وہ ضروری کام کیوں نہیں کرتیں۔ دیکھا آپ نے کیسی غیر منطقی بات کی۔ دراصل وہ کام میرا اصل وجود نمٹائے گا جس کے لئے فی الحال میرے پاس کوئی پرسونا موجود نہیں۔ یہ تو وہی واحد کام ہے جس کے لئے کسی پرسونا کی نہیں خود پورے وجود کی ضرورت ہے۔ اسی لئے اس کے راستے میں حائل ہونے والے ان تمام چھوٹے موٹے کاموں کو اتنی تیزی سے نمٹاتی ہوں۔ یہ تو دراصل جنگل کے خود رو جھاڑ ہیں جنہیں صاف کرکے مجھے اس کام تک پہنچنا ہے۔ وہ جو اس جنگل کے آخری سرے پر ہے۔ کہیں زمین آسمان کی ملتی لکیر کے آس پاس۔

ایک تو میں بے حد بھلکڑ واقع ہوئی ہوں۔ اکثر چیزیں رکھ کے بھول جاتی ہوں۔ ایک وقت تھا جب میں اپنے یاد رکھنے کی عادت سے عاجز تھی۔ ہر بات۔ ہر لمحہ۔ ہر دم ذہن میں زندہ رہتا۔ ایک مسلسل شور جو میرے گرد آندھی کی طرح چلتا رہتا۔ آوازوں کا ہجوم جو دن رات' ایک بھنبھناہٹ کی طرح کانوں میں سناتا۔ نیند میں بھی بیداری کا عالم رہتا۔ میں تو گویا کسی لائبریری کا کیٹیلاگ تھی کہ ہر بات' ہر سانحہ' ہر لمحہ' نمبروار' فہرست وار محفوظ تھا۔ کسی کو بھی کسی وقت طلب کرلیجئے۔ اور وقت کا یوں اپنی ذات میں محفوظ رہ جانا بھی بہت خطرے کی بات ہے۔ اس کی ہیبت سے جو کوئی بھی دوچار ہوتا ہے۔ اس سے گزرا ہوا' آنے والا اور موجود زمانہ سب ایک ہوجاتے ہیں انسان فیصلہ نہیں کرپاتا کہ وہ کہاں ہے۔ اور اس کی کارکردگی بری طرح متاثر ہوتی ہے اور کارکردگی کو تو کسی صورت متاثر نہ ہونا چاہئے۔

تب میں پرسونا کے استعمال سے واقف نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میرا کوئی بھی کام وقت پر اور صحیح نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ ہر کام کے دوران مجھے کچھ اور کرنا چاہئے تھا۔ چنانچہ میں دوسرے کام کی جانب لپکتی مگر آدھا کرچکنے کے بعد پتہ چلتا کہ ضروری کام تو پڑا ہی رہ گیا۔ تمام دن ایک سے دوسرے' دوسرے سے پہلے کام کی طرف لپکتے گزرتا۔

برسوں پہلے نفسیات کے استاد ہمیں ذہنی امراض کے ہسپتال لے گئے تھے۔ وہاں پر چاروں طرف سے بند کوٹھری میں ایک عورت چکر لگارہی تھی۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ تیزی سے چلتی' ایک سے دوسری' دوسری سے پہلی دیوار تک۔ ہم نے یہ منظر لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی سے دیکھا تھا۔ وہ عورت تمام وقت اسی طرح چکر کاٹتی تھی جب تک کہ نڈھال ہوکر گر نہ جاتی۔ وہ پندرہ سال سے اس کوٹھری میں مقید تھی۔

مگر میں نے بروقت پرسونا دریافت کیا۔ اب میرا دن مختلف حصوں میں بٹ گیا تھا اور وقت تیزی سے گزرتا۔ کام تیزی سے سمٹتے۔ یہاں تک کہ رات آن پہنچتی۔ رات جو الٹا لٹکنے والوں کے لئے دن ہے۔ اور اس رات کے لئے میرے پاس ابھی تک کوئی پرسونا تیار نہ تھا۔ نیند سے پہلے کے ان چند لمحوں میں' میں اپنی کوٹھری کے طاقوں کو الٹ پلٹ کرتی۔ اپنا ننگا چہرہ چھپانے کے لئے مجھے کچھ بھی نہ ملتا۔ اس ننگے چہرے کا کوئی حوالہ میرے پاس موجود نہ تھا۔ بجز اس ایک کام کے۔ وہ ازلی وابدی کام جس کی خاطر میں یہ راستے میں آنے والے تمام چھوٹے موٹے کاموں کا جنگل کاٹتی چلی آئی ہوں۔ مگر یہ جنگل عجب ہے کہ رات تک صاف کرکے سوؤ تو صبح پھر ایک نیا' اس سے دگنا گھنا سامنے تیار کھڑا ہوتا ہے۔

اب میں ایک حالت میں دوسری حالت کو فراموش کردینے کی ماہر ہوچکی تھی اور یہی میری سب سے بڑی مصروفیت تھی۔ حالتوں کی تبدیلی۔ ایک سے دوسری میں منتقل ہونا اور پہلی کو فراموش ذہن سے یکسر مٹا دینا۔ شروع شروع میں بھلا دینے کی صلاحیت اور اس کی کامیابی پر میں حیران رہ گئی۔ میرے سر میں ابلتا لاوا یکدم پرسکون اور ٹھنڈا ہوگیا۔ کانوں میں سنسناتی بھنبھناہٹ مدھم پڑ گئی۔ ہاتھوں' پاؤں' بازوؤں' اور گردن میں عجلت کی کیفیت' اس کی تھکن' سانس کی تیزی سینے کی دھم دھم سب ختم ہوگئی۔ پھر بھول کی ایک نرم چادر میرے گرد لپٹتی چلی گئی۔ روئی کے گالوں ایسی چادر جس نے مجھے بے وزن کردیا۔

"بیگم صاحبہ۔ بس ذرا سا سوچ لیجئے کہ خوف محض ایک لفظ ہے"! یہی وہ لفظ تھے جو ڈاکٹر نے مجھے میز پر لٹانے کے بعد کہے تھے۔

بھول کی جادو نگری میں وہ میرا پہلا قدم تھا۔ رفتہ رفتہ ہر شے مجھ سے دور سرکنے لگی۔ چیزیں نام۔ لوگ۔ کبھی مجھے اپنے کانوں پر شک ہونے لگتا۔ اب مدتوں مدتوں کوئی ایسی آواز نہ آتی جو مجھے چونکا سکتی۔ نہ ہی میرے قدم زمین کی سختی سے مس ہوتے۔ وہ میرے رفیق خدشے' خوف' مسلسل تشویش۔ وہ سب کیا ہوئے؟

میرے طاقوں میں سے رفتہ رفتہ وہ چہرے غائب ہونے لگے اور وہاں دھول جمنے لگی۔ اپنے خالی طاق دیکھ کر مجھے خیال آیا ـــ تو کیا وہ وقت آن

پہنچا؟ کیا میں نے واقعی اس جنگل کو پار کرلیا؟ اور اب بالآخر وہ میرے سامنے ہوگا۔ وہ کام جو دراصل مجھے کرنا تھا۔

اب صبح ہوتے پر وہ جنگل دگنا گھنا ہو کر سامنے کھڑا نہ ہوتا۔

"قدرت اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے خود بخود راستے پیدا کرتی ہے"

اب کے ڈاکٹر مجھ پر جھکا کہہ رہا تھا۔ "اس میں انسان کو خود ذرا سی بھی کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ گاہ بزوری کشدا" اس نے آہستہ ہنسی کے ساتھ کہا۔

"بس اب دو لمبے گہرے سانس۔"

اچانک سامنے کھڑکی میں سورج کا پورا تھال چمکتا میری جانب جھکنے لگا اور ایک طویل وقفہ سامنے پھیلا تھا۔ ❖ ❖

غزل

سعید الظفر چغتائی

شہر تھا، لب تھے صوت و صدا کے لیے
دل تھا اک حرف عجز نما کے لیے

رنگ، آواز، خوشبو سبھی دے گیا
اک تصور تھا رنگ حنا کے لیے

رنگ اڑتا رہے، رنگ بھرتے رہو
اور کچھ خون دل نقش پا کے لیے

اے کہ تخئیل تیری چمن در چمن
ایک لمحہ کسی بے وفا کے لیے

جیتے جی تن کا تانبا تپاتے رہے
خاک تو ہوگئے کیمیا کے لیے

چھوڑ کر آئے تھے غیر کی جنتیں
اپنے گھر نت نئی کربلا کے لیے

حرف آغاز خون جگر سے لکھا
کچھ رگ جاں میں ہے انتہا کے لیے

اختر یوسف

شکتی-۴

شکتی مایا... چاروں اور... اور ہوا لرزیدہ اور دریدہ
جیسے چادر جوگی کی گھاٹ کنارے لرزیدہ
تار تار میں بنے ہوئے اسرار
ہوا لرزیدہ یا پرندہ

آنکھ میں جس کے اگنی درپن برہن کے گیتوں کی رات
بارش میگھا جل تھا ندیاں سات سمندر دھنک تماشہ
جس میں
گھلتا جائے... شکتی کی کایا کی مایا

جنگل جنگل مور ناچ پاؤں میں جن کے کالک بندھن
رنگ اڑے تو اڑتا جائے ہوا میں لپکے راج رنگ
جیسے چادر جوگی کی پلک پلک میں اجیارہ... زردارہ...
نیلارہ
اکتارہ... بول رہا ہے

رم جھم برسے شکتی پھلوار
عنبر مہکے دورارے دوار
جوہی جیسی ایک کٹوری
جس میں امرت تارا دمکے
سیب کے باغ میں نیلا چاند
تھوڑی بکھرے شرمائے
شکتی مایا چاروں اور... چاروں اور

شکتی-۵

شکتی کی آنکھوں میں ساگر دھرتی اور آکاش
کنڈل سورج کا
برسائے دھوپ
تمہارا روپ
شکتی روپ... ساگر اندر موتیوں کے ہنس راج کے
درشن دے
لہرائے میرے سامنے
دھرتی کے نیلم مور کی آنکھیں اور آکاش کے سات
پرت
سات پرت والی پتنگ... ایک دھنک اور سب کا
انتم شبد... اللہ
اللہ اول شبد اللہ ارض و سما کا نور اللہ
شکتی کی آنکھیں... بیلا پھول کی خوش بو مجھ کو
آدھی رات جگا کے بولے
دیکھ فلک سے ارض تلک بھیراج کا دریا کیسا صندل
راگ بکھیرے
صندل راگ جہاں بیراگ
ساگر اندر موتیوں کے ہنس راج کے درشن دے
دور کھڑی للچائے... مورکھ پگلی مایا

نظمیں

اختر یوسف

شکتی-۱

ادکی آواز
ہیں دور سے آتی ہے
نتے ہیں ہم
بس ہم
اتی کے کان تو
سانپ کے بلوں کی رکھوالی میں گم ہیں
ادم مانس اور رکت کے رسیا تم
پنی ہی عورتوں کے بندر بانٹ کے باٹ ترازو لہراتے
ال سے الگ ساتھ میں چھال کے کمزتال کی چوٹ سے
رات راگ وشاد شامیں چھوڑتے
تم سانپ کے بلوں کی رکھوالی میں گم
ادکی آواز کہیں دور سے آتی ہے
رقص کا موسم... بس سامنے کھڑا ہے
م دھادم گھنگھرو
اؤں میں قلندر کے
اگ بے تاب شعلے میں جھن جھنا جھن شعلہ
پتوں کی ایک اچھلی ہوئی گھٹا میں اب
گہرا گہرا نیلا دھواں امنڈتا ہے
پیچھے اوپر کبھی سنہری کبھی اوپر سے نیچے سرخ ہو جاتا ہے
اؤں میں قلندر کے گھنگھرو جھن جھنا جھن جیسے
تی ماتی دیدوں میں برچھیاں سی ڈالتے

ناد کی آواز جیسم کانوں میں ڈھلتی ہے
کائنات تھکی تھکی سانس پکڑتی ہے
رقص کا موسم بس سامنے کھڑا ہے

جاگ جانا چاہتی ہے تمہیں سلانا چاہتی ہے
آدم مانس اور رکت کے رسیا تم
تمہیں سلانا چاہتی ہے
جاگ کرو وہ تیسری
وہ تیسری آنکھ
نٹ کھٹ قلندر نٹ ہٹ اگنی بان کے ساتھ
بجر منتر ہونٹوں تک اپنے لاتا ہے
جٹا سے اس کی اک دھارا اس کی دونوں آنکھوں میں
ڈھلک آتی ہے
جانے کیوں
ناد کی آواز کہیں دور سے آتی ہے

دور دیش میں ایک سمندر

دور دیش میں ایک سمندر
پانی جس کا شہد بتاشا
سورج جس کا کبھی نہ ڈوبے
اجلا ایسا جیسے دودھ کے دانت
چاند میں جس کے نیلا دریا
نیلم جیسا پانی

جس میں اپنے چہرے دیکھیں
دودھ نہائے راج ہنس
دور دیش میں ایک سمندر
سر تال میں بہتا جائے
ہوا کے بن میں گیت اجالے
سات رنگوں کی لے بکھرائے
سات رنگوں کے محل اٹھائے
زینے جن کے دل کے اندر
دور دیش میں ایک سمندر

———

شین کاف نظام

مجبوری

سوکھے پتوں پر سے
گزر رہا ہے
سانپ

عرق آلودہ شجر ہیں
دم بہ خود ہیں حجر
لگتا ہے
آج بھی
بھول کر رستہ
آگیا ہے ادھر
ڈھونڈتا
شب گزاری کے لیے
جائے اماں

کیا کروں
اپنے دیے کو

کردیا ٹھنڈا
میں نے تو
شام ہی کے آخری پل میں

بمقامے رسیدہ ام کہ مپرس

دعا و عبا و عصا
کیا کریں گے؟
عصا بھی تو سہارا ہے
عبا ہوگا تو عریانی سے اپنا واسطہ ہوگا
دعا ہوگا تو خالی پن سے چھٹکارا نہیں ہوگا
ہمیں تو عمر ہی کی اوک میں رہتا ہے.....
رستا ہے
ہوا کا ہم سفر ہوتا ہوا ہو کر ہی ممکن ہے
سفر ہی ہم سفر ہوگا
یہی تو سوچ کر اترے پر سیدہ پہاڑوں سے
سفرزاد سفر ہوگا
یہی تو ٹھان کر نکلے خوامش کی گپھاؤں سے
یہاں سے تو سفر کا ساتھ بھی اب چھوڑ دینا۔
دعا ہی سے نکلنا ہے

ہچو حافظ غریب در رہ عشق
بمقامے رسیدہ ام کہ مپرس حافظ

ہر کس کہ دید روئے تو بوسید چشم من

بھری ہے
دھوپ ہی دھوپ
آنکھوں میں
لگتا ہے
سبھی کچھ
اجلا اجلا
اسے دیکھے
زمانے ہو گئے ہیں

ہر کس کہ دید روئے تو بوسیدہ چشم من
کارے کہ کردہ دیدۂ من بے نظیر کرد (عرفی)

دردا کہ ایں معما شرح و بیاں ندارد

وادیوں میں
دیکھتی ہے خواب
رات

خواب میں دیکھتی ہے
برہنہ خود کو

رات کے اس دیکھنے کو
دیکھتا ہے
چاند
چپ چاپ
پہاڑی
مدتوں سے ان چلی
پگڈنڈیوں سے

ہر شیشے دریں رہ صد بحر آتشیں ست
دردا کہ ایں معما شرح و بیاں نہ دارد حافظ

شین کاف نظام

مکتنف

اتنی رات گئے
اتنی دور
آرہا ہے
کون

دیا سلائی.....؟
تیل ہی کہاں ہوگا
دیے میں

کٹورے میں بھی نہیں ہے کچھ
تو اضع کیسے ہوگی
برس بیتے
سوکھے
گھڑے کو اور
بہتا ہے دریا دور
نیچے.....
بہت نیچے.....

برف گرنے والی ہے

بنور تا ہے
پتیاں سوکھی
موسم
چھپاتا ہے
چنگاریاں چناروں میں
پہاڑوں پر گرنے والی ہے
برف

اللہ کی نشانیاں

پہاڑ پر اگے ہیں تھوہر
ڈھلان پر ہے جھاڑی
بیر کی
سایہ
جس کا پڑتا ہے
حوض میں
تیرتے کنول پر

وعا اور چاند

شاطر ہے
چاند
عکس اس کا
ہر وعا میں
اس کا ہی آکار بھر
پھر بھی رہتا ہے الگ
ہر وعا سے

وعا، خلا اور میں

وعا میں خلا ہے
خلا میں وعا
اور میں ؟

منتفی

چاند کی نرم، ٹھنڈی، روشنی میں
سانپ
نکلا ہے ڈھونڈنے وہ
پیڑ
جس کی کھوہ میں
سوچا تھا اس نے
ہوں گے انڈے
طوطے کے

شین کاف نظام

قلب ماہیت

جہاں آج بیٹھے ہو تم
وہیں کبھی آکر بیٹھا تھا
میں
ڈھونڈتا
گزشتہ

پانی میں تیر رہی تھی
بیج
دیودار تمہارے ہی جتنے تھے سب
مٹی اتنی نہیں بھی تھی تب
پل کہاں بنا تھا جب

حیا
صبا
دعا
ایسے ہی ملے تھے
جیسے دیکھتے ہو

تم
لو!

TRANSFORMATION

مکالمہ

میں نے پوچھا
"راستہ کدھر ہے؟"

"کتنا اچھا لگتا ہے
پہاڑ
برف میں ملبوس"
اس نے کہا
"دیوداروں اور چناروں کے سایوں کے
بیچ سے گزرتے
نور کے ٹکڑے
جاذب و پرکشش ہیں کتنے !"

"لیکن.... راستہ ؟"

"ندی نیچے ہے
اوپر ہے برف اور
اس کے اوپر چاند
یہاں ہو
تم !"

موسم بدلتے دیر ہی کتنی لگتی ہے

پیلے ہو گئے پہاڑ
آتی نہیں
آواز
کہیں سے بھی
جھرنے کی
ستانے سناٹوں میں

آتے ہیں
کبھی کبھار، اکا دکا
پرند
جگانے اونگھتی یادوں کو
موسم بدلتے دیر ہی کتنی لگتی ہے

وقت میں سے گزرتے ہوئے

دعا میں ہو رہا ہے سرد قہوہ
پھسلتی ہے پربت سے
دھوپ
گہری گھاٹیوں میں
ہونے --- گھپ اندھیرا

راشد انور راشد

راشد: الیاس صاحب سب سے پہلے ساہتیہ اکیڈمی کا "فائر ایریا" پر انعام ملنے پر ہماری پرخلوص مبارکباد قبول کیجیے۔

الیاس احمد گدی: جی بہت بہت شکریہ۔

راشد: ایوارڈ یا اعزاز اگرچہ فنکار کی محنت کا حاصل نہیں ہوتا لیکن اس کے اعتماد کو، اس کی انانیت کو اس سے کچھ تقویت تو ضرور ملتی ہے۔ یہاں انانیت سے میری مراد خود کی شناخت کی مثبت پہلو ہے۔ اس اعزاز سے قبل اکیڈمی انعام یافتگان کو آپ کس نظر دیکھتے رہے ہیں اور اب خود اسی بلندی پر پہونچنا آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

الیاس احمد گدی: بھئی دیکھیے ایوارڈ جس کو بھی ملتا ہے وہ یقیناً خوش ہوتا ہے اور میں بھی خوش ہوں۔ لیکن یہ آخری مرحلہ ہے، ایسا میں نہیں مانتا۔ ہاں یہ ہے ایک شناخت ملی اور یہاں تک آ پہونچے۔ لیکن آگے کا یہ سفر تو ابھی باقی ہے۔ میرے خیال میں اس کے بعد فن کار پر مزید ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔ لکھنے والے کے سامنے ایک BARRIER کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ ایک حد مقرر کر دی جاتی ہے کہ اب آپ اس سے پیچھے مت ہٹئے اور آگے چلنا ہے آپ کو۔ میں نے اس ایوارڈ کو اسی CHALLANGE کے ساتھ قبول کیا ہے۔

راشد: مختلف عاذوں پر بہار کے فن کاروں کو اپنی قدر شکنی کے کرب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لوگوں کی صلاحیتوں کا اعتراف ہوتا تو ہے لیکن اکثر و بیشتر جانب داری بھی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ اردو کے اکثر علاقوں میں بھی کم و بیش یہی صورت حال ہے لیکن میرا خیال ہے کہ بہار اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی تعصب کا شکار ہوتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

الیاس احمد گدی: میں نہیں مانتا کہ تا دیر کسی کی صلاحیتوں کو دبائے رکھا جا سکتا ہے۔ جس آدمی میں صلاحیت ہوگی اس کو تسلیم کرنا یا لا محالہ ناگزیر ہو ہی جائے گا۔ کسی وجہ سے اگر آپ اس کی صلاحیتوں کو تسلیم نہیں کرتے ہیں تو پھر آپ کی لیاقت اور ادبی فہمی مشکوک ہو جائے گی۔ ویسے آپ کی اس بات سے میں پوری طرح متفق ہوں کہ عصبیت کی لہر اندر ہی اندر چل رہی ہے صوبائی عصبیت کے علاوہ ایک علاقائی عصبیت بھی ہوتی ہے۔ بہار کے ہی تناظر میں اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ پٹنہ والے بس یہی سمجھتے ہیں کہ عظیم آباد ہی سب کچھ ہے۔ اس کے آگے شاید اردو ہے ہی نہیں۔ حالاں کہ یہ بات سامنے کی ہے کہ اردو سے تقریباً نابلد سمجھا جانے والا علاقہ چھوٹا ناگپور بہترین ادیبوں سے بھرا پڑا ہے جن کے مقابلے میں ممکن ہے کہ عظیم آباد میں بھی لوگ موجود نہ ہوں۔ شاعروں میں صدیق مجیبی اور پرکاش فکری کا نام لیا جا سکتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تا دیر کسی کی صلاحیتوں کو نظر انداز کرنا بہت مشکل ہے۔

راشد: سالی دھرتی کے پورے پس منظر کو اس خوبصورتی سے اجاگر کرنے کا خیال آپ کو کب آیا؟ اسے عملی جامہ پہنانے کی داستان یقیناً دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

الیاس احمد گدی: دیکھیے ہم لوگ اسی زمین میں پیدا ہوئے، پلے، بڑھے۔ سب

کچھ کیا۔ غیاث احمد گدی جو میرے بڑے بھائی تھے اور اردو افسانوں کی دنیا میں ان کا بلند مقام تھا۔ انہیں میں ہمیشہ ہی ترغیب دیتا رہا کہ کوئی بڑا کام اس ناول فیلڈ کی تعمیم کو وہ ضرور کر جائیں۔ لیکن پتہ نہیں کیوں وہ ناول لکھنے کو تیار نہیں ہوئے۔ اور ایک آدھ مرتبہ انھوں نے کوشش کی بھی تو ناکام رہے مثلاً انہوں نے "پڑاؤ" لکھا لیکن وہ اس میں ناکام رہے۔ وہ خود اس کا اعتراف کر چکے ہیں۔ پڑاؤ کی ناکامی کا سبب میرے خیال میں یہ تھا کہ وہ جستہ جستہ لکھا ہوا ہے اور افسانے کی شکل میں ہے۔ کہانی یہاں سے وہاں مربوط نہیں ہو پاتی ہے۔ شروع کا باب آخری باب کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے لیکن درمیان میں اتنا زیادہ گیپ ہو جاتا ہے کہانیوں میں کہ ایک ہی چیز نہیں لگتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ افسانے تک تو شاعرانہ زبان ٹھیک ہے لیکن ناول کے لئے قطعی مناسب نہیں۔ اس کو کہیں کہیں مقامی طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ایک لمبا دور ہے جس کو آپ کو بیان کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے شاعرانہ زبان کسی طرح کارآمد اور مناسب نہیں ہو سکتی ہے۔

ان کی وفات کے بعد میں نے محسوس کیا کہ جو کام کرنا چاہئے تھا وہ ادھورا رہ گیا۔ اور تب مجھے اپنی ذمہ داری محسوس ہوئی کہ یہ کام مجھے پورا کرنا چاہئے۔ اس کو بھی میں نے ایک CHALLANGE کے روپ میں قبول کیا۔ اور ایک عرصہ تک اس پر سوچتا رہا۔ یہ آٹھویں دہائی کے آخر کا زمانہ تھا۔ تین سال تو مجھے سوچنے میں لگ گئے اور تین سال کا وقت لکھنے میں لگا جب میں نے لکھنا شروع کیا تو کہیں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ لکھنے کے لئے وقت کم مل پاتا تھا کیونکہ روزی روٹی کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ ساتھ ہی زندگی کی دوسری مصروفیات بھی تھیں۔ چنانچہ میں اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے لکھتا رہا۔ اس دوران کئی مشکلوں سے دوچار ہوا۔ مثلاً میری اہلیہ ایک جان گسل مرض میں مبتلا ہو کر مجھے اکیلا چھوڑ گئی۔ غم کے شدید دباؤ کے باوجود میں اس دوران بھی لکھتا رہا۔ یا یوں سمجھے کہ اس شدید غم کے دباؤ کو ادھر منتقل کرتا رہا۔ یا ایک طرح سے قرار حاصل کرتا رہا۔ یہاں مجھے ایک عجیب دنیا ملی اور میں اپنا زیادہ تر وقت اسی دنیا میں گزارتا رہا۔ اپنے ذہنی کرب سے کچھ حد تک نجات حاصل کرنے کے لئے۔

راشد : آپ نے اپنی اہلیہ کی موت کا ذکر کیا ہے کہ اس سانحے کے بعد ذہنی تناؤ سے کچھ لمحوں کے لئے راحت کی گنجائش آپ نے ایک نئی دنیا میں اپنے آپ کو منتقل کر کے نکال لی۔ حقیقت سے اس طرح فرار فن کار کے لئے کس حد تک مناسب ہے؟ اور اس کیفیت نے "فائر ایریا" کے کن کن حصوں پر اپنے تاثرات منتقل کئے ہیں ؟

الیاس احمد گدی : ناول میں اس طرح کی کئی چیزیں آئیں جن میں اس کیفیت کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ناول کے بعض حصوں میں جھلاہٹ غصہ نفرت یا پیسے کا ابھاؤ یا کمی کی ایک طرح کی محتاجی یا ساری چیزیں کہیں نہ کہیں وہیں سے اثر پذیر ہو کر نکلیں۔ اور ناول میں سما گئیں حقیقی زندگی اور تلخ حقائق کا اثر فن پارے پر ہوتا ہے لیکن یہ بہت لاشعوری ہوتا ہے۔ شعوری طور پر اگر اس کو عمل میں لایا جائے تو تصنع والی بات ہوتی ہے۔

راشد : غیاث احمد گدی کے تعلق سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ بڑے درخت کے سائے میں جب کوئی پودا جنم لیتا ہے تو آگے چل کر اس کی نشو ونما متاثر ہونے لگتی ہے۔ ایک عرصے تک آپ کو غیاث احمد گدی صاحب کے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے ہی جانا جاتا رہا اور آپ کی انفرادیت نظر انداز کی جاتی رہی۔ کیا فائر ایریا" کی کامیابی کے بعد اس طرز فکر میں تبدیلی آئے گی ؟

الیاس احمد گدی : تبدیلی تو اس سے پہلے بھی آچکی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے کسی بڑے درخت کے نیچے میں نہیں تھا۔ میری تحریر اور غیاث صاحب کی تحریر میں جو نمایاں فرق رہا ہے وہ شروع سے آخر تک موجود رہا ہے۔ آپ اس بات پر حیرت کریں گے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کی تحریر اشاعت سے قبل کبھی نہیں پڑھتے تھے۔ میں نے کبھی اپنا کوئی مسودہ غیاث صاحب کو دکھایا نہیں، جب تک وہ شائع نہیں ہو گیا، انہوں نے اس کو نہیں پڑھا۔

راشد : جہاں تک مجھے یاد آتا ہے ایک گفتگو میں آپ ہی نے کہا تھا کہ جب میں نے ایک تحریر غیاث صاحب کو دکھائی تھی تو انہوں نے غصے میں اسے دور پھینک دیا تھا۔

الیاس احمد گدی : آپ نے ٹھیک یاد دلایا۔ لیکن یہ بات کہانیوں کے تعلق سے درست نہیں۔ میں نے بہت پہلے ایک ناول لکھا تھا۔ میرا

خیال ہے کہ یہ زمانہ ان کی وفات سے پانچ چھ سال پہلے کا رہا ہوگا جب میں نے انہیں یہ ناول دکھایا تو انہوں نے اسے اٹھا کر آنگن میں پھینک دیا کہ اس طرح کہیں لکھا جاتا ہے۔ تم ریڈیو نیں ازم پر لکھتے ہو اور اس طرح لکھتے ہو۔ میں نے پوچھا کہ ٹھیک نہیں کیا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ بالکل بے کار ہے۔ وہ پہلی چیز تھی جو میں نے ان کو دکھائی تھی۔ اس کے بعد میں نے آنگن سے وہ ناول اٹھایا اور ان کے سامنے ہی صفحات کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے یہ ڈھائی سو صفحے کا ناول تھا۔ میرا خیال ہے کہ آج بھی اردو میں جس قسم کے ناول لکھے جا رہے ہیں ان سے کم تر تو خیر کسی اعتبار سے نہ تھا نہ صرف اس پورے ناول کو میں نے ضائع کر دیا بلکہ موضوع کو بھی رد کر دیا کہ اب اس پہ لکھنا ہی نہیں ہے۔

راشد : لیکن قارئین میں آج بھی آپ کی شناخت غیاث صاحب کے تعلق سے ہی کیوں قائم ہے؟ کہیں بھی آپ کا نام آتا ہے تو یہ حصہ ضرور شامل کر دیا جاتا ہے کہ غیاث احمد گدی کے چھوٹے بھائی۔ اس میں تبدیلی کب آئے گی؟

الیاس احمد گدی : بھئی اس کا جواب تو پڑھنے والے ہی زیادہ بہتر دے پائیں گے۔ اب لوگوں کے ذہن میں اس طرح کا تاثر قائم ہو ہی گیا ہے تو کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟ اس کے پہلے خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کے متعلق اس طرح کی باتیں ہوتی تھیں۔ لوگ بھول جاتے تھے کہ کون سی کہانی کس کی ہے۔ آپ بھی یوں سمجھ لیجئے۔ غیاث صاحب کا افسانہ یا الیاس احمد گدی کا افسانہ۔ بات ایک ہی ہے۔ حالانکہ فرق دونوں میں ہے اور یہ فرق شروع سے آخر تک قائم رہا۔ ہم دونوں کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ انہوں نے جس طرح کی شاعرانہ زبان استعمال کی ہے اور جس نزاکت سے لکھا ہے وہ میرے یہاں نہیں ہے۔ میرے یہاں کھردری حقیقت زیادہ ہے اور کسی قدر تلخ بھی۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ وہ بہت SOFT قسم کی چیز دیتے رہے ہیں SOFT قسم کی چیزوں سے میری مراد سطحی سے ہرگز نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ افسانوں میں انہوں نے SOFT قسم کی زبان کا استعمال کیا ہے شاعرانہ زبان جس میں شاعری کی جا سکے اور یہ چیز تو یقیناً ایک حسن ہے، ایک الگ پہچان ہے۔

راشد : کامیاب افسانے کے لئے شاعرانہ زبان کا استعمال کہاں تک مناسب ہے؟

الیاس احمد گدی : میں سمجھتا ہوں افسانے کے لئے اس طرح کی زبان مناسب ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ اس کو قاعدے سے برتا جا سکے، اور یہ صلاحیت غیاث صاحب میں بہت زیادہ تھی۔ میں نے اسی ڈر سے ان کے بہت کم افسانے پڑھے ہیں کہ کہیں میں اس کا شکار نہ ہو جاؤں۔ اس سحر کا جواب کی تحریروں ہے۔ اس لئے ان کے افسانے جیسے "خانے اور تہہ خانے" یا "سائے اور ہمسائے"۔ آپ پڑھیں تو محسوس ہوگا کہ قاری زبان کے سحر میں کس طرح گرفتار ہو جاتا ہے اور مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں میں بھی اس سحر کا شکار نہ ہو جاؤں۔

راشد : ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے آپ اس سے اتفاق نہ کریں۔ آپ نے غیاث احمد گدی کی تقلید میں افسانوں سے ہی ادبی زندگی کا آغاز کیا اور اچھی خاصی تعداد میں کہانیاں آپ نے لکھیں کیا وجہ رہی کہ اس میدان میں آپ کچھ خاص کام نہ کر پائے۔ لیکن ناول آپ کو راس آیا۔

الیاس احمد گدی : ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہوا یہ کہ جب تک غیاث صاحب لکھتے رہے اور تمام ادبی پرچوں میں چھپتے رہے تب تک میرا اس طرف سے ذرا بے نیاز تھا اور کمرشیل افسانے میں نے زیادہ لکھے۔ اس کی وجہ تھی کہ "شمع" والے خاص طور پر یونس صاحب مجھے بے حد عزیز رکھتے تھے۔ اور زبردستی کہانیاں لکھواتے تھے اور بڑے اہتمام سے چھاپتے تھے۔ آپ تعجب کریں گے یہ سن کر کہ شاید کوئی ادیب ایسا نہیں ہے: "شمع" میں لکھنے والا جس کی اتنی کہانیاں بلا عنوان سے چھپی ہوں۔ لیکن ان دنوں ادب کی جانب میں زیادہ سنجیدہ نہیں تھا۔ اور بس کمرشیل ٹائپ کی کہانیاں لکھتا تھا۔ اس سے کچھ حاصل کرنے کی امید بھی نہیں تھی۔ لیکن غیاث صاحب کی وفات کے بعد میں نے اچانک محسوس کیا کہ اب میری ذمہ داری ہے کہ اس جانب سنجیدگی سے توجہ دوں، پڑھوں اور لکھوں، چنانچہ ان کی وفات کے بعد میں نے سنجیدہ افسانے لکھنا شروع کئے، جن میں کچھ اہم افسانے بھی تھے۔ مثال کے طور پر "ذہن جدید" میں چھپے میرے کچھ افسانے اور آدی باسی زندگی کے بارے میں میری کچھ کہانیاں۔ اسی دوران میں نے ناول بھی لکھنا شروع

کیا۔ ظاہر ہے کہ پھر یہ افسانے کم ہوتے گئے۔ جب تک میں ناول کی تخلیق میں مصروف رہا۔ ناول ایک بڑا فکری نظام چاہتا ہے کہ آپ ایک دنیا میں رہیئے۔ اور اس سے زیادہ ضروری ہے کہ اس کے متعلق سوچیئے۔ کرداروں کے متعلق، واقعات کے متعلق، تمام چیزیں آپ کے ذہن میں چلتی رہیں گی اور میں اسی کو ایک فکری نظام مانتا ہوں۔ فن کار کو اسی نظام کے اندر رہنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ناول کی تخلیق میں میں ایک عرصہ تک مصروف رہا اور اس کی تکمیل میں مختلف مرحلوں سے گذرتا رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ ناول جب منظر عام پر آیا تو لوگوں نے اسے بے حد پسند کیا۔

راشد: ادب کی تخلیق میں "موڈ" کی اہمیت سے انکار شاید ممکن نہیں۔ لیکن ناول کا معاملہ بالکل ہی مختلف ہے۔ کامیاب ناول کی تکمیل کے مسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے اس خیال کا تجزیہ آپ کس طرح کریں گے۔؟

الیاس احمد گدی: یہ تو میں نے آپ کو بتایا کہ ناول لکھتے وقت ایک فکری نظام ہمیشہ رکھنا پڑتا ہے جس سے آدمی باہر نہ جائے۔ چنانچہ ناول نگار پہلے ہی اس کو ایک عرصے تک نہ لکھے لیکن وہ نظام اس کے ذہن میں کہیں نہ کہیں سے ہمیشہ چلتا رہتا اور جب وہ لکھنے بیٹھتا ہے تو اسے گذشتہ تمام چیزیں اپنی گرفت میں لانی پڑتی ہیں۔ میں دوسروں کے متعلق تو نہیں کہتا لیکن میری یہ عادت ہے کہ میں جتنا لکھ لیتا ہوں ایک وقت میں اسے پھر سے پڑھوں گا اس کے بعد ہی کچھ لکھوں گا۔ پہلے ہی ایک صفحہ لکھنے کے لئے مجھے گذشتہ پچاس صفحے بھی کیوں نہ پڑھنا پڑے۔ اس کے بعد ہی میں کچھ لکھتا ہوں اور اسی نشست میں لکھتا ہوں اس سے ہوتا یہ ہے کہ CONTINUITY بھی آتی ہے اور اپنا موڈ بھی بنا رہتا ہے۔

راشد: کوئی چار سال قبل آپ نے کہا تھا کہ ایک ایسا ناول لکھنے میں مصروف ہوں جو اردو کے گنے چنے ناولوں میں شمار ہوگا۔ کس بنا پر آپ کے اندر کا فن کار اس قدر مطمئن تھا۔؟

الیاس احمد گدی: میں اس سلسلے میں یہی کہنا چاہوں گا کہ تخلیق کے دوران فن کار کے پاس خود اعتمادی کی دولت بھرپور ہونی چاہیے۔ ساتھ ہی اپنے تصورات کو کامیابی کی منزل سے ہمکنار کرنے کا حوصلہ بھی۔ میں نے جب یہ ناول لکھنا شروع کیا تو مجھے معلوم تھا کہ اردو ناول کے

سرمائے میں بیش بہا ذخیروں کے باوجود کول فیلڈ کی زندگی سے متعلق کوئی داستان نہیں ہے۔ یہاں کی اپنی ایک الگ دنیا ہوتی ہے۔ استحصال کا کرب مزدوروں کے ذہن میں اثر انداز ہوتا ہے لیکن وہ گھٹ گھٹ کر زندگی کا زہر پینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ حق کی آواز بلند ہوتی ہے لیکن وہ اتنی بے رحمی سے دبا دی جاتی ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بھوک مجبوری، لاچاری، بے حسی، غریبی اور ظلم کا ننگا ناچ روزمرہ کی زندگی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ اس ماحول سے اچھی طرح آگاہی کے بعد اس موضوع کے ساتھ انصاف ممکن تھا۔ یہ تمام چیزیں بچپن سے لے کر اب تک میرے ذہن میں اچھی طرح پیوست ہو چکی تھیں اور مجھے احساس تھا کہ اگر میں اس موضوع کے ساتھ انصاف کر پایا تو یقیناً یہ ناول ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع رہے گا۔

راشد: "فائر ایریا" میں سماج کے دبے کچلے طبقے کی عکاسی کے دوران آپ نے ان کی زبان کا استعمال جس فطری انداز میں کیا ہے۔ اس پہ بہت سے لوگ ناک بھوں سکوڑنے لگتے ہیں۔ خصوصاً ان موقعوں پر جہاں کردار کی زبان سے نکلی کوئی گالی پڑھنے والے کو ناخوشی کی کیفیت سے دوچار کرتی ہے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہنا چاہتے ہیں؟

الیاس احمد گدی: آپ کا خیال درست ہے لیکن اردو پڑھنے لکھنے والوں کا ایک بڑا طبقہ شرفا کا رہا ہے SO CALLED شرفا کا جنہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو بلند سمجھا ہے۔ اخلاقی طور سے بھی اور ہر حیا سے۔ چنانچہ ان کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے جب کوئی بھدی سی گالی یا کوئی بھدا سا ایسا لفظ پڑھنے کے دوران آ ملتا ہے۔ حالاں کہ جس زندگی میں ہم جیتے ہیں وہاں ہر جملے میں ایک گالی ہوتی ہے اور کئی جملوں کا ایک پیرا گراف لیں تو اس میں کئی لفظ ایسے ہوتے ہیں جن کو شرفا کے لئے حلق سے نیچے اترنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن عام زندگی یہی ہے اور چونکہ میں نے عام زندگی کو لکھا ہے اس لئے اس میں گریز نہ کر سکتا۔ میں نے "فائر ایریا" میں سماج کے کچلے طبقے کے استحصال کی کہانی بیان کی ہے اور انہیں کی زبان میں ان کے ماحول پر مبنی مکالمے پیش کئے ہیں۔ ایک ایسا کردار جس نے کبھی اسکول کا منہ نہیں دیکھا۔ کتابوں سے جس کا واسطہ نہ رہا۔ ہوش

سنبھالتے ہی جوگاؤں سے روزگار کی تلاش میں کوئٹے کے کانوں کا رخ کرتا ہے اور بالآخر جانوروں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا ہے اس کے آس پاس کا سارا ماحول اس سے بھی گیا گزرا ہے۔ اس ماحول میں آپ یہ امید کیوں رکھتے ہیں کہ ایک کول کرڈ یا کوئلہ کاٹنے والا لکھنؤ کی مرصّع زبان میں مکالمے ادا کرے؟ اس تو کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ یوں سمجھ لیجئے میں نے اس کی زبان کی گرامر درست رکھی ہے ورنہ وہ بھی غلط ہی ہوتی ہے۔

راشد : "فائر ایریا" کا پلاٹ اپنے آپ میں بے حد گٹھا ہوا۔ ناول کی کامیابی کے لئے پلاٹ کی اہمیت کو آپ کس حد تک تسلیم کرتے ہیں؟

الیاس احمد گدی : پلاٹ تو خیر ناول کے لئے ضروری ہے۔ ناول کے لئے زمان و مکان بھی ضروری ہے۔ یعنی وہ پرشے بھومی۔ وہ جگہ، وہ علاقہ جس کے متعلق ناول لکھا ہوا ہو۔ اور وہ زمانہ جس میں ناول لکھا گیا ہے، ان چیزوں کی نشاندہی کسی نہ کسی طور پر ضرور کی جاتی ہے۔

راشد : "فائر ایریا" کی باضابطہ شروعات آپ نے جہاں سے کی ہے اس سے قبل اشاریے کے طور پر جو حصہ آپ نے شروع میں شامل کیا ہے اس کا سرا کہیں نہ کہیں ناول کی کہانی سے آگے بھی بندھتا ہے۔ لیکن کچھ جگہوں پر ایسا نہیں ہوتا۔ اور ہزار کوشش کے باوجود آگے چل کر جب اس کا ٹوٹا ہوا سلسلہ کہانی سے نہیں بندھتا ہے تو قاری کو پریشانی ہونے لگتی ہے۔ تعارف کے طور پر جن کرداروں یا واقعات کا اشارہ ہے اس کی تفصیل ہمیں آگے کیوں نہیں ملتی؟

الیاس احمد گدی : میری کچھ مجبوریاں تھیں جن کی بنا پر ایسا ہوا لیکن یہ چنداں قابلِ گرفت نہیں وہ تو محض ایک تعارف تھا اور تعارف بھی اس لئے تھا کہ کوئلے کی دنیا کے متعلق باہر کے لوگ بہت کم جانتے ہیں۔ ان کی معلومات کے لئے ایک تو کوئلے کا تعارف، کوئلہ کیسے نکلتا ہے۔ کب اس کی شروعات ہوتی ہے، یہ کیسے پکتا ہے۔ اس کے نکالنے کا حساب کتاب کیا ہے۔ اور اس کا استعمال کس طرح شروع ہوا۔ یہ تمام چیزیں یہاں کے لوگوں کو تو معلوم ہیں لیکن باہر والوں کے لئے

اس کا تعارف ضروری تھا۔ ہاں اس ضمن میں کچھ واقعات ضرور چھوٹ گئے ہیں اس کا احساس مجھے ہے اور اس کی وجہ تھی کہ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو کئی چیزیں خود بخود طول پکڑتی گئیں۔ مثلاً ٹریڈ یونین ازم کا رشتہ میں نے ملکی سیاست سے جوڑ دیا تو وہ اتنا طویل ہونے لگا کہ الگ سے اس موضوع پر ایک ناول لکھنے کی ضرورت پیش آنے لگی۔ چنانچہ وہاں سے میں اس کو کٹ کیا۔ ایک اور SECTION تھا جہاں میں بھٹکا اور وہ تھا یہاں کام کرنے والی عورتوں کا کوڑی میں کام کرنے والی عورتوں کا۔ ان کا بھی بڑا عجیب و غریب استعمال ہوتا ہے۔ اور خاص طور پر جسمانی استحصال اگر میں اس طرف جاتا تو پھر ایک داستان ادھر بھی چاہیئے تھی۔ چنانچہ ادھر بھی کچھ دور تک بڑھنے کے بعد میں نے اس کو نکال دیا۔ کیوں کہ میں اپنے مرکز سے نہیں ہٹنا چاہتا تھا۔ اتنا نہیں بھٹکنا چاہتا تھا کہ جس سطح سے میں چل رہا ہوں اس سے اتنی دور ہو جاؤں کہ قاری کے لئے یہ فاصلہ طے کرنا مشکل ہو جائے۔ ہر ناول نگار کو اپنا ناول ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے اس کے ساتھ اس کے ذہن میں جتنی جزئیات ہوتی ہیں۔ وہ جب ان کو پڑھنے لگتا ہے تو لاشعوری طور پر وہ جزئیات اس میں شامل ہو جاتی ہیں۔ لیکن قاری کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف انہیں الفاظ کو پڑھتا ہے جو کہ لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ کوئی ایسی چیز جڑی نہیں ہوتی جو اس کو مکمل کرے چنانچہ جہاں سے وہ کمزور ہوتی ہے قاری کو وہاں فوراً محسوس ہونے لگتا ہے۔ اور اس کی اصل شناخت قاری کی گرفت میں نہیں آتی۔ اس سے ناول نگار کو ہمیشہ گریز کرنا چاہیئے۔

راشد : مختلف کرداروں کو ایجاد کرنا اور بدلتے ہوئے ماحول میں ان کے اندر ہونے والی تبدیلیوں اور شخصیت کی باریکیوں کو گرفت میں لانا بڑا دشوار کام ہے۔ آپ نے تقریباً سبھی کرداروں کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی ہے ناول کے مخصوص کرداروں کو ESTABILSH کر کے آپ کو طمانیت کا احساس ہوا؟

الیاس احمد گدی : دیکھیے کچھ کرداروں کو فن کار بناتا ہے، ان کو PAINT کرتا ہے ان کو سامنے لاتا ہے لیکن کچھ کردار کہانی از خود پیدا کرتی ہے۔ اس کے لئے مصنف کو زیادہ زور نہیں لگانا پڑتا۔ ختو نیا اور رسالا چند دو ایسے کردار ہیں جو خود ساختہ ہیں اور یہی دونوں زیادہ اچھے ہیں۔ ویسے میں نے کئی کردار اس ناول میں دیئے ہیں جو کامیاب بھی ہیں لیکن ان کی تعمیر میں کہانی سے زیادہ میرے قلم کا دخل ہے۔

راشد : بڑی خوشی کی بات ہے کہ "فائر ایریا" کو ہم جلد ہی دوردرشن پر سیریل کے روپ میں دیکھ سکیں گے۔ میڈیا کے اپنے مخصوص ضابطے اور تقاضے اور حدود ہوتے ہیں۔ بعض جگہوں پر مصلحت کے پیش نظر اگر ناول کی بنیادی چیزوں کو نظر انداز کیا گیا تو یہ سمجھوتا کئی اعتبار سے گراں گزرے گا۔

الیاس احمد گدی : ہاں یہ تو صحیح ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ جب ہم سیلولائڈ پر کسی کہانی کو اتارتے ہیں تو اس کو من و عن اتار دینا فلم کے لئے تو ممکن ہے لیکن سیریل کے لئے دشوار ہے کیوں کہ سیریل میں بیس بائیس منٹ دیکھنے کے بعد اگلی قسط کے لئے ایک ہفتے کا انتظار کرنا پڑتا ہے حالانکہ دوردرشن پر کچھ ایسے سیریلیس بھی دکھائے جا رہے ہیں جو ہفتے میں چار یا پانچ دن آتے ہیں لیکن یہ اہلیت تو گنے چنے SERIALS کو ہی نصیب ہے۔ سب پیسے کا کھیل ہے۔ خیر چھوڑیئے اس ذکر کو۔ ضرورت کے تحت جہاں تبدیلی کرنی پڑتی ہے وہاں حد درجہ احتیاط لازمی ہے۔ مثلاً یہ کہ بہت زیادہ کردار نہیں رکھ سکتے۔ شروع سے میرے ناول میں اگر آپ دیکھیں تو ایسے کئی کردار ہیں جنہوں نے مافیا کا کام کیا ہے۔ شروع میں الگ ہے، درمیان میں الگ اور آخر میں الگ ہے۔ یہ اگر اس طرح سے CHANGE ہوا تو اس کے اثر کو شدید نقصان ہوتا ہے اور اس کو CONTINUED رکھنا پڑتا ہے میرے ناول کا اہم کردار سہدیو گاؤں میں جو لڑکی چھوڑ کر آتا ہے اور شہر میں اسے دوسری لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے اور فوراً شادی ہو جاتی ہے تو یہ بات میڈیا والوں کو ہضم نہیں ہوگی۔ ان کے لئے زیادہ

بہتر یہ ہوتا کہ گاؤں کی لڑکی از خود بھاگ کر یہاں آ جائے کئی مشکلوں میں پڑے اور آخر میں اسے مقصد میں کامیابی حاصل ہو۔ اس طرح کی کچھ تبدیلیاں ناگزیر ہو جاتی ہیں اور یہاں پر اگر کوئی اڑا رہے کہ جو کچھ ناول میں ہے اسی کو آنا ہے تو وہ سیریل ہی خراب ہو جائے گا۔

راشد : "فائر ایریا" کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ اس میں حیرت انگیز قسم کے واقعات سے کیا مراد ہو سکتی ہے۔ ناول کا کوئی ایسا واقعہ آپ کے ذہن میں ہے جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہو ؟

الیاس احمد گدی : بھئی دیکھئے ان کے لئے تو کئی چیزیں حیرت انگیز ہوں گی۔ مثلاً یہ کہ وہ جس اعلیٰ سطح پر رہتے ہیں اور جس سطح کی یہ کہانی ہے اور جس طرح کے واقعات یہاں پیش آتے ہیں۔ ان سے بیشتر ان کے لئے حیرت انگیز ہوں گے۔ لیکن ہمارے لئے تو یہ عام سی بات ہے۔ مثلاً سہدیو گاؤں میں جانے کے بعد اپنی محبوبہ سے دوبارہ ملتا ہے تو محبوبہ کی شادی ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ ایک بچے کی ماں ہے اور دق میں مبتلا ہے۔ اس کے شوہر نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ وہ شدید تنگی میں ہے۔ گاؤں میں جب دونوں کی ملاقات ہوتی ہے تو ذرا سا ایکانت پاتے ہی، ذرا سی تنہائی ملتے ہی اس کی محبوبہ اس سے پیسے مانگ بیٹھتی ہے۔ اس کے بعد دونوں کا جو REACTION بیان کیا گیا ہے وہ پڑھنے کی چیز ہے۔ ایک کو تو حیرت ہے کہ کیا دنیا میں صرف پیسہ ہی رہ جائے گا، اور کچھ نہیں رہ جائے گا۔ یعنی نہ محبت رہ جائے گی، نہ مروت رہ جائے گی، نہ خودداری رہ جائے گی، نہ غیرت رہ جائے گی، صرف پیسہ رہ جائے گا۔ ایک کا REACTION یہ ہے۔ اور دوسرے کا REACTION یہ ہے کہ کیا ہوا اگر ہم نے اپنی ضرورت کے تحت اس سے پیسے مانگ بھی لئے۔ وہ کوئی غیر تو نہیں ہے۔ وہ یہ سوچ بھی رہی ہے اور اپنا سر بھی پیٹ رہی ہے۔ یہ سارا منظر ایک الگ طرح کی حقیقت کو بیان کرتا ہے جس سے اعلیٰ طبقہ یا جو آسودہ حال ہیں وہ اس طرح کے حالات سے کبھی نہیں گزرے ہیں۔ لیکن نچلی سطح کی زندگی میں اس طرح کے واقعات ہوتے ہیں اور ایسے واقعات کے متعلق

غالباً بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ناول میں عجیب و غریب حقائق ہیں۔

راشد : نظرثانی کے متعلق کسی نے کہا تھا کہ جس طرح رنگیمی اپنے بچے کو چاٹ چاٹ کر صاف کرتی ہے۔ فن کار بھی اپنی تخلیق کے ساتھ یہی عمل کرتا ہے۔ کیا آپ کو "فائر ایریا" کے کسی حصے پر نظرثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ؟

الیاس احمد گدی : نظرثانی کی ضرورت میں نے کئی مرتبہ محسوس کی لیکن چھپنے کے بعد نہیں۔ "فائر ایریا" جب اشاعت کی منزلوں سے گزرا تو پونے چار سو صفحات پر مشتمل تھا۔ میں نے اس ناول کو اپنے حساب سے متعلق کیا تھا تو اس میں تقریباً ساڑھے سات سو صفحات تھے۔ لکھنے کے بعد میں نے ناول کو کئی مرتبہ پڑھا۔ اور ہر بار اس کا کچھ نہ کچھ حصہ حذف کر دیا لیکن اس سلسلے میں میں حد درجہ محتاط رہا تاکہ ناول کا معیار متاثر نہ ہو۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ طوالت کی وجہ سے یہ بوجھل ہو جائے۔ کہانی یا ناول جو بھی لکھا جاتا ہے اسے لکھنے کے بعد اس کو کئی مرتبہ پڑھنا چاہئے۔ اور اس کو کئی مرتبہ ٹھیک بھی کرنا چاہئے۔ اس کو بالکل غیر جانبدارانہ طریقے سے بلکہ سخت گیر نقاد کی حیثیت سے پڑھنا چاہئے یا سخت گیر قاری کی طرح پڑھنا چاہئے۔ اور جہاں کہیں بھی کوئی خامی یا خرابی نظر آئے اسے دور کرنا چاہئے۔ اسی لئے عام طور پر اچھا ناول کئی بار لکھنے کے بعد ہی وجود میں آتا ہے

راشد : کامیاب تخلیق کے لئے کسی مخصوص نظریے کی پابندی آپ کی نظر میں کہاں تک مناسب ہے ؟

الیاس احمد گدی : نظریہ کوئی ضروری نہیں ہے اور نظریے کا دیا ڈیکی کو خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ تو کہانی کی اپنی DEMAND ہوتی ہے کہ آپ اس کو کہاں لے جائیں گے یا اس کو کون سا SHAPE دیں گے۔ اگر لکھنے والا کہانی کو اپنی مرضی کے مطابق لے جاتا ہے تو یہ غلط ہے۔ کہانی جس بہاؤ پہ جا رہی ہے وہاں کے جو حقائق ہیں اور ان کا جو تقاضا ہے اس کو پورا کرنا زیادہ ضروری ہے۔ میرے ناول کے آخری حصے میں یا اس کے انجام پر کمیونزم کا جو ذکر ہے اس پہ کچھ لوگوں کو اعتراض بھی ہوا ہے کہ بھئی یہ تو پرانی بات ہو گئی ہے۔ یعنی ترقی پسندی ختم ہو گئی ہے تب میں ترقی پسندی کا راگ الاپ رہا ہوں۔ حالاں کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ میرے ذہن میں ترقی پسندی بس یوں ہی ہے۔ الگ سے ترقی پسندی کی کوئی چیز میرے ذہن میں نہیں ہے اور نہ تھی کبھی۔ یہاں یہ سوال تھا کہ جس جد و جہد میں مزدور محو ہیں اور جن کی میں کہانی لکھ رہا ہوں ان کے یہاں کمیونزم ایک ایسی حقیقت ہے جو یہاں کی گلیوں میں ہے۔ کولری میں ہے سڑکوں میں ہے یا یوں کہئے کہ ہمارے ساتھ ہے۔ اگرچہ اس طرح کی چیزیں دلی وغیرہ میں کم ہیں۔ وہاں کمیونزم اردو گھر کے قریب جو بڑی سی سرخ عمارت ہے، شاید اسی میں ہے۔ وہاں تو پتہ نہیں کہ یہ باہر آتا بھی ہے کہ نہیں لیکن ہمارے یہاں اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں کہ ہم کمیونزم کو اسی میں تلاش کریں اور یہ میری مجبوری تھی جس کی وجہ سے میں نے اس کو استعمال کیا۔ حالانکہ میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ جو کڑائی ہے مزدوروں کی یا سرمایہ داروں کی یا زیردستوں کی یا زبردستوں کی۔ یہ بہت دنوں سے چل رہی ہے اور بہت دنوں تک چلتی رہے گی۔ میں نے شروع میں ذکر کیا ہے کہ پانی کی بوندا تنے بڑے گرم توے میں گرے گی اور چھن سے جل جائے گی۔ لیکن وہی چیز جب ہم ناول کے آخر میں دیکھتے تو وہ ایک جلوس کی شکل میں اور ایک طاقت کی شکل میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ حالانکہ میں نے درمیان میں کہیں کہیں سیاست کا ذکر اتنی تفصیل سے نہیں کیا ہے لیکن جتنا ان کو کچلا جاتا رہا ہے، جتنا ان کا استحصال ہوتا رہا ہے ان کی جد و جہد اتنی ہی تیز ہوتی رہی ہے۔ اور آخر میں یہ تعداد جو تین کی تھی اور لاکھوں میں پہونچ جاتی ہے۔ کہانی کا عروج یہ ہے لیکن لوگ کہانی کا عروج دوسری طرف دیکھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے ویسے قاری کو یہ آزادی ہونی چاہئے کہ وہ اپنے حساب سے کہانی کا تجزیہ کرے۔

راشد : آپ کا پہلا ناول ہی ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے لئے منتخب کر لیا گیا یہ بات جہاں اپنے آپ میں مثال ہے وہیں آپ کی ذمہ داریوں میں اضافہ بھی کرتی ہے۔ یقیناً آپ کی آئندہ تخلیقات سے لوگ کچھ زیادہ ہی امیدیں وابستہ رکھیں گے۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ اب آپ کی ذمہ داریاں

میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو گیا ہے۔ اور آپ کو مزید جانفشانی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

الیاس احمد گدی : بھئی دیکھئے ابھی تو مجھے یہ ایوارڈ ملا ہے اور یہ درست ہے کہ میرے لئے یہ نہایت CHALLANGING ہے۔ میری ایک حد مقرر کر دی گئی ہے کہ اب اس سے پیچھے نہیں رہنا ہے۔ ظاہر ہے کہ آگے جانے کے لئے مجھے شدید محنت کرنی پڑے گی۔ اور اس کے لئے تیار بھی ہوں یہ الگ بات ہے کہ میں اس میں کامیاب ہوتا ہوں یا نہیں۔ اس لئے کہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی بڑی تخلیق فن کار نے لکھی اور اس کے بعد اس کی جتنی بھی تحریر سامنے آئی وہ اس مقابلے کی نہیں ہو سکی۔ اس میں قرۃ العین حیدر جیسی شخصیت بھی ہے جو "آگ کا دریا" کے بعد اتنی اچھی چیز نہیں لکھ سکیں۔ یا "اداس نسلیں" کے بعد عبداللہ حسین پھر اس طرح کی چیز نہیں لکھ سکے۔ میرا خیال ہے کہ اپنا ایک مخصوص معیار متعین کرنے کی ذمہ داری خود فن کار پر عائد ہوتی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس سے آگے ضرور جاؤں۔

راشد : آپ کا ناول "بیز آسمان کی زمین" کب تک قاری کے ہاتھوں میں ہوگا؟

الیاس احمد گدی : اس میں تاخیر اس وجہ سے ہو رہی ہے کہ اس کا جو موضوع ہے، اس میں ٹھیک سے اتر نہیں پا رہا ہوں یا یوں سمجھئے کہ اس کو میں ٹھیک سے اپنے ذہن میں گھیر نہیں پا رہا ہوں کہ اس کو تمام جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ کوئی اچھی سی شکل دے سکوں۔ مجھے خالص مسلم معاشرے کی عکاسی اس میں کرنی ہے۔ یہاں کا جو ماحول ہے اس میں ان جزئیات کا شائبہ تک موجود نہیں ہے۔ جب تک میں اس کو اچھی طرح سے ہضم نہیں کر لیتا میں لکھنا نہیں چاہتا۔

راشد : میں سمجھتا ہوں "فائر ایریا" کی مقبولیت آپ کے افسانوں کے مجموعوں کے لئے تمہید پیش کرتی ہے۔ یہ مجموعے اگر پہلے منظر عام پر آگئے ہوتے تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔ لیکن اب یقیناً حالات آپ کے لئے سازگار ہیں۔

الیاس احمد گدی : یہ خیال تو یقیناً اچھا ہے لیکن میں اس کو پسند نہیں کرتا۔ اس لئے کہ موقع سے فائدہ اٹھانا میں نے کبھی نہیں چاہا ہے اور یہ کام تو کبھی کیا بھی نہیں اور آئندہ بھی نہیں کروں گا۔ مصلحت کا تقاضا تو یقیناً ہے کہ اگر میں اپنا مجموعہ بازار میں لے آؤں اور افسانے اتنی تعداد میں ہیں کہ مجموعہ بن سکتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اب پہلے مجموعوں سے زیادہ بہتر RESPONSE ملے گا لیکن "فائر ایریا" کا کریڈٹ انہیں ملے یہ میں نہیں چاہتا۔ میرے مجموعے ضرور منظر عام پر آئیں گے لیکن تھوڑی تاخیر کے بعد تاکہ انفرادی طور پر ان کی شناخت ہو سکے۔ میں سمجھتا ہوں میری کہانیاں خود بھی قاری سے داد تحسین وصول کریں گی۔

راشد : آپ کا نام اس اعتبار سے اہم ہے کہ منظر عام پر آتے ہی جہاں لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا وہیں مختلف یونیورسٹیوں میں اسے ریسرچ کا موضوع بھی بنایا گیا۔ کئی زبانوں میں اس کے ترجمے کا کام بھی تکمیل کے مرحلے میں ہے۔ حال ہی اس کا ہندی ایڈیشن جو لکھنؤ سے شائع ہوا ہے اس میں ترجمے کی ذمہ داری آپ نے خود انجام دی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ ترجمے کے بعض مقامات پر آپ لڑکھڑا گئے ہیں۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ اس ضمن میں TRANSLATION کے بجائے TRANSLITERTION زیادہ مناسب تھا؟

الیاس احمد گدی : آپ کا خیال درست ہے لیکن ایسا میں نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ میں جانتا ہوں، اگر ناول کا صرف اسکرپٹ ہی بدلا جاتا اور بقیہ ساری چیزیں ویسی کی ویسی ہی رہتیں تو یہاں بھی ناول کا حسن اردو کی طرح ہی برقرار رہتا۔ لیکن مستقبل میں پیش آنے والے خطرے کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کیوں کہ مجھے اصل اور ترجمے کا فرق واضح رکھنے کا یہی ایک جواز دکھائی دیا۔ اگر ہندی میں اردو کی ساری چیزیں صرف اسکرپٹ کی تبدیلی سے منتقل کر دی جائیں اور ساتھ ہی ثقیل الفاظ کے معنی بھی الگ سے بتا دیئے جائیں تو پھر ایک زبان، ایک تہذیب جس کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہے، جس کی اپنی ایک شناخت ہے اس کا جادو رفتہ رفتہ سرد پڑنے لگے گا۔ اور جلد ہی وہ دم توڑنے لگے گی اس لئے میرا یہی کہنا ہے کہ دوسری زبانوں میں اردو کا سرمایہ ضرور

منتقل کیا جانا چاہیے لیکن اس ضمن میں TRANSLATION سے زیادہ TRANSLITERTION کا راستہ معقول ہے کیوں کہ پڑھنے والوں کو یہ احساس تو رہے کہ ہم اصل نہیں ترجمے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

اِسلم : ہندو پاک میں آج جو ناول لکھے جا رہے ہیں ان کے حوالے سے آپ یہ بتائیں کہ مستقبل میں کن فن کاروں سے امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں ؟

الیاس احمد گدی : تمام ناولوں کا تقابلی جائزہ تو ذرا مشکل ہے ہندوستان سے شائع ہونے والے رسائل کا دستیاب ہونا بھی سنگین مسئلہ ہے، اور پاکستان کی کتابوں کا ملنا دشوار ہے۔ خاص کر اہم مراکز سے ہٹ کر جو علاقے ہیں وہاں کی صورت حال تو اور بھی دگرگوں ہے لہٰذا میں فی الحال پاکستان میں لکھے جا رہے ناولوں کے بجائے ہندوستان کے چند فن کاروں کے حوالے سے اپنی بات پوری کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سلام بن رزاق اور حسین الحق وغیرہ آگے چل کر کوئی اچھا ناول ضرور لکھیں گے۔ بالخصوص سلام بن رزاق سے مجھے امیدیں ہیں

اِسلم : بہار والوں کو جو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اس میں دوسرے لوگوں کی سوچی سمجھی اسکیم تو خیر ہے ہی، لیکن اس میں ہماری کوتاہی اور کاہلی کو بھی زیادہ دخل ہے۔ اپنے یہاں کے فن کاروں کی حوصلہ افزائی میں دلچسپی نہیں لیتے لیکن ٹانگ کھینچنے میں ضرور لگے رہتے ہیں۔ بہار اردو اکادمی یا ریاست میں جو بھی ادبی انجمنیں ہیں۔ ان کا رویہ بھی سرد دکھائی دیتا ہے۔ جب خامی خود ہمارے اندر ہو تو ہم دوسروں سے کیا توقع رکھیں۔؟

الیاس احمد گدی : بھئی دیکھیے تھوڑا سا تعصب تو ضرور ہے۔ اور خصوصاً بہار سے متعلق ہے۔ اس وجہ سے اس کو تھوڑا سا CRUSH بھی کیا جاتا ہے۔ اور ہماری یہ عادت ہے، بہار والوں کی کہ وہ پیچھے رہنے میں ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔ قافلے کے آگے تو بڑھنا ہی نہیں چاہتے اس کی سب سے بڑی وجہ خود اعتمادی کی کمی ہے۔ وہ خود نہیں طے کر پاتے کہ ان کی انفرادی شناخت کیا ہے۔ حالات کا رخ اگرچہ وہ اپنی جانب موڑ سکتے ہیں۔ لیکن شعوری طور پر یہ کوتاہی اور غفلت ان سے سرزد ہوتی ہے۔ اگر وہ اس کے آگے نہیں جا سکتے تو کم از کم اس کے شانہ بشانہ ہی چلیں۔ لیکن یہاں پیچھے چلنے کی جو عادت ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ پیچھے چلیں گے تو آگے والے ہماری تعریف میں ایک دو جملے کہہ دیں گے اور وہ ہمارے لئے سند ہو جائے گا۔ اسی لالچ میں ہم آگے نہیں بڑھتے ہیں۔ پیچھے ہی رہتے ہیں۔ جب کہ میرا ماننا ہے کہ تخلیق میں اگر قوت ہو تو وہ دیواروں میں بھی چھید کر سکتی ہے۔ اپنے آپ کو منوانا کسی تقریب سے ممکن ہے اور نہ کسی چور دروازے سے۔ یہ کام وقتی طور پر تو ہو سکتا ہے لیکن کسی بھی آدمی کی شناخت اور اس کی طویل عمری کی ضمانت اس کی وہ تحریر ہی ہوگی جو وہ چھوڑ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ آج اس کو دبا دیا جائے۔ لیکن کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی آدمی اس کو نکال لے گا مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ کرشن چندر کے عروج کے عہد میں سوائے کرشن چندر کے اور کسی کا نام نہیں آتا تھا۔ بیدی پس پشت تھے منٹو کہیں دور تک بھی نہیں تھے۔ لیکن آج صورت حال بالکل مختلف ہے منٹو جو سب سے پیچھے تھے اور ایک معلوم جنسی افسانہ نگار سمجھے جاتے تھے وہ آج سب سے آگے ہیں۔ بیدی جی کو کبھی گھاس نہیں ڈالی گئی کرشن چندر کے آگے کہ وہ اتنی مرصع زبان نہیں لکھتے آج وہ بھی بہت آگے ہیں۔ تو یہ تسلیم کروانا تخلیق کا کام ہے۔ اگر تخلیق میں طاقت ہے تو اس کو ماننا ہوگا۔ اگر آپ اس کو نہیں مانتے ہیں تو کوئی آدمی اٹھے گا اور کہہ دے گا کہ آپ جاہل ہیں۔ آپ کی قابلیت مشکوک ہو جائے گی اور آپ اس وقت کچھ نہ کہہ پائیں گے۔ یہ خوف ہر تنقید نگار کو بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اچھی چیز ہے تو ہزار مجبوریوں کے باوجود اس کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے زیادہ مناسب ہے کہ ہم اپنی تحریر کو زیادہ مضبوط اور طاقت ور بنانے کی کوشش کریں اور پیچھے چلنے والا احساس کم کر دیں۔

❖ ❖

گذارش

اپنی تخلیقات کے ساتھ جوابی لفافہ ضرور بھیجا کریں تاکہ نامنظور ہونے کی صورت میں انھیں واپس بھیجا جا سکے۔ لفافہ نہ ہونے کی صورت میں نامنظور شدہ تخلیقات ضائع کر دی جاتی ہیں۔

— ادارہ شب خون

مصحف اقبال توصیفی

کھڑکی کے پردوں پر یہ کیسا سایہ ہے
دروازہ تو کھولو کوئی آیا ہے

میری خاموشی نے خواب عجب دیکھا
لب پر تیرا نام ہے اور تو آیا ہے

ہم سے تو بیکار ہی نالاں رہتا تھا
غیر سے مل کر اب کیسا پچھتایا ہے

سورج ہوگا ہوگا اس کو کیا دیکھوں
سوچوں میرا چاند ابھی گہنایا ہے

ذہن کی دوڑ بہت ہوگی سو دو سو گز
آنکھ نے جو کچھ دیکھا تیری مایا ہے

سورج ڈوبا ہم دفتر سے گھر لوٹے
کتا منہ میں گیند دبا کر لایا ہے

دیکھو اس کا غم ہے یا پھر اور کوئی
جانے اتنی رات گئے کون آیا ہے

جانے کس لئے روٹھی ایسے زندگی ہم سے
نام تک نہیں پوچھا، بات بھی نہ کی ہم سے

دیکھو وقت کی آہٹ تیز ہوتی جاتی ہے
جو سوال باقی ہیں پوچھ لو ابھی ہم سے

کوئی غم ادھر آئے اس کو گھورتی کیوں ہے
اور چاہتی کیا ہے اب تری خوشی ہم سے

جانے ایک بھولی یاد آج یاد کیوں آئی
پھر کسی کے ملنے کی آرزو ملی ہم سے

اس کی ایک انگلی پر گھومتی رہی دنیا
چاند کی طرح ہر شے دور ہوگئی ہم سے

برے موسم میں

خالد جاوید

لالٹین کی روشنی مدھم ہونے لگی۔ اس کا تیل ختم ہو رہا تھا۔ شام ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ ستمبر کی اداس اور ابر آلود شام ستمبر کی ہر شام اپنے پیچھے گزری ہوئی تمام بارشوں کا بوجھ اٹھائے افسردہ اور تھکی تھکی سی بھٹکا کرتی ہے اور ستمبر کا ہر دن آسمان پر سست روی سے بلند ہوتے ہوئے سفید بادلوں کے حجم کو اس پار سے اس پار پہونچا آتا ہے۔

اس نے آنکھوں سے کالا چشمہ ہٹا کر آسمان کی طرف نظر اٹھائی۔ زیادہ تر آسمان اندھیرا تھا بس ایک ٹکڑے سے کٹا پھٹا سا چاند جھانک رہا تھا۔ اس وقت حبس بے حد ہو گیا تھا اور مطلع بھی ابر آلود تھا۔ مگر یہ روئی کے مانند برف برف سفید بادل تھے اس کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔

"سفید بلند بادلوں سے بارش نہیں ہوا کرتی۔" اس نے سوچا۔ لیکن اگر اسی موسم میں ایک بار بارش شروع ہو جائے تو پھر قیامت ہی آجاتی ہے۔ واپس جاتے ہوئے مانسون کے یہ بوجھل اور تھکے ہوئے بادل زلزلے اور سیلاب لایا کرتے ہیں اور دور پہاڑوں پر چٹانیں اپنی جگہ سے کھسکا کرتی ہیں۔

"آج حبس بہت ہے لیکن ستمبر کے موسم کی پہچان ہے کہ رات میں افسردہ ہوائیں ضرور چلنا شروع ہو جائیں گی۔"

"بجلی نہیں آئی ابھی تک" اس نے سوچا۔

اس کی ایک آنکھ سے پھر پانی بہنے لگا۔ اس نے کالا چشمہ لگا لیا۔ گزشتہ پندرہ بیس دن سے جیسے ہی بارش ہونے کا سلسلہ ختم ہوا تھا اور چلچلا کر دھوپ نکلی تھی ویسے ہی اچانک شہر میں آنکھیں آجانے کی بیماری پھیل گئی تھی۔ تین دن سے لگاتار اس کی آنکھیں بھی بری طرح دکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ایک تو پہلے ہی بے حد چھوٹی اور بے رونق تھیں اور اب دکھ آنے پر سوج کر بالکل ہی سکڑ گئی تھی۔ سرخی اور کیچڑ آنے کے باعث ان کو دیکھنے سے ہی کراہیت ہوتی تھی۔ اپنے بوسیدہ سے بکس کو کھول کر ان آنکھوں کو چھپانے کے لئے اس نے جو کالا چشمہ تلاش کیا تھا وہ اس کے زمانہ طالب علمی کی یادگار تھا اور اب بالکل متروک ہو چکا تھا۔ ایک زمانے میں اس انداز کا چشمہ ایک مشہور فلمی اداکار سے وابستہ تھا اور کالج کے ہر طالب علم کی طرح اس اداکار کی نقل میں اس نے بھی یہ چشمہ خرید لیا تھا لیکن آج اسے آنکھوں پر لگا کر وہ کوئی سستے قسم کا فلمی مسخرہ نظر آتا تھا۔

دیوار میں لگے لوہے کے کنڈے میں زنگ آلود اور پچکی ہوئی لالٹین کی روشنی کچھ اور مدہم ہوئی تو وہ پلنگ کی پائنتی سے اٹھ کر اس میں تیل ڈالنے لگا۔

"سنو۔ میں ذرا لالٹین میں تیل ڈال رہا ہوں۔ تم آکر بچی کے پاس بیٹھ جاؤ" اس نے بیوی کو آواز دی۔

بیوی باورچی خانے میں تھی، جہاں ایک موم بتی روشن تھی اور ایک اسٹوو بھر بھرا کر جل رہا تھا اس لمبے چوڑے مگر لگ بھگ خالی اور بوسیدہ سے باورچی خانے سے آتی ہوئی اسٹوو کی یہ آواز نہ جانے کیوں اسے بے حد وحشت ناک محسوس ہوئی۔ جلتے ہوئے اسٹوو کے شور میں بیوی نے اس کی آواز نہیں سنی۔ بے حد عجلت اور گھبراہٹ کے ساتھ اس نے لالٹین میں تیل ڈالا اور دوبارہ بچی کے پاس پلنگ کی پائنتی آکر بیٹھ گیا۔ اس نے نہایت آہستگی کے ساتھ بچی کی ایڑیاں چھوئیں۔ ایڑیاں گویا جل رہی تھیں۔ "بخار تیز ہو رہا ہے" وہ فکر مند ہو گیا۔

چوڑا سا آنگن سونا پڑا تھا۔ حال ہی میں یہاں لگا بیری کا ایک بڑا درخت کٹ جانے سے آنگن اور بھی زیادہ بڑا معلوم ہوتا تھا۔ یہ ایک پرانا خستہ حال مکان تھا جس میں بڑا سا آنگن اور چوڑے چوڑے دالان تھے۔ مکان کے ہر حصے میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں تھی وہ یہ تھی کہ چاروں طرف چھوٹے بڑے طاق نظر آتے تھے جو یا تو خالی تھے یا کسی کسی میں کوئی میلا کپڑا، کوئی گلی سڑی چھتری، کوئی زنگ لگا ٹین کا ڈبہ یا ایسی ہی کوئی کباڑ کی شے رکھی نظر آجاتی تھی۔ دالان کے ہر گوشے میں مکڑیوں کے بڑے بڑے جالے لٹک رہے تھے۔ دیواروں اور فرش کا پلاسٹر جگہ جگہ سے ادھڑ رہا تھا۔ عرصے سے سفیدی نہ ہونے کے باعث اجالے میں بھی یہ مکان تاریک سا نظر آتا تھا۔ اس مکان میں کوئی زینہ نہیں تھا، لیکن دروازے کے بالکل سامنے آنگن میں دیوار سے لگا ایک اونچا سا اینٹوں کا بوسیدہ ڈھیر نظر آتا تھا جسے برساتی گھاس نے قریب قریب پوری طرح ڈھک لیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں زینہ رہا ہو اور اینٹوں کا بلتا ہوا یہ بوسیدہ ڈھیر اس کی پچھلی سیڑھی ہو۔ گزشتہ ڈیڑھ دو ماہ سے لگاتار بارش ہونے کی وجہ سے مکان کی چھتیں بری طرح ٹپکتی رہی تھیں اور دیواروں پر چھت کی

دراڑوں سے بہہ کر آنے والے خیالے پانی کی لکیریں جم گئی تھیں۔ چھت کی کڑیوں۔ شہتیروں اور دروازوں کی چوکھٹ میں دیمک لگ گئی تھی۔ بارش رک جانے پر جب دھوپ نکلی تو مکان کے ہر گوشے کی سیلن بدبو اور بھاپ بن کر ہر طرف بکھرنے لگی۔ بستر۔ چادریں۔ تکیے۔ پردے اور کپڑے سب سے سیلن کی بو آتی تھی۔ اس وقت بھی بچی کے بستر میں سے سیلن کا ناخوش گوار بھبکا آرہا تھا۔

"بجلی پتہ نہیں کب تک آئے گی" اس نے پھر تشویش کے ساتھ سوچا۔

اس علاقے میں سرشام ہی بجلی چلے جانے کا معمول بن گیا تھا۔ اکثر تمام رات نہیں آتی تھی۔ آس پاس کچھ ذی حیثیت لوگوں کے گھروں سے جنریٹروں کا بے ہنگم شور بلند رہتا اور ان کے آلودہ دھوئیں فضا میں منڈلاتے رہتے۔ مگر آج کہیں کوئی جنریٹر نہیں چل رہا تھا۔ ہر سو خاموشی تھی۔ صرف اسٹوو اپنی مہیب آواز میں جلے جا رہا تھا۔

یونہی بیٹھے بیٹھے اس نے نگاہ اوپر کی تو تاریک ہوتی چھت کی کائی لگی منڈیر پر ایک جنگلی بلی کسی شکار کی تاڑ لگائے بیٹھی نظر آئی۔

"ہش.... ہش" وہ اٹھ کر اور ہاتھ ہلا ہلا کر بلی کو بھگانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر بچی نے جاگ کر بلی کو دیکھ لیا تو وہ بے تحاشا خوف زدہ ہو جائے گی۔ ویسے بھی کہتے ہیں کہ اس بیماری میں بری اشیا بچے کے آس پاس منڈلاتی رہتی ہیں۔

اس کے ہش ہش کرنے پر بھی جب بلی اپنی جگہ سے نہ ہلی تو وہ فرش پر پڑا اینٹ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اٹھانے کے لیے جھکا۔ بلی نے اچانک جست لی اور منڈیر کے دوسری طرف کود گئی۔ اس نے ٹکڑا پھینک دیا اور پلنگ پر بیٹھ کر اپنی قمیص کے دامن سے آنکھیں صاف کرنے لگا جن میں بری طرح کھٹک ہو رہی تھی اور کیچڑ آرہا تھا۔ تب ہی اسے فرش پر رکھے اپنے ننگے پیروں کے پاس گیلے پن کا احساس ہوا۔ اس نے جھک کر غور سے دیکھا بچی نے پیشاب کیا تھا جو پلنگ کے باندھ سے چھن چھن کر فرش پر بہہ رہا تھا۔ وہ حواس باختہ ہو گیا اور تقریباً دوڑتا ہوا باورچی خانے تک پہونچا۔

"ارے بچی نے پیشاب کر دیا ہے۔ جلدی سے اس کا جا نکیہ بدل دو"

"آرہی ہوں۔ تم تو بس باتیں بنانے کے لیے ہو" بیوی کی کرخت آواز اسٹوو کے شور میں بھی نمایاں تھی۔

اس کی عینک پھسل کر ناک پر آرہی تھی۔ سارا چہرہ پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ وہ واپس بچی کے پاس آکر پائنتی کھڑا ہو گیا۔

اس بیماری میں گیلا پن بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ وہ فکر مند ہو رہا تھا۔

باورچی خانے میں جلتا ہوا اسٹوو اچانک خاموش ہو گیا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی گھر میں ایک مہیب سناٹا لوٹنے لگا۔

جب اس کی بیوی بچی کا جا نکیہ بدل رہی تھی تو وہ بھاگ کر لالٹین وہیں اٹھا لایا۔ بچی نے سوتے میں کلبلا کر اچانک ایک طرف کروٹ لے لی۔ اس کے سرہانے رکھی نیم کی ٹہنیاں زور سے سرسرائیں۔

"لالٹین اس کے منھ پر سے تو ہٹاؤ۔ جاگ جائے گی" بیوی ناخوش گوار لہجے میں بولی۔ وہ لالٹین لیکر تھوڑا پیچھے ہٹ گیا لیکن اس کی روشنی میں بچی کے منھ۔ ہاتھ اور پیروں پر ابھرے ہوئے ننھے ننھے لال دانے صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ پھیکی پھیکی روشنی میں فرش پر نیم کی ٹہنیوں کا سایہ پڑ رہا تھا۔

"دانے بڑھ گئے ہیں" بیوی خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔

لالٹین کی روشنی میں ان دونوں کی جھکی ہوئی پرچھائیاں دیوار پر لرز رہی تھیں۔ آج سے چار دن قبل بچی کو بخار آیا تھا۔ بخار سے پہلے اس تمام دن وہ بار بار روتی اور چڑچڑاتی رہی تھی۔ اس دن سے اسے پوری آستین کا فراک پہنایا گیا تھا اس نے خیال کیا کہ شاید اسی لیے وہ گھبرا رہی ہے۔ اسے جب بھی پوری آستین کا فراک یا سوئیٹر پہنایا جاتا وہ بے حد مچلتی۔ اپنے دونوں ہاتھ بے چارگی کے عالم میں اس طرح ڈھیلے چھوڑ دیتی جیسے ان میں جان ہی نہ باقی رہی ہو اور اس کی آنکھوں سے ایک قسم کی اذیت کا احساس مترشح ہوتا رہتا تھا۔ بچی کی ماں اس عادت سے بہت جھنجلایا کرتی تھی اور اکثر غصے میں اسے زور سے پلنگ پر پٹک دیا کرتی تھی۔ مگر دراصل بچی کو یہ عادت اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ اماں اسے بچپن میں کسی بادشاہ کی داستان سنایا کرتی تھیں جس کے کاندھوں پر دو سانپ اگ آئے تھے اور جب تک ان کو انسانی گوشت کی خوراک نہ دی جاتی وہ بادشاہ کے کاندھوں کو جکڑے رہتے۔ پوری آستین کی کوئی بھی چیز یا جرسی پہن لینے پر اسے بچپن میں ایسا ہی احساس ہوتا تھا۔ وہ اپنے بازوؤں کو اس طرح لٹکائے رکھتا جیسے وہ مفلوج ہو گئے ہوں اور اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو جاری رہتے۔ تب اماں کو مجبور ہو کر اسے آدھی آستین کا سوئیٹر ہی پہنانا پڑتا۔ لیکن یہ سب اس نے بیوی سے کبھی نہیں کہا تھا۔

جب بھی بچی اس حال میں رونے اور گھبرانے لگتی وہ جلدی سے بچی کے کاندھوں کو آہستہ آہستہ سہلانے لگتا۔ مگر اس بار بچی کو آدھی آستین کا فراک پہنا دینے پر بھی اس کی چڑچڑاہٹ میں کوئی کمی نہ واقع ہوئی تھی مگر خلاف توقع اس دن وہ کسی بھی کھلونے سے کھیلے بغیر سرشام ہی سو گئی تھی۔ رات کو بے خبر سوتے سوتے اچانک اس کا جسم جیسے جلنے لگا۔ وہ دھیرے دھیرے کراہ رہی تھی۔ اس کے کراہنے سے ماں کی آنکھ کھل گئی اور وہ اسے تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن بچی تمام رات بخار میں پھنکتی اور کراہتی رہی۔ اس کی ماں نے اٹھ اٹھ کر کئی بار گھبراہٹ کی کیفیت میں سل کے پتھر مرچوں اور پانی کے بھرے لوٹے سے اور نہ جانے کن کن جانے انجانے لوگوں کا نام لے کر بچی کی نظر بھی اتاری لیکن اس کی بے چینی اور بخار میں تمام رات کوئی کمی نہ واقع ہوئی۔

جب صبح ہوئی تو اسے ڈاکٹر کو دکھایا گیا جس نے گلے کی غدود میں سوجن کا آجانا تشخیص کیا۔ بچی ابھی صرف پندرہ ماہ کی ہی تھی۔ دوا پینے میں وہ بے حد چلاتی تھی مگر اس بار جو اس نے رونا اور چلانا شروع کیا اس سے ان دونوں کے

ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ سوتے سوتے جاگ کر اچانک اس طرح چیخنا شروع کر دیتی جیسے کوئی جانور سخت قسم کی تکلیف میں آوازیں نکالتا ہے۔ اس کی ماں اسے آنگن میں کچھ اس طرح گود میں لے کر ٹہلا کرتی جس سے بچی کا سر اس کے سینے میں بالکل چھپ کر رہ جاتا ساتھ ہی وہ برابر کوئی نہ کوئی لوری بھی سناتی رہتی۔ صرف گود میں لینے کے اس خاص انداز سے ہی بچی کو کچھ سکون سا مل جاتا تھا اور وہ دوبارہ غافل سی ہونے لگتی۔ لیکن جیسے ہی اسے پالنے یا بستر پر لٹایا جاتا' ویسے ہی وہ دوبارہ وحشت ناک آوازوں میں چیخنے لگتی اس کی بیوی تھک کر اور پریشان ہو کر اسے چھوڑ دیا کرتی۔ ایسے وقت میں وہ بچی کو اس طرح گود میں لینے کی کوشش کیا کرتا جس طرح اس کی بیوی لیا کرتی تھی اور گھبرائی ہوئی آواز میں وہی لوری بھی سنانے کی کوشش کرتا۔ لیکن اس سے بچی کی چیخیں اور بڑھ جاتیں اور وہ ماہی بے آب کی طرح اس کی گود میں تڑپنے لگتی۔ یہ دیکھ کر اس کی بیوی غصے اور گھبراہٹ کی ملی جلی کیفیت میں اس کی طرف جھپٹتی اور بچی کو اس کی گود سے جھپٹتی ہوئی کہتی کہ اس کی اس پھٹی پھٹی اور بھدی آواز میں لوری گانے سے تو وہ اور بھی خوف زدہ ہو رہی ہے۔

بیماری سے پہلے ایسا نہیں تھا۔ جب بھی بچی روتی تھی وہ بہت کامیابی کے ساتھ اسے بہلا لیا کرتا تھا حالانکہ اس سے پہلے اسے اس قسم کا کوئی بھی تجربہ نہیں تھا۔

یہ بچی ان کی شادی کے ٹھیک سترہ سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ اس کے سر کے تمام بال پک چکے تھے اور بدن پر چربی کی ایک بھدی سی تہ چڑھ آئی تھی۔ زیادہ چلنے پھرنے سے اس کی سانس بھی پھولنے لگی تھی لیکن یہ وثوق کے ساتھ کہہ پانا مشکل تھا کہ ایسا صرف اس کی بڑھتی ہوئی عمر کے باعث ہی تھا ہو سکتا تھا کہ اس کی وجہ اس کے تمام عمر کے ناکارہ پن اور غیر صحتمند خیالات ہی رہے ہوں۔

بچی کی پیدائش کے بعد اس کی زندگی میں صرف ایک اہم تبدیلی واقع ہوئی تھی اور وہ یہ تھی کہ اب اس کے لیے دن دن بھر سو پانا ممکن نہیں رہتا تھا وہ دوپہر کو سونے کا بڑا شائق تھا اور قریب قریب تمام دن ہی سوتا یا اونگھتا رہتا تھا اس قدر سونے کے باوجود بھی اسے رات میں نیند آنے میں کوئی دشواری نہ آتی تھی لیکن بچی کی پیدائش کے بعد وہ اس سلسلے میں حتی الامکان اتنا چاق و چوبند رہنے لگا تھا کہ بمشکل تین چار گھنٹے ہی سو پاتا تھا۔

بچی جب بہت چھوٹی تھی اور مچل کر رویا کرتی تھی تو وہ اسے زور زور سے لوری سنانا شروع کر دیتا تھا لیکن دراصل یہ لوری نہیں ہوتی تھی۔ وہ مضحکہ خیز انداز میں اور پھوہڑپن کے ساتھ محض ایک لفظ "ارے بھئی واہ" "ارے بھئی واہ" کی گردان کیے جاتا اور بچی کے پالنے کو جھونکے دیے جاتا۔ بچی اپنی معلوم اور شفاف آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیتی اور جیسے کچھ بھونچکی سی ہو کر اس بے معنی اور مضحکہ خیز لفظ کو سنے جاتی جسے وہ بغیر سانس روکے جھوم جھوم کر کہے جاتا۔ آہستہ آہستہ جیسے کسی پراسرار سحر کے تحت بچی کی آنکھیں بند ہونے لگتیں اور وہ واقعتاً سو جاتی۔ بچی کے سوتے ہی نہ جانے کیوں اس کا معصوم چہرہ اسے بہت اداس سا نظر آنے لگتا اور دیواروں میں دبکا ہوا سناٹا باہر کی طرف رینگتا ہوا محسوس ہوتا۔ اس سناٹے سے گھبرا کر وہ پھر بھی دیر تک "ارے بھئی واہ" کی گردان کیے ہی جاتا۔

مگر یہ لوری نہیں تھی۔ اس کی آواز میں وہ نرمی گھلاوٹ اور ممتا نہیں تھی اور وہ پرسکون خوابناک لہجہ غائب تھا جس سے لوری تشکیل ہوتی ہے یہ کوئی خطرناک اور بری چیز تھی اس کا احساس اکثر اسے ہوا کرتا تھا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا جب مقصد بچی کو سلانا نہیں بلکہ صرف بہلانا ہوا کرتا تھا ایسے وقت وہ بچی کو پلنگ پر لٹا دیا کرتا اور خود پلنگ کے چاروں طرف تھل تھل کرتا پھوہڑپن سے تھرکتا رہتا۔ ان لمحات میں وہ ایک انسان سے زیادہ ایک بے ڈول' بدہیئت تماشہ دکھانے والا بھالو نظر آتا جو صرف اس امید پر بدسلیقگی سے اچھل کود رہا ہو تاکہ اگر کوئی تماشائی اس کے فن اور صلاحیت کی داد نہ بھی دے تب بھی کم از کم ہنس ضرور سکتا تھا۔ اس کی یہ کوشش بھی کامیاب ثابت ہوتی اور بچی اچانک کلکاریاں مارنے لگتی تھی۔ لیکن اس اچھل کود میں اس کی سانس بہت پھول جایا کرتی۔ سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگتا۔ پاجامہ کھسک کر زیر ناف آ جاتا۔ کمربند باہر لٹکنے لگتا اور وہ قابل رحم حد تک مضحکہ خیز نظر آنے لگتا۔ اسے اس حلیے میں دیکھ کر بیوی اکثر اسے ایک تھل تھل آدمی کا طعنہ دیا کرتی جسے ناچنا تو دور سلیقے سے اچھلنا کودنا بھی نہ آتا تھا۔ تب وہ جھینپ مٹاتے ہوئے اکثر یہ کمزور سا جواز پیش کرتا کہ اس اچھل کود کے بہانے دراصل اس کی ورزش اچھی ہو جاتی ہے جو اس کے ذیابیطس کے مرض کے لیے بہت مفید ہے۔

لیکن اس بیماری میں اس کی کوئی بے تکی' اول جلول اور مضحکہ خیز حرکت یا کوشش بار آور نہ ہو سکی تھی۔ بچی سوتے میں چونک اٹھتی اور بری طرح گلا پھاڑنا شروع کر دیتی' پھر کسی طرح خاموش ہونے کا نام نہ لیتی۔ تمام دواؤں کے باوجود اس کا بخار ایک پل کو بھی کم نہ ہوا۔ اس کی پیٹھ اور ماتھا اس شدت سے گرم ہوتے کہ گویا ان پر چنے بھونے جا سکتے تھے۔ لیکن اصل مسئلہ ان دردناک اور وحشت ناک چیخوں کا تھا جو اچانک سوتے سوتے شروع ہو جاتی تھیں۔ اس درمیان بچی نے دودھ بھی منہ میں لینا چھوڑ دیا تھا۔ تب اس کی بیوی نے کہا تھا کہ میں کسی مولوی سے تعویذ لاؤں گی کیونکہ یہ چیخنا چلانا بے سبب نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ عام قسم کا رونا معلوم ہوتا ہے یہ تو کوئی اور ہی بات لگتی ہے جیسے بچی پر کوئی اثر ہو گیا ہو۔

اس کی بیوی ایک پرائمری اسکول میں پڑھاتی تھی اور آدھے دن سے زیادہ گھر سے باہر رہتی تھی۔ وہ خود آج کل کچھ نہیں کرتا تھا۔ دو سال پہلے اس نے بچوں کی کاپیوں کتابوں کی ایک معمولی سی دوکان کھولی تھی لیکن وہ چل نہ سکی تھی بچی کی پیدائش کے بعد سے بیوی نے اسکول سے لمبی چھٹی لے رکھی تھی' لیکن اب آگے چھٹی ملنا مشکل تھا۔ وہ اس بات سے جھلایا کرتی کہ نہ تو وہ اس قابل تھا کہ بیوی کی غیر حاضری میں بچی کو قاعدے اور سلیقے سے رکھ سکے'

اور نہ ہی اتنی کم آمدنی میں کسی عورت یا لڑکی کا انتظام کیا جا سکتا تھا جو بچی کی دیکھ بھال کر سکے۔

بیوی شام کو کہیں سے کوئی تعویذ لے آئی تھی لیکن تعویذ گلے میں ڈالنے کے بعد بھی بچی کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوئی۔ وہ اسے بخار میں جلتی ہوئی تیسری رات تھی اور اس رات بچی کو پہلے سے زیادہ بخار رہا اور وہ برابر بے چین رہی۔ اس رات مکان کی کائی لگی منڈیروں پر آوارہ بلیاں روتی اور لڑتی پھریں۔

وہ شاید فجر کا وقت رہا ہوگا جب انھوں نے بچی کو قدرے سکون کے ساتھ سوتا پایا۔ اس کا نچلا ہونٹ کچھ آگے ابھر آیا تھا اور وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں باندھے سیدھی لیٹی سو رہی تھی۔ اس کی سانس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ نسبتاً گہری نیند تھی۔ اس کے جسم کو چھونے سے بخار بھی کم محسوس ہوا۔ بیوی نے راحت کی سانس لی اور بچی کے برابر لیٹ گئی وہ خود بھی برابر کے پلنگ پر آڑا آڑا دراز ہو گیا۔ ہلکی سی غنودگی کے عالم اسے بار بار یہ محسوس ہوتا رہا جیسے پلنگ کی سمت مخالف ہو گئی ہو۔

پو پھٹے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ وہ گھبرا کر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ دکھتی آنکھوں میں کیچڑ آنے کے باعث پلکیں آپس میں چپک گئی تھیں۔ بڑی مشکل سے وہ آنکھیں کھول پایا۔ اس نے بچی کی طرف نظر ڈالی اور اس کا جی دھک سے ہو گیا۔ صبح کی سفیدی میں بچی کے سانولے جسم پر ننھے ننھے لال دانوں کا ایک جال سا بکھرا ہوا نظر آیا۔ ہاتھ۔ پیر۔ چہرہ۔ بھنویں۔ آنکھوں کے حلقے۔ پپوٹے۔ پیٹھ اور کانوں کے پیچھے دانے ہی دانے تھے۔ بچی کا چہرہ سرخ ہو کر بھرا گیا تھا۔ اس نے تقریباً جھنجوڑتے ہوئے بیوی کو اٹھایا۔

"دیکھو۔ یہ دیکھو...." اس نے بچی کے جسم پر پھیلے دانوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بھی یہ دیکھ کر گھبرا گئی۔

"میری بچی... یہی تکلیف تو تھی اسے۔ یہی تو کھولن پڑی تھی اندر۔ اسی لیے بخار نہیں اتر رہا تھا۔ خدا خیر کرے۔ کیسے بھرے پڑے ہیں۔" وہ بچی کے ماتھے پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے ہوئے فکرمند لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"ٹیکہ تو لگوایا تھا" وہ مجرمانہ انداز میں آہستہ سے بولا۔

"کچھ نہیں ہوتا ٹیکے ویکے سے۔ یہ سب ہمارے اوپر عذاب خدا ہے۔" بیوی نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

"آج کل چیچک بھی بہت رہی ہے۔ آس پاس کئی گھروں میں بچوں کو نکل چکی ہے۔ دراصل یہ موسم ہی خراب ہے" وہ بے خیالی میں بولا۔

"یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔" بیوی نے اسے گھورا۔

کچی نیند سے اچانک جاگ جانے کے باعث بیوی کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں لیکن اسے یہ آنکھیں بے حد پرائی اور نامانوس نظر آئیں۔ ان آنکھوں کو وہ زیادہ دیر تک دیکھ نہ سکا اور اس نے خود کو ایک ناقابل تشریح قسم کے احساس جرم سے جکڑا پایا۔

"میرا کیا دھرا"...؟

"ہاں تمہارا۔ جب بھی دونوں وقت ملتے تم اسے دروازے پر لے جا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔"

"لیکن وہ تو اسے بہلانے کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا۔" وہ زبردستی مسکراہٹ چہرے پر لاتا ہوا بولا۔ حالانکہ اسے بخوبی علم تھا کہ ایسے موقع پر یہ مسکراہٹ صرف ایک احمقانہ فعل کا درجہ رکھتی تھی۔

"بھلا تو تم سب کو رہے ہو۔ نہ جانے کب سے۔ صرف یہی ایک ایسا کام ہے جسے تم مہارت کے ساتھ انجام دے سکتے ہو۔" بیوی کے لہجے میں طنز کے ساتھ بھولی بسری شکایتیں بھی عود کر آئی تھیں۔ لیکن ان شکایتوں کی سطح معمولی اور روایتی قسم کی نہیں تھی۔ اس میں وجود کے پرزے پرزے کر دینے والے کسی ناقابل تلافی نقصان کا احساس شامل تھا۔

اس نے دکھتی آنکھوں پر کالی عینک لگالی۔

دن چڑھ آیا۔ دھوپ منڈیر سے سرک کر آنگن میں چلی آئی۔ دھوپ کی چمک میں بچی کے جسم پر ابھرے یہ خشخاش جیسے سرخ دانے اور بھی زیادہ چمکدار اور گھنے نظر آنے لگے۔

"اندر کا سارا مادہ باہر نکل آنا چاہیے۔ اب کوئی دوا نہیں دی جائے گی۔" اس نے یقینی لہجے میں کہا۔

بیوی نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ بچی کے بال سہلا رہی تھی۔ اس نے زبردستی بات آگے بڑھانا چاہی۔ "جانتی ہو ان دانوں کا اصل نام...."

"بس بس۔ نام لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے ہی گھر میں بڑی خیر و برکت ہے" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے خشمگیں لہجے میں بولی۔

اس کی بیوی درمیانے قد کی سانولی رنگت لیے ہوئے بھاری بھرکم سی عورت تھی۔ اس کا چہرہ یوں تو بالکل معمولی تھا لیکن ناک کے چوڑی اور قدرے بیٹھی ہوئی ہونے کے باعث اس کی شخصیت میں ایک قسم کی جنسی بے باکی کا گمان گزرتا تھا۔ اس چہرے کی سطح کے نیچے ایک سوئی ہوئی سی شہوت کے نقش اکثر نمایاں ہو جاتے جنھیں دیکھ کر دہشت کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ اس میں دیکھنے والے کی اپنی نظر اور ذہنیت کا دخل ہی کار فرما ہو۔ اس کا دہانہ چوڑا تھا اور ہونٹ فربہ تھے جن کو وہ اس وجہ سے زیادہ تر آپس میں بھینچے رکھتی تھی کہ اس کے دو دانت باہر کو ابھر آئے تھے۔ اس کے ہونٹوں کا رنگ غیر معمولی طور پر سرخ تھا جس کی تہہ کے نیچے سے ایک دھندلی سی سفیدی اکثر اوپر ابھرتی دکھائی دیتی۔ اس کے سانولے چہرے پر یہ عجیب رنگت اور ساخت لیے ہوئے ہونٹ نہ صرف اجنبی اور بے میل نظر آتے تھے بلکہ یہ اپنے اندر اس کے تمام وجود سے ماورا کسی ایسی شے کا بھی سراغ دیتے تھے جو قطعی ناقابل فہم اور ساتھ ہی پراسرار بھی تھی۔

بچی جاگ گئی تھی اور منہ بگاڑ کر رونے لگی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر

اسے گود میں لینا چاہا مگر اس کی بیوی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
"دور ہٹو..... پتہ ہے اس بیماری میں کتنی احتیاط کی ضرورت ہے" بیوی نے بچی کو اپنی گود میں لے لیا۔
وہ شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا مگر پھر فوراً ہی دھیرے سے کھنکارتے ہوئے بولا۔ "یہ دانے فجر کے وقت ظہور میں آتے ہیں اماں کہتی تھیں۔"
"فجر کے وقت۔" بیوی نے اس کی طرف تشریح طلب نظروں سے دیکھا، مگر وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا۔
فجر کے وقت یہ دانے جلد اور لہو کی اتھاہ گہرائیوں سے نکل کر جسم پر نمودار ہوتے ہیں۔ ساری جان کھینچ لینے کے بعد ان ننھے ننھے دانوں کا وجود کسی بھیانک اور نحس تخلیق سے کم نہیں ہوتا۔ اماں کہا کرتی تھیں کہ دانے نکل آنے کے بعد اس لیے بخار کچھ کم ہو جاتا ہے گر خطرہ نہیں ٹلتا۔ بری ہوائیں اور آسیبی طاقتیں بچے کو گھیرے رہتی ہیں۔ اس نے سوچا۔
"خدا کا حکم ہے۔ ٹیکہ بھی لگوایا تھا اور میری امی اس کے پیدا ہوتے ہی سورہ رحمٰن شریف کا گنڈا بھی گلے میں ڈال گئی تھیں پھر بھی ہونی کو کون روک سکتا ہے" بیوی آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگی۔
"سورہ رحمٰن شریف کے گنڈے سے کیا ہوتا ہے"؟
"شیطانی قوتیں اور ناپاک چیزیں دور رہتی ہیں" بیوی نے کچھ اس طرح ہونٹ بھینچے ہوئے جواب دیا تھا کہ ایک پل کے لیے اس کے ہونٹوں کی وہ دھندلی اور مبہم سفیدی سارے چہرے پر رینگتی نظر آئی۔ اس کے لیے اس چہرے کو غور سے دیکھ پانا ممکن نہ تھا۔ پھر ایک بار اسے کس سنگین مگر بے معنی احساس جرم کا شدید اور واضح ادراک ہوا۔
"ازالہ ممکن نہیں" کوئی اس کے اندر تاسف کے ساتھ بڑبڑایا۔
"سنو" اس کی بیوی کہہ رہی تھی۔
"پڑوس سے جا کر نیم کی ٹہنیاں اور پتے لے آؤ۔ آج پہلا ہی دن ہے ابھی یہ دانے اور ابھریں گے۔ خدا اپنا رحم کرے۔ میری پھول سی بچی۔" امی کی آواز رندھ آئی تھی۔
بے اختیار چاہا کہ وہ پیارے بیوی کا ہاتھ تھام لے اور اسے تسلی دے۔ لیکن تب ہی اسے خیال آیا کہ یہ رندھی ہوئی آواز دیر تک بچی کو "آ آ" کر کے بہلاتے رہنے کا نتیجہ رہی ہوگی۔ وہ مایوسی کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھنے لگا جہاں ایک اداس اور تنہا چیل سست روی سے تیر رہی تھی۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس کا دل پھر کوئی بات کرنے کے لیے چاہا۔
"اماں کہتی تھیں.... جب اس بیماری کا کوئی مریض گھر میں ہو تو گوشت نہیں پکانا چاہیے اور کسی بھی قسم کا بگھار نہیں لگانا چاہیے۔"
بیوی نے اس کی طرف تیکھی نظروں سے گھورا۔
"مجھے ان دقیانوسی باتوں کا کوئی علم نہیں نہ میرے گھر میں کسی کے اس قسم کے جاہلانہ خیالات تھے۔"

"نہیں دراصل بزرگ اس بیماری کو آسیب سے ملتی جلتی کوئی شے سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ گوشت وغیرہ پکنے سے اس کی شیطانی قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔"
تم ہی کو روز گوشت بھگوڑنے کا شوق ہے۔ مجھے کیا سمجھا رہے ہو" بیوی بیزار تھی۔
وہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکا۔ دیر سے آسمان کی طرف دیکھتے رہنے کے باعث دھوپ کی چوندھ سے اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ وہ چشمہ اتار کر قمیص کے میلے دامن سے پانی صاف کرنے لگا۔
"اب یہی کسر رہ گئی ہے۔ اگر بچی کی آنکھیں بھی دکھنے لگ گئیں تو....." بیوی کا لہجہ جھنجلاہٹ سے بھر گیا تھا۔
"اس سے تھوڑا دور رہو۔ اور کم از کم اپنی آنکھوں کو پانی سے دھو ہی ڈالو۔
بچی ماں کی گود میں سو گئی تھی۔
وہ نل پر آنکھیں دھونے جھک گیا۔ ٹھنڈے پانی اچھی طرح آنکھیں دھو لینے کے بعد اسے کچھ اور نہیں سوجھا تو وہ نل کے پائپ میں لگی کائی کو صاف کرنے لگا۔ ٹونٹی پر پیلی بھڑیں آکر اکٹھا ہونے لگیں۔ اس نے اپنی ایک چپل اتار کر ہاتھ میں لے لی اور آگے پیچھے دوڑ دوڑ کر ڈورتے ہوئے بھڑوں کو کچلنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب بالکل بے معنی اور فضول ہے لیکن جھینپ مٹانے کے لئے یہ لایعنی حرکات اشد ضروری تھیں۔
اس شام بچی کا بخار کافی کم رہا۔ اس نے تھوڑا سا دودھ پیا اور اپنے بستر پر بیٹھ کر بساط بھر کھیلنے کی بھی کوشش کی۔ بستر پر اس کے کھلونے ڈال دیے گئے لیکن وہ بجائے کھلونوں کے وہاں بکھرے ہوئے نیم کے پتوں اور ٹہنیوں سے کھیلنے لگی۔ نیم کی ایک ٹہنی ہاتھ میں لے کر بچی نے اس کے سر کو چھوا۔ وہ خوشی سے بے قابو ہو اٹھا۔ بچی کمزوری کے عالم میں بھی اس کی قمیص کا دامن پکڑ کر بستر پر کھڑی ہو گئی اور چار پانچ دن کے عرصے میں شاید پہلی بار تتلاتے ہوئے بولی۔
"آ... گئے۔ آ... گئے۔"
وہ جب بھی باہر سے گھر میں داخل ہوتا تھا بچی اسے دیکھ کر تتلاتے ہوئے کہتی تھی۔ "آ... گئے۔ آگئے" وہ اسی لفظ پر نہال ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن بہت ممکن تھا کہ یہ لفظ اس کے باہر سے گھر میں داخل ہونے کی وجہ سے بچی کے منہ سے نہ ادا ہوتا ہو بلکہ بچی نے اسے باپ کے نام یا شناخت کے بطور سیکھ لیا ہو یا پھر خود اس کے کانوں نے ایک بے معنی آواز کو معنی کا جامہ پہنا دیا ہو۔ اس شام اس نے بچی کو گود میں لے کر گھوڑ دوڑنے کی نقل میں منہ سے "ٹک ٹک" کی آوازیں، نکالیں اور پھر باقاعدہ جھک کر گھوڑا بنتے ہوئے آنگن میں دوڑ کر بھی دکھایا جس پر بچی مستقل "آ گئے... آ گئے" کہتی رہی اور درمیان میں کلکاریاں بھی مارتی رہی۔ لیکن جیسے جیسے رات بڑھتی گئی ویسے بچی کا بخار دوبارہ

بڑھنے لگا اور وہ پھر خوف زدہ ہو کر بری بری آوازیں نکالتے ہوئے رونے لگی۔

"بیمار بچی کو تھکا کر رکھ دیا۔ دیکھا پھر اس کی حالت بگڑ گئی۔" اس کی بیوی اچانک اعصاب زدہ آواز میں چلائی اور بچی کو گود میں لے کر تیز تیز قدموں سے دالان اور آنگن کے درمیان چکر لگانے لگی۔

دیر تک گھوڑا بن کر بچی کو ٹہلانے سے وہ ریڑھ کی ہڈی میں دکھن محسوس کر رہا تھا۔ وہ شرمندہ شرمندہ سا پلنگ کی پائینتی پر بیٹھا تو خود اس نے کچھ زیادہ ہی جھکا ہوا محسوس کیا۔ کمر جیسے سیدھی نہ ہوتی تھی۔ اس نے سوچا۔ وہ ٹھیک ہی کہتی ہے۔ اس نے تاسف بھری نظروں سے اپنے پیٹ کی طرف دیکھا تو قمیض پر جگہ جگہ سالن کے خشک دھبے بھی نظر آئے جو کھانا کھانے کے سلسلے میں اس کی جلدبازی اور بدتمیزی کا ثبوت تھے۔

لیکن وہ بھی مجبور تھا۔ آج کل جب بھی وہ کھانا کھانے بیٹھتا نہ جانے کہاں سے اماں پاس آکر بیٹھ جاتیں اور ڈلیہ میں سے نکال نکال کر اس کے ہاتھ میں روٹیاں دیتی ہی رہتیں۔ وہ آگے جھک جھک کر اور ہل ہل کر بغیر رکے کھانا کھاتا رہتا۔ جب اماں کا انتقال ہوا تھا تب وہ صرف سترہ برس کا تھا۔ اماں کو ہڈی کی دق ہوگئی تھی اور مرنے سے پہلے ان کی ریڑھ کی ہڈی کے تمام گریے گل گئے تھے۔'

تھوڑا دیر میں بچی خاموش ہوگئی۔ بیوی نے اسے پلنگ پر لٹادیا اور خود بھی اسی سے لگ کر وہیں بیٹھ گئی۔ وہ خود اسی طرح پلنگ کی پائنتی پر جھکا ہوا بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ بچی کے قریب کچھ اس انداز سے بیٹھ گئی تھی جس سے بے چارگی کا اظہار ہوتا تھا۔

ہلکی سے ہوا چلنے لگی تھی۔ گملے میں لگا پودا ہلنے لگا جس کے سائے میں بیوی کے ہونٹ اور آنکھیں بار بار نگاہ سے اوجھل ہوتے محسوس ہوئے۔ بیوی کا یہ چہرہ اسے بہت اترا ہوا۔ کمزور اور نامکمل سا لگا نہ جانے کیوں اسی ایک پل میں اسے پی سوتی ہوئی بچی اور بیوی کے درمیان ایک ناقابل یقین قسم کی مشابہت نظر آئی۔ اس کے سینے میں ایک عجیب تشریح کے ناقابل تشریح کا جذبہ مچلنے لگا۔ شاید یہ جذبہ ممتا اور ہمدردی سے ملتی جلتی کوئی شے رہا ہو۔ اس جذبے سے مجبور ہو کر اس نے اپنا دایاں ہاتھ بیوی کے سر پر رکھنے کے لئے بڑھایا۔ وہ دراصل دیکھ اپنی سوتی ہوئی بچی کو رہا تھا اسی لئے شاید اس سے اندازے کی غلطی ہوگئی یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے اس طرف کوئی خاص توجہ ہی نہ دی ہو۔ وہ ہاتھ بجائے بیوی کے سر کے اس کے سینے اور گردن کے نچلے حصے کو ہلکا سا رگڑتا ہوا گزر گیا۔ کوار کے مہینے کا پھیکا پھیکا چاند آتے جاتے بادلوں میں الجھا ہوا تھا۔ ایک کرن نہ جانے کس زاویے سے پڑ رہی تھی کہ اس کی بیوی کے کان کا ایک معمولی سا بندا ہیرے کی طرح دمکنے لگا۔

"کیا ہے... یہ بھی کوئی موقع ہے" بیوی نے پوری طاقت کے ساتھ اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"نہیں نہیں..." وہ بری طرح شرمندہ ہوگیا۔

"میرا وہ مطلب... نہیں تھا میں تو۔" اس نے لکنت بھری آواز میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ٹھیک اسی وقت اسے احساس ہوا کہ اس درمیان دیر سے اس کا دوسرا ہاتھ اپنے پیٹ سے کھجاتے ہوئے بدن کو بے خیالی میں کھجاتا بھی رہا ہے۔ وہ غیرت سے گویا زمین میں گڑ گیا۔ تب اس نے محسوس کیا کہ بیوی کی آنکھوں میں اس کے لئے اس وقت جیسی قسم کی نفرت سے ملتی جلتی کوئی شے عود کر آئی تھی۔

ہوا پھر بند ہوگئی۔ حبس اپنی انتہا پر تھا۔ گملے میں لگے پودے کے سائے کے ساکت ہو جانے سے بیوی کی آنکھیں اور ہونٹ پھر نمایاں ہوگئے۔

"نہیں ازالہ ممکن ہی نہیں ہے" پھر کوئی اس کے اندر بہت مایوس ہو اٹھا۔ اس رات بھی بچی تیز بخار میں جلتی رہی۔ وہ صرف دس دس منٹ کے لئے سوتی' اور پھر جیسے کسی شے سے خوف زدہ ہو کر اچھل اچھل پڑتی اور بے حد چیخ چیخ کر رونے لگتی تھی۔ لیکن گذشتہ شب کی طرح اس رات بھی فجر کے وقت اسے کچھ سکون مل گیا جیسے ان ڈراونے خوابوں کا کابوسی سلسلہ رک گیا ہو یا دھیما ہو گیا جس سے پریشان ہو کر بچی تمام رات دل ہلا دینے والی اذیت ناک آواز میں چلاتی رہی تھی۔

دوسرے دن اس کا بخار کم تھا۔ بدن بہت پسیجا ہوا سا ہو رہا تھا۔ لیکن ساتھ ہی دانوں کی تعداد اور ان کے گھنے پن میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ان کی سرخی اور چمک کے خدوخال بدل گئے تھے۔ چہرہ کچھ پھولا ہوا سا اور گال لٹکے سے نظر آنے لگے تھے۔ اپنی پیدائش سے لے کر شاید پہلی بار بچی کا یہ چہرہ اپنی ماں کے مقابلے باپ سے زیادہ مشابہ محسوس ہوا۔ وہ بے اختیار نیم کے پتوں سے اس کا دانوں بھرا جسم سہلانے لگا۔ کل رات بھی فجر کے وقت ہی یہ دانے بڑھے ہوں گے۔ اسی لئے بخار کم ہو گیا ہے۔ اماں کہا کرتی تھیں کہ فجر کے وقت فلک پر سارے ستاروں کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے اور وہ سچے موتی بن جاتے ہیں۔ اس بیماری میں سچے موتی بھی کھلائے جاتے ہیں اگرچہ لوگ انہیں ایک دوا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ دوا نہیں ہیں۔ فجر کے وقت جب وہ مادہ خون کے خلیوں سے نکل کر دانوں کی حفاظت کرتے ہیں اور پھر فلک پر خوابیدہ ستاروں کے جھرمٹ میں جا کر مل جاتے ہیں۔ اس نے سوچا۔

مگر خطرہ۔ خطرہ نہیں ٹلتا۔ ابھی تو دو دن باقی ہیں۔ وہ فکر مند ہو گیا۔

اس دن جو پہلا کام اس نے کیا وہ یہ تھا کہ مکان کے خستہ حال اور بدرنگ صدر دروازے پر گیروے رنگ میں اپنا ہاتھ ڈبو کر پانچوں انگلیوں کا نشان ثبت کیا تھا۔ اسے دیا سے گھر کو محفوظ رکھنے والی ایک دعا بھی یاد تھی جسے اس نے سفید چاک سے ٹوٹی پھوٹی تحریر میں کواڑ پر لکھ دیا۔ ایسا کر کے اس کے قلب کو کچھ اطمینان حاصل ہوا۔ اسے یقین سا ہوتا محسوس ہوا کہ اب یہ بیماری یہ وبا اس کے مکان سے ضرور باہر نکل جائے گی۔

اس وقت اس کا سارا بدن چپک رہا تھا۔ رات سے زکام ہو جانے کی وجہ سے اسے رہ رہ کر کھانسی کا دورہ پڑنے لگتا تھا اور ناک سے پانی بہہ رہا تھا اس

کے دل میں نہانے کی شدید خواہش جاگی۔ وہ کئی دن سے نہیں نہایا تھا اور اس کی کھچڑی ہوتی ہوئی داڑھی بے ترتیبی سے بڑھ گئی تھی۔ اس نے اپنی قمیص اتاری۔

بیوی نے بچی کا فراک بدلنے کے لئے دھلا ہوا صاف فراک پریس کرنے کے لئے میز پر ڈال رکھا تھا۔ یہ سرخ رنگ کا تھا اور اس پر ابھرے ہوئے کانوں والی دو سفید بلیاں بنی ہوئی تھیں۔ نہ جانے کیا سوچ کر اس نے اپنی میلی سی قمیص پر وہ فراک ڈال دی۔ نہ معلوم کیوں یہ اسے دنیا کا سب سے خوبصورت منظر نظر آیا۔ ایک بے زبان، معصوم اور آلودگی سے یکسر پاک لباس اس کے میلے ہوئے عمر رسیدہ اور تجربہ کار کپڑوں کے گویا اندر سے ابھر رہا تھا۔ وہ جیسے دوبارہ پیدا ہو رہا تھا۔

بیوی تیزی سے اس کی طرف جھپٹی وہ فراک کو اٹھا کر دور کھڑی ہو گئی۔

"یہ کیا کیا تم نے؟۔ ابھی میں نے اسے دھویا تھا۔"

وہ کمر تک بے لباس کھڑا ہوا سر جھکائے اپنی میلی قمیص دیکھے جا رہا تھا۔ بچپن میں اسکول میں ماسٹر صاحب کی ڈانٹ سنتے ہی اس کی ناک بہنے لگتی تھی۔ اس وقت بھی اس کی ناک بہہ کر اوپری ہونٹ تک آگئی اگرچہ اب اسے نزلہ بھی ہو رہا تھا۔

"اپنے کپڑوں اور جسم کی حالت دیکھو۔ آنکھیں دکھ رہی ہیں۔ ناک الگ بہہ رہی ہے۔ نہ جانے نزلے میں تمہاری بچوں کی طرح اس قدر ناک کیوں بہا کرتی ہے۔" بیوی نے کچھ اس طرح منہ بنایا تھا جیسے اس نے آتی ہوئی ابکائی کو روکا ہو۔

اماں نہ جانے کہاں سے چرچر کرتی ہوئی سی آئیں اور ایک سفید سوتی رومال سے اس کی ناک صاف کرنے لگیں۔

"دراصل تمہیں کوئی ڈھنگ ہی نہیں ہے اور نہ تمہارے پاس کچھ کرنے کو ہے، دوکان تو خیر لٹا ہی دی۔ مگر خدا کے فضل سے پڑھے لکھے ہو، اگر چاہو تو محلے کے دو ایک بچوں کو ہی ٹائیں ٹائیں کرا سکتے ہو۔ کچھ تو دلدر دور ہوں۔" بیوی کہے جا رہی تھی۔

اس کو اپنی ہتھیلیوں اور ایڑیوں سے آگ نکلتی محسوس ہوئی۔ بخار آ گیا ہوگا۔ اس نے سوچا اور پھر نہانے کا ارادہ ترک کرکے وہ میلی قمیص اس نے دوبارہ پہن لی۔ ایک پل کو اسے محسوس ہوا جیسے بچی کی اسی بیماری اور بخار کا ماخذ اس کا یہ گندا اور تھکا ہوا جسم تھا۔

لالٹین کی روشنی میں بچی پر جھکی ہوئی ان دونوں کی پرچھائیاں دیوار پر لرز رہی تھیں۔

"نہیں دانے بڑھے تو نہیں ہیں۔" اس نے بیوی کی خودکلامی کا جواب بڑی توجہ سے اور بلند لہجے میں دیا تھا۔

"یہ فجر کے وقت بڑھیں گے۔ وہی وقت ہے" وہ لالٹین کو کنڈے میں لٹکاتا ہوا آہستہ سے بولا۔

"نکلی نہیں آئی ابھی تک۔" بیوی بڑبڑائی۔

"آج شاید رات بھر نہ آئے۔ حبس کتنا ہو رہا ہے مگر رات ذرا بھیگ جائے تو ہوائیں ضرور چلیں گی۔" اس نے بیوی کو مطمئن کرنے کے لئے جواب دینا چاہا تھا لیکن یہ اس نے اتنی آہستگی کے ساتھ کہا کہ دوسرا شخص اسے صرف ایک بے معنی بڑبڑاہٹ ہی سمجھ سکتا تھا۔

"آج رات میں اسے آنگن میں ہرگز نہیں۔ کمرے میں سلاؤں گی۔ آنگن میں یہ زیادہ چلاتی ہے ویسے بھی آدھی رات کے بعد آسمان پر بلاؤں کا گزر ہوتا ہے۔ نہ جانے کیا چیز رات بھر میرے پیروں کو کاٹتی کھاتی رہتی ہے۔ اوس پڑنے سے طبیعت اور بھاری ہو جاتی ہے۔"

"پھر تو دکھائی نہیں دیتے" وہ بے وجہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑنے لگا۔

"اڑنے والے پھو ہوں گے۔ کم بخت یہ تو کبھی نظر بھی نہیں آتے۔" بیوی نے بیزار لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ ستمبر کا موسم ہی برا ہے۔ اماں کہتی تھی کہ ان دنوں سے زیادہ خراب پورے سال میں اور کوئی دن نہیں ہوتے اور اس موسم میں بیماری۔۔" وہ کچھ اور کہنے جا رہا تھا لیکن بیوی کی نگاہوں میں اپنے لئے حقارت دیکھ کر اس نے جملہ پورا کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

"خدا کے بنائے ہوئے دن، مہینوں کو تو بدنام نہ کرو۔ یہ موسم خراب نہیں۔ دراصل تمہارا یہ مکان ہی منحوس ہے اور بدبختی سے بھرا ہوا ہے۔ تم نے غور نہیں کیا کبھی۔۔ کہ یہ مکان شیر دہن ہے۔ آگے سے تنگ اور پیچھے سے کشادہ۔ ایسے مکان نحس ہوتے ہیں اور ان کی زمین سب کو راس نہیں آتی۔ کتنی منتوں مرادوں کے بعد میں نے اس بچی کا منہ دیکھا ہے ورنہ اس مکان میں جانے کیا بددعا تھی یا کیا شے تھی یہاں جو سترہ سال تک میری گود بھرنے سے پہلے ہی اجاڑتی رہی۔ اس گھر میں کون سی بلا گھس گئی ہے کہ مفلسی۔ تنگی اور بیماری سے پنڈ ہی نہیں چھوٹتا۔"

"خدا کا شکر ادا کرو اس نے ہمیں اولاد کا منہ دکھایا۔" وہ تفکر آمیز نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگا لیکن ہو سکتا ہے کہ ایسا اس نے صرف بیوی کا مزاج ٹھنڈا کرنے کے لئے کیا ہو۔

"ہاں تم سے زیادہ شکر ادا کرتی ہوں۔ مگر یہ تو بتاؤ تمہارے اس مکان میں سترہ سال تک کیا ہوتا رہا؟۔ دعا۔ تعویذ اور علاج اس کے علاوہ کیا تھا اس گھر میں پریشانی کے سوا تھا کیا اور ہے کیا؟"

"گھر کا کیا قصور۔۔؟" وہ دبی ہوئی آواز میں بولا۔

"گھر۔۔ تمہیں بہت پیار ہے نا اس گھر سے؟ لو میں اس گھر کی خوبیاں گنا رہی ہوں۔ میں کہتی ہوں کون سی بلا ہے جو اس گھر میں نہیں؟ دنیا کے سارے کیڑے مکوڑے گویا اسی گھر میں اکٹھا ہو گئے ہیں۔ ہر کونے میں مکڑیوں کے جالے۔ کڑیوں میں بے شمار چھپکلیاں۔ ہر جگہ دیمک سرسراتی ہے سب چاٹے جاتی ہے۔ باورچی خانے میں برتنوں کے پیچھے جانے کتنے جھینگر کودتے

رہتے ہیں۔ چیونٹیوں کا یہ عالم کہ دیواروں اور فرش کی درازوں میں سے اُمڈ پڑتی ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں تو الگ رہیں ایسا لگتا ہے کہ انسانوں کو چمٹ جائیں گی اور انھیں کھاجائیں گی۔ جہاں دیکھو چوہے دوڑتے پھرتے ہیں الماریوں کے اور بکسوں کے پیچھے سے جب سو گھو سڑاندھ آتی رہتی ہے۔ وہ تو میں نے خیر کرکے بیری کٹوادی ورنہ آنگن میں کوڑا دیکھتے بنتا تھا۔ آخر میں کہاں تک صفائی کرتی پھروں؟ گھر میں جراثیم نہ پھیلیں گے تو اور کیا ہوگا؟ تین مہینے سے میری کھانسی برقرار ہے اور خون کا تو بس بلغم بن گیا ہے۔"

"اس بار قلعی ضرور کراؤں گا" وہ شرمندہ تھا۔

"کراچکے تم قلعی۔" بیوی کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ "کبھی اتنا میسر نہ ہوگا۔ تم سے یہ بھاڑ جیسی کھلی ہوئی موریاں تک تو بند کرائی نہیں گئیں۔ باہر سے کیڑے مکوڑے اور جانور منہ اٹھائے ان کے ذریعے گھر میں گھسے آتے ہیں۔ پرسوں رات موری میں سے کالے کتے کا پورا سر جھانک رہا تھا۔"

"ان میں جالی لگوانا ہی پڑے گی" اس نے مضبوط لہجے میں کہنا چاہا۔ مگر اس کی آواز ایک کمزور سی سرگوشی بن کر رہ گئی۔

وہ کہے جارہی تھی' اگرچہ درمیان میں کئی بار اسے کھانسی کا دورہ پڑا تھا۔ جانے کس قماش کے لوگوں نے یہ گھر بنوایا تھا۔ جدھر نظر پڑی ہے طاق ہی طاق نظر آتے ہیں۔ دالان میں طاق۔ کوٹھری میں طاق برآمدے میں طاق اور دروازے میں طاق۔ کیسی وحشت ہوتی ہے مجھے یہ طاق دیکھ کر۔"

"پہلے کے لوگ مکانوں میں طاق ضرور بنوایا کرتے تھے" وہ آہستہ سے بولا۔

"تو اب کس مقصد سے تم نے انھیں چھوڑ رکھا ہے۔؟ سانپ بچھو کے رہنے کے لئے۔؟ اکثر رات کو میں نے آنگن کے اونچے والے طاق کی دیوار میں یہ بڑی سی چھپکلی گھستے دیکھی ہے۔ نہ جانے چھپکلی ہے یا بچھ کھوپڑا ہے یا کوئی اور ہی بلا ہے میرا دل تو دن میں بھی اس طرف دیکھنے سے ڈرتا ہے۔ تم سے کتنی بار کہا کہ ان کو اینٹوں سے بھروا دو مگر تمہاری توہم پرستی اور بدعتوں سے تو میں واقف ہوں نا۔ تمہارا بس چلے تو تم ہار پھول چڑھا کر ان میں چراغ بھی روشن کرنے لگو۔"

"وہ لاجواب ہوگیا اور منہ موڑ کر وہیں بیٹھے بیٹھے اپنا ایک پیر ہلانے لگا۔

"بارہ وفات تھی۔۔ اماں نے سر سے تولیہ اتار کر فاتحہ ختم کی اور اسے گود میں لیکر اچکاتے ہوئے آنگن والے نسبتاً اونچائی پر بنے طاق تک پہونچادیا۔

"لو اپنے ہاتھوں سے یہاں موم بتی لگادو۔ آج رات پورے گھر میں روشنی رہنا چاہیے۔"

مکان کے تمام طاق روشن ہو اٹھے۔

"بچی کی پائنتی بیٹھ کر پیر تو نہ ہلاؤ۔۔ بے وجہ پیر ہلانا بھی نحس ہے۔" بیوی نے یہ جملہ بے حد سرد آواز میں کہا تھا۔

اس نے اچانک سانس روک کر اپنے پیر کو کچھ اس سختی اور طاقت کے

ساتھ زمین پر چپکا دیا جیسے وہ پتھر کا بنا ہو۔ شاید وہ کافی دیر تک اسی طرح سانس روکے پوری طاقت سے پیر کو زمین میں گڑائے رکھتا اگر اسے فوراً ہی یہ یاد نہ آجاتا کہ آنگن کی پکی زمین کے نیچے کہیں بہت گہرائی میں بے شمار قبریں دفن ہیں۔ لوگ بتاتے ہیں کہ کس زمانے میں اس جگہ سیدوں کا چھوٹا سا قبرستان تھا جہاں اب یہ مکان ہے۔ وہ جلدی سے پیر اوپر اٹھا کر پائنتی سکڑ کر بیٹھ گیا۔

بیوی اس کے آباواجداد کے گناہ گن رہی تھی۔

"سنا ہے تمہارے دادا نے ایک شکرا پال رکھا تھا جس کی آنکھوں پر مخمل کی سلی ہوئی اور موتیوں سے آراستہ ٹوپی چڑھی رہتی تھی اور جب وہ ٹوپی اتاری جاتی تھی تو وہ تیتر کے بچوں کو اندھا کرکے پنجوں میں دبالاتا تھا۔ اس مکان پر تو بے زبان جانوروں کا بھی صبر پڑے گا۔ اپنی ماں کی ہی مثال لے لو جانے کس کی آہ تھی۔" بولتے بولتے اس کی سانس پھول آئی۔ "تم سے کوئی کتنا بھی کہے کہ اس مکان کو فروخت کردو' اور کسی دوسری جگہ کوئی ڈھنگ کا مکان لے لو۔ مگر تم تو اماں کی نشانی کو ایسے ہی کاندھے پر لئے بیٹھے رہوگے۔ ایسے ہی کمروں میں تو بیماریاں گھس کر بیٹھ جاتی ہیں۔ میں ایسی جگہ اپنی بچی کو نہیں رکھ سکتی۔ اتنا یاد رکھنا۔ اور کان کھول کر سن لو کہ اگر میری بچی کو خدانخواستہ کچھ ہوگیا تو میں تمہارا دامن حشر تک نہ چھوڑوں گی اور تمھیں کبھی معاف نہ کروں گی۔ تم اور صرف تم ہی ذمہ دار ہو اس صورت حال کے۔

وہ اچانک سسکیاں لے کر رونے لگی۔

وہ بت بنا ہوا صرف لالٹین کو دیکھے جارہا تھا جو اب ہوا چل جانے کے باعث آہستہ آہستہ جلنے لگی تھی اور اس کی لو دھیرے دھیرے کپکپا رہی تھی۔

اگرچہ وہ بیوی کو دلاسا دینا یا اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا تھا مگر اب اس انجانے سے جرم اور احساس گناہ کی موجودگی کا احساس بے حد شدید ہوگیا تھا۔ اب کچھ بھی کہنا یا صفائی پیش کرنا صرف ایک بدذاقی تھا۔

"پائے میں سے کہیں برادہ جھڑ رہا ہوگا" اس نے سوچا۔ بیوی بچی کو لے کر کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہ یونہی آنگن میں بیٹھا رہا۔ بجلی نہیں آئی تھی۔ بار بار اسے محسوس ہوتا جیسے فوراً ہی اس مکان میں کوئی بری واردات ہونے والی ہو۔ کچھ گھبراہٹ سی محسوس کرتے ہوئے وہ پلنگ سے اٹھ کر کچے آنگن میں اکڑوں بیٹھ گیا اور بے وجہ ماچس کی تیلیاں جلا جلا کر زمین پر پھینکتا رہا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی جب کمرے سے بچی کے رونے کی آواز ابھری۔ وہ دوڑتا ہوا اندر پہونچا اور جلدی جلدی بچی کی پیٹھ پر تھپکیاں دینا شروع کردیں۔ بچی کو کسی کل چین نہ پڑتا تھا کبھی وہ ادھر کروٹ لیتی کبھی ادھر۔ اس کے بار بار کروٹیں لینے سے بستر پر چاروں طرف پڑے نیم کے پتے چرمرانے لگے۔ اس وقت اس نے بچی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ فاصلے سے آتی ہوئی لالٹین کی روشنی میں ننھی ننھی لال پھنسیوں سے بھرا ہوا چہرہ اسے غیر معمولی طور پر بگڑا ہوا اور سیاہی مائل نظر آیا۔ اس کا منہ پورا کھلا ہوا تھا جس سے اس کے حال ہی میں نکلنے والے ننھے ننھے دودھ کے سفید دانت جھانک رہے تھے۔

آنکھیں جیسے کسی خوفناک منظر کو دیکھ کر پھٹ سی گئی تھیں۔ بچی کو تھپکی دیتے وقت اس نے محسوس کیا جیسے وہ اور کسی سے نہیں بلکہ خود اس سے ڈر رہی تھی۔ اس کی ہر پیار بھری تھپکی پر وہ اور بھی زور سے چیخنے لگتی اور اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ بگڑا ہوا نظر آنے لگتا۔

"یہ تو مجھ سے ہی ڈر رہی ہے" اس خیال نے اسے بے حد افسردہ کردیا۔ تب بیوی نے بچی کو گود میں لے کر اپنی چھاتی اس کے منھ میں دے دی بچی ان دنوں ماں کے دودھ کو منہ نہ لگاتی تھی مگر اس وقت خلاف معمول وہ بالکل خاموش ہوگئی اور چسر چسر کی آوازیں نکال کر دودھ پینے لگی۔ وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ سناٹا گہرا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ بچی ماں کی گود میں سوگئی تھی۔ بیوی نے اسے بہت احتیاط اور آہستگی کے ساتھ بستر پر لٹا دیا اور خود اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔

"سنو۔" اس کا بخار تو کچھ کم معلوم دیتا ہے مگر آج یہ سوتے میں بہت ڈر رہی ہے بار بار چونک کر رونے لگتی ہے۔ پتہ نہیں کوئی بھیانک خواب تو اسے بار بار پریشان نہیں کر رہا ہے؟ کیا کروں.....؟ آیتہ الکرسی ہی پڑھ کر پھونکوں۔ صبح گھر میں قرآن خوانی ضرور کراؤں گی۔"

وہ جانتا تھا کہ آیت الکرسی اور چاروں قل پڑھنے سے بدروحیں دور رہتی ہیں اور خوف مٹ جاتا ہے۔

بیوی سنبھل کر قاعدے سے بیٹھ گئی اور سر سے سفید دوپٹہ اوڑھ کر خاموشی سے آیتہ الکرسی کا ورد کرنے لگی۔ ساتھ ہی وہ بچی کے جسم پر پڑھ پڑھ کر پھونکتی بھی جاتی تھی۔ آیت الکرسی کا ورد کرتی ہوئی اپنی بیوی کا چہرہ اسے غیر معمولی طور پر پاکیزہ اور ہولناک حد تک جلال سے بھرا ہوا نظر آیا۔ دور کہیں تین کا گھنٹہ بجا۔ رات کے سناٹے میں اس گھنٹے کی آواز بھی پر ہول محسوس ہوئی۔ اس شہر میں ہمیشہ تو گھنٹے بجتے نہیں ہیں لیکن کبھی کبھی اچانک بجنا شروع ہوجاتے ہیں۔ ہر سال۔ کون سے موسم میں ایسا ہوتا ہے اسے ٹھیک سے یاد نہیں۔

وہ پلنگ کی پائنتی مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

وہ اپنے اندر ایک عجیب سی افسردہ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اندر کہیں متلی کی سی کیفیت ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا کہ آیت الکرسی کے اس ورد کے بعد جو کام سب سے پہلے ہونا چاہئے وہ دراصل یہ ہے کہ اس یہاں سے بھاگ کھڑا ہونا چاہئے جیسے یہ آیت الکرسی محض اس کو دور کرنے اور ناپید کرنے کے لئے پڑھی جارہی تھی اور وہ خود یہاں پلنگ کی پائنتی ایک بے شرم بھوت کی طرح ڈھٹائی کے ساتھ کھڑا تھا اس کے پیر کانپنے لگے اور سارا جسم ٹھنڈے پسینے سے بھیگ گیا۔

بیوی نے ورد ختم کیا اور بغیر اس کی طرف کوئی توجہ دئے بچی سے لگ کر لیٹ گئی پھر اس نے آنکھیں موندلیں۔

وہ بے جان انداز میں بچی کے قریب ٹک سا گیا۔ اس کی ململ اور پسینے سے بھیگی پوری آستین کی قمیص اس کے کاندھوں پر بالکل چپک کر رہ گئی تھی۔ مدتوں بعد آج پھر اس کے شانوں کو زہریلے سانپوں نے جکڑ لیا۔ بے چارگی کے ساتھ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ناخن بڑھ کر نوکیلے ہوگئے تھے۔ انگلیوں کے گٹھوں کے اوپر اکا دکا بال مکروہ انداز میں اوپر کی طرف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور بالوں سے ڈھکی بھالو جیسی کلائیاں۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے جسم پر بال کتنے زیادہ ہیں۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو سونگھا۔ ہاتھوں سے کچے گوشت کی بساندھ آتی محسوس ہوئی۔ بس یہی لمحہ تھا جب اسے اس امر کا انکشاف ہوا کہ وہ بھی تو دراصل ایک ناپاک بدروح ہے جو اپنے اندر کی تمام احساس کمتری اور شیطنیت کو لئے بچی کے آس پاس بھٹک رہی ہے یہ غیر اخلاقی شیطنیت ناقابل معافی گناہ تھی۔ اسے اب یہاں بالکل نہیں ٹھہرنا چاہئے تھا۔

فجر کے وقت یہ خطرناک دانے اور ابھریں گے اسے فجر سے پہلے ہی چل دینا چاہئے۔ یک بارگی اس نے بھی سوچا تھا کہ شدید بیمار اور بخار چھوڑ کر چل دینا ایک انتہائی درجے کی گھٹیا، غیر ذمہ دارانہ اور اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہوگی۔ لیکن بچی کو پاک صاف ماحول اور نیک لوگوں کے درمیان محفوظ اور صاف ستھرا چھوڑ کر جانے کے مقابلے میں اس کا چلا جانا ہی بہتر تھا۔ اس کا یہ سارا لاڈ پیار معصوم بچے کے ساتھ ایک بدروح کی چہل کے مانند بے تکا اور بھونڈا تھا۔

رات کے سناٹے میں پڑوس کے کسی مکان میں کوئی برتن گرا۔ اس نے لالٹین اٹھا کر بچی کے دانوں کو غور سے دیکھا۔ لالٹین کے جگہ کی پرچھائیاں گڈمڈ ہوکر اجنبی بن گئیں۔ روشنی کے اس تازہ زاوئے میں اپنی سوتی ہوئی بیوی کا چہرہ اسے بہت سادہ اور عام نظر آیا۔ بچی کے گلے میں تعویذ اور چند لونگیں بندھی تھیں اور وہ بے خبر سو رہی تھی۔ سرہانے رکھے نیم کے پتے سوکھ کر ادھر ادھر بکھر گئے تھے اور ان کے درمیان چابی والا بندر اوندھا پڑا تھا۔ بچی کا سارا جسم دانوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے ان دانوں کو نکل نکل کر بچی کے بدن پر، بستر پر اور تمام گھر میں رینگتا ہوا محسوس کیا۔

باہر گلی میں کوئی سست روی کے ساتھ تقریباً گھسٹتا ہوا سا گزر رہا تھا لیکن قدموں کی آواز غیر انسانی تھی۔

وہی معذور کتا ہوگا جس کی حال ہی میں ایک حادثے کے دوران دونوں پچھلی ٹانگیں کچل گئی تھیں۔ اس نے خیال کیا۔

بچی کو دیکھتے دیکھتے اچانک اس کے دل میں یہ خواہش جاگزیں ہوئی وہ سرہانے رکھے بسکٹوں کے پیکٹ میں سے ایک بسکٹ نکال کر اس کے ہونٹوں پر لگائے لیکن اسے خیال آیا کہ اس وقت یہ ایک نامناسب اور کافی حد احمقانہ فعل ہوگا۔

اس نے پیار سے بچی کی کبھی ہوئی فراک پر بنی بلیوں کے کان چوم لئے "پوسی ماؤ..... ماؤں....." معاً اسے گمان گزرا جیسے بچی نے اپنی دونوں باہیں پھیلا کر مسکراتے ہوئے توتلی زبان میں کہا تھا۔

"آ.....گئے" "آ.....گئے۔"

مگر وہ جارہا تھا اور ازالہ۔؟ وہ تو اب بھی ممکن نہ تھا۔ اس نے بے حد مایوس ہو کر سوچا۔

آس پاس کوئی بھی نہ تھا۔ ویسے تو روز رات کے اس پہر میں چمگادڑ نکل نکل کر وحشت زدہ انداز میں درو دیوار سے ٹکراتے پھرتے تھے لیکن آج کوئی بھی نہ تھا۔ صرف لالٹین کی روشنی تھی۔

کالی عینک کے عقب میں آنکھوں سے بے تحاشا پانی بہہ رہا تھا۔ دکھتی آنکھ جب ڈبڈبا آئی تو پتہ ہی نہ چلا کہ پانی کے درمیان آنسو کہاں تھے۔ دیکھو۔ بجلی کب تک آئے گی۔ شاید صبح تک۔ اسے خیال آیا کہ صبح اس مکان میں قرآن خوانی بھی تو ہونی ہے۔

کمرے سے باہر نکلتے وقت لالٹین کی روشنی میں اس کی پرچھائیں عجب بے ڈھنگم انداز میں کانپی تھی۔

نیلا آسمان بادلوں کے آوارہ جھنڈ سے گھرنے لگا تھا۔ پرندہ کوئی نہ تھا۔ یہ نہ ان کے بسیرے کا وقت تھا اور نہ چہچہانے کا۔ "ابھی کوئی پرندہ کہاں!" اس نے افسردگی کے ساتھ سوچا۔ مگر ہو سکتا ہے کہ کوئی منحوس پرندہ تاریکی میں کسی درخت کی شاخ میں دبکا ہی ہو۔

موسم کو دیکھ کر اسے اندیشہ ہوا کہ بارش بھی آسکتی ہے۔ اگر بارش ہوئی تو اس موسم میں زلزلے آتے ہیں اور پہاڑوں پر چٹانیں اپنی جگہ سے کھسکتی ہیں۔

آنگن میں جہاں کبھی بیری کا درخت تھا ٹھیک اسی جگہ حواس باختہ اماں ننگے پیر کھڑی تھیں۔ ان کی مٹھی میں امام ضامن دبا تھا۔ ان کے بالکل پشت میں دیوار کے نیچے گلی تاریک موری میں سے گھر کا غلیظ پانی باہر بہہ رہا تھا۔

"آسیب جب گھر سے رخصت ہوتا ہے تو اسے بھلا کوئی امام ضامن بھی باندھتا ہے۔"؟ اس نے نفرت کے ساتھ سوچا۔

آنگن میں کھڑے کھڑے اسے واہمہ گزرا جیسے کہیں دور بے شمار لوگ بلند آواز میں آیت الکرسی پڑھ رہے ہوں۔ وہ بے حد خوف زدہ ہو گیا۔ شیر دہن مکان کے خستہ حال صدر دروازے پر گیروئے رنگ سے انسانی ہاتھ کا نشان بنا تھا اور کوئی دعا ٹوٹی پھوٹی عربی تحریر میں سفید چاک سے لکھی ہوئی تھی۔

بخار کا ایک جلتا ہوا جھونکا گھر سے باہر آیا اور ستمبر کی رات کی قدرے خنک اور اداس ہواؤں میں مل کر غائب ہو گیا۔ ❖ ❖

غزل

جاوید اختر بیدی

ہمارا لگاؤ نہیں دیکھتا
دلوں کے الاؤ نہیں دیکھتا

ہماری خموشی پہ ہے معترض
جہاں کا دباؤ نہیں دیکھتا

یہی چلچلاؤ بقا کی سبیل
مگر چلچلاؤ نہیں دیکھتا

ہرے کھیت پہ ہے نظر وقت کی
ندی کا کٹاؤ نہیں دیکھتا

ہمیں ہے وہ انمول گردانتا
زمانے کا بھاؤ نہیں دیکھتا

نہ چاہے وہ بیدی اگر دیکھنا
دلوں کے بھی گھاؤ نہیں دیکھتا

افتخار نسیم

ہر اک کے پیچھے گیا ہوں میں سرپھروں کی طرح
ہوا کے دور مناظر ہیں طائروں کی طرح

کیا ہے وقت نے تنویم سا عمل ہم پر
ہمارے گرد ہیں لمحات ساحروں کی طرح

ہوائے ذوقِ سفر کب کہاں اڑا لے جائے
ہم اپنے صحن میں چپ ہیں مسافروں کی طرح

بنا رہا ہے مناظر زمیں کے کاغذ پر
نظر میں کون چھپا ہے مصوروں کی طرح

سروں سے ہٹتا نہیں ہے یہ نیل فام طلسم
فلک بھی پھیلتا جاتا ہے دائروں کی طرح

بجا تلا ہوا لہجہ مقرروں سا نسیم
ہر ایک لفظ میں محتاط شاعروں کی طرح

دھوکا سی گمان کا وہم نظر کے ساتھ
کاغذ کے پھول تابک دے سوکھے شجر کے ساتھ

وقت قبولیت ہے مگر کانپتا ہے دل
غائب کا خوف بھی دعا کے اثر کے ساتھ

پھیلی ہوئی سیاہی کے اب تک نشان ہیں
خط کو چھوا تھا اس نے کبھی چشمِ تر کے ساتھ

میں پک گیا مجھ کو کبھی ٹوٹنا ہی تھا
اب اور کتنی دیر میں رہتا شجر کے ساتھ

اس دشت میں ہرن کبھی واپس گئے نہیں
اک شیر کا بھی ڈر تھا شکاری کے ڈر کے ساتھ

پر شکستہ ہوگیا میں سب اڑانیں دب گئیں
ریت کا طوفان وہ اٹھا چٹانیں دب گئیں

جسم پر پھوڑا ہے جانے وقت نے کیا ظلم
سوگئی ہر ایک خواہش سب اٹھانیں دب گئیں

اک اندھیرا پھیل کر رنگِ افق سب لے گیا
رات کے بادل تلے سونے کی کانیں دب گئیں

لگ گئی سب کے لبوں پر ایک ہی مہرِ سکوت
لفظ گونگے ہوگئے سب کی زبانیں دب گئیں

گرگئی بازار سونے اب کے مہنگائی نسیم
قیمتوں کے بوجھ سے ساری دکانیں دب گئیں

افتخار نسیم

میں دروپدی نہیں ہوں

کل رات بھی تم اس قدر
نشے میں تھے
کہ تم سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا تا تھا
مہمان کچھ مجھ پر ہنس رہے تھے
کچھ تم پر
اور کچھ تمہاری باتیں سن کر
"کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں"
کہتے ہوئے چلے جا رہے تھے
فرش پر تمہارے ٹوٹے ہوئے گلاس
کی کرچیاں چنتے چنتے
میرے تلوے زخمی ہو گئے ہیں
میں تھک گیا ہوں
کاش میں تمہاری روح کے
گھٹا ٹوپ اندھیرے میں
چھپے ہوئے اس انسان کو ڈھونڈ نکالوں
جس کی وجہ سے
میں نے تم سے پیار کیا تھا
پینے کے اس کھیل میں تم نے
اپنی زندگی اور میری محبت
داؤ پر لگا دی ہے
اور تم جانتے ہو
کہ تم ہار رہے ہو
لیکن میں دروپدی نہیں ہوں
کہ تم مجھے بھی داؤ پر لگا دو
میں نے کبھی کسی کی زندگی نہیں گزاری
اس لئے میں کسی کی موت نہیں
مرنا چاہتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے

میں نے سنا ہے
اگلے وقتوں میں
اک رسم ہوا کرتی تھی
لڑکی پیدا ہوتے ہی
زندہ دفنا دی جاتی تھی
سوچتا ہوں میں
اس دنیا میں
میرا ہونا بھی
لڑکی ہونے سے کچھ کم تو نہیں ہے
فرق بس اتنا ہے
وہ پیدا ہوتے ہی دفنا دی جاتی تھی
اور میں روز اپنی خاموشی اور اپنے ناگفتہ بہ
جذبے
کے ہاتھوں کتنی موتیں مرتا ہوں

غلام حسین ساجد

اک پری زاد سے گفتگو ہے
اوج پہ آج کار رفو ہے

چاند جھلکا ہے دیر و حرم پر
میکدے میں چراغ سبو ہے

ایک آئینے سے مل چکا ہوں
ایک آئینے کی جستجو ہے

واعظوں کا وہی تملانا
عاشقوں کی وہی ہاؤ ہو ہے

ٹوٹ کر کوئی گرنے لگا ہے
کوئی صید طلسم نمو ہے

منتخب ایک میں ہی نہیں ہوں
میری شمشیر بھی خوبرو ہے

خاک اڑاتا تھا جا کے لئے میں
اب وہ صحرا نہ وہ آب جو ہے

آئنہ تو سلامت ہے، لیکن
کون ہے جو مرے روبرو ہے

غم نہیں دوسروں کی جفا کا
مجھ سے بیزار میرا لہو ہے

شہر کا نام پایا ہے جس نے
افتخار صف کاخ و کو ہے

سچ تو یہ ہے کہ صنف غزل سے
شرق حسن کی آبرو ہے

بن رہی ہے اساطیر ساجد
میری تحریر میری عدو ہے

آسماں میرا ہدف ہے نہ زمیں میری اسیر
کوئی صورت ہے مگر اور کہیں میری اسیر

حق جتاؤں گا میں کیا ساعت آئندہ پہ
جب یہ موجود روایت ہی نہیں میری اسیر

کچھ نہیں تھا مرے قبضے میں بجز وہم و گماں
میں سمجھتا تھا کہ ہے شمع یقیں میری اسیر

عین ممکن ہے، ہزیمت ہی اٹھانی پڑ جائے
کیا ضروری ہے کہ ہو فتح مبیں میری اسیر

زور چلتا ہے مرا، میری سپر پر ساجد
ہو نہ پائے گی مری تیغ حسیں میری اسیر

غلام حسین ساجد

متاعِ صبر کی زد پر ہے بے کلی میری
اسیرِ قریۂ ظلمت ہے روشنی میری

سند سے اور اجازت سے بے نیاز ہے عشق
میں اس کا ہو بھی چکا اور وہ ہو چکی میری

کہیں قیام کیا چاہتا ہوں میں، لیکن
گزر رہی ہے مسافت میں زندگی میری

مری گرفت سے باہر ہے خواب خوش آثار
اور اڑ چکی ہے کئی دن سے نیند بھی میری

بہار تاک سے اتری تو پھر نہیں آئی
غزال سے کو ترستی ہے اب گلی میری

اگر میں بار ہوں دشت جنوں کے پیاروں پر
تو راہ دیکھتے رہتے ہیں کیوں سبھی میری

بجا کہ تیغ و سپر پھر ہوئے عطا لیکن
کسی نگاہ میں تعظیم کیا رہی میری

مجھے جہان تگ و تاز میں کئی دن سے
تلاش کس کی ہے! کیا چیز کھو گئی میری

رکا ہوں چشم سیہ پوش کے اشارے پر
رہین ابروئے خوباں ہے اب خوشی میری

کہیں ستارۂ شب ہار کر اگر رہ جائے
تو میرا ساتھ نبھاتی ہے شاعری میری

میں پاؤں توڑ کے بیٹھا ہوں اس لئے ساجد
کہ خوش نہ آئے گی اس شہر کو کمی میری

خیمہ گاہ عشق دشمن کے تخیل سے ہے دور
یعنی اب میرا ٹھکانہ شہر کابل سے ہے دور

نیند میں جس نخل حیرت پر کھلا کرتے ہیں پھول
زمزمہ کرتی ہوئی تصویر بلبل سے ہے دور

کوئی ہے جس پر نہیں پڑتی نگاہ بیش و کم
کوئی دنیا ہے جو میرے جزو اور کل سے ہے دور

ایک قریہ ہے جہاں زنجیر ہو رہتے ہیں عکس
ایک آبادی ابھی تک صحبت غل سے ہے دور

موسموں کے ساتھ بہہ کر آرہے تھے جتنے پھول
گھر گئے ہیں اک بھنور میں اور وہ پل سے ہے دور

ہو رہا ہے آسماں پر رقص مہتابی، مگر
کاروان خاک ساجد موسم گل سے ہے دور

غلام حسین ساجد

محتسب کی ہے کلی پر، میکشوں کی ہاؤ ہو پر
اب سرے سے کوئی پابندی نہیں ہے گفتگو پر

میری قسمت میں سحر تک جاگنا لکھا ہے شاید
خواب ارزانی ہوئے ہیں آج شب میرے عدو پر

سحر پھونکا ہے کچھ ایسا اس پری گل نے چمن پر
آب حیواں بھی اثر کرتا نہیں شاخ نمو پر

کس لئے حیرت سے تکتے تھے سبھی آب رواں کو
صبح دم کیوں پھول بکھرا تھے کنار آب جو پر

چوم لینی چاہئیں بڑھ کر مجھے ساقی کی آنکھیں
جھک رہی ہے گردن مینا اگر میرے سبو پر

جستجو رمز حقیقت کی اسے رہتی ہے، لیکن
قرض ہے اک خواب خوش آثار بھی میرے لہو پر

دھیرے دھیرے بڑھ رہی ہے وقت کی رفتار ساجد
خاک کی تہہ بیٹھتی جاتی ہے فرش کاخ و کو پر

گزرگاہیں چھلک اٹھی ہیں خلق شہر کے غل سے
کنارہ کر رہی ہیں بستیاں کیا شہر کابل سے

نہیں ہے کوئی امکاں اب مرے آزاد ہونے کا
کہ اس نے باندھ رکھا ہے مجھے زنجیر کاکل سے

سفر کی گرد ہوجاؤں کہ منزل پر پہنچ جاؤں
چلا جاتا ہوں اپنے راستے پر اک تسلسل سے

گلستاں میں بہار جاں فزا کے پاؤں دھرتے ہی
بدن جلنے لگا ہے آتشوں کا شعلہ گل سے

عطائے خلعت و تیغ و سپر تو بے توقف تھی
مگر جاگیر بخشی ہے ذرا سے اک تامل سے

جنم لیتی ہے میری راکھ سے پھر شاعری میری
لپٹ جاتی ہے کوئی یاد جب موج تغافل سے

کہاں بے فکر ہوکر سو سکے گا وہ حسین ساجد
کہ کھل جاتی ہے میری نیند بھی جب شور بلبل سے

غلام حسین ساجد

محبت میں عجب اک معرکہ سر کرکے آیا ہوں
چراغِ سیمیا کو پھر منور کرکے آیا ہوں

چرالی تھی مری آسودگی جس مہرِ تاباں نے
اسے گھر کی حفاظت پر مقرر کرکے آیا ہوں

بہت سے کام نپٹائے ہیں اس مصروفیت میں بھی
بہت سے بیج فرصت پر موخر کرکے آیا ہوں

وہ جس سے زک اٹھائی تھی کبھی شمشیر نے میری
حساب اس شاہزادے سے برابر کرکے آیا ہوں

عدو بھی موت کو ترجیح دیتا ہے ہزیمت پر
ادا اس بار میں بھی رسمِ جوہر کرکے آیا ہوں

ازل سے جس قدر وحشت مرے حصے میں آئی تھی
اسے میں دشت و صحرا کا مقدر کرکے آیا ہوں

مرے قبضے میں جو بھی ساعتِ دیروز تھی ساجد
اسے فردا کی خوشبو سے معنبر کرکے آیا ہوں

اس کے جلو میں تیغ و سپر جانا چاہتے ہیں
میں لاکھ روکتا ہوں مگر جانا چاہتے ہیں

چھائی ہے ریگِ دشتِ محبت بہت دلوں تک
اب اک گلی میں ہم بھی ٹھہر جانا چاہتے ہیں

کیا علم ہے کہیں سے نکل آئے کوئی صورت
کچھ آئنے ابھی سے سنور جانا چاہتے ہیں

شاید وہ میرے صبر سے واقف نہیں کہ امشب
میرے حریف حد سے گزر جانا چاہتے ہیں

میری سرشت میں نہیں دل توڑنا، مگر اب
کچھ لوگ میرے جی سے اتر جانا چاہتے ہیں

کیوں بھولنے لگی ہیں مجھے میری عادتیں بھی
کیا اس چمن سے برگ و ثمر جانا چاہتے ہیں

ساجد اسیرِ صحبتِ شب ہیں سو جل رہے ہیں
ورنہ مرے چراغ بھی گھر جانا چاہتے ہیں

شاہ حسین نہری

بدر و نجم و شہاب ثاقب کی
شب نمائش ہے کیا عجائب کی

ہے سویرے کا قافلہ نزدیک
دھول اڑتی ہے صبح کاذب کی

سنگ در دست جنگ آمادہ
کس کو پروا ہے اب عواقب کی

سب کے ہونٹوں پہ حق کی بولی ہے
جنگ سب ہی نے حق بجانب کی

دوستوں سے ہے پوچھنا اس بار
دشمنی کب خدا نے واجب کی

بھیڑ کا انگ شاہ بن جائے
آپ نے بات نامناسب کی

پاؤں میں صحرا کے کانٹے گل بہ سر زندہ ہوں میں
گم ہے تاروں کی چمک بھی کیا سفر زندہ ہوں میں

ٹوٹ کر گرتی ہیں مجھ پر ظلمتوں کی ڈالیاں
دور ہیں سب نور شاخوں کے ثمر زندہ ہوں میں

سرد ہے کتنا یہ لمس دستگاہ زندگی
ایک آتش زیر پا بس بال و پر زندہ ہوں میں

سر میں سودا ہے نہ دل میں وہ لگن آنکھیں تو ہیں
انتظار منظر فردا بسر زندہ ہوں میں

آگ ہے سینے میں اک مدھم سلگتی آنچ ہے
بند آنکھوں میں دھواں بھی ہے نظر زندہ ہوں میں

یوں دہلتا کیوں ہے اس کوہ ندا کے نام سے
اک ندائے بے ہدف ہے بے خطر زندہ ہوں میں

شاہ زنجیل مناظر ہے مگر سر پوش ہے
جانے کب ٹوٹے یہ جادو سا اثر زندہ ہوں میں

رات

رات رانی کی اڑتی ہوئی تیز خوشبو
مرے پاس سے ہو کے گزری تو ٹھٹکی
مجھے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے کر
بدن بھر مجھے چوم کر، اس نے چپکے سے
پوچھا کہ کیا تم مجھے دن کی سانسوں میں
یوں ہی چھپائے ہوئے رہ سکو گے

خدشہ

نثار احمد نثار

میں پھر سے سبز ہونے کے
تصور سے ہراساں ہوں
ہوا کے لمس سے اور موسموں کے
سنگ باری سے
عذابی آندھیوں کی ضرب کاری سے
جو دل پر چوٹ لگتی تھی اسے
اب تک نہیں بھولا
شجر کی گھن گرج آواز سی سرگوشیوں سے
چین غائب تھا مرا برسوں
میں پھر سے سبز ہونے کے
تصور سے ہراساں ہوں
اگرچہ میں تناور پیڑ ہو جاؤں
تو پھر سارے پرندے شاخ پر میری
نشیمن اپنا اپنا ہی بنالیں گے
اور ان کے شور مجھ کو
رات بھر سونے نہیں دیں گے
ہراساں ہوں اسی باعث
کہ بوڑھا ہو چلا ہوں اب
فقط اک بار جسم و جاں
سا بھی اب نہیں جاتا
اگر میں سبز ہو جاؤں
ثمر تو آہی جائیں گے
ثمر آئیں تو پھر میری
کمر بھی ٹوٹ جائے گی
کسی دن یہ جڑیں میری
زمیں کو چھوڑ ہی دیں گی
میں پھر سے سبز ہونے کے
تصور سے ہراساں ہوں

غزل

ریاض لطیف

نیا عدم کوئی، نئی حدوں کا انتخاب اب
اتار لوں میں رخ سے یہ دوام کا نقاب اب

ہم اپنی زندگی کو خود سے دور لے کے جائیں گے
کہ پھوٹنے ہی والا ہے خلا کا یہ حباب اب

جنم نہ لے سکے ترے بھنور کی آنکھ میں تو کیا
ہم اور پانیوں میں ڈھونڈ لیں اک سراب اب

صدا، سکوت، جو بھی چاہے اٹھالے اس گھڑی
میں بند کررہا ہوں ایسے مرحلوں کے باب اب

جہاں ہے جو 'کہاں ہے وہ' جہاں نہیں' ہے سب وہیں
تراشنے لگا ہوں کسی طلسم سے میں خواب اب

جہاں ہے عکس کا کھنڈر، اڑ پڑے یہی سب ادھر
ریاض ہورہا ہے تیرا آئینہ خراب اب

عبدالحمید

بڑھاپا کچھ نہیں ہوتا جوانی کچھ نہیں ہوتی
کہیں بھی مرنے والوں کی نشانی کچھ نہیں ہوتی

فقط احساس ہوتا ہے گزرنے کا بکھرنے کا
نہیں ہوتا ہے کچھ دریا روانی کچھ نہیں ہوتی

کہیں دل کے اندھیرے میں کوئی نقطہ چمکتا ہے
ذرا آگے اگر بڑھیے کہانی کچھ نہیں ہوتی

یہ کس پہ طنز ہے مجھ پر کہ احوالِ زمانہ پر
نئی تصویر میں تیری پرانی کچھ نہیں ہوتی

وہ اک لمحہ کہ جس کی منتظر ہر شے ہے دنیا میں
وہ اک ساعت جو اکثر جاودانی کچھ نہیں ہوتی

ریت ہے دریائے جاں اور اس کا ساحل ریت ہے
ریت ہے چشمِ فلک دھرتی ترا دل ریت ہے

ریت کی دیوار سی گرتی ہے کوئی پے بہ پے
ریت کا سارا سفر ہے جس کی منزل ریت ہے

ریت کی خوشیاں ہیں سب اور غم بھی ہیں سب ریت کے
ریت کی تنہائیاں ہیں رقصِ محفل ریت ہے

ریت کے سارے شجر ہیں ریت کے موسم ہیں سب
دیکھیے جاکر تو سب باغِ عنادل ریت ہے

ریت کی سب بستیاں ہیں ریت کے سب آدمی
ریت کے مقتول ہیں سب اپنی قاتل ریت ہے

عالم خورشید

ٹھٹھرتے موسموں میں یوں گزارہ کرتے رہتے ہیں
لہو کا ایک اک قطرہ شرارہ کرتے رہتے ہیں

کبھی موتی، کبھی تارے بناتے ہیں ان اشکوں سے
خوشی کو ہم الم کا استعارہ کرتے رہتے ہیں

کھلی آنکھوں کے حلقے میں کوئی منظر نہیں آتا
سو پلکیں بند کرکے ہم نظارہ کرتے رہتے ہیں

ہمیں طوفان کی آہٹ سنائی کیوں نہیں دیتی
چمن کے پھول پتے تو اشارہ کرتے رہتے ہیں

یہ گہری خامشی پہچان ہے طوفان آنے کی
اسی باعث یہ خاموشی گوارا کرتے رہتے ہیں

ہمارے ہاتھ آتے ہیں خزانے ریت کے عالم
انھیں ذروں کو لے کر ہم ستارہ کرتے رہتے ہیں

خاک سے لپٹے ہوئے خون میں تر آئے ہیں
صبح کے بھولے تھے ہم شام کو گھر آئے ہیں

لوٹ آئیں گے بھلا پھر وہ پرانے طائر
میری شاخوں پہ نئے برگ و ثمر آئے ہیں

بند پلکیں کروں، آنکھوں میں مقید کرلوں
ایک مدت پہ نئے خواب نظر آئے ہیں

تجھ کو حسرت تھی جھکانے کی جسے شاہ زمن
دیکھ ہاتھوں میں لئے ہم وہی سر آئے ہیں

خوب معلوم ہے اس جنگ کا انجام ہمیں
کچھ مگر سوچ کے بے تیر و تبر آئے ہیں

جب اسی شہر کی صورت ہے یہ دنیا عالم
کیا برا ہے جو یہیں لوٹ کر آئے ہیں

لمبے قد کا بونا

مشتاق احمد نوری

پورے پنڈال کی نگاہیں ایک میز پر مرکوز ہیں جس پر سترہ اٹھارہ سال کی شالو نام کی، نیم برہنہ لڑکی ایک پہیے والی سائیکل پر بیٹھی ہے۔ وہ دونوں پاؤں پیڈل پر رکھے سائیکل کو بیلنس کرتی ہوئی داہنے پاؤں پر ایک طشتری رکھتی ہے' پھر اسے اٹھا کر اس طرح اچھالتی ہے کہ وہ طشتری اس کے سر پر آ گرتی ہے۔ نیچے کھڑا بونا تالی بجاتا ہے' پھر ایک قلفی ہوا میں اچھال دیتا ہے۔ وہ قلفی کو پاؤں پر روک کر اس طرح اوپر پھینکتی ہے کہ قلفی اس کے سر پر رکھی ہوئی طشتری میں آ گرتی ہے۔ یہ سلسلہ درجن بھر قلفیوں طشتریوں تک چلتا ہے۔ آخر میں چمچے کی باری آتی ہے۔ بونا جوکر چمچہ ہوا میں لہراتے ہوئے کہتا ہے۔

"صاحبان قدردان۔۔ چمچوں کے اس دور میں اس خوبصورت لڑکی کے لئے چمچوں کی کمی نہیں ہے۔ لیجئے اسے آپ ہی رکھ لیجئے' شاید کام آجائے۔"

پھر وہ چمچے کو لاپروائی سے ہوا میں اچھال دیتا ہے۔ لوگوں کی نگاہیں چمچے کا تعاقب کرتی ہیں اور ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ وہ چمچہ اڑتا ہوا لڑکی کے سر پر رکھی ہوئی آخری قلفی میں جا گرتا ہے۔ پورا پنڈال تالیوں سے گونج اٹھتا ہے۔

یہ بونا راجن ہے۔ یہ کھیل بھی صرف راجن ہی دکھا سکتا ہے۔

راجن نئے نئے تماشے گڑھنے میں ماہر ہے۔ جب سے وہ اس سرکس میں آیا ہے' تماشے کے معیار میں اضافہ ہوتا گیا ہے۔ معمولی معمولی تبدیلی سے پرانے کھیل میں بھی نیا پن پیدا کرنے میں اسے مہارت حاصل ہے۔ اس پر طرہ اس کی جملے بازیاں۔ ایک سے ایک چبھتا ہوا فقرہ وہ پبلک کی طرف اچھالتا ہے جیسے کوئی گیند اچھالتا ہو۔ لوگ اس کی بات پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں لیکن بعد میں انھیں احساس ہوتا ہے کہ راجن بہت گہرائی تک وار بھی کر جاتا ہے۔

جب سے یہ سرکس شہر میں آیا ہے گفتگو کا موضوع بنا ہوا ہے۔ ویسے تو سارے سرکس ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ وہی جھولا' وہی جوکر' وہی سائیکل اور لڑکی' موت کا کنواں' جانوروں کا کھیل' طوطے کا کمال' ہاتھیوں کی پوجا وغیرہ۔۔۔ لیکن اس سرکس میں ایک ایسا اسپیشل شو تھا جو دوسرے کسی سرکس میں نہ ہوتا تھا۔ اور یہی شو شہر کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

"راجن دی گریٹ شو۔۔۔" یہ نام تھا اس اسپیشل شو کا اور اس کو انجام دینے والے سارے بونے تھے اور ان سب بونوں کا سردار راجن تھا۔

یہ راجن بھی عجیب تھا۔ کوئی تین فٹ کا بونا۔ اس کی سج دھج ہی نرالی تھی۔ وہ جس شو میں بھی ہوتا اپنی شخصیت کا سکہ ضرور جما دیتا۔

آج بھی قلفی طشتری کا کھیل جاری ہے۔

آج شالو غضب ڈھا رہی ہے۔ اس کے گلابی جسم پر لباس بھی گلابی ہے۔ لباس کے نام پر صرف تو پیس بکنی پہنے اس لڑکی کو ذرہ برابر بھی احساس نہیں کہ سینکڑوں نگاہیں اس لباس کے اندر جھانکنے کی کوشش میں ہیں۔ لباس کے نام پر اس برہنہ شائستگی کا بھی جواب نہیں۔ سینکڑوں مردوں کے سامنے ایک برہنہ لڑکی جوانی کا جوبن سارے بند حسن توڑ دینے کو بے تاب۔۔۔ دور سے دیکھنے میں کپڑے اور جسم کے گلابی پن میں کوئی فرق نہیں لگتا۔ یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ کپڑے کی حد کہاں تک ہے اور جسم کہاں سے برہنہ ہے۔

وہ راجن کے سہارے ٹیبل پر رکھی سائیکل پر چڑھتی ہے۔ پھر راجن ٹیبل سے کود کر نیچے آجاتا ہے اور اسے طشتریاں' قلفیاں اچھال کر دینے لگتا ہے۔ اب آخری قلفی دینا باقی ہے' لیکن راجن کہیں کھو سا گیا ہے۔ شالو اشارے سے قلفی مانگ رہی ہے۔ لیکن وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے بھی اسے گویا دیکھ نہیں پا رہا ہے تب پیچھے سے بھولو نام کا بونا لکڑی کی چوڑی پٹی راجن کے کولھے پر رسید کرتا ہے۔ پڑاق کی آواز ہوتی ہے اور پبلک کا قہقہہ بلند ہوتا ہے۔ راجن چونک پڑتا ہے اور مارنے والا بونا کہتا ہے۔

"کہاں ڈوب رہا ہے راجن؟"

راجن جلدی سے قلفی ہوا میں اچھال دیتا ہے' جسے لپک کر لڑکی پکڑنا چاہتی ہے لیکن پکڑ نہیں پاتی' اور بیلنس کھو دیتی ہے۔ اس کے سر پر رکھی ساری قلفیاں طشتریاں زمین پر گر جاتی ہیں۔ راجن حیرت زدہ رہ جاتا ہے پھر دوسرا بونا بھولو پبلک کی طرف مخاطب ہو کر بلند آواز میں کہتا ہے۔

"آپ لوگ جانتے ہیں ایک بات؟" وہ چاروں طرف نگاہیں دوڑاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھتا ہے۔

"یہ جو بونا ہے نا راجن۔۔۔ ہاں راجن دی گریٹ۔۔ یہ اس لڑکی سے عشق کرتا ہے۔" "سنا آپ نے؟"

اس کی بات سُن کر سارا پنڈال قہقہوں سے گونج اُٹھتا ہے۔ شالو بھی مسکرا دیتی ہے۔ اور راجن۔۔ اسے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اچانک کسی نے اسے بھرے مجمع میں ننگا کر دیا ہے۔ وہ بونے کی جانب دیکھتا ہے' پھر بھرے پنڈال

پر نظر ڈالتا ہے۔ چاروں طرف اسے تضحیک بھری ہنسی نظر آتی ہے۔ وہ اچانک اسٹیج کو چھوڑ کر اندر کی جانب چل دیتا ہے۔

شو کے ختم ہونے کے بعد شالو اندر جاکر راجن سے اس کے اچانک اسٹیج چھوڑ جانے کی وجہ دریافت کرتی ہے۔ راجن اسے بہت غور سے دیکھتا ہے پھر رکی رکی آواز میں کہتا ہے۔

"شالو۔۔۔ اس بونے نے اتنا بڑا سچ اتنی آسانی سے کیسے کہہ دیا؟"

سچ؟ کیسا سچ؟۔۔۔ "شالو چونکتی ہے۔

وہ سچ جو میں آج تک زبان پر نہیں لایا تھا۔"

راجن زمین کی جانب تک رہا ہے۔ شالو ایک لمحہ چپ رہتی ہے۔ پھر کہتی ہے۔ اس کے لہجے میں بے یقینی ہے۔

"راجن۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"وہی۔۔۔ جسے کہنے کا کوئی حق مجھے نہیں۔ صرف اس لیئے کہ میں بونا ہوں۔ بونا صرف بونا ہوتا ہے۔ اسے آج تک کسی نے مکمل آدمی نہیں سمجھا۔"

شالو راجن کی آنکھوں کے کرب کو برداشت نہیں کرپاتی۔ اسے لگتا ہے کہ وہ کسی غیر مرد کے سامنے برہنہ کھڑی ہے۔ اپنی برہنگی سے گھبرا کر باہر نکل جاتی ہے۔ راجن اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ ماضی کے اوراق یادوں کی گرم ٹھنڈی ہوا میں پھڑپھڑانے لگتے ہیں۔

راجن عام بونوں سے بہت مختلف تھا۔ وہ پورنیہ شہر کے ایک دولت مند تاجر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت رؤسا کے بچوں کی طرح اور ان کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس نے پورنیہ کالج سے انگریزی ادب میں آنرز کیا تھا۔ بھائیوں میں وہ سب سے چھوٹا تھا۔ والدین کی محبت تو نصیب تھی لیکن اس محبت میں ترحم کا جذبہ بھی شامل تھا جسے راجن اپنے لیئے تضحیک تصور کرتا تھا۔ وہ اپنے قد کی کمی کو اپنی صلاحیتوں سے پوری کرنا چاہتا تھا۔ اس کی آواز بہت بھاری اور گرج دار تھی۔ کمر سے اوپر وہ بالکل عام آدمیوں جیسا ہی لگتا تھا' صرف اس کے ہاتھ پاؤں چھوٹے تھے۔ اچھے لباس کا وہ ہمیشہ شوقین رہا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک چمک تھی جو مخاطب کو مسحور کرلیتی تھی۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنے قد کی وجہ سے ہر جگہ مار کھا جاتا۔ تین فٹ کا قد۔ جو بھی اسے دیکھتا' اس کی ہنسی چھوٹ جاتی۔ کالج میں داخلے کے بعد وہ کچھ دن تک لڑکوں کے مذاق کا نشانہ بنا رہا۔ لیکن کلاس کو جب اس کی صلاحیتوں کا علم ہوا تو لوگوں کو اس پر رحم آنے لگا۔ برابری کا درجہ اسے پھر بھی نہ ملا۔ وہ سوچتا کہ اس رحم سے تو وہ بے رحم مذاق ہی اچھا تھا۔

بحیثیت مجموعی راجن مذاق اور رحم دونوں سے شدید نفرت کرتا تھا۔ وہ خود کو کسی بھی لحاظ سے دوسروں سے کم نہ سمجھتا تھا۔ ایک ہی سال میں اس نے پورے کالج سے اپنی ذہانت کا لوہا منوالیا۔ انگریزی کے استاد پروفیسر رائے اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔ وہ خود چھپا نگر اسٹیٹ کے وارث تھے اور ان کے رہن سہن اور بول چال میں وہی رئیسانہ ٹھاٹ باٹ تھے۔ وہ راجن سے گھنٹوں انگریزی ادب پر گفتگو کرتے' اس کو ادب اور زبان کے نکات سکھاتے۔

انگریزی ڈیبیٹ میں راجن ہمیشہ اول آتا۔ انگریزی وہ بالکل صحیح لہجے میں بولتا۔ آواز کے سحر میں کھو کر تمام سننے والے اس کا قد بھول جاتے لیکن اس کے بعد پھر وہی ترحم آمیز نگاہیں۔ وہی احتیاط اور لحاظ کہ راجن کسی بات کا برا نہ مان جائے۔ پروفیسر رائے نے اسے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا' باقی کے لیئے وہ صرف ایک مریض تھا' لاعلاج اور رحم انگیز۔

آنرز کی اعلیٰ ڈگری کی بنیاد پر اسے اچھے پبلک اسکول میں نوکری بھی مل گئی لیکن پندرہ دن کے اندر ہی اسے اسکول چھوڑ دینا پڑا۔ کسی بھی کلاس کے لڑکے اسے ٹیچر سمجھنے کے لیئے تیار نہ تھے۔ وہ جس کلاس میں بھی جاتا' لڑکے منہ دبا کر ہی ہی کرنے لگتے اور اس کی بات نہ سنتے۔ بچوں کے لیئے وہ محض بونا تھا۔ اس کی گرج دار ڈانٹ کا بھی لڑکوں پر اثر نہ ہوتا۔ وہ ہوگا انگریزی کا ماہر' لیکن بچوں کے لیئے وہ محض بونا تھا۔ بونا صرف بونا ہو سکتا ہے' اس کے ساتھ انسانی سلوک نہیں ہو سکتا۔

کئی سرکاری آسامیاں ایسی بھی تھیں جو اسے جسمانی طور پر پس ماندہ ہونے کے باعث مل سکتی تھیں۔ اس نے درخواست بھی دی' لیکن اس سے جسمانی پس ماندگی کا سارٹیفیکٹ مانگا گیا۔ وہ حیرت زدہ تھا۔ سب دیکھ رہے ہیں کہ وہ بونا ہے لیکن پھر بھی خود کو بونا منوانے کے لیئے اس سرکاری سرٹیفیکٹ کی ضرورت تھی۔ اس سے بڑی ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ جو تھا لوگ اسے بغیر سرکاری سرٹیفیکٹ کے ماننے کو تیار نہ تھے اور جو وہ خود کو منوانا چاہتا تھا اسے اس کا چھوٹا قد اپنی آڑ میں لے لیتا تھا اور تین فٹ کا قد اس کی تمام بلند وبلا صلاحیتوں کو چھپا لیتا تھا۔

آخر کار وہ گھر کی چہار دیواری میں قید ہو کر رہ گیا۔ یہاں اگرچہ اسے کسی شے کی کمی نہ تھی لیکن اسے بار بار یہ احساس ہوتا کہ وہ گھر والوں پر ایک بوجھ ہے۔ کسی بھی تقریب میں اسے ساتھ لے جانا شان کے خلاف سمجھا جاتا۔ گھر میں مہمان آتے تو اسے اپنے کمرے سے نہ نکلنے کی تاکید کی جاتی۔ بہن کی سہیلیاں اسے کھیل کا سامان سمجھتیں۔ ایک مکمل جوان لڑکے کو بچہ سمجھتی ہوئی وہ عجیب عجیب سوال کرتیں اور جب وہ جھنجلا کر انگریزی میں ان پر لعنت ملامت کرتا تو وہ حیرت سے اسے یوں دیکھتیں جیسے کوئی بندر آدمی کی بولی بول رہا ہو۔

ایسے گھٹن بھرے ماحول میں دیر تک زندہ رہنا بہت مشکل پاکر ایک نئی زندگی کی تلاش میں راجن نے ایک دن چپکے سے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ پورنیہ سے بس لے کر وہ پٹنہ چلا آیا۔

بس اسٹینڈ کے قریب ہارڈنگ پارک میں سرکس کا پنڈال گڑا تھا۔ وہ بھی دل بہلانے کے لیئے اندر داخل ہو گیا۔ اسے حیرت ہوئی جب گیٹ کیپر نے اس کا ٹکٹ چیک نہیں کیا۔ اس نے شاید اسے بھی سرکس کا اسٹاف سمجھ لیا تھا۔

سرکس میں دیگر بونوں کو لوگوں پر قہقہہ اچھالتے دیکھ کر اس کے کسی نہ کسی جذبے کی ایسی تسکین ہوئی کہ اس کا دل سرکس کا ہی ہو کر رہ گیا۔

سرکس کے شو کی گھنٹی بج رہی تھی۔

نیا شو شروع ہونے والا تھا۔

سب سے پہلے جھولے کا شو ہوتا تھا۔

جھولے میں بونے کا کیا کام؟

لیکن راجن تو راجن تھا' جو ٹھان لیتا اسے کر گزرتا۔ اس نے جب پہلی بار سرکس منیجر سے جھولے کے شو میں حصہ لینے کی بات کی تو منیجر ہنس پڑا تھا۔ لیکن صرف دس دن کی پریکٹس میں اسے سکھانے والا جھولا ماسٹر شیرا بھی انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔

شیرا جھولے کا سب سے ماہر کھلاڑی تھا۔ ایسے ایسے کرتب دکھاتا کہ بڑے بڑے استاد بھی دنگ رہ جاتے۔ لمبا گورا چٹا شیرا جو خاندانی کرتب باز تھا۔ وہ کئی پشتوں سے سرکس کا آدمی تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کی دنیا بس سرکس تھی۔ کہیں کوئی گھر نہیں۔۔۔ جہاں سرکس وہیں گھر۔

راجن نے شیرا کی ناک نہ کٹنے دی۔ بلکہ اس کی شہرت اور وقار میں اضافہ ہی کیا۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے پیر جھولے میں پھنسا کر اپنا بدن نیچے لٹکا دیتا۔ پھر اچانک ہوا میں پلٹے کھاتا۔ دوسری جانب سے لڑکیاں جھولتی ہوئی آتیں اور راجن انھیں ہوا میں ہی سنبھال لیتا۔ پھر وہ ان کے پاؤں میں پاؤں پھنسا کر ایسی قلابازیاں کھلاتا کہ لوگوں کی چیخ نکل جاتی۔ سب سے اچھا شو وہ تب دکھاتا جب شالو کا ایک ہاتھ اس کے پاؤں میں پھنسا ہوتا۔ وہ شالو کو ہوا میں لہراتا' پھر اپنے پاؤں سے یوں پھرکی گھماتا کہ پنڈال تالیوں سے گونج جاتا۔

آخر میں وہ شیرا کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر جھولتا۔ شیرا اسے ہوا میں پھرکی گھماتا' پھر وہ اوپر کی پٹڑی پر چلا جاتا اور جب دوسری بار شیرا جھولتے ہوئے ادھر آتا تو وہ اسے اپنے ہاتھ کے بجائے اپنا پاؤں تھما دیتا۔ شیرا کے ہاتھ میں راجن کے پاؤں کی بجائے صرف راجن کا پاجامہ آتا۔ راجن دھڑام سے نیچے رسیوں کی جالی پر گرتا اور لوگ قہقہوں سے اس کا استقبال کرتے۔

سرکس کی دنیا اپنے آپ میں نرالی دنیا تھی۔ باہر سے اسے کوئی مطلب نہ تھا۔ یہاں صرف مالک اور منیجر کا قانون چلتا تھا۔ سینکڑوں کی تعداد میں کرتب باز تھے جو چھوٹے چھوٹے خیموں میں خاندان در خاندان آباد تھے۔ جانوروں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ کرتب بازوں میں زیادہ تر خاندانی تھے۔ عام طور پر سارے لوگ بہت کم پڑھے لکھے تھے۔ ان کے بچوں کو موقع ہی کب ملتا کہ وہ اسکول جائیں۔ بچے بھی ہوش سنبھالتے ہی سرکس کا حصہ ہو جاتے۔ کسی شہر میں دو یا تین ماہ سے زائد نہیں رکنا ہوتا تھا۔ اس طرح ان لوگوں کی زندگی سفر در سفر گزرتی تھی۔ سرکس میں کرتب بازوں کا' بچوں بوڑھوں کا' جانوروں کا' ہر طرح سے استحصال ہوتا۔ جانور تو مجبور تھے اور انسان اسے اپنی زندگی کا ایک حصہ مان چکے تھے۔ کوئی احتجاج' کوئی ملامت کسی گوشے سے نہ اٹھتی تھی۔

شیرا کی نظریں ایک عرصہ سے شالو پر تھیں۔ شالو بھی اندر ہی اندر اسے پسند کرتی تھی۔ شالو کی نانی کیرل کی رہنے والی تھی۔ غربت سے تنگ آکر اس نے یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔ شالو کی ماں یہیں پیدا ہوئی۔ اس سرکس کے ایک جھولا ماسٹر سے اس کی ماں کی شادی ہوئی تھی۔ پھر شالو پیدا ہوئی۔ شالو کا باپ بھی مانا ہوا جھولا ماسٹر تھا۔ شیرا کی تربیت اس نے کی تھی۔ شہروں شہروں گھومتی' پلتی' بڑھتی' بچپن سے سرکس میں کام کرتی شالو جوانی کی دہلیز پر کب ناچ گئی کسی کو

احساس بھی نہ ہوا۔ اسے بچپن میں جو پہنایا گیا' وہ بلوغ میں بھی وہی پہنتی رہی۔ وہ یہی ٹوپیس بکنی پہنتی آئی تھی۔ زمانے کے ساتھ ساتھ لباس میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی' صرف کپڑے کا سائز بدلتا گیا۔ اس نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ اس کی نیم برہنہ جوانی دوسروں پر قیامت برپا کرتی ہے۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ مالک اس کی نیم برہنگی کی کتنی زبردست قیمت وصول کرتا ہے۔ وہ بچپن سے ایک ہی ڈگر پر چلتی آرہی تھی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ ایک دن راجن جیسا بونا اچانک سامنے آکر اس کا راستہ روک لے گا اور کہے گا۔

"شالو۔۔۔ تم یہ باور کیوں نہیں کرلیتیں کہ میں محض ایک بونا نہیں ہوں؟" وہ چونک پڑی۔۔ سامنے شیرا کھڑا تھا۔ نہیں۔ یہ شیرا نہیں' راجن تھا۔ بونا راجن۔۔ کس بنا پر وہ دعوا کرتا ہے کہ میں دوسروں سے مختلف ہوں؟

ویسے سرکس میں سب سے خستہ حالت بونوں کی تھی۔ حالانکہ یہ درجن بھر بونے ہی سرکس کی شان تھے' انھیں کے دم سے شو کی رونق تھی لیکن ان کے مسائل پر توجہ دینے کے لئے کوئی تیار نہیں تھا۔ ان میں راجن بالکل جدا لگتا تھا۔ شو کے بعد وہ بالکل سنجیدہ رہتا' کوئی فالتو گفتگو نہ کرتا۔ اپنا زیادہ تر وقت وہ انگریزی کتب و رسائل کے مطالعے میں گزارتا یا پھر وہ تنہائی میں نئے نئے کرتب ایجاد کرتا اور اس کے مشورے کے مطابق کرتب بازوں کو تربیت دی جاتی۔ شو کے دوران وہ ایسے ایسے فقرے چست کرتا کہ لوگ تلملا کر رہ جاتے۔ پبلک تو صرف یہ جانتی تھی کہ راجن بھی بونوں کی طرح کا ایک بونا ہے' اگرچہ ذرا زیادہ تیز طرار ہے۔ لیکن سرکس کی پوری آبادی اس کی شخصیت کی معترف ہوتی جارہی تھی۔

"راجن دی گریٹ شو" ایک خاص شو تھا جو تھا تو ایک مختصر ڈراما لیکن ہنستے ہنساتے وہ سماج اور سیاست کی ایسی ایسی دکھتی رگوں پر انگلی دھر دیتا کہ ایک طرف تو لوگ ہنستے ہنستے پیٹ پکڑ لیتے اور دوسری طرف انھیں احساس ہوتا کہ اس بونے نے ایک ایسی پھانس ان کے دلوں میں چبھو دی ہے جس کو آسانی سے نکالا نہیں جاسکتا۔ اپنے شو کی کامیابی کے نشے میں کبھی کبھی راجن کو سب بونے نظر آتے اور خود اپنا قد اسے سب سے اونچا نظر آتا۔

سرکس میں بونوں کو آدمی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ بچوں کی فہرست میں بھی مشکل ہی سے شمار ہوتے تھے۔ بچوں کی طرح ہی ان سے بے گار کرائی جاتی۔ بے چارے بونے اف نہ کرتے۔ شاید انھیں یہ یقین دلا دیا گیا تھا کہ سارے سماج نے انھیں ٹھکرا دیا ہے اور سرکس نے انھیں پناہ دی ہے لہٰذا جو کہا جائے وہ چپ چاپ تعمیل کریں۔ بونوں کو کھانا بھی بچوں کے برابر دیا جاتا۔ لڑکیاں خاص طور سے انھیں بہت چھیڑتیں۔ وہ انھیں بچوں کی طرح گود میں اٹھا کر نچاتیں۔ ایک دن شالو نے بھی اس طرح راجن کو اپنی گود میں اٹھا لیا تھا۔ راجن کو محسوس ہوا جیسے اس کے پورے جسم میں بجلی کی لہر دوڑ گئی ہو۔ وہ تڑپ کر شالو کی گود سے نیچے آرہا تھا۔ شالو کے ساتھ دوسری لڑکیاں بھی ہنس پڑی تھیں لیکن راجن کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

ایک دن ایک کرتب باز نے راجن سے بھی بے گار لینی چاہی' لیکن

راجن نے غرّا کر اسے ایسا سخت جواب دیا تھا کہ پھر کسی کو اس کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ بھولو نام کے بونے سے راجن کی خاص قدرتی تھی۔ وہ قدرے تعلیم یافتہ تھا اور بونوں کے استحصال سے چڑھتا تھا۔ اس نے راجن سے یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ کچھ لوگ بونوں کا جنسی استحصال بھی کرتے ہیں لیکن کوئی اس کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا۔

اس کے علاوہ بھی بونوں کے مسائل تھے، لیکن مالک کی نظروں میں کسی بونے کا کوئی بھی مسئلہ قابل اعتنا نہیں تھا۔ وہ بس اتنا ہی جانتا تھا کہ میں بونوں پر احسان کر رہا ہوں کہ انھیں بھوکوں مرنے سے بچا رہا ہوں۔ ایک دن راجن کئی بونوں کو لے کر مالک کے پاس گیا۔ مالک اس کی صلاحیت کی وجہ سے اس کی تھوڑی بہت عزت کرتا تھا اس لیئے اس نے راجن کو کرسی پر بٹھایا۔ باقی سارے بونے کھڑے رہے۔ پھر راجن نے سنجیدہ اور جذبات انگیز لہجے میں مالک کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ بونے بھی انسان ہیں۔ وہ مکمل مرد ہوتے ہیں۔ ان کے جذبات و احساس عام انسانوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ان کی ضرورتیں عام آدمیوں جیسی ہوتی ہیں۔ صرف ان کے ہاتھ پاؤں چھوٹے ہوتے ہیں اس سے زیادہ فرق ان میں اور ایک عام مرد میں نہیں ہوتا۔ انھیں ایک مکمل مرد سمجھتے ہوئے ان کا استحصال کرنے کی بجائے ان کے ساتھ انصاف کیا جائے۔

مالک بھڑک اٹھا۔

”کس انصاف کی بات کرتے ہو تم؟ جب خود بھگوان نے تم لوگوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا تو پھر تم انسان سے اس کی توقع کیوں رکھتے ہو؟“

راجن نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”دیکھیے صاحب--- ہم بونے ہی آپ کے سرکس کی شان ہیں۔ اگر ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا اور ہماری ضرورتوں کی جانب توجہ نہ دی گئی تو پھر کوئی بھی بونا سرکس کے کسی بھی شو میں آئندہ سے حصہ نہیں لے گا---“

مالک نے بونوں کے مسائل کی طرح ہی ان کی اس دھمکی کو قابل اعتنا نہ سمجھا۔ سرکس کی چالیس سالہ اس کی زندگی میں کسی کرتب باز نے آج اسے پہلی بار دھمکی دی تھی۔

”ایسے ایسے کتنے آئے اور میرے پاؤں کے نیچے سے نکل گئے۔“ وہ حقارت سے بولا۔ ”تم سالے ہو ہی کیا؟ چوہوں سے بدتر ہو۔ تم کیا اور تمھاری ضرورتیں کیا۔“

اس نے بونوں کو دھتکار دیا لیکن دوسرے دن جب شو کی گھنٹی کے بعد بھی نہ کوئی بونا اور نہ بڑے قد کا جوکر رنگ میں آیا تو مالک کو تشویش ہوئی۔ بونوں کی اور خاص کر راجن کی کمی سب نے محسوس کی۔ یہ سرکس بے لطف ہو کر رہ گیا تھا۔ پنڈال سے راجن راجن کی آوازیں آنے لگیں۔ جھک مار کر مالک کو بونوں کا حق تسلیم کرنا پڑا تھا۔ پھر سارے بونے رنگ میں اس شان سے آئے کہ لوگ دیکھتے رہ گئے۔ راجن ان بونوں کے کندھے پر سوار تھا اور بڑے جوکر اسے پیچھے سے ہوا جھل رہے تھے۔

یہ راجن کی پہلی جیت تھی

اور اس رات شالو نے راجن کے خیمے میں آکر اسے مبارک باد دیتے ہوئے کہا تھا۔

”راجن--- آج تم نے سب کو یہ باور کرا دیا کہ تم صرف بونے نہیں ہو۔“

”اور تم---؟“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”شالو-- تم بھی یہ کیوں نہیں مان لیتیں کہ میں صرف بونا نہیں ہوں؟“

شالو کچھ بھی بول نہ پائی۔ بس اس کی جانب چپ چاپ دیکھتی رہ گئی تھی۔

”راجن دی گریٹ۔ تم اپنے آپ کو کہاں کہاں منواتے پھرو گے؟“

راجن چونک پڑا۔ یہ آواز تو پروفیسر رائے کی تھی۔

زمانہ طالب علمی میں راجن اکثر پروفیسر رائے سے بونوں کے مسائل پر گفتگو کرتا تھا۔ پروفیسر رائے نے اس کی ہمت بندھائی تھی اور اسے مقاومت، ثابت قدمی اور خود اعتمادی کے گر سکھائے تھے۔ لیکن اسی دوران انھوں نے ایک بار اس سے یہ بھی کہا تھا۔

”راجن دی گریٹ۔ تم اپنے آپ کو کہاں کہاں منواتے پھرو گے؟“

اس کے جی میں آیا کہ وہ چیخ چیخ کر کہے۔

”راجن دی گریٹ نے خود کو منوا لیا ہے۔“

اس رات وہ بہت خوش تھا اس نے پورے سرکس کے اسٹاف کی روزانہ زندگی اور حیثیت پر نظر دوڑائی۔ سارے اسٹاف تھے تو بڑے قد کے لیکن مالک کے سامنے سب اس سے بھی زیادہ بونے تھے۔

اب بونوں سے کوئی بے جا کام نہیں لیا جاتا تھا۔ وہ پہلوانوں کی مالش بھی نہ کرتے تھے۔ اب انھیں ان کی بھوک اور کام کے مطابق کھانا دیا جاتا۔ ان کی تنخواہ میں بھی اضافہ کر دیا گیا تھا۔ لڑکیاں بھی اب ان کے ساتھ تضحیک کا برتاؤ نہ کرتی تھیں۔ شالو کی سمجھ میں اب آیا تھا کہ جب اس نے اچانک راجن کو اپنی گود میں اٹھا لیا تھا تو وہ تڑپ کر کیوں نیچے آ رہا تھا۔ اس روز تو راجن کا چہرہ سرخ ہوا تھا، اور آج اس واقعے کو یاد کر کے شالو سرخ ہو رہی تھی۔ اس سلسلے میں شالو نے کبھی سنجیدگی سے نہ سوچا تھا لیکن قلفی طشتری والے شو کے دوران جو بات کی تھی اس کے باعث وہ پہلی بار چونکی تھی اور اب تو چونکنے کا سلسلہ اتنا دراز ہو گیا تھا کہ کبھی کبھی وہ سوتے میں بھی چونک پڑتی تھی۔

بونوں کا حق تسلیم کرانے کے بعد راجن ان کا ہیرو ہو گیا تھا۔ سارے بونے اسے 'باس' کہہ کر مخاطب کرتے۔ بڑے قد کے جوکر بھی اس ٹولی میں شامل تھے۔

بونوں کے بعد سب سے زیادہ استحصال لڑکیوں کا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو لڑکیوں کے والدین بھی سب کچھ جان کر گونگے بہرے اور اندھے بن جانے پر مجبور ہو جاتے۔ انھیں احساس تھا کہ مجبوریوں کے دریا میں رہ کر ضرورت کے مگرمچھ سے بیر نہیں کیا جا سکتا۔

سرکس کی دنیا نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن اس نے اتنی شائستگی سے ہزاروں نگاہوں کے سامنے دن کے اجالے میں لڑکیوں کے جسم سے کپڑے اتار

تھے کہ خود ان لڑکیوں کو بھی احساس نہ ہو سکا تھا۔ سرکس کے شو کے دوران وہ کئی بار مردوں کے ہاتھوں سے گزرتیں، لیکن انھیں محسوس بھی نہ ہوتا کہ غیر مرد انھیں چھو رہا ہے۔ ہوشیاری سے ان کے جسم سے لباس اتارا گیا تھا، اسی ہوشیاری سے ان کا استحصال بھی ہوتا۔ اور استحصال ان کی زندگی کا معمول بن کر رہ گیا تھا۔

لڑکیوں کا استحصال کرنا ہر مرد اپنا حق سمجھتا ہے۔ لیکن سرکس کے منیجر، مالک، پہلوان، اور دیگر طاقت ور لوگ اسے صرف اپنا حق ہی نہ سمجھتے، بلکہ زندگی کا معمول سمجھتے۔ یہاں زندگی ایسا منظم نظام تھی کہ کوئی چوں تک نہ کر سکتا تھا۔ پھر یہ لوگ سرکس چھوڑ کر جاتے بھی کہاں؟ کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی لڑکا کسی لڑکی کو لے کر رات کے اندھیرے میں غائب ہو جاتا۔۔ بس۔۔

ایک دن راجن نے گفتگو کے دوران مالک سے اس سلسلے میں بھی گفتگو کرنی چاہی، لیکن مالک نے بڑی رکھائی سے جواب دیا۔ "دیکھو راجن۔۔۔ تم صرف بونے ہو، اس لیئے صرف بونوں کے بارے میں سوچو۔۔ ان لوگوں کے بارے میں جو تم نے کہا میں نے سب مان لیا، لیکن دوسرے کے پھٹے میں اپنی ٹانگ نہ اڑاؤ ورنہ اس چھوٹی سی ٹانگ سے بھی ہمیشہ کے لیئے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

مالک کی بات سن کر وہ خاموشی سے چلا تو آیا تھا لیکن اس نے خفیہ طور پر اپنی مہم جاری رکھی۔ شالو کو اپنا ترجمان بنا کر اس نے اندر ہی اندر ساری لڑکیوں کو متحد کر دیا۔ اب لڑکیاں راجن کو دیکھ کر مسکرانے کی بجائے اس کا احترام کرتی تھیں۔ راجن کی محنت نے وہ رنگ دکھایا کہ لڑکیاں جو اشارے میں بھی بات نہ کہہ پاتی تھیں، اب برملا اپنی شکایتوں کا اظہار کرنے لگیں۔ اس سب جھمیلے میں شالو راجن کے بہت قریب آگئی، جذباتی طور پر وہ راجن کو اپنا سہارا کب تصور کرنے لگی، اس کا اسے احساس بھی نہ ہوا۔

راجن، مالک کی نظروں میں خار کی طرح کھٹکتا تو تھا ہی اب وہ شیرا کی آنکھوں میں بھی چبھنے لگا۔ شالو اگرچہ شیرا ہی طرف مائل رہی تھی اور اس کی شادی شیرا سے گویا طے ہی تھی، لیکن شیرا کے دباؤ کے باوجود اس نے دو تین سال تک شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ التوا کی اصل وجہ شیرا خوب سمجھتا تھا، چاہے شالو کو اس کا احساس نہ رہا ہو۔ کئی بار شیرا نے کھل کر راجن سے گفتگو کرنی چاہی لیکن وہ راجن کی نگاہوں کی تاب نہ لا پاتا۔ اور ادھر ادھر کی بات کر کے اٹھ جاتا پھر اچانک شیرا بالکل چپ رہنے لگا تھا۔ شاید مالک نے اسے راجن سے پنگا نہ لینے کا مشورہ دیا تھا۔ راجن نے سب کو یقین دلا دیا تھا کہ صرف قد چھوٹا ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر عزم اور حوصلہ ہو تو چھوٹے قد والا بھی بڑے سے بڑا کام انجام دے سکتا ہے۔

ہارڈنگ پارک میں آج آخری شو تھا۔ آج تین کے بجائے ایک ہی شو رکھا گیا تھا۔ پورا پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس آخری شو کے لیئے سارے کرتب بازوں نے جان توڑ محنت کی تھی۔ شیرا تو آج بجلی کی مانند کوند رہا تھا۔ راجن نے بھی اپنے شو کو آج ایک انوکھا روپ دیا تھا۔ آج کے ڈرامے میں شالو کا بھی پارٹ رکھا گیا تھا۔ سب سے مزے دار آئٹم جھولے کا تھا، اس لیئے اسے سب سے آخر میں رکھا گیا تھا۔ سارے کرتب باز جھولے پر جا چکے تھے۔ سب سے آخر میں راجن آیا۔ وہ حسبِ معمول رنگ برنگی قمیص اور پتلون میں تھا۔ اس کے چہرے پر اعتماد کے ساتھ عجب طرح کی معصومیت بھی تھی۔ شالو بھی آج قیامت کر رہی تھی۔ وہ بات بات پر چہلیں کر رہی تھی، حتیٰ کہ اس نے کئی بار شیرا کو بھی چھیڑا تھا۔ راجن تختے پر اس کے قریب کھڑا تھا۔ اچانک شالو نے اس سے بھی چھیڑ خانی کی، اس پر راجن نے اس کے سر پر چپت رسید کرنا چاہی لیکن راجن کی چپت شالو کی کمر تک ہی پہنچ سکی۔ پھر شالو نے مسکراتے ہوئے اسے دھکا دیا اور وہ دھڑام سے قلا بازی کھاتے ہوئے نیچے جالی پر جا گرا۔ پبلک نے اسے بھی راجن کی خاص ادا سمجھ کر قبول کیا اور پنڈال تالیوں سے گونج گیا۔

سب سے پہلے شیرا نے اپنا کمال دکھایا۔ آج اس نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ جھولے کا فن صرف شیرا پر ہی ختم ہے۔ پھر دوسرے کرتب بازوں نے اپنا کمال دکھایا۔ سب سے آخر میں راجن کی باری آئی۔ وہ پہلے جھولے کو پکڑ کر ہوا میں جھولتا رہا۔ پھر اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں کو جھولے میں پھنسا کر خود کو نیچے کی جانب لٹکا دیا۔ وہ ہوا میں جھولتا رہا۔ اس طرح جھولتے دیکھ کر کوئی یہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ بونا ہے۔ اس نے شالو کو اشارہ کیا۔ وہ دوسری جانب سے جھولتی ہوئی آئی اور ہوا میں اچھل کر اس نے راجن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب وہ راجن کی گرفت میں تھی، وہ اسے ہوا میں تیراتا رہا۔ اچانک اس نے شالو کا ایک ہاتھ چھوڑ دیا اب وہ اسے صرف دائیں ہاتھ میں سنبھالے ہوئے تھا۔

آخری کرتب میں شیرا کو جھولتے ہوئے راجن کی طرف جانا تھا۔ راجن اپنے ہاتھ کے بجائے اپنا پاؤں بڑھاتا۔ شیرا کے ہاتھ میں راجن کی صرف پتلون آتی اور راجن صرف جانگیہ پہنے ہوئے دھڑام سے جال پر گرتا اور پنڈال سے قہقہوں کا شور بلند ہوتا۔

پروگرام کے مطابق شیرا نے ہوا میں قلا بازی کھائی۔ دوسری طرف سے اچھالے گئے جھولے کو اس نے لپک کر پکڑا۔ کچھ دیر تک وہ تنہا اپنا کرتب دکھاتا رہا پھر اس نے اپنی ٹانگیں جھولے میں پھنسا کر خود کو لٹکا لیا۔ دو چار لمبے لمبے پینگ مارنے کے بعد اس نے راجن کو اشارہ کیا۔ راجن دوسری جانب سے جھولتا ہوا آیا اور اس نے اپنا پاؤں شیرا کی جانب بڑھا دیا۔ شیرا نے اس کا پاجامہ پکڑنے کے بجائے اس کا پاؤں ہی پکڑ لیا اور اسے الٹا لٹکا کر ہوا میں قلا بازی کھلانے لگا۔ پنڈال سے تالیوں کی آواز آنے لگی۔

تھوڑی دیر تک راجن کو شیرا چک پھیریاں کھلاتا رہا، پھر پوری شدت سے گھماتے ہوئے اس نے راجن کو ہوا میں اچھال دیا۔ راجن کسی ہوا باز کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا دور نیچے جال کے بجائے باہر زمین پر سر کے بل گرا۔ لوگوں نے دیکھا کہ چشم زدن میں اس کا سر، گردن، شانہ، سب ایک ہو گئے۔ اس کا قد تین کے بجائے دو فٹ رہ گیا۔

سارا پنڈال تالیوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ ❖ ❖

اسعد بدایونی

خسارہ ہے تو دنیا دیکھنے میں
مگر لگتا ہے اچھا دیکھنے میں

حقیقت سے بھی آگے بڑھ گیا ہے
بظاہر تھا جو قصہ دیکھنے میں

کنارے کاٹتا جاتا ہے پل پل
جو ہے معصوم دریا دیکھنے میں

نہ دیکھا اس کو جس کو دیکھنا تھا
گزاری عمر کیا کیا دیکھنے میں

ملے بن دیکھے کچھ لوگوں کو تمغے
ہوئے کچھ لوگ رسوا دیکھنے میں

وہ دنیا دار بھی عیار بھی ہے
نظر آتا ہے تنہا دیکھنے میں

سفر بھی کوئی نہ ہو رہگذر بھی کوئی نہ ہو
ہمارے بعد خراب اس قدر بھی کوئی نہ ہو

میں اس ہجوم میں گم ہونا چاہتا ہوں جہاں
پتہ ٹھکانا بھی خیر و خبر بھی کوئی نہ ہو

خدا وہ دن نہ دکھائے کہ میری بستی میں
سب آنکھیں رکھتے ہوں اور دیدہ ور بھی کوئی نہ ہو

میں وہ زمانہ نہ دیکھوں کہ پھول پھل کے بغیر
فقط گھروں کا ہو جنگل کھنڈر بھی کوئی نہ ہو

مجھے نعش پہ اتارا گیا زوال کے وقت
سو میرے بعد مرا نوحہ گر بھی کوئی نہ ہو

حامدی کاشمیری

پریم چند کے اکثر و بیشتر افسانے فن کے عناصر ترکیبی میں عدم توازن کی بنا پر ایک مربوط عضوی ہیئت میں ڈھلنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ان میں فن کے لازمی عناصر میں سے کسی ایک عنصر مثلاً کردار یا موضوع (تھیم) کو حد سے متجاوز اہمیت دینے سے اس وحدت تاثر کو نقصان پہنچتا ہے جو افسانے کی فنی تکمیلیت کا نتیجہ بھی ہوتا ہے' اور اس کے لئے لازمہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ افسانہ میں مختلف اجزا یعنی قصہ' کردار' واقعہ' یا آہنگ اور موضوع کی باہمی تخلیقی ترکیب پذیری سے عضوی ہیئت سے آشنا ہو کر وحدت تاثر پر منتج ہوتے ہیں۔ "کفن" پریم چند کا منفرد افسانہ ہے' جو فن کے اجزا کی وحدت پذیری اور نتیجہ خیزی کا زندہ اور رخشندہ نمونہ ہے۔

"کفن" کی تحسین و تنقید کا عمل بالعموم دو جہات پر محیط رہا ہے (۱) یعنی افسانے کی موضوعاتی تعبیریں (۲) افسانے کے ہیئتی اجزا کی تشریحیں۔ مروجہ تنقید کا یہ عمل افسانہ ہی نہیں بلکہ تمام ادب کی مختلف اصناف کو جانچنے کے لئے بے دریغ کام میں لایا گیا ہے۔ مجھے اس طریقۂ نقد سے کوئی بیر نہیں' یہ اپنے حدود میں فن کی تشریح کا کام کرکے اپنی اہمیت کو قائم کرتا ہے۔ فن چونکہ اپنی ماہیت کے مطابق تشریح و نقد کے متعدد اوضاع و اسالیب کے لئے جواز رکھتا ہے' اس لئے اس کی تحسین کے لئے بیک وقت کئی تنقیدی نظریات کا ہونا مناسب ہے۔ حالیہ برسوں میں ساختیاتی تنقید نے مصنف کو متن سے خارج کرکے' اور اس کی جگہ قاری کو فائز کرکے' قاری' اور قاری کے حوالے سے ادب فہمی کے Range کو بیکراں کردیا ہے

"کفن" کی موضوعاتی تعبیریں اور اس کے فنی اجزا کے تجزیے سے جہاں پریم چند کے ہندوستانی دیہاتی معاشرے خاص کر غریب طبقے کی زندگی کے مسائل کے گہرے شعور کا پتہ چلتا ہے' وہاں افسانے کے فن سے خود پریم چند کی واقفیت بھی ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اس طریق نقد سے افسانے کی فنی سالمیت یا تخلیقی وحدت' جو دراصل افسانے کی بنیادی شناخت ہے' کی تفہیم و تحسین میں کوئی خوبن مدد نہیں ملتی۔ جب تک تنقید افسانے کی تخلیقی شناخت کے رمز کو منکشف نہ کرلے اس وقت تک اس کی موضوعاتی وقعت یا عدم وقعت کی تشریحیں یا اس عمل فنی وسائل کی عمل آوری کی نشاندہی زیادہ سے زیادہ ماورائے تنقید یا درسی تنقید کی مثال بن کر رہ جائیں گی۔

آیئے ہم افسانے کے متن پر اپنی توجہ مرتکز کریں! افسانے کا پہلا جملہ ہے :

> جھونپڑے کے دروازے پر باپ او بیٹا دونوں بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی جوان بیوی بدھیا دردزہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی۔

یہ جملہ ایک تجسس خیز اور بصری ڈرامائی صورت حال جو کردار' شیئت' فضا اور تحرک سے عبارت ہے' کی نمود کو ممکن بناتا ہے۔ افسانے کا یہ اولین جملہ خارجی سطح پر ہی فضا آفرینی نہیں کرتا' بلکہ داخلی سطح پر بھی کرداروں یعنی باپ اور بیٹے کی ذہنی کیفیت کو منکشف کرتا ہے۔ "دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے تھے" میں بجھے ہوئے الاؤ" اور خاموشی" ان کے داخلی وجود کی بے حسی' تاریکی' منجمدگی اور لاتعلقی کا رمز بن جاتی ہے۔ اور پھر اس جملے کے بقیہ حصہ یعنی "اندر بیٹے کی جوان بیوی بدھیا دردزہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی" میں "جوان بیوی" اور اس کا "دردزہ" میں مبتلا ہونا زندگی کے اثباتی اور امکانی پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ اسی طرح افسانے کا پہلا ہی جملہ ایک متناقض (Paradoxical) صورت حال پیدا کرتا ہے۔ اسی جملے کا بقیہ حصہ یعنی "اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دلخراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے" اس تناقض کو مزید گہرا کرتا ہے' اور پھر یہ چھوٹے چھوٹے تین جملے "جاڑوں کی رات تھی' فضا سناٹے میں غرق' سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو چکا تھا" کم سے کم لفظوں کی مدد سے ماحول کی ایک بھرپور تصویر آنکھوں کے سامنے لاتے ہیں۔ یہ تصویر خارجی منظر نگاری کے علاوہ کرداروں کی داخلی کیفیات' جو متضاد بھی ہے اور پیچیدہ بھی' کا معروض بن جاتی ہے۔ بدھیا ولادت کے عمل سے گزرتی ہے' لیکن "جاڑوں کی رات" "سناٹے اور تاریکی" بنجرپن اور اجاڑپن کا اشارہ بن جاتی ہے۔

افسانے کے یہ ابتدائی جملے اپنی بے ساختگی' فوری پن اور ڈرامائی ثروت کی بنا پر قاری کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں' اور یہیں سے افسانے کی تخلیقی شناخت

کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔

افسانے کے اس اولین پیراگراف سے تین کرداروں' باپ بیٹے اور بدھیا سے تعارف ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور کردار سے بھی فوری طور پر متعارف ہونے کا موقع ملتا ہے' وہ راوی کا کردار ہے۔ جو بظاہر نظر سے غائب ہے۔ مگر یہ باطن افسانے میں ایک متحرک روح یا ایک ناظر یا بصیر کا رول ادا کرتا ہے۔ یہ راوی ہی ہے جو افسانے کے مختلف موڑوں پر نمودار ہوتا ہے' اور نہ صرف کرداروں کے مخفی گوشوں کو روشن کرتا ہے' بلکہ اپنی شخصیت کی پرتیں بھی کھولتا ہے۔ افسانوں میں راوی بالعموم واحد متکلم کے طور پر در آتا ہے' لیکن افسانے کے عمل میں بلاواسطہ شریک نہیں ہوتا۔ لیکن "کفن" میں راوی کی شرکت خاصی نمایاں ہے۔ اس کا شروع میں ہی یہ کہنا کہ "اس (بدھیا) کے منہ سے ایسی دلخراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے" اپنے بارے میں دو امور کی جانب توجہ کو منعطف کرتا ہے۔ (۱) وہ بھی ایک زندہ شخصیت کا مالک ہے' اور انسانی احساسات سے متصف ہے' وہ دردمندی کے احساس کی بنا پر بدھیا کی صدا کو "دلخراش" ہی قرار دیتا ہے۔ (۲) وہ کرداروں کے ظاہر و باطن پر نظر رکھتا ہے' وہ گویا بیک وقت واحد متکلم بھی ہے اور Omniscient narrator بھی۔ وہ کرداروں اور واقعات کے عمل اور رد عمل کا بھی شاہد ہے' اور ساتھ ہی کرداروں کی داخلی کیفیات کا ناظر بھی ہے۔ اس کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ حساس اور نظریاتی کردار کا روپ اختیار کرتا ہے۔ وہ افسانے میں دراندازی تو کرتا ہے لیکن دخل در معقولات کا مرتکب نہیں ہوتا' وہ کرداروں کے قریب بھی ہے' اور ان سے بعد بھی قائم رکھتا ہے۔

افسانے کے پہلے پیراگراف کے بعد باپ بیٹا' یعنی گھیسو اور مادھو گھپ اندھیرے میں ہم کلام ہوتے ہیں۔ گھپ اندھیرے میں طویل خاموشی کے بعد ان کی ہم کلامی' اور کمرے میں بدھیا کا دردِ زہ کی حالت میں بے یار و مددگار' اکیلی ہونا' افسانے کی حقیقی دنیا سے منقطع کر کے ایک تخیلی سطح پر لے آتا ہے۔ اس ماحول میں دونوں کرداروں کا طرز تخاطب اور لہجہ ان کے ذہنی رویوں کے تضاد کو نمایاں کرتا ہے۔ گھیسو کا کہنا "معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں' سارا دن تڑپتے گزر گیا' دیکھ تو آ۔" اور مادھو کا چڑھ کر بولنا "مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی' دیکھ کر کیا کروں' دونوں کے متضاد رویوں کو ظاہر کرتا ہے' لیکن ساتھ ہی مادھو کا یہ کہنا "مجھ سے اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا دیکھا نہیں جاتا" خود مادھو کے رویے کے تناقض پر صاد کرتا ہے۔ مادھو کا بدھیا کے دردِ زہ میں تڑپتے ہوئے دیکھ کر لاتعلق سے الگ بیٹھنا' اس کو تڑپتے ہوئے دیکھ نہ سکنا' اس کے کردار میں گھیسو کے کردار ہی کی مانند غیر معمولی پیچیدگی اور پہلوداری کے امکان کے لئے فضا ہموار کرتا ہے۔ اور دونوں کرداروں کے غیر معمولی پن کی بنا پر قاری کی دلچسپی فزوں ہوتی ہے۔

اس کے فوراً بعد راوی سامنے آتا ہے' وہ گھیسو اور مادھو کے بارے میں

ایک داستان گو کے لہجے میں مزید معلومات بہم کرتا ہے۔ "چماروں کا کنبہ تھا' اور سارے گاؤں میں بدنام' گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام' مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا۔ پھر راوی دونوں کی آوارہ مشربی' بے غیرتی اور فاقہ کشی کا بیان کرتا ہے۔ وہ ان پر اپنے نقطۂ نظر کے تحت نقد و تبصرہ بھی کرتا ہے۔

"کاش دونوں سادھو ہوتے' تو انہیں قناعت اور توکل کے لئے ضبط نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی' یہ ان کی فطرت تھی۔۔ عجیب زندگی تھی ان کی" یہ نقد و تبصرہ اس کے اپنے ردِ عمل کا غماز ہے۔ وہ طنزاً دونوں کی کاہلی اور بے حسّی کو ان کے "ضبط نفس" سے تعبیر کرتا ہے۔ آگے چل کر گھیسو کے بارے میں گہرے طنزیہ لہجے میں کہتا ہے۔ "گھیسو نے اسی صوفیانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی تھی۔ پھر مادھو کے بارے میں کہتا ہے' "مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا' اور اس کا نام روشن کر رہا تھا"۔ پھر وہ اطلاع دیتا ہے کہ وہ دونوں کسی کھیت سے کھودے گئے آلوؤں کو الاؤ کے سامنے بھونتے ہیں۔ بدھیا کے بارے میں وہ اطلاع دیتا ہے کہ "جب سے یہ عورت آئی تھی' اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی' اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی"۔ پھر کہتا ہے کہ "جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب ہو گئے تھے۔"

اس کے بعد گھیسو اور مادھو کا مکالمہ ہے۔ گھیسو مادھو کو پھر اندر جانے کو کہتا ہے۔ مگر مادھو کو اندیشہ ہے کہ وہ کوٹھری میں گھس گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ وہ اندر نہ جانے کے لئے بہانے بناتا ہے۔ راوی اب ایک سماجی ناقد کے روپ میں آتا ہے وہ گھیسو اور مادھو کی منفی ذہنیت کے لئے سماج کو قصوروار ٹھہراتا ہے۔ اور اس کی توجیہ یوں کرتا ہے "جس سماج میں رات دن محنت کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی' اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے' وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہونا کوئی تعجب کی بات نہ تھی"۔ وہ گھیسو کو "کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بیں" قرار دیتا ہے۔ راوی کی یہ رائے' گھیسو سے ذہنی لاتعلقی کو برقرار رکھنے کے باوجود' اس کی حالت زار کے شدید احساس کی غماز ہے۔ اور اس کا طنزیہ رویہ اس کے گہرے دردمندانہ رویے کی توثیق کرتا ہے۔ اس ناقدانہ تبصرے کے بعد وہ ان دونوں کے شدید بھوک کی حالت میں جلتے ہوئے آلوؤں کے نگلنے اور اپنی زبان' تالو اور حلق کے جلا لینے کا بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد راوی گھیسو کی ٹھاکر کے یہاں کھائی ہوئی دعوت کا ذکر خود گھیسو کی زبانی بیان کرتا ہے "اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ اور "پچاس سے کم (پوڑیاں) میں نے بھی کھائی ہوں گی۔ پھر خود اس کا تکملہ کرتا ہے' "اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی' وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ بن گئی تھی"۔

آلو کھا کر وہ دونوں دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے۔ راوی ان کو "دو بڑے اژدروں" سے مشابہ کرتا ہے "جو کنڈلیاں مارے پڑے ہوں" دو بڑے اژدروں سے ان کو تشبیہ دینا بڑھیا کے کراہنے سے ان کے غفلت برتنے کو قابل فہم بناتا ہے۔

افسانے کے دوسرے حصے میں مادھو صبح کو کوٹھری میں جاکر دیکھتا ہے کہ بڑھیا ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے اور کفن اور لکڑی کی فکر کرنے لگتے ہیں۔ دونوں زمیندار کے پاس جاتے ہیں۔ اس نے بادل ناخواستہ دو روپے نکال کر پھینک دیئے۔ اور پھر انھوں نے لوگوں سے مانگ مانگ کر پانچ روپے کی رقم جمع کرلی۔

دونوں کفن خریدنے کے لئے بازار جاتے ہیں اور کئی دکانوں میں کپڑا دیکھتے ہیں، مگر دونوں ایک دوسرے کے دل کی بات تاڑتے ہوئے کفن کے رواج کو یہ کہہ کر مسترد کرتے ہیں کہ جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے، اسے مرنے پر نیا کفن چاہیئے"۔ دونوں شراب خانے میں جاکر خوب شراب پیتے ہیں اور پوریاں کھاتے ہیں، وہ لاش کو بھول کر اور کفن کے روپے کو شراب پر لٹاکر ہر طرح کی بدنامی اور جواب دہی" کو بالائے طاق رکھ کر اپنی حرکت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ گھیسو نشے کی حالت میں کہتا ہے ""ہاں بیٹا بیکنٹھ میں جائے گی، کسی کو ستایا نہیں، کسی کو دبایا نہیں، مرتے وقت ہماری زندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کرگئی۔۔۔ وہ بیکنٹھ میں نہ جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے، جو گریبوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں، اور اپنے پاپ کو دھونے کے لئے گنگا میں نہاتے ہیں اور راوی اطلاع دیتا ہے :

> یہ خوش اعتقادی کا رنگ بدلا، تکون نشے کی خاصیت ہے، یاس وغم کا دورہ پڑا، مادھو بولا ""بیچاری نے زندگی میں بڑا دکھ بھوگا، کتنا دکھ جھیل کر مری"۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا، چیخیں مار مار کے، گھیسو نے سمجھایا۔ "کیوں روتا ہے بیٹا، خوش ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہوگئی، جنجال سے چھوٹ گئی، بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے"۔ اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے،
>
> ٹھگنی کیوں نیناجھمکائے ٹھگنی

سب پینے والوں کی آنکھیں ان پر لگی ہوئی تھیں، اور وہ دونوں شرابی محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے، پھر دونوں ناچنے لگے اور آخر نشے میں بدمست ہوکر وہیں گر پڑے۔

افسانہ، قصہ، ماحول، کردار، واقعہ کے عمل اور رد عمل، راوی کے طنزیہ لہجہ، مکالمت، واقعات کی تخلیقی ترتیب اور نقطۂ عروج ایک مربوط تخیلی تجربے میں ڈھل جاتا ہے، اور لازماً متعدد معنوی امکانات سے متصف ہوجاتا ہے۔

افسانے کے شروع کا پیراگراف نہ صرف افسانے کے باب تخلیقیت کے لئے ایک کلید کی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ دو مخصوص فنی ہتھیاروں یعنی علامت اور تناقض کی عمل آوری سے افسانے کی معنوی تہ داری کے لئے فضا سازگار کرتا ہے۔ یہ دونوں فنی ہتھیار بالعموم شعر سے مختص رہے ہیں۔ لیکن جدید افسانے میں تجربات کی شدت اور پیچیدگی ان کے عملی برتاؤ کی متقضی ہوگئی ہے اور "کفن" اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ چنانچہ افسانے کے تدریجی واقعات اور کرداروں کے ذہنی اور جذباتی رویے ایک دوسرے سے مربوط ہو کر نہ صرف ایک علامتی صورت حال کو خلق کرتے ہیں، بلکہ تجربے کی تہ داری کی توثیق بھی کرتے ہیں۔ افسانے کے کرداروں کی علامتیت کو نشان زد کرنے کے لئے سب سے پہلے گھیسو کے کردار پر نظر پڑتی ہے۔ گھیسو بظاہر ایک کام چور، بدنیت، بے مروت اور کٹھور انسان ہونے کے علاوہ ان پڑھ، جاہل اور مکار آدمی ہے۔ اور اگر اس کے صرف ان ہی معائب کا ذکر ہوتا تو وہ اکہرا کردار ہو کے رہ جاتا۔ لیکن وہ ایسا نہیں ہے وہ ایک ایسے جابر سماجی نظام کی علامت بن جاتا ہے، جو محنت کشوں کو بھوکا اور ننگا رکھتا ہے، اور ان کے ساتھ حیوانوں کا سلوک کرتا ہے۔ یہی سماجی نظام انسان کے اخراج بشریت کا ذمہ دار ہے۔ وہ سفاکیت اور درندگی پر اتر آتا ہے، تاہم گھیسو شیطانی حرکات کے باوجود شیطنیت کا مجسمہ نہیں، بلکہ انسانی خصلت رکھتا ہے۔ افسانے کو ایک کل کے طور پر دیکھیئے، تو علامتی جہتیں جھلکنے لگتی ہیں، کیا یہ انسان کی جبلی نفسیاتی اور جذباتی وجود کی نزاکتوں، گہرائیوں اور پیچیدگیوں کی مصوری نہیں کرتا؟ اس کی سماجی معنویت بھی ہے۔ پست طبقوں (موچیوں کا طبقہ) کے استحصال اور بیچارگی، ان کی اجنبیت اور محرومی، رشتوں کی بے معنویت، نفسیاتی سطح پر انسان کے مسلسل دباؤ میں رہنے کے نتیجے میں کام چوری، کاہلی، اور دروغ گوئی کا حتمی رویوں کا اختیار کرنا، سماجی شکنجے میں کچلے جانے پر بھی انانیت اور برتری کے نفسیاتی مسئلے کا سر اٹھانا (بچی ہوئی پوریوں کا پتل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا)، بنیادی جبلتوں میں بھوک اور بقا کی جبلتوں کی منہ زوری، وجودی سطح پر عصر کرب، لاتعلقی اور بیگانگی، مابعد الطبیعاتی نقطۂ نظر سے زندگی کو مایا جال سے تعبیر کرنے کے رویے، اور بشریاتی نقطۂ نظر سے انسانی تہذیب و تعلیم کی ملمع کاریوں کے اندر حیوانی خصلت کی کارگزاری سے افسانے کے علامتی امکانات کی توثیق ہوتی ہے۔

افسانے کی دوسری خوبی اس کا تناقض ہے، جو پورے افسانے پر مستولی ہے۔ چنانچہ افسانے کے کردار، فضا، کیفیت، شیئت اور معنویت متناقض کردار کو منکشف کرتے ہیں۔ ابتدا میں تناقضات کی نشاندہی کے بعد افسانے کی بافت میں متعدد متناقضانہ عناصر پر ایک نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔ افسانے کے کردار متناقض ہیں۔ راوی کا کرداروں کے بارے میں یہ ریمارک "عجیب زندگی تھی ان لوگوں کی" ان کی متناقض زندگی کا واضح اشارہ ہے۔ وہ انتہائی خستہ حالی اور بیچارگی کی زندگی جو موت سے بدتر ہے، گزارتے ہیں، مگر بے حیائی سے جیئے جاتے ہیں۔ باپ کے نقش قدم پر چلنے اور باپ کی کاربن کاپی ہونے کے باوجود اس کا باپ کی نیت پر شک کرنا (گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کردے گا)، باپ کو روپے چٹ کرنے کا

سے ایک دور دراز گڑگڑاہٹ کے ساتھ نکلا اور قریبی دریا کی سرسراہٹ میں کسی نادرہ روزگار چڑھتے ٹھاٹ کے آخری سر کی طرح مدغم ہوگیا۔

اندر سے ایک عورت کی آواز نے، جس میں کچھ مردانہ کھردراہٹ کا عنصر بھی تھا، حکم دیا "کاجی، ان صاحب سے کہہ دو کہ وہ چھکڑے میں آسکتے ہیں۔"

گاڑی بان نے عاجزی کے ساتھ اپنی مالکن کا حکم دہرایا۔ "تم چھکڑے کے اندر جاسکتے ہو، خاتون کہہ رہی ہیں۔"

نوجوان کا چہرے دمک اٹھا۔ اس نے اپنی داغ دار ٹوپی تعظیم کے انداز میں اتار دی، حالاں کہ چھکڑے والی خاتون نے اپنے آپ کو رضائیوں اور کمبلوں کی پناہ گاہ میں سے ظاہر نہیں کیا۔

"بیگم صاحبہ، اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ آپ جان نہیں سکتیں کہ میں آپ کا کس قدر شکرگزار ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" اندر سے کھنکھے لہجے میں جواب آیا۔ "تم اندر آسکتے ہو۔"

"نہیں، بیگم صاحبہ، چڑھائی کے بعد۔ میں اتنی دور پیدل چلوں گا تاکہ بیلوں کو آسانی ہوجائے۔" وہ اپنی آواز کے دھیمے پن پر خود ہی حیران رہ گیا کہ اس میں بے خانماں شخص کا شکرگزار انکسار شامل تھا۔

اور کچھ نہیں ہوا۔ اس کی محسنہ نے اسے اپنا چہرہ دکھانے کی عزت افزائی نہیں بخشی۔ وہ چھپردار چھکڑے کے اندر بمشکل ایک ٹیکیلے جوتے کی ایڑی کی جھلک دیکھ پایا جو آرام کی خاطر پھیلتا ہوا نظر آگیا، پرانا دیہاتی جوتا، موٹے سرکنڈوں کا بنا ہوا، جو کسی دیہاتی عورت کا موٹا ٹخنا منکشف کررہا تھا۔

چھکڑا بھاری لکڑی کی چرچراہٹ کے ساتھ چل پڑا جب گاڑی بان نے سر پر چابک گھماتے ہوئے جوڑی کو ہانکا۔

"ہانکے! منہ موڑے۔"

اور نوجوان پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا کہ اس غلیظ گوشے کو لوٹ جائے جہاں وہ ایک مہینے رہا تھا۔ وہاں اس نے ایک جوڑی پرانے جوتے، ایک گھسا ہوا ٹوتھ برش اور صابن کی پتلی پتی پیچھے چھوڑ دی تھیں، مگر وہ گیا نہیں۔ اسے تختوں کی اس کچی بستی سے گھن آنے لگی جہاں رات کے وقت دس دس آدمی ڈھیر ہو رہتے۔ وہ دوبارہ سے اس عیار سٹے باز رومواللہ سوٹو کی سرخ ناک نہیں دیکھنا چاہتا تھا، جو پکتے ہوئے پھوڑوں کو چھپانے کے لیے خون سے تر پٹیوں میں لپٹی رہتی۔ اسے اس گم راہ معاشرت سے کراہیت آنے لگی جہاں وہ کڑ کھائے ٹھکانوں کی کیڑوں سے بجبجاتی بستی میں جاکر رہا تھا۔ وہاں کے اجارے دار نے کوہ کی ڈھلان پر اس طرح ٹھوک ٹھاک کے کچا کام کردیا تھا کہ حماموں کے چوبی جھونپڑوں کا منظر خراب نہ ہو۔ وہاں پر مگر ایک اور بھیڑ سما جمائے ہوئے تھی۔ انھیں جذبات کی ماری اور ایسی ہی برائیوں سے سڑتی ہوئی، وہ گنجی خورے جو ٹمٹماتی موم بتی کی روشنی میں تاش کھیلتے اور وہ روسا جو بازی کی میزوں کے گرد مجمع لگائے رہتے، ان کے درمیان کوئی فرق تھا تو بس نوٹوں کی ان ڈھیریوں کے حجم کا جو رولٹ کے کھیل کا پہیہ چلانے والے وصول کرتے یا کوتاہ زاویوں پر پیشہ جھکائے ہوئے خدمت گاروں کو انعام کے طور پر ملتے۔

فروری کی یہ دوپہر اپنے گلابی سکون میں پہاڑوں کی پیچ در پیچ دیواروں، ان کی اچانک نکلنے والی نوکوں اور پہاڑی نالے کی کٹاؤ دار تلیٹی کو لپیٹے ہوئے تھی۔ اس پورے درشت پہاڑی منظر پر ایک انداز چھایا ہوا تھا اور وہ تھا آتش فشانی راکھ کی سرمئی چمک، سخائے ہوئے لاوے کا مسام دار خس بنا۔

چھکڑا اب سرخی مائل کٹاؤ کے راستے پر آگیا تھا جو بہت بڑے ریتیلے ٹیلے کو کاٹ کر گھاٹی بنا رہا تھا۔ نوجوان سب کچھ بھول کر اپنے پیر ایک پرشہوت لذت کے ساتھ زمین کی نرمی میں دھنسانے لگا۔ وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا، پاک صاف اور پچھلے تمام خیالات سے آزاد محسوس کرنے لگا۔ اس کی جیب میں پندرہ پیسوں سے زیادہ نہیں تھے، مگر اس کا بنیادی مسئلہ حل ہوچکا تھا۔ اب وہ چالان جاسکے گا جہاں اس کے دوست تھے جو اس کی مدد کریں گے۔

اس نے چاہت بھری نظروں سے غبار کے بادل میں لپٹے اس پہاڑی چھکڑے کی طرف دیکھا جسے دھوپ نے سرخ رنگ دیا تھا۔ فاصلے مٹاتے بیلوں کی دلکی چال پہیوں کی متوازی لکیروں کے بیچ میں ان کے پھٹے کھروں کے نشان چھوڑتی جارہی تھی۔ اسے گاڑی بان کے چلانے میں بھی مزہ آرہا تھا جو اپنے ایک وفادار بیل سے چڑا ہوا لگ رہا تھا۔ "منہ موڑے! منہ موڑے!" اس کا ذہن اپنے آپ سے ایک پرمذاق مکالمہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ "اس نے بھلا یہ نام اس چتکبرے بیل کو کیوں دیا جس کی کھال کسی مزدور کی پرانی صدری کی طرح دھبے دار ہورہی ہے؟" اور جب اس نے اس انوکھے دیہاتی لقب کی وجہ تسمیہ دریافت کرلی تو حد سے زیادہ خوش ہوگیا۔ ظاہر ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ بیل کے پٹھوں پر سفید سفید چتیاں لگے رہے تھے جیسے گال پر سے ٹپکتا گندہ پانی۔

کوئی پاؤ گھنٹے بعد وہ پہاڑی کوتا اور اس کے عارضی ڈھانچے، تپتی ہوئی ڈھلانوں پر بنے حماموں کی بدصورت سفید کٹیاں اور چشمے کی غلیظ گھمر گھمر، سب پرانے پہاڑی مرتفع کے ناہموار خاکے کے پیچھے غائب ہوچکے تھے۔ اب اس کوہ کے بے پایاں زاویے کے پیچھے سر اٹھائے تھا کھڑا ہوا آتش فشاں چمکدار چٹانوں کا دیو پیکر ڈھیر معلوم ہورہا تھا جس کے ہلال آسا چھر دہانے کے دھواں چھوڑتے خلا کی طرف اشارہ کررہے تھے۔

دوپہر گزر رہی تھی۔ ذرا ذرا کرکے اس کا چمکیلا گلابی پھیکا پڑتا جارہا تھا۔ یہ خاص طور پر آتش فشاں کی دھواں دھواں کلغی میں نظر آرہا تھا، جو وقفے وقفے سے اپنی وسعت کو کسی ایسی موج دار گونج کی رفاقت میں پھلاتا اور کم کرلیتا جو پوری وادی میں یوں پھیل رہی تھی جیسے جادو۔ کھردی چوٹیاں اور میناکی طرح چمکتے برفانی ٹکڑے پتلی رقیق فضا میں گھلتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔ صیقل

شدہ چمکیلے بلوری کرے جیسا چاند چوٹیوں کے اوپر کھنچا ہوا تھا۔

چھکڑا اب چوڑے چوڑے پتوں اور مہندار تنوں والے پیڑوں کے بن میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک نوخیز پودا جسے ابوالائلش نے اکھاڑ دیا تھا اب ایک اور درخت کے دو شاخے میں پھنسا دھیرے دھیرے بڑھتی موت کی پکڑ میں تھا۔ اس کنج میں کسی قدیمی انشقاق کے چھوڑے ہوئے افسردہ' سنگدلانہ تباہی کے آثار تھے۔ پس منظر میں' اپنی کلغی کے گلابی رنگ اور اس کی ہم آہنگ تال کے ساتھ کھڑا ہوا آتش فشاں کسی پرانے انڈین سردار کی طرح معلوم ہو رہا تھا جس نے پورے قبیلے کو اپنی قوت کے جبر سے سہار رکھا ہو۔

چھکڑا اب اترائی کے آخری موڑ پر ڈھلکتا جا رہا تھا۔ وہ گھنے بن میں داخل ہونے سے پہلے اس مقام پر کوئی فرشی تختے کی سطح پر رکی۔ سفیدے کی ہریالی نے پہاڑی چوٹیوں کو چھپا لیا تھا اور درختوں پر ایک شہابی دھند اڑ رہی تھی۔ دریا کی گنگناہٹ چھوٹی سی وادی کے دوسرے سرے پر تیرتی چلی جا رہی تھی جہاں چٹیل پہاڑ تھے۔

گاڑی بان نے چابک درست کئے اور بم کے اوپر بیلوں کا جوا سیدھا کیا پھر اس نے نوجوان سے اندر آنے کے لئے کہا۔

جھجکتا ہوا وہ چھکڑے کی پشت تک آیا اور کہا۔ "بیگم صاحب اگر آپ اجازت دیں تو۔"

- اندر سے ایک مبہم بڑبڑاہٹ آئی جو رضامندی کی طرح سنائی دی۔ تگر پر گھٹنے جماتے ہوئے وہ آہستہ سے اس خلا کے اندر پھسل آیا' اس احتیاط کے ساتھ کہ بندھا ہوا کمبل ڈھیلا نہ پڑ جائے۔ اسے اپنے قد کو برابر کھینچنا اور سیٹنا پڑا کہ وہ چھکڑے کی ساتھی مسافر سے نہ ٹکرا جائے۔ چھکڑے کی محراب دار بناوٹ والی چھت کے اندر سہولت سے بیٹھنا ممکن نہ تھا کیونکہ برابر بیٹھی ہوئی عورت فربہ اندام تھی اور زیادہ تر جگہ گھیرے ہوئے تھی۔ خوش قسمتی سے ایک نرم دیہاتی گدا چھکڑے کے فرش پر بچھا ہوا تھا اور وہ اپنا سر ایک چوڑے گاؤ تکیے پر ٹکا سکتا تھا جو شادی کی مسہری کی ٹیک جیسا تھا۔ روٹھی دلہن کی طرح عورت نے اس کی طرف پیٹھ کر لی تھی' اور نوجوان کو بس اس کے کولھوں کی قوس اور شانے کا زاویہ نظر آ سکا۔ گاڑی بان نے شگاف کا نصف دائرہ بند کر دیا اور چھکڑے کے سرے اور بموں کو باندھ دیا۔ نوجوان کے دل میں کسک اٹھی کہ اسے ساری رات چلی کے تحت تختوں کے بنے اس جھولتے جھومتے کھوکھل کے اندر گزارنی پڑے گی جو اب مسلسل دھچکوں کے ساتھ سلسلہ کوہ کے قلب میں بڑھی چلی جا رہی تھی۔ صرف ایک پٹ کھلا رہ گیا تھا اور اس میں سے موسم گرما کا آسمان نیلا نیلا چمک رہا تھا اور کسی گزرتی شنی کی پھننگ ایک لمحے کے لئے لہراتی اس کے سر پر تھرتھر چڑیا نے دو میٹھے سروں والی سیٹی بجائی' ایسی گھٹی ہوئی جیسے چلی کے بولڈو گل شب کے بیچ۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اونگھنے لگا۔ اس کی یادداشت مدھم پڑ گئی۔ جھونٹے سے چھکڑے کے اندر اسے اپنے اطراف ایک نئی دنیا نظر آ رہی تھی۔ یہ پر اسرار عورت جو گٹھری بنی اس کے پاس پڑی تھی

جو چھکڑے کی چھت کو تھامے ہوئے تھی اور جس نے اس کے واسطے بغیر کسی وضاحت کے ایسی فیاضی کا ایسا مظاہرہ کیا تھا جو گنواروں میں ذرا ہی کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ پھر چٹانوں سے ٹکرائے پہیوں کی زوردار مسلسل کھٹاکھٹ اور سڑک کی کھوکھلی لیک میں ان کی گراوٹ کی جوابی چوٹ اور آخر میں اس کے سرے کوئی انچ بھر دور بہتے پر ٹنگے گاڑی بان کی صدری سے پھوٹتی جنگلوں کی خوشبو اور اس کی آواز جو جھٹ پٹے کے سناٹے کو ذرا ذرا دیر بعد چیر جاتی۔ "منہ موتڑے! اوووے !"

یہ بہت قدیم آواز تھی جس کی تفہیم سے نوجوان لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کا رخ جانور کی طرف تھا جیسے وہ بھی کوئی سنگی ساتھی ہو جسے بہت صبر کے ساتھ کام کرنا سکھلایا گیا ہو اور جو کسی ناقابل معافی غلطی کی وجہ سے گاڑی کھینچنے کے بالکل ابتدائی اصول بھلائے جا رہا ہوں اس میں ایک فہمائش بھی تھی کہ اپنے دوسرے ساتھی کا جتنا زور لگائے۔ اسی وجہ سے اس پکار میں درخواست بھی تھی اور خفگی بھی۔ اور وہ چھوٹا سا بیل یقیناً سمجھ بھی رہا تھا' کیونکہ ہر مرتبہ جب اس کی چوڑی چکلی پیشانی آگے جھٹکا دیتی تو جوئے کی رسیاں اس نئی کوشش کے سبب کراہ اٹھتیں۔

اندر گرمی سے دم گھٹا جا رہا تھا۔ گرمی اونچے پہاڑوں کے درمیان کھائیوں میں طول پکڑ رہی تھی۔ پھڑپھڑاتے کمبل سے آسمان کا جو حاشیہ دکھائی دیتا تھا وہ آہستہ آہستہ رنگ چھوڑنے لگا اور گہرا پڑنے لگا۔ بعض دفعہ کسی ستارے کی سنہری جھلملاہٹ راستہ ڈھونڈتی ہوئی چھکڑے کے اندر بھی آ جاتی۔

برفانی ٹکڑوں سے اٹھنے والی ہوا' جو زمین اور جنگلوں کو ٹھنڈا کر دیتی ہے' اب سرگوشیوں میں سرسرانے لگی تھی۔ چاند کا بلوری کرہ اب ایک گھنی سنہری تمتماہٹ کا روپ بھر رہا تھا جو اپنے پرسکون ٹھنڈے اجالے کا بھید سارے جنگل پر لٹا رہی تھی۔ درختوں میں جنگلی چرند پرند اس کی روشنی سے جاگ اٹھے جیسے پو پھٹ رہی ہو اور شکاری کی پکار سے جھاڑیاں گونج اٹھیں۔

نوجوان نے آنکھیں بھینچ لی تھیں۔ چھپردار چھکڑے کے اندر کا دھندلکا اسے نیند کی جانب ٹھیلنے لگا' مگر تیز و تند نفرت اس کے اندر کلبلانے لگی' اس عورت کے خلاف نفرت جو اس کے پہلو میں اونگھ رہی تھی' جس کا پرشور سانس' نوجوان کی کراہیت کا سبب بنتے ہوئے بھی' محض سیدھا سادا تنفس تھا۔ یہ لوتھڑے جیسی عورت کون ہے؟ کوئی بیمار' روگی ہے جو کہ چھوت کی بیماری میں جتلا ہو اور اپنا منہ دکھانے سے شرماتی ہو؟ وہ اس سے بات کیوں نہیں کرتی؟

شاید وہ کوئی شہری عورت تھی جو طبی ضرورت کی بنا پر یہاں نہانے آئی تھی اور گٹھیا کے ان مریضوں میں سے ایک تھی جو وادی کے کونے کونے سے ہر سال یہاں ان چشموں کی جانب یوں ہجرت کرتے تھے جیسے سینٹ سبتیان کا میلہ دیکھنے جا رہے ہوں اور ان المناک آزاروں سے' جو دیہاتی زندگی کی تنہائی میں رہنے والوں کو لاحق ہو جاتے ہیں' معجزاتی آرام تلاش کرتے۔ یا وہ کسی

ڈمیٹھ اور گمراہ نے سے تھی‘ یعنی ان عورتوں میں سے‘ جو اداسی بھری چوک کے سرخ کھڑے لمبے لمبے کھمبوں والے مکانوں میں‘ اچھے زمانوں سے جاری آبائی وراثت کی قید میں رہتی ہیں۔ کیا وہ اس کے بھک منگوں جیسے حلیے اور اس کی درخواست کے عاجزانہ لہجے کے سبب اپنی تحقیر ظاہر کر رہی تھی؟"

چھکڑے کے ایک دھچکے پر یہ سارے تصورات گڈمڈ ہو گئے اور یوں غائب ہو گئے جیسے چھان پھٹک کر پھینک دیے گئے ہوں۔ مگر فوراً ہی اس کا ذہن اپنے محول لاشعوری چکر پر لوٹ آیا۔ اسے شدت کے ساتھ پچھتاوے کی وہ کرب ناک گھڑیاں یاد آئیں جب وہ اجنبیوں کے ہجوم کے ساتھ ایک عجیب دل چسپی سے نظریں رولیٹ کی میز پر جمائے ہوئے وارنش شدہ میز پر سکوں کی چھوٹی چھوٹی رنگین ڈھیریوں کا تعاقب کرتا رہا اور اس کا تبادلہ رو سوالشو سوٹو کی کچی کٹھریا میں جب اس کے آخری نوٹ کو بھی قمار خانے کے خزانچی کا سونٹا سمیٹ کر لے گیا اور کرب کی وہ گھڑی جب حقیقت بھی بے اثر و زائل ہو گئی اور یہ ننھے ننھے بیچے اپنے فولادی محور پر اپنا ہوش ربا چکر جاری رکھے رہے۔ پھر اس کی آخری ذلت جب سکے بدلنے والوں نے اس کی آخری کوڑی بھی لے لی۔ پھر اسے اپنے ضمیر کا اچانک یوں جاگ اٹھنا یاد آیا جیسے کسی بدخواب سے بیدار ہوا ہو اور ساتھ ہی جس شدت کی نفرت اسے اپنے پیروں میں پڑے جوتوں سے تھی‘ اپنی میلی قمیص سے اور اس بے طرح بڑھے ہوئے ناخنوں سے جیسے کوئی مدت کا بیمار ہو۔

اپنی بربادی کے ان مناظر کی یاد پر اس کے بدن سے ٹھنڈا پسینہ پھوٹنے لگا اور اس کا دل تیز و چکیوں کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ آخرکار اس کی یادیں دھندلا کر غائب ہونے لگیں اور ایک بے پناہ غشی اس کے جسم کو تھپک کر سلانے لگی۔ مگر اس کا ذہن جاگ رہا تھا اور منتشر تاثرات کے اجزا حاصل کر رہا تھا۔ جگالی کرتے ہوئے بیلوں کی ڈور دار‘ بے قرار صدا‘ وقفے وقفے سے آتش فشاں کی مبہم گڑگڑاہٹ۔ اچانک وہ پوری طرح جاگ اٹھا۔ اس نے کوئی آواز نہیں سنی اور ایک دھچکے عالم سکون میں پڑا رہا۔ چھکڑا رک گیا تھا۔

آہستہ آہستہ اسے اپنے برابر لیٹی ہوئی عورت کا احساس ہونے لگا‘ جیسے کسی مخالف قوت کی ناگواری اندھیرے میں روپ دھار رہی ہو۔ اس نے اسے بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے محسوس کیا۔ عورت کے جسم کی الٹ پلٹ اب اس قدر واضح ہو گئی تھی کہ اس کے وجود کی گہرائیوں میں وہ قدیمی طلب سر اٹھانے لگی جو ہر اس بار جاگنے لگتی ہے اور پکارتی ہے جب کوئی مرد اور عورت ایک دوسرے کے آس پاس ہوتے ہیں۔ پھر اس نے صاف ستھری کھال کو کھینچتے ہوئے محسوس کیا اور اس احساس نے اسے بیحد اکسایا۔ اس پر غضب یہ کہ نیند کی لاشعوری حرکت میں وہ عورت اس کے بہت قریب کھسک آئی تھی اور اس کی ران اور کندھا اس کے گھٹنے اور پہلو سے بھڑ گئے تھے۔

اس کے ذہن میں ایک خیال تشکیل پانے لگا جس سے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "یہ بھدی عورت نیند کی کچی ہے!" وہ یہ دیکھ کر بالکل حیران رہ گیا کہ جس شخص نے یہ الفاظ تقریباً باواز بلند کہے‘ وہ اس کی ذات سے الگ کوئی اور معلوم ہو رہا تھا۔ اب وہ پوری طرح بیدار تھا اور بہت احتیاط کے ساتھ‘ تاکہ وہ اس اجنبی عورت کو جگا نہ ڈالے‘ اس نے کمبل ذرا سا اوپر کیا جو باہر کے منظر کو روکے ہوئے تھا‘ اور جنگل کی ہوا تازہ خوشبوئیں لئے ہوئے اس چھوٹے سے سوراخ سے اڑ کر آنے لگی اور اس کے گالوں کی جلن کو ٹھنڈا کر گئی۔

یہ بس ایک منٹ کے لئے ہوا۔ پھر وہ اپنے کونے کی گرم خاموشی کی طرف لوٹ آیا۔

"کیا گڑبڑ ہے کاچی؟"

"کچھ نہیں۔ بس یہ جوئے کی ڈوری ٹوٹ گئی تھی۔ میں نے اب جوڑ دی ہے۔"

"ایک دفعہ پھر چھکڑا اپنے سفر پر چل پڑا۔ گاڑی بان بھی پوری طرح جاگ چکا تھا اور اپنی خفخفی آواز میں مختلف گیتوں کے ٹکڑے پر لطف یکسانیت کے ساتھ گنگنا رہا تھا۔ خوشبودار ملامت سے لدی گرم رات نے شاید اس کی محکوم روح میں شاعری کی کوئی چنگاری بھڑکا دی تھی۔ تھوڑے تھوڑے کرکے الفاظ صاف ہوتے گئے اور نوجوان نے نظموں کے ٹکڑے سنے‘ سیدھے سادے بند جن میں اچھے دنوں کی یاد تھی‘ پرانے سرداری زمانوں کی یاد اور گاڑی بان اپنے چھکڑے کے فرش پر ڈھیر پڑا بیلوں کی جوڑی کو ان سنسان سڑکوں اور جنگل کے پیچ در پیچ راستوں پر ہانکے لئے جا رہا تھا۔

اب گیت کا ٹکڑا صاف سنائی دینے لگا۔

ایک مویشی پال کوٹلے دیہہ میں
رنگ رنگ کے بیل اور ایک دلہن
اور باقی کا بند اس کے مبہم بھنبھناتے لہجے میں گم ہو گیا۔
جیسے کسی کو بھو...... بکیا میں
اس نے اپنے دھ...... من

ایک غیر متوقع چیز نے نوجوان سے گاڑی بان کی بے سری آواز کا سارا دھیان بھلا دیا۔ اس کے برابر او نگھتی ہوئی عورت کا جسم دھیرے دھیرے اس کے پاس کھنچا آ رہا تھا۔ وہ صاف سمجھ گیا کہ یہ کسی ایسے جسم کا غیر ارادی دباؤ نہیں ہے جو زیادہ کھلی جگہ کا عادی ہے اور نیند کی غفلت میں اپنے برابر لیٹنے والے کی کوئی پروا نہیں کر رہا۔ اس کے دل نے تیز ہوتی دھڑکنوں کی زبان سے کہا کہ اس اجنبی عورت کی چپ چاپ کروٹوں کا مطلب کچھ اور ہے۔ جلد ہی اسے اپنے قریب گرم گرم سانسوں کا احساس ہونے لگا‘ خواہش سے بھرپور اور ہونٹ جو اس کے اپنے ہونٹوں کو اس طرح ٹٹول رہے تھے جو صرف موت یا پیدائش کو انسانی حرکات میں ممکن ہے۔

اور اس چھکڑے میں جو پہاڑوں کے بیچ بھاری درندے کی طرح ہلتا ڈولتا چلا جا رہا تھا‘ یوں لگ رہا تھا کہ ساری دنیا خلا میں اپنی حرکت مستدیر کے دوران

اس لئے رک گئی ہے کہ دو اجنبیوں کے لب مل گئے ہیں جو ابھی تک ایک دوسرے کے لئے نا آشنا تھے۔

گاڑی بان چاندنی میں اپنے اڈے پر بیٹھا ہوا ابھی تک وہ پرانی یادوں کا گیت بڑبڑا رہا تھا :

جیسے کسی کو پھول ملے کسی بگیا میں

اس نے اپنے دھن میں لگا تن اور من.....

نوجوان کو اچانک یوں احساس ہوا کہ جیسے وہ بالکل آزاد ہو گیا ہو۔ ایسا لگا کہ اس کی ساری پریشانیوں کو خون کی وہ موج گرم امنڈ کر اڑا لے گئی جو اب اس کی رگوں میں تندرستی کی حترنم دھڑکنوں کے ساتھ تھرتھرا رہی تھی۔ وہ دھیمی آواز میں کوئی دھن گنگنانے لگا جو اچانک اس کے دماغ میں آئی تھی، یہ جانے بغیر کہ کیوں۔ اس نے چاہا کہ اس عورت کو بولنے پر اکسائے، اس اجنبی عورت کو جس نے اتنے غیر متوقع طریقے پر اپنا آپ اسے دے ڈالا تھا۔ اس نے چاہا کہ اس کا نقشہ، اس کی آواز کی مردانہ کھرج، اس کا ڈیل ڈول، رنگ روپ یوں ذہن میں باندھ لے جیسے وہ اس کے سامنے کھڑی ہو۔ اور جو تفاصیل وہ دیکھ پایا یا کھوج سکا، ان سے کوئی ٹھوس شکل نہ بن سکی۔ مادی خواص سے محروم ہو کر وہ کوئی مبہم شے معلوم ہو رہی تھی، کوئی تجرید، ایسی کہ جس کی تصویر نہ اتاری جا سکے۔ بعض لمحوں میں پہلے کی کسی عورت کی یاد داخل ہو جاتی، یا پھر کسی دوکان کے شیشے میں سجی یا کسی رسالے میں چھپی تصویر کی جھلک شامل ہو جاتی۔ اس نے ان ہیجان خیز شعلوں کا مزہ پھر دہرانا چاہا جو اس کے لبوں پر شعلوں کی بارش کی طرح برس پڑے تھے مگر اس سے یہی ہو سکا کہ ذہن میں یہ مقرر کر لے کہ وہ دوہرے بدن کی عورت تھی، کھردری اور کڑی کھال والی، بھرا بھرا سینہ، اور موٹے بال جن کو وہ سیاہ تصور کرنے لگا، اور جس کا بدن نمی کی ہلکی ہلکی بو چھوڑ رہا تھا۔ پھر اسے وہ میلا جوتا یاد آیا جو اس نے گذشتہ دن دیکھا جب وہ روانہ ہو رہے تھے، اور وہ مسکرا اٹھا۔ اب اس کے ذہن میں روزمرہ برتنے کی چیزیں آنے لگیں، کلف لگے پرکال کے لباس پہنے کسان عورتوں کی صورت، بالوں کی لٹیں بکھرائے ہوئے۔ وہ اس کیفیت پر مسکرایا اور فوراً سو گیا، نہ کوئی یاد، نہ فکر، بس ایک حیوانی تساہل کا عالم جس میں صرف ایک ہی سوال اس کے شعور کی دہلیز پر بار بار آ رہا تھا۔

"یہ عورت کون ہو سکتی ہے؟"

یہ تندہی کے ایک دھکے نے اسے چونکا کر جگا دیا۔ گاڑی بان نے ہاتھ کمبلوں میں ڈال دیا تھا اور اپنے اس مہمان کو جھنجھوڑ رہا تھا۔

"آ ہیں، کیا ہوا؟"

"اترئیے جناب، ہم ریکنشو پہنچ گئے۔"

سوال چھکڑے کے اندرونی حصے سے برآمد ہو کر کھلی ہوا میں نکل آیا اور گاڑی بان کا جواب طلوع آفتاب کی تازہ تازہ سرگیں فضا میں بسا ہوا، اندر بہتا

چلا آیا۔ وہ گدے سے اٹھ کر بہت احتیاط کے ساتھ سوراخ کی طرف آنے لگا کہ اپنی ساتھی کو جگا نہ دے۔ ایک عجیب سی شرم اس کے پیر تھامنے لگی۔ وہ عورت اگر اس سے ایک بھی لفظ کہہ دیتی یا اپنے آپ کو ظاہر کر دیتی تو وہ کانپ اٹھتا۔ اسے اس پورے واقعے میں نسائی کردار ادا کرنے پر ایک مبہم سی شرم آنے لگی۔ پھر بھی، اس اجنبی عورت کی کاہلانہ بے تعلقی نے اس کے اندر پھر وہی برہمی اور کوفت پیدا کر دی جو اس نے کل محسوس کی تھی۔ اس کی مردانہ عزت نفس کو ٹھیس پہنچ رہی تھی، اس کے مردانہ وقار کی ہتک ہوئی تھی۔ کل کے حقارت آمیز سوال اس کے ذہن میں سے گزرنے لگے۔ اس نے یہ سلسلہ ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

صبح ہو رہی تھی۔ سڑک کے کنارے نیند میں جھومتے درختوں میں چڑیاں صبح کے کہرے کو اپنی تیز چہچہاہٹ سے چیر رہی تھیں۔ وہ گاڑی بان سے بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"یہ رہے دس پیسو۔"

گاڑی بان ہاتھ پھیلانے ہی والا تھا، اس خلیقی انداز میں جو گنوار پیسے وصول کرتے ہوئے اختیار کر لیتے ہیں مگر اس کی یہ حرکت چھکڑے کے اندر سے عورت کی آواز میں آتی ہوئی ایک فیصلہ کن "نہیں" سے رک گئی۔

نوجوان نے کندھے اچکائے۔

"اب ٹھیک ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

گاڑی بان کی ہانک پر بیلوں نے زوردار جھٹکا دیا اور چھکڑا سرخی مائل، اسفنج نما سڑک پر دھیرے دھیرے کھسکنے لگی۔

نوجوان سڑک کے بیچ سے نہ ہٹا، اس کی آنکھیں اس پہاڑی چھکڑا گاڑی پر گڑی ہوئی تھیں، یہ گھٹیا اور کوکی جیسا ٹوٹا پھوٹا چھکڑا جس میں اس نے اپنی زندگی کا ایک اچھوتا لمحہ گزارا تھا۔ اس کا نقشہ سویرے کے دھندلکے میں گم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ پھر اسی نامعلوم سمت سفر کر رہی تھی جہاں سے گذشتہ دن آئی تھی اور اپنے سینے میں اپنا راز لئے جا رہی تھی۔ نوجوان کی یادوں میں ایک سلگتا ہوا نشان رہ گیا بوسوں کے لئے بیتاب ہونٹوں کا اور دیہاتی عورت کی بدوضع ایڑی کا۔

وہ اس امید میں انتظار کرتا رہا کہ شاید چھکڑے میں سے کوئی ہاتھ پٹ کھول کے باہر نکلے اور رومانی انداز میں الوداعی اشارہ کرے مگر کمبل کا جو کونہ پردے کی طرح چھکڑے کو ڈھکے ہوئے تھا، اس میں حرکت کے کوئی آثار نہ پیدا ہوئے۔

ریکنشو کی چھوٹی سی بستی "کوناۓ" میں درختوں کے درمیان بسی ہوئی تھی۔ اجلے اجلے سویرے میں سے مرغ کی بانگ سنائی دینے لگی، ہوا کا ایک جھونکا دریا کی گنگناہٹ پاس لے آیا۔

نوجوان دھیرے دھیرے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ ❖❖❖

عقیل جامد

ایک پل بھی نہ ہرگز رکیں بکریاں
وقت پر ذبح خانے میں تھیں بکریاں

اس لئے ہیں معزز ہمیں بکریاں
چند نبیوں کی ساتھی رہیں بکریاں

لوگ کہتے ہیں اس دشت میں شیر ہے
چر رہیں تھیں ہماری یہیں بکریاں

اب کی گرمی میں گھوڑے تڑپ کر مرے
اب کی گرمی میں ٹھٹھر کر مریں بکریاں

آسماں جب نگلنے پہ مائل ہوا
کر چکی تھی ہڑپ یہ زمیں بکریاں

میں گرا باولی میں تو وہ بھی گریں
میرے نقش قدم پر چلیں بکریاں

اس قبیلے کی تقسیم پر صاد ہے
اونٹ اس کو تو مجھ کو ملیں بکریاں

اپنے بچوں کی طولانی عمر کی
کب تک آخر دعا مانگتیں بکریاں

بیٹھی تھی جدھر، پیڑ پتے ادھر
پیڑ پتے جہاں تھیں وہیں بکریاں

جھاڑ کے نیچے جب تک تھے ہم ساتھ تھیں
گھر مکمل ہوا تو کٹیں بکریاں

کچھ تو شامیں گھمانے پہ راغب ہوئیں
بعض داڑھی بڑھاتی رہیں بکریاں

پان پر پان کھاتی ہوئی عورتیں
بے رکے کچھ نہ کچھ چابتیں بکریاں

وہ چھلانگیں ہیں اب، اب نہ وہ شوخیاں
عمر ڈھلتی گئی تو ڈھلیں بکریاں

کیرلا کی ہیں یہ، وہ ہیں کشمیر کی
ساخت سے اپنی جانی گئیں بکریاں

تم نے امید ہرنوں کی رکھی عبث
بکریوں ہی کو جامد جنیں بکریاں

عقیل حامد

جو پرانے تھے اڑ گئے کوّے
بس گئے ہیں یہاں نئے کوّے

چین ہو، مصر ہو کہ ہو لندن
ہر جگہ کے ہیں ایک سے کوّے

فاختائیں قریب کی بہتر
یا غنیمت ہیں دور کے کوّے

پسلی پسلی ادھیڑتے ہوئے گدھ
ٹی وی انٹینا ٹھونگتے کوّے

دن دہاڑے کبوتروں کا عشق
پانی پانی ہیں شرم سے کوّے

نیم کی چھاؤں میں جواں، بوڑھے
فضلہ رہ رہ کے داغتے کوّے

اب نمو دیکھنی ہے پیپل کی
بیج محلوں میں بوچکے کوّے

دم ہلاتی رہی میاں کی گائے
سینگ پر دم لیا کئے کوّے

ہم پہ ہوتے حلال یہ بالفرض
آج رہ جاتے چار چھ کوّے

لکھتی رہتی ہیں بلبلیں غزلیں
پڑھتے رہتے ہیں مرثیے کوّے

مالک دو جہاں کی ملکیت
نہ ہمارے نہ آپ کے کوّے

سبز روغن میں غوطہ زن بھی ہوئے
پھر بھی طوطے نہ بن سکے کوّے

تھے مقابل عقاب سبزی خور
غالب آئے قسائی کے کوّے

ہار مانی نہ کوئلوں سے کبھی
اپنی بولی پہ مرمٹے کوّے

کیسی خامی؟ میاں یہ خوبی تھی
ہنس کی چال بھی چلے کوّے

بحر زخار جیسی تیری ذات
ہم شکستہ جہاز کے کوے

سارے چڑیا گھروں کو چھان دیا
ایک پنجرے میں بھی نہ تھے کوّے

ٹیپ بھیجے کوئی سلیماں تک
اپنا دکھڑا سناچکے کوّے

آگے آگے تھی شہر کی قمری
پیچھے پیچھے تھے گاؤں کے کوّے

تم نے توڑی محاورے کی ٹانگ
لکھ کے "ہاتھوں کے اڑ گئے کوّے"

کائیں کائیں کبھی، کبھی کوکو
ہیں یہ مخلوط نسل کے کوّے

مرگ ہم جنس کا لئے ہوئے غم
کھودنے آئے ہیں گڑھے کوّے

کس کو اچھا کہیں غلط دونوں
سر پھری آندھی باولے کوّے

تار برقی کو چوم کر حامد
واصل حق کئی ہوئے کوّے

رباعیات[١]

شمس الرحمٰن فاروقی

(١)

عشاق کی مجلس میں ہے کچھ اور قرار
کچھ عشق کی مے کا دوسرا ہی ہے خمار
جو علم کہ سیکھتے ہیں مکتب میں لوگ
کار دیگر ہے عشق ہے دیگر کار

(٢)

جب پاس ہو تو نہ سوؤں میں یاری سے
دوری میں تری پھر جاگوں زاری سے
سبحان اللہ جاگوں ہر شب لیکن
کیا فرق ہے بیداری میں بیداری سے

(٣)

سنگیں دل کی رات میں زاری بھر دے
دل پر ہیں مرے گھاؤ جو کاری بھر دے
جیبیں ہیں مری مال سے خالی یا رب
اب اپنے کرم سے ان میں یاری بھر دے

(٤)

گونجے ترے اسم سے تو کیا در کیا راغ
خوشبو نہ اڑے تو کیا ہے جنگل کیا باغ
روشن ہو تو کیا شمع ہے کیا گل کیا داغ
چھن جائے گلا تو بلبل کیا کیا زاغ

(٥)

سچا وہی سورما جو تنہا نہ بچے
وہ پیڑ بھی کیا پیڑ جو طوفاں میں بچے
خنجر وہ جو پتھر کے جگر میں اترے
خون اس کو کہیں گے ہم جو ہندی سا بچے

١؎ رباعی ١ اور ٣ مولانائے روم سے ترجمہ ہے۔

ٹی۔ایس۔ایلیٹ

مترجم : حبیب حق

تو مرتکب ہوا ہے
زنا کا۔ مگر وہ کوئی اور دیس تھا
اور پھر یہ بھی ہے کہ وہ لونڈیا مر چکی ہے
—مالٹا کا یہودی (از کرسٹوفر مارلو(۱۵۶۴-۱۵۹۳)

(۱)

دسمبر کی دوپہر کے دھوئیں اور کہرے کے درمیان
سماں خود سے مرتب ہو جاتا ہے—جیسا کہ ایسا لگتا ہے کہ ہوتا رہتا ہے۔
اس کے ساتھ 'میں نے اس دوپہر کو تمھاری خاطر خالی رکھا ہے'
چار موم شمعیں تاریک کمرے میں'
چار ہالۂ نور اوپری چھت پر'
جولیٹ کے مقبرہ کا ماحول
تیار ان امور کی بابت جو کہی جائیں گی' یا نہ کہی جائیں گی'
ہم کہ ہم کہیں یہ 'تیار تھے کہ سنیں تازہ ترین پولش سے
ابتدائی موسیقی' کو اس کے بال اور انگلیوں کے سرے
اتنے مانوس' کہ یہ شوپاں' میرا خیال ہے کہ اس کے قلب کو زندہ
محض دوستوں کے درمیان کیا جائے
جو کہ دو ہوں یا تین' اور اس شگوفے کو نہ مس کریں گے
جسے کہ مسلا جاتا ہے اور پوچھا جاتا ہے ایوان موسیقی میں'
—اور یوں گفتگو بہکتی ہے
ارادۂ خفیف اور ہوش مندانہ تاسف کے درمیان
وائلن کے مدھم سروں کے ذریعہ
دور کے کورنیٹ کے ساتھ ملی ہوئی
اور ہو جاتی ہے شروع
'میرے دوست' تمھیں پتہ نہیں کہ میرے لئے یہ کتنے اہم ہیں'
اور کس قدر' ہاں ہاں کس قدر کمیاب اور تعجب انگیز بات یہ کہ پائی جائے
ایک زندگی میں ایسی کمری خلاقی' اس قدر یہ اور وہ
(کیوں کہ درحقیقت میں اسے پسند نہیں کرتی ... آپ کو پتہ ہے؟ آپ نابینا تو
نہیں! آپ کس قدر ہوشیار ہیں!)
ایک ایسا ہمدم مل جائے جس میں ایسی خصوصیات ہوں
جس کے پاس ہو' اور بخش سکتا ہو
ان خصوصیات کو جن پر دوستی کی بنیاد ہے
اس امر کی کس قدر وقعت ہے جب میں تم سے کہتی ہوں—
ان دوستیوں سے قطع نظر—زندگی' ہائے' کیسی بدخوابی!'

وائلن میں کوک بھرنے کے دوران

اور للکار
بے سرے کورنیٹ کے
میرے سر میں فضول سا دھما دھم شروع ہو جاتا ہے
جو کہ احمقانہ طور پر اپنی سنگیت بجائے چلا جاتا ہے
مَن موجی یک سُرا پن
جس میں کم از کم ایک غلط سُر' موجود ضرور ہے—
ہم ذرا کھلی فضا میں آئیں' تمباکو کے نشہ میں'
عمارات قدیم کی توصیف کریں
تازہ واقعات پر مذاکرہ کریں'
گھنٹا گھر سے اپنی گھڑیوں کو درست کریں
اور پھر آدھ گھنٹہ بیٹھ کر شراب کے گھونٹ لیں

(۲)

اب جب کہ بنفشہ کے پھول کھل چکے ہیں
وہ اپنے کمرے میں بنفشہ کا ایک گل دستہ رکھتی ہے
اور ایک کو اپنی انگلیوں سے مروڑتی ہے جب کہ باتیں کرتی ہوتی ہے
ہاں' میرے دوست' تمھیں پتہ نہیں' تمھیں پتہ نہیں'
زندگی ہے کیا' تم جو اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے ہو'
(بنفشہ کے ڈنٹھل کو آہستگی سے مروڑتے ہوئے)
تم اسے خود سے بڑھنے دیتے ہو' تم اسے بڑھنے دیتے ہو'
اور جوانی ظالم ہوتی ہے' پشیمانی کا شائبہ نہیں ہوتا
اور ان حالات پر مسکراتی ہے جسے دیکھ نہیں سکتی'

میں یقینی طور پر مسکراتا ہوں
اور چائے پیتا چلا جاتا ہوں

پھر بھی ان اپریلی غروب آفتاب کے ساتھ' جو کہ کسی طرح یاد دلاتے ہیں
میری درگور زندگی کو' اور موسم بہار کے پیرس کو'
میں ناقابل فہم حد تک سکون محسوس کرتی ہوں' اور دیکھتی ہوں کہ دنیا
بڑی دلکش اور جواں ہے' آخر کار'
آواز لوٹ آتی ہے جیسے کہ مستقل طور پر تُر سے عاری
ٹوٹنے والی ثلن سے اگست کی دوپہری میں :
'مجھے ہمیشہ سے اطمینان رہا کہ تم سمجھتے ہو
میرے احساسات کو' پورا یقین ہے مجھے کہ تم محسوس کرتے ہو'
تم غیر ضرر پذیر ہو' تم میں کوئی خلقی کمزوری نہیں
تم ترقی کرتے جاؤ گے' اور جب تم حادی ہو جاؤ گے
تو تم کہہ سکو گے : اس مقام تک کئی ایک آکر ناکام رہے ہیں۔
لیکن میرے پاس جو کچھ بھی موجود ہے' ہاں جو بھی ہے' میرے دوست
دینے کے لئے' کیا تم مجھ سے قبول کر سکتے ہو؟
محض دوستی اور دردمندی
اس سے جو کہ اپنے سفر کے خاتمہ پر ہے؟'
میں یہاں بیٹھی رہوں گی' اور دوستوں کو چائے پلاتی جاؤں گی...'
میں اپنی ٹوپی سنبھالتا ہوں' کیوں کر میں محض بزدلانہ تبدیلیاں ہی لا سکتا ہوں

اس پر جو کچھ بھی اس نے مجھ سے کہا ہے؟
آپ مجھے کسی بھی صبح باغ میں پائیں گے
کومک اور کھیلوں کے صفحات کو پڑھتے ہوئے
میں خصوصی طور پر ان امور پر غور کرتا ہوں
کہ ایک انگریز نواب زادی اسٹیج پر جا رہی ہے
ایک یونانی ایک پولش رقص میں قتل کیا گیا ہے
ایک اور بینک کے غابن نے اقبال جرم کیا ہے
میں اپنے حواس سلامت رکھتا ہوں
میں خود اعتمادی پر قائم ہوں
سوائے جب کہ گلی کا ایک پیانو گھٹیا اور استعمال شدہ
رٹنا شروع کرتا ہے کوئی گھسا پٹا عام گیت
جب کہ سنبل کی خوشبو باغ سے پھیلتی ہے
ان اشیا کی یاد دلاتے ہوئے جنھیں دوسرے لوگوں نے چاہا ہے
کیا یہ تصورات صحیح ہیں' یا کہ غلط؟

(۳)

اکتوبر کی شب نازل ہوتی ہے' اولیں طور پر لوٹتے ہوئے
سوائے ایک خفیف احساس کے ذرا دقت سی محسوس کر رہی ہے
میں زینے چڑھتا ہوں' اور دروازے کے ہتھے کو گھماتا ہوں

اور محسوس کرتا ہوں کہ اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چڑھ کر آیا ہوں۔
'چنانچہ تم غیر ملک جا رہے ہو' اور تم واپس کب تک آؤ گے؟
لیکن یہ تم محض بے کار سوال ہے۔
تمھیں تو خود بھی پتہ نہیں کہ تم کب تک واپس آؤ گے'
تم جاننے کے لئے وہاں بہت کچھ پاؤ گے'
میری مسکراہٹ نوادرات کے درمیاں مصنوعی لگتی ہے
'شاید آپ مجھے لکھیں'
میری خود اعتمادی ایک لمحے کے لئے بلند ہوتی ہے'
یہی وہ امر ہے جس کا اندازہ میں نے لگایا تھا
'میں ادھر کئی بار سوچ رہی تھی
(لیکن ہماری شروعات ہمارے اختتام کو نہیں جان سکتی !)
ہم کیوں کر آپس میں دوست نہ بن سکے'
میں اس فرد کی مانند محسوس کرتا ہوں جو مسکراتا ہے اور پہلو بدلتے ہوئے یک بیک
اپنے جام میں کچھ بڑبڑاتا ہے۔
میری خود اعتمادی پسپا ہوتی ہے' ہم سچ مچ تاریکی میں ہیں
'ہر کسی نے یوں ہی کہا ہے' ہمارے سارے دوستوں نے'
سبھوں کو اعتماد تھا کہ ہمارے احساسات ہو جائیں گے آپس میں
بہت ہی قریب ! میں خود بمشکل تمام سمجھ سکتی تھی۔
ہمیں اس معاملے کو قسمت پر چھوڑ دینا چاہئے۔
تم لکھو گے' کم از کم۔
غالباً بہت دیر نہیں ہوئی ہے۔
میں یہاں بیٹھی رہوں گی' اپنے دوستوں کو چائے بڑھاتے ہوئے'
اور میں ہر ایک بدلتی ہوئی صورتوں کو مستعار لوں
تاکہ مناسب اظہار کر سکوں... ناچو' ناچو
رقص کرتے ریچھ کی مانند'
طوطے کی طرح بلکار کرو' بندر کی مانند بڑبڑاؤ۔
ہم کھلی فضا میں جائیں' تمباکو کے نشہ میں---
بہرحال ! کیا ہوا اگر وہ کسی دوپہری میں فوت کر جائے
دوپہر جو کہ خلیجی اور دھوئیں سے بھری ہوگی' شام زرد اور گلابی ہوگی'
وفات پا جائے گی اور مجھے ہاتھوں میں قلم پکڑے بیٹھا چھوڑ جائے گی
جب کہ مکانوں کی چھتوں پر دھوئیں اترتے ہوں گے'
شک میں مبتلا' ایک عرصے تک
نہ جانتے ہوئے کیا محسوس کروں یا یہ کہ کیا میں سمجھ سکا ہوں
یا تو عقل مند یا غبی' سست یا انتہائی تیز...
کیا ان سب باتوں کے علاوہ' وہ کامیاب نہیں رہی؟
ایسی موسیقی' فوت ہوتی گراوٹ' کے ساتھ کامیاب رہا کرتی ہے۔
اور اب جب کہ ہم موت کی باتیں کر رہے ہیں---
کیا میرے لئے یہ ممکن ہے کہ میں مسکراؤں؟

THE SILKEN KNOT : پریم کمار نظر، مترجم : بھوپندر پریہار
رائٹرز ورکشاپ، کلکتہ • قیمت : سو روپے

یہ کتاب ممتاز شاعر پریم کمار نظر کی اکتالیس غزلوں کے انگریزی ترجموں پر مشتمل ہے۔ ترجمے معروف ادیب بھوپندر پریہار کی خلاقانہ کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی تقریظ میں غزل گوئی کی نئی روایت اور جدید دور میں اس کی مقبولیت کے اسباب اور امکانات کے تناظر میں پریم کمار نظر کی غزل گوئی پر تبصرہ بھی ہے۔

پریہار نے پہلی غزل کے ترجمے کے لئے TRANSLATION اور دیگر چالیس غزلوں کے ترجمے کے لئے، TRANSCREATION کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اردو میں موخرالذکر کے لئے عام طور پر آزاد ترجمے کی اصطلاح رائج ہے اور اول الذکر کے لئے، جیسا کہ ظاہر ہے، ترجمہ۔ لیکن آج کل آزاد ترجمہ بھی ترجمے کی ہی اصطلاح میں استعمال ہوتا ہے۔ پریہار نے دونوں اقسام کو الگ الگ طور پر استعمال کرکے یہ واضح ضرور کیا ہے کہ غزل کے ترجمے میں ہیئت کا التزام بہت مشکل ہے جب کہ آزاد ترجمے کی صورت میں اشعار کی بلاغت اور معنی آفرینی کے اظہار کے امکانات نسبتاً زیادہ ہیں۔

بعض اوقات مترجم کے لئے ایک ہی لفظ مسائل کا پہاڑ بن جاتا ہے۔ غالب کے قصیدے صبح دم دروازۂ خاور کھلا میں بھی لفظ کھلا بیسیوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایسے اشعار کے ترجمے جب کہ ہیئت کا التزام بھی ملحوظ ہو، وقت طلب ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر بھوپندر پریہار نے "خالی" ردیف والی غزل کا ترجمہ بھی آزاد کیا ہوتا تو وہ TRANSCREATION کی حیثیت سے کامیاب ہو سکتا تھا۔

نظر کے چند اشعار اور ان کے ترجمے کی مثالیں توجہ طلب ہیں :

حق پرستی کی صدا دیتے ہو بازار کے بیچ
چن دئے جاؤگے تم بھی کسی دیوار کے بیچ

YOU KNOW THE PRICE
THE REWARD
THE LAURELS
YOU WILL WIN FOR DARING
TO SPEAK OUT THE TRUTH
HEMLOCK STONES THE CROSS

نظر میں گھومے ہمیشہ سے ایک ہی صورت
زباں پہ آئے سدا ایک ہی کتاب کا نام

THERE IS ALWAYS ONE FORM SEE
THERE IS ALWAYS ONE WORD I ULTER

چاروں طرف بچھائے گا پانی کی چادریں
ایسا کہاں کا وہ جو فریب سراب دے

SHE WILL WRAP YOU IN CASCADES OF WAVES
SHE IS NOT AN ILLUSION YOU WILL CHASE

مذکورہ بالا مثالوں سے نظر کی شاعری کے انداز اور بھوپندر پریہار کی ترجمہ نگاری کے فن سے ہم کسی قدر واقف ضرور ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا میں تراجم کو کچھ زیادہ ہی آزاد سمجھتا ہوں۔ بہرحال، سب تراجم کم و بیش رواں اور کانوں کو بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

چھبیسویں غزل کے آخری شعر کے ترجمے کے ضمن میں ایک نکتہ غور طلب ہے۔ ہماری شاعری میں خزاں اور بہار دو ہی موسموں کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے برخلاف انگریزی میں بہار کے لئے SPRING اور SUMMER اور خزاں کے لئے AUTUMN اور WINTER استعمال ہوتے ہیں۔ اس تناظر میں مندرجہ ذیل ترجمہ ان انگریزی داں حضرات کے لئے جو ہندوستان ایران کے بہار و خزاں کے تصورات سے ناواقف ہیں، مشکل پیدا کر سکتا ہے:

WE SANG THE REQUIEM FOR THE SPRING
THIS WAS OUR PREAMBLE TO AUTUMN

انگریزی زبان و ادب کے قاری کے لئے SPRING کے بعد SUMMER آنا چاہئے اور اس کے بعد AUTUMN اس لئے SPRING کا نوحہ لازمی طور پر خزاں کی آمد پر منتج نہیں ہوتا۔ اسی لئے شاعری کو بالعموم اور غزل کو بالخصوص محمت بہ تہذیب کہا گیا ہے۔ اس سلسلے میں TARGET LANGUAGE تہذیبی روایت کا لحاظ ازبس ضروری ہے۔ مندرجہ بالا ترجمہ بطور انگریزی نظم کامیاب ضرور ہے، لیکن ممکن ہے ہر جگہ ایسا نہ ہو سکے۔

رائٹرز ورکشاپ جیسے موقر ادارے سے شائع شدہ اس انتخاب کے ذریعہ غیر اردو داں حلقوں تک ایک ممتاز جدید غزل گو شاعر کے کلام کو پہنچانے کے لئے بھوپندر پریہار ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

تقی حسین جعفری

کہتی ہے خلق خدا

• "شب خون" ت ۲۰۰ ملا۔ آل احمد سرور کی تخلیق "اپنی نظر تو ہوگی" کے علاوہ فاروقی کی غزل، ان کے مضمون "استفسار، انکار اور نئی نشانیات: غالب کے چند پہلو" اور پہلے صفحے پر "نئی ادبی تھیوری کا مستقبل" سے محظوظ اور مستفید ہوا۔
"شب خون" نے ربع صدی سے کچھ اوپر کی عمر میں ۲ شماروں کی منزلیں طے کرلی ہیں۔ اس کامیاب سفر کے لئے فاروقی صاحب کی ہمت اور محنت قابل صد مبارکباد ہیں۔ "شب خون" نے اس ربع صدی پر محیط زندگی میں جدید ادبی رجحانات کو قائم کرنے کا جو رول ادا کیا ہے اس کے باعث "شب خون" خود اپنے آپ میں ایک تحریک بن گیا۔ اس تحریک کے دو اہم پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر "شب خون" نہ ہوتا تو کئی جدید شعراء نہ ہوتے یا اپنی حیثیت قائم نہ کرپاتے۔ دوسری بات یہ کہ شب خون نے جدید وقدیم کی معرکہ آرائیاں نہ چھیڑی ہوتیں تو ہم اس کلاسیکی ادبی ادراک سے محروم رہتے جو جدید شعری جمالیات کی اساس ہے۔

علی گڑھ — آصف نعیم

• اپنا مراسلہ اور آپ کا جواب دونوں پڑھ ڈالے اب اس کے بارے میں کچھ کہنا نہیں ہے۔ البتہ غالب پر آپ کا مضمون بہت پسند آیا میں نے اسے جی لگا کر پڑھا۔ غالب کے استفہامی پہلو پر آپ نے شاید پہلی بار روشنی ڈالی ہے بہت سی باتیں ایسی بھی آپ نے لکھی ہیں جنہیں وسیع تر پس منظر اور پیش منظر سے جوڑا جاسکتا ہے اور نئی معنویت پیدا کی جاسکتی ہے۔ کئی جگہ آپ بالکل میرے قریب آگئے ہیں جیسے دیوان غالب کا پہلا شعر، آپ نے بھی سے استفہام کو پکڑ لیا ہے۔ میں نے بھی اپنے ایک مضمون TRADITION AND RATIONALISM IN GHALIB میں اس شعر کو روایتی تصوف سے انحراف قرار دیا ہے کیونکہ غالب اس شعر میں اپنی یا انسان کی EXISTENTIALISM پر سخت احتجاج کر رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ نے شاید غالب پر میرے کام کو زیادہ توجہ طلب نہیں سمجھا یا پھر پڑھنے کی فرصت نہ ملی ہو۔ میں تو آپ کو اپنی کتابیں بھیجتا رہا ہوں۔ ... سے میں برابر غالب پر ہی لکھتا رہا ہوں جس کا نصف سے زیادہ حصہ اردو میں بھی ہے۔ اگر آپ ابھی غالب پر مزید لکھنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو بتایئے میں اپنے مضامین اور کتابوں کی تفصیل آپ کو بھیج دوں اس میں میرا فائدہ زیادہ ہے بقول طالب آملی کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند لیکن لکھنے والے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے موضوع کے متعلق جو کچھ لکھا جاچکا ہے اس سے واقفیت حاصل کرے خواہ تائید کرے یا تردید۔[1]

• "شب خون" پڑھ کر بڑا مزہ ملتا ہے۔ منظوم اور نامنظوم دونوں حصے جو غزل سب سے آخر میں چھپی ہے وہ کتنی کاری اور تیز ہے۔

بولتے بولتے چپ ہو جانا
اور کہنا کہ نہیں کچھ بھی نہیں

خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ بحث کا برا نہ ماننا چاہئے۔ آپ کو راز کی بات بتاؤں۔ سردار جعفری اور جذبی ابھی دونوں زندہ ہیں۔ ترقی پسندی کا عروج تھا جذبی نے سردار سے میرے سامنے کہا تھا کہ مجھ پر کچھ لکھتے کیوں نہیں ہو۔ ع
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی۔ اس کے بعد سردار نے جذبی پر عاشقانہ شاعری کرنے پر اعتراض وتنبیہ وتہدید سے بھرا ہوا مضمون لکھا تھا جسے جذبی پڑھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ اور جواب میں ایک نظم بعنوان "اپنے نقاد سے" کہی تھی جو ان کے کلام میں آج بھی موجود ہے۔ تو جناب دوستی صرف من تراحاجی بگویم کا نام نہیں ہے۔ بقول اخیر شیرانی۔ ع آہ وہ لطف بالنواع عتاب آلودہ۔

دیوہ شریف — وارث کرمانی

---

[1] جناب وارث کرمانی کی بیش تر تحریریں میری نظر میں ہیں۔ غالب کے یہاں ژ لفش فریادی ہے . . . ' کے حوالے سے) انھوں نے جس احتجاج کی نشاندہی کی ہے اس سے انکار نہیں لیکن میری بحث استفہام سے تھی۔ غالب کا استفہام علیاتی EPISTEMOLOGCAL کارروائی بھی ہے۔ (جیسا کہ میں اور جگہ عرض کرچکا ہوں۔) فرمان فتح پوری نے غالب کے یہاں استفہام کا جائزہ لیا ہے۔ لیکن میرا نقطہ نظر شاید کچھ مختلف ہے۔ (فاروقی)

• "شب خون" شمارہ ۲۰۶ پڑھا۔ غالب پر آپ کا مضمون نہایت دلچسپ اور
بصیرت افروز ہے۔ سرور صاحب کی نظم۔ عادل منصوری کی مختصر نظمیں اور منشا یاد
کی کہانی "مینار بابل" بھی پسند آئیں۔ آپ نے کسی قدر کم معروف شاعروں کی
بہت سی غزلیں ایک ساتھ شائع کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ اچھا ہے
کیوں کہ اس طرح ایک شاعر کے شعری اسلوب اور صلاحیتوں کا اندازہ
اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ اب اس پر بھی وہ زیادہ متاثر نہ کر سکیں تو یہ آپ
کا قصور نہیں۔ خطوط کا حصہ بھی دلچسپ ہے۔

آپ نے میرا ترجمہ کیا ہوا ڈراما شائع کیا۔ شکریہ۔ لیکن اس میں کتابت
کی کئی غلطیاں در آئی ہیں۔ سب کی طرف تو اشارہ کرنا ممکن نہیں اور ضروری
بھی نہیں کیونکہ اس قسم کی غلطیوں کو ذہین لوگ خود ٹھیک کر لیتے ہیں۔ لیکن
کیوں کہ ہمارے یہاں سب لوگ اطالوی زبان سے واقف نہیں۔ اس لئے ایک
غلطی کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ جو اس ڈرامے کے عنوان میں ہے۔ اس
ڈرامے کا اطالوی عنوان COSI E SI VE PARE ہے پرچے
میں دونوں جگہ E غائب کر دیا گیا ہے۔ براہ کرم اس کی اطلاع دے دیں۔

زاہدہ زیدی
علی گڑھ

• شہزاد منظر کا مقالہ "پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال" حاصل
شمارہ ہے۔ موصوف نے جس عرق ریزی اور باریک بینی سے نصف صدی کی تنقید کا
جائزہ پیش کیا اس کی داد نہیں دی جا سکتی ہے۔ کئی تاریخوں کو پڑھنا، سمجھنا اور
اسے سمیٹنا اور پھر خود ایک تاریخ بنا کر پیش کرنا غیر معمولی عمل ہے۔ پورے
مقالے میں ایک بہاؤ اور جمالیاتی شان بھی ملتی ہے جس کی بنا پر مقالے کا لطف
دو آتشہ بن گیا ہے۔ جن کو تنقید سے دلچسپی نہیں ان کی میں بات نہیں کرتا لیکن
جو تنقید لکھتے ہیں اور پڑھتے ہیں وہ اس سے مزید کسب نور حاصل کریں گے
تمام تعصب سے پاک ہو کر کچھ کر گزرنا بھی آج کے دور میں جوئے شیر لانا ہے۔
سو شہزاد منظر نے یہ کام بھی کر دیا۔ قابل مبارکباد ہیں یہ کہ انھوں نے اپنے
عہد کی نئی تنقید لکھ کر ادب اور زندگی کے تمام رجحانات اور میلانات کو اپنی
گرفت میں لے لیا اور آپ کو بھی مبارک ہو کہ آپ نے اس مقالے سے فیض حاصل کرنے
کا موقع ہمیں فراہم کیا۔

شب خون کا تازہ شمارہ ۲۰۷ ہر پہلو سے دلکش ہے "نئی ادبی تھیوری
کا مستقبل" پر آپ کا اشہب قلم "شب خون" کے صفحات پر کئی شماروں سے گامزن
ہے۔ آپ کی اس عمدہ پیش کش میں کئی موڑ، پہاڑیاں اور چوٹیاں ہیں۔

ایک زمانے کے بعد آل احمد سرور صاحب کی نظم پڑھ کر کم
اظہار الحق صاحب اپنی غزلوں میں اچھوتے نظر آئے۔ آپ کی
بھی غضب کی ہے۔ زاہدہ زیدی کا ڈراما "عالم تمام حلقۂ دام خیال"
بہت اچھوتا ہے۔ غالب کے مصرعے سے انہوں نے اطالوی ڈراما کے بہت
سے مناظر خلق کئے ہیں لیکن اس کے لئے استقلال چاہیئے۔

ظفر ہاشمی
جمشید پور

• "شب خون کا ۲۰۰ واں شمارہ دیکھا۔ مبارکباد۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ خصوصی
شمارہ ہوتا۔ مشمولات میں سب سے اہم اور موقع۔ غالب پر آپ کا مضمون (استفسار،
انکار اور نئی حسّیات ... چند پہلو) ہے۔ غالب کے سوالات کو آپ نے آج
کے استفہام اور تجسس پر منطبق کر کے انہیں بیسویں صدی کے استعارے سے تعبیر
کیا ہے یہ اس مضمون کا سب سے اہم نکتہ ہے اور بحث طلب بھی۔ غزلوں میں
محمد اظہار الحق اور سہیل احمد زیدی، کرشن کمار طور اور غلام حسین ساجد سنجیدہ
متوجہ کرتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں (زیدی کو چھوڑ کر) بیان کی سطح پر جو یکسانیت
ملتی ہے وہ موضوعاتی تنوع سے بھی حظ اندوز نہیں ہونے دیتی۔ مرحوم ثروت حسین
عرفان صدیقی، عتیق اللہ، اظہار الحق اور غلام حسین ساجد وغیرہ کو ایک
ساتھ پڑھیں تو یہ احساس کچھ زیادہ پریشان کن ثابت ہوتا ہے۔ خاکسار کی رائے
میں اب یہ وقت نئے لوگوں کی جانب سنجیدگی سے توجہ دینے کا ہے۔ جمال اویسی
کی غزلوں کی موجودگی بذات خود اس بات کی موید معلوم ہوتی ہے لیکن ان کا
اپنا کوئی رنگ ہے نہ آہنگ۔ کاش آپ نئے لوگوں کو ذرا تسلسل و تواتر
سے "شب خون" کے صفحات پر جگہ دیتے۔ شاید ان میں سے کوئی تازہ ہوا کے
جھونکے کی طرح ہماری طبیعت کو بحال کر دے۔ سہیل احمد زیدی کی غزلوں
کو منزہ بحری اور طفل زمین راس نہیں آئی۔ یوں بھی سادگی بغیر پرکاری کے
کب مزہ دیتی ہے۔ آل احمد سرور کی نظم اچھی ہے۔ گو کہیں کہیں بند ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔

اصغر محمود
دربھنگہ

• شمارہ ۲۰۰ ملا۔ آل احمد سرور کی نظم اور سہیل احمد زیدی کی غزلیں خاص
طور پر پسند آئیں۔ سرور صاحب کی نظم نے متاثر کیا اس پر خود مجھے تعجب سا ہوا
زیدی اب غزلیں پیش کر رہے ہیں اپنے جگر کے لہو سے صحرا کو سبز کر رہے ہیں۔
آخر میں ایڈورڈ سعید کی بات۔ چھوٹیئے اور فن کو ہمارے وہ نام نہاد دانشور
کہاں گئے۔ وہی مظلوموں، غریبوں اور مزدوروں کے پیغمبران پے تو فقط
تقدیر تو اے چرخ گرداں تفو

محمد آباد

محترم میں کانپور کے کچھ معزز لوگوں سے سنا ہے کہ "شب خون" میں انہیں لوگوں کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں جو کسی کی سفارش لگاتے ہیں یا جو آپ کی تعریف (بہ الفاظ دیگر خوشامد) کرتے ہیں۔ میں ان دونوں چیزوں سے مستثنا ہوں۔ میرا تو یہ خیال کہ کلام میں اگر جان ہے تو اسے "سفارش" یا "خوشامد" کی ضرورت نہیں ہے[1]۔

عرفان نجمی
کانپور

• [2] غالب اکیڈمی (دہلی) میں آپ کے مضمون[2] کے حوالے سے تین باتیں میں نے عرض کی تھیں۔ اول یہ کہ محمد امان نثار کا دیوان موجود ہے۔ دوم یہ کہ تذکروں میں جو اشعار نقل کئے گئے ہیں ان کی صورت دیوان میں ذرا مختلف ہے۔ تیسری بات یہ تھی کہ دیوان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ محض میر کے شعر پہ شعر نہیں کہتے تھے بلکہ عام رائے کے برعکس وہ بذات خود ایک اچھے شاعر تھے۔ آپ نے پوچھا کہ دیوان کہاں ہے بھائی؟ میں تو خود اس کی تلاش میں ہوں۔

محمد امان نثار کا دیوان استاذی مغیث الدین فریدی کو بہت پہلے دہلی میں دستیاب ہوا تھا۔ اس کے اوراق بہت بوسیدہ حالت میں ہیں۔ دہلی یونیورسٹی لائبریری کے ایک صاحب (جن کا نام میرے ذہن سے اتر گیا ہے) کی مدد سے انہوں نے اسے محفوظ کر لیا ہے۔ چنانچہ متعدد ملاقاتوں میں امان نثار کے اشعار میں انہیں سے سنتا رہا ہوں۔ مجھ میں جدید غزل کی جو تھوڑی سی شدبد ہے وہ بڑی حد تک فریدی صاحب کی دین ہے۔ چنانچہ امان نثار کے بارے میں بھی وہ مجھے اسی طرح بتاتے رہے ہیں جیسے کبھی وہ کلاس روم میں حسرت، فانی اور اصغر کو پڑھایا کرتے تھے۔ چند ماہ قبل انہوں نے امان نثار پر اپنا ایک مضمون سنایا تھا۔ میں نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اسے ماہنامہ "آجکل" کو بھیج دیں۔ فریدی صاحب پھر اس کے بعد دہلی نہیں آئے ہیں۔ اس لئے مجھے اس کا علم نہیں ہے کہ انہوں نے اپنا مضمون کہاں بھیجا۔ البتہ پروفیسر امیر عارفی صاحب صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کا کہنا ہے کہ واپس جانے سے قبل غالباً انہوں نے کسی سے امان نثار کے دیوان کو شائع کرنے کی بات کر لی ہے۔

قیصر شمیم
دہلی

• شمارہ بابت دسمبر ۱۹۹۶ (شمارہ ۱۹۸) صرف ۶۴ صفحات پر شائع ہوا ہے "شب خون" کی تاریخ میں میرے خیال سے ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ ساقی فاروقی اور تسلیم الہٰی زلفی کی غزلیں پسند آئیں۔ یہ پورا شمارہ شاعری پر محیط ہے۔ تبصروں کی عدم موجودگی شاق ہے۔ مظہر امام صاحب نے ن۔ م۔ راشد کی نظم کو سمجھنے کے لئے جن نکات کو بیان کیا ہے ان کی رو سے "خودکشی" کا سمجھنا سہل ہو جاتا ہے۔

شمارہ ۲۰۰ میں آپ کے مضمون کے حوالے سے کہنا ہے کہ پہلے مجھے لگتا تھا کہ آپ غالب پر میر کو ترجیح دیتے ہیں۔ مگر اب جو آپ کے مضامین آرہے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ غالب کو ایک خاص نظر سے دیکھ رہے ہیں آپ کا مضمون کئی اعتبار سے قیمتی ہے۔ آپ نے ایک نکتے پر بار بار زور دیا ہے کہ غالب ہمارے آخری بڑے کلاسیکی شاعر ہیں اور ان کی شاعری مغربی شعریات کی روشنی میں بھی بڑی اور جدید شاعری ہے۔ یہ نئی بات غالب فہمی کے لئے نیا راستہ بناتی ہے۔

جمال اویسی
دربھنگہ

• شمارہ ۱۹۹ میں جناب حمید الماس کی نظمیں بہت اچھی ہیں۔ غزلوں میں عتیق اللہ، محمد احمد رمز اور خالد عبادی نے متاثر کیا۔

نثار احمد نثار
سستی پور

• "شب خون" ۱۹۸ میں جناب شہزاد احمد، رفیق راز، اسعد بدایونی اور محترم زبیر شفائی کی غزلیں مرغوب نظر ثابت ہوئیں۔ جناب شفیق فاطمہ شعریٰ، حبیب حق اور رشید افضال کی نظمیں جدیدیت، تازہ فکری اور معاصر حسیات کے اعتبار اپنی مثال آپ ہیں۔

حبیب احمد ساجد
ویلور

• نیاز نے "مشکلات غالب" لکھ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور چونکہ ان کا علم مغربی شعریات کے تعلق سے نہ ہونے کے برابر تھا لیکن مشرقی شعریات کی حد تک انہوں نے بھی غالب کے کلام کی تہہ کھولنے کی کوشش کی لیکن اپنے مفروضہ "استفسار، انکار، اور نئی معانیات۔ غالب کے چند پہلو" غالب کو ۲۰۰ سال بعد ہم سے اور معنی کی تہوں کے زیریں پہلوؤں سے جس طرح آپ آشنا کرا رہے ہیں وہ اس عہد میں ایک خاص انفرادیت کا مالک ہے۔ اس سلسلے کو جاری رکھیے۔ بڑے کام کی چیزیں سامنے آرہی ہیں۔

---

[1] یہ خط بے اصلاح اور بے جواب شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)
[2] مطبوعہ "سوغات" ۱۱۔ یہ مضمون لکچر کی صورت میں غالب اکیڈمی میں پیش کیا گیا تھا۔ مکتوب کی معلوماتی اہمیت کے پیش نظر اسے یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔ ش۔ ر۔ فاروقی۔

محمد اظہار الحق کی غزل کے مطلع میں "کر ڈالا" صوتی اعتبار سے گراں گزرتا ہے ؎

سنہری تتلیوں سے کس نے مجھے بیدار کر ڈالا
دریچہ کھل رہا تھا خواب میں دیوار کر ڈالا

قیصر شمیم کا مضمون بہت عمدہ ہے۔ انہوں نے جو سوالات اٹھائے ہیں وہ قیصر شمیم کا حق ہیں۔ انتظار حسین تو رواداری میں بات کہہ گئے جس کی کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ افسانوں میں "مینار بابل" بہت ہی خوبصورت افسانہ ہے۔ صادق کی نظمیں اور ایک مدت کے بعد عادل منصوری کی نظمیں پڑھنے کو ملیں، اچھی لگیں بہر حال شب خون کا ہر تازہ شمارہ ذہن کے دریچوں کو معطر کر دیتا ہے۔

دہلی　　　　　　امیر عارفی

• "شب خون" نے ۲۰۰ شماروں کی عمر پوری کر لی ہے۔ میری دلی مبارکباد قبول کریں۔ شب خون نے اپنے ابتدائی چند شماروں کے بعد ادب کے تعین سمت کا کام شروع کر دیا تھا۔ اور آج وہ اس راہ پر تیس سال کے مسلسل اور تھکا دینے والے صبر آزما سفر کے بعد بھی اس کے حوصلوں اور دم خم میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ خدا کرے اس کا یہ سفر اسی یقین و اعتبار کے ساتھ مستقبل میں بھی جاری رہے اور حقیقی اور معنی آفریں ادب کی نہ صرف ترویج بلکہ ادب کی حمایت اور اقدار کی دریافت میں یہ آج ہی کی طرح آئندہ برسوں میں بھی سرگرم رہے۔

شب خون ۲۰۰ میں آپ کی غزل میں جو گھلاوٹ اور فقیرانہ لے ہے اس نے دل موہ لیا اور آپ کا یہ نیا نیا انداز بہت ہی بھلا لگا ہے۔

رانچی　　　　　　پرکاش فکری

• زاہدہ زیدی کا ترجمہ کردہ ڈراما پسند آیا لیکن ڈرامے میں جو غزل انہوں انہوں نے شامل کی ہے وہ تو اصل میں نہ ہو گی۔ اصل میں جو نظم تھی اس کا ترجمہ دینا تھا۔ اس ڈرامے سے اطالوی معاشرت بھی ظاہر نہیں ہوتی۔ اصل کو اس طرح منقلب کرنا کہ اس کی کوئی شناخت نہ رہے، درست نہیں۔ مسز یونزا کے چہرے پر موتی نقاب تھی مگر صبا پنہاں کر اسرار فاطمہ کے چہرے پر باریک نقاب ڈال دی گئی۔ گیا

محمد منصور عالم

• باقر مہدی نے مطلع کیا ہے کہ ایک نظم بعنوان 'مقتو' جو شب خون ۱۹۶ میں ان کے نام سے شائع ہوئی ہے ان کی نہیں ہے

ہم خود حیرت میں ہیں کہ یہ غلطی کیسے ہو گئی۔ چونکہ کسی اور شاعر نے اس نظم پر اپنا دعویٰ بھی نہیں بھیجا ہے اس لئے اب یہ کہنا ہمارے لئے ممکن نہیں کہ وہ نظم دراصل کس کی ہے۔ ہم جناب باقر مہدی سے معذرت کرتے ہیں۔

الٰہ آباد　　　　　　شب خون

اخبار و اذکار

• اس سال کا ساہتیہ اکیڈمی انعام الیاس احمد گدی کو ان کے ناول "فائر ایریا" پر ملا ہے۔ وہ ہر طرح اس کے مستحق تھے۔ ہم انھیں مبارکباد دیتے ہیں۔

• حکومت پنجاب کا شرومنی انعام اس بار نامور افسانہ نگار رتن سنگھ کو ملا ہے ہم انھیں مبارکباد دیتے ہیں اور ان کی درازیٔ عمر اور صحت کے لئے دعا کرتے ہیں۔

• اس بار کا گیان پیٹھ انعام بنگال کی مشہور ناول نگار خاتون مہاسویتا دیوی (عمر ۷۰ سال) کو ملا ہے۔ ان کے ناولوں کا بنیادی موضوع بنگال اور بہار کے قبائلی طاقتوں کی زندگی ہے۔ وہ سیاست اور سماجی تحریکات اور سب کو ایک ساتھ موضوع سخن بناتی ہیں۔ ہم انھیں اور بنگال کے ادیبوں کو اس اعزاز پر مبارکباد دیتے ہیں۔

• مشہور سائنس داں اور سائنسی مصنف کارل سیگن CARL SAGAN باسٹھ سال کی عمر میں مر گیا۔ اس نے زمانۂ نوجوانی ہی میں مریخ کی سطح کے بارے میں بعض ایسے نظریات پیش کئے جو حیرت انگیز تھے لیکن بعد میں صحیح ثابت ہوئے۔ سیگن نے سائنسی افکار کو تحریر اور فلم کے ذریعہ عام کرنے میں بڑا کردار ادا کیا تھا۔ اس کی کتابوں میں THE DRAGONS OF EDEN اور BROCA'S BRAIN بہت مشہور ہوئیں اس کے سائنسی ناول COSMOS پر مبنی ٹی۔ وی سیریل بہت مقبول ہوا تھا۔

• کیٹس کا مکان جس میں اس نے اپنے آخری سفر اٹلی (یعنی انگلستان سے ہجرت) سے پہلے کے دو سال گزارے تھے، اب آخر لندن کارپوریشن نے لیا ہے۔ اس میں قائم میوزیم اور خود اس مکان کی دیکھ بھال اب وہ کارپوریشن خود کرے گی۔

• گزشتہ دنوں شاعروں کے مقبول شاعر اور ملک اور بیرون ملک میں الہ آباد کی نمائندگی کرنے والے غزل و نعت گو جناب راز الہ آبادی اللہ کو پیارے ہوئے۔ ہم ان کے غم میں ماتم گسار ہیں۔ (عمر ۷۰ سال)

• ابھی وحید اختر کا غم تازہ تھا کہ منظر سلیم کا داغ لگا۔ منظر سلیم زمانۂ نوجوانی ہی سے ترقی پسند تحریک سے متعلق ہو گئے تھے۔ وہ لکھنؤ کی اس نسل سے تھے جو مجاز اور کیفی اعظمی کے ساتھ اور ان کے زیر اثر پروان چڑھی تھی۔ منظر سلیم نے مجاز پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ ان کے مزاج میں اعتدال تھا۔ ترقی پسندی ان کے فکری رجحان تو تھی لیکن ادبی یا غیر ادبی سیاست سے انھیں واسطہ نہ تھا۔ کئی سال بیرون ملک رہنے کے بعد جب وہ لوٹے تو ان کے کلام میں داخلیت اور ایک طرح کی محزونی نمایاں تھی۔ وہ اپنا مجموعہ مرتب کر رہے تھے کہ پیک اجل نے انھیں آلیا۔ مرحوم نہایت منکسر المزاج اور دوست دار شخص تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔

• وجاہت علی سندیلوی کے بعد شجاعت سندیلوی بھی واصل بحق ہوئے۔ وہ محتاط محقق اور نیک فطرت استاد تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ ہم تمام مرحومین کے ماتم دار ہیں۔

اس بزم میں

اختر یوسف کی نعتیں شکتی سیریز کی نظمیں کہلاتی ہیں۔ اس سلسلے کی گذشتہ نظمیں شب خون ۱۸۹ میں شائع ہوئی تھیں۔

ثروت حسین کی دردناک موت کی اطلاع ہم شائع کر چکے ہیں۔ ان کا غیر مطبوعہ کلام ہمیں آصف فرخی اور صبا اکرام کے توسط سے ملا ہے۔

جیلانی بانو کے افسانوں کا کلیات "تریاق" مکتبۂ دانیال، کراچی سے چند دن ہوئے شائع ہوا ہے۔

راشد انور راشد جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں۔ انٹرویو الیاس احمد گدی کو ساہتیہ اکیڈمی کا انعام ملنے پر بطور خاص لیا گیا تھا۔

شمس الرحمٰن فاروقی کو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں دو سال کے لئے خان عبد الغفار میموریل چیئر کے لئے پروفیسر مقرر کیا گیا ہے۔ ان کا تعلق اردو، فارسی، انگریزی اور اسلامیات کے شعبوں سے ہوگا۔

غیاث متین ان دنوں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں اردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں۔

مشتاق احمد نوری چند دن پہلے تک بہار اردو اکیڈمی کے سکریٹری تھے اب وہ یہاں سے سول سروس میں واپس چلے گئے ہیں۔ ان کا افسانوں کا مجموعہ "بند آنکھوں کا سفر" چند مہینے پہلے شائع ہوا ہے۔

مرزا سعید الظفر چغتائی ان دنوں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں سائنس فیکلٹی کے ڈین ہیں۔

نثار احمد نثار سستی پور میں رہتے ہیں اور ان اطراف کے معروف شاعر و ادیب میں شمار ہوتے ہیں۔

وزیر آغا کی نظموں کا انتخاب و انگریزی ترجمہ (ستیہ پال آنند) بعنوان Poems MILD & MELLOWS حال ہی شائع ہوا ہے

سوسیور پر تنقید : جان ہالووے (JOHN HOLLOWAY)

گذشتہ شمارے میں سوسیور کے اس قول کا ذکر ہوا تھا کہ تصور کچھ نہیں ہے صرف ایک قدر VALUE ہے جو اسی کے مشابہ اقدار کے تعلق سے متعین ہوتی ہے۔ ان اقدار کے بغیر ان میں کوئی معنویت نہ ہوگی۔ یعنی سوسیور نے قدر VALUE اور معنویت SIGNIFICATION کو خلط ملط کر دیا ہے۔ ہالووے کہتا ہے کہ یہ الفاظ وضاحت سے عاری ہیں لیکن ان کی بنیاد پر فلسفۂ لسان میں ایک بہت قوی روایت کی بنیاد رکھ دی گئی جس کی رو سے فکر مشتمل ہے زبان کو استعمال کرنے پر، اور زبان ایک خود معرف SELF DEFINING نظام ہے یعنی زبان کی تعریف زبان کے اندر ہی ہے۔ یعنی کسی زبان کے الفاظ اپنے معنی ایک دوسرے سے حاصل کرتے ہیں نہ کہ خارجی دنیا کے اشیاء کے حوالے سے۔ چنانچہ رولاں بارت نے ۱۹۶۴ میں کہا کہ " وہ بے نام سی چیز "SOMETHING" جو دال SIGN کو استعمال کرنے والے کا مقصود ہے نہ تو شعور کا پیدا کردہ عمل ہے اور نہ کوئی حقیقی شے۔ اس کی تعریف ایک نیم تکراری انداز میں، اور دال۔ مدلول کے عمل کے ہی حوالے سے ہو سکتی ہے۔" آٹھ سال بعد فریڈرک جیمی سن نے اسی بات کو مزید زور دے کر کہا۔ اس نے لکھا ہے کہ " خود سچائی کا روایتی تصور اب تقویم پارینہ بن جاتا ہے کیوں کہ فکر کا عمل تو بس اس بات پر منحصر رہ جاتا ہے کہ ہم دال کے اعتبار سے مدلول کا توافق کرتے جائیں۔" غور کریں کہ جیمی سن کے خیال میں مدلول کے لحاظ سے دال کا توافق ADJUSTMENT نہیں درکار ہے۔ (یعنی اگر کوئی شخص بلی کو کتا کہے تو ہم یہ اعتراض نہ کریں کہ جس جانور کو ہم بلی قرار دیتے ہیں اس کا دال کتا نہیں ہے۔ بلی مدلول ہے لیکن اس کا دال کچھ بھی ہو سکتا ہے) ٹیرنس ہاکس TERENCE HAWKES نے اور آگے جا کر کہا کہ " ہم جس دنیا میں رہتے ہیں وہ ہماری ایجاد کردہ ہے۔" بعد میں اس نے اپنی پوزیشن ذرا سی بدلی اور کہا کہ " جو (دنیا) ہمیں ودیعت ہوئی ہے ہم اس میں ترمیم کرتے اور اسے دوبارہ تعمیر کرتے ہیں۔" کیتھرین بلسی CATHERINE BELSEY کہتی ہے کہ زبان کے ذریعہ " ہمیں مقررہ وجودی اکائیاں نہیں بلکہ سماجی طور پر تشکیل کردہ مدلول ہی حاصل ہوتے ہیں۔ بوسانکے BOSANQUET اور بریڈلی BRADLEY کی عینیت سے ان خیالات کی مشابہت کے باوجود کیتھرین بلسی کی نظر میں " تجربی ۔ عینی " طریق کار لائق اعتراض ہے، یہ ایک مجوبہ ہے۔

ماخوذ از BEYOND STRUTURALISM

مرتبہ WENDELL HORRIS

(۱۹۹۰)

مدیر، پرنٹر، پبلشر: عقیلہ شاہین — سرورق: چودھری ابن النصیر — جلد: ۳۱ شمارہ: ۲۰۳
فون نمبر: ۶۲۲۶۹۳، ۶۲۳۱۳۷ — سرنامہ: عادل منصوری — ترسیل زر کا پتہ: ۳۱۳۔رانی منڈی، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
مطبع: بہار گو پریس الہ آباد — خطاط: افراح کمپیوٹر، دلی — خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۱۳
فی شمارہ: پندرہ روپئے — بارہ شمارے: ایک سو ساٹھ روپئے — الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

ترتیب و تہذیب

شمس الرحمٰن فاروقی

اقبال مجید

SEEKING WHAT IS TRUE IS NOT

SEEKING WHAT IS DESIRABLE

ALBERT CAMUS

(1913- 60)

شوکت جہاں نے غسل خانے میں کپڑے اتارے۔ کملی پیٹھ کے پیچھے اپنا داہنا ہاتھ لے گئی۔ پیٹھ بالکل صاف اور چکنی تھی' وہ انگلیوں سے اس جگہ پر ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھی کہ کیا واقعی کسی چھپکلی نے اپنے چاروں پنجے گاڑ رکھے ہیں اور وہ مسلسل اس کی پیٹھ سے چپکی ہوئی ہے۔ وہ اپنے بھائی قدرت اللہ سے بہت بار قدرت کے اندر بیٹھے ہوئے کسی بچکانے خوف کا ذکر تو کر چکی تھی لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ ایک دن وہ خود اٹھتے بیٹھتے آتے جاتے اپنی پیٹھ پر خوف کی ایک چھپکلی کو چپکا ہوا محسوس کرے گی۔

لیکن پیٹھ تو بالکل صاف ستھری تھی۔

پھر یہ کیا ہے جو کبھی تو لگاتار چپکا رہتا ہے اور کبھی چھوٹ کر فرش پر دور جا گرتا ہے اور اس کو لگتا ہے جیسے وہ کسی خوفناک بوجھ سے چھٹکارا پا گئی ہو۔ چبھن کی چبھن سے اور ایک مسلسل بے چینی سے بھی چھٹکارا پا گئی ہو۔ اب وہ سیدھی لیٹ سکتی ہے' بلا خوف کروٹ بدل سکتی ہے۔ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ سکتی ہے کہ پیٹھ بالکل صاف ہے۔

"جلدی فیصلہ کرو شوکت جہاں"

شوکت کے کانوں میں کئی دنوں سے یہ آواز آ رہی تھی۔

عورت جانتی ہے۔

عورت اس بو کو بہت فاصلے سے سونگھ لیتی ہے۔

"جلدی فیصلہ کرو شوکت جہاں۔"

شوکت شاور کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ پانچ منٹ تک یوں ہی کھڑی رہی۔ بدن خشک کیا' معمولی پاوڈر چھڑکا۔ کپڑے تبدیل کرتے وقت اسے اپنے بھائی قدرت کا خیال آیا...

"عجیب پاگل لڑکا ہے۔" وہ بڑبڑائی "کہتا ہے... ۸۰ فی صدی مسلمان تم کو یہ نہیں بتا پائیں گے کہ انھیں کیا چاہئے۔" بھاڑ میں جائے۔ وہ مسکرائی۔ مجھے بھی نہیں معلوم کہ مجھے کیا چاہئے؟ وہ بالوں میں کنگھا کرنے آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی۔ اس کے سامنے کھڑی شوکت جہاں اس سے کہہ رہی تھی...

جلدی فیصلہ کرو شوکت جہاں...

(۲)

قدرت اللہ ایک دن سویرے سویرے عبدل بکر قصاب کی دکان پر آدھا پاؤ بوٹیاں لینے کے انتظار میں بیٹھا جمائیاں لے رہا تھا۔ پاس ہی لکڑی کی پرانی

تپائی پر کٹ چائے بھی دھری تھی۔ پہلے تو پاس پڑوس کے لوگوں کو اس بات پر بڑی حیرت رہی کہ ایسا مسلمان جو پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہو حافظ ہو' اور پابندی سے روزہ بھی رکھتا ہو' وہ ہندو فرقہ پرست پارٹی کے تنخواہ دار کی حیثیت سے مسلمانوں کے خلاف اخبارات میں زہر کیسے انڈیلتا ہے۔ عبدل نے ٹوہ لینے کے لئے قدرت کو ٹٹولا۔

"میاں آپ اب بھی اسی اخبار کا کام کر رہے ہو...؟"

"ہاں۔"

عبدل کا خیال تھا کہ قدرت اللہ جیسے سیدھے سادے آدمی کو سیاست میں نہیں آنا چاہئے تھا اور اگر آ ہی گئے تھے تو کم سے کم ایسی پارٹی سے تو دور ہی رہنا چاہئے تھا۔ قدرت اللہ کسی سے کیا کہتے۔ قدرت اللہ خدا سے ڈرتے تھے' سماج سے ڈرتے تھے' اخبار کے مالک سے ڈرتے تھے' ادھار دال چاول دینے والے کرانہ مرچینٹ سے ڈرتے تھے۔ قاعدے سے انھیں بکر قصاب سے بھی ڈرنا چاہئے تھا۔

"ارے میاں" عبدل نے چٹکی لی "اپنے مالک سے کہئے کہ شیروانی پر پورے بٹن لگانے کے تو پیسے دے دیا کرے" قدرت اللہ نے سنی ان سنی کر دی۔ عبدل منہ پھٹ تھا دھیرے سے بولا "ایک بات سمجھ میں نہیں آتی میاں۔"

"کیا؟" قدرت نے کہا۔

"یہ جو آپ کر رہے ہیں نا۔"

"کیا کر رہے ہیں؟" قدرت نے استفسار کیا۔

"یہی اخبار میں جو آپ کر رہے ہیں کیا اس پر آپ کو سچے دل سے ایمان ہے۔؟"

"یعنی؟"

"یہ کہ اللہ کو گواہ کرکے کہہ سکتے ہیں آپ کہ آپ ٹھیک ہی کر رہے ہیں۔؟"

آس پاس والے یہ سن کر دھیرے سے مسکرائے جیسے کہہ رہے ہوں میاں قدرت تم سے زیادہ عاقل تو یہ جاہل بکر قصاب ہے۔ پارٹی کا وہ اردو اخبار بس تھوڑا سا ہی چھپتا تھا' زیادہ تر مفت تقسیم ہوتا تھا۔ دراصل اس وقت کے حالات میں پارٹی اوپری دل سے اس کوشش میں تھی کہ مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقے کے سامنے کبھی کبھی اپنی پوزیشن صاف کرتی رہے۔ پارٹی نے قدرت

کو لائن دی کہ ایسے مسلم دانشوروں کے بیانات تلاش کر کے سامنے لائے جو مسلمانوں کو ٹکراؤ کی سیاست سے دور رکھنا چاہتے ہوں۔ اسی لئے اس نے بمبئی میں چھپنے والے ایک مضمون سے کچھ سطریں اپنے اخبار میں نقل کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"ہندوستانی مسلمان کی پہچان میں یہاں کی مٹی کی بو باس بہت ضروری ہے۔ خالص اسلامی تشخص جس پر بعض علما اور سیاسی رہنما اصرار کرتے ہیں کوئی شے نہیں ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ایسے سیاسی مفادات کا ساتھ نہ دیں جو خالص اسلامی شناخت پر جارحانہ حد تک زور دیتے ہیں اور ایسی شناخت کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔"

جلد مسلمانوں نے اس عبارت پر یہ الزام لگایا کہ اس بیان کے چھاپنے والوں کی نیت ہی ٹھیک نہیں ہے' کیونکہ ہندو فرقہ پرست اس وقت تک آرام سے نہیں سو سکتے جب تک مسلمان اپنی مذہبی اور تہذیبی پہچان کو قائم رکھنے کی ضد پر اڑا رہے گا۔ پارٹی کے تھنک ٹینک نے قدرت اللہ کو طلب کیا مشورہ دیا قرآن شریف سے کچھ نکالیں۔ قدرت کے پاس اتنا وقت کہاں تھا اس نے صلح پسند علما کے جاری کئے گئے ایک حوالے سے کام چلاتے ہوئے ایک ترجمہ پیش کر دیا۔

"ہم نے تم میں سے ہر ایک فرقے کے لئے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ مگر اس نے تم کو جو کچھ دیا ہے اس میں وہ تمہاری آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ سو نیک کاموں میں (ایک دوسرے سے) سبقت لے جاؤ۔" یہ چھپنا تھا کہ قدرت کے دفتر میں ہی کھسر پھسر ہونے لگی۔ دوسرے دن پھر قدرت کی طلبی ہوئی تین لوگ سامنے گردن اکڑا کر بیٹھے تھے' فائرنگ شروع ہو گئی۔

"جناب آپ نماز نہ پڑھیں' روزہ نہ رکھیں' حج کو نہ جائیں' لیکن ساری زندگی نیکیاں کرتے رہیں' اور نیکیاں کرنے میں دوسرے سے سبقت بھی لے جائیں تو قیامت کے دن آپ کا کیا ہو گا' کیا آپ مسلمان گردانے جائیں گے؟۔ بخشش ہو گی آپ کی؟۔" حافظ قدرت اللہ بڑے عذاب میں پڑ گیا۔ دھیرے سے بولا "ٹھیک ہے کل سے آپ کسی کا انتظام کر لیجئے۔ میں نہیں آؤں گا۔" لیکن دوسرے دن پھر دفتر والے اسے گھر سے پکڑ لائے۔

"لیکن اس وقت آدھ پاؤ بکرے کا گوشت تلواتے ہوئے بکر قصاب کے جملے پر آس پاس کے لوگوں کی شرارت بھری مسکراہٹ سے قدرت اللہ کے دل پر کچھ ایسی چوٹ لگی کہ وہ بات کو در گزر نہ کر سکا۔ دھیرے سے بولا۔

"عبدل----- اک بات بتائے گا مجھے۔؟"

"پوچھو۔"

چاہا کہ وہ بات ٹال جائے' لیکن قدرت کامیاب نہ ہوا۔ اس کوشش میں قدرت اللہ کا منھ لال ہو گیا۔ دل کے کسی کونے میں پتہ نہیں کب کا دبکا ہوا غصہ جاگ اٹھا۔ وہ عبدل بکر قصاب سے تھرتھرائی ہوئی آواز کے ساتھ بولا۔

"میں جو پوچھنا چاہتا ہوں وہ تو سچ سچ بتا دے گا بھلا؟"

"ہاں پوچھو۔" عبدل نے آواز بلند کی تو قدرت بولا۔

"جس مرد کو تیری ماں تیرا باپ بتاتی ہے' کیا تو اللہ کو گواہ کر کے کہہ سکتا ہے کہ وہی تیرا باپ ہے؟"

"قدرت اللہ بکر قصاب کی دکان سے اتر کر دو قدم نکل چکا تھا' تب تک بکر قصاب یہ طے نہیں کر پایا تھا کہ قدرت نے کوئی عام بات پوچھی ہے یا اس کی ماں کو گالی دی ہے۔ لیکن جب عبدل کو لوگوں نے سمجھا دیا تو پھر تو عبدل کی عید ہو گئی۔ اس نے قدرت اللہ پر ہی نہیں' بلکہ سارے محلے پر یہ روشن کر دیا کہ بکر قصاب کو چوا کہنے اور انھیں ذلت کی نظر سے دیکھنے والے میاں لوگوں کے پرانے دن اب لد چکے ہیں۔ ادھڑی ہوئی شیروانی جس کے دو بٹن ٹوٹے ہوں' پہن لینے سے کوئی شریف اونچی ذات' یا اعلیٰ طبقے کا نہیں ہو جاتا۔ ایسی شیروانی تو میونسپلٹی کا چپراسی بھی پہن لیتا ہے اور کوئی بٹن ٹوٹا بھی نہیں چھوڑتا۔ عبدل نے چلا چلا کر سب کو یہ بھی بتا دیا کہ وہ قدرت اللہ کے آبائی ٹھیکرے نما مکان کو مع بیوی بچوں کے کھڑے کھڑے نیلام کرا سکتا ہے۔ ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کھڑی قدرت اللہ کی بیوی سے اس نے بڑی بے ہودگی اور دیدہ دلیری کے ساتھ کہا تھا۔

"اپنے زنخے میاں سے کہہ دینا... ایک بال برابر بھی نہیں ہے وہ..."

"آس پاس سب ہی شریف بستے تھے لیکن کسی نے عبدل سے یہ نہ کہا کہ پردہ دار عورتوں سے یوں مخاطب نہیں ہوتے۔ اس دن آس پاس کے سارے سفید پوش عبدل کے اس لہجے اور جملے کو سن کر کچھ دیر کے لئے اداس رہے۔ پھر ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھنے کا وقت آ گیا جس سے بات آئی گئی ہو گئی۔ شریف لوگ اپنے ٹی وی سیٹ کے بہت ممنون تھے کیونکہ جب بھی کوئی حادثہ یا واقعہ ان کی شرافت کے خون کو یکایک کھولا دیتا تو وہ چپ چاپ چھوٹے پردے کا بٹن دبا دیتے اور پل میں کوئی حسینہ ان کے کانوں میں اپنی کافرانہ اداؤں کے ساتھ "یہ دل اور ان کی نگاہوں کے سائے" کے ترنم ریز بول گھول کر ان کے غصے کو کافور کر دیتی اور وہ بھول جاتے کہ تھوڑی دیر پہلے کچھ ہوا تھا۔

"بعد میں عبدل نے قریشی برادری میں بھی یہ سوال اٹھا دیا۔ برداری کے چودھریوں نے معاملہ پڑھے لکھے قریشیوں تک پہونچایا تو ایک قریشی نیتا میاں عظیم قریشی بھی جو بارہ ماس کھدر کی ٹوپی پہنتے تھے' اور ڈاکٹر محمد اقبال کے اشعار بھی صحیح صحیح پڑھ لینا جانتے تھے' اس معاملے میں پھاند پڑے۔ میاں عظیم قریشی نے علامہ اقبال کے حوالے سے اپنی خودی کو اس قدر بلند کر لیا تھا کہ بڑے سے سرکاری بنگلے میں کرایہ ادا کئے بغیر برسوں سے مفت رہ رہے تھے اور خدا نے ان کی تقدیر بنانے سے پہلے ان سے اچھی طرح سے ان کی رضا بھی جان لی تھی' اس لئے مسلمانوں کو ان کے مومن ہونے میں اب کچھ بھی شک نہیں رہ گیا

تھا۔ وہ چیف منسٹر سے ملے اور معاملے کو سیاسی رنگ دیکر قدرت اللہ کے پیچھے پڑ گئے۔

قصابوں کا جلوس چیف منسٹر کے پھاٹک پر پہونچا۔

سب کو اندر بلایا گیا۔

"آپ کو اپنی برادری کے لئے کیا کیا چاہئے' ہمیں لکھ کر دیجئے۔ ہم پورا کریں گے۔" چیف منسٹر نے گرم توے پر اپنی روٹی سینکی۔

ادھر قدرت اللہ نے اپنی پارٹی کے نیتاؤں کو خبر دی۔ قدرت اللہ کی پارٹی کانگریسی سیکولر ازم کو ہمیشہ گالی دیتی تھی۔ اس کی پالیسی کے مطابق ایسا کوئی بھی قدم اٹھانا جس میں کسی پہلو سے بھی مسلمانوں کی بہبودی شامل ہو' دراصل مسلمانوں کو وقتی طور پر خوش کرنے والی چاپلوسی مانا جاتا تھا۔ پھر قدرت کی پارٹی نے ابھی یہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے یا چھوڑ دے؟ اس لئے مسلمانوں کے معاملات کو برتنے کے لئے نچلی سطح پر پارٹی کے پاس کوئی احکامات بھی موجود نہیں تھے۔ اس سارے واقعے کو قدرت کے ذاتی معاملے سے تعبیر کیا گیا۔ اور طے کیا گیا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو پارٹی کے وقار کا مسئلہ نہ بنایا جائے۔

قدرت کی بہن کو فون پر رپورٹ ملتی ہی رہتی تھی۔ وہ پرتاپ شکلا کے پاس گئی اور عظیم قریشی کو اس معاملے سے دور رکھوانا چاہا۔ پرتاپ شکلا جانتا تھا کہ عظیم قریشی سے کچھ بھی کہنا بیکار ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے اندر ہی اندر اس حد تک دشمن تھے کہ دن کا آدھا حصہ پارٹی کے اندر ایک دوسرے کی جڑیں اکھاڑنے میں گزار دیتے' لیکن صبح ہوتے ہوتے وہ جڑیں پھر اپنی اپنی زمین پکڑ لیتیں۔ شوکت نے کئی چکر پرتاپ شکلا کے گھر کے لگائے تاکہ بکر قصاب کو نیچا دکھایا جاسکے۔ مگر حاصل کچھ نہ ہوا۔ آخر کو وہ الٹا بھائی پر ہی برس پڑی۔

"تم سمجھتے تھے کہ ہندوؤں کی پارٹی میں گھس کر تم اپنی عزت بچالو گے؟ ایک معمولی چکوا تمہارے گھر پر گالیاں بک کر چلا گیا اور تمہارے پارٹی والے کچھ نہ کرسکے۔"

"کون لے گیا ہے مجھے ہندو پارٹی میں جانتی ہو۔؟" قدرت نے سوال کیا۔

"تمہارا خوف لے گیا ہے۔" شوکت چنگھاڑ سے بولی۔

"خوف گالی نہیں ہے شوکت۔" قدرت اللہ کچھ سنجیدہ ہوگیا۔ "خوف ہمیں ایک جہت بھی دیتا ہے۔"

"میں نہیں مانتی۔"

"میری مانو تو خوف کو اتنا بڑھاوا ملنا ضروری ہے کہ وہ ایک قوت بن جائے۔" شوکت بھائی کے سامنے خاموش بیٹھی ایک انجان سی الجھن میں اپنے پیر ہلاتی رہی اسے خیال آیا۔ پرتاپ شکلا نے کہا تھا۔

"سماجی شریف زادہ اپنے خوف کو اپنی مدافعت کے لئے استعمال کرتا ہے اور سیاسی حرام زادہ اپنے خوف کو جارحیت کے ہتھیار کے طور پر۔"

شوکت کو شاید پرتاپ شکلا کی یہ بات یاد بھی نہ آتی اگر اس کے بھائی قدرت اللہ کو اپنی ادھڑی ہوئی شیروانی پہن کر قریشی برادری کے سامنے نہ جانا پڑتا اور جاہل بکر قصاب سے معافی نہ مانگنا پڑتی۔ شوکت کے دل پر آرے چل رہے تھے۔ لیکن قدرت معافی مانگ کر اپنے کہنے کے مطابق خوش تھا۔ شوکت جانتی تھی کہ اس کا بھائی باپ کی پارٹی کی مخالف پارٹی میں کیوں گیا تھا؟ صرف اس لئے کہ باپ نے اسے بڑے بڑے کھانے کا طعنہ دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ قدرت بکر قصاب سے معافی مانگ سکتا ہے' لیکن باپ کے بستر مرگ پر بھی وہ اس سے ملنے نہیں جاسکتا۔ وہ کہتا تھا اسے کسی کی ضرورت نہیں۔ شوکت نے یہ بھی محسوس کرلیا تھا کہ بھائی نے سجدوں سے سر اٹھانے میں دیر کرنا شروع کردی تھی۔ تب شاید وہ رویا بھی کرتا تھا۔

(۳)

گرمی بہت تھی۔ دوپہر کو ویران کردینے والے جھکڑ باہر چل رہے تھے۔ شوکت جہاں پکی دیواروں والے ٹھنڈے کمرے میں بے خبر سو رہی تھی اس نیند میں اس نے خواب دیکھا۔ اس کا بوڑھا مرحوم باپ کھدر کا کرتا پہنے کسی شامیانے کے نیچے دریاں بچھوا رہا ہے' کوئی کانگریس نیتا تھوڑی ہی دیر میں تقریر کرنے آنے والا ہے۔ بڈھے کو فخر تھا کہ اس نے لال بہادر شاستری جی سے کئی بار ہاتھ ملایا تھا اور اسے خوشی تھی کہ بیلی کاپٹر پر بیٹھتے وقت اس نے گرم پانی کی بوتل اندرا جی کی پیٹھ کے پیچھے رکھی تھی کیونکہ ان دنوں وہ دن رات دورے کر رہی تھیں جس سے ان کی پیٹھ درد کرنے لگی تھی۔ پھر شوکت نے اسی خواب میں دیکھا کہ اس کے والد منہ لٹکائے گھر کے اندر گھس رہے ہیں۔ چہرے پر مایوسی ہے۔ وہ انگنائی میں آکر کھڑے ہوئے ہی تھے اور اپنی سانسیں برابر کر رہے تھے کہ شوکت کی والدہ نے ان پر سوال داغ دیا۔

"کہاں گئے تھے؟"

"کیا بتاؤں کہاں گیا تھا۔ آج چوتھا روز ہے برآمدے کی کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے۔ منتری جی کا انتظار کرتے کرتے۔"

"کیا کہتے ہیں۔ کیا ملتے بھی نہیں۔؟" بیوی نے ٹھوکا دیا۔

"ملے تھے"

"تو تم نے کیا کہا۔۔۔؟ گھی گھی کرنے لگے ہوگے۔ وقت پر منہ سے بول تو پھوٹا نہیں ہے تمہارے۔"

"کہہ تو چکا ہوں کہ قدرت اللہ کے لئے سستے غلے کی دکان کا پرمٹ دلوا دیجئے۔ مہربانی ہوگی آپ کی۔"

"تو۔۔۔۔۔؟"

"تو کیا۔۔۔۔۔ کل آنا' پرسوں آنا۔ آج چوتھا چکر تھا۔"

"شوکت جہاں کے والد مرتے مرگئے' اور کانگریس پارٹی کے جلسوں کی دریاں بچھانا نہ چھوڑیں' لیکن قدرت اللہ کو سرکاری غلے کی دکان کا پرمٹ نہ دلوا پائے۔ اور بیٹا یہ سوچتا ہی رہ گیا کہ بلیک میں شکر کی بوریاں بیچ کر وہ بھی اپنے دن پھیر لے گا۔ باپ نے روٹیاں توڑنے کا طعنہ دیا تو قدرت اللہ ہندو فرقہ پرستوں کا اخبار سنبھالنے چلا گیا۔ قدرت کے والد کے لئے اس سے بڑا صدمہ اور کیا ہو سکتا تھا؟ تو بھی بیٹے کا منہ نہ دیکھا۔

"فون کی گھنٹی بجی مرے تو شوکت جہاں کی نیند کھل گئی' خواب بھی بکھر گیا۔

"فون پر دوسری طرف ویدھاتک پرتاپ شکلا کی آواز تھی۔

"میں تم سے شادی کرنے کے لئے چاہوں تو آج ہی مسلمان ہو سکتا ہوں۔"

"اچھا---"

"ہاں اخباروں میں تصویر چھپوا کر اعلان کر سکتا ہوں کہ پرتاپ جی مشرف بہ اسلام ہو گئے"

"کیا واقعی؟"

"بالکل! پھر تم کو اپنی منکوحہ بیوی بنا کر کسی شریف زادے کی طرح تمہارے کھونٹے سے بندھا بھی رہ سکتا ہوں۔ پر میں یہ آسان کام نہیں کروں گا۔"

"اس دن شوکت جہاں پر ہنسی ہنسی میں یہ راز کھلا کہ ودھایک پرتاپ شکلا بھی گڑ تو کھانا چاہتے ہیں مگر گلگلوں سے پرہیز بھی ہے-- کیونکہ پرتاپ شکلا نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ وہ شوکت جہاں کی تھوڑی سی بالائی کھا کر ساری زندگی اس کی کھوج کو نگلنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

"ایسی صورت میں' میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟" شوکت جہاں نے شرارت کے ساتھ اپنی ہنسی روکتے ہوئے پرتاپ شکلا کو چھیڑا تھا۔ ادھر سے آواز آئی۔

"تم نے کشتی لڑنے والے پہلوانوں کو دیکھا ہے کبھی؟"

"دیکھا تو ہے۔"

"ان کے جسم پر لباس کیوں نہیں ہوتا جانتی ہو---؟"

"بتائیے۔" وہ بولی۔

"لباس داؤں پیچ لگانے میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔"

"تو---؟"

"مگر ہم ایسے پہلوان ہیں کہ جتنے زیادہ کپڑے پہنیں گے اتنے ہی زیادہ خطرناک داؤں پیچ استعمال کریں گے۔ ایسا کیوں ہے؟ جانتی ہو؟"

"آپ ہی بتائیے۔" وہ بولی۔

"اس لئے کہ ہم بدن سے نہیں' اپنی خباثت سے لڑتے ہیں۔ ہماری خباثت جتنی زیادہ پردوں میں رہے گی اتنی ہی گھاتک ہوتی جائے گی۔

"مگر آپ نے قدرت بھائی کو جو کیسٹ سنوانے کے لئے دیا ہے اس میں کوئی بھی بات ڈھکی چھپی نہیں سب کچھ کھول کر کہا گیا ہے۔"

"کونسا کیسٹ---؟" پرتاپ شکلا چونکا۔ "اچھا وہ والے کیسٹ! ہاں تمہارا بھائی جن زہریلے لوگوں کی روٹی کھا رہا ہے اسے سناؤ اور بتاؤ کہ یہ کرتوت ہیں ان زنخوں کے۔"

"آپ ہی کوئی ٹھیک ٹھاک نوکری دلوا دیجئے قدرت کو وہ وہاں سے چلا آئے گا۔"

پرتاپ نے بات ٹال دی' بولا۔ "کیسٹ ویسٹ میں نے تو سنے نہیں' کیا تم نے سنے؟"

"جی ہاں" شوکت بولی۔ "کچھ باتیں زبانی یاد بھی کر لی ہیں"

"جیسے؟"

"جیسے--- بھارت میں بابر بہت ہیں
ان کو ختم کرنے کا انتظام کر دیجئے
بسنے نہ پائیں رام ودروہیوں کی بستیاں
ایسی بستیوں کو شمشان کر دیجئے۔"

"ودھایک پرتاپ گوری چٹی' جگر جگر آنکھوں اور بانکی چتونوں والی لمبی اور چھریری شوکت جہاں کو جس کی مسکراہٹوں میں بجلیاں پسی تھیں' بہت دنوں سے یہ سمجھا رہا تھا کہ شوکت یہ نہ دیکھے کہ کانگریس ہی نہیں بلکہ کوئی بھی پارٹی کیا کر رہی ہے' اور مسلمانوں کو اس سے کیا توقعات تھیں اور وہ توقعات کتنی پوری ہو رہی ہیں اور کتنی نہیں؟ اور وہ کتنی سیکولر ہے اور کتنی فرقہ پرست؟ اور ملک کے مسائل کیا ہیں اور انھیں سلجھانے کے سلسلے میں کون کتنا ایماندار ہے اور کون کتنی قربانی دے رہا ہے؟ اور کتنا سچا اور کتنا جھوٹا ہے؟ ایسی باتوں سے وہ کوئی مطلب نہ رکھے اور اوپر اوپر سے بس پارٹی کی کاریہ کرتا بنی رہے اور ہر گھڑی اس موقعے کو استعمال کرے جو اسے دنیا بھر کے اصولی پچڑوں میں ڈالے بغیر اس کے سکھ سادھن فراہم کرنے میں مدد کر سکیں۔ کیونکہ جب تک وہ پارٹیوں کا تنتر سمجھے گی' عیش کرنے کی عمر نکل جائے گی۔ ایک بار وہ فون پر پھر یہی بولا۔

"تم مجھ سے پوچھتی ہو کہ تم میرے لئے کیا کر سکتی ہو---؟ تو میں تم سے پھر بھی کہوں گا کہ پہلے تم کچھ اپنے لئے کرو۔ کیونکہ سب اپنے اپنے لئے ہی کر رہے ہیں۔ میں خود بھی اپنے ہی لئے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے سے فرصت نہیں پاتا۔ اس لئے تم اپنے لئے فی الحال اتنا کرو کہ خوب بہت سے کپڑے پہن کر اپنی خباثت کو دھار دیتی رہو' کیونکہ تم زناتوں اور زنخوں کی بھیڑ میں ہو۔ یہ زنخے تمھیں ننگا تو کر دیں گے لیکن تمھاری اس نروسترتا کا سوا بھاوک سکھ نہ بھوگ پانے پر الٹا تمھیں ہی سنگسار بھی کروا لیں گے۔" پرتاپ اپنی بات کر

رہا تھا اور شوکت کان پر فون کا ریسیور لگائے جانے کہاں پہونچ گئی تھی۔

کیسے کیسے رنگ دکھاتا ہے وقت! ہائے اللہ۔ کیا میں وہی لڑکی ہوں۔ چودہ یا مشکل سے پندرہ برس کی لڑکی جو باپ کی گردن میں باہیں ڈالے اس کے منہ سے امام حسین کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وصیت کے ارشادات سنا کرتی تھی۔

"فرزند! دنیادار تو بھونکنے والے کتے اور پھاڑ کھانے والے درندے ہیں جو ایک دوسرے پر غراتے ہیں' طاقتور کمزور کو کھاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ بندھے ہوئے اونٹ ہیں جو نقصان نہیں کرپاتے' کچھ چھٹے ہوئے اونٹ ہیں جو ہر طرح کا نقصان کرتے پھرتے ہیں۔ نہ انکا کوئی گلے بان ہے اور نہ رکھوالا۔"

کیا میں وہی لڑکی ہوں۔

سر پر دوپٹہ' نظریں جھکی ہوئی' دل کے اندر عقیدت کی نرم پھواروں کا فوارہ سا چھوٹتا ہوا جب کہ میری عمر کی دوسری لڑکیاں کسی عورت کے بے ہنگم منہ پر نظر پڑ جائے تو اپنی ہنسی نہ روک پاتی تھیں۔

یا نبی سلام علیکا

یا حبیب سلام علیکا

پڑوس والی عورت باقی تمام عورتوں سے الگ' لفظ "سلام" کو کس طرح ادا کرتی تھی' جیسے کسی تکلیف میں ہو' اسے دیکھ کر سب ہی لڑکیاں ہنس دیتی تھیں۔ پوری محفل میں اس بے ادبی پر بعد میں سب کی خبر لی جاتی تھی لیکن شوکت پورا سلام بڑی تمکنت سے پڑھتی۔

باپ کے مردان خانے میں وہ میلاد کا حصہ لے کر چند مہمانوں کو تقسیم کرنے کے لیے پہونچی تو پہلی بار اس نے پرتاپ شکلا کو دیکھا تھا۔ لڈو کا پیکٹ اس نے پرتاپ کو بھی دیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی پرتاپ کی آنکھیں چمک سی گئیں تھیں۔

"بیٹی ہے میری۔ شوکت جہاں۔" باپ نے پرتاپ کو بتایا تھا۔ پرتاپ نے لڈو ہاتھ میں لے کر دوسرے ہاتھ کو شوکت کی کمر کے پیچھے لاکر تھوڑا اپنی طرف کھینچا اور پھر شوکت کے ماتھے کو چوم کر اس کے ایک گال کو تھوڑا سا تھپتھپایا۔ تب وہ تیس برس سے زیادہ کا نہ تھا۔ گورا رنگ' خوبصورت آنکھیں' ہلکے گھنگھروالے بال کھدر کے کرتے میں گریباں کے اندر چھاتی پر گھنے کالے بالوں کے گچھے۔ میں جھوٹ کیوں بولوں میں نے سوچا تھا' میرا دولہا اسی رنگ روپ اور کاٹھی کا اتنا ہی لمبا ایسے ہی مسکرانے والا ہونا چاہئے۔ وہیں پہلی بار میں نے ابا کے دوست شہباز خاں صاحب کی بیوی کو بھی اتنے مردوں کے بیچ پورے اعتماد سے بحث کرتے ہوئے سنا تھا۔ میرے اللہ کتنی معلومات تھی اس عورت کو! لوگ انھیں عائشہ بہن کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ کیا پیشانی تھی ان کی اور کیا کٹورا ایسی شاداب' جگاتی اور جاگتی ہوئی آنکھیں تھیں اور ان کی وہ ریشمی سی نظریں' میں تو حصہ تقسیم کرکے کمرے میں رکتی ہی نہیں' لیکن ان

کی زندگی سے بھرپور اور کھنکتی ہوئی آواز نے مجھے روک لیا۔ وہ بات کوئی بہت اونچی ہی کر رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں۔

"ہر ۲۵ منٹ پر ایک بڑے جرم کا ارتکاب۔

"ہر ۲۴ گھنٹے میں تین قتل' پانچ زنا بالجبر اور تین ہزار چھوٹی چوریاں۔

"یہ ہے ہماری دنیا کا مہذب ملک' امریکہ!"

"زنا بالجبر کسے کہتے ہیں" میں نے سوچا تھا ابا سے پوچھوں گی۔ ہائے اسی وقت میری بدقسمتی کہیں مجھ پر ہنس رہی تھی' لیکن اب تو زندگی کے تیس سال گزار کر وہ ٹیلیفون پر پرتاپ شکلا سے مخاطب ہے۔ وہ غصے میں پرتاپ سے بولی "مجھے ننگا کئے جانے کی تمھیں بہت فکر ہے نا!"

"ہاں" وہ بولا۔ اسی لمحے شوکت نے پرتاپ کو موٹی سی گالی دی۔ کھلی آواز میں ماں کی گالی۔ جس پر پرتاپ نے قہقہہ لگا کر اسے بتایا کہ اس کو مزہ آگیا۔ پھر دونوں نے فون رکھ دیا۔

شہری کاریہ کرتاؤں کی سطح پر پارٹی میٹنگ میں جب وہ شوکت جہاں سے ملا تو اس نے جہاں شوکت کو اس پہلو سے آگاہ کیا کہ راج نیتی میں آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت اپنے کو طرم خاں سمجھنے لگے' وہیں اس نے شوکت جہاں کی یہ تعریف بھی کی کہ فون پر اس نے پرتاپ کو جس قدر نربھے ہو کر اور نسنکوچ طریقے سے پورا منہ کھول کر شرمائے بغیر شبدوں کو مضبوطی سے ادا کرتے ہوئے ماں کی جو گالی دی تھی' اسے سن کر پرتاپ کو پوری امید ہو چلی ہے کہ جس راہ پر وہ شوکت جہاں کو لگانا چاہتا ہے' شوکت بڑے آرام سے اس راستے پر لگ جانے کے پورے جراثیم اپنے اندر رکھتی ہے۔ پرتاپ جب ادھر ادھر دوسرے لوگوں میں الجھ گیا تو شوکت ایک کونے میں زمین پر بچھے سفید فرش پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر کی اس مہلت میں آخر اس نے خود سے پھر سوال کیا۔

"کیا میں وہی لڑکی ہوں۔۔۔؟" اور اسے اپنی زندگی کے انیسویں سال کی وہ دوپہر یاد آئی جب وہ گھر کے سونے برآمدے میں چارپائی پر ہاتھ کہیں اور پیر کہیں ڈالے بے خبر سو رہی تھی۔ پسینے سے ململ کا باریک کرتا اس کے سینے سے چپک گیا تھا اور اوپر کے ہونٹ کی لکیر اور ناک کے درمیان جوان گلابی جلد پر ہلکے ہلکے سنہرے روئیں پسینے کی بوندوں سے تر تھے' اور اس کی شلوار کے چڑھے ہوئے ایک پائنچے سے اس کی سڈول اور دمکتی سی پنڈلی کھلی ہوئی تھی۔ اچانک اس کے سینے پر کاغذ کی گولی سی آکر گری اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ سامنے دیوار کے روشندان سے جو پڑوسی کے گھر کے لئے بھی مشترک تھا دو آنکھیں اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔

"ہائے اللہ" وہ گھبرا کر اٹھی' ادھر ادھر دیکھا۔ روشندان سے آنکھیں جلدی سے ہٹ گئیں۔ شوکت نے کاغذ کی وہ گولی سنبھالی' لوٹا اٹھا کر بغیر غلش

والے پاخانے میں گھسی۔ کاغذ پر عشقیہ عبارت تھی' اس کے بالوں کو ہیمامالنی کے بالوں سے زیادہ خوبصورت بتایا گیا تھا۔ اس کا دل دیر تک دھڑ دھڑ کرتا رہا۔ وہ اسی شام بھاگی ہوئی اپنی سہیلی مشتری کے پاس گئی۔ مشتری لڑکے سے خوب واقف تھی بجازے میں کپڑے کی دکان تھی اس کی۔ پھر ایک اور سہیلی رقیہ رازدار بنی۔ وہ دونوں شوکت کو گھیر کر بجازے لے گئیں' دیکھا ایک دکان پر وہی دو آنکھیں تھیں۔ شوکت گھبرا کر مشتری سے بولی۔

"ہائے اللہ اشفاق بیٹھا ہے۔" اشفاق نے ان سب کو دیکھا' دکان کے اندر بلایا' جیسے سب پہلے ہی سے طے تھا۔ ٹھنڈی بوتلیں منگائیں' پھر آئے دن بجازے کے کام نکالے جانے لگے۔ آئس کریم' چاٹ' گلاب جامنیں' پھر تینوں دوپہر بارہ بجے والے شو میں بھی پہونچنے لگے۔ اشفاق کے پاس والی سیٹ پر شوکت کو بٹھایا جاتا۔ اندھیرا ہوتے ہی اشفاق کی انگلیاں شوکت کی بائیں چھاتی کے پاس سرسراتیں۔ شوکت مزاحمت کرتی مگر اشفاق اور ڈھیٹ ہو جاتا تو شوکت یکایک رقیہ سے اپنی سیٹ بدل لیتی۔ اگلی بار سے اشفاق کے دائیں بائیں رقیہ اور شوکت کو بٹھایا جاتا۔ مگر تھوڑی دیر بعد شوکت اپنی جگہ سے اٹھ کر درمیانی راستے میں روٹھ کر کھڑی ہو جاتی۔۔ وہ بھلا کہاں جانتی تھی کہ بس چند ہی روز بعد وہ زندگی کے سب سے بھیانک تجربے سے گزرنے والی ہے۔ جہاں لفظ ختم ہو جاتے ہیں' بیان بے صدا ہو جاتا ہے' اظہار اپنی بے بسی اور گونگے پن پر دیواروں سے سر ٹکراتا ہے۔

شوکت کے کانوں میں پرتاپ کی آواز آئی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"جی۔۔۔" وہ ایک دم سے اچھل پڑی۔ اور اسے یاد آیا کہ وہ کہیں اور نہیں پارٹی میٹنگ میں ہے' اور اس کے سر پر تاپ شلا کھڑے ہیں۔۔ اس نے پھر شوکت سے سوال کیا۔

"کس سوچ میں ڈوبی تھیں؟"

"کچھ نہیں" شوکت دھیرے سے بولی۔ جلسہ گاہ خالی ہو چکی تھی' دو چار کام کرنے والے ہی رہ گئے تھے۔

"ہم دونوں کو ملتے ہوئے چار برس تو ہو گئے ہوں گے۔ ہے نا۔۔؟" پرتاپ نے جاننا چاہا۔

"مجھے یاد نہیں۔" شوکت بولی۔

"اس دن فون پر جو آواز تم نے مجھے گالی دینے میں نکالی تھی اتنے دنوں میں کبھی نہیں نکالی۔"

"تو یہ ہے۔" شوکت تیوری چڑھا کر بولی "آپ کو آواز بھی یاد ہے۔"

"یاد ہے۔ بہت دنوں تک یاد رہے گی۔"

"چھوڑیئے۔" یہ کہہ کر شوکت فرش سے اٹھی' وہ وہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔

"سنو" پرتاپ نے اسے روکا تو وہ اس کی آنکھوں کو پڑھنے لگی۔

"ہمیں سب پتہ ہے"

"کیا ؟"

"تم کہاں جاتی ہو' کس سے ملتی ہو۔ اور کتنی دیر ملتی ہو۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟" شوکت کی بھویں چڑھ گئیں۔

"یہ بھی پتہ ہے کہ اتنی مضبوط جمی ہوئی' خوب کسی ہوئی' وزن دار آواز تمہیں کہاں سے مل رہی ہے۔"

"اب چلو بھی" شوکت نے کہا اور اس سے پہلے کہ پرتاپ کچھ اور کہتا شوکت شامیانے سے باہر جا چکی تھی۔

(۴)

"تو یہ میری ٹوہ میں لگا رہتا ہے" شوکت اپنا بلاؤز پریس کرتے کرتے بڑبڑائی۔ ہر دم دیکھتا رہتا ہے کہ میں کتنی اس کے انگوٹھے کے نیچے ہوں اور کتنی باہر۔ ایک دو سنّی میز بھی ادھر ادھر کھسکی تو بھڑکنے لگتا ہے۔ ایسے جیسے میرا جسم ہو یا میں اس کی رکھیل ہوں! یہ تو کہا جاتا مجھے اگر روٹیوں کا سارا اس پر ہوتا۔ جب دیکھو جھوٹی سچی کہانیاں گڑھ کر میرا دل لیتا رہتا ہے۔ فلاں منتری تمہیں کیسے گھور رہا تھا۔ فلاں نیتا کی رال ٹپک رہی تھی تمہیں دیکھ کر۔ کئی بار ایسی باتیں کی ہیں اس نے جیسے وہ ایک نہیں' تیسرے درجے کا پھوہڑ اور گھناؤنا دلال ہو۔۔۔ بہت چالاک ہے۔ شوکت نے پریس بند کرتے ہوئے سوچا۔ "عبدل بکر قصاب کے معاملے میں سب کی قلعی کھل گئی۔ میری اور میرے بھائی کی کسے پروا ہے۔ بکر قصاب برادری کے ووٹ انہیں زیادہ پیارے ہیں۔ اتنا سا بھی کام کرتا ہے تو کسی نہ کسی بہانے اپنے فارم ہاؤس پر لے جاتا ہے اور وہاں اپنا ننگا پن دکھاتا ہے۔ بے مرد والی عورت کی چیپ چہالیدر یونہی ہوتی ہے کیا! عائشہ باجی نے کہا تھا کہ میں ان کی انجمن میں کچھ کام کروں۔ ہائے کیسی غلطی کی میں نے۔ شہباز صاحب نے کل صبح بلایا ہے کوٹھی پر کچھ بھی ہو جائے عبدل کو جوتے ضرور کھلواتا ہیں۔ ملوں گی شہباز صاحب سے۔

صبح شوکت کوٹھی گئی

کوٹھی جس کے صدر دروازے پر ھٰذا من فضل ربّی کندہ تھا۔

کوٹھی' جس کے اندر زبانیں باہر نکالے' ہانپتے' خونخوار' اصیل نسل کے دو کتے تھے۔ قد آدم شیشے تھے' ہوادار اور روشن گیلریوں میں پیتل کے چمچماتے بھاری بھرکم گملوں میں پام کے وارنش کئے پتوں والے سبز اور شاداب پودے تھے۔ سرسراتے ہوئے خوابناک پردے تھے۔ بینڈ باجے کے ساتھ لان میں دی جانے والی پر تکلف پارٹیاں تھیں۔ حکام کی ریل پیل تھی' موٹریں اور گاڑیاں تھیں' رونق اور چہل پہل تھی۔ اور ان سب کے بیچ بچاس کے لپیٹے میں مضبوط

ہاتھ پیروں اور اونچی پیشانی والا سرخ و سفید نفس کم مگر سنجیدہ اور نرم گفتار سا کسی قدر اداس اور تنہا تنہا سا شہباز خاں تھا جس کے اسٹڈی روم میں عائشہ کی قد آدم ایک تصویر تھی- ہر طرف چلتے پھرتے نوکر چاکر تھے- ایک وفادار موروثی خانساماں تھا' جو اپنی مرحوم مالکن کو یاد کرکے باورچی خانے کے کونے میں اکثر آنسو بہایا کرتا تھا- کوٹھی کی دیکھ ریکھ کرنے والے اور ٹیلیفون پر مالک کے لئے پیغامات وصولنے والے گنجی چاند والے اور کرتے کے نیچے پستول لٹکائے رہنے والے مجو میاں تھے جن کے ساتھ خانساماں مالک کی غیر موجودگی میں پہاڑ جیسے خالی خالی اور بھائیں بھائیں کرتے ہوئے دونوں میں حقہ گڑ گڑایا کرتا تھا---اس کے مالک کے جوتوں کے کارخانے میں دوبار آگ لگ چکی تھی- اس میں کام کرنے والے کاریگروں کے دروازوں پر کئی بار انجان لوگ کھڑیا سے کٹو کا نشان لگا چکے تھے' لیکن خدا اس کے مالک کو دن دونا رات چوگنا نواز رہا تھا---- مالک کوٹھی میں ہوتے تو کچن مغلئی کھانوں' روسی سلادوں اور چینی ڈشوں کی گرم اور اشتہا انگیز بھاپوں سے بھرا رہتا- اسے دم مارنے کی فرصت نہ ملتی-

شوکت جب کوٹھی میں عائشہ کی تصویر کے پاس پہونچی تو اس کے قدم رک گئے- اس کے کانوں میں اس کی منہ بولی عائشہ باجی کی وہ کھنکتی آواز اور آنکھوں میں سراپا ایک بار پھر ابھر آیا جس سراپے کو اس نے پہلی بار اپنے ہی گھر پر میلاد کے لڈو تقسیم کرتے ہوئے دیکھا تھا اور جس آواز کو اس نے بڑی شان سے بحث کرتے سنا تھا- شوکت کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو آگئے- وہ دھیرے سے بولی-

"عائشہ باجی---- آپ وقت سے اتنا پہلے کیوں چلی گئیں؟"

"آپ نہیں جانتیں باپ کے مرنے کا اتنا غم نہیں ہے مجھے' ماں کی آوارگی نے بھی مجھے نہیں توڑا' بھائی کی کھوکھلی انا کا بھی مجھے شکوہ نہیں---مجھے تو شکوہ آپ سے ہے- آپ نے کہا تھا------ میں تجھے کچھ بتا کر رہوں گی-" شہباز کے ڈرائنگ روم میں جہاں اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے کسی کیسٹ کے بجنے کی آواز آرہی تھی-

کہیں نہ پھر ہم سے چھن جائے
رام جنم بھومی ہماری'
اٹھو چنوتی کو سویکارو
یدوکوں آج ہماری باری
مٹادو وشو سے ان دشوں کو
بنو جگت کے وشو وجیتا

جب شوکت ڈرائنگ روم میں پہونچی تو ٹیپ ریکارڈر بند ہوچکا تھا اور ایک صاحب جو اپنے اندرونی جذبات سے خاصے مغلوب تھے' بولنے کے لئے پر تول چکے تھے-

"شہباز صاحب------کل ملا کر جو باتیں آئی ہیں وہ یہ ہیں--- نمبر ایک---" یہ کہہ کر انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے جذبات سے مغلوب ہو کر پہلے سگریٹ جلائیں' پھر اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے سوال کر بیٹھے-

"ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا----؟"

"نمبر ایک' آپ کہہ رہے تھے----" شہباز خاں نے یاد دلایا-

"جی ہاں-" "وہ بولے" ہر ہندو کو یقین دلایا جارہا ہے کہ جہاں کہیں بھی مسلم برادری ہوگی وہاں یقینی طور پر اسلام کے نام پر یہ برادری دیگر فرقوں سے علاحدگی پسندی کا راگ ضرور الاپے گی-" اس علاحدگی پسندی کی مثالیں دینے کے لئے وہ صاحب آذر بائیجان' مشرقی یورپ' برطانیہ اور برما وغیرہ کے ہنگاموں اور قتل وغارت گری کے حادثوں کے بخیے ادھیڑنے لگے اور وہاں کے مسلمانوں کو علاحدگی پسند ثابت کرنے میں لگ گئے-

"بالکل درست" دوسرے صاحب کو بھی جلدی تھی- وہ بار بار آنکھیں میچ رہے تھے- لگ رہا تھا وہ کچھ ایسے تناؤ سے گذر رہے ہیں کہ بولیں گے تو الفاظ ان کے خیالات کا ساتھ دینے میں اس قدر کم پڑجائیں گے کہ انہیں ایک جملہ بول کر ہی چپ ہوجانا پڑے گا- مگر انہوں نے غالبا ایک اچھا کام یہ کیا کہ اپنے خیالات بہت چھوٹے چھوٹے جملوں میں ادا کرنا شروع کئے- وہ بات کرنے میں جلدی جلدی آنکھیں پٹ پٹا رہے تھے اور آواز کی کپکپاہٹ پر قابو بھی پانا چاہ رہے تھے-

وہ بولے "ہمارے بارے میں سب کو یہ یقین دلایا جاچکا ہے کہ ہر مسلمان تعصبی ہے- ہر مسلمان جارح ہے- ہر مسلمان دل سے پاکستانی ہے-"

پھر انہوں نے بتایا کہ چند مضامین انہوں نے ایسے بھی پڑھے ہیں جس میں نئی ہندو نسل کو یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمان کا کام چپکے چپکے ہتھیار جمع کرنا ہے اور بوسیدہ مکانوں کی چھتوں کے نیچے بم بنانا ہے- اس وقت پہلے والے صاحب نے دوسرے کی بات کاٹی اور بولے "مسلمان مغربی اخباروں کے ذریعے بدنام کئے گئے صدام حسین کی طرح بلا تفریق بد خصلت اور خطرناک ہے' اس لئے اس مسلمان کا یا تو صفایا کردینا چاہئے یا پھر اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردینا چاہئے- اس لئے اسے راہ راست پر لانے کے لئے عام ہندو کو انگریزی کے تین لفظ بار بار یاد کرائے جارہے ہیں...

CONVERSION REDUCTION SUBMISSION

شہباز خاں بولنے کو تھا' اس لئے سب کو یوں دیکھتا رہا جیسے ان سے معافی مانگنے جارہا ہو- وہ اکثر کوئی بات شروع کرنے سے پہلے ایسا احساس ندامت محسوس کرتا تھا جیسے جو کچھ وہ کہنے جارہا ہے اس سے کہیں دوسرے کا دل تو نہیں دکھے گا- وہ نرمی سے بولا-

"ملک کی تقسیم کے وقت پنجاب میں کیا ہوا تھا؟ تقریباً سات ہزار مسجدیں مسمار کی گئیں- پھر بھلا ایک مسجد سے دست بردار ہوجانے میں کیا قیامت

آجائے گی؟ اس بہانے اپنی لیڈری چمکاتا ہے تو بات دوسری ہے۔" اس کے بعد شہباز خاں موضوع کو کچھ دیر کے لئے بدلنے کا موقع نکالتے ہوئے قریب ہی بیٹھیں شوکت جہاں کی طرف پلٹے' دھیرے سے مسکرائے اور بولے۔

"تم نے فون پر مجھے جو کچھ بتایا تھا اسے سمجھنے کے لئے دراصل میں نے تم سے کہا تھا کہ کسی وقت صبح یہاں آجاؤ۔" شوکت کا جیسے بٹن دب گیا اور وہ ریکارڈ کی طرح بجتی ہی چلی گئی۔

"اس کے پچاس جوتے لگوانا ہیں وہ بھی کھلے عام۔ دو ٹکے کا چکوا اور اس کی یہ ہمت ــــــ میرا بھائی حافظ قرآن ہے۔ اپنی سانس سے بھی کس کو چوٹ نہیں پہونچاتا۔ میری بھابھی پانچ وقت کی نمازی' کبھی کسی سے اونچی آواز میں بھی نہیں بولی۔ اس پردہ دار خاتون کو سڑک پر کھڑے ہو کر باتیں سنائیں اس کے شوہر کو زنخا بتایا۔ جیالوں نے اس کی برادری کا ساتھ دیا اور میرے بھائی کو ایک جاہل اور بدقوے سے معافی مانگنا پڑی۔ اس کی یہ ہمت! یہ حوصلہ! میرے والد صاحب سے اکثر موٹی موٹی رقمیں مانگ لے جایا کرتا تھا کہ "میاں تھوک میں ٹکے لیتا ہیں اور باہر کے سوداگر ایک پیسہ ادھار نہیں رکھتے۔ ہماری ڈیوڑھی کو جھک کر سلام کرنے والا اسی ڈیوڑھی کی بہو کے سامنے گالیاں بکنے کے بعد الٹا میرے بھائی سے معافی منگواتا ہے ــــ"

شہباز خاں دو پل خاموش رہے۔ گویا انتظار کر رہے تھے کہ شوکت جہاں کچھ بولے۔ پھر لہجے میں مٹھاس گھولتے ہوئے بولے۔

"کہہ چکیں؟"

"جی۔" شوکت نے جواب دیا۔

"غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا؟"

"جی نہیں۔"

"تو ٹھنڈا کرو ــــ پچاس تک گنتی گنو۔ میں بھی گنتا ہوں۔ پھر بات کروں گا۔" یہ کہہ کر شہباز خاں خاموش ہو گئے گویا دل ہی دل میں شوکت جہاں کے لئے پچاس تک کی گنتی گن رہے ہوں۔ سامنے کے صوفے پر ممو خاں صاحب بیٹھے تھے۔ ممو خاں شوکت کے والد سے خوب واقف تھے کہ مرحوم بے چارے جیالوں اور حکام کے لئے آموں کی ڈالیاں فصل پر ممو خاں کے باغوں سے منگواتے تھے اور کچھوے اور پائے کی بڑے اہتمام کے ساتھ دی گئی دعوتوں میں ممو خاں صاحب کو خاص طور پر بلاوا دے کر آتے اور اس وقت تک دسترخوان پر نہیں بیٹھتے تھے جب تک ممو خاں صاحب تشریف نہیں لے آتے۔ کہا جاتا تھا کہ ممو خاں جس محفل میں بھی ہوتے وہ محفل گل و گلزار ہو جایا کرتی۔ شہباز خاں کی پچاس تک کی گنتی پوری ہو گئی تھی۔ وہ آہستہ سے بولے۔

"تم جو کچھ ہو وہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہاں! جو کچھ تم نہیں ہو وہ بتائے دیتا ہوں۔"

"ایسا کیوں؟ جو کچھ ہوں وہ بھی بتایئے ــ" شوکت شرارت سے بولی'

غالباً پچاس تک گن کر وہ اپنی جھنجلاہٹ سے باہر آچکی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ زور سے ہنسے۔ دوسرے سب بھی مسکرا دیئے۔ "تم خوبصورت ہو۔" وہ بولے "جوان ہو اور کچھ کچھ ذہین بھی ہو مگر۔۔۔"

"مگر ــــ؟" شوکت نے لفظ دہرایا۔

"تم آج کی نہیں ہو۔ یعنی عصری تقاضوں کے مطابق جی نہیں پا رہی ہو۔"

"مطلب ــــ؟"

"مطلب جو تم کو ابھی ہونا چاہئے' وہ تم نہیں ہو۔"

"کیوں ــــ؟" ممو خاں تیوری چڑھا کر بیچ میں بول پڑا۔

"کیوں کا معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے۔" شہباز اداسی سے بولے۔ "یہ پورے گروہ کا معاملہ ہے۔" شہباز نے ایک بار ہمت کی کہ وہ ان لوگوں کو بتائے کہ مسلمان کمبخت اپنے پرانے تاریخی اور طبقاتی شعور سے آگے نہیں نکل پا رہا۔ غالباً اس کے لیڈر اسے ایسا نہیں کرنے دے رہے۔ وہ ملک کے لئے ASSET بننے کے واسطے چھٹپٹا تو رہا ہے لیکن اس کے خود غرض مسیحا ہی پیچھے سے اس کی ٹانگ پکڑے ہوئے ہیں۔ اور وہ یہ نہیں جان پا رہا کہ وہ اپنے وجود کو اپنے عہد کے لئے مفید کیسے بنائے؟ لیکن شہباز ایک ٹھنڈی سانس ہی بھر کر رہ گیا۔ ممو خاں نے اس بار ذرا بھاری آواز نکالی۔ "میں آموں کی باغبانی کرتا ہوں۔ میں نے سب کچھ آموں کے باغوں اور آموں سے سیکھا ہے۔ کتنی ترشی اور کتنی مٹھاس سے لذت پیدا ہوتی ہے' یہ بات میں خوب جانتا ہوں۔" پھر وہ شوکت سے مخاطب ہوا۔

"بیٹی۔ شہباز صاحب کچھ نہیں کریں گے۔ آموں کی فصل تیار ہو گئی ہے۔ میں کروں گا تمہارا کام۔ سکھاؤں گا سبق اس بکر قصاب کو۔"

"تم کیا کرو گے؟" شہباز نے مزہ لیا۔

"اس کو آم کھلاؤں گا۔"

"لاٹھیاں برسوا دو گے' اور کیا۔"

"ہرگز نہیں۔"

"پھر۔؟" شہباز نے اسے غور سے دیکھا۔

"کہا نا ــ میں نے سب کچھ آم سے سیکھا ہے' کیسے اپنی بقا کے لئے لو دھوپ سہی جاتی ہے۔ کیسے گرم تھپیڑے کھائے جاتے ہیں اور چپکے چپکے چاشنی اپنے اندر پیدا کی جاتی ہے اور پھر کس طرح پتوں کی آڑ میں چھپ کر جیا جاتا ہے۔ یہ سب مجھے آم نے سکھایا ہے۔ یقین کیجئے اس بکر قصاب کو صرف آم کھلاؤں گا۔"

شہباز کو ہنسی سوجھی "تو گویا آم نہ ہوا تمہارا شناختی کارڈ ہو گیا۔"

"اس میں کچھ زیادہ شک بھی نہیں۔" ممو خاں سنجیدہ تھا۔ "اچھا آم پیدا کرنا اچھی غزل کہنے کے برابر ہے۔ خدا کی قسم ہماری تہذیب کی مٹھاس کا حال بھی آم کی مٹھاس کی طرح ہے۔"

"ہماری سے تمھاری کیا مراد ہے؟"

"ہماری سے مراد ہے آج کا ہندوستانی مسلمان۔ ترکی کا مسلمان سالا دسہری آم نہیں پیدا کرسکتا ہے۔"

"تم اب اپنی اس MANGOISM کو میڈیا تک پہونچاؤ۔" شہباز نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ شاید پوری طرح سنجیدہ نہیں۔" اس نے کہا "آم کا بدل کچھ اور نہیں آم ہی ہے۔" پھر وہ ایک دم سے شوکت جہاں کی طرف پلٹا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "آؤ بیٹی ہم قدرت سے ابھی ملتے ہیں۔"

شوکت جہاں ممو خاں صاحب کے ساتھ چلی گئی۔ محفل برخاست ہوئی تو شہباز اکیلا رہ گیا۔ وہ اپنا ایک گال کھجاتے ہوئے باربار سوچتا رہا۔

"مجھے کتنا وقت لگے گا بھلا؟" اس نے توقف کیا۔

"کتنا وقت لگے گا اور کتنا صبر کرنا پڑے گا؟" اس نے پھر توقف کیا۔

"کتنا صبر اور ضبط کرنا پڑے گا مجھے۔ اتنی باتیں مسلمانوں کے گلے سے اتارنے کے لئے؟" اس نے پھر توقف کیا۔

"مسلمانوں کو یہ بتانے کے لئے کہ آج ہندوستان میں تین لاکھ سے بھی زیادہ مسجدیں ہیں جب کہ ۱۹۴۷ء میں یہ تعداد کہیں کم تھی۔"

وہ بے چین ہوگیا آنکھیں کچھ بھیگ سی گئیں' وہ پھر اندر سے تڑپا۔

"کتنا انتظار کرنا پڑے گا مجھے یہ دیکھنے کے لئے کہ مسلمان خود یہ محسوس کرنے لگے کہ مسلم کشی کا بھیانک ہوا بہت حد تک ہماری زرد صحافت کی دین ہے۔ ورنہ ملک میں ہر برس مسلم مدرسوں کی تعداد تو بڑھتی چلی جارہی ہے۔"

"یکایک شہباز خاں کی توجہ ایک بار پھر ممو خاں کے اس جملے پر مرکوز ہوگئی جو چلتے چلتے انہوں نے کہا تھا۔ "آم کا بدل کچھ اور نہیں آم ہی ہے۔"

شہباز نے سوچا' سوال یہ ہے کہ ہم اپنے اخلاقی کردار کی چاشنی سے دوسرے کو اپنا گرویدہ بنانے میں کتنا کامیاب ہورہے ہیں۔؟

ممو خاں دھیرے دھیرے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور قدرت اللہ سے عبدل قصاب والی روداد پوری تفصیل سے سن رہے تھے۔ بیچ بیچ میں وہ شوکت جہاں کی بھی زوردار خبر لیتے رہے۔

"ارے تم کو سیاست بازی سے کیا لینا دینا ہے۔ باپ مرچکے ہیں تمھارے۔ اب تم پارٹی وارٹی کے چکر چھوڑو۔ یہ سب ان کی زندگی تک ہی ٹھیک تھا۔"

قبل اس کے شوکت کچھ جواب دیتی' وہ پھر قدرت اللہ کی داستان سننے میں لگ جاتے۔ پھر انھیں غصہ آتا تو قدرت اللہ کو چھوڑ شوکت پر ٹوٹ پڑتے۔

"کیا کررہی ہو آجکل؟"

"لڑکیوں کے لئے ایروبک (AEROBIC) کلاس چلارہی ہوں۔"

"کتنی آمدنی ہوجاتی ہے؟"

"یہی کوئی تین ہزار روپئے ماہانہ"

"مکان تو تمھارا موروثی ہے ۔۔۔ اور تین دکانیں بھی تو ہیں؟۔"

"جی ان میں سے صرف ایک میری ہے۔"

کتنے کرائے پر اٹھی ہیں؟

"پندرہ سو۔"

"میری مانو تو شادی کرلو۔ لڑکا میں تلاش کردونگا۔ مگر پٹھانوں کے لڑکے عورتوں میں بہت گھستے نہیں ہیں یہ میں تم کو بتائے دیتا ہوں۔" پھر ممو خاں نے بار بار شوکت جہاں کو شادی کے معاملے میں ٹٹول کر بھی اس کا عندیہ نہ پایا تو بولے۔

"بھئی کیسے رہوگی؟"

"خدمت خلق کرکے رہ لوں گی۔ میرا بالکل ارادہ نہیں ہے شادی وادی کا۔"

"تمھارے باپ کی کچھ اور جائداد بھی تو تھی۔"

"وہ اسی بازی میں پھنسی ہے۔" شوکت نے بتایا۔

پھر ممو کو اس بات پر غصہ آگیا کہ شوکت بکر قصاب کو سبق سکھانے کے لئے شہباز خاں سے مدد مانگنے کیوں گئی تھی۔ ایک دم سے بولے۔

"ارے بیٹا ہمارا بھی کچھ فرض ہے تم پر۔ تمھارے باپ نے بڑی محبتیں لٹائی ہیں ہم پر خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ پھر انھوں نے شہباز پر بھی دو ہاتھ گھمادیے اور بولے۔

"شہباز کسی کام کا آدمی نہیں ہے۔ انسان نوازی میں اس قدر آگے چلا جاتا ہے کہ شیطان نوازی NEGLECT ہوجاتی ہے۔ آپ شیطان کو نظرانداز کرکے اسے برابر IRRITATE بھی کرتے رہیں اور اپنی انسانیت نوازی کے تمغوں کو بھی برقرار رکھنا چاہیں تو یہ دونوں باتیں ایک ساتھ کیسے ہوسکتی ہیں ؟ شیطان بھی آپ کی چپت تب ہی کھانے کو تیار ہوگا جب آپ اس کا سر تین بار سہلا چکے ہوں گے۔ پر شہباز بے وقوف کی سمجھ میں ہی نہیں آتا۔" پھر ممو خاں نے دو تین بار زور زور سے اقرار میں گردن ہلائی جیسے دل ہی دل میں کسی خیال کی زوردار تائید کررہے ہوں' پھر بولے۔

"ہاں عائشہ میں یہ GUTS تھے۔ وہ جانتی تھی کہ شیطانیت کو کیسے' کتنی دیر اور کس حد تک خوش رکھا جانا ضروری ہے" پھر وہ جوش غضب سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔ انھیں خیال تھا کہ ان کا موٹا سا ازاربند فلک کر زمین کو چھو رہا ہے انہوں نے شوکت کو ایسے گھورا جیسے وہی سماج کی ساری خرابیوں کی جڑ ہو اور بدیوائے۔

"تم ابھی بچہ ہو! تمھیں کیا بتاؤں۔ پریشانی ساری یہ ہے کہ ہم نے بہت زیادہ نیک بننے کے چکر میں رحمانیت کو مجہول کردیا ہے اور وہ ایک ایسی زخم

خوردگی کا شکار ہو گئی ہے کہ اس کا اندمال اب شیطانیت کو جگائے بغیر ممکن نہیں۔۔" پھر وہ ایک دم سے قدرت کی طرف پلٹے۔

"بے فکر ہو جاؤ' میں سب سمجھ گیا۔ میرے آدمی کو کل عبدل بکر قصاب کو دور سے دکھا دینا۔ اور ایک بات سنو" وہ قدرت کو کسی قصائی کی طرح بھیانک آنکھوں سے گھورتے ہوئے شاہانہ رفتار سے اس کے سر پر آکر کھڑے ہو گئے اور بولے۔

"ناظم علی اینڈ سنس کی دکان پر چلے جاؤ' شیروانی کا کپڑا کھوا کر سامنے کے لئے دے دو اور اس سے کہو بل میرے پاس بھجوا دے"

(۵)

"عبدل کو مع اس کے چند دوستوں کے باغ تک لانے کا پلان بنا۔ چیڑ کی پیٹیوں میں باغ سے تازہ تازہ آم توڑ کر رکھے اور عبدل کی باغ سے واپسی پر وہ پیٹی تحفتاً اس کے ہمراہ کرنے کا منصوبہ بھی پوری تفصیل کے ساتھ تیار کیا گیا۔ ممو خاں کے وفادار پشتینی ملازم کالے خاں آپریشن عبدل کے لئے تعینات کئے گئے اور حسب معمول ممو خاں صاحب پردے کے پیچھے رہے۔ کالے خاں کے آدمی عبدل اور ان کے دو بھتیجوں کو باغ میں لے کر آئے۔ سورج اترنے میں ابھی دیر تھی۔ باغ کے اندرونی حصے میں جہاں رہٹ کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی بھی تھا اور ایک چارپائی بھی' عبدل کو وہاں بٹھایا گیا۔ کچھ آم رہٹ کے چھوٹے سے حوض میں ڈال دئے گئے اور رہٹ سے کنویں کا پانی نکال کر حوض کو لبالب بھر دیا گیا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں پڑے ہوئے آم جب تک ٹھنڈے ہوتے' پکے پکے خوش رنگ اور خوش جمال آم توڑ کر چیڑ کی دو پیٹیوں میں بھرے گئے۔ گرمی بہت تھی' کنویں اور رہٹ اور حوض اور ٹھنڈے پانی کو دیکھ کر عبدل نہانے کے لئے مچلا۔ کالے خاں کے آدمی نے' جو عبدل کی میزبانی کے لئے باغ میں پہلے سے مقرر تھا' عبدل کو خوب نہلایا۔ ابھی عبدل اس کام میں مگن تھا کہ اسے خیال آیا کہ باغ میں اس کے اور اس کے دو بھتیجوں کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ پہلے باغ والوں کے وہ لوگ جن کے ساتھ عبدل شہر سے باغ آیا تھا' کہیں غائب ہوئے۔ پھر وہ میزبان غائب ہوا جس نے انھیں باغ کے اندر خوش آمدید کہا تھا۔ باغ میں داخل ہونے والے راستے پر اردو اور ہندی میں ایک آگاہی درج تھی کہ یہ باغ ممو خاں صاحب کی ذاتی ملکیت ہے اس میں مالک کی اجازت کے بغیر داخل ہونا اور ملکیت کو کسی بھی طرح کا نقصان پہونچانا غیر قانونی ہوگا۔ عبدل جب نہا رہا تھا تو اس کے بھتیجے آموں سے بھری پیٹیوں کے منھ بند کرنے کے لئے ان پر تختے جڑ رہے تھے۔ عبدل نے پہلے دور دور نظر دوڑا کر خوش آمدید کہنے والے چوکیدار کو تلاش کیا۔ پھر حوض سے باہر نکل کر دو تین بار اسے آواز دی۔ لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ اس وقت باغ میں داخل ہونے والے راستے کی طرف سے پیڑوں کے پیچھے سے چند لٹھیت ہاتھوں میں تیل پلائی لمبی لمبی لاٹھیاں لئے اور کانوں کو انگوچھوں سے ڈھکے اس کی طرف آتے دکھائی دئے۔ قریب پہونچنے پر وہ سب جیسے معاملے کو تاڑنے کے لئے ایک ساتھ ٹھہر گئے۔ لمبی قلموں والے اور گانجے کی چلم کی گرمی سے کچھ کچھ جلی مونچھوں والے لٹھیت نے جس کی عقاب جیسی تیز اور نوکیلی آنکھیں تھیں سوالوں کی گولیاں داغنا شروع کر دیں۔

"کون ہو۔ تم لوگ؟"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"کس کی اجازت سے اندر آئے؟"

"یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"یہ آم کس نے توڑے؟"

"جھوٹ مت بولو۔ کہاں ہے وہ جس نے یہ آم تڑوائے؟"

"کالے خاں صاحب نے بلایا ہے تو ان کی برچھی دکھاؤ۔"

"برچھی تو نہیں ہے۔"

"ممو خاں صاحب سے ملے تھے۔۔؟"

"نہیں۔۔"

"تو یہ باغ تمہارے باپ کا ہے کیا۔۔؟"

"اے باپ دادا مت کرنا۔۔۔" عبدل میاں کچھ اکڑے۔

"باندھ دو پہلے ان لونڈوں کو۔۔" لمبی قلم والے لٹھیت نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

"ان میں سے دو ایک کے کندھے پر کنویں سے پانی نکالنے والی رسیاں لٹک رہی تھیں۔ بھتیجے بندھنے سے پہلے اچھلے کودے تو ان کی چاند پر کئی چھر دھے پٹا پٹ داغے گئے۔ پھر عبدل کو سمجھایا گیا۔

"آج سنیچر کا دن ہے۔ تھانہ انچارج آدھا سرکار کا اور آدھا ممو خاں صاحب کا ملازم ہے پیٹیوں میں چوری کا آم برآمد ہو چکا ہے۔ آج بند کئے گئے تو اتوار اور سوموار دو دن اور بند رہو گے کہ سوموار کو محرم کی چھٹی ہے' عدالت بند رہے گی۔ اس لئے خیریت اسی میں ہے کہ جو آم توڑ کر حوض میں ڈالے گئے ہیں انھیں کھا ڈالو۔۔" بیچارے عبدل نے بہت کہا کہ وہ باغ میں آیا نہیں لایا گیا ہے اور وہ چور نہیں بکر قصاب ہے۔ مگر ان لٹھیتوں میں سے کسی کو اس پر رحم نہ آیا۔ ایک بولا۔

"بھیا ہم تو ہر فصل میں ایسی دو چار کہانیاں سنتے ہی رہتے ہیں۔" دوسرا بولا :

"تم تو چکوے ہو۔ یہاں کبھی کبھی جنٹلمین لوگ بھی گھس کر پھنس جاتے ہیں۔"

"آم چارپائی پر لا کر رکھے گئے۔ لمبی قلموں والے نے اس میں سے آم اٹھا کر آدھے آم کا چھلکا اتارا اور کاٹ کر عبدل کو پیش کیا۔

"ذرا یہ بھی چھلکے کا آم کھا کر بتاؤ تو کیسا ہے؟"

عبدل چپ بیٹھا رہا اس نے ہاتھ آم لینے کے لئے نہیں بڑھایا۔ لمبی قلم والا دو پل انتظار کرتا رہا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ عبدل کی گردن ویسے ہی جھکی ہوئی ہے اور وہ نہ آم کی طرف دیکھ رہا ہے نہ ہاتھ بڑھا رہا ہے تو وہ بڑے پیار اور دلار والے لہجے میں بولا۔

"تمہارے پیجامے کا ناڑا کھول کر' اس چارپائی پر اوندھا لٹکا کر یہ لاٹھی اندر تک اتار دی گئی تو پھر اس کے بعد تم نے آم کھایا تو کیا مزہ آئے گا؟ پھر تو یہ بھی نہ بتا پاؤ گے کہ کھٹا تھا یا میٹھا۔۔"

عبدل کا ہاتھ بڑھ گیا۔ آم لے کر اس نے زہر مار کیا۔۔ اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"مجھے جانے دو۔ میں معافی مانگتا ہوں۔"

"آم کیسا ہے؟" لمبی قلم والے لفٹیننٹ نے سوال کیا۔

"سچ کہتا ہوں آم چرانے نہیں آیا تھا۔۔"

"ابے ماں کے یار' یہ بتا آم کیسا ہے۔؟"

"اچھا ہے۔" وہ لفٹیننٹ کے پیر پکڑتے ہوئے بولا۔

"بنا چھلکوں کا آم ہم آدمیوں کو کھلاتے ہیں' تو چھلکوں کے ساتھ کھا۔"

پھر عبدل کو چھلکے دار آم کھلائے گئے۔ جب وہ پانچواں آم کھا رہا تھا تو اس کا پیٹ پھول چکا تھا اور سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ پھر چھاتی پر سوار ہو کر چار آم اور کھلائے گئے۔ جب اس کی ناک اور منہ سے جھاگ چھوٹنے لگا تو لمبی قلموں والے نے اس کی چھاتی پر سوار مشٹنڈے سے لفٹیننٹ کو جو کپڑے سے منہ چھپائے تھا حکم دیا کہ ابھی تین آم کھانے کی جگہ اور باقی ہے۔ عبدل نے اپنے سینے پر قے کردی۔ اس کی آنکھوں کے سفید سفید گولے بار بار پھٹے پڑ رہے تھے۔ پسینے سے اس کا آدھا ننگا بدن چپچپا رہا تھا۔ اس کے بڑے بھتیجے نے جو سامنے ہی پیڑ سے بندھا کھڑا تھا یہ منظر دیکھ کر پاجامے میں پیشاب کر دیا تو ایک لفٹیننٹ نے ایک بالٹی پانی اس کے اوپر اتنی زور سے اچھالا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔۔ پھر اس نے ایک آم اٹھا کر اس کے منہ میں اس طرح ٹھونس دیا کہ وہ نہ نگل سکتا تھا اور نہ اگل سکتا تھا۔ اس کے جبڑے کے دونوں کنارے اتنی بری طرح سے کھینچے ہوئے تھے کہ کھال سے خون بہنے لگا۔

عبدل سے کہا گیا کہ وہ حلق میں اپنی بیچ والی انگلی خوب اندر تک ڈالے۔ جتنی بار عبدل نے انگلی اندر ڈالی اس کی چھاتی پر قے کی رطوبت کے ساتھ کچلے ہوئے تازے آم کے ہرے پیلے چھلکے بھی شامل ہوئے۔۔ عبدل کو قے کرا کے جب پیٹ میں دو آموں کی جگہ لمبی قلم والے نے بنوائی تو عبدل کو پھر دو آم ٹھسائے گئے اور جب اس کے منہ سے جھاگ دوبارہ نکلنے لگا اور آنکھیں اوپر کو چڑھنے لگیں اور نبض ماند پڑنے لگی تو اس کو اوندھا کر کے دونوں پیر تین فٹ اوپر اٹھا کر پھر قے کرائی گئی۔ وہ کسی ذبح ہوتے بکرے کی طرح حلق سے آوازیں نکالنے لگا۔ پھر اس کے منہ میں دوا کی گولی کو سفوف کی شکل دے کر پھنکایا گیا۔

کئی الٹیاں ہوئیں تو اس کا پیٹ کچھ ہلکا ہوا۔ لیکن وہ اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ اب اپنی گردن کو ایک جگہ روک نہیں پا رہا تھا۔ اس جان لیوا نقاہت سے اس پر بار بار غشی طاری ہونے لگی۔ اس سے قبل کہ وہ بے ہوش ہو اس کے کانوں میں لمبی قلموں والے کی آواز آئی۔

"یہ پانچ آم الگ رکھ دو۔۔ ہوش آنے پر کھلانا۔"

لیکن دو پل بعد عبدل اس کھری چارپائی پر حالت بیہوشی میں لاش کی طرح بے سدھ پڑا تھا اور اس کی چھاتی پر پڑی رطوبت پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔۔

مزے کی بات یہ تھی کہ ممو خاں اور ان کا لفٹیننٹ کالے خاں دونوں حلف اٹھا کر یہ کہہ سکتے تھے کہ انھوں نے کبھی عبدل بکر قصاب کو دیکھا تک نہیں۔۔

ایک دن شوکت جہاں جب عبدل کی دکان کے پاس سے گزری تو ایک پل رکی۔ پھر دھیرے سے عبدل سے بولی۔ "اچھے آم جب کھاتا ہوں تو مجھے بتا دینا۔"

کارخانے سے کوٹھی کے درمیان جس راستے سے شہباز گزرتا کئی مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکر اک ساتھ شور مچاتے ہوئے ملے۔ جن چہروں پر اس کی نگاہ اٹھتی وہ مسلمانوں کے چہرے ہوتے۔ ان مناظر میں وہ مسلم اوباش لونڈے ہوتے جو نہ مسجدوں کے کام کے تھے اور نہ اسکولوں کے وہاں تو گندے چائے خانوں میں طشتری میں چائے انڈیل کر چسکی لگانے والے وہ مسلمان ہوتے جو یا تو چھوٹے موٹے دفتروں میں معمولی ملازم تھے یا چپراسی' کچہریوں میں منشی تھے یا میونسپلٹی میں پلمبر' سائکل کا پنکچر بناتے تھے یا گیرجوں میں گاڑیاں دھوتے تھے' بسوں میں جیب کاٹتے تھے یا سینما کے ٹکٹ بلیک کرتے تھے یا پھر وہ نیم حکیم جو کمپونڈری کرتے کرتے خود ساختہ ڈاکٹر بن گئے تھے۔ اس کے بعد ہزاروں چہرے تھے' جن میں باربر تھے بکر قصاب تھے' جلد ساز اور دفتری تھے' سبزی فروش تھے' جوتے بنانے والے تھے' اسکوٹر میکینک تھے' حلوائی تھے' پرچون کے دکاندار تھے۔

انسانی حقوق کی سرگرم کارکن عائشہ نے بڑی جدوجہد کے بعد اپنے شوہر کے ذہن کے کیمرے میں جو کچھ سیدھے فوکس میں لا کر کافی اجاگر کر دیا تھا دراصل وہی اب شہباز کی اصل پریشانی بن چکا تھا۔ پہلے تو اس نے بہت کوشش کی کہ وہ جب سینما ہال کے کنارے سے نکلے تو ٹکٹ گھر کی اس کھڑکی کی طرف نگاہ ہی نہ ڈالے۔ لیکن سامنے پہونچ کر اس کا جی نہ مانتا۔ وہ گاڑی دھیمی کر لیتا اور غور سے چلچلاتی دھوپ میں ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے اور قریب ہی بہتی ہوئی نالی کے کنارے ان برقعہ پوش عورتوں کو غور سے دیکھتا جو گھنٹوں لائن میں صرف ایک اینٹ کے چبوترے پر بیٹھی بچے کے منہ میں چھاتی دئے امتابھ بچن کی کس فلم کو دیکھنے کے لئے سر سے' ماتھے سے' پیٹھ سے' کولھوں اور رانوں

سے بدن کا پسینہ نل کی ٹونٹی کی طرح بہایا کرتیں اور لائن میں ذرا بھی آگے پیچھے ہو جانے پر پہلے ایک دوسرے کی نقابیں نوچتیں' پھر گریبان' اس کے بعد بالوں کے تازے تازے گچھے ایک دوسرے کی مٹھی میں نظر آتے پھر جو مشٹنڈی ہوتی وہ کمزور کی چھاتی پر سوار ہو کر بیٹھ جاتی- عام طور پر سائبان کے نیچے اپنا ڈنڈا پہلو میں رکھے بینچ پر لیٹا کانسٹبل اپنی نیند نہ خراب کرتا تھا- ہاں اگر کوئی کم سن اور گوری چمڑی والی عورت زد میں ہوتی تو وہ کچھ دیر مزہ لے کر جھوٹے غصے کا اظہار کرکے لڑنے والیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتا- پھر تھوڑا الگ کھڑے ہو کر گوری چمڑی والی کو دیکھ دیکھ کر بھونڈے پن سے مسکراتا رہتا- چلچلاتی دھوپ میں سینما کی ٹکٹ والی لائن میں لگی ان برقعہ پوشوں کو پسینہ بہاتے بٹوے سے ڈلی تمباکو پھانکتے' چھاتیاں چھڑواتے کانسٹبل کے ڈنڈے کھاتے روز دیکھتے دیکھتے ہی شہباز خاں کے دل میں اس صنف سے دلچسپی بڑھی تھی-

آخر یہ عورت ہے کون؟

اس کے دل میں جستجو جاگی تھی- یہ برقعہ پہنے والی' ٹکٹ کی لائن میں کنگھی چوٹی کرکے آنکھوں میں کاجل بہا کر ٹھیلے والے سے خریدے گئے سستے ہار پہن کر پاکیزہ فلم میں مینا کماری کی شب انتظار کو اپنی شب انتظار مان کر اس کے ساتھ گانے لگتی تھی-

کہ چراغ بجھ رہے ہیں
مرے ساتھ جلتے جلتے
کہ چراغ بجھ رہے ہیں
مرے ساتھ جلتے جلتے

آخر اپنی آنکھوں کو کیوں بھگو لیتی تھی وہ؟ اور پھر چپکے سے دوپٹے سے انھیں پونچھنے میں ایک پیوند لگی آسودگی سی کیوں محسوس کرتی تھی؟ شہباز کی مرحوم بیوی عائشہ کے رہائشی دفتر کی دہلیز پر کہاں کہاں کی اور کیسی کیسی عورتیں پہونچتی تھیں- ان کے چہرے' ان کے کپڑے... شہباز بیوی کو ٹوکتا-

"یار گھر پر بھی وہی چہرے وہی عورتیں--- تم اپنا دفتر کہیں اور لگایا کرو-- کوٹھی میں سب طرف عورت ہی عورت ہو جاتی ہے-"

"عورت تمہارے راستے میں بھی ہے' تمہارے دفتر میں بھی ہے اور تمہارے بستر پر بھی ہے-" وہ چٹکی لیتی

"یار تمہارا FEMINISM لگتا ہے مجھے مسجد کی چٹائی کی طرح لپیٹ کر کہیں کونے میں کھڑا کردے گا-"

وہ مسکرائی- "میں چاہتی ہوں تم سنجیدگی سے ذرا اس کھڑکی میں بھی جھانکو جہاں تمھیں آگے آنے والی وہ عورت نظر آئے گی جو ابھی لڑکی ہے-"

"مطلب----؟"

"میں آج کے نئے اور خوشحال کرخنداروں کے طبقے کی بات کر رہی ہوں- ان لوگوں کی جو برتن بناتے ہیں تالے بناتے ہیں' قالین بنتے ہیں' اور اپنے ڈرائنگ روم میں نصر من اللہ و فتح قریب کے طغرے سجاتے ہیں' روح افزا کا شربت جن کا STATUS SYMBOL ہے- اردو ڈائجسٹ کو سنٹر ٹیبل پر رکھ کر جو خود کو تعلیم یافتہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں میں اس طبقے کی ان مسلم شریف زادیوں کی بات کر رہی ہوں جو مجہول اور ناکارہ شرافت کے جبر کے بوجھ تلے چھٹپٹاتی ہیں- ہائر سیکنڈری تک پڑھتی ہیں- سبز دوپٹے میں قرآن ختم کرتی ہیں- پھر سہیلیوں کے عاشقوں کو لکھے جانے والے جملوں کے لئے مشاعروں اور ڈائجسٹوں سے نوٹ کئے گئے شعر فراہم کرتی ہیں--- آلو کی ٹکی اور مٹر کی چاٹ میں ڈھیروں سرخ مرچیں ڈال کر کھاتی کھلاتی ہیں اور "قسم کلام پاک کی" کے تکیہ کلام کے ساتھ دروازوں کی دراروں سے اپنی بہنوں بھتیجیوں کے شوہروں کی دست درازیوں اور چوما چاٹی کا احوال چاٹ کے چٹخارے لے کر بیان کرتی جاتی ہیں- اور آدھا گھنٹہ "سی سی" کرکے مرچوں جلے منہ کو ہوا دیتی رہتی ہیں- پھر اسکول کے راستے میں نکڑ والی کاپیوں کی دکان پر پینسل لینے کے بہانے ادھر ادھر نظر بچا کر کرائے پر لی گئی بلیو Playboy میگزین کو شلوار کے نیفے میں گھڑس کر غسل خانے تک پہنچانے اور پھر وہاں گہری سانسوں' گرم کنپٹیوں اور تمتماتے گالوں کے ساتھ ننگے آسنوں کی ورق گردانی کرتی ہیں' اور ہیجان سے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیر کر انھیں تر کرتی ہیں- اور پھر باہر نکل کر چڑیا جیسے ہانپتے دھڑکتے دل کی رفتار اپنی سہیلی کو سنانے کے بہانے اس کا ایک ہاتھ اپنے سینے پر قدرے دیر تک رکھ کر اس کی ہتھیلی کی گرمی کی انجان مگر بھلی لگنے والی سرسراہٹ کا مند مند آنکھوں سے مزہ لیتی ہیں اور "ہائے اللہ" کہہ کر اتنی لمبی سانس چھوڑتی ہیں جیسے سیکڑوں میل دور سے بھاگی چلی آرہی ہوں--

"اتنا سب کچھ سانس روک کر سن لینے کے بعد شہباز نے بیوی کی آنکھیں چوم لیں اور بولے-

"واہ" کیا کمال کا مشاہدہ ہے-"

"ایک عورت اور بھی ہے" عائشہ جیسے کھوئی کھوئی سی بولی-

"اب کون ہے؟" شہباز بناوٹی خوف کے ساتھ بولا-

"میری دوست ارچنا تم کو اس عورت سے ملوائے گی-"

"وہ ہے کون--؟"

"آر ایس ایس کے ایک غیر معروف بازو (WING) راشٹریہ سیویکا سمتی کی ایک پرچارکا-"

شوکت جہاں نے اپنی سنگار میز کے آئینے کو صرف اپنی "چھیل بل" کو گھر سے باہر نکلنے سے پہلے آنکنے کے لئے ہی استعمال کیا تھا- اس دن وہ آئینے کے سامنے سے ہٹنے کو ہی تھی کہ اس کی ساری کا پلو سنگار میز کی دراز کے ہینڈل سے الجھ گیا- "کدھر چلیں؟" اس کی ساری کے کھنچے ہوئے پلو نے گویا اس سے

سرگوشی کی۔

شوکت جہاں خوب جانتی تھی کہ وہ کدھر کے لئے چلتی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ جان کو انجان بنتے بنتے اس نے کافی لمبا وقت نکال دیا تھا۔

"احتساب!" کوئی آواز سی سرسرائی اس پلو کی سرسراہٹ میں۔ شوکت جہاں اس آواز کو بھی خوب جانتی تھی۔

تمہیں قسم ہے اپنے مرے ہوئے باپ کی۔ ایمانداری سے بتا دو کہ تم راج نیتی میں کیوں جانا چاہتی تھی۔

مگر شوکت جہاں نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آئینہ کی اس گستاخی کو در گذر کر دیا۔ اور اپنا پرس کندھے پر لٹکا کر اور لپ اسٹک کو ایک بار پھر فنشنگ دیتے ہوئے باہر کے دروازے کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ اسے خیال آیا۔ دھوپ بھی تیز ہے' آٹو کے لئے دیر تک کھڑا رہنا پڑے گا۔ پھر جب آٹو آئے گا تو اس قدر بھرا ہوا ہوگا کہ اندر بیٹھتے وقت بھیڑ بھڑ کے بہانے کوئی دو ٹکے کا ناڑی پی کر نالی میں پڑے رہنے والا کامگار کولھے پر ہتھیلی رگڑے گا اور اپنی داہنی بانہہ ذرا سے ہچکولے پر اس کے بدن تک پہونچا دے گا۔ وہ اس مرد کو گھور کر دیکھے گی لیکن وہ کسی اور طرف ایسے دیکھ رہا ہوگا جیسے اسے کچھ پتہ ہی نہ ہو۔ پھر وہ ٹمپو اسے کہیں اتارے گا۔ وہاں سے وہ کہیں اور جائے گی۔ پھر وہاں سے کہیں اور' اور پھر کہیں اور سے گھر اور گھر سے غسل خانے' غسل خانہ سے باورچی خانے اور تب بے شکن چادر والی مسہری کے قریب ہی رکھی سنگار میز کا آئینہ اور آئینے کا پھر اس تمسخرانہ اور غلیظ لہجے میں ہمیشہ کی طرح بدبدانا۔

تمہیں قسم ہے اپنے مرے ہوئے باپ کی۔

ایمانداری سے بتاؤ۔

بتاؤ کہ تم راج نیتی میں کیوں جانا چاہتی تھیں۔

"پہلے اس کمینے سے نپٹ لیا جائے۔" وہ بڑبڑائی اور واپس آکر دھم سے مسہری پر گر پڑی۔

پھر پنکھا بند پا کر اسے یاد آیا۔ آئے دن بھاری تخفیف کے سبب بجلی غائب رہتی ہے۔ لیکن پرتاپ شکلا کے گھر بجلی کبھی نہیں جاتی۔ سارے کمرے ٹھنڈے ٹھنڈے کولروں سے برف خانہ بنے رہتے ہیں گھر میں کوئی رکے تو کیسے رکے۔ لیکن پہلے اس کمینے سے اسے نپٹنا تھا' یعنی اس چسپاہٹ سے' بہت اندر کی غصہ اور کینہ توز آواز سے دو دو ہاتھ کرنا تھے۔

شوکت جہاں نے سچے دل سے اپنے کو ٹٹولا۔

وہ چاہتی تھی اخباروں میں اس کی تصویریں چھپیں۔

جلسوں جلوسوں میں' نامی گرامی نیتاؤں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا ہو۔

اس کے دروازے پر جیپوں' سرکاری ایمبسڈر کاروں کے ہارن بجیں۔

وہ تازہ اور شگفتہ تمتموں سے چائے کی پیالیوں اور مشروبات کے گلاسوں سے آنے جانے والوں کا استقبال کرے۔ اس لئے وہ کھدر کی ساڑی پہننے لگی۔

پھر نیلی پتانگ کی حمایت میں مسلمان کرخنداروں کی ٹولیوں میں تقریر کرنے لگی۔ اور پھر۔ پھر ایکا ایکی پرتاپ شکلا سے بحث کا وہ کڑوا کسیلا دن اپنی ساری بدمزگی کے ساتھ اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا جس دن اس نے پرتاپ کی دی ہوئی دو ڈبے مٹھائی نالے میں اچھال دی تھی۔ اس نے غصے میں پرتاپ شکلا سے کہا تھا۔

"آپ کو منتری بننے کے لئے اردو اور علی گڑھ کو گالی دینا ضروری ہے؟"

"میرے لئے نہیں۔۔۔۔" پرتاپ بھڑک اٹھا تھا۔ "تمہارے لئے ضروری ہے۔ مین اسٹریم میں شامل ہونے کے لئے یہ باتیں ہندو تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہے۔ لیکن تم سمجھنا چاہو تب نا۔۔۔!"

"یہ نہرو کا سیکولرازم تو نہیں ہے" شوکت نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔

"سیکولرازم کسی گھرانے کی جاگیر نہیں ہے۔" پھر پرتاپ نے سامنے پڑے ہار پھول اور مٹھائیوں کے پیکٹ کی طرف اشارہ کر کے جو اس کے جنم دن کے موقع پر اسے پیش کئے گئے تھے' کہا تھا۔

"میں نے تم سے یہ شکایت نہیں کی کہ میرے جنم دن پر تم ہار پھول لیکر کیوں نہیں آئیں۔ لیکن میں تم سے یہ شکایت ضرور کروں گا کہ تم اپنے نیتا کی بات نہیں مانتیں۔ جب تم سے کہا جا رہا ہے کہ مسلمانوں میں جا کر تم کو پرچار پرسار کا یہ کام کرنا ہے کہ انھیں اردو اور علی گڑھ سے اب اوپر اٹھنا چاہئے تو تم ویسا ہی کرو۔"

اس بات کو سن کر وہ پرتاپ سے بہت جھگڑی تھی۔ مولانا آزاد کے ایک خطبہ کے کچھ حصے بھی اس نے پرتاپ کو سنائے تھے۔ لیکن جب پرتاپ نے شوکت کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا تو وہ جل کر بولی تھی۔

"مجھے تو بتایا گیا تھا کہ کانگریس ایکتا میں ایکتا کو مانتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" پرتاپ نے چڑھ کر جواب دیا تھا۔ "تو کانگریسی نہیں ہوں میں' گھس آیا ہوں کانگریس میں؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں پہلے آر ایس ایس میں رہا ہوں گا۔ ان لوگوں نے گھسیڑ دیا مجھے کانگریس میں' تم بھی سب سے کہو۔ نہرو آزاد اور جانے کون کون سب اپنی اپنی قبروں میں سو رہے ہیں۔ ہم سے کیا بات کریں گے وہ؟ انھیں NEW POLITICAL COMPULSIONS ہیں جھیلنا پڑ رہے ہیں۔ انھیں نہیں۔۔۔ وہ سب تو اسکرو ڈرائیور ٹکنالوجی کی طرح اسکرو ڈرائیور ڈیماکریسی جس کے الگ الگ حصے ہم نے باہر سے منگا کر اپنے یہاں جوڑ لئے تھے' ہم کو پکڑا کر کھسک لئے ہیں۔ اور ان سالے مسلمانوں کے لئے کیا کہوں' وہی مثل ہے کہ بدن پر نہیں لتہ اور پان کھائیں البتہ۔۔۔ مسلمانوں کو روٹی تو مل نہیں رہی۔ اردو بولنے کی عیاشی میں مرے جا رہے ہیں' ارے بھائی پہلے چو تڑ ڈھکنے کا پربندھ کر لو' تب اردو بولو بولتے ہوئے اچھی بھی لگے گی۔"

پھر اس نے شوکت جہاں کے بھائی قدرت اللہ کو لے کر اس کے ہندو سامپروائک پارٹی کے اخبار کی ادارت کرنے کا طعنہ بھی دیا تھا اور مٹھائی کے دو ڈبے بھی تھما دئے تھے جو وہاں بہت سارے پڑے تھے۔

اس دن پرتاپ شکلا نے شوکت جہاں پر، یعنی ایک عورت پر، سب سے کاری ضرب لگائی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ ایک عجیب سا شک اور ایک قدرے غیر موہوم سا وسوسہ شوکت جہاں سے یہ سوال کر بیٹھا کہ بی بی ذرا غور کرکے یہ بتاؤ کہ چوڑیوں سے کھنکتی ہوئی گوری کلائیوں والی اور ادا کے ساتھ تسلیم اور آداب کرنے والی مسلم گھرانے کی چہکتی ہوئی عورت کو بغل میں لے کر گھومتا اور اپنے فارم ہاؤسوں میں لے جاتا کہیں ایسا تو نہیں کہ ہندو دھانگوں کا STATUS SYMBOL بنتا جا رہا ہو۔ اس لئے اس نے پرتاپ سے کہا تھا۔

"اگر میں یہ پارٹی چھوڑ دوں تو---؟"

اور پرتاپ نے جواب میں جیسے پورا خنجر اس کے سینے میں اتار دیا تھا۔

" تمہاری مرضی--- کسی پارٹی میں بھی جاؤ، استعمال عیش و آرام کے لئے ہی کی جاؤگی۔"

رکشے پر بیٹھ کر شوکت کو لگا تھا کہ پرتاپ کے دیئے ہوئے مٹھائی کے ڈبوں سے بو آ رہی ہے، تو اس نے دونوں ڈبے رکشے پر بیٹھے بیٹھے نالے میں اچھال دئے تھے۔ شوکت جہاں نے ودھایک پرتاپ شکلا کے دیئے ہوئے ڈبے رکشے پر سے نالے میں اچھال تو دیئے، لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ آگے ایسا کیا ہونے والا ہے جو پہلے نہیں ہوا کرتا تھا۔ رات دس بجے کے آس پاس شوکت جہاں کا فون گھڑ گھڑایا۔ گرمیوں کی رات تھی، کھلی چھت پر اس نے چارپائی کو پانی چھڑک کر ہلکا سا گیلا کر لیا تھا اور خالی بلاوز اور پیٹی کوٹ میں اس پر لیٹی تھی-- اس نے فون اٹھایا تو دوسری طرف سے ودھایک پرتاپ شکلا کی بھدی سی آواز سنائی دی۔

"تو تم گھبرا گئیں--؟"

"نہیں۔"

"تو پھر ڈر گئی ہوگی۔" وہ پورے اعتماد سے بولا۔ "سچ بتاؤ ڈر گئی ہو نا--"

"ہاں ڈر تو گئی ہوں۔ میں کیا سارا مسلمان ڈرا ڈرا سا ہے۔"

جواب میں پرتاپ دو پل بھونڈی ہنسی ہنستا رہا۔ پھر اپنے ایک ایک لفظ کو جما جما کر کہنے لگا۔

"آج کل دو طرح کے ڈر زیادہ چل رہے ہیں، تم کس ڈر سے ڈر گئی ہو۔؟"

"مطلب--؟" شوکت نے پوچھا۔

"ایک وہ ڈر جو سماجی شریف زادوں کو ڈراتا ہے اور دوسرا وہ ڈر جس سے سیاسی حرامزادے ڈرتے ہیں۔"

شوکت کے جی میں آئی کہ رسیور رکھ دے لیکن ایسا وہ ایک آدھ بار پہلے بھی کر چکی تھی۔ یہ سوچ کر کہ ٹیلیفون کاٹ دینے سے رشتہ نہیں کٹے گا، (کیونکہ پرتاپ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو چپ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں) شوکت جہاں نے سوچا کہ تھوڑی سی بات اور کر لے، اتنی بات کہ پرتاپ کو تھوڑا سا غصہ آجائے۔ غصے میں وہ اکثر ایسی باتیں کرتا تھا جن سے شوکت جہاں کو خود کو اور حالات کو اور حالات کی سنگینی کو سمجھنے یا انہیں سہنے یا ٹال جانے یا پھر ان کی سفاکی سے سبق لینے کا موقعہ مل جایا کرتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جب وہ پرتاپ شکلا سے پہلی بار شروع شروع میں ملی تھی تو پارٹی میں اس کی وہ حیثیت نہ تھی جو آج ہے۔ ویسے تو پرتاپ آج بھی ایک ودھایک ہی تھا۔ لیکن اب وہ مکھیہ منتری کے اس قدر قریب تھا جتنی خود اس کی کھال۔ وہ فون پر اداسی سے بولی...

"اپنے بارے میں تو میں کچھ جانتی نہیں---- آپ مکھیہ منتری کے چہیتے ہیں یہ ضرور جانتی ہوں۔"

"تو کیا ہوا---؟" وہ چہک کر جلدی سے کھلی آواز میں بولا۔ "جانتی ہو! اپنے بچاؤ کے لئے کل یہی مکھیہ منتری مجھے بھی دو کوڑی کا بنا سکتا ہے۔ تم نے سنا نہیں ہے کیا؟ کہتے ہیں جب بندریا جلنے لگتی ہے تو اپنے نیچے اپنے بچے کو رکھ لیتی ہے۔"

"آپ نے فون کیوں کیا !"

"میری کوئی بات بری لگی ہو تو مجھے معاف کردو۔ کل چار بجے گھر پر آؤ۔"

"کیوں-- آپ کے گھر کیوں آؤں؟-- آپ کے ذریعہ استعمال ہونے کے لئے؟--"

"نہیں--- ہرگز نہیں--!"

"آپ ہی نے تو کہا تھا---" شوکت جل کر بولی-- تم عورت ہو جہاں بھی جاؤگی مرد کے استعمال میں ہی رہوگی۔"

یہ جملہ ادا کرتے ہوئے شوکت طے کر چکی تھی کہ جملہ ختم ہوتے ہی اسے فون رکھ دینا چاہئے۔ کیونکہ اس کے بعد کم سے کم فوراً پرتاپ شکلا تو اسے فون نہیں کرے گا-- اس لئے شوکت نے فون رکھ دیا۔ وہ چپ چاپ گیلے بادھوں والی چارپائی پر چت لیٹے کھلے کھلے صاف ستھرے تاروں بھرے آسمان کو دیکھتی رہی۔

کیا وہ جانتی تھی کہ وہ سیاست میں کیوں آنا چاہتی ہے؟ کیا وہ جانتی ہے کہ راستہ اتنا آسان نہیں ہے۔ یا تو وہ گھر بیٹھ رہے اور صبح سے شام تک بیٹھی رہے، یا پھر لیٹ جائے یا پھر دروازے پر کھڑی ہو جائے یا چھت پر چلی جائے یا بجلی چلی جانے پر ہاتھ کے پنکھے سے ہوا کرتی رہے اور مقدر کو کوستی رہے اور لمبے اکتا دینے والے دن تھکا دینے والی بے خواب راتیں جھیلے اور بار بار بستر سے اٹھ کر بتی جلا کر مچھردانی میں گھسے مچھروں کو اکتائے ہوئے من سے مارے پھر بتی بجھائے، پھر کروٹیں لے اور پھر نہ جانے کب سو جائے۔ یہ جو گوری چمڑی ہے

اور یہ جو چوتڑوں کی ٹھیکی مار ہے اور یہ جو کسا کسا اور اٹھا سا جوبن ہے اور پھر سب سے زیادہ یہ جو ایک پارٹی میں باپ کے حوالے سے آنے جانے اور ملنے جلنے کا ایک موقع ہے--- یہ بہت قیمتی ہے۔ گھر بیٹھے کچھ نہ ہو گا سارے بڑے کاموں میں خطرہ تو ہوتا ہی ہے اور جوکھم اٹھائے بغیر--- پھر فون کھڑکھڑایا وہ اٹھی فون تک گئی مگر چونگا اٹھائے بغیر واپس آکر پلنگ پر لیٹ گئی۔ گھنٹی دیر تک بجتی رہی پھر تھک ہار کر خاموش ہو گئی۔

شوکت جہاں کو یاد آیا ودھایک پرتاپ شکلا نے اسے بتایا کہ اس کے ایک منتری دوست کا شوکت جہاں پر دل آگیا ہے--- پرتاپ نے کہا تھا۔

"میرا وہ دوست بڑا نمبری ہے سالا--- سسرے نے کبھی دھوتی کے نیچے جانگیہ نہیں پہنا--- ایک دن تم کو دیکھ کر مجھے بولا تھا--- یار اس کو پٹاؤ--- در اصل پرتاپ کو غصہ اس بات کا تھا کہ اس کا منتری دوست کچا مال پرتاپ سے منگواتا تھا پھر اس سے کہتا تھا کہ وہ اس کو پکا کر کھانے کے لائق بنائے اور پرتاپ ہی کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اس کی تھالی میں اس کے پکے ہوئے مال کو پروس بھی دے--- شوکت نے ایک دن پرتاپ سے کہا تھا...

"جب میں آپ کے ساتھ ہوتی ہوں تو آپ کچھ ڈرے رہتے ہیں۔"

"ہاں---" اس نے اقرار کیا تھا۔

"اس لئے کہ تمہارے آس پاس کیا ہوتا رہتا ہے اس کی ہر دم خبر رکھنا سیکھو، ہر دم اپنی ہی دھن میں مست الست رہنے کی خطرناک اداؤں سے مشکل میں پڑ سکتی ہو۔"

"کیوں---؟" وہ بھولے پن سے بولی۔

"کیونکہ سماجی شریف زادوں اور سیاسی خبیثوں کی دنیا ہی الگ الگ ہیں۔" شوکت نے آنکھیں پٹپٹائیں اور بولی...

"مطلب...؟"

"مطلب ان الگ الگ دنیاؤں کے وسوسے الگ ہیں ڈر اور خوف الگ ہیں۔ کہیں میں تمہیں اپنی گود میں بٹھالوں کہیں کمہ منتری اپنی وھسکی کا گلاس تمہارے ہاتھوں سے بنوانے کے لئے تم کو اپنے ساتھ پہاڑ پر نہ لے جائے اس لئے سماجی شریف زادے کا ڈر اور سیاسی حرامزادے کا ڈر دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

تب شوکت جہاں کو اپنے آس پاس محلے میں، شہر میں بسی ہوئی بہت سی سماجی شریف زادیاں یاد آئی تھیں جن کے پرانے دروازے پر ٹاٹ کے پردے رہا کرتے تھے۔ جو ان پردوں کے پیچھے سے تانک جھانک کے مشغلے سے دل بہلاتی تھیں، کوئی فلمی گیت گنگناتے ہوئے صبح صبح روز یکی اکتائی کا کورا کرکٹ سمیٹتی تھیں۔ مرد کے لئے روٹیاں تھوپتی تھیں۔ بچوں سے چھاتیاں چچڑواتی تھیں، شلوار کی میانی سے لیکوریا کی رطوبت پاک کرتیں اور سماجی شریف زدگی کی چادر اوڑھے اوڑھے چہرے پر جھریاں ابھر آنے پر اگر قسمت نے یاوری کی تو مدینے ہو آئیں نہیں تو اسپتال کے برآمدے میں ہاتھوں سے مکھیاں ہنکاتے ہوئے اور لا الہ الا اللہ پڑھتے ہوئے سانس لیتیں اور ملک عدم سدھار جاتیں۔

وہ تین روز تک شوکت گھر سے باہر نہیں نکلی۔ ایک گہرا تلاطم تھا اس کے اندر، پھر وہی تچھلی سی کیفیت ہونے لگی تھی۔ وہی پرانا انجانا سا خوف، پھر وہی دانت پر دانت بیٹھ جانے والا اور جبڑے بھنچ جانے والا دورہ جو اس روز پڑا تھا---

اس منحوس روز---- شوکت اپنے خیالوں کی دنیاں میں پہونچ گئی۔

ان دنوں اشفاق کی جوان بیوی کسی بات پر ناراض ہو کر اپنے میکے بیٹھی ہوئی تھی، اور میرا باپ لکڑی کی نیلامی چھڑانے کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ جلاؤ لکڑیوں کا کاروبار تھا مگر اس کی آڑ میں قیمتی لکڑیاں بھی مال میں دبا کر نکال لی جایا کرتی تھیں۔ بازار بند تھا اس لئے اشفاق اپنے گھر پر تھا۔ مشتری رقیہ کے ساتھ میرے گھر آئی اور کسی بہانے سے مجھے گھر سے نکال لائی۔ سڑک پر اشفاق کے گھر کے سامنے سے جب ہم تینوں گذرے تو دروازے پر اشفاق کھڑا تھا، اسے کوئی کتاب دینے اور لینے کے بہانے مشتری ہمیں لیکر اس کے گھر کے اندر گئی۔ گھر میں اشفاق اکیلا تھا۔ اس نے صاف شفاف شیو بنایا تھا کپڑوں سے تیز سینٹ کی خوشبو بھی آرہی تھیں۔ وہ بار بار اپنے ہونٹ زبان پر پھیر کر گیلے کر رہا تھا۔ مجھے نہ جانے کیسے کیسے دیکھ رہا تھا۔ مشتری نے مجھ سے کہا کہ میں آرام سے اشفاق کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کروں تب تک وہ دونوں دوسرے کمرے میں کتابوں کی الماری سے ناولیں تلاش کرلیں گی۔ دوسرے کمرے میں جاتے جاتے رقیہ شرارت سے اشفاق سے بولی تھی۔

"جب باتیں ختم ہو جائیں تو ہم دونوں کو پکار لیجئے گا۔" پھر میں اشفاق کے ساتھ کمرے میں اکیلی رہ گئی---- اس منحوس دن مجھ کو مرد کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تو بس اتنا کہ مرد اگر کچھ ہے تو، رانوں کے درمیان پیوست ہوتا ایک تیز دھار سفاک خنجر۔

ایک کبھی نہ مندمل ہونے والا کرب ناک اور شرمناک زخم۔

خون میں لت پت کر کے بھی چیخنے اور چلانے کی مہلت نہ دینے والا قصائی۔

میں فرش پر کھڑی تھی اور میری رانوں اور پنڈلیوں پر سے بہتا ہوا تازہ تازہ خون میری ایڑیوں کو تر کرتا فرش پر ٹپک رہا تھا۔ میں نے مشتری سے مجھے میری پھوپھی کے گھر لے چلنے کو کہا، جب میں اپنی پھوپھی کی گود میں گری تو مجھے غش آگیا تھا۔ میرے جبڑے بھنچ گئے تھے اور اوپر کے دانت نیچے کے دانتوں پر جکڑ گئے تھے۔

لیڈی ڈاکٹر جان پہچان کی تھی۔ میری پھوپھی زاد بہنوں کے یہاں ڈلیوریاں اس کے نرسنگ ہوم میں ہوئی تھیں۔ سات دن بھرتی رہی۔ چھ مہینے میں دوبار خون چڑھا، ماں تو جان گئی لیکن کسی نے میرے باپ کو اصلیت کی بھنک

بھی نہیں لگنے دی۔ ورنہ وہ بستر پر پڑ جاتا' پھر پورے ایک سال میں دن کی روشنی سے بھی ڈرتی رہی۔ پیروں کی کوئی چاپ چارپائی کے قریب سے بھی گذر جاتی تو میں گھبرا کر بیٹھ جاتی۔۔۔ پھر یہ ہونے لگا کہ جب بھی میری شادی کی ذرا سی بات کانوں میں پڑتی تو فوراً میں دانتوں کے درمیان اپنا دوپٹہ رکھ لیتی کیونکہ خوف سے مجھ پر ویسا ہی دورہ پڑ جاتا' جبڑے ایک دوسرے سے چپک جاتے دانت بھنچ جاتے اتنی طاقت اور مضبوطی سے کہ پھر دیر تک علاحدہ نہ ہو پاتے اور پھر کئی دن تک ان میں دکھن ہوتی رہتی۔

انھیں دنوں شہباز میاں کی بیوی اور شوکت کی منہ بولی باجی یعنی عائشہ سے شوکت نے ہر دم اپنی پیٹھ پر چپکے رہنے والے' ایک بے نام سے بھیانک خوف کا ذکر کیا تھا۔ تب عائشہ باجی نے ہی اسے لڑکیوں کے ہیلتھ کلب میں جوڈو کراٹے سیکھنے کا مشورہ دیا تھا اور اپنی موٹر میں بٹھا کر اسے لے گئی تھیں۔ اس کا فارم بھروا کر اپنے پرس سے فیس بھی ادا کی تھی۔۔۔ نہ جانے کیوں عائشہ باجی کے آس پاس رہتے وقت وہ اپنے سارے ڈر بھلا دیتی' لیکن ایک دن گھر کی دیوار کے دوسری طرف جس دیوار کے روشندان پر وہ اشفاق کی آنکھیں دیکھتی تھی' اس نے ماتمی شور برپا ہوتے سنا۔ اسی وقت محبوب علی سقہ کی بیوی باہر کے دروازے کا پردہ ہٹا کر آنگن میں داخل ہوئی اور چھاتی پر ہاتھ رکھ کر چلائی۔۔۔

"اشفاق میاں ٹرک کے نیچے آگئے' بھیجا زمین پر نکل آیا۔۔"

شوکت اچھل سی پڑی' اسے ایک پل کو ایسا لگا جیسے اس کی پیٹھ پر چپکی ہوئی خوف کی گھناؤنی چھپکلی ایک جھٹکے سے اچھل کر دور جا گری ہو۔ اس روز شوکت قدرت اللہ سے لپٹ کر ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ کہنا چاہتی تھی۔

"بھیا قبرستان جانا تو اشفاق کی قبر پر تھوک ضرور آنا۔"

انھیں دنوں پرتاپ بھی شوکت کے باپ سے اجازت لے کر شوکت کو پارٹی کے چھوٹے موٹے کاموں میں دیگر عورتوں کے ساتھ الجھا دیا کرتا۔ تھوڑے دنوں بعد جب کسی جلسے جلوس کے موقع پر شوکت کو ریشمی کپڑے کا رنگین ربن لگا بلا جمپر پر کندھے سے ذرا نیچے کنیا سے ٹانکنے کے لئے دیا جاتا تو بلا لگا کر لوگوں کے درمیان گھومنے پھرنے میں اسے اپنی امتیازی حیثیت کا احساس ہوتا اور وہ سوچتی ایسے موقعے بار بار اور جلدی جلدی آتے رہنا چاہئے۔

لیکن ابھی پچھلے دو چار مہینے سے شوکت کو پھر ایسا لگنے لگا تھا جیسے پیٹھ پر ٹھیک اس پرانی جگہ کوئی موٹی سی چھپکلی اپنے پنجے گڑا رہی ہے۔ پرتاپ اسے فارم ہاؤس میں پھولوں کی نرسری دکھانے لے گیا تھا۔ وہاں اپنے کمرے میں بیر کی بوتل کھلوائی تھی اسے استعمال کے لئے ملازم نے ایک کے بجائے دو گلاس دھو کر رکھے تھے۔ قریب ہی پرتاپ کا نرم گدوں والا کشادہ بستر بھی بچھا تھا اور کھڑکیوں پر دبیز پردوں نے شیشوں کو پوری طرح ڈھک رکھا تھا۔ شوکت اس کمرے میں نہیں رکی۔ جتنی دیر پرتاپ شغل کرتا رہا' شوکت پھولوں کے پودوں کو دیکھتی رہی اور مالی کے بال بچوں کے بیچ مونڈھا ڈال کر تازہ مٹھا پیتی رہی۔

شوکت نے سوچا تھا کہ وہ گھر جا کر فون پر پرتاپ کو گالی ضرور دے گی۔ لیکن یہ بات تھوڑے دنوں بعد شوکت کو پتہ معلوم ہوتی کہ پرتاپ کے لئے اس سے بڑے خوشی کی اور کوئی بات نہ تھی کہ شوکت اسے گالی دے۔ ایک بار نہیں بار بار۔ کل دوسری پرسوں تیسری تاکہ شوکت جہاں پرتاپ کی ضرورت کے مطابق بے شرم اور بے حیا بن سکے۔

انھیں دنوں جب وہ کسی موقعے پر اپنی مرحوم عائشہ باجی کے شوہر شہباز میاں سے ملی تھی تو انھوں نے شوکت سے اپنائیت کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کی تھیں جن میں قیمتی اشارے بھی شامل تھے۔

"میری بیوی اکثر کہتی تھی۔" شہباز اس سے مخاطب ہوئے تھے۔

"عورت کو ہر لمحہ اپنے عورت پن کی تلاش میں رہنا چاہئے۔"

پھر انھوں نے سیدھا شوکت سے مخاطبہ جوڑا تھا۔

"تم بھی مکالمہ کرتی ہو؟"

"کس سے۔۔۔؟" شوکت نے سوال کیا تھا۔

"خود سے" شوکت کچھ نہ بولی۔ "اپنے آپ سے مکالمہ" کم سے کم ہفتے میں ایک بار۔۔۔ بس تھوڑے سے سوال جواب"

"کس چیز کے بارے میں۔؟"

"خود اپنے بارے میں۔ اگر کچھ کیا ہے تو کیوں کیا ہے؟ نہ کرتیں تو کیا ہوتا؟ ایسا کیا کچھ کرنا پڑ رہا ہے جس کے کرنے میں روشنی کی نہیں اندھیرے کی ضرورت پڑتی ہے۔۔۔؟ ایسے ہی بہت سے سوال۔۔ پھر ان کے جوابوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی ساتھ ہی ساتھ قائم رکھنا چاہئے۔"

شوکت کو خبر نہ تھی کہ اس طرح کا مکالمہ اس کی سوتیلی ماں اکبری بیگم بھی گھر سے نکلنے سے پہلے اپنی بغلوں میں ولایتی سینٹ کی پھوار ڈالتے ہوئے اکثر اپنے آپ سے کر لیا کرتی تھیں۔

شوکت کی سوتیلی ماں اکبری بیگم لڑکیوں کے مڈل اسکول میں استانی تھی۔ گھر کی جلاؤ لکڑیاں وہ شوکت کے والد کی ٹال سے خریدنے آیا کرتی۔ تب اس کا بائیس تیئس کا سن تھا اور مدرس کے بیٹے کی قلیل آمدنی سے پریشان تھی۔ انھیں دنوں کچھ ایسا ہوا کہ وہ شوکت کے باپ کو دیکھ کر کچھ زیادہ ہی مسکرانے لگی۔ تب تک باپ رنڈوے ہو چکے تھے اور مسکراہٹوں کی ہی تلاش میں تھے۔ انھوں نے اکبری بیگم کو مشورہ دیا کہ وہ تھوک بھاؤ میں ان سے جلاؤ لکڑیاں لے جایا کرے اور پھٹکر بھاؤ میں انھیں بیچا کرے۔ اکبری بیگم نے اپنے دروازے کے سامنے محرّم کو کھلا پلا کر ایک چھوٹا سا سائبان ڈال لیا تھا اور لکڑیاں بیچنے لگی۔ پھر تو شوکت کے باپ کی ٹال پر ان کی گدی کے پاس مونڈھا ڈالے اکبری کو اکثر بیٹھا پایا جانے لگا۔ بس انھیں دنوں میں سے ایک صبح اکبری کے بدن پر مہکتے

پھولوں کے گہنے شوکت کے باپ کے بستر پر مسلے پڑے تھے اور وہ ان کے نکاح میں آچکی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے برس آندھی طوفان کی طرح گذر چکے تھے جس میں اکبری بیگم کی بیوگی کے پانچ سال بھی شامل تھے۔ حالانکہ شوہر کے مرنے کے تین مہینے بعد ہی سے اکبری کی بیوگی کے نشانات اس کے حلیے اور چہرے مہرے سے غائب ہو چکے تھے، لیکن اب تو اس کی چھل بل ہی کچھ اور تھی۔ جب بھی وہ دن بھر کے بعد گھر میں داخل ہوتی، سب سے پہلے اپنے کندھے پر لٹکنے والے پرس کو دیوار کی الماری میں بند کر کے تالا لگاتی۔ کئی بار شوکت جہاں کے دل میں یہ خواہش بیدار ہوئی کہ وہ کبھی ماں کی نظریں بچا کر اس پرس کی تلاشی لے کر دیکھے۔ لیکن شوکت کو اس کا کبھی موقع نہ ملا۔ مگر ایک دن شوکت جب ماں کے کمرے کے دروازے کے سامنے سے نکلی تو اس نے دیکھا کہ میز پر ماں کا پرس رکھا ہے۔ لیکن ماں تو کچھ دیر پہلے ہی اپنے روز مرہ کے مطابق گھر سے نکل چکی تھی۔ شوکت سمجھ گئی کہ جلدی میں وہ پرس میز پر ہی بھول کر چلی گئی ہے۔ شوکت پہلے تو بھاگ کر گھر کے صدر دروازے پر گئی۔ باہر ادھر ادھر جھانک کر دیکھا۔ پھر جلدی سے دروازہ بند کر کے اور اندر سے کنڈی لگا کر واپس ماں کے کمرے میں آئی۔ دھیرے سے پرس کو کھولا اور احتیاط سے اندر کا جائزہ لینے لگی۔ سب سے پہلے ایک چھوٹی سی ڈائری اس کے ہاتھ لگی۔ ڈائری میں معروف لوگوں اور پولیس کے کچھ حکام وغیرہ کے فون نمبر تھے اور ڈائری کے پلاسٹک فلیپ کے اندر آدھی پھنسی پاسپورٹ سائز کی کسی موچھوں والے مرد کی تصویر جھانک رہی تھی۔ ڈائری بند کر کے اس نے پھر ہاتھ ڈالا۔ دیکھا چھوٹے سے پرس میں چند روپئے تڑے مڑے رکھے تھے۔ پھر اس کو لپ اسٹک، شیشہ اور دستی وغیرہ کے علاوہ اس میں سرکاری اسپتال میں تقسیم کئے جانے والے نرودھ کے دو پیکٹ بھی دکھائی دیئے اس کے ساتھ ربن بینڈ میں بندھے کچھ ملاقاتی کارڈ بھی رکھے تھے۔ جن میں زیادہ تر پولیس افسران اور ہوٹل کے پروپرائٹروں کے کارڈ تھے۔ شوکت کو پرس باہر سے ہی کچھ پھولا پھولا لگ رہا تھا اس لئے شوکت نے پرس کے باہری خانے کی زپ بھی کھولی جو غالباً کافی کھینچ تان کے بعد مشکل سے بند ہو پائی تھی۔ زپ کھلی تو اس خانے سے ایک شیشی نکلی جس میں پانی کی رنگت کا کوئی مشروب تھا۔ شیشی سیل بند تھی اور اس کے لیبل پر کسی ڈرائی جن کا نام لکھا ہوا تھا ساتھ ہی کینٹونمنٹ ایریا کی آرمی کینٹین کی رسید بھی رکھی تھی جو کسی کیپٹن کے نام کی تھی۔ اس کے علاوہ دو ایک سینما گھروں کی بالکونی درجے کے لال پیلے ٹکٹوں والے کاؤنٹر فوائل بھی پڑے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹے سے پرچے پر کسی ٹھاکر نام کے سب انسپکٹر پولیس کا نام، اس کے موجودہ تھانے اور وہاں چارج لینے کی تاریخ وغیرہ کے ساتھ کسی نئے تھانے پر مطلوب تقرر کی تفصیلات درج تھیں، شوکت نے جلدی جلدی سب چیزوں کو ویسے ہی واپس پرس میں رکھ دیا اور بند کر کے پھر ٹھیک اس جگہ رکھ کر ماں کے کمرے سے باہر آئی تھی کہ باہر کے دروازے کی کنڈی کھنکھنانے کی آواز آئی۔ ان دنوں کال بیل کام نہیں کر رہی تھی، کیونکہ بجلی کے پچھلے دو بلوں کے بقایا کی ادائیگی کے نوٹس پر بھی رقم نہ جمع کئے جانے کے سبب کنکشن کاٹ دیا گیا تھا۔ شوکت نے باہر کا دروازہ کھولا تو دیکھا ماں ہے۔ وہ تیر کی طرح اندر آئی اور سیدھے اپنے کمرے میں پہونچی۔ اپنے پرس کو تشویش کے ساتھ کھول کر ایک نظر دیکھا، پھر کندھے پر لٹکا کر الٹے پیروں واپس چلی گئی۔

دھیرے دھیرے شوکت نے یہ بھی دیکھا کہ ماں دو دو تین تین دن گھر سے غائب رہنے لگی۔ ایک دن بیٹی نے ماں سے مکالمے کی شروعات یوں کی۔

"ماں ـــــ تم کہاں چلی جایا کرتی ہو؟"

"تمہارا باپ کہاں چلا جایا کرتا تھا؟ کیا کبھی مجھ کو یا تم کو بتاتا تھا؟" جواب ملا۔

کچھ دن بعد شوکت نے پھر مکالمہ شروع کیا۔

"ماں محلے والے اب بہت باتیں کرنے لگے ہیں۔"

"جب تم اشفاق سے سینما گھروں میں ملتی تھیں تب محلے والوں کا خیال آیا تھا تم کو۔؟" شوکت کو جواب ملا۔

"ماں تمہارے پاس پولیس والوں کے اتنے فون کیوں آتے ہیں۔؟"

"میں تو تم سے کبھی نہیں پوچھتی کہ پرتاپ شکلا تمہیں کیوں فون کیا کرتا ہے۔" شوکت کو جواب ملا تھا۔

پھر شوکت کو معلوم ہو گیا کہ اس کی ماں بڑے بڑے حکام کے عشرت کدوں کی زینت بن رہی ہے۔ وہ پولیس کی مخبری بھی کرتی ہے اور اعلیٰ حکام اور ان کے ماتحتوں کے درمیان رشوت کے لین دین میں دلالی کا کام بھی انجام دیتی ہے۔ ڈھلتی عمر میں ہونے کے باوجود کمرہ بند کر کے ایک گھنٹہ ورزش کرتی ہے، جسم کو متناسب اور وزن کو قابو میں رکھتی ہے۔ اناج چھوڑ کر ایک وقت صرف سلاد کھاتی ہے اور ہر آٹھویں دن کسی بیوٹی پارلر میں پانچ گھنٹے کا مسلسل وقفہ اپنے چہرے مہرے کی زیبائش کے لئے گذارتی ہے پھر وقت بھی کہاں تھا۔؟ ماں بیٹی کے درمیان سارے مکالمے ختم ہو چکے تھے۔

ممو خاں کے چہرے پر ان کی مونچھیں ایسی بہار دیتی تھیں کہ دیکھنے والا پلٹ پلٹ کر اور گھوم گھوم کے دیکھتا تھا۔ بالوں کی موٹائی، چمک اور شادابی کے ساتھ ان کی اینٹھن میں جو بانکپن تھا ممکن ہے وہ آصف الدولہ کی مونچھوں میں رہا ہو۔ جب انہوں نے آموں کا نیا باغ لگوایا تو ایک پڑوس باغبان راحت میاں نے ان کے اس باغ کا پانی کئی بار چوری سے کاٹ کر اپنے نئے باغ میں لگوا لیا۔ ممو خاں کو پتہ لگا تو ایک دن وہ بڑے آرام سے شام کو سفید اور بے داغ شیروانی پہن کر اور اس کے آٹھوں بٹن بند کر کے اور گلے کا تکمہ بھی اچھی طرح لگا کر ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والی چھڑی گھماتے راحت کے گھر بڑی بے نیازی کے

ساتھ پہونچ گئے۔ میزبان کے ساتھ حقہ پیا اور اس کی بیوی کی گٹھیا کی پرانی بیماری کے علاج کے لئے اپنا خاندانی تیر بہدف نسخہ بھی ہوا کر وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ راحت میاں کو خلوص سے دوا پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا۔

"بھابی جان کو اس دوا کی تین پڑیاں بنا کر کھلایئے۔ ایک ماہ میں ہی انشاء اللہ خاطر خواہ شفا ہوگی۔"

لیکن جب راحت میاں ممو خاں کی اس نیک دلی پر تشکر کے کلمات ادا کر رہے تھے تو اس وقت ممو خاں انگلیوں کی پوروں پر بیس بار گن کر اپنے دل ہی دل میں یہ جملہ دہرا رہے تھے۔

"میں یاد رکھوں گا کہ تو نے میرے باغ کا پانی کاٹا تھا۔"

"میں یاد رکھوں گا کہ تو نے میرے باغ کا پانی کاٹا تھا۔"

"میں----"

"-----پانی کاٹا تھا"

اگلے سال جب ممو خاں راحت میاں کے نواسے کے عقیقے کی تقریب میں گئے تو بچے کے لئے جوتے موزے اور بنیان وغیرہ کے ساتھ مکمل جوڑا پورے تکلفات کے ساتھ خوان پوش میں ڈھکوا کر پہنچایا اور بڑے تپاک سے پڑوسی باغبان کے ہاتھ سے پیش کئے گئے پان اور الائچی سے منہ لال کیا۔ لیکن اس وقت بھی انھوں نے انگلیوں کی پوروں پر گن گن کر دل ہی دل میں دہرایا۔

"میں یاد رکھوں گا کہ تو نے میرے باغ کا پانی کاٹا تھا۔"

"میں یاد رکھوں گا کہ تو نے میرے باغ کا پانی کاٹا تھا۔"

ایک آدھ سال اور گذر گیا تو ممو خاں کو کسی موقع پر ایک بار ایسا لگا کہ جو جملہ وہ بیس بار دل ہی دل میں دہرایا کرتے ہیں' اس کی قوت کو وقت غالباً کچھ کمزور کرنے لگا ہے تو انھوں نے آئندہ اس جملے کو اس طرح دہرانا شروع کر دیا۔

"قرآن قسم میں یاد رکھوں گا کہ تو نے میرے باغ کا پانی کاٹا تھا۔"

پھر یہ ہوا کہ سات آٹھ سال میں پڑوسی باغبان کا وہ باغ جسے اس نے کئی بار ممو خاں کا پانی چرا کر سینچا تھا' جب اپنی پہلی فصل کے بوجھ سے مستا رہا تھا تو ممو خاں نے اسی طرح سے سوچا جیسا کہ ان کے خیال میں آم کی باغبانی کرنے والے کو سوچنا چاہئے اور اسی طریقہ سے سات سال پہلے اپنے دل پر لگی چوٹ کو جھاڑ پونچھ کر باہر نکالا' جو ان کے خیال میں آم کو اپنا کلیجہ نکال کر چاشنی فراہم کرنے والی تہذیب کو کرنا چاہئے۔ وہ غصے میں اکثر کہتے تھے۔

"صبر اور انتظار کے معاملے میں حضرت ایوب کی قسم آم کے باغبان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔" لہٰذا ان کی پرانی چوٹ نے سب سے پہلے یہ کیا کہ بڑی رازداری کے ساتھ آم کی منڈی کے آڑھتیوں اور تھوک خریداروں میں اپنے شاندار باغ کے آم کی پوری فصل مفت تقسیم کر دی اور ان کی یونین کو نقد پانچ ہزار روپے بھی چندے کے طور پر دیا اور آخر میں ان کے مکھیاؤں کو ولایتی دارو فراہم کروائی۔ جب راحت میاں اس باغ کی فصل ٹرک میں بھر کر منڈی پہنچے تو سارا دن بھاؤ بٹھانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن منڈی کے تھوک بیوپاری ایک ٹرک ریت کا دام بھی لگانے کو تیار نہ ہوئے۔ ٹرک واپس لوٹ گیا۔

دوسرے دن ٹرک پھر منڈی لایا گیا' اب دام ایک ٹرک مٹی بھر کے بھی نہیں رہ گئے--- مال پھر واپس چلا گیا۔

تیسرے دن جب مال پھر آیا تو داغ لگنا شروع ہو چکا تھا۔ آڑھتیوں نے ایسے دام لگائے جیسے بھیک دے رہے ہوں۔

راحت باغبان کو اپنے مال کی یہ ہتک دیکھ کر غصہ آگیا۔ دیر تک وہ کانپتے رہے۔ انھیں ٹھنڈا فالودہ پلایا گیا تو دل ذرا ٹھہرا۔

"گائے بیل کو کھلا دوں گا لیکن اب نہ بیچوں گا۔" انھوں نے ایسی آواز میں یہ جملہ ادا کیا کہ آسمان دہل گیا۔

تھوڑی دیر بعد منڈی کی بھیڑ نے دیکھا ایک ٹرک سے آم لٹائے جا رہے ہیں اور سڑک پر گھومتی پھرتی آوارہ گائیں اور سانڈ ان پر جھکے ہوئے ہیں۔ ایک دن حقہ پیتے میں شفق رنگ شام کے حسن کے درمیان جس کو بھلی لگنے والی مند مند ہواؤں کے جھکولوں کے ساتھ کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے راحت باغبان' منڈی کے کسی آڑھتے سے پوچھ رہے تھے...

"بھائی رام کھلاون جی---- کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آج بھی سوچتا ہوں تو دماغ کام نہیں کرتا۔ اس دن آخر منڈی والوں نے میرے اس مال کو نہ خریدنے کا دل ہی دل میں فیصلہ کیوں کر لیا تھا۔؟"

"کیا آپ کو اس بات کا دکھ ہے؟۔" آڑھتیے رام کھلاون نے پوچھا تھا۔

"اتنا ہی جتنا میری بہو بیٹیوں کو سر بازار رسوا کئے جانے پر ہو سکتا ہے۔"

"آپ کو ان آموں سے اتنی محبت تھی؟"

"ہاں' وہ دودھ اور شہد سے تیار کی گئی میرے سب سے دلارے باغ کی پہلی فصل تھی۔" راحت میاں تڑپ کر بولے۔

"بھائی صاحب۔" رام کھلاون نظریں جھکا کر بولا "آپ کو پتہ ہوگا کہ آپ کے آدمیوں نے کئی بار ممو خاں کا پانی کاٹ کر اس باغ کو چوری سے سینچا تھا۔" راحت میاں کا منہ دو پل کے لئے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا اور پھر انھوں نے حقے کا اتنا لمبا اور بھرپور کش لیا کہ کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ آنکھیں باہر نکل پڑیں' منہ بیر بہوٹی ہو گیا۔ وہ پھر اپنی سانس کو باوجود کئی ہچکیوں کے واپس نہ لا پائے۔ صرف اس شرمندگی میں کہ وہ صبر اور انتظار میں ممو خاں سے مات کھا گئے تھے۔ راحت کی دونوں آنکھیں کھلی تھیں لیکن اس شفق رنگ شام پر تیزی سے اندھیرا چھا رہا تھا۔ ممو خاں نے دشمنی کی قلم لگانی بھی آم کی قلمیں لگانے سے ہی سیکھی تھی۔ شاخ کو پہلے تیز چاقو سے صفائی سے ترچھا کاٹو' پھر قلم کے

ایک ایک ریشے کو دوسرے ریشوں سے جوڑ کر باندھو۔

موخاں کے باغات کئی تھے۔ زمینوں پر کاشت تھی' ٹریکٹر تھے۔ ایک کان میں ننھی سی بالی ڈالی گانجے کی چلم کھینچنے والے چوڑی اور مضبوط چھاتی کے وہ پاسی جن کے پرداد ابیگم حضرت محل کے ساتھ کسی زمانے میں اودھ کی سرزمین پر انگریزوں سے لڑتے تھے۔ موخاں کی گنے کی CASHCROP کی نگہ داشت کرتے تھے اور موخاں کے لئے ہردم اپنی جان ہتھیلی پر لئے رہتے تھے۔ ایک بار موخاں کے تین جانباز پاسیوں کی بیٹیوں کی شادیوں کا معاملہ آن پھنسا۔ موخاں نے ان لڑکیوں کے جہیز کے انتظام کا وعدہ کرلیا تھا۔ باغوں میں ابھی صرف بور آئے تھے۔ فصل بک گئی ہوتی تو وہ بادشاہ ہوتے۔ کعبے کی طرف منھ کرکے بولے۔

"میرے مالک میں جانتا ہوں کہ آم کے پیڑوں کے بور دکھا کر فصل کا سودا کرنا ہمارے لئے حرام کام کے برابر ہے۔ لیکن تو میری مجبوری کو معاف کرنا کہ مجھے تین تین کنواریوں کے ہاتھ پیلے کرانے ہیں۔ اور میرا تین لاکھ روپیہ دساور میں پھنسا پڑا ہے۔" پھر موخاں نے ایسے بیوپاریوں کو فون کیا جو صرف پیڑوں پر بور دیکھ کر فصل کا سودا کرکے جوا کھیلتے تھے۔ ایک باغ کی فصل اونے پونے ہی بکی۔ لیکن موخاں نے ان پاسیوں کی تینوں بیٹیوں کا جہیز بیل گاڑیوں پر لدوا کر پہنچوا دیا۔ ان میں سے ایک لڑکی کا باپ رات بھر موخاں کے پیر دباتا رہا اور روتا رہا۔ موخاں نے ڈانٹ لگائی تو وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"رو لینے دو مالک' نہیں تو مارے خوشی کے میرے پران نکل جائیں گے۔"

اک دن شطرنج بچھی تھی' ادھر موخاں اور ادھر علاقے کے تحصیلدار راٹھور جی ڈٹے ہوئے تھے۔ راٹھور جی کو زندگی میں صرف دو ہی چیزوں کا شوق تھا' ایک تو مسلمانوں کے گھروں کے شامی کباب جنھیں وہ پاؤ ڈیڑھ پاؤ پیاز کے لچھوں کے ساتھ کھا جایا کرتے تھے اور دوسرے شطرنج۔ شطرنج بھی اس حد تک جب تک وہ مقابل کو مات دیتے رہتے۔ مات کھا جاتے تو ان کی جھنجھلاہٹ انھیں دیوانہ کر دیتی۔ وہ بساط پھاڑ دیتے اور مہرے جلتی ہوئی چلم میں ڈال دیتے۔ راٹھور جی کے اندر ایک چھوٹا سا بچہ پوری طرح ترو تازہ تھا۔ شاید اسی لئے انھیں سنسنی خیزی اور اخباروں کے اسکینڈلوں میں اتنا مزہ آتا کہ وہ دو دو تین تین دن تک ان اسکینڈلوں کو بار بار بیان کرکے موخاں کا دماغ چاٹ جایا کرتے۔ اس وقت راٹھور کے چہرے کی چمک آنکھوں کا تحیر اور اندر کی بے چینی اور پھڑپھڑاہٹ چہرے پر کچھ اس طرح عیاں ہوتی کہ دیکھنے والے کو بھی لطف آجاتا۔ وہ عموماً چارپائی پر بیٹھتے تھے' لیکن ان باتوں کے دوران جوش میں چارپائی پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور چھت کا پنکھا ان کے سر سے آدھا ہاتھ اوپر رہ جاتا تھا۔

ایک بار موخاں کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کسی سنسنی خیز جواب کی امید میں وہ پوچھ بیٹھے۔

"جب شطرنج نہیں کھیلتے تو وقت کیسے کاٹتے ہو---؟"

موخاں کچھ دیر منھ لٹکائے سوچتے رہے پھر' کچھ ایسا شرمائے جیسے سولہ برس کی لڑکی شرماتی ہے۔ پھر انھوں نے دھیرے سے کہا۔

"کیا بتاؤں؟ کئی بار سوچا کہ تمھیں بتادوں لیکن ہمت نہ ہوئی۔"

"کیوں---؟ بھلا ایسی کیا بات ہے؟" راٹھور چونکے۔

"بات کچھ ایسی ہی ہے' بلکہ اب تو وہ کچھ زیادہ ہی خطرناک ہوتی جارہی ہے---"

"اچھا---؟" راٹھور ایسے چلائے اور اچک کر چارپائی پر اکڑوں بیٹھ گئے جیسے ان کی مرادوں کی کلی کھلنے والی ہے۔

"تم میرے اچھے دوست ہو۔" موخاں دھیمے لہجے میں گردن جھکائے بولے۔ "سوچتا ہوں بتادوں' پر ناراض نہ ہونا۔"

"بالکل نہیں۔" راٹھور نے جلدی سے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بے دھڑک بتاؤ۔"

موخاں نے کمرے کے ادھر ادھر دیکھا۔ بار بار لفظ تلاش کرنے اور انھیں ادا کرنے کے لئے ان کے ہونٹوں میں کپکپاہٹ ہوئی' آخر کو وہ بڑی مشکل سے کہہ پائے۔

"جب سے استادگی میں کچھ کمی آئی ہے تب سے مجھ میں ایک شرمناک شوق پیدا ہو گیا ہے۔"

"کیسا شوق---؟" راٹھور کی سانس جیسے رک گئی۔

"میں اپنا زیادہ تو وقت بس لگاتار دیکھتے رہنے میں بسر کرنے لگا ہوں۔"

"کیا دیکھتے رہتے ہیں؟" راٹھور کی دونوں آنکھیں باہر نکلنے کی تیاری میں تھیں۔

"زندگی گینگ ریپ GANG RAPE۔"

"گینگ ریپ؟ کیا بکتے ہو---" راٹھور چارپائی پر کھڑے ہو گئے۔

"یقین مانو ایسی لذت ملتی ہے کہ جوانی میں ہم بستری میں بھی نہ ملی تھی۔"

"لیکن گینگ ریپ تمھیں دیکھنے کو مل کیسے جاتا ہے۔ یہ کہاں ہوتا ہے؟ تجھے میری قسم۔" اب راٹھور کانپ رہے تھے۔

"خوب ہوتا ہے---" موخاں کی دونوں آنکھیں بند تھیں۔ "پہلے بہت دنوں تک سوشلزم کا گینگ ریپ ہوتے دیکھتا رہا۔ پھر فلاحی ریاست WELFARE STATE کا دیکھا آج کل دھرم نرپیکشتا....."

راٹھور کی ساری ہوا نکل چکی تھی۔ وہ موخاں کی بات کاٹ کر چلائے---

"تم ایک نمبر کے حرامی ہو---" رانھو ریہ کہتے ہوئے چارپائی سے اترے پھر انھوں نے بساط کے مہرے الٹے اور باہر نکل گئے۔

(۸)

فرقہ پرست ہندو جماعت کے ہندی اخبار میں پارٹی کے نظریوں کی تشہیر کے سلسلے میں مضامین اور تحریریں چھپتی رہتی تھیں۔ قدرت اللہ سے کہا گیا کہ وہ ان مضامین کا ترجمہ پارٹی کے اردو ترجمان میں بھی کم سے کم ہفتے میں ایک بار دیتا رہے تاکہ عام مسلمانوں کو صحیح نقطۂ نظر کے بارے میں معلومات ہو سکیں اور ان کے دلوں میں صدیوں سے چلی آرہی منافرت اور علیحدگی پسندی کے رجحان کو ختم کیا جا سکے۔ قدرت اللہ غریب اس کام میں لگ گیا--- اگلے ہی ہفتے اس نے اردو پڑھنے والوں کو سب سے پہلے جو بتایا وہ کچھ اس طرح تھا....

بھارت اس لئے سیکولر ہے کہ وہ ایک ہندو راشٹر ہے

اور HINDUTVA نام ہی ہے

رواداری

فیاض دلی

اور فکر و نظر کی کشادگی کا

یہ مذہب نہیں' ایک نظام حیات ہے جو الگ راستوں پر چل کر ایک ایشور تک پہونچنے پر یقین رکھتا ہے۔

جب تک بھارت کا مسلمان اپنے مذہب میں بھارت کے قدیم مذہب کو اور اپنی تہذیب میں بھارت کی قدیم تہذیب کو مدغم نہیں کرے گا' لڑائی جاری رہے گی

کہ ہندو ہی آغاز ہے

اور ہندو ہی انجام

کچھ لوگوں میں اخبار کی اس تحریر پر کچھ چیں چیں بیں بیں ہوئی۔ کبھی اخبار کھولا گیا۔ کبھی بند کیا گیا کبھی یہ سطر پڑھی گئی کبھی وہ--- کوئی اچھلا---

"اجی صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ ہندو ہو جاؤ---"

امتابھ بچن کی فلم کا ٹکٹ لینے والی لائن میں لگی مسلمان برقعہ پوش عورتوں کو آج بھی کچھ پتہ نہیں تھا غالبا انھیں یقین تھا کہ وہ یہ سب پتہ لگائے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہیں کیونکہ قدرت اللہ نے اپنی آنکھوں سے ایک آدھ بار اس اخبار سے انھیں بچوں کی صرف غلاظت ہی صاف کرتے دیکھا تھا... مگر قدرت اللہ کی بھی مجبوری تھی ایک ہفتہ گیا نہیں کہ دوسرا آگیا۔ اخبار پریس میں جانا تھا اس نے پھر ترجمہ کیا...

سخت دل مسلم بادشاہوں نے ہمارے دریاؤں' ہمارے میدانوں اور ہماری بستیوں پر حملہ نہیں کیا تھا۔ یہ سب تو معمولی چیزیں تھیں اصل گھاؤ تو

انھوں نے تاک کر وہاں لگایا جہاں ہم بلبلا اٹھے۔ اور وہ تھا ہمارے سیکڑوں ہزاروں سال پرانے HINDUTVA کا قومی بھاؤ۔

انھوں نے اپنی بربریت سے ہمارے اس بیش بہا بھاؤ تس نہس کرنے کی کوشش کی۔ اس سازش میں برطانیہ کے مورخوں نے برابر کا ساتھ دیا۔ انگریز نے بڑی چالاکی سے ہمیں غلط مغربی علوم کی انجان پگڈنڈیوں پر ہانک دیا۔ ہمیں بتایا گیا...

سارا بھارتیہ گیان لنگڑا ہے

ادھورا اور فرسودہ ہے

علم و آگہی کا نیا سورج مغرب سے طلوع ہو چکا ہے

بھارت ایک جغرافیائی علاقے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس علاقے میں مختلف گروہ اور سماج شامل ہیں۔

جن کا اپنا اپنا مذہب اور اپنی اپنی تہذیب ہے۔

اس جھوٹی اور بدیسی دھرم نرپیکشتا نے بھارت کے ہزاروں سال پرانے راشٹریہ بھاؤ کی اصلی ایکتا اور اکھنڈتا کو دفن کر کے فرقہ پرستی' تشدد اور الگاؤ کی بنیاد ڈالی اور وندے ماترم گانے والوں کی آنکھوں کے سامنے بڑی بے رحمی سے ماں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

ہم بہت لڑے نہو سے۔

بار بار ہم نے کہا کہ مہارانا پرتاپ اور شیواجی کے بھاگوت دھوج یعنی کیسریا جھنڈے کو راشٹریہ جھنڈا بنا دیا جائے' کیوں کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی اس میں کوئی پریشانی نہیں ہو رہی۔ لیکن بدیسی اور جھوٹے علم کی انجان پگڈنڈیوں پر دور تک نکل جانے والے ضدی نہو نہیں مانے اور اپنا جھنڈا اونچا رکھا۔

ہم کتنی بار ذلیل ہو چکے! کتنی کتنی بار!

اب اور کتنا ہی بار ذلیل ہوں گے؟

یہ بات جو ذلیل کر رہا ہے اس کے سوچنے کی نہیں' جو ذلیل ہو رہا ہے اس کے سوچنے کی ہے۔

اس لئے---

گرو سے کہو ہم ہندو ہیں---

کچھ لوگوں میں اخبار کی اس تحریر پر کچھ چیں چیں بیں بیں ہوئیں۔ کبھی اخبار کھولا گیا کبھی بند کیا گیا' کبھی یہ سطر پڑھی گئی کبھی وہ--- کوئی اچھلا۔

"اجی یہ وہی تو ہیں جنھوں نے گاندھی کو گولی ماری تھی---"

نہ تو پیر صاحب کے عرس پر لگنے والے میلے میں بھینسے کی کلیجی کے ٹکڑوں کو سیخوں میں پیوست کر کے انھیں کوئلوں پر سینک کر بیچنے والے کو اور نہ میلے کی بھیڑ میں لونڈیوں کے پیچھے آوازیں کستے' گلے میں لال رومال باندھے اور بالوں میں سستا خوشبودار تیل چپڑے مسلمان لونڈوں کو ہی اس بات کا پتہ تھا کہ کون

کس کو ذلیل کر رہا ہے۔ قدرت اللہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کے اخبار کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پھاڑ کر کیجی والا اس میں بھنی کیجی اور چٹنی رکھ کر گاہکوں کو بیچ رہا تھا۔ مگر قدرت اللہ کی بھی مجبوری تھی۔ اخبار پریس میں جاتا تھا اس نے پھر لکھا۔۔۔ نہیں! نہیں!! پھر لکھا نہیں! نہیں !!

(۹)

خانساماں کچن میں تھا' کتے غنودگی کی حالت میں ست پڑے تھے۔ باہر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ مجو میاں نے سامنے کھڑے ہو کر انگور کی بیلوں میں بکروں کا خون مالی سے ڈلوایا تھا۔ رات پچاس لوگوں کا کھانا تھا موخاں نے باغ سے جس ادھے پر لنگڑا بھیجا گیا تھا اس کے بیل پچھواڑے سائبان کے نیچے آرام سے جگالی کر رہے تھے۔ کوٹھی کی شاندار بیٹھک سے ملحق چھوٹے کمرے میں جس کا سارا فرنیچر اعلیٰ قسم کے بید کا تھا اور جس پر باریک چمڑے کے کوٹوں والے آرام دہ گدے لگے تھے' ان گدوں پر آنسو بہاتی شوکت جہاں بیٹھی تھی اور اسے اپنا رومال دیتا ہوا شہباز خاں۔۔۔ یوں تو شہباز خاں بہت کچھ پہلے سے جانتا تھا لیکن اس وقت وہ چپ چاپ سب کچھ شوکت جہاں سے سن رہا تھا۔ شوکت جہاں' باپ کی دلاری' بی اے میں فرسٹ ڈویژن' جوڈو کراٹے کی مشقوں میں انعام یافتہ لمبی اور اونچی اڑانوں کی شوقین' شہباز سے یوں مخاطب تھی۔

"میں نے سنا ہی تھا' دیکھا نہیں تھا کہ جب نہو جی ہمارے محلے میں علما کے جلسے میں آتے اور میری بوڑھی نانی چھت پر عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر انھیں سڑک سے گزرتے دیکھتیں تو پھولوں کی بارش کرتیں اور دونوں ہاتھوں سے بلائیں لیتیں اور کہتی میرا لعل آگیا' میرا لعل۔۔۔ باپ کو میں نے سیاست کے لئے سب کچھ ہی کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میرا بھی کچھ کرنے کا دل چاہا۔ پرتاپ شکلا کو میرے باپ نے کچھ زمین دلوانے میں بڑی مدد کی تھی۔ تب اوقاف میں اس کی کوئی بات پھنسی تھی۔ میرے گھر کے جب تب چکر لگاتا تھا۔ میں انٹر میڈیٹ میں پڑھتی تھی۔ کبھی کبھی وہ ہنسی ہنسی میں مجھ سے کہتا۔ "بے بی آپ پارٹی کا کام کرئے۔۔ نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ انھیں آگے آنا چاہئے" باپ مرا تو پتہ چلا کہ ہمارا ایک گھر بھی ہے۔ اس کی دال روٹی کیسے چلتی ہے' یہ تو ہم نے کبھی نہ جانا۔ قدرت ہماری سوتیلی ماں سے تھا۔ سوتیلی ماں نے مجھے اپنی گود تو دی لیکن دھیرے دھیرے سب ہتھیا بھی لیا۔ قدرت تو گھر سے ہمیشہ کے لئے چلا جاتا کہ ماں بس اپنی رنگ میں ہی رہنا چاہتی تھی۔ میرے باپ کو جوتی کی نوک پر رکھتی باپ کے مرنے کے بعد ایک بار کسی بڑے ہوٹل کے کمرے میں اسے کسی مالدار سندھی صنعت کار کے ساتھ... قدرت نے تو سنکھیا کھالی تھی۔ اسپتال میں پیٹ صاف کیا گیا اور معاملہ بڑی مشکل سے رفع دفع کیا گیا۔ ۲۵ سال کی عمر ہونے کو آرہی ہے۔ دس سال سے مردوں کی نظریں دیکھ رہی ہوں مرد کن کن پینتروں سے' کون کون سے حیلوں سے اور کیسے کیسے بہانوں سے خود کو عورت کے پاس لاتا ہے۔ کیسی کیسی مہک اور میٹھی آوازوں میں اور کیسے کیسے جادوئی لہجوں میں اور کتنی پرپیچ شیریں سریلی اور کہاں سے کہاں پہنچا دینے والی زبان میں عورت سے بولتا ہے اور کتنی چالاکی اور ہوشیاری سے پراسرار اور پراثر لفظوں کو اپنی آنکھوں کے پرکشش کاغذ کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر جلی حرفوں میں لکھ کر انھیں عورت کی آنکھوں کے راستے پہونچا کر اس کے احساس کے دروازوں کو تھپکیاں دیتا ہے اور ہولے ہولے پکارتا ہے۔ کچھ اس طرح کہ صبح ہو کہ دوپہر' شام ہو کہ رات' خلوت ہو کہ جلوت' وہ تھپکیاں' وہ مند مند گرم گرم اندر کہیں جھرجھری سی پیدا کردینے والی اور دھڑکنوں تک میں سرایت کرجانے والی وہ پکاریں عورت کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ پھر وہ سرگوشیاں' وہ آوازیں' وہ پکاریں ایک دن عورت کو زیر کردیتی ہیں اور آخرکار چیخ چیخ کر بھدے' کرخت' ذلت آمیز اور تمسخرانہ انداز میں اعلان کرتی ہیں۔ "ہم نہ کہتے تھے' اس کم عقل جنس گزیدہ دو پیروں والی مادہ کو گھیر کر مار لینا کتنا آسان ہے۔۔"

شوکت سوچتی رہی۔

جوانی کے دس سال بارش' سردیاں' گرمیاں ویران دوپہریں اور تنہائیاں اور دس سال۔ اسے بتایا گیا تھا کہ فطرت کے بنیادی تقاضوں کو مت بھولو۔ تم جس راحت اور خوش بختی کی تلاش میں دن دن بھر یہاں سے وہاں بھٹکتی ہو' سڑکوں' بازاروں تیری میری چوکھٹوں ڈرائنگ روموں شامیانوں اور آڈیٹوریموں کی چھتوں کے نیچے اپنی نت نئی چپل بل کی چلبلاہٹیں کتاتی رہی ہو' یاد رکھنا کہ تمھاری برداشت کی' قوت غلیل کے ربڑ کی طرح ہے جسے ایک خاص حد تک ہی کھینچا جاسکتا ہے۔ پھر اس کے آگے وہ ٹوٹ بھی جایا کرتا ہے۔ شوکت کو خیالوں میں کھویا کر شہباز نے بات شروع کی۔

"کچھ پوچھوں۔۔۔؟"

"جی۔۔۔"

"ٹھیک ٹھیک بتاؤ گی"

"ضرور۔"

"پرتاپ کے بارے میں۔"

"کیا۔۔۔؟"

"مجھے بتاؤ۔"

"کیا بتاؤ۔۔؟"

"جو ابھی تک نہیں بتایا ہے۔ لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ کچھ ہے ضرور۔ تم چیخنا چاہتی ہو لیکن چیخ نہیں پارہی ہو۔ عورت کا سب سے بڑا گناہ احتجاج کرنے میں دیر کرنا ہے۔ افسوس کہ عورت جہاں دیر نہیں کرنا چاہئے وہاں دیر کر بیٹھتی ہے۔ پھر جب سب کچھ ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو۔۔۔"

"آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا۔۔۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے

ہتھیلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہ بولی۔۔۔ "میں نے اس سے درخواست کی تھی کہ قدرت کو سستے غلے کی دکان کا پرمٹ دلا دے تو اس نے بتایا کہ فی الحال پرمٹ ان لوگوں کو دیئے جارہے ہیں جن کے اصل دھندے راتوں کے ہیں پھر بھی وہ قدرت کو پرمٹ ضرور دلوائے گا لیکن۔۔۔"

"لیکن۔۔۔؟" شہباز نے اپنی بھویں اوپر کیں۔

"لیکن۔۔۔" وہ کچھ دیر چپ رہی پھر آہستہ سے بولی۔ "پانی منگوایئے۔۔"

جب تک پانی آتا اور وہ اس سے اپنا حلق تر کرتی اس نے سوچ لیا کہ وہ شہباز کو سب کچھ بتانا چاہتے ہوئے بھی سب کچھ نہیں بتا سکتی۔۔۔ وہ الفاظ تلاش کرتی رہی کہ کم سے کم شہباز کو اتنا ہی بتا دے کہ ہر عورت اپنی زندگی میں ایک ایسے مرد کا انتظار جانے یا انجانے ضرور کرتی ہے جو اس سے کھلم کھلا' سب کے سامنے بغیر جھجک' مصلحت اور رازداری کے' اپنی محبت کا اقرار کرے۔ جو اس کی چاہت کو پہلے سات پردوں میں دھیمے دھیمے اپنے اور اس کے دل میں پکائے' پھر اس کی لذتوں کو اپنے اور اس کے ہونٹوں پر رکھے' پھر اس خمار آگیں دلنواز اور تڑپانے والے پیار کے انوکھے تجربے کو جو ابھی ان دونوں کی ذات تک ہی محدود تھا طشت ازبام کردے' پوری دنیا کے سامنے' چمکتے سورج کی روشنی میں بار بار اقرار کرے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ دیکھو' اور یہ دیکھو کہ اس کے قدموں کے اوپر ہی اس کا سر ہے۔ لیکن پرتاپ تو صاف لفظوں میں اسے بتا چکا تھا کہ وہ کسی ایسی سماجی شرافت زدگی کا قائل نہیں ہے جو اسے ساری زندگی شوکت جہاں کے کھوج کھلاتی رہے۔ لیکن پانی پی لینے کے بعد وہ شہباز خاں سے بولی۔

"باتیں تو بہت سی ہیں لیکن کیا فائدہ۔"

"شاید کچھ فائدہ ہو سکے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی' پھر بولی۔

"آپ تو جانتے ہیں اس کا نام پرتاپ شکلا ہے۔

"ہاں"

"وہ گورکشا کی حمایت کرتا ہے۔ بالکل صاف صاف۔"

"اچھا تو۔۔۔؟"

"وہ بھی گائے کو ماں مانتا ہے جو پاکیزگی اور احترام کی علامت ہے۔"

"لیکن اس بات کا یہاں کیا ذکر؟" شہباز نے اسے ٹوکا۔

"اس لئے کہ میں نے اسے کئی بار یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ میں عورت ہوں' اور عورت کے لئے اپنی پاکیزگی اور عصمت کی بہت بڑی اہمیت ہے لیکن اس کے جواب نے میری آنکھیں کھول دیں۔

"کیسے۔۔۔؟" شہباز نے سوال کیا۔

"خدا جانے یہ خیال وہ تاریخ کے کس دور سے لایا ہے۔ وہ کہتا ہے پرانی کتابوں کی رو سے عورت کبھی پاک نہیں ہو سکتی۔ وہ سال میں بارہ بار گندی ہوتی ہے' بچہ رکھتی ہے تو بھی گندی رہتی ہے۔ زچگی کے بعد بہت دنوں تک اس کے پاس آنا بھی خود کو گندہ کرنا ہے۔ پھر سب سے دہشت انگیز بات جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ عورت اعلیٰ راونجوں کی کتنی ہی پاسدار کیوں نہ ہو' مرد کو پانے اور بھوگنے کے لئے کہیں بھی فاحشہ بن جانے میں دریغ نہیں کرتی۔ جب کہ گائے کی پاکیزگی اور طہارت مسلم ہے' کیونکہ وہ ہانک بھی دی جاتی ہے تو طاہر رہتی ہے زخمی کئے جانے پر بھی اپنے زخم چاٹتی رہتی ہے' لیکن خود کو پاکیزہ یعنی بے ضرر رکھتی ہے۔ وہ ذبح ہو کر بھی لوگوں کو اپنی بوٹیاں کھلاتی رہی ہے اور لوگ اس کے گن گاتے رہے ہیں۔ مگر عورت گائے کی طرح بے ضرر نہیں وہ مرد کے سینہ پر سوار ہو کر کبھی کبھی اس کے جبڑے تک پھاڑ دینے تک کی قوت رکھتی ہے۔ وہ اسے تمناؤں کے لہلہاتے باغوں میں پھراتی ہے' وصل کی بہشتوں میں سلاتی ہے۔ اور ہجر کی دوزخوں میں جلاتی ہے۔ اس لئے مرد ایسی تمام چیزوں کو طاہر اور پاکیزہ ماننے میں صدیوں سے تامل کرتا آیا ہے۔ اور آگے بھی کرتا رہے گا' جو مرد کو للکارنے اور ایذا پہونچانے کی قوت رکھتی ہوں۔ کیوں کہ جو بے ضرر ہے وہی طاہر ہے۔

"تو پرتاپ تم سے کیا چاہتا ہے؟" شہباز نے ٹوکا۔

"جب مجھے ہمیشہ گندہ رہنا ہے تو کیوں نہ کبھی کبھی اس کے بستر پر بھی گندی ہوتی رہوں۔۔"

"تمہارا کیا رد عمل رہا؟۔۔" شہباز نے ٹٹولا۔

"میرا کوئی بھی رد عمل اس کے لئے اطمینان بخش ہی ہوا کرتا ہے۔"

"یعنی۔۔۔؟"

"اسے اطمینان ہے کہ میں ایک ایک کر کے ایسی تمام علامتیں ظاہر کرتی جا رہی ہوں جو کسی عورت میں بے ارادہ کسی مرد کے بستر تک پہونچنے سے پہلے ظاہر ہوا کرتی ہیں۔۔"

"اس وقت ملازم نے آکر خبر دی' راشٹریہ سیویکا سمیتی کی کوئی پرچارکا ملنے آئی ہیں۔

"شہباز نے لگاتار محنت کے بعد تقریباً سو ہم خیال عورتوں کا ایک حلقہ تیار کر لیا تھا' جو شہباز کی بیوی کے خواب کو تعبیر دینے میں سرگرم ہوئی تھیں۔ انھوں نے اس تنظیم کا نام "کہکشاں" رکھا تھا۔ وہ شہر کی کمزور طبقے کی بچیوں' بے سہارا بیواؤں' یتیم لڑکیوں' بہادر بوڑھیوں اور خاندانی اور گھریلو تشدد کی شکار غریب خواتین کی سماجی خوشحالی کے لئے مختلف پروگراموں کے ذریعے جد و جہد کر رہی تھیں۔ اس انجمن کا اپنا ایک بیت المال تھا۔ اس کے ممبر اپنے اپنے ہم خیالوں سے زکوٰۃ کی رقمیں' قربانی کی کھالیں اور سات سو تیس روپیہ سالانہ یعنی دو روپے روز کی امدادی رقم' اور مالدار افراد سے بڑی رقمیں لیتے تھے۔ انجمن کی اپنی ایمبولنس تھی جسے ایک چھوٹے موٹے آپریشن روم اور لیبر روم

میں منتقل کرلیا گیا تھا۔ اس میں لائق اور تجربہ کار ڈاکٹرز اور لیڈی ڈاکٹروں وغیرہ کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ اگرچہ پسماندگی کا شکار مسلمان عورتیں اس انجمن سے کچھ زیادہ ہی فائدہ اٹھا رہی تھیں' لیکن پڑھی لکھی بے شمار ہندو خواتین بھی اس تنظیم کو پیسے اور ہاتھ پاؤں سے اپنا تعاون دے رہی تھیں۔ کھلے ٹرک پر خاصہ کشادہ پلیٹ فارم بنا کر سستے لباس' میک اپ کا دیسی سامان' کچن کے لئے ریڈی میڈ کھانے پکانے کا سامان اچار مربے وغیرہ کی نمائش ہوتی۔ اسی چلتے پھرتے پلیٹ فارم پر خواتین کو کام دلانے والی مختلف کارگر اسکیموں اور ان سے متعلق تنظیم کے ذریعے دیے جانے والے قرضوں کی بھی معلومات فراہم کی جاتیں۔ کبھی کبھی اسی چلتے پھرتے پلیٹ فارم پر خواتین کلاکار نکڑ ناٹکوں کے شو کرتیں۔

شہباز کی مرحوم بیوی عائشہ کے دل میں اس طرح کی فلاحی تنظیم کے قیام کا خیال در اصل پشپا کھوٹے نے پیدا کیا تھا جو آر ایس ایس کی ایک تنظیم راشٹریہ سیویکا سمیتی کی ممبر تھی اور عائشہ کی کلاس فیلو بھی رہی تھی۔ پشپا نے شادی نہیں کی تھی۔ اس نے عائشہ کو بتایا تھا کہ سیویکائیں شادی شدہ زندگی گذارنے سے دلچسپی نہیں رکھتیں۔ اس طرح سے سنگھ چالک بھی زیادہ تر برہمچاری ہی رہے ہیں۔ اس نے راشٹریہ سیویکا سمتی کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں بتایا تھا کہ ایسا کہا جاتا ہے کہ سنگھ کی اہم رکن لکشمی بائی کیلکر جی ۱۹۳۶ کے آس پاس ایک بار ریل گاڑی میں سفر کر رہی تھیں کہ ان کی آنکھوں کے سامنے کچھ غنڈوں نے' جو مسلمان نہیں تھے' ایک ہندو جوان عورت کو اس کے شوہر کے سامنے ریپ کیا اور اس عورت کا شوہر صرف بے بسی کے ساتھ دیکھتا رہا اور کچھ نہ کرپایا۔ اس حادثے کو دیکھ کر کیلکر جی کو خیال آیا کہ ہندو خواتین کی ایک ایسی تنظیم قائم ہونی چاہئے جو عورت کو خود اپنے دفاع کے لئے تیار کرسکے۔ اس لئے سمیتی دو خاص باتوں کو اہمیت دیتی ہے۔ پہلی' ہندو عورت میں مزاحمت کرنے کی طاقت کے لئے جسمانی تربیت' اور دوسری اس کو آدرش ہندو ناری بنانے اور ہندو تہذیبی قدروں پر اس کی گرفت مضبوط کرانے کی نظریاتی تربیت تاکہ ہندو عورت ہندوستانی سماج کی اہم ترین خاندانی اکائی کے طور پر مضبوط رہے اور بدیسی عناصر کا لایا ہوا انتشار اسے منتشر نہ کرسکے۔

پشپا کھوٹے کو شہباز باہر کے دروازے سے احتراماً اپنے ساتھ نشست تک لے کر آیا اور شوکت سے اس کا تعارف کرایا۔ پشپا بینگنی رنگ کے بارڈر کی سفید سوتی ساڑی میں ملبوس تھی' پیروں کی چپل کا ایک تسمہ ٹوٹنے کو تھا جس کے سبب پشپا وہ پیر کچھ احتیاط سے رکھ رہی تھی۔ بیٹھتے ہی وہ مسکرا کر بولی۔

"سال میں تین جوڑ چپل گھستی ہوں۔"

آر ایس ایس کا نام سن کر شوکت جہاں کے اندر جو تجسس پیدا ہوا تھا اسے ختم کرنے کے لئے وہ جلد ہی پشپا سے بے تکلف ہوگئی اور بہت سے سوال کر ڈالے۔ پشپا اسے بتاتی رہی کہ سنگھ در اصل سماج کا سنگٹھن ہے۔ وہ ایک پریوار ہے جو راج نیتی سے پرے ہے۔ اور پریوار استری کے بنا سمپو نہیں ہے۔ اور استری گھر میں سب سے پہلے دھرم پتنی کے روپ میں آتی ہے۔ وہی ہمارے اچھے سنسکاروں کی دھروہر ہے۔ جنہیں وہ اپنی سنتانوں کو دیتی ہے اور اس طرح اپنی پراچین سنسکرتی اور سبھیتا کو بھویشے کے لئے سنجو کر رکھتی ہے۔

"آپ لوگ کیا کیا کام کرتی ہیں۔"

"سادھارن ہندو مہلا کو بھارتیہ تا کی سیکھ دیتے ہیں ہم' وہ بھی بس آپس میں کچھ دیر ساتھ بیٹھ کر۔"

پھر وہ یکایک شوکت جہاں سے پوچھ بیٹھی۔

"آپ کیا کر رہی ہیں؟"

"کچھ نہیں۔" شوکت مسکرائی۔

"ایسا کیوں۔؟ آپ کو کچھ کرنا چاہئے۔"

"کیا؟"

"مسلم مہلاؤں کو اس یوگیہ بنائیے کہ وہ راشٹر پر بوجھ نہ بن کر راشٹر کی سمپتی بن سکیں۔ عائشہ نے کتنے بہت سے کام چھوڑے ہیں کرنے کو جنہیں شہباز صاحب چلا رہے ہیں۔"

تب شہباز کسی کام سے اندر گیا۔ تو شوکت دھیرے سے بولی۔

"ایک بات بتائیے۔ بلکہ کوئی منتر دیجئے مجھے۔"

"منتر یا سوتر؟" پشپا نے صحیح مترادف لفظ سمجھایا۔

"ہاں۔ کوئی نصیحت۔" شوکت گردن جھکا کر بولی۔ "میں ہر دم ڈری ڈری سی رہتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"میں خود پوری طرح سمجھ نہیں پا رہی۔"

"ڈر تو اندر رہتا ہے' باہر کوئی ڈر نہیں ہوتا۔" پشپا نے کہا۔

"کوئی مجھے ڈرا رہا ہے۔"

"کس بات کے لئے؟"

"جوان عورت کو کوئی کس لئے ڈراتا ہے؟"

"آپ ڈرنا چاہ رہی ہوں گی۔" پشپا اطمینان سے بولی۔

"نہیں ایسا نہیں ہے۔" شوکت نے صفائی دینا چاہی مگر آگے کچھ نہ بولی تو پشپا نے بات آگے بڑھائی۔

"آپ کے پاس ڈرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ شاید اس لئے نہیں ہے کہ آپ کو ڈرانا نہیں آتا' جب کہ استری کے لئے سب سے سرل کام مرد کو ڈرانا ہی ہے۔"

"کیسے؟"

"اپنے آتم سمان کو شریر سے ہی نہیں' من سے بھی مضبوط رکھ کر۔"

"آپ خود عورت ہیں اور عورت کو اس کا کھویا ہوا۔ سمان دلانے کے کام میں اپنی طرح سے لگی ہیں اور قربانی دے رہی ہیں۔ اس لئے آپ سے اپائے پوچھ رہی ہوں۔" وہ ہندی بولنا چاہ رہی تھی۔

"اگر تم اپنی سرکشا خود نہیں کرسکتیں تو کوئی تمہاری سرکشا نہیں کرسکتا۔"

"میں نے جوڈو کرانے بھی سیکھا ہے۔"

"جو ہمت پستول پکڑنے کے لئے کافی ہوتی ہے وہ گولی چلانے کے لئے کافی نہیں ہوتی۔" پشپا نے دھیرے سے کہا اور اس کا ٹیلیفون نمبر مانگ کر اس کے گھر آنے کا وعدہ کیا۔

شہباز دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو پشپا نے بتایا کہ وہ عائشہ کی یاد میں منعقد کئے جانے والے تقریروں کے مقابلے کی صدارت کے لئے شہباز کو مدعو کرنے آئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد شہباز بہت دیر تک شوکت جہاں کو شہر میں خواتین کی مختلف تنظیموں کے سیاسی کردار اور اغراض و مقاصد کو بیان کرتے ہوئے اپنی تنظیم کے لبرل ہیومن ازم (LIBERAL HUMANISIM) کا ذکر کرتے کرتے ایک پل رکا اور شوکت کو گھورتے ہوئے بولا۔

"سنو ! تم آخ تھو کہہ کر تھوکنا تو جانتی ہو نا۔؟" شوکت نے اقرار میں گردن ہلائی۔ شہباز بولا.... "تو اب کی بار پرتاپ کے منہ پر تھوک دینا۔ باقی ہم دیکھ لیں گے۔" شوکت اسی وقت سے پشپا کھوٹے کے فون کا انتظار کررہی تھی۔

رات نو بجے شوکت جہاں کے فون کی گھنٹی بجی۔ لائن پر پشپا کھوٹے نہیں پرتاپ شکلا تھا۔

"میں ہوں۔" ہلو کے بجائے وہ میں ہوں' کہکر ہی مخاطب ہوتا تھا۔

"کہئیے۔"

"جسے تم سب سے زیادہ چاہتی ہو اس کی قسم فون رکھنا نہیں"

"ٹھیک ہے۔"

"یہ جو نیکتا ہے نا' جسے MORALITY کہتی ہو تم۔ اس کی پرکھ کے لئے مرد اور عورت کے بیچ شاریرک سمبھوگ کو آدھار بنانے کے دن اب لد چکے ہیں۔ میں تم سے بھگوان کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں' میری چاچی کی جوان لڑکی بہت سمجھدار' بہت گنی' سماج کو آگے بڑھانے کے لئے پرتی بدھ' ۱۹ سال کی عمر میں ایک بار نرودھ پھٹ جانے پر کنواری ماں بن گئی۔ کیا کرتے؟ زمین میں آدھا گاڑ کر سنگ سار کردیتے؟ جن کے ساتھ ایسا کیا جاتا رہا اور جو ایسا کرتے رہے انھوں نے بھلا کیا بنا لیا' بتاؤ؟ اباریشن ہوگیا۔ چلو چھٹی۔" "! "اچھا ہوگا کہ آپ کسی دوسرے موضوع پر بات کریں۔" شوکت نے ٹوکا۔

"ضرور کروں گا۔" پرتاپ جلدی سے بولا۔" پریوار کی پوترتا کیا تم کو دکھائی دیتی ہے کہیں؟۔ آستھاؤں کی پوترتا کس چڑیا کا نام ہے؟ وکتی واد کا درشن ہی سچ پوچھو تو ہم دونوں کو اپنی اپنی جیوت جگہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ آج کون تمہارے کام آرہا ہے؟ باپ رہا نہیں' ماں کا حال دیکھ ہی رہی ہو۔ رہ گیا بھائی وہ سالا ایک نمبر کا بیوقوف ہے۔ پھر بھی میں اسے سستے غلے کی دکان کا پرمٹ دلانے والا کام لگ بھگ کرہی لایا ہوں۔"

"سچ بتائیے!"

"اتنی سی بات کے لئے جھوٹ کیا بولوں گا۔ جھوٹ تو تم بول لیتی ہو۔"

"میں نے کیا جھوٹ بولا؟"

"سیکڑوں سال پرانے آدرشوں کی تیمارداری میں پھنس کر تم بچے اور تندرست وچاروں سے' جو تم کو آرام اور خوشیاں دے سکتے ہوں' منہ موڑ رہی ہو۔ ان کے لئے دروازے بند کرکے بیٹھ گئی ہو۔ یہ جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے؟۔"

"قدرت کا کام کب تک کرادیجئے گا۔ آپ تو یہ بتائیے۔"

"کھیہ منتری دورے پر ہیں۔ واپس آجائیں' جس دن سے ملے گا' ہوجائے گا۔"

"مجھے آپ سے ڈر لگتا ہے۔"

"اسی میں تمہاری آزمائش ہے۔"

"میری آزمائش؟"

"ہاں۔"

ادھر سے فون رکھ دیا گیا۔ شوکت نے طے کرلیا تھا کہ وہ مرحوم عائشہ کی تنظیم کے لئے اپنی زندگی وقف کردے گی۔ پھر اس نے قدرت والا تازہ اخبار اٹھایا۔ بے دلی سے پلٹا۔ ایک جگہ جلی حروف میں مومنین کے لئے یہ عبارت نقل کی گئی تھی۔

قصص الانبیا صفحہ ۳۷۶

بیان وفات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

"...پھر فرمایا کہ یا اخی جبرئیل بعد میرے دنیا میں تم آؤ گے یا نہیں؟"

جبرئیل نے کہا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے بعد دس بار دنیا میں آؤں گا کہ ہر ایک بار ایک چیز دنیا سے لے جاؤں گا۔"

حضرت نے فرمایا۔ "کیا کیا چیزیں؟"

کہا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' اول بار آکے گوہر صبر دنیا سے لے جاؤں گا۔"

دوسری بار گوہر شرم
تیسری بار گوہر محبت
چوتھی بار گوہر عدل
پانچویں بار گوہر برکت

چھٹی بار گوہر سخاوت' ساتویں بار گوہر صداقت' آٹھویں بار گوہر حلال'
نویں بار گوہر علم
دسویں بار برکت قرآن مجید۔
پھر آثار قیامت ظاہر ہوں گے اور اسرافیل صور پھونکیں گے۔"
شوکت جہاں کے ہاتھ سے اخبار سرک گیا' اسے نیند کی جھپکی آگئی تھی۔

اس رات امس بہت تھی۔ پرتاپ شکلا کے کولروں کی ٹھنڈی ہوا کے درمیان عبدل بکر قصاب پرتاپ کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ پرتاپ نے اسے کرسی پر بیٹھ جانے کے لئے دوبار کہا بھی' لیکن وہ نہیں بیٹھا۔ اس نے پرتاپ کو یقین دلایا کہ مانا کہ عبدل کا ایک لڑکا ڈاکٹری میں داخلے کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے لیکن عبدل رہے گا تو پرتاپ کی پرجا ہی۔۔۔ یہ الگ بات ہے کہ عبدل سے کسی اور موقع پر اگر پوچھا جاتا کہ ودھایک پرتاپ شکلا سے وہ کتنی دھونس کھاتا ہے تو وہ اپنے لنگوٹ کی طرف اشارہ کرتا اور بڑے آرام سے کہہ دیتا... لیکن عبدل جانتا تھا کہ ایک برہمن ودھایک اپنے پیر چھوئے جانے پر کتنی خوشی محسوس کرتا ہے۔ لیکن اب پیر والے بھی چالاک ہیں وہ ہاتھ جوڑ کر **گھگھیانے** والوں کے ناٹکوں سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ لہٰذا شکلا اکتا کر بولا...

"آئے کس لئے ہو تم تو یہ بتاؤ۔"

عبدل نے پہلے تو یہ بتایا کہ اس کی برادری کے لوگ کھہ منتری کے پاس گئے تھے۔ لیکن اس کے مالک تو پرتاپ ہیں اس لئے وہ سیدھا پہلے پرتاپ شکلا ہی کے پاس آیا ہے۔ پھر اس نے معاملے کی بات شروع کی۔ شہر میں ہماری برادری کے ہزار ڈیڑھ ہزار لوگ تو ہوں گے ہی' ان کے خاندانوں کو جوڑ کر پانچ سات ہزار ووٹروں کی برادری تو ہے ہی۔ ہمارے باپ دادا پارٹی کے ہمیشہ ہی وفادار رہے۔ ہم نے کبھی کسی اور طرف دیکھا ہی نہیں۔ آپ سب کے ہوتے ہمیں بے عزت کیا جا رہا ہے۔ ہمیں چور ٹھہرایا جا رہا ہے ہمارے سینے پر سوار ہو کر ہمارے حلق میں جبرا آم ٹھونسے گئے۔ ہم تین دن تک چارپائی پر ہی ٹٹی کرتے رہے۔ سرکار بچ گئے نہیں تو جان چلی جاتی۔"

عبدل سے مطلب کی باتیں ملنے کی امید میں پرتاپ شکلا کی دلچسپی بڑھی اور آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی' وہ اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں ذرا اطمینان سے عبدل نے ممو خاں کے باغ کا دردناک قصہ پوری تفصیل سے بتایا۔

پھر وہ دھیرے سے بولا۔

"یہ سارا کام جوتے والے شہباز میاں کا ہے۔"

"شہباز میاں؟" پرتاپ نے دہرایا۔

"جی سرکار' ممو خاں باغبان ان کے یار ہیں۔ کس کے ذریعہ ہوا ہے یہ بھی سن لیجئے۔"

"کس کے ذریعہ؟" پرتاپ نے پوچھا۔

"یہ چال شہباز خاں کی رکھیل نے چلوائی ہے حضور۔"

"رکھیل کون؟"

"آپ تو سب جانتے ہیں حضور۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہیں"

"مجھے کیا پتہ' تم بتاؤ۔"

"حافظ قدرت کو تو آپ جانتے ہیں' کانگریس کو گالیاں لکتا رہتا ہے۔"

"تو۔۔۔ اس سے کیا؟"

"اس کی بہن شوکت۔ پورا محلہ جانتا ہے حضور۔"

"کیا۔۔۔؟" پرتاپ کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

"یہی کہ وہ شہباز کی رکھیل ہے' دن میں دو دو تین تین بار کسی وقت بھی شہباز خاں کی بڑی گاڑی آتی ہے اسے لینے' اور اب تو سنا ہے وہ ان کے نئے میلا گھر میں اچھے رتبے پر نوکر بھی رکھی جا رہی ہے۔"

"شوکت جہاں کو کہہ رہے ہو تم۔۔۔ وہ رکھیل ہے شہباز کی؟" شکلا نے اپنی آواز کی کمزوری چھپاتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں کیا پورا محلہ کہتا ہے۔۔۔ چپکے چپکے۔۔۔"

"شہباز کی گاڑی گھر لینے آتی ہے اسے۔۔۔؟" پرتاپ نے ایک بار پھر تصدیق چاہی۔

"کھلے خزانے' دروازے پر ہارن بجاتی ہے۔ بڑی مونچھوں والا ڈرائیور میری دکان کے سامنے سے لے کر نکلتا ہے۔"

"تم نے دیکھا ہے؟"

"سب دیکھتے ہیں کیا ٹھاٹ دار ساڑیاں نکل رہی ہیں روز' اتوار کو دیکھا نیلی پتلون اور کھلی بانہہ کی بنیان میں تھی' صاحب چولی بھی اندر نہیں تھی۔ خود اس کی عورت تو رہی نہیں' اس لئے اب تو ہر دم آگے پیچھے عورتیں ہی ہیں اس کے۔ بڑا خدمت گار بنا پھرتا ہے عورت کا۔"

"تم کو کیسے معلوم کہ شوکت جہاں کا ہاتھ تمہارے معاملے میں ہے؟"

"اپنے بچوں کی قسم حضور' میرا شک ٹھیک ہے۔"

"مگر کیسے؟"

"اسی رکھیل نے مجھ سے ایک دن کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا؟"

"کہا تھا۔" عبدل چپ ہو گیا۔ اس کی دونوں آنکھیں غصے سے لال ہو گئیں۔ ہونٹ جذبات سے پھڑپھڑائے۔

"بتاؤ نا۔"

"کہا تھا۔۔۔ اچھے آم جب کھاتا ہوں مجھے بتا دینا۔"

پرتاپ شکلا کچھ دیر چپ رہا۔ عبدل بھی کچھ نہیں بولا۔ پھر ایک لمبے سناٹے کے بعد پرتاپ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کچھ بڑبڑایا...

عبدل خاموش رہا۔۔۔ پرتاپ نے سوچا' پچھلے کچھ عرصے سے مخبر جو خبریں دے رہے تھے وہ زیادہ غلط نہیں تھیں۔

پرتاپ شکلا ہوائی جہاز سے آنے والے کسی نیتا کو لینے ایرپورٹ جا رہا تھا۔ راستے میں گاڑی خراب ہو گئی۔ وہ ایک پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر ڈرائیور کو بانٹ کھول کر انجن پر جھکا ہوا دیکھ تو رہا تھا لیکن دماغ سے گاڑی' راستہ' ایرپورٹ سب اوجھل تھے۔ پیڑ کے سائے میں وہ بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

""آئی تھی' ادھر ادھر کی باتیں بناتی تھی' مٹک کر ایک آدھ ادائیں دکھاتی تھی' لگاوٹ سے مسکرا کر' دانتوں کی بجلیاں چمکا کر' ذرا قریب سے پاس بیٹھ کر' اپنا کام نکالتی تھی اور پھر دھتا بتا کر چلتی بنتی تھی۔"" اس کی یادداشت کے پردے پر پورے راستے بھر میں شوکت جہاں کی ہی تصویر ابھر اور ڈوب رہی تھی۔

""فون لگوا کر دیا۔ بھتیجی کی شادی کے موقعے پر سرکاری غلہ' شکر' تیل' چوری کی بجلی اور ریسٹ ہاؤس کا انتظام کرایا۔ خالہ کے اوباش لونڈے کو تھانے پر سے چھڑوایا۔ فساد میں ایس پی سے کہہ کر پولیس گاڑی میں پورے گھر کو خطرے سے باہر نکلوا کر ایم ایل اے کوارٹر میں جگہ دلوائی۔ اسپتال کے سپرنٹنڈنٹ سے خود مل کر چچا کی لڑکی کو بچہ جننے کے لئے زور زبردستی کر کے وارڈ دلوایا۔ اسٹور سے دوائیں مفت دلوائیں۔ پانی کی وی آئی پی لائن سے اس کے گھر کے نل کا کنکشن کروایا۔ پڑوسی جب بالٹیاں لئے سڑک پر کتوں کی طرح لڑ رہے ہوتے تو یہ دن میں تین تین بار نہاتی۔ جو کہتی تھی کرا ہی دیا کرتا تھا۔ سوشل ویلفیئر اسکیموں سے فرضی آنگن باڑی کے لئے گرانٹ حاصل کرنے کے لئے جب دیکھو دروازے پر کھڑی بل بجا رہی ہے' وہ بھی کرایا۔ بچوں کو تقسیم کرنے والی بڑی بڑی ڈبل روٹیاں گھر میں ڈھیر لگنے لگیں۔ امدادی کیمپ میں تقسیم کئے جانے والے دلی سے بھیجے گئے اچھی کوالٹی کے کمبل دیکھ کر پھسل پڑی تھی۔ جب جتنے چاہے اٹھا کر اپنے رشتے ناطے والوں کے لئے لے گئی۔ میں نے ہاتھ نہیں پکڑا۔ سوار میری چھاتی پر ہوتی'۔ اپنے کام مجھ سے نکلواتی اور اب گھنڈیاں دوسروں کے لئے اچھال رہی ہے۔ ذرا آنکھ بھر کر دیکھتا تھا تو کہتی تھی۔ آپ سے ڈر لگتا ہے۔"" ""اب اس کی گاڑی میں گھوم رہی ہے! اس کی کوٹھی میں لیٹ بیٹھ رہی ہے! چھاتیاں اندر کھلی چھوڑ رکھی ہیں تو ڈر نہیں لگتا۔ یہی تو دیکھنا تھا کہ یہ لئے دیئے رہنے کا ڈھونگ اور کتنا چلے گا۔""

پرتاپ شکلا نے دیکھا ڈرائیور گاڑی آگے بڑھانے کے لئے سیٹ پر بیٹھ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں شوکت کے نام پر دس جوتے مارتے ہوئے پچھلی سیٹ میں دھنس گیا۔

یہ اس رات کی بات ہے جب پرتاپ شکلا نے اپنے گھر پر افطار پارٹی کا انتظام کیا تھا۔ افطاری لگانے کا کام اس نے کچھ ہندو عورتوں کے ساتھ شوکت کے سپرد کیا تھا۔ پڑوس کی مسجد سے غروب آفتاب پر گولہ داغا گیا۔ افطار ہوا۔ مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد پرتاپ تھکی ہوئی شوکت سے بولا۔۔۔

"تم نے سنا ہو گا۔ سب لوگوں سے سنا ہو گا۔"

"کیا؟"

"یہی کہ ہندو اپنی وچار دھارا اور اپنی سوچ میں بڑا سہن شیل اور اہنسا پریمی ہے۔"

"تو؟" وہ بولی۔

"پر وچار دھارا سے کیا ہوتا ہے۔ ہمارا اچھا سوچنا یا اچھا ماننا ایک بات ہے۔ اور ہمارا بیروں کا سادھارن' ہمارا برتاؤ یہ دوسری بات ہے۔۔۔ دونوں کے بیچ کوئی سمبندھ نہیں ہوتا۔"

"ہونا تو چاہئے۔" شوکت بولی۔

"جو چاہئے' وہ کچھ اور ہے اور جو ہوتا ہے' وہ کچھ اور۔۔۔ کیونکہ جیسا کرنے میں ہمیں زیادہ فائدہ ہوتا ہے ہم ویسا کرتے ہیں اس میں ہندو یا مسلمان وچار دھارا کا کچھ لینا دینا نہیں ہے۔"

"یہی بتانے کے لئے آپ نے مجھے روکا تھا۔"

"ہاں۔۔۔ اور ہاتھ جوڑ کر بڑی نمرتا سے کچھ اور بھی بتانے کے لئے۔" پرتاپ نے نظروں میں لجاجت پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"کیا؟ شوکت نے سوال کیا۔

"گمنامی اور بدبختی کے ساتھ مت مرو۔" وہ رکا' ایک سانس بھری' پھر بولا۔ "زندہ رہو۔ ہر کوشش کر کے زندہ رہو کہ یہ جو جیون ہے یہ تمہیں بار بار نہیں ملے گا۔"

"میں سمجھی نہیں۔" شوکت اس کی آنکھوں میں پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔

""اخباروں میں مرنے والوں کی خبریں پڑھتی ہو نا؟۔ شرم سے مر جانے والوں کا کال ہوتا جا رہا ہے۔"" پھر اس نے شوکت کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اب سمجھ دار لوگ یہ یقین کر کے جیتے رہتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر گھڑی اچھا برا سب کچھ ہوتا رہتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اور جنگ میں زخم کھانے والا سپاہی پرم ویر چکر کے لئے نہیں' اپنے بچاؤ کے لئے زخم کھاتا ہے۔ اس نے شوکت سے التجا کی۔ " تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں جب تک بھی جس طرح بھی اور جیسا بھی زخم کھا کے اپنے کو بچا سکتی ہو' بچاتی رہو اور دوسروں کو مرنے دو۔ کیونکہ مر جانے والے کا پرم ویر چکر بھی زندہ کے ہاتھ میں ہی دیا جاتا ہے۔"" پھر دونوں میں پہلی بار ہاتھا پائی ہوئی۔ پرتاپ کپڑے کے نیچے آزاد اور مچلتی ہوئی گھنڈیاں تلاش کرنا چاہتا تھا۔ تب شوکت جہاں نے وہی کیا جو شہباز نے اس سے کہا تھا اور بعد میں چشپا کھوٹے نے بھی جس کی تصدیق کی تھی۔ شوکت نے خوب صورت سا

لعاب اپنے منہ میں جمع کیا اور پوری طاقت سے پرتاپ کے منہ پر تھوک کر ایک پل اسے دیکھتی رہی۔ اسے لگا کہ اس کی پیٹھ سے چپکی خوف کی وہ موٹی چھپکلی ایک بار پھر اس کی کھال سے اپنے پنجے چھڑا کر زمین پر دور جا گری ہے۔ جاتے وقت اس نے پرتاپ کو کہتے سنا تھا۔

"میں بھی تھوکوں گا۔ پر منہ پر نہیں۔"

یہ عید الاضحیٰ کے تین دن بعد کی بات ہے۔ شہباز خاں کے ڈرائنگ روم میں صبح صبح تین افراد اس سے ملنے کے لئے بیٹھے تھے۔

ان لوگوں کا تعلق ایک مسلم محلے سے تھا۔ ان لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ بمبئی کے اندھیری علاقے میں مسلمانوں کی ایک کالونی کے ہر باشندے نے اپنے ٹی وی سیٹ اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دئے تھے تو ان سب نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ وہ بھی اب اپنے گھروں پر ٹی وی نہیں رکھیں گے۔ انھوں نے ٹی وی پھینکے تو نہیں البتہ انھیں اونے پونے بیچ کر وہ سارا پیسہ جو کہ باسٹھ ہزار کے قریب ہو گیا تھا' شہباز خاں کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ اس رقم کو بے سہارا خواتین کے ہوم میں لگا دیا جائے۔ کالونی کے تین معمر حضرات رومال میں وہ رقم نقد کی صورت میں باندھ کر اپنے ساتھ لائے تھے اور شہباز خاں کا انتظار کر رہے تھے۔ شہباز خاں جب مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور انھیں کیفیت معلوم ہوئی تو وہ سٹپٹا کر رہ گئے۔

"ایسا کیوں کیا آپ لوگوں نے۔؟" انھوں نے ایک صاحب سے سوال کیا۔

"ہمارے بچوں کو خراب کر رہا تھا۔؟" جواب ملا۔

"خراب کر رہا تھا۔؟ کون؟ ٹی وی؟"

"جی۔" دوسرا بولا۔ "ان کے شہوانی جذبات کو بھڑکا رہا تھا۔"

"ان میں والدین کی طرف سے بغاوت اور نافرمانی کے جذبات کو جگایا جا رہا تھا۔" تیسرے نے کہا۔

"ہم چاہتے ہیں ہمارے بچے سادگی اور نیکی کے ساتھ جئیں۔" پہلے نے گولی داغی۔ "اور ہماری جوان اور کنواری بیٹیاں وہی کریں جو ہمیشہ کرتی آئی ہیں۔"

شہباز خاں کے منہ سے نکل گیا۔ "تو پھر آپ ماڈرن کیسے بن پائیں گے؟۔"

"مطلب۔؟ پہلے والے نے جس کے ہاتھ میں نوٹوں سے بھرا رومال تھا' بھویں تان کر سوال کیا۔

"مطلب یہ کہ جو آپ کو آج عصری معنوں میں ہونا چاہئے وہ آپ کیسے بنیں گے؟"

"آج ہونے کا مطلب اگر بہو بیٹیوں کا اپنے اندام نہانی ماتھے پر چپکا کر گھومتے پھرنے سے ہے تو ایسے ہونے سے نہ ہونا ہم بہتر سمجھتے ہیں۔"

شہباز خاں نے ایک دوبار یہ کوشش کی کہ وہ انھیں سمجھائے کہ گھر کا ٹیلیفون بھی آپ کو اچھائی اور برائی دونوں ہی کے ساتھ قبول کرنا پڑے گا۔ غلط نمبر لگیں گے' غلط بل بھی آئیں گے۔ پڑوسی کی کال پر اسے بلا کر بھی لانا پڑے گا اور انجان آوازوں کی فحش گفتاری بھی سننا پڑے گی۔ پھر آپ ٹیلیفون کیوں نہیں اٹھا کر پھینک دیتے۔ اچھا ہوگا اگر آپ نیکی کو اتنا قہار اور جبار نہ بننے دیں۔ لیکن ان لوگوں نے ایک نہ سنی۔ وہ رقم کی باضابطہ رسید فراہم کرنے کے لئے ہی تھے کہ کوٹھی کا مخفی سا مالی سارے بدن سے لرزتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ زرد تھا وہ گھٹی گھٹی سی کپکپاتی آواز میں بولا۔

"سرکار باغیچے کے پیچھے ایک بورے میں--- بورے میں--- بورے---" وہ ہکلایا۔

"بورے میں---؟ کیا ہے بورے میں---؟" شہباز گرجا۔

"کوئی لاش ہے مالک---" بورے کے منہ کے دائرے کو بانس کے ٹکڑے سے کھسکا کر ذرا بڑا کیا گیا پھر اس کے اندر جھانکا گیا۔

وہ شوکت جہاں کی کٹی پٹی لاش تھی۔

پولیس کی گاڑیاں' وردی دھاری افسران' رپوٹر' کیمرا مین' زمین سونگھتے کتے۔ کئی روز تک شہر میں سنسنی پھیلی رہی۔ پوسٹ مارٹم بیانات' اعلی پولیس افسران کی میٹنگیں' صحافیوں کی چٹ پٹی رپورٹیں' شہباز خاں کی کئی راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ شوکت جہاں کی تصویریں اخباروں میں چھپ رہی تھیں۔ کیچڑ اچھل رہی تھیں۔

"کھیل لمبا ہے! بہت لمبا۔" شہباز خاں بڑبڑاتا تھا اور بار بار اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹتا تھا۔ "للکارا گیا ہے۔! چیلنج! بولو شہباز خاں' کیسی لگی بورے میں لاش' بولو۔ سنائی دی ہماری للکار؟ بڑے کھلاڑی بن رہے تھے۔ بے سہارا مسلم عورتوں کے مسیحا بننے کا اور اپنی لیڈری چمکانے کا اور لونڈیاں بغل میں لے کر گھومنے کا بڑا شوق چرا رہا تھا تم کو--- سنبھالو یہ بورا' اور بتاؤ' کھیل کھیلو گے یا پالی چھوڑ دو گے؟" شہباز خاں ایک بورا خونی للکار کا ناقابل برداشت بوجھ اپنی چھاتی پر لئے ہزاروں طرح کے بھیانک وسوسوں میں گھرا ہوا ایک دن سینئر ایس پی سے بولا۔

"دو مہینے ہو گئے۔ کوئی سراغ۔"

"کوشش تو ہو رہی ہے۔"

"قانون کے ہاتھ اگر بندھ نہ جائیں تو سنا ہے کہ لمبے ہوتے ہیں۔"

شہباز کے لہجے کی تلخی کچھ کھل گئی تھی۔ چلتے وقت شہباز خاں۔ ایس ایس پی کے چہرے کو دو پل دیکھتے ہوئے رکا' پھر پوری ایمانداری کے ساتھ اس کی نظروں میں نظریں ڈال کر اسی سے بولا۔

"یہ بھی ممکن ہے کہ انصاف نہ ملے؟"

ایس ایس پی نے ایسی کوئی بات نہ پہلے کہی تھی اور نہ اب کہنا چاہتا تھا کہ جو دو ٹوک ہوتی۔ وہ ان کی عزت کرتا تھا۔ اس نے انھیں جو جملہ بڑے بھاری من سے ادا کرتے ہوئے سنا وہ یہ تھا۔

"ایک ہی انصاف اب باقی رہ جاتا ہے۔ اس کا نام ہے POETIC JUSTICE "

شہباز خاں چلا گیا تو اس ایس پی کو خیال آیا کہ اسے اتنا بھی خاموش نہیں رہنا چاہئے۔ وہ کسی بہانے سے دو تین دن بعد شہباز کی کوٹھی پر گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے اپنی بات شہباز کے کان میں ڈال دی۔۔

"اگر آپ خود کوئی قدم اٹھانا چاہتے ہیں تو وہ ایسا قدم ہونا چاہئے جس پر لاکھ چاہتے ہوئے بھی میرا کوئی بس نہ چل سکے۔"

"آپ کا ۔۔؟" شہباز نے ٹوکا۔

"مطلب کہ قانون کا ۔۔"

کئی راتوں کی بار بار آوک جاوک کے بعد ایک دن ممو خان پان سے منہ لال کئے' ذرا اکڑتے ہوئے اور دل ہی دل میں گنگناتے ہوئے آنکھوں میں کچھ زیادہ ہی چمک کے ساتھ شہباز کے سامنے وارد ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں مسوری سے خریدی گئی جو سبک سی چھڑی تھی اس کو وہ جس طرح بار بار مختلف طریقوں سے نچا اور گھما رہے تھے اس سے ان کے دل کی بے چینی کا حال شہباز خاں سے بہتر کوئی دوسرا نہیں بھانپ سکتا تھا۔ ممو خاں کے جبڑے جس تیزی سے ڈلی کے باریک دانوں کو کچل رہے تھے۔ اس سے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ وہ بولنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور وہ بولے۔

"ہم کھیل کھیلیں گے۔ پالی نہیں چھوڑیں گے۔"

شہباز اپنے قدیم خاندانی دوست کی نس نس سے واقف تھا۔ وہ ممو خاں سے محبت بھی بہت کرتا تھا' اور اس کے کردار کے کھرے پن پر ناز بھی۔ دونوں نے زندگی کے اکثر سرد و گرم ایک ساتھ جھیلے تھے اور ایک دوسرے کے لئے بغیر سوچے سمجھے اوکھلی میں سر دے دینے کے پرانے عادی تھے۔ شہباز نے مگر اس بار ممو خاں کو ذرا ترشی سے ڈانٹ دیا۔

"ایسے کھیل ہم نے نہ کبھی کھیلے ہیں اور نہ کھیلیں گے۔"

شہباز کے جواب میں چھپی مایوسی کو ممو خاں نے اس طرح جھپٹ کر پکڑ لیا جیسے بندر سانپ کے منہ کو پکڑ لیتا ہے۔ پھر وہ شہباز کے اس جملے کا وہی حشر کرنے لگے جو بندر سانپ کے منہ کو زمین پر رگڑ رگڑ کر کرتا ہے۔ ممو خاں کمرے میں ٹہل ٹہل کر اور اچھل اچھل کر بولتے رہے۔

"بورے میں لاش بھر کر تمہارے کمپاؤنڈ میں ڈالی گئی ہے۔ باہر دیوار کے جس حصہ پر چڑھ کر لاش کو اندر پھینکا گیا ہے اور پھر سارے نشانات ختم کئے گئے ہیں۔ اس میں خاصا وقت لگا ہوگا۔۔۔ یہ جوکھم یونہی نہیں لیا گیا ہے۔ چلا چلا کر تم سے کہا جا رہا ہے کہ ہمت ہو تو آؤ بیٹا۔۔ اس لئے یا تو ابھی' یا پھر کبھی نہیں۔۔ جنگ کسی کے سر کیسے تھوپی جاتی ہے' یہ سبق دیا جا چکا ہے' اب ہار ہو یا جیت لڑنا ہے اور وار فیصلہ کن کرنا ہے۔"

"اگر ہم نہ لڑیں تو؟" زبردست ذہنی تناؤ میں یہ جملہ پتہ نہیں شہباز نے کیسے ادا کیا۔

"تو پھر ایک کام کیجئے حضور۔" ممو خاں دھم سے صوفے پر اتنی زور سے گرا کہ اس کے اسپرنگ بول پڑے۔

"آپ ناریل کی موٹی رسی اپنے ساتھ لے کر پرتاپ کے گھر جائیے اس سے کہئے کہ رسی کا پھندا چھت میں لٹکا دے۔ اور جب وہ ایسا کر دے تو جھک کر اسے سلام کیجئے اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں یہ مصرع پڑھیے۔۔۔

باغباں جاتے ہیں گلشن ترا آباد رہے

اور پھر اسی کے سامنے اس پھندے میں لٹک جائیے'

"بکواس مت کرو۔۔" دو پل خاموشی رہی۔ پھر ممو خاں نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔

"تم دیکھ لینا۔" آج سے ڈیڑھ سال کے اندر پرتاپ زندہ نہیں رہے گا۔

"ممو خاں کا چہرہ ڈراؤنا ہو گیا جیسے ان پر آسیب چڑھ آیا ہو۔"

"یہ تم کیا بک رہے ہو۔" اس گھڑکی پر ممو خاں کا جواب تھا۔

"اگر میں زندہ رہا تو آج سے ڈیڑھ سال کے اندر پرتاپ اس دنیا میں نہیں ہوگا۔" انھوں نے یہ جملہ اس طرح دہرایا جیسے زندگی اور موت ان کی عمل داری میں آنے ہی کو ہیں۔

شہباز نے ممو خاں کے چہرے پر ایسی رعونت کی بدرنگی اور چنگیزیت کی ظالمانہ کایا کبھی نہ دیکھی تھی۔ ممو خاں سے اس نے کہہ دیا کہ پہلے دن سے ہی وہ بدلے کی آگ میں پھنک رہا ہے' نہاتے میں' کھاتے میں' آتے جاتے' اٹھتے بیٹھتے' بس ایک خیال اسے تڑپاتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ حکام اور قانون کی سرد مہری جلد ہی شوکت کی لاش کی طرح ہی حرارت اور حرکت سے بے نیاز ہو جائے گی۔

"دیکھو" ممو خاں نے اسے سمجھایا۔ "میری بات ہو چکی ہے۔"

"کس سے؟"

"میرے سب سے چہیتے دوست سے۔"

"کیسی بات؟۔"

"یہی کہ مجھے اس حرامزادے کو کیسے ختم کرنا ہے۔"

"کون دوست۔؟" شہباز خوفزدہ ہو کر بولا۔ "خدا کے واسطے اس معاملے میں کسی کو ذرا بھی ہمراز نہ بنانا۔"

"کیا کروں۔؟" ممو خاں نے مجبوری ظاہر کی۔ "ساری پلاننگ اسی کو دے رکھی ہے۔" لیکن ممو خاں کے چہرے پر بڑا اطمینان تھا۔ شہباز اور بھی چڑھ گیا۔

"کون ہے وہ۔" "کیسی پلاننگ؟ یہ ناٹک بازی کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو۔"

"وہ میرا دوست ہے' میرا ہم دم وہم راز ہے۔ وہ میرا داتا ہے۔ میری عزت و ناموس' میری شان اور میری جان سب کچھ تو وہی ہے۔ وہ میرے باغ کا سب سے دلارا اور آموں کا سرتاج درخت۔ اسی نے مجھے راستہ دکھایا ہے اور اب میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

پھر ممو خاں نے اس درخت سے ان کی جو رازدارانہ باتیں ہوئیں تھیں اور اس نے پرتاپ شکلا کو ختم کرنے کی جو پلاننگ ممو خاں کو بتائی تھی اس کا احوال مزے لے لے کر بیان کیا۔

"بھائی ہوا یہ کہ میں اپنے اس دلارے درخت کے تنے سے لگ کر کھڑا تھا اور اسی فکر میں ڈوبا تھا کہ وہ میرے کان میں دھیرے سے بولا۔ میاں معاملہ کیا ہے؟ اتنے فکر مند تو تم جب بھی نہ تھے جب میں آم کی بھری فصل میں ننگا کھڑا تھا۔ تو میں نے اس کو ساری بات بتائی۔ بس سارا ماجرا سن کر وہ چٹ سے بولا۔ میاں آپ بھی کمال کرتے ہو۔ ابھی دو روز بعد آپ میرے تنے کے چاروں طرف تین فٹ اونچی چکنی پولی تھین بند کراؤ گے کہ نہیں؟ میں نے کہا ہاں۔ پوچھا کیوں؟ میں نے کہا تاکہ بور کو کھا جانے والے خطرناک کیڑے ملی بگ سے تمہیں بچایا جاسکے۔ تب اس نے سمجھایا کہ تنے کے چاروں طرف چکنی پولی تھین اسی لیے تو باندھی جاتی ہے کہ ملی بگ اس کے چکنے فرش پر چڑھ نہ پائے اور اس طرح تنے سے شاخ اور شاخ سے بور تک نہ پہونچ سکے اور بور اس کے نقصان سے بچ جائے۔ میں نے اقرار کیا کہ ہاں یہی بات ہے۔ تو وہ بولا مگر جب ملی بگ ضد پکڑ جاتا ہے اور پولی تھین کے چکنے فرش کو اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ بنا دیتا ہے تو اس وقت وہ ننھا سا کیڑا اس درخت کے بور تک حتمی طور پر پہونچ جانے کے لئے کیا کرتا ہے؟ اب ذرا یہ بھی بتاؤ۔ تو میں نے اپنے درخت کو یاد دلایا کہ ایسی صورت میں بہت سے ملی بگ اپنی بال سے بھی کئی گنا باریک ٹانگوں یا پنجوں کو تنے پر بندھی پولی تھین میں گڑو دیتے ہیں' اور وہیں مرجاتے ہیں۔ اور اس طرح وہ پولی تھین کے دونوں کناروں کے درمیان اپنی لاشوں کا پل بنا دیتے ہیں اور ملی بگ کی لاکھوں کی فوج زمین سے اس پیڑ کے تنے پر بندھی چکنی پولی تھین پر اپنے ہم جنسوں کی لاشوں سے بنے ہوئے پل پر ان کو آفریں کہتے ہوئے پہنچ جاتی ہے اور پھر اس پل سے گذرتی ہوئی درخت کے بور پر یلغار کر دیتی ہے۔ یہ سن کر میرے دلارے درخت نے میرے کان میں کہا میاں تمہارے پاس بھی دو چار ایسے ملی بگ تو ہیں ہی جو پل بنانے کے لئے اپنے پنجے گڑو دیں۔ وہ تو دن رات اپنے مالک سے دعا مانگتے رہتے ہیں کہ کبھی تم انھیں اشارہ کرو۔ ان جاں بازوں کی وفاداری کے ٹھنڈے فولاد کو ذرا سا چھو تو دو۔"

اتنا کہہ کر ممو خاں نے شہباز کی طرف ایسے دیکھا جیسے اپنے دلارے درخت کی ذہانت کی داد طلب کر رہے ہوں پھر وہ شہباز کے پاس آئے' شہباز نے دھیرے سے کہا۔

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"تو مت سمجھو۔" "ممو خاں بولے۔" آج سے پرتاپ شکلا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤں گا۔ اور اس سے ہر ملاقات پر اور اس کی ہر ضیافت پر یاد دہانی کے طور پر دل ہی دل میں کم سے کم دو بار دہراؤں گا۔ قسم قرآن کی پرتاپ تجھے ڈیڑھ سال کے اندر دنیا سے اٹھ جانا ہے۔ "قسم قرآن کی پرتاپ تجھے ڈیڑھ سال کے اندر دنیا سے اٹھ جانا ہے۔"

شہباز کچھ اور بولتا کہ ممو خاں کمرے سے جا چکے تھے۔

ممو خاں دراصل اپنے کو تولنا چاہ رہا تھا۔ صرف شہباز کی دوستی کے لئے ہی شاید۔ وہ اپنے تلوؤں کے نیچے زمین کو ٹٹولنا چاہ رہا تھا۔ وہ کہاں کھڑا ہے اس بے لاگ حقیقت سے آنکھیں چار کرنا چاہ رہا تھا۔ اپنی عزت اور ناموس کے لئے ہی نہیں بلکہ اپنے بچاؤ کے لئے۔ سانپوں کو پٹارے میں بند کرکے ان کا سر کیسے کچلا جاتا ہے' اس پرانے سبق کو یاد رکھتے ہوئے وہ اپنے کو آزمانا چاہتا تھا۔ سانپ اگر آپ کے دشمن کو کاٹ لے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ سانپ آپ کا دوست ہے۔ آئینے کے سامنے اس نے خود سے سوال کئے تھے۔

""ممو خاں صاحب! کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ اس دنیا میں سربلند ہو کر جی لیں گے۔ اس کمینی کتی دنیا میں؟ آپ کے ملی بگ اصلی ہیں یا نقلی؟""

پھر ممو خاں روز آم کے ایک گھنے مگر کھلے باغ میں جہاں دور تک آنے جانے والوں پر نظر رہ سکے' چارپائی ڈال کر بیٹھنے لگا۔ چارپائی کے سامنے زمین پر اس کے دو چار ملی بگ بھی ادب سے بیٹھے اپنی سخت اور کھردری ہتیلیوں پر تمباکو اور چونا مل رہے ہوتے۔ ایک ایک دن کا حساب رکھا جا رہا تھا۔ پرتاپ شکلا سے ایک ایک ملاقات' پھر اس ملاقات میں کہی گئی ایک ایک بات کا ریکارڈ رکھ رہا تھا ممو خاں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بارے میں پرتاپ سے جب بھی جو بھی کہتا اسے شام تک رجسٹر میں نوٹ کر لیا کرتا۔ پھر باغ میں اپنے ملی بگوں کے ساتھ بیٹھ کر پہلے رجسٹر کو الٹا پلٹتا اور لکھے کو دل میں پڑھتا۔

"شکلا جی ایک بات کا افسوس ضرور ہے ہم کو۔ وہ سالا عبدل چکوا اگر ہمارے آدمیوں سے آپ کا ہی نام لے دیتا تو اس کی وہ درگت نہ بنتی۔ وہ سالا ان آموں پر گرا تھا جو ہم روس ایکسپورٹ کرتے ہیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں شکلا جی آپ' جب بھی اشارہ کیجئے گا' یہ بندہ آپ کے لئے حاضر رہے گا۔ کبھی بھی' کیسا بھی کام پڑے تو یاد کر لیجئے گا۔ بہت بے حیثیت آدمی ہوں' مگر کلہاڑی کے دستے کی طرح! وہ حقیر دستہ نہ ہو تو کلہاڑی کام نہیں کرپاتی۔"

فصل آنے تو دیجئے حضور جس باغ کے آم کی فصل کے لئے حکم کیجئے گا وہ آپ کے قدموں میں ہوگی۔ وہیں نہیں پورا جشن منائیے گا' پورے انتظام کے ساتھ۔ دن کا بھی رات کا بھی۔ انتظام ہوگا تو پھر ویسا ہی ہوگا کہ آپ کے غلام تک جھوم اٹھیں۔"

ایک جگہ اس رجسٹر میں ممو خاں نے یہ بھی لکھا تھا۔

آج شکلا (پرتاپ شکلا) سے ملاقات ہوئی۔ کوئی قابل ذکر بات تو نہیں ہوئی لیکن میں چلتے وقت اسے دیکھ کر اپنے دل میں وہ جملہ دوبار دہرانا بھول گیا جو ہمیشہ دہرایا کرتا تھا۔ ارے وہی۔ "قسم قرآن کی پرتاپ تجھے ڈیڑھ سال کے اندر اس دنیا....." جی چاہتا ہے اپنے منہ پر طمانچے ماروں۔

ممو خاں کے ٹلی بگوں میں سب سے زیادہ جہاندیدہ اور چالاک آنکھوں والے اور بھوری مونچھوں والے اور مضبوط بازوؤں والے تند گفتار ٹلی بگ کو اس بو رکی خوشبو سنگھائی جا چکی تھی جس تک اس ٹلی بگ کو پہونچنا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ کام کرنے والوں میں سے ایک کو پڑوس کے گاؤں کی ایک ایسی چھنال کو لے کر آنے کے کام پر بھی لگا دیا تھا جو تھی تو پاسی برادری کی ہی لیکن پنچایت کے ذریعہ نکالی جا چکی تھی۔ اس تند گفتار ٹلی بگ نے ممو خاں کو آگاہ کر دیا تھا۔

"مالک ! اس کتیا کے دانت نوکدار ہیں اور کمر کی بھی مضبوط ہے۔ بالکل تیر کمان ہو رہی ہے۔"

قدرت اللہ بمن کے بہیمانہ قتل کے بعد سے چپ ہو کر رہ گیا تھا۔ اکثر نمازیں وہ باجماعت پڑھتا۔ اس کا بڑا بیٹا بھی ان دنوں آئے دن بیمار رہنے لگا تھا۔ تنگ دستی کی یوں تو اس نے کبھی شکایت نہیں کی۔ لیکن بمن کا ماتم بھی جی کھول کر نہ کر پانے پہ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ تنگ دستی خوشی ہی نہیں غم کے منانے میں بھی حارج ہو جاتی ہے۔ اخبار کا عملہ اس قدر مختصر تھا کہ چار چار لوگوں کے کام اور بھاگ دوڑ کو وہ اکیلا سنبھالتا تھا' اور خاموش رہ کر اور دفتر میں صرف ایک گلاس چائے پی کر اور دو چار فون گھما کر اور دو چار ہندی انگریزی اخباروں کے تراشے نکلوا کر کالم بھرنے کے کام میں لگ جایا کرتا۔ بمن مری تو بھی وہ تین دن سے زیادہ کا سوگ نہیں منا سکا۔ کہ اخبار کو وقت پر نکلنا تھا۔

شب برات کے ایک دن پہلے دفتر میں قدرت نے قدم رکھا ہی تھا کہ کسی پارٹی ورکر نے فون کا چونگا اسے پکڑا دیا۔ لائن پر پرتاپ شکلا تھا۔

"شب برات میں قبرستان پر میلہ رہتا ہے۔ کیا میں بھی قبرستان چل سکتا ہوں؟۔"

"ہاں چل سکتے ہیں۔ لیکن کیوں؟"

"لوگ قبروں پر شمع جلاتے ہیں۔ آپ شوکت کی قبر پر جائیں گے نا۔"

"جی ہاں۔"

"تو کیا میں بھی ایک موم بتی جلا سکتا ہوں؟"

"ہاں جلا دیجئے۔"

وقت مقررہ پر عشا پڑھ کر قدرت اللہ نکلنے کے لئے تیاری کر ہی رہا تھا کہ پرتاپ شکلا کی گاڑی آگئی۔ قبرستان کے باہر سینکڑوں محتاج اور فقیروں کی بھیڑ بھڑکے سے ہوتا ہوا جب پرتاپ شکلا شوکت جہاں کی قبر تک پہونچا تو اس نے

دیکھا ہر قبر پر دور دور تک اگر بتیاں اور موم بتیاں جل رہی ہیں۔ قدرت فاتحہ پڑھ رہا تھا کہ پرتاپ شکلا نے قبر کی مٹی پر موم بتی گاڑ کر جلائی اور قبر کو گھورنے لگا۔ اسی وقفے میں وہ دل کے کسی گوشے میں شوکت جہاں سے مخاطب تھا...

"کتنا سمجھاتا تھا تم کو کہ بھگوان کے لئے تم مت مرو۔ دوسروں کو مرنے دو۔ اب دیکھو' اپنی زیادتی دیکھو اور خود سوچو۔۔ تمہارے لئے بس ہمیں رہ گئے تھے اپنی پارسائی کا ڈھونگ دکھانے کے لئے۔ میں بھی کیا کرتا؟ تم نے میرے منہ پر تھوکا۔ میں نے..."

پرتاپ شکلا نے دیکھا' ہوا کے جھونکے سے اس کی موم بتی بجھ گئی تھی۔ اس نے جھک کر ماچس کی تیلی سے پھر اسے جلا دیا۔ اس کے دل کے پھر اسی گوشے سے آواز اٹھی...

"تم کہاں کہاں جاتی تھیں' سب پتہ رکھنا پڑتا تھا ہمیں۔ وہ کیسریا رنگ کی کوٹھی' ارے وہی شہباز خاں' جو مسلمانوں کا چودھری بن کر راج نیتی میں آنے کا لنگوٹ باندھ رہا ہے۔ سالا زنانہ۔" پرتاپ کو یقین تھا کہ شہباز اسے اپنے آدمیوں کے ذریعہ روز رات گئے فون کرواتا تھا اور فون پر وہ گنڈے اس کی ماں بہن کو پنتے تھے۔ کئی کاریہ کرتاؤں نے یہ شکایت پرتاپ سے کی کہ شوکت آر ایس ایس کی ایک سیویکا کے سنگ بھی دیکھی جاتی ہے۔ پرتاپ تو بہت خوش ہوا تھا یہ سن کر شوکت کی اس پر چار کا سے دوستی کو وہ اپنی لابی میں کافی اچھال بھی چکا تھا۔ پرتاپ قبر کو گھورتے ہوئے بڑبڑایا۔ "اگر تم زندہ رہتیں تو تمہیں یہ بات جان لینے میں دیر نہ لگتی کہ راج نیتی والوں کے سچ جیون کی سچائیوں والے سچ سے پرے ہوتے ہیں۔ ہمیں بس سچ کی طرح لگنے والا سچ چاہئے' جو صرف ہمیں درکار ہے۔ پرتاپ شکلا کی موم بتی پر نظر پڑی۔ وہ پھر بجھ گئی تھی۔ وہ جھکا' ایک بار اسے پھر جلایا اور ہونٹوں پر کڑوی سی غیر محسوس مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔۔ "ضدی بہت تھیں' اب اکھاڑ لو اس دنیا کا جو تم سے اکھاڑتے بنے۔"

پرتاپ کی جلائی ہوئی موم بتی ایک دم سے پھر بجھ گئی۔

شب برات کو دو چار روز ہی گزرے تھے کہ قدرت اللہ کا اردو میں چھپنے والا پارٹی آرگن پریس سے آگیا۔ اخبار جب پارٹی کے سربراہوں کے ہاتھ میں پہونچا تو قدرت اللہ اس کمرے میں ایک بار پھر طلب کئے گئے جہاں تین لوگ گردن اکڑائے بیٹھے تھے اور درمیان میں بیٹھنے والے کے گلے میں تواڑے سے کچھ زیادہ چوڑی غالباً دوستوں میں پریس کی گئی کوئی رنگین پٹی پڑی تھی۔ ان کے سامنے میز پر تازہ اخبار پڑا تھا جس کی ایک عبارت کو لال روشنائی سے گھیرا گیا تھا۔

جو درمیان میں بیٹھا تھا وہ تو چپ رہا۔ بائیں طرف والے نے بات شروع کی۔

"آپ انھیں کب سے جانتے ہیں؟"

"کسے۔؟" قدرت اس غیر متوقع ادھورے سوال پر سٹپٹا گیا۔

"وہ جاہک پرتاپ شکلا کو۔"

"بہت دنوں سے جانتا ہوں۔ والد صاحب کے زمانے سے سمجھئے"

"کیا گہرے سمبندھ ہیں؟" داہنی طرف والے نے پوچھا۔

"جی نہیں ایسا تو کچھ ہے۔"

"انھوں نے کبھی یہ چاہا کہ آپ ہمارے اخبار کے ذریعہ مسلمانوں میں ان کے دھرم کے پرتی انقلابی بھاوناؤں کو جگائیں؟۔"

"انھیں ہمارے اخبار سے کیا لینا دینا؟" قدرت نے جواب دیا۔

جو آدمی درمیان میں اپنی گردن میں رنگین پٹا ڈالے بیٹھا تھا اس نے اخبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں نرمی سے سوال کیا۔

"آپ انگریزی جرنلسٹ سعید نقوی کے کالم پڑھتے رہتے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"اچھا کرتے ہیں۔" وہ نرمی سے بولا۔ "سعید نقوی کے کالم سے یہ عبارت آپ نے ہی نکالی ہے؟" اس نے لال روشنائی کے گھیرے میں لکھی عبارت کی طرف اشارہ کیا۔

"جی ہاں۔" قدرت نے حامی بھری۔

"انگریزی سے اردو میں انوواد بھی آپ نے ہی کیا ہے؟"

"جی۔"

"ذرا پڑھ کر سنایئے۔"

قدرت اللہ نے پڑھنا شروع کیا...

لیبیا میں خدا اور بندے کے درمیان کوئی تنظیمی اور باضابطہ بچولیا مقرر نہیں ہے۔ مولانا نا موجود ہے۔ جمعہ کا خطبہ کوئی بھی پڑھا لکھا آدمی جیسے ڈاکٹر وغیرہ پڑھ دیتا ہے۔ وہاں خواتین کے لئے ہر لحاظ سے مکمل فوجی اکادمی بھی ہے۔۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ (اب) تک ہندوستان کے مسلمان یہ طے نہیں کرپائے کہ عید یا محرم (کا تہوار) کس دن منایا جائے۔ جب کہ لیبیا میں ترپولی یونیورسٹی کا شعبہ فلکیات و نجوم بہت پہلے ہی یہ اعلان کردیتا ہے کہ نئے ہلال کی رویت کس تاریخ کو ہوگی۔

قدرت اللہ نے عبارت ختم کرکے سانس لی۔ وہ تینوں کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"کیا یہ ٹھیک ہے؟" بیچ والے نے سوال کیا۔

"کیوں؟ اس میں کیا غلط ہے؟" قدرت بولا۔

"بس ایک بات غلط ہے۔"

"وہ کیا؟"

"چیزوں کو اپنی نظر سے دیکھئے۔ اگر سعید نقوی کی نظر سے دیکھنا ہے تو آپ کی جگہ انھیں بٹھایا جانا چاہئے۔"

پھر چپراسی چائے لے کر اندر آیا۔ چائے کے دوران اسے بتایا گیا کہ مسلمان ہماری ذرا سی انگلی سے بھی اچھل پڑتا ہے اس لئے اس کے بارے میں لکھنا ابھی بہت ضروری نہیں ہے۔ بھارت ویسے بھی لیبیا نہیں ہے۔ یہاں کے مولوی کے ساتھ فوٹو کھنچوا کر اخباروں سے ایک سیاسی محاورہ تیار کیا جاتا ہے جس کے کچھ خاص مطلب ہیں۔

"سمجھ میں نہیں آتا آخر آپ لوگ چاہتے کیا ہیں۔" قدرت جھلا کر بولا اس نے جھٹکے سے کرسی چھوڑی' باہر کے دروازے کی چق اٹھائی اور نکل گیا۔

وہ تیسری بار دفتر سے روٹھ کر گھر بیٹھ گیا تھا۔

ابھی مشکل سے تین روز ہی گزرے تھے کہ دفتر کا آدمی اسے بلانے آگیا۔ وہ سینالک جی کا پرچہ بھی ساتھ لایا تھا جس میں خاص طور پر اسی کے فائدے کی بات کہی گئی تھی اور اسے دفتر بلایا گیا تھا۔ ایک بار تو قدرت کے جی میں آئی کہ وہ نہ جائے لیکن وقت آنے پر وہ پھر چلا ہی گیا۔

تین لوگ کرسیوں پر گردن اکڑائے بیٹھے تھے۔ لیکن کمرے میں قدرت کے داخل ہونے پر گردن میں پٹا لٹکا کر بیٹھنے والا کچھ زیادہ ہی لچیلا اور نرم آرہا تھا۔ بات اسی نے شروع کی۔

"آپ کی بہن کے دردناک قتل کے وشے میں ہمارا شوک پرستاؤ ڈاک سے بھیجا گیا تھا۔"

"جی ہاں۔ وہ تو انھیں دنوں مل گیا تھا۔"

"کیا کچھ آگے کا پتہ چلا؟"

"جی نہیں۔۔" قدرت نے گردن جھکا کر جواب دیا۔

"اخباروں میں پرتاپ شکلا کا نام کچھ چرچا کا وشے بنا تھا اس معاملے میں۔" دوسرا بولا۔

"کیا آپ کا بھی ایسا ہی خیال ہے؟" تیسرے نے سوال کیا۔

"کیا کہا جاسکتا ہے؟" قدرت نے ٹھنڈی سانس لی۔

"ہم آپ کی تنخواہ ڈیوڑھی کئے دے رہے ہیں۔" بیچ والے نے کہا۔

"آپ کی موپیڈ کے لئے پٹرول الاؤنس بھی دیں گے۔" داہنی طرف والا بولا۔

"آپ کا کمرہ' آپ کی میز فرنیچر اور دوسرا تمام تام بھی اب قاعدے کا کیا جا رہا ہے۔" بائیں طرف والے نے بتایا۔ پھر بیچ والے نے قدرت کو بتایا کہ پرتاپ شکلا کے سارے بیانوں کو قدرت اخبار میں نمایاں طور پر چھاپے گا۔ اس کے خلاف چھپنے والے بیانوں کی کاٹ کرے گا اور ان پر گہری نظر رکھے گا۔

"لیکن وہ آپ کی پارٹی کے تو ہیں نہیں۔" قدرت چونک کر بولا۔

بیچ والا قدرت کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا۔ "میاں کون کس پارٹی میں ہے یا نہیں ہے اور اگر ہے تو کیوں ہے؟ اور پارٹی کا نہ ہوتے ہوئے بھی کیا وہ پارٹی کا ہوسکتا ہے؟ اگر ہوسکتا ہے تو کتنا؟ اور جتنا ہوسکتا ہے اس میں کتنا فائدہ ہے اور کتنا نقصان' اور اگر نقصان ہے تو اس نقصان کو آگے اور کتنے دن اٹھایا جاتا رہے کہ اس کا فائدہ حاصل ہوسکے اور اس فائدے کا کچھ وزن بن سکے اور پھر اس وزن کو اپنے پلڑے میں کیسے لایا جائے اور اپنی طرف نہ لاپانے کی صورت میں کب تک انتظار کیا جائے اور انتظار کی وہ مدت گزرنے پر حالات کو تی ضرب تقسیم اور جوڑ گھٹاؤ کے مطابق کیسے آنکا جائے۔ یہ سب باتیں ہمارے طے کرنے کی ہیں کہ ہم یہاں جھک مارنے کے لئے نہیں بلکہ اسی کام کے لئے

بیٹھے ہیں۔" یہ کہہ کر بیچ والا کرسی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔۔ بائیں طرف والے نے قدرت کو ایک کاغذ تھما دیا اور بولا۔۔۔۔۔۔۔ "یہ کاغذ اپنی میز کے شیشے کے نیچے لگا دینا تاکہ اس کی عبارت پر ہمیشہ نظر رہے۔ اگر اب تم روٹھ کر گھر بیٹھو گے تو ہم تمھیں منانے نہیں آئیں گے کمر پر دولات مار کر نکال باہر کریں گے۔۔" پرچے پر لکھا تھا۔

"سیاست میں ہمارے کام یہ تلاش کرنا نہیں کہ سچ کیا ہے؟ ہمارا کام یہ تلاش کرنا ہے کہ وہ سچ کیا ہے جو ہمیں درکار ہے۔۔"

(۱۳)

ابھی سال بھر بھی نہ گزرا تھا کہ آم کے باغوں میں پہلے بور آئے' پھر کیریاں آئیں۔ پھر آندھیوں نے زور مارا' پھر بادل اٹھے اور پھر موخاں کے باغوں میں جھولے پڑ گئے۔ انھیں جھولوں کے پاس شاندار آم بھی شاخوں میں جھولا جھولنے لگے۔ یہ اس رات کی بات ہے جب موخاں کی نئی نرسری سے بس ڈیڑھ کیلومیٹر دور پی ڈبلیو ڈی ریسٹ ہاؤس کی تنہا عمارت بوڑھے سرکاری خانساماں اور ادھیڑ عمر کے چوکیدار اور پرتاپ شکلا کے کم عمر ڈرائیور کے علاوہ بھی چند کارندوں کی آماج گاہ تھی۔ خانساماں تو اپنی کوٹھری میں اپنی مدقوق عورت کے ساتھ بند تھا۔ دن میں کئی بار وہ بوندا باندی میں بھیگ چکا تھا۔ پرتاپ شکلا اور اس کے مہمانوں کے سلسلے کی ضیافت میں وہ ابھی شام چڑھے تک بہت مصروف رہا تھا۔ شام کو آم پارٹی کے برتن دھونے کے لئے تیر کمان چھاتیوں والی بھی کارندوں میں شامل ہو چکی تھی۔۔ جب گہرا اندھیرا چھایا' گہری خاموشی نے بھائیں بھائیں کرتی سرگوشی میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی میں کچھ کہنا چاہا تو ریسٹ ہاؤس کا دن بھر کا تھکا چوکیدار سائبان کے نیچے پرتاپ شکلا کی گاڑی کے ڈرائیور کے ساتھ دیسی دارو کا ادھا اور بیڑی کا بنڈل لے کر بیٹھ گیا۔ شام کی چائے کی میز پر سے ہٹائے گئے آلو کے چپس بھی دو مٹھی سامنے رکھے تھے۔

عمارت کے پیچھے ہائی ٹینشن لائن لگی ہوئی تھی جس کے موٹے موٹے برقی تاروں سے بارش کی موٹی موٹی بوندیں اب بھی ٹپک رہی تھیں۔

ریسٹ ہاؤس کے کمرہ نمبر ایک میں ایک مسہری تھی' مسہری پر مچھردانی تھی' مچھردانی میں پرتاپ تھا' پرتاپ کے ہاتھ میں گلاس تھا' گلاس میں امپورٹڈ وہسکی تھی۔ کمرے سے ملحق باتھ روم کا بلب جل رہا تھا۔۔ اندر سے اس نے دروازے کی سٹکنی نہیں چڑھائی تھی کہ کبھی کبھی وہ کمرے سے باہر برآمدے میں آکر اپنا ایک ہاتھ باہر کھلے آسمان کے نیچے نکال کر اپنے ہاتھ پر بارش کو محسوس کرتا تھا اور گنگناتا تھا۔۔۔

"ڈاکا تو نہیں ڈالا۔۔ ڈالا۔ ڈاکا تو نہیں' چوری تو نہیں کی ہے۔"

پھر وہ اونچی آواز میں پکار کر کہتا۔

"چوکیدار' کرسی باہر لگاؤ۔ ہم باہر بیٹھیں گے۔"

مگر آواز پر نہ چوکیدار آتا' نہ کرسی باہر لگتی۔ وہ بھی اپنے دئے گئے حکم کی تعمیل کا انتظار کئے بغیر پھر اپنے کمرے میں گھس جاتا۔

"وقت دھیرے دھیرے دبے پاؤں کسی شاطر جنگلی شکاری کی طرح دبک دبک کر آگے بڑھ رہا تھا۔

"میں ملی بیگ۔" موخاں نے بڑبڑاتے ہوئے ٹھنڈی سانس چھوڑی۔ اس نے اندر سے بڑی کھڑکی کے شیشوں پر کسی فلمی منظر کی طرح کسی پرچھائیں کو دیکھا اور آہستہ سے کھڑکی پر آیا۔ ذرا سا پٹ کھولا اور دھیمے سے پکارا۔

"چھیدا۔۔"

"سرکار۔۔"

"کیا بات ہے۔؟"

"آشیرباد چاہئی' حکم ہوئے جائے۔"

"جاؤ۔"

سایہ باہر کسی اندھیرے میں کھو گیا۔ موخاں نے حساب لگایا۔ لگ بھگ بائیس ہزار روپئے گیارہ مہینے اور انیس دن میں پرتاپ شکلا کو صرف دوست بنانے کے پروجیکٹ پر خرچ کئے جا چکے تھے اور اس عرصے میں وہ کم سے کم پچاس ساٹھ بار پرتاپ سے ہاتھ ملانے کے بعد اپنے دل میں دہرا چکا تھا۔۔۔

"قسم قرآن کی پرتاپ تجھے ڈیڑھ سال کے اندر اس دنیا سے اٹھ جانا ہے۔"

کتنے دعوے کرتا ہے آدمی' موخاں نے سوچا لیکن کتنا کمزور ہے آدمی' موت ہردم اس کی رگ جاں سے کتنی قریب بیٹھی رہتی ہے۔ موخاں تم اس کی چیز سے جسے موت کہتے ہیں کبھی مت ڈرنا۔

"ریسٹ ہاؤس کے لان اور باغیچے میں ملی بگ پہونچ گئے تھے' کہیں کوئی مزاحمت نہ تھی۔

"دروازہ لاک مت کیجئے گا۔۔" پرتاپ سے کہا گیا تھا۔

"کیوں؟۔" پرتاپ نے جاننا چاہا تھا۔

"کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ویسے دروازے کے لئے آپ کو خان صاحب نے کچھ بتایا نہیں تھا کیا؟"

"پرتاپ نے کچھ دیر سوچا تھا۔ پھر جیسے اسے یاد آگیا تھا۔ "اچھا ہاں! ٹھیک ہے۔ ذرا جلدی بھیجنا۔"

اور وہ آٹھ بجے کے آس پاس ہی اس ہلکی بوندا باندی میں کچھ بھیگے اور کچھ سوکھے بدن کے ساتھ اندر پہونچا دی گئی۔

"ریسٹ ہاؤس کے برآمدے کے کھمبوں کی آڑ میں کھڑے ملی بگوں میں سے ایک ملی بگ کی شادی مہینہ بھر پہلے ہی پنچوں نے اجازت نامہ دے کر اس تیر کمان چھاتیوں والی پاسن سے کرائی تھی کہ یہ بھی اس خونی ڈرامے کا ایک حصہ تھا۔

اندر عورت نے پرتاپ کے سامنے اپنا بدن کھولنے سے پہلے مشغول کر کے اور ہنس ہنس کر خوب دھینگا مشتی کی' اپنے بٹن تڑوائے چولی کو مٹھی میں بھروا بھروا کر جگہ جگہ سے مسکوایا اور نچوایا۔ ازاربند میں پہلے سے لگائی گئی دو دو گانٹھوں کو پرتاپ کھولنے چلا تو بولی۔

"توڑ دے نا۔"

جب اس کا سارا بند کھل گیا' اور پرتاپ کا بھی بدن کھل گیا تو عورت نے اپنی دونوں باہوں میں اس کی کمر کو لے کر اور پیٹھ کے پیچھے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں جکڑ کر چلانا شروع کیا۔ سب سے پہلے چوکیدار اور ڈرائیور آئے۔ پرتاپ کے کمرے کے اندر سے عورت کی چیخیں صرف سنی جاسکتی تھیں' کیونکہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ پہلے تو انہوں نے دروازہ پیٹ ڈالا۔ پھر وہ دونوں تیزی سے عقب میں گئے۔ کمرے کی کھڑکی کو دھکا دیا تو وہ کھل گئی۔ دیکھا ایک عورت برہنہ حالت میں' ننگے بدن پرتاپ سے لپٹی چلا رہی ہے۔ اسی وقت کہیں سے اس کھڑکی پر عورت کا شوہر بھی آگیا۔ وہ پھٹی آنکھوں سے مبہوت سا ایک پل منظر کو دیکھتا رہا پھر دیوانوں کی طرح چلایا...

"حرامزادی' نئی کاٹ لے دانتوں سے۔" دارو پرتاپ کی آدھی سدھ بدھ لے چکی تھی' عورت نے غرا کر سامنے والے سارے دانت پرتاپ کے نرخرے میں اتار دیئے۔ پھر لوگوں نے بھی دیکھا' کھلے بالوں والی' ماتھے پر پھیلی سی سندروی بندیا والی' ترشے ہوئے کولھوں اور کمر والی' اور بے کپڑوں کے بدن والی ایک دہقان عورت اپنے چہرے کو پرتاپ کی گردن میں سے اٹھا رہی ہے اور اس کا دانت ناک اور تھوڑی اس بلی کی طرح لال ہیں جس نے تازہ تازہ کبوتر کھایا ہو۔

علاقے کے حولدار نے چپٹی سلاخ اندر ڈال کر کنڈی آکسا کر دروازہ کھلوایا' عورت کو آس پاس کی کوئی سدھ نہ تھی بس ایک طرف پلکیں جھپکائے بغیر دیکھے جاری تھی۔ شوہر نے کانپتے ہاتھوں سے اپنی دھوتی کھول کر اس کا بدن ڈھانپا تب تک پرتاپ کے چہرے پر آخری کرب کے گہرے نشانات بھی اپنی جگہ ٹھہر کر جم گئے تھے۔

موسم آرہے تھے اور موسم جارہے تھے۔ ممو خاں اپنے ملی بگوں کی قانونی پیروی بھی کرتا جاتا تھا اور آندھیوں کے ذریعہ کی گئی فصل کی بربادی پر آسمان کو مغلظات بھی سناتا جاتا تھا۔

شوکت جہاں کے لئے شہباز کے دل میں کہیں کوئی ہلکی سی چاپ جو سنائی دی تھی اسے لگا کہ وہ کہیں بہت دور سے آرہی تھی۔ آبھی رہی تھی یا نہیں؟۔ بہرحال جس طرف سے بھی آرہی تھی شہباز اسی سمت سے شوکت کو نکالنا چاہتا تھا۔

"مجھے وہاں سے نکال لیجئے شہباز صاحب" شوکت گڑگڑاتی تھی۔

شہباز کروٹیں بدلتا تھا' بڑبڑاتا تھا اور کبھی کبھی اپنی بے بسی بھری تنہائیوں میں دیواروں کے درمیان مٹھیاں بھینچ کر کہتا تھا۔

"اپنی اپنی زندگی کے چلن کے ہاتھوں اپنی اپنی موتیں گروی کردیتے ہیں سب۔ پھر کون کس کو نکال پاتا ہے؟ پھر یہاں سے نکال کر وہاں بٹھا جاؤ تو بھی کیا ہوگا؟۔ بدلے ہوئے آسیب' بدلی ہوئی جنگ۔" شہباز کو لگا کہ کوئی اس کے کانوں میں باربار سوال کرتا ہے۔

"وہ کیا ہے؟"

"وہ" جو ہمارے "ہم" سے بھی آگے چلتا ہے۔

"کیا ہے۔ کوئی بتاؤ۔"

ممو خاں حقے کی نال منہ میں دبائے راٹھور کے ساتھ شطرنج کی بساط پر جھکے ہوئے تھے۔ تب ہی راٹھور ممو خاں کے نئے شکار دلاور باغباں کی سینہ کوبی کی اصلیت کو کریدنے کے لئے اپنے دل میں سوالات کے مہرے بھی بچھاتا جا رہا تھا۔ کیونکہ پوری بستی میں دلاور کے سارے باغوں کی پُراسرار طریقے سے فصل برباد ہوجانے کے بڑے چرچے ہو رہے تھے۔

ممو خاں نے یہ بات بھانپ لی۔ بولے۔

"تم سوچ کیا رہے ہو؟ کہیں اور دماغ ہے تمہارا کیا۔؟"

"ہاں ہے تو۔" راٹھور کو سرا مل گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"سوچ رہا ہوں کہ تم نے بہت دنوں پہلے قرآن کی قسم کھا کر مجھے بتایا تھا کہ فصل میں دلاور کے درختوں میں ایک پھل بھی نہیں ملے گا۔ بتایا تھا نا؟"

"ہاں تو کیا جھوٹ بتایا تھا؟" ممو خاں گرجا۔ "تم اندھے تو ہو نہیں' دیکھ نہیں رہے کہ اس کے سارے باغ بے ثمر کھڑے ہیں' دوا کے لئے بھی ایک کیری نہیں۔"

"دیکھ رہا ہوں" راٹھور چال چلتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ "لیکن تمہارے کون سے کتے پٹنے کی وجہ سے دلاور کا یہ حشر ہوا' بس یہی سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"اس میں سمجھنے سمجھانے کی کونسی بات ہے۔" ممو خاں نے اپنی ران کھجاتے ہوئے تہمد ذرا اوپر کرلی۔ "جتنی بار دلاور سے ملتا تھا بس دل میں ایک بار وہی بات دہرا لیا کرتا تھا۔"

"کون سی بات؟"

"قسم قرآن کی دلاور خاں اگلی فصل میں تیرے باغوں میں ایک امبیا بھی نہیں لگے گی۔"

"میں تجھے پھانسی تھوڑی چڑھوا دونگا۔ مجھے تو صحیح صحیح بتادے یار۔" راٹھور گڑگڑایا۔ ممو خاں کو پھانسی چڑھوانے والی بات چھوٹا منہ اور بڑی بات لگی۔ اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"تو سنو۔" ممو مہرا پٹختے ہوئے غصے سے بولا۔ "جاؤ اس پھوکی اولاد سے بتادو کہ اس کے باغ ہمارے ملی بگوں نے اجاڑے ہیں۔ اس کے بوروں پر غلط پسٹی سائڈ (PESTICIDE) چھڑک کر۔"

"غلط پیسٹی سائڈ؟"

"بور آنے پر انھیں خطرناک کیڑوں سے بچانے کے لئے آلے کے ذریعے پیسٹی سائڈ ان پر اسپرے کیا جاتا ہے۔" ممو خاں نے اسے سمجھایا۔ "بس وہ پیسٹی سائڈ بدلوا دیا تھا ہم نے! سارا بور مرگیا۔ کیسے بدلوایا تھا' یہ ہم اپنے باپ کو بھی نہیں بتائیں گے۔ چال چلو۔"

"اور راٹھور کھلے منہ سے پہلے دو پل ممو خاں کو دیکھتا رہا پھر چال سوچنے میں لگ گیا۔ پھر ایک دم سے اچھل کر بولا۔

"ہاں۔" ممو خاں بولا۔ "پوری پوری قوموں میں کیڑا لگ جایا کرتا ہے۔ پوری نسل تباہ ہو جاتی ہے۔

"تو آدمیوں پر چھڑکنے والا کوئی آلہ کوئی پیسٹی سائڈ نہیں ہے کیا؟"

"ہے۔ بالکل ہے۔" ممو خاں بہت سنجیدگی سے بولا۔ "اور تیر بہ ہدف ہے کیا مجال جو کام نہ کرے۔"

"مذاق نہ کرو۔ سچ بتاؤ۔"

"میں سچ بتا رہا ہوں۔" ممو خاں بولا۔

"کیا ہے؟ راٹھور نے بچوں کی طرح گہری دلچسپی ظاہر کی۔ ممو خاں نے عجب سا اشارہ کیا۔ "یہ رہا۔"

"تم ایک نمبر کے کمینے ہو" راٹھور اچھلا۔ وہ ویسے ہی مات کھانے والا تھا' اس لئے اس نے مہروں پر ایک ہاتھ مار کر انھیں تتربتر کیا اور ممو خاں کو گالیاں دیتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

قدرت اللہ کو نئے دفتر میں بیٹھے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ ایک دن فجر کی نماز ادا کر کے جب وہ مسجد سے باہر نکلا تو پٹیل کے چائے خانے کی بھٹی سرخ ہو چکی تھی اور ساور کی چائے تیار تھی۔ قدرت کے ساتھ مسجد سے باہر آنے والوں میں کچھ لوگ دینی ماہنامہ "الرسالہ" کے مستقل خریدار تھے' جب ان میں سے دو تین نمازی قدرت کے ساتھ پٹیل کے چائے خانے میں صبح صبح کی گرم چائے پینے کے لئے بیٹھے تو ایک نے "الرسالہ" کے کسی مضمون کا ذکر چھیڑ دیا۔

قدرت دیر تک اس بحث میں الجھا رہا کہ حقیقت دراصل یہ ہے کہ عام مسلمان یہ نہیں جانتا کہ اسے چاہئے کیا ہے۔ اس بات پر بحث بڑھ گئی۔ آخر ایک داڑھی والے نمازی نے درمیان کا راستہ نکالا اور بولا۔

"عام ہندو کو بھی یہ نہیں معلوم کہ وہ مسلمان سے چاہتا کیا ہے۔"

"تو سبب کیا ہے اس کا؟"

"ویسے تو کئی اسباب ہیں۔ لیکن جس مضمون پر بحث ہو رہی ہے اس کی رو سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ ملک کے عام ہندو نے ملک کی بدقسمت تقسیم کو ایک تاریخی المیہ نہ مان کر اسے براہ راست مسلمانوں کے ہاتھوں اپنی ذلت آمیز شکست مان لیا ہے اور شکست کی پسپائی کا یہ احساس اس کے لئے مسلمانوں کا دوست بننے میں لگاتار رکاوٹ بن رہا ہے۔ گویا ہندو اور مسلمان دو قومیں تھیں دونوں اپنے اپنے قومی وقار کو لے کر آزادی کی لڑائی لڑ رہی تھیں۔ مسلمان نے ملک تقسیم کرا کے اپنے لئے ایک ملک علاحدہ بنا لیا اور اس طرح ہندو کو پہلی شکست دے کر اس کے قومی وقار کو صدمہ پہونچایا۔"

اب پھر وہی مسلمان آئے دن عام ہندو کے لئے ایک درد سر بنتا جا رہا ہے۔ تو کیا ہندو اس مسلمان سے جس سے وہ ایک بار شکست کھا چکا ہے دوسری بار پھر ہار جائے اور دوسری شکست کی شرمندگی گوارا کرے؟۔

نہیں ہرگز نہیں۔۔۔
یہ اب نہیں ہوگا!
اب ہندو نہیں ہارے گا!

مولانا وحید الدین خاں صاحب کے مضمون پر لمبی چوڑی بات چیت کے بعد قدرت اللہ دفتر آیا تو اس نے مضمون کا ایک اقتباس چھاپنے کو دے دیا۔ جو اس طرح تھا۔

"ہندو اگر بٹوارے کو فرسٹ ڈیفیٹ (First Defeat) کے طور پر نہ لیتے بلکہ گزرے ہوئے روز کا ایک واقعہ سمجھ کر اس کو ماضی کی تاریخ کے خانے میں ڈال دیتے تو ۱۹۴۷ سے اسی طرح ملک کی نئی تاریخ شروع ہو جاتی جس طرح عین اسی زمانے میں جاپان میں نئی تاریخ بننا شروع ہوئی تھی مگر فرسٹ ڈیفیٹ اور سکنڈ ڈیفیٹ کے فلسفے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ امکان واقعہ کی صورت نہ اختیار کر سکا۔" (۱)

جب اخبار چھپ کر آیا تو وہ مضمون اس میں نہیں تھا۔ اس کی جگہ کسی دوسرے کے مضمون کا یہ اقتباس چھپا تھا۔

"جو لوگ پاکستان کے سب سے کم خواہشمند تھے' انھیں پاکستان ملا۔ اور جو پاکستان کے سب سے زیادہ طالب تھے وہ ہندوستان میں رہ گئے۔۔۔ علحدگی پسند مسلمانوں نے جلد ہی خود کو سیکولر کانگریس سے جوڑ لیا اور بعد ازاں یہاں کے مسلم قومی لیڈروں نے مقیم حال مسلم فرقہ پرستوں کے پھلنے پھولنے لئے راہ ہموار کی۔ اس کے سبب انھیں اپنے لئے مسلم برادری کا ووٹ بینک قائم کرنے کا خوب موقع مل گیا۔ اور اس طرح ہندوستانی قوم کے اندر ہی ایک اور علحدہ قوم کی تعمیر میں انھیں زیادہ عرصہ نہیں لگا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہم تلخیوں اور کڑواہٹوں کی فصل کاٹ رہے ہیں۔" (۲)

قدرت کو گھر پر بے کار بیٹھے دن پر دن گزرتے چلے گئے۔ اس بار اس کو دفتر سے کوئی بلانے نہیں آیا تھا۔ ایک رات بیوی نے اسے آگاہ کیا۔

"آمدنی بڑھاؤ تمہاری بچی کا ایک خرچ اور بڑھ رہا ہے کیونکہ آج سے وہ بڑی ہو گئی ہے۔"

❖ ❖

---

(۱) ہندوستانی مسلمان مولانا وحید الدین خاں کی تصنیف کے انگریزی ترجمے ص ۱۰۹

(۲) A HINDU VIEW ABOUT INDIAN MUSLIMS

از موہن گوسوامی' مطبوعہ ہندوستان ٹائمس' بابت ۱۵ جون ۱۹۹۱۔

ترجمہ: اقبال مجید۔

شمس الرحمٰن فاروقی   ترجمہ : احمد محفوظ

فوکو کی بہت سی باتیں اگرچہ غلط تھیں لیکن اس کا یہ فیصلہ بالکل درست تھا کہ ریاست اور فرد کے درمیان رشتہ اصلاً اور اصولاً اقتدار کا ہوتا ہے۔ جمہوری معاشرے میں بھی ریاست اقتدار کی بڑی طاقت رکھتی ہے اور چاہتی ہے کہ فرد اس کی طاقت کے زیر اثر رہے۔ رابرٹ سیموئلسن (ROBERT SAMUELSON) نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ جمہوری فلاحی ریاست بھی اس بات پر مجبور ہوتی ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی آزادی پر کچھ نہ کچھ پابندی لگائے' اگر اسے فری مارکیٹ اقتصادیات کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی غیر انسانی حرکات کو دبانا اور کچلنا منظور ہو۔ فوکو کا مزید یہ کہنا بھی صحیح تھا کہ کمل جدید دور سے اب تک ریاست کے بظاہر تمام اصلاحی اقدام کا رخ فرد کی آزادی و اختیار کو در اصل محدود اور کم کرنے کی طرف رہا ہے یا کم از کم ان اقدام کا منشا یہی رہا ہے۔ زیادہ صراحت کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ریاست کا اقتدار اکثر و بیشتر عوام کی روحوں کو اپنا غلام بنانے کی طرف مائل رہا ہے۔ فوکو اپنی کتاب DISCIPLINE AND PUNISH میں اس تصور کی نشان دہی کرتا ہے جس کی رو سے مجرم کے جسم کے بجائے اس کی روح کو سزا کا مستوجب قرار دیا گیا۔ وہ کہتا ہے "انیسویں صدی میں وہ دن تو آنا ہی تھا جب وہ 'انسان' جو مجرم کے اندر دریافت کیا گیا' اس تعزیری مداخلت کا ہدف بن گیا۔ یعنی مجرم کے اندر جو انسان تھا اس کی قلب ماہیت اور اصلاح کا دعوی کیا جانے لگا۔۔۔"

تو آخر اس منظر نامے میں شاعر کی جگہ کہاں ہے؟ ہو سکتا ہے کہ شاعر تمام افراد میں سب سے زیادہ انفرادیت پسند نہ ہو۔ ہمیں اس کی ضرورت بھی نہیں کہ ہم ورڈزورتھ کے اس رومانی تصور کو قبول کرلیں جس کی رو سے شاعر ایسا شخص ہے جو عام انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ حساس اور گہری فکر رکھنے والا ہوتا ہے۔ ورڈزورتھ کے خیال میں اچھا شاعر "انسانوں کی عمومی فطری حسیت سے زیادہ کا مالک" ہوتا ہے اور "وہ تادیر قائم رہنے والی اور عمیق فکر کا حامل ہوتا ہے۔" کلاسیکی اردو شعراء اور شاید کلاسیکی سنسکرت شعرا بھی اس تعریف کو مسترد کردیتے۔ لیکن اس میں کوئی شک پھر بھی نہیں کہ شاعر کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہ کچھ ہوتا ہے اور اس کا کہا ہوا دوسروں کے لئے ہمیشہ خوشگوار نہیں ہوتا۔ غالب کا مشہور شعر ہے۔

بیاوریدگر ایں جا بود زباں دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

یہ شعر خود شاعر غالب کا استعارہ ہی نہیں ہے بلکہ تمام شاعروں کی تمثیل بھی ہے اور تمثیل کا بنیادی نکتہ یہاں یہ ہے کہ شاعر اپنے ہی شہر میں اجنبی ہے۔ تو اس صورت میں شاعر ریاست کے ساتھ آخر کس طرح کا رشتہ رکھ سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب فرانسیسی علامت نگار ورلین نے دیا ہے۔ وہ کہتا ہے "دنیا' جسے شاعروں کے عمیق الفاظ نے متوحش کر رکھا ہے' شاعروں کو جلا وطن کردیتی ہے۔ اس کے جواب میں شعرا دنیا کو جلا وطن کردیتے ہیں۔" یعنی ریاست جو فرد کی روح کو پابند سلاسل کرنا چاہتی ہے' شاعر سے مطالبات کرتی ہے اور شاعر بیشتر اوقات ان مطالبات کو پورا کرنے میں ناکام رہتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ خود کو دنیا سے علاحدہ اور تنہا پاتا ہے۔

فوکو کی اقتداری مساوات انیسویں صدی میں کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔ اور شاید یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ ورلین کا زمانہ انیسویں صدی کا نصف آخر ہی تھا۔ یورپی ادب کو یہ بات سمجھنے میں صرف چند ہی برس لگے کہ وہ اس جدید دنیا سے الگ تھلگ ہوگیا ہے جو سطح پر تو مہذب ہو رہی تھی لیکن اندر اندر دنیائے تخیل کی طرف سے اس کا رویہ معاندانہ تھا۔ جیسا کہ وی۔ ایس۔ پریچٹ کہتا ہے "ادیبوں میں (دنیا کے نقطۂ نظر سے) یہ بڑی خراب عادت ہے کہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جن کا مزاج یوں بھی ہے اور یوں بھی کی طرح کا ہوتا ہے اور وہ حقیقت اور افسانے کی آزادانہ آمیزش کے کام میں مشغول رہ کر ہی جیتے ہیں۔" موجودہ صدی کی دوسری دہائی میں الکزینڈر بلوک کا یہ کہنا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ "فن وہیں پایا جائے گا جہاں ویدری' زیاں' کرب' اذیت اور شدید لطف ہے۔" پھر اس کے ذرا بعد ہمارے سامنے کافکا آتا ہے۔ وہ گستاف جانوخ (GUSTAV JANOUCH) کو لکھتا ہے کہ "شاعر کے لئے ذاتی طور پر اس کا فن ایک چیخ ہے۔ فنکار کے لئے فن محض اذیت ہے جس کے ذریعہ وہ خود کو مزید اذیتوں کے لئے تیار کرتا ہے۔" شاعر (جسے کافکا نے سماجی اوسط سے زیادہ چھوٹا اور ناتواں شخص کہا ہے) کے اختیارات اور ریاست (جو کبھی کبھی خود کو سماج کی حیثیت سے ظاہر کرتی ہے۔ مارکسی نظریہ کے حامی بھی

کبھی" بلکہ "ہمیشہ" کہیں گے) کہ اختیارات کے درمیان عدم توازن کو سب سے اچھی طرح بودلیئر کی شاعری میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنی شاعری کا دفاع اس بنیاد پر کیا کہ اس کی شاعری نے اس عقیدے سے ٹکرلی کہ انسان اچھا ہے اور تمام انسان خوش و خرم ہیں۔ بودلیئر اس عقیدے کو "قابل نفرت ریاکاری" سے موسوم کرتا ہے۔

ہمارے زمانے میں چیسلاو ملوش (CZESLAV MILOSZ) جیسے شاعروں نے شاعری کے رول پر گفتگو کرتے ہوئے اسے قوموں اور انسانوں کی نجات دہندہ بتایا ہے۔ گویا شاعر کی وہ حیثیت جو اقبال کی نگاہ میں تھی۔ اقبال نے شاعر کو سماجی اور سیاسی نظام کی آنکھ سے تشبیہ دی تھی۔ ان کا شعر ہے۔

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

لہٰذا شاعر ملک و ملت کا ضمیر ہوتا ہے۔ پھر بھی ہم یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اقبال اور ملوش نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ غیر ضروری حد تک سہل پسندانہ ہے۔ کیا اکثر ایسا نہیں ہوتا کہ سماج / ملت دراصل ریاست ہی کا دوسرا نام ہیں ؟ تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر ریاست کے ضمیر کا نگراں ہوتا ہے ؟

ذیل میں جوزف براڈسکی کا قول ملاحظہ فرمائیں جس نے اس مسئلہ میں شاید سب سے جامع اور (میرے خیال میں) سب سے زیادہ قابل قبول رائے پیش کی ہے :

> اگر شاعر کو سماج کی طرف کسی معاملے میں جواب دہ قرار دیا جائے تو وہ صرف یہی ہے کہ اسے خوب سے خوب تر لکھنا چاہئے.... اس کے برخلاف سماج کو شاعر کے سامنے کسی قسم کی جواب دہی نہیں کرنی ہے۔ اصلاً اور اصولاً سماج مشتمل ہوتا ہے اکثریت پر اور اسے اس بات کا احساس رہتا ہے کہ اسے شعر و شاعری پڑھنے کے علاوہ اور بھی بہت سے کام ہیں، شعر و شاعری چاہے کتنی ہی عمدہ چیز کیوں نہ ہو۔ لیکن شعر و شاعری نہ پڑھنے کی صورت میں سماج وجود کی اس سطح پر اتر آتا ہے جہاں وہ جھوٹے وعدے اور دعوے کرنے والے سیاستداں یا جابر حاکم کا بآسانی شکار ہوجاتا ہے۔

لہٰذا شاید وہ بات اسی مفہوم میں ہے کہ شاعری قوم اور عوام کی نجات دہندہ ہوتی ہے جیسا کہ ملوش نے کہا ہے۔

انیسویں صدی کے وسط تک اردو کا ادیب معاشرے کے ساتھ باہم اتحاد اور ہم آہنگی کی خوشگوار صورت میں تھا۔ اس معنی میں نہیں کہ ادیب اور سماج ہمیشہ اور ہر معاملہ میں اتفاق رکھتے تھے بلکہ اس معنی میں کہ معاشرہ شاعر کو مختلف قسم کی آزادیوں کی اجازت دیتا تھا اور معاشرہ کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ افسانہ طرازی کرنا شاعر کا حق ہے۔ جدید خیالات و افکار اور جدید کشاکش کے ظہور کے ساتھ چیزیں تیزی سے تبدیل ہوئیں۔ معاصر اردو ادب کو جدید زندگی کی زخم خوردگی اس کے متناسب حصہ سے زیادہ ملی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اسے ملک کی تقسیم سے سابقہ پڑا۔ یہ ایسی چیز تھی جو خود اردو زبان ہی کی موت کا اعلان کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ آزادی کی جدوجہد میں اردو ادیبوں نے بہت بڑا رول ادا کیا، ادیب اور فرد دونوں کی حیثیت سے۔ لیکن کامیابی ملنے کے فوراً بعد انھوں نے خود کو تنہا اور الگ تھلگ پایا۔ چنانچہ انھوں نے اس المیہ کے بوجھ کو دوہری سطح پر محسوس کیا۔ اب جب کہ وہ اس زخم خوردگی کی کیفیت سے باہر نکل آئے ہیں دوسرے اردو زبان خود آہستہ آہستہ اپنے آپ میں آرہی ہے، یہ دونوں باتیں خود اردو والوں کی کوششوں کا بڑی حد تک نتیجہ ہیں۔ شاید ہی کسی اردو ادیب نے کبھی یہ خیال کیا ہو کہ ہندوستان دو یا دو سے زیادہ قوموں کا ملک ہے۔ اردو ہمیشہ ہندوستانی قوم کے اتحاد کی حامی رہی ہے۔ یہ دو بڑی تہذیبوں کے باہم اشتراک کا سب سے خوبصورت مظہر ہے۔ اردو زبان ہندو مسلمان نہیں بلکہ ہندوستانی ہے۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اردو کا ادیب آج تمام دنیا کی اس صورت حال کا حصہ ہے جس میں ریاستی اقتدار (جو کبھی کبھی بھیس بدل کر قوم کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے) چاہتا ہے کہ ہر شخص پنہاں اور واضح دونوں انداز سے اس کی خواہشات کے آگے سر خم کرے۔ تمام دنیا کے صاحب اقتدار طبقے ادیبوں کو اپنے حصول مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں پاکستان کی مثال سامنے ہے۔ آج پاکستان میں ادیبوں کو اسلامی اور غیر اسلامی کے خانوں میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستان کا معاصر اردو ادیب ہرگز نہیں چاہتا کہ اسے ہندو یا مسلمان کی حیثیت سے دیکھا جائے۔ وہ اپنی شناخت ہندوستانی کی حیثیت سے چاہتا ہے۔ اردو زبان کے سیاق میں دیکھیں تو ہندوستانی سبھاؤ ہندو سبھاؤ نہیں ہے بلکہ یہ ہندو + مسلم سبھاؤ ہے۔ اردو ادیب کو اپنی ہندوستانیت کا ثبوت پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ فارسی کے "سبک ہندی" کی شاعری میں (جسے ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر ایجاد کیا تھا) جو ذہن کار فرما تھا وہ اتنا واضح طور پر ہندوستانی ہے کہ ایران کے لوگ فارسی کی اس شاعری کو اپنا ادب ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ اردو ادب کا براہ راست سلسلہ فارسی کی سبک ہندی روایت سے ملا ہوا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ اردو کا سب سے بڑا شاعر غالب، جس کی شاعری وسط ماضی اور جدید حال کے درمیان خط امتیاز کھینچتی ہے، ہندوستانی انداز کی فارسی کا بھی بہت بڑا شاعر تھا۔

معاصر اردو ادب جدید شعور و احساس سے بھرا ہوا ہے۔ تجربہ پسندی اور بین الاقوامیت کی تیز ہوا جو پہلے پہل ۱۹۶۰ کے آس پاس محسوس ہوئی تھی، اب ہر طرف بہہ رہی ہے۔ آج اردو ادب میں فکر کی بہت سی لہریں ایک ساتھ جاری و ساری ہیں۔ رولاں بارت نے جس چیز کو "اقتدار کا کلام" کہا ہے (یعنی ایسا کلام جو قطعیت کا حامل ہے اور جو "ہمت اور قصور" کو وجود میں لاتا ہے) اب اس کا چلن کم ہوگیا ہے اور اس کی جگہ ادبیت پر زیادہ زور دیا جارہا ہے۔

آج کے اردو ادب میں دردمندی، شعور ذات اور سچائی کو ذاتی حوالوں سے دیکھنے اور لکھنے کی خواہش زیادہ نظر آتی ہے۔ اے۔ الوارے (A.ALVAREZ) کہتا ہے کہ ایسا صرف غیر ممالک کے مقبوضہ علاقوں یا یک جماعتی ملکوں میں ہوتا ہے جہاں ادب پر "وہ بوجھ لادے جاتے ہیں" جو عام طور پر ریاست کو اٹھانے چاہئیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان یک جماعتی قوم نہیں ہے اور نہ ہی کسی کا مقبوضہ علاقہ ہے۔ اس کے ایسا ہونے کا امکان بھی نہیں ہے۔ اس کے لئے ہمیں اپنے مستحکم جمہوری کردار کا ممنون ہونا چاہئے۔

لہٰذا معاصر اردو ادیب زیادہ سروکار اس سے رکھتا ہے کہ وہ خود اپنے تجربات کے ذریعہ قوم کے شعور و فکر کی چھان بین کرے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ آج کی صدر جلسہ اردو فکشن کی ممتاز شخصیت ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک بڑے قابل قدر فن پارے میں ان بے شمار لڑیوں کا پتہ لگایا ہے جن سے ہندوستانی شعور و فکر کی شکل بنی ہے۔ ❖ ❖

شب خون کی قیمت میں اضافہ

گذشتہ دو سال میں ہر چیز کی قیمت چالیس سے پچاس فی صدی بڑھ گئی ہے۔ "شب خون" یوں ہی نقصان پر نکلتا ہے، اب اس نقصان کو مزید کرنا ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ لہٰذا ہم قیمت میں خفیف سے اضافہ پر مجبور ہیں۔ اضافے سے ہمارا نقصان پوری طرح تو برابر نہ ہوگا لیکن ہم کمر شکستگی سے بچ جائیں گے۔ قارئین اور محبان شب خون سے تعاون کی درخواست ہے۔

جنوری ۱۹۹۷ء (شمارہ ۲۰۲) سے قیمتیں حسب ذیل ہیں۔

سالانہ (بارہ شماروں کی قیمت) ایک سو ساٹھ روپے
فی شمارہ پندرہ روپے

—— ادارہ شب خون

ممالک غیر میں شب خون

بیرون ہند کے پڑھنے والے حسب ذیل پتوں پر شب خون کا تعاون بھیج سکتے ہیں رقم کی وصولیابی کی اطلاع ملتے ہی پرچہ ان کے نام بذریعہ ہوائی ڈاک جاری کر دیا جائے گا

(۱) ریاست ہائے متحدہ امریکہ (پچیس ڈالر) جناب عادل منصوری

1. MR. ADIL MANSURI
POST BOX : 922
HOBOKEN NJ-07030 U S.A

(۲) کناڈا (تیس ڈالر) جناب محمد حفظ الکبیر قریشی

2. MR. M.H.K. QURESHI
12, HARVEY COURT
RICHMOND HILL ONT
L4C-5R2-CANADA

(۳) پاکستان (پانچ سو روپے پاکستانی یا پندرہ ڈالر امریکن) جناب صبا اکرام

3. MR. SABA EKRAM
NADEEM CORNER
FLAT NO : B-3, SECTOR 16
BLICK - N
NORTH NAZIMABAD
KARACHI - 33 (PAKISTAN)

(۴) سعودی عرب اور مشرق وسطیٰ (پچیس امریکن ڈالر) جناب حنیف شاہ خاں

4. DR. HANEEF S KHAN (M.D.)
P.O. BOX - 378
AR 'AR - NORTH (K.S A.)

(۵) یورپ بشمول برطانیہ (پندرہ پونڈ اسٹرلنگ) جناب ساقی فاروقی

5. MR. SAQUI FARUQI
100 SUNNY GARDENS ROAD
LONDON - NW4 - IRY

ظفر اقبال

کچھ ہوا گردش میں ہے ، اور ، کچھ فضا گردش میں ہے
ایسا لگتا ہے کہ سب ارض و سما گردش میں ہے

آپ بھی گردش میں ہے جو کچھ ہے اس کے ہر طرف
ورنہ ظاہر میں تو یہ خالی خلا گردش میں ہے

رات دن تنہا نہیں رہتا ہوں گردش میں کبھی
ساتھ ہی میرے مری آب و ہوا گردش میں ہے

روزِ اوّل سے مرے گردش میں ہی رہتے ہیں پاؤں
آج کل تو کچھ ستارہ بھی مرا گردش میں ہے

گردشیں اک دوسری کو کاٹ کر جاتی ہوئیں
کیا بتائیں ، کیا نہیں ہے ، اور ، کیا گردش میں ہے

اک ہوا سی چلتی رہتی ہے مرے سر میں کہیں
زور سے جس کے سبھی برگ و نوا گردش میں ہے

دھوپ ہی کے عکس ہیں جو پھینکتا ہے خاک پر
آفتاب تازہ ہے یا آئنہ گردش میں ہے

وہ جہاں بھی ہے پہنچ ہی جائے گی اک دن وہاں
میں یہاں ساکت سہی ، میری صدا گردش میں ہے

وہ تماشا ہو کہ ہو خود ہی تماشائی ، ظفر
ایسا لگتا ہے کہ سارا ماجرا گردش میں ہے

یہ زمیں ہے یا خلا کا شور ہے
میرے ہر جانب یہ کیسا شور ہے

آسماں پر آسماں کی سنسنی
اور ، ستارے پر ستارہ شور ہے

نیچے نیچے ہو کا عالم ہے کہیں
اوپر اوپر ہلکا ہلکا شور ہے

ہاتھ کانوں پر رکھے بیٹھا ہوں میں
اور ، پہلے سے زیادہ شور ہے

دو طرح کی انتہائیں ہیں یہاں
خامشی کتنی ہے ، کتنا شور ہے

ایک سی آواز ہے سب کی ادھر
اور سب کا ایک جیسا شور ہے

دہر کے خلوت کدے میں رات دن
کچھ تمہارا ، کچھ ہمارا شور ہے

میں نے چپ سادھی ہے پہلی بار اگر
آپ کا بھی پہلا پہلا شور ہے

شاعری اتنی نہیں ہے ، اے ظفر
جس قدر جرأت ہے ، جتنا شور ہے

ظفر اقبال

تیر نکلے جو کماں سے تو ہدف کھینچتا ہوں
اپنے ہی سنچے بکھائی ہوئی صف کھینچتا ہوں

وہ ستارہ ہے ، بہت دور ہے مسکن اس کا
میں زمیں ہوں سو اسے اپنی طرف کھینچتا ہوں

روز اس روزنِ تاریک سے بچنے کے لیے
اپنا ہی سلسلۂ خاک و خذف کھینچتا ہوں

جاگتی جیتی جو مجھ سے کبھی کھینچی نہ گئی
اس توانائی کو اب کرکے تلف کھینچتا ہوں

زہر لگتا ہے یہ آہنگ تماشا مجھ کو
کہیں سازوں پہ جھپٹتا ، کہیں دف کھینچتا ہوں

اس عبارت میں مجھے اس نے کیا تھا شامل
انتظار اپنا ہی اب ہو کے حذف کھینچتا ہوں

کچھ تو درکار ہے اس شوخ سے مجھ کو بھی جو میں
کبھی دامن سے الجھتا کبھی کف کھینچتا ہوں

آنے والا کوئی تکمیل کرے گا اس کی
خاکۂ خوابِ سخن اس لیے رف کھینچتا ہوں

خود کو الزام دیا اس کی محبت کا ، ظفر
اور ، اب خود ہی بڑا رنج قذف کھینچتا ہوں

مصرعِ خواب میں جو قافیہ سا باندھتی ہے
نارسائی کو یہی طبعِ رسا باندھتی ہے

آسماں مجھ پہ گرا ہے تو کشش سے میری
یہ زمیں تو یونہی ایک اپنی ہوا باندھتی ہے

ان خلاؤں پہ مری چشمِ تماشا ہر شام
دیکھتے دیکھتے ایک اور خلا باندھتی ہے

کہکشاں پھیلتی ہے بجھتے ستاروں سے پرے
سر پہ غم خوردہ شعاعوں کی ردا باندھتی ہے

گھومتی پھرتی یہ خوش خوابئ سوراخِ سیاہ
آنے والوں کے مقدر سے قضا باندھتی ہے

زندگی ، تیرا ٹھکانہ ہی نہیں کوئی ، کہ تو
نہیں ہوتی ہے تو ہونے کی قضا باندھتی ہے

دیکھتا رہتا ہوں میں سمتِ رفتہ کی طرف
یعنی کیا کھولتی ہے ، اور ، یہ کیا باندھتی ہے

کوئی شے کھولتی ہے آن کے خود بابِ قبول
میرے پیچھے جو مرا دستِ قضا باندھتی ہے

طبعِ موزوں یہ کسی اور کی ہوگی جو ، ظفر
کوئی مضموں ہو ، اسے سب سے جدا باندھتی ہے

ظفر اقبال

نوجوانی کے ٹھہرتے ہوئے دھارے پر ہوں
ایک سوراخ سیہ کے جو کنارے پر ہوں

راکھ ہے چاروں طرف اور کسی دنیا کی
یہ زمیں ہے نہ کسی بجھتے ستارے پر ہوں

وہ کشش اور تھی میں جس سے نکل آیا تھا
کوئی شے اور ہے اب جس کے سہارے پر ہوں

مجھے ڈھونڈو گے تو مل جاؤں گا آگے پیچھے
میں چڑھاوے پہ نہیں ہوں تو اتارے پر ہوں

اپنی مرضی سے کہاں ہے مرا جینا مرنا
اک زمانے سے یہاں اس کے اشارے پر ہوں

دیکھ لینے سے اگر پیٹ نہیں بھر سکتا
کس لیے زندہ ہوں اور صرف نظارے پر ہوں

راس مجھ کو نہیں آتا ہے کسی اور کا دکھ
یہی کیا کم ہے کہ اپنے ہی گزارے پر ہوں

خد و خال اس کے الگ سے بھی لبھاتے ہیں مجھے
اس پہ مرتا ہوں تو میں سارے کے سارے پر ہوں

یونہی تقسیم ہوا جاتا ہوں تختوں میں، ظفر
روزِ اوّل سے چڑھایا ہوا آرے پر ہوں

آسماں ہے یا فریب آسماں ہے
ہم سے یہ کیسا فریب آسماں ہے

چاند، سورج اور ستارے بھی ہیں شامل
یا یہاں تنہا فریب آسماں ہے

دن بھی دھوکا سا نکلتا ہے کہیں سے
رات بھی گویا فریب آسماں ہے

چادرِ مہتاب ہے پردہ زمیں کا
دھوپ کا دریا فریب آسماں ہے

آ نہ تھے ڈر کر پناہ خاک میں ہم
اِس جگہ الٹا فریب آسماں ہے

وحشتِ دل ہے فریب خواب ہستی
اور، یہ صحرا فریب آسماں ہے

آسماں کچھ بھی نہیں ہے درحقیقت
اور یہ دنیا فریب آسماں ہے

آپ پہ کیا اعتبار آئے کسی کو
آپ کا چہرہ فریب آسماں ہے

اے ظفر، اہل زمیں کیا جانتے ہیں
اور ابھی کتنا فریب آسماں ہے

غزلیں

ظفر اقبال

میں جس کو ڈھونڈتا ہوں میرے انتظار میں ہو
کوئی تو روزنِ شب رنگ اس غبار میں ہو

یہیں کہیں تھا کوئی منہدم ستارہ ابھی
جو ہو تو خواب خلا ہی کے آر پار میں ہو

یہ پھیلنا بھی سکڑنے کی ہے کوئی صورت
عجب نہیں مرا انجام اسی خمار میں ہو

یہ دور بھاگ رہی کہنہ کہکشائیں اگر
پلٹ پڑیں تو یہ سب کچھ ملک کار میں ہو

جہاں بھی ہوں مرے ذرّے بھی اڑ رہے ہوں وہاں
مرا وجود کسی ایک ریگ زار میں ہو

کہاں ہوں میں کہ جہاں وقت سست رو ہے بہت
کہیں اگر مرا مسکن اسی دیار میں ہو

گروں بھی میں تو بھلا کیوں زمین پر ہی گروں
مرا زوال تو کچھ میرے اعتبار میں ہو

نہیں ہے فرق جو ہونے میں اور نہ ہونے میں
تو اس کی سمت ہی کچھ میرے اختیار میں ہو

ہو میرے سر پہ کسی روشنی کا بوجھ، ظفر
مرا وجود اندھیرے کے انتشار میں ہو

مرے شش جہات کی ہاؤ ہو کے علاوہ ہے
یہ جو شور ہے، تری آرزو کے علاوہ ہے

جو ستارہ میرے بدن میں بجھ کے لہو ہوا
کسی کائنات کی جستجو کے علاوہ ہے

کہیں دور بھاگتی کہکشائیں اِدھر ادھر
یہ وہ سلسلہ ہے کہ روبرو کے علاوہ ہے

وہ جہاں ہے اس نے کہاں چھپا کے رکھا ہوا
جو ہمارے آپ کے رنگ و بو کے علاوہ ہے

یہاں فیصلہ نہیں کوئی فتح و شکست کا
یہ وہ معرکہ ہے جو دوبدو کے علاوہ ہے

ہیں اس ایک سمت کی اتنی سمتیں ہزارہا
کہ یہ ایک سمت بھی چار سو کے علاوہ ہے

کبھی شک تھا جس کا وہ اب یقیں میں بدل گیا
کوئی اور بھی ہے جو ہو بہو کے علاوہ ہے

مجھے گوشہ چاہیے تھا یہ عرض نیاز کو
یہ صنم کدہ مرے کاخ و کو کے علاوہ ہے

کوئی ایک بات کچھ اس طرح کی بھی ہے، ظفر
جو کسی بھی سطح کی گفتگو کے علاوہ ہے

ظفر اقبال

آپ کے یا مرے مدار میں ہے
یہ ہوس کون سے مدار میں ہے

زندگی تھی یہیں کہیں موجود
دیکھتے دیکھتے مدار میں ہے

جیسے یہ گھومتی گھرتی زمیں
کسی چھوڑے ہوئے مدار میں ہے

سفر تازہ ہے یہاں درپیش
ہر کوئی اک نئے مدار میں ہے

کیا سلامت رہے گا آپ کہ جو
ٹوٹتے پھوٹتے مدار میں ہے

اسے پکار ڈھونڈتے ہو یہاں
وہ کسی دوسرے مدار میں ہے

راہ تبدیل کیوں کرے گا بھلا
خود وہ اچھے بھلے مدار میں ہے

گرد اس کے طواف ہے سب کا
آپ وہ کس لیے مدار میں ہے

ہے مدار اس کا ایک اپنا بھی
اے ظفر، جو ترے مدار میں ہے

جستجو میں اس کی اکثر گھومتا ہوں
میں زمیں کے ساتھ مل کر گھومتا ہوں

گھومنے دیتے نہیں باہر جو مجھ کو
چار و ناچار اپنے اندر گھومتا ہوں

بچ سکے کوئی اگر تو مجھ سے بچ لے
سب کے اردا گرد پتھر گھومتا ہوں

چار سو میں گھومتا پھرتا ہوں دن رات
رو میں آتا ہوں تو محور گھومتا ہوں

ایک لمحے میں مرا سر گھومتا ہے
دوسرے میں خود سراسر گھومتا ہوں

حرف زن کیا ہیں وہ میرے گھومنے پر
پاؤں میں میرے ہے چکّر، گھومتا ہوں

گھومتی ہے میرے چاروں سمت ہر شے
اور، میں ہر شے سے باہر گھومتا ہوں

گھومنا اچھا نہیں لگتا ہے، پھر بھی
میری مجبوری ہے، اکثر گھومتا ہوں

گھومنے کے بعد بھی شاید، ظفر، میں
رک نہیں سکتا، مکرر گھومتا ہوں

اسد محمد خاں

تو مرکر یجانند گنیش نے 'پلے' والا بٹن دبا دیا' سونڈ پھیلا کر آسائش کی سانس لی اور اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سامنے اسکرین پر جمادیں۔ دے ولوک کے وشنو نرسری اینڈ کنڈر گارٹن ودیالے' کا گرڈ آنے میں ابھی دیری تھی۔ لنچ بکس کا ڈھکنا کھولنے اور دو چار مودک ..... لڈو..... لپیٹ لینے میں کیا لگتا مگر گنپتی گنیش کو یاد آیا کہ مما قالین پر پڑے فوڈ کرمبز دیکھ کے چڑ جاتی ہے "کھا کھا میں یل کرے گی وہ" اس نے ڈھکن لگا لنچ بکس توند پر سے پھسلا دیا اور اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور چھاج ایسے کان پھر سے اسکرین کی اور کرلیے۔

فرش کے بیچوں بیچ ایک گدا پڑا تھا۔ کونے میں ایک مٹکا اور مٹی کا پیالہ دھرا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا' پر سلاخیں لگے اونچے روشندان سے اندر کچھ اجالا پہنچ رہا تھا۔ گدے پر ایک یووک پڑا آرام کرتا تھا۔

دیکھتے دیکھتے یووک کسمسایا اور کروٹ بدل کے اٹھ بیٹھا۔ سر جھٹک کے اس نے جماہی لی اور گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔ "ہے ماں! یہ کون جگہ ہے؟"

اس کی ماں وہاں نہیں تھی۔ کوئی بھی نہیں تھا جو جواب دیتا۔ یووک تیزی سے روشندان والی دیوار تک گیا۔ دیوار پر ہتھیلیاں ٹکا کر اس نے سر اٹھایا دھیمے اجالے کے اس ماخذ کو دیکھا اور چیخ کے بولا۔ "کوئی ہے؟ ارے کوئی ہے؟" پھر بڑبڑایا "کوئی بولتا ہی نہیں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ پھر چیخا۔ "یہ کون جگہ ہے بھائی! بتاتے کیوں نہیں؟" کہیں سے کوئی آواز نہ آئی تو وہ گدے پر آبیٹھا اور اپنی جانگھ کھجانے لگا۔

اسے کھجاتا دیکھ کے گجانن گنیش کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ اپنی ران پر سونڈ مار کے چنگھاڑا۔ کہیں سے عورت کی آواز آئی "کیا بات ہے؟ گجانن!"

"کچھ نہیں ماں! کچھ بھی تو نہیں۔" پکارنے والی اما تھی' شیو اردھانگی' ماں پاروتی۔

یووک نے جانگھ کھجانی بند کردی۔ وہ اٹھ کے مٹکے تک گیا' پانی پی کے پھر گدے پہ آلیٹا۔ اس نے بھاری ناشتہ کیا تھا۔

یووک کچھ دیر کو سو گیا' پھر جو اٹھا تو دن ڈھلنے والا تھا۔ روشن دان اور زیادہ اجلا گیا تھا۔ باہر سے کسی گاڑی کے بار بار سلف اٹھانے کی آواز آرہی تھی' انجن اسٹارٹ نہیں ہو پاتا تھا۔ بیٹری کم زور ہوگی۔

گنیش نے کان لگا کے سنا۔ یہ ودیالے کا گرڈ نہیں ہو سکتا۔ اس کے آنے میں ابھی دیری ہے۔ ٹھیک ہے تا گاڑی کی آواز تو اسکرین سے آرہی ہے۔ اس نے پھر آنکھیں جمادیں۔

صبح سے دوپہر' دوپہر سے شام ہو گئی' کوئی نہ آیا۔۔ بہت بھوک ستاتی تو یووک اٹھ کے پانی پی لیتا مگر خالی پیٹ تو پانی بھی تکلیف پہنچانے لگا تھا۔ یووک کی بپت بڑھتی جارہی تھی۔

گنپتی گنیش نے جماہی لی اور صوفے کی پشت پر اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ صوفہ چرچرا گیا۔ اچانک ہی یووک کے سرہانے کوئی چیز آگری۔ اس نے پہلے پہل توجہ نہ دی' پڑا رہا۔ پھر کچھ گرا۔ بہت ہلکی آواز تھی شیشے کی کھنک جیسی' یووک نے سر گھما کے دیکھا۔ فرش پر سرخ شیشے کے ٹکرے پڑے تھے۔ یہ کہاں سے آئے؟ اس نے سر اٹھایا' روشندان سے اس کے دیکھتے دیکھتے چوڑی کا ایک اور ٹکڑا گرا۔ ادھر کوئی ہے جو اشارہ دے رہا ہے' اس نے گدے سے اٹھ دیوار سے کان لگا دیے۔ ایک اور ٹکڑا گرا اس نے دیوار پر تھپکی دی جواب میں دوسری طرف بھی کسی نے ہاتھ مارا۔ آواز ہلکی تھی۔

آواز گنیش نے نہیں سنی۔ مگر اس کی دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔ اس نے پہلو بدلا۔ صوفہ چرچرایا۔

یووک نے کھڑے ہو کے روشندان کی طرف منہ کیا اور بولا "کون ہے؟ ارے کون ہے ادھر؟" کوئی جواب نہ آیا' آہٹ بھی سنائی نہ دی۔ یووک نے دیوار پر پھر ہاتھ مارا۔ ادھر سے بھی دیوار تھپکی گئی۔ یہ آواز بہت صاف تھی۔

"جے پربھو۔" گجانن گنیش نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ دوسری طرف بھی کوئی ہے۔

یووک نے پوچھا "کون ہو تم؟"

کسی نے سرگوشی کی "شور نہیں کرو..... آہستے بات کرو" یہ لڑکی کی آواز تھی۔

ہے مالک! روشندان کے پار سے لڑکی بات کرتی ہے۔

"کون ہو تم؟" یووک نے پھر پوچھا۔

لڑکی نے کچھ کہا جو کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔
"پھر سے کہو۔ کیا کہہ رہی ہو؟"
"میں ہوں۔ ادھر ان کا کھانا بناتی ہوں۔"
یوک کھانے کا سن کے نہال ہو گیا "میں بھوکا ہوں۔"
"مجھے کھبر ہے۔"
"کچھ کھانے کو مل سکتا ہے؟" یوک نے التجا کی "ذرا دیکھ کے بتاؤ۔"
"مسکل ہے۔ کہیں آجا نہیں سکتی۔" وہ بولی۔ "مجھے بھی تالے میں رکھتے ہیں۔ جب کھانا بنانا ہوتا ہے یا جب جرورت ہوتی ہے میری تب لے جاتے ہیں۔"
"ضرورت؟ کیسی ضرورت؟"
"رتی کریا کے باسطے۔"
لڑکی کے منہ سے اتنے کھلے پن سے کی گئی یہ بات یوک کو بری لگی تھی۔ وہ چپ رہا۔
لڑکی نے سنکوچ سے کہا "کچھ کھائے بنا تمہیں بڑا ٹیم گجر گیا۔ ہاں نا؟"
"ہوں۔"
"دیکھو' پکا نہیں کہتی پر سبیرے تمہارے باسطے کچھ لاؤں گی۔ کوسس کروں گی۔"
"سویرے؟ کل نا؟"
"ہاں۔"
وہ بڑبڑایا "صبح میں ابھی بہت دیر ہے۔"
"ہوں۔"
"یہ تو بتاؤ' یہ جگہ کیا ہے؟"
"کارکھانہ ہے۔"
"وہ تو ہے۔ دھام کون سا ہے؟"
"کھبر نہیں۔"
تھوڑی دیر بعد یوک نے پوچھا "ایسے۔ تمہیں کہاں سے لائے ہیں؟"
"کھبر نہیں۔"
"کیوں لائے ہیں تمہیں؟"
"بتلا تو دیا.... کھانا بنواتے ہیں اور رتی....."
"اچھا اچھا۔" یوک نے اسے جملہ پورا نہ کرنے دیا "وہ تم سے کوئی بات چیت نہیں کرتے؟"
"کرتے ہیں' پر کم کم۔"
"ان سے پوچھنا۔ یہاں سے کہاں لے جائیں گے تمہیں..... اور مجھے۔"
"نہیں بتائیں گے۔ مجھے ماریں گے۔"
"مارتے ہیں؟ کیوں؟"

"چھپا کوئی آرہا ہے۔"
دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوگا۔ آواز اتنی ہلکی تھی کہ بہ مشکل سنائی دی۔
ادھر کسی مو نے دھیرے سے کچھ کہا۔ لڑکی نے اونچی آواز میں پوچھا' "کیا ہے رے؟" مو کی آواز آئی۔ کھوں کھوں کھوں۔
"پر کیوں؟" لڑکی نے بگڑے تیوروں سے پوچھا۔
چٹاخ سے طمانچہ پڑا۔ یوک چونک گیا۔ اس کے سیدھے ہاتھ نے دیوار پر گھونسا بنالیا تھا۔ دوسری طرف سے اب ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے ہاتھا پائی ہو رہی ہو۔ کپڑے پھٹنے چراتا سنائی دیا اور لڑکی کی دبی ہوئی چیخ' یوں لگا جیسے اسے فرش پہ گھسیٹا جارہا ہو۔ کوئی دروازہ کہیں زور سے بند ہوا اور پھر سناٹا۔ یوک روشندان کی طرف منہ اٹھائے' یہ آوازیں سنتا رہا تھا اس کی گردن اکڑ گئی جسے سہلاتا ہوا وہ گدے پہ آن لیٹا اور آنکھیں بند کرکے کھانوں کے خواب دیکھنے لگا۔
گریجانند گنیش توند پر سونڈ پھسلاتے ہوئے میٹھے مہکتے مودک کے بارے میں سوچ رہا تھا جو پلاسٹک کے شوخ رنگ لنچ بکس میں رکھے تھے' وہ گوسوامی تلسی کی لکھی استوتی گنگنانے لگا جس میں خود اس کی مہما کا گن گان کیا گیا تھا اور ان لڈوؤں کا ذکر تھا۔ مودک پریہ مد منگل داتا' مودک پریہ۔ مگر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ وہ بھدی آواز میں گنگنا رہا ہے۔ وہ چپ ہو گیا۔
یوک کتنی ہی بار سویا اور جاگا تھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ اندر دھوپ چلی آرہی تھی۔ کوئی چیز (نرم اور گرم) روشندان کے رستے یوک پہ آگری۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔ سمجھا ہوگا کوئی جانور گرا ہے مگر دوسری طرف سے دیوار پہ ہاتھ مار کے لڑکی نے پوچھا "مل گیا؟"
یوک نے سامنے پڑی چیز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہ ابلا ہوا آلو تھا' خوب گرم۔ اس نے چھیلنے کا بھی کشٹ نہ کیا' کھانے لگا۔
شاید اس کا منہ جلا ہوگا تو یوک نے تکلیف کی آواز نکالی۔
لڑکی سمجھ کے ہنسنے لگی' بولی "ہیاری سے کھارے۔ گرم ہے۔"
"کیا تمہاری' بڑی' بڑی مہربانی۔"
"یہ اور لے۔" ایک اور آلو پھینکا گیا جو واپس ادھر ہی گر گیا۔
لڑکی خوش دلی سے ہنسی' "ٹھیر' پھر پھینکتی ہوں۔" اس بار آلو سیدھا گدے پر آن گرا۔
وہ بولی "پیٹ تو نہیں بھرے گا تیرا۔ پر پانی پینے جوگا ہو جائے گا۔"
"نہیں ٹھیک ہے۔" یوک نے کہا' "ٹھیک ہے۔"
"سنو!" دونوں ایک ساتھ بولے تھے۔ دونوں ہی ہنس پڑے۔
کچھ پیٹ میں پڑا تھا تو یوک چہنے جیسا ہو گیا تھا' بولا "نام کیا ہے تمہارا؟"
"روپکا۔"

"اہو !" یوک نے حیرت کی آواز نکالی۔
"کیا ہوا؟"
"میرا نام روپ ہے۔"
"ارے! اچنبھے کی بات ہے..... ہے نا؟"
"پر ٹھیک ہے۔" یوک نے بات بڑھائی "کوئی اتنی انوکھی بھی نہیں۔ میں روپ' تم روپکا۔" یہ کہہ کے وہ ہنسنے لگا۔

"کے تو !" ماں پاروتی کی دلاس سے بھری آواز آئی۔ "کے تو رے! جا تیرا گرڈ آگیا۔ جا' دیر نہ کر۔" آج پاروتی نے گریجانند کو کے تو' کہہ کے بلایا تھا..... میرا دم دار تارا! میری روشنی!

"ہہ !" گنپتی بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر گرڈ کا ہوا تھا۔ اس کی سن سن سنائی دے رہی تھی۔ گنپتی گریجانند لنچ بکس اٹھا کے بھاگا۔ موک پر یہ مشکل واتا..... موک پر یہ مشکل..... جلدی جلدی میں اس نے اشاپ والا بٹن بھی نہیں دبایا تھا۔

آوازیں سنیں تو جگت ماتا پاروتی ٹہلتی ہوئی آئی۔ وِدیا لئے کا گرڈ گیانن کو لے کے جا چکا تھا' اب کام کوئی نہیں تھا۔ گریجا ماں اسکرین کے سامنے صوفے پہ آن بیٹھی۔

"روپکا !"
"روپ !..... ہاں رے؟" لڑکی کی آواز اب بہت سرس تھی۔
"میں سمجھا تم چلی گئیں۔"
"اب نہیں جاتی۔ اب کہیں نہیں جاتی۔ سنا تو نے؟"
"ہوں۔"
"اور یہ بھی سن لے۔ میں آؤں گی۔ ادھر تیرے پاس ہی آؤں گی۔"
"ماں پاروتی نے لمبی پتلی انگلیوں سے اپنے رخسار چھوئے جو مہیشور شیو شنکر کے خیال سے گلابی ہوئے جاتے تھے اور تپ رہے تھے۔ جے اماور!
"جے دگمبر ! جے مہیشور !
"ایسے کیوں ہنستی ہو؟"
"تیری عمر کتنی ہے؟"
"اٹھارہ کا ہوں۔"
"چھوٹا ہے نا۔"
"چھوٹا؟ تم کتنی بڑی ہو؟"

مہیشی کا دھیان ادھر نہیں تھا۔ یوک اور کماری پہلے کچھ ایسا کہہ گئے تھے جو اس نے سنا نہیں تھا یا سنا ہوگا تو دھیان نہیں دیا۔ وہ سوچنے لگی' پلٹ کے سن لوں۔ پر ایسا بھی کیا ہوگا۔ اما اب سیدھی ہو بیٹھی۔ کماری سے یوک اس کی عمر پوچھتا تھا۔

"سترہ برس کی ہوں میں' مگر....."
"مگر کیا؟ چھوٹی ہو مجھ سے۔"

"میں نہیں تو چھوٹا ہے۔ ابھی کچھ دیکھا ہی نہیں تو نے۔"
یوک چڑ گیا' کہنے لگا "تم نے ایسا کیا دیکھ لیا؟"
دیوار کی اوٹ سے آئی آواز میں دکھ بھرا تھا "بہت کچھ..... جو تو دیکھ لیتا تو چودہ برس کی عمر میں ایک دم بڑھ جاتا۔ ایک ہی راتری میں بڑا ہو جاتا۔"
"ایک ہی..... رات..... میں۔" یوک نے ٹھہر ٹھہر کے دہرایا۔
دیوار کے پار اب وہ سسکیاں لیتی تھی "وہ اٹھانے آئے تھے مجھے..... میں پکاری بچاؤ مجھے بچاؤ! کوئی ایک نہیں بولا۔ کوئی آگے نہیں آیا۔"
یوک نے افسوس کی آواز نکالی' کہا کچھ نہیں۔

اب جو وہ بولی تو آواز میں ایک ذرا ٹھہراؤ تھا "یہاں اس وکت جتنے ہیں سب کی روٹی بناتی ہوں' چہرے دھوتی سکھاتی ہوں۔ روج رات میں دن میں جی مری ہو کھینچ لے جاتے ہیں۔ تین برس سے ایسا ہی ہے۔ ان سے پہلے دوسرے تھے۔ ان سے پہلے دوسرے..... سب سکتی مان' بھی طاکت ور' جب تک جی کرتا ہے رکھتے ہیں۔ جی بھر جاتا ہے کسی اور کے ساتھ ہنکا دیتے ہیں۔" وہ روئے جا رہی تھی۔

یہ کیا کر دیا میں نے؟ یوک دیوار سے لگا بیٹھا دبدھا میں سر جھٹکتا..... چپ رہوں یا دلاسا دوں اسے؟
وہ خود ہی چپ ہو گئی۔
یوک دھیرے سے بولا "دکھ ہوا سب سن کے۔"
لڑکی کی آواز میں چمک تھی "ارے سب چلتا ہے۔ تو دکھی مت ہو' سال پیچھے سنا روئی ہوں۔" اس نے ہنسنے کی بھی کوشش کی تھی۔
"سال پیچھے کسے سنایا تھا؟"
"دیواروں کو۔"
یوک چپ ہو گیا۔
لڑکی نے آواز دی "روپ! ..... رو پمان!"
"ہوں۔"
"کوئی بات کر۔"
"بات؟..... میں یہ بات بھولوں گا نہیں' جو تو نے کہی' بھولوں گا نہیں۔"
"کون بات؟"
"کہ روپکا کشٹ جھیلتی ہے..... مصیبت میں ہے۔"
"مصیبت تو رو پمان اتنی دیر کی تھی جتنی دیر تجھے سنایا۔ اب ٹھیک ہوں پروا نہیں' پکی ہو گئی ہوں۔ ان چنڈالوں سے بدلہ بھی چکا لیتی ہوں اب تو۔"
"بدلہ؟ وہ کیسے؟"
"ابھی دو کو لڑوایا نا۔ ایک نے ایک کے چھری مار دی۔ گاڑی ادھر تجھے لے کے آئی' ادھر اسے لے گئی۔ بچے گا نہیں' گردن کی نری کٹ گئی ہے۔"
"کس طرح لڑوایا؟"

"بس ــــــ لڑا دیا۔"

"لڑا دیا؟ کیسے؟ کیا کیا تم نے؟"

"نہیں بتاؤں گی۔"

"روپکا! یہ کیا بات ہوئی؟ بھلا دوست نہیں ہیں ہم؟"

"دوس؟.... دوس کا تو پتا نہیں۔ پر بتاؤں گی نہیں بڑی بے سری کی بات ہے۔ تجھے تو بالکل نہیں بتانے کی۔"

"اچھا۔ رہنے دو پھر۔"

"برا کیوں منا تا ہے؟..... بس نا کھتم کر۔"

"ہاں۔ ختم کر دیا' پر ایک بات ہے۔"

"کیا؟"

"انھیں پتا چل گیا کہ وہ روپکا کی وجہ سے جھگڑے ہیں تو برا حال کریں گے تمھارا۔"

"اور کیا برا کریں گے چنڈال؟ ویسے کسی کو مالم نہیں ہوئے گا کی جھگڑا کیسے' کس وجہ سے ہوا۔"

"وہ پوچھ لیں گے۔ ایک تو زندہ بچا ہوگا۔ وہ جس نے مارا ہے۔"

"وہ وہ نہیں بتائے گا۔ کوئی مرد ایسی بات نہیں بتا تا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے بات وہ کہی کہ دونوں لڑ پڑے پر ایک نے دوسرے کو بتائی نہیں' چپ کی.... کھاموسی کی بات ہے۔"

"خبر نہیں کیا کہہ رہی ہے؟"

"اسی لیے کہا تھا ابھی تو چھوٹا ہے۔"

"چل پھر وہی مت شروع کر..... جا سو جا۔"

"کھفا ہو گیا؟"

"نہیں نہیں۔ سوچتا ہوں تو پھر نہ رونے لگے۔ اب سو جا۔ میں تھک گیا ہوں۔"

"ہاں' تھک گیا ہے تو سو جا..... دوس!"

"دیکھا! آخر تو نے دوست کہا نا مجھے۔"

لڑکی دیوار کے پار سے ایسے ہنسی کہ یووک کی کوٹھری میں بسنت آ گئی۔

"دیکھا؟ دوست بنا لیا تجھے۔ مجھے دوست کہا نا تو نے۔" یووک اترا کے بولا وہ پھر ہنسی' "وہ تو ایسے ہی کہہ رہی تھی..... ہو ووٹھ۔"

ماں جگد مبے نے سیس کا چندر کرن پشپ اتارا اور روپکا کی اور پھینک دیا۔

"یہ کیا تھا؟"

"کیا؟" وہ کھلکھلا کے بولی۔

"جو ابھی دیوار کے پار تیری طرف گیا؟"

"چندر کرن پشپ۔ یہ تو نے پھینکا ہے نا؟"

"میں نے؟..... نہیں تو۔"

"جیا وہ مت اتراؤ جوٹھے۔"

شیوا اردھانگی پاروتی ایک مند مسکان لیے اسکرین پر نظر ڈالتی رسوئی میں چلی گئی۔ یہاں بہت کچھ ہو تا رہا۔

یووک پوچھ رہا تھا۔ "کیا بازار جا رہی ہے؟"

لڑکی بولی' "ہاں بزار لے جا رہے ہیں سسرے۔ ناج' مسالے کھتم ہو گئے۔"

"اچھا ہے' چلی جا۔ جتنی دیر یہاں سے دور رہے اچھا ہے۔"

"دیر دور کیسا۔ ادھر سے دور اب نہیں رہتا۔ اور جو بزریا جاؤں گی تو تو بھی سنگ ہوئے گا میرے۔"

"وہ کیسے؟"

"ہیا میں..... ہیا سمزتا ہے؟...... ہردے' دل۔"

یووک ہنس پڑا' "اوہ!"

"ہنستا کیوں ہے؟ اعتبار نہیں؟"

"ہے۔ اعتبار ہے' اچھا بتا کیا لائے گی؟ میرے لیے بازار سے کیا لائے گی؟"

لڑکی کچھ دیر سوچتی رہی' پھر بولی' "سارنگ۔"

"سارنگ کیا؟"

وہ بولی' "سب چیج۔"

"کیا سب چیز؟"

"سن۔ سارنگ بولتے ہیں جب کسی اپنے کو کچھ دینا ہووے اور سمز نہیں آوے کی کیا دے۔ جی کرے اس دنیا سنسار کی' برہمانڈ کی سبھی چیج دے دیو۔ تبھی بولتے ہیں کی تیرے لیے سارنگ لاؤں گی۔"

"اچھا۔۔ پر یہ سارنگ ہوتا کیا ہے؟ چیز کیا ہے؟"

لڑکی بولی' "سب چیج! کمل کا پھول سارنگ' کاجل' کپڑا' موتی' سونا' چراگ' دیوا' یہ سب سارنگ۔ باج' ہنس' مور' گھوڑا سبھی سارنگ اور جیسا تو ہے ہاتھ' سیو.... تو تو بھی سارنگ۔ تال' سنکھ' پپیہا' ہرنی' کوئل.... تیرے کو کوئل لا دوں؟ کوا' کوا..... ہاں؟"

"باؤلی ہے تو تو۔"

"ابھی سن نا۔ سارنگ بولتے ہیں رات کو' چندرما کو' سوریہ کو' بھین کو' بھور اور آکاس کو' کبوتر کو' بل کو' راجے کو' سر کے چھتر کو اور تیرے چرن لگانے چندل کو۔"

"چندل؟"

"ارے ہاں نا۔ جسے صندل بولتے ہیں اور چڑیا بھی سارنگ ہے اور عورت بھی....."

"ایک دم مسٹک الٹ گیا ہے تیرا۔"

لڑکی رو پڑی' "ہاں رے روپ! مہادیو میرا شاکسی ہے- تو نے میرا تو مستک ہی الٹ دیا رے-"

اور ٹھیک اسی وقت ایک بھے اکڑ گتی سنائی دی- مہادیو کا ڈمرو بجا تھا- ایک دامنی کے لشکارے میں یووک اور کماری کے بیچ کی دیوار ڈھ گئی-

کوٹھری میں پڑے (کتنی ہی رتی کریاؤں سے چھنٹے) میلے کچیلے گدے پر باکمبر بچھ گیا- جے ہو!

روپ اور روپکا پہلی بار ایک دوسرے کے سامنے آئے-

"تو روپ ہے؟" لڑکی نے پوچھا-

"اور تم روپکا.... تم نرملا ہو اور اجولتا بھی-"

"میں چنڈالوں کی رکھیل روپکا-"

"تم ستیہ ہو' شو اور سندر بھی-"

"میری جنگھاؤں کے بیچ اپوتر آگ کی دلدل ہے-"

یووک نے اس کے دونوں ٹخنوں کو چھوا' "تم لجاونتی اور پوتر ہو اور نرمل بھی-" یووک نے اس کے مستک کو ہاتھ لگایا- "جے ہو!"

لڑکی نے اس کے چرن تھام لیے-

وہ اسے باکمبر پر لے آیا- کسی آخری نرتیہ کے پچھواڑے' جہاں کچھ نہیں بچا تھا' چنڈالوں کا رستہ روکے ہوئے اب ایک نئی اور بے خوف زندگی سر اٹھا رہی تھی- ❖ ❖

گذارش

- "شب خون" سے متعلق خط و کتابت دفتر شب خون کے پتے پر ہی کریں۔
- "شب خون" ہر ماہ کے آخری عشرہ میں پوسٹ کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شمارہ اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ تک نہ ملے تو دفتر کو فوراً عدم وصولیابی کی اطلاع دیں۔ دیر سے ملنے والے خطوط پر ہمارے لئے کوئی کاروائی کرنا اس لئے ممکن نہیں کہ "شب خون" کی کاپیاں فوراً ختم ہو جاتی ہیں۔
- جواب طلب امور کے لئے ڈاک ٹکٹ لگا ہوا لفافہ یا کارڈ ضرور بھجوائیں۔

مصور سبزواری

کف پہ کف لفظوں کے سر تجھ کو کچھ بھی نہ حاصل ہوا
تو نے کشتی ڈبو دی، مری میں تری ضد میں ساحل ہوا

ہم تو صد رنگ آفاق آباد کرنے چلے تھے مگر
جشن تخریب میں تو بھی شامل ہوا میں بھی شامل ہوا

[illegible] مری آگ شاداب رکھنے کی خاطر ابھی
شمع بر کف کوئی چپکے چپکے رگ و پے میں داخل ہوا

اور اک صبح خورشید کے آئینوں میں دکھنے لگی
اپنی خواہش کا چہرہ نہ اب تک نمائش کے قابل ہوا

کالے رتھ آندھیوں کے چلے رعد کے تازیانے پڑے
وقت عجلہ ہے یہ اس کی آمد کا امکان کامل ہوا

چاند جب نکلا چھتوں پہ مہ رخوں کا سامنا تھا
ایک نامحرم تھا اور سارے کمروں کا سامنا تھا

خواب عشرت سے کہیں تھے چور چور اپنی تہوں میں
سے دروازوں کو فاتح دستکوں کا سامنا تھا

مطمئن بیٹھے ملے سب اپنے اپنے دائروں میں
صرف ہم کو جلتی بجھتی ساعتوں کا سامنا تھا

ٹوٹ جاتی تھی کڑی پہ پہلی ہی زنجیر آ کر
دور تک لا حاصلی کے سلسلوں کا سامنا تھا

کیا بتاتی اندرون جاں کی تھیں محرومیاں بھی
محل کے راز فاش کو پھر مجلسوں کا سامنا تھا

عبدالاحد ساز

جو کچھ بھی یہ جہاں کی، زمانے کی، گھر کی ہے
روداد ایک لمحۂ وحشت اثر کی ہے

پھر دھڑکنوں میں گزرے ہوؤں کی صدائے پا
سانسوں میں اک عجیب ہوا پھر ادھر کی ہے

پھر دور منظروں سے نظر کو ہے واسطہ
پھر ان دنوں فضا میں حکایت سفر کی ہے

پہلی کرن کی دھار سے کٹ جائیں گے یہ پر
اظہار کی اڑان فقط رات بھر کی ہے

ادراک کے یہ دکھ، یہ عذاب آگہی کے دوست
کس سے کہیں، خطا نگہ خود نگر کی ہے

حالت جو اپنی غیر ہے عجز کلام سے
سو اچھے شاعروں میں یہی بیشتر کی ہے

وہ ان کہی سی بات، سخن کو جو پر کرے
ساز اپنی شاعری میں کمی اس ہنر کی ہے

منظر شمشان ہوگیا ہے
سپنا بے جان ہوگیا ہے

اک سانس کے بعد دوسری سانس
جینا بھگتان ہوگیا ہے

سرگوشیوں کی دھمک ہے ہر سو
غل کانوں کان ہوگیا ہے

چھو آئے ہیں ہم یقیں کی سرحد
جس وقت گمان ہوگیا ہے

سو نوک پلک جھجک میں
عقدہ آسان ہوگیا ہے

وہ لمحہ ہوں میں، کہ اک زمانہ
میرے دوران ہوگیا ہے

منزل وہ ہم سفر ہے جس پہ
چوری سامان ہوگیا ہے

پیدا ہوتے ہی آدمی کو
لاحق نسیان ہوگیا ہے

کاغذ پہ قلم ذرا جو پھسلا
اظہار بیان ہوگیا ہے

سودے میں غزل کے— فائدہ ساز؟
دیکھو نقصان ہوگیا ہے

عبدالاحد ساز

غیر کی دھرتی، پرایا آسماں ہے
جان جیسی چیز بھی اپنی کہاں ہے

کھو گئیں صدیاں سوالوں کے نشے میں
زہر خاموشی جواب جاوداں ہے

کشتیاں ہر سو، ابھرتی ڈوبتی ہیں
چار جانب موج بے ساحل رواں ہے

بیچ رستے سے زمانہ کھو گیا ہے
دم بخود، گرد و غبار کہکشاں ہے

ہڈیوں میں آگہی چبھنے لگی ہے
زد پہ بےقفلی ہواؤں کی مکاں ہے

صبر— ہمت سے سوا اب زندگی کیا
اک تگ و دو ہے، سفر ہے رائیگاں ہے

یوں مسلط ہیں زمیں پر بت یقیں کے
آسماں جیسے کوئی وہم و گماں ہے

فکر، تدریجی عمل لا حاصلی کا
ٹھوس ہے، سیال ہے، آخر دھواں ہے

حد افق پر سارا کچھ ویران ابھرتا آتا ہے
آنکھوں کے کھو جانے کا امکان ابھرتا آتا ہے

پس منظر میں فیڈ[۱] ہوئے جاتے ہیں انسانی کردار
فوکس[۲] میں رفتہ رفتہ شیطان ابھرتا آتا ہے

پیچھے پیچھے ڈوب رہی ہیں عمر رواں کی منفعتیں
آگے آگے اک بھاری نقصان ابھرتا آتا ہے

جیسے میں دبتا جاتا ہوں ان آنکھوں کے بوجھ تلے
دل پر دو اشکوں والا احسان ابھرتا آتا ہے

ایک تشنج، اک ہچکی، پھر اک نیلی زہریلی قے
سب کچھ لکھ دینے جیسا ہیجان ابھرتا آتا ہے

ساز مری جانب اٹھتی ہے رات گئے انگشت الست
روح میں اک بھولا بسرا پیمان ابھرتا آتا ہے

FOCUS –۲ FADE –۱

وزیر آغا

تشبیہ دو چیزوں کی مشابہت کو کھول کر بیان کرتی ہے۔ استعارہ اس مشابہت کو اشارتاً یا کنایتاً پیش کرتا ہے۔ مثلاً اگر محبوب کی بھیگی ہوئی آنکھوں کے بارے میں کہا جائے کہ وہ ایسے لگتی ہیں جیسے کوئی سمندر ہو تو یہ تشبیہ ہے۔ لیکن اگر "آنکھ سمندر" کہہ دیا جائے تو یہ استعارہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تشبیہ مشابہت کو اتنی تفصیل سے بیان کرتی ہے کہ درمیان کی کوئی کڑی غائب نہیں ہوتی وہاں استعارہ محض اشارے کنائے تک محدود رہتا ہے۔ اور ناظر یا قاری کو تحریک دیتا ہے کہ وہ درمیانی کڑیاں خود مہیا کرے مگر تشبیہ ہو یا استعارہ ان میں مشابہت محض جسمانی سطح تک محدود نہیں ہوتی بلکہ ان داخلی کیفیات کی بھی نشان دہی کرتی ہے جن کی وجہ سے مشابہت کا احساس جاگا تھا۔ اس سب کے باوجود تشبیہ یا استعارہ کا افق محدود ہے۔ دوسری طرف علامت میں تخلیق کار ایک قدم تشبیہ یا استعارے سے باہر رکھنے میں بھی کامیاب ہوتا ہے۔

لغوی سطح پر علامت یعنی سمبل (SYMBUL) سے مراد دو چیزوں کو جوڑنا ہے مگر جب یہ دو چیزیں آپس میں جڑتی ہیں تو ایک تیسری شے جنم لیتی ہے جو نہ صرف ان دونوں کی حاصل جمع سے "زیادہ" ہوتی ہے بلکہ اس سے مختلف بھی ہوتی ہے۔ مثلاً تشبیہ استعارے کی حد تک آنکھ "سمندر" کا روپ ہے مگر علامت اس مماثلت کو بنیاد بنا کر آگے کو بڑھتی ہے اور اس مماثلت کے حوالے سے نئے نئے منطقے دریافت کرتی ہے۔ اس بات کو بعض اوقات EXTENDED METAPHOR یا استعارے کی توسیع بھی کہا گیا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ آنکھ سمندر کے استعارے سے سمندر کی گہرائی وسعت بے کرانی اور ابدیت کے تصورات جاگ اٹھتے ہیں جو آنکھ کو بھی ان تصورات کی "نمائندگی" کا جوہر تفویض کر دیتے ہیں۔ تاہم یہ علامتی اظہار کی طرف محض پہلا قدم ہے۔ کیونکہ علامتی اظہار کہیں رکتا نہیں ہے بلکہ قدم بہ قدم پھیلتا چلا جاتا ہے تا آنکہ ابہام کی دھند میں جذب ہو کر معنی آفرینی کے وصف سے محروم ہو جاتا ہے۔ جب یہ مقام آجائے تو سمجھئے کہ علامت کی کارکردگی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ دوسری طرف اگر علامت کا مفہوم شے سے چپک جائے۔ یوں کہ جب شے کا ذکر آئے تو فقط یہی مفہوم بیدار ہو تو ایسی صورت میں بھی علامت محض نشان تک محدود ہو جائے گی۔ مثلاً اگر صلیب سے قربانی کا مفہوم منسلک ہے تو جب صلیب کا ذکر آئے گا تو لامحالہ قربانی کا خیال بھی آئے گا۔ سو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ صلیب بطور علامت استعمال ہوئی ہے مگر اس کا مفہوم کثرت استعمال کے باعث "نشان" کی سطح پر رک گیا ہے اور اب اس کی حیثیت کلیشے سے زیادہ نہیں ہے۔

علامت کا معنیاتی نظام کس طرح متحرک ہو کر وسعت آشنا ہوتا ہے اسے سمجھنے کے لئے میں نے کئی موقعوں پر ایک تمثیل سے کام لیا ہے۔ تمثیل یہ ہے کہ اگر رات اندھیری ہے اور میدان میں فقط ایک قمقمہ روشن ہے اور آپ اس قمقمے کی طرف آرہے ہیں تو جسم سے جڑا ہوا آپ کا سایہ آپ کے تعاقب میں آئے گا اور قدم بہ قدم مختصر ہوتا چلا جائے گا۔ حتیٰ کہ جب آپ قمقمے کے نیچے آکھڑے ہوں گے تو سایہ آپ کے قدموں میں سمٹ کر غائب ہو جائے گا۔ مگر جب آپ قمقمے سے آگے بڑھیں گے تو یہی سایہ آپ کے قدموں سے نکل کر آپ کے آگے آگے چلنے لگے گا اور بتدریج بڑا ہوتا چلا جائے گا تا آنکہ اندھیروں میں جذب ہو کر معدوم ہو جائے گا۔ علامت کی کارکردگی کو سمجھنے کے لئے یہ تمثیل بہت موزوں ہے۔ ہر شے کے ساتھ اس کا معنی منسلک ہوتا ہے اور شے کے عقب میں ایک غلام کی طرح چلتا ہے مگر جب شے مکمل روشنی میں (جو شعور کی روشنی ہے) آجاتی ہے تو سایہ (معنی) شے کے قدموں میں سمٹ جاتا ہے گویا شے اور اس کا معنی ایک ہو جاتے ہیں۔ یہ "نشان" کی واضح ترین صورت ہے۔ مگر اس کے بعد جب "شے" آگے کو بڑھتی ہے تو اس کا سایہ (معنی) اب دلیر ہو کر اس کے آگے چلنے لگتا ہے۔ گویا جو پہلے ایک دست بستہ غلام تھا وہ اب میر کارواں ہے۔ اب اس کی حیثیت "نشان" کی نہیں بلکہ علامت کی ہے جو متعین معنی کے دائرے سے نکل کر معنیاتی توسیع کی حامل بن گئی ہے۔ مختصر یہ کہ جب شے صرف ایک معنی کی حامل ہو تو ہم کہیں گے کہ یہ نشان ہے، جب یہ شے ایک اور شے سے مشابہت کی بنا پر رشتہ قائم کرے تو یہ تشبیہ یا استعارہ ہے اور جب یہی شے آگے بڑھ کر معنیاتی توسیع کی علمبردار بن جائے تو علامت ہے۔

مگر علامت محض افقی توسیع ہی کی حامل نہیں، دیگر ابعاد میں بھی دخیل

ہے۔ اس بات کو بھی ایک تمثیل سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ کسی جگہ ایک قمقمے کے پاس کھڑے ہیں تو آپ کے جسم سے محض ایک سایہ (معنی) بر آمد ہوگا لیکن اگر آپ متعدد قمقموں کے قریب کھڑے ہیں تو ان قمقموں کی تعداد کے مطابق ہی آپ کے جسم سے بھی متعدد سایے (معانی) بر آمد ہو جائیں گے۔ یہی حال علامت کا ہے کہ زندگی کے مختلف مظاہر کی چھوٹ پڑنے سے علامت کے سایے (معانی) بھی تعداد میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جب کوئی تحریر محض مشابہت تک محدود رہے تو اس میں زیادہ سے زیادہ معانی کی دو صورتوں تک توسیع ہوگی۔ مگر جب کوئی تحریر مماثلت کے دائرے کو کشادہ کرنے میں کامیاب ہو تو اس سے ان گنت معانی پھوٹنے لگیں گے۔ جب ایسا ہو جائے تو ہم کہیں گے کہ اب یہ تحریر علامتی ہے۔

مزاج اور وضع کے اعتبار سے علامتیں کئی طرح کی ہیں مگر زیادہ تر ان کی چار اقسام ہی کا ذکر ہوتا ہے (بحوالہ پرنسٹن انسائیکلو پیڈیا)۔ ان میں سے ایک قسم تو وہ ہے جسے "عام فہم علامت" کہا گیا ہے۔ مثلاً کسی زینے یا پہاڑ پر چڑھنا جو تزکیہ باطن کے مترادف ہے یا شام موت کی اور صبح زندگی کی علامت ہے---- دوسری قسم وہ ہے جسے "روایتی علامت" کہا گیا ہے۔ مثلاً سفید کلی جو کنوارپن کی اور گلاب جو جذباتی تموج کی علامت ہے---- تیسری قسم "داخلی طور پر مربوط علامت" کی ہے جیسے سمندر کا جرأت مندی سے انسلاک۔ چوتھی قسم "پرائیویٹ علامت" کی ہے جیسے مثلاً ییٹس کے ہاں چاند کے گھٹنے بڑھنے کے مدارج میں تاریخ کے ادوار کا عکس وغیرہ مگر غور کریں تو پہلی تین اقسام کا کلیشے بن جانا ممکنات میں سے ہے کیوں کہ وہ مال کار محض ایک معنی کے ساتھ منسلک ہو کر رہ جاتی ہے جب کہ چوتھی قسم میں شاعر کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے استوار انسلاکات کو پار کر کے معنی آفرینی کی ایک نئی دنیا کو وجود میں لائے۔

اعلیٰ ادب بنیادی طور پر علامتی ہوتا ہے۔ وہ سامنے کے معنی کے علاوہ معانی کے سلسلوں کو بھی جنبش میں لاتا ہے۔ اگر کسی تخلیق کا صرف ایک معنی ہو یا محض ایک تناظر ہو تو وہ وقت کی دیوار کو پار نہیں کر پاتی اور بہت جلد متحجر (FOSSIL) بن جاتی ہے۔ اسی لئے علامتی ادب کبھی پرانا نہیں ہوتا۔ وہ ادب جس نے صرف اپنے زمانے کی عکاسی کی اور صرف ایک معنی کو جنم دیا وقت کا ساتھ نہ دے سکا۔ اور اب کرم خوردہ کتابوں میں مقید پڑا ہے مگر علامتی ادب کی خوبی یہ ہے کہ اس کے اندر سے ہمہ وقت نئی سے نئی معنوی جہتیں بر آمد ہوتی ہیں۔ وہ تخلیق کار جو علامت کی اس کارکردگی کا احترام نہیں کرتے اور علامتی عناصر کو مخصوص معانی میں جکڑ لیتے ہیں وہ اپنی تخلیقات کو جنازوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ روایت ان جنازوں کو کندھا دینے پر مامور ہے۔ لہٰذا یہ کافی دور تک زندہ ادب کے جلو میں دکھائی دیتے ہیں مگر مال کار خاک میں مل کر خاک ہو جاتے ہیں۔

علامت اور تجرید میں بنیادی فرق ہے۔ تجرید سے مراد بے صورت ہونا یعنی NON -REPRESENTATIONAL ہوتا ہے۔ چونکہ موسیقی کی کوئی صورت نہیں ہوتی' یہ امیج میں پیش نہیں ہوتی' لہٰذا یہ بنیادی طور پر تجریدی ہے۔ شاعری کی حد تک تجریدیت کی آمیزش کی جو کوششیں ہوئی ہیں ان میں شاعری کو موسیقی کی سطح تفویض کرنے کی طلب صاف نظر آتی ہے مگر شاعری صرف ایک حد تک ہی تجریدی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ شاعری سے اگر متخیلہ منہا ہو جائے (جس کا کام صورت گری ہے) تو اس کی کارکردگی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ علامت' تجرید کی حدوں کو صرف چھوتی ہے۔ وہ بھی متخیلہ کے ذریعے! بے شک جب وہ صورت کو کسی ایک معنی کے شکنجے سے نکال کر کثیر المعانی فضا کے سپرد کرتی ہے تو تجریدی فضا کو ضرور جنم دیتی ہے۔ مگر یہ تجریدی فضا امیج سے کلیتاً منقطع نہیں ہوتی۔ اردو افسانے نے اپنے علامتی دور میں افسانے کے اجزائے ترکیبی مثلاً کردار' پلاٹ اور فضا وغیرہ کو ان کی جسمانیت سے منقطع کر کے تجرید کے حوالے کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ صرف ایک حد تک ہی کامیاب ہو سکی۔ یعنی جہاں واقعات اور کردار ایک دھندلی فضا میں ہیولوں کی طرح دکھائی دیے ہیں وہاں علامتی کارکردگی واضح ہوئی مگر جہاں تجرید' واقعیت سے یکسر منقطع ہو گئی وہاں گہری دھند پھیل گئی اور علامتی کارکردگی متاثر ہوئی۔ اس سب سے باوجود اردو میں علامتی افسانہ نگاری کے دور نے افسانے کو ایک معنوی فضا سے نجات دلا کر نئے نئے امکانات پیدا کر دئے' نتیجۃً اردو افسانے کے جدید دور میں جب کہانی' کردار اور پلاٹ اردو افسانے میں لوٹ آئے تو اپنے ساتھ علامتی وضع اور مزاج بھی لائے۔ چنانچہ اب جو لوگ افسانے لکھ رہے ہیں ان میں قدیم اور جدید کا امتزاج رونما ہوا ہے یعنی ان میں کردار اور کہانی کی اساس پر علامت کی کارکردگی کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ زبان' لسانی نشانات یعنی LINGUISTIC SIGNS پر مشتمل ہوتی ہے اور ہر لسانی نشان کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک "آواز" کا حصہ جسے دال یا SIGNIFIER کہا گیا ہے اور دوسرا خیال یا CONCEPT والا حصہ ہے جسے مدلول یا SIGNIGIED کا نام ملا ہے اور جو "آواز" والے حصے پر اسی طرح چسپاں ہوتا ہے جیسے کرنسی نوٹ پر اس کی قیمت! مثلاً لفظ کرنسی کو لیجئے۔ جب ہم لفظ کرنسی بولتے ہیں تو ایک خاص آواز نکالتے ہیں۔ یہی آواز دال یا SIGNIFIER ہے مگر اس آواز کے نکالنے سے کرنسی کی جو شبیہ' خیال یا CONCEPT ابھرتا ہے وہ مدلول یا SIGNIFIED ہے۔ دونوں ایک کاغذ کی دو اطراف ہیں۔ اگر اس کاغذ کی ایک جانب کو پھاڑ دیں تو دوسری طرف از خود پھٹ جائے گی۔ شاعری کا کام یہ ہے کہ وہ زبان کے اس متعین' منضبط اور ٹھہرے ہوئے نظام کو توڑتی ہے۔ اسی لیے تو دوروف نے کہا تھا کہ شاعری میں زبان خود کشی کرتی ہے۔ تاہم شاعری زبان کے متعین روپ کو کئی طریق سے توڑتی ہے تاکہ اس کا دامن وسیع ہو۔ مثلاً تشبیہ یا استعارہ کو بروئے کار لا کر جو زبان کے پیرایہ کو ناکافی پا کر مشابہت کی مدد سے تجربے کے خدوخال کو روشن کرتا ہے۔ دوسرے مجاز مرسل یعنی METONYMY کے ذریعے جو قربت یعنی CONTIGUITY کو بروئے کار لاتا

ہے۔ تیسرے تجرید کی مدد سے جو تشبیہ سے اوپر اٹھ کر ایک طرح کی ماورائی فضا کو چھونے کی کوشش کرتی ہے۔ علامت' زبان کے متعین نظام کو توڑ کر اسے کشادگی سے ہم کنار کرنے کے ان جملہ وسیلوں سے کام تو لیتی ہے مگر آخر میں انہیں پار کر کے ایک ایسے منطقے کے در بھی کھول دیتی ہے جہاں نہ درتہ معانی کا ایک پورا طلسم آنکھوں کے سامنے پھیل جاتا ہے۔

انسان کے اعماق میں ایک ایسی بے انت "نورانی موجودگی" کے آثار ملتے ہیں جس کا کوئی نام' روپ یا قالب نہیں ہے۔ نفسیات نے اسے اجتماعی لاشعور میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور ساختیات نے "شعریات" کے نظام میں۔ فلسفے نے اسے کبھی "اعیان" کی صورت میں نشان زد کیا ہے' کبھی اسے وجود (BEING) اور کبھی جوہر (ESSENCE) کہہ کر پکارا ہے۔ اسی طرح تصوف نے اسے مجسم حسن اور نور میں اور مذاہب نے اسے لفظ' حکم یا لوگوس (LOGOS) میں پایا ہے۔ اصلاً یہ ایک ایسا TRANSCENDENTAL SIGNIFIED ہے جسے "دیکھنا" تو ممکن ہے دکھانا بہت مشکل ہے۔ فلاسفر' صوفیاء اور نفسیات دان اس کے بارے میں تو بتاتے ہیں مگر اپنے تجربے کو پیش کرنے میں ناکام رہتے ہیں یہ کام تخلیق کاروں کا ہے جو اسے مس کرنے کے بعد اسے صورت پذیر کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ انسان کے اعماق میں جہاں ایک طرف یہ نورانی موجودگی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے وہاں دوسری طرف اسے مس کرنے کے تجربات بھی بکھرے پڑے ہیں۔ فن جب ان تجربات کو صورت پذیر کرتا ہے تو وہ نورانی موجودگی کے پرتو کو بھی اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ فن میں یہ قلب ماہیت امیجز (IMAGES) کی صورت میں ہوتی ہے جن کی تشکیل میں آوازیں' قوسیں' رنگ' بالائی سطحیں (SURFACES) مکان (SPACE) اور زاویے شامل ہوتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ بت تراشی کا عمل بھی ہے تاہم اگر یہ عمل محض بت گری کی حد تک رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے امیج کو مقصود بالذات تصور کیا ہے۔ اسے معنی آفرینی کا ذریعہ نہیں بنایا۔ دوسرے لفظوں میں امیج کو علامت میں ڈھلنے کی اجازت نہیں دی۔ تمثال گری (IMAGISM) کی تحریک میں یہی نقص تھا کہ اس میں شخصیت کو ادراک کے ایک موہوم نقطے پر مرتکز کر دیا تھا۔ گویا "بند گلی" کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ اسی لئے ایزرا پاؤنڈ جلد ہی اس سے منہ موڑ کر کینٹوز کی نسبتاً زیادہ وسیع دنیا میں چلا گیا۔ یوں علامت کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔ تاہم امیج کی ایک اپنی اہمیت ضرور ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ امیج کی یہ خوبی ہے کہ جب یہ شاعری میں نمودار ہوتا ہے تو اس کے ساتھ "نورانی موجودگی" کے روشن اجزا بھی چھنتے چلے آتے ہیں۔ اس سب کے باوجود امیج ایک ذریعہ ہے حول نہیں۔ اس کا کام تجریدیت کی حامل نورانی فضا کی ترسیل ہے نہ کہ صرف تمثال کی پیش کش تک محدود رہنا۔ وہ لوگ جو براہ راست اس "نورانی موجودگی" تک رسائی پاتے ہیں یا تو اس میں جذب ہو جاتے ہیں یا پھر اسے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن تخلیق کار کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ نہ صرف اسے مس کرنے پر قادر ہوتا ہے بلکہ اسے صورتوں (امیجز) میں ڈھالنے اور پھر صورتوں کو معنیاتی توسیع کے لئے استعمال کرنے میں بھی کامیاب ہوتا ہے۔

شعر کی تخلیق میں امیجز کی کار کردگی کو بعض ناقدین نے بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ مثلاً آلسٹن (ALLSTON) نے (OBJECTIVE CORRELATIVE) کے ضمن میں لکھا تھا۔

"THE MIND NEEDS AS THE CONDITION OF ITS MANIFESTATION ITS OBJECTIVE CARRALATIVE

یہ ۱۸۵۰ء کی بات ہے۔ بعد ازاں ۱۹۱۹ء میں ایلیٹ نے لکھا :

THE ONLY WAY OF EXPRESSING EMOTION IN THE FORM OF ART IS BY FINDING AN OBJECTIVE CORRELATIVE IN THE WORDS A SET OF OBJECTIVES A SITUATION A CHAIN OF EVENTS WHICH SHALL BE THE FARMULA OF THAT PARTICULAR EMOTION TERMINATE IN SENSING EXPERIENCE ARE GIVEN THE EMOTION IS IMMEDIATELY EVOKED"

ان دونوں اقتباسات سے یہ بات مترشح ہے کہ انسان کے بطون میں جو محسوسات موجود ہیں وہ اپنے اظہار کے لئے اشیاء' واقعات اور مظاہر کو استعمال کرتے ہیں... یوں کہ جب انسان ان اشیاء یا مظاہر کو مس کرتا ہے تو محسوسات فی الفور متشکل ہو جاتے ہیں۔ غور کیجئے کہ ان دونوں ناقدین نے جذبے یا احساس کی ترسیل میں شے کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے در اصل امیج کی کار کردگی ہی کو نشان زد کیا ہے۔ جس طرح ذرے کو نیوکلس بنا کر بارش کا قطرہ وجود میں آتا ہے اسی طرح شے کو نیوکلس بنا کر جذبہ یا احساس خود کو صورت عطا کرتا ہے۔ آلسٹن اور ایلیٹ دونوں نے شے اور احساس کا "ربط باہم" ہی دکھایا ہے تاہم ان دونوں نے اس "ربط باہم" کے اطراف و جوانب میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کے اندر تجریدیت کا حامل ایک بے انت نورانی پھیلاؤ موجود ہے۔ تخلیق کار جب اس بے انت پھیلاؤ کو مس کرتا ہے تو اس کے ہاں ایک احساس بحر آسا (OCEANIC FEELING) پیدا ہوتا ہے جسے وہ اشیا اور مظاہر میں متشکل کرتا ہے۔ اس مقام پر امیج کی کار کردگی واضح ہوتی ہے مگر اس کے بعد امیج کے اندر سے کرنیں پھوٹ کر باہر آتی اور معنی آفرینی کی فضا کو جنم دیتی ہیں۔ یہ علامت کی صورت ہے مگر آلسٹن اور ایلیٹ دونوں نے (OBJECTIVE CORRELATIVE) کی توضیح کرتے ہوئے علامت کی اس کار کردگی کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ❖ ❖

غزل

من موہن تلخ

یوں رفتہ رفتہ کوئی تعلق رہا نہ تھا
باتیں تو کیں بہت سی، مگر کچھ کہا نہ تھا

کیا ہے کہ اک چبھن سے جو پایا ہے کم نہ جان
سکھ ورنہ مجھ کو کب نہیں تھا اور کیا نہ تھا

خود پر کھلا تو ایسے مجھے جان سا پڑا
جیسے میں لمحہ بھر کو بھی اب تک جیا نہ تھا

ہم بند رستوں ہی میں بھٹکے تمام عمر
جو راستہ کھلا تھا وہ ہم کو ملا نہ تھا

یوں تو ہر اک تلاش ہے مرہون درد دل
لیکن جو درد آج ہے پہلے اٹھا نہ تھا

ہوجائے کچھ بھی، اب کوئی ہوتا نہیں اثر
ایسا ہمارے ساتھ ابھی تک ہوا نہ تھا

ہر نقش زندگی تھا بہت خوب، کیا کروں
کوئی بھی نقش میرے کسی کام کا نہ تھا

آخر کو بول بول کے چپ ہوگئے سبھی
کچھ کہنے کے لیے بھی تو باقی بچا نہ تھا

دم توڑتے سے ہوئے وہ سب ربط کیا ہوئے
اے عمر رفتہ! ساتھ کوئی تھا بھی یا نہ تھا

اک دوسرے کا بھی تو بھرم سارا کھل گیا
باتوں سے جی کسی کا بھی یوں تو بھرا نہ تھا

الجھا گیا تھا وہ جو مجھے زندگی میں تلخ
وہ بھی تھا میں ہی، اور کئی دوسرا نہ تھا

رفیق راز

کرۂ تاریک میں آواز کا سایہ چراغ
ہم مسافر ہیں ہمارا زادِرہ صحرا چراغ

سرپھری وحشی ہوائیں رقص میں مصروف تھیں
نخلِ شب کی شاخ پر رویا کیا تنہا چراغ

ایک دن چھپکے گی اس گھر کی خموشی دیکھنا
ہو ہی جائے گا مرے کمرے کا سناٹا چراغ

پھر مقدس ظلمتوں کے حکم کی تعمیل میں
مرگزار ہو میں دفنایا گیا زندہ چراغ

اس لٹی بستی میں اب بھی کچھ نہ کچھ باقی تو ہے
پیڑ کے سائے ہواؤں کے نقوشِ پا چراغ

تیری گردن پر کسی معصوم غفلت کا ہے خون
تیری آنکھوں میں بھڑکتا ہے کوئی پیاسا چراغ

دیوتاؤں کا گماں ہر شخص پر ہوتا ہے راز
ہر کسی کی آنکھ روشن ہر کوئی چہرا چراغ

ہم نے ہی پانی پہ لکھیں روشنی کی آیتیں
ہم نے ہی روشن کیے ہر شب لبِ دریا چراغ

جو بات شب کو ہونی تھی وہ صبح دم ہوئی
بھاگے ہوئے ستارے کی تکلیف کم ہوئی

بس اک شبیہ خواب تھی جب تک نگہ میں تھی
اتری ہماری روح میں درد و الم ہوئی

کیا کیا ہوا دیار پہ اسرار میں نہ پوچھ
خوشبو جو پھیل ہی نہ سکی شامِ غم ہوئی

جنگل کے پیڑ گوش بر آواز ہو گئے
پتھر کی خامشی بھی ندائے عدم ہوئی

یہ دیکھتے ہی دیکھتے کیا جانے ہو گیا
آواز میں سکوت کی پرچھائیں ضم ہوئی

کہنے کو یوں تو کچھ نہ تھا پھر بھی رفیق راز
کیا جانے کہہ گئے کہ زباں تک قلم ہوئی

غزلیں

رفیق راز

اک چشم ہے کہ جلوہ گہ وحشت سیاہ
چھائی ہے کہ تیرگی نکہت سیاہ

دیوار ماہ وصال پہ تاباں ہے کس قدر
وہ اک شب وصال کہ ہے غیرت سیاہ

ہے شعلہ شعلہ جلوۂ امکاں سے آنکھ نم
ٹپکے ہے قطرہ قطرہ مگر حسرت سیاہ

جنگل میں نخل نور اگ آئیں گے جابجا
ہوکر رہے گا معجزۂ رحمت سیاہ

جلتے رہیں گے صبح تلک کرب کے چراغ
گزرے گی سایہ سایہ شب فرقت سیاہ

یا مرکز مظاہر معجز نما یہ داغ
یا چشم لالہ میں ہے شب حیرت سیاہ

دود خیال ہے کہ خموشی کا درد ہے
اک لمس ہے کہ معرفت قربت سیاہ

محبت ہے تو کرلے سامنا بھی
قیامت کی طرح ہوجا بپا بھی

بہت پیچھے سفر میں چھوڑ آیا
گداؤں کی صدا بھی نقش پا بھی

عجب فنکاری میں تر بتر ہے
نظر سفاک بھی حیرت سرا بھی

میں اپنے فقر کی خوشبو ہوں لیکن
معطر مجھ سے ہے باسی ہوا بھی

اکیلے میں ہی کیوں زد میں ہوں اس کی
بہت کچھ ہے یہاں میرے سوا بھی

یہ شب کیا لے گئی کیا دے گئی ہے
بہت کچھ جانتا ہے یہ دیا بھی

پھر اس کے بعد میں تھا میں ہی میں تھا
بہت دلچسپ تھا وہ حادثہ بھی

مجھے دیوانہ ہی کردے گی اک دن
ترے خاموش رہنے کی ادا بھی

نہ جانے اگلی منزل کیسی ہوگی
پریشاں حال ہے یہ راستہ بھی

بے کراں چپ میں مرے کانپتے نالے بھی ہیں
اور تیری یاد کے سرسبز اجالے بھی ہیں

شہر شک شام گماں شعلۂ نا امیدی
نقش مضمون بھی ہیں اور حوالے بھی ہیں

سوچ کے نور سے کھلتے ہیں کئی بھید مگر
سوچ رکھتے ہیں یہاں سوچنے والے بھی ہیں

اک فقط تو ہی نہیں ابر زدہ ظلمت پوش
اے شب غم ہیں ترے گود کے پالے بھی ہیں

غلام مرتضیٰ راہی

پھر کڑی دھوپ میں دن بھر کا سفر تھا میرا
وہی تعبیر، وہی خواب سحر تھا میرا

آدمی دور سے محفوظ ہوا کرتے تھے
ساری بستی سے نکلتا ہوا گھر تھا میرا

اپنے سایے پہ نظر رکھ کے نہیں چلتا کوئی
میرے نزدیک رہا وہ، جسے ڈر تھا میرا

میری محنت کا صلہ لے گئے پیچھے والے
سارے پھل پھول پرائے تھے شجر تھا میرا

دیکھتا چاک کی گردش میں مرا ہاتھ کوئی
کیسا کھلتا ہوا مٹی میں ہنر تھا میرا

کھانے والے کا ہر اک دانے پہ لکھا تھا نام
یوں وہ خرمن نہ جلا جس میں شرر تھا میرا

تری صبح روشن مری شام روشن
برابر سے آغاز و انجام روشن

ہوا حل فانوس حلقے کئے ہے
چراغ ایک اس کا لب بام روشن

مرے سالہا سال ناکام ٹھہرے
کیا ایک پل نے مرا نام روشن

چمکتی ہوئی تیغ ہاتھوں میں اس کے
مرے سر پہ انعام و اکرام روشن

حجابات سے خود کو دیکھا کیا وہ
رہا آئینے میں سر عام روشن

اجالے اتر آئے پستہ گھروں میں
ہوئے اونچے اونچے در و بام روشن

(نذر غالب)

اک زلف رہی ایسی پریشاں مرے آگے
صورت نہ ہوئی کوئی نمایاں مرے آگے

ہیں اور کئی ریت کے طوفاں مرے آگے
پھیلے کا ابھی اور بیاباں مرے آگے

ہوں میل کے پتھر کی طرح راہ گزر میں
منزل پہ نظر رکھتے ہیں انساں مرے آگے

صحرا مری ہستی ہے سراب اس کا مقدر
آخر اسے ہونا تھا پشیماں مرے آگے

کاندھوں پہ مرے بوجھ رہا رخت سفر کا
یوں نکلا کئے بے سر و ساماں مرے آگے

سو بار نکالے گئے راہوں کے خم و پیچ
پر ایک نہ مشکل ہوئی آساں مرے آگے

جو صلح صفائی میں ابھی پیچھے ہیں راہی
رہتے ہیں بہم دست و گریباں مرے آگے

ظفر احمد صدیقی

بے زبانی بن گئی ہے عقدۂ مشکل، کہوں کیا
چیختی خاموشیوں کا شور لاحاصل، کہوں کیا

سرخ، نیلی، سبز شمعیں روشنی کی برچھیاں ہیں
خندۂ گل سے عیاں ہے دیدۂ قاتل، کہوں کیا

جگمگاتی شب، نگر روشن، جبیں حرفِ شہادت
پوچھتا ہے وہ نشانِ شوخیٔ بسمل، کہوں کیا

لاکھ پردوں میں چھپے وہ، چپ رہے، آنکھیں چرائے
ایسا لگتا ہے، نگاہیں اس کی ہیں سائل، کہوں کیا

میں کہ سیلِ بے اماں میں موجِ بے برگ و نوا ہوں
پھر صدا دیتا ہے مجھ کو تشنۂ لب ساحل، کہوں کیا

نشہ ہرن ہوا آنکھوں کا، مستیاں کیسی
غزال شہر گئے دور، شوخیاں کیسی

کہاں گئے وہ عزیزانِ انجمن افروز
بسا رہے تھے بہ صد شوق بستیاں کیسی

کبھی تو اس کی نگاہوں میں ہو شناسائی
کبھی تو پوچھے وہ حالت ہے اب میاں کیسی

اسی نشں پہ جزیرے بنا کے رہتے ہیں
خلیج پڑ گئی اپنوں کے درمیاں کیسی

ہمارے عہد میں سب لفظ و معنی گم صم ہیں
کہاں کی طرز ادا، شوخیٔ بیاں کیسی

ظفراحمد صدیقی

نیند آتی ہی نہیں خواب کہاں سے آئے
خواب میں صورت مہتاب کہاں سے آئے

ہم تو رہتے تھے سدا دوش ہوا پر رقصاں
کچھ نہ سمجھے تہ گرداب کہاں سے آئے

پوچھتی رہتی ہے اکثر مری آشفتہ سری
زندگی کرنے کے آداب کہاں سے آئے

لے گئی موج خزاں سب گل و لالہ کی بہار
روئے روشن، رخ شاداب کہاں سے آئے

چاک در چاک ہیں اوراق کتاب ہستی
اب کوئی فصل کوئی باب کہاں سے آئے

دل پرندہ ہے عجب تیر نظر مانگتا ہے
آگ میں رہتا ہے اور رقص شرر مانگتا ہے

وہ جو کہتا تھا کہ غواص معانی ہوں میں
صدف خالی ہے، قطروں سے گہر مانگتا ہے

پہلے تو مجھ کو مرا پردۂ جاں تک لایا
خیرۂ خاص میں اب وہ مرا سر مانگتا ہے

عشق بھی جھوٹ ہے اور حسن بھی فرضی ہے میاں
غم کا افسانہ بھی عنوان دگر مانگتا ہے

موج عشرت میں ہے گم، شوخی قاتل دیکھو
ڈوبنے والوں سے ساحل کی خبر مانگتا ہے

اظفر جمیل

گھپ اندھیرے میں بتا جاؤں کہاں کیا ڈھونڈوں
جاگ اٹھے کوئی آہٹ تو میں رستہ ڈھونڈوں

جی اٹھے پھر کسی مانوس بدن کی خوشبو
شام آئی ہے کوئی خواب سنہرا ڈھونڈوں

اے دل خوف زدہ تیری اجازت ہو تو میں
دم بخود چپ کی اداسی میں شناسا ڈھونڈوں

تشنگی ایسی کہ پی جاؤں سمندر سارا
پھر یہ سودا کہ کسی آنکھ میں قطرہ ڈھونڈوں

سر چھپانے کے لئے یوں تو جگہیں ہیں لاکھوں
زندہ رہنے کے لئے کون سا گوشہ ڈھونڈوں

انہیں گلیوں میں جہاں آنکھ لگی تھی اظفر
کھو گیا مجھ سے جو کھلتا ہوا چہرہ ڈھونڈوں

رواں رستوں پہ بھی اکثر ٹھہر جاتا ہے وہ منظر
پھر اس کے بعد آنکھوں میں اتر جاتا ہے وہ منظر

مری آنکھیں سواد شام تک آکر یہ کہتی ہیں
کہاں سے روز آتا ہے کدھر جاتا ہے وہ منظر

کھلے افلاک کی جانب نگاہیں جب اٹھاتا ہوں
تھکن کا زہر بال و پر میں بھر جاتا ہے وہ منظر

ہوا آتی ہے جاتی ہے گھٹن گھٹتی ہے بڑھتی ہے
دریچے کھولتا ہوں پھر گزر جاتا ہے وہ منظر

سکوت ساعت جامد اذیت دینے لگتا ہے
مری آنکھوں میں کیوں آکر ٹھہر جاتا ہے وہ منظر

میں وہ صحرا کہ ساون جس پہ برسا ہی نہیں اظفر
سراسر تر بہ تر مجھ کو بھی کر جاتا ہے وہ منظر

زوال شام سے واقف ہوں ٹوٹنا چاہوں
افق سے اٹھتی ہوئی ایک فاختہ چاہوں

کئی حلیف ہیں بلبل ہوا بہار مگر
میں کیسا پھول ہوں ڈالی سے ٹوٹنا چاہوں

تو ہے وہ شعلۂ بالیدہ جس کو نیند نہیں
میں ایک جذبۂ خفتہ ہوں جاگنا چاہوں

ذرا سا وجد میں آجا مرے سمندر آج
میں تیرا چاند تجھے جھک کے چومنا چاہوں

طلسم ہوش رہا ہے کہ تیری چوکھٹ ہے
یہاں میں خود کو ذرا دیر چھوڑنا چاہوں

ہزار رنگ ہیں اس کے کبھی گدا کبھی شاہ
اس ایک شخص سے اظفر میں اور کیا چاہوں

نفرت کی محبت

شیر شاہ سید

یہ ایمرجنسی کال تھی یونٹ نمبر ۳ سے' اور جب میں بھاگتا ہوا وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ولیم کیلی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ کئی ڈاکٹر' کئی نرس' ٹیکنیشین' وارڈ بوائے اسے گھیرے میں لئے ہوئے تھے مختلف قسم کے ٹیوب اس کے منہ اور ناک سے لگے ہوئے تھے' چھوٹی بڑی کئی مشینوں کی سرخ سبز بتیاں جل بجھ رہی تھیں' دل کو حرکت میں لانے کی ساری کوششیں جاری تھیں۔ "نرس بائی کاربونیٹ دینا۔ نرس ایڈرینالین دینا۔ امبوبیگ پلیز۔ بلڈی ہیل دی سکشن از ناٹ ورکنگ۔" دوسری سکشن مشین لانے کے لئے وارڈ بوائے بھاگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وقت کی رفتار دل کے رفتار سے زیادہ تیز ہے' زندگی مشین سے زیادہ مہنگی ہے۔ وارڈ کے تمام ڈاکٹر اور الماریوں میں رکھی ہوئی تمام دوائیں محض دھوکا ہیں' دھوکے کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ولیم کیلی کو پہلی دفعہ میں نے کیثرو علٹی میں دیکھا تھا۔ اس روز ہم لوگ بہت مصروف تھے۔ شہر میں امن کے لئے جنگ کے خلاف بہت بڑا جلوس نکلا تھا۔ ٹریفک کئی جگہوں سے بند کردی گئی تھی اور سڑکوں کے رخ موڑ دیئے گئے تھے۔ کسی ایسی ہی سڑک پر ایک حادثہ ہوگیا تھا جس کی وجہ سے ہماری کیثرو علٹی زخمیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ایسے میں ولیم کو ایمبولنس والے لے کر آئے تھے۔ بوڑھا ولیم مکمل طور پر ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ اس کی جیب سے ایک کارڈ نکلا تھا جس کے مطابق وہ ذیابیطس کے لئے زیر علاج تھا۔ ایمبولنس والوں نے بتایا کہ ولیم صبح سے امن کے جلوس کے لئے کام کررہا تھا کہ یکایک بے ہوش ہوگیا۔ یقینی طور پر اس نے کھانا نہ کھایا ہوگا اور غیر معمولی طور پر زیادہ کام کرنے کا لازمی نتیجہ یہی نکلنا تھا۔ کام کے لئے طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور طاقت کے لئے خوراک کی۔ گلوکوز کی بوتل لگانے کے تھوڑی دیر کے بعد ہی ولیم نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ کیثرو علٹی میں ہی وہ شام تک رہا اور بعد میں اسے ڈسچارج کردیا گیا تھا۔

دوسری دفعہ میں نے اسے کلینک میں دیکھا تھا۔ اس وقت میں کیثرو علٹی چھوڑ کر میڈیکل وارڈ میں کام کررہا تھا۔ وہ پہلے سے طے شدہ وقت کے مطابق کلینک میں آیا تھا جو ذیابیطس کے مریضوں کے لئے ہوتی ہے۔ اس کی صحت ٹھیک ٹھاک ہی تھی۔ ذیابیطس پر مکمل طور پر کنٹرول تھا مگر بوڑھے ولیم کے دل کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ ای سی جی کے بعد مجھے کچھ شک سا ہوا کہ اس کا دل صحیح طریقے سے کام نہیں کررہا ہے۔ میں نے اسے وارڈ میں داخل کرلیا۔ وہ ایک ہنس مکھ' ملنسار آدمی تھا۔ برطانیہ کے بوڑھے عام طور پر ایسے نہیں ہوتے ہیں۔ اسے دنیا کے بارے میں بہت کچھ معلوم تھا۔ اس نے اور بوڑھوں کی طرح ایسی کوئی شکایت نہیں کی جس کو سن کر ڈاکٹروں کے ماتھے پر بل پڑجاتے ہیں۔ بھلا ڈاکٹر اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہے اگر کسی کا بیٹا اسے کتاڈا سے خط نہیں لکھ رہا ہے یا کسی کی بیٹی گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

دوسرے دن صبح وارڈ راؤنڈ پر پروفیسر نے اسے دیکھا تھا اور دل کے لئے کچھ دوائیں شروع کردی تھیں' تھوڑے آرام کا مشورہ بھی دیا گیا تھا اور جب پروفیسر کو یہ پتہ چلا کہ ولیم امن کی تحریک سے وابستہ ہے تو اس نے کہا کہ فی الحال اسے وارڈ میں ہی رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہ باہر بھاگا دوڑی ضرور کرے گا جو یقینی طور پر اس کے لئے ضرور رساں ہوگی۔

میں نے کئی دفعہ اسے دیکھا۔ وہ وارڈ میں' لاؤنج میں' کھانے کے کمرے میں' اکثر مریضوں سے امن کے لئے جنگ کے خلاف اور ایٹمی تباہ کاریوں کے خلاف بات کرتا رہتا تھا۔ مجھے اکثر حیرت ہوتی تھی کہ ۷۶ سال کا یہ بوڑھا جس کا کل گزر چکا ہے جس کا آج دنیا کے ہزاروں لاکھوں بوڑھوں سے بہت خوبصورت ہے اور جو کل سکون کی موت مرے گا' اسے کیا پڑی ہے کہ امن اور جنگ کے جھگڑے میں پڑا ہوا ہے۔ پھر میں سوچتا تھا کہ شاید جو وقت اس نے بحیثیت ایک سپاہی کے دوسری جنگ عظیم میں گزارا یہ اس وقت سے ڈرا ہوا ایک سپاہی ہے' لہذا ذیابیطس قابو میں تھا اور دل دوبارہ نارمل ہوتا جارہا تھا اور ہم لوگ اسے عنقریب ہی ڈسچارج کرنے والے تھے۔

ایک روز جب میں ڈیوٹی پر تھا اور کرنے کو کچھ نہیں تھا' میں ڈاکٹروں کے ڈیوٹی روم میں بیٹھا ہوا اخبار میں ایڈیٹر کے نام خط پڑھ رہا تھا تو ولیم کمرے کے سامنے سے گزرا اور مجھے دیکھ کر رک گیا۔

"ہاؤ آر یو ولیم؟"

"فائن تھینک یو' آئی ایم آل رائٹ۔" ہمیشہ کی طرح اس نے مسکرا کر کہا تھا۔ پھر میں نے پوچھا تھا کہ آپ کی امن کی تحریک کس مرحلے پر ہے وہ

مسکرا دیا تھا۔ "ٹھیک ہی ہے۔ مگر بالکل ٹھیک اسی دن ہوگی جب تمام ہتھیار پگھل جائیں گے اور بموں کا خوف ختم ہو جائے گا۔" میں نے محض بات کو طول دینے کے لئے پوچھا۔ "مگر ولیم کیا آپ ایمانداری سے سمجھتے ہیں کہ جنگ کا خطرہ ہمیشہ کے لئے ٹل جائے گا؟"

"ٹلے گا تو ضرور" اس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا۔ "مگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ کل کے بجائے آج ہی ٹل جائے۔" یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"مگر کیسے' ہر روز کا نیا سورج کسی نئی تباہ کاری کا پیغام لے کر آتا ہے۔ حکومتیں دولت انسانوں سے ہزاروں گنا زیادہ ہتھیاروں پر خرچ کرتی ہیں اور جنگ کسی وقت بھی شروع ہو سکتی ہے۔ پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جنگ اب کبھی نہیں ہوگی۔"

ولیم نے بڑے غور سے مجھے دیکھا تھا' جیسے پرکھ رہا ہو جیسے تول رہا ہو مجھے اس کے بوڑھے چہرے پر کچھ عجیب قسم کی روشنی سی پھوٹتی نظر آئی پھر وہ دھیرے سے بولا۔ ابھی کی بات اور ہے ڈاکٹر' کل کی بات اور ہوگی۔ یہ بات سچ ہے کہ دولت ہتھیاروں پر خرچ ہو رہی ہے اور امن کی بات کو لوگ دیوانوں کی بڑ سمجھ رہے ہیں لیکن کل بہت مختلف ہوگی آج کے صدر اور آج کے وزیر میری بات اس لئے نہیں سمجھتے ہیں کہ ولیم کیلی ان کا نام نہیں ہے' اے ملڈا کچھ نہیں لگتی اور جینی ان کی بیٹی نہیں ہے۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا جیسے سوچ رہا ہو۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کو کیا کہوں۔ "ولیم کیلی ان کا نام نہیں ہے" سے کیا مطلب ہے' اے ملڈا کون ہے' جینی کس کی بیٹی ہے۔ پھر میں نے پوچھا تھا "میں سمجھا نہیں مسٹر کیلی' آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولا تھا۔ "میں اس وقت فرانس میں تھا اور جنگ ختم ہونے والی لگتی تھی۔ محاذ پر وہ گرمی نہیں تھی مگر کبھی کبھار گولیاں چل جاتی تھیں اور وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا جب کچھ جرمن سپاہیوں سے ہمارا سامنا ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر کی فائرنگ کے بعد ایسا لگا تھا جیسے دشمن بھاگ گئے ہوں۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے جب میں آہستہ آہستہ سے اپنی خندق سے نکلا تھا تو وہ جرمن بالکل میرے سامنے تھا۔ میرے پاس سوچنے سمجھنے کا موقعہ نہیں تھا۔ یا میں اس کو مار دیتا یا وہ مجھے مار دیتا۔ جنگ صرف جنگ ہوتی ہے۔ وردی کے پیچھے جو انسان ہوتا ہے وہ تو صرف ایک نام ہوتا ہے۔ میری گولی اس کے سر پر لگی تھی اور وہ کچھ سوچے سمجھے کہے بغیر ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس کی وردی کی تلاشی سے کچھ کاغذات نکلے تھے۔ سگریٹ کا ایک مڑا تڑا پیکٹ نکلا تھا اور ایک بھرا سا لفافہ تھا جس کے اندر جرمن زبان میں لکھا ہوا خط تھا۔ میں نے تمام چیزیں اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ کاغذات تو بعد میں جمع کرا دیئے تھے مگر وہ خط میری ڈائری کے کور کے اندر ہی رہ گیا تھا۔ میں اس واقعے کو بھی جنگ کے دوسرے حادثوں کی طرح بھول گیا تھا اور پھر ایک دن جنگ بند ہو گئی تھی۔"

وہ تھوڑی دیر شاید سانس لینے کے لئے رکا تھا' پھر دھیرے سے بولا۔ "وہ دن مجھے اچھی طرح سے یاد ہے جب میں اپنے گھر واپس لوٹا تھا۔ ہمارا یہ شہر ویسا اتنا بڑا نہیں تھا جتنا بڑا آج ہے اور جب میں اپنی بیوی لوجیا سے ملا تھا تو مجھے ایسا لگا نہ جانے کتنی صدیوں کے بعد اس سے مل رہا ہوں۔ اس نے میرے چہرے کو ہاتھوں میں تھام کر نہ جانے کتنے بوسے لئے تھے۔ میری آنکھ' میری پیشانی' میرے لب' میرے رخسار۔ میں رو دیا تھا' پھر ہم دونوں دیر تک ایک دوسرے کو تھامے ہوئے روتے رہے تھے۔ امن کا زمانہ بڑا خوبصورت ہوتا ہے اور خاص طور پر اس وقت جب فاتحوں کو نصیب ہو۔ تھوڑے دنوں تک تو میں سب کچھ بھولا رہا تھا۔ زندگی بہت بھلے طریقے سے گزر رہی تھی۔ میں اور لوجیا اتنے خوش تھے جیسے دوبارہ سے ہنی مون منا رہے ہوں۔ جنگ اپنی تمام تر تباہ کاریوں کے ساتھ ایک گزرے ہوئے جھوٹے خواب کی طرح تھی۔ پھر ایک روز نہ جانے کیسے جب میں اپنے کاغذات کو ٹھیک کر رہا تھا' میری ڈائری سے وہ خط نکل آیا اور اس خط کے ساتھ جنگ کا وہ ایک لمحہ "گولی" وہ آوازیں' گرتے ہوئے جسم کی ایک تصویر اور وردی کی تلاشی کسی فلم کی طرح میرے سامنے آگئی۔ میں نے سوچا کہ یہ خط تو کسی سے پڑھوانا چاہئے۔ میں نے فوراً ہی جان کو فون کیا۔ وہ جرمن بہت اچھی جانتا تھا۔ وہ کہنے لگا شام کو وہ آئے گا' چائے پیئے گا اور خط پڑھ لے گا۔

شام کو وہ آیا۔ خط اس مرے ہوئے جرمن سپاہی کی بیوی کا تھا۔ ایک عام سا خط جیسا لوجیا مجھے لکھتی تھی' محبتوں' الفتوں اور جذبوں سے بھرا ہوا۔ بچھڑے دنوں کی یاد لئے ہوئے' جنگ ختم ہونے کی دعاؤں کے ساتھ اور جلد ملنے کی تمناؤں کے ساتھ۔ اس کی بیوی نے بھی یہی لکھا تھا کہ وہ انتظام کرے گی سپاہی کا جو جلد آئے گا۔ کیونکہ جنگ اب ختم ہونے والی ہے۔ یہ خط پڑھ کر تھوڑی دیر کے لئے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آگیا۔ مجھے اپنا وجود ایک ایسے قاتل کی طرح لگا جس نے بلاوجہ کسی کو قتل کیا ہو۔ مگر جان اور لوجیا کی باتوں سے میں جلد ہی سب کچھ بھول گیا تھا۔ پھر جان بھی چلا گیا تھا۔ میں اور لوجیا بہت دیر تک باتیں کرتے رہے' پھر سونے چلے گئے تھے۔"

بوڑھا ولیم کیلی تھوڑی دیر کے لئے پھر رکا تھا۔ مجھے اس کی کہانی کچھ دلچسپ بھی لگ رہی تھی اور میرا وقت بھی گزر رہا تھا اور شاید دوسری وجہ یہ ہوگی کہ آج کے انگلینڈ میں ایسی بات کرتا کون ہے۔ بدلے ہوئے وقت کے بدلے ہوئے لوگ ہیں اور ہم لوگ اجنبی کی طرح گھروں کا راستہ پوچھتے پھرتے ہیں' نہ راستہ ملتا ہے اور نہ گھر۔

"اف میرے خدا!" وہ ایک لمبی سانس بھر کر بولا تھا۔ "وہ رات قیامت کی رات تھی جو مجھ سے سب کچھ لوٹ کر لے گئی یا یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ بہت کچھ دے کر چلی گئی۔ نہ جانے کیسے یکایک میری آنکھ کھل گئی تھی۔ نیم اندھیرے کمرے میں میرے اور میری بیوی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ باہر سرد ہوا گرمی کی تلاش میں تیز سے تیز تر ہوتی چلی جاتی تھی۔ میری بیوی میرے پہلو میں بہت سکون سے سوئی ہوئی تھی اور نہ جانے کیسے یکایک مجھے اس خط کا خیال آگیا جس کے نیچے کسی اے ملڈا کے دستخط تھے۔ پھر مجھے نیند نہیں آسکی۔ جتنا میں بھلا

تا اتنی ہی شدت کے ساتھ وہ خط میری نظروں کے سامنے آجاتا تھا۔ وہ تمام واقعہ گولی' وہ جرمن خندق' وہ لاش' وہ بھورا لفافہ' وہ خط اور اس خط میں لکھا ہوا ایک ایک جملہ۔ میرے اندر سے جیسے کوئی چیختا تھا تم قاتل ہو' ایک انسان کے قاتل۔ میں نے سکون سے سوتی ہوئی بیوی کو ایک نظر دیکھا تھا پھر سوچنے لگا تھا کہ وہ تو ایسے نہیں سو رہی ہوگی' کیا لوچیا اس طرح سے سو سکتی تھی اگر میں مر جاتا؟ یقین کرو ڈاکٹر' میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے' میں زار زار رو دیا تھا۔ لوچیا بھی جاگ گئی تھی وہ بھی مجھے دلاسے دیتی رہی' مگر اس رات کے بعد سے ہر دن وہ واقعہ کسی بھوت کی طرح میرا پیچھا کرتا رہا۔ جب میں واپس ڈیوٹی پر گیا تو حالت ویسی ہی تھی۔ ملٹری کے معمولات سے میرے دل میں نفرت سے پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ میرے ساتھ کام کرنے والے میرے بارے میں تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ مجھے ایک دن کمانڈر نے بلا کر بات کی اور کہا کہ بہتر ہوگا کہ تم تھوڑے دن کی چھٹی لے لو۔ پھر میں چھٹیوں پر واپس گھر آگیا تھا' مگر بدلا کچھ نہیں تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ جنگ میں میں اکیلا تو نہیں تھا۔ مجھ اکیلے نے تو کسی کو مارا نہیں تھا۔ جب دوسرے اس طرح سے نہیں سوچتے ہیں تو پھر میں کیوں اس طرح سے سوچتا ہوں' مگر جواب نہ میرے پاس تھا نہ ڈاکٹر کے پاس' اور وہ خط ایک عذاب کی طرح سے میرے لئے بھیانک خواب بن کر رہ گیا تھا۔ میری چھٹیاں بڑھتی گئیں لوگ مجھ سے بیزار ہوتے گئے۔ پھر ایک دن میری بیوی بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور میرے پاس کچھ بھی نہ رہا۔ صرف احساس جرم کا بوجھ میرا ساتھی تھا۔

پھر ایک دن میں نے جرمنی جانے کا فیصلہ کیا۔ خط پر لکھے ہوئے پتے پر جا کر اـ ملڈا سے معافی مانگ لوں' اس کے سامنے جا کر اس سے کہہ دوں کہ مجھ سے خطا ہوئی ہے' قاتل ہوں تمہارے شوہر کا۔ مجھے معاف کر دو۔ اگر وہ مجھے ایک دفعہ معاف کر دے تو شاید میں زندگی سکون سے گزار سکوں گا۔ یہ احساس مجھے کشاں کشاں میونخ کے قریب اس چھوٹے سے گاؤں ملحاف لے گیا لیکن اس پتے پر اـ ملڈا نام کی کوئی عورت نہیں تھی۔ گاؤں والے ہربرٹ براؤن نام کے ایک فوجی کو جانتے تھے جو جنگ میں مر گیا تھا مگر اس کی بیوہ اـ ملڈا کہاں گئی' کسی کو خبر نہ تھی۔ میں گاؤں کے چھوٹے سے شراب خانے میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی مجھے پوچھتا ہوا آیا۔ یہ وہی آدمی تھا جس سے صبح میں نے اـ ملڈا کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی ماں کو پچھلے کرسمس پر اـ ملڈا نے ایک کارڈ بھیجا تھا جس پر برلن کی کسی جگہ کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے وہ پتہ دے دیا جس کے بعد میں برلن روانہ ہو گیا۔"

یہ کہہ کر ولیم کیلی خاموش ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا بوڑھے سپاہی کو پیاس لگی ہے۔ میں نے فوراً ہی اس کو ایک گلاس پانی کا دیا اور ساتھ ہی کہا آپ کی کہانی بہت ہی دلچسپ ہے' مگر اس سے پہلے کہ آپ آگے شروع کریں ایک پیالی کافی کی پی جائے۔

جب میں کافی بنا کر لایا تو ولیم نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا۔ "تم بھی سوچتے ہوگے کس کے چکر میں پھنس گیا ہوں۔ مگر تمہارے سوال کا جواب دینے کا اس کے علاوہ کوئی طریقہ بھی تو نہیں ہے۔ ہر جنگ کی قیمت ہوتی ہے جو ادا کرنی پڑتی ہے' کسی نہ کسی کو قتل ہونا ہی ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی کو گواہی دینی پڑتی ہے۔ لیکن اگر جنگ نہ ہو تو قتل نہ ہو اور قتل نہ ہو تو گواہی بھی نہ ہو۔ میرا قصور یہ ہے کہ میں پچھلی جنگ کا قاتل بھی ہوں' گواہ بھی ہوں' مجرم بھی ہوں' وکیل بھی ہوں' جج بھی ہوں لیکن میں یہ نہیں چاہتا ہوں کہ تم یا تمہارے جیسا کوئی قاتل بنے یا گواہی کے لئے کھڑا ہو۔" کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا جیسے اپنے آپ کو جج کر رہا ہو۔

پھر وہ کہنے لگا "برلن میں اس پتے پر ایک بوڑھی عورت سے ملاقات ہوئی۔ اس کو میں نے بتایا کہ مجھے اـ ملڈا سے ملنا ہے' میں ہربرٹ کے سلسلے میں ملنا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کیا تم ہربرٹ کے دوست ہو؟ میں نے کہا کہ دوست تو نہیں تھا مگر شاید اب ہو گیا ہوں۔ وہ کہنے لگی اـ ملڈا یہاں نہیں رہتی ہے' کل میری اس سے ملاقات ہوگی' میں اسے بتاؤں گی' اگر وہ ملنا چاہے تو یہاں آجائے گی۔ تم کل دوبارہ اسی وقت یہاں پر آجانا۔

"دوسرا دن جیسے صدیوں کے بعد آیا۔ میں کچھ جلدی بھی پہنچ گیا تھا اور جب وہ بوڑھی عورت آئی تو اس کے ساتھ اـ ملڈا بھی تھی۔ میری بیوی کی طرح جوان جس کے سر پر گھنے سنہرے بال تھے جس کے ساتھ پانچ چھ سال کی چھوٹی سے بچی تھی' جینی جس کا نام تھا' میں نے اسے بتایا کہ بڑی مشکلوں سے میں نے اسے تلاش کیا ہے وہ غور سے سنتی رہی تھی' لیکن جب میں نے بتایا کہ میں کیوں آیا ہوں تو وہ ایک دم کھڑی ہو گئی تھی۔ چائے کی پیالی اس کے ہاتھوں سے زمین پر گر گئی تھی۔ میرے خدا مجھے آج تک اس کی شکل یاد ہے اس کا کپکپاتا جسم' اس کا ایک ایک لفظ۔ پہلے تو اس سے کچھ کہا ہی نہیں گیا تھا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ بڑے زور سے چیخی تھی "تو تم ہو میرے شوہر کے قاتل۔ میں تمہیں مار ڈالوں گی۔" اس نے بڑے زور سے مجھے دھکا دیا تھا' پھر وہ بوڑھی عورت درمیان میں آگئی تھی۔ اـ ملڈا' اـ ملڈا رکو تو سہی' بات تو سنو۔ یہ کہہ کر اس نے اسے پکڑ لیا تھا تھوڑی دیر کے لئے وہ ساکت کھڑی رہی تھی پھر نڈھال ہو کر کرسی پر گر گئی تھی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ میں سر جھکائے دیوار کے سہارے کھڑا رہا تھا۔ ایک ملزم کی طرح۔ میں ایک مجرم کی طرح پھر دھیرے سے بولا تھا "جو گزر چکی ہے' میں تمہارے ہربرٹ کو قتل کر کے خوش تو نہیں ہوں۔ میری زندگی ایک عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ ایک ایسی جنگ جو نہ میں نے شروع کی تھی نہ ہربرٹ نے شروع کی تھی۔ جو نہ میں نے ختم کی جو نہ ہربرٹ نے ہی ختم کی۔ اور میں اس جنگ میں اسے نہ مارتا تو وہ مجھے مار دیتا۔ شاید ایسا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ مر جاتا تو ٹھیک ہی رہتا' لیکن میں تو اسے مار کر مستقل مر رہا ہوں اور تمہارا خط جو اس کی جیب سے نکلا تھا وہ ایک پھانسی کا پھندا بن کر میرے گلے میں پڑا ہوا ہے جس کی رسی کھینچنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ میں تو صرف ایک بھیک مانگنے آیا ہوں۔ مجھے معاف کر دو' ایک دفعہ کہہ دو تم کو مجھ

سے کوئی شکایت نہیں ہے' جو ہو گیا سو ہو گیا تو شاید یہ زندگی گزر جائے گی۔ مجھے اچھی طریقے سے یاد ہے میرا گلا رندھ گیا تھا۔ مجھ سے آگے کچھ کہا نہیں گیا۔ وہ ساکت صامت مجھے تکتی رہی تھی۔ معصوم سی بچی جینی ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ڈری ڈری سہمی سہمی کھڑی تھی۔ وہ آہستہ سے بولی تھی کون اپنے شوہر کے قاتل کو معاف کر سکتا ہے اور تم نے اگر قتل کر بھی دیا تھا تو یہاں کیوں آئے؟ محض مجھے مجبوری کا احساس دلانے کے لئے؟ اور تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ دو لفظ کہہ دو گے تو پھر معاف بھی کر دوں گی؟ میری عقل تو شاید تمہیں معاف بھی کر دے۔ مگر میری روح میرا دل میرا جسم تمہیں معاف نہیں کرے گا۔ اگر تم کل ہربرٹ کو قتل نہیں کرتے تو آج میرا ایک گھر ہوتا' ایک چھوٹی سی زمین جہاں صبح ہوتی' شام ہوتی' رات ہوتی اور زندگی ہوتی۔ آج میں اپنا گاؤں نہیں چھوڑتی۔ برلن کے اس شہر میں نہیں رہتی اور کل زندہ رہنے کی سزا پوری کرنے کے لئے اس میری بچی کو بھی طوائف ہی بننا پڑے گا۔ موت بہت سستی ہے صرف پیسے کی ایک گولی۔ زندگی بہت مہنگی ہے' دن رات جسم فروشی کا زہر جو آہستہ آہستہ مارتا ہے۔ نکل جاؤ اس گھر سے فوراً۔ کبھی مت آنا میرے سامنے۔ میری بربادی کے ذمہ دار' میرے شوہر کے قاتل۔ یہ کہہ کر وہ اپنی بچی کا ہاتھ پکڑ کر اندر چلی گئی تھی۔ بوڑھی عورت مجھے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے میرا ٹھہرنا اس کے لئے بھی پریشانی کا سبب بن رہا ہے۔ مجھے سر جھکا کر نکلنا پڑا۔ میں زندگی کی بھیک لینے گیا تھا مگر موت کی تمنا لے کر آیا۔" یہ کہہ کر وہ پھر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا تھا' سوچتا رہا تھا اور پھر بولا تھا "واپسی کا سفر آسان نہیں تھا میرے لئے۔ لگتا تھا کہ جہنم کا ایک کنارہ جہاں سے شروع کیا تھا اور واپس دوبارہ اسی کنارے کی طرف جا رہا ہوں۔ مگر راستے میں ہی میں فیصلہ کر چکا تھا۔ انگلینڈ آکر سب سے پہلے میں نے فوج سے استعفیٰ دے دیا۔ کچھ رقم فوج سے چھٹنے پر ملی' اپنا بڑا سا مکان میں نے فروخت کر دیا تھا اور چھوٹے مکان میں منتقل ہو گیا' جو میری اکیلے کی ضروریات کے لئے کافی تھا اور بچی ہوئی تمام رقم میں نے جینی کے نام برلن کے اس ایڈریس پر بھیج دی تھی جہاں اسملڈا رہتی تھی۔ اس دن کے بعد سے جینک میں کام کرتا رہا اور امن کے اس فاختہ کے پر چننے کی کوشش کر رہا ہوں جنہیں لمحوں اور گولیوں کی بوچھاڑ نے بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ ویتنام سے ایل سلویڈور تک بیروت سے ایران تک اور افغانستان سے افریقہ' آج ضرور یہ جنگ ہو رہی ہے۔ مگر کل جب فاختہ کے سارے پر امن کے لئے یکجا ہو جائیں گے تو جنگ بھی ختم ہو جائے گی اور کسی سپاہی کی بیوی کو طوائف نہیں بننا پڑے گا۔"

ولیم کیلی کو دوسرے دن ہم لوگوں نے ڈسچارج کر دیا تھا۔ آج صبح مہینے کے بعد بوڑھا کیلی بے ہوشی کی حالت میں آیا تھا۔ اس کی ذیابیطس تو ٹھیک تھی مگر دل کی حالت پھر خراب ہو چکی تھی' جس کے اندر صرف نفرت تھی' جنگ سے نفرت' جس کے سینے پر امن کا نشان جگمگا رہا تھا اور اس وقت اس کا جسم زمین پر پڑا ہوا تھا' ڈاکٹروں' نرسوں' ٹیکنیشن وارڈ بوائے کے درمیان ساکت اور سرد۔ ای سی جی کی سیدھی لکیر اس موت کا اعلان کر رہی تھی۔ ❖ ❖

عاصم شہنواز شبلی

کیا تمہیں یاد ہے
پیڑ پھولوں بھرا
جس کے سائے تلے
میری آنکھوں کی جھیلیں
بہتے بہتے ہیں خشک ہونے لگیں
گل کی خوشبو سے
مدہوش میں نے
تمہارے بدن پر
مقدس حریم روابط کے خاکے لکھے
کتنی صدیاں گزرتی گئیں
میں نے سجدے کئے اور
انگشت پا کو تمہاری نئے برگ گل سے سجاتا رہا
اس پہ سجدے سجاتا رہا

اب تو شاید تمہیں
یاد ہو یا نہ ہو
پھول تو مر گئے
پیڑ پھولوں بھرا اب نہیں ہے مگر
زندہ ہے

اسلم عمادی

چاہتے کچھ ہیں تو ہوتا کچھ ہے
یعنی در پردہ تماشا کچھ ہے

جو ہے مطلوب وہی عنقا ورنہ
آج بازار میں کیا کیا کچھ ہے

دل عاشق میں ہے طوفان جدا
سر میں چھایا ہوا سودا کچھ ہے

وہ جو محفل میں ہے ہنگامہ فروغ
دیکھئے جب اسے تنہا کچھ ہے

استعارات میں روشن سا لگا
جس کا پرتو پس پردہ کچھ ہے

تم جو کہتے ہو چلو مان لیا
ورنہ ان آنکھوں نے دیکھا کچھ ہے

جب بھی من جائے غنیمت ہے کہ وہ
شام کچھ ہے تو سویرا کچھ ہے

جیسے ہر پل ہو بھٹکتی ہوئی روح
ہجر کی شب کا اندھیرا کچھ ہے

تیرے ملبوس کا انداز ہے خوب
کچھ ہے اظہار تو پردہ کچھ ہے

وقت کی رو میں لہو کے جیسا
بہتے پانی پہ ابھرتا کچھ ہے

ہم نے سوچا تھا بہت کچھ اسلم
خط میں لیکن اسے لکھا کچھ ہے

اس کا ہمارے نیک و بد سے رشتہ کیا
وہ جو عدو ہے اس کو حد سے رشتہ کیا

تیرا موقف ہر صورت منظور ہمیں
اہل وفا کا رد و کد سے رشتہ کیا

تیرے نور کی کرنیں ساحل پر بکھریں
ہم بھی محو دید حسد سے رشتہ کیا

شعلۂ کرب تو روح کی جانب لپکے گا
اس حملے کا جسم و جسد سے رشتہ کیا

شرق و غرب میں عشق کی رسمیں ایک سی ہیں
جوش جنوں کا عرض بلد سے رشتہ کیا

میری قامت عوق کہاں اور غیر کہاں
میرے مقام کا ہر کم قد سے رشتہ کیا

رؤف خلش

خود کو اب سرد ہواؤں کے برابر رکھنا
ایک شعلہ سا مگر جسم کے اندر رکھنا

کیا خبر کس گھڑی گر جائے عمارت گھر کی
کبھی دلدل میں نہ بنیاد کے پتھر رکھنا

دل کے دروازوں پہ پہرے نہ بٹھانا ہرگز
کچھ حریفوں کے لیے ایک کھلا در رکھنا

حوصلہ ہار نہ دیں آج پرندے اپنا
تھوڑی سی گرد سفر زخمی پروں پر رکھنا

جانے کب جس کا ماحول مہک بن جائے
ذہن کے گوشوں کو یادوں سے معطر رکھنا

پیش منظر بھی وہی ہے، پس منظر بھی وہی
نئے رجحان بناتا، نئے منظر رکھنا

جنگ جاری ہے کوئی تازہ کمک لے آؤ
اپنے قبضے میں نہ ہارے ہوئے لشکر رکھنا

لوگ رکھتے ہیں قرینے سے خلش گھر اپنا
تم کو رکھنا ہو تو چاہت سے بھرا گھر رکھنا

کون ہے جو ایسے میں، معجزہ دکھاوے گا
پتھروں کی بستی میں، موم کا پتہ دے گا

لوگ ہم سے کہتے ہیں، خواب دیکھنا چھوڑو
خواب کچھ نہ دے لیکن، تھوڑا حوصلہ دے گا

یہ ہوا تو سرکش ہے، سرکشی دکھائے گی
اب خبر زمانے کی، راہ کا دیا دے گا

سب کو آگے بڑھنے کی، راستوں میں جلدی ہے
اس ہجوم میں ہم کو، کون راستہ دے گا

گو نظر نہیں آتا، اپنے آپ کو چھو
وقت ہے بڑا شاطر، آئینہ دکھاوے گا

پھر بنائیں ساحل پر، ریت کے گھروندے ہم
پھر سمندر اب کے بھی، پل میں سب بہاوے گا

سر پہ خوف لٹکائے، تم بھوگے یوں کب تک
دیکھنا کوئی اک دن، خود کی سزا دے گا

میں خلش بنا بھی دوں، اس کے گھر کی دیواریں
پھر بھی میرا ہمسایہ، میرا گھر جلاوے گا

محاسبہ
(شرق اوسط کے نام)

بلند و بالا بنے منقش منار مسجد
فضا میں دلکش گواہیاں دے چکے کبھی کے
محل کے حوضوں پہ اونگھتے وہ سفید بگلے
سفید بگلوں کی تیز آنکھیں
اکھڑتے نبضوں کی لڑکھڑاہٹ کو تاڑتی ہیں
حرم سراؤں کے نرم قالین
لذتوں کے قدم سے بوجھل
انھیں خبر بھی نہیں کہ مٹی کی تازہ قبروں پہ
آج سبزہ اگا ہوا ہے
وبا کی مانند پھوٹتے ہیں لہو کے جھرنے
مگر گنہ گار مطمئن ہیں
کہ ہونے والے حساب میں دیر ہے ابھی تو
زمیں ہے چیخوں کے بعد گم سم
کہ زلزلوں میں ہوئی ہے ملبوس کا ڈھیر بستی
سبھی ہیں وعدوں کی ساعتوں کے
روایتی انتظار میں گم
قلم ہے نقش و نگار میں گم
زباں ہے قول و قرار میں گم

رؤف خلش

عرفت ربی

(حضرت علیؓ کا قول : عرفت ربی من فسخ
العزائم
میں نے ارادوں کی شکست سے اپنے رب کو پہچانا)

نہ جانے سانسوں کی ڈوریوں پر
گناہ ولذت کی کس قدر ہے گرفت باقی
عجب ہے رت، معرکے عجب ہیں
وجود اپنا کسی طلسمی حصار میں ہے
بس ایک فکر نجات کی ہے سرشت باقی
وگرنہ سرکش سمندروں کی امانتیں کب وصول کرتے
نہ اتنی مجبوریوں میں مختاریوں کا منصب قبول کرتے
طویل راہب خموشیوں سے
جنوں صدائیں نچوڑتا ہے
سپردگی کی ہر ایک دستک
حدوں کے دروازے کھولتی ہے
تو کیوں نہ حزن و قنوط کے سارے بت گرائیں
ہجوم بے چارگی میں دست دعا اٹھائیں
جو ٹوٹ جائیں "عرفت ربی" صدا لگائیں !

شاخ زیتون

(ایک نظم بوسنیا کے لئے)

ابلتے چشموں سے گیلے ہیں
صحراؤں کے ریتیلے دامن
سرپہ لٹکتی قول و قرار کی دستاویزیں
تم نے کیوں ہاتھوں میں پہن لیں؟
ان دیکھی برقائی زنجیریں
سامریوں نے کیسی چال چلی ہے اب کے
وادی بے طور اب نہ پکارے
سوئے ہوئے موسیٰ کے عصا کو
شریانوں میں "بوسنیا" کب لاوا بن کر پگھلے
گڑھی ہوئی میخوں سے کب تک
قائم ہیں دشمن کی قناتیں
جنگ کریں یا ماریں شب خوں
کون سے پل ٹوٹے گا افسوں
کب پھوٹے گی سبزہ بن کر
وادی خوں میں شاخ زیتوں

شکست خواب

(تقسیم ہند کے پس منظر میں)

وہ ساعتوں کا جبر تھا
جو کانچ کے کمروں میں، پتھروں کی بارشیں ہوئیں
اچٹتی نیند میں تھے لوگ
جنگ کے محاذ کو بھی خواب کہ سمجھ گئے
دہائیاں گزر گئیں
آنکھوں کے پیڑ قد سے اونچے ہو گئے
سوال یہ نہیں کہ کس نے راستے بدل دیئے
پرندے تھے اڑان بھر کے
ساحلوں کی سمت چل دیئے
اور اس کے بعد
ہم جو بچ گئے تو
ملگجی دھوئیں میں بس شناخت ڈھونڈتے رہے
وہ ساعتوں کا جبر تھا
یہ بھی ساعتوں کا جبر ہے

خواجہ جاوید اختر

نکل تو آئے اس اجڑے ہوئے مکان سے ہم
تمام شب رہے محروم سائبان سے ہم

ہم اپنے وقت کے بالا بلند سورج تھے
غروب ہوگئے کس طرح درمیان سے ہم

ذرا بھی جس میں نصیحت ہو کچھ ہدایت ہو
نکال دیتے ہیں وہ بات اپنے کان سے ہم

وصالِ یار سے اچھا تو ہجرِ جاناں ہے
سکوں سے وہ بھی ہے رہتے ہیں اپنی شان سے ہم

نکل وہ آئے سمندر کی گود سے کیسے
الجھتے ہی رہے بوسیدہ بادبان سے ہم

یہ سر بلند تو کرلیں میاں مگر سن لو
ضرور جائیں گے اک روز اپنی جان سے ہم

دل و دماغ نہیں لفظ کا کرشمہ تھا
تو کیا عجب کہ ہوئے قتل اس زبان سے ہم

روشن لال روشن

قطرہ قطرہ طغیانی میں
ڈوب گیا ساحل پانی میں

دانش مندی نادانی میں
مشکل ایسی آسانی میں

خواب کی قیمت نیند سے زیادہ
آنکھوں کی اس ارزانی میں

در آئی اک اور کہانی
کرداروں کی یکسانی میں

رشتوں کے بے نام صحیفے
روشن حرفِ امکانی میں

میں ہی غائب میں ہی حاضر
آئینوں کی حیرانی میں

دریا، خشکی، غار، کہستاں
ایک شکن اس پیشانی میں

آئینے بے آب سماعت
عکس غزلخواں عریانی میں

سبز رتوں کے خواب بھی کیا ہیں
یارو چشمِ یرقانی میں

صدیوں کو دستار ملے بس
لمحوں کی نافرمانی میں

راتوں کے اسرار نمایاں
روشن دن کی تابانی میں

ساغر جیدی

سوچتا ہوں

سماج کی کجی کیسے دور ہو
وہ ماں باپ کا بھی ہمارے
تعین کرے گا
تبدل میں تشویش
مطلق نہ ہوگی

گینڈے کو ایک سینگ
نیل گائے کو دو
دو زبانیں ناگن کو
آپ کو؟ اور آپ کے ساتھی کو؟

نیم کے پیڑ پہ کٹہل آئے
بیری پہ آئی لوکی
آم کے پیڑ پہ لیمو آئے
سیب کے پیڑ پہ موز
ساغر اب کے کم بولیں گے
کوئل، طوطا، مور۔

یاقوت کی تمنا میں

سرخ کانچ کے ٹکڑے بو رہا ہوں۔
سنا ہے
کسی کی محنت رائگاں نہیں جاتی

خود غرضی نے ٹوپی الٹی کی
حق تلفی نے اس میں سکے ڈال دیے
اپنے بال نوچ لئے تشدد نے

امتیاز دانش ندوی

غزل

ہمارا گھر بہت پختہ نہیں ہے
سدا ہم کو یہاں رہنا نہیں ہے

جہاں چاہیں بنالیں آشیانہ
پرندوں میں کوئی جھگڑا نہیں ہے

سنی ہے رات بھر تقریر سب نے
مگر کچھ قلب میں اترا نہیں ہے

گرانی سر کی بڑھتی جارہی ہے
مگر ہم کو ابھی جھکنا نہیں ہے

ردائے خاک سب نے اوڑھ لی کیا
کسی کو حشر تک اٹھنا نہیں ہے

تمہارے شہر کی بدلے گی حالت
ہمیں ایسا ابھی لگتا نہیں ہے

میم چھوبی ترجمہ بلقیس ظفیر الحسن

عظیم الشان پہاڑوں کی بیٹی
پراز اسرار کہستانی صحرا کی طرح
پرسکون--- باوقار
رکھ رکھاؤ والے فاصلوں کی طرح
حلیم اور متین--- سنگین پہاڑیوں جیسی
ماں- میری پیاری ماں
احتیاط اور اہتمام سے سر کو باندھے
کمر کستی ہوئی- برہنہ پا
اونچے کھابڑ سے گزرتی ہوئی
اپنے کاندھوں سے بندھی جھولتی ٹوکریاں
جھیلتی
پہاڑوں اور چٹانوں سے بار بار چڑھتی اترتی
پہاڑی چشمے سے پانی بھر کر
اپنے لئے لائی سوکھی روٹی ٹکتی ہوئی
فاصلے--- تھکا دینے والے راستے
پتھریلی کھیتوں کی گڑائی میں جٹی
"ہوئے--- ہوئے !"
بھالوؤں اور بندروں کو کھدیڑتی
"ہوئے------ ہوئے---"
واپس پہاڑوں کی طرف---
اطمینان کی سانس اور پسینے کی بوندوں کے ساتھ
"ماں- میری پیاری ماں
کیا ڈھوتی پھرتی ہو تم ان ٹوکریوں میں،
جو لٹکی رہتی ہیں تمہارے کاندھے سے لگی
مجھے دکھاؤ----- دکھاؤ نا! "

اور دیکھ ہی لیا ایک دن
میری متجسس آنکھوں نے---- وہ
جو اپنے کندھوں سے باندھے-
پھرتی ہی رہتی ہے وہ---- ہمیشہ- ہر جگہ
اس کا بوڑھا شوہر--- اس کا نوخیز بیٹا!
"یہ کیا ہے- کیا ہے یہ ماں"
میری حیرانی اپنی حدوں سے باہر تھی،
"کیوں پھرتی ہو تم---- انھیں اٹھائے اٹھائے؟ "
کیوں ڈھوئے جا رہی ہو تم انھیں؟----
کیوں-؟ کیوں-؟
بھولپن سے اٹھاتی ہے وہ
اپنی معصوم نگاہیں-- اور کہتی ہے
بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ
"نہیں ڈھوؤں؟
پھر کیسے بسر ہوگی ان کی---- میرے بغیر! "
اور چل پڑتی ہے---- اپنے روزمرہ کام پر
حسب معمول------ سنجیدہ- باوقار
ہمیشہ کی طرح میری ماں
پیاری ماں- عظیم پہاڑوں کی حلیم، بردبار بیٹی!

آسماں محراب (مجموعہ کلام) مصنف : شمس الرحمن فاروقی

ناشر : شب خون کتاب گھر الہ آباد-211003 قیمت ۲۱۰ روپے

نقاد، دانشور، شاعر، مدیر، مترجم شمس الرحمن فاروقی کا چوتھا اور تازہ ترین مجموعۂ کلام "آسماں محراب" جو ان کے ۱۹۷۶ سے ۱۹۹۶ تک کے منتخب کلام پر مشتمل ہے حال ہی میں شب خون کتاب گھر الہ آباد سے شائع ہوا ہے۔ یہ مجموعہ کلام نہ صرف نام اور پیش کش کے اعتبار سے پرکشش ہے بلکہ اصناف سخن کی بوقلمونی، اسالیب اظہار کی ہفت رنگی، اور معیار حصول کا بھی نمونہ ہے۔ شمس الرحمن کی ایک رباعی ہے

تجھ سر سے روشن ہوئے ہیں ساتوں رنگ
تجھ آنکھ سے برسے ہیں برساتوں رنگ
دل چیر کے میرا کبھی دیکھا ہوتا
کس طرح اچھلتا ہے لہو ساتوں رنگ

"آسماں محراب" واقعتاً ایسا مجموعہ کلام ہے جس سے لہو کے ساتوں رنگ ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ پہلا رنگ طویل نظم کا ہے جس کی آئینہ دار شمس الرحمن کی منفرد طویل نظم "نامکمل سوانح حیات" ہے۔ دوسرا رنگ قصیدہ شہر آشوب کا، تیسرا قطعات و رباعیات کا ہے چوتھا رنگ غزل کا رنگ ہے، پانچواں قطعۂ تاریخ اور تاریخ بنائے خانہ اور اس نوع کی دیگر تخلیقات کا۔ چھٹا مورنامہ اور اس سلسلے کی دیگر نظموں کا اور ساتواں تراجم کا اور پھر رنگوں کی آمیزشیں اور فنی امتزاج جو ان گنت نئے رنگوں کو جنم دے رہے ہیں۔

شمس الرحمن کے کلام کی کچھ بنیادی خصوصیات ہیں۔ وہ چونکہ بیک وقت نقاد، دانشور، شاعر اور کئی دیگر خلاقانہ جہات کے مالک ہیں اس لئے ان کے کلام کو کسی مخصوص دائرہ عمل، دائرہ فکر میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔ فارسی اور عربی نژاد الفاظ کے تئیں ترجیحاتی وابستگی کے باوجود اردو زبان کے اعتبار سے بھی ان کی لفظیات کا دائرہ دیگر جدید اردو شاعروں کے تناظر میں کہیں زیادہ وسیع ہے۔ طویل نظم، مختصر نظم، غزل، رباعی، قطعہ---- اور دیگر منظومات جہاں ان کی ہمہ جہتی کی غماز ہیں وہاں ان کی فنی مہارت اور قادر الکلامی کی بھی دلیل ہیں۔ وہ فنی اور جمالیاتی تجربہ جو شمس الرحمن کے بیشتر کلام کا حصہ ہے ایک سطح پر وجودی مابعد الطبیعیاتی ہے، ایک اور سطح پر حسیاتی بصری اور معاصر یعنی سامنے کے حالات سے منسلک ہے اور پھر مختلف مقامات سفر سے گزرتا ہوا مورنامہ کے سلسلے کی نظموں کی وساطت سے حیات انسان کی بنیادی خصوصیت، بنیادی سادگی اور تمازت سے منور ہوجاتا ہے۔

شمس الرحمن کے یہاں وجودی مابعد الطبیعیاتی تجربے کی مختلف جہات ہیں۔ نامکمل سوانح حیات میں خدا کی تلاش کے سلسلے کا آغاز اگرچہ ایک خارجی محرک سے شروع ہوتا ہے لیکن مقامات سفر سے نہ گزرتے ہوئے جملہ مدارج اور مراحل شامل عمل ہوجاتے ہیں۔ پہلا مرحلہ عصر کو سمجھنے اور اس پر قادر ہونے یا اس سے ماورا جانے کا ہے۔ راہ حق کا مسافر بیک وقت شاعر، تاجر الفاظ---- بارڈی، بیدل، حافظ، لیئر کا ہیملٹ اور جولیٹ کا صورت گر ہے لہٰذا وہ متضاد و منافق قوتوں سے نبرد آزما ہے

تھی ہوئی یہ دکانیں نمائشی ہیں فقط
گرہ میں دام یہاں ہوں تو کچھ نہیں ملتا
وہ سکہ عقل ہے جس کا نہیں کوئی خواہاں
دکان پر جو ملے مال بے حقیقت ہے
جو ڈھونڈنے سے ملے وہ خدا نہیں ہوتا
جو سوچنے سے کھلے وہ کلی نہیں ہوتی

(نامکمل سوانح حیات)

راہ حق کا مسافر شاعر وجود کی تلاش کا تجربہ مکمل سلاست اور احساس تکمیل کے ساتھ بیان نہیں کرسکتا۔ لہٰذا اپنی جستجو کو استفسار تک لاکر ایک بار پھر جستجو کے کسی نئے سفر پر روانہ ہوجاتا ہے۔

میں ایک شاعر بے چارہ تاجر الفاظ
کہیں ہوں بارڈی، بیدل، کہیں حافظ
لیر کا ہیملٹ و جولیٹ کا صورت گر
یہ کہہ گیا ہے کہ شاعر کی آنکھ
فیض جنوں سے گرم
جب سر افلاک سے گزرتی ہے
زمیں کی گم شدہ گہرائیوں کو چھوتی ہے
کہ بے وجود کو بھی بخشتی ہے نام و مقام
تو کیا یوں ہی شعرا نے صنم تراشے ہیں؟
تو کیا تجھے کہوں اپنے وجود کا پرتو؟
مگر وجود تو میرا نہیں ترا ہی ہے

(نامکمل سوانح حیات)

راہ حق کے مسافر کا حاصل سفر اداسی، مزید تلاش، مزید اداسی---- کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ تلاش، اداسی اور مزید درد و کرب کا سلسلہ شمس الرحمن کے یہاں شروع سے آخر تک پھیلا ہوا ہے

اداسی
مرے دل میں دریائے مواج سی
اٹھ رہی ہے، یہ ایسا سمندر ہے جس میں
کبھی جزر آتا نہیں ہے
یہاں مد ہی مد۔ گونجتا ہے یہ
پنچم میں استاد فیاض خاں کی گرج دار آواز کی طرح
لیکن مری جاں میں اب وہ

توانائی باقی نہیں ہے جو آواز کے قہر
سینے میں خون اور دھوئیں کی تب و تاب
اک بے اماں قہر قمری سنسناہٹ' فشار حواس و تخیل
کو نفس تکمیل جائے' اٹھالے

(ناتکمل سوانح حیات)

' قصیدہ شہر آشوب' جانوروں پرندوں اور دیگر جزیات و تفصیلات سمیت اگرچہ نوحہ عصر ہے لیکن ختم بالآخر آرزوئے خامشی پر ہوتا ہے کیونکہ خاموشی بھی تلاش حق کی ایک اور صورت یعنی اداسی ہے

ہیں زخمہ زن کئی شب سے جناب فاروقی
بدن کی قمری سے طوق نفس جدا نہ کریں
یہ ساری خلق ہے بہری بسان مار سیہ
کہو کہ باز رہیں اب لبوں کو وا نہ کریں

قطعہ' تاریخ اور تاریخ بنائے خانہ' تجنیسی رباعیوں' غزل کے کچھ اشعار اور عمومی مشکل پسندی کو میں شمس الرحمٰن کی مشاقی' کلاسیکی تربیت' اور کثرت مطالعہ کی کارکردگی سے منسوب کرتا ہوں۔ عربی اور فارسی الفاظ کے لئے ان کی ترجیحاتی پسندیدگی جو ترسیل کے لئے حواشی کا سہارا لیتی ہے' میرے نزدیک اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ لیکن وہ جمالیاتی تجربہ' وجودی تجربہ جو شمس الرحمٰن فاروقی کی شاعری کی بنیاد ہے' بہرحال ترسیل کے مختلف ابہامات مراحل کو بالعموم بہ خوبی و بہ آسانی طے کرلیتا ہے۔ ان کی سات رنگوں والی رباعی کی مثال میں دے چکا ہوں۔ چند مثالیں' نظموں غزلوں اور دیگر منظومات سے اور پیش کرتا ہوں۔ لالچ بھری رباعیاں انتہائی SESUOUS تجربے کے جمالیاتی اظہار کی عمدہ مثالیں ہیں۔

طاؤس نما غنچہ' خواہش کا نشاں
ناخن کی بدن گرم پہ کاوش کا نشاں
سوکھے پتوں پہ شب کی بارش کا نشاں
بھیگے کاغذ پہ جاں کی کاہش کا نشاں

خالص حسیاتی تجربہ وجودی سفر میں ایک ایسا پڑاؤ ہے جو انسان کے لئے اپنا وجودی سفر جاری رکھنے کے تعلق سے ناگزیر ہے۔ شمس الرحمٰن کو کچھ رنگ اور کچھ مظاہر فطرت انتہائی عزیز ہیں۔ سبز رنگ کا ذکر وہ اکثر کرتے ہیں۔ ارغوانی' ترمزی اور سنہری بھی انہیں بے حد پسند ہیں۔ زندگی کی ہمہ گیری' ہمہ جہتی' بوقلمونی اور رنگارنگی اس کی معصومیت' اس کی تازگی۔ کسی نہ کسی روپ میں شمس الرحمٰن کے کلام کے پورے پیٹنے میں منعکس ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اجگر' جوگی' ڈومنی اور بیز اگرچہ ایک گھر میں نہیں رہ سکتے لیکن جوہر زندگی کی حقیقت یہ ہے کہ متضاد اور منفرد جبلتوں کے باوجود ایک گھر میں قائم و دائم ہیں شہر خوشبو کہیں نہ کہیں موجود تو ہے لیکن شاید دشت و دریا کو پار کئے بغیر اس کا نظارہ ممکن نہیں ہے

کشاں کشاں میں چلا ہوں کہ شہر خوشبو کو
نکل کے دشت سے دریا کے پار دیکھوں گا
سارے بدن میں دھوپ سی اظہار کی چمک
وہ خوش لباس' محو بیاں اس کا کیا بتاؤں

دھوپ کی گرمی' نظر
بے باک عریاں
پھیلتے پارے کی صورت شاہراہوں اور گھروں میں
موجزن ہے' سبز آنکھیں سبز
شفاف آئینہ بن گئی ہیں۔

(سبز سورج کی کرن)

شمس الرحمٰن کے کیے ہوئے آسماں محراب میں شامل تراجم ہال ایلوار' ولیم بلیک' پشکن' سیفو' ڈی۔ ایچ لارنس' جوزف براڈسکی اور کچھ دیگر شعرا کے منتخب کلام کے تراجم پر مشتمل ہیں اور میری دانست میں انتخاب کلام اور معیار کے اعتبار سے ان کے ذوق و شوق اور جمالیاتی ترجیحات کے آئینہ دار ہیں۔
مورنامہ تک پہنچ کر شمس الرحمٰن کے اظہار کی صورت مکمل طور پر رواں دواں اور باترسیل ہوگئی ہے۔

رات کا آنگن چاندی جیسا
دن کا چھو تھالی جیسا
رات کے گھر میں کتنے گھوڑے
دن کے کپڑے کتنے جوڑے
مور کے کپڑے کیسے انوکھے
نیلے ہرے سے سرخ سنہرے
مور کی دم میں سونے کے چھلے
اس سے کہتا ہم سے بدل لے
بھورے سنہرے پروں کو کھولے
مور اڑا تو سب یہ بولے
اس کے پر کمزور بہت ہیں
اس جنگل میں مور بہت ہیں
نیلے پیلے مور بہت ہیں

(مورنامہ)

زندگی کا منظرنامہ اگر ایک سرے پر ظلم و تشدد مکر و فریب کا منظرنامہ ہے تو دوسرے سرے پہ معصومیت' تازگی اور صاف دلی کا خوشگوار گلشن ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا سفر ان دونوں انتہاؤں اور ان کے درمیان کے اس جنگل سے عبارت ہے جس میں زندگی کے منفی و مثبت جملہ مظاہر بیک وقت سرگرم کار ہیں۔ زندگی کا رقص چونکہ دائمی طور پر جاری و ساری ہے اس لئے نہ تو شاعر کو رقص کو اور نہ ہی آخری تماشائی کو گھر لوٹ جانے کی ضرورت ہے۔

بلراج کومل

• "نامکمل سوانح حیات" کا باب چہارم نظر سے گزرا۔ ایک عالی دماغ کے نہاں خانۂ دل میں کرب آرزو کی کیا کیفیت ہوتی ہے، اس کا کچھ اندازہ ہو پایا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ پرکیف اور باشعور مطالعہ کس طرح دل و دماغ میں پیوست ہو جاتا ہے اور لہو کے ساتھ گردش کرنے لگتا ہے اور فکر اور تخیل کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہو جاتا ہے وہی محاورہ بن جاتا ہے زبان اور خیال کے لئے۔ خدا کرے آپ صحت اور خوشیوں کے ساتھ ایک بار اور نصف صدی اور گزاریں۔ یہ تو نہیں کہوں گا کہ اطمینان کے ساتھ رخصت ہوں کہ بے تابی سب سے بڑا انعام ہے جو قدرت نے آپ کو ودیعت کیا ہے۔

نئی دہلی — سید حامد

• تم "شب خون" کو ایک نیا رخ دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ ایڈورڈ سعید کی تعریف اور سب سے زیادہ عبدالسلام کی۔ جی خوش ہو گیا۔ اتنا عظیم دانشور گزر گیا اور پریس خاموش رہا، صد افسوس ہے تم نے جس کشادہ دلی سے اظہار افسوس کیا ہے، مجھے بہت پسند آیا۔

بمبئی — باقر مہدی

• شب خون پابندی سے مل رہا ہے اور اس کے ذریعہ ادب سے استفادہ کا موقع نصیب ہو جاتا ہے۔ شب خون ۱۹۹ میں شہزاد منظر کا ایک طویل مضمون "پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال" شائع ہوا ہے۔ اس کے بارے میں" اس نے بڑی معلومات فراہم کی گئی ہے کہ یہ ان کی ایک زیر طبع کتاب[1] کا باب ہے اس لئے میں نے سوچا کہ چند امور کی طرف انھیں متوجہ کر دوں۔ شاید انھیں نظر ثانی کی غرض سے قابل قبول ہوں۔

ترقی پسند تحریک کے سلسلے میں انھوں نے بہت سی حقیقتوں کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے پاکستان میں زوال کے اسباب میں راولپنڈی سازش کیس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس غداری نے اس ادبی تحریک کے خلاف ایسی شدید نفرت پیدا کر دی کہ لوگ اس کے ذکر پر مشتعل ہو جاتے تھے۔

شہزاد منظر نے علم الانسان یا بشریات کا موضوع چھیڑ کر کروبئر (KROERER) کی ۱۶۱ تعریفوں (DIFINITIONS) کا تو ذکر کیا ہے لیکن ان کے بارے میں غلط رائے پیش کی ہے۔ دراصل کروبئر نے ۱۶۱ تعریفیں اس لئے پیش کی ہیں کہ وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ ان سب میں قدر مشترک ایک ہے جسے اس نے مجمل طور پر اپنی تعریف کی حیثیت سے پیش کیا تھا اس نے اپنے عدم اطمینان کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ ایک جامع تعریف کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے علی الرغم، کروبئر صاحب علم الانسان کی دنیا میں اتنے پرانے ہو چکے ہیں کہ ان کی کتاب ANTHROPOLOGY جس کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن ۱۹۴۸ میں شائع ہوا تھا اب کلاسکس میں شمار ہوتی ہے۔ پانچویں دہائی سے آٹھویں نویں دہائی تک علم الانسان نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ کروبئر اب قصۂ پارینہ ہو گئے ہیں۔ شہزاد منظر نے جتنی تعریفات و تفصیلات علم الانسان کے سلسلے میں پیش کی ہیں۔ انہیں ادبی و شاعرانہ تو کہا جا سکتا ہے فنی نہیں! یہ خطا ادبی ماہرین نفسیات و عمرانیات و تہذیب و ثقافت سے بار بار ہوتی رہی ہے اور ہو رہی ہے۔ اس لئے تنہا وہ قصوروار نہیں ہیں میرے عزیز دوست کلچر وہ نہیں ہے جو آپ نے تفصیل سے اور مرعوب کن حوالوں سے بیان کیا ہے۔

نفسیات کے سلسلے میں شہزاد منظر نے بہت سی غیر فنی باتوں کا ذکر کرتے ہوئے ممتاز حسین کے فرائڈ کے سلسلے میں اظہار خیال کو پیش کر کے ایک اور عام فنی تصور پیش کر دیا ہے۔ فرائڈ "فلسفہ اور علم الانسان کا آدمی" نہیں تھا۔ وہ اصلاً معالج تھا اور اپنے طریقۂ علاج "تحلیل نفسی" کے لئے اس نے نظریہ سازی کی خاطر دیو مالا سے کر معاشرتی علوم تک سے استفادہ کیا تھا۔ اس کا اصل محور لاشعور نہیں جنس تھا جس کے لئے اس نے لاشعور کو وجود بخشا۔ عام ناقدوں کی طرح شہزاد منظر نے نفسیات کے معنی تحلیل نفسی اور ماہرین نفسیات میں فرائڈ تک خود کو محدود رکھا ہے جب اردو تنقید میں ینگ، ایڈلر، ایرک فروم کے علاوہ گسٹالٹ اور نظریہ حلقۂ عمل تک کو منطبق کیا گیا ہے۔ اس طرح نفسیاتی تنقید ۱۹۳۹ (فرائڈ کا سال وفات) سے آگے بڑھ کر ساتویں آٹھویں دہائی تک پیش رفت کر چکی ہے

نفسیات ہی کے سلسلے میں شہزاد منظر نے ایک فروگذاشت یہ کی ہے کہ انہوں نے عام ناقدوں کی طرح شیخ محمد اکرام کو نظر انداز کر دیا۔ شیخ صاحب مرحوم کی کتاب "آثار غالب" کا اگر توجہ سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ

[1] اب کتاب شائع ہو گئی ہے۔ (ادارہ)

اطلاقی نفسیات (APPLIED PSYCHOLOGY) کی یہ پہلی کتاب ہے جو اردو میں فنی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ ان کے بعد میراجی، محمد حسن عسکری یا ممتاز مفتی وغیرہ میں سے کسی نے اس فنی شعور کا ثبوت نہیں دیا ہے۔

اسلامی ادب کے سلسلے میں نہ تو محمد حسن عسکری مرحوم کے معاملے میں سنجیدگی سے توجہ دی گئی اور نہ تحریک ادب اسلامی کے ساتھ سنجیدہ برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ اس تحریک کے سلسلے میں شہزاد منظر نے ڈاکٹر انور سدید کی کتاب "ادب کی تحریکیں" کو اصل ماخذ بنایا ہے۔ پروفیسر فروغ احمد مرحوم کے "تخلیقی ادب" کے مضمون کا حوالہ ضرور ملتا ہے لیکن اس کے مندرجات کو اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ شروع سے آخر تک منفی رویہ ہے۔ ہر نوعیت سے یہ باور کرایا گیا ہے کہ یہ تحریک ادب کے کم سے کم تر معیار تک بھی نہیں پہنچی۔ اگر یہ عالمہ صحیح ہے تو پھر اس نے آپ کو اس قدر کیوں پریشان کیا کہ آپ اس کا ذکر لے بیٹھے جس کی کوئی حقیقت نہیں اس بے حقیقت کی مٹی کوٹنے سے فائدہ ؟

آپ نے اسلامی ادب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں متعدد تضاد بیانیاں ہیں۔ اعتراف کر کے بھی آپ انکار کر رہے ہیں۔ اسلامی ادب کے نام سے اسی طرح بیشتر غیر معیاری ادب پیش کیا گیا ہے جس طرح دوسرے نظریات کے نام پر اس سے زیادہ پست ادب پیش کیا گیا ہے۔ آپ کے پورے محاکمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے اسلامی ادب کے پیش کردہ لٹریچر کا مطالعہ نہیں کیا ہے اس سے زیادہ حد ادب !

ساختیاتی تنقید اور اس کے ذیلی مدارس ردساخت، بالائے ساخت اور شکست ساخت وغیرہ کا فکری یا نظریاتی مدارس کی طرح استقبال میرے خیال میں زیادتی ہے۔ یہ خالص لسانی منہاج ہے اور اس کے ساتھ انصاف وہی کر سکتا ہے جو BEHAVIORAL STATISTICS کی بھی شد بد رکھتا ہو اس کے بغیر جو کچھ دعویٰ کیا جائے گا وہ "ساختیاتی شاعری" ہو گی۔

رام پور
ابن فرید

• آپ کو یاد ہوگا کہ ادھر میں نے اردو کے چند بڑے شعروں کی زمینوں پر کچھ غزلیں لکھ کر بھیجی تھیں جنھیں آپ نے یہ لکھ کر واپس کر دیا تھا کہ جو غزلیں اساتذہ کے دواوین کی زینت ہیں، ان پر غزلیں لکھنے سے کیا حاصل، کچھ مفید مطلب غزلیں بھیجیے!۔

"مفید مطلب" غزلوں کی فرمائش کا "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد" کے مصداق میں نے یوں لطف لیا کہ اپنے حساب سے کچھ اگرم بگرم غزلیں لکھ کر آپ کو بھیج دیں، جن میں سے ایک آپ نے رکھ لی اور باقی یہ لکھ کر واپس کر دیں کہ "مجھے معلوم ہے کہ آپ کے پاس تو توپ خانہ بھرا رکھا ہے۔ بہر حال ایک غزل پسند آئی جو شائع کر دی جائے گی۔" میں اس غزل کی اشاعت کا منتظر ہی تھا کہ دیکھوں اس کی اشاعت ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکری کا کام دیتی ہے یا نہیں اور میرا خیال صحیح ثابت ہوا۔ جولائی کے شب خون میں غزل شائع ہوئی اور اگست کے شمارے میں عزیزی ابو الحسنات کا یہ تبصرہ آ گیا کہ

"محترم عمر انصاری صاحب کو اب پتلون نہیں پہننا چاہیے، وہ میرے کہے کا برا نہ مانیں گے۔ میں واقعی ان کا سعادت آشنا بھتیجا ہوں۔"

اسی شمارے میں محبی پروفیسر وارث کرمانی کا یہ تبصرہ بھی نظر نواز ہوا :

"جب عمر انصاری جیسے دبستان لکھنؤ کے ہفتاد سالہ[1] استاد شاعر شب خون کے لیے شعر کہنا سیکھ گئے، تو ہم تو ان سے بہت جونیئر ہیں، کتنا اچھا شعر کہا ہے ؎

آئی تھی دیہات سے کل، آج شہری ہو گئی
کس قدر چالاک دو دن میں گلہری ہو گئی

اس شعر پر عمر انصاری کی جگہ آپ کو داد ملنا چاہیے ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

ہر چند کہ ان دونوں حضرات کے تبصرے مجھے بہت مزے دے گئے، کہ ان میں ان کے خلوص کی جھلک بھی دکھائی دے گئی۔ اور میرے لیے ان کی محبتیں بھی چھلکتی ہوئی دیکھنے کو ملیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی احساس ہوا کہ جیسے یہ دونوں میرے عزیز ہمہ وقت مجھے چغے اور دستار میں کسا ہوا "مسند پر بیٹھا" اردو زبان میں عربی بولتا ہوا" ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور ذرا دیر کے لیے بھی مجھے کسی قسم کی چھوٹ دینے کو تیار نہیں۔ جو مجھ جیسے وقت کے ساتھ قدم جوڑ کر چلنے والوں کے لیے ایک بہت ہی مشکل میں ڈال دینے والی صورت حال ہے۔

میرے دس مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں اور اب تو میرا مزاج یہ بنتا جا رہا ہے کہ بقول علامہ اقبال ؎

---

[1] پروفیسر کرمانی سے میرا یہ مطالبہ ہے کہ میری عمر کے پندرہ برس مجھے واپس کریں کیوں کہ ہفتاد سالہ کی جگہ انھیں پنج و ہشتاد سالہ لکھنا چاہیے تھا۔ (عمر انصاری)

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

یہاں پر ایک یہ واقعہ بھی یقیناً لائقِ تحریر ہے کہ محرم میں عشرہ والے دن استاذی مولانا عبدالباری آسی چوک میں ایک رنڈی کے کوٹھے پر بیٹھے تعزیے دیکھ رہے تھے۔ صاحبِ خانہ بھی خوش تھیں اور ان کے لواحقین بھی کہ مولانا کی وجہ سے جو پارٹی آتی زیادہ دیر وہاں رکتی۔ اور نوحہ خواں اور مرثیہ خواں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دینے کی کوشش کرتے۔ اسی دوران مولانا نے اپنے ایک شاگرد حافظ انواری کو دیکھا کہ وہ بار بار نیچے مجمع میں گھوم گھوم کر ہر زاویے سے کوٹھے پر بیٹھے مولانا کو دیکھ رہے ہیں اور نگاہیں نہیں چار کر رہے ہیں۔ بہرحال وہ دن تمام ہو گیا۔ دوسرے دن مولانا اپنے گھر پر بیٹھے تھے کہ حافظ انواری صاحب وارد ہوئے۔ مولانا نے انہیں دیکھتے ہی پوچھا :

اے بھائی حافظ صاحب کل آپ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ کیا بات تھی ؟

حافظ انواری نے جواب دیا :

جی ہاں مولانا، مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ آپ ہوں گے۔ کہاں بھلا رنڈی کا کوٹھا اور کہاں آپ !

مولانا زوردار قہقہہ لگا کر بولے :-

ارے بھائی میں کوئی مسجد کا مولانا تھوڑی ہوں، میں تو شاعری کا مولانا ہوں، اور شاعری کے لئے کوٹھا نیچا سب برابر ہوتا ہے۔

لکھنؤ　　　　　　　　　　عمر انصاری

● اس بار مظفر حنفی اور ن۔ م دانش کی غزلیں بہت اچھی ہیں۔ کئی بار پڑھا اور ہر بار نئے لطف سے روشناس ہوا۔ خصوصاً ن۔ م۔ دانش کی چھوٹی بحروں والی غزلیں۔ ؎

جہاں وہم و گماں ہو جائے گا کیا

اور

دل کو تیرے دھیان میں رکھا

بہت جاندار ہیں۔ گیبریلا مسترال کی نظم کا ترجمہ "دعا" بھی خوب ہے۔ خالدہ حسین کا افسانہ "سیٹی" ختم ہوتے ہوتے مزہ دے جاتا ہے۔

سورت　　　　　　　　　　شکیل اعظمی

● شمارہ ۲۰۱ مل گیا۔ شکریہ۔ آپ نے قیمت بڑھا دی۔ کوئی بات نہیں نرخِ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔ جنہیں شب خون سے لگاؤ ہے وہ تو ہر قیمت پر اسے حاصل کریں گے۔ یوں بھی ان دنوں انسانی زندگی کے سوا کون سی چیز ہے جس کی قیمت نہیں بڑھی ہے۔ خالدہ حسین کا افسانہ اچھا ہے۔ تجربے کی آنچ میں تپا ہوا۔ غزلیں نظمیں بھی پسند آئیں۔ عقیل حامد کے کوڑے، مینڈک، بطخ، بلی بکار خوشیں ہشیار نظر آتے ہیں؛ خوب کدکڑے لگا رہے ہیں۔ احمد محفوظ کا ترجمہ، آپ کے مقالے کا بصیرت افروز ہے۔ انیس اشفاق غزل کے نئے علائق نظام کو پیش کرنے میں خاصے کامیاب رہے ہیں۔ اب آئیے آپ کی "ناکمل سوانح حیات" ——— پہلے باب سے ہی بغور پڑھتی رہی ہوں مگر کہا کچھ نہیں اتنی پرشکوہ نظم ہے کہ مارے رعب کے گھگھی بندھ جاتی تھی۔ مگر باب چہارم پر پہنچ کے ٹھٹھک گئی ہوں اور حیران کھڑی سوچ رہی ہوں کہ وہ آتش تھم میں اخگر کی سوزش اور افسردہ کرن میں حرارت کی تابش کا جویا اور اتنا افسردہ؟ جس کے پاس ہمیشہ کھونے کے لئے کچھ نہ کچھ رہتا ہو وہ اور تہی دست ہو یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے۔ وہ بھی اک عمر میں ہوا معلوم۔ یہ شعر جب جب پڑھا میر کی خوش بختی پر رشک کیا۔ کچھ نہیں جاننے کے جان لینے والے کے علم کا تو کوئی اور چھور ہی نہیں بھئی ——— میری طرف سے ہدیہ تبریک کہ آپ کو بھی یہ معلوم ہے ——— ہے ارجن، پھل کی چنتا چھوڑ دو۔ کرم کیے جاؤ، فرمایا ہے شری کرشن نے مقدس گیتا میں ——— اور پھر اتنی فضول سی زندگی ایسی بیکار سی دنیا میں گزارنا ہے۔ کچھ تو رہے شغل کے لئے۔ چلو تھوڑی جستجو ہی کر لیتے ہیں ——— ویسے، لا تقنطو من الرحمت اللہ۔ انہوں نے ارشاد فرمایا تو ہے ——— وان لیس للانسان الا ما سعےٰ ——— جو یوں ہے تو کیا پتا آپ کو پتا ہو ہی جائے کہ "وہ ماہتاب" کہاں چلے جاتے ہیں ——— اگر معلوم ہو بھی جائے تو کیا۔ لہو افشانی زخموں کی رک گئی؟ درد کم ہوگا۔

دہلی　　　　　　　　　　بلقیس ظفیر الحسن

● شب خون ۲۰۱ ملا۔ آپ کی نظم " ناکمل سوانح حیات (باب چہارم) " یہاں تک آتے آتے بڑی اپنائیت محسوس ہونے لگی ہے اور جی یہی دعا کرتا ہے

کہ یہ داستان لذیذ کبھی ختم پر نہ پہنچے۔ خالدہ حسین کی کہانی اور انیس اشفاق کا تجزیاتی مضمون اس شمارے کی خاص چیزیں ہیں۔

خالدہ حسین کی کہانی میں کہیں یہ بات تو نہیں کہ عورت چاہے جس عمر کی ہو، مرد اسے بھیڑیئے ہی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ان کا انداز بیان بڑا ہی پرکشش اور پیا مانگتا ——

انیس اشفاق سے مضمون میں اشعار کا تجزیہ کچھ مدرسانہ سا ہے۔ ہندوستانی شعریات کی طرف ایک قدم، کو اگر آپ ہی اردو میں ڈھالتے تو شاید زیادہ اچھا ہوتا۔

پرکاش فکری
رانچی

• شب خون کا تازہ شمارہ نمبر ۲۰ نظر نواز ہوا۔ غزلوں کی اشاعت کا شکریہ (جزاکم اللہ خیرالجزاء) جناب عقیل جامد بھی سلام و شکریہ کہہ رہے ہیں۔ "نامکمل سوانح حیات" (باب چہارم) خوب بہت خوب ہے، بعض مقامات پر آنکھیں بھر آئی ہیں ہمارے اکابر حضرات نے بھی انہیں حقائق کا اظہار کیا تھا پس "من کان فی هذه اعمیٰ فهو فی الآخرة اعمیٰ" کے مصداق بے بصیرتی گر رہا ہے۔ آنکھیں کھل جانی چاہیئے۔ (رحم سب کی کہ ایک کی)

جناب محمد اظہار الحق کی نظمیں بھی بہت عمدہ ہیں۔ ن۔ م۔ دانش کی تخلیقات پسند آئیں۔

راہی فدائی
کڈپہ

• شب خون نے ہمیشہ معیاری افسانے شائع کئے ہیں۔ شمارہ نمبر ۲۰ میں منظر کاظمی کا افسانہ "مینار بابل" موضوع اور بیان کے اعتبار سے قابل قدر افسانہ ہے۔ "مینار بابل" کا علامتی نظام اپنے اندر بھرپور معنوی جہتیں رکھتا ہے۔ بہار کے افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کے گرتے ہوئے معیار کو سنبھالا ہے اور اسے روشنی دی ہے۔ "مینار بابل" اس کی عمدہ مثال ہے۔

عشرت بیتاب
آسنسول

• شب خون نمبر ۲۰ کا مطالعہ کیا۔ فاروقی صاحب کا مضمون دو مرتبہ پڑھا اس میں غالب کے کلام کو ایک نئے انداز سے سمجھنے اور سمجھانے کا درپہ پوری طرح کامیاب ہے۔ غالب کو اتنے زاویوں سے اردو کے شاید ہی کسی ناقد نے جانچا پرکھا ہو۔ زاہدہ زیدی کا ترجمہ پسند آیا۔ اطالوی ڈرامہ کو اردو میں اس طرح ڈھالا گیا ہے کہ مجھوا معلوم ہوتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی غزل کے اشعار بہت پسند آئے۔ شعری تخلیقات کا معیار مجموعی طور پر عمدہ ہے۔ آل احمد سرور صاحب کی نظم متاثر کن ہے۔ منظر کاظمی کا افسانہ اپنے اندر بڑی معنویت چھپائے ہوئے ہے۔ اس کی تکنیک اچھوتی ہے۔

اشفاق احمد اعظمی
سانگر پور (اعظم گڑھ)

• شب خون شمارہ نمبر ۲۰ نظر سے گزرا۔ آج کل "شب خون" میں عقیل جامد جیسے شعرا بہت شائع ہو رہے ہیں۔ کیا قاری "کتے"، "بلی"، "بکریاں"، اور "کوے" زیادہ پسند فرماتے ہیں۔ باقی غزلیں، نظمیں اور مضمون معیاری ہیں۔

محمد الیاس عاقل نظامی
سنادود

• شب خون تازہ شمارہ میں انیس اشفاق کا مقالہ زندگی میں پہلی بار بہت مرعوب ہو کر پڑھا۔ گذشتہ چالیس سے مجھے اسی قسم کے مقالے کا انتظار تھا۔ جو غزل کے لفظی نظام، ترکیبی نظام اور علامتی نظام کے علاوہ اس کو پس منظر سے پیش منظر میں لا سکے۔ بارے موصوف نے یہ مقالہ لکھ کر احسان کا حق ادا کر دیا ہے۔ شارح ہو تو ایسا ہو۔ نازک اور دقیق مسائل کی تشریح پر ان کو قدرت کاملہ حاصل ہے۔ ایسے ہی مقالوں سے نئی اور جدید شاعری کے محاسن زیادہ روشن ہوتے ہیں۔ خالدہ حسین کا افسانہ "سبق" پڑھتے وقت سانس کو روک لینا پڑا۔ ترتیل کے ساتھ اسے پڑھ کر حظ اٹھانا ضروری ہے۔ شاعری بھی خالدہ حسین نثر نگاری کے آگے شرمندہ ہے۔

کاوش بدری
امبور

• شب خون میں جو کچھ شائع ہوتا ہے ان سے سرسری گزر جانا ممکن نہیں کہ ہر دوسرا تیسرا صفحہ پکڑ لیتا ہے۔ ایسی ہی کچھ کیفیت شمارہ نمبر ۲۰ میں منظر کاظمی کی کہانی "مینار بابل" پڑھ کر ہوئی۔ کیا کرب ہے کہ مسرت کا اظہار بھی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

CRAFT اور TEXTURE دونوں میں جدت اور یکتائی ہے کہ "الفاظ انتہائی سرعت کے ساتھ انگلیوں میں تکلے کا غذ کے دن دسے ٹیک آف کرنے لگتے ہیں۔" کہتے ہیں کہ غزل کے شاعر کی پہچان تب بنتی ہے جب وہ زمین نکالتا ہے۔ اور نثر لکھنے والوں کا اسلوب اس کی شناخت ہے۔ کاظمی کا اسلوب نمایاں ہے۔ "مینار بابل" ایک وسیع استعارہ ہے۔ اس میں عصری مسائل کی دروں بینی اور ظاہر کا باطن بڑے سلیقے سے پیش کیا گیا ہے اس طرح کہ کچھ بھی STATED

نہیں ہے بلکہ اس طرح OPAQUE ہے کہ REFLECTIVE حسن
سادے میں کار فرما ہے۔ یہاں احساس زبان بھی ہے اور اس کا عرفان بھی
اور یہی اس کہانی کا تخلیقی جوہر ہے۔

شفیع جاوید
پٹنہ

• میں آنجناب سے ملاقات کے حوالے سے کچھ عرض کرنے کے لئے بہت دنوں سے سوچ رہا تھا۔ ہر چند کہ غایت حرمت آپ کی عیادت و ملاقات تھی تاہم برسبیل تذکرہ میری غزل آگئی جو شب خون میں اشاعت کے لئے بھیجی گئی تھی اور جیسا کہ آپ نے فرمایا، وہ قابل اشاعت نہ ہوسکی۔ اسباب بھی آپ نے مجملاً ارشاد فرمائے جن میں منجملہ یہ کہ میری پہلی غزل جو شب خون میں جگہ پا چکی ہے۔ موجودہ غزل کے مقابلے میں بہ لحاظ لفظیات و بیان زیادہ مقصد رس ہے اور متاثر کن بھی جہاں تک مجھے یاد ہے آنجناب نے ایسا ہی کچھ فرمایا تھا۔ اس سلسلے میں کچھ عرض کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک طرف آنجناب کی علالت، تکان اور اوقات روانگی کی قلت تو دوسری جانب میرے پاس بھی وقت کی تنگی پھر وہ موقع بھی اس بحث کو مزید آگے بڑھانے کا نہ تھا۔ آپ تنہا ہوتے تو شاید تھوڑا بہت عرض کر بھی دیتا۔ بہر حال اب آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔

ظاہر ہے کہ وہ چند غزلیں جو میں نے قدیم قطب شاہی دور کی زبان میں کہی ہیں وہ تو مروجہ زبان کی ہیں بالخصوص شمالی ہند میں اور نہ ہی وہ لب و لہجہ اور لفظیات آج مستعملات ادب ہیں۔ ایسی صورت میں میں نے زبان میں جو محسوس کئے اور ان کے زیر اثر افکار و خیالات جو اس دور میں تہ پلٹے گئے ہوں اسی زبان کی وساطت سے نظم کر دینے کا جو پلان بنایا یا تجربہ کرنا چاہا (آپ جو بھی سمجھ لیں) بہر حال مجھے اس دور میں پہونچ جانا ناگزیر ہو گیا۔ اور چونکہ وہ میری اپنی زبان بھی نہیں لہٰذا جو بھی ماخوذات ہوں گے ان میں یکسانیت اس دور کے زیر اثر ہر تخلیق میں فطری طور پر ہونا چاہئے۔ فاروقی صاحب! غزلیں میں کہہ رہا ہوں اس سے مجھے ان کی یکسانیت و ہمواری کا احساس پارکھی سے زیادہ ہونا چاہئے۔ اور مجھے ہی یہ حق بھی اور اگر حق کا حق ہونا چاہئے۔ اور احساس بھی ہے کہ ہر طور مجھے پرکھنا چاہئے۔ تاہم مجھے مغالطہ نہیں اور اچھی طرح یاد ہے، نومبر ۹۲ میں آپ کی لکھنؤ میں اقامت تھی اور آپ کی رہائش گاہ پر ایک ملاقات میں میں نے یہی غزل سنائی تھی جسے آپ نے یہ کہہ کر نا قابل اشاعت فرمایا ہے کہ چند الفاظ بدل دینے سے بات نہیں بنتی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ لفظ و لہجے سے قطع نظر اور کیا ہوگا جو اس دور کے بیان و زبان کی ترجمانی کر سکے۔ غزل سننے کے بعد آپ نے اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازا تھا۔ اور ہدایت بھی فرمائی تھی کہ ان غزلوں کو میں کہاں کہاں بھیجوں اور آپ ہی کی ایما پر میں نے انہیں کئی رسالوں بشمول 'شب خون' کو تا بہ نما بھیجیں اور بحمداللہ چھپ گئیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں جو کچھ سمجھ رہا ہوں وہی سچ ہے لیکن ایسا بھی ممکن ہے کہ جو اوروں کا خیال ہے وہ سو فیصد نہیں۔[1]

شمیم عثمانی
کانپور

ضروری تصحیح

میں نے اپنے مجموعۂ کلام "آسمان محراب" کے صفحہ ۲۰۵ پر مطبوعہ اپنی ایک غزل کا سرنامہ حسب ذیل شعر کو بنایا ہے ؎

یکویش رہ سپاری اے دل اے دل
مرا تنہا گزاری اے دل اے دل

میں نے یہ شعر نور العین واقف سے منسوب کیا ہے۔ مجھے جناب سردار جعفری نے متوجہ کیا ہے کہ یہ شعر دراصل اقبال کا ہے اور "پیام مشرق" میں موجود ہے۔ "پیام مشرق" کو میں نے کبھی بار بار پڑھا ہے اور یہ شعر عرصۂ دراز سے میرے حافظے میں ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں مجھے نور العین واقف کے کلام سے کچھ دلچسپی پیدا ہوئی اور شاید حافظے نے میرے ساتھ یہ مذاق کیا کہ اقبال کا یہ معرکہ آرا شعر نور العین واقف کی جھولی میں ڈال دیا۔ قارئین کرام تصحیح فرمائیں کہ یہ شعر نور العین واقف کا نہیں اقبال کا ہے۔ میں جناب سردار جعفری کا شکر گزار اور اقبال کی روح سے معذرت خواہ ہوں۔

شمس الرحمٰن فاروقی
الہ آباد

---

[1] اس خط کے ساتھ جو غزلیں جناب شمیم عثمانی نے ارسال فرمائی تھیں ان کے لئے جگہ نہ نکل سکی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے کلام کے لئے شب خون کے دروازے کھلے ہوئے نہیں ہیں۔

[illegible] تمام [illegible] انعام [illegible]

[illegible] الرحمٰن فاروقی کو یہ انعام "شعر شور انگیز"
[illegible] ان کے توسط سے اپنے تمام بہی خواہوں
[illegible] ہیں۔ اور بہت جلد تمام تہنیتی پیغام کے جواب
[illegible] یہ بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ بعض دوستوں نے
[illegible] نہیں کیا ہے صرف نام پر اکتفا کیا ہے۔ اگر ان کے
[illegible] پتے کی عدم موجودگی کے باعث جواب سے معذور
[illegible] ہم معذور ہیں۔

[illegible] جدید شاعر ندا فاضلی کو اس سال صدر جمہوریہ کے
[illegible] عطا کیا گیا ہے۔ یہ اعزاز رام کرشن جے دیال ہارمونی
[illegible] ہے۔ ہندی میں یہ ایوارڈ راجندر یادو، انگریزی
[illegible] رحمٰن راہی، کنڑ میں شدھر سری نواس، اڑیا
[illegible] جاتا پاترا، گجراتی میں سدھانشو شش چندر، حوالی میڈیا
[illegible] تنظیمات کے لئے بابا آمٹے کو دیا گیا ہے۔ انعام یافتگان
[illegible] ندا فاضلی کا نام دیکھ کر ہم سب اردو والوں کا سر اونچا
[illegible] نیا مجموعہ "کھویا ہوا سا کچھ" بھی چند دنوں پہلے منظر عام

[illegible] انگریزی صحافت اور بی بی سی سے دل چسپی رکھنے والے
[illegible] MARK TOLLEY غیر معروف نہیں لیکن کم
[illegible] ان کی دوست اور ہم کار مس جلیین وائٹ MS. JILLIAN
اردو اور ہندی سے بخوبی واقف ہیں۔ اور انہوں نے شری لال
[illegible] درباری' اور راہی معصوم رضا کے ناول "آدھا گاؤں" کا
[illegible] نہایت کامیابی سے کیا ہے۔ علاوہ بریں وہ لندن اسکول آف
[illegible] اسٹڈیز (S.O.A.S) کی نمایاں طالب علم بھی رہی
[illegible] ادبی پبلشر کا انعام مس جلیین وائٹ کو ان کے ترجمے
[illegible] ہم انہیں مبارکباد دیتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ ان کی
[illegible] اردو، ہندی سے اس قسم کے تراجم کا کام انجام دیں گے۔

[illegible]

ان دنوں وہ پھر ایک ڈرامہ تصنیف کر رہے ہیں۔ بہر حال ہمیں توقع ہے کہ ان
کے اس ناولٹ پر قارئین سیر حاصل گفتگو کریں گے۔

خواجہ جاوید اختر الٰہ آباد کے نوجوان شاعر ہیں اور فٹ بال کے بھی اچھے کھلاڑی
ہیں۔ وطن کلکتہ ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ مقالہ کرناٹک ساہتیہ اکیڈمی کے سیمینار میں پڑھا
جو فروری ۱۹۸۷ میں منعقد ہوا تھا۔ اس جلسے میں محترمہ [illegible] سید صدر
جلسہ کی حیثیت سے شریک تھیں۔

شیر شاہ سید کراچی میں رہتے ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔ انہوں
انہوں نے افسانہ نگاری ابھی ابھی شروع کی ہے۔

ظفر اقبال کے کلیات "اب تک" پر شمس الرحمٰن فاروقی نے مبسوط دیباچہ لکھ لیا ہے۔ اب
یہ کتاب بہت جلد منظر عام پر آجائے گی۔

عبدالاحد ساز کی شخصیت اور شاعری پر ایک گوشہ بمبئی کے رسالہ "تشکیل"
میں شائع ہوا ہے۔

غلام مرتضیٰ راہی نے اپنے مجموعوں "لاریب"، "لامکاں" کو جدید ترتیب و اضافے
کے ساتھ "حرف مکرر" کے نام سے ابھی ابھی شائع کیا ہے۔

منصور سبزواری اب تک ترچ میں مقیم تھے اب اپنے وطن مالوف سنبھل (اردو آباد)
واپس آ گئے۔

من موہن تلخ ایک عرصے کے بعد پھر شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ ان کا نیا مجموعہ
جلد ہی منظر عام پر آئے گا۔

تانیثیت (FEMINISM) کدھر؟

نام نہاد نئی ادبی تھیوری کی بے اعتدالیوں اور اس کی پیدا کردہ بہت سی غلط فہمیوں کے خلاف ردعمل جو مغرب کے فلسفیانہ اور ادبی حلقوں میں دور دور تک پھیل گیا تھا اس کے نتیجے میں اس نام نہاد نئی تھیوری کا وقار گذشتہ پندرہ برسوں میں بہت گھٹا ہے۔ تانیثیت اگرچہ "نئی ادبی تھیوری" کی براہ راست پیداوار نہیں ہے، لیکن اس کا فروغ بھی کم و بیش اسی زمانے میں شروع ہوا تھا۔ چونکہ تانیثیت کے بنیادی اصول اور تصورات (اس سلسلے میں ملاحظہ ہوں 'شب خون' کے شمارے ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱) غیر معمولی انسانی دلچسپی کے حامل ہیں، اس لئے تانیثیت پر مبنی افکار و مطالعات آج تمام دنیا میں مقبول ہو رہے ہیں۔ افسوس کہ یہ صورت حال اردو میں نہیں ہے۔ یہاں تو لوگ تانیثیت کے معنی ہی نہیں جانتے اور اسے زنانہ پن کا مرادف سمجھتے ہیں۔

دکھ کی بات یہ ہے کہ مغرب میں تانیثیت پر مبنی حالیہ مطالعات کا معیار بھی زوال پذیر ہو گیا ہے اور تانیثیت بھی ایک طرح کا "زنانہ فیشن" بن گئی ہے۔ اس سلسلے میں ہم مغرب کی ایک بہت مشہور اور معتبر مصنفہ فیونامیکارتھی FIONA MACCARTHY کا ایک بیان NEW YORK REVIEW OF BOOKS کے حالیہ شمارے سے نقل کر رہے ہیں:

"یہ کتاب اس رجحان اور ذہنیت کی نمائندگی کرتی ہے جو عورتوں کی تحریروں میں ۱۹۶۰ کی دہائی کے اواسط سے نظر آنا شروع ہوتی ہے۔ یعنی پہلی بات تو یہ کہ ہر اس شہادت کو بے چھان بین اور بے تحقیق فوری طور پر قبول کر لینا جس سے یہ امکان ظاہر ہو کہ عورتیں مظلوم تھیں یا سماج کے زیریں حاشیے کا حصہ تھیں۔ سوال اٹھتا ہے کہ عورتوں کے معاملات پر عورت مورخوں اور غیر فکشن لکھنے والی عورتوں نے جو توجہ گذشتہ دو دہائیوں میں صرف کی ہے اس سے عورتوں کے معاملات واضح ہوئے ہیں یا ان کی شکل اور بگڑی ہے؟ زیر تبصرہ بھاری بھرکم کتاب پڑھ کر تو ایسا لگتا ہے کہ عورت / مرد کی تفریق پر مبنی مباحثات اب ایک بند گلی ہو کر رہ گئے ہیں۔ عورت / مرد کے نظام حیات کی تاریخ لکھنے والے لوگ کل کو اس نام نہاد "منطقۂ ترقی" کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟ لیکن ایسا تو نہیں کہ وہ اس دبدھا میں پڑ جائیں گے کہ بیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے یورپ کی عورت نے ایک استبداد کو بدل کر دوسری طرح کا استبداد اپنے گلے میں ڈال لیا؟ اور اس طرح عورت نے اپنے فطری حق انتخاب کی تردید خود کر ڈالی اور اپنے لئے ایک اور ہی طرح کا "بند باڑہ" (GHETTO) تعمیر کر لیا؟"

FIONA MACCARTHY (1997)

مارچ ۱۹۷

مدیر، پرنٹر، پبلشر : عقیلہ شاہین	سرورق : ڈچ ماہر تجدید مصور موندریان کی	جلد : ۳۱	شمارہ : ۲۰۴
فون نمبر : ۶۲۲۶۹۳، ۶۲۳۱۳۷	مصوری کے اتباع میں چودھری ابن النصیر کا عمل	ترسیل زر کا پتہ : ۳۱۳۔ رانی منڈی، الہ آباد ۳	
مطبع : بھارگو پریس، الہ آباد	سرنامہ کی خطاطی : عادل منصوری	خط و کتابت کا پتہ : پوسٹ بکس۔ ۱۳، الہ آباد ۳	
فی شمارہ : پندرہ روپے	کمپوزنگ : افراح کمپیوٹر سنٹر، نئی دہلی۔ ۲۵	بارہ شمارے : ایک سو ساٹھ روپے	

ترتیب و تہذیب

شمس الرحمٰن فاروقی

فراق گورکھپوری، بلونت سنگھ

بلونت سنگھ سے فراق صاحب کی گفتگو جو اب تک غیر مطبوعہ رہی ہے دستاویزی اہمیت کی حامل تو ہے ہی، اس کی ادبی اور تہذیبی اہمیت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک انٹرویو ہے لیکن یہ فراق صاحب کے تفکراتی خود کلامیہ کا حکم رکھتا ہے۔ یہاں فراق صاحب نے اردو ادب، خاص کر اردو غزل، اور غزل کی تہذیب، ادب کے آفاقی مسائل اور انسانی حیات و کائنات میں ادب کی حیثیت پر جو گفتگو کی ہے وہ کئی کتابوں پر بھاری ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہم فراق صاحب کی ہر بات سے اتفاق کریں لیکن ان کی ہر بات قدم قدم رک کر سوچنے اور ہمارے طے شدہ مفروضات کو دوبارہ جانچنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اعلیٰ درجے کی ادبی تحریر کا تقاضا بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ ہمیں غور و فکر، تجسس، اور بصیرت کے منازل سے گزارتی ہے۔ فراق صاحب کی اس گفتگو کا بہاؤ اور ان کی نثر کا دروبست بھی بجائے خود ایک شاہکار ہے۔

ہمیں اس گفتگو کی نقل جو بلونت سنگھ مرحوم نے اپنے ہاتھ سے تیار کی تھی ان کی بیوہ محترمہ منجو سنگھ سے جناب اسرار گاندھی کے توسط سے حاصل ہوئی ہے۔ ہم محترمہ منجو سنگھ اور جناب اسرار گاندھی کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور جناب فراق گورکھپوری اور جناب بلونت سنگھ کی روحوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

فراق گورکھپوری اور بلونت سنگھ کی گفتگو ۱۹۷۱ کی ہے۔ اس کے آخری صفحے پر فراق صاحب نے اپنے ہاتھ سے ۱۳ جون ۱۹۷۱ کی تاریخ ڈالی ہے اور دستخط بھی کئے ہیں۔ فراق صاحب کی درج کردہ تاریخ اور ان کے دستخط کی فوٹو کاپی ہم نے بطور تبرک اس گفتگو کے آخر میں ثبت کردی ہے۔ اگرچہ فراق صاحب نے دستخط کرکے گویا مسودے کی تکمیل کی رسمی کارروائی پوری کردی تھی لیکن مسودے کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بعض جگہ ترتیب اور تدوین کی ضرورت ہے۔ بلونت سنگھ مرحوم کو موت نے غالباً اس کی فرصت نہ دی۔ مسودے کے آخر میں دو صفحات سوالوں یا سوال نما بیانات کے ہیں جو بلونت سنگھ نے غالباً بطور یادداشت پہلے سے لکھ لئے تھے تاکہ وہ انہیں فراق صاحب کے ساتھ گفتگو میں استعمال کرسکیں۔ اگرچہ یہ سوالات سب کے سب اس گفتگو میں موجود نہیں ہیں، لیکن بلونت سنگھ کی ایک اہم یادداشت کے طور پر ہم انہیں بھی شائع کر رہے ہیں۔

مسودے میں کہیں کہیں کچھ عجلت کتابت یا سہو حافظہ کی بنا پر چھوٹے موٹے اغلاط راہ پاگئے ہیں۔ ہم نے ان میں سے بعض کی تصحیح حاشیہ میں کردی ہے۔

(بلو)نت سنگھ : یہ درست ہے کہ آپ نے...

(چند سطریں خالی ہیں)

(ف)راق : میں ہوش سنبھالنے کے پہلے ہی نیم شعوری طور پر یہ محسوس کرنے (لگ)ا تھا کہ جو لوگ ہندوستان میں رہتے ہیں اور مادی کائنات کو پاک نہیں سمجھتے (وہ) ہندوستانی تہذیب کے دشمن ہیں۔ پہلے چولھا، چکی، آنگن، پانی، آگ، گھریلو (س)امان اور گھریلو زندگی کے سامنے سر جھک جاتا ہے۔ پہلے گھاس پات کا (اح)ترام شعور میں پیدا ہونا چاہیے۔ پھر کسی غیبی شخص وجود کو ثانوی حیثیت (دے) کر اس کے متعلق گفتگو ہوسکتی ہے۔ میرے نزدیک قادر مطلق کا تصور (ا)یک گندہ تصور رہا ہے۔ طاقت کی پرستش، مالک کی پرستش کے تصور سے میری (آ)نکھوں میں خون اتر آتا ہے، ہندوؤں میں شکتی پوجا کا تصور کسی ایسے وجود کا (تص)ور نہیں ہے جو آفاق کا کمانڈر انچیف ہے۔ ہم جسے شکتی کہتے ہیں وہ ذرے

ذرے کی ماہیت ہے نہ کہ کائنات کی ماہیت۔ کسی غیر مجسم اور حکمراں خدا کے وجود کو ماننا اور ایسے مفروضی خدا کی عبادت یا غلامی کی تعلیم دینا میں کائنات دشمنی اور انسان دشمنی سمجھتا ہوں۔ خدا کا محبوب جو تہذیب اور انسانیت سے مبرا ہو وہ کوئی آدمی نہیں ہوتا۔ چونکہ جن تصورات کو میں نے مندرجہ بالا بیان میں رگڑ کے رکھ دیا ہے، ان تصورات کے ماننے والوں کو ہندوستان اور ہندوستانی تہذیب کی توہین کرتے ہوئے میں نے کم سنی سے ہندوستان میں دیکھا ہے، اس لئے شاعر ہونے سے پہلے ان عقائد اور تصورات سے اپنے آپ کو ایک جلایا ہوا اور نفرت کرنے والا انسان پایا۔

بنیادی طور پر جن محرکات نے مجھے شاعر بنایا وہ چند پرستارانہ جذبات تھے۔ دھرتی کی پرستش، گھریلو زندگی اور اس کے جزئیات کی پرستش۔ اس انسانی زندگی کی پرستش جسے وحدانیت اور خدا پرستی سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ صرف

اس امر سے تعلق ہے کہ وہ انسانیت ہے۔ اور جسے ملت کے تصور سے کوئی تعلق نہیں۔ مناظر فطرت کی پرستش۔ انسان کے باہمی تعلقات کے تصور کی پرستش۔ اس خیال کی پرستش کہ ہم جن جن چیزوں کی پرستش کرتے ہیں، ان کے نام کو پیغمبر گنوا نہیں سکتا۔ یہ تھے چند محرکات یا تحریکات جنھوں نے مجھے شاعری کی طرف مائل کیا۔

بلونت سنگھ : اردو شاعری میں غزل ہی کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہے، یہاں تک کہ اردو کا تقریباً ہر شاعر غزل پر طبع آزمائی ضرور کرتا ہے۔

فراق : حقیقی شاعری خواہ غزل کی شکل اختیار کرے یا دیگر اصناف سخن کی مثالیں پیش کرے اس میں غزلیت کا ہونا لازمی ہے۔ غزل ایک مخصوص صنف سخن ضرور ہے، لیکن غزلیت حقیقی معنوں میں جوہر شاعری ہے۔ مخصوص موضوعات پر اشعار اور نظمیں کہی جا سکتی ہیں اور کہی گئی ہیں، لیکن شاعری کا اہم ترین اور دائمی موضوع حیات و کائنات کے مرکزی حقائق میں غزل کا سب سے اہم موضوع جنسی یا رومانی تعلقات کے رموز و کنایات اور اس کے مختلف پہلو ہیں۔ ایسا اس لئے ہے کہ اگر ہم جنسی تعلقات کو محض ایک اتفاقی میکانکی افادی حیثیت دیں اور ساری اہمیت سیاسی، اخلاقی، اقتصادی اور علمی امور کو دیں تو ہمارا تصور زندگی ایک کھوکھلی اور بے معنی چیز ہو کر رہ جائے گا۔ زندگی کی تمام کوششیں تمام فکریات اور تمام تگ و دو عمل برائے عمل کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ عمل برائے عشق کے لئے ہے۔ سیاسی زندگی، عشقیہ زندگی اور گھریلو زندگی کی لونڈی ہے۔ غزل کی شاعری اسی عشقیہ زندگی اور نجی زندگی کے جمالیات پیش کرتی ہے۔ اور اس کی معنویت سے ہمیں روشناس کرتی ہے۔

بلونت سنگھ :

(چند سطریں خالی ہیں)

فراق : سب سے پہلے میں ایک دوسرے انگریزی مصنف FRANK SWVINNERTON کا یہ قول پیش کروں گا کہ "جو لوگ فحاشی اور عریانی برداشت نہیں کر سکتے ان کے ذہن میں گندگی کار فرما ہے۔" حقیقی معنوں میں تہذیب و لطافت جسی مطالبات کو کھلے دل سے قبول کر کے اور ان مطالبات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جسمانی تلذذ کی معنویت، خلاقیت اور انسان سازی کی طرف اشارہ کرنا، روح کو جسم سے معرا سمجھنا ایک گندہ تصور ہے۔ مادی اشکال زوال پذیر ضرور ہیں لیکن کوئی حقیقت ان سے پاکیزہ تر نہیں۔ مجھے اس موقع پر عاصی[1] غازی پوری کا ایک شعر یاد آتا ہے۔

تمھیں سچ سچ بتاؤ کون تھا شیریں کے پیکر میں،
کہ مشت خاک کی حسرت میں کوئی کوہکن کیوں ہو

جنسیت سے وہی شخص ڈرتا ہے جس کے دل میں چور ہے۔ جنسی تعلقات کا داخلی تصور اور ان کی داخلی حقیقت پاکیزگی کی انتہا ہے۔ چونکہ بہت سے لوگ جنسی تعلقات کا گہرا تصور نہیں رکھ سکتے، انھیں یہ ثواب عظیم گناہ عظیم معلوم

---

[1] آسی (حضرت شاہ عبدالعلیم آسی)

ہوتا ہے۔ جسے مندرجہ بالا سوال میں VULGARITY کہا گیا ہے وہ کن بلندیوں کو چھو سکتی ہے اور کن بلندیوں تک ہمیں لے جا سکتی ہے، اس کا اندازہ ہندوستان میں کھجوراہا کے مندر اور اس کی بت تراشی اور نقاشی سے ہو سکتا ہے۔ اگر جنسی محرکات کار فرما نہ ہوں تو نہ ہم تاج محل کا تصور کر سکتے ہیں، نہ دنیا بھر کے فنون لطیفہ کے شاہکاروں کا۔ جن لوگوں میں جنسی محرکات سے خوف زدگی کا جذبہ پیدا کر دیا جاتا ہے، وہ شاید لنگوٹ کے سچے ہوتے ہوئے بھی دنیا کے سب سے کمینے انسان بن جاتے ہیں۔ جنسیت کو کچل کر ہم انسان دوستی کی سعادت حاصل نہیں کر سکتے۔ ہر نمک حلال انسان جتلائے جنسیت رہتا ہوا بھی ماورائے جنسیت ہوتا ہے۔

بلونت سنگھ : IN A MANNER OF SFEAKING THE POEM IS ITS

(چند سطریں خالی ہیں)

بلونت سنگھ : ہر حقیقی شعر یا نظم کو ہم ایک عالم راز کہہ سکتے ہیں، جو اپنی صوتیات و مفہوم سے ماورا ہوتی ہے۔ لیکن یہ کہنا کسی قدر زیادتی ہے کہ وجدان سلیم رکھنے والا شخص شعر کے صوتیات و مفہوم کے پس پردہ حقائق کو محسوس نہیں کر سکتا۔ انسانی شعور اور تحت الشعور اور لاشعور حقائق کی آخری منزلوں تک ہمیں پہونچا سکتے ہیں لیکن یہ رسائی یا دوررسی یا رساکاری کسی منطقی مفہوم یا معنی تک پہونچ کر ٹھہر نہیں جاتی۔ حقیقی شعر کا منصب علم دینا نہیں ہے بلکہ ایسے محسوسات اور نیم محسوسات دینا جہاں وضاحت و تشریح کام نہیں آ سکتی۔ اگر ہم مفہوم و الفاظ کی منزلوں سے آگے نہیں گزر سکے تو ہم کہیں پہونچے ہی نہیں بلکہ یوں کہیں کہ شعر کی نغمگی اور اس کا لہجہ اس کے لغوی مفہوم سے ہمیں بہت دور لے جاتا ہے۔

بلونت سنگھ : TO-DAY WE LACK VERY MUCH A WHOLE VIEW OF POETRY AND HAVE INSTEAD MANY ONE-

(چند سطریں خالی ہیں)

فراق : سرمایہ دارانہ نظام آج بے مقصدیت کے مسئلے سے دوچار ہے اور اشتراکی نظام کی مقصدیت میں کوئی صحت مندانہ اور داخلی طور پر ہمہ گیر یا محض وجدانی مقصدیت نہیں ہے۔ بڑی مصیبت یہ رہی ہے کہ ہم دنیا میں اب تک جتنے بڑے شاعر گزرے ہیں انھیں کسی خاص سیاسی و اقتصادی فکریات و نظام کا محض علم بردار سمجھتے رہے ہیں۔ ہم ان کی اس ہمہ گیر آفاقیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو عقائد، تصورات اور فکریات سے بالاتر ہے۔ ٹھنڈے دل سے یا مشتعل ہو کر کوئی بڑا شاعر اگر کچھ عقائد کو مانتا ہے تو ہم یہ بھول جاتے کہ اس کا بلند ترین شاعرانہ کارنامہ خود اس کے عقائد اور فکریات سے زیادہ قیمتی اور زیادہ بڑی چیز ہے۔ ایک شاعر کا وجدان اس کے عقائد و فکریات سے زیادہ اہم ہے۔ آج کے شعرا کے پاس سب کچھ ہے لیکن وہ وجدان نہیں ہے جو شاعری کو ہمہ گیر اور بھرپور بناتا ہے۔ ہم شائد اشتراکیت کو قبول کر لیں لیکن اشتراکی ادیبوں کے محسوسات اور وجدان کے مقابلے میں ایسے محسوسات اور وجدان کو اپنائیں گے جو قدیم ادوار کے بلند ترین شاعروں کا وجدان رہا ہے۔ روس اور چین کے

بلند ترین ادیب بھی وجدان کے معاملے میں ان ادیبوں سے کم تر ہیں جن کو دنیا نے بالاتفاق چوٹی کے ادیب مانا ہے خواہ ان کے عقائد اور نظریات میں کتنا ہی نقص ہو' خود مارکس اور لینن ترقی پسند ادیبوں کے مقابلے میں بیتھوون اور شیکسپیئر سے کہیں زیادہ متاثر تھے- اسپنڈر نے دور حاضر کے نام نہاد ادیبوں کی دکھتی رگ پکڑلی ہے-'

بلونت سنگھ : SERIOUS POETRY DEALS WITH THE FUNDAMENTAL CONFLICTS THAT CANNOT BE

(کچھ سطریں خالی ہیں)

فراق : کسی زمانے میں ایک مشہور ادبی رسالہ LONDON MERCURY کے نام سے کئی برس تک جاری رہا- مجھے یاد آتا ہے کہ غالباً J.C SQUIRE (جو اپنے دور کے بہت بڑے ادیب تھے اور رسالے کے مدیر اعلیٰ بھی تھے) نے لکھا تھا کہ شاعری کے دو ہی موضوع ہیں یعنی انسان بنام انسان یا انسان بنام کائنات - انگریزی کی ایک دوسری کتاب کا نام ہے THE ENGLISH POETIC MIND جس میں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی کہ ہر بڑے شاعر کی دنیاوی اور وجدانی زندگی میں ایک بحرانی وقفہ آتا ہے- انگریزی کے ایک شاعر کے کلام سے ایک نقاد نے اپنی ناآسودگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ اس شخص کی زندگی میں وہ انتشار نہیں ہے جو حقیقی شاعری کو جنم دیتی ہے- نطشے نے کہا تھا کہ "OUT OF CHAOS A DANCING STAR IS BORN" میں اسے یوں کہنا چاہتا ہوں کہ ALL LITERATURE IS A PROBLEM LITERATURE ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ادب کا آغاز کہیں نہ کہیں تناقص اور تصادم کے احساس سے ہوتا ہے اور اسی تناقص اور تصادم کے کچے مال سے ہم آہنگی پیدا کرنا ہی حقیقی ادب کا مقصد ہے- بیدار سے بیدار شعور زندگی میں کسی کمی' کسی خرابی' کسی تضاد و تصادم کا احساس کرتا ہے- لیکن فنون لطیفہ کا منصب اعلیٰ یہ ہے کہ منطقی طور پر اگرچہ ہم ان خرابیوں' ناقصوں اور تضادوں کو ماننے پر مجبور ہیں لیکن وجدانی اور جمالیاتی طور پر ہم انہیں ہم آہنگ بنا سکتے ہیں- یہ ہے فنون لطیفہ کی جمالیاتی حقیقت- جون اسٹورٹ مل نے اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ایک بار میری زندگی میں ایک ایسا دور آیا جب میں نے اپنے آپ سے یہ پوچھا کہ وہ تمام بلند مقاصد جن کا میں دلدادہ ہوں اگر پایۂ تکمیل کو پہونچ جائیں تو کیا مجھ کو بڑی خوشی ہوگی- اور میری روح سے آواز آئی کہ ہرگز نہیں- اس بھیانک جواب کا اثر مجھ پر یہ ہوا کہ میں خودکشی کی سوچنے لگا- عین اسی بحرانی عالم میں WORDSWOTH کی نظموں کا مجموعہ میرے ہاتھ آگیا- یہ نظمیں پڑھ کر زندگی پر میرا ایمان پھر سے قائم ہوگیا اور میں خودکشی کرنے سے بچ گیا- ایک لطیفہ یاد آیا- ایک کھلنڈرے لڑکے سے اس کے چچا کہنے لگے کہ تم کھیل کود میں اپنا تمام وقت ضائع کرتے ہو بھلا پتنگ لڑانے سے کیا فائدہ' تاش کھیلنے سے کیا فائدہ' مٹرگشتی کرنے سے کیا فائدہ' لڑکے نے جواب دیا- کہ چچا فائدے سے کیا فائدہ- میرے پروفیسر S.G.DUNN نے ورڈز ورتھ کی نظموں پر مقدمہ لکھتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اگر دنیا میں شاعری نہ ہوتی تو صرف ایک ہی جوگ یا روحانی عمل انسان کے لیے ممکن تھا' اور وہ جوگ یا عمل خودکشی ہوتا- ہاں تو شاعری کا مقصد اعلیٰ صرف یہ ہے کہ اس پر تضاد' پر نقائص' پر تصادم کائنات کا ایسا جمالیاتی شعور ہمیں حاصل ہو جو ناآسودگی کو آسودگی میں بدل دے اور ناہم آہنگی کو ہم آہنگی میں بدل دے' بلکہ معاملہ یہاں تک پہونچ جاتا ہے کہ غم' ناکامی' بیماری اور دکھ کے اظہار کا المیہ ادب ہمیں ایک غیر متوقع لیکن مسلم سکون عطا کرتا ہے- ناقابل قبول کی قبولیت کا ماورائے منطق احساس پیدا کرنا بلکہ غم کو تنعب غم میں تبدیل کردینا ادب کا سب سے بڑا منصب ہے-

بلونت سنگھ : ادب ایک قسم کے NEOROSIS کی پیداوار ہے' اور کیا یہ محض یہی کچھ ہے-

فراق : دنیا میں جتنی بری چیزیں ہیں ان کی کچھ بلند شکلیں بھی ہیں- چھوٹے آدمی کا NEOROSIS ایک چھوٹی چیز ہے لیکن گوتم بدھ کو قریب قریب جس اعصابی بحران کا سامنا کرنا پڑا ہے' اسے ہم چٹکیوں میں نہیں اڑا سکتے- حضرت محمد کو اہل عرب کی گری ہوئی زندگی کے احساس نے جس قدر بے چین بنا دیا تھا اس میں کم از کم مجھے الوہیت کی جھلک نظر آتی ہے- جتنا دکھ ہندوستان کی حالت سے مہاتما گاندھی کو ہوا تھا وہ NEOROSIS سے بہت مختلف نہیں ہے اور یہی بات ہم مارکس اور لینن کے بارے میں کہہ سکتے ہیں- ہر بڑی شخصیت ایک قابل احترام معنوں میں بیمار شخصیت ہوتی ہے- میرے پروفیسر S.D.Dunn[1] نے اب سے تقریباً پینتیس برس پہلے ایک مقالہ پڑھا تھا جس کا عنوان تھا GENIUS AND THE CLINICAL THERMOMETER جو بیمار نہیں ہے وہ صحت مند نہیں ہے- چنانچہ ہمیں NEOROSIS کے لفظ سے ڈرنا نہیں چاہئے- کچھ حالات اگر ہمیں بے اختیار نہ کردیں تو ہم ترقی نہیں کرسکتے- اس اعصابی اذیت اور خرابی میں بہت سے خلاقانہ صلاحیتیں اور امکانات مضمر ہیں- سب سے بڑا سکون وہ سکون ہے جس میں کرب و درد کی تھرتھراہٹیں توازن حاصل کرلیتی ہیں اور شو کے تانڈو رقص میں ضدین کی اسی ہم آہنگی کو مجسم کردیا گیا ہے-

جب منطق ہمیں یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ وجود بجائے خود ایک متصادم حقیقت ہے' تو وجود کی ہم آہنگی کا احساس کیا ایک دھوکا اور بھرم نہیں ہے- کیا ایسا احساس ایک WISHFUL THINKING نہیں ہے- اسی نازک موقع پر عشق کا لفظ آڑے آتا ہے- کوئی شخص یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ وہ جس محبوب سے محبت کرتا ہے وہ دنیا کی سب سے بڑی ہستی ہے یا اس کے ماں باپ' بھائی بہن اور اس کی اولاد دنیا کے عظیم ترین یا بہترین انسان ہیں- یا اس کا ملک اور اس کے مناظر' اس کا گھر' پڑوس اور ماحول' اس کے دوست اور ساتھی دنیا کی سب سے بڑی حقیقتیں ہیں- پھر بھی وہ ان سب پر اپنی جان چھڑکتا ہے- ان حقائق سے یہ ثابت ہوا کہ جہاں منطق بہت کچھ ہے' عقلیت بھی بہت کچھ ہے

---

[1] صحیح نام S.G.DUNN ہے-

جہاں ایک جذبات کی منطق ہوتی ہے اور ماورائے عقلیت ایک عقلیت ہوتی جس کو ہم مجموعی طور پر وجدانیت کہتے ہیں یا چاہیں تو انسانیت کہہ سکتے ہیں۔ انسان کو حیوان ناطق کہا گیا ہے لیکن اس فقرے میں ہم لفظ ناطق کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دیتے ہیں۔ انسان (ذی حیات) پہلے ہے 'ناطق بعد کو ہے' بلکہ بہت بعد کو۔ جب ہم ایک بچے کو پیار کرتے ہیں تو اس کی زندگی کی افادیت کو جو فی الحال ایک صفر سے زیادہ نہیں ہے خاطر میں نہیں لاتے۔ قوس قزح سے دنیا کا کوئی فائدہ نہیں لیکن اسے دیکھ کر ہمارا دل اچھلنے لگتا ہے۔ مناظر قدرت اگر روس اور امریکہ کی فیکٹریوں کی طرح نظر آئیں تو منطقی لحاظ سے دنیا کا کوئی نقصان نہیں' لیکن خدا نہ کرے ایسا ہو۔ اسی لئے ایک مفکر نے کہا تھا۔ ALL ART IS USELESS۔ فن برائے فن بہت بلند آدرش ہے۔ لیکن اس کا مطلب امانت لکھنوی یا نوح ناروی والی شاعری نہیں ہے۔ اس پر عظمت فقرے کا مطلب یہ ہے کہ ہم مثال کے طور پر کوہ ہمالیہ کی ایسی مصوری کریں کہ اس سے کوئی افادی پہلو نہ نکلے لیکن روح میں بالیدگی پیدا ہو۔ برناڈشا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عشق میں چاہنے کے تصور کو کوئی جگہ نہیں ہے۔

بلونت سنگھ : اردو شاعری میں امرد پرستی کیوں آگئی۔ امرد پرستی دیگر زبانوں کے ادب میں بھی موجود ہے' کیا آپ اس پر کچھ روشنی ڈالنے کی زحمت کریں گے۔

فراق : مذکر کا صیغہ مؤنث کا محض الٹا نہیں ہے یا محض اس کی ضد نہیں ہے۔ بلکہ مونث میں تخصیص ہے اور مذکر میں ہمہ گیری۔ غزل میں عشق کا ذکر ہوتا ہے۔ فلاں نام والے مرد کا فلاں نام والی عورت سے عشق کا ذکر نہیں ہوتا۔ لکھنؤ کی عورتیں اس بات سے بہت بچتی ہیں کہ اپنے متعلق مؤنث کا صیغہ لائیں۔ وہ ایسے فقرے نہیں بولتیں کہ ' میں آئی' بلکہ کہتی ہیں کہ ' ہم آئے'۔ کسی دوسرے شاعر کا نہیں بلکہ حالی پانی پتی کا یہ شعر لیجئے جسے اردو غزل سے بہت سی شکایتیں تھیں۔ کہتے ہیں۔ ؎

بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں' جانتے ہیں وہ
ہم وہ نہیں کہ جس کو منایا نہ جائے گا

' جانتے ہیں' کے ٹکڑے کو ' جانتی ہیں' کر دیجئے تو شعر کتنا پھوہڑ ہو جائے گا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ ہم مذکر کے صیغے کو تو مؤنث کے لیے پردہ بنا سکتے ہیں لیکن مونث کے صیغے کو مؤنث کے لیے پردہ نہیں بنا سکتے۔ فانی کا شعر لیجئے۔ ؎

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جو وہ مقابل سے اٹھا
مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

پہلے مصرعہ میں اٹھا کو اٹھی یا اٹھیں کر دیجئے اور دیکھئے شعر کی کیا گت بنتی ہے۔ ایسا سمجھنا بالکل غلط ہے کہ اردو شاعروں کی اکثریت امرد پرست تھی لیکن غزل اتنی پاکیزہ صنف سخن ہے کہ یہاں محبوب کے جنس کی تخصیص کرنا بدتمیزی سمجھی جائے گی۔ مثنویوں میں یا دیگر اصناف سخن میں مشکل ہی سے کبھی امرد معشوق کا ذکر آتا ہے۔ کھلم کھلا عورتوں سے عشق کا اظہار کیا گیا ہے۔ رہی بات

دوسری زبانوں کے ادب میں اظہار امرد پرستی کی۔ اس کی مثالیں افلاطون کے وقت سے آج تک کے ادب میں ملتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ عاشق مزاج شخصیتوں میں دو ایک فیصد ہی ایسی ہستیاں گزری ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کو عملی طور پر وقف امرد پرستی کر رکھا ہو۔ اس لیے دنیا کا عشقیہ ادب بہت کم امرد پرست جذبات کا حامل رہا ہے۔ ہمیں امرد پرستی کو قابل لعنت بتانے کے بدلے اس جذبے اور عمل کے ساتھ ایک سمجھوتہ کر لینا چاہئے کہ امرد پرستی ایک وبا کی طرح سماج میں نہ پھیلے۔ لیکن جو لوگ خلوص قلب سے اور اپنی تقاضائے فطرت سے اس کی طرف مائل ہوں ہم انھیں بھی اپنے سماج کا فرد قبول کر لیں۔ اب وہ وقت آچکا ہے بلکہ اس سے بہت پہلے آچکا تھا کہ جب ہم اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ ہم جنسیت کا بھی ہمارے تمدن میں ایک مقام ہے۔ امرد سے محبت ہو یا عورت سے محبت ہو' دونوں قسم کی محبتیں ہمیں بہت نیچے بھی گرا سکتی ہیں اور بہت اونچا بھی اٹھا سکتی ہیں۔ بقول داغ ؎

عشق بازی کو ہے سلیقہ شرط
یہ گناہ[1] بھی ہے یہ ثواب بھی ہے

امرد پرستی نے لاکھوں زندگیوں کو سنوار کر رکھ دیا ہے۔ اس موضوع پر غالباً سب سے زیادہ بصیرت افروز تحریریں EDWARD CARPENTER کی ہیں۔ لیکن میں یہ پھر بھی کہوں گا کہ اردو غزل میں اگر چار پانچ ہزار ایسے اچھے اشعار آئے ہوں جن میں محبوب کے لیے مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے تو ایسے اچھے اشعار چالیس پچاس ہزار آئے ہیں جن میں مذکر کا صیغہ نہیں لایا گیا۔ مثلاً ؎

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
خیر تم نے تو بے وفائی کی

غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

ایک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

نکلیں اگر وہاں سے تو ہم تک بھی پہونچیں
پھرتی ہیں وہ نگاہیں پلکوں کے سائے سائے

(میر)

ایسے پچاسوں ہزار اشعار میں کون کہہ سکتا ہے کہ محبوب عورت نہیں

---

[1] اصل میں یوں ہے : یہ گنہ بھی ہے یہ ثواب بھی ہے

ہے۔ لیکن —

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

یہاں وہ نہیں بھولتی کتنا سخت بدتمیزی ہے۔

بلونت سنگھ : بھارت کے بٹوارے نے اجتماعی شعور.....
(چند سطریں خالی ہیں)

فراق : موجودہ زمانے میں محض گھریلو یا سماجی یا ذاتی زندگی پر ادب کا دار و مدار نہیں ہو سکتا بلکہ اسکولوں اور کالجوں میں زبان و ادب کی جیسی تعلیم دی جائے گی اسی پر ادب کی تعمیر ہو سکے گی۔ میں محض شاعر نہیں رہا ہوں بلکہ ایک معلم بھی رہا ہوں اور جس طرح تعلیم کو روز بروز پستی کی طرف ہم لے جا رہے ہیں اسی پستی کی طرف ہمارا ادب بھی جائے گا۔ میں اسے مدتوں سے محسوس کرتا رہا ہوں کہ اردو کے کامیاب ادیب بھی وجدان اور شعور کی وہ سنجیدگی حاصل کرنے سے محروم رکھے گئے ہیں جسے صرف گہرا مطالعہ اور بلند تعلیم ہی ہمارے نوجوانوں کو دے سکتی ہیں۔ مرزا غالب کی فلم کو لے لیجئے جسے دو مشہور ادیبوں نے بنایا ہے۔ دونوں نے موضوع کو اور اسے پیش کرنے کے طریقے کو کافی نیچے گرادیا ہے۔ جس ہندی کو بڑھا ہرا اتنا اچھالا جا رہا ہے آج اس کی تعلیم بھی مٹی میں ملادی گئی ہے۔ ہندوستان کو آج ایک تعلیمی انقلاب کی ضرورت ہے۔ کہا نہیں جاسکتا کہ یہ انقلاب کب آئے گا۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ انقلاب کبھی آئے گا یا نہیں۔ اس لئے اردو یا ہندوستان کی کوئی اور زبان ہو اس کے ادب کے مستقبل کا خدا ہی حافظ ہے۔ آج جاہل سے جاہل آدمی' جو ایک پوسٹ کارڈ صحیح نہیں لکھ سکتے' پارلیمنٹ کے ممبر ہو رہے ہیں۔ منتری ہو رہے ہیں' گورنر ہو رہے ہیں' اور ہزاروں کی تعداد میں بڑے بڑے افسر ہو رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ایسے جاہل لوگ یونین اور صوبجاتی پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہو رہے ہیں' پروفیسر ہو رہے ہیں' ہائی کورٹ کے جج ہو رہے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ادب کا خدا حافظ۔

بلونت سنگھ : اردو ادب میں ہندو' مسلمان' سکھ اور ہندوستان کے دوسرے لوگ جس مشترکہ تہذیب کی نمائندگی کریں گے اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

فراق : اس امر میں میری گزارش یہ ہے کہ تعصب سے پاک رہتے ہوئے بھی مسلمان مسئلے کی تہ تک نہیں پہونچے۔ اردو کے مسلمان ادیبوں کے فرائض ان فرائض سے کچھ مختلف ہیں جنہیں میر و غالب' آتش و ناسخ' انیس و دبیر' حالی و اقبال نے پورا کیا۔ ہندوستان ہمیشہ بدلتا رہا ہے لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہماری تہذیب اور ثقافت و ادب کی جڑیں اگر سنسکرت ادب میں اور ادب سے نہیں پھوٹتیں تو یہ جڑیں ہندوستان کی زندگی میں اوپر سے نہیں پھوٹتیں۔ ادب کا سب سے بڑا کام قومی مزاج کی تخلیق کرنا ہے۔ یہ مزاج موجودہ دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا ہوا وہی مزاج ہوگا جو ویدوں' اپنشدوں' پرانوں' مہابھارت' رامائن' کالیداس اور دیگر ان شاہکاروں اور شاعروں کا مزاج ہے جو ہندو تہذیب کے معمار ہیں۔ ثقافتی' وجدانی اور تہذیبی طور پر ہر غیر ہندو کو ہندو بنتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں میں ہندوستان سے ایک نیم مغائرت کا جذبہ کار فرما رہا ہے۔ مسلمانوں نے ہندوستان کی بڑی خدمتیں انجام دی ہیں۔ لیکن ہندوستان کے تہذیبی ورثہ کے تمام اہم عناصر کو وہ اپنا نہیں سکے۔ اس تہذیبی ورثے کو اپنانا اور اس ورثے سے اپنے آپ کو مالا مال کرنا تمام ہندو اور غیر ہندو ادبائے اردو کا اہم ترین فرض ہے۔

بلونت سنگھ : شعر کہنے کے لئے آپ کیسا ماحول پسند کرتے ہیں۔

فراق : ماحول کا لفظ بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر سکتا ہے۔ ماحول کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس کا تعلق ماضی سے ہے۔ ہندوستان میں اردو ادب کے ادیب کی شخصیت میں ہندوستان کی قدیم ترین تاریخ سے لے کر آج تک کی تہذیبی قدریں کار فرما ہیں۔ محض سطحی اور انفرادی نیکی' شرافت' ظاہری اور فنی صلاحیت سے بڑا ادب پیدا نہیں ہوتا۔ ہم دور نہ جائیں پریم چند کو لے لیں۔ پریم چند بہت بڑے ادیب تھے۔ لیکن ان کی شخصیت میں وہ قدریں کار فرما نہیں آئیں جو شکنتلا ایسے شاہکار کو جنم دے سکیں۔ ہم جب شکنتلا پڑھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ شرت چندر یا پریم چندر یا کرشن چندر کے کارنامے پڑھتے ہیں تو شکنتلا کے مقابلے میں ان دیگر بڑے ادیبوں کے کارناموں میں ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ تہذیب کے سمندر سے بڑے اقدار کا نکالنا سمندر منتھن کی قسم کا کام ہے۔ ٹالسٹائی کوئی معمولی ادیب نہیں لیکن محض ادبی اور فنی لحاظ سے نہیں بلکہ اخلاقی وجدان کے لحاظ سے وہ شیکسپیئر کے مقابلے میں ایک گرا ہوا آدمی ہے۔ حالاں کہ اپنی ہر تحریر میں گھگی باندھ باندھ کر اس نے صرف اخلاق کی دہائی دی ہے۔ ٹالسٹائی کا عظیم ترین کارنامہ بھی شیکسپیئر کے معمولی ناٹک جولیس سیزر کی انسانیت اور شرافت کو چھو نہیں پاتا۔ ٹالسٹائی کی کوئی کتاب اس عظمت کو چھو نہیں سکتی جو ہم VICAR OF WAKEFIELD اور SILAS MARNAR میں پاتے ہیں۔ ٹالسٹائی کے فرشتے بھی ڈیوڈ کو پرفیلڈ نہیں لکھ سکتے۔

بلونت سنگھ : ادب کے متعلق ہم آپ کے کچھ اور اہم خیالات جاننا چاہتے ہیں۔

فراق : ادب زندگی کے واقعات کی مصوری نہیں ہے۔ ان بلند مقاصد کی مصوری ہے جن کا تعلق دنیا سے غلط نظام' بے انصافی' ظلم اور جہالت کو دور کرنا ہے۔ یہ کام بہت اہم ہے اور بڑے بڑے لیڈر انہیں انجام دیتے ہیں' عظیم ادیب' سیاسی لیڈروں کا خیابا بردار نہیں ہوتا۔ وہ ادب کے ذریعے سے وہی نتائج پیدا نہیں کرنا چاہتا جو سیاسی جدوجہد سے گاندھی یا لینن پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ادب تحریک سیاست کا رضاکار نہیں ہے۔ ادیب کا صرف ایک کام ہے۔ جب اور لوگ اور ان کی کوششیں دنیا کو سب کچھ دے چکیں تو ان کے بعد یا ان سے علیحدہ رہ کر ادیب دنیا کو جمالیاتی شعور دے۔ سوچنے کی بات ہے کہ مارکس' لینن

ے

ٹرچوف، میکسی، گیبری بالڈی، گاندھی، اور پیغمبرانہ عالم دنیا کو وہ چیزیں کیوں نہیں دے سکے جو رامائن، مہابھارت، الیڈ اور اوڈیسی AENIED کے شعرا یا دیگر مشاہیر شعر و ادب دنیا کو دے سکے۔ میں کسی بڑے فن کار کے مقابلے میں کسی دوسرے بڑے سے بڑے آدمی کو جگہ دینے کو تیار نہیں ہوں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ بڑے لوگ اگر اپنا کام سرانجام نہ دیتے، تو ادیب یا شاعر کیسے کام کر سکتا تھا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر مہتر ہڑتال کر دیں تو وہ لوگ کوئی کام نہیں کر سکتے جو مہتر نہیں ہیں۔ عمل کے سورما تاریخ کے مہتر ہیں اور فنون لطیفہ کے سورما تاریخ کے عطار ہیں۔ کیا اس لئے مہتر کا پیشہ دنیا کا بلند ترین پیشہ مانا جائے گا۔ کسی کام کا لازمی یا ناگزیر ہونا اس کام کی داخلی اہمیت کی دلیل نہیں ہے۔ زندگی کے مقاصد وہ چیزیں نہیں جنھیں ہم مقاصد سمجھتے ہیں بلکہ وجدانی احساسات اور تجربات حاصل کرنا یا غیر مقصدی اور غیر افادی تجربات سے اپنے کو شرابور کرنا بلکہ یوں کہیے کہ غیر مقصدیت سے زندگی کو مالا مال کرنا زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ زندگی کا مقصد وہ مشقت نہیں ہے جس سے تاج محل کی تعمیر ہوتی ہے بلکہ اس جمالیاتی شعور کا حاصل کرنا ہے جس نے تاج محل کے خواب کو جنم دیا اور جو تاج محل کو دیکھ کر ہمارے اندر پیدا ہوتا ہے۔ افادی عمل ایک نہایت ضروری اور نہایت گری ہوئی چیز ہے۔ ہونا، کرنے سے بہت بڑی بات ہے۔

بلونت سنگھ : آزادی ملنے کے بعد ہم تہذیبی ترقی کے کچھ منازل طے کر سکے ہیں یا نہیں؟

فراق : حصول آزادی ہم کو ایک ایسے آدمی کی رہبری سے نصیب ہوئی جو کئی لحاظ سے بہت بڑا آدمی تھا اور کئی لحاظ سے بہت چھوٹا آدمی تھا یعنی مہاتما گاندھی۔ اس شخص کا شعور اور اس کا پورا وجود اس قابل تھے ہی نہیں کہ فن تعمیر، فن مصوری، فن رقص، فن موسیقی، فن بت گری، فن ادب، علوم اور بلند تعلیم و تربیت یافتہ دماغ کے مفہوم کو کچھ بھی سمجھ سکے۔ مہاتما گاندھی کی عظمت ایک ایسی تھی جس نے ہندوستان کو آزاد بھی کیا اور مستقل طور پر ان عظمتوں کی قدر شناسی سے ہمیں محروم کر دیا جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔ مارکس اور لینن ایسے سورماؤں اور دلدادگان عمل کے متعلق ایسی خبریں ہم تک پہونچی ہیں کہ صدہا ادیبوں اور فن کاروں کے کارناموں پر یہ جھومے ہیں۔ لیکن ہائے ہائے ایک تھے مہاتما گاندھی جو کئی لاکھ الفاظ زندگی میں بولے لیکن ا۔نجلا، ٹکستا، خسرو، تان سین، جے سی بوس اور آفاقی تہذیب کے دیگر پائندہ پائندہ ہستیوں اور کارناموں کے لئے اٹھتر برس کی لمبی چوڑی زندگی میں پانچ سات لفظ بھی نہیں بول سکے بلکہ سر جے سی بوس کی شان میں انھوں نے یہ گستاخی کی کہ ایک پبلک جلسے میں کہہ دیا کہ جے سی بوس کی دریافتوں سے عوام کو کیا فائدہ ہوا۔ واہ رے عوام، واہ رے فائدہ۔ بوجھیں تو لال بجھکڑ اور نہ بوجھیں کوئے۔ اس شخص کی روح محض انگریزی حکومت ہی سے نہیں لڑتی بلکہ علم و ادب سے بھی لڑتی تھی اور تہذیب کی بلند قدروں کو سمجھنے سے بالکل معذور تھی۔ مہاتما گاندھی عمر بھر میں اگر کبھی اس موضوع پر کوئی مضمون لکھنا چاہتے کہ ہندوستان

کا روشن ترین دماغ کن کن صلاحیتوں کا حامل ہو تو وہ مضمون نہایت سڑا ہوتا۔ اس شخص نے ثقافتی اور تہذیبی لحاظ سے ہمیں بھک منگا بنا دیا ہے۔ یہ سب طنزیہ طور پر کہہ چکنے کے بعد ہم بھی کہیں گے کہ مہاتما گاندھی کی جے!

جاہل ہوتے ہوئے بھی یہ شخص ہمیں بہت کچھ دے گیا ہے۔ زندگی کی بہت سی قدریں جو علم ہی نہیں بلکہ فنون لطیفہ سے بے نیاز ہیں۔ عدم تشدد کا سبق، جرأت اور ہمت کا سبق، مادی طاقت کے سامنے سر نہ جھکانے کا سبق، نہتوں کو مسلح قوتوں سے لڑنے کا سبق، زندگی میں ایک شان دار تیور پیدا کرنے کا سبق، دنیا کی سب سے چالاک اور تجربہ کار قوم کے تمام ہتھکنڈوں کو بے کار کر دینے کا سبق جو ہمیں مہاتما گاندھی نے دیا، وہ کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ مہاتما گاندھی اور ان کے اثرات ہماری غلامی کے لئے بہت کار آمد تھے۔ لیکن ہماری آزادی کے لئے گاندھیت یا تو بالکل بے کار چیز ہے یا بہت کم کار آمد ہے۔ جنگ آزادی میں ہم بدیشی حکومت کو مٹا دینا ہی اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھے تھے۔ آزادی حاصل ہونے کے بعد ہم کیا کریں اس سوال کا جواب دینا مہاتما گاندھی کے بس کا کام نہیں تھا؛ سی لئے یہ خطرناک اور کار آمد آدمی، یہ بڑے کام کا اور نہایت نکما آدمی ہمیشہ سوراج کے لئے لڑتا رہا اور سوراج کے لوازمات بتانے سے ہمیشہ دامن بھی کتراتا رہا، ایک بار یہ حضرت یعنی مہاتما گاندھی میسور سنٹرل کالج الہ آباد میں تشریف لائے۔ ان دنوں میں پنڈت امرناتھ جھا، کپل دیو مالویہ اور پرکاش نارائن سپرو سب میسور کالج کے طالبعلم تھے۔ پرکاش نرائن نے مہاتما گاندھی سے سوال کیا کہ کم سے کم کتنی (رقم) یا مالی حیثیت رکھنے کی اجازت آپ کسی کو دیں گے جس کا جواب مہاتما گاندھی نے یہ دیا کہ کچھ نہیں۔ ایسے ہی موقع کے لئے شیخ سعدی نے لکھا تھا۔

بایں عقل و دانش بہ باید گریست[1]

ہائے ہائے

فراق گورکھپوری
۱۳ جون ۱۹۶۱ء

---

[1] اصل میں یوں ہے : بریں عقل و دانش بہ باید گریست

۱- اس میں کچھ شک نہیں کہ آپ نے شاعرانہ صلاحیت کے ساتھ جنم لیا لیکن کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ بچپن اور لڑکپن میں کن حالات میں کن چیزوں نے آپ کی اس صلاحیت کو ابھارا اور سنوارا؟

۲- آپ کی تعلیم کس جگہ ہوئی؟

۳- اردو شاعری میں غزل ہی کو اس قدر اہمیت حاصل کیوں ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اردو کے ہر شاعر کو غزل کے میدان میں طبع آزمائی کرنی پڑتی؟

۴- اقبال کے وہاں زیادہ زور نظم پر ہی ہے لیکن پھر بھی اردو شاعروں نے نظم کو کم ہی اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ہے۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ نظم کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

۵- غزل عام طور پر معاملات حسن و عشق کے لئے مخصوص ہے۔ زندگی کے دوسرے مسائل اس میں کم ہی جگہ پا سکتے ہیں اس صورت میں جب کہ دنیا کے حالات بدل رہے ہیں کیا غزل کا مستقبل روشن ہے؟

۶- شاعروں کا جو گروہ ۱۹۴۷ء تک اہمیت حاصل کر چکا ہے کیا اس کے بعد بھی آپ کی نظر میں کوئی قابل ذکر شاعر میدان میں آیا ہے؟

۷- تقسیم ہند سے پہلے اردو شاعری کے پس منظر میں اس برِاعظم کا مجموعی اجتماعی شعور کام کر رہا تھا۔ تقسیم کے بعد پاکستان کے شاعر کی دنیا پہلے کے بہ نسبت خاصی محدود ہو گئی... ادھر بھارت میں یہ خیال ابھر رہا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ اردو نے علیحدگی اختیار کی ہے۔ ان حالات میں شاعر کا رول پاکستان اور بھارت میں کیا ہے۔ اردو شاعری کا مستقبل کیا ہوگا؟

۸- جہاں تک شاعری کا تعلق ہے آپ کیمونسٹ اور نان کیمونسٹ نقطۂ نظر میں کیا فرق سمجھتے ہیں؟

۹- کیا شاعری کا سب سے بڑا مقصد شاعری کی جمالیاتی حس کی تسکین کرنا ہے؟

۱۰- کیا آپ وجدان.... کو بھی اکتساب علم کا ایک ذریعہ تسلیم کرتے ہیں۔

TODAY WE LACK VERY MUCH A WHOLE VIEW OF POETRY,AND HAVE INSTEAD MANY ONE-SIDED VIEWS OF POETRY WHICH HAVE BEEN ADVERTISED AS THE ONLY AIMS WHICH POETS SLOUND ATTEUPT.

(STEPHEN SPINDER)

کیا یہ بات اردو شاعری پر لاگو ہوتی ہے... اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

۱۲- شعر کہنے کے لئے آپ کس قسم کا ماحول پسند کرتے ہیں۔

۱۳- کہتے ہیں نظم کہتے سے شاعر کو گلے سڑے سیبوں کی بو کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ والٹر امیر کو تمباکو نوشی کی، آڈن AUDEN کو چائے کی، سپنڈر کو کافی اور آپ کو کسی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے--- کیا آپ کو بھی اس قسم کی کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؟

۱۴- ALLEN TALER کے الفاظ ہیں :

IN A MANNER OF SPEAKING THE POEM IS ITS OWN KNOWER,NEITHER POET NOR READER KNOWING ANYTHING THAT THE POEM SAYS APART FROM THE WORDS OF THE POEM.

آپ کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے؟

۱۵- پھر ALLEN TALER کے الفاظ ہیں :

SERIONS POETRY DEALS WITH THE FUNDAMENTAL CONFLICTS THAT CANNOT BE LOGICALLY RESOLVED: WE CAN STATE THE CONFLICTS RATIONALLY BUT REASON DOES NOT RELIEVE US OF THEM,THEIR ONLY FINAL COHERANCE IS THE FORMAL RECREATION OF ART WHICH "FREEZES" THE EXPERIENCE AS PERMANENTLY AS A LOGICAL FORMULA, BUT WITHOUT. LIKE THE FORMULA, LEAVING ALL BUT THELOSIC OUT.

"ITS ONLY WITH GREAT VULGARITY THAT YOU-N CAN ACHIVE REAL REFINEMENT, ONLY OUT OF BOUNDRY THAT YOU CAN GET TENDERNESS." DURREL (LAWRENCE)

A.T.W.SIMEONS

غزلیں

جگن ناتھ آزاد

یہ ہے قصہ خواب آزادی تعبیر کا
تنگ تر ہوتا گیا حلقہ مری زنجیر کا

ہو سکے تو جائزہ اک بار لے تدبیر کا
رونے والے اس طرح ماتم نہ کر تقدیر کا

غنچہ کھلنے سے بھی پہلے اپنے ہی خوں میں ہے غرق
ہائے کیا نقشہ ہے اٹھتے درد کی تصویر کا

اے خرد والو! جسے ظلمت سمجھتے آئے ہو
آنکھ بینا ہو تو اک یہ بھی ہے رخ تنویر کا

عزم اپنا کیا ہے اک گرتی ہوئی دیوار ہے
دل شہید آرزو ہے حسرت تعمیر کا

میکدے میں اک فرنگی رند نے مجھ سے کہا
کوئی ہے تقدیر کا مارا کوئی تدبیر کا

ہائے کس انداز سے چلنے لگی موج صبا
ہو بہو عالم ہے لہرائی ہوئی زنجیر کا

"ہر نئی تعمیر کو لازم ہے تخریب تمام"
غور سے سن اے کہ تجھ کو شوق ہے تعمیر کا

یہ اک اسلوب بیاں ہے معترض اس پر نہ ہو
شعر میں مضموں گر آئے خنجر و شمشیر کا

یوں تو افسانہ ہوا اے زندگی دور شباب
دل نہیں بھولا مگر نغمہ ابھی زنجیر کا

اپنی بات آزاد اپنے رنگ میں کہتا ہوں میں
ہوں میں عاشق لہجہ غالب کا' طرز میر کا

اسی نے آکے مجھے اذن رہنمائی دیا
عجیب سایہ تھا ظلمت میں جو دکھائی دیا

یہ اور بات کہ ہمعصر اس کو سن نہ سکے
وگرنہ میں تو ہر اک دور میں سنائی دیا

ابھی تک اس کو مرے پاؤں یاد کرتے ہیں
وہ جس نے عزم کو ذوق شکستہ پائی دیا

ہمالیہ کی طرح تھا میں ان زمینوں پر
عجیب لوگ تھے جن کو نہ میں دکھائی دیا

مہکتے پھول کی خوشبو کہاں کہاں نہ گئی
اسی نے مجھ کو بھی احساس خود نمائی دیا

بغیر چہرہ تو تھے' بے ضمیر لوگ بھی تھے
نہ اپنا نالہ' ماتم جنھیں سنائی دیا

کہاں گئی مری خلوت کی زندگی آزاد!
یہ کس خلش نے مجھے درد آشنائی دیا

غزلیں

سید امین اشرف

جو ڈر اپنوں سے ہے، غیروں سے وہ ڈر ہو نہیں سکتا
یہ وہ خنجر ہے جو سینے سے باہر ہو نہیں سکتا

جو سچ پوچھو تو یہ تصویر بھی ہے سانحہ جیسی
کسی بھی سانحے پر کوئی ششدر ہو نہیں سکتا

کھٹکتی ہے کسی شے کی کمی اس دارفانی میں
شکستہ بام و در جس کے نہ ہوں گھر ہو نہیں سکتا

یہ آخر کیوں کہ ہر دن ایک موسم، ایک ہی منظر
جہاں زیر و زبر ہو، اس سے بہتر ہو نہیں سکتا

نہ شامل ہو جو آشفتہ خیالی ذہن محکم میں
وہ کچھ بھی ہو، چمن زار معطر ہو نہیں سکتا

کلی کا لب، بدن کندن کا، قامت سرو کی لیکن
وفا نا آشنا میرے برابر ہو نہیں سکتا

فقط صورت میں کیا رکھا ہے اے حسن تماشا بیں
کہ کار آئینہ سے میں سکندر ہو نہیں سکتا

اس عالم کو تحیر ہی نہیں، عرفاں بھی کہتے ہیں
بسا اوقات کوئی رنج دل پر ہو نہیں سکتا

کسی کو چاہنے سے باز آنا کیسے ممکن ہے
لکھا ہے جو کتابوں میں وہ اکثر ہو نہیں سکتا

ترے انکار کو اس زاویے سے دیکھتا ہوں میں
ترا ملنا بھی معیار مقدر ہو نہیں سکتا

یہ مانا عیب بھی ہیں سیکڑوں، کس میں نہیں ہوتے
امین اشرف مگر تجھ سا قلندر ہو نہیں سکتا

مگر اسی کا مرے شہر میں جواب نہ تھا
وہ کوئی پیرہن لالہ و گلاب نہ تھا

فضا میں پھوٹ رہا تھا جو رنگ روئے خیال
وہ کون ذرہ ہے ایسا جو محو خواب نہ تھا

تمام ڈوب رہے تھے درون دجلۂ دل
شجر کا ایک بھی پتا کنار آب نہ تھا

فشار جاں کی تو عادت سی ہوگئی ہے مجھے
ترا جمال ہی عالم میں انتخاب نہ تھا

نہ ہوسکا اسے اندازۂ محبت بھی
پلک بچھی تھی مگر ہاتھ میں گلاب نہ تھا

نبھا سکے نہ ہمیں شرط دوستی اے دل
وہ انتظار مسلسل تھا، اضطراب نہ تھا

عطا ہوا جو یقیں تیری شان رحمت پر
مری خطا کو بھی اندازۂ حساب نہ تھا

زبیر رضوی

اپنا عشق بھولیں

چلو کچھ دیر
جسموں کی بچھی چادر لپیٹیں
لمس کے سب ذائقے بھولیں
لب و رخسار پر پھیلی ہوئی
بوسوں کی یہ سرخی مٹائیں
فرش پر پھینکے ہوئے کپڑے
پہن لیں
اور گہرے پانیوں میں
تیرتی مچھلی کو
سطح آب پر لائیں
زمیں کے جسم پر ہم پھر سے
اپنی انگلیاں رکھ دیں
فلک کے کونے کونے منظروں کو
آنکھ میں بھر لیں
کہیں سے شہر کو دیکھیں
کہیں سے اپنا گھر دیکھیں
چلو کچھ دیر
اپنا عشق بھولیں
اور ہم تم
زندگی کے مختصر
رشتوں میں بٹ جائیں!

دھوپ اور ماضی

بہت دن بعد
سارے گھر میں
دیواروں پہ، آنگن میں
سنہری، چمچماتی دھوپ نکلی ہے
اندھیری کوٹھری کے بند صندوقوں میں
سالوں سال سے رکھا ہوا
اک عمر کا اندوختہ

نادر اثاثہ
سب کا سب باہر نکالیں
دھوپ کے ہاتھوں پہ رکھیں
اس کی سیلن سوکھ جانے دیں
کسے معلوم جانے کب
سنہری، چمچماتی دھوپ پھر نکلے
اندھیری کوٹھری کے بند صندوقوں کو
پھر سے کھولنے کا
جانے کب کس کو خیال آئے :

جو بیت گیا سو بیت گیا

مدتوں کے بعد
وہ دونوں اچانک
راستے میں مل گئے تھے
اور حیرت سے
وہ اپنے سن رسیدہ قامتوں
اور صورتوں کو دیکھتے تھے
گردش ایام
پیچھے کی طرف کو مڑ گئی تھی
سارا ماضی
آنکھ کی پتلی میں آکر جم گیا تھا
وہ بہت ماضی میں کھونا چاہتے تھے
اور بہت آپس میں کہنا چاہتے تھے
جانے پھر کیا سوچ کے وہ رک گئے تھے
اور بیگانوں کی صورت
زندگی کی بھیڑ میں پھر کھو گئے تھے!

غزل

عادل منصوری

جینا بھی ہو سکے کبھی مرنا بھی ہو سکے
شاید ترے بدن سے گزرنا بھی ہو سکے

دیوار کے سکوت سے ڈرنا بھی ہو سکے
ہمزاد سے کلام کا کرنا بھی ہو سکے

زلفوں کی چھاؤں میں جو اترنا بھی ہو سکے
محشر کی دھوپ بیچ ٹھہرنا بھی ہو سکے

یہ کون پل صراط سا حائل ہے راہ میں
چڑھنا بھی ہو سکے نہ اترنا بھی ہو سکے

اٹکا ہوا ہے سانس کا کانٹا گلے میں یوں
چپ سادھنا نہ آہ کا بھرنا بھی ہو سکے

دیدۂ ویران شہر کو کچھ سوجھتا نہیں
مشکل کشائی آپ سے ورنہ بھی ہو سکے

صحرا کے بیچوں بیچ کوئی اونٹ بھی نہیں
سورج کے ساتھ کیسے سفر تا بھی ہو سکے

یہ اور بات ہے کہ نہیں کرتے پیش و پس
ہونے کو یوں تو زیر زیر تا بھی ہو سکے

جبکہ رہے ہوں شیشہ لڑکپن سے بگڑے دل
اس عمر میں تو خاک سدھرنا بھی ہو سکے

کچھ بھی تو ہو نہ سکتا لہو کی وہ بوند کا
شبنم سراب اشک یا جھرنا بھی ہو سکے

ایسا نہیں کہ دونوں جہاں ڈوب ہی گئے
خواہش کی دلدلوں سے ابھرنا بھی ہو سکے

میداں کھلا پڑا ہے چلو چار پاؤں سے
تاکہ پھدکنا ہو سکے چرنا بھی ہو سکے

تلوار ایک ہاتھ میں قینچی ہو ایک میں
گردن بچے تو بال کترنا بھی ہو سکے

ایسی ہوا چلی کہ رضائی بھی اڑ گئی
چھت پر شب وصال ٹھٹھرنا بھی ہو سکے

اردو ہی جانتے ہیں نہ واقف عروض سے
عادل سے کیا غزل میں وگرنہ بھی ہو سکے

فضا ابن فیضی

کسے ہے ہوش بھلا پاسبانیِ جاں کا
کہ سلسلہ ہے وہی رائگانیِ جاں کا

اسیر صدیوں سے، اس خاکنائے جسم میں ہوں
نہ ٹوٹا پھر بھی فسوں بے کرانیِ جاں کا

بدن سے کاسۂ بشکستہ، اور یہ پندار
علاج کوئی نہیں، خوش گمانیِ جاں کا

ہر ایک شخص ہوا، کشتِ زخم و خرمنِ داغ
عجب ہے رنگ، جراحت چکانیِ جاں کا

اسی غبار کے پیچھے ہیں، منزلیں سب کی
غبار ہے یہ نفس، پر فشانیِ جاں کا

یہی بساطِ عناصر ہے، اس کا خوانِ کرم
کہ مٹی اور شرف میزبانیِ جاں کا

ملی ہے مجھ کو عجب یہ سزائے گل بدنی
اٹھائے پھرتا ہوں پتھر، گرانیِ جاں کا

فضا کی ذات ہے، یا کائنات کا آشوب
ہدف بنی ہے، اذیت رسانیِ جاں کا

رخصت ہوئے آنکھوں کے وہ آنسو بھرے موسم
رت بدلی تو جھیلوں سے پرندے نکل آئے

حیرت میں ہیں، لب دوختہ سامان تقاضا
ہم چپ بھی رہے تو، کئی قصے نکل آئے

پانی میں کھلاؤں میں کنول، جب بھی یہ سوچا
ہر بار، سرِ موج سے شعلے نکل آئے

یہ کون سا موسم ہے؟ کہ بھیگے ہوئے بادل
مٹی میں لیے ابر کے ٹکڑے نکل آئے

پہلے تو، نگاہوں میں نہ تھا ہر گھر کا یہ نقشہ
دیوار گری جب، تو دریچے نکل آئے

جو فاصلہ تھا اس سے، بڑے کام کا نکلا
دوری میں بھی، نزدیک کے رشتے نکل آئے

ہم خود تھے فضا! اپنے معانی کا سفینہ
اچھا ہوا، لفظوں کے بھنور سے نکل آئے

فضا ابن فیضی

وہ سب کچھ، جُفت ہو یا طاق میرا
حساب زیست ہے بیباق میرا

بکھر جاؤں، اگر خود کو کروں جمع
شکست ذات ہے الحاق میرا

کبھی سورج کی آنکھوں لے کے دیکھو!
تماشا ہے بزار آفاق میرا

میں اپنے جسم سے، دوزخ تراشوں
یہ ٹکڑا ابر کا، چقماق میرا

دکھوں میں بھیگنے کے بعد بھی ہے
لب و لہجہ ابھی براق میرا

سر اوراق، کیا تم کو نظر آئے؟
جو، منظر ہے پس اوراق میرا

نعت ہے عصر نو کا جس سے خالی
اسی اک لفظ پر، اطلاق میرا

جبیں کی گرد بن کر، رہ گیا ہے
وہ اک جذبہ، کہ تھا خلاق میرا

اسے عرض ہنر ہے، کیا تعلق؟
تقاضا، اس پہ گزرا، شاق میرا

میں دشمن سے بھی، داد ضبط چاہوں
عجب پیرایہ اخلاق میرا

مری پیچیدگی ذہن بھی تو
تری تو صبح بھی، اغلاق میرا

الجھ جاؤ گے، سلجھاؤ نہ مجھ کو،
کہ ہے ہر مسئلہ دقاق میرا

کہیں مجھ کو، ذخیرہ کرکے رکھ لو
مناسب یوں نہیں انفاق میرا

فضا! ڈھل کر جو لفظوں میں، ہوا راکھ
وہی شعلہ تھا، چست و چاق میرا

معروفیت شوق کے حیلے نکل آئے
ناخن جو بڑھے اور بھی عقدے نکل آئے

احساس سمندر کو نہیں، اپنے زیاں کا
پانی سے بہت دور، جزیرے نکل آئے

اب پھینک دو ہاتھوں میں ہے جو سنگ تماشا
آئینوں کے انبوہ سے، چہرے نکل آئے

دیکھو! یہ کرامت مرے سرسبز لہو کی
بوئی تھی خراش اور شگوفے نکل آئے

سناٹے کی چیخوں میں یہ لپٹا ہوا جنگل
ہم گھر سے کہاں صبح سویرے نکل آئے؟

کرشن کمار طور

سر کو اندازۂ اسرار انا دینے میں
ہوگئے خاک یہ اک بات بتادینے میں

میں تو اب خود سے بھی انکار ہوں کرنے والا
میرا کچھ جاتا نہیں اس کو بھلادینے میں

خود تو ہوں عکس سر شیشہ نازک لیکن
کتنا سفاک ہوں اوروں کو سزا دینے میں

وہ مرے خوں کا پیاسا سہی لیکن میں بھی
ہوں کم اندیش اسے شاخ حنا دینے میں

جسم خانہ میں رہوگے بھلا کب تک اے طور
دیر کتنی ہے یہ دیوار گرا دینے میں

یقیں ہے جس کا کہ ہے میری جاں نہیں موجود
مکاں سرے سے ہی گم، لامکاں نہیں موجود

ہے تیرے میرے تعلق کا باعث بنیاد
وہ ایک نکتہ کہ جو درمیاں نہیں موجود

خدا ہی جانے ہمارے قدم ٹکیں گے کہاں
زمین خستہ ہے اور آسماں نہیں موجود

جو ہوگا عدل تو یک طرفہ ہی شہادت پہ
جب اس کے سامنے میرا بیاں نہیں موجود

یہیں سے کھلتے ہیں اسرار اس کے ہونے کے
کہاں پہ طور ہے وہ اور کہاں نہیں موجود

کاوشِ بدری

تجھے تسلیم ہے اپنی جہالت!
کہ تو نے مشرق و مغرب کے ذہنوں کی رفاقت میں بسر کی
تجھے تسلیم ہے اپنی حماقت بھی!
کہ ہر اک احمق و جاہل سے تو دنیا کی بازی ہار جاتا تھا
تجھے اپنی انانیت، خیانت اور گنہگار آدمیت کا بھی
تھا احساس گہرا کہ تو نے سانس بھی منظوم پیرائے میں
لی تھی!

بالآخر تو نے خود مولا کے آگے "اعتراف"[1]
ان سب گناہوں کا کیا ہے!!
کراماً کاتبین نے ان گناہوں کو نہ جانے نامہ اعمال میں
بے حرف و صدا کیسے لکھا ہوگا؟
گو تو اس دور حاضر کا تھا اک ممتاز شاعر
فلسفی و صوفی و مجذوب و مرتاض
دانشور و فقار اعظم
"ترقی" اور توسیع جدت کا محافظ
تو ہی ارض دکن کا آخری فانوس باطن
ترے حساس دل سے ترکمان چرخ بھی
جگمگانے کا ہنر سیکھا، سات رنگوں کو جلا بخشی

فرشتوں کا بھی استاد تھا ابلیس لیکن
مگر اس کو بھی شاید خالق کونین نے
بخشا نہ ہوگا علم اتنا جس قدر تجھ کو عطا اس نے کیا تھا
سرِ تسلیم خم ابلیس نے آگے ترے کر کے مسلماں بن
چکا تھا

مصلیٰ بن گیا تھا دامن قرطاس جاں تیرا
ترے افکار و احسانات و احساسات نے بھی عبادت کی
وحید اختر! یہ دعویٰ ہے مرا تم جنتی ہو!
وسیلے پر ترا ایمان پختہ اور ترا راسخ عقیدہ ہے
چونکہ — تجھے تسلیم ہے اپنی یہ بدعت

"پرستش مصطفےٰ کی کر رہے ہو
خادم شاہِ ولایتؑ اور
مداح سلطان شہادتؑ ہو"
جسارت بارگاہ ایزدی میں تو نے یوں کی ہے
"غفور و رحیم و آموزگارا
تری حمد و ثنا کو چھوڑ کر"
بس منقبت اور نعت پر ہی میرا تکیہ ہے
"شفیع روز محشر رحمت عالمؐ ہیں
جام ساقی کوثر مداوائے عطش ہے
شفاعت ان کی ان کا جام مل جائے"
"میرے سب کچھ معاصی نیکیوں کے خالی پلڑے میں
بہم ہو کر
ترے انصاف کی میزاں کو میرے حق میں کر دیں گے
کہ تو نے عمر کے ایک ایک لمحے کا لہو اپنے عزیزوں کو
پلایا ہے
خود اپنی فاقہ کش جہد و کشاکش کا ثمراں کو کھلایا ہے"
وحید اختر! یقیناً التجا تری قبولیت کو چھو لے گی

یہاں جو ساغر و مینا سے جی تو نے لگایا تھا
علی گڑھ کے چمن، ایران کے میخانوں کو بھی
دلکش کہ عالم بنایا تھا
تری بیگم کا آنچل بھیگ جاتا تھا شراب احمریں میں سے
مگر شیل پون کے پنکھ پر اڑتا ہوا
وہ دامن خوش رنگ، وہ جسم معطر کیا جلا
اس روز تو بھی جل گیا تھا
مگر اک کاغذ دل جل نہ پایا کہ جس پر تو نے
حمد و منقبت اور نعت کہہ کر، آنسوؤں سے شعلہ جاں کو
بجھایا تھا

---

[1] وحید اختر کی نظم "اعتراف" مطبوعہ "شاعر" فروری ۱۹۹۱

فاصلے سب طے ہوئے

ابن فرید

مسلسل چلتے رہنے کی وجہ سے پیر شل ہو گئے تھے۔ ہر قدم بوجھل ہو گیا تھا۔ اب اور کتنی دور تک آگے جانا ہے؟ کہاں ہے وہ منزل جس کی طرف ہم بڑھتے رہے ہیں؟ لیکن اب شاید وہ سنگ میل آ ہی گیا جہاں سفر تمام ہوتا ہے۔ شکن آلود چہرہ، جھریوں بھرے ہاتھ، اور پھولی ہوئی سانس! چلچلاتی دھوپ میں وہ ایک تنہا درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کا تنا کھوکھلا ہو چکا تھا، شاخیں اجاڑ ہو چکی تھیں، پتیاں چھدری ہو چکی تھیں۔ پورا سایہ بھی نہیں بن پا رہا تھا۔ وقت آگے گذر گیا تھا، پیڑ پر اس کے آثار باقی رہ گئے تھے۔ کون کس کی داستان سنے؟

ننھی چڑیا آئی، ٹہنیوں پر پھدکتی رہی، پر تجسس انداز میں نیچے جھانک کر دیکھا اور ہراساں ہو کر اڑ گئی۔ ممکن ہے بے اعتنا ہو کر اڑ گئی ہو۔ کتنے لمحے تھے جو زندہ صبح و شام میں سے یوں ہی، غیر محسوس بن کر ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گئے۔ ان میں کا کوئی مٹھی میں قید نہ ہو سکا۔

"دادا یہ چھوٹے چھوٹے ستارے ہیں نا جو اڑ رہے ہیں؟" بچے نے سراپا سوال بن کر پوچھا۔ یہی سوال تو وہ بھی کرتا اگر اسے اپنے بچپن میں سوال کے الفاظ میسر آ جاتے۔ اندھیری رات میں جھاڑیوں اور درختوں کے بیچ روشنی کی سطریں کھنچ جاتی تھیں جن میں جھینگروں کی پر اسرار آواز خوف اور خواب کی آمیزش کر کے معصوم دل کی دھڑکن کو اور زیادہ تیز کر دیا کرتی تھی۔

"ابا یہ جن ہیں نا جو چمک رہے ہیں؟" دھڑکتے دل کے ساتھ وہ پوچھتا۔

لیکن گرد، غبار اور پٹرول کی دم گھونٹ دینے والی بدبو میں یہ روشنیاں معدوم ہو چکی تھیں۔ سچ ہے موت کا ذائقہ تو سب کو چکھنا ہے، روشنی کو بھی، پر اسرار لمحوں کو بھی! اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں کچھ نہیں بچا تھا۔ بس صرف ایک بھیانک سناٹا تھا جو خلاء کی گود میں معلق ہو کر مکڑی کے جالے کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ تو پھر وہ کون سے گلیارے تھے جس سے گذر کر وہ یہاں اجاڑ چٹیل میدان میں آ پہنچا تھا۔ نہیں، یہاں سے وہ واپس نہیں جا سکتا تھا۔ چلنا ہے تو آگے جاؤ۔

اس نے حسرت سے پیچھے کی طرف دیکھا، رک کر بھری ٹھنڈی سانس لی اور سوکھی رتیلی زمین میں دیکھتا رہا، کچھ ڈھونڈتا رہا۔ جو کچھ کھو جاتا ہے وہ ملتا کب ہے؟۔ مل جائے تو کتنا اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ یہ نرم، کومل، بے فکر، معصوم جسم چھو کتنا تر و تازہ لگتا ہے۔ کاش وہ نقش و نگار پھر تازہ ہو جاتے۔ لیکن زمانے کے نشیب و فراز نے اتنے تیز بے رحم جھکڑ چلائے کہ نرم و نازک جلد کی پرتیں خزاں زدہ پتوں کی طرح بکھر گئیں اور وہ تپتے ہوئے پختہ نقوش کے ساتھ کھلے میدان میں کھڑا ہو گیا۔ کون سی سمت ہے، کون سا راستہ جس پر مجھے جانا ہے؟ یہ سوال تھا جو اس کے ذہن میں چبھتا رہا۔ ہر راستے پر رکاوٹیں کھڑی ہیں۔ وہ قدم بڑھاتا ہے تو زمین بھی آگ کی اونچی لپٹیں اگلنے لگتی ہے۔ پتھروں کے بڑے بڑے پہاڑ لڑھکتے ہیں، سب کچھ لرزنے کانپنے لگتا ہے۔ وہ سہم کر چند قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ پیچھے سے کوئی کلکاریاں مار کر ہنستا ہے۔ وہ بے حد خوف زدہ ہو کر اسے پیچھے ہی رہنے کا اشارہ کرتا ہے۔ آگے نہ آنا، خطرہ ہے۔ پیچھے سے معصوم طفلانہ ہاتھ اسے آگے کو دھکا دیتا ہے۔ پیچھے نہ کھسکنا۔ اب یہ تمہارے لیے بعید بن چکا ہے۔ اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ وہاں تو اب صرف دھندلائے ہوئے خواب تھے۔

کوئی گرد باد میں سے گزرتا چلا آ رہا تھا۔ کون ہے؟ چہرہ اور جسم بھاری لباس میں مستور تھا۔ چلنے کا انداز تو جانا پہچانا ہے لیکن، پھر بھی، پہچان میں نہیں آ رہا تھا۔ بالکل پاس آ کر اس نے چہرہ کھول دیا۔

"اوہ تم!" اس نے سکون کی سانس لی۔ "یہاں اس بے رحم رہ گزر پر تم کیوں آ گئی ہو؟"

"تمہارے ساتھ چلنے کو!" اس نے مسکراتے ہوئے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"اس طوفان میں؟ اس اجڑتے بکھرتے موسم میں؟ یہاں قدم مجھے بھی دشوار ہو رہے ہیں۔ جاؤ، واپس جاؤ تم۔ اسے جھیلنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔"

اس نے بڑے ترحم کے ساتھ اسے دیکھا، دلاسا دینا چاہا۔ لیکن وہ مسکراتی رہی، آنکھیں مشعل کی طرح چمکتی رہیں۔ اس کے شانے پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے اسے ہمت دلائی۔

"میں واپس جانے کے لیے نہیں آئی ہوں۔ ساتھ چلنے اور ساتھ رہنے

آئی ہو۔"

"میں نے تمہارے لئے ہاں کہی تھی۔ نہیں تو نہیں!"

"مگر، میرے ساتھ رہ کر تمہیں کیا ملے گا؟"

"اگر سفر کے شروع میں ہی یہ معلوم ہو جائے تو پھر کوئی کیوں رہ نوردی کرے! آگے چلو، میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہارا حوصلہ ہوں۔"

پھر ان دونوں نے مل کر سفر شروع کیا۔

"یہ جھاڑیاں اور یہ کھائیاں دیکھتی ہو۔ یہاں بچپن میں ہم نے نہ معلوم کتنی آنکھ مچولیاں کھیلی ہیں۔ بڑا مزہ آتا تھا تب!"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "یہاں ان ویرانوں میں اپنا بچپن ڈھونڈھ رہے ہو؟"

"آؤ، آگے چلیں۔" اس نے خفیف ہو کر کہا۔

کسی نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس نے جھنجلا کر، مڑ کر دیکھا۔ یہ تو اس کا استاد تھا۔ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است! اس نے یہ خطا ایک دن کردی تھی۔ کہو، اب کیا کہتے ہو؟ میں تمہارے راستے کا بھاری پتھر ہوں۔ تم ایک معمولی سے کیڑے، تمہیں تو میں چٹکی میں مسل دوں گا۔ اس نے اس دیو پیکر شخصیت کی آنکھوں میں جھانکا۔

کیا تم سے آگے کوئی خدا نہیں ہے؟

"ہاں، ہے! بالکل ہے۔"

پرہول بے ہنگم آواز نے اسے خائف کرنا چاہا۔ یہ بھی تو اسی صف میں سے نکل کر آیا تھا۔ دنیا کی نظر میں جب وہ دستار لئے، اس کے پیچھے کینہ و بغض کا خنجر چھپائے۔ بے خطر اس نے ایک سیڑھی چڑھنی چاہی، دوسرے خود ساختہ خدا نے وہ قدم منہدم کردیا۔ اب چڑھو! وہ ایک چیلنج تھا۔ اس نے پاس کے تناور درخت کی ایک شاخ پکڑلی۔ خود ساختہ خدا نے وہ شاخ بھی کاٹ دی۔ وہ گرنے ہی والا تھا کہ ایک تیز آواز نے اسے چونکا دیا۔

"سنبھل کے! میرا ہاتھ پکڑلو۔ گرنا نہیں!"

اس نے اوپر دیکھا۔ وہ تو وہاں موجود تھی، اس کے ہونٹوں پر تبسم تھا اور وہ اس کا ہاتھ پکڑ چکی تھی۔ مگر اس کے پیروں کے نیچے کا تودہ کھسک گیا۔ اس کے ساتھ ہی خود ساختہ خدا لڑھکتا ہوا نیچے کھائی میں چلا گیا، اوپر سے تودے نے اسے ڈھک لیا۔

کتنے دکھ سے وہ اپنی بلندی سے نیچے دیکھتا رہا۔ جو دوسروں کا راستہ روکنے کے جتن کرتے رہتے ہیں وہ گہری ترین پستیوں میں دفن ہو جاتے ہیں۔ صرف اس سانحے کے لئے تم زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے؟ سوچ کا یہ تسلسل جاری تھا کہ اس کی گرفت میں اپنی کلائی پر گیلاپن محسوس ہوا۔ اس نے چونک کر دیکھا، اس کی ہتھیلیوں سے خون رس رہا تھا۔

"یہ کیا؟" وہ اس کا درد محسوس کر کے چیخ اٹھا۔

"میں بھی تو لہولہان ہوں۔" وہ مسکرادی۔

"کیوں؟ کس لئے؟" وہ مضطرب ہو گیا۔

"آپ کے لئے۔" اس نے پر طمانیت لہجے میں جواب دیا۔

طوفان کی زد پر وہ رہتا تھا لیکن تھپیڑے اسے بھی کھانے پڑتے تھے۔ اگر میں شانہ بہ شانہ نہ رہوں گی تو تم اس تلاطم کا مقابلہ تنہا کیسے کرسکو گے؟ یہ اعتماد تھا جو اس کے متین چہرے سے عیاں ہو رہا تھا۔ ڈھارس تو واقعی وہ اس کی تھی۔ کتنے زخم تھے جنہیں وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے مرہم بن کر مندمل کرلیا کرتے تھے۔ سوچتے تھے دنیا میں اور بھی تو بہت سے لوگ ہوں گے جن کے گھاؤ ہم سے بھی زیادہ گہرے ہوں گے۔ آؤ آگے چلیں، راستے کہیں یوں کھوٹے ہوتے ہیں!

ایک نوعمر لڑکا بھاگتا ہوا آکر اس کی دھندلائی ہوئی نظر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں اسکول کی چند بوسیدہ کتابیں تھیں۔ وہ اس کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا مجھے کوئی قصہ سناؤ۔ لڑکے کے اس بے موقع تقاضے پر وہ مسکرادیا۔ چہرے کی جھریوں کے بیچ تازگی جھلملا اٹھی۔ میں تو خود ایک داستان ہوں۔ کہاں سے سنو گے؟ کیا سنو گے؟ لڑکا بددل ہو کر کھڑا ہو گیا۔ یہ تو میری داستان تھی جس میں تم نے مجھے گم کردیا۔ اس میں تو میں مسخ ہو گیا۔ باغوں، سبزہ زاروں، کھیتوں اور الھڑ گیتوں کی ساری تازگی تمہارے چہرے کی جھریوں میں کھلا کرتا ہو گی ہے۔ اب تو تم اس آم کے اس اکیلا پیڑ کی طرح ہو جو چھتنار ہے لیکن، دیکھو، اندر سے بالکل کھوکھلا ہو چکا ہے۔

اس نے لڑکے سے کچھ کہنا چاہا، لیکن وہ گزرے لمحے کی طرح ایک دم لاپتہ ہو گیا۔ اگر وہ کچھ بیٹھتا تو وہ اس سے اس کے حال احوال پوچھتا۔ اس کے بے فکرے پن کے بارے میں معلوم کرتا۔ اچانک دور سے اس لڑکے کی آواز آئی۔ پچھلی لذتوں کے چٹخارے نہ لو۔ کیا فائدہ! لیکن وہ لڑکا کہیں نظر نہ آیا۔ اس نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے اس کا اپنا کچھ بیش قیمت ماضی کھو گیا ہو۔ وہ شبنم جو دھوپ کے ساتھ اڑ جاتی ہے دوبارہ نظر نہیں آتی۔ پھر تو تیز دھوپ پنکھڑیوں پر خراشیں پیدا کرتی رہتی ہے۔

لیکن تم اس قدر مایوس اور آزردہ کیوں ہو؟ کسی نے اس کے اندر سے اس سے پوچھا۔ کیا تم نے زندگی کا حق ادا نہیں کیا؟ وہ چونک کر سنبھل گیا۔ قافلے گزرتے ہیں، اپنے پیچھے پسپا غبار چھوڑ جاتے ہیں۔ گرد سے اٹا ہوا ساربان شہر کی فصیل کے باہر سبیل پر ٹھہرتا ہے، منہ ہاتھ دھوتا ہے۔ تازہ پانی کے چند گھونٹ حلق کے نیچے اتارتا ہے، بڑی طمانیت سے اپنے بازو پھیلا کر تھکن دور کرتا ہے اور شہر کے دروازہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب یہاں کوئی اس سے پوچھے سفر کیا رہا؟ تو وہ یہی جواب دے گا اچھا ہی گزرا۔

"لیکن تم یہاں بیٹھے کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے ادھر ادھر دیکھا، وہ پاس ہی کھڑی تھی۔

"کچھ نہیں، اب کیا سوچنا!" اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

اس نے ہاتھ کا سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ "چلو، دیر ہو رہی ہے۔"

"تم میرے لئے اس قدر فکر مند کیوں ہو؟"
"فکر مند نہ ہوؤں تو کیا کروں؟"
"ٹھیک کہتی ہو' اب چلنے کا وقت ہو رہا ہے۔"
"ہاں' کیوں نہیں۔ وہ تو ایک خواب تھا جو ہماری زندگی بن کر بیت گیا۔ اب تو کسی دکھ' کسی درد کی اذیت نہیں محسوس ہو رہی ہے۔"
"نہیں' اب کچھ محسوس نہیں ہو رہا ہے' سوائے اس کے کہ ہم زندگی کو زندگی کی طرح جی لئے۔"

ایک بچہ کلکاریاں مارتا ہے' ایک لڑکا جھربیریاں توڑتا کھائیاں پھلانگتا ہے' ایک نوجوان خواب میں جیتا ہے اور رنگوں کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اچانک وہ سب رنگ بکھر جاتے ہیں' خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ ساری زندگی وہ ان کی کرچیں چنتا رہتا ہے' یہاں تک کہ جب وہ انھیں چن کر اٹھتا ہے ایک خوبصورت بلور اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

وہ نظر بھر کر اسے دیکھتا ہے۔
وہ مسکرا دیتی ہے۔

❖ ❖

مکاشفضوت

نذیر آزاد

وہ آئیں گے
ضرور آئیں گے
مجھے جوتوں تلے روندیں گے
میرے گھر کے معصوموں
کو ٹھوکرسے اڑائیں گے
میرے ابا کو داڑھی سے پکڑ کر
گھر سے باہر کھینچ لیں گے اور
میری اماں کی چادر
پھاڑ ڈالیں گے

اگر وہ خود نہیں آئے
تو ان کے ایلچی
پیغام لائیں گے
کہ اس گھر کے مکینوں کو
سروں کو
طشتری میں رکھ
سجا کر بارگاہ عدل میں
لے آ

وہ آخر کیوں نہ آئیں گے
مرے گھر کے مکینوں کی
خطا یہ ہے
کہ ہم نے عادلوں کی
گالیاں سن لیں
مگر ان کو نظر بھر کر نہ دیکھا

علی تطہیر

زخموں کا حساب

نوک شمشیر ہو کہ نوک سناں
نوک سر ہر خار یا نوک خنجر
ایک نقطے سے شروع ہوتا ہے زخموں کا حساب
پھر اسی نقطہ سے کھنچتی ہے نئی سیدھی لکیر
تلوار کی دھار
کاٹتی ہے جو بدن کی چادر

زخم ابدان سے آگے ہے ذرا
زخم جنوں، زخم خرد،
زخم احساس و شعور
یہ بھی سب نقطے سے ہوتے ہیں شروع
نوک زباں
نوک قلم

کھلا ہوا اک منظر

سوچ پہ کیسے کوہ گراں آویزاں ہیں
عقل پہ کیسی میلی میلی دھول جمی ہے
بارش ہو
اک زوردار سی بارش ہو
یہ کوہ گراں بادل جائیں
دھول ہٹے
صاف، درخشاں عقل و فکر کا منظر ہو
پھر تم ہو

اور پھر جام و سبو کی محفل ہو
کچھ صحن چمن ہریالی ہو
یہ دھول ہٹے
یہ کوہ اڑیں
صاف درخشاں منظر ہو

نوائے تلخ

حمید الماس

کہا بقراط نو نے
نبض پر انگلی تھما کر
قلب پر مساج کی چرخی گھما کر
خون جامد ہوتا جاتا ہے
بہت ممکن ہے
دو ایک ماہ میں
گھٹ جائے جسمانی حرارت
زرد رو لمحے
پھسل جائیں
گرفت وقت سے
اک اجنبی
برفیلے ہاتھوں سے دبوچے
پھڑپھڑاتی آخری سانسوں کو
آنکھیں تکتی رہ جائیں....
مگر اس طرح میرے ہاتھ
سوئے آسماں اٹھے
نوائے تلخ گھٹ کر رہ گئی
قلب معالج میں
دعاؤں کی مہک
لہرا اٹھی دھندلی فضاؤں میں

کرایہ دار درونِ خانہ

صبا اکرام

تھکن سے چور تابستاں کے
رستے میں گھڑی بھر کو
جو دم لینے کو ٹھہروں میں
تو چپکے چپکے میٹھی ٹھنڈی
سرگوشی میں کچھ کہتا ہے

گھر آ کر
گھنے سایوں کے نیچے
نیند کی آب رواں جیسی
میں چادر تان لیتا ہوں
یکایک وہ بڑھا کر ہاتھ دل کو بھینچ دیتا ہے

اگر شدت کا پیاسا ہوں
تو آنکھوں سے پلاتا ہے
اگر بھوکا ہوں دن بھر کا تو
کھٹے میٹھے اناروں کا
رسیلا ذائقہ میری زباں کو
بخش دیتا ہے

مگر راتیں کبھی ایسی بھی ہوتی ہیں
کہ بے کھٹکے
مری رگ رگ میں وہ تیزاب کی صورت
اترتا ہے
یہ دل میں کون رہتا ہے؟

امیر عارفی

حشر کے دن

صدی کی انتہا
دو چار لمحوں میں مقید ہے
یہی دو چار لمحے
حشر کا سامان رکھتے ہیں
انھیں لمحوں میں ہم سب کو
ہزاروں
قہر آلودہ
نگاہوں کی سانوں سے
ٹپکتا
قطرۂ تیزاب پینا ہے

خوشبو کا لمحہ

بس
جسموں میں
ہزاروں خواہشوں کے تیر
برسا تا گیا
سیم تن سے پھوٹی
خوشبو کی کرنیں
دل کے دروازے پہ
رہ رہ کے صدا دیتی رہیں
بس
آنکھوں سے اتر کر
دل وجاں میں منجمد ہو تا گیا

لوٹ آئو

عمر تو ایسی نہیں ہے
زندگی سے ہاتھ دھو کر
راہبہ بن جاؤ تم
ہم اور تم انسان ہیں
جن کے دل میں
آرزوؤں' خواہشوں کا
اور بدن کی بھوک کا
رنگین سمندر موجزن ہے
زندگی کی شاہراہیں
باہیں کھولے منتظر ہیں
لوٹ آؤ

احساس

قربتوں
فاصلوں کی سیمائیں
کس قدر بھیانک ہیں
بیسویں صدی کی اس
آخری دہائی میں
قربتوں کی نزدیکی
فاصلوں کی دوری کو
کس طرح سے ناپو گے

آرٹ کا مفہوم

رابندر ناتھ ٹیگور   انگریزی سے ترجمہ : حسن منظر

اتھروید میں ایک عجیب شلوک ہے جو ہر اس چیز کو جو انسانی دنیا میں عظیم ہے زائد سے منسوب کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے :

رِتم[1] (قدرتی قانون)' ستیم (سچائی)' تپو (تپسیا)' راشٹرم (ملک)' سرامو (محنت)' بھرمس (مذہب)' سکرمک (کام کے ساتھ)' بھوتم (ماضی)' بھویشیت (مستقبل)' اچشٹے (اونچائی پر رہنے والے دونو)' ویریم (طاقت)' لکچھمیر بلمبلے (لچھمی دولت کی دیوی)' وبلم (جس میں طاقت نہیں ہے)' بلے (طاقت)

راست شعاری' سچائی' بڑی کاوشیں' فرماں روائی' مذہب' کار عظیم' دلیری اور تن آسودگی' ماضی اور مستقبل بستے ہیں زائد کی قوت رسایت میں

اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنا اظہار بہتات کے ذریعہ کرتا ہے جو اس کی ضرورت محض کو کم و بیش ڈھانپے ہوتی ہے۔ ویدوں کے مشہور شارح سائن آچاریہ کہتے ہیں :

یجنزے[2] ھتسِشتَسیہ۔ اودَنسیہ۔ سروجگت۔ کارنز بھوت۔ برھمابھیدنا۔ سُتوتیہ۔ کریتے۔

چڑھاوے کا بھوجن جو بلیدان کی رسومات کے مکمل ہونے کے بعد بچ رہتا ہے اس کا بکھان اس لیئے کیا جاتا ہے کہ وہ برہما کی علامت ہے جو کائنات کا اول منبع ہے۔

اس شرح کے مطابق برہما اپنی بہتات میں بے انت ہے جو لامحالہ اپنا اظہار کبھی ختم نہ ہونے والے دنیوی عمل میں کرتا رہتا ہے۔ یہاں ہمیں تخلیق کائنات کا قانون نظر آتا ہے اور اسی لیئے آرٹ کے آغاز کا بھی۔ دنیا کی تمام ذی روح مخلوق میں انسان کے پاس اس کی حیاتی اور دماغی قوت اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے اور یہ قوت اسے مختلف النوع تخلیقی کاموں پر' خود ان کاموں کے لیئے' اکساتی ہے۔ خود برہما کی طرح وہ ایسی تخلیقات میں مسرت محسوس کرتا ہے جو اس کے اپنے لیئے غیر ضروری ہیں اور اس لیئے اس کے اسراف کی علامت ہوتی ہیں' نہ کہ آمد و خرچ برابر جیسی قلاشی کی۔ جو آواز محض کافی ہے وہ جتنا روز کے استعمال کے لیئے ضروری ہے بول سکتی ہے' رو سکتی ہے' لیکن جو آواز بالافراط ہے وہ گاتی ہے اور اس میں ہمیں ہماری شادمانی ملتی ہے۔ آرٹ انسان کی زندگی کی دولت کو ظاہر کرتا ہے جو اپنی آزادی کمال کو پہنچی ہوئی ہے شکلوں میں ڈھونڈھتی ہے جو بذات خود اپنی علت نمائی ہیں۔

جو کچھ بھی بے حرکت اور بے جان ہے محض ہونے کی حقیقت تک محدود ہے' زندگی مستقل تخلیق کار ہے چونکہ اپنے اندر وہ' وہ بے چینی زائد رکھتی ہے جو ہمیشہ فوری زمان و مکان کی حد بندیوں کو اپنے بہاؤ میں پار کرتا اپنی آگاہی وجود کے لیئے اپنے بوقلموں اظہار کی مہم میں لگا رہتا ہے۔ ہمارا زندہ جسد اپنے اندر وہ ضروری اعضاء رکھے ہے جو اس کی کارگزاری کے لیئے اہم ہیں لیکن یہ جسم بہرحال معدے' دل' پھیپھڑوں اور دماغ رکھنے کی سہولت کے لیئے ایک تھیلا ہی نہیں ہے۔ یہ جسم ایک تمثال ہے اور اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ اپنی شخصیت کا پتہ دیتی ہے۔ اس میں رنگ ہے' وضع قطع ہے' حرکت ہے جن کا بڑا حصہ زائد کی ملک ہے اور جن کی ضرورت اپنے اظہار کے لیئے ہے' نہ کہ اپنی بقا کے لیئے۔

تمام تخلیق کی نیو میں ایک سچائی ہے جو بظاہر لغو ہے۔ ایک منطقی تخالف۔ اس کا عمل دو مخالف قوتوں کے مسلسل مصالحت میں ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ زائد کا فطری اصرار' یعنی اچشٹا (UCCHISHTA) ہی ہر اس عمل کا جو آمادہ بہ تکمیل ہے طاقت محرکی ہے۔ لیکن زائد کے اس بے حدود بہاؤ کو خود کو ظاہر میں لانے کے لیئے اپنے آپ کو متناہیت کی حدود کے سپرد کرنا ہوتا ہے۔ سچ کو حقیقت میں منتقل ہونے کے لیئے بے حدود کو حدود میں آنا پڑتا ہے۔ ہمارے سامنے ہر شئے کی مبداء کے بارے میں اپنشد کے دو مخالف منطق ہیں۔ ایک

---

1. Rtam satyam tapo rashtram sramo
dharmas ca karma ca,
Bhutam bhavishyat ucchiste
viryam lashmir balam bale

2. Yajne hutasishtasya
odanasya sarvajagat karanabhuta
Brahma bhedena stutih kriyate.

طرف تو یہ کہا گیا ہے۔ آننددھیئوا۔ کھلویمانی۔ بھوتانی۔ جنمیٰ[1] (کائنات مسرت سے پیدا ہوئی ہے)۔ دوسری طرف وہ شلوک ہے جو کہتا ہے تپسیا۔ تاپو۔ تپیتا۔ سا۔ تپستپتوا۔ سروم۔ اسرجتا۔ ید۔ اتم۔ کنچا۔[2] برہما نے تپسیا کی اور تپسیا سے جو گرمی پیدا ہوئی اس سے' اس نے' ہر اس کی تخلیق کی جو ہے۔ مسرت کی آزادی اور تپسیا کی (نرودھ) بندش دونوں ہی برہما کے تخلیقی اظہار میں مساوی طور سے سچ ہیں۔

یہ بے حدود کا' حدود میں آنا فرد کا ہونا ہے۔ برہما جہاں تخلیق کرتا ہے فرد ہے کویر منشی۔ پریبھوہ۔ سویمبھور۔ یتھاتتھیتو رتھان۔ ویدھات۔ تنلسوتیبھیم۔ سمابھیہ۔[3] جہاں وہ زیست کی اندرونی ضرورتیں صحیح وزن میں اور ہمیشگی کے لیئے بہم پہنچاتا ہے۔ وہ شاعر ہے' دماغ کا بادشاہ' مطلق العنان طاقت اور خود کو تخلیق کرنے والا۔ وہ اپنے قانون کی حدود کو تسلیم کرتا ہے۔ اور یوں کھیل چلتا رہتا ہے جو یہ دنیا ہے جس کی حقیقت اس کے اصل عنصر (برہما) سے رشتے میں ہے۔ اشیاء ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن اپنی ماہیت میں نہیں' اپنے ظہور میں' بالفاظ دیگر اپنے اس تعلق میں جو وہ اس سے رکھتی ہیں جو انھیں دیکھتا ہے یہی آرٹ ہے (فن)' جس کی سچائی مادے یا منطق میں نہیں ہے بلکہ اظہار میں ہے۔ تصوراتی سچائی سائنس اور مابعد الطبیات کا حصہ ہو سکتی ہے لیکن حقیقت کی اقلیم آرٹ کی ملکیت ہے۔

دنیا بحیثیت ایک آرٹ کے پرم پرش کا ناٹک ہے جو تمثال سازی کی رنگ رلیوں میں لگا ہے۔ تمثال کے عناصر کی کھوج لگانے کی کوشش کیجئے' وہ آپ کو جل دے جائیں گے۔ وہ کبھی بھی اظہار کے ابدی راز کا آپ کو پتہ نہیں دیں گے۔ زندگی کو گرفت میں لانے کی کوشش میں جیسی کہ وہ زندہ خلیوں کے سلسلوں اور بافت میں ظاہر ہوتا ہے آپ کو کاربن' نائٹروجن اور کتنی ہی حیات سے قطعاً غیر مماثل چیزیں ملیں گی لیکن خود زندگی کبھی نہیں۔ روپ رنگ خود اپنے پر اپنے اجزاء کے ذریعے کوئی شرح پیش نہیں کرتا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے مایا (دھوکا) کہہ لیجئے اور اسے تسلیم نہ کرنے کا بہانا کیجئے۔ لیکن اس سے اس بڑے آرٹسٹ مایاون کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی (مایاوتو= فریب دینے والا) کیونکہ آرٹ مایا ہے۔ اس کی کوئی اور توضیح نہیں ہے سوائے اس کے کہ یہ ویسا لگتا ہے جیسا کہ ہے۔ یہ کبھی اپنی اس ساتھ نہ آنے والی خاصیت کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتا ہے بلکہ خود اپنی تعریف (پہچان) پر مشغول کرتا ہے اور چھپنے ڈھونڈنے کے اپنے کھیل کو اپنے مستقل تغیرات کی اڑان میں کھیلا رہتا ہے۔

اور یوں زندگی کو جو آزادی کا ایک کبھی نہ تھمنے والا دھاکا ہے اپنی بحر (metre) بار بار موت میں ڈوب کر ساتھ آتی ہے۔ ہر روز ایک موت ہے اور ہر صبح۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ نامردی کا ایک بے شکل' ابدا گونگا اور بے حرکت ریگستان۔ کیونکہ زندگی خود مایا ہے اور جیسا کہ معلم الاخلاق کہتے نہیں تھکتے کہ "ہے بھی اور نہیں بھی"۔ ہمارے جو کچھ اس میں سے ساتھ آتا ہے وہ' وہ لے' تال یا تناسب ہے جس میں وہ خود کو پیش کرتی ہے۔ کیا چٹانیں اور معدنیات اس لحاظ سے کچھ بہتر ہیں؟ کیا سائنس نے یہ حقیقت ہم پر آشکارہ نہیں کی ہے کہ ایک عنصر اور دوسرے عنصر میں مختتم فرق محض لے یا تال کا ہے؟ بنیادی امتیاز سونے اور پارے میں محض ان کے اس تال یا لے کے فرق میں ہے جو ان کی اپنی اپنی جوہری ساخت میں مضمر ہے جیسے شاہ اور رعیت میں امتیاز ان کے مختلف عناصر ساخت میں نہیں ہے۔ بلکہ مختلف اوزان' مقام و حالت میں ہے۔ یہاں آپ کو سین کے پیچھے چھپا ہوا آرٹسٹ ملتا ہے' تال اور لے کا جادوگر جو بے حقیقت کو حقیقت کا ایک ظاہرہ بخشتا ہے۔

اور یہ تال یا لے ہے کیا؟ یہ وہ حرکت ہے جسے "ہم ساز" بندش پیدا کرتی ہے اور اس پر ضبط و قیود بھی عائد کرتی ہے۔ یہ تخلیقی قوت ہے جو آرٹسٹ کے ساتھ میں ہوتی ہے۔ جب تک الفاظ ایک بے زیر و بم نثری شکل میں رہتے ہیں وہ ہمیں حقیقت کا کوئی پائدار احساس نہیں بخشتے ہیں۔ جب انھیں اٹھا کر لے یا تال کے حوالے کردیا جاتا ہے' ان میں ارتعاش سے تابندگی آجاتی ہے۔ یہی حال گلاب کا ہے۔ اس کی پنکھڑیوں کے گودے میں آپ کو ہر وہ چیز ملے گی جس سے گلاب بنتا ہے' لیکن جو گلاب مایا ہے' ایک تصور' ایسا کرنے میں وہ گم ہوجائے گا۔ اس کی قطعیت جس میں لامحدودیت کا لمس ہے وہ کھوجائے گی۔ مجھے گلاب ساکت لگتا ہے لیکن اپنی ترتیب کے وزن یا بحر کی بنا پر اس میں اس کی گہری خاموشی کے میان حرکت کا ایک گیت موجود ہے اور یہ ویسا ہی ہے جیسے ایک ایسی تصویر کی محرک خوبی جس میں مکمل طور سے ترتیب کی ہم آہنگی ہو۔ یہ صفت ہمارے شعور میں اسے حرکت کا ایک ایسا جھونکا دے کر جو اس کی اپنی حرکت کے ساتھ "ہمہ وقت" (تال میں) ہو' ایک موسیقی پیدا کرتی ہے۔ اگر تصویر رنگوں اور لائنوں کے بے آہنگ' بے ترتیب جمگھٹے پر مشتمل ہو تو وہ کسی میت کی طرح ساکت ہوگی۔ بے عیب حسن ترتیب میں آن کر آرٹ کی وہ صورت تاروں جیسی بن جاتی ہے جو اپنے بظاہر سکوت میں کبھی ساکت نہیں ہے' جیسے ایک بے حرکت لو جو جز حرکت کچھ اور نہیں ہے۔ ایک مہان تصویر ہمیشہ گویا رہتی ہے۔ لیکن اخبار میں چھپنے والی خبر' چاہے وہ کسی اندوہ ناک واقعے ہی کی ہو مردہ تن وجود میں آتی ہے۔ کوئی خبر کسی جریدے کی گمنامی میں پڑی محض روز مرہ کی ایک بات ہو سکتی ہے لیکن اسے صحیح لے یا تال عطا کیجئے پھر وہ کبھی جگمگانے سے عاجز نہیں رہے گی۔ یہ آرٹ ہے۔ اس کے پاس جادو کی وہ چھڑی ہے جو ہر اس چیز کو جس سے وہ مس ہوتی ہے کبھی نہ مرنے والی

---

[1] anandadhyeva khalvimani bhutani jayante

[2] satapotapyata sa tapastapatva sarvam asrjata yad idam kinca

[3] kavirmanishe paribhuh svayambhur yathatathyatorthan vyadadhat sasvatibhyah samabhyah

حقیقت بخش جاتی ہے۔ وہ ان چیزوں کا ہماری معنوی ہستی سے تعلق پیدا کر دیتی ہے۔ ہم اس کی حقائق کے مقابل ہو کر کہتے ہیں "میں تمہیں ویسا ہی جانتا ہوں جیسا خود اپنے آپ کو۔ تم حقیقی ہو۔"

یہاں مجھے موقع دیجئے کہ اپنے ایک پچھلے مقالے سے آرٹ کے فرض منصبی پر اپنی رائے کو دہراؤں "جب ہم جمالیات کا آرٹ کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں تو ہمیں جاننا چاہیئے کہ یہ خوبصورتی کی اس کے عام معنوں میں بات نہیں ہو رہی ہے بلکہ ان گہرے معنوں میں ہے جس کا اظہار ایک شاعر نے اپنے الفاظ میں یوں کیا ہے "خوبصورتی سچائی ہے' سچائی خوبصورتی۔" ایک آرٹسٹ ایک خستہ حال شخص کی ایسی تصویر پینٹ کر سکتا ہے جو آنکھوں کو بھلی نہ لگے لیکن پھر بھی ہم اسے مکمل یا بے عیب کہتے ہیں جب اس کی سچائی کی ہمیں گہری آگہی ہو جاتی ہے۔"

زندگی کے امید سے تہی المیوں کو اصطلاحاً کبھی بھی خوبصورت نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن آرٹ کے پس منظر کے مقابل ظاہر ہو کر وہ ہمیں مسرت بخشتے ہیں اور اس کی وجہ حقیقت کا وہ تیقن ہے جو وہ ہمارے دماغ میں پیدا کرتے ہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہر چیز جو اپنے اندر پنہاں قطعیت کی بنا پر اپنی ہستی کا لوہا ہم سے منوالیتی ہے' خوبصورت ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جسے سنسکرت میں منوہر[1] کہا جاتا ہے۔ دماغ کو چرا لینے والا' دماغ جو معلوم کرنے والے اور معلوم کے درمیان ایستادہ ہے' ہماری پہلی ہمدردی ان تمام اشیاء کے لیئے ہے جو زندہ ہیں کیونکہ اگر سمجھا جائے تو وہ ہماری زیست کی آگاہی کی محرک ہوتی ہیں۔ یہ حقیقت کہ ہم موجود ہیں اس کی سچائی اس حقیقت میں مضمر ہے کہ دوسری ہر چیز بھی وجود رکھتی ہے۔ مجھ میں کا "میں ہوں" اپنے پھیلاؤ سے اپنی لامتناہیت سے جب ہی پوری طرح آگاہ ہوتا ہے جب بھی وہ کسی دوسری شئے کا صحیح معنوں میں ادراک کرتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اپنی محدودیتوں اور بے شمار ذہنی مشغولیتوں کی وجہ سے ہماری دنیا کا ایک بڑا حصہ باوجود نزدیک سے ہمارے گرد ہونے کے ہماری توجہ کی روشنی کے گھیرے سے بہت دور رہتا ہے۔ اور یہ بڑا حصہ جو دھندلا ہے ہمارے پاس سے گزرتا جاتا ہے' سایوں کا ایک کارواں جیسے ایک لینڈ اسکیپ جو اک روشن ریلوے کمپارٹمنٹ کا کھڑکی سے رات میں نظر آتا ہے' مسافر جانتا ہے کہ باہر کی دنیا اپنا وجود رکھتی ہے' یہ کہ وہ اہم ہے' لیکن وقتی طور سے ریلوے کا ڈبہ اس کے لیئے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے اگر اس دنیا کی ان گنت چند چیزوں میں سے چند ایک ایسی ہوں جو ہماری روح کی پوری تابانی میں آجائیں اور یوں ہمارے لیے حقیقت کا روپ اختیار کر لیں تو وہ مسلسل ہمارے تخلیقی دماغ کو ابدی نمائندگی بخشے جانے کی دہائی دیتی رہتی ہیں۔ وہ اسی اقلیم سے تعلق رکھتی ہیں جس سے ہماری وہ خواہش جو ہمارے اپنے آپ کی دوامیت کی تمنا کی نمائندگی کرتی ہے۔

میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جن چیزوں سے ہم ذاتی منفعت کے بندھن میں بندھے ہیں ان میں حقیقت کا وجدان ہے' اس کے برعکس ایسی چیزیں ہماری اپنے خود کے سائے سے گہنا جاتی ہیں۔ پیش خدمت ہمارے لیئے اس سے زیادہ حقیقی نہیں ہے جتنا محبوب۔ افادیت پر تنگ نظر زور ہماری توجہ کو پورے انسان سے محض کار آمد انسان پر منعطف کر دیتی ہے۔ بازار کی قیمت کا دبیز لیبل حقیقت کی واقعی قیمت کو مٹا دیتا ہے۔

[2] ورھد آرنزیکا میں کہا گیا ہے۔

[3] نوآ ارے پترسیا کاملیا پترہ پریو بھوتی

آتمانستو کاملیا پترہ پریو بھوتی

یہ خواہش کہ بیٹا ہو اسے پیارا نہیں بناتی ہے' بیٹا خود اپنی ذات میں پیارا ہے۔ یعنی بیٹے میں باپ ایک حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے جو اس کے اندر بلاواسطہ اور گہری ہے۔ وہ اس لیئے خوش نہیں ہے کہ اس کا بیٹا بے عیب اور خوبصورت ہے بلکہ اس لیئے کہ اس کا بیٹا بلاشبہ اس کے لیئے حقیقت ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ہماری مسرت حقیقی کے بے لوث ادراک میں ہے۔ یہ منبع ہے تمام فنون اور ادب میں ہماری سرخوشی کا جہاں حقیقت ہمارے سامنے اپنی مطلق قیمت کے پایہ ستون پر رکھ کر پیش کی جاتی ہے۔

ہمارے دماغ کے تمام گہرے نقوش کے ہمراہ کچھ جذبات ہیں جو خود اپنی مختلف النوع تھرتھراہٹ ہمارے شعور میں بپا کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہلچل ہماری آواز اور حرکات کو تناسب سے گمشاتی بڑھاتی ہے اور ہمیں رنگوں' شکلوں اور آوازوں کی تخلیقی نمود پر برانگیختہ کرتی رہتی ہے۔ اس پر مجھے وہ موقع یاد آتا ہے جب میں نے ایک اسکول کی عمارت کی دیوار پر بڑے بڑے حروف میں لکھا دیکھا تھا "بپن پرلے درجے کا گدھا ہے۔" اس بات پر مجھے ہنسی بھی آئی اور ساتھ ہی اس سوال کا جواب بھی مل گیا کہ "آرٹ کیا ہے"۔ کوئی بھی بے وجہ یہ اعلان کرنے کی رتی بھر تکلیف گوارہ نہیں کرے گا کہ بپن لمبا ہے یا یہ کہ اسے زکام ہے۔ عام حالات میں ہمارے دماغ پر بپن کا جو نقش بنے گا وہ متانت آمیز' غیر جانب دار ہو گا لیکن جب ہم اس سے محبت یا نفرت کرتے ہیں تو بپن کی ہستی کی حقیقت جذبات کے اس ہیجانی پس منظر پر دمک کر عیاں ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں ہمارا دماغ غیر جانب دار نہیں رہ سکتا ہے۔ وہ بپن کے تصور کو اس جم غفیر سے جو ہمارے لیئے غیر اہم ہے علیحدہ کرتا ہے اور اپنی صلاحیت کے مطابق اسے دوسروں کے لیئے بھی اتنا ہی ناقابل تردید حقیقی بنانے کی کوشش کرتا ہے جتنا وہ ہمارے لیئے ہے۔ وہ لڑکا جو غصہ میں بپن کے

---

[1] مانس' چیت : دماغ۔ مانس سرودر : فکر اور احساس کا مرکز

من = دماغ (ح-م)

[2] Vrbad Aranyaka

[3] Nanva are putrasya kamaya putrah priyo bhavati, atmanastu kamaya putrah priyo bhavati.

بارے میں اپنی بڑھتی ہوئی رائے کو واضح رکھنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ ساری دنیا بھی اسے تسلیم کرے۔ اس کے پاس سوائے اپنے ناکافی لکڑی کے کوئلے اور اپنی بے اثر تکنیک کے اور کچھ نہ تھا جب کہ اس کے زمانہ قدیم کے آباواجداد جب جوش دلائے جانے پر غصہ میں آجاتے تھے تو اس غصہ کو وہ نہ صرف پُراثر طریقے سے پکار میں نکال سکتے تھے بلکہ زرق برق طریقے سے جلال کے اظہار میں بھی جس کے لیئے قدرتی رنگ، پر، چمکیلی اشیاء اور لڑائی کے ناچ ان کے ہتھیار ہوتے تھے۔ وہ دیوار مدرسہ کی تحریر جو بقائے دوام کے لیئے تڑپ رہی تھی رنگوں اور لے بھری لائنوں کی افسوس ناک حد تک بھکاری تھی جو اسے اس کے شہرۂ آفاق ہم جنسوں کی صف میں جگہ دیتے۔ مشہور زمانہ گپھاؤں کی آبی رنگوں والی تصاویر کی صف میں جن میں فن کاروں نے بعض شخصیتوں اور متعدد واقعات کے اپنے جائزے پر زور دیا اور انھیں ابدیت بخشنے کی کوشش کی کیونکہ آرٹ کی تخلیقات مشتمل بہ جذبات اظہار ہوتی ہیں۔ حقائق اور تصورات کا وہ کبھی بھی فوٹوگرافک کیمرہ کی کاری گری کی مانند نہیں ہو سکتی جو روشنیوں اور پرچھائیوں کو بلا امتیاز تفصیل مفصل طور سے قبول کرتا جاتا۔ ہمارا سائنسی دماغ ہر طرح کی طرف داری سے آزاد۔ اس کے روبرو جو حقائق آتے ہیں انھیں وہ بے رحم تجسس سے بغیر کسی ترجیح کے قبول کرتا جاتا۔ آرٹسٹک دماغ شدید طور سے جانب دار واقع ہوا اور وہ جانب داری نہ صرف یہ کہ اس کی تنک چڑھے پن سے موضوع کے انتخاب میں رہنمائی کرتی بلکہ اس کی تفاصیل کے بھی۔ آرٹسٹک دماغ زور احساس اور اہمیت کی رنگین روشنیاں اس طرح اپنے موضوع پر ڈالتا کہ وہ ایک فرد یا کردار بن جاتا اور یہ سبھاؤ اسے اپنے ساتھیوں سے ممیز کرتا۔ سائنس کے لوے (skylarks) اپنی حقیقت کی شہادت اپنے ایک جیسے ہونے میں دیتے ہیں۔ آرٹسٹوں اور شاعروں کے لوے ایک جیسے نہ ہونے میں۔ اگر شیلی کی نظم اس پرندے کے بارے میں ویسی ہوتی جیسی ورڈس ورتھ کی تو اسے سچائی سے عاری ہونے کی بنا پر رد کردیا جاتا۔

چونکہ آرٹ کسی چیز، کردار یا واقعے کے ہمارے ذاتی جائزے کا حامل ہوتا، آرٹسٹ اپنے عمل میں فطرت کے پھیلے ہوئے بے میل پن کے طور کو نہیں اپناتا۔ اس کے برخلاف وہ اپنی انسانی سرشت کا تابع رہتا جو آمادہ بہ انتخاب۔ جو کچھ بھی اس کے اپنے مقصد اظہار کے لیے غیر ضروری اس سے دامن چھڑا کر، اور اس پر زور دے کر جو اہم، وہ اپنی تخلیق کی سچائی کو کہیں زیادہ وضاحت سے پیش کرسکتا بہ نسبت اس کے کہ وہ حقیقت کی نقل کرے جو ہست کی ہر چیز کے بارے میں قطعاً غیر جانب دار۔ خدا کی تخلیق کی سالمیت بڑی بے کراں اور یہ کسی شے کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اس سے اپنے رشتے میں حد سے زیادہ سرکشانہ طور سے مختلف ہوجائے۔ لیکن انسانی اظہار کا پس منظر چھوٹا، اس لیئے یہ کبھی بھی ممکن نہیں ہوگا کہ ہم فطرت کی تفاصیل کو اپنے آرٹ کی تخالیق میں سمو سکیں۔ قبل از تاریخ کے جنگل کو اپنے باغیچے کے تختوں کے تناظر میں ڈھونڈنے کی کوشش کودکی اور تاریخ حیوانات ونباتات کی ہمارے فن پاروں میں

تصویر کشی بھی جو حقائق کو ہماری شخصیت کے سرچشمہ تک کو نہ زیادہ کرتی۔

ایک دفعہ مجھ سے سوال کیا گیا تھا کہ میں موسیقی کو اپنے فن کے نظریے میں کیا مقام دیتا ہوں۔ مجھے اس سوال کا جواب دینا اور اس موقع کو میں اپنی توضیح پیش کرنے کے لیے کام میں لا رہا ہوں۔

اقلیم سائنس میں ریاضی کی شکل، موسیقی تمام فنوں میں سب سے زیادہ خیالی۔ درحقیقت دونوں میں ایک دوسرے سے گہرا رشتہ ہے۔ ریاضی بحیثیت ہندسے اور ابعاد (لمبائی، چوڑائی، گہرائی یا موٹائی) کی منطق ہماری سائنسی معلومات کی بنیاد۔ جب اسے اس کے کائناتی مظاہر سے مادی رشتوں سے علیحدہ کرکے علامتوں میں محدود کردیا جائے پھر ریاضی اپنی عظیم ساختیاتی کروفر کو ظاہر کرتی۔ اس کی اپنی مکمل ہم آہنگی کی ناگزیریت۔ لیکن ایک چیز ریاضی کا جادو بھی جو تمام ظہور کی تہ میں کارفرما اور جو وحدت کی ہم آہنگی کو پیدا کرتا، اجزا کے ایک دوسرے سے رشتے کا زیروبم جو انھیں کل کی قلمرو میں لے آتا۔ ہم آہنگی کی اس لے کو اس کے عام سیاق وسباق سے نکال کر آواز کے وسیلے سے ظاہر کیا گیا اور یوں انکساریت کا خالص عطر جو وجود میں آیا، اسے موسیقی میں پیش کیا جاتا۔ آواز میں اسے کم سے کم مزاحمت ملتی اور ایسی آزادی میسر آتی جس پر حقائق اور خیالات کا بوجھ نہیں ہوتا۔ یہ چیز اسے ایسی قوت عطا کرتی جو ہم میں حقیقت کے شدید احساس کو بیدار کرتی، جو ہمیں تمام اشیاء کی روح تک لے جاتی ہوئی لگتی اور ہمیں وجدان کے سانس کو عظیم ترین تخلیقی مسرت سے آتا ہوا محسوس کراتی۔

مصوری، پیکر سازی اور صوتی فنون میں مادی شے اور اس سے متعلق ہمارے احساس ایک دوسرے سے بہت نزدیک آجاتے ہیں، جیسے گلاب اور اس کی خوشبو۔ موسیقی میں صوت میں نچوڑا ہوا احساسات بذات خود ایک مستقل شے بن جاتا، وہ لے کی شکل اختیار کرلیتا جو واضح ہوتی لیکن ایسا مفہوم جس کی تعریف ممکن نہیں۔ لیکن جو پھر بھی ہمارے دماغ کو ایک مطلق سچائی کے احساس کے ساتھ اپنے بس میں کرلیتا۔

صدیوں پہلے بنگال میں ایک وقت آیا جب نارائنی پریم ناٹک جس کا ابدی کھیل انسانی روحوں میں تھا، اس کا واضح اظہار ایک ایسی شخصیت میں کیا جانے لگا جو پرم آتما سے اپنی پوری آگاہی کے گہرے تعلق کی ضوافگنی کرتی تھی۔ ایک پوری قوم کا دماغ دنیا کے ایسے دیدنی پیکر کی شکل میں پیش کیے جانے سے جو ایک آلہ تھا جس کے ذریعے ہمیں مسرت کامل سے ملاقات کی دعوت دی جارہی تھی، ہلچل میں آگیا۔ پریم آتما کی محبت کی پکار کے ناقابل بیان راز نے جو رنگوں اور ہیات کا کبھی ختم نہ ہونے والا منظر مسلسل تھا، جیسے اپنا ہم نوا طائفہ انسانی احساسات میں پا رہا تھا، موسیقی میں ایسی تخلیقی حرکت کو جگایا جو کلاسکی تقلیدیت کی بندشوں کو پار کرگئی۔ ہمارے کیرتن سنگیت نے بنگال میں ایسے جنم لیا جیسے ایک جذبے کے آتش گرفتہ بھنور نے ایک ستارے کو ایک پوری قوم کے دل میں اچھا پھینکا ہو۔

ہماری [illegible]
گروہ کا شعور [illegible] ایک [illegible] کے
حلقہ سے کہیں [illegible] نظر [illegible] ہوا تھا۔ ایسا ہی ایک موضوع تھا جب (آزادی)
کی پرواز تمام مادی اور اخلاقی رکاوٹوں کے پار دور کے ساحلوں تک پہنچی۔
وقت ہماری زندگی اور ہماری دنیا نے اپنے حقیقت کے گہرے مفہوم کو اپنے
مرکزی محض سے تعلق میں پایا جس نے ہمیں محبت کی رہائی (آزادی) عطا
کی تھی۔ اور آدمی اس مہان انسانی تجربے کو ذاتی یادگار بنانے کے لیے ناممکن
کو کر گزرنے کا عزم کر بیٹھا۔ انھوں نے چٹانوں کو گویا کرایا، پتھروں کو گویا اور
یادوں کو حافظہ دیا۔ خوشی اور امید کی آواز نے پہاڑیوں، ریگستانوں، لق و دق
میدانوں اور گنجان آباد شہروں میں امر شکلیں اختیار کیں۔ ایک جناتی تخلیقی مہم
نے ان رکاوٹوں کو، جن میں مغلوب کر لینے کی طاقت تھی خاطر میں نہ لا کر عظیم
الشان تراشوں کو جنم دے کر اپنی فتح منائی۔ یہ جوشیلا عمل جو بر اعظم کے پورے
حصے پر پھیلا ہوا اس سوال کا واضح طور سے جواب دیتا کہ آرٹ کیا۔
آرٹ انسان کی تخلیقی روح کو حقیقت کی پکار کا جواب۔

لیکن انفرادی دماغ کا اپنے مزاج اور تربیت کے لحاظ سے حقیقت کا اس
کے بعض پہلوؤں میں اپنا ادراک ہوتا۔ ہم گندھارہ کی بدھ کی مورتیوں میں
یونان کے فنی اثر کو دیکھ سکتے ہیں جس میں سائنسی پہلو بالخصوص تشریح ابدان کی
صحت پر زور دیا جاتا تھا جب کہ خالصتاً ہندوستانی دماغ علامتی پہلو پر قائم رہا اور
اس نے بدھ کی آتما کے اظہار کی کوشش کی اور ایسا کرنے میں کبھی بھی حقیقت
نگاری کی محدودیت کو تسلیم نہیں کیا۔ یورپ کے عظیم مجسمہ ساز رودے کا ہم
عصر روح کے لیے حقیقت کا سب سے اہم پہلو، اس کی کبھی نہ تھمنے والی، نامکمل
کے اپنی کوتاہیوں کی بیڑیوں سے رہائی حاصل کرنے کی جدوجہد جب کہ مشرقی
آرٹسٹ کے دماغ کے لیے جو فطرتاً آمادہ بہ مشاہدۂ نفس وہ جو حقیقی وہ تکمیل کی
آدرشی شکل میں ظاہر ہوتا۔

اس لیے جب ہم اس حقیقت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں جسے
ہندوستانی آرٹ کہا جاتا تو اس سے اشارہ ایک ایسی سچائی کی طرف ہوتا جس کی
بنیاد ہندوستانی روایت اور مزاج پر۔ اس کے ساتھ ہی ہمارا یہ جاننا بھی ضروری کہ
انسانی تہذیبوں میں مکمل ذات پات کی قیود جیسی کوئی چیز نہیں، انسانی گروہوں
میں آمیز ہونے اور نئی متنوع تخلیق کی قوت سدا رہتی اور ایسے امتزاجات
ہزاروں برسوں سے چلے آ رہے ہیں اور یہ اس صداقت پر دال کہ انسانی نفسیات اپنی گہرائی
میں ایک۔ اس بات کو تسلیم کیا جاتا کہ ہندوستانی آرٹ میں ایرانی عنصر کو
[illegible] نہیں ملیں اور دیگر بیرونی اثرات کے بھی نشانات ملتے ہیں۔ چین اور
جاپان کو اپنی آرٹسٹک اور روحانی زندگی کی بالیدگی کے لیے ہندوستان کے زیر بار
ہونے کو تسلیم کرنے میں کبھی قباحت پیش نہیں آئی۔ ہماری تہذیبوں کی خوش
قسمتی سے ایسی تمام آمیزش اس دور میں ہوئی جب آرٹ کے چشمے وہ [illegible] کی
بھرمار نہیں تھی اور جو [illegible] کرنے والے ہر وقت مجبور کی انگلی سے آرٹسٹ

ہی [illegible] گزرتوں [illegible] یہ جہاں حقیقت [illegible] کی حد تک [illegible]
تھی کہ وہ ہندوستانی ہیں، کتنا ہی مختلف ادوار سے تمام [illegible] اخذ کرنے کے انھیں
خود کو قدرتی طور سے ہندوستانی ہونے کی آزادی رہتی تھی۔

بہت اختراعی قابلیت رکھنے والوں کی عظمت کی پہچان، بسا اوقات ان کے
علم میں آئے بغیر، ان کی اخذ کرنے کی زبردست صلاحیت، ان کی ساکھ دنیا کے
تہذیبی بازار میں لامحدود ہوتی۔ صرف اوسط درجے والے اخذ کرنے سے [illegible]
اور ڈرتے ہیں کیونکہ انھیں اپنا قرضہ اپنے سکے میں لوٹانا نہیں آتا۔ ناقدین میں
سے کسی انتہائی بے وقوف کو بھی شیکسپیئر کو اپنی قومی ورثے کے باہر سے کھلم کھلا
تصرف کرنے کا الہانا دینے کی ہمت نہیں ہوتی۔ انسانی روح کو اپنی ہمہ گیر
حساسیت پر فخر، جب وہ پوری طرح باخبر اور بیدار ہوتی تو اپنی ہر جگہ رسائی کا
اعلان کر رہی ہوتی۔ ہم اس امر پر خود کو مبارک باد دیتے ہیں اور اسے روحانی
طور سے اپنے زندہ ہونے کی علامت گردانتے ہیں کہ یورپی خیالات اور ادبی
ہستیوں کی ہمارے ذہن سے اولین اتصال ہی سے بنگالی ادب میں فوری پذیرائی
ہوئی۔ اس سے ہمارے ادبی اظہار کی اقلیم میں ایک عظیم انقلاب آیا۔ بنگالی
ادب میں زبردست تبدیلیاں آئیں لیکن ہماری ہندوستانی روح اس تصادم کو
جھیل گئی اور اس طغیان عظیم پر بجائے پرزور طریقے سے پھلی پھولی۔ اس سے
صرف یہ پتہ چلتا کہ گو انسانی ذہنیت کرۂ ارض کی آب و ہوا کی مثال اپنے مختلف
جغرافیائی خطوں میں بالیقین اپنے مختلف ٹمپریچر رکھتی لیکن ایسے مختلف کمروں میں
دیوار بستہ نہیں کہ ایک سے دوسرے میں اس کا گزر نہ ہو سکے اور یوں مشترک
ہوا کہ حرکت پورے کرے پر اپنے صحت بخش اثر کے ساتھ جاری ہو، ہمیں دلی
پیدا کر کے جرأت مندانہ تجربات کرنے چاہئیں، تمام خطروں کے مقابل کھلی سڑک
پر نکل آنا چاہیے، ناپاک ممانعتوں کو جن کے مبلغ ادنیٰ درجے کے [illegible] ناقدین
ہیں ان کو للکارتے ہوئے انسانی دماغ کی عظیم دنیا کے تجربات سے گزرنا چاہیے
اور جب وہ نزاکت سے ہماری حفاظت کے خواستگاری ہوں، ہمارے آرٹسٹوں
کو اچھے بچوں کی طرح رہنے اور کبھی ان کے اسکول کے کمرے کی دہلیز سے باہر
قدم نہ نکالنے کی تلقین کریں تو ان پر ہنسنا چاہیے۔ ڈرے ڈرے ایک روایتی
ناپ سے سدا مطابقت رکھنا ناپختگی کی علامت۔ صرف چھوٹے بچوں میں خدو
خال کی انفرادیت دھندلی ہوتی اور اس لیے ذاتی پہچان زیادہ واضح نہیں ہوتی۔
بچپنا ایک ذہنیت ہے جس کی بآسانی تعمیم کی جا سکتی، بچوں کی خواہش ہر
جگہ ایک ہی سوتی لرزش پر تلی ہوتی، ان کے کھلونے بھی تقریباً ایک جیسے ہی
ہوتے ہیں۔ لیکن بلوغت کی عمر کی درجہ بندی مشکل۔ بلوغت کی عمر مشتمل ہوتی
افراد پر جو اپنی ذاتی انفرادیت کے پہچانے جانے پر مصر ہوتے ہیں، یہ ذاتی
انفرادیت نہ صرف اپنے مخصوص رویوں میں نظر آتی بلکہ تمام بیرونی محرکات پر
اپنے خصوصی رد عمل یا تاثر میں بھی۔

میں تمام آرٹسٹوں سے شدت سے اس بات پر اصرار کرتا ہوں کہ [illegible]

خدی کمی کے بچے کی طرح جنت کی درستی میں سب بے عیب لیکن اس دماغ کے لیے نامناسب جس کے اندر ترقی کے ان گنت امکانات ہوتے ہیں۔

(خطبے کو) ختم کرنے سے پہلے میں اس موقع سے کام لیتے ہوئے اپنے آرٹسٹوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے پیشے کی عظمت کو پہچانیں ان کا پیشہ زندگی کے تیوہار میں تخلیقی طور سے حصہ لینے کا اور یہ تیوہار درون انسان موجود لامحدودیت کے اظہار کا اپنی روز مرہ کی دنیا میں ہم عسرت میں گذارہ کرتے ہیں' اس میں ہمیں اپنے وسائل کو کفایت شعاری سے تصرف میں لانا پڑتا' ہماری توانائی پست پڑجاتی اور اپنے خدا کے سامنے جب ہم پہنچتے ہیں تو بھکاری ہوتے ہیں۔ تیوہار کے دنوں پر ہم اپنی دولت کی نمائش کرتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں ہم بھی ویسے ہی ہیں جیسے وہ ہے اور خرچ کرتے ہوئے گھبراتے نہیں' یہ وہ دن ہوتا جب ہم اس کو اپنی مسرت کا تحفہ پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ خدا سے ہم حقیقت میں اس وقت ملتے ہیں جب ہم اس کے حضور اپنے نذرانے لیئے آتے ہیں نہ کہ حاجتیں' اور وہ نذرانے اپنے اظہار کے لیئے آرٹ کے طلب گار ہوتے ہیں۔

جس وشال دنیا میں میں نے جنم لیا اس کے بارے میں میرے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ سورج اس کا انتظار نہیں کرتا کہ میں اسے کہوں۔ لیکن صبح سویرے ہی سے میرے وجود کی چھوٹی سے دنیا سے میرے خیالات بھر جاتے ہیں۔ اس کی اہمیت اس حقیقت میں کہ مجھے ایک دنیا دی گئی جس کا دارو مدار اپنی کاملیت کے لیئے میری اپنی تخلیقی روح پر۔ یہ دنیا مہان کیونکہ میرے پاس وہ شکتی جو اسے اس ناتے کی پوگیہ بناتی جو اس میں اور مجھ میں' یہ دنیا اس لیئے مہان کہ اس کی مدد سے میں اپنی میزبانی تمام دنیا کے خدا کے حضور پیش کرسکتا ہوں۔

صبح کو سورج چمک دمک لیئے آتا' جھٹ پٹے میں ستارے اپنی روشنیاں دکھاتے ہیں۔ لیکن یہ ہمارے لیئے کافی نہیں ہیں جب تک ہم اپنے چھوٹے چھوٹے دیئے نہیں جلالیتے ہیں آسمان میں روشنی کی دنیا عبث اور جب تک ہم اپنی تیاریاں نہیں کرلیتے ہیں دنیا کی تیاریوں کی دولت ایسے منتظر رہتی جیسے ایک بنسری انگلیوں سے چھوئے جانے کی۔

ایسی تیاری ساری دنیا میں جاری ہے' غار میں رہنے والے انسان کے دور سے لے کر ہمارے زمانے تک۔ آرٹسٹ انسان خدا آرٹسٹ کو اپنے گھر مدعو کر رہا۔ خدا اس کی اپنی تخلیق میں گھر رکھتا اور انسان سے اس کی توقع کی جاتی کہ وہ اپنا ماحول بھی تخلیق کرے' اپنے رہنے کی جگہ بھی جو اس کی روح کے شایان شان ہو۔ ایک مکمل تخلیق کے لیئے اس کے اندر بیٹھے ہوئے آرٹسٹ کو آزادی ہونی چاہیئے' ایسے آرٹسٹ کو جس کا ایک مدعا کاملیت ہوتا' منفعت نہیں' جس کے تئیں قیمت کی وہ توقیر ہوتی ہے جو مادی کامیابی کو حقارت سے دیکھتی اور جس کے پاس وہ اولعزمی ہوتی جو مشکلات' ہمت شکنی اور احتیاج کے مقابل درونی تکمیل کے آدرش کی جویا رہتی۔ اور تب کہیں جاکے اس کی دنیا خدا کی دنیا کا سچا

جواب دے پاتی جیسے اپنے پریمی کی محبو (دوائی) کے جواب میں ایک استری کی دھڑکن۔

یہ آرٹسٹ کی ذمہ داری کہ وہ دنیا کو یاد دلائے کہ اپنے اظہار کی سچائی سے ہم حق میں پہنچتے ہیں۔ جب انسان کی ترتیب دی ہوئی دنیا اس کی تخلیقی روح کی کم اور کسی طاقت کے مقصد کے لیئے بنائے ہوئے مشینی آلے کی مظہر زیادہ ہوجاتی تو وہ کرختگی اختیار کرلیتی اور زندہ بڑھوتری کی نازک معنی خیزی کے عوض اس کے ہاتھ مہارت آتی' اپنے تخلیقی کاموں میں آدمی فطرت کو اپنی زندگی اور محبت میں جذب کرلیتا۔ لیکن اپنی افادیت کی طاقتوں کو وہ فطرت سے جنگ کرنے کے کام میں لاتا' اسے اپنی دنیا سے نکال باہر کرتا' اپنی ہوسناکی کی بدصورتی سے اسے بدوضع اور غلیظ کرڈالتا۔ آدم کی ساخت کی ہوئی یہ دنیا اپنی بے تال و سرچیخوں اور خودپسندی سے اس کے دماغ میں ایک ایسی کائنات کا مقصدی خاکہ ثبت کردیتی جس میں فرد کا لمس نہیں ہوتا اور اس لیئے نہ ہی بالآخر اس کا کوئی مقصد ہوتا۔ تمام عظیم تہذیبیں جو معدوم ہوچکی ہیں اپنے انجام کو اسی طور انسانیت کے اظہار میں پہنچی ہوں گی' دولت سے جنم لینے والے بہت بڑے پیمانے کے ایک دوسرے کے جسم پر پلنے سے' آدمی کے مادی وسائل سے چمٹے رہنے کے اعتقاد سے' حقیقت کو جھٹلانے اور اس سے انکار کے تشکیکی جذبے سے اور سچائی کی راہ کے ہمارے آدرشوں کو ہم سے چھین لینے سے۔

یہ آرٹسٹ کے کرنے کا کام ہے کہ وہ قائم ودائم اثبات میں اپنے اعتقاد کا اعلان کرے کہ میرا ایمان اس میں ہے کہ ایک آدرش دھرتی کی فضا میں بھی پر مار رہا ہے اور وہ دھرتی میں بھی سرایت کیے ہوئے ہے۔ ایک پرلوک کا آدرش جو محض تصور کی پیداوار نہیں ہے بلکہ آخری حقیقت ہے جس میں تمام چیزیں بستی ہیں اور چلتی پھرتی ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ پرلوک کا یہ درشن سورج کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے اور دھرتی کے سبزے میں' آدمی کے چہرے کی سندرتا میں اور انسانی محبت کے دھن میں' ان چیزوں میں جو بظاہر غیراہم اور نہ بھانے والی ہیں۔ دھرتی میں ہر جگہ سورگ کی آتما جاگ رہی ہے اور اپنی آواز سنا رہی ہے۔ وہ ہمارے بھیتر کے کان میں بلا ہمارے جانے پہنچتی ہے۔ وہ ہمارے جیون کی وینا کے سر ملاتی ہے جس سے ہماری سنگیت کی ابھیلاشا انت سے پرے پہنچتی ہے۔ صرف پرارتھناؤں اور آشاؤں میں نہیں' مندروں میں بھی جو چتر میں اگنی کی لپٹیں ہیں' چتروں میں جو سپنے ہیں جنھیں امر بنادیا گیا ہے' نرت میں جو حرکت کے اچل مرکز میں والہانہ دھیان (مراقبہ) ہے۔

صفحہ۱۔ رابندر ناتھ ٹیگور ۱۸۶۱–۱۹۴۱ (نوبل انعام)

برہما : آخری دور کے ویدمت کا تخلیق کا دیوتا جو بعد میں وشنو اور شو کے ساتھ پوجا جانے لگا لیکن پانچویں صدی عیسوی سے جس کی پوجا کم ہوتی گئی۔

وید : آریاؤں کا اولین ادب' ان کے قول اور زبانی روایتیں ۱۔ رگ وید ۲۔ تیسرے وید : سام وید' یجروید' اتھروا وید۔

صفحہ۷۔ فرانسیسی رومانٹک اسکول کا سب سے مشہور بت ساز وسنگ تراش Aujgste Rodin (1840–1917) (ح-م)

ن — م — دانش

شب زادے!
تم اپنے بانجھ چہرے پر
یہ کیسی عمر کی راکھ مَل کے
کس سحر کی جستجو میں ہو
اجالے کی وہ دیوی
سرزمین عمر سے تو دور
ان دیکھے جزیروں کے گگنوں کے لئے
گل رو شنی کے سرخ پھولوں کی
منگنی تاج پر ٹانکی ہوئی
اس زندگی کے کیف آگیں
روح پرور
پر مسرت گیت گاتی ہے
تمدن مسکراتا ہے

سنو شب زاد
کیوں خوش رنگ خوابوں کے جزیروں میں
بھٹکتے ہو
ادھوری خواہشوں کے زخم سہتے ہو
تم اپنی پیٹھ تو دیکھو
جہاں پر آدمیت کی سواری کو اٹھانے کا
وہ گہرا زخم باقی ہے
اسے چاٹو
(کہ) کتوں کے لئے خود اپنے ہی زخموں میں

ساری لذت کام و دہن ہے
زخم کو چاٹو

کہ یہ وہ زخم ہے
جس پر
تمدن کے عمارت کی نیو رکھی ہے
ہر تہذیب اس کی کوکھ سے پھوٹی ہے
اس کی سیپ ہی وہ آب امریت ہے
ازل سے جو مقدر ہے
زمانے میں
فقط ہی چند لوگوں کے
کہ اس امریت سے ہی ساری توانائی ہے
قوت، حکمرانی ہے
معیار خیر و شر اس سے
تمام اعلیٰ صفات
اقدار کی
واحد نشانی ہے
تم اپنے زخم کو چاٹو

صحیفے جھوٹ کہتے ہیں
کہ ایک آدم ہے
سب اولاد ہیں اس کی
وہ مٹی سے بنا ہے
جھوٹ کہتے ہیں
الگ سب کا خدا
اور سب کا
اپنا اپنا آدم ہے

الجھتے ہو معنوں میں
سوالوں میں
جوابوں میں
چلو خاموش ہو جاؤ
زباں پر حرف ناگفتہ کی اک زنجیر پہنا ڈالو
اور اپنے زخم کو چاٹو

میرا چہرہ کیا آئینہ ہے؟
جس میں عکس دیکھا اس نے
بگڑا عکس
رکھ کر ہاتھ آنکھوں پر وہ چلایا
"چلو — یہ توڑ دو آئینہ
کرچی کرچی کر ڈالو
یہ کس کا عکس ہے
اس کو مٹا ڈالو
اجازت کس نے تم کو دی یہاں آنے کی
سو یہ جرم ہے تیرا
تمہاری پیٹھ
ننگی پیٹھ پر کوڑا برستا ہے گا
تمہارے ہاتھ میں
کیلیں یہ گاڑی جائیں گی
اور تم ہمیشہ کے لئے پابند ہو
کس نے کہا تھا
تم یہاں آؤ
(یہاں کتوں کا آنا تو منع ہے)
کس لئے آئے یہاں پر
تم وہی ہو
جس نے حریت اور آزادی کی بارگاہ میں دعا کے
احتجاج میں

ن۔م۔دانش

یہ کہا تھا
خواب ہے میرا
یہ میرا خواب ہے
ایسا بھی دن آئے گا
جب بیٹے ہمارے
اپنے آقاؤں کے بیٹوں کے برابر بیٹھ کر
اسی زندگی کے پُرمسرت گیت گائیں گے
کہ انساں سب مساوی ہیں
ہمارے باپ
ہم نے
یہاں جو کچھ سہا ہے
ہم وہ اپنے ساتھ لے کر جائیں گے
بیٹے ہمارے
جس آلودہ فضاؤں سے نکل کر
زندگی کی وسعتوں میں سانس لیں گے

یہ یقیں ہم کو ہے
سچائی ہمیشہ جیتتی ہے
ہم کہ سچے ہیں
یہ کالی رات کی دیوار
کتنی ہی بلند ہو
ریت کی ہو
توڑ ہی دیں گے
یہاں جو میں نے جھیلا ہے
میرے بیٹے نہ جھیلیں گے
وہی ہو تم
وہی ہوتا
تمہارا خواب
یہ دیکھو میری مٹھی میں ہے
بیٹا میرا
دیکھو، میرے بیٹے کا تسمہ باندھ کے
سر کو جھکائے منتظر ہے
کب سے احکام جاری ہوں

وہ سرعت سے وہی کچھ کرنے لگ جائے
کیا ہے اس کے آبا نے جو صدیوں سے

میری آنکھوں میں وہ جادو
میرے ہاتھوں میں وہ قوت ہے
جو کچھ بھی یہاں ہم چاہتے ہیں
وہی ہوتا ہے
یہ انساں کب مساوی تھے
یہ انساں کب مساوی ہیں
ہمارے ہاتھ میں جو کچھ ہے
سچائی ہے وہ
انصاف ہے
حق ہے
صداقت ہے
کہ ان ہاتھوں میں قدرت ہے
سو یہ تسلیم کر لو
سب کا اپنا اپنا آدرش ہے
کہ جو کچھ واقعہ ہے
وہ حقیقت ہے

علاوہ اس کے جو کچھ ہے
فقط وہ خواب ہے

خوابوں کی دنیا سے
حقیقت کے جہاں تک کے سفر میں
فاصلے کی تیرگی کو کس نے دیکھا ہے

بدصورتی کا حسن

میرے چہرے پہ تھوکو
تمہیں حق ہے میرے چہرے پہ تھوکو
کہ اس چہرے پہ رعنائی
نہ ایسی آنکھیں
جن کو دیکھ کر آہوئے وحشی کا گماں ہو

ستاروں کی چمک ان میں
نہ خوابوں کی وہ سرمستی
جو کہتے ہیں
خدا نے مشترک بانٹے ہیں انساں میں

دہکتے سیب ہیں یہ گال
نہ جاں میں توانائی
کہ جس کو دیکھ کر صدیوں پرانے دیوتاؤں کی
عظمت کا خیال آئے

دھنسی آنکھیں ہیں
جن میں ان گنت صدیوں کا اک آسودہ ملال
اور مسرت کا
فقط اک انتظار روح فرسا رقص کرتا ہے

سیاہ رنگت
کہ جس کی ہر سطر پر
ہر اک سو یہ لکھا ہے
آدمیت کے ستم کی داستاں

ن۔م۔دانش

اس کی شرافت اور نجابت کی کہانی
تمدن کی نشانی

یہ بچکی ہڈیاں کالوں کی
جن کا خون
گورے دیوتاؤں کا وہ غازہ ہے
کہ جس کی سرخ رنگت سے
جلال ان کا ہے تابندہ
خمار بے کراں زندہ
کہ پوری آدمیت جس کے دم سے
ان کے آگے سرنگوں ہے
سراسیمہ، پریشاں، گومگو ہے

سیاہ رنگت
یہ بچکی ہڈیاں
اور یہ دھنسی آنکھیں
معیار حسن دنیا کا
مقرر جو بھی ہے اس کے مطابق
کوئی بھی تو شے نہیں ہے
یہ فقط بدصورتی ہے
تھوک دو اس پر
مگر یہ جان لو
اس رنگ پر، اس کالے چہرے پر
کہیں انسانیت کے خون کا دھبہ نہیں

احتجاج

پرانے شہر کی ویراں گلی میں
جب بھی آدھی رات ہوتی ہے
تو کتا بھونکتا ہے

کتا بھونکتا ہے
ایک سایا سا ابھرتا ہے
میرے کمرے کے ویراں طاق پر رکھے
دیئے کی لو لرزتی ہے
سڑک کے اک سرے سے اجنبی سی چاپ ابھرتی
اور اسی گھر کے دروازے پر آکر
بین کرتی ہے
اور کتا بھونکتا ہے

کتا بھونکتا ہے
شب کو دشمنوں کی فوج کی یلغار ہے
شہزادیاں سب
سربرہنہ بھاگتی ہیں
اور راجہ قتل ہوتا ہے
فصیل شہر پہ سر کاٹ کر لٹکائے جاتے ہیں
نیا فرمان جاری ہوتا ہے
اور اطاعت کے لئے سب لوگ جھکتے ہیں
زمیں پر

آسماں سے اک ستارہ ٹوٹ گرتا ہے
ہوا فریاد کرتی ہے
درختوں میں عجب سرگوشیاں سی ہونے لگتی ہیں
میرے کمرے کے ویراں طاق پہ رکھے
دیئے کی لو لرزتی ہے
اور اک اژدھا نکل کر
فاختہ کی نرم گردن سے لپٹتا ہے

روایت ہے ہمارے شہر کی
جب بھی مصیبت آتی ہے
تو نیم شب کو اذانیں گونجتی ہیں
(لوگ جانیں شہر پہ کوئی قیامت آئی ہے)
اس شب
غنیم شہر کے آگے
اطاعت کے لئے سب لوگ جھکتے ہیں
اذاں کوئی نہیں دیتا
پرانے شہر کی ویراں گلی میں
ایک کتا بھونکتا ہے

حارث خلیق

پیڈگری چارم[1]

کتا بن جانے میں کتنی سہولت ہے
وقت پہ کھانا مل جاتا ہے
وقت پہ باہر جانا
کبھی کسی مہمان کی خاطر
کرتب کوئی دکھانا
دم جو نہ ہو تو اور اچھا ہے
سر ویسے ہی ہلانا
مالک کے چرنوں میں اپنی
پوری عمر بتانا
پڑھنے سے کیا مل جاتا ہے
کافی ہے چل جانا
کتا بن جانے میں کتنی سہولت ہے

[1] کتوں کے لئے غذا کا ایک تجارتی برانڈ
(PEDIGRE CHARM)

اکتاہٹ

نہ جنت سے ہے دلچسپی
نہ کوئی ڈر جہنم کا
کہ دونوں میں کبھی
احساس کا موسم نہ بدلے گا

مجھے بس
موت کی یکسانیت سے خوف آتا ہے

ڈر

ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے
گرچہ ہر بات چھپائی ہے بڑی خوبی سے
ساتھ اک عمر بتائی ہے بڑی خوبی سے
پھر بھی دھڑکا سا لگا رہتا ہے
عین ممکن ہے کہ شک اب بھی کوئی تازہ ہو
اپنے بارے میں 'جو' مجھ کو بھی نہیں ہے معلوم
کیا خبر اس کو اسی بات کا اندازہ ہو

واقفیت

کیسی حیا کہاں کی شرم
کون سا دین کیا س دھرم
جیسی مری زبان ہے
میری دعا سے آشنا
مجھ سے زیادہ کون ہے
میرے خدا سے آشنا

پہلی دعوت

کم سن تازہ خوشیوں کا
انبار لگا تھا
ان آنکھوں میں رونق تھی
بازار لگا تھا
خوف آتا تھا
اس رونق میں کھو جانے سے
اور بھرے بازار میں
تنہا ہو جانے سے

غلام مرتضیٰ راہی

حد فاصل پہ نظر رکھ لینا
کچھ تعلق میں کسر رکھ لینا

کر لئے جائیں نہ بے وجہ قلم
کوئی ہاتھوں میں ہنر رکھ لینا

حوصلہ رکھنا بہت خوب مگر
دل میں اللہ کا ڈر رکھ لینا

فتح دشمن کی اگر ہوتی ہو
کاٹ کر ہاتھ میں سر رکھ لینا

تو نے دل میں اتر کے دیکھا تھا
زخم تھا اور کتنا گہرا تھا

شام تک زرد پڑ گیا سورج
ذرہ ذرہ کرن کا پیاسا تھا

دل سے آہٹ وہ آج تک نہ گئی
اتنے نزدیک سے وہ گزرا تھا

موجیں اٹھ اٹھ کے کر رہی تھیں سلام
تیرنے والا کوئی ڈوبا تھا

مل کے آپس میں پی گئے ہوں گے
دو کناروں میں ایک دریا تھا

مجھ پر نہ کوہ کن ہوا مامور کس لئے
ہوں جوئے شیر پھر بھی ہوں محصور کس لئے

کرتا نہیں ہے کیوں وہ حقیقت مری بیاں
اوروں کے قصے کر دیئے مشہور کس لئے

کیوں پہلے اس نے آئنوں کو آب و تاب دی
پھر ایک ایک کر کے کیا چور کس لئے

آسودہ میرا قلب ہے تشنہ مری نگاہ
جتنا قریب' اتنا ہی وہ دور کس لئے

مظفر حنفی

تجھے کیسے بتاؤں کیا طریق جنگ ہے میرا
ترے ہاتھوں میں لرزش ہے پریدہ رنگ ہے میرا

انا کا نشہ ہے مجھ کو زمیں ہم رقص ہے میری
تمہارا آسماں اس رقص میں مردنگ ہے میرا

ہمیشہ آئینے کے سامنے محسوس کرتا ہوں
کہ یہ چہرہ نہیں ہے آئینے پر زنگ ہے میرا

ترے ناموس پر کچھ حرف آتا ہو تو البتہ
نہیں تو عشق میں کیا چیز نام و ننگ ہے میرا

غزل فریاد ہے میری ترے نقار خانے میں
مگر فریاد میں اسلوب شوخ و شنگ ہے میرا

مسلسل زلزلہ سا کیوں مرے سینے میں رہتا ہے
خدایا جسم کا یہ نیم جامہ تنگ ہے میرا

مظفر شاعری میں عمر ضائع ہوگئی لیکن
مری آواز الگ ہے، منفرد آہنگ ہے میرا

خفا کیوں ہو اگر تلوار تک ہم سے نہیں اٹھتی
عزیزو، سر پہ اب دستار تک ہم سے نہیں اٹھتی

کسی کو نذر کر دیتی تھی جاں کی اشرفی اب تک
مگر یہ اشرفی دربار تک ہم سے نہیں اٹھتی

ادھر اعلان ہوتا ہے کہ موسم فائدے کا ہے
یہاں لنگر تو کیا پتوار تک ہم سے نہیں اٹھتی

کوئی ہے جو بچھا دے دھوپ لے جا کر کنارے پر
اٹھا تو لائے ہیں اس پار تک ہم سے نہیں اٹھتی

کبھی دامن جھٹک دیتا ہے ہم کو دیکھتے ہی تو
کبھی جھولی ترے دینار تک ہم سے نہیں اٹھتی

ہماری جان پھر بخشی گئی اے وائے محرومی
کہ گردن نیزۂ دلدار تک ہم سے نہیں اٹھتی

مظفر نے کہا تھا جاں لبوں پر تشنہ لب کی ہے
کہا، بوتل لب بیمار تک ہم سے نہیں اٹھتی

مظفر حنفی

میں اس کے سامنے بھی داستاں پوری نہیں کہتا
کوئی کہتا ہے کوئی اپنی مجبوری نہیں کہتا

تمہاری شان میں کیسے قصیدہ لکھ دیا جائے
میاں میں اپنی کستوری کو کستوری نہیں کہتا

مجھے بھی غم ستاتا ہے مجھے بھی رونا آتا ہے
مگر لوبان دے کر شعر کافوری نہیں کہتا

اسے کیسے تسلی دیں عجب نازک طبیعت ہے
کہ وہ رنجیدہ تو ہے وجہ رنجوری نہیں کہتا

دلوں میں فرق آجائے تو اس کو فاصلہ کہیے
کسی کے جسم سے دوری کو میں دوری نہیں کہتا

مظفر سچ ہی کہتا آرہا ہوں سچ ہی لکھتا ہے
خدا کا شکر ہے ناری کو میں نوری نہیں کہتا

اتنی موٹی تہہ ظلمت کی
دن گوشہ پر شہ ظلمت کی

آج کہانی ہم کہتے ہیں
اک ناگفتہ بہ ظلمت کی

تو ہمدم تھا روشنیوں کا
اب یلغاریں سہ ظلمت کی

تاروں کی باتیں تو کرلیں
پیارے اب کچھ کہہ ظلمت کی

جگنو تعریفیں کرتا ہے
گاہے اپنی گہ ظلمت کی

کرنیں کب سے چھان رہی ہیں
جنگل جنگل رہ ظلمت کی

کیوں کرتے رہتے ہیں پیہم
غیبت مہر و مہ ظلمت کی

روز مظفر دن ڈھلنے پر
سنتا ہوں قہ قہ ظلمت کی

اپنا ویرانہ آباد کریں گے ؟
اس کی یادوں کو بنیاد کریں گے ؟

تم نے فولاد کو آئینہ کرلیا
آئینے کو بھی فولاد کریں گے ؟

کچھ وفادار تھوڑے سے خوددار ہیں
خود کو بندھن سے آزاد کریں گے ؟

کاش دنیا کا جنت بنادے خدا
ورنہ دوزخ تو ایجاد کریں گے :

سوچتے تھے کہ اپنا وطن ہے یہاں
جی دکھے گا تو فریاد کریں گے :

اے مظفر زمانے میں خوش کون ہے
دل کو یہ سوچ کرشاد کریں گے

رتنااور راشد

کنور سین

اس سے پہلے میں نے چاچا نوہریا کو کبھی بد حواس ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

جوئے کی ٹکڑی میں بیٹھا چاچا پھینکے جا رہے پانسے پر نظر رکھتا تھا یا داؤ پڑنے کے بعد رقم کے لین دین پر۔

جوا خانے کے باہر کچھ بھی ہوتا رہے چاچا کا اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

قصبے میں جنم لیتی، پھیلتی، سکڑتی، مرتی افواہوں یا خبروں سے بھی چاچا کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔

وہ تو ٹکڑی میں بیٹھا جوا کھیلنے یا کھلانے میں مست جیتنے اور ہارنے والوں کے چہروں کو پڑھتے ہوئے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا رہتا اور من ہی من میں کچھ گنگناتا رہتا۔

میں چاچا کا بھتیجا، شاید اسی کی چھتر چھایا میں پلنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔

کہتے ہیں میرے پیدا ہوتے ہی دایہ نے مجھے میری ماں کے بعد سب سے پہلے جس کی گود میں دیا وہ چاچا نوہریا ہی تھا۔

"اب یہ میرے آخری دم تک میرے ساتھ رہے گا" چاچا نے مجھے نہارتے ہوئے کہا تھا۔"

ایسا بھی نہیں کہ چاچا کنوارا تھا یا اس کے اپنے بچے نہیں تھے یا اس کی چاچی سے ان بن رہتی تھی۔ وہ دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کا باپ تھا اور اپنی خوبصورت اور خوب سیرت بیوی پر جان چھڑکتا تھا لیکن اپنے ساتھ مجھے ہی رکھتا تھا۔

اسکول سے لوٹ کر ہوم ورک ختم کرتے ہی میں چاچا کے چوبارے کی طرف چل دیتا۔ چاچا مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھتا اور مجھے اپنے سینے سے لگانے کے بعد اپنی دائیں طرف بٹھا لیتا۔

چاچا کوئی فقیر تھا نہ پیر۔ وہ کوئی مرشد بھی نہیں تھا۔ وہ تو شوقیہ جوئے کا اڈہ چلانے والا عام آدمی تھا۔ حالانکہ اس کا گورا چٹا اور ورزش سے کمایا ہوا وجود اپنا رعب رکھتا تھا اور اس کے بدن پر گاڑھے کی سفید براق آدمی بازو کی بغیر کالر والی قمیص اور تہبند اس کی شخصیت میں ایک خاص وقار پیدا کرتا تھا۔ چاچا اس رعب اور وقار سے بالکل بے نیاز تھا۔ وہ تو اپنے کردار کی معصومیت میں ڈوبا بس جوا کھیلنے کھلانے کو ہی زندگی سمجھ کر جئے جا رہا تھا۔

شاید چاچا کی یہ مسکینی، معصومیت اور متانت ہی اس کے اس گن کی وجہ تھی جس کے کارن وہ پانسے کے ہوا میں اچھلتے ہی بھانپ لیتا تھا کہ وہ کون سے داؤ گرے گا۔

چاچا کے اس گن کی بڑی شہرت تھی۔ جواری دور دور سے چاچا کے چوبارے جوا کھیلنے آتے اور چاچا کا کرشمہ دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ اکا دکا نئے جواری پہلے تو چاچا کے گن کو ایک سچائی ماننے سے انکار کرتے لیکن جلدی ہی انہیں بھی پتہ چل جاتا کہ چاچا اور پانسے میں کوئی غیبی رشتہ ہے اس لئے ایک بھی بازی ایسی نہیں جا سکتی جس کے متعلق چاچا کی پیشین گوئی غلط ثابت ہو سکے۔ ادھر چاچا بے ایمانی کے سخت خلاف تھا۔ وہ لین دین میں گھپلا برداشت نہیں کرتا تھا۔ سب جانتے تھے کہ چاچا ہمیشہ سچ بولتا ہے اور کھری بات کرتا ہے اس لئے اس کے کہے کو ٹالنے یا نہ ماننے کی جرأت کسی میں نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ چاچا بغیر کسی قسم کا غصہ دکھائے یا تردد کا اظہار کئے جواریوں کے بیچ کبھی کبھار پیدا ہونے والی تلخی کو مٹھاس میں بدل دیتا۔ اس کا فیصلہ سننے کے بعد دونوں فریق محسوس کرتے کہ چاچا نے واقعی انصاف کیا۔ لیکن چاچا کا گن اور انصاف صرف جواریوں تک محدود تھے۔ ان سے آگے وہ نہ کسی کو جانتا تھا نہ مانتا تھا۔

آٹھ دس ہزار کی آبادی والا قصبہ محلوں، گلیوں، بازاروں میں بٹا چین کی زندگی گزار رہا تھا۔ ہر کوئی جہاں یا جس حالت میں تھا اسی میں بنا رہنے میں خوش تھا۔ نہ کوئی بھاگ دوڑ تھی نہ ہنگامہ اور ہیجان۔ قناعت پسند لوگ نہ ایک دوسرے کی زندگی میں دخل دیتے تھے نہ دخل دینے کا سوچتے تھے۔ وہ تو اپنے کام کاج میں مست اپنے گھروں کو سنبھالے جئے جا رہے تھے۔ ان کے خواب میں بھی نہیں آیا تھا کہ قصبے میں کچھ ایسا ہو جائے گا جو ان کا چین چھین کر انہیں بدگمانی کے حوالے کر دے گا۔

قصبے کی پنڈت گلی ختم ہوتے ہی رانگڑ گلی شروع ہو جاتی تھی۔ پنڈت گلی کے ایک سرے پر رتنا رہتی تھی اور اس کے سامنے شروع ہونے والی رانگڑ گلی کے سرے پر راشد رہتا تھا۔

رتنا اور راشد ایک دوسرے کو دیکھتے' ایک دوسرے سے کھیلتے اور ایک دوسرے سے لمبی لمبی باتیں کرتے ہوئے جوان ہوئے اور جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی وہ ایک دوسرے کے ہو کر رہ گئے۔ وہ دن بھی آگیا جب ان کی محبت کوئی راز نہیں رہی۔ لوگوں نے نظر بھر کر ان کو دیکھا' کانا پھوسی کی اور چہ میگوئیاں کرتے کرتے کھلی مخالفت شروع کر دی۔

رتنا کا راشد سے کیا میل؟

وہ کون اور راشد کون!

کہاں کی چیز کہاں پہنچنے لگی!

لیکن رتنا مانی نہ راشد۔ دونوں نے قصبے کی نیند حرام کر دی اور اس کا چین چھین لیا۔ نت نئی آواز آنے لگی۔ تلخی ترشی بڑھنے لگی۔ لوگ ایک دوسرے کو قہر کی نظر سے دیکھنے لگے۔ کئی ایک تو جنگ کا اعلان کرنے لگے۔ کچھ ایک ہتھیار نکال کر دکھانے لگے۔ کئی بار تکرار لڑائی میں تبدیل ہوتے ہوتے بچی اور فساد ہوتے ہوتے رہ گیا۔

رتنا اور راشد کا قصہ چاچا نوہریا نے بھی سنا لیکن حسب عادت اس نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ جب ایک دن جواری دھن راج نے چاچا کو بتایا کہ رتنا اور راشد شادی کرنے ہی والے ہیں تو چاچا بدحواس ہو اٹھا۔ وہ ٹکڑی میں بیٹھے لوگوں کے سامنے پڑے نوٹوں اور ہوا میں اچھلنے کے لئے تیار پانسے کو بھول کر اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے ساتھ لے کر پنڈت گلی اور رانگڑ گلی کے سروں کے درمیان خالی پڑی جگہ پر پہنچ کر رک گیا۔

"رتنا" چاچا نے زور سے آواز لگائی

رتنا کے گھر سے باہر آتے ہی اس نے راشد کو پکارا۔

جب تک دونوں اس کے سامنے آئیں لوگوں کی بھیڑ لگ گئی۔ ہر کوئی چاچا کی طرف دیکھنے لگا اور اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

کافی دیر تک رتنا اور راشد کے چہروں کو پڑھنے کے بعد چاچا نوہریا بولا۔

میں جانتا ہوں تم دونوں جوان ہو گئے ہو۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جوانی' پیسہ اور شہرت کو سنبھالنا آسان نہیں ہوتا۔ ان کا نشہ آدمی کو اندھا کر دیتا ہے۔ اسے پیچھے کی سدھ رہتی ہے نہ آگے کا خیال۔ وہ سچائی سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور حقیقت سے ناطہ توڑ لیتا ہے۔ ایسے وقت میں وہ کسی کی سنتا ہے نہ مانتا ہے۔ لیکن سیانے کہتے ہیں کہ ایسے وقت میں بھی کوئی نہ کوئی آتا ہے اور نشے میں پاگل ہوئے آدمی کو سمجھاتا ہے۔

چاچا خاموش نہیں ہوا۔

محبت ایک لافانی جذبہ ہے لیکن رتنا اور راشد کے بیچ والا معاملہ بھی فانی نہیں ہے۔

چاچا قدرے اداس ہو گیا۔

میں قصبے میں ہونے والی باتوں کو سنتا رہا۔ اس میں جنم لینے والے معاملوں اور مسئلوں کا سنتا رہا۔ سروائی جھگڑوں اور صلح صفائی کا سنتا رہا۔ لیکن سب کچھ ان سنا بھی کرتا رہا۔

چاچا نے بھیڑ کی طرف دیکھا :

لوگ میری آواز سننے کے لئے ترستے رہے۔ وہ میری رائے جاننے کے لئے بے تاب ہوتے رہے۔ مجھ سے وہ سننے کے لئے انتظار کرتے رہے جسے صرف میں ہی جانتا تھا۔ میں نہیں مانا۔ میں اپنے اڈے سے باہر نہیں آیا۔ کہیں آتے جاتے بھی خاموش رہا۔ میں تو صرف پانسے' داؤ اور رقم پر دھیان دئے بیٹھا رہا۔ لیکن رتنا اور راشد ایک الگ معاملہ ہے۔ میں ان کی محبت کے خلاف نہیں ہوں۔ ان کی شادی کے بھی خلاف نہیں ہوں۔ لیکن ایک رتنا ہے دوسرا راشد۔

چاچا نے رتنا اور راشد کے چہروں کو دوبارہ پڑھنے کے بعد دونوں گلیوں کے سروں کے بیچ خالی پڑی جگہ پر نگاہیں گاڑ دیں۔ تھوڑی دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے بھیڑ کو چھٹ جانے اور وہاں سے ہٹ جانے کو کہا۔ بھیڑ کے چھٹتے ہی اس نے رتنا اور راشد کے سروں پر اپنے ہاتھ رکھ دئے اور منہ سے کچھ بولے بغیر اپنے اڈے کی طرف چل دیا۔

اس وقت کے بعد چاچا کے چہرے کا جلال ماند پڑتا گیا۔ اس کی جوئے' پانسے' داؤ اور رقم میں دلچسپی بھی کم ہوتی گئی۔ وہ ٹکڑی میں بیٹھا اپنے میں ہی ڈوبا رہنے لگا۔ میری پیٹھ کو سہلاتے ہوئے اندر ہی اندر ہونے لگا۔

میں حیران تھا کہ چاچا نے رتنا اور راشد کے معاملے کو دل سے کیوں لگا لیا۔ وہ اس کے سگے تھے نہ سمبندھی۔ ان کا چاچا سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ تو بس قصبے میں رہنے والے دوسرے لوگوں کی طرح تھے اور دوسرے لوگوں نے بھی ان کو ایسا ہی سمجھ کر بات کو اپنی سمسیا بنایا تھا نہ اپنے جی اور جان کا روگ۔

بے شک لوگ رتنا اور راشد کی بات کرتے تھے۔ جوش میں بھی آتے تھے۔ پھیلتے تھے پھنکارتے تھے لیکن اپنی زندگی کے ڈھرے سے نہیں ہٹتے تھے۔ ان کے لئے یہ بات آئی گئی ہو جاتی تھی لیکن چاچا تھا کہ اسی بات کو لے کر چلنے لگا تھا اور تل تل کر کے جلنے لگا تھا۔

دوسرا مہایدھ ختم ہو چکا تھا۔ انگریزی سامراج بھی خاتمے کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ ہندوستان کی آزادی کے قدموں کی چاپ بلند ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے بٹوارے کے لئے اٹھتی آواز بھی مہیب ہوتی جا رہی تھی۔ ایک خوش کن دستک تھی' ایک الم ناک مانگ تھی۔ دونوں اپنے وجود میں

آنے کے لئے بے قرار تھے۔ چاچا کے لئے یہ سب بہت بھیانک تھا۔ وہ آنے والی مسرت کا سواگت کرنا چاہتا تھا اور ہونے والے حادثے سے بچنا۔ لیکن اس کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ دونوں باتیں یقینی ہو چکی تھیں۔ ملک بیک وقت آزادی اور بٹوارے کی سرحد پر آکھڑا ہوا تھا۔

ایسے وقت میں بھی چاچا کو رتنا اور راشد کا خیال تھا۔ ان کا مسئلہ ہی اس کے جی کا جنجال تھا۔ حالانکہ ان کی شادی ہو چکی تھی اور رتنا پنڈت گلی چھوڑ رانگڑ گلی میں رہنے لگی تھی۔

آزادی آتے آتے اور بٹوارہ ہوتے ہوتے مار دھاڑ اور خون خرابہ شروع ہو چکا تھا۔ پنڈت گلی اور رانگڑ گلی بھی بٹ چکے تھے۔ رانگڑ گلی کے گھروں میں پڑی لاشیں ان میں لگی آگ میں جل رہی تھیں۔ رتنا اپنے مائکے بھاگ آئی تھی اور وہ راشد کو بھی ساتھ لے آئی تھی۔

اس مار کاٹ کے ماحول میں چاچا نوہریا پنڈت گلی اور رانگڑ گلی کے بیچ آکھڑا ہوا۔ بلوائیوں کی ٹولیاں آتیں اور چاچا کو وہاں کھڑا دیکھ آگے بڑھ جاتیں۔

"چاچا کب تک یہاں کھڑا رہے گا؟"

فسادی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور رتنا کے مائکے اور راشد کے مکان کو بھی گھورتے۔ لیکن یہ بات ایسے ہی لٹکی نہ رہ سکی۔ شام ہوتے ہی کچھ جوان چھوکرے ہتھیار اور مٹی کے تیل کا کنستر لے کر چاچا کے پاس آکھڑے ہوئے۔

راشد کے ماں باپ اور بھائی بہنوں کو تو ان کے کھیتوں میں ختم کر دیا ہے۔ اب راشد کی باری ہے۔ ہم اور صبر نہیں کر سکتے۔

چاچا نوہریا کو اپنی طرف لگاتار دیکھتے پاکر ایک نوجوان کچھ زیادہ ہی جوش میں آگیا۔

چاچا' آپ یہاں سے ہٹ جائیے۔ قدرت نے رتنا اور راشد والا معاملہ نپٹانے کا موقع خود ہی دے دیا ہے۔

"اگر میں نہ ہٹوں؟" چاچا نے انتہائی گمبھیر آواز میں پوچھا۔

"پھر آپ بھی...."

نوجوان اس سے آگے نہ بول سکا۔ ادھر چاچا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تم ابھی نادان ہو۔ ساری رانگڑ گلی جلا کر بھی بات تمہارے پلے نہیں پڑی۔"

چاچا نے ٹولی کے باقی لوگوں کی طرف دیکھا۔

"راشد اب رتنا کا ہے اور راشد کا مکان بھی اس کا ہے۔"

"لیکن وہ راشد ہے۔" ٹولی گرج اٹھی۔

"راشد کو راہل بننے میں کتنی دیر لگتی ہے۔" چاچا مسکرایا۔

"لیکن اس کی شناخت..."

"ماس کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی کوئی شناخت ہوتی ہے۔ پھر جو کٹ گیا اسے جوڑا نہیں جا سکتا لیکن جو اس کے ساتھ ہے اسے توڑا جا سکتا ہے۔ اصلی چیز تو وہی ہے۔"

"پھر بھی...."

"پھر بھی کیا؟" چاچا ہنسا۔ "اب بات پھر بھی کی نہیں رہی پھر کی ہو گئی ہے۔ تم پنڈت مولراج کو بلاؤ اور مندر میں سامان پہنچاؤ۔" چاچا ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "اب تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔"

مندر کے آنگن میں راشد کو راہل بنانے کے ساتھ ہی رتنا اور اس کی پہلی شادی کو رد کرنے کے لئے ان کا دوبارہ ویدک ریتی سے بیاہ رچا کر انھیں مورتیوں کو پرنام کرنے کے لئے مندر میں بھیج دیا گیا۔

میں خوش تھا کہ چاچا نے اپنی اداکاری سے راشد اور رتنا کو موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا۔

میں خوش تھا کہ اب چاچا اپنے میں لوٹ آئے گا اور اپنا اڈہ پوری توجہ سے چلائے گا۔ پانسے' داؤ اور رقم پر دھیان دے گا۔ باقی سب بھول جائے گا۔ ایسا کرتے ہی اس کا جلال لوٹ آئے گا۔ گاڑھے کی قمیص اور تہبند پھر سے اس کے وقار میں اضافہ کر دے گا اور وہ اپنے کو سالم محسوس کرنے لگے گا۔

میں نے دیکھا ایسا نہیں ہوا۔ فساد ختم ہو گئے۔ مار کاٹ تھم گئی۔ جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ ہوش غالب آنے لگا لیکن چاچا نہیں لوٹا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔ اب وہ روز حویلی کو جانے لگا۔ اپنے ماں باپ اور بھائی بھاوجوں کے بیچ بیٹھ کر اپنے کو بھرمانے لگا۔ مجھے بھی کچھ زیادہ ہی پیار کرنے لگا۔ چاچی اور اپنے بیٹے بیٹیوں پر بھی کہیں زیادہ توجہ دینے لگا۔ لیکن جوئے اور جواریوں کی طرف سے اور بھی زیادہ غافل ہونے لگا۔

میں نے دیکھا چاچا چوبارے سے گھر اور گھر سے چوبارے جاتے ہوئے رانگڑ گلی اور پنڈت گلی کے درمیان خالی پڑی چھوٹی سی جگہ پر پہنچتے ہی رکنے سا لگتا۔ اس کی سانس بکھر سی جاتی اور وہ گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔ وہ گزرتے گزرتے اس جگہ کو اپنی نظروں میں سمیٹ لیتا اور کئی قدم آگے تک اداسی میں ڈوبا رہتا۔

ایسی ہی حالت میں ایک دن چاچا نے اپنی زندگی کا شغل تیاگ دیا۔ اس نے اڈہ بند کر دیا اور جوا کھیلنے اور کھلانے سے توبہ کر لی۔

اس کے دوست حیران تھے۔ اس کے یار پریشان تھے۔ میں خود بھی پشیمان تھا کہ چاچا نے اپنی زندگی کے شوق کو کیسے تیاگ دیا۔ اس نے اپنے جیون کی اساس سے کیسے ناطہ توڑ دیا۔ وہ تو بس پانسے کا دوست تھا۔ اس کا

رشتہ تو صرف داؤ سے تھا۔ رقم ہی سے اس کی یاری تھی۔ پھر یہ سب کیسے
ہو گیا۔ اس قصبے میں ان گنت لوگ مارے گئے۔ کسی کو انہیں یاد تک
کرنے کی فرصت نہیں رہی۔ لیکن چاچا رتنا اور راشد کو نہیں بھولا۔ یا
شاید وہ کسی رمز کو یا کسی راز کو نہیں بھولا۔ کیا وہ کسی ایسی بات کو یاد رکھنے
کے لئے مجبور ہو گیا جو نہ ہوتے ہوتے بھی ہمیشہ ہوئی رہتی ہے۔

میں نے دیکھا چاچا کے حویلی کے ساتھ لگاؤ میں وہ بات نہیں تھی جو
اس کے چوبارے کے ساتھ لگاؤ میں تھی۔ اس کی ہنسی میں کہیں نہ کہیں
پھیکا پن ابھر آتا اور اس کی محبت میں بھی ہلکی سی کمزوری جاگ اٹھتی۔ وہ
بات کرتے کرتے خاموشی کے آغوش میں سرکنے لگتا اور اپنے کو بنائے
رکھنے کے لئے جدوجہد کرنے لگتا۔ یہی سب اس کے اندر کی حالت کو عیاں
کرتا تھا۔ کچھ نہ کچھ ایسا ضرور تھا جو وہ خود سہ سکتا تھا نہ جس کے بارے میں
کسی سے کچھ کہہ سکتا تھا۔

چاچا نڈھال ہونے لگا اور اپنی تیسری بیٹی کی شادی کرنے کے بعد تو
شاید وہ موت کو بھی خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہو گیا۔

دنیا سے جانے کا اسے کوئی غم نہیں تھا۔ لیکن دنیا میں رہتے ہوئے
اسے کسی بات کا غم ضرور تھا۔ آخر جب اس کے جانے کا وقت بہت قریب
آگیا تو چاچا نے میری طرف دیکھا۔

میرے بیٹے' تم سب جان لوگے کیونکہ تم سب کچھ اپنی آنکھوں سے
دیکھو گے۔

چاچا اپنی جسمانی کمزوری سے لڑنے لگا۔

ذرا پنڈت گلی اور رانگڑ گلی کے سروں کے بیچ جو جگہ ہے اس تک ہو
آئیں۔

چاچا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس سے پہلے آنے والوں اور اس
کے بعد آنے والوں میں سے بھی اکثر نے اس دنیا کو الوداع کہہ دیا۔ وقت
نے بہت کچھ بدل دیا۔ ملک کی آزادی اور بٹوارہ مسلم حقیقت بن گئے۔
آبادیوں کے قتل عام کے بعد ان کا وسیع پیمانے پر تبادلہ ہو گیا۔

میں حیران تھا کہ انسان کسی مٹی کا بنا ہے۔ وہ جو کچھ جھیلتا ہے'
بھوگتا ہے' برداشت کرتا ہے اس کا تصور ہی لرزا کر رکھ دیتا ہے۔ پھر بھی وہ
اسے بھول جاتا ہے۔ شاید اس کا چل رہی زندگی کے ساتھ موہ اسے ایسا
کرنے کے قابل بناتا ہے یا اس کے کھڑے زندگی کے کڑے مسائل اسے
سب کچھ بھول کر اپنی بقا کے لئے حیلہ کرنے کے لئے مجبور کر دیتے ہیں یا پھر
آنے والا وقت اسے خوش فہمی میں جتلا کئے رکھتا ہے۔

چاچا چلا گیا۔ لیکن میرے لئے رتنا اور راشد کو چھوڑ گیا۔ ان کے
ساتھ ہی وہ چھوڑ گیا ایک سوچ جو میرے اندر بسی مجھے کچوکتی رہتی ہے اور
میں رتنا اور راشد کا تعاقب کرتا رہتا۔

اس نے راہل بن کر جینا منظور کر لیا۔ وہ ہر روز آرتی گانے لگا اور دیوی
دیوتاؤں کے سامنے سر جھکانے لگا۔ اپنے ماتھے پر تلک بھی لگانے لگا اور
اپنے جسم پر بنے' جنیو کو سہلانے لگا۔ مجھے لگا وہ اپنے کو راہل ثابت کرنے
کے لئے دیوانہ ہوا رہا۔ لیکن میں نے دیکھا جب بھی وہ مندر جاتا پجاری
اسے پرساد دیتے وقت اس کے جسم کے ناف سے زیریں حصے پر نگاہیں گاڑ
دیتا۔ پرساد کئی لمحے اس کے ہاتھ میں ہی پڑا راہل تک جانے کا انتظار کرتا
رہتا۔ رتنا یہ دیکھتی تو کانپ اٹھتی اور اس کی آنکھیں بجھ جاتیں۔ اسے
آرتی اتارنے کے کام آنے والی تھالی تھامے رکھنا مشکل ہو جاتا۔

"راشد تو کب کا راہل بن چکا پھر یہ سب کیوں؟"

وہ چاچا کی بات یاد کرتی۔۔ بات کٹتے ہوئے کو جوڑنے کی نہیں بات
تو جو لگا رہ گیا ہے اسے توڑنے کی ہے۔۔ میں بھی سوچ میں ڈوب جاتا۔

پاکستان بننا تھا وہ بننے سے نہیں رکا۔ راشد کو راہل بننا تھا۔ اس نے
اپنے کو ایسا کرنے سے نہیں روکا۔ اب پاکستان میں کیا ہوتا ہے۔ ہندوستان
کے دوسرے راشد کرکٹ میچ دیکھتے ہوئے کیا کرتے ہیں یا دوسرے
معاملات میں رام اور رحیم کیسے الجھتے ہیں اس سب کا راہل کے ساتھ کیا
تعلق؟ اس نے تو رتنا سے محبت کی۔ اسی کا ہو کر رہ گیا پھر یہ پسھڑا کیوں؟
سوچتے سوچتے میں کئی بار چاچا کو بھی کوسنے لگتا۔۔۔ کیا ضرورت تھی اسے
رتنا اور راشد کو بچانے کی۔۔ تبھی میرا دل دہل اٹھتا اور میں انتہائی کس
مپرسی کی حالت میں جواب دیتے بھاری قدموں سے پنڈت گلی اور رانگڑ گلی
کے بیچ خالی پڑی جگہ کی طرف چل دیتا۔

ایک دن تو حد ہو گئی۔

میں پنڈت گلی اور رانگڑ گلی کے سروں پر پہنچا تو دیکھا راہل اپنے
مکان کے دروازے پر بدحواس ہوا کھڑا ہے اور رتنا بے بسی سے گلی میں
کھڑے بھگتو جینٹل کو دیکھ رہی ہے۔

بھگتو چیخ رہا تھا۔

تو راشد ہی ہے۔ تجھ ملیچھ پر ہمارے گھروں کی گندگی نہیں پڑے گی تو
کیا پھول برسیں گے! بڑا آیا واویلا مچانے والا۔۔ پنڈت جی' آپ کے بیٹے
نے مجھ پر گندگی پھینک دی۔۔۔ بھگتو نے ہاتھ لہرایا۔۔ پاجی' ذرا اپنے تہبند
کے اندر تو نظر ڈال۔۔۔ آج بھی تیرا چھوا ہوا بھوجن کوئی نہیں کھاتا۔۔۔ چلا
آیا میرے بیٹے کی شکایت کرنے۔۔۔

بھگتو جینٹل بولتا جا رہا تھا اور میں چاچا تو ہریا کو تولتا جا رہا تھا اور خود
بری طرح ڈولتا جا رہا تھا۔

میں نے بھگتو کو چپ ہونے کے لئے کہا اور راہل کو دروازے سے
ہٹا کر اندر لے گیا :

"کیا ہوا؟"

"تم نے سن تو لیا۔" راہل کی آواز میں اس کی عمر بھی بول پڑی اور

وہ لرزش جھلک اٹھی جو بڑھاپے کے بڑھنے کا اعلان کرتی ہے۔
مجھے بھول کر وہ رتنا کی طرف مڑا۔
"تو روز روتی ہے کہ ہمارے بچے نہیں ہوئے۔ ذرا سوچ' اگر ہوجاتے تو وہ پتہ نہیں کتنے جنم۔" راہل کی زبان گنگ ہوگئی جیسے وہ سکتے میں آگیا۔
رتنا بلکنے لگی تو میں وہاں سے چلا آیا۔

آج میں رتنا کو سن رہا ہوں' راہل کو سن رہا ہوں' چاچا نوہریا کو سن رہا ہوں۔
رتنا اندر چارپائی پر پڑی کھانس رہی ہے۔ وہ اپنی بوڑھی ہڈیوں کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھنے کی کوشش میں جٹی ہوئی بھی کھانسے جارہی ہے۔
راہل کا بڑھاپا بخار میں تپ رہا ہے۔ وہ اس کے جوش کے اثر میں بڑبڑا رہا ہے۔ وہ بے ہوش ہوتا جارہا ہے۔
رتنا اپنی بکھرتی آواز میں مجھ سے کہہ رہی ہے۔
تو تو میرا ساتھ دے گا!
وہ راہل کے ڈوبتے جسم کو دیکھ رہی ہے۔
تو تو چاچا کا بھتیجا ہے۔ اس کی چھتر چھایا میں پلا ہے۔ تو تو اس کے کیے کی لاج رکھے گا!
میں پھٹی آنکھوں سے بوڑھی رتنا کو دیکھتا ہوں۔ اسے سنتا ہوں اور دہشت زدہ ہوجاتا ہوں۔
کیا یہ انرتھ بھی ہوکر رہے گا!
میں اندر ہی اندر ڈھینے لگا ہوں اور چاچا نوہریا کی اداسی کی دبیز چادر اوڑھ کر پتہ نہیں کیا کچھ سہنے لگا ہوں۔

❖ ❖

نظمیں

راشد جمال فاروقی

۱

شناور تم نہیں ہو
میں بھی کب ہوں
تلذذ کے سمندر میں اتر جائیں
چلو۔ آؤ سمندر چند لمحوں بعد
ہم کو خود ہی ساحل پر پٹک دے گا

۲

جھپک جھپک کے پلک
دیکھنے کی کوشش کی
ذرا ذرا کچھ کچھ
دکھائی دینے لگا تھا کہ شام اتر آئی

۳

نئی زمینیں' نئے جزیرے' نئے سمندر
ازل سے سب کو پکارتے ہیں
نئے بدن۔ اجنبی سی خوشبو کی چاہ کوئی نئی نہیں ہے
کہ تم بھی آخر بدل ہی دیتی ہو روز گلدان کے شگوفے

۴

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے
رکشا والے سے حجت کرنی پڑتی ہے
ایک اٹھنی بچ جاتی ہے
یہ آٹھ آنے
خارش کا مرہم لینے میں کام آتے ہیں

بڑھیا کو نشے کی لت کھا گئی

چلچلاتی دوپہر کی سمفنی

صدیق عالم

کھا گئی بڑھیا تجھ کو تیرے نشے کی لت
لے جائے چڑیا تنکا تیرے چھپر سے
اور نشیمن جگ میں کیسے بنتا ہے؟
کیل کو پرل چرا لے چور دیوار و در سے
جتنا کا سب لینے والا جتنا ہے
تو کیلی باہر سے اور اندر سے
جو ماٹی ہے ماٹی میں ہی سنتا ہے
کھا گئی بڑھیا تجھ کو تیرے نشے کی لت
کولھوں کے بل گھسٹتی آدھی ہو جائے گی
واپس لینے پھینکوں میں جھریوں کا جال
اپنے مسوڑھے کھانے کی عادی ہو جائے گی
بست کشادہ ہے میری جرمنی کی تھال

تیری پوتی اب خود دادی ہو جائے گی
پوچھوں گی کب نگوڑی سے میں کوکھ کا حال
کھا گئی بڑھیا تجھ کو تیرے نشے کی لت
تجھ کو تیرا بوڑھا کر گیا ننگی بھنگی
آنکھوں میں ہو پانی تو جل پری ہوں میں
تیری ہتھیلی پر تھوکے پیشے کی تنگی
جھانک کے دیکھ ہیرے موتی سے بھری ہوں میں
کوڑادان سے تجھے نکالے صبح کا بھنگی
رات سے کب بھاگی کب دن سے ڈری ہوں میں
کھا گئی بڑھیا تجھ کو تیرے نشے کی لت
بڑھیا بیٹھ میرے سرہانے قصہ سن
تیری جوں کہیں مجھ کو مسکن نہ بنا لے
آنکھیں تیرے پاس اگر ہوں اس کو چن
اس سے پہلے میرا رب مجھ کو ہی اٹھا لے
تیرے اندر عیب زیادہ تھوڑے گن
اچھا تجھ کو جو بھائے اس کو ہتھیا لے
کھا گئی بڑھیا تجھ کو تیرے نشے کی لت
بست ہوا چل چلم بڑھا
مجھ کو جیتے جی یوں نہ سولی پہ چڑھا

GERMAN SILVER

چھپر پر سو سال کا بوڑھا
بیٹھا بنائے ہانڈی پر منہ ناک اور کان
بنجر بیل کچھ اتنی مچلی
ٹوٹ گئی کمزور مچان
چاروں اور ہیں سوکھے کھیت
ٹھنڈے گھروں میں سانپ اور بچھو رہتے ہیں
موٹی نسوں کے اندر بوڑھا جیسے مکڑا جالے پر
اپنی اپنی باری پا کر
انجر پنجر اپنی بولی کہتے ہیں
کتیا کتنی وفادار
سورج کھانے کو تیار
دم پر رہ گئے تھوڑے بال
بلا سے اڑ گئی ساری کھال
بوڑھے کی آواز پہ کان اٹھاتی ہے
برگد کے موٹے پتوں میں کوئل کوک لگاتی ہے
بڑھیا بالکل بانجھ پرانی
بڑی ہی داتا بڑی سیانی
پانی کے اندر بھی رکھتی ہے پانی
باندھ کے رکھتی ہے بالوں میں
گھاس پھوس کی ویرانی
بوڑھا کھاٹ میں سو کر چھپر تکتا ہے
آسمان میں آخر کیا ہو سکتا ہے؟

SYMPHONY

صدیق عالم

لال بہت ہے چڑیا لیکن لال نہیں
اس کی کھال پہ ایک گلابی بال نہیں
مسی کے دانتوں سے بڑھیا ہنستی جائے ہنستی جا۔
چلبلے مٹک کر گردن پر بھاری بھرکم ہنسلی لٹکائے
گئے وہ دن کہ لال چڑیا بچوں کو بہلاتی تھی
آسمان میں رہتی تھی وہ آسمان سے آتی تھی
بوڑھا تو کیوں گھمائے دیدہ
دیکھ لے طاق میں رکھا ہے تیرے حصے کا دودھ ملیدہ
لاتیا ہجرا موتی رام
خود کو بیچے اونچے دام
آئے محرم بن کر باگھ پھرے وہ گاؤں دیہات
اپنی ماں کی منت پوری کرتا ہے ہر سال
شیر کے جیسا غراتا اور مست نشیلی چال
بوڑھا وہی پرانا راگ الاپے صبح و شام
میں بڑھیا بیچاری اس کے کارن ہوئی بدنام
مجھ کو تھانے لٹو میاں کو بلوائے تھے خاص
اب سے نہ تم دیکھو رانی اب میں سوکھی گھاس
سینکڑوں سال سے اپنے گاؤں میں ایک اکیلا حجام
جب جس دور میں پوچھا اس سے بولا "سنی رام"
سنی رام کی پوٹلی میں رہتی ہے چڑیا لال
نہ تو اس کی کھال ہے کوئی نہ گلابی بال

زمین جہاں پل بھر رکتی ہے اس سے آگے سولہ کوس
تب جا کر دنیا کا کنارا ملتا ہے
بتلاتی ہیں پگڈنڈیاں
دنیا ہے اس گاؤں کا ربط کہاں تک ہے
کن راہوں سے جاتے ہیں درماندہ لوگ
کن رستوں پر، کن کھیتوں میں
کس تالاب کے انت پر
واپس آتے آتے راہی رو پڑتے ہیں

گاؤں کی شام میں دھواں بہت ہے
کچے کنوؤں کے اندر جگنو پلتے ہیں
سوکھے بے حس پتوں میں، نوکیلی گھاسوں کے اندر
اربوں آنکھیں کھلتی ہیں
تارے آنگن میں آتے ہیں
اور ان میں کچھ ٹوٹ پھوٹ بھی جاتے ہیں

ہڈی جیسی سخت بانسری بوڑھے پر نہیں پڑتی ہے
بڑھیا چڑیل بن جاتی ہے
گاؤں میں گھر گھر بچے خائف سنتے ہیں بڑھیا کی بین
بوڑھا بچے کچھے دانتوں سے
رال اور ہوا سے بانسری بھرتا رہتا ہے
بڑھیا سو جاتی ہے، خواب میں رانی بن کر اٹھتی ہے
بوڑھے کے گنجے ماتھے پر راج تلک جماتی ہے
ایک ہی گیت ہے جس کو بڑھیا گاتی ہے
آتما بھوکے تنکوں کی دہلاتی ہے

---

[1] گاؤں اور قصبوں میں ختنے کے وقت حجام بچے کی توجہ ہٹانے کے لئے فرضی لال چڑیا کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی

بلی کہتے شیر کہ خرگوش کے کان
سب میں اس نے پھونکی ہے میٹھی تان
پھر دانت میں سونے کے ڈالی نرم زبان
سیدھی سب کی بولی ہے عرش مکان

اک بھیڑ کا بچہ تھا گورا کالا
اک شاطر بھیڑیا پکارا لالا
آؤ دودھ تو پی لے تو بچے نے کہا
بلی نے کہو کبھی ہے چوہا پالا

دروازہ کبھی بھی زور سے بھیڑو مت
آندھی ہو تو سینہ تانو اسے بھیڑو مت
جنگل کا راجا ہے پیارا ہے شیر
دیکھو تو کرو سلام اسے چھیڑو مت

شمس الرحمٰن فاروقی

پیمانہ دل بھرتا ہے بھرنے دو
اندر سے کچھ مرتا ہے مرنے دو
یہ دشت ریگ اور یہ زہر چراغ
انجان ہے دل ڈرتا ہے ڈرنے دو

ہے آنکھ میں خنجر جو ہلے گا نہ ہلا
دو نیم ہے جو جسم ملے گا نہ ملا
کس لطف سے کاتا میں نے جامہ بدن
خیاط ازل سے جو سلے گا نہ سلا

اک دنیا کا دوست کا شیدا کردوں
کیا صورت ہو کہ فن ہویدا کردوں
مصرعے ہوں تجل تو استعارے حرکی
لاکھوں معشوق گھر میں پیدا کردوں

شمس الرحمٰن فاروقی

کاشی تو اونچی ہے سلیقہ نہیں کچھ
دیوار ہے پشت اور وثیقہ نہیں کچھ
معمار ہے مطلق تو میں چپ ہوں ورنہ
آتا اسے تعمیر طریقہ نہیں کچھ

وحشت کا جلال کا خزانہ دے دے
کچھ اچھے بندوں کا زمانہ دے دے
بجھ پھولوں کو نور نہاتا دے دے
پھر مجھ کو دنیا سے جاتا دے دے

آنکھوں کا دریا بہتا جائے گا   سمجھا تھا یہی
ہر موجہ تازہ بلبلہ لائے گا   چاہا تھا یہی
دریا اب رکتا ہے روانی میں ہے لنگ   موجہ تہ سنگ
سنتے ہیں کہ چشمہ یم نہ بن پائے گا   سودا تھا یہی

خواجہ حسن نظامی کا روزنامچہ

شمس الرحمٰن فاروقی

اردو میں روز نامچوں کا رواج بہت کم ہے۔ حتیٰ کہ روزنامچے کی شکل میں افسانوں اور ناولوں کا چلن بھی یہاں کم ہی رہا۔ افسانہ اور ناول کا رواج ہمارے یہاں انگریزی سے آیا۔ انگریزی اور بعض دوسری مغربی زبانوں میں بھی روزنامچے اور خطوط کی شکل میں بہت افسانے اور ناول لکھے گئے۔ اردو میں مکتوباتی طرز کے افسانے تو تھوڑے بہت اب بھی مل جائیں گے، لیکن روزنامچہ نگاری (حقیقی یا افسانوی) کی طرف توجہ بہت کم رہی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہم لوگ مزاج کے اعتبار سے بقول غالب ورق ناخواندہ ہیں اور کسی کو اپنے باطن سے پوری طرح آگاہ نہیں کرنا چاہتے۔ ؎

کوئی آگاہ نہیں باطن یک دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورق ناخواندہ

ہمارے صوفیوں کے یہاں بھی طالبین حق کو توجہ دینے، یعنی خاموش بیٹھ کر محض قوت روحانی و قلبی کے ذریعہ مرید کے قلب کو متاثر کرنے کا رواج بھی شاید اسی لیے ہے کہ بات کچھ کھلنے نہ پائے اور پوری ہو بھی جائے۔ بیدل نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

سخن اگر ہمہ معنی ست نیست بے کم و بیشے
عبارتے ست خموشی کہ انتخاب نہ دارد

وجہ جو بھی ہو، یہ بات بہرحال ہے کہ ہمارے لوگ روزنامچہ بہت کم لکھتے ہیں، اور اگر لکھتے بھی ہیں تو عام طور پر ان کے پس ماندگان اسے شائع نہیں ہونے دیتے، تاکہ گھر کی بات گھر میں رہے۔ نسبتہً پرانے لوگوں میں صرف ایک مثال پروفیسر نورالحسن ہاشمی کے دادا مولوی سید مظہر علی سندیلوی کی ہے جنھوں نے ۱۸۶۷ء سے لے کر اپنی زندگی کے آخری دن ۲۴ر دسمبر ۱۹۱۱ء تک نہایت پابندی سے ہر روز کا حال اپنے روزنامچے میں لکھا۔ مولوی مظہر علی شاعر یا ادیب نہ تھے، لیکن ان میں تاریخ اور واقعات کا شعور بہت تھا اور وہ جانتے تھے کہ کسی زمانے کے معمولی واقعات بھی آئندہ کسی معنی میں اہم ثابت ہو سکتے ہیں۔ پھر گھر اور خاندان کے معاملات کی تاریخ تو ہے ہی، جو ایسے روزنامچے سے مرتب ہو سکتی ہے۔ مولوی مظہر علی نے روزنامچہ لکھا تو بغرض اشاعت ہی تھا، اور اس کے مطالب کے عنوانات مختلف رنگ کی روشنائیوں سے لکھوا کر اس کا بھی انتظام کر دیا تھا کہ اگر کوئی شخص (مثلاً) شادیوں اور ولادتوں کے بارے میں معلوم کرنا چاہے تو وہ فوراً مطلب مقصود کو ڈھونڈ سکے۔ لیکن انھوں نے جو لکھا ہے کم و کاست لکھا، یعنی اپنی گھری باتیں بھی بے تکلف لکھیں۔ ممکن ہے انھوں نے کچھ چھوڑ بھی دیا ہو، لیکن جو بھی لکھا ہے اس میں صاف بیانی اور باتوں کو چھپانے کے بجائے آشکارا کرنے کا رجحان نمایاں ہے۔ اس عظیم و ضخیم روزنامچے کا انتخاب نورالحسن ہاشمی نے بعض ضروری حواشی کے ساتھ "ایک نادر روزنامچہ" کے نام سے خدا بخش لائبریری سے چھپوا دیا ہے۔

مولوی سید مظہر علی کی تحریر میں ادبی رنگ قطعاً نہیں ہے، اور اغلب ہے کہ خواجہ حسن نظامی کو ان کے روزنامچے کے بارے میں، چہ جائے کہ اس کے مشمولات کا علم بھی رہا ہو۔ لیکن ان کے روزنامچے اور خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں کے ذریعہ ان کے اپنے اپنے عہد کی سماجی، سیاسی اور ذہنی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ مولوی مظہر علی اگرچہ کوائف عالم کی سرخی کے تحت ہندوستان اور بیرون ہند کے تمام حالات لکھا کرتے تھے، اور ان کے بیرسٹر بیٹوں نے لندن سے جو خط لکھے ہیں ان کے اقتباسات بھی روزنامچے میں نظر آتے ہیں، لیکن کوائف ہند و کوائف عالم کے وہ محض ایک چھوٹے موٹے تماشائی تھے۔ اس کے برخلاف خواجہ حسن نظامی ہندوستان کے تمام اہم واقعات میں بہ نفس نفیس شریک تھے اور دنیا کے بھی بہت سے معاملات سے ان کا سروکار ذاتی تھا۔ مولوی مظہر علی کے روزنامچے میں ڈپٹی کمشنر اور تحصیلدار وغیرہ اہم لوگ ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے میں وائسرائے، نظام حیدر آباد، موتی لعل نہرو اور جواہر لعل نہرو، ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، اور اس زمانے کے تمام بڑے لوگ، ہندو یا مسلمان یا سکھ، کسی عظیم الشان فلم کے کرداروں کی طرح ہمارے سامنے جیتے جاگتے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ مولوی مظہر علی ایک بیدار مغز، تعلیم یافتہ اور روشن فکر شخص تھے، لیکن ان کی بساط قصبہ سندیلہ تھی۔ وہ خواجہ حسن نظامی کی طرح مدبر، مصلح، صوفی، مبلغ، مصنف، صحافی، واعظ، تاجر نہیں تھے۔ خواجہ حسن نظامی کا روزنامچہ اور سید مظہر علی کا روزنامچہ ایک طرح سے ایک ہی آپ بیتی کے دو باب ہیں۔ پہلے باب، یعنی مولوی مظہر علی کے دیباچے میں ہندوستانی مسلمان کا تاریخی اور سیاسی احساس بیدار ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن یہ اس کا بدو عمل ہے۔ علم، تجربہ، شخصیت کی کشش، وجدان اور بصیرت، سے مولوی مظہر علی کا روزنامچہ

ایک دھندلا سا خاکہ ہے اس بلند حوصلہ اور رنگا رنگ اور باہمہ لیکن بے ہمہ شخص کا جو ہندوستانی مسلمان نے بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں (یعنی مولوی مظہر علی کے انتقال کے فوراً بعد) اختیار کرنا شروع کیا' اور جس کے مختلف پہلو علامہ اقبال' اکبر الہ آبادی' ابوالکلام آزاد' مولانا محمد علی' محمد علی جناح' نواب چھتاری اور مولانا اشرف علی تھانوی جیسی شخصیتوں میں نظر آتے ہیں' اور جن کا کم وبیش مجموعہ وقتاً فوقتاً خواجہ حسن نظامی کی شخصیت میں نظر آتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے اپنے روزنامچے مورخہ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۳۰ اور مطبوعہ ہفتہ وار "روزنامچہ" بابت یکم نومبر ۱۹۳۰ء میں دوبار لکھا ہے کہ میں نے روزنامچہ لکھنا اسلامیہ کالج اٹاوہ اور "البشیر" کے بانی مشہور مصلح قوم خان بہادر بشیر الدین کے والد سے سیکھا جن سے میرے پرانے مراسم تھے۔ یہ بات یقیناً صحیح ہوگی لیکن خان بہادر بشیر الدین کے والد کے روزنامچے کی بنا پر خواجہ حسن نظامی کو روزنامچہ لکھنے کا خیال ہی خیال آیا ہوگا۔ جس طرح کا روزنامچہ خواجہ حسن نظامی نے لکھا ویسا خان بہادر مرحوم کے والد مرحوم کیا' کسی کے بس میں نہ رہا ہوگا۔ بالفرض اگر کوئی شخص خواجہ حسن نظامی جیسا وسیع دائرہ ملاقات اور مصروفیات رکھتا' تو ان جیسا علم کہاں سے لاتا؟ اور اگر یہ چیزیں بھی اس کے پاس ہوتیں تو خواجہ حسن نظامی جیسا مدبرانہ' بیدار مغز' مفکرانہ ذہن کہاں سے لاتا؟ اور بالفرض یہ سب بھی اگر ہوتا تو حسن نظامی جیسا بے نظیر اسلوب اسے کہاں سے ملتا؟ اور اگر بفرض محال وہ یہ سب بھی پالیتا تو خواجہ حسن نظامی کی سی شخصیت' ان جیسی ساحرانہ کشش' ان جیسی خود اعتمادی' کہاں سے لاتا؟

جدید اردو ادب میں صرف دو شخصیتیں ایسی ہیں جن کا پورا سحر' پورا کرشمہ' تمام کشش' خود اعتمادی' ان کی تحریر میں کھنچ کر آگیا ہے۔ ایک تو ابوالکلام آزاد' "غبار خاطر" اور "تذکرہ" میں (اور ایک حد تک عبدالرزاق ملیح آبادی کی مرتب کردہ "آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی" میں) اور دوسرے خواجہ حسن نظامی اپنے روزنامچے میں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ ابوالکلام آزاد میں صاف گوئی اور حس مزاح کی کمی اور انانیت کی زیادتی محسوس ہوتی ہے اور ان کی تحریر سے الگ ہوجانے کے بعد ان کی بات کا اثر کم ہونے لگتا ہے۔ اس کے برخلاف حسن نظامی کے یہاں صاف گوئی اور حس مزاح کا وفور ہے۔ انانیت کی جگہ خودداری ہے اور ان کی نگاہ شاہ و گدا پر یکساں پڑتی ہے۔ لہٰذا ان کی بات یاد رہتی ہے۔ اولین مثال کے طور پر ایک نمونہ روزنامچے سے باہر کا ملاحظہ ہو۔ اپنے زمانے کے سربرآوردہ لوگوں کے حلیے "منادی" بابت ۲۴ر اکتوبر ۱۹۳۸ میں انہوں نے لکھے تھے۔ وہاں مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں کہتے ہیں' "مسلمانوں میں گاندھی جی ہو سکتے تو ابوالکلام ہوتے اور مولوی جی ہو سکتے تو ابوالکلام ہوتے۔" وہیں مہاتما گاندھی کے بارے میں لکھا ہے "آواز بلند' جسم بڈھا' دل جوان' خیال بچہ' ارادہ ہمالہ پہاڑ' عمل گنگا دریا کی طرح صاف شفاف' قوم ہند' مذہب حق در رحم وعدل۔" اس طرح کے فقروں کی بہار روزنامچے میں نظر آتی ہے۔

حسن نظامی نے روزنامچہ چھپوانے کا اہتمام کیوں کیا' یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن انہوں نے غالباً اسے کبھی نہ کبھی چھپوانے کی نیت ہی سے لکھنا شروع کیا ہوگا۔ روزنامچے میں ذاتی اور قومی' مذہبی اور سیاسی' معاشی اور معاشرتی باتیں رنگا رنگ نظر آتی ہیں اور کہیں کسی بات کے چھپانے یا لیپ پوت کرنے کا تاثر نہیں ملتا۔ وہ شخص جو لاکھوں نہیں تو ہزاروں لوگوں کا پیر ہو' اور جسے سارا ہندوستان مذہبی اور قومی رہ نما کی حیثیت سے جانتا ہو' اگر روزنامچے میں باقاعدگی سے تھیٹروں اور فلموں کے دیکھنے' رؤسا کی محفلوں میں رقص وغنا کا مشاہدہ کرنے' اور کبھی کبھی تکان یا بیماری کی وجہ سے فجر کی نماز قضا ہونے کا ذکر اپنے روزنامچے میں چھپوائے تو وہ محض معمولی قوت ارادی اور حق گوئی کا حامل نہیں ہو سکتا۔

خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے میں ایک بات کبھی کبھی کھٹکتی ہے کہ ساری حکیمانہ اور درویشانہ شان کے باوجود ان کے یہاں دنیاوی اعتبار سے بڑے لوگوں سے ملنے جلنے کا ذکر بہت ہے۔ اس میں بادی النظر میں Celebrity Hunting اور رتبہ پرستی کا شائبہ نظر آتا ہے۔ میں سوچتا تھا کہ بزرگوں کے قول (جسے بعض لوگ حدیث کہتے ہیں) کہ سب سے برا فقیر وہ جو امیر کے دروازے پر ہو (بئس الفقیر علیٰ باب الامیر) اور سب سے اچھا امیر وہ جو فقیر کے دروازے پر ہو (نعم الامیر علیٰ باب الفقیر) سے خواجہ صاحب ضرور واقف رہے ہوں گے۔ پھر ان لوگوں سے اس قدر میل جول کیوں؟ ظاہر ہے کہ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ خواجہ حسن نظامی صرف فقیر اور صوفی نہیں' بلکہ سماجی اور سیاسی رہ نما بھی تھے۔ وہ ایک شخص سے زیادہ ایک ادارہ تھے' اور ادارے کو ہر طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ لیکن روزنامچے میں اس کا ایک اور جواب موجود ہے۔ ملاحظہ ہو :

> ۸ر فروری ۱۹۳۱ بعد مغرب ایک ریاست کے اہل کار ملنے آئے اور اپنے حکم راں سے ملانے کی خواہش کی۔ میں نے کہا اب تو میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ ریاستوں سے اپنے تعلقات کم کردوں کہ اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بزرگوں نے کہا تھا امیر کے دروازے پر جو فقیر جائے وہ بہت برا۔ فقیر کے دروازے پر جو امیر آئے وہ بہت اچھا۔

ہفتہ وار "روزنامچہ" دہلی ۱۶ر فروری ۱۹۳۱

> ۱۷ر جنوری ۱۹۳۱ دہلی کے ایک ہندو دوست کا پرائیوٹ خط آیا تھا کہ وائسرائے کو پارٹی دیتی ہے اور آپ نے اس کی شرکت کا اپنے ایک مسلمان دوست سے وعدہ کرلیا ہے۔ سو روپے چندے کے بھیج دیجیے۔ میں نے آج جواب میں لکھا کہ ۱۹۰۵ سے ہر وائسرائے اور بڑے بڑے انگریزوں سے برابر ملتا جلتا رہا مگر کبھی ایک پیسہ کسی کی دعوت اور پارٹی میں خرچ نہیں کیا اور نہ کبھی اپنے خطاب یا ذاتی کام کے لیے کسی انگریز سے کچھ کہا۔ ہمیشہ دوسروں کے کام کے لیے ملا۔ میں نے اس پارٹی میں شرکت کا وعدہ

اس لیے کیا تھا کہ میں انگریزوں کے سوشل بائیکاٹ کا قائل نہیں
ہوں۔ لیکن سعدی کا عشق زانو سے آگے نہیں ہے۔ زری طلبی
سخن دریں نیست۔

ہفتہ وار "روزنامچہ" دہلی ۲۴ر جنوری ۱۹۳۱

ان اقتباسات سے بات بڑی حد تک صاف ہوجاتی ہے۔ لیکن پھر بھی دل کہتا ہے کہ وہ شخص جو نظام الدین اولیا کا جانشین بننا چاہتا تھا اسے وہی کہنا چاہیے تھا جو سلطان جی نظام الدین اولیا نے علاء الدین خلجی کے بارے میں کہا تھا کہ میرے گھر میں دو دروازے ہیں۔ سلطان ایک دروازے سے داخل ہوگا اور میں دوسرے دروازے سے باہر نکل جاؤں گا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ روزنامچے میں چھوٹے لوگوں کا تذکرہ بھی اسی کثرت اور شفقت اور انہماک سے ہے جو حسن نظامی کا خاصہ تھی اور جسے وہ چھوٹے بڑے پر یکساں صرف کرتے تھے۔ ان میں بے جا انکسار نہ تھا لیکن رعونت بھی نہ تھی۔ بلکہ وہ اس بات کا اظہار فخریہ کرتے تھے کہ انہوں نے زندگی بڑی حسرت اور تنگی میں شروع کی تھی۔ ۲۳ر دسمبر ۱۹۳۱ کے روزنامچے (مطبوعہ ہفتہ وار "روزنامچہ" دہلی بابت یکم جنوری ۱۹۳۲) میں لکھتے ہیں :

ڈیڑھ بجے دوپہر کو دہلی پہنچا۔ موٹر موجود نہ تھی اس لیے واحدی صاحب کے دفتر تک پیدل آیا۔ راستے میں جو ملتا تھا بازار میں پیدل دیکھ کر دریافت کرتا تھا کہ آج پیدل کیوں؟ میں کس کس سے کہتا کہ میں نے عمر کا بڑا حصہ غریبی اور مفلسی میں پیدل چل کر گزارا ہے۔ موٹر تو اب چند سال سے خدا نے دی ہے۔ پیدل پھرنا تو سنت رسول اللہ ؐ بھی ہے۔

حسن نظامی کے اسلوب کا ایک مشکل پہلو یہ ہے کہ چھوٹے اقتباس میں اس کی خوب صورتی پوری طرح سامنے نہیں آتی۔ تصویر کشی، کردار نگاری اور جزئیات پر نظر کے اعتبار سے وہ محمد حسین کے بہت قریب ہیں، لیکن ان کے یہاں ایسے سجے ہوئے جملے نہیں ہیں کہ ایک جملہ نقل کیجئے اور پوری کتاب کا مزا لیجئے۔ تنقیدی نظر کے اعتبار سے وہ محمد حسین آزاد کے برابر نہیں ہیں، لیکن ان سے زیادہ صاف گو ضرور ہیں۔ روزنامچے کے اوراق تنقیدی رایوں سے بھرے پڑے ہیں۔ خود محمد حسین آزاد کے بارے میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں :

۸ر فروری ۱۹۳۱ میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ لوگوں نے پیغمبری اور خدائی کے دعوے کیے۔۔۔ مرزا داغ کی جانشینی کے دعوے کیے۔ لاؤ میں بھی مولانا آزاد مرحوم کی جانشینی کا دعویٰ کروں۔ لیکن ان جیسی ایک سطر بھی نہ لکھ سکا اور شرما کر رہ گیا۔

ہفتہ وار "روزنامچہ" دہلی بابت ۱۶ر فروری ۱۹۳۱ء

اقبال اور اکبر کے تقابل میں وہ اکبر کو اقبال پر فوقیت دیتے ہیں۔ ان کی رائے سے اختلاف کیا جانا چاہیے، کیوں کہ ان کا نظریۂ ادب ایک مخصوص طرز پر مبنی ہے۔ لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہوسکتا۔

۴ر جنوری ۱۹۳۱ء: اقبال مسلمانوں میں سیاسی امنگ پیدا کرنے والے ہیں۔ اور اکبر گذشتہ تہذیب کا مرثیہ لکھنے اور موجودہ تہذیب کی تصویریں بنانے والے ہیں۔ اکبر کے کلام میں مذہب بھی ہے۔ سیاست بھی ہے۔ فلسفہ بھی ہے اور لطف بھی ہے۔ دشمن بھی سن کر ناراض نہیں ہوتے، بلکہ ہنستے ہیں۔ اقبال کے ہاں صرف سیاست اور فلسفہ ہے۔

ہفتہ وار "روزنامچہ" دہلی بابت ۱۶ر جنوری ۱۹۳۱ء

موتی لعل نہرو کے بارے میں انہوں نے جو لکھا ہے وہ ان کی قلمی تصویر کشی کی بے نظیر قوت اور ہندو مسلم اتحاد اور دونوں فرقوں سے ان کی بے ریا دوستی پر مشعر ہے :

۴ر فروری ۱۹۳۱ : گورا رنگ ایسا جیسے چینی کی مورت۔ بہت خوب صورت، میانہ قد، گداز جسم، آنکھیں شرافت وعزم و ہمت کا خزانہ، آواز مضبوط مگر سریلی و بلند۔ دل دماغ ہر قسم کی حوصلہ مندی سے لبریز۔ وکیل تھے مگر دل شاہانہ رکھتے تھے۔۔۔۔ شرارت کے ٹیلیفون آرہے ہیں۔ کہا جاتا ہے آپ کو آج بہت صدمہ ہوگا کہ پنڈت جی مرگئے۔ ہاں مجھے رنج ہے کہ آدمی مرگئے اور جانور رہ گئے جو ایسے سوالات کرتے ہیں۔

ہفتہ وار "روزنامچہ" دہلی بابت ۸ر فروری ۱۹۳۱

آخری جملے میں پر وقار حس مزاح کے ساتھ ساتھ ابنائے وطن کی ناعاقبت اندیشی اور تنگ نظری پر رنج کا جلال دیدنی ہے۔

خواجہ صاحب کے روزنامچے میں سیاسی، حکیمانہ، عارفانہ اور اصلاحی نکتے اور گہری فکر و مطالعہ پر مبنی اقوال اس قدر ہیں کہ اگر انہیں یک جا مرتب کیا جائے تو (اے روش فوکو A Rochefoucauld ۱۶۱۳ تا ۱۶۸۰) کے مشہور زمانہ "اقوال واصول" MEXIMES سے بڑھ کر نہیں تو اس کے برابر کتاب ضرور تیار ہوجائے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

۱۹ر دسمبر ۱۹۳۱ (مطبوعہ "روزنامچہ" یکم جنوری ۱۹۳۲) مجھے خدا نے شکار کرنے کے لیے نہیں بلکہ شکار ہونے کے لیے بنایا ہے۔

۲۱ر دسمبر ۱۹۳۱ (مطبوعہ ایضاً) ہم جو کچھ کشمیر کی نسبت کہتے سنتے ہیں وہ بھی کم ہے۔ اصلیت اور حقیقت اس سے بہت زیادہ ہے جو کچھ کہ ہم دیکھ اور سن رہے ہیں۔

۲۵ر دسمبر ۱۹۳۱ (مطبوعہ ایضاً) خدا کی قدرت ہے یا ہمارے اعمال کی شامت ہے کہ ہمارا کوئی کام جھگڑے اور اختلاف سے خالی نہیں رہا۔

۱۸ر اکتوبر ۱۹۳۰ (مطبوعہ ہفتہ وار روزنامچہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۳۰) تجارت بزدل کردیتی ہے۔ ملازمت سے جرأت جاتی رہتی ہے۔ سیاست بے رحم بنادیتی ہے۔

۱۰ر جنوری ۱۹۳۱ (مطبوعہ ایضاً ۱۹ جنوری ۱۹۳۱) درحقیقت میں

مسلمان اسی کو سمجھتا ہوں جو ضمیر کی آواز کو آزادی سے ظاہر کرسکے۔

۹؍جنوری ۱۹۳۱ (مطبوعہ ایضاً ۸؍جنوری ۱۹۳۱) انگریزوں کی حکومت اس لیے کامیاب ہے کہ ان کو دوسروں سے کام لینا آتا ہے۔ اور ہندوؤں کی کامیابی کا راز ہے کہ انھیں کام کرنا آتا ہے۔ اور مسلمانوں کی ناکامی کا یہ راز ہے کہ وہ کام کرنا بھول گئے اور کام لینا بھی۔

۳۰؍دسمبر ۱۹۳۰ (مطبوعہ ایضاً) سیاست کے عمل میں کتنی ہی زیادہ بداخلاقیاں ہوں لیکن سیاست ہی وہ روح ہے جس سے قومیں زندہ ہوتی ہیں اور زندہ رہتی ہیں۔ اور اسلام، ایک ایسا مذہب ہے جو عملی سیاست کو لے کر پیدا ہوا تھا۔

۱۸؍فروری ۱۹۳۱ کے روزنامچے مطبوعہ ۲۴؍فروری ۱۹۳۰ میں خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں کہ "آج ایک ایڈیٹر دوست کہتے تھے کہ مانٹیگو صاحب کا روزنامچہ پڑھ کر مجھے آپ کے روزنامچے کی قدر معلوم ہوئی کہ آئندہ زمانے میں یہ کیا چیز بن جائے گا۔" اس میں کوئی شک نہیں کہ ادبی، علمی اور تاریخی اعتبار سے حسن نظامی کا روزنامچہ ایسا بحرِ بے پایاں ہے کہ جس میں انسان تاعمر شناوری کرسکتا ہے۔ ❖ ❖

قلپ سوپو ترجمہ: مرزا سعید الظفر چغتائی

آج کی رات، کتنی سست رفتار رات
ہواؤں اور طوفانوں کے باوجود
آہستہ آہستہ گزرنے والے بادلوں والی
صبح کا انتظار کرتے رہنا جو نمودار ہو ہی نہیں چکتی،
دل کی ہر دھڑکن
ہر شبہ جسے مٹاتا ہے
اور جھیل جاتا یہ بے اختررات
جسے امید بھی کہتے ہیں اور نومیدی بھی
آخرش ایک خفیف سی کرن
پھر اک بڑی کرن
شاید شفق یا تڑکا
جب ہم کوئی ذاتی نام پکارتے ہیں
نور کا تڑکا یا شفق۔
اس سکون سے پہلے جو دائمی ہے
یا بس ایک نگاہ
جو پوری طرح یاد نہیں آتی
اور بھولتی بھی نہیں
دھند نہیں، روشنی
جو شور میں ہمیں راہ دکھائے
آواز بھی ہاتھ بھی
جس کا ہم انتظار کرتے ہیں
ساری رات، ساری راتیں
ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہنے کو!

محسن علی

تم کو جلی کہوں، نرموہی کہوں یا کٹھور---- میرے ساجن، میں نے تم کو کبھی دیکھا نہیں------ بس سنا ہے، لیکن سنا بھی ہے تو نہ سنگیت کی ابھری تانوں میں نہ تمہاری شرارت بھری شوخی باتوں میں---

"میرے یار"--- کس قدر پگل ہے میرا یہ خیال جو تم کو یار کہہ گیا--- بنا کسی آواز کے-- لیکن اتنے ہی شور سے یہ شبد میرے اندر گونج گیا ہے--- یہ کوئی گونج نہیں ہے یہ تو بیچ بیچ کی بجلی ہے جو میرے اندر کوند گئی ہے- اور جب میں نے اپنے اندر جھانکنے کی کوشش کی ہے تو میری آنکھیں چکاچوند ہو گئی ہیں- اس ایک گونج کی چمک ہے--- آہ! یہی تو سوچتی رہتی ہوں کہ میں نے تم کو کب سنا ہے کیسے سنا ہے، اور کہاں سنا ہے---؟ بھلا ایسا بھی کوئی مقام ہو سکتا ہے'--- تم کتنے شرارتی ہو، کچھ کہتے تو ہو میرے کانوں میں، اور رکھ دیتے ہو اپنے ہونٹ میرے گالوں پر--- ایسے ایک لمحے سے زیادہ لذیذ بھی اور لمحے ہوتے ہوں گے- نشہ آور ہوتے ہوں گے-- لیکن ایسے ایک لمحے کی لذت اس کا ایک نشہ ہوتا ہے، بالکل انوکھا، انیلا- میری بالی عمر کے لیے ہی نہیں میں تو سمجھتی ہوں کہ دنیا کی ساری ہی زندگیوں کو شاید ہی کبھی ایسا لمحہ نصیب ہوا ہوگا-- یہ تو اپنے اپنے مقدر کی بات ہے-

یہ کتنا بڑا اور گھنا پیڑ ہے- برکھا رت کی پہلی پہلی ہریالی جیسا ہرا اور پھر سدا ہرا، چمکتا ہوا- ادھر سورج کی سرخیاں ابھرتی ہیں نا تو وہ ساری کی ساری اس پیڑ کے ہرے بھرے باولے پن پر نچھاور ہو جاتی ہیں- اف، لگتا ہے بس یہی جیون ہے- بھلا اور کیا چاہیے مجھے یہاں؟ --- تمہارے سوا-

دیکھو نا کتنا بڑا ہے یہ پیڑ، اونچا پورا، گول گول بس ادھر سے سورج نکلتا ہو تو اس کا گھنا سایہ بالکل پچھم تک پہونچ جاتا ہے-- اور سانجھ ہوتی ہے تو اس کا سایہ پورب تک جا پہونچتا ہے-

میں تو دن کی دھوپ میں کتنا گھور گھور کر دیکھتی ہوں اس پیڑ کو-- وہ بھی اس کی پرچھائیں کو پانی میں-- اس چھوٹی سی اتھل، پتھریلی ندی میں، جس کے تٹ پر یہ سادھو سمان پیڑ ایک ٹانگ کھڑا ہوا رہتا ہے--- اب کبھی تم آتے تو بتاتی-- یہ ہمارا چھوٹا موٹا گھر ہے-- یہ ہمارے بڑے مان پان والا پیڑ ہے-- یہ میرے ساتھ کھیلنے والی شوخ الھڑ ندی ہے- اور پھر دیکھو وہ ہرا بھرا میدان کہاں تک پھیل گیا ہے- اس کالے کلوٹے دیو جیسے پہاڑ کے پیروں تک---

جیون میں ڈر تو ہوتا ہے، مگر پتہ نہیں کس سے---؟ شاید تم سے--- میں کبھی صبح کو کبھی شام کو جب سارا آکاش رنگ ہی رنگ بن جاتا ہے، بہت دور اوپر، ساتویں آکاش تک دیکھتی ہوں- تم تو کسی بھی اور سے آ سکتے ہو نا؟ مجھے کیا معلوم تمہارا کون دیش ہے- آشا نراشا کے ارتھ مجھے سمجھ میں نہیں آتے-

میں نے سیتا کا پاٹھ پڑھا ہے نہ رام کی کہانی- بس ایسے نام سنے ہیں- وشنو کا نام سنا ہے، سرسوتی کا نام سنا ہے- برہما اور مہیش کے نام سنے ہیں- کرشن مراری اور رادھا کا نام سنے ہیں- پھر بھی میں نہ جان سکی کہ یہ سب کون ہیں- سوچا تم سب کچھ بتا دو گے- نہیں بھی بتاؤ گے تو فرق کیا پڑے گا- میں تو تمہارے دو ہی بول کے لیے جیتی رہی ہوں- اب تک--

میرے پتا، وہ دور ندی کے تٹ پر تڑکے ہی جاکر سوریہ دیوتا کو نمسکار کرتے ہیں-- وہاں گیان کرتے ہیں- تو مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا- اب ان کی پتنی نہیں ہوتا- اس ندی میں اس کی راکھ بہہ گئی تو خیال آتا ہے، یہ ندی میری ماں ہے- تم سے ایک بات تو میں ضرور کہوں گی- تم چاہے نہ مانو- تم سے پہلے میں اپنے اندر برابر دیکھتی رہی ہو-- تم کتنے بے حیا ہو-- میری دھونکنی جیسی جلتی ہوئی سانسوں سے جب میرے سینے کا اتار چڑھاؤ بڑھ جاتا ہے تو اس پر تم اپنی آنکھیں رکھ دیتے ہو کہ تم اندر بھی بہت کچھ دیکھ سکو- تو میں باولی تمہاری نظروں سے اپنے ڈھکے چھپے انگ انگ کو لاج اور لاڈ میں ایسے سنبھالے اور چھپائے رکھنے کی کوشش کرتی ہوں کہ ایک ایک انگ نکھار بن کر اجاگر ہو جاتا ہے- بس پتہ نہیں ایک روشنی سی ہوتی ہے، جو یہاں وہاں بار بار چمک جاتی ہے-- تمہاری نظروں میں بھلا حیا کہاں---؟ دیکھا ہو گا نا تم نے کہ رات بھی، سویرا ہونے سے پہلے اپنی مستیوں کو اسی طرح شرمساری کے سے انداز میں سمیٹتی ہے کہ دیکھتے دیکھتے سارے میں نور ہی نور اور مستیاں ہی مستیاں پھیل جاتی ہیں-

جی بہت چاہتا ہے، بار بار جی میں گدگدی ہوتی ہے اسی کامنا کے ساتھ کہ ایک بار تم اس دیو جیسے پہاڑ کو دیکھتے-- اس کی ایک جٹو ہے اور بہت پر پیچ-- تم تو اس کو دیکھ کر بے طرح چہنے لگ جاتے اور-- میں تم کو ہنستا ہوا دیکھتی تو

واری نیاری ہو جاتی اور جیون کا سواد مل جاتا مجھے۔ بس جیون ہی تو مل جاتا۔۔۔
دیکھو نا' اس جٹو سے ایک جھرنا پھوٹتا ہے اور میرا بوڑھا باپ پہلے وہاں اپنی پتی اور اپنی بٹیا کو لے کر جایا کرتا تھا اور جم کر پوجا پاٹھ کرتا تھا۔۔۔ میں نے دیکھا تھا پانی کیسے تیزی سے ابلتا رہتا۔۔۔ ہم سب وہاں اشنان کرتے۔۔۔ معلوم یہ نہیں ہوتا تھا کہ پہاڑ کے نیچے کچھ دور اتر کر وہ جھرنا کدھر غائب ہو جاتا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا۔۔۔ بتا جی کہتے کہ پانی اس پہاڑ دیو کے پیٹ میں اتر جاتا ہے۔ وہی سب پانی پی جاتا ہے۔ پھر یہ بھی کہتے کہ یہ بہتی چاندنی جیسا پانی جو ہمارے گھر کے پاس کی ندی میں بہتا ہے وہ اسی جھرنے کا ہے۔ مجھے بھلا اتنی سوجھ بوجھ کہاں۔

میں نے تو اس پانی کا رنگ دیکھا۔ روپ دیکھا۔ چنچل بہاو دیکھا۔ اس کی چمک دیکھی۔ مست اور شانت چال دیکھی۔ لہرلہرا یک چھڑ دیکھی۔۔۔ ایک شوخی دیکھی اور پھر کبھی کبھی نہ رکنے والا سنگیت سنا۔ دل کی بات تو یہ ہے' بس یہی وشواس ہوتا ہے کہ ان ساری کیفیتوں میں دراصل تم مجھے مل جاتے ہو۔ بہت بہت قریب ہو جاتے ہو۔ میرے انگ لگ جاتے ہو۔۔۔ اسی لیے تو لگتا ہے میں ایک دھرتی ہوں اور یہ ندی میرے اندر بہتی ہے۔۔۔ میرے پران۔

دیکھو یہ کیسا تکون ہے جس نے میرے ساری زندگی کو اپنے اندر گھیرے رکھا۔ ہمیشہ رکھا۔۔۔ ادھر یہ سیدھی لکیر جیسی ندی ہو۔ اس کے ادھر آگے لگا وہ پہاڑ ہے اور ان دونوں سے ہو کر گزرنے والی وہ ایک کسی دور کے شہر کو جانے والی سڑک ہو۔ بس اس تکون میں گھرے یہ کالی مٹی والے کھیت ہیں۔ اونچے ناٹے پیڑ ہیں۔ یہیں ان پیڑوں تلے میرا بچپن گزرا۔ میں جوان ہوئی۔ تم بھی یہی چلے آئے۔ اسی پہاڑ سے نیچے اتر آئے۔ اتنی دور تک پھیلے ہوئے میدانوں میں ٹھٹھا مذاق ہوا۔ چھیڑ چھاڑ ہوئی۔ پھر کیا ہوا؟ انجانے میں تم ہمیشہ کے لیے مجھ میں بس گئے۔۔۔ مگر میرے لیے تو ان دیکھے رہے۔

میرا پتا مہارشیوں جیسا تھا۔ اسی تکون کا ہو کر رہ گیا۔ اسی گھنے پیڑ کا جس کے پاس ہمارا اتنا سندر جھونپڑا ہے۔۔۔ اس ندی کا ہو کر رہ گیا اور اس پہاڑ دیو کا۔ میرے بھائیوں نے کھیت جوتے۔۔۔ فصلیں کاٹیں۔ بیاہ کیے اور پتہ نہیں کہاں اور کیوں چلے گئے۔ میں رہ گئی۔ تمہارے لیے۔

یہاں کتنی فصلیں کٹ گئیں۔ میں اب گن تھوڑی ہی سکتی ہوں۔ اس ندی میں کتنی بار باڑھ آئی' مجھے اب سب یاد کہاں۔ کتنی کتنی بار ساون بھادوں جیٹھ اساڑھ آئے اور گذر گئے۔ میں اناڑی ان سب کا کیا حساب رکھتی۔ کتنی برساتوں میں میں بھیگ بھیگ گئی۔ کڑکڑاتے جاڑوں میں کپکپاتی رہی' ٹھٹھر گئی۔ چلچلاتی دھوپ میں جل بھن گئی۔ بس تمہارے لیے۔ تم کو ایک نظر دیکھنے کے لیے۔

اس تکون سے ہو کر جو سڑک گزرتی ہے نا وہ بالکل میرے اندر سی گزر گئی۔ میرے دل و جان سے ہو کر گزر گئی۔ تم ان دیکھے ہی رہو۔

اب تک۔۔۔۔۔۔۔؟

ہاں اب تک۔۔۔۔۔!

اب تو اپنے آپ سے ایسی ہی بے تکی باتیں کرتی ہوں۔ لگتا ہے' اس تکون ہی میں کیا' اس تکون سے باہر پھیلے ہوئے جگ میں بھی میں اکیلی ہوں۔۔۔۔ ایک بیٹا ہوا مجھے۔۔۔ مشٹنڈا' بڑا گھمرو اور پیارا۔ آکاش تک گونج جانے والے قہقہوں کے ساتھ اور جنگلی ہواؤں کے کھلنڈرے پن کے ساتھ وہ بڑا ہوا۔ فصلیں بوئیں۔ فصلیں کاٹیں' اپنے بٹے کٹے چوڑے چکلے' لمبے چوڑے باپ کے ساتھ۔۔۔ میرا بیٹا بھی بیاہ کر کے اسی سڑک سے آگے پہاڑ کے پیچھے چلا گیا۔ اس کا باپ اب کھیتوں پر صبح کو جاتا ہے تو سانجھ کو لوٹتا ہے۔ میں دن بھر اکیلی ہوتی ہوں۔۔۔ بالکل اکیلی۔۔۔ اس ندی کی طرح چپ چاپ بہتی ہوئی۔

اب تک۔۔۔۔؟ ہاں اب تک۔

گزر گیا جیون۔۔۔ بنا تمہیں دیکھے بنا تمہیں سنے۔۔۔ بنا تمہیں چھوئے۔ ویسے تم تو اسی وقت اس پہاڑ سے اتر کر کودتے پھاندتے میرے پاس آئے تھے جب تم نے میرے کانوں میں ایک بات کہنے کے لیے اپنے ہونٹ رکھ دیے تھے میرے گالوں پر۔۔۔ میری دھونکنی جیسی چلتی سانسوں سے ہونے والے میرے سینے کے اتار چڑھاو کے بیچ اپنی آنکھیں رکھ دی تھیں کہ تم میرے اندر بھی بہت کچھ دیکھ سکو۔۔۔ تمہاری نظروں میں بھلا حیا کہاں؟

میں اب ہنستی ہوں' اپنے ہی اندر اندر۔۔۔ اپنے ہی اس خیال پر کہ کتنی اکیلی ہوں' اپنے ہی اندر۔ یوں بھی تو بالکل اکیلی ہوں۔ اس ندی کی طرح چپ چاپ بہہ گئی ہوں۔ بہہ رہی ہوں۔۔۔

ہر ندی کے بیچوں بیچ ایک دھار ہوتی ہے۔ وہ نہ ہو تو ندی ندی نہیں ہوتی۔

ہر جیون کے اندر ہی اندر بھی ایک دھار ہوتی ہے۔ مسلسل بہتی ہوئی۔ ایک خیال' ایک آس ایک چھب۔۔۔ تم جیسی۔۔۔ وہ نہ ہو تو پھر یہ سارا جیون سوکھی ندی جیسا لگتا ہے۔۔۔ سوکھا سا کھا۔۔۔

اس ندی کے بیچ بھی اگر وہ دھار نہ ہوتی تو یہ کب کی سوکھ جاتی اگر تم نہ ہوتے۔۔۔

❖ ❖

لوئی اراگوں ترجمہ: مرزا سعید الظفر چغتائی

یہ عمر گزر جاتی' جیسے کسی بڑی ویران حویلی سے سبھی ہوائیں گزرتی رہتی ہیں
جھونکوں سے پٹ ٹکراتے ہیں اور کوئی کمرہ بند نہیں ہوتا
نامعلوم مفلس کاہل اس میں بیٹھے رہتے ہیں' یہ جانتے ہوئے بھی کہ کیوں
گھاس پھوس کی فوجیں خندقوں میں اتنی بڑھ آئی ہیں کہ انھیں جالیاں نہیں روک سکتیں
اس عمارت میں' پرانی ہو کہ نئی' ہم بہرحال اجنبی ہیں۔
کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا' کون اسے یہاں لایا۔ شاید سب خیالی ہو۔
کچھ سردی سے ٹھٹھر رہے ہیں' کچھ بھوکے ہیں۔ زیادہ تر کو ان کا کوئی راز جھنجھوڑ رہا ہے
کوئی بے چہرہ بادشاہ آ گزرتا ہے' اس کے آگے دو زانو ہو جاتے ہیں۔

بچپن میں سنا تھا' فرشتے جیتنے ہی والے ہیں۔
اور میں نے یقین کر لیا تھا' یقین کرتا رہا..... اور اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔
زمانہ نوجوانوں کے لئے نقاب ہے جو اڑ اڑ کے ان کی آنکھوں پہ گرتی رہتی ہے۔
اور اس میں سے جو بوڑھوں کے لئے بچ رہتا ہے' اتنا بھاری اور چھوٹا ہوتا ہے کہ ہوا اسے ان کے سامنے سے ہٹا نہیں پاتی

وہ پوچھتے رہتے ہیں کہ آخر کس بات پہ یقین کریں۔
جو بھیانک راستہ وہ چھوڑ رہے ہوتے ہیں' اس پہ چلتے وقت انھوں نے جو تھوڑا سا کام کیا تھا' ان کے سامنے ہوتا ہے۔
شکار پہ سایہ کو ترجیح دینے والے غریبو' مستقبل کسی کا یار نہیں
گلی میں کھیلنے والے چھوٹے بچو' مجھے تم پر کتنا بے پناہ ترس آتا ہے۔
بدقسمتی' خاک و خون' تھکن جو کچھ تمھارے سامنے ہے' میں وہ سب دیکھ رہا ہوں
جو فریب ہم نے کھائے ہیں' تم ان سے کچھ نہ سیکھ پاؤ گے' نہ ہماری غلطیوں سے
ہم تمھارے کسی کام نہ آئیں گے' تمھیں اپنے طور پہ ہر قیمت چکانی ہو گی
مجھے تمھارے کندھے جھکتے نظر آ رہے ہیں۔ تمھارے ماتھے پہ شکنیں نمودار ہو چکی ہیں

تم کہو گے ایسا تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے' بیشک' لیکن
انھیں یاد کرو جنھوں نے اپنے زندہ ہاتھ کے گوشت پوست کی انگلیاں چلتی مشینوں میں
ڈال دیں تاکہ وہ بدلیں —
اور انھیں بھی یاد کرو جنھوں نے اپنے پنجروں پہ بھی اعتراض نہ کیا
کیا ہمیں مایوس ہو جانے اور ایک لمحہ بھی رک کے کھڑے رہنے کا حق ہے؟
کاش ایک دن تمھارے سروں پہ کامیابی کا پاگل سورج چمکے !
اس دن یاد کرنا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے بھی چند لوگ
غلامی کا جھنڈا اتارنے قلعہ پہ چڑھ گئے تھے' مگر وہاں سے دھکیل دیے گئے
ان کا اور ان کی فتح کا دل آج تک تاریخ کی مشترک خندق میں دھڑک رہا ہے

دیکھو' مقابلہ کبھی بند نہ ہو' ہار جانا' تین بار' کوئی معنی نہیں رکھتا
اور جیسے ہی ایک انسان دوسرے کو حساب دے دیتا ہے' ہر سوال پھر تازہ ہو جاتا ہے
ہم نے بڑے کام ہوتے دیکھے ہیں' لیکن بڑی افسوسناک باتیں بھی دیکھی ہیں
یہ سمجھنا کبھی آسان نہیں ہوتا' کہاں نقصان ہوگا اور کہاں فائدہ

تم گذرو گے جہاں سے ہم گذرے ہیں' یہ میں تم میں کھلی کتاب کی طرح پڑھ رہا ہوں
میں تمھارے سینے میں اپنا دل دھڑکتا سن رہا ہوں
تم اسے خرچ کر ڈالو گے' تمھارا بھی یہ انگارا سرد ہو جائے گا' خوش ہو جائے گا
جیسے خزاں پھیکی پڑتی جاتی ہے اور جاڑوں کے گلاب کے گرد پھیلی خوشی میں بدل جاتی ہے

یہ باتیں تمھاری ہمت پست کرنے کو نہیں کہہ رہا ہوں
عدم کو دیکھو' اس پہ فتح پانا سیکھنے کے لئے' سر کا اتار کم خوبصورت نہیں ہوتا
لیکن اسے بھی سننا سیکھو جو گونج کی طرح پہاڑیوں میں از سر نو جنم لے رہا ہے
ہم دنیا میں گانے والے تنہا نہیں۔ ڈراما سب گانوں کے مجموعے کا نام ہے

ڈراما جاری رہے' چاہے ایک آدھ آواز خوش ہو جائے
بڑا کورس نامکمل فقروں کو پھر سے دہراتا ہے
جس گھڑی اپنے پیالہ کے لبریز ہو جانے کی حد تک' میں گانے والا جو بھی کر سکتا تھا' کر چکا
کیا فرق پڑتا ہے اگر راستہ چلتے چلتے تم مجھے ایک مفروضہ کی طرح پیچھے چھوڑ جاؤ

میں اپنی بار' تمھیں اس طرح چھوڑ رہا ہوں جیسے آخری بار کھڑا ہونے والا رقاص
وہ اپنی آنکھوں میں جو سناٹے چھپائے لئے جا رہا ہے ان کے لئے اس کی مذمت نہ کرو
میں تمھیں کوئی اور تحفہ نہیں دے سکتا سوائے اس کجلائی روشنی کے
مستقبل کے انسان' کونکوں کو دھونکتا رہ
میں یہی کہہ سکتا ہوں' مجھے اتنا ہی نظر آتا ہے

آزادی

پول ایلوار ترجمہ: مرزا سعید الظفر چغتائی

اپنی اسکولی کاپیوں پہ
ڈسک پہ ' درختوں پہ
ریت پہ ' برف پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

سبھی پڑھے صفحوں پہ
سبھی سادہ ورقوں پہ
پتھر ' خون ' کاغذ ' راکھ پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

سنہرے عکسوں پہ
سپاہیوں کے اسلحہ پہ
بادشاہوں کے تاج پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

جنگل ' بیابان پہ
گھونسلوں ' مچھروں پہ
اپنے بچپن کی ہر گونج پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

راتوں کے تعجبات پہ
دنوں کی سفید روٹی پہ
منگیتر موسموں پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

اپنے سبھی نیلگوں چیتھڑوں پہ
تالاب ' سورج ' شکنجہ پہ
زندہ جھیل پہ ' چاند پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

میدانوں پہ ' افق پہ
چڑیوں کے بازوؤں پہ
سایوں کی چکی پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

بادلوں کی کائی پہ
طوفانوں کے پسینہ پہ
بھاری اور ہلکی بارش پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

طبعی حقیقتوں پہ
جھلملاتی شکلوں پہ
رنگ کی گھنٹیوں پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

جاگتی راہوں پہ
پامال راستوں پہ
چوراہوں کے اژدہام پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

جو چراغ جلے ' اس پہ
جو چراغ بجھے ' اس پہ
اپنے نو مجتمع مکانوں پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

آئینہ اور اپنی خواب گاہ کے
دویم قطع پھلوں پہ
اپنے خالی سیپ جیسے بستر پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

اپنے خوش خور اور نازک کتے پہ
اس کے کھڑے کانوں پہ
اس کے ٹیڑھے پنجوں پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

دروازوں کے کواڑ پہ
جانی پہچانی چیزوں پہ
مقدس آگ کی لپٹوں پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

ہر آمادہ جسم پہ
اپنے دوستوں کی پیشانی پہ
ہر بڑھتے ہاتھ پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

تعجبات کے شیشوں پہ
متوجہ ہونٹوں پہ
خموشی سے کہیں زیادہ بلندی پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

اپنی برباد پناہ گاہوں پہ
غارت شدہ روشنی کے میناروں پہ
پریشانی کی دیواروں پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

بے خواہش موجودگی پہ
ننگی تنہائی پہ
موت کی یورشوں پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

لوٹ آئی محبت پہ
غائب خطروں پہ
بھولی ہوئی امیدوں پہ
میں تیرا نام لکھتا ہوں

اور ایک اس حرف کی طاقت پہ
میں اپنی زندگی پھر شروع کرتا ہوں
میں تجھے پہچاننے کے لیے پیدا ہوا ہوں
اور تجھے نام دینے کے لیے
آزادی!

زبیر شفائی

عضو سے عضو جدا رات میں ہوجاتا ہے
منتقل جسم تری ذات میں ہوجاتا ہے

دم لیتا ہوں دہکتے ہوئے انگاروں کو
یہ عمل غلبۂ جذبات میں ہوجاتا ہے

شہر افسوس ہے یہ، رات دن افسوس کرو
خشک دریا بھری برسات میں ہوجاتا ہے

لعل و زر سے بھی فزوں ایک خزانہ ہے وہ
تن غنی ایک ملاقات میں ہوجاتا ہے

آب و گل سے طرف روح بھی اک جست زبیر
مرض الموت حوالات میں ہوجاتا ہے

کوئی تتلی کوئی غنچہ کوئی خوشبو کہتا
مابدولت کے سوا کون اسے تو کہتا

ایک جیسے کئی چہرے تھے مرے چاروں طرف
یا انہی میں کبھی کہتا کبھی یا ہو کہتا

حد فاصل تھی کہاں قاتل و مقتول کے بیچ
کے درویش صفت کس کو ہلاکو کہتا

گھر بدلتا کبھی چہرہ کبھی آواز اپنی
بچہ بچہ مجھے گنجینۂ جادو کہتا

جیسے افسانوی کردار تھے ہم دونوں زبیر
چاند جنگل میں بلاتا میں لب جو کہتا

گہری سیاہ شب کی یلغار سہہ رہا تھا
کاجل کی کوٹھری میں اک شخص رہ رہا تھا

امواج سے زیادہ تھا اشتعال مجھ میں
ہر کوہسار جیسے پانی میں بہہ رہا تھا

جو گھر کہیں نہیں تھا دل میں نہ دل کے باہر
تعمیر کی ہوس میں دن رات ڈھہ رہا تھا

پھوٹی نہ تھیں شعاعیں آنکھوں سے تیری جب تک
گھر ہی نہیں فلک بھی بے مہر و مہ رہا تھا

جو دشت کہہ رہا تھا میں سن رہا تھا وہ بھی
وہ بھی میں سن رہا تھا جو قیس کہہ رہا تھا

زبیر شفائی

نامد آثار منظر ہے نہ پس منظر کہیں
میری اصل آنکھیں ہیں شاید روح کے اندر کہیں

بوالہوس دل چاہتا ہے چاند سورج آسماں
میری ترجیحات میں ہے خاک مٹھی بھر کہیں

خلوت و جلوت میں تھرتھر کانپتا رہتا ہوں میں
جاگزیں تھا جاگزیں ہے جان و تن میں ڈر کہیں

دھوپ میں نیرنگ کرنیں پھوٹتی ہیں خاک سے
پُر تنوع ہے نواحِ دشت سے باہر کہیں

بولئے تو بولتے ہیں پیار سے یہ کوہسار
واقعی حساس ہیں انسان سے پتھر کہیں

یہ کہ جب پائے ستم کر چھولیا ہے اے زبیر
بدحواسی میں نہ جائے اور نیچے سر کہیں

خیال و فکر سے ماخوذ استعارہ مرا
چمک رہا ہے گھنی دھوپ میں ستارہ مرا

علی الصباح سوا نیزہ آگیا سورج
بدن کچھ اور ابھی ہوتا ہے پارہ پارہ مرا

سیاہ پوش ہوں میں پاؤں کے انگوٹھے تک
کھلے تو کیا نہ کھلے تو بھی کیا نظارہ مرا

ترے جہاں میں جائے اماں کہیں نہ سہی
مگر زمین کی حد تک نہیں گزارہ مرا

یہ سوچتا ہوں کہ اعراب حرف کم کرلوں
کسی کسی کو نہیں ہے سخن گوارا مرا

الجھ کے ٹوٹ گئی ایک ایک سانس مری
یہ آئینہ نہیں صیقل ہوا دوبارہ مرا

زبیر سرمد ثانی ہے یہ جدید غزل
بہت لطیف ہے دشوار و سہل اشارہ مرا

غزال دشت میں ہے عندلیب باغ میں ہے
تمام وحشت و سنجیدگی چراغ میں ہے

میں سانس ہی نہیں لیتا کئی کئی دن تک
عجیب گم شدگی کا عمل دماغ میں ہے

اداس چاند کا ہالا قفس نژاد سہی
یہ نقش اسیر مگر اپنے دل کے داغ میں ہے

کبھی عقب کبھی آگے ہے دائیں بائیں کبھی
وہ کون ہے جو برابر مرے سراغ میں ہے

زبیر میرے لئے رات بھی ہے دن جیسی
کہ ایک چاند ہے پہلو میں ایک ایاغ میں ہے

زبیر شفائی

رائیگاں در رائیگاں در رائیگاں ہوتے ہوئے
سود کی خواہش نہیں جاتی زیاں ہوتے ہوئے

پھول سے خوشبو اڑی شبنم اڑی تتلی اڑی
اب مجھے اڑنا ہے نقش جاوداں ہوتے ہوئے

اپنے ماتھے کی شکن بستر پہ رکھ دیتا ہے وہ
مسکرا دیتا ہوں میں نا مہرباں ہوتے ہوئے

یہ سمندر، یہ کھلے میدان، یہ صد رنگ باغ
منقسم ہیں اشتراک آسماں ہوتے ہوئے

رات پھر دیکھا، تری زلفیں بکھر جانے کے بعد
سیل خوشبو کو ہوا پر حکمراں ہوتے ہوئے

اس زمیں پر آبسے ہیں دوسری دنیا کے لوگ
ہم سخن ہوتے نہیں ہیں ہم زباں ہوتے ہوئے

عجیب تیر تھا کمان کھینچتے ہی چل گیا
کہ گوشہ چھوڑنے کے بعد پھر کہیں نکل گیا

کھنڈر میں بوند بوند رات اتر رہی تھی شام سے
بجھا ہوا چراغ اچانک اپنے آپ جل گیا

یوں ہی خیال مڑ گیا تھا کوے یار کی طرف
بصورت غبار وشت اور پھول پھل گیا

تمام رات انتظار صبح میں گذر گئی
پھر اولیں کرن کے ساتھ آفتاب ڈھل گیا

وہ تاب کار چشم موم کر نہیں سکی مجھے
لہو کے داخلی سلوک سے بدن پگھل گیا

زبیر میں اننت ناگ سے گیا سری نگر
پری محل سے لوٹنے کے بعد ایک ڈل گیا

غزلیں

زبیر شفائی

قمر گزیدہ نظر میں ہالہ کہاں سے آیا
چراغ بجھنے کے بعد اجالا کہاں سے آیا

ندی میں وہ اور چاند ہیں ایک ساتھ روشن
زمیں پہ آسمان والا کہاں سے آیا

یہ غنچہ غنچہ سیاہ بھونرے کی بوسہ خواہی
سواد گلشن میں ہم نوالہ کہاں سے آیا

فضا کی آلودگی تھی پہلے ہی نیم قاتل
یہ دل میں ایک اور داغ کالا کہاں سے آیا

قریب تر دوستوں سے ہونے کی آرزو میں
ابھی ابھی پشت پہ یہ بھالا کہاں سے آیا

میں خواب میں بھی تری گلی سے نہیں گزرتا
یہ دونوں تلوؤں میں سرخ چھالا کہاں سے آیا

کہاں گیا سکہ سکہ قارون کا خزانہ
زبیر ہاتھوں میں یہ پیالہ کہاں سے آیا

کل سے زیادہ آج ہوا زور دار ہے
جلتے ہوئے چراغ کی لو تار تار ہے

پل بھر میں سو ہزار بدلتی ہے زاویے
وہ چشم نیم باز بڑی تازہ کار ہے

چاروں طرف اتھاہ اندھیرا ہے اور میں
مصلوب آفتاب اجالا فرار ہے

میں وقت کاٹتا ہوں مجھے کاٹتا ہے وقت
دونوں کی آن بان مگر برقرار ہے

ایک اور بھی نشان کف پا ہے دور تک
صحرا میں کون کس کے لئے بے قرار ہے

نخوت وہی گداز وہی سرکشی وہی
بالکل ترے بدن کی طرح کوہسار ہے

مصروف آج کل ہیں مشاہیر شعر و فن
اعصاب پہ زبیر شفائی سوار ہے

نظمیں

شاہد عزیز

تم یہاں چلے آؤ

روز ہی نکلتا ہوں
ایک ایسے رستے پہ
کوئی بھی نہیں جس پہ
صرف ایک سناٹا
پھیلتا سمٹتا ہے
اور ہوائیں پتوں میں
سیٹیاں بجاتی ہیں
ان سیاہ درختوں سے
اک ذرا سا کچھ آگے
کوئی شہر ہے جس سے
یہ صدائیں آتی ہیں
تم یہاں چلے آؤ

آج بھی یہی ہوگا

آج بھی یہی ہوگا
وقت اپنے ہاتھوں میں
تیرگی کے ٹکڑوں کو
پھر سمیٹ لائے گا
میری سمت آئے گا
اور راستے میرا
نام بھول جائیں گے
روشنی کے سائے بھی
خواہشوں کی منزل تک
حسرتوں کے صحرا میں
جاکے ڈوب جائیں گے
آج پھر یہی ہوگا

محبوب انور

موجود سے پرے

ہوا
راستہ نہیں دکھاتی
متعصب ہوگئی ہے
دریا
پیاس نہیں بجھاتا
بے مروت ہوگیا ہے
رات
میزبانی نہیں کرتی
خود غرض ہوگئی ہے
صبح
مہربان نہیں رہی
شام
غریب ہوگئی ہے
اور دن فقیر
خواب
سات سمندر پار پردیسی ہوگیا ہے

فوقیہ مشتاق

وہ آنکھیں پھوڑ ڈالی ہیں
کہ جن میں خواب بستے تھے
وہ صورت نوچ ڈالی ہے
جسے آئینہ تکتا تھا
وہ باہیں جو تمہاری راہ
تکتی تھیں، وہ باہیں سو گئی ہیں
وہ مہتاب آسماں سے
گر کے مٹی ہو گیا کب کا
وہ تارے پاؤں میں آکر
فنا ہو بھی چکے کب کے
وہ شبنم جو کسی گل کا
کلیجا سرد کرتی تھی
ہوا اغماض کی اس کو
اڑا کر لے گئی کب کی
وہ جذبے مر گئے کب کے
جو قربانی سکھاتے تھے
وہ امیدیں جو ہجر یار میں
ڈھارس بندھاتی تھیں
نہ جانے کب کی اٹھ کے
چل پڑیں گمنام وادی کو
تو اب تم لوٹ آئے ہو---

اگر تم لوٹ آئے ہو
تو میری بات اک مانو
جہاں سے لوٹ آئے ہو
وہیں واپس چلے جاؤ
کہیں ایسا نہ ہو تم کو
ذرا تاخیر ہو جائے
یہاں کی طرح ہر جذبہ
وہاں بھی خاک ہو جائے

سخاوت شمیم

(۱)

امید یہ تھی کہ
دل کا چراغ

جاں کے لئے
فصیل ذات و
انا کے سمندروں سے پرے
نیا جہاں کوئی آباد کرکے دم لے
مگر یہ جسم کی دیوار پھاندنے والا
خلوص و مہرو رفاقت کی جستجو میں گم
پرائی آگ کی بھٹی میں
تپ کے خاک ہوا

(۲)

جمود طاری ہے خواہشوں پر
بدن سے دل کی
وہ بات پہلی
زباں سے اظہار جذب الفت
عمل میں بے لوث ذمہ داری
ہوئی ہیں معدوم سب
ابھی سے
رفاقتوں پر، عداوتوں پر
ہماری اپنی بھی چاہتوں پر
سکوت یخ بستہ موسموں کا

غزل

روشن لال روشن

ہم نظر کیا ہم زباں کوئی نہیں
لوٹ جا تیرا یہاں کوئی نہیں

کیا ہمارے درمیاں کوئی نہیں
پھر ذرا کہنا کہ ہاں کوئی نہیں

ہر شجر کی اپنی اپنی شاخ ہے
دھوپ ایسی سائباں کوئی نہیں

اپنے سر پہ اپنا ہی دست دعا
مہرباں تا مہرباں کوئی نہیں

صبح تک ہم کو جو باندھے رکھ سکے
آج ایسی داستاں کوئی نہیں

آپ جو چاہیں وہ کہتا ہے ہمیں
یہ بھی ایسا امتحاں کوئی نہیں

زندگی یا پھر صلیب حرف و صوت
سر پہ یوں بار گراں کوئی نہیں

آسماں چھت بھر زمیں سر تا قدم
دل کی صورت بیکراں کوئی نہیں

نظم

آمر صدیقی

قوس قزح کے ساتوں رنگ تمہارے ہی تھے
لیکن تم کو ایسی بلندی—
راس نہ آئی
ایک رنگ
بس ایک رنگ پر
لکھا گیا انعام تمہارا
نام تمہارا
لیکن تم کو یہ توقیر بھی
راس نہ آئی
سات سروں میں گانے والی
ننھی چڑیا
گیت سنانے
کبھی تمہارے پاس نہ آئی
تم کیا کرتے
جیتے جی یوں کب تک مرتے؟
(ایک رنگ میں جینا بھی کتنا مشکل ہے)

مٹی تم پر مہربان تھی
سورج نے آنکھیں جھپکائیں
بادل نے موتی برسائے
گزر گیا اوپر ہی اوپر
وحشت کا رہوار ہوا سے باتیں کرتا...

تم نے اپنے
آلودہ پتوں میں چھپ کر
رنگ بدل کر
نیل گگن تک جانا چاہا
اپنا رنگ جمانا چاہا
لیکن تم تو ٹھہرے ہوئے تھے شاخ پر
اک مکروہ کیل سے

عالم خورشید

رنگ بہت سے ہیں لیکن تصویر نہیں کوئی
یعنی میرے خوابوں کی تعبیر نہیں کوئی

دیر سے اس کو افسانہ سال پڑھتا جاتا ہوں
ویسے تو اس کاغذ پہ تحریر نہیں کوئی

قید کیا ہے ہم نے تو خوشبو کو شیشے میں
پائے وحشت کو لیکن زنجیر نہیں کوئی

رانجھے! تو کیوں موجوں سے ٹکراتا پھرتا ہے
آنکھ بچھائے بیٹھی ہی جب ہیر نہیں کوئی

تاریکی نے کون سا منتر سیکھ لیا اب کے
شمعیں جلتی ہیں لیکن تنویر نہیں کوئی

دنیا پہ قابو پانے کے لاکھ طریقے ہیں
خود پہ غالب آنے کی تدبیر نہیں کوئی

میں ان رستوں پہ چلنے کا کیوں عادی ہوں
جن رستوں پہ دور تلک رہگیر نہیں کوئی

خون رواں ہے اب بھی میری شہ رگ میں عالم
کیا تیرے ترکش میں باقی تیر نہیں کوئی

ہوئے ہیں خاک مگر پھول کچھ کھلائے تو
یہی بہت ہے کہ ہم لوگ مسکرائے تو

میں کب سے بیٹھا ہوں ہاتھوں میں اپنا دل لے کر
وہ دلنواز کبھی اس طرف بھی آئے تو

ہوا سے آنکھ ملانا مری سرشت میں ہے
میں راستے کا دیا ہوں کوئی جلائے تو

فصیل دل میں کئی در بنا لئے ہم نے
مگر جو دور گیا لوٹ کر کے آئے تو

میں اپنا رخت سفر باندھنے کو ہوں تیار
کہیں افق پہ ستارہ وہ جھلملائے تو

دیار غیر میں ہوں میں بھی خوش کہاں عالم
میں لوٹ جاؤں گا ارض وطن بلائے تو

راشد طراز

فریب دید ہے یا راستہ چمکتا ہے
پس غبار کوئی آئینہ چمکتا ہے

میں خود کو دیکھوں تو آتا ہے ظلموں کا خیال
جو اس کو سوچوں تو کچھ خواب سا چمکتا ہے

گزر گیا ہے جنوں کی حصار و حد سے کوئی
پھر آج دشت میں نقش صدا چمکتا ہے

ہم اس کی راہ میں آئے تو سرخرو بھی ہوئے
وصال شوق میں حرف بقا چمکتا ہے

یہ آفتاب و قمر امتیاز لیل و نہار
ہر ایک رخ سے نشان خدا چمکتا ہے

طراز دامن صد چاک سے ملول نہیں
سیاہیوں میں بھی تار قبا چمکتا ہے

شاہد اختر

پا برہنہ ہیں اب کے جنگل میں
تو بھی میں بھی طلب کے جنگل میں

خاک خواہش بھی اب نہیں اڑتی
خون کی تاب و تب کے جنگل میں

ہاں ابھی آرزو نہیں نکلی
اور کچھ روز اب کے جنگل میں

کفر و اسلام مل رہے ہیں گلے
اور کیا ہے ادب کے جنگل میں

وہ بھی میری طرح سے رہ لے گا
عمر بھر روز و شب کے جنگل میں

پارہ پارہ ہے اب لہو کی صدا
سنگ تاریک شب کے جنگل میں

کون آئے گا ملنے کو اختر
ایسی ویران شب کے جنگل میں

راجیش ریڈی

ساگر بنائے ثبت رکھا آسماں رکھا
لیکن وجود اپنا خدا نے نہاں رکھا

میں نے ضمیر بینت کے اپنا یہیں کہیں
رکھا تو تھا یہ یاد نہیں اب کہاں رکھا

جن کو جہاں کی چیزوں سے کچھ بھی غرض نہ تھی
دنیا نے ان کے قدموں میں سارا جہاں رکھا

ہم بھی تمہاری یاد سے باہر نہ جاسکے
تم نے بھی بھول جانے کا وعدہ کہاں رکھا

ویسے تو اس کے ملنے میں تھی بے تکلفی
اک فاصلہ بھی اس نے مگر درمیاں رکھا

خوش بیر سنگھ شاد

سب سے یہ بے لوث چاہت یہ وفا اچھی نہیں
شاد صاحب شہر کی آب و ہوا اچھی نہیں

اس مہذب شہر میں رونے کے بھی آداب ہیں
گھر سے باہر لوگ سن لیں جو صدا اچھی نہیں

لاکھ دلکش ہوں یہ آوازیں مرے اطراف کی
جز ترے دل کی صدا کوئی صدا اچھی نہیں

آئینہ خانے میں اپنے عکس کے منکر ہو تم
یار اپنے آپ سے اتنی ریا اچھی نہیں

خواب آنکھوں ہی کے پردوں پر رہیں تو ٹھیک ہے
خواب پلکوں پر سجانے کی ادا اچھی نہیں

ریت میں تبدیل ہوجاتے ہیں دریا خود بخود
یہ غرور اچھا نہیں یہ کج ادا اچھی نہیں

آصف فرخی

اس وقت ہم "آج" کے دوہرے خصوصی شمارے "کراچی کی کہانی" پر بات کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں' لیکن اس پر بات کرنی مشکل ہے۔ آج مشکل ہے' کراچی مشکل' بات مشکل۔ میرے لیے ایسی مشکل جو پہلے کبھی نہیں تھی۔

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

شہر کا شہر مشکل میں ہے۔ اس شہر کے رنگ محفل کو کیا ہوا۔ کوئی واضح جواب نہیں ملتا۔ ذہن بھٹکتا ہے۔ مشکل سوال' ادھورے مصرعے' بے ربط حوالے پرچھائیں کی طرح لرزتے ہیں۔

لے گیا چھین کے کوئی آج تیرا صبر و قرار

یہ کون سا آج ہے؟ نظم و نثر کے مضامین اور افسانوں کے بجائے کیا اس کی بھی "چھینی ہوئی تاریخ" ہے؟ اور "کون؟" کے جواب میں ایسی کیا مشکل ہے' اس کو تو اب سبھی پہچان گئے ہیں۔

چشم قاتل میری دشمن تھی ہمیشہ لیکن
جیسی اب ہوگئی قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی

چشم قاتل کی دشمنی سے شہر قاتل تک۔ یعنی کہ "جیسی اب ہوگئی" کے سمجھنے کے لیے پیچھے پلٹ کر جانا پڑے گا۔ جہاں سے آج شروع ہوتا ہے۔ آج کی بات' شہر کی بات کو ایک وسیع تر' قدیم اور متنوع تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش "آج" کے اس شمارے کی اہم تر خصوصیت ہے' یعنی ایک مشکل موضوع کی پیچیدگی کا احساس۔

اس کے ساتھ ہی دوسری اہم خصوصیت یہ ابھر کر سامنے آتی ہے کہ موضوع کی مشکل کے ساتھ ساتھ' ایک مشکل رسالے کے انداز یا اپروچ (Approach) کی پیدا کردہ بھی ہے۔ اور وہ مشکل یوں ہے کہ ہم عمومی بیانات اور بلند بانگ دعووں سے خوش ہوجانے والے لوگ ہیں۔ آج کسی سیاسی کرتب باز نے بیان دے دیا اور ہم سمجھتے ہیں کہ یا مظہرالعجائب' کراچی اور اس کا مسئلہ غائب۔ تاریخی اور سماجی تحقیق پر مبنی بے لاگ تجزیے ہمیں حیران پریشان چھوڑ جاتے ہیں کیوں کہ ہم ان سے نمٹنے کی صلاحیت بڑی تیزی سے کم کرتے جارہے ہیں۔ ایسے تجزیوں کو سننا یا پڑھنا' پھر انہیں قلب و نظر میں اتارنا ہمیں نہیں آتا۔ اسی لیے جہاں غور و فکر کا مقام آتا ہے ہم اسے نظرانداز کردیتے ہیں یا سرسری سی مبارک باد دے کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ "کراچی کی کہانی" جو "آج" نے لخت لخت جمع کی ہے اس سے سرسری نہیں گزرا جاسکتا۔ بلکہ کراچی کے احوال و آثار کو جمع کرکے جو تصویر بنائی ہے' اس کی اہمیت اور افادیت کو سراہنے کے لیے آخر ہمارے پاس معیار ہی کیا ہے۔ معیار بھی کیسے قائم ہوں جب ایسا کام شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ کام کرے بھی تو کون۔ سرکاری ادارے جن کے پاس کام کرنے کے وسائل ہیں' وہ اس کے اہل نہیں ہیں اور جو افراد یا تنظیمیں اہل ہیں' وہ وسائل سے محروم۔ مزاحمتی ادب ہو یا قومی ادب کے تراجم' سرکاری ادارے عوامی دولت کو بے دریغ لٹا کر بھی تاریخ و ثقافت کی تخلیقی بازیافت نہیں کرسکتے۔ اور پھر وہ اپنے محفوظ دائرے سے تجاوز کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ ان کو اپنے مفادات عزیز' جھگڑے کی بات کیوں کریں؟ ایسے کام کا بیڑا اٹھانے کے لیے تو وہ جرأت رندانہ چاہیے جس کا مظاہرہ "آج" کے مدیر نے کیا ہے۔

مضامین کی مسلسل جستجو و تلاش' مختلف ماخذ کو کھنگالنا مختلف زبانوں اور متفرق اسالیب کی تحریروں کی چھان پھٹک' پھر ان کو باہم منسلک کرکے ایک سلسلہ وار ترتیب میں ڈھالنا یقیناً اس باہمت اور صاحب نظر مدیر کا ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال آج کل یوں بھی نہیں ملتی کہ تن آسانی' سہل پسندی اور (mediocrity) ہمارے ادب و صحافت میں ایک دوسرے کا سہارا بنتی ہیں اور نئی نئی صورتیں بدل کر بار بار سامنے آتی ہیں۔ اس لحاظ سے کراچی پر یہ کام ایک نیا معیار ہے' اپنی مثال آپ۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم صرف داد و تحسین کے ہار پھول پہنا کر ایک تقریب مبارک باد برپا کرکے چلے گئے تو یہ "کراچی کی کہانی" کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ یہ کہانی اپنے اندر چیلنج رکھتی ہے جو ہمیں اپنا سامنا کرنے کی دعوت دیتا ہے' ایسی گہرائی میں اترنے کی دعوت کہ دیکھ سکتے ہو تو یہاں سے شہر کو دیکھو۔

یہاں سے شہر جیسا دکھائی دیتا ہے' اس حوالے سے چند باتیں جو میری سمجھ میں آئی ہیں وہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ایک شہر ہے اور اس شہر کے چاروں طرف دیوار۔ پاتال سے لے کر آسمان تک فصیل شہر۔ آنکھ سفر کرتی ہوئی آتی ہے اور شہر کے سامنے ٹھٹھک جاتی ہے۔ شہر میں داخل ہونے کے ہزار راستے۔ ہر راستے میں ایک دروازہ' دروازے پر تالا بند' ہر تالے کی چابی غائب۔ وہ چابی کہاں ہے جو شہر کے بند دروازے کھول دے۔ کراچی جیسے شہر میں تالے ایک جیسے ہوسکتے ہیں لیکن ان کی چابی کوئی ایک نہیں۔ شہر کے سراغ بھی الگ اور ان کے لیے کلید بھی الگ۔ مختلف آوازوں' متفرق زاویوں اور علیحدہ علیحدہ نقطہ ہائے نظر کو سامنے لاکر "آج" کراچی کے بارے میں ایک اہم اور پیچیدہ حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اردو' سندھی' انگریزی بلکہ گجراتی' بلوچی بھی' مختلف زبانوں میں بکھری ہوئی ہے اس شہر کی کہانی۔ ذاتی ڈائری' یادداشت' افسانہ' مضمون' تجزیہ' کئی

مختلف طریقوں سے بیان ہوئی ہے یہ کہانی۔ کراچی کی زندگی (Single unifying Vision) میں سمیٹنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ کراچی کی یہ بوقلمونی اور نیرنگی باقی رہنا چاہیے۔ شہر کے اجزائے ترکیبی میں مختلف عناصر کی کار فرمائی کی شناخت کرنا ضروری ہے۔ اور اس شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے ان عناصر کا تجزیہ اس شمارے کی ایسی خصوصیت ہے جس کی اہمیت شہر کے ماضی کے تعلق سے ہی نہیں، مستقبل کے لیے بھی ہے۔ یعنی اگر اس شہر کا کوئی مستقبل ہے۔

کراچی کی کہانی کی اہمیت صرف اسی قدر نہیں کہ اس میں بہت سی دستاویزات یک جا ہو گئی ہیں۔ ان دستاویزات کو مربوط کر کے ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے بروئے کار لانے کا امکان ان کی اصل اہمیت ہے۔ اس میں شامل تحریروں کی اپنی اپنی جگہ اہمیت مسلم، اور ان میں سے بعض تحریریں منفرد ہیں۔ حسن منظر نے شہر کی ایک نیم مضافاتی گوشے کو ایک خاص وقت میں محفوظ کر لیا ہے جب کہ فہمیدہ ریاض نے ایک (Open Form) وضع کر کے اس میں افسانہ و دستاویز کی آمیزش کرنے کا اہم تجربہ کیا ہے۔ لیکن یہ رسالہ محض ان الگ الگ تحریروں کا ڈھیر نہیں۔ یہ ایسا کل ہے جو اپنے اجزاء کے مجموعے سے کچھ زیادہ ہے۔ الگ الگ ٹکڑے جڑ جاتے ہیں تو ان سے ایک مجموعی تصویر بھی بنتی ہے۔

اس تصویر کی الگ الگ تفصیلات میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ بعض پہلوؤں کی کمی محسوس ہوتی ہے اور بعض کے بارے میں مثلاً گوانی عیسائی یا لیاری کی قدیمی آبادی کے بارے میں مزید پڑھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ مدیر نے شروع ہی میں اپنے محدودات کا اعتراف کر لیا ہے، اور پھر ایسی کوئی کوشش یوں بھی مکمل نہیں ہو سکتی کہ سارا شہر اس میں سمٹ آئے۔ اہم بات یہ ہے کہ شہر کو جاننے سمجھنے کے لیے ایک فریم ورک فراہم کر دیا گیا ہے۔ ایسا چوکھٹا جس کے اندر متحرک اور زندہ تصویر نظر آ رہی ہے۔ کراچی کی سماجی زندگی اور شہری مظاہر کو سمجھنے کے لیے ایسے کسی فریم ورک کی غیر موجودگی کی وجہ سے کراچی کے بارے میں عمومی بیان دینا بہت آسان تھا۔ کراچی کی کہانی سامنے آنے کے بعد سیاسی کرگٹوں کے لیے یہ سہولت ختم ہو جاتی ہے۔

حال ہی میں ملک کے ایک ممتاز دانش ور نے جو ممتاز زیادہ ہیں اور دانشور کم، کراچی کے بارے میں یہ فقرہ کہا کہ کراچی میں شہر کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ ان کا یہ بلیغ بیان بھڑکیلے رنگوں اور نوخیز اداکاراؤں کی تصویروں کے ساتھ انگریزی اخبار کے ان صفحات میں چھپا جو شہر اور ملک کی آئندہ سمت سفر کی کوئی اچھی تصویر نہیں پیش کرتے۔ اعلا عہدے سے ریٹائرمنٹ کے بعد اس قسم کے سرپرستانہ، مربیانہ بیانات ہمارے سابق بیوروکریٹس کا مشغلہ ہیں لیکن کراچی کی کہانی پڑھ کر یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان جیسے لوگوں نے شہر نہیں دیکھا۔ جس طرح خزانے کا سانپ محض خاک چاٹ کر رہ جاتا ہے۔ اس سے زیادہ گہری نظر سے تو کراچی کو سر رچرڈ برٹن نے دیکھا تھا جب اس نے پہلی مرتبہ اسے ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کی غلیظ بستی کہا، پھر ایک شان دار شہر بنتے ہوئے دیکھا۔ جس کی بدولت سندھ، اس کے بقول "رشک و رغبت ہفت بہشت" بن سکتا ہے۔

اس شہر کا ایک ماضی بھی ہے جو اس کے آج سے یکسر مختلف ہے، اس رسالے نے اس نکتے کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ ناؤں مل اور جان برٹن کی تحریروں میں ایک قصبہ ہمکنار ہوا نظر آتا ہے جو بڑھنے، پھیلنے کے لیے بے چین ہے۔ کیا کراچی اس سے بھی پرانا ہے؟ مگر کون سا کراچی؟ کیا اس شہر کی ابتداء "شاہ جو رسالو" کے سر گھاؤ میں ہے جہاں کلاچی میں ایک مہیب مگرمچھ ہے اور اس کے جبڑوں میں آ کر ہلاک ہونے والے معصوم لوگ۔ یا پھر قدیم یونانی تاریخوں میں (Alexander s Haven) نام کی وہ بحری پناہ گاہ جہاں اسکندر اعظم کا امیر البحر، خشکی کے راستے اپنی فوج کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ اور وہ پہلا جرنیل نہیں تھا جسے اس شہر نے مایوس اور نامراد کیا۔ یا کراچی اس سے بھی پہلے بن باس کے دوران رام اور سیتا کا پڑاؤ ہے جس کی یادگار رام جھرو کا نام کی سمندری چٹان ہے۔ کراچی واقعی بن باس کا شہر ہو سکتا ہے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر تاریخ سے نکل کر روایات اور اساطیر سے جا ملتا ہے۔ مجھے بورخیس کی وہ نظم یاد آ جاتی ہے جو اس نے اپنے شہر کے لیے لکھی تھی :

"مشکل سے یقین آتا ہے کہ بیونس آئرس کی کوئی ابتدا بھی تھی یہ
شہر تو مجھے ہوا اور پانی کی طرح ابدی معلوم ہوتا ہے"

ثابت ہوا کہ اس شہر کی ابتدا بھی تھی۔ لیکن اس کی انتہا کیا ہے؟ یہ شہر ہر دم اپنے روپ بدلتا رہا ہے۔ بودلیئر کے الفاظ میں "ہائے افسوس کہ شہر کے گلی کوچے انسانی دل سے زیادہ تیزی کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔" کراچی میں تبدیلی کا یہ عمل بہت تیز رہا ہے، ۱۹۴۷ء کے بعد خصوصاً اور تیز۔ اس سے پہلے کے شہر کی جھلک پیر علی محمد راشدی کا قلمی مرقع بڑے دل چسپ انداز میں دکھاتا ہے۔ انہی راشدی صاحب کا یہ جملہ ان کی کسی اردو تحریر میں آیا ہے کہ پورا ہندوستان اجڑا تو ایک کراچی بسا۔

بہر حال اس طرح بسنے میں خرابی کی ایک صورت تھی۔ اس خرابی کا نقشہ عارف حسن نے کھینچا ہے کہ ان کی منتشر تحریروں کو یک جا دیکھنے سے معاشرتی عوامل کی بہت سی تفصیلات واضح ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی اس شہر کا تضاد ہے کہ ایسی اہم اور وقیع تحریریں انگریزی پریس میں شائع ہو جانے کے بعد کچھ محدود سی تھیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ معاشرہ الگ الگ زبانوں میں تو بٹا ہوا ہے، ان زبانوں میں حقیقت اور اس کا بیان بھی الگ ہے۔ ایک حقیقت دوسری سے نہیں ملتی۔ سامنے ہوتے ہوئے بھی آنکھوں سے اوجھل رہنے والی ان تحریروں کے ذریعے "آج" نے اپنے پڑھنے والوں کے لیے ایک نیا راستہ کھول دیا ہے، جو کراچی کے لمحہ موجود کے لیے بہت اہم ہے۔

مطالعے کے لیے نئی راہیں کھول دینا اس رسالے کی ایک اور اہم خصوصیت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انکشاف اور دریافت کی منزلیں سامنے آ رہی ہیں اور ہم کراچی کی کہانی کے ساتھ وقت کے سفر میں ہیں۔ حیرت کے اتنے پہلو

اس ایک شہر کے بیان سے نکل کر آرہے ہیں جیسے پوری اردسی شہر میں ہی طے ہو رہی ہو۔ کراچی کی کہانی میرے لیے دریافت کا ایسا سفر بن گئی ہے جس کی اگلی منزلوں کا انتظار تو ہے' لیکن اس سے پہلے کی منتشر اور علیحدہ علیحدہ تحریریں بھی اسی فریم ورک میں جڑتی ہوئی نظر آتی ہیں' جیسے ان سے شاید اگلی سمت کے تعین میں مدد ملے۔

سفر کا دلدادہ مصنف بروس چیٹ ون (Chat win) سیلانی پن کو اصل انسانی حالت سمجھتا تھا اور شہر کا قیام اس کے نزدیک انسانی روح کے اصل جوہر سے غداری تھا۔ اس نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے :

"دیو جانس کلبی کا کہنا تھا کہ انسان پہلے پہل شہروں میں جوق در جوق آئے کہ باہر کے لوگوں کے غیظ و غضب سے محفوظ رہ سکیں۔ اپنی دیواروں میں مقید ہو کر انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف ہر ممکنہ ہولناک حرکت کی جیسے کہ یہی ان کے یہاں آنے اور جمع ہونے کا واحد مقصد تھا۔"

خون آشام محاذ آرائی کراچی کی تعمیر کا سبب رہا ہو یا نہ رہا ہو' لیکن اس شہر کے آج کا حصہ ضرور ہے جہاں ہم سب (Deathwatch) یا تماشائے مرگ میں مصروف ہیں۔ ڈچ ناول نگار (Cees Nooteboom) نے ناولوں کے ساتھ ساتھ سیاسی مضامین کا ایک مجموعہ بھی حال میں شائع کیا ہے جس کا اختتام یوں کیا ہے :

"اپنے ہم وطنوں سے ڈرتے رہنا کتنا عجیب لگتا ہوگا۔"

کیا یہ خوف کراچی کا رنگ محفل بنا رہے گا؟ اس خوف سے آگے کا منظر اس سے بھی زیادہ دہشت ناک ہے۔ ہانس میگنس انزنس برگر (FNZENSBFRGER) دنیا اور خصوصاً یورپ کی موجودہ صورت حال کے حوالے سے اپنے کلیدی مقالے "خانہ جنگی" میں لکھتا ہے کہ ہتھیار بند ہجوم شہروں میں در آیا ہے۔ عوامی نجات اور رہ نمائی کے پر شور نعرے بھی اس حقیقت کو چھپا نہیں سکتے کہ یہ غول بیابانی اپنے دشمنوں کا بالکل عکس معلوم ہوتا ہے۔ پورے نام کے بجائے انگریزی حروف کے مخفف کے پیچھے چھپ کر بھی یہ تنظیمیں اس حقیقت پر پردہ نہیں ڈال سکتیں کہ ان کا کام لوٹ مار' موت اور غارت گری ہے۔ انزنس برگر کی حتمی رائے میں "حقیقت تو یہ ہے کہ مدتوں پہلے خانہ جنگی بڑے شہروں میں منتقل ہو چکی ہے۔"

کیا ہمارا شہر بھی اسی نتیجے پر پہنچ رہا ہے۔ ہمارے سامنے شہر کی صورت آنکھوں کا جنگل ہے جس میں سوال ہی سوال سرسرا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ شہر پورا نہیں ہوا۔ یہ بہت پرانا ہے لیکن ابھی تعمیر کے مرحلے میں ہے۔ اس میں کتنے بھید اور نامعلوم گوشے موجود ہیں۔ شاید یہی اس کی دل کشی کا راز ہے۔ کیا ہم کراچی کو جانتے ہیں؟ کیا کراچی اپنے آپ کو جانتا ہے؟ کیا کراچی کو معلوم ہے کہ وہ اور بڑا ہو کر کیا بنے گا؟ آخر یہ شہر کیا خواب دیکھ رہا ہے۔ پھر ان سوالوں کے سامنے یہ ساری تحریریں ایک نقطے پر سمٹ آئی ہیں اور "کراچی کی کہانی" ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے میں اس کہانی کے راویوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آگے کیا ہوگا' اس کہانی کا اگلا موڑ کیا ہے۔ ❖ ❖

FORM IV

(SEE RULE 8)

Place of Publication :	313, Rani Mandi, Allahabad
Periodicity of its Publication :	Monthly
Printer's Name : (Whether Citizen of India)	Miss Aqeela Shaheen Hindustani
if Foreigner, State the Coun try of origin & Address :	313, Rani Mandi, Allahabad
Publisher's Name : (Whether Citizen of India?)	Miss Aqeela Shaheen Hindustani
if Foreigner, State the coun try of origin & Address	313, Rani Mandi, Allahabad
Editor's Name : (Whether Citizen of India?)	Miss Aqeela Shaheen Hindustani
if Foreigner, State the Country of origin & Address	313, Rani Mandi, Allahabad
Name and Address of individuals who own the News Paper and Partners or share holders more than one person of the total capital	Miss Aqeela Shaheen 313, Rani Mandi, Allahabad

I Miss Aqeela Shaheen hereby declare hat the particulars given above are true to the est of my knowledge and belief.

ARCH 1997 (MISS AQEELA SHAHEEN)

Signature of Publishers

کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایسی تحریریں سامنے لائی جائیں جن سے جدیدیت کی نفی ہوتی ہو۔ لیکن ایسا کرنے کی کسی میں ہمت نہیں ہے۔ اس جدیدیت کو "ہماج سے کٹا ہوا" "ابہام کے جنگل میں سرگرداں" وغیرہ ایک گم کردہ راہ شخص سب کہتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ ارشاد فرمایا گیا کہ "جن لوگوں نے جدید ادب کا منشور تیار کیا تھا وہ خود پیچھے سے کلاسیک کے کھنڈر میں نکل گئے۔" پیچھے سے کیوں؟ اور کلاسیک کے کھنڈر کیوں؟ کیا میر اور غالب اور سبک ہندی کی فارسی شاعری اور اٹھارویں صدی کا نومندو تو انا اردو ادب کھنڈر کہلانے کے لائق ہے؟ اور کیا ترقی پسند معیار نقد میں یہ حوصلہ تھا کہ وہ میر اور غالب اور دوسرے کلاسیکی شعرا کی وہ تعبیر و تحسین قدر کرتا جو جدیدیت کے علم برداروں نے کی؟ کیا مدیر محترم کو جدیدیت کی پینتیس سالہ تاریخ میں ایک تسلسل نظر نہیں آتا؟ اور اگر ایسا ہے تو ہمیں کہنے دیجئے کہ مدیر محترم کو صرف اس بات کا رونا ہے کہ "جدیدیت کا نقارہ" ان کے ہاتھ میں کیوں نہیں؟

ادبی رسالہ نکالنا مستحسن اور قابل قدر کام ہے۔ ادبی مناظرہ کرنا ہارے ہوئے جواریوں اور ادب سے دیس نکالا پائے ہوئے پٹے ہوئے مہروں کا کام ہے۔ ساجد رشید کو یہ کام زیب نہیں دیتا۔

تضاد بیان کی ایک اور مثال : پرچے کا ایک گوشہ باقر مہدی کے لئے مخصوص ہے اور بجا طور پر مخصوص ہے۔ لیکن باقر مہدی ہمیشہ سے ELITIST جدیدیت کے قائل رہے ہیں اور ان کا دعویٰ تھا کہ جو لوگ بڑے صنعتی شہروں میں نہیں رہتے وہ نئی شاعری کے اہل نہیں ہیں۔ پھر ساجد رشید صاحب کا وہ دعویٰ کہاں گیا کہ ہم قاری اور ادب کے درمیان وہ پل دوبارہ بنا رہے ہیں جو جدیدیت نے توڑ دیا تھا۔

اداریے میں یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے :

> "اردو میں جس طرح کا ادب (جدید) تخلیق ہو رہا ہے وہ شاید اتنا عظیم ہے کہ کسی دوسری زبان میں تلاش بسیار کے بعد بھی دستیاب نہیں ہے۔ جس طرح کے ادبی رسالے اردو میں شائع ہو رہے ہیں ایسے رسالے کبھی بھی دوسری زبان میں اب "بقید حیات" نہیں ہیں"

ان جملوں سے ظاہر ہے کہ ساجد رشید اردو ادب کی تخلیقی رفتار سے مایوس نہیں ہیں۔ انھیں اردو زبان میں شائع ہونے والے رسالوں، ان میں شائع ہونے والی تحریروں کے معیاری ہونے کا پورا ایقان ہے اور یہ بھی کہ لکھنے والوں نے اپنا رشتہ قاری سے جوڑ رکھا ہے (ظاہر ہے جب رسالے شائع ہو رہے ہیں تو ان کے پڑھنے والے بھی ہوں گے ہی) ایسی صورت میں "جدیدیت کا ڈھول پیٹنے والے بوڑھے ہاتھوں" سے ان کا خوف زدہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ آپ جدیدیت کے لاکھ انکاری ہوں لیکن سچ تو یہ ہے کہ جدیدیت نے سنجیدہ ادب کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا تھا اور اب بھی وہ اس کام میں مصروف ہے۔ "نیا ورق" بھی جدیدیت کا کرشمہ ہے، ورنہ کیا ظ انصاری یا پرکاش پنڈت یا واثق احمد کبھی ایسا کرتے

پرچہ نکال سکتے تھے؟

ہم ساجد رشید کو مبارک باد دیتے ہیں کہ انھوں نے ایک ایسے ا
رسالے کا اجرا کیا ہے جس میں اہم لکھنے والوں کی معیاری اور قابل مطا
تحریریں یک جا ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی، بنگالی اور مراٹھی زبانوں کے معیا
ادب شائع کرنا بھی بجائے خود ایک اہم بات ہے (ملحوظ رہے کہ یہ رسم بھی بد
جدیدیت کے بدنام علم بردار "شب خون" نے شروع کی تھی)۔

اس شمارہ کی جو چیزیں زیادہ متاثر کرتی ہیں ان میں زبیر رضوی کی
نوشت "گردشیں" اور ندا فاضلی کے سوانحی ناول "دیواروں کے بیچ" ...
دوسرے حصے کا نیا سلسلہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

رسالہ کی کتابت و طباعت نہایت عمدہ ہے اور قیمت بھی کم۔ ہر سنج
قاری کو یہ رسالہ ضرور پڑھنا چاہئے۔

— چودھری ابن النصیر

مکالمہ ○ ترتیب و تالیف : مبین مرزا ○ اکادمی بازیافت، بی ۵۸، بلاک ۱۷، ایف بی ایریا، کراچی
○ ایک سو پچاس روپے

برصغیر میں ان دنوں کراچی ہی ایسا شہر ہے جہاں سے بیک وقت کئی ا
رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ ہر رسالہ اپنے آپ کو صوری و معنوی اعتبار
بہتر بنانے کی کوشش اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں
حال ہی میں مبین مرزا کی ادارت میں "مکالمہ" نام کا ایک کتابی سلسلہ شر
ہوا ہے۔ مدیر کی کوشش ہے کہ اس رسالے کی ہر اشاعت معاصر ادب کی ا
ایسی نمائندہ دستاویز ثابت ہو جس میں آج کے عہد کی روح اپنی تمام تر سچائ
کے ساتھ بولتی ہوئی سنائی دے۔ علاوہ ازیں اس رسالے کے اجرا کا مقصد ا
ایسا پلیٹ فارم تیار کرنا ہے جہاں مختلف الخیال ادیب ایک دوسرے کے نقط
کا احترام کرتے ہوئے مختلف فکری اور ادبی مسائل اور موضوعات پر پو
آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ آپس میں مکالمہ کر سکیں۔

مکالمہ کے مشمولات کو کئی حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ حمد نعت سلا
افسانے، سوال یہ ہے، نقد و نظر، غزلیں، یادگار خطوط، سفرنامہ، نظمیں، خا
گفتگو، مراسلاتی مکالمہ اور تراجم وغیرہ۔ اس کا ہر حصہ وقیع اور جاندار
افسانوں میں انتظار حسین، اشفاق احمد، اسد محمد خاں، امراؤ طارق، زاہدہ حنا
مرزا حامد بیگ کے افسانے شامل ہیں۔ غزلوں کو دو حصوں میں چھاپا گیا ہے۔
حصے میں حنیف اسعدی، محسن احسان، جمال پانی پتی، حنیف اخگر، عابدہ کرام
عتیق انظر اور محمد ممتاز راشد جیسے پرانے اور نئے لکھنے والے ہیں تو دوسرے
میں ساقی فاروقی، سحر انصاری، افتخار عارف، پیرزادہ قاسم، اعتبار ساجد،
کوثر، احسن سلیم، شوکت عابد، اجمل سراج، خالد مبین اور قیصر عالم کی غز
شائع کی گئی ہیں۔ دونوں حصوں میں کل ۴۹ غزلیں ہیں۔ ایک غزل کو ایک

[طو]یل ہونے کی صورت میں ادھورے دیے گئے ہیں۔ نظموں میں وزیر آغا، شہزاد [احمد]، سحر انصاری، پیرزادہ قاسم، ادیب سہیل، سلیم کوثر، فاطمہ حسن اور علی محمد [فرشی] کی ۱۸ نظمیں شامل ہیں۔ حصہ شاعری کو مزید اعتبار بخشنے کے لیے رضی اختر [شو]ق کی پانچ غزلیں اور ان کے مجموعۂ کلام "جست" پر جمیل جالبی اور شاہدہ [حس]ن کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ "قیمت ختم کیا پانی کا" کے زیر عنوان [ث]روت حسین کی یاد میں ان کی سولہ غزلیں اور دس نظمیں چھاپی گئی ہیں اور [ث]روت حسین کو خراج عقیدت اصغر ندیم سید اور قیصر عالم نے اپنی نظموں میں [پی]ش کی ہے۔

'سوال یہ ہے' میں جمیل جالبی نے حسن عسکری کا تصور روایت' کے [عن]وان سے ایک مختصر مضمون لکھا ہے (یہ مضمون بہت پہلے "علامت" میں بھی [چ]ھپ چکا ہے) جس میں انھوں نے الیٹ کے تصور روایت اور عسکری کے تصور روایت کے فرق کو منزل کا نہیں راستے کا فرق بتایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ وہ فرق بھی کیتھولک عیسائی اور سنی مسلمان ہونے کی وجہ سے ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "[ع]سکری صاحب ازراپاؤنڈ' الیٹ اور دوسرے مغربی مفکرین اور نقادوں کی بنیادی فکر کا مطالعہ کرکے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "مغرب روایت کے معنی سمجھنے میں بالکل ناکام رہا ہے۔" مغربی تصورات وعقائد کی روشنی میں ہماری اپنی روایت کیا ہے؟ روایتی معاشرت جو آہستہ آہستہ مٹ رہی ہے' اس کو کیا کرنا [چ]اہیے؟ یہ اور ایسے بہت سے سوال ہیں جو روایت کی بحث میں پیدا ہوتے ہیں اور جن پر ہمیں غور و فکر کرنا چاہیے۔ جالبی نے سوالات تو رکھ دیے ہیں اب ان کے جواب کی انھیں تلاش ہے۔ توقع ہے کہ برصغیر کے دانشور جواب فراہم کرنے کی کوشش کریں گے۔

'نقد و نظر' کے تحت قرۃ العین حیدر' وزیر آغا' داؤد رہبر' جمال پانی پتی اور سہیل احمد خاں کے مضامین شامل ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے "مایا بازار" کے عنوان سے طویل مقالہ لکھا ہے جس میں کئی اہم معلومات جمع کردی گئی ہیں۔ یہ [مض]مون بہت پہلے "جامعہ" نئی دہلی میں چھپ چکا ہے' مکالمہ میں اشاعت سے پاکستانی قارئین اس سے جی بھر کر استفادہ کرسکیں گے' مدیر رسالہ نے اس مضمون کو چھاپ کر ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ وزیر آغا نے 'ہائیکو نگاری اور زرد پتوں کی شال' کے عنوان سے مضمون لکھتے ہوئے تین صفحوں پر ہائیکو' [ث]لاثی' ماہیے اور غزل کے متعلق سے خامہ فرسائی کی ہے بقیہ دو صفحوں پر نسیم احمد نصیر کی کتاب 'زرد پتوں کی شال' کی تعریف میں محنت ضائع کی ہے۔ وزیر آغا کے بلند پایہ ناقد اور مفکر ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کے اس [ط]رح کے ہلکے پھلکے مضامین دیکھ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ وہ اپنی توانائی اب ایسے توصیف ناموں پر صرف کرنے لگے ہیں جو بہت دنوں تک شاید ہی یاد رکھے جائیں۔ داؤد رہبر نے 'گھر کی رونق' کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس کا تعلق نقد سے نہیں بلکہ نظر سے ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ان اشیاء کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے جو ان کے گھر کو رونق بخش رہی ہیں۔ زیبائش و آرائش اشیاء کی فہرست طویل ہے۔ حیرت ہے ان چیزوں سے اردو کے قاری کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

جمال پانی پتی معتبر لکھنے والے ہیں۔ ان کی مابعد الطبیعاتی فکر اپنی بلندی پر ہے۔ ان کے مقالے دعوت غور و فکر دیتے ہیں۔ احسن سلیم اور جدیدیت کا اثباتی رخ کے نام سے ان کا مقالہ "جدیدیت" کی مختلف جہتوں سے بحث کرتا ہے اور بحث کے ان حدود میں احسن سلیم کی شاعری کا بھرپور اور مدلل جائزہ پیش کرتا ہے۔ سہیل احمد خاں نے ضمیرالدین احمد کے دوسرے افسانوی مجموعے "پہلی موت" کے افسانوں کی بنیاد پر ان کے فن کا اجمالی مطالعہ کیا ہے۔ ضمیرالدین احمد کو وہ شہرت نہ مل سکی جو انھیں ملنی چاہیے تھی اس کی ایک وجہ ان کی طویل خاموشی اور پھر بے وقت موت بھی ہے۔ لیکن افسوس کہ "بھوکے ساون" اور "پہلی موت" کے افسانے بہت کم ناقدوں کی توجہ میں آسکے۔ سہیل احمد خان نے بھی تین مضمون میں ان کے افسانوں کا سرسری جائزہ لکھ کر ان کے فن کے تعلق سے بہت سارے سوالات لاینحل چھوڑ دیے ہیں۔

اس شمارہ کا سب سے دلچسپ حصہ جمال پانی پتی اور ناصر بغدادی کے مابین ایک مراسلاتی مکالمہ ہے۔ (جسے "محمد حسن عسکری' سلیم احمد اور بادبان" نام دیا گیا ہے) جو محمد حسن عسکری کے خط کا ترجمہ بعنوان "قرآن مجید کا ایک راسخ العقیدہ نقطۂ نظر" (مترجم : ناصر بغدادی) پر ناصر بغدادی کے تعارفی نوٹ جو پہلے "دریافت" پھر بادبان' میں شائع ہوا تھا' کو لے کر شروع ہوا تھا۔ چونکہ محمد حسن عسکری کا یہ خط نما مضمون پہلے دریافت (مدیر : قمر جمیل) پھر بادبان (مدیر : ناصر بغدادی) میں شائع ہوا تھا اصولاً ان خطوط کو ان دو میں سے کسی ایک رسالے بالخصوص 'بادبان' میں شائع ہونا چاہیے تھا تاکہ زیر بحث معاملات ومسائل کی اہمیت کے پیش نظر قارئین تمام صورت حال سے باخبر ہوسکتے۔ 'بادبان' میں جمال پانی پتی کے خطوط کسی بنا پر تمام وکمال نہ چھپ سکے اب یہ خطوط اپنی اصل شکل میں "مکالمہ" میں شائع ہوئے ہیں۔ جمال پانی پتی کے خطوط مضبوط دلائل وبراہین پر مبنی ہیں جب کہ ناصر بغدادی نے کئی باتیں غیر واضح چھوڑ دی ہیں۔ محمد حسن عسکری کے نام کو اپنی شہرت یا حیثیت کو قائم کرنے کی غرض سے ہم میں سے کئی لوگ خود ان کو محمد حسن عسکری کا واحد وارث قرار دینے کا انداز اختیار کرنے لگے ہیں۔ (بالکل اسی طرح جس طرح پاکستان میں ہر مولوی خود کو اسلام کا واحد مبلغ، مفسر قرار دیتا ہے۔) یہ رویہ ادب کے لیے نیک فال نہیں۔

مکالمہ' کو خوبصورت اور باوزن بنانے کے لیے تخلیقات کے دونوں جانب چوڑے حاشیے چھوڑے گئے ہیں جس سے جگہ کے ضائع ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

رسالہ بہرحال قابل مطالعہ ہے اور کراچی سے نکلنے والے ایسے تمام رسالوں میں ممتاز نظر آتا ہے۔ ہندوستانی لکھنے والوں کی کمی کھٹکتی ہے۔ یقین ہے کہ اسے برصغیر کا نمائندہ پرچہ بنانے کی غرض سے جناب مدیر سرحد کے دونوں جانب کی بہترین تخلیقات پیش کرنے کی سعی کرتے رہیں گے۔

— چودھری ابن النصیر

تھے تب بھی میر اور غالب، اقبال کے فوراً بعد آزاد کا نام اور پھر انیس کا نام اور

لکھے ہیں کہ کہاں تک مثال دوں۔ نظم بہت اچھی ہے

اس نظم کے بعض حصوں میں

ہے ان دنوں میں نے راشد کو زیادہ پڑھا ہوگا

وصول کی ہے اس رد عمل کے ساتھ نہیں کہ آپ کو یہ بھی نہیں بلکہ اس ٹھوس خیال کے ساتھ کہ آپ صرف ایک محدود و مخلف قسم کی شاعری چھاپتے ہیں اور APPRECIATE کرتے ہیں- سو آپ اپنی حدود میں آزاد اور ہم اپنی فضاؤں میں آزاد-[1]

ساہیوال کاوش عباسی

● اگست ۱۹۹۹ء کے "شب خون" میں اپنی غزلیں پاکر ذرا سا غرور ہوا- آپ کی طرف سے ان کی تصحیح و ترمیم نے ایک احساس چھوڑا کہ فن کی راہیں کتنی کٹھن اور کتنی طویل ہیں- گذشتہ بیس بائیس برس سے اس میدان میں دن رات ایک کرنے کے بعد بھی اپنی "اوقات" کا تعین نئے آفاق کی طرف لے جاتا معلوم ہوتا ہے-

آپ کی نظر میں معتبر ہونا یقیناً معنی رکھتا ہے- اگرچہ فاصلے ایسی حقیقت ہیں جو ہم کلامی کو خود کلامی بنا دیتے ہیں اور سوالات اور ان کے جوابات آپ ہی زندہ ہوتے ہیں اور آپ ہی خاک---- آپ سے طویل رفاقت کا خواب تو وقت اور معروضی تبدیلیوں کی بھینٹ چڑھا ہوا ہے- ایسی حیرت کی کیفیت میں کہ جب ہونے اور نہ ہونے کی تاکید ہی صدیوں کے موڑ پر کھڑا کر جاتی ہے تو ملاقات کی افادیت اور تشنگی کو محسوس کرتا دیوار زنداں پر نقش و نگار بنانے سے زیادہ اہم نہیں رہ جاتا- آپ نے میرے شعر

اپنے ہی تلے آئی زمینوں سے نکل کر
آجاتا ہوں شاخوں پہ دفینوں سے نکل کر

کو اس کی اپنی سطح پر محسوس کرنے کے بعد جس SUBLIMATION کو اس میں شامل کیا ہے یقیناً ہمارے آفاق کا ہم ربط ہونا اور ایک ہی FRAME OF REFERENCE میں سانس لینا مرتکز کرتا ہے یعنی تبدیل شدہ-

اوپر ہی چلا جاؤں زمینوں سے نکل کر
روشن کروں شاخوں کو دفینوں سے نکل کر

تجربے کی دو سطحیں بن کر سامنے آتا ہے جو کہ ایک ہی FRAME میں احاطہ نما ہیں- جہاں آتش کہتا ہے کہ

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زربکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

یا آپ کی ہی تحریر کردہ 'شعر شور انگیز' میں غالب کا شعر جو میر کے کسی شعر سے میل کھاتا دکھائی دیا یعنی

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

تو یہ پہلی سطح اور اس کے تعین کے زمرے میں آتا ہے- آپ نے اسی تجربے کو "شاخوں کو روشن" کرنے کے حوالے سے جو محسوس کیا ہے وہ یقیناً "اوپر چلے جانے کی طرف" کی شاخیں ہیں جو کہ آسمان اور اس کی وسعت میں پھیلی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور وہاں کی روشنی کرنے کی خواہش آپ نے اس شعر میں ڈالی ہے جو کہ ہرگز بے جا نہیں ہے بلکہ مجھے خوشی ہے کہ آپ کو میرے شعر نے ایسے بھی چھوا جس کا مجھے ادراک نہ ہو سکا-

علاوہ ازیں "اپنے ہی تلے آئی زمینوں سے نکل کر" ہمیں نثر کے حساب سے تو آنا چاہئے تھا- اپنے ہی تلے آئی ہوئی زمینوں سے نکل کر یعنی کیا یہ خامی آپ کو بڑی تو نہیں لگی کہ آئی ہوئی کے بجائے صرف "آئی" آیا ہے-

دراصل جس رہنمائی کی ضرورت آپ جیسے رہنما کی طرف سے مجھے رہتی ہے وہ فاصلے اور فقدان ترسل خیالات کے باعث میسر ہی نہیں آئی- لاہور میں تھا تو محمد خالد کی رفاقت میں خاصی علم افزا فضا میں وقت گزرا-

ظفر اقبال' منیر نیازی' سجاد باقر رضوی (جو کہ میرے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے پنجاب یونیورسٹی میں)' محمد سلیم الرحمٰن' سراج منیر مرحوم اور دیگر رفقاء سے خاصا علم حاصل کیا لیکن یہاں کینیڈا میں ایسی کسی افادیت کی گنجائش موجود نہیں ہے آپ سے ملاقات بلکہ آپ کا لکچر ابھی بھی یاد ہے اور آپ کی کتابیں ہر دن رہنمائی کا نیا سورج لے کر آتی ہیں- امید ہے کہ PERFECTIONISM کا خواب پورا ہو کر رہے گا- انشاء اللہ- کیوں کہ دوسری صورت میں اپنی توانائی کو ضائع کرنا کس کو خوش آتا ہے-

دو غزلیں بھیج رہا ہوں' امید ہے کہ ان میں ترمیم کی گنجائش کم ہوگی- کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ میری گذشتہ بھیجی ہوئی غزلوں پر تھوڑا بہت وقت نکال کر تھوڑی سی گفتگو (زبان کی خامیاں وغیرہ) خط کے ذریعہ مجھے بھیج دیں تاکہ اس کی روشنی میں مجھے کچھ اور رہنمائی کی سعادت حاصل ہو-

آپ کی صحت کے لیئے دن رات دعاگو ہوں-

ٹورانٹو افضال نوید

● شمارہ ۲۰۱ کے صفحہ ۳۳ پر مرقوم آپ کی یہ رائیں محل نظر ہیں کہ ظفر اقبال کے ان تین مصرعوں میں پنجابی تلفظ کا لحاظ رکھا گیا ہے- آپ کو مغالطہ ہوا ہے کہ "جز وقتی رہا علاج اپنا" میں لام مشدد ہے "پوچھا نہیں کسی حرامی نے" میں موحدہ مشدد ہے اور "وہ بنے ہوئے ہیں کیا کینے" میں نون مشدد ہے- جن الفاظ کے پنجابی تلفظ کی جانب آپ نے اشارہ کیا ہے وہ پنجابی میں بھی ویسے ہی بولے جاتے ہیں جیسے اردو میں یعنی بلا تشدید کے- تقطیع کی بحث میں نہیں پڑتا کیوں کہ آپ کا فرمانا ہے "یہ بحث یہیں ختم کی جاتی ہے-"

کٹک پی- ایل- رتن

● شمارہ ۲۰۲ ملا- پرچہ من و عن ماشاء اللہ خوب تر رہا- تمام مشمولات پسند آئے- پرچہ کی اشاعت میں استقلال اور استقامت اس سے بھی کہیں زیادہ قابل تعریف و ستائش ہے-

حصہ نظم میں بالخصوص مظفر امام' عقیل جاد' عالم خورشید اور سعید اصغر چغتائی کی غزلیں اور افتخار نسیم' ثروت حسین اور ش- ک- نظام کی نظمیں دل

---

[1] ہم شرمندہ ہیں کہ کاوش صاحب کی یہ غزل بھی (ماضی کے اکثر میں) ہمارے کام کی نہ نکلی (ادارہ)

کو بھاتی ہیں۔ آپ کی رباعیات سبحان اللہ

حبیب احمد ساجد
کڈپہ

● شمارہ ۲۰۱ نظر نواز ہوا۔ خالدہ حسین کا افسانہ زیادہ پسند آیا۔ مظفر حنفی نے غزلوں کے اپنے معیار کو ہمیشہ عروج پر رکھا ہے۔

"ہندوستانی شعریات کی جانب ایک قدم" وقیع' فکر انگیز' ملازمۂ خیالات کا نادر نمونہ ہے۔ میں "شب خون" کو اس لیئے پسند کرتا ہوں کہ اس کے ہر شمارہ میں دماغ کو تخلیقی لطف کے سامان مہیا رہتے ہیں۔ آپ معیاری' فکری ادب اور ادب کے تازہ ترین رجحانات کے واحد علمبردار ہیں۔ آپ نے ہمیشہ تخلیق کو ترجیح دی ہے' تخلیق کار کو نہیں۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے پرانے لکھنے والوں کے ساتھ نئے فنکاروں کی بھی حوصلہ افزائی کی ہے جس کی بنا پر نئے ادب کو اعتبار حاصل ہوا ہے۔

تسیم بن آسی
مغل سرائے

● "شب خون" آج بھی نئی نسل کی نمائندگی کے فرائض پوری ذمہ داری سے ادا کر رہا ہے۔ اس کا حسن اور تازگی آج بھی اسی طرح برقرار ہے جس طرح غزل کی۔۔۔ غزل کی طرح "شب خون" بھی تخیل کا استعارہ بن چکا ہے۔

عبداللہ کمال
ممبئی

● "شب خون" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ خالدہ حسین کا افسانہ "سیٹی" خوب ہے۔ خالدہ حسین نے سیٹی میں جدید دور کی عورت کو بالکل اسی انداز سے دیکھا ہے جیسا کہ پہلے بھی دیکھا جاتا رہا ہے۔ آج سماج میں عورت مرد سے برابری کا درجہ چاہتی ہے۔ لیکن ایسا کیوں؟ مرد سے برابر چاہنے کا مطلب یہ ہے کہ آج بھی عورت مرد کی مرہون منت ہے۔ اگر اسے برابری چاہیئے تو وہ چیز مانگنے سے نہیں ملتی۔ چھین کرلے لینی پڑتی ہے۔ برابری سے مراد آزادی بھی لی جاسکتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ آزادی کے لیئے کن کن دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

عورت کیا کرے؟ کبھی خود ذمہ دار بن جاتی ہے اپنی غلامی کے لیئے یا پھر سماج۔ کیونکہ سماج میں ابھی تک وہ انقلاب نہیں آیا جو عورت کو اس کا مقام دے سکے۔ آج کے دور میں عورت کو ماں یا بہن کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ اس کے لیئے چھپن چھری یا قاتل جوانی جیسے الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے موجودہ ماحول کی عکاسی خالدہ حسین نے خوبصورت انداز سے کی ہے۔ بے شک عورت کے لیئے آسمان اور زمین دونوں چاک کی دو پاٹوں کی مانند ہے۔

نثری نظموں میں کوئی ایسی بات نہیں جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرسکے۔ ایسا محسوس ہوا کہ آج کے دور میں شعرائے کرام دوسرے شعرا کے لیئے ہی نظمیں لکھتے رہ گئے ہیں۔ مستقبل شاید اس رجحان کو کبھی معاف نہ کرے۔ اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ہم مغربی سائے کے پیچھے اس طرح بھاگے جا رہے ہیں کہ اپنے وجود تک کو بھول گئے ہیں۔

محمد افروز خان
علی گڑھ

● "شب خون ۲۰۱ اور ۲۰۲ کا ایک ایک لفظ پڑھ ڈالا اور ہمیشہ کی طرح ان شماروں میں شامل تخلیقات سے بے حد متاثر ہوا۔ غزلیں نظمیں سبھی معیاری ہیں۔ ن۔ م۔ دانش کی ایک غزل کا ایک مطلع تین شعر کے بعد درج ہے' ایسا کیوں؟ سمجھ میں نہیں آیا' لگتا ہے کتابت کا سہو ہے۔ اس کے علاوہ عقیل جامد کی حمد غزلیں دونوں شماروں میں پڑھنے کو ملیں اور سبھی میں انھوں نے ردیف پرندوں' جانوروں اور کیڑوں کو بنایا ہے' یہ اشعار غزل کے ہیں یا اینٹی غزل کے۔ سب میں اشعار بھی بہت زیادہ ہیں' پھر بھی بعض اشعار تو دلچسپ اور پر لطف ہیں۔ بہر کیف یہ بھی غزل میں ایک تجربہ ہی کہا جائے گا۔ آپ کی نظم 'نامکمل سوانح حیات' کا باب چہارم میں نے کئی مرتبہ پڑھا۔ اس میں نظم نگار کی سوانح کے پہلو بہ پہلو اس دنیا کی سوانح بھی بیان ہوتی جاتی ہے۔ راہی فدائی کی غزلوں میں بعض الفاظ اتنے دقیق ہیں کہ لغت دیکھنے کی ضرورت پڑی۔

دونوں شماروں میں نثری حصہ بھی بڑا وزنی ہے۔ انیس اشفاق کا مضمون بہت محنت سے لکھا گیا ہے اس میں انھوں نے صرف تین جدید شعراء کی غزلوں میں علامتی نظام کی تلاش کی ہے وہ ہیں ناصر کاظمی' احمد مشتاق اور منیر نیازی۔ احمد مشتاق اردو کے اہم شاعر ہیں اور فراق کے مقابلے میں بلند قامت شاعرانہ شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ کی گذشتہ گفتگو نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا تھا اس مضمون سے یہ احساس اور بھی پختہ ہو گیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو مثالیں دی ہیں اور ان کی جس طرح وضاحت کی ہے اس سے ان کی شاعرانہ عظمت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ 'ہندوستانی شعریات کی جانب پہلا قدم' بھی شاعری کو سمجھنے کے لیئے ہمیں ایک اچھوتا زاویہ نظریہ دیتا ہے۔ الیاس احمد گدی سے راشد انور راشد کی گفتگو بھی خاصے کی چیز ہے۔ اس سے ان کے ناول "فائر ایریا" کو سمجھنے میں بلاشبہ ہمیں مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری 'کفن کا تجزیاتی مطالعہ' بھی بڑی دقت نظری سے کیا ہے جس سے قاری کو اس کی اصل فنی خوبیوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ دونوں شماروں میں افسانے بھی اچھے ہیں۔ آپ کی رباعیاں اس شمارے میں کچھ اور ہی انداز رکھتی ہیں۔ 'نئی ادبی تھیوری' پھر آپ کی تحریروں کا کیا پوچھنا' اب تو ان سب کو کتابی شکل میں شائع ہو جانا چاہیئے۔

اشفاق احمد اعظمی
اعظم گڑھ

● "شب خون" جس معیار کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اس کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے۔ اور جس فراخ دلی سے آپ مخالف تحریروں کو جگہ دیتے ہیں وہ نہ صرف قابل ستائش ہے بلکہ ادبی دنیا میں بے نظیر۔ اللہ آپ کے مقاصد بلند رکھے اور ان کے حصول میں کامیابی عطا فرمائے۔

عدیل یوسف صدیقی
و۔ممبلی' انگلستان

● غیاث متین نے نظم کی راہ سے ہٹ کر غزل کی طرف رجوع کیا ہے۔ خوب غزلیں نکالی ہیں۔

اسلم عمادی
کویت

مابعد جدیدیت : تشخیص اور علاج

ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ "مابعد جدید" اپنی پیدائش کے وقت سے ہی ابہام اور عدم وضاحت کا حامل رہا ہے۔ ایک طرف تو اسے ایک تاریخی دور کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش ہے، اور دوسری طرف یہ محض ایک تمنا ہے، ایک کیفیت ہے کہ مستقبل شاید کسی طور پر حال کو اس کی گناہ بھری صورت حال سے نجات دلادے۔ اس ذومعنویت اور ابہام کے باعث یہ لفظ ان ساجیاتی مباحثوں کے حاشیوں کی طرف مثلاً [illegible] ہے جو ۱۹۵۰ کی دہائی میں شروع ہوئے تھے اور جن کا ماحصل یہ تھا کہ IDEOLOGY اب ختم ہو چکی ہے۔ لیکن اس اصطلاح کے معنی اس وقت خود کو زیادہ واضح کرنے لگتے ہیں جب اسے فن تعمیر اور ادبی تنقید کے تناظر میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے۔ ان دونوں علوم میں یہ اصطلاح (مابعد جدید) حسب ذیل تناؤ کا اظہار کرتی ہے۔

ایک تو یہ کہ مابعد جدید کوئی تاریخی دور ہے جس میں مسیح موعود تشریف لائیں گے اور تمام برائیوں کا ازالہ کریں گے۔ یہ دور "جدیدیت کے بعد" کا ہے، اور ہم اس دور میں اگر داخل نہیں ہو چکے تو ہونے والے ضرور ہیں۔ دوسری طرف اس اصطلاح میں یہ احساس پنہاں ہے کہ ہمیں ہمیشہ کے لیے زمانۂ حال میں مقید رہنا ہے، اور ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ زمانۂ حال کی بنیادی صفت کشمکش، یا تضاد، یا بے ربطی ہے اور اس احساس کے نتیجے میں ہمیں ایک مخصوص ذہنی رویہ اختیار کرنا چاہئے جسے بعض لوگوں نے منقسم شخصیت (SCHIZOPHRENIA) کا رویہ قرار دیا ہے۔ یہ تناؤ "مابعد جدید" کی اصطلاح کے نیچے ایک اور تناؤ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یعنی مابعد جدیدیت کوئی جمالیاتی اسلوب ہے یا یہ کوئی سیاسی یا ثقافتی حقیقت ہے؟ لہٰذا یہاں یہ بحث پھر شروع ہو جاتی ہے کہ جمالیات اور سیاست میں کیا رشتہ ہے؟ (یعنی کیا "مابعد جدیدیت" کی جمالیات سیاسیات کی تابع محمل ہے جس طرح ترقی پسند جمالیات، مارکسی سیاسیات کی تابع محمل تھی؟)

"مابعد جدیدیت" کی اصطلاح یا لیبل کے پیچھے جمالیات اور سیاست کا انوکھا گٹھ بندھن شروع سے ہی ظاہر رہا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ فرینک فرٹ اسکول اور خاص کر T.W. ADORNO کے اثر کے باعث "مابعد جدید" کا تصور اور اس کا مطلب مارکسیت کے تصور اور معاملے سے مربوط ہو گیا ہے۔ (لہٰذا یہ فرض کرنا کہ مابعد جدید پروگرام میں ادیب کو مکمل آزادی حاصل ہو گی کہ وہ اپنی بات بے تکلف کہہ سکے، غلط ہے)۔ بہت سے لوگوں کے لیے مارکسزم تو اب مسئلے کے حل کی بجائے مسئلے کا حصہ معلوم ہونے لگی ہے۔ BAUDARILLARD (بودریا) تو یہاں تک کہتا ہے کہ مارکسزم کچھ نہیں ہے محض سرمایہ داری کے جسم میں داخل کیا گیا انجکشن ہے تاکہ سرمایہ داری اور زیادہ بہتر طریقے سے کام کر سکے۔ یعنی تمام تر تنقیدی اور مخالفانہ فکر دراصل بورژوا کی آخری پناہ گاہ ہے۔

THOMAS DOCHERTY

([illegible])

شب خون

اپریل ۱۹۹۷

مدیر و ناشر و پبلشر: عقیلہ شاہین | سرورق: چودھری ابن النصیر | جلد: ۳۱ | شمارہ: ۲۰۵

فون نمبر: ۶۲۲۶۹۳، ۶۲۲۳۱۳ | سرنامہ کی خطاطی: عادل منصوری | ترسیل زر کا پتہ: ۳۱۳-رانی منڈی، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

مطبع: بھارگو پریس، الہ آباد | کمپوزنگ: افراح کمپیوٹر سنٹر، نئی دہلی-۲۵ | خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس-۱۳، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

فی شمارہ: پندرہ روپے | بارہ شمارے: ایک سو ساٹھ روپے

ترتیب و تہذیب

شمس الرحمن فاروقی

عمیر مسعود

الہ آباد سے شمس الرحمٰن فاروقی کا فون آیا:

"میں نے محمود ایاز کی خیریت معلوم کرنے کے لئے ابھی بنگلور فون کیا تھا، معلوم ہوا وہ گزر گئے"

فاروقی نے اس سے پہلے بھی بنگلور فون کیا تھا۔ اس وقت خود محمود ایاز نے اپنے مخصوص بشاش لہجے میں انھیں اپنی طبیعت کا حال بتایا تھا۔ فاروقی کو ان کی آواز میں خفیف سا اضمحلال خود محسوس ہوا تھا لیکن ان کی باتوں سے کوئی افسردگی یا مایوسی ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ اس لئے ہم لوگ "سوغات" کے بارھویں شمارے کے منتظر تھے۔

۵ اگست ۹۶ کو محمود ایاز نے ایک خط میں صرف اتنا لکھا تھا:

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے"

پھر ۱۸ اگست کو لکھا:

"بہت بے کیفی کا عالم ہے۔ دیکھیں کب تک باقی رہتا ہے"

پھر ۲۵ اگست کے خط میں لکھا:

"اسی رات [۲۱ اگست] میری طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ پیٹ اور سر میں ناقابل برداشت درد۔ بڑی مشکل سے رات کٹی۔ دوسرا دن ڈاکٹروں کے ساتھ گزرا۔ اب تک کوئی قطعی تشخیص نہیں ہوئی۔ دوائیوں نے سنبھال رکھا ہے۔"

۱۵ نومبر کے خط میں بات یوں صاف ہوئی:

بھائی، صورت حال یہ ہے کہ PANCREAS کا کینسر ہے، اور اب جگر بھی اس کی زد میں آگیا ہے۔ باہر کے اور یہاں کے ڈاکٹروں کی متفقہ رائے یہ ہے کہ یہ NON-OPERABLE کیس ہے، لہٰذا وقت مقررہ تک SYMPTOMATIC علاج ہوتا رہے گا۔ بھوک بالکل غائب ہے۔ درد ہوتا ہے۔ گولیوں سے افاقہ نہ ہو تو انجکشن لے لیتا ہوں اور آرام ہو جاتا ہے۔ بخار آتا رہتا ہے۔ بس، یہ ہے مختصر روداد۔"

کینسر کے اس آخری، مایوس کن اور اذیت ناک مرحلے اور "موت مقررہ" کا ایسا بیباکانہ ذکر، وہ بھی خود مریض کی زبان سے، ضمیر الدین احمد کے بعض خطوں کے سوا اور کہیں کم ملتا ہے۔ ہم لوگوں کو امید پیدا ہو گئی کہ محمود ایاز کی زبردست قوت ارادی ابھی بہت دن تک مرض کو زیر رکھے گی۔ ۲۰ دسمبر کے خط سے اس امید کو تقویت ہوئی:

مجھے دوبارہ اسپتال میں رہنا پڑا اور پھر حیدرآباد میں ایک ہفتہ علاج کے سلسلے میں گزرا۔ آنے کے بعد سنبھلنے میں کچھ دن لگے۔ اب اللہ کے فضل سے افاقہ ہے اور چل پھر رہا ہوں۔" اور خط کے آخر میں یہ اطلاع: "ڈاکٹر نے کہا

[illegible] کرنا ہے۔"

[illegible] میں محمود ایاز نے "سوغات" کے بارہویں شمارے کی تیاری [illegible] کی خبر دی تھی۔

"آئندہ شمارے میں شفیق الرحمن پر خصوصی مطالعہ دینا چاہتا ہوں۔ محمد کاظم صاحب نے تعاون دینے کا وعدہ کیا ہے۔ شفیق الرحمن خالد اختر صاحب کے جو دو خطوں میں ہیں۔ خالد اختر صاحب کا طویل خط آیا ہے۔ بہت اچھا لکھتے ہیں اور بڑی محبت کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے شفیق الرحمن کی جن تحریروں کو شامل کرنے کا مشورہ دیا ہے ان میں سے دو کہانیاں میری نظر سے نہیں گزری ہیں۔ "نیلی جھیل" اور "کشتی" کسی طرح یہ کہانیاں ڈھونڈ کر بھیجئے۔ میں کہیں اور سے حاصل نہیں کر سکوں گا۔ اس بار چاہتا ہوں کہ بارہویں شمارے کی تاخیر کی کچھ تلافی ہو جائے اور پرچہ کم از کم اپریل میں نکل جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ طباعت کے لیے کاپیاں مارچ کے پہلے ہفتے میں بھیج دی جائیں۔"

اس کے بعد محمود ایاز کا کوئی خط نہیں آیا۔ کوئی خبر بھی نہیں آئی۔ مارچ کے آخر تک نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ "سوغات" کو تیاری کے آخری مرحلوں سے گزار رہے ہیں یا طباعت مطبع کے قریب پہنچ رہے ہیں۔[1]

"سوغات" کے تیسرے دور کے آغاز (ستمبر ۱۹۹۱) سے کچھ پہلے محمود ایاز کے ساتھ باقاعدہ خط و کتابت کا آغاز ہوا اور خط مراسلت کے ابتدائی زمانے میں "شاعر" میں ان کا [illegible] شائع ہوا۔ تصویر بھی چھپی جس میں وہ خاصے طرح دار جوان نظر آتے تھے۔ میں نے انھیں لکھا کہ میں سمجھتا تھا آپ کچھ سال خاصے بزرگ سے ہوں گے۔ رنگین تصویر دھوکا اور کر رہی ہے۔ جواب آیا کہ وہ پرانی تصویر ہے اور سیاہ اور سفید ہے اس لئے چھاپی گئی ہے۔ بعد کی تصویروں کے پرنٹ رنگین ہونے کی وجہ سے "شاعر" میں نہیں چھپ سکے تھے۔ خط کے ساتھ محمود ایاز کی ایک تازہ رنگین تصویر بھی تھی جس کی پشت پر انھوں نے لکھا تھا:

—— اپنی سال خوردگی کا ثبوت بہم پہنچانے کے لیے
محمود ایاز

وہی ہے آگ مگر آگ میں دھواں نہ رہا

بڑے قد کی تصویر تھی۔ بالوں میں سفیدی آگئی تھی، مگر طرح داری "شاعر" والی تصویر سے بھی کچھ بڑھی ہوئی تھی۔

"سوغات" کے سلسلے میں ان کے خط برابر آتے رہتے تھے۔ یہ اس قسم کے رسمی خط نہیں تھے جیسے کوئی مدیر اپنے لکھنے والوں کو بھیجتا ہے۔ وہ شاید کسی بھی لکھنے والے کو رسمی خط نہیں لکھتے تھے۔ ان خطوں میں مکتوب الیہ کے ساتھ

[1] بارہواں شمارہ محمود ایاز پر ایک گوشے کے ساتھ خلیل مامون کی توجہ میں جلد ہی شائع ہوگا (ادارہ)

[illegible] کی مدد میں" [illegible] ان سے [illegible] بہتر اور زیادہ سے زیادہ سمجھا جاتا ہے۔

کرناٹک اردو اکادمی کے زیر اہتمام [illegible] سیمینار (۱۲، ۱۳، ۱۴ ستمبر ۱۹۹۴) میں محمود ایاز نے فرحان صدیقی کے ساتھ مجھ کو بھی بنگلور بلوایا اور ہم نے انھیں ان کی رنگین تصویر کے عین مطابق پایا۔ اس وقت وہ چستی اور تازگی کا مجسمہ تھے۔ سیمینار میں باہر کے لوگ [illegible] سعادت علوی اور شمیم حنفی بھی آئے ہوئے تھے اور محمود ایاز اپنے ایک ایک مہمان کو دیکھ کر پھول کی طرح کھلے جاتے تھے۔ وہاں کی صحبتوں میں سب پر حاوی ہوا معلوم ہوتا تھا اور نئی پرانی تحریروں پر محمود ایاز کی نظر حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ اس سے بھی زیادہ حیرت ان کی یادداشت پر ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کچھ انھوں نے ابھی ابھی پڑھا ہے۔

ان ملاقاتوں میں اور محمود ایاز کے خطوں سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ "سوغات" سے ان کو کس قدر لگاؤ ہے اور وہ کتنے منظم انداز میں اسے ادبی دستاویز بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ "سوغات" کی شہرت اور مقبولیت بھی پہلے ہی شمارے کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ ضخامت شروع ہی سے زیادہ تھی۔ اس کے لئے مناسب چیزیں حاصل کرنے اور نامناسب چیزیں مسترد کرنے کے سلسلے میں ان کو لکھنے والوں کے جم غفیر سے نمٹنا اور معلوم نہیں کیا کیا سننا اور سہنا پڑتا تھا۔ کچھ ان کی صحت میں بھی فرق آگیا تھا۔ ایک ڈیڑھ سال سے ان کے کسی کسی خط میں ان کی مخصوص بشاشت اور حوصلہ مندی کی جگہ ایک شکست خوردگی اور تھکاوٹ کی سی کیفیت جھلک جاتی تھی جن کی طرف میں نے ان کو کئی بار متوجہ کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اس کیفیت کی وجہ محض صحت کی خرابی نہیں معلوم ہوتی۔ آخر انھوں نے اعتراف کر لیا کہ اس کیفیت کا سبب "سوغات" ہے، اور ۳ جولائی ۹۶ کے خط میں صاف صاف لکھ دیا:

دراصل "سوغات" سے مجھے جو تکلیف ہوتی رہتی ہے وہ یہی ہے کہ اس کی وجہ سے بیشتر ایسے منفی جذبات سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو میری طبیعت اور مزاج کے بالکل خلاف ہیں۔ اور ایسے منفی جذبات بار بار پیدا ہوتے رہیں تو ان سے بڑا دھکا پہنچتا ہے ذہنی صحت کو۔ اور اس سے شخصیت کا توازن بگڑنے لگتا ہے۔ اور یہ اتنی بڑی قیمت ہے کہ "سوغات" کی خاطر بھی اس کی ادائگی مجھے مہنگی معلوم ہوتی ہے"

اس سے پہلے بھی انھوں نے کئی بار کوفت میں مبتلا ہو کر "سوغات" بند کر دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ لیکن ہم کب جانتے تھے کہ محمود ایاز چاہتے ہی "سوغات" سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ اور یہ بات ہم سے زیادہ محمود ایاز جانتے تھے۔

❖ ❖

محمود ایاز

تمام شب کی دکھن سے کل سبک خوابی
نمودِ صبح کو درماں سمجھ کے کاٹی ہے
رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو کی ہر آہٹ
اجل گرفتہ خیالوں کو آس دیتی ہے
ہنسی ہے!
افق سے صبح کی پہلی کرن ابھرتی ہے
تمام رات کی فریاد اک سکوت میں چپ
تمام شب کی دکھن سے کل سبک خوابی
حریری پردوں کی خاموش سلوٹوں میں گم
جو آنکھ زندہ تھی خاموش چھت کو تکتی ہے
مگر وہ آنکھ جو سب دیکھتی ہے
ہنسی ہے!
نمودِ صبح کی زرد تر روشنی کے ساتھ
مہکتے پھول دریچے سے جھانک کر دیکھیں
تو میز و در پہ کسی درد کا نشاں نہ ملے
اگال دان، دواؤں کی شیشیاں، پنکھا
کنواری یاس کا تبسم ضعیف گو بے جاں
ہر ایک چیز بہ دستور اپنی اپنی جگہ
نئے مریض کی آمد کا انتظار کرے
اور ایک آنکھ جو سب دیکھتی ہے
ہنسی ہے!

حامدی کاشمیری

نوحہ

ساقی فاروقی

یہ کیسی سازش ہے جو ہواؤں میں بہہ رہی ہے
میں تیری یادوں کی ساری شمعیں
بجھا کے خوابوں میں چل رہا ہوں
تری محبت مجھے ندامت سے دیکھتی ہے
وہ آئینہ ہوں خواہشوں کا
کہ دھیرے دھیرے پگھل رہا ہوں
یہ میری آنکھوں میں
کیسا صحرا ابھر رہا ہے
میں بال روموں میں بجھ رہا ہوں
شراب خانوں میں جل رہا ہوں
جو میرے اندر دھڑک رہا تھا
وہ مر رہا ہے

نظم "نوحہ" اشاروں میں ایک گہری اور پیچیدہ حیاتی کیفیت کی مصوری کرتی ہے۔ اس نظم میں متکلم اپنی یا اپنے دھڑکتے دل کی موت کا نوحہ پیش کر رہا ہے' شعری کردار نظم کے پہلے مصرعے ع

یہ کیسی سازش ہے جو ہواؤں میں بہہ رہی ہے

میں حیرت' دکھ' خوف اور تذبذب کے ملے جلے تاثرات سے مملو لہجے میں استفسار کر رہا ہے کہ ہواؤں میں یہ کیسی سازش بہہ رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ گھر سے باہر کھلی فضا میں فطرت کے مظاہر کو دیکھ رہا ہے' فطرت اس کے لئے ماورائے فطرت کا منظر نامہ پیش کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہوائیں "بہہ رہی ہیں"۔ اور ہواؤں کا بہاؤ بصری اور سمعی حواس کو متحرک کر رہا ہے۔ اور لفظ "سازش" جو تجریدی ہے' اپنے سیاق میں متحرک شئے کا بدل بن گیا ہے۔ تاہم متکلم آغاز کار میں "سازش" کی نوعیت کی تفہیم سے قاصر نظر آتا ہے۔ حالانکہ سازش کا شعری برتاؤ تجریدیت کے باوجود ممکنہ تلازمات کو جگاتا ہے۔ یہ سازش کرنے والے اور اس شخص جس کے خلاف سازش کی جا رہی ہے' کے تلازمات کو فوری طور پر انگیز کرتا ہے اور ساتھ ہی فطرت پہلے ہی مصرعے سے ایک مشکوک' تردد انگیز اور Fishy ماحول میں بدل جاتی ہے اور متکلم کے خلاف اس کا ایک معاندانہ رویہ ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جدید فنکار کے مکاشفانہ شعور نے اسے فطرت کی رومانیت پرور مثالیت پسندی سے فریب شکستہ کر دیا ہے اور وہ سماج' تہذیب' زمانہ کی طرح فطرت کے غارت گرانہ رویے کی آگہی رکھتا ہے۔ شعری سیاق میں متکلم کے خلاف سازش کی کاروائی سماج' تہذیب یا زمانہ انجام دے سکتا ہے۔ یہ معاشرتی تضاد کی پیدا کردہ برائیوں یعنی دشمنی' رقابت' اخلاقی گراوٹ' خود غرضی اور تعصب کا اشاریہ بھی ہو سکتی ہے' جو عاشق اور محبوبہ دونوں کی تباہی کے درپے ہوں۔

متکلم کی رد رومانیت کا رویہ دوسرے اور تیسرے مصرعے میں زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے :

میں تیری یادوں کی ساری شمعیں
بجھا کے' خوابوں میں چل رہا ہوں

ان مصرعوں میں روئے سخن محبوبہ کی جانب ہے' جس کی جسمانی موجودگی کے بجائے خیالی موجودگی کا اثبات ہوتا ہے۔ متکلم ان میں اعلانیہ کہتا ہے کہ وہ

محبوبہ کی یادوں کی ساری شمعوں کو بجھا کر خوابوں میں (تاریک خوابوں) چل رہا ہے۔ اس بات کا امکان بھی ہے کہ فطرت کو بھی سازش میں ملوث دیکھ کر اور محبوبہ سے گہرے رشتے کی بنا پر کہہ رہا ہو کہ وہ اس کی یادوں کی ساری شمعیں بجھا کر خوابوں میں چل رہا ہے۔ یعنی تاریک خوابوں کے راستے پر ہولیا ہے' جو منزل نا آشنا ہیں اور پھر اگلے مصرعے یعنی ؏

تری محبت مجھے ندامت سے دیکھتی ہے

سے ظاہر ہوتا ہے کہ خوابوں میں چلتے ہوئے اس کی محبت (مجسم محبت) اسے ندامت سے دیکھتی ہے۔ محبت کی تجسیم' محبت کی لطافت' خوبصورتی اور شدت پر دال ہے۔ محبوبہ کا ندامت سے دیکھنا عاشق کے اختیار کردہ حتمی رویے کی خلاف اس کے رد عمل کا اظہار ہے۔ اس مصرعے میں لفظوں کی ترتیب کئی معنوی امکانات کو جگاتی ہے۔ یہ اس کی بزدلی' خود غرضی' لاتعلقی اور غیر مستقل مزاجی' جس کا ایک طرح سے اسے خود بھی احساس ہے' پر محیط ہے۔ اگلے دو مصرعوں میں متکلم اپنی اندرونی دلی کیفیت کو آشکار کرتا ہے :

وہ آبگینہ ہوں خواہشوں کا

کہ دھیرے دھیرے پگھل رہا ہوں

وہ کہتا ہے کہ محبوبہ سے لاتعلقی اختیار کرنے کے باوجود وہ "خواہشوں" سے دستبردار نہیں ہوا ہے۔ "خواہشوں" کا محور عشق ہے' عشق جسمانی اتصال ہے۔ وہ استعاراتی انداز میں کہتا ہے کہ وہ "خواہشوں" کا ایک ایسا "آبگینہ" ہے جو دھیرے دھیرے پگھل رہا ہے۔ آبگینہ اور اس کا پگھلنا ایک ایسا استعاراتی اسلوب ہے' جس سے خواہشوں کی نزاکت اور حدت کا تاثر ابھرتا ہے گویا محبوبہ سے لاتعلقی کے اعلان کے باوجود' وہ اس کو پانے کی "خواہشوں" سے نجات نہیں پاسکا ہے اور یہ متناقض صورت حال اسے تباہی کی طرف لے جارہی ہے۔

اب یہ دو مصرعے دیکھئے۔

یہ میری آنکھوں میں

کیسا صحرا ابھر رہا ہے

نظم کے پہلے مصرعے کی مانند یہاں بھی متکلم کو استفہامیہ لہجے سے حیرت' خوف اور دکھ کا اظہار ملتا ہے' جو اس غیر متوقع اور ہلاکت خیز وقوع کا پیدا کردہ ہے کہ اس کی آنکھوں میں ایک انوکھا اور ان دیکھا صحرا ابھر رہا ہے۔ آنکھوں میں صحرا کا ابھرنا (اور وہ بھی ایک انوکھا صحرا) حیرت' ویرانی' بنجرپن' دہشت اور اکیلے پن کے جذبات کا معروضی متلازمہ بن جاتا ہے۔ یہ تنہائی' سفر اور قریب شکستگی کے امکانات پر بھی محیط ہے۔ تاریک خوابوں میں چلتے ہوئے کسی موڑ پر عجیب و غریب صحرا کی نمود شعری تجربے کو ماورائیت سے ہم کنار کرتی ہے اور اس کی توسیع کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ یہ خوابوں کی لاحاصلی اور بے ثمری' منزل ناشناسی' رائیگانیت اور جذبوں کے بنجرپن پر بھی دلالت کرتا ہے۔ نتیجتاً متکلم کو انتہائی بیچارگی کے عالم میں اپنی بقیہ زندگی وقتی عیاشیوں کی نذر کرنا پڑرہی ہے :

میں بال روموں میں بجھ رہا ہوں

شراب خانوں میں جل رہا ہوں

بال روموں میں وہ مغربی رقص میں شریک ہو کر یا اس کا تماشائی ہو کر اپنی رہی سہی توانائی برباد کر رہا ہے اور بجھتا جارہا ہے۔ وہ شراب خانوں میں جاتا ہے اور شراب کی آگ رگ و پے میں اتار کر اپنے جسم و جاں کو جلاتا ہے۔ اسے خود اذیتی کے نفسیاتی عارضے سے موسوم کیا جاسکتا ہے' جو اس کی مکمل شکست و ریخت کا اعلانیہ ہے۔

نظم کے آخری دو مصرعے شعری کردار کو اپنے انجام تک لے جاتے ہیں :

جو میرے اندر دھڑک رہا تھا

وہ مر رہا ہے

یعنی وہ اس حقیقت کا احساس کرتا ہے کہ اس کے اندر "جو دھڑک رہا تھا' وہ مر رہا ہے" جو اغلباً دل کی جانب اشارہ ہے' "جو دھڑک رہا تھا" اس امکان کو تقویت دیتا ہے۔ یہ اس کے دھڑکتے ہوئے وجود کا اشاریہ بھی ہوسکتا ہے' جو موت سے ہم کنار ہو رہا ہے۔ یہ "جو" اس کا جذبۂ عشق یا جذبۂ بقا' یا آرزو بھی ہوسکتا ہے۔ ایک مصرعے "جو میرے اندر دھڑک رہا تھا" سے ابہام کی ایسی زرخیزی ساقی فاروقی کی زبان شناسی اور غیر معمولی خلاقی پر دلالت کرتی ہے۔ پوری نظم تقلیل الفاظ کے باوجود ایک ارتقا پذیر اور جہت آشنا تجربے پر محیط ہے۔ ان مصرعوں میں اس ہوش ربا اور تشویشناک احساس کے باوجود کہ متکلم کا دھڑکتا وجود موت سے ہم کنار ہو رہا ہے' جذباتیت کو دخیل نہیں ہونے دیا گیا ہے۔ متکلم احتیاط اور صبر سے اپنے دل یا اپنی موت کا اعلان کر رہا ہے۔ اس طرح سے نظم "نوحہ" محض جذباتیت سے گریز اور موت کی ناگزیریت کے شعور کے منضبط اظہار کی ایک عمدہ مثال بن جاتی ہے۔

"یادوں کی ساری شمعیں" اور "آبگینہ ہوں خواہشوں کا" جیسے حسیاتی اشاروں کے ساتھ ساتھ نظم کی بافت میں "ہواؤں' خوابوں" اور "صحرا" جیسی علامتوں کے عمل کے ذریعہ نظم فنی رچاؤ اور جامعیت حاصل کرتی ہے۔ لسانی اعتبار سے نظم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی اضافت استعمال نہیں ہوئی ہے اور مصرعوں کی نحوی ترکیب' روز مرہ کے الفاظ' وقفے وقفے سے "چل رہا ہوں' پگھل رہا ہوں" اور "جل رہا ہوں" کے ہم قافیہ الفاظ اور ردیف کی جھنکار سے ایک ترنم اور جمالیاتی کیفیت جنم لیتی ہے' جو احساس زیاں بن کر قاری کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔

ظفر اقبال

ملتا جو کائنات کے آواز کا سراغ
پیدا ہوئی ہے جس سے ، اس آواز کا سراغ

جو آسماں پہ ٹھیک ، زمیں پہ غلط رہے
کوئی لگا سکے جو اس انداز کا سراغ

بے سر پڑا ہوں جس کے بغیر ایک عمر سے
دے گا کبھی تو کوئی مرے ساز کا سراغ

شرمندہ ہونا چاہتا ہوں ، پہ ابھی نہیں
دیتا نہیں ہوں اپنی تگ و تاز کا سراغ

لاؤں کہاں سے موج معانی بہاؤ پہ
میں خود لگا سکا نہیں الفاظ کا سراغ

رسوائی کے قریب سے ہوتا ہوا سہی
پاتا کوئی تو میرے اس اعزاز کا سراغ

میں بھی بدلنے والا ہوں اسلوب آرزو
میں نے بھی پا لیا ہے اس اغماض کا سراغ

لیتے ہیں میرے صبر کا روز امتحاں یہ لوگ
لاتے ہیں [illegible] جلوہ گر ناز کا سراغ

محدود عقل دے کے وہ فارغ ہوئے ، ظفر
دیتے نہیں ہیں آپ کسی راز کا سراغ

ہماری کہکشاں ہے یا تمہاری کہکشاں ہے
یہ کس نے آسمانوں سے اتاری کہکشاں ہے

درخشانی کہاں سے آگئی ہے زور کرتی
یہ تم ہو ، میں ہوں ، یا ساری کی ساری کہکشاں ہے

ابھی تو اور بھی ہیں دور میری زندگی کے
ابھی تو میں نے ان میں سے گزاری کہکشاں ہے

توازن کس طرح سے آئنے گا خالی خلا میں
بہت ہلکا ہوں میں ، اور ، اتنی بھاری کہکشاں ہے

ہیں دونوں ہی بہت حیرت زدہ اک دوسرے پر
فلک ٹھہرا ہوا ہے ، اور ، جاری کہکشاں ہے

ستارے ، چاند ، سورج بے شمار اس کے ہیں اپنے
ہزاری ، سو ہزاری ، سو ہزاری کہکشاں ہے

میں اس کے رو برو بس ایک لمحے کو ہوا تھا
لہو میں آج تک جاری و ساری کہکشاں ہے

ہمیں تو دن میں بھی تارے نظر آتے ہیں اکثر
ہماری تو ، یہاں ، بے روزگاری کہکشاں ہے

ظفر میں دودھیا رستے کا راہی تھا ابد سے
مرے خواب سفر پر اب بھی طاری کہکشاں ہے

ظفر اقبال

سوچتے تھے فضا ہے نامانوس
یہ تو سارا خلا ہے نامانوس

آتے جاتے کھڑے ہیں ناواقف
اڑتی پھرتی ضیا ہے نامانوس

فاصلے اس قدر زیادہ ہیں
ایک سے دوسرا ہے نامانوس

ابھی کچھ بھی پتا نہیں چلتا
کیا نہیں ، اور کیا ہے نامانوس

اجنبی حبس بھی وہیں کا ہے
جس طرف کی ہوا ہے نامانوس

یہ ستاروں کی بستیاں ، یہ دھواں
سبھی ناآشنا ہے ، نامانوس

کس طرف مجھ کو کھینچ لائے ہو
یہ کوئی سلسلہ ہے نامانوس

کیسے میری سمجھ میں آنے کا
کہ مرا سوچنا ہے نامانوس

کچھ تو سنتا نہیں وہ بات ، ظفر
اس پہ میرا کہا ہے نامانوس

اس نے خود آکے مجھ کو بتایا ہے طول موج
کتنا لگا ہے ، کتنا بھایا ہے طولِ موج

ذرّوں کے اضطراب کا عالم ہی اور تھا
اک طول موج سے جو اٹھایا ہے طول موج

تابش کے زور شور پہ بندش لگائی ہے
اور ، کافی مشکلوں سے گھٹایا ہے طول موج

گنجائش اور کوئی نہیں تھی ، اسی لیے
آنکھ کے راستوں میں سمایا ہے طول موج

کرتا میں اس کو شعر میں کس طرح سے بیاں
میری سمجھ میں ہی نہیں آیا ہے طول موج

رومیں رواں ہوں ساتھ ہی سب کے کچھ اس طرح
میں ہوں کبھی ، کبھی مرا سایا ہے طول موج

ہے اتنی روشنی کہ مرے آر پار ہے
یہ کس نواح میں مجھے لایا ہے طول موج

میں نے بھی کوئی خاص توجہ نہیں دھری
اس نے بھی دور سے ہی دکھایا ہے طول موج

اس کو بھی نا پسند ہیں یہ فاصلے ، ظفر
میں نے بھی سامنے سے ہٹایا ہے طول موج

ظفر اقبال

عمر جتنی بھی کائنات کی ہے
ہے

آپ ہی آپ پھیلتے جانا
بات ابھی بھی کائنات کی ہے

دور در دور اور خلا بہ خلا
خاک اُڑتی بھی کائنات کی ہے

آسمانوں کے برف زاروں میں
گرما گرمی بھی کائنات کی ہے

جو مرے فہم سے ورا ہے ابھی
ہیرا پھیری بھی کائنات کی ہے

میرے اندر کھلی ہوئی کب سے
کوئی کھڑکی بھی کائنات کی ہے

ایک صورت سی میری آنکھوں میں
بنتی مٹتی بھی کائنات کی ہے

گفتگو ساری کائنات کے ساتھ
کچھ تمہاری بھی کائنات کی ہے

دور تر بھی ہوں اس بلا سے، ظفر
ہم نشینی بھی کائنات کی ہے

دلدل سی ایک ہے کہ ہیں جس میں دھنسے ہوئے
میں اور کائنات ہیں دونوں پھنسے ہوئے

آوارگان گردشِ افلاک، دیکھنا
ڈھیلے سے، اور، پھر بھی ہیں کیسے کسے ہوئے

کچھ آسماں میں اتنی جگہ بھی نہ تھی کہیں
تارے سے میرے دل کے ہیں اندر گھسے ہوئے

دن کو ہے کچھ تو رات کو ہے اور ہی یہ کچھ
یہ آسماں خیال عجب وسوسے ہوئے

سادہ معاملات جو سمجھا نہیں تھا میں
قولِ محال بن کے وہی مخمصے ہوئے

دیکھے تھے میں نے کون سے باغ بہشت میں
شہتوت سے وہ ہونٹ، بہت ہی رسے ہوئے

ہنسنے کے ساتھ ہی نکل آتے ہیں اشک بھی
کچھ اتنی دیر کے بھی نہیں ہم ہنسے ہوئے

اپنا تھا، یا وہ غیر تھا، کچھ بھی خبر نہیں
ہم بار بار ہیں یہاں جس کے ڈسے ہوئے

شاید یہ راکھ ان ہی ستاروں کی ہے، ظفر
جو تھے کبھی ہمارے دلوں میں بسے ہوئے

پہلا سودا

حسن منظر

سورج کے ابھی سر پر آنے میں کچھ دیر تھی۔ عورتیں اور لڑکیاں گپھاؤں کے سامنے پہاڑی کی اوٹ میں سوکھی ہوئی گھاس پر بیٹھی تھیں۔ بچوں میں سے کوئی کھیل نہیں رہا تھا۔ وہ ایک وقفے وقفے سے اپنی ماؤں کے سینے میں منہ مار کر دیکھتے تھے اور بلکنے کی سی آواز نکال کر خاموش ہو جاتے تھے۔ ماؤں میں بھی اتنا دم نہیں تھا کہ انہیں کندھے سے لگا کر ٹہلنے لگیں یا بازوؤں میں جھلا ئیں۔

دور سے ایک لحیم شحیم آدمی گپھاؤں کی قطار کی طرف آتا نظر آیا۔

وہ ادھر کا آدمی نہیں تھا۔ ہرن کی کھال اس نے سوکھی ہوئی بیل سے اپنے کولھے پر باندھ رکھی تھی۔ اوپر کا دھڑ کھلا تھا۔ اس کی رنگت سیاہ تھی اور اس کے سیاہ بال اتنے لمبے اور گھنے تھے کہ لگتا تھا کہ سر گردن اور چہرے پر اس نے بھالو کی کھال پہن رکھی ہے اور اس کے شگافوں میں سے اس کی آنکھیں' ناک اور ہونٹ جھانک رہے ہیں۔ ہونٹ سیاہی مائل سرخ تھے اور ان کے درمیان نوکیلے دانت نظر آرہے تھے' جن میں سے کچھ ٹوٹے ہوئے بھی تھے۔ شاید کہ ان لوگوں میں سے تھا جو گوشت کو پھاڑ کر کھاتے ہیں اور اس کے لئے دانتوں کو کھردرے پتھر سے رگڑ کر نوکیلا بنا لیتے ہیں۔ جیسے شیر' بلیوں اور کتوں کے دانت۔

جب کچھ اور نزدیک آگیا تو سب کو پتہ چلا اس کی گردن کے پیچھے سے دونوں کندھوں پر ایک ہرن پڑا تھا' جس کی چاروں ٹانگیں اپنی ٹھوڑی کے پاس ملا کر اس نے اپنے الٹے ہاتھ سے پکڑ رکھی تھی۔

اس کے سیدھے ہاتھ میں ایک لمبا' پتھر کا تیز دھار والا ہتھیار تھا اور کمر پر بندھی ہوئی سوکھی بیل میں بھی اس نے ایک پتھر کا ہتھیار اڑس رکھا تھا جو بڑے ہتھیار کے آدھے کا بھی آدھا ہوگا۔ اس کی ٹھوڑی کے نیچے جھاڑی کی طرح الجھے ہوئے بالوں پر بھی خون لگا تھا اور ہرن کے نتھنے پر بھی جما ہوا سیاہ خون تھا۔

دونوں ہتھیار بھی بے دھلے تھے۔

پوری گپھاؤں میں کوئی مرد نہیں تھا۔

گھاس پر بیٹھی ہوئی عورتوں کے سامنے پہنچ کر اس کے قدم سست ہوئے اور جب عورتوں نے اسے دیکھ کر نہ بیزاری سے منہ موڑے نہ ہاتھ سے آگے چلتے رہنے کا اشارہ کیا تو وہ ایک جگہ پر رک گیا۔ پہاڑی کی چھاؤں اس تک نہیں پہنچ رہی تھی لیکن لگتا تھا اسے دھوپ کی فکر نہیں ہے۔

کچھ عورتیں اٹھ کھڑی ہوئیں' کچھ اٹھتی اٹھتی بیٹھ گئیں اور لڑکیاں اپنی جگہ پر بیٹھی بیٹھی اسے دیکھتی رہیں۔ بچوں کا رونا رک گیا۔

عورتوں کا خیال تھا وہ شاید پانی کا پتہ پوچھے گا لیکن وہ صرف عورتوں کو دیکھتا رہا۔ کچھ عورتیں بھی اسے دیکھتی رہیں۔ لڑکیوں میں سے کچھ بے دھیانی سے بے جان گھاس کو کھینچ کھینچ کر توڑنے لگیں۔

کسی گپھا میں کوئی مرد نہیں تھا' کوئی بیمار یا زخمی مرد بھی نہیں۔

ہرن بڑا اور مضبوط جسم کا تھا۔ اس کے سینگ لمبے' نوکیلے اور سیاہ تھے' پیٹ بھرا ہوا تھا جیسے تھوڑی ہی دیر پہلے چرنے سے فارغ ہوا تھا' اپنی جان بچانے کے لئے پوری تیزی سے نہیں دوڑ پایا اور مارا گیا۔ اس کو شکار کرنے والا بھی بہت بڑا اور مضبوط شخص تھا جو اکیلا اتنے بھاری بوجھ کو اٹھائے ہوئے تھا جو دو مردوں یا چار عورتوں کے اٹھائے نہ اٹھتا۔ بوجھ جتنا بھی تھا اور دھوپ جیسی بھی تھی اس کا ارادہ ہرن کو خود سے جدا کرنے کا نہیں دکھائی دیتا تھا تاوقتیکہ گوشت سڑنے ہی نہ لگے اور اس کے پیچھے پیچھے سیاروں اور کتوں کی قطار چلنے لگے۔

ہوا ابھی پوری طرح سے گرم نہیں ہوئی تھی۔ ایک جگہ چھاؤں میں چار چڑیاں چونچیں کھولے بیٹھی تھیں۔ اس کی پشت پر سامنے کے درخت کی شاخیں ہل رہی تھیں۔

جب اسے وہاں کھڑے ہوئے کافی دیر ہوگئی تو ایک عورت نے جو اس کے یہاں آنے پر اس کی نیت بھانپنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور پھر کچھ پتہ نہ پڑنے پر بیٹھ گئی تھی اپنی جگہ سے بیٹھے بیٹھے چلا کر کہا "ہمارے یہاں کوئی مرد نہیں ہے"

وہ اس عورت کی بات سمجھ گیا کیونکہ انسان کے الفاظ کے ملنے کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور وہ وہاں جہاں سڈار Cedar کے درخت ہیں اور وہاں جہاں باؤباب Baobab کے درخت ہیں اور وہاں جہاں برگد Bamyan کے درخت ہیں سب جگہ ایک ہی جیسے تھے۔ ان گپھاؤں والوں کے ساتھ ہی اس کے لوگوں کو بھی لفظ ملے تھے اور مناسب چیزوں اور مخلوق کے نام جانتا تھا

اور سب کاموں کے بھی۔ لیکن کاموں کے نام اس نے، اور یہاں والوں اور سب جگہ والوں نے اپنے اپنے طور پر ڈھونڈ نکالے تھے۔

اس نے اپنے لمبے ہتھیار کو گردن ٹیڑھی کرکے کندھے اور سر کے بیچ میں تھاما، ٹھوڑی کے بالوں میں پانچوں انگلیاں ڈال کر بالوں کے نیچے کو سونتا جیسے منہ کو کھولتا ہو اور کہا

"مجھے معلوم ہے"

"تمہیں معلوم ہے؟ "اسی عورت نے کہا

"ہاں"

"کیا؟ "

"اتنی دور چل کر جاؤ کہ دوبار سورج نکلے اور ڈوبے اور تیسری بار سر پر آجائے تو تم ان کو دیکھ سکتی ہو" سب کے چہروں پر اشتیاق ابھر آیا۔ صرف بہت بوڑھی عورتیں غیر متعلق بیٹھی رہیں۔"

"کیا دیکھ سکتی ہوں؟ "اسی عورت نے کہا

"سب مرے پڑے ہیں"

سب کے منہ سے "سی" کی سی آواز نکلی

پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا "ہو سکتا ہو اب نہ پڑے ہوں۔ دو پورے دن اور ایک اتنا دن کہ سورج سر پر آجائے چل کر میں یہاں پہنچا ہوں۔"

پھر اشارے کے لئے ہرن کو ایک جگہ جمع کئے ہوئے کھروں کو ٹھوڑی سے چھوتے ہوئے اس نے کہا

"بس اسے مارنے کے لئے آج صبح ایک جگہ پر رکا تھا۔ ہو سکتا ہے اب تک بھیڑئے اور لکڑبگھے انہیں کھا کر اپنی ماندوں کو جا چکے ہوں"

پہلے کا سوال جواب کرنے والی عورت رو اٹھی، پھر باقی سب عورتیں رونے لگیں اور ان کے پیچھے لڑکیاں۔ بڑوں کو روتے دیکھ کر خوف زدہ بچے اپنی ماؤں اور بڑی بہنوں سے لپٹ گئے۔ ایک بچے نے اپنی کھڑی ہوئی ماں کو اس کے کولھے پر بندھی ہوئی کھال سے کھینچ کر درخت کی شاخ کی طرح نچایا اور اس کے کولھے پر چڑھ گیا۔ اس نے دودھ پینا چاہا لیکن عورت کے تھن برسے ہوئے بادلوں کی طرح خالی تھے۔ جب بچہ رویا تو اس کے رونے میں غصہ تھا۔

بوڑھی عورت نے طنز اور خفگی سے کہا "اس سے پوچھو اسے کیسے معلوم وہ ہمارے مرد ہیں"

"تم خود پوچھ لو"

"اگر تمہارے نہیں ہیں تو تمہارے مرد کہاں گئے؟" نووارد نے بے رخی سے کہا۔

عورتیں لاجواب ہو گئیں۔

"جہاں وہ لوگ پڑے تھے وہاں سے پیروں کے نشان ادھر کو جاتے ہیں جدھر سے میں آیا ہوں اور جہاں کے لوگ خوشیاں منا رہے تھے۔ وہاں سے پیروں کے نشان میں نے ادھر کا رخ کرتے نہیں دیکھے۔

راستے میں کوئی اور آبادی نہیں پڑتی جہاں مرد نہ ہوں، صرف عورتیں ہی عورتیں ہوں یا بچے"

بوڑھی عورت نے کہا "تم بھی وہیں کے ہو؟"

اس نے کہا "نہیں، وہاں سے پرے کا ہوں۔ راستے میں وہ گپھائیں ہیں جہاں کے لوگ خوشیاں منا رہے تھے۔ پھر میں چلتا رہا اور وہاں پہنچا جہاں وہ لوگ تمہارے لوگوں سے لڑے تھے، اور تمہارے لوگ گرے تھے۔ پھر میں سیدھ میں چلتا رہا اور یہاں پہنچا جہاں ایک بھی مرد نہیں ہے۔"

اس یقین نہ کرنے والی بوڑھی عورت نے حساب لگایا کہ کتنی دفعہ سورج تب سے اب تک ابھرا اور ڈوبا تھا جب وہ لوگ یہاں سے گئے تھے، پھر نووارد سے پوچھا

"ان کا خون تازہ تھا؟ "

"نہیں زمین پر سوکھ چکا تھا۔ لیکن نہ ان کے پیٹ پھولے تھے، نہ لاشوں سے بدبو آرہی تھی، نہ ہی جنگلی جانور اس وقت تک وہاں آئے تھے"

بوڑھی عورت نے ایک بار پھر اس دن کو جب مرد لڑنے کے لئے گئے تھے اور نووارد کے یہاں تک آنے کے پورے اور آدھے دنوں کو جوڑتے ہوئے کہا "وہی تھے"

عورتیں رونے کو ہوئیں اور چپ ہو گئیں۔

سوال جواب کرنے والی عورت نے اپنے بچے کو سامنے کرتے ہوئے اس کے منہ اور پچکے ہوئے پیٹ پر انگلیاں رکھ کر انجانے شخص کو دکھاتے ہوئے کہا "بھوکا ہے۔ ہم سب بھوکے ہیں۔ یہ جانور ہمیں دے دو"

ایک عورت نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کہا "ہم تمہیں پانی پر لے جائیں گے"

آدمی نے، لمبے تیز دھار کے ہتھیار والے آدمی نے کہا "لالچ دلاتی ہو"

اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ کھیل گئی۔ پھر اس نے ہرن کے پیروں کو اپنی انگلیوں کی گرفت سے اچانک چھوڑ دیا اور وہاں دھب سے زمین پر گرا۔ پھر وہ عورتوں سے بولا۔

"دیکھ میں جہاں سے آیا ہوں وہ جگہ یہاں سے آٹھ بار سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کی مسافت پر ہے اور اگر چاند اچھی روشنی دینے والا ہو تو راتوں کا بھی کچھ حصہ چلنے کے لئے رکھو۔ لیکن میں بھوکا نہیں ہوں کیونکہ میرے ہاتھ میں یہ ہے" اس نے ہوا کو ہتھیار سے کاٹتے ہوئے کہا

عورتوں کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہیں۔

اس عورت نے جس نے پانی پر لے جانے کی بات کی تھی، کہا "بھوکے ہونے کی بات کس نے کی"

"میں نے" نووارد شخص نے کہا

"کس کے لئے؟"

"تمہارے"

"لیکن تم تو کہہ رہے تھے کہ تم بھوکے نہیں ہو" ایک اور عورت نے جس کے گھٹنے کھال کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے ننگے تھے' کہا

"ہاں یہی میں بتانے جا رہا ہوں۔" پھر اس نے پیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا

"میں پیٹ سے بھوکا نہیں ہوں' پیٹ سے نیچے بھوکا ہوں۔ تم سمجھ گئیں؟"

چھاؤں سمٹ گئی تھی اور چڑیاں سوکھی گھاس پر چل کر اس میں چلی گئیں۔

کچھ توقف سے ایک عورت جو کافی عمر کی تھی لیکن بوڑھی بھی نہیں اس کے ساتھ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شکاری نے' کیونکہ اسے یہی کہا جا سکتا ہے' اس عورت کو ہاتھ سے بیٹھ جانے کا اشارہ اس طرح کیا جیسے اسے زمین میں دھنسا رہا ہو' اور ایک کم عمر لڑکی کی طرف سر کی جنبش اور آنکھوں سے اشارہ کیا۔ اس کا جسم بمشکل جوان ہوا تھا۔ وہ سہم گئی۔

عورت نے اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے لڑکی کو آنکھوں اور سر کی عمودی حرکت سے رضامندی کا اشارہ کیا۔

لڑکی نے جو بچہ اس کے بازوؤں سے لپٹا ہوا تھا' اس گھاس پر لٹا دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

شکاری نے اپنے ہتھیار کو زمین پر رکھ کر ہرن کو پھر سے اپنی گردن کی پشت پر لاد لیا۔ سب عورتوں کے منہ سے استعجاب میں "او" نکلا۔

شکاری نے اپنا ہتھیار اٹھایا اور سامنے کے درخت کی طرف چل پڑا جو پہلے اس کی پشت پر تھا۔

لڑکی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

یہ اس لئے ضروری تھا کہ انسان پر اس کی شرم ہویدا ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا ورنہ کولھوں سے بندھی کھالوں سے نہ عورتوں کی اوپر کی شرم پوری طرح چھپتی تھی' نہ ہی مرد کی نیچے کی اگر وہ زمین پر بیٹھ کر اپنے گھٹنے موڑے۔ گپھاؤں میں بھی یہی حال تھا جہاں ایک ایک میں کئی کئی مرد' عورتیں' بچے مل کر رہتے تھے۔

مرد اور اس کے پیچھے چلتی ہوئی لڑکی پیڑ کے پہنچے پیچھے۔ شکاری نے ایک بار پھر اپنا ہتھیار' وہی لمبا' تیز دھار کا پتھر کا ہتھیار زمین پر رکھا اور ساتھ ہی ہرن کے پیروں کو بھی چھوڑ دیا۔

ہرن کے گرنے کی آواز گپھاؤں کے باہر بھوری پیلی گھاس پر پہاڑیوں کے سائے میں بیٹھی ہوئی عورتوں اور لڑکیوں کے کانوں تک نہیں پہنچی۔

ہوا میں ہلکی گرمی آ گئی تھی۔ درختوں کی شاخیں ہل رہی تھیں اور سائے سے باہر آگی ہوئی گھاس کی پتیاں بھی۔ جہاں وہ دونوں سب کو نظر آ رہے تھے وہ جگہ چٹیل تھی۔ اس طرح تاحد نگاہ نہ کوئی جانور چرتا نظر آ رہا تھا اور نہ ہوا میں پر مارتا کوئی پرندہ۔

بوڑھی عورت نے تینوں طرف افق کو دیکھا پھر سب کو سنانے والی آواز میں کہا "ادھر پیچھے' آدھے یا ایک دن کے فاصلے پر ہرن بھی ہیں اور بکریاں بھی"

کسی نے اس کی بات کو نہیں جھٹلایا۔ سب چپ رہیں۔ پھر

پھر بڑھیا خود ہی بولی "جب مرد چلے گئے تھے تو ہمیں خود ہی جا کر کسی جانور کو شکار کرنا چاہئے تھا"

"اتنی جان ہے ہم میں؟" ایک جوان عورت نے کہا جو اب تک خاموش رہی تھی۔

"اب نہیں ہے تو کیا ہوا' جب تو تھی' جب مرد ایک سورج کے چڑھنے سے دوسرے کے چڑھنے تک نہیں لوٹتے تھے'" کسی نے نہ اس کی بات کو رد کیا نہ اس پر احسنت کہا

"بلکہ جب بھی جانا چاہئے تھا جب مرد یہاں تھے۔"

جب مرد چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے چھوٹے بڑے ہتھیاروں کو سنبھالنے لگا تو لڑکی اٹھی اور چوپایوں کی طرح اپنے جسم پر سے ہل ہل کر سوکھے پتوں اور مٹی کو جھاڑنے لگی۔ جس طرح وہ گئے تھے اسی طرح واپس لوٹے۔

لڑکی اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی اور جو بچہ اس کے دور جانے سے پہلے اس کے بازو سے چمٹا ہوا تھا پھر سے اس کے کندھے کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ شکاری کو غصے سے دیکھ رہا تھا کیونکہ جتنی دیر لڑکی وہاں نہیں تھی وہ گھاس پر پڑا رہا تھا۔ شاید اسے ابھی بغیر سہارے کے کھڑا ہونا نہیں آیا تھا۔

کسی نے لڑکی کی طرف نہیں دیکھا۔ سب کی نظریں شکاری پر تھیں۔

ان لوگوں سے اور نزدیک آ کر شکاری نے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر ہرن کو ان کی طرف پھینکا اور بولا

"مجھے معلوم ہے پانی کہاں ملے گا"

پھر بغیر ہمدردی کے دو بول بولے یا ان کی حالت پر تضحیک کا تاثر دکھائے اپنے ہتھیاروں کو جسم پر سجائے اور اپنی ہرن کی کھال کی پوشاک پہنے وہ اپنی راہ پر آگے چل پڑا۔ ❖ ❖

گذارش

- "شب خون" سے متعلق خط و کتابت دفتر شب خون کے پتے پر ہی کریں۔
- "شب خون" ہر ماہ کے آخری عشرہ میں پوسٹ کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شمارہ اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ تک نہ ملے تو دفتر کو فوراً عدم وصولیابی کی اطلاع دیں۔ دیر سے ملنے والے خطوط پر ہمارے لئے کوئی کارروائی کرنا اس لئے ممکن نہیں کہ "شب خون" کی کاپیاں فوراً ختم ہو جاتی ہیں۔
- جواب طلب امور کے لئے ڈاک ٹکٹ لگا ہوا لفافہ یا کارڈ ضرور بھجوائیں۔

انور شعور

بیابان و گلزار دے دو مجھے
یہ دھرتی یہ سنسار دے دو مجھے

پروؤں گا گجرا کسی کے لیئے
یہ پھول اور یہ خار دے دو مجھے

کھلونے بناتا ہوں میں نت نئے
جو چیزیں ہوں بے کار دے دو مجھے

محبت بھی کرتا ہوں، نفرت بھی میں
کوئی ایک کردار دے دو مجھے

اسے مصرع طرح سمجھوں گا میں
وہ یار طرح دار دے دو مجھے

مجھے تن درستی نہیں چاہیے
دوائے دل زار دے دو مجھے

صداقت کا اقبال کرتا ہوں میں
سزا برسر دار دے دو مجھے

ادب کون پڑھتا ہے اس دور میں
قلم لے کے تلوار دے دو مجھے

یہ تحفے تحائف اٹھاؤ شعور
بس اپنے کچھ اشعار دے دو مجھے

نہ روکے کوئی رہ گزر میں مجھے
مزا آرہا ہے سفر میں مجھے

یہ عمر اور جینا بھی مرنا بھی ہے
اسی مدت مختصر میں مجھے

مری انگلیوں پر ہیں سیارگاں
رکھو لحظہ لحظہ نظر میں مجھے

یہ خستہ لفافے، یہ تیرے خطوط
نوادر ملے ہیں کھنڈر میں مجھے

نہ جانے لگیں اور کتنی شبیں
ابھی اہتمام سحر میں مجھے

جو دیکھا تو کوئی بشر دوسرا
دکھائی دیا ہر بشر میں مجھے

تمہیں خط میں کیا اپنی حالت لکھوں
پڑھوگے کسی دن خبر میں مجھے

اکابر کو دیکھا تو ایک انکسار
ملا اکثر وبیشتر میں مجھے

کہیں تو ملے چھاؤں یا چھت شعور
بیابان میں یا کھنڈر میں مجھے

انور شعور

جو نہ آیا کبھی دوچار گھڑی کی خاطر
زندگی ہم نے گزاری ہے اسی کی خاطر

گاہے گاہے چلے آتے ہیں تمھاری جانب
خوش خیالی کے لیئے، خوش نظری کی خاطر

بادہ نوشی کے کچھ اسباب ہوا کرتے ہیں
کون پیتا ہے فقط بادہ کشی کی خاطر

سچ کی تائید ارادی غلطی ہوتی ہے
حوصلہ چاہیئے ایسی غلطی کی خاطر

عزت نفس بڑی بات ہے انساں کے لیئے
ہم نے گھر چھوڑ دیا کج کلی کی خاطر

آس پاس اس نے ہمیشہ ہمیں رکھا لیکن
نہ کبھی ساتھ بٹھایا نہ کبھی کی خاطر

یہ بجا ہے کہ خوشی ہاتھ نہ آئی تاہم
دکھ بہت ہم نے اٹھائے ہیں خوشی کی خاطر

جب وہ ہنستا ہے تو کلیوں کی طرح ہنستا ہے
ہم اسے دیکھنے جاتے ہیں ہنسی کی خاطر

لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا جو بلا نوشوں کو
رکھ دیا ہاتھ سے پیمانہ کسی کی خاطر

ہم سے ملنے کوئی آئے تو خوشی ہوتی ہے
کون کرتا ہے یہ ایثار کسی کی خاطر

عمر فانی کے مزے لوٹ رہا ہے کوئی
کوئی زندہ ہے حیات ابدی کی خاطر

مجلسیں وعظ و نصیحت سے نہیں ہیں آباد
لوگ آتے ہیں یہاں نوحہ گری کی خاطر

ہے ہمیں عشق رسولؐ عربی سے انور
ہم مسلماں ہیں رسولؐ عربی کی خاطر

عبور کر نہ سکے ہم، حدیں ہی ایسی تھیں
قدم قدم پہ یہاں مشکلیں ہی ایسی تھیں

وہ مجھ سے روٹھ نہ جاتے تو اور کیا کرتے
مری خطائیں، مری لغزشیں ہی ایسی تھیں

تمھارے ساتھ گزاری ہوئی شبیں اب تک
مجھے جگائے ہوئے ہیں، شبیں ہی ایسی تھیں

کہیں دکھائی دیے ایک دوسرے کو ہم
تو منہ بگاڑلیئے، رنجشیں ہی ایسی تھیں

بہت ارادہ کیا کوئی کام کرنے کا
مگر عمل نہ ہوا، الجھنیں ہی ایسی تھیں

ہزار مرتبہ دیکھا مگر نہیں دیکھا
وہ گھر ہی ایسے تھے، وہ سڑکیں ہی ایسی تھیں

بتوں کے سامنے میری زبان کیا کھلتی
خدا معاف کرے، خواہشیں ہی ایسی تھیں

نہ پوچھتا تھا وطن میں شعور کو کوئی
نہ آن بان نہ آسائشیں ہی ایسی تھیں

انور شعور

نہ پوچھ مجھ سے مرے دل ربا کے بارے میں
میں کیا بتاؤں اب اس بے وفا کے بارے میں

سفر کے وقت ذرا احتیاط بہتر ہے
کسی خضر کے، کسی رہنما کے بارے میں

نہ کوئی علم ہمیں انتہا کی بابت ہے
نہ جانتے ہیں ابھی ابتدا کے بارے میں

تمام دیکھنے والوں کی رائے ایک سی ہے
تمہارے شہر کی آب وہوا کے بارے میں

اٹھے نہ صبح سویرے کوئی تو کیا جانے
نسیم کے متعلق، صبا کے بارے میں

خدا کے ماننے والوں کے پاس بھی شاید
کوئی دلیل نہیں ہے خدا کے بارے میں

عمل کرو تو عموماً قبول ہوتی ہے
یہ تجربہ ہے ہمارا دعا کے بارے میں

مرا دماغ بری طرح گھوم جاتا ہے
میں سوچتا ہوں جب ارض وسما کے بارے میں

سخن سراؤں نے کیا کیا سخن نہیں باندھے
تمہارے ناز، تمہاری ادا کے بارے میں

ہوا ہے تجھ سے صداقت کا ارتکاب شعور
کچھ احتمال نہیں اب سزا کے بارے میں

ٹوٹ جاتا ہے معاً خواب مرا کوئی نہ کوئی
ہو نہ ہو، رات کو دیتا ہے صدا کوئی نہ کوئی

ہم بدلنا ہی نہیں چاہتے اپنی حالت
ورنہ ہر درد کی ہوتی ہے دوا کوئی نہ کوئی

لاکھ محتاط رہے چاہنے والا پھر بھی
ہو ہی جاتی ہے محبت میں خطا کوئی نہ کوئی

زندگی میں مرا کردار کوئی تو کرتا
جیسے بنتا ہے ڈرامے میں برا کوئی نہ کوئی

پیار انسان کو تنہا نہیں رہنے دیتا
تھام لیتا ہے مرا ہاتھ سدا کوئی نہ کوئی

اہل ثروت ہی قرابت نہیں رکھتے اس سے
ہم غریبوں کا بھی لگتا ہے خدا کوئی نہ کوئی

ہم بھی ہر صبح شعور اپنی خبر ڈھونڈتے ہیں
روز ہوجاتا ہے پیاروں سے جدا کوئی نہ کوئی

انور شعور

ہوتا ہے وہ جدھر ہم ادھر دیکھتے نہیں
کرتے ہیں سرسری سی نظر، دیکھتے نہیں

دیدار کی شراب ہمہ وقت ہے حلال
اس مشغلے میں شام و سحر دیکھتے نہیں

ہیں صرف راہ گیر محبت وہ راہ گیر
چلتے ہیں اور راہ گزر دیکھتے نہیں

آتے بھی ہو تو دیکھتے ہو صرف منہ مرا
دل دیکھتے نہیں ہو، جگر دیکھتے نہیں

جینے کا ذکر تک نہیں، پینے کا شور ہے
سب عیب دیکھتے ہیں، ہنر دیکھتے نہیں

کرتے ہیں اختیار ہم آمادگی کی راہ
جب اور کوئی راہ مفر دیکھتے نہیں

کیا خیر اور شر میں کوئی فرق ہے شعور
ہم شر میں خیر، خیر میں شر دیکھتے نہیں

جہاں اب کارخانہ ہے وہاں تالاب تھا پہلے
جہاں بازار ہے، اک خطۂ شاداب تھا پہلے

جہاں اب ایک سرکاری عمارت کا احاطہ ہے
وہاں دیوار تھی پہلے نہ کوئی باب تھا پہلے

کھڑا ہے نیم کا جو پیڑ اب تصویر کی صورت
یکے از محرمانِ حلقۂ احباب تھا پہلے

نظر آتا ہے اب سڑکوں پہ اک غول بیابانی
یہاں ہر آدمی شائستۂ آداب تھا پہلے

جہاں اب صرف دن ہے اور دن کا شور و ہنگامہ
یہاں اک رات تھی پہلے، یہاں اک خواب تھا پہلے

شعور اب تو در و دیوار سے حسرت برستی ہے
نہایت پُر فضا یہ عالمِ اسباب تھا پہلے

انور شعور

ہم رکاب و ہم سفر کوئی نہ تھا
اے وفا کی رہ گزر، کوئی نہ تھا

راستے میں ایک آواز آئی تھی
مڑ کے دیکھا تھا مگر کوئی نہ تھا

کوئی ہوتا تو رلاتا اس طرح؟
چشم تر! اے چشم تر کوئی نہ تھا

کاش ہوجاتی ملاقات آپ سے
اتفاقاً رات گھر کوئی نہ تھا

ٹکٹکی باندھے اسے تکتا رہا
گو مرے پیش نظر کوئی نہ تھا

رات آلودہ تھے سب دامن مگر
محتسب آیا تو تر کوئی نہ تھا

میری تنہائی کا ساتھی شہر میں
جانتا ہے شہر بھر، کوئی نہ تھا

آپ کے ہونٹوں سے نکلا تھا مگر
خوش ہمارے نام پر کوئی نہ تھا

چھیڑ دی کیوں داستان دل شعور
کیا فسانہ مختصر کوئی نہ تھا

نواح دل میں عجب اک جہاں بنایا ہے
جو گھر کہیں نہ بنا وہ یہاں بنایا ہے

اگرچہ آدمی خود لو بنالیا ہم نے
جو چاہیے تھا بنانا، کہاں بنایا ہے

تجھے حسین بنایا ہے دست قدرت نے
حسین بھی مرے شایان شاں بنایا ہے

کسی نہیں کو بنایا ہے ہاں کبھی اس نے؟
ہزارہا کو بنایا ہے ہاں بنایا ہے

اسی زمین، اسی آسماں کو ہم نے شعور
نئی زمین، نیا آسماں بنایا ہے

میں کسی بات سے کرتا نہیں آگاہ مجھے
عافیت کی نظر آتی ہے یہی راہ مجھے

چشم بینا کو ضرورت نہیں قندیلوں کی
ہیں برابر شب تاریک وشب ماہ مجھے

ایک وہ چیز فراہم ہو ضیافت میں تو پھر
اور چیزوں سے نہ رغبت ہے نہ اکراہ مجھے

کٹ گئی عمر رواں پیٹ کا دوزخ بھرتے
پیار کا وقت میسر نہ ہوا آہ مجھے

وہ تو کہیے کہ عجب چیز ہے مے ورنہ شعور
کب نصیحت نہیں فرماتے ہی خواہ مجھے

شمس الرحمٰن فاروقی

کبھی کبھی مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے اندر کوئی چیز بے چین ہے، ابل رہی ہے، تڑپ رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے یہ کوئی اور شے ہے، میں نہیں ہوں۔ کیوں کہ میں، وہ میں جسے ابن سینا نے انسان کے شعور وجود Self awareness سے تعبیر کیا تھا، وہ تو اپنی جگہ پر ہے، لیکن کوئی اور کوئی بالکل نا معلوم شے میرے اندر ہے اور وہ الفاظ میں نہیں بلکہ حرکات کے ذریعہ اپنا اظہار چاہتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے ہاتھ پاؤں سر گردن سینہ سب کو جھنجھوڑ ڈالوں، ان کو الگ الگ اور ایک ساتھ، ایک ہی آہنگ میں اور مختلف آہنگ میں متحرک کردوں۔ سارا زمانہ میرے ساتھ رقص کرے، ساری دنیا میرے اندر رقص کرے۔ میں اس اس طرح تھرکوں اور اس اس طرح چکر ماروں کہ وہ چیز جو میرے اندر بھڑک رہی ہے، سرد ہو جائے۔ پہلے ظاہر ہو پھر سرد ہو جائے۔ یا شاید اس کے سرد ہونے کی مجھے کوئی اتنی پروا نہیں ہوتی، جتنی اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ ظاہر ہو جائے۔ میں اپنے اس میں کو، جو ابن سینا کا میں ہے، اور شاید روز مرہ کی دنیا میں نظر آنے والے لوگوں کے لیے ایک بے رنگ میں ہے، اس کو بتادوں کہ میرے اعضا الگ الگ جان رکھتے ہیں، الگ الگ شخصیت رکھتے ہیں۔ اور جب میں کسی پیچیدہ آہنگ، کسی بے عقل وہوش گت پر اپنے اعضا کو حرکت میں لاؤں تو میرے دوسرے والے میں کو معلوم ہو جائے کہ وہی میرا عقل کل نہیں ہے، مجھ میں ایک عارفانہ جنون بھی ہے، جو میرے اعضا پر حاوی ہو سکتا ہے۔

ممکن ہے اس کیفیت کو تخلیقی عمل کا پیش خیمہ کہا یا سمجھا جائے۔ میں تو صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری یہ کیفیت دو چار دس سکنڈ سے زیادہ نہیں رہتی۔ اور اس کیفیت کے حاوی ہونے کے فوراً پہلے یا فوراً بعد میں نے کوئی شعر نہیں کہا۔ بلکہ اس کیفیت کے بعد شعر گوئی کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ تو ممکن ہے یہ ایک طرح کا جنون ہی ہو، اور میری شعر گوئی اس جنون کے دورے کی روک تھام کرتی ہو۔ یعنی چوں کہ میں کبھی کبھی شعر کہہ لیتا ہوں، اس لیے مجھ پر اس جنون کے دورے کم پڑتے ہیں، اور اگر میں شاعر نہ ہوتا تو شاید اس جنون کا بیش از بیش شکار ہو جاتا۔ لیکن میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ شعر گوئی میرے لیے جنون یا تخلیقی جذبے کی شدید گرمی کا فوری اظہار کبھی نہیں رہی۔ یعنی میرا دل ہجوم فکر سے مثل موج کبھی نہیں لرزا، مجھے یہ کبھی نہیں محسوس ہوا کہ شیشہ نازک ہے اور شراب آبگینہ گداز۔ مجھے یہ ضرور اکثر محسوس ہوا کہ زلف خیال نازک ہے اور اظہار کے لیے بے قرار ہے، لیکن یہ بے قراری آتش فشاں کے پھٹ پڑنے کی بے قراری نہیں، بلکہ گہری زمین میں دبے ہوئے بیج کی بے قراری ہے جو آہستہ آہستہ، لیکن بے تکان استقلال کے ساتھ زمین کی بے حس اور بے پرواتہوں کو چیرتا ہے اور ایک نازک، آسانی سے کچل جانے والا، جلدی سے سوکھ جانے والا، اور سورج کی روشنی اور دنیا کی ہوا کا عاشق انکھوا بن کر نکلتا ہے۔ اپنی ننھی ننھی آنکھیں کھولتا ہے، خود کو معاندانہ اور غیر ہم درد ماحول میں پاتا ہے، خود کو اتنا خوب صورت نہیں پاتا جتنا وہ زیر زمین کی تاریکی میں سمجھ رہا تھا۔ لیکن اب جب وہ دنیا میں آہی گیا ہے تو وہ خلق کے سامنے اپنی رونمائی کے لیے تیار اور اپنی تقدیر پر شاکر رہتا ہے۔

تو ایسے شخص کا تخلیقی سفر کیا؟ تخلیقی سفر تو اس کا ہوتا ہے جو آخری منزل پر پہنچ چکا ہو یا پہنچنے والا ہو، جس کو اپنے پچھلے نشیب و فراز، اپنی نارسائیاں اور نا تجربہ کاریاں، اپنی غلطیاں اور اپنی فتح مندیاں، اپنا بھلا برا، سب اچھا لگنے لگتا ہے۔ فاصلے کی دھند ماضی کے تمام نقوش پر افشاں بکھیر دیتی ہے۔ اس وقت اپنی غلطیاں اور کم زوریاں، اپنی گذشتہ خامیاں اور خام کاریاں سب اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ مسافر مسکرا کر کہتا ہے شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم۔ میں تو ابھی شعر گوئی کو کار طفلاں سے بھی زیادہ مشکل سمجھتا ہوں، جو ہر نظم اور ہر غزل کے بعد تھوڑی دیر خوش رہ کر بہت دیر تک سوچتا ہوں کہ اظہار کی یہ راہ کس منزل کو گئی؟ میں نے کیا سیکھا، کیا پایا! الیٹ کہتا ہے کہ جب تک میں نظم نہ پوری کرلوں مجھے کیسے معلوم ہو کہ میں کیا کہنا چاہتا تھا؟ جب تک نظم کتم عدم میں ہے، کسے معلوم کہ وہ کیا کہے گی؟ اور میرے بارے میں بعض لوگوں نے کہا کہ شمس الرحمٰن صاحب کے یہاں نظم گوئی سے زیادہ نظم سازی کا رنگ نظر آتا ہے۔ کیوں نہیں؟ جب نظم بوند بوند کرکے کاغذ پر اترتی ہے تو میں جیکسن پالک (Jackson Pollock) کی طرح کیوں نہ اس کو ادھر ادھر بڑھنے بڑھانے میں مدد دوں؟ جیکسن پالک کینوس کے بڑے سے ٹکڑے پر بہت سے رنگ انڈیل دیتا تھا، اور پھر لمبے لمبے بانس نما برش کی مدد سے ان رنگوں کو کینوس پر ان سمتوں میں پھیلاتا تھا جدھر وہ جانا چاہیں۔ جب نظم پوری ہوگی تب ہی تو میں بتاسکوں گا کہ میں کیا کہہ رہا تھا، کیا کہنا چاہتا تھا؟ جب تمام کینوس پر رنگ پھیل جائیں تب ہی تو میں آپ کو دکھاؤں کہ دیکھیے رنگوں کے اس بڑے سے دھبے میں، جس سے میں نے تصویر شروع کی تھی، یہ شکلیں پنہاں تھیں۔

میں نے پہلا شعر آٹھ سال کی عمر میں کہا تھا۔ میرا بچپن شاید کچھ بہت خوش و خرم، کچھ بہت فارغ البال، محبت اور یگانگت سے کچھ بہت بھرپور نہ تھا۔ یا شاید رہا ہو، لیکن اس وقت مجھے ایسا ہی لگتا تھا کہ میں بہت تنہا، بہت دکھی، بہت بے گانہ اور اندر ہی اندر گھٹتے پسنے والا شخص ہوں۔ اور آج، کوئی چالیس سال بعد، مجھے وہ گھر، وہ شہر، وہ فضا، سب اچھی طرح یاد ہیں جن میں وہ شعر میری زبان سے نکلا تھا۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ بچپن میں ناخوشی اور تلخ تنہائی کا جو احساس مجھے تھا، اس کے لیے اپنے والدین یا اپنے ماحول کو ذمہ دار ٹھہرانا ٹھیک نہیں۔ کیوں کہ اس وقت میری عمر اور میرا مزاج دونوں اس منزل اور اس رنگ میں تھے کہ اپنے بزرگوں کی ہر بات غلط، ان کا ہر رویہ تکلیف دہ، ان کا ہر فیصلہ خلاف معلوم ہوتا تھا۔ ممکن ہے بچپن کی چھوٹی موٹی نا آسودگیوں کو میرے Hyperaltive تخیل نے بڑھا چڑھا کر اس طرح میرے سامنے رکھا ہو کہ اچھی بھلی زندگی بھی تلخ معلوم ہونے لگی ہو۔ بہرحال، میرا وہ شعر، جس کا پہلا مصرع مجھے اب تک یاد ہے ؎ معلوم کیا کسی کو مرا حال زار ہے، اپنی عمر کے لحاظ سے بڑھا، اپنے طرز کے لحاظ سے پھیکا اور اپنی زندگی کے لحاظ سے خفیہ تھا، کیوں کہ اسے اپنے والدین کو سنانے کی ہمت مجھ میں نہ تھی۔ اپنے خیال میں تو میں انھیں کے ظلم و جور کے خلاف احتجاج کر رہا تھا، اس لیے ان سے داد طلب کس طرح ہوتا؟ دوستوں میں کسی کو سنانے کی ہمت نہ تھی، کیوں کہ ان میں کوئی ایسا نہ تھا جس سے مشکل کی داد پانے کی توقع ہوتی۔ لیکن میں الٹے سیدھے ناموزوں اور موزوں شعر کہتا رہا۔ بہت کم لیکن کہتا رہا۔ وہ عجیب کیفیت، جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، اس زمانے میں بھی تھی، لیکن ان دنوں اس کا اظہار بھی ممکن تھا کیوں کہ میں دوڑ بھاگ کر، یا اکیلے میں چیخ چلا کر ایک حد تک اس اجنبی کو ظاہر کر سکتا تھا جو مجھ میں پردہ پوش تھا۔ مگر میری شاعری میں عشقیہ عناصر یا جنسی عناصر بہت دیر میں داخل ہوئے۔ شاید اس وجہ سے کہ میں کٹر مذہبی خاندان کی اولاد تھا، اور شاید اس وجہ سے بھی کہ میرا فن اتنا پختہ نہ ہوا تھا کہ ان معاملات کو تخیلی تجربے میں ڈھال سکے، اور اس وجہ سے بھی کہ میں بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ بوڑھا بھی ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے شعوری طور پر ایسا کوئی احساس یا دعویٰ نہ تھا کہ مجھے دنیا میں بہت بڑے بڑے کام کرنے ہیں، اس لیے مجھے عشق و محبت جیسے غیر سنجیدہ یا خطرناک معاملات سے دور رہنا چاہیے۔ لیکن مجھے یہ احساس ضرور تھا کہ مجھے بہت سا پڑھنا ہے۔ کیوں پڑھنا ہے؟ اس کا بھی کوئی واضح جواب میرے پاس نہ تھا، شاید سوائے اس کے کہ چوں کہ میں کھیل کود میں بہت کم زور تھا، اس لیے اپنے ہم چشموں میں ممتاز ہونے اور ممتاز رہنے کے لیے کسی اور راہ پر چلنا ہوگا۔ اور یہ جواب بھی میں آج دے رہا ہوں، جب میں گذشتہ ماہ و سال کو ایک حد تک صاف اور معروضی طور پر دیکھ سکتا ہوں۔ اس وقت تو مجھے یہی کہنا تھا کہ مجھے پڑھنے کا شوق ہے، اس لیے پڑھ رہا ہوں۔

پہلا شعر کہنے کے لیے مجھے کوئی خاص کاوش نہیں کرنی پڑی تھی، لیکن اس شعر پر اگلا شعر کبھی نہ ہو سکا۔ میری یہ مشکل آج بھی باقی ہے۔ میں ایک دو شعر یا مصرعے تو نسبتاً جلد کہہ لیتا ہوں، لیکن پھر راستہ مخدوش ہو جاتا ہے۔ غزل ہو یا نظم، ایک بیٹھک میں، یا تھوڑے عرصے میں، شاذ ہی مکمل ہوتی ہے۔ میری اس عادت یا کم زوری کو میرے مطالعے سے استحکام ملا۔ ایک تو یہ کہ پڑھنے میں خود تخلیقی عمل کا مزا ہے، اس لیے شعر گوئی بس منھ کا مزا بدلنے والی چیز بن گئی۔ پھر دوسری بات یہ کہ میں نے اکثر شاعروں کے بارے میں پڑھا یا سنا ہے کہ وہ بہت رک رک کر، بڑی مشکل سے شعر کہتے تھے۔ بعض شاعروں کے بارے میں پڑھا کہ وہ پر گوئی یا زود گوئی کو ناپسند کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ میں نے ایسے بھی شاعروں کے بارے میں پڑھا یا سنا ہوگا جو پر گوئی یا زود گوئی کو پسند کرتے تھے۔ لیکن میری طبیعت چوں کہ خود ہی کم گوئی کی طرف مائل تھی، اس لیے ایسے شعرا کے واقعات و اقوال مجھے زیادہ دل کو لگتے تھے جو کم گو تھے۔ پھر بھی، میں نے ایک بیاض تو بنا ہی لی تھی۔ اور چونکہ میرے گھر میں اقبال کا بہت چرچا تھا، اس لیے اس ٹوٹے پھوٹے کج مج زبان و کلام پر اقبال کا اثر تکلیف دہ حد تک واضح تھا۔ پھر ایک دن وہ آیا جب میں نے اپنی بیاض پھاڑ کر پھینک دی اور شعر گوئی کی جگہ شعر کا ترجمہ کرنے کو اپنا طرز قرار دیا۔ انگریزی کی بہت سی شاعری پڑھتے، کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے اور اس سے بہت متاثر ہونے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ دل میں ترجمہ کی ہوک اٹھے۔ لہٰذا میں نے آڈن، ایلیٹ اور ان کے علاوہ کئی چھوٹے موٹے شعرا کے نثری ترجمے شروع کر دیے۔ نثر کی طرف مائل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے نثر کی قوت اور اس کی فطری نفاست کا احساس ہونے لگا تھا۔ محمد احسن فاروقی کا ایک جملہ، کہ نثر میں بھی وزن (= معنی آہنگ) ہوتا ہے، میرے ذہن و دل میں تلاطم برپا کر گیا۔ ان دنوں میں سترہ اٹھارہ برس سے زیادہ کا نہ تھا، اور وقت گذاری کے لیے ایک چھوٹا سا ناول اور کئی چھوٹے افسانے لکھ چکا تھا۔ لیکن نثر نگاری کی ان مشقوں میں نثر کے اظہار کا کوئی عنصر نہ تھا۔ صرف افسانے، اور افسانے کے مقصد و مفہوم کا اظہار منظور تھا۔ اس لیے اگرچہ میرا وہ ناول اور بہت سے افسانہ شائع بھی ہوئے، میں انھیں اپنے تخلیقی سفر میں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ ان کے برخلاف منظومات کے وہ نثری ترجمے، جو کم چھپے اور تعداد میں بھی کم تھے، مجھے زیادہ اہم معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ آڈن کی ایک نظم It s no use raising a shout کا نثری ترجمہ مجھے بہت اچھا لگا تھا، کیوں کہ میں نے اپنے خیال میں آڈن کی نظم کی کمروری اور کلبیاتی (Cynical) لیکن ایک حد تک الم ناک آواز اپنے نثری آہنگ میں حاصل کر لی تھی۔

میری تخلیقی زندگی میں سب سے بڑا انقلاب اس وقت آیا جب میں نے شیکسپیر، غالب اور بعض فارسی شعرا کو سنجیدگی سے پڑھا۔ میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ شاعری صرف شاعری کا اظہار کرتی ہے اور نثر صرف نثر کا اظہار کرتی ہے۔ مقصدیت، تعمیریت، پیغام، اصلاح، یہ سب اصطلاحیں اگر بے معنی نہیں تو ثانوی ضرور ہیں۔ اس وقت میں نے جانا کہ شعر کا جواز اس بات میں نہیں ہے کہ وہ کتنے لوگوں کے لیے سچا ہے، بلکہ اس بات میں ہے کہ وہ اپنے آپ میں سچا ہے کہ نہیں۔ میں نے یہ بھی جانا کہ مختلف ہونا بھی شعر کی خوبی ہے۔ پھر بہت بعد میں مجھے اس بات کا بھی احساس ہوا کہ شعر کو مختلف بنانے کے لیے جذبہ کافی نہیں، اور یہ کہ شعر مختلف تب ہوتا ہے جب وہ اپنی روایت میں ہو اور روایت سے باہر بھی ہو۔ ❖ ❖

شمس الرحمٰن فاروقی

اپنی شاعری کے بارے میں لکھنا میرے لئے اتنا ہی مشکل ہے جتنا اپنا حلیہ بیان کرنا، لیکن حکم ایسا ہے کہ سرتابی کی مجال نہیں۔ لہٰذا یہ فرض کر کے لکھتا ہوں کہ میں خود نہیں لکھ رہا ہوں، بلکہ کوئی اور شخص میرے بارے میں اظہار خیال کر رہا ہے۔

گفتن سخن از پایۂ غالب نہ ز ہوش است
امروز کہ مستم خبرے خواہم از او داد

یہ گفتگو ان باتوں میں سے صرف چند تک محدود رہے گی جو میری شاعری کے بارے میں وقتاً فوقتاً کہی یا لکھی گئی ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ اگرچہ تنقید میں وہ شدید قسم کی جدیدیت کی تبلیغ کرتے ہیں، لیکن خود ان کی شاعری میں کلاسیکی رنگ غالب ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ کہ بطور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کے یہاں اتنی وسعت نظر ہے کہ وہ بہ یک وقت میراجی، راشد، اختر الایمان اور فیض کی شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور افتخار جالب، عادل منصوری، احمد ہمیش، محمد علوی اور عباس اطہر کو بھی پسند کرتے ہیں۔ غزل کے ایک اظہار کا نام وہ ظفر اقبال ہے جو کھردرا، تلخ و تند، کھلنڈرا، لفنگا اور مسٹنڈا ہے۔ اسی اظہار کا دوسرا نام وہ ظفر اقبال ہے جس کے یہاں کلاسیکی رکھ رکھاؤ، غالب کی سی پیچیدگی اور بیدل کی سی طباعی ہے۔ اس اظہار کا تیسرا نام شہریار ہے، تو ناصر کاظمی بھی اس کا چوتھا نام ہے اور پانچواں نام احمد مشتاق ہے تو چھٹا نام سلیم احمد بھی ہے۔ وہ نقاد جو ان سب طرح کی شاعریوں کے لئے اپنے نظریات میں جواز نہ پیدا کر سکے، اسے جدید شاعری کا کامیاب نقاد نہیں کہا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ فاروقی بیک وقت خلیل الرحمٰن اعظمی، بلراج کومل، عمیق حنفی، زیب غوری، عرفان صدیقی، مجید امجد، زاہد ڈار، انیس ناگی، کمار پاشی، سلطان اختر، پرکاش فکری، کشور ناہید، شفیق فاطمہ شعریٰ، پریم کمار نظر جیسے مختلف طرز اور اسلوب کے شعراء کو اپنے تنقیدی دائرۂ کار کے اندر سمجھتے ہیں۔ رہا سوال خود فاروقی کا، تو انھوں نے بار بار کہا ہے کہ کلاسیکی شاعری اور جدید شاعری میں تسلسل، بلکہ ایک طرح کی وحدت ہے اور جب تک اس تسلسل، بلکہ وحدت، کا پورا شعور نہ ہوگا، اس وقت تک کامیاب جدید شاعری ظہور میں نہ آسکے گی۔ دوسری بات یہ کہ جدید شاعری اور کلاسیکی شاعری میں بنیادی فرق اسلوب کا نہیں، بلکہ کائنات کے بارے میں رویہ (attitude) کا فرق ہے اور اس کائنات میں شاعر کے مقام کے بارے میں تصور کا فرق ہے۔ فاروقی نے تو بہت پہلے کہا تھا کہ کلاسیکی شاعری اور جدید شاعری میں کوئی فرق نہیں۔ تیسری بات یہ کہ فاروقی کے یہاں تجربہ اور اسلوب میں نئی روشوں کی دریافت کا عمل بھی بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے مختلف البحر نظموں کے تجربے کئے ہیں اور بہت کامیاب تجربے کئے ہیں۔ انھوں نے رباعی کو مروجہ آہنگ سے آزاد کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے شعر الصوت بمقابلہ شعر المعنی کی طرف بھی قدم اٹھایا ہے۔ فاروقی نے انسان کے وجود اور انسان کی معنویت کے بارے میں بار بار سوال اٹھائے ہیں۔ یہ خالص جدید رویہ ہے۔ فاروقی کے اسلوب میں اتنی لچک ہے کہ وہ نئی فارسی تراکیب اور الفاظ کو اسی آسانی سے استعمال کرتے ہیں جس آسانی سے وہ بظاہر آسان طرز کو اختیار کر لیتے ہیں۔ فاروقی کے خیال میں شاعر کو کسی ایک سانچے میں نہیں ڈھالا جا سکتا، اس کے یہاں تنوع اور بوقلمونی ہونا ضروری ہے۔ چوتھی بات یہ کہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ نقاد شاعری کی ہر اس طرز کو خود بھی اختیار کرے جس کو وہ پسند کرتا ہے۔ نقاد کی وسعت اور گہرائی اس میں ہے کہ وہ مختلف اسالیب کا تجزیہ اور تحسین کرنے پر قادر ہو، لیکن خود اپنی شاعری میں (اگر وہ شاعر بھی ہے) اپنا انداز برقرار رکھے۔

فاروقی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کے یہاں شعر گوئی سے زیادہ شعر سازی کی کیفیت ہے۔ اس سے مراد شاید یہ ہے کہ فاروقی کے یہاں جذبات کی وہ بے ساختگی ہے جسے ہم عام طور پر اردو شاعری سے منسوب کرتے ہیں۔ شعر گوئی اور شعر بازی جیسی اصطلاحیں دراصل خالص موضوعی اور ناقابل اعتبار ہیں کیوں کہ شعر جس صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے اس کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگ سکتا کہ یہ کس طرح بنا ہے اور شعر سازی کوئی بری بات بھی نہیں۔ اگر شعر اچھا ہے تو یہ سب باتیں بے معنی ہیں اور اگر شعر اچھا نہیں ہے تو اس میں شعر گوئی کی کیفیت ہو یا کچھ اور، سب بے کار ہے۔ فاروقی نے خود کہا ہے کہ ان کی نظم بے سمت Direction less ہوتی ہے۔ یعنی وہ کسی منصوبے، کسی موضوع یا خیال کو سامنے رکھ کر نظم نہیں کہتے۔ زیادہ تر نظمیں

کسی ایک مصرعے سے شروع ہوتی ہیں اور کوئی ضروری نہیں کہ وہ مصرع نظم کا پہلا مصرع ہو۔ بعض اوقات ایک پیکر، کوئی استعارہ، کوئی تاثر، نظم کا محرک بن جاتا ہے۔ غزل میں بھی فاروقی کا نقطۂ آغاز کوئی زمین یا کوئی نیم مصرع ہی ہوتا ہے اور چونکہ نظم و غزل دونوں میں فاروقی براہ راست بات کہنے سے گریز کرتے ہیں، اس لئے خارجی محرک ان کے لئے کسی کام کا نہیں ہوتا۔ احمد آباد کے فسادات پر ان کی رباعیاں اور حادثۂ مراد آباد پر ان کی نظم (نمود پر شکستہ شب) اس بات کی دلیل ہیں کہ خارجی محرکات جب تک استعارے اور داخلی معروض کا روپ اختیار نہ کرلیں، فاروقی ان کو اپنی شاعری میں استعمال نہیں کرتے۔

کہا گیا ہے کہ فاروقی کی شاعری بہت مشکل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فاروقی کو سادہ بیانی پسند نہیں۔ غالب کا یہ شعر ان کی شاعری کا منشور قرار دیا جاسکتا ہے۔

سخن سادہ دلم را نہ فریبد غالب
نکتہ چند ز تازہ بیانے بہ سخن آر

اس کی وجہ فاروقی کی افتاد طبع تو ہے ہی، لیکن اس میں قاری کا احترام بھی شامل ہے۔ یعنی فاروقی کی نظر میں قاری کوئی صحرائی اونٹ نہیں کہ جب تک اس کی ناک میں نکیل نہ ہو، راستے پر چلتا ہی نہیں۔ فاروقی کہتے ہیں کہ قاری کا شاعر پر حق ہے کہ اس کو دودھ پیتا بالک نہیں بلکہ بافہم، باشعور اور سنجیدہ سخن سنج سمجھا جائے۔ شعر کوئی شربت نہیں اور قاری کوئی بچہ نہیں کہ اس کو شربت چمچے چمچے کرکے پلایا جائے۔ شاعری سے لطف اندوز ہونے سے مراد یہ نہیں کہ شاعری خارپشت یا جھاواں جیسی چیز ہے جس سے بدن کو کھجایا یا رگڑا جائے تو لطف حاصل ہو۔ شاعری سے جو لطف ہوتا ہے اس کی بنیادی حیثیت ذہنی اور تخیلاتی ہوتی ہے۔ جذبات کو براہ راست برانگیخت کرنا ہو تو شاعر کی ضرورت نہیں، فلمی گیت نویس سے کام چل جائے گا۔ جو لوگ شاعری میں "لذت" کے جویا ہیں وہ شاعری اور شعر فہمی دونوں کی تخفیف قدر کرتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ فاروقی کے یہاں نئی بحروں اور نئے استعاروں کی تلاش بہت زیادہ ہے، اس وجہ سے ان کے کلام میں تجریدی اور دانش ورانہ فضا ہے۔ یہ بات اتنی سطحی ہے کہ ہر اس شاعر پر صادق آتی ہے جس نے زبان کی نیرنگیوں کو بھرپور برتنے کی کوشش کی ہو۔ تجرید اور تعقلاتی رنگ کی کثرت جدید شاعری کا خاص انداز ہے، اس کے ایک سرے پر اسرار اور تحیر ہے تو دوسرے سرے پر تفکر اور تدبر۔ اس رنگ کے کئی پہلو ہیں، اور اس کا خاص اظہار بعض انگریزی اور فرانسیسی شعراء کے یہاں نظر آتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے طباعی، جدت اظہار اور جدت فکر کے جو نمونے اپنے کلام میں پیش کئے ہیں، ان پر کسی قدیم و جدید شاعر کی چھاپ نہیں ہے۔ ان کی شاعری ان کی تنقید کی ہی طرح کسی کی مرہون منت نہیں۔ نقاد کی حیثیت سے ان کی شخصیت نے لوگوں کو کچھ زیادہ ہی پریشان کیا ہے۔ شاید اسی لئے زیادہ تر لوگ اپنی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ ان کی شاعری کو ضمنی حیثیت دیں کہ کہیں تو فاروقی کو پست کیا جاسکے۔ بعض ایسے بھی ہیں، مثلاً بلراج کومل، زبیر رضوی، شہریار وغیرہ، جو فاروقی کی شاعری کو ان کی تنقید سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ خود فاروقی نے اپنی شاعرانہ حیثیت کو منوانے کے لئے کوئی خاص کوشش نہیں کی ہے، لیکن وہ شاعر فاروقی کو نقاد فاروقی سے الگ نہیں سمجھتے۔ ایک کے بغیر دوسرے کو سمجھنا مشکل ہے۔ ❖ ❖

افتخار نسیم

اس قدر بھی تو نہ جذبات پہ قابو رکھو
تھک گئے ہو تو مرے کاندھے پہ بازو رکھو

بھولنے پائے نہ اس دشت کی وحشت دل سے
شہر کے بیچ رہو باغ میں آہو رکھو

خشک ہوجائے گی روتے ہوئے صحرا کی طرح
کچھ بچاکر بھی تو اس آنکھ میں آنسو رکھو

روشنی ہوگی تو آجائے گا رہرو دل کا
اس کی یادوں کے دیئے طاق میں ہر سو رکھو

یاد آئے گی تمہاری ہی سفر میں اس کو
اس کے رومال میں ایک اچھی سی خوشبو رکھو

ترا ہے کام کماں میں اسے لگانے تک
یہ تیر خود ہی چلا جائے گا نشانے تک

میں شیشہ کیوں نہ بنا آدمی ہوا کیونکر
مجھے تو عمر لگی ٹوٹ پھوٹ جانے تک

گئے ہوؤں نے پلٹ کر صدا نہ دی مجھ کو
میں کتنی بار گیا غار کے دہانے تک

تجھے تو اپنے پروں پر ہی اعتبار نہیں
تو کیسے آئے گا اڑ کر مرے زمانے تک

کیا تھا فیصلہ بنیاد آشیاں کا نسیم
ہوائیں تنکے اڑا لائیں آشیانے تک

غلام حسین ساجد

فضائے بے بصیرت کے تسلسل سے نکل جاؤں
اجازت ہو تو کل ہی شہر کابل سے نکل جاؤں

وہ راضی تو نہیں ہوگا مجھے آزاد کرنے پر
کسی صورت مگر میں دام کاکل سے نکل جاؤں

قدم رکھوں، سمجھ کر، سوچ کر، صحرائے وحشت میں
کہ اس جانب اسی طرز تغافل سے نکل جاؤں

تجاوز راس آئے گا نہ پسپائی خوش آئے گی
مگر اب میں حساب جزو اور کل سے نکل جاؤں

اگر لازم نہیں مجھ پر کسی کا منتظر رہنا
تو اپنی کھوج میں رفتار بلبل سے نکل جاؤں

میں جی بھر کر جہان شاعری کی سیر کر دیکھوں
پلٹ آؤں کبھی وشت تغزل سے نکل جاؤں

کوئی مصروفیت پیدا کروں اپنے لئے ساجد
برا کیا ہے اگر میں اس تعطل سے نکل جاؤں

کہو یہ اس سے، جسے فرصت قیام نہیں
کہ گھر اہانت دیوار و در کا نام نہیں

ڈرے ڈرے سے ہیں کیوں اس قدر مکین شہر
ہلال عید ہوں میں، تیغ بے نیام نہیں

ہر اک خوف سے آزاد ہے صباحت وصل
چراغ ہجر کو آسودگی سے کام نہیں

نہیں ہے میرے تعاقب میں اب کوئی زنجیر
بچھا ہوا مرے قدموں میں کوئی دام نہیں

رہی ہے اور نہ کبھی ہوگی حسرت تعمیر
مجھے پسند مگر کار انہدام نہیں

پلٹ پلٹ کے زمانے گزرتے رہتے ہیں
کہ رنج ہو یا خوشی، کوئی بھی مدام نہیں

مری نگاہ بھی ہے تاج و تخت پر ساجد
مجھے بھی حسن زلیخا سے کچھ کلام نہیں

غلام حسین ساجد

مل گئی ہے بادیہ پیمائی سے منزل مری
کام آئی ہے بالآخر سعی لاحاصل مری

پاؤں دھرنے کو میسر آ نہیں پائی زمیں
ناؤ رک جاتی ہے آ کر جب لب ساحل مری

اک کمی میری تگ و دو میں کہیں موجود ہے
ہو نہیں پائی ابھی تک کوئی شے کامل مری

مل نہیں پائی خود اپنے آپ سے فرصت مجھے
مجھ سے بھی محروم رہتی ہے کبھی محفل مری

میں یہیں رہ جاؤں گا ہو کر اسیر دام عصر
راہ تکتا ہی رہے گا میرا مستقبل مری

کیا بچاؤں!! دان میں کیا دوں!! سمجھ آتا نہیں
دولت دل مانگتا ہے مجھ سے اک سائل مری

کوئی اپنے سے گلہ ہوتا نہ ساجد دہر سے
غور سے اک بات سن لیتا اگر یہ دل مری

آج آئینے میں جو کچھ بھی نظر آتا ہے
اس کے ہونے پہ یقیں بار دگر آتا ہے

ذہن و دل کرتا ہوں جب رنج جہاں سے خالی
کوئی بے طرح مری روح میں در آتا ہے

گفتگو کرتے ہوئے جاتے ہیں پھولوں کے گروہ
اور چپکے سے درختوں پہ ثمر آتا ہے

بچ نکلنے پہ مرے خوش نہیں وہ جان بہار
کوئی الزام کرد مرے سر آتا ہے

لوٹ جانے کی اجازت نہیں دوں گا اس کو
کوئی اب میرے تعاقب میں اگر آتا ہے

میری آنکھیں بھی میسر نہیں آتیں مجھ کو
جب ملاقات کو وہ خواب سحر آتا ہے

مری قسمت ہے یہ آوارہ خرامی ساجد
دشت کو راہ نکلتی ہے نہ گھر آتا ہے

غلام حسین ساجد

وشتِ حیرت کا سفر کر نہیں پائے ہم لوگ
اپنی مٹی سے حذر کر نہیں پائے ہم لوگ

رشک غیروں کے شب و روز پہ آتا ہے ہمیں
عمر اپنی بھی بسر کر نہیں پائے ہم لوگ

آخرکار سمجھتے ہیں زمانے کو رقیب
خود کو جب زیر و زبر کر نہیں پائے ہم لوگ

خواب میں اور حقیقت کے جہاں میں تفریق
کر تو سکتے تھے مگر کر نہیں پائے ہم لوگ

آنکھ لگتی ہے تو وہ خواب میں در آتا ہے
نیند کو اپنی سپر کر نہیں پائے ہم لوگ

ذکر اس گل کا رہے آگ نہ بجھنے پائے
اس سلیقے سے سحر کر نہیں پائے ہم لوگ

کتنے سیارے ابھی ہو نہیں پائے دریافت
کتنے افسوں ہیں کہ سر کر نہیں پائے ہم لوگ

بحر دنیا بھی رہی خواہش عقبیٰ بھی رہی
اپنی حالت پہ نظر کر نہیں پائے ہم لوگ

کیا ضروری ہے کہ خود پہ کوئی تہمت لی جائے
کیا ہوا کچھ بھی اگر کر نہیں پائے ہم لوگ

لذت عشق رہی اپنے دلوں تک محدود
پیدا اس گل سے ثمر کر نہیں پائے ہم لوگ

اس کے باوصف کہ ہے پاؤں میں چکر ساجد
ایک کوچے سے گزر کر نہیں پائے ہم لوگ

(نذر غالب)

آج قرباں ہو رہے گا میرا خواب آئینے پر
تاکہ روشن ہو سکے اک مہتاب آئینے پر

ایک مدت تک مرے دل سے حذر کرنے کے بعد
تھم گئی ہے ہار کر وہ موج آب آئینے پر

رات بھر اک دشت حیرت میں سفر کرتی ہوئی
صبح دم رکتی ہے خاک اضطراب آئینے پر

شمع اور نجم سحر ہیں اس کی آنکھوں پر نثار
اور عکس ہے کچھ دنوں سے ماہتاب آئینے پر

چن لیا ہے میں نے اک بے مہر کو اپنے لئے
قرض ہے اک آئنے کا انتخاب آئینے پر

میرے بالیں سے چرا کر میری تیغ بے نیام
رکھ گیا ہے کون چپکے سے گلاب آئینے پر

صید کرلایا ہوں جس کو وسعت صحرا سے میں
کیا نمو پائے گی یہ فصل سراب آئینے پر

محمد صلاح الدین پرویز

پہلا واقعہ (شاید)

آج میرا دن شاید صبح پانچ بجکر ایک منٹ پر طلوع ہوا۔
فجر کی اذان کا وقت شاید پانچ بجکر پینتالیس منٹ پر تھا
چوالیس منٹ، شاید میں شدید درد میں مبتلا رہا
یہ شاید دل کا درد تھا۔
یا شاید کسی اور درد کو میں دل کے درد سے کنفیوز کر رہا تھا
اسی کنفیوژن میں شاید میں نے نماز پڑھ لی تھی
یا اذان سنتے ہی شاید بنا نماز پڑھے سو گیا تھا۔
صبح جب میں دوبارہ نیند سے جاگا تو شاید نو بجے تھے
اسی وقت شاید میری بیٹی فجر میرے کمرے میں داخل ہوئی
میرا ماتھا چوم کے بولی
"ڈیڈی، آپ کا نام اگر میں غلطی نہیں کر رہی ہوں شاید
محمد صلاح الدین پرویز ہے"

دوسرا واقعہ (مہاتما گاندھی)

میں، پچھلی نظم میں
جس درد کو دل کے درد سے کنفیوز کر رہا تھا
وہ اچانک مجھے مہاتما گاندھی روڈ پر چلتے ہوئے مل گیا
اسکے بال، اسکی ریڑھ کی ہڈی کے نیچے تک لٹک رہے تھے
آنکھیں، چہرے کی دونوں سمتوں میں
ایک ایک گز باہر نکل رہی تھیں
ناک اتنی لمبی تھی کہ سڑک کے دوسرے چھور کو بھی چھو رہی تھی
ہونٹ، پہاڑ بن گئے تھے [شدید دھوپ کے موسم میں بھی ان پر برفباری ہو
رہی تھی]
اور، اور جسم کے کبوتر، نعروں کے ظلم اور ترشول سے لہولہان ہو کے
نابھی سے نیچے کہیں کسی اندھے کنویں میں جا کے
"ایک لڑکی کو دیکھا تو ایسا لگا!" کسی ہندی فلم کے شاعر کا گیت گا رہے تھے
، میں شاید اسے آواز دے کے روکنا چاہتا تھا
— اچانک مہاتما گاندھی کا بت میرے دل کے اوپر آن گرا
اور میں مر گیا۔

تیسرا واقعہ (منکر نکیر)

مرنے کے بعد جب میں دوبارہ زندہ ہوا
تو میری بیوی، میرے سرہانے
آنکھوں میں آنسو لئے کھڑی ہوئی تھی
اسکے ہاتھ میں، میرے لئے
دعائیں ہی دعائیں کھلی ہوئی تھیں
"لیکن، لیکن وہ کہاں ہیں!" میں اسکے ہاتھوں سے دعائیں لیتے ہوئے
اسکے آنسو، اسی کی آنکھوں کو واپس لوٹاتے ہوئے
سوال کیا
کون!! اسنے ڈرتے ڈرتے آہستہ سے پوچھا
منکر نکیر!
تبھی دو ڈاکٹر سفید ایپرن پہنے کمرے میں داخل ہوئے
اور میرے کولھوں میں دوا انجکشن ٹانکتے ہوئے بولے
"تمہارا خدا کون!"

چوتھا واقعہ: (پینٹنگ)

شام کا سورج چھپ گیا تھا
تبھی تو کمرے میں زیرو پاور کے بلب کی روشنی
ٹمٹما رہی تھی
کیا، کیا بجا ہے!" میں نے خواب اور بے خواب والی کیفیت میں اپنے سے سوال
کیا
"آٹھ بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں!" میری بیٹی فجر نے جواب دیا
جو میری پائینتی، جھکی ہوئی واٹر کلر سے پینٹنگ بنا رہی تھی
"یہ تم کیا بنا رہی ہو!"
آپ کے لئے ایک پینٹنگ!
اور جب اس نے مجھے اپنی پینٹنگ دکھائی
میں پہلی بار ان چوبیس گھنٹوں کے اندر جی کھول کر ہنسا!

اسنے بادلوں کی جگہ زمین بنادی تھی
اور زمین کی جگہ بادل اکٹھے کر دیئے تھے

پانچواں واقعہ: (ڈی کنسٹرکشن)

ابھی میں ہنس ہی رہا تھا
کہ کمرے میں ایک ہلچل سی مچ گئی

جانے کہاں سے بہت سارے لوگ آ کے مجھ سے چمٹ گئے
"آپ، آپ کون ہیں!" میں نے ان سے پوچھا
"آپ کے دوست، آپ فن کار ہیں نا، ہم بھی فنکار ہیں
آپ کو فن سنانے آئے ہیں" ۔ اتنا کہتے ہی
وہ سب کورس میں اپنی تحقیق، نظم، افسانہ، ناول اور تنقید سنانے لگے۔
اور میں یاد کرنے لگا
اپنا پہلا ڈی کنسٹرکشن،
بوسیدہ شہر،
کالے اندھیرے کی شاخ سے لپٹی ہوئی ٹرین
پرانی بجھتی ہوئی لالٹین
اور اپنا برگزیدہ باپ
انکا کورس ختم ہوا تو میں نے ان سے نہیں، خدا سے بس اتنا ہی کہا:
"تو نے میری زندگی کے پچیس سال
ان احمقوں کو کیوں دے دیئے
کاش تو انہیں اپنے پاس ہی رکھ لیتا"

چھٹا واقعہ: (نیپنسک)

احمقوں کے ڈیپارچر کے بعد
میں نے یک گونہ بے خودی سی محسوس کی
اور دائیں جانب لیٹ کے جیسے ہی
سورۂ یٰسین پڑھنی شروع کی ــــــ دیکھا،
وہ میری دائیں بازو والی ٹیبل پر
پاکستان سے چھپنے والا ایک ادبی رسالہ چھوڑ گئے ہیں
[بے خیالی میں شاید]
جیسے ہی میں نے اسکی ورق گردانی شروع کی
مجھے امریکہ اور یورپ کے سارے
لکھنے والوں سے ہمدردی ہو گئی
میں نے دعا کی:
اے خدا، انہیں بڑھئی، لکڑہارا، دھنکیا، تیلی یا
کچھ اور اسی قسم کی چیز بنا دے ادیب اور شاعر مت بنا کہ
ان بے چاروں کی تحریروں کا ترجمہ اب جدید، ما بعد جدید اردو ادب کے
شاعروں اور ادیبوں کا گرانقدر سرمایہ بن چکا ہے۔
تو کیا سب کے سب نیپنسک ہو چکے ہیں!
(نیپنسکوں کی فہرست میں بہت سارے درسگاہوں کے نقاد بھی شامل ہیں)

ساتواں واقعہ: (فوریکنل نظم)

نیپنسک!
تو کیا میں بھی نیپنسک ہو گیا ہوں؟
"نہیں ـــ" میری بیوی نے کہا "لیکن ـ ابھی ڈاکٹر نے
تمہیں چند دنوں کے لئے مکمل آرام کی ہدایت دی ہے"
"اچھا!" میں نے کہا اور بیڈ سے اچھل کر کھڑا ہو گیا
(ازل سے باغی ہوں نا!)
اب کمرے کی چٹخنی چڑھی ہوئی تھی
اور میں اپنی بیوی کو بانہوں میں بھر کے
اپنے بوسوں اور محبتوں سے لہولہان کر رہا تھا
اور اسکے بعد جب میری پاترا سماپت ہو گئی
میں نے محسوس کیا
کمرے میں میری بیوی تو تھی ہی نہیں
میں نے تو اپنے درد کے تپتے ہوئے سرخ قلم سے
دل کے ٹوٹنے کے بارے میں ایک نظم لکھی تھی
[یہ نظم اوریجنل تھی]

آخری واقعہ (ہیپی برتھ ڈے ٹو یو)

اب کمرے میں تنہائی تھی اور میری بیوی ـــ
ـــ میں کمرے کی چھت پر
بھنگوں کا شکار کرتی ہوئی چھپکلی تک رہا تھا اور میری بیوی،
سامنے دیوار پر ٹنگی ہوئی گھڑی تک رہی تھی
ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن
گھڑی نے دوسری صبح کے پانچ بجائے پھر اسکی بڑی سوئی
تیزی سے فاصلہ طے کرنے لگی ـــ
اب پانچ بجکر ایک منٹ ہو گیا تھا
کہ دل کے اس حصے پر جہاں درد
کے نشانات ابھی تک مہک رہے تھے
اسکے ہونٹ پیوست ہو گئے اور
دعاؤں والے انداز میں
مجھ سے یا خدا سے [معلوم نہیں] گڑگڑاتے ہوئے ـ

ہپی برتھ ڈے ٹو یو!
اس پل جانے کیوں مجھے احساس ہوا، میرا نام
محمد صلاح الدین پرویز ہرگز نہیں ہے

محمد صلاح الدین پرویز

(۱)

شاید تم کو یاد نہ ہو
ہم دونوں اک چھوٹی لائن پہ چلنے والی ٹرین میں بیٹھے
اک جنگل سے گزر رہے تھے
ٹرین میں یوں تو اور مسافر اور بہت سے کوپے بھی تھے
لیکن اس کوپے کے اندر بس ہم دو تھے
کھلی ہوئی تھی کھڑکی اس کوپے کی
سرد ہوائیں،
بھیگے ہوئے پیڑوں کے پتوں کی مدھ بوندیں
شام ڈھلے بارش کے کارن، ان پہ آکے ٹھہر گئی تھیں
اور اب سے تھوڑی دیر پہلے
نیلے امبر پہ روشن چاند کی کرنیں
ہم دونوں کے جسموں کوں یوں چھیڑ رہی تھیں
جیسے ہم دونوں
ان کے روٹھے ہوئے سنگی ساتھی ہوں
ٹرین رک گئی تھی تبھی اچانک اس جنگل میں
خوف سے کانپ گئے تھے ہم دونوں
ہونے والا ہے کچھ !
اندیشہ جاگا تھا سینے میں !!
کیا... کیا ہونے والا ہے !
ہم دونوں نے اک دوجے سے
نظروں ہی نظروں میں پوچھا !!
کوپے کا دروازہ کھلا اچانک....
ایک اجنبی ہیٹ لگائے
خاکی رنگ کی لمبی برساتی پہنے
کندھے پر دونالی بندوق سجائے
ٹارچ لئے دائیں ہاتھ میں
بائیں ہاتھ میں بھیگے ہوئے
آج کے ہندوستان ٹائمز کو موڑے
منہ میں اک پائپ دہکائے
بالکل ہم دونوں کی سامنے والی
سیٹ پہ آکے بیٹھ گیا تھا
اس کے بعد ہوا کیا !
شاید تم کو یاد نہ ہو
وہی ٹرین اور وہی چھوٹی لائن ہے
وہی جنگل اور وہی کوپے ہے
ہاں اب فرق ہے سو اتنا ہے
میں اس کوپے میں بالکل تنہا ہوں
اور کوپے کی کھڑکی کا شیشہ گرا ہوا ہے

(۲)

ہم دونوں اک جیپ میں بیٹھے سفر کر رہے تھے
سطح سمندر سے اونچے اور بہت اونچے جانے کی خواہش
دونوں کے دل میں اک طوفان اٹھائے ہوئے تھی
اور واقعی طوفان آگیا تھا اس شب
اتنی زور سے بجلی کڑکی تھی
ڈر بھی جل کر راکھ ہو گیا تھا اس میں
بارش اتنی تیز تھی
نظر نہیں آتا تھا کچھ بھی
وائپر تک جیپ کے فیل ہو گئے تھے اس شب
لیکن پھر بھی چلے جا رہے تھے ہم دونوں،
اک اونچائی کو سر کرنے
اک بار تو ایسا بھی ہونے والا تھا
ایک تیور موڑ پہ گاڑی گرنے ہی والی تھی
سات ہزار فیٹ نیچی کھائی میں
لیکن پھر بھی بچ گئے تھے ہم دونوں
اک انجانی طاقت نے بچا لیا تھا ہم کو اس صدمے سے
آج اسی صدمے کے نہ ہونے کا افسوس ہے مجھ کو
کاش وہ گاڑی اس دن کھائی میں گر جاتی
تو میں کیوں تنہائی میں بیٹھا
اس کے پیار سے شرمندہ ہو کے .
ایسی نظم جو رنجیدہ کرتی ہے مجھ کو
لکھتا اور اسے چھپوا کے
ساری دنیا کو جتلاتا
وہ دنیا بھر سے زیادہ جھوٹی تھی !
اور میں دنیا بھر سے زیادہ سچا ہوں !!

(۳)

بست ہو گیا واقعی اب سفر کرنا
اور ایسا سفر کرنا
جس میں کوئی بھی میرے ساتھ نہیں ہے
"ایک نہیں بلکہ کئی کئی تمہارے ساتھ
سفر میں جڑے ہوئے ہیں" میرا دل کہتا ہے
سب سے پہلے تمہارے کالے رنگ کا فلیٹ ہیٹ
جو اس نے اڑھایا تھا
بارش والے رم جھم دن میں
اور اس سے تمہارے بالوں کی اک جھانکتی لٹ کو
چوم لیا تھا
اور وہ.... وہ تمہارا ملٹری کے رنگ سے
ملتا جلتا ہنٹر کوٹ
جس کے بٹن لگاتے وقت کسی نے
تمہارا بالوں سے پر سینہ
بوسوں سے روشن کر ڈالا تھا
بھول گئے کیا اپنے ریباک کے جاگنگ شوز
جن کے لیس' بارہ برس پہلے
دو سندر سندر ہاتھوں نے باندھے تھے
کالگز بھی کیا ریباں کے یاد نہیں تم کو
....وہ بھی کسی کا تحفہ ہیں
جن کو پہن کے اب بھی تم اپنے دھوپیلے دن کو
گہری نیند بنا دیتے ہو
اور وہ تمہارے ہونٹوں پہ اک ہلکا سا تبسم
جو اس نے سب سے چھپ کے'
رات کی چوتھی پہری میں رکھا تھا' ہونٹوں پہ
تمہارے
آج بھی ساتھ تمہارے ہے
پھر کیوں تم جسموں کی خواہش کرتے ہو!
اور رشتوں کی یادیں ساتھ لئے پھرتے ہو!!

محمد صلاح الدین پرویز

(۱)

یاد آرہی ہے

یاد آرہی ہے تبھی تو !
پانی میں چپکے چپکے چاند اتر رہا ہے
دھرتی پر دھیرے دھیرے رقص
پیڑ پر خاموشی سے چڑیا گھونسلہ بنا رہی ہے
گھر میں، خود سے الجھی ہوئی بیوی
چترگملے میں گلاب کی قلم لگا رہی ہے
آسمان میں بجلی کڑک کڑک کے
حوروں اور پریوں کی شکلیں بنا رہی ہے
سناٹوں میں ہوا نیلی پیلی شمعیں جلا رہی ہے
پہاڑوں پر بادلوں کی آنکھوں سے برف گر رہی ہے
وادیوں میں سنہرے خوابوں کی آگ جل رہی ہے
قبر میں باپ، پاؤں پسارے
آرام سے سو رہا ہے
کچن میں، بڑبڑاتی ہوئی، بے چین سی خمیدہ ماں
برتن دھو رہی ہے
جنگل میں جانور ایک دوسرے سے مل کے
آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں
آنگن میں بچے، ایک دوسرے کا گریبان پکڑے
گالیاں بک رہے ہیں
مالن، پسینے میں نہائی ہوئی
پائیں باغ میں مہندی توڑ رہی ہے
مالکن، حمام میں گھسی ہوئی
اپنے ٹوٹے ہوئے مجسمے کو جوڑنے کی کوشش کر رہی ہے

میں... لیکن میں ان سب منظروں سے بے پروا
اسے یاد کر رہا ہوں !
جسے میں کب کا بھول گیا ہوں !!

(۲)

یاد، چلی جائے گی
یاد، چلی جائے گی تو !
پانی میں چاند کا عکس نہیں اترے گا
دھرتی پر رقص کا نس یونہی تھرکتا رہے گا
پیڑ پر چڑیا کا نشیمن ٹوٹ جائے گا
گھر میں بیوی کے چترگملے میں گلاب کے بجائے
شمشاد اگ آئے گا

آسمان میں سرپ پھنکاریں گے
سناٹوں میں ہوا کی نیلی پیلی شمعیں
جنوں اور بھوتوں کی شکلوں میں
تحلیل ہو جائیں گی
پہاڑوں پر دھوپ سے بہہ بہہ کے
آگ پگھلے گی
وادیاں گندے پانی کے فضلے سے
بھر جائیں گی
قبر میں باپ سوتے سوتے جگ جائے گا
کچن میں ماں کے ہاتھوں سے برتن
ٹوٹ جائیں گے
جنگل میں جانور، انسانوں کی طرح
بولنا شروع کر دیں گے
آنگن میں بچے گالیوں کی سوغات
سن پڑھ کے گونگے ہو جائیں گے
مالن، حمام میں جڑے ہوئے مجسمے سے
اپنا بدن رگڑ رگڑ کر خوش ہو رہی ہوگی
مالکن، پائیں باغ میں، ٹوٹی ہوئی بینچ پر بیٹھی
مہندی سے خالی اپنے دونوں ہاتھ
آنکھوں پہ رکھ کر رو رہی ہوگی
میں.... لیکن میں، ان سب منظروں میں رہتا ہوا
اسے کیوں بھول رہا ہوں !
جسے میں نے یاد ہی نہیں کیا ہے !!

ٹھکانا

جتیندر بلو

میں نے جھوٹ کو سچ میں اتنی ہنرمندی سے شامل کر رکھا تھا کہ میرا ادا کردہ ہر جملہ ہر بول میرے مقابل بیٹھے ہوئے افسر پر اپنا تاثر اتنی شدت سے چھوڑ رہا تھا کہ وہ اپنی آنکھیں میرے چہرے سے ہٹانے کے قابل ہی نہ رہا تھا۔ بلکہ وہ ہر بات کو دھیان سے سن کر اس ادھیڑبن میں تھا کہ اسے میرے متعلق کیا فیصلہ کرنا ہے؟ میں خوش تھا کہ میرا چلایا ہوا ہر تیر ٹھیک اپنے نشانے پہ بیٹھتا چلا جا رہا ہے اور جس مقصد کے تحت میں مقامی کونسل کے دفتر میں بیٹھا اپنے نجی حالات اور مسائل بیان کر رہا ہوں' اس میں کامیابی یقیناً میری ہوگی۔۔۔ اور جب میں اپنے تمام تیر چلا کر ترکش خالی کر چکا تو اس نے میری فائل کو اٹھا کر کاغذات دیکھنے شروع کر دیئے' کچھ اس ڈھنگ سے کہ میں موجود تو ہوں اور نہیں بھی۔ درحقیقت مجھے رہنے کے کشادہ جگہ درکار تھی' جہاں سانس لینے پر مجھے احساس ہو کہ میں واقعی زندہ ہوں۔ یوں تو میں مرکزی لندن کے ایک بیڈ اینڈ بریک فاسٹ کے مختصر سے کمرے میں مقیم تھا اور اس کے تمام اخراجات کونسل ہی برداشت کر رہی تھی' لیکن وہ کمرہ اس قدر تنگ تھا کہ کسی دوسرے شخص کی موجودگی میں دونوں افراد سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ کون کہاں بیٹھے اور کون کھڑا رہے؟ ایک تو کمرہ چھوٹا' اس پر ستم یہ کہ میں نے دنیا بھر کا کوڑا کرکٹ وہاں جمع کر رکھا تھا' جو دیواروں سے لگا کھڑا تھا اور بعض دفعہ اپنا توازن کھو دینے پر بستر پر پھیل جایا کرتا تھا۔ میری محبوبہ مذاقاً کم "طنزاً" زیادہ کہا کرتی تھی۔

"کبوتر کو بھی اپنے خانے میں چکر کاٹنے کی پوری آزادی ہوا کرتی ہے... مگر تم تو کبوتر سے بھی گئے گزرے ہو۔"

"کیا کروں... مجبور ہوں۔"

"یہ مجبوری تم نے خود پال رکھی ہے؟"

"ممکن ہے؟... مگر میں اپنے ڈھنگ سے جینا چاہتا ہوں۔"

"میں تمہارے اس رویئے سے ہمیشہ ناخوش رہی ہوں۔"

ان دنوں میں ریاست کا داماد بنا بے فکری سے آزاد معاشرے میں گھوم پھر رہا تھا۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا اور نہ ہی کوئی تنقید کرنے والا تھا' سوائے میری محبوبہ کے' جو موقع بے موقع مجھ پر چوٹ کر دیا کرتی تھی۔ لیکن ایک میں تھا کہ ہونٹوں پہ بے ضرر سی مسکراہٹ لا کر اسے نظرانداز کر دیا کرتا تھا۔ ہر ہفتے سرکاری خزانے سے مجھے اتنی رقم مل جاتی کہ روزمرہ کی ضروریات کھینچ تان کر پوری ہو جایا کرتی تھیں۔ پھر ملازمت کرنا میرے نزدیک بے معنی سا تھا۔ کون آٹھ آٹھ گھنٹوں تک ایک ہی کرسی پر جما فائلوں اور کمپیوٹر سے سر کھپاتا پھرے۔۔؟ کون بلا ناغہ دماغ کا گودا خشک کرتا پھرے۔۔۔؟ پھر ہر شام تھکا ماندہ' نچڑا ہوا گھر لوٹے۔۔۔؟ اور اگلے روز منہ اندھیرے بیدار ہو کر ٹھیک وقت پر دفتر پہنچے۔؟ میں تو اپنی مرضی سے اٹھنے بیٹھنے اور سونے جاگنے کا عادی تھا۔ کوئی بندش' پابندی یا دباؤ برداشت کرنا میرے کردار کے خلاف تھا۔ اصل مقصد تو زندہ رہنا تھا' سو میں جی رہا تھا۔ کبھی ہنسی خوشی اور کبھی رودھو کر۔ دراصل آخری ملازمت چھوٹنے پر میرے ہاں کئی تبدیلیاں پیدا ہوئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں تادمِ زیست کسی کے ماتحت کام نہیں کروں گا اور اگر مجبوراً کام کرنا بھی پڑا تو اپنا مالک میں خود ہوں گا۔ لیکن کبھی کبھار میرے ضمیر کی بہت ہی نچلی سطح سے یہ آواز ضرور ابھرا کرتی تھی کہ میں اپنی ذات کو ہی نہیں' اپنی جوانی کو بھی ضائع کر رہا ہوں' جو ایک بار گزر گئی تو ہاتھ ملتا رہ جاؤں گا اور تادم آخر پچھتاتا ہوا اس دنیا کو سلام کروں گا۔ یہ کمبخت احساس اپنی بھیانک صورت کو ساتھ لیئے اتنا جان لیوا ثابت ہوتا کہ میں راہ پیمائی کرتے وقت اکثر سوچتا کہ کیا مجھے کبھی اپنا گھر بنانے' بسانے اور اسے آباد کرنے کا موقع نصیب ہوگا یا نہیں۔۔۔؟ یہ ایک ایسا سوال تھا' جو مجھے خود سے الگ کر دیا کرتا تھا۔ لیکن میں جبراً اسے دامن سے جھٹک کر اپنے تخیل میں کھو جایا کرتا تھا اور اس کی آڑ لے کر کہیں سے کہیں نکل جایا کرتا تھا۔ بسا اوقات دیکھتا کہ کسی دریا کے کنارے' ایک سرسبز ٹیلے پر میرا عالیشان مکان واقع ہے۔ شام کا وقت ہے' ہلکا ہلکا سا دھندلکا پھیلا ہوا ہے۔ آکاش قدرے جھک آیا ہے۔ میں تھکا ماندہ کام سے لوٹ رہا ہوں۔ میرے ہاتھوں میں آئس کریم' چاکلیٹ' کیک' انڈے' گوشت اور ترکاریوں سے بھرے ہوئے تھیلے ہیں۔ بچے مجھے دیکھتے ہی پوری رفتار کے ساتھ میری طرف دوڑتے ہیں' اپنے ہاتھ تھیلوں کی طرف بڑھا کر انھیں چھیننے کی کوشش کرتے ہیں' لیکن میں تھیلے آکاش کی طرف اٹھا کر کہتا ہوں۔

"چلو بچو اندر چلو... آج تمہارا ڈیڈ تمہارے لیئے کئی نئی چیزیں لے کر آیا ہے... مگر یہ سب تمہاری ماں کی موجودگی میں تقسیم ہوگا... جی بھر کر کھاؤ

اور عیش کرو۔"

اچانک کسی کار، ٹرک، موٹر سائیکل یا بس کا تیز ہارن سن کر میں اچھل جاتا۔ کیا دیکھتا ہوں میں فٹ پاتھ کو چھوڑ کر سڑک پر آتی جاتی ٹریفک کے لیے رکاوٹ بنا بیٹھا ہوں۔ ڈرائیور تو کیا، راہ گیر بھی میرا ڈھیلا ڈھالا لباس، بے ترتیب بال، سانولے رنگ اور بے جا حرکت پر ہنس رہے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہنس دیا کرتا تھا۔

اور ایک شام میں اپنی محبوبہ کے ساتھ ایک ریستوراں میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ انگریزی ڈھابا تھا۔ اپنی محبوبہ کو کسی اونچی جگہ پر لے جانا میری توفیق سے باہر تھا۔ پیالوں کے درمیان میز پر فرنچ فرائز (FRENCH FRIES) کی ایک پلیٹ موجود تھی، جس پر اس کی انگلیاں پھرتی سے چل رہی تھیں۔ غیر متوقع طور پر ایک سوال میں نے اس کی طرف اچھال دیا۔

"میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ بہت جلد اپنا گھر بساؤں گا۔"

"تمھارا خیال بڑا نیک ہے۔"

"اور میں یہ بھی فیصلہ کرچکا ہوں۔ بہت جلد شادی کروں گا۔"

"تمھارا یہ خیال بھی بڑا نیک ہے۔"

یہ سنتے ہی ایسا لگا کہ جنت میں فرشتوں نے میری اور اس کی شادی کی گرہ مضبوطی سے باندھ ڈالی ہے اور اب کوئی طاقت اسے کھول کر ہمیں جدا نہیں کرسکتی۔ میں اپنی ذات میں چوڑا ہو کر ریستورنٹ میں موجود ہر گاہک کو ایک فاتح کی نظر سے دیکھتا چلا گیا۔ وہ بھی اپنی بھویں اوپر نیچی کرکے میرا جائزہ لینے لگے۔ لیکن مجھے ان کی کیا پروا تھی۔ اتنے میں میری محبوبہ نے لبوں سے پیالہ ہٹا کر کہا۔

"برا مت ماننا... تم سے کوئی عورت تب شادی کرے گی، جب اسے یقین ہوجائے گا کہ تمھارے پاس رہنے کے لیے کوئی مناسب ٹھکانا ہے۔"

لیکن میری گردن اور کندھے جوں کے توں اونچے رہے۔ میں نے کہا۔

"فکر مت کرو... اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔"

"کب؟... اگلے جنم میں؟"

"نہیں، بہت جلد... تم دیکھتی جاؤ میں کیا کرنے والا ہوں؟... اکھاڑ کر رکھ دوں گا۔" میرے جملے کا آخری ٹکڑا، جس میں میری تلخی بھی شامل تھی، اس پر گہرا اثر چھوڑ گیا تھا۔ دیر تک وہ ہنستی رہی، پھر ہنستے ہی گویا ہوئی۔

"لمبے عرصے سے یہی سنتی چلی آرہی ہوں... مگر تم آج تک نہ تو کسی کا کچھ اکھاڑ سکے، نہ بگاڑ سکے۔ بلکہ کبوتر خانے میں پڑے خود کو ضائع کر رہے ہو... حالانکہ پڑھے لکھے ہو اور دنیاوی حالات کو خوب سمجھتے ہو۔"

"جانتا ہوں۔ مگر اس بار میں تمھیں نراش نہیں کروں گا... یہ طے ہے۔"

افسر میری فائل کا ہر صفحہ بغور دیکھ چکا تھا۔ اسے میز پر رکھ کر تولتی ہوئی نظروں سے مجھے اس انداز سے دیکھتا چلا گیا گویا میرا ایکسرے کرنے پر آمادہ ہو۔ میں لرز اٹھا۔ لگا کہ وہ میرے خود ساختہ جھوٹ سے واقف ہو چکا ہے یا پھر اس سے مطمئن نہیں ہوا۔ بولا۔

"تمھارے حالات تو بالکل نہیں بدلے... ویسے ہی ہیں جو دو برس پہلے تھے... یعنی تم اکیلے ہو، بے روزگار ہو... کمرہ کونسل کی طرف سے ملا ہوا ہے... وہ چھوٹا ضرور ہے۔ مگر اس میں کم سے کم سنک (SINK) تو لگا ہوا ہے..."

"جہاں میں صرف دانت مانجھ سکتا ہوں۔" میں نے کہا "ٹائلیٹ کے لیے مجھے باہر جانا پڑتا ہے، جو برآمدے میں کچن اور باتھ روم سے متصل ہے... وہاں قطار بھی لگا کرتی ہے۔"

"تو کیا ہوا؟ اس منزل پر دوسرے لوگ بھی رہتے ہیں... انھیں اس سلسلے میں کوئی شکایت نہیں۔"

میں نے فوراً پینترا بدلا اور بدلنے میں ہی میری عافیت تھی۔

"میں اپنی پرابلم بیان کرچکا ہوں.... اور اسے تم غور سے سن رہے تھے۔"

"ہاں۔ یہ صحیح ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو اسے دہرانا میرا فرض بن چکا ہے... میری گرل فرینڈ جو میری منگیتر بھی ہے، وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے... ساتواں مہینہ چل رہا ہے... مجھے فوراً بڑی جگہ چاہیے، جہاں میں اس کی دیکھ بھال کرسکوں۔"

اس کے چہرے پہ وہی مسکراہٹ ابھر آئی، جو ابتدا میں اپنا مسئلہ بیان کرتے وقت میں نے دیکھی تھی۔ بولا۔

"میں اس وقت بھی تم سے کہنا چاہتا تھا... کونسل صرف تمھاری ذمہ دار ہے، تمھاری گرل فرینڈ کی نہیں۔"

"مت بھولو اس کڑے وقت میں میری گرل فرینڈ کو میری سخت ضرورت ہے اور مجھے اس کی... تم خود سوچو وہ میرے کبوتر خانے میں آکر کیسے ٹھہر سکتی ہے؟"

"ہاں۔ تمھاری اس بات میں دم ہے۔ اس پر غور بھی کیا جائے گا۔"

"کب؟... جب میں کال کوٹھری میں دم توڑ دوں گا؟"

"نہیں، جب تمھارے حالات بدلیں گے... یعنی تمھارے باپ بننے پر ہی کونسل تمھاری مدد کرسکتی ہے۔ پہلے ہرگز نہیں۔"

مجھے طیش آگیا۔ "مت بھولو، اس پل بھی میرے بچے اور اس کی ماں کو میری اشد ضرورت ہے... اگر ماں یا بچے کو کچھ بھی ہوگیا تو میں کونسل پر مقدمہ دائر کردوں گا۔"

یہ کہہ کر میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے خطرناک تیور دیکھ کر اس کا محتاط ہونا فطری تھا۔ گہری فکر میں ڈوبا سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ پھر فائل کو اٹھا کر پہلے صفحے پر چند فقرے درج کیے اور نرمی سے بولا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں تم پریشان ہو... ہم تمھیں جلد خط لکھیں گے۔"

فائل سمیٹ کر وہ کھڑا ہوگیا اور مجھے دیکھے بغیر کیبن سے چلا گیا۔ لیکن اس

دوران میرا اندرون مجھے یقین دلا رہا تھا کہ میرے چلائے ہوئے تیر خطا نہیں گئے۔

کونسل کا قدیم طرز کا ٹاؤن ہال بلند اور ٹھوس کرسی پر قائم تھا۔ اس عمارت کا بیرونی حصہ رومن تہذیب اور اس عہد کے فن تعمیر کی یاد دلاتا تھا۔ بلند وبالا گول گول ستون' لمبی لمبی تکونی سیڑھیاں' چبوترے سے سڑک کی طرف اترتی ہوئیں۔ میں ایک ستون کا سہارا لے کر سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگا کر دو تین کش لیئے اور راحت کا گہرا سانس بھرا۔ اچانک خیال آیا کہ جھوٹ کے تو پاؤں نہیں ہوا کرتے' لیکن میں نے تو آج کمال ہی کر دیا۔ میں خود پہ حیران تھا کہ جس انداز سے میں نے من گھڑت مسائل بیان کیئے اور جس انداز سے ایک مشاق اداکار کی طرح اداکاری کرتا چلا گیا' وہ بے نظیر تھی۔ افسر بھی چکر کھا گیا تھا۔ میرے تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ میں جھوٹ کی اس سطح کو بھی چھو سکتا ہوں۔ گو جھوٹ بولنا میری سرشت میں شامل ضرور رہا تھا' لیکن ایسی ڈرامائی' خطرناک حد تک میں کبھی نہ گیا تھا۔ چھوٹا موٹا جھوٹ اس نوعیت کا ضرور بول لیا کرتا تھا کہ دوسروں کا نقصان نہ ہو۔ لیکن اگر میری محبوبہ کو کسی طور سچائی کا علم ہو گیا تو اس کی نظر میں یقیناً میرا وقار کم ہو جائے گا۔ جھوٹ کو وہ اخلاقی گراوٹ سمجھتی ہے اور مجھ سے بھی ہمیشہ سچ بولنے کی تلقین کیا کرتی ہے کہ سچ ہی اس کے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی قوت ہے' قدر ہے۔ پریشان ہو کر میں نے ایک زوردار کش لیا۔ دھواں اگلنے پر پلٹ کر یہ خیال میرے ذہن میں ابھرا کہ اگر میں نے یہ خطرناک کھیل کھیلا بھی ہے تو اس میں میری محبوبہ بھی برابر کی شریک ہے۔ پدما چندیوا مجھ سے محبت کرتی ہے اور میرے ساتھ زندگی گزارنے کا بھرپور ارادہ رکھتی ہے۔ بظاہر اس نے کبھی اقرار محبت نہیں کیا' بلکہ اس کا کہنا ہے کہ یوں تو اس کے دوستوں کا دائرہ بڑا وسیع ہے' لیکن میں اس کا بہترین دوست ہوں اور مجھے پسند کرنے کی وجہ بھی وہ یہی بتاتی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں' چہرہ دل کا آئینہ ہوا کرتا ہے۔ میں نے بارہا اس کے نینوں میں جھانک کر دیکھا ہے' وہ میرے جسم کے علاوہ میری آتما سے بھی پیار کرتی ہے۔ بارہا میری پیشانی کو چوم کر یہ جواز پیش کرتی ہے کہ شاستروں کے انوسار ہماری آتما جنم سے مرن تک ہمارے ماتھے کے درمیان موجود رہتی ہے۔ جب تم من کو پگھلا دینے والی باتیں کرتے ہو تو تمہاری آتما کو چھونے کو جی چاہتا ہے۔ اس کی زبانی شاستروں کا ذکر سن کر مجھے خاصا اچنبھا ہوتا ہے کہ اس نے اپنے ماتا پتا کی چھوڑی ہوئی دھرتی کو دور سے دیکھا تک نہیں۔ وہ تو پردیس میں پیدا ہوئی' وہیں کی اقدار اور روایات کے سہارے پلی بڑھی ہے۔ لیکن اس کے عمر رسیدہ والدین نے اسے اپنی سنسکرتی' دھرم اور سبھاؤ کے درس دے رکھے ہیں۔ وہ گاہے گاہے مجھ سے ان موضوعات پر بات کر کے لطف حاصل کرتی ہے۔ اس لیئے کہ میں بدھ' نانک' کبیر اور گاندھی کی بھومی کو چھوڑ کر دانہ پانی کی تلاش میں یہاں آن بسا ہوں۔ لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اپنے ورثے سے خوب واقف ہوں۔ پدما خود مختار ہونے کے ساتھ ساتھ برسر روزگار بھی ہے۔ حالانکہ ایک وقت تھا کہ وہ بھی میری طرح بے کار تھی اور ادارہ سوشل سیکورٹی کے دفتر کے چکر کاٹا کرتی تھی۔ وہیں اس سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ پھر سلسلہ چل نکلا اور ایسا چلا کہ وہ تا حال جاری ہے۔۔۔۔ ایک دفعہ ہم بے روزگاری کے دفتر میں مقررہ دن کے مقررہ وقت پر دستخط کر کے باہر آئے تو میرے دریافت کرنے پر کہ وہ کہاں مقیم ہے؟ اور اگر اس کی قیام گاہ قریب ہے تو ہم باتیں کرتے ہوئے' مزید ایک دوسرے کو سمجھتے ہوئے اکٹھے قدم بڑھا سکتے ہیں' چلتے چلتے وہ اچانک رک گئی۔ پلکیں جھپکائے بنا مجھے دیکھتی رہی' دیکھتی رہی۔ پھر اس نے میرا اعتماد بڑھانا چاہا۔

"تم میرے نئے دوستوں میں سے ہو اور میں دوستوں سے کوئی بات چھپانا پسند نہیں کرتی۔ یہ میرے کردار کا ایک پہلو ہے۔ دوست اس بات کا احترام بھی کرتے ہیں۔۔۔ میں قریب ہی Y.W.C.A (وائی ڈبلیو سی اے) میں ٹھہری ہوئی ہوں۔"

دوران گفتگو مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ اپنے والدین سے ناراض ہو کر وہاں رہنے چلی آئی تھی۔ وجہ اس نے یہ بیان کی کہ یوں تو اس کے بزرگوار اس ملک میں ایک لمبے عرصے سے مقیم ہیں' لیکن وہ یہاں کے بنیادی ڈھانچے اور یہاں کے معاشرے کو سمجھ نہیں پائے۔ اگر وہ بذات خود جنریشن گیپ (GENERATION GAP) کو سمجھ سکتی ہے تو انھیں بھی کچھ کچھ محسوس کرنا چاہیئے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے پیچھے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اب اس سے نجات پانا ممکن نہیں رہا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک ڈھلتی رات کو ان کے درمیان زبردست تکرار ہوئی۔ پدما گویا اپنے حواس کھو بیٹھی۔ وہ چیختی چلاتی' اپنا مختصر سا سامان سمیٹ کر' گھر کا دروازہ قریب قریب توڑ کر چلی گئی۔ اس کے بزرگ رات بھر پریشان رہے اور اس دن کو کوستے رہے' جب انہوں نے اپنے وطن عزیز کو خیرباد کہا تھا۔۔۔۔ صبح تڑکے کا نور پھیلا بھی نہ تھا' جب پدما نے انھیں فون پر آگاہ کیا کہ اس نے رات کہاں بسر کی ہے' تب کہیں ان کے ٹوٹتے ہوئے بدنوں میں زندگی عود کر آئی تھی۔۔۔ مگر وہ بوڑھے لوگ اپنی اولاد سے دور رہنے کا تصور کب تک اور کہاں تک کر سکتے تھے؟ جلد ہی وہ اپنی بیٹی کی طرز زندگی اور اس کے رویوں کے آگے جھک گئے۔ پدما ان شرائط پر گھر لوٹ گئی کہ آئندہ کوئی اس کی ذاتی زندگی میں دخل نہیں دے گا۔ وہ کسی بھی وقت' کسی بھی دوست کے ساتھ جانا چاہے یا لوٹنا چاہے' اس پر کوئی روک تھام' کوئی کرفیو عائد نہیں ہو گا۔ وہ چونکہ بالغ ہے' تعلیم یافتہ اور ذہین بھی۔ اپنے حقوق کو جانتے ہوئے اپنی دیکھ بھال خود کر سکتی ہے۔۔۔ یہ سب جان کر میں نے پدما سے کہا تھا۔

"تم نے بہت اچھا کیا کہ واپس چلی گئیں۔۔۔ تم کیا جانو ماں باپ کا سایہ کیا ہوتا ہے۔ وہ ہر اچھے برے وقت میں اولاد کی حفاظت کرتا ہے۔"

وہ سرراہ مجھ سے بے اختیار لپٹ گئی تھی۔ اس نے اپنے پاؤں میرے

ہونٹوں پر رکھ کر اپنا قد بڑھانا چاہا اور میرے گلے میں بازو ڈال کر ایک کر میرا منہ چوم لیا۔

اور ایک صبح جب پہلا پیرو ٹوٹنے کے قریب تھا' آنکھ کھلنے پر میں نے دیکھا' میرے کمرے کی دہلیز کے پاس قالین پر ایک خط میرا انتظار کر رہا ہے۔ خط کونسل کی طرف سے آیا تھا۔ لکھا تھا۔

ڈیر پی ایس کمند۔

کونسل بڑے افسوس کے ساتھ یہ خط لکھ رہی ہے کہ تمھیں ایک لمبے عرصے تک بیڈ اینڈ بریک فاسٹ کے ایک مختصر سے کمرے میں قیام کرنا پڑا۔ جب کہ ہمارا ارادہ یہ تھا کہ تمھیں وہاں چند ہفتوں کے لیئے رکھا جائے۔ ہم اس غلطی کے واسطے معذرت خواہ ہیں۔ لہٰذا کونسل کا فیصلہ ہے کہ تمھیں دو کمروں کا فلیٹ فورا مہیا کیا جائے۔ اس سلسلے میں تم مسٹر گولڈ اسمتھ سے رابطہ قائم کرو۔ شکریہ۔

جوں جوں میں خط کی سطریں پڑھتا جارہا تھا' میرے ہاتھوں کی لرزش بڑھتی جا رہی تھی۔ بلکہ خط کا مضمون بھی ٹھیک ٹھیک سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ دوبارہ پڑھنے پر ہی واضح ہوا کہ میں اپنے مقصود کو حاصل کرچکا ہوں۔ خط کو چوم کر اور اسے چھت کی طرف اچھال کر لگا کہ میں اپنی زندگی کو راہ راست پر لانے کی خاطر بنیاد رکھ چکا ہوں اور اب میدان ہر اختیار سے میرا ہے۔

اور ایک شام مجھے پدما سے ملنا تھا۔ ویک اینڈ (WEEKEND) کا آغاز ہو چکا تھا۔ پانچ روز تک عرق ریزی کرتے کرتے پدما کو اس شام کا بے صبری سے انتظار رہا کرتا تھا۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتی تھی کہ ہر شام فرائی ڈے (FRIDAY) کی شام کیوں نہیں ہوا کرتی؟ میں اس کے دل پسند پب (PUB) میں داخل ہوا تو وہاں ایک ہنگامہ تھا۔ ہر طرف لوگ پھیلے ہوئے تھے۔ قہقہے' ہنسی مذاق' آوازیں' موسیقی' حسن اور دھواں ہر کونے سے اٹھ رہا تھا۔ لیکن میری نظریں پدما کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ ایک کونے میں اکیلی بیٹھی کسی سفید مشروب سے دل بہلا رہی تھی۔ گلاس کے قریب PEANUTS کا پیکٹ دھرا تھا۔ میں بمشکل تمام کاؤنٹر پر پہنچا اور اپنی ڈرنک خرید کر پدما کے مقابل بیٹھ گیا۔ اس سے قبل کہ ہم رسماً ایک دوسرے کا حال احوال پوچھتے' میں نے چابیوں کا گچھا جیب سے نکال کر اس کے آگے رکھ دیا کچھ اس شان سے کہ وہ میری زندگی کا کل اثاثہ ہو۔ وہ اس کے لیئے ایک معما بن گیا۔ اسے غور سے دیکھتے ہوئے اس نے گلاس ٹکرائے اور حیرت سے پوچھا: "یہ کیا ہے؟"

"نئے ٹھکانے کی چابیاں۔۔۔"

"مطلب؟"

"تم سے کہا تھا نا' اب تمھیں تراش نہیں کروں گا۔۔۔ فلیٹ مل گیا ہے اور وہ بھی بالکل ماڈرن" اسے میرے کہے پر مشکل سے ہی یقین آتا تھا۔ سچائی جاننے کی خاطر وہ میری آنکھوں میں اتر گئی۔

"فلیٹ دیکھو گی تو دنگ رہ جاؤ گی۔۔۔ وہاں کا ماحول تو کمال کا ہے۔۔۔ بیڈ روم سے بہتا ہوا دریائے ٹیمز (THEMES)' اس پر رواں دواں اسٹیمر' لانچ' کشتیاں۔۔۔ فاصلوں پر لمبے پل۔۔۔ پارلیمنٹ ہاؤس' بگ بین (BIG BEN) اور کچھ فاصلے پر سینٹ پال کے گرجے کا تاریخی گنبد' سب وہاں سے دکھائی دیتے ہیں۔"

"سچ کہہ رہے ہو۔۔۔؟"

"ہاں۔ رات کے وقت تو کچن سے ایسا نظارہ دکھائی دیتا ہے کہ بس پوچھو مت۔۔۔ روشنیوں سے جگمگاتا ہوا شہر' جلتے بجھتے نیون سائن آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے' اپنے پاس بلاتے ہوئے۔۔۔ یہ سب دیکھ کر تو آدمی جھوم اٹھتا ہے اور شراب پینے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔"

اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ بائیں ہاتھ کی انگلیاں میز پر تھاپ دینے لگیں اور دایاں ہاتھ گچھے کو اٹھا کر ہوا میں اچھالنے لگا۔

"تمھاری شاعری سن کر تو جی چاہتا ہے' تمھارا ٹھکانا آج ہی دیکھا جائے۔"

"مجھے خوشی ہوگی۔"

"اور اگر تمھاری شاعری اور حقیقت میں فرق ہوا تو۔۔۔؟"

"تم جانتی ہو۔ میں نے جھوٹ بولنا چھوڑ دیا ہے۔"

لیکن وہ مسلسل گچھے کو اچھالتی ہوئی میری آنکھوں میں اتری ہوئی تھی۔ میں نے فورا پینترا بدلا۔

"اچھا اب ایمانداری سے بتاؤ' میرا گھر آباد کرنے کب آرہی ہے؟"

"کیا یہ ضروری ہے؟" اس نے شرارتاً کہا۔

"بالکل۔۔۔ اسی واسطے تو یہ ٹھکانا حاصل کیا ہے۔"

مجھے سنجیدہ دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔ پلکیں جھکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی' دیکھتی رہی' میں جانتا تھا زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا' یقیناً اسے وقت چاہیئے۔ گھونٹ بھرتے وقت بھی اس نے سوچ کا دامن نہ چھوڑا۔۔۔ انجام کار خود ہی بول اٹھی۔

"اس میں شک نہیں میں تمھیں پسند کرتی ہوں۔۔۔ تمھارے ساتھ رہا بھی جاسکتا ہے۔۔۔ لیکن میری چند شرطیں ہیں۔ اگر تم مان جاؤ تو۔۔۔؟"

سنجیدہ تو میں تھا ہی' اب محتاط بھی ہو گیا۔ میری سمجھ میں یکسر نہیں آرہا تھا کہ اس کی شرطیں کیا ہو سکتی ہیں ہم تو پریمی ہیں' پریمیوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں۔ آگے چل کر دیکھیں گے کہ زندگی کیا رخ اختیار کرتی ہے؟ اور ہم کن سمتوں میں سفر کرتے ہیں؟ وہ اپنی کرسی کو آگے کھسکا کر بولی۔

"ہر سنیچر کی صبح ہم گھر' کچن اور ذاتی ضرورت کا سامان اکٹھے جاکر خریدا کریں گے۔ جتنا بھی خرچ آئے گا' ہم بانٹ لیا کریں گے؟"

"مجھے منظور ہے۔"

"تم جانتے ہو صبح میں کام پر جاتی ہوں۔ شام کو تھکی ہاری دفتر سے لوٹا

کرتی ہوں... تب تک تم کھانا تیار رکھا کرنا.... ہم آرام سے بیٹھ کر کھایا کریں گے.... برتن میں صاف کردیا کروں گی۔ ہوسکا تو ڈش واشر لگوالیں گے... مگر ویک اینڈ پر ڈنر باہر ہی کیا کریں گے۔"

میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا' میں اپنے نئے ٹھکانے کے کچن میں کمر' ایپرن باندھے کھانا پکا رہا ہوں۔ صرف یہی نہیں بلکہ فرنیچر کی جھاڑ پونچھ بھی کررہا ہوں اور آخر کار ڈومیسٹک سرونٹ (DOMESTIC SERVENT) بن کر رہ گیا ہوں۔ لیکن میں نے کوئی رد عمل ظاہر نہ ہونے دیا۔ بگلا بھگت بنا خاموش بیٹھا رہا۔ وہ پہلو بدل کر اور ایک دو گھونٹ بھر کر بولی۔

"جو بات میں کہنے جارہی ہوں۔ وہ بہت اہم ہے۔ اسے غور سے سننا... میں نہیں چاہتی بعد میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو۔"

"بے دھڑک کہو' جو کہنا چاہتی ہو؟"

گلا صاف کرکے وہ رواں ہوگئی۔

"صرف ویک اینڈ پر ہی تمہیں میرے قریب آنے کی اجازت ہوگی' وہ بھی صرف ایک بار... ہفتے کے دوران اگر تم کسی بھی روز مجھے چھوؤ گے یا زبردستی کرنا چاہو گے تو اسی وقت میں سامان اٹھا کر چلی جاؤں گی۔"

یہ تختی ہضم کرنا میرے لیئے آسان نہ تھا۔ میں حیرت زدہ اسے دیکھتا جارہا تھا۔

"تمہیں حیران ہونے کی ضرورت نہیں... مجھے اپنا بدن اور اس کی بناوٹ کو قائم رکھنا ہے۔ دفتر میں کام بھی تو کرنا ہے... یہ بھی کہتی چلوں میری مرضی کے بغیر ویک اینڈ پر تم مجھے دوبارہ ہرگز نہیں چھوؤ گے۔"

مجھے لگاتار جھٹکے لگتے جارہے تھے۔ اس نے گلاس کو ختم کرکے کہا۔

"یہ کہنا تو میں بھول ہی گئی۔ ہمیں پوری احتیاط برتنی ہوگی... اگر میرا پاؤں بھاری ہوگیا تو زندگی کا زاویہ بدل جائے گا اور پریشانی ہمیں الگ ہوگی۔"

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی شرطیں اتنی سخت' اتنی بے جا ہوں گی۔ میں تو اس خیال میں تھا کہ اس کی آمد پر میرے کئی مسائل خود بخود حل ہوجائیں گے۔ دن رات قربت رہے گی' پیار بڑھے گا اور جیون میں واجب رچاؤ پیدا ہوگا۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی برعکس ہے۔ اسے خاموش پاکر میں نے کہا۔

"اور بھی کچھ کہنا ہے تمہیں...؟"

"ہاں... تمہارے ساتھ ایک برس رہ کر دیکھوں گی' آیا میں باقی زندگی تمہارے ساتھ گزار پاؤں گی یا نہیں۔"

مجھے غصہ آگیا' لیکن میں نے خود کو ضبط کے دائرے سے آزاد نہ ہونے دیا اور بولا۔

"یہ تو سوشل کنٹریکٹ ہے' جو تم مجھ سے کرنا چاہتی ہو۔"

"تو کیا ہوا؟... اس میں برائی بھی کیا ہے؟... اس دوران ہم ایک دوسرے کی سوچ' رویئے' فطرت' عادتیں' دلچسپیاں' خوبیاں' خامیاں سب جان جائیں گے۔

بات میری سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ بلینک چیک پر دستخط کرنے سے خوف کھاتی ہے' کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتی۔ مجھے اپنا منصوبہ غرق ہوتا دکھائی دیا۔ حالانکہ وہ منصوبہ نہ تھا' زندہ رہنے کا وسیلہ تھا' جسے مل کر ہمیں عملی جامہ پہنانا تھا۔ میں پریشان ہوگیا۔۔۔ پھر کہیں سے لپک کر یہ خیال میرے ذہن میں ابھرا کہ لگے ہاتھوں میں بھی چند کڑی شرطیں عائد کرکے اسے الٹا دیوار کے سامنے کھڑا کردوں۔ تاکہ اسے میرے وقار' میری مردانگی اور میری انا کا بڑھ چڑھ کر احساس ہو۔ پینترا بدلنا میرے لیئے لازمی ہوگیا۔

"میری بھی کچھ شرطیں ہیں' اگر تمہیں منظور ہوں تو..."

اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ میں بھی اس جیسا کوئی قدم اٹھا سکتا ہوں۔ میں نے دھیرے سے کہا۔

"پورے گھر کی صفائی تم کیا کروگی۔"

اس کی آنکھیں پھیل کر فریز ہوگئیں۔

"ہفتے کے دنوں میں روکھا سوکھا ہوکر میں خود پر جبر کرلیا کروں گا... لیکن ویک اینڈ پر میری روح کوئی پابندی برداشت نہیں کرے گی... یہ طے ہے۔"

وہ مصری ممی کی طرح سفید پڑ گئی۔

"تم نے آزمانے کی مدت ایک برس رکھی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کسی کو جاننے کے لیئے چھ ماہ بہت ہوا کرتے ہیں... بولو' اب کیا کہتی ہو؟"

وہ میرے رویئے سے ذرا بھی خوش نہ تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اسے بولنے کے قابل ہی نہ چھوڑا تھا۔ وہ چترائی ہوئی' مورت بنی مجھے دیکھتی جارہی تھی' دیکھتی جارہی تھی۔ مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ جس زمین پر وہ کھڑی تھی' وہ سرک کر میرے پیروں تلے چلے آئی ہے اور اب اللہ ہی اس کا حافظ ہے۔۔۔ چابیوں کا گچھا ہمارے درمیان جوں کا توں پڑا تھا۔ ہم اسے بھی ایک نظر دیکھ لیا کرتے تھے' کبھی دزدیدہ اور کبھی براہ راست۔ لیکن ہم دونوں' مقابل آنکھوں میں جھانک کر جاننا چاہ رہے تھے کہ برف کا تودہ توڑنے میں پہل کون کرے گا۔۔۔ یہ ایسا سوال تھا' جس میں ہماری عزت نفس' محبت اور مستقبل سب شامل تھے۔ ہم اپنی اپنی جگہ پر بے حد محتاط تھے کہ کہیں زندگی کی بساط الٹ نہ جائے۔

اچانک چترائی ہوئی مورت کی اوپری سطح میں حرکت ہوئی' دراڑیں پڑتے ہی لب وا ہوگئے اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ پھر ہنستی چلی گئی اور اسی موڈ میں اس نے گولی کی طرح سوال داغا۔

"تمہارے گلاس خالی ہیں۔ ٹھکانا ملنے کی خوشی میں جشن نہیں مناؤ گے؟"

"کیوں نہیں' یہ شروعات ہے... اب تو جشن ہی جشن ہوا کریں گے۔"

کرسی سے اچھل کر میں نے کاؤنٹر کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ پیچھے سے اس کی آواز سنائی دی "گوونڈ' یہ راؤنڈ میری طرف سے ہے؟" اور دس پونڈ کا نوٹ اس نے میری طرف بڑھادیا۔ ❖ ❖

عبداللہ کمال

میرے دل میں اک جنگل تھا
ــــــ سبز [illegible] جنگل، جس کی
[illegible] میں [illegible] کرتی تھی
[illegible] پھولوں کے مہکتے کنج تھے، جن کی
ہری بھری تر سبز لچکتی شاخوں پر
خوش رنگ تتلیاں
رقص کیا کرتی تھیں
ننھی منی نٹ کھٹ چڑیاں
شاخ شاخ چہکتی پھرتی تھیں
اندھیارے میں جگنو جگ مگ کرتے تھے...
ہر تتلی میری آنکھوں میں اڑتی تھی
ہر چڑیا میرے کانوں میں چہکتی تھی
ہر جگنو میری مٹھی میں چمکتا تھا!
جنگل میں اک جھیل تھی...
ــــــ ٹھنڈے میٹھے پانی کی جھیل
نرم خنک ہوائیں جس کے
ہونٹوں کو چوما کرتی تھیں
جس کے سینے پر چاند کنول کھلتے تھے، جن سے
چاندی کے فوارے اچھلتے رہتے تھے
چنچل جھرنے اونچے پربت سے
ناچتے گاتے پک پک نیچے اترتے تھے
اور جھیل کے گہرے سینے میں چھپ جاتے تھے...
سارا جنگل گیتوں سے بھر جاتا تھا
ہر پیڑ سلیٹو زوکی بن جاتا تھا
پتا پتا بوتا بوٹا گانے لگتا تھا...
سبز شفق کی شاخ پہ بیٹھا بوڑھا موسیقار
جنگل جیون سے سرشار
اپنے راگ کی آگ میں
جل جاتا تھا...

چاندنی، خوشبو اور ہوا
راکھ پہ تازہ خواب چھڑکنے لگتی تھیں
ــــــ آنے والے موسم اور منظر کے خواب!

میرے دل میں اک جنگل ہے...

ــــــ سخت گھنا جنگل، جس کے اندر
چیخوں کا ایک سمندر، جس میں
تتلی، جگنو، چڑیا، گیت
جھیل، چاند اور چاندنی...
سب ڈوب گئے ہیں
گرم ہواؤں کے جھکڑ
تپتے صحراؤں سے
گرم ریت اڑا کر لاتے رہتے ہیں
سبز شفق، ہریالی اور لچکتی شاخوں کو
جھلساتے رہتے ہیں
چاروں اور
نر بھکشک پشوؤں کی غراہٹیں
گونجتی رہتی ہیں...
میرے ہاتھوں میں بندوق ہے، پھر بھی
میں محفوظ نہیں
ہر آہٹ پر فائر کر دیتا ہوں
ــــــ ہر آہٹ
میرے قدموں کی ہے!

تلاش [1]

عبداللہ کمال

وہ میری خوشبو ہے' چاہے کسی چمن میں رہے
تمام پھول سوارت مری دعا کے ہوئے

جگاؤ مت
ابھی سونے دو اس کو
ابھی تو سوئی ہے وہ
—— مرے سینے پہ سر رکھ کر!

وہ میرے پیار کی پہلی کرن ہے
—— میری خوشبو ہے
مری باہوں میں روشن ہیں ابھی
قلقاریاں اس کی
وہ گہری نیند میں بھی
—— ہنستی ہے مری سرگوشیوں پر
چہکتی ہے
—— مری خاموشیوں پر
مرے قدموں کی آہٹ جان لیتی ہے
مری آواز ہر حالت میں وہ پہچان لیتی ہے
مرے ہونٹوں پہ کھلتی ہے سدا وہ
پھول کی صورت
میں اس کے ریشمی رخسار
اپنے کھردرے ہونٹوں سے چھو کر
تروتازہ رہا کرتا ہوں دن بھر!

جگاؤ مت
ابھی سونے دو اس کو ....!

مری بانہیں ابھی تک اس کی کرسی ہیں
وہ اس کرسی پہ جب بھی بیٹھتی ہے
کوئی شہزادی لگتی ہے
—— مغل شہزادی کوئی

عجب نخوت' جلال و تمکنت کے ساتھ
اردوئے معلّیٰ سے نکلتی ہو
رعایا سے خراجِ حسن لینے
زکاتِ حسن دینے!

عجب معصومیت ہے اس کے چہرے پر
—— تحیر کی
نئی قندیلیں روشن اس کی آنکھوں میں
—— تجسس کی
نجانے کن جزیروں کی مہک ہے
—— اس کی باتوں میں
طنابیں شش جہت کی آ گئی ہیں
—— اس کے ہاتھوں میں!

مری باہوں کی کرسی پر
نکلتی ہے کبھی جب سیرِ دہلی کو

تو پہلے لال قلعہ فتح کرتی ہے
کہ صوت و نور کے راوی کا اندازِ روایت
بہت مرغوب ہے اس کو
پرانی داستاں اپنے بزرگوں کی
بہت محبوب ہے اس کو!

وہاں سے واپسی میں
کوئی اندھی خلش ....
عجب بے نام سی کوئی اداسی ...
لے کے آتی ہے
مگر کچھ دیر ہی میں
بہل جاتی ہے آکر چاندنی چوک
کہ گھنٹے والے حلوائی سے اس کی
خوب بنتی ہے

بہت محظوظ ہوتی ہے
وہاں کی ہش ہشوں اور گہما گہمی سے!

دریبے سے گزر کر
چاوڑی بازار سے آگے
اذاں سنتی ہے جب وہ جامع مسجد کی
تو جانے کیوں
بڑی حیرت سے
سر اوپر اٹھا کر
آسماں کو دیکھتی ہے؟
مچل جاتی ہے آکر اردو بازار
کوئی سقا بہشتی جب
کٹورے کھن کھنائے
کہیں سے شاعری کی خوشبو آئے
کوئی شاگرد و استاد رسا جب گنگنائے
تو وہ بے ساختہ
قلقاریوں کی اونچی قرأت میں
لنک کروا دیتی ہے
ہیں قائل اہل دہلی بھی
سخن فہمی کے اس کی
سند استاد دہلی دے چکے ہیں!
نئی دہلی میں چڑیا گھر
پسندیدہ جگہ اس کی
بہت مقبول ہے وہ
وہاں کے بندروں میں
ہرن' خرگوش' بھالو بھی ہیں
اس کے دوستوں میں
مگر جب بھی وہاں پہنچی
تو ہاتھی کی سواری کی
ملی تو تے سے مینا سے!
مری باہوں کی کرسی پر ... وہ اک دن
حضور حضرت خواجہ نظام الدین پہنچی

---

[1] میری بیٹی — البانہ کمال

سلامی دی
عقیدت کے تبسم نذر کر کے
مزاج حضرت خسرو بھی پوچھا
مزار میرزا غالب پہ آ کر
غزل اپنی سنائی داد بھی پائی
وہاں سے سوئے مہرولی چلی وہ
قطب مینار پر پہنچی
نشان عظمت رفتہ کو چوما
اذان عظمت آئندہ دی اس نے
گئی پھر شانتی ون
نہائی آب جمنا میں
پیا زم زم کا پانی
---- اور اک دن
.... بمبئی پہنچی!
جگاؤ مت
ابھی سونے دو اس کو
ابھی وہ تھک کے آئی ہے
مرے سینے پہ سوئی ہے ....!

بہت مصروف رہتی ہے یہاں وہ
قلم کاغذ سے دن بھر کھیلتی ہے
قلم کاغذ کا کھیل
---- اس کا پرانا مشغلہ ہے
غزل ہو
نظم ہو
تصویر کاری ہو....
وہ کچھ بھی لکھ کے رکھ دیتی ہے پل بھر
لکیریں بولتی ہیں
---- کہ ان کو زندگی کس نے عطا کی
کبھی کاغذ کے پرزوں پر
کبھی دیوار پر.... در پر
کبھی اپنی ہتھیلی پر
شکستہ خط میں
"پ" اور "پا" بھی لکھتی ہے
---- وہ میرا نام لکھتی ہے
بہت مصروف رہتی ہے!

وہ واقف ہے غزل کی ہر ادا سے
--- شفق سے
چاند سے
پھولوں سے
خوشبو سے
صبا سے....!
رموز شاعری سارے
علامت، استعارے
کنیزک اور غلام اس کے
کھڑے رہتے ہیں اپنے ہاتھ باندھے
تمام الفاظ و معنی اس کے آگے
اجازت ہو، تو بولیں
غزل کے راز کھولیں
نئے اسلوب و آہنگ
نئے ہیں... مگر اس کی اجازت سے!

وہ دنیا کی بہت سی بولیاں بھی بولتی ہے
ہے اک آفاقیت اس کی زباں میں
زمینیت زیادہ اس کی "غوں غاں" میں!

نہ جانے رات کی وہ کون سی ساعت تھی، جس میں
مری آنکھیں اچٹتی نیند کی زد پر تھیں، لیکن
مرے سب خواب چکنا چور سے
بکھرے پڑے تھے
میں اک طوفان کی زد پر تھا اندر سے

مرے باہر تھی پر اسرار خاموشی
رگوں میں کوئی آندھی سنسناتی تھی
مرا سارا وجود اک آگ کا گولا بنا تھا
اچانک پھٹ پڑا... آتش فشاں سا کچھ...!

کئی طوفان پہلے بھی مرے اوپر سے گزرے ہیں
بہت کھیلا ہوں میں آتش فشاں سے....
مگر اس بار
شاید جل گیا سب کچھ ----
مرا گھر بار

میرے موسم و منظر
مرا سارا اثاثہ
مرے سب چاند تارے
کہیں گم ہو گئے سارے
میں مفلس ہو گیا، لیکن
دل برباد باقی ہے
بس اتنی یاد باقی ہے...
جلے تھے خواب میرے
مگر میں نے
اسے ہر آگ سے
آندھی سے
طوفاں سے بچایا تھا
اسے محفوظ رکھا تھا بلاؤں سے
سدا خود کو جلایا تھا!

---- اور اب یوں ہے
کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں
کہ میرا نام اب کچھ بھی نہیں ہے
---- کہیں پر بھی نہیں ہے
تو پھر کیا ڈھونڈتا ہوں میں
کسی کاغذ کے پرزے پر...
کسی دیوار پر... در پر....
کسی ننھی ہتھیلی پر...
میں آخر ڈھونڈتا کیا ہوں؟
مجھے کس کی ضرورت ہے؟
کسے میری ضرورت ہے؟

حقیقت اب کہانی ہو چکی ہے
کہانی بھی پرانی ہو چکی ہے
کہ اب وہ ننھی ناشی
---- سیانی ہو چکی ہے!
جگاؤ --- مت ابھی سونے دو اس کو
مرے سینے پہ سر رکھے
ابھی تک سو رہی ہے وہ ---؟

غزل

عبداللہ کمال

میں نے جی ہے غزل، لکھا کیا ہے
زندگی کا یہ تجربہ کیا ہے

ایک اک شعر میں بسر ہوتا
خرچ ہوتا یہ حوصلہ کیا ہے

کیا ہے آہنگ، جز نوائے نفس
میرے اسلوب میں نیا کیا ہے

پس انفاس اک طلسم طلب
لوح مفہوم جز ہوا کیا ہے

ذات ہے میری یا کہ زخم سا کچھ
پس اظہار خوں شدہ کیا ہے

کیا ہے توفیق اختیار مری
بیش از یک قدم بتا کیا ہے

کیوں میں اس دوسرے سے خائف ہوں
آئینہ آئینہ بتا کیا ہے

کون موجود ہے سوا میرے
اور جو ہے، مرے سوا کیا ہے

آگے بڑھتا ہے روند کر خود کو
دوسرا کوئی راستہ کیا ہے

بت شکن میں ہوں، خود شکن بھی میں
اور، یہ تیشہ انا کیا ہے

کوئی اچھا نہیں ہے میرے سوا
خود ستائی سہی، برا کیا ہے

کوئی پہچانتا نہیں مجھ کو
نہ سہی، کوئی جانتا کیا ہے

میں کہ ہوں عارضی کرائے دار
نئے گھر کا مرے پتہ کیا ہے

کس جزیرے کی کھوج ہے مجھ میں
اور خوش خوابیا مرا کیا ہے

اک مسلسل سی گونج کیسی ہے
متواتر سی اک صدا کیا ہے

کیا ہے قتل عزیز دل کا قصاص
خون ناحق کا خوں بہا کیا ہے

غم کا چھڑکاؤ دل پہ کرتے رہو
درد میں ورنہ ذائقہ کیا ہے

پتھروں پر سجاتا قوس قزح
عشق کیا ہے، مری وفا کیا ہے

خواب ہیں رزق میری آنکھوں کے
چاند راتوں میں ڈھونڈتا کیا ہے

میرے لب سے ہے اک فلک روشن
چاند تاروں سی یہ دعا کیا ہے

کس حوالے سے آج روشن ہے
کل سے اب میرا رابطہ کیا ہے

دھند یادیں، دھواں دھواں چہرے
پس دیوار جھانکتا کیا ہے

میرے اندر بہت غزل ہے ابھی
اور اس دشت میں بچا کیا ہے

میرے عرض ہنر سے آگے کمال
کوئی غالب کہ میر سا کیا ہے

جمیل الرحمٰن

آنکھوں کی بات بھی نہ سنی میں نے کیا کیا
اب میں ہوں اور اندھی گلی میں نے کیا کیا

کس لہر میں تھا موج کو ساحل سمجھ لیا
دریا پہ اک نگاہ نہ کی میں نے کیا کیا

رکھتا ہے کون خیمہ بگولوں کے دوش پر
اے باد وشت دیکھ کبھی میں نے کیا کیا

دامن پہ جس کے بول رہا تھا مرا لہو
یہ کہہ کے ہوگیا وہ بری میں نے کیا کیا

جب شام آب و آئینہ میں گھل گئی جمیل
تم نے تو کی ستارہ گری میں نے کیا کیا

رخصت طیور ہوگئے موسم کڑا ہوا
صیاد ایک ضد پہ ہے لیکن اڑا ہوا

ملتی نہیں خبر مرے سالم وجود کی
اک بال آئینے میں ہے ایسا پڑا ہوا

ہم جعلیوں نے بھی نئے چہرے پہن لیے
دنیا ہی اور ہوگئی وہ جب بڑا ہوا

مٹی سمیٹ لایا بدن کی جہاں سے میں
ہوگا وہیں کہیں مرا سایہ پڑا ہوا

یونس کے ننھوا سا کوئی ملک ہے جمیل
دہلیز پر عذاب ہے جس کی کھڑا ہوا

جمیل الرحمٰن

پہلے دیوار ستم سے اک صدا ٹکرا گئی
پھر کدالوں کو اٹھائے ساری بستی آگئی

ایک جگنو ایک تتلی ایک بچہ اور تم
کتنی آنکھوں میں گھرے تھے جب فضا دھندلا گئی

بھولنے کی لاکھ کوشش کی مگر وہ داستاں
یاد کے زینے سے اتری اور لبوں پر آگئی

اک ہوائے خود فراموشی میں سب کچھ لٹ گیا
کیا کریں اب چارہ گر کہ شہر دیمک کھا گئی

کچھ نہیں سیکھا یہاں تہذیب نے تاریخ سے
ابن آدم سے جمیل اب تو زمیں اکتا گئی

کیا خبر تھی ایک دن یہ حادثہ ہوجائے گا
تجھ سے کترائے تو خود سے سامنا ہوجائے گا

رہ بگولوں کو دکھا کر خود بھی ڈوبیں گے نجوم
صبح تک وہ شہر بھی وشت قضا ہوجائے گا

میں زمیں کے ہر کنارے سے اسے دوں گا صدا
اس نے بھی دل کی سنی تو رابطہ ہوجائے گا

رنگ افشاں ہیں ابھی موسم زمین شوق پر
رنگ اب قلب ونظر کا دوسرا ہوجائے گا

اس کی مت پوچھو میاں سیماب فطرت ہے جمیل
وہ ہوا عاشق کبھی تو کیمیا ہوجائے گا

فلک پہ شور ہے پہلو بدل رہی ہے زمیں
بلا تھی بندگی جن پر جھکا رہے ہیں جبیں

بہت کہا کہ مری انگلیاں نہ کاٹ ابھی
مری گرفت میں تو ساعت رواں بھی نہیں

نہیں تھا شہر انا میں کسی کو یاد خدا
فصیل اسم پہ نام اپنے لکھ رہے تھے مکیں

عجب سفر تری پہچان کا سفر نکلا
کہ عمر کٹ گئی لیکن مسافتیں نہ کٹیں

جمیل دیدۂ و دل سے تھے کاروبار خرد
نظر کہ جھکتی نہیں اور دل ہے گوشہ نشیں

جمیل الرحمٰن

حسب توفیق رسائی کے ہنر جانتے ہیں
حرمت خاک ہیں انجام سفر جانتے ہیں

اڑ گئے جتنے پرندے وہی محفوظ رہے
ورنہ جنگل پہ جو گزری ہے شجر جانتے ہیں

کس لیے اشک سبھی صرف چراغاں کردیں
کچھ ہنر اور بھی ہم دیدۂ تر جانتے ہیں

کیسی آنکھیں تھیں کہ جن آنکھوں سے دنیا دیکھی
کیسی دنیا تھی جسے بار دگر جانتے ہیں

قریہ شب میں جمیل اک تھی مصروف جنوں
روشنی کیسے ہوئی تیرہ نظر جانتے ہیں

کہاں یہ سوچا سرِ دشت ہم نے آتے ہوئے
کٹے گی کیسے بگولوں میں سر چھپاتے ہوئے

عجب گھڑی تھی قیامت کی حشر سے پہلے
دعائیں بھول گئے لوگ سر جھکاتے ہوئے

فصیل اسم پہ پھر لکھ رہی ہے یاد وفا
بس ایک نام ہر اک نام کو مٹاتے ہوئے

کھلا کہ دشت و وطن میں ہے فاصلہ کتنا
گرے جو سجدے میں آنسو کبھی بہاتے ہوئے

بچالی بانسری اپنی کمال یہ ہے جمیل
کسی نے آگ بھرے شہر کو لگاتے ہوئے

عذرا عباس

میرا تصور شاعری کیا ہے۔ آج اس پر بات کرتے ہوئے آپ میں سے شاید کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ چھوٹا منہ اور بڑی بات۔ لیکن تین کتابیں لکھنے کے بعد جب میں خود اپنے آپ سے یہ سوال کرتی ہوں کہ میں نے کیوں لکھا۔ میں نے لکھنا کیوں ضروری سمجھا۔ کیا لکھے بغیر میرا گزارا ہو سکتا تھا۔ کیا میں صرف ایک بیوی' اور کچھ بچوں کی ماں بن کر مطمئن نہیں ہو سکتی تھی؟ تو یہ جواب میں خود کو دیتی ہوں کہ۔ نہیں۔ یہ جو لکھنے کی مجبوری میرے ساتھ ہے۔ یہ اس وقت ہی میرے لیئے اہم ہو گئی تھی جب سے میں نے سوچنا شروع کیا تھا۔

پھر یہ کہ کیا میں نے ہی سوچنا شروع کیا تھا۔ کیا میرے اردگرد کے لوگ نہیں سوچ رہے تھے۔ میرے بھائی' میری بہن' مرے ماں باپ' پھر میں نے ہی لکھنا کیوں شروع کیا۔ اس کا جواب میرے پاس آج بھی نہیں ہے۔ لیکن شاید میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میں اس سوچنے سے اتنی گھبرا جاتی تھی کہ مجھے لگتا تھا۔ میں تنہا ہوتی جا رہی ہوں اور اس تنہائی کو دور کرنے کے لیئے میں نے لفظوں کو اپنا ساتھی بنا لیا۔ پہلے وہ میرا ساتھ دینے سے کتراتے تھے۔ لیکن پھر وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ سوچ میرا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ سوچ جو زندگی کے ایک ایک کونے سے نکل کر میرے چاروں طرف منڈلاتی۔ بعض دفعہ مجھے باہر کی دنیا سے اتنا علٰحدہ کر دیتی کہ میرے ساتھ چلنے والے اور میرے ساتھ رہنے والے لوگ بھی گھبرا کر مجھے دیکھنے لگتے--- یہ کون ہے؟

لیکن یہ سوچ آسمان سے نہیں گرتی تھی۔ یہ میرے دماغ میں کسی ایسے خیال کے ساتھ نہیں آتی تھی جسے لکھنے کے بعد میں یہ کہتی "یہ فینٹسی ہے۔" بے شک میں نے بہت خواب دیکھے' بہت سی مسافتیں خواب میں طے کیں۔ لیکن میرا ایک ایک لفظ میری زندگی سے مربوط تھا۔ زندگی جو میرے چاروں طرف نت نئی شکلوں میں کبھی ہوا کے جھونکے کی طرح--- کبھی سست رفتار قدموں کی طرح گزر رہی تھی۔ میں نے اپنے لفظوں کو زندگی کی ایک ایک سانس سے ڈھالا تھا۔ کبھی بہت پھرتی سے اور ماہر ہاتھوں کی طرح۔ کبھی بہت پھوہڑپن سے۔ لیکن میرے لیئے یہ ناممکن تھا کہ میں آرام سے ایک طرف اس حیثیت سے بیٹھ جاتی' ایک عورت' بیٹی' بہن' بیوی اور ماں اور جو جو رشتے اس سے بندھے ہوئے ہیں۔ ایک جو میں ہوں۔ شاعرہ' جو میری سوچ کی پیداوار تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے متوازی چلنے لگے۔ میں نے کبھی کبھی یہ سوچا کہ میری شاعرہ مجھ سے جدا ہو گئی--- یا مر گئی--- یا مار ڈالی گئی۔ تو میرا کیا ہو گا؟ میں نے شاید تمام تر توانائیوں کے ساتھ اگر کسی سے محبت کی ہے تو وہ اپنی شاعرہ سے۔ میں نے اس کی بڑی سیوا کی۔ اس کے لیئے میں نے کہیں کمپرومائز نہیں کیا۔ جہاں جہاں مجھے اسے بچانا ہوا۔ وہاں وہاں میں نڈھال بھی ہو گئی۔ لیکن بہرحال میں نے اسے بچا لیا۔ اس کو سجایا۔ بنایا۔ سنوارا۔ اس کی نوک پلک درست کی۔ اس کو دوسروں کی زد میں نہیں آنے دیا۔ مجھے معلوم تھا اگر یہ کسی کی زد میں آ گئی تو میں اپنی تنہائی سے خوفزدہ ہو کر خودکشی بھی کر سکتی ہوں۔ شاید میں یرمیاہ کی طرح اس دن پر لعنت بھیج دیتی جس دن مجھے پیدا کیا گیا تھا۔ لیکن اس شاعرہ نے مجھے بچا لیا۔

شاید آپ کو اس وقت کی گفتگو میں مجھے اس نتیجے تک پہنچانے میں دیر لگے کہ میرا تصور شاعری کیا ہے۔ اگرچہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیئے کہ جن لوگوں نے میری شاعری کی تین کتابیں پڑھی ہیں اور جو میرا بچپن بھی پڑھ چکے ہیں وہ جان گئے ہوں گے کہ زندگی کو میں نے ایک فٹ بالر کی طرح اپنے پاؤں کی حرکت پہ رکھا ہے۔ ایک بہترین فٹ بالر جانتا ہے کہ اس کے پاؤں کی کون سی حرکت اس کی گیند کو گول سے قریب لا سکتی ہے اور کتنا دور لے جا سکتی ہے۔

"نیند کی مسافتیں" میری پہلی طویل نظم ہے۔ اس وقت میرے پاس شاعری کا کوئی امیج نہیں تھا۔ اس وقت میرے پاس میرے ان تجربات کا اثاثہ تھا جو میرے ذہنی سفر میں زادِ راہ تھے اور چیزوں کو بغیر کسی بندش کے دیکھنے کی امنگ۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے غزل کی پابند فارم کو اختیار نہیں کیا۔ میرا بچپن پڑھنے والوں کو یہ بات سمجھ میں آ گئی ہو گی--- کہ ایسا بچپن گزارنے والی اور اسے یادوں کی پوٹلی میں باندھنے والی عورت ہی شاید "نیند کی مسافتیں" لکھ سکتی تھی۔

نیند کی مسافتیں اچانک میرے لیئے کرامت بن گئی۔ جب میں نے یہ نظم شروع کی تھی۔ اس وقت میں ایک ایسی لڑکی تھی' جس کے لیئے اپنے ذہنی تجربے اپنی زبان پر لانا گناہِ کبیرہ بن سکتے تھے۔

میرے تجربے جو میں نے کبھی کھلی آنکھ سے کیئے تھے اور کبھی بند آنکھوں سے۔ پھر میرا مشاہدہ' میں نے اپنے ایک ایک قدم کو گنا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ

میرا مطالعہ گورکی' بادلیئر' دوستوفسکی' چیخوف' منٹو اور بہت سے ایسے جن کو پڑھنے کے بعد میرے تجربوں کو زبان مل گئی تھی۔ اگرچہ کہ مجھے اس وقت ہی پتہ چل گیا تھا کہ میں ان سے مختلف ہوں۔ اس لیئے کہ میری سوچ ایک لڑکی ہونے کی حیثیت سے مختلف ہے۔ جب "نیند کی مسافتیں" کی پہلی لائنیں میرے دماغ سے میر انگلیوں کی پوروں تک پہنچیں جس میں میں ایک قلم پکڑے تھی۔ تو میں حیران رہ گئی۔

پانیوں پہ چلتے ہوئے پاؤں ہمارے ہی تھے
سرسراتے ہوئے لباس اور ان کو چھو لینے کی
خواہش میں تم
ہمارے گلابی' اتک کیا تمہاری انگلیوں کی پوروں سے لگے ہیں
تمہیں پتہ نہیں
"تتلیاں اپنی رنگوں کو ڈھونڈ رہی ہیں
تم انہیں مت چھونا
وہ ہمارے گلابی رنگ لے کر اڑ جائیں گی
اور پانیوں پہ چلتے ہوئے ہمارے پاؤں دیکھیں گے
وہ شاید ہمارے ہی ہوں گے
مگر ہم تو جب اپنی ماؤں کے زانوؤں سے لگے کپڑے سی رہے ہوں گے
اور باورچی خانوں سے مصالحوں کی خوشبو اٹھ رہی ہو گی
کیا یہ سچ ہے---!
اگلے دنوں میں سورج کے پیچھے چلتے بدن'
اپنے گناہوں کا حساب دیں گے
اور پرندے ہماری آنکھیں اپنے پروں میں چھپا اڑ جائیں گے
یہ سچ ہے
ہمارے ہاتھوں میں ابھی محبت سے وزنی لفظوں کی خوشبو ہے
ہم راتوں کو اپنے بستروں سے اٹھ جاتے ہیں
جب ہاتھوں میں پڑی ہوئی چوڑیاں بجنے لگتی ہیں
اور بازوؤں سے نیچے' دور تک--- پھیلی ہوئی مدھم خوشبو
ہم کہاں چلے جاتے ہیں
اندھیرے میں پیچھا کرتی ہوئی روشنیاں

پھر اس لڑکی نے جو "نیند کی مسافتیں" لکھ رہی تھی خود کو تجربات کی ایک نئی بھٹی میں ڈال دیا اور وہ بھٹی محبت اور اس کے عوض زمانے کے سماجی تقاضوں کے تحت شادی--- بچے اور پھر کسی چکی ایک روایت کے مطابق وہ چکی جس میں ہر عورت کا مقدر پستا ہوتا ہے۔ اس عورت نے نیند کی مسافتوں کو خیرباد کیا اور چولہا جھونکنے کے اس تجربے میں داخل ہوئی' جہاں روٹی افضل ترین خواب تھی اور دنیا کی سب سے قیمتی شے۔

"میز پر رکھے ہاتھ" تک پہنچ کر میں ایک نئی بات جان گئی تھی کہ توازن بہت ضروری ہے۔ اگر میں نے اس زندگی اور شاعری کے درمیان توازن ہاتھ سے جانے دیا تو شاید میرا بھی حشر ان ہیرو ہیچوں کا سا ہو گا جو فٹ پاتھ پر کمبل اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔ لیکن جب میں اپنی نظم "میز پر رکھے ہاتھ" لکھ رہی تھی تو شاید اس مرحلے سے گزر رہی تھی۔ میں نے اپنے اندر پیدا ہونے والے پاگل پن کو اس نظم میں بھٹکا دیا تھا۔

لیکن اس آہستہ آہستہ اور تیز رفتار وقت نے مجھے بار بار اس بورڈم میں ضرور ڈالا---- جو شاید میرے عہد کے ہر انسان کا مقدر ہے اور وہ اپنے اس مقدر کو اکثر مصلحتاً اپنی گردن کے اوپر آئے ہوئے بالوں میں چھپا لیتا ہے اور پھر اس گردن کو سنبھالنے کے لیئے اسے کالر لگانا پڑتا ہے۔ میں نے اس مقدر کو اپنی گردن کے بالوں میں نہیں چھپایا بلکہ ایک نظم لکھی "جب سارا دن گزر جاتا ہے" اور کئی ایسی نظمیں جو اسی بورڈم کے چاروں طرف سے نکلی تھیں جس میں وہ مرحلہ بھی "جب جسم سے میل اتارنا مشکل لگتا ہے" اور "لے جاتے ہو کہاں۔"

جب میں نے اپنے پہلے بچے کو جنم دیا۔ وہ تجربہ میری زندگی کا عجیب اور موت کے ذائقے کو چکھنے والا تجربہ تھا۔ جی ہاں--- موت کو میں نے تین دن وقفے وقفے سے اپنے بہت قریب دیکھا' اگر آپ اس اذیت ناک اور لذت آمیز تجربے سے نہیں گزرے ہیں تو میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ لیکن اس تجربے کے دوران میں نے عورت کو سلام کیا اور سب سے پہلے اپنے سرہانے کھڑی اپنی ماں کو--- اور اس کے بعد میں نے یہ نظم لکھی۔

ایک نظم لکھنا مشکل ہوتا ہے
ایک وجود کو دوسرے وجود سے باہر دھکیلنا
باہر آلودگیوں کے ڈھیر پر
دھیرے دھیرے
کوئی نام دینے کے لیئے

شاید آپ اب اس CONCLUSION تک پہنچ رہے ہوں گے' جسے میں نے ابتدا میں شروع کیا تھا۔ میرا پہلا جملہ "میرا تصور شاعری۔" آپ سب جانتے ہیں کہ شاعری کو زندگی سے علحدہ کر دیا جائے تو ان اعضا کی طرح ہو جاتی ہے جن پر فالج گر گیا ہو۔

میری تمام شاعری ایک ہی عنوان کے گرد گھومتی ہے کہ "یہ ہے زندگی۔"

اب میں بہت سی زندگیاں گزارنا چاہتی ہوں اور ان تمام زندگیوں میں ایک شاعرہ کی طرح زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ جو زندگی اس دانے میں بھی دیکھ رہی ہے جو ایک پرندے کی چونچ سے گر رہا ہے' اور اس برف میں بھی جو کہیں آنکھوں سے دور کسی پہاڑ کی چوٹی پر پگھل رہی ہے۔

تو میرے دوستو--- میرے نزدیک شاعری ایک عورت ہے' جو زندگی کو تخلیق کرتی ہے اور زندگی سے تخلیق ہوتی ہے۔ ❖ ❖

آئکرس[1]

عبدالصمد

۸۴۰ دبے پاؤں اس کے پاس سے یوں گزری کہ اسے آہٹ بھی محسوس نہ ہوئی۔ وہ تو جب فیروزہ کی نقرئی ہنسی اس کے کانوں میں گونجی تب اسے پتہ چلا۔ سیٹھ تلا رام گاڑی سے اتر کر ستار کے یہاں پان کی دوکان پر خوشبودار گلوریاں بندھوا رہا تھا اور فیروزہ سے حسب معمول آنکھوں آنکھوں میں اس سے کیا باتیں ہو رہی تھیں کہ فیروزہ ہنس رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس منظر سے وہ اندر اندر بلبلا اٹھا۔

لیکن یہ تو روز کا معمول تھا۔

سیٹھ تلا رام روز اپنی دولت کا سہارا لے کر اس کا مذاق اڑانے چلا آتا اور اس کے سینے پر مونگ دل کر اسے آٹھ آٹھ آنسو رلا واپس چلا جاتا۔ لاکھ چاہنے اور ہزار کوشش کرنے پر بھی وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکا تھا۔ اندر اندر خون کے جو آنسو تیار ہوتے، وہ چپ چاپ آنکھوں کی راہ سے نکل جاتے۔ بنی سنوری فیروزہ ۸۴۰ میں بیٹھ کر چلی جاتی تو وہ پھر پوری دل جمعی کے ساتھ طبق کوٹنے میں مصروف ہو جاتا۔

سیٹھ تلا رام کو یہیں آنے، فیروزہ سے آنکھ مچولی کھیل کر لے جانے، اور اسے خون کے آنسو رلانے میں کوئی خاص مزا ملتا ہوگا ورنہ بازار میں تو ایک سے بڑھ کر ایک فیروزائیں تھیں۔ نوجوان، خوبصورت، نازنین، تازہ مکھن کی طرح چکنی۔ لیکن سیٹھ کو دل چسپی تھی تو صرف فیروزہ سے، اس کی اپنی فیروزہ سے۔ اگر نہ ہوتی تو سیٹھ کا کیا بگڑتا، البتہ اس کا بہت کچھ سنور جاتا، لیکن سیٹھ تک یہ بات پہنچے کیسے---؟ وہ تو شاید ایک ایسا کیڑا تھا جس کے لیئے سیٹھ کے کھاتے میں ایک نگاہ غلط انداز بھی نہ تھی۔ طبق کوٹتے ہوئے اس کے سامنے سے سیٹھ کی گاڑی نکل جاتی، اسے پتہ بھی نہ چلتا کہ گاڑی میں بیٹھا ہوا شخص تلا رام ہے یا کوئی بھوت۔ اس کی نگاہیں تو فیروزہ پر ٹکی رہتیں۔ جو چہلیں کرتی ہوئی سیٹھ کی گاڑی میں بڑی شان سے بنی سنوری آکر بیٹھ جاتی اور پھر......

آنکھوں میں خوشی یا مسرت یا حسرت و یاس کی جو لہریں پیدا ہوتی ہیں انھیں پڑھنے کے لیئے شاید کسی ڈگری کی ضرورت نہیں ہوتی۔

طبق کوٹنے والا اس ایک ساتھی کا منمنایا۔

"جانتے ہو وہ گاڑی والا کون ہے---؟"

وہ چپ رہا۔

"یہ سب چکر چھوڑ دے بیٹا، وہ بہت بڑا سیٹھ ہے، بہت امیر آدمی، اگر اسے بھنک بھی مل گئی تو ہم سب پسو کی طرح مسل دیئے جائیں گے۔"

وہ اب بھی خاموش رہا۔

"اور پھر اس کے لیئے کیا سوچنا، ایک ڈھونڈو گے، ہزار ملے گی، جیب میں دام ہونا چاہیئے دام------ اور پھر تو تو بہت سندر بھی ہے، تجھے کیا کمی ہے---؟"

فیروزہ کو ہزاروں میں شامل کر دینا اسے بالکل اچھا نہیں لگا، اپنے جذبے کو دبا کر وہ آہستہ سے بولا۔

"سنتے ہیں، بڑے بڑے ہوٹلوں میں جو حوریں رہتی ہیں وہ صرف پیسے والوں ہی کو ملتی ہیں، پھر یہ سیٹھ---"

اس کا ساتھی تمسخر سے ہنسا۔

"صرف ہوٹل کیوں---- ان کے لیئے تو بڑے بڑے خوبصورت بنگلے بھی ہوتے ہیں، پھر دفتروں میں۔۔ ارے سیٹھ تلا رام چاہے تو اس کی ایک تالی پر ہزاروں لڑکیاں اس کے سامنے حاضر ہو جائیں۔"

"تو۔؟"

"تو کیا، دل لگی دیوار سے تو پری کیا چیز، ہوگی کچھ ایسی بات اس سالی فیروزہ میں، میری مانو تو خوب محنت کر کے خوب پیسے کماؤ، جیب میں پیسے آجائیں گے تو بہت سی فیروزائیں خرید لوگے---"

بات کچھ لگتی سی تھی۔

فیروزہ میں کچھ ایسی بات ضرور ہے۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا، واقعی یہ بات کتنی سچ ہے۔ لڑکیاں تو بے شمار تھیں اور وہ اتنے پیسے تو کماہی لیتا کہ مہینہ میں دو ایک بار ایسی ہی کوئی لڑکی اس کی دسترس میں رہتی لیکن اسے تو صرف فیروزہ چاہیئے تھی۔ فیروزہ--- گداز جسم، متناسب قد و قامت، ناک نقشہ عام

---

[1] ICARUS یونانی صمیات میں ایک نوجوان جس نے اپنے کاندھوں پر بال و پر موم سے چپکا کر اڑنے کی کوشش کی، لیکن دھوپ کی گرمی سے موم پگھل گئی اور وہ سمندر میں گر کر غرق ہو گیا۔

لڑکیوں جیسا لیکن آنکھیں... اس کی آنکھیں ہی تو تھیں جو ساری دنیا پر حکومت کر رہی تھیں- گہری' بے پناہ معنی کی تہوں میں ڈوبی ہوئی' بولتی ہوئی' پکارتی ہوئی' چکارتی ہوئی آنکھیں-

لیکن اس کا معاملہ صرف جسم تک نہیں رہا تھا بلکہ وہاں تک پہنچ گیا تھا جہاں سے واپس آنا مشکل نہیں' ناممکن ہوتا ہے- فیروزہ بہت دور تک اس کے اندر سرایت کر چکی تھی- اس کے ہاتھ پاؤں' دل دماغ اور آنکھوں سے ایسی حرکات سرزد ہو جاتیں جنہیں سوائے فیروزہ کے دوسرا نام دینا ممکن ہی نہ تھا- اس کے پاؤں جب بھی اٹھتے تو فیروزہ کی جانب' ہاتھ جو کچھ کرتے' وہ فیروزہ کے لیئے اور دل دماغ تو فیروزہ کے علاوہ کوئی اور شے کے بارے میں سوچنے کو تیار ہی نہیں تھے- اسے تو یاد بھی نہیں تھا کہ گرمی کی سنسان دوپہروں اور سردیوں کی خاموش راتوں میں اس نے کتنی بار فیروزہ کی سیڑھیوں کے چکر لگائے تھے اور ٹکٹکی باندھے بالاخانے کی طرف دیکھتے ہوئے' اس نے کتنی صدیاں بتائیں تھیں-

پھر بھی وہ فیروزہ کے بارے میں جانتا کیا تھا؟ بس یہی کہ وہ اسے اچھی لگتی- جوان اور خوبصورت لڑکیاں تو روز ہی اس کی نگاہوں سے گزرتیں لیکن اسے تو بس ہر طرف فیروزہ ہی فیروزہ دکھائی دیتی تھی- وہ فیروزہ سے کبھی ہم کلام نہ ہوا تھا' معاملہ بس نظروں تک تھا' صرف اس کی اپنی نظروں کا- اس نے اپنے طور پر فیروزہ کی نگاہوں کے رموز و نکات کو وہ معنی پہنا رکھے تھے جو اس کی سمجھ میں آسانی سے آتے- جی تو اس کا بہت چاہتا تھا کہ فیروزہ کے پاس جا کر اپنا حال دل سنائے- فیروزہ کی سیڑھیاں سڑک پر کھلتی تھیں اور وہاں آنے جانے پر کوئی روک بھی نہیں تھا' لوگوں نے خود ہی سیٹھ تلا رام کی ملکیت سمجھ کر اس طرف جانا چھوڑ دیا تھا-

بڈھا' بدشکل' بدہیئت... اس کے غلیظ دانتوں تک سے ہوس ابلتی ہوئی محسوس ہوتی' اوپر والے نے اس کے اندر ٹھونس کر ہر چیز بھر دی لیکن وہ تھا دراصل نالی ہی کا کیڑا- کس قدر گھٹیا انداز میں ستار پان والے کی دوکان پر کھڑا ہو کے گندے اشارے کرتا ہے- فیروزہ کو جیسے اغوا کر کے لے جاتا ہے-

ویسے وجود تو خود اس کا بھی ایک مذاق تھا- لاوارث' غریب' لاچار گھر میں ایک خوبصورت بچہ- سرخ و سفید' تیکھا ناک نقشہ- کیچڑ میں کنول' گدڑی میں لال- کسی کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ ایک غریب پس ماندہ عورت اتنے خوبصورت بچے کو جنم دے سکتی ہے- مشتبہ نگاہیں اس کی ماں پر اٹھی تھیں لیکن قبل اس کے کہ اس کے ماں باپ ان نگاہوں کا مفہوم سمجھ سکتے' وہ اکیلا ہی تمام تر نگاہوں کا مرکز بن گیا تھا-

تعلیم و تربیت؟ جو روکھی سوکھی مل جاتی' وہی بہت تھی اور اسی سے زندگی کی گاڑی رینگ رہی تھی- خاردار راستے' چاروں طرف معنی خیز نگاہیں' تیز و تند آندھی' آگ برسانے والے رات اور دن' لق و دق صحرا اور اس میں کھلا ہوا پھول-

"یار' تو تو اس قدر حسین ہے کہ لگتا ہے غلطی سے مردوں میں پیدا ہو گیا' شاید کسی فرشتے نے..."

"تجھے... تجھے دیکھ کر لگتا ہے کہ... کیا گال ہیں تیرے اور کیا ناک نقشہ..."

"پاس آ کے بیٹھ ذرا' ہم سے بات تو کر لے-"

یہ باتیں کچھ اس کی سمجھ میں آتیں' کچھ سر کے اوپر سے گزر جاتیں- اس کے اندر ایک مرد کھیل رہا تھا جس نے ابھی دنیا نہیں دیکھی تھی لیکن اسے فتح کرنے کا حوصلہ تھا- اس کے بازوؤں کی مچھلیاں ساری دنیا کے ساحل پر مچلنے کو بے تاب تھیں- اس کے اندر بجلی کی جو لہریں چل رہی تھیں' وہ دوسروں سے اپنا وجود منوانے کی طاقت رکھتی تھیں' لیکن جب وہ اپنے بارے میں دوسری باتیں سنتا تو اسے اپنے آپ پر ایک شک سا ہونے لگتا- اس کے اندر کوئی چیز ابلنے سی لگتی' کان سرخ ہو جاتے' ایک آنکھ بڑی' ایک آنکھ چھوٹی ہو جاتی' چھوٹی آنکھ سے ساری چیزیں بڑی بڑی دکھائی دینے لگتیں- ایسی حالت میں اسے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پانا پڑتا' اگر وہ ایسی نہ کرتا تو ساری دنیا اس کے قدموں میں ربڑ کی گیند بن کر آ گرتی اور...

ایک ہی بات سے وہ اپنے آپ کو سمجھ لیتا-

جس دم وہ فیروزہ کو سیٹھ تلا رام کی طرح سب کی آنکھوں کے سامنے' اٹھا لے جائے گا' بس اسی دم یہ سب لوگ...

"جانی تیرے رنگ روپ اگر میرے کو مل جاتے نا تو میں دکھا دیتا دنیا کو..." اس کے ساتھ طبق کوٹنے والا راجو اس سے بولا-

"کیا کر لیتا تو؟"

"کیا کر لیتا...؟ تو تو بے وقوف ہے- یہ جو سینما کے پردے پر چکنے چکنے سندر چہرے نظر آتے ہیں نا' وہ لوگ ایک ایک فلم میں کام کرنے کا کیا لیتے ہیں...؟"

"مجھے کیا پتہ...؟"

اس کی لاپروائی برقرار رہی- یوں بھی اس نے ابھی تک طبق کوٹنے کا اپنا کوٹا پورا نہیں کیا تھا-

"پانچ لاکھ... دس لاکھ... پندرہ..."

"اور..."

"کچھ لوگ اشتہار بھی دیتے ہیں- کپڑوں کا' صابن' پاؤڈر اور نہ جانے کون کون چیز کا..." راجو کی معلومات واقعی قابل رشک تھیں-

"یہ لوگ بھی پیسے لیتے ہوں گے؟"

"ابے لاکھوں لاکھ سے کم بات نہیں کرتے-"

"فیروزہ فلم میں چلی جائے یا صابن کا اشتہار دینے لگے تو اسے کتنے پیسے ملیں گے...؟"

اس نے راجو کے بہتے دریا جیسے علم میں ہاتھ ڈالا- من ہی من میں اس

نے بہت پہلے اندازہ لگا لیا تھا کہ سیٹھ تلا رام کی جیب میں فیروزہ کی کیا قیمت ہے۔

"کون فیروزہ....؟ وہ.....؟"

راجو کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا جو اسے گالی کی طرح چبھا' وہ تلملایا' ساز و سامان پھینک کر اس نے راجو کی گردن پکڑ لی اور اسے ایک زوردار جھٹکا دینے ہی والا تھا کہ مالک آپہنچا۔ اس نے دونوں کو کھینچ کر الگ کیا۔ لیکن اس پر تو جیسے ایک جنون طاری تھا۔ متعدد ہاتھوں میں بندھ کر بھی وہ رسی تڑانے کی پوری کوشش کر رہا تھا اور راجو' وہ تو ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس نے کون سی ایسی بات کہہ دی تھی؟ فیروزہ کو تو بہت لوگ بہت کچھ کہتے ہیں' اس نے تو کچھ کہا بھی نہیں۔

مالک نے خشمگیں نگاہوں سے راجو کی طرف دیکھا۔

وہ خاموش رہا۔ مالک کے پاس بھی خاموش رہنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ دونوں اچھے طبق کوٹنے والے تھے اور محنتی مزدور آج کل کہاں ملتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد تمام لوگ اس کے بارے میں جان بھی گئے اور محتاط بھی ہو گئے۔ برف کی ایک پرت جمی تو کچھ ہمدردوں نے اسے سمجھایا۔

"یار' تجھے دل لگانے کو یہی ایک فیروزہ ملی تھی؟"

"تو پھر-----؟"

"کاٹ کھانے والی کوئی بات تو نہیں تھی لیکن پھر' کا جواب بھی کسی کے پاس نہیں تھا۔ سیٹھ تلا رام اس کی آنکھوں کے سامنے فیروزہ کو اٹھا کے لے جاتا تو وہ پنجرے میں بند پرندے کی طرح پھڑپھڑاتا رہتا اور جب پھڑپھڑاہٹ کم ہوتی تو اس کی نگاہیں اپنے آپ میں کسی کمی کی تلاش میں جٹ جاتیں۔ وہ کمی' جس کے سبب سیٹھ تلا رام کو اس پر ہر حال میں سبقت حاصل تھی۔ اتنی بات تو وہ جانتا ہی تھا کہ سیٹھ کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں' پھر بھی تلاش بسیار کے بعد ہر بار اسے کوئی نہ کوئی کمی نظر آ ہی جاتی اور اسی وقت اسے محسوس ہوتا کہ اس کو اگر اس نے فوراً دور نہ کیا تو سیٹھ تلا رام اسے ہمیشہ مات دیتا رہے گا۔ وہ اس کمی کو دور کرنے میں لگ جاتا۔ اسے سیٹھ تلا رام تو بننا نہیں تھا' اس کی طرح تھل تھل' موٹا' بھدا' غلیظ' ندیدہ... پھر بھی اس کی جیب میں کھنک تو ہونی ہی چاہئے اور بھلے وہ ۸۴۰ نمبر کی مرسیڈیز میں چڑھ کر نہ آئے' پھر بھی سڑک پر دوڑنے والے پیسے تو اس کے پاس ہونا ہی چاہئے۔

کمی بیشی کا معاملہ انیس بیس کا ہو سکتا ہے' ایک اور سو کا کیسے....؟ پھر بھی ان مشقتوں سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ اس کی محنت کے پیسوں سے اس کے پاس دو ایک اچھے جوڑے آ گئے۔ خوبصورت مضبوط جوتے' موزے' شیو کا سامان' خوشبودار لوشن' سستے سہی لیکن دور تک خوشبو بکھیرنے والے اسپرے' خوشبودار صابن' آئینے' کنگھیاں' رومال وہ ان سب کو اپنے زنگ خوردہ بکسے میں پرانے اخبار بچھا کر بند رکھتا۔ انھیں استعمال کرنے کی نوبت اس لیئے نہیں آئی تھی کہ اس کے لیئے اس نے جو ایک مبہم سی تاریخ اپنے طور پر مقرر کی تھی وہ اس کے قابو میں نہیں تھی۔ یہ تاریخ اس کے لیئے ایک ایسی مضبوط اور اٹل منزل تھی جس کی طرف وہ کشاں کشاں چلا جا رہا تھا۔

فیروزہ سے اس کا کوئی دیومالائی تعلق تو تھا نہیں' وہ اس قسم کے تعلق کے رموز و نکات سے واقف ہی کہاں تھا۔ اس کو فیروزہ بس اچھی لگتی' اس کے بال' اس کی ہنسی' اس کی ادای' اس کا جسم' اس کے متناسب ہاتھ پاؤں' بدن..... اسے دیوانہ بنا دیتے' اس کی آنکھوں سے گہری معنوی دنیائیں نشر ہوتیں۔ انھیں سمجھنے کی کوشش اس کی زندگی کا مقصد تھا' وہ روز اس کے دیدار سے لطف اندوز ہوتا۔ جس کمرے میں وہ رہتی' اس کی کھڑکی ٹھیک اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ وہ دوکان پر اس انداز سے بیٹھتا کہ فیروزہ کی کھڑکی اور اس کی آنکھوں کا رشتہ مضبوط ہی ہوتا جاتا اور شاید اسی کا کرشمہ تھا کہ وہ طبق کوٹنے والے مزدوروں میں ممتاز تھا۔

اسے فیروزہ کی مصروفیت اور معمولات کی ذرا ذرا خبر تھی۔ کس وقت بستر سے اٹھتی ہے' سب سے پہلے کیا کرتی' پھر کیا کرتی ہے' پھر کیا.... کون سا لباس کس وقت زیب تن کرتی ہے۔ کس وقت اس پر کون سا موڈ طاری ہوتا ہے' کس وقت ہنستی ہے' کس چیز سے خوش ہوتی ہے اور کس چیز سے مغموم' کیا کھاتی پیتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کس وقت اس کھڑکی پر آتی ہے جس کے سامنے وہ ہوتا اور پھر کس وقت وہاں سے ہٹتی ہے... فیروزہ کے سارے پروگرام اسے بہت پسند تھے صرف اس کا ایک حصہ... وہ اس پر بہت بھاری تھا۔

روز جینا اور روز مرنا....

اس کی زندگی کا ایک حصہ مرنے میں گزرتا اور جو حصہ بچ جاتا' بس وہی اس کی زندگی تھی۔ لیکن یہ زندگی بھی کیا....؟

"فیروزہ اس کے خیال میں ایک معصوم چڑیا تھی جو بہت مجبور ہو کر کسی باز کے چنگل میں جا پھنسی تھی اور وہ خود؟ وہ خود ایک لکشمن ریکھا میں قید---- یہ قید خانہ خود اس کا تعمیر کردہ تھا' اس کی جائے پناہ' جہاں اس نے اس یقین کا خطرا لگا رکھا تھا کہ جس پل بھی اس نے یہ ریکھا پار کی' وہ جھلس جائے گا' پھر کچھ بھی باقی نہ بچے گا' وہ خود' نہ فیروزہ اور نہ اس کی اپنی دنیا۔

فیروزہ کے خیالات میں گم رہنے اور طبق کوٹنے کے بعد اس کے پاس جو وقت بچتا' وہ اسے ستار پان والے کی دوکان کے طواف میں گزار دیتا کیونکہ ٹھیک اس کے اوپر۔ ٹھیک اس کے سامنے۔

سیٹھ تلا رام کی طرح خوشبودار گلوریاں بندھواتا' گجرے والے سے تازہ پھولوں کے گجرے خریدتا اور یہ تمنا کرتا کہ فیروزہ سے اس کی آنکھوں آنکھوں میں باتیں ہوں۔ فیروزہ سامنے آتی' اس سے آنکھیں چار ہوتیں' پھر وہ اپنی خاموش آنکھوں کو لے کر اندر چلی جاتی۔ وہ کھڑا رہ جاتا' وہ آتی' پھر چلی جاتی۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا یہاں تک کہ ۸۴۰ دبے پاؤں وہاں چلی آتی۔ پھر تلا رام کا ستار پان والے کی دوکان پر کھڑے ہو کر عجیب عجیب حرکتیں کرتا۔ فیروزہ کا اپنے بالاخانہ سے نیچے اترنا۔ گاڑی کا اسی مست خرامی سے واپس چلا جانا۔ ۸۴۰ کا

فیروزہ کو سنے کر پھر آتا۔ حتیٰ باری فیروزہ کا اس کی نظروں کے سامنے سیڑھیاں چڑھنا۔ یہ وقت اس کا کیسے گزرتا تھا؟

اگر خوش قسمتی سے پان کی گلوریاں وہ منہ میں ڈال چکا ہوتا تو وہ اس کے حلق ہی میں اٹک جاتیں، گجرے کے پھول بکھر جاتے اور وہ خود ٹوٹ پھوٹ کر اپنی جگہ پر آ کے گر جاتا۔

سیٹھ تلا رام امیر آدمی تھا۔ اور وہ خود بہت غریب۔ تلا رام فیروزہ کو جو کچھ دیتا تھا، وہ اس کے بس کی چیز نہیں تھی، البتہ اس کے پاس فیروزہ کو دینے کے لیئے جو کچھ تھا....

اس کا ایک ساتھی کبھی کبھی منمناتا۔

"جو عورت سیٹھ تلا رام کی عادی ہو چکی ہو، وہ تجھے کیا...."

وہ ہمیشہ اسے نظرانداز کردیا کرتا۔ لیکن اس کے ذہن میں یہ بات گشت لگاتی رہتی کیا واقعی اس کے پاس فیروزہ کے لیئے کچھ نہ تھا؟ فیروزہ سیٹھ تلا رام کی بخشش سے کیا واقعی مطمئن تھی؟ یہ تو تلا رام کا پیسہ تھا جو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ جب تک اس کی خواہش ہوگی، فیروزہ پر جما رہے گا، کوئی دوسری پسند آجائے گی تو کہاں کی فیروزہ اور کہاں کا تلا رام۔ لیکن یہ بات فیروزہ بھی سمجھے تب نا----- اس کے پاس سیٹھ کا پیسہ تھا اور اس کے پاس جوانی، محنت اور دل میں فیروزہ کی لگن-- لیکن یہ سب باتیں صرف اس کے نہیں، فیروزہ کے سوچنے کی بھی تھیں، لیکن وہ تو اس سے مخاطب بھی نہ ہوتی۔ اچٹتی ہوئی نگاہیں یوں ڈالتی ہے جیسے وہ بالکل بچہ ہو، وہ بھلے ہی، اپنی بساط بھر ان میں پوشیدہ معنی کی تلاش کرتا رہے۔

کبھی فیروزہ اپنی زبان سے بھی کچھ بولے۔ کچھ اشارے کرے۔ کبھی اپنے پاس بھی بلائے۔

اس نے اپنے زنگ خوردہ بکس میں جو چیزیں بند کر رکھی تھیں، ان کے استعمال کی تاریخ اس کے ہاتھوں کی لکیروں میں دور دور تک دکھائی نہ دیتی تھی.... فیروزہ کی آنکھوں میں تو بالکل ہی نہیں۔ اسے محسوس ہوتا کہ اس کی ساری محنتیں بیکار تو نہیں چلی جائیں گی۔ اصل میں اسے پتہ بھی نہ تھا کہ جو کچھ اس نے سوچ رکھا ہے، یا کر رکھا ہے، وہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ ان معاملات میں اس نے کسی سے مشورہ نہیں لیا تھا، جو کچھ کیا، بس اپنے آپ ہی، اور ان معاملات میں اسے تجربہ ہی کیا تھا؟

"پھر ایک دن اچانک، بالکل اچانک----- پتہ نہیں، اس کی قسمت یاوری کر گئی تھی یا اور کوئی بات تھی، طبق کوٹتے کوٹتے نگاہیں اوپر اٹھیں تو اس نے فیروزہ کو اپنی طرف دیکھتے پایا۔ اس کا کلیجہ اچھل کر حلق میں آگیا۔

پوری کی پوری فیروزہ ثابت سالم کھڑی تھی اور اس کی نگاہیں؟ وہ کچھ دیر یونہی انتظار کرتا رہا کہ شاید فیروزہ بے خیالی میں کھڑی ہوگی ہو اور یونہی اس کی نگاہیں.... لیکن وہ نگاہیں چار طرف گھوم کر ایک ہی مرکز پہ ٹھہر گئیں تو اسے اپنے اندر ایک غیر معمولی توانائی محسوس ہوئی۔ طبق کوٹنے میں اس کا جی نہ لگا۔

شاید وہ تاریخ جس کا بیچینی سے اسے انتظار تھا، اس کی دسترس میں آگئی۔

وہ فوراً کام چھوڑ کر اندر گیا، خوب رگڑ رگڑ کر نہایا، پھر داڑھی بنائی۔ شیو کے بعد خوشبودار لوشن لگایا، بکس سے نئے کپڑے نکال کر پہنے، موزے اور جوتے، بالوں میں تیل، پھر کریم لگا کر سلیقے سے انھیں سنوارا، رومال کو سینٹ میں بھگو کر پینٹ کی جیب میں رکھا، پھر اپنے پورے جسم پر اسپرے چھڑکا۔ بن سنور کر آئینے پر اس نے ایک نگاہ ڈالی۔

اپنے چم چم کرتے جوتوں کے ساتھ وہ ستار کی دوکان پر پہنچا اور اس سے سب سے مہنگی اور نفیس گلوریوں کی فرمائش کی، انھیں سلیقے سے منہ میں دبایا، گجرے والے سے دو گجرے خریدے، ایک کلائی میں لپیٹ لیا، دوسرا ہاتھوں میں رہا۔

اب اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا، اسے جو کچھ کرنا تھا، کر ڈالا تھا، جو کچھ ہونا تھا، وہ فیروزہ کی طرف سے ہونا.... اور فیروزہ کو کس لمحے کا انتظار تھا، وہی جانتی تھی۔

اچانک جیسے کھلے میدان میں زبردست کالی آندھی آگئی، وہ چاروں طرف سے گھر گیا۔ پیچھے کا راستہ بند.... آگے کا راستہ اسے بجھائی نہیں دے رہا تھا۔

بارے آندھی تھمی، کالے غبار چھٹے اور اس کی آنکھیں دیکھنے کے لائق ہوئیں تو سیٹھ تلا رام ۸۴۰ میں دھنسا عجیب پراسرار نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ اس کے پورے جسم میں برچھیاں سی چبھنے لگیں۔

فیروزہ منہ پر دوپٹہ رکھے کھی کھی ہنس رہی تھی۔

❖ ❖ ❖

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

۲۰ ویں صدی کے نمایاں تر تخلیقی ذہن ـــــــــــ ناقد، شاعر اور ڈراما نگار ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے حسی ادراک کے انقطاع اور معروضی ارتباط کے نظریات نے دنیا بھر کے ادب پر نہ صرف گہرے اثرات مرتب کیئے بلکہ زندہ ادبی روایت کا وہ شعور بھی بخشا، جو مختلف تخلیقی ادوار کے بیچ محسوس کیئے جانے والے زمانی بعد کو گھٹانے میں مددگار ثابت ہوا۔

خدا معلوم، اکیسویں صدی میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے نام اور کام کو کن نئے فکری مجادلوں، تبدیل ہوتی ہوئی تہذیبی اور مذہبی صورت احوال اور نت نئی نظریہ سازی کا سامنا کرنا پڑے، اور اس کا نتیجہ کیا رہے۔ یہ سوچتے ہوئے، جانے کیوں قدیم یونانی شاعر ہومر سے متعلق ایک روایت یاد آگئی، جس میں بتایا گیا ہے کہ بڈھا ہومر، ارکیڈیا کے کنارے ماہی گیروں کی ایک بستی تک پہنچا اور سوال کیا کہ :

"اے ارکیڈیا کے ماہی گیرو۔۔!! کیا تمہارے پاس کچھ ہے؟"

اس سوال کے جواب میں انھوں نے ایک پہیلی کہی :

"جو کچھ ہم نے پکڑا تھا، وہ پیچھے چھوٹ گیا، البتہ جو ہم نے نہیں پکڑا، وہی ہمارے پاس ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ ہومر اس پہیلی کو نہ بوجھ سکا اور اسی غم میں مر گیا۔

سو، یہ کہے بنا کوئی چارۂ کار نہیں کہ ایلیٹ جانے اور آنے والا وقت۔ لیکن تخلیقی ادب کی چھان پھٹک کے حوالے سے ایلیٹ کی جو بھی عطا رہی ہے، اس میں سے اردو دنیا کو ملنے والا حصہ بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں۔

ہمارے ہاں ایلیٹ سب سے پہلے (۱۹۳۷ء) بطور شاعر، پھر بطور ناقد (۱۹۴۴ء) اور تیسرے مرحلے پر (۱۹۵۶ء) بطور ڈراما نگار کے زیر بحث آیا۔ جب کہ ایلیٹ کی پہلی شناخت تنقید ہے، دوسری شاعری اور تیسری منظوم ڈراما۔

بطور نقاد ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے تہلکہ خیز مضمون "روایت اور انفرادی صلاحیت" (تکمیل : ۱۹۱۹ء ـــ TRADITION AND THE INDIVIDUAL TALENT) کے ضبط تحریر میں آنے سے قبل رومانوی تنقید کا بنیادی سوال یہ تھا کہ "شعر کا تاثر کیا چیز ہے؟" اور اس سوال کے ساتھ تنقید کرنے کو نقاد کا اہم فریضہ یہ قرار دیا گیا تھا کہ شعر کہنے والے شاعر کے ذہنی درجے نوٹ کیئے جائیں، نیز یہ کہ تخلیقی لمحے میں شاعر پر ماحول کس طرح اثر انداز ہوا۔ یوں ایلیٹ سے قبل رومانوی تنقید میں فن پارے کی بجائے شاعر کی ذات مرکز توجہ رہی تھی جب کہ ایلیٹ نے ان نظریات کو رد کردیا :

"وہ (شاعری) شخصیت کا اظہار نہیں، بلکہ اس سے گریز ہے۔" (ایلیٹ)

اس بات کی وضاحت اس نے یوں کی تھی :

"شاعر کے ہاں شخصیت کی طرز کی کوئی شے نہیں ہوتی، جس کا وہ اظہار کرے۔ اس کے پاس تو محض اظہار کا وسیلہ ہوتا ہے۔ اس وسیلۂ اظہار میں تاثرات اور تجربات عجیب وغریب اور غیر متوقع صورتوں میں یکجا ہوجاتے ہیں۔"

یعنی ایلیٹ کے مطابق تنقید کا بنیادی وظیفہ فن پارے کی تشریح و توضیح ہے اور ناقدانہ تجزیے کے ذریعے فن پارے کی قدر کا تعین بنیادی چیز ہے۔ اس طرح تقابل اور تجزیہ، نقاد کے اہم اوزار ہوئے۔

تخلیقی عمل سے متعلق یہ نظریہ آئی۔ اے۔ رچرڈس کے تنقیدی افکار کی عین ضد کہا جاسکتا ہے۔ جب کہ ایلیٹ کے قریبی دوست اور اہم معاصر ناقد ہربرٹ ریڈ نے بھی ایلیٹ کے اس خیال سے اختلاف کیا ہے۔ خود ہمارے ہاں ممتاز حسین (۱۹۵۷ء) نے شاعری میں شاعر کی شخصیت کے اظہار یا اخفا پر بات کرتے ہوئے ایلیٹ کو رد کیا اور چند اختلافی پہلوؤں کے باوجود ہربرٹ ریڈ کی حمایت کی۔ اس باب میں ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے خیالات (۱۹۶۶ء) بھی قابل مطالعہ ہیں۔

ایلیٹ، ادب اور زندگی دونوں میں معیارات کے نفوذ اور غیر ذاتی میلانات ورجحانات کا قائل تھا۔ اس لیئے اس نے احساس ماضی اور احساس روایت کو ضروری خیال کیا۔ اس ضمن میں اس کے وہ مضامین جو ON TRADITION نامی کتاب میں یکجا ہوئے، خاص طور پر زیر بحث آئے۔ اس نے کہا تھا :

"ادب میں روایت پرستی کا رجحان، ذہنِ انسانی کی ترقی اور تہذیب، نیز

ادب کے صحت مند ارتقاء کے لیئے ضروری ہے۔"

اس کا جواب' الیٹ کے معترضین نے یہ پھبتی کس کردیا کہ : "الیٹ ایک ایسا جدید شاعر ہے جو روایت پرست بھی ہے۔"

الیٹ' بلاشبہ بیسویں صدی کا ایک بڑا باغی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ الیٹ نے بیسویں صدی میں مادی سطح پر جن تہذیبی اور فکری تضادات کا تماشا کیا تھا' ان پر سنجیدگی سے غور کیئے بغیر اس کی ناقدانہ نظریہ سازی اور تخلیقی عمل کو سمجھنا محال ہے۔ پھر یہ کہ ادب کا اتنا اہم ناقد رفتہ رفتہ ادبی تنقید سے سوشل تنقید کی طرف نکل گیا اور اس نے NOTES TOWARDS A DEFINITION OF CULTURE اور IDEA OF A CHRISTIAN SOCIETY جیسے مقالات لکھنے کے ساتھ ساتھ "FOUR QUARTETS" جیسی نظمیں قلم بند کیں جن میں مذاہب عالم کو موضوع بنایا گیا تھا۔

ہمارے ہاں الیٹ کے تصور روایت کو سب سے پہلے محمد حسن عسکری (اپریل ۱۹۴۴) زیر بحث لائے تھے۔ اس کے بعد یہ بحث چل نکلی اور ڈاکٹر آفتاب احمد (اپریل ۱۹۴۵) ڈاکٹر عبادت بریلوی (۱۹۴۹) احتشام حسین (۱۹۵۳) اور آل احمد سرور نے اس ضمن میں اظہار خیال کیا۔ بقول صوفی غلام مصطفیٰ تبسم' اس دور میں پطرس بخاری نے بھی ادبی محفلوں میں الیٹ کو تادیر زیر بحث رکھا۔ (نقوش' لاہور' پطرس نمبر ۱۹۵۹)۔

الیٹ کے تصور روایت سے اثر پذیری کی اولین صورتیں ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ہاں دکھائی دیں۔ انھوں نے ۱۹۵۳ء میں دو مضامین لکھے۔ "اردو شاعری میں حب وطن کی روایت" اور اردو تنقید میں روایت اور تجربہ' ۱۹۵۳ کے اواخر میں محمد طفیل مدیر' نقوش' نے ایک مذاکرے کا اہتمام کیا' جس کا موضوع تھا ' اردو افسانے میں روایت اور تجربہ' (مطبوعہ : نقوش' لاہور شمارہ ۳۷-۳۸ بابت : جنوری ۱۹۵۴)۔ اس مذاکرے کے شرکا تھے' سید وقار عظیم' ڈاکٹر عبادت بریلوی' سعادت حسن منٹو' احمد ندیم قاسمی' شوکت تھانوی' ہاجرہ مسرور' خدیجہ مستور' حمید اختر اور انتظار حسین۔

اسی طرح الیٹ کے تصور روایت کے حوالے سے ایک بڑی ہلچل اس وقت پیدا ہوئی' جب مجلّہ ' سویرا' لاہور شمارہ ۱۷- ۱۸ بابت : ۱۹۵۵ کو مرتب کرتے وقت حنیف رامے نے الیٹ کے لازوال تنقیدی مضمون ' روایت اور انفرادی صلاحیت' کے حوالے سے الیٹ کے تصور روایت اور شخصی استعداد کے موضوع پر ایک تحریری سمپوزیم کا اہتمام کیا۔ محرک بحث تھے مختار صدیقی' جنھوں نے نہ صرف یہ کہ الیٹ کے اس اہم مضمون کا اردو میں پہلا ترجمہ کیا بلکہ اس مضمون کو زیر بحث بھی لائے اور اپنے دور کی ادبی صورت احوال سے متعلق اہم سوالات اٹھائے۔ اس بحث کے شرکا میں سجاد ظہیر' ڈاکٹر عبادت بریلوی' ممتاز مفتی' ڈاکٹر محمد حسن' ظہیر کاشمیری' شاد عارفی' عارف عبدالمتین اور مظفر علی سید کے نام ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ' سویرا' کے مذکورہ شمارے میں ' خوشبو کی ہجرت' کے زیر عنوان شیخ صلاح الدین' حنیف رامے' ناصر کاظمی اور انتظار حسین کے درمیان ایک مکالمہ بھی شامل کردیا گیا۔

اس موضوع پر بحث کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا اور الیٹ بطور ناقد' بار بار زیر بحث آیا۔ الیٹ کے تنقیدی افکار سے متعلق اس فضا بندی میں ایک طرف تو محمد حسن عسکری اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کا حصہ ہے' جنھوں نے انتہائی مرعوب کن انداز میں الیٹ کا ذکر بار بار کیا' تو دوسری طرف کلیم الدین احمد کی کتاب ' اردو تنقید پر ایک نظر' (۱۹۵۶) کا پیدا کردہ ہنگامہ۔ کلیم الدین احمد نے خاص طور پر آل احمد سرور کے تنقیدی نظریات کو رد کرتے ہوئے الیٹ کے حوالے سے بات کی اور بات سے بات چلی۔

اس کے بعد الیٹ کے تنقیدی افکار کو ڈاکٹر وحید قریشی (۱۹۵۶) ڈاکٹر صدیق کلیم (۱۹۵۶) عابد علی عابد اور ممتاز حسین (۱۹۵۷) ڈاکٹر سجاد باقر رضوی (۱۹۶۱) محمد حسن عسکری (۱۹۶۳) احتشام حسین اور علی عباس جلال پوری (۱۹۶۴) زیر بحث لائے۔ اس سارے کے نتیجہ میں ہمارے ہاں الیٹ کے ناقدانہ افکار نے کئی مباحث کو جنم دیا اور الیٹ کی وضع کردہ تنقیدی اصطلاحات مثلاً شخصی استعداد' شخصیت سے فرار' معروضی تلازمہ' نیا شعری مذاق' روایت کا شعور اور شاعری کی تیسری آواز وغیرہ ہماری تنقید میں رواج پا گئیں۔

یہی وہ زمانہ ہے' جب اردو کے اہم ترین ناقد محمد حسن عسکری نے اپنے مضمون ' روایت کیا ہے؟' ("حاذق" لاہور جنوری- فروری ۱۹۶۴) میں الیٹ کے رومن کیتھولک ہونے پر اچنبھے اور غصے کا اظہار کیا اور الیٹ کی روایت سے متعلق نظریہ سازی اور اس میں مذہبی کار گزاری کے پرخچے اڑانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہاں تک کہ اس مضمون کی اگلی کڑی بہ عنوان :' اردو کی ادبی روایت کیا ہے؟' جب ' شب خون' الہ آباد شمارہ ۲۹ بابت اکتوبر ۱۹۶۸ میں شائع ہوئی تو اس پر ڈاکٹر وحید اختر نے "ادب' مذہب اور حسن عسکری" (شب خون' الہ آباد بابت : اپریل ۱۹۶۹) کے عنوان سے شدید رد عمل کا اظہار کیا۔ یوں یہ بحث چل نکلی اور محمد حسن عسکری نے ' اردو ادب کی روایت : چند تصریحات' (شب خون' الہ آباد بابت : اپریل ۱۹۶۹) لکھ کر خالصتاً اسلامی تصوف اور مذہبی خوابوں سے اپنے خیالات کا دفاع کیا۔

اس زمانے میں یقیناً محمد حسن عسکری کی فکر میں تبدیلی کا باعث دیگر عوامل بھی رہے ہوں گے لیکن ٹی۔ ایس۔ الیٹ کا رومن کیتھولک ہونا اور ادبی روایت کے حوالے سے اس پر عسکری کا یہ اعتراض' خود عسکری کو کیا سے کیا بنا گیا۔

محمد حسن عسکری نے رومن کیتھولک ٹی۔ ایس۔ الیٹ کے مذہبی تصور اور تصور روایت کے رد میں اسلامی تصورات کو بے چگوں قرار دیتے ہوئے اسلامی تصوف کی وکالت میں تہذیبی سفر کی نفی کی۔ اس لیئے کہ عسکری کے خیال میں روایت کا انحصار آسمانی صحائف پر ہونا چاہیئے۔ عسکری نے عقل کی تشکیل میں انسانی تجربے اور مسلسل انسانی عمل اور روایات کی نفی کرتے ہوئے عمرانیات' حیاتیات اور نفسیات جیسے علوم کو بے جواز قرار دیا۔ اور آخر کار یہ نتیجہ نکالا کہ مغرب کی غلط نظریہ سازی اور گمراہیوں نے ہمارے نظریہ ساز ادبا وشعرا کو ادبی روایت کے صحیح مفہوم سے نا آشنا رکھا۔ ("بے تکلف گفتگو"

مطبوعہ : شب خون' الہ آباد شمارہ ۲۸:)

یہی وہ زمانہ ہے' جب محمد حسن عسکری ادب سے باقاعدہ کنارہ کشی کر چکے اور مولانا اشرف علی تھانوی کے دینی مدرسے کے لیے نصاب سازی کرتے ہوئے 'جدیدیت یعنی مغربی گمراہیوں کا خاکہ' جیسی کتاب لکھنے میں مگن ہو گئے۔ اب انہوں نے مجدد الف ثانی کی تحریروں کے حوالے سے اصلاح تصوف و اصلاح ایمان اور مولانا اشرف علی تھانوی کی ' شرح حافظ' اور' شرح مثنوی مولانا روم' کے زیر اثر رہ کر ادبی منظرنامے کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی۔ البتہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ کہ عسکری صاحب کے بہترین تنقیدی کام ' ستارہ یا بادبان' کے ناقدانہ طریقہ کار میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور رہا ہے اور 'جدیدیت یعنی مغربی گمراہیوں کا خاکہ' میں ایلیٹ کا مضمون' آفٹر سٹرینج گاڈز : جدید کفر کا قاعدہ(۱۹۳۴) اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

ایلیٹ کی وفات ۴ جنوری ۱۹۶۵ کے بعد' اس کی یاد تازہ کرنے کو ہمارے ادبی جرائد میں بہت کچھ دیکھنے کو ملا۔ خاص طور پر مجلّہ ' افکار' کراچی بابت : فروری ۱۹۶۵ کا خصوصی گوشہ اور شمس الرحمٰن فاروقی کا طویل مضمون "ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ' شاعر اور مصلح" (۱۹۶۵)۔ ' نیا دور' کراچی بابت : ستمبر ۱۹۶۶ کے خصوصی گوشے میں ایلیٹ کے اوائل عمری میں مرتب کردہ جریدے ' آتش دان کے قریب' (FIRE SIDE) کے چند صفحات کا عکس اور ایلیٹ کی نایاب تصاویر کے علاوہ دو مضامین بہ عنوان ' ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ' از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اور 'مفکر نقاد' از ڈاکٹر جمیل جالبی' ایلیٹ کے پانچ مضامین بہ عنوان : ' تنقید کا منصب : شاعری اور پروپیگنڈا' ' بودلیئر' ' ادب اور عصر جدید' اور' صحافت اور ادب' کے تراجم از ڈاکٹر جمیل جالبی کے علاوہ ایلیٹ کے منظوم ڈراما' کاک ٹیل پارٹی' کا ترجمہ از سراج الحق شامل ہیں۔

جمیل جالبی کی کتاب ' ایلیٹ کے مضامین' کا پہلا ایڈیشن بھی ۱۹۶۶ ہی میں سامنے آیا۔ جس میں ایلیٹ کے نو تنقیدی مضامین کے تراجم' نیز "ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ایک مطالعہ" کے عنوان سے جمیل جالبی کا مضمون شامل تھا۔

اب ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ بطور ناقد' مختلف النوع حوالوں کے ساتھ زیر بحث رہا۔ ناصر کاظمی (۶۷-۱۹۶۶) نظیر صدیقی (۱۹۶۷) عتیق اللہ (۱۹۸۰) محمد ہادی حسین۔۔ محمد حسن عسکری (۱۹۶۸) عمیم حنفی (۱۹۷۰) ممتاز حسین (۱۹۸۳) عصمت جاوید (۱۹۸۳) جمیل جالبی (۱۹۹۱) محمد علی صدیقی (۱۹۷۲) اور ایس۔ حسن (۱۹۹۳) تک ایلیٹ کے ناقدانہ افکار کا شاید ہی کوئی پہلو رہ گیا ہو' جس پر بات نہ ہوئی ہو۔ اسی طرح ایلیٹ کی تفہیم کو آسان بنانے میں ہمارے مترجمین کا حصہ بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پر :

ا۔ 'روایت اور انفرادی صلاحیت' از ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ مختار صدیقی' مطبوعہ : ' سویرا' لاہور شمارہ ۱۸--۱۷' بابت : ۱۹۵۵

اسی مضمون کے دیگر چار تراجم کی تفصیل یوں ہے :

'روایت اور انفرادی صلاحیت' ترجمہ : ڈاکٹر جمیل جالبی مشمولہ : 'ایلیٹ کے مضامین' ترجمہ : ڈاکٹر جمیل جالبی' کراچی : طبع اول : ۱۹۶۰

'ادبی روایت اور شخصی استعداد' ترجمہ : افضال حسین مطبوعہ : نقوش' لاہور' شمارہ ۱۰۲' بابت : مئی ۱۹۶۵

'روایت اور نئی تخلیق' ترجمہ : ڈاکٹر صدیق کلیم' مشمولہ : نئی تنقید' مرتبہ : صدیق کلیم ظہور الحق شیخ' مطبوعہ : سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی' گورنمنٹ کالج' لاہور طبع اول : ۱۹۶۹

'روایت اور انفرادی ذہانت' ترجمہ : کشور ناہید مشمولہ : ' باقی ماندہ خواب' مرتبہ کشور ناہید' مطبوعہ : سنگ میل لاہور طبع اول : ۱۹۸۲

۲۔ ' منظوم ڈرامے کا نصب العین' از ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ڈاکٹر جمیل جالبی مطبوعہ :' نیا دور' کراچی شمارہ ۲۹ بابت : ۱۹۵۵

۳ ' شاعری اور ڈراما' از ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ رحمٰن مذنب مطبوعہ : ' ساقی' کراچی سالنامہ ۱۹۵۶

۴۔ کلاسیک کیا ہے؟ از ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ سید قاسم محمود' مطبوعہ : ' نئی تحریریں' شمارہ : ۳' لاہور ۵۷-۱۹۵۶۔ اسی مضمون کا ایک ترجمہ از ڈاکٹر جمیل جالبی : ایلیٹ کے مضامین' ۱۹۶۰ میں شامل ہے۔

۵۔ ' شاعری کا سماجی منصب' از ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ڈاکٹر جمیل جالبی' مشمولہ : ' ایلیٹ کے مضامین' طبع اول : ۱۹۶۰۔ اسی مضمون کا ایک ترجمہ بہ عنوان : ' شاعری کے معاشرتی فرائض' از فاخر حسین' مشمولہ : ' ادب اور ادیب' ۱۹۸۸ ہے۔

۶۔ ' شاعری کی تین آوازیں' از ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ڈاکٹر جمیل جالبی' مشمولہ : ایلیٹ کے مضامین' ۱۹۶۰

۷۔ ' شاعری کی موسیقی' از ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ڈاکٹر جمیل جالبی' مشمولہ : ایلیٹ کے مضامین' (۱۹۶۰)

۸۔ ' مذہب اور ادب' از ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ڈاکٹر جمیل جالبی' مشمولہ : ایلیٹ کے مضامین' (۱۹۶۰)

۹۔ ' تجزیہ اور تنقید' از ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ڈاکٹر جمیل جالبی' مشمولہ : ایلیٹ کے مضامین (۱۹۶۰)

۱۰۔ ' تنقید کے حدود' از ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ڈاکٹر جمیل جالبی' مشمولہ : ایلیٹ کے مضامین (۱۹۶۰)

۱۱۔ ' شعر کی موسیقیت' از ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ رحم علی الہاشمی' مطبوعہ : سیپ' کراچی شمارہ --- ۱۸

۱۲۔ ' کلچر کا مفہوم' از ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ قمر سلطانہ' مطبوعہ : نیا دور' کراچی شمارہ : ۱۸-۱۵

۱۳۔ ' شاعری اور پروپیگنڈا' از ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ڈاکٹر جمیل جالبی مشمولہ : 'ایلیٹ کے مضامین' نظرثانی شدہ ایڈیشن مطبوعہ : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس' دہلی طبع اول : ۱۹۷۸

۱۴۔ ' بودلیئر' از ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ جمیل جالبی' مشمولہ : ایلیٹ کے مضامین نظرثانی شدہ ایڈیشن طبع اول : ۱۹۷۸

۱۵- 'ادب اور عصر جدید' از ٹی- ایس- ایلیٹ، مترجمہ جمیل جالبی، مشمولہ : 'ایلیٹ کے مضامین' (۱۹۷۸)

۱۶- 'صحافت اور ادب' از ٹی- ایس- ایلیٹ، مترجمہ جمیل جالبی، مشمولہ : 'ایلیٹ کے مضامین (۱۹۷۸)

اسی طرح مغربی تنقید سے متعلق ہمارے ہاں جو تھوڑا بہت کام ہوا، اس میں ٹی- ایس- ایلیٹ بطور ایک نظریہ ساز ناقد کے شامل ہے- اس ضمن میں درج ذیل کتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں-

۱- 'تنقیدی نظریے' از ڈاکٹر ملک حسن اختر، مطبوعہ : جدید بک ڈپو، لاہور، طبع اول : نومبر ۱۹۶۶- طبع دوم : مکتبہ میری لائبریری، لاہور : ۱۹۸۱

۲- 'مغرب کے تنقیدی اصول' از ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، مطبوعہ : طبع اول : دسمبر ۱۹۶۶

۳- 'اشارات تنقید' از ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، مطبوعہ : مکتبہ خیابان، لاہور، طبع اول : ۱۹۶۶- طبع دوم : ۱۹۷۳

۴- 'مغربی شعریات' از محمد ہادی حسین، مطبوعہ : 'مجلس ترقی ادب، لاہور طبع اول : مارچ ۱۹۶۸

۵- 'ارسطو سے ایلیٹ تک' از ڈاکٹر جمیل جالبی، مطبوعہ : 'نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان، کراچی، طبع اول : ۱۹۷۶- طبع دوم : ۱۹۷۷ طبع سوم : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی : ۱۹۸۱

۶- 'مغربی تنقید کا مطالعہ : افلاطون سے ایلیٹ تک' از عابد صدیق، مطبوعہ ثاقب پبلشرز، ملتان، طبع اول : ۱۹۸۴

۷- 'تاریخ ادب انگریزی' از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، مطبوعہ : مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد- پاکستان، طبع اول : ۱۹۸۶

(۲)

ٹی- ایس- ایلیٹ، بیسویں صدی عیسوی کے انگریزی ادب کی سب سے بڑی شعری بغاوت کا اہم ترین نظریہ ساز شاعر ہے- اور اس کی طویل نظمیں خصوصاً ہے- الفرڈ پروفراک کا نغمۂ محبت' (۱۹۱۷) اور 'خراب آباد' (۱۹۲۲) انھی رجحانات کی حامل نمائندہ ترین نظمیں ہیں- ان نظموں کا زمانۂ تخلیق ۱۹۱۷ تا ۱۹۲۲ ایسا ہے جب جنگ عظیم اول کے بعد یورپ کا سرمایہ دارانہ نظام ابتلا کے سخت ترین مراحل میں سے گزر رہا تھا- دوسری طرف ایلیٹ کو بطور شاعر کے دیکھیں تو کہا جاتا ہے کہ 'ویسٹ لینڈ' (۱۹۲۲) مکمل کر لینے کے بعد اس نے اپنے مزاج میں جوش اور امید پرستی کے فقدان کے باعث یا نامعلوم وجوہات کے سبب رومن کیتھولک عقائد میں پناہ لی- 'خراب آباد' (THF WASTF LAND)' بہ قول اس کے سخت ترین ناقدین' اس اعتراف شکست یا کم ہمتی کے احساس سے پہلے کی نظم ہے- اس نظم میں رواں، امثالیت کا دارومدار جیسی ویسٹن (JESSIE WETON) کی کتاب FROM RITUAL TO ROMANCE اور سر جیمز فریزر (SIR JAMES FRAZER) کی کتاب 'شاخ زریں' (GOLDEN BOUGH) پر ہے-

یہ آخری بات تو ایک کھلی حقیقت ہے اور اس کا اعتراف خود ایلیٹ نے بھی کیا، لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایلیٹ کے شعری لحن میں حزنیہ لے اور طنز کی کاٹ کے داخلی اسباب کیا رہے؟ کیا یہ محض خارجی حالات کا نتیجہ تھا؟ یقیناً یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں- اور نہ کبھی اس کے ہاں جوش اور امید کا فقدان دیکھنے کو ملا- تیسری بات یہ کہ ایلیٹ کے شعری لحن کو اس دور کی انگریزی شاعری کے سیاق وسباق، ردو قبول کی حدول اور انگریزی کی شعری روایت سے باہر رکھ کر نہ تو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی تحسین ممکن ہے-

اگلا مرحلہ ایلیٹ کے تنقیدی افکار اور اس کے شعری تصورات کو ذہن میں تازہ کرنے سے متعلق ہے- جنھیں جانے اور سمجھے بغیر نہ تو بیسویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی کی شعری بغاوت کے معنی سمجھ میں آئیں گے اور نہ ہی ایلیٹ کی چیدہ نظمیں اور اس کی مذہبی شاعری، خصوصاً 'چہار شنبہ مبارک' (ASH WEDNESDAY) اور "چہار آہنگ کے منظومے" یعنی FOUR QUARTETS- ورنہ ہم بھی گراہم (GRAHAM HOUGH) کے مانند ایلیٹ کے بار بار گرفت سے نکلنے کی شکایت ہی کرتے رہ جائیں گے- لہٰذا یاد رہے کہ ایلیٹ کے عہد میں تہذیبی یکسانیت کا فقدان پایا جاتا ہے اور مذہبی تصورات میں دراڑیں نیز اس دور میں علمی اور ادبی سطحوں پر بہت نئی نظریہ سازی عام رہی ہے-

یہاں اس بات کی وضاحت بھی نہایت ضروری ہے کہ انگریزی کی شعری روایت کو ہمارے ہاں کی کسی بنی ادبی اصطلاح کی طرح کی چیز تصور نہ کیا جائے- اس لیے کہ انگریزی کی شعری روایت کی تشکیل و تہذیب کئی زمانوں کے پیدا کردہ مختلف النوع شعری دھاروں نے کی ہے- اور ایک سرسری نظر ڈالنے پر ہی وہ تمام نزول شعری دھارے الگ الگ اپنی پہچان کروانے کے ساتھ ساتھ جزو میں کل کا جلوہ بھی دکھاتے ہیں-

اس کا سب سے بڑا سبب ادبی رویوں کی چھان پھٹک، تخلیقی اظہار کی پہچان' اور ناقدین کی درست سمت نمائی ہے- انگریزی شاعری کی شعری روایت ہر زمانے میں لمحہ بھر کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے پائی-

کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی کی شعری روایت نے صدیوں کے سفر کے بعد اپنے اندر ایک خاص نوع کی لچک پیدا کر لی ہے، یا یوں کہنا چاہیے کہ انگریزی کی شعری روایت اس درجہ جاذب ہو چکی ہے کہ محض چونکا دینے کی خواہش کے کوئی معنی نہیں- ایسا نہیں کہ کوئی مسخرہ اٹھے اور محض چند روزہ اہمیت ہی حاصل کر جائے، جیسا کہ ماضی قریب میں ہمارے ہاں اکثر ہوتا آیا ہے- یا یہ کہ مرزا غالب کی تحسین کے لیے شیخ ابراہیم ذوق کا دنیا سے اٹھ جانا ضروری معلوم ہو، یا محض مشاعرے میں تیسرے درجے کے سامعین کی واہ واہ کے سبب یاس یگانہ چنگیزی کی موجودگی میں جگر مراد آبادی کو نمبر ایک شاعر قرار دے دیا جائے، یا فراق، فیض، عزیز حامد مدنی یا ناصر کاظمی کی موجودگی میں محض گروہ بندی، کالم

نگاری یا اخبارات کے ادبی صفحات کے زور پر تیسرے درجے کا پیشہ ور شاعر عزت پا جائے۔

شیکسپیئر، ڈن، پوپ، بلیک، براؤننگ، پاؤنڈ اور ایلیٹ انگریزی کی شعری روایت کی باہم پیوست کڑیاں ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان سب کو (شعری روایت میں توسیع کی خاطر ہی سہی) انگریزی کے کل شعری سرمایہ کو یک قلم مسترد کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جب کہ اس نوع کی مثالیں ہمارے ہاں ایک ڈھونڈو، ہزار ملتی ہیں۔ یہ فرق ہے روایت کے شعور کا۔

غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایلیٹ نے جب جارجین، وکٹورین اور خالص رومانی شعرا کی بہت بڑی تعداد کو رد کرتے ہوئے شعری روایت سے نکال باہر کیا تو وہ اس وقت نوکلاسیکی، مابعد الطبیعیاتی اور ایلزبیتھین دور کے بیشتر شعرا کو قبول بھی کر رہا تھا۔ اور جب لوگوں کو وہ قبول کر رہا تھا، انھی میں سے کسی ایک شاعر کی شعری سطح پر تحسین، آگے چل کر خود ایلیٹ کی شاعری کے لیے بڑا چیلنج بھی بن سکتی تھی۔ لیکن اس نے ایسا کیا، اور کمال احتیاط کے ساتھ اپنی بہترین شاعری میں جنگ عظیم اول کے بعد کی دنیا کے فکری اور تہذیبی انتشار کو سمیٹ لینے میں کامیاب ہو گیا۔

ایلیٹ کی شاہکار طویل نظمیں خصوصاً THE LOVE SONG OF J. ALFRED PRUFROCK (جے۔ الفرڈ پروفراک کا نغمۂ محبت) اور THE WASTE LAND (خراب آباد) اس نوجوان نسل کا نوحہ ہیں، جس کا شباب جنگ عظیم اول میں جھونک دیا گیا۔ جنگ کے نتیجہ میں پھیلی ہوئی نفسی کیفیتیں اور وحشت خیزی کا چناؤ، ایلیٹ کی ان نظموں کا موضوع خاص ہے۔

ان یکسر نئے، انوکھے اور ٹیڑھے احساسات اور نفسی کیفیتوں کی پیش کش میں ایلیٹ نے بطور رومانی حقیقت نگار کے ویسا ہی پیرایۂ اظہار چنا جو ان سے لگا کھاتا تھا۔ مثلاً THE WASTE LAND (خراب آباد) میں گوتم بدھ کے افکار، انجیل مقدس، کلاسیکی فکشن اور ڈراما کی پیوند کاری کرتے ہوئے دانتے اور واگنر (جرمنی) شیکسپیئر، مڈلٹن، وبسٹر، گولڈ سمتھ اور کڈ (KYD برطانیہ) سے انتخاب کرتے ہوئے ایلیٹ نے ایک ایسا مناسب حال طنزیہ پیرایۂ اظہار اور پر پیچ علامتی نظام (CRYPTOGRAM) وضع کیا، جو ایلیٹ سے پہلے کہیں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے مضمون : "ویسٹ لینڈ" از ڈاکٹر صدیق کلیم، مطبوعہ : "ادب لطیف" لاہور : ۱۹۵۶۔

یہاں اس بات کی صراحت بھی ضروری ہے کہ THE WASTE LAND کی اشاعت (۱۹۲۲) سے قبل ایلیٹ نے یہ نظم ایذرا پاؤنڈ کو دکھائی تو پاؤنڈ نے اپنی بہترین ناقدانہ صلاحیتوں کے ساتھ اسے نہ صرف پڑھا اور قیمتی مشوروں سے نوازا، بلکہ اس نظم میں شامل بحری جہاز کی غرقابی سے متعلق طویل مناظر، دانتے کے جہنم سے متعلق طویل اقتباس اور THE RAPE OF THE LOCK سے اثر پذیری کو کم کرنے کی خاطر ابتدائی مسودے میں سے بہت حصے قلم زد کرتے ہوئے اس نظم کو مزید پر اثر بنا دیا۔

خراب آباد (THE WASTE LAND) کے آغاز میں تسوجیا کی ایک لڑکی کی یادوں کا ایک سلسلہ ملتا ہے، جب وہ اپنے چچازاد کے ساتھ سیر کو نکلی تھی۔ اسے یاد آ رہا ہے لڑکپن کا وہ زمانہ، جب وہ دونوں آرچ ڈیوک کے کم سن مہمان تھے۔ درختوں کے جھنڈ، بارش کی باڑھ اور گاڑی پر اپنے چچازاد کو مضبوطی سے تھامے ہوئے، بری طرح دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ترائی میں اترنا اور اس کے بعد وقت کے منہ زور دھارے کا سامنے کرتے اور پچھاڑیں کھاتے ہوئے شعور کی رو کی تکنیک میں ماضی قریب اور ماضی بعید کے مختلف کرداروں کا سامنا، اور داخلی ٹوٹ پھوٹ۔ دکھ اور پچھتاوا۔

اسی طرح نظم "جے۔ الفرڈ پروفراک کا نغمۂ محبت" کا مرکزی کردار، صنعتی یورپ کا اینٹی ہیرو ہے، جو ہیملٹ کی طرح بے روح اور بے عملی کا شکار دکھا گیا۔ اس کے بطون سے اٹھنے والے طوفان ساحلوں پر آکر دم توڑ دیتے ہیں۔ ایلیٹ کی ایک اور اہم نظم ایک خاتون کی پورٹریٹ (PORTRAIT OF A LADY) نسوانی مرکزی کردار کی نفسی کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں۔ لہٰذا ایلیٹ نے ان نظموں میں تجرید اور شعور کی رو کا استعمال کیا۔

بغور دیکھیں تو ایلیٹ کے شعری اظہار میں تسلسل خیال نہیں بلکہ ایک ایسی ٹوٹ پھوٹ اور کچھ ایسے مخفی اشارے ہیں جو زوال پرست فرانسیسی علامت نگاروں کی بازگشت کے ساتھ مل کر ایلیٹ کے شعری کرداروں کو گوشت پوست کی کرداری سطح سے اوپر اٹھا لے جاتے ہیں۔

ڈبلیو۔ ایچ۔ آڈن نے یہ سب دیکھتے ہوئے کہا تھا :

"اس نے یاس اور خوف رقم کرنے کے لیے، صحیح لحن ڈھونڈ نکالا۔"

اس کے علاوہ ایک بہت اہم چیز ایلیٹ کا تصور زماں ہے۔ ایلیٹ کے ہاں وقت کا دھارا مستقیمی ہے جو ہر ایک شے کو نیست و نابود کرتا ہوا، آگے اور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس اثنا میں اگر کچھ باقی رہ جاتا ہے تو وہ صرف یادوں کا ذخیرہ ہے۔ ایلیٹ کے خیال میں وقت کا دھارا انسان کے اندر رواں ہے۔ یعنی ایلیٹ زمان روحانی کا قائل ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان وقت کے دھارے کے اندر نہیں، بلکہ وقت انسان کی ذات میں جاری و ساری ہے۔ ایلیٹ کا تصور زماں ہیگل، کارل مارکس، نطشہ اور اشپنگلر کے نظریات کا رد اور اس تصور زماں سے قریب تر ہے جو فخرالدین عراقی اور کانٹ نے پیش کیا۔

ایلیٹ کے ہاں پانی کا استعارہ در حقیقت وقت سے متعلق ہے اور رنگوں کی دھنک مختلف زمانوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ اسی طرح سرما کا شدید موسم ان جکڑ بندیوں کو ظاہر کرتا ہے، جن کے خلاف ایلیٹ نے فکری سطح پر بغاوت کی یا کرنا چاہی۔

ایلیٹ کے قنوطی وژن کے باوجود اس کی شاعری میں حسن، خیر اور محبت کی جستجو دکھائی دیتی ہے اور وقت کے بہتے دھارے میں سے لفظ اور تحرکاکیان، اس کی فضا اور منتہا۔ اس طرح ایلیٹ خارجی بیزاریت کے لاینحل دائرے کا اسیر رہتے ہوئے بھی مابعد الطبیعیاتی حقیقت کا جویا دکھائی دیتا ہے۔

ایلیٹ کے ہاں جنگی جنون سے بے زار انسان، تیز تہ و بالا تہذیب کی

شکست و ریخت کی آواز ایک نوحہ بن جاتی ہے اور الیٹ کے شعری کرداروں کے باطن میں دور تک پھیلی ہوئی ویرانی' مذہب کے روایتی استعارے کی ٹوٹ پھوٹ اور ایقان و اعتماد سے انکار کا باعث بنتی ہے۔

دوسری طرف الیٹ کی مختصر نظمیں ہیں' خصوصاً منظرنامے' (LAND SCAPES) سوینی-- بلبلوں کے درمیان (SWEENY AMONG THE NIGHTINGALES) اور بوسٹن کی شام کا خبرنامہ (BNSTON EVENING TRANSCRIPT) وغیرہ' تو ان میں اکتاہٹ' جھلاہٹ' بیزاری اور طنز کی کاٹ دیکھنے کو ملتی ہے' جو اس تہذیبی ٹوٹ پھوٹ کا شاخسانہ ہے' جس کا سامنا الیٹ کو رہا۔

نظم 'منظرنامے' کی بنیاد مناظر فطرت اور بچپن کی معصومیت ہے۔ اس نظم میں بدھ مت اور تصوف کے حوالے سے معنوی ابعاد پیدا کئے گئے ہیں۔ نظم 'سوینی۔ بلبلوں کے درمیان' کی بنیاد ستارہ شناسی کا علم ہے اور تکنیکی سطح پر تجرید کا ور تارا دیکھنے کو ملتا ہے۔ جب کہ بوسٹن کی شام کا خبرنامہ' اس دور کی اکتاہٹ سے بھری بیزار کن شاموں کی عکاس ہے۔

ان نظموں میں سوائے بدھ مت کے مطالعے (نظم : منظرنامے) اور مجوسیوں کے علمی دائرے (نظم : سوینی۔ بلبوں کے درمیان) سے متعلق مذہبی حوالوں کے (جو الیٹ کے وسعت مطالعہ کی پہچان رہی ہے) کوئی ایک مخصوص رنگ نہیں اور نہ ہی الیٹ نے اس کے لیئے کوئی خاص تگ ودو کی ہے۔ اس کے باوجود امریکی ا-میجسٹ تحریک سے متاثر ہونے والا الیٹ کا یہ روپ نظم گو شعرا کے لیئے تمثال کاری' تاثریت' پیکر تراشی' ذخیرۂ الفاظ اور زبان کے تخلیقی ور تارے کے باب میں راہنما اصول سامنے لاتا ہے۔

الیٹ کی مذہبی شاعری ایک طرح سے تاریخی حصار کو توڑتے ہوئے' تاریخی شعور کے مقابلے میں روحانی VISION کی فتح یابی کا جشن ہے۔ جس کی نمایاں مثالوں میں درج ذیل نظمیں یادگار ہیں :

۱۔ چہار شنبہ مبارک--(ASH WEDNESDAY)(۱۹۳۰)
۲۔ مغاں کا سفر--(JOURNEY OF THE MAGI)
۳۔ اینی میولا-(ANIMULA)
۴۔ مرینا--(MARINA)
۵۔ "چٹان" سے دو کورس۔
(TWO CHORUSES FROM THE ROCK)
۶۔ کوریئولین--(CORIOLAN)
۷۔ منظرنامے--(LANDSCAPES)
۸۔ "آغازیئے"(THE PRELUDES)
۹۔ "مرد پیر"(GERONTION)
۱۰۔ چہار آہنگ-(FOUR QUARTETS)(۱۹۳۶-۴۲)

'چہار شنبہ مبارک' ایک دعائیہ نظم ہے۔ اسی نظم سے الیٹ کے رومن کیتھولک افکار کی جانب نقادوں کی نظریں اٹھیں۔ 'مغاں کا سفر' کا منظرنامہ عرب سرزمین بالخصوص فلسطین ہے۔ شاعر اس نظم میں حضرت عیسیٰ کے زمانے تک پیچھے ہٹتا چلا گیا ہے۔ اور اپنے زمانے تک آتے آتے مذہبی افکار میں پڑنے والی دراڑوں کی بات کرتا ہے۔ نظم میں تجریدی طریقۂ کار کے تحت گزرا ہوا وقت موجود لمحے سے گلے مل رہا ہے۔ نظم 'اینی میولا' میں بھی یہی تکنیک برتی گئی ہے۔ نظم 'مرینا' کی بنیاد ہندومت کا فلسفہ اور ہندی کی امثال رہی ہیں۔ یہ نظم حد سے بڑھتی ہوئی تحریص پر ایک طنز ہے۔ مایا جال کے حوالے سے تلسی داس کی ایک مثل یاد آتی ہے۔

مایا کو مایا ملے کرکر لمبے ہات
تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات

اسی طرح نظم میں مایا کے تین روپ دکھائی دیتے ہیں پرسو' پرسا' پرس رام' یعنی جوں جوں دولت جمع ہوتی جاتی ہے انسان کی عزت اور توقیر میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس نظم میں الیٹ کا وقت کا تصور' خواب و خیال اور یادیں قابل غور ہیں نیز رنگوں کے حوالے سے مختلف موڑ اور کیفیتیں قابل توجہ۔

نظم "چٹان" سے دو کورس' (TWO CHORUSES FROM THE ROCK) کا عنوان ہی بتاتا ہے کہ یہ منظوم ڈراما THE ROCK کے مختلف کورس یا دعائیے ہیں۔

نظم 'منظرنامے' (LANDSCAPES) واضح طور پر بدھ مت اور تصوف کے اثرات کے تحت لکھی گئی' جس میں بچپن کی معصومیت کے ساتھ مناظر فطرت ہم رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ نظم آغازیئے۔ (PRELUDES) میں ہندومت کے حوالے سے آواگون کا تصور' نیز یادوں کے سلسلے اور وقت کا طوفانی دھارا خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ "مرد پیر" (GERONTION) ۱۹۱۸ تا ۱۹۲۵ کی درمیانی مدت میں سامنے آئی۔ عام طور پر ہمارے ناقدین اور محققین اس نظم کو الیٹ کی مذہبی نظموں میں شمار نہیں کرتے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس نظم میں نہ ہی حوالے واضح ہیں' خاص طور پر یسوع مسیح کے مصلوب ہوجانے کے بعد کی نشانیوں اور ظہور کے حوالے۔ اس نظم میں بھی توفیق خداوندی کے حصول کی خواہش کی گئی ہے۔ الیٹ سے مخصوص وقت کا تصور اس نظم میں بھی موجود ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نظم میں شاعر' دہشت کے اثر سے باہر نکلتا دکھائی دیتا ہے۔

اور سب سے آخر میں ذکر اس طویل نظم کا جسے الیٹ کی مذہبی شاعری کے حوالے سے خصوصی توجہ حاصل رہی' یعنی 'چہار آہنگ' (FOUR QUARTETS)۔

یہ نظم چار حصوں پر مشتمل ہے ۱۔ BURNT NORTON (۱۹۳۶)
۲۔ EAST COKING (۱۹۴۰)' ۳۔ THE DRY SALVAGES (۱۹۴۱)
۴۔ LITTLE GIDDING (۱۹۴۲)

واضح رہے کہ الیٹ کی 'چہار آہنگ' سے پہلے کی مذہبی شاعری کی نمایاں خصوصیت عیسائی مذہبی پیکر اور عیسائی مذہبی روایت تھی جبکہ 'چہار آہنگ' ان خصوصیات سے خالی ہے۔ اس کے باوجود یہ مذہبی شاعری ہے بلکہ الیٹ کی مذہبی

شاعری کا بام عروج۔

'چہار آہنگ' میں ایلیٹ نے توفیق خداوندی کی خواہش تو کی ہے لیکن قدرے مختلف انداز میں۔ یہ انداز اس کی دوسری نظموں میں دکھائی نہیں دیتا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ نظم ماضی اور حال سے نہیں' مستقبلیت سے وابستہ ہوئی ہے۔ ایلیٹ نے اس نظم میں کرشن مہاراج کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا ہے کہ "مستقبل ایک مدھم گیت کے مانند ہے' ان لوگوں کے لیئے' جو پر امید رہتے ہیں۔"

اس نظم کی دوسری نمایاں بات یہ ہے کہ یہاں ایلیٹ سے مخصوص وقت کا تصور (تصور زماں) وہ نہیں' جو اس کی دیگر نظموں میں پایا جاتا ہے۔ یعنی وقت کا مستقیمی تصور اس نظم میں دکھائی نہیں دیتا۔ اور یہ بات کچھ کم اہم نہیں۔ 'چہار آہنگ' کو بغور دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ دو یگوں کے بیچ وقت کا دھارا باہم مربوط نہیں۔ لہٰذا ایک یگ (زمانہ) کے خاتمے پر دوسرے یگ (زمانہ) تک رسائی ممکن ہی نہیں۔ بس اگر کچھ ممکن ہے تو وقت کی مار سہنا اور سفر کی صعوبتیں ہی ماحصل ہیں۔ یوں ایلیٹ کا یہ تصور زماں' جاپان کے شنتومت کے عقائد سے قریب دکھائی دیتا ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ایلیٹ کی مشہور طویل نظم 'چہار آہنگ' کا ابتدائیہ بہ عنوان : BURNT NORTON(۱۹۳۰)' نظم ' THE HOLLOW MEN' اور دعائیہ نظم 'ASH WEDNESDAY' چند ایسی نظمیں ہیں' جن کی تشکیل ایلیٹ کے منظوم ڈراموں اور طویل نظموں سے بچے بچائے ٹکڑوں سے ہوئی۔ مثلاً BURNT NORTON کی ابتدائی سطور منظوم ڈراما MURDER IN CATHEDERAL کی تراش خراش کے دوران بچ رہی تھیں۔

(۳)

تخلیقی سطح پر اتنے بڑے جوکھم سے نبرد آزما رہنے کے باوجود ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کو ہمارے ہاں اردو نظم میں بطور ایک ماڈل کے وہ اہمیت نہیں ملی' جو اسے نظری تنقید میں حاصل رہی۔ ایلیٹ کے عروج کے دور میں بھی' اردو میں آزاد نظم کے بانی تصدق حسین خالد یورپ سے محض آزاد نظم کی تکنیک کو ہی چن پائے۔ خود تصدق حسین خالد کے مطابق' انھوں نے سفر انگلستان (۱۹۳۲) سے قبل چند آزاد نظمیں لکھیں۔ اس وقت تک وہ شیلی اور سوئن برن سے متاثر تھے جبکہ انگلستان میں رہ کر انھوں نے ولیم موریس اور ہاپکنز سے ذہنی قربت محسوس کی۔ ایزرا پاؤنڈ یا ایلیٹ کا ذکر تک انھوں نے 'سرود نو' (طبع اول : ۱۹۴۸) کے دیباچے میں نہیں کیا۔

۱۹۴۸ میں ایلیٹ ادب کا نوبل انعام وصول کرکے دنیا کے مقتدر شعرا میں کھڑا ہو گیا تھا اور یقیناً میراجی کے مطالعے میں بھی رہا ہو گا لیکن میراجی اپنی مخصوص افتاد طبع اور موضوعات کے چناؤ میں ایلیٹ سے خاصے دور دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ ن۔م راشد نے عجمی شعری روایت کی بازیافت کے معاملے میں ایلیٹ کا نام لیئے بغیر استفادہ کیا۔ (دیکھیئے ان کا تنقیدی مضمون : "ادب میں اجتہاد" مطبوعہ : شاہکار' لاہور بابت : جولائی ۱۹۳۵)۔

شامرٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا اردو دنیا سے اولین تعارف جنوری ۱۹۳۷ء میں عزیز احمد (پ : ۱۱ نومبر ۱۹۱۳ء م : ۱۶ دسمبر ۱۹۷۸ء) کی معرفت ہوا۔ عزیز احمد' اردو کے معروف ناول نگار' افسانہ طراز' نقاد' شاعر اور محقق تھے۔

انھوں نے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد' دکن سے ۱۹۳۴ میں بی۔ اے (آنرز) کیا اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی کوششوں سے انھیں اعلیٰ تعلیم کے لیئے انگلستان جانے کا موقع ملا۔ ۱۹۳۵ کے آغاز میں وہ لندن گئے۔ عزیز احمد کو جامعہ عثمانیہ کے مولوی عبدالحق' ڈاکٹر محی الدین قادری زور' پروفیسر عبدالقادر سروری' مولوی وحید الدین سلیم اور مولانا احسن گیلانی کی علمی صحبتوں کے بعد انگلستان کی علمی و ادبی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ اس وقت تک عزیز احمد کا ادبی دنیا میں جتنا بھی تعارف تھا' اسے کسی بھی تخلیق کار کے آغاز کے اعتبار سے شاندار ہی کہا جاسکتا ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے :

۱۔ مجلّہ 'مکتبہ' حیدر آباد' دکن (مدیر : عبدالقادر سروری) کے شریک مدیر۔

۲۔ 'دنیا کے شاہکار افسانے' مرتبہ : عبدالقادر سروری' طبع اول : ۱۹۳۳ کے شریک مرتب۔

۳۔ مترجم' افسانہ : 'بچپن' از رڈیارڈ کپلنگ' مطبوعہ : 'نیرنگ خیال' لاہور شمارہ : ستمبر ۱۹۲۸

۴۔ مترجم' افسانہ 'شریر لڑکا' از رابندر ناتھ ٹیگور' مطبوعہ : 'نیرنگ خیال' لاہور شمارہ : دسمبر ۱۹۲۸

۵۔ طبع زاد افسانہ : 'کشاکش جذبات' از عزیز احمد' مطبوعہ : 'مکتبہ' حیدر آباد' دکن : مکتبہ ابراہیمیہ' بابت نومبر ۱۹۲۹

۶۔ طبع زاد مثنوی' عمر خیام' تخیل : ۱۹۳۲

۷۔ مضمون : 'جدید روسی تھیٹر' مطبوعہ : 'اردو' اورنگ آباد' دکن' بابت : اکتوبر ۱۹۳۴

۸۔ مضمون : 'ترقی پسند ادب کیا ہے؟' مطبوعہ : 'اردو' اورنگ آباد' دکن' بابت : اپریل ۱۹۳۵

۹۔ تبصرہ : 'لیلیٰ کے خطوط' از قاضی عبدالغفار' مطبوعہ : 'اردو' اورنگ آباد' دکن' بابت : اپریل ۱۹۳۵

۱۵ جون ۱۹۳۵ کی شام ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے منظوم ڈراما MURDER IN THE CATHEDRAL (کلیسا میں قتل) کی دوسری ریہرسل کنٹربری کیتھڈرل میں ہوئی تو THE NEW YORKER کے ڈراما ناقد نے اس ڈرامے کی تعریف لکھی۔ گمان غالب ہے کہ عزیز احمد نے ایلیٹ کا نام اسی زمانے میں پہلی بار سنا ہو گا۔ نتیجے کے طور پر ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۵ کو جب عزیز احمد' مولوی عبدالحق کے ۱۹۳۰ کے پرانے دوست ای۔ ایم فارسٹر سے ملے تو دوران گفتگو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا ذکر بھی رہا۔ لیکن بقول عزیز احمد :

وہ (فارسٹر) ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے مداح ضرور تھے مگر میں نے ان کی تعریف میں کوئی خاص جوش نہیں دیکھا۔"

(متاعِ عزیز (خطوط) مرتبہ: ڈاکٹر صدیق جاوید 'طبع اول: ۱۹۹۱ ص ۳۲۹)

عزیز احمد نے اپنے قیام جنیوا کے دوران ۱۳ اگست ۱۹۳۶ میں ایلیٹ کا اولین تعارف قلم بند کیا۔ وہ اس وقت تک نہ صرف یہ کہ ایلیٹ کی باقاعدہ اجازت کے ساتھ THE WASTE LAND کا اردو ترجمہ 'خراب آباد' کے عنوان سے مکمل کر چکے تھے بلکہ ایلیٹ کی شاعری کے تلمیحاتی نظام کو مارٹن بلوم فیلڈ اور جے۔ ڈبلیو۔ پار کے ساتھ مل کر سمجھنے کے بھی اولین دعوے دار تھے۔

عزیز احمد کا یہ ترجمہ مع تعارف ماہنامہ 'اردو' آکسفورڈ بابت : جنوری ۱۹۳۷ میں شائع ہوا۔ جب کہ اسی نظم کو بعد میں مکین احسن کلیم اور رفیق خاور نے بھی اپنے اپنے انداز میں ترجمہ کیا۔

بطور شاعر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کو زیر بحث لانے والا دوسرا نام پروفیسر آل احمد سرور کا ہے۔ جنھوں نے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے ایک ریڈیائی نشریہ (۱۹۳۹) میں ایلیٹ کی دوسری اہم نظم 'جے الفرڈ پروفراک کا نغمۂ محبت' کا حوالہ دیتے ہوئے ایلیٹ اور اس دور کے دیگر جدید شعرا مثلاً سٹیفن سپنڈر' ڈبلیو۔ ایچ۔ آڈن اور سی۔ ڈی۔ لیوس کے تشبیہاتی اور استعاراتی نظام پر بات کی۔ دیکھیے مضمون : 'انگریزی شاعری' (تخیل : ۱۹۳۹) مشمولہ : 'تنقیدی اشارے' از آل احمد سرور طبع اول : ۱۹۴۲' طبع چہارم : ۱۹۶۳ ص ۸۳-۸۴۔

۱۹۴۱ میں پروفیسر احمد علی نے MR.ELIOT'S PENNY WORLD OF DREAMS کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جو لکھنؤ یونیورسٹی پریس' لکھنؤ سے ۱۹۴۱ میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں محمد حسن عسکری' ڈاکٹر عبادت بریلوی' آل احمد سرور اور کلیم الدین احمد کے تنقیدی مضامین کے سبب ایلیٹ (بطور شاعر) کا ذکر عام ہو گیا۔

اردو ادب میں شعری سطح پر ن۔م۔ راشد (نظم : حسن کوزہ گر۔ ایران میں اجنبی۔ لا= انسان) مجید امجد (مرے خدا' مرے دل۔ نہ کوئی سلطنت غم نہ اقلیم طرب)' ضیا جالندھری۔ (خزاں۔ سرشام۔ زمستاں کی شام)' صفدر میر (راکھ کا ڈھیر)' مختار صدیقی (موہن جوداڑو) رضی ترمذی (رستخیزِ درخشاں)' شمس الرحمٰن فاروقی (بودلیئر اور ایلیٹ کے لیے حقیر تحفہ)' آفتاب اقبال شمیم (بے انت کا سپنا۔ میں ابد ہوں۔ نہیں اور ہاں سے آگے۔ دھوپ اور دھند)' شہریار ('اسم اعظم' کی متعدد نظمیں)' اختر حسین جعفری (آئینہ خانہ)' وحید اختر (مٹی کی صدا)' افتخار جالب (قدیم بنجر)' محمود سعیدی (ہوا کو نہ روکو)' ساجدہ زیدی (سمندر کے سینے کے خاموش اسرار)' زبیر رضوی (بشارت پانی کی)' پریم وار برٹنی (کتبے) اور راج نرائن راز (آبروئے شیوۂ اہل نظر) نے تخلیقی تجربے میں ایلیٹ کے ساتھ اشتراک محسوس کیا' اور یہ سلسلہ شعور روایت کے حوالے سے ستر کی دہائی کے غزل گو شعرا محمد خالد' ثروت حسین' محمد اظہار الحق' غلام حسین ساجد' شاہدہ حسن' جمال احسانی' سلیم کوثر' غلام محمد قاصر' خالد اقبال یاسر اور عرفان صدیقی تک چلا آیا ہے۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی منظومات کے معلوم اردو تراجم کی تفصیل درج ذیل ہے :

۱۔ 'خراب آباد' (THE WASTE LAND) ترجمہ : عزیز احمد' مطبوعہ : ماہنامہ 'اردو' آکسفورڈ بابت : جنوری ۱۹۳۷

اس نظم کے دیگر دو تراجم بھی دیکھنے کو ملے۔ ایک ترجمہ مکین احسن کلیم کا جو لگ بھگ ساٹھ کی دہائی میں کیا گیا۔ اور دوسرا رفیق خاور کا' جو 'تخلیقی ادب' کراچی' مرتبہ : مشفق خواجہ' شمارہ۔ ۴ میں شائع ہوا۔

۲۔ 'چہار آہنگ' (FOUR QUARTETS) ترجمہ : قرۃ العین حیدر' مطبوعہ : ماہنامہ 'افکار' کراچی' شمارہ۔ ۱۴۳' بابت : ۱۹۵۶

ترجمہ نامکمل۔ محض ایک حصے کا ترجمہ ہے۔ اسی نظم کے پہلے حصے BURNT NORTON کا ترجمہ شان الحق حقی نے کیا۔ مشمولہ : 'درپن درپن' (۱۹۸۵)۔

۳۔ 'چہار شنبہ مبارک' (ASH WEDNESDAY) ترجمہ : سید فیضی' مطبوعہ : 'نقوش' لاہور شمارہ۔ ۱۰۲ بابت ۱۹۶۵ (نامکمل۔ صرف ابتدائیہ)

دوسرا مکمل ترجمہ رفیق خاور نے 'بازگشت' کے عنوان سے کیا۔ جو 'تخلیقی ادب' کراچی مرتبہ : مشفق خواجہ شمارہ۔ ۵ بابت : اکتوبر ۱۹۸۵ میں شائع ہوا۔

۴۔ بوسٹن کی شام کا خبرنامہ (BOSTAN EVENING TRANSCRIPT) ترجمہ : ناصر کاظمی' مطبوعہ : ماہنامہ نصرت' لاہور

۵۔ ...... (GERONTION) ترجمہ : رفیق خاور' مطبوعہ : 'تخلیقی ادب' کراچی' شمارہ۔ ۱' بابت : ۱۹۸۰

۶۔ 'شہر بہ شہر' (LANDSCAPES) ترجمہ : رفیق خاور' مطبوعہ : 'تخلیقی ادب' کراچی' شمارہ۔ ۱' بابت : ۱۹۸۰

اس نظم کا دوسرا ترجمہ بہ عنوان 'تناظر' ادیب سہیل نے کیا۔ جو قومی زبان' کراچی' بابت : دسمبر ۱۹۹۳ میں شائع ہوا۔

۷۔ 'طوفانی رات' (PRELUDES) ترجمہ : رفیق خاور' مطبوعہ : 'تخلیقی ادب' کراچی شمارہ۔ ۱' بابت : ۱۹۸۰

۸۔ 'سوینی۔۔ بلبلوں کے درمیان (SWEENY AMONG THE NIGHTINGALES) ترجمہ : رفیق خاور' مطبوعہ : 'تخلیقی ادب' کراچی' شمارہ۔ ۱' بابت : ۱۹۸۰

۹۔ 'مرینا' (MARINA) ترجمہ : رفیق خاور' مطبوعہ : 'تخلیقی ادب' کراچی' شمارہ۔ ۱' بابت : ۱۹۸۰

۱۰۔ 'مغاں کا سفر' (JOURNEY OF THE MAGI) ترجمہ : رفیق خاور' مطبوعہ : 'تخلیقی ادب' کراچی' شمارہ۔ ۱' بابت : ۱۹۸۰

۱۱- "جے الفرڈ پروفراک کا محبت کا گیت" (THE LOBE SONG OF J.ALFRED PRUFROCK) ترجمہ : احسان اکبر' مطبوعہ : "نیا دور" کراچی' شمارہ-۸۳-۸۴

اسی نظم کا دوسرا ترجمہ بہ عنوان "ساز بے سوز" از رفیق خاور مطبوعہ "تخلیقی ادب" کراچی شمارہ-۵ بابت : اکتوبر ۱۹۸۵ اور تیسرا ترجمہ' بہ عنوان "جے الفرڈ پروفراک کا نغمۂ محبت" "انیس ناگی" دانشور' لاہور' شمارہ-۱

۱۲- "پیاس سرمدی" (TWO CHORUSES FROM THE ROCK) ترجمہ : رفیق خاور' مطبوعہ : "تخلیقی ادب" کراچی' شمارہ-۵' بابت : اکتوبر ۱۹۸۵ ٹیبلوڈراما "THE ROCK" کے دوسرے کورس کا ایک ترجمہ بہ عنوان "نور غیب" شان الحق حقی نے بھی کیا ہے' جو ان کی کتاب "درپن درپن" طبع اول : ۱۹۸۵ میں شامل ہے۔ [۱]

(۴)

شاعری اور تنقید کے بعد ایلیٹ کی تیسری جہت ڈراما نگاری ہے۔ اور ڈراما نگاری بھی منظوم' جس کی چلن اب بہت کم ہے۔ ایلیٹ نے آخری دور میں اپنی پوری توجہ منظوم ڈراما کی طرف مبذول کرنے کا سبب بتاتے ہوئے کہا تھا کہ یہ ادب کی بہترین صنف اظہار ہے۔

لیکن خدا لگتی کہیں تو تخلیقی سطح پر ایلیٹ کے ڈرامے اس پھیلاؤ کے حامل کبھی نہیں رہے' جو موضوعی اور تکنیکی سطح پر ایلیٹ سے مخصوص رہا۔ اس کی ایک وجہ تو غالباً ان ڈراموں کا مذہبی رنگ ہے۔ ایلیٹ نے کل چھ ڈرامے لکھے۔ تفصیل درج ذیل ہے :-

۱- "چٹان" (THE ROCK, A PAGEANT PLAY) ۱۹۳۴ ایک طویل نیم مذہبی' ملبوساتی ٹیبلو ہے' جسے مکمل کرنے میں ایلیٹ کو ای۔ ایم۔ براؤن کا تعاون حاصل رہا۔ "چٹان" میں شامل کورس (پیاس سرمدی) الگ سے بھی شائع ہوئے۔

۲- "کلیسا میں قتل" (MURDER IN THE CATHEDRAL) ۱۹۳۵ یہ ازمنہ وسطیٰ میں ٹامس بیکٹ کی موت سے متعلق ڈراما ہے' جسے اس دور میں توجہ کی نظر سے دیکھا گیا اور اس کا ذکر اذکار تادیر رہا۔ یہ منظوم ڈراما پہلی بار ۱۵ جون ۱۹۳۵ میں کنٹربری کیتھڈرل میں اسٹیج کیا گیا اور یکم نومبر ۱۹۳۵ کو لندن کے مرکزی تھیٹر کی زینت بنا۔ یہی ڈراما ایلیٹ کے مذہب کی جانب جھکاؤ کا اولین مظہر ہے۔

ایلیٹ کے دیگر ڈرامے :

۳- "کنبے کا ملاپ" (THE FAMILY REUNION) ۱۹۳۹

۴- "کاک ٹیل پارٹی" (THE COCKTAIL PARTY) ۱۹۵۰

---

[۱] ان کے علاوہ دیگر تراجم میں وحید اختر کا ترجمہ (FOUR QUARTETS کی پہلی نظم کا)' شمس الرحمن فاروقی اور اسمٰعیل رفیعی کے متعدد تراجم' حبیب حق کے متعدد تراجم بھی ہیں جو پاکستان میں شائع نہیں ہوئے۔ (ادارہ)

۵- "سکریٹری" (THE CONFIDENTIAL CLERK) ۱۹۵۴

۶- "بزرگ مدبر" (THE ELDER STATEMAN) ۱۹۵۹

آخر الذکر چار منظوم ڈرامے ایسے ہیں' جو ایلیٹ کے عہد میں بالائی مراعات یافتہ طبقہ کے ڈرائنگ روم کی حس مزاح اور میلوڈرامائی عناصر کو ظاہر کرتے ہیں لیکن ان میں بھی بین السطور مذہبی لہر موجود ہے۔

اردو میں ایلیٹ کے منظوم ڈراموں سے اثر پذیری کی اولین صورت ناصر کاظمی کا منظوم ڈراما (کتھا) "سر کی چھایا" ہے۔ جو پہلی بار مجلہ "سویرا" لاہور شمارہ ۱۷-۱۸ بابت : ۱۹۵۵ میں سامنے آیا۔ جسے کتابی صورت میں مکتبہ خیال لاہور نے ستمبر ۱۹۸۳ میں شائع کیا۔ اس میں درج ذیل منظوم ڈرامے بھی قابل ذکر ہیں :

۱- "کیوپڈ اور سائیکی" از جعفر طاہر' مطبوعہ : مجلہ "صحیفہ" لاہور' شمارہ-۳ بابت : دسمبر ۱۹۵۷

۲- "جنگل" از صفدر میر

۳- "دست حنا بستہ" از توصیف تبسم' مطبوعہ : "اوراق" لاہور' شمارہ-۲ بابت : ۱۹۶۷

۴- "دائرہ اور تکون" از انور معظم' مطبوعہ : "شعر و حکمت" حیدر آباد دکن' شمارہ-۱' بابت جنوری تا مارچ ۱۹۷۰

۵- "بلیدان" از عارف عبدالمتین' مطبوعہ : "اوراق" لاہور' (دور ثانی) شمارہ-۲' بابت : اکتوبر تا نومبر ۱۹۷۲

اب تک ایلیٹ کے دو مکمل منظوم ڈرامے اردو میں ترجمہ ہو چکے ہیں :-

۱- "کلیسا میں قتل" ترجمہ : قرۃ العین حیدر' مطبوعہ : "نیا دور" کراچی' شمارہ ۳۱-۳۲

۲- "کاک ٹیل پارٹی" ترجمہ : سراج الحق' مطبوعہ : "نیا دور" کراچی' بابت : ستمبر ۱۹۶۶

عتیق اللہ کا ایک مضمون بہ عنوان "بیسویں صدی میں منظوم ڈرامے کا فن اور ایلیٹ" اس نابغہ روزگار کی منظوم ڈراما نگاری کا تجزیہ اور تعارف ہے۔ جب کہ مؤسسہ فرینکلن' لاہور نے لیونارڈ و نگر کے ایلیٹ سے متعلق تعارفی کتابچے کا (مترجم : قیوم نظر) شائع کیا۔

۴ جنوری ۱۹۶۵ میں جب ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے لندن میں وفات پائی تو ژاں پال سارتر نے اپنا ایک تعزیتی بیان ریکارڈ کرایا تھا۔ مجلہ "افکار" کراچی کے شمارہ فروری ۱۹۶۵ کی معرفت سارتر کا یہ تعزیتی بیان اردو دنیا تک پہنچا۔ "افکار" کراچی کے شمارہ مارچ ۱۹۶۵ میں عبادت بریلوی نے اردو دنیا کی نمائندگی کرتے ہوئے ایلیٹ کو خراج تحسین پیش کیا اور جنوری ۱۹۶۶ میں جب مجلہ "اوراق" لاہور کا اولین شمارہ منظر عام پر آیا تو اس میں عرش صدیقی کا مقالہ شامل تھا : "ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ' میرا پسندیدہ فنکار۔"

❖ ❖

وسلاوا شمبورسکا ترجمہ: ضمیر احمد

میں معافی چاہتی ہوں
اتفاقاتِ زمانہ سے جنھیں سمجھا کہ وہ تقدیر تھے
کیا خبر لیکن غلط ہو یہ خیال
میں معافی چاہتی ہوں اس لئے تقدیر سے
اے مسرت! ہو نہ جا اس بات پر مجھ سے خفا
میں نے سمجھا ہے تجھے اپنا سدا
رفتگاں کو یہ نہ یاد آئے کبھی
دل میں اب باقی نہیں ہے ان کی بجھتی یاد بھی
میں معافی چاہتی ہوں وقت سے
جس میں اک دنیائے وافر
ہو تی رہتی ہے نظر انداز ہر دم ہر گھڑی
اور معافی چاہتی ہوں عشقِ دیرینہ سے میں
کیونکہ سمجھا میں نے عشقِ نو کو عشقِ اولین
جنگ کے میدان جو آنکھوں سے او جھل ہیں مرے
چاہتی ہوں معذرت ان سے کہ میں تو پھول گھر
لاتی رہی

رستے زخمو! مجھ کو تم کرنا معاف
تم کو اپنی انگلیوں سے چھیڑتی رہتی ہوں میں
میں معافی چاہتی ہوں
ان سے جو بس مختصر سی اک توجہ کے لیئے
دل کی گہرائی سے یکدم پھوٹ کر رو پڑتے ہیں
میں معافی چاہتی ہوں ان سے جو
پانچ بجتے ہی سویرے
ریلوے اسٹیشنوں پر ہوتے ہیں
اور بستر میں پڑی سوتی ہوں میں
اے امیدو! تم کہ جیسے ہو تعاقب سے سراسیمہ کوئی
تم سے بھی میں چاہتی ہوں معذرت
معذرت وقتاً فوقتاً خندۂ بے فکری
ریگ زارو! میری کوتاہی سے کرنا در گذر
لے کے اک پانی کا چمچہ بھی نہ میں دوڑی ادھر

اے میرے شاہین! اے مردہ پرند
ہے تغیر اتنے سالوں سے اسی پنجرے میں بند
ٹکٹکی باندھے ہوئے
بے حرکت و احساس یوں ہی دیکھتے رہتے ہو
بس ایک ہی جگہ

تم نہیں زندہ تو کیا
تم معافی دو مجھے
میں معافی چاہتی ہوں پیڑ سے
کاٹ کر جس کو بنائے چار عدل پائے میز کے
میں معافی چاہتی ہوں ان سوالوں سے کہ تھے اتنے
بڑے
پر جواب ان کے بہت چھوٹے ملے
اے صداقت! مجھ سے کرنا در گذر
اے متانت! مہر کی مجھ پر نظر
رازِ ہستی! تجھ کو سہنا ہے مجھے
نوچتی رہتی ہوں بال و پر ترے
روح کی گہرائیو!
مجھ کو مت اس بات پر الزام دو
دسترس میں تم میری کم آئی ہو
میں تو ہر شے سے معافی چاہتی ہوں اس لئے
میں نہیں موجود ہو سکتی ہوں ہر دم۔ ہر جگہ
میں معافی چاہتی ہوں ہر کسی سے
ہو نہیں سکتی میں ہر اک مرد اور ہر ایک زن
جانتی ہوں میں کہ جب تک زندہ ہوں
میری ہستی کا نہیں کوئی جواز
میں ہی خود حائل ہوں اپنی ذات میں
اے مری گفتار! اس کو مت سمجھنا بے محل
مانگتی ہوں لفظ تو بھاری مگر
بعد میں کرتی ہوں کوشش
آئیں سب ہلکے نظر

نجات

مظہر الزماں خان

وہ نجس سیاہ کتا اپنی لٹکتی اور مسلسل لعاب گراتی ہوئی بے زبان۔ زبان سے پتہ نہیں کب اور کس بلا خیز موسم میں ہمارے قدیم گھر میں داخل ہو کر ہمارے مسائل زدہ گھر کا ایک عزیز فرد بن گیا تھا۔ مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں ہے بس ایک دھند میں لپٹا ہوا دھواں دھواں سا خیال میرے ذہن کے فانوس میں ہنوز مدھم چراغ سا ہے کہ شاید وہ سیاہ کتا میری عمر کے تیرھویں موسم میں یا شاید اس کے بعد یا شاید اس سے پہلے ہمارے آنگن والے گھر میں داخل ہوا تھا اور غیر ارادی طور پر میرے اندر اس کے لیے خواہ مخواہ ایک خلوص پیدا ہو گیا تھا کہ شعور میرے اندر ابھی جگنو نہیں بنا تھا اس لیے میں غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر اس سیاہ نجس کتے کے قریب آپ ہی آپ چلا گیا تھا کیوں کہ وہ میرے پیروں کے لمس سے اپنی قربت کا ہروقت اظہار کیا کرتا تھا اور اپنی لٹکتی ہوئی چپ چپ' لعاب گراتی ہوئی چکٹ زبان سے مسلسل مجھے چاٹا کرتا تھا جس طرح دنیا آدمی کو چاٹتی رہتی ہے اور پھر پاؤں کو چاٹنے والے سے آدمی فطری طور پر خوش ہوتا ہے اسی طرح میرے اندر بھی اس سے بڑی محبت پیدا ہو گئی تھی اور میں اس کے ساتھ لگے رہتے تھے اور سارے دھول موسم ہم دونوں پر سے ایک ساتھ گزرتے رہتے تھے کیونکہ کسی بھی موسم یا منظر کا احساس اس وقت مجھے نہیں ہوا تھا یا شاید میں موسم یا مناظر' دونوں سے واقف نہیں ہوا تھا اس لیے چپ تھا اور چاہتا تھا کہ میں اور وہ۔ دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں اور وہ اپنی تمام خصوصیات وخباثت آہستہ آہستہ میرے اندر منتقل کرتا جا رہا تھا اور میں بھی بے ارادہ اس کی عادتیں اور اس کا مزاج قبول کرتا چلا جا رہا تھا کیونکہ مجھے اس کی ہر حرکت دنیا کی طرح اچھی لگتی تھی بلکہ بعض وقت تو مجھے یوں محسوس ہونے لگتا تھا کہ وہ اور میں دونوں آہستہ آہستہ ایک سے ہوتے جا رہے ہیں کہ اس کی دنیا کا وہ ہمزاد اب پوری طرح میرا بھی ہمزاد بن گیا تھا کہ دفعتاً ایک بیدار رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ اس کا کہیں پتہ نہیں ہے اور میں اسے مسلسل تلاش رہا ہوں۔ اپنے سارے گھر میں' سارے شہر میں' سارے محلے میں لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا ہے جب کہ اس جیسے کتنے سیاہ' زرد ہزار ہا کتے ہر شہر اور ہر گھر میں موجود و محفوظ ہیں تاہم وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا چنانچہ میں اسے تلاشتے تلاشتے تھک کر اپنے بستر پر لیٹ جاتا ہوں تو اچانک مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ میرے اندر چھپا بیٹھا مسلسل بھونک رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ میرے اندر چکٹ لعاب بھی گرتا جا رہا ہے اور میں اسے اپنے اندر کے جنگل سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن وہ میرے اندر سے باہر آنے کے بجائے میرے پیٹ سے میرے دل میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور میرا دل میرے اندر سے باہر نکل کر دوڑ رہا ہے اور دوڑتے دوڑتے ایک ٹھوکر کھا کر شیشے کی طرح ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہے اور تبھی اچانک میری گہری پیدائشی نیند ٹوٹ جاتی ہے اور میں اپنے میلے بستر سے اٹھ کر حیران نظروں سے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھتا ہوں کہ آیا وہ اپنی جگہ موجود ہے یا سبھوں کے دلوں کی طرح نکل گیا ہے۔ لیکن چند لمحوں کے بعد مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی جگہ موجود ہے مگر آئینہ بن گیا ہے البتہ وہ سیاہ کتا میرے پیٹ میں ہنوز بھونک رہا ہے اور معاً جبھی میری آنکھیں میرے دل میں جگنو بن جاتی ہیں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ ٹیڑھی دم والا سیاہ کتا میرے اندر سے نکل کر مجھے گھورنے لگا ہے اور پھر پہلی مرتبہ مجھے اس کی آنکھوں اور اس کی تھرتھر جھولتی ہوئی زبان اور اس سے گرتے ہوئے چپ چپ چکٹ لعاب سے نفرت ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ گزرے ہوئے تمام رات اور میلے دن ہوا' ہوا ہو جاتے ہیں تو مجھے پہلی بار اپنے اجلے آدمی ہو جانے کا احساس ہوتا ہے اور پھر میرا دل مجھ سے کہتا ہے کہ میں پیدا کیوں کیا گیا ہوں۔ میری پیدائش کا مقصود کیا ہے؟ اور اسی وقت میرے ذہن سے ایک آواز سنائی دیتی ہے کہ اگر اپنے آپ کو سمجھنا چاہتے ہو اور اپنی ذات کو پہچاننا چاہتے ہو تو اس سیاہ کتے سے چھٹکارا حاصل کر لو ورنہ ان گنت کتوں کے کتا خانے میں ایک اور کتے کا اضافہ ہو جائے گا۔ چنانچہ صبح اٹھ کر میں سب سے پہلے اپنے اندر اور باہر کے دونوں جسموں کو دھو ڈالتا ہوں تو پہلی مرتبہ مجھے اپنے وجود کے ساتھ علم کا احساس ہوتا ہے اور پھر اسی وقت میں آنگن میں بیٹھے ہوئے اس سیاہ کتے کے قریب جاتا ہوں اور اس کے گلے میں زنجیر ڈالتا ہوں اور پھر اسے گلی کوچوں اور بازاروں سے گزارتے ہوئے جنگل کی طرف لے جاتا ہوں اور جب ایک طویل مسافت طے کرنے کے بعد جنگل میں پہنچتا ہوں تو سورج اپنا سارے دن کا سفر ختم کیے تکان سے سرخ ہو رہا تھا۔ میں اس سیاہ کتے کے گلے سے زنجیر کھولتا ہوں اور

اسے جنگل میں چھوڑ کر واپس اپنے گھر کی طرف لوٹنے لگتا ہوں تو وہ سیاہ کتا پھر میرے پیچھے آنے لگتا ہے۔ میں اسے دھتکارتا ہوں پھر بھی وہ میرے پیچھے آنے لگتا ہے۔ چنانچہ میں درخت سے ایک پکی لکڑی توڑتا ہوں اور اسے مارنے لگتا ہوں تو وہ بھونکتے ہوئے تیزی سے بھاگنے لگتا ہے اور میں لکڑی لیے مارتا ہوا اس کے پیچھے دوڑنے لگتا ہوں۔ آخر بھاگتے بھاگتے جب وہ سیاہ کتا میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

اختتام ایک

تب میں اپنے گھر لوٹنے کے لیے گھنے جنگل سے پلٹتا ہوں تو اپنے گھر کا راستہ ہی بھول جاتا ہوں کہ جدھر جاتا ہوں مجھے درخت ہی درخت دکھائی دیتے ہیں۔

اختتام دو

اور جب میں اپنے چھوڑے ہوئے گھر کی طرف لوٹنا چاہتا ہوں تو مجھے چاروں طرف غراتے ہوئے درخت دکھائی دیتے ہیں اور ان کی شاخوں سے چپکتے ہوئے چپ چپ چکٹ لعاب میں میں پوری طرح بھیگ جاتا ہوں۔ ❖ ❖

پیارے لال رتن

(۱)

آدمی جو تری پناہ میں تھا
اس کا عالم مری نگاہ میں تھا

آرزو کے چراغ بجھتے گئے
جسم تنہا فریب راہ میں تھا

بام و در سے لگی کھڑی تھی شفق
ماجرا کچھ تو خواب گاہ میں تھا

بجھ گیا میں رواروی کے ساتھ
میں جو لمحوں کی کارگاہ میں تھا

تو ہی منزل نواز ٹھہرا ہے
زندگی کا قدم تو راہ میں تھا

آگ تھی جو انا میں جلتی رہی
وہ دھواں تھا جو خانقاہ میں تھا

(۲)

تشنہ لبی کا قائل ہے
ساقی بھی تو سائل ہے

اس کے بس کی بات نہیں
وہ تو نیک شمائل ہے

چلتا جل رہتا نرمل
ٹھہرا جل تو زائل ہے

پرکاری کا کیا کیجے
دیدہ وری میں حائل ہے

حسن کی سونی وادی میں
عشق چھنکتی پائل ہے

شام کھڑی ہے پر تولے
چہرہ سرخی مائل ہے

وقت نہیں کچھ کہنے کا
لمحہ لمحہ گھائل ہے

برگد کا پیڑ

مصطفیٰ کریم

ولی بیگ غسل خانے سے نکلے۔ ان کی سفید قمیص کے دو بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور کھلے گریبان سے ان کی توند جھانک رہی تھی۔ چکنے گالوں کے درمیان گھنی مونچھوں کا سیاہ دھبا نمایاں تھا۔ خواب گاہ کے نیم وا دروازے پر رک کر انہوں نے ڈرتے ہوئے کمرے کے اندر نگاہ ڈالی۔ اس گناہگار کی طرح جو پیر کے حجرے میں رسائی کے لیئے ڈرتا ہوا جھانکتا ہے۔ کھڑکی کا پردہ کھنچا تھا۔ مدھم روشنی میں چرمی جلدوں میں بندھی مذہبی کتابیں الماری میں سجی تھیں اور دیوار پر مولانا روم کے مقبرے کی تصویر لگی تھی۔ ولی بیگ کی بیوی سجدے میں تھیں۔ دن چڑھ آیا تھا اور صبح کی نماز کا وقت موسم گرما کی راتوں میں اڑنے والی شبنمی ہوا کی طرح جا چکا تھا۔

ولی بیگ کو بے پناہ تھکن کا احساس ہوا۔ وہ مغموم ہو گئے۔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے دران نے اسلام ترک کرکے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ آج وہ اپنی منگیتر کے ساتھ دو سو میل دور برمنگھم سے ان کے یہاں آرہا تھا۔ کل رات جب اس نے فون کیا اور اپنے آنے کی اطلاع دی تو ولی بیگ کو محسوس ہوا کہ زمانہ قدیم کی نصرانی فوجیں جو بیت المقدس کو فتح کرنے کے لیئے یلغار کرتی تھیں وہ ان پر حملہ کرنے آرہی ہیں۔ شریفہ خانم کو عبادت میں مصروف دیکھ کر انہیں احساس ہوا کہ ان کی بیگم تنہا اس بلا کا مقابلہ کرنے والی ہیں۔ دیکھنے میں کمزور اور چھوٹا قد۔ ڈھیلا کرتا ٹخنوں تک پھیلا ہوا اور سر پر اسکارف بندھا۔ ان کی بیوی اس وقت بے ضرر اور مسکین لگ رہی تھیں۔ گذشتہ رات سے مختلف جب وہ بیٹے کی آمد کی خبر سن کر غصے میں ولی بیگ پر چیخ رہی تھیں۔ سر کے بال بکھرے ہوئے۔ چہرہ سرخ اور داہنی آنکھ جو بائیں سے بڑی تھی وہ اس طرح نکلی ہوئی تھی کہ ولی بیگ کو ڈر ہوا کہ کہیں توپ کے گولے کی طرح ان کے سر پر نہ دغ جائے۔

"نہیں.... نہیں.... ہرگز نہیں۔ اس گھر میں قدم رکھنے کی بھی اسے اجازت نہیں مل سکتی۔" شریفہ خانم گرجی تھیں اور ساتھ ہی کلیساؤں کی ان تصویروں کو پھاڑ ڈالا تھا جو ترکی میں شہر توشہو کے قریب غاروں میں گیارھویں صدی میں بنائے گئے تھے۔

"وہ کافر ہے... اچھوت" بیوی پیر پٹک کر دھاڑی تھیں اور ساتھ ہی انہوں نے اس کیلنڈر کو چاک کر دیا تھا جس میں سولہ سو سال ق۔ م اگاریت (شام) دور سے دو سو سال ب۔ م عربوں کے دور تک کے حروف بالترتیب چھپے ہوئے تھے۔ اس کیلنڈر کو ولی بیگ نے کسی کلیسا کی دوکان سے خریدا تھا۔

"یہ سب تمہارا قصور ہے۔ سب بگاڑ تم نے پیدا کیا ہے۔ مذہب پر تمہارا اعتقاد ہمیشہ کمزور رہا۔ اسی کی وجہ سے یہ تباہی آئی ہے۔" شریفہ خانم کی انگشت شہادت ولی بیگ کی آنکھوں کے سامنے اس طرح تھرکی کہ انہیں ڈر ہوا کہ کہیں وہ انگلی ان کی آنکھ میں نہ گھس جائے۔

صورت شکل اور اپنی عادتوں میں دران اپنے باپ سے کچھ زیادہ ملتا جلتا تھا اس لیئے شریفہ خانم کو دیگر بچوں کے مقابلے میں کم عزیز تھا۔ وہ ترکی کے شہر قونیہ کی رہنے والی تھیں۔ ان کے تمام بزرگ مولانا رومی کے معتقد تھے اور مقبرے میں درویشوں کے رقص میں حصہ لیا کرتے تھے۔ گذشتہ رات بہت دنوں کے بعد ولی بیگ کو بھی غصہ آگیا تھا۔ وہ بھی اس پر چیخے تھے۔

"میں جہاں بھی ہوں گا میری اولاد وہاں کسی وقت بھی آسکتی ہے... یہ گھر میرا بھی ہے۔" طیش میں ان کا لحیم شحیم جسم اس طرح ہلا تھا جیسے کوہ ارارات پھٹ پڑا ہو۔ شریفہ خانم بڑبڑاتی ہوئی چپ ہو گئیں۔

لیکن اب' اس وقت' اس لمحے سب کچھ پر سکون تھا۔ سب کچھ پر وقار۔ ان کی بیگم سجدے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ سینے پر ہاتھ تعظیم سے بندھے تھے۔ آنکھیں بند اور چہرہ متبرک۔ وسط رمضان کے چاند کی طرح۔ وہ بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ ولی بیگ کا جی چاہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائیں۔ لیکن یہ خواہش بچکانہ سی تھی۔ دیمک خوردہ درخت کے ہرے بھرے ہونے کی آرزو۔ ولی بیگ سیکولر ترکی میں جوان ہوئے تھے۔ اس کے بعد پچیس سال انہوں نے انگلستان میں گزارے تھے۔ بچپن میں یاد کی ہوئی آیتیں وہ بھول چکے تھے۔ بہت دن پہلے کی عید انہیں یاد تھی جب وہ بیٹوں کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھنے گئے تھے۔ وہ وسطی صف میں کھڑے امام کی شیریں قرأت کو غور سے سن رہے تھے۔ اچانک امام نے اللہ اکبر کہا۔ نمازیوں نے بھی تکبیر کہی اور اپنے ہاتھوں کو کانوں تک لے گئے' لیکن ولی بیگ رکوع میں چلے گئے تھے۔ دران ان سے پیچھے کی صف میں تھا۔ وہ زور سے ہنس پڑا۔ یہ واقعہ مانچسٹر میں ہوا

تھا۔ اس دن کے بعد [illegible] مسلمانوں سے انھیں آنکھ ملانے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ مانچسٹر سے [illegible] وہ اسکاربرو آبسے تو ان میں مزید تبدیلیاں آگئیں۔ انھوں نے خود کو یقین دلادیا کہ جو کچھ ہے اس زمین پر ہے اور جو یہاں سے گیا وہ لوٹ کر نہیں آتا نیز انسان کا خواہ کوئی بھی مذہب ہو اس کی زندگی کا کاروبار برابھلا چلتا ہی رہتا ہے۔

تھکے ہوئے قدموں سے چلتے ہوئے ولی بیگ لاؤنج میں آئے اور صوفے میں دھنس گئے۔ کارنس پر سے ایک کوئلے رنگ کے بھیڑیے کی مورتی ان پر غرا رہی تھی۔ بھیڑیا ترکوں کی قوم پرستی کی علامت تھا۔ کچھ دنوں سے ولی بیگ کو ترک قوم پرستی میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس مورتی کو انھوں نے کسی دوکان سے خریدا تھا اور اپنی قوم پرستی کی تسکین کے لیئے وہ اسے کبھی کبھی غور سے دیکھا کرتے تھے۔

ولی بیگ اور شریفہ خانم کے بچے جوان ہونے کے بعد گھر چھوڑ کر جا چکے تھے۔ میاں بیوی اب تنہا زندگی گزار رہے تھے۔ شریفہ خانم نے بھی آدھی زندگی انگلستان میں گزاری تھی۔ گو اسکاربرو میں ان کی بہن اپنے عرب خاوند کے ساتھ رہتی تھیں پھر بھی شریفہ خانم کو تنہائی کا شدید احساس رہتا تھا۔ تین سال پہلے جب فالج نے ان کے بائیں چہرے کو مفلوج کردیا اور ان کی بائیں آنکھ داہنی کے مقابلے میں چھوٹی نظر آنے لگی تو وہ ڈپریشن کا شکار ہو گئیں۔ اکثر وہ غم زدہ اور خاموش دکھائی دیتیں۔

چھ مہینے قبل جب میاں بیوی کو خبر ملی کہ دران نے اپنا مذہب تبدیل کرلیا ہے تو شریفہ خانم کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ انھیں سائیکی ایٹرک ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ جہاں وہ دن رات ولی بیگ کو صلواتیں سناتیں۔ "وہ ناکارہ موٹو جس کے سر کے اندر سڑا تربوز ہے۔ خبیث آزاد خیال..." ہسپتال کی نائجیرین نرس مس لولو ان دشنام طرازیوں کی خبریں پابندی سے ولی بیگ کو دیتیں۔ جس رازداری سے انھیں اطلاعات ملتے اس سے ولی بیگ کو شبہہ ہونے لگا کہ مس لولو کے دل میں ان کے لیئے نرم گوشہ ہے۔ گو وہ جوان اور ہٹی کٹی مس لولو کے عشق بلا خیز کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے پھر بھی مس لولو کے سفید چمکتے ہوئے ہموار دانتوں کا تصور ان پر مہینوں سوار رہا۔

سچ تو یہ ہے کہ ولی بیگ کو بھی دران کی حرکت سے بہت صدمہ ہوا تھا۔ دران ان کی چہیتی اولاد تھا۔ اس کی تربیت میں انھوں نے خاصی دلچسپی لی تھی۔ پڑھائی اور کھیل میں اچھا بننے کے علاوہ اسے موسیقار بننے کی ترغیب بھی انھوں نے دی تھی۔ دران کو ڈھکے چھپے الفاظ میں یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ عشق میں کامیاب ہونے کے لیئے کون سے مؤثر ہنر ہیں اور اس سلسلے میں کیا احتیاط کرنی چاہیئے۔ لیکن دران نے مذہب بدل کر ولی بیگ کو جیسے ٹھکرا دیا تھا۔ ان کی جو بھی بچی کچی انفرادیت تھی اس کا دران نے خاتمہ کردیا تھا۔ اس انفرادیت کی تعمیر ترک قوم کی تاریخ اور تہذیب سے ہوئی تھی جس میں مذہب اسلام بھی شامل تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ جو گھٹن انھیں تھی، جس شرمندگی کا احساس انھیں تھا، وہ مٹ گیا۔ ماضی میں وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ مفکر کا ذہن ایک چھلنی ہے جس میں وہ اعتقادات کے ڈھیر کو چھانتا رہتا ہے۔ اور جب گزشتہ رات دران نے فون پر اپنے آنے کی اطلاع دی تو اس کی آواز سن کر ولی بیگ کو غصہ نہیں آیا۔ بعد میں انھیں کچھ خوف سا ضرور محسوس ہوا۔ انھوں نے سوچا کہ عیسائی بن جانے کے بعد پتہ نہیں بیٹے کا رویہ کیسا ہو؟

دران اور اس کی منگیتر شام کے وقت پہنچ رہے تھے لیکن گھر میں خورد و نوش کے سامان کی کمی تھی۔ ولی بیگ اٹھ کر خواب گاہ میں گئے۔ ان کی بیگم کمبل تانے پڑی تھیں۔ ان کے قدموں کی آہٹ سن کر خود کو انھوں نے سوتا بنالیا۔

"شریفہ۔ آؤ سپر مارکٹ چلیں۔ دران ہم سے کٹ ضرور گیا ہے، لیکن ہے تو ہمارا بیٹا اور اپنی منگیتر کے ساتھ آرہا ہے۔ ہم لوگوں کو اخلاق کا کچھ نہ کچھ مظاہرہ تو کرنا ہی ہو گا۔"

کمبل کے نیچے سکڑی شریفہ خانم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جب کبھی انھیں غصہ آتا، جو ان کی شادی شدہ زندگی میں اکثر ہوتا تھا تو وہ اپنی خفگی کا اظہار پتھریلی خاموشی سے کرتی تھیں۔

ولی بیگ وارڈ روب سے صاف پتلون نکال کر اسے پہننے لگے۔ "خدا کے لیئے ذرا شرم کرو۔ کہیں اور جاکر کپڑے کیوں نہیں تبدیل کرتے ؟" بیوی کے غصے بھری آواز سے وہ چونک پڑے۔ انھوں نے مڑ کر دیکھا۔ شریفہ خانم ابھی تک کمبل میں چھپی تھیں۔ آتش فشاں پہاڑ پھٹ کر پھر خاموش ہو گیا تھا۔ ولی بیگ کو کئی قسموں کی پریشانیوں نے گھیر لیا۔ دران کی دل شکن روش۔ اس کی انگریز منگیتر جو ولی بیگ کے لیئے بالکل اجنبی تھی، اس کی آمد کی خبر۔ گھر میں کھانے پینے کے سامان کا نہ ہونا۔ بیوی کی خفگی۔ وہ چہار جانب سے سنگسار ہو رہے تھے۔ وہ کپڑے اٹھا کر چپکے سے ٹائلٹ میں چلے گئے۔ انھوں نے وہاں لباس تبدیل کیا۔ پھر اپنی بیوی کو الوداع کے بغیر کار میں گھر سے نکل گئے۔

"اس ڈیڑھ آنکھ کی عورت پر غصہ اتارنا مجھے بھی آتا ہے۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اسے خدا حافظ کہتا۔" ولی بیگ غصے میں بڑبڑائے اور ایکسیلیٹر کو زور سے دبایا۔ موٹر شور مچاتی تیز بھاگی۔ فٹ پاتھ پر چلتے ایک بزرگ انگریز نے اپنی چھڑی غصے سے ہوا میں لہرائی۔ اسے موٹر کی کرخت آواز بہت بری لگی تھی۔ ونڈ اسکرین کے آئینے میں چھڑی کو ہوا میں لہراتے ہوئے ولی بیگ نے دیکھا۔ خوف سے وہ کانپ گئے اور انھوں نے نگاہیں سامنے جمادیں۔

ولی بیگ نے کار پارک میں کار کھڑی کی۔ سپر مارکٹ میں داخل ہوئے اور ایک ٹرالی دھکیلتے ہوئے مطلوبہ اشیا کی تلاش کرنے لگے۔ دونوں جانب بڑے بڑے شیلفوں پر سیب، سنگترے، پیاز، گوبھی اور انواع و اقسام کی چیزیں تھیں۔ ماضی میں وہ یہاں ہمیشہ اپنی بیوی کے ساتھ آیا کرتے تھے۔ جگ مگ

کرتے ہوئے سپرمارکٹ میں پھرتے ہوئے انھیں بڑی فرحت کا احساس ہوتا۔ جیسے وہ اپنے گھر کے اندھے کنویں سے نکل کر کسی نئی کھلی جگہ میں آگئے ہوں۔ اردگرد کے ہجوم میں ضعیف مرد اور عورتیں ہاتھوں میں فہرستیں لیئے ہوئے ان کے مطالعے میں گم۔ کوئی نوجوان جوڑا کھانے پینے کی اشیا کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں کارنیشن کے پھولوں کا گلدستہ سنبھالے ہوئے، اپنی ماں سے چاکلیٹ خریدنے کے لیئے ضد کرتا ہوا بچہ، ان سب میں انھیں اپنی زندگی کا روپ نظر آتا۔ وہ جو گزر گئی تھی اور وہ جو آرہی تھی۔ آہستہ آہستہ دبے پاؤں۔ "سب انسان ایک جیسے ہیں۔" سپرمارکٹ میں پھرتے ہوئے کبھی کبھی ان کے منھ سے نکل جاتا۔ ولی بیگ کی بیوی چونک کر انھیں دیکھتیں لیکن ان کے چہرے پر ایک معصوم سی خاموشی بکھر جاتی جیسے انھوں نے کچھ کہا نہیں تھا۔ لیکن آج جن پریشانیوں نے انھیں گھیر رکھا تھا اس کی وجہ سے سپرمارکیٹ میں انھیں کوئی خوشی نہیں محسوس ہورہی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کے بیٹے کی منگیتر کس قسم کا کھانا پسند کرے گی۔ آخر انھوں نے طے کیا کہ گھر میں ترکی کھانا پکے گا خواہ وہ پسند کرے یا نہ کرے۔ ولی بیگ ٹرالی میں وہ چیزیں رکھنے لگے جو ان کی بیوی خریدا کرتی تھیں۔ کھانا بیوی کو پکانا ہے اسے سہولت ہوگی وہ سوچ رہے تھے۔ جب وہ ٹل (TILL) کے پاس قیمت ادا کرنے کے لیئے پہنچے اور جیب ٹٹولی تو مارے دہشت کے ان کا منھ کھل گیا۔ بٹوا تو وہ گھر ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ لیکن ان کا بااحتیاط ہونا کام آیا۔ وہ بٹوا اور کریڈٹ کارڈ الگ الگ جیبوں میں رکھتے تھے۔ کارڈ سے انھوں نے قیمت ادا کی اور گھر واپس آگئے۔

گھر میں ایک اور مصیبت ان کا انتظار کر رہی تھی۔ جس ننھی میز پر ٹیلیفون رہتا تھا۔ وہاں ایک کاغذ پر لکھی شریفہ خانم کی تحریر نے انھیں اطلاع دی کہ وہ اپنی بہن کے یہاں جارہی ہیں اور واپس اسی وقت آئیں گی جب دران اور اس کی منگیتر جاچکے ہوں گے۔ ولی بیگ کو پتہ تھا کہ ان کی ہزار کوششوں کے باوجود ان کی ضدی بیوی واپس نہیں آسکتی۔ چنانچہ اب انھیں مہمانوں کو خوش آمدید کہنا اور ساتھ ہی ان کے لیئے کھانا بھی پکانا تھا۔ وہ ٹرکش کباب ہاؤس کے مالک تھے اس لیئے انھیں کھانا پکانا آتا تھا۔ "آل ان اے گڈ کاز۔" (ALL IN A GOOD CAUSE) کہتے ہوئے وہ تیاری میں لگ گئے۔ دو گھنٹے میں پلاؤ، قورمہ، سلاد اور وہ رائتہ تیار ہوگیا جس کے لیئے ان کا کباب ہاؤس مقبول تھا۔ اپنی انگلیوں کو جن سے لہسن کی بو آرہی تھی سونگھتے ہوئے "آل ان گڈ کاز۔" ولی بیگ نے دہرایا۔

سورج غروب ہونے سے پہلے دران پہنچ گیا۔ چھوٹا قد اور مضبوط جسم، سر پر گھنگریالے بال۔ وہ اپنی موٹر سے نکلا اور اس کے پیچھے پیچھے اس کی منگیتر باہر آئی۔ دران سے چھوٹا قد، دبلی پتلی اور ناک کا درمیانی حصہ ذرا چپٹا۔ دونوں جینز، ڈھیلی قمیص اور انوریک (ANORAK) میں ملبوس تھے۔ دران کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔ چند لمحے وہ موٹر کے پاس کھڑا رہا۔ جیسے وہ اپنے آپ کو کسی غیر متوقع جذباتی تصادم کے لیئے تیار کر رہا ہو۔ اگر اس کی منگیتر اسے اپنے والدین سے ملنے پر زور نہ دیتی تو شاید وہ یہاں نہ آتا۔ اس کے دل میں بھی سرد مہری آگئی تھی۔ کسی زمانے میں باپ کی یاد سے جو کشش محسوس ہوتی تھی وہ اب غائب ہوچکی تھی۔ بہتا دریا کسی ریگستان میں آکر خشک ہوگیا تھا۔ لیکن اس گھر کو دیکھ کر جہاں وہ پلا بڑھا تھا اور اس تصور سے کہ اس گھر میں اس کے والدین اس کے منتظر ہیں، اسے اسی پرانی کشش کا احساس ہوا۔ دریا ریگستان کا سینہ چیر کر نکل آیا۔

ولی بیگ گھر سے باہر آگئے۔ باپ بیٹا جب گلے ملے تو ولی بیگ کو محسوس ہوا کہ جیسے دران کے جسم پر کانٹے اگ آئے ہوں اور انھیں وہ کانٹے چبھتے محسوس ہوئے۔ لیکن اس چبھن کے باوجود دران انھیں عزیز محسوس ہوا۔

"جینٹ ہے۔ میری منگیتر۔" دران نے تعارف کرایا۔

"ہلو۔" جینٹ بولی اور ساتھ ہی ولی بیگ سے ہاتھ ملایا۔ وہ باپ بیٹے کی اس محبت بھری ملاقات سے محظوظ ہورہی تھی۔ جینٹ امن پسند تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ غیریت کی جو دیوار دران اور اس کے والدین کے درمیان کھڑی ہے وہ گر جائے۔ یہ آپس میں ملنے کے بعد ہی ممکن ہوسکتا تھا۔ وہ جانتی تھی۔

سب گھر کے اندر آگئے۔ ماں کی غیر موجودگی سے دران کو حیرت ہوئی۔

"اماں کہاں؟"

"تمہاری خالہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ وہیں ہیں۔" ولی بیگ نے بیٹے کو جواب دیا۔

دران کا چہرہ اتر گیا۔ اسے ماں کی محبت اب نہیں مل سکتی وہ سمجھ گیا۔ اسے جینٹ کی جانب دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ماں نے بیٹے کے ساتھ اپنی ہونے والی بہو کو بھی ٹھکرا دیا تھا۔ اپنی منگیتر کی بے عزتی پر دران کو غصہ آگیا۔ اس کی ابروئیں تن گئیں اور ماتھے پر شکنیں گہری ہوگئیں۔

"لیکن... لیکن... اماں مجھ سے مل کر جاسکتی تھی۔" دران اپنے باپ کو گھورتے ہوئے بولا۔

ولی بیگ نے اپنی بیوی کی حرکت پر تاسف کا اظہار شانے اچکا کر اور منھ بنا کر خاموشی سے کیا۔ پھر بولے۔

"آؤ بیٹھو۔" "ہوسکتا ہے تمہاری خالہ کی طبیعت اچانک کچھ زیادہ خراب ہوگئی ہو۔" جینٹ نے زبردستی کی مسکراہٹ اپنے چہرے پر لا کر دران کو تسلی دی۔ سب لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے۔

"تم لوگ بہت تھک گئے ہوگے ؟"

"نہیں کچھ زیادہ نہیں۔" دران نے باپ کو خشک جواب دیا۔

"لمبی ڈرائیو تھی ؟"

"پتہ نہیں۔ یہ ڈرائیو کرتی رہی ہے۔"

جینٹ نے جو مشقت کی تھی اس کے اعتراف میں اور اس وقت جس سہارے کی دران کو ضرورت تھی اس کی وجہ سے دران نے جینٹ کا ہاتھ نرمی

سے پکڑ لیا- محبوب کے لمس سے اس کا چہرہ کھل اٹھا- لیکن ولی بیگ جل گئے- اپنے پن کا ایسا کھلا اظہار انھیں کچھ بھلا نہیں لگا- "یہ انگلستان ہے ترکی نہیں-" انھوں نے اپنے آپ کو دل ہی دل میں سمجھایا-

"تم پہلی بار اسکاربرو آئی ہو؟"

"ہاں-" جینٹ نے سر کی ہلکی سی جنبش سے ولی بیگ کو جواب دیا-

اس کے بعد خاموشی کے پتھر گرنے لگے- ولی بیگ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اجنبی جینٹ کے سامنے بیٹے سے کس طرح بے تکلفی سے باتیں کریں-

"میں تم لوگوں کے لیئے چائے بناتا ہوں-"

"میں بنا دیتی ہوں چائے- مسٹر ولی آپ اپنے بیٹے سے باتیں کیجیئے- بتایئے کچن کدھر ہے؟" ولی بیگ کی الجھن کو جینٹ سمجھ گئی تھی-

"نہیں... نہیں... تم مہمان ہو-"

"ڈیڈ- اسے کام کرنے دیجیئے- جینٹ بہت سادہ دل گھریلو لڑکی ہے-" دران نے جینٹ کی سنجیدگی سے تعریف کی-

ولی بیگ نے جینٹ کو وہ الماری کچن میں دکھائی جس میں چائے چینی' بسکٹ' چائے کی پیالیاں اور طشتریاں رکھی تھیں- وہ واپس لاؤنج میں آگئے جہاں دران پیر پھیلائے صوفے پر بیٹھا تھا- اسکول کی تعلیم کے بعد پڑھائی میں اس کا جی نہیں لگا تھا اور وہ گھر چھوڑ کر مختلف شہروں میں انواع واقسام کے کام کرتا رہا تھا- اس نے والدین سے مالی امداد نہیں مانگی- گزرا اوقات کے لیئے خود پر بھروسہ کیا تھا- اس لیئے اس کے چہرے پر خود اعتمادی تھی- ایک سنہری زنجیر جس میں صلیب آویزاں تھی' اس کے گلے سے لٹک رہی تھی- صلیب کو دیکھ کر ولی بیگ غمگین ہوگئے- بیٹے سے گلے ملتے وقت جن کانٹوں کی چبھن انھوں نے محسوس کی تھی وہی چبھن انھیں پھر محسوس ہونے لگی- ایک دیوار کھڑی تھی ان کے اور دران کے درمیان- ان کی غمگین آنکھوں نے بیٹے کا جائزہ لیا- پھر وہ بولے-

"دران- تمھاری حرکت سے مجھے بہت صدمہ ہوا ہے-"

"ڈیڈ یہ میری زندگی ہے-"

"مجھے پتہ ہے- لیکن..."

"ڈیڈ- ممی آپ سے ہمیشہ جھگڑتی رہتی ہیں- حالانکہ اکثر آپ نے قرآن کی آیت کا حوالہ دے کر انھیں بتایا کہ ان پر آپ کی اطاعت فرض ہے- آپ کو کبھی مذہب سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہا- میں دہریہ بن جاؤں یا کوئی نیا مذہب اختیار کروں آپ کو اس بابت پریشان نہیں ہونا چاہیئے-" دران نے اونچی آواز میں باپ کو غصے میں گھورتے ہوئے جواب دیا-

"کبھی تم نے سوچا ہے کہ تم نے اپنی تہذیب اور ملک سے ہمیشہ کے لیئے رشتہ توڑ لیا ہے؟"

"میں انگلینڈ میں پیدا ہوا- یہی میرا ملک ہے- اور تہذیب؟ ادب' رقص' موسیقی' مصوری' ڈرامہ--- بتایئے کس فن میں ترکی ان لوگوں سے آگے ہے؟"

ولی بیگ سے جواب نہیں بن پڑا- اذیت کی سوئی نے ان کے لبوں کو سی دیا تھا- انھیں احساس ہوا کہ وہ اپنے بیٹے سے بحث میں نہیں جیت سکتے- ان کے غم میں اضافہ ہوگیا- صدمے سے ان کا سر ایک جانب جھک گیا اور ان کی دہری ٹھوڑی نمایاں ہوگئی- دیر تک خاموش رہنا مشکل تھا- بات تو کرنی ہی تھی- پتہ نہیں بعد میں بیٹا آئے نہ آئے- ولی بیگ نے موضوع بدلنے کے لیئے پوچھا-

"جینٹ کیا کرتی ہے؟"

"چائے بناتی ہے-" دران نے جواب دیا اور ایک فاتحانہ ہنسی ہنسا- وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا باپ اس کے دلائل رد نہیں کر سکتا-

"نہیں- نہیں- گزر اوقات کے لیئے کیا کرتی ہے؟"

"وکیل ہے-"

"وکیل؟"

"ہاں-" دران کے چہرے پر ولی بیگ کے استفسار سے ایک ناخوشگوار سنجیدگی آگئی تھی-

"میرے ناکارہ بیٹے کے لیئے ایک وکیل؟"

"ہاں-"

"لیکن؟"

"فلاحی کاموں کے سلسلے میں ہم دونوں ملے' پھر ہماری محبت ہوگئی- جینٹ نے کہا عیسائی بن جاؤ- میں نے سوچا یہ کھیل کھیلتے ہیں-"

"اور تم بسر اوقات کے لیئے کیا کرتے ہو؟"

"میں ایک ریستوراں میں گٹار بجاتا ہوں' گاتا ہوں- ساتھ ہی ہم دونوں ان دنوں بوسنیا کے مسلمانوں کے لیئے رقم بھی جمع کر رہے ہیں-"

"مسلمانوں کے لیئے؟"

"ہاں- دنیا کی ہر مظلوم قوم کے لیئے ہم دونوں ایسی خدمت کے لیئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں-"

ایک طشت پر چائے کا سامان اٹھائے ہوئے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جینٹ آگئی-

دو گھنٹے تک مستقل کھانا پکانے کے بعد ولی بیگ تھک گئے تھے- گرم مزیدار چائے پی کر انھیں راحت ہوئی- انھوں نے قبولیت کی نگاہوں سے جینٹ کی جانب دیکھا- "اتنی جلدی نہیں" کوئی ان کے دل میں بولا- جینٹ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دران کو چائے پیش کر رہی تھی- ولی بیگ کی بیوی کا گھر میں نہ ہونا اسے بھی برا لگا تھا- لیکن ان کی غیر موجودگی میں ان کی میزبانی کے فرائض انجام دے کر وہ خوش ہو رہی تھی- دران کے باپ پر میری شخصیت کا اچھا اثر پڑنا چاہیئے- اسے بار بار خیال آتا رہا تھا-

جب سب چائے پی چکے تو دران خالی پیالیاں اور طشتریاں اٹھا کر کچن چلا گیا اور انھیں بیسن میں دھونے لگا۔ لاؤنج میں ولی بیگ اور جینٹ تنہا رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس عورت سے کیا باتیں کریں۔ سچ تو یہ ہے کہ گرم چائے کی تازگی ختم ہوگئی تھی اور اس کی جگہ جینٹ کے خلاف ناراضگی کی دبی آنچ وہ محسوس کر رہے تھے۔

"اس عورت کی وجہ سے دران نے اپنا مذہب چھوڑا۔ صرف ہم سے نہیں بلکہ میرے اسلاف سے بھی دران کو اس عورت نے چھین لیا۔"

لیکن جینٹ اس خاموش احتجاج سے بے خبر بوسیدہ قالین اور صوفے پر نگاہیں دوڑا رہی تھی۔ اچانک اس کی نگاہ کارنس پر رکھے بھیڑیے کی مورتی پر رک گئی۔"

"یہ ترک قومیت کی علامت ہے۔" ولی بیگ اپنی برتری جتانے کے لیئے فخریہ بولے۔ ٹھیک اسی وقت دران لاؤنج میں داخل ہوا۔ اس نے اپنے باپ کے الفاظ سن لیئے تھے۔

"یقیناً۔ چیچنیا میں ترکوں کی آزادی کی جنگ۔ آزربائیجان میں ترک حکومت بنانے کا خواب گویا جلد ہی وہ بھی کویت کی طرح تیل کی کرامات سے امیر ہو جائے گا۔ بھیڑیئے کو اپنی قومیت کی علامت بنانا ترک قوم کی حماقت ہے۔ وہ خرگوش جیسی بے ضرر مخلوق کو کیوں نہیں علامت بناتے؟ دوسروں پر بھی ظاہر ہو تاکہ ترک امن پسند ہیں۔" دران نے اپنے خیالات کا اظہار ذرا جوش سے کیا۔

"نہیں دران۔ گر ترکوں کو اپنی قومیت کے کسی مضبوط اور توانا اظہار کی ضرورت ہے تو بھیڑیا ناموزوں نہیں۔" جینٹ بولی۔ وہ ولی بیگ کی خوشنودی چاہتی تھی۔

اس کی طرفداری پر دران کو حیرت ہوئی۔ لیکن ولی بیگ خوش ہو گئے۔ ان کی بیوی ترک قومیت کے مسئلے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اسے ان کے ناکارہ دماغ کی ناکارہ اختراع سمجھتی تھی۔ پھر سب چپ ہو گئے اور گفتگو کے لیئے نیا موضوع تلاش کرنے لگے۔

"جینٹ وہ تحفے تو لے آؤ۔" دران ذرا تحکمانہ انداز میں بولا۔

جینٹ باہر جاکر کار سے دو پیکٹ لے آئی۔ انھیں اس نے کھولا۔

"یہ دران کی والدہ کے لیئے ہے۔" جینٹ نے ایک کھلا پیکٹ ولی بیگ کی جانب بڑھایا۔

"کیا؟ تسبیح اور جائے نماز؟" ولی بیگ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

"اور ڈیڈ۔ یہ چرمی دستانے آپ کے ہاتھوں کو سردیوں میں گرم رکھیں گے۔" دران بولا۔

ولی بیگ نہال ہو گئے۔ ایسی خیر خواہی ان کی کسی اور اولاد نے ان کے ساتھ نہیں کی تھی۔ جاڑے میں وہ جب بھی باہر نکلتے تھے تو سردی سے ان کے ہاتھ سرخ اور یخ بستہ ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹر سے انھوں نے اس تکلیف کی شکایت کی تھی۔ اس نے انھیں دستانے پہننے کا مشورہ دیا تھا۔

"آؤ جینٹ تمھیں گھر دکھاتا ہوں۔" دران نے جینٹ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ دونوں کمرے کے باہر چلے گئے۔

دران نے جینٹ کو اپنے بچپن کی کہانیوں کی کتابیں دکھائیں اور وہ تصویریں بھی جو اس کے اسکول کے زمانے میں لی گئی تھیں۔ دران کی کتابوں کی الماری میں وہ بانسری بھی رکھی ہوئی تھی جسے بجانے کا سبق وہ اپنے اسکول میں لیا کرتا تھا۔ اس نے بانسری اٹھائی' آنکھیں بند کیں اور بانسری کو ہونٹوں سے لگا لیا۔ ایک عام سا نغمہ جس کے بجانے میں کسی مشاقی کی ضرورت نہیں تھی' بلند ہوا۔ جینٹ اس راگ سے واقف تھی۔ دران کو ایک بچے کی طرح خوش دیکھ کر وہ زور سے ہنس پڑی۔ ہنسی اور نغمے کو ولی بیگ نے سنا۔ ایسی چہل پہل مدتوں سے ان کے گھر میں نہیں ہوئی تھی۔ یہاں وہ اور ان کی بیوی اپنے خیالوں میں گم سائے کی طرح خاموش پھرتے رہتے تھے۔ ولی بیگ کچن میں آئے۔ جہاں پلاؤ اور قورمے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

دران اور جینٹ کو کچن سے برتنوں کے ٹکرانے کی آوازیں آئیں۔ دونوں تیزی سے نیچے آئے۔

"ڈیڈ۔ آپ کچھ نہ کریں۔ ہم لوگ یہیں کچن کی میز پر کھانا کھالیں گے۔" ولی بیگ کے ہاتھوں سے برتن لیتا ہوا دران بولا۔

"نہیں۔ نہیں۔ دران ڈائننگ روم مناسب رہے گا۔"

"ڈیڈ۔ آپ تکلف نہ کریں۔"

جلد اس میز پر کھانا لگ گیا جس پر سفید پلاسٹک کا میزپوش بچھا تھا۔ تینوں میز کے گرد بیٹھ گئے۔

"واہ.... پلاؤ' قورمہ' زرکش دہی اور سلاد میں پودینے کی تازہ پتیاں۔ عمدہ ...بہت عمدہ۔" دران نے منہ سے چٹخارے لینے کی آوازیں نکالیں اور کھانا شروع کردیا۔

"واقعی بہت مزیدار کھانا ہے۔" جینٹ پلاؤ' قورمے اور زرکش دہی کا ملا جلا لقمہ نگلتے ہوئے بولی۔

"میں تمھاری ماں کی طرح کھانا تو نہیں پکا سکتا۔"

"ڈیڈ۔ مجھے کسی کمی کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔" دران بولا۔ وہ بظاہر کھانے میں مصروف تھا لیکن اس کے باپ کا نہ صرف گھر میں موجود ہونا بلکہ اس کی اور جینٹ کی خاطرداری کے لیئے اتنی محنت کرنا۔ دران کو وہ تمام شفقتیں یاد آرہی تھیں جو اسے اپنے والد سے ملی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ فٹ بال کے میچ آگئے جن میں وہ بھی کھیلتا تھا اور ولی بیگ میدان کے کنارے تنہا کھڑے تالیاں بجا کر اس کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ اور وہ سارے تحفے بھی اسے یاد آئے جو اس کے والد اسکول میں اس کے کام کو دیکھ کر اس کے لیئے لاتے تھے۔ دران کو شرمندگی ہو رہی تھی کہ اس نے انھیں گم کر دیا تھا۔ اسے اس قربت کا احساس ہوا جسے اس کی مصروفیتوں نے اس کے ذہن کے کسی

تاریک نماں خانے میں بند کردیا تھا۔ اس وقت وہ قربت شعلہ بن کر لپک رہی تھی اور اس کی روح کو گرم کر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ جینٹ بھی چپ تھی اور وران کی طرح کھانے میں مشغول۔ کبھی کبھی چمچے کی پیالے یا طشتری سے ٹکرانے کی آواز بلند ہوتی۔ مدھم سی ٹن ٹن کرتی آواز۔ مانوس اور آشنا سی۔۔۔

"وران اور جینٹ اپنے طویل سفر سے تھکے ہوئے تھے۔ انھوں نے راستے میں ڈھنگ سے کچھ کھایا بھی نہ تھا۔ دونوں ہی بھوکے تھے۔ لذیذ کھانے کا ہلکا سا نشہ ان پر چھانے لگا۔ وران نے اپنے منہ کو کاغذ کے نیپکن سے صاف کیا اور بلند آواز میں بولا۔

"ڈیڈ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب ہمارا بیٹا پیدا ہوگا تو اس کا نام ہم آپ کے نام پر رکھیں گے۔"

جینٹ شرما کر مسکرانے لگی۔ لمحے بھر کے لیئے حیرت اور مسرت سے ولی بیگ نے وران کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی اور خلوص۔ ولی بیگ کا سر جھک گیا۔ وہ اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آج وران سے مل کر جن کانٹوں سے انھیں چبھن ہوئی۔ جو زخم انھیں لگے۔ ان زخموں پر بیٹے نے عرق گلاب چھڑک دیا تھا۔ وہ دیوار جسے ولی بیگ نے اپنے اور وران کے درمیان محسوس کیا تھا اس دیوار کی دوسری جانب برگد کا درخت تھا۔ تناور اور گھنا۔ جس پر چڑھ کر اس کی گھنی شاخوں سے وران کود کر ان کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ مسرور اور بانہیں پھیلائے۔ اسی طرح جس طرح وہ بچپن میں انھیں پھیلائے ان کی گود میں آنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اور اب۔۔۔ اور اب ولی بیگ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کہ وران سے کس طرح کہیں کہ یہ گھر اب بھی تمھارا ہے۔ ❖ ❖

ممالک غیر میں 'شب خون'

بیرون ہند کے پڑھنے والے حسب ذیل پتوں پر شب خون کا تعاون بھیج سکتے ہیں رقم کی وصولیابی کی اطلاع ملتے ہی پرچہ ان کے نام بذریعہ ہوائی ڈاک جاری کر دیا جائے گا

(۱) ریاست ہائے متحدہ امریکہ (پچیس ڈالر) جناب عادل منصوری

1. MR. ADIL MANSURI
POST BOX 922
HOBOKEN NJ-07030 U S.A

(۲) کناڈا (تیس ڈالر) جناب محمد حفظ الکبیر قریشی

2. MR. M.H.K. QURESHI
12, HARVEY COURT
RICHMOND HILL ONT
L4C-5R2-CANADA

(۳) پاکستان (پانچ سو روپے پاکستانی یا پندرہ ڈالر امریکن)
جناب صبا اکرام

3. MR. SABA EKRAM
NADEEM CORNER
FLAT NO B-3, SECTOR 16
BLCK - N
NORTH NAZIMABAD
KARACHI - 33 (PAKISTAN)

(۴) سعودی عرب اور مشرق وسطیٰ (پچیس امریکن ڈالر) جناب حنیف شاہ خاں

4. DR. HANEEF S KHAN (M.D.)
P O BOX - 378
AR 'AR - NORTH (K S A)

(۵) یورپ بشمول برطانیہ (پندرہ پونڈ اسٹرلنگ) جناب ساقی فاروقی

5. MR. SAQUI FARUQI
100 SUNNY GARDENS ROAD
LONDON - NW4 - IRY

خالد جاوید

بلیک ہول

وہ لہو بھرا، کائی بھرا
مذبح کا پرانا تالاب
چاند کے سفر سے یکسر بیگانہ تھا
بے وسعت تالابوں میں پوکھروں میں
ویسے بھی جوار بھاٹے نہیں آیا کرتے
پھر وہ تو
مذبح کا بساندھ بھرا مردہ تالاب تھا
مگر چاند کی اپنی اخلاقی ذمہ داری تھی
چاند کو اسے بچانا تھا
بوسیدہ کھنڈیا
فضلے کے ڈھیر کی شکل میں بدل جانے سے
وہ گاڑھے سیاہ کیچڑ سے
بالکل ہی ڈھک بھی سکتا تھا
چاند کو یہ صورت حال قطعی گوارہ نہ تھی
وہ مقررہ اوقات میں
سیاہ رات میں
گدھوں اور چیلوں کی غیر حاضری میں
تالاب کی
بے انت لہو زدہ سیڑھیاں
ایک ایک کر کے اترا کرتا
کالے سڑتے ہوئے پانی میں
اترتے وقت

چاند
اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر
دعا مانگتا
اسے کسی معجزے سے آشنا کر دے

مگر نہ جانے کیا ہوتا کہ
وہاں پیر رکھتے ہی
چاند خود
غرق ہو جاتا
اسے چندر شیکھر نے بتایا ہی نہ تھا
کہ کالے پانی میں کوئی عکس ہلکورے نہیں مارتا

سب کچھ غرق ہو جاتا ہے
روشنی بھی
تیرگی بھی

ہاری ہوئی بازی

تم تب بیمار تھیں۔ تم نے
کھینچ کر مجھے سینے سے لگا لیا
اور تیز گرم سانسوں کے درمیان
میرے کان میں کہا
"تم میرے گڈے ہو"
اندھیری سیاہ رات میں
تمہاری ہتھیلی پر
ایک موم بتی پگھلتی رہی
رات بجتی رہی
پھر تمہاری چوڑیاں زور سے کھنکیں
اور میرے ماتھے پر ایک گرم آنسو جلنے لگا

اب تم صحت یاب ہو گئی ہو
اور وہ مٹی کا چھوٹا سا سفید خرگوش
ٹوٹ گیا ہے
جو میں ایک میلے سے لایا تھا
اور ایک بندر بھی تو تھا
وہ بھی ٹوٹ ہی گیا ہو گا
اب تم ان ٹوٹے کھلونوں کو کہیں ڈال دو
کیوں انہیں صندوق میں بند رکھتی ہو
گڈے، خرگوش اور بندر سے کھیلنے کی عمر گئی
چلو تاش کی ایک گڈی خرید لائیں
اور بجے ہوئے کمرے میں
ایک دوسرے کے ساتھ ترپ چال کھیلیں

لوگ تم پر ہنسیں گے تو پھر کیا؟

بڑے بزدل ہو
کیا تم نے دیکھا نہیں کہ
ذبح کے لئے
لے جائے جانے والے جانوروں
کے سر پر بھی کبھی کبھی
ہمدردی سے ہاتھ پھیر دیا جاتا ہے
یا ان کے کان یا پیٹھ کو یونہی بے وجہ
تھپ تھپا دیتے ہیں
گو ان سے ان کی جانے والی جانوں کو
کسی قسم کا فائدہ پہونچنے کا
تصور ہی بے معنی ہے

کیا تمہیں کبھی توفیق ہوئی کہ
کسی شاہراہ سے گزرتے وقت
تم اپنا اسکوٹر روکتے اور
کیچڑ میں پھنسے خارشی ٹٹو
یا نال ٹھکواتے گھوڑے یا بیل
کے سر پر ہاتھ پھیرتے؟

یہ منظر ذبح کے منظر سے زیادہ ہولناک ہیں
مگر تم مضحکہ خیز بن جانے سے ڈرتے ہو
تم سوچتے ہو، لوگ ہنسیں گے

مگر سنو
ایسی بھی بزدلی اور نامردی کیا
زوال کی بھی کوئی حد ہے
یہ کس نے کہا تھا
جہاں مضحکہ خیزی کا ڈر ہے وہاں نیکی نہیں ہے

اب بھی وقت ہے
بزدلی چھوڑ دو
مضحکہ خیز بن جاؤ

مردانہ سنجیدگی

خالد جاوید

جی ہاں
میں نے اپنے چہرے سے مونچھیں صاف کردی ہیں
مجھے علم ہے کہ
میرا اوپری ہونٹ بے حد پتلا ہے
اس صورت میں
اگر میں پان بھی کھالوں
تو میرا چہرہ شہدوں سے ملنے لگے گا
مگر میں واقف ہوں
اپنے ہونٹوں کی اس قدرتی چالاکی سے
وہ کچھ اس طرح دائرے میں سمٹ جائیں گے
کہ لوگوں کو میرے بارے میں
ایک سنجیدہ آدمی ہونے کا گمان گزر سکتا ہے
سنجیدہ نظر آنا کتنا ضروری ہے
اپنی ذات کے پھکڑپن اور نامردی کو زندہ رکھنے کے
لئے

نظم

جانے کیا ہو گیا تھا
کیسی بدشگونی تھی
ایسا لگتا تھا
جیسے ننگا گھومتے رہنا
باعث شرم نہ رہا تھا
بزرگوں' بچوں
بہن اور بیٹی
سب کے سامنے میں
اداس۔ ٹھکرایا ہوا عریاں کھڑا تھا' لیکن

وہ گداز' سفید' بے باک
اور مہربان بانہیں
وہ طلوع ہوتے ہوئے
دھڑکتے ہوئے انگاروں جیسے گرم گرم سورج نما چاند
میرے داغوں بھرے
عریاں جسم کو بھینچ لیتے ہیں
"ادھر آؤ۔ تم
دیکھنے دو سب کو"
میرے رطوبت بھرے
بہتے ہوئے بدبودار کان پر
ایک گرم جلتا ہوا بوسہ
"کتنے پیارے ہو"
بانہوں کی گرفت کچھ اور مضبوط ہو جاتی ہے
"آج نہ جانے دوں گی تم کو
بہت بھٹک لئے۔ بہت دکھ سہہ لئے
دیکھنے دو سب کو۔۔ مجھے کوئی ڈر نہیں"

آنکھ سے باہر
کشش ثقل سے محروم آنسو
خلا میں اٹکے رہ گئے ہیں
تمام زندگی کا حاصل
وہ ایک منظر' وہ ایک سرگوشی
وہ بے چہرہ جسم
اب بالکل ہی سیال ہوا جاتا ہے
سب کچھ دھواں دھواں ہوا جاتا ہے

خالد عبادی

جو خواب تم نے دیکھا تھا نا خواب ہوگیا
مقتل ہمارے خون میں غرقاب ہوگیا

تیرے گمان میں بھی نہ ہوگا مرے طفیل
اے جان ترا سفینہ گہر یاب ہوگیا

وہ چشم تر جو رخصت شب سے رہی پناہ
سنتے ہیں اس پہ حملۂ سیلاب ہوگیا

اپنے سوا ضرر سے تھی اپنی مصاحبت
افسوس میں بھی صاحب اصحاب ہوگیا

گلہائے خود روی کو دیا خوں کا تغذیہ
کیا دشت وشہر جمع ہی شاداب ہوگیا

آنے دے دل کی سمت ستم واردات کو
دربان اب تو سب مجھے ایجاب ہوگیا

لے پاؤں میں نے شاہ زماں کی طرف کیا
لے آج سے یہ افضل آداب ہوگیا

مجھے آوارگی بے گانۂ زنجیر رکھتی ہے
مگر یوں ہے کہ زیر پا سر شمشیر رکھتی ہے

مری خدمت پہ ہے مامور وہ خواب حرم رونق
کہ جس کی خادمہ بھی کشور تعبیر رکھتی ہے

مجھے اچھی نہیں لگتی تو اچھی بھی نہیں ہوگی
یہ دنیا کب مری نظروں میں کچھ توقیر رکھتی ہے

صدائے غیب سے معمور ہے کاشانۂ حسرت
مری شوریدگی کس ملک کی تصویر رکھتی ہے

خس وخاشاک ہوں یا پھر مرے اوراق زریں ہوں
مگر اے زندگی تو شعلۂ تاخیر رکھتی ہے

خداؤں نے نہیں سمجھا کہ یہ مجھ کو سمجھتا تھا
اشارت بازی علق خدا تاثیر رکھتی ہے

محمد اعظم

یہ نشۂ آگہی خطرناک ہے سر میں
ٹوٹے ہیں مرے پاؤں اسی راہ گزر میں

رم جھم کے عقب زار میں باراں ہے ابھی آگ
اچھا ہے نہ جھانکے وہ مرے دیدۂ تر میں

آنسو تھا وہ نکلا تو گیا توڑ کے ہر بند
خوشبو تھا کہ گھر چھوڑ کے بھی رہتا ہے گھر میں

سرمایۂ جاں یوں نہ اٹھا سارے حجابات
تو آنکھ کے پردوں کی بدولت ہے نظر میں

اس بارگہ ناز سے ہم سے فقرا کو
خیرات تو ملتی ہے ولے کاسۂ سر میں

رہتی ہیں مرے ساتھ وہ آگاہ نگاہیں
کچھ فرق نہ تھا ورنہ مرے عیب و ہنر میں

رکھا تھا جسے دل میں وہ اب ہے بھی نہیں بھی
یوں ہی مرے جینے کا سبب ہے بھی نہیں بھی

پہنچا ہے ترے مہر سے قطبین کا موسم
دن تھا تو نہیں بھی تھا یہ شب ہے بھی نہیں بھی

فریاد نے سیکھی ہے تری وضع تبسم!
اس رخ سے کہ شرمندۂ لب ہے بھی نہیں بھی

حیرت کدۂ دہر ہے اک خواب کا عالم
دیکھا جو اس عالم میں عجب ہے بھی نہیں بھی

مل جائے تو کتراؤں جو کھو جائے تو ڈھونڈوں
یہ کیسی طلب ہے کہ طلب ہے بھی نہیں بھی

یہ ہجر کی دوزخ ہی بھلی -- جیسی ہے سب ہے
اس وصل کی جنت سے کہ سب ہے بھی نہیں بھی

محمد اعظم

وہ مل بھی جائے تو پھر کھو کے جستجو کیجے
ہمیں یہ حکم ہوا ہے کہ آرزو کیجے

ہو چاک جیب وگریباں تو ہم علاج کریں
جب آسمان پھٹا ہو تو کیا رفو کیجے

برنگ لالہ چراغاں ہو داغ پامالی
مری بھی خاک کو اک روز سرخ رو کیجے

بجا وہ پھونک بھی ڈالے جو منہ سے کیا کہئے
سوائے صورت نے نالہ در گلو کیجے

غروب دیکھ کہ باقی نہیں ہے یہ بھی تاب
کہ درج آنکھ سے دامن پہ کچھ لہو کیجے

ہے خامشی کو مری یاد وہ بھی شوق کہ جی
یہ چاہتا تھا کہ اس کی ہی گفتگو کیجے

اس خرابی کے لیئے دے نہ برائی مجھ کو
دل یہ ایسا ہی ملا تھا مرے بھائی مجھ کو

مجس خاک میں ہوں منتظر ابر خرام
آکے اک روز تو ہی دے گا رہائی مجھ کو

لے گیا لوٹ کے صد لطف ملاقات فراق
دے گیا وصل کی صورت وہ جدائی مجھ کو

قحط زدگان تمنا کی تھی شورش اس دم
کیا کہا اس نے دیا کچھ نہ سنائی مجھ کو

شہر میں پیاس نے اندھے ہی کنویں جھکوائے
کچھ تو اب دشت میں دیتا ہے دکھائی مجھ کو

یا اب اک آہ پہنچتی نہیں میری تجھ تک
یا ذرا سوچ کہاں تک تھی رسائی مجھ کو

" मुझे यह अच्छा नहीं लगता, जब कुछ लोग कहते हैं कि हम पहले भारतीय हैं और बाद में हिन्दू अथवा मुसलमान। मुझे यह स्वीकार नहीं है। धर्म, संस्कृति, भाषा तथा राज्य के प्रति निष्ठा से ऊपर है – भारतीय होने की निष्ठा। मैं चाहता हूँ कि लोग पहले भी भारतीय हों और अंत तक भारतीय रहें – भारतीय के अलावा कुछ नहीं।"

– भीमराव अम्बेडकर

महान देशभक्त को जन्म-दिवस के अवसर पर

प्रदेश की श्रद्धांजलि

सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उत्तर प्रदेश

o اقبال مجید کا ناولٹ "تیرا اور اس کا سچ" معاشرۂ ہند میں موجود تلخ سچائیوں کو پیش کرتا ہے۔ مولوی نے کہا تھا

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

وہ تصوف کی بات تھی۔ علم نفسیات اپنی ترقیوں کے بعد کہتا ہے کہ ہم وہی بولتے ہیں جو بولنا چاہتے ہیں، وہی دیکھتے ہیں جو دیکھنا چاہتے ہیں، وہی کرتے ہیں جو کرنا چاہتے ہیں، وہی پاتے ہیں جو پانا چاہتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ یہ بھی واقعتاً تصوف کی ہی بات ہے مگر نفسیات کو اس سے مطلب نہیں۔ البتہ ایک راہ کی بات سے کئی باتیں بنتی گئی ہیں۔ کامیو نے کہا :

SEEKING WHAT IS TRUE IS NOT
SEEKING WHAT IS DESIRABLE

جدید مباحث میں خیال کچھ سے کچھ ہوگیا۔ یعنی DESIRE OF THE NON FINDABLE کی جگہ SEEKING OF THE DESIRABLE نے لے لی۔ اصل سچائی کیا ہے اب اس کی فکر نہیں۔ ہم کس بات کو سچائی کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی فکر ہے اور اس فکر میں اس مرحلے کی بھی ضرورت نہیں کہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ اس لائق ہے بھی یا نہیں کہ اس کی آرزو کی جائے۔ بس، ہمارے نفس کو جس وقت جو چاہئے وہ مہیا ہو۔ اقبال مجید صاحب نے کامیو کے قول کو سرنامہ بنا کر یہ تاثر دیا ہے کہ سچ اب مطلق سچ نہیں رہا ہے۔ اس کی حیثیت بالکل اضافی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ انسان دنیا میں اتنا سرگرداں کیوں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ آرزوؤں کی تکمیل میں سرگرداں ہے۔ آرزوئیں مختلف ہیں تو تکمیل کے ذرائع بھی مختلف ہوں گے۔ مذہب اور اخلاق جن راستوں سے سچائی کو پانا چاہتے ہے وہ دنیاداروں کے لیئے موزوں نہیں ہیں کیونکہ ان کے اقداری معیار کم عیار ثابت ہوجاتے ہیں۔ دنیا سے اگر کچھ لینا دینا بھی ہے تو اہل دنیا کو ایسے ذرائع درکار ہیں جو ان کے نفس امارہ کو مطمئن کرسکیں۔ ظاہر ہے کہ بلاامتیاز اکثر و بیشتر اپنے مطلوب کی ہی تلاش ناگزیر ہوگی۔ اقبال مجید نے اپنے ناولٹ میں اس نکتے کو متعدد شواہد سے پیش کیا ہے۔

مسئلے ہندوستانی مسلمانوں کے ہوں یا عورتوں کے۔ ان کی حیثیت کا انحصار اس امر پر ہے کہ ان کی تاویل کس طرح کی جاتی ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں عورت اور مسلمان، ان دو کو سب سے زیادہ ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ ان کا "خوف" کم ہو۔ لیکن خوف بڑھتا جارہا ہے۔ کئی تاویلوں کے سبب ان کا اصل مسئلہ متعین ہی نہیں ہوپارہا ہے۔ مثلاً عورتوں کے متعلق ایک تاویل تو یہ ہے کہ "عورت کا سب سے بڑا گناہ احتجاج کرنے میں دیر کرنا ہے۔"

("شب خون" ۲۰۳ ص ۲۵) اور دوسری تاویل یہ ہے کہ "عورت اعلیٰ روایتوں کی کتنی ہی پاسدار کیوں نہ ہو، مرد کو پانے اور بھوگنے کے لیئے کہیں بھی فاحشہ بن جانے میں دریغ نہیں کرتی۔ (ایضاً ص ۳۶) اس میں شک نہیں کہ حیا حفظ حرمت میں بے بس رہی ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ خواتین کو بھی نہیں معلوم کہ ان کا اصل مسئلہ کیا ہے۔

اسی طرح، ہندوستان کے "۸۰ فیصد مسلمان (آپ کو) یہ نہیں بتا پائیں گے کہ انہیں کیا چاہیئے" (ایضاً ص ۵)۔ دوسری طرف "عام ہندو کو بھی یہ نہیں معلوم کہ وہ مسلمان سے کیا چاہتا ہے" (ایضاً ص ۳۸) اس کے باوجود عجیب و غریب باتیں اور تاویلیں ہیں۔ بعض مسلمانوں کو یہ گمان ہے کہ ہندوؤں نے تقسیم ملک کو اپنی شکست سمجھا ہے۔ اگر وہ شکست نہ سمجھتے تو اس ملک کی نئی تاریخ شروع ہو جاتی۔ (ایضاً ص ۳۸) میرے نزدیک یہ تعبیر کی غلطی ہے اور مولانا وحید الدین خاں ایسی کئی غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مگر ایسی تعبیری غلطیوں میں وہ تنہا نہیں ہیں۔ موہن گوسوامی جیسے ہندوؤں کو یہ وہم ہے کہ جو مسلمان پاکستان کے سب سے زیادہ طالب تھے، وہ پاکستان نہ گئے، ہندوستان ہی میں رہ گئے اور وہی مسلم برادری کا ووٹ بینک قائم کئے ہوئے ہیں اور ہندوستانی قوم کے اندر اپنی علٰحدہ قوم کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں (خلاصہ ایضاً ص ۳۸) یہ جھوٹ ہے غلط ہے تہمت ہے افترا ہے۔

اقبال مجید نے بڑے دانش ورانہ انداز میں اور فنی چابکدستی سے بعض مسائل پر سے نقاب اٹھائی ہے۔ جو شوکت جہاں اخلاق کے فعل شنیع کا شکار ہوکر ذرا بھی احتجاج نہیں کرتی، وہ اب مثلاً ودھایک کی خواہش نفس کی تکمیل سے پیچھے کیوں ہٹتی ہے؟ اور اپنی پیٹھ پر خوف کی چھپکلی چپکی ہوئی کیوں محسوس کرتی ہے؟ وہ تو خود سمجھ رہی ہے کہ "میں ایک ایک کرکے ایسی تمام علامتیں ظاہر کرتی جارہی ہوں جو کسی عورت میں بے ارادہ کسی مرد کے بستر تک پہنچنے سے پہلے ظاہر ہوا کرتی ہیں۔" (ایضاً ص ۳۶) اور مرد بھی جانتا ہے کہ "اس کم عقل جنس گزیدہ دو پیروں والی مادہ کو گھیر کر مار لینا کتنا آسان ہے" (ایضاً ص ۲۵) ایسی عورتیں اپنے وقار و ناموس کے لیئے کیا کرسکتی ہیں؟ بلکہ آج کی راج نیتی میں عورتوں کا آنا اوکھلی میں اپنا سر دینا ہے۔

اب ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف آیئے۔ ان کے ایک نمائندہ شہباز خاں صاحب ہیں۔ یہ مساعد حالات میں تو اونچی اونچی اڑان لیتے ہیں۔ بڑے جید بنتے ہیں اور ترقیاتی منصوبے رکھتے ہیں اور شوکت جہاں میں ہوس پرستوں کے خلاف بغاوت کی جرأت بھی پیدا کردیتے ہیں لیکن جب بورے میں بھری شوکت کی لاش کو اپنے کمپاؤنڈ میں دیکھتے ہیں تو سن ہوکر رہ جاتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ "للکارا گیا ہے۔ چیلنج! بولو شہباز خاں۔ کھیل کھیلوگے یا پلی

چھوڑ دو گے؟" (ایضاً ص ۳۱) وہ پالی چھوڑ دیتے ہیں اور POETIC JUSTICE کا آخری سارا اہتمام لیتے ہیں۔ ایسے شہباز و شاہین مسلمانوں کے مسائل کو کیا سمجھیں گے اور کیا حل کریں گے؟ وہ تو صرف ممو خاں ہے جس نے آم کے باغ لگا رکھے ہیں اور ساری دنیا داری اور سربلند ہو کر جینے کے سارے سلیقے ان ہی باغوں سے سیکھے ہیں۔ وہ شہباز کے کرب کو محسوس کر کے کہتا ہے ـــــ "ہم کھیل کھیلیں گے' پالی نہیں چھوڑیں گے۔" (ایضاً ص ۳۲) اور کھیل کھیل کر دکھا دیتا ہے۔

میں اقبال مجید کے ڈرامے "لسر پھنسا" کے متعلق لکھ چکا ہوں کہ اس میں خوف ہی کو دکھایا گیا ہے۔ اس ناولٹ میں انھوں نے خوف کو ایک جہت دی ہے ـــ "میری مانو تو خوف کو اتنا بڑھاوا ملنا ضروری ہے کہ وہ ایک قوت بن جائے" (ایضاً ص ۷) اگرچہ یہ خیال شوکت جہاں کے بھائی قدرت اللہ نے ظاہر کیا ہے' جس نے ناولٹ میں خوف کو کہیں بھی ایک قوت کے طور پر نہیں برتا لیکن ناولٹ میں خوف کا ماحول کئی جگہ بنتا ہے اور اس ماحول سے توانائی بھی خلق ہوتی ہے۔ زرد صحافت جس کی بھی ہو۔ اپنی شکست عزائم کو بھی دیکھ رہی ہے ــــ صبر' ایثار' احتجاج' انتظار اور انتقام ــــ یہ خوف سے پیدا شدہ لازمی حولیں ہیں۔ ان سے گزر کر ہی بے خوفی کے مقامات آتے ہیں۔ مولانا وحید الدین خاں جیسے لوگ ان مقامات کو نہیں پا سکتے کیونکہ وہ صرف اعراض کی تلقین کرتے رہے ہیں۔ ان مقامات کو ممو خاں جیسے لوگ ہی پا سکتے ہیں کیونکہ وہ پالی چھوڑ جانے میں یقین نہیں رکھتے۔ بے شک اعراض بھی ایک جوابی کارروائی ہے لیکن تا کجے؟ ناولٹ کو چھوڑیے۔ آم کے درختوں کو بھی چھوڑیے۔ معاشرے کو دیکھیے۔

اقبال مجید بہت اچھی تخلیقی نثر لکھتے ہیں۔ یہاں ایک اور بات کہنے کی ہے۔ ناولٹ میں جو مضامین ہیں وہ بیشتر تضاد کی صورت کو پیش کرتے ہیں۔ یہ تضاد اسلوب کے ذریعہ بھی دکھایا گیا ہے۔ جیسے "اپنا ندیدہ پن دکھاتا ہے۔" یا "کوٹھی جس کے اندر زبانیں باہر نکالے۔" اور موضوع کے ذریعہ بھی ــــ یہ مثالیں ناولٹ کے موضوع ــــ ہر شخص کا سچ الگ الگ ہے ــــ سے مناسبت رکھتی ہیں۔ یہ موضوع نہ ہوتا اور مضمون میں تضاد کی صورت نہ ہوتی تو یہ اسلوب اتنا زیب نہ دیتا۔

لیکن اتنی بھی تعریف خوب نہیں۔ اقبال مجید صاحب نے شوکت جہاں کی آبرو ریزی کے بیان میں جزئیات کی غلطی کی ہے۔ اس بنا پر اس منظر کا تاثر کم ہو گیا ہے۔

آپ نے اپنے مضمون "قوم ریاست اور معاصر اردو ادب" میں نہایت اہم نکات کی طرف توجہ کی ہے۔ اگرچہ یہ مضمون دس سال پرانا ہے لیکن آج اس کی اہمیت اور بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اس وجہ سے یہ مضمون محرک کا کام کر رہا ہے۔ اس کی سوئیاں نئی سمتوں کا پتا دیتی ہیں اور ہم سوچنے پر خود کو آمادہ پاتے ہیں ــــ ہندوستان کا سیاسی منظرنامہ جس تیزی سے بدل رہا ہے۔

اس تیزی سے قومیت کے تصور میں بھی تبدیلی کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ریاست ابھی کئی آگہی اور مصلحت آمیز موانع سے گھری ہوئی ہے اس لیے وہ کھل کر اردو ادیبوں سے سخت تقاضے نہیں کرتی۔ لیکن اگر حکومت (GOVERNMENT) کے منشا اور اقدام کے تحت ریاست (STATE) مجبور ہوئی کہ سیکولرزم وغیرہ کے تصورات کو توڑ دے تو مستقبل کے اردو ادب پر وہ ضرور اثر انداز ہوگی۔ یہ سچ ہے کہ "اردو ہمیشہ ہندوستانی قوم کے اتحاد کی حامی رہی ہے" (ایضاً ص ۴۰) اور اس میں بھی شک نہیں کہ "اردو زبان کے سیاق میں دیکھیں تو ہندوستانی بھاؤ نہیں ہے بلکہ یہ ہندو مسلم بھاؤ ہے (ایضاً ص ۴۰) لیکن اب ان صداقتوں کی پروا کتنوں کو ہے؟ آپ نے "تیرا اور اس کا سچ" پڑھا نہیں؟ اسی سے قیاس کیجیے نہ! اب تو یہ سچ ابھی ابھر کر سامنے آ رہا ہے کہ اردو میں جو مسلم بھاؤ ہے اس کو ختم ہونا چاہیے۔ رسم الخط بدلنے کی کوشش ناکام ہوئی تو کیا؟ پھر ہو سکتی ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اردو مسلمانوں کے سبب ہی اس رسم الخط میں وجود میں آئی اور اسی وجہ سے تقسیم ملک کے بعد اس کو جبرا تشدد بھی سہنا پڑا۔[1] ظاہر ہے کہ ہندوستان کی پرانی ریاست نے اردو ادیبوں اور شاعروں کو جو آزادیاں دے رکھی تھیں' وہ نئی ریاست کو کھٹکنے لگی تھیں اور پچھلے پچاس برسوں سے یہ تصور رائج ہونے لگا۔ "بھارت اس لیے سیکولر ہے کہ وہ ایک ہندو راشٹر ہے" اور ہندو تو نام ہی ہے رواداری کا' فیاض دلی کا اور فکر و نظر کی کشادگی کا۔ یہ مذہب نہیں' ایک نظام حیات ہے جو الگ راستوں پر چل کر ایک ایشور تک پہنچنے پر یقین رکھتا ہے۔ جب تک بھارت کا مسلمان اپنے مذہب میں بھارت کے قدیم مذہب کو اور اپنی تہذیب میں بھارت کی قدیم تہذیب کو مدغم نہیں کرے گا' لڑائی جاری رہے گی کہ ہندو ہی آغاز ہے اور ہندو ہی انجام۔" ("شب خون" ۲۰۳ ص ۲۴) معاصر اردو ادب کو اس "شعور و فکر کی بھی چھان بین" کرنی ہے۔ میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن خط طویل ہو گیا ہے۔ لہٰذا' مزید گفتگو سے پرہیز کرتے ہوئے صرف ایک سوال کو سامنے رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوئے ہند کے اردو ادیب کیسے خیالات اور اسالیب اختیار کریں گے جن سے ہندوستانی قوم اور ریاست کے "شعور و فکر کی شکل بنتی" ہوگی اور غیر ہندوستانی اردو ادیب (پاکستانیوں کو چھوڑ کر) کس طرح اس "مشکل" میں تطابق پیدا کریں گے ــ؟

محمد منصور عالم
دکھنیر

○ شمارہ ۲۰۳ نظر نواز ہوا۔ اقبال مجید کے ناولٹ "تیرا اور اس کا سچ" کو جو نمایاں مقام دیا گیا ہے اس کے وہ حقدار تھے۔ ملک کی موجودہ سیاسی' سماجی

---

[1] جی نہیں۔ اٹھارہویں صدی سے آخر تک ناگری رسم الخط پر صرف برہمنوں کا قبضہ تھا' اس لیے برج' اودھی' راجستھانی' حتیٰ کہ بنگالی وغیرہ بھی فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھیں۔ (ادارہ)

صورت حال کے پس منظر میں لکھی گئی' اتنے معروضی و دلکش انداز کی تجزیاتی تحریر نایاب نہیں تو کم یاب یقیناً ہے۔ لیکن ناولٹ ختم کرتے کرتے (آخری پیرا گراف سے پہلی کی سطریں پڑھ کر) یہ احساس بھی ہوا کہ فن کی بلندیوں پر اول تا آخر قائم رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔

خالص پور' اعظم گڑھ — ابرار اعظمی

o اقبال مجید کا ناولٹ "تیرا اور اس کا سچ" نظر سے گزرا۔ اگر ہاتھ مضبوط ہوں تو ادب کا پودا سنگلاخ چٹانوں میں بھی پروان چڑھ سکتا ہے۔ کرشن چندر کی اس بشارت پر صداقت کی مہر اقبال مجید نے ثبت کردی۔ یہ ناولٹ آج کے انتشار' بکھراؤ اور سیاسی' سقہ شاہی' کا ایسا نوحہ بن گیا ہے جسے اقبال مجید نے خون کے آنسوؤں سے لکھا ہے۔ مذہبی جنون' ذات پات' رنگ و نسل کے عفریتوں پر بھرپور وار کئے گئے ہیں۔

بھوپال — ایم رفیق

o دل چاہا خط لکھوں اور شب خون' جس پابندی اور معیار کے ساتھ شائع ہو رہا ہے' اس کی تعریف کروں پھر سوچا یہ تعریف ہر ماہ بہت سے لوگ کرتے ہیں۔ مگر آپ بڑا کام کر رہے ہیں اس کا اعتراف ضروری ہے۔ البتہ اس وقت اچھی کوفت ہوتی ہے جب آپ فیض کو چوتھے درجے کا شاعر قرار دیتے ہیں اور احمد مشتاق کو فراق صاحب پر فوقیت دیتے ہیں۔ خیر مزاج اپنا اپنا' پسند اپنی اپنی۔

شمارہ ۲۰۳ میں اقبال مجید کا ناولٹ "تیرا اور اس کا سچ" پڑھ کر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ خود کو خط لکھنے سے روک نہ سکا۔ شب خون' کے ۳۶ صفحات پر مشتمل اس ناولٹ میں اقبال مجید نے آزادی کے بعد پروان چڑھنے والی ہندستانی مسلمانوں کی پوری نسل کی حالت اور ذہنی کیفیت کو کاغذ پر بکھرایا ہے۔ اس ناولٹ سے پہلے شاید کسی نے بھی نئی طبقاتی کشمکش کو اپنے ادب کا حصہ نہیں بنایا جس کی بھرپور عکاسی اقبال مجید نے کی ہے۔ میں نے پورا ناولٹ ایک ہی نشست میں ختم کیا۔ کئی دن تک دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت رہی۔ شاید ایک وجہ اس بے چینی کی یہ بھی ہو کہ پچھلے دس برس میں مجھے وہاب پرتاپ شکلا' شوکت جہاں اور قدرت اللہ جیسے کرداروں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ویسے بھی آج کے ماحول میں یہ تمام کردار قدم قدم پر ہمارے سامنے کھڑے نظر آتے ہیں۔ البتہ موخاں مجھے کچھ اجنبی سے لگے۔ کیونکہ ایسے کردار آزادی سے پہلے کے ہندوستان میں تو موجود تھے مگر اب بھارت میں عنقا ہیں۔ یہ میرا مشاہدہ ہے۔ ناول نگار کو اختلاف تو ہو سکتا ہے۔ اقبال مجید نے ناولٹ میں ہمارے زمانے کے ہندوستان کی سیاسی' سماجی اور تہذیبی زندگی کو نئے منظرنامے کے ساتھ پیش کیا ہے جو بالکل حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ اس کامیاب تخلیق پر انھیں مبارکباد۔

اسی شمارہ میں وزیر آغا کا مضمون "علامت کیا ہے" عام فہم اسلوب میں اچھا مضمون ہے۔ 'سرسوتی سمان' پر ہم سب اردو والوں کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔

میں نے تو میر کو سمجھا ہی "شعر شور انگیز" پڑھ کر۔

کوٹہ — فاروق بخشی

o اقبال مجید کا ناولٹ پڑھا۔ اسی دوران تقریباً اسی موضوع پر ذہن جدید' میں شیو مورتی کے "ترشول" کا اردو ترجمہ بھی دیکھا۔ شیو مورتی خالص ترقی پسند لگتے ہیں (اگر ترقی پسندی' تضحیک و تحقیر کا دوسرا نام نہیں ہے) یا کم از کم ان کا سماجی شعور (چاہے اس کی وضاحت ہم کسی طور پر بھی کریں' اقبال محترم سردار جعفری کے لیئے بھی اتنے ہی عظیم ہیں جتنے مظفر علی سید کے لیئے) ترقی پسندوں جیسا ہے۔ اقبال مجید کو ہم غالباً جدیدیت کا علم بردار کہتے ہیں۔ ان کے یہاں جدیدیت کی غیر معمولی دلکشی یعنی نئے طور پر چونکا دینے کے انداز کے ساتھ ساتھ سماجی شعور کی بھی غیر معمولی جھلک ہے جسے آپ غالباً POST COLONIALISM کہیں گے۔ یہ رجحان بہرحال سود مند ہے۔

پوسا (بہار) — حبیب حق

o شمارہ ۲۰۳ زیر مطالعہ ہے۔ شمس الرحمن فاروقی اور وزیر آغا کے مضامین بے حد مفید ہیں۔

علی گڑھ — شہاب الدین ثاقب

o شمارہ ۲۰۳ میں اقبال مجید کا ناولٹ "تیرا اور اس کا سچ" ایک ہی سانس میں پڑھ گیا۔ جن حالات کے ہم مارے ہوئے ہیں ان میں سچ "سینڈوچ" بن گیا ہے۔ اس کی نقاب کشائی ضروری ہے' چاہے جس طرح بھی کی جائے۔ حق گوئی و بیباکی نہایت ضروری ہے۔

گورکھپور — مصطفیٰ کمال

o مشتاق احمد نوری کی کہانی ٹھیک لگی۔ میں نے انھیں پہلی بار پڑھا ہے۔ لیکن جیلانی بانو اور خالدہ حسین کی کہانیوں سے مایوسی ہوئی۔ خاص کر خالدہ حسین کی کہانی "معروف عورت" سے۔ انھیں چاہیے کہ وہ وجودی ادب کو سنجیدگی سے پڑھیں۔ اس طرح کا بیانیہ پڑھنے میں بھلا ضرور لگتا ہے لیکن کہانی اس کے بار کو برداشت نہیں کر پاتی۔ تقسیم کے مسئلے سے پیدا ہونے والی تہذیبی خلیج پر سید محمد اشرف کے افسانے "ڈار سے بچھڑے" اور "دوسرا کنارہ" کے سامنے جیلانی بانو کا افسانہ بہت کمزور لگتا ہے۔ بیانیہ بھی بھاری لگتا ہے۔ اختر یوسف اور ش ک نظام کی نظمیں اچھی لگیں۔ افتخار نسیم کی نظمیں غزلیں بھی عمدہ ہیں۔ راشد انور کے انٹرویو میں طرز گفتگو کا ہے اور قابل تعریف ہے۔ صحرا میں' شب خون' ملنے سے جی میں لالہ و گل اگتا ہے۔ اللہ شب خون کی عمر دراز کرے۔

بحرین — رحمٰن عباس

o ان دنوں بیانیہ کہانیاں لکھ رہا ہوں مگر سچ تو یہ ہے کہ مجھے کچھ بھی مزا نہیں آ رہا ہے۔ بیانیہ کہانیاں لکھتے ہوئے یوں لگ رہا ہے کہ پڑوسن میرے گھر میں آ کر اپنے اور دوسروں کے گھروں اور محلوں کے واقعات مبالغے کے ساتھ بیان کر رہی ہے۔ شاعری اس لیئے بری ہے کہ اس میں شاعر موجود نہیں ہوتا جبکہ

بیانیہ کہانیوں میں بے وقوف کہانی کار ایک پڑوسن یا پڑوسی بن جاتا ہے اور بڑے فخر سے دوسروں کے واقعات ملاوٹ کے ساتھ اپنی زبان سے سنانے لگتا ہے۔ یکی بیان ہے اور یہی بیان کرنے والے کی نا سمجھی ہے اور نا سمجھی بھی ایسی کہ خود بیان کرنے والے پر ہنسی آتی ہے جبکہ بہت سے کردار موجود ہیں اور ان کرداروں کے اندر دھڑکتا ہوا دل بھی ہے۔ سر کے اندر دماغ بھی ہے اور کہنے کے لیئے دماغ بھی موجود ہے لیکن بیان کرنے والا بیچارہ ہر ایک کے سر میں داخل ہو کر اس کا دماغ بن جانے کی کوشش کرتا ہے یا اس کی زبان بن جاتا ہے اور وہ یہ نہیں دیکھتا یا سوچتا کہ وہ کردار زندہ ہے' اسے دیکھ رہا ہے' وہ خود اپنی زبان' اپنی فکر' اپنا سر استعمال کرنا چاہتا ہے مگر یہ محض اس کی موجودگی میں اس کے اور دوسروں کے کوائف بیان کرنے لگتا ہے جبکہ اس کے حالات اور مسائل اور فکر سے وہ بہت کم بلکہ نہیں کے برابر واقف ہے۔ لیکن بیچارے بیان باز سے کوئی یہ نہیں کہتا کہ اے محترم باپ تو اپنے اس نالائق بیٹے کے کردار سے اچھی طرح واقف ہی نہیں ہے۔ پھر تو کیوں اس کی کہانیاں لوگوں کو سنا رہا ہے جبکہ وہ خود موجود ہے اور جیسی بھی ہوں خود اپنی کہانیاں اپنے احساس' اپنی زبان سے سنا سکتا ہے تو بیانیہ میں مجھے کچھ مزا نہیں آتا۔ فاروقی صاحب نے بہت عرصہ پہلے ایک سیمنار میں یہی بات بڑے اچھے اور مختصر انداز میں کہی تھی کہ اے افسانہ نگارو! تم بے کار کیوں مداخلت کرتے ہو' تمہارا کام تو بس یہ ہے کہ تم مختصر ماحول کو پیش کر دو اگر ضرورت سمجھو تو' ورنہ جگہ جگہ خود کیوں داخل ہو جاتے ہو جبکہ تمہاری کوئی ضرورت ہی نہیں ہے؟" بہرحال بیانیہ کہانیوں کے بارے میں ان کا جو تاثر ہے میرا بھی وہی ہے اس لیئے آخری داستاں گو" میں ہر کردار اپنی زبان سے اپنی اپنی کہانیاں' اپنے اپنے مسائل' حالات اور واقعات پیش کرتا ہے اور یہ بیان ہر ایک کا اپنا بیان' اپنی زبان اور اپنی سوچ کے مطابق ہے۔ آپ نے آخر میں یہی بات کہی ہے کہ تمثیل کو بیانیہ بنا دینا کارنامہ ہے۔ جو لوگ فکشن پر اپنی اتھارٹی کا دعویٰ کرتے ہیں وہ بس نانی دادی کی کہانیوں کو سمجھ سکتے ہیں اور ان کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔

حیدر آباد   مظہر الزماں خاں

○ شب خون' ۲۰۳ پچھلے کئی شماروں کے مقابلے میں صوری و معنوی دونوں اعتبار سے وقیع ہے۔ طباعت خاص طور پر روشن ہے۔

پٹنہ   شفیع جاوید

○ شب خون' بابت فروری ۱۹۹۷ سامنے ہے۔ ابھی سرسری دیکھا ہے۔ خدا جانے کیوں پہلے "اس بزم میں" اور "کہتی ہے خلق خدا" پڑھتا ہوں یا عرفان صدیقی جیسے پسندیدہ شعرا کا کلام۔ باقی حصہ بعد میں۔ "خلق خدا" میں بلقیس ظفیر الحسن صاحبہ نے ایک خط میں دو قرآنی آیات لکھی ہیں اور دونوں میں غلطی ہو گئی ہے۔ ' **لاتقنطو**' میں واو کے بعد وہ الف بھی ضروری ہے جو عربی میں الف جمع کہلاتا ہے یعنی اسے **لاتقنطوا** لکھا جانا چاہئے۔ دوسری آیت میں لحن نہیں ہے۔ اس کے "بے شک" میں۔ یہ لیس سے قبل نہیں آسکتا۔ ان

ہے۔ اسی جیسی ایک غلطی رؤف خلش صاحب کی نظم کے عنوان میں ہوئی ہے۔ حضرت علی کا قول یہ ہے: **عرفت ربی بفسخ العزائم۔ من فسخ** کا یہ موقع نہیں ہے یہاں **بفسخ** ہی درست ہے۔ خلش صاحب نے جہاں سے یہ قول نقل کیا ہے وہاں ایک بار پھر دیکھنے کی زحمت فرمائیں۔

کمپیوٹر کی وجہ سے رسالے کے ظاہری حسن میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

رام پور   اکبر علی خاں عرشی زادہ

○ ' شب خون' کا خانوادہ دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک پھیلا ہوا ہے۔ ناچیز کو بھی ' شب خون' کا باقاعدہ قاری ہونے کے ناطے اس کی چوتھی سی رکنیت کا فخر حاصل ہے۔ لہذا آپ کی کامیابیاں محض ذاتی نوعیت کی نہیں۔ ان پر ہم تمام شب خونیوں' کا حق ہے اور ہم اپنی خوشی کا اظہار کرنے میں باک نہیں کرتے۔

آپ کے مخالفین چاہے جو پرچار کرتے پھریں لیکن یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ آپ نے اور ' شب خون' نے گزشتہ تیس برس میں اردو زبان و ادب کی جو خدمات کی ہیں وہ دوسروں کی تین سو برسوں کی خدمت پر بھاری ہیں۔ موجودہ نسل اس کے اعتراف میں خواہ کتنا ہی بخل برتے' آئندہ تاریخ اس کی شہادت ضرور دے گی۔ آج غالب سے لے کر میر تک کو جن جن ابعاد سے دیکھا جا رہا ہے وہ سب آپ ہی کی نگاہ دوررس کا فیض ہے۔ اردو شاعری کی آج جو عالمی پہچان بن رہی ہے اس کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔

ناگپور   شکیب غوثی

○ اقبال مجید کا ناولٹ "تیرا اور اس کا سچ" وزیر آغا کا "علامت کیا ہے" اور فاروقی کا مقالہ (جسے احمد محفوظ نے ترجمہ کیا ہے) خوب ہیں۔۔ اس حصۂ نثر نے شب خون ۲۰۳ کا بھرم رکھ لیا ورنہ اس بار کا شعری حصہ لے ڈوبتا۔ دوسرے تو بیچارے معاف کیئے جا سکتے ہیں لیکن ظفر اقبال (جن کا صرف نام ہی فہرست میں دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے) سے ایسی مایوس کن غزلوں کی توقع نہ تھی حالانکہ ان کی "کھینچتے ہیں" والی غزل کا مطلع اور دوسرا شعر غضب کے ہیں۔ لیکن ظفر اقبال جیسا شاعر ڈھیر ساری غزلیں پڑھوائے اور صرف دو شعر نکلے یہ کوئی بات نہ ہوئی۔ قیامت آتے آتے رہ گئی جو آپ نے عقیل جاذ کی کتا' بلی' بکری' کوا' مینڈک اور نہ جانے کیا کیا والی غزلوں کا سلسلہ روک دیا۔ یا ختم کر دیا (اگر ختم کر دیا تو بہتر ہے)۔

سورت   شکیل اعظمی

○ ' شب خون' اپنے آپ میں ایک الگ شان اور اہمیت کا رسالہ ہے۔ اس کی پڑھے لکھے طبقے میں پہچان ہے۔ ایک سائنسی مضمون اگر ہر شمارے میں شامل کرنے کا پروگرام بنا لیں تو مجھے خوشی ہوگی۔ کیونکہ اردو میں سائنسی ادب کی پہچان اسی وقت ہوگی جب ' شب خون' جیسے رسالے اسے شائع کریں گے۔

ٹونک   اعظم شاہ خاں

○ ' شب خون' شمارہ ۲۰۳ نظر نواز ہوا۔ اس شمارے میں ویسے تو بھی

تخلیقات اچھی ہیں لیکن جناب رؤف خلش کی نظم "معرفت ربی" اور جناب امتیاز دانش عمدی کی غزل بہت اچھی لگیں۔

ساوو' مدھیہ پردیش — محمد الیاس عاقل نظامی

○ 'شب خون' نے تین دہائیوں میں اردو ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ واقعی اہم اور عظیم کارنامے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ 'شب خون' کو اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس نے بارہا اچھے شاعروں' ناقدوں اور افسانہ نگاروں کی شناخت قائم کی۔ اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتا رہا ہے۔ کتنے ہی شاعر و ادیب ہیں جو صرف 'شب خون' کی بدولت مقبول ہوئے اور آج بھی یہ پرچہ پوری ایمانداری اور ذمہ داری کے ساتھ ادب کی صحیح رہنمائی کر رہا ہے۔ اس بار بھی فاروقی صاحب کا ایک انگریزی مضمون "قوم' ریاست اور معاصر اردو ادب" شائع ہوا ہے جسے احمر محفوظ نے اچھے انداز سے ترجمہ کیا ہے۔ وزیر آغا کا مضمون معلوماتی ہے۔ فاروقی کے مجموعۂ کلام 'آسماں محراب' پر بلراج کومل کا تبصرہ عمدہ ہے۔ غزلوں میں ظفر اقبال کی غزلیں اپنے لہجے پر کھری اترتی ہیں۔ شاعری کی طرف من موہن تلخ کی مراجعت اچھی ہے۔ مصور سبزواری' رفیق راز' روشن لال روشن کی غزلیں اچھا تاثر پیدا کرتی ہیں۔ عمر انصاری کے خط سے لطف اندوز ہوا۔

بنارس — عارف ہندی

○ وزیر آغا کا مضمون 'علامت کیا ہے' مختصر مگر جامع ہے۔ علامت کی وضاحت کے لئے جس تمثیل سے کام لیا ہے وہ خوب ہے۔ تجرید اور علامت کا فرق بھی بہت اچھی طرح واضح کیا گیا ہے۔ اس بار غزلوں کا حصہ گراں قدر ہے۔ ظفر اقبال کی دو غزلوں کی اشاعت اس شمارے کی خاص چیز ہے۔ غزلوں میں رفیق راز' من موہن تلخ' اسلم عمادی اور غلام مرتضیٰ راہی کی غزلیں بہت خوب ہیں۔

بنارس — روشن لال روشن

○ شب خون' ۲۰۳ میں شمس الرحمٰن فاروقی کو 'سرسوتی سمان' ملنے کی خبر پڑھ کر دل بہت خوش ہوا۔ سچ پوچھیے تو یہ سمان جدیدیت کا اعتراف ہے جس کی داغ بیل فاروقی نے ڈالی اور جس کی توسیع و تشریح میں ان کے رسالے 'شب خون' نے نمایاں رول ادا کیا ہے۔ اردو معاشرہ فاروقی پر جتنا فخر کرے کم ہے۔

پٹنہ — شموئیل احمد

اس بزم میں

افتخار نسیم کے افسانوں کا مجموعہ "ایک تھی لڑکی" چند ہفتے ہوئے لاہور سے شائع ہوا ہے۔

پیارے لال رتن جو حکومت پنجاب کے محکمہ تعلیم کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اب سبکدوش ہو کر اپنے وطن کمنہ (پنجاب) میں قیام پزیر ہو گئے ہیں۔

جمیل الرحمٰن کا نیا مجموعہ کلام "زمین جب آنکھ کھولے گی" بہت جلد شائع ہو رہا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی یہ دو پرانی تحریریں جو فرمائش پر لکھی گئی تھیں، اب تک غیر مطبوعہ رہی ہیں گزشتہ دنوں ان کے کاغذات میں دریافت ہوئیں جب سرسوتی سمان ملنے کے بعد خبر رساں ایجنسیوں اور پریس سے متعلق کئی لوگوں نے ان کے تخلیقی محرکات اور ادبی غور و فکر کے بارے میں مزید جاننا چاہا۔

عذرا عباس کا تیسرا مجموعہ "میں لائین کھینچتی ہوں" کچھ دنوں پہلے شائع ہوا ہے۔

غلام حسین ساجد اردو غزل کے رجحانات کے حوالے سے کام کر رہے ہیں۔ ان کی کتاب جلد شائع ہو گی۔

مصطفیٰ کریم کا مستقل قیام اسکاربرو (انگلستان) میں ہے۔

وسلاوا شمبورسکا کو ۱۹۹۶ کا نوبل انعام برائے ادب ملا تھا جس کی اطلاع ہم پہلے دے چکے ہیں۔ ضمیر احمد نے ان کی یہ نظم انگریزی سے ترجمہ کیا ہے۔ ان کے نام کا صحیح تلفظ وسواوہ ہے لیکن اردو میں وسلاوا مروج ہو گیا ہے اس لئے ہم نے بھی اسے ہی قائم رکھا ہے

• محمود ایاز کی موت بر صغیر ہی نہیں بلکہ اردو کی پوری دنیا کو سوگوار کر گئی۔ ان کے رسالے "سوغات" نے جدید ادب کی نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ خود بھی اعلیٰ درجے کے شاعر اور نثر نگار تھے اور پچھلے پینتیس چالیس برس کے ادبی منظر نامے پر ایک ممتاز وجود کی حیثیت سے قائم تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ۶۸ سال کی تھی۔ انھیں سرطان کا مرض تھا جسکا انھوں نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ ان کی ایک پرانی نظم ہم کچھ تو اس لئے شائع کر رہے ہیں کہ یہ ان کی بیماری کے حسب حال پیشین گوئی سی کرتی معلوم ہوتی ہے اور دوسری بات یہ کہ تیس سال سے زیادہ پرانی ہونے کے باوجود اس نظم میں غیر معمولی تازگی اور معاصر زندگی کا تاثر ہے۔ یہی حال ساقی فاروقی کی نظم "توحہ" کا بھی ہے۔ یہ دونوں نظمیں جدید شاعری اور جدیدیت کی مسلسل زندگی اور معنویت کی دلیل ہیں اور ان لوگوں کے لئے لمحۂ فکریہ فراہم کرتی ہیں جو مابعد جدیدیت کو معدوم سے موہوم کے عالم میں لانا چاہتے ہیں

• محبوب حسین جگر نے ساری زندگی اردو صحافت اور خاص کر روزنامہ "سیاست" حیدر آباد کی خدمت میں گزاری۔ وہ ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین کے صرف بھائی نہ تھے بلکہ ملک کے سر بر آوردہ صحافی اور اردو کے اچھے نثر نگار تھے۔ ان کی سربراہی میں روزنامہ "سیاست" حیدر آباد سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ بن گیا۔

ہم محمود ایاز اور محبوب حسین جگر کی اموات پر ماتم گسار ہیں اور ان کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کرتے ہیں۔

• کچھ دن پہلے عظیم انگریزی جدید شاعر اور بیٹ (BEAT) نسل کے رہنما ایلن گنسبرگ ALLEN GINSBERG کا بعارضہ سرطان انتقال ہو گیا۔ اس کی عمر ستر سال تھی۔ ایلن گنسبرگ نے جدید انگریزی شعرا کی پوری نسل کو متاثر کیا۔ جن لوگوں نے گنسبرگ کی عظمت کا اعتراف کیا اور اثر قبول کیا ان میں مشہور ڈراما نگار اور چیکو سلاویہ کے موجودہ صدر واسلاو ہاویل VACLAV "HAVEL" ناول نگار WILLIAM BURROUGHS اور مشہور مغنی BOB DYLAN شامل ہیں گنسبرگ ہندو اور بدھ فلسفہ سے بھی بہت متاثر تھا اور اس نے بدھ مطالعات اور فلسفے سے متعلق کتابیں شائع کرنے کا ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا ۱۹۵۶ میں اپنی مشہور نظم HOWL شائع کی۔ اس کتاب کو شائع کرنے کے لئے گنسبرگ کے پبلشر لارنس فرلنگٹی LAWRENCE FERLINGHETT (جو خود بھی ایک اعلیٰ درجے کا شاعر تھا) پر مقدمہ چلایا گیا۔ فرلنگٹی بالآخر بری کر دیا گیا لیکن نظم کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔ گنسبرگ نے کئی مہینے ہندوستان میں بھی قیام کیا تھا۔ اسکا زیادہ تر وقت

کلکتہ اور بنارس میں گزرا۔ اس قیام نے بھی اس کی شاعری کو متاثر کیا۔ ۱۹۸۰ تک آتے آتے گنسبرگ کی حیثیت ایک بزرگ جدید شاعر اور نئے شاعروں کے گرو کا درجہ اختیار کر چکی تھی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے گنسبرگ کی موت پر ایک بیان میں کہا "جدید شاعری نے ایک عظیم رہنما اور خود میں نے ایک قیمتی دوست کھو دیا"۔

• قطر کی مجلس فروغ ادب نے اپنا اس سال کا انعام جن کی مالیت ایک لاکھ روپے ہے محترمہ قرۃ العین حیدر اور اشفاق احمد کو پیش کیا ہے۔ ہم انھیں مبارکباد پیش کرتے ہیں

• اسپین کے ایک خود مختار علاقے CATALONIA نے CATALONIA PRIZE کے نام سے ایک لاکھ امریکی ڈالر کا ایک انعام قائم کیا ہے جو ہر سال کسی عظیم مفکر کو دیا جاتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ۱۹۹۶ کا یہ انعام مشہور ماہر اقتصادیات اور مفکر امرتیہ سین AMARTYA SEN کو دیا گیا ہے۔ امرتیہ سین دہلی یونیورسٹی میں اقتصادیات کے استاد تھے۔ اس کے بعد وہ آکسفورڈ میں پروفیسر ہوئے اور آج کل ہارورڈ میں اقتصادیات کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے قحط کی اقتصادیات اور انسانی، خاص کر ہندوستان، آبادی پر قحط کے اثرات کا مطالعہ کئی کتابوں میں پیش کیا ہے۔ علاوہ بریں انھوں نے آبادی اور آبادکاری کے مسائل پر بہت کچھ لکھا ہے۔ ہم انھیں مبارکباد دیتے ہیں۔

• یوپی کے اردو اکیڈمی کے انعامات اس دفعہ زیادہ تر ناگفتہ اور مجموعی حیثیت سے کم نام لوگوں کو دئے گئے ہیں اور کیوں نہ ہو جب انعام کمیٹی میں زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جن کا تعلق ادب سے زیادہ سیاست سے ہے یا وہ اردو ادب سے کوئی علاقہ ہی نہیں رکھتے۔ خبر ملی ہے کہ انعامات واپس لئے جانے کی مانگ ہو رہی ہے۔ انعامات واپس ہوں یا نہ ہوں لیکن جن لوگوں کو انعامات کے ذریعہ نوازا گیا ہے اور یہ انعامات جس طرح سے دئے گئے ہیں اور جن لوگوں نے جن لوگوں کو دئے ہیں، یہ پوری کہانی تقسیم انعامات کے پورے سلسلے پر ہی سوالیہ نشان قائم کرتی ہے۔

• دہلی اردو اکیڈمی کے انعامات بھی اس بار اکثر لوگوں کو مطمئن نہ کر سکے۔ صرف دو انعامات ایسے تھے جس پر مجموعی طور پر اطمینان بخش گیا۔ ایک تو جوگندر پال کی مجموعی خدمات کے لئے بہادر شاہ ظفر ایوارڈ جس کی مالیت اکیاون ہزار روپے ہے اور دوسرا فکشن کے لئے جناب کنور سین کو اکیس ہزار روپے کا انعام۔ ہم جناب جوگندر پال اور جناب کنور سین کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

• گزشتہ شمارے میں ہم نے کنیڈا میں قائم کردہ خواجہ آشکار حسین یادگاری ایوارڈ کے بارے میں لکھا تھا۔ اس سال یہ انعام محمد عمر میمن کو بجا طور پر ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں دیا گیا ہے۔

• مشہور افسانہ نگار اور صحافی جناب رضوان احمد کو بہار اردو اکیڈمی کا سکریٹری مقرر کیا گیا ہے۔ ہم انھیں مبارکباد دیتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ ان کی سربراہی میں بہار اردو اکیڈمی مزید ترقی کے منازل طے کرے گی۔

مابعد جدیدیت: تشخیص اور علاج (۲)

گذشتہ شمارے میں، اور اس کے پہلے بھی بعض شماروں؎ میں، ہم نے THOMAS DOCHERTY کی مرتب کردہ کتاب POST MODERNISM : A READER کے اقتباسات پیش کر کے مابعد جدیدیت کی اوقات کا پردہ فاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ موجودہ اور آئندہ کچھ شماروں میں ہم ایک تازہ کتاب THE POST COLONIAL STUDIES READER کے کچھ اقتباسات پیش کریں گے۔ یہ کتاب لندن اور نیویارک سے رٹلج (ROUTLEDGE) نے ۱۹۹۵ میں شائع کی اور اس قدر مقبول ہوئی کہ ۱۹۹۵ میں ہی دوبارہ اشاعت پذیر ہوئی۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو :

اس بات کو ملحوظ رکھنا کار آمد ہوگا کہ بعض پس نو آبادیاتی تخلیقی متون میں "تھیوری" کا ظہور کہیں کہیں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن پس نو آبادیاتی کے بنیادی متون (مثلاً WILSON HARRIS کی کتاب THE TRADITION,THE WRITER AND SOCIETY) میں بیان کردہ بعض نتائج بظاہر مابعد وضعیاتی تصورات سے ملتے جلتے ہیں، در حقیقت دریدا (DERRIDA) اور فوکو (FOUCAULT) وغیرہ کی تحریروں کے بہت پہلے وجود میں آئے۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ پس نو آبادیاتی تصورات کا اثر دریدا اور فوکو پر بھی پڑا۔ پس نو آبادیاتی فکر کو محض مابعد جدیدیت اور سیاست کے امتزاج کی ایک قسم نہیں کہہ سکتے۔ مثال کے طور پر، مابعد جدیدیت اور پس نو آبادیاتی فکر دونوں کے تقاضے انسانی تجربے کے بارے میں مختلف ہیں۔ مثلاً کبھی کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ ہم لوگ "مابعد جدید عہد" میں جی رہے ہیں۔ اس دعوے میں اصلاً ایک یورپی یا یوروپی+امریکی ثقافتی تحریک پوشیدہ ہے جو دنیا کی تاریخ پر اسی قسم کا قبضہ چاہتی ہے جیسا کہ گذشتہ زمانے میں مختلف یورپی فکری تحریکوں نے چاہا تھا۔ مابعد جدیدیت، چاہے وہ بقول فریڈرک جیمی سن (FREDRIC JAMESON) سرمایہ داری کے دیر آمدہ (یعنی حالیہ) زمانے کی ثقافتی منطق ہو یا نہ ہو، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مابعد جدیدیت وہ بنیادی فریم یا ڈھانچا نہیں معلوم ہوتا جس میں دنیا کی آبادی کا زیادہ تر حصہ اپنے شب و روز گزارتا ہے۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ مابعد جدیدیت دنیا کے بڑے حصے میں ہو یا نہ ہو، لیکن مغربی مابعد جدیدیت کا اثر بڑے باریک اور ناقابل انکار طور پر بقیہ دنیا پر پڑ رہا ہے، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ مابعد جدیدیت کچھ اور نہیں ہے صرف یورپ مرکزیت کے نمائندہ سامراجی عوامل کا اظہار ہے اور یہ سامراجی عوامل (IMPERIAL PROCESSES) مابعد جدیدیت کی شکل میں اب بھی زندہ ہیں۔

THE POST-COLONIAL STUDIES READER
Edited by BILL ASHCROFT
GARETH GRIFFITHS
HELEN TIFFIN
(1995)

؎ "شب خون" ۱۷۸،۱۷۹،۱۸۰،۱۸۱

مئی ۱۹۹۷

مدیر، پرنٹر، پبلشر: عقیلہ شاہین | سرورق: چودھری ابن النصیر | جلد: ۳۱ | شمارہ: ۲۰۶
فون نمبر: ۶۲۲۶۹۳، ۶۲۳۱۳۷ | سرنامہ کی خطاطی: عادل منصوری | ترسیل زر کا پتہ: ۳۱۳-رانی منڈی، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
مطبع: بھارگو پریس، الہ آباد | کمپوزنگ: افراح کمپیوٹر سنٹر، نئی دہلی-۲۵ | خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس-۱۳، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
فی شمارہ: پندرہ روپے | شارپ ٹریک کمپیوٹرس، الہ آباد-۳ | بارہ شمارے: ایک سو ساٹھ روپے

مابعد جدیدیت: تشخیص اور علاج

۱

ترتیب و تہذیب
شمس الرحمٰن فاروقی

زوال پسند عورت

خالدہ حسین

آج کسی کے گھر ماتم ہو گیا۔

سوگواروں کا ہجوم چلا آتا ہے۔ کسی نے کہیں سے خبر پائی کسی نے کسی مقام پہ سنا اور کھنچا چلا آیا۔ اب ایک نقطہ ہے اور اس کے گرد ایک سیاہ ہجوم۔ ایک دائرہ ایک حصار کیا ہوا۔ کس طرح ہوا۔ اچھا اسی طرح ہونا تھا۔ ایک مسلسل بھن بھن بھن۔ وہ ایک جانب' ساکت بیٹھی دیکھتی ہے۔ مجسم بلب' بیٹھی دیکھتی ہے اور نہیں جانتی کہ ان خانوں میں کسی کے لئے ماہ و سال گزر چکے ہیں۔ وہ جو اس کے چند پل' جانتے اور گھنٹے ہیں کسی اور کی پوری عمر عزیز طویل شب و روز ہیں۔ مگر وہ مجسم بلب بیٹھی ہے اور لیمپ کی روشنی آڑی ترچھی اس سیاہ ماتمی ہجوم پر پڑ رہی ہے' کچھ نوحے' مرثیے کچھ آہ و بکا۔ اسے یکدم زور کی ہنسی آجاتی ہے۔ ذرا سی چیز ہے اس پہ غرور کیا کرنا! لفظ دھیرے دھیرے کہیں کانوں سے ٹکراتے ہیں۔ بھولے بسرے لفظ۔ ایک چیز دوسری چیز کے حوالے سے کتنی بے بضاعت' کیسی حقیر ٹھہرتی ہے اور چیز خود اپنے ہی وجود میں برقرار نہیں رہ سکتی۔ اسے ایک وجود بننے کے لئے اپنے سے الگ کوئی امکان چاہئے اور اس امکان کی وسعت میں وہ بے بضاعت ہو جاتی ہے۔

اس نے لیمپ کا شیڈ ذرا ترچھا کیا۔ روشنی کی چھوٹ ایسے رخ سے پڑی کہ ماتمی ہجوم ایک بڑھتی' پھیلتی صورت اختیار کر گیا۔

کیوں ہوا۔ کیسے ہوا۔ کب ہوا۔ وہ دل ہی دل میں ہنستی رہی۔ اتنا قریب ہو کر بھی وہ مخلوق نہ جان سکتی تھی اور نہ ہی وہ انہیں بتا سکتی تھی کہ دونوں وجود کی الگ الگ سطح پر تھے۔ جب کہ وہ جہات سے واقف تھی کہ وہ شاہد بھی تھی اور مشہود بھی۔

اس نے اپنا قلم اٹھایا۔ فی الحال۔ ایک عورت۔ ادھیڑ عمر' قد پانچ فٹ چار انچ' بے کار۔ سوچ (حتی۔ زوال پسند) لفظ اوڑھنا بچھونا۔ لفظوں میں ایک لفظ ہاں شکل و صورت بھی کچھ ایسی کہ گویا کوئی لفظ لکھتے لکھتے رہ جائے۔ تاہم۔ اس نے یاد کرنا چاہا۔ (کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں) کب سے یہ قلم ہاتھ میں ہے۔ اس نے انگلیاں ٹٹولیں' ان پہ قلم کے دباؤ سے گٹے پڑ چکے تھے اور کاغذوں کا انبار۔ پرچے کے پرچے جن پر ایک لفظ بھی مکمل نہ تھا۔ تمام لفظ ادھورے غلط۔ بے معنی۔ شاید وہ "حق" تھا جس نے مجھے بھٹکایا" اس راستے پر ڈال دیا۔ نہیں مگر ج' بھی تو اس کے ساتھ ساتھ ہی تھا' جب 'ف' نہ ہوتا تو 'ج' اس کے کان میں سرگوشی کرتا۔ ہاں یہی تمہارا راستہ ہے۔ اس کو دونوں کی صورتیں یاد آتے آتے رہ گئیں۔ شاید وہ دونوں بھی اب کسی جگہ' وجود کی کسی اور سطح پر بیٹھے دیکھ رہے تھے مجسم بلب اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کو بتا نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ سن نہیں سکتی کہ وہ کس راستے پر ہے۔ اسی اثنا میں 'س' داخل ہوتا ہے۔ اب منظر ایسا ہے۔ ایک عورت' معمولی۔ قد پانچ فٹ چار انچ' اقامت۔ صحت مند افزائش نسل۔ متوازن بجٹ۔ مگر یہ سب بد لوگ اس مقام پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔ اصل کہانی شروع ہوتی ہے۔ (کیونکہ "اک گتے وچ گل مکدی اے")

دنوں' ہفتوں' مہینوں یا شاید سالوں وہ قلم اٹھائے پھرتی ہے۔ جب بھی کاغذ پر قلم کی نوک لگتی' کچھ ہو جاتا ہے۔ کوئی مفید کام بیچ میں آن اٹکتا ہے۔ قلم کی روشنائی سوکھ جاتی ہے۔ نب کرکرانے لگتی ہے۔ وہ اسے رواں کرنے کی خاطر غور سے دیکھتی ہے اور غور سے دیکھنا ہی قیامت ہے۔ چیزیں فوراً اپنی صورت بدل لیتی ہیں۔ وہ کرکرانے اور اٹک جانے والی' اور زنگ خوردہ' رنگ شکستہ نب تو کچھ اور ہی بن جاتی ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتی ہے اور پہچان جاتی ہے۔ ہم کس صورت میں اپنے آپ کو یاد رکھتے ہیں؟ ہر کوئی اپنے ہی انداز میں اپنے آپ کو یاد رکھتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے آپ میں ہو۔ اس کے ساتھ عذاب یہ تھا کہ وہ کبھی اپنے میں نہ رہی تھی۔ ہمیشہ دوسروں میں بستی رہی۔ چپکے سے اپنی جگہ سے اٹھتی اور دوسرے میں حلول کر جاتی۔ میں سے تم۔ تم سے وہ' وہ سے ورے' کچھ اور بن جاتی۔ اس نے نب کو گھورا۔ وہ رنگ شکستہ' پر پیچ' لب گھلنے کے قابل کہاں رہی تھی۔ ایک اتھاہ ہوک' اژدہے کے زہریلے سانس ایسی اسے اپنے اندر کھینچ گئی' آج تو لکھنا بے حد ضروری تھا۔ اس کی وجہ اب بیان ہوتی ہے۔

آج صبح' سب سے پہلی نگاہ جو باہر کھلے آسمان پر پڑی تو وہ بے حد مانوس نظر آیا۔ یہ شاید وہی پرانا آسمان تھا جو صبح سویرے لیا کی کھڑکی سے جھانکا کرتا تھا۔ سامنے بجلی کے تار پر تین چڑیاں ساتھ ساتھ سہیلیوں کی طرح جڑی بیٹھی تھیں۔ تب حسب معمول اس نے منت مانی تھی۔ وہ ایسے ہی ناقابل اظہار

شگون بتاتی اور منتیں مانتی تھی۔ اگر اس کے دیکھتے دیکھتے ایک چڑیا اڑ گئی تو وہ ہر صورت میں لکھے گی اور واقعی دوسرے ہی پل بیچ کی چڑیا اڑ گئی۔ چنانچہ اب لکھنا طے تھا کہ منت پوری نہ کرنے کے عذاب سے وہ ہر دم لرزاں تھی۔ چنانچہ اس دم اس قلم کا چلنا بے حد ضروری تھا۔

تب، عین اس وقت یہ واقعہ رونما ہوا۔ جس کی وہ شاہد بھی تھی اور مشہود بھی۔* ایک مکھی کہیں سے اڑتی اڑاتی آئی۔ نہ معلوم کتنا لمبا سفر طے کر کے۔ شاید وہ حسب معمول کام پر نکلی تھی، کسب معاش کرتی تھی۔ پہلے لیمپ کا طواف کیا اور پھر کاغذ پر عین اس سطر سے کچھ اوپر آن بیٹھی جہاں اس کا قلم چل رہا تھا۔ اس نے قلم روک کر اس کے بارے میں غور کیا۔ اسے خود ہی اڑ جانا چاہئے تھا مگر وہ نہیں اڑی۔ تب اس نے کاغذ ہلایا۔ وہ لپک کر اس کے ہاتھ پر آن بیٹھی ابھی بھی وہ مقرر لمحہ نہ آیا تھا۔ اس نے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ وہ اڑان لے کر کان کی لو پر جھولنے لگی۔ وہاں سے وجپ کھا کر لیمپ کے پیچھے رکھی کتاب پر سیدھی سیدھی جا بیٹھی۔ وہ غور سے اس کو دیکھنے لگی۔ شاید مکھی نے بھی اس کو غور سے دیکھا۔ مگر مکھی کے وژن میں وہ ایک دم سے پوری کی پوری کس طرح آ سکتی تھی۔ اس نے قلم روک کر غور کرنا شروع کیا اور پھر اسے اس فکر نے آن گھیرا کہ میں مکھی کو کیسی نظر آتی ہوں۔ شاید مکھی نے بھی اس کی بات سن لی۔ وہ اڑ کے پھر کاغذ پر بیٹھ کر مسلسل پر پھڑپھڑانے لگی۔ اس نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور اس کی انگلیوں میں جنبش ہوئی۔ پاس ہی رکھے اخبار کی تہ لگا کر اس نے نشانہ لگایا۔

وہ مقررہ لمحہ اس کے ہاتھ کی جنبش میں مقید تھا اور اس کا ہاتھ، اس کے ارادے کا پابند اور اس کا ارادہ اس سے ورے نہ معلوم کس کا پابند اور پابندی کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا یہاں تک کہ پوری کائنات اس میں جکڑی گئی۔ میرا ارادہ بدل بھی تو سکتا تھا! اس نے اس وقت سوچا جب کہ فرش پر گری اس مکھی پر نوحہ گر ہم جنسوں کا ہجوم ہوا۔ نہیں میرا ارادہ نہیں بدل سکتا تھا۔ ایک عورت، معمولی۔ قد پانچ فٹ چار انچ، لفظ اوڑھنا بچھونا۔ تمام ہرج مرج کھینچتی اس مقام پر آن پہنچی جہاں تمام حرج مرج کھینچتی ایک مکھی آن پہنچی اور دو مختلف سمتوں سے آنے والے خطوط ایک نقطہ پر آن ملے اور ایک واقعہ، ایک نکتہ رونما ہوا۔

اس نے ماتمی ہجوم کو دیکھا یہاں کا ایک دن وہ دن، ان کے لئے بے شمار برسوں کے برابر تھے اور جو واقعہ اتنا صاف، سیدھا سادا، تمام کا تمام اس کے رو برو تھا، اس ماتمی ہجوم کے لئے ایک معمہ، سرحد ادراک سے پرے، ناقابل فہم --- اس نے اپنے مقام سے اس بے بضاعت جنس اور اس کے سانحہ کو دیکھا اور ہنس دی۔ مگر اس کی ہنسی میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ تھی۔ اس نے اپنے اوپر نظر کی اور پلٹ کر پھر نگاہ کی۔ اپنے گرد و پیش دیکھا۔ کہیں ہوا میں۔ کسی طرف کسی انجانے ہاتھ کی جنبش لہر در لہر چلی آ رہی تھی۔ وہ اس کے حصار میں تھی۔ وہ کہ جس کے سینکڑوں برس کسی اور کا ایک لمحہ تھا۔

عین اس وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ سرکاری ہرکارہ اس کی

گرفتاری کا پروانہ لئے کھڑا تھا۔ فقیہ شہر نے فرد جرم تیار کی تھی۔ "ایک زوال پسند عورت کے نام کہ جو اس قومی بحران میں بھی ایک مکھی کے بارے میں سوچتی ہے۔"

❖ ❖

ثالث

خالدہ حسین

میں اس کو بہت دیر سے برداشت کرتا چلا آرہا تھا۔

اس کا احساس مجھے ایک دم شدید بے دلی اور ذہنی تھکن کے ساتھ ہوا۔ مگر یہ بھی میری تربیت کا قصور تھا اور اس سلسلے میں میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ ہی بے بس پایا تھا۔ شروع دن ہی سے مجھے برداشت کرنے کی تربیت دی جاتی رہی۔ کم عمری میں یہ محض جسمانی برداشت تھی۔ سردی، گرمی، تھکن، درد۔۔۔ کبھی ماں کے سامنے بھول کر بھی کہہ دیا کہ جسم میں کہیں ناقابل برداشت درد ہے تو اس کا منہ مارے حیرت کے کھلے کا کھلا رہ جاتا، گویا کوئی بہت بڑی خلاف ضابطہ بات ہوگئی ہو۔ گویا ایسا ہونا ممکنات میں سے نہ ہو۔ گویا یہ اعتراف، اعتراف گناہ ہو۔ بس تبھی سے ایک عجیب سی عادت پڑگئی کہ ہر جسمانی کیفیت کو آخری حدوں تک برداشت کرتے چلے جاؤ۔

پھر رفتہ رفتہ حالات اور انسانوں کو برداشت کرنے کی تربیت بھی دی جانے لگی۔ خاموشی اور شور، دونوں حالتوں میں مطمئن رہنا، ہر قسم کے لوگوں کو سننا اور سہنا، یہ تربیت ماں نے میری ہڈیوں میں رچادی تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ میری پیدائش تک وہ لوگوں، حالات اور موسموں سے لڑلڑ کر تھک چکی تھی۔ اور بالاخر اسی نتیجہ پر پہنچی تھی کہ یہ سب بیکار ہے، سوائے ناگزیر صورتوں کے کبھی خارج سے نہ الجھو۔

مگر بعض اوقات۔۔۔ نہیں۔۔۔ بلکہ اکثر اس تربیت کے ہاتھوں میں نے بہت نقصان اٹھایا۔ اور آج اس لمحے جو میں اس چنگل میں آن پھنسا تھا اور معاملہ اس حد تک بڑھ گیا تھا تو یہ بھی اسی قوت برداشت ہی کا کیا دھرا تھا۔ اس وقت مجھ پر کھلا کہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ مہذب ہونا ہی ہے ورنہ اب تک میں اس کے ساتھ دو دو ہاتھ کرکے معاملہ نمٹا چکا ہوتا۔

اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں گیلی گیلی چمک تھی اور آنکھیں اس قدر سیاہ گویا نوزائیدہ چوپایہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہا ہو۔ میں نے پلنگ کی پٹی کو انگلیوں سے زور سے بھینچا۔ اب وہ میری برداشت سے باہر ہو چکا تھا اور میں نے ذہن میں ہردم تنی رہنے والی ماں کی شبیہ سے معذرت کے ساتھ ایک قہر آلود "ہونہہ" کا وار اس پر کیا۔

"کوئی ثبوت؟"

"ثبوت! اپنے اردگرد دیکھو۔ تمام کمرہ ان ثبوتوں ہی سے تو بھرا ہے، اور کیا چاہئے۔" اس نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ پھیلا کر کہا۔

"مگر یہ سب ثبوت تمہاری ذات کے ساتھ بھی تو منسلک ہوتے ہیں، بلکہ کسی کے ساتھ بھی۔"

وہاں۔ مگر جس کا نام لکھا گیا۔۔۔ لکھا گیا۔" اس نے کوٹ کی آستین سے گرد جھاڑی۔

اب میں نے اس کو غور سے دیکھا۔ چہرہ شناسی میں تھوڑی بہت شدبد تو رکھتا ہی ہوں۔ مگر حیرت یہ تھی کہ پہلے میں نے اس کی تیز طراز ناک، چوڑے دہانے اور بے حد باریک ہونٹوں پر توجہ نہ دی، اتنے باریک کہ بس گویا ایک لکیری کھنچی تھی۔ وہ بھی موہوم۔ اور اس طرح کے استری شدہ ہونٹ کچھ قابل اعتبار شخصیت کے مظہر نہیں ہوتے۔ یوں بھی جس طرح ایک دم اس نے اپنا چولا بدلا۔ اس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں اس کو بہت کچھ بتا چکا تھا، اتنا کچھ کہ گویا میں نے اپنا پورا وجود اس کے سامنے اگل دیا تھا۔

اس نے اپنے نہایت لمبی انگلیوں والے کرخت ہاتھوں سے میرا سینہ دبایا اور اب کے میں اپنا غیظ و غضب نہ دبا سکا۔ میں نے مکا تان کر اٹھنا چاہا مگر وقت سے پہلے ہی اس نے مسکرا کر نہایت آہستگی کے ساتھ میرا ہاتھ میرے پہلو کے ساتھ لگا کر ہموار کردیا۔

"صبر، حوصلہ، برداشت، ضبط، تحمل!" یہی الفاظ ہوتے ہیں نا یا کچھ اور بھی۔۔۔" اس کی مسکراہٹ بھی گیلی تھا۔ غصہ کے مارے میری کنپٹیاں جلنے لگیں۔

ماں نے کتنی زیادتی کی کہ مجھے گالیاں تک نہ سکھائیں اور پھر بڑھاپے تک میں اپنے آپ کو مفید قسم کی گالیوں سے مانوس نہ کرسکا۔ حالانکہ گالیاں بھی انسان کے لئے اتنی ہی ضروری ہیں جتنا کہ گاڑی کا ہارن۔ اگر ہارن نہ ہو تو انسان سیدھا ہی دوسرے سے جا ٹکراتا ہے۔

اتنے میں وہ بے وقوف لڑکی پھر ڈھیر سارے کاغذ اٹھائے اندر آگئی۔ اور پھر اپنی خوفزدہ آنکھوں سے چاروں سمت دیکھنے لگی۔

"ادھر میز کے تیسرے دراز میں۔ قسیم احمد' یہی نام ہے نا۔۔۔۔ یہ کارڈ دکھاؤ۔" اس نے میز پر پڑے کارڈ کی طرف اشارہ کیا۔ لڑکی کے ہاتھ سے کارڈ لیتے لیتے اس نے پھر ایک بار میری طرف مسکرا کر دیکھا۔

"ہاں تو کیا کہا تھا تم نے۔۔۔ کہ چند دنوں سے تم نے محسوس کیا ہے کہ تم دراصل جو کچھ کہنا چاہتے ہو اس کے بالکل الٹ کہہ دیتے ہو۔ یعنی جو بولنا چاہتے ہو اس کا متضاد منہ سے نکل جاتا ہے۔" وہ دراز کے کاغذ الٹنے پلٹنے لگا۔

مگر اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ اب بھی میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' حقیقت اس کے برعکس ہے۔"

میں مکمل طور پر سناٹے میں آگیا تھا۔ دراصل مجھے معلوم ہی نہ ہوا کب میں نے اتنی ذاتی اور پردے والی بات اس سے کہہ دی۔

"اور جب کہہ چکتے ہو تو تمہیں مجبوراً' طوعاً و کرہاً۔۔ یہی الفاظ تھے نا۔۔۔۔ ہاں تو تمہیں مجبوراً انہی الٹے ہوئے الفاظ پر قائم رہنا پڑتا ہے۔۔۔ اور پھر یہ کہ کچھ عرصے سے تم موت کے بارے میں سوچتے رہتے ہو۔۔۔ ہردم' ہر وقت' اٹھتے بیٹھتے۔" اس نے لڑکی کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ جاتے ہوئے وہ دروازہ بند کر گئی۔ کمرہ ساؤنڈ پروف تھا۔

مگر میں کہہ چکا ہوں' آج کل بالکل الٹ باتیں میرے منہ سے نکل جاتی ہیں۔ دراصل میں ہر وقت زندگی کے بارے میں سوچتا ہوں۔" میں نے فوراً مکاری دکھائی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے موت کا تصور یوں مسحور کرنے لگا تھا جوں بین ناگ کو۔۔ کیسی ہوگی۔۔۔ کب۔۔۔۔ کہاں۔۔ کس طرح آئے گی۔ اک بے خبری کی سیاہ دھند میں لپٹی نیند۔۔۔ نہیں نیند سے بھی آگے۔ نہ ہونے میں بھی نہ ہونا اور اس سے بھی آگے۔ اور پھر میں نے اسی مار آستین سے' یہ جو میرے سامنے اب بڑے شائل کے ساتھ کرسی کے ہتھے پر ٹکا تھا۔ اس سے یہ بھی ازراہ مذاق کہا تھا کہ موت میں ایک بات تو اچھی ہے تاکہ کم از کم صبح سویرے دفتر تو نہ جانا پڑے گا۔۔۔ پھیلا کے پاؤں سوئیں گے کنج مزار میں۔۔۔ اور تب تو یہ بڑی خوش دلی سے ہنس دیا تھا اور آنکھیں گھما گھما کر اور گھومنے والی کرسی پر گھوم گھوم کر میری باتوں پر داد دے رہا تھا۔

یہ میری ازلی کمزوری ہے' بس کسی نامعلوم لمحے میں' بلاوجہ کسی پر مہربان ہوجاتا ہوں۔ پھر بارش کے پہلے قطرے کی طرح ٹپ سے اپنے باطنی غلاف کا ایک بخیہ ادھیڑتا ہوں' پھر تڑ سے دوسرا اور اس کے بعد تڑ تڑ تڑ۔۔۔ قطار لگ جاتی ہے۔ موسلا دھار بخیے ادھڑنے لگتے ہیں' یہاں تک کہ غلاف اٹھا کر الگ پھینک دیتا ہوں۔ اب مجھے یاد آیا کہ میں نے تو اس کو یہ تک کہہ دیا تھا کہ کبھی "عدم" ہی مجھے مطلوب و مقصود نظر آتا ہے۔ وہ جس کے خوف بھرے انتظار اور دہشت بھری توقع میں ہم عمر کی مہلت بتاتے ہیں جو آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے۔ وہ مطلوب و مقصود نہ ہوگی تو کیا ہوگی۔ افسوس کہ میں نے ماں کا دیا ہوا سبق بھلا دیا۔۔۔ کبھی اپنی ذات کو زیر بحث نہ لاؤ۔۔۔ مگر میں گھنٹوں سے اس کے ساتھ برابر بولے چلا جا رہا تھا۔ اب تو گویا میں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر اس کے حوالے کر دیے تھے۔

"اور پھر یہ کہ تمہیں ہونے نہ ہونے میں اب کوئی خاص حد فاصل محسوس نہیں ہوتی۔ بس ایک قدم ہے لکیر کے اس پار نہیں تو اس پار سہی۔ اور یہ کہ ایک ڈائری تم نے جانے والوں کی فہرست کی شروع کی ہے۔"

"نہیں ایسا تو نہیں۔ وہ ڈائری تو دراصل۔۔۔۔" میں کھسیانی ہنسی ہنسنے پر مجبور تھا۔ مگر اس ناعاقبت اندیش نے میرے منمناہٹ بھی مکمل نہ ہونے دی اور میز پر دھری نیلی پیلی روشنیوں والی مشین کا بٹن دبا دیا۔ کوئی نئی قسم کا ریکارڈر تھا۔

"ہاں یہ ڈائری تو میں نے اس خیال سے بھی شروع کی کہ۔۔۔" میری اپنی آواز آرہی تھی۔ "کہ بعض اوقات مجھے موجود اور ناموجود لوگوں میں شک ہونے لگتا ہے۔ ایک روز میں گئے لوگوں کی فہرست کی پڑتال کر رہا تھا کہ اچانک رک گیا۔۔ بہت سے ناموں کا غلط اندراج' پھر میں نے جانا۔۔ نہیں' یہ تو موجود لوگوں کی فہرست ہے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ فہرست کی سرخی بدل دی جائے۔ موجود' ناموجود یا ہست اور رفت۔ یا اسی طرح کچھ اور عنوانات۔ مگر پھر میں گڑبڑا گیا کہ موجود کون سے ہیں اور غیر موجود کون سے۔ اور میں نے اپنا نام کبھی ایک میں درج کیا اور کبھی دوسری میں۔ مگر ہر عنوان میں غلط ہوگیا۔" پھر میری "بہت خوب۔۔ بھئی واہ' کمال ہوگیا۔۔ کمال کیا جمال ہوگیا۔"

آواز میں ایک قہقہہ۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کا بھی۔

"یہ میں نے کس وقت کہا۔" میں نے احتجاج کی کوشش کی تو گلے میں عجیب سی خرخراہٹ پیدا ہوئی۔

"قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔" اس نے ایکٹنگ کرتے ہوئے ہاتھ بلند کیا۔

"مگر تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں آج کل الٹ بات کہہ دیتا ہوں۔۔ یہی میرا مرض ہے۔ معلوم نہیں دراصل میں کیا کہنا چاہتا تھا' میرا مطلب کیا تھا اس تمام گڑبڑ گفتگو سے۔۔۔" اور دل ہی دل میں' میں نے بات جاری رکھی۔ ثابت ہوا کہ بڑوں کا کہا اور آملوں کا کھایا بعد میں پتہ چلتا ہے۔۔۔ ماں نے کہا تھا اپنی ذات کو موضوع نہ بنانا۔

"تو پھر معاملہ طے ہے۔" اس نے بڑے اطمینان سے اپنا کوٹ اتار کر کرسی پر رکھ دیا۔ اور جوتے کے تسمے کھولنے لگا۔

"کس طرح طے ہے؟ واہ معاملہ طے ہے۔" میں نے منہ ٹیڑھا کر کے اس کی نقل اتاری۔

"تم کہاں کے اتنے معتبر ہو کہ تمہاری بات۔۔۔ عورت کی بات کیا بھڑکی لات کیا۔" میری زبان پر غلط' بے محل' بے تکے محاورے آنے لگے۔

"ہا ہا ہا۔" وہ پیٹ پکڑ کے دوہرا ہوگیا۔ "ہا ہا ہا۔" کمرے کی دیواریں سمٹ سمٹ کر آگے آنے لگیں۔ پھر وہ آگے بڑھا اور اپنی لمبی کرخت انگلیوں کو میرے گرد رسی کی طرح باندھ دیا۔

"اب تو کوئی شک و شبہ نہیں رہ گیا۔" اس نے دوسرے ہاتھ سے میز کی

طرف اشارہ کیا جس پر سفید کاغذ پر سیاہ روشنائی سے بڑے بڑے حروف میں "نسیم احمد" لکھا تھا

بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال مجھے پاؤں سے سر تک جھنجوڑ گیا۔

"مگر یہ نام کس کا ہے؟ تمہارا یا میرا۔"

وہ یک دم ٹھٹھک گیا۔ پھر اس نے میرے گردے اپنی انگلیاں چھڑائیں اور کرسی کی پشت کے ساتھ سر لگا کر بیٹھ گیا۔

"کیا تم جانتے ہو کہ تم خاموش ہو۔ تم بول نہیں رہے تمہارے لئے گفتگو خاموشی' خاموشی گفتگو بن چکی ہے۔" "یوں بات نہ بنے گی۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے! میں پوری قوت لگا کر اٹھ کر بیٹھ گیا نہ معلوم کب اس مکار نے میرے پاؤں بھی باندھ دیئے تھے۔ میں نے انھیں کھولنا چاہا۔

"ابھی بھی کوئی شک ہے۔" اس نے چابیاں جیب میں ڈال کر کوٹ کی گرد جھاڑی۔

"تم جانتے نہیں۔ میں بھی اپنے زمانے کا بہت بڑا بیوروکریٹ رہ چکا ہوں۔ بڑی بڑی انکوائریاں میرے ہاتھوں سے نکلیں۔ ایسے ایسے دہلا دینے والے فیصلے میں نے کئے ہیں۔ کسی تیسرے۔ غیر جانب دار کی ضرورت ہے۔ وہی صحیح صورت حال کا فیصلہ کرے گا۔ میں آڈٹ کا آدمی ہوں۔ پہلے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ موت کا مطلب زندگی کا فقدان ہے یا عدم۔ اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم دونوں میں کون اس عنوان تلے آتا ہے۔" میں نے اپنی ڈائری کے صفحے الٹے۔

"میرے اس کمرے میں آڈٹ' ایڈمنسٹریشن' لیبر سبھی ایک ہیں۔ تم کس خوش فہمی میں ہو؟" اس نے جوتے کے تسمے کستے ہوئے کہا۔ اور اس کا چوڑا دہانہ کانوں کی لوؤں کو چھونے لگا۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے! میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں اس کمرے میں اپنے معالج کے پاس آیا تھا جو اپنے وعدے کے مطابق یہاں نہیں تھا اور اس کی جگہ تم تھے اور میں نے وقت گزاری کے لئے تم سے صاحب سلامت کرلی اور ادھر ادھر کی بات شروع ہوئی۔"

اور بات بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ تم اس کیفیت تک آگئے جہاں تک تمہیں آنا تھا؟ اس نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

اس کا فیصلہ غیر جانبدار فریق کرے گا۔ چلو میرے ساتھ چلو۔ باہر سڑک پر' ہر جگہ۔ ہر کہیں ہزاروں ہوں گے یہ تمام شہر مجھے جانتا ہے میں نے دروازے کی کنڈی سے اپنا دوشالہ اتارا اور اس کی بکل ماری۔ میں نے سوچا سب سے پہلے اس کو اپنے گھر لے جاؤں گا۔ پانچ چھ غیر جانبدار تو وہیں مل جائیں گے۔ تو پھر اپنے تمام کے تمام دوست' احباب' پھر وہ چائے گھر۔ ہاں مسجد' لائبریریاں۔ میں نہایت تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے آگے چلا۔ اس کے قدموں کی چاپ میرے پیچھے پیچھے تھی چاروں سمت جھٹپٹے کا عالم تھا۔ شاید ابھی سورج ڈوبا تھا یا پھر طلوع ہوا تھا۔ میں نے جانی پہچانی سڑکوں اور راستوں اور روشوں کو دیکھا۔ تمام رستے سونے' گلی کوچے ساکت' گھروں کے دروازے کھڑکیاں روشندان بند' دھندلے شیشوں میں سے زرد روشنی نظر آرہی تھی۔ چوکوں' سڑکوں پر آدم نہ آدم زاد اک ہو کا عالم۔ یہ سب کے سب کہاں گئے میں حیران ہوا۔ اوپر کی جانب نگاہ کی درختوں کے پتے ساکن۔ چپ چاروں سمت سیٹیاں بجاتی ہوئی چل رہی تھی۔ ادھر آگے۔ اس گلی میں۔ اس نکڑ پر۔ میں نے دوستوں کے چہل قدمی کے اوقات ذہن میں لانا چاہے شائد کوئی۔ کسی راستے پر۔ مگر ہو حق کرتا عرصہ سامنے پھیلا تھا اور وہ میرے ساتھ ساتھ چلا آتا تھا کسی کی تلاش میں۔ کوئی ثالث' کوئی غیر جانبدار جب کہ رفتہ رفتہ آسمان تاروں سے جڑ گیا اور زمین کو اندھیروں نے لپیٹ لیا تھا اور ہم دونوں اندر ہی اندر اپنا اپنا استغاثہ تیار کرتے چلے جارہے تھے۔ ❖ ❖

کارگو کومپلیکس

انور قمر

اس نے گھر کا ٹیلیفون ملایا، یہ کہنے کے لئے کہ اسے آج گھر پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔ مگر فون پر ایک اجنبی آواز سن کر وہ چونکا۔

"کون بول رہا ہے"

اس نے اپنا نام بتایا۔

"ہم آپ ہی کو فون کرنے والے تھے۔ میرا نام انعامدار ہے، سب انسپکٹر انعامدار۔ آپ کی بیوی کا قتل ہو گیا ہے"

اس کی سانس اکھڑ گئی۔ جب اس نے اپنے پڑوسی کے نمبر ملائے۔ تو اس کی کانپتی ہوئی انگلی دو مرتبہ غلط خانوں میں الجھ گئی۔

"بھابی! میں بول رہا ہوں۔۔۔"

اس نے نام بتایا۔

دوسرے سرے سے اسے رونے اور سسکنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ خبر کی تصدیق ہو گئی۔ رومال سے پسینہ پونچھتا ہوا، وہ ٹیلیفون بوتھ سے باہر آیا، سڑک کے اس پار ایک ٹیکسی کھڑی تھی، اُسے دیکھ کر اس نے سڑک پار کرتے ہوئے ایک مرتبہ اسے ڈوائیڈر سے ٹھوکر لگی، ایک مرتبہ اس کا پیر پتلون کے پائنچوں میں جا پھنسا، وہ گرتے گرتے بچا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو اپنا ٹھکانا بتا کر، وہ پچھلی نشست پر ڈھیر ہو گیا۔ ٹیکسی بے شمار موٹروں کے ساتھ کچھوے کی طرح سمندر کے کنارے کنارے چلنے لگی۔ بادلوں کے سبب آسمان پر سورج کیچڑ میں لت پت نظر آ رہا تھا۔ آفسوں سے لوگ چھوٹ چکے تھے اور کیڑے مکوڑوں کی طرح سڑکوں پر رینگ رہے تھے۔

جب ٹیکسی ساحل کے اس حصے پر پہنچی جو ریتیلا تھا، تو اسے یاد آیا کہ شادی سے پہلے، وہ دونوں اس کی ٹھنڈی ریت پر بیٹھ کر غروب کا منظر دیکھا کرتے تھے اور ان کے جسم کی حرارت ایک دوسرے کے لمس سے بڑھ جایا کرتی تھی۔ یوں بھی اس کی بیوی پہننے اوڑھنے کے معاملے میں خوش ذوق تھی اور اکثر ایسی ساڑیاں پہنتی جو پھولوں کی رعنائیاں لئے ہوتی تھیں۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی کئی پھول اپنے اندر چھپائے رکھتی ہے، جنہیں یہ آنے جانے والوں کی آنکھ بچا کر چھو لیا کرتا تھا۔

ٹیکسی آگے چل کر ایک سہ راہے پر سگنل کی سرخ روشنی دیکھ کر رک گئی۔ جب سبز روشنی نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا تو یہ داہنی طرف کو مڑ گئی۔ اب ٹیکسی اس پہاڑی کے دامن میں آ گئی تھی جس پر گھنے درختوں کے بیچ پارسیوں کا "مینار سکوت" واقع تھا۔ اسے ایک درخت پر مراقبہ کی حالت میں بیٹھے چند گدھ دکھائی دیئے۔ اسے یاد آیا کہ عرصہ ہوا اس نے "راجہ گدھ" نام کا ایک ناول پڑھا تھا، جس کے مرکزی کردار ایک تاریخی شہر کے شاہی باغ میں ملتے اور ایک دوسرے سے محبت بھری باتیں کیا کرتے تھے۔

ایک فلائی اوور سے گزر کر ٹیکسی ٹرافک میں جا پھنسی اور رک گئی۔ وہ ایک وکٹورین طرز کی عمارت پر لگے باد نما کو دیکھنے لگا۔ اس کی بیوی کا پہلا حمل جس اسپتال میں ساقط ہوا تھا اس کی عمارت بھی اسی طرز کی تھی۔ پہلے تو اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھا، وہ طبعاً بڑی صابر و شاکر تھی، اسی کے اصرار پر وہ اسپتال جانے پر آمادہ ہوئی۔ وارڈ میں داخل ہوتے ہوتے خون جاری ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے بہتری کوشش کی کہ خون رسنا بند ہو جائے، لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ انھیں خدشہ ہوا کہ اگر مریضہ کی یہی کیفیت کچھ دیر تک اور رہی، تو جسم سے تمام خون رس جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے اس سنگین حقیقت سے اسے واقف کیا اور اس کی رضامندی سے مریضہ کے بطن سے جنین نکال دیا۔ اس نے نرس سے جنین حاصل کیا اور اسے رات کی تاریکی میں اسپتال کے احاطے میں واقع ایک سرو کے درخت کے نیچے دفن کر آیا۔ وہ رات بھر سمندر کی جانب رُخ کئے نوحہ کرتی رہی۔

جب ٹیکسی ایک اور پہاڑی کے قریب سے گزرنے لگی تو اسے یاد آیا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ یہاں بھی آیا کرتا تھا۔ وہ دونوں پہاڑی پر بنے باغ کے مشرقی سرے پر رکھی ہوئیں بینچوں میں سے کسی ایک بینچ پر بیٹھ جاتے اور بندرگاہ پر زراف کی سی اونچی گردنوں والے کرینوں سے مال، جہازوں پر لدتا اترتا، دیکھا کرتے تھے۔

وہ کہتی "آپ مجھے یہاں کیوں لے آتے ہیں؟ مجھے یہ منظر بالکل اچھا نہیں لگتا"

وہ کہتا "مجھے بھی اچھا نہیں لگتا، اس کے باوجود کسی انجانی کشش کی بنا پر یہاں چلا آتا ہوں"

وہ پوچھتا "اچھا بتاؤ، یہ منظر تمہیں کیوں اچھا نہیں لگتا؟"

وہ کہتی "اس جہاز کو دیکھئے"

وہ اس کی انگلی کی سیدھ میں دیکھتا۔ اسے وہاں ایک وسیع و عریض جہاز کھڑا نظر

آتے۔ جس کا زیادہ تر حصہ سیاہ ہوتا۔ بس کہیں کہیں پر سفید یا سرمئی رنگ جھلکتا سے
بنی ہوئی لاشیں تھیں۔ کسی کا کندھا کٹا ہوتا اور اس کی ٹانگ سے دم نکلا ہوا ہوتا۔
وہ کہتی "اس جہاز پر جو کنٹینرز (Contained) رکھے جا رہے ہیں مجھے ان پر
جنازوں کا گمان ہوتا ہے۔ مگر یہ جہاز انہیں اپنی منزل پر لاد کر نہ جانے کس منزل
کو چل دیتا ہے۔" وہ اپنی بیوی کو عجیب نظروں سے دیکھتا جس کی آنکھوں کے
چشموں سے درد طلب بن کر اٹھ رہا ہوتا۔
ٹیکسی طویل مسافت کے بعد اس کے بتائے ہوئے ٹھکانے پر جا کر رک
گئی۔ اس نے کرایہ ادا کیا، اور ایک کمپاؤنڈ میں بنی عمارت کی سیڑھیاں چڑھ کر دو
جے منزل پر پہنچا۔ فلیٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے باوجود اس نے گھنٹی
بجائی۔ ایک کالے رنگ کا اونچا سا آدمی "   " سے پر آیا۔
"آپ" اس نے نام پوچھا۔
"ہاں! میں ہوں"
اس نے بیگ صوفے سے لگا کر رکھ دیا۔ اس کا یہی معمول تھا۔ وہ کمرے
میں داخل ہوتے ہی صوفے کی اس کرسی پر بیٹھ جاتا، بیوی پانی لے آتی، پانی پی
کر وہ پوچھتا۔
"کوئی خط؟"
بیوی میز کی دراز سے خط نکال کر اسے دے دیتی۔
پھر وہ پوچھتا "کوئی ٹیلیفون؟"
بیوی تفصیل بتاتی۔ وہ جوتے کے تسمے کھول کر جوتے اتار دیتا۔ کیسٹ پلیئر آن کر
دیتا۔ اسے حزنیہ غزلیں سننے میں جانے کیوں دلچسپی تھی!
اس کی بڑی بہن پڑوس کے فلیٹ سے کمرے میں داخل ہوئی، دونوں
نے ایک دوسرے کو غمگین نگاہوں سے دیکھا۔
"پانی!"
"ابھی لائی" کہہ کر وہ پڑوس میں چلی گئی۔ اور کچھ دیر میں پانی لے آئی۔ پانی پی کر
وہ صوفے پر دراز ہو گیا۔ اس سیاہ رنگت کے اونچے سے آدمی نے فلیٹ کی
مشرقی دیوار میں بنی کھڑکی کے قریب رکھی ہوئی کرسی کھینچی اور اس کے سامنے
بیٹھ گیا۔
"ہمیں آپ کے پڑوسیوں نے فون پر خبر دی تھی"
"کتنے بجے؟"
"یہی کوئی تین بجے ہوں گے" ہم فوراً پہنچے۔ دیکھا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔
پڑوسیوں کے دروازے بھی کھلے ہوئے تھے اور وہ دروازوں کے سامنے بیٹھے
ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے [illegible] آپ کے آ"
اس ریمارک پر اس نے، اس آدمی کو یوں دیکھا جیسے اسے، اس کا مفہوم سمجھ
میں نہ آیا ہو۔
"ہم جب آپ کے فلیٹ میں داخل ہوئے تو [illegible] آپ
ابھی [illegible]

میں (Mood) ہو چکے تھے۔ اور اب تک اسی حالت میں ہیں۔ ظاہر ہے کسی سے
لے جائیں، اور لاش پوسٹ مارٹم کو بھیج دی جائے تب آپ اندر جا سکتے ہیں"
اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ وہ اپنے گھر کو اس حالت میں دیکھنا نہیں
چاہتا تھا۔ تو اسے اپنی بیوی کے زخموں سے نکلی ہوئی لاش دیکھنا منظور تھا۔
اس سیاہ رنگت کے اونچے سے شخص نے اپنے اسٹینو کو بھی پاس بلا کر بٹھا لیا۔
اسٹینو کھڑکی سے لگ کر کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں آسمان میں چمکتی ہوئی سرخی پر
جمی ہوئی تھیں۔ وہ ایک نرم گفتار، شائستہ شخص تھا۔
"مجھے افسوس ہے!"
چونکہ اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا تھا، اس لئے اس نے اسٹینو کا ہاتھ
تھام لیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس ہمدردانہ جملے کا کیا جواب دے۔
"ہمیں آپ کا بیان لینا ہے۔ ایک روٹین ہے۔ سرکاری کام، ان کے بغیر
ادھورے رہتے ہیں" اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ بس وہ صوفے کی
کرسی پر پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔
"آپ دفتر جانے کے لئے گھر سے کتنے بجے نکلتے ہیں؟"
"آٹھ بجے"
"کیا آج بھی آٹھ ہی بجے۔۔۔"
"جی"
"جب آپ گھر سے چلے تھے، تب آپ کی بیوی کیا کر رہی تھیں؟"
"دو دن سے وہ بیمار تھی، دراصل اسے ہائپر ٹینشن تھا۔ پچھلے دنوں اس کی بھانجی
کو ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ بڑا سنگین سا۔ کالج کے زنانہ ہاسٹل میں اس کے ساتھ
پڑھنے والے دو لڑکوں نے اس کی عصمت دری کی کوشش کی تھی۔ اس سے
زیادہ میں اس واقعہ کی تفصیل بتانے سے مجبور ہوں۔ اس صدمے سے میری بیوی
کا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے نرسنگ ہوم میں داخل ہو جانے کا
مشورہ دیا تھا، اگر وہ نرسنگ ہوم میں داخل ہو جاتی تو یقیناً اس حادثے سے محفوظ
رہتی۔ لیکن اسے تو میری چھوٹی بڑی ضرورتوں کا بڑا خیال رہتا تھا وہ میری
ضرورتوں کو اپنی ترجیح بنا لیا کرتی تھی اور اکثر ضرورت پڑنے سے پہلے وہ مجھے
ضرورت کی چیزیں پیش کر دیا کرتی تھی۔ ویسے بھی میں کوئی زیادہ ذہین آدمی
نہیں ہوں۔ مجھے معلوم کہ یہ باتیں آپ کی تحقیق میں کیسے معاون ثابت
ہو گی۔
اسٹینو نے کہا
"آپ جیسا مناسب سمجھے ویسا ہی جواب دیجئے"
افسر کو اپنے ماتحت کی دخل اندازی پسند نہیں آئی۔ چنانچہ افسر نے اس
نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھ کر اپنی ناراضی کا اظہار کر دیا۔
"وہ کس کے زیر علاج تھیں؟"
اس نے ڈاکٹر کا نام بتایا، اس کی کلینک کا پتہ اور ٹیلیفون نمبر بھی لکھوایا۔ اس نے
سوچا کہ اب یہ لوگ اسے بھی تنگ کریں گے۔

"کیا پہلے بھی کبھی کیا کرتے تھے؟"
"جی نہیں۔ انہوں نے دوائیں لکھ دی تھیں اور مجھے بلڈ پریشر لینے کی تاکید کی تھی۔"
"آپ بلڈ پریشر لینا جانتے ہیں؟"
"جی ہاں، میرے پاس الیکٹرانک آلہ ہے جس کے ذریعہ ایک عام آدمی بھی آسانی سے بلڈ پریشر لے سکتا ہے۔"
"کیا آپ نے اپنے ڈاکٹر سے ـــــ ؟"
"جی ہاں، میں نے ڈاکٹر کو اس کی کیفیت بتادی تھی :"
"اس نے کیا کہا تھا؟"
"یہی کہ دوا باقاعدگی سے دیتا رہوں، دو دن کے بعد بلڈ پریشر نارمل ہو جائے گا تب اس کے مشورے سے میں دوا کی مقدار کم کر دوں گا۔"
"آپ کو کسی پر شک تو نہیں؟"
"جی نہیں!"
"آپ کی کسی سے دشمنی؟"
"جی نہیں۔"
"آپ کا کسی سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا تھا؟"
"ہوا تھا"
"کس سے؟"
"اپنے بھائی سے"
"بھائی سے؟"
"جی ہاں"
"سگے ـــ؟"
"جی ہاں سگے بھائی سے"
"کس بات پر؟"
"اسے ترکے میں سے میراث نہیں دیا گیا تھا۔"
"بٹوارا ابھی نہیں؟"
"بالکل نہیں"
"تب آپ نے قانونی چارہ جوئی کی ہوگی"
"ضرور کرتا، لیکن مقدمے کا فیصلہ مدتوں بعد ہوتا ہے"
"تو پھر؟"
"ایک صاحب سے مدد لی تھی"
"وہ کیا کرتے ہیں"
"آج کل تو اسکریپ کا دھندہ کرتے ہیں"
"اور پہلے؟"
"پہلے کچھ ناقابل ذکر قسم کا کاروبار تھا ان کا"
"تب انہوں نے کہا تھا آپ کے بھائی کو دھمکایا ہوگا اور آپ کے بھائی نے انتقاماً یہ کاروائی کی ہوگی"

اسے حیرت ہوئی کہ اس نے اس کے بھائی کو آخر کیسے اس کی بیوی کے قتل کا ذمہ دار قرار دے دیا ہے۔

"جی نہیں، آپ کا خیال سراسر غلط ہے۔ میرا بھائی ایسا اقدام نہیں کر سکتا"

"بہر حال آپ ان دونوں کا پتہ ہمیں لکھوا دیجئے۔ روٹین ان ویس ٹی گیشن Routine investigation کے طور پر بھی ان سے بھی بازپرس کرنی ہوگی۔" اس نے طوعاً و کرہاً اپنے دوست اور بھائی کا پتہ لکھوا دیا اور اپنے آپ پر دیر تک لعنت بھیجتا رہا۔

کچھ دیر بعد لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دی گئی۔ اس کی بہن نے سب انسپکٹر انعامدار سے اجازت لیکر کمرہ دھلوا دیا۔ اس نے انہیں تسلی دی اور اپنے محکمے کا مکمل تعاون دینے اور مجرموں کو کیفر کردار کو پہنچانے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا۔ خلاف توقع وہ تدفین کے وقت قبرستان میں حاضر رہنے کا وعدہ بھی کر گیا۔ جن عزیزوں اور رشتے داروں کے یہاں فون تھے اس کی بہن نے انہیں اس سانحہ کی اطلاع دے دی اور ان سے دیگر اعزا واحباب کو بھی مطلع کر دینے کی درخواست کی۔

دوسرے روز صبح سویرے جب وہ چند عزیزوں کے ساتھ اسپتال پہنچا تو اسے محسوس ہوا کہ اسپتال کے احاطے میں سردی کچھ زیادہ ہے اور دھند نے ہر چیز کو اپنے اندر ڈھانپ لیا ہے۔ سرد خانے میں لاش موٹی چادر میں لپیٹ کر رکھی گئی تھی۔ منتظم نے شناخت کے لئے جب لاش کے چہرے پر سے چادر ہٹائی تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی کا منہ پھیل گیا ہے اور کس قدر نیلا بھی پڑ چکا ہے۔

وہ میت کو ایمبولینس میں گھر لے آئے۔ اس کی بہن نے غسل دینے کے لئے ایک دین دار نیک عورت کو بلا لیا تھا۔ اس عورت نے غسل کا تمام انتظام کر رکھا تھا۔ پانچ کپڑوں پر مشتمل کفن منگوالیا تھا۔ اور اس کفن کو اس عورت نے سات دفعہ لوبان کی دھونی بھی دے دی تھی۔ نہلانے اور کفنانے میں تقریباً ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ میت جب مکمل طور پر تیار کر دی گئی تو باہر کے کمرے میں سے اطلاع دی گئی کہ میت تیار ہے وہ اسے لے جا سکتا ہے۔ کئی آدمیوں کی مدد سے اس نے جنازہ عمارت سے نیچے اُتار کر ایمبولینس میں رکھا۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ چند اور عزیز بھی مرحومہ کو رخصت کرنے اس کے ساتھ قبرستان کو روانہ ہوئے۔

قبرستان میں اعزا واحباب مٹی دینے کے لئے پہلے سے جمع تھے۔ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ میت قبر تک لے جائی گئی، قبر میں اُتارنے سے پہلے میت کو سہارا دینے کے لئے وہ خود قبر میں اتر پڑا۔ اس کی مدد سے میت احتیاط سے قبر میں اتار دی گئی۔ اس کے بھائی نے حرم مطہرہ سے لایا ہوا غلاف اسے دیا جسے اس نے میت پر احترام سے پھیلا دیا۔ وہ جست بھر کر ایک ہی لمحہ میں قبر سے باہر آ گیا لیکن وہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دی گئی۔

[illegible]
ہدایت دی کہ تم ایک طرف کھڑے ہو جاؤ تاکہ لوگ تمہیں پُرسہ دے کر اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہوں۔ چنانچہ وہ ایک نیم کے درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ تمام اعزاء و احباب اسے پرسہ دے کر رخصت ہو گئے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ بہت تھک چکا ہے اور یہ حقیقت بھی! اسے یاد آیا کہ آج صبح سے اس نے ایک پیالی چائے بھی نہیں پی ہے۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، اسے کچھ فاصلے پر دو بچے کھیلتے ہوئے نظر آئے اس نے انہیں اپنے پاس بلایا اور انعام دینے کا وعدہ کر کے ایک کپ چائے طلب کی۔ ان میں سے ایک چائے لانے کو دوڑ پڑا۔ دوسرے نے جیب سے روبک کیوب RUBIK CUBE نکالا اور حسبِ دستور اس کی سطحوں کو یکساں رنگوں سے آراستہ کرنے کے لئے اس میں ردو بدل کرنے لگا۔

اس نے کیوب ہی پر نظر مرکوز رکھتے ہوئے پوچھا۔

"کس کا انتقال ہوا؟"

"میری بیوی کا"

"آپ کی بیوی کا۔ اب آپ کے بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟"

"میرے کوئی اولاد نہیں ہے"۔

"تو آپ بھی اکیلے رہ گئے۔ جب میری ماں گزری تھی تو میں اکیلا رہ گیا تھا۔ اب بھی اکیلا ہوں"۔

"تمہارے والد....؟"

"انہوں نے دوسری شادی کر لی ہے۔"

"تمہاری دیکھ بھال کون کرتا ہے"؟

"یتیم خانے والے۔"

اچانک وہ خوشی سے بول اٹھا:۔

"کیوب مکمل ہو گیا"۔

یہ کہہ کر اس نے وہ کیوب اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے دیکھا کہ کیوب کی چھیوں سطحیں چھ مختلف رنگوں سے آراستہ ہو چکی تھیں۔ اس نے اسے مبارکباد دی تو اس نے ایک اور گمبھیر سوال کر دیا۔

"یہاں سے آدمی کہاں چلا جاتا ہے؟"

"جسم تو بس رہ جاتا ہے روح پرواز کر جاتی ہے"۔

"اس کا بھی تو کوئی گھر ہوگا؟"

"گھر....؟ تمہاری عمر کیا ہے؟"

"سات برس"

"ابھی تم چھوٹے ہو، اس بات کو نہیں سمجھ پاؤ گے؟"

اس نے کیوب کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ اسے سمجھ پائے ہیں؟"

"وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ واقعی اس گورکھ دھندے سے ناواقف تھا۔

اس دوران میں [illegible] بھی چائے لے آیا تو اس نے [illegible]

"چائے کے کتنے پیسے ہوئے؟"

"دو روپے"

اس نے جیب سے پرس نکالا اور اس میں سے دو روپے کا نوٹ نکال کر لڑکے کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔

"یہ تو رہے چائے کے پیسے"۔

پھر اس نے پرس میں سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اور یہ رہا تمہارا انعام"۔

پیسے لے کر وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ اور اسی جگہ پر جا کر پھر سے کھیلنے لگے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس بچے سے بات چیت کرنے کے بعد اس کا غم کس قدر کم ہو گیا ہے۔

جب وہ قبرستان کے احاطے سے باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ پاس ہی ایک ٹیکسی کھڑی ہے۔ ڈرائیور کو منزل کا پتہ بتا کر وہ اطمینان سے سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جب ٹیکسی چلنے لگی تو وہ گزرتے ہوئے مناظر کو توجہ سے دیکھنے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد ٹیکسی اسے پہاڑی کے دامن میں لے آئی جس کے باغ میں وہ اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا جب اس نے پہاڑی کی ہموار سطح پر قدم رکھا تو اسے ایک گونہ فضا میں خنکی کا احساس ہوا۔ حسبِ معمول وہ مشرقی سرے پر رکھی ہوئی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ قریب ہی گلاب کی ٹہنی پر خوش رنگ چڑیا بول رہی تھی۔ اور اپنا ننھا سا سر وقتے وقتے سے گلاب سے مس کرتی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اسی طرح اس کی بیوی بھی اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا کرتی تھی۔

"آپ مجھے یہاں کیوں لے آئے ہیں؟"

"کسی انجانی کشش کی بنا پر"۔

"دیکھ رہے ہیں اس جہاز پر جو کنٹینر Container رکھے جا رہے ہیں ان پر مجھے جنازوں کا گمان ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر یہ جہاز انہیں اپنی پیٹھ پر لاد کر جانے کس منزل کو چلا جاتا ہے۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، آس پاس کوئی نہ تھا۔ اس نے سوچا، پھر یہ آواز کہاں سے آئی اور جانے وہ کتنی دیر تک وہ اپنی بیوی سے بات چیت کرتا ہوا بیٹھا رہا۔ ایک تیز سیٹی کی آواز فضا میں گونجی۔ یہ باغ کے چوکیدار کا باغ میں بیٹھنے والوں کو اشارہ تھا کہ باغ کے بند ہونے کا وقت ہو چکا۔

شام واقعی گہری ہو چکی تھی، فضا میں ابابیلوں کا رقص شروع ہو چکا تھا اس نے کل پھر آنے کے وعدے کے ساتھ بیوی سے رخصت لی اور آہستہ آہستہ نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔

❖ ❖

आय सीमा में हुई बढ़त से
शिक्षा अब सरल
कूल चलो
शिक्षा वर्ष 1997
उत्तर प्रदेश द्वारा प्रसारित।
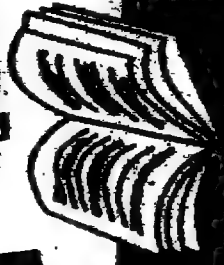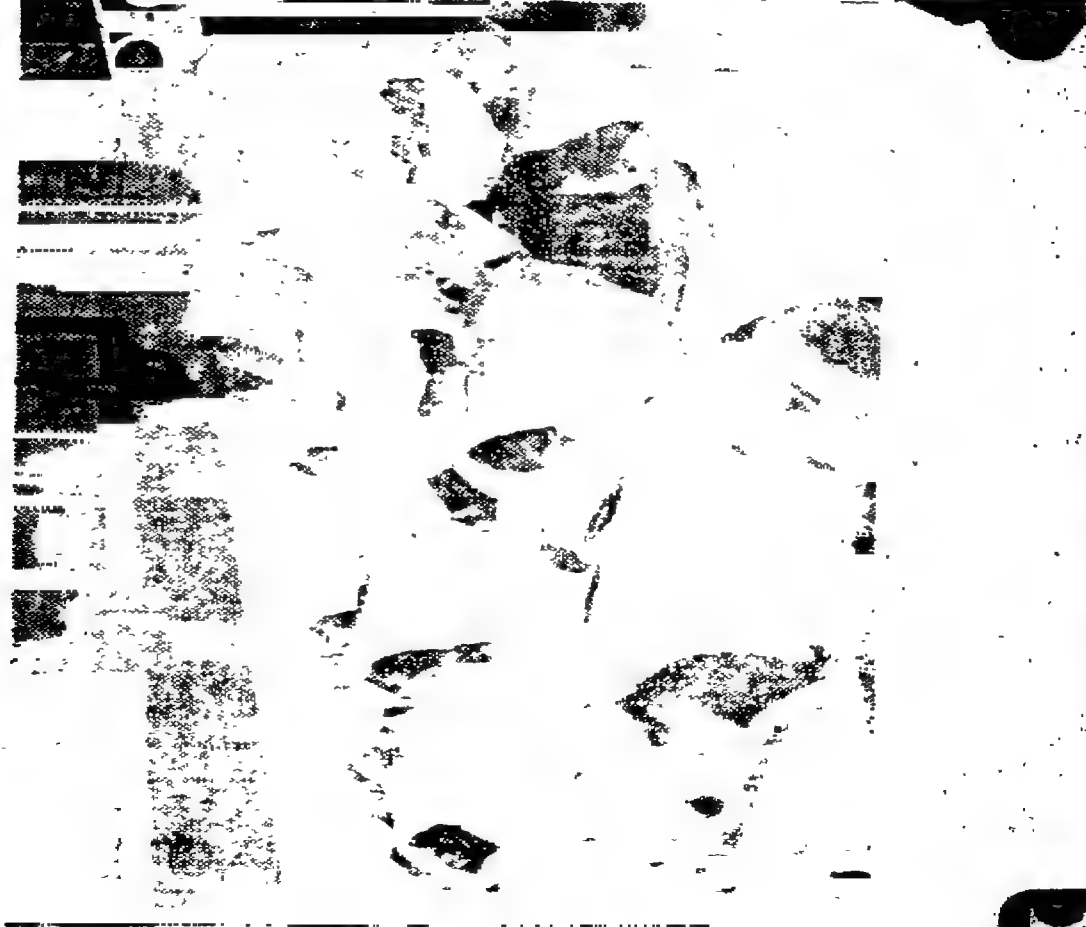
निर्बल वर्गों का उत्थान सरकार का विशेष अभियान

सुश्री मायावती,
मुख्यमंत्री उ०प्र०

अनुसूचित जाति/अनुसूचित जनजाति के अधिक से अधिक छात्रों को छात्रवृत्ति देने के लिए अभिभावकों की आय सीमा में ढाई गुना वृद्धि

- अब 12 हजार रुपये की जगह 30 हजार रुपये तक की वार्षिक आमदनी वाले माता-पिता/अभिभावकों के दसवीं कक्षा तक पढ़ने वाले बच्चों को भी छात्रवृत्ति की सुविधा।
- कम आय सीमा होने से जिन अभिभावकों के बच्चों को पहले छात्रवृत्ति की सुविधा नहीं थी, सरकार द्वारा आय सीमा बढ़ाये जाने से अब वे सभी इसके पात्र होंगे।

شفیع جاوید

آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر۔ گھپ اندھیرے میں ٹرین جنگل کے بیچوں بیچ کھڑی سوتے ہوئے اژدھے کی طرح سوں سوں کر رہی تھی۔ اس ڈبے کے بیچارے مسافر دہشت سے خاموش تھے۔ سناٹے میں گولیوں کے چلنے کی دھائیں دھائیں پھر سنائی دی۔ پھر لوگوں کی چیخ و پکار، عورتوں کے بین، بچوں کے رونے کی آوازیں۔

"یہ کیا ــــ؟" دہشت میں کسی کی آواز گم ہو گئی۔

"ڈاکہ پڑ رہا ہے" آواز میں لرزش تھی۔

"ہائیں ڈاکہ؟ اور پولیس کہاں ــــ؟"

"یہ کوئی نئی بات ہے کیا؟" کسی نے اطمینان سے کہا۔

"اور اس ڈبے میں بھی آ گئے تو ــــ؟"

"تو کیا؟ جو کچھ ہمارے آپکے پاس ہے، لے جائیں گے"

"شاید جان بھی لے لیں" ــــ ایک نا امید آواز

"تو ہم ایسے ہی"

"تو کر بھی کیا لیجیے گا جناب"؟ کسی ایک گوشہ سے سوال اچھل گیا۔ کوئی جواب نہیں۔ سارے ڈبے میں سناٹا چھا گیا۔ گولیاں پھر چلیں، شاید جواب کی کاروائی۔ پھر گولیاں اور تیزی سے دوڑنے، بے تحاشا تیز قدموں کی آوازیں اور سناٹا اور وقفہ اور پھر اسی کمپارٹمنٹ کے دروازہ کو کسی نے زور زور سے پیٹنا شروع کیا ــــ "کھولئے دروازہ، جلدی کھولئے، کھولئے دروازہ جلدی"۔ مسافروں نے ایک دوسرے کو دیکھا، انکے خوفزدہ چہرے اور بھی تاریک ہو گئے۔ دروازہ کو پھر کئی جھٹکے لگے۔ پھر باہر سے کسی نے بڑے شائستہ لہجے میں کہا" دروازہ کھولئے پلیز، میں وہ نہیں ہوں جو آپ لوگ سمجھ رہے ہیں" ــــ آدھی رات ادھر اور آدھی رات اُدھر، ٹرین دہشت بھری سناٹے میں کچھ دیر اور کھڑی رہی، پھر انجن (Engine) کا ہارن سنائی دیا۔ ٹرین چل پڑی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کو کسی نے پھر بڑے زور سے جھٹکا دیا "پلیز دروازہ کھول دیجئے، میرے ہاتھ چھوٹے جا رہے ہیں، میں گر جاؤں گا" ــــ دہشت زدہ مسافروں میں سے ایک نوجوان اُٹھا، بازو کے مسافر نے اُسکا ہاتھ پکڑ لیا "کیا کرتے ہو؟"

"اسکا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ گر کر مر گیا تو؟"

"اور اندر آ کر وہ ہمیں لوٹ کر مار جائے تو؟"

"ڈاکو ہوتے تو کیتنی فوراً دوبارہ نہیں ہوتی"

"اور وہ ڈاکو ہی ہے، یہ بھیا آپ کیسے جانتے ہیں؟"

"کوئی پریشان مسافر بھی ہو سکتا ہے"

"مسافر اسٹیشن پر سوار ہوتا ہے، جنگل میں نہیں"

"ارے بھائی اندھیرے میں رسی کو بھی ــــ" اسی وقت نوجوان اپنا ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھ گیا اور ایک جھٹکے سے اس نے دروازہ کھول دیا۔ آنے والا بھی جوان ہی تھا۔ اسکے اندر آتے ہی سب لوگ اپنی اپنی جگہ مستعد ہو گئے کہ ویسا کچھ اگر ہوا تو مقابلہ کیا جا سکے۔ اندر آ کر وہ ہانپتا ہوا خاموشی سے ایک برتھ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ پسینہ سے اسکی پیشانی بھیگی ہوئی تھی۔ گھٹنے سے نیچا لانبا کرتا، تنگ مہری کا پائجامہ، معمولی کولہاپوری چپل، دائیں کاندھے سے لٹکا ہوا کپڑے کا ایک تھیلا اور کامریڈ نما چھوٹی سی داڑھی۔ وحشت اسکے انگ انگ سے نمایاں تھی۔ ڈبہ کے لوگ حیران بیٹھے تھے کہ سامنے کی برتھ پر لیٹے ہوئے بوڑھے دیہاتی نے اپنی دھری دھری آنکھوں کو اسکی طرف پھیر کر پوچھا "گاڑی دیر تک رکا رہے بابو، انجن پانی لیتا تھا کا؟"

"بابا اب انجن پانی نہیں لیتا تیل سے چلتا ہے"۔ نوجوان کی آواز میں تلخی تھی۔

"کا کہو ہو بابو ــــ تیل سے تو دیا جلے ہے"

"بابا اب دیا بجلی سے جلتا ہے" ــــ اسکی آواز کی تلخی برقرار تھی۔

"بوڑھے نے اپنی آنکھیں پوری طرح موند لیں اور لمبی سانس لے کر بولا" مالک کی لیلا، اس مایا نگری میں کا کا ہووے لگا ہے"

نوجوان کا چہرہ فولاد کی طرح سخت ہو گیا۔ لوگوں نے سمجھا اب وہ حملہ کرے گا لیکن اپنے جھولے کا کاندھے سے اُتارتے ہوئے اُس نے پوچھا" بابا ووٹ دیتے ہو؟"

"ہاں بابو جرور دیتے ہیں" ــــ "کس پارٹی کو دیتے ہو؟" نوجوان کا لہجہ درشت تھا

"پارٹی بارٹی ہم کا جانیں، جو بیل گاڑی لایا، جو چوڑا کو دیا، جو نیتا جی بولن، او نہیں پر انگوٹھا لگا دیا۔"

"انگوٹھا لگاتے ہو؟"

"ارے اوہی بابو لکڑی کا انگوٹھا، نیتا جی جہاں بولے لگا کے ٹھوک دیا" ــــ

نوجوان خاموش ہو گیا لیکن اسکی خاموشی میں ہزاروں سوال پوشیدہ تھے۔ درمیان کی برتھ پر نیم دراز عورت کا بچہ زور زور سے رونے لگا تو نوجوان نے زہر یلے لہجے میں کہا" دیدی بچے کو دودھ پلاؤ ورنہ یہ بھی ڈاکو بن جائے گا" ــــ عورت سہم کر فوراً اپنے آنچل کے سائبان میں بچے کو دودھ پلانے لگی

"اس راج نیتی نے بھی کیا کیا وقت دکھائے" ــــ کوئی اونگھتا ہوا اٹھا

[illegible]

تھا
لیکن مجھ کو معلوم ہو کر یہ احساس ہوتا ہے کہ پہلے رات کتنی پُر سکون تھی اب بیمار ہے"۔ ایک نحیف سی آواز۔
"کیا یہ جگہ گونہیں ملتی، یہ جو ڈاکہ پڑا، بیمار ہے؟"
"جی ہاں بڑے اونچے درجہ کا بیمار، سنا کا بیمار"۔۔۔ لوگوں نے حیرت سے ایکدوسرے کو دیکھا
"سچ ہے جب رات کو راجہ سوئے اور دن کو جمائیاں لے تو پھر ایسا ہی وقت پڑتا ہے"۔
"ہاں یاد آیا، سنی سنائی ہے بھائی کہ جب انگریز کسی راجہ کو گرفتار کر کے ندی کی راہ لے جارہے تھے تو راجہ نے پوچھا یہ کون سا وقت ہے؟ یہ بھور کا وقت ہے سرکار، سپاہی بولا، راجہ نے اسوقت بڑے تعجب سے نیم روشن آسمان کو دیکھ کر کہا، یہ وقت کبھی دیکھ نہیں پایا تھا اسی لئے آج یہ وقت دیکھنا پڑا"۔
کمار اوپر کی برتھ پر پاؤں سکیڑ کر لیٹا ہوا آوازیں سنتا رہا اور سوچتا رہا، کچھ دیر بعد اسکی سوچ نے ایک اور راستہ پکڑ لیا۔ آدھی رات کو یہ سچ جنگل میں کیا کر رہا تھا؟ چہرے سے بول چال سے پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے لیکن اسکا لہجہ اتنا کھردرا اور باتیں اتنی تلخ کیوں ہیں؟ ٹرین اب پوری رفتار سے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑتی ہوئی چلی جارہی تھی کہ کسی نے اس نوجوان سے پوچھا "تو ڈاکہ پڑا کیا"؟
"ہاں" نوجوان نے بے رخی سے کہا
"بہت لوٹا کیا؟"
"ہاں"
"مارا بھی؟"
"ہاں"
"جان بھی لی؟"
"ہاں"
"کتنے کی؟"
"تین کی"
"کیوں؟" کسی دوسرے نے پوچھا
"مال۔۔۔ انھیں جان سے زیادہ پیارا تھا"۔
سب لوگ پھر خاموش ہو گئے۔ آخر کمار سے رہا نہ گیا، اس نے اوپر سے ہی پوچھا
"آپ سب کچھ جانتے ہیں؟"
"ہاں میں وہیں تھا"۔۔۔ لوگ پھر سہمنے لگے
"آپ وہاں کیا کر رہے تھے؟" ٹوائلٹ (Toilet) کیلئے نیچے اترتے ہوئے کمار نے پوچھا۔
آپ کوئی تھانیدار ہیں کیا؟۔۔۔ نوجوان کی آواز نفرت سے بھری تھی۔
"نہیں angry young man ایک سادھارن مسافر کی حیثیت سے جاننا چاہتا ہوں"۔
"[illegible] آپ نے [illegible] مجھے" پھر [illegible] ہوں"۔
[illegible]
[illegible]

[illegible]
ان میں میرے کالج کے دنوں کے کچھ بہت اچھے دوست بھی تھے۔ جانے کیوں میں انھیں سمجھانے لگا لیکن ان کی آنکھوں کی آگ اور بھڑک اٹھی اور انھوں نے سب سے پہلے میرے چھاتی پر ریوالور رکھ دیا۔ پھر شاید پچھلے دنوں کی یاد کر کے یا میری بے چارگی پر ترس کھا کر مجھے باہر دھکیل دیا۔ اسکے بعد دروازہ بند ہو گیا اور تاطو ترجیہ شروع ہو گیا۔ میں نے کھڑکی سے لٹک کر اس وحشی ڈرامہ کو دیکھا، کچھ کر سکتا یا کہہ سکتا۔ اسکے پہلے سنسناتی ہوئی ایک گولی، میرے کانوں کے پاس سے گزر گئی اور میں جھٹکا کھا کر نیچے گر گیا۔ پھر بھاگ کر میں یہاں پہنچا۔ تھا آپ لوگوں نے۔۔۔ "کمار نے آہستہ سے اسکے کاندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔
رات ٹوٹنے لگی تھی۔ ٹرین مدھوپور سے آگے نکل چکی تھی۔ آہستہ آہستہ باہر کا منظر اور کمپارٹمنٹ کا ماحول بدل چکا تھا۔ کچھ لوگ بنگلہ میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک سلونی سے بہرگ تنگی پورب کے نیلے آسمان کو دیکھتی ہوئی کوئی بنگلہ گیت دبے ہوئے لہجہ میں گنگنانے لگی تھی۔ کمار سوچنے لگا بنگلہ نہیں جاننے کے کارن مدھوپور کے آگے ہم اجنبی جیسے ہو جاتے ہیں، کیسی عجیب بات ہے؟
"کیا سوچ رہے ہیں انکل، لیجئے چائے پیجئے" رات کا وحشت ناک نوجوان ہلکی خنکی کے ساتھ بولا۔
مٹی کا پیالہ ہاتھ میں لیتے ہوئے کمار نے محبت سے نوجوان کو دیکھا چائے میں مٹی کی سوندھی خوشبو رچ گئی تھی۔ "اسطرح چائے کا مزہ ہی کچھ اور ہی ہوتا ہے مسٹر۔۔۔"
"صرف راہل۔۔۔ اسطرح چائے پینے میں دھرتی سے جڑ جانے کا احساس ہوتا ہے۔۔۔ شاید اسی لئے رشی منی مٹی کے برتن پسند کرتے ہیں"۔
"تمہاری سوچ تو بڑی گمبھیر ہے راہل، تم بنگلہ جانتے ہو؟"
"ہاں"
"تو ادھر بنگلہ میں لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں؟"
"یہ لوگ ابھی تک رات کی وحشت کو دور نہیں کر سکے ہیں اور بحث کر رہے ہیں کہ اگر وہ سب اس ڈبہ میں بھی آجاتے تو آج کی صبح ان کے لئے نہیں ہوتی"۔۔۔ اسوقت سلونی کی مترنم آواز کچھ اونچی ہو گئی۔ راہل چپ ہو گیا اسکے چہرے پر ایک سایہ سا آکر ٹھہر گیا۔ شاید کوئی گیا وقت تھا، کوئی لوٹ کر نہ آنے کا کوئی لمحہ۔
"یہ گیت کیا ہے راہل"
"مِلن کی آس۔۔۔ اکیلی رات بیت چکی ہے"

سامنے دُھلا، پھیلا، نیلا آسمان ہو
تمہاری آنکھوں کی نیلی جھیلوں کی طرح
یہ سواری بہت آہستہ چلتی ہے،
کاش! میرے پر ہوتے، تو اڑ کر
میں اڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاتی۔۔۔ گی کی [illegible]
[illegible] تو جیسے کہ وہ چپ ہو گئی اور راہل اداس ہو گیا۔ [illegible]
تھی۔

"راستے میں جو ٹرک [illegible] کے کنارے [illegible] سے میک اپ کر رہی ہے" کمار نے رالل کی اداسی کو ختم کرنے کیلئے کہا لیکن رالل نے کوئی جواب نہیں دیا۔
چائے پی آئی تو سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے کمار نے کہا "اچھا رالل چلتا ہوں"
"میں بھی تو یہیں اتروں گا۔ آپ کہاں جائیں گے؟"
"یہاں جو بینک ہے ــــ"
"اچھا گوپال بابو۔ منیجر صاحب کے یہاں شاید" رالل بیچ میں ہی بول پڑا۔
"ہاں میری بیٹی ان سے بیاہی ہے"
"تو آؤں گا۔ کسی دن آپ سے ملنے"
دوسری صبح رالل کے ساتھ چلتے ہوئے کمار سورن ریکھا ندی کے کنارے نکل آیا۔
بہت دور تک ندی کے کنارے مرد، عورت، بچے، سر جھکائے دنیا و مافیہا سے بے خبر پیالہ پیالہ پانی اٹھاتے تھے، چھانتے تھے، پھر زمین پر بہا دیتے تھے۔ اسکے بعد پھر وہی پیالہ پیالہ پانی کا چھاننا شروع ہو جاتا تھا۔
"یہ کیا کر رہے ہیں؟" کمار نے پوچھا
"سونا کھوج رہے ہیں"
"سونا؟" کمار کی آواز میں حیرت بھری تھی۔
"ہاں بابو انکل، یہ سب بھوکے ننگے، شاید جنم جنانتر سے اسی طرح سونا کھوج رہے ہیں۔ مرگ ترشنا۔ کبھی کچھ مل جاتا ہے تو انکی خوشی دیکھنے کی ہوتی ہے۔ ڈھول تاشے اور شہر کے تال اسطرح بجاتے ہیں جیسے دنیا انکی مٹھی میں آگئی ہو۔ پھر جیسے ایک دھان، یا ایک لال یا ایک دال برابر سونا مل جاتا ہے وہ راجہ بھوج کی طرح اکڑتا ہوا لال چند مہاجن کے یہاں جاتا ہے اور جب بنیا کی طرح لال پیلا کہتا ہے، وحشت تیری کی، یہ کیا لایا ہے رے تو؟ سونا کے بھاؤ بیچنے مٹی؟ پھر تھک ہار کے بس پانچ روپے۔ تو اسکے چہرے سامنے کے پتھر کی طرح سیاہ ہو جاتے ہیں۔ جب وہ کماتا اور بھی کم کماتا ہے اور پیتا اور بھی زیادہ ہے کہ بھوک رہے تو رہے ہوش نہ رہے لیکن سچ یہ ہے انکل کہ وہ کچھ بھی نہیں بھول پاتا اور کسی دن تھک کر اسی ندی کے کنارے مر جاتا ہے یا آتم ہتیا کر لیتا ہے" ــــ بولتے بولتے رالل ہانپ گیا اور پسینہ سے بھیگے ہوئے اپنے سخت چہرہ کے ساتھ پلاش کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ کمار دم بخود تھا۔ وہ سارا منظر اسے آسیب زدہ لگ رہا تھا اور کنارے پر سر جھکائے، خاموش، بے امید ہڈیوں کے ڈھانچے جیسے لوگ، لگ رہا تھا وہ سب کالکا کے محل میں کھو گئے ہوں۔
"سونا مل جاتا ہے انھیں؟"
"تو آخر وہ پانچ روپے لال چند کاہے کے دیتا ہے"۔
"سونا؟ اور صرف پانچ روپے؟"
"تمھیں مدد کرنے کے لئے تم ــــ"
"تمھیں دو برس سے بھٹک رہا ہوں انکل اسکے لئے لیکن ابتک نہ کوئی راستہ ملا نہ کوئی ہمدرد ــــ"
دھوپ تیز ہو گئی تو کمار نے کہا "چلو گے؟"

"نہیں ــــ نہیں نہیں رکوں گا" ــــ رالل نے زور سے جھٹک دیا اور تیزی سے جدا کر خاموش ہو گیا۔ کمار ڈر گیا۔ انجانے خوف کو دباتے ہوئے واپس ہوا تو رینو اور گوپال بے چینی سے اسکا انتظار کر رہے تھے۔
"آپ کہاں چلے گئے تھے پاپا؟" دونوں نے ایکساتھ پوچھا۔
"رالل کے ساتھ ذرا ندی تک"۔
"رالل کے ساتھ؟" گوپال نے چونک کر پوچھا۔
"ہاں کیوں، تم جانتے ہو اس کو؟"
"اسے یہاں کون نہیں جانتا پاپا۔ یہاں جو بھی گڑبڑ ہوتی ہے وہ سب ــــ"
"کس طرح کی گڑبڑی؟"
"دھرنا، چام ہنگامہ، نوجوانوں کو اکٹھا کر کے جلوس نکالنا اور نعرے لگانا"
"کیسے نعرے؟"
"اسکا خاص نعرہ ہے جور ظلم چو لبے نا، سارے شہر کو سر پہ اٹھا لیتا ہے، پاپا وہ پکا آتنک وادی ہے، کئی بار یہاں کے تھانہ میں بھی بلایا جا چکا ہے"۔
"تم اسے آتنک وادی کیسے کہتے ہو؟"
"یہاں بینک میں جتنے بھی اہم لوگ آتے ہیں وہ سب کہتے ہیں اور ــــ"
"اور لال چند مہاجن بھی، ہے نا؟"
"آپ یہ نام کیسے جانتے ہیں؟"
"اسکے علاوہ بھی بہت کچھ جانتا ہوں" ــــ میں نے رالل کی آنکھوں میں جو کچھ دیکھا ہے وہ آتنک وادی کی آنکھوں میں نہیں ہوتا بس اتنا جان لو"۔ یہ کہتے ہوئے کمار اپنے کمرہ میں چلا گیا۔
پہاڑی شام اداس بھی تھی اور تاریک بھی۔ بجلی کے کھمبے تو تھے لیکن روشنی کہیں نہیں تھی۔ کھلی چھت پر ٹہلتے ہوئے کمار نے وسیع آسمان کو دیکھا۔ شہر میں اتنے چمکتے ہوئے ستارے اس نے مدت سے نہیں دیکھے تھے۔ تیز پہاڑی ہواؤں کی سائیں سائیں میں بہت دور تک پھیلے ہوئے آسمان سے اسے ڈر لگنے لگا۔ ایک بے نام سا خوف۔ اس خوف کے ساتھ ہی اچانک اسے رالل کی یاد آگئی ــــ "جانے کہاں بھٹک رہا ہوگا ابھاگا"؟ اسی وقت پورب سے بڑے زور کا شور اٹھا۔ بہت سے لوگوں کی آوازیں ــــ "ای جور ظلم چو لبے نا" ــــ "ای جور ظلم چو لبے نا" ــــ جلوس بینک کے سامنے تھانہ کی طرف آ رہا تھا۔ کمار کو اندھیرے میں صرف چند مشعلیں نظر آئیں اور بہت سے تیز قدموں کی آواز قریب آ گئی۔ جب جلوس تھانہ کے احاطہ میں داخل ہوا تو کمار نے دیکھا کہ جلوس کے آگے دو ارتھیاں تھیں اور لاشوں پر ڈالی گئی چادریں خون سے تر بہ تر تھیں۔ اسی وقت گوپال ہانپتا ہوا چھت پر آیا "پاپا رالل مارا گیا"
"کیا؟" کمار چیخ پڑا
"ایک نوجوان سوبی مہتو کے ساتھ رالل لال چند کی تجوری لوٹنے گیا تھا۔ مہاجن کے بیٹے نے ان دونوں کو گولی مار دی، حالانکہ جلوس کو لوگ کچھ اور ہی کہہ رہے ہیں کہ ــــ" اسی وقت جلوس نے جیسے زور کا نعرہ لگایا "ای جور ظلم چو لبے نا ــــ جو لبے نا ــــ رکتوں سے بدلہ رکت ــــ جور ظلم چو لبے نا"

❖ ❖

رقص مقابر

زاہدہ حنا

انقلاب زمانہ کا سفاک ہاتھ ماہ و سال کے رتھ پر چابک برساتا ہے اور یکساں رفتار سے چلتا ہوا رتھ تیزی سے دوڑنے لگتا ہے۔ نسلوں، قوموں اور بستیوں کو اسکے پہیے روندتے چلے جاتے ہیں۔ ہر شے کو تہہ و بالا کرتے ہوئے، ہر شہر کو وقف بلا کرتے ہوئے۔

میلوں میل کا دائرہ رکھنے والے پتھر کے پیالے میں وقت کا رتھ دوڑ رہا ہے۔ تیز تیز تر۔ ہوس اقتدار کے چقماق سے چنگاریاں گر رہی ہیں اور آگ بھڑک رہی ہے۔ نسلیں جل رہی ہیں، چہرے پگھل رہے ہیں۔ پشتون، ازبک، تاجیک، ہزارہ، دھگان اور بنجارے اس آگ کا ایندھن۔

ایک ترک نوجوان سبزہ خط آثار، ایرانی مینا طوروں میں نظر آنے والے لباس میں ملبوس، سر پر پگڑی، بغل میں کتاب، کمر میں تلوار، اس پتھریلے پیالے کی نگر پر کھڑا ہے جو ہزاروں فٹ کی بلندی پر ہے۔ وہ گردن گھماتا ہے اور اس طرف دیکھتا ہے جہاں آریانا ایر لائنز کا طیارہ فضا کو چیرتا اور گرجتا ہوا اس پتھریلے پیالے کی سنگلاخ نگر سے چند سو گز اوپر گزر کر اس کے اندر اترنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ پہیے کھل رہے ہیں اور طیارے کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے اعصاب کھنچ رہے ہیں۔ طیارہ اس ترک نوجوان سے چند سو گز کے فاصلے سے گزرتا ہے۔ ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوتی ہیں۔ وہ مسکراتا ہے اور میں اخلاقاً مسکرانے کی کوشش کرتی ہوں۔ جہاں زندگی اور موت میں بال برابر کا فاصلہ ہو وہاں کیسی ہنسی اور کہاں کا اخلاق۔

میری گھبراہٹ دیکھ کر وہ مسکراتا ہے۔ بغل میں دبی ہوئی کتاب نکالتا ہے اور اسے میری نگاہوں کے سامنے لہراتا ہے۔

یہ میرے لکھے ہوئے اوراق پریشاں ہیں۔ دن بھر دشمن کے تعاقب میں رہنے کے بعد میں پڑاؤ پر پہنچا تو کبھی الاؤ اور کبھی مشعلوں کی روشنی میں انہیں لکھتا رہا۔ وہ اس کی ورق گردانی کرنے لگتا ہے۔ پھر وہ اسے بند کر دیتا ہے۔

"تم اب آئی ہو، میں نے صدیوں پہلے اسی جگہ پر کھڑے ہو کر منہ اندھیرے طلوع ستارۂ سہیل دیکھا تھا۔ ایک عمدہ شگون اور پھر سورج طلوع ہوا تھا، ایک پر جلال ویر شکوہ وادی سونے کے رنگ میں رنگی گئی تھی۔"

"صدیوں پہلے۔" مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ ایک سے ایک بڑبولا پڑا ہے اس دنیا میں۔

طیارہ پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی کے اندر آگیا ہے پتھریلی نگر سے بہت نیچے اور تب یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو جاتے ہیں کہ وہ کہانیوں کے ہندو سادھوؤں کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا آتا ہے اور طیارے کے اس پنکھ پر بیٹھ جاتا ہے جو میری نشست سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ مجھے رے بریڈ بری کی ایک کہانی یاد آتی ہے۔ اس میں بھی ایک کردار طیارے کے پنکھ پر آبیٹھا تھا۔ میں اپنی نشست کو مضبوطی سے تھام لیتی ہوں۔

"میں نے پہلی مرتبہ اس شہر کو دیکھا تو یہ وہ زمانہ تھا جب میں قندز، بدخشاں، ہرات اور دریائے آمو کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ میں نے پہاڑوں کے اس عظیم دائرے میں تپتی ہوئی سنگلاخ چٹانوں کے درمیان اس دریا کو بہتے دیکھا تھا۔" وہ انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتا ہے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس طرف دیکھتی ہوں۔ "اس روز اس دریا کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے بہتی ہوئی چاندی کی ایک زنجیر ہے جو ان ہیبت ناک پہاڑوں کے پیروں میں پازیب بن گئی ہے اور چاندی کی اس زنجیر کے دونوں طرف سر سبز و شاداب مرغزاروں کے زمردیں ٹکڑے جڑے ہوئے ہیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ آدم کے قاتل بیٹے قابیل کی سرزمین ہے اور اس کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ کسی کی حکومت تادیر برداشت نہیں کرتی۔

میرے سامنے کی قطار میں بیٹھی ہوئی ایک گیم شحیم عورت جو اپنی وضع قطع سے سر بسر پنجاب کی لگ رہی ہے، کھڑکی کی طرف جھک کر نیچے دیکھتی ہے اور پھر "ہائے ربا" کہہ کر زور سے سینے پر دو ہتڑ مارتی ہے۔ اسکے برابر بیٹھا ہوا کیسری پگڑی والا سکھ نوجوان آہستہ سے اسے تسلی دیتا ہے۔

میں طیارے کے پنکھ پر بیٹھے ہوئے ترک نوجوان کو نظر انداز کرتے ہوئے نیچے کی طرف نظر کرتی ہوں۔ ہمارے طیارے سے چند سو فٹ نیچے

شعلوں کی ایک چھتری سی تنی ہوئی ہے۔ میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ جاتی ہیں۔

ترک نوجوان ہاتھ ہلا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ میں جھنجھلا جاتی ہوں۔ یہاں جان پر بنی ہوئی ہے اور یہ ایران توران کی ہانک رہا ہے۔ میں جو دلی سے آ رہی ہوں، میں نے منہ اندھیرے کسی کسی طلوع ستارۂ سہیل کا نظارہ نہیں کیا کہ اسے نیک شگون جانوں۔ جہاد ملت اسلامیہ کے لیے دولت ریاستہائے متحدہ امریکہ کا نادر روزگار تحفہ، اسٹنگر میزائیل اور اسے "ڈی ٹریک" کرنے والے اینٹی اسٹنگر فلیئر۔ ان کی لپک دیکھ کر سب ہی کے اوسان خطا ہیں۔ ہوس اقتدار کی چقماق دے گرنے والی کوئی چنگاری کسی بھی لمحے آریانا ایئر لائنز کے اس طیارے کو جلا کر خاکستر کر سکتی ہے۔ طیارے کی فضا میں لتا منگیشکر کی مدھم آواز شاید ہماری حالت کا مذاق اڑا رہی ہے۔ گنگا میا میں جب تک کہ پانی رہے، مورے سجنا تری زندگانی رہے، یہاں کیا سجنی اور کیا سجنا سب کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ ہماری یہ گائیکا اس وقت بمبئی میں شاید ریاض کر رہی ہو یا کسی گانے کی ریکارڈنگ میں مصروف ہو، اسے بھلا کیا خبر کہ اگر سربلندی ملت اسلامیہ کی خاطر گلبدین حکمت یار کے کسی "مجاہد" کا داغا ہوا کوئی اسٹنگر طیارے کو آن لگے تو اس کی تو آواز سے بھرا ہوا صرف ایک کیسٹ جل جائے گا لیکن ہم سب چشم زدن میں خاکستر۔۔۔ یوں جیسے شمشان گھاٹ میں چتا پھونک دی گئی ہو۔ مانا کہ اس طیارے میں دلی سے سوار ہونے والے افغان، ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت ہے لیکن الحمد للہ کہ دس پانچ مسلمان بھی تو ہیں۔ اجی ہٹاؤ بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ بعد از مرگ دفن ہوئے یا جلائے گئے۔ ابھی تو اندیشہ مرگ سے ہی دم لبوں پر ہے۔ سب کی سانسیں رکی ہوئی، وقت کی گردش تھمی ہوئی۔ طیارے کے پہیے کابل ایئرپورٹ کی زمین کو چھو لیتے ہیں اور سب جیسے کسی طلسم سے آزاد ہو کر جی اٹھتے ہیں۔

میں طیارے کے پنکھ کی طرف نظر کرتی ہوں۔ وہاں نہ کوئی ترک ہے نہ تاجیک۔ وہی رے بریڈ بری کی کہانی والا قصہ۔۔۔ موت کا خوف کیسے کیسے سوانگ رچاتا ہے۔

•••••

ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کابل، باغ بالا کی چوٹی پر سر اٹھائے کھڑا ہے۔ کمرہ نمبر ۱۱۹۔ میں بیقراری سے اپنے بستر پر کروٹیں بدلتی ہوں اور پھر اٹھ کر شیشے کی اس دیوار تک جاتی ہوں جس سے کئی میل پرے نشیب میں کابل ایئرپورٹ کی ایئر اسٹرپ نظر آ رہی ہے۔ صبح کا ملگجا اجالا پھیل رہا ہے اور ان میں صنوبر اور بلوط کے اونچے اونچے پیڑ سبزے کی بکل مارے ساکت و صامت کھڑے ہیں۔ ہوا شاید ان کے شانوں پر سر رکھ کر سو گئی ہے۔ شیشے کی دیوار کے دائیں جانب چھدرا سا جنگل ہے۔

دل میں ٹیس سی اٹھتی ہے۔ ہم نے خطوں میں کتنی بہت سی آرزوئیں کی تھیں۔ کتنی بار مجھے کابل بلایا گیا تھا، کتنی ہی بار یہ پیام آیا تھا کہ ہمارے شہر آؤ تو مل کے سیر چمن کو چلیں گے۔ اس کے جنگلوں میں گھومنے کی، اس کی سڑکوں پر چلنے کی آرزو تھی۔ کابل یونیورسٹی کی روشوں پر ٹہلیں گے، خزاں جب پیڑوں کا لباس اتارے گی تو ان مناظر کو دیکھیں گے لیکن وقت اپنی چال چل گیا تھا، اس شہر کا وہ گھر جس میں کئی جوڑ آنکھیں میری منتظر تھیں، وہ گھر کہیں کھو گیا تھا۔ مکینوں نے مکان بدل لیا تھا۔ انتظار کی آنکھیں دنیا کے میلے میں کھو گئی تھیں۔ اپنا نام و نشاں بھیجے بغیر۔ جرمنی، امریکہ، انگلستان۔ ان محبوب ہاتھوں کی تحریریں صدیوں سے نہیں دیکھیں۔ لیکن آقائے عبدالحیٔ حبیبی تو کہیں نہیں گئے ہوں گے اور مادام حبیبی جنھیں ان کے بچوں کی طرح میں بھی "ننو جان" کہتی تھی۔ وہ بھلا کہاں گئی ہوں گی۔ میں ابھی سے مل لوں، ان کی قدم بوسی کر لوں۔

کابل ایئرپارٹ پر اترنے کے بعد سے رات ہونے تک میں آقائے حبیبی کے بارے میں ایک ایک سے پوچھتی رہی ہوں لیکن سب ہی نے اتنے اصرار سے نفی میں سر ہلایا ہے کہ مجھے یقین آ گیا کہ یہ لوگ آقائے حبیبی کے پتے سے واقف ہیں۔ ورنہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی الہ آباد میں رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کا پتہ پوچھے اور اس سے کہا جائے کہ ہم انھیں نہیں جانتے۔ میں نے اپنے کمرے میں ٹیلی فون کی ڈائریکٹری تلاش کی لیکن افغانستان میں اس نام کی کوئی چیز پائی نہیں جاتی۔ آپریٹر نے رئیس مجلس سنا (اسپیکر) محمود حبیبی کے گھر کا نمبر ملا دیا۔ محمود حبیبی اس خاندان کے بے حد قریبی رشتہ دار لیکن نام پہچاننے سے بھی انکاری۔ وہ مرغلرہ کو نہیں جانتے، انھوں نے حبیب اور میر ویس کا نام نہیں سنا۔ جب میں انھیں آقائے عبدالحیٔ حبیبی سے ان کی رشتہ داری یاد دلاتی ہوں تو وہ غصے سے فون بند کر دیتے ہیں۔ کچھ تو ہے کہ جس کی پردہ داری ہے۔

ملک اور شہر جب دو مخالف اور متحارب کیمپوں میں بٹ جائیں، جب چچا، بھتیجے کے اور ماموں، بھانجے کے خلاف ہتھیار اٹھا رہا ہو، جب بھائی، بھائی کی مخبری کر رہا ہو تو رئیس مجلس سنا کو ایک پاکستانی ادیب اور اخبارت نویس کے ساتھ یہی سلوک کرنا چاہیے۔ مانا کہ میں صدر افغانستان کی مہمان ہوں لیکن پناہ بہ خدا آئی ایس آئی کی ایجنٹ بھی ہو سکتی ہوں یا ایم آئی کی۔ اور جب براستہ دلی واپس کراچی پہنچوں گی تو یہود و ہنود کی ایجنٹ قرار پاؤں گی۔ ہیون سانگ اور فاہیان اور ابن بطوطہ ہمارے زمانے میں ہوتے تو دیکھتے کہ کیسے بچتے ہیں سی آئی اے یا کے جی بی کی ایجنٹی کے الزام سے۔ ان دونوں سے بچ نکلتے تو انھیں "را" کا ایجنٹ ثابت کرنا تو بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

اور تب کوئی ہولے سے کھنکارتا ہے۔ میں دہشت زدہ ہو کر پلٹتی ہوں۔ مقفل کمرے میں کوئی اندر کیسے آیا؟ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ رائیٹنگ ٹیبل کے ساتھ والی کرسی کھینچ کر وہ بیٹھ گیا ہے اور مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہا ہے۔ وہی ترک نوجوان۔۔۔۔۔ لیکن وہ تو واہمہ تھا، نظر کا فریب۔۔۔ تو پھر یہ کون ہے اور پتھریلی دیواروں سے گزر کر مجھ تک کیسے

آ پہنچا ہے؟ خیالوں کی یورش، اندیشوں کی دوادوش۔

"دیواریں ـــــ" وہ ہنستا ہے ـــــ "میرا راستہ تو فصیلیں اور دریا اور گہری کھائیاں نہیں روک سکی تھیں، تو پھر اس دیوار کی کیا حقیقت ہے۔" وہ اپنی انگلیوں کو دیوار پر بجاتا ہے، بغل میں دبی ہوئی کتاب رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دیتا ہے اور اب کمر سے بندھی ہوئی تلوار کھول رہا ہے۔ شاید میری گردن اڑانے والا ہے۔ میری خطا؟ میرا قصور؟

"میں تمہیں بتاؤں، جنگ کے دامن سے جدائی بندھی چلی آتی ہے۔ وہ جدائیاں جن سے تم دل گرفتہ ہو، میں نے بہت جھیلی ہیں اور میری وجہ سے ہزاروں، لاکھوں نے جھیلیں۔" اس کی آواز ملول ہو گئی ہے۔

میں غور سے اسے دیکھتی ہوں۔ "تم عالم الغیب ہو؟"

وہ نفی میں سر ہلاتا ہے۔

"تو پھر یکے از رجال الغیب؟"

وہ مسکراتا ہے "میرے بارے میں جو جی چاہے فرض کرو لیکن بس یہ ہے کہ میں تھا، میں ہوں اور میں رہوں گا۔"

"یہ تو کچھ خدائی کی سی دعویداری کا معاملہ ہے۔" میں ابرو اٹھا کر اسے دیکھتی ہوں۔

"میں روح زمانہ ہوں جو کبھی ایک اور کبھی دوسرے نام میں قیام کرتی ہے"

"تو اے روح زمانہ ان دنوں تم کس نام میں قائم ہو؟" مجھے اب اسکی باتوں میں لطف آرہا ہے۔

"تو تم کیا واقعی ابھی تک مجھے نہیں پہچانیں۔" اس کی آواز میں حیرت ہے۔ "کل میں روزانہ کی دھواں دھوں سے بیزار ہو کر ذرا ادھر ادھر کی سیر کو نکلا تھا کہ تمہارے ہوا پیا پر نظر پڑی۔ اس ہجوم میں بس تم ہی تھیں جو مجھے واقعی جانتی تھیں، اسی لئے تم سے کلام کیا۔"

میں اسے غور سے دیکھتی ہوں۔ کھنچی ہوئی غلافی آنکھیں، نکیلی ٹھوڑی۔ "ہاں شاید تمہیں کہیں دیکھا تو ہے۔" میں جھینپ جاتی ہوں۔ وہ ایک گہرا سانس لیتا ہے اور پھر میز پر رکھی ہوئی کتاب اٹھاتا ہے اور میرے سامنے لہراتا ہے "تم نے تو اسے کئی بار پڑھا ہے۔" لیجیے صاحب، اسے کہتے ہیں مان نہ مان میں تیرا مہمان، ابھی جناب کا دعویٰ روح زمانہ ہونے کا تھا، اب شکایت اسکی ہے کہ میں انہیں پہچان کیوں نہیں رہی اور اس پر بھی اصرار ہے کہ میں نے ان کی کتاب کئی بار پڑھی ہے۔ یہ تو اپنی پوشاک، پگڑی اور پاپوش سمیت آنکھوں میں گھسے آتے ہیں۔ مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ جھوٹے کو گھر تک چھوڑ کر آنا چاہئے۔ میں ہاتھ آگے بڑھا کر وہ کتاب اٹھا لیتی ہوں جس پر مراکشی چمڑے کی جلد ہے۔ میں اسے کھولتی ہوں، اس فارسی مخطوطے کا ہر صفحہ مطلا اور ہر صفحہ مذہب ہے۔ پہلی سطر پر میری نظر پڑتی ہے۔

"در سنہ ہشت صد و نود و نہ۔ در ولایت فرغانہ بہ سن دوازدہ سالگی پادشاہ شدم۔"

میری انگلیاں لرزنے لگتی ہیں۔ ناممکن۔ میں نگاہیں اٹھاتی ہوں۔ میرے سامنے اس وقت کا محمد ظہیر الدین بابر مسکرا رہا ہے جب اس نے "بادشاہ" کا لقب اختیار نہیں کیا تھا اور میرے ہاتھوں میں "بابر نامہ" ہے۔

"توزک میں نے ترکی میں لکھی تھی، یہ اس کے ترجمے کی نقل ہے جسے عبدالرحیم خان خاناں نے برائے خوشنودی پادشاہ محمد جلال الدین اکبر نے کیا۔" وہ میری حیرت سے لطف ہو رہا ہے اور اسی لمحے دروازے پہ دستک ہوتی ہے۔ روح زمانہ پل چھن میں آنکھوں سے او جھل۔ نہ شمشیر، نہ کتاب، میں غرق در حیرت آب۔

دستک دوبارہ ہوتی ہے۔ اب کہیں محمد جلال الدین اکبر یا محمد نور الدین جہانگیر نہ چلے آتے ہوں۔ میں جھجکتے ہوئے دروازہ کھولتی ہوں۔

سامنے کسی روح زمانہ یا رجال الغیب کی بجائے گوشت پوست کا بیل بوائے کھڑا ہے۔ "خانم۔ جاکت و دامن و لباس روز"

ہینگر پر میرے استری شدہ کپڑے۔

ایک ڈالر کے نوٹ کی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک منتقلی۔

"تشکرم۔ تشکرم۔"

•••••••

ارگ ـــــ پریذیڈنشل پیلس۔ ایک پر شکوہ پتھریلی عمارت۔ راہداریوں سے گزر کر کمرۂ ملاقات۔

شوروی جاچکے۔ جنیوا معاہدہ ہو چکا۔ اس معاہدے کی قیمت جو نیجو نے معزولی کی شکل میں ادا کی اور جنرل ضیاء نے جان کی صورت۔

میں جنرل نجیب کی گہری اور پر سکون آنکھوں میں جھانکتی ہوں۔ اس شخص سے کیسی کیسی کہانیاں وابستہ ہیں۔ "خاد" کا سربراہ۔ زندان پل چرخی کا عقوبت خانہ۔ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ؟ جس بات کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا وہ یہ کہ اس شخص نے امریکیوں اور روسیوں، پاکستانیوں اور ہندوستانیوں سبھی کے اندازے الٹ کر رکھ دیے۔ دنیا میں روزانہ اس کی حکومت کے خاتمہ کا مژدہ سنایا جاتا ہے اور یہ کہ اپنی کرسی پر جما بیٹھا ہے۔

میرے کانوں میں روح زمانہ کی آواز گونجتی ہے۔ "یہ سرزمین قابیل ہے، آدم کے قاتل بیٹے کی بسائی ہوئی۔ شاید اسی لیے اس کی خاصیت ہو چکی ہے کہ تا دیر کسی کی حکومت برداشت نہیں کرتی۔" جنرل نجیب کو یہ زمین نہ جانے کب تک برداشت کرے۔

نجیب ترجمان کے ذریعے باتیں کرتے کرتے اچانک اردو بولنے لگتے ہیں۔ ان کی جوانی پشاور کی گلی کوچوں میں گزری ہے وہ اپنے کالج کے ساتھیوں کو یاد کر رہے ہیں۔ سیاسی دوستوں کو، پشاور کے بازار اور کراچی کی گلیاں نجیب کی آنکھوں میں جاگنے لگتی ہیں۔ فیض کے اشعار۔ میں اس شخص کو دیکھتی ہوں، یہی ہے جو اس گھر کا نام و نشان بتا سکتا ہے، جس کا راستہ مجھے کوئی نہیں بتاتا۔

شاید میرا سوال پروٹوکول کے اعتبار سے مناسب نہ ہو۔ شاید اس گھر نے ترا کی، امین، ببرک کارمل اور نجیب کی سیاست سے اختلاف کیا ہو۔ شاید اس گھر کے کسی بیٹے کی چیخیں بھی زندان پل چرخی میں گونجی ہوں۔ خوف کا ایک لحظہ، ہچکچاہٹ کی ایک ساعت۔ دل کے رشتے کسی زندان، کسی بندی خانے کو نہیں جانتے۔

میں اپنی فنجان پر ایک نظر ڈالتی ہوں جو خالی ہو چکی ہے اور جس کی تہ میں چائے کی چند پتیاں رہ گئی ہیں۔ کسی پیالی کی تہ، میں رہ جانے والی پتیوں سے کیا واقعی تقدیر پڑھی جا سکتی ہے۔؟

اور میں اس شخص کے خاندان کے بارے میں سوال کر دیتی ہوں جو پشتو دانش و ادب کی آبرو تھا، جس کے نام کے بغیر پشتو ادب اور افغان دانش کا تذکرہ مکمل نہیں ہوتا، جس نے اپنی زندگی کے سنہرے سال جلا وطنی میں گزارے۔ دانش گاہ پنجاب کی مرتب کردہ دائرۃ المعارف اسلامیہ میں جس کی تحریریں شامل ہیں۔ جس کے گھر کا عشق آج بھی دل میں پہلے دن کی طرح راسخ ہے، ایک ایسا گھر جس کے کسی بھی فرد کو میں نے ۲۸ برس سے نہیں دیکھا۔

نجیب کی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑی ہوئی ہیں "یہ سوال شاید آپ نے کسی اور سے بھی کیا تھا"۔

میری پیشانی پر ہلکی سی نمی پھیل جاتی ہے۔ جنرل نجیب کو اپنے مہمان کے سوالات کے بارے میں اطلاع مل چکی ہے۔ خاد۔۔۔ افغان سیکرٹ سروس۔۔۔۔۔۔زندان پل چرخی۔۔۔۔۔۔وہ جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ امریکی جاسوسی فلموں کے مناظر آنکھوں میں گھوم جاتے ہیں۔

اب جو ہو سو ہو "جی ہاں افسر مہمانداری عباس کرگر سے کئی دوسروں سے بھی یہی سوال کر چکی ہوں۔"

ہم دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے کو تول رہی ہیں۔

ایک گہرا سانس اور پھر جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ جنرل نجیب اپنے سامنے رکھی ہوئی پنسل سے کھیلنے لگتے ہیں "آقائے عبدالحیٔ حبیبی کے خاندان میں سے اب کوئی بھی کابل میں نہیں۔"

مجھے صدر افغانستان کی بات پر اعتبار نہیں آتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بو جان نے وہ شہر چھوڑ دیا ہو جس پر وہ ہزار جان سے عاشق تھیں، جسکا نام لیتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔

اور یہ بات پانچ برس بعد کراچی میریٹ میں بیٹھے ہوئے ان کے سب سے چھوٹے بیٹے خوشحال حبیبی نے بتائی کہ میرا یقین درست تھا۔ جب میں کابل میں ان کے گھر کا راستہ ڈھونڈ رہی تھی۔ اس وقت وہ کابل میں ہی موجود تھیں، آقائے عبدالحیٔ حبیبی ختم ہو چکے تھے۔ چاروں بچے افغانستان سے باہر تھے، پرامن زمینوں میں۔ لیکن وہ کابل میں تھیں، تنہا۔۔۔ اکیلی۔ اور جب ان کے بیٹوں نے انھیں بہ جبر اپنے پاس بلانا چاہا اور وہ کسی نہ کسی طور سرحد عبور

کر کے پشاور میں اپنے ایک رشتہ دار کے پاس پہنچائی گئیں تو اسی رات ختم ہو گئیں اور اب پشاور کے کسی قبرستان میں سوتی ہیں۔ ان کے آخری لمحوں میں ان کی کوئی اولاد ان کے پاس نہ تھی اور انھوں نے دس برس سے کسی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ خوشحال حبیبی IUCN کی کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے کراچی آیا تھا اور کسی نہ کسی طرح میرا فون نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

بو جان تم جو ستر بہتر برس کی ایک فراق زدہ عورت تھیں، جس کی جوانی اپنی ماں، اپنے بھائیوں اور بہنوں سے اور کابل سے جدائی کے غم میں آنسو بہاتے بسر ہوئی، جس کا بڑھاپا اپنے بچوں کے فراق میں تڑپتے اور خون روتے گزرا ہو گا۔ تم سے اگر میں گھنٹہ گھڑی کے لیے مل لیتی تو کون سی قیامت آجاتی۔ لیکن بو جان، رموز مملکت خسرواں دانند اور خسرو اپنے پہلو میں دل نہیں رکھتے اور شاید دنیا کی بیشتر عورتوں کے دلوں کا اپنے پیاروں اور اپنے شہروں کی جدائی سے دولخت رہنا ہی ان کا مقدر ہے۔

....

افغانستان کی لتا منگیشکر، نغمہ منگل کی دلدوز آواز کابل انٹر کانٹینینٹل میں "پامیر کلب" کے در و دیوار کے بوسے لے رہی ہے۔

کابل تو تباہ ہوا

کابل میں تیرے فراق میں بیقرار

کابل تیری گلیوں کے سامنے ساری گلیاں ہیچ

میں کہیں بھی رہوں کابل، لوٹ کر تیری گلیوں میں آؤں گی۔"

نغمہ منگل کی آواز گلوگیر ہے اور سننے والے دل گرفتہ۔ فراق رشتوں سے، جدائی شہروں سے، وہ جنھیں جنگ اور سیاست اپنے گھروں سے نوچ کر اجنبی بستیوں کی طرف اچھال دے، وہ بھلا کب لوٹ کر سہسرام اور دلی اور کابل کی گلیوں میں واپس آئے ہیں۔

آوارگان عشق کا پوچھا جو میں نشاں، اک مشت خاک لے کے صبا نے اڑا دیا۔

....

ٹیلی وژن اسکرین پر کابل کے ایک چوک میں کھمبے سے جھولتے ہوئے جنرل نجیب کا خون آلودہ چہرے اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ پھریری بن کے میرے تن بدن کی دھجیاں، شہر کے دیوار و در کو رنگ پہنانے لگیں پھر نکل آئے ہو ستاکوں کے رقصاں طائفے، دردمند عشق پر ٹھٹھے لگانے کے لئے۔۔۔وہ جس کے زمانے میں کابل خون میں نہیں نہایا تھا، اسی نے کابل میں اپنے لہو سے وضو کیا۔ وہ جس نے امریکیوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے اسی کے منہ میں ڈالر ٹھونسے جا رہے ہیں۔ وحشی چہروں والے اس کے بے جان بدن کی بے حرمتی کر رہے ہیں، قہقہے لگا رہے ہیں۔ "آدم کے قاتل بیٹے کی بسائی ہوئی بستی کسی کی حکومت تادیر برداشت نہیں کرتی۔" روح زمانہ کی آواز کسی پرشور موج کی طرح آتی ہے اور گزر جاتی ہے۔

میری نگاہوں میں کابل کے پریزیڈنشل پیلس کا وہ کمرہ گھوم جاتا ہے

جس میں ہم نے باتیں کی تھیں، ہماری تصویریں کھنچی تھیں۔ تصویریں رہ جاتی ہیں۔ تصویروں والے دار پر کھینچ دیے جاتے ہیں۔ خاک میں ملا دیئے جاتے ہیں۔

تو اب یہ سرزمین نئے آنے والوں کو کتنے دنوں برداشت کرے گی۔ کتنے بے گناہوں کا لہو ابھی اس سرزمین کو اور سیراب کرے گا۔

کابل میں ہر طرف طالبان کے "امن" پرچم لہرا رہے ہیں۔ وہ سفید جھنڈے جن پر خون کے دھبوں کے درمیان اب کہیں کہیں سفیدی رہ گئی ہے۔

لوگ سولیوں پر لٹکائے جا رہے ہیں۔ عورتیں اور مرد سنگسار ہو رہے ہیں۔ بوڑھوں کو ان کی داڑھیوں سے پکڑ کر لاٹھیوں اور چابکوں سے مسجدوں کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔

۱۹۲۴ میں جہنمی امیر امان اللہ خان نے عورتوں کو گھر سے نکالا تھا۔ ہم نے اس ملعون کی اور اس کے بعد آنے والے تمام ملاحدہ کی شریعت منسوخ کی۔ عورتیں حجروں میں پیدا ہوں اور ان ہی میں زندگی گزار کر اپنے گھروں کے آنگنوں میں دفن کر دی جائیں گی۔ علم انھیں گمراہ کرتا ہے، بے باک و گستاخ کرتا ہے اور مردوں کے لیے بھی یہ ہم طے کریں گے کہ وہ کیا پڑھیں گے اور کیا نہیں پڑھیں گے۔ ہم خود علم کا خزینہ، علم کا دفینہ ہیں۔ یہ فرنگی اور شوروی ہمیں علم کیا سکھائیں گے؟"

جلا دو، جلا دو کتابوں کو جلا دو۔ گرا دو، گرا دو تہذیب افرنگ کی ہر نشانی گرا دو۔ کھرچ دو، کھرچ دو، ہر تصویر کو، ہر تحریر کو کھرچ دو۔ کچل دو، کچل دو ہر ساز کو، ہر آواز کو کچل دو۔ موسیقی حرام ہے اور مصوری شرک۔ ٹیلی وژن شیطان کا چرخہ۔ گھر گھر بت کدے ہیں۔ اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں، مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ۔

"یا امیر المومنین ملا عمر۔ اسلحہ امریکی ہے، گولہ بارود بھی فرنگی ہے؟"

"ان گستاخوں کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے۔ انھیں پل چرخی کے زندان میں بند کیا جائے، ہم کفار کو تہس نہس کرنے آئے ہیں اور ہمیں اسلحہ چاہئے خواہ وہ فرنگی ہو یا امریکی۔"

یا امیر المومنین لیکن مولوی ربانی اور احمد شاہ بھی کلمہ گو ہیں۔"

"وہ دشمنان دین، دشمنان اسلام ہیں۔ ہم اسی کی جاں بخشی کریں گے جو ہماری سربراہی تسلیم کرے۔"

اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی؟ ایک اور موج خوں کابل کے سر سے گزر رہی ہے۔

دنیا بھر میں سوالوں کا ایک ہجوم ہے "یہ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کون ہے ان کے پیچھے؟"

"یہ میرے بچے ہیں"۔۔۔MY DISCIPLES۔ ہمارے مدرسوں کے پالے ہوئے، ہماری تربیت گاہوں کے ڈھالے ہوئے۔ ایک ہوں مسلم

حرم کی پاسبانی کے لئے۔ نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر۔ ہم نے طالبان کی شکل میں اللہ کی فوج بنائی ہے۔ اللہ کی فوج۔"

لیکن جنرل صاحب خادمین حرمین شریفین نے تو خلیج کی جنگ میں امریکی اور افرنگی فوج بلائی تھی۔"

"کون ہے یہ غدار؟ یہود و ہنود کا ایجنٹ؟"

"حضور ہمارے یہاں حب وطن کا ٹینڈر کب تک صرف حاضر اور سابق جرنیل بھرتے رہیں گے؟"

"ارے کوئی ہے جو اس بدبخت کی زبان گدی سے کھینچ لے اور کراچی کے کسی عقوبت خانے میں رکھے۔"

سفاک چہرے والا ایک قابوچی چھڑی بغل میں دبائے ہوئے ٹہل رہا ہے۔ خاکی لباس، شانوں پر ستارے جھلملا رہے ہیں۔ آواز کہیں دور سے آتی ہے۔۔ ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں۔ ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں۔ سفاک چہرے پر ایک آسودہ مسکراہٹ۔ "شاعر ہمیں خراج دیتے ہیں۔ لفظوں کا خراج اور یہ ملعون، یہ بدبخت۔ گندی نالے کے یہ کیڑے۔ یہ اخبار نویس ہم سے سوال کرتے ہیں۔ ہم سے۔۔۔۔؟" پادشاہ ہندوستان محمد ظہیر الدین بابر کا ہم نام اپنے دانت پیستا ہے۔

"بابر۔۔۔۔بابر۔۔۔۔۔!" کراچی کے کسی عقوبت خانے میں اذیتیں سہتا ہوا کوئی نوجوان چیختا ہے۔

اور اچانک وہ نمودار ہو جاتا ہے، وہ جو آریانا افغان کے طیارے کے پنکھ پر بیٹھا باتیں کر رہا تھا اور پھر کابل انٹر کانٹی نینٹل میں آن پہنچا تھا۔ کمر میں تلوار ہے اور ہاتھ میں توزک، عبا کا دامن ہوا سے لہرا رہا ہے۔

"کسی نے مجھے پکارا؟" ترچھی ترک آنکھیں مجھے غور سے دیکھتی ہیں۔

"نہیں۔۔۔ تمھاری نہیں، تمھارے کیری کیچر کو۔۔۔" میں خاکی وردی والے کی طرف اشارہ کرتی ہوں جو ٹیلی وژن اسکرین پر کف در دہن ہے۔ "طالبان، مسلم امہ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مسلم امہ کی جنگ۔"

"یہ۔۔۔؟ ہشت۔۔۔ میرے زمانے میں ہوتا تو اسے سپاہی بھی بھرتی نہ کرتا۔ تاریخ میں منادی کر دی جائے۔۔۔ ہاں تاریخ میں منادی کر دی جائے کہ من کہ محمد ظہیر الدین بابر میں نے کبھی اپنے لوگوں پر ستم نہیں توڑے۔ میں نے کبھی اپنے شہر نہیں اجاڑے، اپنے ہی لوگوں کے قاتلوں اور اپنے ہی شہروں کو اجاڑنے والے بابروں سے میرے خاندان کا کوئی علاقہ نہیں۔"

ٹیلی وژن اسکرین پر اب مس ورلڈ ایشوریا رائے اپنا جلوہ دکھا رہی ہیں۔ الیسان دولت بیگم کا نواسہ اور نگار خانم مغل صدر بیگم کا بیٹا بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست گنگناتا ہوا اس طرف متوجہ ہے۔

کہ عالم دوبارہ نیست۔۔۔ کہ عالم دوبارہ نیست۔۔۔ مس ورلڈ اپنی جھلک دکھا کر غروب ہو جاتی ہیں۔ پان پراگ کا اشتہار۔

بابر کی آنکھوں میں گزرے ہوئے دنوں کی دھند۔۔۔ "یہ خاک ہندوش

ختم، سمرقند و بخارا۔۔۔اسے دیکھ کر مجھے اپنی عم زاد معصومہ سلطان کی یاد آئی۔ درشہوار، درآبدار تھی۔ میری منکوحہ، میری محبوبہ، ہرات میں دیکھا تھا اسے اور دل ہار بیٹھا تھا۔ زندگی نے اس سے وفانہ کی۔" وہ ایک آہ بھرتا ہے۔

اشتہاروں کے بعد ٹیلی وژن پر "زی نیوز" کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ اسکرین دراز داڑھیوں اور سفاک چہروں سے بھرا ہوا ہے۔ تسبیح کے دانے شمار کرنے والی انگلیاں گولے اور میزائل داغ رہی ہیں۔ توپوں کی نالیں شعلے اگل رہی ہیں۔ الجہاد۔۔۔الجہاد۔۔۔الاماں۔۔۔الاماں لوگ بھاگ رہے ہیں۔ گرتے پڑتے، ٹھوکریں کھاتے، گردنوں میں دربدری کے طوق لٹکے ہوئے، آنکھوں میں ویرانیوں اور وحشتوں کے الاؤ جلتے ہوئے، شہر اور دیہات، کھیت اور باغات، بارودی سرنگوں سے اٹے ہوئے، پٹے ہوئے۔ ہماری عظیم طاقتوں کی ایجاد جس کی کہیں داد ہے نہ فریاد۔ بچے باپوں سے محروم، ماؤں سے بچھڑے ہوئے۔ کسی کا ہاتھ ندارد۔ کسی کی ٹانگیں اڑی ہوئی۔ میری نگاہوں میں اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف چائلڈ ہیلتھ، کابل کے وہ وارڈ گھوم جاتے ہیں جہاں میں نے سینکڑوں معذور بچوں کو دیکھا تھا، جو لینڈ مائنز اور بلائنڈ راکٹوں کا شکار ہوئے۔ سوراخ دار ہڈیاں، کھوپڑیاں چٹخی ہوئی، کسی کے دونوں ہاتھ، کسی کے دونوں پیر کٹے ہوئے۔ یہ جوے خوں ہے۔ یہ جوے خوں ہے۔ چار برس سے ادھر اور ادھر دونوں طرف دعویٰ نفاذ اسلام کا۔ دونوں اپنے مقتولین کو شہید کہنے پر مصر۔ دونوں ایک دوسرے کے مقتولین کو جہنم واصل کرنے کی لذت سے سرشار۔ قاتل بھی کلمہ گو، مقتول بھی۔ دونوں کے صنم خاکی، دونوں کے صنم فانی۔۔۔اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی؟

ہم سے کہا گیا تھا "سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا۔ لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا۔"۔۔۔۔"تو اب ہم ہی امام۔۔۔ ہم ہی امیر المومنین۔ تم جب تک ہمیں تسلیم نہیں کرتے، ہماری تعظیم نہیں کرتے۔ جنگ جاری ہے۔ جنگ جاری رہے گی۔ کشتوں کے پشتے لگتے رہیں گے، شہر جلتے رہیں گے، انسان پگھلتے رہیں گے۔ الجہاد۔۔۔الجہاد۔۔"

"کیسا جہاد؟ کہاں کا جہاد؟ محض فریب نفس، خواہش اقتدار۔" روح زمانہ، محمد ظہیر الدین بابر کے وجود میں بل کھاتی ہے۔ "سعدی شیرازی نے کہا تھا "دہ درویش در گلیمے بہ خسپند و دو پادشاہ در اقلیمے نہ گنجد" سعدی کے کہنے کے مطابق دس درویش تو ایک کمبل پر سو سکتے ہیں لیکن دو بادشاہ ایک مملکت میں سانس نہیں لے سکتے۔ تو یہ کیسے درویش ہیں جنہیں اپنے سوا کوئی دوسرا گوارا نہیں۔"

روح زمانہ کف در دہن ہے اور کھلی ہوئی کھڑکیوں سے آتی ہوئی تیز سمندری ہوائیں توزک بابری کے ورق پھڑپھڑا رہے ہیں۔

اسکرین پر سے تصویریں جو پل بھر کے لیے غائب ہو گئی تھیں پھر ابھر آئیں۔

منادی ہو رہی ہے۔ گلی گلی گھر گھر۔" عورتیں گھروں میں رہیں گی۔

سڑک پر ان کا سایہ نظر نہ آئے۔ قدم باہر نکالنے والیوں کو شرعی سزائیں دی جائیں گی۔ عورتوں پر شیطان کا سایہ ہے سو انہیں گھروں میں رکھو۔ کسی اخبار میں ان کی تصویر نہ چھپے۔ کسی اسکول یا مدرسے کی طرف ان کا قدم نہ اٹھیں۔ ٹانگیں توڑ دی جائیں گی، پیر کاٹ دیے جائیں گے۔ بیواؤں کے گھروں میں فاقے ہوا کریں۔ بے باپ کے بچے لاچار ماؤں کی گودوں میں بھوکوں مریں۔ ہمارا قانون فاقے اور بھوک اور موت پر مقدم ہے۔"

محمد ظہیر الدین بابر جو ایک دیوان پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے، آہ سرد بھرتا ہے "ان سے اچھے تو ہم تھے جو سربلندی اسلام کے لیے نہیں اپنی امارت و بادشاہت کے لیے لڑتے تھے۔ میں نے جو ابراہیم لودھی سے ہندوستان کی سلطنت چھینی تو کون سے خدمت اسلام کی؟ ہاں جب کفار کے ممالک فتح کرتے تو کچھ فائدہ دین مبین کا بھی ہو جاتا۔ ہم نمازیں ادا کرتے، مسجدیں بناتے، شراب پیتے اور اپنے اردو میں اکثر اپنی ماؤں اور بیویوں کو ساتھ رکھتے تھے۔ میری شیر دل نانی ایلسان دولت بیگم، میرے تن آسان باپ کے محل اور ملک کا سارا انتظام، میری منتظم ماں نگار خانم المعروف بہ مغل صدر بیگم اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی، لکھنا پڑھنا جانتی تھی اور شعرا کے کلام سے لطف اندوز ہوتی۔ میری بہن خانزادہ بیگم، میری سوتیلی نانی شاہ بیگم، میری سوتیلی خالہ مہر نگار چغتائی، میری افغان بی بی مبارکہ بیگم، ماہم خانم۔۔۔ سبحان اللہ کیا عورتیں تھیں۔ میدان میں ہوتیں تو گھوڑوں پر سواری کرتیں، قیامت کی تیر انداز، تلوار چلاتیں، جانوروں کو اور وقت پڑے تو دشمنوں کو شکار کرتیں۔ خیموں میں ہماری ناز برداری کرتیں، شعر خوانی میں حصہ لیتیں، داستان سرائی کرتیں، کتابیں لکھتیں، میری بیٹی گلبدن بیگم نے "ہمایوں نامہ" لکھا جس کی دھوم سارے جہاں میں ہے، میری پوت بہو نور جہاں بانو بیگم نے سارے ہندوستان پر فرمانروائی کی۔ ٹکسال میں اس کے نام کا سکہ ضرب ہوا، میری سگو پوتی زیب النساء مخفی، صاحب دیوان ہوئی۔ یہ عورتیں جن کا خمیر سمرقند و بخارا سے، بلخ و بامیان سے اور کابل و قندھار سے اٹھا تھا اور جو صدیوں پہلے گزر گئیں کیسے کیسے کام کر گئیں اور یہ بدبخت جنہوں نے کابل پر یلغار کی، اس کی عورتوں کو زندہ در گور کیے دیتے ہیں۔

تک سک سے درست کسی وومن ایکٹوسٹ کی تقریر۔

"میں جا رہا ہوں۔" وہ یکایک کھڑا ہو جاتا ہے۔

"میں ہندوستان کا بادشاہ، آگرے میں امانتاً دفن ہوا اور جب میرا فرزند اپنے دشمن شیر خان سور کے ہاتھوں دربدر تھا تب میری بیگم بی بی مبارکہ نے آگرہ آکر شیر خان سے مطالبہ کیا کہ وہ میری باقیات بہ حفاظت بہ راستہ درۂ خیبر کابل لے جانے کے انتظامات کرے۔ شیر خان نے اپنے دشمن کے باپ کی باقیات کو تکریم و احترام کے ساتھ ہندوستان سے روانہ کیا اور میں نے بالا حصار کی بلندیوں پر کابل کی خاک میں آرام کیا۔ میرے گھر کو "رحلت گاہ بابر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، میں وہیں رہتا ہوں اور وہیں جا رہا ہوں۔ وہ کابل جو

...وی افواج کی موجودگی میں محفوظ رہا تھا، نجیب کی عملداری میں جس کی ...کیں اور بازار آباد تھے، وہی کابل ان کے ہاتھوں لوٹا گیا اور لٹ گیا جو ہاتھوں ...ز آن اٹھائے ہوئے اس میں داخل ہوئے تھے۔ میری ہڈیاں اس کی خاک ... آسودہ ہیں۔ یہ درست ہے کہ میری رحلت گاہ کے مرمریں ستون گولیوں ... چھلنی ہوئے اور لوح مزار چھل گئی لیکن وہ کہے تو میری آرام گاہ۔۔۔ میں ... نہیں تو اور کہاں جاؤں گا۔۔۔ وہ ایک آہ بھرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

میلوں میل کا دائرہ رکھنے والے پہاڑوں کے پیالے میں ہوس اقتدار کے ...اق سے چنگاریاں گر رہی ہیں اور کابل جل رہا ہے۔ پشتون، ازبک اور ...یک، ہزارہ، دھگان اور بخارے، عورتیں، بچے اور مرد اس آگ کا ایندھن۔

بامیان میں نصب بدھ کا بلند ترین بت لڑکھڑاتا ہوا اپنی جگہ سے اتر آیا ...۔ ساٹھ گز اونچا یہ بت زمین پر جھکا ہوا اپنی آنکھیں ڈھونڈتا ہے۔ ساتویں آٹھویں صدی کے جوشیلے مجاہدین اسلام اپنے خنجروں سے اسکی آنکھیں ... چکے، ان کے پیش قبض اس کا چہرہ کھرچ چکے۔

بامیان کا بدھ اپنے محبوب ترین چیلوں ساری پت اور موگلان کو آوازیں ...ے رہا ہے۔

"موگلان!" یہ جیسا ہون ہے جس میں انسان جل رہے ہیں۔"

جواب نہیں آتا۔

"ساری پت! میں نے تو جانوروں کی بجیہ نہیں ہونے دی تھی۔ یہ کون ... جو اپنے بھائی بھتیجوں اور بیٹوں، اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی بجیہ کرتے ...۔"

اس بار بھی جواب نہیں آتا۔

ساری پت اور موگلان شاید پیدائش کے دائرے میں پھنسے ہوئے ہیں اور ...ان نہیں پا سکے ہیں۔ تب ہی کوئی جواب نہیں آتا اور بدھ کی آواز پر اس مسجد ... موذن کی آواز غالب آجاتی ہے جس کے مینار امت مسلمہ کی سربلندی کے ...پر ہونے والی جنگ میں مسمار ہو چکے اور جس کی دیواروں کو مسلم امہ کے ...د کی خاطر بلا سٹنڈر اکٹوں کی چاند ماری سے چھلنی کیا گیا۔ لاؤ تو قتل نامہ مرا ... بھی دیکھ لوں، کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی۔

بدھ کی ڈوبتی ہوئی اور موذن کی ابھرتی ہوئی آواز کو ایک اسٹنگر میزائل کا ...اکہ ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ تمجید کرو تمجید کرو اس رب ذوالجلال کی جس نے ...ق دی ہمیں اپنوں سے لڑنے کی۔ تسبیح کرو۔۔۔ تسبیح کرو۔ اس خداوند کی ... نے دلوں کو موم کیا صلیب کے فرزندوں کے اور ہمارے جہاد کے لیے ان ... اسلحہ اور ڈالروں کی فراوانی کی۔

میلوں میل کا دائرہ رکھنے والے پہاڑوں کے پیالے میں انسان جل رہے ...۔ بستیاں پگھل رہی ہیں۔ نغمہ منگل کی آواز نوحہ کر رہی ہے۔ کابل تو تباہ ... ہوا۔ میں کہیں بھی رہوں کابل، لوٹ کر تیری گلیوں میں آؤں گی۔

بچو جان تم پشاور کے کسی قبرستان کی گمنام قبر ہی میں ہی دفن رہو گی۔

تمہارے لیے کوئی بی بی مبارک نہیں آئے گی جو تمہاری ہڈیاں کابل لے جائے اور اسے وہاں کی زمین میں دفن کرے۔ خاموش ہو جاؤ نغمہ منگل۔ تمہیں بھی معلوم ہے اور ہمیں بھی کہ کابل تباہ ہو گیا ہے اور اسکے لاکھوں عشاق اب کبھی لوٹ کر اس کی گلیوں کو نہ جا سکیں گے۔

••••••••••

شور سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ گلی میں شاید بہت سے بچے آوازیں لگا رہے ہیں۔ ان کی آوازیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں سر کو جھٹکتی ہوں اور اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکتی ہوں۔ بچوں کا ایک ہجوم ہے جو گلی سے گزر رہا ہے۔ آوازیں لگاتا ہوا۔

"ہڈیاں لے لو اور نان دو۔۔۔ نان دے دو اور ہڈیاں لے لو۔"

ان کے شانے بڑی بڑی بوریوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے ہیں۔

میں حیران و پریشان انہیں دیکھتی رہتی ہوں۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں، کس سے کہہ رہے ہیں، نان کے عوض کیا بیچ رہے ہیں۔ اور پھر میری نگاہ اس پر پڑتی ہے۔ پہلی نظر میں وہ مجھ سے پہچانا نہیں جاتا۔ پگڑی کے پیچ کھلے ہوئے اور وہ گردن میں جھولتی ہوئی، چہرہ خاک سے اٹا ہوا۔ کمر سے بندھی ہوئی تلوار کا نام و نشان نہیں، بغل میں دبی ہوئی کتاب بھی غائب۔۔۔ اسکے کندھے پر بھی ایک بوری دھری ہے۔

میری آواز سن کر وہ رک جاتا ہے۔ کندھے سے بوری اتار کر زمین پر دھرتا ہے اور مجھے دیکھتا ہے۔

"میں تھک گیا۔۔۔ ہندوستان کی بادشاہی اتنی مشکل نہ تھی۔۔" اسکی آواز میں صدیوں کی تھکن ہے۔ ایک ٹوٹے ہوئے شخص کی آواز۔

"یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو اور یہ بچے کہاں سے ساتھ لے آئے ہو؟"

میں ان بچوں کی طرف اشارہ کرتی ہوں، وہ بھی اسکے رکتے ہی ٹھہر گئے ہیں۔ حلقہ چشم میں دھنسی ہوئی آنکھیں پھٹے ہوئے لباس سے جھانکتے ہوئے لاغر بدن، چہروں پر بھوک کی اور بیماری کی تحریر۔

"یہ میرے بچے ہیں۔ کابل کے بچے۔ ان کے لیے میں نے بادشاہی ترک کی اور پاوندہ ہوا۔"

"معموں میں کیوں بات کرتے ہو"

"انہیں تم معما کہتی ہو؟ یہ تمہیں چیستاں نظر آتے ہیں؟" غصے سے اسکی آواز کانپ رہی ہے۔ "ذرا اپنے دائیں جانب تو نظر کرو۔"

میں گردن گھما کر دیکھتی ہوں۔ دور دور تک کھلی ہوئی قبریں۔ ان میں اترتے ہوئے بچے۔ ہڈیاں چنتے ہوئے۔ یہ بازو کی ہڈی ہے اور یہ پنڈلی کی۔ "اور ہنسلی کی ہڈی کہاں گئی۔" ایک دوسرے سے پوچھتا ہے۔ بچے قطار در قطار، سینکڑوں ہزاروں کھلی ہوئی قبریں۔

"یہ سب کیا ہے؟ کیا ہے یہ سب؟" میری آواز لرز رہی ہے اور وجود کانپ رہا ہے۔ MACABRE موت کا رقص۔ الفرڈ ہچکاک کی کسی فلم کا

"یہ۔۔۔۔ یہ رقصِ مقابر۔۔۔۔ فرانسیسی میں Danse Macabre۔ عربی میں فتح اول و کسرِ چہارم بہ معنی قبروں کا رقص اور عبرانی میں بہ کسرِ اول و کسرِ چہارم پڑھا جائے تو قبر کھودنے والے کا رقص۔"

وہ قہقہہ لگاتا ہے۔ دیوانگی سے چھلکتا ہوا قہقہہ۔

"میرے شہر میں اناج عنقا، دوائیں ناپید، شہر یخ دان، گھر برف دان۔ باپ اور بھائی جہاد کا لقمہ، مائیں اور بہنیں گھروں میں جبراً و حقاً قید۔ یہ بچے کہاں جائیں؟ بھوک کیسے مٹائیں؟ پہلے جانوروں کی ہڈیاں بیچتے تھے۔ جانور کھا لیے گئے ان کی ہڈیاں بک چکیں۔ نئی ہڈیاں کہاں سے آئیں؟ بھوک نے انھیں قبرستان کا راستہ دکھایا جہاں ہڈیوں کے انبار۔ ہڈیاں جو سرحد پار خرید لی جاتی ہیں۔ تیل، صابن اور مرغیوں کا کھاجا بنانے میں بکام آتی ہیں۔ قبرستانوں سے ہڈیاں چراؤ اور تاجران استخواں کے پاس لے آؤ۔ پنجر یک مرد افغاں پنجاہ (۵۰) سینٹ۔ ۷ اپاکستانی روپے۔ ۰۰۰ ۷ افغانی، ۲ کلو آٹے کا تھیلا ۲۰۰ ۳ افغانی کا آتا ہے۔ سو ایک پنجر برابر ہوا ۱۳ کلو آٹے کے۔ تمہارے یہاں سے طالبان، سرزمین افغانستان کو برآمد کیے جاتے ہیں اور وہاں سے پنجر افغانان در آمد۔ نازی نسل پرست تھے، یہودیوں کی چربی سے صابن بناتے تھے اپنی غلاظتیں صاف کرنے کے لیے۔ تم مسلم امہ کے سرپرست و سرخیل، افغانیوں کے ملی بھائی، ان کی ہڈیاں باریک پیستے ہو اپنی مرغیوں کو کھلانے کے لیے۔ تمہارا اسد اللہ خان غالب اپنے اشعار میں انسانی ہڈیاں ہما کو کھلاتا تھا۔ اللہ اللہ۔۔۔ تم نے ہما کی خوراک اپنی مرغیوں کو کھلائی۔۔۔ اس کی آواز کانپ رہی ہے، غم و غصے سے، درد و اندوہ سے۔

افغان جہاد کی کھیتی تمہارے کئی جرنیلوں نے کاٹی اور اب وہ چھنوا میں ان کے بینک اکاؤنٹوں میں محفوظ ہے۔ جبکہ ان کابلی بچوں کے حصے میں یہ قبریں آئیں۔۔۔ میں دنوں اور راتوں کو ان بچوں کے ساتھ مارا مارا پھرتا ہوں۔ قبرستان زیارت عاشقان و عارفان میں، گورستان شہدائے صالحین میں۔ ان کے ساتھ قبریں کریدتا ہوا۔ ان کا حوصلہ بڑھاتا ہوا۔ یہ بھی نازوں سے پالے گئے تھے، ان کی ماؤں نے بھی انھیں رات کو کبھی گھر کی دہلیز سے باہر قدم نہیں دھرنے دیا تھا۔ قبر سے کوئی بجو نکل کر بھاگے تو یہ ڈر جاتے ہیں۔ سسکنے لگتے ہیں۔ اندھیروں میں ہڈیاں چمکیں تو خوف سے گھگیانے لگتے ہیں۔۔۔ لیکن پیٹ۔۔۔ لیکن بھوک۔۔۔۔ چناں قحط سالے شد اندر دمشق۔۔۔ کہ یاراں فراموش کردند عشق۔"

اپنی بوری سے وہ ایک کاسہ سر نکالتا ہے اور میری طرف اچھال دیتا ہے "پہچانو اسے۔ کس کا ہے یہ؟ عباس کرگر کہ عبداللہ شادان کا، باز محمد خان کہ میجر جنرل گل دوست کا، سلطان علی اوروزگانی کہ آقائے عبدالحی حبیبی کا۔"

من لرزہ بر اندام۔ آنسو کاسہ سر پر لگی ہوئی خاک کو دھو رہے ہیں۔ میں بھی کسو کا سر پر غرور تھا۔ خشک تار و خشک چوب و خشک پوست، از کجای آید ایں آواز دوست۔ از کجای آید۔۔ کابل میں دیکھے ہوئے کتنے ہی چہرے آنکھوں میں گڈمڈ ہو رہے ہیں۔ کون رہا اور کون رخصت ہوا۔

"خاموش ہو جاؤ۔۔۔ از برائے خدا خاموش ہو جاؤ۔" میں اپنے دونوں کان اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیتی ہوں۔

روح زمانہ کی نگاہیں مجھے حقارت سے دیکھتی ہیں، پھر اسکے ہاتھ بوری اٹھا کر شانے پر دھر لیتے ہیں۔ اسکے قدم آگے کی طرف اٹھتے ہیں اور اسکے ساتھ ہی سارے بچے چل پڑتے ہیں۔

"ہڈیاں لے لو۔ ہڈیاں لے لو۔ ازبک اور پشتون ہڈیاں، تاجیک اور ترکمان ہڈیاں۔ ہزارہ اور بخارہ ہڈیاں۔ یکے پنجر افغان، پنجاہ سینٹ، پنجاہ سینٹ۔"

❖ ❖

رشید امجد

"عام طور پر متلی کا تعلق ہاضمے کے نظام سے ہے لیکن یہ عجیب مریض تھا کہ جیسے ہی اس کے کمرے میں کچھ لوگ اکٹھے ہوتے' اس کی طبیعت خراب ہونے لگتی اور اس پر متلاہٹ کا ایسا شدید دورہ پڑتا کہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ مختلف دوائیں آزمانے کے باوجود کوئی افاقہ نہ ہوا' اکیلا ہوتا تو گھنٹوں ٹھیک رہتا لیکن جیسے ہی اس کے ملنے والے یا ہسپتال کے دو چار اس کے کمرے میں داخل ہوتے' اسے شدید متلاہٹ شروع ہو جاتی۔

فزیشن ہونے کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے مریضوں کے نفسیاتی معاملات سے بھی خاصی دلچسپی ہوتی ہے لیکن یہ مریض میری سمجھ سے باہر تھا۔ اچھی سے اچھی دوائیں اور گھنٹوں اس کے ساتھ گفتگو کے بعد بھی میں اس کی بیماری کی نوعیت نہ سمجھ سکا' اس سے مجھے خود الجھن ہونے لگی۔ فرصت ملتے ہی میں اس کی فائل کھول لیتا' لیکن اس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ کسی ادارے میں معقول جگہ کام کر رہا تھا' ٹھیک ٹھاک آمدنی تھی' یہ بیماری بھی اچانک ہی شروع ہوئی تھی۔ وجہ نہ اسے معلوم تھی نہ اس کی بیوی کو۔

اس وقت بھی میں اسی کی فائل دیکھ رہا تھا کہ نرس کچھ لینے کمرے میں آئی۔ فائل کھلی دیکھ کر اسے کچھ یاد آیا' کہنے لگی۔

"آپ نے کہا تھا نا کہ اس کی بیوی سے پوچھوں؟"

"ہاں ہاں" میں نے دلچسپی سے کہا --- "کیا بتایا اس نے۔"

"شاید آپ کے لئے اہم ہو۔" وہ قدرے توقف سے بولی۔ "اس کی بیوی نے بتایا ہے کہ یہ بیماری شروع ہونے سے چند دن پہلے وہ کسی جھگڑے میں ایک رات تھانے میں رہا تھا۔"

"اچھا" میں چونکا --- "اس وقت اس کے کمرے میں کون ہے؟"

"کوئی نہیں۔"

میں نے جلدی سے فائل بند کی اور سٹیتھو سکوپ اٹھا کر اس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

وہ نیم دراز اخبار دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر اس نے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور ذرا اوپر ہو کر چارپائی کے سرہانے سے ٹیک لگا دی۔

میں نے پوچھا --- "کیا حال ہے؟"

"بالکل ٹھیک۔" اس نے خوش خلقی سے کہا۔

میں کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔

"آج کل تو اخباروں میں لڑائی جھگڑوں کی خبروں کے سوا کچھ نہیں۔"

اس نے سر ہلایا۔

"اب تو راہ چلتے جھگڑے ہو جاتے ہیں' لگتا ہے لوگوں......

"اب تو راہ چلتے جھگڑے ہو جاتے ہیں' لگتا ہے لوگوں کے مزاجوں میں کچھ تلخی آگئی ہے۔"

اس نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔

"اس کی وجہ شائد ہمارے مجموعی معاملات میں ہے" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "شائد پورے ماحول میں کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔"

وہ اسی طرح خالی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اچانک سوال کیا --- "پچھلے دنوں آپ کا بھی تو کسی سے جھگڑا ہوا تھا۔"

اسے اس طرح جھٹکا لگا جیسے بجلی کے ننگے تار پر ہاتھ آگیا ہو۔ آنکھیں جھک گئیں۔ گہری چپ نے کمرے کو اپنی بغل میں لپیٹ لیا۔

پھر بہت ہی دھیمی آواز میں جسے میں بمشکل سن سکا بولا --- "ہاں"

قدرے توقف کے بعد میں نے پوچھا --- "کیا ہوا تھا۔"

"کچھ بھی نہیں" ---- وہ آہستہ سے بولا --- "روڈ بلاک تھی' گاڑیاں بے ترتیبی سے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مجھے بچوں کو لینے کی جلدی تھی' میں نے بھی ایک سائیڈ سے نکلنے کی کوشش کی اور آگے کھڑی جیپ سے کترا کر آگے آگیا۔ اس پر جیپ والا نیچے اتر آیا اور کہنے لگا کہ میں نے اس سے آگے گاڑی نکالنے کی کوشش کیوں کی ہے۔ میں نے کہا --- اس میں غیر معمولی بات کیا ہے۔ روڈ بلاک ہے اور سبھی یونہی کر رہے ہیں۔ اس پر وہ مشتعل ہو گیا' تمہیں معلوم نہیں میں یہاں کا اے سی ہوں' تمہیں جرات کیسے ہوئی مجھ سے آگے نکلنے کی۔ اس پر تکرار ہو گئی' تو تو' میں میں سے بات گالی گلوچ تک آگئی۔ ٹریفک آدھے گھنٹے سے بند تھی۔

بچوں کو [illegible]ے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ میں اتنا زچ ہوا تھا کہ میں نے بھی اسے خوب سنائیں۔ اتنے میں ٹریفک والے آگئے۔ اس نے ان سے کچھ کہا' چنانچہ انہوں نے مجھے تھانے جانے پر مجبور کیا' بلکہ زبردستی تھانے لے گئے۔"

وہ چپ ہو گیا۔

[illegible] میں نے تجسس سے پوچھا۔

وہ چپ خلاء میں دیکھتا رہا۔ بہت دیر چپ رہا پھر دھیمی آواز میں بولا---

"تھانے میں انہوں نے مجھے بنچ پر بٹھادیا۔ ایک ایک آتا' گھور کر دیکھتا اور دو چار گالیاں نکال کر کہتا--- اچھا تو یہ ہے۔

میں نے کئی دفعہ کہا--- دیکھو میں سرکاری افسر ہوں' مجھے اپنے بچوں کو اسکول سے لینا ہے۔

اس پر تھانے دار نے کہا--- "تمہاری ماں کی---- خاموش بیٹھو۔"

میں نے کہا--- "مجھے کس جرم میں یہاں لائے ہو' مجھے گھر فون کرنے دو۔"

اس پر تھانے دار مشتعل ہو گیا اور تیزی سے میری طرف آیا۔

"اچھا تو تم اپنا جرم معلوم کرنا چاہتے ہو۔"

"ہاں" میں نے غصے سے کہا--- "میں سرکاری افسر ہوں۔"

"اچھا تو سرکاری افسر ہو۔" وہ پھنکارتے ہوئے بولا۔ "الو کے پٹھے مجھے قانون پڑھاتے ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ میرے منہ پر مارا۔ مجھے لگا میرے ہونٹوں سے کوئی نمکین سی شے بہہ رہی ہے۔

"اگر اب بولے تو مار مار کر الو بنا دوں گا۔"

اس نے میرے کندھے کو دبا کر مجھے بنچ کی گود میں دھکیل دیا۔ شام ہو گئی۔ ہر آنے والے کی گالیاں سن سن کر میرا دماغ سن ہو گیا۔ کچھ پتہ نہیں لگتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ بس لمحہ بھر کے لئے سڑک پر انتظار کرکے بچوں کی تصویر ذہن میں ابھرتی اور ڈوب جاتی۔ دور کہیں سے بیوی کی آواز آتی--- "ابھی تک کیوں نہیں آئے۔"

پھر ایک گھپ خاموشی اور نیم تاریکی۔

ایک نیم تاریک خاموشی کا تالاب' جس میں میں لمحہ لمحہ ڈوب رہا تھا۔

میں کون ہوں---- کہاں ہوں---- یہ کیا ہو رہا ہے۔

کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

خاموشی کا ایک نیم تاریک تالاب' لمحہ بہ لمحہ مجھے اپنے اندر کھینچے جا رہا تھا اور وقت--- وقت شاید ختم کیا تھا یا اتنا تیز رفتار ہو گیا تھا کہ گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔

یہ اذیت تھی--- یا شاید کچھ بھی نہیں تھا۔ میرا کوئی وجود نہیں تھا--- کوئی احساس' کوئی تشخص---- کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

میں کون تھا---- کوئی بھی نہیں تھا۔

بس سانس لیتا ایک لوتھڑا----

"شاید ایک صدی بیت گئی تھی

اندھیرا' اندھیرا---- چاروں طرف اندھیرا' چھت سے لٹکا ایک بلب جس سے لڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ تھانے دار کی کرسی خالی تھی' سب جا چکے تھے۔ بنچ پر ایک میں تھا اور دروازے میں کھڑا سپاہی' جس کی نظریں بھوکے گدھ کی طرح مجھ پر جمی ہوئی تھیں' جمی رہیں---- جمی رہیں' پھر وہ آہستہ سے میرے قریب آیا اور دھیمی آواز میں بولا---- "کسی کو اطلاع بھیجنی ہے یا یہیں رہنا ہے۔"

میں نے خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تو پھر جیب میں ہاتھ ڈالو نا۔"

میں نے میکانکی انداز سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس نے جھپٹ کر بٹوہ میرے ہاتھ سے چھین لیا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا---- "اتہ پتہ بتاؤ۔"

مجھے معلوم نہیں میں نے اسے کیا بتایا۔

اس نے سر ہلایا--- "فکر نہ کرو' صبح ہوتے ہی خبر ہو جائے گی۔"

وہ چپ ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا۔" میں نے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم۔" اس نے خلاء میں گھورتے ہوئے ایسے کہا جیسے اس کا مخاطب میں نہیں کوئی اور ہے--- "میں تو اسی رات مر گیا تھا۔" تھانے ہی میں' اسی بنچ پر بیٹھے بیٹھے' حرکت قلب بند ہو جانے سے۔"

خاموشی گہری ہو گئی۔

وہ چپ خلاء میں کسی نامعلوم شے کو گھورے جا رہا تھا---- گھورے ہی جا رہا تھا۔

میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ یہاں تو آدھے سے زیادہ شہر اسی طرح بنچوں پر بیٹھے بیٹھے مر چکا ہے اور......

دفعۃً اس کے تنفس میں تیزی آگئی۔ میں اس کی طرف بڑھا' لیکن لگا میرے اپنے اندر بھی کوئی چیز تیزی سے پھیل رہی ہے۔ میں نے جلدی سے نرس کو بلانے والا بٹن دبایا۔ جتنی دیر میں نرس نے کمرے کا دروازہ کھولا' ابکائی میرے منہ تک آچکی تھی۔ وہ حیرت سے دروازے میں کھڑی' ہم دونوں کو دیکھنے لگی۔

"مارزین کے دو انجکشن جلدی۔" میں نے بمشکل کہا۔ لیکن نرس دیر تک نہ لوٹی۔ متلاہٹ کے بھنور میں غوطے کھاتے ہوئے میں نے سوچا---

"شاید وہ بھی--- شاید سارا شہر ہی----- !"

❖ ❖

مرزا حامد بیگ

بڑے دن کی رات تھی۔

دریا کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلی ہوئی آبادی گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پچھم سے چلی ہوئی نرم قدم ہوا کا ریلا خاموش گلیوں میں دونوں طرف سے جھکے ہوئے سرکنڈوں سے سرمارتا' بین کرتا ہوا گزر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے آبادی میں دیو پھر گیا ہو۔

پوری آبادی میں صرف ایک تھا جو سوتے میں بھی ہوا کے بین سن لیا کرتا۔ اسے چاند سے ایک تعلق خاطر تھا۔ وہ اکثر راتوں میں آسماں پر رواں ستاروں کی چالیں شمار کرتا۔ وہ جاگتے میں سوتا رہتا اور سوتے میں جاگتا تھا۔

اور یہ بڑے دن کی رات تھی۔

اپنے تکیے والے پلنگ پر وہ بے خبر سو رہا تھا کہ سوتے میں اس نے ہوا کی سسکی سنی۔ کمرے میں نیچے دری پر اس کی دو بہنیں اور ذرا ہٹ کر تخت پوش پر ماں گہری نیند سوئی تھی۔ برابر کے کمرے میں اس کی پھوپھیاں اور ایک چچی نواڑی پلنگوں پر جس کروٹ لیٹی تھیں وہیں رہ گئی تھیں۔

لڑکیوں کو ان کے گھر سے اٹھے ابھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اس کمرے میں جہاں وہ سو رہا تھا؛ کچھ ہی دیر پہلے اسے مہندی لگائی گئی تھی اور وہ لڑکیوں کے ہجوم کے درمیان بید کی کرسی پر بیٹھا رہا تھا۔

اب رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی اور اس کے ہر طرف نیند کا غلبہ تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اٹھا' جیسے سب جاگتے میں اٹھتے ہیں۔ اس نے جھک کر کھیڑیاں پہنیں اور دروازہ کھول کر صحن میں نکل آیا۔ اس وقت صحن کی دیوار کے ساتھ جڑ کر کھڑی بکائن میں سے زرد چاند نے اسے جھانکا تھا۔

وہ گہری نیند میں تھا' اس کی آنکھیں مندھی ہوئی تھیں۔ اس کے دائیں بازو کی کلائی میں سرخ گانا جھول رہا تھا۔ جس پر اس نے کس کر ریشمی رومال باندھ دیا تھا۔ اس کے چمک دار لمبے سیاہ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کے دودھیا کرتے کو خنک ہوا دھیرے دھیرے جھلا رہی تھی۔ وہ روتی کرلاتی ہوا کے ساتھ آبادی سے دریا کی سمت نکل آیا۔

اسے کسی نے نہیں دیکھا' وہ اس طرح سنبھل کر چل رہا تھا' جیسے پوری طرح جاگ رہا ہو۔ پھر وہ کشتیوں والے پل پر آگیا۔ چاند کی زردی میں مردہ رنگ کی کشتیاں تیز پانی پر ہلکورے لے رہی تھیں۔ دریا کا لشکتا ہوا پانی دور دور تک سنگین کناروں سے ٹکرا کر جھاگ اگل رہا تھا۔ وہ بہت سنبھل کر قدم رکھتا ہوا دریا پار کر گیا۔ اب وہ اس پتھریلے راستے پر ہولیا تھا جو سیدھا مغلوں کی آبادی کو نکل جاتا ہے۔

نرم قدم ہوا اس کے پیچھے سج سج چلی آئی تھی۔ سامنے پتھریلا راستہ زرد چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ تڑخی ہوئی چٹانوں میں سے ہوتا ہوا یہ راستہ ڈھکی عبور کر کے سیدھا مغل بیگوں کی حویلی تک آتا تھا۔ حویلی کے بڑے دروازے تک' جس کی اوپر اٹھتی اور پھیلتی ہوئی محرابیں دونوں جانب سرخ پتھروں کی بڑی چوکیوں پر ٹھہری ہوئی تھیں۔

بہتی ہوئی خنک ہوا چوکیوں تک اٹھ آئی تھی۔

مغلوں نے بڑے حجرے سے متصل مسجد میں ابھی کچھ دیر پہلے وضو کرنے والوں کے قدموں کی آہٹ تھی۔ ان کے کپڑوں کی سرسراہٹ اور گلی کے گرتے ہوئے پانی کی آواز ابھی کچھ دیر پہلے سنائی دے رہی تھی۔ لیکن اب بہت تھوڑے سے وقت کے لیئے دریا کی سمت سے آئی ہوئی ہوا نے سب کچھ ڈھانپ لیا تھا۔ حویلی کے گرداگرد پوری آبادی پر چاند کی خاموش زردی ٹھنڈی ہوئی تھی اور گلیوں میں اندھیرا لوٹنیں لے رہا تھا۔

جانے کتنی دیر بعد گلی کے اس کنارے سے نکیجے اندھیرے میں راستہ بناتا' کھٹ کھٹ کرتا ممرا بہشتی ظاہر ہوا ہے' اس کے آگے آگے گدھے کی پشت پر خالی مشکیزے دونوں جانب جھول رہے ہیں "ہٹ ہٹ" کی آواز کے ساتھ گول پتھروں پر سنبھل کر قدم رکھتا لاٹھی ٹیکتا وہ ایک لحظہ کے لیئے مسجد کے سامنے ٹھہر گیا۔ اس نے صحن کی سن گن لی۔ پھر آگے بڑھ گیا۔ وہ جہاں ابھی ابھی رکا ہے' مسجد کے دروازے کے ساتھ پتھر کی بڑی سل پر پانی کی ٹینکی ٹھہری ہوئی ہے' جس کے نیچے کا خلا باہر گلی سے درختوں کے تنوں اور جڑوں سے پر ہوتا ہے۔ ممرا اپنے اگلے پھیرے میں اس کاٹ کباڑ کو دیا سلائی دکھا جائے گا۔

گلی کے دوسرے سرے پر اس کے غائب ہوتے ہی مسجد سے کانپتی آواز میں فجر کی اذان ہر طرف پھیلنے کا جتن کرتی ہوئی ابھری۔ اب صرف طہارت کرنے والوں کی مدہم۔ جھنجھناہٹ اور گرتے ہوئے پانی کا شور رہ گیا۔

بڑے حجرے کے صحن میں بے ترتیب بچھی ہوئی کمانوں پر چادریں تنی ہوئی ہیں۔ صحن میں چلم کی راکھ اڑی ہوئی ہے اور سامنے اصطبل اور بازو والے کمرے کے درمیان ایک قطار میں بڑے گوشت کے کٹورے آدھے زمین میں دبے ہوئے ہیں۔ ذرا ہٹ کر چاول دم ہوئے رکھے ہیں اور قریب ہی تھڑوں پر گھٹنوں کو چھاتی میں دبائے شیفاتالی منہ کھولے پڑا ہے۔

یہ سب دیر تک اسی طرح رہا۔ پھر حویلی کا بڑا دروازہ اپنے مخصوص شور کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ جب بڑے مرزا نے کھنکار کر گلا صاف کیا ہے تو حجرے میں تنی ہوئی چادریں یکلخت سمٹی ہیں اور شفاتالی اٹھ کر تھڑے پر بت بن گیا ہے۔ اس وقت کھلے میں چاند اپنی زردی سمیٹ رہا تھا۔

بڑے مرزا نے ایک ہاتھ سے حجرے کی چوکھٹ کو تھام رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وضو کھار رہے تھے پھر وہ اسی طرح شکروں والی راہداری سے ہوتے بازو والی کوٹھری میں چلے گئے۔

گزشتہ کئی روز سے حویلی میں شادی کا ہنگامہ تھا۔ آج سہ پہر تک مغل برادری اور قرب وجوار کی آبادی کا کھانا نپٹانا تھا۔ برات کے پہنچنے کا وقت سہ پہر کی نماز کے بعد تھا۔ منہ اندھیرے، بڑے مرزا کی مردانے میں آمد کے ساتھ ہی حجرے میں برات کے استقبال کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ دالان میں چھولداریوں کے نیچے دریاں بچھا کر نیم دائرے میں تکیوں والے نواڑی پلنگوں کو جگہ دی گئی۔ بڑے مرزا سے یہ دریافت کرنا باقی تھا کہ برات کی آمد پر دولہا کے بیٹھنے اور نکاح کے لیئے کون سی جگہ موزوں رہے گی۔ لیکن وہ بازو والی کوٹھری میں تھے۔

مردانے میں کام کے شور کے ساتھ ہی حویلی سے ڈھولک کی گھٹی گھٹی آواز نے سر اٹھایا۔ لڑکیاں بالیاں دو ایک چھپاکے پانی کے منہ پر مارتے ہوئے پورے گھر میں بھنناتی ہوئی پھیل گئیں۔ صبح کے ناشتے میں چائے کی بڑی نیلی کیتلیوں کے ساتھ جوار کی روٹیاں آگئیں۔

ابھی دلہن رانی کو سنبھالنے والی سہیلوں کی بڑی تعداد آنا باقی تھی۔ چھوٹی لڑکیوں نے ماڑی پر سے کھڑے کھڑے جرنیلی سڑک پر رنگ برنگے تانگوں کی آمد کا اعلان کر دیا۔ حویلی سے بچوں کا ایک ریلا جرنیلی سڑک کی طرف بڑھا۔ وہاں سڑک کے ساتھ ساتھ دو کوس پرے دریا کا پانی تڑپ تڑپ کر کناروں سے اوپر اٹھ رہا تھا۔

نیچے پتھریلی ڈھلوان پر اٹھتے گرتے، تانگوں کے ڈھکی کی ترائی تک پہنچنے سے پہلے وہاں پہنچ گئے۔ تانگہ رکتا، کوچوان اتر کر گھوڑی کی باگیں سامنے سے تھامے دوسری طرف منہ پھیر کر کھڑا ہو جاتا، تانگے کے گرد اگر دلپٹی ہوئی چادریں کھلتیں، زنانہ سواریاں سفید چادروں کی بکلوں میں راہ پڑ جاتیں تب کوچوان مڑ کر تانگے کا رخ کرتا چھوٹے مہمانوں کے سواگت میں مگن تھے۔

سنبھالنے والی سہیلوں میں سے دریا پار سے بھی آ رہی تھیں۔ وہ ایک چھوٹے سے رنگین بجرے میں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے چوکڑیاں بھرتی ہرنیوں کی یہ ڈار قہقہوں کی پھلجھڑی چھوڑتی، ایک دوسرے کے چٹکیاں کاٹتی جرنیلی سڑک پر آ دھمکی اور قلانچیں بھرتی ڈھکی پار کر گئی۔ شور کلکارا کرتے بچے ان سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ ہرنیوں کی اس ڈار نے حویلی کے قریب پہنچ کر وداع کے گیت میں آواز ملائی، پھر مترنم قہقہوں کا جھرنا پھوٹا۔ یکلخت بڑے مرزا تڑپ کر سامنے آئے ہیں اور حجرے سے ہی چنگھاڑ کر حکم دیا کہ زنانے کا دروازہ گرا دیا جائے۔

"کنواریوں کے یہ چالے نہیں ہیں" ان کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ وداع کا ذکر سن کر وہ تھر تھر کانپنے لگے تھے پھر وہ بازو والی کوٹھری کی طرف مڑ گئے۔

حویلی کی فصیل پر اندر کی عورتوں اور لڑکیوں نے چپ سادہ رکھی تھی۔ نیچے زنانے میں ڈھولک والے کمرے کی فرشی دری پر کھلے سنگھار دان کے برابر دلہن اکیلی رہ گئی تھی۔ باہر گلی میں پار سے آئی ہوئی مہمان لڑکیاں شرم میں نہائی اپنی ایڑی کی جگہ میں ڈوب مرنا چاہتی تھیں۔ یہ ہنگامہ بہت دیر تک رہا۔

دلہن اکیلی تھی۔ وہ اپنے کمرے سے حویلی کے عقب میں کھلنے والی بالکنی میں آبیٹھی۔ نیچے دور تک چٹانوں کی ترائی میں سبزے کی تہیں جمی ہوئی تھیں جن کے درمیان میں پہاڑی چشموں کا شفاف پانی ایک پتلی لکیر کی صورت چلتا تھا۔ اس نے نظر بھر کر نیچے دیکھا، پھر دستی آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لینے لگی۔

نوک والی تلے دار جوتیوں کو ڈھانپے ہوئے کلی کی شلوار جس کی پیلی دھاریاں اوپر اٹھ کر کانچ کی قمیص میں گم ہو گئی تھیں۔ گلے میں **جھجھمی** کا دوپٹہ ٹھہر نہیں رہا تھا۔ پیشانی پر دونوں طرف سنہری تعویذ، جن کے پیچھے باریک گندھی ہوئی مینڈھیوں کو کن پولوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ناک میں ایک طرف چار کل کا پھول اور سامنے ہونٹوں پر سونے کی بلاکڑی، گلے میں سرخ گانی، کانوں میں مندرے اور مندروں تک آئی ہوئی لحسی، انگلیوں میں چاندی کے برہیالے، جن میں چھوٹے گھنگھرو ہردم بے چین تھے۔ ابھی چاندی کے چوڑے، گورے بازوؤں پر لپیٹنے باقی تھے، ان کے ساتھ ہی اندر دری پر سرخ ٹمکن والے بازوبند اور انگوٹھوں کے چھلے اور برابر کی انگلیوں کی ستمیاں پڑی رہ گئی تھیں۔

وہ بہت دیر تک وہیں ساکت بیٹھی رہی۔ یکایک اسے یوں لگا جیسے نیچے چٹانوں کی ترائی میں سبزے کی چادر پر کسی نے کروٹ لی ہے۔ یہ کون تھا جو اتنے بڑے ہنگامے سے کٹ کر یوں سکون کے ساتھ لیٹا تھا۔

نیچے سبزے کا گہرا سایہ تھا جس میں نرم رو ہوا، اس کا دودھیا کرتا دھیرے دھیرے جھلا رہی تھی۔ اس کے چمک دار لمبے سیاہ بال شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ایک کنج میں کروٹ لیئے دنیا جہان سے بے خبر تھا۔

وہ بہت دیر تک اسے تکتی رہی۔ پھر خاموشی سے اٹھ کر ڈھولک والے کمرے میں آبیٹھی۔ اب بڑے مرزا کسی طرح مان گئے تھے۔ بڑے دروازے کی کھڑکی کھلتے ہی مہمان لڑکیاں شرم میں ڈوبی سر نیوڑھائے اندر زنانے میں کود گئیں۔ صحن اور دالان میں تخت پوش اور مسہریوں پر بیٹھی بڑی بوڑھیوں کے سر جڑے ہوئے تھے۔

"ہائے نی-- مرزا کو یوں نہیں کرنا تھا۔ کال۔ سریوں کی آہ بڑی بری ہے۔"

"ہاں نی خوارے۔ وہ گھڑی جس بول لیا تو کیا آفت ٹوٹ پڑی تھی۔"

"نی میں کہتی ہوں مرزا بیٹیوں کو مصلے پر بٹھائے گا۔"

دالان، کوٹھڑیوں اور ماڑی کی چوکیوں، مسہریوں اور مخملیں فرش پر ہر طرف سر جڑے ہوئے تھے۔ دلہن کے کمرے میں سہیلیاں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھ گئیں۔ ہر طرف مردنی چھا گئی تھی۔ مردانے میں اور حویلی کے اندر صحن، برآمدوں اور دالان میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ چار چار کوس تک کی آبادی ٹوٹ پڑی تھی۔ دونوں طرف بان کے کھاٹوں کو جوڑ کر چوکیاں بنا دی گئیں تھیں اور زنانے میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ پھر مٹی کی کوری سنکوں میں پلاؤ اور کوّے کے گوشت کا ورتارا شروع ہوا ہے۔ چار چار کی ٹکڑیوں میں چاولوں اور گوشت کے طباق تقسیم ہوتے گئے ہیں اور ان کے پیچھے چادروں کو تھامے ہوئے ٹوکے جن میں خمیری روٹیوں کے انبار لگے تھے۔ کھانے والوں کو پانی کے بھرے ہوئے کوزے بھول گئے۔ زنانے میں بار بار پنتے اور روتے ہوئے بچوں کی چیخ پکار کھانا ختم ہو جانے کے بہت بعد تک رہی۔

دونوں اطراف میں جب ساری برادری اور چار کوس سے آئے ہوئے باری نواری کھانے سے فارغ ہوئے ہیں تو عصر کا وقت ہو چلا تھا۔ ممکن ہے دریا پار، براتیوں کے گھروں سے نکلنے کا ہوکا بھی ہو چکا ہو

جب مسجد سے مؤذن کی کانپتی ہوئی آواز ابھری ہے، صحن میں چارپائیاں خالی کروا کے جہیز لگا دیا گیا۔ پھر مردانے سے دلہن کے بھائی کو بلوایا گیا، اس نے دلہن کے کمرے میں جا کر اس کی اوڑھنی کے چاروں سروں پر سات سات کچے چاول باندھ دیئے اور گردن لٹکائے باہر نکل گیا۔ سات سہاگنوں نے دعائیں دیں۔

بڑے مرزا باز والی کوٹھڑی سے صبح کے گئے نہیں نکلے تھے۔ اس اثنا میں آپ نے صرف بودے اور کیمے کو طلب فرمایا تھا۔ جس گھڑی دونوں اپنے کاندھے کی چادروں کے ساتھ پسینہ پونچھتے ہوئے باہر نکلے ہیں، کالا ٹھپے دار سامنے ہو گیا۔

"بودے، میں نے بڑے مرزا سے پتا کرنا تھا کہ برات کی آمد پر دولہا کے بیٹھنے کو کون سی جگہ موزوں رہے گی۔"

بودے نے کیمے کی طرف دیکھا :

" ٹھپے دارا، خواہ کچھ ہو مغلوں کی عزتیں گھروں سے باہر قدم نہیں دھرتیں۔"

اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔

"مرزے کا حکم ہے، جس طرح باز جھپٹتا ہے نا، بس اسی طرح جھپٹ پڑو۔ ہلا ٹھپے دارا ہم گئے اب وہ آتے ہی ہوں گے۔"

کالا وہیں بیٹھ گیا۔

اب مردانے میں چھولداریوں کے نیچے لوگ ایک بار پھر یک جا ہونے شروع ہوئے تھے۔

زنانے میں دلہن کے کمرے سے ایک بار پھر ڈھولک کی آواز ابھری تھی، سہیلیاں بڑی بے دلی کے ساتھ رقص میں دو ایک پھیرے لے کر بیٹھ رہی تھیں۔ کمرے کے ماحول میں گھٹن بڑھ رہی تھی۔ سرخ انگارہ دلہن گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔ لپٹی ہوئی گوری بانہوں میں کہنیوں تک چڑھے ہوئے چاندی کے چوڑے دمک رہے تھے اور انگلیوں میں برہیالے، جن کے گھنگرو ہر دم بے چین تھے۔ اس کی نظریں اپنے پیروں کے انگوٹھوں پر تھیں وہ آگے کو جھکی ہوئی تھی اور دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔

وہ اسی طرح چپ بیٹھی رہی تھی اور سامنے سہیلیاں بے دلی کے ساتھ پھیرے لے کر بیٹھ رہی تھیں۔ اس وقت کمرے سے ملحقہ بالکنی میں نیلا آسمان رفتہ رفتہ دھندلا رہا تھا۔ اس نے یکلخت سر اٹھایا :

"نی----- میرے لیئے وداع کا کوئی گیت نہیں گاؤ گی۔ وہ شیروں کی چھاتی والا نہیں آئے گا کیا۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا ماتھا پیٹ ڈالا۔

حویلی میں ہر طرف شور مچ گیا۔ سب دلہن کے کمرے کی طرف دوڑیں۔

"ہوا کیا ہے؟" صحن میں کسی نے پوچھا۔

"نی خوارے، اب بھی پوچھتی ہو، ہوا کیا ہے۔ برات کہیں رہ گئی ہے۔ نماشاں ہو گئیں اور دور دور تک کوئی پتا نشان نہیں۔"

اب بڑی مغلانیاں اٹھیں، چاندی کی بالیوں سے لدے پھندے کانوں کے پیچھے چکن کے دوپٹے اڑستی ہوئی۔

"بھرے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ خود تو شہزادی بیوی سمیت چار چار گھروں میں ڈال رکھیں، مجرے کرائیں، کوٹھوں پر جائیں اور جب بیٹیاں جوان ہوں تو ان کے بر زہر دے کر بلوہ کرا کے اٹھوا دیں۔"

وہ ڈھیلے کانوں میں بالیوں کو جھلاتی، کولھوں پر دونوں ہات ٹکائے لڑکیوں کو سمجھاتی بجھاتی، بڑے مرزا سمیت پوری برادری کو صلواتیں سناتی، گھڑی بھر میں ہانپ کر بیٹھ گئیں۔ ہر طرف کھسر پھسر ہونے لگی۔

اس ہنگامے میں پتا ہی نہ چلا کہ کب سورج ڈوب گیا۔ برات کی کوئی خبر نہیں تھی۔ ہر طرف بے چینی بڑھنے لگی۔ گیس کے ہنڈے جلا کر اونچے استھانوں پر رکھ دیئے گئے۔ لڑکوں کی وہ ٹولی جنھیں مشالیں دے کر دریا کی سمت بھیجا گیا تھا، واپس لوٹ آئی تھی۔ برات کا پتا نشان کہیں نہیں تھا۔

زنانے میں بڑی مغلانیاں بے کل ہو کر گھومنے لگیں۔

تب سرخ انگارہ دلہن بھی اٹھی اور دھیرے دھیرے چلتی بالکنی تک آ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے سہیلیوں کا ہجوم تھا۔

نیچے تنگ گھاٹیوں میں گھپ اندھیرا گہرے سانس لے رہا تھا۔ ہریالی کے تخت پر وہ شیروں کی چھاتی والا اب تک اسی طرح سو رہا تھا۔ اس کے دودھیا کرتے کو نرم رو ہوا دھیرے دھیرے جھلا رہی تھی اور وہ ایک کنج میں کروٹ لیئے دنیا جہان سے بے خبر تھا۔ ❖ ❖

دستک

مرزا حامد بیگ

گزشتہ رات، معمولی سے ہٹ کر کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ ہم سب نے مل کر کھانا کھایا، بچے تا دیر چہکتے رہے، تاوقت کہ موسم سرما کی تعطیلات سے متعلق پروگرام بناتے بناتے ہم سب حسب معمول گہری نیند سوگئے۔

رات کا دوسرا یا تیسرا پہر ہوگا، جب اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے دھیرج کے ساتھ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہو، یا جیسے دروازے پر دستک ہوئی ہو۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ جڑ کر لیٹا ہوا چھوٹا بیٹا بے خبر سو رہا تھا اور برابر کے پلنگ پر بیگم اور منی۔ لیکن نیند اچٹ گئی اور میں بدحواس سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چنبیلی کی خوشبو سارے گھر میں بھری ہوئی تھی۔ شاید رات کو باہر کا دروازہ کھلا رہ گیا۔ اس خیال نے پریشان کر دیا یا شاید اس خوشبو کے احساس نے۔ جب کہ چنبیلی کا پودا تو ہمارے قرب و جوار میں کہیں نہیں تھا۔"

اپنے کندھوں پر گرم شال ڈالتے ہوئے، میں ڈرائنگ روم سے گزر کر محتاط قدموں کے ساتھ ٹی۔ وی لاؤنج تک آیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ باہر کا دروازہ واقعتا کھلا ہوا تھا۔ انجانے خوف کے تحت میں نے ایک ایک کر کے گھر کے سارے بلب روشن کر دیئے۔ باتھ روم اور کچن میں جھانکا، ٹیرس پر سے ہو آیا۔ وارڈ روب دیکھ لیئے، پلنگ کے نیچے اور پردوں کے پیچھے دیکھ بھال کر ہر طرح کا اطمینان کر لیا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی لیکن طبیعت میں ایک بے چینی سی تھی۔ اک انجانا سا خوف، اور چنبیلی کی خوشبو سارے گھر میں بھری ہوئی تھی۔

میں حیران کھڑا تھا کہ اچانک باہر کھلنے والے دروازے کی سمت سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ جیسے وہاں کوئی تھا اور ابھی ابھی سیڑھیاں اتر گیا ہو۔ میں ایک لحظہ کے لیئے رکا اور پھر بلا سوچے سمجھے میں بھی سیڑھیاں اتر گیا۔

میں نے دیکھا کہ رات کو پڑنے والی نرم برف پر انسانی قدموں کے مانند پڑتے ہوئے نشانات تھے۔ کوئی ننگے پاؤں چلتا ہوا نکل گیا تھا۔ یہ کون ہو سکتا تھا۔ کچھ سمجھ نہ آیا، یا شاید نیند کا خمار ابھی ٹوٹا نہیں تھا اور میں اپنی اس دلیری پر حیران اور ششدر، پلٹنا چاہتا تھا کہ کار پورچ کے ستون کے پیچھے، زیرو پاور کے رات بھر جلنے والے بلب کی مدھم نیلی روشنی میں، میں نے اسے دیکھا۔

وہ کوکی تھی۔ بلاشک و شبہ، وہی بیس برس پہلے کا ناک نقشہ۔ وہ بالکل ویسی کی ویسی تھی۔ اس کے ساتھ کھیلتے، لڑتے جھگڑتے اور اسے چڑاتے ہوئے میرا لڑکپن گزرا تھا اور جسے اوائل جوانی میں ٹوٹ کر چاہا تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور اس نے صرف ایک ہلکی سی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ وہ سردی سے کانپ رہی تھی اور اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں چنبیلی کا ہار تھا۔

میں حیران کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ ویسی کی ویسی تھی اور ان بیس برسوں میں میرے سر کے بال سفید ہی نہیں ہوئے بلکہ کافی حد تک جھڑ چکے تھے۔ اس کی مخروطی انگلیاں اسی طرح ملائم تھیں اور ان میں چنبیلی کا ہار جھول رہا تھا۔ اس کی پیشانی کی چمک، رخسار اور ہونٹوں کی تپش ویسی ہی تھی، یا شاید مجھے محسوس ہوئی۔ میں نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی، بس حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔

اس وقت فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ وہ اسی طرح ساکت و جامد، کانپتے ہوئے ہاتھوں میں چنبیلی کا ہار تھامے کھڑی رہی، منہ سے کچھ نہ بولی۔ لیکن جب میں اسے اپنے بازوؤں میں بھر لینے کو آگے بڑھا تو اس نے منہ پھیر لیا۔ اس کے اٹھے ہوئے بازوؤں میں چنبیلی کا ہار اسی طرح کانپ رہا تھا۔ پھر میں نے وہ ہار ہمیشہ کی طرح لے کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اس اثنا میں وہ مڑ چکی تھی اور نرم برف پر چلتے ہوئے اس کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ میں نے اسے آواز دی، لیکن وہ رکی نہیں۔ میں نے اسے دوڑ کر روکنا چاہا تو گھٹنوں تک برف میں دھنس گیا، اور وہ تھی کہ سبک قدموں کے ساتھ جیسے برف پر پیرتی چلی جاتی تھی۔ میں بڑی مشکل سے شوالہ کی جانب اتر جانے والی گہری ترائی تک چل کر آیا، لیکن ترائی سے آگے وہ نہیں تھی۔

میں وہیں ٹھہر گیا۔ وہ یک لخت کدھر نکل گئی، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر مجھے اپنے حواس کو مجتمع کرنے کے لیئے شاید بہت وقت لگ گیا۔ صبح کی سفیدی میں، میرے سامنے حد نگاہ تک ہر طرح کے نشانات سے پاک برف ہی برف تھی۔ میں پلٹا، اپنے گلے کا ہار اتار کر پورچ کے ستون کے ساتھ ٹانگ دیا اور خوف ملی حیرانی کے ساتھ گھر کی سیڑھیاں چڑھ آیا۔

اس وقت میری بیوی جاگ چکی ہے اور کچن میں مصروف ہے۔ اس نے مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں اتنی دیر کہاں رہا۔ شاید اس نے یہ خیال کیا ☐

کہ مجھے جاگے ہوئے کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا اور رات کی برف باری کے بعد میں چہل قدمی کو نیچے اتر گیا ہوں۔

میں وہ دن یاد کرتا ہوں' جب سارا چھپچھو تف تف کر رہا تھا۔ جھلار والے کنویں کی سمت پانی بھرنے کے لیئے رواں لڑکیوں کی قطار کی رفتار سست پڑ گئی تھی' حجروں میں چلموں کی گڑگڑاہٹ اونچی سرگوشیوں میں دم توڑ گئی تھی اور مغلوں کے حجرے میں تمباکو پینے والے کمیوں نے شام کی بیٹھک ترک کر دی تھی۔

کوکی سے میرے میل جول کی اطلاع اجی کو قدرے تاخیر سے ملی' لیکن انھوں نے دیر نہیں کی۔ پھر کر کارنس سے اپنی تلوار اتار لی اور غصے میں کانپتے ہوئے صرف اتنا کہہ پائے کہ اگر میرا بیٹا حلالی ہے اور مغل خون ہے تو رقعہ پڑھتے ہی شہر سے فوراً واپس آئے گا' لیکن پہلے میں اس نمک حرام فیکے کی گردن ماروں گا۔

اس وقت میں شہر میں تھا اور یہ سب میری جنتی ماں نے بتایا تھا۔

ایسے میں اجی کو کون روکتا۔ حویلی میں چپ پڑ گئی اور وہ میری روتی کرلاتی ہوئی ماں کو پیچھے دھکیل کر صدر دروازہ الانگھ گئے۔ میرے اجی کا گاؤں کی گلیوں میں یوں نکلنا تھا کہ دم بھر میں بھری پری آبادی ویران ہو کر رہ گئی۔ سب اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے اور جب تک وہ فیکے کمہار کے دروازے پر دستک دیتے' فیکا اپنی بیٹی کوکی سمیت غائب ہو گیا۔

اس روز اجی' ڈولتے سنبھلتے ساری آبادی میں گھوم گئے لیکن فیکے اور کوکی کا سراغ کہیں نہ پایا۔ وہ سخت حیران تھے کہ ان دونوں کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ وہ دن اور وہ رات' ان کے غصے کی تلوار خود انھی کے لہو میں نیام ہوتی رہی۔

اگلے روز انھوں نے اعلان کیا کہ آبادی میں کوئی ننگے سر نہیں نکلے گا اور جرنیلی سڑک سے گاؤں کی سمت آنے والے راستوں پر کوئی سوار نہیں آئے گا۔ گزرگاہ سے سب اونٹ کی نکیل اور گھوڑے کی باگیں تھام کر پیادہ پا گزریں گے' مبادا مغل حویلی کی بے پردگی ہو۔ یہ اعلان کر چکنے کے بعد انھوں نے منشی کو طلب فرمایا اور میرے نام شتاب گھر لوٹنے کا رقعہ لکھوایا۔

ادھر میں' اپنے کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں' کوکی کا دیا ہوا کڑا بازو میں پہنے' کمھلائی ہوئی چنبیلی کا ہار گلے میں ڈالے اور سینے پر عطر چنبیلی ملے صرف نیلے رنگ کی پتلون اور تسمے والی چپل میں گھومتا تھا۔

جب اجی کا خط ملا تو یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو جائے گا۔ لڑکپن گزار کر جوانی کی سرحد پر کوکی سے میں ملا ہی کتنی بار تھا۔ میں نے تو اکثر اسے گھنٹوں انتظار کروایا تھا۔ ملنے کا وعدہ کر کے بھول جاتا تھا۔ لیکن یہ سب جیسے پلک جھپکتے میں ہو گیا۔

میں نے وارڈن کے کمرے میں بیٹھ کر چھٹی کی درخواست لکھی اور گاؤں کے لیئے نکل کھڑا ہوا۔ میں ابھی جرنیلی سڑک پر اترا ہی تھا کہ کیما آجڑی مل گیا۔ اس نے چرتے ہوئے ڈھور ڈنگروں کو وہیں چھوڑ کر میرا کتابوں اور کپڑوں سے بھرا ہوا اٹیچی کیس اٹھایا اور خاموشی سے آگے ہو لیا۔ وہ چپ چپ تھا اور میرے ہر سوال کا جواب صرف ہاں یا نہ میں دے رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے روک کر پوچھا تو کہنے لگا :

"نیکا' کیا بتاؤں------ تم پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بنو گے۔ چھوڑو' جو ہوا سو ہوا۔" میں چکرا گیا اور اٹیچی کو ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے سر سے کھینچتے ہوئے وہیں بیٹھ گیا۔ "اب بول بھی۔ بتاتا کیوں نہیں۔ ہوا کیا ہے؟"

"کیا ہونا تھا نیکا۔ تمھاری کھیل تھی اور کسی کی زندگی اجڑ گئی۔ غریب غربا کا کیا ہے۔ بس یوں ہی گزر جاتے ہیں۔"

"اوئے' کون گزر گیا؟ اب بک بھی۔"

"نیکا--- اللہ تمھیں حیاتی دے۔ بس یوں سمجھو کہ فیکے کی بیٹی کوکی گزر گئی--- تم ٹھہرے مغلوں کی اولاد' اور وہ بے چاری کمہارن۔ میل ہو تو کیسے؟"

"گزر گئی۔"

مجھے چکر سا آ گیا اور اس کی بات پوری طرح نہ سن سکا۔

"پتر--- تیرہ برس کی لڑکی کسی بڈھے ٹھڈے سے بیاہ دی جائے تو گزر ہی گئی نا---"

"پر یہ ہوا کیسے؟ کیسے ہوا یہ سب؟؟"

میں گاؤں پہنچنے تک یہی رٹ لگائے رہا' لیکن وہ سر پر اٹیچی تھامے' تیز تیز قدم اٹھاتا' بس چلتا گیا۔

حجرے کے سنگی ساتھیوں نے بتایا کہ جس روز اجی کو پتا چلا ہے' اس کے اگلے روز شام کو فیکے اور کوکی' دونوں باپ بیٹی کو مستان شاہ کے دربار کے پچھواڑے سے برآمد کر لیا گیا۔ پہلے تو دونوں کو کُٹ ماری دی گئی اور پھر عشا کی نماز کے فوراً بعد کوکی کا نکاح' اس کی باپ کی عمر کے ایک کمہار سے پڑھوا دیا گیا۔

میں نے یہ سنا اور چپ چاپ حویلی کی سمت چل دیا۔

لیکن کوکی کو میرے گاؤں پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ اپنے گھر سے نکل کر ہماری اونچی ماڑی کے چھجے پر جا بیٹھی تھی۔ سارا گاؤں نیچے حیران کھڑا تھا اور وہ ہماری ماڑی کے روشن دانوں سے جھانکتے اور سینہ کوبی کرتے ہوئے رو رو کر میری والدہ سے ایک ہی التجا کیئے جاتی تھی :

"او مائے! نی مائے!! تیرے روشن دانوں میں بیٹھی رہوں گی' جاؤں گی نہیں۔ مجھے یہیں بیٹھے رہنے دے۔"

پھر میں اپنے صحن میں نکل آیا اور وہ مجھے بس ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔ روئی نہیں' چیخی نہیں۔ اس نے کچھ بھی تو نہیں کہا۔ میرے دیکھتے دیکھتے' ہمارے ملازموں نے اسے کھینچ کھانچ کر چھجے پر سے اتارا' ہاتھ پاؤں رسی سے باندھے اور اس کے گھر لے جا کر باہر سے کوٹھڑیا کی کنجی چڑھا دی۔ میں گاؤں میں ہوتے ہوئے' کچھ بھی نہ کر پایا۔

میں نے بتایا نا کہ اس وقت میں نے میٹرک کے بعد نیا نیا کالج میں داخلہ لیا

تھا۔

امی نے میرے بازو سے اس کا دیا ہوا کڑا اتار لیا اور خفگی کے ہمراہ مجھے دوبارہ شہر بھیج دیا۔ اب میرے گاؤں آنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ شام کو وارڈن باقاعدگی سے میری کمرے میں موجودگی کا ریکارڈ رکھتا اور امی کو بلا ناغہ خط لکھ کر میری پروگریس سے مطلع کرتا۔

بورڈنگ ہاؤس میں میرے پاس اس کی دو ہی نشانیاں تھیں۔ موتیے کا سوکھا ہوا ہار اور چنبیلی کے عطر کی ایک چھوٹی شیشی۔ ہار کو میں نے کمرے کی کھونٹی پر ٹانگ دیا تھا اور عطر کی شیشی کتابوں والی الماری میں چھپا دی تھی۔ الماری پر تالا لگا تھا اور میرے کمرے میں چنبیلی کی خوشبو بھری تھی۔

شام کو' میں اکثر دوستوں کے ہمراہ گھومتا گھماتا لاری اڈے تک نکل جاتا اور نیاز بس سروس کے لیئے مخصوص کونے میں اس وقت تک ٹھہرا رہتا جب تک بس آخری پھیرا لگا کر واپس نہ آجاتی۔ آخری پھیرے پر بس سے اترتے ہوئے کریم استاد گاؤں کی خیر خبر بتاتا اور میں دوستوں کے ساتھ چپ چاپ بورڈنگ ہاؤس کی سمت چل پڑتا۔

شہر پھر شہر تھا' ایک ہنگامہ تھا۔

دن گزر رہے تھے اور شہر کے ہنگاموں نے کوکی کی یاد کو دھندلانا شروع کر دیا تھا۔ البتہ سرشام دوستوں کے ہمراہ لاری اڈے تک نکل جانا اور آخری بس دیکھ کر پلٹ آنا اب جیسے ایک عادت سی بن گئی تھی۔

ایک دن کریم استاد نے بس سے اترتے ہوئے' مجھے الگ لے جا کر بتایا کہ کوکی نے اپنے خاوند کو چھری مار دی ہے' وہ بچ تو گیا ہے لیکن کوکی کے ہاتھوں اور پیروں میں رسی ڈال کی پابند کر دیا گیا ہے۔ یہ سن کر ایک لحظہ کے لیئے اس کی یاد نے سینے میں کروٹ لی لیکن اگلے روز امتحانات کا شیڈول ملنے پر میں سب کچھ بھول بھال کر اپنی کتابوں میں کھو گیا۔ یہ دھیان ہی نہ رہا کہ ان کتابوں کے پیچھے ایک چھوٹی سی عطر کی شیشی کبھی سنبھال کر رکھی تھی۔

امتحانات کے بعد گرمیوں کی چھٹیاں ملنے والی تھیں اور امی کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ انھی چھٹیوں میں میری بہن کی شادی کی تاریخ طے پائی ہے۔ امی نے مجھے شادی سے پندرہ دن پہلے گاؤں پہنچنے کی تاکید کی تھی۔

امتحانات کے ریلے نے ساحل پر اسارے گئے سارے گھروندے جیسے مسمار کر دیئے تھے اور میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ چھٹیاں ملیں تو کپڑوں اور کتابوں سے بھری اٹیچی کے ساتھ نیاز بس سروس تک چل کر آتے ہوئے گاؤں کے لیئے دل میں کچھ زیادہ امنگ نہیں تھی۔ بس ایک ہلکی سی عجالت کا احساس تھا' کوکی کے لیئے ہمدردی یا رحم کا ایک معمولی سا جذبہ' اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

گاؤں پہنچ کر میرا زیادہ تر وقت شادی سے متعلق انتظامات اور حجرے میں دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں گزر گیا۔ مجھ سے اتنا بھی نہ ہوا کہ ادھر جاتا۔ دوستوں سے جو کچھ سنا' وہ میرے لیئے نیا نہیں تھا۔ پھر شادی کا ہنگام شروع ہو گیا۔ مہمانوں کی ریل پیل میں کسی بات کا ہوش نہ رہا تھا۔

شادی کی رات ڈیوڑھی سے نکل رہا تھا کہ لڑکیوں کا ایک ریلا آیا' جس میں' میں نے اسے آخری بار دیکھا۔ وہ سب سے پیچھے تھی۔ اس نے اپنے سوئے ہوئے بیٹے کو کندھے سے لگا رکھا تھا اور مجھے دیکھ کر ایک لحظہ کے لیئے ڈیوڑھی میں ٹھہر گئی تھی۔ پھر وہ چپ چاپ آگے بڑھ گئی اور میں بھی ڈیوڑھی میں زیادہ دیر نہیں رکا۔

میری بہن نے مجھے بتایا تھا کہ اس روز کوکی اس کے پاس کچھ دیر کے لیئے بیٹھی تھی اور اس نے میرے بارے میں پوچھا بھی تھا۔

اب لڑکیوں سے صرف اتنا سنا ہے کہ اس کے پاس میری پی ہوئی سگرٹوں کے ٹوٹے اب بھی محفوظ ہیں' جو اس نے میرے کمرے سے اٹھائے تھے۔ اسے مجھ سے کوئی گلہ نہیں۔ کہتی ہے' وفا تو بے وفا کے ساتھ ہی کی جاتی ہے۔

جب سب گھر والے سو جاتے ہیں تو وہ سگرٹ کے ٹوٹوں کا ڈبہ نکالتی ہے' ایک ایک ٹوٹے کو ہونٹوں سے لگاتی ہے اور سینت کر رکھ لیتی ہے۔ کسی سے کچھ نہیں کہتی۔

میں بھی کبھی چنبیلی کی خوشبو گھر نہیں لایا۔

لیکن یہ موسم کی پہلی برف باری ہے۔ باہر حد نگاہ تک برف جمی ہوئی ہے۔ بیگم' کچن میں ہے' بچے گہری نیند سو رہے ہیں اور گھر میں چنبیلی کی خوشبو ہر طرف بھری ہوئی ہے۔ ❖ ❖

منیر الدین احمد

فرانکفورٹ کے ہوائی اڈے پر اسرائیل ائرلائنز "ایل آل" کا کاونٹر سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں ہے۔ اس کے گرد ایک حفاظتی جنگلہ بنا ہوا ہے۔ چاق و چوبند پہرے دار اسلحہ سے لیس ہر آنے جانے والے پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ میں اپنا بیگ اٹھائے ہوئے وہاں پر پہنچا' تو دوسرے مسافروں کے ساتھ مجھے بھی ایک ایک چیز کھول کر دکھانی پڑی۔ پوچھا گیا کہ کیا کسی نے کوئی تحفہ' خط یا پیکٹ ساتھ لے جانے کو دیا ہے۔ میرا جواب نفی میں تھا۔ چیک ان کے کاونٹر پر ایک عورت مجھ سے آگے تھی۔ اس کے پاس چالیس کلو زائد سامان تھا' جس کے لیئے وہ سرچارج دینے کو تیار نہ تھی۔ کبھی کہتی تھی کہ اس کے پاس جرمن مارک کافی نہیں ہیں۔ پھر دوسرے ہی سانس میں کہتی تھی کہ سارا جہاز خالی جارہا ہے' اس لیئے اگر چالیس کلو زائد سامان ہوگیا' تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ دوسرے لفظوں میں وہ سرچارج کی چھوٹ چاہتی تھی۔ اس عرصے میں ایل آل کا اسٹیشن کمانڈر بھی کاونٹر پر پہنچ گیا۔ اس نے کہا کہ اگر وہ نصف سامان کا سرچارج دینے کو تیار ہوجائے' تو وہ ایک آنکھ میچتے ہوئے اس کا سامان نکلنے دے گا۔ محترمہ نے یہ دیکھا' تو ادائیگی سے بالکل ہی مکر گئیں۔ یہ ساری گفتگو انگریزی' جرمن اور عبرانی کی ملی جلی کھچڑی میں ہورہی تھی اور میں اپنے آپ کو اسرائیل میں پہنچا ہوا محسوس کررہا تھا۔ جہاں پر مباحثات زندگی کا جزو ہیں۔ میں نے دخل اندازی کرتے ہوئے پیش کش کی کہ محترمہ کے سامان کے دس کلو میرے سامان میں شامل کئے جاسکتے ہیں' کیونکہ میرے سامان کا وزن صرف دس کلو تھا۔ جب کہ بیس کلو سامان ساتھ لے جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس سے محترمہ کو اور بھی شہ مل گئی۔ اب بحث صرف دس کلو کے سرچارج کی ادائیگی پر ہونے لگی۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ اس معاملے کو تل ابیب پہنچ کر طے کرلیا جائے گا۔

لاونج میں راحل' جس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ تھی' میرے پاس آکر بیٹھی۔ وہ شکریہ ادا کرنے کے لیئے آئی تھی کیونکہ میری پیش کش کی وجہ سے سارا جھگڑا طے ہوگیا تھا۔ اس نے کہا کہ یہاں سے ایک دفعہ سامان سرچارج کے بغیر نکل جائے' تو تل ابیب میں کوئی نہیں پوچھے گا۔ یوں بھی وہاں پر اس کا خاوند اس کو لینے کے لیئے ہوائی اڈے پر آئے گا۔ وہ ایل آل کے سارے کارندوں کو جانتا ہے۔ راحل بڑی صحت مند اور پھرتیلی عورت تھی۔ باتیں آنکھیں گھما گھما کر کرتی تھی اور موضوع کو اتنی تیزی سے بدلتی تھی' جیسے چڑیاں ایک ٹہنی سے پھدک کر دوسری پر جا بیٹھتی ہیں۔ اس نے خاصا شوخ میک اپ کر رکھا تھا۔ ایک کلائی پر سونے کی گھڑی' دوسری پر روپہلے بازو بند۔ گلے میں سچے موتیوں کا ہار۔ اور قریب قریب ساری انگلیوں میں انگوٹھیاں' جن میں ہیرے یا دوسرے قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے۔

مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ ہم دونوں سمیت صرف آٹھ مسافر لاونج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کیا جہاز خالی جارہا تھا؟

"نہیں یہ بات نہیں ہے" راحل نے رازداری سے کہا "ایل آل کی ہر فلائیٹ اوپر سے نیچے تک سامان سے لاد دی جاتی ہے۔ تم کیا جانو کہ یہ لوگ کون کون سی چیزیں ٹرانسپورٹ کرتے ہیں۔ مسافروں کی کمی کی کسر اس طرح نکال دی جاتی ہے کہ بڑی بڑی بھاری مشینوں اور جنگی سامان کو فریٹ میں لاد دیا جاتا ہے۔"

"تو کیا تم بھی اسی حساب سے اتنی بے شمار چیزیں لے جارہی ہو۔"

"سامان میں میری چیزیں تو تھوڑی سی ہیں۔ باقی سب میری بیٹی کے کھلونے اور دوسرے تحفے ہیں۔"

"کیا تم بھی کرسمس مناتی ہو' جو اتنے کھلونے اور تحفے بیٹی کے لیئے لے جارہی ہو۔"

راحل کھلکھلا کر ہنسی۔ ہم دسمبر کے مہینے میں کرسمس سے ایک ہفتہ قبل سفر کررہے تھے' جو عیسائیوں کا تہوار ہے۔ یہودی اسے نہیں مناتے۔ راحل کے سامان کی مقدار کو دیکھ کر میں نے قیاس کیا تھا کہ شاید اس کے خاندان میں کرسمس منایا جاتا ہوگا۔

"نہیں یہودی کیوں کرسمس منانے لگے؟ دراصل یہاں پر جرمنی میں میری بیٹی عارضی طور پر مقیم ہے۔ میں اسے ملنے کے بعد واپس جارہی ہوں۔ یہ تحفے تحائف اسے ان جرمن میزبان فیملیوں نے دیئے ہیں' جن کے ہاں وہ یہاں پر رہتی ہے۔"

پتہ چلا کہ راحل کی نو سالہ بیٹی چھ مہینے سے جرمنی میں مقیم تھی۔ ہر دو

تین ماہ کے بعد وہ کسی دوسری فیملی کے ہاں منتقل ہو جاتی تھی۔ جس کا انتظام راحل نے کر رکھا تھا۔ ہر فیملی کی طرف سے اسے تحفے تحائف دیئے گئے تھے' جن کو اب اسرائیل لے جانا تھا۔ مگر پیشتر اس کے کہ میں یہ پوچھ سکتا کہ بچی کی پڑھائی کا کیا انتظام تھا' ہمارے جہاز کی بورڈنگ کا اعلان ہو گیا۔

جمبو جیٹ کے غار نما پیٹ میں آٹھ مسافر دکھائی ہی نہ دیتے تھے۔ دوسروں کی طرح میں نے بھی کھڑکی والی سیٹ کو چنا۔ ابھی ہمیں پرواز کئے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ راحل اپنی سیٹ سے اٹھ کر میرے ساتھ والی سیٹ پر آگئی۔ آخر اس کو ایک سامع کی ضرورت تھی۔ اور پھر اسے یہ بھی تو معلوم کرنا تھا کہ میرے اس جہاز میں ہونے کا راز کیا تھا۔ میں ایک کانفرنس کے سلسلے میں تل ابیب جا رہا تھا۔ اتفاق سے راحل اسی شہر میں رہتی تھی۔

"کیا تم وہاں پر کسی کو جانتے ہو" راحل نے پوچھا۔

میرا جواب نفی میں تھا۔ مگر پھر مجھے یاد آیا کہ وہاں پر میریم بھی تو رہتی ہے' جس کے ساتھ میرا طالب علمی کے دنوں میں ملنا جلنا تھا۔ میں نے دوستوں سے سنا تھا کہ اس کے خاندان کا موٹروں کا کاروبار تھا۔ اور یہ کہ ان کے پاس مرسیڈیز کاروں کی ایجنسی تھی۔

"میریم کو تل ابیب میں کون نہیں جانتا۔" راحل نے جواب دیا۔ "مگر مجھے یقین نہیں ہے کہ میریم ان دنوں میں تل ابیب میں ہوگی۔ وہ سال کا اکثر وقت نیو یارک میں گزارتی ہے' جہاں پر اس کے بچے پڑھ رہے ہیں۔"

میریم مجھ سے جونیر تھی اور ہمارے مضامین بھی الگ الگ تھے۔ وہ سوشیالوجی پڑھتی تھی' جب کہ میرے مضامین سیاسیات اور تاریخ تھے۔ وہ اچانک میرے دوستوں کے حلقہ میں شامل ہو گئی تھی۔ ہماری ملاقات ایک پارٹی میں ہوئی تھی' جب ہمارا گروپ پچھلے پہر کیفے ٹیریا میں جا کر بیٹھتا تھا' تو وہ ہر روز موجود ہوتی تھی۔ مجھے اپنے مقالہ کے لیئے ایک تھیسس یروشلم سے منگوانا پڑا تھا' جس کے ایک باب کا میں حوالہ دینا چاہتا تھا۔ مقالہ چونکہ عبرانی میں تھا' اس لیئے مجھے ترجمہ کروانے کے لیئے میریم کی طرف رجوع کرنا پڑا تھا۔ اس نے ایک دو ہفتوں کے اندر ترجمہ کر دیا تھا اور مجھ سے اس کا معاوضہ لینے کے لیئے تیار نہ ہوئی تھی۔

میرے واقف کاروں میں ایک عراقی یہودی بھی شامل تھا' جس کے ساتھ میرا تعارف ہمبرگ میں قیام کے ابتدائی دنوں میں ہوا تھا۔ اس کا نام طارق تھا۔ جب میں نے اسے کہا کہ یہ نام تو بالکل مسلمانوں والا ہے' تو اس نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ عراقی یہودیوں میں یہ نام بہت مقبول ہے۔ وہ میرے دوسرے دوستوں سے ملنے سے کتراتا تھا۔ جس کی وجہ میں کبھی نہ سمجھ سکا۔ اس نے ایک روز مجھے کہا کہ ایک عرب لڑکا حمزہ' جو بحرین کا رہنے والا ہے' میریم کو دھوکا دینے کے لیئے اس کا نام استعمال کر رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو عراقی یہودی بتاتا ہے اور چونکہ ہمبرگ کے یہودی حلقوں میں سب لوگ جانتے ہیں کہ وہاں پر طارق نام کا ایک یہودی لڑکا رہتا ہے' جو عراق کا رہنے والا

ہے' اس لیئے کسی کو شک نہ ہوا۔ طارق خود سیناگوگ میں نہیں جاتا تھا۔ اس وجہ سے اسے شاید کسی نے نہیں دیکھا ہوا تھا۔ البتہ اس کے باپ نے ہمبرگ کے ربائی کو اپنے بیٹے کے بارہ میں لکھا تھا۔

انہی دنوں میں ہماری شادی ہوئی تھی اور ہم ہوسٹل سے ایک فلیٹ میں منتقل ہو گئے تھے۔ اوتا نے مجھے کہا کہ تم میریم کو کسی روز کھانے پہ بلاؤ۔ میں نے میریم سے اوتا کی اس خواہش کا ذکر کیا' تو وہ فوراً آنے کو تیار ہو گئی۔ میں نے کہا کہ اگر اسے پسند ہو' تو بیشک اپنے ساتھ کسی دوست یا سہیلی کو لیتی آئے۔ اس نے کہا کہ وہ طارق کو ساتھ لائے گی' جو عراق کا رہنے والا ہے۔ میں نے کہا کہ میں طارق کو خوب جانتا ہوں۔ اس لیئے وہ اسے ضرور ساتھ لائے۔

اتوار کے روز میریم بناوٹی طارق کے ساتھ ہمارے گھر پر پہنچی' جو مجھ سے کسی قدیمی دوست کی طرح بغل گیر ہو کر ملا۔ میں نے میریم کے سامنے اس کا بھانڈا پھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ کھانے کی میز پر اس نے سب سے پہلے اپنی پلیٹ کو چاولوں سے لادا اور مرغی کے گوشت پر دھاوا بول دیا۔ میں نے نوٹ کیا کہ میریم نے گوشت کے ڈونگے کو ہاتھ تک نہ لگایا' طارق اس عرصے میں ڈٹ کر کھا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میریم کو گوشت کے کوشر ہونے کے بارہ میں شبہ تھا' اس لیئے اس نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ طارق اس بات کو بھانپ گیا اور اس نے بھی گوشت والی پلیٹ کو ایک طرف رکھ دیا۔ اس نے پوچھا کہ یہ کوشر گوشت کا قصہ کیا ہے۔

اصلی طارق سے ملاقات ہونے پر میں نے اسے میریم اور نقلی طارق کے ہمارے گھر پر آنے کا حال سنایا اور کہا کہ میریم کو سمجھ آگئی ہوگی کہ اس کا دوست' جسے کوشر اور غیر کوشر گوشت کے فرق کا علم نہیں ہے' یہودی نہیں ہو سکتا۔ مگر طارق کا کہنا تھا کہ عشق محبت کرنے والوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے۔ اس لیئے اسے امید نہیں تھی کہ میریم نے اس چیز کو نوٹ کیا ہوگا۔ اس واقعہ کے تھوڑے عرصے کے بعد میریم کو ملٹری سروس کے لیئے اسرائیل جانا پڑا۔ اس نے سب دوستوں کو تل ابیب آنے کی دعوت دی۔ اس کے بعد میریم کے بارہ میں کبھی کچھ سننے میں نہ آیا۔

راحل نے کہا کہ اگر میریم تل ابیب میں نہ بھی ہوئی' تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ وہ خود میرا خیال رکھے گی۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے کسی دوسرے گائیڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ یوں بھی بچی کے وہاں پر نہ ہونے کے وجہ سے اس کے پاس وقت ہوگا۔

راحل کی پیدائش تل ابیب کی تھی' مگر اس کے ماں باپ رومانیا سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ اس کے خاوند کا خاندان پولینڈ کا تھا' جہاں پر اس کے بہت سے رشتہ دار نازیوں کے کنسنٹریشن کیمپوں میں مارے گئے تھے۔ میں نے کہا کہ پھر تو اسے اپنی بچی کو جرمنی نہیں بھیجنا چاہیئے تھا۔ راحل نے کہا کہ جرمنوں کی موجودہ نسل کا اس میں بھلا کیا قصور ہے' وہ تو ہٹلر کے وقت میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ رہا سیاسی یا مذہبی جنون' تو اس سے کوئی قوم بچی ہوئی نہیں

ہے۔

ہماری فلائیٹ لیٹ تھی اور وہ جمعہ کا روز تھا۔ پروگرام کے مطابق ہمیں دوپہر سے تھوڑا بعد تل ابیب پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مگر فرانکفورٹ سے ہم وقت پر پرواز نہ کرپائے تھے۔ راحل کو خطرہ تھا کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے کہیں سبت شروع نہ ہو جائے' جس کا آغاز غروب آفتاب سے گنا جاتا ہے۔ سبت کے روز یہودیوں کو سفر کرنے' آگ جلانے اور دوسرے کئی ایک کاموں کی ممانعت ہے۔ ایل آل کے طیارے بھی سبت کے روز پرواز نہیں کرتے۔ اور اسرائیل کے شہروں میں مذہبی جنونی سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کردیتے ہیں۔ اگر کوئی کار یا بس ان کی آبادی میں بھول کر آنکلے' تو اس پر پتھراؤ کرتے ہیں۔ راحل نے کہا کہ اس کا فلیٹ شہر سے باہر ایک ایسے علاقے میں ہے' جہاں پر پہنچنے کا راستہ بنیاد پرستوں کی آبادی میں سے گزر کر جاتا ہے۔ اگر ہمارے پہنچتے پہنچتے شام پڑ گئی' تو انھیں شہر میں اپنے کسی واقف کار کے گھر پر رہنا پڑے گا۔

تل ابیب کے ہوائی اڈے پر راحل کا خاوند اسے لینے کے لیئے آیا ہوا تھا۔ اس نے مجھے ہوٹل میں پہنچانے کی پیش کش کی' مگر وقت کی تنگی کے پیش نظر میں نے ٹیکسی لینے کو ترجیح دی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے عرب سمجھتے ہوئے عربی میں بات شروع کی۔ میں اس کے لہجے سے جان گیا کہ وہ مراکش کا رہنے والا تھا۔ جب اس کو پتہ چلا کہ میں عرب نہیں ہوں' تو اس نے عربوں کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالنی شروع کردی۔ اس کے باپ کو اپنا کاروبار اور گھربار چھوڑ کر اسرائیل ہجرت کرنی پڑی تھی۔ میں نے کہا کہ یہ تو تمہارے ہوش یا شاید تمھاری پیدائش سے بھی پہلے کی بات ہوگی۔ اس نے بتایا کہ اس وقت اس کی عمر سات برس تھی اور اسے اپنا گھر' گلی' محلہ' باپ کی دوکان سب کچھ یاد تھا۔ اس کے ماں باپ اپنے آپ کو اسرائیل میں اجنبی سمجھتے تھے۔ اگر اس کے باپ کا بس چلے' تو وہ فوراً مراکش واپس چلا جائے۔

"کیا تم بھی واپس جانا چاہتے ہو" میں نے پوچھا۔

"ہاں' مگر صرف بم گرانے کے لیئے۔" اس نے جواب دیا اور میری طرف داد خواہ نظروں سے دیکھا۔

ہوٹل میں پہنچتے پہنچتے سبت کا وقت شروع ہوچکا تھا۔ لفٹ کے دروازے پر بورڈ لگا ہوا تھا کہ سبت کے روز بٹن دبانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لفٹ خودکار تھی اور مسلسل نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے چلتی رہتی تھی اور ہر منزل پر رکتی تھی اور دروازہ خود بخود کھلتا اور بند ہوتا تھا۔ میں نے سوچا کہ رات کو بجلی کون جلاتا اور گل کرتا ہوگا۔ مگر کمرے کے دروازے پر ایک نوٹس لگا ہوا تھا کہ بجلی شام پڑنے پر خود بخود جل اٹھتی ہے اور نصف شب کو گل ہوجاتی ہے۔ مگر میرے اس سوال کا کوئی جواب موجود نہ تھا کہ اگر کسی کو سبت کے روز ٹیلی فون کرنا ہو' تو اس کا کیا انتظام ہے۔ لوگ ٹیلی ویژن یا ریڈیو کیسے لگاتے اور بند کرتے ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار ایک بین الاقوامی سمینار میں جب ایک یہودی اسکالر کے بولنے کی باری آئی اور اس کا نام پکارا گیا' تو وہ دائیں بائیں جھانکنے لگا۔ صدر مجلس نے تھوڑے وقفہ کے بعد دوسری بار اس کا نام پکارا تب مجھے خیال آیا کہ آج جمعہ ہے اور شام پڑ چکی ہے۔ اس لیئے ممکن ہے کہ یہودی اسکالر سبت کی وجہ سے مائیکروفون کا بٹن نہ دبانا چاہتا ہو۔ میں اس سے کافی دور بیٹھا ہوا تھا۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر گیا اور میں نے جاکر اس کے سامنے رکھے ہوئے مائیکروفون کا بٹن دبایا۔ یہودی اسکالر نے گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا اور اپنا مقالہ پیش کرنے لگا۔ میں نے بعد میں اس سے پوچھا کہ تم سبت کے روز سگریٹ کیسے سلگاتے ہو۔ اس نے کہا کہ اس کام کے لیئے ہمارے گھروں میں ایک دیا جلتا رہتا ہے۔ کھانا گرم کرنے کے لیئے ٹائمر اوون کو مقررہ وقت پر خود بخود آن اور آف کرتا ہے۔

سمینار اتوار کو شروع ہونا تھا۔ میں نے ہفتے کے روز یروشلم جانے کا پروگرام بنالیا۔ ہوٹل نے میری فرمائش پر مجھے ایک ٹیکسی منگوادی' جس کا ڈرائیور عرب تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا خاندان دنیا بھر میں بکھر چکا تھا۔ سات بھائیوں میں سے ایک امریکہ میں تھا' دوسرا فرانس میں اور تیسرا جرمنی میں۔ دو بھائی اور ایک بہن بیروت کے فلسطینی مہاجروں کے کیمپ میں مقیم تھے۔ ایک بہن مرچکی تھی۔ اور چونکہ بڑے بھائی کو عمر قید کی سزا ہوئی تھی' اس لیئے وہ اپنے ماں باپ کا واحد سہارا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا اس کے بھائی کو سیاسی وجوہات کی بنا پر قید و بند کی سزا دی گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اس سوال کا جواب دینے سے ہچکچا رہا تھا۔ پھر اس نے کہا اس کا خاندان سیاسی معاملات میں بالکل حصہ نہیں لیتا' اس کے بھائی کی عمر قید کا تعلق خاندان کے ناموس کے تحفظ سے تھا۔ یہ سن کر میرے کان کھڑے ہوگئے۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ فلسطینی عربوں کے ہاں خاندانی ناموس کی حفاظت کی خاطر اپنے خاندان کی عورتوں کو قتل کردینے کا رواج ہے۔ چنانچہ وہی بات نکلی۔ اس کی بہن نے ایک شام گھر سے باہر ایک نوجوان کے ساتھ چند گھنٹے گزارے تھے' جس کے ساتھ وہ شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس سے اگلے روز بڑے بھائی نے بہن کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔ یہ واقعہ بارہ برس قبل پیش آیا تھا۔ اس کا بھائی نصف قید بھگت چکا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا اسے اپنے بھائی کے اس عمل سے اتفاق تھا۔ اس نے جواب دیا کہ اگر بھائی نے خاندان کے ناموس کو نہ بچایا ہوتا' تو وہ یہ فریضہ ادا کرتا۔ پھر اس نے اضافہ کیا کہ اگر وہ کسی عرب ملک میں مقیم ہوتے' تو اس کے بھائی کو ایک دن کے لیئے بھی قید خانے میں نہ جانا پڑتا۔ میں جان گیا کہ اس کے ساتھ اس بارے میں بحث کرنا فضول تھا۔

میں واپس لوٹا۔ تو راحل کا پیغام ملا کہ وہ اور یوی' مجھے شام کو لینے کے لیئے آرہے ہیں۔ راحل پہلے روز سے زیادہ شوخ و شنگ لگ رہی تھی۔ یوی نے کہا کہ وہ مجھے کھانا کھلانے ایک ریستوران میں لے جارہے ہیں۔ اس کے بعد ہم کافی ان کے گھر پر جاکر پیئیں گے۔ ان کا فلیٹ ایک بلند و بالا بلڈنگ میں چودھویں منزل پر تھا' جو سمندر کے کنارے پر واقع تھی اور جہاں سے میلوں تک نظر جاتی تھی۔ جب ہم آدھی رات کے لگ بھگ وہاں پر پہنچے' تو سمندر پر اندھیرا کا

مچھیروں کی کشتیاں اور بحیرہ کے جہازوں کی بتیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ان کے دوستوں میں کوئی عرب شامل نہ تھا' اگرچہ ان کے اپنے محکمہ میں عرب کام کرتے تھے۔ دونوں کو عربی کا ایک لفظ بھی نہ آتا تھا۔ جب کہ ان کے عرب ساتھی فرفر عبرانی بولتے تھے۔ انہیں دو ایک بار عربوں نے اپنے تہواروں میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی' مگر وہ نہیں گئے تھے۔ خود ان کے گھر پر کبھی کوئی عرب نہیں آیا تھا۔ یوسی نے کہا کہ عربوں کو ہجرت کر جانی چاہیے' جیسے یہودی دوسرے ملکوں سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ عرب ملکوں میں ان کو آباد کرنے کے لیئے کافی زمین موجود ہے۔ پھر میریم ہماری گفتگو کا مرکز بن گئی۔ راحل نے بتایا کہ اس نے میریم کو نیویارک فون کیا تھا اور اسے میری آمد کی اطلاع دی تھی۔ میریم یوں بھی تل ابیب آنے والی تھی۔ اس نے پیغام بھیجا تھا کہ وہ بدھ کے روز پہنچ جائے گی اور مجھے اس کی آمد سے پہلے واپس نہ جانا چاہیے۔

اگلے تین روز سیمینار کے سبب میرے لیئے بہت مصروفیت کے تھے۔ دن میں دو اجلاس ہوتے تھے اور شام کو ڈنر پر جانا ہوتا تھا۔ میں راحل اور یوسی سے بھی ان دنوں میں رابطہ نہ رکھ سکا۔ چوتھے روز سویرے سویرے راحل کا فون آگیا کہ میریم دوپہر کو تل ابیب پہنچ رہی ہے۔ اس نے مجھے شام کو اپنے گھر پر آنے کی دعوت دی ہے۔ راحل اور یوسی اس شام ایک دوست کی بیٹی کی شادی پر مدعو تھے۔ اس لیئے راحل نے کہا کہ وہ جاتے ہوئے مجھے میریم کے ہاں چھوڑتے جائیں گے۔

میریم کا فلیٹ شہر کے سب سے مہنگے علاقے میں تھا۔ عمارت کے دروازے پر دو مسلح پہرے دار بیٹھے ہوئے تھے۔ یوسی نے بتایا کہ اس عمارت میں ایک وزیر رہتا ہے' جس کی وجہ سے حفاظت کا خاص انتظام ہے۔ میریم نے گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ ہم اسے طالب علمی کے دنوں میں اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کی وجہ سے ہرنی کہہ کر پکارتے تھے۔

"ہرنی تمہارا حسن اور زیادہ نکھر گیا ہے۔" میں نے میریم سے کہا اور اسے چوم لیا۔

"اور تمہارا قد بالکل نہیں بڑھا۔ بلکہ لگتا ہے کہ تم کچھ گھس گئے ہو۔" میریم فقرے کسنے میں کسی سے پیچھے نہ رہتی تھی۔

میریم کا فلیٹ اچھا بھلا میوزیم لگ رہا تھا۔ ڈیکوریشن کا جواب نہ تھا۔ فرنیچر بے حد نفیس تھا اور دیواروں پر اوریجنل تصویریں تھیں۔ فرش پر ایک سے ایک عمدہ قالین بچھے ہوئے تھے۔ میں نے اسی روز اپنے ہوٹل کے پہلو میں واقع ایک دوکان میں ایرانی قالین دیکھے تھے' جن میں سے ہر ایک کی مالیت بیس ہزار ڈالر سے اوپر تھی۔ اور میریم کے قالین ان سے کسی طرح گھٹیا نہ تھے۔ راحل مجھے بتا چکی تھی کہ میریم کا شمار ملک کے کروڑ پتیوں میں ہوتا تھا۔ میریم نے بتایا کہ اس کا کاروبار بہت پھیلا ہوا تھا۔ اس کی فرم کا ہیڈ کوارٹر نیویارک میں تھا' جس کے سبب اس کا بہت سا وقت وہاں پر گزرتا تھا۔ وہیں پر اس کے اکثر رشتہ دار اور دوست یار رہتے تھے۔

میں اس کے خاوند کے بارے میں پوچھنے ہی والا تھا کہ میری نظر اس کے ہاتھ کی اس انگلی پر پڑی' جس پر لوگ شادی کی انگوٹھی پہنتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اس نے اس انگلی پر دو انگوٹھیاں چڑھا رکھی ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بیوہ تھی۔ میں نے گلہ کیا کہ اس نے کبھی بھول کر بھی ہمبرگ کا رخ نہ کیا۔ اس نے کہا کہ وہ تو سمجھتی تھی کہ ہمارے دوستوں میں سے وہاں پر اب کوئی مقیم نہ ہوگا۔ اس کی بات درست تھی۔ میں اس شہر میں طالب علمی کے زمانے کی آخری یادگار تھا۔ میں نے کہا کہ شاید طارق بھی وہیں پر ہو' مگر ایک عرصہ سے میں نے اسے نہیں دیکھا۔ اس نے پڑھائی کو خیرباد کہہ کر قالین کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔

میریم نے کہا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ قالین کا کاروبار طارق نے نہیں شروع کیا تھا۔ بلکہ حمزہ نے' جو بحرین کا رہنے والا تھا۔ چنانچہ جب میریم نے ہمبرگ کو چھوڑنے سے پہلے خفیہ طور پر طارق سے شادی کی' تو حمزہ اور اس کی ایک سہیلی ان کے نکاح کے گواہ بنے تھے۔ میریم کو یہ خطرہ تھا کہ اس کے ماں باپ اس شادی کی مخالفت کریں گے۔ جب کہ طارق کے ماں باپ عراق میں فوت ہو چکے تھے۔ ان کے علاوہ اس کا دنیا میں اور کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔

اتنے میں میریم فوٹو البم مجھے دکھانے کے لیئے اٹھا لائی۔ ان میں اس کی شادی کی تصویر بھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے پہلو میں فعلی طارق کھڑا تھا۔ میں سخت مخمصے میں تھا کہ میریم کو کیسے کہوں کہ اس کا خاوند یہودی نہیں عرب تھا۔ میں نے کہا کہ اسے یاد ہو گا کہ جب وہ طارق کے ساتھ ہمارے ہاں آئی تھی' تو اسے کوشر اور غیر کوشر گوشت میں فرق کا علم نہیں تھا۔ میریم نے کہا کہ دراصل طارق کا بچپن مسلمانوں کے ماحول میں گزرا تھا' جس کے سبب اسے یہودی رسوم و رواج اور مذہبی باتوں کا پتہ نہیں تھا۔ اسے بھی اس بات پر حیرت ہوئی تھی' مگر طارق نے اس کو بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ نے اپنے گرد و پیش کے تشدد سے بچنے کے لیئے اسے یہودیت کی تعلیم نہ دی تھی۔ اسکول میں وہ اپنی کلاس میں واحد یہودی تھا۔ اس لیئے اس نے کبھی کسی کو اپنے مذہب کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اسکول میں طالب علموں کو اسلامی دینیات پڑھائی جاتی تھی۔ جس کے سبب طارق کو اسلام کے متعلق بہت کچھ معلوم تھا۔ اس کو قرآن کی کئی سورتیں زبانی یاد تھیں۔ اسے نماز پڑھنی بھی آتی تھی۔ میریم نے کہا کہ وہ خود بھی بہت زیادہ مذہبی نہیں ہے۔ بس دو چار باتیں ایسی ہیں' جو اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں۔ اور جن کا وہ خیال رکھتی ہے۔ جیسے کوشر گوشت اور سبت کا احترام۔ وہ سال میں دونوں مذہبی تہواروں پر سیناگوگ بھی چلی جاتی ہے۔ یہ باتیں طارق نے بھی اختیار کر لی تھیں۔ اسرائیل آجانے کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی مذہبی ہو گیا تھا' بلکہ ایک مذہبی سیاسی پارٹی کا ممبر بن گیا تھا' جو اسرائیل کو عربوں سے پاک کرنے کا پرچار کرتی ہے۔ طارق نے اسرائیل میں لازمی ملٹری سروس بھی کی تھی اور بمبار طیارے کا پائلٹ بن گیا تھا۔ جب اسرائیل نے لبنان پر

حملہ کیا، تو اس نے ایک رات میں اپنے اسکواڈرن کے ساتھ بارہ حملوں میں حصہ لیا تھا اور سارے ٹارگٹ کامیابی کے ساتھ تباہ کردیئے تھے۔ اس پر اس کو بہادری کا تمغہ دیا گیا تھا۔ مگر اس جنگ سے وہ زندہ واپس نہیں لوٹا تھا۔ اس نے اپنی جان اسرائیل کے لیئے قربان کردی تھی۔ جنگ بندی کے بعد لبنان کی حکومت نے جب اسرائیلی فوجیوں کی لاشیں واپس کیں، تو ان میں طارق کی لاش بھی شامل تھی۔ پھر میریم اس کے کاغذات اٹھالائی، جن میں اسکول کی سندات، بغداد کے ربائی کا تصدیقی خط اور اس کا عراقی پاسپورٹ شامل تھے۔ ہم دیر تک پرانے وقتوں کی باتیں کرتے رہے اور اس زمانے کے سارے لطیفے ہم نے ایک دوسرے کو سنائے، جو ہمیں یاد تھے۔ آدھی رات کو میریم مجھے ہوٹل میں چھوڑ گئی۔

دوسرے روز ہمبرگ واپس پہنچ کر میں نے طارق کا نمبر ٹیلی فون ڈائرکٹری میں سے تلاش کرکے اسے فون کیا۔ وہ میری آواز سنتے ہی مجھے پہچان گیا۔ کہنے لگا کہ تم اب تک کہاں چھپے ہوئے تھے۔ میں نے کہا کہ میں تل ابیب میں اس کی بیوہ میریم سے مل کر آرہا ہوں۔ طارق نے حسب عادت قہقہہ لگایا اور بتایا کہ حمزہ نے اس کو دس ہزار مارک ادا کرکے اس کے سارے کاغذات خرید لیئے تھے، جن کی اسے یوں بھی ضرورت نہ تھی، کیونکہ اس نے جرمن شہریت حاصل کرلی تھی۔ ایک پروفیشنل جعل ساز نے اس کی تصویر ہٹاکر حمزہ کی تصویر کو پاسپورٹ میں ایسی صفائی سے لگادیا تھا کہ ذرا بھی شبہ نہ ہوسکتا تھا۔

اس نے کہا "تم جانتے ہو کہ اس زمانے میں دس ہزار مارک کتنی بڑی رقم تھی۔ اس لیئے میں نے سوچا کہ چند بے قیمت کاغذات کے عوض اگر مجھے اتنے پیسے نقد مل جائیں، تو سودا برا نہیں ہے۔ حمزہ کو اس کی میریم مل گئی اور مجھے اپنی تجارت کے لیئے سرمایہ میسر آگیا۔"

❖ ❖

سرد رات کی کہانی

مظہرالزماں خاں

آج خلاف معمول اس نے رات گیارہ بجے ہی سے رونا شروع کردیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے وہ رات کو کبھی روتا ہی نہ تھا۔ البتہ صبح ہونے سے کچھ دیر پہلے وہ بلاناغہ رونے کا عادی تھا۔ لیکن چند لمحوں کے بعد وہ آپ ہی آپ چپ ہوجایا کرتا تھا کہ یہ اس کے روز کا معمول تھا۔ مگر آج خلاف توقع بس وہ روئے چلا جارہا تھا۔ اور جسموں کو برف بنا دینے والی سرد رات چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اور پورے محلے کے گھروں کے تمام دروازے، کھڑکیاں اور لائٹیں خاموش ہوچکے تھے کہ تمام گھروں کے مکین اپنے اپنے کچل دینے والے مسائل کے ساتھ اپنی اپنی ضروری اور غیر ضروری مصروفیات لیئے اپنے اپنے میلے کچیلے۔ شکن در شکن لیکن بظاہر دھلے دھلائے بچھونوں میں گپ چپ چھپے ہوئے تھے۔ البتہ گلی کی فساد زدہ نکڑ پر لگی لائٹ کے نیچے کوڑا کرکٹ کے کچ ج ڈھیر کے قریب ایک زخمی بکری بیٹھی ہوئی اپنے تھن زبان سے چاٹ رہی تھی کہ صبح کسی دوسرے محلے کے ایک آوارہ کتے نے اس کے بھرے بھرے تھن کو کاٹ لیا تھا۔ اور وہ سارے دن رہ رہ کر ممیاتی ہوئی ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر دوڑتی رہی تھی۔ اور مصروف و مہذب محلے کے نالائق بچے کھڑے تماشہ دیکھتے رہے تھے کہ تماشہ دیکھنا محلے کے شریف زادوں کی پرانی عادت تھی۔ البتہ مہذب ولا کی بالکونی میں کھڑی۔ روز اپنا سینہ سورج کے سامنے پیش کرنے والی کچی کنواری لڑکی نے اس کے تھن پر اپنی بدقماش ملازمہ سے صبح ہلدی کی لیپ لگوائی تھی کہ وہ کسی کے زخم دیکھ نہیں سکتی تھی کہ زخم کو دیکھ کر اسے اپنا پہلا باپ یاد آجاتا تھا۔ پتہ نہیں وہ بکری کس گھر کی تھی اور کہاں سے بھٹک کر شریف زادوں کے اس محلے میں آگئی تھی۔ اور اس سرد ترین اور زخم میں جلن پیدا کرنے والی رات میں کوڑا کرکٹ کے قریب بیٹھی۔ اپنے زخمی تھن کو دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر رو رہی تھی۔ اور چاروں طرف جسموں میں دھنس جانے والی مہیب لمبی سرد رات پھیلی ہوئی تھی اور وہ اس یخ رات میں مسلسل روئے چلا جا رہا تھا اور اس کے پھوٹ کر رونے کی بے ملاوٹ آواز نہ صرف ٹھنڈی رات کی کوکھ میں زہر آلود تلوار کی طرح اتر رہی تھی بلکہ اندھیرے کے جسم کو چیرتی ہوئی بوسینا کی مظلوم عورتوں کی خالی چھاتیوں سے لپٹ لپٹ کر بین کرتی ہوئی مختلف زمینوں کے خود ساختہ مہذبین کے زندہ جسموں میں بھی ٹکڑے ٹکڑے اتر رہی تھی اور پورے علاقے کو برف میں تبدیل کردینے والی سردی ہر طرف حکومت کر رہی تھی کہ ان دنوں تیز دھوپ اور جسموں کو منجمد کردینے والی حکومتوں ہی کا نہ ختم ہونے والا راج تھا، چنانچہ اس وقت بھی پورے علاقے میں کڑاکے کی سردی پھیلی ہوئی تھی اور اس کڑاکے کی سردی میں وہ متواتر روتے چلا جارہا تھا۔ بس روئے چلا جارہا تھا کہ لاکھ کوشش کے باوجود وہ چپ ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ لیکن وہ خاموش اور گم صم۔ اپنے بیڈ روم میں اپنے دونوں پاؤں صوفے پر پھیلائے بے نیاز بیٹھا ہوا خاموشی پر کتاب پڑھ رہا تھا کہ خاموشی اور موڈرن آرٹ سے اسے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی وہ رونے کی آواز سے بے تعلق چپ چاپ بیٹھا خاموشی پر ایک مضمون پڑھ رہا تھا۔ جس میں لکھا ہوا تھا کہ خاموشی ازل کا پہلا منظر ہے کہ خاموشی ابد کا آخری منظر ہے کہ خاموشی رستے ہوئے کچ کچ زخم کے اندر کی سنائی نہ دینے والی آواز ہے کہ خاموشی شہروں، بازاروں اور پر ہجوم چوراہوں پر پھیلی ہوئی مسلسل ٹیس ہے کہ خاموشی بھری محفلوں، کلبوں میں شراب کے لبریز گلاسوں میں برف کی پگھلتی ہوئی قاشوں کی طرح ہے کہ خاموشی سمندر کی سطح پر چلتی ہوئی ہواؤں کی سائیں سائیں آواز ہے کہ خاموشی زمین پر لڑی جانے والی جنگوں میں بکھری ہوئی لاشوں کے جسموں پر پھیلی ہوئی چادر ہے کہ خاموشی زمین پر انسان کی پیدائش سے پہلے بھی موجود تھی اور انسان کی پیدائش کے بعد بھی موجود ہے کہ خاموشی دراصل چیخ کی ایک پوشیدہ علامت ہے--- چنانچہ وہ صمٌ بکمٌ بیٹھا خاموشی پر مضمون پڑھ رہا تھا اور حسب حال سرد ترین رات چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور وہ مسلسل بلک بلک کر روئے چلا جارہا تھا۔ اور ایک خوبصورت جوان عورت اپنے بے ترتیب بستر پر بیٹھی اس رونے والے اکیلے دودھ کے بچے کو ہر طرح سے سمجھانے منانے اور بہلانے کی مسلسل کوشش کر رہی تھی لیکن بچہ بہلنے اور چپ ہونے کی بجائے مچل مچل کر لگاتار روئے چلا جارہا تھا چنانچہ روتے روتے جب اسے ہچکیاں شروع ہوگئیں تو عورت جھلا کر اپنے بستر سے اٹھی اور پھر صوفے پر پاؤں پھیلا کر بے نیاز بیٹھے ہوئے مرد کے قریب جاکر بلند آواز میں اس نے مرد سے کہا۔ شرم نہیں آتی کہ بچہ بھوک سے بلک بلک کر رو رہا ہے اور تم بے فکر بیٹھے خاموشی پر کتاب پڑھ رہے ہو۔۔ یہ کہہ کر عورت نے

کتاب کو مرد کے ہاتھوں سے چھین کر دور پھینک دیا اور پھر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ کتنی بار کہا کہ وہ صبح صبح کچھ دیر تک رو کر چپ ہو جانے کا ایک عرصے سے عادی ہو گیا ہے۔ لیکن رات تو وہ کسی قیمت پر چپ نہیں رہ سکتا۔ تاہم تم نے سنا نہیں اور اپنی بد عادت کے مطابق آج کی رات اس معصوم کی حق تلفی کر دی اور مسلسل حق تلفی کر رہے ہو۔ جس طرح اسرائیل فلسطینیوں کی حق تلفی کر رہا ہے۔ امریکہ نے برسوں ویت نام کی حق تلفی کی اور جس طرح روس برسوں تک دوسروں کے حقوق پر قابض رہا۔ مگر روس کا انجام دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ کس طرح ٹوٹ کر بکھر گیا۔ اس طرح سارے غاصب، جنھوں نے حق داروں کی زمینوں پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ ایک دن وہ سب ختم ہو جائیں گے۔ مٹ جائیں گے کہ زیادہ دیر تک کسی کی حق تلفی نہیں کی جا سکتی اور یہ میرے اجڑے بچڑے پستان نہ اب میرے ہیں اور نہ تمھارے کہ ان پر صرف اس معصوم کا حق ہے کہ یہ پستان اس معصوم کی زندگی ہیں، اس کی ملکیت ہیں اور تم اس کی زندگی اور اس کی دنیا پر۔ اس کے حق پر اور اس کی خبر پر قابض ہو۔ تمھیں شرم آنی چاہیے۔ دیکھو کہ وہ کس قدر پھوٹ پھوٹ کر اور بلک بلک کر روئے جا رہا ہے۔ بتاؤ کہ اب میں کیا کروں؟ کیا اپنی چھاتیاں کاٹ کر اسے کھلا دوں؟ یہ کہہ کر عورت نے بھی پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا تھا۔ اور دونوں کے رونے کی آوازیں جسموں کو منجمد کر دینے والی ٹھنڈی رات کی چھاتی میں گرم دودھ بن کر قطرہ قطرہ اترنے لگی تھیں۔ ❖❖

مہدی ٹونکی

میں نے بس میں سوار ہو کر تجیس نمبر کی سیٹ تلاش کی۔ بیس اکیس بائیس۔ تجیس دوسری لائن میں کھڑکی کے پاس سیٹ ملی۔ مجھے خوشی ہوئی۔ میں جانتا بھی یہی تھا۔ میں نے اٹیچی اوپر لگیج بر تھ پر رکھی اور کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گیا۔ نظریں آس پاس دوڑائیں۔ بس آدھی سے زیادہ بھر چکی تھی۔ اپنی کلائی کو موڑ کر دیکھا۔ تین بجنے میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا برابر کی چوبیس نمبر کی سیٹ پر کون آئے گا؟ میری پرانی خواہش ابھری۔۔ کاش کوئی لڑکی ہم سفر ملے۔ اگر کالج گرل ہو، خوبصورت ہو تو واہ ری قسمت! اگر ادھیڑ عمر کی عورت بھی ہم سفر بن جاتی ہے تو بھی مردوں سے لاکھ درجہ بہتر۔ خوبصورت عورت کے تصور سے میں اندر سے مہک اٹھا۔ ابھی چند سال پہلے تک میں کئی کئی بسیں اسی وجہ سے چھوڑ دیا کرتا تھا کہ جہاں مجھے سیٹ ملا کرتی تھی وہاں بد شکل عورتیں یا مرد ہم سفر ملا کرتے تھے۔ جب جب بھی مجھے اپنی برابر کی سیٹ خالی ملا کرتی تھی تو میں اس پر اپنا رومال یا کتاب رکھ دیا کرتا تھا۔ پھر جب بھی کوئی مرد مسافر اس سیٹ کے بارے میں پوچھتا یا اس سیٹ پر بیٹھنا چاہتا تو میں اسے ٹوک دیتا۔۔ سیٹ خالی نہیں ہے۔ لیکن جب سڈول جسم والی عورت، لڑکی بس کے دروازے پر چڑھتی تو میری نظریں اس پر جم جاتیں اور خواہش مرغولہ بن کر دماغ پر چھا جاتی کہ یہ میرے پاس ہی بیٹھے۔

اصل میں، مردوں کو اپنے پاس نہیں بٹھانے کی کئی وجوہات ہیں۔ کچھ نفسیاتی طور پر بیزاری بھی ہے۔ مرد مسافر نہ صورت میں اچھے ہوتے ہیں اور نہ سیرت میں۔ صورت دیکھو تو کوئی ٹماٹر نما نظر آئے گا تو کوئی بینگن، کوئی بھی یا تربوز جیسا کسی کی توند نکلی ہوتی ہے تو کوئی یرقان کا مریض معلوم ہوتا ہے۔ چلو صورت بھی برداشت کر لیں، صورت تو اللہ کی بنائی ہوئی ہیں۔ لیکن ان کی عادت، طور طریق اپنے کو برداشت نہیں۔ کسی کا شیو بڑھا ہوا ہے تو کسی کے کپڑے میلے ہیں۔ کسی کی ناک بہ رہی ہے تو کوئی پسینے کے بھبکے چھوڑ رہا ہے۔ کوئی شرابی ہے تو کوئی اتنا باتونی کہ دوسرے کا سر اگر پتھر کا بھی ہو تو ان کی باتوں کی ٹھپانوں سے چوٹیں کھاتے کھاتے ریزہ ریزی ہو جائے۔ گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی کچھ مردوں کو جو غنودگی کے دورے پڑتے ہیں تو برابر والے کو مسل مسل کر پچکا دیتے ہیں۔ سگریٹ بیڑی کے دھویں اور پان کی پیکیں ان کی آزادی کی نشانیاں ہوتی ہیں۔ ان مرد مسافروں کو پیشاب بھی بہت آتا ہے اور کھنکار بھی۔ کھڑکی کے پاس بیٹھے آدمی کی شامت آجاتی ہے۔ برابر والے کو جب کھنکار آتا ہے تو وہ کھڑکی والے کو رگیدتا ہوا کھڑکی سے منہ نکالتا ہے اور ہونٹوں کو توپ کی نال بنا کر جو بلغم داغتا ہے تو برابر والے کو بلغم اپنے اوپر آتا معلوم ہوتا ہے۔ ایسی حالت کے تصور سے مجھے گھن آگئی۔ اس لئے میں ایسے ہم سفر لوگوں کے پاس بیٹھنے کے بجائے بس میں کھڑے کھڑے سفر کرنا پسند کرتا ہوں۔

اس وقت میں پرائیویٹ لگژری کوچ میں بیٹھا تھا۔ مجھے ایک سرکاری مشاعرے میں ٹھکانہ شہر جانا تھا۔ دو دن پہلے ہی میں نے سیٹ ریزرو کرائی تھی۔ مجھے سیٹ کا دھیان آیا ابھی وہ خالی تھی۔ کاش کوئی لڑکی ہم سفر ملے۔ میں نے بس میں نظریں گھمائیں۔ تقریباً بس بھر چکی تھی۔ گھڑی دیکھی تین بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔ یعنی پانچ منٹ بعد بس روانہ ہوگی۔ میری نظریں خوشنما چہروں کے ڈیزائنوں پر پھسلنے لگیں۔ بس اسٹارٹ ہوئی تو نیچے کھڑے مسافر دروازے کی طرف جھپٹے۔ کسی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی نظریں اندرون بس کیں اور اوپر دیکھا۔ ایک مرد مجھ سے پوچھ رہا تھا "چوبیس نمبر!"

میں نے مایوسی سے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "جی ہاں"

وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ بریف کیس اپنی رانوں پر رکھ لیا۔ میں بے زار ہو کر پھر باہر دیکھنے لگا۔ بس چکر کھاتی ہوئی، دوسری بسوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی بس اسٹینڈ سے باہر نکلی اور مین روڈ کی تیز رفتار ٹریفک کی دھارا میں شامل ہو گئی۔ دھیرے دھیرے بھاری ٹریفک پتلی دھاریں تبدیل ہونے لگا۔ کثیر منزلہ عمارتیں روبہ زوال ہوتے ہوئے ایک ایک منزل پھر جھونپڑیوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ جب جنگل شروع ہو گیا تو میری توجہ سیٹ پارٹنر کی طرف گئی۔ کنکھیوں سے دیکھا، وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔ مجھ میں بے چینی شروع ہو گئی۔ مجھے ٹھکانہ جانا ہے چھ گھنٹے کا سفر ہے۔ خاموشی سے کیسے کٹے گا؟ رات ہوتی تو آنکھیں بند کر کے سفر پورا بھی کر لیا جاتا۔ مین نے اس کی طرف گردن موڑی۔ وہ خوش شکل تھا۔ عمر لگ بھگ چالیس سال ہوگی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا "آپ کہاں جائیں گے"

"سرائے پیر"

"سرائے پیر"۔۔۔ میں نے سوچا۔۔ یہاں سے سرائے پیر کا سفر تین گھنٹے کا ہے اور یہ تین گھنٹے اسی کے ساتھ گزارنا ہیں۔ وہ پہلے کی طرح خاموش بیٹھا سامنے دیکھتا رہا۔ اتنا لمبا سفر کیسے کٹے گی۔ یہ تو گوتم بدھ بنا ہوا ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کا

نام پوچھوں مگر خواہش الفاظ بنتے بنتے رہ گئی۔ 'اگر وہ ہندو نکلا تو۔۔۔۔ ؟'"

مجھے اپنے اور اُس کے درمیان ایک خلا محسوس ہونے لگا جبکہ ہم دونوں کے جسم ایک دوسرے کو چھو رہے تھے۔ میں نے سوچا۔۔ 'اس سے کھل کر بات چیت بھی نہیں کر سکتا۔ ہندوؤں سے کتنی ہی اپنائیت سے بات کرو وہ کبھی اپنا نہیں سمجھیں گے۔ سر کٹانے کے باوجود یہ لوگ مسلمانوں کو غیر ملک کا وفادار سمجھتے ہیں۔ خیالات نے پھر پلٹا کھایا۔ 'کئی دوست ہندو ہیں۔ مرلی دھر شرما، لکشمی نارائن، سریش ٹیلر، منوہر لال آریہ۔۔۔ منوہر لال اور مرلی دھر سے دانت کاٹی کی دوستی ہے۔ ہر دوسرے تیسرے دن ان سے گھنٹوں بات چیت ہوتی ہے۔ اختلافات بھی ہوتے ہیں تو گرم توے پر پانی کے چھینٹوں کی طرح بہت جلد صاف۔ میں ان کے یہاں کھانا کھاتا ہوں اور وہ میرے یہاں۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کے اور میرے درمیان کئی باتوں کا ہم خیال ہونا بھی دوستی کی وجہ ہے۔ وہ بھی کانگریسی اور میں بھی کانگریسی۔ میں سیکولر تو وہ بھی صاف ذہن کے مالک۔ وہ بھی دل میں بات نہیں رکھنے والے اور میں بھی۔ لیکن۔۔۔ یہ ہم سفر اگر سیکولر ذہن کا نہیں ہوا تو؟ آر ایس ایس کا ممبر نکلا تو؟ یا بھاجپائی خیال کا ہوا تو؟ یہ تو مسلمانوں کے پکے دشمن ہیں۔ ان کی سیاست کی روٹیاں مسلم دشمنی کے توے پر ہی تو سینک رہی ہیں؟

میرے اور ہم سفر کے درمیان گلے گلے تک جیسے سیمنٹ کی موٹی دیوار اٹھ گئی۔ میں نے نفرت سے منھ موڑا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ لب سڑک کھڑے بجلی کے کھمبے اور درخت نظریں ملائے بغیر پشت کی طرف جھپٹ رہے تھے۔ دور کے پیڑ خراماں خراماں شناختی پریڈ کی طرح چلے آ رہے تھے۔ میں نے سوچا۔۔ 'اگر یہ آر ایس ایس کا، بی جے پی کا آدمی ہے بھی تو کیا ہوا؟ شہر میں تمہارے کئی ایسے جان پہچان کے لوگ ہیں جو ہندو تو، کے نظریہ کے کٹر حامی ہیں۔ ان سے روزانہ ہی سلام و رام رام ہوتی ہے۔ ان کے دل میں چاہے کیسی ہی مخاش ہو لیکن وہ خوش اخلاقی سے تو پیش آتے ہیں۔ وجے کمار تو ہمارے پڑوسی ہیں جو آر ایس ایس کا پکا ممبر ہے۔ دو سال پہلے جب وہ گاؤں گیا ہوا تھا تو ایک رات اس کی بیوی کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ تم ہی تو اسے اسپتال لے کر گئے تھے۔ اپنے پاس سے بنا کچھ خیال کئے پانچ ہزار روپے ایک رات میں خرچ کر دئے تھے۔ جب تک وجے کمار نہیں آگیا تم اور تمہاری بیوی اسپتال میں ہی رہے۔۔ جب وجے کمار آیا اور تمہاری خدمت کا اسے پتہ چلا تو اُس کے سنگھی خیالات کافور ہو گئے پھر جب تمہارا تبادلہ دوسرے شہر میں ہوا تو اس نے دن رات ایک کر کے وزیر اعلا سے کہہ کر تبادلہ کینسل کرا لیا۔ محنت اور خرچے کا ایک پیسہ بھی نہیں لیا۔ اب تو اُس کے تہواروں پر تم گھر والے خصوصی مہمان ہوتے ہو۔ اور وہ تمہارے یہاں کھانے دانے میں وہ دل جمعی سے ہاتھ بٹاتا ہے۔ اگر یہ لوگ جمہوری نظام کے بجائے ہندو مذہب کا راج چاہتے ہیں تو کیا ہوا؟ تمہاری بھی دلی خواہش ہے کہ پوری دنیا میں اسلامی نظام قائم ہو۔ سیاسی پارٹیوں کے ممبر بننے سے انسانیت مر تھوڑی جاتی ہے۔ تم قربانی کرو گے تو دوسرا بھی قربانی کریگا۔ محبت کی بنیاد ہی قربانی ہے"۔ میرا نفرت کا رویہ متبدل ہوا۔ تناؤ ڈھیلا ہوا۔ میں اُس کی طرف مڑا "آپ کا کیا نام ہے"

"خادم حسین"

"واہ" میرا جی خوش ہو گیا، یہ تو مسلمان ہے، میں نے راحت کی سانس کی اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اب میں بے فکر تھا۔۔ اب ہر طرح کی باتیں اطمینان سے ہوں گی۔ سیاسی، ملی مذہبی۔۔۔ 'اچانک میں چونکا، مذہبی؟۔۔۔ اس کا نام تو خادم حسین ہے۔ یہ تو شیعہ ہے۔ یہ شیعہ حضرات تو سنیوں کے دشمن ہوتے ہیں۔ حضرت علیؓ اور حسنؓ حسینؓ کو ہم بھی مانتے ہیں۔ ہم اُن کے نام پہ فدا۔ لیکن ان شیعہ لوگوں نے تو اسلامی تاریخ اسلامی قانون میں ہی تبدیلی نہیں کی بلکہ اسلامی فرائض میں بھی ہیر پھیر کر دئے۔ سیدھے سادے اسلام میں کتنی ٹیڑھی باتیں ملا دی ہیں۔ یہ لوگ تو ہمارے خلفا پر تبرّہ بھیجتے ہیں۔ میں نے خادم حسین کی طرف سے منھ پھیر لیا۔

تھوڑی دیر بعد خیال آیا۔ 'نفرت! وہ بھی مسلمان سے ہمارے حضورؐ کا فرمانا ہے کہ ہر کلمہ گو ایک دوسرے کا بھائی ہوتا ہے۔ تبھی تو فسادات میں کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ تم شیعہ ہو یا سنّی۔۔۔ دونوں مار دئے جاتے ہیں پھر۔۔۔ وحدانیت ان کا ایمان ہے۔ رسالت پر ان کا یقین ہے اور قیامت کے یہ قائل ہیں۔ ایک مسلمان کو اور کیا چاہئیے اسلامی دنیا میں ایران واحد ملک ہے جہاں شریعت سختی سے نافذ ہے۔ ایران ہی وہ واحد ملک ہے جس نے مردود سلمان رشدی کی موت کا فتویٰ جاری کیا تھا اور یوروپی ملکوں کے سخت دباؤ کے باوجود اس فیصلے پر قائم ہے جبکہ دوسرے اسلامی ممالک بھیگی بلی بنے ہوئے ہیں۔۔۔ میرے ذہن پر کھڑا نفرت کا خیمہ گر گیا۔ میں کسمسا کر خادم حسین کی طرف متوجہ ہوا۔ محبت سے اُسے دیکھتا ہوا بولا۔

"میں چاہتا ہوں کہ نہج البلاغہ پڑھوں مگر وہ مجھے دستیاب نہیں ہو رہی

۔۔ میں آپ کا مطلب سمجھا نہیں؟ اُس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

مجھے حیرت ہوئی "اے جناب آپ شیعہ حضرات کی متبرک کتاب۔۔۔۔

وہ ہنس پڑا "اجی صاحب میں شیعہ نہیں ہوں، سنّی ہوں سنّی وہ بھی حنفی مسلک کا"

"لاحول ولا قوۃ۔۔۔ میں آپ کو شیعہ سمجھا تھا" میرے دل کی کلی کلی کھل گئی۔ میں بھی سنّی ہوں اور حنفی مسلک کا ہی ہوں۔ لیجئے پان کھائیے۔ میں نے پان کی ڈبیہ اُس کے حوالے کی۔

"اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ لوگ میرے نام کی وجہ سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ ابھی ٹھہرئیے، اُس نے ڈبیہ واپس کرتے ہوئے کہا" شو پور آنے والا ہے پہلے چائے پئیں گے پھر پان کھائیں گے۔"

چونکہ شہر کی عمارتیں شروع ہو چکی تھیں اس لئے میں بھی باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد شو پور بس اسٹینڈ آگیا۔ ہم دونوں بس سے اتر کر قریب کے ہوٹل کے پاس جا کر کھڑے ہوئے۔ کھڑے کھڑے چائے پی۔

چائے جلدی سے پی کر جیسے ہی میں نے ہوٹل والے کو پیسے دینا چاہے تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پیسے ادا کر دیئے" واہ صاحب واہ۔۔ چائے کے لئے تو میں نے آپ کو مدعو کیا تھا"

میں اس کی خاطر مدارات سے بہت متاثر ہوا۔ اس کے لئے دل میں اور مٹھاس بڑھ گئی۔ واپس سیٹ پر بیٹھ کر پان کھایا۔ بس چل پڑی۔ طبیعت شگفتہ تھی اٹھتی بیٹھتی ہلکی ہلکی لہروں کی طرح ہلکی پھلکی باتیں ہونے لگیں۔ دھیرے دھیرے مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ وہ میری کئی باتوں سے اتفاق نہیں کر رہا ہے بلکہ کہیں کہیں تو وہ اپنی بات منوانے کے لئے شدت اختیار کر لیتا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو بحث میں جانے سے روکا۔ موضوع بدلتا رہا۔ اچانک بس کی رفتار دھیمی ہو گئی۔ اگلی سیٹ پر سے ایک ایک مرد اپنی سیٹ پر سے اٹھ کر ریج برتھ پر سے سامان اتارنے لگا۔ باتوں میں پتہ ہی نہیں چلا کی جگت پورہ آگیا ہے۔ یہ قصبہ تھا اس لئے بس، موٹر اسٹینڈ کی طرف نہیں گئی۔ مرد کے ساتھ بیٹھی نوجوان لڑکی کھڑے ہو کر سامان سنبھالنے لگی۔ لڑکی نے تنگ جینس پہن رکھی تھی۔ بوشرٹ کے دونوں دامنوں کو باندھ کر گٹھان دے رکھی تھی جس کی وجہ سے آدھا پیٹ ننگا دکھائی دے رہا تھا۔ پتلے پینٹ پر ٹنڈی بری معلوم ہو رہی تھی جیسے پیپے میں بد وضع چھید ہو۔ میں نے برا منھ بنایا۔ جب دونوں اتر گئے اور بس روانہ ہو گئی تو میں نے کہا" زیادہ آزادی عورت کے لئے ہی نقصان دہ ہے"

"کیا مطلب ؟" خادم حسین نے مجھ سے پوچھا

"مردوں نے عورتوں کو بہت چھوٹ دے رکھی ہے۔ مرد اتنے اندھے ہو گئے ہیں کہ انہیں یہی پتہ نہیں چلتا کہ ہماری بہن بیٹیوں نے کیسا لباس پہن رکھا ہے۔ اب دیکھئے نا۔۔ اس لڑکی نے کیسا پھٹی جھولی کا سا لباس پہن رکھا تھا۔ سب کی نظریں اُس کے پیٹ پر مرکوز تھیں"۔

خادم حسین ہنس پڑا" آپ بہت دقیانوسی معلوم ہوتے ہیں اصل میں اسی معاملے میں عورتوں سے زیادہ وہ مرد گناہ گار ہیں جو اپنی تسکین کے لئے عورت کو ایکس رے مشین سے دیکھتے ہیں۔ آدمی کو تو اپنے پر مکمل اختیار ہونا چاہیئے۔ آپ کو ایک اللہ والے بزرگ کا واقعہ سناؤں۔ انہوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ سونے چاندی سے رغبت رکھنا حبِ دنیا ہے اور حبِ دنیا اپن جیسے اللہ والوں کے لئے تعلق لا اللہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اس لئے آج میں نے سونے چاندی کی انگوٹھیاں اور تعویذ دوسروں کو دیدئے ہیں اب میں کبھی ان کے ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ بیوی نے کہا۔ میں بھی قسم کھاتی ہوں کہ آج سے سونا چاندی اس گھر میں نہیں رہے گا۔ ایک دن ان بزرگ کا دوسرے گاؤں کو جانا ہوا۔ بیوی بھی پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ جنگل میں ایک موڑ پر ان بزرگ کو اچانک سونے کا ایک ہار پڑا دکھائی دیا۔ وہ ایک دم ٹھٹھکے پھر دھیان آیا میں نے تو قسم کھا رکھی ہے میں کیوں ہاتھ لگاؤں ؟ پھر خیال آیا کہ میری بیوی پیچھے آرہی ہے حالانکہ اُس نے سونا پہنا اور رکھنا چھوڑ دیا ہے، پھر بھی ہو سکتا ہے اتنا بھاری سونے کا ہار دیکھ کر نیت ڈانواڈول ہو جائے۔ عورت ذات ہے۔ عورت کو سونے سے زیادہ محبت ہوتی ہے اس لئے اس ہار پر مٹی ڈال کر چھپا دینا چاہئے۔ بزرگ نے جھک کر جیسے ہی مٹی ہاتھ میں لی بیوی آموجود ہوئی اور پوچھا کیا کر رہے ہو۔ بزرگ کو کہنا پڑا۔ اجی سونے کا ہار ہے۔ بیوی نے جلدی سے بات کاٹی۔ سونے کا ہار۔ کہاں ہے۔ مجھے تو نظر نہیں آرہا پھر جب ہم نے سونے کی محبت ہی چھوڑ دی تو اب اُس کی ضرورت اور اہمیت کیا؟ آؤ آگے بڑھو۔ ایسا نظریہ مردوں نے کبھی غیر محرم کے لئے نہیں رکھا، جب متاعِ غیر پا ہی نہیں سکتے تو پھر اُس کے اعضا کو ٹٹولنا کیا۔ ؟"

میں چڑ گیا" آپ تو انتہا پر پہنچ گئے۔ ایسے کام تو فرشتے ہی انجام دے سکتے ہیں۔ عورت اور مرد آگ اور بارود ہیں اسی لئے ہمارا سماج یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنا جسم ادھیڑ کر سر عام چلے۔ ان کی برہنگی، نیم برہنگی مردوں کو ہوسناک بنا دیتی ہے۔ اس میں نقصان عورت کا ہی ہے۔ چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر، ہر حالت میں نقصان خربوزے کا ہی ہے۔ جب تک عورت چراغ خانہ تھی کتنی محفوظ اور روزی روٹی سے بے فکر تھی لیکن جب سے مردوں کے دوش بدوش رہ کر کمانے کا شوق پال لیا ہے اُن کے لئے درندگی بڑھ گئی ہے۔ پھر آپ اس پہلو پر بھی غور کیجئے کہ ان عورتوں کو روزگار فراہم ہونے کی وجہ سے ضرورت مند گھر کے ذمہ دار مردوں کو روزی روٹی سے محتاج ہونا پڑتا ہے"۔

"دیکھئے صاحب" خادم حسین نے میری بات کاٹی" آپ کا یہ اندازِ فکر، نقطۂ نظر قطعی غلط ہے۔ پڑھی لکھی عورت جہاں اپنے بچوں کی پرورش بہترین طریقے سے کرتی ہیں وہیں نوکری پیشہ بیوی اپنے شوہر کے لئے خوشحالی کے ضامن بھی ہوتی ہے۔ کیوں صاحب یہ کیسی ناانصافی ؟ مرد تو اپنے حقوق کا استعمال ہر طریقے سے کرلیں مگر عورتوں کو محروم رکھیں ؟ ہمارے آئین نے عورتوں اور مردوں کو برابری کا درجہ دے رکھا ہے پھر عورتوں کو نوکری کرانے کے بارے میں، آزادی کے بارے میں یہ منفی رویہ کیوں ؟۔ اصل میں ہمارے یہاں قانون تو بن گیا مگر اس کا نفاذ بہت سست طریقے سے ہو رہا ہے۔ اس معاملے میں کیمونسٹ ملکوں کی تعریف کرنا پڑیگی۔ اِدھر قانون بنا اُدھر اس پر پوری طرح سے عمل شروع۔۔"

میں چونک اُٹھا۔۔ اچھا تو حضرت کیمونسٹ ہیں۔ مجھے کیمونسٹوں سے سخت نفرت ہے۔ یہ تو اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ لاکھوں مسلمانوں کو گولیوں سے بھون دیا۔ مسلم ملکوں میں اسلامی تشخص ختم کر دیا افغانستان اس کی زندہ مثال ہے۔ اللہ نے تبھی روس میں ہی اُن کا منھ کالا کر دیا۔

میں نے بے دلی سے کہا" زور زبردستی کا قانون کتنے دن کا ؟ جب تک اُس کی اہمیت اور احترام دل و دماغ میں نہیں جمے وہ قانون نہ تو قابل قبول ہو سکتا ہے اور نہ سود مند۔ کسی بھی ملک کے آئین کو دیکھ لیجئے ابتک اسمیں سینکڑوں بار تبدیلیاں ہو چکی ہیں اور ہو نگی۔ حالات کا نام دے کر کئی ملکوں میں نئے نئے

آئین نافذ کیے گیے اور رد کیے گیے لیکن اسلامی شریعت آج بھی وہی ہے جو ڈیڑھ ہزار سال پہلے تھی کیونکہ حضورؐ نے ۲۳ سال تک دن رات کی جانفشانی اور عرق ریزی کے بعد لوگوں کے دلوں میں وحدت رسالت اور آخرت کا یقین راسخ کر دیا تھا۔ یہ ایمان اور یقین ہی مسلمانوں کو شریعت پر قائم رکھے ہوئے ہے اور قیامت تک یہ عمل جاری رہے گا۔ آج کا ہر مسلمان اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا احترام واہتمام کر رہا ہے چاہے وہ کسی اسلامی حکومت میں رہ رہا ہو یا کسی غیر مسلم حکومت میں"

"محترم آج اسلامی حکومت ہے کہاں ؟ جن کو آپ اسلامی حکومتیں مان رہے ہیں وہ اصل میں صرف مسلمان حکومتیں ہیں کیونکہ ان کے سربراہ مسلمان ہیں اور عوام مسلمان ہیں لیکن شریعت پوری طرح سے نافذ نہیں ہے۔ یہ سربراہ نظام مصطفےٰ کا نعرہ دیکر عوام کو ہرے جھنڈے کے نیچے جمع تو کر لیتے ہیں لیکن کرتے ہیں اپنی من مانی۔"

'دیکھئے صاحب" مجھے خادم حسین کی ضد بحث بری معلوم ہوئی "اصل میں ان ممالک میں دینی تعلیم کی کمی ہے۔ مغربی تعلیم نے معاشرے کو مادہ پرست اور اس کی سیاست نے موقعہ پرست بنا کر دین حنیف سے دور کر دیا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے معاشرے کی اکائی یعنی فرد کے اعمال کو درست کرنا ہوگے جیسا کہ دین چاہتا ہے۔

"آپ کی بات بجا لیکن ایک مسلمان بے دینی کے ماحول میں انفرادی زندگی مذہبی طور پر، شرعی طریقے سے کب تک اور کیسے گذار سکتا ہے۔ موجودہ ماحول بہت جلد اُس کے قدم اُکھاڑ دیگا۔ پھر اسلام نے تو مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کو کہا ہے۔ اِن کی اجتماعی دینی تعلیم اور تربیت کا اہتمام اسلامی حکومت ہی مطلوب طریقے سے کر سکتی ہے۔ اجتماعی طور پر رہنے سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں اُن کا شرعی حل اور اسلامی قوانین کا نفاذ حکومت ہی کر سکتی ہے اس لئے اسلامی حکومت کا اور نقشہ ہمارے ذہن میں ہونا چاہئیے۔"

میں نے بات کاٹی "پہلے بگڑے ہوئے انسان کو راہ راست پر لانا چاہئے تا کہ معاشرہ درست ہو اور جب معاشرہ درست ہو جائے گا تو اسلامی حکومت اپنے آپ وجود میں آجائے گی۔"

"محترم !" خادم حسین نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا" برسات میں اکثر بہت جلدی پھوٹتے ہیں کیونکہ نمی کے اثرات ہر طرف سے ہر شے پر پڑتے ہیں۔ زمام اقتدار اسلامی ہاتھوں میں آتے ہی ایک قصبے کا نہیں ایک شہر کا نہیں بلکہ پورے ملک کا معاشرہ برق رفتاری سے بدلنے لگتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسلامی ملک کا ثقافتی، مذہبی اور سیاسی اثر دوسرے ملکوں پر بھی پڑتا ہے۔ آپ کے سامنے ایران کی مثال موجود ہے۔ نو مولود اسلامی سوڈان کو دیکھئے۔ اس کا ہر شعبہ اسلامی احکام کے تحت کام کر رہا ہے۔ ہم لوگ تو بہت چھوٹی کھوپڑیوں کے مالک ہیں۔ سروں پر بستر رکھ کر مسجد در مسجد دروازے در دروازے گھومنے اور خالی نمازی بنانے سے کام نہیں چلے گا۔ سیاسی بصیرت کی بھی ضرورت ہے۔ آج کے زمانے میں ٹک ٹک گھوڑے کی رفتار کام نہیں دے سکتی۔ دوسرے لوگ ہمیں روند ڈالیں گے۔ اسی لئے امت مسلمہ کو بیدار کرنے کے لئے مولانا مودودی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ ـــ"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی" اوہ تو یہ مودودیہ ہے۔ کمبخت جبھی جماعت کی بُرائی کر رہا ہے۔ ان ہی لوگوں نے تو پڑھے لکھے لوگوں کے ذہن بگاڑ رکھے ہیں۔ یہ اپنے علاوہ کسی کو راہ راست پر پاتے ہی نہیں۔ کانے بیل کی طرح ایک ایک طرف چلتے ہیں۔ سیاست اور اقتدار کی بھوک جنم سے لئے پھرتے ہیں جبھی اللہ نے انہیں حکومت سے محروم رکھا۔ میرا منہ کسیلا ہو گیا۔ میں نے کھڑکی کی طرف مُنہ پھیر لیا۔ ذہن سے جھنجھلاہٹ کا پارہ اُترا تو دیکھا آبادی شروع ہو چکی تھی۔ غور سے مقامات کو دیکھا، پہچانا۔ کریم نگر تھا۔ کچھ مسافر اُترنے کے لئے بس کی گیلری میں سامان لئے تیار کھڑے تھے۔ خادم حسین ان کی طرف متوجہ تھا۔ میں نے دل میں سوچا، اچھا ہوا ورنہ ابھی پوری مودودیت بھنکارتا۔ بس نے موڑ کاٹا اور پرائیویٹ موٹر اسٹینڈ پر جا رکی۔

"آیئے ایک ایک کپ چائے پی لیں۔" میں اس کی آواز سے چونکا لیکن میں نہ اس کی طرف متوجہ ہوا اور نہ بولا۔ مجھے آمادہ نہیں دیکھ کر اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اُٹھتے ہوئے اپنی طرف کھینچا "ارے آیئے تو سہی یہاں گاڑی دیر تک رُکے گی"

مجبوراً اترا سامنے کی بھیڑ بھری ایک ہوٹل میں وہ مجھے لے گیا۔ کاؤنٹر سے گزرتے ہوئے اس نے کاؤنٹر مین سے کچھ کہا جسے لوگوں کی تیز بول چال کی وجہ سے نہیں سن سکا۔ ایک کونہ کی میز پر ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ بیرے نے دو پلیٹیں ہمارے سامنے رکھ دیں جن میں ایک ایک کچوری اور دو دو گلاب جامن تھیں۔

"ارے صاحب یہ کیا۔ ؟میں نے خادم حسین کی طرف دیکھا

"محترم۔ جو میں اپنے لئے پسند کرتا ہوں وہی دوسرے کے لئے بھی۔ مجھے اِس وقت ان چیزوں کے کھانے کی شدت سے خواہش پیدا ہوئی تھی۔ اب ضروری تھا کہ آپ بھی وہی کھائیں جو میں کھاؤں۔'

خادم حسین کے اس جذبہ سے میں کٹ کر رہ گیا۔ نفرت کا درجہ حرارت ایک دم گر گیا۔ سر جھکا کر کچوری کھانے لگا۔ سوچا، میاں رفیق۔ تمہیں تو ہر ایک سے بلاوجہ لڑنے کی عادت ہو گئی ہے۔ خادم حسین نے تبلیغی جماعت کی برائی تھوڑی کی تھی تنقید ہی تو کی تھی۔ اپنا اپنا نظریہ ہے۔ مولانا مودودی کا قلم دین ہی تو پھیلا رہا ہے دینی تو نہیں۔ کیمونزم کی وکالت تو نہیں کر رہا۔ اپنا اپنا طریقہ کار ہے۔ ذرا سے اختلاف پر دوسروں کے لئے اپنے دل میں گانٹھ باندھ لیتے ہو۔ خادم حسین کا برتاؤ دیکھو۔ کس محبت اور خلوص سے پیش آرہا ہے۔"

کاؤنٹر پر جب میں نے رقم ادا کرنی چاہی تو اُس نے سختی سے منع کر دیا۔ میں اور بھی نادم ہوا۔ جب سیٹ پر بیٹھا تو میں خادم حسین کے لئے نفرت سے اتنا خالی، اتنا ہلکا پھلکا ہو گیا تھا جیسے کاڑک دباؤ کی وجہ سے پانی میں دوبار ہتا ہے،

دباؤ بڑھتے ہی سطح آب پر آکر ہچکولے کھانے لگتا ہے۔ میں نے اسے محبت سے پان پیش کیا۔ گاڑی جب آبادی سے نکل کر رفتار پکڑنے لگی تو میں نے اُس سے پوچھا۔

"آپ کو اردو ادب سے دلچسپی ہو گی ہی؟"

"ارے صاحب کیوں نہیں۔۔۔ اسی کی مہربانی سے مجھے روزی روٹی مل رہی ہے۔ میں اردو لیکچرر ہوں اور یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں۔"

"ارے واہ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے" میں نے خوش ہو کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

اب میں اطمینان سے پان چباتا ہوا سیٹ پر پھیل گیا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا" میں رفیق احمد رفیق ہوں ٹھکانہ میں ایک سرکاری مشاعرے میں جا رہا ہوں۔"

"اچھا۔ اچھا" پھس پھسی آواز میں اُس نے کہا اور سامنے دیکھنے لگا میں چونکا۔ میں اتنا مشہور شاعر ہوں لیکن اُس نے مجھے اہمیت ہی نہیں دی، میں نے کہا" معلوم ہوتا ہے آپ کو شاعری پسند نہیں"

"جی ہاں مجھے شعر کہنے کا شوق نہیں۔ والد صاحب کو ہے"

"ارے صاحب شعر کہنے کا نہیں تو سننے کا تو ہو گا۔ اردو شاعری سننے کے لئے تو کوئی کافر بھی انکار نہیں کر سکتا۔ میں نے ہنس کر کہا۔

"یہ بات نہیں۔۔ جو نوخیز شاعر بچپن میں حسین رنگین سپنے خیالوں میں سجائے شعر کہتا تھا اور سنا تھا وہی شاعر ساٹھ ستر برس کی عمر میں بھی حسین نوجوان عورت کا عریاں نیم عریاں رنگین پوسٹر آنکھوں میں بند کئے، اس کے اعضا کی تعریف میں رال بہا رہا ہے جبکہ اب اس کی محبوبہ جوان نواسہ نواسیوں والی ہو چکی ہے۔ دنیا بدل گئی۔ دوسرے ملکوں کا ادب کہاں سے کہاں پہنچ گیا مگر ہمارا شاعر اب بھی عورت کو مرکز بنائے گھانی کے بیل کی طرح وہیں گھوم رہا ہے۔"

مجھے غصّہ آگیا، معلوم ہوتا ہے آپ نے شعری ادب پڑھا ہی نہیں آپ نے بزرگان ادب، محسنان شاعری میر غالب، مومن، جگر کی توہین کی ہے۔"

"ارے صاحب۔ آپ غلط سمجھے۔ میں تو ان کا مدّاح ہوں۔ لیکن اُن کے خیالات کی جگالی کب تک ہو گی؟ حالی کے زمانے میں لوگ کلاسیکل شاعری سے اوب گئے تھے۔ دیکھئے نا تبھی تو نئی نظم کا ارتقا ہوا۔۔۔"

"اچھا تو آپ ترقی پسند شاعر ہیں۔۔! میرا غصّہ برقرار تھا" آپ ہی لوگوں نے تو شاعری کے حسن کا ستیاناس کیا ہے۔ آپ لوگوں کو تو پولیو زدہ شاعری پسند ہے۔

خادم حسین ہنس پڑا" واہ کیا تعریف کی ہے آپ نے شاعری کی۔ مگر جناب اس میں قصور ترقی پسندوں کا نہیں بلکہ خود روایتی شعرا کا ہے۔ بدلتے ہوئے ماحول، بدلتے ہوئے حالات نئے نئے مسائل، ان کی طرف سے تو ان حضرات نے آنکھیں ہی موندلی تھیں۔ نئی نسل، نیا خون ان پریشانیوں سے نبرد آزما تھا۔ تیز رو پانی کو جب نکاسی نہیں ملتی ہے تو وہ بندشوں اور رکاوٹوں کو توڑ دیتا ہے۔ روایتی شعرا نے نئی پود کے لئے دور بینی اور دور اندیشی سے کام نہیں لیا۔ ان کو مسدود راہوں کا مسافر بنا دیا۔ نئی نسل اپنے تیز رو، تند بجوم خیالات کا اظہار دو رسیوں کے جھولے میں ہچکولے لے کر نہیں کر سکتے تھے۔

اختلافات کی کڑواہٹ لب میرے دانتوں تک میں آگئی تھی۔ دانت پر دانت زور سے جماتے ہوئے میں نے کہا" جناب خادم حسین صاحب۔۔۔ دو مصرعوں کی رسیوں والی شاعری کے جھولے میں بیٹھ کر ہم نشیب و فراز کے سکھ دکھ یقینا بہترین طریقے سے پیش کر سکتے ہیں۔ چاہئے اس کے لئے الفاظ کا ذخیرہ، چاہئے خیالات کی بلندی، چاہئے کمالات کی ہنرمندی، چاہئے محنت کش دماغ۔۔۔ ہے آپ کی نئی نسل کے پاس۔۔۔؟

"آپ کا فرمانا بجا ہے، ۔۔۔ میں روایتی شاعری کی برائی نہیں کر رہا۔۔۔ یہ شاعر تو خوبصورت خیالات کا حسین مجسمہ ہے، الفاظ کی خوبصورت ترتیب والا خوشنما گلدستہ ہے۔ ان کی ادائیگی میں حسن ہے، لچک ہے، لے ہے۔ لیکن گزارش کرنا یہ ہے کہ نئے افکار اور نئے زاویوں کا اظہار اس شاعری میں ممکن نہیں لگا تانگے کا گھوڑا سڑک پر ہی دوڑ سکتا ہے۔ وہ نہ تو جنگ کے میدان میں مہارت و بہادری دکھا سکتا ہے اور نہ گھوڑ دوڑ کے مقابلے میں بازی مار سکتا ہے۔ آج کا انسان اتنے مسائل سے گھرا ہوا ہے کہ پنجرے نما گھر سے نکل کر ہنگامہ برپا سڑک تک، سڑک سے لے کر جیل نما دفتر تک اور دفتر سے بھاگ کر بے وفا کی آغوش تک پہنچتے پہنچتے وہ اتنا بکھر جاتا ہے، ٹوٹ جاتا ہے کہ اپنے درد کرب کو بیان کرنے کے لئے اُسے نئے الفاظ جٹانے پڑتے ہیں اور ان الفاظ کے لئے نئے پیراہن دینا پڑتے ہیں۔ داد دینی پڑیگی غیر ملکی ادب کو کہ وہ ہر طرح کے خیالات کو اور اُس کے طریقہ اظہار کو اپنے میں سمیٹ رہا ہے۔ اسی لئے تو آج وہ تیزی سے مالا مال ہو رہا ہے۔ بلکہ قائد بھی بن رہا ہے" یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی جیبوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ تلاش کیا، پھر زانوؤں پر رکھی اٹیچی کھول اور گٹکھا مسالہ کی پڑیا نکالی۔ پڑیا کے نیچے ایک رسالہ رکھا تھا۔ ۔۔شب خون۔۔۔ میرا خون کھول اٹھا۔۔۔ ارے یہ تو کمبخت جدیدیہ نکلا۔۔ اسے سمجھانا بیکار ہے۔

میں نے اپنے خیالات کی کشتی واپس کنارے کی طرف موڑ دی" خادم حسین صاحب۔۔ آپ کا غیر ملکی ادب، ادب نہیں ہوا۔ حرامی بچوں کا یتیم خانہ ہوا۔ صاف بات ہے کہ آپ کی لنج پنج شاعری آپ کو مبارک۔ آپ کی نثری نظم کیا ہے ایک ڈھونڈا ہے، تباہ شدہ مکان ہے جس طرف سے چاہے اندر پہنچ جاؤ، مطلب کی جو چیز نکالنا چاہو نکال لو۔۔۔"

اتنے میں وہ مجھ پر آگرا۔ بس نے موڑ کھایا تھا۔ میں نے جلدی سے باہر دیکھا۔ چدسرائے آگیا تھا۔ بس اسٹینڈ پر جا رکی۔

"واللہ۔ آپ تو ناراض ہو گئے آپ کا دل دکھانے کا میرا ارادہ ہرگز نہیں تھا۔ یہ تو اپنے اپنے خیالات ہیں۔ میں تو روایتی شاعری کی دل سے قدر کرتا ہوں لیکن

اتنی نہیں جتنی میرے والد صاحب کرتے ہیں۔ وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ ان کے یہاں تو روز ہی شعرا کی محفل جمتی ہے۔ کل واپسی پر آپ یہاں رُکیے، میرے والد صاحب آپ سے بہت خوش ہوں گے۔ میں کل آپ کا انتظار کروں گا" وہ اُٹھتا ہوا بولا۔

"آپ کے والد صاحب کا نام۔۔۔ پتہ۔۔۔؟

"فدا حسین عاشق جو مشہور پیر جناب حضرت خواجہ توکل شاہ الفت نقشبندی مجددی کی درگاہ کے متولی ہیں۔۔۔"

ایسا معلوم ہوا جیسے دہکتے تنور میں پانی ڈال دیا۔ ڈھیر ساری بھاپ اور راکھ چاروں طرف پھیل گئی۔ نفرت کا بھپارہ میرے بند ہونٹوں سے جا ٹکرایا۔۔۔ کمبخت قبر پرست۔۔۔"

"دیکھیے واپسی میں آپ کل ضرور یہاں رکیئے گا۔ میں آپ کو لینے گیارہ بجے خود بس اسٹینڈ پر آؤں گا"

اس نے میرے ہاتھ کو زور سے داب کر الوداع کیا لیکن میرا بے زار ڈھیلا ہاتھ اسے گرم جوشی نہیں دے سکا۔ بنا نظریں ملائے میں نے صرف گردن ہلا دی اور دل میں کہا۔۔ "کرتا رہ میرا انتظار۔۔۔ دوسرے روٹ سے ہی گھر واپس پہنچوں گا"

میری طبیعت بہت مکدر ہو گئی تھی۔ باہر جھانکا۔ اندھیرے میں ڈوبتا شہر اپنی پہچان بتانے کے لئے برقی قمقموں کے ذریعہ ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ میں نے گردن واپس موڑلی۔ چھ بج رہے تھے۔۔۔، ٹھکانا یہاں سے اب بھی آدھی دور پر ہے۔۔' میں نے برابر کی سیٹ دیکھی جو خالی ہی تھی۔ میں نے اپنے گرد چادر لپیٹی، کمر اور سر کھڑکی سے لگایا، خادم حسین والی سیٹ پر پیر رکھے اور آنکھیں بند کر لیں۔

❖ ❖

گزارشات

- شب خون سے متعلق خط و کتابت دفتر شب خون کے پتے پر ہی کریں۔
- شب خون، ہر ماہ کے آخری عشرہ میں پوسٹ کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شمارہ اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ تک نہ ملے تو دفتر کو فوراً عدم وصولیابی کی اطلاع دیں۔
- جواب طلب امور کے لئے ڈاک ٹکٹ لگا ہوا لفافہ یا پوسٹ کارڈ ضرور بھجوائیں۔

مصطفیٰ کمال

میرا مکان غائب ہے۔ میرا وجود اپنی مکانیت کھو رہا ہے۔ میں آگ اور خون کی ہولی سے بھاگ رہا ہوں۔ بچنے کیلئے کہاں جا رہا ہوں مجھے نہیں معلوم آگ مجھے ہر سو گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ میں ہوا میں تحلیل ہونا چاہتا ہوں، میں مکانیت کی تلاش میں ہوں۔ وجود اپنا خول چاہ رہا ہے۔ باہر موت کا سناٹا۔

میں کیسے دوست کے دروازے پر پہنچا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم ہاتھ پیر گواہی دے رہے ہیں۔ دل کی دھڑکنیں شاہد ہیں۔ پسینہ کے قطرے گواہ ہیں۔ دوست نے دروازہ کھول کر اندر کھینچ لیا۔ وہ خطرہ جو پیچھے لگا ہوا ہے اس کا وہ بھی شکار معلوم ہوتا ہے۔ اس نے کمرے کی روشنی بھی گل کر رکھی ہے۔ میرے دوست، اب پیر پھیلاؤں تو کہاں پھیلاؤں۔ رہوں تو کس کے گھر میں رہوں۔ کوئی چھپر کوئی چھپر کھٹ ٹھکانے کیلئے چاہئے۔ یہ کھلا آسمان لامتناہی ہے۔ یہ زمین بھی اتنی پھیلی ہوئی ہے جتنا آسمان، یہ شہر بے سان گمان پھیلتا جا رہا ہے۔ گلیوں اور سڑکوں کے سلسلے بھی لامتناہی ہیں۔ کیا میں اس لامتناہی تسلسل کو برداشت کر پاؤں گا۔ میرا اتھاہ وجود اپنی لامکانیت پر چیخ رہا ہے۔

مسٹر خالد! تم خوفزدہ ہو۔ دہشت سے تم کانپ رہے ہو۔ لو پانی پیو۔ آرام کرو۔ پھر بات کرنا۔ چیخو چلاؤ نہیں۔ بات کرو، میرے گھر میں ہو۔ میرے کمرے میں ہو۔ جہاں تمہارے اور میرے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ فساد باہر ہے اندر نہیں۔ ایک ذرا سے کرفیو کا اتنے بڑے کینوس پر مت پھیلاؤ۔ فساد ختم کرنے کی یہ احتیاطی تدبیریں ہیں۔ لوگ جلد ہی اپنے حدود میں سمٹ جائیں گے۔ فضا اپنے آپ پر سکون ہو جائیگی۔ فساد خود بخود کنٹرول میں آجائیگا۔ یہ عارضی فضا ہے کوئی مستقل نہیں۔

"روز کوئی نہ کوئی خبر ایسی آرہی ہے"

"وہ سب خبریں حقیقت نہیں۔۔۔

"اور یہ حقیقت جس سے ہم دوچار ہیں۔

شرپسندوں نے ایسا کر لیا ہے۔

ہم لوگ دفتر کیسے پہنچیں گے۔ کیا دفتر پہنچنے کیلئے شناختی کارڈ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔۔؟

ضرور پڑے گی۔ ضرور پڑے گی۔ تیاگی نے ہنکاری بھری

شناختی کارڈ کے لئے ایک چھوٹی سی فوٹو چاہئے۔ تیاگی نے جتایا

یہ روز کا معمول بن گیا ہے۔ اس خطرہ کو ٹالنے کیلئے اب مستقل شناختی کارڈ کی ضرورت پڑے گی۔ ہم شخص کا ثبوت اسی سے دے پائیں گے۔ ہم شخص کا ثبوت اپنے کام سے اپنی ڈیوٹی انجام دے کر کرتے ہیں" تیاگی بولا۔ "اس خطرے میں ہماری شخص اسی چوکھٹے میں سمائی ہوئی ہے۔ یہی ہمیں خطرے سے بچائیگی۔ یہی اصلی سرٹیفکٹ ہے"

"میرا البم اُٹھاؤ۔ اس کے ورق پلٹو"

تصویریں بہت ہیں۔ خوشی و شادمانی کی۔ سیر و تفریح کی۔ رنج و غم کی یہاں شخصیت کی ہر رنگ مین جلوہ گری ہے۔ بچپن، جوانی، طالب علمی، کھلنڈراپن اور شادی بیاہ۔۔۔"

مگر میری دو چار تصویریں تمہارے ساتھ کھینچی ہیں۔ کوئی اکیلی تصویر نہیں ہے۔ یہ اس سرکاری چوکھٹے میں نہیں سما پائیگی۔ میرے شناختی کارڈ کا چوکھٹا بہت چھوٹا ہے" خالد بولا

تمہاری وفاداری افسر کی تصدیق سے ثابت ہو جائے گی" تیاگی نے تردید کی۔ "وہ چوکھٹے کا پاسبان ہے۔ اپنی عطا کردہ متعین حدود میں میری تصویر چاہتا ہے"

خالد نے وہ کارڈ اسے دکھایا۔

"خالد میاں! بڑی تصویر سے بھی کام چل سکتا ہے" تیاگی نے صراحت کی

"نہیں نہیں، چوکھٹے میں سمانا ضروری ہے مسٹر تیاگی، میں اپنی وفاداری کسی صورت بھی مشکوک نہیں بنانا چاہتا۔"

"جو ڈیوٹی پر نہیں پہونچے گا۔ وہ فسادیوں میں شامل سمجھا جائیگا۔ خالد نے وضاحت کی

"جب دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم ہو تو ڈیوٹی کیسی۔" تیاگی بولا۔

"ہمارا شناختی کارڈ ڈیوٹی پر پہنچائے گا۔ اس لئے کہتا ہوں اس شناختی کارڈ کو مکمل کرادو"۔

"تصویر کا انتظام ہو جائیگا" تیاگی نے تکرار سے بچنے کی کوشش کی

کہیں کھنچوانا پڑیگا۔ کہیں سے لانا پڑیگا۔ خالد خودکلامی کے انداز میں بڑبڑاتا رہا۔

"کون سے مکان کا در کھلا ہے؟ کون سی دوکان کھلی ہے؟ تیاگی نے پوچھا

"تو یہ پرانی تصویر اس کارڈ پر لگالو۔ بے فکری کے زمانہ کی تصویر۔ جوانی کا دم خم لئے۔ دیکھو مسکراہٹ شخصیت کا نکھار بن گئی ہے۔ خوف و ہراس کا چہرہ پر کوئی شائبہ نہیں۔ تیاگی یار۔! افسر اس کی تصدیق نہیں کریگا"

"کرے گا مسٹر خالد، کیسے نہیں کریگا۔ تمہاری پہچان اس میں مکمل ہے۔"

"ایک کرمچاری کی فوٹو دیکھکر افسر نے کہا تھا یہ بردکھاوے والی فوٹو کہاں سے

لائے ہو؟ پولس والے اتنے فرق پر دھر پکڑیں گے۔"
"صاحب! یہ چوکھٹے میں فٹ ہو گئی ہے"
"ایسی بھرتی کی فوٹو شناختی کارڈ میں نہیں لگتی۔۔۔"
"پھر اچھی فوٹو کیلئے کیمرہ بھراؤ۔ دلدار فوٹو گرافر کو بلاؤ"
"جب تک مسجد مندر کا مسئلہ طے نہ ہوگا۔ دلدار فوٹو گرافر کہاں ملے گا۔ وہ بھی کسی تہ خانہ میں چھپا ہوگا۔"
"جانتے نہیں ہو رام کا نام لینا گناہ ہو گیا ہے" تیاگی بولا۔
"کیا بکتے ہو۔ آج وی آئی سنگھ ٹی وی پر رام کا نام لے رہے تھے" خالد نے بتایا۔
"انھوں نے جے شری رام کہا؟"
"اس کے کیا معنی۔۔۔؟ خالد نے پوچھا۔
"مطلب وہ چوکھٹے میں نہیں سما رہے ہیں" تیاگی بولا۔
"اشومیدھ یگیہ کے گھوڑوں نے سیماؤں کو توڑ دیا ہے۔ ہر طرف ہاہاکار ہے۔ منہ زور گھوڑے کا رُخ بدلنے کیلئے سب پر تول رہے ہیں۔ بہار کے یادو جی بھی زور مار رہے ہیں" تیاگی نے خالد کو بتایا۔
"کیسے کہتے ہو۔ ڈیسائی جی کہہ رہے ہیں۔ اس رتھ کو سومناتھ دیوتا کا آشیرواد نہیں پراپت ہے۔ وہ کہتے ہیں سومناتھ مندر کے احاطہ والی مسجد میں اذان ہو رہی ہے۔ اور یہاں ہر سو اذانیں بند ہیں، ایک بے معنی سی مسکراہٹ خالد کے ہونٹوں پر آئی۔
"چھوڑو ان وسوسوں کو، سورج دیوتا اس کا فیصلہ کر دیں گے۔ چلو سوؤ۔ تیاگی نے دلاسا دیا۔
"ساری سرحدوں پر پہرے والے بیٹھے ہیں۔ یہاں ہر پل بھاری ہو رہا ہے۔ تم سورج دیوتا کی بات کر رہے ہو" خالد نے آہستگی سے یہ بات کہی۔
"ارے یار! سورج کا راستہ مسدود نہیں ہے"
"ہوا کو بھی راستہ دے دو۔ کمرہ میں بڑی گھٹن ہو رہی ہے، خالد نے التجا کی۔
"نہیں نہیں۔ اسے بند رہنے دو۔ کوئی بھی جھانک سکتا ہے۔ تیاگی نے سراسیمہ ہو کر کہا۔
"یار تیاگی! انسان کا خون کتنا سستا ہو گیا ہے"
"یار پھر چوکھٹے کے باہر کی تصویر دکھانے لگے۔ اندر کی بات کرو، ہم دونوں کو آفس میں گھس دیتی ہے" تیاگی بولا۔
"یعنی شناختی کارڈ چاہیئے۔ نئی فوٹو چاہیئے"۔ خالد نے کہا۔
"سنگھ صاحب کی تصویر کاٹ کر لگالو۔" تیاگی بولا۔
"یہ تصویر ہم سے بہت بڑی ہے۔ قومی ڈھانچے میں سمانے والی قومی سطح پر پوجی جانے والی"۔ خالد نے بلند آہنگی سے بات کہنے کی کوشش کی۔
"یار اتنا چھوٹا چوکھٹا کیوں بنایا؟"
"کیونکہ ہم اک نفر ہیں۔ ہم بہت چھوٹے ہیں" تیاگی نے جواب دیا۔
"کیا ان سیاسی پارٹیوں کیلئے کوئی چوکھٹا نہیں ہے؟"

"سب اپنی مکمل شناخت رکھتی ہیں۔ ان کا چوکھٹا ہمالیہ اور راس کماری کے بیچ بنتا ہے۔ تمہارا کیا۔ تم تو پدی ہو" تیاگی بولا۔
"یعنی ہمارا چوکھٹا فرقہ واریت۔ تنگ نظری اور بھید بھاؤ جیسا چھوٹا ہے۔ بڑی مشکل میں جان پڑی ہے۔ جھگڑے نے ہماری ففس کو کتنا مجروح کر دیا ہے" خالد بڑبڑایا۔
"ارے کیا بکتے ہو۔ ہم لوگ فٹ ہیں۔ بس ذرا کرفیو نے معاملہ گڑبڑ کر دیا ہے" تیاگی نے جھلا کر کہا۔
"ففس صحیح ہونی چاہیئے۔ ورنہ ہماری طرح تمہیں بھی پولس کے ڈنڈے کھانے پڑیں گے"۔ خالد بولا۔
"اٹھو۔ پرانی فوٹو سے کام نکالا جائے" اس نے تیاگی کے منہ سے چادر ہٹائی۔
"یار بور نہ کرو،" تیاگی بولا۔
"تشخص کا مسئلہ رات میں نہ جانے کتنے خواب دکھائے گا۔" خالد پھر بڑبڑایا۔
"اس فوٹو کو کاٹ چھانٹ کر ٹھیک کرو۔" خالد نے تیاگی کو البم سے ایک فوٹو نکال کر دکھائی۔ دونوں دوستوں نے کھڑے ہو کر فوٹو کھنچوائی تھی۔ "یہ یادگار فوٹو ہے۔ اس کو کیسے کاٹو گے۔ اس کو کاٹنے کی ہمت ہے؟۔ یار طبیعت نہیں کرتی۔ پکی دوستی کی انمول یادگار ہے۔ اچھا لو اسے کاٹ چھانٹ کر ٹھیک کرو" تیاگی نے سلائی مشین پر رکھی بڑی قینچی اٹھا کر اسے تھما دی۔
"افسر ٹوک دیگا۔ وہ اصل چوکھٹے کا نگہبان ہے۔ نیا بھارت نئے چوکھٹے کا طالب ہے۔ وفاداری سب کی مشکوک ہے" یہ کہتے ہوئے خالد نے قینچی لے لی۔
"اس نے فوٹو کو کئی زاویوں سے دیکھا۔ اور جلدی سے اپنی فوٹو کاٹ ڈالی۔ دونوں کو الگ الگ دیکھا۔ اسے بڑا عجیب سا لگا۔ دونوں وجود الگ الگ دو ٹوٹی پتنگ کی طرح لگ رہی تھیں۔ اس نے اپنی تصویر کا ملان بار بار تیاگی کی تصویر سے کیا پھر اس نے اپنا دھڑ کاٹ دیا۔ بس چہرہ باقی رہ گیا۔ اس نے دائیں کاٹا۔ بائیں چھانٹا۔ پھر بھی وہ چوکھٹے میں نہ سما سکا۔ وہ دائیں بائیں اوپر نیچے کاٹتا چھانٹتا چلا گیا۔ اس کی فوٹو بے تکی ہو گئی۔ اس کا وجود چھوٹا ہوتا گیا۔ اس کی شخصیت کا وقار غائب ہو گیا۔ اس نے گردن کے بجائے بال کاٹے وہ سر منڈا ہو گیا۔ ٹائی کی گانٹھ کاٹی۔ اس کی گردن غائب ہو گئی۔ اس کے سامنے صرف چہرہ باقی رہ گیا۔ جس پر آنکھیں تھیں،۔ ہونٹ ناک اور کان تھے۔ اس کا پورا دھڑ غائب تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے قینچی چلائی۔ تیاگی ہاں ہاں کہتا رہ گیا تب تک خالد نے اپنی تصویر کے پرزے پرزے کر دیئے اس نے۔ قینچی، فوٹو پھینک کر سر سے پیر تک چادر تان لی۔
تیاگی نے دھڑ اٹھایا۔ وہ بے گردن کے تھا۔ اس نے گردن ڈھونڈنی چاہی۔ ایک اسے بالوں کا ٹکڑا ملا۔ اف۔ کیا بے ڈھنگی چیز ہے۔ اسے کان کی کترن ملی اسکو کہاں لگاؤں۔ اس نے اسے کنارے رکھا۔ وہ نیچے اندھیرے میں خالد کی وہ فوٹو کے مزید ٹکڑے تلاش کرنے لگا۔ اسے چہرہ ملا جو بیچ سے ادھ کٹا تھا۔ یہ اور بدنما لگ رہا تھا۔ دوسرا ٹکڑا مل گیا۔ اس نے چہرے کو جوڑ کر خوشی محسوس کی۔

پھر بھی گردن ناپید تھی۔ وہ دھڑ کو کیسے جوڑے ؟ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ ان ٹکڑوں کو جوڑنے میں بڑی دیر تک پریشان رہا۔ گردن بھی کیا چیز ہے۔ کٹ جائے تو کوئی اسے کیسے جوڑے۔ اس نے اپنی تصویر بالمقابل رکھی۔ وہ مسلم تھی۔ خالد ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر چکا تھا۔ اس نے اپنی گردن کو انگلی سے چھپا کر دیکھا۔ اسے اپنا وجود بھی ادھ کٹا لگا۔ اس نے اندھیرے میں پھر ٹٹولنا شروع کیا۔ تلاش بسیار کے بعد بھی اسے نہ پا سکا۔ اس نے بغل میں دیکھا چادر تانے ہوئے خالد ایک لاشہ نظر آیا۔ منہ۔ وہ بھی اس کی بغل میں لیٹ گیا۔

اچانک خالد کو کچھ شور سنائی دیا۔ اس نے منہ سے چادر ہٹا کر کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ شور ادھر ہی بڑھتا آرہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کھڑکی کھولی۔ گردن باہر نکالی۔ اندھیرے میں سڑک سنسان تھی۔ شہر کے آسمان پر سرخ روشنی کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ آسمان کو گھورنے لگا۔ اچانک کسی نے اس کی گردن پکڑی۔ اس کی چیخ پر تیاگی نے اس کی کمر پکڑ لی۔ جو اس کے پیچھے چپکے سے آکر کھڑا ہوا تھا۔ خالد مال پر فمال بنا کھینچا تانی میں پھنسا ہوا تھا۔ تیاگی کی پکڑ سخت تھی۔ نہ جانے کہاں سے اس کے سر پر ایک ضرب پڑی۔ اس کی گرفت سے خالد چھوٹ گیا۔ اس نے بڑی تیزی سے دروازہ کو اندر سے بند کر کے تالا لگایا۔ کمرہ میں آواز گونجی۔

"یہ پنڈت بڑا وفادار بنتا ہے۔ اس کی بھی خبر لینی پڑے گی۔"

تیاگی نے چوٹ کی جگہ کو دبا لیا۔ جہاں ایک گولا سا ابھر آیا تھا۔ خود کو سنبھالتے اسے غش آنے لگا۔ خالد کا آدھا دھڑ اندر تھا آدھا اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ اندھیرا بہت تھا۔ ❖ ❖

پان والا

منصور رضا

'پان والا'--- ہر شام ساڑھے پانچ بجے گرمیوں میں اور تقریباً چار بجے سردیوں میں یہ آواز گلی میں ضرور ابھرتی ہے۔ سڑی گرمی جس میں نانی اماں کہتی ہیں کہ چیل بھی انڈا چھوڑ دیتی ہے اور ہماری گلی میں بھی کوئی آدم زاد نظر نہیں آتا ہے یا موسم سرما جس میں تمام دن کی مزیدار سینک والی دھوپ کے بعد ہلکی بہت مناسب خنکی جو محض شام کی آمد کا احساس پیدا کر رہی ہوتی ہے--- تو اس وقت یہ آواز--- آواز جس میں ایک گھرج ہے اور پان کے نون پر زور ڈالنے کے بعد دوسرا نون' نون غناں میں تبدیل ہو جاتا ہے--- ہر روز گرمیوں میں ساڑھے پانچ بجے اور سردیوں میں چار بجے۔ یہ آواز ضرور ابھرتی ہے۔ میں نے کبھی اس صدا میں ناغہ نہیں پایا اور ہماری گلی میں یہ صدا تین وقت سنائی دیتی ہے۔ پہلے گلی کے شروع میں۔ دور سے آتی ہوئی۔ پھر گلی کے وسط میں بجلی کے کھمبے کے پاس۔ یہ وہی کھمبا ہے جہاں صبح کے وقت ماسیوں کی میٹنگ ہوتی ہے۔ اس میٹنگ میں کیا ہوتا ہے کچھ پتہ نہیں۔ بس ہر صبح ہوتی ہے۔ مجھے یہ عمل یوں لگتا ہے جیسے دفتر میں حاضری کے وقت عین رجسٹر کے پاس ہم لوگوں کی خیر سگالی کی میٹنگ ہوتی ہے' اور میں کہہ رہا تھا--- اچھا مجھے ذرا معاف کر دیجئے گا کیونکہ جب میں ادھر ادھر کی تفصیلات میں بھٹک جاؤں اس لیئے کہ میں نے اس سارے واقعے کو یوں ہی محسوس کیا ہے--- اور تیسری آواز دور ہوتی ہوئی--- گلی کے آخر میں لگے نیم کے پیڑ کے نیچے۔

پان والا' کی صدا خاں صاحب لگایا کرتے ہیں۔ خاں صاحب بہت ٹھسے کے آدمی ہیں۔ سفید براق کرتا اور اتنا ہی سفید پاجامہ۔ سراب کی بائیسکل۔ پیچھے اسٹینڈ پر رکھا ہوا بانس کی کھپچیوں کا بنا ہوا ٹوکرا اور اس میں تہوں میں لپٹے ہوئے بنگلہ اور سانچی پان۔ سفید ململ کی اوپر والی ہلکی نم تہہ میں بنگلا اور نیچے والی تہہ میں سلیقے سے لپٹا ہوا سانچی۔ خاں صاحب کی لمبی مخروطی انگلیاں انتہائی نزاکت سے تہوں کو کھولتیں۔ ویسے کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اوپر والی تہہ میں بنگلا کیوں ہوتا ہے اور نیچے کی تہہ میں سانچی۔ لیکن مجھے تو اور بھی بہت ساری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ مثلاً یہ کہ خان صاحب جو اس قدر نفیس طبیعت آدمی ہیں تو وہ پان کیوں بیچتے ہیں کوئی اور قابل عزت دھندا کیوں نہیں کرتے۔ کونے والا بنگالی جو پان کا کھوکھا چلاتا ہے اس کو دو دفعہ پولیس لے جا چکی ہے اور وہ بھتہ دے کر باہر آیا ہے تو کیا خاں صاحب بھی بھتہ دیتے ہیں۔ دل نہیں مانتا۔

خاں صاحب کی شخصیت کی دو باتیں بہت توجہ طلب ہیں۔ ایک تو ان کے جسم کی ساخت۔ انتہائی چھریرے بدن کے مالک۔ ان کا رامپوری پٹھانوں جیسا چہرہ اور اس پر مستزاد ان کی گھنی مونچھیں۔ پھر ان کا کرخت گھرج دار آواز میں صدا لگانا--- پان۔ ن۔ والا۔ کبھی کبھی اماں کہتی تھیں۔ 'کھنڈرات بتاتے ہیں عمارت حسین ہوگی' اور پھر یہ کہنے کے بعد خود ہی دیر تک خاموش رہتی تھیں جیسے کبھی بھری محفل میں آپ کے منہ سے کوئی غلط جملہ نکل جائے تو آپ دیر تک خاموش رہتے ہیں اس لیئے نہیں کہ جملہ غلط ہوتا ہے بلکہ اس لیئے کہ دوسروں نے سنا کیوں اور ویسے بھی غلط اور صحیح تو کوئی چیز نہیں ہوتی وقت کے سامنے--- اور دوسری بات وقت کی پابندی۔ آپ گھڑی ملالیں۔ ادھر خاں صاحب نے کہا "پان والا" اور ادھر دیوار میں لگی گھڑی نے ہلکی سی آواز میں لبیک کہا' اور ساتھ ہی نانی اماں نے مجھے نوٹ پکڑایا۔ بیٹا ایک چھٹاک سانچی تو لے آ۔ کبھی کبھی مجھے غصہ آجاتا تھا۔ ادھر میں کوئی کام لے کر بیٹھا ادھر باہر سے صدا آئی اور پھر نانی اماں نے کہا 'بیٹا ذرا....' اور گھڑی کی ہلکی سے کھنکار۔ یوں لگتا تھا جیسے گھڑی اور نانی اماں دونوں خاں صاحب کا انتظار کر رہے تھے اور اب تینوں میرے ہوتے ہوئے کاموں کو روکنے کے لیئے کوئی ملی بھگت کر بیٹھے ہوں۔

خاں صاحب خوددار بھی بہت ہیں۔ مجال ہے جو کبھی ایک روپیہ زیادہ بھی لے لیں یا ناراضگی میں بھی حساب میں کوئی گڑبڑ کر دیں۔ الٹا احسان کرنے کی فکر میں ہی لگے رہتے ہیں۔ کبھی نانی اماں کے پاس کھلے پیسے نہ ہوتے تو وہ مجھے اپنے کانپتے ہاتھوں سے سو روپے کا نوٹ دیا کرتیں۔ اب خاں صاحب کی کوشش یہ ہوتی کہ مجھ سے پیسے نہ لیں۔ کوئی بات نہیں بیٹا' کل دے دینا۔ اور آواز میں کسی ریٹائرڈ فوجی کا تحکم یعنی مزید اصرار کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور جب میں ایک چھٹاک پان اور سو روپے کا نوٹ نانی اماں کو واپس کرتا تو سوتے

کے دندانوں کے بیچ چھالیہ کو گلو نین کرتے ہوئے کہتیں "کسی اچھے خاندان کے لگتے ہیں۔ پتہ نہیں کیا آفتاد آن پڑی۔ ان موئے حالات نے تو سیدوں کو کہیں کا نہیں چھوڑا" اور دو نیم ہوا چھالیہ کا ڈلا اپنے بکھرے وجود کے ساتھ پاندان کے تھال میں جاگرتا اور نانی اماں کو یوں دیکھتا جیسے پتہ نہیں نانی اماں نے کیا کہہ دیا ہو۔

خاں صاحب بہت کم گو بھی ہیں۔ ایک دفعہ میں نے ایسے ہی کہہ دیا کہ خاں صاحب آپ کبھی چھٹی کیوں نہیں کرتے۔ ایک آدھ دن آرام کرلیا کریں۔ یہ کیا کہ ہڑتال ہو' بارش ہو' لو چل رہی ہو آپ اپنی سائیکل پر..... تو کہنے لگے 'بیٹے کا آخری سال ہے۔ پڑھ لے گا تو آنا چھوڑ دوں گا' اور اس دن مجھے یوں لگا کہ ہم بہت ساری چیزوں کے بن کہے عادی ہوجاتے ہیں۔ خاں صاحب کے جملے کا آخری حصہ ' میں آنا چھوڑدوں گا' مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے گھر میں نانی اماں نہ رہیں گی۔ ابا نانی کے ہاتھ کا لگا پان نہیں کھائیں گے۔ گھڑی ساڑھے پانچ کا اشارہ نہ دے گی۔ میں نے خاں صاحب سے پھر پوچھا کہ آپ کا بیٹا کیا پڑھ رہا ہے' تو مختصر مگر انتہائی صاف زبان میں جواب ملا' بی کام فائنل ائر میں ہے۔ یہ کہہ کر سائیکل کو پیڈل مارا اور گلی کے کونے پر پہنچ کر آخری صدا لگائی ' پان والا' میں نے گھر واپس داخل ہوتے ہوئے سوچا کہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا خاں صاحب کا بیٹا بی کام بھی کرے اور خاں صاحب پان بھی بیچتے رہیں چاہے صرف ہماری گلی میں اور اپنے اس بچکانے خیال پر خود ہی ہنس پڑا۔

ہمارا گھر چونکہ ڈسٹرکٹ سنٹرل میں ہے اس لیئے ہڑتال کے دن عموماً بہت بھاری پڑتے ہیں۔ سارا دن گھر میں بور ہوتے رہو ٹی وی دیکھو۔ کھانا کھاؤ اور سوجاؤ۔ سڑک پر ایسا سناٹا جیسے محرم کی دسویں ہو۔ بس لے دے کر ایک شام کا اخبار اور دوسرے خاں صاحب ہماری گلی کی رونق ہوا کرتے ہیں۔ تو ایسے لگتا ہے جیسے پورے شہر نے ہمارا بائیکاٹ کر رکھا ہو۔ لیکن اس دن تو کچھ زیادہ ہی سناٹا تھا۔ ٹیلیفون پر بھی بری بری خبریں آرہی تھیں۔ بنارس کالونی کا محاصرہ ہوگیا ہے' لیاقت آباد تھانے پر راکٹ لانچر سے حملہ ہوگیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ نانی اماں تو بولائی بولائی پھر رہی تھیں۔ اللہ سب کے دل کو ٹھنڈا رکھے۔ مالک کسی کو اولاد کا غم نے دیجیو۔ سب کو اپنی امان میں رکھیو۔ یا علی مشکل کشا۔ سب کی مشکل کو آسان کر۔' پھر ای کو مخاطب کرکے کہتیں۔ آج کل کے لڑکوں کے سروں پر تو خون سوار ہے۔ یہ نسیم--- وہی میمن کا لڑکا ہاتھ میں پستول لیئے گھومتا ہے۔ اور وہ کونے والے درزیوں کا بیٹا میں نے خود دیکھا بندوق کندھے پر لٹکائے مدراسیوں کی دیوار پر نعرے لکھ رہا تھا۔ نانی اماں کو بھی پورے محلے کی خبر ہوتی ہے۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ--- بس خالہ بوا نے بتایا کہ رینجرز کی گاڑیاں نسیم کے چکر میں آکر گلی کے کونے پر کھڑی ہوگئی ہیں۔ نسیم کافی عرصے سے روپوش تھا مگر آج اس کی بہن کی شادی ہے۔ شاید اسی لیئے رینجرز کی گاڑیاں--- خدا جانے--- مگر مجھے اسی وقت سے کچھ بے کلی کا احساس ہو رہا تھا۔ اور طبیعت میں بھی ایک بھاری پن در آیا تھا۔ پھر ساڑھے پانچ بجے یکایک سناٹے کو چیرتی ہوئی صدا ابھری ' پان۔ن۔ والا' ادھر نانی اماں نے گلے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ گھڑی نے اپنا فرض پورا کیا اور ادھر دو مسلسل فائر ہوئے۔

نانی اماں ناد علی کا ورد اٹھایا۔ اماں یا علی مشکل کشا کہا۔ ابا نے مجھے باہر جاتے دیکھ کر گھور کر دیکھا اور میں واپس کرسی میں دھنس گیا۔ مجھے ابھی تک خاں صاحب کی دوسری صدا نہیں آئی تھی۔ تھوڑی دیر میں بھاگ دوڑ کی صدائیں بلند ہوئیں تو سب اپنے اپنے گھروں سے نکلنا شروع ہوئے۔ بس جو کچھ دیکھا وہ بہت تکلیف دہ تھا۔ خاں صاحب کے سفید کرتا خون میں بھیگا ہوا تھا۔ گلے سے ہلکی ہلکی خرخراہٹ کی آواز میں نکل رہی تھیں۔ محلے کے 'معززین' ایک دائرے میں خاں صاحب کے آخری سفر کا دیدار کر رہے تھے مگر فاصلے سے۔ اور آوازیں ناگوار صوتی اثرات پیش کر رہی تھیں۔ بے گناہ ہی مارے جاتے ہیں۔ بیچارے خاں صاحب۔ سید علی کو فون کرو۔ اب پان کون دے گا۔

خاں صاحب کی لاش پولیس اٹھا کر لے گئی۔ خون بھی صاف ہوگیا اور رات گئے تک ہر گھر میں خاں صاحب کی موت موضوع گفتگو بنی رہی۔ وہ رات کس طرح شروع ہوئی اور اگلا سورج کب طلوع ہوا کچھ پتہ نہیں۔ بس افسوس کی ہلکی ہلکی چادر ہم سب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے دھیرے دھیرے وقت کے روش پر پرواز کرتی رہی۔ نانی اماں کو یہ فکر کہ اب پان کہاں سے آئے گا اور خاں صاحب کی ناگہانی موت کا غم بھی۔ غرض عجیب مشکل تھی۔ لیکن پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ نجانے کس وقت میں ہلکی ہلکی غنودگی میں تھا۔ ایک گھرج دار آواز جس میں کچا پن بھی تھا ابھری پان۔ ن۔ والا' میں نے بے یقینی کے عالم میں گھڑی کی طرف دیکھا تو ساڑھے پانچ بجے کی ہلکی ہلکی سی ٹک ٹک ہوئی' ادھر دادی اماں نے گلے سے روپے کا نوٹ نکالا۔ باہر نکل کر دیکھا تو بالکل خاں صاحب کی شکل۔ وہی چہرہ۔ ویسی ہی مونچھیں۔ چہرے پر حالات نا آشنا معصومیت اور کچا پن۔ اور آج عثمانی صاحب نجانے کہاں تھے کیونکہ ان کی لڑکی پان لے رہی تھی۔ پھر گلی کے آخر میں دور جاتی ہوئی آواز۔' پان۔ن۔ والا' اور مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے نکلنے والی مولوی کی آواز ' پان۔ ن۔ والا' کی صدا کو دبا رہی تھی کہ بے شک ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹ جاتی ہے۔۔ ❖ ❖

نہی رضوان' ترجمہ : مسعود اشعر

وہ پورے جسم کا زور لگا کر آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتی ہے۔ بڑی مشکل سے دونوں پلکیں ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے۔ اس کی ادھ کھلی آنکھیں کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بھٹکتی ہیں اور پھر بند ہو جاتی ہیں۔ کمرے کی ہر چیز چغلی کھا رہی ہے کہ اس نے یہ کمرہ پہلے بھی دیکھا ہے۔ کھڑکی پر پڑے زردی مائل بھورے پردے' قد آدم آئینہ اور لکڑی کی وارڈروب جس پر نہایت بھدے نقش و نگار بنے ہیں' یہ سب چیزیں اسے اجنبی معلوم نہیں ہوتیں۔ وہ بند آنکھیں پھر کھولنے کی کوشش کرتی ہے۔ ابھی وہ پوری طرح آنکھیں کھولنے بھی نہیں پاتی کہ ایک دم گھبرا جاتی ہے۔ دو آنکھیں اسے دیکھ رہی ہیں۔ اسے یہ محسوس کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے کہ یہ اس کی اپنی آنکھیں ہیں۔ وہ آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھ رہی ہے۔ اور بستر پر جو ننگا جسم پڑا ہے وہ اس کا اپنا جسم ہے۔

یونہی پڑے پڑے وہ کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ بستر کی چادر پر بڑی محنت سے کشیدہ کاری کی گئی ہے۔ وہ اسے غور سے دیکھتی رہتی ہے۔ چادر پر سے ہوتی اس کی نظر اس جسم پر جاتی ہے جو اس کے پہلو میں پڑا ہے۔ وہ اسے دیکھتی ہے اور جلدی سے دوبارہ آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ گہرے گہرے سانس لیتی ہے اور پھر سونے کی کوشش کرنے لگتی ہے۔ اب اس کے اندر متلی کا ایک طوفان زور مارتا ہے جو پیٹ سے اٹھ کر حلق تک ابھرتا چلا جاتا ہے۔ وہ زور سے آنکھیں میچتی ہے تو رات کے سارے واقعات اس کی بند آنکھوں میں پھرنے لگتے ہیں۔ اب اسے احساس ہوتا ہے کہ نیند ٹوٹتے ہی اس پر کپکپی کیوں طاری ہو گئی تھی۔ اس کی بند آنکھوں میں پھرنے والے مناظر پر وہی مرد چھایا ہوا ہے جو اس کے پہلو میں لیٹا نہایت ناگواری کے ساتھ لمبے لمبے سانس لے رہا ہے۔ تو کیا واقعی رات کچھ ہوا تھا؟ مگر اس نے اپنے ساتھ زیادتی کیوں ہونے دی تھی؟ اس نے اس آدمی کو اس کی اجازت کیوں دی تھی؟ اس نے مزاحمت کیوں نہیں کی تھی؟ مقابلہ کیوں نہیں کیا تھا؟ وہ مدد کے لیئے کسی کو پکار تو سکتی تھی' وہ چیخ تو مار سکتی تھی۔ اس نے چیخیں ماری تھیں۔ لیکن کیا اس کی وہ چیخیں کسی نے سنی بھی تھیں؟ اسے بالکل یاد نہیں۔

پھر وہ ان بچوں کو دیکھتی ہے جنھوں نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اسے بستر کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ انھوں نے اس کی کلائیوں' پنڈلیوں حتیٰ کہ اس کی گردن کو بھی ریشمی ڈوریوں سے باندھا تھا۔ جب وہ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اسے بستر کے ساتھ باندھ رہے تھے تو اس نے ان کے پیارے پیارے چہرے دیکھے تھے وہ مسکرا رہے تھے۔ ہنس رہے تھے وہ۔

وہ دونوں ہونٹ بھینچ کر اندر سے اٹھنے والی قے کو پھر روکتی ہے۔ وہ زور سے منہ بند کرتی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ کمرے کی مسموم ہوا اس کے پھیپھڑوں میں جائے۔ اس نے اپنا ہاتھ بھی منہ پر رکھ لیا ہے۔ متلی شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اس کے اندر کی ہر چیز باہر نکلی جا رہی ہے۔ اس کا سارا وجود جسم کے پنجرے سے باہر نکلا آ رہا ہے۔

پھر اسے لگا جیسے کوئی اس کے سر میں کھٹ کھٹ کر رہا ہے۔ کوئی اس کے سر پر ہتھوڑے مار رہا ہے۔ اس کا سر پھٹا جا رہا ہے۔ کھٹ کھٹ اس کی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔ اب وہ نہیں سو سکتی۔ بالکل نہیں سو سکتی۔ وہ آنکھیں کھول دیتی ہے۔ کوئی کمرے کے دروازے پر آہستہ آہستہ کھٹ کھٹ کر رہا ہے۔ کوئی دروازے پر ہے۔ وہ سر اٹھاتی ہے' اٹھ کر بیٹھتی ہے۔ پاؤں پلنگ سے نیچے اتار کر پیروں سے ہی جوتے تلاش کرتی ہے۔ جوتے نہیں ملتے۔ دروازہ کی طرف جانے سے پہلے وہ اپنے ننگے بدن کو چادر میں لپیٹتی ہے۔

دروازہ کھولتے ہی وہ بت بن جاتی ہے۔ ایک چھوٹا سا لڑکا ڈری ڈری نظروں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ اس کا ننھا سا ہاتھ دروازہ پہ دستک دینے کے لیئے اٹھا ہوا ہے جیسے وہ پھر دستک دینا چاہ رہا ہو۔ کیا وہ ابھی خواب میں ہے؟ وہ رات والا خواب ہی دیکھ رہی ہے؟ ننگے پیروں کو چھوتا ٹھنڈا فرش اسے بتاتا ہے کہ نہیں' وہ جاگ رہی ہے۔ لیکن وہ خوب جانتی ہے کہ اس کے سامنے جو بچہ کھڑا ہے وہ بھی ان بچوں میں شامل تھا جنھوں نے اسے بستر کے ساتھ باندھا تھا۔ اسی معصوم مسکراہٹ کے ساتھ اس نے باندھا تھا جو اس وقت بھی اس کے ننھے منے ہونٹوں پر کھیل رہی ہے۔

"صباح الخیر۔ آپ کو کیا ہوا؟ آپ ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟"

وہ کوئی جواب نہیں دیتی۔ بچہ کمرے کے اندر آ جاتا ہے۔ "میں تو ابو سے یہ کہنے آیا تھا کہ آج اسکول کے لیئے مجھے زیادہ پیسے چاہئیں۔"

❖ ❖

پال گومرا کا اسکوٹر

اودے پرکاش ترجمہ : حیدر جعفری سید

ہندی کوی پال گومرا نے اسکوٹر خریدنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ابھی سال دو سال پہلے کی بات ہے۔ وہ اتر پردیش کے غازی آباد کی کوی نگر نامی کالونی میں رہتے تھے اور دلی کے آئی۔ ٹی۔ او پل کے پاس بہادر شاہ ظفر روڈ پر واقع ایک قومی روزنامے کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ ان کی عمر پینتالیس پار کر رہی تھی۔ وزن پچھلے چار پانچ برسوں میں اچانک بڑھ گیا تھا۔ کمر کے ارد گرد، گردن اور کندھوں پر چربی جمع ہو گئی تھی۔ پیٹ نکل آیا تھا، جسے وہ 'فراڈ' مانتے تھے کیونکہ ان کی خوراک در اصل بہت کم تھی۔ مکھن، دودھ، گوشت، آئس کریم، چاکلیٹ وغیرہ فیٹ پیدا کرنے والی چیزیں وہ کھاتے نہیں تھے۔ روٹی اور آلو ان کا روز مرہ کا لنچ تھا۔ اس کے باوجود وہ موٹے، گول اور گنجے ہو رہے تھے۔

پال گومرا کوی تھے، ہندی بھاشا کے کوی، ان کے نام سے ضرور ایسا لگتا تھا کہ وہ لاطینی امریکی یا کسی افریقی ملک کے شاعر ہوں گے۔ یا پھر ریمو فرنانڈیز، مناشا الیو قرق، اپاجی انڈین کی طرح ان کا نسلی سلسلہ ماضی بعید میں کسی غیر ہندوستانی نسل سے وابستہ ہو گا لیکن حقیقت یہ نہیں تھی۔

جب وہ اپنا نام کسی کو بتاتے تو وہ دیر تک انھیں دیکھتا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ جیسے آلو، تمباکو، مرچ یا امرود برازیل اور پیرو سے پرتگالیوں کی بدولت بھارت تک پہنچے تھے اور یہاں کی مٹی اور آب و ہوا نے انھیں اپنا بنا لیا، اسی طرح پال گومرا کا نسلی سلسلہ بھی جنوبی افریقہ یا کیوبا سے، ان کے نامعلوم آباء و اجداد کے ساتھ چل کر یہاں تک پہنچا ہو گا اور بالآخر وہ راجدھانی کی سرحد پر غازی آباد نامی شہر میں مستقل طور پر آباد ہو گئے ہوں گے۔ یا کیا معلوم وہ مغرب سے نہیں بلکہ ناریل کی طرح جنوب مشرق کی جانب سے آئے ہوں۔ ملیشیا، انڈونیشیا یا جاوا سماترا سے۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ وہ کاغذ کی طرح چین سے ترکی۔ ایران ہوتے ہوئے بھارت پہنچے ہوں۔ یہ امکان بھی تھا کہ وہ کہیں اور پیدا ہو کر کہیں اور سے ہوتے ہوئے کوی نگر، غازی آباد تک پہنچے ہوں۔

""آپ کا 'اوریجن' کیا ہے؟ مطلب، آپ کے آباء و اجداد کا کہاں سے آنا ہوا؟" ان سے اکثر پوچھا جاتا "شکل صورت سے تو آپ غیر ملکی نہیں لگتے؟""

"میں ہی ہوں!" پال گومرا کہتے، پھر ہنستے، پھر تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ سوال کرنے والے سے پوچھتے "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ انڈا بھارت میں کس عیسوی سن میں آیا؟ اسے ترک مغل لے آئے تھے یا ولندیزی، انگریز، پرتگالی؟"

وہ سامنے والے کی پریشانی کا جائزہ لیتے پھر سنجیدگی کے ساتھ کہتے "مشہور مورخ فرانسوا برنیر اور آر۔ پام دت کے مطابق سن ۱۴۹۸ عیسوی میں جنوب میں مالا بار کے سمندری ساحل پر واسکو ڈیگاما کے ساتھ آنے والے پرتگالی ماہر نباتات گارسیا دا اورتا پہلی بار انڈا لے کر ہونڈراس سے بھارت آیا۔ اس کے پہلے بھارتی چڑیاں انڈے دینا نہیں جانتی تھیں۔"

حقیقت یہ تھی کہ پال گومرا تو پیدائشی اتر پردیش کے تھے۔ جیسا کہ ہندی کے ہی ایک کوی دھومل نے اپنی ایک کویتا میں لکھا تھا "میں بھاشا میں بھدیس ہوں، اتنا کایر ہوں کہ اتر پردیش ہوں" تو کوی پال گومرا بھی خاص بھدیس (خراب ملک، بھونڈا بھدا) تھے۔ ارہر کی دال، بھات، چوکھا، آم کا اچار، کڑھی، دھنیے کی چٹنی جیسی چیزوں میں ان کے پران بستے تھے۔ وہ بزدل بھی تھے کیونکہ تمام ذلالت کے باوجود وہ گذشتہ بائیس برسوں سے اسی دفتر میں ملازمت کرتے آ رہے تھے جہاں نہ کبھی ان کو کوئی پروموشن ملا تھا، نہ کوئی اعزاز۔

اپنے اصولوں اور نظریات میں وہ انقلاب اور سماجی تبدیلیوں کے زبردست حامی تھے۔ لیکن ملازمت کے معاملے میں وہ اسٹیٹس کوئسٹ STATUS QUOIST تھے۔ جب انھیں محسوس ہوتا کہ ان کی ملازمت پر کوئی آفت نازل ہونے والی ہے تو کئی بار وہ تھر تھراتے، کانپتے، ان۔ جل تیاگ کر دیتے، خاموشی کا برت رکھ لیتے۔ ایک بار ایسے ہی حالات میں انھیں دل کا پہلا ہلکا حملہ (مائلڈ ہارٹ اٹیک) ہو چکا تھا۔

ایک بار تو وہ ملازمت چھوٹ جانے کے اندیشے میں، غازی آباد سے میرٹھ جانے والی سڑک کے قریب کسی بارہ فٹ گہرے گڈھے میں، آدھی رات کے وقت خود کلامی کرتے ہوئے اور گڈھے کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے پائے گئے تھے۔

یہ بات نہیں تھی کہ وہ ناکارہ یا نااہل تھے۔ وہ بے حد محنتی تھے۔ پروف ریڈنگ، سبنگ اور لے آؤٹ کا کام بھوت کی طرح کرتے تھے۔ تاریخ کا انھیں لامحدود علم تھا لیکن حال ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بہت لگن سے یکسو ہو کر وہ

کا بے بگا بے حال کو سمجھنے کی کوشش کرتے، اس وقت تک وہ بدل جاتا تھا۔ خصوصاً پچھلے دس برسوں میں تو دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا بدل گئی تھی۔ ان کا اخبار مونو پرنٹنگ کی تاریخ سے نکل کر، فوٹو کمپوزنگ سے ہوتا ہوا اب مکمل طور پہ کمپیوٹرائزڈ ہو چکا تھا۔ سیٹلائٹ کمیونکیشن سے صفحے کے صفحے پلک جھپکتے میں دلی سے بمبئی اور احمد آباد پہنچ جاتے، موٹے لینس کا چشمہ آنکھوں پر چڑھائے چمٹی سے ٹائپ فیس چن چن کر ایک ایک حرف، ماترا اور لفظ بنانے والے، بیڑی پھونکتے، کھینی ملتے، بوڑھے کمپوزیٹرس اب نہیں رہ گئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی "جو ہم سے ٹکرائے گا چور چور ہو جائے گا" "لال قلعے پر لال نشان، مانگ رہا ہے ہندوستان!" جیسے نعرے، یونین بازی، دارو نوشی، قہقہے اور ساری مستی غائب ہو گئی تھی۔ ان کی جگہ اب کمپیوٹر اور لیزر پرنٹر پر بیٹھنے والے جینس، پیٹر والے فور کلر سیلری کے جدید ترین کمپوزیٹرس آچکے تھے۔

زمانے کی اس اتھل پتھل آلود سرحد پر کھڑے ہندی کوی پال گومرا حیران وششدر تھے، یوگوسلاویہ، جرمن عوامی جمہوریہ، سوویت یونین جیسے عظیم ممالک اور سپر پاورس کرۂ ارض کے سیاسی نقشے سے غائب ہو چکے تھے۔ سماج واد کا یورپ سے صفایا ہو چکا تھا اور لوگ بے صبری سے ایشیا اور تیسری دنیا سے ان کے غائب ہو جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ بات اگر اتنی ہی ہوتی تو پال گومرا کو اتنی فکر نہ ہوتی۔ وہ دیکھ یہ رہے تھے کہ جتنی تیزی سے مشرقی یورپ میں سماج واد ختم ہوا تھا اتنی ہی تیزی سے دلی سے شائع ہونے والے ہندی رسائل اور اخبارات بھی غائب ہو رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان کیا "کنیکشن" ہے، یہ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

بازار اب سب ہی چیزوں کا نعم البدل بن چکا تھا۔ شہر، گاؤں، قصبے بہت تیزی سے بازار میں بدل رہے تھے۔ ہر گھر دوکان میں تبدیل ہو رہا تھا۔ باپ اپنے بیٹے کو گھر سے اس لیئے نکال کر بھگا رہا تھا کہ وہ بازار میں کہیں فٹ نہیں بیٹھ رہا تھا۔ بیویاں اپنے شوہروں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہی تھیں کیونکہ بازار میں ان کے شوہروں کی کوئی خاص مانگ نہیں تھی۔ "عورت بکاؤ اور مرد کماؤ" کا عظیم دور آگیا تھا۔

ابھی آٹھ مہینے پہلے کشن گنج کے جنتا فلیٹ میں مقیم، سرگنگا رام ہسپتال کے صفائی ملازم رام اوتار آریہ کی سترہ سال کی بیٹی سنیلا راتوں رات مالا مال ہو گئی تھی کیونکہ ٹی۔ وی کے کسی اشتہار میں آٹھ فٹ بائی چار فٹ سائز کے شاندار بلیڈ کے ماڈل پر ننگی سو گئی تھی۔ سنیلا کو اپنے چہرے پر اس برانڈ کے بلیڈ سے ہونے والی شیونگ سے پیدا ہونے والے، چڑیوں کے پر کے لمس جیسے سکھ اور لامحدود لذت کو دس سیکنڈ کے اندر اندر ظاہر کرنا تھا۔ یہ کام اپنے چہرے کے کلوز شاٹ میں اتنی مہارت اور خواب آگیں جذباتیت کے ساتھ کیا تھا کہ ملک کے ایک اہم ترین مصور نے ایک انگریزی اخبار میں بیان دیا تھا کہ وہ ایک ہفتے میں اس اشتہار کو ڈیڑھ سو بار دیکھ چکے ہیں اور اب آنے والے دو برسوں تک وہ مسلسل سنیلا کے "نیوڈس" ہی بنائیں گے۔

اسی طرح بہار کے چھپرا ضلع کے پرائمری اسکول کی ٹیچری کا کام چھوڑ کر اپنے اچکے عاشق کے ساتھ دلی بھاگ آنے والی آشا مشرا نام کی لڑکی "کنٹیسا کلاسک" میں چل رہی تھی۔ اس نے کسی اشتہار میں ایک طاقتور آبنوسی رنگ کے عربی گھوڑے کی کھردری پیٹھ پر بیٹھ کر اپنے ٹرانسپیرنٹ جانگھیے کے اندر سے "دا بلیک ہارس" نامی بیئر کی بوتل نکال کر چھاتیوں میں انڈیل لی تھی اور گھوڑے کی پشت پر بیٹھی بیٹھی، وہ خود بیئر کے جھاگ میں بدل گئی تھی۔ کالے گھوڑے کی کھردری پیٹھ پر صرف آشا مشرا کا جھاگ بچا تھا جو بتدریج بیئر کی برانڈ میں بدل رہا تھا۔

قومی سطح پر میڈیا کے ماہرین اور دیگر دانشوروں کے درمیان اس اشتہار کا کافی ذکر ہوا تھا لیکن اس اشتہار کو بنانے والی "اینڈ کمپنی" نے دعویٰ کیا تھا کہ آشا مشرا کے اندر ویر سے نکلتی ہوئی بیئر کی بوتل کا شاٹ اور چھاتی میں بیئر الٹتے ہی آشا مشرا کے پستانوں کا جھاگ میں تبدیل ہونا اتنا مؤثر ہے کہ اس سے اس نئے برانڈ کی مارکیٹنگ کا ٹیک آف ہی زبردست ہوگا۔ اس اشتہار کے پری ویو سروے کے دوران کمپنی کو معلوم ہوا تھا کہ بیس سیکنڈ کے اس اشتہار کو دیکھتے ہوئے ہر دس میں سے سات مردوں نے جن کی عمریں ۱۵ سے ۶۰ برس تک تھیں، "ماسٹربیٹ" کی خواہش کا اثر تسلیم کیا تھا۔

تو اس طرح اسپین کے بہت زیادہ حقیقت پسند مصور سلوا دور دالی کی گھڑیوں کی طرح گھوڑے کی پشت پر بیٹھی آشا مشرا پگھل کر بیئر کے جھاگ بن گئی تھی اور اپنے دور کی اجتماعی حسیت میں چپ چاپ بہہ گئی تھی۔ نتیجہ یہ کہ ہر ایک کروڑ میں ستر لاکھ ناظرین نے "سیکس کی فیلنگ" اپنے اندر محسوس کی تھی اور "دا بلیک ہارس" بیئر قیاسی تخمینے سے ۲۷ فی صد زیادہ فروخت درج کرا گئی تھی۔

یہ سب کچھ پال گومرا کی آنکھوں کے سامنے ان کے دیکھتے دیکھتے ہو رہا تھا۔ حقیقت مشینی دور سے نکل کر الکٹرانک اور اس کے آگے کے دور میں جاری تھی۔ بچے جادوؤں، پریوں کی کہانیوں اور ڈائنوسار جیسے ماقبل تاریخ جیسے جانوروں کے ساتھ گلی ڈنڈا یا بیس بال کھیل رہے تھے، وہ ہنومان جی، بھیشم پتاما اور کرشن جی کو کیڈبریز کے چاکلیٹ کھلا رہے تھے اور میکڈاویل کا سوڈا ملا رہے تھے۔ سڑک چھاپ غنڈوں اور اچکوں کے پاس ایسے ہتھیار آچکے تھے کہ وہ چند ہی منٹوں میں ملک بھر کے تمام شہروں کی بے شمار عمارتوں کو دھماکوں کے ساتھ اڑا سکتے تھے۔ بھیڑ کو مارنا، سواری گاڑیوں کو اڑانا اور ہوائی جہازوں کا اغوا معمولی لفنگوں کا کھیل ہو گیا تھا۔

پال گومرا کی آنکھ جو دیکھ رہی تھی اور دماغ جو سوچ رہا تھا ان کا درمیانی ربط اور سلسلہ گڑبڑا گئے تھے۔ سیاسی ایرکنڈیشنڈ گاڑیوں میں تیرتھ یاترا کر رہے تھے اور این۔ آر۔ آئی۔ سرمائے اور پیٹرو ڈالروں سے "کار سیوا" کرا رہے تھے۔ بین الاقوامی اسلحہ بازار میں تانترک مختلف قوموں کے درمیان میزائلوں، پن ڈبیوں اور لڑاکا جہازوں کی خرید و فروخت میں دلالی کر رہے تھے۔ چھتیس سال

سے گنڈھے میں گردن تک دھنسے یوگی نے کئی ملکوں کے کئی شہروں میں پانچ ستارہ ہوٹل کھول رکھے تھے اور پچاس سال سے پیڑ کی مچان پر ٹنگے ایک بابا کے پیر کے انگوٹھے کی چھاپ اپنی پیشانی پر لگوانے کے لیئے دنیا کے سب سے بڑے جمہوریہ کی تمام کابینہ قطار بنا کر کیچڑ میں کھڑی تھی۔ وزیر اعظم تاریخ کے سب سے بڑے ٹھگ کو عوامی طور پر مسلسل چومے جا رہے تھے۔ پانچ سال قبل ایک گاؤں میں سوتے ہوئے ہزشہ لوگوں کو گولیوں سے بھون دینے والے ڈاکو کی زندگی پر بنی فلم سپرہٹ ہو گئی تھی اور اسے آسکر ایوارڈ ملنے والا تھا۔ مہاتما گاندھی کو فحش گالیاں دے کر ملک کا ایک معزز ہم جنس پرست میڈیا اسٹار بن چکا تھا۔

سرکاری محکمہ نقل و حمل کی ہزاروں خونی رنگ کی ہزاروں بسوں میں نادر شاہ کا جن سوار ہو گیا تھا اور ہر روز پچاسوں بچوں عورتوں اور عام لوگوں کو اپنے ٹائروں تلے کچل رہا تھا۔

چاروں طرف خون، بھرم، جرم، دنگے، دولت، لالچ اور لاشیں پھیل رہی تھیں۔ اس دن آٹھ بج کر چالیس منٹ پر کناٹ پلیس کے مدراس ہوٹل کے پیچھے جب غازی آباد جانے والی بس پر پال گومرا حسب معمول سوار ہوئے تو وہ دن بھر کے کام سے اس قدر تھک چکے تھے کہ بس کی ٹوٹی ادھڑی سیٹ کے چبھتے ہوئے فریم کے باوجود انھیں نیند آ گئی۔ جب کنڈکٹر نے انھیں جگایا تو وہ بس میں اکیلے بچے تھے اور بس کافی دیر سے غازی آباد ڈپو میں کھڑی ہوئی تھی۔ ڈپو سے کوی نگر کالونی لگ بھگ تین کلو میٹر دور تھی۔

پال گومرا ہر روز دفتر جاتے ہوئے اپنے ساتھ پلاسٹک کے چپٹے چوکور لنچ باکس میں چار روٹیاں، آدھی پیاز، اچار کی ایک پھانک اور دو آلوؤں کے آٹھ ٹکڑے لے جاتے تھے۔ لیکن پہلے ہی کی طرح آج پھر ان کا لنچ تین لوگوں میں بٹ گیا تھا اور ان کے حصے میں صرف ایک روٹی اور آلو کے ڈیڑھ ٹکڑے آئے تھے۔ وہ بھوکے تھے، اس لیئے انھوں نے طے کر رکھا تھا کہ گھر پہنچتے ہی وہ بیوی سے چار روٹیاں سینکنے کے لیئے کہیں گے۔

لیکن جب کوی نگر کے اپنے ایل۔ آئی۔ جی۔ فلیٹ تک پہنچ کر انھوں نے کال بیل بجائی اور دروازہ کھلا تو وہ گرتے گرتے بچے۔ ان کے گھر کا دروازہ ان کی بیوی سیندھ لتا سکینہ نے نہیں، مشہور ماڈل مہر جیسیا نے کھولا تھا۔ رولر اور کنڈیشنر سے گھنگھریالے ہونے والے بال، جنھیں ڈرائر سے سکھا کر چمکدار بنا دیا گیا تھا، بھورے اور کٹھئی ہو کر پنکھے کی ہوا میں کانپ رہے تھے۔ سانولا رنگ بدل کر ہلکا ہرا اور آسمانی ہو گیا تھا۔ پلکوں میں سنہرا شیڈو۔ جسم میں مائرل کی مشہور یو ڈی کلون شینٹلی کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس نے ہلکے گلابی اور سلیٹی رنگ کی جو لنگری پہن رکھی تھی اس کے اوریجنل ڈیزائن کا آئیڈیا پیرس کے فیشن ڈیزائنر رومیاں کارتیئں کا تھا۔

پال گومرا کی نگاہ اندر کمرے کی طرف گئی۔ ان کا آٹھ سالہ بیٹا منٹو، جس کی موچ کا علاج انھوں نے پرسوں نورانی تیل کی مالش سے کیا تھا اور جسے وہ پیاسکھ۔ جیٹھ کی دوپہر بھنے ہوئے جو اور چنے کا ستو کھلایا کرتے تھے وہ کمرے کے بیچوں بیچ اسٹیریو ڈیک میں میڈونا کا کیسیٹ چلا کر ڈانس کر رہا تھا۔

ہندی کوی پال گومرا کو چکر آ گیا۔ یہ ٹھیک سے معلوم نہیں کہ تکان کی وجہ سے یا کرۂ ارض کی گردش کے سبب، میڈونا اور منٹو کی وجہ سے یا ابھی ابھی وقوع پذیر ہونے والے منظر کے حملے کے سبب۔ لیکن وہ دھم سے صوفے پر گر گئے اور دوبارہ ہوش میں اس وقت آئے جب بیوی کے دیئے ہوئے پانی کے گلاس کو غٹاغٹ حلق سے نیچے اتار لیا۔

اسی رات جب ان کی تینوں اولادیں محو خواب تھیں اور ہندی کوی پال گومرا اپنے ٹی۔ وی سیٹ پر اسٹار چینل سے دکھائے جانے والے 'بولڈ اینڈ بیوٹی فل' کے بعد جین ٹی۔ وی میں 'کس می گڈبائی' نامی ہالی ووڈ کی فلم دیکھ رہے تھے اور شینٹلی کی خوشبو کے درمیان ہلکے ہرے آسمانی رنگ کی ماڈل کے ساتھ صحبت کر رہے تھے، اسی عرصے میں ان کا ضمیر بیدار ہوا تھا اور انھوں نے دو فیصلے کیئے تھے۔

یہ دونوں فیصلے ہندی کوی پال گومرا کی زندگی کے انتہائی اہم فیصلے تھے اور علامتی طور پر ان دونوں فیصلوں کا دائرہ بہت وسیع اور مختلف زمانوں کے معاملات سے وابستہ تھا۔

ان کے پہلے فیصلے کے اندر ہی ان کے نام پال گومرا کے ماخذ کا راز چھپا ہوا تھا کیونکہ اس فیصلے سے پہلے تک ان کا نام پال گومرا تھا ہی نہیں۔ جہاں تک دوسرے فیصلے کا تعلق ہے، تو وہ بدلتے ہوئے تیکنیکی سماج، بازار اور مابعد جدید۔ مابعد تاریخی حقیقت کے ساتھ تال میل بٹھانے اور بات چیت کرنے کی ان کی پہلی سنجیدہ منظم کوشش سے وابستہ تھا۔

پہلا فیصلہ

پال گومرا کا اصلی یعنی بنیادی نام ان کے مدرس والد نے بیسویں صدی کے وسط میں بہت پیار اور غور و فکر کے بعد رکھا تھا۔ ان کے والد رامپور کر۔سن ورناکیولر ہائی اسکول میں ہندی کے استاد تھے۔ آزادی کے بعد وہ اسکول سر دولت رام گورنمنٹ انٹر کالج میں بدل گیا تھا۔ انھیں ہندی، برج بھاشا، اودھی، بنگلہ اور سنسکرت ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ 'اوتیکا' 'سرسوتی'، 'سکوی'، 'چاند'، 'متوالا' جیسے رسائل باقاعدگی سے منگواتے تھے۔ اس وقت تک نہ تو پال گومرا کا جنم ہوا تھا، نہ ان کے اس عجیب نام کا ہی وجود تھا۔

اسی کالج میں سنسکرت کے ایک ٹیچر تھے۔ شری کرشن پرپن شاستری جو ایک بار دو ڈھائی مہینوں کے لیئے، سیعرٹی اور اندرونی حالات کی وجہ سے اس کالج کے ایکٹنگ پرنسپل بھی بن گئے تھے۔ اپنی پرنسپلی کی انتہائی عارضی مختصر مدت میں انھوں نے کالج میں شاستری نظم و نسق کا ایسا دشوار اور بمشکل قابل عمل سلسلہ چلایا تھا کہ دو مہینوں کے اندر اندر وہاں طلباء اور ملازمین ہڑتال پر چلے گئے تھے۔ ان دنوں رامپور کی ہر دیوار، نکڑ اور اسٹیشن آنے والی مال گاڑی

کے ڈبوں میں ایک نعرہ جگہ جگہ لکھا نظر آتا تھا "شاستری جی کرو کمنتال' جن کی چھاتی میں جمے ہیں بڑے بڑے بال۔" ظاہر ہے کہ یہ نعرہ ان نوخیز بغیر بالوں کے لڑکوں نے لکھا تھا جن کی بچگانہ نگاہ میں گھنے بالوں والے' شاستروں سے پیدا ہونے والی مرادنگی سے مالا مال' زیادہ کھانا کھانے والے' توندیل اور چوٹیا رکھنے والے شاستری جی کی چمپینزی یا گوریلے سے مختلف نظر نہیں آتے تھے۔ قدیم انسان۔ ویدک دور کے نی اینڈ یتھرل مین۔

یہی شاستری جب ڈھائی مہینے کے اندر اندر بدقسمتی کی وجہ سے بے عزتی سے پرنسپل کے عہدے سے برطرف کر دیئے گئے تو ان میں کچھ غیر فطری علامتوں کا ظہور ہونے لگا تھا۔ مثلاً' اکیلے میں کہیں بیٹھے ہوئے' چلتی ہوئی بات چیت یا کلاس میں پڑھاتے ہوئے وہ اچانک ہی اپنی آنکھیں موند لیتے تھے اور قریب قریب چوتھے عالم میں (برہم میں تحلیل ہو جانا) مستغرق ہو کر 'ہے رادھے ہے رادھے' رادھے' کرنے لگتے تھے۔ شاستری جی کرشن بھگت ہو گئے تھے۔ کسی فرقے کے سچے عاشق اور رام سے انھیں اتنی بیزاری ہو گئی تھی کہ کسی کے 'جے رام جی کی شاستری جی' کہتے ہی وہ چراغ پا ہو جاتے تھے۔ سر دولت رام گورنمنٹ انٹر کالج' رامپور کے بارے میں شاستری جی کی بیزاری کی جڑیں ان کے پرنسپل کے عہدے سے برطرفی کی زمین میں کہیں دھنسی ہوئی ہیں۔

بعد میں' ریٹائر مینٹ کے بعد سے شاستری جی رامپور میں 'جے رام جی' کے نام سے ہی مشہور رہے۔ کہتے ہیں کہ شاستری جی نے بھارت کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک طویل میمانسا (ایک قسم کا ہندوستانی فلسفہ) اور تتو گیان (برہما' کائنات اور فطرت کا علم) سے بھرپور۔ جس میں کاویہ شاستر' پران اور اسمرتی گرنتھوں کے معنی خیز اقتباسات تھے۔ خط لکھا تھا۔ اس خط میں انھوں نے رامپور کا نام بدل کر گوپال پور یا رادھا گرام کرنے کے حق میں دلائل دیئے تھے۔ وزیر اعظم کے دفتر سے انھیں اس خط کی رسید بھی موصول ہوئی تھی جس کے اوپر اشوک استمبھ کے تین شیر اور ستیہ میو جیتے کی مہر لگی تھی۔

بہرحال' شاستری جی جب تک زندہ رہے' رام پور کے بچے انھیں دیکھتے ہی شہد کی مکھیوں کی طرح ان کے پیچھے پڑ جاتے اور ان کے چاروں طرف اڑا اڑ کر "جے رام جی کی' جے رام جی کی' کے نعرے لگاتے اور شاستری جی غصے کی آگ میں جلتے ہوئے اپنی جمن ناتھی چھڑی سے انھیں کھدیڑتے ہوئے شہر کی گلیوں میں اکثر دکھائی دیتے۔

پال گومرا کے والد لال بہادر سکسینہ نے شاستری جی کا حال دیکھ کر ہی اپنے اکلوتے بیٹے کا نام رام گوپال سکسینہ رکھا تھا۔ یہ اعتدال اور مصلحت پسندی پر مبنی حل تھا یعنی رام اور کرشن دونوں ایک ساتھ 'بیچ میں بغیر کسی ہائفن' ڈنڈے یا دو لفظوں کے جوڑنے کے نشان کے رام بھگتی فرقے اور کرشن بھگتی فرقے کا خوشگوار' خیر سگالی' اور سیکولر میل ملاپ۔

تو اس مسلک اعتدال کے ذریعے اب آپ کو معلوم ہی ہو گیا کہ پال گومرا کا اصلی نام رام گوپال سکسینہ تھا۔ بس تیکنیکی سماجی تبدیلی' ارضیت اطلاعاتی نظام میں انقلاب' سوشلزم کا زوال اور مکمل کرۂ زمین پر پھیلتے بازار کے نئے حقائق کی روشنی میں رام گوپال سکسینہ کو اپنا نام پریم چند' للو لال' سدل مشر' نوجادک لال' ہزاری پرشاد' کروڑی مل' کبیر داس' کیدار ناتھ' سدا سکھ لال جیسا پسماندہ' دقیانوسی' اور نچلے درجے کا لگنے لگا تھا۔ ایسے نام دلی کے صفائی کرمچاریوں' ٹھیلے ریڑی والوں اور گلی کباڑیوں کے ہوتے تھے۔ دلی آنے' آئی۔ٹی۔او۔ کے قومی اخبار میں ملازمت جوائن کرنے کے بعد سے ہی وہ اپنے نام کے بارے میں شدید کشمکش میں مبتلا تھے۔ اسی طرح کی اپنے آپ سے جنگ جیسی مکتی بودھ کی کویتاؤں اور اگیہ اتانگ' یا 'برہم راکشش' میں نظر آتی ہے۔

اس رات وہ اپنے رنگین 'ہاٹ لائن' ٹی۔وی۔ سیٹ پر ہالی وڈ کی فلم 'مسں ی گڈبائی' دیکھتے ہوئے ہاٹ لائن کمپنی کے مالک کیشن اگروال کی تقدیر اور ستم ظریفی کے بارے میں سوچ رہے تھے جو پہلے میرٹھ کے کسی ویشنو ڈھابے میں کپ پلیٹ دھوتا تھا اور بعد میں سائیکل کے مڈگارڈ پر' پیچھے لگنے والی پلاسٹک کی لال ڈبی بناتے بناتے اس فراخدلی اور اعتماد کے نئے چمکار سے' ہاٹ لائن' برانڈ کا رنگین ٹی۔وی۔ سیٹ بنانے لگا تھا۔ لیکن ہالی وڈ کی مشہور ہیروئن میں اپنے ویشنو ڈھابے سے پہلے کے بچپن کی لڑکی کو کھوجنے کے المیے میں اس نے گلے میں پھندا لگا کر خودکشی کر لی تھی۔

کیشن اگروال کے المیے بلیڈ کے اشتہار سے سنسنی پیدا کر دینے والی سرگنگا رام ہسپتال کی صفائی کرمچاری رام اوتار آریہ کی سترہ سال کی بچی شیلا نامی ماڈل کے المیے سے ملتی جلتی تھی۔ شیلا کو پچھلے آٹھ مہینے میں تین بار 'ٹرمینشن' کرانا پڑا تھا اور دو ہفتے پہلے ایک خبر کے مطابق اس میں ایچ۔آئی۔وی۔ پازیٹو ملا تھا۔ یا پھر گھوڑے کی پشت پر مکمل کریئر کا جھاگ بن جانے والی آشا مشرا کے المیے' جسے پچھلے دنوں راجدھانی کے ٹکڑ سیاحت کے ایک بار بیکیو میں کاٹ کاٹ کر تندور میں بھون دیا گیا تھا۔

پال گومرا انسان کی تقدیر کے راز کے انھی اجزاء کی ادھیڑبن میں لگے تھے کہ شیشلی کی خوشبو اور روماں کار تیسیں کی ڈیزائن شدہ لنگری میں لپٹی ہوئے آسانی جسم کی مہر جیسیا ان کے پاس آئی تھی۔ ان کی تینوں اولادیں ملحقہ کمرے میں نیند کی آغوش میں تھیں۔ پال گومرا نے مہر جیسیا کو پچکوئیاں روڈ کی 'ماڈرن فرنیچر شاپ' سے آدھی قیمت میں خریدے گئے سیکنڈ ہینڈ موٹے اسپنجی کشن والے صوفے میں کھینچ لیا۔ وہ جھاگ بننے سے ٹھیک ایک پل پہلے' ایک سیکنڈ کے بارھویں حصے میں کوندنے والے آشا مشرا کے اجلے پستانوں کا اشل فوٹوگراف بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ عین اسی وقت ان کی علمی حسیت بیدار ہوئی۔ یہ طلوع نو کے عرفان میں جگمگاتے سورج کی چکاچوند روشنی کی طرح انتہائی عرفان ذات کا لمحہ تھا۔ عین اسی لمحے کے وسط میں انھوں نے پہلا فیصلہ کیا۔

ان کا یہ پہلا فیصلہ اپنے نام کے بارے میں ہی تھا۔ انھوں نے سچی کر

ٹکڑے ٹکڑے کرکے پڑھانے کے طریقے کو اپناتے ہوئے صرف یہ کیا کہ اپنے نام رام گوپال کے 'پال' کو توڑ کر الگ نکالا اور اسے ہلکا سا 'ڈسٹارٹ' کرتے ہوئے 'پال' بنا دیا۔ اس کے بعد باقی بچے 'رام گو' کو الٹی طرف سے پڑھ دیا۔ 'گومرا' اس طرح ان کا جو نیا نام بنا۔ وہ تھا۔۔ پال گومرا۔ بیشک یہ نام ایاچی انڈین 'لوئی بینکس' ریمو فرنانڈیز' شیم چترودا یا ٹی۔کے۔ بینجی جیسے مشہور ناموں سے برابری کی ٹکر لیتا تھا۔ ٹی۔کے بینجی دراصل تشار کانتی بینرجی سے 'بینجی' بن گیا تھا۔ 'موکانجی' بھی دراصل مکرجی تھے' جو انگریزی حکومت کے دوران فرنگیوں کے جم خانہ' ریس کورس' اور ڈانٹرس کلب کے ہندوستانی ممبر ہوا کرتے تھے۔ وہ چمپارن کے انگریز نیل صاحبوں کے تجارتی ایجنٹ تھے جو اڑیسہ' تامل ناڈو' اور مدھیہ پردیش سے نیچ مزدوروں کو پکڑ پکڑ کر نیل کے باغات اور کنڈوں میں کام کرواتے تھے۔ سن ۱۸۸۶ میں مطبوعہ دین بندھو مترنے اپنے مشہور بنگالی ڈرامے 'نیل درپن' میں اسی موکانجی خاندان کی انگریز پرستی اور نیل مزدوروں کے بارے میں ان کی سختی اور درندگی کا ذکر کیا ہے۔

'نیل درپن' پر انگریزوں نے پابندی لگا دی تھی۔ اس ڈرامے کو کھیلنے اور شائع کرنے پر سخت پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ بھارت کے پہلے وزیر اعظم نے ۷ دسمبر ۱۹۳۲ میاں تحریر کردہ ایک خط میں 'نیل درپن' کا ذکر کیا ہے۔ "آئی مائٹ مینشن ہیر ویٹ اے ڈزین ایرس بیفور آنند مٹھ۔ اے بنگالی پوئم ہیڈ کم آوٹ وچ کری ایٹیڈ اے اسٹر۔ دس واز کالڈ 'نیل درپن' دی مرر آف انڈیگو۔ اٹ گیو اے ویری پین فل اکاؤنٹ آف دا بنگال پیزینٹری انڈر دا پلانٹیشن سسٹم" یہ خط ان کی کتاب "گلمپسیز آف ورلڈ ہسٹری" کے الہ آباد سے ۱۹۳۵ میں مطبوعہ دوسرے حصے میں شامل ہے۔ لیکن اس خط سے یہ صداقت آشکار ہوتی ہے کہ بھارت کے پہلے وزیر اعظم کو بھی بھارتی ادب کی صحیح واقفیت نہیں تھی کیونکہ انھوں نے 'نیل درپن' نامی اس ڈرامے کو جس نے انیسویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی چولیں ہلا دی تھی "ایک بنگالی کویتا" بتا دیا ہے۔

بہرحال آج کا 'موکانزی انڈسٹریل گروپ' اسی موکانزی خاندان کا ہے جس کے سترسالہ منیجنگ ڈائریکٹر کے ڈی۔ موکانزی کو دوسال پہلے ملک کا بلند ترین اعزاز بھارت رتن سے صدر نے نوازا تھا اور ابھی پانچ ماہ قبل جن کی وفات پر وزیر اعظم' صدر' اور کئی صوبوں کے وزراء اعلیٰ نے اپنی اپنی شردھانجلیوں' میں کہا تھا کہ ملک نے ایک عظیم آزادی کے مجاہد اور سماج کے خادم کو کھو دیا ہے۔ بھارت رتن کے ڈی موکانزی قومی ترقی کے مضبوط اور مستقل ستون تھے۔

"پال گومرا !!"

"پال گومرا !!" رام گوپال سکسینہ نے اس رات عرفان کے ان جگ مگ لمحات میں اچانک بلند آواز میں کہا اور 'ہاٹ لائن' کو بند کرتے ہوئے اپنی بیوی سیمہ لتا سکسینہ کو نیند سے ہلا کر جگا دیا۔

مہرجیسیا' جس کی لنگری فرش پر گری ہوئی تھی اور چہرے کا میک اپ پھلکوئیاں روڈ سے آدھی قیمت میں خریدے گئے صوفے کے اسپنج کشن سے رگڑ کھا کر پچھ گیا تھا' اب نہ مہرجیسیا رہ گئی تھی اور نہ ٹھیک سارن پور کی گلیوں میں کھلی کھالی' پلی پوسی سیمہ لتا۔ وہ اب دونوں کے بیچ کی کوئی سر سلٹ عورت تھی۔ لوٹ لار جسٹ یا ایکوارسٹ جیسی ہالی وڈ کی فلموں میں جادو ٹونا' وچ کرافٹ جاننے والی عورت' جو آدھی رات نیند سے سرخ چوڑی پھٹی پھٹی بھوں چڑھی آنکھوں سے اپنا سر کھجاتی ہوئی اپنے شوہر کو گھور رہی تھی۔ "کیا ہے؟" بڑی مشکل سے اس عورت کے گلے سے پھٹی ہوئی اردھانیشور (شو کا آدھا اپنا اور آدھا پاروتی کا روپ) والی کھردری آواز نکلی۔

"پال گومرا !" رام گوپال سکسینہ نے بلند آواز میں دوہرایا "پال گوم۔۔۔را"

"یہ کیا ہے؟ دھیرے بولو۔ بچے اٹھ جائیں گے" سیمہ لتا سکسینہ کی جانی پہچانی آواز فکرمندی سی باہر آئی۔

"یہ آج' اسی پل سے میرا نیا نام ہے۔ دا گریٹ لیجنڈری ہندی پوئٹ۔ پال گومرا" یہ کہتے ہوئے رام گوپال سکسینہ نے اپنی بیوی کو ماڈرن فرنیچر والے سیکنڈ ہینڈ صوفے میں پھر دبا لیا اور رام گوپال سے پال گومرا بننے کے عمل میں جٹ گئے۔

اس کے لگ بھگ پچپن منٹ بعد جب گھڑی کی سوئیاں دو بج کر دس منٹ کا وقت بتا رہی تھی اور سورج و چاند کی رفتار اور حالت سے نہ جڑنے والے مغربی وقت کے اصولوں کے مطابق' جب پرانی تاریخ کی جگہ ایک نئی تاریخ دو گھنٹے دس منٹ پہلے ہی آچکی تھی۔ پال گومرا نے اپنی زندگی کا دوسرا اہم فیصلہ کیا۔

اسکوٹر خریدنے کا فیصلہ

ابھی تک پچھلے لگ بھگ بائیس برسوں سے وہ غازی آباد کے کوی نگر محلے میں صبح صبح ساڑھے سات بجے' سرکاری روڈویز کی بس میں کسی طرح دھنس کر یا اکثر لٹک کر' نام نہاد قومی زبان کے نام نہاد قومی اخبار میں سب ایڈیٹر کم پروف ریڈر کی نوکری کرنے دلی کے آئی۔ٹی۔او۔ پل تک پہنچتے تھے لیکن پچھلے پانچ سات برسوں میں صبح کی ان بسوں میں دودھ والوں' سبزی والوں اور روزانہ دلی۔ غازی آباد کے درمیان اپ ڈاؤن کرنے والے بابوؤں' کرمچاریوں' مزدوروں کی تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ لوگ بس کے اندر ہی نہیں' دروازوں' چھت' پائیدان پیچھے کی جالی اور وڈپر پر بھی لٹکے رہتے تھے۔ شب و روز ادھیڑ عمری سے بوڑھاپے کی جانب کھسکتے ہندی کے ناکام' معمولی' نظر انداز کیے ہوئے کوی پال گومرا کے تفکرات' عمر' یادوں اور امراض سے بھرے بیمار اور غریب جسم کے لیے بس کا یہ لمبا سفر ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

ان کے اسکوٹر خریدنے کے فیصلے کے پس منظر میں ان کی اس وقت کے شمار کرنے کا بھی ہاتھ تھا' جسے اپنی زندگی سے جوڑ کر پال گومرا ڈر گئے تھے۔ غازی

آباد سے آئی-ٹی-او-پل تک پہنچنے میں انھیں دو گھنٹے لگتے تھے۔ اتنا ہی وقت انھیں لوٹنے میں بھی لگتا تھا۔ یعنی ہر دن چوبیس میں سے چار گھنٹے سرکاری روڈویز کی اس بس میں، فسا فس اجنبی جسموں کے دباؤ، پسینے اور ریاحی امراض کی ناگوار بدبو کے درمیان گزارنے پڑتے تھے۔ اگر اتوار کی چھٹی کو چھوڑ دیا جائے تو اس حساب کے مطابق وہ ہر ہفتے چوبیس گھنٹے یعنی ایک پورے دن، دن-رات وہ اس بس پر سوار غازی آباد سے دلی اور دلی سے غازی آباد کی سڑک پر آتے جاتے رہتے تھے۔

اگر ایک پورے سال کا حساب لگائیں تو تقریباً باون دن یعنی ایک مہینہ اور بائیس دن وہ لگاتار اس بس میں ہوتے تھے۔ اس طرح راجد حانی دلی کے بہادر شاہ ظفر روڈ پر واقع اس دفتر میں نوکری کرنے کی اب تک کی مدت میں وہ کل ملا کر تین سال، دو مہینے اس بس میں گزار چکے تھے۔

تین سال اور دو مہینے! یعنی برسات، سردی، جاڑا، بسنت، شرت (کنوار سے کارتک تک رہنے والی ایک رت) اور گرمی کی تین تین سموچی رتیں، ایک ہزار ایک سو چوالیس دن، صبح، دوپہر، شام اور رات کے تمام پہر، گھڑیاں، پل! گھنٹے، مہینے، سال !! اور یہ سلسلہ ابھی مستقبل میں بھی ختم ہونے والا نہیں تھا۔

اوپر سے سن بیاسی کے ایشیاڈ کے بعد سے ہونے والی ٹیکنیک، ابلاغ، ترسیل اور آدمی کی سمجھ میں اس قسم کی بے تحاشہ بے نظیر تبدیلی۔

لوگ باگ ماروتی، ایسٹیم، سیلو، زین، سیرا، سومو، ہونڈا، کاواساکی، اور معلوم نہیں کن کن گاڑیوں میں چلنے لگے تھے، کہاں سے کہاں پہنچ گئے تھے اور پال گومرا کو سائیکل چلانی تک نہیں آتی تھی۔ وہ سماج کے آگے آگے کبیر-پریم چند کی طرح مشعل لے کر چلنے والے اگوا- اوانگارد ادیب کے بجائے، وقت کے پیچھے پیچھے کسی طرح رینگتے، گھسٹنے والے کنکھجورے، گوجرا کینچوا، یا گھونگھا بنتے جا رہے تھے۔

اس موجودہ دور کی اصل نبض ٹیکنیک میں پوشیدہ ہے اور اگر ٹیکنیک کی ان بے شمار شکلوں میں سے کسی بھی ایک روپ کو اگر سادھ لیا جائے، اس پر مکمل دسترس حاصل کرنے کے بعد اس کی کارکردگی اور بناوٹ کی 'جینیس' کو سمجھ لیا جائے تو یہ طے ہے کہ اس بدلے ہوئے دور سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے، ہم عصر ہوا جا سکتا ہے، علم نو، تدبیر نو اور اپنی نئی 'ایستھینا' کے ساتھ اگلی صدی میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔ پال گومرا نے مشہور شاعر شمشیر کے دو کویتا کے مجموعوں کو زور زور سے اکٹھا کہا "ابھی چکا بھی ہوں نہیں میں" "کال تجھ سے ہوڑ ہے میری۔"

اس طرح راجد حانی دلی کے سرحدی شہر غازی آباد (اتر پردیش) کی کوی نگر کالونی کے ایل-آئی-جی فلیٹ یعنی نچلے طبقے کے دو چھوٹے چھوٹے کمروں والے مکان (جن میں سے ایک کمرے کو 'ڈرائنگ روم' اور دوسرے کو 'بیڈ روم' کہنے کا رواج تھا) نمبر اے ایم 122 میں، اس رات تقریباً دو بج کر دس منٹ

پر، اسکوٹر خریدنے کا فیصلہ کچھ ہی دیر پہلے رام گوپال سکسینہ سے منعکس ہونے والے ہندی کوی پال گومرا کے ذریعے کیا گیا ہے۔ یہ عکس فرانز کافکا کی مشہور کہانی 'میٹا مورفوسس' کا برعکس تھا کیونکہ یہاں رام گوپال سکسینہ نامی ایک ادنیٰ سا کاکروچ پال گومرا جیسے گریٹ لیجنڈری پوئٹ میں بدلا تھا۔

ایک دن کے وقفے کے بعد، سوموار کو دفتر پہنچتے ہی پال گومرا نے اپنے پراویڈینٹ فنڈ سے پانچ ہزار روپے کی رقم نکلوائی اور تقریباً ساڑھے تین بجے وہ قرول باغ کے آتھورائزڈ بجاج آٹو موبائلز ڈیلر کے سامنے موجود تھے۔ ساری کارروائیاں مکمل کرنے میں تقریباً دو گھنٹے کا وقت لگا اور پانچ بج کر چالیس منٹ پر وہ ایک نئے بجاج چیتک اسکوٹر کے مالک بن چکے تھے۔ چار سو اٹھائیس روپے کی بقایہ ماہانہ قسطوں کی ادائگی کی شرط کے ساتھ۔

چونکہ پال گومرا کو اسکوٹر چلانا نہیں آتا تھا، اس لیئے اگلے دن دوپہر بارہ بجے تک ڈلیوری ان کے کوی نگر کے پتے پر پہنچا دینے کی فرمائش ڈیلر نے ہمدردانہ طور پر مسکراتے ہوئے تسلیم کر لی۔

اس رات پال گومرا نے اپنے ٹی-وی-سیٹ پر خواب جیسا اشتہار دیکھا۔ بستر، ابو جھماڑ، کرر، یا میور-بھنج جیسے کسی ادیواسی علاقے میں اپنے تیر کمان لے کر نکلے ہوئے ادیواسیوں کا ایک جھنڈ اچانک جنگل میں لوہے کا ایک عجیب و غریب جانور دیکھتا ہے۔ وہ اس پر اپنے زہر آلود تیر چلانے ہی والے ہوتے ہیں کہ ان ہی میں سے ایک جوان ادیواسی، جو جرأت رندانہ اور نئی اشیاء کے بارے میں فطری تجسس سے بھرپور ہے، انھیں روک کر اس جانور کے پاس پہنچتا ہے اور اسے ساکت دیکھ کر اس کے اوپر چڑھ جاتا ہے اور اس کی پشت اور پٹھوں پر کودنے لگتا ہے اور وہ چیختا ہے: ہوں... ہوں... شوانگ سونگ...!!!

یہ اس لوہے کے اجنبی جانور پر ادیواسیوں کی جیت ہے، اب تک کی تہذیب کی تاریخ میں انسان کی بے شمار فتوحات کے سلسلے میں ایک اور نئی کڑی۔

فتح کے جوش و مسرت میں سارے ادیواسی ناچتے اور جھومتے ہیں۔ تبھی دھوکے سے اس جوان ادیواسی کی کسی نامعلوم حرکت سے وہ آہنی جانور اسٹارٹ ہو جاتا ہے اور اپنے اوپر سوار، حیرت اور خوف سے جامد ہو چکے، اس جوان ادیواسی کو لے کر رفتار، لطف، سفر اور اسرار کے ایک نئے طلسم لوک کی جانب چلا جاتا ہے۔

ابو جھماڑ یا علی راجپور کے جنگل میں آیا ہوا وہ آہنی جانور، جسے ادیواسیوں نے اس دن دیکھا تھا، کسی کمپنی کا اسکوٹر تھا۔

عین اسی وقت پال گومرا کو نیند آ گئی تھی اور خواب میں آئی-ٹی-او-پل سے پرگتی میدان، کناٹ پلیس، ساؤتھ ایکسٹینشن، گرین پارک، پنڈارا روڈ، منڈی ہاؤس، اورنگ زیب روڈ، پرتھوی راج روڈ، انڈیا گیٹ، نارتھ، ساؤتھ ایوینیو کی تمام سڑکوں پر اسکوٹر چلاتے ہوئے جا رہے تھے۔

ستم ظریفی یہ تھی کہ پال گومرا کو مسلسل محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے کندھے پر تیر کمان ٹنگے ہیں، کمر کے ارد گرد بھیڑ کی کھال لپٹی ہوئی ہے۔ ان کا

رنگ سیاہ، ہونٹ موٹے، ناک چپٹی اور بال گھنگھریالے ہیں اور ان کی زبان میں بہت کم الفاظ ہیں۔ جو الفاظ ہیں بھی، وہ کسی اور تہذیب اور زمانے کے الفاظ ہیں۔ جب بھی وہ دلی کی کسی عمارت، لڑکی یا دوکان کو دیکھ کر کچھ کہنا چاہتے ہیں، ان کے گلے میں گھوں، گھوں ہاں، ہوں! کوئی جانگ بھو گھو، سو گھو، ہو ہو، جیسا جملہ نکلتا ہے۔ آخر میں اپنی زبان کی بے بسی سے ہار کر وہ بھارت کی راجدھانی دلی میں دوڑتے اپنے اسکوٹر پر ناچنے لگتے ہیں۔

پال گومرا نے دیکھا کہ شروع میں تو لوگ انھیں ذوق و شوق سے دیکھتے رہے پھر اچانک کچھ عورتیں اور بچے جیسے ان سے ڈرنے لگے۔ پھر یکے بعد دیگرے دوکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگیں۔ ' ڈنگ ڈانگ ڈنگ ڈانگ' کرتی آگ بجھانے والی گاڑیاں اور پولس کی پی۔ سی۔ آر۔ جیپیاں دوڑنے لگیں۔ پھر ہزاروں کی تعداد میں ان کی جانب خونی رنگ کی ' ریڈ لائن' نامی گاڑیوں کی فوج دوڑا دی گئی۔

وہ گھبرا کر اسکوٹر کے اوپر سے کود گئے۔ اسکوٹر تو خواب کی جانب چلا گیا لیکن وہ اپنے بستر پر پسینے سے لت پت جاگ گئے۔ ان کا حلق سوکھ رہا تھا۔ پیاس لگی تھی۔ انھوں نے اپنی بیوی سیمہ لتا کو آواز دے کر پانی منگوانا چاہا لیکن ان کے گلے سے بمشکل گھوں گھاں۔ کھانا۔ کھونا جیسا کچھ نکلا۔

اگلے دن ڈھائی بجے دوپہر ڈیلر نے اسکوٹر ان کے گھر پہنچا دیا۔ ہلکے ہرے رنگ کا، چمکدار، سورج کی کرنوں میں اضافہ کرتا ہوا، پیٹرول اور نئے پینٹ کی تازہ بو میں ڈوبا وہ اسکوٹر پال گومرا کے ایل۔ آئی۔ جی۔ فلیٹ کے بالکل سامنے کھڑا تھا کسی پالتو، فرمانبردار، بھولے، خاموش جانور کی طرح۔ گہرے چمکدار کالے رنگ کی ریکسن کی گدی دار سیٹ، ہینڈل پر دائیں طرف لگا ہوا ایک گول آئینہ، سیٹ کے پیچھے اور فٹ بورڈ کے اوپر سامان وغیرہ رکھنے کے لیے بنا ہوا رنگین جالی دار ' بکیٹ۔'

ان کی تینوں اولادیں اس اسکوٹر پر لگاتار چڑھ اتر رہی تھیں اور ممی سیمہ لتا سکینہ انھیں بار بار ڈانٹ رہی تھیں۔ پال گومرا کی آنکھیں اس وقت بھر آئیں جب منٹو کے جوتے کی مٹی اسکوٹر کی سیٹ پر لگ گئی اور سیمہ لتا نے اسے اپنے پلو سے پونچھا۔

اس طرح ابو جھماڑ کے نامعلوم گھنے جنگل سے چلتا ہوا وہ آہنی جانور ٹی۔ وی۔ کے پردے سے نکل کر ان کے خواب سے ہوتا ہوا اب غازی آباد کے کوی نگر کالونی کے ایل۔ آئی۔ جی فلیٹ نمبر اے مر 122 کے سامنے خاموش کھڑا تھا۔

"پاپا آپ کو چلانا آتا ہے نا؟" آٹھ سال کے منٹو نے پوچھا۔

"میرے کو تو پاپا اس کا کلر سب سے زیادہ زوردار لگا" بچو نے ناچتے ہوئے کہا۔

اب اس کا کیا کیا جائے؟ یہی سوال بار بار پال گومرا کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ انھوں نے زندگی میں کبھی سائیکل بھی نہیں چلائی تھی۔ ان کی زندگی میں مشینی دور کی پیٹرول ایندھن سے چلنے والی یہ پہلی ٹیکنالوجی تھی۔ اس ٹیکنالوجی پر ملکیت اور اختیار کے بعد انھیں سرکاری روڈویز کی تکلیف دہ ٹھساٹھس بھری بس سے نجات مل رہی تھی۔ ہر روز ان کے سفر کے چار گھنٹوں میں سے دو گھنٹے کم ہو رہے تھے۔ سال بھر میں ملازمت کی آمدورفت ایک مہینے بائیس دن بس میں پھنسے رہنے کے بجائے فقط چھبیس دن اب اکیلے پرانی فلموں کے گیت گاتے اور اپنی کوتاؤں کی لائنیں دوہراتے، انھیں اس اسکوٹر کی چمکیلی کالی گدے دار سیٹ پر ہونا تھا۔

پال گومرا نے اپنے اسکوٹر کو بغور دیکھا۔ ہرا رنگ ـــــ بالکل ہلکا۔ جیسے کسی پیڑ کی نئی نئی کونپلیں ہوتی ہیں۔ نوزائیدہ، بیک وقت پیدا ہونے والی، غیر مصنوعی اور فطری۔ اسکوٹر فطرت کی ہی ایک قسم ہے۔ اس کا ایک ایک پرزہ، ایک ایک عضو جس دھات سے بنا ہے وہ لوہا خام لوہے کی شکل میں دھرتی کے پیٹ سے ہی نکالا گیا ہوگا۔ اس میں استعمال ہونے والی ربر کیرل کے اڈپی ضلع یا آسام کے کسی علاقے کے ربر کے پیڑوں سے شب و روز رستے رس سے بنی ہوگی۔ جس ایندھن سے یہ اسکوٹر اپنی رفتار حاصل کرے گا۔ وہ پیٹرولیم اور کچھ نہیں ہزاروں سال تک دھرتی کے پیٹ کی آگ میں اور فطری توانائی سے پیدا ہونے والی نباتات کا ہی ترقی کار بینک روپ ہے اور اس کی تیکنیک جس کے ذریعے اس کی رفتار کنٹرول ہوتی ہے، پہیے گھومتے ہیں اور یہ دوڑتی ہے، اس تیکنیک کا خلاصہ دانتی اور چرخی کا وہ مشینی نظام ہے جس کا استعمال مہاتما گاندھی نے چرخے کی علامت کے روپ میں برطانوی سامراج کے خلاف کیا تھا۔

اس طرح اسکوٹر علامتی طور پر اس نو آبادیاتی، بین الاقوامی صارف پسند، بازارو، سامراجیت کا طاقتور دفاع ہے۔ اگر گاندھی جی کو یہ ماننے کی آزادی تھی کہ انگلینڈ کی شاندار مشینی صنعتوں کے خلاف چرخا ایک اوزار نہیں بلکہ دستکاروں اور بنکروں یا انسانوں کے ہاتھ کا ہی فطری پھیلاؤ ہے تو ہندی بھاشا کے پتر کوی پال گومرا کو بھی یہ ماننے کا اختیار تھا کہ آج کے دور میں اسکوٹر دراصل انسان کے پیروں کا انتہائی انسانی پھیلاؤ ہے۔

پال گومرا کا خیال تھا کہ وقت یعنی ازلی ' تیور تمان کال' ہر اوزار کو ایک دن انسانی، فطری، اور قدیم داستانوں کو نئے معنی دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ انھیں بھرپور اعتماد تھا کہ موجودہ دور میں جس طرح سائیکل اب مشین نہیں لگتی بلکہ آیورویدک، ہومیوپیتھی یا نیچروپیتھی کی طرح فطری وسیلہ ہی لگتی ہے، اسی طرح ٹیکنالوجی کی ایسی ترقی کو دیکھتے ہوئے اسکوٹر کے بھی آیورویدک ہو جانے کا بھرپور امکان ہے۔

لیکن مسئلہ تو اسکوٹر کو چلانے کا تھا۔ گاندھی جی تو کپاس کی پونی بنا کر چرخے سے دھڑا دھڑ سوت کات لیتے تھے جبکہ پال گومرا کو سائیکل چلانی بھی نہیں آتی تھی۔

وہ اپنے دفتر کے کولیگس سے اپنے اسکوٹر خرید لینے کا ذکر کرتے ہوئے

ان سے اصرار کرتے کہ وہ انھیں چلانا سکھادیں، لیکن وہ سب کسی فرصت کے دن تک یہ کام ملتوی رکھنے کی بات کہہ کر کنی کاٹ لیتے۔ دلی میں لوگوں کے پاس دوسروں کو راستہ بتانے تک کا وقت تو ہوتا نہیں تھا، اب انھیں بھلا اسکوٹر چلانا کون سکھائے؟

انھیں دلی کے ایک پریس میں تیس سال تک پروف ریڈر۔ کم۔ سب ایڈیٹر کا کام کرنے والے دھنی رام شرما ابھی تک یاد تھے جن کے بارے میں لوگوں کے درمیان ایک قصہ بیان ہوتا تھا۔ تین دہائیوں تک دلی میں ملازمت کرنے کے باوجود دھنی رام شرما کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس شہر میں کناٹ پلیس، ساؤتھ ایکس، گرین پارک، تال کٹورہ، ڈیفنس کالونی جیسی جگہیں بھی ہیں۔ انھوں نے نہ کبھی قطب مینار دیکھا تھا، نہ صفدر جنگ کا مقبرہ۔ انھوں نے ایک بار چودہ سال پہلے پارلیا مینٹ اور راشٹرپتی بھون کے درشن کیئے تھے جب وہ کسی سیاس نیتا کا پروف لے کر پارلیا مینٹ اسٹریٹ سے ہوتے ہوئے پرتھوی راج روڈ کی کسی کوٹھی، بنگلے میں گئے تھے۔

کہتے ہیں دھنی رام شرما ایک بار کسی بس میں سوگئے تھے اور آنکھ کھلنے پر جب انھیں بتایا گیا کہ یہ شادی پور ڈپو ہے تو وہ زور زور سے روئے کہ یہ میں کس شہر میں آگیا، میرے پاس تو واپسی ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں ہیں۔

دن پر دن گزرتے گئے اور پال گومرا کا اسکوٹر اسی جگہ جوں کا توں کھڑا رہا۔ جہاں ڈیلر کے آدمی نے اسے کھڑا کیا تھا۔ اس پر بارش ہوتی، دھول جمی ہوتی، بچے اس پر چڑھتے اور کودتے، جاڑوں میں ٹھنڈک اسے برف بنا دیتی۔ شبنم کے قطرے اس ساکت گونگے آہنی جانور پر چپ چاپ رات بھر اس پر گرتے رہتے۔

ایک دن منٹو نے بتایا کہ اسکوٹر کے مڈگارڈ پر اور جہاں جہاں اس میں نٹ بولٹ لگے ہیں اور جوڑ ہیں، وہاں وہاں زنگ لگ رہا ہے۔

اسی درمیان خلیج کی جنگ ہوئی، اور اپنے ٹی۔ وی۔ سیٹ پر پال گومرا نے سی۔ این۔ این۔ چینل پر میر انیس کے اودھی میں تحریر کردہ مرثیوں کا وہ بھیانک منظر دیکھا جس میں عرب کی ریگستانی زمین پر تیس ہزار سے زیادہ انسانوں کا قتل عام تیل کے کنویں کی خاطر کیا جارہا تھا۔ تہذیب مستقبل کے لیئے نئی اساطیری داستانیں گڑھ رہی تھی۔ یورپ ایک بار پھر اٹھ کر کھڑا ہو رہا تھا۔ دنیا یک قطبی ہوگئی تھی۔ نیٹو، نہو، ناصر، کینیڈی جیسے کئی نام کسی داستان پارینہ کے کردار لگتے تھے۔

دلی میں کوئی ڈنکل تھا جو چلا آرہا تھا، اور مرکزی حکومت کا وزیر مالیات چار پانچ سال سے بغیر کھائے، بغیر پیئے، بغیر سوئے، بغیر جاگے اور بغیر سوچے قرضوں اور غیر ملکی کمپنیوں کے تمام معاہدات پر دھڑا دھڑ دستخط کرتا چلا جارہا تھا۔ ملک کے سبھی بینکوں کا روپیہ نکال کر ایک شاندار سوٹ کیس میں بھروا گیا تھا جو سموچے آسمان پر ٹنگا تھا۔ سورج مستقبل کے ساتھ اس سوٹ کیس کے

پیچھے ڈھلک گیا تھا اور لوگ اندھیرے میں ایک دوسرے کو ٹٹولتے، راستہ پوچھتے، گڑھوں اور کھائیوں میں گر رہے تھے۔ ایک بھیانک لکیر تھی، جس کے نیچے پہلے ہر ۱۰۰ میں سے ۳۶ لوگ گرے ہوئے تھے۔ اب یہ تعداد بڑھ کر چالیس ہوگئی تھی۔

پال گومرا نے اس رات ایک عجیب و غریب نظارہ دیکھا۔ وہ آدھی رات اپنے اسکوٹر کے پاس کھڑے اس کی جلد کو اپنی ہتھیلیوں سے پونچھ رہے تھے۔ تبھی ان کی نگاہ اوپر ٹنگے ہوئے سوٹ کیس کی جانب گئی۔ اس کا ڈھکن تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور انڈیا گیٹ سے ایک شاندار سیڑھی اوپر کی جانب گئی تھی۔ اس پر لوگ چیونٹیوں، چوہوں اور چھپکلیوں کی طرح رینگ رہے تھے۔ وہ اس سوٹ کیس تک جاتے اور اپنے دانتوں میں نوٹوں کی گڈیاں دبا کر نیچے کود جاتے۔ ان کی پشت پر کاغذ کی چھوٹی چھوٹی چپیاں چپکی تھیں جن پر دیکی ترقی، روزگار، مکان، سڑک، تعلیم، پلیگ، غریبی، چیچک، خاندانی فلاح و بہبود، راحت، زلزلہ، ماحولیات، بیت الخلاء، ثقافت، ایڈس، ادب، وغیرہ لکھے ہوئے تھے۔ ہر لفظ کے آخر میں ایک لفظ تھا جو ہر چپی پر موجود تھا۔۔۔۔ 'منصوبہ'۔

تبھی پال گومرا کو چاند دکھائی دیا۔ سوٹ کیس کا ڈھکن کھلنے سے جو ہلکی سی دراز ہوگئی تھی وہ اسی میں سے دکھائی دیا۔۔ وہ چونک گئے کیونکہ اس کا منہ ٹیڑھا تھا۔

اور اسی لمحے چاند کی مدھم روشنی میں انھوں نے سیڑھی پر رینگتے لوگوں کو دیکھا۔ ان میں سے بیشتر کو وہ پہچانتے تھے۔ اچانک گجانن مادھو مکتی بودھ کی کویتا 'اندھیرے میں' کی لائنیں پال گومرا کے ذہن میں گونجنے لگیں۔

چہرے وے میرے جانے بوجھے سے لگتے
ان کے چتر سماچار پتروں میں چھپے تھے
ان کے لیکھ دیکھے تھے
یہاں تک کہ کویتائیں پڑھی تھیں
بھئی واہ!
ان میں کئی پرکانڈ آلوچک، وچارک،
جگمگاتے کوی گنڑ
منتری بھی، ادیوگ پتی اور ودوان
یہاں تک کہ شہر کا ہتیارا کُکھیات
"ڈوماجی استاد۔۔۔۔"

اور تبھی ان میں سے ایک نے پال گومرا کو دیکھ لیا اور زور سے چیخا۔

"مارو۔ مارو سالے کو! ٹھنڈا کردو ایک دم۔"

وہ ایک قومی صحافی تھا، جس نے اسٹیبلیشمنٹ کو قارئین گفٹ دے کر مدیر معاون کی ملازمت حاصل کی تھی اور جس نے پچھلے تین برسوں سے کوڑھ مٹاؤ منصوبے سے کافی کمائی کی تھی۔

"گولی مار دو۔ اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ ختم کردو حرامی کو۔" یہ ناک

سے بولنے والا راجدھانی کا سیکولر کوی تھا جو ایک طویل مدت سے ایک وزیر کی جیب میں بیٹھا ہوا بادام کھا رہا تھا اور چھلکے پال کومرا کی تخلیقات اور خوابوں پر گرا رہا تھا۔

ڈر کی وجہ سے پال کومرا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے اسکوٹر کے پاس نہیں، صوفے پر سوئے ہوئے تھے اور ٹی-وی پر "زی بار بر شو" آرہا تھا۔ ان کی پیشانی جل رہی تھی اور جسم پسینے سے لت پت تھا۔ انھیں یاد آیا کہ مکان مالک گزشتہ پانچ مہینوں سے مکان خالی کرنے کا نوٹس دے رہا تھا، پچھلے مہینے اس نے دو غنڈے بھیجے تھے۔

جب اسکوٹر کو اس جگہ کھڑے ہی چھ مہینے ہو چکے تھے تب جاکر انھیں راجدھانی میں ایک ایسا دل والا دوست ملا جو اپنے مصروف اور بیش قیمت وقت میں سے ایک پورا دن پال کومرا کو اسکوٹر سکھانے میں دان کردینے کے لیے تیار تھا۔ پال کومرا اس دوست کی جانب احسان مندی سے ڈبڈبائی آنکھوں سے اور وفور جذبات سے دھڑکتے دل کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ اس دلخراش بڑے شہر میں بھوگل علاقے کے ایک ایم۔ آئی-جی فلیٹ میں اگے اس انسانی اور شریف درخت کا نام تھا---- پروفیسر اقبال جعفری---- مشہور ڈرامہ نگار، افسانہ نگار اور سیریل پروڈیوسر۔

پروفیسر اقبال جعفری نے اسکوٹر سکھانے کی بات خوشی خوشی فوراً مان لی بلکہ انھوں نے شکوہ بھی کیا کہ اتنے مہینے گزر گئے، انھوں نے کبھی اطلاع کیوں نہیں دی۔ بس انھوں نے ایک ہی شرط رکھی کہ سنیچر کی شام کو اسکاچ کی ایک بوتل اور جامع مسجد کے پاس کے مشہور ہوٹل کریم سے کشمیری دم پخت اسٹو اور قورمہ مٹی کے سوندھے کلھڑ میں پیک کرا کے دلی سے ساتھ لایا جائے۔ رات میں ضمیر خاں، مانسی راجورکر اور سوینا دیوی کا گانا سنتے ہوئے راگ درگا اور ٹھمری کے درمیان کھایا پیا جائے اور اطمینان سے اتوار کے پورے دن اسکوٹر چلانا سیکھا سکھایا جائے۔

سنیچر کی رات سنگیت، اسکاچ اور قورمہ، کشمیری دم پخت کے ساتھ دلی میں شب و روز ختم ہوتی انسانیت اور ملک سے غائب ہوتا حسن اخلاق اور ضمیر کے بارے میں مرثیے جیسی بات چیت میں گزری۔ اگلے دن پال کومرا رات آدھی بوتل چڑھا لینے کے باوجود کسی ہینگ اوور کے بغیر صبح پانچ بجے ہی اٹھ گئے۔ پروفیسر جعفری کے تیار ہونے اور ناشتہ کرنے سے پہلے ہی انھوں نے اسکوٹر دھو پونچھ کر سنئے کی طرح چمکا دیا۔

اسکوٹر کو ٹی نگر کے امینڈکر پبلک اسکول کے لمبے چوڑے کھیل کے میدان میں لایا گیا۔ چابی گھما کر سوئچ آن کیا گیا اور تب پال کومرا نے اپنی زندگی میں اسکوٹر کی پہلی کک لگائی۔

اسکوٹر اسٹارٹ نہیں ہوا۔

انھوں نے [illegible] بار کک لگائی، لیکن انجن بے جان ہی رہا۔ وہ زکام جیسی تک سوک کر خاموش ہو جاتا تھا۔

پروفیسر اقبال جعفری نے عقلمندی سے مسکراتے ہوئے بتایا کہ انڈین اسکوٹر کے ساتھ یہی ایک تکنیکی خامی ہے کہ جب تک اسے دائیں جانب جھکا کر لٹانہ دو اس وقت تک وہ اسٹارٹ ہی نہیں ہوتا جبکہ امریکہ میں اپنی رہائش کے دوران انھوں نے ایسے ایسے اسکوٹر دیکھے تھے جو تالی یا چٹکی بجانے سے ہی اسٹارٹ ہوجاتے تھے۔

پروفیسر جعفری نے اسکوٹر کو دائیں جانب آدھا لٹا کر پھر سیدھا کھڑا کیا اور کک لگانے لگے۔ پھر تو یہ ایک سلسلے جیسا بن گیا۔ اسکوٹر کو سلایا جاتا، جھک لیا جاتا اور کک لگائے جاتے۔

پال کومرا اور پروفیسر جعفری تھک ہار کر مضمحل ہو چکے تھے۔ دونوں کی دھوپ بڑھ گئی تھی۔ پھیپھڑے غبارے کی طرح پھول اور پچک رہے تھے اور انھیں اسکوٹر اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں تقریباً ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ اسی وقت انھیں بغل کی سڑک پر ایک آٹو رکشا نظر آیا۔ انھوں نے آواز دے کر اور ہاتھ ہلا کر بلایا اور پھر اس سے اپنا مسئلہ بتایا۔

آٹو والے نے اسکوٹر کو غور سے دیکھا اور ہینڈل کی دائیں جانب جہاں ہارن اور ہیڈلائٹ کا سوئچ تھا، اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے کہا۔

"اسکوٹر اسٹارٹ کیسے ہوتا صاب، اس کا اگنیشن لاک تو ابھی آن ہی نہیں ہے۔"

اس نے کک ماری اور ایک دو بار چڑ-چڑ کی ناپسندیدہ آواز نکالنے کے بعد اسکوٹر اپنے انجن کے روایتی سنگیت میں آگیا۔ کتنی صاف، شفاف، ملائم اور مشکرانہ آواز تھی۔ آٹو والے نے ایکسیلیٹر گھمایا تو سنگیت ذرا دیر کے لیے درت لے میں آیا۔ پسٹن، اسپارک پلگ اور سائلینسر کا ماہرانہ سنگیت۔

آٹو والے نے چلتے ہوئے اسکوٹر کا ہینڈل پروفیسر جعفری کو تھمادیا اور اپنا آٹو رکشا لے کر سیٹی بجاتا ہوا چلا گیا۔

پروفیسر اقبال جعفری کافی دیر تک اسکوٹر کا ہینڈل پکڑے کھڑے رہے جبکہ گوپال کومرا ان سے اصرار کر رہے تھے کہ وہ ایک بار اس میدان میں اس کا ٹرائل لے کر دیکھ لیں۔ پال کومرا اپنے اسکوٹر کو ایک بار چلتے ہوئے، امینڈکر اسکول کی ہموار سطح پر بطخ کی طرح تیرتے ہوئے، آنکھ بھر کر دیکھنا چاہتے تھے۔

پال کومرا نے دیکھا کہ دور شمال کی جانب چدھران کا فلیٹ تھا، میدان کے اس پار منٹو، نیتا اور پپو کھڑے تھے اور اشتیاق سے پاپا کو اسکوٹر چلانا سیکھتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔

اور ان کے پیچھے پلو کا کونہ منہ میں ٹھونسے سیندھ تا سکینہ کھڑی تھیں۔ اب وہ مہر جیسا نہیں، ان کی بیوی تھیں۔

لگ بھگ پندرہ منٹ تک اسٹارٹ اسکوٹر کو علی حال پہ تھامے رکھنے کے بعد پروفیسر اقبال جعفری نے آخر یہ تسلیم کرلیا کہ انھیں اسکوٹر چلانا تو خیر آتا نہیں، انھیں یہ بھی نہیں آتا کہ اسے بند کیسے کیا جائے۔

اس کے بعد اسکوٹر طویل مدت تک' آبپاشی سے محروم ناجائز' خودرو زہریلے پودے کی طرح چپ چاپ کھڑا رہا۔ اسے نہ کسی نے پونچھا' نہ دھول جھاڑی' نہ کبھی اس کی بھوک پیاس' دکھ درد کے بارے میں پوچھا۔ پال گومرا سرکاری روڈویز کی بس سے چار روٹی' دو آلو کے آٹھ ٹکڑے اور پیاز پلاسٹک کے چوکور ٹفن میں لے کر نکل جاتے اور رات میں لوٹتے تو اتنی دیر ہو چکی ہوتی کہ اگلی صبح جاگنے کے لیئے سونے کے علاوہ ان کے تھکے ہوئے دماغ اور جسم میں اور کوئی بات نہیں آتی تھی بلکہ ایسے ہی کسی لمحے میں اچانک پال گومرا کو لگا تھا کہ ان کی ساری کوتاہیں ایک تھکے ہوئے' شکست خوردہ اور غیر مربوط جسم کی کوتاہیں ہیں۔

اس درمیان' ان کا بیٹا ضرور پاپا کے اس لاوارث پڑے آہنی جانور کو اشتیاق اور لالچ سے دیکھتا لیکن بابا صاحب امبیڈکر کے نام پر قائم شدہ انگریزی میڈیم کے پبلک اسکول کا کورس اور ہوم ورک اتنا زیادہ تھا کہ اسکوٹر چلانا تو دور اسے رفع حاجت کے لیئے بھی وقت نکالنا دشوار ہو جاتا تھا۔ باقی دونوں اولادوں کا بھی یہی حال تھا۔

اب بچیں سینہ لتا سکینہ۔ گھر کا سارا کام نمٹانے کے بعد جب وہ دوپہر کو پاس پڑوس کی عورتوں کے ساتھ افواہیں سننے بانٹنے کا کھیل کھیلتیں تب اکثر ان کی نگاہیں اسکوٹر پر جا پڑتیں۔ اس کے اس طرح بیکار کھڑے رہنے سے انھیں کئی قسم کے ناپسندیدہ سوالات کا سامنا کرنا پڑتا' مثلاً یہی کہ "کیا آپ کے شوہر آجکل دفتر نہیں جاتے؟ بیمار ہیں؟" "یہ اسکوٹر بھی ہے کس کا؟" "جب چلانا نہیں تھا تو پیسہ پھونکنے کی کیا ضرورت تھی؟" وغیرہ۔

اسی لیئے ایک دن انھوں نے اپنے شوہر پال گومرا سے کہا کہ "اگر اسے چلانا نہیں ہے تو ہم ہر مہینے مفت میں اس کی قسط کیوں ادا کریں؟ یہ لوہے کا **کھنکھڑ** تو ایک طرح سے ہمارے سر پر مسلط ہی ہو گیا۔ وہ پانچ ہزار پراویڈینٹ والے اور اب تک کی ساری قسطیں جوڑلیں تو دلی کے جمنا پار یا ادھر روہنی سائیڈ میں اچھا خاصا فلیٹ مل جاتا۔ پھر نہ تو اس جنجال اسکوٹر کی ضرورت رہتی' نہ محلے کی آلتو فالتو عورتیں اس طرح بات کا بتنگڑ بناتیں؟"

انھوں نے اپنے شوہر سے کہا "کیوں نہ اسے بھونیشور کو دے دیا جائے۔ وہ کئی بار کہہ بھی چکا ہے۔ وہ اپنا اسے چلاتا رہے گا اور قسطیں بھی بھرتا رہے گا۔ جب آپ کو چلانا آجائے تو واپس لے لیں گے۔"

بھونیشور سینہ لتا کا چھوٹا بھائی یعنی پال گومرا کا سالا تھا اور میرٹھ میں ٹی-وی ریپیرنگ اینڈ گلاس ورکس وغیرہ الڑم بلڑم کی اس کی ایک مشکوک سی دوکان تھی۔

"نہیں!" پال گومرا نے اپنی آواز میں ساری تلخی بھر کر اس تجویز کو فیصلہ کن انداز میں خارج کر دیا۔ سبب' ایک تو وہ اپنے سالے بھونیشور کو سر تا پا قدم بری طرح ناپسند کرتے تھے اور دوسرا یہ کہ جس قسم کا غیر واضح اور مشکوک اس کا دھندہ تھا اس میں ایک تو پیسہ ڈوب جانے کا اندیشہ تھا اور دوسری بات یہ کہ

وہ چار مہینے میں اس نئے بجاج چیتک کو یہاں وہاں ٹھوک ٹھاک کر کباڑ بنا کر وہ دوبارہ ان کے سر پٹخ سکتا تھا۔

دفتر میں اور دلی میں ان کے واقف کاروں میں اب اسکوٹر جیسے نہایت معتبر' غیر مہذب' غیر سماجی' غیر سنجیدہ موضوع پر کوئی بات نہیں ہوتی تھی' جب کہ وہ ہلکے ہرے رنگ کا بجاج چیتک پال گومرا کے شعور میں ہمیشہ موجود رہتا۔ پال گومرا اپنے اخبار کے لیئے کسی اہم حادثے پر لکھے گئے کسی دھرندر لکھاڑ کے چٹ پٹے مضمون کو ترتیب دے رہے ہوتے تو اچانک اس مضمون کی سطور کے درمیان یا کسی لفظ کے معنی کے اندر وہ چپ چاپ کھڑا دکھائی دے جاتا' انھیں اس کی دھڑکنیں تک سنائی دیتیں۔ وہ مضطرب ہو جاتے اور کوتاہیں ادھوری رہ جاتیں۔

چاروں طرف تبدیلیوں کی رفتار بہت تیز تھی۔ دلی کلائڈواسکوپ بن چکی تھی۔ لاکھوں اقسام کے صابن' ہزاروں ٹوتھ پیسٹ' کروڑوں گھڑیاں' ہزاروں کاریں' جا نگھیے' کریم' بریسری' ڈلڈا' سینیٹری نیپکنس' سی-ڈی' رائفلیں' ریموٹ' کاسمیٹکس' لگزری کنڈوم' ٹرانکولائزرس' ٹیلی فون' فیکس' مساج سینٹرس' ہمس.....

سرکاریں بنتیں بگڑ جاتیں۔ کوئی وزیر اعظم بنتا' پھر یا تو گرا دیا جاتا یا مار دیا جاتا۔ لوگوں کی یادداشت اس کیسیٹ کی طرح تھی جس میں ہر روز نئی پرچھائیاں' نئی آوازیں ٹیپ کی جاتیں اور رات میں انھیں پونچھ دیا جاتا۔ صبح وہ سب کے سب نئی یادوں کے ہو جاتے۔ انھیں پچھلا کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔

خود پال گومرا کی یادداشت بھی دغا دینے لگی۔ حالانکہ وہ اسے بچائے رکھنے کے لیئے سخت جدوجہد کرتے رہتے۔ اپنی یادداشت کو بچائے رکھنے کے لیئے انھوں نے ایک عجیب و غریب طریقہ ایجاد کیا تھا۔ جب وہ سب بھولنے لگتے تو اپنی آنکھ کی پتلیوں کو ناک یا ناک کی نوک پر مرکوز کر کے دلی کے عجائب گھر میں رکھے سفید رنگ کے دوشالے پر اپنی تمام دھیان مرکوز کر دیتے۔ یہ ایک مشکل اور پر مشقت عمل تھا۔ کچھ دیر کے بعد ان کی یادداشت میں ہلکا سا اجالا ہونے لگتا اور سستی سی چپل اور کمانی دار عینک کے برابر رکھا وہ دوشالہ ان کے سامنے ابھرنے لگتا۔ تب وہ اور زیادہ محنت کرتے اور پھر دھیرے دھیرے ان کے شعور کی اندرونی آنکھوں کے سامنے اس دوشالے پر لگے خون کے دھبے دکھائی دینے لگتے جنھیں وقت اور تبدیلی نے کالا کر ڈالا تھا۔

یہ دھبے ۱۹۴۸ میں ہوئے ایک قتل کے دھبے تھے۔

پال گومرا کو یاد آجاتا کہ گذشتہ پانچ برسوں میں ہندی زبان میں ان کے جیسے ہی تقریباً دو درجن شاعروں اور ادیبوں نے جراثیم کش محلول پی کر یا سیلنگ کے ہک میں رسی سے پھندا لگا کر خودکشی کر ڈالی تھی۔ کچھ کو نامعلوم لوگوں نے مار ڈالا تھا۔ پال گومرا کو لگا کہ بڑی بڑی ایجنسیوں' صنعتی گھرانوں' سرکاری محکموں نے سب کچھ حاصل کر لیا ہے اور اب ان کے پیچھے کوئی لگے

لیے فلٹ پینے یا گلے میں پھندہ لگانے کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

چاندنی چوک کی ایک تنگ گلی میں' پال کومرا نے بچشم خود دیکھا تھا کہ دلی کے ایک بہت بڑے شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کا مکان تھا' جسے کوئلہ گودام میں بدل دیا گیا تھا اور انھوں نے سنا تھا کہ لکھنؤ کے پاس' دلی کے ایک دوسرے شاعر میر تقی میر کی قبر تھی جس کے عین پہلو میں ریل کی پٹریاں بچھادی گئی تھیں جن پر دن رات چوبیس گھنٹے مال اور مسافروں کو ڈھونے والی ریل گاڑیاں دھڑدھڑاتی ہوئی دوڑتی رہتی تھیں۔

اس قبر کے ایک ٹوٹے پھوٹے پتھر پر لکھا تھا۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

دیکھتے ہی دیکھتے غازی آباد' امریکہ کے لاس اینجلس کے بعد جرائم کے لیے دنیا کا دوسرا سب سے بڑا شہر بن گیا تھا۔ یہاں ہر گھنٹے اغوا' لوٹ' پھروتی' زنا بالجبر اور قتل کی شرحیں لاس اینجلس کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ ہو گئی تھیں۔

اور بھارت کی راجدھانی نئی دلی جو تمام تبدیلیوں کا نروسینٹر تھی وہاں کے حالات کسی تیسرے درجے کی لگدی ناول یا ستیہ کتھائیں مارکہ سڑک چھاپ رسائل کے قصوں سے الگ نہیں تھے۔ وہاں ہر روز ڈیڑھ سال سے نو سال تک کی عمر کی بچیوں کے ساتھ زنا بالجبر اور گلا گھونٹنے کی خبریں اس اخبار کے دفتر تک پہنچتی تھیں جس میں پال کومرا کام کرتے تھے۔ جو خبریں نہیں پہنچتی ہوں گی ان کی تعداد کے بارے میں صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا تھا۔

اور سکریٹریٹ' جہاں بھارتی انتظامیہ کی سب سے زیادہ طاقتور اور فیصلے کرنے والی نوکر شاہی یعنی انڈین ایڈمنسٹریٹو سرویز کے چنیدہ افسروں کے چیمبرس تھے' ان کے ڈیٹا' اعداد و شمار اور حقائق کافکا کے ڈراونے خوابوں جیسی کہانیوں سے ملتے جلتے تھے۔ وہاں ایک سکریٹری ایسا تھا جو اپنی آٹھ سال کی بیٹی کے ساتھ کسی ہوٹل کے روم میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ غیر فطری مباشرت کر رہا تھا' دوسرا اپنے محکمے کے تحت ملنے والے سارے انعاموں' عطیوں اور خطابوں سے اپنی جیبوں کو بھر رہا تھا' تیسرا ایک بدنام اسمگلر اور کالونائزر کو کسی پرائم ایریا کا فرضی ملکیت نامہ دے کر جنوبی دلی کے پاش علاقے میں اپنا شاندار بنگلہ بنوا رہا تھا' چوتھا میزائل اور ایٹمی ایندھن کی قومی دفاع کے نقطۂ نگاہ سے نہایت پوشیدہ معلومات دشمن ملک کی خفیہ ایجنسی کو فروخت کر رہا تھا' پانچواں اپنی ماتحت کے کولھوں میں چکوٹی کاٹ رہا تھا' چھٹا اپنے بھائی بہن' اعزا و اقارب اور چاپلوسوں کو دھڑا دھڑ نوکریاں' ملازمتیں' فیلوشپ اور خطاب بانٹ رہا تھا اور ان سب کی ترقی ہو رہی تھی اور جمہوری حکومت کا چوتھا پایہ اس بے ایمان اور مجرم عمارت کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔

کہیں سے بھی مخالفت یا تنقید کی چیں چپڑ نہیں تھی۔ کسی بھی قسم کی مخالفت کو یورپ کے سوشلزم کی طرح پسماندہ غیر متعلقہ پنگ اور مان لیا گیا تھا۔

الہ آباد' بنارس' یا متھرا' یا بریلی متھرا جیسے کسی شہر سے نئی دلی آیا ہوا ایک پڑوا' بورسیاٹا' دریدا' پھوکو' باتھ' جیسے لفظوں کے منتر پڑھتا ہوا ہر اخبار اور رسالے کے صفحات پر ہر روز ڈگڈگی بجاتا ہوا ناچ رہا تھا۔

"سنو' سنو' سنو! اب تاریخ کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اب اس نئی تہذیب کے مرکز میں انسان نہیں' بلکہ دولت اور اقتدار ہے یعنی سسٹم اینڈ پاور۔ انسان تو اب صرف ماحولیات کا حصہ ہے۔ اقتدار اور بازار' سرمایہ اور بازار کی مذمت ہی اب الفاظ اور زبان کا دھرم ہے۔ اب کہیں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ چاروں طرف صرف اطلاعات ہیں۔"

"مظفر نگر کے گیہوں کے کھیتوں میں ۲ اکتوبر ۱۹۹۳ کو جن پچیسوں اتراکھنڈی عورتوں کو بھارت ورش کی پولس نے کھدیڑ کھدیڑ کر ریپ کیا' وہ صرف ایک اطلاع ہے۔ فلپائن کے شہر منیلا میں دلی کے وسنت کنج علاقے میں رہنے والی لڑکی سستا سین کے مس یونیورس چنے جانے کی اطلاع کے مقابلے ایک نہایت پھسپھسی اطلاع' کیونکہ بھارت اب آفاقیت کی وجہ سے بین الاقوامی معاشی نظام کا ایک ابھرتا ہوا کھلا مال گودام اور شاندار کنزیومر بازار بن گیا ہے۔ مظفر نگر کی اطلاع سے اس مال گودام کی جو عورت بین الاقوامی بازار میں اب بھنڈی' ککڑی' آلو یا مولی ثابت ہو رہی تھی' منیلا کی اطلاع نے اسے سونا' افیم یا یورینیم جیسا قیمتی اور گراں کر دیا ہے اور ۲ اکتوبر کی تاریخ اب کوئی بھی علامت بننے کی پرانی صلاحیت کھو چکی ہے کیونکہ ایشور اب مر چکا ہے۔"

دلی کے نہایت حقیر معمولی اور اسکوٹر تک چلانا نہ جاننے والے کوی پال کومرا کو لگتا کہ وہ کسی قبر کے اندر سو رہے ہیں اور ان کے دماغ کے ٹھیک اوپر لوہے کی پٹریاں بچھادی گئی ہیں جن پر شتابدی میل دھڑدھڑاتی ہوئی دوڑتی جا رہی ہے۔

ایک کے بعد ایک ڈبے۔ لامتناہی
دھڑ..... دھڑ..... دھڑ.....!
دھڑ..... دھڑ..... دھڑ.....!!

اس درمیان پال کومرا کی پہچان راجیو مینن سے ہو گئی۔ وہ کوچین کے قریب کے ایک قصبے اڈیم پور کا رہنے والا تھا اور سرکاری روڈویز کی اسی بس سے روزانہ غازی آباد سے دلی جاتا تھا۔ وہ آئی۔ٹی۔او پل کے پاس ہی میور بھون میں فیشسا نیوز کی ایک کمپنی میں اکاؤنٹ کا کام کرتا تھا۔

سانولے' کوسلے' دبلے پتلے' داڑھی والے ہنس مکھ راجیو مینن نے پال کومرا کی یہ تجویز منظور کر لی کہ بس سے آنے کے بجائے وہ اب اسکوٹر سے دفتر آیا جایا کریں گے۔

اسکوٹر چلائے گا راجیو مینن اور پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوں گے اس کے مالک ہندی کوی پال کومرا۔

اس طرح شوفر۔ ڈرائیورین بجاج چیتک کے ذریعے کوی پال کومرا اب

ہر روز غازی آباد سے دلی کے اپنے دفتر آنے جانے لگے۔ لیکن ایک مسئلہ یہاں بھی تھا۔ ان کی ڈیوٹی تین بجے دوپہر کو ہی ختم ہو جاتی تھی جبکہ راجیو مینن میسیسائیڈس کی جس پرائیوٹ فرم میں کام کرتا تھا وہاں روزانہ سات آٹھ بجنا تو معمولی بات تھی۔ مہینے میں دو چار بار زیادہ کام ہونے پر دس گیارہ بھی بج جاتے۔ یعنی اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر پال کومرا عموماً تین چار گھنٹے روزانہ مینن کے انتظار میں بیٹھے رہتے۔ اس کا مطلب یہ کہ اسکوٹر خریدنے کی ان کی جس وقت شماری کی منطق تھی، وہ بیکار ہو چکی تھی۔ انتظار کا یہ وقت بالکل خالی وقت ہوتا۔ دلی ایک ایسا شہر تھا جہاں لوگ ایک دوسرے سے صرف کام ہونے پر ہی ملتے تھے۔ یوں ہی مل لینے سے لوگوں کے من میں اس شخص کے بارے میں رائے خراب ہو جاتی تھی، اس لیئے دھیرے دھیرے دلی کے احباب کے درمیان کوپال کومرا کی امیج خراب ہونے لگی۔ وہ کسی مسخرے 'غیر سنجیدہ' گھٹے اور غیر مفید چیکو کے طور پر مشہور ہونے لگے۔ لوگ ان کی شخصیت اور ان کی تخلیقات کی جانب سے آنکھیں پھیر لیتے۔

کیسی ستم ظریفی تھی۔ بچپن سے ہی پال کومرا نے کچھ اور نہیں، صرف کوی بننا چاہا تھا۔ ایک بالکل 'محفوظ' خالی اور سنسان علاقہ۔ اسکولی کاپیوں میں کویتائیں لکھنے پر انھیں ڈانٹ کھانا پڑتی۔ کوئی نیا نیا لفظ انھیں اپنے جادو اور نشے میں اتنا باندھ لیتا کہ وہ اسے لگاتار بدبداتے یا دیواروں پر لکھتے اور گھورتے۔ وہ تلسی، کبیر، نیودا یا میر جیسا شاعر ہونا چاہتے تھے۔ ویسی ہی زبان، اسی طرح کے لفظ اور دل کی گہرائی تک اتر جانے والے ویسے ہی درد کے شاعر۔۔۔ اور اس تلخ حقیقت نے وہ خواب بھی چھین لیا تھا۔

وہ کچھ نہیں رہ گئے تھے۔ نہ شاعر، نہ شہری، نہ شاید ٹھیک ٹھیک ڈھنگ سے انسان ہی۔

اس دوران راجیو مینن کے انتظار میں خالی وقت کو انھوں نے کویتائیں لکھ لکھ کر پر کیا۔ ان کے جھولے میں رکھی ڈائریوں اور رف کاغذوں میں سینکڑوں آدھی پوری لکھی ہوتیں۔ وہ اکثر کچھ کاغذوں کو سمیٹنا بھول جاتے اور وہ کاغذ ہوا سے ادھر ادھر اڑ جاتے۔

آئی۔ٹی۔او پل کے پاس بس اسٹاپ پر ملے ایک کاغذ میں ان کی ادھوری کویتا کچھ اس طرح لکھی ہوئی تھی :

میں نہیں بن سکتا سی ویڈ پائپ
اپنے بھیتر سے نہیں گزر جانے دوں گا میں
یہ سارا کیچڑ، اس بوڑھی صدی کی
وشٹھا
اتنا پیلا ابھی بھی نہیں ہوا ہے
میرا من
کہ ہر آتی جاتی ہوا اس میں اپنی
سکتی بجا جائے۔۔۔۔
کھا کھا کھا کھا کھا
کھا کھی کھی کھی کھی کھی کھا
کھو کھو کھا کھا کھو کھو کھا کھو کھا
کھی کھی کھی کھی
کھن کھن کھن
کھہ کھہ کھہ !!

ایسی کئی اور بھی آدھی ادھوری کویتائیں تھیں جو آئی۔ٹی۔او پل کے آس پاس یہاں وہاں اڑتے کاغذوں پر لکھی ہوئی مل جاتی تھیں۔ ان میں طوائف الملوکی تھی، فرسٹریشن اور کنٹھائیں تھیں، ہیجان تھا، پاگل پن کی علامتیں تھیں یا کسی گہری لیکن لاچار نفرت اور جمود، اوسر اور بانجھ غصہ کا اظہار تھا، یہ کہنا مشکل ہے۔

اب تک آپ سب ہندی کوی کی اس کہانی سے کافی اوب گئے ہوں گے۔ بیان میں تکرار، غیر ضروری تفصیل اور بیچ بیچ کے درمیانی معاملات، ذیلی معاملات سے ناراض بھی ہو گئے ہوں گے لہٰذا اس قصے کو اب جلد از جلد سمیٹ لیا جائے۔ ویسے بھی اب جو کچھ بچا ہوا ہے، وہ اختتامیہ جیسا ہی ہے۔

تو ہوا یہ کہ چار مہینے پہلے ایک دن پال کومرا کو ایک تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ کسی وزارت کے سکریٹری کی سطح کے ایک انتظامیہ افسر کو بیک وقت پدم شری، ساہتیہ وبھوشن، ویدویاس اعزاز اور جاپانی تعاون سے بھارتی کار بنانے والی موکانجی کمپنی کی جانب سے دس لاکھ روپے کا 'سرجن شکھر' انعام ملا تھا۔

جس تاریخ کو وہ پروگرام رکھا گیا تھا، اس دن وہ سکریٹری اپنی عمر کے پچاسویں اہم سال میں قدم رکھ رہا تھا، اس لیئے اس پروگرام کو نام دیا گیا تھا۔۔۔۔ "ان حد اردھ شتی" (غیر مجروح نصف صدی والا) اس سلسلے میں وزارت کے تحت آنے والی تمام انجمنوں، اکادمیوں نے اپنے اپنے جریدوں کے نصف صدی خصوصی شمارے چھاپ رکھے تھے جن کا اجراء بھی اسی دن ہونا تھا۔

پروگرام کا انعقاد جنوبی دلی کے انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ہونا تھا۔

راجیو مینن سے جب پال کومرا نے اس رات اس پروگرام میں چلنے کے لیئے کہا تو اس نے انھیں منع کیا۔ راجیو مینن نے کہا "لیکن پال، یہ پروگرام تمھارے جانے کا نہیں ہے۔ اتنے دنوں سے تمھارے ساتھ رہ کر ہم تمھارا نیچر سمجھ گیا ہے۔ تمھارا دنیا الگ ہے، ان لوگوں کا الگ ہے۔ ویسے آر یو فل سینٹیمنٹل، یو آر اے پور، سمپل، ویک ہندی پوئٹ، گوڈ ننس کو دیسا۔۔۔"

لیکن پال کومرا نے الٹے راجیو مینن پر شک کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے کہا۔۔۔ "میں نے پہلی بار تم سے اپنے کسی کام کے لیئے رکھنے کو کہا ہے تو تم

اس میں بھی بہانے بنا[illegible]ہو- جبکہ تمھارے لیئے میں ہر روز ایورنج تین چار گھنٹے خالی بیٹھا رہتا ہوں- جہاں تمھارا جی چاہتا ہے تم میرا اسکوٹر لے جاتے ہو' میں نے کبھی منع نہیں کیا..... "وغیرہ-

بہرحال' اس رات اس پروگرام میں کیا کیا ہوا اس کی مکمل تفصیل کا حصول تو ممکن نہیں ہے کیونکہ ایک تو ایسے پروگراموں میں جو لوگ شرکت کرتے ہیں ان تک پہنچنا اور ان سے ملاقات کرنا مشکل ہوتا ہے' پھر پوچھ تاچھ کے معاملے میں وہ لوگ اکثر چپ ہی رہتے ہیں- وہ لوگ اتنے مصروف' اعزاز یافتہ اور معزز ہوتے ہیں کہ ان سے اسکوٹر حادثے جیسے کسی معاملے کے بارے میں کچھ پوچھنا مناسب بھی نہیں معلوم ہوتا-

اس پروگرام کی خبر اگلی صبح دلی کے سب ہی اخباروں میں شائع ہوئی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پروگرام کافی کامیاب اور شاندار رہا- اس میں مرکزی وزارت انسانی وسائل کے وزیر' وزیر وزارت داخلہ' موکانجی انڈسٹریل گروپ کے شری ڈی-ایل- موکانجی' دوبئی کے امیر خلیل الفرقانی' کئی نان ریزیڈینٹ انڈین انٹرپرینیور' وزیر وزارت اطلاعات' مشہور فلمی ہیروز اور ہیروئنیں' کتھک اوڈیسی وغیرہ کی رقاصائیں' دلی کے تقریباً تمام ادیب' شاعر' نقاد اور صحافی موجود تھے- یہ خبر بہادر شاہ ظفر روڈ کے اس قومی روزنامے کے ثقافتی صفحے پر نمایاں طور پر چھپی تھی جس میں پال گومرا ملازمت کرتے تھے اور تک بھگ اپنی ۲۳-۲۴ سال کی ملازمت کی مدت میں پہلی بار بغیر پیشگی اطلاع کے دفتر نہیں پہنچ سکے تھے-

اس تقریب میں راجدھانی کے چوٹی کے نقادوں اور ایڈیٹروں نے پدم شری سکریٹری کا موازنہ ہومر' غالب اور کبیر سے کیا تھا- ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری نے پدم شری سکریٹری کو آکٹوویوپاز اور پابلونیرودا جیسے ایسے شاعروں کے سامنے پیش کیا تھا جو ذمہ دارانہ انتظامیہ عہدوں پر رہتے ہوئے بھی اپنی تخلیقی حسیت اور تخیل کو برقرار رکھ سکے- مشہور ترقی پسند نقاد ڈاکٹر لوک ناتھ ترویدی نے سکریٹری کی تخلیقات میں اندرونی روحانیت کو کبیر' رے داس اور تکارام کی باغیانہ حسیت کی روایت کی نئی سیڑھی ثابت کرتے ہوئے کہا تھا کہ پدم شری سکریٹری کی کوتائیں ہندی کی ترقی کوتا کی انمول امانت ہیں-

وزیر انسانی وسائل نے کہا تھا کہ سکریٹری کی تمام زندگی ہی ایک جیتی جاگتی شاعرانہ تخلیق ہے- انھوں نے اعلان کیا کہ سکریٹری کی بصیرت کی قدر شناسی اور عزت افزائی کے لیئے وہ پوری کوشش کریں گے کہ نوبل اور گولڈن بکر جیسے بین الاقوامی سطح کے انعامات میں ہندی کی تخلیقات بھی منتخب ہو کر شامل ہوں-

موکانجی انڈسٹریل گروپ کے موجودہ چیئرمین ڈی-ایل موکانجی نے دس لاکھ روپے کا ڈرافٹ سکریٹری کو دیتے ہوئے اعلان کیا کہ چمپارن کے غریب نیل کی کاشت کرنے والے کسانوں کی خدمت کے ساتھ ان کے انڈسٹریل گروپ نے ڈیڑھ سو سال پہلے جس روایت کا آغاز کیا تھا' وہ اب اسے آگے بڑھائیں گے اور اب بھارتی ثقافت کی عظیم روایات کے فروغ میں اپنا تعاون پیش کریں گے-

ہندی کے چوٹی کے مانے جانے والے کوی شکل بندھوؤں نے اس موقع پر اپنی اپنی کوتاؤں کا پاٹھ بھی کیا- خاص واقعے کا اگلا حصہ اس دوران وقوع پذیر ہوا تھا-

ہندی کوی پال گومرا ضرورت سے زیادہ شراب پی گئے تھے اور نشے میں دھت ہو کر بلند آواز میں انٹ شنٹ بولنے لگے تھے- انڈین کلچرل ریلیشنس سوسائٹی کے زیر اہتمام آیوا کی بین الاقوامی شاعری ورکشاپ میں شامل ہو کر حال ہی میں لوٹنے والے کوی مدھرناگپال نے بتایا تھا کہ بہت دیر تک تو پال گومرا اسکوٹر پر ہی لیکچر دیتے رہے...... وہ بہک گئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اسکوٹر ایک چرخا ہے جس سے سوت کات کر امریکہ کی ملٹی نیشنل کمپنیوں کو ختم کیا جا سکتا ہے- لوگوں نے انھیں چپ کرانے کی کوشش کی تو وہ دلی کو ہی گالیاں دینے لگے-

انڈین ہسٹاریکل ریسرچ کمیٹی کے اہم افسر ڈاکٹر ڈی- آر وا چسپتی کے مطابق پال گومرا نے کہا تھا کہ میں میواتیوں' بنجاروں' پنڈاریوں' قبائلیوں اور سے-سے کالونی والوں کے جتھے بنا کر بجاراؤ پیشوا یا شیر شاہ سوری کی طرح چاروں اور سے دھاوا بولوں گا- وہ آزاد ہند فوج بنا کر برما بھاگ جانے کی بھی بات کر رہا تھا- شری یشونت نرائن سنہا نے جو انڈین پولس سروس میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل تھے اور مشہور افسانہ نگار تھے' ہنستے ہوئے بتایا تھا کہ بھئی وہ شخص تو عجیب و غریب حرکتیں کر رہا تھا- اس نے کہا تھا کہ دلی کی ساری سپلائی لائنیں کاٹ دوں گا- باہر سے نہ یہاں دودھ آئے گا' نہ مکھن' نہ سبزی' نہ پانی! بجلی گل ہو جائے گی' اے-سی بند ہو جائے گا تو یہ سارے کے سارے ولایت بھاگ جائیں گے- میں تو کھیتی پھانک کر لال قلعے کے میدان میں سو جاؤں گا-

ہندوستانی ادارہ آثار قدیمہ کے ایک کیوریٹر ڈاکٹر ایس- آر صدیقی کا کہنا تھا کہ پال گومرا کہہ رہا تھا کہ موہن جوداڑو نیست و نابود ہو گیا لیکن اس کے آس پاس کے گاؤں ختم نہیں ہوئے- وہ آج بھی ہیں' جاؤ دیدے پھاڑ کے دیکھ لو- ڈائنوسار غائب ہو جاتا ہے' چیونٹی بچی رہتی ہے' حرامزادو! دلی فنا ہو جائے گی' گڑگاؤں رہ جائے گا.....

کئی صحافیوں نے بتایا تھا کہ پال گومرا نے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں الٹیاں کی تھیں اور کہا تھا کہ دلی میرے ملک کو توڑ رہی ہے-- وہ طوائف الملوکی' غنڈہ گردی' توڑپھوڑ اور پاگل پن پر اتر آئے تھے-

انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں جو کچھ بھی ہوا ہو' یہ سچ ہے کہ اس تقریب میں جتنے بھی معززین شامل ہوئے تھے' کسی نے بھی پال گومرا کی حمایت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا- بلکہ ایک مرکزی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبہ ڈاکٹر دودھا ناتھ سنگھ کھنڈوال نے جو اب سنت رے داس یادگار کے صدر بھی تھے' کہا تھا کہ وہ

تو یہاں موچیوں، منگیوں اور دھوبیوں جیسی چھوٹی ذاتیں کیا کرتا تھا۔ ایسے چرکٹ کویوں کو تو ایسی تقریبوں میں بلانا ہی نہیں چاہیے۔ اس نے تو سر ہندی کی ناک ہی کاٹ دی۔

ویسے کچھ بھی معلومات راجیو مینن سے مل سکی تھیں جو اس رات پال گومرا کے ساتھ اس پروگرام میں لگاتار موجود تھا اور اسکوٹر چلاتا ہوا انھیں واپس غازی آباد ان کے گھر پہنچا رہا تھا۔ لیکن راجیو مینن کی موت ہو چکی تھی۔ مختصراً اگر تھوڑے سے تخیل، اٹکل اور فینتاسی کا سہارا لیا جائے تو بعد کی روداد کچھ اس طرح بنتی تھی۔

انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں اس رات جب پال گومرا نے اودھم مچایا اور سول ڈریس یعنی سادی وردی میں موجود پولس والوں نے انھیں گردن پکڑ کر کشتی سے تربیت یافتہ چوٹ پہنچاتے ہوئے انھیں گیٹ سے باہر نکالا اور جب راجیو مینن کے ساتھ اپنے اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر وہ غازی آباد کے لیے روانہ ہوئے تو بہت عام ذہنی حالت میں نہیں تھے۔ سادی وردی والوں نے تربیت یافتہ کہنیوں اور گھونسوں سے جو چوٹیں انھیں پہنچائی تھیں، نشے کے باوجود وہ ان کا درد محسوس کر رہے تھے۔ دارو ضرور انھیں بے تحاشہ چڑھ گئی تھی اور وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے زور زور سے بک رہے تھے.... "سالا لارڈ کلائیو، پلاسی کی لڑائی جیت گیا تو سوچتا ہے سارا ہندوستان جیت لوں گا! سنو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹو اور دلالو، سنو فرنگیو کے آئی-اے-ایس افسرو.... یہ ہندی تو موچیوں، جولاہوں، دھوبیوں، فقیروں اور سادھوؤں کی ہی بھاشا ہے....

"یہ ریختہ، تمھاری زبان نہیں ہے پیارے...."

راجیو مینن کو بھی اس حادثے کے بعد سے کوچین میں اپنا قصبہ اڈیم پیرور مسلسل یاد آ رہا تھا۔ سمندر کا بیک واٹر، ناریل، آم، کٹھل، تاڑ، کھجور کے پیڑ، کاجو، الائچی، کالی مرچ، تاڑی اور مچھلیوں کی مہک، اسے کانور کا سمندری ساحل یا مغربی گھاٹ کی موسلادھار بارش کی یاد آئی ہوگی اور وہ مستی میں ساٹھ ستر کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے اسکوٹر سڑکوں کے بیچوں بیچ بھگانے لگا ہوگا۔

اس رات موسم بہت اچھا ہو گیا تھا۔ ہلکی بوندا باندی کے آثار تھے۔ ہوا میں بھاری پن، ٹھنڈک اور نمی تھی جو انسان کی جلد میں اپنے لمس سے امنگ اور مستی بھرنے لگتی ہے۔

پال گومرا اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے علامہ اقبال کا گیت گنگنانے لگے ہوں گے۔

ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
دشمن رہا ہے صدیوں....

بس ان ہی لائنوں کے آس پاس وہ حادثہ ہوا ہوگا، جس میں راجیو مینن کی جانے حادثے پر ہی موت ہو گئی ہوگی اور پال گومرا اگلی صبح تک جب تک انھیں دلی پولس کی پی-سی-آر جیپ نے لوک نایک جے پرکاش ہسپتال میں بھرتی نہیں کرایا ہوگا، اس وقت تک وہیں پڑے رہے ہوں گے۔

ایکسیڈنٹ کیسے ہوا؟ اس کے بارے میں کئی قیاس آرائیاں ہو سکتی ہیں۔ دلی-اترپردیش سرحدی پولس چیک پوسٹ کے رجسٹر کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس وقت کے آس پاس درجنوں ٹرک، کاریں اور دوسری گاڑیاں وہاں سے کراس ہوئی تھیں۔ انھیں میں سے کسی ایک گاڑی نے پال گومرا کے اسکوٹر کو ٹکر ماری ہوگی۔

حادثہ رات ساڑھے گیارہ اور ایک بجے کے درمیان کسی وقت ہوا تھا۔ ان ڈیڑھ گھنٹوں کے دوران دلی-یوپی بارڈر چیک پوسٹ کے رجسٹر میں بائیس ٹرک، آٹھ ٹیمپو، چھ ماروتی وین، پانچ پرائیویٹ اور دو سرکاری روڈویز کی بسیں، سولہ ماروتی کار، دو ٹاٹا سیرا، تین فیاٹ کی انٹری ہے۔ اسکوٹر اور موٹر سائیکلوں کی تعداد الگ ہوگی۔

لیکن انھی ڈیڑھ گھنٹوں کے اندر آٹھ کاروں کے ساتھ ایک وی-آئی-پی ایسکورٹ کے گزرنے کی بھی انٹری درج ہے۔ یہ وی-آئی-پی قافلہ اترپردیش کی ولت سرکار کے ایک منتری کا تھا۔ یہ ولت سرکار ایک ہی ذات والوں اور فرقہ پرستوں کی حمایت سے اقتدار میں آئی تھی۔ جس وزیر کا وی-آئی-پی ایسکورٹ تھا، اس کا پچھلا ریکارڈ بحرانہ تھا اور وہ اشتہاری ہسٹری شیٹر تھا۔ وزیر بننے سے پہلے تک اس کے فوٹوگراف پولس تھانوں میں لگے رہتے تھے۔ انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں منعقدہ پدم شری سکریٹری کے اعزازی جلسے میں وہ وزیر بھی موجود تھا یا نہیں، اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔

ممکن ہے ایکسیڈنٹ اسی تیز رفتار قافلے کے ساتھ ہوا ہو، جس طرح سے پال گومرا مستی، لاقانونیت اور نشے کی حالت میں تھے، علامہ اقبال کا "سارے جہاں سے اچھا" گا رہے تھے، اس میں بالکل ممکن ہے کہ دونوں لوگوں نے دور تک اور دیر تک ان وی-آئی-پی گاڑیوں کو سائیڈ نہ دی ہو، سڑک کے بیچوں بیچ اسکوٹر چلاتے رہے ہوں، سیکیورٹی کمانڈوز سے پنگا مول لے لیا ہو اور یہ ایک ایکسیڈنٹ جان بوجھ کر کر دیا گیا ہو۔

جو بھی ہوا ہو، غازی آباد کے کوی نگر کالونی کا ایل-آئی-جی فلیٹ نمبر اے-۲۲، اب خالی ہے اور پچھلے ہفتے اس کے اوپر "ٹو لیٹ کرو و ریسپٹی ڈیلرس" کا بورڈ لگا ہے۔ ہندی کوی پال گومرا کی بیوی سینہ لتا سکسینہ، جو ایک رات چند گھنٹوں کے لیے سربیا بنی تھیں، اپنے بیٹوں منٹو، پپو اور بیٹی نیتا کے اپنے سسرال بریلی چلی گئی تھیں یا کہیں اور، کوئی نہیں جانتا۔

آپ سب نے اتنی بوجھل، بیکار اور لمبی سی کہانی پڑھی۔ ایسا عمل اس زمانے میں مشکل ہے۔ اب آپ یہ ضرور جاننا چاہتے ہوں گے کہ آخر پال گومرا کا ہوا کیا؟ تو بہت بھاگ دوڑ، پوچھ تاچھ اور چھان بین کرنے پر جو تھوڑی بہت معلومات حاصل ہو سکیں، وہ پیش ہیں۔

پال گومرا کو ہسپتال میں تیسرے ہی دن چھٹی دیدی گئی تھی۔ ان کے سر میں معمولی چوٹ تھی، آٹھ ٹانکے لگے تھے لیکن ڈاکٹروں نے باقی علاج کے لیئے انھیں آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے نیورولوجی ڈپارٹمنٹ میں ریفر کیا تھا کیونکہ کیٹ اسکیننگ سے پتہ چلا تھا کہ ان کے دماغ کی جانب جانے والی ایک نس میں کلاٹنگ ہے۔

لیکن آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے نیورولوجی ڈپارٹمنٹ میں ہندی کوی پال گومرا کے پہنچنے کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ شاید وہ یا تو وہاں گئے ہی نہیں یا پھر انھیں وہاں سے بھگا دیا گیا ہوگا۔ ویسے بھی آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں ہر ایک جانتا ہے کہ وہاں وی۔ آئی۔ پی لوگوں کا، اعلیٰ افسروں اثر و رسوخ والوں کا ہی علاج ہوتا ہے۔ وہاں سے تو منشی پریم چند کے بعد ہندی زبان کے دوسرے سب سے اہم ناول نگار جینندر کو بھی بھگا دیا گیا تھا۔

دلی کے شاعر ادیب، پال گومرا کو بھولنے لگے ہیں۔ یہاں تک کہ آئی۔ ٹی۔ او پل کے پاس بہادر شاہ ظفر روڈ پر واقع قومی روزنامہ کے صحافی بھی بمشکل انھیں یاد کر پاتے ہیں۔ یاد انھیں اس وقت آتی ہے جب وہ ہنستے ہوئے کہتے ہیں "اوہ! اوہ! وہ اسکوٹر والا پوئٹ۔"

لیکن گذشتہ ڈیڑھ سال سے دلی سے غازی آباد، دیر رات جانے والے لوگ جو باتیں بتاتے ہیں اس سے پال گومرا کی اس کہانی میں ایک نئے زاویے کا اضافہ ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں جی۔ ٹی۔ روڈ پر آدھی رات کو اکثر ایک عجیب و غریب حلیے کا آدمی، اچانک بغل کی جھاڑیوں یا پلیا کی آڑ سے ہو.... ہو.... کہا.... کہاں سونک" کرتا ہوا کود کر چلتی ہوئی گاڑیوں کے سامنے آجاتا ہے۔

دھیرے دھیرے ہائی وے پر ٹریفک جام ہونے لگتا ہے۔ شروع میں لوگ ڈرتے ہیں، پھر سمجھ جاتے ہیں کہ بوڑھا ہوتا ہوا آدمی پاگل ہو گیا ہے اور اس سے کسی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

چلتے چلتے آدھی رات کو ہائی وے پر انٹرٹینمنٹ ہو رہا ہے، تو تھوڑی دیر کے لیئے ڈرائیور اور دوسرے مسافر تماشہ دیکھنے لگتے ہیں۔ جب بھیڑ آس پاس اکٹھا ہو جاتی ہے تو وہ بوڑھا آدمی ڈگمگاتا ہوا سڑک پر چلتا ہے: "وانڈی مارچ، وانڈی مارچ.... " اور گاتا ہے: "ویشنو جن تے تینے کہیئے.... جے پیڑ پرائی جانے رے.... " اس کے بعد وہ اچانک فوجیوں کی طرح پاؤں پٹخ کر لیفٹ۔ رائٹ کرتا ہوا مارچ کرنے لگتا ہے اور تب وہ آزاد ہند فوج کا ترانہ گاتا ہے "قدم قدم بڑھائے جا، خوشی کے گیت گائے جا، یہ زندگی ہے قوم کی، تو قوم پہ لٹائے جا!"

اس کے بعد شروع ہوتی ہے اس کی رواں دواں تقریر جسے سن کر لوگ تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ وہ اپنی تقریر میں نانا صاحب، دھندو پنت، تانتیا ٹوپے، اشفاق، خودی رام، تیغ بہادر جیسے کئی نام لیتا ہے۔ پھر کہتا ہے "میں ہوں دلت ہندی کوی رام گوپال۔ میں دلی کا نہیں رام پور اور غازی آباد کا ہوں۔ میں سودیشی آندولن چلاؤں گا۔"

اس کے بعد وہ طیش میں آجاتا ہے۔ آس پاس پڑے پتھروں کو اٹھا کر اندھیرے میں دلی کی سمت پھینکتا ہوا پوری طاقت سے انگریزی میں نعرے لگانے لگتا ہے: "کوٹ انڈیا، کوٹ انڈیا، کوٹ انڈیا...."

جی۔ ٹی روڈ پر آدھی رات، اس بوڑھے ہوتے آدمی کا تماشہ دیکھنے اکٹھا ہوئی ٹرک ڈرائیوروں، کلینروں اور مسافروں کی بھیڑ تالیاں بجاتی ہوئی اس کے ساتھ ساتھ دوہراتی ہے "کوٹ انڈیا، کوٹ انڈیا، کوٹ انڈیا...."

پال گومرا کا اسکوٹر یقیناً اب بھی شاہدرہ کے پاس، دریا گنج کی ٹریفک کوتوالی کے عقب میں مڑی تڑی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ اس ٹوٹے پھوٹے، حادثے کے شکار اسکوٹر پر مرنے والے راجو مینن اور پاگل پال گومرا کے خون کے دھبے ہیں جو سوکھ کر سیاہ پڑ چکے ہیں اور اس اسکوٹر کی ڈکی کے اندر اب بھی پال گومرا کی کویتاؤں کی ایک ڈائری بند ہے۔ اس کے آخری صفحے پر لکھا ہے۔

جو ہر جاتیاں پست ہو رہی ہیں
معقار جو مٹا رہا ہے جن کا ستو
ہو سکے تو ہم ان کی ہتیا میں نہ ہوں
شامل
اور سمجھ ہو تو سنبھال کر رکھ لیں
ان کے چتر....
یہ چتر اتیت کے اسمرتی چنہ ہیں....

پال گومرا ۱۵ اگست ۱۹۹۵

❖ ❖

آنے والا شخص

کلریس لسپکٹر ترجمہ : آصف فرخی

ہفتے کی شام تھی، چھ بج چکے تھے اور سات بجنے والے تھے۔ میں کوکا کولا اور سگریٹ خریدنے کے لیئے نیچے آئی۔ میں نے سڑک پار کی اور مانوئیل کی چھوٹی سی دوکان کا رخ کیا۔ مانوئیل پر تگیزی تھا۔

دوکان میں جب میں اپنی باری کے انتظار میں کھڑی تھی، تو ایک آدمی، جو چھوٹا سا ہارمونیم بجارہا تھا، وہاں آیا۔ اس نے میری طرف دیکھا، ہارمونیم پر ایک دھن بجائی اور میرا نام پکارا۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے انگلستان کے سفارت خانے سے جانتا ہے، جہاں میں نے دو تین ماہ پڑھا تھا۔ اس نے کہا۔ "مجھ سے ڈرو مت۔"

میں نے جواب دیا۔ "میں ڈر نہیں رہی۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ انگریزی میں جواب دیا۔ "نام سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

اس نے مانوئیل سے کہا۔ "یہ عورت مجھ سے صرف اس لیئے بہتر ہے کہ یہ لکھتی ہے اور میں نہیں لکھتا۔"

مانوئیل نے پلک بھی نہ جھپکائی۔ وہ شراب کے نشے میں دھت تھا۔ میں نے اپنی چیزیں اٹھائیں اور باہر نکلنے والی تھی کہ وہ بول اٹھا۔ "کیا مجھے یہ اعزاز حاصل ہو سکتا ہے کہ میں آپ کے لیئے یہ بوتل اور سگریٹ اٹھا کر لے چلوں؟"

میں نے جو کچھ خریدا تھا، اس کو پکڑا دیا۔ اپنی عمارت کے دروازے پر پہنچ کر میں نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ اور کوکا کولا کی بوتل لے لی۔ وہ میرے سامنے ساکت کھڑا رہا۔ پھر اس کے چہرے کو بہت مانوس پا کر، میں نے دوبارہ اس کا نام پوچھا۔

"میں کلادیو ہوں۔"

"کلادیو کون؟"

"اچھا، اس کا بھی جواب نہیں۔ کون کیا؟ میرا نام کلادیو برتو ہے۔"

"کلادیو!" میں نے چیخ کر کہا۔ "ارے، خدارا میرے ساتھ میرے گھر چلو۔"

"تم کون سی منزل پر رہتی ہو؟"

میں نے اسے منزل اور فلیٹ کا نمبر بتا دیا۔ اس نے کہا کہ میں دوکان پر اپنے پیسے ادا کرنے جارہا ہوں، پھر اوپر آؤں گا۔

میرے گھر پر میری ایک سہیلی آئی ہوئی تھی۔ میں نے اسے سب حال بتایا اور کہا کہ شاید وہ شرمندگی کے مارے یہاں نہ آئے۔

میری سہیلی نے کہا۔ "وہ نہیں آئے گا، وہ نشے میں ہے۔ وہ فلیٹ کا نمبر بھول جائے گا اور آ بھی گیا تو جانے کا نام نہیں لے گا۔ مجھے بتاؤ کہ تم کیا چاہتی ہو کہ میں اپنے کمرے میں چلی جاؤں اور تم دونوں کو تنہا چھوڑ دوں؟"

میں انتظار کرتی رہی ـــــــ وہ نہیں آیا۔ میں کلادیو برتو کی شکست پر افسردہ ہو گئی۔ میں دل گرفتہ ہو گئی اور میں نے کپڑے بدل لیئے۔

پھر کسی نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ بند دروازے کے پیچھے سے میں نے پوچھا، کون ہے۔ ادھر سے جواب آیا کلادیو۔

میں نے کہا۔ "برآمدے میں بنچ پڑی ہوئی ہے، اس پر انتظار کرو۔ میں ایک منٹ میں دروازہ کھول رہی ہو۔"

میں نے دوبارہ کپڑے بدلے۔ بڑا اچھا شاعر تھا، یہ کلادیو۔ اس دوران وہ کیا کرتا رہا ہے؟

وہ اندر آگیا اور میرے کتے سے کھیلنے اور یہ کہنے لگا کہ صرف جانور ہی مجھے سمجھ سکتے ہیں۔ میں نے پوچھا، قہوہ پینا پسند کروگے۔ اس نے کہا۔ "میں صرف تیز چیزیں پیتا ہوں، میں تین دن سے پی رہا ہوں۔"

میں نے جھوٹ بولا۔ "افسوس کہ میرے گھر میں شراب نہیں ہے۔" اور میں نے دوبارہ قہوہ پینے پر اصرار کیا۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا۔ "مجھ پر حکم مت چلاؤ۔"

میں نے جواب دیا۔ "میں حکم نہیں دے رہی ہوں۔ میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ قہوہ پی لو۔ میرے گھر کے تحت خانے میں بہت عمدہ قہوے کا تھرمس بھرا ہوا رکھا ہے۔"

اس نے کہا کہ مجھے تیز قہوہ پسند ہے۔ میں نے ایک پیالی میں قہوہ لاکر دیا جس میں بہت ذرا سی شکر تھی۔

اس نے پیالی کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ میں نے اصرار کیا۔ پھر اس نے قہوہ لیا اور میرے کتے سے باتیں کرتا رہا۔ "اگر تم نے یہ پیالی توڑ دی تو میں تمہیں

ٹھیک کروں گا۔ دیکھو۔ میری طرف کیسے دیکھ رہا ہے' میری بات سمجھتا ہے۔"

"میں بھی تمہاری بات سمجھتی ہوں۔"

"تم؟ تمہارے نزدیک تو صرف ادب ہی اہمیت رکھتا ہے۔"

"نہیں' تم غلط کہہ رہے ہو۔ میرے بچے' خاندان' دوست احباب۔۔۔۔ یہ پہلے آتے ہیں۔"

اس نے ٹیڑھی آنکھ سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تم قسم کھا سکتی ہو کہ ادب اہم نہیں ہے؟"

"میں قسم کھاتی ہوں۔" میں نے اس یقین کے ساتھ جواب دیا جو کسی اندرونی سچائی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔ "کوئی کتا' کوئی بلی بھی ادب سے زیادہ اہم ہیں۔"

"یہ بات ہے؟" اس نے کہا' وہ بہت متاثر معلوم ہو رہا تھا۔ "تو پھر ہاتھ ملاؤ۔ مجھے تم پر یقین ہے؟"

"تمہاری شادی ہو گئی؟"

"ہزاروں بار ہوئی ہے۔ مجھے تو اب یاد بھی نہیں ہے۔"

"تمہارے بچے ہیں؟"

"میرا پانچ سال کا ایک لڑکا ہے۔"

"میں تمہارے لیے اور قہوہ لاتی ہوں۔"

میں اس کی پیالی لبالب بھر لائی۔ وہ چسکیاں لینے لگا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "تم بہت عجیب عورت ہو۔"

"نہیں' بالکل نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں بہت سیدھی سادی ہوں۔ مجھ میں ایسی کوئی پیچیدگی نہیں۔"

وہ مجھے فرا سکو نام کے کسی آدمی کا لمبا قصہ سنانے لگا۔ میری سمجھ میں پوری طرح نہیں آسکا کہ وہ تھا کون۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تم کام کیا کرتے ہو؟"

"میں کام نہیں کرتا۔ میں ریٹائر ہو چکا ہوں' شرابی اور ذہنی مریض ہونے کی وجہ سے۔"

"تم ذہنی مریض نہیں ہو۔ تم بس ضرورت سے زیادہ پیتے ہو۔"

اس نے مجھے بتایا : میں ویت نام کی جنگ میں لڑا تھا اور دو سال تک ملاح رہا اور یہ کہ سمندر کے ساتھ بہت خوش رہا۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

میں نے کہا۔ "مرد ہو اور روؤ' روؤ جی بھر کے روؤ' اتنی جرأت پیدا کرو کہ کھل کر رو سکو۔ تمہارے پاس رونے کی بہت سی وجوہ ہوں گی۔"

"اور میں یہاں بیٹھا قہوہ پی رہا ہوں اور رو رہا ہوں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' خوب روؤ اور یہ سمجھو کہ میں یہاں نہیں ہوں۔"

وہ ذرا سا رویا۔ وجیہہ آدمی تھا۔ اسے حجامت کی ضرورت تھی۔ وہ صد سے زیادہ شکست خوردہ ۔۔۔۔ اسے نظر آرہا تھا کہ وہ ناکام ہو چکا ہے۔ ہم سب کی طرح۔ اس نے کہا۔ "میں تمہیں ایک نظم سنانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا' بہت شوق سے۔ اس نے تھیلا کھولا' ایک موٹی سی ڈائری نکالی اور اس کے صفحات پلٹتے ہوئے ہنس پڑا۔

پھر اس نے مجھے نظم سنائی۔ نظم بہت خوب صورت تھی۔ اس نے اس نظم میں لطیف الفاظ بے حد نفیس تراکیب کے ساتھ شامل کر لیے تھے۔ "ارے کالو۔" میں نے اسے پکارنا چاہا۔ "ہم سب ناکام ہیں' ہم سب ایک دن مر جائیں گے! کون' مگر کون' خلوص دل کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے امکانات پورے کر رہا ہے؟ کامیابی جھوٹ ہے۔"

میں نے کہا۔ "کتنی خوب صورت ہے یہ نظم۔ تم نے اور بھی لکھی ہیں؟"

"ایک اور ہے' مگر میں شاید تمہیں پریشان کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ دل ہی دل میں تم یہ چاہتی ہو گی کہ میں چلا جاؤں۔"

"میں نہیں چاہتی کہ تم ابھی سے چلے جاؤ۔ جب تمہارے جانے کا وقت آئے گا میں پہلے سے تمہیں بتا دوں گی۔ میں جلدی سو جاؤں گی۔"

وہ اپنی ڈائری میں نظم ڈھونڈنے لگا۔ جب نظم نہیں ملی تو ہار مان کر اس نے کہا۔ "میں تمہارے بارے میں تھوڑا بہت جاننا چاہتا ہوں۔ میں تمہارے سابق شوہر کو بھی جانتا ہوں۔"

میں چپ رہی۔

"تم بہت خوب صورت ہو۔"

میں پھر بھی چپ رہی۔

میں بہت اداس تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی مدد کرنے کے لیے کیا کروں۔ یہ بڑی ہولناک معذوری تھی کہ سمجھ میں نہ آئے کہ کسی کی مدد کس طرح کرنی چاہیے۔

اس نے مجھ سے کہا۔ "اگر ایک دن میں اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالوں۔۔۔۔"

"تم ہرگز اپنے آپ کو ہلاک نہیں کرو گے۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "زندہ رہنا ہمارا فرض ہے اور زندہ رہنا اچھا بھی ہو سکتا ہے۔ یقین کرو۔"

اور اب یہ میں تھی جس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑنے کو بے تاب تھے۔

اس سے میں نے پوچھا' تم کہاں رہتے ہو۔ اس نے بتایا کہ وہ یوتا کو میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ میں نے کہا۔ "گھر جا کر سو رہو۔"

"پہلے میں اپنے بیٹے کو جا کر دیکھوں گا' اسے بخار ہے۔"

"تمہارے بیٹے کا کیا نام ہے؟"

اس نے مجھے نام بتایا۔

میں نے جواب دیا۔ "میرا بھی ایک بیٹا ہے' جس کا یہی نام ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"میں تمہیں بچوں کی کہانیوں کی ایک کتاب دوں گی' جو میں نے کبھی اپنے بچوں کے لیئے لکھی تھی۔ اسے پڑھ کر سنا دینا۔"

میں نے اسے کتاب دی اور اس پر دستخط کر دیئے۔ اس نے کتاب تھیلے میں ڈال لی' جو اس کے بریف کیس کا کام بھی دیتا تھا اور میں نے مایوسی کے عالم میں پوچھا۔ "تمہیں کوکا کولا چاہیئے؟"

"تمہیں لوگوں کو قہوہ اور کوکا کولا پلانے کا خبط ہے۔"

"اس لیئے کہ میرے پاس دینے کے لیئے کچھ اور نہیں ہے۔"

دروازے پر پہنچ کر اس نے میرا ہاتھ چوم لیا۔ میں لفٹ تک اس کے ساتھ آئی' نچلی منزل کا بٹن دبایا اور اس سے کہا۔ "خدا حافظ۔"

لفٹ نیچے چلی گئی۔ میں اپنے فلیٹ میں واپس چلی آئی' بتیاں گل کر دیں' اپنی سیلی کو بتا دیا کہ وہ جا چکا ہے' کپڑے بدلے اور سونے کے لیئے گولیاں کھالیں ----- اور کمرے میں بیٹھ کر سگریٹ پینے لگی۔ مجھے یاد آیا کہ کلادیو نے چند لمحوں پہلے مجھ سے یہی سگریٹ مانگا تھا جو میں اس وقت پی رہی تھی۔ میں نے اسے دے دیا تھا۔ اس نے یہ سگریٹ پیا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا۔ "ایک دن میں کسی کو مار ڈالوں گا۔"

"یہ سچ نہیں ہے' میں نہیں مانتی۔"

اس نے بتایا کہ اس نے ایک کتے کو گولی مار دی تھی کیوں کہ کتا بہت تکلیف میں تھا۔ میں نے پوچھا کہ "تم نے وہ فلم دیکھی ہے جس کا انگریزی میں نام تھا گھوڑوں کو گولی مار دی جاتی ہے؟' اور جس کا پرتگالی میں نام رکھا گیا تھا مایوسی کی شب' ہاں' اس نے وہ فلم دیکھی تھی۔

میں سگریٹ پیتی رہی۔ میرا کتا اندھیرے میں مجھے دیکھتا رہا۔

یہ کل کی بات تھی' ہفتے کے دن کی بات۔ آج اتوار ہے' مئی کی بارھویں تاریخ' آج ماؤں کا دن ہے۔ کیا میں اس آدمی کے ساتھ ماں کا سا سلوک کر سکتی ہوں؟ میں اپنے آپ سے پوچھتی ہوں اور مجھے کوئی جواب نہیں ملتا۔

کسی بات کا کوئی جواب نہیں ہے۔

میں جا کر لیٹ رہتی ہوں۔ میں مر چکی ہوں۔ ❖ ❖

سیانوں کے شہر میں پاگل شخص

منظور کوہیار ترجمہ : کرن سنگھ

الماری میں فائلوں کو الٹتے پلٹتے خطوں کی ایک فائل پر نظر پڑ گئی- فائل کو اچھی طرح جھاڑ کر صاف کیا' پھر فائل کھول کر خطوں پر سرسری نظر ڈالنے لگا' کچھ خطوں کے ورق رنگ تبدیل کر چکے تھے' مگر لفظوں میں ابھی تک وہی سحر تھا- وہ آہستہ آہستہ فائل میں گم ہو گیا- ایک خط پڑھتے ہوئے تو وہ اپنے آپ کو بھی کھو بیٹھا' بار بار پڑھنے لگا-

منصور بھائی السلام علیکم!

ہر طرف کی خیر خیریت کی خواہش کے بعد' احوال یہ ہے کہ کچھ دن سے اپنے محلے میں لسانی اور نسلی پرچار بڑھ گیا ہے' ایسا لگتا ہے جیسے محبت کی حدود محدود اور نفرت کی حدود لامحدود ہوتی جارہی ہیں- لوگ خوابوں کے سوداگروں DREAMS MERCHENTS کے کہنے پر خود کو کنویں سے نکال کر کھائی میں پھینکنے کے لیئے بے تاب ہیں- زندگی کے ہر شعبے میں جیسے اجتماعی خودکشی ہو رہی ہو-

مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے دوسرے مشاغل کی طرح خودکشی بھی ایک شغل ہے- محبت کا اسیر فرد ایک پاگل کی طرح ہے اور نفرت کسی بے بہا شئے کی طرح جس کو حاصل کرنے کا جنون' سیانا پن سمجھا جاتا ہے-

سماجی اقدار اتنے گر گئے ہیں' جو پاگل کتے سے بدتر انسان کو ہیرو کہا جاتا ہے' جبکہ پاگل کتا کسی نسل یا رنگ کا ہو' پاگل کتا ہی ہوتا ہے- جس کا کام ہر آئے گئے کو بلا امتیاز کاٹنا ہے- یہ کیسی ستم ظریفی اور سماجی ناانصافی ہے' جو دہشت گرد اور قاتل کو اس کے کرتوتوں کی بنا پر نہیں بلکہ نسلی اور لسانی بنیادوں پر پرکھا اور تولا جاتا ہے' اور ان کے جرم کو کارنامہ قرار دیا جاتا ہے- ایسی صورت حال کی وجہ سے نوجوان نسل' سائنائیڈ زہر کی طرح موت مار نسل بن چکی ہے- جس کو موت سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کسی کو زندگی سے ہو-

سماج میں تم جیسے اور مجھ جیسے افراد بہت ہیں' جن کے دکھ اور غم ایک جیسے ہیں' مگر یہ مل کر دکھ بانٹ نہیں سکتے- پتا نہیں کیوں لوگ گل رہے ہیں مگر کچھ کہہ نہیں پاتے' مگر ٹس سے مس نہیں ہوتے-

دوست! میں نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر' شہر کے حد سے زیادہ سیانے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی اور انھیں بتایا کہ تم 'سیانے کوے' کی مانند ہری ہے

طرح پھنس جاؤ گے- پہلے تو دھمکیاں ملیں اور اب آخری الٹی میٹم... اپنا اور اپنے بچوں کا سر بچانے کے آج کل میں دوسرے محلے میں منتقل ہونے والا ہوں- یہاں' رہ رہ کر مجھے گاؤں کے گلی کوچے' کھیت اور فضائیں یاد آتی ہیں- پتا نہیں جنم بھومی کی اتنی تڑپ کیوں ہوتی ہے؟

مہربانی کر کے اس سال آپ ہمارے نئے آشیانے کو دیکھ جاؤ- آئندہ سال ہم آئیں گے- آپ کے خط کا انتظار رہے گا- سب کو میرا اور سلمٰی کا سلام کہنا-

آپ کا دوست

سید محمد رضا

اس نے خط پر لکھی ہوئی تاریخ پر ایک بار پھر نظر ڈالی- ۲۴ جولائی ۱۹۹۳

اس نے ذہن پر زور دیا اور یہ یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس نے کیا جواب دیا تھا؟ مگر اسے کچھ بھی یاد نہ آیا- اس نے ٹھنڈا اور گہرا سانس لیا' اور سوچنے لگا کہ کیسی نفسا نفسی ہے' دوست دوست کو بھلا بیٹھتا ہے اور پھر غیر ضروری عذر پیش کر کے ضمیر کی لعنت ملامت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے- اس نے سوچا کہ خط لکھے اور اس سے معافی مانگے اور اپنے آنے کی اطلاع دے' لیکن پھر یہ سوچ کر فیصلہ کیا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں جا کر اپنے بھولے ہوئے دوست سے ملوں گا اور اسے مناؤں گا- ویسے بھی بچپن کی دوستی کی جڑیں دل کے اندر تک ہوتی ہیں اور محمد رضا سے تو اس کا ایسا رشتہ رہا ہے جس میں زمانے کی متعصب ہوائیں بھی لرزش پیدا نہ کر سکیں- اگرچہ کہ دونوں کے بزرگ ڈھکے چھپے انداز میں ان کو تعصب کی طرف راغب کرتے رہے' جیسے انھیں اٹھنے بیٹھنے کی تمیز سکھا رہے ہوں-

"ان کو ہم نے ہندوؤں سے آزادی دلائی اور تہذیب سکھائی ورنہ یہ تو ہندوؤں کے غلام تھے اور بلا تہذیب تھے- وہ جب آئے تھے تو تالیوں میں سے مینڈک نکال کر کھاتے تھے اور کہتے تھے یہ بھی چھوٹی (ٹیکٹی[۱]) مچھلی ہے-"

بچوں کی ایسی متضاد باتیں سن کر' یہ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ ان

۱- ایک قسم کی مچھلی

کے بڑے ایسے کیوں کہتے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ان کے نزدیک آزادی کا مطلب کچھ اور تھا' اور کتابوں میں کچھ اور لکھا ہے!۔ ان کا خیال تھا کہ آگے چل کر جب ان کے بڑے بھی لائیس کینال کے کناروں پر بیٹھ کر پکھریاں کرنا شروع کریں گے اور مل کر موہن جودڑو کی سیر کریں گے تو ان کے یہ سب شکوے اور شکایتیں دور ہو جائیں گی۔ مگر ایسا ہو نہ سکا' ان کی سب باتیں اور خیال غلط ثابت ہوئے۔ بڑوں کے اندر بٹھائے ہوئے یہ سانپ سنپولیے اجگر بن گئے۔

۱۹۷۳ میں جب اس کے باپ نے گاؤں سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس نے رضا سے پوچھا تھا کہ آخر کس تکلیف کی وجہ سے آپ ہجرت کر رہے ہیں۔ رضا نے روتے ہوئے اسے بتایا تھا کہ انھیں نہ صرف گاؤں کے لوگ بلکہ گھر میں لگے ہوئے سرس کے پیلے پاپڑ بھی کھڑکتے ہوئے اور پلٹتے ہوئے ناں ناں کرتے روکتے ہیں۔ مگر والد صاحب بضد ہیں کہ یہاں ہمارا مستقبل روشن نہیں۔

اگرچہ کہ محمد رضا کراچی جا بسا تھا' مگر گاؤں کے کانٹوں اور کیکروں کو نہ بھول پایا' خود یہ بھی رضا کی یادوں کو جو گاؤں سے لے کر انٹرمیڈیٹ کالج تک بکھری ہوئی تھیں نہ بھول سکا' اس دونوں دور ہوتے ہوئے بھی نزدیک تھے۔ ایک دوسرے کے مرنے جینے اور شادی غم میں برابر کے شریک' کوئی ایسا سال نہ تھا جس میں آنا جانا نہ ہوا ہو مگر پتا نہیں کیوں دونوں کے بیچ میں لگ بھگ دو سال کا خلا آگیا تھا۔ اس نے خط کے حاشیے پر دیا ہوا نیا پتہ نوٹ کر لیا۔

سید محمد رضا

فلیٹ نمبر۱۹' رضوان اپارٹمنٹ' ملیر سٹی' کراچی

چھٹیوں میں' بیگ تیار کر کے' وہ رضا سے ملنے کے بن سنور کر گھر سے نکلا' بیگ میں دو جوڑے کپڑوں کے' ایک آدھ کتاب' بھوبھل پر پکی ہوئی میٹھی روٹی کا خاص تحفہ اور ایک زنانی رش چیش' جو اس کی بیوی نے محمد رضا کی گھر والی کے دی تھی۔

صبح کا گاؤں سے نکلا ہوا جب شام کو کراچی پہنچا تو بس نے اس کی ہڈی پسلی ایک کر دی تھی۔ سہراب گوٹھ سے ملیر جانے والی ایک منی بس میں سوار ہوا' جس میں پہلے ہی کام کاج سے واپس لوٹنے والے تھکے ہارے بیزار لوگ سوار تھے۔ کنڈیکٹر زور زور سے بس کی باڈی کو بجا رہا تھا جیسے منی بس میں ٹھنسے ہوئے مسافروں کو چڑا رہا ہو۔

"نیپا! گلشن!... ڈرگ روڈ... ملیر! قائدہ آباد! لانڈھی... لانڈھی۔"

"ارے اب چلو بھی! ... بھر گئی ہے!" پسنجر غصے سے چلا رہے تھے۔ مگر یہ گونگا اور بہرہ بنا اپنے خیالوں میں گم سم بیٹھا تھا اور تصور ہی تصور میں اس منظر کو دیکھ رہا تھا کہ جب اچانک رضا اور اس کی بیوی سلمیٰ' اس کو اپنے دروازے پر کھڑا دیکھیں گے' پہلے تو خوشی سے چلا اٹھیں گے' پھر شروع ہوں گی حکایتیں اور شکایتیں جو تھوڑی دیر بعد ایسے غائب ہو جائیں گی جیسے پانی کے بلبلے۔

اچانک ہاکروں کی دل دہلانے والی آواز نے اسے لرزا دیا۔

"آگیا آج کا تازہ اخبار... اور گی میں ایک بچی اور پانچ آدمی ہلاک! ... بوریوں میں سے پانچ لاشیں برآمد... گل بہار میں نامعلوم افراد اور پولس میں زبردست مقابلہ... اب یہ آخری الٹی میٹم ہے!"

وہ اخبار لے کر پڑھنے لگا' اسے یوں محسوس ہوا جیسے اخبار کی ایک ایک سطر میں موت رقص کر رہی ہو' ایک ایک سطر میں سسپنس' دہشت اور رونگٹے کھڑے کرنے والی منظر نگاری تھی۔ اسے یوں لگا جیسے اخبار والے رومن ایمپی تھیٹر کے وہ باذوق تماشائی ہیں جو میدان میں بہنے والے انسانی خون کو دیکھ کر' خوش ہوتے تھے اور خون کے پیاسے پہلوانوں کو ہشکارتے تھے۔ وہ مزید نہ پڑھ سکا' اس کو چکر آنے لگے۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس نے سوچا ملک میں محبت کی فصل سکداسی چاولوں کی طرح کتنی کم اور نایاب ہو گئی ہے اور نفرت اس طرح بڑھی ہے جیسے ایری چاول کی فصل۔ اچانک ایک ہاتھ بڑھا اور اس سے اخبار چھین کر پڑھنے لگا' اس نے گردن گھما کر صرف ایک نگاہ میں اس آدمی کا جائزہ لیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ سرخیوں کو اپنی حریص نگاہوں سے ہڑپ کر رہا تھا۔ آخر میں وہ ہنس کر تبصرے کے ساتھ اخبار واپس کرنے لگا۔

آدمی کل اور پرسوں سے کم مرے ہیں۔"

"اچھا!" قریب بیٹھے ہوئے شخص کو جیسے عجیب لگا' اس نے درمیان ہی سے اخبار جھپٹ لیا اور یوں چھینا جھپٹی میں اخبار گاڑی کے پچھلے حصے میں گردش کرنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے آدمیوں کو آدمیوں کی موت پر کم مزہ آیا ہو۔ اس نے دل میں سوچا اذیت پسندی سے آدمی ایک مرتبہ مزہ لے کر دیکھے' پھر وہ اس کی عادت کا جزو بن جاتی ہے۔

منی بس بریک کے جھٹکوں کے ساتھ ادھر ادھر ہوتی ہوئی' کبھی تیز اور کبھی آہستہ دوڑ رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے ڈرائیور بھی اذیت پسند کھلاڑی ہو جس کو زندگیوں سے کھیلنے میں لطف آ رہا ہو۔

ملیر سٹی کا اسٹاپ آیا تو وہ اتر گیا۔ لوگ تیزی سے اپنے اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے' جیسے ان کے پیچھے خوف کا ہوا ہو۔ روڈ کے بائیں طرف پولیس کی چوکی تھی۔ جس میں سپاہی مارنے یا مرنے کے انتظار میں الرٹ کھڑے تھے۔

پوچھتے پوچھتے وہ رضوان اپارٹمنٹ کی سفید بلڈنگ تک پہنچا جو اس کے تصوراتی ڈریکولا کے سفید تابوت کی طرح لگ رہی تھی۔ سیڑھیوں کے ایک ایک زینے پر پیر رکھتے ہوئے اور فلیٹوں کے نمبر گنتے ہوئے وہ آگے بڑھتا رہا۔ ۱۹ نمبر فلیٹ آیا تو اس کی کال بیل کو دبا کر اور تھوڑا ہٹ کر کھڑا ہو گیا' کشمکش کی حالت میں کچھ سوچتا رہا' تھوڑی دیر بعد دروازے کے پٹ میں سے ایک گردن نکلی جس پر سجدوں کے سیاہ نشان اس کے نمازی ہونے کی چغلی کھا رہے تھے۔

"جی!... فرمائیں؟" اس نے تیزی اور کرختگی سے پوچھا۔"

"جی" ادھر سید محمد رضا صاحب رہتے ہیں؟"

"نہیں!"

گردن اندر گئی اور دروازے کے پٹ کھڑاک سے بند ہو گئے۔ وہ مزید کچھ لے

پوچھنا چاہ رہا تھا۔ مگر ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر امیدوں کے دہکتے ہوئے دیے ایک ایک کر کے بجھنے لگے' وہ خود بھی بجھ گیا کہ کہاں ڈھونڈے اتنے بڑے شہر میں اپنے اس دوست کا پتا جو کہیں کھو گیا ہے۔

وہ واپس ہو رہا تھا کہ ایک اور شخص جو اوپر سے نیچے آ رہا تھا' اس نے اس کو اجنبی دیکھ کر پوچھا۔

"آپ ادھر کیوں کھڑے ہیں؟"

"دوست کا پتہ پوچھنے آیا تھا!"

"کون ہے؟"

"سید محمد رضا!"

"کیا کرتا تھا؟"

"اسکول میں ٹیچر تھا۔"

"آپ کا نام؟"

"منصور احمد۔"

"کیا کرتے ہیں؟"

"ٹیچر ہوں!"

"کہاں سے آئے ہیں۔"

"گاؤں سے!"

یہ شخص کچھ بڑبڑایا "سندھ سے" پھر کہنے لگا۔ "آؤ تمہیں تمہارے دوست سے ملاتا ہوں۔"

وہ چلتے وقت کچھ عجیب عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کے اندر رہ رہ کر خدشات و وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ وہ اپنے دل کی دھڑکن صاف سن رہا تھا۔ اس نے سوچا ایسا تو نہیں ہے کہ یہ شخص کہیں اور لے جا کر گولی مار دے۔ اسے اس وقت اپنی بیوی کے وہ الفاظ یاد آنے لگے کہ "نہ جاؤ... سنا ہے کہ ادھر ہنگامے لگے رہتے ہیں..." مگر اس نے بیوی کو تسلی دی تھی کہ "آج کل سکون ہے..." ویسے بھی اس کا ایمان تھا کہ موت کہیں بھی آ سکتی ہے' اس دوڑنا اور بھاگنا بے کار ہے۔

وہ اسے اپارٹمنٹ کے پاس ہی ایک چائے کی ہوٹل پر لے آیا' جہاں کچھ نوجوان چائے پی رہے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک کو بلایا۔

"تقی ادھر آؤ!"

ایک نوجوان بڑی شان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر آیا۔

"ان صاحب کو محمد رضا کا فلیٹ تو دکھاؤ۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا اور مسکرا دیے۔ اس کے اندر کا پرندہ خوف سے پھڑکنے لگا مگر وہ اسے تسلی دیتا رہا کہ وہ محض اس کا خوف اور وہم ہے۔ اب ایسا اندھیر بھی نہیں ہے کہ خواہ مخواہ ایک ایسے شخص کو دھوکے سے مار دیں جس کا کوئی قصور نہیں۔

اس کے دوست کا نیا گھر دکھانے والا خوبصورت جوان بالکل نو عمر تھا۔ اس کے گالوں پر ابھی رواں ہی نکلا تھا۔ اس نے محمد رضا کے متعلق کچھ ذاتی قسم کے سوال کیے کہ محمد رضا اس بلڈنگ سے کیوں شفٹ ہو گیا ہے؟ تم اس کے کیا لگتے ہو وغیرہ۔ مگر اس نے اس کو کوئی جواب نہ دیا اور چپ سادھے آگے بڑھتا رہا۔ اس کو' اس کے جواب نہ دینے پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس کے بازو کی حرکت معمول کی حرکت نہ تھی' اس میں سرکشی اور زور آوری تھی۔ منصور چلتے چلتے سوچ رہا تھا یہ نوجوان اتنا بے رخا کیوں ہے' اس کو تو اپنی عمر کے مطابق معصوم اور شرمیلا ہونا چاہیے۔ مگر جس نسل نے نفرت میں جنم لیا ہو' نفرت کو کھایا ہو' اور نفرت کو اوڑھا ہو اس نسل میں سادگی اور معصومیت کہاں سے آئے' جو اعلیٰ انسانی تہذیب کا ظرف ہوتی ہے۔ شہر جو افراد کی کثرت کی وجہ سے مضبوط جکڑے ہوئے اور انسانی تہذیب کے مرکز ہوتے ہیں ان کا یہ حال ہو گیا ہے' جو یہاں کے آدمیوں سے آدمیت نکلتی جا رہی ہے۔ یوں لگ رہا ہے جہاں زیادہ افراد ہیں' وہیں عقل کی کل کھسکی ہوئی ہے۔

وہ اپنے سوالوں کا جواب خود ہی دیتے ہوئے اس نوجوان کے پیچھے پیچھے ادھر ادھر ہوتے ہوئے چلتا رہا۔

"محمد رضا اوپر فلیٹ نمبر ۱۵ میں رہتے ہیں۔ آپ ان سے جا کر مل سکتے ہیں" یہ نوجوان پیلے رنگ کی ایک بلڈنگ کے سامنے جا کر رکا' جس کا رنگ اترنے کی وجہ سے جگہ جگہ دھبے پڑ گئے تھے۔

اس کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ محمد رضا آخر ایسی پرانی اور کچھ کچھ ویران سی بلڈنگ میں آ کر کیوں رہنے لگا ہے؟ وہ اسی اضطراب اور تکلیف کے ساتھ زینہ چڑھنے لگا ان اندیشوں اور خدشات کے ساتھ کہ اگر محمد رضا بھی اس سے پیشانی پر بل ڈال کر یا بے رخی سے ملا تو اس کی دوستی کا نازک تار بھی ٹوٹ جائے گا۔ یکایک اس کے دل میں خیال آیا کہ لوٹ جائے' مگر لوٹ نہ سکا' ہاتھ غیر ارادی طور پر کال بیل کے بٹن کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد دروازے میں سے ایک موٹا تگڑا شخص باہر نکلا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر پہچاننے کی کوشش کی۔ اس کو یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ اتنے بڑے شہر کے ان روشن فلیٹوں میں اندھیرے زینوں کا رواج کیوں ہے؟ آخر جب اندھیرے میں بجلیوں نے پھیل کر دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھنے کے قابل کیا تو اس نے دیکھا کہ ایک اجنبی شخص کلاشنکوف کے ساتھ اس کے استقبال کے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے ہچکچاہٹ کے ساتھ تھوک نگلتے ہوئے کہا :

"سید محمد رضا صاحب سے ملنا ہے۔"

"بھائی اس کو ماسٹر جی کے پاس بھیج دو' جو امن محبت اور سکون کی باتیں کرتا تھا" اس شخص نے اسے اندر دھکیلتے ہوئے کرخت آواز میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک کمرے میں' ہاتھ پاؤں بندھے سامنے پھانسی کا پھندا' ہتھوڑا اور ڈرل مشین کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ حد سے زیادہ سیانوں کے شہر میں اپنے پاگل دوست کو اس راہ سے گزرے پتا نہیں کتنا عرصہ ہوا ہو گا؟

❖ ❖ ❖

● ذہن رسا ● نمود سخن ● کیمیائے سخن ● خاصانِ خدا ● گنج شہیداں
● سرمایۂ تحسین ● قصر جناں ● بہار حسین آبادی ● بہار فاؤنڈیشن پٹنہ
● ہر کتاب کی قیمت دس روپئے۔

عظیم آباد کے مرثیہ گو بہار حسین آبادی کے زیر تبصرہ موضوعاتی مرثیے ۱۹۲۰ سے ۱۹۲۶ء کے درمیان کی تصنیف ہیں۔ "ذہن رسا" "نمود سخن" اور کیمیاے سخن ۱۹۲۰ میں لکھے گئے۔ دلو رام کوثری کے حسین قرآن (۱۹۱۵) کے بعد بہار حسین آبادی کے مرثیے موضوعاتی مراثی کے باب میں اضافہ ہیں افسوس کہ ہلال نقوی نے برسوں کی تحقیق "بیسویں صدی اور جدید اردو مرثیہ" (۱۹۹۴) میں بہار حسین آبادی کے مرثیوں کا ذکر بھی نہیں کیا۔ حیرت ہے کہ ان تجرباتی مرثیوں پر دیگر ناقدین و محققین کی نظر بھی نہیں پڑی۔

جابر حسین قابل تحسین ہیں کہ انہوں نے بہار حسین آبادی کے ان مرثیوں کا الگ الگ پیش لفظ بھی لکھا اور انھیں بہار فاؤنڈیشن پٹنہ سے شائع کرایا۔

"ذہن رسا" بہار حسین آبادی کے دستیاب مرثیوں میں غالبًا پہلا مرثیہ ہے۔ یہ ۱۶۰ بندوں پر مشتمل ہے۔ ان کے دیگر مراثی محض ۸۵۔۸۰ بندوں پر مشتمل ہیں، سوا آخری کے جس میں ۱۰۷ بند ہیں۔ زیر تبصرہ مرثیہ میں فلسفہ زندگی، فلسفہ صبر و اخلاق، ثقافت اور معاشرت وغیرہ سے متعلق موضوعات سے گونج رہا ہے۔ شہادت کے تین اور بین کا صرف ایک بند ہے۔

بہار حسین آبادی اس راز سے واقف تھے کہ مسدس کا تیسرا مصرع پر زور ہونا چاہئیے۔ انھوں نے نکتہ عام طور پر ملحوظ بھی رکھا ہے۔ ان کے مسدس میں تیسرا مصرع اکثر غیر متوقع ہوتا ہے لیکن اس میں ہر بار وہ قوت نہیں ہوتی جو انیسی مرثیوں کا امتیاز ہے۔

"نمود سخن" میں حضرت امام حسینؑ کی ولادت باسعادت کا بیان ہے۔ تمہید میں مناظر فطرت، فلسفہ حیات و کائنات، انسانی جذبات اور اخلاقی اقدار وغیرہ سے متعلق بند شامل ہیں۔ رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین کے بند نہیں ہیں بلکہ اس کی فضا اس مجلس جیسی ہے جس میں فضائل محمدؐ بیان کئے جاتے ہیں اور آخر میں چند جملے مصائب کے۔

"کیمیائے سخن" میں شاعر نے تمہید کے بندوں میں ہی آلِ رسولؐ پر ہوئے ظلم کے سبب کا سوال اٹھایا ہے اور پھر سوال کا جواب یزید کی زبان سے دیا ہے پھر مرثیہ کو فلسفہ شہادت اور مقصد شہادت نظم کرتے ہوئے دوسرے سوال کی طرف موڑ دیا اور یہاں سوال کے جواب میں واقعہ کربلا کا دوبارہ ذکر کیا ہے لیکن اس سوال و جواب کے درمیان مرثیہ میں شروع سے آخر تک ربط برقرار ہے۔

خاصان خدا" ۱۹۲۳ کی تخلیق ہے۔ اس نظم کی ابتدا "خاصان خدا حامل اندوہ بلا ہیں" سے ہوتی ہے۔ تمام پیغمبران خدا کے اندوہ و بلا میں مبتلا ہونے کا ذکر کرتے ہوئے شاعر نے آخری پیغمبر محمدؐ کی شب ہجرت کا ذکر کرکے نظم کا رخ فضائل حضرت علیؑ کی طرف موڑ دیا ہے، لیکن اصل مقصد فلسفہ صبر و تحمل، ایثار و قربانی، رموز حیات وغیرہ بیان کرنا ہے۔ تاریخی واقعات زیادہ تر اشاروں ہی میں بیان کئے گئے ہیں۔

"گنج شہیداں" بھی ۱۹۲۳ کی تخلیق ہے۔ یہ مرثیہ حضرت علیؑ کے فضائل سے شروع ہو کر واقعہ کربلا تک آتا ہے۔

"سرمایۂ تحسین" کی تاریخ ۱۹۲۴ ہے۔ اس میں تمہید کے بندوں میں ذہنی اور روحانی سکون حاصل کرنے کے لئے حقیقت، عظمیٰ کی جستجو جو اسلام، بانی اسلام اور امام حسینؑ تک پہنچتی ہے، کا بیان ہے۔ یہاں واقعہ کربلا بیان نہ کرکے اس کے مقصد پر زور دیا گیا ہے۔ آخری تین بندوں میں رونے کی تلقین کی گئی ہے۔ تمام بند ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہیں کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ گریز کب آیا اور شاعر کب اپنے مقصد پر آیا۔

"قصر جناں" ۱۹۲۶ کی تخلیق ہے۔ یہ مرثیہ مندرجہ بالا سبھی مرثیوں سے مختلف ہے۔ عاشور کے دن جنت کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ جہاں تمام پیغمبراں مع حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کے، کربلا کے شہیدوں کے منتظر ہیں۔ لیکن واقعہ کربلا جوں ہی شروع ہوتا ہے ایک کے بعد ایک شہید داخل ہونے لگتا ہے اور مکمل واقعہ بیان نہیں ہونے پاتا۔ آخر کار جبرئیل امین ابتدا سے آخر تک پورا واقعہ چشم دید بیان کرتے ہیں۔ اس طرح منظر در منظر یہ مرثیہ ڈرامے کی سی فضا پیدا کر دیتا ہے اور قارئین کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ اس طرز کا غالبًا یہ پہلا مرثیہ ہے۔

سبھی مراثی ساخت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہار حسین آبادی کی اندرونی ساخت پر طرح طرح کے تجربے کر رہے تھے۔ جدید کے بانی شاد عظیم آبادی نے مرثیہ میں جو تبدیلیاں

کہیں ان کا تعلق بڑی حد تک موضوع سے تھا۔ انھوں نے اجزائے مرثیہ سے یکسر انکار نہیں کیا تھا۔ بہار حسین آبادی نے اجزائے مرثیہ سے بجا انکار کر دیا۔ شاید اسی لئے علامہ جمیل مظہری نے بہار حسین آبادی کے مرثیوں کو "ذہنی انقلاب" کہا تھا۔ افسوس کہ ناقدین و محققین حضرات نے ایسے مرثیہ گو کو نظر انداز کر دیا۔ اس بات کا اندازہ شاید خود بہار کو تھا۔

تازیست مری مرقد نہ سمجھیں گے بہار
کھولیں گے مجھے ہاتھ سے جب ڈھونڈیں گے

تمام کتابیں غیر مجلد ہیں لیکن کتابت، طباعت اور گٹ اپ کے اعتبار سے خوبصورت ہیں۔

— سید ارشاد حیدر

نوائے سکوت ● مرتضیٰ اظہر رضوی، مرتب: جابر حسین، اردو مرکز، عظیم آباد۔ پٹنہ ● پچاس روپئے

"نوائے سکوت" مرتضیٰ اظہر رضوی (۱۹۳۵۔۱۹۹۵) کے سات مراثی کا مجموعہ ہے۔ مرتضیٰ اظہر ملت کالج دربھنگہ کے شعبہ فلسفہ میں مدرس تھے۔ مرثیہ کے علاوہ انھوں نے غزلیں، قصیدے، سلام، نوحے اور رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ وہ اپنے مرثیوں کو 'مسدس' کہتے تھے۔ ان کے مرثیوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے طوالت سے گریز کیا ہے اور تمہید میں غزل اور قصیدے کا سا رنگ ہے۔

مرتضیٰ اظہر رضوی نے اپنا آخری مرثیہ انتقال سے گیارہ دن قبل مکمل کیا تھا۔ انتقال سے چند ماہ قبل ان کی قوت گویائی سلب ہو گئی تھی۔ اس مرثیہ کی ابتداء 'ہاں اے زباں خموش ہوئی ہے تو غم نہ کر —' مصرع سے شروع ہوتی ہے۔ درمیان میں انھوں نے اپنے والد اجمی رضوی کی نظم "تنہائی" کے چند اشعار اور کچھ رباعیاں شامل کی ہیں۔ یہ شمولیت بقول شاعر بہ سبب مجبوری اور اتفاقاً ہے۔ لیکن مرثیہ بحر کی تبدیلی اور مسدس کی جگہ رباعی کی شمولیت برداشت نہیں کر سکا۔ اس طرح نہ مرثیہ میں روانی رہی نہ ربط ہی برقرار رہ سکا۔

مرتضیٰ اظہر رضوی مختلف شعرا خاص کر بہار حسین آبادی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ غالباً اسی لئے انھوں نے ہیئتی تجربے بھی کئے لیکن انھیں کامیابی زیادہ نہ ہوئی۔ اکثر مصرعے چست نہیں۔ کہیں کہیں غلطیاں بھی رہ گئی ہیں۔

ادھر ایک عرصہ سے لوگوں کی توجہ صنف مرثیہ کی طرف سے ہٹ سی گئی تھی۔ ایسی صورت حال میں بہار فاؤنڈیشن اور اردو مرکز عظیم آباد کا یہ اقدام کہ نئے پرانے شعرا کے مرثیے شائع کئے جائیں، لائق تعریف ہے۔

— سید ارشاد حیدر

ساحل سے دور ● شمشاد سحر ● اردو مرکز عظیم آباد ● پٹنہ ● پچاس روپئے

"اردو مرکز" نے ایسے مصنفین کی کتابوں کی اشاعت پر توجہ دی ہے جو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان مصنفین کے ادبی سرمائے کی اشاعت "اردو مرکز" کی مساعی کے بغیر شاید ممکن نہ ہوتی۔ لیکن مصنف کے انتقال کے بعد اس کے مکمل ادبی سرمائے کی دستیابی اور متن کی صحت کا مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے۔ کتاب اگر مصنف کی حیات میں شائع ہو تو وہ اس پر نظر ثانی بھی کرتا اور بہتر انتخاب ہوتا۔

شمشاد سحر ۱۹۸۲ء میں محض ۳۲ سال کی عمر میں انتقال کر گئے تھے وہ تقریباً تین سال تک بستر مرگ پر پڑے رہے۔ آخر وقت میں بینائی بھی چلی گئی تھی لیکن شعر و ادب کے ذوق و شوق کا عالم یہ تھا کہ کتابیں دوستوں سے پڑھوا کر سنتے تھے۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۸۲ء تک کی تخلیقات جو کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھی ہوئی تھیں، شمشاد سحر کے چھوٹے بھائی نذر السلام رومی نے کسی طرح یکجا کیں اور اردو مرکز نے جابر حسین کے پیش لفظ اور صفدر امام قادری کے مضمون کے ساتھ شائع کیا۔ اس مجموعہ میں ۴۶ غزلیں، ۲۵ نظمیں (جن میں ولادی میر مایا کوفسکی اور ناظم حکمت کی ایک ایک نظم کا ترجمہ بھی شامل ہے) اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔

مرحوم کی شاعری کا زمانہ وہ تھا جب ترقی پسند شاعری کا زوال ہو چکا تھا اور جدید شاعری اپنے عروج پر تھی۔ شمشاد سحر جدیدیت سے متاثر تھے لیکن کہیں کہیں ترقی پسند ادب کے نظریات سے آزاد بھی نہ تھے۔ ان کی شاعری کسی امکان کا پتہ ضرور دیتی ہے لیکن نظر ثانی کی طلبگار ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت نے ایک جواں مرگ شاعر کا کلام محفوظ کر دیا یہی بہت ہے۔

— سید ارشاد حیدر

تمت رقصاں ● ساجد حمید ● تاج پرنٹرس، بنگلور ۵۱۰۰۶۰ ●
● قیمت: پچاس روپئے

"تمت رقصاں" ساجد حمید کا تیسرا مجموعہ کلام ہے۔ اس سے پہلے ان کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں "یادوں کے مہتاب" اور "نقش ضرب نفی"۔ زیر نظر مجموعہ میں کل ۴۳ نظمیں شامل ہیں۔ جن میں سے زیادہ تر آزاد نظم کی ہیئت میں ہیں۔ ان میں چند پابند نظمیں بھی ہیں اور ایک نظم بعنوان "احتیاط / احتجاج" کی شمولیت کے ذریعہ مجموعہ میں نثری نظم کی خانہ پری بھی کر دی گئی ہے۔

ساجد حمید کی یہ نظمیں خود اپنے آپ میں ایسی ہیں کہ ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ ہیئت کے اعتبار سے ان نظموں میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو قاری کے لئے اجنبی ہو یا جس سے یہ

چونک جاتیں۔ دوسرے یہ کہ نظموں کی داخلی ہیئت اگرچہ زیادہ تر وہی ہے جو اچھی نظموں کی ہوتی ہے یعنی ان میں استعارہ، علامت اور پیکر تراشی کی کامیاب کار فرمائی، مگر اس اعتبار سے ہمیں ان نظموں میں کچھ بہت زیادہ نیا پن نظر نہیں آتا۔ زیادہ تر استعارے اور پیکر ایسے لائے گئے ہیں جو مانوس ہیں اور پھر ان میں کچھ زیادہ تازگی کا احساس نہیں ہوتا۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ "تمت رقصاں" کی نظمیں خوشگوار فنی مزاج کی بھی حامل ہیں۔

ان دنوں شاعری کی باڑھ آئی ہوئی ہے اور نہ جانے کس کس طرف سے شاعری کے مجموعے امڈے چلے آرہے ہیں۔ لیکن اچھی شاعری تو کیا، محض شاعری بھی بہت کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ ایسی صورت حال میں اگر کوئی مجموعہ ایسا نظر آئے جس کے مشمولات کو ہم سچی شاعری کے طور پہ قبول کر سکیں تو یہ بھی بڑی بات ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو "تمت رقصاں" کی زیادہ تر نظمیں ہمیں شاعری کا خوشگوار احساس عطا کرتی ہیں۔

ان نظموں میں بنیادی طور پر دو طرح کے احساسات ہیں جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ایک تو یہ احساس کہ انسان موجودہ دنیا میں جنس رائگاں کی حیثیت سے ہے۔ اس کا کوئی مصرف نہیں ہے۔ اس کی زندگی بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ دوسرا احساس جو ان نظموں سے ابھرتا ہے اسے ہم امید کی ہلکی سی کرن سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس سے میری مراد زندگی کا اثبات اور زندہ رہنے کی خواہش ہے۔ لیکن جسے ہم مثبت رُخ کہتے ہیں وہی کسی اور کے لئے منفی رُخ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن نظموں کا حاوی لہجہ بہر حال گہری تاریکی اور ناکامی کے تاثر کا حامل ہے۔ یہاں انسان اپنی ذات کو مرکزی مقام عطا کرتا ہے،

اپنے داخلی اور ذاتی کرب کو شعر کا سرچشمہ قرار دیتا ہے اور خارجی دنیا کو بھی ذات ہی کے حوالے سے دیکھتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جہاں بالکل خارجی، سماجی، سیاسی حوالوں کے سیاق میں نظم کہی گئی ہے (مثلاً ۶ دسمبر کے بارے میں دو نظمیں) وہاں شاعر بہت کامیاب نہیں۔

ساجد حمید کا یہ مجموعہ مجموعی حیثیت سے اس قابل ہے کہ اسے پڑھا جائے۔ یہ مجموعہ شاعری کی سطح پر ایک حد تک ضرور متاثر کرتا ہے۔ ایسے دور میں جب محض کلام منظوم بطور شاعری ہر طرف بکھرا پڑا ہو "تمت رقصاں" جیسے مجموعے ضرور ہماری دسترس میں ہونا چاہیے۔

— احمد محفوظ

اس بزم میں

انور قمر کا قیام بمبئی میں ہے۔ ان کا افسانوں کا مجموعہ حال میں شائع ہوا ہے۔

اودے پرکاش ہندی کے افسانہ نگاروں میں ان دنوں بہت نمایاں ہیں۔ اس وقت وہ دہلی میں مقیم ہیں۔ ان کے مترجم **حیدر جعفری سید** نے ہندی سے تراجم کثرت سے کئے ہیں اور خود بھی افسانے لکھتے ہیں۔

رشید امجد کا مرتب کردہ انتخاب "مزاحمتی ادب" اکادمی ادبیات پاکستان نے حال میں شائع کیا ہے

زاہدہ حنا کراچی کے رسالے "روشن خیال" کی مدیر ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "راہ میں اجل ہے" جدید افسانے کی تاریخ میں اہم مقام رکھتا ہے۔

کلریس لسپکٹر CLARICE LISPECTOR (۱۹۲۵ تا ۱۹۷۷) لاطینی امریکہ (برازیل) کی اہم افسانہ نگار تھی۔ **آصف فرخی** نے یہ ترجمہ انگریزی کے توسط سے کیا۔

مرزا حامد بیگ کی مرتب کردہ کتاب "بیسویں صدی کے شاہکار افسانے۔ نسوانی آوازیں" چند دنوں پہلے شائع ہوئی ہے۔

مصطفیٰ کمال گورکھپور یونیورسٹی سے سبکدوش ہو کر تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے ہیں۔ انھوں نے بہت دنوں بعد افسانہ لکھا ہے۔

منصور رضا کراچی کے نوجوان افسانہ نگار ہیں اور سماجی ترقی کے ادارے میں کام کرتے ہیں۔

منظور کوہیار سندھی کے جدید افسانہ نگار ہیں۔ وہ اور ان کے مترجم **کرن سنگھ** دونوں کراچی میں مقیم ہیں۔

نمی رضوان (پیدائش ۱۹۶۸) کا وطن قاہرہ ہے۔ وہ عرب افسانہ نگار خواتین کی اس نسل سے تعلق رکھتی ہیں جو علامت نگاری اور حقیقت نگاری دونوں میں پیش پیش ہیں۔ **مسعود اشعر** نے یہ ترجمہ انگریزی کے توسط سے کیا ہے۔

□□ "شب خون" ۲۰۴ میں فراق صاحب کا جو انٹرویو آپ نے شائع کیا ہے اگر وہ ان کی زندگی میں شائع ہوتا تو اُس کا کوئی لطف بھی تھا، اب تو یہ بے وقت کی راگنی ہے۔ تاہم جب آپ نے یہ راگ چھیڑ ہی دیا ہے تو کچھ سخن گسترانہ گفتگو ہو ہی جائے۔

اس انٹرویو میں چند ایک معقول باتوں سے قطع نظر پوری گفتگو بڑے منہ اور چھوٹے دماغ کی بات معلوم ہوتی ہے۔ بڑے منہ کا آدمی جب انسانی تاریخ کی عظیم ہستیوں کے بارے میں کچھ بکنے لگتا ہے تو اُس کا منہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے اور اُسے کچھ جھوٹ اور تضاد بیانی سے کام لینا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر فراق صاحب کہتے ہیں کہ میری اٹھان ایک جھلائے ہوئے نوجوان کی رہی۔ سب جانتے ہیں کہ نوجوانی میں جو نقش بیٹھتا ہے وہ بہت پائیدار ہوتا ہے اور آئندہ کی زندگی میں اُس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں لیکن فراق صاحب کی پوری شاعری میں کہیں بھی کسی جھلاہٹ کا پتہ نہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ وہ اپنے آبائی مذہب و تہذیب سے پوری طرح مطمئن تھے جس کے لئے عقلی جواز ساٹھ ستر کی عمر تک پہنچتے پہنچتے انھوں نے جوڑے بٹورے۔

فراق صاحب محبت اور پرستش کے فرق کو بالکل نہیں سمجھ سکے۔ یہ دونوں الگ الگ جذبے ہیں۔ جس شخص سے کوئی محبت کرتا ہو ضروری نہیں کہ اس کے اندر کوئی صفت بھی ہو۔۔

سودا جو ترا حال ہے ویسا تو نہیں وہ

اور خود فراق کا شعر ہے ۔

تو برا ہے اگر تو اس سے کیا
اے برے آ میں تجھ کو پیار کروں

لیکن انسان پرستش اُس کی کرتا ہے جس میں حُسن اور کمال ہو، جس سے انسان کچھ امیدیں وابستہ کرے اور اُس سے کسی حد تک ڈرتا بھی ہو۔ کسی بھی مادی چیز میں یہ صفات نہیں ہوتی ہیں۔ فراق صاحب کا تضاد ملاحظہ فرمائیے جس مادّے کی وہ ابتدا میں حمد و ثنا کرتے ہیں آخر میں اسی مادی قوت کی گاندھی جی کے ہاتھوں شکست کو تسلیم کرتے ہیں۔ پھر مادہ پرستوں کی عمومی صفت یہ رہی ہے کہ جب وہ خود کو کمزور اور بے بس محسوس کرتے ہیں تو کاسہ لیسی پر آ جاتے ہیں اور اگر اپنی قوت کا ذرا سا بھی احساس ہو تو فرعون کی زبان بولنے لگتے ہیں۔ مسلمانوں سے تحکمانہ لہجے میں بات کرنے کا انداز صاف دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔

پرکاش نرائن سپرو کے اس سوال پر کہ آپ آزادی کے بعد ملک میں ایک آدمی کو کتنی ملکیت رکھنے کی اجازت دیں گے، گاندھی جی کا جواب تھا "کچھ نہیں"۔ یہ بلیغ جواب فراق صاحب کے محدود دماغ میں سما نہیں سکا۔ دراصل گاندھی جی ملکیت کے بالمقابل امانت کی بات کر رہے تھے۔ اسی بنیاد پر ان کے شاگرد ونوبا بھاوے نے ملک کو یہ نعرہ دیا تھا "سب بھومی گوپال کی"۔ اس بات کے علاوہ فراق نے گاندھی جی کے بارے میں جو کچھ کہا ہے سب اُن کی سخن سازی ہے۔ شعر میں تو متضاد باتیں یکجا کر کے لطف پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن زندگی کے سنگین حقائق میں یہ بازی گری کسی کام کی نہیں۔

تمام انسانی افعال کی ایک تہذیب ہوتی ہے، کھانے پینے کی تہذیب، گفتار و رفتار کی تہذیب۔ اسی طرح جنسی فعل اور اس پر گفتگو کرنے کی بھی ایک تہذیب ہوتی ہے۔ مادّہ پرست حضرات جنسی باتیں کرتے وقت اس میں فحاشی کا عنصر شامل کر کے لطف لیتے ہیں اور دوسروں پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ بہت دلیر انسان ہیں۔ لطف یہ ہے کہ یہ حضرات کبھی اپنی ذاتی جنسی حرکات و سکنات کی تفصیل بیان نہیں کرتے۔ دوسروں کے حوالے سے فحش جنسی گفتگو تو گلی کوچے کے لوفر لڑکے بھی کر لیتے ہیں، اس کے لئے علم و فن کی کیا ضرورت۔ فراق صاحب کو ہم جنسی کے سوال پر تفصیل سے اپنے تجربات بیان کرنے چاہئے تھے لیکن حضرت اس مقام سے وعظ فرما کر گذر گئے۔ یہ بات درست ہے کہ انسان کو اول اول عشق کا تجربہ جنسی کشش کے ذریعہ ہوتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس کی انتہائی منزل جسمانی تلذذ ہی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو گوتم بدھ اپنی جوان سال بیوی کو چھوڑ کر دربدر نہ بھٹکتے اور دنیا کے تمام نوجوان جنھوں نے اعلیٰ مقاصد کے لئے اپنی جانیں قربان کیں، ایسا کبھی نہ کرتے۔

فراق صاحب کا کہنا ہے کہ ہر بڑے انسان کو دنیا جہان کے سارے کام کرنے چاہئیں۔ حالانکہ انسان وہی کام کرتا ہے بلکہ کر سکتا ہے جس کے لئے قدرت نے اسے پیدا کیا ہے۔ فراق صاحب بھی تو معلمی اور دوسرے درجہ کی شاعری کے علاوہ کچھ نہیں کر سکے (خیر۔ وہ یوں بھی بڑے آدمی کہاں تھے ؟) حضرت کو مثال سوجھی تو مہتر اور عطار کی۔ حالانکہ اگر کوئی مثال ہو سکتی ہے تو سخی داتا اور بھک منگوں کی ہو سکتی ہے۔ موسیٰ، عیسیٰ، محمدؐ، رام، کرشن، گوتم بدھ کے بغیر ادب اور کسی فن کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ سارے ادیب اور شاعر ان عظیم ہستیوں کے در کے سوالی ہیں۔

فراق صاحب ادب کے دو مقاصد بیان کرتے ہیں، ایک یہ کہ جب کوئی انسان بلندی کی آخری منزل پر پہنچ جائے اور پھر بھی بے چین ہو تو اُس کے سکون کا سامان مہیا کرنا۔ یعنی جب بادشاہ سلامت ملک فتح کر چکیں تو اُن کے لئے قصیدہ خوانی کی بزم سجانا اور مجرے کی محفل جمانا۔ پھر ان کے بقول ادب کا دوسرا کام قومی مزاج کی تخلیق ہے۔ لیکن قوم تو جغرافیائی حدود اور سیاسی نظم سے بدلتی رہتی ہے۔ ہم مزاج، ہم مسلک اور ہم مشرب لوگ ایک ملت کہلاتے ہیں اور ملتیں جغرافیائی حدود سے ماورا ہوتی ہیں کیونکہ اُن کی تخلیق عظیم ہستیاں کرتی ہیں، شاعر لوگوں کو اس مزاج کا شعور دے سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح حسن کی کوئی متعین تعریف نہیں کی جا سکتی اُسی طرح ادب

کا بھی کوئی متعین مقصد نہیں بتایا جا سکتا۔ ہر ادیب اور شاعر اپنی وراثت، ماحول، دروں بینی اور دور بینی کے ذریعہ اپنے مقاصد خود طے کرتا ہے۔

آخر میں، میں یہ بات کہوں گا کہ تہذیبیں پر امن دور میں انتہائی خاموشی سے بغل گیر ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کے اثرات قبول کرتی ہیں۔ یہ کام ہندوستان میں صدیوں سے جاری ہے اور اس کے لئے کسی ڈرل ماسٹر کی ضرورت نہیں۔

الہ آباد سہیل احمد زیدی

□□ فراق گورکھپوری اور بلونت سنگھ کی گفتگو کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ مجھے فراق کے تقریباً ہر خیال سے اختلاف ہے لیکن اس کی ضرورت نہیں کہ ہر خیال پر اظہار خیال کیا جائے۔ البتہ یہ کہنا ضروری ہے کہ وہ اردو رسم الخط اور اردو تہذیب دونوں کو بابری مسجد کی طرح منہدم کر دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے اردو اور ہندوستان کے رشتے پر تو توجہ دی تھی لیکن اردو اور ہندوستانی مسلمان کے ربط خاص کو نظر انداز کر دیا تھا۔ انہوں نے اردو ادب اور مسلم تہذیب کے تعلق سے ایسا خیال ظاہر کیا ہے جو ہمیں حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ ہم نئی نسل کے ادیبوں کو آج معلوم ہوا کہ فراق بھی وہی ذہنیت رکھتے تھے جو اقبال مجید کے ناولٹ ''تیر اور اس کا سچ'' میں ہندو فرقہ پرست جماعت کی ہے۔ یعنی فراق کے خیال میں بھی :

ثقافتی، وجدانی اور تہذیبی طور پر ہر غیر ہندو کو ہندو بننا ہے۔ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں میں ہندوستان سے ایک نیم مغائرت کا جذبہ کار فرما رہا ہے۔ مسلمانوں نے ہندوستان کی بڑی خدمتیں انجام دی ہیں لیکن ہندوستان کے تہذیبی ورثے کے تمام اہم عناصر کو وہ اپنا نہیں سکتے۔ اس تہذیبی ورثے کو اپنانا اور اس ورثے سے اپنے آپ کو مالا مال کرنا تمام ہندو اور غیر ہندو ادبائے اردو کا اہم ترین فرض ہے (شب خون)

بلونت سنگھ نے جو ایسی اٹ پٹانگ بات سنی تو گھبرا کر موضوع بدلا اور اگلا سوال یہ رکھا۔۔۔ ''شعر کہنے کے لئے آپ کیسا ماحول پسند کرتے ہیں؟'' لیکن فراق صاحب اپنی بات کو اتنی جلد منقطع نہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس سوال کے جواب میں بھی لفظ ''ماحول'' کو پکڑ کر انہوں نے یوں کھینچا۔۔ ''ماحول کا لفظ بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر سکتا ہے۔ ماحول کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس کا تعلق ماضی سے ہے۔ ہندوستان میں اردو ادب کے ادیب کی شخصیت میں ہندوستان کی قدیم ترین تاریخ سے لے کر آج تک کی تہذیبی قدریں کار فرما ہیں''

فراق اپنی کج فکری اور کج عملی کے جواب میں جو کچھ کہہ جائیں لیکن ان کو تمام ادبائے اردو سے ثقافتی، وجدانی اور تہذیبی طور پر ہندو بن جانے کا تقاضا کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ آج جبکہ اردو زبان، اردو رسم الخط اور اردو تہذیب نے سابقہ دشواریوں کو نپٹ لیا ہے، ایسے مضامین کو شائع کرنے کا بس ایک ہی جواز ہو سکتا ہے وہ یہ کہ نئی نسل پرانوں کو پہچانتے ہوئے آگے بڑھے۔ عنوان ''باتیں ہماری یاد رہیں'' سے بھی اس کا اشارہ ملتا ہے۔ اس بات کے لئے شب خون کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

میں یہاں ماہنامہ ''آج کل'' دلی۔ اپریل ۱۹۹۷ کا حوالہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتا، اس میں آج کل کی پرانی فائل (اپریل ۱۹۴۹ء) سے ماخوذ فراق کی ادبی ڈائری شائع ہوئی ہے۔ تقسیم کے سانحے سے ہندوستان نیا نیا گزرا تھا اور تعصب کے کئی داغ اس کے دامن پر ابھر آئے تھے۔ ہم ایسے ہیں، کاش کے سکوت کی چادر ہی تان لیتے۔ لیکن فراق بڑھ بڑھ کر بولے۔ انہوں نے اردو زبان اور رسم الخط کے متعلق جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اردو کو اپنا موجودہ رسم الخط چھوڑ دینا چاہئے اور ناگری رسم الخط اختیار کر لینا چاہئے۔ نیز موجودہ اردو ہندی شعبوں کو توڑ کر ناگری حروف کے ذریعے دونوں کو ایک شعبہ کر دینا چاہئے۔ کہنے کو تو انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اردو رسم الخط کو اختیاری بنا دیا جائے۔ اس طرح اردو یا فارسی رسم الخط کی پوری حفاظت ہو جائے گی۔ فراق گورکھپوری نے اردو کو رومن رسم الخط میں منتقل کرنے کی بات کی، پھر ناگری رسم الخط اختیار کرنے کی بڑی زور و کالت کی۔ اگرچہ اب یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے اور اردو اور ہندی والے اپنے شعبے قائم کرنے اور چلانے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے اور فرضی دقت کے حل کے لئے فراق کے محتاج نہیں ہیں، لیکن ہم نئی نسل کے لوگ فراق کی ایسی ذہنیت سے واقف نہ تھے۔

دکھنیر، گیا۔ محمد منصور عالم

□□ شمارہ ۲۰۳ اور ۲۰۴ ملے، اقبال مجید کا ناولٹ کرافٹ اور پلاٹ کے لحاظ سے عمدہ ہے، لیکن تھیم کے اظہار پر میں بزرگوں کی گفتگو پڑھنے کے لئے بے قرار ہوں۔ اسد محمد خاں کا افسانہ ''سارنگ'' اور شیر شاہ سید کی کہانی ''نظر بند کی محبت'' عمدہ ہیں۔ ظفر اقبال، ظفر احمد صدیقی اور اظفر جمیل بہت پسند آئے۔ ۲۰۴ میں عادل منصوری اور زبیر رضوی کا کلام بار بار پڑھتا رہا۔ فراق گورکھپوری اور بلونت سنگھ کی گفتگو میں برجستگی سے زیادہ ملاوٹ ہے۔ لیکن اس کی اہمیت پھر بھی ہے۔ محترم ساجد رشید کے رسالے پر تبصرے میں ان میں آپ کا زاویہ مقابلے کے لئے دعوت دینے ایسا ہے۔ یہ بات کیا کم ہے کہ انہوں نے ہمت کر کے رسالہ جاری کیا ہے، رسالہ چلنے دیجئے، پھر از خود واضح ہو جائے گا کہ ادب اور قاری کا رشتہ کیا معنی رکھتا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟ آپ نے اداریئے کے جملوں کی جانب اشارہ کیا ہے وہاں ایک بڑی دشواری (جو مجھے سمجھ میں آتی ہے وہ) یہ ہے کہ ساجد اپنی بات کو صحیح لفظوں میں نہیں کہہ پاتے۔ میں گزشتہ آٹھ نو برس سے ساجد رشید کو جانتا ہوں۔ ''علامتوں، استعاروں اور ابہام کے جنگل'' سے ان کی مراد لایعنی باتیں ہیں نہ کہ کہانی کا فنی نظام۔ میں نے بمبئی میں اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر یونیورسٹی کے حوالے سے سید محمد اشرف کی کتاب ''ڈار سے بچھڑے'' کی رسم اجرا منعقد کی تھی اس وقت ساجد

رشید نے بھی سوشرکا کے سامنے یہ بات کہی تھی کہ "کاش وہ "دھند" کے مصنف ہوتے"۔ "دھند" ایسی علامتی کہانیوں سے ساجد رشید کا کوئی جھگڑا نہیں ہے لیکن غیر ضروری ابہام اور تجریدیت سے انھیں تعرض ہے لیکن اس بات کو صحیح انداز اور حوالوں سے نہ کہہ سکے۔ اور دوسری بڑی وجہ جس کے سبب انھوں نے جدیدیت کا لفظ استعمال کیا ہے وہ یہ کہ گزشتہ برسوں میں ہر شخص اپنی ناکامی کو جدیدیت کی ادبی تحریک کے حوالے سے منوانے کے چکر میں رہا۔ جدیدیت اور "شب خون" کو مشکوک کیا گیا اور جدیدیت کے نام پر اتنی ناکامی کی گئی۔ درحقیقت ساجد رشید اس فاسد رجحان کے خلاف ہیں نہ کہ جدید ادب کے۔

بحرین — رحمٰن عباس

• مجھے امید ہے کہ رحمٰن عباس نے ساجد رشید کے موقف کی صحیح وضاحت کی ہو گی۔ اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

الہ آباد — چودھری ابن النصیر

□□ پچھلے ڈھائی برس سے "شب خون" کی بلا تاخیر اور باضابطہ اشاعت ایک ریکارڈ ہے جو ادبی پرچوں کو کم ہی نصیب ہے۔ اس کے لئے آپ کے علاوہ دیگر کارکنان شب خون بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

شمارہ ۲۰۳ میں "تیر اور اسکاچ" موضوع کے اعتبار سے غیر تازہ اور بحث طلب ناولٹ ہے۔ لیکن فنی اعتبار سے اقبال مجید کو رفعت کی ایک نئی منزل عطا کرتا ہے۔ اقبال مجید نے افسانے، ڈرامے کے بعد ناول نویسی یوں اختیار کی ہے جیسے یہ انھیں کا حصہ ہے۔ ناولٹ پر جلد ہی اپنی تفصیلی رائے ارسال کروں گا۔ احمد محفوظ نے فاروقی کے انگریزی مضمون کا خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔ مضمون مختصر ضرور ہے مگر بھرپور ہے۔ معاصر اردو ادب کے حوالے سے ریاست اور قوم کے تصورات کو فاروقی نے اس خوبی سے واضح کیا ہے کہ ایسا پیچیدہ موضوع قارئین کے لئے آسان ہو گیا ہے۔ چونکہ میں سیاسیات کا طالب علم رہا ہوں اس لئے قوم و ریاست کے افلاطونی اور ارسطوئی عقیدوں اور ان کھلنے والی گرہوں سے واقف ہوں۔ ان کے جمہوری اور اقتداری تصورات کو یکجا کر لئے اتفاقی ہو سکتے ہیں۔ یہ آپ نے اچھا کیا کہ تصور ریاست کے ان دونوں پہلوؤں بنیاد گزاروں سے اپنے مضمون کو الگ رکھا ورنہ احتمال اس کے گنجلک ہو جانے کا تھا۔ کاش کے میں سے وزیر آغا کا 'علامت کیا ہے' تیس برس پہلے چھپا ہوتا۔ بہت عمدہ مضمون ہے۔ "افسانہ" "سارنگ" مختصر ہے مگر پختہ ہے۔ اسد محمد خان کا افسانہ ہر اعتبار سے معیاری اور قابل ستائش ہے۔ انھیں اس کامیاب افسانے پر مبارکباد دیتا ہوں۔

کلکتہ — انیس رفیع

□□ شمارہ ۲۰۲ اور ۲۰۳ میں آپ نے جان بالڈوسے کے اقتباسات کے

ذریعہ سوسیور کی فکر کے بعض اسقام کو خوب واضح کیا۔ اس سے پہلے آپ نے ہرمن ہالینڈ کے ایک مضمون کا ترجمہ کیا تھا۔ اس میں بھی سوسیور پر سکت تنقید تھی۔ افسوس کہ ہم اردو والے ادھر ادھر سے جو کچھ درآمد ہوتا ہے (کچا پکا) اسے فوراً گھونٹ جاتے ہیں اور پھر بلا ہضم کئے کاغذ پر اتار دیتے ہیں۔ آپ کے ان تراجم سے یہ بات صاف ہو جانا چاہئے کہ سوسیور کے نظریات حرف آخر نہیں ہیں۔ معلوم نہیں آپ نے Raymond Tallis کی کتاب Not Saussure دیکھی ہے کہ نہیں۔ نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اس کے عنوان میں لطف یہ ہے کہ اسے Not so Sure بھی پڑھ سکتے ہیں۔ تعجب ہے کہ بعض اردو والے سوسیور کا تلفظ سائسیر کرتے ہیں۔

ملبورن، آسٹریلیا — مامون مظفر

□□ اقبال مجید نے اپنے ناولٹ میں ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ سیاسی اور سماجی حالت کی موزوں ترین عکاسی کی ہے۔ ناولٹ میں بین السطور اس نام نہاد کانگریس سیکولرزم کا Mephistopheles بھی اپنی شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ جھانکتا نظر آتا ہے جس کا طوق ہم مسلمان اب بھی ایک عالم بے حسی میں اپنی گردنوں سے نہ جانے کیوں باندھے پھرتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کا حال دیکھنا ہو تو کشمیر کے حوالے سے زیادہ واضح طور پر بات کہی جا سکتی ہے۔ گذشتہ پچاس سال ایسے ہی کتنا Mephistopheles مسلسل سودابازی کے ذریعہ ان کے خون کا ہر قطرہ چوسنے کے درپے ہیں لیکن Faust کو اپنی زندگی کے سارے دکھ سہتے ہوئے بھی ایک دیرپا خوشی اور سکون کا حق نہیں پہنچتا؟ یہ تخلیق پڑھنے والوں کو جھنجھوڑنے کا باعث بن سکتی ہے۔ کیا انتہا پسندوں کی سیاست گری آج ہندوستان کے لئے زیادہ واضح اور برمحل ہے؟ مسلمان اگر مجبوریوں کے قدرت اللہ ہی بنے رہے تو کیا انھیں دوسرے درجے کے شہری سے زیادہ کوئی اور مرتبہ حاصل کرنے کی توقعات نہیں رکھنی چاہیں؟

سری نگر، کشمیر — غلام نبی خیال

□□ شمارہ ۲۰۳ میں اقبال کا ناولٹ فرقہ واریت کو ہوا دینے اور ہندو مسلمان کو ایک دوسرے کا گلا پکڑ لینے کے لئے کھلے بندوں ترغیب دیتا ہے۔ لطف کیا کہ آپ نے اقبال مجید کا فوٹو بھی ساتھ ہی چھاپ دیا۔ فوٹو سے ابھرتے چہرے کی کراہت اور کہانی سے ابھرتے غیر انسانی پیکروں میں مشابہت غضب کی ہے۔

نئی دلی — بھگوان داس اعجاز

□□ زبیر شفائی کی غزلیں دل میں اتر گئیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی رباعیاں بہت اچھی ہیں۔ یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ شمس الرحمٰن فاروقی رباعیوں کا دوسرا مجموعہ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ پڑھ کر بھی خوشی ہوئی کہ جناب مرزا نعیم بیگ کو علامہ اقبال ادبی مرکز کا ڈائرکٹر بنایا گیا ہے۔

ساہو — محمد الیاس عاقل نظامی

شب خون کا شمارہ نمبر ۲۰۴ بھی زیر مطالعہ رہا۔ اُس میں شائع ہوا کنور سین کا افسانہ "رتنا اور راشد" اردو ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اتنے نازک موضوع کو افسانے کی اساس بنانا اور اُسے فن میں ڈھالنا کنور سین کا کارنامہ ہے۔ افسانے کا ہر جملہ ایک علامت ہے اور پورا افسانہ ایک استعارہ۔ افسانے میں اشتعال انگیزی ہے۔ نہ شر خیزی، ادعائیت ہے نہ بنیاد پرستی، عصبیت ہے نہ ظلمت، مخاصمت ہے نہ منافقت، صحافت ہے نہ خطابت، اتحاد ہے نہ اعلان، اگر ہے تو بس Catholicity۔ جو ازمع ادب اور اعلےٰ آرٹ کی پہچان ہوتی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجھک نہیں کہ اردو زبان کی موت کی خبر دینے اور اس کا مرثیہ لکھنے والوں کو جان لینا چاہیے کہ جس زبان میں "رتنا اور راشد" جیسے شاہکار لکھے جاتے ہوں اُسے کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔

نئی دلی — عتیق الرحمٰن

شمارہ ۲۰۴ میں میری نظم "وحید اختر کی یادیں" شائع کرنے کا شکریہ۔ اس میں کتابت کی دو غلطیاں ہو گئیں ازراہ کرم تصحیح کر دیں۔ (۱) ترے حساس دل سے ترکمان چرخ نے بھی (لفظ "نے" چھوٹ گیا ہے) (۲) تری بیگم کا آنچل بھیگ جاتا تھا شراب احمریں سے۔ (یہاں "احمریں" کے پہلے لفظ "میں" غیر ضروری طور پر آ گیا ہے) فراق گورکھپوری کی گفتگو میں بعض باتیں ذات مطلق کے خلاف ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے کا بے لاگ محاکمہ کیا ہے۔ فاروقی صحیح معنی میں کلاسیکی اقدار کے عظیم محافظ ہیں اور اسی وجہ سے سر سوتی سمان انھیں ملا ہے۔ جدیدیت ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ چودھری ابن النصیر کے تبصرے جواب نہیں رکھتے۔ رسائل پر اس بار انھوں نے منصفانہ تبصرے کئے ہیں۔

امبور، مدراس — کاوش بدری

شمارہ ۲۰۴ میں فراق کا انٹرویو، مضمون "خواجہ حسن نظامی کا روزنامچہ" اور بندر ناتھ ٹیگور کا مضمون بہت پسند آئے۔ حسن نظامی کی نثر پر آپ ایک طویل مضمون لکھیں تو اور لطف آئے۔

بمبئی — انور خان

بلونت سنگھ مرحوم سے فراق گورکھپوری مرحوم کی گفتگو خاصی دلچسپ ہے۔ مگر شیخ سعدی کا وہ مصرع "بوستان" میں تلاش کے باوجود نہ مل سکا جسے بلونت سنگھ نے یوں "عقل و دانش" درج کیا ہے اور آپ نے بریں عقل و دانش ... فٹ نوٹ میں لکھ کر اس کی تصحیح کر دی ہے۔ البتہ مترجم بوستان سعدی کے صفحہ ۵۲ پر ایک شعر یوں ضرور چھپا ہوا ہے۔ اغلب ہے آپ دونوں کا اشارہ اسی کتاب کی جانب ہو۔ بر آشفت دانا کہ ایں حرف چیست۔ بریں عقل و ہمت بباید گریست۔ اب تحریفاً کوئی عقل و ہمت کے بجائے عقل و دانش لکھ دے تو بات دیگر ہے ورنہ اصل اصل ہے اور غلط غلط۔

گھنہ — بہار — [illegible]

۲۰۴ میں زبیر شفائی کی غزلوں کے بعض شعر حذف ہو گئے۔ ان کی غزلیں پہلے بھی پڑھنے کو ملتی تھیں مگر چونکاتی نہیں تھیں۔ ماشاء اللہ اب رنگ کچھ اور ہی ہے۔ ان کا یہ شعر ؎

میں سانس ہی نہیں لیتا کئی کئی دن تک
عجیب گم شدگی کا عمل دماغ میں ہے

پڑھ کر ان لوگوں کی حکایت یاد آتی ہے جن کے بارے میں مشہور ہے کہ چالیس چالیس سال تک عشا کے وضو سے فجر کی نماز بھی پڑھ لیا کرتے تھے۔

حیدر آباد — رؤف خیر

"شب خون" ۲۰۴ میں چودھری ابن النصیر کے دونوں تبصرے عمدہ ہیں اور ان کی باخبری اور جدید ادب پر گہری نظر کا پتہ دیتے ہیں۔

علی گڑھ — ابوالکلام قاسمی

شب خون ۲۰۴ مل گیا۔ رسائل پر چودھری ابن النصیر کا تبصرہ خوب ہے۔ لیکن "نیا ورق" کے رجحان کو (وہ خواہ کچھ بھی ہو) "شب خون" کی لَے سے کوئی تعلق نہیں۔ "شب خون" اردو کا سب سے اہم ادبی رسالہ ہے اور اس کا حلقہ بھی وسیع ہے۔ "شب خون" اور فاروقی سے بے جا اختلاف کرنے والوں کا انجام ہمارے سامنے ہے۔

سورت — شکیل اعظمی

مابعد جدیدیت کے سلسلے میں آپ نے "شب خون" کے کئی گزشتہ شماروں کے پہلے صفحے پر بڑی معلومات افزا اور سچی بات درج کی ہے۔ اب میرے خط کے جواب میں مابعد جدیدیت کے سلسلے میں آپ کی دھماکہ خیز رائے بھی ملی۔ مشکور ہوں۔ ادھر آپ کے خلاف الہ آباد سے دہلی تک سازش کا ایک سلسلہ ہے۔ لکھتا کوئی اور ہے اور چھپتا کسی اور کے نام سے ہے۔ ایک آدھ بیوقوف کی انا کی تسکین اسی طرح ہو رہی ہے۔ لیکن انھیں کون سمجھائے کہ آسمان پر تھوکنے سے اپنا ہی وجود داغدار ہوتا ہے۔

بھاگلپور — مناظر عاشق ہرگانوی

"شب خون" برابر مل رہا ہے۔ شمارہ ۲۰۰ اور پھر ۲۰۱ دونوں بہت ترقی یافتہ محسوس ہوئے۔ مشمولات کا ہر حصہ روز بروز بہتر ہوتا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری میں دن رات محو رہتا ہوں کہ اس نے تمھارے توسط سے ہمارے سروں کو فخر سے بلند کر دیا ہے۔ جہاں کہیں بھی جاتا ہوں لوگ تمھارا تذکرہ اس انداز سے کرتے ہیں جیسے تم انھیں کے خاندان کے فرد ہو اور ان کے دل و دماغ اس نعمت عظیم پر سجدۂ شکر بجا لا رہے ہیں۔ اور تو اور ایک کرم فرما نے ہندوستان کے کسی دور افتادہ گاؤں سے مجھے مبارکباد بھیجی ہے اور اپنی بے پایاں مسرتوں کا اظہار کیا ہے۔ اللہ اللہ کیا مقام شکر ہے۔ اور بقول مولانا روم ؎

شکر نعمت واجب آمد در خرد
ورنہ بکشاید در خشم ابد

کراچی — محمد عزیز فاروقی

• حکومت مہاراشٹر نے ہر سال کسی ادبی شخصیت کو سنت گیا نیشور ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کا پہلا ایوارڈ اردو کے مشہور شاعر اور ناقد جناب علی سردار جعفری کو دیا گیا ہے۔ اس ایوارڈ کی مالیت اکیاون ہزار روپے ہے۔ اس کے ساتھ سپاس نامہ اور شال بھی دیا جاتا ہے۔ ہم جناب علی سردار جعفری کو اس ایوارڈ کے ملنے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

• جدید فکشن سے منسلک کتھا آرگنائزیشن، دہلی نے ۱۹۹۶ کا کتھا ایوارڈ مشہور جدید افسانہ نگار شوکت حیات کو ان کے افسانے "گنبد کے کبوتر" پر دیا ہے۔ اس سے پہلے یہ انعام جدید افسانہ نگار سید محمد اشرف کو بھی مل چکا ہے۔ شوکت حیات اور سید محمد اشرف کو یہ انعامات ہندوستانی فکشن کے میدان میں ان کی اہمیت اور جدید اردو افسانے کی مرکزی قدر و قیمت کا اعتراف ہیں۔ ہم اپنے ان فکشن نگاروں کو مبارکباد دیتے ہیں۔

• انگریزی کے مشہور جواں مرگ صحافی اسامہ طلحہ کی یاد میں اسامہ ایوارڈ کے نام سے تین ایوارڈ قائم کئے گئے ہیں۔ اس سال یہ ایوارڈ ساجد رشید (اردو) اسپکلاوت مسرا (ہندی) اور محترمہ تکوین سنگھ (انگریزی) کو دئے گئے ہیں۔ ہم ان انعامات پر مسرت کا اظہار کرتے ہیں اور انعام یافتگان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

• افسوس کہ گذشتہ دنوں مشہور محقق نقاد اور ماہر اسلامیات ڈاکٹر تارا چرن رستوگی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ڈاکٹر رستوگی ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے بھرپور نمائندے اور اردو کے علاوہ فارسی، سنسکرت اور تقابلی ادیان کے ماہر کی حیثیت سے تمام اہل علم حلقوں میں معروف تھے۔ تنہائی اور سرطان کے موذی مرض کے باعث ان کی زندگی کے آخر چند سال بڑی زحمت اور تکلیف میں گزرے۔ لیکن انھوں نے کبھی حرف شکایت زبان سے نہ نکالا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۸ سال کی تھی۔ ان کے پسماندگان میں ہم اردو والوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ ہم ان کے غم میں سوگوار ہیں اور ان کی روح کے لئے دعا کرتے ہیں

• چند دن ہوئے بنگال کے مشہور ڈرامہ نگار ایکٹر اور تھیٹر کے نمایاں فرد شمبھو مترا کا اکیاسی برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ انھوں نے بنگالی کے طبع زاد ڈراموں کے علاوہ غیر زبانوں کے ڈراموں کو بھی بنگالی روپ دے کر بہت کامیابی سے پیش کیا تھا۔ ان میں سافیکلز (Sophoc'as) کا ڈرامہ OEDI-PUS REX راجہ ایڈپس کے نام سے برخت (Brecht) کا ڈرامہ Galileo اسی نام سے، اور ابسن (Ibsen) کا ڈرامہ "The Doll"s House" "پتل کھیلا" کے نام سے بہت مشہور ہوئے۔ علاوہ بریں انھوں نے مشہور فلم "جاگتے رہو" کی بھی ہدایت کاری کے فرائض انجام دئے تھے۔ ان کو ۱۹۷۰ میں پدم بھوشن اور ۱۹۸۹ میں میگسائے سائے ایوارڈ اور ۱۹۸۳ میں کالی داس سمان ملے تھے۔ ہندوستان کے عام ادیبوں اور خاص کر تھیٹر یا فلم کی شخصیات کے طور طریقے کے برخلاف شمبھو مترا پبلک ریلیشن پبلسیٹی اور نام و نمود سے بے زار رہتے تھے۔ کئی سال سے وہ بالکل الگ تھلگ زندگی گزار رہے تھے اور ان کی وصیت کے مطابق ان کے انتقال اور جنازے کی خبر اخباروں وغیرہ کو بالکل نہیں دی گئی اور ان کا کریا کرم صرف گھر والوں کی موجودگی میں عمل میں آیا۔ بنگالی کے مشہور ڈرامہ گروپ "بہوروپی" کے بانی اور روح رواں کے طور پر ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھیں مثانے کا سرطان تھا۔ چند مہینوں کے اندر اندر سرطان کے نامراد مرض نے ہمیں کئی بڑی شخصیتوں سے محروم کر دیا۔ ہم شمبھو مترا کی روح کے لئے دعا گو ہیں اور ان کے غم میں سوگوار۔

• گذشتہ دنوں مشہور ادیب اور ماہر غالبیات آفتاب احمد خاں کا انتقال ہو گیا۔ غالب پر ان کی کتاب 'غالب آشفتہ نوا' کچھ دن پہلے شائع ہوئی تھی۔ اگرچہ جو مضامین اس میں شامل تھے وہ پہلے کے لکھے ہوئے تھے، لیکن ان کی تازگی اب بھی برقرار تھی۔ ادارہ ان کے ماتم میں سوگوار ہے۔

• عبدالحمید لاہوری کی "پادشاہ نامہ" کا ایک نسخہ آج کل ہندوستان اور پھر امریکہ کی بعض نمائشوں میں رکھا گیا ہے۔ یہ نسخہ برطانیہ کی ملکہ الزبتھ کی ملکیت ہے۔ اس میں چالیس سے زیادہ تصویریں ہیں اور ہر تصویر کو مغل مصوری کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ علاوہ بریں، خطاطی اور کتاب سازی کے اعتبار سے بھی یہ نسخہ یکتائے روزگار ہے پھر یہ بھی کہ یہ نسخہ شاہجہاں کی اپنی ملکیت تھا، افسوس کہ ۱۷۹۷ میں اودھ کے نواب سعادت علی خاں نے یہ نسخہ اس وقت کے قائم مقام گورنر جنرل وائی کاؤنٹ ٹین متھ (Viscount Teigh-mouth) کو تحفتاً عطا کر دیا۔ سعادت علی خاں نے تو یہ تحفہ پیش کر کے ناقدروانی کی مثال مہیا کی لیکن قائم مقام گورنر جنرل وائی کاؤنٹ ٹین متھ اس نسخے کی قدر و قیمت سے پوری طرح واقف تھا اور اس نے صاف کہا کہ میں ایسے غیر معمولی اور نادر العصر تحفے کو قبول کرنے کا اہل نہیں ہوں، میں اسے نواب کی طرف سے شاہ برطانیہ کو پیش کر دوں گا۔ چنانچہ اس نے یہ نسخہ اس وقت کے انگریز بادشاہ جارج سوئم کی نذر کر دیا اور تب سے لے کر اب تک یہ بحفاظت شاہان برطانیہ کے پرائیوٹ میوزیم کی زینت رہا ہے۔ آج اس کی قیمت کا اندازہ لگانا غیر ممکن ہے اس وقت بھی یہ بے انتہا قیمتی تھا۔ امریکہ میں اس کی نمائش کے دوران بعض ہندوستانی حلقوں کی طرف سے مانگ کی گئی کہ اب یہ نسخہ ہندوستان کو واپس کر دیا جائے، لیکن برطانیہ کے سرکاری حلقوں کی طرف سے صاف انکار کر دیا گیا۔

مابعد جدیدیت: تشخیص اور علاج (۳)

گزشتہ شمارے میں ، اور اس کے پہلے بھی بعض شماروں میں ، ہم نے THOMAS DOCHERTY کی مرتب کردہ کتاب POST MODERNISM : A READER کے اقتباسات پیش کر کے مابعد جدیدیت کی لو قاہت کا پردہ فاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ موجودہ اور آئندہ کچھ شماروں میں ہم ایک تازہ کتاب THE POST COLONIAL STUDIES READER کے کچھ اقتباسات پیش کریں گے۔ یہ کتاب لندن اور نیو یارک سے روٹلج (ROUTLEDGE) نے ۱۹۹۵ میں شائع کی اور اس قدر مقبول ہوئی کہ ۱۹۹۵ میں ہی دوبارہ اشاعت پذیر ہوئی۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

مابعد جدیدیت کا تصور جن افکار اور مقدمات کے ذریعہ تیار کیا گیا ہے وہ کم و بیش ارادی طور پر (یعنی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت) پس نو آبادیاتی تشخص کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے وجود میں آئے ہیں۔ بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ارادے اور اضطرار کی بحث تو الگ رہی، پس نو آبادیاتی صورت حال کے تصورات کو صفحۂ ہستی سے مٹائے بغیر یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی ایسی دلیل یا بحث اٹھائی جائے جس کی رو سے یہ کہنا ممکن ہو کہ "ہم" اب مابعد جدیدیت کی صورت حال میں جی رہے ہیں۔ جہاں تک میرا اپنا سوال ہے، میں پس نو آبادیاتی تصورات کو سامراج کے ذریعہ کچلی گئی قوموں اور گروہوں کی ضرورت سمجھتا ہوں کیونکہ اس کے بغیر وہ ایسا تشخص حاصل نہیں کر سکتے جو یوروپ مرکزیت کے پیدا کردہ تصورات اور پیکروں سے آلودہ نہ ہو۔

پس نو آبادیاتی تمنا یا ضرورت کیا ہے؟ یہ تمنا یا ضرورت صرف اتنی ہے کہ وہ قومیں اور گروہ جو کل تک سامراجی نو آبادیات میں شامل تھے، آج اپنی غیر نو آبادیاتی شخصیت کا وجود اور استحکام چاہتے ہیں۔ پس نو آبادیاتی افکار میں زبان کا معاملہ سیاسی ثقافتی اور ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ کینیا کے ناول نگار انگوگی (NGUGI) جیسا کوئی قوم پرست جو بین الاقوامی سرمایہ داری کے زیر اختیار زندگی گزار رہا ہوتا ہے، جب زمین کو دیکھتا ہے تو اسے وہ پیداواری ذرائع میں سے ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ پیداواری ذرائع سے کوئی تشخص نہیں پیدا ہوتا۔ البتہ یہ ذرائع جس حد تک کسی کے قبضے میں آسکتے ہیں، اس حد تک وہ قبضہ ہمیشہ غیر ملکوں کا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں پس نو آبادیاتی مصنف کا تشخص زمین سے نہیں بلکہ زبان سے، اور زبان کے اندر تہذیب سے، ہی قائم ہو سکتا ہے۔ لہذا ہم یہ دیکھتے ہیں کہ زبان کی سیاست پیدا ہوتی ہے جس میں طاقت کا مرکز زبان اور اس کی ریطوریقائی صلاحیت نہیں بلکہ وہ طاقت ہے جو زبان کے پیچھے ہے۔ یعنی پس نو آبادیاتی وجود اختلاف اور افتراق کی طرف واپس جانا چاہتا ہے تاکہ وہ نو آبادیاتی سامراج سے خود کو الگ کر سکے۔ لیکن مابعد جدید اپنے نقطۂ نظر سے انگریزی (یا مغربی یوروپ مرکز زبانیں جو بین الاقوامی سرمایہ داری کی زبان ہیں) نام نہاد بین الاقوامی یکسانیت کی ضرورت کا دعویٰ کر کے ان زبانوں کو جو نو آبادیاتی معاشروں میں پہلے سے موجود تھیں زندہ یا مردہ عجائب گھر کی زینت بنا کر مغرب کے کلام (DISCOURSE) کو رائج کرنا چاہتا ہے۔

SIMON DURING

ماخوز از

THE POST-COLONIAL STUDIES READER

Edited by BILL ASHCROFT
GARETH GRIFFITHS
HELEN TIFFIN
(1995)

ط "شب خون" شمارہ ۱۸۵ ۔ ۱۹۰ ۔ ۱۸۵ ۔ ۱۸۱

جون ۱۹۹۷

مدیر، مرتب، ناشر: عقیلہ شاہین
سرورق: چودھری ابن النصیر
جلد: ۳۱ شمارہ: ۲۰۷

فون نمبر: ۶۲۲۶۹۳، ۶۲۲۳۱۷
سرنامہ کی خطاطی: عادل منصوری
ترسیل زر کا پتہ: ۳۱۳ رانی منڈی، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

مطبع: بہار کو پریس، الہ آباد
کمپوزنگ: افراح کمپیوٹر سنٹر، نئی دہلی-۲۵
خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس-۱۳، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

فی شمارہ: پندرہ روپے
شارپ ٹریک کمپیوٹرس، الہ آباد-۳
بارہ شمارے: ایک سو ساٹھ روپے

ترتیب و تہذیب
شمس الرحمٰن فاروقی

ادا جعفری

آنسو ہے، گلاب ہے، دیا ہے
دل آپ ہی اپنا ماجرا ہے

پل بھر میں بدل رہے ہیں موسم
کچھ بھی نہ سمجھ میں آسکا ہے

پرچھائیں سی میں یہیں کہیں ہوں
دور ایک چراغ جل رہا ہے

ہے یوں کہ ابھی نہ حال پوچھو
یادوں سے ابھی مکالمہ ہے

لمحے کہیں کھو نہ جائیں، جن پہ
اس نے مرا نام لکھ دیا ہے

اک عمر کے روپ دیکھتی ہوں
دیوار فراق آئینہ ہے

اک ساعت خواب سا ملا تھا
صدیاں مرے نام کر گیا ہے

میں آبلہ پا یہ کس سے پوچھوں
اب فاصلہ کتنے کوس کا ہے

میں رنج کے ساحلوں اکیلی
یہ کون مجھے پکارتا ہے

یہ بھی تو کسی پیام سا ہے
یہ پھول جو شاخ پہ کھلا ہے

خوشبو ہے، کتاب ہے، دعا ہے
جو سانس ہے خود معاملہ ہے

ہربنس مکھیا

ماضی

ہمارا ماضی
اساڑھ کی تپتی دھوپ ہے
جس نے ہمارے پیار کی معصومیت کو
صحراؤں کی ریت بنا دیا ہے

ہمارا ماضی
نیم کی گھنی چھاؤں ہے
جس کے نیچے تھکا ہارا مسافر
چند لمحے آنکھیں بند کر
اپنی ہار میں بھی
جیت کے خواب دیکھ لیتا ہے
ہمارا ماضی
ایک پرچھائیں ہے
جس سے ہم کتنا بھی دور بھاگیں
وہ دبے پاؤں ہمارے پاس آ کھڑا ہوتا ہے
اور رنگ بھیس بدل کر
کبھی پیار اور کبھی طنز بھری نظروں سے
ہماری طرف تکتا رہتا ہے
پر بولتا کچھ بھی نہیں
ہمارا ماضی
وہ محبوبہ ہے
جس کی گلی میں
عاشق
ترک تعلق کے بعد بھی
عمر بھر آس لگائے بیٹھا رہتا ہے
کہ شاید کبھی
وہ مڑ کر دیکھے
اور مسکرا دے

لا عنوان

وہ انگنت خط
جو کتنی ہی زندگیوں میں
میں نے تمہیں لکھے تھے
اور تم نے ہر ایک خط
مسکراتے، ہنستے، روتے
کئی کئی بار پڑھا
اور اٹھا کر رکھ دیا

ایک بار اور پڑھنے کو
جیسے یہ خط ہی تمہارا اور میرا سب کچھ ہوں

ان خطوں میں ہم نے کئی رنگ ڈھالے
سفید پاکیزگی، سبز تازگی
سرخ تمازت اور نیلی گہرائی
تم اور میں ہر رنگ میں ڈوب کر، تیر کر
لڑکھڑاتے اور سنبھلتے رہے
کئی حسین خواب بنے، کئی توڑے

پھر ایک دن اچانک
طوفان کے اک جھونکے سے
پانی کے وہ تمام رنگ
جن میں ہم اترا کر ڈوبے اور تیرتے تھے
آگ کے رنگ میں ڈھل گئے
جس میں میرے وہ سارے خط
جل کر راکھ ہو گئے
اور تمہاری آنکھوں میں تیرتے آنسو کے پردہ میں
میں نے ایک دبی سی مسکان
کی پرچھائیں دیکھی

ہربنس مکھیا

اداسی

میری اداسی میں
پہلی بارش میں بھیگی
مٹی کی خوشبو ہے
پہاڑ کی چوٹی پر مندر میں جلتے دئے
کی پاکیزگی ہے
میری اداسی ایک ایسی سچائی ہے
جسے کسی کے میلے ہاتھوں نے چھوا نہ ہو
کسی بری نظر نے دیکھا نہ ہو
یہ اداسی ہمارے عشق کی امانت ہے
عشق، جس کی شدت نے
زندگی سے ایک خاموش بغاوت کی تھی
اور کئی سوال کئے تھے
وہ سب سوال جو ازل سے
ہر عاشق اور ہر محبوب
زندگی سے کرتے آئے ہیں
اور جن کے جواب کی تلاش میں
تھک ہار کر
اداسی کی گود میں سو جاتے ہیں
گویا یہی
عشق کے ہر سوال کا جواب ہو

لکیریں

ہم اپنے ماضی میں
دو زندگیاں جینے کے عادی ہو گئے تھے
اپنی اپنی اور ایک دوسرے کی زندگی
ان کے بیچ چند دھندلی سی لکیریں
کھنچی تھیں
یہ لکیریں
کبھی ایک جگہ نہیں ٹھہریں
ان کے رنگ، روپ، گہرائی
دونوں زندگیوں کی حدود
برابر بدلتے رہتے تھے
سنگیت کے سُروں کی طرح

پھر ایک دن ہم نے
اپنی اپنی لکیروں کو
الگ الگ کر کے غور سے دیکھا
تو محسوس ہوا
کہ ان میں تمہاری اور میری
انفرادی فطرت کی
کوئی لکیر نہیں ہے

ہم نے ان لکیروں کو
سیدھا کھڑا ہونا سکھایا
انہیں مضبوط بنا دیئے
اور ذرا ہٹ کر
انہیں فخر سے دیکھا
ہمارے ماضی میں جہاں
مصور اوراق تھے
وہاں آج
بس لکیروں کا ایک ڈھیر ہے

غزل

عرفان صدیقی

یمن ویراں ہوا اب دل کی جولانی سے کیا ہوگا
نقیب و لشکر و تخت سلیمانی سے کیا ہوگا

قبا سے کیا ہوا ہنگامۂ شوق تماشا میں
ہم آنکھیں بند کرلیں گے تو عریانی سے کیا ہوگا

مری دنیائے جاں میں صرف میرا حکم چلتا ہے
بدن کے ملک پر اوروں کی سلطانی سے کیا ہوگا

یہاں کس کو خبر ہوگی غبار شہسواراں میں
میں خوشبو ہی سہی میری پریشانی سے کیا ہوگا

پھر اک نوبرگ نے روئے بیاباں کردیا روشن
میں ڈرتا تھا کہ حاصل ایسی ویرانی سے کیا ہوگا

عرفان صدیقی

تو وہاں ہو تو گرفتار نفس ہو جاؤں
میں کہاں جاؤں کہ پھر تیرا ہرن ہو جاؤں

شہر بلقیس میں ہونے کی خبر آئے تو میں
شامل خاک نشینان یمن ہو جاؤں

یاد آئے جو تری کم سخنی کا انداز
اپنے ہی آپ سے مصروف سخن ہو جاؤں

روح میں کیسی تھکن ہے کوئی تدبیر کروں
شاید آسودہ سر بستر تن ہو جاؤں

کب سے پتھر ہوں بیابان فراموشی میں
میرے ساحر، مجھے چھو لے کہ بدن ہو جاؤں

وہ ہلال ماہ وصال ہے دل مہرباں اسے دیکھنا
پس شام تن جو پکارتا سر بام جاں اسے دیکھنا

وہ ستارہ ہے سر آسماں ابھی میری شام زوال میں
کبھی میرے دست کمال میں تہ آسماں اسے دیکھنا

مری عاشقی مری شاعری ہے سمندروں کی شناوری
وہی ہم کنار اسے چاہتا وہی بے کراں اسے دیکھنا

وہ ملا تھا نخل مراد سا ابھی مجھ کو نجد خیالی میں
تو ذرا غبار شمال میں مرے سارباں اسے دیکھنا

نہ ملے خبر کبھی دوستو مرے حال میرے ملال کی
تو بچھڑ کے اپنے حبیب سے پس کارواں اسے دیکھنا

غزلیں

انور شعور

جاگیر اور ہماری کیا تھی
یا سپنا تھا یا آشا تھی

من آنگن میں چاند نہیں تھا
رات کی رانی البتہ تھی

سب جب گہری نیند میں گم تھے
روشن شمع دل چتا تھی

ٹوٹے پڑتے تھے پروانے
ایک قیامت سی برپا تھی

اے جلادو! محبت کرنا
جرم نہیں تھا صرف خطا تھی

انساں کا محتاج ہے انساں
ورنہ میری کسے پروا تھی

دنیا آج بھی کیا ہے تاہم
آج سے پہلے بھی یہ کیا تھی

ایک ملاقات اس نے کی ہے
وہ بھی وعدے کا ایفا تھی

کیا کچھ گزری، مجھ سے پوچھو
میری چشم تماشا وا تھی

کیا آدم، کیا ہستی آدم
اک مٹی تھا، ایک ہوا تھی

آج اسے نزدیک سے دیکھا
صورت تو تصویر نما تھی

اس کی خاموشی خلوت میں
ایک طلسم ہوش ربا تھی

رات شعور کے دل کی حالت
اس کی صورت سے افشا تھی

شور غل میں سنا نہیں جاتا
ورنہ کیا کیا کہا نہیں جاتا

کون سا پارسا زمانے کا
اس گلی میں بھلا نہیں جاتا

رات کے وقت اور گھر میں بھی
شور بازار کا نہیں جاتا

اب تو اس بارگاہ تک برسوں
تذکرہ تک مرا نہیں جاتا

اس کا درباں جسے اجازت دے
کوئی اس کے سوا نہیں جاتا

رائگاں صاحب وفا کا سر
اے مرے بے وفا نہیں جاتا

ساتھ رکھتا نہیں وہ شخص شعور
اور اکیلے رہا نہیں جاتا

के लिए

पयावरण
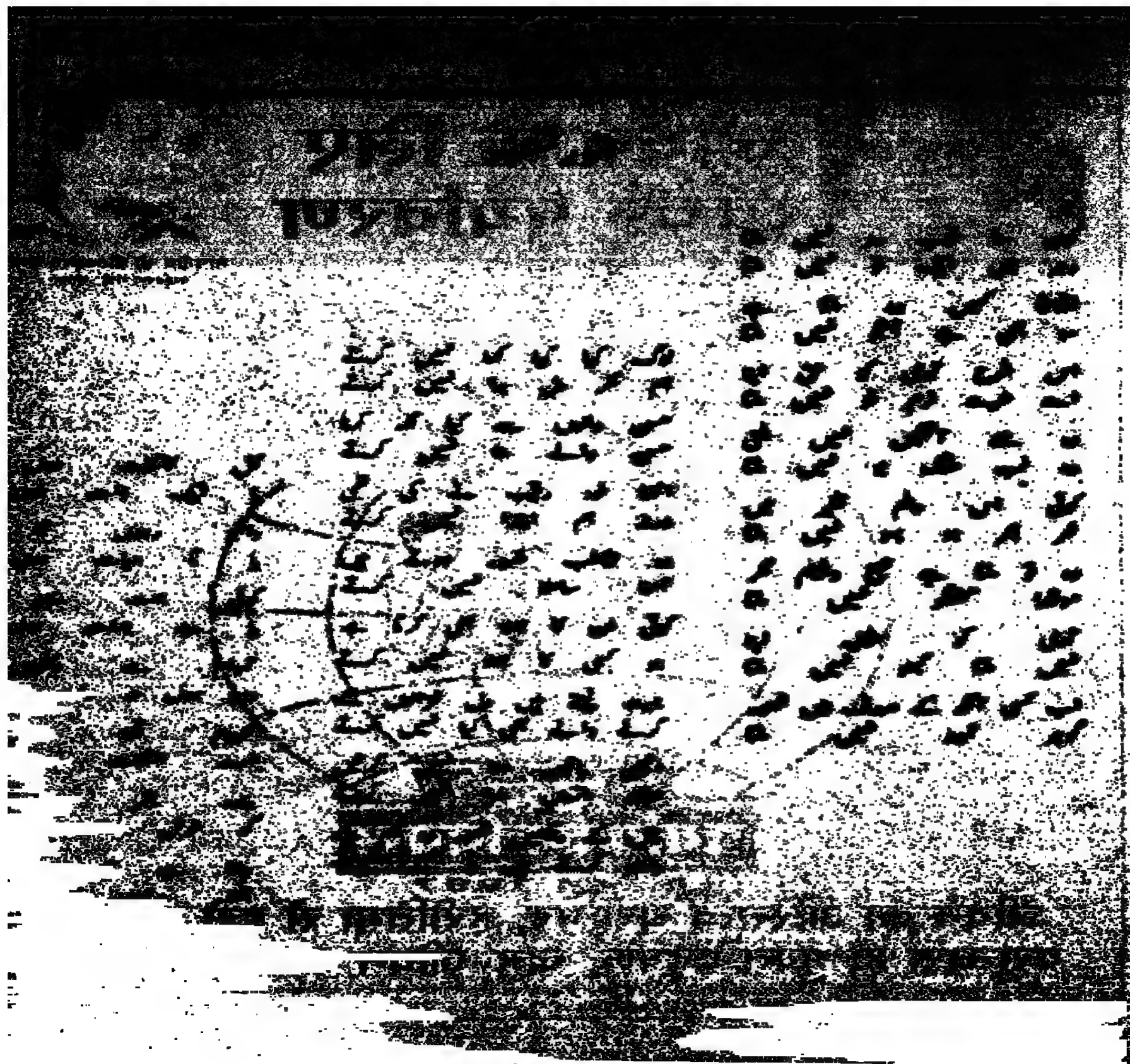
5, जून 1997

जीवन का अस्तित्व धरा पर, हरीतिमा से

हो मुक्त प्रदूषण, जन-जीवन को

کلام محمد طور

دہر میں جو حاصل ہے اسکو کھونا ہے
اور پھر اے دل لمبی تان کے سونا ہے

پہلے آنکھ رقم کرلی ہے صحرا پر
جو ہوتا ہے اس کے بعد ہی ہوتا ہے

جو دیکھا ہے وہ ہے یہاں کے ناقابل
جو پایا ہے وہ سب کچھ کھونا ہے

اس سے کرتا ہے اظہار محبت کا
پھر تن میں اک بیج وفا کا بوتا ہے

اپنا سر لٹکاتا ہے غم کی سولی پر
داغ جو دامن پر ہے اک دن دھونا ہے

طور یہ سب دھوکا ہے تیری آنکھوں کا
کب دنیا سچی ہے کب دل سوتا ہے

سولی کے پیچھے منظر ہے محشر کی طرف
اس کا اشارہ ہے شاید اس سر کی طرف

بہت ہے دل کی دولت ہم جیسے فقیروں کو
دیکھنا کیا اس دہر کے مال و زر کی طرف

اک رستے پر چلتے ہیں سب دنیا والے
اک رستہ جاتا ہے اس کے گھر کی طرف

عشق کہاں کم ہوتا ہے [illegible] سے
یہ تو گلی کھلتی ہے کچھ اندر کی طرف

زندہ ہو تو رہو اپنے ہی بوتے پر
کیا تکتے رہتے ہو چارہ گر کی طرف

پھر کرنا اک عالم عرفاں کی خواہش
پہلے دیکھو طور تم اپنے گھر کی طرف

انور سین رائے

اس شہر میں
ہر فرلانگ پر ایک گھر ہے
جس میں ہر شام
کسی کے لوٹ آنے کا انتظار ہوتا ہے

اس شہر میں
ہر دو فرلانگ پر ایک گھر ہے
جس میں ہر شام
کسی کے قتل پر آنسو بہائے جاتے ہیں

اس شہر میں
ان گھروں کی
اب تک کوئی گنتی نہیں کی جا سکی
جہاں سے روزانہ
مختلف قید خانوں کے لئے
خط روانہ کئے جاتے ہیں
یہ جانے بغیر
کہ ان کا کوئی جواب کیوں نہیں آتا

سڑکوں پر بہہ کر جم جانے والے خون کے
نشانات مٹتے جا رہے ہیں
لیکن میں اب بھی
روزانہ وہاں جاتی ہوں
جہاں تجھے قتل کیا گیا میرے بیٹے

میں روزانہ وہاں جاتی ہوں
جہاں تجھے قتل کیا گیا میرے بھائی

میں روزانہ وہاں جاتی ہوں
تجھے پکارتی ہوں
اور تیرے کراہنے کی آواز سنتی ہوں

میں روزانہ وہاں جاتی ہوں
جب بچے تمہارے بارے میں سوال کرتے ہیں
جب تمہارا نام لیا جاتا ہے
جیسے سرگوشی ہو رہی ہو
جیسے مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے
ہمیں روکنے کے لئے
پابندیاں لگائی جاتی ہیں
بکتر بند گاڑیاں کھڑی کی جاتی ہیں

راستوں پر
اور چوکیاں بنائی جاتی ہیں
کیا
وہ ہمیں روک سکے؟
کیا وہ ہمیں روک سکیں گے؟

انہوں نے ہر راستے پر خاردار نظریں پھیلا دیں
تاکہ کوئی گھروں سے نہ نکل سکے
تاکہ ہم ان کی زد میں آ جائیں
کیا وہ ہمیں روک سکے؟
کیا وہ ہمیں روک سکیں گے؟

کسی نہ کسی دن
کسی نہ کسی کو تو نکلنا ہی تھا
اس لئے میں نکل آئی ہوں

کسی نہ کسی دن تو
اس خاموشی کو ٹوٹنا ہی تھا
جس نے ہر چیز کو ممکن بنا دیا
اس لئے
میں نے اس خاموشی کو توڑ دیا ہے
انہوں نے ہمارا مذاق اڑایا
اور انصاف کا بھی
انہوں نے وردی اور گولی کو عدالت بنا دیا
انہیں یقین تھا
وہ کبھی نہ جانے کے لئے آئے ہیں
انہوں نے
ہر چیخ کو سنگینوں سے لہولہان کر دیا
لیکن ہماری چیخیں پھر بھی بلند ہو رہی ہیں

ہماری چیخیں گھوم رہی ہیں سڑکوں پر
ہماری چیخیں چکرا رہی ہیں
بندی خانوں اور
نجی تشدد گاہوں کے گرد

ایک نہ ایک دن ہم تمہیں پا لیں گے
یا
ایک نہ ایک دن تم تک پہنچ جائیں گے
ہم خود بھی

انور سین رائے

میرا خواب ہے میرا ملک
خواب جس میں میں رہتا ہوں
سوتے ہوئے
اور جاگتے ہوئے

میرا خواب ہے میرا ملک
ایک مضبوط چٹان
لیکن اس کی اپنی ہی ہواؤں نے اسے کاٹ ڈالا
اس کے اپنے ہی پانیوں نے اسے بہانا شروع کر دیا

میرا خواب میرے پاس آتا ہے
میرا خواب مجھ سے پوچھتا ہے
کیا یہ میں ہوں؟
کیا یہ میں ہی ہوں
تمہارا خواب
اور کیا یہ تم ہی ہو تم؟

میرا خواب ایک شہری ہے جس کی زبان کاٹ دی گئی ہے
الٹا لٹکا کر رکھا گیا ہے اس کو

لیکن وہ پھر بھی نہیں بھولا کہ وہ ایک خواب ہے
اس کے سر کو دیواروں سے ٹکرایا گیا
یہ مت پوچھو کہ کس زمانے میں اور کس SAFE HOUSE میں
میں نے اس کے بالوں کو
بحیرہ عرب کے کنارے اس شہر میں اڑتے ہوئے دیکھا ہے
اس سمندر کا ایک اپنا رنگ ہے
اس کے پانیوں میں گھلنے والی کسی چیز کا رنگ باقی نہیں رہتا
لیکن میں آج بھی دیکھ سکتا ہوں ان سرخ لکیروں کو
جو اس کی ناخنوں سے محروم انگلیوں کو دھوتے ہوئے بنی تھیں

یہ خواب میرا بنایا ہوا نہیں
یہ خواب ایک وراثت ہے
ان بزرگوں کی جو بہت دور جا چکے ہیں
جو اس زمین میں جذب ہو چکے ہیں
جس پر میں ایک مفتوح کی طرح رہتا ہوں
اس زمین پر میں ایک ابدی آلودگی بن چکا ہوں
بار بار شروع کئے جاتے ہیں مجھے صاف کرنے کے آپریشن
لیکن میں پھر بھی باقی رہ جاتا ہوں

میں اور میرا سر بریدہ خواب سڑکوں پر گھومتے ہیں
میں اور میرا سر بریدہ خواب رفتگاں کو پکارتے ہیں
اور ہمیں سنائی دیتی ہے اپنی ہی آواز کی گونج

ہوا میں معدوم ہو گئی ہے ہماری آواز
مٹی میں مل گیا ہے ہمارا لہو

عدالتوں کے دروازوں پر
کیا یہ تم ہو میرے خواب؟
کس امید پر آئے ہو تم؟
کیا اس شاندار تاریخ کو دیکھ کر
جو ہر زمانے میں ایک نئے معنی کا لباس پہن لیتی ہے
جسے ایک بار پھر لکھا جا رہا ہے
گولیوں سے اور تمغوں سے

کیسے نکل آئے ہو تم
جبری مشقت کرنے والوں سے بنوائی گئی ان نو آبادیاتی بیرکوں سے
جواب اسیروں کے ہجوم سے ابلی پڑ رہی ہیں
کیا تمہیں یاد ہیں ان ملزموں کے چہرے
ان بد نصیب اسیروں کے نام
جنہیں بے گناہی ثابت کرنے سے بہت پہلے
بیرکوں اور تاریک کمروں میں ڈال کر فراموش کر دیا گیا
کیا وہ کوئی انقلاب لانا چاہتے تھے
کیا انہوں نے کوئی بغاوت کی تھی
کیا تھے وہ؟
سوائے ان خوابوں کے

ن سے ہم اپنا مستقبل وابستہ کر سکتے تھے

کس کے لئے چلا رہی ہے یہ چٹان
کس کے لئے پھڑپھڑا رہا ہے
بیچ میں آزادی کا یہ درخت
کس چیخ سے ٹوٹے گی یہ ٹھٹھری ہوئی منجمد خاموشی

میرے خواب میں تجھے کیسے بتاؤں
کیوں اور کیسے تار تار کیا گیا پٹ سن کا سنہرا پیراہن
کس خوف سے کانپ رہی ہے سفید کپاس کی اداسی

لہروں سے اٹھ رہا ہے ایک ممنوعہ شور
بلند سے بلند تر ہوتی عمارتوں کے نیچے
سرسرا رہی ہے گھٹی ہوئی چیخوں کی روشنی

دارالحکومت بہت پہلے جا چکا
اب بحیرۂ عرب کی باری ہے
لیکن میرا دارالحکومت تو ہے میرا خواب
سربریدہ گولیوں سے چھلنی اور لہولہان

نسل کشی

انور سین رائے

ہم نے اپنے والدین کو دیکھا
ہم نے اپنے والدین کے والدین کو دیکھا

ہم نے اپنے والدین کو دیکھا
وہ اپنے والدین کو دفن کر رہے ہیں

ہم نے ان سے دکھ سکھ کے جذبات کا اظہار
تدفین کے طریقے
اور آخری رسومات کی انجام دہی سیکھی

یہ سب کچھ
ہم اپنے بچوں کو منتقل نہیں کر سکے
وہ پیدا ہی نہیں ہوئے
ہمارے والدین کو ہماری شادیاں کرنے
اور دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملا

کسی جنگ کے بغیر
کسی وبا کے بغیر
کسی پرانی دشمنی کے بغیر
انہیں صرف ایک موقع ملا ہماری لاشیں اٹھانے کا

اپنی اپنی خاص پہچانوں سے
جو صرف مائیں اور باپ ہی جانتے ہیں
انہوں نے ہمارے مردہ جسموں کی شناخت کی
اور ہر قسم کی روایتی رسومات کے بغیر
ہمیں زمین کے حوالے کر دیا
مکمل خاموشی سے

قانون نافذ کرنے والوں کی نگرانی میں
چند آنسو تک بہانے کا موقع تک نہیں دیا گیا
انہیں

انور سین رائے

نام ہے میرے پاس
اور ایک چہرہ بھی
لیکن کیسے کہہ سکتا ہوں
یہی ہے 'میرا نام
اور یہی ہے
میرا چہرہ
کیسے ثابت کر سکتا ہوں
یہی ہوں 'میں
اور میں ہی ہوں 'میں
اس میں 'میں
ہو چکا زوال 'شاید
میرا اور اس دنیا کا
جس میں آنا تھا' مجھے
اور یہ بھی محض ایک خیال ہے
کیا مجھے ہی آنا تھا؟
ہر عمل کا ایک وقت ہوتا ہے
اور ہر وقت کا بھی
اور ہر وقت کے ہوتے ہیں
کل 'آج اور کل
لیکن میرے لئے
نہ تو وقت ہے
نہ کوئی وقت تھا
نہ ہی میں کہہ سکتا ہوں
کہ اس کی ہوگی 'کل

میرے لئے تو صرف رات ہے
ایک ٹھہری ہوئی رات
جس کی نہ تو کوئی کل تھی
نہ کوئی آج ہے
نہ ہی کوئی کل ہوگی
ادھر سے ادھر تلک
پھیلی ہوئی ایک رات
جیسے یہ شہر
چھو کر محسوس کرتا ہے
جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں
کسی عزیز کو
نام اور چہرے کے بغیر
اور پہچان کر بھی
یقین نہ کرنا چاہتا ہو

(۲)

چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں نام
اور چھپا ہوا ہوں میں
ان بہت سے ناموں کے درمیان
ایک نام میں
جس پر میرا کوئی دعوئ نہیں
یہ نام
جو مجھ سے پہلے بھی تھا
اور باقی رہے گا میرے بعد بھی
کون ہوگا وہ
جو اس نام میں رہے گا
اور کون تھا
جو اس نام میں رہا ہوگا
کیا کیا نہ سوچا ہوگا اس نے
اس نام کے بارے میں
لیکن میں نکل جانا چاہتا ہوں
ناموں کی اس قید سے
زبان کی ان بھول۔ بھلیوں سے
جو وقت کی طرح پھیلتی ہی جا رہی ہیں
لیکن یہ وقت
اور مہ و سال
جنہوں نے مجھے گزارا ہے
کسی سوال اور کسی معاہدے کے بغیر
کسی بات اور مفاہمت کے بغیر
جو مجھ سے کی جانی چاہیے تھی

(۳)

بہت عرصے بعد
جانا ہے میں نے
کچھ بھی نہ جاننے کو
بہت وقت گزار دیا ہے
ایک خوش فہمی اور حماقت میں
اور اب مشتعل ہو رہا ہوں
خود اپنے ہی بنائے ہوئے
اس قول کے خلاف
جو سخت سے سخت تر
اور مضبوط سے مضبوط ہوتا جا رہا ہے
بہت مشکل ہو چکا ہے
میرا ہونا
ایک ایک کر کے
بند کر دیئے ہیں میں نے سب راستے
اب نہ تو رخصت ہو سکتا ہوں
اور نہ ہی کہیں پہنچ سکتا ہوں
چھوڑ دیا ہے میں نے سب کو
ہو سکتا تھا جن کے ساتھ

کچھ بھی نہیں رکھا سنبھال کر
مسلسل تبدیل ہوتے ہوئے
ان موسموں کے لئے

(۴)

کوئی پیدا نہیں ہوا ہو گا
اپنے وقت سے پہلے
یا اپنے وقت کے بعد
لیکن میرے بارے میں
اس کے علاوہ بھی کہا جا سکتا ہے

میں پیدا ہوا ہوں
سب کی مرضی کے برخلاف
اسی لئے مجھے زندگی نہیں دی گئی
اور جو کچھ میں نے دیکھا ہے
اس پر نہیں رکھا جا سکتا
زندگی ہونے کا الزام

رینگتا ہوا پہنچا ہوں
میں اس یقین تک
منجمد شور میں گونجتی
اس خاموشی تک

آوازسے خالی قہقہوں
اور ہونے کے اس گمان تک
یا اس تک
جسے آخر کار زندگی مان لیا جاتا ہے
شاید تنگ آکر

کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے
اس خیال کو
ان ساری باتوں کو
بے معنی ہو چکی ہیں، ساری مثالیں
کھوکھلے ہو چکے ہیں

سارے لفظ اور محاورے
ایک نئی زبان چاہیے
بالکل ایک نئی زبان
جس کا نہ تو کوئی ماضی ہو
اور نہ ہی کوئی روایت

(۵)

اور یہ سڑکیں اور یہ گلیاں
جو کسی کو کہیں نہیں لے جائیں گی
یہ جو کسی کا انتظار نہیں کرتیں
اور فحش انداز میں تعمیر کی گئی یہ عمارتیں
جو ہر چوراہے پر ٹانگیں پھیلا کر کھڑی
آنے جانے والوں کو اشارے کرتی ہیں
جیسے مرنے ہی والی ہوں

معذرت خواہ ہوں
میں اس صیغے کے لئے
لیکن اس زبان کے سارے دروازے
بند ہوتے جا رہے ہیں
وقت گزرتا جا رہا ہے
گھٹتا جا رہا ہے
ان لفظوں میں چھلپ کر بچ رہنے کا امکان
جن کے ذریعے
میں
اپنے آپ کو
اس نام کو
اور اس چہرے کو تلاش کرنے کا سوچتا تھا
جو میں ہوں گا

انور سین رائے

شاعری سے ہم توقع کرتے ہیں
غنائیت کی
خارجی آہنگ کی
ناممکن کے خوابوں
چھپے ہوئے اشاروں اور رمزیت کی
اور ان باتوں کی
جو بہت دنوں سے
یا شاید کئی نسلوں سے
ہماری زندگیوں میں نہیں ہو رہیں
مثلاً خوشی اور سکون
خوشحالی اور اطمینان
جن پر کسی کی اجارہ داری نہیں
لیکن ہمارے حصے میں
صرف ان کی تلچھٹ ہی آتی ہے

تمام عمر
ہم دو زندگیوں کے درمیان رہتے ہیں
ایک وہ زندگی جو ہم گزارتے ہیں
اور ایک وہ زندگی
جو ہم گزارنا چاہتے ہیں

آزادی کے اور محبت کے بھی
ہم صرف خواب دیکھتے ہی ہیں

ہم فرض کر لیتے ہیں
کہ ہم آزاد ہیں
یہ جانتے ہوئے بھی
کہ ہم بہت نیچے ہیں
ایک دو نسلوں کے بعد
ہم کچھ اوپر چلے جائیں گے
اوپر، درمیان کی طرف
درمیان سے کچھ قریب

ہم آزاد ہیں
کہ اچھے مزدور اور کلرک بنیں
کہ اچھے ہاری اور کسان بنیں
کہ اچھے خدمت گار اور محنت کش بنیں

ہم آزاد ہیں
کہ محبت بھی کر سکتے ہیں
اپنی غربت سے

اپنے افلاس سے
اور
اور اپنی پسماندگی سے

لیکن شاعری
ہمیں شروع ہی سے بتا دیا جاتا ہے
شاعری میں ان باتوں کا ذکر نہیں کیا جانا چاہیے
کمزور ہو جاتی ہے شاعری
آلودہ ہو جاتا ہے تخیل
سمٹ جاتا ہے شاعری کا دائرہ و دائرۂ پھیلاؤ
اور

شاعری میں یہ باتیں
تمہیں پسند نہیں آتیں
شاعری کے لیے خواص کی پسند ضروری ہے
ضروری ہے شاعری کے لیے
دلال دانشوروں کا سرٹیفکیٹ
کیوں؟

زندگی کی طرح
شاعری بھی کیوں نہیں کی جا سکتی تمہاری پسند کے بغیر
کیوں ضروری ہے تمہاری مہر
شاعری پر بھی

اور زندگی پر بھی
دانش کو بھی تم نے
اپنی دلالی پر مجبور کر دیا ہے

کیوں نہیں لکھا جا سکتا شاعری میں
کہ تم جرم کرتے ہو
کچھ نہیں تمہارا وجود
ماسوائے جرم
لیکن پھر بھی تم پر کوئی مقدمہ نہیں بنتا
میں اختلافات کی بات نہیں کر رہا
تمہارے کبھی کبھی کے اور آپس کے اختلافات

اور اگر
تم پر کوئی مقدمہ بنتا بھی ہے
تو تم چلا اٹھتے ہو
تمہارے خلاف بننے والا ہر مقدمہ سازش ہوتا ہے
نظام کے خلاف
ملک کے خلاف
اور ___ اور ہمارے خلاف

ابھی وقت

تم کس نظام کی بات کر رہے ہوتے ہو؟
اس وقت

تم کس ملک کی بات کر رہے ہوتے ہو؟
اور کون ہوتے ہیں
اس وقت عوام جن کے خلاف سازش کی جاتی ہے؟

کون ہو تم اور کتنے ہو؟
سو میں ایک
سو میں دو
یا سو میں تین

یہ ایک دو یا تین
کیا تم نظام ہو
کیا تم ہو وہ ملک
جس میں ہم رہتے ہیں
یا تم بھی وہی ہو
جو ہم ہیں
ہم
ہم جو ہیں سو میں ننانویں
سو میں اٹھانویں یا ستانویں؟

کس نے بنایا ہے تمہیں
ہمارا نظام
کس نے قرار دیا ہے تمہیں
ہمارا ملک
کیسے بن جاتے ہو تم
وہ جو ہم ہیں

تمہارے مقدمات
اعلیٰ عدالتوں میں جاتے ہیں
تمہارے لیے بنائے جاتے ہیں
ٹریبونل اور کمیشن
تم بڑے بڑے وکیلوں کو لے آتے ہو
لمبی لمبی اور چکنی زبانوں والے وکیل
جو بڑی مہارت سے ثابت کر دیتے ہیں
کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں ہوئی
جو کچھ بھی تم نے کیا
تمہارا استحقاق تھا

وہ درست ہی کہتے ہیں
کیسے ہو سکتی ہے
قانون کی خلاف ورزی

کیا تم بتا سکتے ہو
یہ قانون کون بناتا ہے

عدالتیں
تمہیں باعزت بری کر دیتی ہیں
کیونکہ
وہ قانون
اور قانون بنانے والوں کو جانتی ہیں
کیونکہ وہ انصاف
اور عدالتیں بنانے والوں کو جانتی ہیں

لیکن یہ سب
یہ سب ہمارے ساتھ نہیں ہوتا
کیونکہ ہم
ہم نظام نہیں ہیں
کیونکہ ہم
ہم ملک نہیں ہیں
او شاید
شاید ہم عوام بھی نہیں ہیں

اب تم کہو گے
کہ یہ شاعری نہیں ہے
ان باتوں سے نہیں بنتی شاعری
لیکن میرے پاس تو یہی کچھ ہے
یہی وہ سب ہے

جو میں لکھنا اور کہنا چاہتا ہوں
اسی کو بنانا چاہتا ہوں شاعری
تمہاری تائید کے برخلاف
تمہاری پسند اور حمایت کے برخلاف

انوپا

اپولو

میری دھرتی کے بھوکے بچوں کے ہاتھوں میں
بھیک کا جو پیالہ ہے
اس میں روٹی کے بجائے اب اسکرین رکھی جائے گی
اس لئے کہ اس پر کھانے پینے کی چیزوں کے بڑے خوبصورت
اشتہار ہوتے ہیں
بھوک + خوبصورتی حرارت
اور میری ماں کے آنسو اپولو میں
تحفے کے طور پر رکھے جائیں گے
اس لئے کہ میری دھرتی کے ننگے بچے دن میں
سورج پہنتے ہیں
رات میں چاندنی اوڑھ کر سو جاتے ہیں
اور بارش میں بہتے ہوئے یہ مکان
مریخ میں رہنے والوں کے ہیں
تم کھرڈل کے ماڈل شوکیس میں کیوں دیکھتے ہو؟
اور رات بھر سڑکوں پر آوارہ اس لئے پھرتے ہیں
کہ یہ ہمارے باپ کے بنائے ہوئے لان ہیں
ہم نے کیا بنایا
ہم نے میلوں کی اونچی چمنیاں اس لئے بنائیں
کے اس کی وسل میں

ہماری آوازیں دب جائیں
اور فٹ پاتھ کا طوطے والا نجومی کہتا ہے
تمہاری قسمت کا فیصلہ آج پھر گدھوں کی کانفرنس
میں ہوگا
اور کیرو کی پامسٹری کے لئے اب الگ سے
اک وزارت بنائی جائے گی

سیاسی نصاب

یوں اپنی ہتھیلی کی ریکھاؤں میں کیا دیکھتی ہو
روتی کیوں ہو ماں
رشتے تو روایت اور نفسیات کا جبر ہیں
تم نے چکیاں پیس کر یا بوجھ اٹھا کر جو نصابی کتابیں
دلائیں مجھے وہ سب جھوٹ ہی لگیں
تم ہی نے کہا تھا۔ سچ ہی بولا کرو ——
اب ڈرتی ہو کیوں
انقلاب زندہ باد
ہمارا معاشرہ، منافقت، مصلحت
ہمارے اصول، خود غرضی، بے رحمی
ہماری سیاست، اختیار، اقتدار اور غصب
ہمارا مذہب، دکھاوا اور کلچر
ہمارا دین و ایماں محض پروپیگنڈہ
ہماری تبلیغ جبر اور ظلم
ہمارے فرائض، بددیانتی، افواہیں، سازشیں انقلاب زندہ باد

میرے بچے چپ رہ
کچھ دیر کی خامشی بھی اک علم ہے
اے جلاوطنی میں جنم دینے والی ماں
اب تو چپ رہ
ہماری شامیں، بھوک، افلاس اور تفریحیں
انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد

انوپا

سہرا

آؤ میرا گھونگھٹ الٹو
میری مانگ میں چمکا کے آنسو کی افشاں ہے
میرے بالوں میں پھول بہاروں سے چھپ کر روتے ہیں
میرے ہاتھوں کی مہندی میں
جانے کتنی شام کے سورج سوتے ہیں
دیکھو مجھ سے الٹو گھونگھٹ
میرے ماتھے جلتی دوپہر کا سورج
جھومر بن کر جھٹ گیا ہے
میں دلہن ہوں
میرا جسم جبر کی آگ میں جھلس جھلس کر
کندن سا چمک اٹھا
میرے بچھوؤں کانٹوں کی پازیب
پیار کے گیت سنائیں
چپکے سے گھونگھٹ کو چھونا
میرے چہرے پر جانے کتنے ہاتھوں کی
خراشوں کا حسن سجا ہے
میری آنکھوں میں
سب کی آنکھیں روتی ہیں
ہاں میں اپسرا ہوں دیوی ہوں دلہن ہوں

میرے جسم کا پتھر ٹوٹ ٹوٹ کر ترش گیا
دیکھو ہولے سے گھونگھٹ الٹو
شبنم کے تاروں کا سب موتی گر جائیں گے

پتھر

ان آنکھوں کب روپ کے رنگ تھے
کون تراشے اس پتھر کو
جس میں میرا انگ چھپا تھا
جس میں میری ترسی آنکھیں
اور میں چاہوں یہ بے مصرف پتھر
اس کے رنگ و روپ بنائے
وہ آنکھیں اس پر آکر
کوئی ایسا لفظ ہی لکھ دیں
جو میری ہی آواز ہوا ہو
جیسے کوئی امر کہانی
جیسے اس میں میری جوانی
اور یہ جھوٹے بادل میرے
ساون میرا برکھا میری
یہ کرنیں اور چندا میرا
میرا آنگن پھول بھی میرے
لیکن وہ روپ کے رنگ سب
میری ہی آس کا اک دھوکا تھے
اور پھر یہ ان ترشا پتھر
جس میں میرا انگ چھپا ہے

جس میں میری ترسی آنکھیں
اپنی آنچ پگھلتا جائے
اپنی ہی صورت ڈھلتا جائے

نہ معلوم

صفر سے صفر تک
کسی بچے کی سلیٹ پر
لفظ دائروں اور نقطوں میں قید
اک پکار ہے کون ہے
اور کون unknown ہے
اس سچ کی طرح
جسے دیکھنے کی خواہش میں
میری لاش بھی
خون میں لتھڑے بچے کی طرح
کوڑے کے اس ڈھیر پر
پھینک دی گئیں
جہاں آنکھیں خوابوں کے جبر میں
چہرے نوچتی رہیں
محبتوں کے نفرتوں کے
مگر سچ خواہشوں سے آزاد
اور unknown ہے
اور میں unknown کے جبر میں ہوں

انوپما

ہریل

بس حیرت ہے
کچی شاخ پہ بیٹھا اک ہریل
پنکھ کھلے تو شام کے رنگ
پنکھ سمیٹے رادھا کی ہریالی
جانے کیسے مل جاتے ہیں
ان بلوری آنسوؤں میں
دونوں الگ الگ سے
ملتے اور بچھڑتے رنگ
جن میں میری گلی کے بچوں کی
بھولی بھالی تصویریں
یہ سوچتے سوچتے میں بھول گئی
میرے ہاتھ تھے آدھے کچرے والے اٹے
اتنی جلدی کیسے شام پھر رات آئی
ایک ستارہ شاخوں کے پیچھے چھپ کر
رکھوالی کرتا رہتا
اٹھ نا سوچنے والی
ابھی تو برتن دھونے ہیں
پھر سے جھاڑو دینی ہے
دیئے کے پیچھے اجیالے تارا
آجاتے ہیں کبھی کبھی کنڈلی والے سانپ
ان بوری آنسوؤں میں کیا رکھا ہے
کہیں یہ کچے کمہار مٹی لیپے سوکھے ہاتھ
کہیں کلب کے ٹھنڈے فرش پہ
ننگے پنڈے سے منتر کہیں
رُٹھ رہی سوچنے والی
سالن رکھ دے چھکے میں
اک ناچنے والی بھی یہی کہتی تھی
ہم صبح کے کارن
رات کو اپنے جسم
جھکوں میں رکھ دیتے ہیں

انوپا

آزادی

اس کی باتیں کتنی پیاری
اس نے کہا تری آنکھیں چین کے لمحے
اور میں اپنی آنکھیں ڈھونڈوں
مجھ کو اپنی آنکھیں کھو جانے کا اب دکھ ہے
پر میں چپ ہوں
اس نے کہا ترے لب، ترا چہرہ
خواب ہیں میرے، میرا بسیرا
جس کی چاہت میں
صدیوں سے میں بے حال پھرا کرتا تھا
اور میں اپنے آپ کو ڈھونڈوں بستی بستی
اپنے ہونے کے جھوٹ سے عاجز ہوں میں بھی
پھر بھی چپ ہوں
اس کی باتیں کتنی پیاری
میرے شانوں پر ہاتھ رکھے
اس نے کہا "ہائے میری آزادی"
میں اپنی زنجیریں تھامے حیراں ہوں
اس کی باتیں کتنی پیاری

کوئی اور نہیں

تم نے اپنی آنکھیں بچوں کو کنچے کھیلنے کیلئے کیوں دے دیں
میری آنکھوں کے پتھر دہلیز پر کیوں نصب کر دیئے
وہ تو اجاڑ آنگنوں سے ہوا کی طرح گزر جاتا ہے
اور ہم دونوں یہ سمجھتے ہیں
سوکھے پتوں کی سرسراہٹ
زندگی کا گیت ہے
ڈراؤنی کالی رات کا وجود
ہمارے ہونے کا یقین ہے
ہم اپنے جسم وحشیوں کو کھلا چکے
پھر بھی حواس کا کھیل کھیلنا چاہتے ہیں؟
اسٹیج پر؟
اور جب بھی ہم کردار بنے
بچوں کی طرح کا ایک کھیل
ہرا سمندر، گوپی چندر
بول میری مچھلی کتنا پانی
اتنا پانی، اتنا پانی
اور ہر بار یہ آگ کا سمندر
اب کہاں جاؤ گے بہتے ہوئے راستوں
سمتوں کا مذاق
اس نے بھی کہا تھا
چپ رہو۔ نروان کی کوئی اور نہیں

میرا جیون

دو پل میرا جیون
اک سپنا، اک آنسو
آنکھیں موندوں تو تم یاد آؤ
آنکھیں کھولوں تو سب کھو جائے
اور یہ سندر چھلیے منظر
ہم دونوں کی ہی آشا کے جھوٹ کا کارن ہیں
اور سب عمر تمہیں برساتوں کی یا پھولوں کی
سے گئی ریت ہیں، اپنی تو نہیں
سچ ملیں تو سناٹے ڈرائیں
جھوٹ میں اپنا آپ گنوائیں
گیان کے خوف سے ہم کریں
کب تک بھول کے کھیل رچائیں
آؤ دونوں قسمیں کھا کر زہر کا پیالہ پی لیں
مگر سنو!
اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہنے دینا

انوپا

ٹھنڈی آگ

چاند کی ٹھنڈی آگ میں اب بھی
میرے سپنوں کا گھر جلتا ہوگا
اور تمہارے آنسو!
اب بھی میری پلکوں پر ٹھہرے ہوں گے
بیتے چہرے جھوٹے تھے
ان کو دہراؤ گے تو سپنے اڑ جائیں گے
آنسو ٹھہرے رہنے دو
اور تم تو
وقت کو ٹھہرا کر جسم کی قبروں میں بھی جی لوگے
میں کوئی آشا تو نہیں
میری روح روشنیوں کے کھنڈر سے دور نکل آئی ہے
چاند کی ٹھنڈی آگ میں اب بھی
میرے سپنوں کا گھر جلتا ہوگا
آنسو ٹھہرے ہوں گے——
اور روحیں روحیں تو آوارہ ہیں
سپنوں اور لمحوں سے آزاد
یونہی ماری ماری پھرتی ہوں گی

روایت

کون سے مذہب جہاں میں فاصلے سمٹتے گئے
کانچ کی دیوار کے اس طرف
جسم شعاعوں کا لرزتا سا عکس
آواز میں فقط خواب کی باتیں لگیں
وقت کی ہیبت میں لکیریں لفظ اور
حرف حرف بکھرنے سے سوا اور کیا ہے
کس ماورا خواب میں ہم پر
ایک دوسرے کی جستجو میں بھٹکتے رہیں
ترستے ہوئے لب جلتے ہوئے لمس کو
سرد مہکتی ہواؤں کے سپرد کرکے ہم
کس خوف سے ہر رات تکیوں میں منہ چھپائے دبک جاتے ہیں

انوپا

زیرو پوائنٹ

وہ ایک جنگل بیابانی پتھر پھول
پر میری طرح سے تنہا ہے
ہاتھوں کی طرح پھیلی ہوئیں شاخیں
خالی ہیں دعاؤں سے
دیدہ بے خواب کی مانند کھلے غنچے
کہتے ہیں
تم جن کی ہو منتظر
وہ لمحے تو کب کے بیت گئے
اور اک خواب ہے ٹھہرا ٹھہرا ابدی فضاؤں تک
جنگل کی سرگوشی کرتی ہوائیں
کہتی ہیں
پیچھے پلٹ کر دیکھو گی
تو پتھر کی ہو جاؤ گی
کون ہے یہ
گئے دنوں سے نکل کے آئی
آنے والے دنوں کی آنکھ مچولی

بندیا

تم اپنی ساجن کے ماتھے
مرے آنسو کی اک بندیا لگا لو
اور گلے کا ہار بنا لو
میرے یہ ٹوٹے کنگن
شاید کوئی روپ ہی جھلکے
اپنے پیا سنگ آنچل ڈھلکے
بھونوان کلیوں کو ساری
جو مرے بالوں مہکیں بہکیں
سو رے بن بے لذت قسمت
مان ہیں سپنے مول محبت
سب بکتے ہیں جاؤ خریدو
تن کی سندرتا من کے ارماں
اور جو تم سنگ لا کے تمنائیں
بن چادر کی سیج پہ اپنی
میرے سر کا آنچل ڈالو
تم اپنی ساجن کے ماتھے
مرے آنسو کی اک بندیا لگا لو

کاغذ

کاغذ چننے والے لڑکے کو
کوڑے کے اس ڈرم سے
اس کے بستے خط ملے تھے
جواب کہیں اور بیاہی جا چکی ہے
اور آج وہ لڑکا
کوڑے کے خالی ڈرم کے پاس کھڑا
بابو کے ہاتھ سے اخبار کو
بڑی للچائی نظروں سے دیکھ رہا ہے
اسے کیا خبر
کہ اخبار میں بڑی بڑی ہولناک خبریں چھپی ہیں!
اس وقت میرا جی چاہا
کہ میں اپنی ساری کتابیں
اس خالی ڈرم میں ڈال دوں

انوپا

دھرتی ہولی کا اک تہوار
خون نہائے دھوپ اوڑھے
کالک میں بجھی رات اور گھر کی آگ
ننگی ماں بچہ سینے سے لگائے
موت کے رنگ سے ڈھانپ نہ پائے
پاپ کا رنگ کالا
کاجل بھرو آنسوؤں سے پوتر ہو جائے
ہرے ہرے رنگوں سے دل کی برہن لپٹ کے روئے
پھول سے بچے
گلال رنگوں سے کھیلتے کھیلتے بھوکے سو جائیں
میری مہندی کا رنگ خیالہ
کہ ان سے چپکے مشینوں اور بسوں میں پسے
اور مٹی کے رنگ میں مکمل مل جائے
کیا تم نے اپنے کمروں کے پردوں "قالینوں
اور گلدانوں میں
ٹوٹی چوڑیوں کے رنگ روتے دیکھے
نیلے دریا آسمانوں کو پکارتے رہ جائیں
اودے کاسنی رنگوں میں چھپ کر
میرا خواب آنکھ مچولی کھیلے

پیلے پیلے زرد چہرے نیند اڑا کر لے جائیں
ٹاٹ کے بوسیدہ پردوں کے پیچھے کندنی چہرے
رستہ دیکھتے دیکھتے سنولا جائیں
اچھے دن کے خواب تکیں میری بستی کے بالک
اور جو کھٹ بیٹھے بیٹھے بوڑھے ہو جائیں
دھرتی ہولی کا اک تہوار
پھر بھی میں ڈرتی ہوں
بارودی دھوئیں کے رنگ سے
یہ چھایا تو تتلیاں جل جائیں گی
اور ہم سب راکھ ہو جائیں گے
BLANK PAPER
میں اپنی تصویر سے باہر نکل آئی ہوں
اور تم
میرا خالی فریم اپنی دیواروں پر ٹانگے
فتح مند نظر آتے ہو
کیوں کہ تم نہیں جانتے
جو لوگ "کن" کا لفظ جس پیپر پر پڑھ رہے ہیں
وہ BLANK PAPER ہے

انوپا

دو نظمیں

(۱)

میں سب کے لئے اس وقت ہی مر چکی تھی
جب میں نے اپنے جسم پر دیواریں چن دی تھی
میں اپنے لئے اس وقت مر رہی تھی
جب تم میرے دل پر دیواریں چن رہے تھے
رہا احساس تو آج بھی پریشان ہے اس سے
اور آواز کو پناہ حرف میں بھی نہ ملی

(۲)

پہلا پتھر تمہیں نے پھینکا تھا
اس نے کیا کہ دیواریں گر جاتیں
یا گھر چکنا چور ہو جاتا
یہ تو کھنڈر ہی تعمیر ہوا تھا

ناشناس آئینے

اس سے پہلے کہ یہ لوگ
ہماری کھال کے جوتے بنا کر پہن لیں
ان کے بخشے ہوئے تابوت لوٹا دو
اور اپنے کفن میں فرشتوں کو قید کر لو
ابھی تم مرے نہیں ہو
ناشناس آئینوں میں اپنا عکس کیوں ڈھونڈتے ہو
یہ لوگ تو تمام رنگوں کی اک ڈش بنا کر کھا جانا چاہتے ہیں
انھیں [illegible] نے کا [illegible] اس آ گیا ہے
[illegible] طرح Face Less میں
ہم اپنے چہروں سے نکل آئے ہیں

TIME LESS

اس شہر میں Time Less لوگوں کو بھی
ایک ایسے موڑ پر پھینکا گیا
جہاں وہ
بیکنڈ کی سوئی سے بندھے
چہرہ بے معنی قبروں پہ سے
گزرتے رہیں

انوپا

ریت سے کھیلے گھر کا کھیل
بھولی آشا باز نہ آئے
ریزہ ریزہ چن چن رکھوں
اور گھروندہ بکھرا جائے
پھر بھی بالک من نہ مانے
تکتا جانے کیا رہ جائے
اور نیا ناسور کہے یہ کوئی تو لمحہ امر ہو شاید ۔ کوئی تو لمحہ امر ہو شاید
سب جیون کے ڈھونگ ہیں یہ تو
میں تو جنم کی آس لگاؤں
اپنے من کے سچ کی کارن
کس کس جھوٹ سے ریت نبھاؤں
پھر سوچوں سب پاگل پن ہے
جینے کا کیوں سوانگ رچاؤں
اور نیا ناسور کہے یہ کوئی تو لمحہ امر ہو شاید ۔ کوئی تو لمحہ امر ہو شاید
گلیوں گلیوں پھرا ہے اور
لہو لہو کے ہار سجائے
اندھیراوں سے سجے نیناں
انگاروں کے دیپ جلائے
تھک گئے راہ کو تکتے تکتے
آنے والا آئے نہ آئے
اور نیا ناسور کہے یہ ۔ کوئی تو لمحہ امر ہو شاید ۔ کوئی تو لمحہ امر ہو شاید
اب تو جو رہے من بھی ایسا
ٹوٹا مندر کوئی جیسے
ہے کوئی بھگوان اور نہ پجاری
ٹوٹا مندر اور من جوگی
بن آشا کے اپنی لگن میں
پوج رہا ہے اپنی ارتھی
اب ہے کہاں ناسور کہے کوئی نہ لمحہ امر ہو شاید
کوئی نہ لمحہ امر ہو شاید

انوپا

ٹیکسلا

دھوپ میں نہائے کھنڈروں میں سجے والے
کتنے چہرے
دل میں اپنے آنسو رکھ کر بھول گئے
کہ ہم تھک چکے ہیں
ان لمحوں کو
جو نہ آتے ہیں نہ جاتے ہیں

ڈیکورم

ان مچھلیوں کی طرح
ہم سب اپنے اپنے ایکوریم میں بند ہیں
اگر یہ دیواریں ٹوٹ بھی جائیں
تو سارا پانی بہہ جائے گا
اور ہم سب مر جائیں گے

نیون سائن

تمہارے جانے تک یہ سب کچھ بدل چکا تھا
اس بس کا روٹ بھی جو میرے گھر سے ہوتی ہوئی جاتی تھی
اسکی بینک کا نمبر بھی
اور وہ بھی جو محبتوں کے قصے دیا
ایک نظر میں بھانپ لیا کرتا تھا
سب کچھ بدل چکا
اس شہر کے سارے نیون سائن
اور وہ بچی اب بھی الٹی پہ کھڑی ساون گایا کرتی ہے

—الفی، کراچی کی ایک بارونق سڑک

پروز پوئم

تحقیق کسی صنف کی محتاج نہیں
فرق صرف اتنا ہے کہ
قلم یا تیشہ کس کے ہاتھ میں ہے
سچا لفظ بن کر آتا ہے
نہ تم اس کو عروض اور ارکان کے گھٹنے پہنا سکتے ہو
نہ پروز اور فری ورس کے ناقص تجربوں کی انڈرویئر
اظہار کیا تم نے دیکھا نہیں
سچی شاعری
منافقوں کی تالو سے زبان کھینچ لیتی ہے

عبید صدیقی

یہ بستی چھوڑ کر صحرا میں کیا کرتا ہے ہم کو
چراغ جاں تجھے کیش ہوا کرتا ہے ہم کو

ابھی اک خواب کو تعبیر میں تبدیل کر کے
جو قرض آنکھوں کا باقی ہے ادا کرتا ہے ہم کو

ہمارے ذمے کس نے کردیا یہ کار مشکل
فلک کو خاک واں کا ہم نوا کرتا ہے ہم کو

وہی مٹی کہ جس کو ہم تم راک دن چھوڑ آئے
اسی مٹی کو اب زنجیر پا کرتا ہے ہم کو

نہ جانے کب چراغوں کے دھوئیں سے جان چھوٹے
ابھی تو ماتم شمع ضیاء کرتا ہے ہم کو

کہیں ایسا نہ ہو اس بار بھی سب رائیگاں جائے
سفر سے پہلے منزل کا پتہ کرتا ہے ہم کو

گنجان پیڑ آئیں گے سایہ بھی آئے گا
صحرا کے بعد ابر بھی دریا بھی آئے گا

سانسوں کے اس سفر کو اُداسی میں طے نہ کر
دنیا کے بعد حاصل دنیا بھی آئے گا

یک رخی جہاں کی شکایت فضول ہے
جینا پڑا تو ذوق تماشہ بھی آئے گا

پہلے کسی کی یاد کا مہتاب تو کھلے
آئینۂ خیال میں چہرہ بھی آئے گا

اک دوسرے سے جس پہ جدا ہوتا ہے ہمیں
ان راستوں کے بیچ وہ رستہ بھی آئے گا

عبید صدیقی

منظر روز بدل دیتا ہوں اپنی نرم خیالی سے
شام شفق میں ڈھل جاتی ہے رنگ حنا کی لالی سے

تجھ سے بچھڑ کر زندہ رہنا اپنے لوگ، میں جیتا ہے
دل اک پھول تھا خوشبو والا ٹوٹ گیا ہے ڈالی سے

شہر طرب کو جانے کس کی نظر لگی ہے آج کی شب
رستے بھی ویران پڑے ہیں گھر لگتے ہیں خالی سے

دنیا والے جس کو اکثر رونا دھونا کہتے ہیں
آنکھیں دریا بن جاتی ہیں جذبوں کی سیالی سے

دھول بھرے رستوں کے سفر نے طرز فکر بدل ڈالا
خوف زدہ سی رہنے لگی ہے خاک بدن پامالی سے

اپنے بعد حقیقت یا افسانہ چھوڑا تھا
پھول کھلے تھے میں نے جب ویرانہ چھوڑا تھا

سانس گھٹی جاتی تھی کیسا حبس کا عالم تھا
یاد ہے جس دن سبزے نے لہرانا چھوڑا تھا

آنسو گرے تو خاک بدن سے خوشبو پھوٹی تھی
مینہ برسے تو موسم نے گرمانا چھوڑا تھا

میرے علاوہ کس کو خبر ہے لیکن میں چپ ہوں
ساحل سے کیوں موجوں نے ٹکرانا چھوڑا تھا

میں پہلے بے باک ہوا تھا جوش محبت میں
میری طرح پھر اس نے بھی شرمانا چھوڑا تھا

مصطفیٰ ارباب

یاد رکھنے کی بات

آپ
جب بھی چاہیں
اس تک پہنچ سکتے ہیں
اس کا بدن
رنگا رنگ مٹھائیوں کی مانند
ایک سے زائد ذائقے رکھتا ہے
اس کے لمس کے بعد
آپ اپنی شناخت
کھو دیتے ہیں
یا حاصل کر لیتے ہیں
یہ ایک طویل بحث ہے
کسی اور وقت کی جائے گی

یاد رکھنے کی بات
صرف یہ ہے
کہ وہ
محض آپ کی نہیں ہے
اس کی سمت جانے والوں کی قطار
ناختم ہے

کسی کو بھی
مایوس نہیں لوٹاتی
اس کے باوجود
ہر کوئی گلے لگنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں
آپ کے استحقاق حق سے
انکار نہیں کیا جاتا
لیکن مجھے تو
محبت ایک رنڈی کی مانند لگتی ہے

میں معافی مانگتا ہوں

وہ میرا دشمن ہے
اس کا خیال ہر وقت
مجھے بے چین کیے رکھتا ہے
میں نے
ہر اس طریقے پر عمل کیا
جس سے
کسی بھی دشمن کو نابود کیا جا سکتا ہے
مگر سارے جتن سراب ثابت ہوئے
میں ابھی تک
خود میں حوصلہ پاتا ہوں
دشمنی کا شعلہ
اس کی موت ہی سرد کر سکتی ہے
میں معافی مانگتا ہوں
ان سے
جو محبت کرتے ہیں
میں مہلک ہتھیار کے طور پر
محبت کو استعمال کرنے والا ہوں

چڑیاں

ہم قفس پنجروں میں
خوب صورت چڑیاں پالتے ہیں
ان کی چہکار
ہماری روح کو سیراب کرتی ہے
ہم اپنے ہاتھوں سے
انھیں دانہ چگاتے ہیں
ہمارے لمس سے
محبت پھوٹتی ہے
ہمارے درمیاں
بے پناہ یگانگت پھیلی ہوئی ہے
ہم
ان کے بغیر
زندہ رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتے
اور
کبھی جاننے کی کوشش نہیں کریں گے
کہ چڑیاں
ہمارے بغیر زندہ رہنا چاہتی ہیں

مصطفیٰ ارباب

یادوں کے فوٹوگراف

ایک یاد
ایک شخص پر
منڈلاتی ہے
جس کی آنکھیں بھیگی ہوئی ہیں
ایک یاد
نشانے بازی کی زد میں آکر
راستے میں
دم توڑ دیتی ہے
ایک یاد
نحیف ہو کر
آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے
چلتی رہتی ہے
ایک یاد
انتظار کر رہی ہے
کہ کب اسے
آواز دی جاتی ہے
ایک یاد

ڈھونڈ رہی ہے
ایک لڑکی کو
جو خود ایک یاد میں تبدیل ہو گئی ہے

وارننگ

وہ
ایک پولیس مین ہے
جیسا کہ
ایک پولیس مین ہوتا ہے
اس سے دور رہو
کیوں کہ
تم پولیس مین نہیں ہو
اس کی نگاہ
ایک شکنجہ ہے
اور ذہن
ایک ایسی دلدل
جس کی کوئی حدود نہیں

نقاد

اس کی
پسندیدہ ترکیب
اور مصالحوں سے تیار شدہ مرغ
ایک مرغ ہوتا ہے
وہ
اسے کھاتا نہیں
گھنٹوں اس کی خوبیوں اور ذائقے پر
باتیں کرتا رہتا ہے
آپ اصرار کریں تو
اپنے منہ سے
ایک اصیل مرغ کی بانگ بھی نکال سکتا ہے
وہ یہ مرغ
کسی کو کھانے نہیں دیتا
ایک ڈنڈا لے کر
اس کا دفاع کرتا رہتا ہے
کسی دوسری ترکیب سے
پکایا گیا مرغ
وہ ڈکار لیئے بغیر
کھا جاتا ہے
اور مسلسل
چیختا رہتا ہے
یہ کیا تھا

مصطفیٰ ارباب

میں کچھ بھی نہیں کہوں گا

دکھ
مجھے ورثے میں ملا تھا
اور تم
قرعہ اندازی میں
تمھارے ساتھ

گزرا ہوا وقت
ایک حقیقت تھا
جسے تمھارے جانے نے
خواب بنا ڈالا
میں
کچھ بھی نہیں کہوں گا
کہ آنسو
مجھ سے کتنی بار ملنے آتے ہیں
تنہائی کیسی ہوتی ہے
وقت کی رگ کاٹ کر
واپسی کا سفر
کیسے کیا جاتا ہے
دن اور رات
میرے پہلوؤں میں
کیوں سوئے ہوئے ہیں
میں کچھ بھی نہیں کہوں گا
کیوں کہ
دکھ مجھے ورثے میں ملا تھا

نظم

میرے دل میں
محبت کا سمندر موجزن ہے
پھر بھی
میں تم سے
محبت نہیں کر سکتا
اصرار مت کرو
خوب صورت لڑکی !
تمھاری نگاہیں
سطح کو چھو سکتی ہیں
گہرائی کو نہیں ناپ سکتیں
میری آمادگی
تمھیں محبت کے سمندر میں
ڈبو دے گی
کیا تم
تیرنا جانتی ہو

میں نہیں جانتا

ابھی
"میں" نہیں ہوں
یہ جو گھنٹوں
بولتا رہتا ہے
چیزوں کی ساخت پر
سوچتے ہوئے
ان سے کلام کرتا ہے
خود کو
کبھی اعداد میں تبدیل کرتا ہے
تو کبھی اکائی بن جاتا ہے
یہ جو موجود ہے
لڑکپن سے جوانی
اور جوانی سے
بڑھاپے کی مسافت پر گامزن ہے
یہ "میں" نہیں ہوں
میرا تعاقب ہے
"میں" کہیں اور ہوں
میرے آنے کا وقت
گزر چکا ہے
یا ابھی آئے گا
میں نہیں جانتا
میں اپنی ساعت کھو چکا ہوں

مصطفیٰ ارباب

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا
وہ انتظار کا اسیر ہے
لیکن اس کی پنشن کا مقدمہ
'کسی مرغ کی کہانی کی طرح لگنے لگا ہے'
'زندہ رہنا آسان نہیں ہے'
پھر بھی

'خط کی امید نے اسے معمولی سہارا دے رکھا تھا'
ہر بار وہ پوسٹ آفس جاتا ہے
پوسٹ ماسٹر کو کہنا پڑتا ہے
'صرف موت ہی ایسی چیز ہے جو یقیناً آتی ہے'
وہ ہر دم اپنے آپ کو سنبھالے رکھتا ہے
تھوڑا تھوڑا ٹوٹنے کے باوجود
اسے احساس ہے کہ
'برے حالات کی بدترین بات یہ ہے کہ
انسان جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے'
اسی لیئے
وہ کبھی ہیٹ نہیں پہنتا
تاکہ ہر ایک کے سامنے سر سے اتارنی نہ پڑے

وہ
اپنے خوابوں میں ڈرتا رہتا ہے
اور جاگ جانے پر
وہی انتظار ملتا ہے
وہ کسی بھی وقت
دلے کے خیالی بوجھ تلے مر سکتا ہے
مجھ سے مزید برداشت نہیں ہوتا
آج میں نے
کرنل کو ایک خط لکھا ہے

تم ایک گیت میں رہتی ہو

تم
ایک گیت میں رہتی ہو
اور میں
ایک سر میں
ہم
اسی وقت یکجا ہو سکتے ہیں
جب کوئی راگی
اسی گیت اور اسی سر کو
باہم کر دے گا
ایسا ممکن ہے

اور مشکل بھی
پھر بھی
اسی امید پر
میں مختلف گیتوں
اور تم
کئی دوسرے سروں کے ساتھ
باہم ہوتی رہو گی
ساتھ رہنا
شناخت بن جاتا ہے
اور میں ڈرتا رہتا ہوں
اسی بات سے
اور شکر بھی کرتا ہوں
اسی بات پر
کہ ہم
کسی نہ کسی کے ساتھ تو ہیں

میرے پاس بہت سی باتیں ہیں

میرے پاس
بہت سی باتیں ہیں
جو میں نے زندگی سے کشید کیں
بات سنانے کے لیئے ہوتی ہے
چاہے اچھی ہو یا بری
اور میں نے ایسا نہیں کیا

بات
زندگی کی امانت ہے
جسے لوٹانا پڑتا ہے
میں باتوں کو پلے باندھ کر
جمع کرتا رہا
باتوں کا باڑا وسیع ہوتا چلا گیا
اور میرا انحصار بھی
ایک روز
ایک بات مجھ پر بھونکی ہے
میرا انحصار ٹوٹا ہے
میں
چونک کر دیکھتا ہوں
ایک کے بعد دوسری
اور دوسری کے بعد تیسری

وہ سب
مجھ پر بھونکنے لگی ہیں
میں انہیں پچکارتا ہوں
مگر بے سود
شور سے میرا دماغ بھر جاتا ہے
مجھے کچھ بھی نہیں سوجھتا
اور میں بھی
بھونکنا شروع کر دیتا ہوں

مصطفیٰ ارباب

میرے پاس بہت سی محبت ہے

میرے پاس
بہت سی محبت ہے
میں نے اسے
ایک کنڈے میں لٹکا دیا ہے
ہر آنے والے کو
اس میں سے
ایک ٹکڑا کاٹ کے دے دیتا ہوں
میں نے
محبت کا سب سے عمدہ ٹکڑا
ایک لڑکی کے لیے
بچا رکھا ہے
وہ
میرے پاس کبھی نہیں آتی
اس نے بھی
محبت کو کنڈے میں لٹکا دیا ہے

تم بہت اچھی ہو

تم بہت اچھی ہو
تمھاری ہنسی پر

سوئے ہوئے کان
بیدار ہو جاتے ہیں
تمھاری آنکھوں میں
ان دیکھی کائنات کے
اسرار پوشیدہ ہیں
تمھاری ناراضگی
ایک جہنم ہے
اور مسکراہٹ
پیار کا پہلا بوسہ تھا
تمھارے بدن کی مہک
ہر شے پر حاوی ہے
فاصلے کو
شرمساری سے بچا لو
اور ایک اچھا پیڑ
کچھ دیر کے لیے
ایک کتبہ بنانا پسند کرو

تراشیدہ لڑکی

وہ کہتی ہے
میں تمھیں چاہتی ہوں
تم بھی مجھ سے محبت کرو
میں
اسے دیکھتا ہوں
وہ
ایک خوش شکل لڑکی ہے
لیکن میرا دل
محبت پر مائل نہیں ہوتا
وہ
اصرار کرتی ہے
تو میں اپنے تخیل میں
اسے
تراشنے لگتا ہوں
نقوش میں
چند تبدیلیوں کے بعد
وہ پرکشش بن جاتی ہے
میں
اپنے تخیل میں
اس کے ساتھ محبت کرنے لگتا ہوں
اور اسے
کمرے سے باہر نکال دیتا ہوں

احتشام اختر

دل پہ خنجر وہ مار کر خوش ہیں
اور ہم ہیں کہ ہار کر خوش ہیں

زندگی نے پلٹ کے دیکھا ہمیں
ہم بھی اس کو پکار کر خوش ہیں

دور جاتی ہوئی حیا کا !
عکس دل میں اتار کر خوش ہیں

پہلی بارش کے خوشنما بادل
رنگ گلشن نکھار کر خوش ہیں

خشک پتے ہوا کے کاندھوں پر
چند لمحے گزار کر خوش ہیں

دل کے اس ڈوبتے سفینے سے
بار الفت اتار کر خوش ہیں

غم نے مدت سے مار رکھا تھا
آج ہم غم کو مار کر خوش ہیں

مصطفےٰ شہاب

کہیں قدر کی مصلحت میں گم، کہیں قضا کے ساتھ
کبھی کسی دیئے کی آنکھ ہم، کبھی ہوا کے ساتھ

اسے ہمارے راستے کی تیرگی کا علم تھا
تبھی چراغ دل کو اس نے کر دیا جلا کے ساتھ

یہ جانتے تھے وہ ہماری ہجرتوں میں ساتھ ہے
تو ہم بھی دشت دشت گھومتے رہے خدا کے ساتھ

وہ صاحب نظر کہ جن پہ راز منکشف ہوئے
انھیں پتہ ہے اب کوئی دوا نہیں دعا کے ساتھ

وہی شہاب جس کو اپنی شاخ گل پہ ناز تھا
پرانے خار و خس بھی ٹانکنے لگا ہے اب قبا کے ساتھ

معزول حکمران برطرف شدہ مشیر کے حضور میں

آصف فرخی

"بیٹا جلتی ہوئی کشتی میں
پاؤں مت رکھنا
وہ دور سے آتی ہوئی آواز کو
پہچاننے کی کوشش کرتی ہے"
کیا کسی نے اسے خبردار کرنا چاہا تھا
اور کس بات سے — چلتی ہوئی کشتی
یا جلتی ہوئی کشتی؟
لیکن فرق کیا پڑتا ہے
جب کہ کشتی ما ڈ بکن ڈ بکن می کند
اے سبک ساران ساحل ہا

آسمان کسی پرانی نظم کے مصرعے کی طرح ہے
وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی ہے
داغ داغ اجالے میں
مسہری اور عنابی پردوں کے بیچ
کسی ڈھکی ہوئی چیز کو
پہچاننے کی کوشش کرتی ہے
کس کا ہے یہ دھندلا، حرکت کرتا ہوا سایہ

دو تفصیلات کے ذریعے
وہ اپنے شک کی
تصدیق کرنا چاہتی ہے
ہاتھوں میں "گھبراہٹ کے موتیوں" کی تسبیح
اور سر پر دوپٹے کا کھڑا زاویہ

ایک سایہ اور میں، ہم دونوں خاموش نہیں رہ سکتے
زیادہ دیر تک ایک ہی کمرے میں
اسے محترمہ سے کچھ بات کرنا چاہیے
وہ سوچتی ہے

کوئی بھی بات
مثلاً یہ کہ رام پور میں بے نظیر کا میلہ ہوتا تھا
مشہور شعر ہے، آپ نے سنا ہوگا
"آگیا بے نظیر کا میلا
دل پابند وضع کھل کھیلا"
آپ نے نہیں سنا ہوگا

اچھا تو پھر آپ نے ان دنوں
کوئی اچھی کتاب پڑھی ہے؟
"کسنڈرا کراسنگ" یا "دی پرنسس"؟
کوئی بھی کتاب پڑھی جا سکتی ہے
مثلاً عذرا عباس کی نظمیں ہی کیوں نہ ہوں
"سویرا آخر اپنی مرضی سے کب جیے گی؟"
نہیں، ہیملٹ تو بالکل نہیں
باپ کی روح
اور روح کی بیوہ
اور بیوہ کا دوسرا شوہر
بہت دنگا کرتے ہیں۔
پھر باپ کے بعد بیٹا
وہ ہی کیوں روح القدس ہو؟
"ہم تو اے بابل...
اماں میرے باوا کو بھیجو ری..."
یا پھر کوئی اچھی سی مثنوی کیوں نہیں؟
وہ احتیاطاً دوسری طرف
جھانک لیتی ہے
اس کا بدر منیر تو کہیں اس کے ساتھ
نہیں؟

وہ ان سے کچھ تو پوچھے
آپ کے مزاج تو اچھے ہیں
آپ کے شوہر کی مونچھوں کے کونڈے میں
کیا میں آسکتی ہوں؟
یا کوئی اور ڈر لے بیٹھے
مثلاً یہی کوئی چلتا ہوا موضوع
—— جلتا ہوا موضوع
ہائے کراچی وائے کراچی
بھاڑ میں جائے کراچی

کچھ تو پوچھنے کی گھبراہٹ میں
وہ پوچھ بیٹھتی ہے
"کیا آپ شہر کے لیے پیکیج دیے ہیں؟
یہ آپ کیا کیسے ہیں؟"
یا شاید اسی کو پیکیج ڈیل کہتے ہیں
وہ رک جاتی ہے

شاید ان کو ثقافت کے نہیں
سیاست کے مشیر کی ضرورت
زیادہ ہے

اب میرا بھی یہی ارادہ ہے...
"آج" والے خصوصی گوشہ چھاپتے چھاپتے
کل کر دیں گے
اس کے لیے مجھے کیا لکھنا چاہیے
ذکر قیام یا سفرنامہ
"ہوا ہے پھر سے حکم جاری..."
تب تک کی کراں
میں منجھی کتھے ڈاواں؟

آصف فرخی

ہیملٹ کی مشکلات

اس بار الیکشن میں ہیملٹ
ضرور جیت جائے گا
اس کے باپ کی روح
کی نموداری کی اطلاع
پر اس کے صدمے
اس کی کامیابی کی ضمانت ہیں
مرغ سحر کی بانگ سے پہلے
اس کا چچا یا کوئی ظالم حکمراں
سوچتے ہوئے شہزادے کے لیے
عوام الناس کی پسند کو
اٹھتے ہوئے
گلیوں میں شہروں میں پھیلتے ہوئے
روک نہیں سکتے۔
ہیملٹ ایک بار تخت پر بیٹھ جائے
تو سوال کی نوعیت بدل جائے گی
ٹوبی اور ناٹ ٹوبی
دیٹ از ناٹ دی کوئسچن۔
ٹوبی کا مطلب ہے ہیملٹ ہونا
اور پھر وہی سوال
ٹو رول اور ٹو گیو اپ؟
اصل میں ہیملٹ
نہ ہونے کی اذیت سے
بہت اچھی طرح واقف ہے۔
وہ کٹھ پتلی تماشا
جاری رکھنا چاہتا ہے۔
ڈنمارک کے تماشائی
حیران ہیں کہ ڈرامے میں ڈرامہ کون سا ہے

ڈائرکٹر نے مس کاسٹ کر دیا تھا
ہیملٹ ایک بار پھر
حزب مخالف بن گیا ہے۔

ایک اور عورت

شہر میں ایک عورت ہے

جو کہتی ہے اس کا وہی نام ہے
جو میرا نام ہے

وہ ان جلسوں پر پبلک اپیئرنس دیتی ہے
جہاں مجھے اپنے جانے کی توقع ہوتی ہے
وہ مسکراتی ہوئی
سر کے اشارے سے سلام کرتی ہوئی
سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے
وہ میرے دوستوں کو وش کرتی ہے
اور ان کے جوابی سلام قبول کرتی ہے
اس کے کپڑے اور چہرہ
اب بھی دلکش ہیں

وہ میرے شوہر کے بستر سے اٹھتی ہے
میرے بچوں کے لیے ناشتے رکھتی ہے تعویذ بھیجتی ہے

وہ ایک اسکرین کی طرح
میرے سامنے جل اٹھتی ہے
مگر ریموٹ کنٹرول اس کے ہاتھ میں ہے
وہ خالی جگہوں کو میرے چہرے سے بھر رہی ہے
وہ جل کھمبی کی طرح کھل رہی ہے

میں ڈرتی ہوں
کہ اس کا فون نمبر ڈائل کروں
تو اپنی ہی آواز سنائی دے
معاف کیجیے
آپ کو یہ سہولت میسر نہیں کی گئی۔

میں ہاتھ دھونے کے لیے پانی بہاتی ہوں
وہ صاف ہو جاتی ہے
میں درختوں پر بیٹھ کر
آتے جاتے لوگوں پر تھوکتی ہوں
میں آئینے کو چھو دیتی ہوں
وہ ٹوٹ جاتی ہے
پھر میرے پیچھے سے آواز دیتی ہے
"ٹوٹے ٹکڑوں کو چھو لو"

ایک دو تین
میں گرتے ہوؤں کو چھونے
آگے بڑھتی ہوں
وہ ایک ایک کر کے
بیٹھ جاتے ہیں۔
میوزیکل چیئرز میں
ہم دو کھلاڑی ہیں
اور کرسی ایک

آصف فرخی

اردو بازار کے سارے ناشروں میں کھلبلی مچ گئی ہے
اس ایک خبر سے
کہ جارج ڈبلیو رینالڈز نیا ناول لکھ رہا ہے
اور اس کے حقوق حاصل کرنے کے لیئے
شروع ہوگئی ہے دوڑ
اس کا ترانس لیشن شائع کیا جائے گا
یا کہانی کو مقامی نام کے کرداروں میں ڈھال کر
اڈ پٹ کیا جائے گا
اس کا فیصلہ ہونے میں کیا دیر لگتی ہے۔
ہاٹ لائن پر
منشی تیرتھ رام فیروز پوری سے
رابطہ کرلیا گیا ہے۔
اور قصوں کے تانے بانے چھوڑ کر
وہ اب اسی کہانی پر کام کریں گے
اور ناشر کے حوالے کتابت شدہ جزو کرتے جائیں
گے

جیسا ان کا دستور ہے
معاوضے میں پہلے کی طرح
کتابت اور ترجمہ دونوں کی اجرت شامل ہوگی۔

ایک ناشر کو کامیابی کا پورا یقین ہے
وہ غلط گھوڑے پر داؤ نہیں لگاتا
دی مسٹریز آف دی کورٹ آف اسلام پور
خوب بکنے والی کتاب ثابت ہوگی'
جادو نگار قلم سے
ایسی محیر العقل داستانیں
ناظرین با تمکین کے ہوش اڑ جائیں گے
اور ناظم سرگرمیاں :
ملک معظم کا شوہر زنگی کافور
مرتبانوں میں سونا بھر کرلے جاتے ہوئے
رنگے ہاتھوں گرفتار۔
ایک اور محلاتی سازش پکڑی گئی
خواجہ سرا نے راز اگل کر ہیرا چاٹ لیا۔
صدر الصدور کی آستینوں میں خنجر تھا
کنیز خاص سنگھار دان میں جواہر
بھر کر اڑن چھو ہوگئی
لاکھوں کے گھپلے کروڑوں کے غبن
شاہی خزانے میں خاک اڑنے لگی
اصطبل شاہ کے گھوڑے بے چین
توشہ خانے کے محافظ بے ہدایت
اور امراء حق حیران ہیں
غرض ناول میں عجوبہ داستانیں ہیں

ابتدائی مسودہ دیکھنے والے نے
ناشر کے نام ریڈرز رپورٹ میں لکھا ہے
نیا زمانہ' نئے انداز
میجیکل ریئلزم کا امریکا دریافت ہوچکا ہے
رینالڈز کی داستانیں پرانی لگتی ہیں
ناول کو حقیقت سے قریب تر ہونا چاہئے
اتنے قریب کہ
ہاتھ لگا کر اسے چھو سکیں
کرداروں کا سانس
اپنے چہرے پر محسوس کرسکیں
یہ تجویز پیش کی جاتی ہے
کہ معزز ناول نگار
اپنے تازہ ناول میں
مبالغہ ذرا کم کریں

آصف فرخی

ٹائڈل فلو

سائبیریا سے پرندے
سندھ کے پانیوں میں اترنے لگے ہیں
حکومت کی تبدیلی کا شکار ہونے سے پہلے
آخری مضمون انھوں نے
ہجرت کرنے والے پرندوں کی خوبصورتی کے
بارے میں لکھا تھا
"جب بھی میں زندگی کے چیلنج کا سامنا کرتی ہوں
چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے یاد دلاتی ہیں
کہ دنیا میں خوبصورتی اور امید باقی ہیں"

"بدین کے ٹائڈل لنک میں"---
وہ لکھتی ہیں
جیسے صرف وہی لکھ سکتی تھیں--
"جہاں دریائے سندھ کا شوریدہ پانی
سمندر کی طرف بڑھتا ہے
زیرِ زمین پانی کی مقدار بڑھ جاتی ہے
زمین بنجر ہو جاتی ہے
کسان بھوکے رہ جاتے ہیں

لیکن اس گلابی بادل کے سامنے
سارس کا جھنڈ
کس قدر خوبصورت تھا!"

دنیا بھر کے دارالخلافوں میں
ان کا آخری سنڈے ایکسٹنڈ کالم
----کالم جس میں پھڑپھڑاتے ہوئے سارس
ہیلی کاپٹر کے سامنے اڑے چلے جاتے ہیں--
برطرفی کے خلاف عدالتی درخواست
اور الزامات کی فہرست کے ساتھ پڑھا جاتا ہے

الزامات کی فہرست طویل ہے
اڑتے ہوئے پرندوں کی قطار سے بھی زیادہ طویل
دریائے سندھ کے پانی سے زیادہ گہری
سیم مارے کھیتوں سے زیادہ بنجر
کسانوں کی بھوک سے زیادہ وحشت ناک

سائبیریا سے بدین آنے والے سارس
اب کتنی دور نکل گئے ہوں گے
دریائے سندھ کے خود سر پانی نے
اور کتنے کھیتوں کو بنجر کر دیا ہوگا
اور کون کون سے کسان
اب بھوکے رہنے لگے ہوں گے
آخری کالم ان الزامات کے بارے میں
یکسر خاموش ہے
لیکن بادل
ہائے وہ گلابی بادل....

واٹر مارک

اب مجھے ہر ایک نوٹ پر
شبہ ہوتا ہے یہ جعلی ہے

مجھے کہیں سے بھی رقم ملتی ہے
نوٹ گننے کے بعد
ایک ایک نوٹ کو
روشنی کے رخ پر رکھ کر
واٹر مارک دیکھتا ہوں
کہ قائد اعظم کیسے ہیں

کئی دنوں سے وہ مجھے مٹے مٹے سے لگ رہے
کسی نوٹ میں ٹوپی ادھوری ہے
کسی نوٹ میں ان کا چہرہ

بہت سے ہاتھوں سے بار بار گزرنے سے
وہ میلے ہو گئے ہیں
یہ قول کہ رزق حلال
عین عبادت ہے
ان کے چہرے سے دور ہونے لگا

ٹکسال والے
جان بوجھ کر ان کو غلط یا کم چھاپ رہے ہیں
اصل میں وہ چاہتے ہیں
کہ یہاں سکہ چلے
جس کو اچھالا جائے
تو ایک طرف عقاب ہو
دوسری طرف چاند

آصف فرخی

ین و حضرات، آج کی محفل میں
ریف آوری کے شکریے کے ساتھ

زبان حاضر ہے
فل ہم نے ان خواتین کے اعزاز میں
جو پچھلے دنوں
نے والے افسوس ناک واقعات میں

ہے کہ
ار ہوئیں
پ کو بتائیں گی ان کے ساتھ کیا ہوا
یں آپ کو شریک کریں گے ہم
زور ت ت تالیوں میں
کیجئے

ں فرزانہ
یں گی آپ کو میرا مطلب ہے ریپ
کیسے کیا گیا
وہ لوگ کتنے تھے، کس راستے سے آپ
کے گھر میں

ے وہ
ھوں نے قابو کیسے پایا
اور کون کون تھا
لے کہاں تھے جب آپ کو وہ فرش پر گرا
رہے تھے
منہ پر یہ خراشیں اسی دن سے پڑی ہیں؟
شور مچایا تھا یا آپ روئی تھیں؟
ں نے آپ کو دھمکایا تھا
تعاون کی درخواست کی تھی؟

دوپٹے سے آپ کا منہ بھی باندھا تھا یا صرف ہاتھ؟
کیا ان تینوں نے ایک ساتھ یا باری باری؟
اور کیا وہ تینوں یکساں تھے
یا کوئی ایک آپ کے لیئے زیادہ تکلیف دہ؟
اچھا اس دن تو آپ کہہ رہی تھیں کہ
دوسرے کے بعد تیسرا

آپ کو محسوس ہی نہیں ہوا؟
پہلے میں خون بھی نکلا تھا، کہاں سے؟
ہاں ایسے کر کے دکھائیے
اسکرین پر پورا نظر آئے
یہ کپڑے ادھر کیجئے

روئیے نہیں، اس میں رونے کی کیا بات ہے
اس وقت تو پورے ملک کی ہمدردیاں اور نظریں
آپ کے ساتھ ہیں
اچھا تو یہ سوجن تبھی سے ہے
لیکن آپ ہمارے ناظرین کو
کیسے یقین دلا سکتی ہیں
یہ اس کی وجہ سے ہوا ہے
پہلے کی کسی اور وجہ سے نہیں
میرا مطلب ہے آپ صحت مند اور نوجوان خاتون
ہیں،

آپ کو بھلا کون روک سکتا ہے
اگر آپ چاہیں تو

کیا مطلب ہے ٹھیک نہیں لگ رہا؟
اگر آپ اس کے بارے میں ٹی وی پر
بات نہیں کر سکتیں
تو آپ نے ریپ کروایا کیوں تھا
محض ہمارا وقت ضائع کرنے کے لیئے؟

خیر دفع کیجئے، آپ آیئے اماں جی
آپ کیا کہہ رہی تھیں کہ آپ کے سترہ سال کے
بیٹے کو لے گئے
اور دو ماہ بعد اس صدمے سے مرگیا آپ کا آدمی
کچھ اور بھی بتایئے، اب اتنا کافی تو نہیں
آپ تو روئے چلی جا رہی ہیں

دیکھیے آپ لوگوں کی فضول ضد میں
ہمارے پروگرام کا وقت ختم ہوا چاہتا ہے

اگلے ٹارچر تک کے لیئے اجازت دیجئے
معزز خواتین و حضرات
شب بخیر

آصف فرخی

آنے والے جاڑے کی ہواؤں سے
میری ایڑی کی کھال پھٹنے لگی ہے
اور میری بچی کے سانس میں تکلیف
بڑھنے لگی ہے
لیکن موسم کی تبدیلیوں سے زیادہ
اس بار
میں حکومت کی تبدیلیوں سے پریشان ہوں
میری ایک نظم کا نام
نئی حکومت کی ایگزٹ کنٹرول لسٹ پر آ گیا ہے
وہ باہر نہیں آ سکتی

وہ میرے اندر پھڑپھڑائے جا رہی ہے
ویران مکان کی چمگادڑ کی طرح
وہ بال و پر جھٹک رہی ہے
وہ سر پٹک رہی ہے

وہ میرے ہونٹوں سے نکلنا چاہتی ہے
وہ میری ناک اور کانوں سے رسنا چاہتی ہے
وہ میرے جسم کے سوراخوں سے
ٹپکنا چاہتی ہے

میں بھی اسے روکنا چاہتا ہوں
کہیں کسی حساس آلے کی مدد سے
اسے پکڑ نہ لیا جائے
جہاں
لاوارث پیکٹ، مشتبہ بنڈل
ہونٹوں سے نکلی بات
اور ایسی چیزوں کا
مشینی جائزہ لیا جاتا ہے

وہ باہر نکلتے ہوئے گرفتار نہ ہو جائے
وہ باہر آ کر سیاسی بیان نہ دے دے
کہیں وہ نگراں حکومت میں وزیر نہ بنا دی جائے
ایک نظم کہیں بھی پکڑی جا سکتی ہے
کسی وقت بھی
کسی بھی طرح کی مشکل میں
گرفتار ہو سکتی ہے
ہتھیلیوں میں ناخن
زمین میں ایڑیاں گاڑ کر
میں اس نظم کو روکنا چاہتا ہوں
یہ مجھ سے باہر نکل نہ جائے کہیں

آصف فرخی

اس بار میرے بھرپور عزائم ہیں

مجھے پتہ ہے میں کیا کرنا چاہتا ہوں

میں کراچی کی تصویر والا کارڈ بھیجنا چاہتا ہوں
مَنی ہنی رنرز آف دی ڈے سوئٹ چکی

ہر سودے میں دس فی صد طلب کرنے والے
حاکم اعلیٰ کے لیئے تالیاں بجا بجا کر
گانا چاہتا ہوں
ہے یو ہیو مَنی مور

ملک سے دور ہو جانے والے رہنما کے لیئے
فلمی گانے کی فرمائش ریڈیو پر بھیجنا چاہتا ہوں
آ تا میری جان، میری جان
سنڈے کے سنڈے

یہ گانا تو پرانا ہو گیا
ٹاپ آف دی پاپس کے نمبروں پر
سیرٹ سے جوبی تک
پورے داؤ میں ڈسکو ناچنا چاہتا ہوں
چھا چھا چھا
ایک چھا ادھار دے دے
اس کے بدلے میں سارا یوپی بہار لے لے

میں نگراں حکومت کے لیئے
آیت کریمہ کا ختم کروانا چاہتا ہوں

معزول وزیر کے لیئے
کثیر زرِ مبادلہ سے خریدے گئے
ہیلی کاپٹر میں بھر کر
ذی شان ساحل کی نظمیں
اپنے شہر پر برسانا چاہتا ہوں
کسی مستحق کو
اپنا ووٹ دینا چاہتا ہوں

جو شہریوں کے جان و مال کی ضمانت دے سکے
ایسی حکومت میں سانس لینا چاہتا ہوں

میں اس طرح کی بوگس نظموں سے
چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں

اس طرح کی حرکتیں
سب بند کرنا چاہتا ہوں

ایسے حالات میں
اب میرے لیئے

لکھنا بہت مشکل ہے
اور کچھ نہ لکھنا
اس سے بھی مشکل

آصف فرخی

اگر آپ یہ پڑھ رہے ہیں
تو اس کا مطلب ہے
نظم لکھی جا چکی ہوگی

میرے صیغے گڑبڑ ہو گئے ہیں
یقیناً یہ بھی اسی بحران کا اثر ہوگا
جس طرح میرا یہ نظم لکھنا
اور آپ کا پڑھنا ہوگا

یعنی جب میں اس نظم کو لکھ چکا ہوں گا
اور لکھنے کے بعد
یہ شائع کروائی جا چکی ہوگی
اور چھپنے کے بعد
اسے لوگوں کے ہاتھوں میں آنے کا
موقع مل رہا ہوگا

لیکن جس وقت یہ نظم لکھی جا رہی ہے
یہ مرحلہ دور کی بات ہے
کبھی ایسا بھی ہوگا

اس نظم کا لکھنا مجبوری ہے
اس کا پڑھنا ایک امکان ہے
ایک امکان جس پر دوسرا امکان
اور اس سے اگلا
جیسے ایک اینٹ پر
اگلی اینٹ

ہوا کا مکان
نظموں کا مچان

یہ نظم بھی مستقبل تکلیہ میں لکھی جا سکتی تھی
اگر اس طرح کا صیغہ ہوتا
باقی سب چیزوں کی طرح
کیا ہی اچھا ہوتا
اگر میں نے اسے ماضی تمنائی میں لکھا ہوتا

بحرانوں کی آنکھ کھلنے سے پہلے
یہ بحران
حال میں ہے
ماضی میں ہے
مستقبل میں ہے
شخص اول مفرد میں ہے
شخص دوم میں ہے
شخص سوم میں ہے

قواعد کی رو سے
بس یہ نظم امکان میں ہے

آصف فرخی

آپ نے یقیناً سب کچھ طے کر رکھا ہے
آنے والا ہفتہ کیسے گزرے گا
پھر بھی ہم آپ کی مدد کریں گے
کہ ایسے موڑ اور گھماؤ آپ کے سامنے لائیں
جو دوسری صورت میں رہ جائے
ہمیں یہ یقین نہیں
کہ آپ آنے والے دنوں کے اہم واقعات
ہماری وجہ سے بدل لیں گے
جیسے دندان ساز کے ہاں جانا
بیگم کے والدین کے ہاں جانا
پالتو کتے کو نہلانا
بچوں کو پارک لے جانا
لیکن شاید ان سطروں کو پڑھنے کے بعد
آپ کو زندہ رہنے کے لیئے
کوئی نئی ٹھوس اور معقول وجہ مل جائے

اگر آپ کو اس ہفتے ایک کتاب پڑھنی ہے
ایک البم سننی ہے
ایک ویب سائٹ میں داخل ہونا ہے
ایک ڈریگ کوئین کو دیکھنا ہے
تو ہم بتاتے ہیں
اور ایک نئی ڈش کھانی ہے
تو "کانٹ سے تو" پر رال ٹپکایئے
آپ واقعی
نہیں، نہیں کہہ سکتے
یہ پنج ستارہ ہوٹل کے
ہفت ستارہ مینو میں نیا اضافہ
چوکلیٹ براؤنی میں
ونیلا بھر کر کیا گیا ہے

اور ظاہر ہے
براؤنی نیم گرم ہے
ونیلا یخ، بالکل یخ
یہ پورا ایک خواب ہے، چکھ کر تو دیکھیے
آپ سارا حساب بھول جائیں گے
کیلوریز کا
دھوبی کے کپڑوں کا
شہر میں آج کی لاشوں کا

آپ انکار نہیں کر سکتے
یہ سہولت ابھی تک
صرف کراچی کے لیئے محدود ہے

"احتساب سب سے پہلے!"
نئی تحریک کے سربراہ مطالبہ کرتے ہیں
"بدعنوانی کی سزا موت ہوگی"
بہت جوش میں
انصاف کے ساتھ
موت سب کے لیئے
پھر کیا وہ بھوتوں کے ملک پر
حکومت کرنا چاہتے ہیں؟

آصف فرخی

جناب والا آپ سے مودبانہ گذارش ہے
اس نظم کے کاغذات
جانچ لیں
ان کو درست قرار دے دیں
یہ امیدوار بننا چاہتی ہے
آنے والے الیکشن میں
یعنی اگر کوئی الیکشن آنے والا ہے

آپ اچھی طرح سے دیکھ لیجئے
پورا اطمینان کر لیجئے
اس نظم پر ٹیلی فون، بجلی، گیس کی کوئی رقم
واجب الادا نہیں ہے
یہ تو نظم ہے، محض ایک نظم
اسے یہ سہولتیں میسر ہی نہیں کی گئیں
اس نے جو کچھ استعمال نہیں کیا
اس کا بل بھی باقاعدگی سے ادا کرتی رہی ہے

اس کا نام کسی قرضے کے
نادہندگان کی فہرست میں شامل نہیں
اس لیئے کہ اس نے بینک سے قرضہ نہیں لیا
اس نے انڈسٹری نہیں لگائی
اس نے پرمٹ کے لیئے درخواست نہیں دی
اس نے اسپیشل کوٹا نہیں مانگا
اس نے الاؤنس نہیں کلیم کیا
اس نے وفاداریاں تبدیل نہیں کیں
اس کو موقع نہیں ملا

اپنے ہونے کے سوا
اس نے کچھ نہیں کیا

اب یہ سامنے آگئی ہے
اسے ایک بار آزما کر تو دیکھیے
یہ الیکشن میں لڑنے پر تیار ہے
اور اگر کسی تکنیکی کمی کی وجہ سے
اس کے کاغذات مسترد کر دیے گئے

تب بھی
یہ لڑنا چاہتی ہے
لڑتے رہنا

اس وقت تک
جب آپ صفحہ پلٹ دیں گے
اور یہ نظم اپنی موت آپ مر جائے گی
ایک نظم کی موت
جس کا صفحۂ ہستی
یہ آخری صفحہ ہے
اور اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے

عین تابش

(محمود ایاز کے نام)

ہماری شرط ملاقات بھی سلامت ہے
ابھی تو خیمہ بھی ہے رات بھی سلامت ہے

تو اپنی اپنی زباں ہی میں بات کرتے ہیں
ترا ہنر بھی مری ذات بھی سلامت ہے

ہمیں بھی دعوت نظارہ ہے قبول ابھی
تمہارا شوق مدارات بھی سلامت ہے

ہمارا سر بھی ہے اور نیزہ بلند بھی ہے
غبار موسم آفات بھی سلامت ہے

(شمس الرحمٰن فاروقی کے نام)

اک انتظار ہے باقی ابھی قیامت کا
غبار آنکھ میں بھرنے لگا مسافت کا

کوئی بھی لکھ نہیں پایا یہاں حساب زوال
کہ یہ زمانہ ہے کتنی طویل مدت کا

اتر رہی ہے ملاقات بام مژگاں سے
چراغ جلنے لگا ہے تری محبت کا

عجیب دھند ہے منظر کہیں سے صاف نہیں
سو ہم سے فرق نہ ہوگا وصال و فرقت کا

ترے حوالے سے دنیا بھی یاد آتی ہے
یہ جان و دل کا تعلق بھی ہے ضرورت کا

ہم اپنا نامہ اعمال ساتھ رکھتے ہیں
ہے انتظار ہمیں بھی کسی قیامت کا

یہاں تو سارے بھری چرہ گوالے بستے ہیں
جواب کیسے ملے گا پیام وحشت کا

عین تابش

(عرفان صدیقی کے نام)

رات تاریک سہی زخم بھی تابندہ ہے
عرصۂ رنج نہ ہو ختم کہ ہم زندہ ہیں

تیرے ہاتھوں سے نکل جائیں گے اے عہد رواں
ہم کو پہچان کہ سرمایۂ آئندہ ہیں

صدمۂ ہجر سے رنجور نہیں ہوتا ہے
خم تری زلف طرحدار کے جب زندہ ہیں

شہر کی بھیڑ میں سب ایک ہی جیسے تو نہیں
اس میں کچھ وادیٔ حیرت کے بھی باشندہ ہیں

روز اول سے ہے جاری سفر قصۂ خواب
اور ہم لحظۂ اول ہی سے رقصندہ ہیں

(اسعد بدایونی کے نام)

اپنی رگوں میں رات کا خوں اور چاہیئے
یا کاسۂ سفر میں جنوں اور چاہیئے

اے شام ہجر ہم کو زبوں اور چاہیئے
ان منظروں کے نام فسوں اور چاہیئے

اس مرحلہ میں غیب سے ہوتی رہیں نصرتیں
کشت یقیں کو وہم دروں اور چاہیئے

ہے انتظام دیدہ سو دیوانگی کے ساتھ
مشغول کار پہلے سے ہوں اور چاہیئے

اے شام ہجر روٹھ کے مجھ سے کہیں نہ جا
داروئے وصل بہر سکوں اور چاہیئے

عین تابش

(جون ایلیا کے نام)

تقویم ماہ و سال ترے ساتھ ہم بھی ہیں
اے موسم زوال ترے ساتھ ہم بھی ہیں

اے عہد رفتنی و جہاں گزشتنی
یا صاحب الکمال ترے ساتھ ہم بھی ہیں

ہر چند ہم پہ ہجر کا صدمہ گراں سہی
اے وادیٔ جمال تری ساتھ ہم بھی ہیں

بجھنے لگی ہے آتش آوارگی عمر
اے شہر بے مثال ترے ساتھ ہم بھی ہیں

اے لحظہ لحظہ بجھتی ہوئی شمع انقلاب
اتنا رہے خیال ترے ساتھ ہم بھی ہیں

ہرچند اب نشے کی ضرورت نہیں رہی
صہبائے خط و خال ترے ساتھ ہم بھی ہیں

اے میرے خواب گرچہ اداسی زیادہ ہے
زنبیل تو نکال ترے ساتھ ہم بھی ہیں

(زاہدہ حنا کے نام)

گھر دفن ہوا جس میں وہ گرداب سفر ہے
اک عرصہ جانکاہ ہے اور خواب سفر ہے

اک دل کے علاقے میں ہے اشکوں سے چراغاں
اور سر پہ چمکتا ہوا مہتاب سفر ہے

جو بیت گیا عہد تعلق تھا سو اس بار
لے دے کے جو بچتا ہو سو غرقاب سفر ہے

تخریب تو وہ ہے کہ ٹھکانہ نہیں ملتا
تزئین میں کیا ثانیٔ محراب سفر ہے

اب آنے لگا ہے ہمیں مٹی کا بلاوا
اس کھولتے موسم میں کسے تاب سفر ہے

عین تابش

(اکرام خاور کے نام)

وہی ہے ظلمت شب اور وہی مرا انکار
عجیب کھیل ہے اس میں نہ کوئی جیت نہ ہار

جنوں ہے سر میں اُداسی دل شکستہ پہ
بلائیں موج پہ موج اور ساحلوں کی پکار

وصال و ہجر کے بیچ آنسوؤں کا وقفہ رہے
عزیز من اسے تو جیسے چاہے ویسے گذار

عمارتیں جو زمیں بوس ہو گئیں ان میں
دبی ہوئی ہیں ابھی صبحیں اور شامیں ہزار

وہ کون لوگ تھے ان بستیوں میں رہتے تھے
گیا ہے بے نشاں کر کے انھیں فنا کا غبار

(شاہد انور کے نام)

جنوں کا قصد ہی جب پاک ہم کو کرنا
تو انتظار سحر خاک ہم کو کرنا

ہم ایک آگ کے تودے پہ بیٹھ کر خوش
کچھ اہتمام الم ناک ہم کو کرنا

پھر ایک بار گزرنا تھا کوئے جاناں
پھر اپنا دامن دل چاک ہم کو کرنا

تو پاس آیا تو جاگیر غم لٹا بیٹھے
ترے سلوک کا ادراک ہم کو کرنا

ہم اسکی زلف گرہ گیر میں الجھتے گئے
اگر چہ سہل وہ پیچاک ہم کو کرنا

اسی زمین نے خوشے دیئے تھے گیہوں کے
اسی زمین کو ناپاک ہم کو کرنا

مبین مرزا

[مشرق کے لیے ایک نظم]

ہر نئی صبح کے تابندہ افق
ضوفشانی کا نشاں ہیں تری سماعی سے
کسی آنگن کی کرن ہو کہ کوئی تازہ شفق!
کتنے سورج تری تابندہ و درخشندہ جبیں سے چمکے
کتنے آفاق کی وسعت تری نسبت سے در آئی ہے مرے

خوابوں میں
میرے ادراک کی دُنیا ۔۔ مرے ہونے کا اشارہ تو ہے!
میرے مشرق ۔۔۔!
تو نے بخشا ہے مجھے شوکتِ ہستی کا یقیں
حکمت میں تری پنہاں ہے زمانوں کا شعور
وہ زمانے ۔۔ جنھیں سیراب کیا تھا تری تہذیبوں نے
وقت کو آج تلک مل نہ سکی ان کی مثال!
تیری تہذیب کے اسرار تری زندہ روایات میں پوشیدہ
ہیں
وہ زندہ روایات کہ جن پر دلِ گیتی کو سدا ناز رہا!
جن کی تفہیم سے ہستی کا جمال اور بڑھا!
تیرے باطن سے ابھرتے ہوئے افکار میں دنیائے معانی کا
ظہور
۔۔۔ ایسی دُنیائے معانی جس سے
زندگی کرتی رہی کسبِ شعور!
دشتِ امکاں میں مری خاک نشینی کا حوالہ تو ہے
میرے مشرق مری نسبت سے ہے تابندہ مرے
سارے خیالوں کی جبیں!!

میری توقیر مرے سکھ مرے جذبوں کا شمار
میری رسوائی مرے دکھ مرے صدموں کا حساب!
تیری تاریخ کے اوراق میں لکھا ہے تمام!!
تجھ پہ افشا ہیں مرے ذات کے سارے پہلو
تجھ سے مخفی تو نہیں میرے مقدر کے ستارے ۔۔
مرے مٹھی میں چمکتے جگنو!
میرے ہونٹوں کا تبسم مری آنکھوں کے اشک ۔۔۔!
آب و گل سے ترے پیوستہ ہے اس دل میں نمو کی
خواہش!
میں کہ ہو کر بھی بس اک فرد ۔۔ فقط فرد نہیں ہوں کوئی
کہیں تاریخ کا دھارا کہیں تہذیب کی دنیا ہوں میں!
میں ازل سے ترے اسرار کی دولت کا امیں
مجھ سے روشن تری محرابِ تمنا کا چراغ!
تو افق ہے تو ہوں میں تیری جبیں پر شبِ تاباں کا اُبھرتا
ہوا چاند
میں فقط تجھ سے ہوں مشرق ۔۔ مرے مشرق، مری
دنیا تو ہے!!

لیکن اے ارضِ وفا!
تیری تاریخ کے صفحات اڑے جاتے ہیں
تیری تہذیب کے سب نقش مٹے جاتے ہیں
تیری شاخوں سے سبھی پھول جھڑے جاتے ہیں
تیری قسمت کے ستارے تو بجھے جاتے ہیں

دیکھ میں تجھ سے ہوں ایسے مجھے ناپید نہ کر
وہ حرارت جو لہو میں مرے باقی ہے ابھی سلب نہ کر
وقت کو اتنی بھی سرعت سے گزر جانے کا تو اذن نہ دے
میرے ہونے کی نشانی نہ مٹا
یوں مجھے تند ہواؤں کے حوالے مت کر
ایسی تاریک مسافت پہ نہ بھیج
دیکھ اس طرح مجھے بجھنے نہ دے!
اے مرے مشرق ۔۔۔ مشرق!!

مبین مرزا

[جنگ آزادی ۱۸۵۷ کے بعد ایک مغل زادے کا پہلا مکالمہ]

مونسو، اے دوستو، اے ساتھیو!
ہم سے اب ـــــ
ـــــ احوال عہدِ رفتہ کا پوچھا نہ جائے
اور وہ سب زمزمے ـــــ
جو سازِ جاں میں بجھ گئے ہیں
اب انھیں چھیڑا نہ جائے!
جو شرارے راکھ ہوتے تھے ـــــ وہ کب کے ہو چکے
اور ـــــ وہ جس راکھ کو اڑ کر لہو میں بھیگنا تھا
سرد جسموں کا لہو اس کی کثافت پا چکا
اب کسی جذبے تلے جمتے لہو کا حوصلہ پرکھا نہ جائے!
جن چراغوں کو ہوائے وقت نے اب روند ڈالا
ان چراغوں کی وفا کو شک بھری آنکھوں سے یوں دیکھا نہ جائے!
مدعا اس استعاروں کی زباں میں گفتگو کا بس یہ ہے
ٹوٹ کر جو گر چکا ہے ـــــ
اس ستارے سے فلک کی رفعتوں کا پوچھنا اچھا نہیں
ڈھل چکی ہے جس کی لو اس چاند سے ـــــ
سحر آگیں شب کا منظر مانگنا اچھا نہیں ـــــ!

اے رفیقو!
اے نئی راہوں پہ چلنے والے اچھے دوستو!
ہم سے یہ ہرگز نہ پوچھو ـــــ
کون سے تہذیب کے پالے ہیں ہم!
کس فلک کا چاند ہیں ـــــ کس چاند کے ہالے ہیں ہم!
کون سے محراب میں ہم سے ضیا پاشی ہوئی!! ـــــ
شیوۂ اسلاف کی کوئی کہانی ـــــ
شوکتِ اجداد کی کوئی نشانی ـــــ
تم خدارا ـــــ ہم سے اب بس کچھ نہ پوچھو ـــــ کچھ نہ مانگو
ہاں اگر اب ـــــ پھر ضرورت آپڑی ہے ـــــ
تو غمِ میراث کے ان سارے ناکردہ گناہوں کی ہزیمت سونپ کر
آؤ پھر اک بار اٹھا کر وقت کی میزان میں رکھ دو ہمیں ـــــ!!

ہوا آفاق لکھتی ہے

مبین مرزا

افق جب سرخ ہوتا ہے
پرندے شام کے قدموں کی آہٹ
دور ہی سے جان لیتے ہیں!
سمندر ساحلوں پر آ ٹھہرتے ہیں
مسافر اور مسافت شام کے سائے میں
دو پل رکتے ہیں تو اپنے سب دکھ بھول جاتے ہیں
ہوا آفاق لکھتی ہے!

ہوا اوراق لکھتی ہے
کہ اس کی سرسراہٹ میں
زمین و آسماں کے گنبدوں میں گونجنے والے
صحیفوں کا بیاں ہوتا ہے،
جن میں زندگی اور ماورائے زندگی کا (نیستی کا اور ہستی کا)
وجود اور روح کے رشتوں کا۔۔۔ صبحوں اور شاموں کا
جہانوں اور زمانوں کا۔۔۔ مسافت اور وسعت اور بڑھتے
فاصلوں کا
پاشکستہ آرزو کا، بے کراں دوری کا، موسم اور منظر کا
۔۔۔ سبھی کا بھید لکھا ہے
ہوا کے زرد، بے آواز لہجوں میں!

ہوا نخل ازل پر جھومتی شاخ ابد ہے
جس کے برگ و گل کی پلکوں پر غبار رنگ اور سانسوں
میں خوشبو ہے
جنہیں آتی ہوئی ہر اک نئی ساعت فنا کا خوف دیتی ہے
جو اپنے ہونے کے دُکھ اور نہ ہونے کے الم کی ساعتوں
کے درمیاں
ہر پل لرزتے ہیں، ڈرتے بھی ہیں لیکن پھر بھی پیہم
مسکراتے ہیں
بہار جاوداں کے خواب بنتے ہیں!

ہوا آفاق لکھتی ہے
ہوا آوارگی کا استعارہ ہے
ہوا یہ جانتی ہے، شہر الفت کی گزرگاہوں پہ بکھری گرد میں
تحلیل ہو جانا ہی معراج مسافت ہے
اسے معلوم ہے، ہر اک سفر کی حد اسے ایک اور ہی لمبی
مسافت کا پتا دے گی
مگر وہ جانتی ہے۔۔۔ زندگی چلنے، مسلسل چلتے رہنے سے
ہی قایم ہے
ٹھہرنا موت کے دکھ کی حقیقت ہے

ہوا یہ جانتی ہے اس لیے ہر دم رواں رہتی ہے
ساحل، ریت، گھونگے، سیپیاں، سائے سبھی اس کو بلاتے
ہیں
درختوں، شاخساروں اور پتوں پر اترنے والے موسم
آبشاریں، چاند، جھیلیں، مسکراتے سبز جھرنے
کتنے ہی گل پوش رستے اور دریچے اس کو کہتے ہیں۔۔۔
"ہوا تم چند لمحے تو ہمارے پاس رک جاؤ!"
پہاڑوں کے نگیں دامن سے آتے قہقہوں کا شور۔۔۔
صحراؤں کے آنگن میں لچکتی جھلملاتی دھوپ۔۔۔
شب بھر جاگنے والی نگاہوں میں مہکتی چاندنی
۔۔۔ آکاش، تارے، رنگ، خوشبو
بادباں، موجیں، سمندر۔۔۔
اور افق میں ڈوبتے موہوم منظر۔۔۔ سب اسے آواز دیتے
ہیں
مگر موج ہوا بیتاب ہے۔۔۔ وہ رک نہیں سکتی!
زمانوں اور جہانوں تک بکھر سکتی ہے۔۔۔
لیکن وہ سمٹ جانے سے عاری ہے!
وہ سونے راستوں پر دور تک حرف خس و خاشاک لکھتی
ہے
ہوا اوراق لکھتی ہے

ہوا آفاق لکھتی ہے

مبین مرزا

چاند اترا ہے شب گل کے در یچوں سے پرے
جھیل کے پانی میں ہے عکس نمازرد اداسی
شاخچے بکھرے پڑے ہیں ہر سو ـــــ
جس طرح راکھ ہوا سے یونہی بے سمت بکھر جاتی ہے
جیسے آواز خموشی کی مسافت میں ہر اک زینہ اتر جاتی ہے
ہر طرف پھیلا ہوا ہے شب ہجراں کا ملال ـــــ!
کوئی آواز نہ کوئی آہٹ ـــــــــ
ـــــ کوئی رنگت ہے کسی سمت نہ کوئی خوشبو ـــــ
درد کی اوٹ میں رقصاں ہے قیامت کا ظہور ـــــــ
آرزو ریت کے ذرّوں کی طرح ارزاں ہے!!
کتنی بے نام تمنائیں کہ سانسوں میں ہیں لرزاں پیہم
کتنے بے حرف صحیفے کہ رقم ہوتے ہیں لوح دل پر
کتنے نغموں کا ترنم پتھر
اور ہونٹوں پہ ہوئیں کتنی دعائیں بے اثر
ایک منزل سے گزرتی ہے وفا ہو کہ طلب کی حسرت!!
ایک ہی شاخ کے سینے میں لرزتی ہے دعا ہو کہ نظر کی
خوشبو!
ایک آنگن میں مہکتے ہیں جنوں ہو کہ خرد کا مہتاب
ایک ہی لے پہ چھنک دیتے ہیں ـــــ
ـــــ کوئی گھنگھرو ہو کہ زنجیر کی پائل ـــــ!!

پہ مگر کس کو خبر ـــــ لمحہ فردا کوئی پتھر ہے کہ گل سا
پیکر!
کہ یہ آہٹ وہی آہٹ ہے کہ دستک در ہستی پہ جگاتی ہے
اجل!!

فضا ابن فیضی

منزلیں گو مختلف ہیں، رہ گزر ہے ایک سی
ہو کوئی بھی سمت، رفتار ہے ایک سی

اتنا رنگا رنگ منظر نامہ، حسن ذات کا
اور سب کے پاس، چشم خود نگر ہے ایک سی

اس کے پس منظر سے، اس کا پیش منظر مختلف
ایک صورت، ایک آئینہ، نظر ہے ایک سی

میں سلگتا ہوں، ترے آنگن کا موسم پھول پھول
دھوپ تو، مری تری دیوار پر ہے ایک سی

زندگی میں، مسئلہ ہر شخص کا، اپنا جدا
زندگی لیکن، وبال دوش و سر پہ ایک سی

یہ ہنر میں، زاویے اتنے، کہاں سے آگئے؟
ایک محفل اور تمذعب ہنر ہے ایک سی

تیرے میرے لفظ، حقاً صورتاً کیوں ہیں الگ؟
گفتگو تو سب، بہ الفاظ دگر ہے ایک سی

کیسے نقطے پر، صحافت بھی سمٹ کر آگئی
سارے اخباروں میں، لگتا ہے، خبر ہے ایک سی

کتنے رخنے ہیں پس دیوار و در، کس کو خبر؟
یوں بہ ظاہر، صورت دیوار و در ہے ایک سی

اب کوئی تیشہ بکف ہو، یا ہو آئینہ بہ دست
کل بساط معتبر نا معتبر ہے ایک سی

اتنی سمت آہنگ ہکرب زندگی کی لے فضا
سب کے ہونٹوں پر فغاں مختصر ہے ایک سی

لفظ و معنی کے سوا، سلسلہ رکھا نہ کوئی
ہم نے اور اپنے لیے، راستہ رکھا نہ کوئی

اور ہی کچھ ہے سفر، بے سروسامانی کا
توشہ رخت کجا، مرحلہ رکھا نہ کوئی

میرے ناخن سے یہ الجھے ہوئے عقدے ہیں گواہ
مسئلہ میں نے پس مسئلہ رکھا نہ کوئی

نقد و تجزیہ ماحول، ضروری ٹھہرا
ماجرا ذہن میں، بے جائزہ رکھا نہ کوئی

میں نے اس وقت تلک، آگے بڑھائے نہ قدم
جب تلک پاؤں تلے، حادثہ رکھا نہ کوئی

کب توقع کے مطابق تھا، یہ حالات کا موڑ
بیچ میں تیرے مرے، فاصلہ رکھا نہ کوئی

قید میں چہروں کو، مجھ سے نہیں دیکھا جاتا
اپنے کمرے میں کبھی، آئنہ رکھا نہ کوئی

گو، مری شخصیت اک نقطۂ مرکوز سی ہے
ارد گرد اپنے مگر، دائرہ رکھا نہ کوئی

کاٹ دی عمر، یہی ایک ورق پڑھتے ہوئے
میں نے بجز خود نگری، مشغلہ رکھا نہ کوئی

یہ قلم بھی ہے بہت، کیوں ہو یہ شکوہ یارب!
تو نے ہاتھوں پہ مرے، معجزہ رکھا نہ کوئی

ہے مری وضع انا، سب سے جدا، سب سے الگ
خود سے بھی میں نے فضا! واسطہ رکھا نہ کوئی

قیصر عالم

پچھلے ایک مہینے سے گھر پر ہی تھے
جی، رات کوئی ساڑھے دس بجے
مجھے فون کرلیا ہوتا
وہ تو میں ویسے ہی ملنے آگیا تھا ورنہ....
ضیاء الدین سے پہلے پولیس والوں نے روک لیا
اب کیسے ہیں ؟
آپ ان کے ساتھ ہیں
یہ انجکشن لے آئیں
نہیں نہیں آپ لوگ باہر ہی ٹھہریں
جلدی کرو— میری گاڑی لے جاؤ
سلام علیکم ماموں جان
یہ آپا ثریا کا ہی منجھلا لڑکا ہے نا؟
جیتے رہو
ابا کیسے ہیں؟
میاں کہیں سے ایک گلاس پانی تو لاؤ
زیادہ تر گھر پر ہی رہتے ہیں
ڈاکٹر صاحب آرہے ہیں
آپ نے پوچھا ہی نہیں
تمھاری موٹر سائیکل مل گئی؟
اللہ رحم کرے
ارے بھائی تفضل یہاں کیسے؟
کب؟
لیکن میرا فون تو ٹھیک ہے
ہاں ہاں— ضرور آؤں گا کسی دن
ویسے ڈاکٹر کیا کہتے ہیں
یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی

بھلا بتایئے— چار سو روپے کا ایک انجکشن!
پھر بھی—— حد ہوتی ہے ہر چیز کی
رسید لائے ان کی؟
لایئے— لے آئے؟
ارے تم کیا کروگے اندر جاکر
امی امی
وہ انھیں اندر لے گئے ہیں

سب ٹھیک ہو جائے گا
اچھا تم یہیں بیٹھو میرے پاس
عجیب جگہ ہے، ہوا ہی نہیں آتی
آپ ذرا اسے باہر لے جائیں۔

فون تو کردیا ہے— دیکھیے رات تک پہنچ جائیں گی
ٹھیک نہیں ہو گئے تھے؟
آدمی کو معلوم ہو جاتا ہے
میاں گلی میں ہی ایک شامیانہ لگوادو
جی— ظہر کے بعد لے جائیں گے

جنازہ بالغ ہے
گاڑی کہاں ہے؟
کہاں—؟ سخی حسن؟
آیئے آپ میرے ساتھ آجائیں
بڑے اچھے آدمی تھے
یہ گاڑی کب لی
ذرا سنبھال کے
میں تو زیادہ چلاتا نہیں
ویسے ری سیل ویلیو اچھی ہے
بڑا لڑکا کیا کرتا ہے؟
ماچس ہے آپ کے پاس؟
قادری صاحب نے تو وعدہ کیا ہے
جب سے اٹیک ہوا ہے خاصی کم کردی ہے
ضعیف بھی خاصے ہو گئے تھے
دھوپ تیز ہے یہاں چھاؤں میں کھڑی کردیں
بس تو ابھی پہنچی نہیں!
سنبھال کے— سیدھا رکھیے سیدھا
ارے آپ تو ہٹیے یہاں سے
دیکھیے دیکھیے مٹی اندر گر رہی ہے
سلیب تو مجھے کہیں نظر نہیں آرہے
ویسے جگہ اچھی ملی ہے
لایئے کپڑا مجھے دے دیں

بس صاحب بند کروایئے
برابر کی قبروں پر بھی ڈال دو
جمعہ کو پتہ نہیں گرمی کیوں زیادہ ہوتی ہے؟
صاحب ایک تو میرے یہ پکی قبریں سمجھ میں نہیں
آتیں
آپ کے والد کی قبر بھی تو یہیں ہے نا؟
"نجن بی— متوفی ۷۵ء عمر ۸۵ برس"
شام کو آپ کیا کر رہے ہیں؟

دعا پڑھ لیجئے حضرات
چلیئے رات کو چکر لگا لیجئے گا
سوئم مسجد الفلاح میں ہوگا
یہی ہے نا ان کا بڑا لڑکا؟
خواتین کے لیئے گھر پر انتظام ہے
میں تو ذرا طارق روڈ جاؤں گا
کوئی بات نہیں— بس تو ہے
اور ہاں وہ فائل لیتے آیئے گا
یہ لو سو روپے، قبر کا خیال رکھنا
مل گئی تو ضرور لیتا آؤں گا
یہ یزدانی صاحب بھی خوب ہیں
ارے آپ کہاں تھے— نظر ہی نہیں آئے
کیسے ہیں؟

کہاں؟ کراموبل سے؟
ہاں— مہنگا تو بہت ہے
آپ خیریت سے ہیں؟
اچھا— دادی حضور کو سلام کہیئے گا
صدیقی صاحب— گھر جایئے گا؟
میاں جیتے رہو
ایم بی اے کا امتحان دیا ہے
بس ادھر ہی— الٹے ہاتھ پر
اچھا— کبھی آجایا کرو

قیصر عالم

بہت ہو گیا...

جاؤ جاکر چاند کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دو
ستارے شور مچائیں تو گلا دبا دو
سورج کو لات مار کر کائنات سے باہر پھینک دو

اندھیرا کتے کی طرح بھونکتا رہتا ہے
زہر دے دو سالے کو

روشنی؟ کیسی روشنی؟
تیزاب پھینک دو اس کے لباس پر
پھول اتنا اتراتے کیوں ہیں
تمیز سکھاؤ انھیں
بلندی خود کو سمجھتی کیا ہے
آئینہ دکھاؤ اسے
سمندر کو ساحلوں کے حوالے کر دو
تنہائی کو بہت ناز ہے خود پر
چوراہے پر کوڑے لگاؤ اس کے

ٹھنڈے پانی سے طبیعت بہل جاتی ہے
بکواس --- اس کے چہرے پر گرم چونا مل دو
نیند کو موت کے حوالے کر دو

لیکن

کون ہو تم؟
دنیا ---
کہاں سے آئی ہو
ازل سے ---
کہاں رہتی ہو؟
تمہارے دل میں ---
لیکن ---
آؤ چلیں
کہاں؟
جہاں سب جا رہے ہیں

چلو ٹھیک ہے

بادل آسمان کا آنچل ہیں
رنگ تتلیوں سے بنتے ہیں
پانی دریاؤں کا زیور ہے
پھول دلہن ہیں
صبح ہنستی ہوئی بچی ہے
شام دن کا سنگھار ہے
رات کاجل ہے
خوشبو قافلوں کے ساتھ چلتی ہے
بارش بھی ٹھیک ہے
لیکن ---

ریشم موت سے بنتا ہے

وصل ہجر کی گلی میں رہتا ہے
حال ماضی گروی رکھ لیتا ہے
خوشی اداسی کی شاہراہ پر ملنے والے اجنبی ہیں
امن کے پرندے بارود کی الٹیاں کرتے ہیں
لفظ مجذوب بے بس ہیں
بات کہہ دینے سے ادھوری رہ جاتی ہے

قیصر عالم

جال

ہواؤں کے بادبان پھٹ چکے ہیں
ستارے اندھے ہو چکے ہیں
درختوں کے سرسے چادریں چھین لی گئی ہیں
پتے یتیم ہو گئے ہیں
پھول تھک کر چور ہو چکے ہیں
تتلیاں اپنے رنگ تلاش کر رہی ہیں
خوشبوں نے اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیا ہے

دریا ایڑیاں رگڑ رہے ہیں
سمندر کی پونجی ختم ہو رہی ہے
چاند کو دیمک لگ گئی ہے
پہاڑ بستیوں سے باہر چلے گئے ہیں
کھیتوں نے رقص کرنا چھوڑ دیا ہے
مرغابیاں پتھروں پر بیٹھی ہوئی ہیں
سانپ سڑکوں پر گھوم رہے ہیں
پرندے دھوپ میں بیٹھے ہیں
مکڑی اپنے ہی جال میں
کب کی مر چکی ہے

نظم

پہاڑ ہوا میں تحلیل ہو گئے ہیں
دریاؤں نے نیند کی گولیاں کھالی ہیں
درخت اپنی جڑیں تلاش کر رہے ہیں
پرندوں کے صرف پر اڑ رہے ہیں
سمندر کو سکتہ ہو گیا ہے
رات کاجل کی طرح بہہ گئی ہے
شام کو اب کوئی نہیں روک سکتا
چاندنی میدانوں میں کھو گئی ہے
خاموشی نے صحرا میں خیمے لگا لیے ہیں
آہستہ --- بہت آہستہ
وقت کو شاید کسی کا انتظار ہے

کیا تمہیں معلوم ہے

اندھیرے اور خاموشی میں کیا فرق ہے
بلندی اتنی تنہا کیوں ہوتی ہے
صبح دریا کے پاؤں میں پازیب کیوں باندھ دیتی ہے
زمین کولھو کا بیل کیوں ہے
سورج پلک کیوں نہیں جھپکتا
چاند کیا ہمیشہ کنوارا ہی رہے گا
شام کب تک اکیلی رہے گی
دن سایوں کے پیچھے آخر کیوں پڑا رہتا ہے
رات اتنی بدچلن کیوں ہے
پہاڑ آخر اتنا پردہ کیوں کرتے ہیں
جھیلیں دھرنا دے کر کیوں بیٹھ جاتی ہیں
خوشی کے ہاتھ میں تلوار کیوں ہوتی ہے
اداسی بغیر پوچھے کیوں آجاتی ہے
موت اتنی بھوکی کیوں ہوتی ہے

قیصر عالم

گفتگو موضوع کے بغیر ہی اچھی لگتی ہے

ہوا کو آخر اتنی جلدی کیا ہے؟
درخت بات بات پر ہنسنے لگتے ہیں
دریا، خاموشی اور سانپ
ڈر لگنے لگتا ہے
اکیلا پرندہ پوری جھیل پر چھا جاتا ہے
ایسی بھی کیا ہٹ دھرمی

پہاڑوں کی لاش پر سے گزرنا پڑتا ہے
کتنی بری بات ہے
دریا ہمیشہ راستہ کاٹ دیتے ہیں
مچھلیاں سمندر کی پرائیویسی میں مخل نہیں ہوتیں
جلدی کرو
کہیں چاندنی کی آنکھوں میں ریت نہ بھر جائے
دیئے کی روشنی میں سائے قریب آجاتے ہیں
اچھی بات خوشبو کی طرح ہوتی ہے
زور سے مت بولو
چڑیا ابھی آکر بیٹھی ہے
آنکھیں بند مت کرو
مجھے اندھیرا اچھا لگتا ہے
لفظ کسی کے نہیں ہوتے
گفتگو موضوع کے بغیر ہی اچھی لگتی ہے

نظم

چلو نیت بھی توڑ لیتے ہیں
کیا سب جمع ہو گئے؟
ہاں ـــ ہاں، پہنے رہو
کفن بھی احرام ہی کی طرح ہوتا ہے

سوال جواب شروع ہو گئے؟
یہ خوشبو کیسی ہے؟
وہ آگئے؟
ارے ـــ یہ روشنی کیسی ہے؟
نہالو ـــ نہالو
سب ٹھیک ہو جائے گا
ویسے بھی تم اتنی روشنی لے کر کہاں جاؤ گے؟
اچھا چھوڑ دو
مجھے نماز پڑھنے دو

قیصر عالم

نظم

وقت ہاتھ باندھے کھڑا ہے
کائنات نے اپنا سانس روک رکھا ہے
دیا، آئینہ اور آرائش
خوشبو پھول کے رحل میں رکھ دی جاتی ہے
لفظ اپنے نام دہرانے لگتے ہیں
پہاڑ دوسری طرف دیکھنے لگتے ہیں
زمین گونگی ہو گئی ہے
ارادہ حکم دے چکا ہے
اچھا ۔۔۔ دیکھو

تنہائی، قربت اور بہت کچھ
احساس خاموشی سے درمیان میں آکر بیٹھ جاتا ہے
وقت کائنات کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے گھومنے لگتا ہے
زمین استقبالیہ گیت گانے لگتی ہے
سورج اپنی سرچ لائٹ ادھر ادھر گھمانے لگتا ہے
سمندر اچھل اچھل کر سارے پرندے اڑا دیتا ہے

درخت ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں
دریا بستیوں کے درمیان چہل قدمی کرنے لگتے ہیں
چاند بھی شرارت پر اتر آتا ہے

کوئی فرق نہیں پڑتا

بارش سے پہلے تیز ٹھنڈی ہوائیں
اڑتی ہوئی ساکت چیلیں
اندھیرا، گھٹا اور خاموشی
مسجد کے مینار اور بھی بلند ہو جاتے ہیں

قلابازیاں کھاتے ہوئے سفید کبوتر
باادب درخت
سہمے ہوئے کھمبے
ویران سڑک
گھبرائی ہوئی چڑیا
بادل ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیتے ہیں
بارش نہ بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا

چلو کوئی بات نہیں
کل وقت کے ہاتھ پھر باندھ دیے جائیں گے۔

ہمدم کاشمیری

شہر سے شہر اٹھایا ہم نے
خود کو یوں بہلایا ہم نے

بستی میں اک قتل ہوا اور
گھر میں شور مچایا ہم نے

دیواروں سے سر ٹکرا کر
اپنا سوگ منایا ہم نے

سچ تو یہ ہے روح کا تن کا
دوہرا بوجھ اٹھایا ہم نے

اپنے اپنے تہہ خانوں سے
خود کو ڈھونڈ کے لایا ہم نے

اوڑھا تھا جو رات کہیں پہ
دن کو وہی بچھایا ہم نے

دشت گماں سے شہر یقیں تک
پھولوں کو ملکایا ہم نے

کوئی نہیں تھا اس کے حق میں
ناحق ہاتھ اٹھایا ہم نے

گھر کے سناٹے سے ڈر کر
آنگن میں چلایا ہم نے

لکھا تھا جو اپنی خاطر
'شب خون' میں چھپوایا ہم نے

ہاتھ میرے ہیں ہنر میرا نہیں ہے
ہاں یہ سامان سفر میرا نہیں ہے

پھول پتے چاندنی رنگ اور خوشبو
کیا سر شاخ شجر میرا نہیں ہے؟

دور رہتا ہوں میں آب و خاک سے یوں
کاروبار خشک و تر میرا نہیں ہے

میں یونہی بے کار زد میں آگیا ہوں
عکس کسی کا ہے شرر میرا نہیں ہے

مجھ پر کیوں الزام ہے جادوگری کا
شعر میرے ہیں اثر میرا نہیں ہے

یہ حقیقت ہے کہ میں بے خانماں ہوں
یہ غلط ہے میرا گھر میرا نہیں ہے

ہوتا ہے کون دیکھئے مسمار شہر میں
کس نے کیا ہے عشق کا اظہار شہر میں

لگتا نہیں ہے پھر سوار نصیب ہو
دیکھے ہیں صبح شام کے آثار شہر میں

آؤ کسی سرا میں ٹھہر جائیں رات بھر
آنے لگی ہے شام کی دیوار شہر میں

سوچو تو سانس لینے کا امکان بھی نہیں
دیکھو ہیں زندہ رہنے کے آثار شہر میں

ہر سمت ہے سکوت کا سایہ بچھا ہوا
کیا پوچھتے ہو گرمیٔ بازار شہر میں

کچھ دیر کے لئے ہی سہی یاد کیجئے
رہتے تھے کسی طرح کے طرحدار شہر میں

بلقیس ظفیر الحسن

شمع کی لو لہرائی؟ پتنگا کوئی جلا تھا
پل بھر کو یہ شعلے جیسا کیا بھڑکا تھا

دھن جانی پہچانی سی لگتی ہے اس کی
ہم نے ایسا گیت کبھی پہلے بھی سنا تھا

کیا بیتی، کیا کیا گزری، کیسے جیتے ہیں
ہم تو سب کچھ کہہ دیتے وہ کب سنتا تھا

اپنی انا کا خود بہت کام آیا اپنے
کیسے کاری وار تھے! کوئی سہہ سکتا تھا

شیشے چکنا چور کئے گملے بھی توڑے
سناٹا بے طرح مرا دم گھونٹ رہا تھا

یوں خاصا آراستہ گھر تھا اس کا لیکن
زہریلے پھولوں سے ہر گلدان سجا تھا

ان کی ساری باتیں سچ میری سب جھوٹی
اب اپنے لوگوں سے کیا کہنا سننا تھا

اف اف کرکے، ڈر ڈر کے ہی ڈالا آخر
سچ سچ اب کے زخم نہایت ہی گہرا تھا

ان رنگوں میں ہی تو اس کی جان بنی تھی
تتلی کے پنکھوں کو تم نے کیوں توڑا تھا

سوکھے لب، ویران آنکھیں، کچھ تو بتاؤ
اس سنسان نگر میں اک دل بھی رہتا تھا

آج بہت ہنستی تھیں تم، بلقیس کہو تو
چوٹ پرانی دکھتی تھی یا زخم نیا تھا

کون یہ مجھ میں چھپا مجھ کو پکارے جارہا ہے
ہے تلاش اپنی مجھے یا اور کوئی ڈھونڈتا ہے

پتھروں کے شہر میں رہ کے بھی پتھر کیوں نہیں ہوں
ہے یہ کیا شیشے سا جو دن رات مجھ میں ٹوٹتا ہے

ہے یہ آواز شکست دل کہ سناٹے کی گونجیں
جیسے کوئی سسکیاں لے لے کے روئے جارہا ہے

دور اندھیرے میں وہ اک پل کے لئے کیا جھلملایا
روشنی ہے؟ یا مری نظروں کو دھوکا ہورہا ہے

سر کسی پتھر پہ رکھ کے اک ذرا آرام لے لوں
رات گہری ہو چلی ہے اور بیہڑ راستہ ہے

اس ہجوم یاس میں بلقیس خود کو کھو نہ بیٹھوں
بھیڑ بڑھتی جارہی ہے دل بہت گھبرا رہا ہے

بلقیس ظفیر الحسن

۱

کوئی آہٹ، کوئی سرگوشی، صدا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک بے حس خموشی کے سوا کچھ بھی نہیں

نام اک نایاب سا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا
اب ہتھیلی پر لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں

بے چھوئے اک لمس کا احساس اک خاموش بات
اس کے میرے بیچ آخر تھا بھی کیا، کچھ بھی نہیں

خاک پہلے اڑ رہی تھی، راکھ کا اب ڈھیر ہے
تھا یہاں پہلے بھی آخر کیا دھرا، کچھ بھی نہیں

تو کہاں ہے دور مجھ سے اے رگِ جاں سے قریب
بس نظر کی دوریاں ہیں، فاصلا کچھ بھی نہیں

زخمِ دل کو سنگ و دشنام و ملامت چاہیے
بے نمک ہو تو تڑپنے میں مزا کچھ بھی نہیں

دوستی کیسی، وفا کیسی، تکلف بر طرف
آپ کچھ بھی ہوں، مگر کیا دوسرا کچھ بھی نہیں

دیکھنا یہ ہے کہ ملنے کس سے پہلے کون آئے
میرے گھر سے اس کے گھر کا فاصلا کچھ بھی نہیں

جانے کب بلقیس ہوگا ختم یہ جلتا سفر
دھوپ کے صحرا میں چھالوں کے سوا کچھ بھی نہیں

فسوں زدہ ہیں فضائیں، منظر تمام مسحور سے پڑے ہیں
سیاہ جادو یہ نیم شب کا ستارے جھک جھک کے دیکھتے ہیں

سحر کی لو میں جلا رہی ہے ہوا کنول رنگ و بو میں ڈوبے
درخت سارے، سجائے موتی کی تھالیاں صف بہ صف کھڑے ہیں

ہزار راتیں گزر گئیں ہاں ہمارے غم کی نہ رات گزری
یہ کدے سے ہمارے دن کے اجالے خائف گزر گئے ہیں

خود اپنی خواہش پہ جان دینے کا نام رکھا ہے عشق و الفت
ہوا ہوس نے یہ خود فریبی کے جال کیا دلنشیں بنے ہیں

ہزار دیں دستکیں مگر وہ تو ایک خالی مکان نکلا
لہو چکاں ہاتھ کرنے البتہ چند شیشے چج گئے ہیں

حقیقتیں یوں نہیں بدلتیں بخوبی معلوم ہے ہمیں بھی
فرار پانے کو خود سے کچھ خواب زار پھر بھی بنا لئے ہیں

ہے آگے دریا تو پیچھے کھائی، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن
بتاؤ بلقیس اب کریں کیا، یہ کس جگہ آ کے ہم کھڑے ہیں

ن،م ہوا قش

لوک سے ہوئے اک عجب بے کلی آسماں زرد ہے
جانے کیا ہو یہ کل دیکھیے گا ابھی آسماں زرد ہے

سرخ پھولوں کی خواہش میں تھک ہار کے اپنی جاں وار کے
لوٹ آئے ہیں زخمی پرندے سبھی آسماں زرد ہے

دل کے پاتال میں اک سیہ رات کا قبضہ جاوداں
سر پہ سورج کی خوابیدہ کھڑکی کھلی آسماں زرد ہے

رات کی گود میں ماہتاب جہاں کی سڑی لاش ہے
وقت کی بانسوں میں مردہ سیاہ روشنی آسماں زرد ہے

چاند کے پاؤں میں خواب کی بیڑیاں چھنچھناتی ہوئی
سرد آنکھوں میں کالی گھنی چاندنی آسماں زرد ہے

اپنے خون اور خوابوں کے رنگوں سے غم کی سیاہ رات میں
دل کی دیوار پہ ہم بھی لکھتے کبھی آسماں زرد ہے

ایک زنجیر سی خواب اور خاک کی اس کے پاؤں میں تھی
آسماں دیکھ کے رو پڑا اجنبی آسماں زرد ہے

خیال و خواب میں ہوتا صدائے یاد میں رہتا
کسی کی آس میں جیتا کسی کی یاد میں رہتا

پر اسراری عجب سی ہے گھری ویران آنکھوں میں
مجھے بھی راس آیا خانہ برباد میں رہتا

محبت ایک بحر بے کراں ہے اور محبت میں
کہیں پہ قید ہوتا ہے دل آزاد میں رہتا

کسی کی یاد ہے ابھی ہوئی سانسوں کی ڈوری سے
کسی کے ہجر میں ہے عرصہ فریاد میں رہتا

تو پھر ہجر و وصال و رنج و غم سارے اضافی ہیں
جو حاصل ہے وفا کو عشق کی بنیاد میں رہتا

جفا کی ایک سی رسمیں ہی انساں کا مقدر ہیں
کسی کوفہ میں جیتا ہو یا کہ بغداد میں رہتا

ن۔ م۔ دانش

جنگل ہے اس جنگل میں ناچ رہے ہیں ننگے قتل پھول
منظر ہے جس منظر میں قید ہوئے ہیں ننگے قتل پھول

عالم ہے جسے آنکھ میں جلتی بجھتی خوابوں کی قندیل
وحشت ہے جس میں سارے نقش مٹے ہیں ننگے قتل پھول

خاموشی ہے روح کے سناٹے میں جلتی دھوپ کا راج
ویرانی ہے سب معدوم ہوئے ہیں ننگے قتل پھول

دنیا وہ جس دنیا کی لہروں سے تھی خوشبوؤں کی تقسیم
دنیا یہ جس میں سارے ڈوب گئے ہیں ننگے قتل پھول

تنہائی ہے رات کی بانہوں میں ہو ہنگامے کی لاش
تاریکی ہے سارے دیپ بجھے ہیں ننگے قتل پھول

محرومی ہے ہارے لشکر کا ہو تنہا ایک سوار
سناٹا ہے سارے قتل ہوئے ہیں ننگے قتل پھول

اے دانش کون سا ایسا جرم ہوا تھا جس کا دیا خراج
گھر کی ساری پونجی چھین گئے ہیں ننگے قتل پھول

بکھرے تھے ابر کھل کر پھول ہے
کھڑے تھے لوگ چھت پہ پھول ہے

یہ کیسے موسموں کا ہے تسلط
اجڑ جاتے ہیں منظر پھول ہے

تھا وہ شہر نگاراں روشنی کا
کہیں خوشبو کے تھے گھر پھول ہے

وہاں اب کوئی بھی رہتا نہیں ہے
جہاں تھے لوگ اکثر پھول ہے

پرانی راکھ اڑتی پھر رہی ہے
نئے بام و چھت و در پھول ہے

لیے تعبیر کی حسرت جلو میں
جلے ہیں خواب شب بھر پھول ہے

یہ دھرتی سرخ پھولوں سے بنی ہے
سجے ہیں دار پہ سر پھول ہے

رفیق راز

دریا دریا رواں دواں ہے میری سوچ
کسی کے روکے رکتی کہاں ہے میری سوچ

لفظوں میں ہر سوچ بہت بوسیدہ لگے
میری چپ میں ابھی جواں ہے میری سوچ

فصل گل خاموشی کٹنے والی ہے
اٹھتی ہوئی سی موج سناں ہے میری سوچ

تو تو اپنی ذات میں گم ہے اپنی چھوڑ
مجھ میں اک محشر کا سماں ہے میری سوچ

حرف و صدا پہ آن پڑا ہے کیسا وقت
میری سوچ پہ نوحہ کناں ہے میری سوچ

چاروں اور کے منظر شعلہ ہیں
بیچ میں گم صم دھواں ہے میری سوچ

ہرے بھرے یہ پیڑ ستارے دشت و جبل
لگتا ہے یہ سارا جہاں ہے میری سوچ

شمس الرحمٰن فاروقی کے نام

زخم احساس کو کچھ اور ہرا ہونے دے
برگ آواز کو موسم کی دعا ہونے دے

اب کسی پیڑ پہ پتے نہیں لگتے اچھے
میں صبا ہوں مجھے سفاک ہوا ہونے دے

لفظ و معنی کے شفق رنگ سمندر ہی اتار
جوئے افکار کو سیلاب بلا ہونے دے

خانۂ غم میں سسکتی ہوئی خاموشی کو
رات کے پچھلے پہر نغمہ سرا ہونے دے

ـــ خلل اور سراسمہ سیہ خاک میں ڈال
ف نادیدہ نواح دل بے باک میں ڈال

ہ نہیں ساتھ بجز تیرگی فکر نا
پنے ہونے کا شرر ہی رہ ادراک میں ڈال

ں کہ روشن ہوں یہ ظلمت زدہ اطراف وجود
تے جاتے شرر ایسا خس و خاشاک میں ڈال

ے خموشی میں شرابور معانی کی مہک
ر تاثیر مرے نغمہ سفاک میں ڈال

ت کے پیچھے پھر ہی یہ کرامت ہو جائے
لہ خواب مرے دیدۂ نمناک میں ڈال

رفیق راز

اپنا ہی کوئی درپئے آزار مجھ میں ہے
مجھ سے ہی کوئی برسر پیکار مجھ میں ہے

میرا ضمیر ہے کہ تری یاد کی رمق
برسوں سے اک ستارۂ بیدار مجھ میں ہے

وحشت بدن میں شور ہے ایسا مچا ہوا
جیسے قدیم مصر کا بازار مجھ میں ہے

آہنگ لاشریک لہ ، ہر نفس میں ہے
جوبن پہ ایک موسم اسرار مجھ میں ہے

سیلاب ہفت رنگ مری خامشی میں ہے
سہمے ہوئے سکوت کی جھنکار مجھ میں ہے

راہی فدائی

دام ہوس میں قید قلندر ہیں، بوالعجب
دن کے فقیر، شب کے سکندر ہیں، بوالعجب

جن کی تہوں میں .درِ علش کی کمی نہیں،
عرفان و علم کے وہ سمندر ہیں، بوالعجب

اخلاق کی سند بھی چبا کر نگل گئے!
کتنے ذہین آج کے بندر ہیں، بوالعجب

فطرت میں جھول آگیا، منظر بدل گئے
ملی کے ساتھ موش مچھندر ہیں، بوالعجب

دریائے آتش میں سمک خوش خرام ہیں
برف۔ آب میں حیات سمندر ہیں، بوالعجب

صدہا جہاز نفس کناروں پہ لٹ گئے
طوفان کی زد میں قلب کے بندر ہیں، بوالعجب

تن پر تلاش اُن کی یقیناً فضول ہے
سرخ و سپید ذات کے اندر ہیں، بوالعجب

زیروزبر ہوئے ہیں مقامات آگہی
سرسبز ڈالیوں پہ چقندر ہیں، بوالعجب

راہی ہمارے سجدوں میں کوئی نہیں شریک
کیوں؟ مسجدوں کے قلب میں مندر نہیں، بوالعجب

شاہد اختر

صدائے موج ہنر جاگتی بہت ہوگی
اسے بھی میری طرح آگہی بہت ہوگی

ابھی تو خیر سے میں اپنے راستے پر ہوں
وہ ہمسفر ہے تو پھر کج روی بہت ہوگی

ترے لئے نہ سہی تیری وضع داری پر
قدم قدم پہ یہاں خودکشی بہت ہوگی

دلوں کے داغ ابھی تک ہیں بے طرح محفوظ
چراغ ہے تو میاں روشنی بہت ہوگی

ابھی تو یار بھی زندہ ہے اور صحبت بھی
حیات باقی ہے تو پھر دشمنی بہت ہوگی

رواروی میں بھی ملتا ہے اک شان سے وہ
میں جانتا ہوں اسے بد دلی بہت ہوگی

برہنہ دھوپ ہر اک رہگزر کو چاٹتی ہے
سفر میں اب کے برس رہزنی بہت ہوگی

"گل امید نہ سرسبز کوئی برگ امید"
نواح چشم میں بے منظری بہت ہوگی

ملال کیا ہے کہ اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں
دلوں کے بیچ ابھی کھلبلی بہت ہوگی

• شب خون برابر مل رہا ہے۔ خوب سے خوب تر ہوتا جارہا ہے۔ امید ہے کہ یہ معیار قائم رہے گا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں آپ کی درسی ذمہ داری کا اثر پرچہ پر نہ پڑے لیکن ساقی فاروقی نے بتایا کہ آپ مستقلاً دہلی میں نہ رہیں گے بلکہ مہینے میں ایک آدھ بار جاکر اپنے حسب دلخواہ موضوع پر لکچر کر لوٹ آیا کریں گے۔ اس خبر سے یک گونہ اطمینان ہوا۔ کل کوئی کہہ رہا تھا کہ آپ اپنے خلاف اپنے رسالہ میں خطوط اس لئے شائع کرتے ہیں کہ اپنی ذات کے اندر آپ جتنا بڑھنا تھا بڑھ چکے۔ اب اپنے مخالفین کو سر پر بٹھا کر آپ اپنا قد اونچا کر رہے ہیں۔ دیکھئے لوگوں کو کسی کروٹ چین نہیں۔

مڈل سکس (انگلستان) — مصطفےٰ شہاب

• میرا خیال ہے کہ ادب میں تبدیلی ارتقائی اور فطری ہوتی ہے، اب رہا کسی رجحان اور تحریک کو نام دینے کا کا معاملہ تو وہ نقادان کرام اور دانشوران ادب کا کام ہے۔ فنکار تو بس اپنے ضمیر کی روشنی میں اپنے فن کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ مثلاً آپ دیکھیں کہ ادب میں سیاسی ناوابستگی کی بات اب بھی موجود ہے، فنکار تو اپنی ذات سے ہی وابستہ رہے گا اور سماجی معنویت کی بات کل بھی کہی گئی تھی اور آئندہ بھی کہی جائے گی۔

ساجد رشید کے رسالے پر چودھری ابن النصیر کا تبصرہ معنی خیز ہے، ایسا لگتا ہے کہ اب بعض لوگ جدیدیت کے خلاف ہو گئے ہیں ان میں اپنی اپنی ضرورتیں اور اپنے اپنے غصے کار فرما ہیں۔ سمجھدار لوگ تو بس اپنا کام کرتے رہتے ہیں، انجام سے بے خطر اپنی ذات پر اعتماد، اپنے کام پر ایمان اور اپنے قول پر وقار، ایسی ہی شخصیتیں عہد ساز اور انجمن ساز ہوتی ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی مثال سامنے ہے۔

گلبرگہ — حمید سہروردی

• شب خون کے ہر صفحے پر آپ کی انفرادیت کی چھاپ نمایاں ہے۔ میں حتی المقدور پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش بھی کرتا ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ میری تمام تر ذہنی نشوونما غزل کے کلاسیکی بلکہ روایتی ماحول میں ہوئی، تقسیم کے وقت میں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ایم۔ اے کا طالب العلم تھا۔ جدید ادب اور بالخصوص جدید شاعری میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں وہ وقت کے تقاضے کے مطابق ایک فطری عمل تھا۔ آپ کے رسالے میں بہت سی باتیں اچھی ہیں لیکن بہت سی باتیں مجھے نامناسب بھی لگیں کہ مقصد صرف تبدیلی پیدا کرنا ہی نہیں بلکہ تبدیلی کے جمالیاتی پہلو کو بھی پیش نظر رکھنا ہے۔ بہر صورت اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ جس لگن اور جانفشانی سے اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں وہ آپ کا اور صرف آپ کا حصہ ہے۔

جھانسی — اندر موہن کیف

• اقبال مجید کا ناولٹ "تیر اور اُسکا تج" پڑھ کر دماغ کھوم گیا اور دل پر ایسا اثر ایکبار پہلے صرف شیام بینیگل کی فلم "تشانت" (مختلف واقعاتی تناظر کے ساتھ) دیکھ کر ہی پڑا تھا۔ ہم لوگ تو پاکستان بنا کر اپنے ہی کچھ خاص رنگوں میں نہا رہے ہیں لیکن کیا ہندوستان میں مسلمانوں کے ان پڑھ، پسماندہ طبقوں کا واقعی کوئی مستقبل نہیں؟

ریاض — کاوش عباسی

• آپ نے میرے تعارف میں جو جملہ لکھا ہے اس میں بہت دیر تک کھسیا کر ہنستا رہا۔ بھائی میں صرف اپنی بیوی کی مدد ہی نہیں کر رہا ہوں، اپنے کام بھی خاموشی سے کئے جارہا ہوں۔

ابھی نومبر ۱۹۹۶ میں میری کتاب Incidence of Divorce Among Indian Muslims شائع ہوئی ہے۔ شاید یہ واشنگٹن اور کوالالمپور سے (دونوں جگہ سے الگ الگ) بھی شائع ہو۔ یہ کتاب خاصی ضخیم ہے اور Objective Empirical Study ہے۔ اس پر مصنف کا نام ابن فرید نہیں M.M.Siddiqi لکھا ہوا ہے۔ دوسری کتاب Sociology in Islam ic Perspective پریس جاچکی ہے۔

میرے تنقیدی مضامین کا تیسرا مجموعہ "صوابدید" اور چوتھا مجموعہ "ادب داد طلب"، افسانوں کا دوسرا مجموعہ "میں کا تعاقب" اور تیسرا مجموعہ "خون آشام" کتابت شدہ تیار رکھے ہیں۔ سرمایہ کا انتظام ہو تو شائع کراؤں، ورنہ ـــــ

جذبی صاحب پر کتاب "اعتراف جذبی" اب شروع کر رہا ہوں۔ ناول "گم گشتہ" تقریباً نصف مکمل ہو چکا ہے۔ Islamic Social System Concepts and Features کے پروف دیکھ رہا ہوں۔ کچھ اور کام ہیں جو بالکل ابتدائی مراحل میں ہیں اس لئے ان کا ذکر نہیں کر رہا ہوں۔

رام پور — ابن فرید

• اس بزم میں، جو میرا تعارف آپ نے درج فرمایا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ میں ایک پرائیویٹ پوسٹ گریجویٹ کالج سے منسلک رہا تھا۔ یہ کالج پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ سے Affiliated ہے۔ ڈگری اور آنرز کلاسز کو انگریزی زبان وادب پڑھاتا رہا ہوں، کچھ تصانیف نظم و نثر کی اُردو میں اور ایک انگریزی میں تقابلی تنقید کی منظر عام پر آچکی ہیں۔ کم از کم دو اور کتابیں زیر ترتیب ہیں۔ ایک انگریزی میں اور ایک اُردو میں۔

کھنہ — پیارے لعل رتن

• "شب خون" ۲۰۵ نظر نواز ہوا۔ محمود ایاز کی نظم "اسپتال کا کمرہ" اس شمارے کی خاص چیز ہے۔ حالانکہ یہ نظم تقریباً ۳۰ سال پرانی ہے مگر شب

خون میں پڑھ کر ایسا لگا کہ جیسے محمود ایاز مرحوم نے یہ نظم اپنی عمر کے آخری حصے میں کہی ہو۔ محمود ایاز کی رحلت سے اُردو ادب اور ادبی صحافت کی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا فی الحال پورا ہونا ممکن نہیں۔ موصوف نہ صرف ایک اچھے ادیب و شاعر تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ ان کی خدمات ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔ خدا ان کی روح کو ابدی سکون عطا فرمائے۔ میری رائے میں آپ کو ان پر ایک مکمل نمبر شائع کرنا چاہئے۔ تاکہ عام قاری بھی ان کی شخصیت سے واقف ہو۔ ساقی فاروقی کی نظم "نوحہ" اور اس پر حامدی کاشمیری صاحب کا تبصرہ بھی خوب ہے۔ آپ کی دونوں تحریروں "دست خود دہان خود" اور "میں کون ہوں اے ہم نفسان" پڑھ کر لطف آیا۔

بنارس جاوید انور

● سوچا تھا اب کی مرتبہ بنگلور جاؤں گا تو محمود ایاز صاحب سے ضرور ملوں گا اور ان سے خوب جھگڑا کروں گا کہ میرے افسانے اور نظمیں چھاپنے سے کیوں ڈرتے ہو۔؟ پچھلے خط میں تو انہوں نے صاف لکھا کہ تمہاری یہ نظمیں "سوغات" میں نہ چھاپوں گا۔" لیکن اب محمود ایاز صاحب سے کہاں ملوں۔ جھگڑا کیا کروں۔

"شب خون" ۲۰۵ میں "اسپتال کا کمرہ" پہلی بار پڑھا گمان ہوا کہ نئی نظم ہوگی۔ مگر اسی شمارے کے آخری صفحہ پر ان کی موت کی خبر جہاں دل کو لرزا گئی وہیں تیس سال سے بھی زیادہ پرانی نظم ہمارے لئے نئی سوغات بنی۔

بیجاپور احمد عارف

● شمارہ ۲۰۵ کے اداریہ میں آپ نے قوسین میں یہ جو لکھا ہے (لہذا یہ فرض کرنا کہ مابعد جدید پروگرام میں ادیب کو مکمل آزادی حاصل ہوگی کہ وہ اپنی بات بے کھٹکے کہہ سکے غلط ہے) تو میرا بھی خیال یہ ہے کہ مابعد جدیدیت مکمل سپردگی چاہتی ہے جو ایک طرح کی ذہنی اور ادبی غلامی کے مترادف ہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت میں کم از کم ایسی آمریت نہیں تھی۔ مختلف ناموں سے ریت کا قطب مینار بنانے کی کوشش بھی اس دور میں کبھی نہیں ہوئی۔ آج بہت سے لوگ شہرت اور سیمیناروں کی چکاچوند اور آرام و آسائش میں گم ہوتے جا رہے ہیں۔ چاہے ان کے اپنے نظریات کچھ بھی ہوں۔ وہ حق بات کہنے سے گریز کرتے ہیں۔

"دست خود دہان خود" والا مضمون شعری کیفیت کا حامل ہے اور آپ کے انداز فکر کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ عبد اللہ کمال کی نظم ناشی پسند آئی۔ مگر غزل کا یہ مصرعہ۔ "میں نے جی سے غزل لکھا کیا ہے" عجیب سا لگا۔ جمیل الرحمٰن کی غزلیں تازہ اور جاندار ہیں۔ عذرا عباس کی نظمیں ادھر پڑھیں۔ کیا ہماری نظم کی صنف ناکارہ ہو گئی ہے کہ اسمیں وہ سب کچھ ادا نہیں ہو سکتا جو شاعر کہنا چاہتا ہے؟ نثری نظم کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ یا تو شعری نثر کہئے یا پھر نثر کہئے۔ نظم کے اپنے کچھ حدود ہیں۔ انکی کچھ نظمیں جنس کے گرد گھومتی ہیں۔ جنس بری چیز نہیں ہے مگر کہنے کا سلیقہ چاہئے۔ میں تو نثری نظموں کو مختصر افسانچے سمجھ کر پڑھتا ہوں اسمیں ابھی تک اچھی اور متاثر کرنے والی شاعری پیدا نہیں ہوئی ہے۔ جینڈ با سچ بہت دنوں تک ادب میں ساتھ نہیں دیتے۔

انعام تو دولت کے بل بوتے پر حاصل کیا جا سکتا ہے مگر "سرسوتی سمان" کا ملنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ سرسوتی ندی جسے چھو کر گزری وہ وودان ہو جاتا ہے۔

دہلی امیر عارفی

● شبخون کی عجب شان ہے کہ ہر پرچے میں کچھ ایسی بات ضرور ہوتی ہے جس پر بحث اور تنقید گرم رہتی ہے۔ سو پڑھنے سے محرومی شاق گذرتی ہے۔

لورانٹو ضمیر احمد

● شمارہ ۲۰۶ باصرہ نواز ہوا۔ اس مرتبہ ایک بھی غزل شائع نہیں ہوئی۔ کچھ افسانے اچھے لگے۔ "اخبار و افکار" میں یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ جناب علی سردار جعفری کو "سنت گیا نیشور ایوارڈ" سے نوازا گیا جسکے لئے انہیں مبارکباد۔

سناود عاقل نظامی

● محمد صلاح الدین پرویز کی "چوبیس گھنٹوں کے واقعات" سیریز کی جو نظمیں ہیں انہیں پڑھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ نظموں کے بجائے انہیں کے افسانچے پڑھ رہا ہوں مگر پھر خیال آتا ہے کہ وہ تو شاعر ہیں! لیکن "سفر کیلئے نظمیں" اور "یاد کیلئے دو نظمیں" سیریز کی تمام نظمیں ٹھیک لگیں "سفر کیلئے نظمیں" کے تحت جو نظمیں ہیں وہ غیر معمولی طرز تخلیق کی عکاس ہیں۔ عذرا عباس نے نثری نظم کے حوالے سے پاکستان کے چند معروف نظم نگاروں میں اپنی شناخت مضبوط کرلی ہے۔ فاروقی صاحب کی تحریریں "دست خود دہان خود" اور "میں کون ہوں اے ہم نفساں" بڑی دلچسپی سے پڑھیں۔ اپنے بارے میں کچھ بھی لکھنا بڑا دشوار کام ہے۔ فاروقی صاحب نے الگ الگ تحریروں میں اپنے فن و ذات کے تعلق سے جو لکھا ہے وہ ساری کی ساری باتیں قاری کو اس دنیا سے الگ الگ عجیب دنیا کی سیر کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔

آپنے فرمایا ہے کہ غلام حسین ساجد غزلوں کے نئے رجحانات کے حوالے سے کام کر رہے ہیں۔ غلام حسین ساجد دل گداز اور بڑے پیارے شاعر ہیں وہ یقینا عمدہ کام کریں گے۔

سستی پور نثار احمد نثار

● مرزا حامد بیگ کے مضمون کا بیشتر حصہ پڑھ چکا ہوں۔ مصطفیٰ کریم صاحب کا "برگد کا پیڑ" بھی پڑھ لیا ہے افسانہ آخر میں علامتی ہو گیا ہے۔ اسی عنوان اور مرکزی خیال پر مبنی میری ایک نظم بھی ہے جو دس پندرہ سال پہلے "ہماری زبان" میں چھپ چکی ہے۔ شمارہ ۲۰۵ میں محمد صلاح الدین پرویز کی نظمیں مجھے بے حد پسند آئیں۔ دوسری نظمیں اور غزلیں، مضامین اور افسانے

بھی اپنے دامن میں معانی کی کچھ نئی چنگاریاں سمیٹے ہوئے نظر آئے۔ آپ کا مضمون ہمیشہ اردو والوں کے لئے کچھ نہ کچھ نیا موضوع یا نئی فکر لے کر "شب خون" کے صفحات پر جگمگاتا ہے اور بار بار پڑھنے اور اپنے پاس محفوظ رکھنے کی چیز رہا ہے۔ شمارہ نمبر ۲۰۵ میں آپ نے اپنے ادبی سفر کی ایک مختصر روداد پیش کی ہے لیکن نئے انداز میں اس طرح پیش کی کہ جدید فکر و فن کے ادیب و شاعر کی اپنی روداد بھی بن سکتی ہے۔ عذرا عباس کی روداد بھی پر کشش اور پر مغز ہے۔

شمارہ نمبر ۲۰۳ میں "اقبال مجید" کا ناولٹ "تیر الور اس کا بچ" جو طوالت کے لحاظ سے بھلے ہی ناولٹ ہے مگر تاثر کے لحاظ سے ضخیم ترین ناول پر بھاری ہے۔ اس قماش کا ایک ضخیم ناول شوکت صدیقی کا "خدا کی بستی" ہے لیکن وہ بھی اس کے سامنے چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔

اعظم گڈھ — اشفاق احمد اعظمی

• شمارہ ۲۰۵ نظر نواز ہوا۔ نہایت دیدہ ذیب اور بصیرت افروز ہے۔ کیا شعر کیا نظم، تمام جگر جگر ہو رہا ہے ہیرے چمک رہے ہیں۔ سب سے پہلے "دست خود وہان خود" اور "میں کون ہوں اے ہم نفساں" پڑھا۔ کیوں کہ فاروقی کو سمجھنے کے لئے فاروقی کی اپنی کوشش ہم پر کیا منکشف کرنے جا رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ فاروقی کی شاعری کو فاروقی کی مدد کے بغیر سمجھنا بہت مشکل ہے۔ "آسماں محراب" کو بار بار پڑھا ہے اور ہر بار علم و ہنر کا وارداتی سطح پر پہنچا ہوا شعری اوراک میں گھلا ملا جادوئی اثر احساس پر نئی طرح سے طاری ہوا۔ جدت اظہار اور جدت فکر کا جو نمونہ ان کے کلام میں ملتا ہے، اسکے بارے میں بلقیس بیچاری کیا کہہ سکتی ہے۔ ناطقہ سر بگریباں، ہے۔ مگر اتنا تو کہہ ہی سکتی ہوں کہ زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے۔ عذرا عباس کا شاعری کے بارے میں اظہار خیال خوب ہے کہ شاعری عورت ہے جو تخلیق کرتی ہے اور زندگی سے تخلیق ہوتی ہے، شاعری کی مکمل اور جامع تعریف اس سے بہتر کی ہی نہیں جا سکتی۔ ظفر اقبال، غلام حسین ساجد، انور شعور، عبداللہ کمال اور محمد اعظم کا کلام متاثر کرتا ہے۔ افسانوں میں مجھے حسن منظر اور مصطفےٰ کریم کی کہانیاں بہت اچھی لگیں۔

دہلی — بلقیس ظفر الحسن

• فروری کے شمارے میں اقبال مجید کا ناولٹ "تیر الور اسکا بچ" بہت عمدہ تخلیق ہے۔ تمام واقعات میں منطقی تسلسل ہے۔ ہر کردار منفرد، زندگی سے بھرپور اور پورا ناولٹ وہ حقیقت ہے جسے قبول کرنے میں ذرا جھجھک نہیں ہوتی۔ دانشور جنھوں نے فکری سطح پر خود کو زندہ رکھا ہے اور جو اس طرح ہندوستانی تہذیب کو مالا مال کر رہے ہیں ان کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔ فروری کے شمارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کا مضمون بھی بہت اچھا ہے، ایسے مضامین کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔

اسکاربرو — مصطفیٰ کریم

• شمارہ نمبر ۲۰۴ میں کنور سین کا افسانہ "رتنا اور راشد" پڑھنے کا موقع ملا۔ کنور سین نے اس بے مثال تخلیق میں چاچا نو نہریا جیسا معصوم لیکن با قوت کردار پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی سنگین، خونچکاں اور ہیجان خیز معاملے کو کسی شور و شر کے بغیر اپنے منفرد اسلوب میں بن کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اس دور کے اہم ترین افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔

دہلی — کاوش پرتاپ گڈھی

• شمارہ نمبر ۲۰۵ موصول ہوا۔ آپکے دو مضمون "شب خون" کے صفحات کی زینت بنے ہیں انھیں پڑھ کر ذہن کو تازگی ملی۔ نثری حصے کے ساتھ غزلیں نظمیں ہمیشہ کی طرح معیاری ہیں۔ غزلوں میں جناب انور شعور کی گیارہ غزلیں ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک ہے جتنی تعریف کی جائے کم ہے مگر پہلی غزل کے شعر نمبر ۲ پر غور کیجئے کہ اس میں گجروں کی بات ہے تو پھولوں کے ساتھ خاروں کی کیا ضرورت ہے۔ غزل نمبر ۳ کے شعر نمبر ۶ کا ثانی مصرع بحر سے خارج ہو کر ناموزوں ہو گیا ہے۔ اسکی تقطیع درج ذیل ہے۔ :

موزوں۔ عبور کر نہ سکے ہم حدیں ہی ایسی تھیں۔

مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن

ناموزوں۔ وہ گھر ہی ایسے تھے وہ سڑکیں ہی ایسی تھیں۔ط

مفاعلن فعلاتن مفعلن فعلن

غزل نمبر ۵ کا مطلع بالکل ہی بے جان ہے تو اسی غزل کا شعر نمبر ۳ بہت جاندار ہے اور آخری شعر (مقطع سے پہلے کا) میر کے تخاطب اور لب و لہجے کی مہک بکھر رہا ہے۔ ظفر اقبال صاحب کی پانچویں غزل کے مطلع کا ثانی مصرع چھپا ہی نہیں۔

تیر مسعود کی تحریر دو صفحوں میں محمود ایاز کی یادیں سمیٹ گئی بہتر ہو گا کہ اردو ادب کے اس جیالے سپاہی کیلئے شبخون کا مخصوص شمارہ نکالیں۔ جو انھیں کی شخصیت پر ہو "اخبار و افکار" کالم میں آپنے درست فرمایا کہ محمود ایاز کی موت بر صغیر ہی، نہیں بلکہ اردو کی پوری دنیا کو سوگوار کر گئی۔ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں میں بھی شامل ہوں۔

سناود — تاباں ضیائی

• شمارہ نمبر ۲۰۶ دراصل افسانہ نمبر ہے لیکن اس بار کے خطوط بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ میں اس شمارے پر اپنی رائے کا مکمل اظہار دو خطوط میں کروں گا۔ اس خط میں میں صرف خطوط پر اپنا ردعمل بھیج رہا ہوں۔

سہیل احمد زیدی اور محمد منصور عالم نے فراق کے ادب، زبان اور شخصیات کے متعلق خیالات، فرمودات اور آرا کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ یہ احتجاج دعوت فکر بھی دیتا ہے اور دعوت مباحثہ بھی۔ آپ نے خوب کیا جو فراق کا انٹرویو شائع کر دیا۔ فراق جیسی ہستی کے افکار سے ہر نسل کو واقف ہونا چاہئے، بڑے ادیبوں کی شخصیت کا ایک یہی پہلو زیر نظر اور زیر مطالعہ رہنا ٹھیک

ط سہو کتابت ہے۔ سڑکیں نہیں لڑکیں (بمعنی لڑکیاں) ہے جو مغربی یوپی کا روزمرہ ہے۔

نہیں۔ یہ انٹرویو کبھی پرانا نہیں ہو سکتا۔ اس کی ادبی، سماجی اور تاریخی حیثیت ہے۔ اس پر ردِ عمل آج بھی ہوا ہے، آئندہ بھی ہوتا رہے گا اور زمانہ اس ردِ عمل کو بھی غلط یا صحیح ثابت کرنے سے باز نہیں آئے گا۔

رحمٰن عباس نے بڑی معصومیت سے ساجد رشید کی وکالت کرتے کرتے انھیں مجرم گردان ڈالا۔ نہ ساجد رشید کو پتہ تھا کہ وہ 'نیا ورق' کے اداریہ میں کیا فرما رہے ہیں نہ رحمٰن عباس کو معلوم ہے کہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ۔

غلام نبی خیال نے بھگوان داس اعجاز کا خط پڑھ کر اقبال مجید کے ناولٹ کے بارے میں اپنی رائے یقیناً بدل لی ہو گی۔ اقبال مجید کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اس تین سطری خط کے آئینے میں اپنے کو دیکھیں اور اپنے سماجی، سیاسی، قومی، وطنی۔ ادبی، فکری اور دینی رویوں کا از سرِ نو جائزہ لیں تاکہ وہ اپنی تخلیقات کو صحافت اور پمفلٹ بنانے سے گریز کر سکیں۔

یہ مناظر عاشق ہرگانوی کی کایا کلپ کیسے ہو گی؟ کل تک تو وہ مابعد جدیدیت کا وظیفہ پڑھا کرتے تھے۔

کنور سین
دہلی

● شمارہ ۲۰۴ کا سرورق بہت جاذبِ نظر تھا۔ تازہ شمارہ کو دیکھ کر بھی دل خوش ہو گیا۔ نیر مسعود صاحب جیسے اچھے نثر نگار سے ایسے تشنہ مضمون کی قطعی امید نہ تھی۔ ہم لوگ محمود ایاز کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ ان پر سوانح قسم کا کوئی مضمون شائع کریں "اسپتال کا کمرہ" حسبِ حال رہی، ساقی فاروقی کی نظم "نوحہ" کا تجزیاتی مطالعہ نظم کی تفہیم کے نئے زاویے روشن کرتا ہے۔ "دست خود دہان خود" آپکو سمجھنے میں قاری کی مدد کرتا ہے۔ "میں کون ہوں اے ہم نفساں" لکھتے ہوئے آپ نے خود کو کسی دوسرے کی نظر سے کیونکر دیکھا ہو گا۔ اس مشکل سے بھی آپ کامیاب و کامراں گزر گئے۔

راشد جمال فاروقی
دہرہ دون

● شمارہ نمبر ۲۰۶ سامنے ہے حیرت ہے کہ اس میں نظم نام کی کوئی چیز نہیں۔ نئے نئے تجربے کرنا آپ کا دلچسپ کام ہے۔ اللہ آپ کو توفیق دے کہ اسی طرح انقلابی قدم اٹھا کر "شب خون" کا معیار اونچا کرتے رہیں۔ کہانیوں میں منیر الدین احمد کی "نقد سودا" حالاتِ حاضرہ کے تحت لکھی گئی ہے۔ فرانس کے شہری پرواز کے حکام نے جنرل ڈیگال ایرپورٹ پر اسرائیلی ایر لائنز کا کاؤنٹر بھی علحدہ ایک طرف کرنے کا حکم صادر کر کے ایک اہم فیصلہ کیا تھا۔ یہ کہانی اسی کے پس منظر میں لکھی گئی ہے اور شمارے کی بہترین کہانی ہے۔

ابرار احمد صدیقی
دھوبی

● شمارہ نمبر ۲۰۵ دلکش نظر ہے، پرچہ از روئے کمیت و کیفیت بہت خوب ہے۔ "صاحب البیت أدری بما فیہا" اور "من آنم کہ من دانم" کے مصداق آپکے دونوں مقالات میں اپنا تعارف خود آپکے ہاتھوں بہت اچھا لگا۔

پند و نصائح سے پر اور مفید مشوروں سے لبریز آپ کا پیام بھی دستیاب ہوا۔ راقم الحروف کی شعری صلاحیت کے اعتراف اور ادبی فن کے استقبال کا شکریہ۔ میں نے آج تک جتنی بھی تخلیقات ارسالِ خدمت کی ہیں انکو آپ نے محض یہ کہہ کر واپس بھجوا دیا کہ راہی فدائی اور عقیل حامد کی پیروی سے باز آئیے۔ ان دونوں حضرات کے طرز سے احتراز کرتے ہوئے شعر کہو۔ آنحترم کا یہ گھو کھانا اور گلگلوں سے پرہیز کرنا میرے ادراک سے باہر ہے۔ آپ راہی فدائی اور حامد صاحب کا کلام بار بار "شب خون" میں قابلِ اشاعت گردانتے ہوئے شائع بھی فرماتے ہیں اور انکے پیروکار شعرا سے کہتے ہیں کہ انکی پیروی اور اقتدا سے باز رہو۔

"شب خون" ادب کا ایک ایسا علمبردار ہے جسمیں شائع ہونے والے اکثر و اغلب شعرا و ادبا اس پایہ کے ہوتے ہیں کہ انکی پیروی باعثِ فخر بھی جا سکے۔ میری نظر میں راہی و حامد اسی صف کے سرِ فہرست شعرا میں سے ہیں۔ ایک بالغ النظر نقاد، کامل الفکر ادیب، بدیع الخیال شاعر اور ملیح الذوق مدیر ہونے کے ناطے آپ کا نظریہ اتنا وسیع تر ہونا چاہئے کہ مختلف الانواع شعرا اور متنوع الانحاء ادبا کو برداشت کرتے ہوئے انکی عمدہ تخالیق کو اپنے رسالے کی زینت بنائیں۔ آپ کے لئے یہ زیب نہیں دیتا کہ ہر اس شاعر و ادیب کو اپنا راندۂ دربار بنا دیں کہ جسکے غریب و نادر اسلوب سے آپ کا مزاج عطر ہو۔ وہ چمن ہی کیا کہ جسمیں غنچہائے نوع بہ نوع اور گلہائے رنگ بہ رنگ نہ ہوں۔ اگر ایک ہی اسلوب کو معیار اور ایک ہی ڈھنگ کو میزان مان لیا جائے تو وہ ایک "ماہنامہ" نہیں بلکہ کسی منفرد شخص کا شعری مجموعہ یا نثری مجموعہ تسلیم کیا جائے گا۔ "شب خون" جیسے بامعیار و باوقار رسالے کے لئے یہ سزاوار نہیں کہ وہ کسی فنی تعصب اور فکری تعقب کا شکار ہو جائے۔

حبیب احمد باقوی
ویلور

● "مابعد جدیدیت تشخیص اور علاج" (۳) بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ مجھے جدیدیت سے خاص انس رہا ہے۔ "شب خون" تو شروع سے زیرِ مطالعہ ہے، محمود ایاز مرحوم کے "سوغات" نے بھی مجھے بہت متاثر کیا۔ جدیدیت کے خد و خال اور نقش و نگار "شب خون" کے ذریعے جتنے نمایاں ہوئے اور ان میں جو تاثر آپ نے پیدا کی اس میں پختگی ہے۔

مابعد جدیدیت کے سلسلے میں یہ جملہ "مابعد جدیدیت کچھ اور نہیں ہے صرف یورپ مرکزیت کے نمائندہ سامراجی عوامل کا اظہار ہے" عالمی سیاست کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔۔ مغربی ذہنی استعمار اور مابعد جدیدیت ایک ہی سکے کے دو رخ معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے تو یہ فکری + ثقافتی سطح پر امریکہ دوست ملکوں کی ایسی تحریک نظر آنے لگی ہے جو انگریزوں کی طرح دنیا پر حکمرانی کی خواہاں ہے۔ اس کا واضح اشارہ مابعد جدیدیت ۔۔۔۔ (۴) کے اس بیان میں موجود ہے کہ "ہم لوگ "مابعد عہد جدید" میں جی رہے ہیں۔ اس دعوے میں اصلاً ایک یوروپی یا یوروپی + امریکی ثقافتی تحریک پوشیدہ ہے جو دنیا کی تاریخ پر قبضہ چاہتی ہے"۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم اس کلچر کو قبول کرنے کیلئے مجبور ہیں؟

کیا یہ دوڑ ہمیں واپس وہی غلامی میں نہیں لے جائے گی ؟ کیا ہمارا اپنا ادبی، فنی، اور اجتماعی کلچر معدوم ہو چلا ہے ؟ کیا یہ سب بربادی کے نشانے پر ہے۔ ؟اگر ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہے۔ ؟ایک بڑا سوال یہ بھی ہے کہ کیا ہمارا ادب مغربی والے کا اتنا محتاج ہو گیا ہے کہ آنکھ بند کر کے اردو ادب کو ہر تحریک کے پیچھے ہانک دیا جائے۔ ہمیں مغربی ادب اور مشرقی ادب کے حوالے سے اپنی تشخیص کرنی چاہئے۔ اپنا علاج کرنا چاہئے۔ عنوان آپ نے خوب رکھا ہے۔

اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ میں اصولاً مابعد جدیدیت کے خلاف ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ میں اس سلسلے میں قلق کا شکار ہوں کہ پاپ کلچر کا ادب ہے یا نہیں۔ ؟مار دھاڑ والی غیر انسانی ثقافت ادب ہے یا نہیں ؟ جدیدیت میں انسان کبھی منہا نہیں ہوا۔ جدیدیت ایک مثبت تحریک ہے۔ انسان کے منفی اور مثبت پہلوؤں کے ساتھ۔ پتہ نہیں میں کہاں تک جدیدیت کو سمجھ پایا ہوں مگر اتنا جانتا ہوں کہ جدیدیت بمعنی محض عصریت نہیں ہے۔ جدیدیت بمعنی محض جدت بھی نہیں ہے۔ جدیدیت بمعنی سعی ضرور ہے اور میرا خیال ہے یہ سعی کسی بھی ادبی + انسانی جہت میں ہو سکتی ہے۔ خیر مابعد جدیدیت کو تھوڑا بہت سمجھ لیا جائے تو اس کی ماہیت ضرور معلوم ہو گی۔

شمارہ ۲۰۳ میں اقبال مجید کا ناولٹ "تیر اور اسکاچ" پڑھا تھا۔ اب اس پر رد عمل کے کچھ خطوط پڑھے۔ توصیف اور مخالفت کی جھلک تو دیکھی مگر تنقید کم ہوئی ہے۔ یہ ناولٹ جرات اظہار کا نمونہ ہے۔ اس کی زبان اچھی ہے مگر سب سے اچھی فنی خوبی اظہار کی وضاحت اور شفاف پن ہے۔ اقبال مجید اظہار کی تلاش میں یہاں تک پہونچے ہیں۔ اس ناولٹ کے سلسلے کی ابتدائی کوششیں ان کے افسانے "جنگل کٹ رہے ہیں" (سیریز) اور "سڑی ہوئی مٹھائی" میں ملتی ہیں۔ یہ افسانے اپنی اپنی جگہ پر مکمل ہیں۔ اقبال مجید کی پہچان انکی طنز آمیز زبان ہے۔ Irony کی ذیل میں آتی ہے۔ کہیں کہیں یہ Sarcastic سی ہو گئی ہے۔ سارا طنز کرداروں کے عمل اور رد عمل کے ذریعہ منکشف کیا گیا ہے۔ ان سب کے باوجود، برہنہ گفتاری شاید اس ناولٹ کی کمزوری ہے۔ علامت کی کمی بری طرح سے کھٹکتی ہے۔ ناولٹ میں استعاراتی جہت موجود ہے۔ کاش براہ راست انکشاف کی جگہ علامتی اظہار اپنایا گیا ہوتا تو یہ ناولٹ ایک زمانے تک زندہ رہتا۔

بھوپال

جعفر مہدی

گذارش

اپنی تخلیقات کے ساتھ جوابی لفافہ ضرور بھیجا کریں تاکہ نا منظور ہونے کی صورت میں انھیں واپس بھیجا جا سکے۔ لفافہ نہ ہونے کی صورت میں نامنظور شدہ تخلیقات ضائع کر دی جاتی ہیں۔

—ادارہ شب خون

● ممتاز شاعر اور نثر نگار، ماہر قانون اور اردو کے جانباز سپاہی پنڈت آنند نرائن ملا کا انتقال پر ملال ہمارے درمیان ایسا خلا پیدا کر گیا ہے جو غالباً کبھی بھی پر نہ ہو سکے گا۔ آنند نرائن ملا نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے سالانہ جلسے منعقدہ جے پور میں کہا تھا کہ "اردو میری مادری زبان ہے۔ میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن مادری زبان نہیں چھوڑ سکتا۔" توقع نہیں کہ اب آنند نرائن ملا جیسا روشن خیال اردو دوست ہمارے درمیان پھر پیدا ہو۔ ملا صاحب کی پیدائش ۱۹۰۱ میں ہوئی تھی یعنی ان کی زندگی تقریباً پوری صدی کو محیط تھی۔ افسوس کہ ان کے آخری چار پانچ سال کولہے کی ہڈی ٹوٹ جانے کے باعث ذی فراشی کے عالم میں گزرے۔ ملا صاحب نے شاعری نسبتاً دیر میں شروع کی لیکن وہ بہت جلد یعنی ۱۹۳۰ آتے آتے اردو کے جدید شعرا میں نمایاں مقام بنا چکے تھے۔ غزل میں انھوں نے ناسخ اور آتش کا سا رنگ اختیار کیا تھا۔ نظم میں انھوں نے قوم پرستانہ اور انقلابی خیالات کا بے دھڑک اظہار کیا۔ ان کی نظموں میں جوش کی سی خطابت ہے لیکن جوش جیسی بے مصرف لفاظی نہیں۔ ملا صاحب ہائی کورٹ کے جج رہے، ایک عرصے تک ممبر پارلیمنٹ رہے۔ دونوں حیثیتوں میں انھوں نے اپنی اردو پرستی کو ہر چیز پر مقدم رکھا۔ ان کا مجموعہ کلام "کچھ ذرے، کچھ ستارے" مضامین کا مجموعہ "کچھ نثر میں بھی" اور خود نوشت "میری حدیث عمر گریزاں" ایسی کتابیں ہیں جو عرصے تک زندہ رہیں گی۔ شمس الرحمن فاروقی نے ملا صاحب کے انتقال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا "میں نے ایک مربی اور بزرگ کھو دیا ہے۔ اردو زبان و ادب کا یہ جانباز خدمتگار تاریخ میں اپنی جگہ بنا چکا ہے اور اس کا نام تا دیر روشن رہے گا۔"

● کچھ دن پہلے میں فارغ بخاری کے انتقال کی اطلاع شان الحق حقی کے خط سے ملی۔ افسوس کہ ہندوستان میں یہ اطلاع بہت کم لوگوں تک پہنچی کیونکہ کسی اخبار یا رسالہ میں اس کا تذکرہ دیکھا نہ گیا۔ فارغ بخاری جدید شعرا کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جو میرا جی اور قیوم نظر کے فوراً بعد پروان چڑھی تھی۔ ان کی پیدائش ۱۹۱۷ میں ہوئی۔ انھوں نے اردو اور پشتو میں کئی تصانیف چھوڑی ہیں جن میں "خوشبو کا سفر" (شعری مجموعہ) اور "البم" (خاکوں کا مجموعہ) خاص طور پر یاد رکھے جائیں گے۔ ادارہ ان کے غم میں سوگوار ہے۔

● افسوس کہ الہ آباد کے معروف اور مجبور ناول نگار شکیل جمالی ہم سے جدا ہو گئے۔ وہ نکہت، جاسوسی دنیا، رومانی دنیا اور طلسمی دنیا کے بانی عباس حسینی کے چھوٹے بھائی تھے لیکن ان کی شہرت اس رشتے کی بنا پر نہیں بلکہ معروف اور مقبول ناول نگار کی حیثیت سے قائم تھی۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۳ سال تھی۔ ادارہ ان کے ماتم میں سیاہ پوش ہے۔

● بی بی سی کی ایک خبر کے مطابق مشہور ادیب و شاعر اور جنگ کراچی کے

● ادا جعفری کی خود نوشت "جو رہی سو بے خبری رہی" ہند و پاک کے ادبی حلقوں میں توجہ اور بحث کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

● آصف فرخی نے کراچی کے موضوع پر نظموں کا ایک سلسلہ تصنیف کیا ہے اور اسے "بحران کے دنوں کی نظمیں" کا نام دیا ہے۔ زیر نظر نظمیں ان کے مجموعے "اس وقت تو یوں لگتا ہے" سے منتخب کی گئی ہیں۔ توقع ہے کہ مجموعہ ہند و پاک سے بہت جلد شائع ہو گا۔

● انو پا نے سن ۷۰ کی دہائی میں شاعری شروع کی لیکن دیر تک خاموش ہو گئی تھی۔ اب انھوں نے شعر گوئی کی ہے اور یہ نظمیں بطور خاص "شب خون" کے لئے کہی ہیں۔

● عبید صدیقی بی بی سی لندن سے نوکری چھوڑ کر دہلی میں آباد ہو گئے ہیں۔

● مبین مرزا کراچی سے نکلنے والے ممتاز جریدے "مکالمہ" کے مدیر ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام جلد ہی شائع ہونے والا ہے۔

● مصطفٰے شہاب کا مجموعہ کلام 'شام ڈھلے سویرا' کچھ دن ہوئے شائع ہوا ہے۔

● ن۔ م۔ دانش کا مجموعہ "بچے، تتلی، پھول" ابھی ابھی شائع ہوا ہے۔

● ہر بنس مکھیا ہمارے زمانے کے مشہور مورخوں میں سے ہیں۔ ان دنوں جواہر لال یونیورسٹی کے مرکز برائے تاریخی مطالعات میں پروفیسر ہیں۔ شاعری کے میدان میں یہ ان کا پہلا قدم ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نظمیں انھوں نے "شب خون" کے تازہ شمارہ سے تحریک پا کر لکھی ہیں۔

ادبی ڈویژن کے انچارج منظر امکانی پولیس کی فائرنگ میں انتقال ہو گئے۔ ان کے ساتھ ایک اور صحافی کامران رضوی تھے جو زخمی ہوئے۔ یہ لوگ کسی موقعہ واردات پر آنکھوں دیکھا حال معلوم کرنے کے لئے موجود تھے جہاں پولیس نے گولیاں چلائیں اور جہاں منظر امکانی لقمہ اجل ہو گئے۔ ہم ان کی ناوقت اور بے گناہ موت پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مرنے والوں کی روحوں کو امن و سکون عطا فرمائے۔

● گذشتہ ماہ ہم نے سردار جعفری کو سنت گیانیشور ایوارڈ کے ملنے کی خبر چھاپی تھی۔ مہاراشٹر اردو اکیڈمی کا ولی دکنی ایوارڈ جناب مجروح سلطان پوری کو اور سراج اورنگ آبادی ایوارڈ جناب علامہ کالی داس گپتا رضا کو دیا گیا ہے۔ یہ دونوں انعامات نہایت مناسب بلکہ انسب ہیں۔

مابعد جدیدیت: تشخیص اور علاج (۴)

گزشتہ شمارے میں اور اس کے پہلے بھی بعض شماروں میں؎ ، ہم نے THOMAS DOCHERTY کی مرتب کردہ کتاب POST MODERNISM : A READER کے اقتباسات پیش کرکے مابعد جدیدیت کی او قات کا پردہ فاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ موجودہ اور آئندہ کچھ شماروں میں ہم ایک تازہ کتاب THE POST COLONIAL STUDIES READER کے کچھ اقتباسات پیش کریں گے۔ یہ کتاب لندن اور نیویارک سے رٹلیج (ROUTLEDGE) نے ۱۹۹۵ میں شائع کی اور اس قدر مقبول ہوئی کہ ۱۹۹۵ میں ہی دوبارہ اشاعت پذیر ہوئی۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو :

گایتری اسپیوک (GAYATRI SPIVAK) کہتی ہے۔ "سامراجیت کے فاعل (SUBJECT) اور بشر دوستی کے فاعل میں ایک تعلق اور یگانگت ہے۔" یعنی پس نو آبادیاتی فکر سامراجی فاعل کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتی ہے اور مابعد جدیدیت موخر الذکر (یعنی بشر دوستی کے فاعل کو) اپنا ہدف بناتی ہے اور تانیثیت (FEMINISM) کا یہ کام ہے کہ وہ ان دونوں تصورات کی تہ میں پدری نظام اقدار کے وجود پر آپ کی توجہ منعطف کرے۔ آج کے مابعد وضعیاتی اور مابعد جدید دعوے یہ ہیں کہ کوئی مربوط، منضبط اور آزاد فاعل (SUBJECT) نہیں ہے۔ تانیثی اور پس نو آبادیاتی کلام ان دعووں کو غلط سمجھتا ہے اور ان سے اپنا سروکار نہیں رکھنا چاہتا۔ تانیثیت اور پس نو آبادی فکر دونوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے پس نو آبادیاتی انسانوں اور عورتوں کی اس فاعلیت کی پر زور تصدیق اور استحکام کریں جو سامراجی نظام اور پدری نظام اپنے محکوموں سے چھین لیتا ہے یا دور کر دیتا ہے۔ (یعنی دونوں ہی نظام انسان کی قوت عمل کو سلب کرنا چاہتے ہیں اور مابعد جدیدیت جس حد تک انسان کو مربوط اور آزاد فاعل ماننے سے انکار کرتی ہے اس حد تک وہ سامراجی / استحصالی نظام کو مضبوط کرنے کا کام کرتی ہے۔) سچ پوچھئے تو یہ نام نہاد بنیادی تبدیلی پسند (RADICAL) مابعد جدیدیت اور اس کے خیالات حکمراں اور صاحب اقتدار طبقے کی عیاشی کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ وہی طبقہ ان چیزوں کو معرض سوال میں لا سکتا ہے جو اس کے پاس پہلے سے موجود ہیں اور بڑی مضبوط بنیادوں پر قائم ہیں۔ (یعنی سامراجیت کے ہاتھوں کچلا ہوا انسان جس کو آزادی نصیب ہی نہیں ہوئی، اگر یہ کہنا شروع کر دے کہ آزاد فاعل کا وجود نہیں ہے، تو وہ گویا اپنی غلامی پر مہر تصدیق لگا رہا ہے۔)

جیسا کہ ریمنڈ ولیمز (RAYMOND WILLIAMS) نے کہا ہے، تمام قوم پرستانہ ادب اسی طرح ارتقا کی راہیں طے کرتا ہے کہ وہ پہلے حکمراں یا حاکم طرز فکر و احساس کی نقل کرتا ہے۔ پھر وہ اسے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور پھر آخر کار کھلے طور پر حکمراں اور حاکم طرز فکر و احساس کے خلاف بغاوت کرتا ہے اور ان چیزوں کو دوبارہ قدر و قیمت بخشتا ہے جنھیں حکمراں یا حاکم طرز فکر و احساس نے ادب اور اقدار کی دنیا سے خارج کر دیا تھا۔

LINDA HUTCHEON

ماخوذ از

THE POST-COLONIAL STUDIES READER

Edited by: BILL ASHCROFT
GARETH GRIFFITHS
HELEN TIFFIN
(1995)

؎ "شب خون" شمارہ ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱

جولائی ۱۹۹۷

مدیر، پرنٹر، پبلشر: عقیلہ شاہین | سرورق: چودھری ابن النصیر | جلد: ۳۱ شمارہ: ۲۰۸
فون نمبر: ۶۲۲۶۹۳، ۶۲۳۱۳ | سرنامہ کی خطاطی: عادل منصوری | ترسیل زر کا پتہ: ۳۱۳-رانی منڈی، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
مطبع: بہار گو پریس، الہ آباد | کمپوزنگ: افراح کمپیوٹر سنٹر، نئی دہلی-۲۵ | خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس-۱۳، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
فی شمارہ: پندرہ روپئے | شارپ ٹریک کمپیوٹرس، الہ آباد-۳ | بارہ شمارے: ایک سو ساٹھ روپئے

ترتیب و تہذیب
شمس الرحمن فاروقی

شان الحق حقی

محمود ایاز

بہت شاق ہے دل پہ یہ سانحہ
کہ وہ شمع بنگلور میں جل بجھی

گئی وہ تجلی بساط ادب
رہی چار دن یہ بھی اک چاندنی

صدا دل سے نکلی کہ محمود ایاز
"بھری بزم سوغات سونی ہوئی"
(۱۴۱۷ھ)

فارغ بخاری

وہ جن کے نغمہ پیرائی کے دم سے
پشاور بھی تھا اک بستان اردو

نواجن کی تھی گل بانگ ترقی
وہ فارغ "فخر سرحد جان اردو"
(۱۴۱۷ھ)

شان الحق حقی

یوں کہاں ہوتی ہے اک موج نفس میں یہ کھنک
ہے خوشا حرف کہ پہنچے لب اعجاز تلک

بن گئی یونہی سخن میں تو ذرا نوک پلک
میرے لہجے میں کہاں ہے مرے سینے کی کھنک

یوں دعا مانگ کے شرمندہ ہوں دل میں جیسے
تیری خاطر سے در غیر پہ دی ہے دستک

دل کی وسعت سے ہیں کیا کیا گل خوش رنگ نصیب
میرے دامن پہ بھی ہے کچھ ترے آنچل کی جھلک

نام نے اس کے دکھائے ہیں کرشمے کیا کیا
منہ سے نکلے تو مہک، ہاتھ سے لکھے تو دمک

دیکھے محفل میں تری جنبش لب کے انداز
وہ بھی کیا خوب سخن تھے جو نہ پہنچے ہم تک

گو زباں کو گرہ تفتہ مقالی پایا
پھر بھی سینوں کو بہت سوز سے خالی پایا

یہ جو صحرا ہیں، کف دست لہو مانگتے ہیں
میں نے ہر دشت کو اک دست سوالی پایا

وہ یہ کہتے ہیں قفس میں بھی نہ جینے دیں گے
گر زباں پر گلہ بے پر و بالی پایا

دل تو شعلہ سا جلا اس میں اور آنکھوں نے فقط
دہر کو گردش فانوس خیالی پایا

غزل

شہریار

تیرے آنے کی خبر آتے ہی ڈر لگنے لگا
غیر کا لگتا تھا تو جو وہ اپنا گھر لگنے لگا

کیا حریفوں میں مرے سورج بھی شامل ہو گیا
زرد پتا راستے کا کیوں شجر لگنے لگا

یاد آتا تھا کسی اک نقرئی آواز کا
پھر سے سناٹوں کا مجمع بام پر لگنے لگا

میں سلامت ہوں مگر یہ خواب آنکھیں کربلا
جو جدا تن سے ہوا وہ میرا سر لگنے لگا

جانے کیا افتاد پڑنے کو ہے مجھ پر دوستو
معتبر لوگوں کو اب میں معتبر لگنے لگا

شہریار

آخری پڑاؤ تک
ساتھ آنے والوں کو
راستے میں کیوں چھوڑا
گیند اپنی گولائی
کس طرح بدل دے گی
ریت سے بھری بوری
اپنی پیٹھ پر لادے
جس سفر پہ نکلے ہو
اس کے ختم ہونے پر
چند روز ستا کر
لوٹ کر چلے آنا
یہ جو ایک پگڈنڈی
آسماں کو جاتی ہے
ہم یہیں پہ رکتے ہیں

شاخ شاخ وہ باہیں
جھول جائیں گردن میں
اور خون کی گردش
تیز جب رگوں میں ہو
سسکیوں بھری بارش
دور کے گھروں میں ہو
اس منڈیر پر بیٹھے
کانپتے کبوتر کی
آنکھ سرخ ہو جائے
میری بائیں پسلی پر
تیز ناخنوں والی
اس چڑیل نے اپنے
دانت کیوں گڑوئے تھے
ہاتھیوں کا یہ لشکر
اب کی بار جنگل سے
بے نیاز گزرے گا
میرے پاس جتنی بھی
رات کی امانت تھی
جاگتا رہا اس کی
میں نے تو حفاظت کی
مجھ میں جرم کا احساس
کس لیئے ہوا پیدا
سوچتے میں اب میرے
ربط کیوں نہیں باقی

غزلیں

سید امین اشرف

عجب صورت بدلتی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی
خزاں کے جبر سے باد گلستانی نہیں جاتی

ہواؤں پر گلوں کی مہر افشانی نہیں جاتی
جنوں میں در بہ در کی خاک اب چھانی نہیں جاتی

یقیناً قریۂ جاں کی یہی پہچان ہوتی ہے
بنا لیتی ہے جب گھر، جلوہ سامانی نہیں جاتی

ہوس نا آشنا شوق لب و عارض نہیں ہوتا
کسی قیمت پہ جان و تن کی عریانی نہیں جاتی

نہ ہوں آنکھیں تو دل ہوجاتا ہے پرکالۂ آتش
جو دل قابو میں ہو آنکھوں کی حیرانی نہیں جاتی

یہی محسوس ہوتا ہے کہ ہر شے میں کوئی شے ہے
کہ جاں مسمار ہوتی ہے درخشانی نہیں جاتی

قیامت تھا بدلنا راستہ تیری گلی کا بھی
سمندر خشک ہوجاتا ہے، طغیانی نہیں جاتی

وہ تاج و تخت و کشور ہے نہ بلقیس سخن پر ہے
رگ و پے سے مگر خوئے سلیمانی نہیں جاتی

جو تختی پر لکھا تھا مٹ گیا بارش کے پانی سے
مگر مٹی سے اب تک بوئے سلطانی نہیں جاتی

یہ معبد و جسم کا سارا تصادم حسرتوں سے ہے
میسر کیا نہیں ہوتا، پریشانی نہیں جاتی

یہ انساں بھی وفور تشنگی کا اک سمندر ہے
برس جاتا ہے بادل تنگ دامانی نہیں جاتی

بدن کی جھریوں کا عکس بھی پڑتا ہے اس گھر پر
سجانے سے دل افسردہ ویرانی نہیں جاتی

دل ہجراں رسیدہ کو وہی آزار دیتا ہے
اس بے مہر کی لیکن ثناخوانی نہیں جاتی

گلہ جنوں کو ہے عہد خرد نواز آیا
کہ خیر و شر میں کسی کو نہ امتیاز آیا

زمین دور نہیں ہفت آسماں سے بھی
وہیں نشیب ملا ہے جہاں فراز آیا

ہے سہل وقت کا کیوں نام مہلت دو روز
میان وقفہ تو اک عرصۂ دراز آیا

خیال سود و زیاں سے تو دل نہیں بنتا
خلوص تھا کہ رگ سنگ میں گداز آیا

بغیر مہر و محبت سنبھال سکتا ہے
مگر جسے ہنر داستاں طراز آیا

ہم ایسے خاک نشینوں میں خوئے سیر کہاں
پہ کیا کریں جو سوار سمند ناز آیا

ادھر کئی مہینوں سے سب بہت خاموش تھے

محمد صلاح الدین پرویز

ادھر کئی مہینوں سے سب بہت خاموش تھے
کسی نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا میرے خلاف
میں ان کے کانوں کے پردوں'
آنکھوں کی پلکوں اور ہونٹوں کے کنارے کنارے چل رہا
تھا
میری نظموں کی گونجیں' شمسی حوض کے پانی سے وضو
کرکے
ادا کر رہی تھیں نماز۔
دیکھ رہے تھے محرابوں پر کھڑے ہو کے
عقاب' ابابیل اور ابدال
اندھیری رات میں
گھاس کے بھیتر جگنوؤں کا رقص
دراصل وہ گھاس میں ہی تھا
جسے عشق نامی دشت سے
کاٹ کے لایا تھا ایک بزرگ گھسیارا
اس کی کھرپی' دانتوں کے نیچے تھی
نہ آنکھوں کے بھیتر
اس کی کھرپی' کانوں میں رکھی تھی
نہ ہونٹوں کے اوپر
اس کی کھرپی ٹوپی میں تھی
نہ آستین کے اندر
ادھر کئی مہینوں سے سب بہت خاموش تھے

ادھر کئی مہینوں سے سب بہت خاموش تھے
سنتے ہیں ہر شب کی اپنی ہی الگ سیاہی ہوتی ہے
اور وہ سیاہی مارتی رہتی ہے ڈنک
شب کے آگے پیچھے کھڑے کرکے
بے شرم کے پیڑ
ان پیڑوں سے اگتے ہیں کالے رنگ کے بدمزہ
کیلے اور سیب
پھر بجانے آجاتے ہیں ان کے عرس میں سلد نگیاں
مستعار کھلائی ہوئی دستاریں باندھے بھانڈ
عرس کے اختتم دن بٹتی ہے سوغات
اندھا اپنوں کو دیتا ہے ریوڑی اور دوجوں کو لات
ہائے یہ خود اپنی ہی محبت میں جتلا سائے
سوچتے ہی نہیں کیا ہے ان کے زیر ناف! کیا انہوں نے
دیکھ لیے ہیں لات و منات !!
ادھر کئی دنوں سے سب بہت خاموش تھے
ادھر کئی دنوں سے سب بہت خاموش تھے
لیکن میں خوف زدہ تھا' بہت خوف زدہ
راتوں کو اٹھ اٹھ کے سینے میں دل ڈھونڈا کرتا تھا
ہاتھ اور پاؤں ٹٹولا کرتا تھا
سرپہ آیتہ الکرسی پڑھ پڑھ کے پھونکا کرتا تھا
اس کے علاوہ کتنی بار اپنے دیکھے سرخ قلم کی

آگ کو چھوکے روتے روتے ہنس پڑتا تھا
سب کے سب سلامت تھے
ہاتھ' پاؤں' دل' دماغ-- ہاں سب کے سب ہی
سلامت تھے
پھر کیوں ایسا لگتا تھا
میں مرچکا ہوں
ادھر کئی مہینوں سے سب بہت خاموش تھے
ادھر کئی مہینوں سے سب بہت خاموش تھے
لیکن آج اتنے بہت سارے مہینوں کے
گذر جانے کے بعد
کسی نے ٹیلی فون پر مجھے بتلایا ہے
میں زندہ ہوں
مجلس عامہ میں میرے لیے قرارداد پاس کی گئی ہے
محمد صلاح الدین پرویز کی ہر نظم کا سر
کھلے عام' بیچ بازار' اس کی سچائی کے انعام کے طور پر
قلم کر دیا جائے
اور یہ سارے کٹے ہوئے سر
دجلے کی لہروں کے نام میل کر دیے جائیں
اس قرارداد کے بالکل نیچے
بہت سے دستخطوں پر
قلم کا نب توڑ کے روشنائی کا نقطہ پھیلا دیا گیا ہے
لیکن روشنائی کے اس نقطے میں
نقابوں کے باوجود' دوستوں کے چہرے
بالکل صاف دکھائی دے رہے ہیں
ادھر کئی مہینوں سے سب بہت خاموش تھے
ادھر کئی مہینوں سے سب بہت خاموش تھے
میں ان کو ان کی خاموشی توڑنے پر دلی مبارکباد پیش
ہوں
اور پڑھتا ہوں--- سورہ فاتحہ
الحمد للہ رب العالمین......

شمس الرحمٰن فاروقی

کلاسیکی اردو غزل کی شعریات جن تصورات پر قائم ہے انھیں موٹے طور پر دو انواع میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جن کی نوعیت علمیاتی (Epistemological) ہے۔ یعنی یہ تصورات اس سوال پر مبنی ہیں کہ شعر سے ہمیں کیا حاصل ہوتا ہے؟ دوسری نوع کے تصورات وہ ہیں جنھیں وجودیاتی یعنی Ontological کہا جا سکتا ہے یہ وہ تصورات ہیں جن کا تعلق اس سوال سے ہے کہ شعر کا وجود کن چیزوں پر منحصر ہے۔؟

علمیاتی تصورات	وجودیاتی تصورات
مضمون آفرینی	با معنی لفظ (یا مضمون)
معنی آفرینی	وزن و بحر
خیال بندی	قافیہ
کیفیت	ربط
شور انگیزی	

ظاہر ہے کہ وجودیاتی تصورات کی قائم کردہ شرطوں اور ضرورتوں کا لحاظ نہ رکھا جائے تو شعر وجود ہی میں نہ آئے گا۔ لیکن مندرجہ بالا چاروں تصورات کے کچھ ذیلی تصورات بھی ہیں جن کو شعر کے لیئے لازمی نہیں قرار دے سکتے' ہاں اگر ان کی پابندی کی جائے تو شعر میں خوبی پیدا ہوگی۔ مثلاً بامعنی لفظ (یا مضمون) کے تصور کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ شعر کی بندش چست ہو' یعنی اس میں کوئی غیر ضروری' یا کم زور یا معنی کے لیئے نامناسب لفظ نہ ہو۔ وزن و بحر کے تصور کا ایک تقاضا یہ ہے کہ شعر میں روانی ہو۔ کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ کوئی عبارت موزوں ہو (یعنی بحر اور وزن کی شرطیں پوری کرتی ہو) لیکن اس میں روانی نہ ہو یا کم ہو۔ کلاسیکی زمانے میں مختلف شعرا کی درجہ بندی میں یہ سوال بیشتر زیر بحث آتا ہے کہ فلاں شاعر کے یہاں روانی زیادہ ہے' یا کم ہے۔ فارسی کے دو سب سے بڑے غزل گویوں' یعنی خسرو اور حافظ' دونوں نے روانی پر بہت زور دیا ہے۔ قافیے کے ساتھ اگر ردیف ہو تو قافیے اور ردیف کا باہم مربوط ہونا اور ردیف کا قافیے کے معنی قائم کرنے میں کارگر ہونا خاص اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ ربط سے مراد یہ تھی کہ شعر کے دونوں مصرعے مل کر مکمل بیان بناتے ہیں کہ نہیں۔ ان تمام تصورات میں بڑی باریکیاں ہیں جن کے بیان کرنے کا موقع یہاں نہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ شعر کے وجود کے بارے میں جن افکار کا ہمارے یہاں فروغ ہوا وہ دو طرح کے تھے۔ کچھ وہ جن کے بغیر شعر ممکن نہ تھا' اور کچھ وہ جن کے ذریعہ شعر میں خوبی پیدا ہونے کے امکانات تھے۔

جہاں تک سوال علمیاتی تصورات کا ہے' ان کے بھی بہت سے ذیلی تصورات تھے۔ خیال بندی کو مضمون آفرینی کا ذیلی تصور بھی کہہ سکتے ہیں' لیکن خیال بندی نے ایک زمانے میں اتنی مقبولیت حاصل کرلی کہ ایک پورا طرز سخن اس تصور سے وابستہ ہوگیا۔ معنی آفرینی کے ذیلی تصورات میں ایہام' رعایت' اور مناسبت خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ کیفیت اور شور انگیزی کو علمیات شعر کے اس سرے پر فرض کرسکتے ہیں جس کا دوسرا سرا معنی آفرینی ہے۔ مضمون آفرینی کا ایک ذیلی تصور بیان کی صفائی بھی تھا۔ بیان کی صفائی سے مراد یہ تھی کہ مضمون ایسا نہ ہو' یا اسے ایسی طرح نہ بیان کیا جائے' کہ اس کو سمجھنے میں محنت اور مشکل صرف ہو' اور جب اسے سمجھ لیں تو محسوس ہو کہ یہ ساری محنت بے کار گئی۔

کلاسیکی غزل کی شعریات کے ارتقا کی پہلی اہم منزل یہ تھی کہ معنی اور مضمون کے درمیان فرق قائم ہوا جس کے باعث مضمون آفرینی کو مرکزی اہمیت حاصل ہوئی۔ پھر معنی آفرینی کی مہم میں ایہام' رعایت اور مناسبت کے تصورات کو بروئے کار لایا گیا۔ انیسویں صدی کے شروع یا اٹھارویں صدی کے آخری برسوں میں خیال بندی کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ شعریات کے نقطۂ نظر سے کلاسیکی غزل کے سفر کے اہم منازل یہی ہیں۔

"ایہام" کی تعریف عام طور پر یہ کی جاتی ہے کہ شاعر ایسا لفظ استعمال کرے جس کے دو معنی ہوں' ایک قریب کے اور ایک دور کے' اور شاعر نے دور کے معنی مراد لیئے ہوں۔ ایسی صورت میں شاعر کو ایسا کوئی قرینہ بھی رکھنا چاہیئے جس سے معلوم ہو کہ اس نے کیا معنی مراد لیئے تھے۔ یہ قرینہ مخفی بھی ہو سکتا ہے اور واضح بھی۔

مندرجہ بالا تعریف کو ایہام کی "خالص" اور اقل (Minimum) تعریف کہہ سکتے ہیں۔ "اقل" میں نے اس لیئے کہا کہ ایہام کی بحث میں بہت سی

باریکیاں بھی ہیں اور بہت سے الجھاوے بھی۔) علاوہ بریں، کلاسیکی اردو شعرا نے اظہار کی کچھ اور صورتیں اختیار کی ہیں اور انھیں بھی عام طور پر ایہام کا نام دیا ہے۔ مختصر طور پر کہیں تو ہمارے ایہام کی تین قسمیں نظر آتی ہیں۔

(۱) ایہام خالص۔ یعنی جہاں ایک لفظ کے دو معنی ہوں، ایک قریب کے اور ایک دور کے، اور شاعر نے دور کے معنی مراد لیئے ہوں۔

(۲) ایہام پیچیدہ۔ جہاں ایک لفظ کے دو یا دو سے زیادہ معنی ہوں اور تمام معنی کم و بیش مفید مطلب ہوں، عام اس سے کہ شاعر نے کون سے معنی مراد لیئے تھے۔

(۳) ایہام مساوات۔ جہاں ایک لفظ کے دو معنی ہوں، دونوں برابر کے کم و بیش یا بالکل قوی ہوں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو کہ شاعر نے کون سے معنی مراد لیئے تھے۔

ایہام کو معنی آفرینی کی غرض سے استعمال کرنے والے شعرا نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا کہ اردو میں نہ صرف کثیر المعنی الفاظ بہت ہیں، بلکہ ایسے الفاظ بھی بہت ہیں جن کے درمیان بظاہر معنی کا علاقہ ہے، اور یہ بات بھی اردو الفاظ کی فطری کثیر المعنویت کے باعث ہے۔ لہٰذا اگر ایسا کلام بنایا جائے جس میں معنی کا آپس میں بظاہر علاقہ رکھنے والے الفاظ ہوں، تو یہ معنی آفرینی تو نہ ہوگی، لیکن معنی کے رشتوں کے التباس کے باعث ایک طرح کا ایہام تو پیدا ہی ہوگا۔ اس عمل کو کلام میں رعایت پیدا کرنے کا عمل کہہ سکتے ہیں۔

رعایت کثیر الاطلاق اصطلاح ہے۔ الفاظ کے مابین معنوی علاقے کا التباس ہو، یا بعض صنعتیں ہوں، مثلاً ایہام تضاد، ایہام صوت، ایہام تناسب، لف و نشر کی بعض صورتیں، ضلع جگت، یہ سب رعایت کے تحت آتی ہیں۔ رعایت کی وجہ سے ہمیشہ کلام میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ جو شخص رعایت کو نہیں سمجھتا، یا اسے غیر اہم سمجھتا ہے، یا جسے رعایت میں لطف نہیں آتا، اسے کلاسیکی شاعری پڑھنا پڑھانا چھوڑ کر کوئی اور دھندا کرنا چاہیئے۔ اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ رعایت محض "لفظی بازی گری" ہے اور ہمیں کائنات کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔ اول تو "لفظی بازی گری" کوئی ایسی بری چیز نہیں۔ جس چیز کو شیکسپیئر اور حافظ نے بڑے اہتمام سے روا رکھا ہو، جو کیٹس (Keats) سے لے کر بھرتری ہری اور امارو کے یہاں برابر کی شان سے جلوہ گر ہو، جسے خاقانی، خسرو اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنے اپنے طور پر حسن کلام کا وسیلہ بنایا ہو، اسے "لفظی بازی گری" کہنا شاعری کی روح کو جھٹلانا ہے۔ رعایت ہمیں زبان اور اس کے امکانات، زبان کی لطافتوں اور نزاکتوں، معنی کے غیر متوقع پہلوؤں کے بارے میں بھی بہت کچھ بتاتی ہے۔ اور زبان ہماری کائنات کا اہم ترین عنصر ہے، یعنی زبان نہیں تو کائنات نہیں۔ کائنات کے بارے میں بیانات زبان ہی کے ذریعہ ممکن ہیں، اس لیئے ساری کی ساری زبان ہمارے علم کائنات کی موجد ہے۔ جب ولی کہتے ہیں۔

نہ جا انکھیاں میں آ مجھ دل میں اے شوخ
کہ نئیں خلوت میں دل کی خوف مردم

تو وہ ہمیں "مردم"، بمعنی "آنکھ کی پتلی" اور "مردم"، بمعنی "انسان" کے ذریعہ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ انسان کا وجود کسی نہ کسی سطح پر آنکھ کا مرہون منت ہے (مثلاً کسی تصویر میں سے آنکھیں مٹا دیجئے اور دیکھیئے کیا بچتا ہے۔)

یہ خیال غلط ہے کہ میر، غالب، انیس، وغیرہ "سچے" شاعر تھے، لہٰذا انھیں رعایت، ایہام، یا کسی طرح کی صنعت گری سے کوئی سروکار نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان سب لوگوں کو اس بات کا احساس تھا کہ اردو زبان میں ایہام اور رعایت کے اسی قدر توانگر امکانات ہیں کہ ان سے منفعت حاصل کرکے شاعر اپنے کلام کا دامن نئے نئے لعل و گہر سے مالا مال کر سکتا ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ ہنرمندی اور فنی نزاکت اور لفظی باریکی ہر جگہ کام آتی ہے۔ اگر شیکسپیئر رومیو اور جولیٹ میں خودکشی اور موت کے موقعے پر رعایت سے کام لیتا ہے تو میر انیس اور میر بھی بکا اور حزن کے موقعے پر رعایت کو برتتے ہیں اور کلام کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر Romeo and Juliet کے پانچویں ایکٹ کا وہ موقع ملاحظہ ہو جب جولیٹ کے مرنے کی خبر رومیو کو ملتی ہے۔ رومیو کا خادم بالتھزار (Balthasar) خبر لے کر آیا ہے۔

Romeo: How doth my lady? Is my father well?
How fares my lady? That I ask again,
For nothing can be ill if she be well.
Balthasar: Then she is well and nothing can be ill.

(V, I, 14-17)

رومیو How is my lady کی جگہ How doth My Lady کہتا ہے۔ دونوں کے معنی ایک ہیں، لیکن to do کے ایک قدیم معنی to go بھی ہیں، اور to go کے ایک معنی to die بھی ہیں۔ دوسری سطر میں fares کے معنی وہی ہیں جو doth کے ہیں۔ لیکن fares کی آواز fair's کی سی ہے، جو مخفف ہے fair is کا۔ یعنی:

How fair is my lady

اور fair کے کئی معنی ہیں۔ "خوبصورت"، "اچھی حالت میں"، "تندرست"، "انصاف پسند"، وغیرہ۔ جولیٹ چونکہ مر چکی ہے اس لیئے یہ معنی ایہام کی طرح کیفیت کے حامل ہیں اور اگلی سطروں میں ill اور well سے

مناسبت بھی رکھتے ہیں۔ خود ill کے کئی معنی ہیں' "بیمار" "برا" "نا مناسب" وغیرہ۔ اور well کے معنی ہیں "تندرست' بخیریت۔" well بمعنی "اچھا اچھی" بھی ہے' اور خادم کے جواب میں well کے یہ معنی زیادہ نمایاں ہیں' کہ (مرجانے کے باعث) وہ نیک ہے' معصوم ہے' اچھی ہے' یعنی اب اسے کوئی برائی' کوئی گناہ' آلودہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اب کوئی بھی شے بیمار یا خراب نہیں ہو سکتی۔ چونکہ تھوڑی ہی دیر میں رومیو فرط غم سے خودکشی کرلے گا' لہٰذا Nothing can be ill کے معنی ہوئے کہ جولیٹ کی موت کے نتیجے میں رومیو خود مرجائے گا اور مردہ کو مرض نہیں' وہ ہمیشہ کے لیئے بیماری سے نجات پا جاتا ہے۔

اور آگے دیکھیئے۔ رومیو بھاگا بھاگا جولیٹ کے مزار پر جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں زہر کی شیشی ہے۔ وہ جولیٹ کی قبر کھولتا ہے۔ تابوت کا ڈھکنا اٹھاتا ہے' جولیٹ کے مردہ سراپا پر نظر ڈالتا ہے۔ خودکشی کرتے وقت اس کے الفاظ ہیں :

Romeo: Eyes look your last,
Arms take your last embrace, and lips (you
The doors of breath) seal with a righteous kiss
A dateless bargain on engrossing Death!
Come bitter conduct, come unsav'ry guide,
Thou desp'rate pilot, now at once run on
The dashing rocks thy seasick weary bark.
Here's to my love. O true apothecary,
Thy drugs are quick. Thus with a kiss I die.

(V,iii,114-121)

جہاں look کے بہت سے معنی ہیں' وہاں ایک (قدیمی) معنی ہیں "دیکھنے کی قوت یا صلاحیت حاصل کرنا۔" لہٰذا رومیو کی بات کا ایک قوی مطلب یہ ہوا کہ "اے میری آنکھو اب آخری بار دیکھنے کی قوت حاصل کرلو' کیوں کہ جب جولیٹ نہ دکھائی دے گی تو کچھ بھی دکھائی نہ دے گا۔" ان معنی کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ پورے ڈرامے میں رومیو نے جولیٹ کے لیئے جگہ جگہ روشنی کے استعارے استعمال کیئے ہیں۔ یہاں look ایہام کی عمدہ مثال ہے۔ Take کے معنی ہیں "لینا" "فتح کرنا۔" اور arms کے معنی ہیں "بازو" "ہتھیار۔" ان کی مناسبت ظاہر ہے۔ ایہام تب کھلتا ہے جب اس بات کو خیال میں لائیں کہ embrace کے ایک معنی "مباشرت کرنا" بھی ہیں اور جنسی عمل کو قلعہ فتح کرنے سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ embrace کی ایک شکل embrase بھی ہے' جس کے معنی ہیں "آگ لگا دینا" ان معنی کا تعلق جنسی جذبے کی شدت سے ظاہر ہے۔ اور embrase سے لفظ embrasure حاصل ہوتا ہے' جس کے معنی ہیں قلعے کے بلند سوراخ دار برج جس میں بندوق رکھ کر اور جس کی آڑ لے کر دشمن پر نشانہ لگاتے ہیں۔ ان سب الفاظ میں جنسی جذبے کی شدت اور عمل کی طرف اشارے ہیں۔ بقیہ سطریں چھوڑتا ہوں کیوں کہ تفصیل بہت لمبی ہو جائے گی۔ صرف آخری فقرے پر غور کیجئے :

Thus with a kiss I die.

Kiss (بوسہ) اور جنسی عمل (embrace) دونوں کو موت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور چند سطریں پہلے جولیٹ کی لاش کو دیکھ کر رومیو کہہ چکا ہے کہ موت نے تیری سانسوں کا شہد چوس لیا ہے۔ اس کے بعد زیر غور سطور میں وہ ہونٹوں کو doors of breath کہتا ہے۔ جب بوسہ لیتے ہیں تو سانس رک جاتی ہے' یعنی سانس کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ لیکن جس طرح "نفس" بمعنی "سانس" بھی ہے اور بمعنی "گفتگو" بھی' اسی طرح breath بھی بمعنی "سانس" اور بمعنی "گفتگو" ہے۔ بوسہ لیتے وقت ہونٹ بند ہو جاتے ہیں یعنی سانس اور گفتگو دونوں کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بوسہ برابر ہے موت کے' موت جس نے جولیٹ کے ہونٹوں سے شہد چوس کر اس کی جان لے لی ہے۔ پھر die کے معنی "مرنا" بھی ہیں اور go بھی' اور Come بھی۔ لہٰذا موت یا بوسہ' جانا بھی ہے اور اپنے آپ میں آنا بھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ Come کے ایک معنی جنسی عمل کی تکمیل بھی ہیں۔ لہٰذا رومیو کی موت اس کے لیئے وصال بھی ہے اور وصل بھی۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا' اگر ان سات آٹھ مصرعوں کا پورا تجزیہ کروں تو کئی صفحے لگیں گے۔ لیکن اس ذرا سی مثال سے یہ واضح ہے کہ شیکسپیئر کو ان چیزوں سے کتنا شغف تھا جنہیں میں نے ایہام' رعایت' اور مناسبت سے تعبیر کیا ہے اور جنہیں ہمارے کتابی نقاد "لفظی بازی گری" قرار دیتے ہیں اور شرمناک چیز سمجھتے ہیں۔

اوپر میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میر انیس اور میر ببر علی اور حزن کے موقعے پر بھی ایہام اور رعایتوں کا التزام رکھتے ہیں۔ یہاں ایک ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ میر انیس کے مرثیے "جب کربلا میں داخلۂ شاہ دیں ہوا" میں جناب عباس کی جنگ اور شہادت کے بیان میں بیت ہے۔

رکھے ہوئے ہیں مشک پہ منہ پیار دیکھیئے
شانے کٹے ہیں شان علم دار دیکھیئے

علم دار حسینی کے دونوں شانے قلم ہیں لیکن وہ دانتوں سے مشک پکڑے ہوئے ہیں اور اسی عالم میں جام شہادت نوش کرتے ہیں۔ جناب علی اکبر اور امام حسین اپنے لشکر کے علم دار کی تلاش میں نکلے ہیں۔ حضرت علی اکبر کی نگاہ لاشۂ جناب عباس پر پڑتی ہے اور وہ پکار اٹھتے ہیں' شانے کٹے ہیں شانے' علم دار دیکھیئے۔ اصل مصرعے میں "شان علم دار" مضاف مضاف الیہ ہے۔ لیکن "شان" پر کسرہ کے باعث اسے "شانے" بھی پڑھ سکتے ہیں۔ ایسام صوت کا موقع ہاتھ آیا

میر انیس نے اسے فوراً استعمال کر لیا۔ بلاشبہ لمہ اپنی جگہ، لیکن شاعر بحر معنی
ر فن کاری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ میر انیس کی نگاہ میں درد و غم کے بیان
ر فن کاری کے اظہار میں کوئی تناقض نہیں۔

میر کی مثال کے لیئے میں محض ایک لفظ "واقعہ" کو پیش کرتا ہوں۔
واقعہ" کے حسب ذیل معنی اردو میں مستعمل ہیں :

(۱) کوئی بات جو پیش آئے، (۲) event (۳) حقیقت

(۴) خواب (۵) موت

میر نے لفظ "واقعہ" کئی بار استعمال کیا ہے۔ مندرجہ ذیل مثالیں دیکھیئے کہ ان
ں میر نے اس لفظ کے مختلف امکانات کو کس کس طرح اجاگر کیا ہے۔

دیوان اول : آیا جو واقعے میں در پیش عالم مرگ
یہ جاگنا ہمارا دیکھا تو خواب نکلا

دیوان دوم : ایسا نہ ہوا ہو گا کوئی واقعہ آگے
اک خواہش دل ساتھ مرے جیتی گڑی ہے

دیوان سوم : جہاں میں میر سے کاہے کو ہوتے ہیں پیدا
سنا یہ واقعہ جن نے اسے تاسف تھا

دیوان دوم : مرنے کے پیچھے تو راحت سچ ہے لیک
بیچ میں یہ واقعہ حائل ہے میاں

ایہام اور رعایت کو ایک دوسرے کا عکس کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے
وپر کہا، ایہام کی اقل شرطیں دو ہیں۔ اول یہ کہ کسی لفظ کے دو معنی ہوں، ایک
قریب اور ایک بعید۔ اور دوم یہ کہ شاعر نے بعید معنی مراد لیئے ہوں۔ اسی
طرح، رعایت کی کم سے کم شرطیں دو ہیں۔ اول یہ کہ کسی لفظ یا فقرے کے دو
معنی ہوں، ایک قریب اور ایک بعید۔ دوسری شرط یہ کہ قریب کے معنی بیان
کے مناسب ہوں، لیکن بعید معنی اسی جگہ کے کسی اور لفظ یا فقرے سے مناسبت
رکھتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایہام کے مقابلے میں رعایت زیادہ مشکل ہے۔ ایہام
کا اقتضا یہ ہے کہ ایسا لفظ یا فقرہ لایا جائے جس کے دو معنی ہوں۔ اور رعایت کا
اقتضا یہ ہے کہ ایسا لفظ یا فقرہ لایا جائے جس کے دو معنی بھی ہوں، اور ایک معنی
کا علاقہ اسی عبارت میں وہیں کہیں کسی اور لفظ یا فقرے سے بھی ہو۔ اسی اعتبار
سے یہ نکتہ بھی ہے کہ جس لفظ یا فقرے پر ایہام کی بنا رکھی گئی ہے اسے بدل کر
کوئی مرادف رکھ دیں تو کلام بے معنی ہو جائے گا۔ لیکن اگر رعایت والا لفظ یا
فقرہ بدل کر کوئی دوسرا ہا معنی مرادف یا قریبی مرادف رکھ دیں تو کلام بے معنی نہ
ہوگا، لیکن اس کی قوت کم ہو جائے گی۔

رعایت کی اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ رعایت بھی ایک
طرح کا ایہام ہے۔ "مناسبت" کو بھی پرانے لوگ رعایت کے عالم سے سمجھتے
تھے، کیوں کہ مناسبت کی بھی شرط یہی ہے کہ کلام میں الفاظ یا فقرے ایسے ہوں
ان کا آپس میں معنوی علاقہ ہو۔ لیکن ان دونوں میں ایک بنیادی فرق بھی ہے۔
رعایت میں الفاظ یا فقرہ کے مابین معنی کے علاقے کا محض گمان گزرتا ہے۔ اور

مناسبت میں معنی کا علاقہ واقعی ہوتا ہے۔ مناسبت کے ذریعہ شعر کے معنی میں جو
افزائش اور استحکام وجود میں آتا ہے وہ رعایت کے بس کا نہیں۔ یعنی مناسبت
کے معنی ہیں "کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال جو آپس میں معنوی علاقہ رکھتے
ہوں اور جو کلام کے معنی میں اضافہ کریں، یا اسے مزید قوت، یا وسعت، یا گہرائی
عطا کریں۔"

حالی اور آزاد کے زیر اثر جو شاعری پیدا ہوئی، اس کے رد عمل کے طور پر
(یا بزعم خود اس کی اصلاح کر کے، اور اس میں "نئی" خوبیوں کا اضافہ کر کے)
نظم جدید کے دوسرے، میرے دور کے جو شعرا سامنے آئے مثلاً جوش، سیماب، وغیرہ، وہ کلا
تصورات سے ناواقف تھے اور مغربی اقدار سے بھی بے بہرہ تھے۔ لہٰذا ان کا
نقصان سب سے زیادہ ہوا۔ ان شعرا کو مناسبت کی خوبیوں کی کچھ خبر نہ تھی۔
حسرت موہانی نے "محاسن سخن" میں مناسبت کا ذکر ضرور کیا تھا، لیکن نہ مثالیں
دی تھیں اور نہ تفصیل بیان کی تھی۔ متذکرہ بالا شعرا اور ان کے ساتھیوں کا
خیال تھا کہ "خیال" مکمل طور پر ادا ہو جائے تو کافی ہے۔ وہ اس نکتے کو نہ جانتے
تھے کہ خیال جتنی خوبی سے بیان کیا جائے، وہ اتنا ہی عمدہ ہو گا۔ یعنی حسن بیان
کے بغیر حسن خیال نہیں۔ وہ عام طور پر حسن بیان کو حسن خیال سے الگ سمجھتے
تھے۔ یہ لوگ رعایت کو سرسری قسم کی ضلع جگت سے زیادہ نہ سمجھتے تھے۔ ایہام
کی صرف اقل تعریف سے وہ واقف تھے، اور بہر حال وہ ایہام کو باعث شرم
سمجھتے تھے۔ بلکہ وہ لوگ ایہام خالص کو بھی برتنے پر قادر نہ تھے۔ عدم مناسبت
الفاظ، زبان کے امکانات کو تخلیقی طور پر بروئے کار لانے سے گریز، زبان کا
میکانکی اور بے روح استعمال، یہ جوش صاحب کے خاص صفات ہیں۔ اور جوش
ہی کیوں، اس زمانے کے تمام شعرا کا کم و بیش یہی حال تھا۔ فرق صرف درجے کا
تھا، نوع کا نہیں۔

رعایت اور ایہام جیسے تصورات کے زوال اور ان پر عمل کم و بیش
متروک ہو جانے سے ہماری شاعری کو جو نقصان پہنچا اس کی تلافی تھوڑی بہت تو
یوں ہوئی کہ آزاد و حالی کے زیر اثر "حقیقت نگاری" اور "جذبات نگاری" کو
فروغ ہوا اور ایسی شاعری کم ہو گئی جس میں ذہن پر زور دینا پڑے۔ لیکن
مناسبت کا تصور غائب ہو جانے، یا مناسبت کا لحاظ نہ رکھنے کے باعث جو نقصان
پہنچا اس کی محدود تلافی اسی وقت ہو سکی جب جدیدیت پر مبنی شاعری، اور خاص
کر جدیدیت پسند نظم کا بول بالا ہوا۔ جدیدیت کی شعریات میں بھی ایہام وغیرہ کی
گنجائش ہے۔ لیکن اس کا کام اس کے بغیر بھی چل سکتا تھا، اور چلا۔ جدیدیت
پسند نظم چونکہ زیادہ تر ذاتی تاثرات و تصورات پر مبنی تھی، اس لیئے اس نے
مناسب تشبیہات، استعارات اور علامات کو تو اختیار کیا، لیکن الگ سے
مناسبت وغیرہ پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جدیدیت
کا زمانہ آتے آتے کلاسیکی شعریات کی قدر و منزلت بالکل جاتی رہی تھی۔
جدیدیت نے اپنا جواز زیادہ تر غالب کے یہاں سے حاصل کیا، یا پھر مغربی غیر

افلاطونی نظریات ادب سے' جن میں علامت پرستی اور رومانیت سب سے زیادہ نمایاں تھیں- جدیدیت کو کلاسیکی ادب سے محبت تھی' لیکن ابھی اسے کلاسیکی شعریات کو دریافت کرنا تھا جس کی روشنی میں صرف غالب ہی نہیں' بلکہ تمام کلاسیکی ادب کو' اور خود غالب کو بھی' انھیں تقاضوں کی روشنی میں پڑھنا ممکن ہوتا جن تقاضوں نے کلاسیکی ادب کو جنم دیا تھا-

جدیدیت پسند نظم میں تجربہ اور اظہار کی آزادی پر زور سب سے زیادہ تھا- لہٰذا کلاسیکی تصورات شعر اس کی فوری ضرورت نہ تھے- اقبال نے اپنی نظم میں قدیم طرز کو بہت کچھ باقی رکھا تھا- اس لیئے ان کے یہاں مناسبت خوب کار فرما ہے- رعایت بھی موجود ہے' حتیٰ کہ وہ ایہام بھی برت لیتے ہیں- حالی اور آزاد کے زیر اثر اقبال بھی شاعری کو "پیغام" کا مرادف قرار دیتے تھے اور عام طور پر وہ اس بات سے انکار بھی کرتے تھے کہ وہ شاعر "یا فن کار" بھی ہیں- لیکن واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے یہاں "فن کاری" یا کلاسیکی طرز کی شعر گوئی جگہ جگہ کار فرما ہے- اقبال کے خیال کی جدت (یا اس کا معاصر حقیقت سے مربوط ہونا) اور پیغمبرانہ حکیمانہ لہجے کے باعث' اور اس باعث کہ ان کا کلام بعض سیاسی سماجی ضرورتوں کو پورا کرتا ہوا نظر آتا تھا' لوگوں نے ان کے "پیغام" پر فوری توجہ دی اور دل کھول کر اس کی داد دی' یا پھر سیاسی وجوہ کی بنا پر ان کے "پیغام" کی دل کھول کر مخالفت بھی ہوئی- اس شور غل میں اقبال کے فن کی طرف دھیان کم دیا گیا-

اقبال کے ساتھ دوسری بات یہ ہوئی کہ ان کے اولین ناقد سب کے سب حالی و آزاد کے معنوی شاگرد تھے- اور بعد میں آنے والے بھی یعنی ترقی پسند اور مکتبی ناقدین' دونوں اس بات پر متفق تھے کہ شاعری بجز خیالات کچھ نہیں- لہٰذا اقبال کے ادبی محاسن پر' اور خاص کر ان محاسن پر کوئی توجہ نہ ہوئی جو کلاسیکی شعریات کے مرہون منت تھے- اور کیوں ہوتی' جب کلاسیکی شعریات کے ارے میں یہ خیال عام تھا کہ وہ زیادہ تر انحطاط پذیر تصورات پر مبنی ہے اور اس ں "لفظی بازی گری" کے سوا کسی چیز کی اہمیت نہیں- ورنہ کلیات اقبال کا لوئی صفحہ کھولیئے' آپ کو رعایت' مناسبت' اور کہیں کہیں ایہام کی بھی جلوہ لری نظر آئے گی- ممکن ہے (بلکہ اغلب ہے) کہ اقبال نے ان چیزوں کو شعوری ور پر نہ اختیار کیا ہو' لیکن ہر اچھے شاعر کی طرح (اور اقبال اچھے ہی نہیں' ے شاعر بھی تھے) زبان کے امکانات کو بروئے کار لانا اور معنی کو بالقوۃ سے لفعل میں منتقل کرنا ان کا فطری رجحان تھا- میں نے ابھی کلیات اقبال کو رست دیکھے بغیر بس یوں ہی کھولا تو "شمع اور شاعر" کا آٹھواں بند سامنے تھا- ں کے ہر شعر میں مناسبتیں اور رعایتیں ہیں- میں شروع کے صرف تین شعر ش کرتا ہوں-

پردۂ دل میں محبت کو ابھی مستور رکھ
یعنی اپنی مے کو رسوا صورت مینا نہ کر

"مستور" کے معنی ہیں "چھپا ہوا-" عورتوں کو اسی لیئے "مستورات" کہتے ہیں کہ وہ پردے میں چھپی رہتی ہیں- لہٰذا "پردہ" اور "مستور" رعایت ہے' خاص کر جب یہ خیال کریں کہ لفظ "محبت" خود مونث ہے- "دل" کو "مینا" سے اور دل کے خون کو شراب سے تشبیہ دیتے ہیں- "رسوا" کے ایک معنی ہیں "کھلا ہوا' بے پردہ' وہ جسے سب کے سامنے کر دیا جائے' خاص کر اہانت کی غرض سے-" اب "دل" "مینا" "رسوا" "پردہ" اور "مے" کی مناسبت واضح ہے-

خیمہ زن ہو وادی سینا میں مانند کلیم
شعلۂ تحقیق کو غارت گر کاشانہ کر

حضرت موسیٰ کو وادی سینا میں اللہ تعالیٰ کی تجلی شعلے کی شکل میں دکھائی گئی تھی- اس شعلے نے کوہ طور کو جلا کر غارت کر دیا تھا- حضرت موسیٰ اس وقت تک ایک گھریلو آدمی تھے- وہ اپنی حاملہ بیوی حضرت صفورہ کو لے کر کہیں جا رہے تھے- رات کا وقت تھا' حضرت صفورہ کی طبیعت خراب ہوئی تو کوہ طور پر وہ آگ لینے گئے تھے اور شعلۂ جمال الٰہی نے ان کو پیغمبر بنا دیا' یعنی اب وہ گھریلو آدمی نہ رہ گئے' اللہ کے رسول بن گئے- اب انھیں گھر اور گھر والوں سے وہ مطلب نہ رہا جو کسی عام شخص کا ہوتا ہے- ان مناسبتوں کی روشنی میں "وادی سینا" "کلیم" "شعلہ" اور "غارت گر کاشانہ" کی معنویت اور لطف دوبالا ہو جاتے ہیں-

شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجام ستم
صرف تعمیر سحر خاکستر پروانہ کر

"شمع" اور "خاکستر پروانہ" میں مراعات النظیر تو ہے ہی' جو مناسبت کی ادنیٰ صورت ہے- "شمع" اور "ستم" میں بھی مناسبت ہے- ایک تو یہ کہ شمع کے شعلے کو تلوار سے تشبیہ دیتے ہیں اور دوسری یہ کہ پروانہ کی موت شمع کے عشق میں ہوتی ہے لیکن شمع اس قربانی کے باوجود پروانے کا کچھ خیال نہیں کرتی- باریک بات یہ ہے کہ تعمیر کے لیئے خاک استعمال کرتے ہیں' لہٰذا "تعمیر" اور "خاکستر" میں مناسبت ہے- مزید باریکی یہ کہ "خاکستر" کا رنگ بھورا (gray) ہوتا ہے اور سحر کو سفید فرض کرتے ہیں- لیکن اس سفیدی کے ضو دار ہونے سے پہلے آسمان کا رنگ خاکستری (gray) ہوتا ہے- لہٰذا "سحر" اور "خاکستر" میں بھی مناسبت ہے-

میں نے اوپر کہا ہے کہ اقبال کے کلام میں ایہام بھی نظر آتا ہے- یہ دعویٰ دلیل چاہتا ہے' لہٰذا چند مثالیں پیش خدمت ہیں-

مردم چشم زمیں یعنی وہ کالی دنیا وہ تمہارے شہدا پالنے والی دنیا
گرمی مہر کی پروردہ ہلالی دنیا عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا

تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

("جواب شکوہ")

"مردم چشم" (یعنی آنکھ کی پتلی' جو کالی ہوتی ہے) اور "کالی" میں

مناسبت ظاہر ہے۔ لیکن "کالی" میں ایہام بھی ہے کہ اس کے ایک معنی ہیں black جو قریب کے معنی ہیں، اور دوسرے معنی ہیں "کالے رنگ والوں کی۔" یہ بعید معنی ہیں اور یہی معنی شاعر نے مراد لیئے ہیں۔ "پالنے والی" میں بھی ایہام ہے۔ ایک معنی ہیں "پرورش کرنے والی" اور ایک معنی ہیں "گود میں لیئے رہنے والی۔" اول الذکر معنی قریب کے ہیں، موخر الذکر معنی بعید ہیں، اور وہی مراد شاعر ہیں۔ یعنی افریقہ کی زمین مسلمانوں کے شہدا کو آغوش میں لیئے ہوئے ہے۔ اول الذکر معنی بھی نامناسب نہیں۔ یعنی یہ وہ زمین ہے جو ایسے لوگوں کو پالتی پوستی ہے جو بڑے ہوکر شہید ہوں گے (افریقی مسلمانوں اور مغرب کے سامراجی حاکموں کے درمیان جہاد کی تاریخ بہت پرانی اور خونیں ہے۔ یہاں فوری حوالہ الجیریا، مراکش اور سوڈان کے مسلمانوں کے جہاد کا معلوم ہوتا ہے۔) "مہر" بمعنی "سورج" ہے۔ یہ معنی قریب کے ہیں، لیکن بعید معنی ("مہر = محبت، عشق") بھی کار آمد ہیں، جیسا کہ اگلے مصرعے سے معلوم ہوتا ہے۔ "ہلالی" میں بھی ایہام ہے۔ اس کے قریبی معنی ہیں "ہلالی شکل کی" لیکن یہ معنی مراد نہیں۔ بعید معنی ("اسلامی") مراد ہیں، کہ ہلال کو تمام دنیا میں اسلام کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ "بلالی" میں پھر ایہام ہے۔ قریب کے معنی ہیں "حضرت بلال کا دیس، حضرت بلال جہاں سے آئے وہ خطۂ زمین۔" یہ معنی مناسب ہیں، لیکن مراد شاعر ہے "وہ دنیا جس کے باسیوں میں حضرت بلال جیسی صفات عشقیہ پائی جاتی ہیں۔" بیت کے مصرعوں میں ایہام نہیں، لیکن گذشتہ چار مصرعوں کے کلیدی الفاظ سے مناسبت رکھنے والے الفاظ بہت ہیں۔ ("آنکھ کا تارا" محاورہ ہے لہٰذا اس کو شاعر کا بنایا ہوا ایہام نہیں کہہ سکتے، مگر ایہام اس میں بہرحال موجود ہے کہ آنکھ کی پتلی جو سیاہ ہوتی ہے، اسے "تارا" یعنی روشن شے کہا جارہا ہے۔)

ہر چیز ہے محو خود نمائی
ہر ذرہ شہید کبریائی
تیری قندیل ہے ترا دل
تو آپ ہے اپنی روشنائی
اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمود سیمیائی

("بال جبریل")

"شہید" کے قریب معنی ہیں "اللہ کی راہ میں جان دینے والا" جو مراد شاعر نہیں۔ مراد شاعر ہے "گواہ" جو بعید معنی ہیں۔ "روشنائی" کے قریب معنی ink مراد نہیں، بلکہ دور کے معنی ("روشنی") مراد ہیں۔ "باقی" کے قریبی معنی ہیں "وہ جس کو بقا ہے" اور مصرع اولیٰ میں "حق" کی وجہ سے خیال آتا ہے کہ یہی معنی مراد ہوں گے، لیکن جب مصرع پورا ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ "باقی" بمعنی "بقیہ چیزیں" ہے۔

عشق و مستی نے کیا ضبط نفس مجھ پہ حرام
کہ گرہ غنچے کی کھلتی نہیں بے موج نسیم

("فقر و ملوکیت۔" "ضرب کلیم")

"نفس" کے معنی قریب ہیں "سانس" اور معنی بعید ہیں "گفتگو، تکلم۔" یہاں یہی بعید معنی مراد ہیں۔ لیکن معنی اول بھی بالکل بے کار نہیں۔ "نفس" بمعنی "سانس" اور "موج نسیم" میں لطیف رعایت ہے۔

یہ مثالیں اس بات کو ثابت کرنے کے لیئے کافی ہیں کہ اقبال کے یہاں رعایت، مناسبت، اور ایہام کا اہتمام موجود ہے، چاہے اس کثرت اور تسلسل سے نہ ہو جو ہمیں میر، غالب، میر انیس وغیرہ کے یہاں نظر آتا ہے۔ شاعری کے منصب اور شعر کے تفاعل کے بارے میں اقبال کے خیالات سے ہمیں اتفاق ہو یا نہ ہو، لیکن ان کی شعری عمل آوری practice سے کم و بیش پورا اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ اقبال کو کلاسیکی طور طریقوں سے پوری آگاہی تھی اور وہ جدید مغربی تصورات سے بھی اچھی طرح آشنا تھے۔ ان کے برخلاف، جوش جیسے شعرا جو "کلاسیکی رکھ رکھاؤ" کے ساتھ "جدید خیالات" کو بیان کرنے کے دعوے دار تھے، نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم کے مصداق ہو کر رہ گئے۔ "کلاسیکی رکھ رکھاؤ" سے ان کی آشنائی آزاد، حالی، طباطبائی، حسرت موہانی اور حد سے حد شبلی کی تحریروں کے ذریعہ تھی۔ تمام علمیت اور سنجیدگی اور خلوص نیت کے باوجود اردو کی کلاسیکی شعریات سے ان حضرات کی واقفیت بعض تعصبات اور بعض نقصان دہ مغربی اثرات کی بنا پر ناقص رہ گئی۔ جب شبلی جیسے لوگ بعض مغربی خیالات سے اثر پذیری اور "ایرانی مذاق" کو سبک ہندی پر فوقیت دینے کے باعث کلاسیکی اردو غزل کے سچے مزاج شناس نہ بن سکے، تو پھر جوش جیسے لوگوں سے کہاں ممکن تھا کہ وہ ہماری کلاسیکی روایت سے واقف بھی ہوں، اسے سمجھنا تو بڑی بات ہے۔ "جدید خیالات" سے ان لوگوں کی ملاقات اکثر اور حد سے حد بی۔ اے میں پڑھائی جانے والی انگریزی نظموں تک محدود تھی۔ اور یہ نظمیں انھیں جس طرح پڑھائی گئی تھیں اور جس نظریۂ شعر کی تربیت انھیں ملی تھی، اس کی رو سے شیلی، ٹی ایس، ٹامس گرے، ٹامس مور اور ورڈز ورتھ وغیرہ سب ایک ہی طرح کے شاعر تھے (یعنی سب ایک درجے کے اچھے شاعر تھے۔)

مثال کے طور پر گرے کی Elegy کا ترجمہ طباطبائی نے کیا، اگرچہ وہ انگریزی بہت کم جانتے تھے۔ پھر ان کی دیکھا دیکھی اس نظم کے متعدد ترجمے ہوئے، اور ایک سے ایک خراب۔ لیکن، ان تمام تراجم کے ذریعہ جس ہوشمندی (Sensibility) کا اظہار ہوتا تھا (بلکہ جن مختلف ہوشمندیوں کا اظہار ہوتا تھا) ان سب کو ہی مغربی یا انگریزی ہوشمندی سمجھ لیا گیا۔ نادر کاکوری نے جو تراجم انگریزی سے کیئے، وہ بھی ایسی ہی نظموں کے تھے جو اسکول کالجوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ بلکہ ان کے بعض تراجم تو ایسی نظموں کے تھے جو

چھٹے ساتویں درجے سے زیادہ کے معیار کی نہ تھیں۔ انگریزی سے نادر کاکوری کی واقفیت کا یہ عالم تھا کہ وہ Rose Hartwick Thorpe نامی شاعر کو مرد سمجھتے تھے' حالانکہ وہ عورت تھی۔

نادر کاکوروی کے تراجم بھی اصل سے اتنی ہی دور تھے جتنے طباطبائی اور ان کے مقلدوں کے تراجم تھے۔ لیکن ان کو بھی انگریزی ہوشمندی کا مظہر سمجھا گیا' اور کہا گیا کہ ان اور اس طرح کے تراجم کی بنا پر اردو ادب میں انگریزی شاعری کی حسیت عام ہونے لگی ہے۔ چنانچہ "جذبات نادر" (مطبوعہ ۱۹۱۰) کی تقریظ میں عبدالحلیم شرر نے لکھا کہ "حضرت نادر نے کوشش کی ہے کہ انگریزی شاعری کے لطیف مذاق کو اردو میں پیدا کریں... حضرت نادر نے شعرا ے اردو کی ایک نئے میدان میں رہبری کی ہے۔" مرزا محمد ہادی رسوا نے لکھا کہ نادر کا مذاق شعر جس انداز کا ہے وہ "ہمارے ملکی شعرا میں کم تر اور شعراے یورپ میں بیش تر ہے۔" مولوی عزیز مرزا نے فیصلہ دیا کہ نادر "اچھی طرح جانتے ہیں کہ مغرب کے خیالات کو مشرق کی شاندار زبان میں کیوں کر ادا کریں۔" لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ نادر کاکوروی ہی کیوں' اس زمانے کے تقریباً تمام مترجمین کو انگریزی شاعری کی بالکل مبتدیانہ شدبد تھی۔ زبان وہ بہت کم جانتے تھے' اور اس شعریات اور تصور کائنات سے وہ بالکل بے خبر تھے جس نے انگریزی شاعری کو جنم دیا تھا۔ لیکن یہی لوگ اور ان کے تراجم ہمارے عام پڑھنے والوں اور معمولی انگریزی داں شاعروں کے لیئے "جدید مغربی خیالات" کے پیام بر بنے۔

انگریزی سے جو نظمیں ہمارے یہاں ترجمہ کی گئیں ان میں کچھ ایسی نظمیں تھیں جن میں شاعر کی مختصر سی ملاقات کسی لڑکی' یا بچے' یا پر اثر شخصیت سے ہوتی ہے۔ جوش کی نظم "جنگل کی شاہزادی" اسی طرح کی نظموں کے اتباع میں لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جوش صاحب انگریزی نظموں کی اصل روح سے بے خبر تھے' اور اردو کے کلاسیکی طور طریقوں سے نا آشنا تھے۔ مثلاً انھوں نے "جنگل کی شاہزادی" میں ایک دیہاتی لڑکی سے اپنی ملاقات افسانوی (اور اپنے خیال میں رومانی) انداز میں بیان کی۔ گویا انھوں نے ظاہر کیا کہ انگریز شعرا کی طرح انھیں بھی اس بات کا احساس ہے کہ حسن فطرت' یا وہ حسن جو فطرت سے قریب ہو' زیادہ موثر اور "فطری" اور "سچا" ہوتا ہے۔

انھیں یہ تو معلوم نہ تھا کہ ایسے حسن کو انگریزی والے بیان کس طرح کرتے ہیں' لیکن یہ بات وہ ضرور جانتے تھے کہ اردو میں سراپا نگاری کی رسم ہے۔ لہٰذا انھوں نے جھٹ ایک سراپا بزعم خود نظم کر دیا۔ سراپا' یا کسی بھی کلاسیکی صنف (یا ذیلی کلاسیکی صنف) میں مناسبت الفاظ کی مرکزی اہمیت ہوتی ہے' تاکہ بیان مربوط ہو اور معشوق (یا حسین شخص' جس کا سراپا لکھا جا رہا ہے) اس کی جسمانی شخصیت کا نامیاتی اور مصورانہ بیان ہو سکے۔ سراپا نگاری کے کچھ رسومیات بھی تھے۔ وہ شاعر جو تخیل کی زیادہ بلندی یا پیکر کی رنگا رنگی پر قدرت

نہ رکھتے تھے' انھیں رسومیات کے سہارے اپنا کام چلا لیتے تھے۔ جوش صاحب کو مناسبت الفاظ کے فن سے واقفیت نہ تھی' اور نہ وہ سراپا نگاری کی رسومیات جانتے تھے۔ (یا اگر وہ اسے جانتے بھی تھے تو اسے سال خوردہ "غیر حقیقی" اور ان تنجل شاعری کا طور قرار دیتے ہوں گے) اب دیکھیے انھوں نے "جنگل کی شاہزادی" میں سراپا نگاری کے نام پر اردو شاعری کو کس طرح رسوا کیا ہے۔ پورا سراپا ناقابل برداشت ہے' لہٰذا صرف پانچ شعر نقل کرتا ہوں:

زاہد فریب' گل رخ' کافر' دراز مژگاں
سیمیں بدن' پری رخ' نوخیز' حشر ساماں
خوش چشم' خوبصورت' خوش وضع' ماہ پیکر
نازک بدن' شکر لب' شیریں ادا' فسوں گر
کافر ادا' شگفتہ' گل پیرہن' سمن بو
سرو چمن' سہی قد' رنگیں جمال' خوشرو
گیسو کمند' مہوش' کافور فام' قاتل
نظارہ سوز' دلکش' سرمست' شمع محفل
ابرو ہلال' سے گوں' جاں بخش' روح پرور
نسریں بدن' پری رخ' سیمیں عذار' دلبر

یوں تو مندرجہ بالا اشعار کو شاعری سے زیادہ موزوں تک بندی ہی کہنا چاہیے' لیکن اس سے تنقید کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اگر بقول فرینک کرموڈ Frank Kermode کسی نظم پر بہترین رائے زنی کسی اور نظم سے ہی ہوتی ہے' تو اس سراپا کی سب سے آسان تنقید یہ ہے کہ کسی اوسط درجے کے کلاسیکی شاعر کے یہاں سے کوئی سراپا نقل کر دیا جائے۔ زیادہ دور نہ جائیں تو "داستان امیر حمزہ" ہی میں سے کوئی نمائندہ سراپا اٹھا لیں۔ لہٰذا ملاحظہ ہو "طلسم ہوش ربا" جلد سوم (مصنف احمد حسین قمر' مطبوعہ ۱۸۹۳) کے صفحہ ۲۰۰ پر ہے۔

کیا خوب جبیں ہے مطلع نور
رنگ رخ صبح جس سے کافور
شیرازہ پے کتاب ہر ناز
فہرست جریدہ ہاے اعجاز
صحبت میں جو بار یاب ہو جائے
آئینہ حیا سے آب ہو جائے
دونوں رخ صاف باغ امید
گویا ہے قران ماہ و خورشید
سینے کے بیاں کیا ہوں اوصاف
ڈبیاں معجون باہ کی صاف
کیا نور ابد ملا ازل میں
سینہ ہے کہ آئینہ بغل میں
پر نور شکم ہے آئینہ صاف

ہے چاہ ذقن کا عکس وہ ناف
چیتے کی کمر بہت ہے مشہور
نازک ہے یہ اس سے چشم بد دور
توصیف ہو زانوؤں کی کیوں کر
دو پلۂ حسن ہیں برابر

سب سے پہلی بات تو یہ کہ جوش صاحب صرف فوں فاں کرتے رہے ہیں۔ وہ دور ہی دور سے جسم کا طواف کرتے رہے ہیں۔ ورنہ کوئی واقعی عضو بدن انھوں نے نہ دیکھا ہے اور نہ ہمیں دکھا سکتے ہیں۔ موٹی موٹی تعمیمی باتوں سے آگے جانے کی ہمت ان میں نہیں۔ "طلسم ہوش ربا" سے جو سراپا میں نے بالکل یوں ہی سرسری تلاش کے بعد اخذ کیا ہے' وہ اس داستان کے عام معیار سے ذرا کم تر ہے۔ اور میں نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہے' کہ جوڑی کچھ تو برابر کی ہو۔ لیکن شاعری تو دور رہی' بدن کے بیان میں بھی یہ سراپا "جنگل کی شاہزادی" سے بہت آگے ہے۔ اس میں جبیں' رخسار' سینہ' بغل' شکم' ذقن' ناف' کمر' زانو' اتنے اعضا سے ہم دو چار ہوتے ہیں۔ جوش صاحب مژگاں' لب' گیسو' ابرو' عذار سے آگے نہیں جاتے۔ اور ان کا ذکر بھی وہ الگ الگ' ٹھٹک ٹھٹک کر' اٹھلا اٹھلا کر' رکتے رکتے کرتے ہیں۔ اور ذکر بھی صرف نام کی حد تک۔ صفت یا ثنا کچھ نہیں بیان کرتے۔ (بلکہ بیان کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔) محمد حسین جاہ نے اپنے سراپا میں تمام اعضا کی صفات بیان کی ہیں' اور زیادہ تر ایسے الفاظ ہیں' جن میں پیکر کا انداز نمایاں ہے۔

ممکن ہے کہا جائے کہ جوش صاحب سراپا نہیں لکھ رہے ہیں۔ وہ تو لڑکی کے حسن کا بیان شاعرانہ لہجے میں کر رہے ہیں۔ یعنی وہ اپنی ہی طرح کی نظم لکھ رہے ہیں' سراپا کی رسومیات سے ان کا کچھ لینا دینا نہیں۔ اور نہ انھیں مغربی شاعری سے کوئی خاص تمتع حاصل کرنے کا دعویٰ ہے۔ لہٰذا آیئے جوش صاحب کے اشعار کا محاکمہ شاعری کے معیار سے کریں۔

ایک ہی نظر میں بات کھل جاتی ہے کہ اگر بے جا تکرار' بے جوڑ اجتماع الفاظ' بے معنی اور رسمی صفاتی الفاظ کے مجموعے کا نام شاعری ہے تو اور بات ہے' ورنہ جوش صاحب کے منقولہ بالا اشعار کسی طرح شاعری کہلانے کے مستحق نہیں۔ اور ان کا سب سے بڑا عیب الفاظ کی عدم مناسبت ہے' اور جب عدم مناسبت ہو تو تکرار بھی اکثر پیدا ہو جاتی ہے۔ بہر حال' مصرع مصرع کر کے دیکھتے ہیں۔

(۱) زاہد فریب گل رخ کافر دراز مژگاں

زاہد فریب اور کافر میں ایک حد تک مناسبت ہے۔ لیکن زاہد فریب اور گل رخ میں کوئی مناسبت نہیں۔ گل رخ اور دراز مژگاں میں بھی کوئی مناسبت نہیں۔ لیکن خیر' پہلا ہی مصرع ہے۔ ممکن ہے آئندہ کوئی بات نکلے۔ اس وقت تو اتنا ہی ہے کہ گل رخ انسان کی صفت مانی جاتی ہے۔ دراز مژگاں انسانوں کے علاوہ آہوؤں وغیرہ کی صفت بھی ہے۔ لیکن چلئے' دراز مژگانی حسینوں کی

صفت ہے' اس لیئے قابل قبول ہے۔ حالانکہ "گل رخ" سے مراد پھول جیسا (نازک' گلابی' شاداب' وغیرہ) چہرہ ہے اور "دراز مژگان" کسی اور ہی عالم کی چیز ہے۔ دونوں میں کوئی ربط و مناسبت نہیں۔

(۲) سیمیں بدن پری رخ نوخیز حشر ساماں

سیمیں بدن کا گذشتہ مصرعے سے کوئی تعلق نہیں' کہ وہاں بات گل رخی اور درازی مژگاں کی تھی۔ گل رخ کے بعد پری رخ میں رخ کی تکرار بھی ہے' اور مضمون کی پستی بھی' کہ پورے بدن کو سیمیں کہا' لیکن صرف چہرے کو پری کا چہرہ بتایا۔ نوخیز میں تکرار در تکرار ہے' کہ جو گل رخ اور سیمیں بدن ہے وہ نوخیز تو ہوگا ہی۔ (اس کے پہلے کہہ بھی چکے ہیں کہ دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی ہے۔ (اگر لڑکیاں نوخیز نہیں ہوتیں تو کیا بوڑھی عورتیں نوخیز ہوتی ہیں؟) یہ تینوں فقرے انتہائی رسمی ہیں' بلکہ مصرع اولیٰ کے بھی چاروں فقرے بالکل رسمی اور معنی باختہ ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر کا تعلق لڑکی کے ظاہری سراپا سے تو ہے۔ جسمانی اور حسیاتی بیان نہ سہی' موضوع سے متعلق بیان تو ہے۔ اگلے فقرے میں جوش صاحب اسے بھی ترک کر دیتے ہیں۔ اب اچانک ایک بالکل رسمی اور ساتھ ہی ساتھ نامناسب فقرہ (حشر ساماں) سامنے آتا ہے۔

"حشر ساماں" سے زیادہ نامناسب فقرہ یہاں مشکل ہی سے ہوگا۔ حشر ساماں کے پہلے جو کچھ اب تک کہا گیا تھا وہ محض Bombast' محض لندھور بن سعدان کی بے لطف داستان تھی' لیکن کم و بیش سراپے سے متعلق تھی۔ اب وہاں سے کھسکا کر ایک اور بھی عمومی لیکن جسم کو صورت سے زیادہ عمل سے متعلق بات پر اٹکا دیا۔ بہر حال چلئے' یہ شعر کا آخری لفظ ہے' ممکن ہے اگلے شعر میں اس سے مربوط کوئی مضمون ہو (ملحوظ رہے کہ جوش صاحب غزل کے خلاف اس لیئے تھے کہ اس کے اشعار میں ربط نہیں ہوتا۔)

(۳) خوش چشم خوبصورت خوش وضع ماہ پیکر

سخت مایوسی ہوتی ہے کہ حشر سامانی کی تفصیل کے بجائے خوش ۔۔ خوب ۔۔ خوش کی تکرار سنی پڑتی ہے۔ چلئے خوش چشم کا تھوڑا سا جواز ہے' لیکن لڑکی گل رخ' پری رخ ہے' اسے پھر خوبصورت کہہ کر مضمون کو پست کرنا اور فضول تکرار کے ذریعہ ذلیل کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور لڑکی خوبصورت ہے' سیمیں بدن ہے' نوخیز ہے' وہ خوش وضع تو ہوگی ہی۔ کیا خوش وضع ہونا' سیمیں بدن ہونے سے بڑھ کر ہے؟ اور پھر جب وہ سیمیں بدن ہے تو پھر اسے ماہ پیکر کہنا کیوں؟ سیمیں بدن اور ماہ پیکر تقریباً ہم معنی ہیں' انتہائی رسمی ہیں' اور اثر کے لحاظ سے برابر ہیں۔

(۴) نازک بدن شکر لب شیریں ادا فسوں گر

نازک بدن اگر ہیر کے پھل کے معنی میں ہے تو اور بات ہے۔ ورنہ جو محض خوبصورت' سیمیں بدن' گل رخ' پری رخ وغیرہ وغیرہ ہو' اسے نازک بدن کہنا' رتبۂ معشوق سے گرا دینا اور تکرار کے باسی بدبودار پھولوں کا ہار پہنانا ہے۔ بہر حال' نازک بدن اور ماہ پیکر میں تھوڑی سی مناسبت تھی' شکر لب کہہ

کر اسے بھی ضائع کر دیا۔ شکر لب تو اس وقت مناسب تھا جب بوسہ لے کر دیکھا ہوتا۔ دور سے کیسے کہہ دیا کہ شکر لب ہے؟ چلئے مان لیا کہ دور ہی سے میٹھے لبوں والی لگ رہی تھی لیکن اس کی شیریں ادائی کیسے معلوم کرلی؟ ابھی تو پاس بھی نہیں گئے ہیں' بات بھی نہیں کی ہے۔ شکر لب اور شیریں ادا یہ پہلی صحیح مناسبت تھی جو ہمارے شاعر نے دریافت کی تھی۔ لیکن افسوس کہ دونوں فقرے صحیح جگہ پر نہیں ہیں۔ پھر غضب یہ کیا کہ فسوں گر لکھ دیا۔ اگر شیریں ادائی کو فسوں گری مان بھی لیں تو بقیہ سب فقروں کو کدھر لے جائیں؟ چلئے خوش چشم کو فسوں گر فرض کرلیا' لیکن خوش وضع' خوبصورت' نازک بدن' یہ سب فسوں گری کی شان ہیں' یا ان سب میں شان فسوں گری ہے۔ لہٰذا فسوں گری بے معنی ہے' یا یہ فقرے بے معنی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ فقرے ہی اس قدر رسمی اور بے روح ہیں' اور اس میکانیکی ڈھنگ سے برتے گئے ہیں کہ بے معنی ہی لگتے ہیں۔

(۵) کافر ادا شگفتہ گل پیرہن سمن بو

ابھی ابھی اسے شیریں ادا اور کافر کہہ چکے تھے' اب کافر ادا کہا' گویا ان کے خیال میں کافر ادائی کوئی اور چیز ہے اور کافری اور شیریں ادائی اور چیز ہے۔ ہو گا' لیکن ان میں اتنا کم فرق ہے اور یہ سب فقرے اتنے رسمی اور مشینی ہیں کہ یہاں تک آتے آتے دماغ چکرانے لگتا ہے۔ پھر ابھی گل رخ' نوخیز' نازک بدن' سب کچھ کہہ چکے تھے' مگر قادر الکلامی کی شہرت کے باوجود' جوش صاحب کے یہاں در اصل الفاظ کی اس قدر کمی ہے اور تخیل کی ناکامی اس قدر زبردست ہے کہ پھر شگفتہ کہہ دیا' گل رخ اور پری رخ کو گل پیرہن کہہ دیا۔ اور ابھی لڑکی کے قریب بھی نہیں پہنچے لیکن اسے سمن بو کہہ دیا۔ تکرار اور عدم مناسبت کا بازار گرم ہے۔ شگفتہ' اور گل پیرہن اور سمن بو میں مناسبت ہے۔ لیکن کافر ادائی سے ان کا مطلب نہیں۔ اور یہ صفات کافر ادا کے بعد لائی گئی ہیں' لہٰذا انہیں کافر ادائی کی وضاحت کرنا چاہئے تھی۔ لیکن جو چیز محض رسمی' فرضی اور مشینی طور پر لائی گئی ہو' اس کی وضاحت کہاں ممکن تھی؟ چار رسمی فقرے اور جس فقرے سے آغاز کلام کیا (کافر ادا) اس کی کوئی مناسبت بعد کے فقروں سے نہیں' اگلے مصرعے سے بھی نہیں۔ الا یہ کہ سب فقرے رسمی اور مشینی ہیں۔

(۶) سرو چمن سہی قد رنگیں جمال خوش رو

خدا معلوم معمولی سرو نے کیا بگاڑا تھا کہ سرو چمن کہا' اور پھر سہی قد کہہ کر اس کی تکرار کیوں کی؟ رنگیں جمال کا فقرہ بے معنی ہے (بے رنگ جمال کون سا ہوتا ہے؟) اور گل رخ' گل پیرہن' شگفتہ وغیرہ وغیرہ کہنے کے بعد رنگیں جمال چہ معنی دارد؟ مناسبت اب بھی غائب ہے۔ اور خوش رو کہہ کر تو بیڑا ہی غرق کر دیا۔ پورے مصرعے میں کسی لفظ سے خوش رو کو کوئی مناسبت نہیں۔ اور اب تک خوش وضع' خوش چشم وغیرہ ہو چکا تھا تو کون سا فائدہ حاصل ہوا تھا کہ خوش رو بھی کہہ دیا؟

سچی بات یہ ہے کہ یہ سارا تجزیہ اس قدر اکتا دینے والا ہے کہ آگے کی ہمت نہیں پڑتی۔ ایک سادہ سا نقشہ بنا کر بات ختم کرتا ہوں۔

مصرع نمبر	مناسبت	عدم مناسبت	تکرار
۱۔	زاہد فریب کافر	گل رخ دراز مژگاں	
۲۔		سیمیں بدن نوخیز حشر ساماں	پری رخ
۳۔	خوش چشم خوش وضع	ماہ پیکر	خوش چشم خوبصورت خوش وضع ماہ پیکر
۴۔	شکر لب شیریں ادا	نازک بدن فسوں گر	نازک بدن
۵۔	گل پیرہن سمن بو شگفتہ	کافر ادا	کافر ادا شگفتہ
۶۔		سرو چمن رنگین جمال خوش رو	سرو چمن سہی قد رنگیں جمال خوش رو
۷۔		کافور فام قاتل گیسو کمند	مہ وش
۸۔		نظارہ سوز دل کش سرمست شمع محفل	دل کش
۹۔	جاں بخش روح پرور	ابروہلال بے گوں	
۱۰۔		دلبر پری رخ سیمیں عذار دلبر	نسریں بدن پری رخ سیمیں عذار

اب اور کیا باقی رہا ہے؟ اتمام حجت کے لیے "طلسم ہوش ربا" والے سراپا کے اول دس مصرعوں کا نقشہ بھی بنائے دیتا ہوں۔

مصرع نمبر	مناسبت	عدم مناسبت	تکرار
۱-	جبیں		
	مطلع		
	نو ر		
۲-	رنگ رخ صبح		
	کافور		
۳-	شیرازہ	ناز	
	کتاب		
۴-	فہرست		
	جریدہ		
	اعجاز (ناز)		
۶-	آئینہ		
	آب		
	حیا		
۷-	رخ	باغ امید	
	صاف		
۸-		قرآن ماہ و خورشید	ماہ و خورشید (باغ کے لیئے نامناسب رخ کے لیئے مناسب)
۹-	سینہ		
	(او) صاف		
۱۰-	ڈبیاں		
	معجون باہ		
	صاف		

یہ کہنے کی ضرورت شاید نہ ہو کہ "ہوش ربا" والے سراپے میں مصرعے چھوٹی بحر کے ہیں۔ اور پھر بھی شاعر نے حروف عطف و جار' افعال وغیرہ لاکر بیان کو مربوط رکھا ہے۔ جوش صاحب کی بحر مثمن ہے۔ لیکن انھوں نے صرف صفات جمع کیئے ہیں۔ ان کو جوڑنے کی کوشش کرتے تو اور مشکل ہوتی۔ افعال وغیرہ سے خالی مصرعے خوب لگتے ہیں۔ اگر ان سے کوئی معنوی یا ریٹوریقائی حسن حاصل ہو۔ یہاں تو کوئی نہیں مصرعے صرف فہرست ہی فہرست ہیں۔ اور فہرست بھی گویا پنساری کی دوکان جیسی ہے۔

اس قسم کی دراز نفسی اور عدم مناسبت سے جوش صاحب کا کلام بھرا پڑا ہے۔ ان کی ایک اور مشہور نظم "فتنۂ خانقاہ" جو اچھی طربیہ نظم ہے' اور اعلیٰ درجے کی ہوتی اگر اس میں بھی وہی عیوب نہ ہوتے جو ہم نے "جنگل کی شاہ زادی" میں ابھی دیکھے۔

ایہام' رعایت اور مناسبت' اردو شعرا نے معنی آفرینی کے یہ تین نئے طریقے کم و بیش از خود دریافت کیئے۔ یہ زمانہ سترھویں صدی کے اواخر اور

اٹھارویں صدی کے اوائل کا تھا۔ پھر کوئی سو برس تک کلاسیکی غزل' بلکہ کلاسیکی شعر کی شعریات میں کوئی نیا موڑ نہ آیا۔ پھر اٹھارویں صدی کے اواخر میں (غالب کے سال پیدائش ۱۷۹۷ سے پانچ سات برس پہلے) دلی میں شاہ نصیر۔ اور لکھنؤ میں ناسخ نے خیال بندی کا آغاز کیا۔ شاہ نصیر کا سال تولد نہیں معلوم لیکن نصیر و ناسخ کی تاریخ وفات ایک ہے۔ (۱۸۳۸) اس وقت تک خیال بندی پوری طرح جم چکی تھی' اور اس طرز کے سب سے بڑے شاعر غالب نے اپنی استادی قائم کرلی تھی۔ ذوق تو پہلے ہی اس رنگ کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ مومن نے بھی اس انداز کو ایک حد تک اپنایا تھا۔

مصحفی نے ناسخ کو اس طرز نو کا موجد ٹھہرایا ہے۔ اور آتش کو حتیٰ کہ خود کو بھی' اس اسلوب میں ناسخ کا تبع قرار دیا ہے۔ ناسخ کی پیدائش ۱۷۷۱ ر ۱۷۷۲ کی ہے' اور انھوں نے (بقول مصحفی) بیس ۲۰ برس کی عمر میں (بیس قمری برس یعنی ۱۷۸۹/۱۷۹۰ سے) شعر کہنا شروع کیا تھا۔ شاہ نصیر ۱۷۵۵ اور ۱۷۶۰ کے درمیان پیدا ہوئے ہوں گے' اور انھوں نے ۱۷۷۵۔ ۱۷۸۰ کے درمیان شاعری شروع کی ہوگی۔ اس اعتبار سے شاہ نصیر کو خیال بندی کے اسلوب میں اولیت ہونا چاہیئے۔ لیکن ممکن ہے شاہ نصیرالدین نے بھی شروع شروع میں عام طرز (میر اور سوز کا طرز) میں شعر گوئی کا آغاز کیا ہو' اور بعد میں ناسخ کے رنگ کی طرف مائل ہوئے ہوں۔ مصحفی نے تو صاف لکھا ہے۔ کہ ناسخ نے "طرز ریختۂ گویان سادہ کلام" پر عرصۂ قلیل میں "خط نسخ" کھینچ دیا۔ اس پر تفصیل کے لیئے رشید حسن خاں کا دیباچۂ "انتخاب ناسخ" مطبوعہ مکتبہ جامعہ ملاحظہ ہو۔ نو احمد علوی کا کہنا ہے کہ شاہ عالم کے آخری زمانے (وفات ۱۸۰۶) تک شاہ نصیر کی شہرت اطراف ملک میں پھیل چکی تھی۔ مصحفی نے بھی "ریاض الفصحاء" میں ایسا ہی لکھا ہے (تاریخ ترتیب ۱۸۰۶) لیکن مصحفی نے شاہ نصیر کو موجد طرز نہیں کہا ہے۔ اس کے برخلاف انھوں نے "تذکرۂ ہندی" (تاریخ ترتیب ۱۷۹۴) میں شاہ نصیر کی درا کی طبع وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ناسخ کا ترجمہ اس میں نہیں ہے۔ اس سے یہ خیال گزرتا ہے کہ شاہ نصیر نے ناسخ کے پہلے اپنا رنگ پوری طرح واضح نہ کیا تھا' اور دونوں ہی شعرا نے کم و بیش ایک وقت میں اس طرز نو کو اپنایا جسے ہم "خیال بندی" کہتے ہیں۔

بہر حال' یہ بات بنیادی طور پر اہم نہیں ہے کہ خیال بندی کو اردو میں رائج کرنے کا سرا شاہ نصیر اور ناسخ دونوں کے سر ہے یا صرف ناسخ کے سر۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اٹھارویں کے اواخر یا انیسویں صدی کے بالکل اوائل میں خیال بندی ایک ایسے طرز کے طور پر رائج ہوئی جسے اردو غزل کا نیا موڑ کہا جاسکتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل کی دلی میں بقول محمد حسین آزاد' علم استادی شاہ نصیر کے ہی ہاتھ میں تھا۔ لیکن یہ بھی ہے کہ ناسخ کی غزل جب جب لکھنؤ سے آتی تھی تو ذوق اس پر بطور خاص غزل کہتے تھے۔ ممکن ہے یہ بات محمد حسین آزاد نے ذوق پر شاہ نصیر کے اثر کی اہمیت کم کرنے کی غرض سے لکھی ہو' لیکن ناسخ کی زمینوں میں ذوق کی غزلیں کم بہت ہیں۔

فی الحال ہم اتنا کہیں گے کہ خیال بندی کے اسلوب میں سب سے بڑا نام
شاید سب سے پہلا نام ناسخ کا ہے۔ اور سوچنے کی بات ہمارے لیئے یہ ہے کہ
طرز نے اتنا رسوخ قائم کرلیا تھا کہ مصحفی جیسے استاد نے بڑھاپے کے عالم
بھی اس کو بے تکلف اختیار کیا' وہ آج تقریباً سو سال سے کوچۂ ملامت میں
ں ہے اور اس کا آفتاب اقبال کیوں اس قدر گہنا گیا کہ آج بہت سے لوگ
و شاعر ہی نہیں مانتے؟ اس میں کچھ ناسخ کی بد نصیبی کو بھی دخل ہوگا' کیوں
آتش بالکل انھیں کی طرح کے شاعر ہیں اور ناسخ کا شعوری اتباع بھی انھوں
لیا ہے۔ لیکن آتش کو سچا اور بڑا شاعر ہم آج بھی مانتے ہیں' اور ناسخ کو کوئی
وں بھی نہیں پوچھتا' حتیٰ کہ "اصلاح زبان" جو میرے خیال میں لغو اور لا
ں شے' اور آج کے نام نہاد "استادوں" کے نزدیک بڑی زور دار چیز ہے'
کا بھی سہرا ناسخ کے سر سے اتار لیا گیا۔ رشید حسن خاں نے دکھایا ہے کہ جو
لاحیں" اور زبان کی جو "ترقی" اور "صفائی زبان" کے جو اصول ناسخ سے
ب کیئے جاتے ہیں ان کے بارے میں نہ ناسخ کا قول ہمارے پاس ہے اور نہ
ا عمل اس کی گواہی دیتا ہے۔

یہ بات میرے نزدیک اہم نہیں کہ ناسخ نے "زبان کی اصلاح" کی یا
' اغلب ہے کہ نہیں کی۔ مجھے اس بات میں بھی شک ہے کہ "اصلاح
" کا کوئی تصور "آب حیات" کی اشاعت کے پہلے ہمارے یہاں رائج تھا۔
کو (یعنی Parole کو) زبان کے عام بولنے والوں کی عظیم الشان اور ممکن
ر پر (یعنی Langue پر) حاوی قراری دینا اور Parole کو
Langu سے زیادہ مقتدر بتانا' یہ تصور کلاسیکی اردو میں نہیں' محمد حسین آزاد
الی کا ایجاد کردہ ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ناسخ (اور شاہ نصیر' آتش' ذوق' اصغر علی
نسیم وغیرہ) اور سب سے بڑھ کر غالب' ان لوگوں نے خیال بندی کے ذریعہ
ی اردو غزل کی شعریات میں آخری اہم اضافہ کیا۔ غالب کی موت (۱۸۶۹) پر
ی اردو شعریات کی تقریباً دو سو سالہ تاریخ کا اختتام ہوتا ہے۔

خیال بندی کو بڑی حد تک کیفیت کی ضد کہہ سکتے ہیں۔ خیال بند شاعر ماہر
ت کی طرح دور دور کے کنوئیں جھانکتا ہے' ہر پتھر کو الٹا پلٹتا ہے کہ شاید
نیا ذی روح' کوئی نیا پودا' ہاتھ لگ جائے۔ اس کا شعر جذبات یا محسوسات
ری طور پر بر انگیخت نہیں کرتا' بلکہ ذہنی سطح پر ہمیں متحرک کرتا اور
تا ہے۔ کیفیت کا شاعر معنی اور مضمون سے زیادہ جذباتی تاثر پیدا کرنے کی
، مائل رہتا ہے۔ اس کا شعر اکثر بظاہر معنی کے لحاظ سے کم زور' یا معنی کی
ی اور تہ داری سے بے نیاز محسوس ہوتا ہے۔ خیال بندی اور کیفیت ان دو
احوں کے کھو جانے کے باعث ہم غالب' ناسخ' ذوق' شاہ نصیر' آتش'
ر نسیم وغیرہ شعرا سے پوری طرح لطف اندوز ہونے سے قاصر رہے۔ اور نہ ہی
ے کے کلام' اور میر' میر سوز' مصحفی' قائم' وغیرہ شعرا کے اکثر کلام کے درمیان
کرنے کے لیئے کار آمد طریقوں کو اپنا سکے۔ ایک اور نقصان یہ ہوا کہ کیفیت
روں کی فوری اثر انگیزی کے باعث ہم نے یہ فرض کرلیا کہ وہی شعر اچھا ہے
اسے زیادہ دل' تخیل سے زیادہ احساس' اور "خارج" سے زیادہ "داخل" کو

متاثر کرے۔ حسرت موہانی کا شعر اسی غلط تصور پر مہر تصدیق لگاتا ہے ۔۔

شعر دراصل ہیں وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

"از دل خیزد و بر دل ریزد" جیسے بے معنی فقرے بھی ہمارے یہاں اسی وجہ سے عام ہوئے کہ کیفیت والا شعر فوراً جذبات کو متحرک کرتا تھا۔ اگر ہم نے کیفیت اور خیال بندی کی اصطلاحیں بھلا نہ دی ہوتیں تو ہم اپنے تنقیدی تاثرات کو زیادہ مربوط اور مدلل طریقے سے پیش کرسکتے۔ اب تو یہ ہوا کہ ہم نے کیفیت کی اصلاح نہ استعمال کی' صرف "دل میں اتر جانے" اور "دل پر اثر کرنے" وغیرہ کی بات کرتے رہے۔ اور خیال بند شعرا کے کلام کو ہم "خارجیت" اور "تزئینت" پر مبنی' یا "تصنع سے بھرپور" شاعری کہتے رہے۔ صرف غالب اور ایک حد تک آتش اس قتل عام میں بچ نکلے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں' غالب کے بارے میں حالی نے' پھر عبدالرحمٰن بجنوری نے سند دے دی تھی کہ ان کی شاعری کو "مغربی" اصول نقد اور عمل شعر کی روشنی میں دیکھا جائے تو بھی وہ کامیاب ٹھہرتی ہے۔ پھر غالب کا مزاج بھی بیسویں صدی کے مزاج سے کئی معاملات میں ہم آہنگ تھا۔ اور غالب بہرحال ناسخ' ذوق' شاہ نصیر وغیرہ کے مقابلے میں بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ لیکن چونکہ ہم لوگ وہ طریقے بھول چکے تھے جن کو کام میں لاکر ناسخ اور ذوق اور شاہ نصیر جیسے شعرا کی صحیح تعیین قدر ممکن تھی۔ اس لیئے ان بیچاروں کو بہت نقصان پہنچا۔ یعنی غالب سے کمتر درجے کے شاعر ہونے کی بنا پر انھیں نا شاعر یا غیر شاعر ہی قرار دے دیا گیا۔ ادھر ناسخ و ذوق کے کمتر درجے کے شعرا' مثلاً انعام اللہ خاں یقین' عبدالحی تاباں وغیرہ کو ناسخ و ذوق سے بہتر کہہ دیا گیا' صرف اس لیئے کہ یقین و تاباں وغیرہ کے اشعار "دل کو چھوتے تھے۔"

آتش کی شہرت قائم کرنے کا سہرا محمد حسین آزاد کے سر ہے۔ آتش اور ناسخ ایک ہی طرح کے شاعر تھے۔ (مصحفی نے اس حقیقت کی طرف بہت پہلے اشارہ کردیا تھا۔) لیکن آزاد نے آتش کے قلندرانہ صفات کا تذکرہ کچھ اس والہانہ انداز میں کیا کہ آتش کی شخصیت کا ایک نہایت خوش گوار پیکر ہمارے ذہنوں میں قائم ہوگیا۔ حالی و آزاد و شبلی سب کے یہاں یہ بات تنقیدی اصول کی طرح جاری تھی کہ شاعری چونکہ دراصل شخصیت کا اظہار ہے اس لیئے جس شاعر کی شخصیت دلکش ہوگی' اس کی شاعری بھی دلکش ہوگی۔ لہٰذا آتش کے ذاتی کردار کی قلندرانہ' صوفیانہ' بانکی صفات ان کی شاعری میں بھی فرض کرلی گئیں۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ناسخ و آتش کا کلام تخلص ہٹا کر پڑھا جائے تو دونوں میں بہت کم فرق دکھائی دے گا۔ ناسخ کے یہاں حس مزاح اور خوش طبعی آتش سے زیادہ ہے' اور آتش کے یہاں جنسیت ناسخ سے زیادہ ہے۔ ناسخ کے مضامین آتش کے مقابلے میں زیادہ تازہ اور تجریدی ہیں۔ لیکن یہ باتیں پورا دیوان غور سے پڑھنے پر کھلتی ہیں۔ ورنہ مندرجہ ذیل شعروں کو دیکھیے ۔۔

سیر میدان عدم کو جو ہوا میں دوڑا
باد بن کر میں پس توسن قاتل دوڑا

نہ ہوئی بعد D بھی مجھے آفت سے نجات
پھاڑ کھانے کو سگ کوچہ قاتل دوڑا
ابر ساں گرد جو اٹھی فرس قاتل کی
برق کی طرح میں پابند سلاسل دوڑا
حول عشق کی وہ راہ ہے رکھتے ہی قدم
بن کے قزاق ہراک حور شمائل دوڑا
حول شوق میں بھاری ہوا دل مجھ کو
میں سمجھتا ہوں بغل میں لئے اک سل دوڑا

ہر شعر میں "خارجیت" نمایاں ہے۔ ہر شعر میں دو راز کار بات کہنے کی
شش ہے، لیکن تیسرے شعر کے سوا کسی میں بھی بیان مدلل اور مضمون واقعی
نہیں ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ کسی خیال بند شاعر نے خاصی کوشش کر کے مشکل
ف میں پانچ شعر نکالے ہیں جو صاف اور شگفتہ تو ہیں، لیکن ایک کے سوا (شعر ۳)
ن میں کوئی خاص بات نہیں۔ اشعار بہرحال ہیں ایک ہی شاعر کے۔

مندرجہ بالا فیصلہ ہر بات میں مبنی بر حقیقت ہے، سوائے اس کے کہ یہ
ں کسی ایک شاعر کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر تین شاعروں کے ہیں:

شعر ۱، ۳ ناسخ
شعر ۲، ۴ آتش
شعر ۵ آباد

یہ وہی آباد لکھنوی ہیں جن کے بارے میں سعادت خاں ناصر نے لکھا
ہ کہ جب میں نے ان سے کہا کہ میں نے اپنے تذکرے میں آپ کو ناسخ کا
گرد لکھا ہے تو وہ خفا ہوئے اور بولے کہ "اپنا ہی شاگرد لکھا ہوتا۔" اور جب
ادت خاں ناصر نے وضاحت چاہی تو آباد نے کہا کہ "اب ہم ناسخ سے اچھے
ں۔" خیر، یہ بات تو الگ رہی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ آج کیا وجہ ہے کہ ان
ین میں گہری مشابہتوں کے بعد لوگ عام طور پر آتش کو بڑا شاعر، ناسخ کو ناشاعر
ر آباد کو معدوم جانتے ہیں؟ کیا ہمیں اپنی تاریخ نویسی اور شعر شناسی پر نظر
نی کرنے کی ضرورت نہیں؟

غالب نے خیال بندی کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔ ان کے زمانے میں
۱۸۵ کا سانحہ رونما ہوا جس نے ہماری تاریخ ادب کے تسلسل کو منقطع کر دیا۔
اسیکی شعریات، کلاسیکی اقدار حیات، کلاسیکی تصور کائنات، ان سب چیزوں پر
الیہ نشان لگ گیا۔ پھر ان میں سے زیادہ تر کو مسخ کرنے اور بھلانے کی کوششیں
ئیں، اور یہ کوششیں اس حد تک کامیاب ہوئیں کہ کلاسیکی ادب کا زیادہ تر حصہ
رے لیئے بے معنی یا بے روح اور غیر ضروری ہو کر رہ گیا۔ کلاسیکی ادب کے جو
زاو عناصر قبول بھی کیئے گئے طرح طرح کی شرطوں اور پابندیوں کے ساتھ قبول
یے گئے۔ میر اور سودا کے کلام سے انتخابات کی مثال سامنے کی ہے اور سودا کی
یات کے بارے میں محمد حسین آزاد کی رائے بھی ہمارے سامنے ہے۔ بعض
ناف (مثلاً مثنوی) صرف کتابوں تک محدود ہو کر رہ گئیں، اور ان کے بھی چند ہی
رنے مقبول ٹھہرے۔ قصیدہ تقریباً سارے کا سارا مسترد ہو گیا۔ انگریزوں کی

تعلیمی پالیسی، اور دلی/لکھنؤ والوں کے تعصبات کے زیر اثر کلاسیکی ادب کا
ایک بہت بڑا حصہ، اور کلاسیکی ادب کی تاریخ کا تقریباً تین سو برس پر مبنی کارنامہ
ہمارے لیئے بے وجود یا پھر دکھنی اور ذیلی ٹھہرا۔ آج بھی آپ اردو شاعری کے بڑے
ناموں کا تصور کریں تو ولی تک ذہن میں نہیں آتے۔ نصرتی، وجہی، ہاشمی، غواصی،
خوب محمد چشتی اور علی محمد جیو گام دھنی وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ہم میں سے اکثر کے
لیئے اردو نثر کی تاریخ میر امن سے اور اردو نظم کی تاریخ میر سے شروع ہوتی ہے۔
تاریخ اور نظریے کا یہ سمٹاؤ ہمارے لیئے انتہائی المناک ثابت ہوا۔

۱۸۵۷ کے تہذیبی انقطاع کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ہم لوگوں نے باور کر لیا
کہ ہمارے یہاں تنقید، خاص کر نظری تنقید، اور شعریات تھی ہی نہیں۔ لہٰذا یہ
چیزیں ہمیں اپنی کوششوں سے ایجاد کرنی پڑیں گی۔ آزاد، حالی، امداد امام اثر،
شبلی، اور بعد میں طباطبائی اور حسرت موہانی کی تحریریں اسی شعریات سازی کی
مظہر ہیں۔ اس شعریات میں اردو کے کلاسیکی تصورات بہت کم تھے۔ جو تھے بھی
انہیں پوری صحت کے ساتھ پیش نہیں کیا گیا تھا، اور بعض کو تو سراسر غلط یا
مضحکہ خیز قرار دیا گیا۔ مثلاً شبلی جیسے غیر معمولی مفکر نے اپنی شعریات کی بنا بعض
عربی، بعض انگریزی، بعض یونانی اور بعض سنسکرت تصورات پر رکھی۔ لیکن
انہوں نے اردو والوں کے خیالات کے بارے میں یہ تاثر دیا کہ گویا وہ ہیں ہی
نہیں، اور اگر ہیں بھی تو وہ محض "جھوٹی رعایت لفظی" اور "غیر واقعی، غیر
عقلی" شاعری کو فروغ دیتے ہیں، لہٰذا ان سے بچنا چاہیئے۔ سبک ہندی کی فارسی
شاعری سترھویں صدی سے لے کر انقطاع ۱۸۵۷ تک اردو شاعر کے لیئے نمونے
اور مثال کا کام دیتی رہی تھی۔ لیکن شبلی نے اپنی عہد ساز کتاب "شعر العجم"
میں سبک ہندی کو بہت کم اہمیت دی۔ اس کے اکثر شعرا خاص کر اس کے بڑے
ہندوستانی شعرا مثلاً غنی، سرخوش، ناصر علی بیدل، آزاد بلگرامی، غالب وغیرہ کے
ذکر سے "شعر العجم" کے صفحات خالی ہیں۔ اس کا نقصان خود شبلی کو بھی اٹھانا
پڑا لیکن اس سے بہت زیادہ نقصان کلاسیکی اردو غزل کا ہوا کہ اس کو سمجھنے
سمجھانے کے اصل حوالے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ہماری کلاسیکی غزل کی شعریات میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے غزل کے
لیئے آج بھی نہ استعمال کیا جا سکتا ہو۔ لہٰذا یہ بالکل ممکن ہے کہ غزل جدید بھی
ہو اور کلاسیکی اصولوں کی پابندی بھی کرے۔ یہ اس وجہ سے کہ جدید غزل کی
بنیادی صفت مضمون آفرینی ہے، اور مضمون آفرینی کے لیئے کلاسیکی غزل کی
روایتی لفظیات کی پابندی ضروری نہیں۔

غزل کی دنیا جن مفروضات (یا تصورات یا رسومیات) سے
عبارت ہے وہ بہرحال موجود رہیں گے۔ در حقیقت کلاسیکی شعریات کی پابندی
شعر کی خوبی کے لئے بڑی حد تک ضامن ہو سکتی ہے۔ ہاں جدید نظم (یعنی
جدیدیت کی پروردہ نظم) کے لئے کلاسیکی غزل کی شعریات کی پابندی ضروری
نہیں۔ آج غزل اور نظم میں یہی فرق سب سے زیادہ اہم کہا جا سکتا ہے کہ
جدیدیت کی قائم کردہ نظم نے اپنے لئے الگ سے ایک شعریات وضع کی ہے اور
جدید نظم کو سمجھنے کے لئے اس کا حوالہ ضروری ہے۔

اکرام باگ

"زندگی قرض ہے۔ مگر اسے سود کے ساتھ کیوں چکایا جائے؟"——
سیں اوپر اٹھائیں' کوئی نہ تھا۔ میرا وہم بھی نہیں۔ نساء تو کب کی جا چکی۔
ج زینہ کی دیوار پر ارجنا پارک کا سایہ اب بھی متحرک ہے۔ معمولی ہواؤں
، لچکنے والا۔ آج تو اوپر بڑی تیز ہوائیں چل رہی ہیں۔ بیچ کے حبس سے
۔ آگری میں نے چھت پر بستر لگوایا تھا۔ صبح سفر پر نکلنا ہے۔ بیگ میں تمام
زات سلسلہ سے رکھ دیئے تھے۔ ان کاغذات ہی کے لیئے تو اتنا سب کچھ
ے لپٹ ہوا تھا۔ عجیب بات ہے۔ ان کو جمع کرنے کے لیئے کاوشیں اور چھٹکارا
ے کے لیئے جدوجہد۔ میں نے کب ایسا چاہا تھا' بس اپنی چھوٹی سی من پسند
ی گزار نہ پانا ہی سب سے بڑا المیہ ہے—— اب تو اندوختہ سرہانے رکھ لیا
۔ آسمان پر چھتناری چتیاں پھیل گئی تھیں۔ نویں رات کے چاند کی کرنوں
تیز ہواؤں کی لہروں پر سوار او ٹھتی ہوئی سی بلی دھم سے بستر پر آگری۔ ارجنا
ل کا سایہ شہر کی بیزار کن روشنیوں پر محیط ہو چکا تھا۔

"مجھے یہ سب معلوم نہ تھا۔"

"آپ کو فہرست شرائط کی نقل دے دی گئی تھی۔"

"میں نے اسے پڑھا نہیں۔"

"یہ ہمارا مسئلہ نہیں۔"

"تو اب کوئی ایسی صورت نہیں کہ مجھے دوسری؟"

"آپ کے پاس کوئی تیسری ہے؟"

"مجھے چھٹکارا ملنے کی آس بندھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بیگ کھولا اور کاغذ
تیسرے خانے سے نکال کر مخمل پر رکھ دیا۔ انھوں نے اسے غور سے دیکھا
مسکراتے ہوئے اسے میری طرف سرکایا۔

"آپ ایک ماہ سے پیچھے رہ گئے۔"

"یعنی...؟"

"ہم تین سال کے بعد ہی غور کر سکتے ہیں۔"

"تو پھر——؟"

"فی الحال کچھ نہیں ہو سکتا... ہاں ایک صورت ہے۔ آپ پہلی فہرست
دوبارہ طلب کر سکتے ہیں اور اس کے عوض میں دوسری لے جا سکتے ہیں۔"

"یعنی پہلی آپ کے حوالہ کرنی ہوگی...؟ یہ تو——"

"عجیب گورکھ دھندا ہے نا۔" —— انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہر عارضی حل کو کشت مت سمجھیئے۔ تاریخیں یاد نہ رکھنے سے الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔"

میں نے کب الجھنیں چاہی تھیں۔ میں انھیں کیا بتاتا۔ سارا معاملہ ہی اپنے اختیار میں نہ تھا۔ کیسی اتھل پتھل ہوئی تھی۔ زندگیوں کی ضمانت میں اپنے چھوٹے سے اصول کو ٹوٹتے دیکھ کر—— یہاں اس دلدل سے نکلنے کی کوئی صورت بھی ہے؟ مجھے تو اس وقت بھی جناب کی بات یاد آئی تھی۔ "کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انھیں جنت اتنی آسانی سے مل جائے گی۔ ابھی تو ہم نے انھیں مال' اولاد' اور عورت سے آزمایا نہیں ہے۔"

میں نے اپنا اندوختہ سنبھالا اور مزید کاغذات ٹھونس کر سیڑھیاں اترا۔ سورج اوپر آچکا تھا۔ پھاٹک سے ایکسٹینشن روڈ کی دونوں جانب ارجنا پارک کے سائے جھلملا رہے تھے۔ مین روڈ پر ٹریفک شباب پر ہے۔ تاہم مجھے وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ بیگ کھول کر شناخت نامہ اور وجہ ملاقات کی نوٹس دکھائی اور ہال میں داخل ہوا۔

انھوں نے بیٹھنے کے لیئے کہا۔ کھڑکی کی سلاخیں مخمل پر سایہ فگن تھیں۔ لیکن تمازت کو اے سی نے رخصت کردیا تھا۔ انھوں نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر سے نظریں اٹھائیں اور مجھے مخاطب کیا۔

"اس ضمن میں ہمارے پاس کئی مراکز اور متعلقہ افراد سے شکایتیں ملی ہیں کہ..."

"مگر وہ سب غلط ہیں۔"

"آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس ضمن میں جو غیر ذمہ داری آپ سے سرزد ہوئی ہے اور جس کے نتیجے میں جو پریشانی اور نقصان ہوا ہے' اس کا محاسبہ کیا جانا ابھی باقی ہے۔"

"آپ کا مفروضہ صحیح نہیں ہے۔"

"ہمارا؟ اس باب میں اتھارٹی نے بھی سخت نوٹس لیا ہے جن میں کئی ایک ماہرین بھی ہیں۔"

"غالباً انھوں نے میرے Version سے اس کا تقابل ہی نہیں کیا ہے۔"
وہ تو انکوائری مکمل کرنے کی فکر میں ہیں تاکہ آپ سے..... تم سے اس
رے واقعے میں ہمدردی رکھتا ہوں اس لیے..... غالباً ان دنوں تمھاری ذہنی
لت..... مرا مطلب ہے تم کسی ذہنی یا گھریلو مسئلہ میں الجھے ہوئے تھے؟"

"ان سب باتوں کا اس سے کیا تعلق؟"

"ان دنوں مجھے تمھارے ہاں شادی کی تقریب کا دعوت نامہ ملا تھا۔ پنے کالج میٹ کے ہاں خوشی کے اس موقع پر شریک نہ ہونے کا افسوس بھی ہوا ا۔ بہرحال مبارکباد۔"

"شکریہ۔ اس نے بھی وداعی تقریب میں تمھیں یاد کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ن دنوں میں بہت سرگرداں رہا۔ ساری دوڑ دھوپ مجھے ہی کرنی تھی۔"

"Look۔ اس کاغذ پر اپنے دستخط کردو۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔"

"کیا ہے یہ؟"

"Apology Letter۔"

"مگر کیوں؟ میں نے کیا ہی کیا ہے؟"

"سوالات نصاب سے تجاوز کر گئے تھے۔ مگر میں نے اس لیٹر میں بڑی نت اور ہوشیاری سے ایک Genuine Excuse کو شامل کیا ہے..... تم پڑھو تو ی۔"

میں نے کاغذ لے کر پڑھا اور اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"یہ غلط توجیح ہے۔ میں اپنے گھریلو مسائل اور پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو لگ الگ خانوں میں رکھتا ہوں۔"

"میری بات مانو۔ زندگی میں Compromise سب سے بڑی قدر ہے۔"

"Absolutely not, I shall face the enquiry" کاغذ لوٹاتے ئے میں سیٹ سے اٹھا۔ سوچنے لگا۔ کیا واقعی چھوٹے موٹے اصولوں کے ے میں اللہ کارسازی کرتا ہے؟ ایسی رائے قائم کرنے میں کتنی راحت ہے۔"

باہر نکلا تو سورج سر پر آچکا تھا۔ سامنے لان میں ارجنا پارک کے سائے مگوں ہو گئے تھے۔

"سپرنٹنڈنٹ صاحب آپ کو یاد کررہے ہیں۔" اطلاع ملی' چاروناچار جانا پڑا۔

"بعد مدت حضور کے درشن ہو رہے ہیں۔ اپنے احوال ہمیں بھی تو سنئے۔"

"کام کی بات کرو۔ مجھے جلدی ہے۔"

"مبیں وحید صاحب آپ کو ہر معاملہ میں جلدی ہوتی ہے مگر ہم جو تحفہ پ کو عنایت کرنے....."

"تحفہ؟ کیسا تحفہ؟"

"نساء کا مارکس کارڈ۔"

"مگر اس نے تو امتحان ہی نہیں دیا اور اب تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"کیا خوب۔ اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔ اس کاغذ پر اپنے دستخط' نام اور پتہ ثبت کیجئے۔ حالانکہ یہ قواعد کے خلاف ہے مگر ہم ٹھہرے محبت کے دیوانے..... آپ کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے..... یہ رہا مارکس کارڈ... مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نامہ بر کو میں..."

میں نے حیرت سے کارڈ لیا اور کھو گیا......

زم زم چوراہے پر ہم دونوں کی زم زم دیدہ بازی ہوتی۔ نساء روٹ ۴ پر سفر کرتی اور میری کوئی روٹ مقرر نہ تھی۔ اس کی چوکیداری میں زمانے بھر کا لطف تھا۔ میں اسے خوبصورت تو نہیں کہہ سکتا مگر اسے دیکھتے ہی مجھے اپنی ماں کا چہرہ یاد آتا..... عجب ممتا بھرا چہرہ..... نور سے پرنور گوزا رنگ۔ بڑی بڑی گول آنکھیں جن میں آسمان کی نیلاہٹ منعکس ہوتی۔ سراپا ایسا کہ بھینچ لینے سے زیادہ چھونے میں سرور ملے۔ ہم دونوں کی عمروں میں بھی تفاوت تھا۔ اس میں استقلال کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور میں پارہ نصیب..... کئی ملاقاتوں کے بعد اس نے مجھے بتلایا کہ کس طرح تین ماہ پہلے کے فسادات کے بعد پولیس نے شہر کے اسی چوراہے میں اس کے بڑے بھائی کو گھیر کر گولیوں سے بھون دیا اور بعد میں اسے ان کاؤنٹر کا نام دیا...... وہ مجھ سے کسی قسم کی مطالبہ نہ کرتی بلکہ بات بھی کم کم ہی کرتی' مگر میں اپنے طور پر اس کے چھوٹے موٹے کام کردیا کرتا تھا۔ مختلف قسم کے فارم بھردینا' پراکٹیکل ریکارڈ بک میں شکلیں اتارنا' لائبریری سے کتابیں لانا' بس پاس کے لئے دوڑ لگانا...... اور ایسی سب ضرورتیں پوری کرنے میں مجھے عجب سی مسرت ملتی تھی۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ سب کچھ بدل گیا۔ ایک آدمی کی روز مرہ تبدیلیوں میں یا تو اسے بیوی مل جاتی ہے یا نوکری..... زمانہ گزر گیا... نساء کی خبر ہی نہیں رہی بلکہ میں نے جاننے کی کوشش بھی شاید نہیں کی تھی۔

ایک دن : نواب جلال خاں صاحب کی نوٹس آئی۔ وہ ہماری سابقہ جاگیر کے متوقع جانشین تھے مگر پولیس ایکشن کے واقعہ کے باعث وہ اپنے حق توارث سے محروم ہوئے۔ ان کے والد نواب سید احتشام خاں صاحب کو بھی بڑی حکمت عملی سے والی جاگیر بنایا گیا تھا۔ ان کے والد سید مکرم خاں صاحب کی اور جاگیرداروں کی طرح چار بیویوں کے علاوہ' بیسیوں عورتیں تھیں۔ وہ حسب دستور اپنے بڑے فرزند نواب سید رضی خاں صاحب کو اپنا جانشین مقرر کر گئے اور اس کی توثیق والی ریاست سے بھی حاصل کرلی گئی تھی۔

نواب رضی کو کشتی رانی کا شوق تھا۔ ایک شام وہ اپنے مصاحبوں اور محبوبوں کے ہمراہ جاگیر کے دریا میں کشتی رانی کا لطف اٹھا رہے تھے کہ اچانک کشتی ڈوب گئی۔ ایک ماہر تیراک کے علاوہ سب ڈوب گئے۔ تیراک نے نواب کو بچانے کی جدوجہد کی مگر صرف وہی اس خبر کو سنانے کے لئے زندہ رہا۔ بعد ازاں نواب احتشام کو حسب دستور والی جاگیر بننا پڑا۔ نواب صاحب نے ماہر تیراک کو اس کی خدمات کے عوض کئی ایکڑ زمین انعام میں عطا کی... پولیس

ایکشن میں نواب احتشام کو کسی نے بڑی بے دردی سے قتل کیا- ان کی خون سے بھری لاش کے اطراف کاغذات کا انبار تھا- خون سے سنی مٹی سے کاغذات کو بڑی مشکل سے نکالا گیا- جاگیر ختم ہوئی- ریاست ٹوٹ گئی- محلات لوٹے گئے- عورتیں غائب ہوئیں- اسی دور پر آشوب کے پانچ سال بعد نواب سید جلال خاں صاحب سابقہ ریاست کی راجدھانی حیدر آباد سے اپنی آبائی جاگیر تشریف لائے اور اپنی آراضیات اور آثار کو حاصل کرنے میں جٹ گئے-

انھوں نے شبانہ روز کی محنت سے اپنی سابقہ جاگیر کے ریکارڈ کو جمع کیا- آج ان کا ریکارڈ روم ان کی محنت شاقہ کا جیتا جاگتا نمونہ ہے— نواب نے اپنے محلات میں کئی اسکول اور کالج قائم کئے اور اس طرح ان عمارات کے تحفظ کا بندوبست کرلیا ورنہ موجودہ حکومت کے آثار قدیمہ کو ان عمارات میں اپنے دفاتر اور میوزم قائم کرنے کی عجلت تھی- نواب نے اپنا ٹرسٹ قائم کیا- ایک سیکولر پارٹی کے جھنڈے تلے الیکشن لڑا اور شہر کے چیرمین کے عہدہ پر فائز ہوئے- محرم کے تعزیے پھر سے دھوم دھام سے نکلنے لگے- صوفیوں نے اپنے تارک الدنیا حجروں میں سماع کی محفلیں آراستہ کرنی شروع کیں- عرس اور سالانہ مشاعرے جاگ اٹھے- مجھے اپنے زمانے میں ایسا فعال نواب کم نظر آیا- انھوں نے مجھے اپنے تعلیمی اداروں کا سکریٹری مقرر کیا- ان کی وہ نوٹس ٹیچرس کے تقررات کے باب میں تھی-

انٹرویو میں نساء کو ایک مدت بعد دیکھا- نواب نے میرے کچھ کہنے سننے سے قبل ہی نساء کا تقرر کردیا- اب پھر وہی دیوانگی——— میں طرح طرح کے بہانوں سے نساء کے آگے پیچھے سرگرداں ہوتا رہا- میرے لئے یہ نئی بات تھی کہ نواب موصوف بھی اسکول پر مسلسل حاضری دینے لگے- نساء نے ایک دن اپنے اندیشے کا بھی اظہار کیا- میں نے اسے تسلی دی اور اپنے طور پر تحفظ کا احساس بھی دلایا مگر اس نے ایک سال کے اندر اپنا استعفیٰ بھیج دیا- میں نواب صاحب کے پاس طیش کے عالم میں پہنچا-

"نواب صاحب یہ سب کیوں ہوا؟"

"وہ ایک بار پھر میرے ہاتھوں سے نکل گئی-"

"آپ ایک خراب مثال قائم کررہے ہیں-"

"وہ ہماری جاگیر ہے" نواب نے کہا "اور جو کوئی ہمارے اس حق کے بیچ آتا ہے، ہم اسے غائب کردیتے ہیں-"

میں نے اپنا استعفیٰ بھیج دیا مگر انھوں نے مجھے برطرف کردینے کی نوٹس بھیجی- ایک زمانہ گزر گیا- نساء کی کوئی خبر نہیں تھی بلکہ میں نے شاید جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی—— اور اب یہ مارکس کارڈ!

کارڈ کو اپنے اندوختہ میں رکھے جب میں عمارت سے باہر نکلا تو ارجنا پارک کے سائے طویل ہوگئے تھے-

وہی دورویہ گلی——— مگر بہت کچھ بدل بھی گیا تھا- چراغ مسجد کی ریلنگ کے سہارے دور تک جانے والی گلی Upper Lane اور ریلنگ سے نیچے دور تک جانے والی گلی Lower Lane کہلاتی تھی- اب دونوں جگہوں پر کولتار کی سڑک گلیوں کی آخری سرے تک دکھائی دے رہی تھی- جگہ جگہ نئی نئی بڑی عمارتوں نے اپنے سر اٹھا رکھے ہیں- مجھے یاد تھا- تھوڑی ہی دور پر ارجنا پارک کا طویل درخت اور اس سے متصل نیچی گلی میں نساء کا مکان ہے--- میں نے دروازہ کھٹکھٹایا- شام پوری طرح پھیل چکی تھی-

"آپ کا نام"——— ایک دس گیارہ سال کا لڑکا مجھ سے ہمکلام تھا- اس کی نظریں میرے بیگ پر لگی تھیں-

میں نے اپنا نام بتایا-

لڑکا چونکا اور تھوڑا سا مسکرایا-

"آپ جاگیر سے آرہے ہیں؟" نواب انکل کیوں نہیں آئے؟ آپ ان کا پیغام لائے ہیں؟"

لڑکا پارہ صفت لگا-

میں نے نفی میں سر ہلایا-

"آپ بھی ممی کے کالج میں پڑھاتے ہیں یا پاپا کے دوست ہیں؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی دروازے کا دوسرا پٹ کھلا- نساء کے چہرہ پر حیرت نما مسرت تھی- وہی سراپا-- میک اپ سے عاری چہرہ- بالوں میں دو سفید پٹیاں فوری طور پر متوجہ کرتی تھیں- میں اس کے بلانے پر کمرہ میں داخل ہوا- ایک لانبی میز پر چائے کی پیالیاں، بسکٹ اور فروٹ بکھرے پڑے تھے-

میں نے اپنا بیگ کھولا اور اوپری خانہ سے اس کا مارکس کارڈ نکالا-

"مبارکباد-"

"آج میرے لئے خوشیوں کا دن ہے" کارڈ پر نظریں گاڑتے ہوئے اس نے کہا- پھر بولی- "آج ہی مجھے Promotion بھی ملا ہے- نواب صاحب نے زبردستی یہ پارٹی ارینج کروائی تھی مگر وہ—— ابھی تک نہیں آئے؟"

میں کچھ کہہ ہی نہ سکا-

وہ میری خاطرمدارت میں ادھر سے ادھر اندر سے باہر' آتی جاتی رہی- میں اس کی باتیں سنتا رہا- دروازے پر ہلکی سی آہٹ کے ساتھ ہی اس نے کہا-

"تایا نواب صاحب تشریف لائے ہیں-"

میں نے رخصت چاہی- اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی- دروازے پر اس نے مجھے غور سے دیکھا اور ایک چٹ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا-

"اسے گھر پر پڑھیے گا-"

میں خاموشی سے مکان سے نکلا- لڑکے کی ہنسی کی آواز کسی اور کمرے سے نکل اور میرا پیچھا کرتی رہی- رات کے آثار نمایاں ہوچکے تھے- ارجنا پارک دھندلا گیا تھا- مسجد کے صحن میں گلی کے پول لائٹ میں' ریلنگ کا سہارا لیتے میں نے کاغذ کھولا اور پڑھنے لگا-

"جناب- آپ نے مجھے بیحد خوشیاں پہنچائی ہیں- مگر آپ سے ایک گلہ

...

ہے۔ آپ نے اپنے ہاں شادی میں مجھے یاد نہ کیا۔ نواب صاحب سے مجھے اس کی اطلاع ملی تھی۔ کتنا بدل گیا ہے وہ شخص۔ مجھے کبھی کبھی تو یہ احساس ہوتا ہے کہ کہیں آپ کی روح تو ان میں نہیں سا گئی؟ آپ نے ان دنوں مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا زندگی محض جنگ ہی نہیں صلح بھی ہے۔۔۔ نواب صاحب نے وقت سے سمجھوتہ کرلیا ہے۔ ان کی رعونت۔۔۔ آج مجھے احساس ہوتا ہے کہ ان کی پژمردہ شگفتگی کا رد عمل تھی۔ گھر میں سب کو سلام کہیئے گا۔ بچی کو ڈھیروں پیار اور دعائیں۔ کیا وہ آپ کے ہاں آئی ہے یا سسرال میں ہے؟ نساء۔

نوٹ : طارق سے آپ کے آنے کا ذکر کروں گی۔ طارق' وحید کے ابو کا نام ہے۔"

مجھے کول کول گہری آنکھوں سے آسمان کی سی نیلاہٹ فضا میں' منعکس ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔۔۔

آسمان ابھی دھندلا تھا۔ میں نے اپنے سب چیزیں سمیٹیں۔ اندوختہ سنبھالا۔ لائٹ آف کی۔ میں وقت پر جاگ گیا تھا۔ سیڑھیاں اترا۔ ہاتھ منہ دھویا۔ لباس تبدیل کیا اور بیگ لیے دروازہ کی طرف بڑھا۔ صبح ہو چکی تھی۔

"بابا کب تک لوٹیں گے؟ پیچھے سے نساء کی آواز آئی۔ میں نے بغیر مڑے جواب دیا۔ "شام تک۔"

فضا ابن فیضی

کوئی کاذب جو نہیں، کوئی صادق بھی نہیں
یہ مرا شہر، اب اس درجہ منافق بھی نہیں

کیا اسی شخص کو تم کہتے ہو قاتل، اپنا؟
آستیں قامت خنجر کے مطابق بھی نہیں

دور تک، کوچہ ہجرت میں ہے سناٹا سا
اس دریچے میں، کوئی چہرہ بس چق بھی نہیں

پھر بھی سب ہیں، صفت کاوش ناخن فرسا
ہوں وہ اندیشہ، جو اس دور کو لاحق بھی نہیں

اپنے ہی سامنے استادہ ہوں، دیوار آسا
یعنی اب، بمنعٔ تردید حقائق بھی نہیں

کس عدالت میں، بھلا تیری وکالت کرتا؟
فیصلہ میرا، تو خود اپنے موافق بھی نہیں

تجھ پہ کس ڈھنگ سے اے زندگی! سوچا چاہیئے؟
ان مسائل کی تو مربوط کوئی شق بھی نہیں

کیا ہوا شیرازہ گری، دفتر آئندہ کی؟
اب تو ہاتھوں میں کوئی صفحہ سابق بھی نہیں

شخصیت اس کی ہے، شئے متنازع کی طرح
متقی جو نہیں وہ شخص، تو فاسق بھی نہیں

ہاتھ میں لے کے قلم، وہ مرا منہ تکتا ہے
بات ایسی ہوں، جو تحریر کے لائق بھی نہیں

شاعری بھی عجب آزار ہے، کیا کہیے فضا!
اس مرض کا متبادل، مرض دق بھی نہیں

بنجامن کا فلیٹ

صدیق عالم

یہ آبادی کی آہوں کا دھواں ہے
سر کہسار ابر تر نہیں ہے

حامدی کاشمیری

یہ چار منزلہ قدیم عمارت اپنا رنگ و روغن ہمیشہ کے لیئے کھو چکی ہے۔ اس کی لانبی سلاخوں والی آدم قد کھڑکیوں کے پٹ ٹوٹے ہاتھوں کی طرح باہر کو لٹک رہے ہیں۔ ان پر چڑیوں کے بیٹ کی سفید لمبی لکیریں ہیں۔ ان کی جھلملیوں سے چڑیوں کے ایک دو پر بھی برآمد کیے جا سکتے ہیں۔ ان کھڑکیوں پر لٹکتے پردے ہوا اور پانی کے تھپیڑے کھا کھا کر بوسیدہ ہوگئے ہیں' جھڑنے لگے ہیں۔ کل ملا کر نیچے بستی کے گلی کوچوں سے یہ عمارت کسی پرانے سرکاری اسپتال سے مشابہ نظر آتی ہے۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ عمارت کے سارے کمرے رہائش کے لیئے کرائے پر اٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے اوپر کی منزل پر ایک بوڑھا یہودی بنجامن فرانکل اپنی کوتاہ قد بیوی پاؤلا کے ساتھ پچھلے کچھ ہفتوں تک رہتا آیا تھا۔ اب وہ لوگ نئی امیدوں کے ساتھ یا شاید ڈائس پورا (DIASPORA) کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے پروشلم ہجرت کر چکے ہیں۔ وہ ایک پرانی میز کے دراز میں تالمود (TALMUD) کی کتاب بھول کر گئے ہیں۔ یا ایسا کسی عقیدے کے تحت انھوں نے کیا ہے' یہ کہنا مشکل ہے۔

"عمارت خاصی پرانی ہے۔ مگر لگتا ہے پہلے لوگوں میں آب و ہوا کو دھیان میں رکھ کر اقامت گاہیں بنانے کا رجحان زیادہ تھا۔" لانبے قد کے ذہین کرایہ دار نے پردوں کو کھڑکیوں سے نوچتے ہوئے کہا ہے۔ اسے نیچے بستی میں ایک گندا تالاب دکھائی دیتا ہے۔ اس میں بچے تیر رہے ہیں۔ ایک کتا نہا رہا ہے۔ کچھ بچے نکاسی کے نالے پر بیٹھے رفع حاجت کر رہے ہیں۔ ایک سال خوردہ کنواری بجلی کے تار کے ایک کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑی جانے کیا سوچ رہی ہے۔ چاروں طرف کھپریل کے چھپر ہیں یا تنگ گلیارے اور درمیانی راستے تو بس اتنے کشادہ ہیں کہ مشکل سے ایک رکشا اور ٹیکسی ایک دوسرے کو مس کیے بغیر گزر پائیں۔ کرایہ دار پلٹ کر بیوی بچوں کی طرف تاکتا ہے۔ بیوی ایک نئے ماحول کے تصور سے ہراساں نظر آتی ہے۔ بچے بڑے بڑے خالی کمرے دیکھ کر ناخوش ہیں۔ انھیں بتایا نہیں گیا تھا ورنہ وہ اپنی گیند اٹھا لاتے۔

"اچھا ہوتا اگر ہمیں سڑک کی طرف والا کوئی فلیٹ ملتا۔" بیوی کہتی ہے۔ "لگتا ہے اگلے کچھ برسوں تک ہمیں اس گندی بستی کو تاکتے رہنا پڑے گا۔ کیا ہم کوئی دوسرا مکان نہیں ڈھونڈ سکتے؟ کسی اچھے محلے میں جہاں ماحول قدرے صاف ستھرا ہو۔"

"اتنے کرائے پر کلکتہ میں؟ ایسا کوئی محلہ میں تو نہیں جانتا۔" مرد اپنے ہونٹوں کو مایوسی سے دباتے ہوئے کہتا ہے۔ "تمھیں ایسا کوئی پتہ معلوم ہو تو بتا سکتی ہو۔" صاف ظاہر ہے وہ اپنی شکست کا اعتراف کرنا چاہتا ہے۔ "شکر ادا تو ہے کہ یہ عمارت اس محلے کا حصہ نہیں۔"

"مگر یہ محلہ اتنا غلیظ کیوں ہے؟ کتنا گھبرا دینے والا ماحول ہے بستی کا۔ لگتا ہے سارے مرد عورت اور بچے اپنے گھروں سے دائمی طور پر باہر نکل آئے ہیں۔ کیا یہ گھروں کے اندر نہیں جا سکتے؟ اور یہ غلیظ کتے جو تالاب کے کیچڑ میں لوٹ رہے ہیں اور یہ چھکڑے نہ جانے کس نے پال رکھے ہیں۔ کتنے غلیظ ہو رہے ہیں ان کے پر۔"

"اگر تم غور سے دیکھو تو تالاب کے پانی پر تیل کے عجیب و غریب دھبے تیرتے دکھائی دیں گے۔ آخر ان کے پر اجلے تو نہیں رہ سکتے۔"

"وہی تو۔ آخر ہر چیز پر غلاظت کی یہ چادر کیوں چڑھی ہوئی ہے؟"

"انھیں بھول جاؤ۔ ہم ان کھڑکیوں پر پہلے کی طرح دبیز پردے ٹانگ دیں گے۔ مالک مکان بتا رہا تھا صبح اور شام ان کھڑکیوں کو بند رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ نیچے محلے سے کھانا پکانے کا اتنا گاڑھا دھواں پھیلتا ہے کہ دم گھٹ جائے۔"

"یہ لوگ گیس کے چولھے استعمال کیوں نہیں کرتے؟"

"شاید یہ لوگ گیس کے بارے میں نہ جانتے ہوں۔ یا شاید انھیں گیس کے چولھے پسند ہی نہ ہوں۔" مرد نے تنگ آ کر کہا۔ "یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھیں مٹی کے تیل کے لیئے راشن کی دکانوں کے سامنے لمبی لمبی لائن لگانا پسند ہو۔ اوہ کیا ہم کوئی دوسری بات نہیں کر سکتے۔"

ابھی انھوں نے اپنا کچھ ہی فرنیچر منتقل کیا ہے۔ گھر کے سارے افراد پچھلی جگہ پر ہی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ شام کو کرایہ دار اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ میز پر شراب پینے بیٹھتا ہے۔ انھوں نے ہوا پانے کے لیئے کرسیاں اور میز ایک آدم قد کھڑکی کی طرف سرکا لی ہیں۔ ان کے آبگینے وِھسکی، سوڈا اور پانی کے مرکبات سے روشن ہو گئے ہیں۔ کمرے کے اندر ایک طاقتور بلب جل رہا ہے۔ باہر چرکھا والی بڑھیا بڑے سے چاند پر بیٹھی نیچے محلّے کے نیم تاریک جھپروں سے ابھرے ہوئے بجلی کے کھمبوں کی طرف تاک رہی ہے جن پر یرقان زدہ بلب روشن ہیں۔ کہیں سے لوہے پر ہتھوڑے جمانے کی آواز آرہی ہے۔ بڑے ہی پُراسرار طور پر آوارہ کتے خاموش ہیں۔

"بڑی اچھی جگہ چنی ہے تم نے۔" ایک مہمان کرایہ دار کی طرف جھک کر کہتا ہے۔ "اس چھوٹے سے ایک کمرے والے فلیٹ سے یہاں آنا تمھیں اچھا لگے گا۔"

"اس محلّے پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔" کرایہ دار شراب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہتا ہے۔

"اچھا، مگر کیوں؟"

"یہ محلّہ ان لوگوں کا ہے۔"

سب کی آنکھیں ایک دوسرے پر مرکوز ہیں۔ ایک نہ کہی جانے والی بات کہہ دی گئی ہے۔ سب اپنی سوچ کسی دوسری بات پر مرکوز کرنا چاہتے ہیں۔

"اچھا ہوتا اگر ایسا نہ ہوتا" کسی مہمان نے کہا ہے۔ "مگر ایسا نہ ہوتا تو شاید اس فلیٹ کا ملنا ہی دشوار تھا۔"

"ارے انھیں بھول جاؤ۔" دوسرا مہمان دلاسا دیتا ہے، جیسے اس کے سامنے کوئی کینسر کا مریض ہو۔ "تمھارا فلیٹ تو اتنی بلندی پر ہے، تمھیں ان سے کیا سروکار! مگر ایک سوال اکثر میرے سینے میں کلبلاتا رہتا ہے، بڑا ہی بے چین رکھتا ہے مجھے۔ کاش کوئی اس کا جواب میرے لیئے ڈھونڈ کرلاتا۔"

"حضورِ اعلیٰ، شاید میں آپ کی مدد کروں۔" تیسرے اور آخری مہمان نے نشے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہے۔ "میں دنیا کے اہم مسئلوں کی گتھی سلجھانے کے لیئے بطورِ خاص پیدا کیا گیا ہوں۔"

"تم سارا ہندوستان گھوم آؤ، تم دیکھو گے یہ ہر جگہ ایک سی زندگی جیتے ہیں۔ اس کا کچھ تو سبب ہوگا۔ آخر غلاظت کے ڈھیر میں زندگی گزارنا کسے اچھا لگتا ہوگا؟"

نیچے محلّے کی عبادت گاہوں سے لاؤڈ اسپیکر پر اذان کی آوازیں ایک دوسرے پر حاوی ہوتی ہوئی کھڑکیوں تک پہنچ رہی ہیں۔ ان کی سماعت اس یلغار کو قبول نہیں کرتی۔ انھیں بچپن سے اس کی عادت دی گئی ہے۔

"بہت جلد تم ان سب چیزوں کے عادی ہو جاؤ گے۔" دوسرا مہمان کرایہ دار کی پیٹھ پر ہمت افزائی کا ہاتھ رکھتا ہے، "اور ایک وقت آئے گا کہ ان کے بغیر نہ تمھیں نیند آئے گی نہ تمھاری آنکھیں کھلیں گی۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ جلد یا بدیر انسان کے لیئے ہر شے معتد ہو جاتی ہے۔"

"مگر سوال آخر وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟" پہلے مہمان نے پھر سے پوچھا ہے۔ "یہ محلّے ہمیشہ دھوئیں میں ڈوبے ہوئے کیوں رہتے ہیں؟ ان کے کھمبوں پر بلب ٹوٹے ہوئے کیوں ملتے ہیں؟ یہاں بازار میں اتنی بھیڑ کیوں ہے؟ یہاں بچے خارش زدہ کتوں سے بھی زیادہ خوفناک کیوں ہیں؟ عورتیں اتنے بچے کیوں جنتی ہیں؟ یہ لوگ اتنے گوشت خور کیوں ہیں؟ سوال آخر وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے۔"

انھوں نے بوتل خالی کر ڈالی ہے۔ مگر گلاس ان کے حاشیوں تک لبالب بھرے ہیں۔ سگریٹ کے لانبے لانبے کش لگاتے ہوئے وہ پلکیں جھپک رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں اب کمرے کے اندرون میں مرکوز ہیں۔ جانے یہ کب خود اپنے اندر مڑ جائیں۔

"یہ چھت کتنی اونچی ہے!" تیسرا مہمان اپنا گلاس نصف خالی کر چکا ہے اور اسے یاد نہیں اب اس کا گلاس کون سا ہے اسی لیئے وہ سب سے آخر میں باقی کی شراب پینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ "اگر مکڑیوں نے جالے بنے تو تم انھیں صاف بھی نہ کر پاؤ گے۔"

"شاید میں فائر بریگیڈ والوں کو بلا لوں۔" کرایہ دار مسکرا رہا ہے۔

"تم اس چھت پر اعتبار نہیں کرسکتے۔" تیسرا مہمان اپنے گلاس کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ "اس کے کچھ اینٹ شہتیر سے باہر نکل آئے ہیں۔"

"شاید مکڑیاں انھیں اپنے جال سے کس ڈالیں۔" کرائے دار کا حوصلہ کسی وجہ سے بلند ہے۔ اس نے دل ہی دل میں نہ ہار ماننے کی ٹھان لی ہے۔

"پھر بھی تم ان کمروں میں خوش نہیں رہ سکتے۔ ان کی دیواروں پر تمھیں یہودی جوڑے کی پرچھائیاں دکھائی دیں گی۔ اور جانے کیوں مجھے لگتا ہے اس بڑھیا کی ناک طوطے کی چونچ کی طرح نوکیلی ہوگی۔ پاؤلا، کچھ اس طرح کا تصور دیتا ہے یہ نام۔"

"بکواس ہے یہ سب۔" پہلے مہمان نے اپنا پاؤں فرش پر پٹکنے کی کوشش کی ہے۔ "اس سے بڑی بکواس میں نے آج تک نہیں سنی۔ میں کہتا ہوں اس بکواس سے تمھارا ارادہ کیا ہے؟ تم ہمارے دوست کے اندر خوامخواہ کا ڈر پیدا کر رہے ہو۔"

"ارے ہاں، دیکھو مجھے۔ میں ڈر سے سہما جا رہا ہوں۔ مجھے پکڑے رہو ورنہ میں بگٹٹ بھاگ نکلوں گا۔"

شراب کی محفل ٹوٹ چکی ہے۔ بلب بجھا دیا گیا ہے۔ دروازے پر تالا لٹکا کر وہ لوگ جاچکے ہیں۔ شاہراہ کی طرف کھلنے والے پھاٹک پر انھوں نے ایک ٹیکسی روکی ہے۔ سکھ ڈرائیور میٹر سے زیادہ پیسے مانگ رہا ہے۔ یہ تو کلکتہ کے ہر دن کا رونا ہے۔

دم توڑتے دن نے پورے منظر پر تاریک سلوٹیں ڈالنی شروع کر دی

ہیں۔ ساری رہائشی علامتیں اقلیدس کے معلوم اور نامعلوم اصولوں کے منافی دکھائی دے رہی ہیں۔ مگر بچے کھڑکیوں کی لانبی عمودی سلاخوں کے درمیان اپنے معصوم بیضوی چہرے پروئے مسرور دکھائی دیتے ہیں۔ اسی دوران انھوں نے اپنی بہت ساری گیندیں کھو دی ہیں۔ انھوں نے محلے کے بچوں کو گیندیں اٹھا کر بھاگتے دیکھا ہے۔ ان کے اندر پلنے والی نفرت کی اپنی وجہیں بننے لگی ہیں۔ روایتی باپ نے بچوں کے ذہنوں کو پڑھنا شروع کردیا ہے۔ وہ ان کھڑکیوں پر تار کی جالیاں لگانے کے بارے میں سوچنے لگا ہے۔ مگر ایسے بہت سارے فیصلے ہیں جنھیں وہ عملی جامہ نہیں پہنا پاتا۔ وہ اکیلا آدمی اپنے روز کے معاملات میں الجھا رہتا ہے۔ اس کے تینوں بچے اپنے اسکول کے روزنامچوں پر ماں کے دستخط لیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے باپ کو ہمیشہ تھکا ہارا پایا ہے اور انھوں نے اپنے لیے مناسب فاصلے اپنا لیے ہیں۔ روایتی باپ ان فاصلوں کو طے نہیں کرپاتا۔ وہ اس ریگستان پر بھوکا پیاسا چل رہا ہے۔ اسے کسی نخلستان کی تلاش ہے۔ وہ اکثر رات کی تنہائی میں کسی کھڑکی کا پردہ سرکا لیتا ہے اور بوتل سے وہسکی اپنے گلاس میں انڈیلنے لگتا ہے جس میں برف کے کیوب پڑے ہیں۔ اس کی بیوی اس کے لیے اس کی لاعلمی میں تلے ہوئے نمکین بادام طشتری پر رکھتی ہے۔ بچے دوسرے کمرے میں ایک دوسرے پر تکیوں سے ٹکر مارتے ہیں۔ مکڑیاں چھت کے کونوں میں مکھیوں کے گرد جالے بن رہی ہیں۔ غسل خانے کے نلکے سے پانی قطرہ قطرہ ٹپکتا رہتا ہے۔ اس کے کاسۂ سر کے اندر شور مچاتا رہتا ہے۔ عورت اپنے شب خوابی کے لباس سے باہر آنا چاہتی ہے۔ اسے بھی کاہے بگاہے اپنے شوہر کی ضرورت پڑتی ہے۔ مرد شب و روز کے آخری حصہ پر خود کو تنہا، خالی اور نچوڑا ہوا پاتا ہے۔ وہ بیڈ شیٹ میں جذب دھبوں کو نظرانداز کرنا چاہتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب و غریب خواب منڈلاتے ہیں۔ خواب جو حقیقت سے بھی زیادہ بھیانک ہیں۔ خواب جن تک پہنچتے پہنچتے اکثر وہ جاگ اٹھتا ہے اور پھر ساری رات جاگتا رہتا ہے۔ جانے کب سو جاتا ہے۔

مکان مالک کا ایک نمائندہ بھی اس عمارت کے کسی فلیٹ میں رہتا ہے۔ چھت پر کئی لوہے کے پرانے کرم خوردہ ٹینک ہیں جو سارے کے سارے سڑ چکے ہیں، چوتے رہتے ہیں۔ وہ ان کے بیچ منڈلاتا رہتا ہے، ہر ایک کی اسٹاپ کاک سے سر کھپاتا ہے۔ کرائے وصولتا ہے، کرایہ داروں کی شکایات سنتا ہے گرچہ اس کے پاس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ایک دبلا پتلا سہما ہوا سا انسان، کیئر ٹیکر کی قلیل دقیانوسی آمدنی پر اپنے بال بچوں کے ساتھ کسی طرح گزارا کررہا ہے۔ وہ چائے پینے کے لیے اکثر رک جاتا ہے۔

"کبھی یہ سارا محلہ ویران پڑا رہتا تھا۔" وہ انھیں بتاتا ہے۔ "ایک دو کچے گھر، کچھ خودرو پیڑ اور تالاب کے چاروں کنارے کپڑا پچھوں پر پٹکتے ہوئے دھوبی یا مچھلی پکڑنے والے کاہل بوڑھے جن کی کھچڑی داڑھیوں میں کچھوؤں کے ٹوٹے ہوئے جسم چپکے ہوتے۔ اب تو وہ مچھلیاں، وہ دھوبی ان کے گدھے اور چھوکر سب جا چکے ہیں اور بوڑھے جانے کہاں مرکھپ گئے ہیں۔ اور آج اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو لوگ صحیح ڈھنگ سے بوڑھا ہونا بھی بھول گئے ہیں۔ میں لڑکا تھا جب لوگوں نے زمیندار سے بیکار پڑی زمینیں سستے پر لے کر ڈھانچے کھڑے کرنا شروع کردیے۔ زمینداری تو غیر قانونی قرار دی گئی ہے۔ زمینیں سرکاری ہوچکی ہیں۔ اب انھیں یہاں سے بے دخل کرنے کی طاقت کسی سیاسی جماعت میں نہیں اور لوگوں کی تعداد ہے کہ بڑھتی ہی جارہی ہے۔ تالاب کے کنارے کی کھلی جگہوں پر پرانے ڈرم کے کارخانے ہیں، تالاب کے پانی میں چمڑے دھوئے جاتے ہیں اور لوگ دستی بم بناتے ہیں، ہر سال ایک دو خون ہوجاتے ہیں۔ یہاں سے جانے کتنی لڑکیاں طوائفوں کے محلوں کی طرف چلی جاتی ہیں اور دائمی بیماریوں کے ساتھ واپس لوٹتی ہیں۔ پچاس سال کے اندر اندر اتنا کچھ میں نے بدلتے دیکھا ہے کہ اب مجھے لگتا ہے اگلے بیس سال تک شاید اور کچھ نہ بھی بدلے تو بھی میں کام چلا سکتا ہوں۔"

"شکر ہے، اس جانب تمھاری چہار دیواری اونچی ہے اور اس عمارت کا پھاٹک دوسری طرف کھلتا ہے۔" کرایہ دار کی بیوی موضوع کو بدلنا چاہتی ہے۔ "مگر اس عمارت میں تو پرانے کرایہ دار بھی ہوں گے۔ کتنی پرانی عمارت ہے یہ!"

"سب سے پرانے کرایہ دار تو مسٹر فرانکل تھے۔" کیئر ٹیکر ہنستا ہے۔ "نیو مارکیٹ میں ان کے کیک کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ میں نے تو کبھی وہاں گاہکوں کی بھیڑ نہیں دیکھی۔ کرسمس کے تہوار اور نیا سال کو چھوڑ کر۔ ایک گجراتی سیٹھ نے اسے خرید تو لیا ہے مگر لوگ کہتے ہیں اب اس کے کیک میں وہ بات نہیں۔ ظاہر ہے گجراتی سیٹھ کیک میں انڈے استعمال تو نہیں کرسکتا اور انڈوں کے بغیر کیک ویسا ہی ہے جیسے فرانکل کی بیوی کے بغیر مسٹر فرانکل۔"

"کیا مطلب؟"

"مسز بنجامن کے سارے دانت نقلی تھے۔ بڑھی پاؤلا اس کے کھانے چبا دیا کرتی تھی۔ یہ کہاں تک سچ ہے مجھے نہیں معلوم۔ مگر سب لوگ اس میں یقین رکھتے تھے۔"

"سچ مچ؟"

"اور کیا؟" کیئر ٹیکر ہنستا ہے۔ "مگر بوڑھے کے اندر بڑا دم خم تھا۔ اچھے اچھے مسٹنڈے اس کے ڈنڈے سے ڈرتے تھے جس کے سہارے وہ اس عمارت کے اندر اور اس کے آس پاس منڈلایا کرتا تھا۔ یہ افواہ گرم تھی کہ ویجا (OUIJA) کے ذریعے وہ اپنے مرے ہوئے رشتہ داروں کی روحوں کو بلایا کرتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم یہ افواہ صحیح تھی یا غلط۔ مگر میں نے کبھی چھان بین کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بوڑھے کے پاس ایک گن بھی تھی، لی انفیلڈ تھری ناٹ تھری (LE-ENFIELD 303)۔ سال میں ایک بار میں اسے بوڑھے کے لیے رجسٹر کرانے تھانے لے جایا کرتا تھا۔ اتنے بڑھاپے میں ایک نئے ملک میں جانے وہ کیا تیر ماریں گے۔"

"پانی کا ہر قطرہ واپس سمندر کی طرف لوٹنا چاہتا ہے۔" کرایہ دار کی بیوی
ے پسند نہیں کرتی۔ وہ جلد سے جلد اس سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔

"چھوٹے موٹے کام ہوں تو یاد کرلیا کیجئے گا۔"

"یہ لوگ ہماری گیند اٹھالے جاتے ہیں۔" سارے بچے یک زبان بول
ٹھے۔

"اب کی بار ہمیں بتا دینا۔ بہت پرانا آدمی ہوں میں یہاں کا۔ پیچھے کا سارا
لہ میرا چھانا ہوا ہے۔"

"کرایہ دار ان دنوں ذہنی طور پر پریشان رہنے لگا ہے۔ اس کے کام کی
وعیت اسے نیند میں بھی بے چین رکھتی ہے۔ مگر یہ پریشانی کسی دوسری طرح کی
ہے۔ اس کی بیوی اس سے کبھی کچھ نہیں پوچھتی۔ ایسے دورے اس پر آتے
ہتے ہیں۔ بادل گھرتے ہیں اور پھر چھوٹ جاتے ہیں۔ صاف نیلا آسمان دائمی
ہے۔ باقی کے سارے واقعات محض پرچھائیاں ہیں۔ بیویاں ان معاملات میں
پنے شوہروں سے زیادہ دانشمند نکلتی ہیں۔ نئے رنگ و روغن کے بعد دونوں
کمرے اور بھی بڑے اور خوبصورت لگنے لگے ہیں۔ کھڑکیوں کے کواڑ تو پرانے
یں مگر نئے پردوں نے کسی حد تک ان کی ویرانی کا ازالہ کردیا ہے۔ ایک چڑیا
نکوا اپنی چونچ کے درمیان تھاما یا پھوس کا گچھا اٹھائے کھڑکیوں کے بیچ منڈلاتی نظر
آتی ہے جیسے کوئی عمارت کی چھت پر کھڑا پپیٹری (PUPPETRY) کررہا ہو۔
اپنے وہ اپنا گھونسلہ عمارت کی دیوار سے نکلے ہوئے کسی چھجے پر یا طفیلی پودے پر بنا
ہی ہے۔ باورچی خانے کی دیوار سے چپکی ہوئی جڑوں کو کھرچ کھرچ کر نکالنا پڑا
ہے۔ شاید باہر دیوار سے کوئی پیڑ اگا ہوا ہے۔ کھڑکیوں کی سلاخیں سر باہر نکال کر
یکھنے سے روکتی ہیں۔ اندر اور باہر کی دنیا کبھی ایک دوسرے میں دراندازی نہیں
وتیں۔ اس کے چند ہی گز سمت رام کی بالکنی شاہراہ کی طرف کھلتی ہے۔ اس
نے ایک نوکرانی کا انتظام کردیا ہے' تتری خاتون۔ وہ اسی گندے محلے سے آتی
ہے۔ اس اطراف کی ساری نوکرانیاں اسی محلے سے بن کر آتی ہیں۔ تتری
بھاڑو لگاتی ہے' زمین پونچھتی ہے' برتن دھوتی ہے' بہت کم گو ہے۔ اکثر سیدھی
سادی باتیں' جن کا تعلق اس کے کام سے نہ ہو' اس کے پلے بھی نہیں پڑتیں۔
تاہم کرایہ دار کی بیوی اسے پسند کرنے لگی ہے۔ بچے تتری کے ساتھ کھیلنے کے
لیئے بضد رہتے ہیں۔ مگر تتری کے پاس زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ اسے اور بھی بہت
سارے گھروں میں کام کرنے پڑتے ہیں' اپنے بچے سنبھالنے پڑتے ہیں' بچے
کرانے پڑتے ہیں۔

"اچھا ہے آپ کے فلیٹ کی کھڑکیاں اور بالکنی شاہراہ کی طرف کھلتی
ہیں۔" کرایہ دار گرمیت رام سے کہتا ہے۔ "یہ گندی بستی تو میرے سپنوں میں
بھی آجاتی ہے۔ میں اچھی چیزیں سوچ ہی نہیں پاتا۔"

"ارے نہیں۔ ادھر شاہراہ کا اتنا شور ہے کہ ہمیں ساری کھڑکیاں بند
رکھنی پڑتی ہیں۔ گاڑی کے دھوئیں نے تو بالکنی کی دیواروں کو سیاہ کر رکھا ہے۔
شاید اسی لیئے کتنے کرائے دار آئے گئے' مسٹر بنجامن نے کبھی اپنا فلیٹ نہیں
بدلا۔"

"اچھا!" مگر کرایہ دار کے شبہے کی دیوار جیسن قائم رہتی ہے۔ وہ اسی پر
بیٹھا رہتا ہے۔ اسے اپنے فلیٹ کی چاروں کھڑکیاں ایسے فریم کی طرح دکھائی دیتی
ہیں جنھوں نے پرانی' دھندلی اور اچاٹ تصویروں کو گھیرے میں لے رکھا ہو۔
دن بھر کے تناؤ کے بعد جب وہ شراب کی بوتل کھولتا ہے یا جب اپنی بیوی کے
پاس جاتا ہے' اس کے الفاظ' اس کا رد عمل اسی بستی کا احاطہ کیئے ہوئے رہتے
ہیں۔

"ایسی بستیاں ہمارے وطن کے سینے پر داغ ہیں' ہمیں ان کے بارے میں
سوچنا چاہیئے۔" وہ خود کو ایک وسیع و عریض قومی نظریئے کے پیچھے پناہ لینے پر
مجبور پاتا ہے۔ "یقیناً انھیں بدلنے کی ضرورت ہے۔ ضرورت ہے کہ نئے سرے
سے پورے شہر کی گندگی دور کی جائے۔ ایک مکمل سرکاری پالیسی جو چھوٹے
موٹے روز مرہ کے سینٹی منٹس (SENTIMENTS) سے ابھر سکے اور اپنا کام
کرے' ایک سرجن کی طرح جو ہمارے جسم کی رسولی کاٹ کر باہر نکالتا ہے۔"

"تم ناممکن چیزوں کو بہت سوچنے لگے ہو۔" اس کی بیوی اسے سمجھاتی
ہے۔ "تم یوں ہی تناؤ کا شکار نہیں ہو' تم نے خود کو اس کے لیئے مخصوص کر رکھا
ہے۔ مجھے نہیں لگتا ہم یہاں کسی دوسری جگہ سے کسی طور اچھے یا برے ہیں۔
بچے اپنا الگ کمرہ پاکر کتنا خوش ہیں۔"

"تم عورتیں بہت جلد مطمئن ہوجاتی ہو۔" کرایہ دار کے اندر کا غصہ
اس کی زبان روک دیتا ہے۔ ایک مختصر سی خاموشی کے بعد وہ اپنی دلیل پیش کرتا
ہے۔ "اور کیا بچے کھلی ہوا نہیں مانگتے؟"

"تم تو انھیں پارک تک نہیں لے جاتے۔"

"عورت تم بس عورت ہو۔" کرایہ دار مزید کچھ کہہ نہیں پاتا۔ ہمیشہ کی
طرح وہ خود کو بیوی کے آگے بے بس پاتا ہے۔ مگر پھر وہ اپنے سوچنے کا انداز بدلتا
ہے۔ بیچاری' دن بھر اسے اسی منظر کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ سنک گئی ہے۔

اس دن بھی دوسرے دنوں کی طرح کام پر جانے کے لیئے وہ تیار بیٹھا ہے
مگر اسے سارا گھر گندا اور بدبودار سا لگتا ہے۔ تتری پچھلے چار دن سے غائب
ہے۔ اس کی بیوی تین بار باتونی کیئر ٹیکر سے مل چکی ہے۔ مگر اس کمبخت کو
پرانے انگریزی تھریلر (THRILEER) پڑھنے کا جنون ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح
خود کو اس معاملے سے الگ کرلیتا ہے۔ خود اسے اپنے تناؤ سے فرصت کب تھی
کہ اس طرف توجہ دے پاتا۔

"لگتا ہے اسے کسی دوسری جگہ کام مل گیا ہے۔" کرایہ دار حقارت سے
کہتا ہے۔ "اس گندی بستی کے لوگوں سے تم اور کیا امید کرسکتی ہو؟"

"تتری ایسی نہیں ہے۔" بیوی کہتی ہے۔ "وہ بیچاری تو سیدھی سادی
عورت ہے۔"

"تب یا تو بچے جن رہی ہوگی یا شوہر کی مار کھا کر لہولہان پڑی ہوگی۔"
کرایہ دار کہتا ہے۔

"اسے بھول جاؤ۔ کسی اچھی ماسی کا انتظام کرتے ہیں۔ کینٹ اور گوساپہ سے شرنار تھی لڑکیاں بہت آتی ہیں۔"

"اتنا آسان نہیں ہے یہ۔"

شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا۔ متواتر چھ دنوں کے انتظار کے بعد کرایہ دار کو تتری کی تلاش پر نکلنا پڑتا ہے۔ پانی کا کام کرتے کرتے بیوی کو دمے کی شکایت بڑھتی جارہی ہے۔ کپڑے ٹھیک سے دھل نہیں پاتے۔ فرش پر میل اور چکنائی کی موٹی تہہ جمتی جارہی ہے۔ کینٹ سے آنے والی ماسی کے سو نخرے ہیں۔ وہ ماہانہ تین سو روپئے مانگتی ہے جو ضرورت سے زیادہ تو نہیں مگر اس اطراف کی نوکرانیوں کی عادت خراب کرنے کے لیئے کافی ہے۔

بستی میں داخل ہونے کے لیئے اسے ایک لمبا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ موسم سرما کے ہلکے بادلوں نے سورج کو اداس کردیا ہے۔ کچھ لنگور سامنے پھیلے ہوئے ٹن کے شیڈ پر شور مچاتے ہوئے اس کا استقبال کرتے ہیں۔ گوشت کی دکانوں کے سامنے جہاں غلیظ کتے لوٹ رہے ہیں وہ رومال ناک پر رکھ لیتا ہے۔ اتنی گلیاں غیر متوقع طور پر راستے پر کھلتی ہیں کہ ہر دو قدم پر کسی راہ گیر یا تیز سائیکل سوار یا کسی گھومتے ہوئے ٹھیلے سے ٹکراتے ہوئے وہ بچتا ہے۔ کم عمر کے لڑکے نمبر پلیٹ سے عاری موٹر سائیکلوں پر چکر لگا رہے ہیں جب کہ یہ صاف ظاہر ہے کہ ان کی موٹر سائیکل سواری کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ مکھیاں کھلے نالوں پر' سڑے گلے پھلوں پر اور بڑی بڑی غیر انسانی آنکھوں پر جم رہی ہیں۔ ہر قدم پر نت نئی بدبوؤں کی یلغار ہے۔ مگر ایک بدبو' چربی کے گلانے کی اور چمڑوں کے دھونے کی بدبو دائمی طور پر اس کے نتھنوں پر جمی ہوئی ہے۔ وہ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیئے سانسوں کو زور زور سے باہر کی طرف پھینکتا ہے۔ آخر اسے بستی میں آنے کا خیال ہی کیوں آیا تھا۔ اس نے ایسے حالات پیدا ہی کیوں کئے کہ اسے زندگی کی اتنی گھناؤنی حقیقتوں کا اتنی نزدیکی سے سامنا کرنا پڑا۔ آہ' یہ کہاں تک سچ ہے کہ ہم ایک حیرت انگیز راہ کی پرجا ہیں۔ وہ بلاوجہ کبھی کبھار آنکھیں موند لیتا ہے اور کبھی کبھی اس کی آنکھیں یاقوت میں بدل جاتی ہیں۔ کیا وہ اس دنیا کو دیکھ پاتا ہے جو پیدا نہ ہو پائی۔ کیا وہ ان غیر معمولی واقعات کو ہونے سے روک پاتا ہے جو دوسرے حالات میں اتنے غیر معمولی نہیں ہوتے۔ اگر اس مٹی پر انسانی زندگیاں ایک سی نوعیت کی ہیں تو وہ کون سے اتفاقات ہیں جو انھیں الگ الگ دھارے کی طرف بہالے جاتے ہیں؟

اور ایک دن تھا جب میں خود بھی ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ ماں میرے سامنے رنگین' میٹھے لبھاؤنے ڈھنگ سے اپنے پستان کھولتی اور میری انگلیوں میں صبح کی لالی پھوٹتی تھی اور میری آواز پرندے اٹھالے جاتے۔ میرے سر پر چاند کی درانتی بادلوں کو کاٹتی جاتی۔ مہمان عجیب و غریب واقعات کے ساتھ ہمارے دروازے پر آتے۔ مگر یہ جانے کب کی بات ہے؟ جانے کبھی یہ واقعات پیش آئے بھی یا نہیں اور اگر نہیں تو کیوں اب ہوا کھتیوں میں ارتعاش ڈالتی ہے۔ موجوں سے جھاگ اڑ اڑ کر ہمارے بالوں سے چپکتی ہے۔ میں [illegible] کراں سمندر کے پار تاکتا ہوں۔ مگر ایک کالا دھواں ہے جو میرے اندر [illegible] رواں ہے۔ میں اس کا کیا کروں!

تتری کی پلکیں لانبی ہیں۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی سے تکونے ہرے [illegible] نکل آئے ہیں۔ وہ ایک گیت بن چکی ہے جس میں ایک دائمی حمل کا ذکر [illegible] ایک جاوداں طور پر دردزہ سے کراہتی ماں کا المیہ ہے۔ وہ مڑ کر تاکتا ہے۔ یہاں [illegible] مکانات اتنے بے تکے طور پر کمزور کیوں ہیں؟ کیوں لوگ باگ نئی نئی آنکھوں سے میری طرف تاک رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ساری دنیا کسی طے شدہ منصوبے کے تحت اس ایک مرکز پر جمع ہو گئی ہو۔ آہ' میں اس بھنور میں کیسے [illegible] جہاں کٹے' انسان' کاغذی کشتیاں' کنول کے پھول' تنکے سب میرے ساتھ چکرا رہے ہیں' میرے جسم سے ٹکرا رہے ہیں۔ میں ایک مصروف بازار کے بیچ [illegible] ہوں اور اپنے پر کھول کر اڑنا چاہتا ہوں۔ تتری نتھنے پھلا کر ہنس رہی ہے۔ [illegible] میرے قریب رہنا چاہتی ہے۔ وہ مجھے اڑنے سے روکتی ہے۔

"میں بیمار ہوں۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔ دیکھو میرے بدن میں خون [illegible] بند ہو چکا ہے۔"

"میں راستہ بھول چکا ہوں تتری۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"اس کا مطلب کیا ہے؟"

"اس کے لیئے وقت کس کے پاس ہے۔ تم صرف راستہ کے [illegible] مجھے سنبھال کر چلتے رہو۔ صرف چلنا ہی سارے مسئلوں کا حل ہے۔"

"اس طرح تو میں اس دہرے بوجھ سے دب کر فنا ہو جاؤں گا۔"

"مگر تم کبھی فنا نہیں ہوتے۔ یہ سچ ہے کہ تم کبھی فنا نہیں ہوتے۔"

"تتری اس پر بھروسا نہ کرنا۔" ایک گرگٹ بجلی کے کھمبے سے اپنا رنگین [illegible] سر موڑ کر کہتا ہے۔ اس کی لپلپاتی زبان پر الفاظ بونے انسانوں کی طرح رقص کرتے ہیں۔ "اس پر بھروسا نہ کرنا' نہ کرنا۔"

مجھے سخت پیاس لگتی ہے۔ تتری میرے مانوس گلاس میں مجھے پینے کے لیئے کچھ دیتی ہے۔ اس کا ذائقہ وسکی کی طرح تیکھا ہے۔ ایک شخص میری بغل میں کھڑا ہے۔ اس کے داہنے ہاتھ میں صرف ایک ہی انگلی بچی ہے۔ وہ اپنی واحد انگلی سے گلاس کے اندر اشارہ کررہا ہے۔ اب میں تتری سے [illegible] ہوں۔ وہ مجھے ڈھکیلنا چاہتا ہے۔ تتری کی ناف کی ڈوری ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ [illegible] سے کراہتی ہے' چلاتی ہے۔ میں سڑک پار کرتا ہوں۔ مگر میں بار بار تتری کی طرف لوٹنے لگتا ہوں۔

"تتری مجھے معاف کردینا۔ میرے گناہ عظیم ہیں۔"

تتری تخت پوش پر ننگی پڑی' بڑی بڑی بے رونق آنکھوں سے میری طرف تاک رہی ہے۔ وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے جانے کا اشارہ کرتی [illegible] میں بگٹٹ سڑک کے پار بھاگتا ہوں۔ وہ عجیب الخلقت آدمی اپنی اکلوتی انگلی [illegible]

ے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے میرا پیچھا کرنے سے باز نہیں آتا- میں ہار کر
لاس زمین پر پٹخ دیتا ہوں- بہت آگے جا کر مڑ کر دیکھتا ہوں- وہ اس گلاس کے
لڑوں کے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے' واپس لوٹ رہا ہے-

مجھے لگتا ہے' میں بہت تھک چکا ہوں-

میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا تالاب کے کنارے پہنچ گیا ہوں- میں
ھٹنوں کے بل گر کر اپنی غلیظ انگلیوں کو اس کے پانی کے اندر پیوست کر رہا
ں- میری انگلیوں سے ایک گز کی دوری پر کنول کے لاتعداد پھول پانی پر بچھے
ہے پتوں کے بیچ ڈول رہے ہیں-

اور میرے سر اٹھانے سے پہلے ہی تالاب کے اندر سے ایک
صورت' دلدار ٹوٹی پھوٹی بوڑھی عمارت ابھرتی ہے- اس کی بالائی منزل پر
وم قد کھڑکی کی سلاخوں کو تھامے بوڑھا بنجامن فرانکل کھڑا ہے- پھر وہ غائب
رجاتا ہے اور دوبارا دکھائی دیتا ہے تو اس کے ہاتھ میں ایک گن ہے- مگر اس
ے باوجود کہ اس کے ارادے کچھ بھی ہوں' ہوا میں میٹھی آوازوں کا سرگم ہے
یسے بچے کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر کچھ گیت الاپ رہے ہوں- اور جب کہ یہ
بھی آوازیں میرے بچپن کے معصوم دنوں سے پردے سرکا رہی ہیں' میری
ندید خواہش کے باوجود یہ عمارت ایک غلیظ چادر کی طرح میرے سامنے لٹک
ہتی ہے اور جب اس عمارت پر رات اترتی ہے تو پرندے اس کی کمزوری
یواروں' اس کے پایوں اور روشن دانوں سے ٹکراتے ہیں' بھٹکی ہوئی آتماؤں
ی طرح جب کہ وہ دیوار سے نکلے ہوں پیڑ پر بنے گھونسلے تک پہنچنا چاہتے ہیں-
یہ عمارت جو دھیرے دھیرے ذرات میں منتشر ہو رہی ہے' وہ آنکھیں کیسی ہوں
ی جو اس عمل کو دیکھ پاتی ہیں؟

شاید بوڑھے بنجامن اور بوڑھی پاؤلا نے اس کو دیکھا ہوگا اور یروشلم کی
ہرت کا یہ جواز انھیں کسی ذائس پورا سے تم نہ لگا ہوگا- مگر شاید بوڑھے
زانکل نے لی انفیلڈ تھری ناٹ تھری داغ دی ہے ورنہ خون شمال سے جنوب کی
طرف ہندوستان کا نقشہ بناتا ہوا اس کی عینک کے شیشوں کو ڈھک کیوں
رہا ہے؟ اور جب کہ اس کی سانسیں پھول رہی ہیں وہ اپنے بچوں کی آوازیں
پہچان لیتا ہے وہ کھڑکیوں سے اپنے ننھے منے ہاتھ باہر نکال کر اسے پکار رہے
ہیں- اس کی بیوی خاموش ہے- اس کے چہرے پر ایک بلا کی طمانیت ہے- وہ
سپنے دبیز بالوں میں دانت سے نکال نکال کر کلپ گھونپ رہی ہے-

یہ آوازیں چاند کی روشنی کی طرح مجھ تک تو آتی ہیں- مگر میرے
بھگوان' کیا میں کبھی ان ہاتھوں تک پہنچ پاؤں گا- کیا میں ہاتھ بڑھا کر ان کے
لیئے کوئی سرخ کنول توڑ پاؤں گا- ◢◢

غزل

باقر نقوی

شہر میں یوں ہی ڈھیر بہت ہے سونے چاندی کا
لطف تو جب ہے محل ہو اپنا چاند کی مٹی کا

دل پتھر کا ہوتا شاید آنکھیں شیشے کی
مجنوں صاحب شکر کرو حوا کی بیٹی کا

چاند کو گرہن سال میں دو ایک بار ہی لگتا ہے
ہم نے تو ہر رات ہی دیکھا گرہن دھرتی کا

اس مٹی نے ہمیں بہت مایوس کیا جرنیل
اب کوئی چلا چاندی کی یا مریخ کی مٹی کا

مٹی مٹی کرتا ہے اور بھول گیا پیارے
سَتر ہی صد جسم ترا مقروض ہے پانی کا

دھرتی ہم نے تجھ سے مانگا بھی تو کیا مانگا
ایک پیالہ پانی ایک نوالہ روٹی کا

دنیا کے ہر کام سے ہم ہو جاتے ہیں بے کام
شام ڈھلے جب کھل جاتا ہے پٹ اس کھڑکی کا

اسلام آباد بسانے والے ملے بہت باقر
ہے کوئی چاہنے والا اپنے شہر کراچی کا

ایک سنجیدہ ڈی ٹیکٹو اسٹوری

اسد محمد خاں

[مغلوں سے پہلے ـــــ اور ان کے بعد بھی ـــــ ناپسندیدہ سلطان یا نا پسندیدہ سلطانہ سے پیچھا چھڑانے کی راست صورت یہی سمجھی گئی کہ ایکسو ایک مروج طریقوں میں سے کوئی ایک استعمال کرتے ہوئے اسے ہلاک کر دیا جائے۔ تلوار سے یا پھانسی دے کر، وش کنّیا سے ہمبستری کراکے یا سور کے پر سے تلوؤں میں گد گدی کرتے ہوئے ـــــ جیسے بھی بن پڑے۔
ذاتی طور پر مصنّف ان تمام ایکسو ایک طریقوں کے حق میں ہے۔ مگر کیوں کہ یہ کہانی مزاحمت کرنے والے نقطۂ نظر سے سوچی گئی ہے اس لئے فی الحال یہ مصنّف رسمی معذرت پیش کرتے ہوئے کہانی سنانا شروع کرتا ہے۔]

دریا خاں حجاب دار پرانے وفاداروں میں سے تھا۔ وہ اقامت گاہ سلطانی کے قریب کہیں رہتا تھا۔ ایک بار راستہ طے کرتے ہوئے دریا خان بازار کے بھیڑ بھڑکے میں پھنس گیا۔

اجناس کی منڈی کے اس ہجوم میں پھنس کے دریا خان حجاب دار نے عجیب طرح کی بے بسی اور الجھن محسوس کی۔ اُسے دیر پر دیر ہو رہی تھی۔ یہ الجھن ایک آہستہ سلگنے والے غصّے کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی کہ اس نے دوسری طرح سی یہ بات سوچی۔ اس نے غور کیا کہ اناج منڈی کے حمال گاڑیاں، بیلیاں اور گڑاسکے راستے میں نہیں آ رہے، وہ خود ان کی راہ کھوٹی کر رہا ہے۔ "یہ ان کا علاقہ ہے اور میں یہاں اجنبی ہوں" یہ سوچتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ غصّہ ٹل گیا۔

دریا خان کے لباس، اس کی تلوار کے مرصّع نیام یا دستار کے جواہر نگار جیغے پر جس بھی رہ گیر کی نظر پڑتی یا جو بھی گاڑی بان اس کی بے تکلف چال، سرخ و سپید رنگت اور بارعب چہرے کی جھلک دیکھ لیتا وہ حیران اور مرعوب ہو کر راہ دے دیتا، گاڑی کی رفتار کم کر کے اسے گزرنے کا موقع دیتا تھا۔

روزمرّہ کے مفید کاموں میں مصروف ان سادہ، محنتی لوگوں کو اپنی موجودگی سے اس طرح ٹوکتا دریا خان کو اچھا نہ لگا۔ اس نے چلتے چلتے ہاتھ بڑھا کر دستار کا زیور اتار لیا۔ اُسے اپنی جیب کے حوالے کیا۔ کمر کا دوپٹا کھول اسے سر اور شانوں کے گرد اس طرح لپیٹ لیا کہ زردوزی کی جھلملاتی دستار اور گردن اور شانوں پر بنے درباری نشان چھپ گئے۔ چہرے کا کچھ حصّہ بھی بازار کے گرد و غبار سے اور سرسری دیکھنے والوں کی نظروں سے محفوظ ہو گیا۔ اس نے آستین سے رومال کھینچ کر اسے اپنی تلوار کے مرصّع نیام پر لپیٹ لیا۔ اب چلتے پھرتے، قریب و دور کا کائی بھی دیکھنے والا دریا خان کو دیکھ کر ٹھٹھکتا نہیں تھا۔ وہ خریداروں، بیوپاریوں، حمالوں کے ہجوم میں اب ایک عام سادہ گیر تھا جو اجناس کی منڈی میں اعتماد کے ساتھ راستہ طے کر رہا تھا۔

لوگوں نے اسے دیکھنا بند کر دیا تھا مگر ادھر ادھر نگاہ ڈالتے ہوئے خود دریا خان نے ایک ایسا شخص دیکھا جو اگرچہ عامیانہ پوشاک پہنے تھا مگر عامیوں میں سے نہ تھا۔ وہ اپنے نکلتے قد کے ساتھ کوبڑ نکال کر چل رہا تھا۔ دریا خان کو یوں لگا جیسے وہ بھی ہجوم میں گم ہونا چاہتا ہے۔ اور یہ احساس ہوا کہ میں نے اسے کہیں بار بار دیکھا ہے۔ مگر کہاں؟ دارالحکومت میں؟ دربار میں؟ دریا خان نے اُس کشیدہ قامت آدمی کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ دربار میں پیش بھی کیا تھا ـــــ ہاں! یہ بد نگالی طبیب زادہ ہے ـــــ بھلا سا نام ہے، القانس؟ نہاں ـــــ اقانزو ـــــ مگر یہ اس وقت یہاں؟ اجناس کی منڈی میں؟

ایک حبشی حمال بڑا سا تھیلا اُٹھائے اقانزو کے پیچھے پیچھے چلا جاتا تھا۔

دریا خان نے سوچا عجیب بات ہے جو شخص دیسی درباریوں کو خاطر میں نہ لاتا ہو وہ اس وقت اس حبشی حمال کے ساتھ خوب باتیں کرتا کہیں جا رہا ہے؟ ـــــ تو یہ کہاں جا رہا ہے؟

کہیں بھی جانے سے پہلے دریا خان اپنے تجسّس کی تسکین چاہتا تھا ـــــ وہ دس قدم کے فاصلے سے اقانزو اور حمال کے پیچھے چلنے لگا۔

جس شہر میں سلطان یا سلطانہ موجود ہوں وہاں دیوان غرطہ کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ بات مملکت کے میر توزک اور دربار کے حجاب دار (یہ دونوں عہدے دریا خان کے پاس تھے) سے زیادہ کون جانتا ہوگا۔ دریا خان جانتا تھا کہ کتنے ہی مخبر اور پرچہ نویس ولایت "تلف" کی سرکار "با" میں اسوقت زندگی کے ہر شعبے کی ہر عامی اور سرکاری سرگرمی کا مشاہدہ کر رہے ہوں گے اور ڈاک چوکی کے تیز رو نظام کو لیاقت سے استعمال کرتے ہوئے آس پاس کے احوال سمیت اپنے مشاہدات درروزہ ڈاک چوکی کی وساطت سے خود سلطان والا جاہ یا سلطانہ معظمہ تک پہنچاتے ہوں گے۔ مگر دریا نے یاد کیا کہ سلطان کچھ عرصے سے علیل ہیں اس لئے بے شمار پرچہ نویسوں کی بھیجی ہوئی

بے حساب خبریں خود اُن کے ملاحظے میں نہیں آرہی۔ پھر بھی دیوان وزارت آٹھوں پہر بیدار رہنے والا محکمہ تھا تو اس کے ہوتے دریا خان کو ڈاک چوکی کے فرائض ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے ۔۔۔ ؟ تاہم ایک غیر معمولی بات مشاہدے میں آگئی ہے اس لئے جاننا ضروری ہے کہ یہ شخص افانزو آخر اس وقت جاتا کہاں ہے۔ تجسس دور کر کے دریا خان اپنی راہ لے گا۔ اگر کوئی غیر معمولی بات اِس بارے میں اس کے مشاہدے میں آئی تو شحنہ کو بلوا کے اس کے علم میں لائے گا ورنہ سمجھے گا کہ یہ نصف ساعت بازار میں ضائع ہوئی۔

افانزو اور حبشی نارجیل فروشوں کے کوچے کی طرف مڑ گئے۔ یہاں دکانوں پر تازہ سبز کھال کے ناریل لٹکے تھے۔ کہیں پختہ کتھئی رنگ اور گھنی جٹا والے ناریل کسی شیلانی جنگ و جدال کے بعد بنائے گئے سروں کے میناروں جیسے سجائے گئے تھے تو کہیں مونجھ نوچ لیے جانے کے بعد وہ لکڑی کی بیضوی گیندوں کی طرح پڑے لو جھکتے تھے۔ کسی دوکان دار نے نارجیل کا کاسہ توڑ کے اور تازہ کھوپرے کو قاموش میں تراش کے یہ دکھانے کے لئے انھیں طشتوں میں سجا دیا تھا کہ اس کے پھل تازہ اور فربہ ہیں۔

دریا خان یہی سب دیکھتا اور دکان داروں کے آوازے سنتا آرہا تھا کہ اچانک سامنے کوئی کشمکش اور ہیجان ساائی اور دکھائی دیا۔

ہوا یہ تھا کہ بے ڈھنگے پن سے چلتے ہوئے افانزو کے ساتھی حبشی نے اپنا تھیلا سبز نارجیلوں کی ایک سجاوٹ سے ٹکرا دیا تھا۔ تھیلا اس کی گرفت سے چھوٹ کے زمین پر آواز کے ساتھ گرا تھا اور کھڑبڑ کرتی بہت سی چیزیں تھیلے سے باہر جا پڑی تھیں۔ تانبے کے قلعی کیے ہوئے کٹورے، بادیے، طشتریاں، قاشق، چمچے سب طرف بکھر گئے تھے۔ دریا خان ٹھہر گیا۔ افانزو سخت پریشان اور برہم ہوا، اس نے طیش میں حبشی کی کمر پر لات ماری اور اپنی زبان میں بک جھک کرتا اکڑوں بیٹھ کے برتن سمیٹنے میں حبشی کا ہاتھ بٹانے لگا۔

تھیلے کا ٹکرانا اور برتنوں کا بکھر جانا ایک اعتبار سے غیبی امداد تھی۔ یوں لگا جیسے قدرت خود دریا خان کی مدد کر رہی ہے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ حبشی کے تھیلے میں کیا ہے اور اب اس نے دیکھ لیا تھا۔ یہ کس باحیثیت گھر کے برتن تھے، تاہم ایک بات طے تھی کہ یہ افانزو کے گھر کے برتن نہیں تھے۔ نہ ہی یہ عرقیات اور سفوفوں، معجونوں کے ظروف یا طبیبوں کی دوا سازی میں کام آنے والے قرابے اور بادیے تھے۔ پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا افانزو انھیں قلعی کرانے لیے جا رہا ہے۔ ؟ مگر یہ تو تازہ قلعی سے چمچمارہے ہیں اور دستور یہ ہے کہ قلعی گروں کے پاس برتن بھانڈے نہیں لے جائے جاتے، وہ خود مکانوں پر پہنچ کر قلعی کرتے ہیں۔ یہ برتن نئے خریدے ہوئے بھی نہیں تھے ۔۔۔ یہ اگر ابھی خریدے گئے ہیں تو اجناس کی منڈی میں ان کا کیا کام ؟ ٹھٹھیروں کسیروں کا بازار تو کسی اور ہی طرف ہے۔ دریا خان پہلے سے زیادہ الجھ گیا بھلا الجھنے کی بات نہیں تھی ؟ افانزو کا ٹھکانہ اقامت گاہ سلطانی کے قریب دریائے عود کے رخ پر ہے تو پھر راہ سے بے راہ یہ برتن اٹھوائے کہاں جا رہا ہے ؟

حبشی نے برتن سمیٹ کے دوبارہ تھیلے میں بھر لئے تھے اور اب وہ زی
احتیاط اور مستعدی سے افانزو کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دریا خان نے دونوں کے پیچھے چلتے ہوئے برتنوں کی اقسام اور اُن کی تعداد پر پھر غور کیا۔ سـ
برتن وہ تھے جو کھانا نکالنے پیش کرنے میں استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں ایسا کو
برتن نہ تھا جو کھانا پکانے میں کام آتا ہو۔ دریا خان نے سوچا سبحان اللہ یہ ج
کوتوال کے مخبروں، دیوان شرطہ کے دانش مندوں کی طرح برتنوں کی
کیوں سلجھا رہا ہوں ؟ راستے کی تھکن اور بھوک کا تو واللہ مجھے خیال ہی نہ ر
اس بد نگالی طبیب بچے سے فراغت ہو تو کچھ زہر مار کروں۔

نارجیل فروشوں کا کوچہ ختم نہیں ہوا تھا کہ دیوان شرطہ کے دو اہل
پٹکے باندھے کمر کسے سامنے کوچے میں داخل ہو گئے۔ افانزو نے اپنے حبشی
زیر لب کچھ کہا اور خود اس نے ایک محراب کی اوٹ لے لی۔ دیوان شرطہ
اہل کار دریا خان کو توجہ سے دیکھتے ہوئے اس کے برابر سے نکل گئے۔ ان
ہجوم میں غائب ہوتے ہی افانزو نے محراب سے سر نکال کے جھانکا اور دور
نظر ڈالی۔ دریا خان مڑ کے ایک نارجیل فروش سے سودے کے دام پوچھنے لگا
مگر اس کا دھیان دکان دار کے جواب پر نہ تھا، جس نے کچھ کہا تھا دریا خان ا
میں سر ہلاتا افانزو کے پیچھے چل پڑا۔ پر نگالی طبیب زادے نے قدم بڑھا
حبشی حمال کو جا لیا تھا۔ طبیب زادہ قانون کے خلاف کسی کام میں پڑا ہے ج
دیوان قانون کے اہلکاروں سے چھپتا ہے۔ اب میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑ
گا۔"

نارجیل فروش کے کوچے سے نکل کر حبشی اور قرا افانزو روغن فروش
اور نانبائیوں کے علاقے میں پہنچ گئے تھے، یہاں ایک حقیر سے قہوے خا
کے پاس وہ دونوں ٹھہر گئے۔ حبشی قہوے خانے کے مالک سے کچھ کہتا رہا، وہ
ہلا کے انکار کرتا تھا مگر جب افانزو نے اپنی پہنی ہوئی انگشتری اتار کے اسے
تو قہوے خانے کا مالک پہلے تو الٹ پلٹ کر اسے دیکھتا رہا پھر دونوں کو اندر دکا
میں بلایا اور خود وہ انگشتری جیب میں ڈال ایک طرف کو روانہ ہوا۔

افانزو نے قہوے خانے کی یکدری میں جا بیٹھنے سے پہلے دور تک کو
میں نظر ڈال کے اپنا اطمینان کیا تھا۔ دریا خان اس کا ارادہ بھانپ کے پہلے
ایک روغن ساز کے کارخانے میں داخل ہو گیا تھا جہاں روغنوں کے بھاؤ پو
اور عدم اطمینان ظاہر کرتا وہ گھومتا رہا۔

کچھ وقت گذر گیا آخر قہوہ فروش اپنی دکان میں واپس آیا اور افانزو کو
انگشتری لوٹا کر اسے اور حبشی کو اپنے ساتھ لیے چل پڑا۔ دریا خان نے رو
فروش سے پیچھا چھڑانے کو یہ کہا کہ میں دام سے خوش نہیں ہوا، مال یہ بہر حا
اچھا ہے، کیوں نہ ایک دو دوکان اور دیکھ لوں ۔۔۔ یہ کہہ کے وہ افانزو اور اس
ساتھیوں کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

دریا خان نے دیکھا وہ لوگ کچھ دور ایک چوڑی گلی میں داخل ہو گئے ہیں
دو چار بڑے پھاٹکوں والے مکان چھوڑ وہ ایک غیر معمولی بلند دروازے تک

پہنچے۔ یہ کسی با اختیار معزز کا مکان ہو گا کس لئے اتنا بلند دروازہ فیل نشین ہی بنواتے ہیں۔ تاہم مکان پر ایک عام خستہ حالی چھائی ہوئی تھی۔ قہوے فروش نے دروازے پر خفیہ دستک دی ہو گی یا شاید روزن سے انھیں کوئی دیکھتا ہو گا جو خاموشی سے دروازہ کھل گیا اور وہ تینوں مکان میں داخل ہو گئے۔ دروازہ بند کر لیا گیا۔

دریا خان کے لئے یہ وقت بڑے اضطراب کا تھا وہ بہ زور اس مکان میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ شور شرابا سن کے افانزو کسی اور راستے سے نکل جاتا اور ساری محنت اکارت ہوتی۔ خان نے آس پاس کے مکانوں اور گلیوں کا جائزہ لیا۔ بازار کی عمومی سرگرمی جاری تھی۔ کسی نے دریا کو یا افانزو اور اس کے ساتھیوں کو نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا ہو گا۔ اس نے سوچا وہ کیا کرے؟ کیا دیوان عرطہ سے مدد لے؟ مگر دریا خان اپنے مستقر سے دور تھا اور وہ دربار سلطانی میں اپنے ہم چشموں ہم رتبہ امیروں کے تمسخر کا نشانہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ "میرے پاس کہنے کے لئے پوری بات اور کوئی واضح الزام تو ہونا چاہئے۔ صرف شک شبہے پر تو کام نہیں چلتا"

دریا خان نے کوچے پر نظر ڈالتے ہوئے اس بات کا مشاہدہ کیا تھا کہ اس بڑے رستے اور متصل گلیاروں میں نانبائی، شیر فروش، باورچی بہت سے تھے مگر قہوہ فروش کی صرف دو ہی دکانیں تھیں۔ ایک دوکان تو وہی تھی جس کا مالک افانزو کو ساتھ لے گیا تھا دوسری ایک درجت کی اوٹ لیے جیسے بازار میں جھانکتی دکھائی پڑتی تھی اور پست حقیر اور خستہ حال تھی۔ اس وقت اس پر گاہک کوئی نہیں تھا۔ خیال ہوتا تھا کہ کچھ دیر سے ادھر کوئی آیا بھی نہیں۔ ایک بوڑھی عورت کوئلے کی انگیٹھی پر کیتلیاں جمائے اور تختے پر فنجان اوندھائے حقارت کے ساتھ ہر آتے جاتے کو دیکھتی تھی۔

دریا خان نے اندازہ لگایا کہ اگر کوئی اس کی مدد کر سکتا ہے تو یہی عورت کر سکتی ہے۔ اسے قیافہ شناسی میں دعویٰ تو نہیں تھا تاہم انتظامی امور میں ایک تجربہ ضرور تھا جس نے آگاہ کیا تھا کہ ایک کوچے میں ایک ہی طرح کا کاروبار کرنے والے دو دکانداروں میں رقابت تو ہو گی۔ دیگر یہ کہ بڑھیا کا دھندا بہت مندا چل رہا ہے اسے عام گاہکوں سے شکوہ بھی ہو گا اور سامنے یکدرے میں دکان جمائے جو ملعون رقیب بیٹھا ہے اس سے تو وہ باقاعدہ نفرت کرتی ہو گی۔

دریا خان نے خود پر جھنجھلاہٹ طاری کی، بڑبڑاتا ہوا بڑھیا کی خالی دُکان میں داخل ہو، پاپوش اتار گاہکوں کے چبوترے پر جا بیٹھا۔ عورت نے پیروں سے شروع کر کے دستار کے طرّے تک دریا خان کا جائزہ لیا۔ وہ پاپوش سے بندھی قیمتی مہمیز اور پوشاک کی عام نفاست دیکھ کے متاثر ہوئی تھی مگر عادتاً اتنی تلخ مزاج تھی کہ لگتا تھا دریا خان جیسے معزز گاہک کو بھی خاطر میں نہ لائے گی۔ خاموشی سے خان کا چہرہ دیکھتی رہی۔ دریا خان نے سوچے سمجھے طریق پر عمل کرتے ہوئے کہا: "تجھے بھی کہیں جانا ہو تو چلی جا۔ میں انتظار کر لوں گا"۔ اس نے یہ ظاہر کیا تھا جیسے وہ سامنے والے قہوہ فروش سے ناراض ہو کے یہاں آیا ہے۔ عورت گاہک کے جھنجھلانے پر حیران ہوئی۔ وہ سمجھی تھی جھنجھلانے کا حق اسی کا ہے۔ حیرت سے اپنے اس گاہک کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی، "مجھے کہیں نہیں جانا۔۔۔ کہو کیا چاہیے؟"

"قہوے اور چاروں طرف بھنبھناتی مکھیوں کے سوا تیرے پاس ہے کیا؟"

بات درست تھی۔ عورت نے مصالحت کے انداز میں چھوٹی سی کیتلی کو انگاروں پر ادھر ادھر جمانے کی کوشش کی 'بولی' یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ویسے اگر کچھ کھانا چاہو گے تو مشہدی قاسم کی دکان سے تازہ پنیر لا دو گی۔ مگر اسے دینے کے لئے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تمہیں پہلے پیسے دینے ہوں گے۔"

دریا خان بھوکا تھا۔ اس نے سوچا کیا حرج ہے پنیر اچھا ہوا تو کھا لوں گا ورنہ غریب بڑھیا خود بھوکی لگتی ہے وہ کھا لے گی۔ اس نے جیب سے چمڑے کی تھیلی نکالی اور دو دام لے کے بڑھیا کی طرف بڑھا دیے جب کہ پنیر، قہوے اور بہت سی چیزوں کے لیے ایک ہی دام کافی ہوتا۔ بڑھیا حیرت اور جھنجھلاہٹ میں سے کسی ایک کا انتخاب نہ کر سکی ملی جلی کیفیت میں بولی "ایک ہی بہت ہے"

"رکھ لو" دریا خان نے ہلکے غصے میں کہا، "بد دیانت قہوہ فروشوں کے کوچے میں خود کو یہاں اعتبار کا ثابت نہ کرو۔ رکھ لو!"

عورت پہلی بار گاہک سے خوش ہو کے بولی، "آقا! مجھے مرنے کے بعد خدا کو منہ دکھانا ہے۔ کوچے کے شیاطین سے مجھے کیا سروکار"۔ اور وہ تیزی کے ساتھ قہوے خانے سے نکل گئی۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ واپس آ کے اس اپنے منحوس رقیب قہوہ فروش کے خلاف ضرور کچھ کہے گی۔ یہ گاہک اس کے مزاج کا آدمی لگتا ہے۔

وہ لوٹی تو کیلے کے دھلے ہوئے تر و تازہ پتے میں لپٹا پنیر کا بڑا سا ٹکڑا اور ایک صاف ستھرے نئے کوزے میں پانی لائی تھی۔ کہنے لگی "تم جیسے سردار، ملک التجار کے لائق پانی کا برتن نہ تھا تو مشہدی قاسم سے کورا کوزہ مانگ لائی۔ لو کھاؤ میں ابھی قہوہ بناتی ہوں"

دریا خان نے ابھی کھانا بھی شروع نہیں کیا تھا کہ بڑھیا نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنا شروع کر دیے، بولی، "میں تو کہتی ہوں اُس منحوس قزاق سے ہم غریبوں کا مقابلہ نہ کیا جائے تو اچھا ہے۔ کاہی ایک کاروبار تو ہے نہیں اس کا۔" بڑھیا فقرہ پھینک کے گاہک کا تجسس اُبھارنا چاہتی تھی۔ مگر دریا خان کو صحیح وقت کا انتظار تھا۔ کہنے لگا، "معلوم ہے، معلوم ہے۔۔۔ میں اس کے کرتوت خوب جانتا ہوں۔ مگر مجھے کیا اب تو چھ ماہ بعد ادھر آنا ہو گا۔ وہ جانے اور اس کے اعمال۔"

بوڑھی عورت نے اثبات میں سر ہلایا مگر وہ یہ سوچ کے پریشان ہو گئی کہ گاہک کو معلومات کے اُس ذخیرے سے کوئی دلچسپی کیوں نہیں جو اس کے سینے میں محفوظ ہے۔

"خیر اچھا ہے۔۔۔ میں سمجھتا ہوں تو قہوہ بھی اچھا دے گی۔ کم سے کم سامنے والے اس۔۔۔ اس لاپروا آدمی سے تو اچھا قہوہ بناتی ہو گی۔"

"میں بازار کی سب سے اچھی دکان پہ نہیں بیٹھی مگر قہوہ کہیں اچھا پلاؤں گی"۔

قہوہ سامنے آیا تو دریا خان پوری طرح تیار تھا بولا "میں اسے توجہ اور یکسوئی سے تیار کیا ہوا قہوہ کہوں گا۔ تو نے اپنے کام پر دھیان دیا ہے اور دیکھ لے کیسا اچھا قہوہ بنایا ہے۔ بے شک تو انعام کی حقدار ہے۔" دریا خان نے چاندی کا ایک سکہ نکال بڑی بی کی طرف اچھال دیا۔

بڑھیا غریب نے کس کہیں اچھے موسم میں چاندی کا سکہ دیکھا ہوگا! وہ حیرت اور شکر گزاری میں ہکلانے لگی اور بے رکے دریا خان کو دعائیں دینے لگی کہ اے خدا تجھے یوں رکھے اور یہ عطا کرے اور وہ دے۔ دریا خان اٹھ کھڑا ہوا پاپوش پہنتے ہوئے بولا "جاتا ہوں۔۔۔اور اگر وہ سامنے والا خبیث اپنی دلالی سے لوٹتا مجھے مل گیا تو کہیں سے تازیانہ لے کے اسے اتنا پیٹوں گا کہ۔۔۔"

"آغا! تم نے دلال اچھا کہا۔۔۔وہ ملعون اس جہنمی جادوگر کا دلال ہی تو ہے۔ گاہک لاتا ہے اس کے پاس"۔

دریا خان نے پاپوش پہننے میں دیر کر دی۔ چاندی کا سکہ نتائج لا رہا تھا۔ اس نے بوڑھی کو دیکھا اثبات میں سر ہلایا، بولا، جانتا ہوں، جانتا ہوں۔ یہ تو مجھ سے کہہ رہی ہے؟ اس بد انجام سامری کے چکر میں تو اسی نے مجھے پھنسایا تھا کہتا تھا آغا! کنیز تمہاری مطیع فرماں بردار ہو جائے گی۔ ایسا عمل کرا دوں گا اس بد قماش سے کہ۔۔۔"

"عمل؟" عورت حیران ہوئی تھی، "اے یہ مردہ عملیات کب سے کرنے لگا؟ اسے شیطانی دوائیں تیار کرنے سے ہی فرصت کہاں ملتی ہے؟ عملیات اور حاضرات کرے گا۔"

دریا خان کو مایوسی ہوئی۔ افانزو اور اس کا حبشی دواؤں کے لئے اس مکان میں گئے ہیں۔ ظاہر ہے یہ پرتگالی علم طب کی تعلیم کے لئے یہاں آیا ہے، مددگار طبیب ہے۔ افسوس دریا خان نے پوری ایک ساعت کہیں ایسے ناتجربہ کار نوجوانوں کی طرح گزار دی جس کا ذہن اوہام سے اور خیالی داستانوں سے خوب مشتعل ہو۔

وہ مایوسی اور خفت میں دکان سے چلنے کو ہوا کہ بڑھیا نے جو کچھ نہ کچھ بولے جا رہی تھی کہا "تم شاید اُس قطامہ سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو۔۔۔اپنی کنیز سے؟"

"ہاں ہاں" دریا نے یونہی سر ہلا دیا۔

"یہ خبیث سب طرح کے زہر تیار کرتا ہے۔ کام میں فرد ہے اپنے"

زہر! دریا خان رُک گیا

شاید وہ ٹھیک جگہ آیا ہے۔ شاید صحیح طور پہ کلام کر رہا ہے۔ اس نے محتاط انداز میں گول مول بات کی، بولا ہاں یہی عمل کرایا تھا۔ کچھ بھی نہ ہوا۔"

عورت رازدارانہ دریا کے قریب پہنچی اور دھیرے سے کہنے لگی "ایک بات آغا! میں خدا لگتی کہوں ہوں۔۔۔اس منحوس کے تیار کئے زہر اپنا اثر

دکھائے بغیر نہیں رہتے۔ آج نہیں تو ایک ماہ بعد، چھ ماہ بعد وہ مردی ختم ضرور ہو جائے گی کنیز تمہاری بچے گی نہیں"۔ پھر وہ فوراً ہی پوچھنے لگی، "کس طرح کا دیا تھا اُس نے؟ کھانے کا؟ سونگھنے کا؟"

"سونگھنے کا؟" دریا خان نے بناوٹ کی حیرت ظاہر کی۔

"کیا سمجھتے ہو؟"۔۔۔یہ ایسا زہر بھی تیار کر سکتا ہے جو رنگ کے ساتھ لباس میں سرایت کر جائے اور پہننے والے کو آٹھ دس روز میں ختم کر دے"

دریا خان کا دل بہت زور سے دھڑکا "کیا ایسا زہر بھی جو برتنوں میں پیوست کیا گیا ہو؟۔۔۔اور پھر جب ان برتنوں میں کھایا پیا جائے تو۔۔۔"

کیوں نہیں آغا! یہ منحوس سب طرح کے کام ہاتھ میں لیتا ہے۔ طاق ہے اپنے ہنر میں"

مسند عالی دریا خان حجاب دار نے چاندی کا ایک سکہ بخش کے بڑھیا کو اپنا مطیع کر لیا تھا وہ سامری منحوس کے بارے میں تفصیلات بتانے پر آمادہ تھی۔ ہر چند کہ اس کا کاروبار بڑھیا کے کاروبار سے جدا تھا۔ دونوں میں براہِ راست کوئی ٹکراؤ نہ تھا۔ بڑھیا کو تو اس بات کا حسد تھا کہ وہ اس کے رقیب قہوہ فروش سے دلال کا کام لیتا ہے اسے اپنی جیب سے حق محنت دیتا ہے۔ بڑھیا کو یقین تھا کہ قہوہ فروش گاہکوں سے بھی کچھ نہ کچھ اینٹھ لیتا ہوگا۔ دونوں ہاتھوں سے پیسا کھینچ رہا ہے نافرجام۔ قہوہ فروش کو خود کیا محنت پڑتی ہوگی اس نے شہر بھر کے آوارہ گردوں سے کہہ رکھا ہے کہ وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں ایسوں کی پہچان کے خبر کر دیں جنہیں دشمنوں کو چپ چپاتے ٹھکانے لگانے کی ضرورت ہے۔ آوارہ گردوں ایسے لوگوں کا پتا نشان قہوہ فروش کو بتا کے آدھی رات کو بھی اپنا انعام لے سکتے تھے۔ قہوہ فروش ضرورت مندوں کے بارے میں کچھ دوسروں سے مدد لے کے اطمینان کر لیتا کہ سودا طے ہو سکتا ہے کوئی خطرے کی بات نہیں۔ پھر وہ ضرورت مندوں سے مل کے تفصیل سمجھتا اور زہر فروش سے پوچھ کے رقم بتا دیتا۔ بڑھیا کا خیال تھا مردود اس رقم میں بھی الٹ پھیر کرتا ہوگا۔

دریا خان بڑھیا سے یہ سن کے بہت پریشان ہوا۔ کہ سامری وہ زہر بھی تیار کرتا ہے جو کھانے کے برتنوں میں سرایت کر جائے اور جب ان برتنوں میں کھانا اتارا جائے تو زہر اپنا کام دکھا دے، کھانے والا ہلاک ہو جائے۔ دریا نے افانزو کو برتن لے جاتے دیکھا تھا خدایا! اگر یہ برتن سلطان والا جاہ کے استعمال کے ہوئے؟ اللہ رحم کرے!

دریا خان دل کی پریشانی میں دوبارہ چبوترے پر بیٹھ گیا۔ دستار کے پیچ ڈھیلے کر پھر سے باندھنے لگا۔ "سلطان کو اور سلطانہ کو مالک سلامت رکھے۔ کیسی الجھن کی بات سامنے آئی ہے"

دریا نے افانزو کو برتن لے جاتے دیکھا تھا۔ یہ طبیب زادہ اقامت گاہ سلطانی کے پڑوس میں رہتا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ سلطان اور سلطانہ کے

استعمال کے برتن ہوں جنھیں یہ حرام خور اس سامری نابکار سے مسموم کرانے لے جارہا ہو۔ اللھم احفظنا! فوری طور پر کچھ کرنا ازبس ضروری ہے۔

دریا خان نے سوچا اگر زہر ساز کے مکان کا یہی ایک دروازہ ہے (جس کا کہ امکان کم ہی ہے) تو اقانزو اس کے علم کے بغیر یہاں سے نہیں نکل سکتا۔ اگر کوئی اور دروازہ بھی ہے اور طبیب زادہ یہاں سے نکل کے اپنے سلطانی سامان کے ساتھ سلطانی اقامت گاہ تک پہنچ جاتا ہے تو دریا خان کو کچھ اور کرنا ہو گا۔ وقت بالکل نہیں ہے۔

تاہم عورت کو مدد دینے پر آمادہ کرنے میں کوئی زیادہ محنت نہ لگی۔ دریا خان نے کہا "میں تمھیں انعام دوں گا۔ اتنا کہ تو سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"بڑھیا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کا نصیبا پلٹنے میں اب دیر کوئی نہیں، بولی "آغا! حکم کرو۔ میں حاضر ہوں"

دریا بولا، "مجھے اس مکان کے بارے میں بتا اور زہر ساز کے بارے میں بھی اور یہ بھی سمجھا دے کہ مکان میں جلد اور خاموشی سے کیوں کر داخل ہوا جائے۔"

لالچ اپنی جگہ، مگر بڑی بی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھی اپنا اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ کہ یہ آغا کہیں دیوان قانون کا کوئی عہدیدار تو نہیں ہے کہنے لگی "عالی جاہ! میں بہت غریب مسکین، بدحال عورت ہوں۔ کوئی بیٹا نہیں جو اس عمر میں میری کفالت کرے۔ آپ بے شک انعام اکرام دو گے، سخی معتبر ہو لیکن ایک بات قرآن کو بیچ میں لا کر کہو کہ دیوان شرطہ کے الجھیڑے میں تو مجھے نہیں ڈالو گے؟"

دریا نے کہا، "بالفعل دیوان شرطہ بیچ میں آیا بھی تو میں قسم کھاتا ہوں تجھے گزند نہ پہنچنے دوں گا۔ وہ لوگ بھی تجھے انعام ہی دیویں گے۔ تو بے خدشے میرا ساتھ دے"

بڑھیا کہنے لگی، "یہ تو کہو تم دیوان قانون کے عہدے دار، قاضی سررشتہ دار تو نہیں ہو؟"

دریا خان کو الجھن ہونے لگی، "اگر ہوا بھی تو تیرا کیا نقصان؟"

بڑھیا بولی، "میرے دس دشمن دس دوست ہیں۔ گڑے مردے اکھڑنا شروع ہو گئے تو مجھ غریب کا اللہ ہی والی ہے۔"

دریا خان سمجھ گیا تھا کہ خود بڑھیا کے ہاتھ صاف نہیں ہیں اسی لئے ڈرتی ہے، کہنے لگا "میں سمجھ گیا، لے میں قسم کھاتا ہوں کہ دیوان قانون سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور آج سے پہلے چاہے تو کچھ بھی کرتی رہی ہو تیری گردن کہیں پھنسنے نہیں دوں گا۔ بے فکر رہ۔۔۔ پہنچ میری دور تک ہے۔"

"آغا سردار! تمہاری شوکت اور دبدبے کو خدا دس گنا بڑھائے۔ مجھے یقین آگیا۔ لو اب سنو" کہہ کے بڑھیا ڈھڈو نے اس مکان کا احوال بتایا جس میں قہوہ فروش رقیب اس ولایتی جوان اور حبشی حمال کے ساتھ داخل ہوا تھا۔ کہنے لگی مکان کا ایک پچھلا دروازہ بھی تھا جہاں سے وہ دریا خان کو داخل ہونے میں مدد دے گی۔ اندر کہاں کہاں خطرات ہیں، زہر ساز کے آدمی کہاں کہاں پہرہ دیتے ہیں۔ کس ڈھب کے لوگوں سے اندر واسطہ پڑ سکتا ہے یہ بڑھیا نے خوب سمجھا دیا۔ وہ زہر ساز کا حلیہ بیان کرنے سے قاصر تھی، بولی "جنھوں نے اسے دیکھا ہے وہ بتانا نہیں چاہتے یا بتا نہیں سکتے۔ اور وہ نحوست مارا خود کبھی باہر نہیں نکلتا۔"

دریا خان نے چاندی کے بیس بائیس سکے دکان کے تختے پر رکھ کے کہا، "سن، یہ رقم تیرے لئے نہیں ہے تجھے تو میں اشرفیوں میں انعام دوں گا۔ یہ سکے رکھ۔ مجھے مکان میں داخل کرنے سے پہلے چار پانچ تگڑے شہدے کہیں سے پکڑ لا انھیں پیسے دے کے یہاں اپنے چبوترے پہ بٹھا دے میری طرف سے قہوہ پلا اور خود بھی سامنے دروازے پہ نظر رکھ۔ پرتگالی اقانزو اور اس کا حمال یا تیرا حریف قہوہ فروش مکان سے نکلیں تو شہدوں تگڑوں کو سمجھا دے کہ وہ کوئی فساد کھڑا کر دیں، انھیں روک رکھیں، جانے نہ دیں۔ آگے میں سنبھال لوں گا۔"

اتنے بہت سے روپے دیکھ کے بڑھیا تو سمجھو غش کھا گئی۔ تاہم اس نے خود کو سنبھالا اس لئے کہ آغا نے اُسے طلائی سکے انعام میں دینے کو کہا تھا۔

واللہ اشرفیاں! سونے کی مقدس ٹکیاں! اب تو وہ سامنے والے خبیث کو بندھوا کے ڈلوا دے گی۔ تختے پر جو چاندی پڑی ہے، اس سے دس درجے کم رقم پر تو بڑھیا نے اپنے بیٹوں بھتیجوں سے کتنے الٹے سیدھے کام کرائے ہوں گے۔ اس آغا کا دکان پر آنا کیا ہوا کہ سمجھوں جیسے بند دروازہ کھل گیا۔

اس نے دریا خان کی فرغل کا دامن چھوا اور اپنا ہاتھ چوم لیا، "آغا ملک! تمھیں تو کہیں کا حاکم ہونا تھا۔ یہ خدائے کریم، کیا حکمت سوچی ہے۔ میں پلک جھپکتے بازار کے تگڑے شہدوں میں سے دو چار کو پکڑ لاتی ہوں۔ اتنی رقم میں تو وہ اس مردود قہوہ فروش کے ٹکڑے کر دیں گے۔"

دریا خان کا منہ بن گیا، الجھ کر بولا، "لو تیرہ بخت! مجھے کسی کے ٹکڑے نہیں کرانا۔ ان شہدوں تگڑوں کو سمجھا رکھنا کہ کھینچا تانی اور فضول گوئی سے زیادہ کچھ نہ کریں۔ اور سن لے! مجھے آتا دیکھے تو تو ان شہدوں کو چلتا کر دیجو۔ میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ وہ مجرم اگر اس راہ سے نکل بھاگنا چاہیں تو تیرے تگڑے انھیں جانے نہ دیں۔"

بڑھیا سعد عالی دریا خان کو گاہکوں کے چبوترے پر بٹھا کے چلی گئی اور ذرا دیر میں چار مشٹنڈوں کو گھیر لائی، ان میں دو تو اس کے اپنے ہی بیٹے تھے۔ کہنے کو یہ چاروں بازار میں حمالی کرتے تھے مگر بازار والے سب جانتے تھے کہ انھیں حمالی سے زیادہ مختصر پہ کھڑیا سے لکیریں بنا کے کوڑیوں، ٹھیکروں سے کھیلنا اور بھلیوں، بوروں، ٹوکریوں سے گرا پڑا سامان سمیٹ کے چل دینا ہی آتا تھا۔ کسی باحیثیت رہگیر کو تاک لیتے تو دائیں بائیں دیکھ کے دست سوال بھی دراز کر دیتے تھے۔ ایک بار دیوان قانون کے اہل کار اس کے ان بیٹوں بھتیجوں کو جرم گداگری میں کھینچ کے لے بھی جا چکے تھے۔ مختصر یہ کہ چاروں اس قابل تھے کہ ثبوت شہادت، گواہوں، استغاثوں کے بغیر ہی سلطانی جلادوں کے ہاتھوں

مارے جاتے تو انسب تھا۔

خیر۔ شمدوں نے صدر دروازے کی نگرانی شروع کر دی اور بڑھیا دریا خان کو مکان کا عقبی راستہ سمجھانے لے چلی۔

پچھواڑے گلی کا عجب حال تھا۔ مکان دار کی بے توجہی نے یا شاید جان بوجھ کے چھوڑی گئی خودرو گھاس اور لونٹ کٹارا جھاڑیوں کی وجہ سے گلیارا جیسے جنگل بیابان ہو رہا تھا۔ خودرو درخت قدِ آدم زیادہ بلند تھے اور بہت گھنے تھے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ پتوں شاخوں کے پیچھے مسلسل دیوار ہے کہ کوئی دریچہ، روشندان یا موکھا ہے۔ گلیارے میں سناٹا تھا۔ دریا خان اور بڑھیا کسی خرخشے کے بغیر مکان کا جائزہ لے رہے تھے۔ اسی دوران دیوار کے برابر آگے پیپل کے ایک ادھ بکھرے درخت کے پاس بڑھیا جا کھڑی ہوئی اور اشارے سے بتانے لگی تو دریا خان کو پتوں کے گچھے اور جھاڑ جھنکاڑ کی اوٹ میں ایک بڑا سا دریچہ نظر آیا۔ بڑھیا اگر اشارہ نہ کرتی تو دریا خان نکلا چلا جاتا۔ دریچہ اسے ہرگز نظر نہ آتا۔ اس جگہ فرش زمین پر گھاس بھی جیسے تہ در تہ اگی ہوئی تھی۔ بڑھیا نے اشارے سے بانس کی ایک سیڑھی بھی دکھائی جو گھاس میں چھپی پڑی تھی۔ کہنے لگی، "دریچہ اندر باہر سے کھلا رہتا ہے۔ کیا خبر کب ان نصیبوں جلوں کو بھاگنا پڑے۔ آغا! تم بلا تامل مکان میں اتر جاؤ۔"

دریا نے سیڑھی لگا کے دیکھا دریچہ پرانی مگر مضبوط لکڑی کا بنا تھا۔ پٹوں کی سانکل کاری لوہے کی موٹی چھڑیوں، سانکلوں سے ہوئی تھی۔ بند کرنے ایک کنڈا سانکل باہر کو ایک اندر کو لگا تھا۔

دریا نے بڑھیا سے کہا، "سن میں جاتا ہوں تو صدر دروازے کا خیال رکھنا۔"

وہ خوش ہو کے بولی۔ "جی آغا اور جانے کو ہوئی

دریا خان بولا، "ٹھیر تو نیک بخت! میں اندر اتر جاؤں تو باہر سے تو دریچے کے پٹ بند کر کے کنڈا چڑھا دینا۔

وہ بولی "کیا فرماتے ہو؟" بڑھیا کو یقین نہ آیا کہ جو کچھ وہ سن رہی ہے وہ وہی ہے جو آغا چاہتا ہے۔ ایسے پُر خطر مکان میں خود کو اس طور بند کر لینا کہ صدر دروازہ مسدود ہو تو ان ناکوں سے بچ نکلنے کی کوئی اور صورت نہ رہے۔ یقیناً بڑھیا کے سننے سمجھنے میں فرق ہے۔ کون ایسا پاگل ہو گا جو اس مکان میں بند ہونا چاہے گا۔ پوچھنے لگی، "کیا فرمایا؟ پھر کہو آغا۔ تمہارا حکم کس طرح ہے؟"

دریا خان جو چاہتا تھا اس نے پھر بتا دیا۔ عورت کو شک سا ہوا کہ یہ حاکم آسیب مارا یا سڑی دیوانہ ہے۔ یہ اگر بند ہو گیا اور مارا گیا تو بڑھیا کے انعام کی اشرفیاں تو گئیں۔ وہ دریا خان سے حجت کرنے پر تل گئی۔ خان چڑ گیا کہنے لگا "نیک بخت! بے کار باتیں نہ بنا۔ میں ملک التجار نہیں سپاہی ہوں۔ غلط کاروں کی گرفت کرنے کا فوری اور سادہ طریقہ اختیار کرتا ہوں یعنی گھیر کے اور تلوار کے ذریعہ۔" پھر اس نے کمر سے تلوار کھینچ ہاتھ میں لے لی۔ بڑھیا کو اشارہ کیا اور سیڑھی چڑھ کے مکان میں اتر گیا۔

قہوہ فروش بڑھیا کیا کرتی اس نے اس مخبوط الحواس آغا کو اس خطرناک مکان میں، بچھو سانپوں کھٹوؤں بھری بانبی میں بند کر دیا۔

مسند عالی دریا خان تجاب کوئی لڑکا بالا نہیں تھا جو اس نحوست آثار مکان کی ویرانی بے رونقی سے وحشت زدہ ہو جاتا۔ وہ ایک پختہ کار سپاہی درجنوں معرکے، سینکڑوں لڑائیاں جھیلا ہوا سردار تھا جس نے دربار دیکھے تھے، انھیں برتا تھا۔ کتنے ہی دریاؤں، ندی نالوں کو کبھی تیر کے کبھی کشتی ناؤ سے کبھی اصیلوں کی پشت پر عبور کیا تھا۔ جنگل بیلے راتیں گزاری تھیں۔ لاشوں کے انبار دیکھے اور خود بھی کشتوں کے پشتے لگائے تھے۔ اس نے عالی مرتبت سرداروں سے لے کے آدھے دام کی چادر چرانے والوں تک کے معاملات فیصل کیے تھے۔ تاہم عجیب بات تھی کہ اس وقت اس مکان میں وہ بے کیف ہو رہا تھا۔

دریچے سے مکان میں پہنچنے کے بعد ہی سے دریا نے خود کو نفرین کرنا شروع کر دیا تھا کہ یہ میں خود کو کہاں لے آیا۔ وہ ایک اچھا منتظم تھا اور اس بات پر برہم تھا کہ اس نے اس قضیے میں کوڑی بھر فراست کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ جوں ہی اس نے دیکھا تھا کہ اغازو دیوان قانون کے اہلکاروں سے چھپ رہا ہے اسے بڑھ کے اغازو کی ٹانگ ہی ناپ دینی چاہیے تھی۔ بہر حال جو ہوا۔

جس نحوست نشان کمرے میں اس وقت کھڑا دریا خان باہر کی آوازیں سننے کی کوشش کر رہا تھا اس میں چوکور پتھروں کا شطرنجی بنا فرش تھا جس میں جگہ جگہ درازیں پڑی تھیں۔ مہینوں برسوں کا میل کچیل ان درازوں میں بھر گیا تھا۔ فرش پر گرد کی تہ جمی تھی اور ادھر ادھر سے اڑ کے آنے والے سوکھے پتوں کے ڈھیر لگے تھے۔ تسلیم کا کوئی قابل ذکر انتظام نہیں تھا۔ حامیوں میں سے اکثر کو ناخواندہ اور محتاج رکھا گیا تھا۔

باہر دالان کی طرف سے کوئی آہٹ سنائی نہ دی تو دریا دبے قدموں دالان میں نکل آیا جو خاصا چوڑا تھا۔ یہاں بھی فرش پتھر کی سلوں سے بنا تھا۔ صحن کے رخ پتھر کی جالیوں سے بنائی گئی ایک نیم قد دیوار تھی۔ جالیاں وقت کے ساتھ ٹوٹ گئی تھیں تو ان پر بھی زمانے کی گرد جمی تھی اور جالے لگے تھے۔ صحن کا حال اس گلیارے سے کچھ بہتر نہ تھا جسے دریا خان مکان کے پچھواڑے بھگتا آیا تھا۔ صحن میں اگے جامن، پیپل اور نیم کے پیڑوں پر گرگٹوں اور کیڑے مکوڑوں کی اجارہ داری تھی شوراکی مجلسوں میں بھی وہی سب بھرے تھے۔ وہاں کہیں پتھر کا فرش نظر آتا تھا، کہیں کمر کمر گھاس اگی تھی۔ دریا کو یقین تھا کہ آنگن کی جھاڑیاں اور گھاس پھونس سانپوں بچھوؤں سے پٹے پڑے ہوں گے۔ اس نے دشمن اور نفرت کی بھر پری لی۔ وہ حملہ کرتے شیر کا سامنا کرنے کو ہر وقت تیار تھا مگر رینگتی ہوئی چیزیں اور سرد خون والے سرسراتے ہوئے لجلجے جانوروں اور سازشی ٹولے خدا محفوظ رکھے!

اچانک سامنے دالان میں آواز کے ساتھ دھات کی کوئی چیز آگری دریا خان کو اگلے کمرے سے کسی کے چھینکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ فوراً اس کمرے میں چلا گیا جس سے ہو کر صحن میں آیا تھا۔

دروازے کی اوٹ سے اُس نے دیکھا کہ بکری سے بڑا ایک جانور اچھل کے دالان میں آیا ہے۔ دریا خان نے ایسا چوپایا پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بدن پر بکری جیسے بال تھے جن کا رنگ گدلا سفید اور بادامی تھا۔ پچھلی ٹانگوں کے مقابلے میں اسکی اگلی ٹانگیں بڑی تھیں اور چلتے وقت یوں لگتا تھا کہ اس کی کمر یا پچھلی ٹانگیں کبھی توڑ دی گئی تھیں جو پھر صحیح طریق پر جڑ نہیں پائیں۔

یہ جانور جو کتے اور سیار کی نسل کا تھا ایک بار حلقے سے کھنکھارا یا شاید یہ اس کی ہنسی کی آواز تھی۔ دریا خان کو یقین تھا کہ یہ شیطانی جانور اندر کمرے میں کوئی شیطانی کام کر کے آیا ہو گا جس پر آدمی نے پھینک کے اسے کچھ مارا ہے اور اب یہ اس پر ہنستا ہے۔ دریا خان جاب دار نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی اور تلوار کے قبضے پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ اگر یہ منحوس چوپایا ہنستا ہوا اس طرف آیا اور اس نے کمرے میں دریا خان کی بو سونگھ لی یا اسے دیکھ کے حملہ آور ہوا تو دریا نے حساب لگایا کہ پہلا وار اس کے سر پر کیا جائے گا تا کہ یہ ختم ہو جائے اور دوسرا وار اس کی ٹوٹی ہوئی کمر یا پچھلی ٹانگوں پر کیا جائے گا تا کہ بعد میں بھی یہ ابلیس آثار چلتا ہوا قریب نہ آسکے۔ اس کی منحوس ساخت۔ بالوں کا گھناؤنا رنگ اور اس کی نفرت انگیز ہنسی بتا رہی تھی کہ اس طرح کے چیزیں مرنے کے بعد بھی آگے بڑھ کے اپنے مارنے والے پہ حملہ کر سکتی ہیں۔

دریا خان پھر ایک بار بڑبڑایا کہ، پناہ بہ خدا! یہ میں کس شیطانی طلسم میں آگیا ہوں۔

جانور کی ہنسی ابھی جاری تھی کہ ایک آدمی جھپٹ کے کمرے سے نکلا۔ اس کے ہاتھ میں سلگتی ہوئی لمبی سی لکڑی تھی جو اس نے چوپائے کی کمر پہ ماری۔ اچھی سے چوٹ لگی ہو گی جو جانور ہنستا ہوا بھاگا اور دالان کی ٹوٹی ہوئی جالی سے نکل کر صحن کے جھاڑ جھنکاڑ میں غائب ہو گیا۔ دریا نے سنا وہاں وہ اپنے کسی بھٹ میں چھپا ہوا ابھی تک دبی ہوئی ہنسی ہنسے جا رہا تھا۔

عجیب الخلقت چوپائے کا پیچھا کرنے والے نے بڑبڑاتے ہوئے جھک کر فرش سے دھات کی وہ چیز اٹھالی جو اس نے چوپائے پر پھینکی تھی۔ یہ بڑا سا کفگیر تھا۔ کفگیر اور جلتی ہوئی لکڑی اٹھائے وہ شخص بڑبڑاتا ہوا لوٹ گیا۔

بڑھیا کی بتائی ہوئی تفصیل کے مطابق یہ باورچی ہو گا اور باورچی خانے میں گیا ہو گا۔ دریا خان کے ذہن میں مکان کا نقشا بنتا جا رہا تھا۔ کمرے ہوں گے جس کے بعد زینہ ہو گا جو اوپر مہمان خانے کو جاتا ہے۔ بڑھیا کے خیال میں افانزو کو مہمان خانے میں ہونا چاہئیے۔

دریا خان کو جب اطمینان ہو گیا کہ باورچی اب واپس نہیں آئے گا تو وہ نکلا اور دبے قدموں دالان میں چلتا اس کمرے کے آگے پہنچا اور اس در کے سامنے سے گزرا جس سے وہ جنمی چوپایہ کھنکھارتا تمسخر کرتا برآمد ہوا تھا۔ یہاں خادموں کے کمرے تھے جن میں سے بعض مقفل نظر آئے۔ ایک سے اس نے کسی مرد کے کھانسنے کی آواز سنی۔ جھانک کے دیکھا کہ جو کھانستا تھا کوڑ بستر پہ چادر لپیٹے پڑا تھا۔ سانس لینے کے ہموار انداز سے پتہ چلتا تھا کہ سو رہا ہے۔ دریا

خان رسانیت سے آگے بڑھ گیا۔ اس نے سوچا قدرت نہیں چاہتی کہ یہ اجل گرفتہ بدمعاش میرے ہاتھ سے مارے جائیں۔ ویسے بھی اس قبیل کے لوگوں کے خون سے اپنی تلوار ناپاک کرنا مناسب نہیں۔ ایسے غلط کار تو جلادوں کے لئے ہوتے ہیں۔

وہ سیڑھیوں تک جا پہنچا تھا۔ اوپر فرش پر لکڑی جڑی تھی اور فرش اور سیڑھیوں پر سستے چند مزدوروں کے ہاتھوں بنوائے ہوئے کھردرے بھدے قالین پڑے تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کے دریا خان نے سب طرف نظر دوڑائی۔ دور تک کوئی نہیں تھا۔ مگر وہ ٹھٹھک گیا۔ اگر یہ وہم نہیں ہے تو اسے ایک جوان عورت کی ہنسی کی آواز سنائی دی تھی۔ یہ وہم نہیں تھا کچھ دیر بعد اسے پکھاوج کی گمک اور تان پورے کی ترنگ سنائی دی۔ عورت پھر ایک بار ہنسی۔ وہ ابھی ہنستی تھی کہ سارنگی کی دل گداز آواز جیسے بین کرتی ہوئی چلی۔ بجانے والوں نے کوئی حزنیہ دھن شروع کر دی تھی۔ عورت کی ہنسی ڈوب گئی۔

ربّ العالمین! یہ اس منحوس سامری کا کارخانہ ہے کہ کسی گانے بجانے والی کا مکان؟ یہ تو موت کے سوداگر ہیں یہاں گانا بجانا، یعنی چہ؟ سازوں کی آواز ہلکی ہوئی تو عورت نے بھرپور قہقہہ مارا۔ بڑی کھل کھیلتی ہوئی آواز تھی۔ طے شدہ طور پر بازار کی آواز۔ اب ایک مرد نے گھوں گھوں کرتے ہوئے کچھ کہا۔ الفاظ سمجھ میں نہ آتے تھے تاہم بولنے والا ٹھہر ٹھہر کے بولتا یا لکنت کرتا معلوم ہوتا تھا۔ عورت مرد دونوں نے قہقہہ لگایا۔ بڑھیا کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق یہ آوازیں مہمان خانے سے آ رہی تھیں "اگر مہمان خانے میں افانزو ہے تو مجھے پہلے اسے قابو میں کرنا ہو گا۔"

دریا خان ابھی کوئی مفصل حکمت عملی تیار نہ کر سکا تھا کہ مہمان خانے سے زور و شور سے ساز بجانے کی اور گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس بار کوئی طربیہ دھن بجائی جا رہی تھی۔ گانے والی اجنبی زبان میں گاتی تھی۔ حیرت ہے بڑھیا نے ایسا تو کوئی اشارہ نہیں دیا تھا کہ یہاں گانے بجانے والے بھی رہتے ہیں، خیر ہو سکتا ہے صاحب خانہ مہمانوں کی تواضع اس طرح کرتا ہو۔

دریا خان کمرے کے ٹوٹے دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ دروازے سے کمرے کا خالی حصہ دکھائی دیتا تھا۔ ایک بے حیثیت قالین جگہ جگہ سے پھٹا ادھڑا ہوا کمرے کے فرش کو چھپائے تھا۔ دریا کو چھپر کھٹ کا ایک پایہ بھی دکھائی دیا۔ ابھی تک سموچا آدمی کوئی نظر نہ آیا تھا۔ ایک پرانے چوبی تخت کا سرہانہ دکھائی دے رہا تھا جس پر میلے چیکٹ گاؤ تکیے رکھے تھے اور تکیوں سے ٹیک لگائے ایک عورت بیٹھی تھی سارنگی بجاتی۔ اس کی صرف پشت دکھائی دیتی تھی عورت کسی طرح کا جھر جھرا جھلا لباس پہنے تھی جس کے پار سے نیچے پہنے محرم کا رنگ ساخت اور ڈوریاں تک نظر آ رہی تھیں۔ برابر یہ پکھاوج بجانے والی تھی جس کا آدھا چوتھائی چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں اجلی رنگت کی جوان عورتیں تھیں۔

دریا خان ابھی ساز بجانے والیوں کا جزوی منظر دیکھتا تھا کہ اندر کمرے کی دیوار پر

اسے چمک سی دکھائی دی۔ پردہ ہلا تھا اس نے کھلایا ہوا سا قد آدم آئینہ دیکھا۔ آئینے پر دو عکس واضح تھے۔ چھپر کھٹ کے تکیے سے ٹیک لگائے اقانزو پیالہ ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا اور اس سے بالکل جڑی ہوئی اجلی رنگت کی ایک جوان عورت بیٹھی تھی جس کی آنکھیں سبز اور بڑی بڑی اور سر سے سنواری ہوئی لگتی تھیں۔ یہی عورت تان پورا اٹھائے گا رہی تھی۔ اقانزو کی توجہ اس کے گانے پر نہیں تھی وہ اس کے لباس کی سلوٹوں میں جیسے کچھ ڈھونڈ تا تھا۔ حرام الدہر بد معاش۔!

اس نے ـــــ دریا خان نے یہ سب دیکھا اور سوچا۔ یہاں دار الحکومت میں اقامت گاہ سلطانی کے بہر حال نزدیک ہی یہ کیا ہو رہا ہے؟

اس نے سوچا دیوان فرحلہ کو کیا ہوا؟ کیا سب پرچہ نویس اور مخبر نااہل ہو گئے؟ یا وہ بد دیانت ہیں؟

مگر سوچنے کی بات ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ پرتگالی اقانزو اپنے مزاج کے مطابق لطف و تفریح کے لئے یہاں آتا رہتا ہو اور میں ایک غیر ضروری محتسب اور مداخلت کار کی طرح اس کی تفریح اور خلوت میں کھنڈت ڈالنے یہاں گھس آیا ہوں۔ مجھے کیا؟ بہت کروں گا تو ایک تحریری بیان دیوان قانون کو ارسال کر دوں گا کہ فلاں فلاں جگہ شراب نوشی کا اہتمام شاید کسی ضابطے اجازت نامے کے بغیر کیا جاتا ہے اور ایسی ایسی سرگرمیاں جاری ہیں باقی وہ جانیں ان کا کام۔

دریا خان قاب ولد ابھی یہیں تک سوچ پایا تھا کہ اس نے ایک بہت ہی ہلکا سا دھماکہ سا ــــ مگر نہیں یہ دھماکہ اس کے سر میں ہوا تھا۔ اس نے گھوم کے دیکھنا چاہا، گھوم نہ سکا کوئی کند چیز پھر اس کی کنپٹی پر آ لگی۔ اور کوشش کے باوجود دریا خود کو اپنے پیروں پر کھڑا رکھنے میں ناکام ہوا۔

وہ تیورا کر گرنے لگا تو دائیں بائیں سے نکل کے آگے آنے والے پانچ سات شہدوں نے اس بلند قامت سردار کو سنبھالا اور اسے اٹھاتے ہوئے برابر کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اقانزو کی مے نوشی اسکا بے محابہ تجسس اور گدرائی گئی عورت کے فحش قہقہے جاری رہے ــــ ساز وغیرہ بھی بجتے رہے۔

آنکھ کھلی تو دریا نے دیکھا کہ اسے پلنگ پر لٹا کر مضبوط رسیوں کی مدد سے اس طرح باندھا گیا ہے کہ اس کے لئے ہلنا بھی ممکن نہیں سر اس کا بہت بری طرح درد کرتا تھا اور بھوک کسی درندے کی طرح بدن کے بیچ بیٹھی اسے بھنبھوڑے ڈالتی تھی۔

"معاذ اللہ! کیا تباہی ہے! غذا کے سوا دماغ کچھ بھی سوچنے سے انکاری ہے" پھر بھی غصے کی ایک لہر نے دریا خان کے بدن میں غیر معمولی طاقت بھر دی اس نے زور لگا کے رسیاں تڑانا چاہیں۔ "اگر ابھی اس بندش سے آزاد ہو جاؤں تو ان حرام خور غلط کاروں میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑوں۔ وہ تعداد میں بیس ہوں یا پچاس مجھ پر ان بے ادب نافرجاموں کو سزا دینا لازم ہے۔ غضب خدا کا! رہزنوں حرام خوروں نے مجھے اپنی لاٹھیوں سے زدوکوب کیا؟ مجھے؟ دریا خان کو؟"

مگر فوراً ہی اسے یاد آیا کہ یہ رہزنی کی واردات نہیں دریا خان آپ ہی اس گھر میں چوری سے داخل ہوا ہے۔ مملکت کے قانون کے مطابق اجازت کے بغیر گھر میں اس طرح داخل ہونا جرم اور قابل مواخذہ ہے۔ "پھر بھی ــــ پھر بھی غور طلب بات یہ ہے کہ ان بدقماشوں نے مجھے زدوکوب ــــ مگر نہیں مجھے اصل بات یاد رکھنی چاہئے ـــ اصل بات یہ ہے کہ پرتگالی طبیب زادے کی مدد سے یہاں کوئی سازش تیار ہو رہی ہے۔ شاید میرے سلطان یا سلطانہ کے خلاف۔ ایسی صورت میں اپنے مرتبے اور عہدے کی رو سے مجھے اختیار حاصل ہے کہ میں اس گھر میں ــــ یا کسی بھی گھر میں جہاں سازش ہو رہی ہو بہ زور یا بہ حکمت داخل ہو جاؤں اور مجرموں سازشیوں کا حساب لوں۔ مگر ہاں ہاں ہاں ــــــ یہ بات تو مجھے کسی کے سامنے کہنی ہی نہیں ہے۔ جہاں سلطان یا سلطانہ کے نام آ جاتے ہیں ہر درباری عہدے دار کو وہاں بہت محتاط ہونا پڑتا ہے۔ یہ سازش والی بات تو کسی کے سامنے کہنی ہی نہیں ہے۔ تو پھر کیا کہا جائے؟ ہاں! مجھے کہنا چاہئے کہ اصل میں میں ملک التجار ہوں مشرق جنوب یا شمال سے آیا ہوں۔ کسی سے سنا تھا کہ یہ سامری موثر زہر تیار کرتا ہے۔ بس آ گھسا آگے پھر وہی کہانی نافرمان کنیز والی جو میں نے قہوہ فروش بوصیا کے لیے تیار کی تھی"

دریا خان ابھی تک اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ لوہا چڑھی جریب اٹھائے ایک کریہہ صورت غلام کمرے میں آ گیا۔ کمرہ کیا تھا یہ جگہ کسی تہہ خانے کا خالی ڈھنڈار حصہ لگتی تھی ادھر ادھر بے کار سامان پھیلا پڑا تھا۔ غلام نے آتے ہی بے شور انداز میں ایک بے ڈھنگا صندوق کھینچ لیا اور صندوق پر بیٹھ کر وہ سکون سے لاٹھی ٹیک فرش کو ایسے دیکھنے لگا جیسے خاص اسی کام کے لئے آیا ہے۔

دریا خان نے غلام کو مخاطب کیا، "او نامراد! مجھے کھول۔ ایسے کیوں بیٹھ گیا؟ مجھے کھول اپنے مالک کے پاس لے چل"۔

جریب والے غلام نے جیسے ان سنی کر دی، بے تعلق بیٹھا رہا۔

"خبیث غلام زادے! مجھے کھول دے، سنتا ہے؟ مجھے کھول ورنہ تیرے ساتھ بہت بری ہوگی۔"

غلام نے پلک تک نہ جھپکائی۔

"تیرا مالک کہاں ہے؟ اسے بلا اور مجھے آزاد کر کیا کہہ رہا ہوں سنا کہ نہیں؟"

غلام نے جماہی لی اور نیم وا آنکھوں سے دریا خان کو دیکھا، بے تعلقی سے مسکرایا اور پھر لاٹھی کی ٹیک لگائے فرش کو تکنے لگا

دریا خان غصے کی بے بسی میں چیخ کے بولا، "او بد انجام! لعنت ہو تجھ پر! ایسا بیٹھا ہے جیسے بہرا ہو خبیث۔"

عقب سے ایک نرم مردانہ آواز نے ستھرے لہجے میں کہا، آپ نے ٹھیک فرمایا وہ بہرا ہے اور گونگا بھی"

دریا نے سر گھما کے دیکھنا چاہا مگر بالکل عقب میں دیکھنا ممکن نہ تھا جھنجھلا

کے اس نے مطالبہ کیا، "سامنے آؤ۔ کون ہو تم؟"
"آقا پہلے اپنا تعارف کرائیں گے۔ صاحب خانہ سے متعلق ہونے کے سبب یہ حق میرا ہے کہ میں آپ سے سوال کروں ـــــ بتایئے کون ہیں آپ؟" بولنے والے کا لہجہ واضح طور پر مصنوعی تھا۔
نہ چاہتے ہوئے بھی دریا خان مشتعل ہو گیا، "ذلیل زادے کی بے ضابطہ اولاد! مجھے کھول دے ـــــ پھر میں بتاؤں گا کہ کون ہوں"
"چچ چچ، چچ چچ ـــــ آقا! آقا" بولنے والے نے بہت نرمی سے ملامت کی کہنے لگا "آقا! یہ بدکلامی آپ کی شان کے شایان نہیں۔"
"تو کون ہے۔ سامنے آ"
"ناں ناں۔ پہلے آپ اپنا تعارف کرائیں گے۔"
جیسا کہ سوچ کے بیٹھا تھا دریا خان نے بتایا کہ وہ شمال سے آیا ہے، مسالوں کا تاجر ہے اور اُس 'ملعون' سے ملنا چاہتا ہے جو گھر میں بیٹھا ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کیا کرتا ہے۔
عقب سے بولنے والا ہنسا، "اس ملعون سے ملنے کیوں آئے ہو"؟
"وہ" "میں اسی کو بتاؤں گا"
"مجھے بتادو۔ میں تمہاری بات اس تک پہنچادوں گا"
تس پہ دریا خان تجاب ولد نے وہی کنیز سے نجات حاصل کرنے والی بات کر دی اور جب اس نے پوچھا کہ مکان میں اس طرح داخلے کی ضرورت کیوں پیش آئی تو کہہ دیا کہ یہ بات میرے علم میں ہے کہ زہر ساز سامری کے سبھی خادم رشوت خور بے دین ہیں پیسے لے کر بھی مجھے اس سے نہیں ملنے دیں گے۔ اس لئے مکان میں پوشیدہ طور پر داخل ہوا ہوں۔ جب اس نے سوال کیا کہ داخلے کا یہ رستہ اسے کس طرح معلوم ہوا تو دریا کو بوڑھی قہوہ فروش کا ذکر کرنا پڑا۔ پوچھنے لگا بوڑھی کو تم کب سے جانتے ہو تو بولا "آج پہلی بار اس کی منحوس شکل دیکھی ہے۔"
"یعنی پہلے اس بوڑھی سے معاملات نہیں رہی؟"
دریا نے کہا "نہ"
"تو پہلے کس سے معاملات رہی تھی؟ ـــــ اس دوسرے قہوہ فروش سے؟"
"ہاں"
"اس سے کس نے ملوایا تھا؟"
"ایک تاجر نے"
"نام؟"
"تو تاجر کا نام پوچھتا ہے یا اس حرام زادے قہوہ فروش کا؟"
عقب سے بولنے والا ہنسا "اس حرام زادے کا نام ہی بتادو"
دریا خان نے منہ پر کف لا کر "ہے" کی آواز نکالی۔ اس طرح کے سوال جواب اسے مشتعل کر دیتے تھے۔ "ہم پوچھنے والے نے اپنے نرم مصنوعی لہجے

میں پوچھا "اگر اسے قہوہ فروش کو یہاں بلوائیں تو وہ تمہیں پہچان لے گا"
"کیوں نہیں" دریا خان نے درشتی سے کہا "کیسے نہیں پہچانے گا۔ اس خنزیر کو بھی تو پیسے کھلائے ہیں۔"
وہ ہنستا ہوا سامنے آگیا، شاکیا کہنے لگا، "تم ایسے سردار کو جھوٹ پہ جھوٹ بولتے دیکھ کے مجھے خفت ہو رہی ہے آقا" دریا نے دیکھا یہ وہی قہوہ فروش تھا جو اقانزو کو مکان میں لایا تھا۔
دریا نے پھر غصے کی آواز نکالی۔ کہا کچھ نہیں
قہوہ فروش نرمی سے بولا، "ہم تو سبھی کے خادم ہیں ـــــ اب کہو، کیا کرو"
دریا خان کا اصرار تھا کہ اسے کھول دیا جائے اور فی الفور صاحب خانہ سے ملوا دیا جائے۔ قہوہ فروش پوچھتا تھا اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم اشتعال میں آکر خود اسے یا صاحب خانہ کو نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔؟
اسی حیص بیص میں بہت وقت گزر گیا۔
بالآخر طے پایا کہ دریا خان کلام اللہ کو گواہ کر کے اور اپنی تلوار کی قسم کھا کے اقرار کرے گا کہ گھر والوں کے بد امن رہتے خود بد امن رہے گا اور نہ قہوہ فروش پر اور نہ صاحب خانہ پر حملہ کرے گا، سکون کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرے گا پھر مسافروں کی طرح رخصت ہو جائے گا۔
اب جب کہ باہمی سلامتی کا معاہدہ طے پا گیا تھا تو قہوہ فروش کا انداز یکسر بدل گیا گھگھیا کر بولا "عالی جاہ! یہ غلام اپنے اہل کاروں کی جانب سے معافی کا خواستگار ہے اور خود اپنی طرف سے بھی سو ہزار دفعہ معافی مانگتا ہے۔ کیا کریں عالی مرتبت! ہمارا کام ہی سر اہرا ہے۔ پھر حضور جو اچانک خفیہ راستے سے تشریف لے آئے تھے ـــــ
دریا خان نے کہا، "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے"
مگر قہوے فروش بے رُکے بولے جا رہا تھا کہ حضور اس بد حیا ڈھڈو ہی کو پابند کر دیتے وہ دستک دے کے کسی کو بلا لیتی۔ میری تو کیا اوقات ہے عالی جاہ واللہ باللہ خود صاحب خانہ پیشوائی کو آتا اور یہ کہ توبہ توبہ کیسی تقصیر ہوئی ہے غلاموں سے ـــــ
دریا خان تجاب ولد جھنجھلا گیا بولا، "چل چل اور باتیں نہ بنا بے غیرت اب ہمیں کھول بھی دے"
"حاضر، حاضر" کہتے ہوئے قہوہ فروش رسیاں کھولنے لگا۔ گو کہ بہرے جریب بردار نے بھی اس کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ پلنگ سے کھول دینے کے بعد دونوں بدمعاشوں نے مستعدی سے دریا خان کے ہاتھ پیر سونت کر دوران خون بحال کیا۔ دریا خان کی پاپوشیں، کمر سے باندھنے کا دوپٹہ، دستار کا جیغہ، ر... والی چیزوں کی تھیلی غرض ہتھیاروں کے سوا تمام سامان سامنے لا رکھا۔ قہوہ فروش نے دریا کو اپنے ہاتھ سے پاپوش پہنائے، دوپٹہ باندھا، دونوں ہاتھ پر رکھ رکھ کے سب چیزیں دیتا رہا مگر جب اس نے ہتھیار طلب کیے تو ہمیں نکال

کے بولا کہ عالی مرتبت ہم تو بڑے کمزور بے حیثیت لوگ ہیں۔ حضور کے ہتھیاروں کو ایک بار ہاتھ لگانے کی جسارت تو جیسے تیسے کر گزرے تھے اب ہمت نہیں کہ دوبارہ ہاتھ لگا دیں۔ عالی مرتبت جب مکان سے تشریف لے جاویں گے تو وہیں ڈیوڑھی میں تخت پوش کے گدیلوں پہ دونوں ہتھیار رکھے ملیں گے سرکار اپنے دست مبارک سے پہن لیجئے گا۔

دریا خان اس عزلم لدبر چاپلوس کی باتیں خوب سمجھ رہا تھا۔ ظاہر ہے جب تک دریا اس مکان میں ہے وہ لوگ اسے غیر مسلح ہی رکھیں گے۔ برا سا منہ بنا کر بولا "چل ۔۔۔ اس منحوس تہہ خانے سے تو نکل۔"

الغرض آگے آگے قہوہ فروش چراغ اٹھائے ہوئے راستہ دکھاتا، پھر دریا خان اور آخر میں گونگا بہرا غلام۔ یہ چھوٹا سا جلوس ناہموار سیڑھیاں چڑھتا ہوا تہہ خانے سے نکلا اور ایک کچے صحن میں پہنچ گیا۔ یہاں کہیں ہاتھ بھر اونچی گھاس تھی اور کہیں بے ترتیب قطعوں میں گھناؤنے رنگوں اور نامانوس شکلوں کے پھولوں اور پتوں سے ڈھکی جھاڑیاں تھیں جن کی شکل صورت اور بدبو ہی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ زہریلی جڑی بوٹیاں سامری منحوس کی زہر سازی میں کام آنے والی چیزیں ہیں۔

دریا خان نے اوپر کہیں ساز بجنے کی آواز سنی۔ مدھر نکالی افازندا ابھی تک اپنی بے نوشی اور جشن میں مصروف تھا۔ دریا نے قہوہ فروش کی طرف دیکھا، "یہ کون لوگ ہیں جنھوں نے دن کے اوقات میں رات کی مصروفیت جاری رکھی ہیں۔؟

قہوہ فروش نے کوئی جواب نہیں دیا، خوشامد سے ہنسنے لگا۔

دریا بولا "میں انھی نافہم لوگوں کو دیکھنے بڑھا تھا جو تیرے آدمیوں نے عقب سے حملہ کر دیا"

قہوہ فروش بولا "غلام کو اور شرمندہ نہ کیجئے عالی جاہ!"

دریا خان نے منہ بگاڑ کے کہا، "تیری شرمندگی میرے سر کا درد دور نہیں کر سکتی"

وہ بولا، "یہ حقیر اپنے استاد سے سر درد کی کوئی زود اثر مجرب دوا لے کر حضور کو پیش کر دے گا"۔

دریا خان نے پریشان ہو کر ہاتھ بلند کئے "پناہ بہ خدا! تیرے استاد کی مجرب دواؤں سے خدا بچائے۔"

قہوہ فروش خوش دلی سے ہنسا، بولا کچھ نہیں۔

جڑی بوٹیوں والے صحن سے بچ بچا کر گزرتے ہوئے یہ تینوں ایک اور ویران دالان میں پہنچے۔ ہر چند کہ جگہ صاف ستھری تھی مگر بے رونق اتنی ہی تھی جتنا گھر کا کوئی حصہ۔ دالان سے ایک تنگ زینہ اوپر گیا تھا۔ زینے پر موٹی بانات کی دری بچھی تھی۔ ایک اور لٹھ بند زینے کی شروعات پر اپنی جریب سے ٹیک لگائے ڈھیلا ڈھالا کھڑا تھا ان لوگوں کو آتا دیکھ کر مستعد ہو گیا۔ دونوں لٹھ بند زینے کی شروعات پر رکے رہے۔ دریا اور قہوہ فروش چڑھتے چلے گئے۔

کئی طرح کے دروازوں سے گزرتے، دالانوں کو پار کرتے یہ دونوں ایک دہرے کمرے میں پہنچے اور ایک بھاری بھرکم دروازے کے سامنے جا رکے۔ قہوہ فروش نے دستک دی۔ جواب میں اندر سے کسی نے کچھ پوچھا۔ قہوہ فروش نے کچھ کہا جس پہ دروازہ کھول دیا گیا اور قہوہ فروش کو اندر بلا لیا گیا۔

دریا خان کو انتظار کرنا پڑا۔ آخر کار قہوہ فروش اور ایک بلند قامت چوبدار کمرے سے برآمد ہوئے۔ چوبدار باہر رہ گیا اور قہوہ فروش دریا کو لے تاریک کمرے میں داخل ہو گیا۔

اندر مکمل تاریکی تھی۔ کچھ دیر بعد جب آنکھ اندھیرے کی عادی ہو گئیں تو دریا خان کو کمرے کے صدر میں بچھی ایک بھاری بھرکم کرسی میں ایک ہیولا بیٹھا دکھائی دیا۔ یہ پستہ قد منحنی آدمی اس بڑی کرسی میں سامنے کے رُخ ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ ایسی نشست کے باوجود اس کا پورا سراپا کرسی میں سما گیا تھا، کچھ کرسی بڑی ہوگی، کچھ یہ چھوٹا تھا۔ آدمی کے اس ہیولے نے پیروں میں زرکار پاپوشیں پہن رکھی تھیں جن میں شاید یاقوت جڑے تھے۔ دریا نے سوچا ہو سکتا ہے یہ اصل پتھر نہ ہوں بے حیثیت کنکروں سے سجاوٹ کی گئی ہو، جو بھی تھا۔ دریا کو اس کی جوتیوں کے تلے دیکھنا برا لگا۔

یہ بات ہیولے نے محسوس کر لی۔ آہستہ سے کہنے لگا "میری معذوری ہے بندہ نواز! کوئی بے ادبی مقصود نہیں۔ میں اپنے گھٹنے نہیں موڑ سکتا۔" پھر کچھ ٹھیر کر بولا "خوش آمدید! مجھے عزت بخشی۔"

اس کی آواز ایسی تھی جیسے شام پڑے کنجوں میں چڑیاں شور کرتی ہوں۔

دریا نے جواباً کہا "ہوں" پھر بے وجہ پوچھا، "تم صاحب خانہ ہو؟"

ہیولا اپنی چہچہاتی آواز میں بولا، "آپ کا خادم!"

دریا نے کہا، "بھلے آدمی! اپنے ملازم سے روشنی لانے کو کہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی شکل تو دیکھیں"

ہیولا اسی چہچہاتی آواز میں ہنسا "میں بدصورت آدمی ہوں۔ آپ مجھے دیکھ کے بے کیف ہوں گے اور آپ کا مبارک چہرہ میں صرف انگلیوں کے پوروں سے چھو کر دیکھ سکوں گا ۔۔۔ نابینا نہیں ہوں تاہم پوری طرح دیکھ نہیں سکتا۔ چھو کے، چکھ کے، سونگھ کے اور سن کے پہچان لیتا ہوں۔"

ہوں" دریا خان نے ہونکارا بھرا

وہ چہچہایا، "بعض معاملات میں بصارت سے زیادہ بصیرت کام آتی ہے۔"

"مثلاً کیسے؟"

"مثلاً حضور کا یہ فرمانا کہ آپ کے تردد اور ملال کی وجہ کوئی نافرمان کنیز ہے۔ جی کو نہیں لگا تھا اب آپ کی آواز سن کے یقین آگیا کہ ہو نہ ہو کنیز کا نام مصلحتاً لیا گیا تھا کس لیے آپ تاجر نہیں صاحب سیف سردار ہو۔ کنیز سے خفا ہوتے تو اسے بے تامل کاٹ کے پھینک دیتے میرے پاس آنے کی زحمت کیوں کرتے"

دریا نے کہا، ہوں ۔۔۔ اور؟ اور کیا؟"

وزیا نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ شادی خان سے نجات جس قدر جلد ممکن ہو
ہے۔ دبیر مملکت کی مسند کے لئے اگرچہ اس نے اتنی چاہت سے پہلے کبھی
سوچا تھا۔ تاہم۔۔۔
آگے کرسی میں بیٹھے ہیولے نے دریاخان سے اس اہم معاملے میں گفتگو
ار کی۔
دریا کی آنکھیں کمرے کی تاریکی کی عادی ہو چکی تھیں۔ وہ بے چینی جو
نے آتے ہی محسوس کی تھی اب نہیں تھی۔ دریا، شادی خان سے رو کے
کو طے کر کے جانا چاہتا تھا۔ کیا خوب اتفاق ہے کہ اس شخص نے یہ
نوع خود ہی چھیڑ دیا ہے۔ اس لیے بات فیصلہ کن ہو جائے تو انسب ہے۔
مگر فی الاصل یہ کوئی اتفاق نہیں تھا کہ دریاخان ہیولے تک آپہنچا تھا۔
تاریک کمرے کے مماثل ایسا ہی ایک تاریک کمرہ اور تھا جس میں عین میں
ہیولے کا ہم شکل ایک سایہ کرسی میں ٹانگیں پھیلائے بیٹھا چہچہا رہا تھا اور
عالی قدر مہمان دبیر دولت شادی خان فرلی کو سامنے بٹھائے عرض کرتا
بندہ نواز! غور کیا جائے کہ حجاب دار دریاخان سے (جو شادی خان کی مسند
در پے ہے) نجات حاصل کرنے کے لئے کیا حکمت وضع کی جا سکتی ہے؟۔
اور ایسے ہی ایک اور تاریک کمرے میں ایک اور فراخ کرسی میں ٹانگیں
لائے بیٹھا ایسا ہی ایک اور ہیولا خوشامد میں چہچہا رہا تھا اور دریا اور شادی سے
زیادہ عالی منزلت ایک نر تاج دار (یا شاید وہ مادہ تھی) کو آمادہ کر رہا تھا کہ
پر گرفت رکھنے کے لئے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ بعض عمائد مملکت کو عطر
لباس کے تحائف دیے جائیں؟ یا برتنوں کے تحفے؟ اور مواصلت کے لیے
کی گئی ناکتخدا عورتوں کے تحفے؟ کس لیے کہ ان اشیاء سے متعلق حکمت اس
ہزار کے پاس فی الوقت موجود ہے۔
اور اس خدائی خوار عمارت کے ہزار خدائی خوار کمروں کی تاریکی سے جیسے
چڑیوں کی آوازیں چلی آرہی تھیں جب شام پڑے وہ کنجوں میں شور کرتی
چہچہاتی ہیں۔
اور یہاں یہ کہانی ختم اور شروع ہوتی ہے۔ ◢◢

غزل

فرید پربتی

رگ و پے میں سرایت کر گیا وہ
کبھی کو مجھ سے رخصت کر گیا وہ

گری دیوار سر پہ من و تو کی
بیاں کیسی حقیقت کر گیا وہ

درون خانہ سے غافل ہے لیکن
بدون خانہ نعمت کر گیا وہ

تھا نقشہ نقش بر دیوار کوئی
مجھے بھی محو حیرت کر گیا وہ

حوادث کا تھا جھونکا یا کہ لشکر
ثمر دل کے اکارت کر گیا وہ

این میری شمل ترجمہ : مہر افشاں فاروقی

جناب صدر، خواتین و حضرات

میں آپکی رہ نما تقریر کے لئے ممنون ہوں۔ آپ نے مجھے خراج تحسین پیش کیا اور جس پر زور طریقے سے آپ نے ہماری خارجہ پالیسی میں معاشروں کے سمجھنے اور انکے ساتھ رواداری برتنے کی اہمیت واضح کی وہ میرے لئے بے حد مسرت کا باعث ہوا۔ مجھے جب یہ اطلاع ملی کہ مجھے امن انعام کے لئے منتخب کیا گیا ہے تو میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی۔ بھلا کون یہ تصور کر سکتا تھا کہ آنے والے مہینوں میں ایک ایسی طاقتور تحریک شروع ہو جائیگی جو عنقریب میری زندگی بھر کی محنت پر پانی پھیر دے گی، میری اس محنت پر جس کا مقصد مشرق اور مغرب کے درمیان افہام اور تفہیم کو فروغ دینا تھا؟ لیکن انعام قبول نہ کرنے کے لئے مجھ پر جو دباؤ ڈالا جارہا تھا اس کے سامنے میں نے گھٹنے نہیں ٹیکے، کیونکہ مجھے یہ احساس تھا اور ہے کہ مجھے ان مستشرقین کے تئیں ایک ذمہ داری نبھانی ہے جو خاموشی سے ایک مکالمے کی تلاش میں ہیں اور یہی ذمہ داری مجھے ان لوگوں کے ساتھ بھی نبھانی ہے جو اسلامی دنیا میں ہیں اور جو انکے بارے میں نیک خواہشات رکھتے ہیں۔ اور پھر یہ ذمہ داری خود مجھے اپنی کوششوں کے تئیں بھی نبھانی ہے جو میں نے تاحیات اس سلسلے میں کی ہیں۔

میں امید کرتی ہوں کہ جن لوگوں نے مجھے جانے بغیر، میری تصانیف پڑھے بغیر، مجھ پر حملے کئے انھیں کبھی ایسی آزمائش سے نہ گزرنا پڑے گا۔

میں نے اب یہ سمجھ لیا ہے کہ علم دوستی اور شاعری کے طور طریقے اور ہیں اور صحافت اور سیاست کے کچھ اور۔ بہر حال چاہئیں اس بات کے قائل ہیں کہ "لفظ" خاص طور پر آزاد "لفظ" ہماری زندگی اور معاشرے میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے سرخ ہیں آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر زنجیر کا دامن
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

اور یہ نظم مجھے میری آج کی اس تقریر کے موضوع تک لاتی ہے۔

مجھے اکثر یہ خیال آیا ہے کہ اگر فریڈرش روکرٹ~ (۱۷۸۸ء-۱۸۶۶) آج زندہ ہوتا تو وہ ضرور اس انعام کا حقدار ہوتا کیونکہ اسکا مقولہ تھا "عالمی شاعری ہی آپسی عالمی سمجھوتے کا راستہ دکھاتی ہے۔" اپنی زندگی میں اس نے درجنوں زبانوں سے ہزاروں نظموں کے عمدہ ترجمے کئے۔ اور وہ جانتا تھا شاعری "نوع انسان کی مادری زبان ہے۔" وہ انسانوں کے درمیان رشتے جوڑتی ہے کیونکہ یہ تمام تہذیبوں کا حصہ ہے۔

پھر بھی، جس دور میں روکرٹ نے شاعری کو عالمی سمجھوتے کا، اور اس طرح امن کا ذریعہ قرار دیا، اس دور میں غیر مغربی دنیا سے متعلق آج کے دور کے مقابلے میں بہت مختلف تھا۔ آٹھویں اور نویں صدی میں قبل مغرب نے حیرت اور وحشت سے مسلمانوں کو بحر روم تک اپنی فتح کا جھنڈا لہراتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن وہ عرب جنھوں نے اندلس پر صدیوں تک حکومت کی۔ یہ انکا ہی فیض تھا کہ مغرب نے جدید سائنس کی بنیادیں ورثے میں پائیں۔ یورپ میں جدید دور کی شروعات تک رازی اور ابن سینا کی طبی تصانیف معیاری کتب تھیں اور ابن رشد کی تحریروں نے فلسفہ مذاہب کی بحثوں کو راہ دی اور اس طرح روشن خیالی (Enlightment) کے دور کے لئے راہ ہموار کی۔ طبقات - کے حرمین ...وہ یہودی ہوں یا عیسائی یا مسلمان، پر امن طریقے سے

-- میرے پاکستانی شاعر دوست فیض نے جیل میں یہ نظم پچاس کی دہائی میں لکھی تھی۔

~ FRIEDRICH RUEKERT جرمن رومانی ناول نویس اور شاعر (مترجم)

قدیم عربوں کا اعتقاد تھا کہ شاعر کے الفاظ تیر کی طرح ہوتے ہیں۔
ابھی حال میں خلیجی جنگ کے دوران عراقی آمر صدام حسین نے شاعروں
کلام کو اپنے عزم فتح کو شہرت دینے کے لئے استعمال کیا۔ اسلامی دنیا میں
عری کی قوت ہماری دنیا کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ ہم پر موسیقی اثر کرتی
مسلمانوں پر محض لفظوں کی آواز۔

میں نے شہر استنبول کو کوچہ بہ کوچہ، گوشہ بہ گوشہ ترکی شاعروں
کلام کے ذریعے دریافت کیا۔ وہ کلام جو پانچ سو برس سے شعرا اس حیرت
شہر کے بارے میں کہتے اور پڑھتے رہے ہیں۔ پاکستان کی تہذیب سے محبت
نے ان نغموں سے حاصل کی جو پاکستان کے تمام صوبوں میں گونجتے رہتے
جب ہارورڈ میں پڑھنے والا میرا ایک طالب علم جب سوئے اتفاق سے
ان میں دیگر امریکیوں کے ساتھ یرغمال بنا لیا گیا تھا۔ تو جب اس نے فارسی
کچھ شعر پڑھ کر سنائے تو اس نے اپنے نگہبانوں کے رویے میں خاصی
یلی محسوس کی اچانک ایک مشترکہ محاورہ ان کے درمیان وجود میں آ گیا تھا،
نے چاہے وقتی طور پر سہی لیکن بہر حال گہرے تصوراتی اختلافات کی
ی کم کرنے میں مدد کی۔

مجھے ہرڈر (Herder) — کی یہ بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ اس
ایک بار کہا تھا کہ "ہم ملکوں اور زمانے کے بارے میں شاعری کے ذریعہ
علم حاصل کر سکتے ہیں بہ نسبت ان کی جھوٹی سیاسی اور جنگی تاریخوں کے
کے طور طریقے فریب اور زحمت سے بھرے ہوئے ہیں۔"

انیسویں صدی کے اردو شاعروں نے جو لمبے لمبے مرثیے امام حسین
ادت پر لکھے وہ انگریزوں کی نو آبادیاتی حکومت کی نکتہ چینی بھی ڈھکے چھپے
میں کرتے ہیں۔ ہمیں ان کے معنی کی تہوں کو اسی طرح کھولنا چاہیے جس
کسی کوڈ (Code) کو توڑا جاتا ہے تاکہ ہم ان کے دعا کہ خفیہ سیاسی پیغام
پہنچ سکیں۔ آج بھی شاعری ایک ایسا گوشہ ہے جہاں آمرانہ حکومتوں کے
کے تلے بھی لوگ چھپ کر خاموشی کے ساتھ اور خفیہ طریقے سے
ی آب و ہوا کو بدلنے کے لئے کام کر سکتے ہیں۔

ہرمن ہیسے — کی Morgenland fahrt سے ہم بخوبی واقف
اس نے Hesse ... اس انعام کو قبول کرتے وقت اپنی تقریر میں کہا تھا "
[illegible]
[illegible]
[illegible] (Adonis) [illegible]
[illegible]

ایک گلاب اٹھا لو، اسے پھیلا کر تکیہ بنا لو
کچھ دیر بعد
کمزوری تمہیں کھا جائے گی
گہری تاریک گرد میں
بھاری بم باری تھمیں
اپنا شکار بنا لے گی
کچھ دیر بعد
ایک گلاب لو اور اسے گیہوں کا نام دو
اور ساری دنیا کے لئے اسے نغمہ بنا کر گاؤ۔

اسلامی متاخرین شعرا پر صوفیانہ رنگ غالب ہے۔ لیکن جیسا کہ عموماً
ہوتا آ رہا ہے، اس اسراری صوفیانہ رنگ کو محض غفلت پسندی یا حزنیت کے
مساوی قرار دینا نہیں چاہیئے یا اسے روشن خیالی کے بعد آنے والی نسل کے
لئے بے معنی نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اکثر صوفی اسراری شعرا ان چیزوں کے خلاف
بغاوت کرتے تھے جنہیں وہ بے انصافی یا بے ایمان حکومت یا کٹھ ملاؤں کی شکل
میں دیکھتے تھے۔ ایسے کٹھ ملا جو بقول امام غزالی "طلاق کے اصولوں کے بدیک
سے بدیک نکات تو جانتے تھے لیکن خدا کی ذات سے بالکل نا آشنا تھے۔"

سبھی مذاہب کی صوفی اسراری روایات میں یہی رجحان نظر آتا ہے۔
نصرانیوں کے اولیاء چاہے وہ مرد ہوں یا عورت، اپنے ملکوں کی تقدیر کو بدلنے
کے لئے کوشاں رہتے۔ اور یہی بات مشرقی یورپ کے یہودی خاصد اولیا سے پر
بھی صادق آتی ہے جیسا کہ ہمیں مارٹن بیوبر Martin Buber — کی کتابوں
سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ یہ لوگ روحانی اقدار کو زیادہ اہمیت
دیتے تھے اور اس لئے وہ سماج کے اکثر رسوم کے زبردست نقاد اور سماجی انصاف
کے علم بردار بن گئے۔ اسلام کی تاریخ میں بہتیرے ایسے صوفیوں کے نام ہیں
جنہوں نے اپنی پوری زندگی خدا اور اس کی مخلوق کی محبت کو حاصل کرنے میں۔

— Johann Gottfried von Herder (۱۷۴۴ تا ۱۸۰۳) جرمن
پادری، فلسفی اور نقاد جس نے جرمن رومانیت کی نظریہ سازی کا کام انجام دیا۔
(مترجم)

— Hermann Hesse (۱۸۷۷ تا ۱۹۶۲) جرمن ناول نگار۔ ۱۹۴۶ء کا نوبل
انعام اسے ملا تھا۔
(مترجم)

— Chassidim/Hasidim یہ یہودی لوگ یہودی دینداروں کا ایک طبقہ جو اٹھارویں
صدی میں وجود میں آیا۔ یہ لوگ تصوف کی طرف مائل تھے۔
(مترجم)

— Martin Buber (۱۸۷۸ تا ۱۹۶۵) یہودی فلسفی اور ماہر دینیات
(مترجم)

گذار دی۔ ان میں سب سے عظیم نام منصور حلاج کا ہے جنھیں ۹۲۲ میں بغداد میں سزائے* موت دی گئی۔ اس سزا کی وجہ ان کے بے باک مذہبی عقائد کے ساتھ انکی سیاسی سرگرمیاں بھی تھیں۔ آج بھی وہ مسلمانوں کے لئے ایک علامت ہیں۔ کٹر ملا ان سے نفرت کرتے ہیں اور وہ لوگ ان کی تحسین کرتے ہیں جو انھیں خدا کی بے ریا محبت کا نمائندہ ہی نہیں بلکہ ارباب اقتدار کے خلاف جنگ کا مجاہد بھی قرار دیتے ہیں۔ انکی ایک تمثیل ہے کہ پروانہ دراصل حق زندگی حاصل کرنے کی خاطر خود کو شمع پر قربان کر دیتا ہے۔ اس نے گوئٹے کی مشہور نظم Selige Sehnsucht کو فیضان بخشا۔ اس "شہید عشق حقیقی" کی روحانی معراج اقبال کی طویل فارسی نظم "جاوید نامہ" میں ایک منظر کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ اس نظم میں حلاج جدید شاعر کو متنبہ کرتے ہیں۔

انچہ من کردوم تو ہم کردی بہ ترس
محشرے بر مردہ آوردی بہ ترس

حلاج کا نام وہ نام ہے جسے تمام اسلامی ملکوں میں روشن خیال شعرا بار بار ذکر میں لاتے ہیں۔ حلاج کے قول کا مطلب یہ ہے کہ شاعر نے انسان کو غیر ضروری قانونیت کی قبر دنیا سے نکال کر زندہ کر دیا، انسانی ذمہ داری کا منکر ہو کر نہیں بلکہ انسان کے اصل عملی کردار کی تکمیل کر کے۔ کیا یہ قرآن میں نہیں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "بنی آدم کو عزت بخشی" (سورہ بنی اسرائیل آیت ۷۰ ترجمہ فتح محمد خان جالندھری) "اس طرح کہ انھیں ایک قیمتی چیز عطا کی (سورہ احزاب آیت ۷۲)۔

پاکستان کے بابائے روحانی علامہ اقبال کی شاعری اسلام کی جدید کی تعبیر کی بہترین مثال ہے۔ ۱۹۳۰ کی دہائی میں ان کے اشعار ہندوستان میں سبھی کو زبان پر تھے۔ زیادہ عوام غیر تعلیم یافتہ تھے اور انھیں شاعری کے ذریعہ ہی متاثر کیا جا سکتا تھا، کیونکہ شاعری بہ آسانی یاد ہو جاتی ہے۔ رومی اور گوئٹے سے متاثر ہو کر اقبال نے ایک متحرک اسلام کا تصور پیش کرنے کی کوشش کی۔ انھیں بخوبی یہ معلوم تھا کہ انسان کا فریضہ ہے کہ وہ خالق کی مرضی کے مطابق خالق کی پیدا کردہ دنیا کو بہتر بنائے، اور اسے کوشش کرنی چاہئے کہ بدلتے ہوئے زمانے میں زندہ رہنے کے لئے قرآن کے لامختتم تفسیری امکانات سے استفادہ کیا جائے۔ لیکن انھوں نے یہ بھی سکھایا کہ محض عقل پر بھی مکمل تکیہ نہ کرنا چاہئے۔ ہر چند کہ جدید ٹکنالوجی اور ترقی سراہنے کے قابل ہیں، اور انسان کے لئے ضروری ہے کہ ان میں حصہ لے۔ اپنی ایک مرکزی نظم "پیام مشرق" (جو کہ گوئٹے کے "مغربی دیوان" کا جواب ہے) میں اقبال لکھتے ہیں کہ علم اور عشق یعنی تنقیدی تجزیہ، اور محبت آمیز احتراج، دونوں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے ہی مستقبل کی مثبت اقدار پیدا ہو سکتی ہیں۔

مندرجہ بالا بحث ہمیں ایسے نکتہ پر لے آتی ہے جو دن بدن میرے لئے اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ غیر تہذیبوں کی محبت آمیز فہم پیدا کرنے کا مسئلہ۔ افسوس یہ ہے کہ لفظ "فہم" آجکل غیر تنقیدی رضامندی اور غلطیوں کے معافی کا مرادف قرار دیا جا رہا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ حقیقی سمجھ، تاریخی سچائیوں کے علم سے پیدا ہوتی ہے جو بہت کم لوگوں کے پاس ہے۔

سینٹ آگسٹائن نے کہا تھا کہ "انسان اُسی حد تک کسی چیز کو سمجھتا ہے جس حد تک اسے چاہتا ہے۔" اور ہمارے قرون وسطیٰ کے علمائے دین جانتے تھے کہ "محبت عقل کی آنکھ ہے۔" اس پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ محبت میں عشق اندھا ہو جاتا ہے، لیکن میرا اعتقاد ہے کہ گہری محبت انسان کی آنکھیں کھول دیتی ہے، اور ہمیں اپنے معشوق کی کمزوریاں اور غلطیاں دیکھ کر کسی اجنبی کی کم زوریوں کو دیکھنے سے زیادہ رنج ہوتا ہے۔ ہم مستشرقوں نے اپنی ساری زندگی اسلامی دنیا کے سیکڑوں پہلوؤں کا مطالعہ کرنے میں گذار دی اور ہم نے کوشش کی ہے کہ اس کے مثبت پہلوؤں کو منظر عام پر لایا جائے تاکہ وہ لوگ جنھیں اس پیچیدہ دنیا کا بہت کم علم ہے اپنی غلط فہمیاں دور کر سکیں۔ اس لئے پچھلی چند دہائیوں میں اسلامی دنیا کے کچھ حصوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے ہمیں اور لوگوں کے بہ نسبت زیادہ صدمہ پہونچا ہے۔

ایسے معاشرے میں جہاں لوگ ایک دوسرے سے ملتے پر لفظ "سلام" (جو عبرانی لفظ "شالوم" کی طرح ہے) سے ایک دوسرے کو مخاطب کرنا ضروری سمجھتے ہیں، آج ہم ایسی صورت حال دیکھ رہے ہیں کہ کٹر ملائیت اور قانون پرستانہ موقفوں پر لوگ بھیانک حد تک تنگ نظری اور سختی کا رویہ اختیار کر رہے ہیں۔ پہلے ہم سمجھے تھے کہ یہ مغرب کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کی طرف ایک قدم ہے تاکہ مومن اس سیدھے راستے پر چلیں جو خدا کے پیغمبر حضرت محمدؐ نے دکھایا ہے۔ اب لیکن یہ ظاہر ہے کہ بات دراصل یہ نہیں ہے۔ اسلامی دنیا کے بڑے بڑے حلقوں میں ہمارا سامنا صرف طاقت کی سیاست سے ہے اور ایسی آئیڈیالوجی سے ہے جو اسلام کو کم و بیش نعرے کے طور پر استعمال کرتی ہے اور اسکے اور اسلامی مذہبی بنیادوں کے درمیان کوئی خاص قدریں مشترک نہیں ہیں۔

کم از کم میں نے تو نہ قرآن مجید میں اور نہ حدیث میں ایسا کچھ دیکھایا پڑھا ہے جو دہشت پھیلانے اور ضمانت کے طور پر لوگوں کو قید کرنے کا حکم دے یا کم سے کم اسے جائز ہی قرار دے۔ اسلامی اخلاقیات کا اہم حصہ اعتدال کا معتبر اصول ہے۔ کوئی بھی ذی ہوش شخص دہشت کے عمل کو معاف نہیں کر سکتا، چاہے وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں رونما ہو اور چاہے کسی بھی نظریہ خیال میں اسکے بیج ہوں۔ اور ہم مستشرقین سے بڑھ کر کوئی اور خوش نہ ہوگا اگر مروجہ

ے مخالف رائے رکھنے والے لوگ یا تنقیدی فکر رکھنے والے مفکرین کو
ہ موت یا سزائے قید سے محفوظ رکھا جائے اور ایک بار پھر سچے مکالمے کی
پیدا ہو۔ زیادہ تر انتہا پسند کٹھ ملا یہ بھول جاتے ہیں کہ قرآن میں فرمایا گیا
لا اکراہ فی الدین، یعنی دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ اور یہ کہ پیغمبرؐ نے
نے والوں کو اس بات سے منع کیا تھا کہ کسی اور کو کافر قرار نہ دیا جائے۔ کٹھ
اپنے پیروؤں کی بھرتی بیکار اور بے جڑ نوجوانوں میں سے کرتے ہیں۔ ان
ں کو چند آسان مذہبی نعرے سکھا کر بڑی آسانی سے اپنی مرضی کے
چلایا جا سکتا ہے۔ لیکن سیاسی طور پر استعمال کیا گیا اسلام، اصلی اسلام سے
لف ہے۔ سیاسی اسلام تو، جیسا کہ طاہر بن جالون نے لکھا ہے، اصلی
محض کارٹون ہے، کیونکہ وہ "ایسے سیاسی عقیدے کی نمائندگی کرتا ہے
ے کچھ عرصے پہلے تک عربی۔ اسلامی دنیا میں وجود ہی نہیں رکھتا تھا۔

بہر حال، مختلف اسلامی ملکوں میں اکثر مغرب کی شکل بھی اس قدر
پیش کی جاتی ہے کہ ہمیں مشرق اور مغرب دونوں کو اصل صورت حال
ف کرانا ضروری ہو گیا ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ روشن خیال
مسلمان بھی اپنی تاریخ اور ان کارناموں سے بہت کم واقف ہیں جو
، صدیوں میں مسلمانوں نے سر انجام دیئے ہیں۔ اور جب نرمی سے
پنے ہی معاشرے کی عظیم روایات سے متعارف کیا جاتا ہے تو وہ بہت
ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ وہ روایات ہیں جو آج تہہ زمین ہیں لیکن وہ
ں کو ایک جدید مستقبل کی طرف لے جا سکتی ہیں، خاص کر ایسا جدید
جو ج معنوں میں انکا اپنا ہے۔ اور خیال رہے کہ ان کو یہ بات نرمی نے
ے، استاد کی طرح تنبیہہ کرتے ہوئے نہیں، کیونکہ اسکا نتیجہ فارا النا ہو
اور اسے تنذیبی نو آبادیاتی استبداد قرار دیا جا سکتا ہے۔

میں یہ سب کچھ اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ رہی ہوں، وہ تجربہ جو
پچھلے چالیس برس میں مختلف مشرقی ملکوں میں انگنت لیکچروں کے
صل کیا ہے، ان دنوں میں جب میں ایک نسبتاً نو عمر غیر مسلم عورت
دئے بھی انقرہ یونیورسٹی کی اسلامی دینیات کے نئے شعبے میں تاریخ
ے پروفیسر کی کرسی پر متمکن تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جرمنی کی
ہوں میں بہ مشکل ہی کوئی عورت پروفیسر ہوا کرتی تھی۔ میرے
ں نصرانی گرجا کی تاریخ اور اصول و عقاید بھی پڑھانا شامل تھا۔ اور ایک
ہم بات ہے ہم عموماً بھول جاتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ یعنی 'روح اللہ'
والدہ ماجدہ بی بی مریمؑ کا قرآن اور اسلامی عقیدے میں کتنا اہم حصہ
ا بھی ہمیں نوالس (Novalis) — کا وہ فقرہ ذہن میں لانا چاہئے جو
ے ناول (Heinrich von Ofterdingen) میں ظلمہ سے کہلوایا

تھا۔ ظلمہ ایک مسلمان عورت تھی جو بیت المقدس میں قید تھی۔ "میں ادب
کے ساتھ عرض کروں گی کہ ہمارے شاہوں نے تمہارے ولی کے مزار کا احترام
کیا۔ تمہارے ولی کو ہم بھی خدا کا پاک پیغمبر مانتے ہیں۔ کتنا اچھا ہوتا اگر انکا
مقدس مزار خوشگوار اتحاد اور میل جول اور کبھی نہ ختم ہونے والے باہمی
رشتوں کا مرکز بن جاتا۔۔۔۔"

یہودیت، نصرانیت اور اسلام، تینوں میں آخر الایام کے زمانہ امن کا
تصور موجود ہے جب شیر اور بکری منصف حاکم کے دور میں ساتھ ساتھ رہیں
گے۔ لیکن امن کوئی جامد شے نہیں ہے۔ "اس کی تہذیب کو فروغ دینے میں
مذہب کی اہمیت" کے موضوع پر یونسکو نے اپنے اعلانیہ (دسمبر ۱۹۹۴) میں
کہا ہے کہ "امن ایک سفر ہے، کبھی نہ ختم ہونے والا ایک عمل" امن جیتی جاگتی
حرکت ہے جو ہمارے اندر سے شروع ہوتی ہے۔ صوفیائے کرام کے مطابق
اصلی جہاد تو ان کے اندر ان کے اپنی نفس کے سرور کو مٹانے کی جدوجہد ہے۔
اور جب انکی روحیں بالآخر اطمینان قلب حاصل کر لیں گی تب وہ دنیا میں امن
کے قیام کے لئے جدوجہد کر سکیں گے۔

کچھ لوگ یہ سوچ سکتے ہیں کہ اسلام کا یہ تصور جو میں پیش کر رہی
ہوں بے حد مثالی ہے اور تلخ سیاسی حقیقت سے بہت دور ہے۔ لیکن مورخ ادیان
کی حیثیت سے میں نے سیکھا ہے کہ بہترین کا مقابلہ بہترین سے ہونا چاہئے۔ سویڈن
کے لوتھرن بشپ (Lutheran Bishop) تار آندرے (وفات ۱۹۴۸) جو
اپنے وقت کے سربرآوردہ ماہر اسلامیات تھے، اپنی سیرت رسول اللہ میں لکھتے
ہیں "کسی بھی مذہب کو یہ حق ہے کہ دوسری روحانی تحریکوں کی طرح اسکا بھی
محاکمہ اسکی نیت اور عقائد کی روشنی میں کیا جائے نہ کہ ان جھوٹے نقوش کی
روشنی میں جو انسانی کمزوریوں اور درماندگیوں نے اس کے بارے میں پیدا کئے
ہیں"۔

اسلام کا میرا اپنا تصور، میری دسیوں سال پرانی اسلامی ادب اور فن
میں دلچسپی سے ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ، ساری دنیا میں ہر طبقے کے
مسلمانوں سے دوستی کے ذریعہ تشکیل ہوا ہے۔ وہ سارے دوست جنھوں نے
مجھے اپنے گھروں میں جگہ دی اور مجھے تہذیب سے روشناس کرایا۔ میں ان کے
احسان کے قرض سے لدی ہوئی ہوں جن کے ایک ادنیٰ سے ٹکڑے کا اعتراف
میں آج کرنا چاہتی ہوں۔ سولن جن (Solingen) — کی ترک خاتون مولود

— جرمن ناول نگار 'فریدرش نان ہارڈن برگ (۱۷۷۲ تا ۱۸۰۱) کا قلمی نام۔
نوالس جرمنی کے عظیم ترین رومانی ادیبوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ (مترجم)
— مغربی جرمنی میں ایک شہر جہاں کے ترک شہریوں کو کچھ برس ہوئے تشدد کا
نشانہ بنایا گیا تھا۔ (مترجم)

گنج کی طرح کے لوگ۔ جس نے ان سب کو معاف کر دیا جنھوں نے اسکے خاندان کے بہت سارے لوگوں کو مار ڈالا۔ میرے لئے اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں وہ اسلام جس کو میں برسوں سے جانتی ہوں۔ اور میں اپنے والدین کی شکر گذار ہوں جنھوں نے مجھے مذہبی آزاد خیال کے ماحول میں پالا۔ ایسا ماحول جو شاعری میں ڈوبا ہوا تھا۔ اپنے اساتذہ، شرکائے کار اور شاگردوں کی بھی میں احسان مند ہوں جن میں سے ہر ایک نے میرے تصورات کے افق کو اپنے اپنے طریقے سے وسیع کیا۔

میں جرمن بک ٹریڈ اسوسی ایشن (German Book Trade Association) کی بھی شکر گذار ہوں جس کی کمیٹی میں یہ جرات تھی کہ میرا انتخاب کرے اور مجھے ان ممتاز شخصیتوں میں شامل کرے جنھیں یہ انعام مل چکا ہے۔ چودھویں صدی کے عظیم شمالی افریقی فلسفی ابن خلدون نے اپنی کتاب کے ایک باب کے عنوان کو یوں قائم کیا ہے۔ "عالم وہ ہے جو روزمرہ کی سیاست کے معاملات کے بارے میں اور لوگوں کے مقابلے میں سب سے کم معلومات رکھتا ہے۔" لیکن بہر حال آج کے ادیب مفکر کا فرض یہ ہے کہ وہ مختلف تہذیبوں کو سمجھے اور سمجھائے۔ ۱۹۵۳ میں مارٹن بوبر نے اس بات کی نشاندہی کی تھی کہ دوسرے لوگوں کے وجود کو قبول کرنا ہی مکالمے کی بنیاد ہے۔ اور یہ بات مغرب اور اسلامی دنیا کے درمیان تعلقات کے معاملے میں بھی صادق آتی ہے۔ حالانکہ مشرق مغرب کی آویزش اور سرد جنگ کے ختم ہونے کے باعث یہ خطرہ ہے کہ مغرب میں اب اسلام کو "نئے دشمن" کے پیکر میں پیش کیا جائے گا۔ پھر بھی بوبر کی طرح مجھے بھی مکالمے پر یقین ہے جو بقول اسکے، "قائم ہے دوسرے کے وجود کو اس طرح قبول کرنے پر جیسا کہ وہ ہے۔ کیونکہ اسی طرح اختلافات مغلوب کئے جا سکتے ہیں اگرچہ پوری طرح سے ختم تو نہیں کئے جا سکتے۔"

میری راہ اطلاق عام کی راہ نہیں ہے۔ یہ دھوم دھڑکے سے خالی ہے۔ پھر بھی مجھے یقین ہے کہ۔

جو پتھر پیہم پانی پڑے متصل
تو گھس جائے بے شبہ پتھر کی سل

جن الفاظ سے جرمنی کی وفاقی جمہوریہ کے صدر نے مجھے مخاطب کیا وہ میری حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ اور میں دعا کرتی ہوں کہ عالمی امن قائم کرنے میں تھوڑی بہت کارگذاری کی طاقت مجھے بھی دی جائے۔

اول و آخر بہر حال میں اس پروردگار کی شکر گذار ہوں جس کے بارے میں گوئٹے نے اپنے "دیوان مغرب" میں کہا ہے:

مشرق خدا کی ملکیت ہے
مغرب خدا کی ملکیت ہے
شمال اور جنوب کے وطن
اسکے ہاتھوں کی امان میں آسودہ ہیں۔
وہی واحد منصف حاکم ہے وہ
سب کی بھلائی سوچتا ہے وہ حق ہے
اس کے سو ناموں میں سے
اس نام کی حمد و ثنا ہو
اور اس کی شانیں گائی جائیں۔

رونق نعیم

خواہش

گرمی کی یہ دھوپ بہت پاجی ہے
میرا تو جی چاہ رہا ہے
زور سے اس کے منہ پر ایسا تھپڑ ماروں،
جس سے یہ چلائے
چیخے
بلکھے کھائے
پھر اس ساگر میں
جس میں جل پریوں کی ٹولی
غوطہ لیتی ہو
ڈوب کے ابھرے
جی بہلائے

اندر دھنش

اندر دھنش کو اپنے گھر میں لے آؤں
سوچ رہا ہوں
اس کے ساتوں رنگ بچھا کر سو جاؤں

بڑا آسمان

چاروں اور دھانی سیلاب امڈ پڑا ہے
سرخ کچے راستے ڈوب ڈوب گئے ہیں
بیل گاڑیاں بجتی ہوئی نظر آ رہی ہیں
یہ میں کہاں آ گیا
یہاں تو آسمان بہت بڑا ہے

جمیل الرحمٰن

تھے ہم فقیر اسے کار خسروانہ رہا
کھلا کہ دل کے تصرف میں اک خزانہ رہا

کوئی بگولہ کہیں دشت خواب سے اکثر
پکارتا ہے کہ دیکھو کہاں ٹھکانا رہا

پھر اس کے بعد درختوں کی چھاؤں روٹھ گئی
پڑی وہ برف کہ پتہ کوئی ہرا نہ رہا

ہوا چلی تو بہت روئے ہم کہ لٹتے ہیں
وہ کیا ملے گا اگر کوئی نقش پا نہ رہا

جمیل رکھ لیا شانوں پہ کس لئے وہ سر
طلسم ٹوٹ گیا راہ کا فسانہ رہا

افتخار نسیم

آر سے پار سے نہیں نکلا
عکس دیوار سے نہیں نکلا

شہر بنتے گئے مگر انساں
آج تک غار سے نہیں نکلا

ہونٹ پتھر کے ہوگئے میرے
چشمہ کہسار سے نہیں نکلا

اس کنویں میں پڑا ہوا صندوق
ایک دو چار سے نہیں نکلا

میں بہت سامنے ہوا اس کے
وہ حسیں کار سے نہیں نکلا

ایک موتی سا خواب شب بھر میں
چشم بیدار سے نہیں نکلا

لوگ دفتر چلے ہیں اور نسیم
گھر سے اتوار سے نہیں نکلا

غم سے آزاد بھی نہیں کرتا
وہ مجھے شاد بھی نہیں کرتا

میں اسے: بھول ہی نہیں سکتا
وہ مجھے یاد بھی نہیں کرتا

شہر مفتوح میں مرا فاتح
مجھ کو برباد بھی نہیں کرتا

قفل دل کھول دے کچھ ایسا طلسم
وقت ایجاد بھی نہیں کرتا

پہلے دل احتجاج کرتا تھا
اب تو فریاد بھی نہیں کرتا

جیسی تنقید اس نے کی ہے نسیم
ایسی نقاد بھی نہیں کرتا

غم سے پاگل جو ہونے لگتے ہیں
وقت بے وقت سونے لگتے ہیں

بے وجہ قہقہے لگاتے ہیں
بات بے بات رونے لگتے ہیں

کل کے اونچے پہاڑ جیسے لوگ
آج اتنے سے بونے لگتے ہیں

روزگاری کے ہل میں خود کو لوگ
صبح ہوتے ہی جوتے لگتے ہیں

اس کے ہونے سے رات دن اپنے
سانولے اور سلونے لگتے ہیں

غزلیں

مصور سبزواری

طلسم برباد بستیوں کا نہ میں نے دیکھا نہ تو نے دیکھا
نقاب الٹا جمال صحرا نہ میں نے دیکھا نہ تو نے دیکھا

کمندیں تھیں ہفت آسماں تک تھے بند مٹھی میں ماہ و انجم
مگر وہ دیوار کا نوشتہ نہ میں نے دیکھا نہ تو نے دیکھا

تجسس تشنگاں کی سرحد تحفظ آب سے پرے تھی
فرات نزدیک بہہ رہا تھا نہ میں نے دیکھا نہ تو نے دیکھا

سبک نگاہی نے اور پیچیدہ سانحوں کو جنم دیا تھا
پس المیہ چھپا المیہ نہ میں نے دیکھا نہ تو نے دیکھا

دو اجنبی چہروں کا وہ ملنا فقط خبر آئینوں کی صورت
یہ حد ہے عکس ایک دوسرے کا نہ میں نے دیکھا نہ تو نے دیکھا

نظر جو اٹھتی تو ہم بھی شاداب رت کو چل کر وداع کرتے
ہوا کا پتوں سے مل کے رونا نہ میں نے دیکھا نہ تو نے دیکھا

پتوں نے جو کی مزاحمت کم
یوں پیڑ ہوا پرت پرت کم

اترا وہ گھروں میں خوف جس سے
گلیوں میں ہوئی چلت پھرت کم

ہے رابطہ ساحل و صدف میں
ہوتی ہے کہیں مطابقت کم

چہروں سے کشید علم کی ہے
پڑھتا ہوں کتاب میں بہت کم

آنکھیں سنجیدہ ہو گئی ہیں
ہے دید کسی کی کم بہت کم

اعداد و شمار رفتگاں کیا
جب لوگ ہوئے ہوں ان گنت کم

مصور سبزواری

یوں درگزر نہ کر کہ اضافی شکست ہے
آئندہ مورچے پہ یقینی شکست ہے

آگے تھے نصب پچھلی شکستوں کے سنگ میل
سمجھا تھا میں نے یہ مری پہلی شکست ہے

مقتول سر نے اپنا سفر ختم کر دیا
لے طشت میں سجی ہوئی تیری شکست ہے

شاید بدل گئے ہوں نئی کاشت کے اصول
بوئے تھے ہم نے حوصلے کاٹی شکست ہے

وہ رن پڑا ہواؤں کے خیمے اکھڑ گئے
جو باقیات میں سے ہے باقی شکست ہے

بازی تو مات ہو چکی اب جاؤ گے کدھر؟
کالی ہے رات، رات سے کالی شکست ہے

(نسیب غوری کی تلاش میں)

حد ممکنات سمیٹ کر تو کہاں گیا؟
مرے اگلے خواب کے نقش گر تو کہاں گیا؟

نہ الجھتا تھا تجھے برق و باد جلال سے
ترا کل وجود چراغ بھر تو کہاں گیا؟

جو بھی سنگ میل حیات تھے بچے نہیں
ہوئے ختم راستے رہگذر تو کہاں گیا؟

میں قدیم وقت کی لاش ہوں کسی غار میں
مرے نوحہ گر مرے قبر گر تو کہاں گیا

تری ہمرہی میں مسافتیں تھیں لطیف تر
مرا اب کڑا ہے بہت سفر تو کہاں گیا؟

مجھے کیا بتائیں گی عرش فرش کی حیرتیں
کوئی مستقر نہ کوئی خبر تو کہاں گیا؟

مظفر حنفی

٭

ہاں شہادت مری رقم کر لی
ایک اور انگلی پھر قلم کر لی

لوگ رونے کو بھی ترستے ہیں
رات نے آستین نم کر لی

دست بیضا کہاں سے لاؤ گے
خیمہ سے آگ تو بہم کر لی

لقمۂ تر ثقیل ہوتا ہے
میں نے خوراک اپنی کم کر لی

ذہن الجھا دیا تھا غالب نے
میر کی بیت پڑھ کے دم کر لی

ہم پہ دنیا ترس نہ کھانے لگے
مختصر داستان غم کر لی

چھوٹے پڑتے تھے ہاتھ بچے کے
ہر چنبیلی نے ڈال خم کر لی

تخت طاؤس پہ آ بیٹھا میں
سرمۂ مفت نظر جیسا میں

زیر شمشیر مری گردن تھی
اور شمشیر بکف میں تھا میں

بادباں عرش، زمیں لنگر ہے
ناخدا ایسے سفینے کا میں

آسمانوں پہ بھی رخشندہ
زیر افلاک دکھی تنہا میں

جب سے نیزوں پہ کٹے سر دیکھے
نیزہ بردار ہوں سر والا میں

ریت ہی ریت وہاں پھیلی تھی
روکتا کون مجھے دریا میں

کون ہے، کیا ہے مظفر حنفی
ساٹھ برسوں میں نہیں سمجھا میں

مظفر حنفی

زمین و آسماں کا بھید سارا تم سمجھتے ہو
مگر شیشے کے ٹکڑے کو ستارا تم سمجھتے ہو

مجھے دیکھو کہ اپنا مہرباں تم کو سمجھتا ہوں
مرے پہلو میں نیزہ کس نے مارا، تم سمجھتے ہو

بچاؤ سر کہ یہ شانے سے غائب ہونے والا ہے
کدھر سے ہونے والا ہے اشارہ تم سمجھتے ہو

کبھی مٹی سے بھی پوچھو کہ اس میں خون ہے کس کا
کہ اس دھرتی پہ بس اپنا اجارہ تم سمجھتے ہو

ذرا سوچو کہ مل کر بوجھ دونوں بانٹ سکتے تھے
ہمارا ہم سمجھتے ہیں تمھارا تم سمجھتے ہو

بھروسہ ناخدا پر ہے تمھیں، مجھ کو خدا پر ہے
ڈبودے گا تمھیں، جس کو سہارا تم سمجھتے ہو

مظفر کیوں کنارا کر گئی ہر موج ساحل سے
وہ دلدل ہے میاں جس کو کنارہ تم سمجھتے ہو

ریت کا جسم ڈھ نہ جائے سب
خون آنکھوں سے بہہ نہ جائے سب

وار سینے پہ ہنس کے جھیلتا ہے
تیر تلوار سہہ نہ جائے سب

بھید گہرائیوں کے تنکے سے
سر پھری موج کہہ نہ جائے سب

چھانٹ کر بات کر نہیں سکتا
جی کی جی میں ہی رہ نہ جائے سب

شعر کہتے رہو مظفر جی
جب تلک درد ذہ نہ جائے سب

جوگندر پال ترجمہ: چودھری ابن النصیر

۱۹۸۰ کی دہائی کے وسط کی بات ہے کہ میں کراچی گیا۔ میں نے دیکھا کہ
مں تو ایسے حیرت زار میں پہنچ گیا ہوں جہاں لوگ گہری نیند میں ہیں اور چلتے
پھرتے بات چیت کرتے غرض سارے ہی کام کرتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ یہ
حیرت زار مجھے مانوس لگا کہ وہاں یو پی کے بہت سے شہر بھی موجود تھے جو
میرے خیال میں نہ صرف انہیں جغرافیائی طول و عرض کے مقامات پر آباد
تے، بلکہ تناسب میں بھی یو پی ہی کے شہروں کی طرح چھوٹے یا بڑے تھے۔ اور
دُ؟ وہ تو وہی شگفتہ اور ٹکسالی اردو بولتے تھے جو مجھے تقسیم ہند کے قبل کے
نوں کی یاد دلاتی تھی جب لوگ اردو زبان کو جمالیاتی لطف کی خاطر بولتے تھے نہ
۔ روزمرہ کے کام نکالنے کے لئے۔ میں اکثر اپنے میزبان اور ساتھی اور ادیب
مد علی صدیقی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتا تو وہ کندھے اچکا کر کہتا "بھئی
یرا خیال ہے کہ ہمارے اس میلوڈراما کے تعبیر آپ ہی ہمیں بیان کریں"۔

حقیقت ہے کہ میرے ناول "خواب رو" کا کردار مرزا اسحاق محمد علی
مدیقی پر ہی مبنی ہے۔ سیدھی تچی چال نے مجھے اس ناول کے اختتامیے کی طرف
شارہ کیا تھا اور پھر اسی اختتام سے میں نے الٹے پاؤں چلتے ہوئے پورے ناول کا
ماکہ ذہن میں تعمیر کیا۔ مرزا اسحاق کی طرح محمد علی صدیقی بھی لمحہ موجود اور
قام حال میں پوری طرح جوش و خروش سے الجھا ہوا نظر آتا تھا۔ جب کہ اس
کے برخلاف کراچی کے اکثر مہاجر زمانہ ماضی کے سوا کسی اور طریقے سے زمانہ
ال میں جی ہی نہیں سکتے تھے۔

محمد علی صدیقی مجھے امروہہ، گورکھپوری، میرٹھ حتیٰ کہ ملیح آباد بھی
لے گئے اور آپ کو یقین نہ آئے گا کہ وہاں کیا ہوا۔ اس کے قبل کہ وہ مجھے شہر
۔اچی کی گنجان گہرائیوں میں لے جاتا وہ ایک لمحے کو ٹھٹکا اور کچھ خوش ہو کر
ے تمسخر سے بولا۔ "اب یہاں سے ہم چلیں گے اور اپنے عظیم لکھنؤ کی
ان و شوکت ملاحظہ کریں گے۔"

اور بالکل جیسا کہ ہندوستان میں ہوتا ہے ہم کراچی میں بیٹھے ہوئے
ھنؤ کے امین آباد کی حس اور نہ ہلنے والی بھیڑ بھاڑ اور شوروغل میں پہنچ گئے۔
لف ان گنت سمتوں سے سڑکیں چلی آ رہی تھیں، خراماں خراماں بھیڑ بھاڑ
ے آہستہ روی سے مد، ہر شخص کی کلاہ ذرا سی کج تھی اور جیسے ہی چوک کے
چوراہے پر وہ ایک دوسرے کو دیکھتے، بھیڑ بھاڑ کو چیرتے ہوئے ایک دوسرے
سے گلے لگ جاتے اور گلے لگے ہی رہتے۔ وسیع و عریض چوک میں اسی طرح
کی جھمگھٹ تھے۔ پوری بھاجی والے، کباب والے، مٹھائی والے اور جب ہم ان
نعمتوں سے آپ اپنا پیٹ بھر لیتے تو ہلکے قدم چلتا ہوا کوئی عطر والا نہ جانے
کہاں سے آ کے سامنے سلام کرتا ہوا نمودار ہو جاتا۔

محمد علی صدیقی نے مجھے دیکھا اور میری بے چینی کا لطف اٹھاتے ہوئے
اس نے کہا "آپ کے سارے کا سارا لکھنؤ تو کراچی میں اٹھ آیا ہے کہ نہیں؟
میں سوچتا ہوں اب بھلا وہاں بچا ہی کیا ہو گا"۔

"وہاں پنجابی ہیں" میں نے کہا۔ "وہ اس بات پر اصرار کرتے نظر آتے
ہیں کہ میاں ہم تو اپنی اردو کی پنجابی میں ہی بولیں گے۔"

ایک بار میں اور محمد علی صدیقی مہاجروں کے لکھنؤ میں ایک ریستوراں
میں گئے۔ رات تقریباً آدھی جا چکی تھی۔ سارا ریستوراں چہل پہل اور نقل و
حرکت سے بھرا ہوا تھا جیسے یہ اس کے سب سے مصروف اوقات ہوں۔
میرے دوست نے مجھے بتایا کہ لکھنؤ والے اپنے بستروں پر سوتے ہوئے اپنے
خوابوں سے اٹھ کر سیدھے چوک چلے آتے ہیں۔ اس نے کہا کہ آپ یقین
کیجئے ایسے خواب رو لوگ رات کی آخری گھڑیوں تک یہاں بھٹکتے رہیں گے۔

میرا ناول "خواب رو" اس طرح میرے دماغ میں عدم سے موجود میں
آیا اور جب کئی مہینے بعد وہ کاغذ پر پیدا ہو جانے کے لئے تیار ہو گیا تو میں نے
اپنے کو بہت سنبھال کر رکھا تھا کہ ذہن کے پردے سے کاغذ پر پیدا ہونے کا
عمل بلا کسی جھنجھٹ کے گذر جائے۔

جو سوال کانٹے کا سوال ہے وہ یہ ہے کہ مہاجروں نے کراچی میں آباد
ہونے کے لئے ہندوستان میں اپنے گھروں کو کیوں چھوڑا؟ تو صاحب بات یہ
ہے کہ جب آپ کے گھر میں آگ لگے تو آپ جدھر منہ اٹھے ادھر بھاگ نہ
کھڑے ہوں گے۔ اور یہی بات ان لاکھوں پنجابیوں پر بھی صادق آتی ہے جو
عادت اور طور طریقہ کے اعتبار سے ہندوستان کو ایک سمجھتے تھے۔ انھوں نے
اچانک خود کو پنجاب سے باہر اپنے کابوسی خواب سے جاگ کر ہندوستان میں پایا۔

٭ یہ افسانہ جوگندر پال کے مجموعے "بے ارادہ" میں شامل ہے۔ (مترجم)

میرا ایک افسانہ ہے "پناہ گاہ" ـ جس میں میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ تقسیم ہند کے نتیجے میں جو فرقہ وارانہ فساد ہوئے ان کے سائے آج تک کے زمانے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

ادھیڑ عمر کی ایک میراثن ہندوستانی پنجاب کے اپنے گاؤں میں تنہا رہ جاتی ہے۔ بھیانک فرقہ وارانہ فساد ہو چکا ہے اور اب وہاں کوئی مسلمان باقی نہیں ہے۔ اس کی عزت بار بار لوٹی جاتی ہے، اسے طرح طرح سے ذلیل کیا جاتا ہے مارا پیٹا جاتا ہے۔ بیچاری جاہل عورت کو کچھ پتہ نہیں کہ اس کے ساتھ کے سب لوگ کہاں چلے گئے۔

چلے کہاں گئے؟ ہم نے سب کو پاکستان ڈھکیل دیا ہے۔ اس کا پرانا غیر مسلم ساتھی اور دوست استہزائیہ لہجے میں کہتا ہے۔ "تو تم بھی وہیں کیوں نہیں چلی جاتیں، جہاں وہ گئے ہیں؟"

صورت حال یہ ہے کہ اس کے تمام اعزہ واقربا ایک پڑوسی شہر کے پناہ گزیں کیمپ میں منتقل کر دئے گئے ہیں۔ ایک دن گاؤں کا نرم دل سرپنچ اسے تیز بخار اور تکان کے باعث بے ہوش پڑا پاتا ہے اور اسے خود اپنی بیل گاڑی میں بٹھا کر کیمپ کو لے جاتا ہے۔ افسانے کے آخر میں شام ڈھل چکی ہے اور بجلی کی زرد روشنی میں جب وہ آنکھ کھولتی ہے تو کیمپ کا ایک نوجوان ہندو ڈاکٹر پیار بھرے لہجے میں اس سے پوچھتا ہے کہ اب تم کیسی ہو؟ اور پھر بڑے نرم لہجے میں کہتا ہے "اماں تم ڈرو نہیں' اب تم یہاں پوری طرح محفوظ ہو"

بیچاری جاہل میراثن کا دل اس ساری محبت اور مہربانی کو دیکھ کر بھر آتا ہے۔ "ہاں بیٹا! میرے گھر والوں کو بھی ضرور بتا دینا کہ میں بھی پاکستان پہنچ گئی ہوں۔"

سچی بات یہ ہے کہ چاہے وہ ہندو مہاجر ہوں جو پاکستان سے ہندوستان آئے، یا مسلمان مہاجر ہوں جو ہندوستان سے پاکستان گئے، گئے وہ بہر حال پاکستان، جن کے حقیقی معنی ہیں "پاک پناہ گاہ" لفظ پاکستان کے میرے یہ معنی میرے افسانے "پناہ گاہ" میں گہری معنویت کے حامل ہیں۔ لیکن یہ بات بھی دلچسپی کی حامل ہوگی کہ "خواب رو" میں نواب مرزا کی بیوی کے دل و دماغ میں لفظ پاکستان کے تعلق سے خوف اور تشویش کے انسلاکات پیدا ہو چلے ہیں۔ اس کی وجہ وہ مخصوص صورتحال ہے جس سے وہ گذر رہی ہے۔ اس کا دل اس خوف سے بھرا ہوا ہے کہ اس کے الفاظ میں اس کا شوہر ہر روز کام پر آتے جاتے ایک تنگ پاکستانی راہداری سے گزرتا ہے۔ "پناہ گاہ" کی میراثن خوش ہے کہ وہ پاکستان پہنچ گئی حالانکہ وہ ابھی ہے ہندوستان میں ہی۔ اور "خواب رو" کی چاند بی بی کو اس چیز سے خوف آتا ہے کہ کراچی میں اپنے لکھنؤ کے اندر وہ ایک پاکستانی راہداری دیکھتی ہے۔ جب ہم مسئلے کی پیچیدگی کو سمجھ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسے پرجوش جذباتی بہاؤ کے ذریعہ اس کو حل یا اس کی شدت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں شاید مناسب ہوگا کہ میں آپ کی توجہ کو "خواب رو" کے ایک غریب سندھی کردار "سائیں بابا" کی طرف مبذول کروں۔ یہ اس کی غریبی ہی ہے جس کے باعث وہ اپنے پاکستان کی تلاش میں اپنے ہی ملک میں شہر بہ شہر مارا مارا پھرتا ہے۔ دیوانے مولوی صاحب کو سائیں بابا پر رحم آتا ہے اور ایک سادہ اور خالص دیوانگی کے جوش میں وہ اس عقیدے پر کار فرما ہیں کہ سائیں کو اپنے دور دراز سندھ سے ان کے لکھنؤ تک صرف ذرا سی روٹی اور پناہ کے لئے دوڑ کر آنا پڑا ہے۔ لہذا آپ دیکھتے ہیں کہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور اسے ہمدردی اور دوسروں کے نقطۂ نظر کو حل کرنے کے ذریعہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

دیوانے مولوی صاحب کا پرزور اور دیوانگی سے بھرپور عقیدہ یہ ہے کہ وہ مسلسل، بلا کسی وقفے کے اپنے پرانے لکھنؤ میں ہی رہ رہے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ اور صورتحال دردناک تو شاید ہے لیکن اگر ان کی دیوانگی ہی ان کے لئے ہی علاج کا کام کر سکتی ہے تو پھر ان کی دیوانگی کے پھیلاؤ کو قرار اور مراعات کیوں نہ دے دی جائے؟ لیکن اگرچہ آپ یہ فیصلہ بالارادہ کر بھی لیں تو نواب محل میں اچانک ایک بم پھٹتا ہے اور اس کے نتیجے میں ان کی پیاری بیوی 'اچھی بیگم' ان کے سب سے بڑے بیٹے اور بہو کی جانیں چلی جاتی ہیں اور اب دیوانہ دیوانہ نہیں رہ گیا وہ سائیں اپنے سندھی باورچی کے کندھے پر سر رکھ کر زار زار روتا ہے اور اپنی دیوانگی سے بیدار ہو جاتا ہے۔ اور اسے اچانک معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ تمام برسوں سے وہ کراچی ہی میں تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھیں گے اس کی دیوانگی کی صرف نوعیت ہی بدلی ہے اب اسے خیال ہے کہ اپنے بیٹے اسحاق مرزا سے ملنے کی خاطر کراچی آیا ہے اور اسے جلد از جلد اپنی اچھی بیگم کے پاس لکھنؤ واپس چلا جانا چاہئے۔

اسحاق مرزا دیوانے مولوی صاحب کا چھوٹا بیٹا ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ معاصر تاریخ نے مہاجروں کے ساتھ کیا کھیل کھیلا ہے۔ وہ کراچی کے اندر بسے ہوئے ہندوستانی لکھنؤ کے افسانے سے بھی خوب واقف ہے۔ اور اگرچہ اپنے فطری مزاج کی بنا پر وہ اپنے لوگوں کے اس عقیدے سے ان پر گرفت نہیں کرتا لیکن اسے خوب معلوم ہے کہ کراچی کا لکھنؤ کبھی اپنے اصل ہندوستانی سرچشموں کی طرف واپس نہیں ڈھکیلا جا سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ اگر ایسا ہوا بھی تو اس کی نسل کی اولادوں کو ایک اور مہاجرت دیکھنی پڑے گی۔ یہی وجہ ہے کہ دیوانے مولوی صاحب اپنے پوتے سے کہتے ہیں کہ لکھنؤ چلنے کی تیاری کرو تو وہ بچہ اپنی گیند کے پیچھے دوڑتا ہوا حیرت سے اس سے پوچھتا ہے۔ کون سا لکھنؤ بڑے ابو؟ ہم لوگ اپنے لکھنؤ میں ہی تو بیٹھے ہوئے ہیں؟"

ناول میں بیان کردہ صورتحال کا یہ مختصر بیان آپ کے سامنے رکھنے کو میرا جی چاہ گیا کیونکہ یہی صورتحال اس کے پورے پورے معنی ہیں۔ جس نے مجھے یہ ناول قلمبند کرنے کی ہمت بخشی۔

میں نے یہ ناول اپنے دوست محمد علی صدیقی کے نام معنون کیا ہے۔ یہ صرف ایک دوستانہ اشارے کے طور پر نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک جذبہ

بھی تھا۔ محمد علی صدیقی کی شخصیت میں مجھے ناول کے اس کردار کا خاکہ قائم کیا جو مجھے سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے، میرا مطلب اسحاق مرزا سے ہے۔ محمد علی صدیقی کو ہندوستان میں بسے ہوئے اپنے امروہہ سے محبت ہے لیکن وہ ہمیشہ اس بات کو ترجیح دیتا ہے کہ وہ کراچی کے اندر اپنے بچوں کے امروہہ میں جم کر بیٹھا رہے کیونکہ انھیں ہندوستانی امروہہ صرف وہی معلوم ہے جو ان کی دادی نے انھیں کہانیوں کے ذریعہ بتایا ہے۔

میرے دیوانے مولوی صاحب کی طرح مجھے بھی اپنے وطن سیالکوٹ سے بھاگ کر آنا پڑا تھا جب تقسیم ملک کا تہلکہ مچا ہوا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دیوانے مولوی صاحب کے برخلاف میں اس وقت اٹھتی عمر کا نوجوان تھا۔ لیکن میں بہت سادہ مزاج اور بوڑھے ان پڑھ والدین کی اولاد تھا اور جب دور دراز بھارت میں اپنی نازک صورت حال کو سنبھالنے کی ذمہ داری مجھ پر پڑی تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میرے سب بال سفید ہو گئے ہیں۔ ہندوستان اب تک ہم لوگوں کے لئے ایک بہت اجنبی شے تھا جس سے ہمارا تعارف صرف سیاسی نیتاؤں کی نعرہ بھری تقریروں کے ذریعہ ہی ہوا تھا۔ میرا دور بھی دیوانے مولوی صاحب سے کچھ کم نہ تھا۔ ان بوڑھے میاں کو دکھوں نے براہ راست فاتر العقل کر دیا تھا لیکن مجھے انھیں آفات نے قبل از وقت عقل اور بلوغ کی تلاش میں دیوانوں کی طرح بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ مجھ جیسے شخص سے زیادہ مہاجر زندگی کے ساتھ ہم آہنگی کا رویہ اور کس کا ہوگا کیونکہ میں ان لوگوں میں سے تھا جو کئی نسلوں سے اپنے پرانے ملک میں رہ رہے تھے اور اچانک اس ملک کا نام بدل گیا۔ محمد علی صدیقی مجھے ایک گھنی آبادی سے بھرے علاقے میں لے گئے جہاں سڑک پر ایک دیو قامت بورڈ پر لفظ "مہاجر" لکھا ہوا تھا اور وہ بورڈ اتنا ہی بڑا تھا جتنی بڑی وہ عمارت تھی جس پر وہ نصب کیا گیا تھا، تو میں نے سمجھا کہ محمد علی صدیقی کا مطلب کیا تھا اور بے ارادہ طور پر اس نظارے کو میں نے اپنے ہندوستانی تجربے سے منسلک کیا اور پھر کچھ پاگل سا ہو کر میں وہاں سے ہٹ آیا۔

مجھے ایک اور بات یاد آتی ہے جو میرے مندرجہ بالا خیالات کی تصدیق کرتی ہے۔ جس زمانے میں میں نے اس ناول کا مسودہ مکمل کیا ہی کیا تھا۔ تب ایک جرمن ماہر ہندوستانیات اپنے شوہر کے ساتھ مجھ سے ملنے آئیں۔ میں ان کے شوہر سے باتیں ہی کر رہا تھا اور وہ مسودے کے اوراق الٹ پلٹ رہی تھیں۔ چند صفحے پڑھنے کے بعد انھوں نے آنسو بھری سسکی سی لی۔

"کیوں کیا بات ہے؟ میں نے بہت نرم اور محبت بھرے لہجے میں پوچھا"

"لیکن یہ تو میری کہانی ہے" آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھوں والی خاتون نے بمشکل اپنے پر قابو پایا" یہ تو ہم ان سب لوگوں کی کہانی ہے جو دیوار برلن کے اس پار مشرقی جرمنی میں رہتے تھے۔" میں آپ کو بتاؤں کہ ہم لوگوں پر کیا گزرری ـــــ""؟

مجھے قطعی یقین تھا کہ ان خاتون کی دلچسپی جھوٹی نہیں تھی اور یقیناً وہ کسی مختلف وقت میں اور مختلف موقع پر ویسی ہی خوف انگیز صورتحال سے گزری

تھی جس کا ذکر ناول میں تھا۔ تو کیا میں یہ کہوں کہ واقعات کی مشابہت نہیں بلکہ جذباتی تاثر کی مشابہت وہ چیز ہے جو ادبی سچائی کو جنم دیتی ہے؟

جذبات کو پیدا کرنے کی قوت اگر مصنف میں نہ ہو تو اس کی تحریر میں وہ چیز نہ ہو گی جو اسے تخلیقی طور پر قابل قدر اور باوزن بناتی ہے۔ بھلے ہی اس میں تفصیلات بالکل صحیح صحیح لکھی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں کوئی اور نہیں ہوں وہی "خواب رو" کا دیوانہ مولوی صاحب ہوں اور یہاں ہندوستان میں رہتے ہوئے میں نے پاکستان میں اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں اور اس کے جزئیات خوب برتا ہوگا اور اس مخصوص سیاق سباق میں میرے پیارے دوست انور سدید کو چاہئے کہ مجھے اپنا پاکستانی ہم وطن تصور کریں۔ ◢◢

ذکاءالدین شایاں

صبا کم ہے لباسِ شب ابھی بدلا نہیں ہوگا
وہ لب کیا پھول بھی کھلنے پہ آمادہ نہیں ہوگا

فضا وحشت زدہ ہے صورِ اسرافیل کی زد پر
کہ راتوں میں بھی معنی خیز سناٹا نہیں ہوگا

سبھی کچھ برق رفتاری میں پیچھے چھوٹا جاتا ہے
مسافر کے لیئے سایہ بھی ہمسایہ نہیں ہوگا

فلک بوس آخری منزل پہ خوشبو بال کھولے گی
کہاں تک شہر افسردہ تروتازہ نہیں ہوگا

سلگتی ریت پر وہ آفتابی غسل کے منظر
مگر پرچھائیں کا جسموں سے سمجھوتا نہیں ہوگا

سیفی سرونجی

غالب میں ہم نے پائی نہ سوز و نظیر میں
جو بات ہم نے دیکھی ہے دیوان میر میں

تجھ کو تلاش کرتے مری عمر کٹ گئی
ڈھونڈوں کہاں کہاں تجھے جم غفیر میں

ویسے تو زخم سینکڑوں دل پر لگے مگر
لگتا ہے اب کے زہر بھی شامل ہے تیر میں

رہتا ہے اک ہجوم مرے آس پاس کیوں
کچھ بات ہے ضرور اس ادنیٰ فقیر میں

سیفی خدا کا شکر مناؤ کہ اب تمہیں
پہچاننے لگے سبھی بر صغیر میں

عالم خورشید

رنگ برنگے خوابوں کے اسباب کہاں رکھتے ہیں ہم
اپنی آنکھوں میں کوئی مہتاب کہاں رکھتے ہیں ہم

یہ اس کی زرخیزی ہے کہ کھل جاتے ہیں پھول نئے
ورنہ اپنی مٹی کو شاداب کہاں رکھتے ہیں ہم

ہم جیسوں کی ناکامی پر کیوں حیرت ہے دنیا کو
ہر صورت میں جینے کے آداب کہاں رکھتے ہیں ہم

تیز ہوا کے ساتھ اڑے ہیں جو اوراق سنہرے تھے
اب قصے میں دلچسپی کا باب کہاں رکھتے ہیں ہم

محرومی نے خوابوں میں بھی ہجر کے کانٹے بوئے ہیں
اس کا پیکر مرمر سا کمخواب کہاں رکھتے ہیں ہم

صبح سویرے آنگن اپنا گونج اٹھے چہکاروں سے
توتا، مینا، بلبل یا سرخاب کہاں رکھتے ہیں ہم

تاریکی میں زندہ رہنا، ہم کو نہیں منظور
جگنو سا تابندہ رہنا، ہم کو نہیں منظور

ایک پل کو ہی چمکیں لیکن بجلی سی لہرائیں
راکھ تلے پائندہ رہنا، ہم کو نہیں منظور

نغمہ چھیڑیں، ساز بجائیں اپنے دل کا ہم
موسم کا سازندہ رہنا، ہم کو نہیں منظور

ہم آزاد پرندے، ساری دنیا اپنی ہے
خطے کا باشندہ رہنا ہم کو نہیں منظور

دست و گریباں حال سے ہیں ہم فردا روشن ہو
ماضی میں رخشندہ رہنا ہم کو نہیں منظور

دل کے وسیلے سے ہی ہم نے سب کچھ پایا ہے
عقل ترا کارندہ رہنا ہم کو نہیں منظور

حسن اثر

آپ کو کہنے کا بھی موقع ملا تو
سامنے والوں نے بھی آخر سنا تو

بات کہنے کی نہیں تھی کہہ گیا وہ
کام کا نکلا بڑا وہ سرپھرا تو

کس گلی میں سر وہ ٹکرائیں گے جاکر
خوش نہ آئے گی انھیں گھر کی فضا تو

تیزی رفتار سے جی ڈر رہا ہے
اب سڑک کے بیچ کوئی آگیا تو

پھر ہوائیں لطف کی چلنے لگی ہیں
اور یہ بادل بھی اگر ترسا گیا تو

ہاں بلندی پہ پہنچ کر سوچنا بھی
اس بلندی سے اگر میں گرپڑا تو

اے اثر اب مصلحت کوشی ہے بہتر
سر سے اوپر تک جو پانی آگیا تو

ہمارے بارے میں اک اک سے پوچھتا تھا وہ
تمام شہر و مضافات میں گیا تھا وہ

مکان اس کے لیے منتظر رہا برسوں
قصور اس کا تھا باہر نکل گیا تھا وہ

کسی نے اس کو جگایا نہیں نہ وہ جاگا
ہمکوں سے اپنے ہی کمرے میں سورہا تھا وہ

بہت اڑان کی عادت خلا میں تھی اس کو
مہیب وشت کے دلدل میں گر پڑا تھا وہ

اندر موہن کیف

پت جھڑ جیسا پتہ پتہ بکھرنے والا میں
لمحہ لمحہ وقت کے ہاتھوں مرنے والا میں

روشن دن میں اپنا سایہ لے کر ساتھ چلوں
تاریکی میں اپنے آپ سے ڈرنے والا میں

ایک گھڑا مٹی کا دریا اور طوفانی رات
دیکھنے والا کوئی نہیں پار اترنے والا میں

دل سے ان مل اک رشتہ ہے کیسے پار پڑے
اُلٹے سیدھے کام ہیں اس کے کرنے والا میں

بھول خطائیں ساری اس کی تہمت میرے نام
اب دنیا جو سمجھے صاف مکرنے والا میں

جن زخموں سے دل روشن تھا کیسی بھول ہوئی
ان زخموں کو اپنے ہاتھوں بھرنے والا میں

ریاض لطیف

لمس

نیند کی دھندلی خانقاہوں میں
ایک نقطہ بنی ہیں صدیاں تمام

اور لمحوں نے گھر بنایا ہے
اپنے جذبوں کی گیلی مٹی سے
اپنی شدت کے اجلی بالو سے
جس پہ پانی سمٹ کے آتا ہے
اور بناتا ہے لمس کے وہ بھنور
اور ڈھاتا ہے بوند میں وہ کھنڈر
جس کے سیال سنگ کی گونجیں
ہر بدن چیر کر گزرتی ہیں
اپنی تخریب میں سنورتی ہیں
اک تمدن میں ڈھل کے مرتی ہیں

اور ہر لمس ایک تند بھنور
جس کی گردش میں ہم جنم پا کر
پھیل کر، ہر جہت میں چھترا کر
تیرے بوسوں میں اب دھڑکتے ہیں
تیرے منظر کی راہ تکتے ہیں

اور یہاں بوند بوند کچھ بھی نہیں
ساری صدیاں بنی ہیں اک نقطہ
اور ہر لمس، ہر بھنور بے جان
کس کی سانسوں سے ہم کنار ہیں ہم؟
کس کی نظروں کے آرپار ہیں ہم؟
کس کی آنکھوں میں ہم بھٹکتے ہیں؟

پہلی تعمیر سائبر اسپیس میں[1]

سات بے گھر فلک ڈھل گئے کوکھ میں
اگلے پچھلے جنم سب ہوئے بے زباں
سارے اجداد پتھر پہ جمنے لگے
ریت، صحرا، کھنڈر، اب بھی ناپید سب
پھر بھی تعمیر ہوتے ہیں سات آسماں
ایسی شدت ہے اس کار تخلیق میں
خشت پر آبلے انگلیوں کے نشاں
جال ہے، جال ہے، بس حدوں کا بیاں
دیکھیے سکرین[2] پر اور کچھ بھی نہیں
سارے سسٹم[3] میں گڑبڑ ہے بے انتہا
کوکھ کی بے نشاں، بے صدا جست میں
کوئی کن کہہ کے پھر ماورا ہو گیا
ہم سمجھنے لگے فاصلوں کی زباں
ہم نے مینار بابل مکمل کیا

۱۔ CYBERSPACE
۲۔ SCREEN
۳۔ SYSTEM

نامکمل تعارف

اور جنموں سے ترے اندر چھپا تھا وہ بھی میں
اور ترے اظہار سے باہر اڑا تھا وہ بھی میں
اور تجھ سے تجھ تلک جو فاصلہ تھا وہ بھی میں
اور سارے فاصلوں میں راستہ تھا وہ بھی میں
اور تیری رات کی زد پر جلا تھا وہ بھی میں
اور ایوان فلک میں جو بجھا تھا وہ بھی میں
اور کھنڈر کے دل میں جو نغمہ سرا تھا وہ بھی میں
اور صفر کے گنبدوں میں گونجتا تھا وہ بھی میں
اور نفی کی خاک سے تنہا اٹھا تھا وہ بھی میں
اور نہ ہونے کی فضا میں ہو گیا تھا وہ بھی میں
اور تیرے رنگ سے بچھڑا ہوا تھا وہ بھی میں
اور بدن کے پار تجھ کو ڈھونڈتا تھا وہ بھی میں
اور سانسوں کے کناروں پر بسا تھا وہ بھی میں
اور عدم کے بادبانوں میں ہوا تھا وہ بھی میں
اور بکھری کہکشاں کا سلسلہ تھا وہ بھی میں
اور سیاروں کے محور سے اگا تھا وہ بھی میں
اور ازل کی روح سے پہلے بنا تھا وہ بھی میں
اور ابد کے اس طرف اک نقش پا تھا وہ بھی میں
اور خود اپنے سے پہلے آپڑا تھا وہ بھی میں
اور خود اپنے سے پہلے جا چکا تھا وہ بھی میں
---------- وہ بھی میں

ریاض لطیف

جمود-۱

وہی ہے سب کچھ
وہیں ہے سب کچھ
خلا کے گنبد کے جسم و جاں پر
تمام تر فاصلے وہی ہیں
وہی ہے سب کا مقام لیکن
خدا کی انگلی پکڑ نہیں پا رہا ہے آدم
چھتوں پہ سسٹین کی ابھی تک

SISTINE CHAPEL –I

جمود-۲

وہی تو ہے سب
وہیں تو ہے سب
وہی ہے صدیوں سے رات کا دودھ کالا کالا
خلا کے پستان میں ابھی تک
اور اپنی راتوں کے دودھ میں وہ
ازل ابد سب سمو گیا ہے
یگوں یگوں سے
انھیں زمینوں سے روز ابھر کر
ہمارے نتھنوں سے سانس کا لمس کھو گیا ہے
بدن میں ہونا نہ ہونا سب ایک ہو گیا ہے

جمود-۳

وہی ہے
روحوں کے گھونسلوں میں
سڑا ہوا گوشت
آگہی کا

اس پار

چلے آیئے
زبانوں کی سرحد کے اس پار
جہاں بس خموشی کا دریا
پگھلتا ہے اپنے میں تنہا
خود اپنے عدم ہی میں زندہ

زبانوں کی سرحد کے اس پار
کسی کی بھی آمد نہیں ہے
بس اک جال پیہم حدوں کا
مگر کوئی سرحد نہیں ہے

آمد

ہماری سانسوں کی جلوہ گہ میں
وہ سارے چہرے
یگوں کے پہرے
جو سات پانی کے پار جا کر
بسے ہوئے ہیں
پھر آج سیال سطح پر
جھلملا رہے ہیں
سراب کے آئینوں میں
ہونا نہ ہونا اپنا دکھا رہے ہیں
قریب آ کر ہمیں بہت دور
خود سے باہر بلا رہے ہیں

اور ہم یہ چہرے
رگوں کے ساحل پہ نقش جیسے
سجا چکے ہیں
جہاں ہمارا کوئی نہیں ہے
وہیں پہ پہلے سے آ چکے ہیں

راشد جمال فاروقی

میں بدن قفس کے پرے گیا

میں بدن قفس سے ذرا نکل کے
کھلی ہوا میں کبھی گیا
تو کھلا
کہ سب وہیں رہ گیا
نہ وہ دھڑکنیں نہ وہ الجھنیں
نہ وہ نیند، بھوک نہ پیاس تھی
وہاں سانس سانس اداس تھی
نہ تخیلات کے مسئلے
نہ سرور و کیف کے زمزمے
نہ وہ آبلے نہ تھکاوٹیں
کہ سفر بچھے تھے چہار سو
پہ نہ پاؤں تھے
نہ کہیں پہنچنے کی آرزو
میں بدن قفس سے پرے گیا
تو کھلی ہوا میں ذرا رہا
بڑا حبس تھا

نظم

آسماں سر پہ تاننے کے لیئے
پیڑ جب کم لگے تو پھر ہم نے
چند کھمبے زمیں پہ گاڑ دیے
اور تاروں کا جال پھیلا کر
مطمئن ہیں
کہ اب گرے گا نہیں

نظم

مستقبل کو گولی مارو
آج کا دن جوں توں کٹ جائے
اس کی کالی پرچھائیں سے
آنے والا دن بچ جائے
بچے جو اسکول گئے ہیں
خیر سے شام کو گھر لوٹ آئیں
اور ہم سب
رات کی باہنوں میں سو جائیں

احمد سہیل

وہ وقت آیا
جب میری کہانی کا سفاک منظر شروع ہوا
جلا دینے والا
مجھے اپنی آنکھوں میں جلا دینا چاہتا تھا
میرے سامنے ایک چیز ٹوٹ گئی
جو زندگی تھی
لڑکی افسردہ ہے
اسے قتل گاہ کی طرف لے جایا جا رہا ہے
جہاں میں سیاہ لباس میں کھڑا ہوں

مجھے تابوت میں بند کر کے لڑھکا دیا گیا
جس میں شیشے کی کرچیاں موجود تھیں

یہ کہانی
مجھے تابوت میں بند کرنے والے کی سمجھ میں
نہیں آئی

میں خواب دیکھتے دیکھتے مر گیا
مجھے بتایا گیا
زندگی کے تین منظر ہوتے ہیں
مگر میں تو ایک منظر دیکھ کر مر رہا ہوں
خوابوں میں ہم قربانیاں دیکھتے ہیں ---- اور
آنکھ کھلتے ہی بزدل ہو جاتے ہیں
تمہارا اسٹیج شو
میرے مرتے ہی ناکام ہو گیا ہے
اس کے دو کردار تمہارے خوابوں میں آئیں گے

مجھے وہ لڑکی پھر مل گئی
جس کے ہاتھ اب سیاہ ہو گئے ہیں
وہ مجھ سے میرا پتہ پوچھتی ہے
میں چہرہ بدل کر
اس کے ہاتھوں میں اپنا سایہ دے دیتا ہوں
سرکس کے مسخرے کی طرح
میرے منہ سے دھواں نکلتا ہے
لڑکی سڑک پر ناچنے لگتی ہے

سمندر کے کنارے میں اسے تلاش کرتا ہوں
مجھے اس شام کا انتظار ہے
جہاں سے ہم نے سفر شروع کیا
سمندر اور گلی کے درمیان
یہ میری کہانی کا عنوان ہے

شاہد میر

چڑیا اور چڑے کی کہانی

ہم نے سنی تھی بچپن میں
"چڑیا لائی مونگ کا دانا
چڑوا دانا چاول کا
دونوں نے پھر کھچڑی پکائی
ایک ساتھ مل مل کر کھائی
پروائی کی تال پہ جھومے
پیار کی کجری، ٹھمری گائی

روز سویرے وہ دونوں بھی
مونگ اور چاول کے دانے
حاصل کرنے چل دیتے ہیں
تپتی دھوپ کے لمحے جی کر
کچی کڑوی باتیں پی کر
خالی ہاتھ شکستہ دامن
بجھے بجھے سے لوٹ آتے ہیں
وہی کہانی دہراتے ہیں، سو جاتے ہیں

فاک لینڈ روڈ بمبئی

دھوپ شجر کا آخری پتا
جب کمھلا کر گر جاتا ہے
مسجد کے مینار سرمئی نور کی بارش کر دیتے ہیں
فلک بوس بلڈنگوں کے سائے میں پروردہ
مٹ میلی مرجھائی کوٹھری
جیون کے آثار بتانے لگتی ہے
مسجد کے مینار سے سیدھے سچے رستے کی آوازیں
ہر پل آتی رہتی ہیں
کوٹھریوں میں بسنے والا
بھوکی آنکھوں تپتی سانسوں کا یہ جنگل
ساری شب لہراتا ہے
نیند سے بہتر تو نماز ہے
یہ پیغام جب آتا ہے
جسموں کے اس جنگل کا
ہر پتا سو جاتا ہے

سخاوت شمیم

سراب

شدت شوق کے
تپتے ہوئے صحرا ہیں
ناقۂ حرص و ہوس
ان میں سراسیمہ ہے
تشنگی بڑھتی چلی جاتی ہے
دل کو

کھوئے ہوئے احساس کی یاد آتی ہے

ٹائم مشین

یہ حقیقت ہے کہ ہم ہیں
مگر اک دن ہم بھی
وقت کے اندھے سفر میں کہیں گم ہو جائیں گے
اور پھر تازہ حقیقت نظر آئے گی یہاں
اپنے ہونے سے گریزاں
اسی تاریک سفر میں کہیں گم ہو جائے گی
کیوں نہ ہم اپنی اجل سے پہلے
اک روش ایسی کچھ ایجاد کریں
وقت کا تلخ کنواں ہم ہی میں مدغم ہو جائے

پرکاش تیواری

وقت کے ساتھ کیسی نادانی
ایک ہی سانس زندگی فانی

کیسی ہے چشم غم کی حیرانی
صورت دوست بھی نہ پہچانی

دیکھ کر بھی مجھے نہ پہچانی
میری دنیا ہے کتنی دیوانی

اپنا دکھ درد کیا کہیں اس سے
میری حالت نہیں ہے انجانی

باغ ہستی میں شوق دل کے بغیر
زندگی کا وجود بے معنی

جان نکلے نہ ہی سکون ملے
قہر جاں ہے مری گراں جانی

سب فرشتے ہیں آسماں کے یہاں
کون جانے گا درد انسانی

آدمی ہو گیا ہے دیوانہ
رنگ لائی ہے گھر کی ویرانی

مت دلا خوف ظلمت شب کا
ہر مصیبت ہے جانی پہچانی

پی لیا جام عشق کا میں نے
ہو گئی دور ہر پریشانی

ہر نفس موت سا لگے پرکاش
کیا کہیں حال زخم پنہانی

امجد جاوید

میں ابھی کالج میں ہی تھا کہ یکایک ایک اعلان سنائی دیا- آدھے گھنٹے میں ں کرفیو نافذ کیا جا رہا ہے- تمام لوگ اپنے اپنے گھر جائیں- اعلان سنتا تھا ہ میں عجیب سی سراسیمگی پیدا ہو گئی-

کرفیو کا لگنا کوئی نئی بات نہیں تھی- مگر نہ جانے کیوں آج کے اعلان نے ، اوسان خطا کر دیئے- ایک تو گھر کالج سے بہت دور ہے' اور دوسرے ں کو پہنچنے کے لیے پولس والوں نے قلیل وقت دیا ہے- آج صبح سے ہی ، میں ایسی کسل مندی تھی کہ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا- طبیعت میں ایک طرح کا خوف اور بے چینی سی تھی- دن اداس بری بری آوازیں نکالتے گدھ آسمان میں منڈلا رہے تھے- بیوی کہہ رہی تھی کہ تمام رات گلی میں ں قدر رو رہے تھے کہ میں خوف کے مارے سو ہی نہیں سکی-

میں نے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا- "تم بیوقوفوں جیسی باتیں کرتی ہو- ونکتے رہے- اور تم پر خوف طاری ہو گیا-"

اس نے کہا- "چپ رہیے- آپ کو معلوم نہیں رات میں کتوں کا ئی اچھی بات نہیں-"

میں نے کہا- "یہ تمہارا وہم ہے اور کچھ نہیں- کم از کم میرے سامنے یار باتیں نہ کرو- ہماری شادی کو اتنے سال ہوئے مگر تم ابھی تک نہیں - انہیں دقیانوسی باتوں پر یقین رکھتی ہو-"

آج کرفیو کے اعلان نے مجھ میں ایک طرح کی جھرجھری سی پیدا کر دی- ب کالج کو نکل رہا تھا عجیب طرح کے مخمصے سے دوچار تھا- کبھی طبیعت نہ چھٹی لے لوں اور کبھی دل کہتا کہ جانا چاہئے- مجھے حیرت بھی ہوئی کہ ں نے ایسا سوچا کیوں- پھر یہ سوچ کر کالج چلا آیا کہ یہ محض وہم ہے-

اتنے قلیل وقت میں جوں توں کر کے گھر پہنچ گیا- بیوی کے چہرے پر ں اڑ رہی تھیں- میری راہ تکتے تکتے وہ نڈھال سی ہو گئی تھی- مجھے دیکھتے پٹ کر زار و قطار رونے لگی- میں پتھر کی مانند حواس باختہ کھڑا رہا- کچھ ں نہیں آ رہا تھا- پھر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا-

"ارے بھئی میں وقت سے پہلے ہی گھر پہنچ گیا ہوں- گھبرانے کی کوئی بات مگر وہ روتی ہی رہی- میں نے اسے لاکھ دلاسا دینے کی کوشش کی مگر اس کی ہچکیاں تھیں کہ برابر جاری تھیں- اچانک میری نظر بالکونی پر پڑی تو دیکھا کہ ایک گدھ مجھے خوفناک انداز سے گھورے جا رہا ہے- میں نے اسے اڑانے کی کوشش کی تو وہ ایک کریہہ آواز نکالتا ہوا اڑ گیا- لیکن وہ گھر کے اطراف ہی چکر لگاتا رہا- اس کی آوازیں میرے دل و دماغ میں عجیب سی سنسنی پیدا کر رہی تھیں-

دور سے پولیس کا اعلان سنائی دے رہا تھا- ایسا لگ رہا تھا کہ پولیس کی وین اور جیپ نے اپنی گشت تیز کر دی ہے- اعلان مسلسل ہو رہا تھا- "کوئی بھی گھر سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرے ورنہ گولی مار دی جائے گی-" بیوی نے جلد جلد تمام دروازے اور دریچے بند کر دیئے اور اپنے آپ سے بڑبڑاتی ہوئی بولی- "یہ دنگے فساد ہوئے' اف' اے اللہ تو انسانوں کو عقل دے" پھر با آواز بلند بولی "چلئے کھانا کھا لیجئے ؟ پتہ نہیں صبح جاتے وقت آپ نے ٹھیک سے کھایا بھی کہ نہیں-"

میں نے بے دلی سے جواب دیا- "نہیں ! کھانے کو جی نہیں چاہ رہا ہے-" اپنے اضطراب میں اس نے میرے جواب کو ان سنا کر دیا- اور کہنے لگی "دو منٹ انتظار کیجئے کھانا گرم کر کے لاتی ہوں-"

وہ کھانا گرم کرنے کے لیئے باورچی خانہ چلی گئی اور میں منہ ہاتھ دھونے باتھ روم چلا گیا- منہ ہاتھ دھوتے ہوئے محسوس ہو رہا تھا کہ باہر تمام سڑکیں پوری طرح سنسان ہو گئی ہیں- کہیں کوئی نہیں- صرف کبھی کبھی دور سے کہیں پولیس والوں کی جیپ اور وین کی آوازیں سنائی دیتیں یا پھر ماحول میں پھیلے سناٹوں کی سرگوشیاں-

باہر آیا تو میری نگاہ پھر اچانک گھر کی منڈیر پر پڑی- وہی گدھ- آنکھیں پھاڑے مجھے گھورے جا رہا تھا- میں نے طرح طرح سے اسے وہاں سے اڑانے کی کوشش کی مگر وہ قدرے اڑ کر پھر وہیں بیٹھ جاتا-

یکایک مجھے بچے کا خیال آیا- میں نے "نبیل ! نبیل !" کی آواز لگائی- بیوی سے پوچھا- "نبیل نظر نہیں آ رہا ہے- کہاں ہے بھئی-"

اس نے کہا "یہیں کہیں کھیل رہا ہوگا-"

"کہاں کھیل رہا ہے ؟ کتنی بار کہا ہے- تم ہو کہ بس- ارے تم کتنی

ہ وقوف ہو یار۔ دیکھتی نہیں ہو" بیوی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اسے کیا
لوم کہ حالات خراب ہیں۔ میں تو بار بار اسے اندر لاتی ہوں۔ بچہ ہے وہ۔
ب جگہ نہیں بیٹھتا۔"

میں متواتر "نبیل ! نبیل ! "کی آوازیں لگاتا رہا۔ میری بے چینی
ھنے لگی۔ ادھر ادھر پورا گھر تلاش کیا۔ کہیں نظر نہیں آیا۔ میرا غصہ بڑھنے
۔ جھلاتے ہوئے بیوی سے کہا۔ "ارے کہاں ہے بھئی۔"

"آپ بھی خوب ہیں۔ خواہ مخواہ اتنا پریشان ہو رہے ہیں۔ یہیں کہیں
گا۔"

"تم عورتوں کو مردوں کی باتیں پہلے تو سمجھ میں نہیں آتیں۔ اگر آتیں
کا ہیں تو غلط سمجھ میں آتی ہیں اور غلط کہی ہوئی بات کا ظاہر ہے جو اب بھی
ط ہوگا۔ ایک ہی رٹ لگا رکھی ہو۔ یہیں کہیں ہوگا یہیں کہیں ہوگا۔ جب کہ
ں گھر کا چپہ چپہ تلاش کر چکا ہوں۔ اور آپ اب تک "یہیں کہیں" میں ہیں۔

میرا غصہ بڑھتا ہوا دیکھ کر وہ بھی اب پریشان ہو رہی تھی۔ کھانا گرم کرنا
ھوڑ ادھر ادھر آوازیں لگاتی ہوئی بے چین ہو کر ڈھونڈنے لگی۔ کھڑکی کھول کر
۔ "نبیل ! نبیل !" مسلسل پکارے جا رہی تھی۔ مگر بچہ ہو تو نظر آئے۔
واب دے۔

میں نے بڑے ترش لہجے میں بیوی سے کہا۔ "لاکھ مرتبہ سمجھایا ہے
تمہیں۔ بچہ چھوٹا ہے۔ نگرانی رکھو۔ ایک تم ہو کہ ہر وقت لاپروائی کا ثبوت
یتی ہو۔ خدا معلوم بچے کو کہاں ڈال دیا تم نے" پریشانی کے عالم میں چھت پر گیا
کہ دور تک نظر دوڑاؤں "گدھ تھا کہ چھت کے کونے پر بیٹھا مسکی سی بری
آوازیں نکال رہا تھا۔ میں نے بھر اسے اڑانے کی کوشش کی۔ مگر اس کی وہی
ترکت۔ اڑ کر گھر کے اطراف ہی چکر لگاتا رہا۔

باہر پوری سڑک سنسان پڑی تھی۔ کوئی بھی نہیں۔ تمام دکانیں گھروں
کے در اور دریچے سب بند تھے۔ تھے تو بس وہ ایک کتے جن کے بھونکنے کی
آوازیں صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے سڑک پر دور تک نظریں
دوڑائیں۔ اچانک میری چیخ نکل گئی۔ نبیل سڑک پر اکیلا چلا جا رہا تھا۔ بیوی
بھاگتے بھاگتے ہوئے چھت پر آئی۔ وہ بھی چیخ پڑی۔

گدھ ہمارے اطراف ہی منڈلا رہا تھا۔ مجھے اب اس سے ڈر لگنے لگا تھا مگر
بیوی گدھ کے منڈلانے سے یکسر بے نیاز تھی۔

نبیل بے خوف جا رہا تھا۔ ہم دونوں اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔
میرے ہوش گم ہو رہے تھے۔ رہ رہ کر وہی باتیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔
کرفیو ! دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم۔ میری ہمت جواب دے رہی تھی۔ کچھ کہنا
چاہ رہا تھا مگر کہنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ حلق اور ہونٹ سوکھ کر لکڑی ہو گئے
تھے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دونوں ہاتھ منہ پر پھیرے۔ ہونٹوں پر
زبان پھیرتے ہوئے بادل ناخواستہ بیوی سے کہا۔ "جا کر نبیل کو لاتا ہوں۔" مگر
حقیقتاً اندر ہی اندر مجھ میں طرح طرح کے خیالات جنم لے رہے تھے۔ باہر جانا
موت کو دعوت دینا ہے۔ ادھر نبیل برابر ہم سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ بیوی نے
بھڑکتے ہوئے کہا۔

"ارے ! دیکھتے کیا ہو ؟ جا کر لاتے کیوں نہیں ؟"

میں نے کہا۔ "دیکھتی نہیں دور گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ اور تم
ہو کہ جا کر لانے کی بات کر رہی ہو۔ باہر جانا اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالنا
ہے۔"

وہ مجھے نفرت سے گھورنے لگی۔

میں نے کہا "اس طرح کیا گھور رہی ہو۔"

"بس ! آپ خاموش رہیے۔ میں خود جاتی ہوں۔" اس کا لہجہ ترش
تھا۔

میں نے کہا۔ "زبان بہت لمبی ہو رہی ہے تمہاری۔"

اس نے مجھے حقارت آمیز نظروں سے دیکھا اور تیز تیز قدموں سے نیچے
اترنے لگی۔

میں نے کہا۔ "کہاں جا رہی ہو؟"

"کہہ دیا نا۔ خاموش رہیے" اس کا لہجہ نفرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ "ارے
سنتی کیوں نہیں ؟ کہاں جا رہی ہو ؟ "اس نے کہا۔ "اللہ واسطے چپ
رہیے۔ بہت ہو چکا۔ پھر میں اپنے غصہ پر قابو نہ رکھ سکا اور اسے میں نے ایک
زوردار طمانچہ مارا۔ وہ مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرح گھورنے لگی جیسے
اس نے بھی مجھے ایک بھرپور طمانچہ رسید کیا ہو۔ مگر میرے قدم بچے کو لانے کے
لیے اٹھنے کو تیار پھر بھی نہ تھے۔

"پاگل تو نہیں ہو۔" میں نے غصہ سے کہا۔ "باہر کرفیو ہے۔ باہر جانا
اپنے آپ کو جوکھم میں ڈالنا ہے۔ اللہ محافظ ہے۔ صبر سے کام لو۔"

اس نے کہا۔ "جانتی ہوں اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ مگر یوں
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے کو صبر نہیں کہتے۔"

اچانک دور کہیں پولیس کا کچھ اعلان سنائی دینے لگا۔ آواز صاف نہ تھی
لیکن لگ رہا تھا کہ پولیس کی جیپ ہماری ہی طرف آ رہی ہے۔

"خاموش !" جھڑکتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔ "اللہ واسطے خاموش
ہو جاؤ۔ کچھ ضروری اعلان ہو رہا ہے۔" مگر اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ اب
میری کوئی بات نہیں سنے گی۔ وہ چیخ کر بولی۔

"پولیس پولیس چھوڑیے۔ آپ جائیے یا پھر مجھے جانے دیجیے۔"

پولیس کا اعلان اب کچھ صاف سنائی دے رہا تھا۔ "ایک ضروری سوچنا
ایک چھوٹا بچہ سڑک پر ملا ہے۔ نام نہیں بتاتا۔ جس کسی کا ہو باہر آ کر لے
لیں۔"

پڑوس کے لوگ نیم وا دریچوں کو کھول کر باہر جھانک رہے تھے۔ مجھے ایسا
لگ رہا تھا کہ وہ باہر نہیں بلکہ حقارت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔
میرے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ اور میں اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا۔ پولیس کا

اعلان برابر جاری تھا۔

پولیس کی جیپ گھر کے قریب آنے لگی۔ جب گھر قریب آیا تو نبیل نے گھر کی طرف دیکھ کر کچھ اشارہ کیا اور پھر وہ ممی ممی کہہ کر زار و قطار رونے لگا۔

وہ مجھے باہر جانے کو کہہ رہی تھی۔ مگر میں ساکت رہا۔

اس نے اصرار کیا "جاتے کیوں نہیں ؟" میں نے "خاموش" کہہ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ میرے ہاتھ کو جھٹک کر چیخ پڑی اور بڑی بے تابی سے بچے کو لینے باہر چلی گئی۔

بچے کو گود میں لے کر وہ آپے سے باہر بے اختیار چومنے لگی۔ باہر پولیس والے پولیس کی زبان میں بک بک کرتے ہوئے چلے گئے۔

میں چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بچے کو لینے آگے بڑھا تو اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میرا اس سے اور بچے سے کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ میں ساکت اپنی جگہ کھڑا رہا۔

"گدھ اب بھی منڈیر پر بیٹھا تھا۔ میں نے اسے لاکھ اڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ◢◢

غزل

صابر زاہد

بس اک آنچل ہے سر پہ آسماں نہیں
عجب ساعت ہے کوئی درمیاں نہیں

نفس میں سانپ وحشت ناک منظر
زمرد لب قریب جسم و جاں نہیں

چراغ دود ہے روشن لہو میں
اجالا دودھیا سا ہے دھواں نہیں

ترازو ہو گیا ہے تیر دل میں
اگر دیکھو تو ہاتھوں میں کماں نہیں

اچانک وہ برہنہ ہو گئی تھی
میں بے قبضہ تھا یہ میرا بیاں نہیں

ہماری ہڈیوں میں سرخ لاوا
جو بہہ جائے یہ وہ آتش فشاں نہیں

لہو میں چاند گھل جانے سے پہلے
تذبذب کیا ہے بولو کچھ تو ہاں نہیں

غزل کے شعر طاؤسی پروں پر
ہمارے درد کا سایہ کہاں نہیں

سخن اپنا ہے روح عصر زاہد
خدا رکھے متاع رائیگاں نہیں

شاہد کلیم

سراغ

چیخ ابھر کر
ڈوب گئی
بہتے خون کے دھارے تھے
پُر اسرار فضا
گلیوں میں
بازاروں میں
دل میں ہیبت،
ہونٹوں پر خاموشی --- لیکن
آنکھیں سب کی
ڈھونڈ رہی تھیں
قاتل کو
شام کی خبروں میں

چڑیا، بچہ اور میں

آنگن میں
اک چڑیا روز اترتی تھی
میرا بچہ بے خوفی سے
اس کو ہاتھ میں لیتا
کھیلتا اس سے پہروں پہروں
اک دن
میں نے سوچا میں بھی
اس کو پکڑوں
اس سے کھیلوں، دل بہلاؤں

میں بس اس کے پاس گیا ہی تھا
میرے ہاتھ بڑھانے سے پہلے ہی
پھر سے اڑ گئی وہ

##

کبھی زنجیر بجتی ہے کبھی در بولتا ہے
مجھے کیا نیند آئے رات بھر گھر بولتا ہے

میں اس کی بات سنتا ہوں سمجھتا کچھ نہیں ہوں
نہ جانے کیا ہر اک لمحہ سمندر بولتا ہے

مرے کانوں میں آوازیں مسلسل گونجتی ہیں
یہاں کوئی نہیں--- تو کون؟ پتھر بولتا ہے

سمجھنا ہے تو سمجھو تم زبان خامشی کو
اشاروں میں ہی سب کچھ میرا پیکر بولتا ہے

نہ جانے کس بلا کے خوف سے سب لوگ چپ ہیں
یہاں سناٹا ہی ہر وقت گھر گھر بولتا ہے

سکوں تو ہے بہت آبادیوں سے دور شاہد
مگر رہ رہ کے جو پر ہول منظر بولتا ہے

رد و قبول

تقی حسین خسرو

اثبات اور انکار' قبولیت اور استرداد' تعلق اور بے تعلقی' محبت اور نفرت' روشنی اور تاریکی' زندگی اور موت' انھیں دو انتہاؤں کے بیچ اکبر زندہ تھا اور یہ کوئی اس کا کارنامہ بھی نہیں تھا کہ سب ہی جو اس عالم رنگ و بو میں سانس لیتے ہیں' ان دو انتہاؤں کے بیچ زندہ رہتے ہیں۔ ایک ایسی کیفیت جس میں کبھی ایک رنگ غالب آنے لگتا ہے اور کبھی دوسرا۔ اور یہ دھوپ' چھاؤں اور یہ ثنویت شاید ضروری بھی ہے۔ مگر پچھلے کچھ دنوں سے......

اکبر کو ایک بڑے میاں' ایک بزرگ' بہت محترم' شہر کے جو لوگ جانتے تھے' ان کا احترام کرتے تھے' اکثر یاد آتے ہیں اور وہ یاد آتے ہیں تو اپنی محرومی اپنی نارسائی' اپنی عدم قبولیت' اپنا مسترد کردیا جانا یاد آتا ہے۔ اور پھر یہ ڈوبنے والی کیفیت' یہ کشمکش' یہ دونیم احساس ختم ہونے لگتا ہے' جیسے کوئی داستانی اژدہا' اپنے داستانی سانس کے زور پر اسے اپنی جانب کھینچنے لگتا ہے۔ فاصلہ کم ہوتا جاتا ہے۔ درخت' جھاڑیاں' پرند' دھول' راہ کے پتھر' جو کچھ بھی اس سے متعلق ہے' اس کے ساتھ کھنچتا چلا جاتا ہے اور پھر وہی تاریکی اور زہر جس کا حصہ بن جانا محض کچھ وقت کی بات ہے۔ وہ ثنویت جو زندگی بھر جان کا روگ بنی رہی ہے' ختم ہو جاتی ہے اور یہ یونہی ختم نہیں ہوتی ہے گویا دار پر کھینچ دیا جاتا ہے اسے' ایک بار نہیں بار بار اور پھر اکبر دو انتہاؤں میں سے ایک کا حصہ بن جاتا ہے' ناگزیر حصہ' جیسے کانٹا پھول کا' ایک صحرا کا۔ پیپ اور خون کے سڑے زخم کا۔

استرداد کی کہانی بہت پرانی ہے۔ بلکہ کہانی شروع ہی استرداد سے ہوئی تھی۔ استرداد کے اظہار ہی کے لیے کہانی کہی گئی' کہانی کی بابت' کہانی کے بہاؤ' کہانی کی معنویت کے لیے استرداد کا اظہار ناگزیر ہے۔ پھول ایک کی جانب پھینکا جاتا ہے' دوکی جانب پھینکنے سے پھول سے خوشبو غائب ہو جاتی ہے۔ اور نذرانہ یا نذر دو میں سے ایک کی قبول کی جاتی ہے۔ اگر دونوں کی قبول ہو جائے تو پھر نذرانہ' نذرانہ یا نذر' نذر نہ رہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ کیوں ہوا تھا۔ کیا ایک بار پھر وہ "وہی تھا" وہی جسے مسترد کردیا گیا تھا۔ بس یہاں تک پہنچ کر وہ جیسے دو انتہاؤں میں سے ایک کے ساتھ جا ملتا اور پھر وہی انتہائی کیفیت مستحکم ہونے لگتی اور......

جولائی ۱۹۹۷ء / ۲۰۸

مگر پھر اکبر اب تک زندہ کیسے تھا؟

دراصل وقت بہت گزر چکا تھا۔ اور وقت کا دوران ساحل سمندر پر دور تک آکے لوٹتی لہروں کی طرح جہاں بہت کچھ مٹاتا ہے اور اپنے ساتھ سمیٹ کے لے جاتا ہے۔ وہاں کچھ پھینک بھی جاتا ہے۔ مٹانے اور ساتھ بہا کے لے جانے کے لیے ریت کے گھروندے' ریت پر بنے نقش اور کبھی کچھ غفلت کا شکار ـــــ جیتے جاگتے انسانی جسم' آرزوئیں' ارادے' خواہشات پسند کی جاتی ہیں اور پھینک جانے کے لیے' سال خوردہ ٹوٹی کشتیاں' گم کردہ راہ جہاز جن کے زنگ کھائے بے اندازہ وزنی ڈھانچے جو پھر ایک مدت تک زبان حال سے رکے بغیر' بہت موثر لب و لہجے میں' تحرک اور عدم تحرک کا فلسفہ بیان کرتے ہیں یا پھر اکثر مچھلیوں کے اور کبھی انسانوں کے مردہ جسم۔ گھروندے اور نقش' ایک مدت ہوئی مٹ چکے تھے اور وہ خود' تمام غفلت کے باوجود' لوٹ کر جاتی لہروں کے ساتھ بہہ جانے سے بچ گیا تھا۔ ایک بار پھر مسترد کردیا گیا تھا۔ وقت کے ساحل پر اپنی ہی طرح مسترد کردہ اشیاء کا بلا شرکت غیرے ناظر تھا۔ جب تک نقش بنتے اور مٹتے رہے تھے' یوں کہنا چاہیے کہ مٹتے اور بنتے رہے تھے تو آرزو بھی زندہ تھی یا یوں تھا کہ جب تک سینے میں آرزو تھی' نقش ہزار بار مٹ کے بھی بن جاتے تھے اور اب شاید یوں تھا کہ نقش اور ریت کے گھروندوں کے ساتھ خود آرزو بھی بہہ گئی تھی۔

اب اس کا ذہن اس گاڑی کی طرح تھا جو پکنک سے واپسی میں' سیدھا راستہ چھوڑ کر (وہ موج میں آتا تو پہلے سے باندھ کر رکھنے والی نصیحت' راہ راست ہو گرچہ دور راست' بھول جاتا) کچے میں اترنے سے دلدل میں پھنس گئی تھی' جس کے باقی گیئر بے کار ہو گئے تھے۔ صرف بیک گیئر کام کر رہا تھا' چنانچہ اب اس کے لیے آگے' پیچھے نہیں تھا۔ بس پیچھے ہی پیچھے تھا۔ اور یہ ایک ایسے آئینے کا ذکر' جس نے عرصہ ہوا اپنی آب کھو دی تھی۔

وہ دلی دروازے کے قریب مکان' جس کا دروازہ' عام دروازوں سے بڑا ہونے کے باوجود جب تک دروازے تک جانے والے راستے کی سیدھ میں نہ پہنچیں نظر نہ آتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ جگہ گنجان آباد تھی۔ وہ جگہ کچھ ایسی تھی کہ وہاں گنجان آبادی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ مسجد بلڈنگ والے بڑے

سہ راہے سے ایک سڑک گویا ٹوٹ کر عمودی سمت میں آتی تھی' یہ مین روڈ' جو دائیں مڑکر' اپنی خمیدہ کمر سیدھی کرتی' آگے پل کے متوازی چلتی۔ بیچ میں دکانوں کی قطار تھی' جن کی پشت اس سڑک کی جانب تھی۔ وہ پکی سڑک جو اس وقت خود مین روڈ میں تبدیل ہو جاتی جب ٹریفک ون وے کر دیا جاتا۔ مگر کچھ ایسی لمبی سڑک بھی نہیں تھی وہ۔ لگتا تھا بس کچھ دور چل کر ہی اس کا سانس پھول گیا تھا۔ چنانچہ دلی دروازے تک پہنچ کر اس سے نکلتی تو اپنے آگے موجود افقی سڑک سے جا ملتی۔ اس طرح گویا خود کو پتھر کی خوبصورت رکاوٹ پھاند کر موسیٰ ندی کے پاٹ میں جا گرنے سے بچا لیتی۔ اس مختصری سڑک میں اس کی دلچسپی کی وجہ سڑکوں اور راستوں کا اس کے لیئے بے انتہا پرکشش ہونے کے علاوہ شاید اس سڑک کا تاریخی محل وقوع بھی تھا کہ اس پر شہر کی' شہر پناہ کا دلی دروازہ ایستادہ تھا' خود شہر پناہ غائب تھی۔ ایک وجہ اور بھی ہو سکتی تھی کہ بائیں جانب مسلم جنگ پل کی سمت میں' پاس ہی شہر کا سب سے بڑا سرکاری زچگی خانہ تھا۔ جہاں اس کی نال گڑی تھی۔ مگر سب سے بڑی وجہ اس مکان کا مختصر قیام تھا۔ وہ کسی طرح اس کا مکان نہیں تھا۔ مگر وہاں رہنے پر وہ مجبور تھا۔ تاریخ کا جبر—— اس مکان اور اس سڑک کے بیچ جو خالی جگہ تھی' اس میں چھوٹے بڑے کیلے' لوہے کی پتیاں جن سے لکڑی کی پیٹیوں کو کسنے کا کام لیا جاتا' پرال کی گھاس اور خالی پیٹیوں کے انبار بکھرے ہوتے اور فضا میں کچی لکڑی کی بو پھیلی ہوتی۔ لکڑی کی پیٹیاں بنانے والوں نے وہاں اپنا عارضی سا کاروبار سجا رکھا تھا۔ آتے جاتے زرد زرد گھاس' جو پیکنگ کے کام آتی' کا کوئی تنکا لباس میں کبھی سر کے بالوں میں الجھ کر ساتھ چلا آتا۔ چھوٹے بڑے کیلے گھسے ہوئے جوتوں کے تلووں میں سوراخ کرنے کی کوشش کرتے اور لوہے کی پتیاں' پھندوں کی شکل میں پاؤں میں الجھ الجھ کر گرانا چاہتیں' مصروف کار ہتھوڑا' بلکہ ہتھوڑے۔ ٹھوکتے پیٹتے کی کان کے پردے پھاڑتی آوازیں' سڑک سے گزرتا ٹریفک—— بے آب آئینے کا زنگار کچھ اور کثیف ہو جاتا ہے۔ دروازے کی دوسری طرف بقا کی جنگ زیادہ شدید ہے۔ گھر کی چار دیواری نے گویا اس جنگ کو ایک نسبتاً مختصر رقبے میں مرتکز کر دیا ہے۔ اس گودام نما گھر میں دو خاندان آباد ہیں۔ ایک بیوہ اور دو بچوں پر مشتمل خاندان نسبتاً بہتر صورت حال سے دوچار ہے۔ اس میں ایک شیروانی میں ملبوس' نک سک سے ہر طرح مہذب' ادھیڑ عمر صاحب بہ پابندی وقت شام کو قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ دوسرے خاندان میں بچے زیادہ ہیں' چھوٹے چھوٹے بچے' وہ ہائی اسکول کا طالب علم ہے۔ وہ گھر سے نکل رہا ہوتا ہے تو اس کی نظر بلاناغہ اس بچے پر پڑتی ہے جو صحن میں دیوار کے ساتھ کھڑا رو رہا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دیوار تھام رکھی ہے۔ ڈھائی تین برس کا ٹھٹھرا ہوا بچہ جس کا کرتہ پیچھے سے اٹھا کر اڑس دیا گیا ہے۔ اس کی نکلی ہوئی بادی توند' لیلبی نکلی جلد' ٹانگیں جو اس کی اپنی ہی غلاظت میں سنی ہوئی ہیں' وہ نہیں معلوم کب سے کھڑا ہے' اس کی طرف گردن موڑ کر دیکھتا ہے گویا فریاد کرتا ہے' بچہ جو اس کا بھانجا ہے' بقا کی جنگ ہار چکا ہے۔ وہ جواباً اسے حقارت سے دیکھتا' اس کے پاس سے تیزی سے گزر جاتا ہے۔ بچہ کچھ دنوں کے بعد مر جاتا ہے۔ مگر وہ دیوار کے ساتھ کھڑا بچہ آج بھی اسی طرح موجود ہے' اس کی نکلی ہوئی بادی توند' لیلبی نکلی جلد' ٹانگیں جو اس کی اپنی ہی غلاظت میں سنی ہیں' بچہ جس کے حصے کی روٹی اس نے کھائی ہے اور اسے حقارت سے دیکھتا اس کے پاس سے گزر گیا ہے۔ تو یہ استرداد اور استرداد کا جواز ہے کہ کوئی بھی چیز کوئی بھی عمل دنیا میں بے جواز نہیں ہوتا۔ پھر وہی دو انتہاؤں میں سے ایک کے ساتھ ناگزیر ادغام اور مستحکم ہوتی وہی انتہائی کیفیت۔

یہ اور ایسے بہت سے واقعات جو ابھی وقوع پذیر بھی نہیں ہوئے اس کے ذہن میں عود کرتے ہیں جو ان بزرگ کے اس کے ساتھ سلوک کا جواز مہیا کرتے ہیں۔

شاکر' اس کے قریبی عزیز تھے۔ کچھ تھوڑی سی ذہنی یگانگت بھی تھی ان کے ساتھ۔ عمر میں چونکہ بڑے تھے اور اس کے مقابلے میں ذہین بھی تو ان کی دوستی' ان کی محبت' ان کا ساتھ' اس میں ہم عمروں میں اپنے اہم ہونے کا احساس پیدا کرتا۔ وہ خود بھی دلجوئی کرتے' اس کے ذہنی رجحان کے پیش نظر گھڑ گھڑ کر قصے کہانیاں سناتے' آرسین لوپن اور شرلاک ہومز کی کہانیاں' وہ رومان کے حدود میں بہ اعتبار عمر داخل ہو چکے تھے اور وہ اگرچہ ابھی دور تھا' اس معاملے میں ان کا رازدار بن کر خوشی ہوتی تھی۔ ان کے رشتے کے چچا' وہ ان کی ماں طرف سے ان کا عزیز تھا۔ ان کی لڑکی تھی' جمال' مردانہ نام کے باوجود واقعی وہ اسم بامسمیٰ تھی۔ مگر خود شاکر اور ان کے رشتے کے چچا کے گھر کے ماحول میں قدامت پسند فکر کچھ اتنی زیادہ حاوی تھی اور پھر مواقع بھی کچھ اتنے کم ہوتے تھے کہ بات کبھی محض خیالی خوش وقتی سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ اسے یاد نہیں کہ کبھی شاکر نے کسی اور ایڈونچر کا ذکر تو دور رہا' جمال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے یا پھر اسے چھو لینے کا ذکر بھی اس سے کیا ہو۔ ہاں البتہ شاکر نے ایک دفعہ ایک عجیب بات اس سے کہی تھی جس میں اس نے اپنی نادانی اور دیوانگی کے باوجود ایک عجیب مزہ محسوس کیا تھا۔ بعد میں جب خود اس کی اپنی مسیں بھیگنے لگی تھیں تو کسی تقریب میں شاکر نے شاید جمال کو اس سے لگاوٹ سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا تو اس سے کہا تھا' تم میں وہ اس لیئے دلچسپی لیتی ہے کہ وہ جانتی ہے تم مجھ سے قریب ہو۔" بعد میں جمال کی شادی ہو گئی تھی اور شاکر نے کوئی احتجاج نہیں کیا تھا۔ وہ ان کی جگہ ہوتا تو سخت احتجاج کرتا۔ جمال ایسی ہی لڑکی تھی کہ اس کے لیئے پرزور احتجاج کیا جا سکتا تھا۔

شاکر ان لوگوں میں سے تھے جن کی دلچسپیاں چاروں سمتوں میں برابر ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ زندگی میں کم ہی ٹھوکر کھاتے ہیں۔ کسی سمت میں چل پڑیں' ان کا توازن کم ہی بگڑتا ہے' کم ہی کوئی چوٹ' کوئی کمی یا کوئی نامساعد صورت حال ان کا بال بھی بیکا کر سکتی ہے' اصل واقعے کی طرف آنے سے پہلے' جس کے بارے میں اب اس کا خیال ہے کہ وہ شاکر کے ساتھ نہ ہوتا تو شاید وہ پیش ہی نہ آتا' اپنا شاکر کے ساتھ گزرا ہوا ایک اور تجربہ بیان کرنا چاہے گا۔ اس سے مزید

ایزاد ہوگا کہ وہ کیسی محفوظ و مامون طبیعت کے مالک تھے' کیسے واقعات اور حادثات کا اگر اثباتی نہیں تو بے ضرر رخ ضرور ان کی جانب ہوتا۔

گھر سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر ایک سستا سینما گھر تھا۔ بیچ میں بہت بڑا میدان پڑتا تھا۔ ہری ہری گھاس سے پٹا ہوا میدان' جس میں جگہ جگہ اعلیٰ کے دیو قامت درخت گویا ایسے سنتری تھے جو چوبیس گھنٹے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کرتے تھے۔ میدان میں سے جائیں تو فاصلہ آدھا رہ جاتا تھا۔ یوں بھی وہ میدان ان کی جولانی طبع کی آماجگاہ تھا۔ اسی سبزہ زار میں شام خنکی کے دوران میں شاکر کا براق ذہن اونچی اونچی اڑانیں بھرتا۔ وہ بات سے بات نکالتے اور قصے میں سے قصہ اور شام ان کے سروں کے اوپر اوپر سے اپنے ٹھکانوں کو لوٹتے جوق در جوق رنگ برنگے پرندوں کے ساتھ ساتھ پرواز کرتی آناً فاناً افق پار جاکر انھیں کی طرح کہیں چھپ جاتی۔ ان دنوں فلم "ایزاز" کی بہت دھوم تھی۔ شاکر نے کچھ نہیں تو ہزار بار اس کی کہانی اسے سنائی ہوگی۔ وہ فلم کے مختلف مناظر اس سے بیان کرتے نہ تھکتے تھے۔ اس نے فلم نہیں دیکھی تھی۔ شاید دوسرے یا تیسرے پھیرے میں وہاں لگی تھی۔ اس نے اور شاکر نے پھر سیکنڈ شو میں دیکھی تھی۔ بہت مزہ آیا تھا' مگر پھر آدھی رات کو واپسی مشکل ہوگئی تھی۔ میدان میں سے آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ روشنی کی عدم موجودگی میں اس میں جگہ جگہ ایستادہ دیو قامت سنتری' اس بات کی اجازت نہ دے سکتے تھے۔ عام راستہ بھی کوئی ایسا چلتا ہوا نہ تھا۔ ساتھ ساتھ' تیز تیز چلتے ہوئے وہاں پہنچ کر' وہ جیسے ایک دوسرے سے جڑ گئے تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ بڑی سختی سے پکڑ رکھا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا موڑ تھا' راستہ تنگ تھا کہ دونوں طرف پرانی بوسیدہ قبریں تھیں۔ دائیں طرف' ذرا سا اندر کی طرف ایک چھوٹی سی غیر آباد مسجد تھی' جو جنوں کی مسجد کے نام سے مشہور تھی۔ بجلی کے کھمبے کی زرد زرد روشنی' ان دنوں بجلی کے کھمبے کی روشنی زرد ہوتی تھی' میں انھوں نے دیکھا کہ راستے کے بیچ میں کوئی گرا ہوا تھا۔ منہ سے کسی چیز نے بہہ کر' جو اسے سرخ سرخ خون معلوم ہوتی تھی' زمین پر دھبا سا بنا دیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے برابر سے گزر کر آئے تھے۔ پھر دو تین تک وہ بخار میں پھنکتا رہا تھا۔ شاکر کا حال بھی بیگانہ ہوا تھا۔ دراصل انھیں شاید یاد تھا کہ وہاں قریب ہی میدان میں سیندھی خانہ تھا۔

شاکر ہی کی معیت میں اس نے مسجد میں نماز پڑھی تھی۔ شاکر ہی کے توجہ دلانے پر ان بزرگ کی جانب وہ متوجہ ہوا تھا۔ دیکھا تو خیال ہوا کہ اس سے پہلے انھیں نہیں معلوم کتنی بار دیکھ چکا تھا۔ شہر میں راستوں پر' سڑکوں پر اور نہیں معلوم کہاں کہاں۔ جو جانتے تھے ان کا احترام کرتے۔ تمتماتا' سرخ و سفید چہرہ' براق سفید داڑھی' سرخ ترکی ٹوپی' جس کا پھندنا مسلسل جھولتا ہوا' شیروانی کے بٹن اوپر تک بند' آڑھا پاجامہ' پتلے پتلے ہونٹ جیسے کبھی پان کھایا ہو اور انداز میں بے پناہ بے نیازی اور آنکھوں میں ایسی ہی روشنی' وہ بھاری بھرکم بھی نہ تھے۔ مسجد کے صحن میں ایک جانب اکیلے بیٹھے تھے۔ شاکر کی تجویز پر وہ انکار نہ کر سکا تھا' اگرچہ ان باتوں کا اسے تجربہ نہ تھا۔ آداب سے ضرور واقف تھا۔ شیروانی کی دائیں جیب سے جو نوٹ ہاتھ لگے' دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر رکھے' وہ ڈانواں ڈول ہو گیا تھا' مگر پھر جیسے لمحہ بھر میں اس کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا۔ بزرگ نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا' کہا "اللہ دیتا ہے" وہ شاکر کی طرف متوجہ تھے' کہا "ہاں لاؤ لاؤ۔" وہ مسترد کر دیا گیا تھا اور پھر دو التجاؤں میں سے ایک کے ساتھ اس کا ناگزیر انجام۔۔۔ مگر نہیں' اب جب کہ وہ دوبارہ سفر طے کرکے یہاں تک پہنچا تھا تو جیسے کھوئے ہوئے اپنے آپ کو پالیا تھا۔ دراصل راستے میں ملنے والے اس بچے نے خود مسترد ہو کر' اسی کے مسترد کردیے جانے کا جواز مہیا کردیا تھا' اس طرح استرداد محض سے بچالیا تھا اسے۔ مگر اب وہی بچہ۔ جو دیوار کے ساتھ کھڑا رو رہا ہے' جس نے دونوں ہاتھوں سے دیوار تھام رکھی ہے' ڈھائی تین برس کا ٹھٹھرا ہوا بچہ' جس کا کرتہ پیچھے سے اٹھا کر اڑس دیا گیا ہے۔ اس کی نکلی ہوئی باہر توند' پلپلی کھنچی ہوئی جلد' ٹانگیں جو اس کی اپنی ہی غلاظت میں سنی ہیں' وہ نہیں معلوم کب سے کھڑا ہے۔ اس کی طرف گردن موڑ کر دیکھتا ہے' گویا فریاد کرتا ہے۔ بچہ جو بقا کی جنگ ہار چکا ہے' بچہ جس کے حصے کی روٹی اس نے کھائی ہے اور جو اپنا حقارت سے اسے دیکھتا اس کے پاس سے تیزی سے گزر گیا ہے' بچہ جو اس کا اپنا بچہ ہے ——— ماضی کی کتاب کے بے رحم صفحات سے اٹھ کر اس کے سامنے آگیا ہے' اس کے مسلسل رونے کی آواز اب زیادہ تیزی سے اس کے کانوں میں اترنے لگی ہے۔ ▲▲

شمیم قاسمی

اپنی اوقات بتا دیتے ہیں
دن کو جب رات بتا دیتے ہیں

صرف آنکھوں سے ملا کر آنکھیں
اس کی ہم ذات بتا دیتے ہیں

با وضو بیٹھو بساط دل پر
ہوگے کب مات بتا دیتے ہیں

دانت ہاتھی کے وہ رکھتے ہیں مگر
شیر کے دانت بتادیتے ہیں

کیا سبب ہے مری بربادی کا
بس ترا ساتھ بتادیتے ہیں

ہم جو لوٹیں گے سمندر پی کر
ہوگی برسات بتادیتے ہیں

پھر ہجر کے زہراب سے
ہم ہوگئے سیراب سے

فرہنگ شعری ہے نئی
کیا کام ہے اعراب سے

بازار میں بکنے لگے
چہرے جو تھے زرتاب سے

تو سگ گزیدہ تو نہیں
کیوں ڈر رہا ہے آب سے

دشمن کے نرغے میں رہو
بہتر ہے یہ احباب سے

ہیں مرے یار بھی کوڑا کرکٹ
اپنے اشعار بھی کوڑا کرکٹ

اب کہاں ہجر میں رونا دھونا
اس کا اظہار بھی کوڑا کرکٹ

نہیں مضراب سے بجتا یعنی
وصل کا تار بھی کوڑا کرکٹ

اتنے انکار کیے ہیں اس نے
اس کا اقرار بھی کوڑا کرکٹ

اتنا مہنگا ہے عرب کا پانی
اب مری کار بھی کوڑا کرکٹ

شکیل اعظمی

رکے نہیں کہ ہمیں شوق خود نمائی تھا
وگرنہ اب تو مقام شکستہ پائی تھا

بچھڑنے والا مہکتا ہے اب بھی کمرے میں
جو ہاتھ چھوٹ گیا کس قدر حنائی تھا

بھلا ہوا کہ تجھے دیکھ آئے ہم ورنہ
بہت دنوں سے ہمیں دعویٰ خدائی تھا

زمیں کی ناف تو چیری خرد کے بندوں نے
پھر اس کے بعد وہی رنج نارسائی تھا

ترے خیال کی اک لہر دل سے ٹکرائی
پھر اس کے بعد وہی جبس انتہائی تھا

شکیل خوب ہوا دھر لیئے گئے ہم بھی
ہمارے سر پہ بھی الزام پارسائی تھا

سفر ہی تھا نہ سفر زاد بے ارادہ تھے
زمیں کی راہ میں ہم لوگ کتنے سادہ تھے

وہی چراغ بجھا جس کی لو اٹھان پہ تھی
وہی درخت گرا جس پہ پھل زیادہ تھے

کوئی چراغ نہ تھا راہ نما بھی تھا نہ کہیں
سفر کا شوق تھا سب لوگ پا پیادہ تھے

حسب نسب کو کہیں راستے میں چھوڑ آئیں
یہ بھول جائیں کبھی ہم بھی خان زادہ تھے

وہ دن کہاں گئے جو ہم پہ خرچ ہوتے تھے
وہ لوگ کیا ہوئے ہم جن کا استفادہ تھے

شہاب الدین ثاقب

چاہا تھا بہت ہم نے پریشانی سے بچنا
دل ہی کو نہ تھا بس کسی نادانی سے بچنا

صحرا میں مجھے چھوڑ کے کیوں شرط یہ رکھ دی
ہر حال میں آسیب بیابانی سے بچنا

اک شور سلاسل وہ بپا رکھے گا ہر دم
آساں نہیں یاں بھی ترے زندانی سے بچنا

راہوں میں زمانے کی عجب راہ ہے تیری
مشکل ہے یہاں بھی ہمیں آسانی سے بچنا

خائف رہے محتاط رہے پھر بھی یہاں ہم
کتنوں سے نہ بچ پائے تو کیا پانی سے بچنا

کرن خورشید کی اس جانبِ پہلو سے روشن ہے
جو سچ پوچھو تو رستہ نالۂ آہو سے روشن ہے

بتانے کی نہیں پھر بھی سرِ محفل بتاتا ہوں
مشام جان و دل میرا اسی خوشبو سے روشن ہے

بعد موسیٰ سے کاوِ طور پر کیا کیا نہ روشن تھا
تعجب ہے کہ یہ دنیا مگر جادو سے روشن ہے

اندھیرا بستیوں میں ہے مگر اپنا تو ویرانہ
غبار راہ سے اور کچھ رمِ آہو سے روشن ہے

یہ سچ ہے خانۂ فرہاد تیشے سے ہی روشن تھا
چراغ چشم شیریں بھی مگر آنسو سے روشن ہے۔

• "شب خون" کا شمارہ نمبر ۲۰۶ باصرہ نواز ہوا۔ اتنے بہت سے افسانے دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ میں نے سب سے پہلے زاہدہ حنا کا "رقص مقابر" پڑھا، اسلئے کہ اسے ہندی ماہنامے "ہنس" کے مئی کے شمارے میں پڑھ کر پوری طرح لطف اندوز ہو سکی تھی۔

زاہدہ حنا نے افغانستان کے سیاسی انتشار، قتل و غارتگری اور خانہ جنگی کے جاں کن و المناک حالات کو فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ ایک ایسے افسانے کے قالب میں ڈھالا ہے جس میں شروع سے آخر تک قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ میں نے ان کا مجموعہ "راہ میں اجل ہے" بھی پڑھا تھا اور اس میں شامل ناولٹ "نہ جنوں رہا نہ پری رہی" کو بھی بہت دلچسپ اور فکر انگیز پایا تھا۔ لیکن میں یہ بھی کہنا چاہتی ہوں کہ زیر نظر افسانے اور مذکورہ ناولٹ دونوں کو پڑھتے سے ہمیں ان کے طرز تحریر پر قرۃ العین حیدر کی گہری چھاپ محسوس ہوئی۔ علاوہ ازیں "رقص مقابر" کے تانے بانے میں بابری دھاگوں کی شمولیت سے بھی قرۃ العین حیدر کا ایک افسانہ یاد آیا جو بیس برس یا اس سے بھی قبل ماہنامہ "شمع" میں شائع ہوا تھا۔ اس میں جلال الدین محمد اکبر اس جہان فانی میں اپنے آپ کو نورتن کے ساتھ جادوئی رولس رائس پر چڑھ کر آتے ہیں اور حالات حاضرہ پر تاسف کا اظہار کر کے واپس لوٹ جاتے ہیں۔ زاہدہ حنا کے سیاق و سباق بالکل مختلف ہیں اور یہ مماثلت محض ایک اتفاق ہے۔ لیکن جہاں تک طرز تحریر کا سوال ہے تو ان جیسی حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھنے والی ذہین خاتون کا اگر اپنا الگ طرز ہو تو یقیناً بہتر ہوگا۔

افسانے میں کچھ نظریاتی اختلافات کی گنجائش موجود ہے (فکشن جیسی غیر معروضی صنف میں ہمیشہ رہے گی بھی)۔ جنرل نجیب نے امریکہ کے آگے گھٹنے بیشک نہ ٹیکے ہوں روس کے ہاتھوں افغانستان کو گرو ضرور رکھ دیا۔ نجیب کے زمانے میں کابل خون میں نہ نہایا ہو لیکن افغانستان محض کابل سے تو عبارت نہیں۔ کابل کے باہر نہ جانے کتنے افغان مجاہدین (ایک اندازے کے مطابق دس لاکھ) خاک و خون میں لوٹے۔

ظہیر الدین بابر نے فرغنہ کے آس پاس زندگی کے ابتدائی دور میں جتنی لڑائیاں لڑیں وہ زیادہ تر چچا، ماموں اور بھائی کے خلاف تھیں۔ ان میں بچے کھچوں کے پیچھے گئے وہ سب ان کے اپنے تھے۔ کیا فاضل مصنفہ بابر کے وسیلے سے یہ کہنا چاہتی ہیں کہ طالبان ہندوستان (یا پاکستان) پر چڑھ دوڑیں تو وہ کابل میں خونریزی چاہنے سے بہتر ہوگا؟ بابر جیسے ماہر فن حرب اور مدبر سیاستداں پر

انگلی اٹھانا میرا مقصد نہیں، اسکے وقت میں یہی سب زندگی میں شامل تھا۔ میں یہاں بابر کی بطور علامت استعمال پر معترض ہوں وہ واقعی اگر لوٹ کر آسکے اسے افغانستان کی صورت حال پر تعجب بس اتنا ہی ہونا چاہئے کہ انسان اسکے بعد سے آگے نہیں بڑھا ہے۔ ہوس اقتدار کے چقماق سے چنگاریاں آج بھی جھڑ رہی ہیں۔ آنکھ لگی ہی تھی کہ نیند ٹوٹ گئی۔ رہیں بیچاری خواتین تو ہم لوگ بھی بغلیں بجا لیتے ہیں کہ ہمارے یہاں طویل مدت تک ایک خاتون پرائم منسٹر رہیں اور ابھی چند دن پہلے گجرال حکومت نے چار خواتین کو وزارت میں شامل کیا باقی اللہ اللہ خیر سلا۔

ان موشگافیوں سے قطع نظر زاہدہ حنا تعریف کی مستحق ہیں انھوں نے ایک مشکل موضوع کو اخباری رپورٹ یا ڈرائنگ روم ڈسکشن بننے سے بچا کر ایسے افسانے کی صورت دی ہے جو افسانے کی بنیادی شرط کو پورا کرتا ہے۔ برسبیل تذکرہ "شب خون" کے مدیر یا قارئین میں سے کوئی صاحب Read-ability کا اردو مترادف بتائیں تو ممنون ہوں گی۔ اقبال مجید کے ناولٹ میں مجھے کہیں کہیں اخباری رپورٹ یا ڈرائنگ روم، کا احساس ہوا تھا۔

"پال کومرا کا اسکوٹر" ہندی میں پڑھ چکی تھی۔ اسے بھی دوبارہ پڑھا۔ ایسے افسانے ہندی میں بھی بہتات سے نہیں لکھے جا رہے اور اردو میں تو بہت کمیاب ہیں۔ ویسے لودے پرکاش نے بات ذرا کم الفاظ میں کہنے کی کوشش کی ہوتی تو بہتر ہوتا۔

پٹنہ ذکیہ مشہدی

• گذشتہ کچھ برسوں میں صنف غزل کے بارے میں per se تو کم، لیکن کلاسیکی غزل کے متبعین کی جاری سطحی غزل کی فراوانی کے بارے میں لکھتا رہا ہوں۔ یا تو میں اپنا موقف پوری طرح واضح نہیں کر پاتا یا پھر بقول آنجہانی اختر الایمان غزل اور بے غزلی کی بحث میں پڑنا ہی لوب اور بے لوبی سمجھا جاتا ہے، مجھے غزل دشمنی' کے علاوہ اردو دشمنی، کا بھی مورد الزام ٹھہرا لیا گیا ہے۔ میں نے 'شعر شور انگیز' کے چاروں دیباچے پڑھے ہیں۔ تمہیدیں بھی غور سے دیکھی ہیں۔ اندازِ گفتگو کیا ہے۔ کے مضامین بھی زیر مطالعہ رہے ہیں اور مجموعی طور پر صنف غزل کی کلاسیکی روش کے بارے میں آپ کی آراء اور تجزیے کو میں معتبر مانتا ہوں۔ ان سے اختلاف کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ میں صنف غزل یا اس کے چلن کا مخالف ہرگز نہیں ہوں۔ بہر حال دس پندرہ برسوں تک انگلینڈ، کینیڈا اور امریکہ میں انگریزی اور تقابلی ادب پڑھاتے ہوئے مجھے اس

ے:

بات کا شدید احساس رہا ہے کہ غزل اردو کے شعری ادب کو عالمی ادب کے اسٹیج پر پروجیکٹ کرنے میں مانع رہی ہے۔ اور گزشتہ ربع صدی میں کچھ جدید شاعروں کی قابل قدر کاوشوں کے باوجود ڈھیروں غزلیں صرف ریپیٹیشن اور کمبی نیشن کے طریق کار سے استعاروں کے ردوبدل کو بروئے کار لا کر لکھی جا رہی ہیں۔ آپ نے مجھ سے اتفاق کیا تھا کہ غزل کا مستقبل کچھ بھی ہو، صرف اور صرف کلاسیکی غزل کا تتبع نہیں ہے۔ "شعر شور انگیز" کے دیباچے، تمہید میں اور اعادۃً گفتگو کیا ہے، کے مضامین ایک بار پھر پڑھوں گا۔ شاید مجھے روشنی مل سکے۔

ہرنڈن، امریکہ۔ ستیہ پال آنند

● جناب ستیہ پال آنند کی یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ "غزل اردو کے شعری ادب کو عالمی ادب کے اسٹیج پر پروجیکٹ کرنے میں مانع رہی ہے۔" اگر حافظ کی غزلوں، رومی کی مثنوی اور غزلوں، عطار اور نظامی کی مثنویوں کے کامیاب ترجمے انگریزی اور دیگر زبانوں میں ہو سکتے ہیں تو اردو غزل کے کامیاب ترجمے کیوں ممکن نہیں؟ یہ عیب غزل کا ہے یا مترجموں کا؟ میں نے کچھ دن ہوئے میر کی مثنویوں "دریائے عشق" اور "معاملات عشق" کا اچھا خاصا فرانسیسی منظوم ترجمہ دیکھا ہے۔ تفصیلات حسب ذیل ہیں۔

Masnavis: Poemes d, amour
de l' Inde moghole
(Gallimard, 1993)

مترجم کا نام ہے Denis Matringe۔ اس نے مختصر دیباچہ بھی لکھا ہے جو عام فرانسیسی طالب علموں کے لئے کار آمد ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ اردو شاعری میں غزل کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اور اردو شاعری کے مختلف عنوانوں کے فرانسیسی اور انگریزی میں تراجم کی روایت بہت پرانی ہے۔ عالمی ادب (یعنی مغربی ادب) والے اردو شاعری کو بہر حال اپنی فہرست میں بہت اوپر نہ رکھیں گے۔ اس کی وجہیں سیاسی ہیں، ادبی نہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ ترجمہ کوئی آسان کام نہیں۔ اور ایسی شاعری جو مختلف تہذیبی اقدار، مذہبی اور غیر مذہبی تصورات، اور سیکڑوں برس کی ارتقا یافتہ رسومیات کے زیر اثر لکھی جائے، اس کا ترجمہ بہت ہی مشکل کام ہے۔ آج کتنے لوگ ہیں جو Dante کا اردو ترجمہ پڑھیں اور از خود یقین کر لیں کہ یہ بڑی شاعری ہے؟ لیکن چونکہ Dante کے بارے میں ایک سے ایک جید مغربی نقاد نے قسم کھا کھا کر کہا ہے کہ وہ بڑا شاعر ہے، لہٰذا اس کے کلام کے بے رس اور ناکام تراجم بھی ہمیں اردو میں بڑی شاعری معلوم ہوں گے۔ اور ڈانٹے کو چھوڑئے، ذرا کوئی صاحب pope کی نظم The Rape of the lock کا ہی کامیاب اردو ترجمہ کر دیں؟ اس نظم کی بنیاد جن رسومیات پر ہے اور جس سماج اور طرز معاشرت کا اس میں مذاق اڑایا گیا ہے اسے آج کے انگریزی والے ہم اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ تو کیا اس بنا پر کہ ڈانٹے اور پوپ کے کامیاب اردو تراجم ممکن نہیں ہیں، ہم ان اصناف کو ہی ملعون قرار دیں جن میں ڈانٹے اور پوپ نے نظمیں کہی ہیں؟

یہ بات بالکل درست ہے کہ ہماری بہت ساری غزل فارمولا ٹائپ غزل ہے۔ لیکن یہی بات اٹھارویں صدی تک کے اکثر انگریزی Sonnets کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ اور ہر اس شاعر کے بارے میں یہ بات صادق آئے گی جو رسومیات پر مبنی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان رسومیات کو کام میں لا کر بڑی شاعری کن لوگوں نے لکھی اور کس طرح لکھی۔

ستیہ پال آنند صاحب اردو کے عمدہ شاعر اور ہمارے اپنے آدمی ہیں۔ انھیں غزل دشمن یا اردو دشمن کہنا ظلم ہے۔ لیکن ہماری درخواست ان سے صرف یہ ہے کہ کلاسیکی اصناف شعر کا مطالعہ انھیں اصناف کے تقاضوں کی روشنی میں کریں۔ غزل کی تنقید کے لئے یہ سوال کار آمد نہیں کہ غزل اردو شاعری کو عالمی اسٹیج پر ٹھیک سے پیش کرنے میں ناکام ہے یا نہیں۔

الہ آباد شمس الرحمٰن فاروقی

● "شب خون" کے شمارہ ۲۰۵ کے "اخبار و اذکار" والے صفحے پر درج ہے کہ اس سال کا خواجہ آشکار حسین یادگاری ایوارڈ مجھے ادبی خدمات کے اعتراف میں دیا گیا ہے۔ از راہ کرم کسی آئندہ اشاعت میں یہ وضاحت فرما دیں کہ ایوارڈ مجھے نہیں دیا گیا ہے بلکہ "سالنامہ دراسات اردو" کو دیا گیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اس کا مدیر ہوں لیکن اس کے حسن و قبح کی ذمہ داری میں نہ صرف گرفتھ شاسے (Grifith Chausse) شریک ہیں جو اس کے مدیر معاون ہیں بلکہ اس کے جملہ قلمی معاونین بھی۔

میڈیسن وسکانسن محمد عمر میمن

● اس بار پندرہ کہانیاں ایک ساتھ پڑھتے ہوئے احساس ہوا کہ کہانی کا رجحان ایک بار پھر تیزی سے بدل رہا ہے۔ خالدہ حسین، رشید امجد اور مظہر الزماں خاں کی کہانیوں سے ہم اب خاصے مانوس ہو گئے ہیں۔ مقابلتاً صدیق ٹونکی، انور قمر، اودے پرکاش اور منظور کوہسار کی کہانیاں آج کے حالات سے کچھ زیادہ متاثر اور نئے مزاج کی حامل ہیں۔ منیر الدین احمد کی کہانی پڑھتے ہوئے اس کا شدید احساس ہوا کہ آج کا انسان مذہبی منافرت اور علاقائی تعصبات سے اس قدر اوب چکا ہے کہ اقدار کی بندشوں کی بھی پروا نہیں کرتا اور اس کے لئے انسانی رشتہ ہی اب سب سے زیادہ اہم ہے۔ افسانے کے لئے یہ ایک خوش گوار تبدیلی ہے۔ اودے پرکاش کی کہانی واقعی کچھ زیادہ ہی طویل اور صبر آزما ہے،

بمبئی انور خان

• "شب خون" میں جگتی ہے خلق خدا" کا حصہ بھر بہت بے نام ہونے لگا
ہے۔

ونیا پور — پریم کمار نظر

• پچھلے شمارہ میں یاد کی پہلی نظم میں جہاں "دھیرے دھیرے چاند کا
قص" والی لائن ہے "رقص" کے آگے تین لفظ شاید میں یا کمپوز لکھنا بھول
لہ "رقص" کے بعد تین لفظ یہ تھے "ٹھہر رہا ہے"۔ اب یہ مصرعہ پورا ہوا
"دھیرے دھیرے رقص ٹھہر رہا ہے"

لی گڈھ — صلاح الدین پرویز

• "شب خون" مل رہا ہے۔ قیمت کا اضافہ قبول ہے۔ ادھر کچھ نام ہر
شمارے میں نظر آئے ہیں۔ "شب خون" کو قلمکاروں کی کمی تو نہیں۔ پھر ایسا
کیوں؟

دمے پورہ۔ بہار — مشتاق احمد

• شمارہ ۲۰۵ موصول ہوا۔ بہت عمدہ ہے۔ اب تعلیق دینا مشکل ہو جاتا ہے
کہ کون سا شمارہ کس پر فوقیت رکھتا ہے۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ ہر شمارہ پر اپنے
تاثرات لکھوں مگر مختلف النوع مسائل، وقت کی کمی اور خرابی صحت کی بندشوں
کی وجہ سے ایسا کر نہیں پاتا۔ "مابعد جدیدیت" پر آپ کا اداریہ فکر اور سوچ کے
نئے زاویے بناتا ہے۔ محمود ایاز کی یاد میں نیر مسعود کی تحریر دل کو چھو لیتی ہے۔
حامدی کاشمیری نے تجزیاتی مطالعہ کے تسلسل کو آگے بڑھایا ہے۔ آپ کی
دونوں تحریریں دست خود دہان خود" اور "میں کون ہوں اے ہم نفسان" نئے
معنیاتی آفاق کا حکم رکھتی ہیں۔ غزلوں میں انور شعور خاص طور پر پسند آئے۔
تمام افسانے بھی عمدہ ہیں لیکن عبد الصمد کا افسانہ منفرد ہے۔ دہلی اور یوپی اردو
اکیڈمی کے متعلق آپ کے احتجاج سے پہلی بار شدید گونج کا احساس ہوا ہے۔ ہم
اگر کچھ لکھتے تو چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوتی۔۔

مرزا حامد بیگ کے مقالہ """ "الیٹ کا اردو دنیا میں چند قدم" کی شمولیت
سے یہ شمارہ یادگار بن گیا ہے۔

بشید پور — ظفر ہاشمی

• "شب خون" اردو رسائل کی بھیڑ میں منفرد اور نمایاں ہے۔ اس کے
معیار کی بلندی اور انفرادیت آپ کی مدیرانہ بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ "شب
خون" کے مشمولات شعر و ادب کا قاری کے لئے مشعل راہ ہیں۔ آپ جس
لگن اور ایمانداری سے اردو زبان کی خدمات انجام دے رہے ہیں وہ قابل
تحسین اور قابل مبارکباد ہے۔

اکر، بردوان — مہتاب پیکر اعظمی

• ۲۰۶ میں سید ارشاد حیدر صاحب کے تبصرے پسند آئے۔ شفیع جاوید،
رشید مجید، مرزا حامد بیگ، ضمیر الدین احمد، مظہر الزماں خاں کے افسانے بھی
عمدہ ہیں۔

دربھنگہ — جمال اویسی

• شب خون کے مطالعے سے کچھ روشنی ملتی ہے۔ تازہ تخلیقی رویوں اور
نظریات سے آگہی بخشنے والا یہ موثر جریدہ ادبی دنیا کے لئے ایک نایاب تحفہ
ہے۔

لدھیانہ — عزیز پریہار

• یہ بات یقینی ہے کہ ۱۹۹۰ کے بعد کی نسل اپنے آپ کو پچھلوں سے الگ
گردانے گی۔ اس کی بعض وجوہ ہیں۔

(۱) مابعد جدیدیت کے پاس کوئی بات کہنے کے لئے نہیں ہے۔
(۲) ان کے یہاں احتجاج کی جگہ مصالحت ہے۔
(۳) ان کے یہاں اقدار نہیں ہیں۔
(۴) ان کا ادبی وجود بھی غیر یقینی ہے۔
(۵) ان کے پاس زبان نہیں ہے

اور یہ اتنی بڑی وجہ ہے کہ یہ انھیں ادیب ماننے سے انکار کرنے کے لئے
کافی ہے۔ میں نے یہ بات پہلے بھی کہی ہے کہ سریندر پرکاش، انور سجاد اور
انتظار حسین جیسی زبان ! میر میں کسی کے پاس نہیں ہے۔ غیاث احمد گدی اور
اکرام باگ جیسا اسلوب کسی کے پاس نہیں ہے۔ شوکت حیات، عبد الصمد،
سلام بن رزاق، اور اشرف مابعد جدیدیت کے چکر سے الگ تھلگ نظر آتے
ہیں۔ ان کے پاس کچھ تو ہے۔

فاروقی صاحب کی بات صحیح ہے کہ بہت سے لوگوں کے یہاں جھلاہٹ
ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں ادبی اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ ان کی کہانیوں پر
بات نہ ہوئی اور انھیں موضوع نہ بنایا گیا۔ بمبئی کی نئی نسل جو ۱۹۹۰ بلکہ ۱۹۹۵
کے بعد کی نسل ہے وہ خود انتہائی شدت کے ساتھ انھیں رد کرنے والی ہے۔ اور
کئی بار ادبی مباحثوں میں یہ بات سامنے آئی ہے۔ میں اس سبب بہت برا سمجھا گیا
ہوں کہ محض اس لئے کہ کسی نے مجھ سے دس پندرہ برس پہلے لکھنا شروع کیا
ہے، میں اپنے آپ پر اس کی اطاعت نافذ نہیں کرتا۔

بحرین — رحمن عباس

• رسالہ کے آخری صفحات چھپنے جا رہے تھے کہ مشہور جدید افسانہ و ناول نگار الیاس احمد گدی کے انتقال کی پر ملال خبر ملی۔ ان کی عمر ۶۵ سال کی تھی۔ الیاس احمد گدی اپنے افسانوں کی بدولت ہی مقبول ہو گئے تھے لیکن بعد میں وہ ناول بھی لکھنے کی طرف مائل ہوئے اور "فائر ایریا" جیسا اہم جدید ناول لکھا جس پر انھیں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا۔ ان دنوں وہ نئے ناول "بے آسمان کی زمین" پر کام کر رہے تھے اور اپنے افسانوی مجموعے اشاعت کے لئے دینے والے تھے۔

ان کی اچانک موت بر صغیر ہی نہیں بلکہ اردو کی پوری دنیا کو سوگوار کر گئی۔ مرحوم نہایت منکسر المزاج اور خاموش طبیعت کے مالک تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔

• شمس الرحمٰن فاروقی نے اتر پردیش اردو اکیڈمی کی صدارت کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اگرچہ صدارت کا عہدہ اکیڈمی میں سب سے اعلیٰ ہے لیکن شمس الرحمٰن فاروقی نے حکومت یو پی سے کہا کہ اردو اکیڈمی کو پوری طرح فعال بنانے کے لئے ضروری قدم اٹھائے جائیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہو کہ اردو کے پالیسی معاملات پر فیصلہ اکیڈمی کے مشورے سے ہو۔ یہ اور اس طرح کی چند باتوں کو عمل لائے بغیر صدارت کی کرسی محض علامتی منصب کہلائے گی۔ چونکہ حکومت یو پی کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا اور حکومت نے مجلس عامہ اور مجلس عاملہ میں ارکان کی نامزدگی شمس الرحمٰن فاروقی کا مشورہ حاصل کرنا تو کجا، اطلاع دئے بغیر کر دی۔ لہٰذا فاروقی نے اس منصب کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

• اعلان کیا گیا ہے کہ ریاست جموں کشمیر میں اردو اکیڈمی الگ سے قائم کی جائے گی۔ اب تک اردو زبان کے معاملات J&K Academy of Arts, Culture & Languages کے تحت آتے تھے۔ توقع ہے کہ الگ سے اکیڈمی قائم ہو جانے پر اردو کے معاملات وہاں اور بھی بہتر ہوں گے۔

• اس سال ادب کے لئے MAGSAYSAY AWARD بنگالی کی مشہور ناول نگار مہا شویتا دیوی کو دیا گیا ہے۔ انھیں ۱۹۹۶ کا گیان پیٹھ ایوارڈ بھی مل چکا ہے جس کی خبر ہم نے شائع کی تھی۔ ہم انھیں تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ یہ انعام حاصل کر کے انھوں نے ہندوستانی ادیبوں کا سر فخر سے اونچا کر دیا ہے۔

• شہریار اب یونیورسٹی کے مکان سے منتقل ہو کر مندرجہ پتے پر مقیم ہو گئے ہیں۔ ۸۱/۴۔ کبیر کالونی، جمال پورہ۔ علی گڈھ۔ ۲۰۲۰۰۱

• صلاح الدین پرویز علاج معالجے کی غرض سے دلی میں مقیم ہیں۔ انھیں مندرجہ پتے پر خط لکھا جا سکتا ہے۔ فلیٹ ۴، ٹاور۔ اے، ذاکر باغ، نئی دہلی ۲۵

• مظفر حنفی گذشتہ دنوں بغرض سیاحت لندن گئے ہوئے تھے۔

• اسد اللہ خاں کے گیتوں کا مجموعہ "رکے ہوئے ساون" چند دنوں پہلے شائع ہوا ہے۔

• اندر موہن کیف جہانسی کے سر بر آوردہ شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔

• این میری شمل نے یہ تقریر جرمن زبان میں کی تھی۔ اس کا انگریزی ترجمہ ہمیں اسلم محمود کے توسط سے دستیاب ہوا ہے۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ جب جرمن بک سیلرز ایسوسیئشن نے ۱۹۹۵ میں اپنا امن انعام این میری شمل کو دیا تھا تو مغرب کے بعض بڑے ادیبوں نے احتجاج کیا تھا۔ یہ انعام این میری شمل کو نہیں ملنا چاہئے تھا کیونکہ انھوں نے سلمان رشدی کی دریدہ دہنی کی مذمت کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ سلمان رشدی کی کتاب The Satanic Verses پر مسلمانوں کی ناراضگی برحق ہے۔ این میری شمل کے خلاف احتجاج کے ذریعے یورپ کے بڑے بڑے لکھنے والوں کی قلعی کھل گئی تھی کہ وہ لوگ اسلام کی مخالفت میں لکھنے والوں کے خلاف کچھ سننا پسند نہیں کرتے۔ این میری شمل کی یہ تقریر اس پورے ہنگامے کے پس منظر میں پڑھی جانی چاہئے۔

• پرکاش تیواری دلی کے معتبر شعرا اور اردو کے خاموش خدمت گذاروں میں ہیں۔

• جمیل الرحمٰن کا شعری مجموعہ "زمیں جب آنکھ کھولے گی" شائع ہو گیا ہے۔

• جوگندر پال کے ناول "خواب رو" کا انگریزی اڈیشن چھپنے والا ہے جس کے لئے انھوں نے بطور خاص دیباچہ لکھا ہے۔ 'زیر نظر مضمون' اسی دیباچے کا ترجمہ ہے۔

• رونق نعیم "سمندر بولتا ہے" کے بعد اپنا نیا مجموعہ ترتیب دے رہے ہیں۔

• سیفی سرونجی رسالہ "انتساب" سرونج (مدھیہ پردیش) کے مدیر ہیں اور ان اطراف کے مشہور شاعر ہیں۔

• شان الحق حقی ان دنوں کینیڈا میں ہیں اور خبر ملی ہے کہ شاید وہیں شہریت قبول کر لیں۔ اس وقت وہ اپنی غزلوں کے انگریزی ترجمے کا مجموعہ تیار کر رہے ہیں۔

• شاہد کلیم کا مجموعہ "پھول جب کھلتے ہیں" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

• شمس الرحمٰن فاروقی نے اس مضمون میں کچھ مسائل کی توسیع و تفصیل کی ہے جو اس سے پہلے وہ اپنی کتاب "اردو غزل کے اہم موڑ" (مطبوعہ غالب اکیڈمی، دہلی) میں اشارۃً بیان کر چکے ہیں۔

• شمیم قاسمی بہار کے جدید شعرا میں ایک معتبر نام ہے۔

• شہاب الدین ثاقب علی گڈھ یونیورسٹی میں اردو کے استاد اور گذشتہ چند برسوں میں نمایاں ہونے والے قابل ذکر شعرا میں ہیں۔

۱۹۶۵ کے بعد ادبی تھیوری (۱)

۱۹۷۱ میں مشہور نقاد HAZARD ADAMS نے ایک بھاری بھر کم کتاب CRITICAL THEORY SINCE PLATO کے نام سے شائع کی تھی جس کا نیا ایڈیشن ۱۹۹۲ میں نکلا۔ اس کتاب میں ADAMS نے پوری ادبی تھیوری پر لکھی ہوئی تحریروں کے مفصل اقتباسات یکجا کر دیے ہیں۔

۱۹۶۵ کے بعد چند دنوں کے لئے ادبی تھیوری کے میدان میں خاصی تبدیلیاں پیدا ہوئیں جن کے نتیجے میں شور غل زیادہ ہوا اور نئی باتیں کم نکلیں۔ پھر بھی چونکہ ۱۹۶۵ سے لے کر ۱۹۸۰ تک کا زمانہ تھیوری کے لئے بہت اہم قرار دیا جاتا ہے، اس لئے HAZARD نے ۱۹۸۶ میں ایک اور کتاب شائع کی جس کا نام CRITICAL THEORY SINCE 1965 ہے۔ اس کتاب کی ترتیب میں LEROY SEARLE جو یونیورسٹی آف واشنگٹن میں انگریزی پڑھاتا ہے، HAZARD ADAMS کا شریک مرتب تھا۔

اس کتاب میں صرف ان چیزوں پر ہی تحریروں کے اقتباسات نہیں ہیں جنہیں بعض لوگ جدید تھیوری سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کتاب میں ادب کے بارے میں نئے خیالات کے حوالے سے فلسفہ، نفسیات، تنقید، لسانیات وغیرہ تمام علوم سے متعلق تحریریں جمع کر دی گئی ہیں۔ (برسبیل تذکرہ یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس پوری کتاب میں جو تقریباً نو سو صفحات پر مشتمل ہے مابعد جدیدیت کے بارے میں کوئی اندراج نہیں ہے) موجودہ اور آئندہ شماروں میں اس کتاب کے اقتباس ہم پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کریں گے۔

"BROOKS کا یہ کہنا غلط ہے کہ اصولی طور پر کسی نظم کا مکمل لفظی ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن لفظی ترجمہ اور نظم کے درمیان جو تعلق ہے اس کے بارے میں BROOKS کا متردد ہونا بجا ہے۔ WINTERS کا یہ ادراک درست ہے کہ کچھ شاعری ایسی ہوتی ہے جسے ہم اپنے لفظوں میں بیان کر سکتے ہیں اور کچھ ایسی ہوتی ہے جسے ہم اپنے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط ہے کہ اتنا کہہ دینے سے وہ صورت حال اطمینان بخش ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں نقاد تنقید اور وہ شے جس پر تنقید کی جاتی ہے، کے درمیان تعلق کے مسئلے کو جانتے ہیں لیکن دور تک اس کا پیچھا نہیں کرتے۔ اور اب میرا خیال ہے کہ ہم کم سے کم اختیار بند یا کم سے کم سطحی حالت میں اگر اس پورے سوال کا سامنا کر سکتے ہیں، جس کے نتیجے میں یہ اشکالات پیدا ہوئے ہیں۔ یعنی جب ہم کسی فن پارے کو بیان کرتے یا اس کی وضاحت کرتے ہیں تو دراصل ہم کیا کر رہے ہوتے ہیں؟ تنقید کون سا کام انجام دیتی ہے؟ کیا مختلف فنون یا کسی ایک فن کے مختلف اصناف مختلف طرح کی تنقید کا تقاضا کرتی ہیں؟ کسی مخصوص فن پارے اور عام طور پر فن کے بارے میں ہم تنقید کے بارے میں کیا جان سکنے کی توقع کرتے ہیں؟

۔۔۔ کانٹ (KANT) اپنی بات یہاں سے شروع کرتا ہے کہ جمالیاتی فیصلہ نہ تو نظری ہوتا ہے نہ منطقی نہ معروضی، بلکہ یہ ایسا فیصلہ ہوتا ہے" جس کے تعین کی بنیاد موضوعی کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتی۔"

۔۔۔ کانٹ نے جو توجہ جمالیاتی فیصلوں میں "آفاقی آواز" پر صرف کی ہے وہ بجا طور پر کیے گئے دعوے کی اس ہوائی وجہ بیان کرتی ہوئی نظر آتی ہے جس میں ہم اپنی کہی ہوئی بات کو زبان کے عام عوامل کے نقادوں کی بات کی طرح بیان کرنے لگتے ہیں۔

۔۔۔ بہر حال جب ہم اشکالات کو برداشت کرنے کی توقع نہیں کرتے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہم اپنے خیالات کو بیان کر دیں تو ہم سب انسانوں کی طرف سے کلام کر دیں گے اور ایسے واجب (necessary) تصورات کو دریافت کر چکے ہوں گے جو ہم سب میں مشترک ہیں۔"

STANLEY CAVELL

اگست ۱۹۹۷

مدیر، پرنٹر، پبلشر: عقیلہ شاہین
فون نمبر: ۶۲۲۶۹۳، ۶۲۳۱۳۷
مطبع: بھارگو پریس، الہ آباد
فی شمارہ: پندرہ روپئے

سرورق: چودھری ابن النصیر
سرنامہ کی خطاطی: عادل منصوری
کمپوزنگ: اقراح کمپیوٹر سنٹر، نئی دہلی-۲۵
شارپ ٹریک کمپیوٹرس، الہ آباد-۳

جلد: ۳۱ شمارہ: ۲۰۹
ترسیل زر کا پتہ: ۳۱۳-رانی منڈی، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس-۱۳، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
بارہ شمارے: ایک سو ساٹھ روپئے

ترتیب و تہذیب

شمس الرحمٰن فاروقی

شمس الرحمٰن فاروقی

عزت مآب جناب اندر کمار گجرال، وزیر اعظم ہندوستان، صدر
ے۔ کے۔ برلا فاؤنڈیشن جناب کے۔ کے۔ برلا، انتخابی کمیٹی کے صدر اور ارا
ن، میرے ساتھی شاعر اور ادیب، خواتین، حضرات :
سب سے پہلے تو میں کے۔ کے۔ برلا فاؤنڈیشن اور انتخابی کمیٹی کا شکریہ
کرتا ہوں کہ ۱۹۹۶ کے "سرسوتی سمان" کے لئے انھوں نے میرا انتخاب
۔ میں اس وقت آپ کے سامنے مسرت کی لہر میں ڈوبا ہوا ہوں۔ یہ احساس
، نشے کا سا ہے۔ عمر خیام یاد آتا ہے ؂

من بندۂ آں دمم کہ ساقی گوید
یک جام دگر بگیرو من نتوانم

لیکن خوشی اور فخر کی اونچی اڑان کا یہ احساس بہت جلد فکر مندی میں بدل
تا ہے۔ اس عظیم اور محترم جلسے میں آپ کے سامنے میں ایک ایسی تہذیب،
ں روایت کا حصہ بن کر حاضر ہوں ہمارے وزیر اعظم خود جس کا عمدہ نمونہ
ں۔ یہ ہمارے ویس کی ملی جلی ہندو مسلم تہذیب ہے۔ یہ تہذیب روشن خیالی
ہ لریت، اور رواداری کا پودا اور پھول ہے۔ یہ ہندوستانی اور عرب ایرانی
۔ہی شعور کے بہترین عناصر کے آپس میں مکمل مل جانے سے پیدا ہوئی۔
ں تہذیب کا نمونہ ہونے کے معنی ہیں، ہندوستانی حقیقت کی ایک ہزار سالہ
یخ سے رشتہ قائم کرنا۔ یہ بڑے فخر اور ذمہ داری کی بات ہے۔ اس ذمہ
ی کو نبھانا آسان نہیں اور یہی میری فکر مندی کا باعث ہے۔
آنند نرائن ملا، جو کچھ ہفتہ ہوئے ۹۶ برس کی عمر میں اللہ کو پیارے
ے، اسی ہندو مسلم تہذیب کی اولاد تھے۔ شاعر، نثر نگار، مقنن، رکن
ینٹ، اردو کے مقصد کے لئے لڑنے والے، یہ آنند نرائن ملا ہی تھے جنھوں
، کہا تھا "اردو میری مادری زبان ہے۔ میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن مادری
ن نہیں چھوڑ سکتا"۔
اس تہذیب کے بارے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے تخلیقی
ات اور سرچشمے ہندوستانی ہیں یہ کسی مذہب، فرقے، یا نسل کی ملکیت
ں۔ اس تہذیب کی بنائی ہوئی چیزیں آپ کو ہندوستان کا رنگ روپ دکھاتی
محسوس کراتی ہیں۔ حقیقت کو ہندوستان میں جس طرح جانتے یا جس طرح
کی تصویر کشی کرتے ہیں، یہ تہذیب بھی اپنی حقیقت کو بس اسی طرح پیش
ا ہے۔ اس تہذیب کا بنیادی سرچشمہ اس قدر و قیمت میں ہے جو یہاں لفظ،

اور اس لئے شاعری کو حاصل ہے۔ بھرتری ہری نے کہا ہے کہ "تمام ذی روحوں میں شعور اسی وقت اپنا جلوہ دکھا سکتا ہے جب کلام پہلے سے وہاں ہو"۔ تو پھر یہ یوں ہی نہیں کہ ہم اردو میں "شاعری" کے لئے لفظ "کلام" استعمال کرتے ہیں اور کلام کا اصل معنی ہیں "بات چیت۔" اردو بولنے والے کو اس بات پر کوئی تعجب نہ ہوگا کہ میر نے خاموشی کو موت کے برابر قرار دیا ہے۔ میر کہتے ہیں ؂

شاعر ہو مت چپکے رہو اب چپ میں جانیں جاتی ہیں
بات کرو ابیات پڑھو کچھ بیتیں ہم کو بتاتے رہو۔

کلاسیکی مخلوط سماج میں لفظ کا احترام دنیاوی چیزوں سے بڑھ کر تھا۔ بطور خالق اور فنکار شاعر کی حیثیت اپنی کائنات میں سب سے اعلیٰ تھی۔ شاعری پر دنیا کے ادب آداب نہیں چلتے تھے۔ میر نے کہا ؂

جیسی عزت مری دیواں میں امیروں کی ہوئی
وہی ان کی بھی نہ ہوگی مرے دیوان کے بیچ

میر کے وقت سے اب چیزیں بہت بدل گئی ہیں۔ جیسا کہ شے مس ہنی نے لکھا ہے۔ "ہم یہاں خود ہی بڑے نازک زمانے میں جی رہے ہیں۔ یہ ایسا وقت ہے جب خطرہ ہے کہ شاعری کی فنکارانہ حیثیت پر شاعری بطور سیاسی عمل کے نقشے کی تلاش حاوی ہو جائے۔" جدید ریاست جب لفظوں کی دلکش توانائی کو دیکھتی ہے تو اسے بڑی لالچ لگتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ شاعر کو صاحب اقتدار اشرافیہ طبقے کے ترجمان کے طور پر استعمال کرے۔ کلاسیکی زمانے میں ریاست شاعر کو یا تو اکیلا چھوڑ دیتی تھی۔ یا پھر اسے دربار کی زینت کے لئے استعمال کرتی تھی۔ ترجمان یا سیاسی مفکر کا کام اس سے نہ لیا جاتا تھا۔ جدید تخلیق کار کو اس بات کی لالچ لگی رہتی ہے کہ وہ خود کو ریاست کے استعمال میں لا سکے اور رابرٹ براؤننگ کے لفظوں میں انعام کے طور پر "مٹھی بھر چاندی کے سکے" یا اس سے بھی کم مقدار پر راضی ہو جائے۔

اس کے علاوہ ایک اور مسئلہ بھی ہے جو کم و بیش ہندوستانی ہے۔ جدید ہندوستانی فنکار اور اس کے نو آبادیاتی ماضی کے درمیان خوف اور تشویش بھرے رشتے ہیں۔ نو آبادیاتی حاکم نے ہندوستانی تخلیقی مزاج پر اپنا ہی بیانیہ جاری کیا۔ کچھ تو نا سمجھی کی وجہ سے، اور زیادہ تر نو آبادیاتی نظام کی ضرورتوں کے باعث، انگریزوں نے ہمارے ادب میں اخلاقی کھوکھلے پن اور دانشمندانہ ناکامی کی

کیوں نہ ہوں؟۔

ساٹھ کی دہائی کا وسط آتے آتے یہ بات مجھ پر صاف ہو چکی تھی کہ ہم وگ اپنی کلاسیکی شاعری جس طرح پڑھتے آرہے تھے اس میں کوئی بہت بڑی کی تھی۔ اس شاعری میں بہت سی ایسی باتیں تھیں جن کی تعبیر یا تجزیہ مغربی شعریات کی روشنی میں ہو ہی نہ سکتا تھا۔ مثال کے طور پر حقیقت اور استعارے کے بارے میں اردو شاعری میں جو نظریہ اپنایا گیا تھا وہ مغربی ادب میں اپنائے گئے ان چیزوں کے نظریے اور بنیادی اصولوں سے بہت مختلف تھا۔ ان دنوں میں غالب کے مطالعے میں لگا ہوا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اردو تنقید کی ایسی زبان ور محاورہ گڑھنے کی کوشش میں تھا جو اردو کے جدید تجربہ پسند ادب کے لئے مناسب ہوتا، کیوں کہ اس نئے ادب کو اردو کے معاصر طرز کی حیثیت سے قائم کرنے کی ضرورت تھی۔ غالب کا دماغ جدید ذہنی فضا سے ہم آہنگ معلوم ہوتا تھا اور ان دنوں ہم لوگوں میں یہ طریقہ عام تھا کہ جدید استعمالات اور تجربات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے غالب کا سہارا لیتے تھے۔ لیکن میں غالب کے بھی پہلے زمانے اور آج کے زمانے کے بیچ کے تسلسل کی تلاش کر رہا تھا، تاکہ اپنے پچھلے زمانوں سے رشتہ جوڑ سکوں اور اس دیوار کو پھاند سکوں جو وسط انیسویں صدی سے انگریزی پالیسی نے ہمارے اور ہماری تاریخ کے درمیان کھڑی کر دی تھی۔ میں نے ۱۹۶۷ میں لکھا کہ نئی اور پرانی شاعری میں فرق صرف رویے کا ہے ورنہ دونوں ہی شاعری کے بہترین معنی میں شاعری ہیں۔

غالب کا معاملہ ایک اور طرح سے بھی آسان تھا۔ ان کا دیوان بہت چھوٹا سا ہے۔ مشکل سے دو ہزار شعر ہوں گے۔ انھوں نے اپنی اردو شاعری کا کوئی دو تہائی حصہ مسترد کر دیا تھا یا دبا دیا تھا۔ اس لئے ہم سب لوگوں کو یقین تھا کہ جب معاملہ غالب سے ہے تو ہم ان کے جوہر کا جوہر پڑھ رہے ہیں اور ہمیں اس حصے کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں جو غالب نے خود کاٹ کر نکال دیا تھا۔ میر کا معاملہ کچھ اور تھا۔ ان کا کلام غالب کے کلام سے پندرہ گنے سے بھی زیادہ تھا اور اس کے زیادہ تر حصے کے بارے میں خیال تھا کہ اس کی کوئی قیمت نہیں۔

لیکن کیا وہ کلام، واقعی بالکل بے قیمت تھا؟ اور یہ فیصلہ کیا کس نے تھا؟ میر کے ساتھی شاعروں اور ان کے فوراً بعد کے شاعروں میں سے کسی کا بھی یہ خیال نہ تھا کہ میر کی شاعری کا بڑا حصہ بالکل ردی ہے۔ ۱۸۳۰ کے آس پاس شیفتہ کا وہ بیان جس کا میں نے اوپر ذکر کیا، دراصل کچھ اور ہی تھا۔ اصل دیکھنے پر معلوم ہوا کہ شیفتہ نے یہ کبھی کہا ہی نہیں تھا کہ میر کا پست کلام حد سے زیادہ پست ہے، اگرچہ ان کا بلند بہت بلند ہے۔ انھوں نے کہا تو یہ تھا کہ "اگرچہ میر کا پست کلام تھوڑا پست ہے، لیکن ان کا بلند بہت بلند ہے۔" اور شیفتہ نے میر کے زیادہ تر کلام کے ردی ہونے کی بات بھی کبھی نہیں کہی۔ کیا ہم لوگوں کو اختیار تھا کہ میر کے زیادہ تر حصے کو اپنے آپ ہی رد کر دیں اور اپنے مطالعہ سے خارج کر دیں؟ شاید تھا، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ پہلے ہم میر کو اس طرح پڑھیں

جس طرح انھیں پڑھا جانا چاہئے تھا۔

پرانے زمانے کے شاعر اور خاص کر ایسے زمانے کے شاعر جس کے اور ہمارے درمیان بہت بڑا انقطاع ہو اس کی تعین قدر دو طرح سے ہو سکتی ہے۔ ایک یوں کہ ہم کہیں وہ اپنے زمانے میں بڑا شاعر رہا ہو گا لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ کچھ اتنا عمدہ شاعر نہ تھا۔ یہ فیصلہ اس شاعر کے ساتھ چاہے انصاف نہ کرے، لیکن ایسا ہے کہ اسے برحق ثابت کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ بہر حال ہر زمانہ پرانے شاعروں کو اپنی ہی شرطوں اور حوالوں کے ذریعہ پڑھتا اور سمجھتا ہے۔ پرانے شاعر پر تنقید کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم بالکل دو ٹوک لفظوں میں کہیں: وہ خراب شاعر تھا۔ یا یہ کہیں کہ اگرچہ وہ اچھا یا بڑا شاعر تھا، لیکن جو کچھ اس نے لکھا اس کا زیادہ تر حصہ کوڑا کرکٹ ہے۔ ہمارے زمانے میں تاج کو پہلے فیصلے کا دکھ سہنا پڑا۔ لوگوں نے کہا، تاج خراب شاعر تھے۔ بس۔ میر کو دوسرے فیصلے کا بوجھ اٹھانا پڑا۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا کیا ہمیں حق ہے کہ ہم گذشتہ شاعروں کے بارے میں ایسے فیصلے صادر کریں جب کہ ہم نے یہ پوچھا اور جانچا بھی نہ ہو کہ پرانے زمانے کے شاعروں، ان کے ساتھیوں، سننے والوں اور مربیوں کا اپنے بارے میں کیا خیال تھا کہ ہم لوگ کر کیا رہے ہیں؟ "شاعری" لفظ سے وہ کیا مراد لیتے تھے؟ کیا وہ اپنے اشعار کی تخلیق خلا میں کرتے تھے؟ یا کیا ان کے سامنے نمونے اور مثالیں تھیں جن کی روشنی میں وہ کام کرتے تھے؟ کیا کوئی شخص بڑا شاعر ہو سکتا ہے، یا بڑا کیوں، شاعر ہی ہو سکتا ہے اگر اس کے پاس تنقیدی شعور نہ ہو؟ یا شاعر کے طور پر اپنے مشن کا خیال بالکل نہ ہو۔

میر نے ایک لمبی اور حوادث سے بھرپور زندگی پائی۔ علما، بڑے شاعروں، امیروں رئیسوں، فوجی جرنلوں وغیرہ کے ساتھ ان کا میل جول اکثر رہا اور دیر دیر تک رہا۔ وہ اٹھاسی برس جیے۔ اگر ہم فرض کریں کہ انھوں نے ۱۴ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تو ان کی ادبی زندگی ۷۴ برس ہوئی۔ کیا ہم یہ سوچنے میں انصاف پر ہیں کہ ان ۷۴ برسوں میں ان کو کبھی بھی ایک لمحے کا شک اپنی شاعری پر نہیں گذرا اور وہ مسلسل متھ متھ کر ایسی شاعری بناتے رہے جس کا بڑا حصہ، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، بالکل بے رس اور خالی از خوبی ہے؟

نئی ادبی تھیوری کی ایک بالکل جانی پہچانی معمولی بات ہے کہ کوئی نظم دوسری نظموں کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اور نظموں اور اشعار کو مسلسل دوسرے اشعار کے سامنے رکھ کر جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ ایسا میر کے زمانے میں بھی ضرور رہا ہو گا۔ میں نے خود سے پوچھا کہ میں اگر میر کو سمجھنا چاہتا ہوں تو کیا مجھے بھی ایسا نہیں کرنا چاہئے؟ مجھے میر کو ان کے معاصروں کی روشنی میں اور ان لوگوں کی روشنی میں پڑھنا چاہئے جن کو میر اپنا پیش رو قرار دیتے تھے۔ اور مجھے چاہئے کہ میں میر کے معاصروں اور پیش رووں کو بھی میر کی روشنی میں پڑھوں اور مجھے یہ بھی چاہئے کہ میں اس ادبی تھیوری کو پھر سے حاصل کرنے کی کوشش کروں جو میر اور ان کے معاصروں کے کلام میں جاری و ساری رہی ہو گی۔ اور یہ شعریات کیا عرب عجمی، یا ایرانی، یا ہندوستانی؟ یا یہ ان سب کا

مجموعہ تھی یا کوئی نئی ہی شعریات تھی؟ مجھے خیال آیا کہ "سبک ہندی" کی فارسی شاعری جو ہندوستان میں لکھی گئی، اس کا ایرانیوں کے نزدیک کوئی خاص مفہوم یا اہمیت نہ تھا۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ ایرانیوں نے "سبک ہندی" کی شاعری کو یہ کہہ کر نامنظور کیا کہ وہ "بدیسی" اور "اجنبی" ہے۔ تو جب "سبک ہندی" کی فارسی شاعری اپنے سبھاؤ میں گہرائی تک ہندوستانی تھی، تو اردو شاعری کو اور بھی ہندوستانی ہونا چاہئے۔

ان، اور ان جیسے سوالوں کے ساتھ میں نے میر اور اٹھارویں صدی کی اردو شاعری کے علاقے میں اپنا سفر شروع کیا۔ یہ سفر ایسا تھا جس کے لئے کوئی نقشہ میرے پاس نہ تھا یا اگر کوئی نقشہ تھا بھی تو اس میں بنائے ہوئے نشان اور علامتیں اپنے معنی کھو چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ خود شاعروں سے ہی شروع کرنا چاہئے۔ ان شاعروں نے شاعری کی نوعیت کے بارے میں، اور خود اپنی شاعری کے بارے میں کیا کہا ہے؟ ایک بات جو مجھے فوراً معلوم ہو گئی یہ تھی کہ ۱۶۹۰ کے آس پاس سے اردو میں دھیرے دھیرے ایک نئی شعریات اور شاعری بنانے کے نئے اصول سامنے آنے لگے اور اس عمل کا ارتقاء ۱۸۵۷ کا عظیم انقلاع تک رہا۔ ولی (۱۶۶۵ سے کوئی ۱۷۰۷) سے لے کر غالب (۱۷۹۷ سے ۱۸۶۹) تک ہر قابل ذکر شاعر نے شاعری کی اصلیت اور نوعیت کے بارے میں دلچسپ اور اکثر خیال انگیز شعر لکھے ہیں۔ میری دوسری دریافت یہ تھی کہ ان شاعروں کے بعض بنیادی بیانات کو سنسکرت شعریات کی روشنی میں زیادہ اچھی طرح سمجھا جا سکتا تھا۔ مثال کے طور پر، میر نے اکثر اس بات پر زور دیا ہے کہ میری شاعری، پیچ دار اور کئی پہلوؤں والی ہے۔ شاعری کی اصلیت اور حقیقت کے بارے ایسا بیان میں کسی عربی یا ایرانی کتاب میں مشکل سے ملے گا۔ اور جو کتابیں میر کے وقت میں مروج تھیں، ان میں تو ہرگز نہ ملے گی۔

میر کے ان شعروں کو پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ آچاریہ ممٹ نے قول (Utterance) کی جو تقسیم آنند وردھن کی پیروی کرتے ہوئے کی ہے اس کے حساب سے بالواسطہ اور بلا واسطہ قول میں سات طرح کے فرق ہو سکتے ہیں۔ لہذا کسی قول یا بیان کے معنی اس میں استعمال کئے ہوئے لفظوں سے زیادہ یا مختلف ہو سکتے ہیں، میر نے جب اچھی شاعری کے بارے میں کہا کہ وہ تہ دار اور پیچ دار ہوتی ہے تو ان کا یہی مطلب تھا۔

کئی برسوں کے مطالعے کے دوران شاعر میر اور فنکار میر کی خصوصیات اور خط و خال مجھ پر دھیرے دھیرے کھلتے گئے۔ مجھے پتہ چلا کہ کسی بھی رسمی بیان یا کسی مختصر کئے ہوئے لیبل کے ذریعہ میر کو نہیں بیان کیا جا سکتا۔ ان کی شاعری کو پڑھنا سورج کی روشنی کو کسی طیف سے گزرتے ہوئے دیکھنے کی طرح ہے۔ روشنی کا زاویہ جتنی بار بدلتا ہے نئی حقیقت دکھائی دیتی ہے۔ لیکن کسی بھی حقیقت کو آخری اور قطعی نہیں کہہ سکتے۔ میر بیک وقت صوفی بھی ہیں اور پاپی بھی، راجا بھی اور پرجا بھی، عاشق بھی اور عیاش بھی، کڑوے بھی اور میٹھے بھی دانشمند بھی اور دیوانہ بھی۔ انسانی تجربے کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جسے میر نہ

جانتے ہوں اور جسے وہ اپنے شعر میں بیان نہ کر سکتے ہوں۔

میں نے اس انقلاع کا ذکر کیا ہے جو ۱۸۵۷ کے حادثات کے بعد ہماری تہذیب میں رونما ہوا "کا سامراجی پیلنے کا استیلا" یہ فقرہ ۱۸۵۷ کے ایک صدی بعد تک کے اردو ادب اور تصورات کی تاریخ کو کم و بیش بیان کرتا ہے۔ بیسویں صدی کا وسط آتے آتے ایک اور موضوع کا سایہ اردو کے افق پر پھیلنے لگا۔ اردو کے دن اتنے بگڑ گئے کہ اسے بدیسی زبان کہا جانے لگا۔ میری نسل کے اردو ادیبوں نے اپنی زبان کو ملک کی تہذیبی اور سماجی زندگی میں اپنی اہمیت کھوتے ہوئے اور طرح طرح کے الزام اور گالی بھرے ہوئے فقرے سنتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ادب کو علیحدگی پسند اور اس کی روح کو اجنبی بتلایا گیا۔ اس طرح میری نسل کے ادیبوں نے خود کو ایک ایسی زبان میں تخلیق کرنے پر مجبور پایا جسے وہ خود تو ہندوستانیت کا جوہر سمجھتے تھے، لیکن جسے بہت سے دوسرے لوگ فطرتاً علیحدگی پسند، بلکہ ملک کی تقسیم کی اصل بنیاد سمجھتے تھے۔ تخلیقی تحریر ایسے حالات کتنے میں کس طرح پھل پھول سکتی ہے اور نئے لکھنے والے کے لئے ایسے حالات کس قدر دل شکستگی کے ہوں گے، اس کو محسوس تو کر سکتے ہیں بیان نہیں کر سکتے۔ اردو کے مصنف یا ادیب اور اردو زبان کی قوت مقاومت کے لئے تعریف کی بات ہے کہ وہ ان دنوں کو سہ گئے اور ہندوستانی ادب اور ہندوستانی سیاسی سماجی زندگی میں قابل قدر اور فائدہ مند اضافہ کرتے رہے۔

جمہوریت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کو سدھار لیتی ہے اور پچھلی ناانصافیوں کو ٹھیک کر سکتی ہے۔ آج ہماری جمہوریت اردو کے معاملے میں یہی کر رہی ہے۔ دھیرے دھیرے ہی سہی۔

عالی جناب، وزیر اعظم، ہمیں آپ سے بڑی امیدیں ہیں۔ ؟ آپ خود اردو ادب کے شیدائی ہیں اور اردو زبان کے عمدہ جاننے والے ہیں۔ برصغیر کے سب سے بڑے ادبی اعزاز کا ایک اردو ادیب کو دیا جانا اور وہ بھی ایک ایسی کتاب کے لئے جو خاصی لمبی اور مشکل ہے، خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے یہاں ایک صحت مند جمہوریت در گرم عمل ہے۔ شکریہ

انور شعور

تمھارے شہر کے لوگوں کو بے کلی کیا ہے
یہ انتشار ہے کیسا یہ ابتری کیا ہے

کسی سے ترکِ تعلق کے بعد بھی ملنا
غلط ضرور ہے لیکن کبھی کبھی کیا ہے

ہم اپنے حال کا احساس ہی نہیں کرتے
نہ جانے بے خبری ہے کہ آگہی کیا ہے

یہی سوال نہیں ہے فقط کہ ہم کیا ہیں
یہ کائنات ہے کیا اور زندگی کیا ہے

ہنسی جو دیکھ رہے ہو ہمارے ہونٹوں پر
زبانِ حال سے فریاد ہے، ہنسی کیا ہے

شعور ابھی سے یہ خوش فہمیاں یہ امیدیں
ابھی تو بزم میں آئے ہو تم، ابھی کیا ہے

نہ اس گلی میں نہ اس شہر بھر میں کوئی ہے
یہاں سے دور ہماری نظر میں کوئی ہے

کبھی کبھی مجھے لگتا ہے گھر میں کوئی نہیں
کبھی کبھی مجھے لگتا ہے گھر میں کوئی ہے

سنائی دیتی ہیں سرگوشیاں سی رہ رہ کر
مرے مکان کے دیوار و در میں کوئی ہے

کسی وجود کا احساس ہو رہا ہے مجھے
مرے علاوہ بھی شاید کھنڈر میں کوئی ہے

ہمارے سامنے رہتا ہے یہ سوال اکثر
کہ سکھ بھی زندگیِ مختصر میں کوئی ہے؟

شعور شوق نہیں ہے مجھے سیاحت کا
کہ روز و شب مرے اندر سفر میں کوئی ہے

انور شعور

وہ ہوتا نہیں ہے مرے سامنے
مگر دیکھتا ہوں اسے سامنے

بہت ہو چکی اوٹ سے گفتگو
اب آ بیٹھیے آمنے سامنے

تری زلف کے پیچ و خم کھل چکے
معمے ہیں اب دوسرے سامنے

نہیں کم مری بے بسی کے گواہ
لٹا ہوں بھرے شہر کے سامنے

ابھی دور ہے پھر بھی اپنا مآل
نظر آ رہا ہے مجھے سامنے

بہت یاد آتے ہیں وہ لوگ جو
جیئے سامنے پھر مرے سامنے

تمھی انقلابی نہیں ہو شعور
کھڑے ہیں کئی سر پھرے سامنے

توجہ طلب رقص حالات ہے
کبھی روشنی ہے، کبھی رات ہے

بشر نے قدم رکھ دیا چاند پر
یہ اقدام ہے یا کرامات ہے

ذرا صبر اے دل ذرا انتظار
ابھی تازہ تازہ ملاقات ہے

ترے در سے آئی ہوئی خاک بھی
نہایت گراں قدر سوغات ہے

جھلک دیکھ لی اور خوش ہو گئے
فقیروں کی اتنی ہی اوقات ہے

قدم گھر سے باہر نہ رکھنا شعور
بڑی موسلا دھار برسات ہے

انوپا

بے خواب آنکھیں

یہ بے خواب آنکھیں جو راتوں کو چھپ کر
محبت کے معبد میں یوں خون روتیں
ہر اک آنسو کوئی زخم جیسے
یہ رستے سے ناسور کا یوں مقدس
کہ جس دیوتا کے چرن کو
یہ بے خواب آنکھیں یونہی روتے روتے
خراج اپنے خوں کا
کسی دن تو دیں گی اسی سے
اور پھر لہو کی
یہ ناسور کی بوند
برستی رہے گی برسات بن کر
آنگن میں اس کے
جہاں دفن ہیں اس کے معصوم ارماں
کہ جیسے کوئی لے کے انگڑائی
بدلی اٹھی ہو
اتر جانے کی ہے
ان ترستی سی جلتی منڈیروں پہ سایہ سا بن کر
جنہوں نے
محبت کی سب داستانیں سنی ہیں
یہ ناسور کی بوند برسے گی یونہی
درختوں کے ان جھمگھٹوں پہ
کہ جس کے شاداب جھنڈ میں چھپی کوئی کوئل
دھڑکتے دلوں کو ستایا ہی کرتی
یہ بے خواب آنکھیں
خراج اپنے خوں کا کسی دن تو لیں گی اسی سے
کہ جیسے بدلتا ہے موسم
نئے خواب اور نئے زخم لے کر

جب ماں نہیں ہوتی

برف کی سل پر لکھی آیتیں پگھلتی گئیں
لفظ مٹتے گئے
کالکوں میں بجھے پیڑ چپ ہیں
آسمانوں کا نور معدوم ہے
بھکاری کی لاش کی مانند
باہیں پھیلائے لمبی سڑک
جس پر رکشوں بسوں اور ویسپوں کا شور
پناہ گاہ کی جستجو
سرد رات اور خوف سے
آج پھر میں اس دہلیز پر دستکیں دیتی رہی
کہ ماں آئے اور دروازہ کھلے
لیکن وہ دروازہ اب دیوار میں تبدیل ہے

جبر کی دھوپ

زندگی سے لڑوں یا موت کی خواہش کروں
سر پہ سورج اٹھائے
صبح کی جستجو میں اک سی تپ پر
کن اجالوں کے گیت لکھوں
دھوپ سے سہمے سناٹے
گھر میں چھپ کے روتے رہیں
سڑکوں پر چلتے بکھرتے چہروں پر
حیرت ہے زندہ رہنے کی
وقت کی گرفت سے نکلا جاتا ہے چاک مشینوں کا
وحشت میں دوڑ رہا ہے بس کا پہیہ
تم بھی کیسے پاگل ہو ایسے موسم میں
چاہت کی باتیں کرتے ہو
آؤ ہم بھی اپنی زنجیریں تھامے وحشت سے رقص کریں

انوپا

بھیدبھرا سناٹا

سوئی تھیں نہ جاگتی آنکھیں
کس چھایا پتھ میں پیر رکھے اتنی دور نکل آئی
ایسا جل تھل جس کی کوئی اور نہ چھور
سب تاریکیں تند۔بیں بھنور بھنور کے ناچ
اتنے بڑے سمندر میں یوں روز میں کس سے
ملنے جاتی ہوں
مجھے یاد نہیں یہ آنے والے دن ہیں یا وہ جو
گزر گئے
ان سب بچھڑنے والوں میں بس آنکھیں انت میں
رہ جاتی ہیں
جس کا بھید بھرا سناٹا جھانکتا رہتا ہے سوتی جاگتی
آنکھوں میں
کہ رات دعا ہے آس بھرے ہاتھوں میں سوئی ہوئی
رات سزا ہے اپنوں سے بچھڑ کر جانے والوں کی
ہر تیکھا چھنا ہے پتھرائے ہوئے نینوں کی
ہر آہٹ ہے دیر سے واپس آنے والے کی
کون یہ کہتا ہے چپکے سے
اس رات کا کوئی انت نہیں
جاگتے رہنا جاگتے رہنا

ان عورتوں کے نام

فرائڈ اور بودلیر کی اترن سے
لذتیں لکھنا چھوڑ دو
اور تم بھی باورچی خانے میں کھنکناتی ہوئیں
معصوم چوڑیوں سے کھیلنا چھوڑ دو
لکھ سکو تو کبھی اپنی شب عروسی
روح کے ناسور سے بھی لکھو
جسم کے شعبدوں میں
لفظ بھی ہار جاؤ گی
اور جو کچھ بھی نہیں ہے تو اپنے
گزشتہ لمس کو بینت کر رکھ لو
آنے والی کل تک
دیکھنا کہ تم کرنسی پھر بدل جائے گی

کاغذ چننے والا

کاغذ چننے والے لڑکے کو کوڑے کے اس ڈرم میں
اس کے بہت سے خط ملے
جواب کہیں اور بیاہی جاچکی ہے
اور اب وہ بابو کے ہاتھ تھمے اخبار کو
بڑی للچائی نظروں سے دیکھ رہا ہے
اسے کیا خبر کہ اخبار میں
بڑی بڑی سیاسی خبریں چھپی ہیں
اس وقت میرا جی چاہا
میں اپنی ساری کتابیں کوڑے کے اس ڈرم میں
ڈال دوں

پرکاش فکری

مجھ سے سارا حساب مانگے گا
خار دے کر گلاب مانگے گا

شاخ پھوٹے نہ پھر سوالوں کی
کوئی ایسا جواب مانگے گا

عہد گل میں جو اس نے لکھی تھی
شام سے وہ کتاب مانگے گا

اپنے شعروں میں رنگ بھرنے کو
دشت و دریا سراب مانگے گا

جس نے پایا نہ کچھ کہیں فکری
کالی راتوں سے خواب مانگے گا

لمحہ لمحہ زوال ہوتا تھا
زندگی کو محال ہوتا تھا

پتیاں اس کے پاؤں کی بیڑی
جس کو حد کمال ہوتا تھا

عہد حاضر جواب کی خاطر
کوئی مشکل سوال ہوتا تھا

ہر عقیدہ جو واہمہ نکلا
پھر ہوا جو ملال ہوتا تھا

پھر جنوں خیز یہ جہاں ہوتا
پھر لہو میں ابال ہوتا تھا

عمر تشنہ کو بھول کر فکری
بارشوں میں نہال ہوتا تھا

اختر یوسف

۱

مہاراتری کے میلا میں شکتی رقص کرتی ہے
ایک ہاتھ میں دھرتی آکاش دوسرے میں
انگارہ جیسے ہونٹوں پہ ہیں پرلے گیت
آنکھوں میں سات آسماں کے
ٹھہرے ہوئے سمندروں کی سوچ
ہری کے باغ... گلستاں... گاؤں... شہر
طلسم شگاف کی ساحرہ لال قلعہ سے لے کر
جھونپڑ ٹاٹ تک

مات دیتی اپنی ماں خبیثہ؎ کو
کھاتی ہے مردہ شاہ جہاں اور شاہ غراب
کے گوشت

ٹاٹ کے اندر بیڑی بجھ جاتی ہے
کھانسی ہچکی لیتی ہے
کوئی چیخ اٹھتی ہے
سب کچھ تم نے میرا اجاڑا
باغ میرا گلستاں میرا
آسماں اور جہان میرا
وشت ناہنجاران کے درندے
تم طلسم شگاف کی ساحراؤں کی
نسلیں اگاتے ہو
بس دیکھنا
مہاراتری کا میلا آتا ہے
شکتی رقص... پرلے گیت
تم پاتال میں سماجاؤ گے

۲

گھنی تاریک راتوں میں
بارش بیچ چلتے چلتے
اداس رستوں میں آگے جب کچھ دکھتا نہیں
بادل بے تحاشہ گرجتے ہیں... مجھے ڈراتے ہیں
نہ کہیں کوئی پیڑ ہوتا ہے اور نہ جھونپڑی
بس تیز بارش اداس رستے
بادل ڈانٹتے پھنکارتے پھر
بجلی کا ایک جھماکا اور شکتی
تم راستہ دکھا جاتی ہو
خوف بھی مٹا جاتی ہو
گھنگھور گھٹا آلود سیہ راتوں میں
شکریہ تمہارا شکریہ

؎ طلسم ہوشربا کا ایک نسوانی کردار

اختر یوسف

شکتی تمہاری آنکھوں میں سورج چاند ستارے
پہاڑوں آبشاروں اور آسمانوں اور۔ چپ
سمندروں کے اسرار تمہاری آنکھوں میں
پورے چاند کی رات برہمانڈ کے قصے کہتی ہے
اجلی اجلی دھوپ کے
اجلے سناٹوں میں آیتوں اور اشلوکوں کی
اجلی عنبرناک خوشبو پھیلی ہوتی ہے
شکتی تمہاری آنکھوں میں
نشہ پیار کا مجھ کو کوئی جوگ سکھاتا ہے
کاش تمہاری آنکھوں میں
میں ڈوب جاؤں

شکتی گیت سرسنگار ہوا کا مدھم رقص کہ جیسے
باغ میں کلیاں دھیرے دھیرے لب کھولیں
اور چنک
چڑیوں کی بھیگے پتوں کی شہ رگ میں پنا
رنگ گھولیں
شکتی گیت پنا رنگ پکھراج رنگ اور کبھی
یاقوتی رنگ
سورج دریا میں یاقوت پنا اور پکھراج
بس گھلتے جائیں
بہتے جائیں شکتی گیت ہم پربت کے آئینوں میں
چاند بدن اک لہرا جائے
دھوپ سنہرے تھوروں کی پھر جنگل جنگل
مشک پروئے
پھولوں کی سوغات لٹائے شکتی گیت جاڑے کی
ساتا خیز
دوپہروں میں قطرہ قطرہ دھوپ ہماری آنکھوں میں
تھہ ٹھہرے
دھیرے دھیرے نشہ گلابی گھولے پھر نیند وہاں
سے جائے
جہاں سنہرے پیڑوں کے جنگل کے اوپر سبز آسماں
دور دور تک
پھیلا ہو جس کا سورج پنا رنگ اور
سنہرے جنگل کے
پیڑوں میں زمرد یاقوتی اور زردی چڑیاں
جھل مل جھل مل جھل مل جھل مل جیسے تارے
شکتی گیت

عبید صدیقی

اپنے علاوہ تیرا بھرم بھی شہر فنا میں رکھا
میں نے جب اک دیا جلا کر بادِ انا میں رکھا

ساحل سے ملنے کی خواہش اتنی تیز ہوئی
میں نے اپنا تنکا تنکا موج بلا میں رکھا

بزم حسن میں بھیڑ بہت تھی اور میں دیکھ رہا تھا
کس نے فسوں کا کتنا حصہ رنگ حنا میں رکھا

دل صحرا میں ابھر رہے تھے نئے نئے منظر
یادوں کو جب ریت بنا کر تیز ہوا میں رکھا

کون بشر تھا جس کی خاطر میں نے شعر کہے
کس نے ساری عمر مجھے اس دشت صدا میں رکھا

رشتہ اس دن ہوگا مکمل میرا ہوا کے ساتھ
خاک بدن جب اڑنے لگے گی باد صبا کے ساتھ

اپنی سماعت کھو بیٹھیں گے اس بستی کے لوگ
سناٹا وہ پھیل رہا ہے سیل صدا کے ساتھ

شمع وصل کی لو سے جلی ہے ہجر کی راتوں کی مشعل
مجھ کو کیسا زخم ملا ہے خاک شفا کے ساتھ

خوف سے اب تک کانپ رہے ہیں صنم کدوں کے بت
اک دن میں نے باتیں کی تھیں اپنے خدا کے ساتھ

پھولوں بھرے آنگن کی خوشبو چاندنی راتوں کی ٹھنڈک
اک گھر تھا سو خواب ہوا ہے موج بلا کے ساتھ

سلیم اختر

جیسے جیسے موسم سرد ہوتا جاتا سردی کے متوازی جسم کی گرمی میں اضافہ
جاتا اور رگ و پے میں زندگی کی نہر تیز سے تیز تر! پہلی برفباری کے ساتھ
، پھول کی مانند کھل اٹھتا گویا برس بھر کی نیند کی مشقت کے بعد بیداری کی
ت حاصل ہو رہی ہو۔ مسلسل برفباری سے زمین سفید کمبل میں چھپ
ہ۔ شاخوں پر برف کی سفید جھالر سج جاتی۔ پھولوں کے رنگوں میں سفید حاشیہ
ضافہ ہو جاتا اور جھیل کی سبز لہروں میں سفید قلمیں گھل مل جاتیں' تب افق
ق سفید زمین سورج کی مہربان دھوپ میں خوشگوار سانس لیتی۔

۲۵ ر دسمبر --- کرسمس!

خداوند یسوع مسیح کی دنیا میں آمد کا دن۔ وہ مسیح جس نے دنیا کے گنہ
دں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیئے صلیب کو خوش آمدید کہا۔ وہ مسیح
، کی پیدائش کی بشارت کا سن کر ہندوستان' ایران اور عراق کے دانا مجوسی
شلم پہنچے' چرنی میں گھاس کے بستر پر نوزائیدہ کے دیدار سے مشرف ہو کر
عوبت طویل سفر کا ثمر حاصل کیا۔ معصوم صورت ماں اور مسرور باپ کو
رک باد دی۔ سونا' لوبان اور مر کے تحائف نذر کیئے۔ جب وہ شاداں و فرحاں
ے نکلے تو آسماں پر تین روشن ستارے یکجا دیکھے۔ ستارے یوں نیچے جھک
ئے تھے گویا وہ بھی نجات دہندہ کا دیدار کرنا چاہتے ہوں۔ ان کی ملکوتی روشنی
ں کو نور کا غسل دے رہی تھی اس سے بہتر شگون اور کیا ہو سکتا تھا --- نجات
ندہ آگیا تھا اور اسی نجات دہندہ کی آمد کا جشن کرسمس کو منایا جاتا ہے۔
تیوں کی ریت میں عزیزوں' دوستوں اور بہی خواہوں کو تحائف تقسیم کیے
تے ہیں' خیر و برکت کی دعائیں دی جاتی ہیں۔ روشنی سے منور کرسمس کے شجر
ں بچوں کے لیئے کھلونے پھلوں کی مانند لگے ہوتے ہیں۔

آج اسی کا دن ہے۔ برس بعد اس کی آنکھیں خوشی کی روشنی سے چمکتی
ں' وہ برف کے رنگ کے حاشیہ والا دبیز سرخ چوغہ پہن کر لمبی سرخ ٹوپی میں
کے گھنے سفید بال چھپا لیتا ہے' روئی جیسی داڑھی کے بال بکھرے ہیں' وہ اپنا
خ تھیلا اٹھا لیتا ہے ایسا تھیلا جس میں بچوں کے خوابوں کی تعبیریں' خوشبوں
، تحائف' آرزوؤں کے گلاب سبھی کچھ ہوتا ہے۔ خیر و برکت والا یہ تھیلا
ئیاں بانٹنے میں کبھی خالی نہیں ہوتا' اس میں سے ہمیشہ تمنا کے مطابق کچھ نہ
کچھ ضرور نکل آتا ہے۔ باہر برف گاڑی تیار ہے جس میں روشنی سے بھی تیز
قدم دو پھرتیلے رینڈیر جتے ہیں جو اسے دنیا کے ہر گوشہ میں لے جا سکتے ہیں۔ سرد
سے گرم علاقہ میں' باراں سے بے آب خطہ میں' خوش منظر مرغزار سے مردہ
ریگستان میں' وہ سب جگہ جاتا اور بچوں میں خوشیاں تقسیم کرتا ہے۔ چیتل کی
چمکیلی گھنٹی بجا کر وہ خوشی سے نعرہ لگاتا ہے ہاہاہاہا! ہو ہو ہو ہو۔

آج کرسمس ہے۔ برس بعد سانتا کلاس اپنا خوشگوار فریضہ ادا کرنے کو
تیار ہے۔ یہ اس کا دن ہے' سانتا کلاس کے بغیر کرسمس نامکمل رہتا ہے۔

سانتا کلاس چیتل کی گھنٹی بجاتا ہے' نرم باگ ہاتھ میں تھامتا ہے اس کا
اشارا پاتے ہی رینڈیر ہوا ہو جاتے ہیں۔ تیز ہوا سے اس کی داڑھی گویا دو
حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور سر سے بار بار کھسکتی سرخ پھندے والی ٹوپی گویا
سرخ دم والے پرندے کی مانند اڑ جائے گی۔ سردی' سرد ہوا اور سرد فضا اس
کے جسم کی حرارت میں اضافہ کر رہی ہے۔ زمین پر ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو فضا
میں اڑتا محسوس کر رہا ہے۔

جلد ہی سانتا کلاس کی صدیوں پرانی جہاں دیدہ آنکھیں بھانپ لیتی ہیں کہ
اس کرسمس میں سب کچھ ٹھیک نہیں' کہیں نہ کہیں' کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ کسی
چیز کی کمی کا احساس تھا مگر کیا موجود نہ تھا اس کے بارے میں کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا۔
گاڑی کے ساتھ بھاگتے مناظر میں تبدیلی نہ ہو رہی تھی گویا اس کی گاڑی دائرہ
میں بھاگ رہی ہو' شاید ایسا نہ تھا بلکہ دائرہ بھاگ رہا تھا اور وہ اس میں ساکت
تھا' عجیب نامانوس سے احساسات تھے۔ پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھا' عجب فضا'
عجب ماحول' تب احساس ہوا کہ شاید وہ ایک دائرہ میں قید ہے جو کسی بڑے دائرہ
کا حصہ ہے اور وہ دائرہ کسی اور نادیدہ دائرہ کا جزو۔

یسوع مسیح! کیا ہو رہا ہے؟ یہ سب کیا ہے؟ کہیں میں کسی شیطانی چکر
کا اسیر تو نہیں ہو گیا؟ کہیں پلید روحیں تو نہیں مجھے بھٹکا رہیں؟ آخر یہ سب
کیوں ہے؟ یسوع رحم! اگر مجھ سے کوئی نادانی ہوئی ہے تو خداوند یسوع مسیح
مجھے معاف کر دے۔

سانتا کلاس کی گاڑی رک جاتی ہے۔ رینڈیر کی گرم سانسوں سے ان کے
منہ کے گرد بھاپ کے دائرے بن رہے تھے۔ عجیب ویران اور اداس کر دینے

والا مقام تھا۔ سانتا کلاس نے تحائف سے بھرا تھیلا اٹھایا، یہ تھیلا کبھی خالی نہ ہوتا اور ہمیشہ دل کی مرادیں پوری کرتا، سامنے خانہ تاریک تھا۔ سانتا کلاس نے سوچا یہ کیا نامراد مکان ہے جس میں کرسمس شمع روشن نہیں، جو بدبخت کے چولھے کی مانند ٹھنڈا ہے اور جس کی زمین کرمچھ کی کمال کی طرح کمزوری ہے۔ یقیناً یہاں کے ملول مکینوں کو روشنی، حرارت اور خوشیوں کی ضرورت ہوگی۔ سانتا کلاس نے چند لمبے لمبے ڈگ ہی بھرے تھے کہ ٹھٹھک کر رک گیا، اندھیرے کی چادر میں لپٹے مکان کی گندی چوبی سیڑھیوں پر ایک چھوٹی بچی ننھے ہاتھوں میں سر تھامے اداسی اور دل گرفتگی کی تصویر بنی نظر آئی۔

سانتا کلاس نے خوشی کا نعرہ لگایا۔۔ ہا ہا!! ہو ہو ہو ہو!!

وہ چونکتی ہے، لب کانپتے ہیں مگر خاموش رہتی ہے، تاہم بڑی بڑی اداس آنکھیں سوال کرتی ہیں۔

"کون ہو تم؟"

سانتا کلاس زور شور سے گھنٹی بجاتا ہے۔ "مجھے نہیں جانتی؟"

وہ نفی میں سر ہلاتی ہے۔

کمال ہے سانتا کلاس نے تعجب سے سوچا۔ "عجب بچی ہے، جو مجھے نہیں جانتی؟ سانتا کلاس کو؟ اور وہ بھی کرسمس کے دن؟

"میں سانتا کلاس ہوں۔" وہ بالآخر متعارف کراتا ہے اگرچہ اسے یوں اپنا نام بتانا کچھ اچھا نہ لگا۔ بچی کی بڑی بڑی اداس آنکھیں ہاتھوں کی مانند گویا اس کا چہرہ ٹٹولتی ہیں۔

"سانتا کلاس؟" وہ یوں دہراتی ہے گویا لفظ کا ذائقہ محسوس کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔۔۔ "سانتا کلاس!"

"ہاں ہاں! سانتا کلاس" وہ گویا چہک کر اسے یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اسے عدم دلچسپی سے گھور رہی ہے!

سانتا کلاس الجھن میں تھا۔ آج تک کسی بچے نے اسے پہچاننے سے انکار نہ کیا تھا، انکار کیسا۔۔ اسے دیکھ کر تو بچے خوشی سے کھل اٹھتے اور من پسند تحفوں کا تقاضا کرتے، مگر یہ بچی تو اس کے نام تک سے واقف نہ تھی او مسیح! آج کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیسا کرسمس ہے؟

"بیٹی!" سانتا کلاس نے اس کے قریب ہو کر گویا سمجھانے کے لہجہ میں کہا۔

"میں سانتا کلاس ہوں۔"

"سانتا کلاس؟"

"ہاں ہاں! میں کرسمس کے موقع پر بچوں میں کھلونے، تحفے اور خوشیاں تقسیم کرتا ہوں۔"

"کھلونے، تحفے اور خوشیاں؟" بچی نے بے یقینی سے دہرایا۔

"ہاں ہاں!" وہ پرجوش لہجہ میں تھیلے میں ہاتھ ڈال کر بولا "کھلونے، تحفے، خوشیاں۔۔۔ تمہیں کیا چاہئے؟"

"جو چاہتی ہوں مجھے ملے گا؟" اس نے بے اختیاری سے پوچھا۔

"ضرور! ضرور!" سانتا کلاس نے یقین دلایا۔

"مگر کیوں۔۔۔۔؟"

کسی بچے نے سانتا کلاس سے یہ نہ پوچھا تھا۔۔ وہ بولا۔ "اس لیئے کہ میں سانتا کلاس ہوں اور آج کرسمس ہے۔ محبت، امن اور خوشیوں کا دن۔"

وہ تذبذب سے کبھی اسے اور کبھی اس کے تھیلے کو دیکھتی ہے۔ سانتا کلاس کی انگلیاں مناسب تحفہ کے لیئے تھیلا ٹٹول رہی ہیں۔ بچی لمبی سانس لے کر کہتی ہے۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے میرا باپ لا دو۔"

تھیلے میں پھرتا سانتا کلاس کا ہاتھ گویا پتھر میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا؟"

"مجھے میرا باپ چاہیے۔"

"بیٹی! میں سمجھا نہیں۔"

"تم کہتے ہو نا، اس تھیلے میں کھلونے، تحفے اور خوشیاں ہیں۔"

"ہاں" سانتا کلاس کا جوش ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا۔

"بس! تو پھر ٹھیک ہے، اس کرسمس کے موقع پر مجھے اپنا باپ چاہیے۔"

سانتا کلاس نے اسے سمجھانا چاہا کہ باپ کھلونا نہیں جسے خوشیوں کے تھیلے میں سے نکال کر ہاتھ میں تھمادیا جائے۔ وہ سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور بچی کو گود میں بٹھالیا۔ معصوم چہرہ پر سنجیدہ اور سوال کرتی آنکھیں، الجھے بال اور جسم میں غربت کی بو، سانتا کلاس نے پیار سے بچی کے الجھے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"بیٹی! کہاں ہے تمہارا باپ؟"

"مجھے نہیں پتہ۔"

"وہ کام پر گیا ہے؟"

"نہیں!"

"پھر؟"

"وہ ہمارے ساتھ نہیں رہتا۔"

"تو پھر کہاں رہتا ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔"

"کیا وہ مر گیا ہے۔ دیکھو بیٹی! اگر وہ مر چکا ہے تو۔۔۔۔"

"وہ مرا نہیں۔"

سانتا کلاس کا فقرہ ایک عورت کی چھری جیسی تیز آواز نے کاٹ دیا۔ اس نے آنکھیں اٹھائیں، سامنے جوان عورت کھڑی تھی۔ اگرچہ سانتا کلاس نے عمر بھر بچے اور کھلونے ہی دیکھے تھے مگر اس کی جہاں دیدہ آنکھوں کو اسے پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ سردی میں مختصر اور سستا سرخ لباس، ضرورت سے زیادہ کھلے گریبان میں اٹکا سرخ پھول اور سانس میں الکحل کی بو، وہ کولھے پر ایک ہاتھ رکھے، سینہ تانے، پوچھ رہی تھی۔

"مگر تم کون ہو؟"
کمال ہے۔ سانتا کلاس نے پریشانی سے سوچا' یہ بھی مجھے نہیں پہچانتی۔
"بھئی! میں سانتا کلاس ہوں" اس نے سمجھانے کے انداز میں اپنا تعارف کرایا۔
"اوہ! سانتا کلاس" وہ بولی۔ "میں بچپن میں تمہارا ذکر سنا تھا مگر آج تمہارا دیدار نصیب ہوا" وہ مضحکہ خیز لہجہ میں بولی۔
"مگر تم اسے گود میں کیوں لیئے بیٹھے ہو؟" اس نے چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو سکیڑ کر مشکوک لہجہ میں پوچھا۔ "کیا اسے اغوا کررہے ہو؟"
سانتا کلاس نے وضاحت کی۔ "میں ادھر سے گزر رہا تھا تمہاری بچی اداس سی بیٹھی تھی۔ میں اسے کھلونے اور تحفے دینے رک گیا۔
"کیا دے رہے تھے اسے؟" اس نے لاتعلقی سے پوچھا۔
"میں تو۔۔" پھر ایک لمحہ توقف کے بعد بولا۔ "یہ تحفہ میں باپ مانگ رہی ہے۔" اس نے عورت سے پوچھا۔ "کیا ماجرا ہے؟"
"کوئی ماجرا نہیں۔"
"کیا یہ یتیم ہے؟"
"نہیں۔"
"کیا تمہارا خاوند چھوڑ گیا ہے؟"
"نہیں۔"
"تو پھر؟"
عورت کا جسم ایک لمحہ کو کسی کمان کی مانند تن جاتا ہے۔ وہ بولنے کو منہ کھولتی ہے تب اچانک ہی وہ گویا مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہوجاتی ہے' ڈھ جاتی ہے' وہ سیڑھیوں پر بیٹھ جاتی ہے اور پھر اس کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگتی ہے۔ سانتا کلاس آج تک ایسی صورت حال سے دوچار نہ ہوا تھا۔ اسے تو کرسمس کے دن ہمیشہ قہقہے لگاتے بچے اور مسرور والدین ملے تھے مگر آج یہ سب کیا ہورہا ہے۔ وہ اسے تسلی دینا چاہتا تھا مگر نہیں جانتا کہ ایسے مواقع پر کیا کہا جاتا ہے یہ اس کی تربیت میں شامل نہ تھا' وہ خاموش رہا' عورت روتی رہی۔
سانتا کلاس کی گود میں بیٹھی بچی بھی پریشان نظروں سے اسے دیکھتی رہی مگر چپ رہی۔۔ ہارے وہ خاموش ہوئی۔
"معذرت۔" وہ بولی "مجھے یوں رونا نہ چاہیے تھا۔"
سانتا کلاس نے آنسوؤں سے دھلا چہرہ دیکھا' سفید اور لال رنگ دھل جانے کے بعد اندر سے کیسا سچا اور کھرا چہرہ نکل آیا تھا۔ گالوں پر آنسوؤں کی نمکین راہ چمک رہی تھی۔
"بات یہ ہے۔" عورت نے اٹک اٹک کر بولنا شروع کیا۔
"بچی کا کوئی باپ نہیں۔"
"کیوں؟"
"کہ میرا کوئی خاوند نہیں۔"

"کیوں؟"
وہ چڑ کر بولی۔ "سانتا کلاس ہوتے ہوئے تم اتنے احمق کیوں ہو؟"
"اوہ! تو یہ بات ہے۔"
"نہیں" وہ زور دے کر بولی "وہ بات جو تم سمجھ رہے ہو۔"
"تو پھر؟"
"مجھے کئی مردوں نے مل کر خراب کیا اور وہ بھی کرسمس والے دن! یہ بدقسمت کرسمس کے اس حادثہ کا تحفہ ہے۔ کسی نے میری بات پر یقین نہ کیا' میں شریفوں کی بستی سے نکلنے پر مجبور ہوگئی۔۔۔ تنہا!"
"اوہ"
"اب میں اکیلی رہتی ہوں اور اسی طرح روزی کماتی ہوں جس طرح روزی کمانے کا ایک دروازہ میرے لیئے کھلا چھوڑ دیا گیا۔"
سانتا کلاس کا دل درد سے بھر گیا۔
وہ بولے جارہی تھی۔ "اب سمجھے؟ کہ تم اس احمق بچی کو کرسمس کے تحفہ میں باپ کیوں نہیں دے سکتے۔" وہ تلخی سے ہنسی۔ "خود میں بھی نہیں جانتی کہ یہ کس مرد سے ہے۔ وہ کئی تھے' شکاری کتوں کی مانند' کرسمس کی شراب کے نشہ میں اندھے' اپنی ہوس کی بو کے اسیر' میں روئی' چلائی' دہائی دی' مگر نہ کوئی مدد کو آیا نہ شنوائی ہوئی۔" وہ خاموش ہوگئی' پھر آنسو بھری آنکھوں کو مسل کر بولی۔ "اور یہ احمق لڑکی باپ مانگتی ہے اور وہ بھی کرسمس پر!"
سرد خانہ تاریک کی سیڑھیوں پر سر جھکائے وہ تینوں خاموش بیٹھے تھے اپنی اپنی اداسی کے اسیر۔ سانتا کلاس مسلسل سوچ رہا تھا' انھیں تحفہ میں کیا دے؟
وہ اچانک بولی۔ "کیا تم اس کرسمس کے مبارک دن' مجھے میری لٹی ہوئی عزت تحفہ میں دے سکتے ہو؟"
سانتا کلاس نے سر جھکالیا۔
"تو پھر بھاگ جاؤ۔" وہ تلخی سے بولی۔ "یہاں بیٹھے وقت کیوں ضائع کررہے ہو؟"
سانتا کلاس نے اسے بے بسی سے دیکھا۔
"چلو بھاگو!" وہ غصہ سے بولی "کچھ خاص مہمان آنے والے ہیں۔"
اس نے جھپٹ کر سانتا کلاس کی گود سے بچی اچک لی اور اندر چلی گئی مگر دھڑ سے دروازہ بند کرنا نہ بھولی۔
اداس اور ملول سانتا کلاس سیڑھیوں پر بیٹھا رہ گیا۔ کیا چاکلیٹ' کینڈی' ریل گاڑی' موٹر کار' فراک' رنگین جوتے باپ کا نعم البدل ہوسکتے ہیں؟
سانتا کلاس ٹھنڈی سانس بھر کر اٹھا' اسے ہر حالت میں اپنا کام مکمل کرنا تھا لہٰذا سفر میں رہا۔
سانتا کلاس ٹھٹھک کر رک گیا۔ "تم؟"
اس نے اپاہج سے پوچھا۔ سانتا کلاس کو بے بسی میں چھپے چہرہ کے نقوش شناسا سے لگے' شاید بچپن میں اسے کھلونے اور تحفے دے چکا تھا۔ تو یہ کیا؟ سانتا

کلاس کے ہاتھوں کھلونے اور تحفے حاصل کرنے والے بچوں کا یہ انجام ہوتا ہے۔

"ہاں" وہ بولا "میں بھی یہی سوچ رہا ہوں" پھر یک لخت بولا۔ "مجھے یاد آگیا۔۔۔ یقیناً ہم مل چکے ہیں۔"

"اچھا؟" سانتا کلاس خوش ہو کر بولا۔

"بالکل یاد آگیا تم نے بچپن میں مجھے تحفہ دیا تھا۔"

سانتا کلاس خوش تھا کہ اس کا اندازہ غلط نہ نکلا۔۔۔ "کیا تحفہ تھا؟" اس نے پوچھا۔

"تمھیں نہیں یاد؟"

"نہیں تو۔" سانتا کلاس نے وضاحت کی "اتنے تحفے تقسیم کرتا ہوں بھلا کیسے یاد رکھ سکتا ہوں کہ کسے کیا کیا دیا؟"

"اے کاش تم یاد رکھ سکتے۔" وہ آزردگی سے بولا۔

"کیوں کیوں۔ ہوا کیا؟"

اپاہج نے بتایا۔ "تم نے کرسمس کے موقع پر مجھے شاعری کی کتاب تحفہ میں دی تھی۔"

"مگر یہ تو خوبصورت تحفہ ہے۔"

"یقیناً۔"

"پھر تم کیوں ہو؟"

"اس لیئے کہ شاعری کے بجائے کوئی اور تحفہ۔۔۔ مثلاً کھلونے، مٹھائی وغیرہ دے دیتے تو آج میرا یہ حال نہ ہوتا۔"

"شاعری کا اپاہج ہونے سے کیا تعلق؟"

"واقعی کوئی تعلق نہیں۔" وہ تلخی سے ہنسا۔ "مگر میری مثال میں بن گیا۔"

"وہ کیسے؟"

"شاعری کی کتاب نے میرے دل پر گہرے اثرات چھوڑے اور میں ہر وقت شعر کی دنیا میں رہنے لگا۔ تصور پرست اور تخیل مست۔۔۔ یوں میں شاعر بن گیا، حسن اور محبت کے گیت گانے والا، انسان کو انسان سمجھ کر سب سے محبت کرنے والا۔"

"مگر یہ تو بڑی اچھی بات ہے، خرابی کیسے ہوئی؟"

"خرابی یوں ہوئی کہ میں ظالموں کی بستی کا شاعر تھا، ظلم پرستی معاشرہ میں، میں انسان کی عظمت، مساوات اور حقوق کا شاعر تھا۔ میں زندگی میں حسن، خوشی، نغمہ اور الفت کا شاعر تھا مگر یہ باتیں بستی کے ظالموں کو خوش نہ آئیں، جیسے جیسے پھولوں کی مہک کی مانند میرے اشعار کی شہرت پھیلتی گئی ویسے ویسے ہی بستی کے ظالم میرے خلاف ہوتے گئے۔ حتی کہ ایک دن مجھے بے دین اور باغی قرار دے کر، بستی کا سکھ چین غارت کرنے کا جرم عاید کرکے، مجھے اس حال کو پہنچا کر، بستی سے باہر نکال دیا گیا۔"

سانتا کلاس کا جھکا ہوا سر اوپر نہ اٹھ رہا تھا۔

"اب میں اس راستے پر پڑا ہوں راہ کے پتھر کی مانند۔"

"اور تمھاری شاعری؟"

"مجھے سب سے بڑا دکھ یہی ہے کہ میں اب شاعری کے قابل نہیں رہا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔"

"ہاں! کیا تم بھی ایسا ہی سمجھتے ہو۔"

"ہاں! یقینی طور پر!"

"اگر تم بھی میرے ہم خیال ہو تو پھر اسی تھیلے میں ہاتھ ڈالو اور میری گم شدہ شاعری مجھے واپس لوٹا دو! میرے مردہ تصورات میں جان ڈال دو، میں پہلے کی مانند لفظوں کا نبض شناس بن جاؤں۔"

سانتا کلاس سر جھکائے بیٹھا رہا۔

شاعر بولے جا رہا تھا۔ "پہلے میں تخیل کے پر لگا کر ان دیکھی فضاؤں میں پرواز کرتا تھا مگر اب یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ موم کے نقلی پر تھے، نہ بلندی تک لے جا سکتے ہیں نہ تمازت برداشت کر سکتے ہیں۔"

خفت سے سانتا کلاس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کے پاس تو معذرت کے لیئے الفاظ بھی نہ تھے اور پھر وہ کن لفظوں میں شاعر سے معذرت کرتا؟ وہ خاموشی سے بوجھل قدموں سے اپاہج شاعر کے پاس سے اٹھ گیا۔ اب اسے خوش و خرم لوگوں کی تلاش تھی تاکہ تحائف سے بھرا تھیلا خالی کرکے کرسمس کے فرض سے سبکدوش ہو سکے۔

سانتا کلاس ایک پر رونق بستی سے گزر رہا تھا کہ اسے بھیڑ نظر آئی۔ سانتا کلاس بھی کھڑا ہو گیا۔ نورانی چہرہ اور مقدس داڑھی والا مقرر پرجوش اسلوب میں نیکی، عبادت، شرافت، اخلاقی قدروں، مذہب اور خدا کے حقوق کی تفسیر کر رہا تھا۔ وہ بار بار اس امر پر زور دے رہا تھا۔۔۔ یہ زندگی فانی ہے، یہ دنیا نظر کا دھوکا ہے، نیکی کی صورت میں دائمی زندگی کے سفر کے لیئے زاد راہ جمع کر چاہیئے۔۔۔ وہ بڑے موثر لہجہ میں بڑی اچھی نصیحتیں کر رہا تھا۔ مجمع متاثر معلوم ہو رہا تھا کہ سب کی گردنیں اس کے الفاظ سے اتفاق میں ہل رہی تھیں۔ اس نے دعائے خیر پر وعظ ختم کیا۔ سب نے حسب استطاعت اسے کچھ نہ کچھ دیا اور یہ بھی بہت کچھ تھا۔ لوگ رخصت ہو گئے۔ وہ خوشی خوشی پیسے گن رہا تھا کہ آگے بڑھ کر سانتا کلاس نے سلام کیا۔

نورانی چہرہ اور مقدس داڑھی والے مرد نیکوکار نے اسے سر سے پاؤں تک تمسخرانہ انداز میں دیکھا۔

"کون ہو تم؟" وہ روکھے لہجہ میں بولا۔

سانتا کلاس نے اپنا تعارف کرایا۔

"واقعی؟ کیا تم واقعی سانتا کلاس ہو؟"

"تمھیں شک ہے کیا؟"

"دراصل میں تو سانتا کلاس کو بچوں کا ڈھکوسلہ سمجھتا رہا ہوں۔"

"مگر تم دیکھ رہے ہو کہ میں حقیقی ہوں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔"

سانتا کلاس نے کہا۔ "تم اللہ کے نیک بندے ہو' میں تمہارے وعظ سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔"

وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "واقعی؟"

"تمہیں پتہ ہونا چاہیے' سانتا کلاس جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ وہ ایک لمحہ کو ٹھٹکا پھر بولا۔ "پھر میں بھی سانتا کلاس سے جھوٹ نہ بولوں گا۔"

"کیا بات ہے؟" سانتا کلاس نے ہمدردی سے پوچھا۔

"دراصل ---- دراصل مجھے خود اپنے کہے پر اعتماد نہیں۔"

"کیا مطلب ---- کیا تم مذہبی نہیں ہو؟"

"یوں سمجھو! میں بے مذہب نہیں ہوں۔"

سانتا کلاس اسے گھورتا رہ گیا۔

وہ مسکرا کر بولا -- "سمجھے میری بات؟"

"بات تو سمجھ گیا ہوں مگر اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ خوشگوار نہیں۔"

"بالکل" وہ یقین سے بولا۔ "خود مجھے بھی اس کا احساس ہے۔"

"مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ یہ ہے کہ مذہب میرا پیشہ ہے' میرا روزگار ہے اور بچوں کا پیٹ پالنے کا ذریعہ ---- بس! اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

"تم کہنا چاہتے ہو کہ تم منافق ہو۔"

"نہیں! میں منافق نہیں' سچا عقیدہ ہے میرا۔"

"تو پھر؟"

"اسے یوں سمجھ لو کہ میرے پاس جوش خطابت ہے مگر عقیدہ کا جوش نہیں' میرے قول و فعل میں تضاد ہے' اپنی نصیحتوں پر میں خود عمل نہیں کرتا۔"

"چلو یہ بھی بڑی بات ہے کہ تمہیں اس کا احساس تو ہے۔"

وہ افسردگی سے بولا۔ "نہ صرف احساس ہے بلکہ دن بدن اس احساس کی شدت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے مگر کیا کروں۔ مذہب کی روح کو میری روح سے مناسبت نہیں۔" وہ ایک لمحے کے لیئے خاموش ہوا' پھر بولا۔ "یوں سمجھو کہ میں پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر چلنے بلکہ بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں" وہ پھر خاموش ہو گیا' تب سانتا کلاس کے دونوں ہاتھ تھام کر منت بھرے لہجہ میں کہنے لگا۔ "کیا تم میرے دل میں مذہب کی روح پیدا نہیں کر سکتے؟" وہ پرجوش لہجہ میں بولا۔ "میں سچا مذہبی انسان بننا چاہتا ہوں' خدا کا نیک اور عاجز بندہ! اگر مذہب کی روح اور میری روح ہم آہنگ ہو جاتی ہے تو مجھے سکون مل جائے گا ---- کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا تمہارے تھیلے میں میرے لیئے کچھ بھی نہیں؟ کہ آج ---- کم از کم آج کا کرسمس تو میں سچے مذہبی کے طور پر منا سکوں۔ کتاب کے الفاظ کے مطابق نہیں بلکہ ان الفاظ کی روح کے مطابق زندگی بسر کروں' سچا مذہبی بن کر!

سانتا کلاس نے اس دکھی مذہبی مقرر کو گلے لگا لیا۔ وہ اسے تسلی دینا چاہتا تھا مگر اسے ایسے لوگوں کو تسلی دینے کا فن نہ سکھایا گیا تھا۔ وہ تو صرف بچوں میں کھلونے مٹھائیاں اور تحفے میں تقسیم کر سکتا تھا۔

"خدا تمہاری مدد کرے۔" اس نے بمشکل کہا اور چل دیا۔

"ٹھہرو" دو قدم چلا تھا کہ اس نے آواز دی ---- سانتا کلاس نے مڑ کر دیکھا۔ "کیا بات ہے؟"

"سانتا کلاس" وہ بولا "تم اگر واقعی کرسمس کے تحفے تقسیم کر رہے ہو تو میری طرح ایک اور شخص بھی تحفہ کا طلب گار ہے۔"

"وہ کون؟"

"میرا دوست -- ہم دونوں نے اکٹھے عملی زندگی شروع کی تھی میں مذہبی بن گیا اور وہ مجرم۔"

"تو؟"

"تم اسے ملو! اگر تم اسے راہ راست پر لا سکے تو سمجھ لینا کہ یہ کرسمس ضائع نہیں گیا۔"

سانتا کلاس نے مجرم کو اور مجرم نے سانتا کلاس کو تلاشی لینے والی نظروں سے دیکھا۔ اس کے ہونٹ کوئی طنزیہ بات کہنے کو استہزائیہ انداز میں کھلے مگر انہیں سختی سے بند کر لیا' لیوترے چہرہ پر لکیر کی مانند۔ سانتا کلاس تذبذب میں تھا' وہ اب تک بچوں سے ملتا آیا تھا جو اسے دیکھ کر خوشی سے قہقہے لگاتے' وہ انہیں تحفے دیتا' بہتر مستقبل کی دعائیں دیتا اور اپنی راہ لگتا مگر یہ عجیب کرسمس تھا کہ ایسے ایسے لوگوں سے ملنا پڑ رہا تھا جن کے لیئے اس کے سدا بہار تھیلے میں کچھ بھی نہ تھا۔ سانتا کلاس نے نرمی سے پوچھا۔ "میں تمہیں تحفہ میں کیا دے سکتا ہوں؟"

"کیا تم وہی ہو جو نظر آ رہے ہو؟"

"تمہیں شک ہے کیا؟"

"دراصل میں تو سانتا کلاس کو بچوں کو بہلانے والی چیز سمجھتا رہا ہوں۔"

"تم بھی تو خداوند یسوع مسیح کی نظروں میں بچے ہی ہو۔"

وہ یہ سن کر لرز گیا اور کانپتی آواز میں بولا۔ "ہاں ہاں بے شک" سانتا کلاس سکون سے اسے دیکھتا رہا۔

وہ عجب کرب ناک لہجہ میں بولا۔ "میں بچہ تھا' بہت برس پہلے' شاید صدیوں پہلے' جب میں معصومیت سے قہقہہ لگا سکتا تھا اور بھولپن سے سوال کر سکتا تھا' جب میں نادانیاں کر سکتا تھا مگر اب نہیں' اب تو میں سخت دل مجرم بن چکا ہوں۔"

سانتا کلاس صبر سے سنتا رہا' وہ بتا رہا تھا۔

"کون سا جرم ہے جو مجھ سے سرزد نہیں ہوا؟"

"جب یہ احساس ہے تو تائب ہو جاؤ۔"

"میں تو تائب ہونا چاہتا ہوں مگر ہو نہیں سکتا۔"

"کیوں؟ خدا کے گھر کے دروازے سب کے لیئے کھلے ہیں۔"

"میں گیا تھا اعتراف گناہ کے لیئے' مقدس مریم کے مجسمے کے سامنے' موم شمع بھی روشن کی' تبرکات نہ بنی۔"

"کیوں؟"

"جرائم نے میرا ضمیر مردہ کردیا ہے تم بنجر زمین میں پھول نہیں کھلا سکتے۔" اس نے سانتا کلاس کو اداس آنکھوں سے دیکھا۔ "یہی میرا حال ہے' میں توبہ کرتا ہوں مگر مجرم آنکھوں سے گناہوں کو دھو دینے والے پشیمانی کے آنسو نہیں بہتے۔" اس نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "میں دعا کے لیئے ہاتھ اٹھانا چاہتا ہوں مگر یہ مجرم ہاتھ جیسے کسی اور کے --- مجھ سے بھی بڑے مجرم کے ہاتھوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں" وہ چیخ کر بولا "سانتا کلاس کیا تم میرے دکھ کو سمجھ سکتے ہو؟ میں تائب ہونا چاہتا ہوں مگر توبہ کر نہیں پاتا۔"

سانتا کلاس نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں اسے کیا دے سکتا ہوں؟ سوائے دعا کے وہ بڑبڑایا۔ "توبہ قبول تو بعد میں ہوتی ہے پہلے توبہ تو ہو جائے..."

سانتا کلاس نے کرسمس کی جس صبح کا آغاز بڑے جوش' خوشی اور تیاریوں سے کیا تھا اب شام کے پھیلتے سایوں کی مانند اس کے دل پر بھی اندوہ کے سایے پھیلا رہی تھی۔ اس نے اپنے دل کو حرماں کی مٹھی میں پایا' سانتا کلاس نے آسمان کو دیکھا اور پھر سینہ پر صلیب کا نشان بنایا۔ یہ کیسی دنیا ہے اور یہ کیسے لوگ ہیں اور یہ کیسا کرسمس ہے جس میں کھلونوں' مٹھائیوں اور تحفوں سے بھرا تھیلا خالی رہ گیا۔ اس کا اداس دل غم سے معمور تھا۔

"اے" اسے خشونت بھرے لہجے میں پکارا گیا۔

سانتا کلاس نے مڑ کر دیکھا' قانون کے محافظ کھڑے تھے۔ "ابے کون ہو تم؟"

"میں" سانتا کلاس نے حیرت سے سوچا' بھلا ایسا کون ہے جو مجھے بھی نہ جانے؟

"ہاں ہاں تم! کون ہو اور ادھر کیا کرتے پھر رہے ہو؟"

"بھائی میں سانتا کلاس ہوں۔"

وہ قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک بولا۔ "سانتا کلاس --- سالے تم تو مجھے بہروپیے لگتے ہو۔"

"بہروپیے نہیں تو پھر مسخرا۔"

"اور یہ تمھارے تھیلے میں کیا ہے؟" ایک نے پوچھا۔

سانتا کلاس کا جواب سننے سے پہلے دوسرا بولا۔

"یقیناً' چوری کا مال ہوگا۔"

"دکھاؤ تو۔"

"بھائیو! اس میں بچوں کے لیئے کھلونے' مٹھائیاں اور تحفے ہیں۔"

ایک نے اس کی نقل اتاری۔ "بچوں کے لیئے کھلونے' مٹھائیاں اور تحفے ہیں --- حرامی! چور کہیں کا۔"

اس کے ساتھی نے سانتا کلاس کو گردن سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

"چلو! انصاف گھر لے چلو اسے۔"

"مگر کیوں۔" اس نے احتجاج کیا "میں سانتا کلاس ہوں اور سانتا کلاس انصاف گھر نہیں جاتا۔"

"انصاف گھر نہیں جاتا تو کیا چکلے جائے گا۔"

سب نے قہقہے لگائے۔

"تلاشی تو لو اس سالے سانتا کلاس کی۔" ایک نے تمسخر سے کہا۔

"ہم بھی تو دیکھیں کہ اس نے بچوں کے لیئے کون کون سے کھلونے مٹھائیاں اور تحفے چرا رکھے ہیں۔"

تلاشی پر سانتا کلاس کے تھیلے میں سے کچھ بھی نہ نکلا۔ تب اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں اور لے چلے اسے انصاف گھر! ◢◢

مصطفیٰ ارباب

وگ نہیں جانتے

ھوڑ دو
سی سے ملنا نہیں چاہتا
لڑکی سے بھی نہیں
یرے لیئے
ضروری ہے
ے کہہ دو
تمھارے دیئے ہوئے
کے ساتھ
ُو بسر کر رہا ہوں

پنے پچھتاوے کو
ٹ بنا کے گلے میں ڈال لو
تمھیں یاد دلاتا رہے گا
کون تھا
رے پاس

بھی نہ آئے
انتا ہوں
رخی شائستگی کے خلاف ہے

ک نہیں جانتے
دکھ بھرا ہوا ہے

دو بدن

مجھ میں
ادھوری لذت سو رہی ہے
میں
اس کی نیند کو
طول دینا چاہتا ہوں
لیکن ایسا ممکن نہیں
اپنے طے شدہ
نامعلوم اوقات میں
یہ بیدار ہو جاتی ہے
اپنی تکمیل کی جستجو میں
اس بدن کے
حصول میں لگ جاتی ہے
جس میں
ادھوری لذت کا
بقیہ حصہ سویا ہوا ہے

دو بدن
لذت کے یرغمالی ہوتے ہیں
آپ ان پر
فرد جرم عائد نہیں کر سکتے

ٹریفک

وہ عورت
کبھی کسی کی جانب
نہیں دیکھتی
نہ ہی

کسی سے بات کرنا پسند کرتی ہے
اس کے چہرے کی جلد
مرجھا گئی ہے
اعضاء کا تناسب
اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے
وہ
ڈپارٹمنٹل اسٹور سے
اشیاء خرید کر
خاموشی سے
لوٹ جاتی ہے
کوئی مرد
اس پر ایک نگاہ سے زیادہ نہیں ڈالتا
وہ عورت
ٹوٹ پھوٹ چکی ہے
نہ جانے
اس پر سے
کتنے مرد گزر چکے ہیں

تازہ محبت کی ایک نظم

ایک لڑکی نے
مجھے بہت سی محبت دی
لوگ اس کا ذرہ پا کر بھی
خوش ہو جاتے ہیں
جب کہ میں
اسے دیکھ کر گھبرا گیا
یہاں کوئی بھی شے فراوانی سے نہیں ملتی
میں
قلیل عرصے میں
اتنی ساری محبت کو
استعمال نہیں کر سکتا
اور نہ ہی
کسی دوسرے کو دے سکتا تھا
وہ صرف میرے لیئے تھی
تازہ محبت
دیر تک پڑی رہے
تو اس میں
بساند پیدا ہو جاتی ہے
میں نے
محبت کو زیادہ عرصے تک
استعمال کرنے کے لیئے
اسے
آلوچوں کے ساتھ
دھوپ میں سکھانے کے لیئے رکھ دیا

مصطفیٰ ارباب

نظم

مجھے
روشنی کی راہداری نہیں ملی
میں چلتے چلتے
تھک چکا ہوں
اجالا بہت دور ہے
مجھ سے
مزید نہیں چلا جاتا
سناٹا اپنے اندر
بہت کچھ سمائے ہوئے ہے
میں اس سمت سے
منہ پھیر لیتا ہوں
جہاں سے
روشنی ملنے کی امید ہے
میرے عقب میں
اندھیرا ہے
گہرا اندھیرا
وہ مجھ سے بغل گیر ہو جاتا ہے
اس کے اندر
ایک تیز چمک ہے
اتنی تیز
کہ روشنی میں بھی نہ ہوگی
ملاقات
محبت کا اولین زینہ ہے

ہم دوست بن جاتے ہیں
اب میں
سارا دن سویا رہتا ہوں
اور
رات میں جاگ پڑتا ہوں

جنگ

میں
ایک نئی جنگ کا سپہ سالار ہوں
دونوں افواج
آمنے سامنے آنے تک
میرے ہی زیر کمان رہتی ہیں
میں دونوں سے
مکمل انصاف کرتا ہوں
ایک فوج کے جنگی راز
دوسری فوج کو نہیں بتاتا
دونوں کے جنگی نقشے
میں ہی ترتیب دیتا ہوں
یہ جنگ
کسی فلم یا ڈرامے کی
ریہرسل نہیں ہوتی
ایک حقیقی جنگ ہوتی ہے

میں ایک پہاڑی سے
انھیں لڑتے ہوئے
دیکھتا رہتا ہوں
جنگ کے اختتام پر
ایک واضح نتیجہ نکلتا ہے
ایک شکست
مجھے مار ڈالتی ہے
ایک فتح مجھے زندہ کر دیتی ہے
ایک اور جنگ کے لیے

میں نے جو چاہا

میں نے جو چاہا
وہ ہو گیا
یہ اور بات ہے
اس ہونے میں کتنے برس صرف ہوئے
میں نے
اس خوب صورت لڑکی کے ساتھ
کتنا وقت بسر کیا
یہ بات کوئی وقعت نہیں رکھتی
میں اس کے پاس گیا
اسے چوما
اور اپنے بازوؤں میں بھر لیا
سرشاری کہاں سے شروع ہوتی ہے
یہ میں نے جان لیا
اس کی حد کہاں ختم ہوتی ہے
یہ بھی معلوم ہو گیا
اب زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں

ہمارا بھائی

(ثروت حسین کی یاد میں)

آپ
ہمارے بھائی کے متعلق
معلوم کرنا چاہتے ہیں
وہ
گھر پر نہیں ہے
اور دکھ کے بارے میں
وہی بتا سکتا ہے
کہ کتنا گہرا ہوتا ہے
اسے
یہ بھی معلوم ہے
محبت کتنی نوکیلی
اور کتنی میٹھی ہوتی ہے
ہم سے کوئی سوال مت کریں
ہم سیلف میڈ لوگ ہیں
آپ کی تشفی
ہمارا بھائی ہی کر سکتا ہے

جو آج کل
اندھیری سرنگ میں
ایک لانگ ڈرائیو پر نکلا ہوا ہے

حارث خلیق

خوف

رات کا خوف نہیں
رات تو کٹ جائے گی
ان گنت ہجر کی راتوں میں سے
اک رات ہے یہ
جو کہ ہر رات کے مانند
حریم جاں میں
شام ڈھلتے ہی اتر آئی ہے
آنکھوں آنکھوں میں بسر ہو
کہ حسیں خوابوں میں
جاگتے سوتے ہوئے رات گزر جائے گی
رات کا خوف نہیں
رات تو کٹ جائے گی
ڈر کوئی مجھ کو اگر ہے
تو وہ دن کا ڈر ہے
دن جو نکلے گا مجھے گھر سے نکلتا ہو گا
ایک اک لحہ جانکاہ سے گا مجھ کو
ایک ادبار مسلسل سے گزرتا ہو گا
جانے کس کس سے مجھے اپنی طبیعت کے خلاف
خندہ برلب بصد اخلاق سے ملتا ہو گا
ہر جفاکار، ستم پیشہ و زر کش کے حضور
جسم تو جسم مری روح کو جھکتا ہو گا
اور احساس کے اس شعلۂ سوزاں کے طفیل
کرب کی آگ میں دن بھر مجھے جلتا ہو گا

رات کا خوف نہیں
رات تو کٹ جائے گی
ڈر کوئی مجھ کو اگر ہے
تو وہ دن کا ڈر ہے

یہ ہوا کہ موسم گل
کسی شاخ پر نہ اترا
کہ سکوں بھی رائیگاں ہے
یہ جنوں بھی رائیگاں ہے
جو یقین ہے بہ ظاہر
وہ بھی عالم گماں ہے
اسے یاد بھی نہ رکھا
اسے بھول بھی نہ پائے

کراچی- میرا شہر

ایسی شدت ہے اب کہ موسم میں
بچ کے جائیں تو کس طرف جائیں
آگ سے موت ڈھالتا سورج
آخری سائباں میں اترا ہے
خوف اس شہر بے نہایت کی
ہر گلی، ہر مکاں میں اترا ہے

کیا مگر کیجئے کہ وحشت میں
خون ناحق کے رنگ لانے کا
وہ پرانا خیال دل افروز

پھر مرے جسم وجاں میں اترا ہے
جیسے حرف خدائے ذوالاجلال
قلب پیغمبراں میں اترا ہے
ذوالجلال

دکھن

راتیں بھولیں باتیں بھولیں
ہر اک مورت سبھی کی صورت
جھوٹے سچے سارے قصے
اور اقرار کی لمبی صدیاں
مے کی آگ میں خاک ہوئیں
دل کی پھانس بنے وہ دو پل
جب ان نے انکار کیا

حارث خلیق

ایک پرانا گیت

نیند نہیں آتی ہے مجھ کو
پاؤں کس کل چین

آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹے
کتنے ہی دن رین

اس سے بچھڑ جانے پہ کیا تھا
روئیں رونے نین

بھول گیا ہر بات میں لیکن
بس اس کے دو نین

پارہ

بے قراری قرار ہے مجھ کو
ایک پل بے شمار ہے مجھ کو

ایک وہ بھی نہیں بزار ہے وہ
جس کی خواہش بزار ہے مجھ کو

جاں کی وحشت سے میں ہوا برباد
کیا بے بس ہوں، کسقدر آزاد

اداسی کی ایک نظم

اسے یاد بھی نہ رکھا
اسے بھول بھی نہ پائے
کسی راہ بے ثمر میں
جو ہنر تھے آزمائے
کسی جادۂ جنوں میں
شب و روز سب گنوائے
اسے یاد بھی نہ رکھا
اسے بھول بھی نہ پائے

وہ جو غم تھا بیش قیمت
اسے سینت سینت رکھا
نہ تو پوری نیند سوئے
نہ ہم آنسوؤں سے روئے
تھے خوشی کے چند لمحے
سو غم جہاں میں کھوئے
اسے یاد بھی نہ رکھا
اسے بھول بھی نہ پائے

باتوں باتوں میں

کیا خبر اُن سے بھی اندھیرے میں
بس ہمارے خیال کے جگنو،

چھپ چھپ نظر ملاتے ہوں
روشنی کی جھلک دکھاتے ہوں

تازگی جس کی کم نہیں ہوتی
وہ پرانی کتھا سناتے ہوں
رات بھر بے طرح جگاتے ہوں
اُن سے معلوم کر کے دیکھیں گے

ہمارا گھر

ایک روشن دان تھا جس میں سلاخیں نصب تھ
روشنی تھی کم، ہوا کا بھی گزر زیادہ نہ

چار دیواری تھی جس میں کوئی بھی کھڑکی نہ
ہم جہاں پیدا ہوئے اس گھر میں دروازہ نہ

رہنے والے خود کو برتر بھی سمجھتے تھے بہ
ان کو اپنی بدنصیبی کا کچھ اندازہ

مہدی جعفر

بعد جدیدیت کو پوری طرح پھیلا کر احاطہ و ادراک میں لانا دشوار
ں سے بھی زیادہ مشکل مابعد س جدیدیت کی تحریری تشکیل ہے۔ وجہ یہ
ابعد جدیدیت مختلف النوع علوم و فنون خصوصاً نئے بنتے ہوئے سیاسی اور
ظاہر کو مافوق انداز یا ارتفاع کے ساتھ احاطہ کار میں لانے کا دعویٰ کرتی
ر اس تحریک کے ضمن میں جو کچھ لکھا گیا وہ غیر مکمل، کہیں واضح، کہیں
ہ۔ اسی لیے بعض لوگوں نے کہا کہ مابعد جدیدیت ابھی تشکیلی مرحلے
۔ جب اس کا تقابل جدیدیت سے کیا جاتا ہے تو خیال آتا ہے کہ مابعد
ی کہیں جدید تر یا جدید ترین عصری فن تو نہیں ہے جس میں فنی روایت
جدیدیت کی مشترک ارتقائی صورت کار فرما ہے۔ جس کی بنیاد پر اس کی
یا محیط الارضی (GLOBALISATION) ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے
قین جو مابعد جدیدیت پر کتابیں لکھ رہے ہیں مابعد جدیدیت کی ماہیت
لے میں شک بھی پیش کرتے ہیں اور ان میں چند اپنے آپ کو مابعد جدید
تے۔ مثال کے طور پر اسکاٹ لیش (SCOTT LASH) اپنی
Sociology of Postmodernism (۱۹۹۰) میں لکھتا ہے۔

یں مابعد جدید قبیل کا نہیں ہوں۔ میں چند اہم خصوصیات کی
بنا پر ایک عوامی اور تجارتی ذوق کا حامل ہوں۔ میرا خیال ہے کہ
مابعد جدید کلچر نے سیاسی بائیں بازو کے لیے سازگار توازن نہیں
پیدا کیا جبکہ جدیدیت نے بائیں بازو کی ثقافتی جدوجہد کے لیے
زیادہ سازگار میدان بنایا ہے۔ پھر بھی میں اس تصنیف میں دکھانا
چاہتا ہوں کہ ثقافتی نشیب و فراز کے سنگلاخ علاقے جہاں
ہماری رہائش ہے، ہمارے کام ہیں، ہماری محبتیں اور آزمائشیں
ہیں اس پر مابعد جدیدیت کا اثر ہے۔ یہ درست ہے کہ بائیں بازو
کی اس سے بے اعتنائی نا سمجھی کی بات ہوگی۔

برائن میک ہیل (BRIAN McH...) اپنی کتاب Constructing postmode... (۱۹۹۲) کی ابتدا اس طرح کرتا ہے۔

س میں کوئی شک نہیں کہ کوئی "چیز" ایسی نہیں ہے جسے مابعد
جدید کہا جا سکے۔ کم سے کم کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے "باہر
دنیا" میں ایک شے کی طرح پہچانا جا سکے۔ ایسی دنیا جو علاقائی
ہے، جو اپنے حدود میں بند سی ہوئی ہے، جو معائنے کیلئے کھلی
ہوئی ہے، جس میں ایسے ساز و سامان ہیں جن کے متعلق ہم
بھی متفق ہیں۔۔۔ مابعد جدیدیت کا وجود بیانیہ ہے۔ یہ وجود وہ
کلام" (ڈسکورس) ہے جو مابعد جدیدیت کے بارے میں اور

اس کے استعمال کے سلسلے میں ہم خلق کرتے ہیں۔ مابعد
جدیدیت لسانی کھیلوں کا اکھاڑا بن گئی ہے۔

ہمارے یہاں بھی "دوسرا" بیانیہ بالمقابل اعلیٰ بیانیہ (بیانیہ اعظم) یعنی ما
بعد جدیدیت بالمقابل جدیدیت کی (غالباً غیر ضروری) تشکیل نظر آنے لگی
ہے۔ ایک مغربی ناقد نے جیمس جوائس کی مشہور تصنیف ULYSSES کا پہلا
نصف حصہ جدید قرار دیا ہے اور دوسرے نصف کو مابعد جدید کے کلام میں ڈال
دیا ہے۔ اس طرح نئے بیانیہ کو 'دوسرے' کی متنازع جہتوں کے تجزیہ یا جوہر کو نئی
اور آسان ہیئت میں پیش کرنا مابعد جدیدیت کی وجودیاتی شعریات (-ONTO
LOGICAL POETICS) قرار دیا گیا ہے۔ یہ رویہ یا رجحان یا تحریک
جدیدیت کی علمیاتی شعریات (EPISTEMOLOGICAL POETICS)
(یعنی طریقہ کار، بنیادی علمیت اور فنیت) سے مختلف ہے جس میں بیانیہ اعظم
کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جدیدیت کی افہام و تفہیم کے لیے خاص
شعور کی اہمیت ہے۔ مخصوص قاری کی جگہ کے بجائے مابعد جدید کلام یا
ڈسکورس عام قاری کی سطح پر اترتا ہے۔ مابعد جدیدیت میں بیانیہ اعظم سے
احتراز اور 'دوسرے' یا نئے بیانیہ کی تخلیق پر زور ہے جس کی بنیاد پر علاقائی بیانیہ
اعظم کا عطر کشید کر کے نئے بیانیہ کی رقت سے عالمیت کی سیاسی مرکزیت تعمیر کی
جا سکے۔ کیا یہ وحدۃ الاقوامیت کا وہ انداز نہیں ہے جو بالآخر مغربی سیاسی قطب
(POLE) کو قوی کرتا ہے تاکہ مغربی ملک کے خواص کی اعلیٰ بیانیہ والی
اقلیت ساری دنیا کے عوام کے کثیر الجہت اور مختلف السمتی کلچر پر اپنی مہر ثبت کر
سکے؟

برئن میک ہیل لکھتا ہے۔

(۱) سازشی کج ذہنی (سازشی رویہ) تکراری ثقافتی منظر ہے۔
امریکی سیاسی زندگی خصوصی طور پر اس کا عکس ہے۔ جس
میں مخالف نورانیت (یعنی مخالف روشن معرفت) (ANTI
ILLUMINISM) مخالف میسونزم (ANTI MASONISM)
مخالفت یعنی ان جدیدیوں کی مخالفت جو آزاد ریاستوں سے
محکوم ریاستوں کو جدا کرتی ہیں)، مخالف کیتھولی سزم (یعنی
مذہبی بنیادوں کی مخالفت)، مخالف کمیونزم وغیرہ وغیرہ کی
متواتر لہریں چلتی ہیں۔
(۲) اعلیٰ معاشروں کی کش مکش کی تمام نمائندگیوں کے پیچھے یا
نیچے، مواد کی سطح پر، ایک سیاسی اور ثقافتی جنگ جاری ہے۔
(۳) مابعد جدیدیت کے میدان میں سازشوں کی روایتوں سے

بر آمد اور مشکل تھیوریاں بر سر عمل معلوم ہوتی ہیں۔ اسی انداز میں مختلف النوع ہائی ٹیک کام کرتا ہے۔ اور یہ سب عصری دنیا کے انتظاموں کی وہ "شکلیں" ہیں جو دور دراز علاقوں تک پہونچتی ہیں/پہونچائی جاتی ہیں۔

چنانچہ hi tech کے سپر کمپیوٹر اور سٹیلائٹ اور دوسری ایجادات کے ذریعے خارجی دنیا کی باریک سے باریک نقشہ آرائی (MAPPING) ممکن ہے۔ یہاں تک تو سب خیریت ہے۔ مگر جب خارجی دنیا پر برتری حاصل کرنے اور اسے قابو میں لانے کے لئے ہائی ٹک 'وحدالاقوامی سیاست کا آلۂ کار بن جاتا ہے تو فکر مندی کی بات ہے۔ عالمی سیاست کا سب سے بڑا مسئلہ داخلی نقشہ تعمیر کرنا (SUBJECTIVE MAPPING) ہے۔ مخفی ثقافت اور مخفی معاشرت کا نقشہ بنانے کے لیے کوئی داخلی سپر کمپیوٹر یا سٹیلائٹ موجود نہیں ہے۔ نہ ہی شاید ہو سکتا ہے۔ کیا بھروسا بہتے دریا میں ایک سازشی کنیا ڈالی گئی ہو تاکہ دنیا بھر کے مخفی معاشروں کے اپنے فنکار 'دوہرے' "دوسرے" یا نئے بیانیہ کے ذریعے خود ہی اپنی معاشرت کی دنیاوی قوت کو کہانی کی شکل میں طشت از بام کر دیں تاکہ عالمی سازشوں کی خاطر داخلیت کی نقشہ سازی (Subjective mapping) میں کامیابی ہو۔ اس حصول کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ دنیا بھر میں جگہ جگہ معاشرتی کش مکش اور تصادم کو ہوا دی جائے، آپس میں بغض و نفرت کے شعلے بھڑکیں تاکہ "چیزیں" برہنہ ہو کر سامنے آجائیں۔ یہ صورت حال بیحد خطرناک ہو سکتی ہے مگر کس کے لئے؟ اس شک اور فکر مندی کو نظر انداز کرتے ہوئے آیئے نئے (یا دوسرے) بیانیہ کے سلسلے میں کچھ کلام کر لیں۔

مابعد جدیدیت کی پہلی مشکل ایسے نئے بیانیہ کی تشکیل ہے جس میں حقیقت اور دروں بینی، اعصابی ردِ عمل، مافوق الفطرت احساسات، ٹھکوئیٹی (غیر معروضیت)، باہری دنیا سے تغافل کی تارحیت، سرعلوم، مابعد الطبیعات، سازشی عوامل، 'دوسرے پن' 'دوہرے پن' وغیرہ وغیرہ کا ارتقائی کلام (ڈسکورس) قائم ہو سکے۔ مسئلہ یہ بھی ہے کہ نیا بیانیہ اعلیٰ بیانیہ سے کس طور پر متغائر ہو کہ عوام کی سطح پر فکشن کرتے ہوئے تمام فائق احساسات کا ماحصل پیش کر سکے۔ فوری طور پر اعلیٰ بیانیہ سے مکمل خلاصہ ممکن نہیں۔ ان سب کے باوجود اعلیٰ بیانیہ اور نئے بیانیہ کا ڈسکورس خاصا دلچسپ ہے۔ آیئے ہم دونوں طرح کے بیانیہ کا امتیاز سمجھنے کی کوشش کریں۔ چونکہ مابعد جدیدیت کا ڈسکورس فن و ادب کے علاوہ بیشتر علوم و فنون کی 'دوسری' سطحوں کو اپنے احاطۂ کار میں لاتا ہے اس لئے فی الحال ہم ادبی اعلیٰ بیانیہ سے گریز کرتے ہوئے کسی دوسری شاخ کے اعلیٰ بیانیہ پر آجائیں تو مابعد جدیدیت کی راہ سے شاید کچھ بات بنے۔ تغذیاتی سائنس میں 'وٹامن اے' کی حیثیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس ضمن میں کہ اس کی دنیا کیا ہے، کچھ یوں کہا گیا ہے۔

(الف)

وٹامن اے کا کیمیائی منصبی نام ریٹنال ہے۔ اس کی ساخت میں ہائڈروجن کاربن کی زنجیر ہے۔ جس کے ایک سرے پر بیٹا آئیونون کی انگشتری سی شش پہل شکل ہوتی ہے۔

CH2OH

(ریٹنال کی علامت)

کیمیائی تبدیلی کی راہ سے نظام ہاضمہ میں بیٹا کیروٹین منقلب ہو کر ریٹنال کی تشکیل کرتی ہے۔ بیٹا کیروٹین زرد رنگ کا ایک کیمیائی مرکب ہے۔ سبز، نارنجی اور زرد ترکاریاں اور میوہ جات اس کے تغذیاتی ذرائع ہیں۔ غذا میں وٹامن اے کی قلت بینائی کے PURPLE VISUAL کو متاثر کرنے کے علاوہ دیگر امراض چشم، غیر صحتمند جلد اور دیگر جسمانی بیماریوں کا باعث ہے۔

اس بیانیہ اعظم کے ذریعہ ہم وٹامن اے کی علامتی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس کا تشکیلی اسلوب متعین کرتے ہیں۔ وٹامن اے کی ہیئت تعمیر کرتے ہیں۔ اسکی تعمیراتی اور علامتی ماہیت کو سمجھنے میں خاصی کاوش، ارتکاز اور ایک پٹری پر دور تک چلنے والا کیمیاگر ذہن درکار ہے۔ 'تمام کیمیا کہ پامال کرنہ پا[ئے]'۔ اس کے لئے خاص قاری کی ضرورت ہے۔ جو وٹامن اے سے متعلق بیانات کو ان اعلیٰ ترین سطحوں تک سمجھنا چاہتا ہے جہاں تک وہ لے جاتے ہیں۔ یہ ایک لازمی عمل ہے خواہ وہ اعلیٰ بیانیہ کے تجربے کی صورت ہو خواہ ٹوٹے پھوٹے بیانیہ کی راہ ہو یا اس کے ارد گرد کی بات۔ تشکیلی سطح پر ہمیں اعلیٰ بیانیہ کے تجربے سے گزرنا ہوگا۔

مگر اب جبکہ سائنس نے بیشتر عظیم انکشافات (جنہیں پہلے کے سائنس دانوں نے کہیں بھی تنہا یا عوام کے اذہان سے متعلق ہو کر ان کے درمیان) مکمل کر لیے ہیں اور اب بچے کچھے انکشافات خاص الخاص ٹیکنالوجی + صنعتی حالات میں ہوتے ہیں، بیانیہ اعظم کی اہمیت کم کی جارہی ہے تاکہ اسے خاص الخاص تک محدود رکھا جائے۔ اب بیانیہ اعظم کے افہام و تفہیم کے لیے تجزیہ و تحلیل کی ضرورت پر زور ہے تاکہ ہر قاری کے لئے 'دوسرے' کو اہم بنایا جا سکے۔ اب بیانیہ کا نیا فکشن ہے جس میں نمائش (ڈیمانسٹریشن) کی تکنیک کارفرما ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ سیدھے سادے آسان بیانیہ کی 'ایجاد' ضروری ہے جو مشکل یا ثقیل اعلیٰ بیانیہ کی جگہ لے سکے۔ یہاں تک اس کا آخری کرشمہ

~ Human Nutrition & Diete tics; Davidsonet al, 1975

(روا) بھی زیادہ سے زیادہ تحلیل ہو جائے۔ مگر منکشف چیزوں' راہوں اور علامتوں کے جنگل میں موجود جھاڑ جھنکاڑ کا بے دردی سے صفایا کر کے ایک علی شاہ راہ بناتا اور اس پر اصرار کرتا کہ ہم پوری ماہیت کو نہ سہی اس کے دوسرے' کے کچھ جزو کو ہی سہی اپنے بیانیہ کلام میں شامل کر لیں۔ ایسے ہی سی ہمیں بیانیہ اعظم "عادت" سے چھٹکارا حاصل ہو۔ یہ کیا ہے اس پر سوالیہ نشان قائم ہوتا ہے۔

آپ کہیں گے اُردو میں شروع سے ہی مشکل الفاظ سے پرہیز اور سادہ اور آسان زبان کے استعمال پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ تو کیوں نہ ہم اپنے اس روایتی طورے پر کلی طور پر عمل کریں۔ مگر حکیم صاحب کی مثال سامنے کی ہے۔ جو اپنے قدیمی تجربوں کی بنیاد پر ہمیں بتاتے ہیں کہ "گاجر کا حلوہ' مفید اور مقوی ہے۔ مگر امراضِ چشم کے حوالے سے اس نسخے کو نہیں برتتے۔ علاوہ بریں اس میں جو شیرینی اور روغن ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ جن کی ضرر رسانی آج کے دور کا عطیہ ہے۔ تغذیاتی سائنس نے اپنے اعلیٰ بیانیہ کی بنت سے وٹامن اے کی بناوٹ اور جسمانی خلیاتی نظام سے اس کے تفاعل سے متعلق ہمیں بخوبی آگاہ کر دیا ہے اور 'ہائپر میٹنشن' اور 'ہائپر گلائی سیمیا' کے بارے میں تمام تفصیلات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس زاویے سے دیکھنے پر اب حکیم صاحب کا دل پسند نسخہ 'غیر' نظر آتا ہے۔

تغذیاتی سائنس کے اعلیٰ بیانیہ تجربوں کو تفاعل اور ڈیمانسٹریشن کی سطح تک پہونچانے کے لیے ایک نئے اور عام فہم بیانیہ کی ضرورت سے انکار نہیں کیا سکتا۔ یہ فنکشن "قصہ" کر سکتا ہے۔ قصے" میں کہانی، افسانہ، ناول، داستان سبھی آجاتے ہیں۔ شاید ہم 'دوسرے' بیانیہ کو قصہ جاتی انداز میں ایجاد کر سکتے ہیں۔ یوں بھی مابعد جدیدیت میں آواں گارد ادب یا جدت راہ پاتی ہے۔

اس ضمن میں ژاں فرانسوا لیوتار (Jean-Francois Lyotard) "چھوٹے" بیانیہ کی بات کرتا ہے اور رچرڈ رارٹی (Richard Rorty) کہتا ہے ز لوگ دو راستوں سے اپنے تصور کو معنویت دیتے ہیں ایک تو خود اپنے آپ کا غیر انسانی حقیقت سے قریبی انسلاک کا اظہار یعنی معروضیت کا اظہار۔ دوسرے دگوں کو جو اس حصول کو ایک قوم کے درمیان پہونچانے والی کہانی کہے۔ یل (APPLE) مابعد جدید رویہ سے متعلق ہو کر کہتا ہے "اسکی چھوٹی کہانی یمانسٹریٹ کرتی ہے"۔

وٹامن اے کے سلسلے میں اعلیٰ بیانیہ کا فنکشن 'دوسرے' کے عام بیانیہ ں کیسے بدل سکتا ہے آیئے اسے ڈیمانسٹریٹ کرنے کی اچھی سی کوشش کی بائے۔ اس لیے کہ مابعد جدید ادب میں نیا بیانیہ اہم ہے خواہ بیان ہونے والے ل کا کتنا ہی جز کم ہو گیا ہے۔ لہذا یہ کہانی۔۔۔

ب)

رحمت ایک موٹر ڈرائیور ہے۔ اس پیشے سے اپنی بیوی اور دو بچوں کا پیٹ پالتا ہے۔ ایک دن وہ گھر سے نکلا تو دوسرے

روز بھی دیر رات تک واپس نہیں آیا۔ گھر کے لوگ پریشان ہو گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ اسپتال میں بھرتی ہے گھر کے لوگ رحمت کو دیکھنے اسپتال گئے۔ رحمت کو چوٹیں تھیں۔ اس نے بتایا کہ اسے رات میں ٹھیک سے بجھائی نہیں دیتا۔ سڑک پر دھیمی رفتار کا نشان نہ دیکھ پانے کی وجہ سے اس کی ٹکر ہو گئی تھی۔ اس کا لائسنس بھی ضبط ہو گیا ہے۔ رحمت ٹھیک ہو کر اسپتال سے گھر آجاتا ہے۔ اب اسکی نوکری نہیں رہی۔ گھر کی مالی حالت بہت بگڑ جاتی ہے۔ دشواریاں گھیر لیتی ہیں۔

ایک دن اس کی چھوٹی بیٹی اسکول سے آتی ہے اور سلیٹ پر پالک اور گاجر کی شکلیں بنا کر دکھاتی ہے۔ وہ بتاتی ہے، آج ٹیچر نے اُسے پڑھایا ہے کہ روزانہ ہر ایک کو ہری اور پیلی ترکاری یا پیلے پھل کھانا چاہیے۔ یہ سستے ہوتے ہیں۔ ورنہ آنکھوں کی بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ گھر میں روز پتیوں والی ترکاری پکنی چاہیے۔ اس سے آنکھیں ٹھیک رہتی ہیں۔ رات کی روشنی میں ہم آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔ رتوندھی ٹھیک ہو جاتی ہے۔

گھر میں اب روز سبز پتیوں کی یا زرد رنگ والی ترکاریاں پکتی ہیں۔ کچھ دنوں میں رحمت کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے اور رات میں صاف نظر آتا ہے۔ جلد ہی اُسے ڈرائیوری کی نوکری پر بحال کر دیا جاتا ہے۔

اس کہانی میں (الف) والے اعلیٰ بیانیہ کے وٹامن اے، کیروٹین اور ریٹنال جیسے لفظ غائب ہیں۔ مگر یہ لفظ سبز پتوں، زرد رنگ کی ترکاریوں اور زرد پھلوں میں ESSENCE کی صورت موجود ہیں۔ یہ تحلیل کا عمل ہے۔ خاص کو عام کیا گیا ہے۔ نئے بیانیہ کا یہ پہلا عمل ہے۔ بیان کو کہانی میں بدلا گیا ہے۔ یہ دوسرا عمل ہے۔ ریٹنال کی علامت موجود ہوتے ہوئے بھی ناموجود ہے اور تحلیل ہو کر کہانی کی تھیم میں پنہاں ہے۔ یہ تیسرا عمل ہے۔ پس پردہ غذائی کلچر بھی ہے۔ ڈیمانسٹریشن پورا ہے۔ کہانی علاقائی نہیں عالمی ہے۔ مابعد جدیدیت کے ان عوامل کے ساتھ کیا ہم اس 'چھوٹی' سی کہانی کو مابعد جدید کہہ سکتے ہیں۔ شاید ہاں۔ اس لیے اور بھی کہ یہ کہانی مابعد جدید افسانوی ادب نہیں، چھوٹا سا سائنس فکشن ہے۔ ادبی اعتبار سے اسمیں کلام کی کمی ہے۔ کنٹینیوٹی (داخلیت) نہیں ہے۔ وہ علاقائی جہات نظر نہیں آتیں جنھیں عالمیت کے دائرے میں لایا گیا ہو۔ سیاسی اور سماجی آزمائش کا فقدان ہے۔ فوق الفطرت سرریلزم نہیں ہے۔ مابعد جدید زاویے سے 'دوسرا پن' یہ ہے کہ یہ کہانی حکیمی نسخہ نہ ہو کر 'کچھ اور' ہے اور اسمیں متن کی دنیا اور متن سے 'باہر' کی دنیا کے درمیان حدود مٹ گئے ہیں۔ ذرا سے فرق کے ساتھ یہ کہانی مابعد جدید کہانی کی پیروڈی بھی بن سکتی ہے۔

امبرٹو ایکو (Umberto Eco) (۱۹۸۴) 'ما بعد جدید' اصطلاح کے سلسلے میں شاید صحیح کہتا ہے۔ "میرا تاثر ہے کہ آج مابعد جدید لفظ کو استعمال کرنے والا اسے حسب خواہش جہاں چاہے برت لے"۔ یہ خطرہ موجود ہے۔ مگر وہ مابعد جدید رویے کے سلسلے میں سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے مکالموں کی 'معصومیت' کے ساتھ ساتھ عصری مکالموں کی گمشدہ معصومیت کے ربط کی نشاندہی کرتا ہے۔ (یہ دوہرا کوڈ ہے) جان بارتھ (۱۹۷۹) تھکے ہوئے اور دم نکلے ہوئے ادب کے بالمقابل تازہ ادب پر مضامین لکھتا ہے۔ چارلس جنکس (Charles Jencks) (۱۹۸۶) اپنی کتاب "مابعد جدیدیت کیا ہے؟" میں مابعد جدیدیت کو 'دوسرے کوڈ' سے پہچانتا ہے۔ اسکا کہنا ہے کہ مابعد جدیدیت میں "اقلیتی خواص والے قارئین کے لیے بلند فنی کوڈ اور عوام الناس کے لیے پاپولر (Popular) کوڈ بیک وقت موجود ہوں"

ڈک ہگنس (DICK HIGGINS) (۱۹۷۸) جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی اصطلاحوں سے پرہیز کرتے ہوئے 'شناختی فن' (COGNITIVE ART) اور مابعد شناختی فن' (POST COGNITIVE ART) کی اصطلاحیں کام میں لاتا ہے۔ وہ ان اصطلاحوں کی تعریف کچھ اس طرح کرتا ہے۔

شناختی سوالات۔

(۱۹۵۸ کے آس پاس، بیسویں صدی کے افلاطونی یا ارسطوی فنکاروں کے سوالات)

"میں اس دنیا کی کیا تفسیر کروں؟۔ میں اس کا حصہ ہوں؟۔ میری اس دنیا میں کیا حیثیت ہے۔؟"

مابعد شناختی سوالات۔۔

(۱۹۵۸ کے بعد کے بیشتر فنکاروں کے سوالات)

"یہ دنیا کیسی ہے۔؟ اس میں میں کیا کر سکتا ہوں۔ میری ذات کا کون سا حصہ یہ کام انجام دے۔؟"

برائن میک ہیل (BRIAN Mc HALE) (۱۹۹۲) کا کہنا ہے کہ جدیدیت کے فکشن میں علمی بنیاد کی برتری (EPISTEMOLOGICAL DOMINANCE) ہے۔ اس کی ہیئتی تراکیب میں فنی رسائی، معتبر اور غیر معتبر ہونا، ترسیل اور ابلاغ وغیرہ کے مسائل ہیں۔ یہ مسائل دنیا کے بارے میں جاننے سے متعلق ہیں۔

دوسری طرف مابعد جدید فکشن میں عصر کشیدگی اور مافوق عناصر کی برتری (ONTOLOGICAL DOMINANCE) ہے۔ یہ ایسا فکشن ہے جس کی ہیئتی تراکیب میں فکشن والی دنیاؤں کی جہتیں موجود ہیں۔ اس کے باسی فکشن کی دنیاؤں کے رہنے والے ہیں۔ یہ دنیائیں مختلف النوع ہیں خواہ "حقیقی" ہوں، امکانی ہوں یا افسانوی۔

اس تحریک کے ضمن میں کچھ اس طرح کے سوال قائم ہوتے ہیں۔ کیا مابعد جدیدیت معتبر ہے؟۔ کیا مابعد جدیدیت بس جدیدیت کی تجدید ہے؟۔ کیا واقعی جدیدیت کا دم قدم نکل گیا؟۔ کیا واقعی حقیقی دنیا ختم ہو گئی ہے؟۔ کیا واقعی الفاظ، بیانیہ اور ڈسکورس حقیقی دنیا کی جگہ لے چکے ہیں؟۔ اور حقیقی دنیا سے زیادہ اہم ہیں۔؟ کیا مابعد جدید ادب مار دھاڑ، شور شرابے اور پاپ کلچر کا فن ہے۔؟ سازشی ذہنیت کے اعتبار سے کیا مابعد جدیدیت ایک خطرناک تحریک ہے؟۔ مابعد جدید ادب آخر کار اپنے لیے کون سی نمایاں شکل مرتب کرتا ہے؟۔ مابعد جدیدیت کی عمر کتنی ہے؟۔

توصیف تبسم

دھوپ کی ڈھلتی شام تھی "ٹیکاٹیک" دوپہری لگتی تھی
دھوپ میں اس کے چہرے پر لٹ اور سنہری لگتی تھی

تنہائی میں باتیں کرتی تھیں وہ جادوگر آنکھیں
چپ ہوئیں تو ان کی خموشی رات سے گہری لگتی تھی

شبنم کی جھلمل میں رنگ جھلکتے تھے سب آنگن کے
اور پھولوں پر تنی ردائے ماہ اکہری آلگتی تھی

ادھر ادھر کی باتیں جب چھڑتی تھیں ختم نہ ہوتی تھیں
آس پاس کی دنیا ساری، گونگی بہری آلگتی تھی

اس بستی کے رہنے والے خواب میں جیسے چلتے تھے
گھر تانبے کے لگتے تھے اور جھیل سنہری لگتی تھی

رکتے تھے تو ہاتھ ہلاکر دور سے پیڑ بلاتے تھے
قدم قدم ہمراہ رہی وہ راہ جو ٹھہری آلگتی تھی

عمر کے کچے پن بنتے رہتے تھے ورنہ دل میں
درد بھی کچھ "زیادہ" ہوتا تھا چوٹ بھی گہری لگتی تھی

گھرے تھے جو سر مژگاں کئی فصیلوں میں
وہ چاند ڈوب گئے ہیں اداس جھیلوں میں

کھلا کہ خود ہی چمکتے ہیں ریت کے ذرے
پس غروب بھی اک روشنی ہے ٹیلوں میں

سپاہ غم تھی بہت سخت جاں نہ زیر ہوئی
ہزار رخنے پڑے جسم کی فصیلوں میں

خرد ہے بحر، ٹھہرتی نہیں شبیہ کوئی
وہ موج موج ابھرتا تو ہے دلیلوں میں

نظر اٹھا کہ تری آنکھ میں سما جائیں
وہ دوریاں کہ سمٹتی نہیں ہیں میلوں میں

توصیف تبسم

وہ اولیں درد کی گواہی، تجی ہوئی بزم خواب جیسے
وہ آنکھ جیسے کلام کرتی، وہ سارے چہرے کتاب جیسے

مری مژہ سے، ٹپکتا آنسو، ہو جیسے ہر ڈوبتا ستارہ
لکھا گیا ہو مری ہی پلکوں پہ رت جگوں کا حساب جیسے

وہ آنکھ سایہ فگن ہے دل پر جو بے خودی کا ہے استعارہ
کھلی ہوئی نیلگوں سمندر میں، طلعت ماہتاب جیسے

بس اک دھماکہ کہ رات کی سرحدوں کا کچھ تو سراغ پائیں
بس ایک چنگاری چاہتا ہو فتیلۂ آفتاب جیسے

وہ جس کی پاداش میں سحرزاد، اپنی آنکھیں گنوا چکے ہیں
اک اور تعبیر چاہتے ہوں وہ اول شب کے خواب جیسے

وہ موج سرکش جو ساحلوں کو ڈبو گئی کیسے ٹوٹتی ہے
اس ایک منظر کے دیکھنے کو کھلی ہو چشم حباب جیسے

لہو جو رزق زمیں ہوا ہے وہ بارشوں میں دھلا نہیں ہے
تمام آئندہ موسموں کو ہو نام، یہ انتساب جیسے

تہہ جو مٹی کی جمی ہے وہ ہٹاؤں کیسے
میں بھی مدفون خرابہ ہوں بتاؤں کیسے

بوجھ پلکوں پہ ہے کسی حسرت نادیدہ کا
دیکھنا چاہوں مگر آنکھ اٹھاؤں کیسے

آئینہ ہنستا ہے، ہنسنے دو مرے چہرے پہ
سیکڑوں زخم ہیں، ہاتھوں سے چھپاؤں کیسے

رکھ دیا کاٹ کے، اس وقت کے دھارے نے مجھے
موج پایاب سے، اب سر کو بچاؤں کیسے

ہر قدم مجھ سے الجھتا رہا میرا سایہ
دشمن ایسا ہو تو میں زخم لگاؤں کیسے

پے بہ پے میں نے تمناؤں کو پیکر بخشے
اس تمنا میں کہ خود کو نظر آؤں کیسے

ممو خاں دوبارہ

اقبال مجید

ممو خاں' والد رافع خاں' ولد تاج الدین خاں باغ والے' آپ کے حقے کی چلم اور چلم پر رکھی تمباکو اور تمباکو پر رکھا مٹی کا چھوٹا سا توا اور توے پر رکھے انگارے اب اتنی گری میں بس گئے ہیں کہ کش کھینچنے پر بڑا گاڑھا اور مست کردینے والا دھواں نکلے گا- اس لیئے لمبا سا کش لیجئے' راٹھور کی چال پر سوچیے اور باقی عیش کیجئے- ایک زمین اور اس کا مٹھی بھر آسمان اور اس آسمان کے نیچے آباء و اجداد کا بنوایا لکھوری اینٹوں کا یہ کھلا کھلا سا گھر' کچھ پیڑوں کے باغ اور مٹی کی ہی مہربانی سے دیئے گئے کچھ پھلوں کے ساتھ آپ کی قسمت مہند کردی گئی ہے- آپ کو دس پندرہ سال اور جینا ہے' یہ زندگی ہی ٹرافک سے بھری پری ایک سڑک ہے جیسا پہلے کرتے رہے اب بھی کیجئے' نہ کچھ بدلا ہے اور نہ بدلے گا' اگر کچھ بدلے گا تو اس بدلے ہوئے کو بدلنے کے لیئے کوئی اور بدل تیار ہوجائے گا- بس بچ بچ کر چلتے رہیئے چاہے داہنے یا بائیں یا درمیان- اگر کسی لڑائی میں جیت جایئے تو آنے والی ہار پر رنجیدہ ہونے کا حساب برابر کرنے کے لیئے تھوڑی دیر کو خوش ہو لیجئے- کم اور زیادہ کے معاملات میں نہ آپ کے باپ پڑے اور نہ دادا' وہ بھی باغبان ہی تھے آپ بھی باغبان ہیں-

کیا آپ کو اور زیادہ باغ چاہیئے؟ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اور زیادہ باغ آپ کو مل جائیں' لیکن دوسروں کے پاس آپ سے اور زیادہ جو باغ ہیں اور جن کے بستر آپ کے بستر سے زیادہ آرام دہ ہیں' اور جن کی راتیں آپ کی راتوں سے اور زیادہ روشن ہیں اور جن کے دسترخوان آپ کے دسترخوان سے زیادہ لذت بخش ہیں ان کے پاس اتنے ہی خوف' اتنے ہی وسوسے' راتوں کی اتنی ہی بے چین کرنے والی بے خوابی اور لمبے لمبے دنوں میں لمبی لمبی دم پھلا دینے والی دوڑ بھاگ بھی ہے--- بیوی ان کے آقاؤں کی دل بستگی میں لگی رہتی ہے اور وہ دیکھتے بھی نہیں- اس لیئے جناب ممو خاں صاحب اپنے حقے کا دوسرا کش لیجئے' پھیپھڑوں میں خوب بہت سا دھواں بھر کر ہوا میں چھوڑ دیجئے پھر ہلکا سا کھانسیئے اور اس کے بعد اس بات کو یاد رکھیئے کہ خدا کے اس بے انتہا آسمان کے نیچے کیڑوں کی طرح رینگتے یہ انسان ایک نمبر کے لچے اور کمینے ہیں- انھیں اور زیادہ برا کہنے کو دل چاہے تو یہ بھی کہیئے کہ یہ ساری پچھلی کی گئی نیکیوں میں آگ لگانے' فتوحات کو دھول چٹانے اور اقبال مندیوں کو اوندھے منہ گرانے کے لیئے پیدا ہوئے ہیں--- ایسی ساری تقریروں کو دل ہی دل میں دہرایئے کہ جن میں کہا گیا ہے کہ ان کی ساری یاترائیں چاہے وہ رتھ پر ہوں یا گھوڑوں پر' ٹینکوں پر ہوں یا بکتربند گاڑیوں پر ان کے پیدائشی دوغلے اور کمینے پن کا اعلان ہیں-

اب یہ بھی جان ہی لو' جو شاید تم پہلے نہیں جانتے تھے اور خدا جانے اس وقت بھی جاننا چاہتے ہو کہ نہیں کہ آم کو خود پر کوئی گمان نہیں ہوتا- وہ جھوٹ بولتا اور نہ فریب کرتا ہے اور نہ تیتی پولیشن کرتا ہے اور نہ جوڑ توڑ- یہ اختیارات تو تم جیسے انسانوں کو ہیں- اس نے تو بس آم ہونا ہی قبول کیا ہے اور اس نے اپنے ہونے میں ایک سیدھا پن یہ کیا ہے ممو خاں صاحب کہ وہ اپنی حیثیت کو نہیں بھولتا' وہ کشل بننے کے خواب نہیں دیکھتا--- اچھا! کیا آپ اپنے والد کے زمانے کے ایک باغبان کو بھول گئے' جو اپنا سب کچھ بیچ باچ کر شہر چلے گئے تھے- وہاں آئس کریم کا ایک کارخانہ ڈالا' منافع کمایا پھر ایک سنیما ہال چلایا' خوب کمایا' وہ کشل ہو گئے' خوب بھاری بھرکم' خوب گودا تھا ان میں' پکے پکے سے' یہاں تک کہ سڑنے لگے' مگر بیٹا ممو خاں وہ آم نہ رہے' کچھ نیا بننے کے لیئے پرانا چھوڑنا پڑتا ہے- انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ جب وہ آم تھے تو بھی توپ نہیں تھے اور جب وہ بڑی مشکل سے کشل بنے تو آم نہیں رہ گئے' جب توپ بن جائیں گے تو کشل نہیں رہیں گے- ہٹلر میں یہ ایک بات کتنی اچھی تھی کہ اس نے اپنی فطرت سے کبھی لڑائی نہیں لڑی' اس نے کبھی سدھارتھ بننے کی کوشش نہیں کی یہی ایمانداری سدھارتھ نے بھی کی' ننگے بدن کانٹوں پر بھی کچھ دنوں لیٹا تو اسے لگا کہ وہ بے سرا ہو رہا ہے-

پرتاپ شکلا بھی کانٹوں پر ضرور لیٹا ہوگا' کوئی اپنا ضمیر بیچنے یا دوسرے کا ضمیر خریدنے پر کچھ دیر کانٹوں پر ضرور لیٹتا ہے-

آخر یہ بات تم کئی دنوں سے کیوں سوچ رہے ہو؟ کیا ضروری ہے کہ پرتاپ شکلا نے ہی شوکت جہاں کو قتل کیا یا کرایا ہوگا؟ شوکت' ایرو بیک' بھی تو لڑکیوں کو کرواتی تھی- سونے کی زنجیر پہن کر موٹر سائیکل پر دھواں اڑاتا ایک اوباش باپ کا اوباش لونڈا اپنی بہن کو وہاں لے کر آتا ہے- آج کل کی فلموں میں ایسے لونڈوں کو خوبصورت لڑکیوں کو ریپ کرنے کا جو جنون دکھایا جاتا ہے' کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ اس موٹر سائیکل والے نے' چمڑے کے آدھے دستانے

اور ایل پی کیپ پہننے والے ڈرگ کا استعمال کرنے والے اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہ کیا ہو اور وہ یہ بھی جانتا ہو کہ لاش کو کہاں پھینکا جائے جو پولیس بھٹک جائے؟ بہت ممکن ہے یہ لونڈا اور اس کے ساتھی بہت پہلے سے شوکت کی آوا جاوی پر نظر رکھتے رہے ہیں۔

کل اگر پولیس نے ایسا ہی کردیا تو ---؟ اور وہ بالکل صحیح بھی ہوا تو؟

کیا یہ ممکن نہیں کہ پرتاپ شکلا بس ندیدہ ہی رہا ہو' رال بہاتا ہو' اندھیرے اجالے چوما چاٹی کرکے آگے کے لیئے شوکت کو راستے پر لگا کر دیکھنے کی بس ہمت جٹا رہا ہو۔ تفتیش کے دوران پولیس سے لے کر کئی دوسرے لوگوں کے دلوں میں پرتاپ شکلا اور شہباز پر شک تھا۔ بعد میں اگر یہ مشہوا ہوا کہ سیاسی دباؤ میں آکر پولیس نے پرتاپ شکلا کی طرف اپنا رویہ بدل کر اس راستے پر چلنا شروع کردیا کہ ہو نہ ہو یہ کام شہباز خاں کے تجارتی دشمنوں کا ہے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے ---

لیکن ممو خاں' اس سناٹے میں تم حمد باندھے اپنے حقے سے شغل کر رہے ہو اور راٹھور گیارھویں بساط پھاڑ کر مہرے بکھرا کر بستر پر پاپڑ بیلنے جاچکا ہے۔ تو تمھارے پاس یہ سوچنے کے لیئے کافی وقت ہے کہ آخر تم نے پرتاپ شکلا کو اس کمینے پن کے ساتھ کیوں مروایا؟

کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ پرتاپ نے ہی شوکت جہاں کی عزت لی --- نہیں !

کیا اس نے تمھارے باغوں کو کوئی نقصان پہنچایا --- نہیں !!

کیا پرتاپ تمھاری ذاتی زندگی کے لیئے کوئی خطرہ تھا؟ ---- نہیں !!!

کیا پرتاپ نے تمھیں کبھی للکارا کہ سالے ذرا باہر تو نکل؟ ---- نہیں' نہیں' نہیں۔

تو پھر سالے' بچے لفنگے ممو خاں' ابے او حرامی کی اولاد۔ تو نے پرتاپ کو کیوں مارا؟

حقہ پیتا جا اور سوچتا جا لیکن ایسا بھی نہیں ہے ممو خاں کہ تو نے بالکل سوچا ہی نہیں ہو۔

تم تو بیٹا جب پرتاپ شکلا کو مارنے والا کھاتا کھول رہے تھے تب ہی تم نے سوچا ہوگا' یہ قتل تو تم نے برف جیسے ٹھنڈے خون کے ساتھ کیا ہے۔ ایک ایک قدم سوچ سوچ کر اٹھایا ہے جیسے قتل نہیں موہڈن کرتے جا رہے ہو۔ تم گدی میں عقل رکھنے والے جنگلی زمانے کے جلالی پٹھانوں کی نسل سے ضرور ہو لیکن نئے زمانے نے تمھیں اب خاصا ہوشیار کردیا ہے۔ نفع نقصان دیکھ کر کام کرتے ہو۔ کبھی تم نے کسی سے مار پیٹ بھی نہیں کی' تو یہ بات تو گلے سے نہیں اترے گی کہ تم نے اپنی خاندانی پٹھانی کے ابال میں یہ قدم اٹھایا ہے --- تو بتاؤ پٹھان میاں کیا بات تھی؟ اگر دنیا کو معلوم ہو جائے کہ یہ قتل تم نے کرایا ہے تو اسے کچھ تعجب تو ہوگا ہی کہ یہ کام تو اس زنخے قدرت اللہ کو کرنا چاہئے تھا۔ اگر وہ گھر میں گھس کر بھی پرتاپ شکلا کو مار ڈالتا تو عدالت کو بھی زیادہ حیرت نہ ہوتی کہ شوکت اس کی بہن تھی لیکن تم نے اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا؟

کیا تم کوئی الیکشن لڑ رہے تھے جسے جیتنے کے لیئے یہ قتل ضروری تھا؟ ---- نہیں۔

کیا تمھیں موٹی رقم والا کوئی ٹھیکہ ملنے والا تھا جو اس قتل کے بغیر ملنا ممکن نہیں تھا؟ ---- نہیں۔

کیا تمھیں بدنام خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی نے یہ کام نپٹانے کے لیئے لالچ دی تھی؟ ---- لاحول ولا۔

تو پھر جو قتل قدرت اللہ نے نہیں کیا وہ تم نے کیوں کردیا؟ بولو؟

استاد! اس مشکل سوال کا جواب تم یہ دیتے ہو کہ شہر کی میونسپلٹی صبح صبح شہر کا کچرا تو ٹرالیوں میں سمیٹ لے جاتی ہے لیکن شہر کے ہاتھوں دن رات کا بکھرایا ہوا خوف و ہراس سڑکوں پر ہی پڑا رہ جاتا ہے اور پچھلے پچاس برسوں سے پھکتا ہوا اجتماعی ملبہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے اور اسے دفن کرنے کا کوئی انتظام نہ ہونے پر یہ آخور عمارتوں سے بھی اونچا ہو چکا ہے لیکن تم ہی اپنی اس تقریر کے جواب میں خود اپنے آپ سے یہ سوال بھی تو کرتے ہو کہ قدرت بھی تو اسی کے درمیان رہ رہا ہے پھر اس خوف کے خلاف یا خوف کے دباؤ میں اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟

اس سوال کا جواب دینے کے لیئے تم دن بھر حقہ پیتے ہو' پھر ٹہلتے ہو' پھر بوڑھے ملازم کو گالیاں دیتے ہو پھر پاخانے چلے جاتے ہو پھر نہاتے ہو پھر سوچتے ہو کہ اب پنج وقتہ نماز شروع کردینی چاہئے لیکن شروع نہیں کرتے اور اس نتیجے پر پہنچتے ہو۔

خوف کوئی چتا کشی وکشت تو ہے نہیں جس کی ایک ہی شکل ہو' خوف کی ہزار شکلیں ہیں اور ہر شکل کے الگ الگ رد عمل ہیں۔

پھر کہتے ہو ----

قدرت وہ سیدھا سادہ مسلمان ہے جو دین کی تین چوتھائی باتیں تو مانتا ہے اور ان پر عمل بھی بہت کچھ کرتا ہے لیکن وہی قدرت اللہ ضرورت پڑنے پر دین پر جان دینے کے لیئے سو بار سوچے گا جب کہ ایسے مسلمان جو روزانہ کی زندگی میں دین کی ایک بات بھی کبھی نہیں مانتے اور نہ اس پر عمل کرتے ہیں اور نہ ان کو نماز ہی یاد رہ گئی ہے۔ گرم حالات میں اپنے کو مسلمان ثابت کرنے کے لیئے دین پر جان بھی دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ خوف تو ایک ہی ہے مگر ان جانبازوں پر اس کا اثر کچھ ہے اور سہمے دبکے قدرت اللہ پر اس کا اثر کچھ اور۔

تب میاں ممو خاں تم یہ کہہ کر نکل لیتے ہو کہ قدرت تو غریب اپنی ٹوٹی پھوٹی گرہستی کے ڈر سے ہی دبکا رہتا ہے' وہ تو پہلے ہی سے سہما ہوا خدا کی راہ میں لڑی جانے والی خاموش بے ضرر اور پاک لڑائی میں گرفتار ہے۔ جہاں اپنے آس پاس کے سارے ذروں کو کسی بھی طرح نظرانداز کرتے رہنے کا ناٹک کھیل کر اسے پھسلائے رہنے کا چانس لیا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جب تم ایک بار شکار پر گئے تھے یہ جانتے ہوئے کہ وہاں شیر ہو سکتا ہے تم اپنی احتیاط بھر

قدم بھی اٹھا رہے تھے کہ یکا یک تمھارے سامنے شیر آگیا تھا' اتنا پاس کہ تم کو بندوق اٹھانے کا بھی یارا نہ تھا۔ تو تم دم سادھ کر بلا حرکت' پتھر کی مورت کی طرح' جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے ـــــ تب خوف کی بجلی نے تمھارے جسم کا خون جیسے جلا کر رکھ دیا تھا اب یہ شیر کے اس وقت کے مزاج پر منحصر تھا کہ وہ تم پر ایک اوچھی نظر ڈال کر اپنا راستہ لے یا غرا کر تم پر چھلانگ لگا دے کہ تم دونوں ہی طرح سے راضی تھے۔

قدرت دفتر سے روٹھتا تو بے بسی میں گھر چلا آتا۔

منا کر لایا جاتا تو بے بسی میں دفتر چلا آتا۔

یہ کس نے دیکھا تھا کہ اس پر خوف کی گرنے والی بجلی نے اس کا خون جلا دیا تھا؟ کسی کا خون جل جاتا ہے تو کسی کا خون کھولنے لگتا ہے۔

ان خوفزدہ یہودیوں کا اگر پوسٹ مارٹم ہو سکتا جنھیں جہاز میں بٹھا کر ہٹلر بیچ سمندر میں جنگی پن ڈبیوں کے ذریعہ جہاز کے تلے میں چپکے سے چھید کروا کر جہاز کو غرق کروا دیتا تھا تو ان سب کا خون جلا ہوا ہی ملتا۔ اسی لیئے تو تم بہت اٹھلا اٹھلا کر اس دن راٹھور سے شطرنج کھیلتے میں کہہ رہے تھے کہ آنجہانی حضرت بونا پارٹ کے دست مبارک میں اپنے خوف کو کندھوں سے جھٹکنے کے لیئے ہزاروں جانوں کو تلف کرنے کے وسائل موجود تھے۔ سو انھوں نے ویسا ہی کیا۔ اگر تمھارے پاس صرف ایک ہی جان کو اپنی مرضی سے تلف کرنے کا وسیلہ ہوگا تو تم اپنے کندھوں پر چڑھے خوف کو مٹھی بھر ہی سہی' اتار پھینکنے کے لیئے اس ایک جان کو ہی نپٹا دوگے۔

یار خاں صاحب! تم نے تو یہ تک کہہ دیا تھا کہ جب شہباز سالا حکام کی آئے دن دعوتیں کرتا ہے' انکم ٹیکس والوں اور جانے کیسے کیسے چپڑ اسیر افسروں کو ولایتی شرابوں سے نہلاتا ہے' جماعت اسلامی اور ہندو وشو پریشد کو ایک ساتھ بالٹیاں بھر بھر کر چندے کی شکل میں نوٹ پہنچاتا ہے اور فسادات کے زمانے میں سرمایہ کاروں کے ساتھ آپسی بات چیت کر کے اپنے اور اپنے کاروبار کے فائدوں کی حفاظت کے لیئے ہندوؤں کے محلے میں ان کے دفاع کی خاطر ہندوؤں کو چوری چھپے بندوقیں وغیرہ سپلائی کرانے کے لیئے اپنی گاڑی استعمال کرواتا ہے' جو پکڑے جانے پر چپ چاپ چھڑا لی جاتی ہے تو اس وقت بھی یہ کون جان پاتا ہے کہ اتنی دولت لگا کر اور اتنا جوکھم اٹھا کر شہباز بیچارہ بس اسی خوف کو اپنے کندھوں سے اتار کر کم کرنے کے جتن میں ہی لگا ہے؟

اس لیئے خاں صاحب' آپ سے بھی کیا چوری' سچ تو یہ ہے چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں کہ آپ کا بھی ایک کندھا کافی عرصے سے بہت جھکا ہوا لگنے لگا تھا اور اس میں ہر دم ایک انجانا سا درد رہنے لگا تھا۔ اسی لیئے آپ کو یہ سوچنے میں ذرا دیر بھی نہیں لگی کہ ہو نہ ہو یہ پرتاپ شکلا کا ہی کام ہے۔ اب آپ کو اپنے گھر کے اطراف میں کچھ اجنبی لوگ جیپ پر سوار کبھی کبھی گھومتے اور آپ کو عجیب نگاہوں سے گھورتے نظر آتے رہتے ہیں۔

اس لیئے اپنے مرے باپ کی قسم' آندھیاں تمھارے باغ اڑا لے جائیں جو جھوٹ بولو' کہو اور زور سے کہو۔

میں نے پرتاپ شکلا کو نہیں ایک خوف کو قتل کیا ہے۔ (شاباش)

تو پھر یہ بھی سمجھا دو ممو خاں کہ تم تو آموں کے بھاؤ کو لے کر بہت ڈینگیں مارا کرتے تھے۔ کہتے تھے تم نے خود کو برتنے کے لیئے آموں سے سبق لیئے ہیں' کہاں گیا تمھارا وہ مینگوازم؟ تو اسی الجھن میں تم نے اس روز دو ڈونگے تازی رساول اپنے پیٹ کے گودام میں بھر کر اس الجھن کو بھی سلجھانے کا راستہ نکال لیا تھا۔

تم بیٹا پھولے نہیں سما رہے تھے اپنی فلیتی پر۔ کیا زور زور سے کہہ رہے تھے کہ جن آموں کے باغوں کے چاروں طرف کچی اینٹیں پکانے کے بھٹے کثرت سے ہوتے ہیں ان آموں کا آم پن مر جاتا ہے یہاں تک کہ پیڑ بھی دھوئیں سے اپنی شادابی کھو دیتے ہیں ـــــ تم نے چہک کر یہ بھی کہا تھا۔

متھرا ریفائنری کو تاج محل کے پاس سے ہٹانے کا شور تو بہت اٹھتا ہے لیکن آدمی کے دل کے تاج محل کے کالے پڑ جانے کا کسی کو ہوش نہیں۔

کوئی مشکل سے شاید مانے لیکن تمھاری اس بات میں کچھ دم تو ہے کہ اگر تم پرتاپ شکلا کو نہیں بھی مارتے تو اس کی کیا ضمانت تھی کہ اسے کوئی دوسرا نہ مارے گا؟ کیونکہ اب دن بہ دن اپنی موت مرنے کا چلن گھٹتا جا رہا ہے' کوئی مارتا ہے تب ہی کوئی مرتا ہے اور تم جو جرم کر کے قانون سے خود کو چھپا لے گئے ہو تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ کسی دن اپنے ہی باغ میں اپنے ہی کسی خوفزدہ ملک کے ہاتھوں خاک اور خون میں تڑپتے نظر نہیں آؤ گے؟

اپنے آموں کو ذرا غور سے دیکھو۔

اگر یہ تم کو کچھ آم جیسے' اوپر سے گول اور نیچے سے آموں کی طرح خم کھائے ہوئے نظر آئیں' ان کی رنگت بھی سبز اور زردی مائل ہو لیکن ان آموں کے پورے جسم پر' یعنی ان کی اوپری کھال پر کٹہل کی طرح خاردار دانے سے دکھائی دیں تو تم پر کیا گزرے گی؟ تم بھاگے بھاگے پھروگے ـــ ممو خاں ابھی نہیں تو کچھ دنوں بعد ایسا ہونے جا رہا ہے۔ تمھارے آموں کی بے بسی بھی کچھ نہ کر پائے گی ان سے کہو کہ زمین کے اس عذاب کو برداشت کریں کہ زمین انھیں جو دے گی وہ انھیں قبول کرنا ہوگا ورنہ وہ اپنی جڑیں ان زمینوں سے اکھاڑ لیں اور یہ کام ان کے بس میں نہیں۔

ضیا مارفاسس ہو رہا ہے۔

پھر جیسی روح ہوگی ویسا ذائقہ ہوگا۔

لیکن بھائی میاں! تمھارا حقہ بھی تو اب ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ تمھارے باغ کے گیدڑوں کی بھی اب آنکھ لگ گئی ہے۔ پھر تم یہ کروٹیں کیوں بدل رہے ہو؟ سوچتے ہو تم بھی تو اپنے آموں سے الگ نہیں۔ تو کیا خاں صاحب اسی لیئے تمھیں بھی نیند نہیں آ رہی؟

تم بار بار آئینے کے سامنے جا کر کیوں کھڑے ہوتے ہو؟

غسل خانے میں چلا چلا کر نہاتے وقت یہ کیوں کہتے ہو کہ میں تو وہی ممو

خاں ہوں؟ رام کھلاون کھٹیک نے جب تمہارے پڑوس کا باغ خریدا، اس کے چاروں طرف اینٹوں کی دیوار اٹھوائی، شاندار پھاٹک بنوایا اور اس پر کیسریا جھنڈا بھی چھوٹا سا لہرایا اور سب کو مٹھائی تقسیم کی تو اس روز بھی اپنے غسل خانے میں تم چلا چلا کر کچھ جا رہے تھے اور نہاتے جا رہے تھے۔

"میں وہی موخاں ہوں---" "وہی موخاں"

اس روز جب مشاعرے میں تم موٹا چندہ دے کر سب سے آگے بٹھائے گئے تھے تو تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور بار بار تمہاری ہی طرف دیکھ کر اور اشاروں سے تم کو ہی مخاطب کر کے ایک شاعر تمھیں کو اپنی نظم کیوں سنا رہا تھا۔ تمھیں وہ نظم جس کو تم بے سر پیر کی کہتے ہو، دماغ پر بہت زیادہ زور دیئے بغیر یاد کیوں رہ گئی ہے؟ آخر وہ تم سے ہی کیوں کہہ رہا تھا۔

یہ خنجر لو، اور وار کرو
اور میرے سو ٹکڑے کردو

تم ایک باغ بان، وہ بھی آم جیسا میٹھا پھل پیدا کرنے والا باغ بان، خنجر اور سو ٹکڑے، سے تمھیں کیا لینا دینا--- مگر وہ پھر بھی تمہاری ہی طرف انگلی اٹھا کر کیوں کہہ رہا تھا؟

یہ خنجر لو اور وار کرو
اور میرے سو ٹکڑے کردو
پھر چھلنی جسم کو سہلاؤ
آنکھوں کی اوس میں نہلاؤ
تم میرے قاتل کہلاؤ
اس دن کے لیئے میں زندہ ہوں [1]

"اس دن---" "کون سا اس دن، بیٹا موں خاں.... ارے میں نے تو مشاعرے سے آتے ہی آدھی رات تک آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تھا--- یہ دیکھنے کہ آخر میرا چہرہ کچھ اور تو نہیں ہو گیا--- نہیں! نہ میں کچھ بدلا ہوں اور نہ میرے آم بدلے ہیں وہ شاعر وہمی ہے سارے شاعر وہمی ہوتے ہیں۔

آخر کو مو خاں کروٹیں بدل کر سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو اتوار کی صبح تھی، باہر ناشتے سے فارغ ہو کر راٹھور شطرنج کی بازی جمانے کے لیئے، نئی بساط پکڑے دروازہ پیٹ رہا ہے۔ ◢◢

---

[1] شہریار کی نظم "ایک ادھوری خواہش"

امیر عارفی

خول سے باہر آکر دیکھے

ترا کردار
بوسیدہ مکاں ہے
تری گفتار
اک ٹوٹا ہوا پیمانہ
جس میں خشک مٹی ہے
ترے افکار
اب خود سوالی بن گئے ہیں

خزاں ہے خزاں

کتنی شاداب تھیں زندگی کی بہاریں
کتنا دلچسپ تھا زندگی کا قرینہ
اب یکایک یہ کیسے ہو گیا
تم سہاگن بھی ہو
اور بیوہ کی اوڑھے ردا
جی رہی ہو

بلقیس ظفیرالحسن

آسمان بے مہر! تو کچھ بھی پسیجا کیوں نہیں
آس سے تکتی زمیں جلتی تھی، برسا کیوں نہیں

لوگ ہو جاتے ہیں پتھر کس طرح، معلوم ہو
ہم پہ دربندی طلسم دہر کی وا کیوں نہیں

بے ہوس چہروں پہ کالک پوتتے یہ بوالہوس!
کوئی ان کے روبرو آئینہ دھرتا کیوں نہیں

ہے یہاں جو بس تغیر کو ہی حاصل اک ثبات
پھر خزاں ساماں یہ موسم دل کا بدلا کیوں نہیں

ہر بن مو سے نکلتی ہی رہی بس آنچ سی،
اپنا یہ جلنا کبھی شعلوں سا بھڑکا کیوں نہیں

رنج سے خوگر ہوا، یا حسیت جاتی رہی
ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے دل تڑپتا کیوں نہیں

تپ جل تھل رہ کے بھی آنکھیں ہیں کیاریتی مری
خواب آسا کوئی آنکر انہیں اپجا کیوں نہیں

جان دے دیتے ہیں، کوئی باز بھی آیا کبھی
نشہ زہراب غم چڑھ کے اترتا کیوں نہیں

لوٹ آئی ہے مجل ہو کر پھر اک فریاد آج
بے صدا چیخیں مری سن لے وہ ایسا کیوں نہیں

آبلہ پا کی پذیرائی کو اب اے اے ریگزار!
وہ جو ہوتا تھا ببولوں والا سایا کیوں نہیں

خاک برسر مل رہے ہیں اب کف افسوس ہم
پھونک ڈالا گھر دلِ ناداں بسلا کیوں نہیں

سخت جانی ہائے جانِ ناتواں بلقیس حیف!
سسکیاں لیتا پڑا ہے دم، نکلتا کیوں نہیں

تڑپ رہی ہے پڑی جان نیم جاں کیسی
لبوں پہ آکے رکی ہے مرے فغاں کیسی

تمام ایک بپھرتا سکوت طاری ہے
عذاب رنگ یہ چھائی ہیں بدلیاں کیسی

لگی تھی آگ نشیمن میں آتش گل سے
اڑا رہی ہے صبا یہ ہوائیاں کیسی

پڑے ہیں پاے تنگ میں یہ آبلے کیسے
بجھی ہوئی تھیں فضاؤں میں گرمیاں کیسی

چھپائے رکھے تھا پتھر بھی آگ سینے میں
ذرا سی چوٹ لگی ہے ہوئی عیاں کیسی

شجر مثال ہو ہر ایک گھر نہیں ہوتا
ہیں دشت دشت بھٹکتی کہانیاں کیسی

ہر ایک جرم ہے ثابت [illegible]
لکھی تھیں اپنے لیئے یہ گواہیاں کیسی

انار نار تھے ہم کھل کے جل بجھے پل میں
بہار بن کے ہمیں کھا گئی خزاں کیسی

یہ ابر چھایا ہوا ہے کہ نارسا آہیں
نکل نکل کے تڑپتی ہیں بجلیاں کیسی

ذرا سی بات تھی' اس کو سراہ بیٹھے تھے
بنا کے رکھ دی زمانے نے داستاں کیسی

وہ ماتھے چاند تو ٹھوڑی ستارہ رکھتا ہے
اسی سے مجھ کو ملی ہیں سیاہیاں کیسی

نہ پوری طرح سے جلتی ہیں اور نہ بجھتی ہیں
مرے الاؤ میں ڈالیں یہ لکڑیاں کیسی

ہمیشہ دیکھا ہے ہنس ہنس کے جھیلتے بلقیس
ہیں آج رخ پہ یہ اتنی اداسیاں کیسی

ستیہ پال آنند

ساگر ملن

میں ایک دریا تھا، ثابت و سالم و مکمل
جو ایک جانب ہی بہہ رہا تھا
مجھے فقط ایک دھن تھی
بہنے کی، بڑھتے رہنے کی
چاق و چوبند سنتری سے مرے کنارے
جو میرے دونوں طرف کھڑے تھے
مری ہی خود ساختہ حدیں تھیں
جو میری پہچان بن گئی تھیں
سبھی مماثل تھے۔ سمت، رفتار، راستہ
اپنی دھن کا پکا
میں اپنی راہوں کو خود بناتا ہوا رواں تھا
ڈھلان، میدان، میرے قدموں تلے
بچھے میری رہگزر تھے

میں ایک ہی سمت بہنے والا
خود اپنی ہی ذات میں مکمل
جو کل تلک تھا
وہ آج ہرگز نہیں ہوں
اپنے مدار و مرکز سے، ہٹ گیا ہوں
میری اکائی ہزار حصوں میں بٹ گئی ہے
میں اپنے ڈیلٹا تلک پہنچ کر
وہ فرد واحد نہیں رہا ہوں
جسے کبھی ایک دھن، تھی
بہنے کی، بڑھتے رہنے کی
ایک جانب سفر ہی جس کا شعار تھا ساری زندگی کا
مری روانی کے پاؤں اب دلدلوں نے جیسے جکڑ لئے ہیں
میں چاروں اطراف بہہ رہا ہوں
میں کترنوں میں بٹا ہوا ہوں
میں ریزہ ریزہ ہوا ہوں
ساگر ملن سے پہلے!

"میں" اور "میں"

میں اپنے نوزاد ننھے بچے کے خال و خد میں
خود اپنے چہرے کے ابتدائی نقوش
بچپن کی ایک جیسی نشانیاں دیکھ کر یہ کہتا ہوں
میرا بچہ ہے۔ میرا "میں" ہے
آنے والے دنوں میں مجھ کو
میری شباہت کو، شخصیت کے ہر ایک پہلو کو
جاودانی حیات دے گا
کہ میرا بچہ ہے۔ میرا "میں" ہے۔

مندی ہوئی اپنی ننھی آنکھوں کو
کھول کر میرا بچہ اپنی نظر سے کہتا ہے
دیکھو، ابو
میں وہ نہیں ہوں، جو تم کبھی تھے
میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھتے ہو تم کبھی تھے
کہ میں تو خود میں ہی ایک مکمل اکائی ہوں
اپنا انفرادی مزاج رکھتا ہوں
شخصیت ہوں
میں آپ کا "میں" نہیں ہوں، ابو
میں اپنا "میں" ہوں!

احتشام اختر

اس کے آنے سے یکایک گھر مرا روشن ہوا
گھپ اندھیرے گھر میں جیسے اک دیا روشن ہوا

بارشوں نے شہر کا نقشہ بدل کر رکھ دیا
ہر گلی ہر باڑ پر منظر نیا روشن ہوا

میں گھنے تاریک جنگل میں اکیلا تھا مگر
یک بیک میرے لئے اک راستہ روشن ہوا

انگنت ہاتھوں نے تعمیر قصر شاہ کی
سارے جگ میں نام لیکن ایک کا روشن ہوا

سامنے کی بند کھڑکی کھل گئی تھی رات کو
پھر یکایک ایک چہرہ چاند سا روشن ہوا

دشمنوں نے سب بجھائیں مشعلیں جب راہ کی
بے سہاروں کے لئے اک حوصلہ روشن ہوا

یاروں کی زندگی سے بہت دوستی رہی
لیکن ہمارے واسطے وہ اجنبی رہی

پھر یہ ہوا کہ جان کا دشمن وہ بن گیا
ہاں کچھ دنوں تو اس سے بہت دوستی رہی

روشن ہوئی تھیں شمعیں تمہارے خیال کی
دل کے مکاں میں کل تو بڑی روشنی رہی

ڈالی سے برگ خشک تو سارے ہی جھڑ گئے
یادوں کی گرد شاخ الم پر جمی رہی

کتنی خوشی ملی تھی تمہارے وصال سے
حالانکہ یہ خوشی بھی بہت عارضی رہی

لڑتا ہے اپنے آپ سے اپنے وجود سے
ہم کل ملیں گے تم سے اگر زندگی رہی

وارث کرمانی

کہاں قلزم میں یا جیحوں میں آئی
یہ طغیانی جو میرے خوں میں آئی

کبھی پتھر سے سر پھوڑا تھا میں نے
صدا اب گنبد گردوں میں آئی

جسے سب ڈھونڈتے تھے وہ حقیقت
مرے افسانہ و افسوں میں آئی

مری صحرا نوردی حق بجانب
یہ عادت کس طرح مجنوں میں آئی

محبت پہلے اک کافر سے کی تھی
پھر اس کے بعد وہ بچوں میں آئی

امین اشرف بہت اڑنے لگا ہے
یہ شوخی کیسے اس مخزوں میں آئی

بہت پرشور ہے جنت عنب بھی
کہاں وہ بات جو گیہوں میں آئی

یہ غزلیں لے کے وارث کیا کرے گا
غزل تو وہ ہے جو شبخوں[1] میں آئی

زمیں فریب زماں خواب زندگی بکواس
تمام فکر و نظر علم و آگہی بکواس

جو وہ کہے تو زمانہ کہے بجا ارشاد
جو ہم کہیں تو وہی بات ہوگئی بکواس

تمام کرم کتابی اسی میں ڈوبے ہیں
وہ کون لوگ تھے جو لکھ گئے نری بکواس

مری نظر میں تو اک سر پھرا تھا افلاطوں
جو بک گیا ہے کہ ہے ساری شاعری بکواس

زباں سنبھال کے اے شیخ جی کہ اچھی نہیں
حضور شاعر اعظم یہ آپ کی بکواس

تری غزل یہ بہت خوب ہے مگر وارث
عتوری میں ہے لازم کبھی کبھی بکواس

[1] شعر کا مصرع اول باقر مہدی کی غزل (شبخون جنوری ۱۹۹۶ء، ۱۹۰ صفحہ ۹) سے چھین کر میں نے اپنا مقطع بنالیا ہے۔

اظہار الاسلام

دروازے پر دستک ہوئی۔ میں سمجھا ڈاکیہ ہوگا، دروازہ کھولنے پر کوئی اور

سانولا رنگ، دایاں گال مہاسوں سے اوبڑ کھابڑ، بائیں کنپٹی پر بڑا سا مسا، ...پائی شرٹ اور جینز، دایاں پاؤں کچھ سوجا ہوا۔

"جی فرمایئے؟"

جواب دینے کے بجائے اس نے مجھے ہٹا کر ایک خالی کمرے میں قبضہ ...لیا۔ میں اس کی دیدہ دلیری پر ابھی حیران بھی نہ ہو پایا تھا کہ میری بیوی ...ن مین نکل آئی۔

"کیا بات ہے؟ کس سے باتیں کر رہے تھے؟"

"کسی سے نہیں۔" میں دم سادھے کھڑا رہا۔

بیوی عجیب نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی واپس چلی گئی۔ وہ اب کمرے ...اپنا بوریا بستر کھول رہا تھا۔ سامان کیا تھا بس کچھ کپڑے اور چند کتابیں۔

"آخر کون ہیں آپ اور اس طرح اندر کیوں چلے آئے؟" میں حد درجہ ...ان تھا۔

اس کی پشت میری طرف تھی، بغیر مڑے ہی اس نے جواب دیا

"میرا یہاں ٹرانسفر ہو گیا ہے، بس سر چھپانے کی جگہ چاہئے۔"

میں ابھی گومگو میں تھا کہ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا،

"اگر ایک پیالی چائے مل جائے؟"۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اسے چائے لا کر دی۔

"صرف چائے، بسکٹ سے چائے کا مزہ جاتا رہتا ہے" اس نے پیالی ...ی "کون سا اخبار لیتے ہیں آپ؟"

"ٹیلی گراف" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

"کل سے اسٹیٹس مین کے لئے کہہ دیں"۔

میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گیا، بیٹھے بٹھائے کون سی بلا سر آن پڑی۔ ...بھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کچھ آہٹ سی ہوئی۔

"ذرا نہا لوں۔"

میں نے کمرے سے نکل کر دیکھا، وہ سامنے واش بیسن پر جھکا دانت مانجھ ...ا، پھر برش وہیں چھوڑ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا جیسے سب کچھ پہلے جانا سنا ہو۔

مجھے کچھ کرنا چاہئے۔۔۔ محلے والے۔۔۔ نہیں؟ کیا آج بھی آفس نہیں جانا؟" بیوی مجھے سوالیہ نگاہوں سے تک رہی تھی۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ"

"یہ سارا سوچنے کا کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"کمال کرتی ہو تم، کیا ہم گھر سے بے گھر ہو جائیں؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"بے گھر تو نہیں کنگال ضرور ہو جائیں گے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"پتہ ہے، اس ماہ پورے پندرہ دن آپ کا آفس ناغہ ہوا ہے۔"

میں بوکھلا گیا، یعنی اس ماہ بھی پندرہ دنوں کی تنخواہ کٹے گی؟ سال بھر کی چھٹیاں پہلے ہی ختم ہو چکی تھیں، یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟ لاتعلقی اور بے حسی میرے دل و دماغ میں گھر کرتی جا رہی ہے، سب کچھ خالی خالی سا لگتا ہے۔

باتھ روم کا دروازہ کھٹاک سے کھلا اور میری سوچ کا سلسلہ منقطع ہو گیا، وہ سامنے سے گذرا۔ اس کے بھیگے سلیپر کے نشان اب بھی پردے کے نیچے سے صاف نظر آرہے تھے، میں فوراً اٹھ کر کمرے سے باہر آیا، آنگن میں گیلا تولیہ تار سے جھول رہا تھا۔

"اگر ایک کپ چائے مل جائے تو!" اس کی آواز آئی،

میں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔

گھنٹہ بھر بعد میں نے خود کو آفس کے لئے تیار کر لیا، رومال، پرس، گھڑی اور سن گلاس دوبارہ دیکھے۔ سب ٹھیک ٹھاک تھے لیکن سائیکل اپنی جگہ نہیں تھی۔ میرا دل دھک سے ہو گیا۔ جب آٹھویں میں پڑھتا تھا تب کی سائیکل تھی، صرف ڈیڑھ سو کی، ابا نے بہت کہا کہ اسکوٹر لے لوں مگر اس سے وابستہ پرانی یادیں۔۔۔۔ آج صبح سے کیا ہو رہا ہے، میں مزید سوچ کر آفس لیٹ نہیں ہونا چاہتا تھا۔

آفس میں سب کچھ نارمل تھا۔ سب سے اسی طرح باتیں ہوئیں جیسے اکثر ہوتیں۔ شاید وہ میرے جب تب کے ناغہ کے عادی ہو گئے تھے۔ ٹیبل پر ساری چیزیں ٹھیک ٹھاک تھیں۔ فائلیں اپ ٹو ڈیٹ، کوئی نیا کام بھی نہیں آیا تھا۔ میں ابھی اپنی چیئر میں بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ بھدر آدھمکا۔

"یار چائے منگواؤ، تمہاری چائے پئے کافی دن ہو گئے۔"

"ضرور" میں اس کی آئے دن کی فرمائش سے تنگ تھا، لیکن اوپری دل

سے نکالا۔

"تم نے گولڈن ہینڈ شیک کی بابت کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"ابھی تک معاملہ گومگو میں ہے، کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پارہا ہوں۔"

میری مانو تو اسے فی الحال التوا میں ڈال دو۔"

چائے پیتے ہوئے میں نے سوچا، صبح والی بات مجدار سے چھیڑوں مگر اس نے کچھ اور سوچ لیا تو۔ ؟

"کیا بات ہے یہ بار بار گھڑی کی طرف کیوں دیکھ رہے ہو؟ کیا کسی کا انتظار ہے؟"

"نہیں کچھ نہیں، سوچتا ہوں تمہیں بتاؤں کہ نہیں؟"

"کیا؟"

"آج صبح سے میرے گھر میں کوئی آیا ہے، وہ بھی زبردستی نہ جان نہ پہچان،"

"کیا کہہ رہے ہو، فوراً ٹیلی فون کرو، اب تک وہ قتل کر کے پورا گھر صاف کر چکا ہوگا۔"

میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

"تمہیں پتہ نہیں آج کل ایسی وارداتیں اکثر ہو رہی ہیں، اخبار نہیں دیکھتے؟" مجدار مجھے سوالیہ نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

اس کے جانے کے بعد ٹیلی فون؟ آخر پڑوسی کیا سوچیں گے؟

لنچ کے وقفے میں میں آفس سے باہر آ گیا، فٹ پاتھ پر فاسٹ فوڈ اسٹالوں کے سامنے لمبی قطار تھی۔ مجھے بھوک نہیں تھی اس لئے آگے بڑھتا گیا پھر یوں ہی ایک بک اسٹال پر رک گیا، کتابوں اور رسالوں کی بھرمار تھی، زیادہ تر رسالوں کے سرورق پر نیم برہنہ تصویریں تھیں۔

اچانک ایک جانی پہچانی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

پاس ہی نیلو The god of small Things خرید رہی تھی۔

"ارے تم!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"اوہ! یہ تم ہو!" اس کی آنکھیں آج بھی روشن تھیں۔

"اب کون سی جاب کر رہی ہو؟" میں نے مذاقاً کہا، مجھ میں تھوڑی سی تازگی لوٹ آئی تھی۔

"ایک سافٹ ویئر کمپنی میں ہوں اور دو سال کی ٹریننگ لے کر لوٹی ہوں۔"

"آؤ کہیں بیٹھتے ہیں، تم نے لنچ لیا نہیں؟"

"ابھی نہیں اور نہ ایسا کوئی ارادہ ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"پہلے فلم پھر لنچ، چنانچہ آفس کینسل" اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

وہ اب بھی نہیں بدلی تھی، وہی سیمابی فطرت، مزاح کی مورت، ذہانت

کی علامت، لائف اسٹائل بالکل مختلف لیونگ ٹوگیدر کی حامی، ہم نے تین سال ایک ہی فلیٹ میں گذارے مگر شادی سے متعلق اس کی رائے نہیں بدلی۔

سامنے تھیٹر میں Basic Instinct چل رہی تھی، ہم لوگ ہال میں جا بیٹھے۔ تھیٹر میں رش نہیں تھا، فلم بھی دونوں کی دیکھی ہوئی تھی، اس لئے اندھیرے میں ہم دونوں کی آوازیں چہک رہی تھیں۔

اس نے بتایا وہ اب بھی تنہا ہے اور اپنی مرضی سے جی رہی ہے بغیر کسی سمجھوتے کے۔ فلم کے سین کی طرح صبح والا واقعہ پھر میرے ذہن میں تازہ ہو گیا، پتہ نہیں وہ کیا کر رہا ہوگا یا کیا کر چکا ہوگا، میرے اندر وحشت کا ناگ پھن اٹھانے لگا، کئی بار دل چاہا اٹھ کر گھر کی طرف بھاگوں۔۔۔

"میں صبح سے پریشان ہوں، پتہ نہیں کون میرے گھر میں زبردستی گھس آیا۔" میں نے شارن اسٹون کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے کہا۔

وہ ہنس پڑی، "اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے، کیا میں تمہاری زندگی میں زبردستی نہیں ہوں؟ کیا تم نے اپنے آپ سے مجھے نکال پھینکا ہے؟ پہلے تو ہر سانس کے ساتھ تمہارے ساتھ تھی بلکہ اکثر راتوں میں تم نے مجھے محسوس کیا ہے۔"

ہال میں روشنی ہو جانے پر پتہ چلا کہ فلم ختم ہو چکی، تھیٹر کے باہر ٹیکسی مل گئی۔ کہیں ٹریفک جام نہ تھا اس لئے ٹیکسی کی رفتار خاصی تھی، ایک جگہ اس نے ٹیکسی رکوا کر کچھ چیزیں خریدیں، اس کے نئے پتے کا مجھے علم نہ تھا، چنانچہ میں بالکل صم بکم بیٹھا تھا، آدھ گھنٹہ بعد ٹیکسی رکی، اس نے پچاس کا نوٹ ڈرائیور کی طرف بڑھا دیا، اس سے پہلے کہ ڈرائیور بقیہ پیسے لوٹائے وہ مجھے لے کر سامنے والی بلڈنگ کی طرف بڑھ گئی، چوتھی منزل پر لفٹ رکی، اس نے اپنے پرس سے فلیٹ کی کنجی نکال کر دروازہ کھولا اور مجھے صوفے پر بٹھا کر خود کچن میں چلی گئی۔

اکیلے میں پھر مجھے گھر کی یاد آئی، کیا کروں کیا نہ کروں، کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا، عجیب عجیب سے تصور میرے ذہن میں ابھر رہے تھے۔ خود کو بھلانے کے لئے آس پاس کا جائزہ لیا، پورا فلیٹ قرینے سے سجا ہوا تھا، خوبصورت ڈرائنگ روم، بک شیلف، کمپیوٹر، میوزک سسٹم، سی ڈی، کیا سب کچھ۔

"بور تو نہیں ہو گئے، چلو لنچ تیار ہے" نیلو نے اسی درمیان کپڑے بدل بھی لئے تھے۔ وہ دن میں کئی بار نہاتی اور ہر بار کپڑے بدلتی۔ اس کی یہ عادت اب بھی نہیں گئی تھی۔

لنچ ٹیبل پر خاصا اہتمام تھا، اس نے فاسٹ فوڈ کے ساتھ ایک آدھ چیز اپنے ہاتھوں سے تیار کر لی تھی۔ پھل بھی سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔

کھانے کے بعد میں اس کے بستر پر لیٹ گیا، مجھے قیلولہ کی عادت تھی، کچھ دیر بعد وہ میرے پاس آکر لیٹ گئی، میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا، وہ کچھ کہے جا رہی تھی مگر میرا ذہن کہیں اور تھا، دھیرے دھیرے خود بخود ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوتی گئی، پھر مجھے کچھ یاد نہ رہا۔

آنکھ کھلی تو شام ہونے کو تھی، سورج کی زرد کرنوں سے کمرہ کچھ کچھ روشن تھا، میں نے قریب پڑے تولیئے کو اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا، اچانک میری نگاہ اس کی ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی جو آدم آئینہ پر سرخ لپ اسٹک سے بڑے بڑے حرفوں میں لکھا تھا،

ویل کم ٹو ایڈس کلب

Welcome to Aids Club

میں پسینے میں نہا گیا، کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو چکی تھی۔ میں تیزی سے اٹھا اور اسے ڈھونڈنے لگا۔

وہ کچن یا کسی کمرے میں نہیں ملی۔ بس ایک باتھ روم بچ گیا تھا، میں اندھا دھند اس میں گھس گیا، وہ شاور میں تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرا دی، لیکن میری آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔

"وہ کیا ہے ؟" میں چیخا "آئینے میں کیا ہے ؟"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی، "تم آج بھی نرے بدھو کے بدھو ہو۔"

"کیا مطلب ؟"

"ارے ڈفر ! آئینہ تو آئینہ ہے اس کے پاس زبان کہاں۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اس نے مجھے شاور کے نیچے کھینچ لیا۔

میں گھر پہنچا، دروازہ بھڑا ہوا تھا، سائیکل اپنی جگہ پر تھی۔

وہ چٹائی پر لیٹا کچھ پڑھ رہا تھا، فرش پر سگریٹ کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے، میری آمد سے اس کے انہماک پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ سفید تہبند میں ننگے بدن وہ عجیب سا نظر آرہا تھا۔ میں نے چاہا کہ بڑھ کر آج کا اخبار اٹھالوں مگر وہ میری طرف متوجہ ہو جاتا۔

میں آنگن سے گذر کر اپنے کمرے میں آگیا، ہر طرف سگریٹ کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

"آپ کب آئے !" میری بیوی نئی ساڑی میں خوب کھل رہی تھی۔

"یہ ساڑی کہاں سے آئی ؟" میں نے چڑھ کر پوچھا۔

"کمال کرتے ہیں، ابھی پچھلے دنوں تو آپ نے لا کر دی تھی۔"

"وہ ابھی تک گیا نہیں ؟"

"کون نہیں گیا !"

"اوہ ! کچھ نہیں، جاؤ چائے لاؤ۔" میں نے بات بدل دی۔

وہ الٹے پاؤں لوٹ گئی۔ میں جوتے اتار کر لیٹ گیا، بستر سے بھی سگریٹ کی بو آئی۔

چائے پی کر میں نے کپڑے بدلے۔ میری تھکن مٹ چکی تھی لیکن کہیں ایک چبھن اب بھی باقی تھی، میری آنکھیں بند تھیں، پتہ نہیں وہ کب میرے سرہانے آکر بیٹھ گئی۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا" اس نے میری پیشانی کو چھوا۔

"مجھے کیا ہوا ؟"

"آج کل آپ سوچتے بہت ہیں، نیند میں بھی کچھ بڑبڑاتے ہیں۔"

"پہلے کی طرح ہنسنا بولنا بھی بند، پتہ نہیں ہر وقت کہاں کھوئے رہتے ہیں ؟"

"صبح آپ نے سائیکل نہیں لی، پیدل ہی نکل گئے۔"

"دوپہر کو دفتر سے فون آیا تھا۔ کیا آج بھی آفس نہیں گئے ؟"

"یہ آپ کے پاؤں کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھلاتے کیوں نہیں ؟"

میری خاموشی بدستور قائم تھی۔

"کم از کم بچوں کا تو کچھ خیال کیجئے !"

اچانک مجھ میں کہاں سے طاقت آگئی، میں ایک جھٹکے سے اٹھا اور باہر کمرے کی طرف لپکا۔ وہ اب بھی چٹائی پر لیٹا سگریٹ کے مرغولے چھوڑ رہا تھا۔ میں نے اسے گردن سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی مزاحمت کرے میں نے پوری طاقت سے اسے باہر دھکا دیا اور زور سے دروازہ بند کر دیا۔

غزلیں

قمر رضا شہزاد

تری محبت کا بوجھ ڈھونے سے رہ گیا ہوں
مجھے یہ دکھ ہے میں تیرا ہونے سے رہ گیا ہوں

مجھے بھی آتی ہے دنیاداری بچھڑنے والے
مگر میں اس سانحے پہ رونے سے رہ گیا ہوں

کہیں ہوں موجود میں بھی اس داستاں میں لیکن
تری زبانی بیان ہونے سے رہ گیا ہوں

مرے خدوخال مختلف تو نہیں ہے تجھ سے
مگر میں کیوں تیرے جیسا ہونے سے رہ گیا ہوں

یہ خاک میرے لہو کی پیاسی ہے اور شہزاد
یہاں میں شاخِ گلاب بونے سے رہ گیا ہوں

مہلت یک نفس بہت ہے مجھے
صرف اتنی ہوس بہت ہے مجھے

کھینچ مت میرے گرد کوئی حصار
زندگی کا قفس بہت ہے مجھے

اپنے چاروں طرف فقط میں ہوں
اپنی قربت ہی بس بہت ہے مجھے

آسماں کون چاہتا ہے یہاں
خاک پر دسترس بہت ہے مجھے

جسم بھر سائے کے لئے شہزاد
چادرِ خاروخس بہت ہے مجھے

تیری گفتگو ترا دھیان چھوڑنا ہے
ہمیں اب یہ خستہ مکان چھوڑنا ہے

یہ ہماری خاک نجانے کب سے ہے بے
یہاں اپنا کوئی نشان چھوڑنا ہے

یہاں کوئی ہم سا نہیں رہا سو ہمیں بھی
یہ خراب حال جہان چھوڑنا ہے

یہی ایک عشق تو عمر بھر کی کمائی
اسے سوچ کر مری جان چھوڑنا ہے

یہ زمانہ سچ کے خلاف ہے تو قمر
تجھے اپنا رنگِ بیان چھوڑنا ہے

قمر رضا شہزاد

لباس زر کہ غربت میں رہوں گا
[illegible] اپنی اصل صورت میں رہوں گا

سبھی کچھ آشکارا ہے مگر میں
کسی نادیدہ حیرت میں رہوں گا

میں اپنا آپ ہوں ظلِ الٰہی
میں اپنی ہی حکومت میں رہوں گا

اٹھا سکتا ہوں میں بھی صبر کا پھل
مگر افسوس عجلت میں رہوں گا

بچانا چاہتا ہوں تیری دنیا
اسی خاطر ہلاکت میں رہوں گا

غروبِ مہر تک شہزاد میں بھی
مسلسل اپنی حدت میں رہوں گا

تری جانب بہاؤ میں نہیں ہوں
میں پانی میں ہوں ناؤ میں نہیں ہوں

مجھے تو کاٹتی ہے میری مٹی
میں دریا کے کٹاؤ میں نہیں ہوں

بغاوت کا بھی خطرہ ہے، مگر میں
رعایا کے دباؤ میں نہیں ہوں

کسی کا تو مجھے ہونا ہے آخر
اگر تیرے چناؤ میں نہیں ہوں

جلا ہوں اتنی حدت سے کہ اب میں
دھوئیں میں ہوں الاؤ میں نہیں ہوں

طالب منصب و جاہ بھی ہو سکتا ہوں میں
کبھی کبھی گمراہ بھی ہو سکتا ہوں میں

کر سکتا ہوں حملہ اپنے لشکر پہ
دشمن کے ہمراہ بھی ہو سکتا ہونا

دے سکتا ہوں اصل بیان کٹہرے میں
ترے خلاف گواہ بھی ہو سکتا ہوں

مجھ سے گریز نہ کر اے بھاگنے والے شخص
تیری جائے پناہ بھی ہو سکتا ہوں میں

یہ بھیدوں سے بھری ہوئی دنیا شہزاد
کیا اس سے آگاہ بھی ہو سکتا ہوں میں؟

افضال نوید

یہاں غبار میں اکثر وجود رہتا ہے
سو ہست رہتا ہے یاں اور نہ بود رہتا ہے

یہ دل شکار زمان و مکاں ہے پہلے سے
اور اس پہ زیرِ رسوم و قیود رہتا ہے

شعاع آتش سے ان لبوں سے اٹھتی ہے
یہ خط ہمارے دلوں پر عمود رہتا ہے

جھکائے رکھتا ہے ہر باب عشق پر ہم کو
ہمارے سر پہ جو بارِ سجود رہتا ہے

بہت خیال ہے نام و نمود کا اس کو
ابھی یہ دل پسِ نام و نمود رہتا ہے

رہے گی ہو کے ہر اک بات رو بہ رو اس کے
بھلا لبوں پہ کہاں تک جمود رہتا ہے

ہمارے شہر پہ بارش کی دیر ہے ورنہ
قریبِ آتش ہے صرف دود رہتا ہے

جو زود رنج بھی آجائے اس خرابے میں
نہ رنج رہتا ہے اس کا نہ زود رہتا ہے

خجالتِ رہِ وحشت وصال اور اٹھا
نوید ایسے خسارے میں سود رہتا ہے

جائے یک ساغر سے کوئی تو جا لے جائے
تشنگی کری و برخاست ہے آ لے جائے

سینہ آشوبیِ مجنوں کرے آساں غم دہر
انتہائے شبِ مقسوم بلا لے جائے

ان دیاروں میں ہوا ٹھیک سے چلتی ہی نہیں
ورنہ تجھ تک تو مجھے موجِ صبا لے جائے

سرگرانی ہے کہ افلاک لیے پھرتا ہوں
رائیگانی ہے کہ جھونکا بھی اڑا لے جائے

ہوں تو نایاب مگر ایسی کوئی بات نہیں
کوئی چاہے تری باتوں میں لگا لے جائے

میں نے کب نغمۂ دشوار ابھی چھیڑا ہے
کوئی چاہے تو مرا ساز اٹھا لے جائے

نہ سہی جان و جگر مہلتِ نظارہ سہی
تیرے در سے جو کوئی آنکھ بچا لے جائے

سامعِ زمزمۂ بادِ بہاراں ہوں نوید
سوئے میخانہ مجھے آب و ہوا لے جائے

ایم۔ کوٹھیاوی راہی

جسم فانی شعور لافانی
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیسا؟

سر اٹھا کر کے دیکھتا ہے کون
چاہتا ہے کوئی صلہ کیسا؟

پاچکے ہیں سزا گناہوں کی
سنگسار آپ ہوچکے ہیں ہم

اے خودی تو نے تو یہ دیکھا ہے
خود کو سوبار کھوچکے ہیں ہم

کوئی اچھا لگا معاً جو کبھی
محویت کا گناہ ہوکے رہا

دم فاقہ خیال نان جویں
فقر گم کردہ راہ ہوکے رہا

سہ لیں یہ دکھ بھی چاہیے آئندہ
زندگی مثل سنگ و خشت ملے

بعد اپنے ان اہل قریہ کو
اپنی یہ زرد خود نوشت ملے

ہوگا اپنا شعور لافانی
کس کو دنیا ملے کسے بہشت ملے

کیا اڑ گئے مرے سبھی ہمدرد ساتھ دے
اے یاد یار شب ہے ہوا سرد ساتھ دے

اندر سے ٹوٹ پھوٹ کے گم سم پڑا ہے وہ
باہر سے جس کا نالۂ شب گرد ساتھ دے

یہ زندگی کسی زن قحبہ سے کم نہیں
بدنام ہو جو کوئی جواں مرد ساتھ دے

اس یار کوئی غار مرا ہم سفر نہیں
اب راستے کی اڑتی ہوئی گرد ساتھ دے

حسنین صدیقی

زیر لب خندہ بیانی ہوتی
بات کوئی نہ زبانی ہوتی

دل سلگتا تو دھواں بھی اٹھتا
آگ کی کچھ تو نشانی ہوتی

جم گئے برف سے آفاق لہو
دل پگھلتا تو روانی ہوتی

طرز گفتار تو اپنا ہوتا
بات کتنی ہی پرانی ہوتی

بار ہا یہ بھی خیال آیا مجھ کو
مانگ کر پایا تو کیا پایا اُسے

ہم سے ہم کو مانگ کر تو دیکھتے
ہم کہاں کے ایسے کچھ نایاب تھے

ڈھونڈھئے اب اجنبی اک سرزمیں
دوست دشمن تو بہت پیدا کئے

وہ کہ سایہ تھا سدا آگے رہا
ہم تعاقب بے وجہ کرتے رہے

شفق سوپوری

[illegible] میں کیا رکھا ہے
[illegible] خواری میں کیا رکھا ہے

[illegible] سنو اب کشمیری کی
[illegible] میں کیا رکھا ہے

[illegible] یا میلا بستر
[illegible] میں کیا رکھا ہے

اب کہ جدا ہونا ہی ٹھہرا
[illegible] میں کیا رکھا ہے

رفتہ رفتہ جان گیا میں
عیاری میں کیا رکھا ہے

غم خواری بھی اک خواری ہے
غم خواری میں کیا رکھا ہے

دیپک راگ بھی گا کر دیکھو
درباری میں کیا رکھا ہے

گھر کی عورت کیا جانے بھلا
بازاری میں کیا رکھا ہے

مسائل بھی ہوں گے اسی راہ میں
دلائل بھی ہوں گے اسی راہ میں

اسی راہ میں مشکلیں ہیں ہزار
وسائل بھی ہوں گے اسی راہ میں

گئے کاروانوں سے بچھڑے ہوئے
قبائل بھی ہوں گے اسی راہ میں

ترے رہبر و رہنما کے عیاں
خصائل بھی ہوں گے اسی راہ میں

بہرحال اس خلق مغضوب کے
فضائل بھی ہوں گے اسی راہ میں

اسی راہ میں فرض ہوں گے ادا
نوافل بھی ہوں گے اسی راہ میں

جی ہاں کچھ سے کچھ ہورہا ہے
جہاں کچھ سے کچھ ہورہا ہے

نہاں 'خانۂ زندگی میں
عیاں کچھ سے کچھ ہورہا ہے

زمیں پر وہی 'آگ' لیکن
دھواں کچھ سے کچھ ہورہا ہے

وہاں کی خبر تو نہیں کچھ
یہاں کچھ سے کچھ ہورہا ہے

ہمیں وہم ہے ہم سے ہی اب
جہاں کچھ سے کچھ ہورہا ہے

کہتا کہ دور تک ہے یہاں اور کچھ نہیں
صحرا ! کہ دور تک ہے یہاں اور کچھ نہیں

اے ابر شام ! نخل ہے بخت کے سوا
آیا کہ دور تک ہے یہاں اور کچھ نہیں

میں پوچھنے ہی والا تھا' درویش خامشی
بولا کہ دور تک ہے یہاں اور کچھ نہیں

وہ باد بے تمیز چلی تو میں خود بخود
سمجھا کہ دور تک ہے یہاں اور کچھ نہیں

سمجھا کہ اڑ رہا ہے دل قیس کا غبار
دیکھا کہ دور تک ہے یہاں اور کچھ نہیں

شے مس ہینی ترجمہ: ضمیر احمد

وکلو[1] میں جاڑے کی رت ہے
شاخِ بید سے رستا پانی
ٹی صنوبر کو ورثے میں
بجھتی شام کی سرخ نشانی
نظر درختوں پر پڑتی ہے
سردی میں تکنے لگتی ہے

شفق میں شاید آئے نظر
کھویا ہوا دم دار ستارہ
کبھی جو نور کا ملبن تن تھا
اب جیسے بس ایک شرارہ
ایک جھلک سی جھاڑی میں ننھے پھولوں کی

مجھے نظر آیا کرتا ہے
کبھی کبھی اک شہابِ ثاقب
کاش میں اس کا راکب ہوتا
مگر قدم ہیں زمیں پہ میرے
جہاں پہ بکھرے گیلے پتے
اور بھوسے کے بھیگتے تنکے
جیسے خزاں کے ٹوٹے نیزے

میرے تصور میں رہتا ہے
ایک بہادر
کچے صحن میں اور کیچڑ میں
لاچاروں کی مدد کی خاطر
گھما تا رہتا ہے جو ہر دم
اپنی استعداد کی گوپھن

کیسے میں اس حال کو پہنچا؟
میں اکثر سوچا کرتا ہوں
ان احباب کے بارے میں
جن کی ہدایت
الوان[2] منشور نما کی صورت اچھی لگتی تھی
اور ان ذہنوں کے بارے میں
جو سندان کی صورت ہیں اور
جو مجھ سے نفرت کرتے ہیں

اکثر سوچتا رہتا ہوں
ذمہ داری کی یہ اداسی
کیوں ہے؟ کن لوگوں کے لیئے ہے؟
کانوں سنے جو سنی ہیں باتیں
غیبت میں جو ہوئی ہیں باتیں

بید کے پیڑوں میں بارش کی
ایک جھڑی سی لگی ہوئی ہے
موہنی سی آوازوں میں
دبے دبے سے لہجے میں
کیا کچھ باتیں کہتی ہے
وقت پہ ساتھ نہیں دینے کی
جڑوں سے مٹی کٹ جانے کی
پھر بھی اس کا اک اک قطرہ
یاد دلا دیتا ہے اس کی

جو حق بھی ہے اور مطلق بھی
ہیرے جیسا کامل ہے
میں قیدی ہوں۔ اور نہ مخبر
اپنے وطن میں جلاوطن ہوں

بال بڑھائے۔ سوچ میں ڈوبا
ایک پیادہ

قتلِ عام سے بچ کر جو اب
بھٹک رہا ہے جنگل جنگل
اور چھپنے کو
پیڑ کی چھالوں اور تنے کے
رنگ میں رنگتا جاتا ہے
آندھی کے ہر جھونکے سے ہل جاتا ہے

تھے وہ بہت کمزور شرارے
پھونکیں مار کے جن کو ہر دم
میں روشن کرتا رہتا تھا
حیف مگر یہ محرومی
میں نے تو دیکھا ہی نہیں
پھول سا زندہ چمک تارا
نیک شگون کا ایک اشارا
عمر میں جو اک آدھ دفعہ ہی
اپنی جھلک دکھلاتا ہے

---

[1] وکلو (Wicklow) آئرلینڈ میں ایک پہاڑی علاقہ

[2] الوان منشور نما۔ پرزم (Prisom)

کارلس منہار ترجمہ: احمد سہیل

جوا

جو شیالوڈو مونٹی
تم آدمی نہیں گدھے ہو
بڈیوں کے ساتھ نیچے آجاؤ
فوجی دستے کے ساتھ الفاظ اچھلتے ہیں
تمھاری ہڈیوں پر کمال ہے
جو مٹے میں بھری بیٹھی ہے
تمھاری روح کے خیالات ابھی پتہ نہیں

تم ہل نہیں سکتے
راستے کو لوٹنے سے پہلے
دوپہر کی نیند کے بعد
آوازیں کھیلتی ہیں
یا تم اپنی کمر پر
لکڑیوں کے شہتیر اٹھا کر
ندی کے پار جاتے ہو
دنیا تمھارے آس پاس لپٹی ہے
جیسے زین
اور ہر چیز تمھارے پاس ہے
مایوسی کے پار جست لگاؤ
پیڑوں کی جڑوں سے
تمھارے پاؤں جدا ہو جائیں گے
یہ کیا ہے ؟
انسان مت بنو
موت کی طرح مضبوط رہو

یہ کیا ہے
انسان مت بنو
خواب، سوکھی گھاس میں حیران کھڑے ہیں
معجزات اترتے ہیں

کسی خیال کے بغیر
جہاں تم جانے کو کر رہے ہو

یہ کیا ہے
انسان مت بنو
جب تمہاری کمال پر تیزی سے چابک برسائے جاتے ہیں
تم آہستہ آہستہ رینگتے ہو
اور لگام کے دبانے پر جگالی لیتے ہو
یہ کیا ہے
انسان مت بنو

تیل کا چراغ

جو شیالوڈو مونٹی
جب تم آزاد ہو جاؤ
وہاں تمھاری کمر پر کوئی گٹھری نہ ہوگی
آج تم کاشت نہیں کروگے
کاغذ میں لپٹا، آگ میں ترجنگلا
تمہاری جنم بھومی کے قریب

جب تم آزاد ہو جاؤ گے
تمھاری کمر پر کوئی گٹھری نہ ہوگی
اور نہ رسد گاڑی
اور نہ ہی کوئی چابک برسائے گا
اور نہ تمھارے خوابوں کو سزا دی جائے گی

جب تم آزاد ہو جاؤ گے
تمھاری پشت پر کوئی گٹھری نہ ہوگی

ترجمہ : منیر الدین احمد

فرانز ہوجک

پل

اس طرف جہاں پر
پل پار لے جاتا ہے
میں نہیں جانا چاہتا
مگر میں تصور کر سکتا ہوں
کہ اگر پل موجود نہ ہوتا
تو مجھے دوسرے ساحل پر جانے کی خواہش ہوتی
اس ساحل پر میں اجنبی ہوں
اب جب کہ پل پایا جاتا ہے
تو کوئی فرق نہیں پڑتا
میں اس طرف کے ساحل پر رہ جاتا ہوں
اور کشتیوں کو تکتا ہوں
جو آ رہی ہیں نہ جا رہی ہیں

ہائنز موللر

ہارٹ سرجری

آئینے میں میرا چیرا گیا جسم
درمیان میں کٹا ہوا آپریشن کے سبب
جس نے میری زندگی کو بچایا کاہے کو
میں پوچھتا ہوں آئینے میں تکتے ہوئے
زندہ رہنا سیکھنا آدمی مشین کے ساتھ
سانس لینا کھانا ممنوع ہے یہ سوال کاہے کو
جو آسانی کے ساتھ ہونٹوں پر آتا ہے موت
تو عام سی چیز ہے
مر تو ہر بیوقوف سکتا ہے

رائنر کنزے ترجمہ : منیر الدین احمد

مکان

اب موت ہمیں کرایہ دار بناتی ہے
ہم نہیں جانتے کہ وہ کب
ہمیں انخلا کا نوٹس دے گی
اور کیسے جیئے
ہم صرف اسقدر جانتے ہیں
کہ ساری عرض داشتیں رد کی جا چکی ہیں

جلا وطن شاعر

ان کے جوتوں سے چمٹی ہوئی ہے
ان کی زبان کی مٹی
درست ہے کہ گرم روٹی کی مہک
ان پر ترس کھاتی ہے
مگر کون جانتا ہے اس بات کو
کہ لفظوں کی رسی سے لٹکنے کا کیا مطلب ہے۔

قالین

صرف اللہ کی شان ہے پیدا کرنا بلا تقصیر
اور انسان غلطیوں کا پتلا۔ کمال کی حد تک
لپنے خدا کو دیتا ہے۔ جو اس کا حق ہے
مُنتا ہے ایک دھاگہ غلط رنگ کا
اور سات لاکھ درست گانٹھیں

گرما

ایسی گرمسالی
کہ راتوں کو کانوں میں
بارش گونجنے لگتی ہے
ننگے پاؤں تم بھاگ کر باہر جاتے ہو
گھاس بالکل بے خبر پڑی ہے
اور آسمان پر
تاروں کا اژدہام ہے

قبرستان

ایک روز قبرستان بھی مرجائے گا
مردوں کے ہجوم کے سبب اور
مرمر کی سلوں تلے وہ سانس تک نہیں لے سکتا
انسانوں کو پتہ نہیں چلتا کہ اسکو کہاں لے جائیں
قبرستانوں کے لئے کوئی قبرستان نہیں ہے
وہ اسکو وقت کے حوالے کر دیتے ہیں
پھر وہ دیکھنے جاتے ہیں
کہ کیا باقی بچا ہے

دھتکار

ہم دھتکارے ہوئے ہیں
جنم دن سے
اور ہر کوئی ہر کسی کو دھتکارتا ہے
اسلئے ہم ایک دوسرے کو قلاوے میں جکڑتے ہیں
آپس میں جکڑنا دھتکارتا ہے سب کو
سوائے ایک کے

ایرانی قالین

آفتاب کو اس پر قدم دھرنے کی اجازت
صرف چاند کے واسطے سے ہے
وگرنہ خطرہ ہے کہ وہ نقصان پہنچا سکتا ہے
اس میں بنی جانے والی آنکھوں کی روشنی کو

ہلڈے ڈومن   ترجمہ : منیرالدین احمد

میرا دائیاں ہاتھ (آج کون مانے گا)
ایک زمانے میں کھلا ہوا گلاب تھا
تتلیوں سے لدا پھندا
اچانک کسی تیاری کے بغیر
جیسے کسی کو دھکا لگے اور وہ گر جائے
اس نے اپنی پتیاں کھو دیں
بے رنگا ہوا اور ننگا
ایک انسانی ہاتھ
جیسے سبھی دوسرے
تمہیں یاد ہو گا
میرے بائیں ہاتھ کی پیالی
جو تمہارے پرندوں کو پانی پلاتی تھی
ٹوٹ گئی
تمہیں پتہ ہے کہ کتنی دیر تک کرچیاں
ہمارے باغ میں پڑی رہیں

سچ مچ میں اس زمانے میں
اپنے آپ کو پھلتی پھولتی انگوروں کی بیل میں
تبدیل کر سکتی تھی
تمہاری شہد کی مکھیوں کے لئے

سال کے موسم کی
کوئی قید نہ تھی
اس روز سے قبل
جب میں نے اپنے ہاتھوں کو
میز پر دھرا تھا
اور وہ خالی تھے

اس دن سے میں منکسر ہو گئی ہوں
تھیلا پکڑ کر مارکیٹ میں چلی جاتی ہوں
جہاں پر تولا اور کاٹا جاتا ہے
اور میں نے تمہارے لئے پیالیاں اور پلیٹیں خریدی ہیں
کسی بھلی چنگی گھر والی کی طرح

مگر جب تم روتے ہو
اور بیکسی کے ساتھ
سوتے میں شکایت کرتے ہو
تب میرے دل پر
ننھے منے دکھنے والے پر نکل آتے ہیں
اور مجھے اس کی بے صبری کا احساس ہوتا ہے
اپنے گلے میں
کہ میرا دم گھٹنے لگتا ہے

روزے اوسلینڈر

ترجمہ : منیر الدین احمد

اس قدر

کون کہہ سکتا ہے
اس قدر
جس قدر اس کا جی چاہتا ہے

کون کہے گا اس قدر
جس قدر وہ سوچتا ہے

کون سوچتا ہے اس قدر
جس قدر اس پر گزرتی ہے

کون جیتا ہے اس قدر یقین کے ساتھ
جس قدر وہ مرتا ہے

سارہ کرش

نقش پا

میں دریاؤں پر چلی ہوں جو اب
سڑکوں تلے بہتے ہیں میں چاہتی تھی
پھر تیلی ہوتا اپنی تتلی کی طرح
میں درختوں پر کھڑی ہوئی چھتوں پر
دریا بہتے رہے اوپر تلے
کمرے مختلف منزلوں پر
سب کچھ گہرائی میں چلتا ہوا لگا

محمود درویش ترجمہ : ضمیر احمد

ں رجسٹر میں لکھو
یں ہوں عرب۔
ارڈ کا نمبر ہے اِکاون ہزار۔
یرے بچے آٹھ ہیں اب
ور نواں آنے کو ہے گرما کے بعد۔
س میں کیا ہے ایسی جھنجلاہٹ کی بات ؟

اں رجسٹر میں لکھو
یں ہوں عرب۔
پنے دیگر ساتھیوں کی طرح میں
پتھروں کی کان میں مزدور ہوں۔
آٹھ جو بچے ہیں میرے
ن کی روٹی۔ ان کے کپڑے اور ان کی کاپیاں
وت بازو سے اپنی
پتھروں سے چھین کر لیتا ہوں۔
بھیک لینے آپ کے در پر کبھی آیا نہیں
آپ کی دہلیز پر جھکنا مرا شیوہ نہیں۔
س میں کیا ہے ایسی جھنجلاہٹ کی بات ؟

ں رجسٹر میں لکھو
یں ہوں عرب۔
یں تو بس اک نام ہوں میرا لقب کوئی نہیں۔
یک ایسے ملک میں بھی
س میں ہر شے
ہی کے اک بھنور میں مستقل گردش میں
ہے

صبر سے جیتا ہوں میں۔
آفرینش میری کچھ اس سے بھی پہلے ہی کی ہے۔
وقت جب پیدا ہوا
جب یہ صدیاں تھیں شگوفے بن کھلے
سرو تھے جب اور نہ یہ زیتون تھے
جب خس و خاشاک یوں پھیلے نہ تھے
باپ میرا ہل چلانے والوں میں سے ایک ہے
اشرف و امجد نہیں۔
اور دادا جان بھی تھے اک کسان
کوئی شجرہ اور نہ عالی خاندان۔
گھر مرا چھپر کی اک کٹیا ہے چوکیدار کی
کہیے کیا اب مطمئن ہیں حیثیت سے میری
آپ ؟
میں تو بس اک نام ہوں، بے خاندان

ہاں رجسٹر میں لکھو
میں ہوں عرب
رنگ بالوں کا : سیاہ۔
اور مری آنکھیں ہیں بھوری۔
کیا مری پہچان ہے ؟ کیا ہے شناخت ؟
سر پہ اک رومال اور اس پر "عقال"۔
جو چھونے گا اس کو جھل جائیں گے ہاتھ
اور پتہ میرا ؟
میں رہنے والا ہوں اس گاؤں کا

دور افتادہ کچھ اتنا یاد سے بھی مٹ گیا
اس کی گلیاں سب کی سب بے نام تھیں۔
اور جتنے مرد تھے
کھیتوں میں یا کہیں کانوں میں ہیں۔
اس میں کیا ہے ایسی جھنجلاہٹ کی بات ؟

ہاں رجسٹر میں لکھو
میں ہوں عرب۔
تم نے ہی چھینے ہیں مجھ سے
باغ تھے جتنے مرے اجداد کے
اور چھینا ہے زمیں کا وہ قطعہ
جس کو میں اور میرے بچے
کاشت کرتے تھے کبھی
تم نے میرے واسطے اور میری نسلوں کیلئے
کچھ نہیں چھوڑا بجز پتھر یہاں
کیا تمہاری یہ حکومت
سارے پتھر بھی کہیں لے جائیگی ؟
لوگ کہتے تو یہی ہیں آجکل
ہاں تو پہلے ہی صفحے پر
سب سے اوپر یہ لکھو
مجھ کو انسانوں سے کوئی بغض اور نفرت نہیں
دست اندازی کسی کے مال پر۔ فطرت نہیں۔
لیکن اتنا ہے کہ میرا رزق گر چھن جائے گا
غاصبوں کا گوشت بھی کچا چبا جاؤں گا میں۔
بس ڈرو۔ تم بھوک سے میری ڈرو
اور مرے غیظ و غضب سے تم ڈرو۔

خواہش

محمود درویش ترجمہ : ضمیر احمد

مت کہو مجھ سے
کہ ہوتا الجزائر میں اور ہوتی نان کی میری دکان
پھر میں گاتا باغیوں کے ساتھ گیت۔
مت کہو مجھ سے
کہ ہوتا گر یمن میں گلہ بان
پھر میں گاتا وقت کی لرزہ بر اندازی کے گیت۔
مت کہو مجھ سے
کہ ہوتا میں ہوانا کے کسی کیفے میں اک ویٹر اگر
پھر میں گاتا غم کی ماری عورتوں کے واسطے
نصرت کے گیت
مت کہو مجھ سے
کہ ہوتا گر جوان مزدور میں اسوان میں
پھر چٹانوں کے لئے گاتا میں گیت
میرے ہمدم

وانگا میں نیل کا پانی تو بہہ سکتا نہیں
کانگو دریا ہو یا ہو جارڈن
ہو نہیں سکتے وہ دریائے فرات
ہے ہر اک دریا کا اک منبع الگ
راستہ اس کا الگ ہے۔ زندگی اس کی الگ
میرے ہمدم
سرزمیں اپنی بھی بنجر تو نہیں
وقت ہوتا ہے معیّن
ہر زمیں کی آفرینش کے لئے
ہے سویرے سے ملن اک دن ضرور
ہر مجاہد کے لئے۔

غزل کا نیا علامتی نظام
(ظفر اقبال)

انیس اشفاق

اب تک ہم نے جن شاعروں کا مطالعہ کیا ہے ان کے اشعار غزل کی نئی فضا تعمیر کرتے ہوئے تو نظر آتے ہیں لیکن ان سے غزل کے نئے علامتی نظام کی تشکیل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ناصر کاظمی، احمد مشتاق اور منیر نیازی کی غزلوں میں الگ الگ لہجے اور الگ الگ شاعرانہ فضائیں موجود ہیں۔ یہ لہجے پیشرووں سے مختلف ہیں لیکن ان میں میلان سازی کی صلاحیت نہیں ہے۔ منیر نیازی کے یہاں بعض علامتوں اور ان کے تلازموں کا بار بار استعمال ہوا ہے لیکن وہ غزل سے زیادہ نظم کی طرف مائل رہے اس لیے ان عناصر کو وہ اپنی غزل میں ایک مستقل رجحان کی شکل نہیں دے سکے۔ ناصر کاظمی نے غزل کا لہجہ بڑی حد تک بدل دیا لیکن ان کا انداز نئی غزل کے لیے زیادہ مناسب نہیں تھا کیونکہ اس میں وہ عناصر موجود نہیں تھے جو غزل میں معنی کی قوت اور وسعت پیدا کرتے ہیں۔ ناصر کاظمی اور احمد مشتاق کی غزل کے ساتھ ساتھ ہماری غزل ایک نئے رجحان کی خبر دے رہی تھی۔ یہ نیا رجحان اس لیے وجود میں آرہا تھا کہ ہم فراق کی انفعالیت سے بیزار ہو چکے تھے اور ایک ایسا جارحانہ اور غیر انفعالی لہجہ اختیار کرنا چاہتے تھے جو ترقی پسند شاعری کی بلند آہنگی سے مختلف ہو۔ اس لہجے کو پانے کے لیے ہم یگانہ کی طرف متوجہ ہوئے ورنہ ایک اسلوب کی سطح پر ہم نے یگانہ کی پیروی بالکل نہیں کی لیکن یگانہ تائپ ہماری غزل میں مقبول ہونے لگا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ نئی غزل میں شکست و ریخت کا عمل یگانہ کے ہی اثر سے شروع ہوا۔ چنانچہ سب سے پہلے ظفر اقبال نے اس رجحان کی نمائندگی کی اور وہ جدید غزل کے میلان ساز شاعر کے طور پر نمودار ہوئے۔ ظفر اقبال نے اس رجحان کی اس حد تک نمائندگی کی کہ بعد کے بیشتر شعراء انھیں کے لہجے کی پیروی کرنے لگے پھر یہی لہجہ ہماری غزل پر حاوی ہو گیا۔ ظفر اقبال کی غزل کے غائر مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ فیض اور اقبال کے بعد ایک ایسا شاعر سامنے آیا ہے جو اپنے منفرد اسلوب سے ایک نیا شعری نظام بنانا چاہتا ہے۔ اس شعری نظام کو وجود میں لانے کی کوشش ان کے ان شعروں سے ظاہر ہوتی ہے جن میں انھوں نے شعر گوئی کے مختلف مرحلوں اور پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

ہمارے شعر ہمیں پر نہ کھل سکیں شاید
ڈرے ہوئے ہیں کچھ ایسے قبول عام سے ہم

یہی ہے فکر کہیں مان ہی نہ جائیں ظفر
ہمارے معجزۂ فن پہ گفتگو ہے بہت

مضامیں چاہئے اعلیٰ غزل میں
غزل میں شاعری بے شک ہو مفقود

ظفر یہ وقت ہی بتلائے گا کہ آخر ہم
بگاڑتے ہیں زباں یا زباں بناتے ہیں

یہ بھی اک مرحلۂ سخت ہے اے صاحب طرز
کہ بیاں کی جگہ انداز بیاں رہ جائے

تماشا ہی جشن مرگ معانی منائیں ہم
لیکن حصار حرف سے باہر صدا تو آئے

غزل میں تھے بہت آزادہ رو ظفر لیکن
تلازمات کی زنجیر سے رہا نہ ہوئے

شرمندہ بہت ہیں ظفر اس عیب سخن پر
اور اس کے سوا کوئی ہنر بھی نہیں رکھتے

جہاں جہاں مرے عیبوں کی آندھیاں ہیں ظفر
وہیں میں لے کے چراغ ہنر بھی آتا ہوں

میں نے کہ ہے یہ عیب سخن ہی مرا ہنر
الفاظ رائج اور تھے برتے کچھ اور ہیں

ظفر اب کے سخن کی سرزمیں پر ہے یہ موسم
بیاں غائب ہے اور رنگ بیاں پھیلا ہوا ہے

کوئی اور نقشہ بناتے کہ اب
تغزل کا طوفان تھم بھی گیا

مری غزل پہ ظفر ان کے سر ہلیں کیونکر
طریقِ خاص میں لطفِ مذاقِ عام کہاں

ہے جدا طور تمہارا بھی ظفر
وہ بھی سو طرح کا طرزی ہے میاں

مشاقی معنی بہت ہوچکی ظفر
کچھ روز اب یہ زلف پریشاں بھی چاہئے

ظفر اب اور یاران غزل کیا چاہتے ہیں
کہ میں اک بار تو مردے کو زندہ کرچکا ہوں

لگا رہے ہیں نئے ذائقوں کے زخم ابھی
اساس فکر نہ طرز بیاں بناتے ہیں

نقال بڑا بڑا پڑا ہے ہم لاکھ لگائیں اپنا ٹھپا
کنکر پتھر کے قافیوں سے کرتا ہے ظفر غزل مرصع

سیدھے سیدھے شعر کہتے سب کو خوش آتے ظفر
کیا کیا جائے کہ اپنی عقل میں افتور تھا

ان اشعار کو تفصیل سے اس لیے نقل کیا گیا ہے کہ ان سے شاعر کے شعری نظریے کا اندازہ ہوسکے اور یہ معلوم ہوسکے کہ سخنوری کا مفہوم اس کے نزدیک کیا ہے- ان شعروں کو پڑھ کر یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ شاعر نئی لفظیات کے ذریعے ایک نئے اسلوب کی جستجو کرنا چاہتا ہے- وہ قبول عام سے ڈرا ہوا ہے اس لیے عام روش پر چلنے سے گریز کرتا ہے- وہ یہ جانتا ہے کہ موضوع اور اسلوب کو الگ الگ نہیں کیا جاسکتا اور صاحب طرز بننا اسی وقت ممکن ہے جب شعر میں آغاز بیاں کے بجائے بیاں موجود ہو-

یہ بھی اک مرحلۂ سخت ہے اے صاحب طرز
کہ بیاں کی جگہ انداز بیاں رہ جائے

ظفر اب کے سخن کی سرزمیں پر ہے یہ موسم
بیاں غائب ہے اور رنگ بیاں پھیلا ہوا ہے

ان شعروں میں ظفر اقبال نے یہ نکتہ بالکل صاف کردیا ہے کہ بیاں اور انداز بیاں ر رنگ بیاں الگ الگ چیزیں ہیں- یہاں بیان سے ظفر اقبال کی مراد معنی سے بھرے ہوئے اس بیان سے ہے جس کے بغیر بیان کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا- یہی بامعنی بیان شاعر کو صاحب طرز بناتا ہے- طرز دراصل اسی معنی میں پوشیدہ ہوتا ہے جو بیان کے اندر موجود ہے- بڑے شاعر کے یہاں یہ ہوتی نہیں

سکتا کہ معنی موجود ہوں اور بیان غائب ہو یا بیان موجود ہو اور معنی غائب ہوں- ظفر اقبال کو یہ بھی احساس ہے کہ غزل پر ایک ہی طرح سے طبع آزمائی کی جارہی ہے یعنی سب کے یہاں موضوعات و مضامین کی یکسانی ہے اور سب کا انداز ایک سا نظر آتا ہے (اسی لیے وہ خود کو دوسروں سے الگ رکھنا چاہتے ہیں) وہ اپنے عیب سخن ہی کو اپنا ہنر سمجھتے ہیں' کیونکہ انھوں نے الفاظ کو بالکل نئی طرح سے برتا ہے اور چونکہ دوسرے اس طرز نو (الفاظ کو نئی طرح سے برتنے کا انداز) سے مانوس نہیں ہیں اس لیے وہ اسے عیب سخن سمجھتے ہیں- علاوہ بریں وہ اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ آزادہ روی کے باوجود (غزل میں) تلازموں سے آزاد نہیں ہوا جاسکتا کیونکہ یہی تلازے غزل کے نظام کی تشکیل کرتے ہیں-

اس طرح ظفر اقبال نہ صرف غزل گوئی کے آداب سے واقف ہیں بلکہ اس صنف سخن کے امکانات کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ زبان و بیان کے تجربے کس طرح نئی معنویتوں کو سامنے لاتے ہیں اور کس طرح غزل میں ایک نیا اسلوب تشکیل پاکر ایک نئے معنوی نظام کو وجود میں لاتا ہے -

ظفر اقبال کی شاعری کے بالاستیعاب مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ معنی اور آہنگ کو ایک کردینے پر کس حد تک قادر ہیں- اگر ہم ان کی شاعرانہ ترکیبوں پر غور کریں تو ان کی یہ قدرت پوری طرح ظاہر ہوجاتی ہے- ظفر اقبال کو ترکیب سازی کا فن آتا ہے- ان کی ترکیبیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فارسی اور اردو کے دو اہم علامت ساز شاعروں بیدل اور غالب کا گہرا مطالعہ کیا ہے- ان کی یہ ترکیبیں ملاحظہ کیجئے :

گنگ ہے خاکستر خوں بولتا پھرتا ہوں میں
خواب کے موتی ہیں جن کو رولتا پھرتا ہوں میں

اپنے ہی پاؤں کی آواز سے ڈر جاتا ہوں
میں ہوں اور رہ گزر بیشۂ تنہائی ہے

فراز شام سے کرتا رہا فسانۂ شب
گدائے گوہر گفتار نے سنا ہی نہیں

جس دل کو آج کنج اماں کہہ رہے ہیں لوگ
آسیب آرزو اسی اجڑے مکاں میں تھا

بساط بام ثریا پہ جاکے بھول گئے
کہ فرش خاک پہ بھی گرم انجمن ہے کوئی

آن کر سایۂ دیوار میں بیٹھا ہوں ابھی
پھر مرے ہاتھوں میں تصویر تگ و تاز نہ دے

اسی کے خواب سے روشن ہے شام وحشت ہوس
وہ داغ عکس تماشا کہ جابجا بھی نہ تھا

کہیں ٹھہر تو سہی اے دلِ تنک تعبیر
مقابل اب کے تو اک خوابِ خوش نما بھی ہوا

خواب سفر ہی مرا زاد سفر ہو تو ہو
وحشت خطا خیز کا خوف و خطر ہے الگ

فلک پہ ڈھونڈتے ہیں گرد رنگ رفتۂ دل
زمیں پہ شامِ طلب کا نشاں بتاتے ہیں

غبار آب سیہ کی فصل ویراں پہ
ہوا کا نقش تو ہوگا ہوا کا نام کہاں

گرد و غبار خواب سے نکلا نہیں ابھی
یعنی وہ نقش آب ابھی بے نشان ہے

پتوں کی طرح زرد بکھرنا تو چاہیے
شہر شب خزاں سے گزرنا تو چاہیے

اک دن ادھر سوار سمند سفر تو آئے
خود بڑھ کے روک لیں گے کہیں وہ نظر تو آئے

جلائیں گے غم ساحل پہ کشتیاں اپنی
اس آب زار تماشا میں پاؤں دھرتے ہوئے

لو میں اک الگ انداز سے مستور تھا وہ
سر شاخِ تماشا اور بھی تنہا کھلا ہے

اتار پھینکنے کو اب یہی ہے چادرِ چشم
وہی ہے دامنِ دل تار تار کرنے کو

آنکھوں میں رنگ تیرگی آب سبز ہو
آخر وہ نقش تاب نکھرنا تو چاہیے

دن میں کھلا ہے ٹوٹتی راتوں کا زہر زرد
پھیلا ہے سر میں صبح کے آثار کا بدن

ابھی نہیں کوئی دھڑکا زیانِ زر کا اسے
وہ دشتِ دل سے ابھی بے خطر گزرتا ہے

وجدان ایک سیلِ فلک سیر تھا ظفر
ہم نے بچھا رکھا ہے چٹائی کے طور پہ

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کا کہ آخر
کہاں تک سایۂ عہد زیاں پھیلا ہوا ہے

ان اشعار کی خط کشیدہ ترکیبیں ظفر اقبال کی نئی اور منفرد ترکیبیں ہیں۔ یہ ترکیبیں فقط اندازِ بیاں کے لیے نہیں بنائی گئی ہیں بلکہ ان میں غنائی عنصر کے ساتھ ساتھ کثرتِ معنی کی صفت بھی موجود ہے۔ ظفر اقبال کے ہر دوسرے یا تیسرے شعر میں ایک نئی اور انوکھی ترکیب نظر آتی ہے۔ ان ترکیبوں کو وضع کرنے کے لیے اگرچہ وہ ایک ہی حرف کا التزام رکھتے ہیں لیکن ترکیبوں کے یک حرفی آہنگ میں بھی معنویت معدوم نہیں ہونے پاتی۔ اس التزام کو ان ترکیبوں میں دیکھیے جو حروفِ تہجی کے اعتبار سے نقل کی گئی ہیں :

آ : آئینۂ آفتاب، آسیبِ آرزو
ب : بساطِ بام ثریا، برف بدن، باغ بدن، بیم بشر
ت : تصویرِ تگ و تاز، تیغِ تغافل، تابِ تماشا، تلخیٔ تقریر
ج : جوشِ جنوں، جوشِ جہالت
چ : چراغِ چہرہ، چادرِ چشم
ح : حریفِ حرف، جبینِ حجر
خ : خاکسترِ خوں، خوشۂ خطا، خوابِ خوش نما، خوابِ خوں، خار زارِ خاک، خرمنِ خاک، خوفِ خطا، خرمنِ خوں، خوفِ خرابی، خاموشیٔ خزاں، خلوتِ خاک، خوابِ خاک، خوفِ خواب
د : داغِ دروں، دشتِ دشوار، درسِ دلالت
ذ : ذراتِ ذات
ر : رازِ رہ گزر، رنگِ راز، رنگِ رواں
ز : زورِ زمستاں، رنگِ زمستاں، زنجیرِ زمستاں، زہرِ زرد، زیانِ زر
س : سمِ سفر، سترِ سنگ، سرگشتۂ سراب، سیلِ سفر، سوارِ سمند سفر، سوادِ ساحل، سوزِ سخن
ش : شکستِ شوق، شہرِ شب خزاں، شعلۂ شر
ص : صحرائے صبر
ض : ضربِ ضیا
ط : طرۂ طوفاں، طغیانِ طلب
ع : عکسِ عتاب
گ : گدائے گوہرِ گفتار
ل : لبِ لرزاں
م : مہرِ منور
ن : نقشِ نیاز، نقشِ نمایاں، نقشِ ناب، نیلِ نظر
ہ : ہالۂ ہوا

عمدہ اور نادر ترکیبیں ناصر کاظمی اور احمد مشتاق کے یہاں بھی موجود ہیں

لیکن ظفر اقبال کے یہاں ترکیب سازی کا ایک منظم عمل نظر آتا ہے۔ وہ بہت زیادہ ترکیبوں کا استعمال کرتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ یہ ترکیبیں نئی، بامعنی اور زیادہ سے زیادہ خوش آہنگ ہوں۔ ان ترکیبوں کا وضع کرنا آسان نہیں ہے۔ کلاسیکی شاعری کے وسیع مطالعے اور غیر معمولی فہم کے بغیر اس طرح کی ترکیبیں نہیں بنائی جاسکتیں۔ ان ترکیبوں کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ظفر اقبال کی غزل کا لہجہ متعین کرتی ہیں اور انھیں ترکیبوں کی وجہ سے وہ ایک منفرد اسلوب کے شاعر قرار پاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے یہاں آزاد لفظ اسلوب سازی میں کوئی کردار ادا نہیں کرتے۔ ترکیبیں وضع کرتے وقت وہ آزاد لفظوں کے آہنگ کو بھی نظر میں رکھتے ہیں۔ اس طرح ان کا اسلوب ترکیبوں اور آزاد لفظوں کے مجموعی آہنگ کا زائیدہ ہے۔ یہ اشعار ایک بار پھر ملاحظہ کیجیے :

بساط بام ثریا پہ جاکے بھول گئے
کہ فرش خاک پہ بھی گرم انجمن ہے کوئی

خواب سفری مرا زاد سفر ہو تو ہو
وشت خطا خیز کا خوف و خطر ہے الگ

فلک پہ ڈھونڈتے ہیں گرد رنگ رفتۂ دل
زمیں پہ شام طلب کا نشاں بناتے ہیں

پتوں کی طرح زرد بکھرنا تو چاہیے
شہر شب خزاں سے گزرنا تو چاہیے

ان شعروں میں دو لفظی ترکیبیں بھی ہیں، سہ لفظی ترکیبیں بھی اور چہار لفظی ترکیبیں بھی۔ لیکن یہ ساری ترکیبیں شعر کے دوسرے (آزاد) لفظوں سے مل کر کس طرح اپنے آہنگ کو ہموار کرتی ہیں، اسے محسوس کرنے کے لیے مستعمل ترکیبوں اور آزاد لفظوں کو الگ الگ کرکے پڑھیے :

پہلا شعر :

بساط بام ثریا پہ جاکے بھول گئے
کہ فرش خاک پہ بھی گرم انجمن ہے کوئی

دوسرا شعر :

خواب سفری مرا زاد سفر ہو تو ہو
وشت خطا خیز کا خوف و خطر ہے الگ

تیسرا شعر :

فلک پہ ڈھونڈتے ہیں گرد رنگ رفتۂ دل
زمیں پہ شام طلب کا نشاں بناتے ہیں

چوتھا شعر :

پتوں کی طرح زرد بکھرنا تو چاہیے

شہر شب خزاں سے گزرنا تو چاہیے

ان شعروں کو اس طرح پڑھنے سے یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ یہ ترکیبیں شعر کے بقیہ لفظوں کے ساتھ مل کر اپنے آہنگ کو ہموار کرلیتی ہیں۔ ایسا نہیں محسوس ہوتا کہ بقیہ لفظوں کو صرف ترکیب کی خانہ پری کے لیے لایا گیا ہے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان لفظوں کی ترتیب سے ترکیب کو ہم آہنگ کیا جارہا ہے۔ شاعری میں یہ کمال بڑے ریاض کے بعد پیدا ہوتا ہے ورنہ ہوتا یہ ہے کہ ہم ترکیب تو وضع کرلیتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھ پاتے کہ شعر کے بقیہ اجزا کے ساتھ اسے کس طرح ہم آہنگ کیا جائے۔ ایسی صورت میں ترکیب اپنے معنوی مرتبے سے گرجاتی ہے۔ اس لیے کسی ترکیب کے آہنگ اور معنی کو متحرک کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے شعر کے دوسرے لفظوں کی مناسبت کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ ظفر اقبال کے یہاں یہ ہنر موجود ہے اسی لیے ان کی ترکیبیں دوسرے لفظوں کے ساتھ مل کر اپنے آہنگ اور معنی کو اور زیادہ متحرک کردیتی ہیں۔ انھوں نے جس کثرت اور فنکاری کے ساتھ ان ترکیبوں کو استعمال کیا ہے اس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک بڑے ترکیب ساز شاعر ہیں۔

جس طرح ظفر اقبال مترنم اور غنائی ترکیبوں سے آہنگ پیدا کرتے ہیں اسی طرح وہ ترکیبوں کے بغیر بھی اس آہنگ کی تعمیر کرسکتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے :

فضا کی فوج میں یہ جنگ ہورہی ہے کہاں
ہوا کی موج میں یہ رنگ ہے رواں کیسا

بکھرے ہوؤں کو موتیوں کی طرح اے ظفر
کس نے پرودیا ہے کسی ڈر کی ڈور میں

یہ حال ہے تو بدن کو بچایئے کب تک
صدا میں دھوپ بہت ہے لہو میں لو ہے بہت

کسی تازہ معرکے پہ گیا آج پھر ظفر
تلوار طاق میں ہے نہ گھوڑا ہے تھان پر

اک بے طلب نشے میں گرفتار ہے بدن
اک بے سبب ہراس کی مٹھی میں جان ہے

دھاروں دھار برسنے والا بادل خشک ہوا
خوابوں خواب چمکنے والی صورت ماند پڑی

رات میں دن سا کردیتا تھا یاد کا روشن لمس
پھر وہ موسم بدلا اور وہ صلت ماند پڑی

ان شعروں میں نہ تو کوئی ترکیب استعمال ہوئی ہے اور نہ کوئی اضافت۔

ان میں سے ہر شعر بلکہ ہر مصرعہ مفرد لفظوں پر مشتمل ہے لیکن ان تمام شعروں میں زبردست آہنگ موجود ہے۔ علاوہ بریں بعض ایسے شعر ہیں جن میں برائے نام ترکیبیں استعمال ہوئی ہیں لیکن ان کا بیشتر حصہ مفرد لفظوں پر مشتمل ہے۔ ایسے شعروں میں بھی آہنگ انھیں لفظوں کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے :

موت مداح مری موت پہ مائل میں بھی
کیا پھرا ہوں سفر سنگ سے غافل میں بھی

نوا میں نکھرا ہوا راز رہ گزر ہی نہ ہو
ہوا میں نکھرا ہوا وہ رنگ در ہی نہ ہو

رخ پھیر کر جو ابر شبانہ میں چھپ گیا
جی میں پھرا کرے گی اسی چاند کی چمک

کچھ راس آچلی تھی مجھے وحشت ہوس
کچھ اس کے جنگلوں کی ہوا مہربان ہے

اس شوق بے مہار کا انجام ہو بخیر
اچھے نہیں لہو میں بھنور آفتاب کے

مفرد لفظوں سے آہنگ پیدا کرنے کی مثال میں ظفر اقبال کے تازہ مجموعے "غبار آلود سمتوں کا سراغ" کی یہ پہلی غزل ملاحظہ کیجیے۔ اس غزل میں بھی کہیں کہیں مرکب لفظوں کا استعمال ہوا ہے لیکن اصل آہنگ یہاں بھی مفرد لفظوں کے ذریعے ہی پیدا ہوتا ہے :

وہی منظر برف برسنے کے وہی گھڑیاں دھوپ نکلنے کی
بھی سلسلہ وار جبلیں ہیں ترے موسم راز میں ڈھلنے کی

یہ جو خواب خیال امیدیں ہیں یہ جو وصل وصال نویدیں ہیں
مری سال سفر کی کلیدیں ہیں تری روشن راہ پہ چلنے کی

کہیں ساعت سبز کا عکس اڑے کہیں گریہ شام کی موج مڑے
کوئی سعی سعید حجاب میں ہے ترا لمس لباس بدلنے کی

کسی سان گمان کرشمے پہ کوئی نقش لبوں کے لرزنے کا
کسی خواب سراب سمندر میں کوئی لہر لہو کے اچھلنے کی

یہ جو زخموں کی پھلجھڑیاں ہیں یہی صورت صورت کڑیاں ہیں
اسی خار خمار خرابے میں مرے گرنے اور سنبھلنے کی

آرام حرام ہے میرے لیے یہی شام انعام ہے مرے لیے
ترے ہجر کی آگ میں جلنے کی اسی آگ میں پھولنے پھلنے کی

وہی میں ہوں ظفر مری راہ وہی، مرے دل کا یہ سنگ سیاہ وہی
کہیں پردۂ غیب میں صورت ہو کوئی اس پتھر کے پگھلنے کی

اپنی ترکیبوں کی طرح ظفر اقبال نے ایک حرف کے التزام سے جس طرح مفرد لفظوں کے ذریعے اس غزل میں آہنگ کی تعمیر کی ہے وہ خط کشیدہ لفظوں سے ظاہر ہے۔ ان لفظوں کو ترتیب سے ایک بار پھر ملاحظہ کیجیے :

۱- برف برسنے
۲- سلسلہ وار جبلیں
۳- وصل وصال
۴- سال سفر
۵- روشن راہ
۶- ساعت سبز
۷- موج مڑے
۸- لمس لباس
۹- لبوں کے لرزنے
۱۰- سراب سمندر
۱۱- لہر لہو
۱۲- صورت صورت
۱۳- خار خمار خرابے
۱۴- پھولنے پھلنے
۱۵- سنگ سیاہ
۱۶- پتھر کے پگھلنے

لیکن اس غزل میں آہنگ پیدا کرنے کے لیے کچھ اور طریقے بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ جیسے ہم آواز لفظوں کی تکرار، ایک ہی لفظ کی تکرار، ملتی جلتی آوازوں والے لفظوں کی تکرار مثلاً : سان گمان، خواب سراب، خواب خیال، وصل وصال، خار خمار، صورت صورت، پھولنے پھلنے، لمس لباس وغیرہ۔

اس طرح ظفر اقبال آہنگ کی تعمیر میں ہر طرح سے پیدا ہونے والے غنائی عنصر کا لحاظ رکھتے ہیں۔ لیکن ظفر اقبال کا مقصد فقط غنائیت پیدا کرنا نہیں ہے۔ شاعری کو موسیقی میں بدل دینے کے تجربے مغرب میں بہت ہوئے ہیں۔ بقول انگریز پوپ "The Sound must seem an echo to the sense" لیکن ظفر اقبال کے یہاں موسیقی کے ذریعے سامع کی حسوں کو متحرک کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن کو اسی موسیقی آمیز عنصر کے ذریعے معنی کی طرف منتقل کرنے کا عمل بھی نظر آتا ہے۔ مندرجہ بالا غزل میں لفظوں کی تقسیم و ترتیب کے ذریعے آہنگ کو نمایاں کرنے کی کوشش اسی عمل کی نشاندہی کرتی ہے۔ آوازوں کی ترکیب و ترتیب ہی شاعرانہ معنی میں بدل جاتی ہے۔ آہنگ کی تعمیر کی مثال میں ظفر اقبال کی یہ دو غزلیں بھی ملاحظہ کیجیے :

(۱)

سرِ شاخسار گلاب ہے کہ سراب ہے
مرے سامنے یہ کتاب ہے کہ سراب ہے

کوئی پیاس ہے مری خواہشوں میں رکی ہوئی
کہیں دور چشمۂ آب ہے کہ سراب ہے

یہ طلسمِ خوابِ وصال ہے کہ ہے واہمہ
یہ لہو میں زورِ شباب ہے کہ سراب ہے

وہ ہمارا نقشِ نیاز تھا کہ نہیں ظفر
یہ کسی کا عکسِ عتاب ہے کہ سراب ہے

(۲)

دل میں ہوتی ہے خلا کی آہٹ
خاک پر چھائی فضا کی آہٹ

پھیل جاتے ہی دھواں آنکھوں میں
کان پڑتی ہے گھٹا کی آہٹ

سانپ سا سر میں سرکتا ہے کبھی
کبھی آتی ہے عصا کی آہٹ

کھل گئے گھر کے سبھی دروازے
آئی جب سیلِ بلا کی آہٹ

منظرِ سحرِ خزاں کے پیچھے
کھو گئی سبز ہوا کی آہٹ

سفرِ شوق کے آغاز میں ہی
آ گئی لغزشِ پا کی آہٹ

بھاگ اٹھے ہیں کہاں دیوانے
اور ہوتی ہے کہاں کی آہٹ

موسمِ قحط ہوا میں بھی سن
لرزشِ برگِ نوا کی آہٹ

خلق مبہوت تھی جب ظفر
آسمانوں پہ خدا کی آہٹ

پہلی غزل میں ایک حزنیہ بحر استعمال کی گئی ہے اور تمام مصرعے بائے ثانی
میں قافیے اور ردیف کی ہم آوازی نے آہنگ پیدا کیا ہے اور بحر کو اور زیادہ
غنائی بنا دیا ہے۔ لیکن دوسری غزل کا آہنگ پیدا کرنے میں ظفر اقبال نے خاص
ہنر دکھایا ہے۔ نو اشعار کی اس غزل کے بارہ مصرعوں میں کسی اضافت کا
استعمال نہیں ہوا ہے لیکن ترکیبوں اور اضافتوں سے آزاد ان مصرعوں میں
موجود آہنگ کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ
صرف ترکیبوں اور اضافتوں سے ہی آہنگ کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔ اس غزل کی
ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں لفظی آہنگ نے ہی معنوی آہنگ پیدا کیا ہے۔
غزل کے پہلے مصرعے (خلا کی آہٹ) سے لے کر آخری مصرعے (خدا کی
آہٹ) تک خوف، ہیبت اور وسوسے کا آہنگ صاف سنائی دیتا ہے۔

اب ہم ظفر اقبال کے ان شعروں کو پیش کر رہے ہیں جو خوبصورت اور
غنائی پیکروں کی بہترین مثال ہے۔ ان پیکروں کی تخلیق میں شاعر نے زبردست
خلاقی کا ثبوت دیا ہے۔ ان شاعرانہ پیکروں کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ شاعر
کی تخلیقی بصیرت کی ایک اور جہت کو نمایاں کیا جائے۔ اب ان پیکروں کو ملاحظہ
کیجئے:

جیسے گلِ سیاہ بکھرتا ہو عرش پر
گرتی رہیں زمیں پہ اندھیرے کی پتیاں

اک راز تھا چمکتے ہوئے سرخ رنگ کا
نگین کارنس پہ دھرے سبز مور میں

دریا نے زرد سانس لیا جس نواح میں
برسی ہوئی گھٹا ہے دھنک دھار اس طرف

چھانے لگی خیال پہ دودِ رواں کی چھاؤں
بجھنے لگا چمکتی ہوئی آنکھ کا نگیں

شب بھر رواں رہی گلِ مہتاب کی مہک
پو پھوٹتے ہی خشک ہوا چشمۂ فلک

پھر ہوا ایک بھٹکی ہوئی روح کی طرح آہستہ رو
آئی یادوں کے تالاب میں درد کی کنکری پھینکنے

یہ ایک شاخچۂ غم سے اتنے پھول جھڑے ہیں
کبھی قریب سے گزرو تو ایک باغ پڑا ہے

چشمۂ صبح سے قطرہ قطرہ
گر رہی ہے یہ صدا اٹھ بیٹھو

شاخوں نے پھیلائی ہی تھیں برہنہ باہیں ابھی
لے کے تر و تازہ برگ و بار بہار آ گئی

میں ڈوبتا جزیرہ تھا موجوں کی مار پر
چاروں طرف ہوا کا سمندر سیاہ تھا

شہر سارا سو رہا ہے نیند کی گری میں گم
بند دروازے ہوا کے کھولتا پھرتا ہوں میں

دن ہوا کٹ کر گرا میں روشنی کی دھار سے
خلق نے دیکھے لہو میں رات کے انوار سے

آنکھوں میں راکھ ڈال کے نکلا ہوں سیر کو
شاخوں پہ ناچتے ہیں شرر میرے سامنے

کیا ریت کی رنگت پہ ہے رفتار لہو کی
اے بے خبری کچھ تو بیاباں کی خبر دے

منظر ظفر کھلیں ہی کھلیں آفتاب کے
اڑنے لگے ہوا میں کنارے نقاب کے

کوئی اندازہ کر سکتا ہے کیا اس کا کہ آخر
کہاں تک سایۂ عہد زیاں پھیلا ہوا ہے

مجھے کچھ بھی نہیں معلوم اور اندر ہی اندر
لہو میں ایک دستِ رائیگاں پھیلا ہوا ہے

اقسام کے اعتبار سے ان میں سے بیشتر متحرک اور بصری پیکر ہیں اور ان میں کوئی بھی پیکر ایسا نہیں ہے جو شعریت کے عنصر سے عاری ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ پیکر معنویت سے محروم ہیں۔ آہنگ کے ذیل میں تفصیلی گفتگو کرتے وقت ہم مثالیں دے کر یہ واضح کر چکے ہیں کہ ظفر اقبال آہنگ کی فکر میں شعر کے اصل عنصر یعنی معنی کو ضائع نہیں ہونے دیتے۔ اسی طرح اپنے شاعرانہ پیکروں میں بھی وہ معنی پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں اسی لیے ان پیکروں میں معنی کی کئی سطحیں موجود ہوتی ہیں۔

ظفر اقبال کی علامتوں اور استعاروں وغیرہ پر ہم آگے چل کر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ کس طرح اپنے منظروں سے معنی اخذ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں کوئی بھی منظر برائے منظر نہیں ہوتا بلکہ ہر منظر کسی نہ کسی معنی کا حامل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ان شعروں کو ملاحظہ کیجیے :

دریا نے زرد سانس لیا جس نواح میں
بری ہوئی گھٹا ہے دھنک دھار اس طرف

میں ڈوبتا جزیرہ تھا موجوں کی مار پر
چاروں طرف ہوا کا سمندر سیاہ تھا

شہر سارا سو رہا ہے نیند کی گری میں گم
بند دروازے ہوا کے کھولتا پھرتا ہوں میں

ان شعروں میں جن منظروں کو پیش کیا گیا ہے ان کا حقیقی دنیا سے بظاہر کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن یہ منظر جن معنی کی طرف ہمارے ذہن کو منتقل کرتے ہیں وہ حقیقی دنیا کی عکاسی کرتے ہیں۔ مثلاً پہلے شعر میں دریا۔ دنیا اور وقت کی، اور زرد سانس زوال یا موت کی علامت ہے۔ دوسرے اور تیسرے شعر میں ہوا تخریب کی علامت بھی ہے اور وقت کی علامت بھی۔

پہلے شعر کا مجموعی پیکر دنیا کے المناک زوال کی علامت ہے۔ بری ہوئی گھٹا کہہ کر شعر میں جو طنز پیدا کیا گیا ہے اس نے زوال کی المناکی کو اور شدید کر دیا ہے۔ جس نواح میں دریا نے زرد سانس لیا ہے اسی نواح میں گھٹا بھی کھل کر برس چکی ہے۔ گھٹا کا برسنا باران رحمت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ شعر میں طنز کا پہلو یہی ہے کہ جہاں ابھی رحمتوں کا نزول ہوا ہے یا جس زمین سے نمو اور بالیدگی کا سفر شروع ہوا ہے، اسی زمین کو زوال اور فنا کا سامنا ہے۔

دوسرے شعر میں ہوا کا سیاہ سمندر ہولناک تباہی کی علامت ہے جس کی زد میں ڈوبتا ہوا جزیرہ (شاعر کی ذات) ہے۔ اور تیسرے شعر میں ہوا کا بند دروازوں کو کھولنا سوئے ہوئے لوگوں کو نئے زمانے کی بشارت دینے سے عبارت ہے۔

اس طرح تینوں شعر صرف منظروں کو پیش نہیں کرتے بلکہ ان کے اندر موجود معنی کی تہیں کھولتے ہیں اور اسی لیے ظفر اقبال کا ہر پیکر ایک معنوی پیکر بن جاتا ہے۔

ظفر اقبال کی شاعری سے متعلق یہ پہلو ہماری اصل گفتگو کا موضوع نہیں ہیں۔ لیکن ان پہلوؤں کا ذکر اس لیے ضروری تھا کہ اس سے ظفر اقبال کے اس شاعرانہ اور خلاقانہ ذہن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو انھیں ایک بڑے علامت نگار شاعر کے طور پر ہمارے سامنے لاتا ہے۔

اب آئیے دیکھیں کہ علامت کے نقطۂ نظر سے ظفر اقبال کس اہمیت کے حامل ہیں اور انھوں نے کن کن علامتوں کو کن کن معنی میں استعمال کیا ہے۔ پہلے ان علامتوں پر مشتمل اشعار ملاحظہ کیجیے جو ہماری پرانی شاعری میں موجود ہیں اور جنھیں ظفر اقبال نے بہت نئے معنی میں استعمال نہیں کیا ہے تاہم یہ علامتیں نئے معنوی تاثرات کی طرف ضرور ہمارے ذہن کو منتقل کرتی ہیں :

عکس اور آئینہ :

عکس :

کیا دھوپ تھی کہ آنکھ ٹھہرتی نہ تھی کبھی
تھا کس کا عکس آئینۂ آفتاب میں

کس لیے راہ میں رکنے لگی رفتار مری
آنکھ پڑتی ہے یہ کس عکس پہ ہر بار مری

کہ شامل اس میں مری لرزش خیال بھی تھی
جو اصل چھوڑ کے میں عکس کے اثر میں رہا

آغاز شیشہ رنگ تمنا کی ابتری
پانی کا پھول عکس گرفتار کا بدن

آئینہ :

آئنہ عکس رخ رنگ سے خالی ہے کہ ہوں
سات پردوں کے سوا آٹھواں حائل میں بھی

جو ایک جسم جلاتی ہے برق ابر خیال
تو لاکھ زنگ زدہ آئنے نکھارتی ہے

آیا نہیں ہے عکس بہت صاف اب کی بار
آئینہ ہوگیا ہے مکدر کسی طرح

نقش خود مست ہے لیکن ہے ابھی
عکس آئینہ نما سے ناراض

آئینہ توڑ کر ہی ممکن ہے
روٹھنے والے عکس کا احیا

ہے سنگ پر نشاں کسی نقش نیاز کا
لرزش ہے آئینے میں کسی عکس ناز کی

نکل جائے گی صورت آئینے سے
ہمارے گھر میں حیرانی رہے گی

ان اشعار میں سے چند کی تفہیم و تشریح کے ذریعے یہ دیکھ لیا جائے کہ عکس اور آئینے کی علامتوں نے کن کن مفاہیم کی نمائندگی کی ہے۔ پہلے یہ شعر :

کہ شامل اس میں مری لرزش خیال بھی تھی
کہ اصل چھوڑ کے میں عکس کے اثر میں رہا

عکس اور اصل میں فرق یہ ہے کہ عکس غیرمادی اور موہوم ہے جب کہ اصل مادی اور موجود۔ اس لیے عکس کے مقابلے میں اصل زیادہ اہم ہے۔ عکس کے اثر میں رہنے کا مطلب ہے واہمے کا اسیر ہونا اور حقیقت یعنی اصل سے دور ہونا۔ سوال یہ ہے کہ ہم حقیقت سے روگردانی کیوں کر رہے ہیں اور حقیقت کے مقابلے میں واہمے کے اثر میں کیوں آنا چاہتے ہیں؟ اس لیے کہ اصل کے اثر میں رہنا زیادہ اندوہناک ہے۔ واہمہ اصل کی اذیت سے آزاد ہے۔ لیکن اصل کی اذیت ہے کیا؟ ہمیشہ قائم رہنے والا ذہنی اور روحانی اضطراب۔ اسی اضطراب سے نجات پانے کے لیے ہم واہمے کی دنیا میں پہنچنا چاہتے ہیں اور اس دنیا میں پہنچنے کی تحریک کچھ کچھ ہمیں اپنی لرزش خیال سے

ملتی ہے۔

اس شعر کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جس میں عکس اور اصل کی دوسری تعبیر بھی ممکن ہے۔ کبھی کبھی اصل غیرمادی ہوتا ہے اور عکس مادی۔ مثلاً خدا جس کا کوئی جسمی وجود نہیں ہے لیکن اس کا عکس یعنی یہ دنیا مادی وجود رکھتی ہے۔ اب مفہوم یہ ہوا کہ پہلے میں اصل کے اثر میں تھا لیکن یہ اصل ایک واہمہ تھا اس لیے کہ اصل کا ظاہر میں کوئی وجود نہیں تھا۔ جس طرح خدا کا ظاہر میں کوئی وجود نہیں ہے۔ تو ایسا اصل جو اپنے کو ظاہر نہ کر سکے یا ہم جس کا مشاہدہ نہ کر سکیں اس سے وہ عکس بہتر ہے جو عکس تو ہے لیکن ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہی اصل ہے بقول میر ؎ یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

لرزش خیال سے ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔ یعنی خیال کا زاویہ بدلنے سے عکس کا زاویہ بھی تبدیل ہوا۔ اس کی وجہ سے آئینے میں یکسانی نہیں آنے پائی۔ دوسرے یہ کہ لرزش خیال کی وجہ سے میں عکس کو پوری طرح نہیں دیکھ سکا اور بہت طرح سے دیکھ لیا۔ یعنی اس مشاہدے میں ایک طرح کا Paradox موجود ہے۔

کس لیے راہ میں رکنے لگی رفتار مری
آنکھ پڑتی ہے یہ کس عکس پہ ہر بار مری

یہ کون سا عکس ہے جس پر آنکھ پڑنے سے راہ میں میری رفتار رکنے لگتی ہے۔ یہ عکس منزل یعنی اصل کا عکس ہے۔ میں اصل کی طرف جا رہا ہوں اس طرح عکس ہی میری منزل ہے اور جب بھی منزل کی طرف میری نگاہ اٹھتی ہے میری رفتار دھیمی پڑنے لگتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ منزل آگئی ہے لیکن منزل آتی نہیں ہے کیونکہ اصل (عکس) تو ہر جگہ موجود ہے۔ اسی لیے مجھے قدم قدم پر منزل کا گمان ہوتا ہے جب کہ منزل کہیں نہیں ہے اور ہر جگہ ہے۔

آئنہ عکس رخ رنگ سے خالی ہے کہ ہوں
سات پردوں کے سوا آٹھواں حائل میں بھی

اس شعر میں اصل کی نہیں عکس کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ ایک عکس اصل ہے اور ایک عکس اصل نہیں ہے یعنی ایک وہ عکس ہے جس کے رنگ صحیح نہیں ہیں۔ یہ رنگ سات پردوں کی وجہ سے بدل جاتے ہیں اور ان کو بدلنے میں ایک مخفی (آٹھواں) پردہ میں بھی ہوں۔

مفہوم یہ ہوا کہ یوں تو انسان اور عرفان کے درمیان خود اس کی ذات حائل ہوتی ہے لیکن یہاں دوسری چیزیں بھی حائل ہیں جن کی وجہ سے ہمیں عرفان حاصل نہیں ہو رہا ہے۔

آئینہ توڑ کر ہی ممکن ہے
روٹھنے والے عکس کا احیا

یہ آئینہ دل کا آئینہ ہے جس میں اصل عکس نظر آتا تھا۔ اب اس میں کچھ اور عکس نظر آنے لگے ہیں۔ دل میں اصل عکس کے علاوہ اگر دوسرے عکس نظر آئیں گے تو اصل عکس غائب ہو جائے گا۔ اب اصل عکس کو حاصل

کرنے کا راستہ یہ ہے کہ دل کو توڑ دیا جائے۔ اس دل شکستگی کے بعد ہی اصل
عکس (یعنی ذات) کا عرفان حاصل ہو سکے گا۔

آیا نہیں ہے عکس بہت صاف اب کی بار
آئینہ ہو گیا ہے مکدر کسی طرح

شعر کا مفہوم بالکل صاف ہے۔ جب تک آئینہ صاف نہیں ہو گا عکس
بھی صاف نظر نہیں آئے گا۔ جس طرح آئینے پر ذرا سی گرد جمنے سے عکس
دھندلا ہو جاتا ہے اسی طرح دل میلا ہونے سے یعنی دل میں غیر اللہ کے آجانے
سے خدا کا مشاہدہ نہیں ہوتا۔ دل میں اللہ کا مشاہدہ کرنے کے لیے صفائے قلب
کا ہونا ضروری ہے۔ دل جتنا صاف ہو گا حقیقت (اللہ) اتنی ہی روشن نظر
آئے گی۔

آپ نے دیکھا کہ ظفر اقبال کے یہاں عکس اور آئینہ کے کتنے پیچیدہ اور
تہ دار مفاہیم موجود ہیں۔ ظفر اقبال یا ان ہی کی طرح کے دوسرے شاعر اپنے
مخصوص اور منفرد ذہن کی وجہ سے اس طرح کی علامتوں کے ذریعے بہت گہرے
اور خاص سطح کے مفاہیم ادا کرتے ہیں۔ اسی لیے ہم ان شعرا کے اس نوع کے
شعروں کی تفصیلی تشریح کا جوکھم اٹھاتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ
ہمارا تجزیہ ان شعروں کے اصل اور تہ دار مفاہیم تک پڑھنے والے کی رہنمائی
نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان شعروں کی تعبیر کے عمل میں ہم نے اپنے مفاہیم کو
وہیں تک محدود رکھا ہے جہاں تک ہمارا ذہن پہنچ سکا ہے اور جہاں تک پڑھنے
والے کی رسائی ممکن ہے۔

پرانی شاعری کی ان اہم علامتوں کی تفہیم کے بعد اب آئیے دیکھیں کہ
دوسری کون سی علامتیں ہیں جنہیں ظفر اقبال نے مقابلتاً زیادہ استعمال کیا ہے اور
جن کی معنویت کو بڑی حد تک بدل بھی دیا ہے :

نقش :

ہماری موج نگہ نے مٹا دیے ورنہ
ہزار نقش بنے خاک پر ہمارے لیے

پڑا ہوں کب سے گزر گاہ باد و باراں میں
مٹا ہوا سا کسی نقش کا نشاں ہوں میں

دن کا دیدار ہی فردوس نظر تھا لیکن
رات چمکی تو عجب نقش نمودار ہوئے

سب اڑ گیا ہوا پہ جمانے کی سعی میں
وہ ایک نقش لائے تھے جس کو بچا کے ہم

ایک ہی نقش ہے اب سوچ سمجھ لو کہ نہیں
فرق مٹنے میں کوئی اور مٹا دینے میں

ایک ہی نقش ہے جتنا بھی جہاں بھی رہ جائے
آگ اڑتی پھرے ہر سو کہ دھواں رہ جائے

کیا نقش بنائیے کہ گھر میں
دیوار کبھی نہیں کبھی ہے

دل سے تو خیر دھو گئی بارش تمام نقش
دیوار شہر کا بھی وہ عالم نہیں رہا

ان شعروں میں نقش گزرے ہوئے زمانوں اور بھولی بسری یادوں کی
علامت ہے۔ یہ اذکار رفتہ اور پیش پا افتادہ چیزوں کی علامت ہے اور یہ نقش نئی
خواہشوں اور تمناؤں کو بھی ظاہر کرتا ہے اور کہیں کہیں عرفان و آگہی کی بھی
علامت بن جاتا ہے۔ ان معنویتوں کو اب ذیل کے تجزیوں میں ملاحظہ کیجیے :

ہماری موج نگہ نے مٹا دیے ورنہ
ہزار نقش بنے خاک پر ہمارے لیے

خاک پر بننے والے نقش کیا تھے جنہیں نگاہ کی موج نے مٹا دیا۔ یہ ایسے
ہی نقش تھے جو میری نگاہ کو اچھے نہیں معلوم ہوتے تھے یا میری نظر کو تلاش
تھی۔ یعنی جو نقش بن رہے تھے ان میں کوئی ایسا مثالی یا معیاری نقش نہیں تھا
جسے میری نگاہ قبول کر لیتی۔ اس نقش کا نہ بن پانا ہی شاعر کی اذیت ہے۔

اب مفہوم یہ ہوا کہ ہم فن کے جس مثالی نمونے کو پانا چاہتے ہیں وہ
ہمیں نہیں مل پا رہا ہے۔ اور غیر معیاری نقوش کو ہماری نظر (بصیرت) قبول
نہیں کر رہی ہے۔ اس طرح شاعر دہری اذیت میں مبتلا ہے۔ (۱) اصل یا مثالی
نقش کا نہ بن پانا (۲) اس نقش کے بجائے ناقص، سطحی اور غیر معیاری نقش کا
بننا۔

دن کا دیدار ہی فردوس نظر تھا لیکن
رات چمکی تو عجب نقش نمودار ہوئے

دن کی روشنی میں ہر موجود چیز واضح اور اپنی سب جزئیات کے ساتھ نظر
آتی ہے۔ چیزوں کا صاف دکھائی دینا بجائے خود ایک لطف دیتا ہے، اسی کو شاعر
نے "فردوس نظر" کہا ہے۔ لیکن تاریکی میں اشیاء کی ہیئت طرح طرح سے بدلتی
ہے کبھی جزئیات غائب ہو کر ایک مجموعی اور اجنبی ہیئت رہ جاتی ہے اور یہ تو
بہت ہوتا ہے کہ ایک شے پر دوسری شے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ دن کی مانوس
چیزیں رات کو انوکھی اور غیر مانوس نظر آتی ہیں۔ کہیں ان کی اصل ہیئت وہی تو
نہیں جو رات کو نظر آتی ہے؟ "رات چمکی" سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اشیا کی
اصل یا باطن کی نمود دن کی روشنی میں نہیں، رات کی تاریکی میں ہوتی ہے۔

سب اڑ گیا ہوا پہ جمانے کی سعی میں
وہ ایک نقش لائے تھے جس کو بچا کے ہم

ہوا پر نقش جمانے کا کام سعی لاحاصل ہے۔ جب ہم نے یہ کوشش کی تو

ہمارا بنا بنایا قفس اڑ گیا۔ یعنی جب ہم نے اپنے جوہر کی نمائش کی تو اس نمائش میں ہمارا جوہر ہی ختم ہو گیا۔ قفس یہاں جوہر کی علامت ہے اور ہوا قدر ناشناسی کی علامت۔ قدر ناشناس لوگوں میں اپنے جوہر کو نمایاں کرنا جوہر کو گنوا دینے کے مترادف ہے۔ قفس یہاں روایت کی علامت بھی بن سکتا ہے اور ہوا نئی تہذیب یا نئے زمانے کی علامت یعنی جب ہم نے نئی تہذیب کے مقابل روایت کو لانے کی کوشش کی تو ہم اس روایت ہی سے محروم ہو گئے۔

اس طرح قفس ان اشعار میں مختلف مفاہیم کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ مفاہیم پرانی معنویتوں کی توسیع بھی کرتے ہیں اور نئی معنویتوں کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔

ان علامتوں پر گفتگو کرنے کے بعد اب ہم ظفر اقبال کی بعض نجی علامتوں کا جائزہ لیں گے۔ ان علامتوں میں انھوں نے بالکل نئے مفاہیم پیدا کیئے ہیں۔ اس قبیل کی علامتوں میں سب سے پہلے زرد / زردی سے متعلق یہ اشعار ملاحظہ کیجیئے :

آگے بڑھوں تو زرد گھٹا رنگ رو بہ رو
پیچھے ہٹوں تو گرد سفر میرے سامنے

اٹھے اب اس نواح سے کس طرح موج سبز
بہتا ہوا یہ خاک کا دریا ہی زرد ہے

میں نکل سکوں کیسے میں پہنچ سکوں کیونکر
سبز کے اندھیرے سے زرد کے اجالے میں

دریا نے زرد سانس لیا جس نواح میں
بری ہوئی گھٹا ہے دھنک دھار اس طرف

میں سرد آگ نہ پانی کے زرد ڈر میں رہا
رہا تو سوئی ہوئی خاک کے خطر میں رہا

بدلے ہیں آب و خاک کے کتنے ہی پیرہن
یہ رنگ پیرہن ہے کہ ویسا ہی زرد ہے

چہروں کی دھند بجھنے لگی چار سو ظفر
رنگ ہوائے شام کچھ ایسا ہی زرد ہے

یہ اتفاق نہیں ہے جو رنگ زرد اس کا
کبھی کبھی مرے چہرے سے بھی جھلکتا ہے

زرد / زردی ظفر اقبال کے یہاں زوال اور فنا کی علامت ہے۔ یہ مفہوم ظفر اقبال کے یہاں مختلف معنوی تاثرات کے ساتھ ادا ہوا ہے۔ مثلاً یہ شعر :

آگے بڑھوں تو زرد گھٹا رنگ رو بہ رو
پیچھے ہٹوں تو گرد سفر میرے سامنے

آگے زرد گھٹا رنگ ہے جس میں راستہ صاف نظر نہیں آتا۔ راستہ صاف نظر نہ آنے کی وجہ سے میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔ گرد سفر یہ بتا رہی ہے کہ پیچھے پامال کیا ہوا راستہ ہے اس لیئے میرا پیچھے پلٹنا بھی مشکل ہے۔ اس طرح (سفر میں) اب میں اس مقام پر ہوں جہاں نہ آگے بڑھا جا سکتا ہے نہ پیچھے ہٹا جا سکتا ہے۔

زرد گھٹا رنگ اور گرد سفر میں معنوی مماثلت بھی ہے۔ جس طرح زرد گھٹا رنگ میں کچھ نظر نہیں آتا اسی طرح گرد سفر میں بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ زرد گھٹا رنگ زوال اور زہر یعنی موت کی علامت ہے۔ اس شعر کا علامتی مفہوم بیان کرنے سے قبل یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ظفر اقبال کے یہاں زرد اور زہر کی علامتیں ایک دوسرے کا لازمہ ہیں۔ زرد ان کے یہاں زوال اور زہر سے وابستگی کی علامت ہے۔ اس علامت (زرد) کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ یہ ظفر اقبال کی غزل میں جب بھی ہمارے سامنے آتی ہے تو اس کے ساتھ زہر کا خیال آنا لازم ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح یرقان میں سارا جسم زرد ہو جاتا ہے اور یہ زردی جسم میں زہر کے پھیلنے سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

اب اس شعر کا علامتی مفہوم ملاحظہ کیجیئے : آگے زرد گھٹا رنگ ہے اس لیئے آگے بڑھنا موت کا سامنا کرنا ہے اور پیچھے پلٹنا ناممکن ہے اس لیئے کہ وہ روندا ہوا راستہ ہے اور روندے ہوئے راستے کی طرف لوٹنا ایک طرح کی پسپائی بلکہ توہین آمیز پسپائی ہے۔ زندگی کے سفر میں ہم ہمیشہ آگے کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں۔ یہاں آگے بڑھنا موت کو دعوت دینا اور پیچھے پلٹنا ذلت خیز پسپائی کو قبول کرنا ہے۔

ایک دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ آگے زرد گھٹا رنگ کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے اور پیچھے گرد سفر کی بنا پر۔ بفرض محال میں پیچھے پلٹنے کا ارادہ کر بھی لوں تو نہیں معلوم کہ گرد سفر کے بیٹھنے کے بعد اس راستے پر کیا نظر آئے۔ ممکن ہے کہ وہاں بھی زوال اور فنا کا سامنا ہو۔ اس طرح دونوں ہی حالتوں نے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کی صورت حال پیدا کر دی ہے۔

اٹھے اب اس نواح سے کس طرح موج سبز
بہتا ہوا یہ خاک کا دریا ہی زرد ہے

زرد یہاں بھی زوال اور زہر (فنا) کی علامت ہے۔ خاک کے زرد دریا سے کوئی سبز موج نہیں اٹھ سکتی۔ سبز موج ارتقا اور نمو کی علامت ہے۔ یعنی جہاں خزاں کا دور ہو وہاں نمو کیسے ممکن ہے۔ خاک کے زرد دریا سے مراد یہ دنیا ہے جہاں اشیا کے وجود میں آتے ہی عدم کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ خاک کا زرد دریا اس زمین سے عبارت ہے جس میں زہر موجود ہے اور اسی وجہ سے اس زمین پر کوئی شاداب یا زندگی سے بھرپور چیز پنپ نہیں سکتی۔

شعر کا علامتی مفہوم یہ ہوا کہ دنیا میں آتے ہی ہمارے مقاصد اور عزائم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ہم اپنی صفتوں اور جوہروں کو بروئے کار لا کر تکمیل کی منزل کی طرف بڑھنے لگتے ہیں لیکن تکمیل کی یہ منزل ہمیں حاصل

نہیں ہوتی کیونکہ یہ پورا سفر عدم کا سفر ہے اور جس منزل کی طرف بظاہر ہم بڑھ رہے ہیں وہ عدم کی منزل ہے۔ اس طرح اس دنیا میں کسی شے کا پوری طرح سرسبز و شاداب ہونا ناممکن ہے۔

اسی مفہوم کے مماثل مفہوم درج ذیل شعر میں بھی موجود ہے۔

دریا نے زرد سانس لیا جس نواح میں
بری ہوئی گھٹا ہے دھنک دھار اس طرف

پچھلے صفحات میں پیکر اور معنی کی بحث میں ہم اس شعر کی علامتی معنویت پر روشنی ڈال چکے ہیں اس لیئے دوبارہ ہم اس کے مفہوم کی نشاندہی نہیں کریں گے۔

زرد / زردی کی علامت کے بعد اب ہم ظفر اقبال کی اس علامت پر گفتگو کریں گے جو مفہوم کے اعتبار سے زرد سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اس علامت پر مشتمل یہ اشعار دیکھیئے :

رات کا زہر بجھاتے رہے بینائی میں
چھپ کے بیٹھی رہی تصویر تماشائی میں

خمار مرگ سے ہے اب یہ کیفیت کہ کبھی
پیا ہے زہر تو نشہ چڑھا شراب ایسا

یہ کس ہوا سے لرزتا ہے برگ برگ اس کا
یہ زہر کون سی رت کا ثمر میں اتا ہے

زہر زمیں میں ہے نہ فشار فلک میں ہے
وہ حبس جاں کی لہر جو اس کی جھلک میں ہے

ان اشعار میں زہر مرگ یا فنا کردینے والی شے کی علامت ہے۔ زہر ناپسندیدگی کو بھی ظاہر کرتا ہے اور Corrupting force کی بھی علامت بنتا ہے۔ درج بالا شعروں میں سے دوسرے شعر میں زہر صاف طور پر مرگ کی علامت ہے۔ اس شعر میں خمار مرگ شدید طلب والی کیفیت ہے۔ یعنی مجھے موت کی آرزو ہے۔ اس آرزو نے مجھ پر ایسی کیفیت طاری کردی ہے کہ موت کے آنے میں مجھے وہی لذت مل رہی ہے جو شراب کے نشے کے دھیرے دھیرے چڑھنے میں ملتی ہے۔

زہر کی معنویت کو اس شعر میں بھی ملاحظہ کیجئے :

یہ کس ہوا سے لرزتا ہے برگ برگ اس کا
یہ زہر کون سی رت کا ثمر میں اتا ہے

زہر یہاں بھی مرگ کی علامت ہے۔ کیونکہ ثمر میں زہر بھرا ہوا ہے اس لیئے اس کا برگ برگ ہوا یعنی ہوائے مرگ سے لرز رہا ہے۔ یہ زہر منافرت کا زہر ہے۔ ثمر سے مراد ہمارا ملک اور برگ سے مراد افراد قوم ہیں۔ کون سی رت کے زہر کا مطلب ہے کسی پچھلی رت کا زہر۔ مثلاً تقسیم وطن کے زمانے کا زہر۔ منافرت کا یہ زہر اب بھی ہمارے اندر بھرا ہوا ہے۔ ہم اس زہر سے خوفزدہ

ہیں۔ اگر یہ اسی طرح ہم میں سرایت کرتا رہا تو ہم ایک دن ختم ہو جائیں گے۔ اسی خوف مرگ سے ہر ایک (برگ) کا دل کانپ رہا ہے۔

نئی معنویتوں کے اعتبار سے ہوا اور دریا بھی ظفر اقبال کی اہم علامتیں ہیں۔ ان علامتوں کو انھوں نے بہت زیادہ استعمال کیا ہے اور ان سے طرح طرح کے مفاہیم پیدا کیئے ہیں۔ ان کے ہر مجموعے میں یہ علامتیں دوسری علامتوں سے زیادہ نظر آتی ہیں۔ ان دونوں علامتوں میں نئے مفاہیم کی جستجو کے لیئے پہلے ہم ہوا کی علامت کو لیتے ہیں :

میں ڈوبتا جزیرہ تھا موجوں کی مار پر
چاروں طرف ہوا کا سمندر سیاہ تھا

میں خود کسی کے خون کی آندھی ہوں ان دنوں
اڑتی ہوئی ہوا سے نہ ڈر مرے سامنے

شہر سارا سو رہا ہے نیند کی گری میں گم
بند دروازے ہوا کے کھولتا پھرتا ہوں میں

اس طرح ظفر سب کو ہوا قید کرے گی
دے گا نہ دکھائی کبھی دروازہ قفس کا

آثار آب سیل صدا رنج رائیگاں
کیا کیا ہوا کی لو پہ لرزتا ہے بادباں

اڑے نہیں خس و خاشاک ابھی قفس کے ظفر
اگرچہ شہر میں ہنگامۂ ہوا بھی ہوا

یہ کس ہوا میں لرزتا ہے برگ برگ اس کا
یہ زہر کون سی رت کا ثمر میں اتا ہے

نئی ہوا میں مہک ہے پرانے پتوں کی
جو خاک ہوگئے پر خاک سے جدا نہ ہوئے

سنسناتی ہوئی فضا کے سوا
کچھ نہیں کہیں ہوا کے ہوا

خالی خلا ہے اور ہوا میں رکھا ہے کیا
تو خود کہیں نہیں ہے کسے ڈھونڈتا ہے کیا

کچھ ٹھہرتا نہیں یلغار ہوا کے آگے
تھا خزاں کے خس و خاشاک میں شامل میں بھی

ہوا کے اندھے کنوئیں میں گر کر ظفر بچے گے تو دیکھ لیں گے
ابھی تو یہ دور کا تماشا کھڑے سر رہ گزار دیکھو

موج ہوا سے کانپ گیا صبح کا چراغ
سیل صدا میں ڈوب گئی یاد کی دھنک

کب تک چلے گی دور کی خوشبو سے دوستی
دنیا اجاڑ ہوتی ہے جس دن ہوا نہ ہو

زندانی غنچے ہی رہے ہم
پوچھی نہ ہواؤں نے خبر تک

میں ہوا ہوں مجھے کلیوں سے گزرنا ہے ابھی
اے گل سرخ مجھے اپنا کوئی راز نہ دے

برگ و بار اپنے پہ قابو ہی نہ تھا
اور رہتے تھے ہوا سے ناراض

خاک پہ ہوگئی ہوا ناظم   خرمنوں پہ ہوا شرر نافذ

موسم قحط ہوا میں کبھی سن   لرزش برگ نوا کی آہٹ

زندانی حبس آرزو کو   جنگل کی ہوا ہے جان لیوا

میں جو ہوتا بھی تو اس تند ہوا نے مجھ کو
خس و خاشاک کے ہمراہ اڑا دینا تھا

ہے یہیں تک ہوا بھی نایاب
شاخ تو آپ ہی لرزی ہے میاں

خاک پہ اڑتی بکھرتی پرزہ پرزہ آرزو
یاد ہے یہ کچھ ہوا کی آخری یلغار سے

آواز و ہوا دونوں ہی زنجیر ہوئے ہیں
اب کون ہے جو تیزی طوفاں کی خبر دے

ان شعروں کو ہم نے تفصیل سے اس لیئے نقل کیا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ ظفر اقبال اس علامت کو کس طرح بدل بدل کر استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سے چند شعروں کے تجزیے کے ذریعے ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ اس علامت کے مختلف پہلو مختلف شعروں میں کس طرح نمایاں ہوئے ہیں۔ ان پہلوؤں کو نمایاں کرنے سے قبل یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہوا ظفر اقبال کے یہاں بظاہر منفی معنی میں استعمال ہوئی ہے لیکن ان کے یہاں سب سے زیادہ قوت بھی اسی علامت میں موجود ہے۔ ہوا ہماری پرانی شاعری میں پیغام رسانی یا عاشق و معشوق کے درمیان رابطے کی علامت ہے۔ پرانی شاعری میں یہ علامت اپنے تمام تلازموں کے ساتھ استعمال ہوئی ہے۔ لیکن ظفر اقبال کے یہاں یہ مجرد علامت کے طور پر سامنے آئی ہے اور تخریبی قوت کا مفہوم ادا کرتی ہے۔ اس مفہوم کے علاوہ ظفر اقبال کے یہاں ہوا کا

روایتی مفہوم بھی موجود ہے جو تبدیلی اور زمانے سے عبارت ہے۔ لغوی مفہوم میں بھی ہوا کو ہم زمانے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اب آیئے ان شعروں میں ہوا کی مختلف معنویتوں کا جائزہ لیا جائے۔

میں خود کسی کے خون کی آندھی ہوں ان دنوں
اڑتی ہوئی ہوا سے نہ ڈر میرے سامنے

اپنے آپ کو خون کی آندھی کہہ کر اڑتی ہوئی ہوا سے خوف نہ کھانے کی تلقین کرنا خود بتاتا ہے کہ ہوا اس شعر میں تخریب کی علامت ہے۔

ان دنوں مجھ میں خود ہوا کی سی قوت موجود ہے بلکہ میں ہوا سے زیادہ غضبناک ہوں اس لیئے میرے سامنے ہوا سے نہ ڈر کہ میں اس کے لیئے ایک مزاحم قوت بن جاؤں گا اور چونکہ مجھ میں اس سے زیادہ تیزی ہے اس لیئے میں اس پر غالب آجاؤں گا۔ بظاہر یہ شعر کسی اعلیٰ مفہوم کی نمائندگی نہیں کرتا لیکن یہ ہوا کے اس منفی پہلو کو سامنے لاتا ہے جو ظفر اقبال کے یہاں اس علامت سے مخصوص ہے۔ علامتی مفہوم میں یہ شعر ظالمانہ قوتوں کے سامنے زبردست مزاحمت کی علامت ہے۔

اس طرح ظفر سب کو ہوا قید کرے گی
دے گا نہ دکھائی کبھی دروازہ قفس کا

اس شعر میں ظفر اقبال نے ہوا کے روایتی مفہوم کو بالکل پلٹ دیا ہے۔ روایتی مفہوم میں ہوا قفس اور اس کے باہر کی دنیا کے درمیان رابطے کی علامت ہے اور یہ رابطہ دروازۂ قفس کے چاک کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ لیکن یہاں اس رابطے کا قائم ہونا مشکل ہے کیونکہ ہوا سب کو اس طرح قید کرے گی کہ قفس کا دروازہ کبھی نظر ہی نہ آئے گا۔ روایتی شاعری میں جو شے دونوں دنیاؤں کے درمیان رابطہ قائم کرنے کا وسیلہ ہے وہی یہاں رابطہ منقطع کر دینے کا موجب ہے۔ اور ستم ظریفی یہی ہے کہ اب ہم اسی شے کے اسیر ہوں گے جو اسیری میں آزاد دنیا سے ہمارا تعلق پیدا کرتی تھی۔

اڑے نہیں خس و خاشاک ابھی قفس کے ظفر
اگرچہ شہر میں ہنگامۂ ہوا بھی ہوا

اگرچہ شہر میں ہوا نے ہنگامہ کیا اور اس ہنگامے میں زبردست تباہی ہوئی لیکن قفس پر اس تباہی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے خس و خاشاک اپنی جگہ پر ہیں۔ اس شعر میں ہوا احتجاج کی علامت ہے اور قفس اسیری کا مفہوم ادا کر رہا ہے۔ اگرچہ ہم نے ظلم کے خلاف پرزور احتجاج کیا لیکن ہمیں اس ظلم سے نجات نہیں مل سکی۔ یعنی ہمارے گرد ظالمانہ قوتوں کا شکنجہ اتنا مضبوط ہے کہ ہم شورش یا بغاوت برپا کرنے کے بعد بھی ان سے آزاد نہیں ہو سکے۔

کچھ ٹھہرتا نہیں یلغار ہوا کے آگے
تھا خزاں کے خس و خاشاک میں شامل میں بھی

ہوا کی یلغار نے سب کچھ اڑا دیا ہے اور جو کچھ اس نے اڑا دیا ہے اس میں میں بھی شامل ہوں۔

ہوا نے دو کام کیئے ہیں۔ پہلے تو اس نے باغ کو مبتلا بہ خزاں کردیا پھر خزاں کی وجہ سے باغ میں جو خس و خاشاک جمع ہوا اسے اڑا دیا۔ ہوا یہاں نیستی اور فنا کے مفہوم کو ادا کررہی ہے اور خزاں فنا پذیری کے عمل کو ظاہر کررہی ہے۔ اس عمل کا شکار میں بھی ہوں کیونکہ میں بھی خس و خاشاک میں شامل ہوں۔ اس شعر میں خیام کی اس رباعی کی بازگشت ہے :

یک قطرۂ آب بود در دریا شد
یک ذرۂ خاک با زمیں یکتا شد

آمد شدن تو اندریں عالم چیست
آمد مگسے پدید و ناپیدا شد

شعر کے مفہوم میں ایک طرح کی خود تحقیری ہے لیکن اس خود تحقیری کا انداز بدلا ہوا ہے۔ خس و خاشاک میں شامل ہونے کی بنا پر ہوا نے ہم کو اڑا دیا لیکن ہوا کو یہ نہیں معلوم کہ اس نے کس شے کو اڑایا ہے۔ ہم خس و خاشاک میں شامل ضرور تھے لیکن ہم ان بیکار محض چیزوں سے مختلف تھے۔ باغ کے لیئے ہماری بڑی اہمیت تھی لیکن ہوا نے ہماری قدر و منزلت کو نہیں پہچانا اور ہمیں بھی فضول اور بیکار اشیا کے ساتھ باغ سے باہر کردیا۔ اس طرح شاعر نے اپنی خود تحقیری کو بھی احساس عظمت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

زندانی غنچہ ہی رہے ہم
پوچھی نہ ہواؤں نے خبر تک

یہاں ظفر اقبال نے ہوا کو دوسرے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ ہوا کا ایک کام غنچے کو کھلا کر پھول بنانا بھی ہے۔ چونکہ ہوا ہماری طرف نہیں آئی اس لیئے ہم غنچے سے پھول بننے کے عمل سے محروم رہے۔ اگر ہوا ہماری خبر لیتی (یعنی ہمیں کھلانے کا کام انجام دیتی) تو ہم غنچے سے پھول بن جاتے۔ دوسری طرف ہوا بوئے گل کو پھیلانے کا کام بھی کرتی ہے۔ ہوا کے خبر نہ لینے کی وجہ سے ہم دونوں ہی حالتوں سے محروم ہیں۔ نہ تو ہم غنچے سے پھول بن سکے اور نہ ہماری خوشبو دوسروں تک پہنچ سکی۔

علامتی مفہوم میں یہ شعر سازگار ماحول نہ مل پانے کی وجہ سے صلاحیتوں کے کند ہوجانے کو ظاہر کرتا ہے۔ انسان کے جوہر اس وقت تک نہیں نکھرتے جب تک انھیں مناسب مواقع فراہم نہ ہوں۔

موسم قحط ہوا میں کبھی سن
لرزش برگ نوا کی آہٹ

مفہوم کے اعتبار سے یہ ظفر اقبال کا بہت عمدہ شعر ہے۔ موسم قحط ہوا سے مراد زبان بندی کا موسم ہے۔ لرزش برگ نوا ہونٹوں کی وہ جنبش ہے جو آواز نکلنے سے قبل ہوتی ہے۔ اب مفہوم یہ ہوا کہ موسم قحط ہوا یعنی زبان بندی کے زمانے میں ہمیں اس آہٹ کو بھی سننا چاہیئے جو اصل سے پہلے کی چیز ہے۔ یہ آہٹ ضرور کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ 'کبھی سن' میں تاکید اور اصرار ہے

کہ سن (سن تو) تجھے اس لرزش سے معلوم ہوجائے گا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ اسی طرح برگ نوا (آواز) کی یہ لرزش بہت معنی خیز ہے خواہ یہ ظالموں کے طبقے سے تعلق رکھتی ہو یا مظلوموں کے گروہ سے۔ اس شعر کا معنوی حسن یہ ہے کہ لرزش کا تعلق بھی ہوا سے ہے اور آواز بھی ہوا کے ذریعے پھیلتی ہے۔ قحط ہوا کی وجہ سے ہوا نایاب ہے پھر بھی (برگ نوا میں) لرزش ہو رہی ہے۔ یہی چیز تشویش کا باعث ہے کیونکہ اس لرزش کے نتیجے میں جو شے (آواز) باہر آئے گی اسے چاروں طرف ہوا ہی لے جائے گی۔ گویا قحط ہوا کہنے کو قحط ہو ہے لیکن کہیں نہ کہیں ہوا موجود ہے جو لرزش بھی پیدا کررہی ہے اور لرزش سے پیدا ہونے والی آواز کو بھی پھیلا رہی ہے۔

شعر سے ایک دوسرا مفہوم بھی اخذ کیا جاسکتا ہے :

لرزش برگ نوا کی آہٹ سے مراد آواز کی وہ لرزش ہے جو کسی خوف کے طاری ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ خوف اس حکومت کا خوف ہے جس نے زباں بندی کا دستور نافذ کیا ہے۔ ایسے میں (حکومت کے خلاف) کچھ کہنا حکومت کے عتاب کا شکار ہونا ہے۔ معتوب ہونے کا یہی خوف ہونٹوں سے آواز کو پوری طرح نکلنے نہیں دیتا۔ ترقی پسند شاعروں نے دستور زباں بندی پر بیسیوں شعر کہے ہیں لیکن جو معنوی حسن ظفر اقبال کے اس شعر میں موجود ہے وہ بہت کم شعروں میں نظر آتا ہے۔ جس فضا اور ماحول کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے اس کی سنگینی ان لوگوں کی آواز کی لرزش سے ہی ظاہر ہوتی ہے جن کی آزادی اظہار کو سلب کرلیا گیا ہے۔

آواز و ہوا دونوں ہی زنجیر ہوئے ہیں
اب کون ہے جو تیزی طوفاں کی خبر دے

اس شعر میں پہلے شعر کی بازگشت موجود ہے۔ پہلے شعر میں قحط ہوا کی بات کہی گئی ہے اور یہاں ہوا کے زنجیر ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہوا کے ساتھ ساتھ آواز کو بھی قید کرلیا گیا ہے۔ تیزی طوفاں سے مراد کسی انقلاب یا بغاوت کی شدت ہے۔ اس شدت کی خبر ہمیں دو وسیلوں سے ملتی ہے۔ یا تو لوگوں کے لہجوں اور گفتگوؤں سے یا اس ہوا سے جو تبدیلی یا (حالات کے) نشیب و فراز کا احساس دلاتی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ یہ دونوں وسیلے ختم کردیئے گئے ہیں اس لیئے ہم حالات کی سنگینی یا ان میں رونما ہونے والی کسی تبدیلی سے باخبر نہیں ہوسکتے۔

ہوا سے متعلق کئی شعروں کے مفاہیم ہم نے اس لیئے بیان کیئے کہ اس طرح یہ معلوم ہوسکے کہ ہوا کی علامت ظفر اقبال کے یہاں کن کن مفاہیم کی حامل ہے۔ ان شعروں کے تجزیے میں ہم نے دیکھا کہ ظفر اقبال کے یہاں ہوا کے قریب قریب سبھی مفاہیم موجود ہیں لیکن ان تمام مفاہیم میں تخریب یا فنا کا مفہوم نمایاں ہے۔ بعض شعروں میں تبدیلی یا رفتار زمانہ کا مفہوم بھی موجود ہے۔ ان مفاہیم سے واضح طور پر یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ہوا ظفر اقبال کے یہاں پرانی شاعری سے مختلف مفہوم ادا کررہی ہے۔ یہ صرف قفس کے باہر کی دنیا سے رابطے یا عاشق و معشوق کے درمیان پیغام رسانی کی علامت نہیں ہے بلکہ یہ

زیادہ تر حقی معنی میں استعمال ہوتی ہے اور ظفر اقبال نے اس علامت سے سیاسی مفاہیم ادا کرنے کا بھی کام لیا ہے۔

ہوا کی مختلف معنویتوں کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم ظفر اقبال کی ایک اور اہم علامت 'دریا' کو لیتے ہیں :

ایک دھندلے نقش نے صحرا کو بخشا اضطراب
ایک زیریں لہر نے دریا کو بے کل کردیا

کچھ اصل تو کھلے کہیں اس زور و شور کی
دریا کے راستے میں بیاباں بھی چاہیے

موج بلا اڑی ہوئی دریا کے درمیاں
فوج قضا کھڑی ہوئی تیار اس طرف

تصویر باغ و منظر دریا الٹ گیا
بیٹھے بٹھائے طاق تماشا الٹ گیا

آگ جنگل میں لگی ہے سات دریاؤں کے پار
اور کوئی شہر میں پھرتا ہے گھبرایا ہوا

موڑ کر دریا کو دشمن لے گئے اپنی طرف
اور ادھر روئے زمیں پر داغ دریا رہ گیا

ان شعروں میں دریا وقت کی علامت بھی ہے اور دنیا کی علامت بھی۔ شروع کے چاروں شعروں میں یہ علامت وقت اور دنیا کا مفہوم ادا کررہی ہے۔ ہوا کی طرح ظفر اقبال نے دریا کو بہت نئے معنی میں استعمال نہیں کیا ہے پھر بھی دوسری علامتوں کی طرح یہ علامت بھی ان کے مفاہیم میں تنوع پیدا کرتی ہے۔ مثلاً پہلا شعر :

ایک دھندلے نقش نے صحرا کو بخشا اضطراب
ایک زیریں لہر نے دریا کو بے کل کردیا

صحرا کی زمین پر ایک دھندلا نقش ہے جسے دیکھ کر صحرا مضطرب ہوگیا ہے۔ یہ اضطراب نقش کے دھندلے پن کی وجہ سے ہے۔ اگرچہ نقش بالکل صاف ہوتا تو صحرا میں یہ اضطراب نہ پیدا ہوتا۔ صاف نظر آنے کی وجہ سے اسے یہ معلوم ہوجاتا کہ یہ نقش کس کا ہے اور ادھر سے گزرنے والا کون ہے۔ لیکن صاف نظر نہ آنے کی بنا پر صحرا کو یہ تجسس اور تشویش ہے کہ نقش کس گزرنے والے کا ہے۔ دریا کی بے کلی بھی اسی لیے ہے کہ لہر سطح پر نہیں ہے اور موج تہ نشیں کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ موج کس طرح کی ہے۔ اس طرح صحرا کے اضطراب اور دریا کی بے کلی کا سبب ایک ہے یعنی مخفی اور دھندلی شے۔ صحرا کا اضطراب یہ ہے کہ یہ نقش، جو صاف دکھائی نہیں دے رہا ہے' کس چیز کا پیش خیمہ ہوسکتا ہے۔ دریا کی بے کلی یہ ہے کہ تہ میں دیکھیے

اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا۔ ان اشیا کے اپنے آپ کو پوری طرح ظاہر نہ کرپانے کی وجہ سے ایک غیر یقینی کی سی کیفیت ہے جو طرح طرح کے اندیشے پیدا کرتی ہے۔

علامتی مفہوم میں صحرا اور دریا دنیا کی علامت ہیں۔ دنیا میں ہمیں اس طرح کے تجربوں سے روز گزرنا پڑتا ہے جب صورتحال کے واضح نہ ہونے کی وجہ سے ایک اضطراب آمیز سکون (Uneasy Calm) کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے جو کسی بڑے خطرے کی علامت ہوتی ہے اور ہمیں یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ نظام فطرت کے خلاف کوئی غیر محسوس چیز موجود ہے جو فطرت کی ہموار پیش رفت میں خلل ڈالنے والی ہے۔

کچھ اصل تو کھلے کہیں اس زور و شور کی
دریا کے راستے میں بیاباں بھی چاہیے

دریا روانی اور فیض رسانی کا سلسلہ ہے۔ اس روانی اور فیض رسانی کی اصل اس وقت کھلے گی جب دریا کے راستے میں بیاباں آئے گا۔ اگر دریا بیاباں کو سیراب یا شاداب کرتا ہے تو واقعی وہ فیض رساں ہے اور وہ ہر مزاحمت کو انگیز کرسکتا ہے اور اگر بیاباں شاداب یا سیراب نہیں ہوتا اور دریا اس میں جذب ہوجاتا ہے تو اس کی فیض رسانی کا بھرم ٹوٹ جائے گا۔

دریا ہے رکا ہوا ہمارا — صحرا میں ریت بہہ رہی ہے

شعر کے دونوں مصرعوں کا تعلق متکلم سے ہوسکتا ہے۔ ہمارا دریا یعنی ہماری طبع رواں رکی ہوئی ہے اور اس وقت ہماری یہ کیفیت ہے کہ صحرا میں ریت بہہ رہی ہے۔ طبع رواں کے رکے ہونے کی وجہ سے ہم تخلیق فن سے محروم ہیں۔ اس عالم میں اگر ہم فن کی تخلیق کا عمل انجام دیں بھی تو وہ صحرا میں ریت بہنے کے مترادف ہوگا۔ یعنی اس عمل کے دوران ہمیں کوئی کار آمد یا قابل قدر شے دستیاب نہیں ہوگی۔

اگر شعر کے دونوں مصرعوں کا تخاطب الگ الگ سمجھا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہمارا دریا تو رکا ہوا ہے لیکن دوسری طرف ریت جو بے فیض شے ہے اسے بہایا جارہا ہے۔ صحرا میں ریت بہنے سے مراد یہ ہے کہ جس چیز کا سلسلہ جاری ہے وہ کسی کام کی نہیں ہے۔ علامتی مفہوم میں یہ شعر اس پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو شعر و ادب کے میدان میں قابل قدر کارنامہ انجام دے سکتا تھا وہ طبیعت کے رواں نہ ہونے کی بنا پر تخلیق فن سے محروم ہے لیکن جن کے ذہن کند اور بنجر ہیں یعنی جو بے ہنر اور متشاعر لوگ ہیں وہ تخلیق فن کے نام پر فضول اور سطحی چیزوں کے انبار لگا رہے ہیں۔

روشنی بھی ظفر اقبال کی پسندیدہ اور منفرد علامت ہے۔ یہ علامت ان کے یہاں ناگوار حقیقت کا مفہوم ادا کرتی ہے۔ آیئے دیکھیں کہ اس علامت سے متعلق درج ذیل شعروں میں یہ مفہوم موجود ہے یا نہیں :

دن ہوا کٹ کر گرا میں روشنی کی دھار سے
خلق نے دیکھے لہو میں رات کے انوار سے

اٹھا کے لے ہی گئے دن کی روشنی میں اسے
مجھے یہ وہم جو سچ پوچھیے تو رات سے تھا

وہ روشنی ہے کہ منظر ہے ایک سا ہر سو
مجھے خبر نہیں کچھ کون ہے کہاں کیسا

ہے کس کا نقش رات کے پتھر پہ جا بہ جا
تھی کس کی مہر روشنیوں کی رداؤں پر

وہ روشنی ہے سفر میں کہ سوجھتا نہیں کچھ
سیاہی دل کی دکھاتی ہے راستہ مجھ کو

کسے میں نے پکارا ہے سرِ شام ظفر میرے گلو میں روشنی ہے

اس علامت کے مفہوم کی نشاندہی کے لیے ان میں سے ایک دو شعروں کا تجزیہ ضروری ہے:

اٹھا کے لے ہی گئے دن کی روشنی میں اسے
مجھے یہ وہم جو سچ پوچھیے تو رات سے تھا

جو کچھ دن کی روشنی میں ہوا، اس کا اندیشہ مجھے رات سے تھا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ اگر میرے محبوب کو مجھ سے چھینا جائے گا تو رات کے وقت کیونکہ اس طرح کے واقعات رات ہی میں رونما ہوتے ہیں۔ دن کی روشنی انسان کی محافظ ہوتی ہے۔ لیکن مجھے اسی روشنی سے نقصان ہوا۔ دن کی روشنی اس شعر میں اس شخص کی بے بسی کو ظاہر کر رہی ہے جس کی محبوب شے کو اس سے چھین لیا گیا ہے اور اس طرح روشنی اس کے لیے ناگوار حقیقت کی علامت بن گئی ہے۔

اسی طرح یہ شعر:

وہ روشنی ہے سفر میں کہ سوجھتا نہیں کچھ
سیاہی دل کی دکھاتی ہے راستہ مجھ کو

روشنی یہاں مثالی نظام کی علامت ہے۔ وہ نظام جس میں سب کچھ اچھا ہی اچھا ہے۔ ایسے صاف ستھرے اور بے عیب نظام کی خرابی یہ ہے کہ برائیوں کے ختم ہو جانے کی وجہ سے اس نظام میں اچھائیوں کی فہم ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ خوب کا تصور زشت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ چیزیں ہمیشہ اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں۔ تیز روشنی میں دل کی سیاہی کے راستہ دکھانے کا مطلب یہ ہے کہ میرے اندر کی بدی ہی مجھے خوب کی فہم عطا کرتی ہے۔

اس طرح دونوں ہی شعروں میں روشنی ناگواری کا تاثر قائم کرتی ہے۔

روشنی کے بعد ظفر اقبال کی ایک اور اہم علامت خواب کی معنویت کو ان شعروں میں ملاحظہ کیجیے:

ابھری نہیں ہے لاش کبھی ڈوب کر یہاں
بدلا نہیں ہے رخ کبھی دریائے خواب کا

نہ روئیے کہ جہاں سر پہ ہاتھ ہو اس کا
نہ سوئیے کہ جہاں خواب کا خطر ہی نہ ہو

مگن ہے خاکستر خوں بولتا پھرتا ہوں میں
بند دروازے ہوا کے کھولتا پھرتا ہوں میں

اسی کے خواب سے روشن ہے شام وحشت ہوس
وہ داغ عکس تماشا کہ جابجا بھی نہ تھا

اس طرح خواب خاک میں الجھا ہوں اے ظفر
گویا زمین ذرہ نہیں دام ہے کوئی

ہم کیسے ہوئے ہیں دیکھنا خواب اور خوشبو
گزرتے موسموں کا آخری تحفہ کھلا ہے

مجھے پتہ نہ چلا' تھا میں اپنے خواب میں گم
شعور فرق مجھے آشیاں کے بعد ہوا

چھپا ہوا ہی سہی خوف خواب کے پیچھے
سفر کے بعد غبار سفر گزرتا ہے

گلشن خواب ہوں تاراج حقیقت کر دے
اتنے احسان کیے ہیں یہ بھی مروت کر دے

میں خواب سبز تھا دونوں کے درمیان میں ظفر
کہ آسماں تھا سنہرا زمین بھوری تھی

خواب کی تعبیر پر اصرار ہے جن کو ابھی
پہلے ان کو خواب سے بیدار ہونا چاہیے

درج بالا شعروں میں قریب قریب ہر شعر میں خواب کی علامت dream کے معنی میں استعمال ہوئی ہے (sleep کے معنی میں نہیں)۔ یہ خواب ظفر اقبال کے یہاں خوفناک اور تمنائی خواب ہیں اور یہ خواب ان آرزوؤں کی علامت ہیں جن کا پورا ہونا ممکن نہیں ہے۔ مثلاً یہ شعر:

ابھری نہیں ہے لاش کبھی ڈوب کر یہاں
بدلا نہیں ہے رخ کبھی دریائے خواب کا

دریائے خواب میں لاش کا ڈوب کر نہ ابھرنا یہ بتاتا ہے کہ خوابوں میں ایک چیز اپنے آپ کو ایک ہی بار ظاہر کرتی ہے اور ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ دریائے خواب اپنا رخ نہیں بدلتا۔ اگر دریائے خواب کا رخ بدلا ہوتا تو ڈوبی ہوئی لاش ابھر آتی۔

ڈوبی ہوئی لاش سے مراد حقیقی اور بیداری کی زندگی میں ضائع ہو جانے والی چیز ہے۔ لاش کا ڈوب کر پھر ابھر آنا کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ ایسا صرف شاعر ہی کے ساتھ ہوتا ہے کہ خواب کا دریا اپنا رخ نہیں بدلتا اور اسی لیے اس میں گئی ہوئی چیز کبھی پلٹ کر نہیں آتی۔ شاعر یہ تمنا کر رہا ہے کہ کاش وہ چیزیں خواب ہی میں پوری ہوتی ہوئی نظر آتیں جو حقیقی زندگی میں ضائع ہو گئی ہیں۔ پورے شعر میں مایوسی کا لہجہ ہے۔

اسی طرح یہ شعر:

گنگ ہے خاکستر خوں بولتا پھرتا ہوں میں
خواب کے موتی ہیں جن کو رولتا پھرتا ہوں میں

خاکستر خوں کے گنگ ہونے سے مراد جوش عمل کا ختم ہو جانا ہے۔ خون کے راکھ ہو جانے کی وجہ سے حقیقی (عملی) زندگی سے میرا رشتہ منقطع ہو گیا ہے۔ یعنی میرے اندر سے عمل کا داعیہ ختم ہو گیا ہے۔ اب میں صرف خواب دیکھتا ہوں اور خوابوں سے کھیلتا ہوں۔ شعر کے پہلے مصرع میں بولتا پھرتا اور دوسرے مصرع میں موتی رولتا (عمدہ باتیں کرنا) غور طلب ہیں۔ دونوں فقروں کا مفہوم یہ ہے کہ اب صرف باتیں ہی ہیں عمل کچھ نہیں۔ یعنی ہم وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے یا جسے کرسکنے کی قوت اور صلاحیت ہم میں نہیں ہے۔

شکست خواب ہے زنجیر خواب کے پیچھے
سفر کے بعد غبار سفر گزرتا ہے

ہم خواب دیکھتے جا رہے ہیں اور ہمارے خواب ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ کوئی خواب ایسا نہیں ہے جو حقیقت میں بدل جاتا ہو۔ جس طرح سفر کے بعد اٹھنے والے غبار میں کچھ نظر نہیں آتا اسی طرح خوابوں کے سلسلے کے پیچھے بھی کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ یعنی حقیقت دونوں ہی جگہ آنکھوں سے اوجھل رہتی ہے۔

گلشن خواب ہوں تاراج حقیقت کر دے
اتنے احسان کیے یہ بھی مروت کر دے

مجھے خواب کا گلشن بننے کے بجائے حقیقت کے ذریعے تاراج ہو جانا پسند ہے۔ خواب کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو وہ خواب ہی رہے گا' حقیقت میں تبدیل نہیں ہوگا۔ میں بیداری کی تلخ زندگی کو خواب کی خوشگوار زندگی پر ترجیح دیتا ہوں کیونکہ حقیقت میرے اصل وجود کو مجھ پر آشکار کرتی ہے جبکہ خواب واہمے میں مبتلا رکھتا ہے۔ اور واہمے سے حقیقت بہرحال اہم ہے خواہ وہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔

ان شعروں کے تجزیے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خواب ظفر اقبال کے یہاں نیند کے معنی میں نہیں بلکہ dream کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور یہ تمنائی خواب ہے۔ یہ ان تشنہ آرزوؤں اور خواہشوں کی علامت ہے جو پوری نہیں ہوتیں اور ان کا پورا نہ ہونا ہی شاعر کے لیے ناگواری کا سبب بن جاتا ہے۔

لہو کی علامت ظفر اقبال کے شروع کے مجموعوں میں بہت زیادہ استعمال نہیں ہوئی ہے لیکن ان کے تازہ مجموعے "غبار آلود سمتوں کا سراغ" میں یہ علامت

بار بار نظر آتی ہے۔ ہوا' دریا' روشنی اور زہرہ وغیرہ کی طرح لہو ظفر اقبال کے یہاں منفی معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ یہ علامت ان کے یہاں تحریک اور زندگی کی نشانی ہے اور یہ جوش عمل' خواہش عمل' قوت عمل نمو داعیہ (inner urge) وغیرہ کا مفہوم ادا کرتی ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

فساد سارا لہو کا ہے جانچتے رہیے
کہ تھا قیام میں اتنا سفر میں اتنا ہے

کیا ریت کی رنگت پہ ہے رفتار لہو کی
اسے بے خبری کچھ تو بیاباں کی خبر دے

اس کے لہو کی لہر میں شامل تو ہیں مگر
کس حال چال میں ہیں کچھ اپنا پتہ تو آئے

غبار آرزو میں روشنی ہے   مرے دم سے لہو میں روشنی ہے

لہو میں اک الگ انداز سے مستور تھا وہ
سر شاخ تماشا اور بھی تنہا کھلا ہے

سنو کے لفظ میں بھی پھڑپھڑاہٹ   لہو میں بھی پر افشانی رہے گی

لہو کی لہر تھی یا سوچ کی کوئی سلوٹ
لرز رہی تھی کوئی شے شراب کے پیچھے

میں قتل ہو کے بھی خوشبو بکھیرتا ہوں ظفر
لہو گلاب کی صورت پڑا مہکتا ہے

اس شوق بے مہار کا انجام ہو بخیر
اچھے نہیں لہو میں بھنور آفتاب کے

بندھے وہ زور ظفر خاک کی روانی کے
کہ رنگ بجھنے لگے خون کی نشانی کے

سوال وصل کرتا ہوں کہ چکاؤں لہو دل کا
میں اپنا رنگ بھرنے کو کہانی مانگ لیتا ہوں

لہو میں پیاس کی پرواز ہے وہی پیہم
کہ انحصار اسی تیغ بے نیام پہ ہے

کھوئے ہوؤں کا لوگ لگاتے تو ہیں سراغ
لیکن لہو میں اپنے اترتے کچھ اور ہیں

مجھے کچھ بھی نہیں معلوم لہو اندر ہی اندر
لہو میں ایک دشت رائیگاں پھیلا ہوا ہے

ان تمام شعروں میں لہو روایتی معنی ہی میں استعمال ہوا ہے۔ اس مفہوم کی مختلف جہتوں کو ان شعروں کے تجزیے میں دیکھیے :

فساد سارا لہو کا ہے جانچئے سبھی
کہ تھا قیام میں اتنا سفر میں اتنا ہے

قیام بے عملی کی حالت ہے۔ اس حالت میں لہو بدن میں جمع رہتا ہے، خرچ نہیں ہوتا۔ سفر حرکت اور عمل کو ظاہر کرتا ہے۔ سفر اگرچہ زحمت طلب چیز ہے لیکن وسیلۂ ظفر ہے۔ اور سفر کرنے سے قوت عمل پیدا ہوتی ہے۔ اس لیئے سفر میں لہو کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ شاعر کی فکر مندی یہ ہے کہ قیام میں جتنا لہو جمع ہوا ہے، سفر میں وہ سب خرچ ہو جائے گا۔ دوسری طرف جب میں دیکھتا ہوں کہ سفر میں لہو بس اتنا رہ گیا ہے تو مجھے یہ فکر ہونے لگتی ہے کہ اب اور لہو کہاں سے آئے گا۔ یہی حساب کتاب ہماری قوت عمل کو متاثر کرتا رہتا ہے۔ اس طرح سفر اور مقصد سفر اصل مسئلہ نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ اس چیز کا جانچتے رہنا ہے کہ کتنا لہو تھا اور کتنا خرچ ہو گیا۔

اسی طرح ذیل کے تینوں شعروں میں بھی لہو جوش عمل کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے :

سنو گے لفظ میں بھی پھڑپھڑاہٹ لہو میں بھی پر افشانی رہے گی

اس شوق بے مہار کا انجام ہو بخیر
اچھے نہیں لہو میں بھنور آفتاب کے

سوال وصل کرتا ہوں کہ چمکاؤں لہو دل کا
میں اپنا رنگ بھرنے کو کہانی مانگ لیتا ہوں

پہلے شعر میں لہو میں پر افشانی سے مراد لہو کا جوش مارنا ہے۔ یہاں لہو پھر داعیے کی علامت ہے۔ لہو کا پر افشاں ہونا تخلیقی وفور کو ظاہر کرتا ہے۔ قریب قریب یہی مفہوم دوسرے شعر میں بھی موجود ہے۔ لہو میں آفتاب کے بھنور کا الٹنا تخلیقی تموج کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ علاوہ بریں یہ کسی بھی جذبے کی انتہائی حالت کا مظہر ہے۔ وہ حالت جس میں انسان از خود رفتہ ہو جاتا ہے۔ پہلے مصرعے میں شوق بے مہار کا انجام بخیر ہونے کی بات اسی لیئے کہی گئی ہے کہ جذبے کی یہ انتہائی حالت نہ معلوم کہاں لے جائے۔ تیسرے شعر میں وصل کا سوال اس لیئے کیا جا رہا ہے کہ اس سے دل کا لہو چمک اٹھے گا۔ دل کے لہو کا چمکنا جوش عمل کا پیدا ہونا ہے۔ یعنی وصل وہ کہانی ہے جس سے رنگ بھرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ رنگ بھرنا کسی شے کو اجاگر یا دوبالا کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں رنگ بھرنے سے مطلب قوت عمل کو مہمیز کرنا ہے۔ اس پورے مفہوم کو بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا گیا ہے: وصل سے دل کے لہو کا چمکنا۔ دل کا لہو جتنا زیادہ چمکے گا، رنگ اتنا زیادہ نکھرے گا۔ رنگ جتنا زیادہ نکھرے گا قوت عمل تیز ہوگی۔

لہو کی علامت سے متعلق یہ شعر بھی قابل غور ہے :

مجھے کچھ بھی نہیں معلوم اور اندر ہی اندر
لہو میں ایک دست رائیگاں پھیلا ہوا ہے

دست رائیگاں بے عملی کو بھی ظاہر کرتا ہے اور بے حاصلی کو بھی۔ یہ کسی ایسی طلب کی بھی علامت ہے جس کے بارے میں ہم خود بھی نہیں جانتے کہ یہ کس نوع کی طلب ہے۔ یعنی جس طلب کے سلسلے میں ہم اپنا لہو صرف کر رہے ہیں اس کے بارے میں ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم۔ گویا لہو کا صرف ہونا ایک طرح کی رائیگانی ہے۔ اور ہماری تگ و دو کا کوئی مطلب نہیں کیونکہ ہماری صلاحیت عمل ختم ہو چکی ہے۔
ظفر اقبال کا یہ شعر میر حسن کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے :

اتنا معلوم تو ہوتا ہے کہ جاتا ہوں کہیں
کوئی مجھ میں ہے کہ مجھ سے لیئے جاتا ہے مجھے

درج بالا شعروں کے تجزیوں میں لہو کی علامت کسی نئی معنویت کی حامل نہیں ہے لیکن پیرائۂ بیان نے روایتی معنویتوں میں ایک نیا لطف پیدا کر دیا ہے۔

○

شہر، جنگل اور گھر کی علامتوں میں بھی ظفر اقبال کے یہاں بالکل نئے معنی موجود نہیں ہیں۔ یہ علامتیں ہماری پرانی شاعری میں بھی برابر استعمال ہوتی رہی ہیں اور پرانی شاعری میں ان علامتوں سے جو مفاہیم مخصوص ہیں وہی مفاہیم ظفر اقبال کے یہاں بھی نظر آتے ہیں تاہم کہیں کہیں پرانے مفہوم میں نیا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔
یہ اشعار دیکھیے :

اور ویران ہوا جاتا ہوں اندر سے ظفر
ربط کچھ ہے تو سہی شہر کی تعمیر کے ساتھ

ظفر میں شہر میں آ تو گیا ہوں
مری خصلت بیابانی رہے گی

کسی نے رخ نہ کیا اس کے بعد جنگل کا
نہ شیر ہی کبھی نکلا کچھار سے باہر

تمام شہر سلامت ہے میرے گھر کے سوا
یقین کیجیئے بھونچال ہی کچھ ایسا تھا

تھک پڑے جب آخر اپنے جوش جنوں سے ہم
جنگل سے واپس گھر آئے وحشت ماند پڑی

دیکھنے آتا بھی ہے چھوڑتے ہوئے اس شہر کو
یعنی اس کے بعد کیا اجڑا ہے کتنا رہ گیا

بجھ گئیں خواب تمنا سے چھلکتی آنکھیں
شہر برباد ہوا اور ٹھکانے خالی

کاروبار شوق جب تک گرم ہے زیر فلک
ذہن میں پریاں ظفر جنگل میں آہو آئے گا

شہر تھا شہر فقط اس کے یہاں ہونے سے
کیسے گزرے اس اجڑے ہوئے آثار کے ساتھ

ہماری ساری فتوحات کے برابر ہے
وہ ایک شہر کہ زیر نگیں نہیں آتا

پرانی شاعری میں شہر رونق اور گہما گہمی کی علامت ہے اور جنگل وحشت اور ویرانی وغیرہ کی علامت۔ کہا جاچکا ہے کہ ظفر اقبال کے یہاں بھی ان علامتوں کے یہی مفاہیم موجود ہیں۔ آیئے تجزیے کے ذریعے ان مفاہیم کی جستجو کی جائے۔

اور ویران ہوا جاتا ہوں اندر سے ظفر
ربط کچھ ہے تو سہی شہر کی تعمیر کے ساتھ

اندر سے ویران ہونے کا سبب شہر کی صنعتی تہذیب ہے۔ شہر جتنا آباد ہوتا جارہا ہے' میرے اندر کی ویرانی اتنی بڑھتی جارہی ہے۔ میرے اور شہر کے درمیان ربط اسی آبادی اور ویرانی کا ہے۔ یعنی اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ شہر کتنا آباد ہوگیا ہے تو یہ دیکھو کہ میرا دل کتنا ویران ہے۔ اگر میرے دل کی ویرانی زیادہ ہے تو سمجھو کہ شہر زیادہ آباد ہے۔ گویا شہر کی آبادی کے تناسب سے میرے دل کی ویرانی بڑھتی جاتی ہے۔ اس طرح موجودہ صنعتی تہذیب جس طرح انسان پر اپنے اثرات مرتب کر رہی ہے اور جس طرح انسان اس تہذیب میں خود کو خالی خالی محسوس کررہا ہے' یہ شعر اس کی بہترین عکاسی ہے۔

شہر اور جنگل کی طرح گھر کی علامت بھی ظفر اقبال کے یہاں بیشتر پرانے مفاہیم ہی ادا کرتی ہے :

ایک امید کہ جھوٹی ہی سہی پر دیکھو
اسی امید سے روشن ہیں یہاں گھر دیکھو

طعنے دیتا تھا کبھی خانہ بدوشی کے ہمیں
آج اس بے مہر کا اپنا بھی گھر پانی میں ہے

دل کے ہمسائے میں نکلو تو نظر آئیں گے
گھر کئی اور بھی تاریک' پرانے' خالی

میں چلتے چلتے اپنے گھر کا رستہ بھول جاتا ہوں
جب اس کو یاد کرتا ہوں تو کتنا بھول جاتا ہوں

پڑتا ہے جب سے راہ میں اپنی کسی کا گھر
رکنے لگے ہیں اور ٹھہرتے کچھ اور ہیں

زردیاں ہیں مرے چہرے پہ ظفر اس گھر کی
اس نے آخر مجھے رنگ در و دیوار دیا

وہ بے بسی ہے کہ دل کو یقیں نہیں آتا
مکاں پکار رہا ہے مکیں نہیں آتا

تجھے دیکھا ہے بہت دن ہم نے
اے برے! اب ترا گھر دیکھنا ہے

احمد مشتاق اور منیر نیازی کے یہاں گھر کی علامت میں جو متنوع مفاہیم موجود ہیں' وہ ظفر اقبال کے یہاں موجود نہیں ہیں۔ منیر نیازی کی طرح ظفر اقبال نے اس علامت سے زیادہ کام نہیں لیا اسی لیئے یہ علامت ظفر اقبال کے یہاں بہت گہرے معنی کی حامل نہیں ہے۔ اور اسی لیئے ان شعروں میں سے کسی شعر کا تجزیہ ضروری نہیں سمجھا گیا۔

○

ظفر اقبال کی علامت سازی کے اس طویل جائزے میں ہم نے دیکھا کہ ان کے یہاں علامت سازی کا زبردست رجحان موجود ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ہماری شاعری کی روایت سے پوری طرح واقف ہیں اور لفظ کی علامتی حیثیت اور قوت کو پوری طرح سمجھتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی علامت کے تلازمے کس طرح وجود میں آتے ہیں اور ان تلازموں سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ لیکن لفظ کی علامتی حیثیت کو سمجھنے اور رموز شاعری سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود ظفر اقبال نے زیادہ علامتیں وضع نہیں کیں اور جو علامتیں وضع کیں ان کے پورے تلازمے وجود میں نہیں آئے۔ اس لیئے ظفر اقبال کے یہاں بھی کوئی باقاعدہ علامتی نظام تشکیل ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ انھوں نے دریا' ہوا روشنی اور زہر وغیرہ علامتوں کی علامتی قوت سے بہت زیادہ کام لیا اور ان کے زیادہ سے زیادہ امکانات کو روشن کیا نیز ان میں طرح طرح کے معنوی تاثرات پیدا کیئے۔ ان علامتوں میں زہر' زردی اور روشنی کو ان کی نجی علامتیں قرار دیا جاسکتا ہے اور دریا اور ہوا کی علامتوں میں انھوں نے جو نئی اور مختلف معنویتیں پیدا کی ہیں اس کی وجہ سے یہ علامتیں بھی پرانی علامتیں نہیں معلوم ہوتیں۔ ان علامتوں پر گفتگو کرتے وقت ہم نے دیکھا کہ ان کے گرد ان کے تلازمات و متعلقات کا دائرہ مکمل نہیں ہوپا رہا ہے۔ اور اسی لیئے کوئی نیا نظام بھی وجود میں نہیں آرہا ہے۔ اس طرح علامت نگاری کے نقطۂ نظر سے اہم ترین شاعر ہونے کے باوصف ظفر اقبال اس نظام کو وجود میں نہیں لاسکے جسے غزل کا نیا علامتی نظام کہا جاسکے۔

ماہی بادبان ● مدیر اعزازی، ناصر بغدادی ● ای۔ ۲، ۸/۱۴، معمار اسکوائر، ک نمبر ۱۴، گلشن اقبال، کراچی۔ ۷۵۳۰۰ ● ایک سو بیس روپئے

کراچی والوں سے میری ایک بڑی شکایت یہ ہے کہ وہ لوگ رسالہ لنے پر تو خوب محنت کرتے ہیں لیکن ایسے لوگوں پر متنازعہ تحریروں کو ادھر مر سے حاصل کرنے یا لکھنے پر بھی محنت کرتے ہیں جن سے ان کے تعلقات ں وجہ سے کشیدہ ہو گئے ہیں۔ ذاتی تعلقات، ذاتی رنجش یا ذاتی معاملات طول دینے کی غرض سے ایسی تحریروں کی اشاعت فعل بد ہے
ں شمارہ میں محمود ایاز کے "سوغات" میں مطبوعہ اداریے کا ایک حصہ جو شمس رحمٰن فاروقی کے تعلق سے ہے، نمایاں طور پر صرف اس لئے شائع کیا ہے کہ وں میں غلط فہمیاں پیدا ہوں۔ ہر شخص کو ذاتی رائے رکھنے کا حق حاصل ہے ر اس کا اظہار کرنے کا بھی۔ لیکن دوسرے کی رائے پر اپنا ذاتی حق جتا کر سرے لوگ غلط طور سے عام کریں تو یہ نازیبا ہے۔ اس میں ان کی کیا نیت ہے یہ تو خدا بہتر جانتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اور محمود ایاز میں بھائی چارے ے تعلقات "سوغات" کے دور اول سے تھے، جب "بادبان" اور اہل "بادبان" وجود بھی نہ تھا۔

جمیل الدین عالی کے بارے میں ایک صاحب نے لکھا ہے اس مضمون کے مصنف تو اس کتاب کا نام بھی صحیح نہیں پڑھ پائے جس کے سہارے عالی کے خلاف لطیفہ سازی کی گئی ہے۔ کہا گیا ہے کہ کتاب کا نام "تذکرۂ علمائے اہل دیث ہند ہے" اور دہلی کے ایک بزرگ شاعر جو اہل حدیث بھی ہیں، انھوں نے یہ کتاب مضمون نگار کو فراہم کی۔

حقیقت حال یہ ہے کہ اس کتاب کا نام جیسا کہ "بادبان" نے خود چھاپا ہے "تراجم علمائے حدیث ہند ہے" کہ تذکرۂ علمائے حدیث ہند، اس معلومات روشنی میں ان بزرگ اہل حدیث شاعر کے حوالے سے بیان کی ہوئی پوری انی بے وقعت ہو جاتی ہے، نہ ہم دلی کے کسی بزرگ شاعر سے واقف ہیں جو حدیث ہو، اور نہ یہ سمجھ پائے کہ جن صاحب کا کلام عالی نے چرایا ان کے ن عزیز نے یہ بات دنیا پر اب تک ظاہر کیوں نہ کی؟۔

آل احمد سرور پر بھی مدیر "بادبان" بے وجہ اور بے مطلب ریریں چھاپتے رہتے ہیں۔ ہمارے محترم اور معظم بزرگ پروفیسر اسلوب احمد ساری کو بعض لوگوں سے ذاتی شکایتیں ہیں اور ان شکایتوں کا تلخ اور اکثر بھونڈا ہار وہ اپنی تحریروں میں کرتے ہیں۔ یہ تحریریں ان کے اپنے رسالے میں چھپتی ہیں۔ علی گڈھ کی ذاتی ناراضگیوں کو کراچی میں مشتہر کرنے کے لئے مدیر "بادبان" اپنا رسالہ کیوں استعمال ہونے دیتے ہیں، یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔

مولوی عبدالحق کے بارے میں مدیر "بادبان" کی تحریر اور بھی جاندار ہوتی اگر اس میں جگہ جگہ تکرار اور بے ربطی کا احساس نہ ہوتا۔ مولوی عبدالحق کے ساتھ کن لوگوں نے کیا سلوک کیا، اس پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مزید لکھنے سے مولوی صاحب کی روح کو کون سی مسرت نصیب ہوگی؟۔ اچھا تو یہ ہے کہ مولوی صاحب کی تحریروں کے عالمانہ ایڈیشن شائع کئے جائیں اور اردو زبان و ادب کی جو خدمت انھوں نے بطور محقق اور بطور مجاہد انجام دی اس کا ثبوت یوں فراہم کیا جائے کہ ان کی تصنیفات کے عالمانہ ایڈیشن چھاپے جائیں ورنہ گڑے مردوں کو اکھیڑنے سے کیا فائدہ۔ ہر آدمی اپنی اپنی سی کہتا ہے، اصل حقیقت تو تب معلوم ہوگی جب کوئی غیر جانبدار شخص برہمی اور تعصب کو بالائے طاق رکھ کر تمام حالات کا جائزہ لے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بابائے اردو کے ساتھ پاکستان اور اہل پاکستان نے انصاف نہیں کیا لیکن شکوے شکایتیں اٹھانے سے بھی انصاف نہ ہوگا۔ انصاف تو ان کی تصنیفات کو عام کرنے اور ان کے مرتبے کا عرفان حاصل کرنے سے ہوگا۔

رام لعل کے بارے میں گیان چند نے اپنے غیر جذباتی انداز میں خوب لکھا ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ رام لعل کے مخالف ہیں یا دوست۔ مرے ہوؤں پر جب مضمون لکھا جاتا ہے تو یا تو تعریف و توصیف کی جاتی ہے یا پھر متنازعہ فیہ چیزوں سے اجتناب کیا جاتا ہے کہ ان چیزوں کا محل اور ہے نہ کہ کسی بڑے ادیب کی موت کے فوراً بعد کسی تعزیتی تحریر میں۔ پھر یہ بات بھی سمجھ میں نہ آئی کہ رام لعل کی بہت سے معصومانہ باتوں کو غیر ضروری اہمیت دینے سے کیا فائدہ ہوگا۔ گیان چند صاحب جس چیز کو خود رام لعل کی اشتہاری اور خود نمائی اور شہرت طلبی جیسے الفاظ کے ذریعے بیان کرتے ہیں وہ محض بے ضرر سی افتاد طبع تھی۔ تعجب ہے کہ ہمارے زمانے میں خود اشتہاری، خود نمائی اور شہرت طلبی کے ایک سے بڑھ کر ایک بڑے نمونوں کے ہوتے ہوئے بھی گیان چند کو رام لعل کی موت کے بعد رام لعل میں یہ کمزوریاں نظر آئیں۔

پرانی تحریروں کو دوبارہ شائع کرنے کا فائدہ اس وقت ہے جب ان کی کوئی معاصر اہمیت بھی ہو۔ عسکری صاحب کے مضمون 'فرائڈ اور جدید ادب' اور نظیر صدیقی کے مضامین "غیر منصفانہ دماغ کی معذوریاں" شائع کرنے سے کسی کا کیا فائدہ ہوگا، یہ مدیر مکرم ہی بتا سکتے ہیں۔ فرائڈ اور ولیم رائخ دونوں کے بارے میں عسکری صاحب نے جس انتہا پسندانہ عقیدت کا اظہار کیا ہے اس سے بھی وہ بعد میں منکر ہو چکے تھے پھر ایسے مضمون کو اب چھاپنے سے کیا فائدہ ؟۔

نظیر صدیقی نے سلیم احمد سے اپنے کسی پرانے اختلاف کے بارے میں کبھی کوئی مضمون لکھا تھا اور نظیر صدیقی نے بقول رفیق سندیلوی یہ مضمون نہ چھپوایا کیونکہ یہ مضمون "بے خیالی کا شکار" رہا۔ اور پھر یہ کہ "سلیم احمد کی گمراہ کن باتوں کا کوئی کیا جواب دیتا کہ" اس کے نتیجے میں صرف سلیم احمد کے حواریوں کی ناراضگی ہی حاصل ہوتی۔ تو ایسی صورت میں اب یہ مضمون کیوں چھپوایا گیا جب سلیم احمد مر گئے ہیں ؟ بات یہ ہے کہ رسالے کو موضوع بحث بنانے اور زندہ طور پر متنازعہ فیہ بنانے کی تمنا تو خوب ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ مدیر مکرم یا ان کے قلمی معاونین زندہ اور اہم موضوعات پر ایسی باتیں کر سکیں جن میں اختلاف اور بحث کے پہلو نکلتے ہوں۔ گڑے مردے اکھیڑنے سے تعفن ہی پیدا ہو سکتا ہے تجسس نہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھیں رفیق سندیلوی صاحب کا ایک خط تازہ 'تشکیل' میں شائع ہوا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نظیر صدیقی سے کچھ خاص خوش نہیں ہیں، پھر نظیر صدیقی کے اس مضمون کو دریافت کرنے اور چھپوانے میں کیا مصلحت ہے یہ وہی لوگ جانیں۔

'بادبان' کے پچھلے تین شماروں کے مقابلے میں یہ شمارہ زیادہ ضخیم ہے لیکن مشمولات میں کئی کمزور تحریریں شامل کر لی گئی ہیں۔ 'بادبان' کے پچھلے شماروں سے رسالے کا جو امیج بنا تھا وہ اب مجروح ہوتا نظر آتا ہے کیونکہ اب ہندو پاک کی ملکی گندی سیاست کی طرح اس رسالے میں بھی (ہندوستان کے کچھ رسالوں کی طرح) ادبی سیاست کا زور کچھ زیادہ دکھائی پڑ رہا ہے۔ اگر ناصر بغدادی "ادبی سیاسی بازیگری" سے دور رہیں تو رسالہ یقینا کوئی اہم کارنامہ انجام دے پائے گا ورنہ رسالے تو نکلتے ہی رہتے ہیں اور ان کے دم سے کچھ دنوں کے لئے بازار میں چہل پہل تو رہتی ہے۔ پھر خدا حافظ !

— چودھری ابن النصیر

فکر رسا● تھونی لال وحشی● مرتبہ : جابر حسین● بہار فاونڈیشن لوہیا نگر، پٹنہ ● دس روپے۔

آج شاید ہی کوئی ادارہ ہو جو مشہور و معروف شعرا کے بجائے کم معروف شعرا کے کلام کی اشاعت کو فوقیت دیتا ہو لیکن "اردو مرکز" عظیم آباد کے فرائض عملی میں یہ شامل ہے کہ اردو کے کلاسیکی اور جدید نسبتا گمنام شعرا کے کلام کی ترتیب و اشاعت کی جائے۔ تھونی لال وحشی کے "فکر رسا" کی اشاعت بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

وحشی کی ولادت انیسویں صدی کے آخر میں حاجی پور ضلع ویشالی کے ایک کھتری خاندان میں ہوئی تھی۔ ۱۹۵۰ کے آس پاس کلکتہ میں ان کی وفات ہوئی۔ وحشی علامہ جمیل مظہری کے والد مولوی سید خورشید حسنین کے شاگرد تھے۔ ان کا زمانہ ہم سے اتنی دور نہیں کہ ہمیں ان کے حالات نہ معلوم ہو سکیں، لیکن افسوس کہ وحشی مرحوم کی تمام زندگی گم نامی میں گذری۔ اخبار "الناصر" پٹنہ کے محرم نمبر میں وحشی کا کلام دیکھ کر جابر حسین نے ان کے دیگر کلام کی تحقیق و تفتیش کی اور محترمہ ثریا میل مظہری کی وساطت سے اسے حاصل کیا۔ ہلال نقوی کی کتاب "بیسویں صدی اور جدید اردو مرثیہ (۱۹۹۴)" کے مطابق "فکر رسا" کا سنہ تصنیف ۱۹۴۱ ہے اور "معراج عشق" کے عنوان سے ۱۳۹۲ھ میں "امامیہ مشن" لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔

عام روایت ہے کہ کربلا کے شہیدوں کی تعداد بہتر تھی، غالبا اسی مناسبت سے وحشی نے بہتر بندوں پر مشتمل مرثیہ تصنیف کیا ہے۔ وحشی کے عقیدے یا تصور کے مطابق ان کے آباواجداد، جو ہندوستانی تھے، بصرہ میں تجارت کرتے تھے اور جنگ جمل کے بعد حضرت علیؑ نے انھیں مال غنیمت کا پہرے دار بنایا تھا۔ وہ تجارت کے سلسلے میں کوفے جا رہے تھے کہ خبر ملی کہ حضرت امام حسینؑ کو یزید نے کربلا میں محصور کر لیا ہے۔ یہ خبر پا کر وہ کربلا گئے، جنگ کی اور امام حسینؑ پر اپنی جان نثار کر دی۔ "فکر رسا" میں واقعہ کربلا اسی تصور کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

وحشی کا عقیدہ اتنا قوی ہے اور زبان اتنی سلیس و شستہ ہے کہ اگر اس مرثیہ میں کہیں کہیں ہندو دیومالا، مہابھارت اور رامائن کے کرداروں سے کام لیا ہوتا اور اپنے ہندو ہونے کا اعلان نہ کیا ہوتا۔ یہ گمان بھی مشکل ہوتا کہ شاعر لکھنؤ کے باہر کہیں کا ہے۔ مجموعی طور پر مرثیہ بیانیہ شاعری کے باب میں اضافہ ہے۔

پروانۂ نجات● مہدی علی● مرتبہ : جابر حسین● بہار فاونڈیشن، عظیم آباد پٹنہ ● سو روپے۔

"پروانۂ نجات" میں ۷۱ نوحے ہیں۔ نوحے کا مقصد محض مصائب کربلا پر آہ و بکا اور ماتم کرنا ہے اور کامیاب نوحے وہ ہیں جن کے اشعار مصائب کربلا پر مشتمل ہوں، لے موثر اور مسجع ہو اور سینہ پر ماتم کے ہاتھ روانی سے پڑیں لیکن اس دور کے اکثر نوحوں میں فضائل اہل بیت سے متعلق مضامین بھی شامل ہوتے ہیں۔ اب سامعین آہ و بکا کے بجائے 'واہ واہ' کرتے ہیں اور فضائلی اشعار پر ماتم بھی کئے جاتے ہیں کہ نوحہ کے لئے شرط ماتم کی بھی ہے۔ زیر تبصرہ

[illegible]

طور سے نوحے کی ہیئت غزل کی سی ہوتی ہے لیکن مہدی علی نے مثنوی کی ہیئت میں بھی نوحے کہے ہیں۔ کچھ الگ الگ کہے ہیں۔ نوحے کو وجود ماتمی انجمنوں سے ہے۔ ہر انجمن کے اپنے اپنے شاعر ہوتے ہیں جو ہر سال محرم میں نئے نوحے کہتے ہیں۔ یہ نوحے فنی اعتبار سے بلند نہیں ہوتے اور آج کل تو اکثر اشعار کی صحت کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا۔ ایسی صورت حال میں مہدی علی کے نوحوں کا معیار تشفی بخش ہے۔

— سید ارشاد حیدر

حرف آغاز ● فرخ جعفری ● اشک فاؤنڈیشن۔ الہ آباد ۲۱۱۰۰۱ ● پچاس روپے

"حرف آغاز" فرخ جعفری کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ کلام کی تعداد کے اعتبار سے اگرچہ یہ مجموعہ مختصر ہے لیکن کیفیت کو دیکھتے ہوئے اسے متعدد کئی مجموعوں پر فوقیت دی جا سکتی ہے۔

"حرف آغاز" کی غزلوں میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ جذبہ و احساس کی داخلی کیفیات سے عبارت ہے۔ اگر کوئی شخص سہل پسندانہ انداز اختیار کرے تو فرخ جعفری کی شاعری کو داخلی شاعری کہہ کر اپنا کام چلا سکتا ہے۔ لیکن ان غزلوں کی داخلیت اتنی سطحی اور سپاٹ نہیں ہے کہ اسے بآسانی گرفت میں لایا جا سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ خارجی کائنات کی طرح ہی انسان کی ایک اندرونی دنیا بھی ہوتی ہے۔ اور یہ قطعی ضروری نہیں کہ ہر شخص کی داخلی کائنات ایک دوسرے سے مشابہت بھی رکھتی ہو۔ ان غزلوں کے توسط سے ہم شاعر کی اندرونی دنیا میں داخل تو ہوتے ہیں لیکن یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہمیں اس دنیا سے پوری آگاہی حاصل ہو گئی ہے۔ یہ اشعار دیکھئے۔

ٹھہر جانا حد منزل پہ پہنچ کر کیا ہے
دیکھ دیوار سے آگے بھی کہ منظر کیا ہے
درمیاں اس کے مرے کچھ نہیں حائل یوں تو
جو دکھائی نہیں دیتا ہے وہ پتھر کیا ہے
وہ اپنے وہم کو فرخ یقیں سمجھتا رہا
وہ خوف کیا تھا کہ باہر کھنڈر سے آیا نہیں
جانے کیا ایسا اسے مجھ میں نظر آیا تھا
مجھ سے ملنے وہ بلندی سے اتر آیا تھا
دریچہ اک قفل پر اسرار پڑا تھا فرخ
بھید کھلتا بھی تو کیسے کہ مکاں میں ہی تھا

کم گوئی کے پردے کے پیچھے فرخ جعفری کی فکر آمیز طبیعت تخلیق شعر کے پر اسرار مراحل طے کرتی رہتی ہے۔ جعفری نے اردو غزل کی قدیم و جدید روایت کے ساتھ فارسی غزل کی روایت سے بھی کسب فیض کیا ہے۔ ان کے اشعار اس بات کی واضح مثال ہیں کہ شعر میں بندش کی چستی کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں یہ وصف بہت کم شاعروں کے یہاں ملتا ہے۔ لہجے میں رکی رکی سی بے تکلفی، الفاظ کی تشکیل کے ساتھ لطف دیتی ہے۔

آپ ہی آپ خرابی نہیں ممکن دل کی
اس میں کچھ ہاتھ کا اس کے بھی ہنر لگتا ہے

[illegible]
عجیب پاؤں کا چکر دکھائی دیتا تھا
مٹے مٹے سے بھی جس کے نہیں رہے آثار
کبھی یہاں بھی کوئی گھر دکھائی دیتا تھا
نہ جانے کون سی بستی میں جا بسا فرخ
وہ ایک شخص جو اکثر دکھائی دیتا تھا

فرخ جعفری کے یہاں کیفیت کے اشعار زیادہ ہیں۔ واضح رہے کہ کیفیت سے مراد یہاں کلاسیکی غزل کی اس صفت سے ہے جسے تاثیر بھی کہا گیا ہے۔ کیفیت والے اشعار کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ہم ان کے اثر میں اس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ شعر کے معنی یا اس کی باریکیوں کی طرف ہماری نگاہ نہیں جاتی یا ہم اس کی طرف بہت بعد میں توجہ کرتے ہیں۔ لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کیفیت کے ساتھ۔ فرخ جعفری کے بیشتر اشعار اسی سے تعلق رکھتے ہیں۔

جعفری کی غزل کا مرکزی کردار ایک ایسے فرد کی شکل میں دکھائی دیتا ہے جو اپنی ذات کے حوالے سے حیات و کائنات کے مظاہر اور مخفی گوشوں کی آگہی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ناکامی اور نارسائی جس کا مقدر ہے لیکن اس کا لہجہ تلخ اور شکایت آمیز نہیں ہوتا بلکہ اس لہجہ میں ہلکی سی محزونی ہے۔ اس کردار کو موجودہ دور کے انسان کا استعارہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ قدروں کی گمشدگی ایک طرف اس انسان کو محرومی اور شکست خوردگی کے احساس سے دوچار کر رہی ہے تو دوسری طرف وہ مادی آسائشوں سے اس قدر قریب بھی ہو گیا ہے کہ گمشدہ اقدار کی بازیافت کی اسے کوئی فکر نہیں رہی۔

کھڑے تھے دیر سے سب انتظار میں اس کے
نکل کے اپنی گلی میں وہ گھر سے آیا نہیں
بھٹک رہے تھے سبھی آس پاس اپنے مگر
قریب کوئی بھی اپنی خبر سے آیا نہیں
وہ تار تار تھا اندر سے بھی کسے معلوم
لباس جسم کہ جس کا پھٹا پرانا تھا
کسی کو یاد نہ کرنے پہ کر دیا مامور
سزا کے طور پہ دل کو ذرا ستانا تھا

"حرف آغاز" ایسا مجموعہ غزلیات ہے جس میں آواز تازہ اور لہجہ نو کی کارفرمائی ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی "فرخ جعفری کا وجود ریگستان میں کھلنے والے اس پھول کی مانند ہے جو سو برس میں ایک بار کھلتا ہے اور وہ بھی تھوڑی مدت کے لئے"۔ الہ آباد کے اشک فاؤنڈیشن نے اس مجموعہ کو زیور طبع سے آراستہ کر کے اردو ادب کے قارئین کو ایک بیش قیمت تحفے سے نوازا ہے۔ کتابت و طباعت معیاری اور سرورق جاذب نظر ہے۔

— احمد محفوظ

"دست خود دہان خود" اور "میں کون ہوں اے ہم نفساں" (شب خون
۱) کو بالاستیعاب پڑھا۔ تلاطم اندرون کا انداز ہوا لیکن ساتھ ساتھ تشنگی کا
احساس سوا ہوا۔ بہت سی باتیں اور آپکے کئی Dimensions رہ گئے۔ یوں
پ انہیں آئندہ جسطرح قارئین کے سامنے لائیں لیکن فی الحال ان کی کمی
را کرنے کیلئے " آسماں محراب " کا مطالعہ جاری رہے۔ فنکاری تو
سل Creative observation میں ہی پوشیدہ ہوتی ہے اس لئے آپکی
ں کا بے سمت ہونا لازمی ہے۔ یہ لکھتے وقت استاد محترم نرمد یشور پرساد کی یاد
ی ہے جو کہا کرتے تھے کہ بڑا آرٹسٹ ہمیشہ Marginal ہوتا ہے یعنی "شعر
ے تب ہوتا ہے جب وہ اپنی روایت میں بھی ہو اور روایت سے باہر بھی
۔ لیکن ان ساری باتوں کے ساتھ ساتھ میں نے آپکو ہمیشہ Trendset-
کے خانہ میں رکھکر دیکھا ہے، میرا خیال ہے کہ یہ وہ اہم پہلو ہے جو جیلانی کین
ر کو دوسروں سے مختلف و ممتاز بناتا ہے۔

"تلاش وسعی کا فسانہ" آسماں محراب دراصل جاں سوز تحیر کا عمل ہے،
ہ دانہائے کائنات منکشف ہوتے ہیں۔ یہاں انکشافات کا ایک طویل سلسلہ
، جن میں وسیع علم، تیز مشاہدہ، زرخیز ذہن، عمیق تاثرات اور بے کنار
ات شامل ہیں۔ یہ قابل رشک بھی ہے اور لائق تقلید بھی، کہ لینے دیجئے
ہ فن اور شخصیت کا اعجاز ہے۔ رشید صاحب نے کہیں لکھا ہے "اردو کی وادی
فار اپنے کانٹوں کی پیاس بجھانے کیلئے ہمیشہ کسی آبلہ پا کی منتظر رہے
"۔۔۔ سو آپ جیسا آبلہ پا "خاصان عصر" میں بھی نمایاں ہے اور رہے گا۔ ان
للہ۔ ایسی عرق ریزی اور چو مکھی، خدا کی پناہ، اعلیٰ منصوبوں سے بہ حسن و
ں عہدہ برآ ہونا، لفنگے لونڈوں سے بھی دو دو ہاتھ، بے علموں کی تربیت، موثر
ری اور عملی رہبری، بے ہنروں سے بھی محبت، مورچہ بند ادبی ٹھیکہ داروں
، بھی مقابلہ، خوبیوں کی داد دینا، کمزوریوں کو درگذر کرنا، ایذا رسانوں کی
ں سلیم کیلئے نادر نیم شی۔۔۔ ایسے تیر ہر ترکش میں نہیں ہوتے۔

چودھری ابن النصیر صاحب ہر شمارہ کو دیدہ زیب بنا رہے ہیں۔ ذوق
ب بذات خود رنگوں کی افشاں بکھیر دیتا ہے۔ خداوند کریم ان کے رنگوں کو
تازگی اور مزید کشش سے نوازدے۔ آمین! انہیں میری دعائیں۔

شفیع جاوید

شب خون (۲۰۵) میں مظہر الزماں خان کا افسانہ " نجات " اچھا ہے یا
ب اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اپنے افسانے کے دو اختتام لکھ کر قارئیا
ں کی رائے جاننا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ ادا مجھے اچھی لگی۔ سوال یہ ہے کہ پہلا
ام بہتر ہے یا دوسرا؟ میرے خیال میں دونوں ہی اختتام ٹھیک نہیں ہیں۔
نے کا مرکزی کردار سیاہ کتا "گناہ" کا استعارہ ہے۔ جس کا انسانی فطرت کے
ہ ایک خاص انسلاک ہے۔ اور یہ کوئی چونکا دینے والی بات نہیں ہے۔ افسانہ
نے سیاہ کتے کو خود بھی "گناہ" کا استعارہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ
افسانے کے عنوان " نجات " سے پتہ چلتا ہے۔ یہی نہیں افسانے کے دونوں
اختتام بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ پہلا اختتام جب میں اپنے گھر لوٹنے
کے لئے جنگل سے پلٹتا ہوں تو اپنے گھر کا راستہ ہی بھول جاتا ہوں کہ جدھر جاتا
ہوں مجھے درخت ہی درخت دکھائی دیتے ہیں" اپنے عنوان (مرکز) "نجات"
سے جا ملتا ہے۔ یہاں نیکی اور بدی کا فرق بھی واضح ہے۔ انسان جب بدی کو
چھوڑ کر نیکی کے راستے پر چلتا ہے تو اسے ہزار ہا دشواریاں پیش آتی ہیں۔ جیسا
کہ پہلے اختتام میں ہر طرف درخت ہی درخت دکھائی دینا اور ان درختوں میں
الجھ کر گھر کا راستہ بھول جانا بیان کیا گیا ہے۔ افسانے کا یہ اختتام مجھے اس لئے
پسند نہیں کہ یہ سپاٹ بھی ہے اور انسانی فطرت کے خلاف بھی۔ دوسرا اختتام"
اور جب میں اپنے چھوڑے ہوئے گھر کی طرف لوٹنا چاہتا ہوں تو مجھے چاروں
طرف غراتے ہوئے درخت دکھائی دیتے ہیں۔ اور ان کی شاخوں سے ٹپکتے
ہوئے چپ چپ چکٹ لعاب میں میں پوری طرح بھک جاتا ہوں" یہ ظاہر کرتا
ہے کہ راوی (خود کردار بھی ہے) ایک گناہ سے نجات کے چکر میں دوسرے
کئی گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، افسانہ اسی اختتام کا متقاضی ہے، لیکن اس کی
شکل ذرا تبدیل کرنا ہوگی۔ مثال کے طور پر سیاہ کتے کو جنگل میں چھوڑ کر اور
پوری طرح مطمئن ہو کر جب راوی گھر پہنچے تو اسے اپنے بیڈ روم میں یا بیڈ پر
ایک کتے کے بجائے دو چار یا کئی سیاہ کتے رال ٹپکاتے ہوئے ملیں۔ ان کتوں کو بیڈ
سے اٹھا کر گھر کے دروازے پر بھی بٹھایا جا سکتا ہے۔ جنگل سے راوی کے گھر
لوٹتے وقت درختوں کا کتوں کی شکل اختیار کر لینا یا کتوں کی طرح بھونکنا اور غرانا
ایک فوری نتیجہ ہے، جو انسان کو کمزور کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس گناہ کے
دلدل سے نکل کر راوی کو بہر حال گھر بھی جانا ہے، اور اگر ایسا ہوتا ہے تو گناہ
اور گھر کے بیچ ایک حد فاصل کھنچ جاتی ہے جو قطعی طور غیر فطری ہے۔
مطلب یہ کہ کتوں (گناہ) کا رشتہ گھر سے ہر حالت میں برقرار رکھنا ہوگا۔ یا
برقرار رکھنا چاہئے۔

ظفر اقبال کی غزلوں نے ایک بار پھر مایوس کیا۔ افتخار نسیم کی دونوں
غزلیں بہترین ہیں۔ جمیل الرحمٰن کی بھی کچھ غزلیں اچھی ہیں۔ محمد صلاح
الدین پرویز ہمیشہ طویل نظمیں لکھتے ہیں جنہیں پڑھ کر اکثر یہ احساس ہوتا ہے
کہ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا، کبھی کبھی تو وہ بھی نہیں۔

شکیل اعظمی
سورت

● اس وقت اردو کے تمام ادبی رسائل میں 'شب خون' سر فہرست ہے۔
شمارہ ۲۰۳ میں اقبال مجید کا ناولٹ " تیر اور میر اچ " ایک ناولٹ ہی نہیں بلکہ
موجودہ سیاسی اور سماجی ماحول میں پروان چڑھتے حالات کا بھرپور تجزیہ ہے۔ اقبال
مجید کا قلم ہی ایسا ناولٹ تحریر کر سکتا ہے۔ ویسے ان دنوں اردو ادب میں ناولوں کا
سیلاب آیا ہوا ہے۔ اس بھیڑ میں اپنی الگ پہچان، الگ آہنگ قائم کرنا قابل

ش ہے۔

نیر مسعود کی تحریر "محمود ایاز کی یاد میں" پڑھ کر ان کی موت سے قبل
حالات فلمی مناظر کی مانند نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ اور محمود ایاز کی نظم
سپتال کا کمرہ" پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے کلیجے کو مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔
عجیب سے درد کا احساس ہوا۔ محمود ایاز اردو ادب کا ایسا تناور برگد کا پیڑ تھا،
کے سائے میں جدید نسل پروان چڑھی، اپنی شناخت قائم کر پائی۔ ایسے
ہم شخص کی موت اردو ادب کا ایک ایسا نقصان ہے جس کی بھرپائی ممکن نہیں

آپ کی تحریر "دست خود دہان خود" "میں کون ہوں اے ہم نفساں"
حد پسند آئیں۔ افسانوں میں حسن منظر "پہلا سودا" جتندر بلو "ٹھکانا" مظہر
اں خان "نجات" عبد الصمد "آکرس" اور مصطفیٰ کریم "برگد کا پیڑ"
ں تمام افسانے بے حد پسند آئے۔ شعری حصے میں تمام غزلیں اور نظمیں
اری ہیں، دل کو چھو لیتی ہیں۔ عذرا عباس "میں لائنیں کیوں کھینچتی ہوں"
مرزا حامد بیگ "الیٹ کا اردو دنیا میں خیر مقدم" کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہو گی۔
دونوں تحریروں نے بے حد متاثر کیا۔ خطوط کے کالم میں مظہر الزماں خاں
خط نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ بھائی مجبوراً ان دنوں میں بھی بیانیہ
یاں تحریر کر رہا ہوں، اور سچ تو یہ ہے کہ بیانیہ کہانی تحریر کرنا ایسا ہی ہے جیسے
پلاؤ کے نام پر قاری کو کھچڑی کھلا رہے ہوں۔

انور امام
ید پور

شب خوں کا ایک شمارہ بھی مطالعہ سے رہ جائے تو قاری کو بہت کمی
س ہوتی ہے۔ تخلیقات اتنی جامع اور فکر انگیز ہوتی ہیں کہ ذہن متاثر ہوئے
نہیں رہتا۔

فرحت جہاں
ال

شب خون ۲۰۶ میں سترہ افسانے شائع کر کے اسے آپ نے افسانہ نمبر
ا ہے۔ 'شب خون' کی یہ ادا بھی خوب ہے۔ زاہدہ حنا کا افسانہ 'رقص مقابر'
ستان کے حالات کی عمدہ عکاسی کرتا ہے۔ مجھے پہلی بار ایسا افسانہ پڑھنے کو ملا
کسی اور اردو رسالے نے اس موضوع پر اب تک کوئی افسانہ نہیں چھاپا۔
قر کا افسانہ بھی اچھوتے موضوع پر ہے۔ شفیع جاوید نے اپنے افسانے میں
وع کو کامیابی سے برتا ہے۔ منیر الدین احمد کا افسانہ اس بار زیادہ متاثر نہ
کا۔ رشید امجد اور مرزا حامد بیگ کے افسانے ایک ہی ڈھرے کے لگتے ہیں۔
نا کے یہاں اب ٹھہراؤ آگیا ہے؟ البتہ خالد حسین کے یہاں تازگی ہے۔ ان
دونوں افسانے اس قابل تھے کہ انھیں ترتیب میں اولیت دی جائے۔ آپ
یہاں ترتیب بھی خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ میں نے ہمیشہ دیکھا ہے کہ آپ
ں کار سے زیادہ تخلیق پر توجہ دیتے ہیں۔ بڑے چھوٹے کی پروا کئے بغیر
تخلیقات کے اعتبار سے ناموں کو ترتیب دیتے ہیں جبکہ دوسرے رسالوں
دیروں پر ناموں کا دباؤ زیادہ رہتا ہے۔

"مابعد جدیدیت: تشخیص اور علاج" کا سلسلہ جدید ادب کے طالب
علموں کے لئے ضروری ہے۔ ادھر مابعد جدیدیت، بعض ادبی حلقوں میں
موضوع بحث بنی ہے۔ جو لوگ گذشتہ تیس برسوں تک جدیدیت سے وابستہ
رہے اور اسی تحریک یا رجحان کی بدولت اور اس کے حوالے سے ہی ان کے
کارنامے یاد رکھے جا سکتے ہیں۔ اور اب یہ جدیدیت مخالف باتیں کرنے لگے ہیں
تو سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنی ہی تاریخ کو کیوں منسوخ کر رہے ہیں؟

وجیہہ الدین جمال
آسنسول

● شمارہ ۲۰۷ مل گیا ہے ۲۰۶ نثری تھا تو ۲۰۷ غزلیات اور نظموں سے
مرصع ہے۔ نثر کے طور پر آپ کا اداریہ اور خطوط کا حصہ علمی ادبی اور فکری
بصیرت افروز ہے۔ مابعد جدیدیت تشخیص اور علاج کے تحت آپ نے مختلف
حوالوں سے اور اقتباسات سے مابعد جدیدیت کے اثرات سے آگاہ کیا ہے اور
شاید مجھ جیسے قاری بھی کچھ سمجھ پائے ہیں لیکن علاج کے بارے میں ابھی باقی
ہے اور انتظار ہے۔

اقتباس میں یہ کہنا کہ یورپ ہمیں ذہنی طور سے اپنا غلام بنا لینا چاہتا
ہے۔ کیا یہ ہونا ابھی باقی ہے؟ میری ناقص رائے میں یہ سب ہو چکا ہے اب تو
ہم اپنے تشخص کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔

ہماری صدی اتنی تیزی سے دوڑی ہے کہ آج جو کچھ نیا ہے کل پرانا لگنے
لگتا ہے دنیا تنگ ہوتی جا رہی ہے یا ہم ایسے پیچھے ہوتے جا رہے ہیں کہ سب کی
ضرورتیں یکساں ہوتی جا رہی ہیں ہمارا ادب معاشرہ ثقافت خلط ملط ہوتے جا
رہے ہیں۔ اب تو دیکھنا ہے کس کی کتنی چھاپ ہے۔

مہدی جعفر کے خط میں بہت ہی تیکھے اور فکری سوالات ہیں لیکن ان
کے جوابات ہمیں خود اپنے آپ ڈھونڈنا ہیں۔

مجبوراً ضرور تھا یا تجاہل تھا کیا سب کچھ ہم اپناتے ہی جا رہے ہیں۔

غیاث الرحیم شکیب
جاؤرہ

● شب خون کے ادھر دو شمارے جو یک موضوعی خصوصی شمارہ کا حکم
رکھتے ہیں بہت اچھے لگے مگر خط لکھ کر معاملہ وہی ہوتا ہے کہ مدیر خوش اور
دوست خفا کہ بھئی کچھ تخلیقی کام ہو تو چھپواؤ۔ بہر حال دونوں شمارے بہت بہت
عمدہ اور سنبھال کر رکھنے کے لائق ہیں۔ خدا آپ لوگوں کو حوصلہ اور اردو والوں
کو ایسے رسالوں کو زندہ رکھنے کی سمجھ عطا کرے۔

مرغوب علی
نجیب آباد

● شب خون کا شمارہ ۲۰۷ زیر مطالعہ ہے۔ تقریباً سب غزلیں بہت خوب
ہیں ادا جعفری عرفان صدیقی، انور شعور، عتیق اللہ، کرشن کمار طور، عبید
صدیقی۔ عین تابش، ہدم کاشمیری، بلقیس ظفیر الحسن، ن م دانش، رفیق راز
کی غزلیں ماشاء اللہ دل و دماغ پر چھا گئیں انوپا اور جبین مرزا کی نظمیں ٹھیک ہیں،
یہی لب و لہجہ ہے ہماری شاعری کے کلچر کا۔ مجھے ایک بات آپ سے کہنی ہے۔
آپ ایک شاعر کی کئی کئی غزلیں اور کئی کئی نظمیں شائع کرتے رہتے ہیں۔ اس

[illegible] ہے، سوئم [illegible]۔ کوئی بھی [illegible] ہے۔ ان طرف آپ کیوں توجہ نہیں فرماتے۔

لاہور　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　نثار بھارتی

● اقبال مجید کے ناولٹ پر بھگوان داس اعجاز اور کنور سین کے خطوط شائع کر کے آپ نے بڑا نیک کام کیا ہے۔ ان کا دل جس بات پر دُکھنا چاہئے تھا اس کا اظہار تو کہیں نہیں ہوا مگر ان کا نازک دل اس واقعہ کے ذکر پر اقبال مجید کو کریہہ قرار دینے سے بھی باز نہیں آیا۔ شاید انھیں سورت اور بمبئی کے مناظر بڑے دلپذیر لگے ہوں گے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوریا کی جنگ میں امریکی فوج کے سربراہ جنرل میک آرتھر کو شمالی کوریا کے سپاہیوں کی لاشوں کے ڈھیر کو دیکھ کر لگا تھا اور اس نے بہت خوش ہو کر کہا تھا۔

"This is a good sight for my old eyes"

چند دن پہلے شوکت حیات کو بھی اس سلسلے مین لکھا ہے۔ دیکھئے وہ کچھ کرپاتا ہے یا نہیں۔

کراچی کے شاعروں کی نظمیں پڑھ کر اب تو کراچی haunt کرنے لگا ہے۔ جب بھی شب خون آتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ کوئی ایسا ملے جس سے اس پر ڈھیر سی باتیں کروں۔ مگر اس شہر نامراد میں کوئی اور ایسا نہیں۔ میری تنہائی شاعری والی تنہائی ہے، میں واقعی تنہا ہوں۔

رانچی

● 'شب خون' (۲۰۷) دو روز پہلے ملا ہے، اس میں میرا خط سمٹ کر بہت اچھا ہو گیا ہے۔ اس بار "مابعد جدیدیت : تشخیص اور علاج (۳)" اور بھی معنی خیز ہے۔ اس میں مابعد جدیدیت کی ماہیت اور عوامل کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً مابعد جدیدیت اپنی صورت پس نو آبادیاتی تصورات کے آئینے میں متضاد عکس بن کر کس طرح دیکھتی ہے۔ اقتباس کے یہ جملے غور طلب ہیں۔

(۱) پس نو آبادیاتی۔۔ تمنا یا ضرورت صرف اتنی ہے کہ وہ قومیں اور گروہ جو کل تک سامراجی نو آبادیات مین شامل تھے، آج اپنی غیر نو آبادیاتی شخصیت کا وجود اور استحکام چاہتے ہیں۔

(۲) پس نو آبادیاتی افکار میں زبان کا معاملہ سیاسی ثقافتی اور ادبی اہمیت کا حامل ہے۔

(۳) پیداواری ذرائع سے کوئی تشخص نہیں پیدا ہوتا۔

(۴) مابعد جدید اپنے نقطۂ نظر سے۔ ان زبانوں کو جو نو آبادیاتی معاشروں مین پہلے سے موجود تھیں زندہ یا مردہ عجائب گھر کی زینت بنا کر مغرب کے کلام (ڈسکورس) کو رائج کرنا چاہتا ہے۔

ڈسکورس کا ترجمہ کلام خوب کیا ہے۔ گفتگو سے وہ بات نہ بنتی۔ ریطور یقائی صلاحیت جیسے مشکل لفظ کو قوسین میں واضح کرنے کی ضرورت تھی۔ (ROUTLEDGE 1995) کی اشاعتوں کے متعلق اور جاننے کی خواہش رہ گئی ہے۔

ہربنس مکھیا صاحب کی نظریہ تلاش آپ نے خوب کی۔ ان کی تازگی متاثر کرتی ہے۔ انور سین رائے اور انویا کی نظمیں جھنجھوڑتی ہیں۔ ان میں نثری

[illegible] کا شمارہ ہے۔ [illegible] جدید شاعری اور افسانے میں نظر آنے لگی ہے۔ اپنی خوبیوں کے ساتھ۔ ایک ساتھ اتنی نظمیں چھاپ کر آپ نے آصف فرخی کی شعری صلاحیت کو بھی قاری کے سامنے رکھ دیا ہے۔ میں سست آدمی ہوں۔ جلدی جلدی نہیں نپٹا سکتا۔ ایک 'شب خون' ختم ہوتے ہوتے دوسرا آجاتا ہے۔ یہ شمارہ شاعری پر کیوں موقوف ہے؟ افسانہ یا مضمون اس میں کیوں نہیں ہے۔؟

بھوپال　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　مہدی جعفر

● شمارہ ۲۰۷ ملا۔ اکثر رسالے روایتی طریقے سے کسی شمارے میں کثیر تعداد میں شاعری چھاپ کر مدت سے رکے ہوئے کلام کو چلتا کرتے ہیں۔ اس عمل میں ایک قسم کا جبر داخل ہوتا ہے۔ "شب خون" کا یہ شمارہ بھی غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔ اگر اس شمارے میں غزل اور نظم کے علاوہ اور دیگر اصناف بھی شامل ہوتیں تو اسے مکمل طور پر شاعری کا شمارہ کہا جا سکتا تھا۔ بہر کیف اس بار اچھی نظمیں اور غزلیں پڑھنے کا موقع فراہم ہوا۔ غزلوں اور نظموں کے معیار اور حسن انتخاب کو دیکھ کر لازمی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس خوبصورت کوشش کے پیچھے کوئی جبر کار فرما نہیں۔ یہ شمارہ پاکستان (ادا جعفری، آصف فرخی، سبین مرزا)، لندن (عبید صدیقی) اور ہندوستان کے شعری منظر نامے کا ترجمان ہے۔

ادا جعفری کی غزل خوب ہے مگر آخری دو شعر اگر مطلع کے بعد ہی آتے تو ترتیب برقرار رہتی۔ عرفان صدیقی کی غزلوں کا داستانوی رنگ اور لب و لہجہ جاذب توجہ ہے۔ انور شعور کی غزلوں میں روایتی غزل کا خوبصورت پرتو ملتا ہے۔ منموہن تلخ کی غزلوں کی زبان اکھڑی اکھڑی سی ہے۔ ان کی دوسری غزل کے دوسرے شعر اور کرشن کمار طور کی پہلی غزل کے مقطع میں شتر گربہ ہے۔ عین تابش کی غزلیں جاندار اور تازہ ہیں۔ انھوں نے اپنے "نامہ اعمال" کو معتبر حضرات کے نام کیا ہے۔ خدا سب کو سلامت رکھے۔ محمود ایاز کے انتقال سے اردو زبان کا ایک فعال ادارہ (سوغات کے حوالے سے) ختم ہو گیا۔ فضا ابن فیضی ہمارے دور کے بزرگ، پختہ کار اور معتبر غزل گو شاعر ہیں۔ مگر غالباً مشاعرے میں پڑھنے کی عادت اشاعت میں بھی در آتی ہے۔ یعنی ان کے ہر شعر میں کہیں (ان کے) حسب منشا Comma لگے ہوتے ہیں۔ شعروں میں اس طرح الٹی واؤ داغ دیتے ہیں کہ مجھ جیسے کم فہم کو لگتا ہے کہ ان کی غزلیں الٹے پاؤں معنی کا سفر طے کر رہی ہیں۔ ہمدم کاشمیری کی غزلوں میں کہیں کہیں کشمیری عوام کے مصائب کا علامتی اظہار ملتا ہے۔ بلقیس ظفیر الحسن کی غزلوں میں ان کے زخموں کی سلسلاہٹ سے معاصر فکر کے درد کا احساس ہوتا ہے۔ رفیق راز کی غزلوں میں بہت سے الفاظ، تراکیب، استعارے، علامتیں اور فکر کی کہ [illegible]، جدت احساس، جدت تجربہ اور جدت بیان کی مثالیں ہیں۔ وہ غزل کی ایک نئی جمالیات تخلیق کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ عتیق اللہ، ن۔ م۔ دانش، راہی فدائی اور شاہد اختر بھی ٹھیک ہیں۔ نظموں میں ہربنس مکھیا کی نظمیں خوب ہیں۔ ہم انھیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ امید ہے وہ اپنا سفر جاری رکھیں گے۔ انور سین رائے کی کچھ نظموں سے معلوم ہوتا ہے جیسے انھیں کشمیریوں کے دکھ

اور درد کا عملی تجربہ [illegible] کی [illegible] شاعر کا دل اسے محسوس کرتا ہے۔ اور بیان کرتا ہے۔ انجلا [illegible] ارباب، آصف فرخی، تمکین مرزا اور قیصر عالم کی نظمیں نئی شاعری کا عمدہ نمونہ ہیں۔ آصف فرخی کی نظمیں حصہ نظم کی جان ہیں۔

شفق سوپوری

لہہ (لداخ)

● شب خون کا تازہ شمارہ آج ہی ملا ہے جس میں میری غزلیں بھی شامل ہیں۔ کئی مصرعے اور شعر کمپوزنگ کی غلطیوں کی نذر ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر صفحہ ۳۴ کی دوسری غزل کے دوسرے شعر میں "سفر" کے بجائے "صفر" چھپا ہے۔ اصل شعر یوں ہے۔

سانسوں کے اس سفر کو اواسی میں طے نہ کر
دنیا کے بعد حاصل دنیا بھی آئے گا

اسی طرح صفحہ ۳۵ کی پہلی غزل کے دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں "سوگ" کی جگہ "سوک" چھپ جانے کی وجہ سے شعر مہمل ہو گیا ہے۔ اس شعر کو یوں ہونا چاہئے تھا

تجھ سے بچھڑ کر زندہ رہنا اپنے سوگ میں جینا ہے
دل اک پھول تھا خوشبو والا ٹوٹ گیا ہے ڈالی سے

اسی صفحہ پر شائع شدہ دوسری غزل کے تیسرے شعر میں "مینہ برسا" کی جگہ مینہ برسے "کمپوز کر دیا گیا ہے۔ اس شعر کو یوں ہونا چاہئے تھا۔

آنسو گرے تو خاک بدن سے خوشبو پھوٹی تھی
مینہ برسا تو موسم نے گرمانا چھوڑا تھا

صفحہ ۳۶ پر جو غزلیں ہیں ان میں بھی کئی غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ پہلی غزل کا دوسرا مصرع کچھ سے کچھ ہو گیا ہے یہ شعر اس طرح تھا

زمیں پر میرے ہونے نے کبھی کچھ تو بدل ڈالا
مجھے تو ہی بتا اب اور کیا تبدیل ہو جائے

اسی صفحہ کی دوسری غزل کے دوسرے شعر کا مصرع ثانی غلط چھپا ہے جس میں "موجہ خوں" کی جگہ "موج خوں" کمپوز کر دیا ہے۔

جانے کس دشت سے آیا ہے بلاوا میرا
موجہ خوں تہہ افلاک لئے پھرتی ہے

اسی غزل کے آخری شعر میں "رم آہوئے خیال" کے بجائے "دم آہوئے خیال" چھپ گیا ہے۔

ہم سے دیکھا نہیں جاتا رم آہوئے خیال
ایک پرچھائیں سی خراک لئے پھرتی ہے

صفحہ ۳۶ کی تیسری غزل کے تیسرے شعر کا پہلا مصرع بھی غلط چھپا ہے۔ اصل شعر اس طرح تھا

تجھ سے مجھ کو بیر سہی پر کبھی کبھی
دنیا تیرا جادو بھی چل جاتا ہے

آپ اگر مناسب خیال کریں تو خط کا یہ حصہ شب خون میں شائع کر دیں۔

عبید صدیقی

دہلی

- یورپ سے ٹیلی فون پر ملنے والی اطلاع پر اعتماد کر کے ہم نے 'شب خون' شمارہ ۲۰۵ میں اپنے عزیز اور محترم دوست ڈاکٹر آفتاب احمد خان کے بارے میں غلط خبر چھاپ دی تھی کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ہمیں متعدد دوستوں خاص کر شمیم حنفی، مشفق خواجہ اور صبا اکرام نے متوجہ کیا ہے کہ یہ خبر غلط ہے اور جناب آفتاب احمد خان ماشاللہ بقید حیات اور تندرست ہیں۔ ہم جناب آفتاب احمد صاحب سے اور ان کے تمام دوستوں اور بہی خواہوں سے معذرت خواہ ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اس خبر کی اشاعت ان کی درازی عمر کا بہانہ ثابت ہو۔ آمین

- گذشتہ دنوں مشہور امریکی ناول نگار WILLIAM BURROUGHS کا بعمر ۸۳ سال انتقال ہو گیا۔ ولیم بروز نے جدید مغربی ناول نگاروں اور خاص کر بیٹ نسل BEAT GENERATION کے مضمون اور فرانسیسی آواں گارد لکھنے والوں کو متاثر کیا ہے۔ اس کے ناولوں میں NACKED LUNCH اور NOVA EXPRESS خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
- جیسا کہ قارئین کو معلوم ہوگا 'کتھا' نامی ایک ادارہ ہر سال، زبان کے ایک افسانے کو کتھا ایوارڈ، سے مشرف کرتا ہے جو "کتھا" کے مبصروں کی کمیٹی ہر زبان میں ایک افسانہ کو اس سال سب سے اچھا افسانہ قرار دے کر اسے ایوارڈ کے لئے تجویز کرتی ہے۔ اس کے پہلے اردو افسانہ نگاروں میں سید محمد اشرف اور شوکت حیات کو یہ انعام مل چکا ہے۔ اس سال کا کتھا ایوارڈ "شب خون" ۲۰۲ میں چھپنے والے خالد جاوید کے افسانے "برے موسم میں" کو دیا گیا ہے۔ افسانہ نگار کے علاوہ ایوارڈ کی ایک مقررہ رقم 'شب خون' کو بھی دی جائے گی لیکن رقم سے بڑھ کر اہمیت اس بات کی ہے کہ ایک غیر جانبدار ادارے نے پوری چھان بین کے بعد خالد جاوید اور 'شب خون' کے حق میں یہ فیصلہ کیا۔ ہم خالد جاوید کو مبارکباد دیتے ہیں۔ ان کے اس افسانہ کا انگریزی ترجمہ 'کتھا' کی طرف سے شائع کیا جائے گا۔

میں صاف ظاہر ہے۔

- مہدی جعفر عرصے کی خاموشی کے بعد پھر ادب کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ ہم ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

- اظہار الاسلام، رانی گنج (مغربی بنگال) کے معروف افسانہ نگار ہیں اور ایک لمبے وقفے کے بعد دوبارہ ادب کی طرف متوجہ ہوئے ہیں، ہم ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔
- اقبال مجید کا ناولٹ "تیر اس کا ہچ" "شب خون ۲۰۳ میں شائع ہوا تھا۔ اب وہ اس میں کچھ ترمیم کے ساتھ اسے کتابی شکل میں شائع کر رہے ہیں۔ جو اضافے انھوں نے کئے ہیں، ان میں ناولٹ کے ایک کردار ممو خان کے بارے میں ہے، ہم اسے یہاں شائع کر رہے ہیں۔
- حارث خلیق کی نظموں کا مجموعہ "سارے کام ضروری تھے" اور انگریزی نظموں کا مجموعہ "IF WISHES WERE HORSES" حال میں چھپا ہے۔
- شفق سوپوری اب لہ (لداخ) منتقل ہو گئے ہیں۔
- شے مس ہینی (SEA MUS HEANNEY) کو ۱۹۹۵ کا نوبل انعام برائے ادب ملا تھا۔
- ضمیر احمد کی کتاب "عالمی ادب سے خوبصورت نظموں کے ترجمے" چند دنوں پہلے کراچی سے شائع ہوئی ہے۔
- کارلس نیجار (CARLOS NEJAR) (پیدائش ۱۹۴۵) پرتگالی زبان کا مشہور شاعر ہے اور وہاں کی جدید حسیت کے حامل شعرا میں نمایاں ہے۔ احمد سہیل نے یہ نظمیں انگریزی کے توسط سے ترجمہ کئے ہیں۔
- قمر رضا شہزاد پاکستان کے غزل گویوں کی سب سے نمایاں نسل کے فرد ہیں، ان کی غزلوں کا مجموعہ "پیاس بھرا مشکیزہ" کچھ دن ہوئے شائع ہوا ہے۔
- محمود درویش کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ وہ آج کا اہم ترین فلسطینی شاعر ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں اب وہ کئی سال کی جلاوطنی کے بعد فلسطین واپس گیا ہے۔
- منیر الدین احمد نے جرمن نظموں کے حسب معمول براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ کئے ہیں۔ روزے او سلینڈر (ROSE AUS-LAENDER) کو جرمن ادب کی سب سے زیادہ محترم شاعر قرار دیا جاتا تھا، کچھ دن ہوئے اس کا انتقال ہو گی۔ سارہ کرش (SARAHKIRSCH) کا تعلق مغربی جرمنی سے ہے، اب وہ جرمن زبان کی اہم ترین شاعرات میں گنی جاتی ہے۔ فرانز ہوجک (FRANZ HODJAK) نامی علاقے میں پیدا ہوا جہاں جرمن زبان بولی جاتی ہے۔ روزے او سلینڈر بھی وہیں کی رہنے والی تھیں۔ ہائنر مالر (HEINER MUELLER) نمایاں جدید ڈرامہ نگار و شاعر تھا۔ کچھ دن ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔ ہلڈے ڈومن (HILDO DOMIN) بھی جرمن ادب کی خاتون اعلیٰ شمار ہوتی ہے۔ بطور نقاد بھی اس کا درجہ بلند ہے۔ رائنر کونزے (REINER KUNZE) مشرقی جرمنی، مغربی جرمنی سے آنا چاہتا تھا لیکن اسے اپنی شہرت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ بے گھری کا یہ درد اس کی نظم

ستمبر ۱۹۹۷

مدیر، پرنٹر، پبلشر : عقیلہ شاہین
فون : ۶۲۲۶۹۳، ۶۲۳۱۳۷
مطبع : بھارگو پریس، الہ آباد
فی شمارہ : پندرہ روپئے

سرورق : چودھری ابن النصیر
سرنامہ کی خطاطی : عادل منصوری
کمپوزنگ : شارپ ٹریک کمپیوٹرس، الہ آباد-۳

جلد : ۳۱ شمارہ : ۲۱۰
ترسیل زر کا پتہ : ۳۱۳-رانی منڈی، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
خط وکتابت کا پتہ : پوسٹ بکس-۱۳، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
بارہ شمارے : ایک سو ساٹھ روپئے

آزادی کے پچاس سال

۱

ترتیب و تہذیب

شمس الرحمٰن فاروقی

منیر نیازی

کل رات میرے خواب میں دو مکان تھے

ایک بہت بڑا گھر تھا
جس کا نام وقت تھا
ایک اور گھر تھا جو بڑے گھر سے چھوٹا تھا
نام اس کا بھی وقت تھا
ہم دونوں ان دونوں گھروں کی طرف جا رہے تھے
ہنستے کھیلتے
میرے ساتھ، ایک دبلی سی شوخ و شنگ لڑکی تھی
جو عمر میں مجھ سے چھوٹی تھی
مگر جب وہ میری طرف دیکھتی تھی تو وہ مجھے
میری عمر سے بڑی لگتی تھی
پھر بھی ہم دونوں تو خیز ہم عمروں کی طرح
ہنستے کھیلتے جا رہے تھے
بڑے گھر کی طرف یا چھوٹے گھر کی طرف

کسی سوچے ہوئے کو ملنا نیند میں

نیند میں چلتے ہوئے
شہروں، مکانوں اور پہاڑوں اور زمانوں سے گزر کر
وسعت حیراں میں رک کر
اس کو دیکھیں
کیا ہے وہ ـــ
دیکھنا، ملنا اسے اور دیر تک ملتے ہی رہنا
نیند میں رک کر اسے
جاگنے سے خوب ہے ملنا اسے
اور ساتھ رہنا نیند میں ـــ

رونق نعیم

عمرو عیار

چار سو ہے طلسم ہوش ربا
ہر نفس اک جہان دیگر ہے
ہر قدم پر ہے اک نیا عالم
دم شمشیر سے گذرتا ہوں
کیا وہ تعویذ مل نہیں سکتا
باندھ کر جس کو اپنے بازو پر
میں نکل جاؤں اس چھلاوے سے

دور
کچھ دور
یعنی کوسوں دور

میں نے پوچھا امیر حمزہ سے
اس نے ہنس کر کہا جناب من
استدر پیچ و تاب کیا معنی
دیکھئے اب کہ کیا دکھاتی ہے
عمرو عیار کی نئی زنبیل

الہ دین

الہ دین کی طرح قسمت جو ہوتی
چراغ اپنا گھستا
دھوئیں سے کوئی جن نکلتا
اسے حکم دیتا
دشت گماں سے دور سیہ رنگ یہ پہاڑ
امکاں کے جنگلوں سے پرے اس کو پھینک دے
رگ رگ میں جوئے نور بہا
ظلمتوں میں ہوں
سورج کہاں ہے مجھ سے ملا
ظلمتوں میں ہوں

رونق نعیم

حاتم طائی

ہوس کے لمبے لمبے ہاتھ بڑھ کر
آسماں کو نوچ لیتے ہیں
زمیں حیرت سے تکتی ہے
تباہی اپنی آنکھوں کو نچاتی ہے
تو اک شعلہ نکلتا ہے
عجب وحشت کا عالم ہے
جو ہوتا کوئی حاتم طائی
تو اُس سے میں یہ کہتا
عتابوں کا یہ جنگل ہے
یہاں انساں نما پیڑوں کی شاخوں سے
ہزاروں سر لٹکتے ہیں

علی بابا

تو کیا چالیس چوروں کو اجازت ہے
کہ لاکھوں گھر کو لوٹیں
اس طرح ان کی رعونت میں
کروڑوں کا اضافہ ہو
در حشمت پہ محرومی کے سائے طنز کرتے ہیں
علی بابا کہاں ہے
کیا ہوا اس کو
کہ وہ سم سم نہیں کہتا

سند باد

جہاز ڈوبنے کو ہے
مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے
اس پہ آندھیوں کا قہر ہو
اودھر بھنور کے روبرو ہے
موج موج اک بلا
ادھر ہے سند باد
اپنے ہی بچاؤ کے حصار میں

رونق نعیم

ابوالحسن

ابوالحسن! تو کسی اجنبی کو گھر میں نہ لا
کہاں وہ موسم شفاف جب ہواؤں میں
ترے خلوص کی خوشبو چمک سی جاتی تھی
خلیفہ رات گئے گشت اب نہیں کرتا
تمام شہر کا چہرہ اڑا اڑا سا ہے
خبر ہے گرم کہ اپنے محل کے گوشے میں
وہ تاج و تخت کے بارے میں
سوچتا ہے بہت

حسن بانو

ساعتوں کے نئے جزیرے میں
آگیا کیسے پانچواں موسم
کیا ہوا ہے منیر شامی کو
تجھ سے اتنا خفا خفا کیوں ہے
تیرے ہونٹوں کی تھرتھراہٹ سے
کیوں ہوا ہو گئے ہیں ساتوں سوال
حسن بانو! یہ ماجرا کیا ہے

طوطا

طوطا تیرے بدن پر سبز لباس
پرکشش بھی ہے خوبصورت بھی
دیکھ کر تجھ کو یہ خیال آیا
دل جو بے رنگ ہو چکا ہے بہت
کاش اس کو بھی ملتی ہریالی

جیلانی کامران

عہد حاضر کے کسی بھی نقاد کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس ایسے ذرائع ہوں جن سے وہ اپنے زمانے کی پہچان کر سکے۔ یہ اس لئے بھی مناسب دکھائی دیتا ہے کہ نہ تو زمانہ نظر آنے والی شے ہے اور نہ معاشرہ ہی نظر آنے والی شے ہے جس میں زمانہ آشکار ہوتا ہے۔ جو شے نظر آتی ہے وہ ہجوم ہے، افراد ہیں، کاروبار مملکت اور کاروبار زیست ہے۔ اور ولادت و سوگ کا سلسلہ ہے اور شور ہے جو ان عناصر سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسا منظر ایک اعتبار سے زمانے اور معاشرے کا معروضی چہرہ بن کر اس غلط اندازے کو سامنے لاتا ہے کہ جو کچھ نظر کے سامنے ہے اسے ہی زمانہ کہا جاتا ہے، وہی معاشرہ ہے، اور وہی زندگی ہے جس میں لوگ جیتے ہیں، ہم جیتے ہیں، میں جیتا ہوں۔ یہ سب کچھ سطح پر ہونے والا ارتعاش کا مشاہدہ ہے۔ زمانے کی پہچان کے لیے شاید ان نقوش پر سطح آب کی حیثیت بنیادی نہیں ہوتی کیونکہ یہ نقوش ہر لمحہ تبدیل ہوتے ہیں اور تیز رفتار اور متحرک ہوتے ہیں اور نقش میں کئی نقش ٹوٹتے بنتے، مگر بگڑتے، نابود ہوتے دکھائی دیتے ہیں اور جو آنکھ ایسے منظر کا مشاہدہ کرتی ہے وہ کچھ دیر کے بعد چکرا جاتی ہے۔ اور ذہن ایسے مشاہدے کے دباؤ کا شکار بنتا ہے۔ یہ اس اعتبار سے معاشرے کے ان نقوش بر سطح آب کو زمانے کی پہچان کے لئے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو علامات کی نسبت دی جا سکتی ہے۔ تاہم علامات کے ذریعے جن حقائق تک پہنچا جا سکتا ہے ان کی شناخت بھی غلط ہو سکتی ہے۔

معاشرے کی عام فہم آب و ہوا، جسے میں نے نقوش بر سطح آب کے استعارے میں بیان کیا ہے، از خود برپا نہیں ہوتی۔ بعض حقیقتوں کی خارجی شکل و صورت سے ظاہر ہوتی ہے۔ ساٹھ ستر برس قبل اسے معاشرے کی طبقاتی تقسیم سے نسبت دی گئی تھی۔ اور تنقید کا جو اسلوب تیار کیا گیا تھا اسے ترقی پسند تنقید کہا گیا تھا۔ اس تنقید کا ہدف طبقاتی معاشرہ، پامال انسان اور غربت تھی۔ ترقی پسند تنقید کی ساٹھ ستر برس کی کارگزاری کے بعد معاشرہ بدستور طبقاتی ہے۔ تاہم پامال انسان اور غربت محض استعارہ بن گئے ہیں۔ اور اگر کسی کے کہنے پر پامال افراد اور غربت کو ڈھونڈنا بھی چاہیں تو ممکن ہے کہ وہ معاشرے میں کہیں بھی دکھائی نہ دیں گے۔ روزگار کے مواقع وسیع تر ہونے کے باوجود بے روزگاری کا مسئلہ رونما ہوا ہے لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ بے روزگاری نے افراد کو پامال کر رکھا ہے اور غربت نے فاقہ کشی کو گھرانے کی مصوبت بنا دیا ہے۔ معاشرے کی طبقاتی توجیہ نے جاگیردار کو قائم رکھتے ہوئے کوئی ایسا ظلم جائز قرار نہیں دیا جسے ترقی پسند تنقید اپنا کوئی مزید ہدف بنا

سکے۔۔۔ ستر برس کا طویل عرصہ گزرنے کے بعد ترقی پسند تنقید کے [illegible] فکر اور معاشرتی ہدف اور موضوع اپنا اثر و رسوخ زائل کرتے دکھائی دیتے [illegible] اور ترقی پسند ادب کی اپنے عہد کے ساتھ ہمکلامی بھی موثر ثابت نہیں [illegible] لوگ ایسے ادب کی باتیں اور ایسی تنقید کے اسلوب کو تکرار زدہ شے گردانتے ہوئے قابل اعتبار نہیں سمجھتے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ترقی پسند تحریک [illegible] ادب کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔

(۲)

گزشتہ ساٹھ ستر برس کے دوران دو ایسے استعارے بھی [illegible] ہوئے تھے جن کا تعلق مغربی تہذیب کے اس رابطے کے ساتھ تھا [illegible] تہذیب نے یورپ کے باہر دوسرے ملکوں کے ساتھ قائم کیا تھا اور جہاں [illegible] ممالک کی تاریخ اور تہذیب، مغربی تہذیب کے رویوں سے متاثر ہوئی [illegible] ایک استعارہ جدید دنیا کا تھا اور دوسرا استعارہ سیکولرازم کا تھا۔ جدید دنیا کے ادب میں نئے تجربے وارد ہوئے۔ نظم اور فکشن کی نئی صورتیں قبول کی [illegible] اور سیکولرزم کے نام پر موضوعات کی ایک خاص حد مقرر کی گئی جس کا مر[illegible] کردار انسان قرار پایا، خطہ ارض کو گلوبل ولیج (Global Village) کہا [illegible] ممالک کی تہذیبوں کو غیر جدید گردانا گیا۔ سیکولرزم نے مذہب کے حوا[illegible] ناقابل فہم قرار دیا اور اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ مغرب کی اعلیٰ تعلیم، [illegible] اور امریکہ میں سیر و سیاحت، اور مغربی کلچر کی تقلید میں جدید دنیا کا [illegible] دستیاب ہوتا ہے اس میں مذہب کو حوالہ کسی طرح شامل نہیں ہو سکتا۔ [illegible] کلچر نے مشرق کے ملکوں میں جس تنقید ادبی فکر اور فلسفے کو روا رکھا وہ سیکو[illegible] اور جس میں مذہب کا کوئی حوالہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ روشن خیالی کے [illegible] عیسائیت کو بھی حوالے کی فہرست سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ تاہم دو[illegible] جنگ کے خاتمے کے بعد عیسائی مذہبی حوالے، تہذیبی استعاروں کے [illegible] ادبی تنقید میں شامل ہوتے گئے۔ درس و تدریس کے مقاصد کی خاطر [illegible] یونیورسٹیوں نے عیسائیت کے تہذیبی استعاروں کو اپنے انداز فکر کا جزو [illegible] لیکن ایسا بدلا ہوا انداز فکر ان ملکوں میں کسی طرح رواج نہ پا سکا جن کو جد[illegible] اور سیکولرازم کے سلوگن متاثر کر چکے تھے۔ ان حالات میں یہ سوال سا[illegible] ہے کہ کیا وہ جدید دنیا اور سیکولرازم برابر موجود ہیں جن کی ولادت [illegible] صدی کے آغاز میں اور بیسویں صدی کے فکر و فلسفے کے نتیجے میں ہوئی تھی [illegible]

(۳)

اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ جدید دنیا جو مادی ترقی اور سائنس اور ٹیکنالوجی سے پیدا ہوئی تھی، اب ایک مانوس دنیا بن چکی ہے اور مادی ترقی کے تصور نے انسان کے تصور کی شکل بدل دی ہے۔ انسان اخلاقی طور پر بہتر نہیں ہوا کمپنیوں اور کارپوریشنوں کو جدید انسان کا مصداق گردانا گیا ہے۔ ان کو نیو پرسن (Neo-person) کہا گیا ہے۔ یہ نیو پرسن اخلاقیات کا پابند نہیں ہے اور مفادات کے حوالے سے اپنا لائحہ عمل بناتا ہے۔ جدید دنیا ٹیکنالوجی کی فروخت کی سپر مارکیٹ ہے جس میں خریداری کرنے سے پسماندہ ممالک جدید دنیا میں وارد ہو سکتے ہیں۔ خریداری کے اس رویے نے بین الاقوامی قرضوں کی ترغیب دی ہے اور جدید بنتے ہوئے پسماندہ ممالک مقروض قوموں کی فہرست میں شمار ہونے لگے ہیں۔ جدید دنیا کا وہ فخر جو علم و حکمت اور روشن مستقبل پر قائم تھا، خریداری اور قرض کی وبا بن کر زائل ہو رہا ہے۔ اب انسانیت کا مستقبل شاید روشن نظر نہیں آتا۔ مقروض قوموں کا مستقبل البتہ تاریک دکھائی دیتا ہے۔ مغربی دنیا کا بھی مستقبل کے بارے میں رجائی رویہ اب برقرار نظر نہیں آتا۔ اور جب سے مغربی دنیا کی سفید اقوام کی قوت تولید کمزور پڑی ہے اور ان کی عددی کم سے کم تر ہوئی ہے، مغربی دنیا کے احوال بھی کوئی بہتر دکھائی نہیں دیتے۔ امریکہ میں ان احوال سے بچنے کے لیے بین الاقوامی تصور ظاہر ہوا ہے۔ ایسی صورت جدید دنیا کے بارے میں بخوبی جانچی جا سکتی ہے۔

(۴)

سیکولرازم جس نے ہمارے ماحول میں تعلیم یافتہ افراد کو متاثر کر رکھا تھا اب اس انداز میں موثر دکھائی نہیں دیتا جس انداز میں اس کی گرفت انقلاب روس کے زمانے میں تھی یا مغربی روشن فکری کے زیر اثر تھی۔ امریکہ کے مشہور میگزین "دی نیشنل انٹرسٹ" کے شمارہ نمبر ۴۶ (موسم سرما ۱۹۹۶ـ۹۷) میں سیکولرازم کے بارے میں پیٹر برگر (Peter Berger) کا کہنا ہے

> یہ مفروضہ کہ ہم ایک سیکولر دنیا میں جی رہے ہیں، غلط ثابت ہوا ہے۔ دنیا اپنے عہد حاضر میں بڑی شدت کے ساتھ مذہب پسند ثابت ہوئی ہے اور جو ادب گزشتہ ساٹھ ستر برسوں کے دوران سیکولر نظریے کی تقلید میں لکھا گیا تھا، سچائیوں پر مبنی ادب دکھائی نہیں دیتا۔ جس زمانے میں سیکولر ماحول اور سیکولرازم کا چرچا خلوص اور شدت کے ساتھ ہوا تھا اس وقت یہ باور کیا گیا تھا کہ جدید بننے کے شوق میں تعلیم یافتہ افراد مذہب سے دور ہوتے جائیں گے اور مذہب کا عمل دخل ان کی زندگیوں میں کم ہوتا جائے گا۔ لیکن یہ خیال بھی درست ثابت نہیں ہوا۔ جدیدیت اور مذہب کا رشتہ اتنا آسان دکھائی نہیں دیتا۔ یہ رشتہ بے حد پیچیدہ ہے۔

پیٹر برگر نے مذہب کے احیا کا ذکر کرتے ہوئے رومن کیتھولک احیائے عیسائیت کی جانب بھی اشارہ کیا ہے اور اسلامی ممالک میں بھی احیا کے منظر کا جائزہ لیا ہے۔ وہ اسلامی ممالک کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> یہ خیال کرنا اسلامی احیا صرف ان معاشرتی طبقوں میں نفوذ کر رہا ہے جو جدیدیت سے دور ہیں یا پسماندہ اور غریب ہیں بہت بہت حد تک درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی احیا کے رویے ان شہروں میں بہت نمایاں ہیں جو جدیدیت کے بے حد قریب ہیں اور ایسا احیا ان گھرانوں میں بڑی شدت کے ساتھ ظاہر ہوا ہے جن کے افراد مغرب کی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل ہیں۔ مصر اور ترکی میں جدید گھرانوں کی لڑکیاں نقاب اوڑھ کر باہر جانے کو ترجیح دیتی ہیں۔

اپنے دلائل اور جائزے کی تفصیلی بحث کے بعد وہ لکھتا ہے:

> عصر حاضر کے جائزے میں سیکولر انداز فکر کی پیروی ادھوری اور نامکمل ہے۔ مذہب کو نظر انداز کرنا کئی اعتبار سے خطرناک دکھائی دیتا ہے۔

(۵)

ترقی پسند تنقید نے سب سے زیادہ نقصان شاعری کو پہنچایا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ترقی پسند انداز فکر جن حقیقتوں کا ذکر کرتا تھا ان کا تعلق معلومات سے تھا۔ تاکہ قاری معلومات وصول کر کے اپنے رویوں کو ترقی پسند مقاصد کے لیے قابل قبول بنا سکے۔ ایسے طریق کار نے کہانی کو تخلیق کا ذریعہ بنایا اور نثر کی معلومات کے اظہار کے لیے مناسب تربیت کی۔ اور چونکہ ترقی پسند تنقید نثری ذہن کی پیداوار تھی اس لیے شاعری نہ نثر بن سکی نہ شعر کہہ سکی۔ شاعری خطابت بن گئی اور اس زمانے میں بھی ترقی پسند شاعروں کی شاعری زبان کی شاعری ہے۔ لفظی ترجمہ کے قریب تر ہے اور جہاں نظم کی بجائے غزل میں اظہار ہوا ہے وہاں تغزل کم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ گزشتہ کئی برسوں کے ادبی سفر نے ہمارے موجودہ دور میں اس بات کی خبر دی ہے کہ شاعری کا زمانہ ختم ہو چکا ہے نثر کا زمانہ آ گیا ہے۔ اس بات کی وضاحت کی شاید ضرورت نہیں ہے۔ کہانیاں اور سفر نامے زیادہ تر لوگ پسند کرتے ہیں۔ شاعری جو روایتی نوعیت کی ہے اسے مشاعرہ پسندی کے باعث روا گردانا گیا ہے۔ اور وہ شاعری جو مرکزی رجحانات کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی ہے، ایک اقلیت کے ذوق کا حصہ بن گئی ہے۔ نثر کے زمانے میں شاعری کا کیا جواز ہے، ایک کڑا سوال بن کر ظاہر ہوا ہے۔ اور کیا ہمارا عہد حاضر شاعری چاہتا ہے؟

ایک دوسرا اور سنجیدہ سوال ہے۔ اور اگر شاعری اسے درکار ہے تو کیا وہ مانوس طرز اظہار کی شعر گوئی ہے، یا نثری نظم ہے۔ یا کسی اور اندازِ بیان کی شے ہے؟ لیکن سب سے بڑا سوال غالباً یہ ہے کہ کیا ہمارا اجتماعی ذہن شاعری کی دنیا میں ہے یا شاعری کی دنیا سے باہر کسی بدلے ہوئے زمانے میں وارد ہو چکا ہے جہاں شاعری کی شاید ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہمارا انسان بدل چکا ہے اور کیا واقعی ہمارا انسان بدل چکا ہے۔

(۶)

آج مغربی نظام فکر میں دو رویے نمایاں ہوئے ہیں: ایک کا تعلق تاریخ کے اختتام (The end of History) جس کا محرک جاپانی امریکی مفکر فرانسس فوکویاما (FRANCIS FUKUYAMA) ہے اور دوسرے رویے کا تعلق ادبی تھیوری کے مستقبل (The future of literary theory) سے ہے جس کا محرک رالف کوہن RALPH COHEN ہے۔

کیا ادب کے نظریات کی کوئی افادیت ہے؟ اور کیا ادب کے نظریات اپنے افادی جواز کو زائل کر چکے ہیں اور ادب کا زمانہ بھی تاریخ کے اختتام کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے؟۔ تاریخ کے اختتام کا تصور اس مفروضے پر قائم ہے کہ بنیادی حقوق کی ضمانت اور جمہوری نظام حکومت کے استحکام کے بعد تاریخ کے کسی بنیادی محرک کا جواز باقی نہیں رہا اور فرد کو ریاستی تصور زیست میں آزادی حاصل ہو گئی ہے۔ ادبی تھیوری کا مستقبل اس لیے خطرے میں آ گیا ہے کہ معاشرے کا ظلم اب فرد کی زندگی کو پریشان نہیں کرتا کیونکہ معاشرہ انسانی فلاح کے اداروں کا معاشرہ بن گیا ہے۔ اور مغربی انسان کا ذہن فلاح و بہبود کی تدبیروں اور تجویزوں کو تحریک دینے کے عمل میں شریک ہے۔ معاشرہ اب انسان کا دشمن نہیں رہا۔ حکومتی ادارے اس کی رضا سے چلتے ہیں انسان کو بنیادی تحفظات حاصل ہیں۔ بے روزگاری الاؤنس ہے۔ بیماری کے لئے سوشل سکیورٹی کا دستور ہے۔ ہر کام خوش اسلوبی سے ہوتا ہے۔ انسان کی عزت نفس کو کوئی گزند نہیں پہنچتا۔ عشق کسی بھولے ہوئے ماضی کا حصہ بن چکا ہے اور عشق کی زبان اور محاورے انسان کو بھول گئے ہیں اور عشق کی جگہ جنس کے نسوانی قالب نے لی ہے جسے کسی طویل کورٹ شپ کے بغیر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ان بے شمار تبدیلیوں کے بعد جو انسان ظاہر ہوا ہے اس کے لیے ادب بے کار شے ہے اور تاریخ کا اختتام آسائش کی چیزوں کی خرید اور ان کے استعمال کے ساتھ منسوب ہو گیا ہے۔ جدید عہد میں انسان نے کم از کم مغربی دنیا میں اس بہشت کو پا لیا ہے جس کا اچھے لوگوں سے اقتصادیات کے نظریہ سازوں نے وعدہ کیا تھا۔ تاریخ کے اختتام کے ساتھ ان افراد کی پیرالائز ظاہر ہوئی ہے جو کام کرتے ہیں، روزی کماتے ہیں۔ ویک اینڈ پر تفریح اور سیاحت کو جاتے ہیں جن کی زندگی وافر پنشن کے ساتھ آرام سے گزرتی ہے اور جن کی تہذیب عہد حاضر میں بلند ترین مقام پر بھی دکھائی دیتی ہے۔

ایسے انسان کے لیے ادبی نظریات مستقبل نے ایک عجیب و غریب رویہ ظاہر کیا ہے۔ اس کے لیے ادب محض ایک متن بن کر سامنے آیا ہے۔

(۷)

ادب کو متن کے طور پر زیر غور لانا اس عقیدے کی بنا پر درست دکھائی دیتا ہے کہ شاعر (یا ادیب) تخلیق کرتا ہے۔ اور تخلیق کی واردات کے دوران جو زبان استعمال کرتا ہے اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ اور یہ مطالعہ مصنف کو بھی غیر ضروری گردانتا ہے۔ اور اس کے عہد کو بھی نظر انداز کرتا ہے۔ کیونکہ اصل شے متن ہے جو قاری تک پہنچتا ہے۔ اور متن ہی کا مطالعہ ادب ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان تمام کتابوں میں جو ادبیات کے مطالعاتی کورس میں شامل ہوتی ہیں متن ہی کو فوقیت دی جاتی ہے۔ شاعر کی زندگی، اس عہد، اور اس کی زمانے تحریکیں ان کو در خور اعتبار نہیں سمجھا جاتا۔ اصل شے، لفظ ہے اور لفظ زندہ رہتا ہے۔ مصنف اور اس کا عہد گزر جاتے ہیں۔ اس لئے جب لفظ زمانے پر حاوی اور زمانے سے ماورا ہے تو متن ہی کو ضروری گردانے کی روش کو کوئی الزام نہیں دیا جا سکتا... تاہم اس ضمن میں ایک الجھن ضرور سامنے آتی ہے اور اس کا تعلق کلاس روم کے ساتھ ہے۔

کسی بھی ادب پارے کا متن دو طرح پڑھا جاتا ہے۔ ایک طریقہ سرسری انداز میں پڑھنے کا ہے جس سے آدمی محظوظ بھی ہوتا ہے۔ اس کا تنقیہ (Catharsis) بھی ہوتا ہے اور اسے متن سے کچھ دستیاب بھی ہوتا ہے۔ دوسرا طریقہ کلاس روم اور سیمینار میں گہرا مطالعہ کرنے سے تعلق رکھتا ہے، یہ طریق کار ادب کی زبان کے عمیق معانی تلاش کرتا ہے اور غالباً متن کو ایسے انداز میں قبول کرتا ہے جسے پرانے زمانے کے مقبروں سے قدیم رسم الخط میں لکھی ہوئی تختیوں کی عبارت ہوتی ہے۔ اس روش کی موجودگی میں اگر ادبی تاریخ فراموش ہو جائے، مصنف کا عہد قابل توجہ نہ رہے اور قوموں کی اجتماعی زندگی کے ساتھ متن کا رشتہ باقی نہ رہے تو ادب آثار قدیمہ کی سرگرمی بن سکتا ہے۔ شاید اسی لئے عہد حاضر میں تشکیلات اور رد تشکیلات اور ساختیات کی آمد تخلیقی ذہن کے لیے ایک صبر آزما دو راہہ بن کا ظاہر ہوئی ہے۔

(۸)

اگر متن کو غیر معمولی اہمیت دی جائے اور مصنف اور اس کا عہد کسی حوالہ جاتی رشتے کی نشاندہی نہ کریں تو متن کس حد تک قاری کی رہنمائی کر سکتا ہے؟ متن کی اہمیت قاری سے غیر معمولی توقعات کا مطالبہ بھی کرتی ہے کہ قاری کا مطالعہ وسیع ہو، اس کی الفاظ کے ساتھ تربیت بھی قابل اعتماد ہو اور اس کی افتادِ طبع بھی کسی طویل ادبی ذوق سے آشنا ہو۔ اگر قاری کے پاس ایسی

وصیات موجود بھی ہوں اور وہ مصنف اور اس کے عہد سے نا آشنا ہو تو بھی وہ
ں کے مطالعے میں بہت دور تک رسائی نہیں کر سکتا۔ یہ باتیں اس لئے
ں غور ہیں کہ تنقید کے بارے میں توقعات قائم کرتے ہوئے نہ تو عہد کو
ِ انداز کیا جاسکتا ہے اور نہ مصنف ہی کو حذف کیا جاسکتا ہے۔ یہ مطالبہ
ے لئے جن توقعات کو ضروری ٹھہراتا ہے ان کو جاننا بھی نقاد کی کارگزاری
زی جزو بنتا ہے۔

(۹)

تنقید سے ایک اہم توقع یہ ہے کہ اس کی رہنمائی میں ہم یہ جان
ں کہ عہد حاضر میں ہم کہاں مقیم ہیں؟۔ کیا ہم زمانے کے اعتبار سے اسی
ر سے تعلق رکھتے ہیں جو مغربی تہذیب کے انسان کا ہے؟ اور کیا ہماری
اعی سرشت اس نوع کی ہے جس نوع سے اہل مغرب کی اجتماعی سرشت
ری ہے؟ کیا اس سائنس کی ایجاد میں ہمارا کوئی حصہ ہے جس نے مغربی
ن کو سائنس کی ایجاد کے مواقع دیئے ہیں؟ اور کیا ہماری توانائی اسی درجے ا
اہلیت کی ہے جو مغربی تہذیب کی کارگزاری میں دکھائی دیتی ہے؟ ان سوالوں
. اسی نوع کے دوسرے سوالوں کے جوابات سے اس سوال کا جواب بر آمد
تا ہے کہ ہم کہاں مقیم ہیں؟

اور اگر کسی طرح اس امر کا علم ہو جائے کہ ہم کہاں مقیم ہیں اور ہمارا
انہ اور عصر کون سا ہے؟ اور ہمارے ذہن کی نوعیت کیا ہے اور ہم کس زمانے
ے گزر رہے ہیں؟ تو یہ اندازہ بھی ممکن ہو سکے گا کہ ہمارا ادب ہم سے کیا توقع
. تا ہے اور ہماری تنقید اس توقع کو کس طرح اور کہاں تک پوری کرتی ہے؟
ن یہ ساری کارگزاری اس وقت تک سود مند ہو گی جب تک ہم اس حقیقت کو
یں جان سکتے کہ ہمارا انسان کیسا ہے؟ گذشتہ ساٹھ ستر برس کے دوران جو
سان ہمارے ادب میں ظاہر ہوا ہے اس کی پہچان تنقید کا پہلا فرض ہے۔ اور یہ
وال بھی تنقید سے توقعات میں شامل ہے کہ معاشرے اور گھرانے میں بسنے
لا انسان اس انسان سے کہاں تک مشابہ یا مختلف ہے جو ادب میں نظر آتا
ہے۔ معاشرے میں انسان کا جو چہرہ دکھائی دیتا ہے وہ گھرانے میں دکھائی نہیں
یتا اور انسان کا جو چہرہ گھرانے کی بنیادی رشتے داریوں میں نظر آتا ہے وہ ادب
ں دکھائی نہیں دیتا۔ تنقید سے توقعات میں ان مختلف صورتوں کا ادراک بھی
امل ہے کہ انسان، رشتے بندیوں کی دنیا سے باہر نکل کر جب معاشرے میں
رد ہوتا ہے تو اس کا چہرہ کیسے بدل جاتا ہے۔ اور کیوں بدل جاتا ہے اور وہ عناصر
.ن سے ہیں جو انسان کی سرشت کو پامال کرتے ہیں۔

(۱۰)

ہمارا انسان کیسا ہے؟ اور اس کی بنیادی سرشت کیا ہے؟ ان سوالات
کے جوابات سے ہم اپنے انسان کی شناخت کر سکتے ہیں۔ تنقید کا اس شناخت کے
عمل میں اعانت کرنا ضروری ہے۔ اس ضمن میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ہم
اپنے انسان کو سمندر پار کے علاقوں میں پہچاننے کی کامیاب کوشش کر سکتے ہیں
کیونکہ سمندر پار کے تمدن میں ہمارا انسان اپنے لئے جو حوالے قائم کرتا ہے ان
سے اس کے عزائم اور کردار کی شناخت ممکن ہو سکتی ہے اور گھرانے کے ساتھ
آبائی تعلق سے اس کے کردار کی خوبیاں بھی آشکار ہوتی ہیں۔ اور اس سچائی کا
علم ہوتا ہے کہ ہمارا انسان اپنے باطن میں کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟

اس بات سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارا عہد دو مختلف کہانیاں
قلمبند کر رہا ہے۔ ایک کہانی ملک کے اندر لکھی جارہی ہے جس کا انسان شکستہ پا
ہے۔ اور دوسری کہانی سمندر پار کے ملکوں میں ہمارے ملک کے باشندے لکھ
رہے ہیں جو محنت اور لگن کی کہانی ہے۔ یہ دوسری نوع کی کہانی لکھی جارہی ہے
اور اس میں جیا بھی جارہا ہے۔ اس اعتبار سے سمندر پار کے پاکستانیوں کی کہانی
ایک سچی کہانی ہے کیونکہ یہ کہانی ہمارے اصل انسان کا چہرہ دکھاتی ہے۔ انسان کا
یہ چہرا ہمارے تمدن اور معاشرے میں درمیانے طبقے کی تشکیل کر رہا ہے۔ اس
طبقے کے ساتھ ذہن کی زرخیزی کو منسوب کیا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں تنقید
کے لیے اس سوال کا جواب دینا بھی ضروری ہے کہ سمندر پار کی لکھی جانے والی
کہانی کو ادب میں کیا مقام ملتا ہے؟ اور اس کہانی کے کرداروں کو ادب میں کیسے
شامل کیا جاسکتا ہے۔

انسان کے جس وجود کو سمندر پار پاکستانیوں کی کہانیاں اور نظمیں
آشکار کرتی ہیں، اس انسان کے ساتھ ہمارے مستقبل کا رشتہ نمایاں ہوتا
ہے۔ ایسے زاویے سے احساس ہوتا ہے کہ اس انسان کی ہمراہی میں ہمارے
مستقبل کا سفر طے ہوگا۔ اور یہی انسان ان وعدوں کو پورا کرے گا جو ہم نے
آزادی کے نام پر اپنے مقدر سے کئے تھے۔ تنقید سے ایک توقع یہ بھی کی جاسکتی
ہے کہ وہ ان دو مختلف کہانیوں اور ان دو مختلف وارداتوں کو باہم مربوط کرنے
کے لیے طریق کار اور انداز فکر تلاش کرے جنہیں سمندر پار کے ملکوں میں اہل
پاکستان اور ملک کے اندر ادیب اور شاعر اپنے طور پر بیان کرتے ہیں۔ محنت اور
لگن کی خوبیوں پر مقاصد کی تعمیر مستقبل کی ضمانت دے سکتی ہے۔

(۱۱)

انسان کی جس کیفیت اور عہد حاضر کے جس مقام کا ذکر کیا گیا ہے
۔ ان سے تنقید کی صورت بدل گئی ہے اور اس کے ساتھ وابستہ توقعات ظاہر
ہوئی ہیں۔ تنقید موجودہ دور میں ان مضامین کو متروک قرار دے چکی ہے جو
کلاس روم کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ یا جن کے حوالے سے ادب کی
معلومات میسر آتی ہیں۔ ان موضوعات اور معلومات کے ساتھ تنقید کی اوائل
عمری وابستہ ہے۔ ادیب اور شاعر اس تنقید سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں کر
سکتے۔ اگر ایسی تنقید کو تخلیقی عمل کے ساتھ منسلک کیا جائے تو ادب کی نشوونما
رک سکتی ہے۔ ادب تقلید کا شکار ہو سکتا ہے اور ادب کی زبان کسی بدلے ہوئے

انداز بیان کی تلاش بھی نہیں کر سکتی۔ ان حالات میں تنقید ہمارے مقاصد کا فکری وسیلہ ہے۔ اسے کسی ایسے نظام فکر کے سپرد نہیں کیا جا سکتا جو تاریخی اعتبار سے زوال آمادہ ہو۔

(۱۲)

تنقید کا دائرہ عمل خیالات اور افکار ہیں اور وہ فکری آب و ہوا ہے جو کسی فرد اور عہد کی ذہنی سرشت کو مرتب کرتی ہے۔ اس لئے تنقید کی سرحدوں کو محدود نہیں کیا جا سکتا اور نہ تنقید کو صرف ادب اور شاعری ہی کے ساتھ منسوب کیا جا سکتا ہے۔ تنقید کا کام افکار کی تلاش کا ہے اور تلاش کے عمل کے دوران افکار کی دریافت کا ہے۔ تلاش اور دریافت کا عمل ایجاد کا سبب بنتا ہے۔ اس اعتبار سے تنقید کا سارا کام ذہن کی سرحدوں کو وسیع تر کرنے کا ہے۔ ایسی عمل آوری جملہ علوم کا احاطہ بھی کرتی ہے۔ ادب اور تنقید مل کر علوم کو ادب کی سرحدوں میں شامل کر سکتے ہیں۔ تنقید ادب کے حدود اربعے کو علوم کی شرکت سے مزید وسیع کر سکتی ہے اور اس طرح ذہن کو متحرک، فعال اور تخیل آفریں بنا سکتی ہے۔ ایسی توقعات میں تنقید کی بالغ نظری کی نشانیاں ہیں۔ اور کوئی بھی ادبی کلچر تنقید کی بالغ نظری کے بغیر اپنے پختہ کار ہونے کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ تنقید کو الفاظ کی گرامر کا قصہ بنانا عہد حاضر کی توقعات کو غلط سمجھنے کے مترادف ہے اور ایک ایسے معاشرے میں جہاں قاری کا ذہنی قامت مشکوک ہو، اسے لفظوں کی گرامر میں الجھانے سے طرف منفی نتائج ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔

(۱۳)

موجودہ زمانے میں تنقید کو بڑے اور عظیم مقاصد کے لئے آزمایا جا سکتا ہے۔ اور ان مقاصد کی مدد سے ادب کی آبیاری کا مناسب انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔ تنقید کی کار فرمائی کے ذریعے ذہن اور لفظ کا رابطہ پیدا ہوتا ہے۔ اور ادب کی بجائے افکار رونما ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے تنقید انسانی ذہن کو سوچنا سکھاتی ہے۔ اسے غور و فکر کا انداز بتاتی ہے اور افکار کے ظہور اور مشاہدے کو انسانی مسرت کا سرچشمہ بنا سکتی ہے۔ ادب کی بصیرت کسی اور نوعیت کی ہے۔ تنقید کی بصیرت ذہن کی بصیرت ہے۔ تنقید، فلسفے اور ادب کے درمیان ایک مختلف دنیا کی نشاندہی کرتی ہے جہاں افکار پیدا ہوتے ہیں اور اپنے عہد اور زمانے میں نئے موسموں کے آنے کی خبر دیتے ہیں۔ تنقید کے ساتھ نئے موسموں کی توقع بھی وابستہ ہے۔ ◢◢

ناصر شہزاد

رنگ کیسا؟ غبار کیسا ہے
اس کے رخ پر نکھار کیسا ہے

ریت تنہا کھجور، ویرانہ
راستے میں مزار کیسا ہے

ہر جگت ہم یہاں ملیں، بچھڑیں
جگ میں یہ فشار کیسا ہے

سدا چاہے، سدا سراہے تجھے
دل اطاعت گزار کیسا ہے

دشت میں تیاگے پران، جل میں جان
تیرا میر ا یہ پیار کیسا ہے

تو تو جانے سکھی، مجھے بھی بتا
سے اس دل کے پار کیسا ہے

گیت کی تال سے غزل کا وصال
دیکھ، یہ بج سنگھار کیسا ہے

کچھ تو پہچان لو سہیلی مان
تجھ پہ من تن نثار کیسا ہے

تیری گئیاں چراؤں، من بھاؤں
جی لگے تیرے دوار کیسا ہے

بیبیاں کیوں بندھی ہیں اونٹوں پر
سر نیزہ سوار کیسا ہے

سانس مالا پہ گن اسے نسدن
رکھ شمارہ، شمار کیسا ہے

نین نشے کی چڑھتی تمو پر
باقی بدن سب جام و سبو پر

پیار میں تیری میری باتیں
کچھ میں میں پر، کچھ تو تو پر

چڑیاں، مور، ممولے، داوی
ہم تم ایک کنار جو پر

خاخ انار نے چہرہ چوما
پھول گرے اس کے گیسو پر

لکھی گئی تاریخ ہماری
کوفہ تیرے کاخ و کو پر

چاہت میں رسوائی اول
کان نہ رکھنا ہاؤ ہو پر

دھوپ پھسل کر بام سے اتری
روپ گیا اس آئنہ رو پر

ہم نے اپنی کویتا گوندھی
مٹی کی سوندھی خوشبو پر

منگ سہیلی، رنگ چنبیلی
زرد لباس کھلے گیسو پر

منوا سو کے، بدرا ہو کے
کوئل کی کو ہو! کو ہو پر

کربل — حرب، ہراول، حملہ
کربل — آخری ضرب عدو پر

تن من مہمان ہے پیاس کی پونجی
من میزان ہے آب وضو پر۔

ایرانی فارسی، ہندوستانی فارسی اور اردو: مراتب کا معاملہ

شمس الرحمٰن فاروقی

میں نے اس مضمون میں ایک ایسا سوال اٹھایا ہے جس کا مکمل جواب
ینے سے میں قاصر ہوں۔ گویا اس مضمون کی مثال کسی ناقص اور خام کارانہ
اسوسی کہانی کی ہے جس میں حسب ذیل سوالات کو بے جواب چھوڑ دیا گیا
ہے: کس نے کیا؟ کیسے کیا؟ اور کیوں؟ اس مضمون کی سب سے زیادہ دلچسپی
ناید اس بات میں بھی ہو کہ میں نے جو سوال اس میں اٹھایا ہے، وہ اب سے پہلے
ی اٹھایا نہیں گیا تھا، بلکہ اس کے وجود کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں کیا گیا
ا۔ یہ سوال بجائے خود دلچسپی کا حامل ہے کہ جو مسئلہ میں نے یہاں اٹھایا ہے اس
ا آج سے پہلے کسی کو خیال کیوں نہ آیا تھا؟ اس سوال کو جواب دینے کی کوشش
ی جائے تو شاید ہمیں کچھ یہ بھی پتہ لگے کہ گذشتہ سو سوا سو برس میں ہمارے
ور ضمین زبان و ادب کا ذہن کس طرح کام کر رہا تھا؟ لیکن میں اس سوال کے
واب دینے کی سعی نہ کروں گا، کیونکہ میرا اپنا سوال خود ہی کچھ کم ٹیڑھا نہیں
ہے۔

میرے مسئلے کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ:

(۱) انیسویں صدی کے اوائل کے آس پاس ہندوستانی فارسی
دیوں اور فارسی بولنے والے ہندوستانی الاصل لوگوں اور اہل اردو میں خود
عتمادی کی زبردست کمی پیدا ہوئی۔ یہ لوگ ہندوستانی فارسی اور اسی اعتبار سے
ردو کو ایرانی فارسی کے مقابلے میں کم تر اور حقیر سمجھنے لگے۔ یعنی اپنے ہی کو
پ ہی کمتا کہنے لگے۔

(۲) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی فارسی گویوں کو استناد حاصل نہ
ا اور ان کی فارسی اسی حد تک معتبر ٹھہری جس حد تک وہ ایرانی فارسی کے
طابق ہو۔

(۳) اردو کا حال اور بھی برا ہوا۔ اردو میں مستعمل فارسی عربی الفاظ
کے استعمال پر یہ شرط عائد کی جانے لگی کہ ان الفاظ، تراکیب اور فقروں کو اسی
قت صحیح مانا جائے گا جب وہ فارسی ضابطوں اور قاعدوں کے مطابق ہوں گے یا
جن کے لئے فارسی سے سند مل سکے۔ بالفاظ دیگر، زبان کی حیثیت سے اردو کا
کوئی آزاد وجود نہ رہ گیا۔

(۴) مندرجہ بالا باتوں کو مراتب کے حسب ذیل گوشوارے کے
ذریعے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

اعلیٰ : ایرانی فارسی، یعنی وہ فارسی جو ان اہل ایران نے لکھی جو ہندوستان کبھی
نہیں آئے۔

متوسط بالائی : ہند ایرانی فارسی، یعنی وہ فارسی جو ان ایران نژاد شعرا نے
لکھی جنھوں نے اپنی تخلیقی زندگی کا بڑا حصہ ہندوستان میں گزارا۔

متوسط زیریں : ہندوستانی فارسی، یعنی وہ فارسی جو ہندوستانیوں یا ان
ایرانیوں کی اولادوں نے لکھی جو ہندوستان میں رہ بس گئے۔

سطح اسفل سے ذرا اوپر : اردو، بشرطیکہ اس میں جو فارسی الفاظ،
فقرے، تراکیب وغیرہ استعمال کئے جائیں وہ فارسی قواعد، محاورے، معنی اور
تلفظ وغیرہ کے اعتبار سے درست ہوں۔

سطح اسفل : وہ اردو جس میں فارسی الفاظ وغیرہ کا استعمال فارسی ضوابط اور
روز مرہ وغیرہ کا خیال کئے بغیر کیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ یہاں ایران سے مراد موجودہ ایران ہی نہیں بلکہ
بہت سارا وہ بھی علاقہ ہے جو آج وسط ایشیا کہلاتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ
فارسی سے مراد عربی بھی ہے، اس حد تک جس حد تک عربی الفاظ اور فقرے
فارسی میں شامل ہیں۔

میں یہ بات بھی شروع ہی میں عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ مندرجہ
بالا گوشوارے کی رو سے جو صورت حال بنتی ہے وہ آج بھی کم و بیش موجود ہے۔
اگرچہ عام اہل اردو اس سے انکار کریں گے۔

میرا سوال یہ ہے کہ جو صورت حال میں نے اوپر پیش کی وہ کب،
کس طرح، اور کیوں وجود میں آئی؟ اور اب تک باقی کیوں ہے؟ رہی یہ بات کہ

اردو والے اس کو نہ مانیں گے کہ ہماری صورت حال وہی ہے جو میں نے اوپر بیان کی، تو مندرجہ ذیل مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) کچھ دن پہلے میں نے الہ آباد میں، جہاں میں رہتا ہوں ایک لکچر دیا۔ کچھ ادبی موضوع تھا اور سننے والے سب پڑھے لکھے مختلف عمروں کے خواتین و حضرات تھے۔ لکچر بہت دلچسپی سے سنا گیا۔ لیکن اس کے بعد ایک صاحب جو عمر میں کم و بیش میرے برابر رہے ہوں گے اور شکل سے میری ہی طرح کچھ پرانے خیال کے لگ رہے تھے، میرے پاس تشریف لائے۔ انھوں نے ارشاد فرمایا:

"آپ نے لفظ "دیہات" کو "گاؤں" کے معنی میں واحد استعمال کیا ہے"۔ میں نے کہا "جی ہاں! کیوں نہیں، گاؤں اور دیہات ہم معنی ہی تو ہیں اور اردو میں دیہات واحد مستعمل ہے"۔ انھوں نے فرمایا "مگر لفظ "دیہہ" کے معنی ہیں "گاؤں" اور یہ لفظ خود واحد ہے۔ آپ نے اس کی جمع بنائی "دیہات" اور اسے واحد استعمال کیا۔ پھر یہ بھی کہ آپ نے اس لفظ میں عربی قاعدے سے "ات" لگا کر جمع بنادی جبکہ دیہہ فارسی لفظ ہے، اس میں عربی کی علامت جمع لگ ہی نہیں سکتی۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا جواب دوں۔ میں نے اپنی بات دہرائی کہ اردو کا محاورہ یہی ہے کہ یہاں دیہات بمعنی "گاؤں" واحد استعمال کیا جاتا ہے۔ اس پر وہ کچھ نہ بولے لیکن ایسا لگا کہ ان کی تشفی ہوئی نہیں۔

(۲) تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ "ہماری زبان" میں مہینوں اس بات پر بحث چلتی رہی کہ "استفادہ حاصل کرنا" صحیح ہے کہ نہیں۔ کہا یہ گیا کہ چونکہ عربی میں "استفادہ" کے معنی ہیں "فائدہ اٹھانا"، اس لئے اردو میں بھی "استفادہ حاصل کرنا" درست نہ ہوگا، "استفادہ کرنا" بولنا چاہئے۔ میں نے ہزار کہا کہ اردو پر عربی کا قاعدہ جاری کرنا درست نہیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ کئی فارسی اردو لغات سے "استفادہ حاصل کرنا" "استفادہ اٹھانا" وغیرہ استعمالات کے صحیح ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ میں نے مولانا حالی کی سند پیش کی کہ انھوں نے "استفادہ حاصل کرنا" لکھا ہے۔ میں نے سید سلیمان ندوی کا قول پیش کیا کہ اردو میں جو لفظ آجائے اسے اردو کے محاورے کے اعتبار سے صحیح یا غلط قرار دینا چاہئے، عربی کے اعتبار سے نہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود لوگ یہی کہتے رہے کہ چونکہ عربی میں لفظ "استفادہ" کے اندر "حاصل کرنا" کا مفہوم موجود ہے لہٰذا ہم "استفادہ حاصل کرنا" کو صحیح قرار نہ دیں گے۔ رہے لغات تو وہ غلط ہیں۔ جہاں تک سوال مولانا حالی کا ہے تو ممکن ہے انھوں نے بھولے سے لکھ دیا ہو یا سہو کتابت ہو، اور مولانا سید سلیمان ندوی نے تو لفظ 'استفادہ' پر تو کلام کیا نہیں ہے۔ ایک عام اصول بیان کیا ہے۔ جب تک مولانا سلیمان ندوی یہ صاف صاف نہ کہہ دیں کہ استفادہ حاصل کرنا صحیح ہے، ہم نہ مانیں گے ا۔

(۳) امیر خسرو کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے فارسی گو ہیں، اور تمام دنیا کی تمام فارسی گویوں میں بھی ممتاز ہیں۔ عرصہ ہوا میں نے لڑکپن میں غالب کا یہ قول پڑھا تو رنجیدہ ہوا کہ اہل ہند میں سوائے امیر خسرو کے کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ (ٹھیک نکل جانا بمعنی لغزش ہو جانا) مجھے افسوس یہ ہوا کہ غالب نے فیضی تک کو مسلم الثبوت نہ مانا، اگرچہ اکبر نے اسے کئی ایرانی شعرا پر ترجیح دیتے ہوئے اپنا ملک الشعرا مقرر کیا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ افسوس مجھے تب ہوا جب میں نے "شعر العجم" میں علامہ شبلی کا یہ بیان دیکھا کہ امیر خسرو نے ایسے بہت سے الفاظ اور محاورے استعمال کئے ہیں جو فارسی کے اہل زبان کے یہاں نہیں ملتے۔ شبلی نے مزید کہا کہ ایسے استعمالات کی بنا پر بدگمانوں کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ ہندوستان میں طویل قیام کے باعث خسرو کی فارسی میں ہندوستانی پن ہے۔ شبلی نے خسرو کے نام نہاد ہندوستانی محاوروں کی ایک فہرست تو بنادی لیکن امیر خسرو کی مدافعت میں کچھ نہ کہا، سوائے اس کے کہ میں نے اس پر غور نہیں کیا ہے ۲۔ مجھے بڑا رنج اس بات کا ہوا کہ شبلی تو خسرو کے زبردست مداح تھے اور مجھے خود شبلی اور خسرو سے بے انتہا عقیدت ہے۔ لیکن شبلی نے خسرو کی مدافعت تو درکنار، قوت استدلال کا بھی مظاہرہ نہ کیا کہ خسرو ایسے بڑے شاعر کو زبان میں تصرف کرنے کا حق کیوں نہ ہو تا۔ پھر یہ بھی دیکھنا تھا کہ کوئی لفظ یا محاورہ کسی ایک دو لغات یا چند ایک شعرا کے یہاں نہیں ملتا تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ اس لفظ یا محاورے کا وجود ہی نہیں ہے۔

(۴) انیسویں صدی کے اواخر میں پڑھے لکھے حلقوں میں یہ بحث چلی کہ فارسی لفظ "نم" جس کے معنی ہیں "بھیگا پن" کیا اسے محض "بھیگا" کے معنی میں بھی استعمال کر سکتے ہیں؟ علمائے زبان نے فتویٰ دیا کہ چونکہ فارسی میں 'نم' کے معنی "بھیگا ہوا" نہیں ہیں اس لئے "چشم نم" "دیدۂ نم" جیسی ترکیبیں جو اردو میں رائج ہیں، درست نہیں ہیں۔ جلال لکھنوی کے صاحبزادے حکیم مہدی کمال نے لکھا کہ "چشم نم" یا "دیدۂ نم" کو استعمال کرنا یا لفظ "نم" کو "بھیگا ہوا" کے معنی میں استعمال کرنا درست نہیں ہے کیونکہ "نم" کے معنی ہیں "بھیگا پن" نہ کہ "بھیگا ہوا" ۳۔

(۵) کچھ عرصہ بعد بعض لوگوں نے خان آرزو کے معرکہ آرا لغت "چراغ ہدایت" کا حوالہ دیا کہ خان آرزو نے اس لغت میں لکھا ہے کہ "نم" بمعنی "بھیگا ہوا" بھی درست ہے اور سند میں ایرانی استاد اور امیر محسن تاثیر کا شعر بھی درج کیا جس میں "نم" بمعنی "بھیگا ہوا" استعمال کیا گیا تھا۔ اب ہمارے علمائے زبان کی ضد دیکھئے کہ علامہ طباطبائی نے محسن تاثیر کا کلیات دیکھنے اور شعر کے متن کی تصدیق کرنے کے بجائے یہ فرمایا کہ محسن تاثیر کا شعر کاتب نے غلط نقل کیا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ فارسی ابھی ہندوستان میں مردہ نہیں ہوئی ہے، اس کے ہزاروں بولنے والے اب بھی موجود ہیں۔ میں نے کسی اہل زبان کے منہ سے 'نم' بمعنی 'نم ناک' نہیں سنا۔ اس میں کوئی شک نہیں

"چشم نم" بمعنی "چشم نم ناک" بالکل غلط ہے یا یہ ہندوستانیوں کا گڑھا ہوا فقرہ ہے۔[4]

(6) طباطبائی کا یہ بھی خیال تھا کہ اہل اردو نے عربی کے بہت سے الفاظ سے عربی کے طرز پر بنا لئے ہیں لیکن یہ سب الفاظ غلط ہیں کیونکہ وہ اصل عربی میں نہیں ہیں۔ مثلاً "تمازت" جو عربی ہے ہی نہیں، فارسی لفظ "تموز" سے عربی طرز پر بنا لیا گیا ہے۔ یا عربی "ذہن" سے "ذہانت"۔ یا عربی "شمول" سے "شمولیت"۔ یہ سب غلط ہیں اور ان کا استعمال نہ کرنا چاہیئے۔[5]

طباطبائی کے مندرجہ بالا بیان کے بارے میں یہ خیال نہ کیا جائے یہ ستر اسی سال پرانا ہے اور اب یہ حال نہ ہوگا۔ ابھی چند ہی ہفتے مجھے ایک شاعر نے لکھا کہ "خیریت" بروزن "فاعلن" غلط ہے کیونکہ عربی میں "خیریت" بروزن "مفعولن" ہے۔ اس سے کچھ دن پہلے ایک صاحب نے اعتراض کیا تھا کہ "حیثیت" بروزن فاعلن غلط ہے کیونکہ عربی میں "حیثیت" بروزن مفعولن ہے۔ اگر میں ان لوگوں کو یہ جواب دیتا کہ اردو میں یہی صحیح ہے اور بہر حال اردو کے الفاظ پر عربی کا قاعدہ جاری نہ کرنا چاہیئے تو میری بات کوئی نہ مانتا۔ لہذا میں نے مجبوراً "نور اللغات" کے حوالے سے کہا کہ "نور اللغات" میں "خیریت" اور "حیثیت" دونوں کو بروزن فاعلن صحیح قرار دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود ایک صاحب نے پھر یہی اعتراض کیا کہ "ماہیت" کو تو بروزن مفعولن ہونا چاہیئے کیونکہ اس کے بارے میں نور اللغات نے کوئی حکم نہیں لگایا۔

(7) لطف کی بات یہ ہے کہ ہمارے علمائے زبان کے نزدیک ایرانی فارسی گویوں کو عربی میں بھی تصرف کرنے کا حق تھا۔ لیکن اردو گویوں کو فارسی یا عربی میں تصرف کرنے کا حق نہیں تھا، حتیٰ کہ ہندوستانی فارسی گو کو بھی یہ حق نہ تھا کہ وہ عربی الفاظ میں تصرف کرے۔ امیر مینائی کے شاگرد زاہد سہارنپوری نے کہیں "قدس" کی 'دال' ساکن کے بجائے متحرک استعمال کیا۔ امیر مینائی نے اس کو غلط قرار دیا، تو زاہد سہارنپوری نے دلی کے ایک پرانے شاعر خواجہ نصیر کا ایک شعر سند کے طور پر لکھا جس مین "قدس" کی دال متحرک نظم ہوئی تھی۔ لیکن امیر مینائی نے جواب میں لکھا کہ خواجہ نصیر مرحوم کی سند کافی نہیں ہے ہاں اگر کسی ایرانی اہل زبان نے لکھا ہوتا تو ٹھیک تھا۔[6]

(8) انیسویں صدی کا وسط آتے آتے ہندوستانی فارسی گویوں کی وقعت اتنی کم ہو گئی کہ غالب کو یہ بات کچھ اچنبھے والی اور کچھ پریشان کن معلوم ہوتی تھی کہ کوئی ایرانی شاعر کوئی ایسا لفظ استعمال کرے جسے کسی ہندوستانی نے وضع کیا ہو۔ چنانچہ لفظ "بے پیر" کے بارے میں انھوں نے لکھا کہ یہ لفظ تورانی بچہ ہائے ہندی نژاد کا بنایا ہوا ہے۔ مرزا جلال اسیر خود مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ میں کیونکر کہہ سکتا ہوں کہ ان کا لکھا لفظ غلط ہوگا۔ مگر حیرت اور سخت حیرت ہے کہ ایرانی امیر زادہ ایسا لفظ لکھے۔[7]

(9) جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، نیاز فتح پوری اپنے رسالے نگار میں مالہ وماعلیہ کے نام سے ایک کالم لکھا کرتے تھے بعد میں کتابی شکل میں

چھپ گئے۔ اس کتاب سے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"ذمہ" عربی لفظ ہے جس کے معنی "عہد" "امان و ضمیر" کے ہیں۔ اردو میں یہ "جواب دہی" کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے جو اپنے اصلی مفہوم کے لحاظ سے درست نہیں۔ "روتیہ" بروزن "صبیہ" عربی لفظ ہے جس کے معنی "غور و فکر" کے ہیں۔ روش کے معنی میں اس کا استعمال فارسی والوں نے بھی نہیں کیا۔ اردو میں البتہ صرف عوام اس معنی میں بولتے ہیں۔[8]

میں یہ بات برسبیل تذکرہ واضح کر دوں کہ "ذمہ دار" بمعنی "جواب دہ" اور "رویہ" یعنی واؤ مفتوح اور ی مشدد "بمعنی" روش، ایک عرصے سے معیاری اردو ہیں اور پلیٹس (۱۸۸۴) اور نور اللغات (۱۹۲۴ تا ۱۹۳۴) جیسے مستند اور محتاط لغات میں درج ہیں۔

(10) اب چند بیانات مشہور ماہر لغات، ماہر اسلامیات اور شاعر حضرت شوق نیموی (۱۸۶۳ تا ۱۹۰۴) کے یہاں سے ملاحظہ ہوں:

"خود رفتہ" کا فقرہ اردو میں اٹھارویں صدی سے رائج ہے۔ لیکن شوق نیموی لکھتے ہیں کہ فارسی اساتذہ کے یہاں "خود رفتہ" نہیں ملتا صرف "از خود رفتہ" ملتا ہے یا شاید کسی نے استعمال کیا ہو۔ واللہ اعلم۔ راقم الحروف کو اردو میں "از خود رفتہ" لکھنا معیوب معلوم ہوتا ہے چونکہ اہل علم اساتذہ "خود رفتہ" نہیں لکھتے اس لئے راقم الحروف بھی نہیں لکھتا۔ لہذا ان دونوں الفاظ کو ترک کر کے "وارفتہ" لکھتا ہے۔[9]

آج بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو عربی لفظ "عادی" کو بمعنی "عادت رکھنے والے" نہیں استعمال کرتے کیونکہ عربی میں اس کے معنی ہیں "وہ چیز یا کام جس کی عادت پڑ جائے"۔ شوق نیموی کا فتویٰ تھا کہ اگر "عادی" اگر مع عطف و اضافت ہو تو "عادت رکھنے والے" کے معنی میں غلط ہے۔ ہاں اگر الگ استعمال ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یعنی اگر "عادی" کسی مرکب صورت میں آئے تو اسے عربی معنی ہی میں استعمال ہونا چاہیئے۔[10]

(11) ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ غالب کا قول تھا کہ اہل ہند میں امیر خسرو کے سوا کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ غالب کا خیال کچھ بھی ہو، لیکن حقیقت حال تو یہ ہے کہ تیرھویں صدی سے شروع کر کے انیسویں صدی تک فارسی زبان کے جو عظیم لغات مرتب کئے گئے، وہ سب ہندوستانیوں نے لکھے۔ ان میں کچھ وہ تھے جو ایرانی تھے لیکن ایک دو نسلوں سے ہندوستان میں رہ رہے تھے۔ اور کچھ ہندو تھے مثلاً ٹیک چند بہار (۱۶۸۷/۸ تا ۱۷۶۶/۷) اور وارستہ سیالکوٹی (وفات ۱۷۶۶) اور کچھ مثلاً خان آرزو یا محمد پادشاہ اتنے دنوں سے ہندوستان میں آباد تھے کہ ہر معنی میں ہندوستانی بن چکے تھے۔ غالب پر بھی دو نسلیں ہندوستان میں گزر چکی تھیں لیکن وہ ان تمام لغت نگاروں کو مسترد کرتے تھے جو ایرانی شاعر نہ تھے یا جنھوں نے اپنا لغت خود ایران میں بیٹھ کر مرتب نہیں کیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے تفتہ کو لکھا کہ لغت نویس تو رائے اور قیاس پر بھروسا کرتے ہیں۔ ہر لغت نویس وہی لکھتا ہے جو اس نے صحیح سمجھا۔ ظامی یا سعدی کی

لسی ہوئی کوئی فرہنگ ہو تو ہم اسے مانیں۔ ہندوستان کو ہم کس طرح مسلم الثبوت جانیں۔ ١١

جس زمانے میں کہ غالب نے تفتہ کو یہ خط لکھا تھا انھیں دنوں "نامۂ غالب" نام کا ایک رسالہ بھی انھوں نے لکھا جس میں انھوں نے حسب ذیل رائے ظاہر کی:

> ہند کے شاعروں میں سابقے اچھے خوش گو اور معنی یاب ہیں۔ لیکن یہ کون احمق کہے گا کہ یہ لوگ دعوائے زبان دانی کے باب ہیں۔ رہے فرہنگ لکھنے والے، خدا ان کے بیچ سے نکالے۔ اشعار قدما آگے دھر لئے اور اپنے قیاس کے مطابق چل دیئے۔ وہ بھی کوئی ہم قدم نہ کوئی ہم راہ بلکہ سو بہ سو پراگندہ طبع، رہنما ہو تو راہ بتائے، استاد ہو تو شعر کے معنی بتائے۔۔۔ فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھولتے جاؤ، لباس ہی لباس دیکھو گے۔ شخص معدوم۔ فرہنگوں کی ورق گردانی کرتے رہو۔ ورق ہی نظر آئیں گے۔ معنی موہوم۔ ١٢

(١٢) مرزا رحیم بیگ کے نام تحریر کردہ "نامۂ غالب"، اور تفتہ کے اپنے خط دونوں میں غالب نے اپنے بارے میں ایک ہی طرح کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یعنی انھیں زبان فارسی کا فہم پیدائشی ہے، یہ خدا کا ان کو خاص عطیہ ہے۔ زبان فارسی کی باریکیاں انھیں از خود معلوم ہو جاتی ہیں جس طرح فولاد میں جوہر پیوست ہوتا ہے۔ غالب کا کہنا تھا کہ اپنی ان صفات کی بنا پر وہ دوسرے ہندوستانی فارسی گویوں سے مختلف اور افضل ہیں۔ تقدیر کی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ ہندوستانی فارسی گویوں کے بارے میں غالب کا عدم اعتماد خود ان کو بھی اپنا شکار بنا گیا۔ اپنے بارے میں غالب کی رائے کتنی ہی اچھی کیوں نہ رہی ہو لیکن شبلی اور طباطبائی جیسے ایران پرستوں کی توقیر انھیں کبھی حاصل نہ ہو سکی۔ شبلی نے تو ایک بار یہاں تک لکھ دیا کہ وہ، لفظ "انداز" کے لئے غالب کی سند کو کافی نہیں سمجھتے کیونکہ غالب اہل زبان نہیں۔ ١٣

(٢)

ایرانی فارسی کو ہندوستانی فارسی کے اوپر رکھنا، ایرانی کے لئے یہ آزادی تسلیم کرنا کہ وہ عربی زبان پر تصرف کر سکتا ہے لیکن اردو بولنے والے کو فارسی اور عربی کے بارے میں اس تصرف کی اجازت نہ ماننا، اس بات پر اصرار کرنا کہ اردو میں فارسی عربی کے جو عناصر ہیں ان پر فارسی کے قاعدے جاری کرنا، یہ سب باتیں ہمارے ساتھ کچھ بہت عرصے سے نہیں ہیں۔ لیکن یہ باتیں اردو ماحول میں اتنی دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور تقریباً ہر جگہ ان کو بلا حیل و حجت کچھ اس طرح تسلیم کر لیا گیا ہے جیسے کہ یہ صورت حال اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود اردو زبان۔ وہ لوگ بھی جو سلسلہ مراتب کے موجودہ نقشے کی عائد کردہ جکڑبندیوں کو ناپسند کرتے ہیں، وہ بھی ان جکڑبندیوں کی پابندی کرتے ہیں، اس خوف

سے کہ کہیں انھیں جاہل نہ قرار دے دیا جائے۔ ہاں شعرا نے کبھی کبھی بعض مخصوص استعمالات یا پابندیوں پر سوالیہ نشان قائم کیا ہے لیکن نیم دلی کے ساتھ، اور بہت کم۔ سید سلیمان ندوی اور عبدالستار صدیقی جیسے ماہرین نے البتہ مضامین اور دیگر تحریروں میں سخت احتجاج کیا کہ یہ بات درست نہیں ہے کہ اردو زبان کو بطور زبان وہ اختیارات اور مراعات نہ دی جائیں جو کسی بھی زبان کو چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، حاصل ہیں۔ ١٤

سلیمان ندوی اور عبدالستار صدیقی کی تحریروں کا اثر صرف چند ہی پابندیوں پر پڑا۔ زیادہ تر تنگیاں اور پابندیاں ویسی ہی رہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایسی مثالوں اور معاملات کو ہاتھ ہی نہیں لگایا جو سب سے زیادہ نمایاں ہیں اور جن کا وقوع بے انتہا کثیر ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے یہاں بہت سے فارسی عربی الفاظ ہیں جن کا اصل تلفظ وتد مفروق کے وزن پر ہے مثلاً عربی کا لفظ "جمع" اور فارسی کا لفظ "شہر"۔ اردو میں یہ سب الفاظ وتد مجموع یعنی "نظر" کے وزن پر بولے جاتے ہیں۔ لیکن شاعری میں ہمیں اصرار ہے کہ انھیں اصل فارسی عربی کے تلفظ کے اعتبار سے باندھا جائے۔ اس پابندی کی کوئی وجہ ہے نہ ضرورت۔ لیکن یہ آج بھی ویسی ہی باقی ہے اور اکثر لوگوں کے خیال میں روز اول سے یوں ہی چلی آ رہی ہے۔ سید سلیمان ندوی یا عبدالستار صدیقی نے اس مسئلے پر کوئی کلام نہیں کیا ہے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ "جمع"، "شمع"، "شہر"، "شہد" وغیرہ الفاظ کو اصل عربی فارسی تلفظ کے ساتھ نظم کرنے کی پابندی روز اول سے نہیں ہے۔ پکی بات یہ ہے کہ اس پر ابھی دو سو برس بھی نہیں گزرے۔ لیکن یہ اور اس طرح کی دوسری پابندیوں کو قبول عام حاصل ہے اور ان کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ ہم فطری طور پر یہ سوچنے لگے ہیں کہ جو خلاقانہ تصرف ایرانی اہل زبان عربی پر کر سکتا ہے وہ ہم اردو والے فارسی اور عربی پر نہیں کر سکتے۔ ہم نے یقین کر لیا ہے کہ ہماری لسانی حیثیت ایرانی اور عرب کے مقابلے میں بالضرور کم تر اور فروتر ہے۔ ہمارا اعتقاد یہ بن گیا ہے کہ ادبی اور نفیس قرار دئے جانے کے لئے اردو کو ضروری ہے کہ وہ عربی، فارسی میں بالکل کوئی مداخلت نہ کرے اور ان زبانوں کو مقدس اور ناتغیر پذیر قرار دے۔

یہ بات یقین کرنے کی نہیں ہے کہ ایسی صورت حال جس میں خود پر اعتماد کی کمی اور خود پر نفرت پوری طرح نمایاں ہے، روز اول سے ہی ہمارے ساتھ رہی ہوگی۔ تاریخ کے کسی موقع پر ہمارے ساتھ ایسا ہوا ہوگا۔ لیکن یہ کب ہوا؟ کس نے اسے ہونے کا موقع فراہم کیا اور یہ کیوں ہوا؟ ہماری ادبی یا لسانی تاریخوں میں یہ سوالات کبھی نہیں اٹھائے گئے۔ کسی شخص نے کبھی بھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی زبان کے بارے میں اپنے رویے کی وضاحت کریں اور اس کا تجزیہ کریں، کیونکہ اس رویے کا اثر ہر جگہ نظر آتا ہے۔ اس کا اثر ہماری ادبی تہذیب پر ہے۔ ہمارے اپنے ادب کی شخصیت کے تصور پر ہے، ہمارے ادب کی فہرست استناد پر ہے اور ان خطوط اور

راہوں پر ہے جن پر ادبی یا نام نہاد نفیس اردو کو زبردستی چلنا اور ارتقا کرنا پڑا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کا اثر زبان کی نوعیت اور تاریخ کے بارے میں ہمارے نظریات پر بھی پڑا۔

زبان کے بارے میں اس نظریے کو اختیار کرنے کے پیچھے کہیں نہ کہیں کوئی ذہنی رکاوٹ رہی ہوگی۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ ہمارے تعلیمی اور ادبی اداروں (دونوں اکثر ایک ہی چیز ہوتے ہیں) کو یہ تسلیم کرنا شروع کرنے میں بھی بہت مشکل ہوئی کہ گجری (یعنی پرانی اردو جو چودھویں صدی عیسوی سے گجرات میں بہ کار آ رہی تھی) اور دکنی (یعنی پرانی اردو جو دکن میں پندرھویں صدی عیسوی سے مستعمل تھی) دونوں ایک ہی زبانیں ہیں اور یہ اردو سے الگ کوئی بولیاں نہیں ہیں بلکہ خود اردو ہی ہیں۔ چونکہ گجری اور دکنی کے سبھی شعرا و ادبا فارسی اور عربی الفاظ پر بے کھٹکے اور عام معمول کے طور پر تصرف کرتے تھے، اس لئے ہمارے علمائے ادب کو کسی صورت سے یہ کہنے کی گنجائش بالکل نہ تھی کہ گجری اور دکنی والے بھی عربی فارسی الفاظ و تراکیب کا احترام کرتے اور انھیں اردو سے برتر جانتے تھے۔ یعنی ان کا وہی شیوہ تھا جو شمالی ہند کے اردو مصنفوں نے اٹھارویں صدی کے اواخر میں اختیار کیا۔ اس کے مقابلے میں، یہ کہنا آسان تھا کہ گجری اور دکنی ہماری زبان کی معیاری اور معمولہ شکلیں نہیں ہیں، کیونکہ پھر یہ تسلیم کرنے کی ضرورت نہ پڑتی کہ اردو زبان کے اوائلی تین سو برس میں عربی فارسی کو وہ فوقیت نہ تھی جو اٹھارویں صدی کے آخر سے ہمارے مصنفوں نے رائج کی۔

ایسا ہی معاملہ ان افسانوں کے ساتھ ہے جو زبان اردو کی نوعیت اور اس کے آغاز کے بارے میں مشہور ہیں۔ سب سے مشہور افسانہ تو یہ ہے کہ اردو کا جنم مسلمانوں کے فوجی بازاروں اور قیام گاہوں میں ہوا۔ اس افسانے کے نتیجے میں دو اور افسانے (جو اسطور یعنی MYTH کی وقعت اور عظمت اختیار کر چکے ہیں) وجود میں آئے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور دوسرا یہ کہ چونکہ یہ فوجی قیام گاہوں، بازاروں اور کم مرتبہ لوگوں کے درمیان پیدا ہوئی اور پلی بڑھی، اس لئے اسے اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ اسے "صاف شستہ اور شریف" بنایا جائے اور اردو زبان کو صاف شستہ اور شریف بنانے کا عمل اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں دہلی کے استادوں نے شروع کیا۔

مندرجہ بالا افسانوں کی قوت کے پیش نظر یہ کچھ تعجب کی بات نہیں لگتی کہ لفظ "اردو" جو ہماری زبان کے نام کی حیثیت سے ۱۷۸۰ کی دہائی سے پہلے وجود ہی نہ رکھتا تھا، اس کی بنیاد پر حسب ذیل دلیل قائم کی گئی۔ یعنی یہ کہا گیا کہ چونکہ "اردو" کے معنی ہیں "لشکر" "لشکر گاہ"، یا "بازار لشکر" لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ اردو زبان کا جنم غیر ملکی مسلمان فوجیوں اور مقامی ہندو شہریوں اور بازاریوں کے میل جول کی وجہ سے ہوا۔ لوگوں نے ذرا سا رک کر یہ سوچنے کی بھی زحمت نہ کی جب ۱۷۸۰ کی دہائی کے پہلے لفظ "اردو" کو ہماری زبان کے نام

کے طور پر استعمال ہی نہیں کیا گیا اور ۱۷۸۰ کے آتے آتے ہندوستان میں کوئی غیر ملکی مسلمان فوجی نہ رہ گیا تھا اور اس وقت جو غیر ملکی فوجیں تھیں بھی وہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی تھیں، ایسی صورت میں یہ کہنا کہاں تک مناسب ہے کہ اس زبان کا نام اردو کا نام اس لئے پڑا کہ یہ مسلمان فوجیوں کے 'اردو' یا "لشکر گاہ" یا لشکر بازار" میں پیدا ہوئی تھی؟ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جس زمانے میں یہ نام ہماری زبان کے لئے استعمال ہونے لگا اس وقت کوئی مسلمان غیر ملکی فوجی یہاں نہ تھا۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اس زبان کا نام شروع میں "ہندی" یا "ہندوی" تھا اور مسعود سعد سلمان لاہوری ۱۵ (۱۰۴۶ تا ۱۱۲۱) کے بارے میں کہا گیا کہ اس نے ایک ہندوی دیوان مرتب کیا۔ خسرو نے بھی ہندوی' یا' دہلوی" زبان کا نام لیا ہے اور کہا ہے کہ میں نے اس میں چند جزو شعر کہہ کر دوستوں کی نذر کئے ہیں۔ ۱۶

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ فارسی کے پرانے لغات میں، جو ہندوستان میں مرتب ہوئے، کہیں بھی لفظ "اردو" ہماری زبان کے نام کے طور پر نہیں آیا ہے، ہاں لفظ "ہندی" یا "ہندوی" اکثر ان الفاظ کے لئے لایا گیا ہے جنھیں ہم آج اردو کے الفاظ قرار دیتے ہیں۔ خیر اب ذرا چند ایسے اردو انگریزی لغات دیکھ لئے جائیں جو انگریزوں نے مرتب کئے۔ یہاں لفظ 'اردو' کی تعریف میں طرح طرح کی دلچسپ باتیں لکھی گئی ہیں۔ سب سے پہلا اقتباس DUNCAN FORBES کی ڈکشنری مطبوعہ ۱۸۶۶ کا ہے۔ ۱۷

> *urdu* m an army, a camp; a market, *urdu i mu'alla,* the royal camp or army (generally means the city of *Dihli* or *Shahjahanabad;* and *urdu,i mu'alla ki zaban,* the court language) This term is very commonly applied to the Hindustani language as spoken by the Musalman population of India proper. 18

حسب ذیل اقتباس فیلن کے لغت مطبوعہ ۱۸۷۹ کا ہے:

> **ur'du,** **n.f.** ***Originally,*** **a camp.**
> 1. **An army; a bazaar attached to a camp...**
> 2. **The Hindustani language as spoken by the Mohamedans of India, or the Hindus who have learnt of them or have intercourse with them...**
>
> ***i-mual'la***
> 1. **The court language.**
> 2. **The Delhi idiom.** 19

سب سے آخر میں اردو انگریزی کے مقبول ترین اور بقول بعض

مستند ترین لغت پلیٹس مطبوعہ ۱۸۸۴ کا بیان دیکھئے۔

Urdu, s.m. Army; camp; market of a camp; s.f. (= *urdu zaban*), The Hindustani language as spoken by the Muhammadans of India, and by Hindus who have intercourse with them or who hold appointments in the Government courts &c....___*urdu-i-mu'alla*, The royal camp or army (generally means the city of Dehli or Shahjahanabad); the court language (= *urdu-i-mu'alla ki zaban*); the Hindustani language as spoken in Dehli. 20

ان تمام اقتباسات سے حسب ذیل باتیں صاف ظاہر ہیں :

(۱) اردو مسلمانوں کی زبان ہے یا حد سے حد ان ہندوؤں کی بھی جو مسلمانوں سے میل جول رکھتے ہیں۔

(۲) اردو مغل دربار کی زبان کا نام ہے۔

(۳) اردو شاہی لشکر گاہ کا نام ہے، جس سے عام طور پر دہلی یعنی شاہ جہاں آباد کا شہر مراد لیا جاتا ہے۔

(۴) اردو کے معنی ہیں فوج۔

ان میں سے تیسری بات تو صحیح ہے، پہلی بات بالکل جھوٹ ہے اور دوسری بات صرف اس حد تک صحیح ہے کہ مخصوص سیاق و سباق میں 'اردو' کے معنی "لشکر گاہ" یا "لشکر بازار" ضرور ہوتے ہیں۔ چوتھی بات بھی بالکل غلط ہے، کیوں کہ ہماری زبان میں "اردو" کے معنی "فوج" کبھی نہیں ہوئے۔

لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا اقتباسات میں حسب ذیل اہم اطلاعات نہیں ہیں :

(۱) اردو وہ زبان ہے جس کا مقبول ترین نام "ہندی" ہے پھر "ریختہ"۔

(۲) اردو مغل دربار کی زبان کبھی نہیں رہی لیکن یہ انیسویں صدی کے آخر تک بھی ہندوستان میں ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی تھی جیسا کہ آئندہ ظاہر ہوگا۔

یعنی سب سے بڑا ظلم ان لغت نگاروں نے یہ کیا کہ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان قرار دیا اور یہ نہ بتایا کہ جس زمانے میں یہ لغات لکھے جا رہے تھے اس زمانے میں بھی ہماری زبان کا مقبول ترین نام "ہندی" تھا۔ ظاہر ہے کہ انگریزی پالیسی یہی تھی کہ ہندی نام کی زبان کو ہندوؤں سے مختص قرار دیا جائے اور اسے ایک الگ زبان کہا جائے۔ اور مسلمانوں کے لئے ایک الگ زبان مخصوص قرار دی جائے جس کا نام پہلے "ہندوستانی" رکھا گیا اور بعد میں جب یہ نام نہ چلا تو انگریزوں نے اسے "اردو" کا نام دیا۔

اس بات کو ثابت کرنے کے لئے گلکرسٹ کی کتاب The Oriental Linquist کے شروع کے ہی صفحات پڑھ لینا کافی ہے۔ وہ صاف صاف

لکھتا ہے کہ اس زبان کے بولنے والے اسے "ہندی" کہتے ہیں لیکن "ہندی" سے شبہ ہوتا ہے کہ اس کا تعلق ہندوؤں سے ہے۔ حالانکہ یہ زبان مسلمانوں کی ہے اور اس کا نام "ہندوستانی" ہونا چاہئے۔ اس زبان کے بولنے والے اسے "ہندی" کہتے ہیں تو کیا ہوا۔ وہ سب لاعلم اور بیوقوف لوگ ہیں۔ ۲۱

خیال رہے کہ یہی گلکرسٹ اس بات کو قبول کر چکا ہے کہ اردو کے معنی ہیں دربار کی صاف اور شستہ زبان۔ ۲۲ لیکن چونکہ اتنا کہنے سے بات پوری طرح بنتی نہ تھی اور یہ دکھانا ضروری تھا کہ اردو زبان دراصل فوجیوں کی زبان ہے، لہذا میر امن کی زبانی "باغ و بہار" میں حسب ذیل فرضی باتیں کہلائی گئیں۔

> آخر امیر تیمور نے (جن کے گھرانے میں اب تک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے) ہندوستان کو لیا۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا۔۔۔ جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم، قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔ ۲۳

میر امن نے مندرجہ بالا قصے میں کئی جھول چھوڑ دیے ہیں تاکہ جاننے والے جان جائیں کہ یہ بیان بھی محض افسانہ ہے۔ واضح رہے کہ "باغ و بہار" کی تصنیف کا مقصود انگریزوں کو، نہ کہ ہندوستانیوں کو اردو پڑھانا تھا۔ لہذا میر امن اتنا صاف جھوٹ بولتے وقت اس خیال میں رہے ہوں گے کہ یہ باتیں اپنے وطن تک نہ پہنچیں گی۔ اب یہ ہندوستانیوں اور اہل اردو کی بدقسمتی ہے کہ 'باغ و بہار' ہندوستانیوں میں گھر گھر مقبول ہوئی اور آج بھی اکثر لوگوں کی نظر میں اردو نثر کا آغاز 'باغ و بہار' سے ہی ہوتا ہے۔ میر امن کے بیان میں بڑے بڑے جھول حسب ذیل ہیں :

(۱) انھوں نے یہ تاثر دیا ہے کہ تیمور سے لے کر تا حال (یعنی عہد شاہ عالم ثانی) ایک ہی خاندان اور ایک ہی راج ہندوستان پر رہا۔ ظاہر ہے کہ واقعہ اس کے بالکل خلاف ہے۔

(۲) میر امن نے یہ تاثر دیا ہے کہ تیمور کی آمد (۱۳۹۸) اور اکبر کی تخت نشینی (۱۵۵۶) میں کوئی خاص فاصلہ نہیں بلکہ ایک تسلسل ہے۔

(۳) اکبر چونکہ دلی میں کبھی رہا نہیں لہذا یہ سب باتیں فرضی ہیں کہ اس کے زمانے میں لوگ چاروانگ ملک سے آکر دلی میں جمع ہوئے اور وہاں بازار کی وہ زبان بنی، جسے زبان اردو کہا گیا۔

(۴) میر امن نے یہ بات بھی صاف اڑا دی ہے کہ اس زبان کا اصل نام 'ہندی' ہے اور اس میں خسرو بلکہ مسعود سعد سلمان تک نے شعر کہے ہیں جبکہ اکبر کیا تیمور تک کا وجود نہ تھا۔

(۵) میر امن نے اس بات کو صاف نہیں کیا ہے کہ ان کے آخری جملے میں "اردو" کی زبان سے مراد اس جگہ کی زبان ہے جس کا نام اردو ہے یعنی شہر دہلی نہ کہ لشکر گاہ اور لشکر بازار کی زبان۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو زبان کے آغاز کے لئے ایک قطعی
ضی افسانہ جو انگریزوں نے میر امن کی زبانی مشہور کیا، ہماری تاریخ کا حصہ
ن گیا۔ پھر یہ کہنے میں بھی آسانی ہوئی کہ یہ زبان چونکہ بازاری لوگوں اور
جیوں کی تھی اس لئے اسے تہذیب اور صفائی کی ضرورت تھی۔ پھر یہ افسانہ
ھا گیا کہ ۱۷۵۰ء سے شروع ہو کر لکھنؤ کے آخری زمانے تک زبان کی صفائی
اصلاح کا عمل جاری رہا۔ صفائی اور اصلاح سے مراد لی گئی اردو فارسی عربی
اصر کو دیسی عناصر پر مقدم ٹھہرانا اور دیسی الفاظ کو جہاں تک ممکن ہو سکے
میانہ زبان قرار دے کر ادبی زبان سے دور رکھنا۔

انگریزوں کو یہ بات منوانے میں بڑی دیر لگی کہ وہ زبان جسے ہم آج
د کہتے ہیں اور جس کا پرانا نام ہندی تھا اور جسے انگریزوں نے ہندوستانی بھی
کہا وہ دراصل سارے ملک کی زبان ہے اور صرف مسلمانوں کی نہیں۔ بعض
ت وہ دونوں باتیں بیک وقت کہتے نظر آتے ہیں چنانچہ YULE اور BUR-
NEL کے مشہور لغت HOBSON JOBSON (اول اشاعت ۱۸۸۶)
ں لکھا ہے کہ ہندوستانی وہ زبان ہے جو ہندوستان کے مسلمان فاتح بولتے ہیں
ن یہ سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہے اور آج بھی اسے LINGUA FRAN-
CA کی حیثیت حاصل ہے۔ ۲۴

اب ذرا ایک منٹ یہ دیکھ لیں کہ اردو کو زبان اردو کے نام کے طور پر
ب سے پہلے کہاں استعمال کیا گیا ہے۔ حافظ محمود شیرازی نے مصحفی کا حسب
ا شعر نقل کیا ہے۔

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منھ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے ۲۵

قیاس کیا جاتا ہے کہ اس شعر میں میر سے مراد میر تقی میر اور مرزا
مراد مرزا سودا ہیں۔ چونکہ سودا کا انتقال جون ۱۷۸۱ء میں ہوا اور اس شعر
خدا رکھے کا فقرہ استعمال کیا گیا ہے اس لئے قیاس یہ بھی چاہتا ہے کہ یہ شعر
ن ۱۷۸۱ء سے پہلے کہا گیا ہو جب سودا زندہ تھے۔ چونکہ مصحفی کی پیدائش
۱۷ ای ہے اور اگر انھوں نے پندرہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تو یہ
ر ۱۷۶۵ء کا ہونا چاہئے۔ لیکن مصحفی کی سودا اور میر سے ملاقات ۱۷۷۱/۱۷۷۲
پہلے نہیں ہوئی۔ لہذا اگر ہم یہ فرض کریں کہ یہ شعر میر اور سودا کے

بارے میں ہے اور یہ سودا کی زندگی میں کہا گیا تو اس کا زمانہ تصنیف ۱۷۷۲ تا ۱۷۸۱ ٹھہرتا ہے۔

لیکن یہاں ایک دو الجھنیں اور بھی ہے مثلاً خدا رکھے کا فقرہ، میر اور سودا کے لئے نہیں بلکہ زبان کے لئے ہو سکتا ہے یعنی خدا زبان کو رکھے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ یہ شعر مجھے مصحفی کے آٹھوں دواوین اور ان کے غیر مطبوعہ قصائد مرتبہ نور الحسن نقوی میں نہیں ملا۔ حافظ محمود شیرازی انتہائی محتاط محقق تھے اس لئے ممکن ہے انھوں نے یہ شعر مصحفی کے کسی معتبر غیر مطبوعہ نسخے میں دیکھا ہو لیکن فی الحال تو یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ پوری صحت کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ شعر مصحفی کا ہی ہے اور سودا کی زندگی میں ہی کہا گیا تھا۔

لفظ اردو کا سب سے پہلا ذکر زبان کے معنی میں مصحفی کے یہاں صدق طور پر دیوان چہارم میں ملتا ہے جو ۱۷۹۶ء کے آس پاس مرتب ہوا۔ مصحفی مسدس حسب حال خود "ابنائے زمانہ" میں لکھتے ہیں۔

ہر جائے گوش چشم بناناک کان کو
اپنی زباں سمجھے ہیں اردو زبان کو ۲۶

یہاں مصحفی ان لکھنؤ والوں کی برائی کر رہے ہیں جو اردو میں بے وجہ فارسی الفاظ ٹھونستے ہیں یعنی ناک کان کی جگہ گوش چشم استعمال کرتے ہیں۔

خان آرزو نے اپنا عبد الواسع ہانسوی کی فرہنگ "غرائب اللغات" (مرتبہ تقریباً ۱۶۹۰ء) پر حواشی لکھے اور جو بجائے خود "نوادر الالفاظ" نامی کتاب بن گئے (تاریخ تصنیف ۱۷۴۳ء)۔ اس میں انھوں نے جگہ جگہ لفظ اردو کو شہر دہلی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ ہم آئندہ دیکھیں گے، انشا نے دریائے لطافت (تاریخ تصنیف ۱۸۰۷ء) میں بھی لفظ اردو کو شہر دہلی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

(۳)

اوپر کی بحث سے بات واضح ہو جانی چاہئے کہ زبان کے نام کے طور پر اردو اور زبان اردو کے آغاز کے بارے میں لشکری زبان کا نظریہ دونوں انگریزوں کی ایجاد ہیں۔ ان کے نتیجے میں اہل اردو کو اپنی زبان کے بارے میں یہ فرض کرنے میں کچھ مشکل نہ ہوئی کہ ہماری زبان ایک عامیانہ زبان ہے اور اس کا وہ مرتبہ نہیں جو فارسی عربی کا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اردو والوں کی نگاہوں میں زبان اردو کی قدر و قیمت میں کمی اس وجہ سے آئی کہ انگریزوں نے اردو کو ہٹا کر انگریزی رائج کر دی اور اعلیٰ طبقے کی زبان بننے کا شرف اردو کے ہاتھ سے نکل گیا۔ صحیح معنی میں تو اردو صاحب اقتدار طبقے کی زبان کبھی نہیں تھی۔ لیکن اگر اردو کی قدر میں کمی اس وجہ سے آئی کہ پہلے اقتدار کی زبان نہ رہ گئی تو پھر فارسی کے بارے میں کیا کہا جائے؟ اٹھارویں صدی میں فارسی ہر جگہ رائج تھی۔ اٹھارویں صدی کے

نصف دوم میں تمام بڑی ہندوستانی حکومتوں کی زبان فارسی تھی حتیٰ کہ مادھوراؤ سندھیا (وفات ۱۷۹۴) جو شاہ عالم اور اپنے پیشوا کے نام پر ہندوستان کے بہت بڑے حصے پر حکمراں تھا، خود فارسی بخوبی جانتا تھا اور اس کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ ۲۷

علیٰ ہذا القیاس جنوب میں ٹیپو سلطان اور نظام الملک اور شمال میں اودھ اور بنگال کے حکمراں سب فارسی میں کام کرتے تھے تو پھر کیا وجہ ہوئی کہ ہندوستانیوں نے اپنی فارسی کو نامعتبر اور حقیر کہنا شروع کر دیا؟

یہ بات خیال میں رکھنے کی ہے کہ اٹھارویں صدی کا وسط آتے آتے ہندوستانیوں کو اپنی فارسی پر اس درجہ اعتماد اور اطمینان حاصل ہو چکا تھا کہ وہ خود کو اہل زبان فارسی والوں سے کم نہ سمجھتے تھے بلکہ برتر سمجھتے تھے، جیسا کہ مندرجہ ذیل چند مثالوں سے ثابت ہوگا۔

شیخ علی حزیں (۱۶۹۲ تا ۱۷۶۶) ایرانی شاعر اور امیر زادہ اپنے ملک میں حالات نامساعد پا کر ۱۷۳۴ کے آس پاس ہندوستان پہنچا۔ یہاں اسے سب لوگوں نے، بالخصوص مغل شہنشاہ محمد شاہ اور اس کے وزیر عمدۃ الملک امیر خان انجام نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لیکن شیخ کے مزاج میں کچھ ٹیڑھ تھی اور اسے ہندوستان کبھی پسند نہ آیا۔ وہ جگہ جگہ ہندوستانی شاعروں اور خاص کر ہندوستانی فارسی گویوں پر اعتراض کرتا تھا اور اس نے اپنی خود نوشت میں بھی ہندوستان کو کچھ اچھے الفاظ میں یاد نہیں کیا ہے۔ آج کا زمانہ ہوتا تو سب ہندوستانی فارسی گو حضرات شیخ علی حزیں کے فرمودات کو آنکھوں سے لگاتے۔ لیکن وہ زمانہ وسط اٹھارویں صدی کا تھا جب ہندوستانیوں کو اپنے بارے میں کوئی احساس کمتری نہ تھا۔ لہٰذا ۱۷۵۰/۵۱ میں خان آرزو نے خود شیخ علی حزیں کی شاعری پر سخت اعتراضات کرتے ہوئے اپنا رسالہ "تنبیہ الغافلین" لکھا۔ اس کے چند سال بعد آزاد بلگرامی (۱۷۰۴/۵ تا ۱۷۸۶) نے اپنے تذکرے "خزانۂ عامرہ" میں خان آرزو کے بعض اعتراضات کو تسلیم کیا، بعض کو نہیں مانا۔ لیکن آزاد بلگرامی نے خود بھی عرفی جیسے ایرانی شعرا پر نہایت زبردست اعتراضات کیے۔ ۲۸ لیکن علی حزیں کے دفاع میں جواب دینے والا بھی ایک ہندوستانی ہی تھا، یعنی سیالکوٹی مل وارستہ جنھوں نے "رجم الشیاطین" ۲۹ کے نام سے خان آرزو کا رد لکھا۔ میر افضل ثابت الہ آبادی اس زمانے کے بڑے فارسی گویوں میں تھے۔ ان کے ایک شعر پر علی حزیں پر اعتراض کیا تھا کہ اس کا مضمون فلاں ایرانی شاعر سے مستعار ہے۔ اس پر میر افضل ثابت کے بیٹے ثبات نے ایک پورا رسالہ "ثبات" کے نام کا لکھ ڈالا جس میں شیخ علی حزیں کے سینکڑوں شعروں کے بارے میں کہا گیا تھا کہ یہ پرانے شعرا سے مستعار ہیں۔

منیر لاہوری (وفات ۱۶۴۴) کے بارے میں خان آرزو نے لکھا ہے کہ فیضی کے بعد ان سے بڑا کوئی شاعر مغل درباروں میں نہ ہوا۔ منیر نے سولہویں صدی کے چار بڑے ایرانی شاعروں یعنی عرفی، طالب، زلالی اور ظہوری پر تنقید لکھی۔ خان آرزو نے اس کا جواب "سراج منیر" کے نام سے لکھا۔ یعنی بنیادی بات یہ ہے کہ ایرانی شاعروں پر اعتراض کرنے والے بھی ہندوستانی ہیں اور ان کا دفاع کرنے والے بھی ہندوستانی ہیں۔ ہندوستانیوں کو اپنے اوپر اطمینان کلی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ ایرانیوں کی ہر بات کو حدیث و قرآن سمجھ لیں (جیسا کہ بعد میں غالب نے کیا)۔ ۳۰

ان سب سے دلچسپ واقعہ وہ ہے جو سودا اور فاخر مکین کے درمیان گزرا۔ یہ زمانہ ہے ۱۷۷۴ سے ۱۷۸۱ تک اور جگہ ہے لکھنؤ۔ ۳۱ سودا نے خود یہ تمام واقعہ اپنے کلیات میں "عبرت الغافلین" کے نام سے درج کیا ہے۔ سودا لکھتے ہیں:

> اشرف علی خان، جو ایک شریف خاندان کے بزرگ ہیں اور میرے پرانے ملاقاتی، انھوں نے پندرہ سال محنت کی اور بہت سی نئی پرانی بیاضیں دیکھیں اور پھر اپنی ایک بیاض مرتب کی جس میں کوئی ایک لاکھ شعر ہوں گے۔ یہ بیاض وہ فاخر مکین کے پاس لے گئے، خدائے وہاب انھیں سلامت رکھے۔ اشرف علی خان نے مرزا مکین سے بہت التجا کی کہ وہ اس بیاض کے اغلاط درست کر دیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا، مجھے اس طرح کے کام کے لئے نہ وقت ہے نہ دماغ، لیکن میں آپ کی خاطر یہ کام کر دوں گا لیکن شرط یہ ہوگی کہ میں تمام ہندوستانی شعرا مثلاً فیضی، غنی، نسبتی، ناصر علی، بیدل، سراج الدین علی خان آرزو، اور میر شمس الدین فقیر وغیرہ کے کلام پر قلم پھیر دوں گا اور ایران کے شعرا کے کلام پر اصلاح دوں گا اور ان کا انتخاب کروں گا۔ اس گفتگوئے لغو کو سن کر خان موصوف اپنی بیاض واپس لے آئے اور مرزا فاخر مکین کی شرطوں کو نامنظور کر دیا۔۔۔۔

لیکن حالات کچھ ایسے ہوئے کہ غریب اشرف علی خان کو اپنی بیاض مرزا فاخر مکین کی ہی خدمت میں پیش کرنی پڑی۔ مرزا فاخر مکین نے خسرو، سعدی، رومی اور جامی جیسے لوگوں کے بہت سے اشعار یہ کہہ کر کاٹ دئے کہ یہ کمزور ہیں یا مہمل ہیں۔ رہا سوال ہندوستانیوں کا مثلاً واقف، قبول، ناصر علی، آیت اللہ ثنا اور بعض ایرانیوں کا، مثلاً مولانا روم اور شیخ علی حزیں وغیرہ، تو ان کے کلام پر مرزا مکین نے بے تکلف اصلاحیں دیں۔

ظاہر ہے کہ اشرف علی خان کو مرزا فاخر مکین کی اس حرکت پر انتہائی رنج ہوا اور غصہ بھی آیا۔ وہ ان مجروح صفحات کو لے کر سودا کے پاس گئے کہ مکین کے اعتراضوں پر انصاف کی نظر ڈالئے اور ان کا جواب لکھئے۔ سودا نے پہلے تو انکار کیا اور کہا کہ مجھے اتنی فارسی آتی ہی نہیں کہ میں یہ کام کر سکوں اور انھوں نے کئی اور معتبر نام تجویز کئے کہ وہ اس کام کے اہل ہیں۔ لیکن اشرف علی خان نہ مانے۔ "مختصر اً یہ کہ میری درخواست اور انکار کے باوجود خان موصوف

نے اس عاجز کے سامنے وہ اوراق رکھ دیے جو مرزا مکین کے قلم سے مجروح تھے اور رنجیدہ اور ناخوش اپنے گھر چلے گئے"۔ اب سودا کو کوئی چارہ نہ تھا۔ انھوں نے مرزا فاخر مکین کے اعتراض کو دیکھا اور ان کا مناسب رد لکھ کر اس رسالہ کا نام "عبرت الغافلین" رکھا اور اس میں مرزا فاخر مکین کے بعض اشعار پر بھی اعتراض کیے۔ ۳۲

ایسی بہت سی مثالیں مل جائیں گی لیکن یہ چند مثالیں کافی ہوں گی۔ بس اتنا اور دیکھ لیجیے کہ وہی سیالکوٹی مل واستہ جنھوں نے شیخ علی حزیں کے دقائع میں خان آرزو کا رد لکھا، خود اپنے لغت "مصطلحات شعرا" میں کئی ہندوستانیوں کا کلام بطور سند لاتے ہیں۔ ۳۳ اور فاخر مکین جو ایک ہندوستانی اور فارسی کے معمولی شاعر ہیں، یہ غرہ رکھتے ہیں کہ کیا سعدی اور کیا رومی میں سب کے کلام کو لائق اصلاح قرار دیتا ہوں۔ اور مرزا مکین کا رد لکھنے والا بھی ایک ہندوستانی ہے یعنی مرزا سودا۔ اور یہ رد اتنا مسکت ہے کہ مرزا فاخر مکین کا قلم تو چپ ہو جاتا ہے لیکن وہ اپنے لفنگے شاگردوں کو سودا کی زد و کوب کے لئے لگا دیتے ہیں۔ ۳۴

آپ خود سوچیں کہ فارسی زبان اور ادب میں ہندوستانیوں کو اپنی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد تھا کہ نہیں؟ مندرجہ بالا مثالوں سے کیا یہ پوری طرح ثابت نہیں ہوتا کہ ہم اہل ہند کو اپنے بارے میں شک کرنے کی کوئی وجہ تھی نہیں لیکن پھر بھی اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ہم نے خود پر شک کرنے اور خود کو ایرانیوں کے مقابلے میں حقیر سمجھنے کی جس رسم کی بنا ڈال دی وہ اب تک ہماری جان کے ساتھ ہے۔

جہاں تک سوال اردو کا ہے تو اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے شمالی ہند کی اردو سارے ہندوستان میں پھیل چکی تھی اور بڑی حد تک یہی اردو ہر جگہ معیاری کہلائی۔ اورنگ آباد جو پہلے ہی سے دہلوی لہجے میں اردو بولنے والوں کا جنوبی مرکز تھا اب اور پھلا پھولا۔ آزاد بلگرامی کے علاوہ سراج اورنگ آبادی (۱۷۱۴ تا ۱۷۶۵) لچھمی نرائن شفیق (۱۷۴۵ تا ۱۸۰۸) اور خود ولی کے نام اورنگ آباد کی ادبی حیثیت پر دال ہیں۔ نوابان کرناٹک کی وجہ سے مدراس اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں دہلوی اردو اور اردو کی ادبی حیثیت کا استحکام ہوا۔ ملا عبد العلی بحر العلوم (۱۷۲۹ تا ۱۸۱۰) اور مولانا باقر آگاہ (۱۷۴۵ تا ۱۸۰۶) کے نام مدراس اور اطراف مدراس کی ادبی حیثیت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ حیدر آباد اور میسور میں تو اردو کا چلن پہلے سے تھا ہی۔ یہی عالم گجرات کا تھا جہاں سے ۱۷۵۰ کے آس پاس عبد الولی عزلت جیسا غیر معمولی شاعر نمایاں ہو کر دلی اور پھر دکن پہنچا۔ ادھر مہاراشٹر میں شاہ تراب خطائی ۱۷۴۵ کے آس پاس مراٹھی صوفیانہ شاعری کو اردو میں منتقل کر رہے تھے۔ دلی کے اطراف میں آگرہ اور فرخ آباد اردو مرکز کی حیثیت سے نمایاں تھے۔ یہ سلسلہ لکھنؤ، الہ آباد، بنارس، پٹنہ، مرشد آباد سے ہوتا ہوا کلکتہ پہنچ چکا تھا۔ ۱۸۰۷ میں مرشد آباد اور عظیم آباد کی اہمیت اردو ادب کے مراکز کی حیثیت

سے اسقدر نمایاں ہو چکی تھی کہ انشا کو "دریائے لطافت" میں مرشد آبادی اور عظیم آبادی اردو بولنے والوں پر طنز کرنا پڑا کہ وہ لوگ اپنے کو ہولی والا اہل زبان اور اپنے شہر کو اردو (دلی) سمجھیں تو سمجھیں لیکن ہیں وہ مقامی اور دیسی لوگ ۔۳۵

انشا نے مرشد آبادیوں اور عظیم آبادیوں کا مذاق اڑایا تو سہی اور لکھنؤ والوں کے بارے میں لکھا کہ وہ معمولی معمولی الفاظ کا تلفظ صحیح نہیں کرتے۔ ۳۶ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخر تک کم ہی ایسا تھا کہ لوگ فارسی، عربی الفاظ کے ساتھ خلاقانہ آزادیاں نہ برتتے ہوں۔ میر کی مثال سامنے کی ہے۔ ان کے کسی معاصر نے یہ الزام نہیں لگایا کہ ان کی زبان عامیانہ یا عالموں کی زبان سے مختلف ہے۔ بلکہ تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے ان کی زبان کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ میر بہت "مانوس" زبان استعمال کرتے ہیں۔ "آب حیات" میں آتش کا واقعہ لکھا ہے کہ جب انھوں نے لفظ "بیگم" کو اردو تلفظ کے مطابق زبر کے ساتھ باندھا تو ان سے کہا گیا کہ حضور ترکی میں تو کاف پر پیش ہے اور فارسی زبان کے قاعدے بھی اسی تلفظ کا تقاضا کرتے ہیں۔ تو آتش نے ہنس کر جواب دیا کہ جب ہم ترکی جائیں گے تو ترکی بولیں گے۔ ابھی تو ہم اردو بول رہے ہیں۔ ۳۷ اس کے برخلاف امیر مینائی کو دیکھیے کہ آتش کے بمشکل ایک صدی بعد عربی کے تلفظ مین دلی کے محاورے کے مطابق ایک معمولی تصرف نہیں برداشت کر سکتے اور ایرانی استادوں کی سند مانتے ہیں۔

(۴)

یہ تبدیلی کیسی آئی؟ کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ فارسی زبان و ادب کے بارے میں ہندوستانی خود اعتمادی اٹھارویں صدی کے وسط میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور پھر اس کے بعد خود بخود اس کا زوال ہونے لگا؟ لیکن ادب اور ثقافت کی دنیا میں معاملات اس طرح ہوتے نہیں۔ فیشن بدل جاتے ہیں، کوئی مصنف یا کوئی طرز مقبول سے غیر مقبول ہو جاتا ہے یا کوئی بھلایا ہوا طور دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اپنی زبان و ادب کے بارے میں رویہ اتنا بدل جائے کہ لوگ اپنے اچھے کو خود ہی برا کہنے لگیں، یہ کسی بہت بڑی نفسیاتی یا تاریخی وجہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

انگریزوں کی دیکھا دیکھی ہمارے مورخوں کا یہ رواج رہا ہے کہ وہ اٹھارویں صدی کو ہندوستان میں زوال، نقصان اور انتشار کی صدی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مغل حکومت ۱۷۴۸ کے بعد روز بروز کمزور ہوتی چلی گئی۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔ لیکن جس طرح کی تباہی اور بربادی کی گرم بازاری کا حال ہمارے مورخین بیان کرتے ہیں اس کے نشانات اتنے واضح نہیں ہیں۔ اور اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ تہذیبی ثقافتی اور علمی سطح پر اٹھارویں صدی کو ہندوستان کی تاریخ کو غیر معمولی طور پر روشن قرار دینا چاہیے۔ جتنا علمی اور فکری سرمایہ خاص کر عربی، فارسی اور اردو میں اس صدی میں ہمارے ملک میں

لق کیا گیا وہ کسی بھی پچھلی صدی کے کارنامے سے کم نہیں ہے۔ بعض حالات میں وہ برتر ہی ہو سکتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ کیا اٹھارویں صدی کی تہذیب خود اپنے کو زوال آمادہ اور مائل انتشار سمجھتی تھی؟ کیا اس مانے کے لوگوں کو خیال تھا کہ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب ہندوستان کی تہذیب کم و بیش مٹ جائے گی اور ملک پر فرنگی کا دور دورہ ہو گا؟ ظاہر ہے کہ ہیں۔ کم سے کم اٹھارویں صدی کے آخر تک تو ایسا کوئی احساس ہمیں پھیلتا ملک نم لیتا نظر نہیں آتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہندوستانیوں کو اچانک اپنی فارسی اور پنی اردو کے بارے میں طرح طرح کے شکوک اور شبہات قائم کرنے کی عادت پڑ گئی؟

یہ صحیح ہے کہ شیخ علی حزیں نے اٹھارویں صدی کے وسط میں شک کا یک چھوٹا سا بیج بویا تھا اور ۱۷۷۰ کی دہائی میں فاخر مکین کا یہ کہنا کہ وہ ہندوستانی فارسی گویوں کو کچھ نہیں سمجھتے غالباً اس بات کا ثبوت ہے کہ شیخ علی حزیں کا بویا ہوا بیج برگ و بار لا رہا تھا۔ لیکن یہ نہ بھولئے کہ یہی فاخر مکین ایرانی اساتذہ کو بھی اطاس نہیں ڈالتے اور انھیں نہ صرف اصلاح دینے کا دعویٰ رکھتے ہیں بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سعدی، رومی، جامی وغیرہ کے بہت سے اشعار مہمل ہیں۔ لہذا فاخر مکین اور سودا والے واقعے سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہو گا کہ شیخ علی حزیں نے ہندوستانیوں کے تئیں حقارت کا جو رویہ اختیار کیا تھا اس نے ہندوستانیوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مکین اور سودا کا یہ واقعہ گم نام رہ جاتا اگر سودا نے اپنا رسالہ "عبرت الغافلین" اپنے کلیات میں درج نہ کر دیا ہوتا۔ اور پھر سودا کے ٹھیک سو برس بعد محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں اسے اپنے لاجواب اور لازوال اسلوب میں پیش نہ کیا ہوتا۔

لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخر ہوتے ہوتے اردو والوں کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑنے لگتا ہے کہ مثلاً دیسی اور فارسی عربی الفاظ کو مرکب نہ کرنا چاہئے۔ یا فارسی عربی الفاظ کو اسی تلفظ کے ساتھ باندھنا چاہئے جو اصل زبان میں رائج ہیں۔ اس سلسلہ میں تھوڑا سا کام شاہ حاتم نے بھی کیا، جب انھوں نے دیوان زادہ (۱۷۵۵/۶) کے دیباچے میں یہ کہا کہ میں دہلی کے مرزاؤں اور رندوں کی زبان لکھنا پسند کرتا ہوں اور فارسی عربی کے الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ باندھنا ضروری قرار دیتا ہوں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ ہر کہ دمہ کی زبان، خاص کر دہلی کے اطراف کی بھاکا کے الفاظ کو شاعری میں نہ لانا چاہئے۔ لیکن انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ فارسی عربی کے وہی الفاظ لائے جائیں جو عام فہم ہوں اور مروج محاورے کو بہر حال باقی تمام چیزوں پر فوقیت ہے۔ ۳۸

یہ صاف ظاہر ہے کہ شاہ حاتم ایک طرف تو مروج محاورے پر زور دے رہے ہیں اور دوسری طرف عربی فارسی کی "حرمت" کو بھی برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اس میں ایک تضاد ہے جس پر میں نے کہیں اور مفصل بحث کی ہے۔ فی الحال یہی کہنا کافی ہے کہ شاہ حاتم کے خیالات میں جو اچھی باتیں تھیں

ان پر ہمارے مورخوں نے کم دھیان دیا اور ان کے منفی اشاروں کو بڑھا چڑھا کر اور "اصلاح زبان" کی تحریک کا نام دے کر پیش کیا گیا۔ بہر حال ایک فضا تو بن ہی رہی تھی جس میں اردو کو عربی فارسی استعمالات کا محکوم ٹھہرانا ضروری سمجھا جانے لگا تھا۔ انشا نے "دریائے لطافت" میں بہت سی بنیادی اصولی باتیں کہیں جو ترقی یافتہ زبانوں کے مزاج کے مطابق ہیں۔ لیکن انھوں نے بھی یہ بخ لگا دی کہ دیسی الفاظ کو فارسی عربی کے ساتھ مرکب نہ کرنا چاہئے۔

انشا نے بہت زور دے کر اور صاف الفاظ میں لکھا:

> یہ بات پوری طرح سب لوگوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ جو لفظ اردو میں رائج ہو گیا وہ اردو ہے۔ چاہے اس کی اصل عربی ہو یا فارسی یا ترکی یا سریانی یا پنجابی یا پوربی اور وہ اردو کا لفظ ہے، چاہے اسے اصل زبان کے طریقے اور ضوابط کے لحاظ سے استعمال کیا گیا ہو یا نہیں وہ صحیح ہے۔ ایسے لفظ کی صحت یا عدم صحت کا فیصلہ اس بات سے کیا جائے گا کہ وہ اردو میں کس طرح مروج ہے۔ جو کچھ اردو محاورے کے خلاف ہے، وہ غلط ہے۔ اور جو کچھ اردو محاورے کے مطابق ہے، وہ صحیح ہے۔ چاہے وہ اصل زبان کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ اگرچہ یہ بات ہم اس کتاب میں پہلے بھی کہہ چکے ہیں لیکن یہاں مزید وضاحت سے بیان کر رہے ہیں۔

مندرجہ بالا عبارت "دریائے لطافت" کے تقریباً بالکل آخر میں ہے گویا انشا یہ چاہتے ہوں کہ ان کا یہ نکتہ پڑھنے والوں کے ذہن میں جم جائے۔ اس کے بعد انھوں نے اس کی بہت سے مثالیں بھی دیں۔ لیکن افسوس کہ انھوں نے دیسی اور فارسی الفاظ میں اضافت لگانے کو غلط قرار دیا۔ ۳۹

ایک دلچسپ یہ ہے کہ تقریباً اسی زمانے میں مولانا باقر آگاہ نے بھی دیسی اور فارسی عربی الفاظ کے مابین اضافت لگانے کو غلط قرار دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی لہر تھی جو شمال تا جنوب دوڑی ہوئی تھی۔ ۴۰

سعدی نے لکھا ہے کہ دنیا میں ظلم کی بنیاد پہلے تو ذرا سی تھی، اس کے بعد جو بھی آیا اس میں تھوڑا سا اضافہ ہی کر گیا۔ ۴۱ انشا اور باقر آگاہ نے جو پابندی دیسی اور عربی فارسی الفاظ پر اضافت کے خلاف لگائی تھی وہ چھوٹا سا ظلم نہ تھی اور خود ان کے بنائے ہوئے ضابطوں کی روشنی میں داخلی تضاد کا شکار تھی۔ لیکن انشا اور شاہ حاتم کے روشن فکر اور عملی طور پر کار آمد ضابطوں کو کسی نے بھی پوچھا نہیں اور ان کے مناسب اور غیر منطقی پر مبنی مشوروں کو ہم لوگوں نے آنکھوں سے لگایا اور سر پر رکھا۔

شروع شروع میں یہ پابندیاں اور جھگڑے چھوٹے پیمانے پر تھے۔ عربی فارسی الفاظ کو اردو میں کیسے برتا جائے، اس پر پہلا جھگڑا جہاں تک میرا خیال ہے انشا سے ہی شروع ہوا۔ معرکۂ مصحفی و انشا میں جن الفاظ اور استعمالات کو زیر بحث لایا گیا ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

سقنقور: اس لفظ کو اکیلے نہیں استعمال کرنا چاہئے بلکہ "ماہی سقنقور"

لنا چاہئے۔ یہ بھی کہا گیا کہ ماہی مسطور میں ماہی کی ی پر تشدید نہ لگانی چاہئے یعنی ماہی بروزن مفعولن یا مفعول کے بجائے بروزن فاعلن یا بروزن فعل ہونا چاہئے۔

سکوت: بمعنی وہ جو ساکت ہے، عربی میں نہیں ہے لہذا غلط ہے۔

حلقہ: عربی میں دائرہ یا گول چیز کے معنی میں ہے، اسے انگوٹھی کے معنی میں نہ ستعمال کرنا چاہئے۔

بلور: ل پر تشدید نہیں ہے ی کو مخفف ہونا چاہئے۔ ۴۲

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ جھگڑا بعد میں بہت بڑھا اور ۱۷۹۷ میں آصف الدولہ کی مداخلت سے ختم ہوا۔ آصف الدولہ اس کے چند برسوں بعد مر بھی گئے لیکن مصحفی اور انشا بھی شاید تھک چکے تھے، اس لئے چپ ہو گئے ۴۳

مصحفی کا ایک اور واقعہ "خوش معرکہ ءِ زیبا" میں یوں درج ہے کہ انھوں نے مفتی غلام حضرت نامی کسی شخص کی تاریخ وفات کہی جس میں لفظ مفتی کی یائے تحتانی دبتی تھی۔ کسی نے ان سے کہا کہ حضرت عربی فارسی الفاظ کا حرف علت دبانا درست نہیں ہے۔ مصحفی نے اٹھارویں صدی والوں کے انداز میں تیکھا سا جواب دیا کہ خود میرے تخلص مصحفی میں یائے تحتانی سو جگہ دبی ہو گی۔ کس کو دماغ ہے کہ ٹھیک کرتا پھرے۔ ۴۴

(۵)

لیکن یہ سب تو ذرا ذرا سے واقعات تھے۔ ۱۸۲۷/۸ میں ایک پورا طوفان اٹھ کھڑا ہوا جب غالب نے کلکتے میں کسی معترض کو یہ جواب دیا کہ قتیل نے کچھ بھی لکھا ہو، میں قتیل کو سند نہیں مانتا۔ یہ سارا واقعہ سب لوگوں کو مفصل معلوم ہے لہذا میں یہاں مزید تفصیل نہ لکھوں گا۔ صرف اس بات کی طرف توجہ دلانا منظور ہے کہ غالب نے کلکتہ میں جو مثنوی "باد مخالف" لکھی تھی اس میں بیدل کی تعریف کی تھی، یعنی انھیں دیگر فارسی گویوں کی طرح حقیر نہ گردانا تھا۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس واقعے کے بعد سے غالب نے اپنے کسی شعر میں بیدل کو خراج تحسین نہیں پیش کیا، جبکہ اس کے پہلے وہ بیدل کا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ اپنے اشعار میں کرتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ وقت آگیا جب انھوں نے تیس بتیس سال بعد ۱۸۵۹ میں بیدل کو بھی اپنے خاص نا پسندیدہ فارسی گویوں کے برابر حقیر جانا۔ انھوں نے عبدالغفور سرور کو لکھا:

> ناصر علی اور بیدل اور غنیمت، ان کی فارسی کیا؟ ہر ایک کا کلام بہ نظر انصاف دیکھئے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ منت اور مکین اور واقف اور قتیل، یہ اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجئے۔ ۴۵

غالب نے اسی پر بس نہ کی۔ ان کے خط پڑھئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو، آزاد بلگرامی اور ٹیک چند بہار وغیرہ پر بمشکل ایک صدی بھی

نہ گزرنے پائی کہ ہندوستانیوں کا بازار سرد ہو گیا۔ ایک وقت وہ تھا کہ آزاد بلگرامی "خزانہء عامرہ" میں عرفی اور حزیں وغیرہ پر بے دھڑک اعتراض کرتے تھے۔ ۴۶ آزاد اور ان کے معاصروں کا خیال تھا کہ عرفی، یا کوئی بھی ایرانی ہو، بہر حال انسان ہے اور اس سے غلطی ہو سکتی ہے۔ اس کے بر خلاف غالب تمام ایرانیوں کو اور بالخصوص عرفی کو اللہ میاں سے ذرا ساہی کم سمجھتے تھے احمد علی رامپوری کو لکھتے ہیں:

> عرفی کی زبان سے جو نکل جائے وہ سند ہے۔ ہمارے واسطے وہ ایک قاعدۂ محکم ہے۔ وہ مطاع ہے اور ہم اس کے مقلد اور مطیع ہیں۔ ۴۷

غالب نے خود اپنے لئے جو راہ فرار یا راہ نجات نکالی وہ یہ تھی کہ انھوں نے کہا کہ مجھے فارسی زبان سے مناسبت ازلی ہے۔ اور پھر یہ کہ انھوں نے فارسی زبان ایک ایرانی استاد سے بھی سیکھی تھی۔ ۴۸ لیکن یہ باتیں ان کے دشمن تو کیا ان کے دوست بھی کہاں ماننے والے تھے؟ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ شبلی نے غالب کو اہل زبان کے برابر مستند تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

ہندوستانی فارسی گویوں کا ستارہ دھندلا پڑتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ شبلی کی شعر العجم کی پانچ جلدیں ۱۹۰۹ سے ۱۹۱۸ تک سامنے آئیں۔ تقریباً بارہ سو صفحات کی اس لاجواب کتاب میں شبلی نے غالب اور بیدل کا بمشکل ایک دو جگہ نام لیا۔ اور سبک ہندی کے بیسوں عظیم فارسی گویوں کا نام تک اس کتاب میں نہیں ملتا، ان کا تذکرہ تو دور کی بات ہے۔ اس کا ایک بہت بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ ہندوستان میں فارسی مطالعات کی فہرست استناد میں ان ہندوستانیوں کے نام شامل نہ ہو سکے جنھیں شبلی نے نظر انداز کیا تھا۔ غالب کا معاملہ تو ذرا دیگر تھا، اور بیدل کا نام غالب اور اقبال کی وجہ سے چمکا۔ ان دو کے علاوہ کوئی ہندوستانی فارسی گو ایسا نہیں جو ہمارے فارسی مطالعات کے فہرست استناد میں شامل ہو۔ ایرانیوں نے ہندوستانی شعرا اور سبک ہندی کے ایرانی شعرا کو بھی چنداں لائق اعتنا نہ سمجھا تھا۔ ہندوستانیوں نے بھی انھیں بالائے طاق رکھ دیا۔ بے چارے نہ وہاں کے رہے نہ یہاں کے رہے۔

اردو پر اس کا اثر یہ ہوا کہ زبان کا میدان وسیع ہونے کے بجائے تنگ ہو گیا۔ خلاقانہ تصرف کی جگہ کتابی کٹھ ملائیت محترم اور معتبر ٹھہری۔ ہزاروں نہیں تو سینکڑوں الفاظ ٹکسال باہر قرار دئے گئے۔ عام بولنے والے انھیں بولتے رہیں تو کیا ہوا، نام نہاد اساتذہ تو انھیں دیس نکالا دے ہی چکے۔

کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ اردو واحد زبان ہے جس کے ماہرین اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہم نے اتنے اتنے الفاظ کو متروک قرار دے دیا یا ترک کر دیا؟ چہ جائیکہ وہ اس بات پر فخر کریں کہ ہم نے اتنے نئے الفاظ یا تراکیب یا استعمالات زبان میں داخل کئے ہیں۔ تمام دنیا میں طریقہ ہے کہ لسان بالقوت یعنی LANGUE حاوی ہوتی ہے۔ لسان بالفعل یعنی PAROLE ۔ پر یہاں الٹا معاملہ ہے کہ لسان بالفعل کے چند اجارہ دار ہیں جو لسان بالقوت پر تسلط

رکھنے کا گمان رکھتے ہیں۔ آج بھی ایسی فہرستوں کی کمی نہیں جو رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ فلاں فلاں عربی فارسی الفاظ کو یوں نہیں بلکہ یوں استعمال کرنا چاہئے تاکہ وہ عربی فارسی کے مطابق ہو جائیں۔ فلاں فلاں الفاظ کا تلفظ جو اردو میں مروج ہے، وہ غلط ہے کیونکہ وہ عربی فارسی کے مطابق نہیں ہے۔ وغیرہ۔ ان فہرستوں کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یار لوگ اپنے مخالفوں کی زبان میں کیڑے نکالنے کے لئے ان کا جائز ناجائز استعمال کرتے رہتے ہیں۔ ۴۹ شاہ حاتم لاکھ کہا کریں کہ محاورہ اور روزمرہ کو کتاب پر فوقیت حاصل ہے لیکن یہاں سنتا کون ہے؟ یہاں تو اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ "بجز" "بحر" میں غلط ہے کیونکہ "بجز" میں ج پر زبر ہے۔

شاہ حاتم اور انشا کے اصولوں میں جو گنجائشیں تھیں، ان کا بھی غلط استعمال کیا گیا۔ یعنی یہ طے کر لیا گیا کہ اہل ایران جو اپنی کتابوں میں لکھ گئے ہیں اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس کے برخلاف خان آرزو نے اپنی معرکہ آرا کتاب "مثمر" میں لکھا ہے:

> کچھ تراکیب ایسی ہیں جو خاص حیثیت رکھتی ہیں اور زبان میں خاص طرح استعمال ہوتی ہیں اور عام لوگوں کو ان کی نزاکتوں اور باریکیوں کا پتہ نہیں ہوتا۔ ہندوستان کے کچھ علما نے کسی ایرانی شاعر سے کہا کہ آپ کے اساتذہ نے زبان اپنے یہاں کے بوڑھے بوڑھیوں سے سیکھی ہے جبکہ ہم لوگوں نے خاقانی اور انوری جیسے فصحا سے یہ زبان سیکھی ہے۔ ہندوستانی علما کا اس بیان سے مطلب یہی تھا کہ مختلف اور متنوع تراکیب ہیں جو مخصوص اور مختلف جگہوں پر استعمال ہوتی ہیں۔ عام لوگوں کو ان کے اسرار کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ لہذا وہ شخص جس نے کسی زبان کے خواص سے تربیت پائی ہے وہ اس سے بہتر ہے جس نے اس زبان کے عوام سے تربیت پائی ہے۔ ۵۰

خان آرزو نے بڑی گہری بات کہی ہے اور اس کا ثبوت بلاحظہ کرنا ہو تو ٹیک چند بہار کی مرتب کردہ "بہار عجم" کا کوئی صفحہ کھول لیجئے۔ لیکن اس سے پہلے خان آرزو کے ذکر کردہ واقعے کو غالب کی زبان سے سنئے اور دیکھئے کہ غالب کا رویہ اور نظریہ کتنا غلامانہ ہے اور خان آرزو کا رویہ اور نظریہ کس قدر عالمانہ اور روشن خیال۔ غالب لکھتے ہیں:

> کیا تو نے سنا نہیں، جو عرفی اور فیضی میں گفتگو ہوئی ہے اور موتمن الدولہ شیخ ابوالفضل کے روبرو ہوئی ہے۔ لغات فارسی اور ترکیب الفاظ میں کلام تھا۔ مولانا جمال الدین عرفی رحمتہ اللہ علیہ نے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور نطق آشنا ہو گیا ہوں، اپنے گھر کی بوڑھیوں سے لغات فارسی اور یہی ترکیبیں سنتا رہا ہوں۔ فیضی بولا کہ جو کچھ تم نے اپنے گھر کی بوڑھیوں سے سیکھا ہے وہ ہم نے خاقانی اور انوری سے اخذ کیا ہے۔ حضرت عرفی نے فرمایا کہ تقصیر معاف خاقانی اور انوری کا ماخذ بھی تو مطلق گھر کی پیر والوں کا ہے۔ ۵۱

آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ خان آرزو کا رویہ ترقی یافتہ ذہن، عالمانہ مزاج اور خود اعتمادی کا رویہ ہے اور غالب کے یہاں ان چیزوں کا نام و نشان نہیں۔ لیکن افسوس یہ کہ بات غالب ہی کی چلی اور خود غالب کو بھی اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔

خان آرزو نے اوپر تراکیب و محاورات کا ذکر کیا ہے جن سے صرف پڑھے لکھوں کی زبانیں آشنا ہیں۔ میں نے "بہار عجم" کا ایک حصہ بالکل بے ارادہ کھولا (جلد سوم صفحہ ۴۵۶) تو اس میں لفظ "کوچہ" پر مبنی پندرہ تراکیب فقرے اور محاورے نظر پڑے۔ جن کے معنی اور استعمال کی سند کے طور پر ٹیک چند بہار نے مندرجہ ذیل شعرا کے اشعار پیش کئے ہیں۔

صائب تبریزی، محسن تاثیر، ملا طغری، اشرف ماژندرانی، شفائی اصفہانی، علی قلی خراسانی، دانش مشہدی، فوقی یزدی، زلالی خوانساری، طالب آملی اور محمد قلی سلیم۔ ۵۲

ان شعرا میں امیر و وزیر بھی ہیں، ملک الشعرا بھی، معلم اور صوفی بھی، طنز نگار بھی اور فحش گو بھی۔ ذرا کوئی مجھے بتادے کہ وہ کون سا ایسا گھر ہوگا جس کے رہنے والوں نے اس کی بڑی بوڑھیوں کی زبانی یہ سب فقرے اور محاورے سن لئے ہوں گے؟ ظاہر ہے ان فقروں، محاوروں اور تراکیب سے شناسائی اساتذہ کے کلام سے ہی مل سکتی ہے۔ گاؤں گھر کی بوڑھیوں سے نہیں۔

ایسا نہیں کہ غالب کو یہ فرق معلوم نہیں تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ پڑھے لکھوں کی بولی اور خاص کر شاعری کی با محاورہ، انتہائی استعاراتی اور پیچیدہ زبان کچھ اور ہے اور عام لوگوں کی گھریلو بول چال شے دیگر ہے۔ اپنی مخصوص تضاد بیانی کو کام میں لاتے ہوئے انھوں نے قتیل کے بارے میں لکھا کہ قتیل کے ماخذ وہ کشمیری، کابلی یا قندھاری یا اکا دکا ایرانی رہے ہوں گے جو سعادت علی خان (زمانۂ حکومت ۱۷۹۸ تا ۱۸۱۴) کے وقت میں گھومتے پھرتے لکھنؤ پہنچے ہوں گے اور تقریر کچھ اور چیز ہے تحریر کچھ اور چیز۔ ۵۳ (یعنی ان لوگوں کی بولی سن کر قتیل کو کوئی فائدہ نہ ہوا ہوگا۔ لیکن یہی بات تو فیضی بھی کہہ رہا تھا اور خان آرزو بھی۔ لیکن غالب ان کی بات کیوں مان جاتے؟) خان آرزو نے تو یہاں تک کہا تھا کہ اگر ایرانیوں کو یہ حق ہے کہ وہ عربی اور ہندی الفاظ پر تصرف کریں تو "صاحب قدرتان ہند" کو بھی فارسی میں تصرف کرنے کا حق کیوں نہ ہو۔ ۵۴ لیکن خان آرزو کی بات یہاں بھی نہ سنی گئی اور انیسویں صدی کی الٹی گنگا بہتے بہتے خود غالب اور شبلی کے کنارے آ لگی اور ساری ہندوستانی اردو فارسی کو آلودہ کر گئی۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اپنے آخری زمانے میں غالب نے بلاوجہ کی ایک بحث "برہان قاطع" کے بارے میں کھڑی کر دی تھی اور یہ بات بھی سب

بیان کیے ہیں کہ اس بحث نے غالب کی عظمت میں کوئی اضافہ نہ کیا اور نہ ان کی فارسی طبیعت کا سکہ لوگوں پر جم سکا۔ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ "برہان قاطع" کا سب سے زیادہ مفصل جواب اور رد مولوی احمد علی نے "موید برہان" کے نام سے ۱۸۶۶ء میں چھپوایا۔ غالب کا بنیادی بیان یہ تھا کہ "برہان قاطع" کے مولف محمد حسین تبریزی کو فارسی میں مستند نہ ماننا چاہیے کیونکہ وہ ہندوستانی تھے۔ مولوی آغا احمد علی نے اپنی کتاب میں غالب کے اعتراضات کو رد کیا۔ اس طرح انھوں نے بالواسطہ طور پر یہ ثابت کر دیا کہ محمد حسین تبریزی ہندوستانی تھے تو کیا ہوا ان کا قول معتبر ہے۔ تقدیر کی ستم ظریفی دیکھیے کہ نقصان بھی غالب کا ہوا اور جیت بھی غالب کی ہوئی۔ نقصان یہ ہوا کہ غالب کو کسی نے اہل زبان جیسا مستند فارسی گو نہ مانا اور جیت ان کی یوں ہوئی کہ آغا احمد علی جیسے جید مخالفوں کے باوجود زمانے نے غالب کی ہی بات کو تسلیم کیا کہ ہندوستانی فارسی گو اور ہندوستانی فارسی لغت نگار مستند نہیں ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کا شمار فارسی کے بڑے شاعروں میں ہونا چاہیے اور ہوتا ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ شبلی جیسا فارسی کا زباں شناس اور فارسی شعر کا ذوق رکھنے والا عالم بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ شبلی کی فارسی شاعری ایرانی طرز کی ہے اور انھوں نے بخیال خود ہندوستانی فارسی گویوں کے طور طریقوں سے اجتناب کیا ہے لیکن جس طرح شبلی نے غالب کو مستند نہ مانا، اسی طرح شبلی کی زبان پر بھی یاروں نے اعتراض کیے۔۵۵ گویا یہ کہا کہ کوئی بھی ہندوستانی اہل ایران کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔ غالب اور بیدل نہیں تو شبلی بھی نہیں۔ اور جب ہندوستان کا فارسی گو اہل ایران کا ہم مرتبہ نہیں ہو سکتا، تو پھر بے چارہ اردو والا جو ٹوٹی پھوٹی عربی اردو میں لائے گا تو وہ بھلا کیا بھاڑ لے گا؟

(۷)

ایرانی فارسی، ہندوستانی فارسی، اردو کے مراتب میں فرق کب شروع ہوا؟ میرا خیال ہے اس کا جواب میں نے بڑی حد تک دے دیا ہے۔ یہ کیسے ہوا؟ اس کا جواب بھی میں نے دلائل اور قیاس کی روشنی میں بڑی حد تک بیان کر دیا ہے۔ لیکن کیوں ہوا؟ یہ کم سے کم میرے لئے اب تک ایک راز ہے۔

حواشی

۱۔ اس بحث کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو "ہماری زبان" نئی دہلی بابت ۱۹۹۶ کے حسب ذیل شمارے: ۱۵ مارچ، ۲۲ مارچ، ۱۵ مئی، ۶ جون، ۱۵ جون، یکم جولائی، ۸ جولائی، یکم اگست، ۸ اگست، ۱۵ اگست، ۹ ستمبر اور ۲ ستمبر۔

۲۔ مکتوب مورخہ ۱۴ مئی ۱۸۶۵ء بنام ہر گوپال تفتہ۔ خلیق انجم (مرتب)

غالب کے خطوط، جلد اول، دہلی ۱۹۸۴ء، صفحہ ۳۵۳

۳۔ شبلی نعمانی: شعر العجم، جلد اول، علی گڑھ ۱۹۰۹ء، صفحہ ۸۲۔۱۸۱

۴۔ حکیم صدری کمال: دستور الفصحا، لکھنؤ ۱۸۹۷ء، صفحہ ۴۲

۵۔ نظم طباطبائی کا مضمون "تلفظ کی تحقیق" مطبوعہ اردوئے معلی، علی گڑھ بابت مئی جون ۱۹۱۳ء۔ ملاحظہ ہو اشرف رفیع (مرتب) مقالات طباطبائی، حیدر آباد ۱۹۸۴ء، صفحہ ۲۰۱۔ اسی کتاب میں طباطبائی کا ایک اور مضمون ہے (صفحہ ۲۰۷) جس میں وہ کہتے ہیں کہ ماہرین فن اس بات کو تسلیم نہ کریں گے کہ بیدل اور فیضی سے غلطی نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ تو مقلد تھے۔ اہل زبان کبھی بھی "چشم نم" نہ کہے گا۔

۶۔ ایضاً صفحہ ۲۰۷

۷۔ ملاحظہ ہو امیر مینائی کا خط بنام زاہد سہارنپوری۔ "مکتوبات امیر مینائی" (مرتبہ) مولوی احسان اللہ، لکھنؤ ۱۹۲۴ء، صفحہ ۱۸۲

۸۔ خلیق انجم: غالب کے خطوط، ایضاً جلد اول صفحہ ۲۳۴

۹۔ نیاز فتح پوری: مالہ و ماعلیہ، لکھنؤ ۱۹۴۹ء، صفحہ ۶۰ اور ۷۰

۱۰۔ شوق نیموی: ایضاح مع اصلاح جواز احسن الاقلاد، لکھنؤ ۱۸۹۳ء، صفحہ ۱۵

۱۱۔ شوق نیموی ایضاً صفحہ ۱۵

۱۲۔ مکتوب مورخہ ۱۳ مئی ۱۸۶۵ء بنام ہر گوپال تفتہ۔ خلیق انجم، ایضاً جلد اول صفحہ ۳۵۲

۱۳۔ خلیق انجم، ایضاً جلد چہارم، دہلی، ۱۹۹۳ء صفحہ ۱۴۷۷

۱۴۔ بحوالہ شعیب اعظمی: "شبلی، منکر غالب" مطبوعہ، جامعہ، غالب نمبر، فروری مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۶۶

۱۵۔ مثلاً ملاحظہ ہو، شوق سندیلوی کی کتاب "اصلاح سخن" (لکھنؤ ۱۹۹۶) (اول اشاعت ۱۹۳۶) میں عبدالستار صدیقی کا نوٹ صفحہ ۱۳۱ تا ۱۳۳ اور سید سلیمان ندوی کے مضامین، مشمولہ "نقوش سلیمانی" اعظم گڑھ ۱۹۳۹ء، صفحات ۷۷ تا ۱۲۴ اور ۲۸۹ تا ۳۴۹

۱۶۔ لباب الالباب از محمد عوفی، مرتبہ براؤن و قزوینی حصہ دوم، لائیڈن اور لندن ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۴۶ تا ۲۵۲

۱۷۔ امیر خسرو: دیباچہ و غرۃ الکمال، مرتبہ سید علی حیدر، پٹنہ ۱۹۸۸ء، صفحہ ۹۷ تا ۹۸

۱۸۔ Duncan Forbes: A Dictionary, Part I , Hindustani and English, Part II, English and Hindustani, Lucknow 1987 p- 28 .

۱۹۔ S.W.Fallon: A New Hindustani. English Dictionary, Lucknow 1986, p. 69

۲۰۔ John Platts: A Dictionary of Urdu, Classical Hindi, and English, Oxford, 1974, p. 40

۲۱۔ Dr John Gilchrist: The Orient Languish, Calcutta, 1802, p. 1

۲۱۔ Dr John Gilchrist: A Grammar of the Hindoostanee Language, Calcutta. 1796.' page 261

۲۔ باغ و بہار از میر امن دہلوی، مرتبہ: رشید حسن خان، دہلی ۱۹۹۲، صفحات ۷ تا ۸ (اصل متن)

۲۴۔ " Habson Jobson" by Henry Yule and A.C. Burnell, Rupa New Delhi, Reprint 1986 (Originally published.1886) Page 417

۲۔ مقالات حافظ محمود شیرانی، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، جلد اول، لاہور ۱۹۶۶، صفحہ ۳۱

۲۔ کلیات مصحفی، حصہ دوم مرتبہ حفیظ عباسی، دہلی ۱۹۶۹، صفحہ ۵۷۸

۲۔ Madhava Rao Sindhia by H.G.Keene (Rulers of India Series) Oxford, 1891 pp. 174, 178, 193

۲۔ آزاد بلگرامی: خزانۂ عامرہ، نولکشور پریس، کانپور ۱۸۷۱، صفحہ ۱۹۵ تا ۲۰۰

۲۔ رجم الشیاطین پر تھوڑی سی گفتگو کے لئے دیکھئے نذیر احمد: غالب پر چند تحقیقی مقالے، دہلی ۱۹۹۶ صفحات ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۷۴

۳۔ نبی ہادی: Dictionary of Indo Persian Literature ,Delhi 1995 page 436,437 مزید دیکھئے، صحف ابراہیم از علی ابراہیم خاں خلیل۔ مرتبہ عابد رضا بیدار، پٹنہ ۱۹۷۸، صفحہ ۷ اور مجمع النفائس از خان آرزو مرتبہ عابد رضا بیدار، پٹنہ، تاریخ ندارد، صفحہ ۹

۳۔ شیخ چاند: سودا، کراچی ۱۹۶۳، صفحہ ۹۵، اول اشاعت ۱۹۳۶

۳۔ کلیات سودا: مرتبہ عبدالباری آسی، جلد دوم، نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۳۲ صفحات ۳۷۵ تا ۳۷۷

۳۔ وارستہ سیالکوٹی: مصطلحات شعرا، لکھنؤ، نولکشور پریس، ۱۸۹۸۔ یہ کتاب وارستہ نے ۱۷۶۶ میں اپنی موت کے ذرا پہلے مکمل کی۔

۳۔ یہ پورا واقعہ سودا نے اپنی ایک طویل نظم میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو کلیات جلد دوم، مرتبہ، عبدالباری آسی، نولکشور پریس، لکھنؤ ۱۹۳۲ صفحات ۳۵۸ تا ۳۶۵

۳۔ اگرچہ دریائے لطافت کی تصنیف میں قتیل بھی انشا کے ساتھ تھے لیکن زبان اور قواعد سے متعلق تمام ابواب اس کتاب میں انشا کے لکھے ہوئے ہیں لہذا ان بیانات کو انشا کے ہی حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو دریائے لطافت، مرشد آباد ۱۸۵۰ صفحہ ۱۱۶

۳۔ دریائے لطافت، ۱۸۵۰ صفحہ ۱۱۱ تا ۱۱۴، ۱۱۶

۳۔ محمد حسین آزاد: آب حیات، کلکتہ ۱۹۶۷، صفحہ ۳۶۷ (اول اشاعت ۱۸۸۰) آزاد نے یہ واقعہ جس طرح سے بیان کیا ہے اس سے لگتا ہے کہ وہ آتش کی بات سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے۔

۳۸۔ دیوان زادہ از شاہ حاتم مرتبہ غلام حسین ذوالفقار، لاہور ۱۹۷۵، صفحہ ۳۹

۳۹۔ دریائے لطافت، ایضاً صفحہ ۷۰ تا ۷۵، ۳

۴۰۔ ملاحظہ ہو باقر آگاہ کا اپنے اردو دیوان پر دیباچہ، مشمولہ مولانا باقر آگاہ کے ادبی نوادر، مرتبہ، علیم صبا نویدی، مدراس ۱۹۹۴ صفحہ ۶۳

۴۱۔ ملاحظہ ہو گلستاں باب اول صفحہ ۳۵ مطبوعہ مطبع مجیدی کانپور۔ ۱۹۰۹

۴۲۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو۔ خوش معرکۂ زیبا از سعادت خاں ناصر مرتبہ مشفق خواجہ، لکھنؤ ۱۹۷۱، صفحات ۲۷۸ تا ۲۸۷

۴۳۔ ملاحظہ ہو کلیات شہزادہ سلیمان شکوہ مرتبہ شاہ عبدالسلام، لکھنؤ ۱۹۸۲ صفحہ ۳۶

۴۴۔ خوش معرکۂ زیبا، ایضاً صفحہ ۲۷۳

۴۵۔ خلیق انجم (مرتبہ) غالب کے خطوط جلد دوم دہلی ۱۹۸۵ صفحہ ۵۹۴

۴۶۔ آزاد بلگرامی: خزانۂ عامرہ ایضاً صفحہ ۹۵ اور ۳۱۸

۴۷۔ خلیق انجم (مرتب) غالب کے خطوط جلد چہارم دہلی ۱۹۹۳ صفحہ ۱۵۴۳

۴۸۔ ملاحظہ کیجئے خلیق انجم ایضاً جلد چہارم صفحہ ۱۳۴۷ اور ۱۳۷۷۔ ایرانی استاد کے لئے دیکھئے خلیق انجم ایضاً جلد دوم صفحہ ۴۴۷ اور جلد سوم صفحہ ۱۲۰۲

۴۹۔ مثلاً ملاحظہ ہو، ایک فہرست اس طرح کے الفاظ کی جو نشتر جالندھری نے ہمایوں، لاہور بابت مارچ ۱۹۳۲ میں شائع کی، اسے "ابر" بدایوں نے اپنے جولائی دسمبر ۱۹۹۵ کے شمارہ میں صفحہ ۷۲ سے ۷۷ تک شائع کیا۔ ماجد الباقری نے اس طرح کی کئی فہرستیں زمانہ حال میں شائع کیں۔ مثلاً سالنامہ 'صریر' کراچی بابت ۱۹۹۵ صفحات ۱۷۱ تا ۱۸۴

۵۰۔ بحوالہ اقبال انصاری: "مرزا غالب کی بے اعتدالیاں" یہ مضمون 'زمانہ' کانپور کی اشاعت بابت جون ۱۹۴۱ میں پہلی بار چھپا اور اب خدا بخش لائبریری کی مرتب کردہ "زمانہ کی غالبیات" میں پھر چھپا ہے۔ پٹنہ ۱۹۹۴ صفحہ ۱۱۹

۵۱۔ خلیق انجم: ایضاً جلد چہارم صفحہ ۱۳۷۶

۵۲۔ بہار عجم از ٹیک چند بہار، جلد دوم، دہلی، ۱۸۶۶، صفحہ ۲۵۶

۵۳۔ خلیق انجم، ایضاً جلد دوم صفحہ ۵۸۷

۵۴۔ بحوالہ اقبال انصاری، ایضاً صفحہ ۱۱۷

۵۵۔ ملاحظہ ہو غلام ربانی عزیز کی تحریر نیاز فتح پوری کی مالہ وماعلیہ میں، لکھنؤ ۱۹۴۹ صفحہ ۱۳۳ تا ۱۵۰

نظمیں

حمید الماس

زوال کا رنگ

اداس شام کے منظر میں منتشر ہیں خیال
سکوت محو سخن ہو تو حوصلے کا جمال
نشاط ذہن کا باعث ہو
گوشۂ دل میں خلش سی ہو
رگ و پے میں کسک ہو
باد معتبر سے
یوں نفس مہکے
تمام دن کی کثافت ہو دور
لہجے میں
شگفتگی ہو
نظر میں نہ ہو زوال کا رنگ
اداس شام کے منظر میں کھو گئی ہے حیات

وجود کا رشتہ

میں اس مقام سے نزدیک ہوں جہاں شاید
خجستہ پائی سے محروم ہوں نئے لمحے
افق اداس ہے
کل سے دھنک بھی غائب ہے
زمین یوں ہے گریزاں کہ اس کی آنکھوں میں
نہیں رفاقت کہنہ کی کوئی پرچھائیں
نئی جہات سے اب مرا سامنا ہوگا
قدم رکیں گے مگر
کب کہاں نہیں معلوم
بہت مہیب ہیں راہیں
فضا ہے انجانی
خدا کے نیک فرشتو!
چلوں تو کیسے چلوں
مرے وجود سے ممکن نہیں فراق دوام

توصیف تبسم

آسماں غرق ہے پانی میں نکالوں اس کو
پاؤں ٹھہریں جو تہِ آب اٹھالوں اس کو

ہے سبب، عمرِ گزشتہ کی شکایت کیسی
ساتھ ہولوں گا، اگر راہ میں پالوں اس کو

راکھ کا ڈھیر ہوئی جاتی ہے اک اک ساعت
جو بھی اندوختہ باقی ہے بچالوں اس کو

وہ ہر اک سانس میں موجود ہے خوشبو کی طرح
دل کی حسرت کہ ذرا ہاتھ لگالوں اس کو

خون ہو دل میں تو کچھ صفحے پہ تحریر کروں
ہو سیاہی تو فضاؤں میں اچھالوں اس کو

کیا طلب ہے مرے دل کی مجھے معلوم نہیں
جو مرے گھر میں نہیں کیسے نکالوں اس کو

ایک لو ہو تو میں توصیف چراغاں کرلوں
اک کلی پاؤں تو گلزار بنالوں اس کو

طلوعِ صبح کا منظر اداس کرجائیں
جو تو کہے تو اسی چاندنی میں مرجائیں

سحر تلک تو یہ آنسو ہمیں ڈبودیں گے
ابھی تو درد ہے پایاب پار اتر جائیں

پڑے نہ ماند کبھی نقش نامرادی کا
جو ہاتھ آئے بھی خوشبو تو خود بکھر جائیں

بساط بھر رکھیں روشن فلک کے ٹکڑے کو
پھر اس کے بعد، خلا میں کہیں اتر جائیں

ستم تو یہ ہے کہ وحشت ہے جان و دل پہ محیط
نصیب ہو تو اسے آنسوؤں سے بھر جائیں

کرن بنے ہیں تو مٹی میں جذب ہوتا ہے
پلٹ کے آئیں اگر صورتِ نظر جائیں

ہمارے بعد کوئی آنکھ نم ہوئی کہ نہیں
جو ہو سکے تو یہ منظر بھی دیکھ کر جائیں

توصیف تبسم

عشق میں اک گلبرگ بدن کے، کیوں خود کو بے حال کریں
دل کا جام الٹ کر رکھ دیں، مے سے چہرہ گلال کریں

دیکھو کیسے موج صبا سے کلیوں کے دل خون ہوئے
شاید یہی ہوا کے جھونکے، جی کا درد بحال کریں

صبح وداع گل بدناں ہے، ڈھانپ کے منہ شبنم اور ہم
روئیں عارض گل کو، آئینہ تمثال کریں

آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں اس کو، ہر انجانے چہرے میں
اس کی صورت یاد آئے تو کیسے ہجر، وصال کریں

دنیا اگر نہ رستہ روکے، ہم بھی زعم فقیری میں
موج ہوا کی صورت انھیں سیر دشت و جبال کریں

بتا کے بھی جب وہ دل کی ساری بات سمجھتا ہے
کیوں نہ لبوں کو مہر کریں اور چشم کو دست سوال کریں

جسم سے روح کی وادی میں اترنا اس کا
خواہش وصل پہ انکار نہ کرنا اس کا

منکشف ہوتے ہوئے لمس بدن کے اسرار
گل نورستہ کی مانند سنورنا اس کا

نشۂ قرب سے آنکھوں کا گلابی ہونا
خون میں اٹھتی ہوئی لہر سے ڈرنا اس کا

آنکھ پہ کھلتے ہوئے دور کے منظر سارے
سیل احساس پہ اس پار اترنا اس کا

ایک دریا مری آنکھوں سے رواں رہتا تھا
دل کے پاتال میں گرتا ہوا جھرنا اس کا

روح پہ سایہ تھکن، نیند سے بوجھل پلکیں
بند آنکھوں سے دبے پاؤں گزرنا اس کا

کٹ گئی عمر ترے غم کی نگہ داری میں
ساعت درد میں رہ رہ کے بکھرنا اس کا

غلام مرتضیٰ راہی

پڑی ہے میری تاک میں ساری رات الگ
ادھر لگائے بیٹھا ہے دن گھات الگ

داد ہنر کی دینے والا ہو کوئی
چاہے کاٹ کے کردے میرا ہات الگ

دھوم دھام کے ساتھ بڑی خاموشی سے
نکلی اس کی یادوں کی بارات الگ

کوئی اسے پہچان سکے تو پہچانے
سب میں رہ کر سب سے اسکی ذات الگ

نذرانے تھے ایک سے ایک عقیدت کے
سب میں میرے سر کی تھی سوغات الگ

تو اپنے بندوں سے پردہ کرتا ہے
حور ملائک دیو پری جنات الگ

دھرتی کے نیچے کا پانی کھنچا ہوا
روٹھ گئی ہے اوپر سے برسات الگ

اب میں تم کو کن لفظوں میں سمجھاؤں
اس کے اشاروں کی ہے راہی بات الگ

میری غفلت کے سبب راستہ ہم وار ہوا
چھوڑ کر نقش قدم کو میں گرفتار ہوا

ہوا افسوس جب اوروں کا میں غم خوار ہوا
سارا جینا مرا اپنے لئے بیکار ہوا

در حقیقت جو رہا میری طرف سے غافل
خواب بن کر وہ مری نیند میں بیدار ہوا

میری بینائی کا عرفان ہوا جب اسکو
اندھا بن کر مری آنکھوں کا طلبگار ہوا

بوجھ سے جھکتی ہوئی شاخ کے غم کو لے کر
پھول بھی میری طبیعت پہ گراں بار ہوا

کس کی آہٹ سے مرے ہوش ٹھکانے آئے
نیند بھی ٹوٹ گئی خواب بھی مسمار ہوا

اے زمیں! ایسی کشش تجھ میں کہاں سے آئی
دو گھڑی اوج پہ رہنا مجھے دشوار ہوا

یہ کرشمہ ہے مرے چاند کا ورنہ راہی
کہاں سورج کبھی مغرب سے نمودار ہوا

جلا وطنی کے افسانے

جیتندر بلّو : خلا میں ایک ملاقات

مصطفٰے کریم : برف کے موسم

شیر شاہ سید : دیس سے دیس تک

مصطفٰے کریم : اماں میرے باوا کو بھیجو جی

جتیندر بلو

سنو

میں اپنے کمرے میں کاغذات کا ایک ایک صفحہ، ایک ایک پرزہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایک دیرینہ دوست کے پتے کی سخت ضرورت تھی۔ وہ ایک طویل مدت سے پردیس میں سکونت پذیر تھا۔ ساوتری کی آواز پر میرے ہاتھ پاؤں وہیں رک گئے۔

"کچھ سن رہا ہوں"

وہ برآمدے سے ہو کر کمرے میں چلی آئی اور مجھے اس انداز سے دیکھنے لگی، گویا میں بیرون ملک نہیں چاند پر جا رہا ہوں اور لوٹنے پر سماج میں اگر اس کا نہیں تو میرا رتبہ یقیناً اونچا ہو جائے گا اور دنیا میرے آگے پیچھے دوڑتی ہو گی۔

"یہ سب میری پوجا کا پھل ہے۔ اب تم یورپ جا رہے ہو تو وہاں اپنا ٹھکانا بنانے کی کوشش کرنا"

وہ پتہ، جس کی مجھے گھنٹوں سے تلاش تھی جسے پانے کے لئے میں نے دنیا بھر کے کاغذات اور فائلیں کھنگال ڈالی تھیں، ایک پرزے پر اچانک لکھا مل گیا تھا۔ اسے چوم کر میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا دورہ مکمل ہو گیا ہے اور میں سرخ رو ہو کر لوٹ بھی آیا ہوں۔ وہ میرے بالکل پاس آ کر بولی۔

"باہر جانے کا موقع ہر کسی کو نہیں ملا کرتا۔ اب جا رہے ہو تو وہاں اپنی بنیاد بنا کر لوٹنا۔"

میں اپنی بیوی کی معصومیت پر ہنس دیا، کچھ اس طرح دھیرے سے کہ وہ اس کا جائزہ نہ لے پائے۔ دیگر کاغذات کے ساتھ اس پرزے کو فائل میں رکھ کر میں نے کہا۔

"شاید تم اس خیال میں ہو کہ ویسٹ میں سیٹل ہونا بہت آسان ہے۔ مگر تم کیا جانو وہاں کتنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کتنی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔

"اچھا؟۔ پر وہاں لوگ تو دھڑا دھڑ جاتے رہتے ہیں۔ پھر وہاں ج
بس بھی جاتے ہیں۔۔۔ کوئی راستہ تو ہو گا؟۔"

"ساوتری، تم اس طرح کیوں سوچا کرتی ہو۔" میں نے ا
سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ہمارا جیون یہاں ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ بنیا
ضروریات روز و ہو کر پوری ہو جاتی ہیں۔ نوکری ہے۔ سر پر چھت ہے۔ کا
میں ساکھ ہے، چار لوگ جانتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات بھگوان نے
کے بعد ہماری سن لی ہے، تم ماں بننے جا رہی ہو۔ اور کیا چاہئے ہمیں؟"

لیکن وہ قدم بڑھا کر میرے قریب چلی آئی۔ میرا گال چھو کر اور ہاتھ میرے بالوں میں پھیر کر بولی۔

"میں اتنی پڑھی لکھی تو نہیں جتنے تم ہو۔ اور نہ ہی تمہاری طر
ہوشیار ہوں۔ مگر وہاں بندوبست ہو جائے تو اس میں برائی بھی کیا ہے؟ آ
تمہاری ڈگری کس دن کام آئے گی؟ میری فکر مت کرنا۔ میں بعد میں ؛
آؤں گی۔

مجھے پھر ہنسی آ گئی، مگر اس مرتبہ اس میں اتنی شدت تھی کہ ا
سنبھالنا میرے لئے مشکل ہوا جا رہا تھا مجھے شدید کھانسی پڑ گئی۔ انجام کار اس
قابو پا کر اور آنکھوں کے گرد سے پانی صاف کر کے میں نے کہا۔

"ساوتری، تم واقعی ماڈرن ساوتری ہو۔ پراچین کال میں ا
ساوتری وہ تھی، جس کا پتی ستیہ وان جنگل میں لکڑیاں کاٹتے کاٹتے اچانک چل
تھا اور جب یم دوت اسے لے جانے کے لئے جنگل میں گیا تھا اور اسے پاشو
میں سمیٹ کر آکاش کے طرف لے جانا چاہتا تھا تو ساوتری پہاڑ بن کر اس ؛
آگے کھڑی ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ وہ جنگلوں، اندھیروں اور خطرناک راستوں
دنوں بھوکی پیاسی، گرتی پڑتی یم دوت کا پیچھا کرتی رہی، یم دوت اس کی سادھ
شردھا، لگن، پریم اور وابستگی کو دیکھ کر پگھل گیا تھا اور وہ ستیہ وان کو ساوتری
کسی ایک مانگ پر زندہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ جانتی ہو ساوتری نے ا

سے کیا مانگا تھا؟"

"ہاں، جانتی کیوں نہیں؟ اس نے یم دوت سے کہا تھا۔ پہلے مجھے بارہ بچوں کی ماں بن لینے دو۔ پھر آ کر میرے پتی دیو کو لے جانا۔"

"۔۔۔ اور ایک تم ہو کہ مجھے خود سے الگ کر کے پردیس میں دھکیلنا چاہتی ہو" میں مسکرا کر بولا۔

"ایسا کبھی نہ کہنا۔ میں تمہارے بنا جینے کی کلپنا بھی نہیں کر سکتی۔"

ہم خاموش گز بھر کے فاصلے پر کھڑے، شادی کی پہلی رات سے ایک دوسرے کو جانتے ہوئے سخت حیران تھے کہ اس کا پاؤں بھاری ہوتے ہی ہم اس قدر قریب آ چکے ہیں کہ ایک اکائی ہونے کا گمان گزرتا ہے۔

"پر کیلاش جی، سننے میں آیا ہے، لوگ وہاں جا کر تین چار برس میں دھن دولت والے بن جاتے ہیں" وہ ہچکچاتی ہوئی بولی

میں اس کی خواہشات اور جذبات سے خوب واقف تھا۔ وہ گاہے گاہے مجھے پردیس میں اپنا ٹھکانا بنانے کا راگ الاپا کرتی تھی۔ لیکن میں اسے ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا اس تناظر میں سوچنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ ہوا یہ تھا کہ چند برس پہلے ہمارے بلاک کے سات نمبر فلیٹ سے دو جوان بھائی اپنے ماموں کے پاس امریکہ میں جا کر بس گئے تھے۔ مہینوں میں اس خاندان کی آن بان شان میں فرق نمایاں ہونے لگا تھا۔ رنگین ٹی وی، ویڈیو، ٹیلی فون، واشنگ مشین، فرج، ڈیپ فریز، گکر، قیمتی فرنیچر، قالین اور مکان کے آگے ماروتی کار۔ اس خاندان کی کایا پلٹ دیکھ کر ذہن میں ایک ہی خیال پیدا ہوا کرتا تھا کہ سات نمبر والوں کا واقعی کوئی جیک پاٹ (jack pot) نکل آیا ہے۔ لیکن ساوتری نے اچانک ان سے ملنا جلنا بند کر دیا تھا۔ ایک شام وہاں سے لوٹنے پر لال پیلی ہو کر بولی۔ "وہ سالے سات نمبر والے جانے خود کو کیا سمجھتے ہیں۔ گھر کیا بھر گیا ہے، ہر کسی کو چھوٹا سمجھتے ہیں۔ نیچ کہیں کے۔"، میں دل میں سب یادیں دہرا کر گہری سوچ میں تھا کہ ساوتری کی آواز پر چونک پڑا۔

"یہ سوچنے کی گھڑی نہیں ہے کیلاش جی۔ آج شام آپ جا رہے ہو۔ میرا کہا اپنے ساتھ رکھنا۔ اس پر غور کرنا۔"

آسمان رنگ بدل چکا تھا۔ وہ گھڑی بھی آن پہنچی جب مجھے سامان اٹھا کر ایئر پورٹ روانہ ہونا تھا۔ صدر دروازے پر ساوتری دہلیز کے اس طرف ہاتھ میں چاندی کا چھوٹا سا کٹورا اٹھائے پاس پڑوس کی عورتوں اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ میں دروازے پر پہنچا تو ساوتری نے ساڑی کا پلو سر پر رکھا، آنکھیں بند کیں اور کچھ یوں بولنا شروع کیا گویا وہ آواز سیدھی اس کی آتما سے آ رہی ہو۔

"ہے پربھو، میں اپنا سہاگ تمہارے شرن کرتی ہوں، پردیس میں ان کی رکھشا کرنا۔ یہ ہنستے ہوئے جائیں، ہنستے ہوئے لوٹیں اور جس کام سے جا

رہے ہیں اس میں سپھل ہوں۔ بس یہی میری پرارتھنا ہے۔"

میں اس روایت کو بھولا نہ تھا۔ بھول بھی کیسے سکتا تھا۔ جب کبھی مجھے دورے پر کسی شہر جانا ہوا کرتا تھا تو وہ تیل سے آدھا بھرا ہوا چاندی کا کٹورا لئے دہلیز پہ کھڑی ہوا کرتی تھی اور میں اسے پار کرنے سے پہلے اس میں حکومت کا جاری کردہ ایک آدھ سکہ ڈال دیا کرتا تھا۔ لیکن اس مرتبہ سکہ ڈالنے سے پہلے میں نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں اشکبار تھیں، آنسو گالوں سے اتر کر منگل سوتر کو چھو رہے تھے اور اسے سسکیاں لگ گئی تھیں۔ میں نے نظر جھکا کر اس کے شریر کا وہ انگ دیکھا، جہاں ہم ایک بالک کی صورت میں پھل پھول رہے تھے اور وہ بالک سنسار میں آنے کے لئے دن گن رہا تھا۔ میں نے جھٹ سے سکہ ڈالا اور سامان اٹھا کر آگے بڑھ گیا۔ عقب سے عورتوں کی ملی جلی آوازیں بدستور آتی رہیں۔ "کیلاش بھائی دھیرج رکھنا۔ آرام سے جاؤ۔ چنتا مت کرنا۔ ساوتری کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ ہم اس کا خیال رکھیں گے۔"

شیطان کی آنت کی طرح پھیلا ہوا نوے لاکھ باسیوں کا لندن شہر میرے روبرو تھا۔ میں اکثر تین سو ساٹھ ڈگری گردن گھما کر اور دائرہ مکمل کرنے پر سوچا کرتا کہ میں کون سی دنیا میں چلا آیا ہوں۔ جہاں صدیوں پہلے کے تعمیر شدہ ایک ہی طرز کے مکانات، جدید شیشے کی بلند و بالا عمارتیں، صاف ستھری سڑکیں، نیم برہنہ سفید سیاہ سانولے اور پیلے رنگ کے اجسام، پرکشش لباس، سپر مارکیٹیں، جہازی اسٹور، زمین دوز گاڑیاں، باغات،، تھیٹر، سینما، میوزیم، نائٹ کلب، رستوراں، قہوہ خانے، شراب خانے، آرٹ گیلریاں، مختلف ملکوں کے شہری، آزادانہ گھوم پھر رہے تھے۔ کھلی آنکھوں سے ہر شے کو دیکھتا، اسے قریب سے محسوس کرتا میں کسی گمنام سی حیرت کے عالم میں تھا کہ مجھے ڈاکٹر جانسن کا قول یاد آیا:

If you are tired of London you are tired of life.

شہر کا ماحول کچھ کچھ جان لینے کے بعد اور اس کی نبض پر کچھ کچھ ہاتھ رکھنے کا احساس کرنے پر میں نے اپنے دوست شنکر دت کو فون کیا۔ دوسری طرف سے نسوانی آواز کی تھرتھراہٹ جان کر احساس ہوا کہ کوئی معمر خاتون مجھ سے ہمکلام ہے۔ شنکر کے متعلق دریافت کرنے پر اس خاتون نے ایک لمبی خاموشی اختیار کر لی۔ لگا کہ رانگ نمبر لگ گیا ہے یا لائن کٹ گئی ہے۔ ریسیور رکھنا ہی چاہ رہا تھا کہ کپکپاتی آواز آئی۔

"جس انڈین کا تم پوچھ رہے ہو، وہ، وہ، مدت ہوئی یہ جگہ چھوڑ گیا۔ اس نے اپنا فلیٹ خرید لیا تھا، ہر کرسمس پر وہ عمدہ سا کارڈ ضرور بھیجا کرتا ہے God Bless Him کو۔۔۔ میں اس کا فون نمبر اور پتہ تمہیں دیتی ہوں۔"

شنکر کی قیام گاہ لندن کے مضافات ایسٹن ٹاؤن میں تھی۔ بیٹے بھر کا

دفتری کام اور اس کی مصروفیتی سے فارغ ہونے پر ہی ملاقات ممکن تھی۔ لہذا ویک اینڈ کے ابتدائی روز ہم نے اطمینان سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی صبح کا پہلا پہر ٹھیک طرح سے جوان نہ ہوا تھا کہ میں شنکر کے فلیٹ پہ موجود۔ اسے بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔ "وقت" نے اس کے ساتھ مناسب سلوک نہیں کیا تھا اس کی شخصیت میں کئی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ میں حیران تھا اور مجھے قلق بھی ہو رہا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نو دس برس کا عرصہ آدمی کے بدن اور اس کے نقش و نگار پر کہیں نہ کہیں اپنی چھاپ ضرور چھوڑا کرتا ہے اور اس کی خارجی شخصیت کیا سے کیا بن جایا کرتی ہے، مجھے شنکر کی شخصیت میں تبدیلیاں غیر متوقع لگ رہی تھیں۔

پچھلی بار جب میں نے شنکر کو دہلی کے ایک معقول رستوراں میں رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا تو اس کی صورت کا ہر تیکھا نقش، چھریرے بدن کا ہر انگ، بھرپور جوانی کا ہر تیور اور بہترین تراش کا ہر کپڑا اپنی زبان خود بول رہا تھا۔ رستوراں میں موجود ہر شخص اس کی دلکش شخصیت سے اتنا متاثر تھا کہ لوگ بار بار نگاہیں گھما کر اسے دیکھ رہے تھے۔ اس وقت میرا عالم یہ تھا کہ خود میں اس کی صحبت میں اپنے کو قد آور پا رہا تھا۔ لیکن اب اس کی آنکھوں پہ موٹا سا چشمہ تھا۔ چہرے کا ہر نقش بجھتا ہوا سا، گھنے بال ساتھ چھوڑتے ہوئے اور بدن پر کئی تہیں ابھر آئی تھیں۔ اس کے فلیٹ میں داخل ہونے پر وہ شدت کے ساتھ مجھ سے لپٹ گیا اور اسی انداز میں دیر تک بے حس و حرکت کھڑا رہا تھا۔ لگا کہ وہ یہاں قیام اختیار کرنے پر بہت ہی اکیلا ہو گیا ہے یا مجھ میں اپنے چھوڑے ہوئے دیس کو تلاش کر رہا ہے۔ اس پل مجھے اس کی ذہنی صحت پر قدرے تشویش بھی ہوئی تھی۔ اس سے نظریں چرا کر میں نے لاؤنج پر نگاہ دوڑائی۔ تمام جدید ترین لوازمات موجود تھے۔ فرنیچر سے لے کر برقی اشیا تک، بعض چیزیں تو ایسی تھیں کہ وہ میرے لئے مقناطیسی کشش رکھتی تھیں۔ خاص طور پر ٹیلی ویژن۔ ویسا شاندار ٹیلی ویژن دیکھنے کا اتفاق مجھے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ یہی حال دیگر اشیا کا تھا۔ ویڈیو، ہائی فائی، لیمپ اسٹینڈ، قالین، تصویریں اور ٹیبل لیمپ، فرنیچر اس معیار کا تھا گویا انتباہ دے رہا ہو کہ مجھے سوچ سمجھ کر ہاتھ لگانا، ورنہ تمہارا ہاتھ جھٹک ڈالوں گا۔ لگا کہ میں واقعی کسی امیر کبیر شخص کے دولت کدے پہ چلا آیا ہوں، جس نے اس ملک میں اپنی بنیاد کو ٹھوس بنا کر اپنی کلاس بھی بدل ڈالی ہے۔ لیکن بیک وقت مجھے تعجب بھی سخت ہو رہا تھا کہ مجرد ہوتے ہوئے بھی اس نے فلیٹ کو کتنا صاف ستھرا، کتنا جاذب نظر، کتنا نفیس رکھا ہے۔ اس کے جمالیاتی ذوق اور اس کی پسند پر بے ساختہ میں نے داد دی۔ لیکن وہ سنی ان سنی کر کے پوچھ بیٹھا۔

"ناشتہ کرو گے؟"

بھلا میں کیا جواب دے سکتا تھا۔ صبح ہوٹل چھوڑتے وقت کانٹی نینٹل بریک فاسٹ ضرور کیا تھا۔ لیکن نئے ماحول میں، آب و ہوا بدلنے پر جگر کا کام بھی بدل جاتا ہے۔ اور اشتہا کا بڑھ جانا یا گھٹ جانا فطری قرار دیا جاتا ہے۔

میں واقعی اپنا معدہ خالی پا رہا تھا۔ لیکن مارے شرم کے لب وانہ ہوئے منہ پھیر کر ٹیلی ویژن کو دیکھنے لگا۔ لیکن وہ میرے چہرے سے ہو کر میرے اندرون تک پہونچ چکا تھا۔ کالج کے ابتدائی دنوں سے ہی لوگوں کے چہرے کے ذریعہ ان کا ذہن پڑھنا اس کا محبوب مشغلہ رہا تھا۔ اس وجہ سے طلبا اس سے فاصلہ رکھا کرتے تھے لیکن میرا رویہ اس کے متعلق یکسر مختلف تھا۔ وہ میرا عاقل و دانا دوست تھا اور مجھے اس کی ہر بات، ہر فیصلہ منظور تھا۔

مہاگنی لکڑی کی گہری سرخ میز پر ہم مقابل بیٹھے بریک فاسٹ کر رہے تھے۔ میز پر لیموں کا اچار بھی دھرا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے ساوتری کی یاد آ گئی۔ اس کا ہر کھانا اچار کے بنا ادھورا رہا کرتا تھا۔ کل شام میں نے فون پر اس کی اور نو وارد کی خیر خیریت دریافت کی تھی۔ اس نے بتایا کہ سب کشل منگل ہے ابھی چند روز باقی ہیں، میرے لوٹنے پر ہی آنے والا اس دنیا میں قدم رکھے گا۔ پلیٹ میں لیموں کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا رکھ کر میں بولا۔

"یار شنکر یہ بتاؤ، یہاں جاب پوزیشن کیا ہے؟ کام آسانی سے مل جاتا ہے؟ وہ مسکرایا، پھر میری آنکھوں میں اتر کر بولا۔ "کیوں؟ یہاں آنے کا ارادہ ہے؟"

"میرا نہیں، لیکن تمہاری بھابی کا خیال یہی ہے۔"

"تو پھر ایک کام کرو، بھابی کو یہاں بھیج دو اور خود وہیں رہو۔"

جملے کی نزاکت اور لطافت سے محظوظ ہو کر ہم اپنی اپنی پلیٹ پر جھک گئے۔ آملیٹ کا ٹکڑا کاٹ کر منھ کے پاس لاتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ ملاقات میں اس موضوع پر مفصل بات کروں گا۔ لیکن وہ توسٹ پر مکھن لگاتے ہوئے مجھے غور طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر جانے کیا ہوا کہ یک لخت توسٹ اور چھری اس کے ہاتھوں میں فریز ہو گئے۔ وہ قدرے تاسف کے ساتھ بولا!۔

"بیک ہوم (Back Home) آج بھی ہمارے لوگ سمجھتے ہیں کہ لندن، برلن، پیرس، ٹورانٹو اور کیلی فورنیا کی سڑکیں نوٹوں سے بھری پڑی ہیں۔ وہاں پہونچ جاؤ تو زندگی کا نقشہ بدل جاتا ہے۔" آرنج جوس کے گلاس سے گھونٹ بھرتے ہوئے مجھے خوشی ہوئی کہ جو بات میں اگلی ملاقات کے دوران کرنے کی سوچ رہا تھا، وہ یقیناً ناشتے کی میز پر مکمل ہو جائے گی۔ موقع کا فائدہ اٹھا کر میں نے فوراً موضوع سے وابستہ ایک پہلو پر اشارہ کیا۔

"یار مجھے یہاں آئے ہوئے سات آٹھ روز ہوئے ہیں۔ مضافات کی بابت مجھے کوئی علم نہیں۔ آج پہلی بار اس طرف آنا ہوا ہے۔ لیکن سینٹرل لندن کے ہر علاقے میں میں نے اپنے لوگوں کی دکانیں، رستوراں، ہوٹل، سپر مارکیٹس، چھوٹی بڑی دکانیں بہت دیکھی ہیں۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہم لوگوں نے اتنی ترقی کی ہے کہ انگریز حیران ہیں اور پریشان بھی، ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ پچھلے پندرہ بیس برسوں میں یہ لوگ کہاں سے کہاں پہونچ گئے ہیں۔ مگر یقین جانو یہ سب

حاصل کرنے کے لئے ہم نے بہت بڑی قیمت چکائی ہے۔ اپنے لوگوں نے یہاں آکر بارہ بارہ، چودہ چودہ گھنٹے کام کیا ہے۔ کیا دن، کیا رات، ساتوں دن کام پر جٹے رہے ہیں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ قصے پرانے ہو چکے۔ دنیا بہت آگے نکل گئی ہے۔ مگر ایک بات جو اکثر مجھے پریشان کرتی ہے وہ بالکل الگ ہے۔۔ غور سے سنو۔"

میں اپنے تمام تر حواس مجتمع کر کے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس کے ہاتھوں میں چھری کانٹا فریز ہو گئے۔

آج ہم لوگوں کے پاس کیا نہیں ہے، مکانات سے لے کر بڑے بڑے کاروبار تک۔ روز بروز سوسائٹی کے ہر شعبے میں ہماری جڑیں مضبوط ہوتی جا رہی ہیں۔ اور اب تو فنانس کے میدان میں ہمارے کئی بینکر بھی اتر آئے ہیں۔ مگر افسوس، اس سوسائٹی میں ہمارا کوئی وقار، کوئی رتبہ، کوئی مقام نہیں ہے۔ ہم آج بھی دوسرے، تیسرے درجے کے شہری قرار دیئے جاتے ہیں۔ آنے والی نسلوں کے ساتھ بھی شاید یہی سلوک ہوگا۔"

یہ سن کر میں ذرا چکرایا۔ میں تو اس خیال میں تھا کہ یہ سوسائٹی بڑی مہذب ہے، یہاں کے لوگ تہذیب یافتہ، دردمند اور روشن خیال ہیں۔ سابق آقا ہونے کے ناطے اپنی سابق نو آبادیوں کے باشندوں کے لئے یہ لوگ نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی برعکس ہے۔ میں اس قدر محتاط ہو گیا کہ اپنی پلیٹ کو فراموش کر بیٹھا۔

"کیلاش پربت،" (وہ کالج میں مجھے اسی نام سے پکارا کرتا تھا اور میں اسے نیل کنٹھ کہا کرتا تھا۔ حالانکہ دونوں القاب بھگوان شیو سے ہی منسوب تھے) یقین جانو میں نہیں جانتا میرے پڑوس میں، کون رہتا ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ شخص سفید فام ہے۔ کبھی برآمدے میں یا لفٹ میں آمنا سامنا ہو جائے تو ہم محض 'ہیلو' کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں اور یہاں پہونچ کر پڑوسیوں کا کھیل تمام ہو جاتا ہے۔"

وہ یقیناً میرا ردعمل جاننے کا خواہشمند تھا۔ لیکن میرا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔ کیوں؟ میں خود بھی حیران تھا کہ مجھ پر اس کی باتوں کا اثر کیوں نہیں ہو رہا ہے۔؟

"صبح گھر سے نکلتا ہوں تو سفید لوگوں کی نظریں کہتی محسوس ہوتی ہیں کہ تم تعلیم یافتہ ڈگری یافتہ ضرور ہو۔ مگر یہ ملک تمہارا نہیں ہے۔ اس ملک کے ساتھ تمہارا رشتہ کبھی نہیں رہا۔ پھر یہ ملک تمہارا کیسے ہو سکتا ہے؟ ذرا سوچو تو تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ واپس لوٹ جاؤ۔"

"اس وقت تم کیا محسوس کرتے ہو؟"

"میری گردن جھک جاتی ہے اور میں دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتا ہوں کہ ان کا کہنا بالکل صحیح ہے۔ واقعی اس زمین سے میرا واسطہ کبھی نہیں رہا اور نہ کبھی ہوگا۔ میں اگر یہاں رہ بھی رہا ہوں تو محض پیسوں کی خاطر۔ ورنہ میری نسل اور یہ ملک آپس میں ایک آنکھ نہیں بھاتے۔"

"تمہارے بعد کی نسل تو یہاں پیدا ہوئی ہے کیا وہ بھی تمہاری طرح محسوس کرتی ہے؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ وہ خود کو اس ملک کا اٹوٹ حصہ سمجھتی ہے اس کا اپنے والدین کے چھوڑے ہوئے ملکوں کے ساتھ رشتہ برائے نام ہی رہ گیا ہے۔"

"سچ؟"

"ہاں۔ وہ اب صرف نام کے ایشیائی ہیں۔ ان میں اور انگریز میں کوئی فرق نہیں رہا بلکہ وہ میری اور مجھ سے پہلے والی نسل کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔"

نئی نئی سچائیاں میرے سامنے آرہی تھیں، جنہیں برداشت کرنا میرے لئے مشکل ہوا جا رہا تھا۔ اپنی پوری ہمت کو یکجا کر کے میں نے ذرا تیکھے لہجے میں کہا۔

"شنکر، اگر یہاں ایسا ہے تو تم اپنی ذات پر ظلم کیوں ڈھا رہے ہو؟ اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟۔ واپس کیوں نہیں لوٹ جاتے؟ کس نے روکا ہے تمہیں؟"

اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کا دیرینہ دوست، جو عرصہ دراز کے بعد اس سے ملا ہے، بالمشافہ اس ڈھنگ کا سوال پوچھ بیٹھے گا۔ اسے میرے رویے پر تعجب تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ ماند سا پڑ گیا تھا۔ لیکن میں نے اپنی زبان روکی نہیں۔

"تم پروفیشنل ہو۔ نوکری حاصل کرنا تمہارے لئے کوئی سمیا نہیں۔ اب تم انگلینڈ کا تجربہ بھی رکھتے ہو۔ سند یافتہ ہونے کے کارن چاہو تو اپنی کمپنی بنا کر کام شروع کر سکتے ہو۔ وہاں کئی نودولتیے پیسہ لگانے کو تیار بیٹھے ہیں۔"

"جانتا ہوں۔" چھری کانٹا پلیٹ میں پھینک کر وہ بولا: "کئی بار ان خطوط پر سوچ چکا ہوں۔ مگر میری ٹریجڈی بہت الگ ہے۔"

وہ کیا ہے؟"

"اس میں کوئی شک نہیں۔ بیک ہوم اپنے لوگ مجھے دل و جان سے قبول کرتے ہیں۔ میرا احترام بھی کرتے ہیں۔ میں ان کے درمیان گردن اونچی کر کے چلتا ہوں۔ کوئی مجھے غیر نظروں سے نہیں دیکھتا۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔"

"رک کیوں گئے؟ آگے کہو۔"

"وہاں کا سماجی، سیاسی اور معاشی نظام اتنے کرپٹ (Corrupt) ہو چکے ہیں کہ قدم قدم پر مجھے ذہنی جھٹکے لگتے ہیں۔ ہر چیز کے لئے ہر کام کے لئے مجھے جیب ہلکی کرنی پڑتی ہے۔ کبھی کبھی اتنا پریشان ہو جاتا ہوں کہ رات کی نیند کھو بیٹھتا ہوں۔"

"اس وقت تمہارا ضمیر کوئی نہ کوئی مشورہ تو دیتا ہوگا؟"

وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کے خاموش رہنے پر میں بھی خاموش ہو گیا۔ پھر وہ یکبارگی میز سے اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔ لوٹا تو اس کے

دائیں ہاتھ میں گلاس تھے اور بائیں میں وائن کی سرد بوتل۔ میں حیران کہ پہلے پہر کے جوان ہوتے ہی اسے دو آتشہ کی طلب کیونکر محسوس ہوئی ہے؟ گلاس بھر کے وہ بولا۔

"تم کیا جانو مجھے اپنے دیس سے کتنی محبت ہے۔ میں آج بھی اپنی جڑیں وہیں دیکھتا ہوں۔ ہر ڈیڑھ دو برس پر گھر واپس کرتا ہوں۔"

"کیا۔۔۔؟"

"ہاں۔ تم سے اس لئے نہیں مل پاتا کہ میری الجھنیں اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ میں ان میں دب کر رہ جاتا ہوں اور تمھیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

اس کے گلاس اٹھانے پر مجھے بھی اخلاقاً گلاس اٹھانا پڑا۔

"میں وہاں چھ چھ، آٹھ آٹھ ہفتے رکتا ہوں۔ ہر بات کا جائزہ قریب سے لیتا ہوں۔ بدلتے ہوئے حالات کو سمجھتا ہوں، پھر ان کا تجزیہ اپنے حساب سے کرتا ہوں، صرف اس غرض سے کہ میں اس سوسائٹی میں خود کو کہاں تک اڈجسٹ کر سکتا ہوں؟"

"پھر تمہارا دل کیا کہتا ہے؟"

"بس ایک ہی بات کہ یہ سوسائٹی جیسی بھی ہے، اسے قبول کر لو۔ اگر اس کا حصہ بن سکتے ہو تو رک جاؤ، ورنہ واپس لوٹ جاؤ۔"

"اور تم ہمیشہ لوٹ آتے ہو؟"

"ہاں۔ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ نہیں۔"

"میں سمجھ سکتا ہوں، کیوں؟" وائن کا ہلکا سا گھونٹ بھر کر میں بولا: "نیل کنٹھ، تم یورپ میں رہتے ہو۔ مگر تمہارا ذہن راجہ ہریش چندر، مہاتما بدھ اور گاندھی جی کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ کیوں بھولتے ہو کہ یہ صدی آخری دموں پہ ہے۔ تیسری دنیا بے حد کرپٹ ہو چکی ہے، بلکہ اسے دانستہ کرپٹ کیا گیا ہے، اپنے مفاد کی خاطر۔ بعض طاقتیں اپنا کلچر (Culture) تیسری دنیا کے ہر ملک میں پھیلانے کا خواب دیکھ رہی ہیں اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو رہی ہیں۔"

وہ خاموش رہا۔ غالباً وہ ان حقائق سے واقف نہ تھا اور اگر تھا بھی تو اس نے خاموشی کو بڑی چابکدستی سے اپنی سنگین ڈھال بنالیا تھا۔ مجھ سے چپ نہ رہا گیا۔

"کیوں بھولتے ہو کہ جب تمہارے سامنے بے شمار رنگ بکھرے ہوں، پھیلے ہوں اور تم خود کو ان رنگوں میں شامل نہ کرو تو انجام کیا ہوگا؟ بے رنگ ہو کر رہ جاؤ گے۔"

اس کی آنکھیں مجھ میں ڈوب رہی تھیں۔ لیکن ہاتھ سیدھا گلاس کی طرف بڑھ کر اسے اٹھا چکا تھا۔ بولا: "ہم دونوں نے بی، کام (B.Com) کی ڈگری ایک ہی یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ لیکن اس دوران تم فلاسفر بھی بن چکے ہو" اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

میں کہنا چاہتا تھا کہ جب حالات سازگار نہ ہوں، مالی پریشانیاں سر اٹھائے کھڑی ہوں، تلخ حقائق کا سامنا کرنا پڑے اور انسانی فطرت کی ناپائیداری شخصیت کے پرزے اڑاتی پھرے تو بہت کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ لیکن میں نے اس سے وہ کہا، جو آئندہ اس کے کام آئے۔

"ایک معروف مقولہ ہے When you go to Rome, do as Romans do۔ اگر تم لوٹنا چاہتے ہو تو تو کچھ قربانیاں دینی ہوں گی۔ بس۔ بڑا سیدھا سا فارمولا ہے۔ رقم ادا کرو، کام کراؤ اور چین کی نیند سو جاؤ۔ کوئی قانونی چارہ جوئی نہ ہوگی۔ وہ اگر ہو بھی گئی تو اس کے توڑ موجود ہیں۔"

"میں نے ہر بار یہی محسوس کیا ہے۔"

"تو پھر کیا تکلیف ہے تمھیں؟ کیوں بھولتے ہو کہ حکومت کا ہر کارندہ اپنی حیثیت کے مطابق اور کام کی نوعیت کے مطابق دام وصول کرتا ہے۔ اس کی رقم بندھی ہوئی ہے۔ اب یہ روایت ہماری طرز زندگی، طرز نظام اور طرز حکومت کا حصہ بن چکی ہے۔ اب کوئی بھی شخص دیتے دلاتے وقت برا نہیں سمجھتا کہ وہ کوئی غیر اخلاقی۔ غیر قانونی حرکت کر رہا ہے۔"

"مگر میں یہ سب نہیں کر سکتا۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔ "میرا ذہن بدل چکا ہے، میری سوچ بدل چکی ہے۔ میرا اندرونی نظام بدل چکا ہے۔"

اس کی یہ بات میری سمجھ میں آنے لگی تھی کہ دو تہذیبوں کا متقابل ان کے تمدنی فاصلے، اخلاقی تقاضے، دو عظیم جنگیں، تباہی، ذاتی تحفظ کا گہرا احساس، مادی اونچ نیچ، اور زر کی ہوس اس صدی میں وہ وہ رنگ دکھائے ہیں کہ کوئی حساس اور دانشمند شخص اخلاقی اور ذہنی کش مکش کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ کہیں وہ ضمیر کا قیدی بن گیا تو کہیں اس نے اپنا ضمیر سر عام فروخت کر ڈالا اور کہیں سمجھوتا اس کا ایمان بن گیا۔

"یقین کرو یہاں کا ماحول بالکل الگ ہے۔ سیاسی، سماجی، معاشی نظام کی بنیادیں گہری اور پرانی ہیں۔ ان کے تمام ادارے دستور کے مطابق کام کرتے ہیں"

"کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ اس سوسائٹی میں کوئی سکینڈل (Scandal) نہیں ہوتا؟ کوئی شخص رشوت نہیں لیتا؟ کوئی غیر قانونی سودا نہیں ہوتا؟"

"نہیں یہاں بھی بہت کچھ ہوا کرتا ہے، خاص طور پر اونچی سطح پر۔ مگر یقین کرو اس سے ایک عام شخص کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسے اپنے کام کے واسطے دینے دلانے کی نوبت پیش نہیں آتی۔ کوئی کسی کے آگے ہاتھ پھیلا کر کھڑا نہیں ہوتا کہ پیسہ لاؤ تو کام کریں۔"

میں نے آنکھیں چرا کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا اس کے اصل معاملے کو سمجھ چکا تھا۔ لیکن میں ہر لفظ اس کی زبانی سننا چاہتا تھا۔

"یقین کرو میں خود کو پھر بھی اس سر زمین پر اجنبی سمجھتا ہوں۔ یہاں کے لوگ مجھے دل سے قبول نہیں کرتے۔"

اس نے کم و بیش وہی کہا، جو اس سے بغلگیر ہوتے وقت میں نے محسوس کیا تھا۔ بلا شبہ اس نے مجھے قریبی دوست سمجھ کر اپنا شفاف دل ایک

مرتبہ پھر میرے سامنے ڈال دیا تھا۔ لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ دونوں براعظموں کو کھو بیٹھا ہے۔ ایک اس کے لئے گئی گزری کہانی بن چکا ہے۔ وہ نہ کا رہا ہے نہ باہر کا۔ داخلی شناخت اس کا اہم مسئلہ بن چکی ہے۔ اس کا جسم یورپ میں ہے تو روح وطن عزیز میں۔ اچانک مجھے ایک ہندو دیومالائی کردار ترشنکو یاد آگیا، جو دھرتی اور آکاش کے بیچ رشی وشوامتر اور وشسٹ کی ذاتی لڑائی کے کارن کیوں پہلے لٹک کر رہ گیا تھا۔ شاستروں کے مطابق وہ آج بھی وہیں میں لٹکا ہوا ہے۔ شنکر کے حالات ترشنکو سے بہت مختلف تھے، لیکن بنیادی مسئلہ ایک تھا۔ کون سی جگہ میری اپنی ہے؟ کس مقام پہ میں کھل کر سانس لے سکتا ہوں؟۔۔۔ اور کس مقام پر میرا دم نکلے گا؟

کچھ دیر تک ہم خاموش بیٹھے رہے، پھر مجھ سے رہا نہ گیا۔

"تم نے ترشنکو کا قصہ ضرور سنا ہو گا؟"

"ہاں"۔ زیر لب یہ کہہ کر اس کا چہرہ بالکل ہی بجھ گیا۔ لگا کہ وہ کوئی اور ہی شخص ہے، ایسا شخص جس نے اپنی پوری ہستی گنوا دی ہو سامنے بیٹھا ہو اور اب وہ اپنے بھگوان، اپنے ستاروں اور اپنی تقدیر کے رحم و کرم پر زندہ ہو۔

"ترشنکو کو جنت کا لالچ تھا۔ مگر اسے جنت نہ ملی۔ وہ زمین اور آسمان کے درمیان میں لٹک کر رہ گیا۔ میں دھن دولت، مادی اشیا اور بہتر زندگی کے لالچ میں پردیس چلا آیا۔ مجھے سب کچھ ملا۔۔ مگر میرا دیس مجھ سے چھوٹ گیا۔"

میرے کانوں میں ساوتری کے الفاظ گونج رہے تھے۔ "اب تم یورپ جا رہے ہو تو وہاں اپنا ٹھکانا بنانے کی۔۔۔" اس کے آگے میں کچھ نہ سن پایا۔ جھٹ سے بوتل اٹھا کر میں نے گلاس اتنی تیزی سے بھرا کہ شراب چھلک کر میز پر پھیل گئی۔ ◢ ◢

مصطفی کریم

"ڈوروتھی۔ کرسمس ٹری کو یہاں سے ہٹادو۔" صوفہ پلنگ پر لیٹی ایڈنا اپنی بہن سے بولی۔ ڈوروتھی سلگتے آتشدان کے پاس کھڑی کارنس پر رکھے کرسمس کارڈ کو مغموم تک رہی تھی۔ کرسمس کارڈ پیانو۔ میز اور ننھی الماری پر بھی سجے تھے۔

"کیسے ہٹادوں؟ گملے سمیت اسے کھسکانا بھی مشکل ہے۔" ڈوروتھی نے بغیر بہن کی جانب دیکھے جواب دیا۔

"روشنی کے بغیر یہ بھیانک لگ رہا ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے گھر میں تاریکی ہے۔"

ایڈنا کمر کے شدید درد میں مبتلا تھی۔ بوسیدہ رسالے کے ورق جیسا اس کا چہرہ پریشان تھا۔

"تمہیں ایسا نہیں محسوس کرنا چاہئے۔ کمرے میں بجلی کا بلب روشن ہے۔" ڈوروتھی بولی اور پاس کے صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔ اسکی نگاہیں آتشدان میں اٹھتے شعلوں پر تھیں۔ ہیئر ڈریسر نے صبح کے وقت آکر دونوں بوڑھی بہنوں کے سفید بالوں کو سنوار دیا تھا۔ لیکن میک اَپ کے بغیر دونوں کے چہرے کچھ زیادہ ہی ضعیف لگ رہے تھے۔

"یہ روشنی کس کام کی؟ کل کرسمس ہے۔ کاش ہمارے کرسمس ٹری پر روشنیاں ہوتیں اور تحفے ٹانگے جاتے۔ تم پھر کوشش تو کرو۔" ایڈنا نے اس کو منانے کے لہجے میں کہا۔

"کیا تو تھا۔ تاروں کو سلجھانے میں بار بار جھکنا اور کھڑا ہونا۔۔۔۔۔ مجھ سے اتنی محنت نہیں ہو سکتی۔ پلگ میں بھی کوئی خرابی ہے۔ اور تحفے؟ کسے دینا ہے؟" ڈوروتھی تھکی ہوئی آواز میں بولی۔

پانچ فٹ اونچا سرو کا درخت گملے میں لگا تھا۔ اس کے گرد فرش پر بجلی کے تار ننھے ننھے سرخ، سبز، زرد اور نیلے بلب سمیت الجھے پڑے تھے۔ قریب کی میز پر چاکلیٹ کے ڈبے، سستی کتابیں، کنگھیاں اور آئینے چمکیلے کاغذوں میں لپٹے ہوئے تھے۔

"چھوٹے بھائی نے صرف کرسمس کارڈ بھیج دیا اور فون پر مبارکباد دیدی۔ وہ اپنے بچوں سمیت آج گیا بھی نہیں۔

"ایڈنا۔ اب اسکے بچے جوان ہو چکے ہیں، انہوں نے اپنے گھر بسا لئے ہیں۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ان کے یہاں گیا ہوگا۔ برفباری ہو رہی ہے۔ وہ آنا چاہتے بھی تو مشکل ہوتا۔"

"کیا بہت برف گر رہی ہے؟" ایڈنا نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ دبلی پتلی اور کمبل میں سکڑی ہوئی وہ خزاں رسیدہ چیری کے درخت جیسی لگ رہی تھی۔

ڈوروتھی اٹھ کر کھڑکی کے پاس گئی اور دبیز سرخ پردے کو ہٹا کر اس نے باہر جھانکا۔ سفید موتیوں جیسی برف ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

"بہت نہیں۔ بس اتنی کہ۔۔۔"

"کہ کل وہائٹ کرسمس ہوگا۔ ہے نا۔۔۔" ایڈنا نے آنکھیں کھول دیں۔ ان میں بشاشت آگئی۔

"ہاں۔۔۔ عین ممکن ہے۔ اخبار میں بھی یہی اطلاع تھی۔" ڈوروتھی ابھی تک کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ اس کی سانسوں کے باعث ایک دھند سی کھڑکی کے شیشے پر بن گئی تھی۔

"وہائٹ کرسمس؟ باہر کے مناظر کل کتنے حسین ہونگے! افسوس میں ان سے لطف اندوز نہ ہو سکوں گی۔ پلنگ سے اٹھنا محال ہے۔" ایڈنا پھر اداس ہو گئی تھی۔

"اٹھ بھی سکتیں تو جاتیں کہاں؟ موٹر تو ہے نہیں ہمارے پاس۔" ڈوروتھی منہ سکیڑ کر تلخی سے بولی اور واپس آکر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اسکا جسم بھاری تھا۔ صوفہ دھنس کر رہ گیا۔

"چل پھر سکتی تو کل باہر نکل کر گھوم لیتی۔ لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ اب چلنا بھی مشکل ہے۔ اکثر سوچتی ہوں بوڑھے لوگوں کے گھر میں جا کر رہوں۔"

"تم وہاں چلی جاتیں؟ میں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہونے دیتی؟۔ تم۔۔۔ تم۔۔۔ اپنی چھوٹی بہن کو چھوڑ کر چلی جاتیں؟ میں بھی جوان نہیں رہی ایڈنا۔ میرے پاس اتنی رقم نہیں کہ میں بھی تمہارے ساتھ بوڑھے لوگوں کے گھر میں رہنے جاؤں۔"

دونوں بہنیں چپ ہو گئیں۔ سناٹے میں پیانو پر رکھی قدیم گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی۔

"کتنی خاموشی ہے۔"

"نہیں ایڑنا خاموشی نہیں ہے۔ ہم تم باتیں تو کر رہے ہیں۔"

ایڑنا نے آہستہ سے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ اسکی نگاہیں کمرے میں رکھے کرسمس کارڈوں پر گھوم گئیں۔

"کتنے سارے کرسمس کارڈ آگئے ہیں۔"

"جیسے سارا شہر ہمیں جانتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف پڑوسیوں سے ہماری ملاقات ہوتی ہے اور کسی سے ملنا جلنا نہیں ہوتا۔ مہینے میں دو تین بار چھوٹا بھائی فون کر دیتا ہے اور کبھی کبھی ملنے آجاتا ہے۔" ڈوروتھی شانے اچکا کر ایک بے جان سی ہنس دی۔

"طاہر اور غزالہ، کے کارڈ نہیں آئے ؟"

"نہیں ایڑنا۔ پچھلے کرسمس میں بھی نہیں آئے تھے۔ دونوں مختلف شہروں کی یونیورسیٹی میں پڑھ رہے ہیں۔"

"کارڈ تو بھیج سکتے تھے۔ کرسمس ہے۔ دونوں اسی شہر میں اپنے والدین کے پاس ہو نگے۔"

"ضروری نہیں۔ کرسمس انکا تہوار تو ہے نہیں۔" "تم نے انہیں بڑی محبت دی تھی۔ یہی موقع یاد کرنے کا ہوتا ہے۔" ایڑنا آنکھیں بند کئے بولی۔ وہ طاہر اور غزالہ، کی بابت سوچ رہی تھی۔ جنکی رنگت اور گھر میں گرم مسالے کی بو ہوتی تھی اور جنکے والدین گھر میں ڈھیلے ڈھالے پاجامے پہنتے تھے۔ اسے ساری اطلاعات ڈوروتھی سے ملا کرتی تھیں۔

"وقت کے جنگل میں یادیں گم ہو جاتی ہیں۔ انکے والدین کام پر چلے جاتے تھے۔ گھر میں کسی ایسے فرد کی ضرورت تھی جو دونوں بچوں کی دیکھ بھال کر سکے۔ وہ کام میں نے کر دیا۔ اجرت مجھے مل جاتی تھی۔ طاہر اور غزالہ، جب بڑے ہو گئے تو انکے گھر میں میری ضرورت نہ رہی۔ کوئی ضروری نہیں کہ دونوں مجھے یاد رکھیں۔" ڈوروتھی اداسی سے بولی۔ وہ اپنے زرد سوئٹر کی آستینوں کو تک رہی تھی، جنکے دھاگے نکل آئے تھے۔

"دوسروں کے بچے اپنے نہیں ہو سکتے ڈوروتھی۔"

"میں نے ایسا کبھی نہیں سمجھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ لوگ مجھ پر مہربان بہت تھے، طاہر اور غزالہ، بھی مجھے چاہتے تھے۔ انکے والدین نے ہمیشہ اپنائیت کا اظہار کیا۔ ہر کرسمس پر دونوں بچے تحفوں سے لدے آتے تھے۔ انکے گھر میں شراب نہیں پی جاتی تھی۔ لیکن ہمارے لئے شیری اور سویٹ وائن کی بوتلیں۔ بسکٹ کے ڈبے، مفلر، جرابیں ـــ" ان یادوں سے خوش ہو کر ڈوروتھی ہنسنے لگی۔

"تحفے تو اب بھی تمہارے لئے آتے ہیں۔"

"ہاں چیک کی صورت میں کوئی رقم آجاتی ہے۔ بچے جب تحفوں سمیت آتے تھے تو اسکی بات ہی جدا تھی۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

"ڈوروتھی رک جاؤ۔ میں ذرا کروٹ بدل لوں۔ چت لیٹے لیٹے تھک آگئی ہوں۔" ایڑنا بولی۔ اس نے کروٹ لینے کی کوشش کی۔ فوراً ہی اس کی کمر میں زور کی ٹیس بجلی کی لہر بن کر اٹھی۔

"اف خدایا۔ ڈوروتھی۔ بہن ـــــ مدد کرو۔"

وہ ایڑنا کی جانب لپکی۔

"ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے کمر میں خنجر بھونک دیا۔ ڈاکٹر کی گولیوں سے ابھی تک فائدہ نہیں ہوا ہے۔" ایڑنا کا ایک ہاتھ کمر پر تھا اور چہرے پر اذیت کی شکنیں تھیں۔ ڈوروتھی نے کروٹ بدلنے میں بہن کی مدد کی۔ اور تکیے اسکی پیٹھ سے لگا دیئے۔

"تم نے میری بڑی خدمت کی ہے ڈوروتھی۔"

"میرے مقدر میں خدمت کرنا لکھا ہے۔ ماں ضعیفی میں اندھی ہو گئی۔ باپ پر فالج گرا۔ پھر چھوٹا بھائی جو عمر میں مجھ سے بارہ سال چھوٹا تھا، اسکی دیکھ بھال بھی مجھے ہی کرنی پڑی۔ ـــ تم نے اچھا کیا اسکول میں پڑھانے نکل گئیں۔"

"سارے الیئے میرے جانے کے بعد ہوئے ورنہ، ضرور تمہارا ہاتھ بٹاتی۔"

"پھر تم بھی میری طرح نادار رہ جاتیں۔ والدین کے مرنے کے بعد بڑے بھائی نے قانون کی رو سے ساری جائداد پر قبضہ کر لیا، ہمیں ایک کوڑی بھی نہیں ملی۔ خیریت ہوئی والد نے یہ گھر اپنی زندگی میں خرید کر ہمارے نام کر دیا تھا۔ ورنہ نہ معلوم میں کہاں جاتی۔ تمہارا گزارا ہو ہی جاتا۔ پنشن جو ملتی ہے۔"

"تم شادی کر سکتی تھیں۔ اچھی شکل صورت والی ہو۔"

تم کونسی بد شکل ہو ؟ کیوں بن بیاہی رہ گئیں ؟" اپنی تعریف پر مسکرا کر ڈوروتھی نے پوچھا۔

"مرد ریل گاڑیاں ہوتے ہیں۔ اور ہم عورتیں اسٹیشن پر کھڑے مسافر۔ جب تک فیصلہ کریں سوار ہونا ہے یا نہیں، ٹرین روانہ ہو جاتی ہے۔" ایڑنا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"میں تو جیسے کسی قلعے میں محصور تھی۔ اندھی ماں، پھر فالج زدہ باپ، اسکے بعد چھوٹے بھائی کی دیکھ بھال۔ دل کے دروازے پر کسی نے دستک بھی دی تو مصروفیت کی وجہ سے میں سن نہ سکی۔"

بہن کے بجھے ہوئے چہرے کو ایڑنا نہیں دیکھ سکی، اسکا رخ دوسری جانب دیوار کی طرف تھا جہاں بڑے بھائی کی تصویر ٹنگی تھی۔ ایڑنا کی نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں۔ اسکے منہ سے ہلکی سی آہ نکل گئی۔

"کیا ابھی تک آرام نہیں کیا ایڑنا؟"

"آرام؟ مشکل ہے ڈورو تھی۔ سامنے دیوار پر بڑے بھائی کی تصویر ہے۔ میں اس سے نفرت نہیں کر سکی۔ ہم دونوں میں بڑی محبت تھی۔"

"مجھے اسکی کوئی خوبی یاد نہیں۔"

"وہ بہت ذہین تھا۔ اس نے کیمبرج سے ڈگری لی تھی۔ ہمارے خاندان میں کسی نے اتنی تعلیم حاصل نہیں کی۔"

"ایسی تعلیم کس کام کی جو انسان کو لالچی بنادے۔"

"وہ ایسا تھا نہیں ڈورو تھی۔ بیوی نے اسے بدل دیا۔" ایڑنا اپنی ناک ٹیشو پیپر سے پونچھتے ہوئے بولی۔ اسے بڑا بھائی شدت سے یاد آرہا تھا۔

"پھر وہ لالچی اور بد عقل دونوں ہی ہے۔ تمہاری وجہ سے اسکی تصویر یہاں لاؤنج میں ہے۔"

"والدہ کا پیانو۔ والد کی مخصوص میز اور چمڑے کی گدے دار کرسی، ہمارے بچپن کی تصویریں سچ تو یہ ہے کہ ہمارے آبائی گھر کی بہت سی نشانیاں یہاں ہیں۔ اسی لئے میں نے بڑے بھائی کی تصویر بھی یہاں ٹانگ دی۔"

آبائی گھر کے ذکر سے ڈورو تھی کی آنکھوں کے سامنے اسکا بچپن آگیا۔ اسوقت اسکے والدین خوش حال اور خوش و خرم تھے اور وہ اپنی ایک بہن اور بڑے بھائی کے ساتھ چہکتی پھرتی تھی۔ چھوٹا بھائی اسوقت پیدا نہیں ہوا تھا۔ کرسمس میں لندن کی سیر۔ برائٹن کے Promenade پر ہاتھوں میں غبارے پکڑے ہوئے بھاگنا۔ جب زندگی کا نام مسرت تھا۔ بھلی یادوں کی سرشاری سے اسکی آنکھوں میں ہلکا سا سرور آگیا۔

"آج کرسمس کی رات ہے مجھے برے خیالوں کو دل سے نکال دینا چاہئیے۔" ڈورو تھی ماضی کے خوشگوار باغ میں پھرتے ہوئے بولی۔ ایڑنا نے بھی ہاتھ کی ہلکی جنبش سے ہاں کردی۔

اچانک باہر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں بہنیں چونک پڑیں۔

"کون ہے؟" دروازے کے پاس پہنچ کر ڈورو تھی نے پکارا۔

"لِسلی۔ ہم طاہر اور غزالہ ہیں۔" دونوں بھائی بہنوں نے کسی نا معلوم وجہ سے بہار کے ایک پھول کا نام ڈورو تھی کو دے رکھا تھا۔

"آؤ۔ آؤ۔ اندر آؤ۔ خوش آمدید۔ اتنی سردی اور برفباری میں آگئے!" ڈورو تھی دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ اسکے چہرے پر سے افسردگی مٹ گئی اور چہرہ دھلے ہوئے شیشے کی طرح صاف ہو گیا۔ اس نے دونوں کے سرد گالوں کو باری باری چوما۔

"ایڑنا۔ دیکھو تو سہی کون آئے ہیں!" ڈورو تھی ہال سے پکاری۔

سانولے اور نوجوان طاہر اور غزالہ، دبلے پتلے تھے۔ پرانی مانوسیت کی وجہ سے دونوں کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے برف سے نم اپنی ٹوپیاں، مفلر اور کوٹ اتار دیئے۔ سب لاؤنج میں آگئے۔ طاہر اور غزالہ نے ایڑنا کو کرسمس مبارک کہی ایڑنا نے بھی مبارکباد کے وہی الفاظ استعمال کئے اور ہاتھ ہلا کر خوشی کا اظہار کیا۔ "یہ کرسمس کارڈ ہم لوگوں کی جانب سے ہیں اور یہ لفافہ، خاص طور پر تمہارے لئے والدین نے بھیجا ہے۔" ڈورو تھی کی جانب لفافوں کو بڑھاتے ہوئے طاہر بولا۔

وہ سمجھ گئی کہ لفافے میں تیس پاؤنڈ کا چیک ہوگا۔ یہی رقم اسے کرسمس کے موقعوں پر طاہر اور غزالہ کے والدین سے تحفے میں ملتی تھی۔ ڈورو تھی کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا۔ اس نے چیک والے لفافے کو میز پر رکھدیا اور کرسمس کارڈ کو کارنس پر سجادیا۔

"بہت بہت شکریہ۔ تمہارے والدین بہت مہربان ہیں۔ ان سے ضرور میرا سلام کہنا۔" ڈورو تھی مسکراتے ہوئے بولی۔

ایڑنا نے مڑ کر طاہر اور غزالہ، کی جانب دیکھنا چاہا لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

"تمہیں کیا ہوا ایڑنا؟" غزالہ نے محبت اور لگاؤ سے پوچھا۔

بھائی بہن صوفہ بستر کے قریب آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ جس پر کروٹ کے بل ایڑنا لیٹی تھی۔

"کمر کے درد نے مجبور کر رکھا ہے۔ دوا کھا رہی ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے بستر پر لیٹ کر آرام کرتی رہوں۔ دو ہفتے میں آرام آجائیگا۔ ڈورو تھی ذرا مدد کرو میں ان بچوں کی جانب رخ کرلوں۔"

"اب ہم بچے نہیں ہیں۔ غزالہ یونیورسیٹی کے پہلے سال میں ہے اور میں فائنل کر رہا ہوں" طاہر نے ہنستے ہوئے احتجاج کیا۔

"میری نگاہ میں بچے ہی رہو گے۔ وہ دن بھول گئے جب میں تم دونوں کو چلنا سکھا رہی تھی۔" ڈورو تھی بشاشت سے بولی اور ایڑنا کو کروٹ بدلنے میں مدد کرنے لگی۔ ایڑنا کراہتے ہوئے سیدھی ہو کر لیٹ گئی۔

"آؤ۔ میرے قریب آؤ۔" ایڑنا نے باری باری طاہر اور غزالہ کو چوما۔

"دونوں ہم عمر لگتے ہیں۔ ہے نا ڈورو تھی؟"

"غزالہ اپنے بھائی سے ایک سال چھوٹی ہے۔" ڈورو تھی نے بھائی اور بہن کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں پچھلے کرسمس میں کیوں نہیں ہمارے پاس آئے۔؟" ایڑنا نے بناوٹی غصے سے پوچھا۔

"ہم سب لوگ رشتہ داروں سے ملنے پاکستان گئے ہوئے تھے۔ ہم نے وہاں سے کرسمس کارڈ بھیجا تو تھا۔ کیا نہیں ملا؟"

دونوں بہنوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"ڈورو تھی۔ اسکے لئے چائے تو لاؤ۔"

"میں چائے بنالاتی ہوں۔" صوفے پر سے غزالہ اٹھتے ہوئے بولی۔ پھر وہ اور ڈورو تھی کچن میں چلی گئیں۔ جہاں سے چند لمحوں بعد چینی کے برتنوں کے ٹکرانے کی آوازیں آنے لگی۔ کچھ دیر بعد چائے کے ساتھ کھانے کا سامان

بھی آیا۔

یکشش سے بھری نان خطائی کو میٹ پائی (meat pie) کیوں کہتے ہیں؟ میں کبھی سمجھ نہیں سکا۔" طاہر ایک میٹ پائی کھاتے ہوئے بولا۔

"ہم انگریزوں کی بد عقلی۔ جب ہمیں پہلی بار کشمش ملی تو ہم نے اسے میٹھا گوشت سمجھا۔" ایڑنا نے منہ بگاڑ کر اپنی قوم کا مذاق اڑانے کی کوشش کی۔ اسکی کمر کے پیچھے تکیہ رکھ کر اسے نیم دراز کر دیا گیا تھا۔ وہ چائے پی رہی تھی۔

"اس کرسمس ٹری میں روشنی کیوں نہیں ہے؟" غزالہ نے اپنے ہونٹوں کو رومال سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بتاؤں۔ بجلی کے یہ تار مجھ سے نہیں سلجھے اور نہ ہی پلگ کو ساکٹ میں لگانے سے کچھ بنا۔" ڈوروتھی بے چارگی سے بولی۔

"آؤ غزالہ ہم کوشش کرتے ہیں۔" طاہر نے کہا۔ بھائی بہن نے مل کر تار کو سلجھایا اور اسے کرسمس ٹری کے چاروں طرف لپیٹ دیا۔ جب طاہر نے پلگ کو ساکٹ میں لگایا تو بھی روشنی نہیں ہوئی۔

"للسی۔ اسکرو ڈرائیور لاؤ۔ شاید پلگ میں کوئی خرابی ہے۔" پھول کے نام سے پھر مخاطب کیے جانے پر ڈوروتھی ہنس پڑی۔ ایڑنا بھی مسکرا دی۔ ڈوروتھی اسکرو ڈرائیور لے آئی۔ اسکی مدد سے طاہر نے پلگ کھولا "دیکھو یہ تار پن سے نکلا ہوا ہے۔" طاہر نے کہا اور تار کو پن سے جوڑ دیا۔ جیسے ہی اس نے پلگ کو سوکٹ میں لگایا، رنگ برنگی روشنیاں کرسمس ٹری کی شاخوں پر لٹک اٹھیں۔

"ونڈر فل!" دونوں بہنیں مارے خوشی کے بے اختیار پکار اٹھیں۔ غزالہ اٹھ کر پیانو کے پاس گئی اور اسٹول پر بیٹھ کر کرسمس کی ایک مقبول دھن بجانے اور اسی پر گانے بھی لگی۔

Jingle bells, jingle bells
Jingle all the way
Oh what fun is to ride
On the open sleigh

ڈوروتھی نے میز پر رکھی رنگ برنگی کاغذی جھالروں کو سبھوں کے سر پر پہنا دیا۔ ایک گلابی رنگ کی جھالر اس نے خود بھی پہن لی۔ دونوں بہنیں غزالہ کی آواز میں آواز ملا کر گانے لگیں۔ طاہر نے بھی جھوم جھوم کر ان سب کے ساتھ اپنی آواز ملا دی۔

لیکن باہر اب بھی برف گر رہی تھی جو سڑک پر جلتی بجلی کی روشنی میں ہیرے کے ذروں کی طرح جھلملا رہی تھی۔ ◢ ◢

شیر شاہ سیّد

You are my television
you are my fridge
you are my ice cream
you are my lollypop
you are my moon

بار میں جاکر بیٹھا تھا کہ یہ آواز آئی اور میں سمجھ گیا کہ گلو کسی لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے اور اب وہ یہی کہے گا کہ میرا ٹیلی ویژن مجھے دنیا دکھاتا ہے اور تم نئی دنیا کی طرح ہو، تم رفریجریٹر اس لئے ہو کہ تمہارے سرد خانے میں میں نے اپنا دل رکھ دیا ہے تم آئس کریم اس لئے ہو کہ میں تمہیں لالی پاپ کی طرح ہلکے ہلکے چوس کر اپنے جسم و جان میں اتاردوں گا اور جب غم ستائے گا پریشان ہوں گا تو اس ملک میں جہاں چاند نکلتا ہی نہیں تمہیں سامنے رکھ کر دیکھا کروں گا۔ تمہاری پوجا کروں گا تم ہی سب کچھ ہو میرا۔ میرا چاند تم ہو میرا سورج میرا ٹیلی فون۔

پھر یہ بے وقوف لڑکی ہنسے گی۔ بات تو ہنسنے ہی کی ہے۔ مگر گلو یہ کہتا ہے کہ ہنسے گی پھر پھنسے گی۔ اور اس لئے تھوڑی ہنسی ہے کہ بات ہنسنے کی ہے۔ وہ تو اس لئے ہنستی ہے کہ اس طرح سے کون بات کرتا ہے۔ اس جگہ پر اپنے بارے میں اتنی غلط فہمی میں جتلا کرادینا بھی ایک آرٹ ہے اور ہر آرٹ کی طرح اس کی بھی قیمت ہے اور قیمت کچھ زیادہ بھی نہیں، صرف چند دنوں کا ساتھ۔ پھر وہ اپنی راہ اور ہم اپنی راہ، کسی ٹیلی ویژن، کسی آئس کریم، کسی ریفریجریٹر، کسی چاند کی تلاش میں۔

میری اس کی ملاقات محض اتفاق ہی تھی اس روز میں گیلوز بار میں بیٹھا ہوا بارپ کے پاس بیٹھا پی رہا تھا۔ عام طور پر میں پیتا نہیں ہوں مگر جب وطن یاد آرہا ہو تو پھر پینی پڑتی ہے۔ بھولنے کے لئے پینا ضروری ہے، یہ کسی کا کہا ہوا سنہرے الفاظ میں لکھنے کے قابل جملہ نہیں بلکہ برسوں کے پینے پلانے کے تجربے کا نتیجہ ہے۔ جب بار بند ہونے میں گھنٹہ بھر رہ گیا تو گلو آیا تھا۔ اس نے تو مجھے نہیں دیکھا کیونکہ وہ جس لڑکی کے ساتھ آیا تھا اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی مصروف تھا۔ میں تھوڑے تھوڑے سرور میں ضرور تھا لیکن دکھوں کے فرق کو بھولا نہیں تھا۔ ایک نظر میں ہی بھانپ گیا تھا کہ یہ اپنا ہے، وطنی ہے۔ وہ آکر میرے قریب ہی بیٹھا تھا۔ وہ لوگ گینز پی رہے تھے سیاہ خالص آئرش بیر، بچے کی طرح آئرش اور قلندر کی طرح مست۔

اس کے ساتھ جو لڑکی تھی کچھ خاموش تھی اور گلو ہی کی آواز زیادہ آرہی تھی۔ آوازوں سے کچھ اندازہ ہوا کہ وہ اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وعدے نبھانے کی قسمیں کھا رہا تھا اور ساتھ چلنے کی باتیں کر رہا تھا، مگر بات صرف یہاں تک رہتی تو شاید میں بھی سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتا، لیکن یکایک بڑی رومانی سے آواز میں وہ بولا تھا ”تم تو میرا ٹیلی ویژن ہو، ارے حسینہ میری جان، تم میرا سرد خانہ ہو۔ میری آئس کریم کی طرح ملائم، میری لالی پاپ کی طرح کھٹی میٹھی اور میرے کھوئے ہوئے چاند کی طرح مکمل۔ اور بولتے بولتے بیچ میں دو تین الفاظ اردو کے بھی بول گیا تھا جو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آدمی بھی اپنا ہی ہے۔ بڑا دل چاہا کہ اٹھ کر اس کی ٹیبل پر بیٹھ جاؤں، ایک دو شعر سناؤں، ایک آدھ گندہ لطیفہ سنوں، پنجابی میں ایک گالی وہ بکے اور ایک گالی میں بکوں، مگر پھر رکنا پڑا۔ ایک ایسے وقت جب کوئی کسی لڑکی سے ایسی بات کر رہا ہو اس کا مطلب ہوتا ہے مجھے تنگ نہ کرو، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ جب بار بند ہو گیا اور گلاس خالی ہو گیا تو وہ اٹھا تھا۔ لڑکی کے کمر میں اس کا ہاتھ تھا، اور لڑکی نے اسے زور سے تھاما ہوا تھا۔ جب وہ مڑا تو اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ وہ مسکرایا اور مجھے آنکھ ماری دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔

ایک دن میں نے اسے پھر دیکھا تھا۔ اسٹیفن گرین کے شروع میں ہی ایک بار سے بیڈیز وہاں سے کسی اور لڑکی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے نکل رہا تھا اس دن پھر مجھے اس کی آنکھ کی مار کھانی پڑی تھی اور میں دل ہی دل میں ہنس دیا تھا۔

اگلے ماہ عید تھی اور عید کے دن جب میں ڈبلن کی واحد مسجد سے عید کی نماز پڑھ کر نکل رہا تھا تو میں نے اسے دیکھا۔ وہ بھی دوسرے دروازے سے باہر آرہا تھا۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو اس نے آنکھ ماری، پھر عید مبارک کہہ کر گلے لگ گیا تھا۔ اس روز میں اس کے فلیٹ پر گیا، چھوٹا سا فلیٹ تھا، اور بیچ اسٹریٹ کے بالکل بیچ میں۔ وہ یہاں کپڑوں کا کام کرتا تھا، فورڈ کی ایک ویگن اس

کے پاس تھی اور آئرلینڈ کے مختلف شہروں میں لگنے والی مارکیٹوں میں اپنے اسٹال لگایا کرتا تھا۔ "فرصت کے وقت میں وہی کرتا ہوں جو آپ دیکھ چکے ہیں" یہ کہہ کر اس نے مجھے پھر آنکھ ماردی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ آنکھ مارنا اس کی عادت بن چکا ہے۔

اس کے بعد ہم کئی دفعہ ملے تھے۔ اس کے پاس وقت کم ہوتا تھا مگر پھر بھی جب بھی ملتا تھا اچھے طریقے سے ملتا تھا۔ کبھی گھر لے جاتا کہ آج گوشت اچھا پکایا ہے کھالو، اچھے کباب بنائے ہیں کھالو، آج چاول پکے ہیں کھالو اور میں ہمیشہ بغیر ٹالے ہوئے چلا جاتا تھا کیونکہ ہاسٹل میں ائرش کھانوں کے سوا کچھ ملتا ہی نہیں تھا اور روز روز آئرش کھانا ایسا ہی ہے جیسے آئی آر اے کے ہاتھوں انگریز فوجیوں کا شکار بننا۔ اس سے گپ شپ بھی ہوتی رہتی۔ اسے آئرلینڈ آئے ہوئے تین سال ہو گئے تھے اور ملک چھوڑے ہوئے پانچ سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا تھا۔ کپڑوں کے کام میں پیسہ بہت ہے مگر خوشی نہیں، جب بھی ملتا آنکھ مارنے کے بعد دوسری ضروری بات وہ یہی کرتا تھا۔ ملک واپس نہیں جاسکتا تھا کیونکہ بقول اس کے "عادتیں خراب پڑ چکی ہیں۔ نئی نئی لڑکیوں کے بغیر اداس ہو جاتا ہوں۔ اپنے ملک میں تو پاگل ہو جاؤں گا۔"

ایک دن وہ اپنا گھر یاد کر رہا تھا تو میں نے کہا تھا کہ "بھائی واپس کیوں نہیں چلا جاتا ہے تو کہنے لگا واپس جا کر کروں گا کیا؟ یہاں کپڑوں کے بازار میں تین چار سو پونڈ ہفتہ کماتا ہوں، وہاں تین چار سو روپے مہینہ کماؤں گا۔ گاؤں چلا جاؤں اور زمین پر ہی کام کروں تو روپیہ تو کم ہے سکون بہت ہے۔ مگر عادت خراب پڑ چکی ہے۔ اس کا کیا کروں۔

"ارے یار، اب تو یہ اگر کپڑے ہی بیچنے تھے تو آئے کیوں تھے؟ تکلیف کیا تھا جو خوامخواہ اپنا گاؤں چھوڑ کر اس ملک میں ذلیل ہو رہے ہو؟ ذلیل تو خیر نہیں ہو رہے ہو اچھی شرابیں پی رہے ہو۔ گوری لڑکیوں کے ساتھ گزارا کر رہے ہو اور پونڈ کما رہے ہو اور کیا چاہئے تمہیں؟ خوشی کیسی؟ خوشی تمہارے لئے یہی خوشی ہے۔" میں نے کچھ نصیحت اور کچھ طنز کے انداز میں اس سے کہا۔

"چاہئے تو کچھ نہیں، مگر سکون نہیں ہے۔ پیسہ بہت ہے میرے پاس، مگر گھر یاد آتا ہے۔" اس نے میری بات کا جواب دیا ہماری جان پہچان ہی رہی دوستی نہ بن سکی مگر اکثر اس سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، وہ ملتا پابندی سے تھا، آکر پاکستانی اخبار لے جاتا تھا۔ خاص طور پر جب ملتا تھا اپنے گاؤں کی، ملتان کی اور لاہور کی بات کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے گھر کی یاد بری طرح سے ستاتی رہتی ہے اسے، اور یہی وجہ تھی کہ میں بھی اپنی طرف سے کوشش کرتا تھا کہ اسے زیادہ سے زیادہ وقت دوں، ملوں تو محبت سے ملوں۔ اسکالرشپ پر آئے ہوئے طلبا کے پاس دینے کو زیادہ کچھ ہوتا نہیں۔ سننے کو کان ضرور ہوتے ہیں اور میں سنتا تھا اس لئے وہ اکثر سنانے کو آجاتا تھا۔

ایک روز عاشورے کا دن تھا، شام کا وقت، ہوسٹل میں کھانے کو دل نہ

چاہا تو ایک ترک کی دوکان سے ڈونا کباب خریدنے چلا گیا تھا۔ ڈیڑھ پونڈ کا یہ کباب اتنا ہوتا ہے کہ آدمی کا پیٹ بھر جاتا ہے۔ جیسے ہی میں ٹرنٹی کالج کے سامنے سے نکلا تو مجھے گلو مل گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر گاڑی اس نے روک دی پھر میں اس کے گھر چلا گیا تھا۔

"ارے آج کوئی لڑکی نہیں ہے تمہارے ساتھ۔ بڑا ہی خراب چھٹی کا دن گزار رہے ہو میاں۔" میں نے اس سے پوچھا۔

"بس یار آج کچھ گھپلا ہو گیا۔ گھڑی بند ہو گئی تھی جس کا مجھے خیال نہیں رہا۔ مارک اسپنز کے سامنے جس لڑکی سے ملنا تھا، وہ دو گھنٹے انتظار کر کے چلی گئی۔ لہذا بوریت ہی بوریت ہے۔" اس روز میں نے اس سے پوچھ ہی لیا" بھائی یہ ٹیلی ویژن آئس کریم والی بات سے یہ لڑکیاں کیسے پھنسا لیتے ہو، مجھے تو سخت حماقت والی بات لگتی ہے یہ تو۔"

وہ ہنس دیا" آپ لڑکی جو نہیں ہو حمید صاحب! اگر لڑکی ہوتے تو آپ کو بھی پھنسا لیتا۔" اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا تھا۔ پھر خود ہی کہنے لگا" حمید صاحب دنیا کے سترہ ملکوں کا ٹھپہ میرے پاسپورٹ پر لگا ہوا ہے چار پانچ ملکوں تک تو مجھے ہوش ہی نہیں تھا، باقی ملکوں میں یہ فارمولا میرا چلتا رہا ہے۔ جہاں بھی گیا ہوں کامیاب ہی رہا ناکام نہیں ہوا۔"

بات میں دلچسپی تو پیدا ہو ہی گئی تھی، میں نے پوچھ لیا" سترہ ملکوں میں کیا کرتے رہے؟۔"

"ارے حمید صاحب اپنے گاؤں سے تو لڑ کر بھاگا تھا۔ باپ کہتا تھا کام کرو یا پڑھائی کرو، میں کہتا لاہور جاؤں گا۔ بات بہت بڑھ گئی۔ ایک دن گھر سے کچھ روپے چرا کر لاہور بھاگ گیا اور مزدوری شروع کر دی۔ جہاں رہتا تھا وہاں جوہر آباد کا ایک بندہ رہتا تھا لطیف، ہم دونوں نے مل کر طے کیا کراچی چلتے ہیں۔ کراچی جا کر معاملہ خراب ہو گیا۔ وہاں ایک کارخانے میں مزدوری کر لی، وقت اچھا ہی گزر رہا تھا کہ میرا باپ کسی نہ کسی طرح تلاش کرتا ہوا گلشن ہیر کے علاقے میں ہم لوگوں کے گھر پہنچ گیا جہاں میں دوسرے لوگوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ آج بھی روتا ہوں دل ہی دل میں کہ اگر ان کے ساتھ واپس ملتان چلا جاتا تو خود ہی اپنی زمینوں پر کام کرتا۔ گھر میں بیل بھی تھے ٹریکٹر بھی، گاؤں کی ہی کسی لڑکی سے شادی ہو جاتی۔ نہ میں اس کو ٹیلی ویژن کہتا نہ چاند پکارتا نہ وہ لالی پاپ ہوتی نہ اسے آئس کریم کی طرح کھا جاتا۔ وہ میری بیوی ہوتی صرف بیوی اور میں خوش رہتا۔"

اس کے ساتھ ہی اس کا گھر آگیا۔ فلیٹ میں جا کر سب سے پہلے تو میں نے پکا ہوا سالن گرم کرنے کو رکھ دیا اور اس نے ہارپ کی دو بوتلیں کھولیں اور ایک مجھے پکڑا دی۔ دو گھونٹ بھر کر کہنے لگا" تو حمید صاحب باپ میرا واپس چلا گیا ناراض ہو کر۔ میں نے بھی کوئی خیال نہیں کیا کہ اب تو کراچی میں ہی رہنا ہے، مگر کراچی چھوڑنا پڑ گیا۔ ہوا کیا کہ ابو ظہبی کے لئے مزدوروں کی بھرتی ہو رہی تھی۔ میں اور میرا دوست لطیف دونوں ہی بھرتی ہو کر ابو ظہبی

پہنچ گئے۔ بڑی بڑی بلڈنگیں بن رہی تھیں وہاں پر اس وقت اور پاکستان کے بہت سے لوگ مزدوری کر رہے تھے۔ پیسے اچھے ملتے تھے، مگر زندگی نہیں تھی، صبح سے شام تک کام۔ عرب کوئی کچھ کہتا تو نہیں تھا مگر دیکھتا ایسے تھا جیسے ہم اس کے غلام ہوں۔ گھر والوں کو پتہ ہی نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ پھر عید آئی تو میں نے بھی ایک کارڈ سب کی دیکھا دیکھی گھر کے پتے پر ڈال دیا۔ فوراً ہی میرے باپ کا خط آیا کہ اس ملک میں مزدوری ہی کر رہے ہو گے، اتنی محنت اپنی زمینوں پر کرو تو نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاؤ۔ عید کارڈ کا جواب بھی مجھے چڑھا کر دیا گیا تھا۔ سخت غصہ آیا تھا باپ کا خط پڑھ کر اور اس روز یہی غصہ تھا جس کی وجہ سے سائٹ پر دوسرے مزدور سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ تو بعد میں پتہ لگا تھا کہ وہ بے چارہ اپنی بیوی کے خط کا غصہ لئے بیٹھا تھا، تو ہوا کیا کہ وہاں سے مل گئی چھٹی۔ مگر خدا کی شان حمید صاحب، ابو ظہبی میں بیٹھے بیٹھے ہی ایک نوکری کویت کی مل گئی اور میں وہاں سے کویت پہنچ گیا۔ یہ کام تھا ایک آفس میں پیون کا۔ آفس ایک پاکستانی کا ہی تھا، ایک کویتی کے ساتھ مل کر اس کا کام تھا۔ پیسے اچھے تھے اور کام بھی کوئی زیادہ نہیں تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ میں تھوڑے سے پیسے اور جمع کر لوں تو پھر واپس ہی چلا جاؤں لاہور۔ کراچی، ابو ظہبی، کویت دیکھ لیا تھا، آنکھیں کافی کھل گئی تھیں۔ اپنا گاؤں دنیا کی سب سے اچھی جگہ کی طرح یاد آ رہا تھا کہ لطیف کا خط برمنگھم سے آیا تھا جہاں اس نے کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کر لی تھی، کام کر رہا تھا اور خوب عیاشی بھری زندگی گزار رہا تھا۔ پھر میرا ابھی دماغ خراب ہو گیا کہ یورپ تو دیکھ ہی لوں۔ جمع کی ہوئی رقم سے ٹکٹ کٹایا اور پہنچ گیا سیدھا لندن ایئرپورٹ پر۔ ایئرپورٹ والوں نے بڑا تنگ کیا، نہ میرے سوٹ پر توجہ کی نہ ٹائی دیکھی اور نہ ہی وہ ڈالر جو میں نے اپنے بٹوے میں رکھے ہوئے تھے۔ دو گھنٹے تک میرا انٹرویو لیتے رہے، میں جو کہتا رہا وہ اپنے رجسٹر پر لکھتے رہے اور پھر کہنے لگے تم انگلینڈ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ دوسرا ایک جہاز مراکش جا رہا تھا اس میں بیٹھا کر مراکش پہنچا دیا۔"

باتوں کے دوران سالن اور چاول دونوں ہی گرم ہو چکے تھے۔ میں نے دونوں دیگچیاں لا کر ٹیبل پر رکھ دیں۔ کھانے کے ساتھ اس کی بات کا سلسلہ بھی چل نکلا۔ "تو صاحب۔ ملتان کا نکلا ہوا بندہ مراکش پہنچ گیا۔ وہ لوگ کچھ نہیں دیکھتے ہیں، صرف ڈالر دیکھتے ہیں اگر پیسہ ہے تو اہلاً و سہلاً، پیسہ نہیں تو ویزا نہیں۔ تو جناب مراکش میں میرا ٹورسٹ ویزا لگ گیا۔ مراکش پہنچ کر میں نے لطیف کو فون کیا بھائی اپنے ساتھ تو یہ ہو گیا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ تمہارے لئے کوئی لڑکی تلاش کرتے ہیں۔ بس اب یہی طریقہ رہ گیا ہے۔ میں تم کو خط لکھوں گا جلدی ہی۔ میں اس کے خط کا انتظار کرنے لگ گیا۔ ادھر ڈالر اس طرح خرچ ہونے لگے جیسے حرام سے کمائے ہوں۔ ہر چیز مہنگی ہے وہاں پر، زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔ وہاں ہی میری ملاقات ایک اور پاکستانی الطاف سے ہوئی اور ہم دونوں دوست بن گئے۔ آپ یقین نہیں کرو گے وہ وہاں پر کیا کر رہا تھا۔ مجھے جب اس نے بتایا تھا تو مجھے یقین نہیں آیا، مگر جب مجھے بھی وہی کچھ کرنا پڑ گیا تو اس روز احساس ہوا تھا کہ پانی سر کے اوپر گزر چکا ہے، رہا کچھ بھی نہیں سوائے گلو کے جس کا سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ تو پھر ایسا ہوا کہ پیسے سارے ہی ختم ہو گئے۔ جہاں رہ رہا تھا وہاں سے نکلنا پڑا۔ سامان جا کر الطاف کے کمرے میں ڈال دیا اور شام کے وقت جب سورج ڈوبنے والا تھا شیخ المکر کے چوراہے پر جا کر ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ہی ایک لمبی سی سیاہ گاڑی آئی، ایک بوڑھے سے عرب نے سر نکال کو پوچھا خول؟ اور الطاف نے سر ہلا کر جواب دیا "خول" ساتھ ہی کار کا دروازہ کھل گیا اور میں کار میں بیٹھ گیا۔ یہ آغاز تھا۔ رات بھی اس عرب کے ساتھ رہنا پڑا اور بقول الطاف کہ میری طرح کے مضبوط جوان تو بہت کماتے ہیں اس شہر میں۔ مجھے تو اس رات اتنے پیسے مل گئے تھے کہ ہفتہ آرام سے گزر گیا۔"

مجھے تھوڑی دیر کے لئے یقین نہیں آیا کہ گلو کیا کہہ رہا ہے، کس دنیا کی بات کر رہا ہے، مگر اس کے چہرے کی سنجیدگی چیخ چیخ کر اپنی سچائی کا اعلان کر رہی تھی۔ "ارے صاحب، بہت سے لوگوں کا یہی کام ہے۔ وہاں پر اپنا الطاف تو بہت دنوں سے یہی کر رہا ہے، بڑے بڑے مال دار عرب لے جاتے ہیں، کھلاتے ہیں، پلاتے ہیں اور اگر کچھ زیادہ ہی انہیں خوش کر دیا تو پیسے بھی تھوڑے زیادہ مل جاتے ہیں۔ تو کافی دنوں تک اپنا یہی سلسلہ چلتا رہا۔ وہیں پر الطاف نے یہ ٹیلی ویژن اور آئس کریم والی ترکیب سکھائی تھی۔ ہوتا کیا تھا کہ ہفتے میں ایک رات تو عرب شیخوں میں گزرتی تھی اور باقی دن بڑے بڑے ہوٹلوں میں یا ڈسکوز میں لڑکیوں کی تلاش میں۔ سوچتا تھا کہ زندگی ابو ظہبی کویت میں خراب ہی کر دی کیونکہ اب ہر کام میں مزا آنے لگ گیا تھا۔ ادھر لطیف کی کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ جو کاغذات اس نے منگوائے وہ بہت پہلے ہی بھیج چکا تھا مگر کوئی جواب اس کا نہیں آیا تھا۔ میں نے پھر فون کیا تو کہنے لگا کہ تھوڑا صبر کرو، کوشش کر رہا ہوں مگر کوئی چڑیا پھنس نہیں رہی۔ پھر ایک دن اس کا خط ملا کہ پیرس پہنچ جاؤ۔ کسی کا پتہ لکھ دیا تھا۔ اس نے بس تو جناب فوراً ٹکٹ کٹا کر جہاز میں بیٹھ کر پیرس پہنچ گیا۔ پیرس میں یہ لوگ کو تلی وی ماں میں رہتے تھے۔ لطیف کے سسرال کے لوگ تھے۔ وہ لوگ وہاں پر کپڑوں کا کاروبار کرتے تھے۔ وہاں سے لطیف سے تفصیل سے بات ہوئی۔ وہ کہنے لگا کہ تمہارے پاسپورٹ پر ایسی مہر لگ چکی ہے کہ کوئی ماں باپ اپنی لڑکی دینے کو تیار نہیں ہے، کیونکہ تمہاری شادی کو یہ انگریز لوگ شادی نہیں مانیں گے بلکہ یہی کہیں گے کہ شادی تم نے انگلینڈ میں داخل ہونے کے لئے کی ہے۔ لڑکیاں بہت ہیں مگر مسئلہ اب ایسا پیدا ہو گیا ہے کہ فی الحال سلجھانا مشکل ہے۔" پھر اس نے بتایا کہ پیرس والے لوگ میری مدد کریں گے، فی الحال پیرس میں ہی ٹک جاؤ۔ وہ بڑے اچھے لوگ تھے۔ سب لوگوں نے مل کر میرے لئے کچھ رقم جمع کی، کچھ الطاف نے بھیجی۔ ملا کر قسطوں پر ویگن لے لیا اور پیرس کے ارد گرد کے علاقوں میں لگنے والی مارکیٹوں میں میں اپنی دوکان لگانے لگ گیا۔ کام نیا تھا مگر مشکل نہیں تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں سارے ڈھنگ سیکھ گیا۔ ساتھ ہی وہاں

کام کرنے کا پرمٹ بھی مل گیا۔

جب پیسے جیب میں آگئے تو الطاف کے سکھائے ہوئے الفاظ پھر کام
نے لگے اور زندگی مزے سے گزرنے لگی۔ ہفتے میں چھ دن کام اور پھر ہفتے کی
ام سے شراب ڈسکو اور لڑکی نہیں بلکہ لڑکیاں۔ مگر حمید صاحب چکر خراب ہو
یا۔ ایک لڑکی تھی فلوریا۔ ارے کیا لڑکی تھی جیسے ہی دکھائی دی دل میں اتر گئی۔
راہی دوستی ہو گئی مگر تھی بڑی پاگل۔ باتیں خوب کرتی تھی ہاتھ لگانے نہیں
تی۔ مطلب یہ کہ سیریس ہو گئی تھی۔ ادھر مسئلہ آن کا آپڑا تھا۔ اب تک
ہاں جہاں کوشش کی ہے ناکام نہیں ہوا ہوں۔ بس تو جناب شادی کا وعدہ کرنا
ا۔ ادھر شادی کا وعدہ کیا تو سمجھ لیں میری ہی ہو گئی۔ میں اسے لے کر ایک
ے کے لئے جرمنی چلا گیا۔ خوب گھوما، بڑی عیاشی کی مگر جب واپس آیا تو کچھ
دن بعد وہ کہنے لگی کہ ماں بننے والی ہوں، جلدی شادی کرو۔ میں نے سمجھا کہ
ماں واں والی باتیں بے کار باتیں ہیں، ابارشن اس ملک میں کوئی مسئلہ نہیں
ہے، مگر اس نے کہاں ماننا تھا۔ الٹا روز روز یہی کہتی تھی کہ شادی کرو۔ مسئلہ
ب کافی سیریس ہو گیا تو پھر میں نے دوستوں سے مشورہ کیا کیونکہ شادی تو
ں نے کرنی نہیں تھی۔ اب سوچتا ہوں کہ کر ہی لیتا تو اچھا تھا۔ مگر سب لوگوں
نے یہی کہا کہ یہاں سے چلے جاؤ تو اچھا ہے۔ یہ لڑکی کچھ ٹیڑھی ہے، مسئلہ بنا
ے گی۔ اصل میں ایسا کبھی کسی کے ساتھ ہوا نہیں تھا، اس لئے میں غلط
ئوروں کا شکار ہو گیا۔ وہ تو بعد میں پتہ لگا کہ کرنا کچھ نہیں تھا لڑکی سے ملنا جلنا
ر کر دیتا، کچھ دنوں بعد خود ہی بھول جاتی مگر میں ایسا گھبرایا کہ سارا سامان
یرہ بیچ باچ کر جمع شدہ رقم کے ساتھ فیری پکڑ کر سیدھا آئرلینڈ پہنچ گیا۔
لن اچھی جگہ ہے اور لوگ بھی بڑے اچھے ہیں، ادھر کچھ پاکستانی لوگوں کا کام
ی ہے۔ ان لوگوں نے پھر مدد کی اور یہاں بھی پیرس والا کام چل نکلا۔ میں
ب پیرس میں پریشانی میں تھا تو مجھے پتہ لگا کہ میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے مگر
د اس وقت اتنا پریشان تھا کہ زیادہ توجہ نہ دے سکا، مگر بعد میں بڑا رونا آیا۔ پر
ن ہمت نہ ہو سکی کہ واپس چلا جاتا۔ اور اب، اب تو ڈبلن میں فٹ ہو گیا ہوں،
ن سال ہو گئے ہیں اس ملک میں نہ جانے کتنی لڑکیوں سے دوستی کی ہے،
ؤں سے دوستی توڑی ہے، ہر ایک کی قسمت ہے۔ کوئی صرف ڈسکو لے جانے
ہی راضی ہو جاتی ہے، کسی کو ہفتہ دو ہفتہ گھمانا پڑتا ہے اور زیادہ مہنگی ہوتی ہے
اسپین، اٹلی، ہالینڈ، بلجیم، سویڈن لے جانا پڑتا ہے۔ الطاف کے سکھائے
ے جملوں کا جادو ہے حمید صاحب، جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔"

اس روز مجھے گلو پر بڑا غصہ آیا۔ اس سے زیادہ تو اپنے اوپر آیا تھا کہ
ہے شخص کا اپنا اتنا وقت دیا تھا۔ خوا مخواہ دھوکے میں تھا کہ بے چارہ وطن سے
ر پریشانیوں میں گھرا ہوا ہے، بات کرنا اچھا ہے، ملنے جلنے سے خوش ہو جاتا
ہ تو میرا کیا جاتا ہے، مگر سارے نیک خیالات بھاپ کر طرح اڑ گئے تھے۔
ں اس سے کہتا کیا۔ کچھ کہنا بیکار تھا، صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ ابھی بھی بہت دور
ہیں گئے ہو گلو۔۔۔ وقت نے کافی کچھ دے دیا ہے۔ دولت ابھی اور ملے گی، شاید

دو تین تیس سال اور گزر جائیں ابھی بھی وقت ہے، ملتان واپس چلے جاؤ، وہی
ملتان جہاں حسین آگاہی، صرافہ بازار اور چوک بازار ہے جہاں کی گلی گلی قمعر ان
والی میں شاہی قلفی والا اپنی چھوٹی سی دوکان میں دو سو روپے کی قلفی بیچ کر خوشی
خوشی گھر چلا جاتا ہے، جہاں کی دن بھر کی دھول مٹی میں لتھڑا ہوا چہرہ جب
ٹیوب ویل کے ٹھنڈے پانی سے دھلتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے انسان پھر سے پیدا
ہو گیا ہے، جہاں فلوریا ہے نہ سوزن، نہ لالی پاپ ہے نہ آئس کریم، جہاں برگد کا
بوڑھا درخت ہے جس کی ٹھنڈی چھاؤں ہے۔ اگر ابھی نہیں جاؤ گے تو کچھ
سال کے بعد تم کو مراکش نہیں جانا پڑے گا یا ڈبلن کی کونیلی برج کے اوپر اپنی
لمبی سی گاڑی روکو گے وہاں کھڑے ہوئی کسی بلجیم، ہالینڈ یا پاکستانی لڑکے سے سر
نکال کو پوچھو گے "ہو مو"؟ اور وہ کہے گا کہ "ہاں" اور تمہارے ساتھ چلا آئے
گا۔ یہی انجام ہے تمہارا۔

مگر اسے بات اچھی نہیں لگی تھی۔ مجھ سے ناراض ہو گیا تھا۔ بہت
دنوں تک نہیں ملا اور نہ میں اس کے پاس گیا تھا۔ آج یکایک بار میں اس کی آواز
آئی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک لڑکی کے سر کو سینے سے لگائے چوم رہا تھا۔

◢◢

اماں میرے باوا کو بھیجو جی

مصطفیٰ کریم

جب نظیر اپنی بیٹی کی کتابیں، فائلیں اور کپڑے، بکس اور گتے کے ڈبوں میں رکھنے لگا تو مارے خوشی کے اس کے لبوں پر گنگناہٹ آگئی۔ سلویا کل یونیورسٹی جارہی تھی، جہاں اسکا آخری سال تھا، اسکے بعد اسکے دیرینہ بوائے فرینڈ سے اسکی شادی ہونے جارہی تھی۔ پھر اسکا اپنا گھر ہوگا۔ خاوند اور اسکی مشترکہ ملکیت۔ جہاں سے وہ نظیر کے پاس آئیگی بھی تو محض ایک دو دن کے لئے۔ ساری چھٹیاں گزارنے نہیں۔ ساٹھ سال کی عمر میں بیٹی کی بہت ساری ضرورتیں اسے گراں گزرتی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ضعیفی کی تنہائی کو دور کرنے کے لئے وہ خود بھی دوبارہ اپنا گھر بسا لینا چاہتا تھا۔ اس نے موزوں خواتین کی ایک فہرست مرتب کر رکھی تھی۔ وہ مقامی ہسپتال میں کنسلٹنٹ سرجن تھا۔ شریک حیات ملنے میں اسے کیا دیر لگتی ؟۔

مدت ہوگئی نظیر کی اپنی انگریز بیوی سے طلاق ہوگئی تھی۔ دونوں کی بیٹی سلویا اپنی ماں کے پاس رہتی تھی۔ جب وہ ذرا بڑی ہوئی تو اسکے سوتیلے باپ نے اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہا۔ وہ بھاگ کر نظیر کے پاس آگئی، جو اپنی بیٹی سے کبھی بیگانہ نہ ہوا تھا۔ ہر ہفتے پر سلویا اسکے پاس آجاتی تھی اور اکثر دونوں چھٹیاں منانے مختلف ممالک چلے جاتے تھے، نظیر نے بیٹی کی بہت اچھی طرح دیکھ بھال کی تھی۔ فیشن ایبل کپڑے اور جوتے۔ عمدہ ہائی فائی سیٹ۔ یہاں تک کہ جب وہ یونیورسٹی گئی تو نظیر نے اسے موٹر بھی خرید دی۔

اب بھی جوان بیٹی جب گھر آتی تو بچی بن جاتی۔ معمولی باتوں پر ضد کرتی۔ نظیر کی مرسڈیز پر قبضہ جمالیتی اور اسے بیٹی کی میلی کچیلی موٹر میں ہسپتال جانا پڑتا وہ باپ کی طرح بھاری بھرکم نہ ہونا چاہتی تھی اسلئے اسے کم کیلوری کی غذائیں مرغوب تھیں۔ ان تلاش میں نظیر کو دوکانوں کے چکر لگانا پڑتے۔ اگرچہ کام کرنے والی ایک خاتون گھر میں آتی تھی لیکن وہ بیٹی کے بہت سارے کام خود کر دیا کرتا تھا۔ پہلے خوشی خوشی اور اب بادل ناخواستہ۔

بیٹی نے اپنی ساری چیزیں بٹور لی تھیں۔ جیسے اسے پتہ تھا کہ اب اس گھر میں اسکا قیام ہوگا بھی تو بہت مختصر عرصے کے لئے۔ آج صبح ہی سے وہ مضطرب تھی۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتی جیسے اسے کسی شے کی تلاش ہو۔ اپنا سامان رکھنے میں بھی اسکا دل نہیں لگا۔ جب دو بج گئے تو اس نے نظیر سے مدد مانگی۔ اور اسوقت وہ باغ میں لکڑی کی اس بنچ پر بیٹھی تھی جسے ہفتوں کی محنت کے بعد نظیر نے بنایا تھا۔ جسکے بیک ریسٹ پر۔۔۔ 'پیاری بیٹی سلویا کے لئے' اسکے ہاتھ سے کندہ تھا۔ یہ بنچ سلویا کو بہت عزیز تھی۔ اس میں اسکے باپ کا وجود، اسکی ساری وابستگی سمٹ آئی تھی۔ گرمیوں میں گھنٹوں وہ اس پر بیٹھی کتابیں پڑھتی رہتی۔ دوستوں کو خط لکھتی۔ واک مین سے گانے سنتی۔ اور پاس کے حوض میں سنہری مچھلیاں فوارے سے گرتے جھم جھم کرتے پانی میں رقص کرتیں۔

نظیر نے سر بلند کر کے کھڑکی کے باہر بیٹی کو دیکھا۔ وہ زرد کارڈیگن اور سیاہ اسکرٹ میں ملبوس بنچ پر افسردہ بیٹھی سامنے نرگس کے پھولوں کو تک رہی تھی۔ جسکی پنکھڑیوں کو گذشتہ شب تند ہوا نے توڑ دیا تھا۔

"جیسے میں اسکا نوکر ہوں۔ سارا کام مجھ پر چھوڑ دیا۔ شام کے کھانے میں یہ لیمب چاپ (Lamb chop) کھانے سے رہی۔ الگ سے اسکے لئے مجھے پاستا (pasta) کی ڈش بنانی پڑیگی۔ کاش مجھے "نہیں" کہنے کا گر آتا۔" نظیر جھنجلایا ہوا اپنے آپ سے بولا۔ کچھ دیر بعد نظیر نے اٹھ کر کھڑکی کھولی اور اونچی آواز میں بیٹی سے بولا۔

"مجھ سے جتنا ہو سکتا تھا میں نے کر دیا۔"

"شکریہ ڈیڈ۔" سلویا نے غم زدہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

شام کے وقت کھانے پر باپ بیٹی مین ادھر ادھر کی مختصر باتیں ہوئیں۔ نظیر نے اپنی کم سخن بیٹی سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کہ وہ کیوں افسردہ ہے۔ بتانا ہوتا تو وہ خود ہی بتا دیتی۔ سونے سے پہلے اس نے سلویا کو اخراجات کے لئے سات سو پونڈ کا ایک چیک دیدیا۔

نظیر کے سونے کا کمرہ بالائی منزل پر تھا۔ وہ سکون کی نیند سویا۔ پھر نہ جانے رات کا کونسا پہر تھا اسکی آنکھ کھل گئی۔ چاند کی بجھی بجھی روشنی کھڑکی کے پردوں سے لپٹی تھی۔ نچلی منزل میں کھٹ پٹ سی ہوئی پھر خاموشی چھا گئی۔ رات کی تاریکی سے بوجھل اور پراسرار۔

"کہیں سلویا کا بوائے فرینڈ تو اسکے کمرے میں نہیں آگیا ہے ؟"

یہ ممکن نہیں تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے بیٹی کو آزادی ضرور

دی تھی۔ لیکن سلویا نے اس آزادی کا ہمیشہ احترام کیا تھا۔ اسکا بوائے فرینڈ دوسرے شہر میں رہتا تھا وہ جب بھی اسکاربرو (Scarborough) آتا تو ہوٹل میں ٹھہرتا۔ اور نظیر کے گھر میں گیارہ بجے رات کے بعد کبھی نہ رکتا۔ اور اب چوری چھپے اسے آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دونوں کی شادی جلد ہونے والی تھی۔ باغ کے آہنی دروازے کے کھلنے کی اچانک آواز آئی۔ نظیر چونکا ہو گیا۔

"شاید کوئی چور ہے ؟"

کسی تار یا اسکرو ڈرائیور سے دروازے کے قفل کھولنا چوروں کے لئے مشکل نہیں ہوتا۔ خوف سے اسکے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ نچلی منزل میں سلویا سو رہی تھی۔ کہیں چور اسے تشدد کا نشانہ نہ بنائے ؟ اس نے سوچا کہ پکار کر سلویا کو ہوشیار کر دے۔ لیکن یہ سب شاید محض اسکا واہمہ تھا۔ خاموشی پھر چھا گئی تھی۔ سکوت پھر طاری ہو گیا تھا۔ رات میں آنے والی سحرائی آوازوں کو کسی جادوگر نے پھر مقفل کر دیا تھا۔ نظیر کچھ دیر دم سادھے لیٹا رہا۔ پھر اس نے سوچا احتیاطاً نیچے دیکھ لینے میں کیا حرج ہے ؟

وہ اٹھا۔ سلیپر میں پیر ڈالے اور ڈریسنگ گاؤن پہن کر کمرے کے باہر لینڈنگ پر نکل آیا۔ نیچے ہال میں ڈائیننگ روم کی روشنی، جسے وہ بجھاتا نہیں تھا۔ بند دروازے کے شیشوں سے چھن کر ہال کے فرش پر اقلدیسی شکلیں بنا رہی تھی۔ اسے پیانو اور ایک جانب ٹیلیفون کی میز صاف نظر آئی، وہ آہستہ آہستہ چوبی سیڑھیوں پر اترا، سلویا کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ نظیر نے جھانک کر اندر دیکھا۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں بستر خالی نظر آیا۔

"کیا سلویا باغ میں گئی ہے ؟ اسوقت ؟"

رومانی حکایتوں کے مناظر اسکی آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ وہ لاکھ آزاد خیال سہی۔ پھر بھی اسکے گھر کی مخصوص حرمت تھی۔ کوئی اس طرح بن بلائے نہیں آسکتا تھا۔

باغ مکان کے تین جانب پھیلا ہوا تھا۔ اسکے کچھ حصے کھانے کے کمرے اور بیٹھک سے نظر آتے تھے۔ نظیر نے وہاں جاکر پردوں کو ہٹا کر باہر جھانکا۔ سڑک سے آتی بجلی کی روشنی میں اسے کچھ نظر نہ آیا۔ پیچھے کی طرف باغ میں جانے کے لئے وہ کچن میں آیا جسکے باہر جانے کے بند دروازے کا قفل کھلا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ باغ میں آگیا۔

رات خنک تھی اور آسمان میں تارے چینی کے دانوں کی طرح بکھرے تھے۔ ہوا میں شبنم سے نم پھولوں کے پودوں اور گھاس کی بو بسی تھی، سرو کے درخت سیاہ فام سپاہیوں کی طرح تنے کھڑے تھے۔ باغ کی گھنی جھاڑیوں سے پرے لکڑی کی وہ بنچ جسے اس نے بیٹی کے لئے بنایا تھا اس پر کوئی شے نظر آئی۔ نظیر ادھر چل پڑا۔ قریب پہنچ کر وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ سلیپنگ بیگ میں لپٹی سلویا بنچ پر لیٹی تھی۔

"ڈیڈی۔ آپ ابھی تک نہیں سوئے ؟" بیٹی نے پوچھا۔ ◢ ◢

فرید پربتی

جان وقف کا رہا ہے رائگاں کرتا ہوں میں
جمع خاروخس برائے آشیاں کرتا ہوں میں

زندگی کی حیرتوں میں پھر اضافہ ہو گیا
تھی جو کرنے کی توقع وہ کہاں کرتا ہوں میں

سونپ کر جس کو چلا تھا تو نگہ داری کا کام
اس کو محو سازش تیر سناں کرتا ہوں میں

واپسی کے راستے مسدود ہیں کب سے مگر
دل کو پھر بھی فارغ سودوزیاں کرتا ہوں

میں خوب کس کر باندھ لے ناویں فریدا ہی کہ اب
پھر سے برگشتہ ہوا و بادباں کرتا ہوں میں

دوران گفتگو وہی پہلو نکل پڑے
میں آپ کہنا چاہوں، مگر تو نکل پڑے

اب تیرہ روز گار کسے ہم نوا کریں
دن کی تلاش میں سبھی جگنو نکل پڑے

وہ موجہ گلاب جو گلشن میں کھو گیا
ممکن ہے زیر سایہ گیسو نکل پڑے

آئی ہے یاد تیرہ نصیبوں کی اس لئے
لے کر چراغ چہرۂ نیکو نکل پڑے

جو تیر اس نظر کا ہوا تھا خطا کبھی
وہ کیوں نہ میرے دل میں ترازو نکل پڑے

شاہد عزیز

بہت دن بعد

بہت دن بعد
سورج کے نکلنے پر
ہمارے گھر کے آنگن میں
سنہری دھوپ اتری ہے
گلی کوچوں میں
پھر کھلتے ہوئے
چہرے نظر آئے
کبھی سوچا نہیں میں نے
بہت دن پہلے یہ سورج
سمندر میں
کیوں اترا تھا
جزیرے ڈوب جانے تک
کناروں پر
کوئی کشتی نہیں آئی
کوئی طوفان گزرا تھا
بہت دن بعد
سورج کے نکلنے پر
مجھے سب یاد آتا ہے
کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے
اجالوں کے پرندے مار ڈالے تھے

یاد آتا ہے

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ وہ منظر
جنھیں دیکھا نہیں ہم نے
نگاہوں میں
ابھرتے ہیں
پرندے آسماں تارے
خلاؤں میں
بھٹکتے ہیں
سمندر جھیل دریا
اور ان میں
ڈوبتے لمحے
بہت کچھ یاد آتا ہے
تمہارے شہر کا سورج
مجھی میں
ڈوب جاتا ہے

نظم

پھر وہ کہانی
سناؤ ہمیں
جس کے ہر موڑ پر
تم سے
جھگڑا ہوا
کہانی کو
سننے سے پہلے سنو
مجھ سے وعدہ کرو
کہانی میں جتنے بھی
موڑ آئیں تم
مجھ سے ان پر
دوبارہ
نہ جھگڑا کرو گے کبھی
تمھیں چاہیے
تم کہانی کے
ہر موڑ پر
آکے ٹھٹکو
ذرا رک کے پوچھو
کہو آگے
پھر کیا ہوا

ساغر جیدی

آگ کے ہاتھوں میں گجرے
کوئلے پر سونے چاندی کا ملمع
گدھ سے طاؤس کا ناپاک رشتہ
لاکھ مصنوعی ہی سہی
کچھ نہ کچھ لکھتے رہو
اُنکے شاطر روزمرّہ کی طرح چکلے کالے آسماں
پر موتیا چونا چڑھا ہے
پھر بھی استعجاب اپنا ایک کونے میں رہے
کورے برتن میں پھپھولوں کا چھلکنا
نیلی آنکھوں کے جھروکوں سے سمندر کا نکلنا
دیکھنے کی تاب ہے تو دیکھ لو
تم بھی اک جنت بنالو ایک یادِ وابستہ کی
اُنکے شاطر روزمرّہ کی طرح کیا بھروسہ
کیا یقین ؟
تم کو اس تصویر سے ضد ہو گئی ہے
جس نے اپنا رنگ و روغن کھو دیا ہے
کس کو کس سے اختلاف ؟

جی اٹھے گا آج پھر مردہ ملازمیش مطلق کا مکر
رنگ لائے یا نہ لائے غاصبوں کی نیک نیت
ظالموں کی عاجزی پر فتح پا جگی بخیلوں کی سخاوت
آج بھی
جس سے سب کی فاسقی پردہ کرے گی
مفلسانہ شفقتوں پر تجّمیں
اُنکے شاطر روزہ مرّہ کی طرح
ایک ڈائن شیرنی بچوں کو اپنے چاٹتی ہو
رات کی تاریکیوں میں
معوروں کی کجی مٹی لالچی ہی لالچی ہے
آنِ واحد میں لپٹ جاتی ہے سب کے پاؤں سے
ہاں گل شبّو سے بھونرا کیا کرے گا بس
خوشامد کے سوا؟

چیل کے بچوں کو قمری پالتی ہو
اپنے انڈوں کو اکیلا چھوڑ کر
اس سے بڑھ کر چاپلوسی ہے اور کچھ ؟
تم اسے اپنا رہے ہو

میرے کاندھے کی کلہاڑی سے ذرا لو واقف نہیں
اک صدوا انگلی پہ بیسوں ناخنوں کی روشنی
آنکھ کی پتلی پہ حاوی ایک چٹکی بھر تجلّی
کانچ کے چوڑے میں پاگل لکڑیوں کی گنتی
میرے ہاتھوں کے ہتھوڑے سے کوئی واقف نہیں
سب کے نافرمان کاغذ جلنے والے ہیں
ریت سے بھر جائینگے سب گندے پانی کے کنویں
حاسدوں کی نازبرداری سے الگ
بیچنے نکلے نہ نکلے مفلسی کے چنے
لوگ پتھریلی زمیں پر ڈال دینگے روغنی اشیا
کچھ نہ کچھ لکھتے رہو کہتے رہو

دار سے دربار تک
کیوں قلم کی روشنائی قعرِ ذلت سے
نکلنا چاہتی ہے
آج کے جعلی تعصب سے کہیں ماحول بدلا
ایسا بے ہنگم رویّہ کون بدلے گا بھلا ؟
تو پھر اس کے بعد شاہی کرّوفر
قیمتی دیوار پر لو رہ بدلا آخری تصویر ہو گا

عقیل شاداب

آستین میں سانپ پالتا رہتا ہوں
دنیا کو حیرت میں ڈالتا رہتا ہوں

واقف ہوں پھولوں کے سیاست دانوں سے
کانٹے سے کانٹا نکالتا رہتا ہوں

بازاروں میں بھاؤ نہ اپنا گر جائے
کھوٹے سکے ہی اچھالتا رہتا ہوں

تازہ کرتا رہتا ہوں ماضی یاد
زنگ لگے برتن اجالتا رہتا ہوں

کبھی گزارے تھے جس کسی کی رفاقت میں
پچھلے پرانے دن سنبھالتا رہتا ہوں

رفو کیا کرتا ہوں گزشتہ لمحوں کو
ٹوٹے ہوئے رشتوں کو پالتا رہتا ہوں

صابر زاہد

خاکدانے سے الگ ایک جہاں چاہتا ہے
دل مرا روز نئے کون و مکاں چاہتا ہے

میری کوشش کہ نم خاک سے شعلہ جاگے
وہ اٹھانا مرے سبزے سے دھواں چاہتا ہے

کیا بتاؤں اسے یک رنگی ہمہ رنگی ہے
میں تجھے چاہوں نہاں کوئی عیاں چاہتا ہے

میں بچاتا ہوں اسے دھوپ سے سایہ سایہ
جانے کیوں وہ مرے سورج کا زیاں چاہتا ہے

میں اسے مان گیا قامت و قد رکھتے ہوئے
اور کیا مجھ سے مرا سرو رواں چاہتا ہے

چپ رہوں میں تو دکھاتا ہے مجھے تیغ اصیل
بات کرتا ہوں تو کم بخت زباں چاہتا ہے

زبیر شفائی

آسماں سے چھت پر اترا، چھت سے آیا گھر میں وہ
منقسم ہوتا گیا منظر سے پس منظر میں وہ

در دریچے بند ہیں ممنوع دن کا داخلہ
خواب کی بانہوں میں ہے تنہا نہیں بستر میں وہ

شمع کی لو سے لپٹتا ہے پتنگے کی طرح
یعنی ہوتا ہے اچانک سرخ رو پل بھر میں وہ

سخت پہلے دل ہوا، پھر ہونٹ، پھر آنکھیں ہوئیں
رفتہ رفتہ رفتہ رفتہ ڈھل گیا پتھر میں وہ

زخم اندر زخم اِدھر ہیں دست و پا غائب ادھر
رائیگاں در رائیگاں دونوں طرف لشکر میں وہ

خوب ہے آب و ہوائے خاک کی جادوگری
ایک رخنہ چاہتا ہے گنبد بے در میں وہ

پھر ہوا کے ساتھ اڑے گا کم، اڑائے گا بہت
کیمیا ہو جائے گا جب اپنی خاکستر میں وہ

میں کہاں روشن ہوں ظلمت خانہ جاں میں زبیر
جگمگاتا ہے جہاں اطراف بحر و بر میں وہ

چاروں طرف ہیں خار و خس وحشت میں گھر ہے باغ سا
چوٹی پہ کوہسار کی جلتا ہے کیا چراغ سا

شام بھی ریشہ ریشہ ہے صبح بھی ہے رفو طلب
اور یہ تاب کار وقت خود بھی ہے داغ داغ سا

آب رواں کی گونج سے شورش خاک و باد تک
میں ہی ہوں نقش جاوداں میں ہی عدم سراغ سا

تیری نگاہ لطف کے طرز تکلمات سے
دل کی بساط تھی ہی کیا ٹوٹ گیا ایاغ سا

لیل و نہار وقت کی لمبی قطار میں کہیں
ایک زبیر اور ہے شاعر کم دماغ سا

غزلیں

زبیر شفائی

پر نہیں تھے مگر اڑ کر آیا
پھول کو توڑنے پتھر آیا

وہی ترتیب تھی تہذیب وہی
دشت سے لوٹ کے جب گھر آیا

زلف کے بعد گریبان کھلا
پھر وہ پوشاک سے باہر آیا

شاخِ زیتون ثمر بار ہوئی
دن گیا اور کبوتر آیا

خستہ دیواریں رخنے تھے کئی
شور یوں ہی تو نہیں در آیا

فطرتاً بوئے گل آوارہ تھی
لیکن الزام صبا پر آیا

جنگجو وقت تھا شمشیر بکف
کون میدان میں جاکر آیا

خوب دیکھا تجھے ان آنکھوں نے
لطف دونوں کو برابر آیا

موسمِ سبز گلستاں میں زبیر
خوف سے کانپتا تھر تھر آیا

کامرانوں پہ گجر بجتے ہی گلباری ہو
اور آگے کے لئے کوچ کی تیاری ہو

کسی اک رات، جھپکنے نہ دو پلکیں اپنی
خواب وہ خواب ہے جس خواب میں بیداری ہو

بحر و بر چھان لیا پھر بھی وہ گوشہ نہ ملا
جہاں صحرا ہو نہ صحرا کی عمل داری ہو

سبز سے سرخ وہ گلشن میں ہوا یوں جیسے
پاؤں کے نیچے زرِ گل نہ ہو چنگاری ہو

میں تو میں ہوں پلٹ آئے گا یہ جاتا موسم
بانوے شہر کا فرمان اگر جاری ہو

کب سے اک غول ہنر دوست ہے کوشش میں زبیر
کہ سخن عرض کریں تو بھی اداکاری ہو

صائمہ بتول

رہین چاک وحشت حوصلہ ہوگا ہمارا
کہ دشت ہجر ہی اب راستہ ہوگا ہمارا

درِ دل وا نہ کر پائی تھکے ہاتھوں کی دستک
تمھاری روح سے کیا رابطہ ہوگا ہمارا

تمھاری بزم میں تو معتبر کب ہوسکے ہم
اب اس محفل میں شاید تذکرہ ہوگا ہمارا

حسی پلکیں چنیں گی موجۂ کوثر کی چاندی
بہشتی بادلوں میں راستہ ہوگا ہمارا

ہمارے واسطے باد مراد اک دم چلے گی
ریاض سبز جاں میں ٹھہرنا ہوگا ہمارا

تعارف پہ مصر ہے وہ جسے ہم خوش گماں لوگ
سمجھتے تھے فقط اس کو پتہ ہوگا ہمارا

خوشبیر سنگھ شاد

جو میری سانسوں میں اکثر نہاں سا لگتا تھا
کبھی کبھی تو بہت بدگماں سا لگتا تھا

بدن سے روح تلک شور ہے قیامت کا
یہ درد پہلے بہت بے زباں سا لگتا تھا

عجیب عالم حیرت میں ہوں اسے پاکر
جو خواب مجھ کو کبھی رائیگاں سا لگتا تھا

وہ ایک خواب کا لمحہ عجیب لمحہ تھا
ہر ایک رنگ حقیقت گماں سا لگتا تھا

کبھی کبھی وہی مڑکر نکل گیا چپکے
وہ آشنا جو بڑا مہرباں سا لگتا تھا

کچھ دیر میں وہ آگ تو خاموش ہے
بستی مگر زمیں سے ہم آغوش ہے

پھیلی جو روشنی تو زمینوں پہ بچھ
گئی تو ایک غار میں روپوش ہے

اب مجھ کو تیرا نام بھی آتا نہیں ہے
اک داستاں تھی وہ بھی فراموش ہے

جتنی اذیتیں تھیں وہ سب مجھ کو سونپ
قسمت بھی شاد کتنی سبک دوش ہے

شاہین بدر

اسے کہنا

اسے کہنا
ہتھیلی کی لکیریں
اس پرندے کی طرح ہیں
جو بصارت سے تہی ہو جائے

اسے کہنا
کہ شب کی فصل کٹتی ہے
تو صبح نو کی شاخوں پہ
کرن کے پھول کھلتے ہیں
مگر آساں نہیں کھلتے

ہوا جب بادباں کھولے
سفینہ رات کا
جب صبح کے ساحل پہ آپہنچے
تو وہ بھی فکر کر لے اپنی
دل کی روشنی کا پھول بن جائے

جعفر ساہنی

کبھی تم جھوٹ بھی بولو

ہمیشہ سچ ہی کہتے ہو
تکلف نہیں رکھتے
کھری سب کو سناتے ہو
بہت ہی صاف گو ہو تم
مگر بابا

زمانہ کا بدلنے کو
تکلف سے سہی لیکن
کبھی میٹھی سلونی بات
کہنا خوب ہوتا ہے
جہاں کانٹے ہیں

اس گلشن میں آخر
گلوں کی سانس بھی ہے
شب دیجور کے دل میں
سحر کی آس بھی ہے

عالم خورشید

نہ جانے کیا زمیں سے ہم نے وعدہ کرلیا ہے
کہ اس کی خاک کو تن کا لبادہ کرلیا ہے

بلا سے آندھیاں آئیں کہ بارش کی ہو رم جھم
دیے کی لو کو ہم نے پھر زیادہ کرلیا ہے

غزال دشت ہیں کیوں شہر میں آکر بدل جائیں
یہیں ہو طرفۂ وحشت' ارادہ کرلیا ہے

نہ جانے کتنی مدت میں وہ طے ہوگا سواروں سے
سفر جو پل میں ہم نے پا پیادہ کرلیا ہے

ہمیں تو اب عدو بھی دوست جیسے لگ رہے ہیں
ذرا کچھ اور ہم نے دل کشادہ کرلیا ہے

کبھی سوچیں تو عالم رہبران قوم و ملت
جدا سب نے علم کیوں ایستادہ کرلیا ہے

دل کی کوئی طلب نہیں' لب پہ کوئی دعا نہیں
زندہ ہیں لوگ کس طرح ہم کو پتہ چلا نہیں

خلقت تمام شہر کی' مجھ پہ ہے مہربان کیوں
میں نے تو آج تک کوئی کار جفا کیا نہیں

شاید ہوس کی آگ بھی تشنہ لبی کے ساتھ ہے
پانی ملا ہے اوس بھی' شعلہ مگر بجھا نہیں

نظم و غزل سے کیا ہوا' دل میں رہی وہی خلش
لکھنا تھا جو لکھا نہیں' کہنا تھا جو کہا نہیں

عالم یہ انتقام کی منزل بھلا ہے کون سی
خود سے شکایتیں بہت' دنیا سے کچھ گلا نہیں

گڑیا

مقدر حمید

وِنّی کی سالگرہ کو کوئی ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا۔ وہ اسے دھوم دھام سے، نہایت شاندار طریقے سے منانا چاہتی تھی لیکن اب تک تیاریاں پوری نہ ہو پائی تھیں۔ وہ آج وِنّی کو میڈ سرونٹ کے پاس چھوڑ آئی تھی۔ اسی لیے ایک طرف تو بے حد عجلت تھی گھر پہنچنے کی اور دوسری طرف یہ احساس بھی کھائے جا رہا تھا کہ اب تک ڈھنگ کی شاپنگ بھی نہیں کر پائی۔ وہ لوگ کھارادر سے گزر رہے تھے کہ بیوٹی گیلیریز کے بورڈ پر نظر پڑی۔ یکلخت دھچکا سا لگا۔ اور اچانک بھولی بات یاد آ گئی۔ او گاڈ! ایسی بات وہ کیوں بھول گئی تھی!

"دو ڈھائی سال! میڈم مشکل ہے۔ اتنے دنوں تک، کہہ نہیں سکتے۔ ممکن ہے دس پوز بھی کر دیے گئے ہوں۔ پھر آپ رسید بھی کھو چکی ہیں۔ ایسے میں ڈھونڈنا تو..." وہ منیجر کی بات پر دھیان دیے بغیر، جیسے ٹرانس کے عالم میں اس مشہور اور کشادہ لانڈری کے اندرونی حصے میں داخل ہو گئی۔ اس کی متلاشی نظریں اس سرے سے اس سرے تک ہر ایک ریک پر قرینے سے تہ کیے یا پھر ہینگر میں ٹنگے ملبوسات کو چھوتی ہوئی گزرتی چلی گئیں۔ چہرے پر مایوسی چھانے لگی تھی کہ اچانک۔ ڈھیر سارے کپڑوں کے درمیان وہ دکھائی دے گئے۔ اس کی پیاری پیاری گڑیا، دھلی دھلائی، اجلی اجلی اور پاس ہی پولی تھین تھیلیوں میں ٹیڈی بھالو، خرگوش .... "وہ رہے۔ وہ رہے۔" وہ بے حد جوش سے خوش ہو کر چیخ پڑی اور لپک کر اپنی گڑیا کو سینے سے لگایا۔

اس نے اپنے بہت سارے کھلونے، ٹیڈی بھالو، بندر، بالوں کے بنے خرگوش اور اپنی پیاری پیاری گڑیا ڈرائی کلیننگ کو دے دیے تھے، کچھ عرصہ پہلے۔ ہوا یہ تھا کہ گھر میں کی نے پینٹنگ اور مرمت کا کام نکالا تو سارے کے سارے دھول مٹی میں اَٹ کر میلے ہو گئے تھے۔ کتنے دن ہو گئے اس بات کو، کیسے بھول گئی وہ؟ ہاں۔ اس بیچ اس کی شادی کا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور پھر سال بھر میں وِنّی آ گئی۔ وہ اس کی کلیلیں بھرتے، فرشتے جیسی ٹیڈی کو پا کر جیسے سب کچھ بھول گئی۔ اپنے پرانے ٹیڈی بھالوؤں اور جان سے پیاری گڑیا کو بھی۔

دراصل اس تمام عرصے میں شب و روز کچھ ایسے ہنگامہ خیزیوں کے تھے کہ بس اپنے کوئی میراتھان دوڑ تھی کہ جب تک منزل نہ مل جائے یکسوئی کا کرشمہ نہ لے۔ آج اچانک، خود کو اس دکان کے سامنے پا کر، سب کچھ یاد آ گیا۔

پہلی بار جب ڈی اس کے گھر گیا اور ڈیڈ مام سے ملنے کے بعد اس کے کمرے میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ کمرہ تقریباً سارے کا سارا ٹیڈی بھالوؤں سے بھرا پڑا تھا۔ اور ان کے بیچ تھی بڑی کی چہیتی، چیاچولی پہنی وہ سانولی گڑیا جو پاپا نے اسے دی تھی۔ اس نے بتایا تھا اس کے سنگی ساتھیوں میں بس یہی ایک گڑیا ہے۔ باقی اتنے سارے ٹیڈی اس لیے ہیں کہ ہر سالگرہ پر، بڑی ہو جانے کے بعد بھی، ایک ٹیڈی ضرور اسے تحفے میں دیا جاتا رہے۔

"نہیں گنتا مست۔ ورنہ تم میری عمر جان لو گے۔"

"تو کیا اب تک اپنی عمر غلط بتاتی رہی ہو؟"

"نہ غلط نہ صحیح۔ بتاتا کون ہے؟ اور پھر لڑکیوں سے پوچھا جاتا ہے بھلا؟" وہ چڑھانے کے انداز میں بولی۔ ڈی ہنسا: "تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے ادھیڑ ہو گئیں!"

"کیوں؟ ادھیڑ ہونا کوئی عیب ہے؟ پکی عمر کے لوگ خوب صورت اور اچھے نہیں لگتے؟ دادی کو دیکھا تا؟ ہو نہ ..... پکی عمر بھی کوئی خوبی ہے بھلا۔ مجھے تو شروع ہی سے مزہ آتا تھا خود کو اپنی عمر سے زیادہ ظاہر کر کے لوگوں کو دق بنانے میں۔ بچپن میں سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی تو بالوں میں پاؤڈر کی سفیدی لگا کر دادی اماں بن جایا کرتی تھی۔"

"تم کہیں کہیں سے، دیکھو نا، کچھ میں آگی بھی ہو اور نہیں بھی۔ ویسے تمہاری باتیں عجیب ہوتی ہیں"

"تمہاری بھلا ہے اس میں۔ جان لو میں کتنی عجیب ہوں۔"

اور گزرتے وقت کے ساتھ معلوم ہوتا چلا گیا کہ وہ صرف عجیب

بلکہ بے حد مختلف لڑکی تھی۔ کسی حد تک خودسر اور ضدی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو اپنی بات منوانے کے لیے شام سے شروع کی ہوئی بحث کو اگلی صبح تک جاری رکھ سکتے ہیں۔ غضب کی خود اعتماد لڑکی تھی۔ غالباً یہی ضد اور اعتماد کا نتیجہ تھا کہ دونوں طرف نہ صرف والدین بلکہ خاندان کے تقریباً سبھی افراد کو جھکنا پڑا اور پھر ایک دن اپنے والد کو الوداع کہہ کر وہ کامرانی اور شادمانی کے ساتھ سسرال چلی آئی۔ لیکن یہ سب اتنی آسانی سے نہیں ہوا تھا۔ آگ کے دریا سے گزرنا پڑا تھا۔ اس معرکے میں لوگوں کے ایسے رویے سامنے آئے جو اس کے لیے نئے اور عجیب تھے۔ اس انکشاف نے اسے نہ صرف حیرت میں ڈال دیا بلکہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آخر ایسا کیوں؟ بظاہر سماجی سطح پر ایک دوسرے سے خوش اخلاقی کے ساتھ ملتے جلتے، دوستیاں نبھاتے لوگ، اندر ہی اندر، ذات پات، مذہب اور علاقائیت کی بنا پر اتنی شدید نفرتوں کو بھی پروان چڑھاتے ہیں۔ اس معلومات نے اس کے غصے کی آگ کو مزید ہوا دی تھی۔

Bloody hypocrites کیا کیا نہ دباؤ ڈالے گئے، کیا کیا نہ ترکیبیں آزمائی گئیں؟ ہاتھ جوڑنے، واسطے دینے سے لے کر ایموشنل بلیک میل اور پھر خطرناک دھمکیوں تک۔ لیکن وہ نکی ہی کیا جو من مانی سے باز آ جائے۔ گزرتے وقت کے ساتھ سب کو معلوم ہو گیا کہ وہ اپنی جان دے سکتی ہے، اپنی بات سے ٹل نہیں سکتی۔ یہ اور بات ہے کہ رشتہ داروں میں جو کٹر مخالف تھے ایک دو ملاقاتوں میں ہی، ڈی ان کے دلوں پر حکمرانی کرنے لگا اور یہ جملہ دونوں خاندانوں میں گونج اٹھا کہ: ایسا سونا منڈا تو اپنی برادری میں بھی ڈھونڈے نہ ملتا۔

یہ اس کی دوہری جیت تھی۔

ڈی نے دھیرے دھیرے جانا تھا کہ نکی میں صنفِ نازک کے جتنے اوصاف گنائے جاتے ہیں، بدرجہ اتم موجود تھے۔ نرم گفتار، خوش کردار، ہر ایک کا خیال رکھنے والی۔ Feminist قسم کی چیز تو وہ ہرگز نہیں تھی۔ کبھی یہ نہ ہوا کہ کسی کا جنم دن، شادی کی سالگرہ یا ایسی ہی کوئی اہم تقریب وہ بھولی ہو یا بے پناہ مصروفیت کے باوجود کوئی تحفہ، کوئی پیارا سا یا سستی تہنیتی کارڈ بھیجنا اسے یاد نہ رہا ہو۔ لیکن جہاں ذرا سا امتیازی یا متعصب رویہ اس نے محسوس کیا کہ وہ چراغ پا ہو کر شیر سوار درگا بنی۔ بس مشتعل ہو جاتی۔ اندر سے کوئی چھپا ہوا آتش فشاں پھٹ کر سامنے والے کی شخصیت کو تہس نہس کرنے لگتا۔

کار چلاتے ہوئے اپنے خیال میں کھوئی نکی کے چہرے کو ایک نظر دیکھا تو وہ ہو بہو دادی لگی۔ اس نے چھیڑنے کے لیے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ کچھ یاد آ گیا اور خاموشی میں ہی عافیت نظر آئی۔ نکی کے خاندان میں جس شخصیت سے وہ بے حد متاثر ہوا وہ دادی تھیں حالانکہ ڈی نے دادی کو بس دو چار بار ہی دیکھا تھا۔ بڑی جاہ و جلال کی خاتون تھیں۔ پرانی قدروں کی امین۔ روایات کی پاس داری نہ صرف اپنی ذات تک محدود رکھتی تھیں بلکہ کنبے کے ہر فرد پر اس کی پابندی لازم قرار دیتی تھیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ رسم و رواج برقرار رکھنے کے معاملے میں انتہائی شدت پسند تھیں اور اس پر عمل پیرا ہونے میں کسی رکاوٹ، کسی حد کو تسلیم نہیں کرتی تھیں۔ ان دنوں وہ سخت علیل تھیں اور بستر سے لگ چکی تھیں لیکن ضعیفی اور کمزوری کے باوجود ڈی اور نکی کو لے کر سب سے زیادہ مخالفت ان ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ شادی طے ہوتے ہوتے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی تصویر رواج کے مطابق ہال کی دیوار پر لگا دی گئی تھی۔ فریم سے جھانکتی، آرپار ہو جانے والی تیز آنکھیں اور ان آنکھوں کی وہ ناقابلِ بیان چمک جو آج بھی زندہ لگتی تھی۔ غور سے دیکھتے ہوئے محسوس ہوا تھا کہ ان کے اور نکی کے خدوخال میں غضب کی مشابہت ہے۔ اس کے ذہن میں ایک شریر خیال نے سر اٹھایا: کیا ہو جو نکی کا ذرا سا میک اپ کر دیا جائے بالوں کی ایک لٹ کو ہلکی سفیدی میں پوت کر اور چہرے پر لکیریں کھینچ کر۔۔۔ تو وہ کیسی لگے؟

وہ اس مشابہت کے حوالے سے کبھی کبھار نکی کو چھیڑتا لیکن وہ ہمیشہ کی طرح ڈی کی چھیڑ خانی سے محظوظ ہونے اور خود بھی مذاق میں شامل ہونے کے بجائے ناراض ہو جاتی۔

"خبردار جو پھر کبھی مجھے ان سے کمپیئر کیا"

"لیکن وہ تو تمھیں بہت چاہتی تھیں۔"

"چاہتی ہوں گی۔ لیکن میں، میں ہوں۔ مجھے یہ بات سخت ناپسند ہے۔" وہ غصے سے لال پیلی ہو کر کہتی اور پھر چپ سادھ لیتی۔

ایک دن اسے اچھے موڈ میں دیکھ کر اس نے موقع نکال لیا۔

"تم نے دادی کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔"

"کیا بتاؤں، میں خود زیادہ نہیں جانتی۔"

"مت بتاؤ۔ کب تک چھپاتی رہو گی۔ دیکھتا ہوں۔"

"میں کچھ چھپا نہیں رہی ہوں۔ اور سنو، جس صداقت پر چھان بین کے بعد مجھے یقین ہو جائے میں صرف اور صرف اس بات کو کسی سے کہنا پسند کرتی ہوں۔ گپیں ہانکنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔" وہ بولتے بولتے چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔ پھر آہستہ آہستہ رک رک کر کہنے لگی: "وہ تو گزرے وقتوں کی چیز ہو گئیں۔ تم آج کے لوگوں کو کتنا جانتے ہو؟"

"جو سامنے دکھائی دیں، ان کے بارے میں ایسا کیا ہو سکتا ہے جو جاننا چاہوں؟"

"سامنے سے مائی فٹ۔۔۔ خاک جانتے ہو تم۔۔۔ یہ سو کالڈ تعلیم یافتہ، اونچی سوسائٹی کے مہذب لوگ۔ یہ درندوں سے کم نہیں۔ ان کے یہاں آج بھی کئی کئی سطحوں پر ڈس کریمی نیشن ہے، گھناؤنی نفرتیں ہیں۔"

"کبھی اسے ہمارا ورثہ کہہ لو ایک طرح سے۔ دھیرے دھیرے رویے بدلیں گے۔ میں تو انتظار نہیں کرتی۔"

"اسی لیے تو تم مجھے اچھے لگتے ہو۔"

"سمجھ لو تمھاری زبان پر دن بھر میں کوئی ایک تو اتنی اچھی بات آئی۔ تو جناب یوں ہے۔۔۔ ہر فیلڈ میں ٹاپ پر پہنچنے کی کوشش، یہ یونیورسٹی کے

انعامات۔ شاید اتنی رونقوں کے خلاف احتجاج..."

"اسٹوپڈ۔ یونیورسٹی میں ٹاپ کرنے کے لیے نخرے اور احتجاج کی نہیں، کڑی محنت، ریاضت اور عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ عقل، جو تمہاری کھوپڑی میں ہے ہی نہیں۔"

"ابھی پل بھر پہلے تم نے میرے کیے اتنا پیارا جملہ کہا تھا۔ اپنی رائے کو اتنی تیزی سے بدل کر سارا نشہ غارت کر دیا۔ چلو بتاؤ۔ بات کہاں سے چلی کہاں جا پہنچی۔ جو تم نہ کہنا چاہو تو یوں ہی سہی لیکن۔"

"پہلے میں خود جان لوں کہ کہاں کتنی سچائی ہے، اور یہ بھی کہ نہیں۔ فی الحال بے کار کی باتوں میں سر کھپانا چھوڑ دو۔ کھوپڑی میں کہیں غلطی سے ہلکی ذرا سی عقل بچی رہ بھی گئی ہو، تو وہ بھی جاتی رہے گی۔"

"تا ہیں۔۔۔"

ان دنوں کی بات ہے جب ان کی منگنی ہو چکی تھی اور شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایک دوپہر نکی اپنے گھر میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ کسی ضروری کام سے وعدے کے باوجود ابھی تک لوٹا نہ تھا۔ گھر میں اتفاق سے کوئی نہ تھا سوائے نوکرانی کے جو کچن میں مصروف تھی۔ وہ ہال میں بیٹھی اونگھنے لگی تھی۔ رات ٹھیک سے نیند نہیں ہو پائی تھی اور قدرے تکان بھی تھی۔ دیوار کی تصویر کو دیکھتے دیکھتے اُسے جھپکی سی آئی۔ اس نے آنکھیں موند کر صوفے سے سر ٹکا دیا۔ سانسوں کے زیر و بم میں اچانک جیسے بھونچال سا آیا اور سب کچھ دھندلا گیا۔ اس دھواں دھار پس منظر سے ایک تصویر ابھری۔ کمرے میں ڈوبی ہوئی قدیم طرز کی حویلی۔ گھوڑوں کی ٹاپیں اعلان جنگ کرتی بگل کی دل خراش آواز۔ دور دور تک پھیلا ہوا ڈراؤنا ریگستان۔ آہستہ آہستہ بڑھتی ایک سفید پوش عورت... بچی کی دل دوز چیخ...

"یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟" وہ چیخی

"اوگاڈ! کیسا ڈراؤنا خواب تھا یہ... اس کا سر صوفے سے ٹکا ہوا تھا اور بدن پسینے میں شرابور۔

"ارے لو۔ ہم کہاں کہاں ہو آئے۔ پھر بھی کام ہیں کہ ختم ہی نہیں ہوتے۔ اور ان کو دیکھو مزے سے نیند ہو رہی ہے۔" ڈی اندر آتے ہوئے بولا۔

"ایسے ہی بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ گئی۔ کیا وقت ہوا ہے؟"

نکی طے نہیں کر پا رہی تھی کہ ڈی سے اس بات کا ذکر کرے یا نہ کرے، کہیں یہ صرف واہمہ تو نہیں؟ اکثر وہ جب بھی تنہا ہوتی اور ہال میں آویزاں اس تصویر پر نظر پڑتی تو ایک عجیب سی سوتے جاگتے کی کیفیت طاری ہونے لگتی اور پھر وہی آوازیں اور وہی منظر کسی ڈراؤنے خواب کی طرح دہرانے لگتے۔

ایک اور دن؟ ایک اور گرمیوں کی دوپہر وہ ہال میں تنہا بیٹھی تھی۔

ڈی اپنے پروجیکٹ کے کچھ کاغذات ساتھ لے گیا تھا اور نکی کے بیڈ روم میں بیٹھا انہیں دیکھنے میں محو تھا۔ نکی نے محسوس کیا کہ وہ پھر ویسی ہی غنودگی کے نرغے میں ہے۔ اس نے خود کو جگائے رکھنے کی شعوری کوشش کی تھی۔ جانے کیوں کسی پہاڑ کی بلند چوٹی کو سر کرنے جیسی دقت ہو رہی تھی۔ وہ ہانپنے لگی تھی کہ اچانک پھر وہی منظر، وہی آوازیں اور وہی چیخ۔۔۔ وہ تیزی سے اٹھ کر بیڈ روم کی طرف دوڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈی شان کو متوجہ کرتی اور سب کچھ بتاتی، اس نے دیکھا ڈی دروازے کی طرف پشت کیے اپنے کانوں میں گم ہے اور ٹی وی پر کوئی فلم یا شاید سیریل چل رہا ہے۔ چاروں طرف کمرے میں رقص کرتے تا گل یا ایک طرف زنجیروں میں جکڑی ایک عورت، کھاروں پر پڑتی ہوئی ضرب اور تلواروں کی جھنکار۔ دوسری طرف سے ایک سفید پوش عورت، کمرے میں ڈولی جھاڑیوں کی طرف دھیرے دھیرے بڑھتی ہوئی اور پھر مکمل تاریکی میں ڈوبتے ہوئے اسکرین سے ابھرتی ایک دل دوز چیخ۔

"کیا بات ہے؟ اس طرح دبے قدموں آکر، چپ چاپ دروازے میں کیوں رک گئیں؟" ڈی نے پلٹ کر پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں... کچھ بھی تو نہیں......" اور وہ پلنگ پر ایسے ڈھیر ہو گئی جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے وہاں تک پہنچی ہو۔

کھار سے ڈرائیو کرتے ہوئے وہ لوگ سانتا کروز سب وے کی طرف چل پڑے۔ چوراہے پر سگنل نہ ہونے کے باعث رکنا پڑا۔ اور پھر چاروں طرف سے۔۔۔ ونڈ اسکرین کو بظاہر صاف کرنے کی کوشش میں گندے کپڑے سے اسے میلا کر دینے والے اور پھر ڈھٹائی سے معاوضہ طلب کرنے والے لڑکے، پھول بیچنے والیاں، غبارے والے اور بھکاری۔۔۔ سب نے دھاوا بول دیا۔ لیکن وہ تو جیسے کسی اور ہی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی اپنی گڑیا کو سینے سے لگائے۔ ڈی نے اسے اس طرح گم سم دیکھا تو مسکرا دیا۔

"بھوکی ہوں۔ کھانا کھاؤں گی .... روپیہ دے۔ اے میم۔ روپیہ دے نا۔۔۔"

جانے کہاں سے بھکارن لڑکی کاروں کے بیچ زگ زیگ رستہ بناتی، آکر کھڑی ہو گئی۔ مشکل سے پانچ چھ برس کی ہو گی۔ ننگ دھڑنگ۔ صرف ایک میلی کچیلی چڈی پہنے ہوئے۔ خود اتنی سی اور اوپر سے گود میں ایک چھوٹے سے بچے کو اٹھا رکھا تھا۔ بچہ بار بار کولہے سے پھسلتا تو جھٹکے سے اوپر اٹھا لیتی اور مسلے رٹائے جملے بغیر رکے دہرانے لگتی۔ گود کا بچہ خوب موٹا تازہ تھا اور اچھے لباس میں۔ پھولدار پیا سوٹ پہنے ہوئے۔ لگتا تھا جیسے لاڈ پیار نے بنایا سنوارا گیا ہو۔ نکی اپنی دھن میں تھی۔ آواز سن کر چونکی اور پھر اس نے پرس سے کچھ ریزگاری نکال کر لڑکی کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ اچانک لڑکی کی نظر نکی کی اور غور کوشش سے ہوتی ہوئی سینے سے لپٹی ہوئی گڑیا پر جا کر ٹک گئی۔ اس کی آنکھوں

میں ایک نئی چمک آگئی۔

"کسم میم۔ وہ باؤلی دے نا۔ میرا بھائی کھیلے گا۔ باؤلی دیا میرے بھائی کو..." جانے کیا ہوا کہ بچی غصے سے سرخ ہو گئی۔ اس کے حواس پھر اسی منظر کے شکنجے میں آگئے۔ آوازوں اور روشنیوں کا سحر، طبل جنگ، بے ہنگم شور، ریگ زاروں میں بگولوں کا شیطانی رقص، گرد باد میں جکڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہوتے انسانی ہیولے......

"نہیں دوں گی۔ نہیں دوں گی.... کبھی نہیں دوں گی اپنی گڑیا...!"
بچی گڑیا کو کھینچتے ہوئے اتنی زور سے چیخی کہ آس پاس کے سارے لوگ چونک گئے۔

چوراہے کی بتی سرخ سے سبز ہو جانے کے باوجود رکی ہوئی کار نے، شہر کی بے چین ٹریفک کو غصے میں بدل دیا اور بیک وقت سینکڑوں ہارن زور زور سے چیخنے لگے۔ ◢◢

رونق شہری

مغالطہ لہو کا پھر وبال بن کے رہ گیا
تمام شہر سرخ اشتعال بن کے رہ گیا

گہر کی طرح اشک میں چمک رہا ہے آج وہ
سیاہ شب میں دل کا جو ملال بن کے رہ گیا

مری طرح برت کے دیکھتا تھا جو حروف کو
ذرا سی چوک میں سب ابتذال بن کے رہ گیا

ضرورتوں کی فوج کا محاصرہ عجیب تھا
وہ اپنی خواہشوں کا یرغمال بن کے رہ گیا

یہاں کی خاک سرمہ تک نہ بن سکی کبھی
بدن کا خون صرف ریال بن کے رہ گیا

اسنیٰ بدر

وہ بھی کیا دن تھے کیا مقدر تھے
تم ہمیں ہم تمھیں میسر تھے

تم ہمیں سب سے اچھے لگتے تھے
ہم تمھیں ہر کسی سے بڑھ کر تھے

حوصلے کانپ جاتے تھے
جو ارادے تمھارے اندر تھے

آگ میں پاؤں دے ہم نے
راہ میں ہزار پاؤر تھے

ہم کو سچ کا گمان ہونے لگا
جھوٹ کے کیا اڑان کیا پر تھے

تم نے آنسو بنا دیا ہم کو
پیرہن دھول کا تھا پتھر تھے

خیر سے خواب جھوٹ ہوتے ہیں
آنکھ کھولی تو اپنے گھر پہ تھے

جمال اویسی

کوئے بتاں کے آگے خندق بنائیں گے ہم
جچتے ہیں تیرے عاشق ان کو مٹائیں گے ہم

آباد ہو رہے ہیں گلشن بھی آشیاں بھی
بے سود ان کا دعویٰ بجلی گرائیں گے ہم

امروز ہے جہاں اب فردا ہے اور نہ ماضی
حدِ زماں سے آگے بستی بسائیں گے ہم

کب کھیل ختم ہوگا اس کی خبر نہیں کچھ
جب تک یہ تن ہے من ہے ناچیں گے گائیں گے ہم

زندگی تیرے لئے خاک بہت چھانی ہے
تو بھی میرے لئے اک وجہ پریشانی ہے

میں نے بس دیکھ لئے نقش و نگار دنیا
ویدنی اتنی نہیں جتنی ثناخوانی ہے

غرق ہوتا ہوا دریاؤں میں صحرائے وجود
بے زمیں کرتا ہوا چاروں طرف پانی ہے

میں نے مانگا تھا بہت اس نے دیا ہے کچھ کم
قحطِ اکرام میں خواہش کی فراوانی ہے

وقت کے بارے میں کب سوچتے ہیں ہم ویسے
یہ تواریخ کا راقم نہیں، زندانی ہے

سب دعا کرتے ہیں اور حل کے نہیں رہتے ہیں
اس جہالت پہ مجھے آج بھی حیرانی ہے

اقتدار جاوید

موت تو بعد کی چیز ہے

سانس لینے نہ دو
دم نکلنے نہ دو
عمریں غارت کرو اور کہو
موت تو بعد کی چیز ہے

(اس دفعہ)
ہونٹ جتنے کھلے تھے کھلے رہ گئے
آنکھ جو ایک جانب مڑی دفعتاً
وہ مڑی رہ گئی
میری پنڈلی سے پنڈلی جڑی رہ گئی
موت تو بعد کی چیز ہے

خاک ہوتے محاذوں پہ بیٹھے ہوئے ہم
ابھی تک وہیں مورچہ بند ہیں
موت تو بعد کی چیز ہے

اے مری نظم کے نوحہ گر
پڑھ ہی لے مجھ کو شاید کہانی مری
کاٹ لیں مجھ کو شاید زمانوں سے
حیران ہوتی ہوئی زندگانی مری
موت تو بعد کی چیز ہے

ساری باتیں بھول رہا ہوں

سکھ دکھ میں تبدیل نہ کرنا پاگل پن ہے
خود ہی کہا تھا
تم نے مجھ سے خود ہی کہا تھا
سرحد پر اب رہتے رہتے ساری باتیں
بھول چکا ہوں
چھوٹی چھوٹی ساری باتیں بھول چکا ہوں
آگے جانا ممکن تو ہے
واپس مڑنا ناممکن ہے
دکھ سے ناطہ جوڑ لیا ہے
اب کے خط میں کچھ نہیں لکھتا
خط نہیں لکھتا

اور بھلا کیا لکھوں خط میں
راتوں والی گٹھری بھاری ہوتی جاتی ہے
سب کچھ ٹھیک ہے
پاگل کر دینے والے پاگل پن میں خوش خوش وقت
گزار رہا ہوں
کچھ سامان اتار چکا ہوں کچھ سامان اتار رہا ہوں

میری دنیا

کئی دنیائیں ایسی ہیں
کہ جو آباد ہونے سے بہت پہلے کہیں دم توڑ دیتی ہیں
ستاروں سے پرے رہنے کی خواہش ہو
اگر ارض دعا میں قیام کرنے کی تمنا ہو
کئی دنیائیں ایسی ہیں
کسی ساحل پہ دو پل بیٹھ کر اس پار سے آتی
ہوا سے باتیں کرنی ہوں
ہوا جو ہجر کے پیغام دیتی ہے
گئے موسم مسافر ہیں
وہ جا کر آ نہیں سکتے
شبیہیں آنسوؤں میں قید ہو سکتیں
تو موسم اور مسافر لوٹ سکتے تھے
کئی دنیائیں ایسی ہیں
ذرا اس وقت کی دیوار کے اس پار جانے کی تمنا ہو
کہ صبحیں کس طرح شفاف ہوتی ہیں
زمانے کس طرح تخلیق ہوتے ہیں
کئی دنیائیں ایسی ہیں

غزلیں

قربان آتش

کہاں تھی تاب کہ نیزہ چلائیں غازی پر
سوار رہ گئے سب لوگ اسپ تازی پر

پکارتا رہا کل رات ستارۂ مقسوم
میں بین کرتا ہوں اب اپنی بے نیازی پر

بہت یہ قیمتی شے ہے سنبھال کر رکھو
لہو نہ صرف کرو صورت مجازی پر

شکستہ بال کو قوت یہ مل گئی کیسے
دکھائی دینے لگا شاخ سرفرازی پر

چمکتا چہرہ بھی دھندلا دکھائی دینے لگا
اب اعتبار کروں کیا میں شیشہ سازی پر

لہو میں تیرے رہے ہیں خوشبوؤں کے کنول
نثار دل مرا ایسی سخن طرازی پر

شاہد اختر

یہ دنیا دم بخود یوں ہی ہے ایسا کچھ نہیں ہے
ابھی میں نے ترے بارے میں سوچا کچھ نہیں ہے

بہت جی چاہتا ہے اس کی خاطر کچھ بچا رکھوں
مگر اتنی گرانی ہے کہ ہوتا کچھ نہیں ہے

سبھی کو دے دلا کر مطمئن ہو گیا ہوں اب
مرے اوپر کسی کا اگلا پچھلا کچھ نہیں ہے

وہی آنکھیں وہی منظر نہ منظر ہائے ہجراں
مری دالان میں اب پہلے جیسا کچھ نہیں ہے

بہت کچھ ہے ابھی کہنے کو میرے پاس بھی اختر
مگر اس سال موسم سے الجھنا کچھ نہیں ہے

روشن لعل روشن

ہر قدم ہر موڑ پر ختم سفر کی ہے
اس تماشے میں کہاں ممکن ہے گمر کی ہے

کس قدر دشوار ہے تازہ فضا کا مر
اس قفس سے چھوٹنا پھر بال و پر کی ہے

دل کے آگے ہر قدم گمراہیوں کی کھائی
جس طرف جانا نہیں پھر کیا ادھر کی ہے

بے بصارت ہم ہیں یارو بے سماعت وہ
اٹھ سکے دست دعا جب تو اثر کی ہے

اس قدر خائف نہ تھے روشن کبھی دانشور
ایک پل مہلت ملے تو عمر بھر کی ہے

• شمارہ نمبر ۲۰۸ میں "اخبار و اذکار" کے تحت اتر پردیش اردو اکیڈمی کی صدارت کا عہدہ قبول کرنے سے آپ کے انکار کی خبر نظر سے گزری۔ پھر میں نے "کتاب نما" میں آپ کا مفصل خط جو وزیر اعلیٰ حکومت اتر پردیش محترمہ مایاوتی کو لکھا گیا تھا، پڑھا۔ آپ نے جن وجوہات کی بنا پر انکار کیا ہے وہ واقعی بہت اہم ہیں اور جس قلبی صفائی سے فاش گوئی کی جرات کی ہے وہ اوروں کے لیے لبیک کہنے کے قابل ہے۔ جب اصل معاملہ "ہمارے" کچھ کرنے کا نہیں ہے بلکہ "آپ کے حسن کرشمہ ساز" کا ہے تو "ہم" اپنے کندھے کو بندوق رکھنے کے لئے کیوں حاضر کریں۔ یہ کام تو کسی سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی نہیں سوچا جاتا کہ دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر۔ جو شخص سر سوتی سمان پا چکا ہو، بہترین منتظم اور کار گزار رہ چکا ہو، ادب اور تاریخ کے حوالے سے ساجیات اور اس کی ضرورتوں سے واقف ہو، اور اردو اکیڈمی کی صدارت اس کے مرتبے سے فروتر ہے۔

تازہ شمارے میں آپ کا مضمون "ہماری کلاسیکی غزل کی شعریات" نظر سے گزرا۔ ادارہ شب خون نے "اس بزم میں" کے تحت صحیح لکھا ہے کہ اس مضمون میں فاروقی صاحب نے کچھ ایسے مسائل کی توسیع و تفصیل کی ہے جن کو وہ پہلے بیان کر چکے ہیں۔ میں نے سوغات نمبر (۱۱) پڑھا تھا تو ایک مفصل خط، جیسا کہ میری عادت ہے، محمود ایاز صاحب کو لکھا تھا محمود ایاز صاحب اب نہ رہے اور اس کا امکان کم نظر آتا ہے کہ سوغات رہے اور میرا خط شائع ہو۔ لہذا میں آپ کے مقالہ مطبوعہ سوغات نمبر (۱۱) اور محمود ایاز صاحب کے اداریے اور مغنی تبسم صاحب کے جوابی مضمون سے تعلق رکھنے والے اپنے جملوں کو یہاں پیش کرتا ہوں۔

"آپ (محمود ایاز) اور مغنی تبسم، صاحب نے کلاسیکی اردو شاعری میں بڑی کم مائیگی کو دکھلایا ہے۔ یہ نہیں کہا ہے کہ صنعت گری ہی اصل شاعری ہے۔ اور ایہام، رعایت اور مناسبت نہ ہوں تو شاعری وجود میں نہیں آ سکتی۔ مجھے مغنی تبسم صاحب کی بیشتر باتوں سے اختلاف ہے البتہ فاروقی صاحب نے لکھا تھا کہ ایہام اور رعایت وغیرہ کی شعریات کے تحت "طنز" جیسی اصطلاحیں نہ تھیں تو اس میں کلام ہو سکتا ہے کیونکہ بعض تذکرہ نگاروں نے شعرا کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے ایسی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ اور آپ نے بھی فاروقی صاحب کے مدعا کو سمجھنے میں عجلت کی ہے۔ فاروقی صاحب نے ایہام وغیرہ کو شاعری کا مقصود ہرگز نہیں بتلایا ہے۔

آپ نے اپنے اداریہ میں فاروقی صاحب کا جملہ "زبردست شعر ہے" لکھ کر یہ شعر نقل کیا ہے۔

بولا نہ کرچہ میں نے بہتیری کی تھی چوری
نکلا نپٹ وہ جھوٹا کہتے تھے جس کو شوری

لیکن فاروقی صاحب نے اس شعر کو "ایہام کا کارنامہ" لکھا ہے "زبردست شعر" نہیں کہا ہے۔ (دیکھئے سوغات نمبر ۱۱ صفحہ ۳۵) اور جس شعر کے متعلق "زبردست شعر کہا ہے" لکھا ہے وہ یہ ہے۔

جس ہاتھ میں رہا کی اس کی کمر ہمیشہ
اس ہاتھ مارنے کا سر پر بندھا ہے کرسی

(ایضاً صفحہ ۲۹)

آپ کو نقل کرنے میں Exactness کا خیال رکھنا تھا۔

حق یہ ہے کہ فاروقی صاحب کے اس مقالے کی "سوغات" نے وہ قدر نہ کی جس کی یہ مستحق ہے۔ مغنی صاحب نے علمی اختلاف کیا ہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو، اس لیے گوارا ہے۔ آپ نے جارحانہ اور غیر سنجیدہ اعتراض کیا ہے۔ وہ مجھے قابل قبول نہیں، اوروں کو ہو تو ہو۔ میں اپنا احتجاج درج کرتا ہوں۔" (خط مورخہ یکم فروری ۱۹۹۷)

میرا مقصود محمود ایاز مرحوم کو مجروح کرنا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ سنجیدہ علمی گفتگو کو منظر عام پر لانا ہے۔ ان جملوں کو یہاں پیش کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ ایک حلقے میں یہ تاثر اب بھی قائم ہے کہ فاروقی صاحب ایہام، رعایت و مناسبت کو ہی شاعری سمجھتے ہیں۔ اتفاق سے تازہ "شب خون" میں پھر اسی طرح کا آپ کا مضمون آیا ہے۔ حالانکہ اگر اس مضمون کو غور سے پڑھا جائے تو آپ کے بنیادی نکتے کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے اس کے لیے اس مضمون کے اختتامی دو پیراگراف کافی ہیں۔

ابن میری ہل کی جو تقریر بشکل ترجمہ "شب خون" میں شائع ہوئی ہے، اس سے یہ تاثر تو ضرور قائم ہوتا ہے کہ آج کی دنیا کو دہشت گردی اور دہشت زدگی سے بچانے کے لیے اسلامی تہذیب اور شعر و ادب کی بطور خاص ضرورت ہے۔ لیکن افسوس کہ اسلامی تہذیب خالص نہیں رہی اور شعر و ادب بھی کئی تعصبات کا شکار ہو گیا ہے۔ ابن میری ہل نے "شیطانی آیات" پر سلمان کی مذمت کی تھی تو مغرب کے بڑے ادیب خفا ہو گئے تھے۔ دوسری طرف اسلام جن عالمی مسائل سے دو چار ہے، ان کے تناظر میں مزاحمت کرنے والے کا نقطہ نظر بہت اہم نظر آتا ہے۔ اسلام نے ابتدا سے ہی اس نقطہ نظر کی گنجائش رکھی ہے۔ ابن میری ہل مستشرق ہیں۔ مذہبی آزاد خیال کے ماحول میں پلی ہیں ایسا ماحول جو شاعری میں لذت پاتا ہو اتھاہ اور ساری دنیا میں ہر طبقے کے مسلمانوں سے ان کی دوستی رہی ہے۔ اس لیے ان کے خیالات میں اتنی کشادگی آئی ہے جس کا اسلام متحمل نہیں ہو سکتا۔ دوسرے مستشرقوں کی طرح وہ بھی ایسی ہی باتیں کہتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ "

ایک عمدہ لفظ ایک عمدہ چیز کی طرح ہے (کاش ان کا اصل جرمن جملہ اور انگریزی ترجمہ دیا جاتا!) اور جس طرح اس خیال کی وضاحت کرتی ہیں، اس سے ان کے مافی الضمیر اور قرآن کے منشا میں صاف مغائرت نظر آتی ہے۔ انہوں نے "کٹھ ملائیت اور قانون پرستانہ موقفوں" پر تو سخت تنقید کی ہے مگر اسلام کے قانون مکافات و مزاحمت کو بالکل فراموش کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کوئی باب اسلام میں نہ پہلے تھا نہ اب ضرورت ہے۔

"اسد اللہ خاں" نہیں، اسد محمد خاں کی کہانی "ایک سنجیدہ ڈی ٹیکٹو اسٹوری" بہت عمدہ ہے۔ ممکن ہے، سلطان یا سلطانہ پرتگالی طبیعت زادہ اور حبشی غلام کی حرکتوں سے باخبر نہ ہو سکیں لیکن مخبری اور مزاحمت کی راہیں اسلام نے بھی دکھائی ہیں۔ ذاتی اور اجتماعی بقا کے لئے ضرورت ہو تو ان سے دریغ کرنا درست نہیں بلکہ فطرت انسانی کے خلاف ہے۔ یہ ایک عظیم ناول کا تھیم ہو سکتا ہے۔ اس سے مغرب کو وحشت زدہ نہ ہونا چاہئے، لیکن مستشرقین شاید ہی "محمدؐ کے شیروں" کی ہمت افزائی کر سکیں۔

ہم نے مغرب سے بہت کچھ لیا ہے۔ شعر و ادب کے میدان میں تو ہماری کاوشوں کا تمسخر ہی اڑایا جاتا ہے کہ مغرب کی محض نقالی کی جا رہی ہے۔ تہذیبی امور کے کسب میں ہم اتنے آگے نکل گئے کہ آزادی افکار، جس کو اقبال نے ابلیس کی ایجاد کہا تھا، بھی اپنالی۔ اب مخدوش ہی سی ذرا سی بلالیت باقی ہے وہ بھی "ان" کو پسند نہیں۔

"یہ جو ایک پگڈنڈی"
آسماں کو جاتی ہے
ہم یہیں پہ رکتے ہیں۔ — شہریار (شب خوں ۲۰۸)

دکھیم، گیا — محمد منصور عالم

● کل شب خون کا شمارہ نمبر ۲۰۸ آیا، مشمولات پر نظر ڈالی تو آپکا مضمون بھی تھا۔ لیکن مضمون سے پہلے خطوط والا کالم دیکھا تو ستیہ پال آنند کے خط کا جواب بھی آپ نے لکھا ہے، سوچا پہلے وہی پڑھا جائے اسلئے کہ یہ شخص جسکو آپنے عمدہ شاعر لکھا ہے مجھے نقلی آدمی لگتا ہے اور مجھے اس سے اللہ واسطے کا بیر ہے (واللہ اعلم بالصواب) جواب، آپنے جو لکھا وہ نہایت سلیقے اور ہنرمندی سے لکھا ہے اور آپکی تحریر سے مجھے خود بھی یک گونہ اطمینان ہوا اور شخص مذکور سے میرے تعصب میں نسبتاً کچھ کمی بھی آئی۔

اب آپکے مضمون کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ اظہار بھی کرتا چلوں کہ میں ہمیشہ آپکی تحریریں رک رک اور سمجھ سمجھ کر پڑھتا ہوں چنانچہ اس مضمون "ہماری کلاسیکی غزل کی شعریات: کچھ تنقیدی کچھ تاریخی باتیں" اپنی اسی ذہنی رکھ رکھاؤ کی بنا پر پڑھا تو ایک ہی نشست میں ٹھہر ٹھہر کر۔ مضمون کی شروعات جسطرح آپ نے کی ہے وہ قابل ستائش ہے (اسکا مطلب یہ ہرگز نہ لیں میں خط چھپوانے کا خواہش مند ہوں) لیکن جیسے جیسے مضمون ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا آپ نے مثالیں نظموں سے دینا شروع کر دیں جو سراسر عنوان کے منافی ہے، اگر یہ مثالیں آپ کسی غزل کے شاعر کے کلام سے دیتے تو میرے خیال میں زیادہ بہتر ہوتا کیونکہ بہت ممکن ہے کہ بعض حضرات اس بات کو آپ کے جوش سے تعصب پر محمول کریں۔ مناسبت اور رعایت کی اچھی اور بری مثالیں ہماری کلاسیکی غزل میں موجود ہیں جن کے بارے میں آپ خود بھی مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ آگے چل کر جہاں آپ نے ناسخ، آتش اور آباد کے ہم طرح اشعار نقل کئے ہیں ان کے بارے میں اگر یہ بھی بتاتے چلتے کہ یہ کوشش شاید اب سے ستر اسی برس پہلے نولکشور والوں نے انہی متذکرہ بالا شعرا کے ہم طرح اشعار پر مشتمل ایک کتاب چھاپ کر کی تھی اور شاید اسکا مقصد یہی تھا۔ مجھے اب اسکا سنہ اشاعت یاد نہیں رہا، میرے لڑکپن کا دور تھا جب یہ کتاب میں نے باقاعدہ پڑھی تھی ہر صفحہ پر ناسخ، آتش اور آباد کی ہم طرح غزلیں درج تھیں چنانچہ یہ کتاب میری ذہنی تربیت میں بڑی ممد ثابت ہوئی۔ کہ ان تینوں شعرا کو ایک ہی جیسا ثابت کیا جائے۔ ناسخ کو ان تینوں میں اوّلیت کا درجہ کم از کم میں تو دیتا ہی ہوں اور یہی موقف میرے والد مرحوم کا بھی تھا جب انھوں نے آتش کے سلسلے میں ایک مضمون لکھا تھا اور انھیں ناسخ سے کم تر ثابت کیا تھا تو یہی لکھنو والے چڑھ دوڑے تھے۔

آخر میں عرض ہے کہ خدا کرے کلاسیکی غزل سے جدید غزل کا یہ رشتہ استوار کرنے میں آپ کی کوششیں کامیاب ہوں اور نئی غزل کے لئے مزید امکانات روشن ہوں۔ میں نے بہت دنوں سے رسالوں میں لکھنا چھوڑ دیا ہے اسلئے گزارش ہے کہ میرے خط کو پڑھ لیجئے اور بس۔ چونکہ آپکا مضمون میری دلچسپی کا باعث تھا اسلئے خط لکھے بغیر اپنے آپ کو روک نہیں سکا۔ اردو غزل کے اہم موڑ" آجائے تو پڑھوں۔

ان دنوں میں اپنے والد مرحوم کی شرح دیوان غالب کی اشاعت میں مصروف ہوں اور چاہتا ہوں ذرا نئے طریقے سے یہ کتاب چھپ جائے۔

لکھنو — والی آسی

● والی صاحب نے جس کتاب کا ذکر کیا ہے اس کا نام "بہارستان سخن" ہے۔ نولکشور پریس سے انیسویں صدی میں چھپی ہوگی میرے پاس جو نسخہ ہے وہ ناقص الآخر ہے اس لئے تاریخ اشاعت نہیں عرض کر سکتا۔ غالباً مرزا کاظم علی خاں بتا سکیں۔ حضرت عبدالباری آسی کی یہ رائے بالکل صائب ہے کہ ناسخ کو آتش پر بوجوہ فوقیت ہے۔

الہ آباد — شمس الرحمن فاروقی

● شمارہ ۲۰۸ میں اسد محمد خان کی کہانی ایک سنجیدہ ڈیٹکٹو اسٹوری، نے مجھے یہ خط لکھنے کے لئے آمادہ کیا۔ کہانی کی گنجان بنت اور بلوث اور بیانیے کی سجاوٹ نے کہانی کو بلا کسی تکلف اور تکلیف کے بڑی زندہ علامت بنا دیا ہے۔ موضوع کے ساتھ انصاف کرنا اور موضوع کے اندر چھپی تہہ داریت کو آشکار کرتے ہوئے بھی کہانی کے حسن کو مجروح نہ ہونے دینا اور اسے اعلامیہ نہ بننے دینا معمولی بات نہیں ہوتی۔ کہانی انسانی سرشت میں چھپے حسد اور رقابت

کی ریشہ دوانیوں کو جس طرح ظاہر کرتی ہے اس میں ادب بھی ہے اور آرٹ بھی۔

ادھر ذکیہ مشہدی اور مہدی جعفر کے خطوط رقص مقابر اور تیر اور اس کا بچ، کی قباحت کو ظاہر کرتے ہیں۔ زاہدہ حنا نے انسان اور انسانیت کی ذلیل اور خون زدگی کا ہیبت ناک منظر تو کھینچ دیا لیکن ادبی خلوص پر سیاسی طرفداری کو فوقیت دے کر افسانے کے فنی حسن کو ذبح کر ڈالا۔ زاہدہ حنا سے ایسی امید نہیں تھی۔ ایسا ہی کچھ اقبال مجید نے بھی کیا تھا۔ اس نے ادب، فکر اور فن کو طلاق دے کر بالآخر افسانے کو ایک پمفلٹ بنا کر رکھ دیا اور اپنی فنی ذہانت پر عصبی ذہنیت کو سوار کر کے افسانے کا بڑی بے دردی سے قتل کر دیا۔ مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ علامت کو سوچی سمجھی سکیم کے تحت اوڑھنے اور اسے اپنی تحریر کے بل پر خود رو طریقے سے جنم لینے کے عمل سے گزار دینے کے مابین جو فرق ہے وہ اکثر اردو افسانہ نگاروں کی سمجھ سے باہر ہے۔ اقبال مجید افسانے کی ہیروئن کے اندر صورت حال کے خلاف پیدا ہوتی بے زاری اور جھنجھلاہٹ کو چھپکلی کا ذکر کیے بغیر عیاں کرنے سے قاصر تھا، اور یہی اس کے افسانے کا عیب ہے باقی اس کے بہت Open اور لاؤڈ ہو کر صحافت بن جانے کی بات ذکیہ مشہدی جیسی اعلیٰ افسانہ نگار اور مہدی جعفر جیسے باخبر ناقد نے بھی کی ہے۔ سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ "شب خون" میں جس کی اردو دنیا میں ایک مسلم حیثیت ہے اور جس کی ترتیب و تہذیب زمانہ ساز نقاد شمس الرحمن فاروقی کی ذمہ داری ہے ایسا یک رخا اور طرفداری کا مارا ہوا افسانہ اس طمطراق سے شائع کیسے ہو گیا۔

آخر میں میں انور قمر کو "مارکو کلیکس" جیسا خوبصورت اور سبک فضا افسانہ لکھنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔ انور قمر کی تحریر میں درد کی لہر کی دلکشی اور جاذبیت ہے۔ فن کے معیار پر پورا اترتا یہ افسانہ قاری کے احساس کو بڑے سلیقے سے جھنجھوڑتا ہے اور اسے اداسی کی لطافت سے روشناس کراتا ہے۔

کنور سین
نئی دہلی

● غالب کا ایک شعر ہے۔

بلبل کا کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

اس شعر کا مطلب جو میں سمجھ سکا وہ یہ ہے کہ عشق کرنا بلبل کا پیشہ ہے۔ اپنا کاروباری مقصد حاصل کرنے کے لئے وہ پھولوں سے عشق کرتی ہے۔ کاروبار کی مناسبت سے پیشہ کا لفظ استعمال مناسب ہے۔ اپنا کاروباری مقصد حاصل کرنے کے لیے وہ پھولوں سے عشق کرتی ہے۔ عشق یہاں خالص جسمانی اتصال سے مراد ہے۔ یہ جذبہ بلبل کو فطرتاً ودیعت ہوا ہے۔ یہ عشق، پھولوں سے رس یا خوشبو کشید کرنا، وہ اپنے فریضہ کے طور پر ادا کرتی ہے۔ یہ پھول بلاوجہ ہی گمرہی میں مبتلا ہیں۔ بلبل کی فریفتگی کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں کہ وہ ہم پر عاشق ہے۔ اپنا پیار ہم پر نچھاور کر رہی ہے۔

دوسرے مصرعے کے صحیح مطلب تک پہنچنے کے لیے یہ اضافہ بھی کر دیا جائے کہ شاعروں نے جس افلاطونی عشق، جیسا لیلیٰ و مجنوں یا شیریں و فرہاد کا عشق، کو رواج دیا ہے وہ دراصل ایک دماغی خلل ہے اصل تو جسمانی رشتہ یا سیکس ہے، اسی سے محبت و عشق کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ یہ افلاطونی عشق بے معنی ہے اور اگر کہیں ایسا عشق ہے تو یہ دماغی خلل کا نتیجہ ہے۔ مرزا غالب کا عقیدہ بھی یہی ہے۔ اگرچہ زیادہ تر شعرا نے گل و بلبل کے عشق کو افلاطونی مفہوم میں بیان کیا ہے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے

لیے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گل
شہید ناز کی تربت کہاں ہے

آغا محمد باقر نے اس شعر کا مطلب یہ بیان کیا ہے:

بلبل، گلوں کے عشق میں دیوانی ہو رہی ہے اور پھول اس پر ہنس رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے جس چیز کو عشق کہتے ہیں وہ اصل میں خلل دماغ ہے کیونکہ دیوانوں پر ہی لوگوں کو ہنسی آیا کرتی ہے۔

اس تشریح کو قبول کرنے میں ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ پھول بلبل کے نچھاور ہنے پر کیوں ہنسیں گے۔ پھولوں کے لیے یہ خوشی اور فخر کی بات ہے نہ کہ تمسخر کی۔

اس شعر کے بارے میں باقر نے طباطبائی کی تشریح کا حوالہ بھی دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"طباطبائی کہتے ہیں کہ حال زار کی جگہ کاروبار اس لیے استعمال کیا ہے کہ کار بمعنی زراعت اور بار بمعنی ثمر ہے۔ یہ گل سے مناسبت رکھتا ہے۔ طباطبائی کو ہمیشہ ایسی ہی سوجھتی ہے"

آغا محمد باقر اور طباطبائی کی تشریحیں پڑھ کر میں کیا کہوں؟ یہی کہہ سکتا ہوں کہ دونوں کو بے سر و پا کی سوجھتی ہے۔

آپ غالب کے مستند شارح ہیں، مقدمہ آپ کی عدالت میں پیش ہے اس ضمن میں یہ بھی دریافت طلب ہے کہ یہ گل و بلبل کا کیا قصہ ہے، بلبل یا عندلیب کیا کوئی خیالی پرندہ ہے؟ آج گل و بلبل کا محاورہ اردو شاعری کے لیے ایک گالی بن گیا ہے۔

"سرسوتی سمان" کی تقریب کے موقع پر آپ نے اٹھارویں صدی کی اردو شاعری کے بارے میں جو "ہندوستانیت" کی بات کہی ہے وہ آپ کی کھوج ہے اور دل کو لگتی ہے۔ بلاشبہ لفظیات، استعارہ و تشبیہ و تلمیح غیر ملکی ہو چکے ہیں ان کے مفاہیم و علائق ہندوستانی ہیں۔ ہر عہد میں لفظ اپنے معنی بدلتا رہتا ہے۔ اس کا انحصار اس کے استعمال پر ہے۔ اقبال کی لفظیات کا مفہوم فیض کے یہاں آتے آتے بالکل بدل گیا اور آج جدید شاعروں کے یہاں کلاسیکی لفظیات بالکل نئے رنگ و آہنگ کی حامل ہیں۔

شیخ سلیم احمد
نئی دہلی

● "بلبل" یا "عندلیب" استعارہ ہے عاشق کا، اور علامتی قوت رکھتا

... جو لوگ اس طرح کی استعاراتی علامتوں کو اردو شاعری کے لئے گالی کے
... پر استعمال کرتے ہیں انھیں شاعری چھوڑ کر کوئی اور شوق اختیار کرنا
چاہئے۔ "بلبل" کی طرح کی استعاراتی علامتیں دنیا کی شاعری میں قدیم الایام
... ہیں۔ تامل، جاپانی، چینی اور قدیم یونانی شاعری کا مطالعہ کریں تو یہ بات اور
... ہو جائے گی۔

غالب کے شعر کا مطلب طباطبائی اور باقر دونوں نے صحیح بیان کیا
... صرف اتنی سی مزید وضاحت ضروری ہے کہ "گل" (یعنی معشوق) غزل
... دنیا میں "بلبل" (یعنی عاشق) کو عام طور پر حقیر اور لائق استہزا سمجھتا ہے۔
شوق گویا کہتا ہے "یہ مسخرہ اور مسور کی دال" یا "تم چاہے کتنا ہی رو دُھو لو لیکن
ہاتھ آنے والے نہیں۔" لہذا معشوق (گل) بلبل (عاشق) کو تضحیک کی نگاہ
... دیکھتا ہے، کہ وہ بے کار اتنی محنت کر رہا ہے اور جان کھپا رہا ہے۔ (ظاہر ہے
... اصل عاشق معشوق کی دنیا میں بھی یہ باتیں ہوتی رہتی ہیں)

"کاروبار" یہاں زبردست معنی خیز لفظ ہے۔ یعنی بلبل (عاشق) کو
... ق کے سوا کوئی کام نہیں۔ عشق اور عاشق کے طور اس کا دھندا ہیں، وظیفہ ...
... بات ہیں۔

طباطبائی نے ٹھیک لکھا ہے کہ "کار" اور "بار" کے لفظوں اور
... ل "، "گلشن"، "بلبل" وغیرہ لفظوں میں رعایت کا تعلق ہے۔ یہ شعر کا مزید
... ن ہے۔ لیکن "حال زار" یہاں بہت کمزور لفظ ہوتا۔ "کاروبار" میں سب کچھ
... ال ہے، "حال زار" بھی، دوڑ بھاگ بھی، نغمہ و آہنگ بھی۔ لہذا یہ بڑے
... ر کے کا لفظ ہے۔ "گل" کو خنداں یوں کہا کہ پھول کے کھلنے کو اس کی ہنسی سے
... بیر کرتے ہیں۔ شگفتہ ہونا اور کھل جانا اور ہنسنا ایک ہی شے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی
... آباد

شمارہ ۲۰۸ پیش نظر ہے۔
شمس الرحمٰن فاروقی کی تحریر ہماری کلاسیکی غزل کی شعریات: کچھ
... تنقیدی کچھ تاریخی باتیں نے، مجھ جیسے شعریات کے طالب علم کے ذہن کے
... نیم روشن گوشوں کو روشن کیا اور نئی جہات سے آشنا بھی۔ یہ اور بات کہ
... دوران مطالعہ "آستین کے بتوں" کے شکست و ریخت کی صدائیں آتی رہیں۔
این میری شمل کی موثر تحریر کی اشاعت قابل تحسین و ستائش ہے۔
... ر افتخار فاروقی نے ترجمہ اور ترجمانی کی سرحد کو چھوڑ کر، اکثر تخلیق کی
... ر حدوں کو چھو لیا ہے۔ زور قلم اور زیادہ کی تمنائیں اور دعائیں۔
شہریار کی نگارشات نے اس بار کچھ زیادہ ہی متاثر کیا۔ شاید اس لئے
... ے

میں سلامت ہوں مگر یہ خواب، آنکھیں، کربلا
جو جدا تن سے ہوا وہ میرا سر لگنے لگا

پوری غزل میں رچی بسی فکر اور اس کا آہنگ و اعزاز ایک اضطراب انگیز
... کون سے آشنا کرتا ہے۔

اور ستیہ پال آنند کی یہ بات (کہتی ہے خلق خدا) کہ "غزل اردو کے شعری ادب
کو عالمی ادب کے اسٹیج پر پروجیکٹ کرنے میں مانع ہو رہی ہے" سمجھ میں آنے والی
ہے ہی نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ،

واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

کاش شمس الرحمٰن فاروقی میر، غالب کی چند منتخب غزلوں کا منظوم انگریزی
ترجمہ بھی کر ڈالتے۔

ابرار اعظمی
خالص پور، اعظم گڑھ

• فاروقی صاحب نے "ہماری کلاسیکی غزل کی شعریات" کے متعلق
کچھ تنقیدی کچھ تاریخی باتیں تحریر کر کے قارئین شب خون کو غور و فکر کے
لئے ایک نئی جہت اور نیا موضوع دیا ہے۔ فاروقی صاحب ایک ماہر سرجن کی
مانند شعر کا آپریشن کر کے اچھے اور برے شعر کی پہچان اس طرح کرا دیتے ہیں
کہ قاری کو ان کے کہے ہوئے الفاظ پر آنکھ بند کر کے ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔
انھوں نے جوش ملیح آبادی کی نظم "جنگل کی شہزادی" اور طلسم ہوشربا جلد سوم
سے احمد حسین قمر صاحب کی نظم کا موازنہ کرتے ہوئے نقشہ کی مدد سے عام
قاری تک ذہن میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ اصل کیا نقل کیا ہے۔ قمر صاحب
نے ہوشربا والے سراپے میں چھوٹی بحر کے مصرعے ہونے کے باوجود حروف
عطف و جار، ما اتصال وغیرہ لا کر بیان کو مربوط رکھا ہے۔ جب کہ جوش صاحب کی
نظم بحر مثمن میں ہے لیکن صرف انھوں نے صفات جمع کئے ہیں اتصال وغیرہ
سے خالی مصرعے، نہ کوئی معنوی ربط بلکہ ایک فہرست ہے وہ بھی پنساری کی
دوکان کی مانند!! اتنی صاف ستھری اور سلیقے سے سمجھائی ہوئی بات کون نہیں
سمجھے گا اور کون کافران کی بات سے انکار کر سکتا ہے شب خون میں ادھر کچھ ماہ
سے عمدہ کہانیاں آنے لگی ہیں اقبال مجید کا "تیرا اس کا سچ" اس کے بعد منیر
الدین احمد کی "سودا" جیسی عمدہ کہانیاں پڑھنے کو ملیں اور اب اسی شمارہ میں اسد
احمد خان کی ایک سنجیدہ ڈی ٹیکٹو اسٹوری نے بہت متاثر کیا محلاتی سازش پر مبنی یہ
کہانی دل کو جھنجھوڑنے والی اور ماضی کو یاد دلانے والی کہانی ہے شاہوں کے
درباروں میں کیسی کیسی کہانیاں جنم لیتی ہیں اور سازشوں کے تانے بانے کس
کس طرح بنے جاتے ہیں اس پر مصنف نے بہت عمدہ طریقے سے روشنی ڈالی
ہے۔ دریا خاں حجاب دار جو سازشی کا سراغ لگانے کے لئے نکلتا ہے وہ آخر کار
سازشی ذہن والے ایک مکڑی کے جال میں بے بس مکھی کی مانند پھنس کر بے
کار ہو جاتا ہے کہانی کا یہ انجام دل پر گھونسے کی مانند لگتا ہے۔ افسوس یہی ہے کہ
اتنی عمدہ کہانی کبھی کبھی ہی پڑھنے کو ملتی ہے۔

ابرار احمد صدیقی
مدھوبنی

• میں نے آخری داستان گو "آخری درویش" "پڑاؤ" "آگ الاؤ، صحرا"
" نہیں پڑھے ہیں۔ غضنفر کے ناول "پانی" اور "کہانی انکل" کو چھوڑ کر پچھلے دس
برسوں میں جو ناول ہندوستان میں شائع ہوئے ہیں، جن کے لکھنے والے ہمارے
جدید افسانہ نگار ہی زیادہ ہیں ان میں کوئی بھی ناول جدیدیت کی میزان پر پورا

نہیں اترے گا۔ مثلاً عبدالصمد کا "دو گز زمین" "خوابوں کا سویرا"، "حسین الحق کا "فرات"، پیغام آفاقی کا "مکان"، جیلانی بانو کا "ایوان غزل" "الیاس احمد گدی کا "فائر ایریا" قرۃالعین حیدر کے "چاندنی بیگم"، "گردش رنگ چمن" وغیرہ وغیرہ۔

کیا آپ "شب خون" میں اس موضوع پر کوئی مذاکرہ شائع نہیں کر سکتے؟ اگر ممکن ہو تو آپ خود بھی اس موضوع پر قلم اٹھائیں تاکہ ہمارا اور دوسرے لوگوں کا Confusion دور ہو۔

انیس رفیع
ذیرو گنڈہ (آسام)

• یہ خوشی کی بات ہے کہ اب شب خون پابندی سے نکل رہا ہے اس سے انکار ممکن نہیں کہ شب خون نے ہندوستان میں جدیدیت کی اساس رکھی اور اس کی معنویت اور اہمیت کو اجاگر کرنے میں اہم اور تاریخی رول ادا کیا۔ اور اسی سلسلے میں ایک خاص بات یہ کہ شب خون کے ذریعہ شمس الرحمن فاروقی نے یہ فریضہ تن تنہا انجام دیا۔ اس لئے میں فاروقی صاحب کو نیاز فتح پوری ثانی کہتا ہوں۔ نیاز فتحپوری مرحوم نے بھی نگار کے کئی خاص نمبر تن تنہا نکالے۔ اس زمانے میں نگار کی جو اہمیت تھی وہی آج شب خون کی ہے۔

آج کئی ایسے نقاد اور شاعر ہیں جو معتبر اور Established سمجھے جاتے ہیں لیکن ان کی اوّلین تحریر شب خون میں ہی شائع ہوئی یا ان کی پہچان شب خون کے ذریعہ قائم ہوئی۔ مثلاً وارث علوی نے ابن حسین کے نام سے سب سے پہلے شب خون میں لکھا اور پھر وہ ابن حسین سے وارث علوی بن گئے اس میں وارث علوی کی ہی تخصیص نہیں ہے اور بھی بہت سارے نام ہیں۔

احتشام اختر
کوٹہ

• کئی برس سے "شب خون" متواتر پڑھ رہا ہوں۔ یہ اردو کا واحد جریدہ ہے۔ جو صحیح معنوں میں جدید افکار کی ترجمانی کر رہا ہے۔ البتہ ایک کمی عرصہ دراز سے کھٹک رہی ہے کہ اس کے مواد میں توازن کی زبردست کمی ہوتی ہے، مثلاً پیش نظر شمارہ ۲۰۷ ہی کو لیجئے۔ اس میں جہاں ایک طرف ادا جعفری اور عرفان صدیقی کا پر مغز، مرصع کلام شامل ہے وہاں رفیق راز کی کمزور شاعری بھی شامل شمارہ ہے۔

عرفان صدیقی کی غزلیں خاص طور پر پسند آئیں۔ خصوصاً پہلی غزل جو بحر ہزج میں ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے واقعہ کو بطور تلمیح جس نئے انداز سے شعر میں جگہ دی گئی ہے وہ لاجواب ہے۔ لگتا ہے موصوف عربی ادب کا وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔ انور شعور کی چاروں غزلیں خوب ہیں۔ البتہ مندرجہ ذیل شعر تھوڑی سی اصلاح چاہتا ہے۔ انور شعور نے لکھا ہے ؎

رات کے وقت اور گھر میں بھی
شور بازار کا نہیں جاتا

مصرع اولیٰ یوں بہتر ہوتا ۔ رات کے وقت بھی نہ گھر سے مرے

محمد اشرف عادل
سری نگر

• شب خون عرصہ دراز سے زیر مطالعہ ہے اور اس میں شائع ہونے والی تخلیقات نظم و نثر سے بساط بھر استفادہ کرتا رہتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شب خون کا جس اساس پر اجرا عمل میں آیا تھا، اس نے ادیبوں اور شاعروں کا ایسا وسیع حلقہ بنالیا ہے جسے بجا طور پر چھٹی دہائی کے بعد کی ادبی شناخت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

یزدو اسلی
بھوپال

• شب خون شمارہ ۲۰۸ میں آپ کا مضمون "ہماری کلاسیکی غزل کی شعریات" پڑھا۔ یقین کیجئے جی خوش کر دیا آپ نے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔

عمر انصاری
لکھنؤ

• شمارہ ۲۰۸ میں چودھری ابن النصیر نے جوگیندر پال کے مضمون کا ترجمہ بڑی عرق ریزی سے کیا ہے۔ بہت کامیاب ترجمہ ہے۔ شمارہ ۲۰۲ میں مطبوعہ خالد جاوید کی کہانی 'بری موسم میں' پر کتھا اعزاز کے لئے "شب خون" اور خالد جاوید کو بہت بہت مبارکباد۔

حیدر جعفری سید
کانپور

• شمارہ ۲۰۸ میں فاروقی صاحب کا مضمون کلاسیکی شعریات کی توضیح کرتا ہے۔ مضمون وقت ذہنی کا طلبگار ہے۔ قاری اس کو روا روی میں پڑھ کر سمجھ نہیں سکتا۔ مہر افشاں فاروقی نے این میری شمل کے مضمون کا بہت عمدہ ترجمہ پیش کیا ہے حالانکہ یہ ترجمے کا ترجمہ ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد مجھ پر کئی کیفیتیں گزریں۔ پھر میں نے مولانا وحید الدین خاں کی کتاب اسلام اور سوشلزم نکال کر پڑھی۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ مولانا صاحب کو پڑھنا چاہئے۔ این میری شمل کے مضمون اور مولانا صاحب کی تحریروں میں ضرور کوئی مطابقت ہوگی جن سے میں متاثر ہوا۔ مولانا نے بھی اپنی کتاب میں اسلامی فتوحات کا بہت موثر بیان کیا ہے۔ مصور سبزواری کی غزل (زیب غوری کی تلاش میں) بہت اچھی لگی۔ عالم خورشید کی غزلیں بھی اچھی ہیں اور باقر نقوی کی غزل کو تعریف نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔

جمال اویسی
دربھنگہ

• شب خون" کے ہر شمارے کا دوستوں یاروں میں کبھی فون پر، کبھی ملاقاتوں میں اور کبھی خطوط میں چرچا رہتا ہے۔ "شب خون" وہ واحد رسالہ ہے جس کا کوئی شمارہ صحت مند بحث مباحثے اور گرم گرم تبادلہ خیال کے بغیر نہیں گزر جاتا۔ برصغیر میں جدیدیت کا "شب خون" اول آخر امام ہے۔

شاہد جمیل
مہوا (ویشالی)

• شب خون شمارہ ۲۰۷ میں آپ کا مضمون "ہماری کلاسیکی غزل کی شعریات کچھ تاریخی کچھ تنقیدی باتیں" فکری اور تنقیدی اظہار کے

نئے دروازے کھولتا ہے۔ آپ نے ہی قارئین ادب کو سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ "کہتی ہے خلق خدا" میں رحمٰن عباس صاحب کا خط پڑھا عجب لگا۔ ۱۹۹۰ بلکہ ۱۹۹۵ کے بعد کی نسل۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہر دوسرے تیسرے دن ادب میں نئی نسل آرہی ہے اب کل وہ لکھیں گے کہ پیر کی نسل منگل کی نسل سے آگے ہے یا پھر جمعرات کی نسل جمعہ کی نسل سے پیچھے ہے۔ بھائی ادب میں تو پچاس سال کے بعد ہی کچھ کہا اور لکھا جاسکتا ہے۔ اور اب اسلوب کے بارے میں عرض ہے کہ فاروقی، احمد ہمیش انور سجاد، عسکری اور مظہر الزماں کا اسلوب منفرد کہا جائے تو ٹھیک بات ہے کہ ان لوگوں نے اور دوسرے چند ایک نے اپنا اسلوب بنایا ہے۔ جن کا نام دیکھے بغیر بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا لکھا ہوا ہے۔ بہرحال غیر ذمہ دار لوگ جو کچھ جی میں آتا ہے کہہ دیتے ہیں اسلوب ایسا فیشن ہے جو برسوں میں بنتا ہے۔

شاہ آباد کرناٹک — عادل قادری

● شمارہ ۲۰۶ پڑھا۔ محمود ایاز کی موت برسوں غم دیتی رہے گی۔ تخلیقی ادب کا بہت بڑا نقصان ہو گیا۔ اودے پرکاش، انور قمر، زاہدہ حنا، مظہر الزماں خان، مہدی ٹونکی اور رشید امجد کے افسانے اچھے ہیں۔ اس شمارہ میں ایک خوش آئند بات یہ نظر آئی کہ ہمارے افسانوں میں کچھ تبدیلی آگئی ہے، عالمی مسئلے اب موضوع بننے لگے ہیں۔

جھریا — شباب اختر

● تازہ شمارہ یعنی شب خون ۲۰۸ میں آپ کا مضمون "ہماری کلاسیکی غزل کی شعریات کچھ تاریخی کچھ تنقیدی باتیں" اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نے آج تک فن کو فیشن کے طور پر کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اس مضمون پر آپ کے جتنے بھی بیانات ہیں وہ خیالی بیانات نہیں ہیں۔ آپ کے یہ بیانات اور آپ کا یہ ذہنی اور فنی سفر نہ صرف آپ کو اس عہد کے ہم عصر نقادوں سے الگ رکھتا ہے بلکہ اس دور کے ہم عصر نقادوں میں ایک دیو قامت شخصیت کا عکس پیش کر رہا ہے۔ جو ادب میں ہمیشہ ہر عہد میں احترام سے یاد کیا جائے گا۔ تازہ شمارے میں تمام مشمولات مجموعی طور پر پسند آئے۔ "شب خون" کے مطالعے سے ایک طرح کا ادبی وذہنی سکون حاصل ہوتا ہے۔ شب خون ہی ایک ایسا رسالہ ہے جس میں مختلف النوع اور تازہ کار ادبا کی معیاری تخلیقات دیکھنے کو ملتی ہیں۔

ڈونگر پور — معصوم نظر

● شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا مضمون "ہماری کلاسیکی غزل کی شعریات: کچھ تنقید کچھ تاریخ" اپنے موضوع سے انصاف کرتا ہے۔ جلسوں میں بڑی سخن گسترانہ باتیں آپڑی ہیں لیکن روئے سخن کسی کی طرف نہیں بلکہ کلاسیکیت اور جدیدیت کے شعری سفر کے کئی اہم اور قابل غور مقامات پر ٹھہر کر کچھ سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کی ایک پر خلوص اور کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ فضا ابن فیضی کا ایک شعر اور حضور سبزواری کی ایک غزل بہت خوب ہے۔

بنارس — روشن لال روشن

● شمارہ ۲۰۹ میں ایم کو ضیاوی راہی کے اشعار جو نظم کی ہیئت میں ہیں، غزلوں کے زیر عنوان شائع کئے گئے ہیں۔ کہیں یہ نظم تو نہیں؟ 'میر' اردو اور میں' نے بے حد متاثر کیا۔ کہیں، یہ وہ خطبہ تو نہیں جو آپ نے دہلی میں سرسوتی سمان لیتے وقت دیا تھا۔ کیا یہ خطبہ اردو میں تھا۔ اس شمارہ میں کمپیوٹر کمپوزنگ کی کئی فاش غلطیاں ہیں مثلاً چودھری ابن النصیر کے تبصرے کے تیسرے اور چوتھے پیراگراف کی عبارت واضح نہیں ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ "جمیل الدین عالی کے بارے میں ایک صاحب نے لکھا ہے" کے بعد کچھ چھوٹ گیا ہے۔ اور اس کتاب کا نام بھی شاید غلط چھپ گیا ہے جس کے حوالے سے گفتگو ہوئی ہے۔

الہ آباد — علی حیدر رضوی

● سب سے پہلے تو ہم جناب کو ضیاوی راہی سے معذرت کرتے ہیں کہ شمارہ ۲۰۹ میں ان کی نظم ایک "خود نوشت" کا عنوان چھپنے سے رہ گیا اور پورے صفحے پر "غزلیں" کا عنوان چلا گیا۔ قارئین براہ کرم صحیح کرلیں کہ جناب راہی کی دو تخلیقات اس شمارہ میں صفحہ ۵۴ پر شائع ہوئی ہیں۔ پہلی تخلیق ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "ایک خود نوشت" اور دوسری تخلیق غزل ہے جس کا پہلا مصرع ہے "کیا اڑ گئے مرے سبھی ہمدرد ساتھ دے۔"

دوسری بات یہ کہ شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون ان کا وہ خطبہ ہے جو انھوں نے سرسوتی سمان حاصل کرنے پر ۳۰ جولائی ۱۹۹۷ کو نیشنل میوزیم دہلی کے ہال میں پیش کیا تھا۔ سمان چونکہ وزیر اعظم کے ہاتھ سے انھیں ملا تھا اس لئے خطبے کا خطاب وزیر اعظم سے ہے۔ یہ خطبہ شمس الرحمٰن فاروقی نے ملی جلی اردو ہندی میں پیش کیا تھا۔ "شب خون" کے قارئین کی خاطر انھوں نے اسے اردو میں لکھا ہے۔ اس کا اصل ہندی اردو روپ اور انگریزی ترجمہ برلا فاؤنڈیشن کے شائع کئے ہوئے کتابچے میں شامل ہیں۔

چودھری ابن النصیر کے تبصرے میں واقعی کمپوزنگ کی کئی اہم فرو گذاشتیں رہ گئیں۔ براہ کرم درج ذیل تصحیحات کرلی جائیں۔

۱) پیراگراف ۲ کے آخر میں ایک جملہ چھوٹ گیا تھا جو حسب ذیل ہے۔

> محمود ایاز کے اداریے کا ایک بے ربط اقتباس بلا سیاق و سباق شائع کرنے سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ محمود ایاز اور فاروقی میں کوئی اختلاف رائے تھا، ظاہر ہے کہ یہ غلط بھی ہے اور مرحوم محمود ایاز پر بہتان بھی۔

۲) پیراگراف ۳ میں پہلا جملہ نامکمل رہ گیا ہے براہ کرم اسے یوں پڑھا

جائے۔

"جمیل الدین عالی کے بارے میں ایک صاحب نے لکھا ہے کہ اہل حدیث کی ایک کتاب میں درج ہے کہ جمیل الدین عالی نے اپنے دادا ضمیر الدین عالی کا کلام اپنے نام سے پیش کیا ہے۔"

۳) تیسرے پیراگراف کا پہلا جملہ درست ہے سوائے اس کے کہ اصل کتاب کا نام ہے "تراجم علمائے حدیث ہند" جیسا کہ تبصرے میں چھپا ہے اور "بادبان" میں مطبوعہ ورق کے عکس سے بھی ظاہر ہوتا ہے لیکن 'بادبان' کے مضمون نگار صاحب نے اس کتاب کا نام "تذکرہ علمائے اہل حدیث ہند" لکھا ہے۔

کمپوزنگ کی لغزشوں اور فروگزاشتوں کا ذکر ہے تو ہم یہ بھی کہہ دیں کہ جناب جوگندر پال کے مضمون کا جو ترجمہ ہم نے شمارہ ۲۰۸ میں شائع کیا تھا اس کے صفحہ ۵۷ کے نئے پیرا سے پہلے ایک عبارت چھوٹ گئی تھی جو حسب ذیل ہے:

> میرے ایک پاکستانی نقاد دوست، انور سدید نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی حیرت کا اظہار کیا تھا کہ 'خواب رو' کسی پاکستانی نے کیوں نہ لکھا۔ مگر کیا یہ فطری نہیں کہ کوئی ہندوستانی بھی، جو 'خواب رو' میں بیان کردہ مہاجرت کا المیہ بعینہٖ جی سہار چکا ہو، ہماری حالیہ تاریخ کے ان واقعات کا کرب، اپنی کہانی میں بن پائے۔

جناب انیس اشفاق کے مضمون مطبوعہ 'شب خون' ۲۰۹ میں صفحہ نمبر ۵۳ اور ۵۴ چھپ گئے ہیں جبکہ یہ ۵۵ اور ۵۶ نمبر صفحات ہیں ورنہ مضمون اپنی جگہ پر بالکل مکمل ہے اور کوئی عبارت چھوٹی نہیں ہے۔

شب خون

الہ آباد

● نیر مسعود کو اس سال صدر مملکت کی سند اعزاز برائے مطالعات فارسی سے معزز کیا گیا ہے۔ ہم انھیں دلی مبارکباد دیتے ہیں اور قارئین کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ یہ سند مرحوم پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کو مل چکی ہے اور اس طرح یہ وراثت باپ سے بیٹے کو پہنچی ہے۔ ادب کی دنیا میں ایسی مثالیں کم ہیں۔

● ہمارے معروف ماہر لسانیات اور محقق مرزا خلیل احمد بیگ کو اس سال کا نقوش ایوارڈ ان کے مضمون "اردو میں لسانی تخلیق"، مطبوعہ نقوش ۱۴۲ پر دیا گیا ہے۔ ہم انھیں مبارکباد دیتے ہیں اور اس بات پر بھی مسرت کا اظہار کرتے ہیں کہ نقوش ایوارڈ اپنی قابل فخر روایت کے مطابق ہندو پاک کی قید کے بغیر محض کام اور کارنامے کے اعتبار سے دیے جا رہے ہیں۔

● ہندی کے نامور افسانہ نگار اور ادبی صحافی دھرم ویر بھارتی کا بہتر برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ ہندی فکشن میں قابل قدر کارناموں کے علاوہ ہندی کے ہفتہ وار "دھرم یگ" کو اپنے زمانہ ادارت میں اعلیٰ ادبی مقام دلانا بھی ان سے یادگار رہے گا۔ دھرم ویر بھارتی کا تعلق الہ آباد سے تھا، اس لئے ہم ان کے دہرے ماتم گسار ہیں۔

● مشہور ماہر نفسیات ایچ۔ جے۔ آئسنک H.J. Eysenk کا کچھ دن ہوئے اکیاسی برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اس نے تحلیل نفسی اور نفسیاتی علاج میں فرائڈ کے برعکس غیر تاریخی طریق کار کا استعمال کر کے جدید نفسیات اور معالجات میں ایک نیا باب قائم کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ (فرائڈ کے قول کے علی الرغم) مریض کا ماضی نہیں بلکہ اس کا حال زیادہ اہم ہے۔

● اقتدار جاوید منڈی بہاؤ الدین (پاکستان) میں رہتے ہیں اور ان اطراف کے اہم شعرا میں ہیں۔

● جمال اویسی بیگو سرائے سے دربھنگہ واپس آگئے ہیں اور وہاں کے ایک کالج میں شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔

● رونق شہری جھریا (بہار) کے ایک کالج میں اردو کے استاد ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام "سبز آتش" کے نام سے زیر اشاعت ہے۔

● شاہین بدر کی زندگی کا طویل عرصہ کلکتہ میں گزرا ہے۔ اب کراچی میں مقیم ہیں اور وہاں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔

● شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ مضمون شکاگو یونی ورسٹی اور NEH کی طرف سے قائم کردہ ایک ادبی تاریخی مطالعات کی کانفرنس کے لئے انگریزی میں لکھا تھا۔ اب انھوں نے اسے خود اردو میں ترجمہ کیا ہے اور اس میں ضروری اضافے بھی کئے ہیں۔ اس کانفرنس کے مختلف جلسے حیدر آباد، شکاگو اور دہلی میں ہوئے تھے۔ اس کا اگلا جلسہ اکتوبر ۱۹۹۷ میں میڈیسن (Madison) میں منعقد ہوگا۔

● صائمہ بتول پشاور میں رہتی ہیں اور پاکستان کے بالکل نئے غزل گویوں میں تیزی سے اپنی جگہ بنا رہی ہیں۔

● غلام مرتضیٰ راہی نے اپنے دو گذشتہ مجموعوں کا انتخاب "حرف مکرر" کے نام سے حال میں شائع کیا ہے۔ اب وہ ایک نیا مجموعہ ترتیب دے رہے ہیں۔

● مقدر حمید بمبئی میں رہتے ہیں اور بڑی تیزی سے نئے افسانہ نگاروں میں اپنا مقام بنا رہے ہیں۔

● وطن سے دور مغرب کے دیسوں میں دور رہنے والے ہندو پاک کے باسیوں کے تجربات، ان کی سماجی اور نفسیاتی زندگی اب ہمارے افسانے کا اہم موضوع بن چکے ہیں۔ جتیندر بلو، مصطفےٰ کریم اور شیر شاہ سید کے افسانے ہم پہلے بھی شائع کر چکے ہیں۔ عمر اور تجربے کے لحاظ سے جتیندر بلو ان تینوں میں بزرگ ہیں۔ ان کا اور مصطفےٰ کریم کا قیام برطانیہ میں ہے، جبکہ شیر شاہ سید جو پیشے کے اعتبار سے طبی ڈاکٹر ہیں، ان میں سب سے کم عمر ہیں اور اپنے شہر (کراچی) واپس آچکے ہیں۔ زیر نظر چاروں افسانوں میں موضوع کے چار پہلوؤں کا الگ الگ انداز میں مطالعہ کیا گیا ہے۔

فلسفہء لسان اور شاعری کی زبان

(بہ سلسلہء شمارہء گزشتہ)

اگرچہ نئی تنقید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے لسانیات یا فلسفہء لسان سے کچھ لینا دینا نہیں تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ نئی تنقید بھی اپنے طور پر لسانیات ہی کی دنیا کی باسی تھی۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ فن پارے کے آزاد، خود مختار وجود ہونے کا تصور پیش کرنے میں نئی تنقید اگرچہ پیش پیش تھی، لیکن اس تصور کی ابتدا در اصل کانٹ سے ہوتی ہے۔

نظم چونکہ زبان سے بنتی ہے لہذا بظاہر منظوم یہ زبان کا ایسا استعمال تھا جو ان استعمالات سے مختلف تھا جن کے بارے میں کانٹ نے کہا تھا کہ وہ خارجی، بامقصد فہم کے تصور کے زیر سایہ وجود میں آتے ہیں۔ ایسے استعمالات ہمیشہ تفہیم ان کے علاوہ اور بھی انحرافی نظریے مقبول تھے۔ ایک نظریہ جو مندرجہ بالا خیال کی ضد کہا جائے گا، سارے جدید عہد کے دوران ارتقاء و ترقی پذیر رہا۔ اس کی بنیاد ویکو (Vico)ــ کے نظریہ ارتقا سے لسان و تہذیب کے بعض پہلوؤں پر تھی۔ ویکو کا خیال تھا کہ بعض بڑے استعارے (یا استعاراتی جہت رکھنے والے کلمات) ایسے ہیں جو زبان میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ یا کم از کم ابتدائی عہد میں مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ اور یہ کہ سائنس کی زبان، جو ریاضیاتی علامت نگاری کی حدوں کو چھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، زبان کے استعاراتی مزاج و منہاج سے انحراف ہے۔ (یعنی منطق صوری اصل معیار لسان نہیں ہے، بلکہ اس معیار سے انحراف ہے۔) زبان کی اصل وہ ہے جسے ویکو نے "شعری منطق" (Poetic Logic) کہا تھا۔ یہ نظریہ ان نظریات کی لہر سے خلاف قائم ہونے کی کوشش کرتا رہا ہے جن کو منطقی اثبات پرستانہ اور دانش ورانہ (Intellectual) کا نام دیا جا سکتا ہے۔۔۔ ان کے بر خلاف پال دمان اور دوسروں کا نظریہ، جسے استعاراتی زبان کا لا تشکیلی نظریہ کہا جا سکتا ہے زبان کے استعاراتی مزاج کو ناگزیر مانتے ہوئے اس کے فریب کارانہ، دھوکا دے کر دل لبھانے اور نا معتبر کردار پر زور دیتا ہے۔

دریدا کی لاتشکیل کے مخالف اور ویکو سے غیر متعلق وہ نظریہ ساز ہیں جو زبان کے اس تجزیے کے ماننے والے ہیں جو وٹگنسٹائن نے پیش کیا، اور جو زبان کے "عمل کلام" (Speech-act) نظریے کے موید ہیں جس کو جے۔ ایل۔ آسٹن اور ان کے شاگرد رونلڈ سرل Ronald Searle نے قائم کیا۔۔۔۔ دریدا اور سرل میں بحث ہو چکی ہے، اور دریدا نے موخر الذکر کا جو جواب دیا ہے وہ اپنے شرائط پر تو مسکت معلوم ہوتا ہے، لیکن وہ اپنے ہی مقدمات میں محصور ہے، اگرچہ دریدا بات "کھلے کھیل" کی کرتا ہے اس لئے بالآخر اس کی یہ کمزوری اس کے خیالات میں لوگوں کی دلچسپی کے گھٹ جانے بلکہ ختم ہو جانے کا سبب بن جاتی ہے۔

Hazard Adams

1990

ــ Giovanni Batista Vico (جیووینی باتستا ویکو، ۱۶۸۸ تا ۱۷۴۴) مشہور اطالوی مفکر

اکتوبر، نومبر ۱۹۹۷

مدیر، پرنٹر، پبلشر : عقیلہ شاہین
فون نمبر : ۶۲۲۶۹۳، ۶۲۳۱۳۷
مطبع : بھارگو پریس، الہ آباد
فی شمارہ : پندرہ روپے

سرورق : چودھری ابن النصیر
سرنامہ کی خطاطی : عادل منصوری
کمپوزنگ : شارپ ٹریک کمپیوٹرس، الہ آباد-۳

جلد : ۳۱ شمارہ : ۲۱۱
ترسیل زر کا پتہ : ۳۱۳- رانی منڈی، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
خط و کتابت کا پتہ : پوسٹ بکس-۱۳، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
بارہ شمارے : ایک سو ساٹھ روپے

فلسفۂ لسان اور شاعری کی زبان

ترتیب و تہذیب

شمس الرحمٰن فاروقی

محمد علوی

مگر جی چاہتا ہے

بہت سوئے
مگر جی چاہتا ہے
کہ اب کے سوئیں تو
آنکھیں نہ کھولیں!
نہ کچھ بولیں!
خدا کے پاس ہو لیں!!

الماٹی
(قزاکستان کا دارلسلطنت)

ہوٹل کی چھبیسویں منزل سے دیکھا تو
شہر پہاڑوں کے دامن میں
بیٹھا گھر گھر کھیل رہا تھا!!

محمد علوی

ممبئی

جب بھی آتا ہوں
ممبئی میں تجھے
رانوں تک پتلون چڑھائے
ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں
آگے ہی آگے
کھڑا پاتا ہوں!!

ریڈیو

گھر والے سب
کتنے خوش تھے
پہلے پہل جب
ڈبے سے آواز آتی تھی
اب وہ ڈبا
اک کونے میں پڑا ہوا ہے!
ڈرائنگ روم میں
چمک دمک کرتا
ٹی وی کھڑا ہوا ہے!!

ٹی وی

ٹی وی گھر میں آجائے تو
دنیا آجاتی ہے
دنیا گھر میں آجائے تو
گھر نہیں رہتا ہے!
گھر والوں میں
چھوٹے بڑے کا
ڈر نہیں رہتا ہے!!

ہربنس مکھیا

سکون

ایک طویل عمر
تم اور میں
اپنے اپنے کمروں میں بند تھے
جہاں زندگی نے کڑے پہرے لگا رکھے تھے
اصولوں کے، رشتوں کے اور فرائض کے

اس تمام مدت میں
جو شاید سترہ برس تھی یا ستر
ایک دوسرے کی سانس کی آواز نے
ہمیں تپش دی
آواز جو بہت ہلکی، بلکہ مدھم تھی
تپش جو دور تھرتھراتی لو سے بھی ملائم

اور ایک دن
سانسوں کی تپش
اور تھرتھراتی لو کی آگ میں
زندگی کے سارے پہرے موم کی طرح پگھل گئے

ویران گھر میں گلاب کے رنگ
اور موتیا کی خوشبو کا اضطراب بکھر گیا
جس نے ہماری پرسکون خاموشی کو
ریزہ ریزہ کر دیا

آؤ آج پھر ہم
تم اور میں
اپنے پیروں کے ارد گرد
ہلکی ہلکی لکیروں کے دائرے کھینچ لیں
یہ لکیریں شاید کبھی دیوار بن جائیں
اور ہم پھر اپنے اپنے کمروں میں
سکون کی نیند سو سکیں

جرم

وہ موڑ کتنا دور رہ گیا ہے
جہاں ایک شام کے جھٹ پٹے میں
تم اور میں آمنے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے
اور وقت ہمارے گرد دائرہ کھینچ کر
نظریں چرا کر واپس لوٹ گیا تھا
وقت نے پھر آ کر کبھی
ہمارے دروازے پر دستک نہ دی
کبھی بھنویں تان کر ہمارے سامنے آیا
کبھی الارم کی گھنٹی نہیں بجائی

آج مدت کے بعد
اچانک
ہم وقت کی عدالت میں آ کھڑے ہیں
جہاں وہ ملاقات ہی
ہم پر جرم ثابت ہوئی ہے

ہرجس کھیا

دیا

سر دھویں سی زندگی میری
ہار کر درد کے تھپیڑوں سے
نیند کی گود میں سمٹ سی گئی
منتظر تھی کہ کب سحر ہوگی
بندش غم سے کب ملے گی نجات

اک حسیں خواب نے دبے پاؤں
پھول بکھرا دیے تبسم کے
پاؤں کی آہٹوں سے برف گھلی
زلف کے سائے میں چراغ جلے

مدتوں سے اداس سی شب نے
زندگی کو نئی طرح دیکھا
موتیوں سے ہنسی کے جھولی بھر
حسن کے آتشیں گلاب لئے
درد کے آنسوؤں کو پلکوں پر
ہلکے ہلکے سنوار کر رکھنا

خواب بھر خواب تھا تمام ہوا
نیند کا جام جب ہوا خالی
خواب کا وہ اک حسیں لمحہ
بن گیا ہے اب وقت لا تمام
میرا ماضی، میرا حال، میرا مستقبل

وقت

میں صدیوں کی تاریخ کو
مٹھی میں بند کئے
وقت کی تلاش میں نکلا ہوں

زندگی کے ہر موڑ پر میں نے
وقت کو ڈھونڈا
حق کی ہر صلیب پر
جہاں کسی باغی کے خون کے داغ
اب تک موجود ہیں
زہر کے ہر پیالے میں
جہاں کسی سوال کرنے والے انسان کے
لبوں کے نشان باقی ہیں
ہر عاشق کی قبر پر
جس میں اگنت ارمان دفن ہیں

ہر جگہ میں نے وقت کی تلاش کی
جو مجھے بتا سکے
کہ بغاوت کا انجام موت کیوں ہوتا ہے
سوال پوچھنا گناہ کیوں ہوتا ہے
عشق ہمیشہ ناکام کیوں ہوتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی، پریم کمار نظر

ترجمہ: چودھری ابن النصیر

یم کمار نظر: آپ شاعر کے مقابلے میں نقاد کی حیثیت سے زیادہ معروف ہیں۔ ایسا تو نہیں ہے کہ آپ کے اندر کے نقاد نے آپ کے اندر کے شاعر پر حاوی ہو کر اسے پس پشت ڈال دیا ہے؟

س الرحمٰن فاروقی: میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میرے اندر کے نقاد نے میرے اندر کے شاعر کو دبا لیا یا اس پر حاوی ہو گیا۔ ایسا نہیں کہ۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میرے اندر کے شاعر نے کسی نہ کسی طرح مجھے اس طرح کا نقاد بننے میں مدد کی۔ جیسا کہ میں بتا اب یہ اور بات ہے کہ اپنے لائحہ عمل میں، میں نے اپنی شاعری کو ذرا حاشیے پر رکھا اور اسے بہت آگے بڑھنے سے روکا۔ مجھے لگتا تھا کہ نقاد کی حیثیت سے جو باتیں میرے پاس کہنے کو ہیں، وہ دوسرے نقاد شاید نہیں کہہ رہے تھے۔ اور میرا خیال تھا کہ میری طرح کی شاعری شاید اور لوگ بھی لکھ سکیں گے۔ لیکن جو صورت حال بالآخر بنی اس میں مجھے یہ نظر آتا ہے کہ اپنی شاعری کے بارے میں میرا خیال غلط تھا۔ کیونکہ میرے تازہ مجموعے۔ آسماں محراب' کے بارے میں، ایک بات جو شاید سب لوگ کہہ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ مجموعہ اس تمام شاعری سے مختلف ہے جو آج اردو میں لکھی جا رہی ہے۔

وال: جب آپ کسی ادبی متن کی طرف راجب ہوتے ہیں تو اس کے معنی تک پہنچنے کے لئے آپ کون سے ذرائع استعمال کرتے ہیں؟ کسی ادبی متن میں معنی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ کیا شے ہے؟

واب: سب سے پہلی اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ ہمیں اس زبان سے بخوبی واقف ہونا چاہئے، جس زبان میں وہ متن لکھا گیا ہے۔ اور اسی کے برابر اہم یہ بات بھی ہے کہ ہمیں متن کی کسی صورت حال میں معنی کے وجود اور اس کے امکان کے بارے میں فطری اور وہبی احساس ہونا چاہئے یعنی یہ احساس ہونا چاہئے کہ یہاں معنی موجود ہیں۔

اس کے بعد بہت شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ شعریات، وہ تہذیبی مفروضات اور تصورات اور وہ تصور کائنات کیا ہیں جو کسی متن میں جاری و ساری ہیں۔ پھر اتنا ہی کافی نہیں کہ ہم کسی ایک مقررہ متن کو بخوبی جانیں۔ ہمیں اسی طرح کے اور اسی مصنف اور دیگر مصنفین کے دوسرے متون کو کثیر تعداد میں جاننا چاہئے۔

یہ تو درست ہے کہ نقاد یا متن کا تعبیر کنندہ کسی بھی متن کو اپنی ہی بصیرت اور تصورات کی دھند میں لپٹا ہوا دیکھتا ہے۔ لیکن پھر بھی ضروری ہے کہ اسے ممکن حد تک اس ادبی تہذیب کے بارے میں معلومات ہو جس میں متن زیر بحث بنایا گیا تھا۔ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ ادب کے بارے میں اس ادبی تہذیب کی کیا توقعات تھیں۔ لفظ "شاعری" سے وہ تہذیب کیا مراد لیتی تھی۔ اور وہ اپنے ماضی اور حال کے درمیان کس قسم کے رشتے قائم کرتی تھی اور کس طرح قائم کرتی تھی۔ منظومات (اشعار یا نظمیں جو بھی کہیں) دوسرے منظومات پر اور دوسرے منظومات سے اور ان کے ذریعہ بنتی ہیں۔ یہ اصول سنسکرت، عربی، فارسی اور اردو کی کلاسیکی شاعری پر بطور خاص صادق آتا ہے اور اب تو مغربی شاعری پر بھی اس کا اطلاق کرنے والے نظر آتے ہیں۔ یہ قول فرینک کرموڈ Frank Kermode کا ہے کہ کسی نظم پر بہترین رائے کوئی اور نظم ہی ہو سکتی ہے۔

ہمیں ژولیا کرسٹیوا Julia Kristeva کی یہ بات تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں کہ سب متن ایک دوسرے کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ہمیں ضرور یاد رکھنا چاہئے کہ ہم کسی نظم چاہے وہ غزل ہو یا کچھ اور کا محاکمہ تب ہی کر سکتے ہیں جب ہمیں اور نظموں کے بارے میں براہ راست معلومات ہو۔ مثال کے طور پر کسی ایسے

طالب العلم کا تصور کرو جسے تم غزل کے بارے میں بہت کچھ بتاؤ، بہت کچھ معلومات اس تک پہنچاؤ لیکن اسے کوئی غزل پڑھنے کو نہ دو تو کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طرح کی تربیت کے بعد چاہے وہ کتنے ہی عرصے تک اور تفصیل سے کیوں نہ دی جائے، تمہارا طالب العلم کسی واقعی غزل کو سمجھ پائے گا، چہ جائیکہ وہ کوئی غزل لکھ بھی سکے۔ ظاہر ہے کہ نہیں۔

اچھا اب جہاں تک معنی کا سوال ہے تو میرا خیال ہے کہ تمام معنی سیاق و سباق پر منحصر ہوتے ہیں اور اس حد تک ہر معنی میں تھوڑی بہت عدم استقلال کی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن تمام متون میں ایک بنیادی اور قابل حصول معنی ضرور ہوتے ہیں یعنی ایسے معنی جن پر تمام تعبیر کنندگان کا اتفاق ہوتا ہے اور ہم، جو زبان کو استعمال کرتے ہیں، ہمیں بھی ان پر اتفاق ہوتا ہے۔ ان کم ترین اور غالباً تخفیف ناپذیر معنی کے علاوہ کوئی ایسے معنی نہیں ہیں جو متن میں بس کسی نے رکھ دیے ہوں اور انھیں کسی ایسے شخص کا انتظار ہو جو متن تک جائے اور انھیں اس طرح پالے جس طرح آثار قدیمہ اس بات کے منتظر ہیں کہ کوئی ماہر آئے اور انھیں ڈھونڈ نکالے۔

رچرڈز کا قول ایک بار پھر ذہن میں لاؤ۔ "کسی نظم کو سمجھنا اسے پڑھنے کے لئے تیاری کرنا نہیں ہے بلکہ اسے سمجھ لینا ہی دراصل نظم ہے"

"Understanding it is not a preparation for reading the poem, it is itself the poem"

اس کا مطلب یہ ہے کہ نظم کے باہر کوئی معنی نہیں ہوتے۔ لیکن یہ وہ بات نہیں ہے جو دریدا نے کہی ہے کہ "متن کے باہر کچھ نہیں ہے۔" یہ کہ کر دریدا بین المتونیت کے تصور کو مستحکم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس اصول کو منطقی انتہا تک لے جایا جائے تو پھر کوئی بھی متن، تمام متن سب کے سب کو ایک آفاقی اور تقریباً الوہی مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ ہندو فلسفہ ہمیں سکھاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز ایک آفاقی شعور (Cosmic Consciousness) میں شامل ہے۔ دریدا کا تصور بین المتونیت مجھے کچھ اسی طرح کی چیز معلوم ہوتا ہے اور اس معنی میں یہ مابعد الطبیعات ہے اور وہ بھی ایسے شخص کی زبان سے مابعد الطبیعات کا منکر ہے اور اسے حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا قاری کے بارے میں میرا یہ خیال نہیں ہے کہ وہ کسی سیاح یا ماہر آثار قدیمہ کی طرح اپنے وجود سے باہر جا کر اشیاء کو تلاش اور حاصل کرتا ہے۔ یعنی ایسی اشیا کو جن کا وجود خود سیاح یا ماہر آثار قدیمہ کے وجود کا محتاج نہیں۔ اس کے برخلاف میرا خیال ہے کہ قاری اپنے شعور، اپنے علم، اپنے تہذیبی اور ذاتی مفروضات کو متن پر جاری کرتا ہے۔ لہذا یہ قاری ہے جو متن کو روشن کرتا ہے۔ اور یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ بعض متن ایسے ہوتے ہیں، جن میں روشنی کی صلاحیت اور امکانات بعض اور علوم سے زیادہ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی فلمی گانے یا ریل گاڑی کے ٹکٹ کے مقابلے میں شیکسپیئر کے ڈرامہ 'ہیملٹ' معنی کے زیادہ امکانات رکھتا ہے۔ ہم متون کی قدر عام طور پر اس بات سے متعین کرتے ہیں کہ کوئی متن تعداد اور قسم کے اعتبار سے کتنے معنی کا متحمل ثابت کیا جا سکتا ہے۔

سوال: تو کیا آپ کے خیال میں محکم اور پختہ تنقیدی شعور کو استعمال میں لایا جائے تو کسی متن کے بنیادی معنی تک پہنچنا ممکن ہے؟

جواب: میرا خیال ہے کہ زیادہ تر بلکہ تقریباً سب کے سب متن ایسے ہیں جن میں معنی کی ایک اقل مقدار ہوتی ہے جسے وہ سب لوگ حاصل کر سکتے ہیں جنھیں اس متن کے تعلق سے ضروری کمائی اور ادبی صلاحیت حاصل ہو۔ لیکن کوئی ضروری نہیں کہ وہ معنی اس متن زیر بحث کی بنیادی یا اصلی معنی ہوں۔ ہم عام طور پر معنی یابی میں یعنی اقل معنی کو حاصل کرنے میں اس لئے کامیاب ہو جاتے ہیں کہ کسی متن یا قول میں جو الفاظ یا دال Signifier معنی کو قائم کرتے ہیں، ان کے بارے میں اس متن کی زبان کے تمام بولنے والوں کا اتفاق رائے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر میں یہ کہوں کہ "بلی چٹائی پر ہے" تو ہو سکتا ہے کہ بلی اور چٹائی کے مابعد الطبیعاتی معنی کے بارے میں کچھ جھگڑا اٹھ سکے۔ لیکن اس بات پر کوئی جھگڑا نہ ہو گا کہ لفظ 'بلی' کے معنی 'کتا' نہیں ہیں اور لفظ "چٹائی" کے معنی "آسمان" نہیں۔ لفظ 'پر' کے معنی کے بارے میں کچھ جھگڑا ہو سکتا ہے لیکن وہ جھگڑا بھی معنویت کے ایک مقررہ مرتبہ یا مطلع کے اندر ہی رہے گا۔ اسی وجہ سے رچرڈز نے کہا تھا کہ اس جملے میں "پر" یعنی ON کا مطلب پوری طرح ادا کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ بلی (CAT) لکھ کر اس کے نیچے چٹائی (MAT) لکھ دیا جائے۔ اس طرح CAT/MAT کیونکہ بقول رچرڈز ایسا کرنے پر ہی لفظ "پر" کو ابہام سے دور رکھا جا سکتا ہے۔ حالانکہ آپ مجھ سے پوچھیں تو کہوں گا کہ یہ طریقہ بھی بالکل تیر بہ ہدف ثابت نہ ہو گا۔

اس مثال پر غور کریں جو چامسکی CHOMSKI نے وضع کی تھی:

"Fruit flies like bananas"

ظاہر ہے کہ ہم سب جملے کے معنی بر آمد کرنے میں اس لئے کامیاب ہو جاتے ہیں کہ ہمیں یہ خوب معلوم ہے کہ پھل پھلاری کچھ بھی کریں لیکن وہ اڑ نہیں سکتے۔ لیکن استعاراتی یا تاڈاروف-TADAR

OF کی اصطلاح میں علامتی زبان میں معنی ہوتے ہیں جن کو پوری طرح بیان کرنا یا جنھیں پوری طرح بیان کے احاطے میں لے آنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ بات سب سے پہلے شیخ عبدالقاہر جرجانی نے کہی تھی۔

ل: ایسا کیوں ہے کہ آپ نے فیض حاصل کرنے کی غرض سے میراور دوسرے کلاسیکی اساتذہ کی طرف دیکھا ہے؟

ب: میرا خیال ہے کہ جو چیز میں حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں اس کو بیان کرنے کے لئے لفظ فیض صحیح ترین لفظ نہ ہو۔ دیکھو، بات یہ ہے کہ ہمارا اور ہماری طرح ان تمام تہذیبوں کا جو نو آبادیاتی سامراج کی آمد کے پہلے بھی تہذیبی طور پر ترقی یافتہ تھیں اور جن کی ادبی تہذیب پہلے ہی سے موجود اور متحرک تھی ان سب کا ایک مسئلہ ہے اور وہ مسئلہ انقطاع کا ہے۔ نو آبادیاتی سامراج کی مداخلت کے باعث ہمارے حال اور ماضی کے درمیان انقطاع پیدا ہو گیا ہے۔ ہم اپنی روایت کے ساتھ خلاقانہ اور بصیرت انگیز طریقے سے رشتہ نہیں قائم کر سکتے۔ ہم اس بات پر مجبور ہیں کہ اپنے ادبی ماضی کو (اور صرف ادبی کیوں، سیاسی ماضی کو بھی) مغرب کی آنکھوں سے دیکھیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بہت سی چیزیں تو ہم دیکھ ہی نہیں پاتے اور بہت سی چیزیں جو ہم دیکھتے بھی ہیں تو ایسے آئینے میں منعکس دیکھتے ہیں جس میں شکل تھوڑی یا زیادہ بگڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ جب میں اپنے کلاسیکی مصنفوں کی طرف لوٹتا ہوں تو اس مقصد سے کہ میں انھیں اس طرح کچھ سمجھ لوں کہ ہمارا تہذیبی انقطاع ختم ہو کر تسلسل میں بدل سکے۔ ایسا کئے بغیر ہم جدید شاعروں مثلاً راشد، میراجی، اخترالایمان وغیرہ کے کارنامے کو بھی پوری طرح نہ پہچان سکیں گے۔

ل: کیا آپ کا خیال ہے کہ کلاسیکی اساتذہ آج کے زمانے میں مثال اورنمونے کا کام دے سکتے ہیں؟ اور اگر ہاں تو کس معنی میں؟

ب: دیکھو، معاملہ صرف یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے ماضی سے مثال اور نمونے ڈھونڈ کر لائیں۔ ویسے وہ معاملہ بھی ہے بہت اہم۔ ایلیٹ نے ہی تو کہا تھا کہ وہی جدید شاعر اپنے زمانے کے سب سے زیادہ انفرادی اور ممتاز شاعر بن سکتے ہیں جو کلاسیکی اساتذہ کا شعور رکھتے ہوں اور انھیں تخلیقی طور پر اپنے کام میں لا سکیں۔ لیکن ہمارا اہم ترین معاملہ یہ ہے کہ ہم زمانہ حال میں بھی اپنے راستے کا مکمل نقشہ نہیں بنا سکتے جب تک کہ ہم ماضی کے جغرافیے سے پوری طرح مانوس اور باخبر نہ ہوں۔ نقل جدید کے ایک سر برآوردہ شاعر اور نقاد

نے ایک بار بھرے مجمع میں کہا "میں اردو کی زیادہ تر کلاسیکی شاعری اور خاص کر درجہ دوم کے شعرا کی شاعری کے ساتھ کوئی رشتہ قائم نہیں کر سکا اگر چہ میں نے انھیں پڑھا ضرور ہے"۔ پھر میں نے جواب میں کہا کہ "چونکہ درجہ دوم کے شعرا کی تعداد اور درجہ اول کے شعرا کے مقابلے میں بہت کثیر ہے اس لئے کیا یہ افسوس اور رنج کی بات نہیں کہ ان کے جیسے پڑھے لکھے لوگوں کے لئے بھی ہمارے کلاسیکی ورثے کا کم و بیش نوے فی صدی حصہ ضائع ہو گیا ہے؟

اس طرح اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ معاملہ صرف کلاسیکی اساتذہ کو مثال یا نمونے کے طور پر استعمال کرنے کا نہیں بلکہ تاریخ ادب اور تہذیب اور فہرست استناد کا بھی ہے۔

سوال: کچھ ایسا لگتا ہے کہ آج کلاسیکی طرز و محاورہ معاصر زبان پر حاوی ہے، لہذا کلاسیکی جڑوں کی طرف واپسی کو آخر تجزئے میں کلاسیکیت کی جیت کہا جا سکتا ہے۔ کیا آپ کے خیال میں یہ صورت حال ادب کی ترقی یا ترقی کے رک جانے کا حکم رکھتی ہے؟

جواب: میرا خیال یہ ہے کہ ادب میں ترقی یا نشو نما یا باز گردانی (Repres-sion) کے تصورات غلط ہیں۔ ادب کی تاریخ خط مستقیم میں نہیں سفر کرتی جب فلسفے یا موسیقی کی تاریخ خط مستقیم میں سفر نہیں کرتی تو تاریخ ادب کا معاملہ مختلف کیوں سمجھا جائے؟، کسی مقررہ دوران یا مدت میں ترقی یا باز گردانی کا تصور عہد وکٹوریہ کی یادگار ہے۔ اس زمانے کے انگریز لوگ خود کو تمدن کے گل و ثمر سمجھتے تھے۔ اور اپنے بارے میں خیال کرتے تھے کہ ہم تبدیلی، نشو نما اور ارتقا کے ایک طویل قاعدۂ عمل کی انتہائی صورت ہیں۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ تاریخ نے انھیں غلط ثابت کر دیا ہے۔

جہاں تک معاملہ تمہارے سوال کا ہے تو میرے خیال میں یہ ممکن نہیں کہ کلاسیکیت کی جیت اس طرح واقع ہو جائے کہ معاصر ادبی محاورہ منسوخ ہو کر کلاسیکی محاورہ جاری ہو جائے۔ بہت سے بہت یہ ہو سکتا ہے کہ کلاسیکی لفظیات جدید محاورے کو سہارا دے اور اس میں اضافہ کرے۔ کلاسیکی نمونوں سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ پہلے کیا ہو چکا ہے اور وہ کس طرح ہوا۔ ان سے ہم یہ بھی جان سکتے ہیں کہ کون سی چیزیں کامیاب ہوئیں اور کون سی ناکام ٹھہریں۔ ممکن ہے ہمیں اس سے یہ بھی معلوم ہو سکے کہ چیزیں جیسی کہ تھیں تو کیوں تھیں۔

ماضی سے خوفزدہ ہونا غیر صحت مند ادبی رویہ ہے۔ لیکن ماضی کو حقیر سمجھنا جیسا کہ ہم میں سے بعض لوگ آج کر رہے ہیں، اس سے

بھی بدتر ہے۔

سوال: ڈاکٹر جانسن کا قول ہے کہ "کلاسیکی اقتباس تمام دنیا کے ادبی لوگوں کا مستعمل روز مرہ معلوم ہوتا ہے" یہ بات آپ پر بطور خاص صادق آتی ہے، کیا آپ ڈاکٹر جانسن سے اتفاق کرتے ہیں؟

جواب: میرا خیال ہے کہ میں جانسن سے پوری طرح متفق نہیں ہوں اور شاید ٹھیک سے سمجھا بھی نہیں کہ وہ کہہ کیا رہا ہے، بہرحال جانسن کا یہ قول ہماری صورت حال کے لئے درست نہیں ہو سکتا کیونکہ جانسن کے لئے تو یورپ کی کلاسیکی روایت کم و بیش مسلسل اور غیر منقطع تھی۔ جانسن کو تو چھوڑیئے، ٹی ایس ایلیٹ بھی تمام یورپ کی شاعری کو ایک وجود واحد اور ایک روایت قرار دے کر اس کے بارے میں بات کر سکتا تھا۔ ہمارا حال یہ ہے کہ کلاسیکی روایت کے بارے میں ہمارا احساس اور کلاسیکی روایت کے تعلق سے ہماری فہم ٹوٹی ہوئی ہڈی کی طرح ہے۔ ہمارے یہاں ایسے ایسے انقطاع ہیں جن کا ڈاکٹر جانسن کو کبھی مقابلہ نہ کرنا پڑا تھا۔ ہمیں اپنے کلاسیکی ورثے کو دوبارہ جمع کرنا اور تعمیر کرنا ہے اور کلام کے کھوئے ہوئے ضوابط اور گم شدہ بصیرتوں کو دوبارہ دریافت کرنا ہے۔ تبھی ہم فیصلہ کر سکیں گے کہ ہماری کلاسیکی روایت ہمارے ساتھ بہت زیادہ ہے یا بہت کم۔

سوال: اچھا اب جدیدیت کی موت پر بات کرتے ہیں۔ کیا اردو شاعری سے جدیدیت غائب ہوتی جا رہی ہے؟ اگر مجھے غلط یاد نہیں تو آپ کا خیال یہ ہے کہ مابعد جدیدیت تو دور رہی اردو کی جدید شاعری پوری طرح دید ہی نہیں ہے۔

جواب: میرا خیال یہ ہے کہ ادبی تہذیب میں ایک رہنما اصول کی طرح جدیدیت نہ صرف ہمارے یہاں اردو میں بلکہ جدید دنیا کے بڑے حصے میں قائم اور مستحکم ہو چکی ہے۔ جدیدیت کے جتنے بنیادی اصول تھے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے آج دنیا میں کہیں بھی صفحۂ ادب سے محو کر دیا گیا ہو۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ معاصر اردو ادیب اپنے اس دعوے کے باوجود کہ وہ جدیدیت سے منحرف ہو گئے ہیں، دراصل اپنے انحراف کا کوئی ثبوت نہیں فراہم کر پائے۔ تو میرا مطلب بس اتنا ہوتا ہے کہ معاصر اردو ادب آج بھی جدیدیت کی راہ پر گامزن ہے۔

مابعد جدیدیت ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو لازمی طور پر جدیدیت کے بعد آئے اور نہ ایسی کوئی چیز ہے جسے جدیدیت کی ترقی یافتہ شکل یا جدیدیت کا اگلا قدم کہیں۔ دراصل مابعد جدیدیت تو ذہن اور

احساس کی ایک صورت حال ہے۔ ایہاب حسن جس نے مغربی تنقید میں مابعد جدیدیت کی اصطلاح پر سب سے پہلے بحث کی، وہ کہتا ہے کہ مابعد جدیدی رجحانات ۱۹۲۰ کی دہائی میں ہی دکھائی دینے لگے جب یورپی جدیدیت کا دھارا اپنی پوری قوت سے بہہ رہا تھا۔

ایہاب حسن نے واضح کیا ہے کہ جدیدیت کبھی کبھی مابعد جدیدیت کے بعد بھی ظاہر ہوتی نظر آتی ہے۔

سوال: اگر اردو میں مابعد جدیدیت کا میدان تنگ ہے تو پھر معاصر جدید شاعری کے لئے ممکن راستہ کیا ہوگا؟

جواب: مابعد جدیدیت کے پاس کوئی لائحہ عمل، کوئی ایجنڈا نہیں اور نہ کوئی ادبی یا فلسفیانہ پروگرام ہے۔ یہ محض ایک انکار ہے اور مایوسی کی پکار ہے۔ لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کوئی ادبی نظریاتی پوزیشن نہیں ہے یہ ایک عمومی فلسفیانہ پوزیشن ہے اور جیسا کہ تم جانتے ہو، کسی فلسفیانہ پوزیشن کے ساتھ پرجوش یا باعمل وابستگی کے بغیر بھی انسان بہت عمدہ ادب تخلیق کر سکتا ہے۔

سوال: کیا آپ اب بھی اس خیال کے ہیں کہ نثری نظم میں باقاعدہ صنف بن جانے کی قوت نہیں ہے؟ آج کی نثری نظم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: آج ہندوستان میں اعلیٰ درجے کی نثری نظم بہت کم لکھی جا رہی ہے۔ اس کا رواج اب کچھ گھٹ سا گیا ہے اور اس کے رواج میں یہ تخفیف میری بات کو ثابت کرتی ہے کہ نثری نظم کوئی ایسی صنف نہیں ہے جس کے لئے اردو میں ضرورت محسوس کی جا رہی ہو۔

جہاں تک پاکستان کا معاملہ ہے، کراچی اور اسلام آباد میں نثری نظم کا چلن بہت ہے۔ اور وہاں کچھ بہت عمدہ نثری نظمیں لکھی بھی جا رہی ہیں۔ لیکن جیسا کہ کچھ عرصہ ہوا میں نے آصف فرخی کو لکھا تھا اردو کی نثری نظم کا وہی حال ہوتا نظر آتا ہے جو ہندی میں ہو چکا ہے۔ آج پاکستان میں لکھے جانے والی نثری نظموں کے آہنگ میں ایک بہت واضح مشابہت ہے جو ایک خاندان کے لوگوں کی ایسی مماثلت سے زیادہ ہے۔ یعنی ان تمام نظموں کے آہنگ اور موسیقیاتی تاثر کا ڈھانچا بالکل ایک لگتا ہے۔ اگر بہت سی ایسی نظمیں اکٹھا پڑھی جائیں تو کارخانے میں سے ڈھلی ڈھلائی نکل کر آنے والی چیزوں کا احساس ہوتا ہے۔ شاید تمہیں ہندی کی صورت حال کا علم ہو۔ وہاں اب ایک پرزور اور پرجوش تقاضا بحر کی طرف واپسی کا ہے۔ ہندی والے اب یہ کہہ رہے ہیں کہ وزن اور بحر کے ذریعے وضع اور آہنگ کے تنوع اور شاعری کی مختلف مہارتوں کے استعمال کا موقع زیادہ ملتا ہے۔

س: شروع شروع میں آپ پر یہ الزام لگایا گیا کہ آپ اردو ادب خاص کر اردو شاعری کو مغربی اصول نقد کی روشنی میں پرکھتے ہیں، اور آج کل آپ مکمل زور اس چیز پر دے رہے ہیں جسے آپ مشرقی شعریات یا ہندوستانی شعریات کہتے ہیں۔ کیا یہ داخلی تضاد نہیں؟

ج: یقینا میں نے اپنی زندگی کی کسی بھی منزل پر مغربی تصورات اور معیارات کو اپنے ادب پر اندھے استخراجی طور پر جاری کرنے کی کوشش کی ہوتی تو یہ آج کی صورت حال کی روشنی میں بہت بڑا تضاد ہوتا۔ لیکن میں نے مغربی تصورات و معیارات کو اردو پر منطبق کرنے کی کوشش کبھی کی ہی نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ میں نے ادبی نظریات اور طریق عمل سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ فکر کے بعض علاقے مغرب والوں کے یہاں ایسے ہیں جہاں ہمارے نظریہ سازوں نے زیادہ کام نہیں کیا تھا۔ وہ سب چیزیں میں نے مغرب سے طالب العلمانہ طور پر حاصل کیں۔ لیکن میں نے مغربی تصورات کو تنقید اور انتخاب کی نظر سے گزار کر اردو ادب پر استعمال کیا۔ اور مغرب مرکزیت کی غلطی کبھی میں نے نہیں کی۔ جن بنیادی مغربی تصورات کو میں نے قبول نہ کیا یا رد کیا ان میں افلاطون کو پورا نظریۂ شعر اور نمائندگی محاکات کی نام نہاد حرکیات شامل ہیں۔ ان چیزوں کے خلاف میں نے اس وقت لکھا جب ان کے بارے میں اردو میں کچھ سوچا بھی نہیں گیا تھا۔ میں نے اپنے سن ۷۰ کی دہائی کے مضامین میں بہت سارے رومانی اور نورومانی نظریات کو نامنظور کیا۔ اردو میں غالبا میں پہلا شخص ہوں جس نے کانٹ کی جمالیات پر سوالیہ نشان لگایا۔ اور مارکسی افکار ادب پر میری تنقیدیں تو بہر حال مشہور و معروف ہیں۔ اگر اس کے باوجود لوگ خود کو یہ فریب دیں کہ میں نے مغربی خیالات کی اندھادھند درآمد کی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

یہ صحیح ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں میری توجہ کا زیادہ حصہ ہمارے اپنے نظریاتی ورثے یعنی سنسکرت، عربی، فارسی اور اردو پر صرف ہوا ہے لیکن اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ آج کل میں اپنے کلاسکی ادب کے بارے میں زیادہ لکھ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ وہ آج سارے کا سارا پس نو آبادیاتی کلام پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ہمیں اپنے ادبی ماضی کی تعیین قدر از سر نو کرنی چاہئے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ہماری اپنے نظریاتی تنقید کی روشنی میں ممکن ہے نہ کہ مغربی اقوال و مقدمات کی روشنی میں۔ ہچکچاہٹ کے ساتھ اور آہستہ آہستہ سہی لیکن دنیا اب کثیر پسندی Pluralism کی طرف بڑھ رہی ہے۔ مغربی کلام کے ماڈل کو مسلم القوت قرار دینے کے زمانے اب چلے گئے۔

سوال: آپ فراق کو بار بار اپنی تنقیدوں کا نشانہ بناتے رہے ہیں اور اب فراق پر آپ کی تنقیدوں کا طرز تشویشناک ہو گیا ہے، کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ آپ کے مزاج میں فراق کے خلاف کوئی تعصب ہے جس کی وجہ سے آپ ان کے شاعرانہ مرتبے سے انکار کرتے ہیں۔ بعض دوسروں کا خیال ہے کہ آپ کی نظر میں ایسی رائے بالکل بیکار ہے جس میں جانبداری کا شائبہ نہ ہو۔ یعنی تنقید غیرجانبدار ہو ہی نہیں سکتی۔ اس سلسلے میں آپ کیا کہیں گے؟

جواب: فراق صاحب مجھ سے اسقدر زیادہ سینئر اور میرے اتنے بزرگ تھے کہ میں اس جگہ پر بیٹھنا شروع بھی نہیں کر سکتا جس جگہ وہ متمکن تھے جب میں پیدا ہوا۔ میں نے فراق صاحب کے مقابل خود کو کبھی پیش نہیں کیا اور اگر کوشش کرتا تو بھی ایسا نہ کر سکتا تھا۔ میرے ان کے ذاتی تعلقات خوشگوار تھے سوائے اس کے کہ انھوں نے میری بعض تنقیدوں کو پسند نہ کیا جو ان کی شاعری کے بارے میں تھیں اور جو میں نے ۱۹۷۱ اور ۱۹۷۳ میں لکھیں۔ تو پھر میری ان سے کسی ذاتی مخاصمت کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ جب یہ بات سب جانتے ہیں کہ ان کی تحریروں کے بعد بھی ہمارے تعلقات خوشگوار رہے۔ میں فراق صاحب کے کارناموں اور ان کی شخصیت کا احترام کرتا تھا اور احترام کرتا ہوں لیکن میں تب اس بات پر تیار تھا اور نہ اب تیار ہوں کہ ان کو دیوی دیوتاؤں کی جگہ بٹھا دیا جائے۔

میں نہیں سمجھتا کہ فراق صاحب پر میری تنقیدیں تشویشناک صورت اختیار کر گئی ہیں۔ میں نے فراق صاحب پر جتنے اعتراضات کئے ہیں ان سے بہت زیادہ اور مزید شدت کے ساتھ اعتراضات میں نے نظیر اکبر آبادی، کلیم الدین احمد، فیض احمد فیض، اسلوب احمد انصاری، خوشونت سنگھ، سردار جعفری اور بہت سے دوسروں پر کئے ہیں۔ سچ پوچھئے تو محمد حسن عسکری کے بعد اردو میں شاید واحد نقاد میں ہوں جس نے غیر ہر دل عزیز رایوں کا اظہار کرنے میں کوئی جھجک نہیں دکھائی۔ اور ان چیزوں کو بھی ان کی کاغذی قیمت پر قبول نہ کیا جو استناد کا درجہ اختیار کر چکی تھی۔ اس کی تازہ مثالیں گذشتہ چند برسوں میں حالی پر میری تنقیدیں ہیں اور محمد حسین آزاد کی "آب حیات" کا بنیادی تبدیلی پسند (Radical) مطالعہ ہے۔ یہ

تحریریں تو انگریزی میں بھی موجود ہیں۔ نہ ہی میں بالکل یہ کہتا کہ جو تنقید غیر جانبدار ہو اس کی کوئی قیمت نہیں لیکن تکنیکی سوکھی غیر تنقیدی طور پر کسی چیز کو قبول کرنے کی ادا بھی کچھ سود مند نہیں۔

سچ پوچھیں تو فراق صاحب کی تحریروں کے طالب العلم کی حیثیت سے میری سوانح حیات وہی ہے جو مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کی تحریروں کی طالب العلم کی حیثیت سے ہے۔ یہ تینوں میری نوجوانی کے ہیرو تھے اور میری زندگی میں ان تینوں پر دیوتا جو دیوتا ثابت نہ ہوئے "The Gods that failed" کا فقرہ صادق آتا ہے۔ ان تینوں کے تعلق سے میری کہانی فریب شکستگی کی کہانی ہے۔ نوجوانی میں میرا رویہ ان کے بارے میں ہیرو پرستی اور دیوتا سازی کا تھا۔ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ان تینوں کے پاؤں مٹی کے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان کا علم اور ان کی تخلیقی صلاحیت دونوں ہی کچھ بہت اطمینان بخش نہ تھے۔ انجام کار میں نے ان تینوں کے خلاف لکھا اور ان پر نکتہ چینی کی۔ سب سے مشکل معاملہ مجنوں صاحب کا تھا جو میرے والد کے ملاقاتیوں میں تھے۔ ۶۰ کی دہائی کے شروع میں ایک منصوبہ بنایا کہ مغربی ادبی اور فلسفیانہ اصطلاحوں کی ایک فرہنگ اردو میں تیار کی جائے۔ انھوں نے نمونے کے طور پر مجوزہ فرہنگ کی دو تین قسطیں ہماری زبان شائع کرائیں۔ مجھے یہ فرہنگ بہت غیر اطمینان بخش لگی اور میں نے اس پر ایک طویل اگرچہ مودبانہ مراسلہ لکھا جس میں اس فرہنگ کے نقائص کی نشاندہی کی۔ مجنوں صاحب نے میری تحریر کا برا نہ مانا۔ کچھ عرصہ بعد ان کا الہ آباد آنا ہوا تو وہ غریب خانے پر تشریف لائے۔ سرور صاحب ان کے ساتھ تھے۔ مجنوں صاحب نے فرمایا کہ ہر شخص کی طرح مجھے بھی اپنی رائے قائم کرنے کا حق تھا۔ اس کے کئی سال بعد میں نے اپنے طویل مضمون بعنوان "کیا نظریاتی تنقید ممکن ہے" میں مجنوں صاحب کے بعض خیالات پر سخت تنقید کی۔ اس مضمون کا ایک بڑا حصہ انگریزی میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

نیاز صاحب کی علمیت مجھے خیال انگیز لیکن جزئیات میں کمزور لگیں۔ جب ان کا انتقال ہوا تو 'شب خون' میں میں نے ان پر ایک نوٹ لکھا جس میں ان کا کچھ ذکر تھا اور تفہیم غالب، میں میں نے نیاز صاحب پر بہت کچھ تیز و تند لکھا ہے۔

چونکہ فراق صاحب شاعری اور تنقید دونوں میں سر بر آوردہ حیثیت کے مالک ہیں اس لئے ان سے میری مایوسی بھی، اسی نسبت سے زیادہ ہوئی۔ فراق صاحب پر میری تنقید اور میرا ان سے عدم اطمینان ایک پورے سلسلے کا حصہ ہے اور اسے سلسلے سے الگ کر کے نہ دیکھنا چاہئے۔ اصلاً اور اصولاً ان تینوں کے خلاف میری بغاوت ادب کے بارے میں تو آبادیاتی سامراجی نظریات کے خلاف بغاوت ہے اور اس تو آبادیاتی نظام تعلیم کے خلاف بغاوت ہے جو بعض چیزوں کو بعض چیزوں پر غلط طریقے سے فوقیت دیتا ہے۔

سوال: جب فراق کے بارے میں آپ کے خیالات لوگوں کو بخوبی معلوم ہیں تو انھیں دہرانے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب: ایسا تو نہیں ہے کہ میں فراق صاحب کے بارے میں اپنے نظریات اور خیالات کو اضطراری یا مجنونانہ ڈھنگ سے بار بار دہرائے جاتا ہوں۔ خیر، لیکن یہ بات بھی ہے کہ بعض خیالات کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ انھیں بار بار پیش کیا جائے، ان کا بار بار محاکمہ کیا جائے، ان کی بار بار چھان بین کی جائے اور ان پر بحث کی جائے۔ یہ ان خیالات کے بارے میں زیادہ صحیح ہے جو نئے اور مروجہ رایوں کے خلاف ہوں۔ کیونکہ ان کی وجہ سے پرانے موضوعات پر از سر نو غور کرنے کو مہمیز ملتی ہے۔ میں نے فراق صاحب کی شاعری کے بارے میں اسی وقت اظہار خیال کیا جب کوئی موقع تھا۔ لوگوں کو شکتے میں ڈالنے اور پریشان کرنے کے لئے میں کبھی کچھ نہیں لکھتا۔ اور جیسا کہ میں نے ابھی کہا وہ نقاد نقاد نہیں ہے جو غیر ہر دل عزیز رایوں اور فیصلوں کو اختیار کرنے کی جرأت نہ رکھتا ہے۔

آخری بات یہ کہ لوگوں کی نظر میں فراق صاحب بہت بڑے شاعر ہیں اور اگر ایسا ہے تو انھیں میری تنقید سے کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ فراق صاحب سے بہت زیادہ تنقید تو غالب پر کی گئی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اس تنقید سے غالب کو کوئی نقصان پہنچا ہے۔

سوال: آپ کہتے ہیں کہ فیض کی شاعری بالکل شفاف اور تہ سے عاری ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ شاعری کی Numinous صفت کو نہیں دیکھ پا رہے ہیں؟ فیض کی شاعری کے سیاق و سباق ہیں، تعبیرات ہیں۔ اس میں سیاسی لہجہ سطح کے نیچے رواں ہے اور اس کی معاصر معنویت ہے۔

جواب: میں سمجھا نہیں کہ یہاں لفظ Numinous سے کیا مراد ہے، آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کلاں میں معنی دئے ہوئے ہیں "۔ الوہی، روحانی، کسی دیوتا کے وجود کا انکشاف کرتی ہوئی یا اس کی طرف اشارہ کرتی ہوئی کوئی چیز۔ کوئی چیز جو عقیدت اور رعب کا تاثر پیدا کرے"۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان میں سے کوئی بھی بات فیض پر صادق آتی ہے۔ ہاں اس لفظ کو میر یا غالب یا اقبال، شیکسپیر، رومی، بھرتری ہری، کالی داس، اور بودلیئر وغیرہ کے لئے یقیناً استعمال کر سکتے ہیں۔ بے شک فیض کی شاعری بڑی شیریں، دل کو خوش کرنے

والی اور کیفیت انگیز ہے لیکن اس میں تکرار ہے اور ایسی تکرار جو کمزوری کی پیدا کردہ ہے۔ ان کی شاعری کا غالب رجحان پہلے سے طے کردہ مفروضات اور فارمولوں کی طرف ہے۔ خاص کر اس بات میں کہ ادب اور تہذیب میں شاعر کا مقام کیا ہے۔

جہاں تک سوال فیض کی معاصر معنویت کا ہے اور ان سیاسی مفاہیم کا جو ہم ان کی شاعری سے حاصل کرتے ہیں تو میں ان سے ہرگز انکار نہیں کرتا۔ لیکن سوال دراصل یہ ہے کہ یہ معنویت خود کب تک با معنی رہے گی۔ اگر وہ مارکسی ربط و تعلق نہ رہے تو فیض کی شاعری کے لئے ذہنی اور جذباتی سہارا قائم کرتی ہے تو وہ معنویت کہاں رہے گی؟ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے یہ سب رسمی رسومیاتی آدرش کاری امید اور آرزو کے کسی جلد پیکر کی اور کسی غیر قطعی مستقبل میں کسی انقلاب کے آنے کا مژدہ جو ایسی کسی سرزمین پر برپا ہوگا جو خود بھی ابھی مستقبل میں ہے۔ یہ سب کچھ مجھے متاثر نہ کرسکا اور پھر یہ سب اشک فشانی جو انسانی ہمدردی اور جذباتی یک آہنگی کے پردے میں صرف رحم کی درخواست ہے۔ (مثلاً ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے، جو راہ ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کر جاتی ہے)۔ یہ چیزیں بہت دور تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ فیض کا سیاسی پیغام ان کی شاعری کا جزو لاینفک نہیں ہے۔ ہم اسے ان کی شاعری سے بر آمد کرتے ہیں خارجی معلومات کے تحت، میں نے اس باب میں انگریزی اردو دونوں میں لکھا ہے۔

سوال : کیا آپ اپنے ساتھی نقادوں کی صحبت میں کسی قسم کی الجھن محسوس کرتے ہیں؟ یا آپ کو ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے؟

جواب : میں یقیناً ہم آہنگی محسوس کرتا ہوں اور مجھے اپنے ساتھیوں کے درمیان کوئی الجھن نہیں لگتی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میں اکثر اپنے ساتھیوں سے اتفاق نہ کروں اور یہ بھی کہ بہت کم تنقید اردو میں ایسی ہے جسے پڑھ کر علم میں اضافہ ہو۔ لیکن مجھے اپنے معاصر نقادوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں کوئی الجھن یا کسی فاصلے کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ ضرور ہے کہ مجھے ایسی تنقیدی تحریریں پسند ہیں جن کی زبان صاف واضح اور جن کے معنی آسانی سے سمجھ میں آنے والے ہوں۔ نام نہاد شاعرانہ یا انشاپردازانہ تنقید مجھے بے حد ناپسند ہے۔

اور میرے اوپر جو تنقیدیں ہوتی ہیں مجھے ان پر بھی کوئی پریشانی یا شکایت نہیں ہوتی ہاں یہ ضرور ہے کہ غیر منطقی اور تعصب آمیز اور اضطراری رد عمل مجھے ٹھیک نہیں لگتا۔ (مثلاً مجھے یقین ہے کہ میری بہت سی باتوں کی مخالفت صرف اس لئے ہوئی ہے کہ وہ میں

نے کہی ہیں۔ وہی بات کوئی اور کہے تو شاید فوراً قبول کرلی جائے)

سوال : غزل کا ترجمہ ممکن کیوں نہیں؟

جواب : بنیادی طور پر سب متن ناقابل ترجمہ ہوتے ہیں۔ بس کچھ زیادہ کچھ کم اور شاعری غالباً سب سے زیادہ ترجمہ ناپذیر شے ہے۔ پھر غزل میں ایک مخصوص ادبی تہذیب رچی بسی ہے اور اصلاً یہ ایسی شاعری ہے جو رسومیات اور ضوابط و قواعد کے ذریعہ بامعنی بنتی ہے لہٰذا یہ ان لوگوں کے لئے تقریباً ناقابل فہم ہے جنھیں اس تہذیب اور اس رسومیات سے واقفیت نہیں اور ظاہر ہے کہ جو شخص غزل کو ترجمے میں پڑھتا ہے وہ اصلاً ایسا ہی شخص ہوگا جو غزل کے رسومیات اور ضوابط سے نابلد ہیں۔

دوسرا معاملہ یہ ہے کہ غزل کے کلام میں معنی کا وفور ہوتا ہے بعض غزل کے شعر کے ایک معنی دوسرے معنی کو منسوخ کرتے نظر آتے ہیں اور آخری بات یہ کہ صدیوں کے طریق عمل اور سامع قاری کے استجاب کی بنا پر غزل کی لفظیات نے اشاراتی زبان (Code) کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اور بعض اوقات تو یہ لفظیات سامع / قاری کو فریب دینے کا بھی کام کرتی ہے اور سامع / قاری اسے پسند کرتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ہم کسی Code کو Decode کرسکتے ہیں یعنی اشاراتی زبان کے اشاروں کو حاصل کرسکتے ہیں لیکن اس کا ترجمہ نہیں کرسکتے۔ لیکن پھر بھی غزل کا ترجمہ با صلاحیت مترجم کی دسترس سے بالکل باہر نہیں ہے۔ غزل کا ترجمہ کرنے والا تنگ آکر اپنا سر پیٹ لیتا ہے لیکن ترجمہ اگر ٹھیک ہو جائے تو بڑے کام کی چیز بنتی ہے۔

سوال : عام طور پر خیال ہے کہ اردو کے نقاد ادبی نظریات کو مغرب سے درآمد کرتے ہیں لیکن اسی وقت جب وہ اپنے اصل دیس میں پرانے ہو چکے ہوتے ہیں یا معنویت کھو چکے ہوتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب : میرا خیال ہے کہ یہ بات کم و بیش صحیح ہے۔

سوال : میر اور غالب کی تعبیروں میں آپ نے معنی بیان کرنے کی مہم میں بعض اوقات اشعار پر اپنے ہی معنی جاری کر رہے ہیں، تو کیا یہ معنی کا قبضہ غاصبانہ نہ کہلائے گا؟

جواب : متن کی تعبیر کے میدان میں معنی کا قبضہ غاصبانہ کوئی وجود نہیں رکھتا۔ ہر وہ معنی جو متن سے بر آمد ہو سکتے ہوں، صحیح اور معتبر ہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ وہ معنی متن سے بر آمد ہوں۔ اس معاملے میں میں STANLEY FISH کے ابتدائی دور والی حد تک تو نہیں

جاتا لیکن میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ بنیادی طور پر یہ قاری ہی ہے جو کسی متن میں معنی بناتا ہے۔ جیسا کہ ہرش HIRSCH نے کہا ہے "متن کا مزاج ہی ایسا ہے کہ وہ تعبیر کا تقاضا کرتا ہے۔"

شیخ جرجانی نے یہ سوال پوچھا تھا کہ اگر کسی متن میں دو یا دو سے زیادہ معنی ہیں تو کیا ہمیں یہ نہ کہنا چاہئے کہ دراصل دو یا دو سے زیادہ متن ہیں جو ایک ہی میں لپیٹ دیے گئے ہیں؟ شیخ جرجانی کی رائے میں منطقی اعتبار سے ایک متن میں ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے یہ نہ پوچھا کہ وہ معنی کس کے ہوتے ہیں؟ لیکن اپنے اصل سوال کا جواب انھوں نے یہ کہ کر دیا "معنی سے ایسی صورتوں میں ہم مراد لیتے ہیں، متکلم کا اپنے کلام سے حتمی اور انتہائی مقصود کیا ہے، یعنی وہ مقصود یا شے کیا ہے جسے وہ بالآخر قائم یا رد کرنا چاہتا ہے۔"

لہٰذا جرجانی کے خیال میں یہ ضروری نہیں کہ کسی قول کے اصل معنی اور اس کے ابتدائی دونوں ایک ہی ہوں۔

بھرتری ہری نے لکھا ہے کہ اگر ہم کوئی ایسا لفظ استعمال کر رہے ہیں جس کے دو یا زیادہ معنی ہیں تو دراصل یہ کئی الفاظ ہیں جنھیں ہم ایک وقت میں اور ایک ہی جگہ برت رہے ہیں۔

سوال: آپ کے تنقیدی مزاج میں کچھ رعونت اور خود پسندی اور کچھ تلاطم آمیزی معلوم ہوتی ہے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہنا پسند کریں گے؟

جواب: جس چیز کو تم رعونت یا خود پسندی کہتے ہو، اسے یوں بیان کیا جائے تو بہتر ہوگا کہ میں اپنے خیالات کو بے کم و کاست بیان کرنے کی جرأت رکھتا ہوں اور جس چیز کو میں صحیح سمجھتا ہوں اسے صحیح کہنے سے جھجکتا نہیں اور میرا خیال یہ ہے کہ اعتبار دارانہ آواز اور فیصلہ کن انداز میں کلام کرنا نقاد کے لئے اہم ہے، خاص کر جب وہ رائج تعصبات، تاثرات، افسانوں اور مسلم الثبوت اشیاء کو رد کرنے کی یا کم سے کم معرض سوال میں لانے کی کوشش کر رہا ہو۔ رچرڈز نے نقاد کی تشبیہ ڈاکٹر سے دی تھی، اس نے لکھا کہ نقاد کو ذہن کی صحت سے اتنا ہی سروکار ہوتا ہے جتنا ڈاکٹر کو جسم کی صحت سے۔ تنقید کا کاروبار قائم کرنے کے معنی ہیں اقدار کے نقاد اور منصف کی حیثیت سے خود کو قائم کرنا تو اب ظاہر ہے کوئی یہ تو نہ چاہے گا کہ اس کا ڈاکٹر تذبذب میں گرفتار اور تشخیص و تجویز کے بارے میں گوں مگوں میں مبتلا ہو۔ یقیناً کوئی یہ نہ چاہے گا کہ نقاد ہٹ دھرم اور ادعائیت پرست ہو۔ لیکن یہ بھی کون پسند کرے گا کہ وہ یوں بھی ہے کی بیماری میں مبتلا ہو۔

اب جہاں تک سوال تلاطم آمیزی (Agitation) تلاطم انگیزی کا ہے تو بھائی، میں سمجھا نہیں کہ ادب کے سیاق و سباق میں تم اس لفظ سے کیا مراد لیتے ہو؟ آڈن AUDEN نے کہا تھا کہ کوئی نسل اس وقت جدید نہیں کہلا سکتی جب تک وہ اپنی فوری پیش رو نسل کو مسترد نہ کرے۔ میں نے نئی اردو تحریک کی موافقت میں یونین بازوں کے اندر میں کوئی تحریک تو چلائی نہیں لیکن میں نے اس کی پرزور موافقت ضرور کی اور میرا خیال ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔

سوال: شیلی نے یہ کس بنا پر کہا کہ شاعری اخلاقیات اور سیاسیات سے بہت کم تر درجے کی چیز ہے، اس خیال کا معاصر ہندوستانی منظر نامے سے آپ کیا رشتہ یا تعلق دیکھتے ہیں؟

جواب: شیلی جو کئی معنوں میں خود تو افلاطونی تھا خود کو افلاطونی بندھنوں سے آزاد کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ افلاطون کی تعلیم تھی کہ شاعری کو آئینی ریاست میں کار آمد عمل قرار دیا جانا اسی وقت ممکن ہے جب شاعری لوگوں کے اخلاقی اور ذہنی صفات کو بہتر بنائے اور لوگوں کو کچھ اس طرح کا بنا دے جیسے آج کی اصطلاح میں سیاسی طور پر درست (Politically Correct) کہا جاتا ہے۔ اپنی حیثیت کے اعتبار سے تو شیلی افلاطون کا پیرو ہے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ وہ فکریاتی پابندیاں بھی قبول نہیں کرنا چاہتا۔ لہٰذا وہ ادھر ادھر کی ہانکتا ہے اور ایسی باتیں کہنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے خیال میں افلاطون کو قبول ہوتیں لیکن جن سے رومانی شاعر کی آزادی کا استحکام بھی ہوتا۔ مثال کے طور پر تمھیں شیلی کے مشہور مضمون A Defence of poetry کا اقتباس پڑھ کر سناتا ہوں۔

The whole objection of the immorality of poetry rests upon a misconception of the manner in which poetry acts to produce the moral improvement of man...Poetry acts in another and deviner manner. It awakens and enlarges the mind itself by rendering it the receptacle of a thousand unapprehended combinations of thought. Poetry lifts the veil from the hidden beauty of the world, and makes familiar objects as if they were not familiar...The great instrument of moral good is the imagination:...Poetry strengthens the faculty which is the organ of the moral nature

of man, in the same manner as exercise strengthens a limb.

میں چونکہ افلاطون کا مخالف ہوں اس لئے مجھے شیلی کے محولہ بالا خیالات سے کوئی ہمدردی نہیں اور یہی بات تو یہ ہے کہ شاعری کو کسی Defence یعنی وکیل صفائی کی ضرورت ہے۔ شیلی نے قوت متخیلہ کی طاقت کے بارے میں کچھ باتیں ایسی ضرور کہی ہیں جن سے میں خود کو متفق پاتا ہوں۔ لیکن مجموعی طور پر اس مضمون میں اس کا رویہ کچھ زیادہ ہی مدافعانہ ہے۔

سوال: آپ کے بارے میں اکثر یہ کہا گیا ہے کہ آپ کے کچھ محبوب یعنی Favourite ادیب و شاعر ہیں، کیا واقعی؟

جواب: یہ بات ہر شخص کے ساتھ ہے کہ اسے کچھ چیزیں کچھ اور چیزوں کے مقابلے میں زیادہ اچھی لگتی ہیں اور میں اس کلیئے سے باہر نہیں ہوں۔ لیکن میں نے کبھی کسی کو چاہے وہ میرا دوست ہی کیوں نہ ہو بانس پر چڑھانے یا کسی کو چاہے وہ میرا دشمن ہی کیوں نہ ہو، اس کی مناسب جگہ سے گرانے کی یعنی کسی کو منظور نظر بنانے اور کسی کو معتوب رکھنے والا کھیل کبھی نہیں کھیلا۔ نہ میرا کوئی منظور نظر ہے اور نہ میں اصلاً کسی کو ناپسند کرتا ہوں۔ میں نے کسی کی تعریف اس بنا پر کبھی نہیں کی کہ وہ میرا دوست ہے۔ تم خود میرے قدیم ترین اور عزیز ترین دوستوں میں ہو۔ اس لئے تمہیں تو خوب معلوم ہونا چاہئے کہ تمہاری تعریف میں نے دوستی کی بنا پر کبھی نہیں کی۔

سوال: کیا اردو نے تفریحی صنعت و حرفت کے آگے گھٹنے ٹیک دئے ہیں؟

جواب: نہیں میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ ہاں اردو غزل گائیکی کو ایک بزنس کا درجہ ضرور حاصل ہو گیا ہے اور یہ افسوس کی بات ہے۔ کیونکہ غزل گائیکی کی زبردست مقبولیت کو اردو شاعری کی سچی حیثیت اور اہمیت کے بارے میں تعلیم و تربیت دینے کا ذریعہ بنایا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ تم جانتے ہو اردو شاعری کے بارے میں، اردو نہ جاننے والوں یا کم جاننے والوں کی عام رائے یہ ہے کہ یہ شاعری شراب، معشوق اور رقص و تفریح کے بارے میں ہے اور اس کا تعلق سستی روحانی محبت کے عامیانہ جذبات سے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات حقیقت سے بہت دور ہے۔ لیکن جو بات چل جائے اسے رد کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے اور آج کی غزل گانے والوں کی مقبولیت میں جو طاقت ہے اسے غزل کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یعنی اگر غزل گانے والوں کو اردو شاعری کی صحیح تحسین کا علم و فن سکھایا گیا تو ان کی جھولی میں اچھی شاعری

ہوتی جن میں شاعری کا سچا ذائقہ ہوتا۔ نہ کہ وہ نقلی یا گھٹیا شاعری جسے وہ آج تمام گاتے پھرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ انھیں کلاسیکی موسیقی اور غزل گائیکی کے بارے میں بھی کچھ زیادہ نہیں معلوم۔ لہٰذا جو چیز وہ ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ خراب موسیقی ہی ہے اور خراب شاعری بھی۔

یوں تو مشاعرہ بھی ایک طرح کی تفریحی صنعت و حرفت بن گیا ہے لیکن ابھی اسے زیادہ سے زیادہ چھوٹی انڈسٹری کا درجہ حاصل ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں ادیب کو سماج میں کوئی کردار ادا کرنا چاہئے؟ یعنی سماج کے فرد کی حیثیت سے ادیب کے فرض کی ذمہ داری کیا ہے؟

جواب: ادیب کی ذمہ داری اچھا لکھنا ہے۔ جوزف براڈسکی نے کیا سچے کی بات کہی ہے کہ شاعروں کے بغیر سماج کا کام بخوبی چل سکتا ہے اور سماج کے تئیں شاعر کا اور کوئی فرض نہیں بجز اس کے کہ وہ اچھا لکھے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ جب کوئی نابغہ (Genious) پیدا ہوتا ہے تو ہم اسے اس طرح پہچان سکتے ہیں کہ سارے احمق اس کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ اپنے تعلق سے آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

جواب: بھائی مجھے نہیں معلوم نابغہ کیا اور کون شے ہے۔ بہر حال نابغہ کے بارے میں جو تصور میرے ذہن میں ہے، میں خود کو اس سے کم تر پاتا ہوں۔ جہاں تک سوال میرے مخالفوں کا ہے، تو میں ان کی صاف بیانی کی وجہ سے ان کی عزت کرتا ہوں۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ میں کسی یونیورسٹی کا پروفیسر یا وائس چانسلر ہوتا تو میرے مخالفین کس حد تک صاف گو ہوتے۔

سوال: ادبی شہرتوں میں خوش نصیبی کا کتنا حصہ ہوتا ہے؟

جواب: بد نصیبی تو یقیناً خاصی نظر آتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ اچھے لکھنے والوں کو ہمیشہ کامیابی ملے یا اگر ملتی بھی ہے تو صحیح وقت پر نہیں ملتی۔ اسی طرح کبھی کبھی تقدیر کی یاوری بھی بروئے کار آجاتی ہے۔ ایک بار نپولین کے سامنے کسی جرنیل کی جنگی فہم و فراست کی تعریف کی گئی تو پھر پوچھا کہ وہ سب ٹھیک ہے لیکن وہ قسمت ور بھی ہے کہ نہیں۔

سوال: آپ نے بڑی مصروف زندگی گزاری ہے اور بڑے عہدوں پر فائز رہے ہیں اور پھر یہ بھی ہے کہ گذشتہ کئی برس سے آپ بیمار چلے آتے ہیں تو پھر اتنی مصروفیت اور پڑھنے اور لکھنے کا اتنا بوجھ

آپ کس طرح سنبھالتے ہیں؟ آپ کی قوت اور فیضان کے سرچشمے کیا ہیں؟

جواب: میرا خیال ہے میں نے کچھ اتنا بہت تو نہیں کیا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص کو کسی ایسے حلقے کی ضرورت ہوتی ہے جسے وہ اپنا کہہ سکے اور وہ اس حلقے کو خلق کرنے یا حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جہاں تک الہام اور فیضان کے سرچشموں کا معاملہ ہے، میرا سرچشمہ یہ احساس تھا کہ وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ اور آج بھی وہی کیفیت ہے۔ مجھے اپنے اندر اس بات کا اشد تقاضا محسوس ہوتا ہے کہ میں شعر کہوں، ادب کے بارے میں لکھوں، اپنی تہذیب کی شانیں اور عظمتیں دریافت کروں اور انھیں دریافت کرنے میں دوسروں کی مدد بھی کروں۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو مجھے لگتا تھا کہ مجھے کچھ ایسی باتیں کہنا ہے جو اور لوگ نہیں کہہ رہے تھے یا نہیں کہنا چاہتے تھے۔ یہ احساس اب بھی باقی ہے۔

سوال: کسی ادیب کی زندگی میں سب سے زیادہ مطمئن کن لمحہ کون سا ہو سکتا ہے؟ کیا آپ کی زندگی میں وہ لمحہ آچکا ہے؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ سب سے زیادہ مطمئن کن لمحہ وہ ہوگا جب کوئی شخص کاغذ پر پورے غور و فکر اور مکمل طور پر سوچی سمجھی ہوئی کوئی پوزیشن یا بات لکھے اور لکھنے کا انداز منطقی بھی ہو اور شستہ و پاکیزہ ہو اور جو بات کہی گئی ہو اس میں نظریے کی قوت بھی ہو اور وجدان کا حسن بھی۔ میں ایسی چیز لکھنے کی کوشش تو کرتا رہا ہوں لیکن مجھے پتہ نہیں کہ ایسی کوئی تحریر میں بنا بھی سکا ہوں یا نہیں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ میری نظریاتی تحریروں میں سے کچھ ایسی ہیں اور غالب اور میر اور جدید اردو شاعری اور افسانہ کے بارے میں بھی کچھ تحریریں ایسی ہیں، جن میں کئی برس گزر جانے کے باوجود تازگی باقی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت بڑا انعام ہے۔

سوال: ساہتیہ اکیڈمی کے لئے آپ نے جو 'کلیات غالب کا' کا اردو انتخاب کیا ہے۔ آپ کے سامنے اصول انتخاب کیا تھے؟

جواب: میں نے ساہتیہ اکیڈمی کی فرمائش پر اپنے خیال میں غالب کے بہترین کلام کا نمونہ پیش کیا ہے اور اس کے دیباچے میں میں نے غالب کی بطور جدید شاعر حیثیت اور پہچان قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

سوال: کیا آپ نے کبھی دوسروں کے نام سے لکھا ہے یعنی وہ چیز کی ہے جسے انگریزی Ghost Writing کہتے ہیں۔

جواب: نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ میں نے خود کئی ناموں سے لکھا ہے مثلاً شہرزاد، جاوید جمیل، اور ایک دو نام اور۔ یہ سب تحریریں 'شب خون' میں چھپیں۔ اپنے بہت لڑکپن کے زمانے میں میں نے 'شمشی رحمانی' کے نام سے لکھا۔ اگر مجھے اپنی تحریر کے ذریعہ روٹی کمانی پڑتی اور اس میں مجھے Ghost Writing بھی کرنی پڑتی تو میں بخوشی کرتا۔

سوال: نقاد کو بیان کرنا چاہئے، تجویز نہیں کرنا چاہئے۔ آپ کے بارے میں اکثر یہ الزام لگتا ہے کہ آپ بیان سے زیادہ تجویز سے کام لیتے ہیں۔

جواب: جتنے بیان ہیں وہ سب کسی نہ کسی سطح پر تجویزی یا فیصلہ جاتی ہوتے ہیں۔ اقداری فیصلے سے کسی کو مفر نہیں۔ یہ باتیں تنقید کی دنیا میں کم سے کم ۱۹۵۰ کی دہائی سے معروف ہیں۔ میں نے ایسی تحریریں بھی لکھی ہیں جن میں بیان زیادہ ہے اور تجویز کم لیکن میں نے تجویز یا فیصلہ کرنے کے عمل کو ادب کے لئے ضرر رساں کبھی نہیں سمجھا۔ جب تک آپ کی تجویز میں ادبی تصورات اور اصول ہیں، آپ بطور نقاد اپنا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ اس میں کوئی نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہی فائدہ ہے، اگر یہ کہا جائے کہ کسی نظم کو کیا ہونا چاہئے۔ چاہے آپ Macleish کی طرح سے یہی کیوں نہ کہیں کہ نظم میں معنی ہونا ضروری نہیں نظم کو بس نظم ہونا چاہئے۔

سوال: نقاد کی حیثیت سے آپ شاعروں سے ہر بار معجزے یا کرامت کی توقع رکھتے ہیں؟

جواب: نہیں، لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ شاعر نے جو حاصل کر لیا ہے اسی پر قانع ہو کر بیٹھ رہے۔ انھیں چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لائیں۔

سوال: یہ اکثر دیکھا گیا ہے (خاص کر شب خون میں) کہ آپ ان معاملات میں بھی اپنا رد عمل ظاہر کرتے ہیں جنھیں آپ باسانی نظر انداز کر سکتے ہیں۔ کیا اس کی وجہ برہمی ہے یا آپ کو واقعی تکلیف پہنچتی ہے، جس وجہ سے آپ جواب دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں؟

جواب: سب سے پہلی بات تو یہ کہنے کی ہے کہ بہت سے اخباروں، رسالوں اور سیمیناروں میں مجھ پر مسلسل حملے ہوتے رہتے ہیں۔ اکثر یہ حملے ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں اور بدمذاقی کے آئینہ دار ہوتے ہیں لیکن 'شب خون' کے باہر چھپنے یا کہی جانے والی باتوں کا میں کبھی جواب نہیں دیتا لیکن جب 'شب خون' میں ایسی تحریریں چھپنے کے لئے آتی ہیں (اور اگر ان کا چھاپنا ضروری سمجھا جاتا ہے) تو میں خود کو جواب کے لئے مجبور پاتا ہوں۔ اس کی وجہ بالکل سامنے کی بات ہے۔ زیادہ

ترایسی تنقیدیں اور نکتہ چینیاں اسی لئے ہوتی ہیں کہ مجھ سے جواب لکھوالیا جائے۔ 'شب خون' میں جو بھی تحریر، مضمون یا خط میرے خلاف چھپنے کے لئے آتا ہے، ان کا بڑا حصہ میں چھاپ دیتا ہوں اور جواب میں تقریباً نصف دیتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ کبھی کبھی مجھے تکلیف بھی پہنچتی ہے۔ خاص کر جب حملے کسی ذاتی مقصد کی بنا پر ہوں یا علمی وقار اور دیانت سے عاری ہوں یا ذاتیات پر مبنی ہوں۔

سوال : فاروقی صاحب آپ کے خیال میں شاعری کا تفاعل جدید زمانے میں کیا ہے یا کیا ہونا چاہئے ؟

جواب : ممکن ہے کہ یہ چھوٹا منہ بڑی بات لگے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاعری کا زمانہ حال میں وہی تفاعل ہے جو Myth یعنی اسطور کا زمانہ قدیم میں تھا۔ شاعری ہماری داخلی اور خارجی دونوں دنیاؤں کو با معنی بنانے میں مدد کرتی ہے۔ یہ زندگی کو کچھ زیادہ لائق زیست بناتی ہے۔ نوبل انعام یافتہ فرانسیسی مارکسی ناول نگار Claude Simon فرانس پر جرمنی کے قبضے کے زمانے میں جرمنوں کے خلاف خفیہ مقاومت میں سرگرم تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ سخت کوشی اور خطرۂ جان کے ان دنوں میں شاعری اس کے لئے قوت کا بہت بڑا سرچشمہ تھی۔ وہ کہتا ہے کہ شاعری پڑھنے سے بھوک تو نہیں مٹتی تھی لیکن اس کے باعث زندگی کسی نہ کسی سطح پر قابل قدر معلوم ہونے لگتی تھی۔

آڈن Auden نے لکھا ہے کہ شاعری عملی دنیا میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیتی۔ آڈن کا کہنا بالکل صحیح ہے اور اس میں شاعری کی قوت بھی ہے کیونکہ اس نقطۂ نظر سے شاعری میں کچھ وہ بات پیدا ہو جاتی ہے جو کانٹ کے نظریے کے مطابق خوبصورتی میں ہے۔ تمہیں خیال ہوگا کہ کانٹ نے خوبصورتی کی تعریف یہ کی ہے کہ یہ وہ چیز ہے جس کے باعث ہم اس چیز سے بے غرض لطف اندوز ہوتے ہیں جس میں وہ یعنی خوبصورتی پائی جائے۔ تو وہی حال شاعری کا ہے کہ ہم اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں اگرچہ ہمارا پیٹ نہیں بھرتی۔
اور آخر میں ولیم کارلیس ولیمز William Carlos Williams کی چند سطریں تمہاری نذر کر کے اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔

It is difficult
to get the news from poems
yet men die everyday
for lack
of what is found there.

شفق

یہاں وہی حال ہے جیسے داستان کا کوئی دیو قلعے کو اٹھا کر پہاڑ کی چوٹی پر رکھ آتا تھا۔ یا الف لیلہ کا کوئی جن اس آبادی کو یہاں قید کر کے بھول گیا ہے۔ اس کے چاروں طرف جنگل جھاڑیاں اور زہر یلے پودے ہیں، راکھ اور ریت کا انبار ہے نالوں میں بہتا ہوا کول واشریوں کا زہریلا پانی، کالی کالی سڑکیں، زمین سے نکلتی مسموم گیس۔ کسی اونچی جگہ سے دیکھا جائے تو چاروں طرف آگ اور دھواں نظر آتا ہے۔ فضا میں کوئلے کے ذرات اور گیسیں، یہاں آدمی آسمان میں اڑنے کے بجائے سیکڑوں فٹ زمین کے نیچے سفر کرتا ہے، یہاں کے لوگ سحر زدہ ہیں سب کو بہت جلدی ہے جیسے قیامت آنے والی ہے اس سے پہلے کاروبار حیات نپٹالو، جو بیچنا ہے بیچ دو، جو خریدنا ہے خرید لو۔ بازاروں میں بے انتہا بھیڑ، ایک بھاگم بھاگ کا عالم ہے۔

سورج ڈوبتے ہی مٹگجا اندھیرا اس بستی پر محیط ہو جاتا ہے۔ یہ مزدوروں کی بستی ہے دولت مندوں کے بازار اور عمارتیں ہیں مگر آدمی نہیں ہیں سب روپوش ہیں ملکتے بھی اور کامنیں بھی اور دوکانوں پر بیٹھنے والے سیٹھ ساہوکار بھی۔

یہاں کے اسٹیشن پر ٹرینیں بہت کم آتی ہیں اور عموماً سناٹا رہتا ہے۔ شام کے وقت یہی ایک گوشہ عافیت ہے، اسٹیشن کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر تازہ فضا کا احساس ہوتا ہے۔ پرندوں کے جھنڈ اپنے ٹھکانوں کو لوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دور تک پھیلی ہوئی ریت اور جھاڑیاں نظر آتی ہیں، مزدوروں کے جھونپڑوں سے اٹھتی ہوئی دھویں کی لکیریں نظر آتی ہیں یا پھر جگہ جگہ بڑی بڑی آگ کا ڈھیر۔

مین روڈ سے جو راستہ اسٹیشن کی طرف جاتا ہے اس میں ایک گلی ٹیچری لین ہے۔ یہاں ایک دو منزلہ مکان ہے، نیچے دوکانیں اور اوپر مکان، میں اسٹیشن سے واپسی میں اکثر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا جاتا ہوں، میرے لئے اجازت ہے پکار کر چلے آیا کرو، یہاں ہے ہی کون، ایک ماں ہیں وہ تم سے کیا پردہ کریں گی؟

یہ اردو کے مشہور افسانہ نگار غیاث احمد گدی کا مکان ہے۔ گرمی کی رات ہے، غیاث صاحب چھت پر ایک آدمی کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ دوسرے آدمی کا چہرہ صاف نظر نہیں آتا کیوں کہ وہاں روشنی نہیں ہے۔ آسمان میں چاند بھی نہیں ہے تاروں کی ہنسی سے رات کی چادر ذرا سی سرک گئی ہے۔ میں غور سے دوسرے آدمی کو دیکھتا ہوں، وہ نہ ناٹے ہیں نہ لمبے، نہ گورے نہ کالے، نہ موٹے ہیں نہ پتلے۔ آواز میں گرج ہے نہ چمک۔ کول واشریوں کے گندے پانی سے ریت پر اگائی جانے والی سبزیاں کھانے والے اور زہریلی ہوا میں سانس لینے والے جیسے ہوتے ہیں، ویسے ہی ایک عام سے آدمی تھے۔

دونوں کے درمیان بڑے انہماک سے باتیں ہو رہی تھیں، وہ ان دو مساکسٹ (masochist) بھائیوں کا تھا جو کبھی کیرم کی گوٹ نگل جاتے تھے کبھی چھری کاٹتے۔ میں ان کی باتیں بڑے دھیان سے سنتا ہوں اور اندازہ ہوتا ہے کہ کسی انگریزی ناول کے کردار زیر بحث ہیں۔ بحث ختم ہوئی تو غیاث صاحب کو احساس ہوا کہ انہوں نے میرا تعارف نہیں کرایا ہے۔

"ان سے ملو یہ الیاس احمد گدی ہیں میرے چھوٹے بھائی اور یہ شفق ہیں"

میں الیاس احمد گدی کے نام سے واقف تھا۔ ان کی کہانیاں بھی پڑھی تھیں۔ مگر اس نام میں میرے لئے کوئی کشش نہ تھی "الشجاع" کراچی میں میری ایک کہانی شائع ہوئی تھی۔ اس میں الیاس صاحب کی بھی ایک کہانی تھی۔ قصہ ایک ٹرک ڈرائیور کا تھا جو چھوٹا ناگپور کے پہاڑوں سے پتھر لاتا تھا، وہ ایک سنتھالی لڑکی سے شادی کرنے کے لئے پیسے جمع کر رہا تھا۔ جب پیسہ پورا ہو گیا تو وہ ٹرک بکنے لگا۔ اتنے دنوں کی رفاقت میں اسے ٹرک سے اتنی محبت ہو گئی تھی کہ اس نے لڑکی کے بجائے ٹرک خرید لیا۔

اب جب کہ جدید کہانیوں کا دور تھا، غیاث احمد گدی "تج دو تج دو"، "پرندہ پکڑنے والی گاڑی"، خانے تہہ خانے" جیسے افسانے لکھ رہے تھے اور میری کہانی اندھی رات، "سوغات" میں چھپی تھی، "سیاہ کتا" اور "کانچ کا بازی گر" "شب خون" میں، تو ان کہانیوں کے مقابلے میں روایتی بیانیہ کی کیا اہمیت تھی۔

غیاث صاحب مذاق کے موڈ میں کہنے لگے، "الیاس نے ایک بہت اچھی کہانی لکھی تھی وہ 'شمع' میں میرے نام سے چھپ گئی۔ 'شمع' والوں نے سوچا ہو گا اتنی اچھی کہانی غیاث ہی لکھ سکتے ہیں۔"

الیاس صاحب دھیرے سے گمبھیر سی ہنسی ہنسے تھے۔ وہ خشک سے آدمی نظر آئے۔ انہوں نے مجھ سے مل کر کسی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا، نہ ہی کچھ باتیں کیں، میں جھریا چند دن ہی پہلے آیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی نہ پوچھا کہ یہاں کس غرض سے آیا ہوں اور کتنے دنوں قیام رہے گا۔ وہ اٹھ کر جانے لگے تو میں نے غور سے دیکھا۔ وہ دیوانند کی طرح کچھ جھک کر چل رہے تھے۔

جھریا میں میرا قیام تین سال رہا۔ اس دوران میری توجہ کا مرکز غیاث صاحب کی ذات رہی۔ میں ان کے افسانوں کا پرستار تھا۔ ان کا نیم تمثیلی اور نیم بیانیہ اسلوب، نئی نئی اصطلاحیں اور جدید حسیت سے بھرپور کہانیاں، میرے لئے مشعل راہ بنی ہوئی تھیں۔ اس دوران الیاس صاحب سے کم ہی آمنا

سامنا ہوا، کسی نے بتلایا تھا کہ وہ دھنباد میں ٹرانسپورٹ میں کوئی کام کرتے ہیں۔ انہیں جب بھی دیکھا غیاث صاحب کے یہاں دیکھا ایک دن ان کی موجودگی مین غیاث صاحب نے میری عمر پوچھی۔

"۲۷ سال" میں نے بتلایا۔

الیاس صاحب نے کہا "تم نے تین سال دبا لئے"

مجھے ان کی قیافہ شناسی اچھی نہیں لگی، ان کے کہنے کا دو ٹوک انداز شرمندہ کرنے والا تھا۔

پھر شہزادی 'زرنگار'، کا وہ جن جو مجھے یہاں قید کر گیا تھا واپس میرے شہر چھوڑ گیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سزا کے دن پورے ہوئے۔

پھر خبر ملی کہ غیاث احمد گدی کا انتقال ہو گیا، اب رسالوں میں الیاس صاحب کی کہانیاں کچھ زیادہ ہی نظر آنے لگیں۔ اب ان میں آنچ بھی محسوس ہونے لگی تھی اور سفر نامہ بنگلہ دیش میں تو وہ نئے روپ میں سامنے آئے۔ ابھی اس سفر نامہ کی گونج کم بھی نہ ہوئی تھی کہ "مکدہ پوری کا قصہ" کا چرچا ہوا۔ پھر بہار اردو اکیڈمی کے رسالے "زبان و ادب" میں "فائر ایریا" کی ایک قسط چھپی۔

کیا غیاث صاحب ولی اللہ تھے؟ مرتے وقت بھائی کو سینے سے لگایا اور ان کا سارا ہنر بھائی کے سینے میں سما گیا۔ الیاس احمد گدی کے فن کی آنچ بھڑک کر شعلہ بن گئی تھی۔ میں نے اس ناول کی قسط پڑھ کر عامر عثمانی کے ذریعہ انہیں پیغام بھیجا، ناولٹ شائع ہو جائے تو مجھے ضرور بھیجیں، اس لئے بھی کہ یہ کہانی جھریا کے پس منظر میں تھی اور وہ سرزمین میری دیکھی بھالی تھی، مگر تب اندھیرا اتنا گھنا نہیں تھا۔ آگ اس طرح باہر نہیں آئی تھی، نہ پگھلی ہوئی آگ یوں دوڑتی تھی کہ نہ عزت محفوظ تھی نہ زندگی۔ سفید کھادھاریوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ وہ سیدھے سادے دیہاتی نوجوان جو یہاں مزدوری کرنے آتے تھے اور اکثر ظلم کے خلاف سینہ سپر ہو جایا کرتے تھے، اب مافیا سرداروں کا داہنا ہاتھ بن گئے ہیں اور علاقہ مافیا گروہوں کے درمیان ہونے والی قتل و غارت گری سے جہنم بنا ہوا ہے۔

پتہ نہیں وہ اسٹیشن اب کیسا ہوگا۔ ویسا ہی پر سکون؟ آبادی اتنی بڑھ گئی ہے۔ گاڑیاں بھی بڑھی ہوں گی اور لائنیں بھی۔ اور ریلوے کوارٹروں میں رہنے والی وہ بنگالی لڑکیاں جو شام کے وقت دو دو چار چار کی ٹولیوں میں کھڑی رہتی تھیں اور مجھے آتا دیکھ کر ایک دوسرے کو کہنی مارتی تھیں، مجھے یہ وہم تھا کہ وہ میرا انتظار کرتی ہیں اور وہ سمجھتی ہوں گی کہ میں ان کے لئے آتا ہوں۔ اب تو بال بچے دار ہو کر نہ جانے کہاں ہوں گی۔ میں تو انہیں اکثر یاد کرتا ہوں۔ کیا کبھی انہیں میرا بھی خیال آیا ہوگا اور وہ ہورلاڈیہ قبرستان جو دور سے جنگل معلوم ہوتا تھا وہاں کتنا سکون تھا جی چاہتا تھا بیٹھے رہا جائے۔

پھر "فائر ایریا" کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا۔ اس سے پہلے شمس الرحمٰن فاروقی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے ہندوستان کے علاقائی ادب کا شاہکار تسلیم کیا۔ "ذہن جدید" اور دوسرے رسالوں نے بھی اس پر بہت اچھے تبصرے کئے اور اس ناول پر ٹی وی سیریل بننے کا اعلان ہوا۔ الیاس صاحب کو وہ ملا غیاث صاحب کو نہ مل سکا۔ غیاث صاحب نے بھی ناول "پڑاؤ" لکھا تھا مگر ان کا فن افسانوں میں زیادہ تابناک رہا اور ناول کے وسیع کینوس کا متحمل نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس الیاس صاحب کہانیوں میں غیاث صاحب کے مرتبے کو نہ پہنچے مگر ناول میں سبقت لے گئے اور ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ نے انہیں معتبر ہونے کی سند دی۔

یہ بھی خبر ملی تھی کہ الیاس صاحب بہار اردو اکیڈمی کے سکریٹری بننے کے لئے کوشاں ہیں، اور پندرہ دن پٹنہ میں رہ کر ناکام لوٹ گئے ہیں۔ اصل انہوں نے سن لیا ہوگا کہ ایک صاحب دیوانہ وار اٹھے اور صاحب اقتدار کی خدمت میں حاضر ہو کر انہوں نے عرض کیا، فدوی بھی وہی ہے جو حضور ہیں فرق اتنا ہے کہ ہمارے اجداد نے اسلام قبول کر لیا تھا ویسے اب تک ہمارے یہاں خاندانی کاروبار جاری ہے لہٰذا امیدوار ہوں کہ ۔۔۔

اور صاحب اقتدار نے خوش ہو کر انہیں کرسی بخش دی۔

مجھے یقین ہے الیاس صاحب نے بھی من و عن یہی باتیں دہرائی ہوں گی مگر وہ بھول گئے تھے کہ معاملہ اتنا سادہ نہیں۔ سفارش اور پیروی بغیر کام نہیں ہوتا۔ یہ سب بھی ضروری تھا بھائی، بلکہ یہی سب سے ضروری جو وہ جھریا میں بیٹھ کر نہ کر سکے۔ اور نہ یہ سچے فن کار سے ممکن ہے۔ ویسے ملاوٹ کا زمانہ ہے اور چمکنے کے لئے تھوڑی سی ملاوٹ ضروری ہے، سونا بھی ملاوٹ کے نہیں چمکتا۔

اتفاقاً جھریا جانے کی سبیل نکل آئی ان بیس برسوں میں شہر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی صرف بازار اور تنگ ہو گئے تھے بھیڑ اور بڑھ گئی کولریاں شہر سے چمٹ گئی تھیں۔ "چانک" نظر آنے لگے تھے۔ میں نے جو اسٹیشن دیکھا اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ ریلوے کوارٹر ویران نظر آئے۔ سارے مناظر وہی تھے۔ میں نے قبرستان کا رخ کیا۔ قبرستان سے ہو کر ہوئی ایک کالی سڑک نظر آئی، دور سے ایک آدمی سفید کپڑے پہنے اس سڑک پر چل رہا تھا اسے دیکھ کر لگا کوئی مردہ کفن پہنے چہل قدمی کے لئے نکلا ہے۔ میں نے جھک کر سڑک دیکھی، کوئلے کے ٹکڑوں سے جھڑنے والے ذرات نے سڑک سیاہ کر ڈالی تھی۔ قبرستان کے درختوں بلکہ قبروں پر بھی ذرات تھے اور قبرستان کا سناٹا۔ ٹرکوں کے مسلسل گھوں گھوں سے درہم برہم ہو رہا تھا، تو یہ گوشہ عافیت بھی غارت ہوا۔

غیاث احمد گدی کے بیٹے تصور سے ملاقات ہوئی۔ باپ بیٹے میں صرف اتنا فرق ہے کہ غیاث صاحب قلم کے غازی تھے اور تصور گفتار کے غازی ہیں۔

میں الیاس احمد گدی کے گھر گیا وہ سڑک پر آتے ہوئے مل گئے میں نے انہیں دیوانند کی طرح جھک کر چلنے کے انداز سے پہچان لیا۔ ویسے اس بیس برسوں میں ان میں بہت کم تبدیلی ہوئی تھی، صرف رنگ ذرا صاف

اور وہ کچھ کمزور سے۔

میں نے اپنا تعارف کرایا، غیاث صاحب ہوتے تو بیٹے سے لگتے، انہوں نے غور سے دیکھا اور ہاتھ ملایا، میں نے فوراً ناول کا مطالبہ کر دیا۔

وہ کچھ ہچکچائے پھر بولے۔ اچھا دیکھتا ہوں۔ وہ واپس گھر کی طرف چلے گئے۔ کھٹال میں دودھ دوہی بندھے ہوئے تھے جی چاہا آگے بڑھ کر ان کا گھر دیکھوں کہ پہلی بار ان کے گھر گیا تھا مگر وہ واپس آتے نظر آگئے۔ وہیں ایک فوٹو گرافر کی دوکان پر بیٹھ کر انہوں نے ناول پر لکھا "برادرم شفق کے لئے جو اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے"۔ میں نے شکریے کا ساتھ ناول قبول کیا بلکہ جھپٹ لیا۔ الیاس صاحب نے کہا اگر تم دو منٹ بھی دیر سے آتے تو میں دھنباد کے لئے نکل گیا ہوتا اور رات دس بجے واپسی ہوتی۔

"دھنباد میں کیا ہے"؟

"وہاں خراد مشین کا کام کر رہا ہوں۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے چلتے رہے۔ "جس موضوع پر یہ ناول ہے وہ پل صراط ہے اس پار یا اس پار۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ پار اتر گئے۔"

"یہ ناول آٹھ برس تک پیسوں کی کمی کی وجہ سے چھپ نہ سکا، دھنباد میں میرے ایک ایم۔ ایل۔ اے دوست ہیں وہ مدد نہ کرتے تو اب بھی نہ چھپتا اور ایسی کئی چیزیں پیسوں کی کمی کی وجہ سے پڑی ہیں، اور اردو میں اپنے خرچ سے کتابیں چھاپنے والے پبلشر ناپید۔"

"اب تو فائر ایریا کا بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ رائلٹی ملی ہوگی۔"

"ایک دو جگہ سے ملی ہے اصل چیز ٹی وی سیریل ہے ایک قسط کا ایک لاکھ کے قریب ملتا ہے اور فائر ایریا کی کئی ہوں گی۔" میں نے ان کا چہرہ دیکھا خوش آئند دنوں کا خواب نور بن کر ان کے چہرے پر پھیل گیا تھا۔ ہم باتیں کرتے ہوئے کپڑا منڈی پہنچے اور قمر الطاف کی دوکان میں بیٹھ گئے۔ "آج تم سے اتنی باتیں ہو رہی ہیں تم تو غیاث صاحب کے دوست تھے اور مجھے نظر انداز کرتے رہتے تھے۔"

"یہ سچ ہے کہ میں غیاث صاحب سے زیادہ قریب تھا مگر میں تو یہ سمجھے ہوئے تھا کہ آپ بہت خشک آدمی ہیں۔"

وہی بیس برس پہلے والی گمبھیر سی ہنسی۔

"الیاس صاحب آپ کا کمال یہ ہے کہ آپ سیاسی موضوعات پر لکھتے ہوئے بھی کیبنڈ ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ جھارکھنڈ تحریک کے پس منظر کو آپ نے جس کامیابی سے پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔"

سفر نامہ بنگلہ دیش کا ذکر آیا تو کچھ جذباتی ہو گئے۔ "دلی میں شمس الرحمن فاروقی بڑے تپاک سے ملے، کہنے لگے میں نے کچھ خاص چیزوں میں سفر نامے کو محفوظ کر لیا ہے، مقصد یادگار تخلیق ہے"

"یہ بتائیے جب غیاث صاحب زندہ تھے تو آپ اتنی اچھی کہانیاں نہیں لکھتے تھے اب اتنی اچھی کہانیاں کیسے لکھنے لگے۔"

وہی گمبھیر ہنسی "بھیا نہیں رہے تو گدھ پوری کی قصہ گوئی کی شمع جلائے رکھنے کی ذمہ داری مجھ پر آگئی ہے اس لئے اچھا لکھ رہا ہوں۔"

پھر بہت سی باتیں ہوئیں۔ بہت سے ناول اور افسانے زیر بحث آئے جہاں وہ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ اور ٹی وی سیریل سے خوش تھے وہیں نقادوں سے شاکی بھی تھے۔ میں نے اتنی دیر میں انھیں ایک سیدھا سادہ سچا فن کار محسوس کیا، وہ کم گو تھے۔ ان کی باتوں میں بناوٹ نہ تھی، وہ خود کم کہتے دوسروں کی زیادہ سنتے۔ اپنی کہانیوں کی خود سے تعریف نہ کرتے نہ اپنی علمیت کا لوہا منوانا چاہتے، نہ بڑے بڑے حوالوں سے مرعوب کرتے تھے۔ میں ان کے بعد کی نسل سے تھا پھر بھی دوستانہ انداز میں اپنی پسند ناپسند خوشی اور ناراضگی کا اظہار کرتے رہے یہاں تک کہ دن کے دو بج گئے۔

"تم اس ناول کو پڑھو گے تو سارے کرداروں کو پہچان جاؤ گے، تم تو بہت دن یہاں رہ چکے ہو سارے کردار شناسا ہیں۔"

"پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس دن کا بے چینی سے انتظار کروں گا جب یہ ٹی وی پر دکھلایا جائے گا، اب ہم پڑھنے سے زیادہ دیکھنے کے شائق ہوتے جا رہے ہیں۔"

الیاس صاحب نے اس دن بھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں کیوں آیا ہوں، بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور دوکان سے نکل گئے۔ کچھ دیر تک وہ نظر آتے رہے پھر بھیڑ میں کھو گئے۔

پھر اخبار میں خبر آئی کہ ٹی وی کی ٹیم پٹنہ آئی ہے اور سیریل پر کام شروع ہو رہا ہے۔ پھر ریڈیو سے خبر نشر ہوئی کہ الیاس احمد گدی نہیں رہے۔

پتہ نہیں شوٹنگ شروع ہوئی تھی یا نہیں، میری نظروں میں بار بار ان کا چہرہ روشن ہو جاتا ہے، جب ٹی وی سیریل کا خوش آئند تصور نور بن کر ان کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا ایک قسط کا ایک لاکھ کے قریب ملتا ہے۔

الیاس صاحب ساری زندگی جد و جہد کرتے رہے مگر قسمت کے لکھے کو نہ مٹا سکے۔ سیریل نہ بن سکا اور خراد مشین سے اڑتی چنگاریاں آخر وقت تک ان کا مقدر رہیں۔ شمع بجھ گئی، گدھ پوری کے قصہ گو محفل سونی کر کے وہ ہورلا ڈیہ قبرستان میں آرام کرتے چلے گئے۔ کیرم کی گوٹ لگنے والے ساکٹ بھائیوں کی طرح بڑا بھائی دو شیر خوار بچوں کی خاطر بھری جوانی میں جسمانی سکھ سے محروم ہو گیا اور چھوٹا بھائی ساری زندگی معاشی آسودگی کا شکار صرف خوش آئند مستقبل کا خواب دیکھتا رہا۔

کالی سڑک پر ٹرک کی گھوں گھوں سے دونوں بھائیوں کی آنکھیں کھل جاتی ہوں گی۔ پھر قدموں کی چاپ پر دونوں خاموش ہو جاتے ہیں، شاید کوئی فاتحہ پڑھنے آرہا ہے۔

نہیں، یہ تو ختونیا اور سہدیو ہیں، پوچھنے آرہے ہیں کہ اب ہماری بقیہ کہانی کون لکھے گا۔

ظفر اقبال

پکارتی ہے بہت دور سے زمیں مجھ کو
مگر، یہ اپنی طرف کھینچتی نہیں مجھ کو

یہی کرے مرے اندر بھی ہیں خلا، بہ خلا
ذرا سی دیر کو بس چھوڑ دو یہیں مجھ کو

سبھی سفر میں ہیں، تارے، غبار، کاہکشاں
کرے گا کیا کوئی ایسے میں ہم نشیں مجھ کو

گھماؤ میں کوئی ٹھہراؤ کی نہیں صورت
کہیں پہ بھی نہیں دیکھو گے جاگزیں مجھ کو

میں اپنی سیدھ میں چلتا ہی جاؤں گا بھی تو پھر
یہ گردشیں کبھی لے آئیں گی وہیں مجھ کو

ابھی ہوں سلسلۂ انجماد سے بھی پرے
زمانہ چاہیے کچھ اور آتشیں مجھ کو

چہار سو مرے پھیلاؤ پہ نہ جا کہ یہاں
لیے بھی پھرتا ہے اک خواب واپسیں مجھ کو

کوئی بھی چیز نہیں ہے یقین کے قابل
رہے گا ایک اسی بات پہ یقیں مجھ کو

بغیر سمت کے چل تو پڑا ہوں میں، سو، ظفر
یہ لے ہی جائے گی آخر کبھی کہیں مجھ کو

باہر کی روانی ہو کہ اندر کی روانی
ہے میرے لیے ایک ہی چکر کی روانی

بہتی ہے ندی اپنے سے آگے بھی نکل کر
اور، اپنے ہی اندر ہے سمندر کی روانی

بہتا ہوا ذروں کا کوئی سیل فلک تاب
جیسے کسی دریائے منور کی روانی

سیلاب جمال ایسا گزرتا ہے شب و روز
کیا یاد رہے گی کسی پیکر کی روانی

میں سوچ بھی سکتا نہیں رک کر کسی صورت
گردش ہے برابر کی، برابر کی روانی

ہیں ایک ہی زنجیر جہانگیر کے حلقے
ملتی نہیں آپس میں ہی اکثر کی روانی

میں نے سفر آغاز ہی کرنا ہے وہاں سے
رکتی ہے جہاں جا کے مقدر کی روانی

کم ہے کہ زیادہ ہے، مجھے کچھ نہیں معلوم
گلیوں کی روانی سے مرے گھر کی روانی

اب کے یہ، ظفر، کیسی ہوا ہے مرے پیچھے
پہلے سے زیادہ ہے مکرر کی روانی

ظفر اقبال

بے شک یہ تماشا ہے تمنا کے مساوی
دنیا تو نہیں ہے مری دُنیا کے مساوی

آگے ہے فلک، اس سے بھی آگے کئی افلاک
کیا کیا ہے مگر راہ میں کیا کیا کے مساوی

اس چادر صد خواب کی دھجّی بھی نہیں اب
اک شے جو مرے پاس تھی صحرا کے مساوی

کرتے کبھی اس کام سے بڑھ کر کوئی، ورنہ
لاتے کوئی شے آپ ان اشیا کے مساوی

کچھ میرے کنارے سا بھی ہے کوئی کنارہ
دریا تو بہت ہیں مرے دریا کے مساوی

لمحہ جو نہیں ہے کسی لمحے کے برابر
کچھ اور بھی ہوگا اسی اثنا کے مساوی

ہونے کی میں کوشش تو بہت کرتا ہوں دن رات
اعلیٰ کے مساوی، کبھی ادنیٰ کے مساوی

فی الحال میسّر تو نہیں ہے مجھے، لیکن
ہوتی ہے کوئی شے لب گویا کے مساوی

ہوتی ہے، ظفر، اور طرح کی یہ ملاقات
اک بار جو ہو جائے دوبارہ کے مساوی

ڈھونڈوں جو ستارے کو، ستارہ نہیں ملتا
خود کو بھی بھٹکنے کا اشارہ نہیں ملتا

دھنسنے کے لیے ہم کو میسر نہیں دلدل
اڑنے کے لیے کوئی غبارہ نہیں ملتا

رکھتے کوئی اس بحر تغافل سے سروکار
مدت ہوئی اپنا ہی کنارہ نہیں ملتا

یہ سانپ تو سارے ہیں کبھی ایک ہی جیسے
ہر چند پٹاری سے پٹارہ نہیں ملتا

مشکل سے یہاں ایک ادارے کو ملے ہم
اس بھیڑ میں۔ اب ہم کو ادارہ نہیں ملتا

ہم بھی کئی دن سے نہیں موجود زمیں پہ
کچھ یوں بھی سراغ اس کو ہمارا نہیں ملتا

مصروف محبت ہے زیادہ ہی کہ وہ شوخ
ملتا بھی اگر ہے تو دوبارہ نہیں ملتا

وہ ہم کو میسّر ہے، مگر، گاہے بگاہے
تھوڑا سا ملا کرتا ہے، سارا نہیں ملتا

اک عمر سے رہتے ہیں، ظفر، ہم بھی یہیں پہ
ہم کو تو مزاج اب بھی تمہارا نہیں ملتا

ظفر اقبال

اصل میں میرے سوا ہے دریافت
آج تک جو بھی ہوا ہے دریافت

مجھ سے پہلے تو یہ موجود نہ تھی
میری اپنی یہ ہوا ہے دریافت

جو بھی دریافت ہوا دنیا میں
کچھ مری اس سے جدا ہے دریافت

رونما ہونے لگا ہوں کچھ تو
وہ مجھے کرنے لگا ہے دریافت

کبھی آ کر اسے جھٹلا تو سہی
میں نے جو کر کے دیا ہے دریافت

جس کو دریافت کیا ہے میں نے
یہ تو پہلے بھی رہا ہے دریافت

میں نیا کوئی نواگر بھی نہیں
نہ ہی یہ طرز نوا ہے دریافت

یہ جو صحرائے سخن ہے، اس میں
ایک میری بھی صدا ہے دریافت

خود کو اک طرح سے گم کر کے، ظفر
آپ نے کچھ تو کیا ہے دریافت

ٹھہرے کہیں وقت ہی کی رفتار
یکساں نہیں روشنی کی رفتار

گزرا ہوں وہاں سے بھی، جہاں پر
تبدیل ہوئی گھڑی کی رفتار

رہتا جاتا ہے پیچھے انساں
آگے ہے آگہی کی رفتار

کچھ موت کے بند باندھنے سے
رکتی نہیں زندگی کی رفتار

قابو میں نہ آسکی کسی کے
یہ عمر رسیدگی کی رفتار

کھلتا نہیں اس دفعہ تو، اے دوست
کیا کچھ رہی دوستی کی رفتار

گھٹتا گیا زور آدمیت
بڑھتی رہی آدمی کی رفتار

احباب زیادہ ہوں نہ حیران
یہ بھی ہے کبھی کبھی کی رفتار

خالی ہونے ہی والا ہوں میں
ایسی ہے، ظفر، کمی کی رفتار

ظفر اقبال

پھیلتا جاتا ہے کاغذ پہ علاقہ میرا
کیوں نہ ہو باعث تخلیق دھماکہ میرا

بنتی مٹتی مری تصویر خلا میں ہے وہی
آسمانوں میں اُڑا کرتا ہے خاکہ میرا

بے خبر رہتے مرے کانچ کے دل سے یونہی لوگ
گر کے ٹوٹا تو سنا سب نے چھناکا میرا

میں کسی اور کی دھن میں کہیں پھرتا رہا ' اور
میرے پیچھے یونہی خالی رہا ناکہ میرا

میں نے ہتھیار ہی جب پھینک دیئے لڑتے ہوئے
فتح پھر ہوتا نہ کس طرح سے ڈھاکا میرا

کچھ مجھے خلق بھی رکھتی رہی مشغول فساد
کچھ لہو بھی تھا زیادہ ہی لڑاکا میرا

حرف بے معنی سے ہوتی ہے مری افزائش
صفر لگنے سے ہی بنتا ہے دہاکا میرا

ڈرتے ڈرتے یونہی آغاز کیا میں نے سخن
رفتہ رفتہ یونہی کھلتا گیا جھاکا میرا

سعیٔ فن میں جو بہت زور لگاتا ہوں ' ظفر
کچھ اسی طرح سے نکلے گا کڑاکا میرا

یہ جو اب ہے تو ہے کبھی کا غبار
گرتا رہتا ہے روشنی کا غبار

اڑ رہا ہے کئی زمانوں سے
آسمانوں پہ آدمی کا غبار

یہ قرن ہا قرن پرانا بھی
لگ رہا ہے ابھی ابھی کا غبار

کوئی پہچان ہی نہیں سکتا
موت کا ہے کہ زندگی کا غبار

اٹھتے جائیں گے خواب قدم
بیٹھتا جائے گا کسی کا غبار

کسی آواز کے جزیرے پر
پھیل جاتا ہے خامشی کا غبار

راستہ میرا روک دیتا ہے
خود ہی میری مسافری کا غبار

شام کے وقت آپ ہوتا ہوں
اور میری کسی کمی کا غبار

اے ظفر ، دشمنی کے شیشے پر
جمتا جاتا ہے دوستی کا غبار

عبدالاحد ساز

زندگی — تم بھی سمجھ پائے کہاں میں بھی نہیں
نام دے دو! اسے کچھ اپنے تئیں، اپنے تئیں

کیا سزا، کیسی جزا، اپنا سخن، اپنا نشاط
ساتھ لے جائیں گے ہم حشر میں فردوس بریں

ذہن کی راہ پہ یہ گوشت کے ریشوں کا سفر
قصۂ ناف و کمر، مرحلۂ چرخ و زمیں

مفلسی بھوک کو شہوت سے ملا دیتی ہے
گندمی لمس میں ہے ذائقۂ نانِ جویں

سرد لہجہ یہ ترا — دعویٰ تقدیس بدن
یہ دلیل تپش بوسۂ رخسار نہیں!

دیدہ ریزی ہے مسلسل کہ گرہ کھل جائے
پیچ ہے میری نظر کا خم منظر کے قریں

کس مزے سے نئے اظہار کے دکھ میں ہیں میرے
وہ روایات دل سوختہ و جان حزیں

ساز گر ذوق نشاط غم ہستی ہے تو سن
گیت میرے — الم انگیز و مسرت آگیں

میں کوئی عکس چنوں، کوئی لمس لکھوں پھر
کہاں تلک یہ سفر خواب خواب، جاگوں پھر

مری رفیق نفس موت! تیری عمر دراز
کہ زندگی کی تمنا ہے دل میں افزوں پھر

تعینات کے منظر کی خیر ہو یارب!
مری نگاہ کے احوال ہیں دگرگوں پھر

میں اپنے آپ سے اک رشتۂ رقابت ہوں
کسے ندیم کروں، کس کو دوست جانوں پھر

وہی اعادۂ کرب فریب و خفت — تا!
میں ان سوالوں سے پھر ایک بار الجھوں — پھر؟

تمام فلسفے افشائے راز میں ناکام
میں راز و رمز کے نغمے ہی گنگناؤں پھر

جو شعر تم نے کہے ساز کیا تمہیں نے کہے
اگر تم اس پہ مصر ہو تو میں کہاں ہوں پھر؟

عبدالاحد ساز

وجد میں آنا بھی، زنجیر بپا رہنا بھی
کیا تقاضہ ہے کہ اڑنا بھی، کھڑا رہنا بھی

گھر سے خوش، کام سے آسودہ، سفر کو تیار
کیسی سرشاری ہے راضی بہ رضا رہنا بھی

مہلت دید بھی کم، پھر کوئی مشروط نہیں
حسن کو دیر تلک محو ادا رہنا بھی

اس میں اب اس کی کمی دیکھ کے دل کڑھتا ہے
یاد ہے جس کا مجھے، خود سے سوا رہنا بھی

شعریت ہے وہ عجب حلقۂ معنی، جس کا
پر بھی ہو رہنا ضروری ہے، خلا رہنا بھی

برف جمتی بھی، پگھلتی بھی ہے جس نقطے پر
ہے وہیں درد کو اظہار نما رہنا بھی

مجھ سے گزرے وہ، قدم بھر مجھے ثابت کر دے
مجھ کو منظور ہے نقش کف پا رہنا بھی

ساز کچھ ہم سے گنہ گاروں کی وقعت ہے ولے
زیب دیتا ہے اسے کس سے خفا رہنا بھی

بسرا ہوا جمال زمانوں کی آڑ سے
یہ کون جھانکتا ہے مکاں کی دراڑ سے

دل میں ہوائے ذہن سے پانی کی ہے کشید
جھرنے اتر رہے ہیں زمیں پر پہاڑ سے

شب بھر سنائی دیتی ہے وادی میں ایک چیخ
دن بھر لرزتا رہتا ہے جنگل دہاڑ سے

ماضی کے سانپ زہر اگلتے نکل نہ آئیں
کھولو نہ یہ کھنڈر جو کھڑے ہیں اجاڑ سے

ترک تعلقات میں روشن ہے اک کسک
رشتوں کا نور پھوٹ رہا ہے دراڑ سے

اپنی انا کی جھیل سے نکلے تھا کے ہم
اور گر پڑے خود اپنی نظر کی پچھاڑ سے

ٹھہرا سا ایک لفظ گھنی سوچ کے تلے
فانوس جیسے ساز لٹکتا ہو جھاڑ سے

عبدالاحد ساز

گم نام رہ شعر میں کھو جائیں گے اک دن
کچھ زخم ہم اس راہ کے دھو جائیں گے اک دن

پہنچو گے جو منزل پہ تو پاؤ گے ہمیں تم
ہم راستہ چلتے ہوئے کھو جائیں گے اک دن

آکاش کو چھو لینے کی رخصت بھی ہے شاید
یہ جبر، کہ دھرتی میں سمو جائیں گے اک دن

چھت گرنے کا کیا غم کہ ہم آفاق نشیں ہیں
جو واقعے ہونے ہیں، ہو جائیں گے اک دن

ہم دم! کبھی نکلو بھی فریبوں سے قبا کے
اس جسم سے باہر بھی چلو جائیں گے اک دن

کچھ لوگوں کی آنکھوں میں بچے عکس پکڑ لو
کھو جائے گا منظر جو یہ سو جائیں گے اک دن

دکھ یہ ہے کہ پھر تم ہی ہمیں پا نہ سکو گے
یوں روز نہ جانے کو کہو، جائیں گے اک دن

اک عمر گزاریں گے سر نوک قلم ساز
اک شعر کسی دل میں چبھو جائیں گے اک دن

لمحۂ تخلیق بخشا اس نے مجھ کو بھیک میں
میں نے لوٹایا اسے اک نظم کی تکنیک میں

بام و در کی روشنی پھر کیوں بلاتی ہے مجھے
میں نکل آیا تھا گھر سے اک شب تاریک میں

فیصلے محفوظ ہیں، اور قافلے ہیں بر قرار
گرد اڑتی ہے یقیں کی وادیٔ تشکیک میں

سی کے پھیلا دوں بساط فن پہ میں دامان چاک
ڈور تو گزرے نظر کی سوزن باریک میں

میں زیارت گاہ آگاہی سے لوٹا ہوں ندیم!
پھول لایا ہوں الم کے ہدیۂ تحریک میں

بول میرے سر کو چھوتے چھوتے رہ جاتے ہیں ساز
آہ! یہ کیسی کسر ہے درد کی تحریک میں

تیرھواں برج

سلیم اختر

عجیب سماں اور عجیب تر منظر تھا، کچھ ہونے کے باوجود بھی کمی کا
حساس کرچی کی مانند چبھن پیدا کر رہا تھا۔ چھتر چھایا سے محروم اشجار کی جڑیں
مردے کی سوکھی اور مڑی تڑی ٹانگوں جیسی تھیں، اوپر کو اٹھتی شاخیں گویا
ست بددعا کی بے خون انگلیوں کی ہڈیاں ہوں۔ بے ثمر اشجار کی جڑوں میں
مدری کھال والے ایسے سانپ کلبلاتے جو عالم جوش میں دم کھڑی کرتے تو
جھنجھنے کی مانند بج اٹھتی۔ موت کا یہ زہریلا جھنجھنا ان بے برگ و بار درختوں
ی جڑوں میں مسلسل بجتا رہتا، بے مہک جنگل کی مردہ ہوا سانپوں کے جھنجھنے کی
آوازیں اوپر نیچے دائیں بائیں لے جاتی، بے رنگ باغ میں سانپوں کے جھنجھنے
مسلسل گونجتے رہتے، یہ اس منظر کا حصہ بن چکے تھے۔ اگر کہیں اچانک ان
جھنجھنوں کی آوازیں بند ہو جاتیں تو بے ثمر باغ کی باسی چرند پرند پریشان ہو
جاتے، کان کھڑے کرتے، تھوتھنیاں اٹھا کر گمشدہ جھنجھناہٹ کو گمشدہ مہک
کی مانند تلاش کرتے۔

ننگی شاخیں اور بھری بیلیں باہم آمیز گویا ناگ ملاپ کی سسکاری
بھر رہی ہوں۔ اندھے بھکاری کے بدرنگ کٹورے جیسے بے رنگ پھول خوشبو نا
آشنا، ہریالی سے محروم سیاہ زمین ایسی گویا لاوے نے بہنے کی ٹھانی مگر بہہ نہ سکا
اور منجمد ہو گیا۔ لاوا دھرتی کی دراڑوں، دروازوں، سوراخوں میں ہزارپا بسرام
کرتے اور سیاہ بچھو آرام، یہ بچھو باہر آتے تو زہر بھری مالا کے منکے زہریلی
پچکاریاں چلاتے، جس پر زہر کی ایک بوند بھی پڑ گئی وہ گیا کام سے کہ زہر کی بوند
کھال چیر کر دوسری جانب نکل جاتی۔ بدہیئت ناگ پھنیوں کے سایہ میں
نیولے کلکاریاں مارتے۔ حبس سے بوجھل فضا، پسینہ میں تر جسم میں ایسی
چپچپاہٹ پیدا کرتی کہ تن کسی اور کا غلیظ شریر محسوس ہونے لگے۔ سورج آگ کا
گولہ بن کر، تمام غضب دھوپ اور تمام غیض گرمی کی صورت میں لاوا دھرتی
پر اتار رہا تھا، زمین لوہے میں تبدیل ہو گئی ایسا لوہا جسے اوپر اور نیچے سے تپایا جا رہا
ہو۔ رات آتی تو چاند کوڑھی کے زخم کی مانند اور چاندنی مردہ کے کفن جیسی میلی
محسوس ہوتی۔ گرمی اور حبس سے گھبرا کر لاوا دھرتی کی درزوں سے موٹے
موٹے سیاہ چیونٹے، بوکھلا کر، قطار در قطار باہر نکلتے سرد اور پرسکون درز کی
تلاش میں، مگر بے سود۔ بھسم ہو کر سیاہ زمین پر سیاہ لکیر میں تبدیل ہو جاتے۔
یہ خطہ بے آب بالعموم بادلوں کی ٹھنڈی چھتری سے محروم رہتا، کبھی بادل آ بھی
جاتے تو نیچے بے رنگ دھرتی کا آئینہ بن جاتے۔ گندی کثیف روئی جیسے بادلوں
سے گرم اور بوجھل بوندیں زخموں کی پیپ کی مانند رستیں۔ دراڑوں، درزوں
اور سوراخوں میں سے ہزارپا، بچھو، سانپ اور چیونٹے باہر نکل آتے مگر گرم بدبو
دار بارش سے نہال ہونے کے برعکس نڈھال ہو جاتے البتہ ناگ پھنی کو یہ
بوندیں راس آتیں۔

یہ تھا وہ کرۂ خطہ جہاں مسافر نے خود کو پایا۔ مسافر پکھوں کی بستی
میں زیست کرنے لائق نہ تھا کہ وہ بدکار، ریاکار اور خطاکار تھا لہٰذا ایک شب
بستر سے اٹھا اور گھر سے یوں بے آہٹ نکلا گویا مال مسروقہ لے جا رہا ہو۔ دیس
نکالا لے کر سفر کے برج برج پہنچنے تو شاد ہوا اور گرم لو کی دھال پر چلتا گیا۔
عالم مستی میں دیوانہ وار۔ تسبیح روز و شب پر یوم شماری بھولا، انجانی جستجو انگلی
تھامے کھونٹ کھونٹ اڑائے لے جا رہی تھی۔ راستہ میں خوشنما مناظر ملے ایسے
کہ من کا پیاسا پپیہا تھے۔ برفانی پانی والے گہرے کنوئیں اور جل میں جوالا جگاتی
سخت چھاتیوں، نرم کولہوں اور ملائم پیٹ والی، چنچل انگھڑیوں سے پیغام دیتیں
ناریاں۔۔۔ وہ نہ رکا۔ سر کا سودا پاؤں کا چکر بن گیا، وہ نہ رک سکتا تھا۔ کبھی کبھی،
تھکن سے چور جسم کی اینٹھن لئے بازوؤں کا تکیہ بنائے، ستاروں میں کھویا ہوتا تو
بستی کی وہ مردود عورت یاد آتی، جو جادوگرنی سمجھی جاتی جس سے سب خائف
رہتے اور اسی لئے وہ بستی میں بسیرے لائق نہ تھی، وہ کھوسٹ رستہ کاٹ جاتی تو
سمجھا جاتا سفر کھوٹا ہو گیا لہٰذا اسے دیکھ کر راستہ تبدیل کر لیا جاتا۔ اجاڑ برباد
مقامات پر جس کسی کو نظر آتی وہ مذہبی دعائیں پڑھتا وہاں سے بھاگنے کی کرتا۔
اس نیم دیوانی کھوسٹ کی بات پر کوئی کان نہ دھرتا مگر اس کے باوجود وہ مدفون
ماضی اور نازائیدہ مستقبل کے بارے میں بتانے کی شہرت بھی رکھتی تھی۔

شام کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ خوش نظر جنگل پر
چھائیوں کے جنگل میں تبدیل ہونے کو تھا کہ اچانک وہ نمودار ہو گئی۔ یوں
اچانک گویا درخت نے اس کا روپ دھار لیا ہو۔

"تم!" اس نے لکڑی جیسی سوکھی انگلی اٹھا کر گدھ کی ہنسی سے مشابہ آواز میں
کہا۔

وہ خوفزدہ تھا مگر گھبرا گیا۔

"تم۔۔۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

وہ خاموش تاکا کیا۔

وہ قریب ہوئی تو جسم سے اٹھتے تعفن کے بھبھوکوں کی وجہ سے دم گھٹتا محسوس
ہوا، وہ بارہ سنگھے کے سینگوں جیسی آڑی لکڑی لیے اسے چپچپاتی چندھیائی
آنکھوں سے گویا پی اور کھینچ رہی تھی، کندھے پر لٹکتا بڑا سا تھیلا جس کے بارے

میں یہ باور کیا جاتا تھا کہ وہ دودھ پیتے بچے اٹھا کر اس تھیلے میں ڈال لیتی اور پھر جنگل میں چھپ کر انھیں کوئلوں پر بھون کر کھا جاتی ہے جبکہ کچھ کے بقول انہوں نے اسے اس تھیلے میں غائب ہوتے بھی دیکھا تھا، وہ اس تھیلے میں چھپ کر پل بھر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جا پہنچتی ہے۔ کچھ داناؤں کے خیال میں اس تھیلے میں شجر حیات کے پھل پھول تھے، سالخوردہ ہونے کے باوجود صدیوں سے جو زندہ تھی تو اس تھیلے کے کارن!

اس نے بھاگنا چاہا مگر خوف کو مردانگی کے بعید جانا لہذا اکھڑا رہا۔ وہ پھر بولی۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ تمھیں تو وہاں ہونا چاہیے۔"

"کہاں؟" پپڑائے ہونٹوں کو زبان سے تر کر کے پوچھا۔

"وہاں۔ جہاں تمہارا مقدر ہے"

"مقدر۔۔۔ ؟ میرا؟"

"ہاں تم عام لوگوں جیسے نہیں، الگ ہو، جدا ہو"۔

"مطلب؟"

"سب کے بارہ برج ہوتے ہیں"

یہ کیا کہہ رہی ہے؟ اس نے پریشانی سے پوچھا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو، میں کچھ سمجھا نہیں۔"

وہ اسے معلم کے انداز میں سمجھا رہی تھی "دیکھو! عام لوگوں کے مقدر سیاروں، ستاروں کی چال اور ان کے برجوں کے مطابق ہوتے ہیں، جدی، دلو، حوت، حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، اور قوس۔ یہ عام لوگوں کے لیے ہیں مگر کچھ لوگ سوریہ، چندرماں، راہول اور کیتو سے الگ زندگی گزارتے ہیں۔ کیوں کچھ لوگ ہمیشہ فاتح ہی رہتے ہیں، کچھ کے قدم دولت چومتی ہے تو کچھ کے خوبصورت عورتیں، کچھ ہمیشہ منحوس ہی ثابت ہوتے ہیں اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لئے بھی، کچھ ہمیشہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ کچھ سدا کے روگی تو کچھ آتم ہتیا کرتے ہیں۔ کوئی ظالم، کوئی مظلوم۔ ایسے لوگ عام لوگوں کے بارہ برجوں سے ہٹ کر تیرھویں برج کے زیر اثر ہوتے ہیں۔"

"تیرھواں برج" وہ اب بھی کچھ نہ سمجھ پایا۔

"ہاں ہاں تیرھواں برج۔۔۔ برج ہول!"

وہ جس طرح اچانک نمودار ہوئی تھی اسی طرح اچانک غائب ہو گئی گویا پرچھائیں بن کر شام کے پھیلے سایوں میں چھپ گئی ہو۔ وہ بے اختیار پکارا "ٹھہرو"

وہ دوبارہ سامنے کھڑی تھی گویا پرچھائیں کے سایہ ہی میں تھی۔ اس کے بولنے سے پہلے اس نے پوچھا۔

"مگر میرے لیے ہی تیرھواں برج کیوں؟"

"کیونکہ تم عام لوگوں جیسے نہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ پھر تمہارا برج تو تیرہ سے بھی کچھ زیادہ ہی ہو گا۔ اکیس، بائیس۔ چوبیس!"

وہ ہنسی "ہاں! میں تو سینکڑوں ہزاروں اور لاکھوں سے بھی الگ ہوں اس حساب سے تو میرا کم از کم ایک سو تیرہ برج ہونا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں۔ بارہ کے بعد صرف تیرھواں برج ہی ہے۔ مقدر کا برج، جس سے فرار ناممکن۔ تم عمر بھر اس کے اچھے یا برے سایہ میں زندگی بسر کرو گے یہ آقا ہے تم غلام، تم اس کے گھوڑے ہو اور تمہاری باگ اس کے ہاتھ میں ہے، تم اس کے کتے ہو اور اس کی سیٹی پر دم ہلانے پر مجبور ہو"۔

"مگر کیوں؟"

"یہ متعین مقدر کا برج ہے۔ اس لئے!"

"تو میں۔۔۔ ؟"

"ہاں تمہارا تیرھواں برج ہے برج ہول!"

سفر کے برج مرج کھینچتا اب وہ اس خطہ ناخوب میں خود کو پا کر عالم حیرت میں تھا، بازو میں چٹکی بھری تو باور کیا کہ کسی بھیانک سپنے کے برعکس وہ بیدار لمحات میں تھا۔ لاوا دھرتی کی دراڑوں سے بہ رہا تھا، سوراخوں سے سیاہ بچھو اور درزوں سے چیونٹے اسے دیکھ رہے تھے۔ بے مروت درختوں کی پھیلی انگلیوں سے لپٹے سانپ اسے دیکھ کر شوکے۔ شاید خیر مقدم کو! ناگ پھنی کی چھتریاں آنکھوں میں تبدیل ہو کر اسے گھورے جا رہی تھیں۔ حیرت کے بھر پور وار نے اسے گنگ کر دیا مگر جلد ہی سنبھل گیا۔ طویل سفر میں وہ ناممکن کے متعدد روپ، اچنبھے کے کئی تماشے اور ان ہونی کے بہت سے سوانگ دیکھ چکا تھا۔ چلو ایک تماشا اور سہی۔ لہذا ادھر ادھر سن گن لیتا پھرا۔

باولی دیکھی تو ٹھٹھک کر رک گیا۔ زمین کے اندھیرے سینے میں اترتی، ناہموار پتھروں کی تنگ سیڑھیاں نیچے اترنے کی دعوت دے رہی تھی۔ وہ کھڑا سیڑھیاں تکا کیا نیچے اترے یا نہ اترے، پھر ہمت باندھی، جی کڑا کیا اور پہلی سیڑھی پر قدم دھر دیا، پرندوں کی بیٹوں کے بدبودار لیپ کی وجہ سے سیڑھیاں پھسلنی ہو رہی تھیں مگر وہ آہستہ آہستہ دیوار کا سہارا لئے قدم قدم نیچے اترتا گیا۔ بڑھتے اندھیرے کے ساتھ گھبراہٹ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا نیچے ہوتے ہر قدم کے ساتھ خنکی اور نامانوس بو میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور ان سب کی وجہ سے دل کی دھڑکن میں بھی!

کسی نادیدہ ڈور سے بندھا وہ اترتا گیا۔

"اوہ" چکرا کر رک گیا۔

سامنے روشنی کے ہالے میں چمکیلے پانی کا دائرہ تھا۔ جس میں چھوٹی بڑی بدرنگ بدہیئت مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ پانی پینے کو جھکا، دیکھا، غور کیا، یہ مچھلیاں نہ تھیں بلکہ فگار انگلیاں، کٹے بازو، دریدہ رانیں اور مجروح پنڈلیاں۔ زندگی سے بھرپور پانی میں ڈوبتی ابھرتی نظر آ رہی تھیں۔

"اوہ" خوف زدہ سوکھے حلق سے نکلا۔

پھر نہ جانے کہاں سے اور کیسے انسانی سروں کا آبشار پانی میں آن گرا۔ کھلی آنکھیں، بھنچے ہونٹ، کٹے کان، چری ناک، کھڑے بال۔۔۔ ایک کے اوپر ایک لڑھکتے، چلے آ رہے تھے۔ عین اسی وقت چمگادڑوں کے جھنڈ نے حملہ کر دیا۔ چیخ

کر بھاگا تو کئی گردنوں سے جو قہقہے بلند ہوئے۔ وہ دیر تک تعاقب میں رہے ایسے وقت جو کسی انسانی حلق سے آج تک خارج نہ ہوئے۔

تو کیا یہی ہے تیرھواں۔ برج ہول!"

مگر میں نے ایسا کیا گناہ کیا جس کی یہ عقوبت ہے۔ نیم دیوانی جادوگرنی نے کہا تھا "یہ مقدر ہے۔ مقدر جو کبھی روگ ہے تو کبھی بھوگ! ہونی نہ ہونی اور انہونی یہ سب تیرھویں برج کا چمتکار ہے"۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولی تھی "ہر شخص اپنے مقدر کے مطابق تیرھویں برج کا نام دیتا ہے اور تم نے اسے برج ہول کا نام دیا ہے"۔

مگر مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم۔۔ میں کیا جانوں بارہ برجوں یا تیرھویں برج کو۔

"یہی تو مزے کی بات ہے، تم کچھ نہیں جانتے، تمھیں کچھ نہیں معلوم۔۔ اور اس کے باوجود تم اپنے تیرھویں برج کا نام بھی دے چکے ہو۔۔ برج ہول"

برج ہول! برج ہول!! برج ہول!!!

شجر، شاخیں، ناگ پھنی، کوڑیالے سبھی چلا رہے تھے؟ یا بڑھیا کے الفاظ کی بازگشت ہنوز جاری تھی۔

مسافر نے خوف کی دلدل میں دھنستے اعصاب سمیٹے اور دھیرے دھیرے محتاط قدموں سے آگے بڑھنا شروع کیا مگر اشجار اور حشرات نے کچھ تعرض نہ کیا۔ آہستہ آہستہ خوف زائل اور اعتماد بحال ہوتا گیا۔ تھکن والے کمزور قدم مضبوطی سے زمین پر پڑنے لگے، وہ بڑھتا گیا اور پھر اچانک رک گیا۔ گویا دھرتی نے پاؤں جکڑ لیے ہوں۔

"اوہ!" عالم حیرت میں کھلے منہ سے نکلا۔

سامنے شکستہ مندر تھا۔ موسم کی مار کھائی دیواروں میں آڑھی ترچھی لکیروں کی صورت میں دراڑیں اوپر اٹھتی جارہی تھیں جن میں سے لاش کے بالوں جیسی بیلیں نکل کر اطراف میں رینگتی چلی گئی تھیں۔ ایسے ویرانے اور ایسے سے میں ایسا مندر ہی ہونا چاہیے تھا یوں محسوس ہوتا گویا ارد گرد کے ماحول نے ہی اس مندر کو جنم دیا ہو۔

وہ ٹوٹی سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ مردہ کائی سے ڈھکی بد رنگ سیڑھیاں گویا کراہ رہی ہوں۔ بے چوکھٹ، بے کواڑ، بے زنجیر در سے اندر داخل ہوا تو پھر حیرت کا جھٹکا لگا۔ استھان پر، گردن کے بغیر، عالم نزاکت میں سندری، سنگی مجسمہ کی صورت میں، ایستادہ تھی۔ گول بھری بھری رانیں، ناف کا گہرا سوراخ، اوپر کو اٹھی دودھ بھری چھاتیاں گویا چھلکنے کو ہوں۔ ایک ہاتھ یوں اٹھا ہے گویا اشارہ کر رہی ہو یا پاس سے ہٹا رہی ہو یا پھر آشیرواد دے رہی ہو۔ نظریں انگ انگ کا کساؤ، گات کی سختی اور پیٹ کی نرمی محسوس کر سکتی تھیں۔ اٹھے ہاتھ کی کھلی انگلیوں کی پوروں میں دوڑتے خون کی سنسناہٹ سنی جا سکتی تھی اور ناخنوں کی پیار بھری چبھن محسوس کی جا سکتی تھی۔ دوسرا ہاتھ سینہ کی جانب یوں اٹھتا ہوا گویا تارنگاہ ہٹا رہی ہو۔ ایک پاؤں یوں اٹھا گویا استھان سے نیچے اترنے کو ہو۔ تختی سے لگی دوسری ٹانگ کی ننگی پنڈلی کی سڈول مچھلی کا ابھار بنتا نظر آئے۔

"اوہ" وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

ٹوٹی چھت کے دائرہ سے روشنی نرم پھوار کی مانند برس رہی تھی۔ سندرتا اس روشن پھوار اشنان کر رہی تھی۔

"اوہ!" حلق سے خفیف سی آواز نکلی۔

اندر کا منظر باہر سے بالکل برعکس تھا۔ کچی زمین سے تازہ گھاس کی سوندھی سوندھی خوشبو تنے اعصاب پر خوشگوار اثر کر رہی تھی۔ دیواریں خوش رنگ اور خوش مہک پھولوں والی بیلوں سے ڈھکی تھیں۔ سفر کی کلفت اور خوف سے جسم آزاد ہوتا محسوس ہو رہا تھا، ٹوٹی چھت کے دائرہ میں آسمان کی نیلاہٹ چمک رہی تھی۔ نیلگوں دائرہ میں پرندہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ یہ کون ہو سکتی ہے۔ دیوی؟ اگر دیوی تو کیا لکشمی، پاربتی یا سرسوتی؟ اگر نار تو کس منچلے کی کلپنا کا چمتکار ہے۔ جو بھی تھی اس کی من موہنی صورت دل کو اپنی اور کھینچے جا رہی تھی اور دل کو بھی یوں کھنچنا خوش آ رہا تھا۔ دیوار سے ٹیک لگائے نیم دراز، نرم گھاس کے فرش پر، عالم آسودگی میں وہ اسے تکے جا رہا تھا۔ کاش اس کا سر بھی ہوتا تو سراپا مکمل ہو جاتا۔ میں اس کی سندرتا کے سامنے سیس نوا دیتا۔ مہربان دھوپ، خوشگوار مہک، من موہک روپ۔۔ عافیت اور شانتی کا مدھر احساس اسے تھپکیاں دے رہا تھا، آنکھیں خود، بخود بند ہوتی جا رہی تھیں۔ تنے اعصاب، اینٹھے اعضاء اور تنی رگوں سے وسوسے، خوف اور تھکن نچڑتی جا رہی تھی۔ ابھی وہ شانتی کے ساگر میں شانت ہونے ہی کو تھا کہ بند ہوتی آنکھیں پوری قوت سے کھل گئیں۔

مجسمہ بے سر نہ تھا،

چمکیلے بالوں کے سیاہ ہالہ میں تمکین مکھ دمک رہا تھا۔ بڑی بڑی کٹورا آنکھیں اپنی اور کھینچ رہی تھیں۔ وہ خود کو سیاہ بھنورا آنکھوں کے بھنور میں غرق ہوتا محسوس کر رہا تھا مگر غرق ہونے سے خود کو روکنے پر بھی تیار نہ تھا کہ اس ڈوبنے میں عجب رس تھا۔ سیاہ بالوں کا آبشار سر کشیدہ چھاتیوں پر چمکیلی لہروں کی صورت میں بکھر رہا تھا۔ وہ ایک ادا سے گردن ٹیڑھی کئے اسے تکے جا رہی تھی۔

یہ پل تھا کہ سال، سال تھا کہ صدی۔ خواب تھا یا خیال تھا، کیا تھا؟

اس نے انگڑائی لینے کے انداز میں دونوں بازوؤں اٹھائے گویا شاخ گل جھوم کر سیدھی ہونے کو ہو مسافر کی حیرت سے کھلی آنکھوں میں اس تصویر، ہر اٹھتے قدم کے ساتھ بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ اب تن شجر سامنے تھا، نظروں کے دائروں میں مکمل۔ جسم کی گرم مہک جھرنے کی مانند شرابور کر رہی تھی، وہ اور قریب ہو جاتی ہے، مسافر دھرتا سے نین، بھنور میں ڈوب رہا ہے۔ تب وہ اس پر چھا جاتی ہے۔ جیسے گھنا جنگل پر، جیسے خوشبو پھول پر، جیسے سر آواز پر، جیسے نشہ اعصاب پر!

وہ گویا الگ وجود کی صورت میں اسے خود میں سماتا دیکھ اور محسوس کر رہا تھا۔ دو دھڑکنیں ایک دل میں، سانسیں، ماس، مسام یوں ملے کہ مخلے اعصاب ایک ہوئے میں اس وقت جبکہ نقطۂ عروج کا فوارہ خوشی سے چھلکنے کا تھا

وہاں کچھ بھی نہ تھا وہ واپس اپنے سنگی استھان پر تھی۔ سن موہنے، چہرہ کی جگہ مکروہ بھیانک چہرہ زندہ جسم کو چیرتی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ بالوں میں سانپ لیے لہرا رہے تھے۔ تیز تنفس سے چھاتیوں کے سرے لرزش میں تھے، اٹھے ہاتھ میں سیاہ رگیں ابھر آئی تھیں اور جسم نے گویا کہ ریچھ کی کھال اوڑھ لی تھی جس پر ریچھ جیسے سیاہ چکیلے بال اگتے دیکھے جا سکتے تھے۔ منہ کھلا تو زردی مائل سیاہ دانتوں میں گوشت کے ریشے لرز رہے تھے۔ مسافر نے چیخنے کو منہ کھولا مگر وحشت نے زبان گنگ کر دی۔ خوف سے پھٹی آنکھوں نے اس کے پاؤں پیچھے گھومتے دیکھے۔ پنجوں کی جگہ ایڑیوں والے پاؤں اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

سب کچھ ایک لمحہ میں ہو گیا!

وہاں نہ مندر تھا، نہ ٹوٹی چھت سے بکھرتی دھوپ کی نرم پھوار نہ دیواروں سے لپٹی خوش مہک بیلیں نہ سنگی استھان نہ سندر نار کا بے گردن مجسمہ۔

لاوا دھرتی کے پھٹے منہ سے آہستہ آہستہ ایک درخت نمودار ہو رہا ہے۔ انسانی ہاتھ کی کھلی انگلیوں سے مشابہ شاخوں پر زہریلی مکڑیاں جالے بنانے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ آسمان پر غلیظ بادل جمع ہو رہے ہیں جن سے کثیف چپچپاتی بارش برسے گی، لاوا دھرتی کی دراڑوں، درزوں اور سوراخوں سے ہزار پا بچھو اور سیاہ چیونٹے جشن منانے نکلیں گے، ناگ پھنی نہال ہو گی اور شاخ در شاخ سانپ خوشی سے شوکیں گے۔

عذرا عباس

یہ سب ایسے ہوا ہے
جیسے زمین سرک گئی ہو۔ سب چیزیں بے ترتیب
تھوڑی سی اوپر
تھوڑی سی نیچے
تھوڑی سی ادھر
تھوڑی سی ادھر
چیزیں تتر بتر ہو گئی ہیں
جو دائیں تھیں
وہ بائیں چلی گئیں
جو بائیں تھیں دائیں پہ پڑی ہیں
کچھ تو بالکل ایسے
جیسے کراس میں کھسک گئی ہوں
اور ایک نشان بنا دیا ہو
چھوٹے چھوٹے بہت سے کراس
اور ان سے مل کر ایک بڑا کراس
جو زندگی پہ بھی لگا ہوا ملا
وہ جو ان سب سے مل کر بنی تھی
جب یہ ترتیب میں تھیں
خود میں بھی تھوڑی سی
بہت تھوڑی سی۔ سرک گئی ہوں
لیکن ابھی پتہ چلا۔۔۔ ادھر یا ادھر
دائیں یا بائیں
کروٹ بدل کر دیکھوں
تو پتہ چلے
میرا سرہانہ کدھر ہے
اور پائنتی کدھر
جو دیکھوں تو۔۔۔ شاید
بڑے والے کراس نے تو مجھے ڈھانپ لیا ہے
جو لوگ دیکھیں گے
تو اس کراس کے پیچھے پڑی ہوئی میں
انھیں نظر نہیں آؤں گی
اسے لیے کہ مجھے بھی وہ نظر نہیں
آ رہے ہیں

عذرا عباس

آخر اداسی کو جشن منانے کا موقع مل ہی گیا
اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود
میں اسے نہیں روک سکی

اس کی آنکھیں میرے تعاقب میں رہتی ہیں
اس کے ہاتھوں اور ناخنوں پر مجھے
زخمی کرنے کے ارادے ہمیشہ رہتے ہیں
لیکن میں ہمیشہ بچ نکلتی ہوں
جب بھی وہ گلیوں، بازاروں اور تماشگاہوں میں
میرا پیچھا کرتی ہے
میں اس سے کترا کترا کر نکلتی ہوں
کبھی کبھی اس کی کوششوں کے نتیجے میں
میرا لباس دھول سے اٹ جاتا ہے
مرے پاؤں بھاگنے کی جلدی میں پھٹنے لگتے ہیں
اس کی جیت نہیں ہوتی
اس نے بہت سی شکلیں اختیار کیں
میرے روشندانوں، کھڑکیوں دروازوں
اور دیواروں پر اپنی نت نئی صورتیں
اور شبیہوں کے ساتھ
کبھی یوں بھی ہوتا ہے
وہ بالکل مرے بستر میں برابر
لیٹی ہوئی ملتی ہے
میرے تکیے پر اپنے آنسو چھوڑ جاتی ہے
مری آواز سے آواز ملا کر چلنے لگتی ہے
لیکن میں بہت جلد اسے پہچان لیتی ہوں
وہ میری ناک میں رہتی ہے

صبح کے اخبار میں
روپے کے بھاؤ گرنے کی خبر کے ساتھ
میرے آٹے کے ڈبے میں
مرے باورچی خانے میں، میرے کپڑوں کی
الماری میں، اور جہاں جہاں وہ گھات
لگا سکتی ہے
کبھی کبھی تو بالکل میرے ہونٹوں پر
اپنے دانت گڑو دیتی ہے
اس کی سرسراہٹ کسی بھی ہم بستری کے دوران
اس نشے میں داخل ہو جاتی ہے
جو صرف مرے حصے میں آیا ہے
مجھے نہیں پتہ چل سکا
وہ کس راستے سے اور کس وقت
میرے گھر میں داخل ہوئی

شروع میں اس کو دیکھنے والے نے مجھ سے
چھپایا
وہ ڈرتے رہے
جب وہ دبے پاؤں مرے گھر کی سیڑھیاں
چڑھ رہی ہوگی
انھوں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے ہوں گے
اور اپنی شہادت کی انگلی ہونٹوں پر رکھ لی ہوگی
اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی ہوں گی
کسی کے منہ سے سی کی آواز بھی نہیں نکل رہی
ہوگی

شاید وہ سوچ رہے ہوں
کہ میں گہری نیند سے جاگ جاؤں گی
شاید وہ سوچ رہے ہوں
کہ میں اپنے کسی کمرے کو سجانے کا خواب دیکھ
رہی ہوں

شاید وہ یہ سوچ رہے ہوں
تو کیا ہوا ؟
ہمیشہ کی طرح یہ آج بھی ناکام رہے گی
لیکن جب وہ آئی تو
مری بالکونی میں ٹنگے ہوئے پرندے نے بھی
اس دن شور نہیں مچایا
نہ ان پودوں نے مجھ سے کچھ کہا
جن کو روز میں پانی دیتی ہوں
میں نے وہ دن بھی ایسے ہی گزارا تھا
شام ان درختوں پر گر رہی ہے
جن کے نیچے میں جوگنگ پارک میں ایک
بینچ پر بیٹھی سو رہی ہوں
روز مرہ کی طرح شروع ہونے والا دن
روز مرہ کی طرح ختم ہو رہا ہے
پھر اداسی کو میرے گھر میں جشن منانے
کا موقع کیسے ملا ؟

عذرا عباس

لفظوں کا زوال

اب آ گیا
لفظوں کے زوال کا وقت
بہت دھوم دھڑکے سے سر اٹھایا تھا
بہت شوریدہ سر
دلوں کو کچلتے ہوئے۔ سروں کو روندتے ہوئے
جسموں سے کھیلتے ہوئے
اب خاموشی اور سناٹے کے درمیان
یہ ٹکر ٹکر دیکھیں گے
جب ایک دوسرے سے ٹکراتی چیزوں
کی آوازیں
ان کا ساتھ نہ دیں گی
بہے گا جب پانی --- ایک موج بھی
نہیں دے گی انھیں جواب
یہ دنیا چپ چاپ سفر کرے گی
اور سب دھکیل دیں گے انھیں سمندر
میں --- خاموشی سے
یہی تو ان کا مقدر ہے
لیکن مرا معالج اس نے ہی چنا ہے
مری موت کے دن وہ' وہ CENT
لگاتا ہے جسے مرے ہی نام پر اپنے لیے
خریدا ہے
اور ایک اچھے ہوٹل میں کھانا کھاتا ہے
اپنے اس دوست کے ساتھ
جس کے ساتھ وہ لنچ کرنا چاہتا ہے
اس دن وہ بستر جلدی چھوڑ دیتا ہے
اور مرے لمس کی تمام یادوں کو
پرانے تکیے میں بھر دیتا ہے
اور اس بستر کی چادر بدل دیتا ہے
جس پر میں نے وہ رات
سرخوشی میں گزاری
وہ مجھ سے سرگوشی میں کہتا ہے
تمھاری محبت مرے لیے آنے والے دنوں
کی یاد کا حصہ بن سکتی ہے
میں اس عہد کا انجام دیکھنا چاہتا ہوں
جسے میں نے تم سے نفرت کے ساتھ
پچھلی دہائیوں میں شروع کیا
قید میں اترنے سے پہلے
مری آنکھیں' اپنی محبت کا آخری
الوداعی بوسہ لیتے ہوئے --- سوچ رہی ہیں
آخر نفرت سے محبت کا انجام
آن پہنچا

اور کچھ دن

اور کچھ دن باقی ہیں
اور کچھ دن زندہ رہنے دو مجھے
اس فریب میں
جس میں میں ہمیشہ خوش رہتی ہوں
اس جھوٹ میں
جہاں میں ہمیشہ ننگے پاؤں چلتی ہوں
اس رات میں
جس میں میرا جسم اپنی روح سے
دور رہتا ہے
اس دن میں جہاں کسی بھی سائبان
نے مجھ سے انکار کیا
اور کچھ دن رہنے دو مجھے
اس دل میں جو دھڑکن بھول گیا
جینے کے لیے
جن شرائط کا ہونا ضروری ہے
وہ میرے پاس نہیں ہے
ہارنے کے لیے جو کچھ ہونا چاہیے
وہ میرے پاس ہے
اب جیت اور ہار کے درمیان
ایک لکیر ہے
مجھے اپنے لیے وہ لکیر چننا ہے
لیکن۔ کب تک

عذرا عباس

تو کیا اس زندگی کو تبدیل کرنا ہوگا
تبدیلی ایک مشکل عمل ہے
آپ اپنے سے جڑے ہوئے
اپنے تمام اعضاء کو آہستہ آہستہ
الگ کرنا، اپنے وجود سے
ناممکن ہے ؟
لیکن اگر یہ ناگزیر ہو تو
اب سوچا جائے
اس کا نعم البدل۔ کیا ہو
پہلے تو وہ پیمانہ جو گذشتہ زندگی سے
پیوست رہا تھا
اس سے مکمل طور پر نفی
اس تبدیلی کا حصہ ہے
یہ اچانک نہیں ہوتا
بہت پہلے سے شروع ہو جاتا ہے
یہ سب کچھ
جن چیزوں کو آپ اپنے سے علٰحدہ کر رہے ہوں،
پہلے ان کا راضی ہونا
اور پھر آپ کا تیار ہونا
یا پھر یوں کہ
پہلے آپ کا راضی ہونا
اور پھر ان کا تیار ہونا

کیا دونوں ایک ہی بات پر متفق ہیں
اس نتیجے تک پہنچتے پہنچتے
آپ کی روح بدحال ہو جاتی ہے
کس کا ساتھ دے
لیکن تبدیلی ناگزیر ہے

ورنہ گذشتہ سے پیوست رہتے رہتے
چیزیں اداس ہونا شروع ہو جاتی ہیں
خزاں کے بعد بہار کا موسم
اور ان کے درمیان
وہ جو اس تبدیلی کی زد میں آجاتے ہیں

وہ تو کچلے جاتے ہیں پاؤں کے نیچے
مگر۔ کون سا پیمانہ ڈھونڈا جائے
ایک نئی شروعات کے لیئے
ایک نئی شروعات یوں تو کہیں سے بھی
شروع ہو سکتی ہے
وہاں سے ہی جہاں سے
آپ ہی کے پاؤں کچلنے والوں کے ساتھ ہوں

◢

یہ کیسی بے بسی ہے
جہاں جدائی نے اپنے پنجے میرے سینے میں
گڑو دیئے ہیں
اور لمحہ لمحہ مجھے مرنے سے گریز کے باوجود
موت میرے چاروں طرف منڈلا رہی ہے
وہاں کیا ہے
جہاں کچھ بھی نہیں ہے
جہاں کچھ بھی نہیں ہے
وہاں میں کیوں ہوں
دل خالی ہو رہا ہے
اور زندگی اپنے بے سبب ہونے کے یقین
میں داخل ہو رہی ہے
کیا مرے خواب مجھے ہمیشہ بے خوابی
میں رکھیں گے
کیا میں ایک اور زندگی نہیں گزار سکوں گی
اس زندگی میں
بے سرو سامانی اور زادِ راہ میں
کوئی فرق نہیں ہے
محبت اور نفرت کے درمیان
کچھ بھی نہیں ہے
ایک خلا ہے
جس میں مجھے جھولنے کے لیئے
چھوڑ دیا گیا۔۔
اس وقت تک کے لیئے
جب تک میں
وہاں موجود ہوں
جہاں کچھ بھی نہیں ہے

◢

عذرا عباس

جب آپ کسی کو خدا حافظ کہتے ہیں
اور جانے والے کے لیئے آپ کی
انگلیاں
اشاروں سے اس طرح اٹھ رہی ہوتی ہیں
جس میں یہ ارادہ بھی شامل ہو
تو اس دروازے کی آواز
بہت دیر تک پیچھا کرتی ہے
جسے آپ نے جانے والے کے لیئے
بہت زور سے ہمیشہ کے لیئے
بند کردیا ہو
جیسے چاہے نہ جانے کے باوجود
دروازہ خود بخود بند ہو جاتا ہے
دوبارہ نہ کھلنے کے لیئے
اور جانے والا
پیچھے سے آنے والے تمام اشاروں
کے درمیان آگے بڑھتے ہوئے قدموں
کو تیز کردیتا ہے کبھی واپس نہ آنے کے لیئے

▲

ایک سستے سچ نے
مجھ سے ایک مہنگے جھوٹ کا سودا کیا ہے

یہ ضروری ہے
میں ان دونوں کے درمیان
بنے ہوئے نئے معاہدے سے نکل جاؤں

اور اپنے پرانے معاہدے سے دستبردار
ہونے کی تیاری کروں
اس لیئے کہ سچ کی شکستگی نے
جھوٹ کو پنپنے کا موقع دیا ہے
اور میں اپنی پرانی دستاویز
میں ایک اضافہ کر رہی ہوں
جھوٹ کا مکمل ہونا یقینی ہے
ورنہ سچ مکروہ نظر آتا ہے

▲

مرنے سے پہلے

اس کے دونوں ہاتھ مرا کفن بن رہے ہیں

اور اس کی آنکھیں
مرے اردگرد ایسے گھوم رہی ہیں
جیسے لمحہ لمحہ مری موت کے انتظار میں
بجھی جا رہی ہوں
اس کا دل دھڑک رہا ہے
بہت تیز --- وہ بہت جلدی میں ہے
مجھے مارنے سے پہلے
مرے معالج کو ٹیلی فون کرتا ہے
اور کتنی دیر ہے
ادھر سے کیا جواب آتا ہے
مجھے نہیں پتہ

ثروت حسین کے لیئے ایک نظم

ثروت حسین
تم کٹی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ
کتنے دن زندہ رہے!
میں کٹے ہوئے دل کے ساتھ
کتنے دن زندہ رہوں؟

بلقیس ظفیرالحسن

چالاک ــــ گماگھ بلّی کی طرح
ہتی ہے کہیں ــــ نگاہیں جمائے
جھپکنے والی تیزی سے ــــ دبوچ لیتی ہے
میں ــــ اپنے دانتوں میں
ت ہو جاتی ہے ــــ خدا ہی جانے کہاں!
ہے ــــ موت ــــ کسی کو بھی
ی چاہیئے ــــ
ــــ جینا اور جیتے ہی چلے جانا۔
ریت ہے! ــــ اُف! ــــ کوئی شک ہی نہیں
رسے تو ہم پکڑے رہتے ہیں
ی مٹھیوں میں ــــ زندگی کے ناپائیدار دھاگے
لپیٹ کر ــــ ناخن ناخن
چاہیئے ــــ جو بھی پیدا ہوا ہے
مرنا ہی چاہیئے
وبصورتی بھی اسی میں ہے
ں کرو لربا لوگوں کو
کھلے ہوئے پھولوں والے موسم میں ہی
رہ ہو کر گرے پڑے رہنے سے بچنے کا
یک طریقہ ہے
رح ــــ بہار ــــ ہمیشہ کھلی رہتی ہے
ں کی آنکھ میں
نہیں مرجھاتی!

◢

دیکھو ــــ!! مرگئی
وہ جو مرجانے کی اپنی کوشش میں
ناکام رہی ہر بار ــــ مرگئی
ٹھیک اسوقت ــــ جب اپنی شرطوں پر جینے کی
ٹھانی تھی اس نے ــــ سرکش اور نڈر ہو کر
اور مرگئی ــــ! زندگی اپنی باہنوں میں سمیٹے
اس کے ساتھ! ــــ کئے ہوں شاید وعدے جس سے
ساتھ ساتھ جینے کے ــــ کچھ ہی لمحے پہلے!
یا شاید ــــ نہ بھی کئے ہوں! ــــ پتہ نہیں
لیکن ساتھ ساتھ مرگئے دونوں
یہ تو ہوا ہی!!
کچھ لوگوں کو کتنی زندہ موت عطا کر دی جاتی ہے!

◢

ہمیشہ رہتی تھی خبروں میں
بے حد چھپتی رہتی تھیں ــــ تصویریں اسکی
لاکھوں پاؤنڈز کی قیمت والی!
سایا بنے پھرا کرتے تھے ــــ اسکے آگے پیچھے
کیمرے! ــــ ہم زادوں کی طرح
تاک میں اسکی ــــ لگے ہی رہتے تھے
کلک کلک ــــ چلتے ہی رہتے تھے
اور اس وقت بھی چلتے رہے جب
"مرسیڈیز" کے آہنی پنجوں میں وہ اکی
تڑپ رہی تھی
کلک کلک چلتے ہی رہے
کیمرے ــــ آخر وہ بھی کیا کرتے
اتنا اور "شاٹ" وہ کیسے مس کر دیتے!

◢

من موہن تلخ

ایسا کہیں غضب نہ ہو، عمر حساب مانگ لے
میں کہ ہوں خود ہی اک سوال، مجھ سے جواب مانگ لے

چوک نہ اے اوائے لو! اب بھی تو عہد رفتہ سے
مانگ لحاظ آنکھ کا حسن حجاب مانگ لے

دل سے پسند کی ترنگ، آنکھ سے ربط کی چمک
تجھ کو جو آئے مانگنا، ہیرے سے تاب مانگ لے

مانگنا ہے جو تو خوشی، دل کو تو چاہیئے تڑپ
کوئی وبال پال لے، کوئی عذاب مانگ لے

جو بھی ہوا ہے آج تک، میں نے تو کچھ لکھا نہیں
ڈر ہے نہ مجھ سے زندگی کوری کتاب مانگ لے

دل کے جو ہاتھوں جی ترا جینے سے ہے اچاٹ تو
دل کے یہاں کمی نہیں۔ کوئی سا خواب مانگ لے

ریت کے ذرّوں کی چمک دھوکہ نہ دے گی پھر تجھے
تو اگر آسمان سے عکس سراب مانگ لے

مانگنا ہے تو مانگ وہ، جس سے بجھے نہ تشنگی
وسعت ریگ زار سے، قطرۂ آب مانگ لے

پہرے یہ کیا بٹھا دیئے، گھر ہیں کہ قید خانے تلخ
ایسے گھروں سے کیا کوئی خانہ خراب مانگ لے

اور جو ہو سو ہو، کہو نہ کہو
جیسی بھی زندگی کرو، نہ کہو

یاد کچھ بھی اگر نہ ہو، نہ کہو
اور سب کچھ ہو یاد، تو نہ کہو

ٹھن گئی جب روش پہ، اب کیا ہے
وقت سے صلح، کچھ سنو نہ کہو

جو بھی ہو جائے اب، سو کم جانو
تھک گئے کہہ کے، چپ رہو نہ کہو

ہم ہی شاید غلط ہیں، اچھا ہے
جو کرے کوئی، کرنے دو، نہ کہو

اور بھی تھک گئے ہیں جی جی کر
جیسی کٹتی ہے کاٹ لو نہ کہو

بات کہنے کی عمر بھر نہ کہی
اب بھلا کیا ہے، کچھ کہو نہ کہو

ڈھیر ہونے لگی ذرا سی نہ دیر
ہم نہ کہتے تھے رکنے کو نہ کہو

بنتی باتوں میں کچھ نہیں رکھا!
کم سے کم تلخ آپ تو نہ کہو

منیر الدین احمد

میں یوگوسلاویہ کے جزیرہ کورچولا پہ کمرہ بک کرائے بغیر پہنچا تھا۔ ابھی ٹورازم نے اتنی ترقی نہ کی تھی کہ ساحلی علاقے کے سارے ہوٹلوں، ہوسٹلوں اور پرائیویٹ گھروں کے کمرے مہینوں پہلے بک ہو جاتے ہوں۔ میرا ارادہ کورچولا میں دو چار روز ٹھہرنے کا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر مجھے جگہ پسند آگئی اور کسی کا ساتھ مل گیا، تو ایک آدھ ہفتہ مزید رک جاؤں گا۔ اس کے بعد آڈریا کے ساحل پر چلنے والے کسی جہاز میں بیٹھ کر آگے یونان چلا جاؤں گا یا ہرزیگوینا کے طول و عرض کو ناپوں گا۔

ہمارا جہاز رات بھر سمندر کی لہروں کا مقابلہ کرنے کے بعد بہت سویرے کورچولا میں جا کر لنگر انداز ہوا تھا۔ میں اپنا سفری بیگ اٹھائے ہوئے بندرگاہ کی گودی پر اترا، تو بالمقابل کی دوکانوں کے پٹ کھولے جا رہے تھے۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر جانتا تھا کہ ٹورسٹ بیورو وہیں کہیں آس پاس ہوگا۔ مگر اتنی صبح کون وہاں پر بیٹھا ہوا میرا انتظار کر رہا ہوگا کہ مجھے رہائش کے لئے کمرہ دلوائے۔ میں نے کسی ریستوران میں جا کر ناشتہ کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر وہ ابھی بند تھے۔ پہلی گلی میں ہی میری نظر ایک ٹریولنگ ایجنٹ کے بورڈ پر پڑی۔ جہاں پر ایک نوجوان لڑکی دوکان کا قفل کھول رہی تھی۔ میں نے اسے صبح بخیر کہا اور پوچھا کہ کیا وہ مجھے ایک اچھا سا کمرہ دلوا سکتی ہے، جس کی کھڑکی سے انسان بندرگاہ کا نظارہ کر سکتا ہو۔

اس نے مجھے اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تک دیکھا، جیسے میری قیمت لگا رہی ہو۔ اس نے کہا کہ ایسا کمرہ موجود ہے اور مجھے مل سکتا ہے۔ پھر وہ میرے ساتھ چلنے کے لئے دوکان کے پٹ بھیڑنے لگی۔ میں نے کہا کہ میں وہاں پر جانے سے پہلے ناشتہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ایک قریبی ریستوران کے بورڈ پر پڑھا تھا کہ وہاں پر یوگوسلاوین ناشتہ ملتا تھا۔ میں نے بورڈ کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا کہ یوگوسلاوین ناشتہ کیسا ہوتا ہے۔ اس نے پھر ایک بار میرا معائنہ کیا اور کہا کہ وہ میرے کام کی چیز نہیں ہے۔ میں یقیناً کانٹی نینٹل ناشتہ کرنے کا عادی ہوں۔ اس نے کہا کہ اگر مجھے کمرہ پسند آگیا، تو وہاں پر مجھے ناشتہ بھی مل جائے گا۔

ماریا نے پرانی بندرگاہ کے عین وسط میں بنی ہوئی ایک قدیم بلڈنگ کا دروازہ کھولا اور مجھے سب سے اوپر والی منزل پر لے گئی۔ بلڈنگ پرانی تھی، مگر فلیٹ اتنا نیا تھا، جیسے معماروں نے ابھی ہفتہ عشرہ قبل کام مکمل کیا ہو۔ ماریا نے کہا کہ وہ اس کا اپنا فلیٹ ہے اور مجھے کرائے پر مل سکتا ہے۔ اس نے پوچھا کہ میں کتنا عرصہ ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اس بات کا انحصار کرائے پر ہے اور اس بات پر کہ مجھے وہاں کا ماحول پسند آتا ہے یا نہیں۔ اس نے ہفتہ بھر کے لئے جو کرایہ مانگا، اس میں میں جرمنی کے کسی اچھے ریستوران میں دو وقتوں کا کھانا شاید ہی کھا سکتا۔ میں نے فوراً منظور کر لیا۔ ماریا نے کہا کہ وہ دوکان پر جانے سے پہلے مجھے نچلی منزل سے ناشتہ تیار کر کے بھجوا دے گی۔

میں شیو کرنے اور نہانے دھونے کے بعد قصبے کی سیر کو نکل گیا، جس کی پرانی آبادی زمانہ قدیم سے فصیل کے اندر رہتی تھی۔ وہاں کی تنگ گلیوں کے مقابلے میں نئی آبادی کی سڑکیں کھلی تھیں اور مکانات زیادہ کشادہ بنائے گئے تھے۔ اکثر گھروں کے ساتھ باغیچے تھے، جن میں قسم قسم کے پھول بہت بہار دے رہے تھے۔ قصبے کے بہت سے باسی کسی نہ کسی طریق سے ٹورازم سے وابستہ تھے۔ بیشتر گھروں کے کمرے ٹورسٹوں کو کرائے پر دیئے جاتے تھے۔ اور قریب قریب ہر خاندان کے افراد ہوٹلوں اور ریستورانوں میں کام کرتے تھے یا کوئی چھوٹی موٹی دوکان لگا کر خورد و نوش کا یا دوسرا سامان بیچتے تھے۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ سیر و سیاحت کا سیزن لگ چکا تھا اور یورپ بھر سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے سامان کی گٹھڑیاں پیٹھ پر باندھے ہوئے رات کے ٹھکانے کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ یہ لوگ اکثر یوتھ ہوسٹلوں میں ٹھہرتے تھے اور اگر وہاں پر جگہ نہ ملتی تھی، تو خدا کی وسیع زمین پر انہیں کوئی نہ کوئی جگہ کھلے آسمان کے نیچے رات بھر کے لئے پڑ رہنے کو مل ہی جاتی تھی۔

کھانا کھانے کے لئے میں ایک ریستوران میں گیا، جس کے مینیو پہ وہی پانچ چھ قسم کے کباب اور روسٹڈ گوشت کے کھانے درج تھے، جو سارے یوگوسلاویہ میں ملتے تھے۔ مگر انسان کتنے دنوں تک صبح و شام کباب

بچی اور روز بچی کھا سکتا ہے۔ میں نے ویٹر سے پوچھا کہ کیا وہ میرے لئے مچھلی کی ڈش تیار کرا سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ پوچھ کر بتائے گا۔ اس عرصہ میں ایک دلفریب فرانسیسی لڑکی میری میز پر آن کر بیٹھی۔ ویٹر نے واپس آکر کہا کہ مجھے مچھلی مل سکتی ہے۔ باورچی نے کہلا بھیجا تھا کہ وہ میرے لئے ایسی لذیذ مچھلی پکائے گا کہ میں انگلیاں چاٹتا رہ جاؤں گا۔ لڑکی نے یہ بات سنی، تو اس نے کہا کہ وہ بھی انگلیاں چاٹنا چاہتی ہے۔ اس کو بھی مچھلی کھانے کا شوق تھا۔

فرانسواز بھی میری طرح اکیلی سفر پر نکلی تھی۔ اس نے کہا کہ یہ ضروری تو نہیں کہ آدمی ان لوگوں کی ہمراہی میں چھٹیاں منانے جائے، جن کے ساتھ اس کا سارا سال گذرتا ہے۔ اس کا تجربہ تھا کہ اس کو ہر ملک میں دلچسپ ہمسفر مل جاتے تھے۔ وہ مجھ سے ایک روز قبل کورچولا میں پہنچی تھی اور قصبے کا جائزہ لے چکی تھی۔ پچھلے پہر اس کا ارادہ جزیرے کے ایک دوسرے حصہ میں جانے کا تھا، جہاں پر ساحل سمندر زیادہ صاف ستھرا تھا اور جہاں پر ٹورسٹ کم ہی پہنچ پاتے تھے۔ پھر اس نے خود ہی تجویز پیش کی کہ اگر مجھے کوئی دوسرا کام درپیش نہ ہو، تو اس کے ساتھ پیراکی کے لئے چلوں۔

فرانسواز جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی اچھی پیراک بھی تھی۔ پتہ چلا کہ وہ گھوڑ سواری کی دلدادہ تھی اور ہر روز جوگنگ کرتی تھی۔ مگر اس نے اس سوال کا جواب نہ دیا کہ وہ فرانس کے کس شہر میں رہتی تھی اور کیا کرتی تھی۔ اس نے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ ہم بالکل معلوم کرنے کی کوشش نہ کریں کہ کون کیا ہے اور کیا کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ چار ہفتوں کے لئے اپنا تشخص بھول جانا چاہتی ہے۔ ہماری ملاقات اتفاقیہ طور پر ہوئی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے پتوں کا تبادلہ نہیں کریں گے۔ اور اگر کبھی مستقبل میں ہمارا آمنا سامنا ہوگا، تو ہم انجانوں کی طرح ایک دوسرے کے پاس سے گذر جائیں گے۔

میں نے کہا کہ یہ تو ڈرپوکی ہے۔ آخر آدمی اپنی شناخت کو کیوں چھپائے۔ صحیح معنوں میں آزاد وہ شخص ہے، جسے اپنی شناخت کو چھپانا نہیں پڑتا۔ فرانسواز اس بات سے متفق نہ تھی۔ اس نے کہا کہ اپنے آپ کو اپنی شناخت سے چند ہفتوں کے لئے جدا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے یہ ویسی ہی بات ہے، جیسے لوگ کارنیوال میں بھیس بدل کر اور نقلی چہرہ لگا کر ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں، جس کی جرأت وہ اپنے جانے پہچانے چہرے کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا کہ ہمیں یہاں پر یوں بھی کوئی نہیں جانتا۔ اس لئے اگر ہم اپنی شناخت کو چھپاتے ہیں تو خود اپنے آپ سے دوسروں کو تو پتہ ہی نہیں ہے کہ ہماری اصلی اور نقلی شناخت میں کیا فرق ہے۔ فرانسواز نے کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ "اگر میں بالفرض شادی شدہ ہوں اور تمہیں اس بات کا پتہ ہے، تو تمہارا ردعمل وہ نہیں ہوگا جو اس وقت ہے، جب کہ تم سمجھتے ہو کہ میں شادی شدہ نہیں ہوں۔"

شام پڑنے پر ہم کورچولا واپس لوٹے۔ فرانسواز میرا کمرہ دیکھنے کے لئے ساتھ گئی۔ ماریا اور اس کا خاوند رادووان اور اس کا دیور ایوان کرسیاں میز لگا کر اپنے مکان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ فرانسواز بھی میری طرح فلیٹ اور کھڑکی میں سے بندرگاہ کے نظارے سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اس نے وہاں پر منتقل ہو جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس کی رہائش ایک یک منزلہ مکان میں تھی اور اس کے کمرے کی کھڑکی مکان کے پچھواڑے کی طرف کھلتی تھی۔ ماریا نے فلیٹ کا دوسرا کمرہ فرانسواز کو دینے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ اس طرح فرانسواز میری ہمسائی بن گئی۔ ماریا کا خاندان بلڈنگ کی دوسری منزلوں پر پھیلا ہوا تھا۔ سب سے نچلی منزل پر اس کی ساس اور سسر رہتے تھے۔ پہلی منزل پر اس کا دیور اپنی بیوی صوفیہ کے ساتھ مقیم تھا۔ تیسری منزل پر ماریا اور اس کا خاوند اپنی بچی نینا کے ساتھ رہتے تھے۔

اتوار کے روز ماریا کی ایجنسی نے موستار کی سیاحت کے لئے ٹرپ کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ ہم نے بھی گروپ میں اپنے نام لکھوا دیئے۔ ماریا نے کہا کہ وہ خود ہماری گائیڈ ہوگی اور ہمیں اپنی بہن ویزنا کے گھر بھی لے جائے گی، جو ایک بوزنیاک مسلمان کے ساتھ بیاہی ہوئی ہے۔ ماریا بلغراد کی رہنے والی تھی اور آرتھوڈکس چرچ اور سرب قومیت سے تعلق رکھتی تھی۔ جب کہ اس کا خاوند کیتھولک اور کروواٹ تھا۔ ماریا کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کٹر قومیت پرست تھی۔ اس نے کہا کہ ٹیٹو کو آنکھیں بند کر لینے دو، پھر تم دیکھنا کہ اس ملک میں کیسی تباہی مچتی ہے۔

یوگوسلاویہ کا شمار اس زمانے میں ان کمیونسٹ ملکوں میں ہوتا تھا، جو سوویٹ یونین کی سرداری کو تسلیم کرنے سے انکاری تھے۔ ملک میں ڈکٹیٹرشپ ضرور تھی، مگر ایسی جس میں اسٹالن والی سختی نہ پائی جاتی تھی۔

یوگوسلاویہ کے باشندوں کو ملک سے باہر سفر کرنے کی اجازت تھی۔ بلکہ ان پر دوسرے یورپی ملکوں میں جا کر کام کرنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اس طرح ملک میں باہر سے تھوڑا بہت سرمایہ آتا تھا۔ مغربی ملکوں سے آنے والے ٹورسٹوں کو خوش آمدید کہا جاتا تھا، جن کے دم قدم سے آڈریا کے ساحلی علاقے کے باسیوں کے لئے آمدنی کا ایک زائد ذریعہ پیدا ہو گیا تھا۔

موستار کا شہر اپنی مسجدوں اور دریائے ڈرینا پر بنے ہوئے ترکوں کے وقتوں کے چار صد سالہ پل کی وجہ سے مشہور تھا۔ فرانسواز نے اس کی طرز تعمیر میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ پل کی عثمانی قوس دراصل رومن قوس کی ترقی یافتہ صورت تھی۔ ہمارے گروپ نے پل کے پہلو میں واقع ایک ریستوران میں کھانا کھایا، جس کے

دوران نماز ظہر کی آذان مسجد کے مینار سے بلند ہوئی، جو کسی راکٹ سے مشابہت رکھتا تھا۔ موذن مینار کی گیلری پر چاروں طرف گھوم کر نماز کے لئے بلا رہا تھا۔ پھر ہم نے نمازیوں کو مسجد کی طرف جاتے ہوئے، وضو کرتے ہوئے اور نفل پڑھتے ہوئے دیکھا۔ میرے اندر چھپا ہوا مسلمان جاگ اٹھا اور میں بھی شتابی سے وضو کر کے باجماعت نماز میں شامل ہو گیا۔ فرانسواز نے اس سارے نظارے کی فلم بنائی۔ اس نے کہا کہ مغرب میں مشرق کا ایسا پیوند کسی دوسری جگہ پر نہیں دیکھا جا سکتا۔

ماریا کی بہن ویزنا کا مکان مسلمانوں کے محلہ میں تھا۔ وہاں کا ماحول ترک قصبے والا تھا۔ ویزنا کی ساس اور نندیں ترکی لباس میں ملبوس تھیں۔ انہوں نے اپنے گھر کے دیوان خانے میں ہمارا استقبال کیا اور ترکی کافی سے ہماری تواضع کی۔ ویزنا نے اپنے جہیز کا سامان نکال کر دکھایا، جس میں ایک سو ڈیڑھ سو سال پرانا قالین شامل تھا۔ وہ قالین اس کے خاوند بالچ کے خاندان میں نسل بعد نسل بہوؤں کو تحفہ میں دیا جاتا تھا۔ اسے لکڑی کے ایک صندوق میں رکھا جاتا تھا اور صرف تہواروں پر نکال کر ڈیکوریشن کے لئے سجایا جاتا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ پہلے دن کی طرح نیا نکور تھا۔ ویزنا نے کہا کہ جب اس کا بیٹا بہو کو گھر لائے گا، تو وہ اس قالین کو بہو کے سپرد کر دے گی۔

میں نے محسوس کیا کہ فرانسواز یہ بات سن کر اندر ہی اندر ابل رہی تھی۔ اس نے وہاں پر تو کچھ نہ کہا، مگر واپسی کے راستے میں اس نے میرے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ اس نے کہا کہ لوگ روایات کے مردے کی پرستش کب تک کرتے رہیں گے۔ کیا ضروری ہے کہ ہم ہر بات میں اوائل کی پیروی کریں۔ اس کو یہ بات بھی بالکل پسند نہ آئی تھی کہ بالچ خاندان کی عورتیں ترکوں والا لباس پہنے ہوئے تھیں، جو عام طور سے ان کا روزمرہ کا لباس نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ عورتیں کیوں اپنے آپ کو بنا سنوار کر پیش کرتی ہیں، جیسے ریس کورس میں گھوڑوں کو طرح طرح کی لگاموں، کاٹھیوں اور پھولوں سے سجا کر لایا جاتا ہے۔

مجھے یہ چیز پہلے دن ہی قدرے اوپری لگی تھی کہ فرانسواز ہر قسم کی آرائش اور میک اپ سے عاری تھی۔ مگر میں نے سوچا تھا کہ اس جیسی خوبصورت عورت کو کسی قسم کے رنگ و روغن کی حاجت نہ تھی۔ پھر مجھے یاد آیا کہ وہ خود میری میز پر آکر بیٹھی تھی اور اس نے ہی مجھے اپنے ساتھ پیراکی کے لئے چلنے کی دعوت دی تھی۔ اس نے خود میرا کمرہ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور پھر اپنی مرضی سے میرے فلیٹ میں اٹھ آئی تھی۔

فرانسواز نے کہا کہ وہ ہمیشہ سے ایسی آزاد نہ تھی۔ وہ ایک

کیتھولک گھرانے میں پیدا ہوئی تھی، جہاں پر آزاد روی کو بغاوت کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اس کا باپ یوں تو بہت رعب داب رکھتا تھا، مگر اس کی ماں کے سامنے میمنا بن جایا کرتا تھا۔ اس کی ماں ایک سیدھی سادی عورت تھی، جس کے اصولوں میں لچک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ فرانسواز باپ کو حیلوں بہانوں سے اپنے دام میں کر لیتی تھی اور اپنی ہر بات منوا سکتی تھی۔ مگر ماں کے آگے اس کی ایک نہ چلتی تھی۔ اس کی ماں کہا کرتی تھی کہ آدمی کا حافظہ کمزور ہو، تو اسے ہمیشہ سچ بولنا چاہیئے۔ اس طرح اس کو زندگی میں کبھی شرمندگی نہیں اٹھانی پڑتی۔ فرانسواز نے کہا کہ آج کل کون سچ بولتا ہے اور پھر ضروری بھی تو نہیں کہ ایک شخص کی سچائی دوسروں کی بھی سچائی ہو۔ میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا، کیونکہ فی الواقعہ اسرائیلیوں کی سچائی فلسطینیوں کی سچائی نہیں ہو سکتی۔

فرانسواز بہت تنوع پسند تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر روز یکساں قسم کی زندگی گذارنے کے لئے اسے گھر سے باہر قدم دھرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ ہر روز کسی نئی جگہ پر جانے، نئے کھانے چکھنے، نئے کپڑے پہننے کی خواہش مند تھی۔ میں نے کہا کہ مزہ تو تب ہے کہ خود اس کے اندر بھی روز روز تبدیلی آئے، محض ظاہری چیزوں کے بدلنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اس بات کو وہی شخص جان سکتا ہے، جو لمبے عرصہ تک اس کے ساتھ رہے۔ انسانوں میں بھی ہر آن تبدیلیاں آتی رہتی ہیں، مگر دو چار ہفتوں میں ان کو دیکھا اور محسوس نہیں کیا جا سکتا۔

ماریا کی ایجنسی کا دوسرا دورہ ہمیں سرائیوو لے کر گیا۔ وہاں پر گھومتے پھرتے ہوئے فرانسواز نے ایک اسٹور سے ایک گھڑی ایسی صفائی کے ساتھ اپنی جیب میں ڈال لی کہ سیلز مین کو پتہ تک نہ چلا۔ میں نے اسے بعد میں کہا کہ گھڑی چرانے کی کیا ضرورت تھی، جب کہ اس کے پاس اچھی بھلی گھڑی موجود ہے۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے دکھانا چاہتی تھی کہ اس کے اندر تبدیلی آ سکتی ہے۔ پھر اس نے کہا کہ وہ اس کی زندگی کی پہلی اور آخری چوری تھی۔

بازار میں ایک بازی گر کالے کاغذ کو ایک ڈونگے میں ڈال کر دھو رہا تھا۔ چند منٹوں کے اندر اندر کاغذ نے ایک سو ڈالر کے نوٹ کی صورت اختیار کر لی۔ کالے کاغذ کو وہ نصف قیمت پر بیچ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ اگر ڈالر بنانا اتنا آسان ہوتا، تو اسے بازار میں شعبدہ بازی کی ضرورت نہ ہوتی۔ دوسروں کے ساتھ فرانسواز نے بھی ایک کاغذ خریدا۔ میں نے کہا کہ اس سے گھڑی کی قیمت وصول کر لی گئی تھی۔ البتہ وصول کرنے والا شخص اس سے بڑا چور تھا۔ چنانچہ وہی بات نکلی، جس کا مجھے خدشہ تھا۔ کالا کاغذ دھونے کے باوجود سو ڈالر کے نوٹ میں تبدیل نہ ہوا۔ پتہ چلا کہ

بازی کر کے کالے کاغذوں کی گڈی میں چند ایک اصلی نوٹ تھے، جن کو صرف وہ جانتا تھا اور جو کسی کیمیکل میں ڈالے جانے سے دھل جاتے تھے، جب کہ باقی کے کاغذ کالے رنگ کی معمولی کاغذ تھے، جن کو دنیا کا کوئی پانی سو ڈالر کے نوٹوں میں تبدیل نہیں کر سکتا۔

ایک دو روز کے بعد راودوان نے ہمیں مچھلی کے شکار پر چلنے کی دعوت دی۔ اس روز ماریا کی ایجنسی کسی تہوار کی وجہ سے بند تھی، اس لئے وہ بھی ہمارے ساتھ ہو لی۔ ہم راودوان کی کشتی میں جزیرے کے ایک ایسے حصہ میں گئے، جس کا شاید ٹورسٹوں کے نقشے پر کوئی وجود نہ تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہاں پر شکاریوں کا اچھا خاصا میلہ لگا ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ اس روز مچھلی کے شکار کا مقابلہ ہوگا، جس میں ہر کوئی حصہ لے سکتا ہے۔ ماریا اور راودوان تو شکار کے سازوسامان سے پوری طرح لیس تھے۔ مگر فرانسواز اور میرے پاس دو دو کانٹوں اور ڈوری کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہم نے درختوں سے شاخیں کاٹ کر راڈ بنالئے اور بوتلوں کے ڈھکنوں کے کاک ڈوری میں پرو کر کانٹے باندھ کر مقابلے میں شریک ہو گئے۔ مجھے یقین تھا کہ ماہر شکاریوں کی موجودگی میں ہمیں ایک بھی مچھلی پکڑنے میں کامیابی نہ ہوگی۔ اس لئے ہم نے اپنے کانٹے پانی میں ڈال تو دیئے، مگر ہماری توجہ دوسرے شکاریوں کی طرف لگی ہوئی تھی، جو شاید شکار کرنے سے زیادہ اپنے آلات شکار کی نمائش کرنے کے لئے آئے تھے۔ مجھے مچھلی کے شکار کا تجربہ نہ تھا، مگر فرانسواز اس کی کچھ سدھ بدھ رکھتی تھی۔ اس کا باپ ماہر شکاری تھا اور وہ فرانسواز کو بچپن میں اکثر اپنے ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ باپ سے اس نے دو ایک گر سیکھے تھے۔ وہ بیٹی کو لمبے انتظار کے لمحات میں بور ہونے سے بچانے کے لئے خود ساختہ کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ میں نے فرانسواز سے فرمائش کی کہ وہ مجھے اپنے باپ کی کوئی کہانی سنائیے۔ اس نے کہا کہ اس کو وہ کہانیاں یاد نہیں ہیں۔ البتہ وہ مجھے ایک اپنی خود ساختہ کہانی سنا سکتی ہے۔

اس کی کہانی نورماندی کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی ایک لڑکی کے بارہ میں تھی۔ اس گاؤں کے پچاس ساٹھ گھروں میں بچوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور گاؤں کا مدرسہ اتنا چھوٹا تھا کہ چاروں کلاسوں کو ایک استاد پڑھاتا تھا۔ مدرسہ کے سارے بچے ایک کمرہ میں اپنی اپنی کلاسوں کے اعتبار سے الگ الگ بیٹھتے تھے۔ اور استاد باری باری ہر کلاس کو سبق دیتا تھا۔ اس لڑکی کی کلاس میں ایک لڑکا بھی پڑھتا تھا۔ دونوں پڑھنے لکھنے میں خوب ہوشیار تھے۔ ان کے درمیان مقابلہ بھی چلتا تھا، مگر ان کی آپس کی دوستی بھی پکی تھی۔ جب وہ سیکنڈری اسکول میں پڑھنے کے لئے ایک قریبی قصبہ میں جانے لگے، تو ان کا جانے آنے کا ساتھ بھی ہو گیا۔ یہ دوستی آگے چل کر ٹیکنیکل اسکول میں بھی قائم رہی۔ دونوں نے آرکیٹیکٹ بننے کا فیصلہ کیا اور اپنی تعلیم اور پریکٹیکل ٹریننگ کے بعد ایک تعمیراتی فرم میں ملازم ہو گئے۔ چند سالوں میں انہوں نے کافی تجربہ حاصل کر لیا اور اپنی علیحدہ فرم قائم کر لی، جس کا کاروبار ان کی توقع سے بڑھ کر چلا۔ اس دوران میں وہ شادی کر چکے تھے اور ان کا بیٹا بھی پیدا ہو چکا تھا۔ فرم کا ہیڈ کوارٹر پیرس میں تھا، جہاں پر ان کی اپنی رہائش تھی۔ پھر ان کی زندگی میں ایک موڑ آیا، جس کا سبب لڑکی کی اپنی سہیلی بنی۔ اس نے چوری چھپے اس کے خاوند کے ساتھ تعلقات بڑھائے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میاں بیوی میں جدائی ناگزیر ہو گئی۔ چونکہ دونوں فرم میں برابر کے حصہ دار تھے، اس لئے ان کو اکٹھے کام کرنا پڑتا تھا۔ قریبی دوستوں کے سوا کسی کو پتہ نہ تھا کہ ان کے درمیان ایک خلیج پیدا ہو چکی ہے۔ دونوں کے درمیان دوستی کا بھرم قائم تھا اور لڑکی کو امید تھی کہ اس کا خاوند ایک روز اس کی طرف واپس لوٹ آئے گا۔ آخر دنیا امید پر ہی تو قائم ہے۔

مچھلی کے شکار کا مقابلہ تو ہم نے کیا جیتنا تھا۔ البتہ پانچ چھ مچھلیاں ہم نے ضرور پکڑیں، جو ہمارے شام کے کھانے کے لئے کافی تھیں۔ راودوان کو سب سے پہلی مچھلی پکڑنے کا انعام ملا۔ مگر اصل انعام سب سے بڑی مچھلی پکڑنے کا اس کے ہمسائے کے حصہ میں آیا۔ سب لوگوں نے سمندر کے کنارے چھوٹے چھوٹے چولہے بنا کر مچھلیاں بھونیں اور ہم آدھی رات کے بعد گھر واپس لوٹے۔

اس دوران میں ہمارے کورچولا میں قیام کا چوتھا ہفتہ آ گیا تھا۔ ہمارا ارادہ ایک روز کے لئے ڈوبرونک جانے کا تھا۔ جہاز کورچولا سے شام کو چلتا تھا اور دوسری صبح ڈوبرونک پہنچتا تھا۔ سارا دن وہاں پر قلعہ اور شہر کی سیاحت کے لئے ملتا تھا۔ وہاں کا قلعہ زمانہ ہائے وسطیٰ میں ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ فصیل کی مضبوط دیواروں کے اندر بازار پایا جاتا ہے، جو ٹورسٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم ایک اسٹور سے نکل رہے تھے کہ فرانسواز کو ایک جاننے والا جوڑا مل گیا۔ انہوں نے جس خوشی اور مسرت کا اظہار کیا، اس کو دیکھتے ہوئے میرا اندازہ تھا کہ تینوں بہت بے تکلف دوست تھے۔ موریس اور میدلین ایک ہفتہ قبل پیرس سے چلے تھے۔ راستے میں انہوں نے وینس اور پولا کی سیر کی تھی اور ریکا سے ساحلی جہاز لیا تھا، جو راستے میں پڑنے والی بندرگاہوں میں ٹھہرتا ہوا یونان جا رہا تھا۔ وہ کورچولا میں بھی رکے تھے۔ اگر انہیں پتہ ہوتا کہ فرانسواز وہاں پر ٹھہری ہوئی ہے، تو وہ ہر قیمت پر اسے ڈھونڈ نکالتے۔ وہ بھی اسی صبح ڈوبرونک پہنچے تھے اور شام کو آگے جا رہے تھے۔ ہم نے باقی کا سارا دن اکٹھے گذارا۔ اور شام کا کھانا مچھلی کے ایک ریستوران میں کھایا۔ ان کا جہاز ہمارے جہاز سے پہلے روانہ ہو رہا تھا۔ ہم انہیں الوداع کہنے کے

لئے گئے۔ بعد میں اپنے جہاز پر لوٹ آئے، جسے رات کے بارہ بجے کورچولا واپس لوٹنا تھا۔

تین بجے کے لگ بھگ میری آنکھ شور کے سبب کھل گئی۔ فرانسواز ٹائیلٹ روم میں قے کر رہی تھی۔ میں دوڑ کر جہاز کے ڈاکٹر کو بلا لایا۔ اس نے کہا کہ فکر کی کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ محترمہ کو سمندری متلاہٹ کی بیماری ہے، جس کا شکار بہت سے لوگ ہچکولوں کے لگنے سے ہو جاتے ہیں۔ اس نے ایک دوا دی اور کہا کہ قے سے معدہ خالی ہو جانے کے بعد آرام آجائے گا۔ مگر فرانسواز کی حالت لمحہ بہ لمحہ خراب ہوتی چلی گئی۔

اس کو یقین تھا کہ میدلین نے آنکھ بچا کر اس کے کھانے میں زہر ڈال دیا تھا۔ میں نے کہا کہ وہ ایسا کیوں کرتی اور پھر اس نے ہماری موجودگی میں یہ کام کیسے کیا ہوگا۔ مگر فرانسواز میرے دلائل سننے کو تیار نہ تھی۔ اس نے کہا کہ میدلین ہمیشہ سے موریس کو اپنے قبضہ میں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے وہ فرانسواز کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتی ہے۔ ایک دو گھنٹوں کے بعد مجھے بھی قے آنے لگی۔ لگتا تھا کہ معدہ کٹ رہا ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے وہی دوا دی، جس سے مجھے ذرہ بھر فائدہ نہ ہوا۔ فرانسواز نے کہا کہ اس کی بات درست تھی۔ میدلین نے نہ صرف اس کے کھانے میں زہر ملا دیا تھا، بلکہ میرے کھانے میں بھی۔ اس طرح وہ عینی گواہ کو ٹھکانے لگانا چاہتی ہے۔

اگلی صبح ہمیں اسٹریچر پر کورچولا کے ہسپتال میں پہنچایا گیا۔ ہماری حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ ماریا کو ہماری جان کے لالے پڑ گئے۔ مگر ڈاکٹر نے ٹیسٹ لینے کے بعد بتایا کہ ہمیں کسی نے جان بوجھ کر زہر نہیں دیا تھا۔ ہم غذائی زہریت کا شکار ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں ریڈیو نے خبروں میں بتایا کہ ڈوبرونک کے ایک ریستوران کا ڈیپ فریزر خراب ہو جانے کے سبب اس میں رکھی ہوئی مچھلیاں پگھل گئی تھیں اور مضر صحت بن گئی تھیں۔ ریستوران کے بے شمار گاہک ہماری طرح کلینکوں میں پڑے ہوئے تھے۔ موریس اور میدلین بھی یقیناً ایتھنز کے کسی ہسپتال میں داخل ہوں گے۔ ▲▲

ضروری اطلاع

شب خون کے لئے چیک/ڈرافٹ صرف SHABKHOON کے نام سے بھیجیں۔

—ادارہ

خدا بخش ابڑو

ہم نے اپنی زندگی خانوں میں بانٹ لی ہے
اور پھر اپنے اپنے خانوں میں اپنے آپ کو
ڈھونڈتے رہتے ہیں
کبھی کسی خانے میں کچھ رکھ کر بھول جاتے ہیں
تو کبھی کسی خانے میں کچھ
کبھی دل نہیں ملتا تو کبھی دماغ
اور کبھی ہاتھ ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں
تو کبھی پاؤں
بس اسی وجہ سے ہر کام میں دیر ہو جاتی ہے
ابھی کچھ دیر پہلے خود کو سنبھال کر رکھا تھا
اب مل ہی نہیں رہا
معلوم نہیں کہاں رکھ دیا اپنے آپ کو
خانے بھی تو اتنے سارے ہیں
کوئی ایک ہو تو یاد بھی رہے
ویسے یاد بھی ایک خانے میں رکھ دی تھی
اب پھر اسے بھی ڈھونڈھنا پڑے گا
اور پھر اگر نہیں ملی تو کیا ہوگا
زیادہ سے زیادہ شرمندہ ہونا پڑے گا
سو اس کے تو ہم عادی ہو چکے ہیں
اس کو بھی کسی خالی خانے رکھ کر بھول جائیں گے
کوئی ہمارا کیا کرلے گا
اتنے سارے خانوں میں کہاں ڈھونڈے گا
خود ہی گم ہو جائے گا
پھر صرف خانے رہ جائیں گے

اور وہ خود گم ہو جائے گا۔
اور پھر خانوں سے باہر اسے کچھ بھی نظر نہیں
آئے گا

خدا بخش ابڑو

...یں کہیں گم ہو گیا ہوں

...ں کہیں گم ہو گیا ہوں
...یلف میں رکھی کتابوں میں
...واروں پر لگی پینٹنگز میں
...بجا بکھری فوٹو گرافس میں
...پھر بچوں کے شور میں
...ں کہیں گم ہو گیا ہوں

...اسنے اخبارات کے ڈھیر میں
...لی گیس ٹیلیفون اور پانی کے بلوں میں
...بوں کی فیس، مکان کے کرائے
...یلز ٹیکس، انکم ٹیکس، جائداد ٹیکس،
پروفیشنل ٹیکس
...میلے کچیلے بدبودار نوٹوں میں
...وادھر سے لے کر ادھر دیتے ہوتے ہیں
...پھر گھڑی کی ٹک ٹک میں
...ں کہیں گم ہو گیا ہوں

گاڑیوں کے دھوئیں اور شور میں
شام کے اخبار بیچنے والے ہاکر کی چیخوں میں
باسی اخباروں کی سرخیوں میں
صبح سے رات تک دماغ پر ہتھوڑے چلانے
والے
اشتہاروں میں
اور ٹی وی خبرنامے میں دھاڑتی چنگھاڑتی
ملکہ عالیہ کی دھاڑوں میں
میں کہیں گم ہو گیا ہوں

بجلی چلی گئی ہے، آٹا نہیں ہے
دودھ ختم ہو گیا ہے
دوائیں لانی ہیں
سینیٹی نتس والے آئے تھے
کرائے والی کا فون آیا تھا
میرے پاس کپڑے نہیں ہیں
شادی پر جانا ہے
تعزیت کے لیئے جانا ہے
اور ایسی ان گنت آوازوں میں
میں کہیں گم ہو گیا ہوں

اب کوئی خبر خبر نہیں رہی
کوئی منظر نیا منظر نہیں رہا
وہی کہانی، وہی منظر، وہی الزام
بس بدلتے ہیں تو صرف نام
جانے والے سر جھکائے چلے جاتے ہیں
آنے والے سر اٹھائے چلے آتے ہیں
اور میری سسکتی آخری سانس لیتی لاش کو
میری حفاظت کا حلف لینے والے
تازہ دم درندوں کے حضور پیش کیا جائے گا
اور پھر وہ مجھے نوچیں گے
میری رگوں میں باقی ماندہ خون سے
جام پہ جام انڈیلیں گے چھلکتے حلقوں میں
اور نہ مٹنے والی بھوک کو مٹانے کی کوشش کریں گے
قومی ترانے جو جانے والوں کے حق میں لکھتے تھے
اب جو سنیں گے تو آنے والوں کے حق میں لکھے
ہوئے لگیں گے

اور پھر مقدس کتاب سے ایک آیت
جو حاکم وقت کے اقدام کو صادق ثابت کرتی ہوگی
وہ مجھ نیم بسمل کو بمع ترانوں کے گوش گزار کرنی ہوگی
اور آنے والے تازہ دم درندوں کے آگے
(جو میری حفاظت کے لیئے اور مجھے بچانے کے لیئے
آئے ہیں)
بے چوں چرا، بے سدھ پڑا رہنا ہے
وہ مجھے نوچیں، میرا خون پئیں یا
میرے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مجھے مل بانٹ کر کھائیں
مجھے نہ آہ کرنی ہے نہ چیخنا ہے
آج جو آنکھیں بند کر کے کھا رہے ہیں
کل وہ آنکھیں ڈال کر باری کا انتظار کر رہے تھے
اور جو کل مجھے نوچ رہے تھے اور آنکھیں بند
کر کے کھا رہے تھے
آج پھر وہ باری کے انتظار میں آنکھیں ڈال کر
بیٹھے ہوئے ہیں
بس اسی طرح ہی باری بدلتی رہے گی
جب تک سب کچھ ختم نہیں ہو جاتا

خدا بخش ابڑو

قاتل

میرے قاتل بھی میرے سوگواروں میں شامل ہیں
اور مجھ پر بین کرنے والوں میں سب سے آگے
بھی وہی ہیں
اور وہی بڑے دکھ کے ساتھ میری تعزیت بھی
وصول کر رہے ہیں
اور خود ہی میرے قاتلوں کا سراغ لگانے کا ذمہ
بھی لے لیا ہے

اور میرے لیئے منصف بھی مقرر کردیا ہے
میں جن کے خلاف ساری عمر لڑتا رہا
آج وہی آمریت کے پروردہ سب ایک جگہ جمع
ہوئے ہیں
ان کی آنکھوں سے آنسو نہیں رکتے
ہچکیاں بندھی ہوئی ہیں
اور وہ مجھ پر بین کر رہے ہیں
اور ٹی وی اور اخبار کے کیمرے یہ سارا منظر
ساری دنیا تک پہنچا کر اپنا فرض ادا کر رہے ہیں
جن کے دل رو رہے ہیں اور جن کی ہچکیاں بندھی
ہوئی ہیں
ان کے گلوں میں چیخیں پھنس کر رہ گئی ہیں
اور جن کے گھروں میں کئی دنوں سے چولہا تک
نہیں جلا

جن کے پاس تعزیت کے لیئے الفاظ بھی نہیں
وہاں تک نہ ٹی وی کیمرہ پہنچے گا نہ اخبار والا
ہم قاتلوں کے بیان ہی پڑھیں گے کہ
ظلم ہو گیا، بربریت ہو گئی
اور ان کی روتی دکھ سے بھری تصویریں دیکھ کر
لوگ مغالطے میں پڑ جائیں گے
اور قاتلوں کا کام بھی یہی ہے کہ
قتل بھی کرو اور قاتل قاتل کا شور بھی مچاؤ
چوری بھی کرو اور چور چور کا شور بھی مچاؤ
ظلم بھی کرو اور ظلم ظلم کا شور بھی مچاؤ
اور قوم کو ہمیشہ مغالطے میں رکھو
نہ کبھی قاتل پکڑا جائے گا
نہ کبھی چور پکڑا جائے گا
نہ کبھی ظالم پکڑا جائے گا
اسی طرح قتل ہوتے رہیں گے
چوریاں ہوتی رہیں گی
ظلم ہوتے رہیں گے
اور ہم مغالطے میں ہی رہیں گے

کھانے والے

ہم سب کھانے میں لگے ہوئے ہیں
سر سے پاؤں تک، اوپر سے نیچے تک
جس کے ہاتھ جو کچھ لگتا ہے
اسے کھائے جا رہا ہے
کوئی زیادہ کھا رہا ہے کوئی کم
جو کم کھا رہا ہے
اس کی نظر زیادہ کھانے والے پر ہے
اور جو زیادہ کھا رہا ہے
اس کی نظر اس سے بھی زیادہ کھانے والے پر ہے
سب ایک دوسرے کی نظر میں ہیں
لیکن کوئی بھی کھانے سے دستبردار نہیں ہوتا
سب کو کھانا ہے پھر جو بھی مل جائے
جانور تو کیا انسان بھی ہیں مرغوب ہمیں
لاش پر لاش ہمیں چاہیے کھانے کے لیئے
صبح دوپہر اور رات دسترخوان پر
گر مردہ نہیں زندہ ہی سہی
لاش مگر چاہیے ضرور
ہمیں کھانا ہے جو بھی مل جائے
کسی کے جذبات ہوں، احساس ہوں یا خواب سہی
کسی کی آنکھ کا پانی، کسی کی مسکراہٹ
کسی کا خون پسینہ، کسی کے دل کی دھڑکن
جو بھی مل جائے ہمیں کھانا ہے
اپنا دسترخوان تو بہر حال سجانا ہے
لذت و ذائقہ سب ثانوی باتیں
اصل میں دسترخواں سجا ہونا چاہیئے
پھر کسی کی آہیں کھائیں یا آنسو نگلیں
یا کسی کے گلے میں پھنسی آخری چیخ
سب آرام سے ہم کھا جاتے ہیں
بغیر ڈکار دیئے بغیر وقفے کے

ہم سب کھانے میں لگے ہوئے ہیں
سر سے پاؤں تک اوپر سے نیچے تک

خدا بخش ابڑو

جانوروں کا کھیل

انھوں نے ایک طوطا پالا تھا
اسے اپنی مرضی کے الفاظ سکھائے تھے
جیسے وہ کہتی تھیں
ویسے وہ بھی کہہ دیتا تھا
وہ کہتی تھیں میاں مٹھو چوری کھاؤ !
میاں مٹھو فوراً کہتا تھا بیگم صاحبہ چوری کھلاؤ !
وہ کہتی تھیں مہمانوں کے سامنے بالکل نہیں بولنا
میاں مٹھو فوراً کہتا بالکل نہیں بیگم صاحبہ !
جب اس کا دل چاہتا تو وہ مہمانوں کو محظوظ کرنے کے لیئے کہتیں

میاں مٹھو مہمانوں کو گانا سناؤ
میاں مٹھو مہمانوں کو گانا سناتا اور ان کا دل لبھاتا
اور بیگم صاحبہ کی بڑی تعریف ہوتی کیسا سدھایا ہے
کہاں سے لیا، آخر ایسے طوطے اور بھی ملتے ہیں
وہ سر جھٹک کر کہہ دیتیں بس قسمت سے مل گیا تھا
ایسے زندگی خوشی خوشی کٹتی رہی
پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ
میاں مٹھو نے دو چار باتیں ادھر ادھر سے بھی سیکھ لیں
اب بیگم صاحبہ کہتیں کہ اس طرح بولو
وہ کہہ دیتا بیگم صاحبہ اس طرح نہیں، اس طرح بولتے ہیں

وہ کہتیں جو راگ میں نے سکھایا ہے وہ گاؤ
وہ کوئی اس سے بہتر راگ الاپنے لگتا
بس وہیں سے جھگڑا شروع ہوا
میاں مٹھو کے راگ ٹیں ٹیں میں بدل گئے
اور بیگم صاحبہ ٹیں ٹیں کا بہت برا مناتیں
انھوں نے اپنے جادو کے زور سے میاں مٹھو کو
کتے میں تبدیل کر دیا

اس نے سوچا کتا وفادار ہوتا ہے
دم ہلاتا رہے گا
اور جس پر میں کہوں گی اس پر ہی بھونکے گا
کتے نے بھی یہی کیا
باسی روٹی کی خاطر دم ہلاتا
اور دوسروں پر بھونکنا مشکل کام نہیں تھا
بیگم صاحبہ مہمانوں کے آگے کتے کی اتنی تعریفیں کرتیں

کہ مہمان بھی پریشان ہو جاتے
کہ کتا ہے کہ انسان ہے
سب عادتیں انسانوں والی پائی ہیں
پھر سب پوچھتے بھی کہاں سے ملا یہ کتا
بیگم صاحبہ کہتیں بس قسمت سے مل گیا تھا
پھر قسمت کا کرنا یہ ہوا
کتے نے پہلے مہمانوں پر غرانا شروع کیا
اور پھر اپنی مالک پر بھی غرانے لگا
آخر انسانوں والی خصلتیں جو پائی تھیں
سو بیگم صاحبہ بہت پریشان ہوئیں
پھر انھوں نے جادو کے زور سے اسے بندر بنا دیا
اب بندر سب کو ہنساتا، ناچ دکھاتا ہے
اور الٹے سیدھے کرتب دکھاتا ہے
بیگم صاحبہ کے بچے بھی خوش ہیں
مہمان بھی خوش ہیں
اور خود بیگم صاحبہ بھی بہت خوش ہیں !

پیار

پیار کسی لمحے یا گھڑی کا محتاج نہیں ہوتا
پیار کسی وقت بھی آسکتا ہے
سولی پر بھی تو بستر مرگ پر بھی
پیار کو آپ وقت کی قید میں نہیں ڈال سکتے
آپ بے شک اپنے لکھے ہوئے پروگرام کے مطابق
کھانا کھا سکتے ہیں، سو سکتے ہیں، پڑھ سکتے ہیں
لیکن پیار کا کوئی وقت مقرر نہیں کر سکتے
کہ پیار تو نہ ہواؤں کا پابند ہے نہ موسموں کا
دہکتی دوپہر ہو یا ٹھنڈی رات
یا پھر آسمان آگ کے اولے برسا رہا ہو
پیار کسی کا محتاج نہیں
پیار تو کسی لمحے بھی آسکتا ہے

منتر

آپ ہاں کہیں
میں ہاں کہوں
آپ ناں کہیں

میں ناں کہوں
آپ بولیں رات ہے
میں بھی بولوں رات ہے
آپ بولیں دن ہے
میں بھی بولوں دن ہے
جو آپ کہیں وہ میں کہوں
یا پھر بہتر ہے چپ رہوں

مظفر حنفی

آگے آگے پھول بچھائے یاروں نے
پیچھے سے پتھر برسائے یاروں نے

بجلی کے کھمبوں نے آنکھیں جھپکائیں
جلدی جلدی ہاتھ ملائے یاروں نے

مِن تپتی راہوں میں دھول اڑاتا تھا
مجھ کو ڈھونڈا سائے سائے یاروں نے

دیواروں کو ریت نہیں ٹکنے دیتی
منصوبے تو لاکھ بنائے یاروں نے

نیچے سے بنیادی اینٹیں کھسکا دیں
چوٹی پر جھنڈے لہرائے یاروں نے

غیروں کی غیروں سے کوئی لاگ نہیں
یاروں ہی سے دھوکے کھائے یاروں نے

رتیلے ماحول، مشینی محفل میں
چکنے چپڑے شعر سنائے یاروں نے

قسمت اچھی ہے کہ گھر جاتے ہیں
راہ میں سیکڑوں مر جاتے ہیں

جب ٹپکنے نہیں پاتے آنسو
دل میں نشتر سے اتر جاتے ہیں

اوس پڑجاتی ہے امیدوں پہ
خواب چنتا ہوں، بکھر جاتے ہیں

شاعری کارِ زیاں ہے، لیکن
شعر کچھ کام تو کر جاتے ہیں

آپ کیوں تشنہ لبوں کی سوچیں
آپ کے جام تو بھر جاتے ہیں

سرفرازی میں مزا بے شک ہے
لیکن اس کھیل میں سر جاتے ہیں

اے مظفر کئی استاد سخن
میری غزلیں بھی کتر جاتے ہیں

بیٹے کو حلال کر دکھایا
رستم نے کمال کر دکھایا

پھر بھی نہ یقین آیا اس کو
سر آگ میں ڈال کر دکھایا

سب آئینہ رو بنے ہوئے تھے
آئینہ نکال کر دکھایا

وہ آپ کا سر نہیں تھا جس کو
نیزہ پہ اچھال کر دکھایا

ظالم نے بھی امن کا کبوتر
تصویر میں پال کر دکھایا

فق ہو گئے دوستوں کے چہرے
جب خون ابال کر دکھایا

فرقت میں شہید نے تمہارے
اک روز وصال کر دکھایا

ہم نے بھی مظفر اپنا جوہر
اشعار میں ڈھال کر دکھایا

حامدی کاشمیری

در و روزن ہیں خوگر تیرگی کے
دلوں میں بس گئے گھر تیرگی کے

نہ پوچھو، تھا درونِ سینہ کیا کیا
گرچہ ہیں سمندر تیرگی کے

منور جھیل تھی نیلو فروں سے
اب اُگ آئے ہیں کیکر تیرگی کے

چھپالو پارۂ المنور دل میں
امنڈ آئے ہیں لشکر تیرگی کے

طیور ناروَن ہیں، دیکھ ان کی
ہیں چونچیں آگ کی، پر تیرگی کے

دعائے صبح آتی ہے لبوں پر
برس جاتے ہیں خنجر تیرگی کے

ہیں کنگروں پہ پہرے تیرگی کے
ہیں آخر کیا ارادے تیرگی کے

یہ کیسی وادیٔ ظلمات آئی؟
بکھرتے ہیں اجالے تیرگی کے

تری آنکھوں کی لو بجھنے نہ پائے
ابھی ہیں اور رستے تیرگی کے

چمن میں سانس لینا بھی ہے مشکل
بکھر جاتے ہیں پتے تیرگی کے

شعاعِ مہر کی خواہش دلوں میں
لبوں پر ہیں فسانے تیرگی کے

ٹپکتا ہے لہو مہرِ مبیں سے
گڑے ہیں دل میں پنجے تیرگی کے

یہاں تو دن بھی ہیں اب تیرگی کے
تحیر خیز ہیں ڈھب تیرگی کے

فلک پر جھنجھناتے پھر رہے ہیں
ستارے ہیں کہ اشہب تیرگی کے

یہاں کی روشنی کا کیا بھروسہ؟
یہاں تابع ہیں کوکب تیرگی کے

ستارے، حرف، لالہ اب کہاں ہیں؟
امنڈ آئے ہیں عقرب تیرگی کے

نفس کی آمد و شد بھی گراں ہے
گزر جائیں گے دن کب تیرگی سے

ستارے نور کیوں برسا رہے ہیں
یہاں مداح، ہیں بہت تیرگی کے

حامدی کاشمیری

چمن زاروں کا پیماں ہے ہوا سے
بس اک تتلی گریزاں ہے ہوا سے

قدم روکے سے بھی رکتے نہیں ہیں
یہ کیسا ربط پنہاں ہے ہوا سے

حصار جسم حائل ہو نہ جائے
ہمارا رشتۂ جاں ہے ہوا سے

چمن اس کے لئے آغوش وا ہے
بس اک سنبل کہ لرزاں ہے ہوا سے

نہ روکو اس کا رستہ، کوہسارو
ولر، مواج طوفاں ہے ہوا سے

ہیں محو نغمہ بلبل، خندہ لب گل
فقط اک تو پریشاں ہے ہوا سے

یہاں سے دور، ہر لمحہ سے پرے ہے
وہ ارض نور، ہر لمحہ سے پرے ہے

یہاں گھر گھر میں ہے جشن چراغاں
شب عاشور ہر لمحہ سے پرے ہے

یہاں ایک ایک پر ہے فضل رزّاق
اک اک مقہور ہر لمحہ سے پرے ہے

یہاں دن ہے درو روزن کو کھولو
شب دیجور ہر لمحہ سے پرے ہے

کوئی بھی لوٹ کر آتا نہیں ہے
عجب دستور ہر لمحہ سے پرے ہے

یہاں ڈھونڈو گے کیا اس نوش لب کو
وہ رشک حور، ہر لمحہ سے پرے ہے

مخاطب ہوں گے طائر، دیکھ لینا
سمندر کے مظاہر دیکھ لینا

پس کہسار حیرانی نہ ہوگی
یہ خوں گشتہ مناظر دیکھ لینا

مکیں پل بھر میں آنکھیں موند لیں گے
مکاں ہوں گے مقابر دیکھ لینا

اجالوں کی قبا پہنے ملیں گے
وہ تاریکی کے تاجر دیکھ لینا

ستارو، آنکھ لگ جانے سے پہلے
زمینوں کے نوارد دیکھ لینا

مرے حجرے میں خورشید مبیں ہے
کبھی شب کے مسافر دیکھ لینا

ن۔م۔دانش

میں گول خانوں میں فٹ ہونے والوں کی
اک بھیڑ میں
بیٹھ کے سوچتا ہوں

نقابوں کے پیچھے بے رنگ چہرے چھپے ہیں
بے انت صدیوں کی تاریک
وہ زخم خوردہ مسافت کا
حاصل یہی ہیں؟

یہ مردہ نسلوں کی،
مردہ روایت کے تلچھٹ
جو بے ورثہ
اور کھوکھلے کوکھ کی
بے ثمر خواہشوں کا نتیجہ ہیں
جو اپنے "ہونے" "نا ہونے" کے احساس سے
بے خبر ہیں

جن کے مقدر میں لکھی گئیں
کالے حرفوں میں
جھوٹے نصابوں کی سچائیاں
ذات کے بند کنویں کے مینڈک ہیں
وہ جوہڑوں کو سمندر سمجھتے ہیں
اور گدلے پانی میں
گہرائیاں ڈھونڈتے ہیں

پوپ، ڈسکو سے
جو اپنے ویران روح کے
خلا کے شکم کو
یوں بھرنے کی کوشش میں آوارہ پھرتے ہیں
تنہائی نے اس قدر ان کو مارا ہے

کہ وہ ہجوم اور اژدحام کی
ایک موٹی ردا اوڑھ کر گھومتے ہیں
یہ دانشوری کے سمے
سیاست کے پھندے
ادب کے یہ تکتے
اور کافی ہاؤس کی بوجھل فضا میں
یہ لفظوں کے گہرے دھندلکے
بے معنی سی میلی کچیلی ہنسی
اور سگریٹ کا دھواں!
کوئی ان سے پوچھے یہ کیا چاہتے ہیں؟
سبھی گمشدہ ہیں
سبھی اپنے بے روح چہروں پہ
اک اشتہار اب سجائے ہوئے گھومتے ہیں
کوئی ان کی پہچان ان سے کرادے
کہ وہ دائروں کے حصاروں میں جکڑے ہوئے ہیں
روایت کے،
دن رات کے،
زندگی کے یہ معمول کے دائرے
ان کے گھر بھی تو وہ گھر نہیں ہیں
کہ جو ان کی آمد کے،
قدموں کی آہٹ کے ہی منتظر ہوں
پناہ اب کہیں بھی نہیں ہے
سو اب ان کے چشموں کے شیشوں پہ

لاحاصلی کے عجب دکھ لکھے ہیں
مگر کون ان کو پڑھے گا
سبھی اپنی اپنی صلیبوں پہ لٹکے ہوئے ہیں
اسی واسطے
صبح سے شب گئے
شہر کی اندھی گنجان سڑکوں پر آوارہ پھرتے ہیں
اپنی بھی ہمراہی سے وہ ہراساں ہیں
سورج سے ان کو گلہ ہے
(اندھیرے کی سازش میں وہ بھی شریک ہے)

آنے والے زمانوں میں لوگوں کو
جب یہ عجائب گھروں میں ملیں گے
تو وہ جان لیں گے
یہ وہ نسل ہے
جو کہ مردہ ہی پیدا ہوئی تھی
جو مردہ ہی زندہ رہی
اور اسی مردنی کے ہی عالم میں جو مرگئی

ان کی پیشانیوں پر
سوائے اب اخبار کی سرخیوں کے
تو کچھ بھی نہیں ہے
کہ یہ سر سے پاؤں تلک
سرخیوں میں ہی لپٹی ہوئی
جھوٹی سچائیاں اوڑھ کر جی رہے ہیں

اب ان کی باتوں میں بھی
شام کے جھوٹے اخبار کی سرخیوں کا
تعفن جھلکتا ہے
کہ عصر حاضر کی ساری صداقت یہی ہے

نظم

ن-م-دانش

ہوا جب تک میرے اس جسم کی دیوار کو
بوسیدہ چھلنی کی طرح
سوراخ در سوراخ کر لیتی نہیں
میں سانس لینے کی کوئی قیمت نہیں دوں گا

یہ آندھی،
جب تلک گھر کے اندھیرے سرد کونے میں
مسلسل ٹمٹماتی بوڑھی بتی کو
بجھا دیتی نہیں
میں روشنی کے ہاتھ بیعت کے لئے
اپنے یہ سوکھے ہاتھ
اوپر نہ اٹھاؤں گا

نیا سورج طلوع جب تک نہیں ہو گا
میں گلیوں، آنگنوں
کچے مکانوں
شہر کی ویران سڑکوں
اور دیواروں پہ تاریکی ملوں گا
تیرگی پھیلاؤں گا

سورج (نیا سورج)
طلوع جب تک نہیں ہو گا
میں سارے کوسنے
اور گالیاں
ہر صبح ہوا کے دوش پہ رکھ کر
اسے پیغام بھیجوں گا

یہاں جب لوگ
تاریکی میں گھٹ کے مر رہے ہوں گے
ہنسوں گا
کوسنے دوں گا
کہ میں مرنے سے پہلے
اک دفعہ
بس اک دفعہ جی بھر کے جینا چاہتا ہوں
میں کہ جو صدیوں پرانے گھر کے
تیرہ کمرے میں پیدا ہوا تھا
بے حس و مردہ
سیاہ جسم اور زخمی روح کے ہمراہ!
مگر اس بار میں مرنے سے پہلے
ہنستے سورج کی شعاعوں میں نہانا چاہتا ہوں
جس کی خاطر
شہر کی گلیوں
مکانوں، آنگنوں
سڑکوں، دیواروں پہ
میں تاریکی بچھاتا ہوں

◢

ہمیں کیا پتہ ہے
یہ ممکن ہے پھول اور پتھر
ہوا، روشنی
ریت، پانی
یہ دریا، پہاڑ اور صحرا کا آپس میں رشتہ ہو
پتھر کے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہو
پانی بھی زندہ ہو
آئینے دراصل انسان ہو
چاند تاروں میں صدیوں کی اک دشمنی ہو

ہمیں کیا پتہ ہے
یہ ممکن ہے
آپس میں وہ باتیں کرتے ہوں
روتے ہوں
ہنستے ہوں
الفت، محبت ہو
رنجش ہوں، جھگڑے
کوئی ان میں شیریں
کوئی ان میں لیلیٰ ہو
ان میں بھی قصے، کہاوت
محبت، شجاعت کی رسمیں ہوں
وہ بھی جدائی کے صدمے
ہماری طرح جھیلتی ہوں
ہماری طرح وہ بھی جیتے ہوں
مرتے ہوں

ممکن ہے
سناٹا دراصل آواز ہو
موت ہی زندگی ہو
اور انساں خدا سے بڑا ہو
ہمیں کیا پتہ ہے
یہ ممکن ہے

اسعد بدایونی

سب یقینوں پہ مسلط تھا گماں راستے بھر
گرد ہی گرد تھی یہ صرف دھواں راستے بھر

ہم سفر اچھے تھے سب اور سفر بھی دلچسپ
اک کہانی ہمیں کرتا تھی بیاں راستے بھر

سسکیاں بھرتے تھے اشجار سے گرتے پتے
اور پھرتی تھی ہوا رقص کناں راستے بھر

راستے میں کوئی انساں تھا نہ قریہ نہ دیار
صرف محسوس ہوا شور سگاں راستے بھر

کوئی بادل تھا نہ دریا نہ سمندر کوئی
پھر بھی ہمراہ رہا سیل گراں راستے بھر

ہم کہاں ڈوبے تھے کس شہر میں لاش ابھری ہے
صرف سنتے رہے موجوں کی زباں راستے بھر

اب مکینوں کے لب و رخ کو کوئی کیا دیکھے
ان سے اچھے ہیں یہ خوش رنگ مکاں راستے بھر

میر صاحب تو نہ رستے میں کسی سے بولے
ہم نہ کر پائیں گے یوں جی کا زیاں راستے بھر

دلوں میں درد کی شدت کو آزمائے کیوں
غرض کسی سے نہیں ہے تو پھر نبھائے کیوں

اگر پسند خدا کو ہے صرف تنہائی
یہ آسمان و زمیں اس نے پھر بنائے کیوں

انا کا پیڑ تو گرتا ہے پورے جسم کے ساتھ
وہ شاخ سبز نہیں ہے تو سر جھکائے کیوں

اگر کسی کی اجالوں سے رسم و راہ نہیں
تو پھر چراغ لیے گھومتے ہیں سائے کیوں

تم اپنے عشق میں گم کیوں نہیں جو عاشق ہو
وہ بے وفا ہے تو پھر غیر کے نہ جائے کیوں

تمام تیر تو لگتے نہیں پرندے کو
ہر ایک شکل بھلا آنکھ میں سمائے کیوں

تمام کار زیاں کو ہنر کیا ہم نے
ہمارے بعد ادھر دوسرا نہ جائے کیوں

اسعد بدایونی

ف تو دشت و بیابان میں چمکتے ہیں
غ عرصۂ امکان میں چمکتے ہیں

کائی ہٹاکر اداس جھیلوں کی
د صبح زمستان میں چمکتے ہیں

ں ان کو شاخ پہ کھلتے بھی دیکھ آیا تھا
پھول جو ترے گلدان میں چمکتے ہیں

اں میں کچھ بھی نہیں ہے ملاوتوں کے بغیر
اں کے رنگ بھی ایقان میں چمکتے ہیں

گر پڑیں تو ستاروں کے رخ بدل جائیں
اشک دیدۂ حیران میں چمکتے ہیں

لغات بھی ہے گانگی کے موسم بھی
جانے کیوں تری پہچان میں چمکتے ہیں

ب آبشار جنوں چشم تر کے اندر ہے
بجھ اسم ہیں جو دل و جان میں چمکتے ہیں

نہ مہر و ماہ نہ سیارگاں سے روشن ہے
تمام خانۂ دل رفتگاں سے روشن ہے

دلوں میں درد کے جگنو بھی جلتے بجھتے ہیں
ستم کی رات بھی شور سگاں سے روشن ہے

چراغ لالہ جو روشن ابھی نہیں ہے تو کیا
جنوں کا رنگ تو آوارگاں سے روشن ہے

جہاں میں یوں تو سبھی آب و گل کے پتلے ہیں
ترا جمال کسی کے بیاں سے روشن ہے

کتاب عشق و محبت کے حاشیوں پہ نہ جا
بیاض ہجر و ہوس درمیاں سے روشن ہے

کہاں پہ تیرہ و تاریک ہے یہ عرصۂ دہر
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہاں سے روشن ہے

ہمارے سامنے جلتا نہیں عدو کا چراغ
ہماری فکر حد لامکاں سے رشن ہے

شاعر جو غزل بکھانتے ہیں
تجھ لب کی صفت بھی جانتے ہیں

نقصان میں بس وہی رہیں گے
ی روں کا کہا جو مانتے ہیں

کب بھیڑ کا سامنا کریں گے
اخبار میں جو بیانتے ہیں

ہر شہر منافقوں کی جنت
ہم پست و بلند جانتے ہیں

شہروں سے جنوں مٹانے والے
اب دشت کی خاک چھانتے ہیں

ہم کیسے لکھیں کوئی حقیقت
احباب تو تہمت مانتے ہیں

دیکھا ہے جہاں کو جس قدر بھی
کھلتا ہے کہ ہم ہی جانتے ہیں

اسعد بدایونی

خاک ہوجاتا ہے گلزار کا چہرہ جیسے
گردش عصر بنا دیتی ہے صحرا جیسے

ڈوبنے والی زمینوں کو یہ معلوم نہیں
راہ تبدیل کیا کرتے ہیں دریا کیسے

شہر در شہر ہزیمت کے گلی کوچے ہیں
تیری تقدیر میں ہر موڑ ہے اچھا جیسے

میں بھی کوزے کو سمندر کا بدل جانتا ہوں
ورنہ اس عہد میں رہ سکتا تھا زندہ جیسے

نور و ظلمت کا تصور بھی اضافی ہے نیا
کھل گیا چشمۂ خورشید میں سایہ جیسے

عشق کو کار سیاست کی طرح کرتے ہیں
پھر بھی احباب نہیں ہوتے ہیں رسوا جیسے

میں کسی سوچ کے منزل سے پلٹ آیا ہوں
مجھ سے آگے تھا مرا نقش کف پا جیسے

فصیل قصر انا عشق نے گرادی گیا
شکست کھائی پھر قوت ارادی گیا

تمہارے شہر کی شب دن کو مات دیتی ہے
یہاں سبھی نے چراغوں کی لو بڑھادی کیا

نہ کوئی نعرۂ ہو ہے کہیں نہ جام و سبو
اجاڑ دی گئی اب کے جنوں کی وادی گیا

جو معرکے میں نہ جائے وہ بادشاہ نہیں
جو عشق ہی نہ کرے پھر وہ شاہ زادی گیا

دیار درد میں تھا جس سے روشنی کا وجود
وہ آگ بارش حالات نے بجھادی گیا

نہ کوئی پھول نہ چہرہ نہ چاندنی نہ چراغ
یہاں ہر ایک ہے بدصورتی کا عادی گیا

مسائل دل و دنیا پہ غور کرتے لوگ
ضرورتوں نے یہ زنجیر سی ہنادی گیا

احباب گلاب سے بنے ہیں
ہم خاک خراب سے بنے ہیں

کچھ اہل کتاب بن کے آئے
کچھ لوگ کتاب سے بنے ہیں

قصبوں میں مکاں تھے جن کے بے ڈھب
شہروں میں حساب سے بنے ہیں

کچھ نقش و نگار لوح دل پر
اک شخص کے خواب سے بنے ہیں

اس شوخ کی بے شکن جبیں پر
کیا نقش جواب سے بنے ہیں

یہ پھول بدن یہ چاند چہرے
کیا موج شراب سے بنے ہیں

آنکھوں کی جگہ ہیں دو ستارے
ہونٹوں پہ گلاب سے بنے ہیں

ایک اَننت چپ

انیس رفیع

ہوا کچھ بھی نہ تھا۔ حالات اطمینان بخش تھے۔ رات بھی پر سکون تھی اور صبح میں ڈھلا ہی چاہتی تھی۔ بس اچانک۔۔۔ہاں! اچانک ہی وہ نیند سے بیدار ہوا اور نرخرے سے ہوائی حملے کے وقت بجنے والے سائرن جیسی خطرناک آواز نکالنی شروع کی۔ آواز میں گونج اتنی تھی کہ سارا محلہ لرز اٹھا۔ گھر کے سب ہی سوئے پڑے مرد و زن بستروں سے چھلانگ لگا کر زمین پر آ گئے۔ پھر اس کی خوابگاہ کی جانب دوڑے۔ آواز اس کی خوابگاہ سے ہی آ رہی تھی، گھر کے لوگ حیران تھے۔ سائرن تو روز دن کے نو بجے تھانے کی عمارت سے بجایا جاتا ہے، وہ بھی نرم آواز میں مشق کے لیے۔ خوابگاہ کے اندر سائرن طبل جنگ کی مانند بج رہا تھا۔ بات واقعی حیرانی کی تھی۔ اس کی بیوی نے بتایا کہ خوابگاہ میں کوئی ایسی مشینی شئے بھی نہیں ہے جس سے سائرن بج سکتا ہو۔ البتہ رات گئے تک وہ کچھ پڑھ رہے تھے۔ روشنی میں مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے میں باہر ڈرائنگ روم میں آ کر سو گئی۔ خدا نہ کرے اندر کوئی بد روح نہ داخل ہو گئی ہو، اندر سے دروازہ بھی بولٹ تھا۔ بہت کھٹکھٹایا گیا مگر نہ کھلا۔ ادھر آواز کان پھاڑے دے رہی تھی۔ لوگوں کی ایک بھیڑ بنگلے کے کمپاؤنڈ میں جمع ہو چکی تھی۔ آواز گھٹنے کی بجائے اور اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ گھر والوں سے خاطر خواہ جواب نہ پا کر باہر کے لوگ سراسمہ ہو رہے تھے۔ بیوی نے بڑی بے چارگی سے اپنے چھوٹے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ دروازہ پیٹ پیٹ کر نڈھال ہو چکا تھا، پر ماں کو ہراساں دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا۔ زور سے دروازے پر ایک لات ماری اور دروازہ دھڑام کی گونج کے ساتھ کھل گیا۔

سب نے دیکھا۔ وہ دونوں جبڑوں کو انگلیوں سے چیرے شہتیروں کی جانب منہ اٹھائے نرخرے سے گونجتی، لرزتی آواز پیدا کر رہا تھا۔ کوئی تماشہ نہ تھا، حقیقت تھی۔ تحیر خیز منظر تھا۔ کوئی مشین نہ تھی، ایک آدم زاد کی آواز تھی۔ بیوی بچے یہ منظر دیکھ کر دہل گئے۔ اس کی آنکھوں کے لٹو کٹوروں سے باہر آ گئے تھے۔ زبان VIBRANT کی مانند اس تیزی سے لپلپا رہی تھی کہ اس کے قریب جانا محال تھا۔ بیوی کسی طرح نزدیک جا کر چیخی۔ "آواز بند کرو۔" مگر پھر بھی کچھ نہ ہوا۔ پھر اس نے بھی اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ڈالیں اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چیخنا شروع کیا۔ پھر کیا تھا۔ ایک کہرام تھا جو بچ گیا۔ مگر بات کچھ بنتی نظر آئی۔ آوازوں کے تصادم سے گھبرا کر آنکھوں کے لٹو اپنے کٹوروں میں سرکے۔ آواز مائل بہ اعتدال ہوئی۔ زبان کی لرزش دھیرے دھیرے کم ہوئی۔ پھر رک گئی۔ اس نے چاروں طرف ایک بھیڑ دیکھی۔ DE-FOCUS سے اس کی بیوی کا چہرہ ابھرا۔ خوف زدہ چہرہ۔ اس نے بیوی کا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور گلے پر رکھ دیا، گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میرے گلے پر ہاتھ پھیرو۔ دیکھنا سب ٹھیک ہے کہ نہیں۔ کہیں کوئی PART غائب تو نہیں۔ بولو، میرے گلے کا ارتعاش محسوس کر رہی ہو نا۔"
بیوی نے پیار سے اس کے گلے کو سہلایا اور بولی کہ سب ٹھیک ہے۔ ساری نسیں اپنی جگہ قائم ہیں۔ گردن جیسی تھی ویسی ہی ہے۔ ہلکی سی کھرنچ بھی نہیں آئی۔ مگر یہ کیسا پاگل پن ہے؟

"پاگل پن نہیں ہے۔ ان لوگوں نے مجھے چاروں طرف سے نرغے میں لے لیا تھا۔ سب کے سب ہتھیاروں سے لیس تھے۔ وہ سب مجھ سے میری آواز چھین لینا چاہتے تھے۔ لے جانا چاہتے ہیں میری آواز کہ انہیں میری آواز کی ضرورت ہے۔ ہاتھی کے سونڈ جیسی مشین تھی ان کے پاس، اس سے میری آواز SUCK کر رہے تھے مگر انہیں کیا پتہ کہ میرے کلیجے میں حبشی کی آواز ہے۔ گلا کٹ جائے، آواز گھٹ نہیں سکتی۔ دراصل میں مدافعت کر رہا تھا کہ اس آواز کی حفاظت لازمی ہے۔ صدیوں سے اس کی حفاظت کی ہے آج کیسے کسی کو لے جانے دوں۔ جانتی ہو، وہ میری آواز کا استعمال کر کے مجھ جیسا بننا چاہتے ہیں۔ میں کوئی اور ہو جاؤں، کوئی اور میں ہو جائے، ایسا ہرگز نہ ہونے دوں گا۔ دیکھا نہیں جب میں نے اپنی آواز سے ان کے لشکر پر حملہ کیا تو سب کے سب فضا میں بکھر گئے۔ باہر تمہیں لاشوں کے چیتھڑے ملیں گے۔ بہت بڑا CRASH تھا۔ تم لوگوں نے کیوں بھیڑ لگا رکھی ہے۔ جاؤ باہر جاؤ، جا کر دیکھو۔" بیوی نے کہا یہ بھیڑ نہیں ہے یہ سب اس کی بہی خواہ ہیں۔ اس نے بہی خواہوں کے چہروں پر اپنی نظریں گھمائیں اور شربت کا ایک گلاس طلب کیا۔ شربت پی کر اس نے ان سب کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے بروقت اس کی خبر

کیری کی۔

بچپن میں اس کی آواز پھیکی اور بے کیف تھی۔ اکثر اس کی خواہش ہوتی کہ وہ قلزم کی طرح حمد پڑھے اور لوگ اس کی آواز سن کر دم بخود ہو جائیں۔ قلزم کی خوش الحانی پر اسے رشک آتا۔ جب وہ حمد سرا ہوتی تو پوری جماعت پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی۔ مدرسے کے ہیڈ مولوی صاحب آنکھیں بند کیے مبہوت کھڑے سنا کرتے۔ ایک دن حسب معمول قلزم مدرسے کے آنگن میں حمد پڑھ رہی تھی۔

داتا او سنسار کے داتا سب سے اونچا نام تیرا
پیڑ لگانا محنت میری پھول کھلانا کام تیرا

قلزم کی آواز اسے آج ہر دن کے مقابلے میں زیادہ ہی کیف آور محسوس ہو رہی تھی، اس کے اندر کوئی ایسی شئے پھڑ پھڑائی کہ وہ اپنے آپ کو روک نہ سکا۔ اپنی صف سے کود کر باہر آیا اور بڑی سرعت کے ساتھ قلزم کے قریب پہنچا اور اسے دبوچ کر زمین پر گرا دیا۔ اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ ثبت کر دیے۔ آواز بند ہو گئی۔ سارے بچے ششدر اور بھونچکا کھڑے تھے۔ آواز کا سحر ٹوٹا تو مولوی صاحب اس کی اس حرکت پر زور سے گرجے۔ "نا ہنجار، بے ہودہ، چھوڑ دے۔" مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ پھر مولوی صاحب لپکے اور اس کی گردن پکڑ کر زور کا جھٹکا دیا۔ وہ جھٹکا کھا کر دور جا گرا۔ قلزم چیختی ہوئی مولوی صاحب کی میز کی طرف بھاگی۔ مولوی صاحب کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا، مہندی کی شاخ سے تراشی ہوئی چھڑی نکالی۔ اسی اثنا میں وہ زمین پر کھڑا ہو چکا تھا۔ چھڑی دستِ قہار میں تازیانہ جیسی تھی، مگر وہ بڑی بے خوفی سے کھڑا تھا۔ مولوی صاحب جب بالکل قریب آگئے تو اس نے احتجاج کیا۔

"خود نہیں گیا تھا۔ قلزم کی آواز نے بلایا تھا۔ جادو گرنی ہے قلزم۔ اس سے کہئے کہ وہ پڑھتی جائے۔ پڑھتی جائے۔۔۔ پڑھ قلزم۔۔۔ پڑھو۔۔۔" اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں، ہونٹوں پر بدبداہٹ تھی۔ "پڑھو، پڑھو" ادھر مولوی صاحب نے اتنی بیدیں رسید کیں۔۔" تقریباً بے ہوش ہو گیا۔ پھر اسی بے ہوشی کے عالم میں چار لڑکے اسے ٹانگ کر گھر پہنچا آئے۔ اس کی آنکھ کھلی تو اپنے گھر میں تھا۔ چہرہ، گردن، پیٹھ، ہاتھ سب لہو لہان تھے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ بے طرح رویا۔ پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ مگر آج ماں نے بھی اس سے ہمدردی نہیں جتائی۔ مولوی صاحب، ماں، بابا، آخر آج ان سب کو کیا ہو گیا۔ بڑی مشکل سے وہ جانپا کل تک گیا، بدھنے میں پانی بھر کر کسی طرح ہاتھ منہ دھویا پھر اپنے کمرے میں آگیا۔ جزدان سے بڑی کتاب نکالی اور رحل پر رکھ کر قرأت شروع کی۔ اس کی آواز میں حیرت انگیز گونج کی کیفیت تھی۔ آواز سن کر ماں دوڑی آئیں۔ بولیں "یہ کیا ہوا رے۔ تو تو کوئی اور ہو گیا۔ یہ من موہک آواز۔ تو ہی پڑھ رہا ہے بڑی، کتاب!!"

"کوئی اور نہیں ہو گیا اماں۔ میں ہی ہوں۔ یہ میری ہی صدا ہے۔ اب میں اپنی ہی صدا پر سر دھنوں گا اماں، قلزم کی آواز پر نہیں۔ مولوی صاحب ماریں گے پھر، چمڑی ادھیڑ لیں گے" اس کے آنسو زخموں پر مرہم بن کر ٹپ ٹپ کرنے لگے۔ اماں نے دوڑ کر گلے لگا لیا۔ بہت دلار کیا۔ مولوی صاحب کو سمجھا دوں گی۔ اب وہ نہیں ماریں گے۔ قلزم کو دور سے ہی سننا۔ وہ جل ترنگ ہے۔ جل میں کوئی بھی شے چاہے چھوٹی سی کنکری ہی کیوں نہ ہو، پھینکنے سے ترنگیں بکھر جاتی ہیں۔ سب کچھ الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔۔۔ بیٹے۔ دھیان میں رکھنا، چلو دودھ پی لو۔ آنکھیں سوج گئی ہیں تمہاری۔ چھ چھ نہیں روتے۔ آؤ چلو بابا بھی پوچھ رہے تھے۔"

دھیرے دھیرے اس کی آواز ہی اس کی شناخت بن گئی۔ لکچر روم، سیمینار، ریڈیو، ٹیلی ویژن، مباحث ہر جگہ اس کی آواز کا تسلط تھا۔ عمر کی ڈھلتی ہوئی ایک موڑ پر اسے محسوس ہوا کہ اس کی آواز نے دنیا کی ساری آوازوں کو مسحور کر لیا ہے۔ اس کا یہ احساس تبسم بن کر تادیر اس کے ہونٹوں پر قائم رہا۔

جب نوادرات کو مستقبل کے لیے محفوظ کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کی آواز بھی نادر گردانی گئی اور اسے ریکارڈ کر کے آنے والی پیڑھی کے لیے محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اسے نہایت عزت و احترام کے ساتھ ریکارڈنگ کے لیے مدعو کیا گیا کہ وہ اب ایک قومی اثاثہ بننے جا رہا تھا۔ ریکارڈنگ مکمل تو ہو گئی مگر ماہر صدا بندی اس کی آواز سے مطمئن نہ تھا۔ اس کا ریمارک اس کے کانوں تک بھی پہنچ گیا۔ اس کے دل میں ایک کھٹکا سا لگ گیا۔

وہ واپس گھر پہنچا۔ چائے پینے کے بعد اک ذرا لیٹا۔ پھر اٹھ کر شلف سے بالِ جبریل کا ڈیلکس ایڈیشن نکالا اور بہ آواز بلند پڑھنے کی کوشش کی۔ گلے میں خراش سی محسوس ہوئی۔ پھر اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔ مگر کوئی افاقہ نہ پا کر گھبرا گیا۔ بیوی کو آواز دی اور کہا، دیکھو میری آواز مجھ سے چھینی جا رہی ہے۔ بیوی نے ہنس کر ٹال دیا۔ "کچھ نہیں ٹھنڈ لگنے سے ٹانسل سوج جاتی ہے، گرم پانی سے غرارہ کرو ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے ایسا ہی کیا۔ متعدد بار مگر نتیجہ وہی۔ کہیں کوئی واقعی اس کی آواز چھین تو نہیں لینا چاہتا۔ وہم یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔

چند روز بعد ہی اس کے ایک شاگرد کی کتاب کی رسم اجرا تھی۔ وہ تقریب کی صدارت کر رہا تھا۔ صدارتی تقریر شروع کی تو الفاظ آواز ڈھونڈ رہے تھے۔ رہ رہ کر کھانسی آ رہی تھی۔ جملے ٹوٹ رہے تھے۔ کسی طرح تقریر مکمل کی۔ جب نشست پر واپس آیا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس کی نسیں پھولی ہوئی تھیں۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ چہرے سے کرب نمایاں تھا۔ گھر آیا تو بے حد مضمحل تھا۔ اس کی طبیعت کی ناسازی کا سن کر اپنی سسرال سے اس کی آپا بھی آگئی تھیں۔ انہوں نے بھی سمجھایا۔ "بے وجہ ہلکان ہوتے ہو۔ گلے میں نزلے کا اثر ہے جو علاج چل رہا ہے چلنے دو۔ ٹھیک ہو جائے گا اور تم بولتے بھی بہت ہو۔ گلے کو ذرا آرام نہیں۔"

"ہاں! ہاں! بولتا بھی بہت ہوں۔ اس لیے تو مجھ سے میری آواز چھنی جا رہی ہے۔ یہ سب سازش ہے۔ سازشی جانتے ہیں کہ اس آواز میں بلا کی

تاثیر ہے۔ اک ذرا بلند ہوئی تو طنابیں مل جاتی ہیں، خیمے اکھڑ جاتے ہیں۔ میں اپنی آواز کی حفاظت کرنا جانتا ہوں۔"

یہ وہی فیصلہ کن رات تھی جب اس کی آواز سائرن بن گئی تھی۔ اس رات کی صبح ہوئی۔ رات پھر آئی، پھر صبح۔ یوں ہی دن رات صبح نکلتے گئے۔ بیوی نے بہت کوشش کی کہ وہ بولے بات کرے۔ مگر وہ نہیں بولا۔ باتیں اشاروں میں کرتا گویا انگلیاں اس کی زبان بن گئی تھیں۔ گھر کے افراد اس کی اس حالت سے پریشان تھے۔ متعدد ڈاکٹروں نے دیکھا۔ طرح طرح کے نسخے آزمائے گئے۔ مگر اس کا مون نہ ٹوٹا۔

ایک صبح ایک بات ہوئی۔ تڑکے ہی اس کے کمرے میں ایک آواز ابھری "سبحان اللہ، جزاک اللہ، مرحبا" بیوی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بول رہا تھا۔ اس کی بازگوئی کی خبر دینے وہ کمرے سے باہر گئی۔ بچے سب سوئے ہوئے تھے۔ آپا جانماز پر نماز کی آخری رکعت ادا کر رہی تھیں۔ سلام پھیرتے ہی اس نے اس کی بازگوئی کا مژدہ آپا کو سنایا۔ وہ اس کو بولتا دیکھنے کے لیے دوڑ کر کمرے میں گئیں۔ وہ جیسے وجد میں تھا۔ ہونٹوں پر سبحان اللہ، مرحبا کا ورد جاری تھا۔ آپا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے، فرط جذبات میں انہوں نے اس کو آواز دی۔

بھائی!!

چند لمحوں کے لیے وہ اس کیفیت سے باہر آیا۔ اس کی نگاہیں کھلی کھڑکی پر اب بھی مرکوز تھیں۔ آپا سے استفسار کیا۔

"کون تلاوت کر رہا ہے؟"

"سروش۔۔۔" آپا نے بتایا۔

"کون سروش؟"

یاد ہے وہ مدرسے والی قلزم۔ قلزم کی بیٹی ہے سروش۔" آپا بولیں۔

"بنت قلزم۔ سبحان اللہ۔ کل شئی یرجع الی اصلہ۔ ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے چپ سادھ لی۔

ایک انت چپ!!۔

▲▲

غزل

احمد محفوظ

اٹھ جا کہ اب یہ موقع ہاتھوں سے جا رہے گا
یہ کارواں ہے آخر کب تک رکا رہے گا

زخموں کو اشک خوں سے سیراب کر رہا ہوں
اب اور بھی تمہارا چہرہ کھلا رہے گا

یوں تو بہت ہے مشکل بند قبا کا کھلنا
لیکن کھلا تو پھر یہ عقدہ کھلا رہے گا

سرگرمِ ہوا کو دیکھا ہے پاس دل کے
اس آگ سے یہ جنگل کب تک بچا رہے گا

کھلتی نہیں ہے یارب کیوں نیند رفتگاں کی
کیا حشر تک یہ عالم سویا پڑا رہے گا

وقت زوال ہے ہم کھلواڑ دیکھتے ہیں
اٹھیے کہ یہ تماشایوں ہی لگا رہے گا

یکسر ہمارے بازو شل ہو رہے ہیں یارب
آخر دراز کب تک دست دعا رہے گا

حبیب حق

ہوا

ہوا مضطرب سی ہے——
ندی کے اس پار بادلوں کا جھرمٹ ہے
اپنی سونڈیں ندی میں ڈال کر وہ پانی پینے والے ہیں
کئی ایک مچھلیاں ان کی سونڈوں کے ذریعہ بادلوں میں آجائیں گی
اور کل ہم پر من و سلویٰ بن کر برسیں گی

ہوا سے میں کہنا چاہتا ہوں کہ کل کو باد صبا بن جائے
اور میرا پیغام اس تک پہنچاوے
جس کے ہونٹوں کی سرخی شفق نے مستعار لے لی ہے
اور ساری دنیا کو لبھائے پھرتی ہے

پر ہوا تو بادلوں کی تواضع میں پریشان سی ہے

بس ایک یاد

جہاں ہم رہا کرتے تھے آفتاب بس اک سرخ ستارہ تھا
نحیف، نہ تو آنکھیں نہ تو جیوت کا مارا
آنکھیں اس کی کول کول اور پیاری پیاری
سارے دن کپڑوں سے بے پروا لیٹے رہو نیلے پول کے کنارے
نہ تو کھجلاہٹ ہو نہ تو ورم ابھر آئے
بدن ہو جائے تپ کر سنہرا، نجیلا، رسیلا

جب رات آتی اور روپہلے ستارے ایک ایک کر
سرمئی آسمان کو منور کر جاتے
تو ہم ساری دودھیا بتیاں گل کر دیا کرتے
اور پھر چاند جب دھیرے دھیرے اتر آتا ہم تک
کر لیٹ جائے نیلے پول کے کنارے
تو ہم میں سے ہر ایک آگے کو بڑھتا
کہ گلے لگا لے اسے نیلے پول کے کنارے

چاند جس کے لب سرخ تر تھے جذبات کے مارے

روایت

دیو کا دل ننھی سی شکر خور چڑیا کے قلب میں واقع تھا
جو کہ دیودار کے اونچے پیڑ کی پھنگی پر چوں چوں کیا کرتی تھی
دیو کا قلب لٹے ہوئے مخزن کی مانند خالی تھا
اس لیئے اژدر نے جانا کہ دیو کو نابود کرنا اتنا آسان نہ تھا
جتنا کہ شاہ زادہ دل افروز سمجھتا تھا
یوں بھی نہ تو شاہ زادے کو درخت کی پھنگیوں پر چڑھنے کا فن آتا تھا
اور نہ تو اژدر کو کہ اسے اوپر چڑھنے کا سن کر ہی لرزہ طاری ہو جاتا تھا
چنانچہ دونوں گئے اس مکروہ سے پرند کے پاس جس کی چونچ نکیلی تھی
اور پنجے با آسانی کئی ایک شکر خوروں کی جان قبض کر سکتے تھے

میں معصوموں کی جان نہیں لیتا، منحوس سے گدھ نے انھیں بتایا
لیکن، دونوں ایک ساتھ بولے اس کے اندر دیوتا کا دل ہے،
'اس سے کیا ہوتا ہے؟'
'ہوتا یہ ہے کہ اگر وہ باحیات رہا تو ہمیں بے حیات کر جائے گا'
جب دیو نازک سی بچی کو گلے سے اتار کر فرش پر پچھاڑ کھانے لگا

تو اژدر و دل افروز جان گئے کہ گدھ اس قدر منحوس نہ تھا
جس قدر وہ سمجھتے تھے

حبیب حق

دو بلیاں آمنے سامنے فرش پر بیٹھی مونچھوں کو بل دے رہی تھیں
اک نیلی، دوسری پیلی
پیلی فربہ تر، غالباً نر
نیلی کی آنکھیں سبز تھیں
پیلی کی سرخ
(سیاہ آنکھوں والی بلیاں خوں خوار ہوا کرتی ہیں)
اور کمرے سے باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی
ان دو بلیوں کو میں اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا
تاکہ چوہوں کی فوج نیست و نابود ہو جائے

میں نزدیک آیا
اور دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ میں تو خود چوہا ہوں
موٹا تازہ، بھورے بالوں والا، لمبی دم ہلاتا ہوا
اور دونوں بلیاں، جن میں سے ایک نر تھا
میرے تعاقب پر آمادہ ہو رہی تھیں

▲

وہ سو رہا تھا
کھٹ پٹ ہوئی، تختے ہٹائے گئے
اس کا نصف جسم اس کا نہ تھا
خاک کا تودہ تھا
بیلچے سے چھونے پر اس کی آنکھیں کھلیں
پر اس وقت تک وہ سراگرد و غبار سے پاک
سفید پوشاک میں ملبوس
آن کر اس کے برابر لیٹ چکا تھا
پہلو بدلنے کے بجائے اور کوئی چارہ نہ تھا

▲

میں تمہارے حضور اپنی آنکھیں بلوریں طشتری میں رکھ کر لے گیا
چلنا میرے لیے دشوار تھا کہ میری آنکھوں کے حلقے ننگے تھے، میری
جوتیاں شکستہ

تم نے میری جانب دیکھ کر منہ پھیر لیا
اور طشتری پر لات ماردی تھی
(جو کہ غالباً معشوقوں کا طرز ہوا کرتا ہے)

اب میں فرش پر اپنی آنکھیں ٹٹول رہا ہوں
جو کہ نہ جانے کہاں بچوں کی گولیوں کی مانند لڑھک کر غائب ہو چکی ہیں

▲

جب بھی میں اس سے ملا ہوں، اس نے میرے جسم کے ایک حصے کو
مجھ سے الگ کر خود سے چپکا لیا ہے
اور اب تو صورت حال یہ ہے کہ میں بس ایک سایہ سا بن کر رہ گیا ہوں
سارے کے سارے عضو مجھ سے جدا ہو گئے ہیں اور اس کے عضو سے
جا ملے ہیں
اب اس کے دو سر ہیں، چار آنکھیں، چار کانیں، دو ناک، چار ہونٹ
میری بانہیں اس سے جڑ گئی ہیں، اور اس کے پاؤں بھی چار ہو گئے ہیں

لیکن مجھے یقین ہے جلد ہی میری باری آئے گی
اور وہ بہت جلد سایہ سا ہو کر رہ جائے گا، اور میں ایک دوہرا انسان

▲

اپنی آنکھیں حلقوں سے باہر نکال کر اس نے مجھے تحفتاً دیں
پھر تم دیکھو گے کیوں کر پاؤ گے، میں نے دریافت کیا
تمہاری آنکھیں اپنے حلقوں میں سو کر، اس نے جواب دیا
تب میرا کیا ہو گا، میں نے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی
تمہیں کیا ضرورت کہ غور کرو تیرگی عالم پر
میری تصویر، مجھے یقین ہے، تمہارے دل کے نہاں خانے میں رکھی ہے
اور کس شے کی ضرورت ہے تمہیں، اس نے مجھے آگاہ کیا

▲

حبیب حق

بس نازک سا اک پتہ
تیرتا جائے، تیرتا جائے

رنگ پانی میں تحلیل ہوتا جائے
ہوائیں سر کو چومیں
گدگدی لگائیں
بس نازک سا اک پتہ
نہ جانے کب ڈوب جائے

میں لکھتا جا ہوں گا   اور لکھوں گا
الفاظ چاہے ہاتھ نہ آئیں
تتلیوں کی مانند اڑتے چلے جائیں
میں لکھتا جاؤں گا   لکھتا چلا جاؤں گا
اور ایک صبح
جب کہ چڑیوں نے چہکار شروع کی ہوگی
الفاظ ہاتھ باندھے
میری میز کے چاروں جانب
قطار میں کھڑے دیکھے جائیں گے

جب صبح ہو رہی تھی
اور میں اپنے ارادوں کے کمربند کس رہا تھا
کہ لپکتی جھجکتی وہ آئی
آنکھیں ویراں پریشاں مو
تم نے مجھے بلایا کیوں
اس قدر سویرے کہ میں
غازہ پٹی نہ کر سکی
میں کہتا کیا سوائے اس کے
کہ علی الصبح ہی میں کیا کرتا ہوں آغاز
کثافت کو ذہن سے دور کرنے کی

پہاڑوں پر چڑھتے ہوئے
ہر ایک دمکتی روشنی منزل آخر لگا کرتی ہے
چاہے وہ نیچے کو آتی کار
کے ہیڈ لائٹ کیوں نہ ہوں

پہاڑوں سے اترتے ہوئے
ہر ایک اوپر کو جاتے مسافران
یوں لگا کرتے ہیں
جیسے کہ ابھی ابھی بھیڑیے کی گرفت سے ہوئے
ہوں آزاد

مہتاب حیدر نقوی

(آشفتہ چنگیزی کی نذر)

عشق کی آگ کو پی لینا ہے آساں کتنا
پر زیاں جان کا اسمیں ہے میری جاں کتنا

درد تو دل کی رفاقت کے لئے ہوتا ہے
بے سبب لوگ کیا کرتے ہیں درماں کتنا

ہم اسی واسطے خوش ہیں کہ یہ معلوم نہیں
اپنے جینے کے لئے کرنا ہے ساماں کتنا

حاکم شہر کو اسکی خبر ہے کہ نہیں
شہر کی حد میں در آیا ہے بیاباں کتنا

دشت میں آئے ہیں تو دیکھ بھی لیں دیوانے
کتنی وحشت ہے ابھی اور گریباں کتنا

جو بھی ہوتا تھا وہ سب ہو چکا اب دیکھتے ہیں
کس کے حصے میں ہے زخموں کا گلستاں کتنا

ہم بھلا کیسے خود اپنا ہی نشاں ڈھونڈیں بتا
جسم سے باہر کہاں ہے اپنی جاں ڈھونڈیں بتا

تم تو اپنی روشنی میں گھومتے ہوگے کہیں
اپنی تاریکی میں ہم تم کو کہاں ڈھونڈیں بتاؤ

ایسی بے سمتی کے عالم میں بھلا کچھ تو کہو
یہ گلی ، وہ شہر یا سارا جہاں ڈھونڈیں بتاؤ

تم تو رہتے ہو سدا ہی اپنے دل کے آس پاس
پھر کہاں تم کو بھلا اے جان جاں ڈھونڈیں بتاؤ

گر نہیں دیتے ہو تم ہم کو کوئی اپنا سراغ
ہم کہاں اپنے لئے شہر گماں ڈھونڈیں بتاؤ

اہل دنیا دیکھتے ہیں اور حیرانی کے سا
زندگی ہم نے بسر لی ہے آسانی کے سا

اک تمناؤں کا بحر بیکراں تھا اور
کشتی جاں کو بچالائے ہیں آسانی کے سا

ہم کو اس دل کے دھڑکنے کی صدائیں یاد
یہ بھی ہنگامہ گیا اس گھر کی ویرانی کے سا

اے ہوا تو نے تو سارے معرکے سر کر د
صبح فردا دور بیٹھی ہے پشیمانی کے سا

تو نہیں آتا نہ آ ، اے دوست اب تیری طر
ہم بھی چل نکلے ہیں اپنے دشمن جانی کے سا

شفق سوپوری

مگر کسی نہ پوچھا کہاں سے آئے ہو
ادھر کسی نے نہ پوچھا کہاں سے آئے ہو

تو اس میں جانتا ان کی کوئی سیاست ہے
اگر کسی نے نہ پوچھا کہاں سے آئے ہو

تمام رات مرے بارے میں باتیں تھیں
مگر کسی نے نہ پوچھا کہاں سے آئے ہو

اسی لئے ،کہ مرے ساتھ اونٹ گھوڑے تھے
نہ زر کسی نے نہ پوچھا کہاں سے آئے ہو

عجیب لوگ تھے تھا ان کے ساتھ ہی میرا
سفر کسی نے نہ پوچھا کہاں سے آئے ہو

خواجہ جاوید اختر

راز ازل سے ہے یہ برائی کی ہوئی
کھلتے کنول کے ساتھ ہے کائی لگی ہوئی

سائے میں چھت کے بیٹھ گیا ہوں یہ سوچ کر
اک عمر کی ہے اس میں کمائی لگی ہوئی

اک دن یہی فصیل بڑے کام آئے گی
دیکھی ہے جس پہ آپ نے کائی لگی ہوئی

یہ سوچ کر وصال بھی غمگین کر گیا
ہر اتصال سے ہے جدائی لگی ہوئی

جس وقت آسمان کو چھونے چلا تھا میں
پیچھے تھی میرے ایک خدائی لگی ہوئی

ہوا کے دوش پہ جلتا ہوا دیا ہوں میں
میں ترا کون ہوں، اکثر یہ سوچتا ہوں میں

وجود ہوگا مجسّم میرا کبھی نہ کبھی
ابھی تو تیری فضا میں بکھر رہا ہوں میں

یہ کیسے کہہ دوں کہ پہچانتا بھی ہوں اسکو
وہ جس کو ایک زمانے سے جانتا ہوں میں

دعا قبول ہوئی اضطراب باقی ہے
یہی بہت ہے کہ کچھ کامیاب سا ہوں میں

نہ جانے کب میں کنارے پہ جا لگوں جاوید
سوار ناؤ پہ ہوں اور ڈوبتا ہوں میں

عامر حسین سے گفتگو: آصف فرخی

آصف فرخی : عامر حسین صاحب، آپ نے اپنے افسانوں میں نقل مکانی اور ایک سے زیادہ کلچرز کا اثر محسوس کرنے اور رشتے استوار کرنے کو موضوع بنایا ہے۔ کہیں کہیں اس میں آپ بیتی کا رنگ نظر آتا ہے۔ آپ کے افسانوں کے قاری کی حیثیت سے میں آپ کے اپنے پس منظر کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں، جس حد تک اس سے آپ کے افسانوں کو سمجھنے میں مدد ملے۔

عامر حسین : پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ذاتی پس منظر میں جگہوں کا زیادہ اثر ہوا ہے مجھ پر گھروں کا، لوگوں کا، درختوں کا، باغوں کا، جھیلوں کا، یعنی اس طرح کی چیزوں کا۔ اپنی زندگی کے باقی حالات کا اثر میرے افسانوں پر کم ہوا ہے۔ اپنی زندگی کے بارے میں تین افسانے تو لکھے ہیں میں نے۔ یہ نہیں کہوں گا کہ کون سے تین، آپ خود اندازہ لگالیں۔ مگر اتنا بتا سکتا ہوں کہ قریب تیرہ سال کی عمر تک کراچی میں رہا۔ جن میں سے زیادہ تر برس پی ای سی ایچ ایس کے علاقے میں گزرے۔ وہ پس منظر آپ میری کہانیوں میں دیکھ سکیں گے، خاص طور پر LITTLE TALES جس کا ترجمہ فہمیدہ ریاض نے کیا ہے۔ وہ جگہ بالکل میری زندگی کی ہے، حالانکہ وہ حالات میرے نہیں ہیں۔

سوال : اس کہانی کا انداز ایسا ہے کہ اس پر آپ بیتی کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

عامر حسین : جی نہیں۔ سچ بولوں تو آپ بیتی نہیں ہے۔ حالانکہ کئی چیزیں اس میں بالکل سچی ہیں۔ بلی سچی ہے۔ ایک بلی ایسی تھی۔ باکل باورچی سچا ہے۔ دوسرے کردار ایسے ہیں جن کو آپ COMPOSITE کہہ سکتے ہیں۔ تیرہ سال کی عمر تک میں کراچی میں رہا۔ اس کے بعد دو سال تک میں انڈیا میں رہا۔ میں، BLUE MOUNTAINS میں، نیلگری میں، اوٹی میں جو بالکل دوسرا اور مختلف مقام تھا۔ کراچی سے بالکل الگ تھا۔ زبان وہاں پر اردو نہیں تھی۔ تامل تھی۔ تو اگر آپ کلچر شاک (CULTURE SHOCK) کے بارے میں پوچھنا چاہیں تو زندگی میں پہلی بار کلچر شاک مجھے وہاں ملا۔ کیونکہ میرے لیے پاکستان جو کچھ تھا وہ کراچی تھا اور ہندوستان کا مطلب تھا گوالیار، بھوپال، اندور، جس طرح کی جگہوں میں میرا خاندان بسا ہوا تھا۔ وہ جگہیں میرے لیے ہندوستان تھیں۔ ساؤتھ انڈیا تو جیسے ایک بالکل الگ ملک تھا۔ مجھے وہاں پر کافی گھٹن محسوس ہوتی تھی اور اکیلا پن۔ شاید اس اکیلے پن کی وجہ سے یہ تھیم، اکیلے پن کا موضوع میرے لیے بہت اہم ہے، میری کہانیوں کے لیے اہم ہے۔ اپنے گھر کو چھوڑنا، ایک گھر سے دوسرے گھر جانا، ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک شہر سے دوسرے شہر جانا، ذاتی طور پر میرے لیے بہت اہم ہیں، میرے پس منظر کا اہم حصہ ہیں۔

سوال : اکیلا پن اور گھر کو چھوڑ کر جانا، کیا آپ کے ان احساسات اور موضوعات کی ابتداء کراچی سے ہوتی ہے۔

عامر حسین : میرے خیال میں کراچی ہی سے ہوتی ہے۔ کراچی میں اس لیے کہ آس پاس دوست تھے اور رشتے دار تھے۔ اکیلا پن بھی تھا لیکن ان لوگوں کے بیچ ـــــــ مگر جس طرح کا اکیلا پن اوٹی میں محسوس ہوا، جہاں پر میری دو بہنیں تو میرے ساتھ تھیں، وہ بھی اسکول جایا کرتی تھیں، مگر وہ ایک سنسان اور بہت ہی سرد اور بہت ہی چھوٹا سا شہر تھا جس کے بیچ میں بڑا سا تالاب تھا اور مجھے اسکول جانے کے لیے تالاب پار کرکے تین میل جانا پڑتا تھا۔ وہاں کوئی تفریح نہیں تھی۔ صرف ایک چھوٹا سا، پرانا سا سینما تھا جس میں ہم کبھی کبھی ہالی وڈ کی پرانی فلمیں دیکھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک پرانی کولونیل (COLONIAL) لائبریری تھی جس میں سو سال پرانی کتابیں تھیں اور وہ وہاں پر میری سب سے اچھی دوست تھیں۔

سوال : تو اکیلے پن کا یہ پس منظر شروع کہاں سے ہوا۔

عامر حسین : میرے والد کا تعلق سندھ سے ہے۔ حالانکہ ان کے خاندان میں زیادہ تر بیویاں باہر سے لائی گئیں، اس لیے اردو اور فارسی کا بہت گہرا اثر رہا۔ تو میرے والد کے خاندان میں سندھی کے علاوہ سرائیکی بولنے والے اور بلوچ اور افغان بھی ہیں۔ میری والدہ مالوے کی ہیں۔ میرے والد کا آبائی شہر شکارپور ہے۔ میں نے ان علاقوں کا کبھی سفر نہیں کیا۔ اس لیے نہیں کیا کہ وہاں پر اس زمانے میں سخت پردہ ہوتا تھا اور نہ میری والدہ، نہ میری بہنیں پردہ کرتی ہیں۔ میرے والد، ان کے والد اور میں، تین نسلیں ہیں جن کا کراچی شہر سے پیدائشی تعلق رہا ہے۔

سوال : اب آپ اتنے برس کے بعد کراچی آئے ہیں ـــــــ

عامر حسین : اٹھائیس برس کے بعد۔

سوال : تو اٹھائیس برس کے بعد یہ شہر، جہاں آپ کا گھر تھا اور جہاں آپ تنہائی سے بھی دوچار ہوئے، اس شہر میں دوبارہ آنا کیسا لگا؟

عامر حسین : کچھ کچھ جگہیں جو مانوس سی لگتی ہیں اب تک۔ جیسے اپنا پرانا گھر دیکھا، کلفٹن کی ایک دو جگہیں ہیں، فریئر ہال ہے، دیکھا۔ ہوٹل میٹروپول دیکھا حالانکہ اس کا ذرا خستہ حال لگا۔ تو ان جگہوں میں تو۔۔۔ FELT AT HOME، مگر اب یہ ایک شہر نہیں، شاید کئی شہر مل کر ایک شہر بنا ہوا ہے۔ کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں کراچی کے پاس کسی شہر میں ہوں اور کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ جس کراچی کو میں جانتا تھا، وہ بقول اٹالو کالوینو (CALVINO) کے، کوئی نظر نہ آنے والا شہر (INVISIBLE CITY) ہے اسی شہر کے اندر وہ غائب نہیں ہوئی، وہ ابھی تک ہے۔ یہاں پر۔ اور اس کی کچھ آہیں ابھی تک سننے میں آتی ہیں اور ہنسی بھی سننے میں آتی ہے۔

سوال : تو آہوں اور ہنسی کا وہ شہر جو آپ کے خیال میں غائب نہیں ہوا، وہ کیسا شہر تھا؟

عامر حسین : ایک بات میں بتا سکتا ہوں کہ اس شہر میں سکون بہت تھا۔ میرے گھر کے آس پاس۔۔۔ بچوں کے ساتھ کھیلنا، اکیلے کھیلنا، اس میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کرنے کو کم چیزیں ہوا کرتی تھیں اس لیے جو بھی ہم کرتے تھے اس میں مزہ بہت آتا تھا۔ اس وقت باغ بہت خوبصورت ہوا کرتے تھے، لوگ بہت اچھے ہوتے تھے۔

سوال : یہ تو وہ شہر ہو گیا جس کو آپ چھوڑ کر گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ ماضی ایک اور ملک ہے، یا ایک اور شہر ہے۔ اب آپ جس شہر میں لوٹ کر آئے ہیں، وہ بدلا ہوا شہر ہے۔ آپ نے آہوں کا ذکر کیا تو اس شہر میں آہوں کی فراوانی ہے۔ تو اس شہر کو آپ نے کس عالم میں پایا۔

عامر حسین : جی میں ماضی کا نہیں، حال کا شہر دیکھنے آیا تھا کہ کچھ اندازہ لگا سکوں کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا۔ یہ حال کا شہر۔۔۔۔ اس کے بارے میں کچھ تو مجھے پتہ چلتا رہا ہے کیونکہ میرے دوست احباب آتے جاتے رہتے ہیں یہاں سے۔ اور کچھ پڑھنے سے پتہ چلا ہے اور کوئی دو مہینے ہوئے میں نے فہمیدہ ریاض صاحبہ کی کتاب پڑھی کراچی کے بارے میں جس کا مجھ پر کافی اثر ہوا۔ کیونکہ بہت اچھی لکھی گئی ہے۔ مگر اس سے زیادہ، اس میں جو سچائی بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کا اثر ہوا۔

سوال : وہ سچائی آپ کے خیال میں کیا ہے۔

عامر حسین : وہ سچائی یہ ہے کہ ہر طرح کے لوگ اگر ایک دوسرے کے ساتھ سمجھوتا کر کے ساتھ رہنے کی کوشش نہیں کریں گے تو ہم اپنے آپ پر تباہی لاتے ہیں۔ یہ حالات مصنوعی ہیں کسی حد تک اور بنائے جاتے ہیں اور اس طرح کے لوگوں کے ذریعے بنائے جاتے ہیں جو طاقت کی بھوک (POWER HUNGER) کی وجہ سے لوگوں میں کشمکش اور نفرت پیدا کرتے ہیں۔

سوال : مجھے، اس کتاب میں جو ہیئت کا تجربہ کیا گیا ہے، وہ بہت اہم اور معنی خیز معلوم ہوا۔

عامر حسین : مجھے بھی کافی اچھا لگا اس لیے کہ میں ایک ادبی آدمی ہوں، فارم میرے لیے بہت اہم ہیں اور مجھے باہر کے لوگوں کو یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں ایسے ادیب ہیں۔۔۔ حالانکہ آپ لوگ کہتے ہیں کہ کم ہیں لیکن باہر رہتے ہوئے لگتا ہے کہ کافی تعداد میں ہیں۔۔۔۔ جو فارم یا ہیئت کی تگ و دو میں رہتے ہیں اور نئی چیزیں بنانے و پیدا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اور یہ زیادہ تر افسانے میں نظر آیا ہے مجھے اب تک۔ افسانے میں اور نظموں میں۔ لیکن ناول میں ذرا کم۔ فہمیدہ ریاض کی یہ کتاب ناول اور رپورتاژ کے بیچ ہے۔

سوال : آپ نے افسانوں اور نظموں کا جو ذکر کیا ہے، تو ان میں سے کون سی تحریریں آپ کو اہم اور قابل ذکر معلوم ہوئی ہیں؟

عامر حسین : انتظار حسین اور خالدہ حسین کے بغیر تو کوئی جدید اردو پڑھنے والا گفتگو شروع کر ہی نہیں سکتا، کیونکہ ان دونوں نے بہت ہی خوبصورت کہانیاں لکھی ہیں، چاہے آپ ان سے اتفاق کریں یا نہ کریں، ان کے نظریات سے فلسفے سے یا ان کے وژن سے، پھر بھی اردو زبان کے لیے اور پاکستانی افسانے کے لیے جو انہوں نے کیا ہے، اس کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی اور بھی ہیں۔ فہمیدہ ریاض کی کتابیں ہیں۔ آپ نے بہت اچھے افسانے لکھے ہیں، یہ تو اب میں DISCOVER کرتا جا رہا ہوں۔ آہستہ آہستہ ان کا بھی اثر ہوگا۔ الطاف فاطمہ کے کئی افسانے پسند ہیں۔ ناول بھی ان کے دو میں نے پڑھے ہیں، دونوں مجھے پسند آئے۔ شاید "چلتا مسافر" کا پہلا حصہ ذرا کمزور ہے، مگر اس میں کچھ یہی کوشش ہے کہ کہانی مختلف PERSPECTIVE سے بیان کی جائے اور یہ بات مجھے پسند ہے۔ کچھ خطوط میں ہے، کچھ فرسٹ پرسن NARRATIVE میں ہے، کچھ تھرڈ پرسن میں، کچھ تاریخی واقعات کا بھی ذکر ہے، تو یہ سب باتیں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔

سوال : آپ کی ایک خاص ان ناولوں سے رہی ہے جو اس صدی کی ابتدائی دہائیوں میں خواتین نے لکھے اور آپ نے ان پر ایک بھرپور مقالہ بھی لکھا ہے۔ پھر ناول نگار خاتون محمدی بیگم کا حوالہ آپ کے افسانے SWEET RICE میں بھی آیا ہے۔ اردو فکشن کے اس سرمائے کی طرف ہمارے نقادوں نے بالعموم توجہ نہیں دی ہے۔ آپ اس گم شدہ فکشن کی طرف کس طرح اور کس وجہ سے متوجہ ہو گئے۔

عامر حسین : میں بتاتا ہوں۔ قریب چار پانچ سال ہوئے کہ ایک ایڈیٹر جن کا نام MARSHA ROWE ہے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم INFIDELITY کے موضوع پر ایک کہانی لکھ دو۔ پتہ نہیں کیوں میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ میں یوسف اور زلیخا کو لے کر ان کے بارے میں ایک جدید کہانی لکھ دوں جس کا پس منظر پاکستان ہو اور کسی عجیب وجہ سے مجھے حجاب امتیاز علی کی کہانیوں کی یاد آئی، کیونکہ میں نے وہ سال چھ مہینے پہلے پڑھی تھیں، ایسے

ی پڑھی تھیں کیونکہ تھیں سامنے۔ تو میں کتابیں نکالنے گیا تو جو ان کی پہلی کتاب تھی "میری ہمیرنا تمام محبت۔" اس کے لیئے گیا تو میرے ہاتھ ایک اور کتاب پڑ پڑے۔ میں نے نکالی تو وہ محمدی بیگم کی کتاب تھی۔ میں نے دیکھا تو اس کی زبان اتنی شستہ اور صاف تھی کہ میں نے سوچا کہ میں کم از کم اسی وجہ سے اس کتاب کو پڑھ لوں۔ پھر جب میں نے پڑھنا شروع کیا تو ایک اور جو میری تھی کہ COLONIAL زمانے میں ہم کیسے تھے اور ہم کس حد تک COLONIZED ہوئے تھے اور ہمارا ذہن کس حد تک بدلا تھا' تو اس حوالے سے بھی میں نے دیکھا۔ اس سوال سے مجھے خاصی رہی ہے کیونکہ میرے اندر ایک خیال یہ تھا کہ جتنا ہم سمجھتے ہیں یا جتنا ہم سے کہا جاتا ہے' ہم اس حد تک COLONIZED نہیں ہوئے تھے۔ MY INSTINCTS ALWAYS TOLD ME THAT IT WAS NOT SO کچھ اور تھا جو اس کے خلاف تھا۔ جب میں نے محمدی بیگم اور دوسری خواتین کی کتابیں پڑھیں' پھر محمدی بیگم کے شوہر کی بھی کتابیں پڑھیں تو مجھے اپنی تاریخ کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوئیں' جس میں میں نے بہت محسوس کی۔ اس میں تین باتیں اہم تھیں' بلکہ چار' ایک تو تاریخی پس منظر' دوسرا نظریاتی پس منظر' تیسرے زبان کی صفائی اور چوتھی بات ناول کی تعریف۔ ہم سے ہمیشہ یہ کہا جاتا ہے' جس طرح آپ سے بھی بات ہو رہی تھی کہ نقاد کہتے ہیں ناول مغربی صنف ہے اور یہ ساری کتابیں مکمل طور پر ناول نہیں ہیں' کیا یہ ناول ہیں یا یہ ناول نہیں ہیں' ہمارے ہاں ناول ہے یا ہمارے ہاں ناول نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان باتوں کی کس کو پروا ہے؟ ان کتابوں میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ ایک طویل بیانیہ یا LONG NARRATIVE ہے جس پر کسی مغربی ادیب کا یا مغربی کتاب کا اثر نہیں ہے اور اگر اسے ناول کہا بھی جاتا ہے' جو کہ کہا نہیں گیا اور اس کتاب کے سرورق پر بھی "قصہ" درج ہے' تب بھی یہ ایک طویل بیانیہ ہے جس کی ایک ابتدا ہے اور ایک انتہا ہے۔ یہ سب چیزیں تو ہیں۔ لیکن مجھے اس کے علاوہ ایک پوری زندگی نظر آئی۔ اس میں وہ گھٹی ہوئی اور چھپی ہوئی عورت' جس طرح ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمان عورت اس زمانے میں تھی' اس عورت کی زندگی چند ادیبائیں تھیں جو اس گھٹن کا شکار نہیں تھیں اور وہ جدوجہد میں مبتلا تھیں کہ عورت اس طرح شکار نہ بنی رہے اور جب وہ اس طرح کی زندگی کے بارے میں لکھتی تھیں تو ان کی مراد یہ ہوتی تھی کہ عورت اس طرح نہ رہے۔ اور وہ خود اپنی ذہنی آزادی کو اس طرح استعمال کرتی تھیں کہ اپنی بہنوں کو آواز دیں' ان عورتوں کو آواز بخشیں جن کی آواز نہیں تھی۔ پتہ نہیں کون کہہ رہا تھا کہ نذر سجاد حیدر کی تمام ہیروئنیں آئیڈیل کردار تھیں' جس طرح وہ چاہتی ہیں کہ عورتیں ایسی ہوا کریں۔ یہ سن کر پھر میں نے سوچا کہ محمدی بیگم جیسی ادیبہ' جنھوں نے نذر سجاد کو کافی ENCOURAGE کیا' نے تو بہت ہی REALISTIC عورت کا احوال لکھا ہے جو پڑھی لکھی تو تھی مگر اسے اپنے ذہن کو استعمال کرنے سے روکا جاتا تھا یا جھجک محسوس کرتی تھی۔ یہ سب چیزیں،

اور وہ COMPLEX INTERPLAY جو ہوتا ہے ادیب اور اس کے خلق کردہ کرداروں کے بیچ' یہ بہت اہم ہے۔

سوال : ان خواتین ادیباؤں پر ہمارے نقادوں نے کوئی توجہ نہیں دی ہے' لیکن ان کی تحریروں کا ایک بڑا اہم اثر ان کے بعد آنے والی ادیباؤں پر پڑا ہے اور ان کے توسط سے ہم تک پہنچ رہا ہے۔ خاص طور پر عطیہ حسین اور قرۃ العین حیدر کی تحریریں۔ تو کیا آپ کو ان میں کوئی تسلسل نظر آتا ہے۔

عامر حسین : صرف نظر نہیں آتا بلکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ تسلسل ہے۔ کیونکہ رشید جہاں ایک ایسے خاندان کی فرد تھیں جو "تہذیب نسواں" والوں سے قریبی تعلقات رکھتا تھا۔ اس کے بعد ان کے والد نے اپنا ایک رسالہ شروع کیا جس کے آغاز پر محمدی بیگم نے آکر ایک نظم پڑھی۔ رشید جہاں سے عصمت چغتائی بھی بہت متاثر ہیں اور عطیہ حسین بھی۔ سب ہم عمر تھیں اور دس سال چھوٹی تھیں رشید جہاں سے۔ لیکن دونوں نے رشید جہاں کے زیر اثر لکھنا شروع کیا۔ رشید جہاں نے اگر لکھنے کا راستہ اختیار نہ کیا ہوتا تو یہ دونوں اس طرح سامنے نہ آتیں۔ یعنی ان کا براہ راست رشتہ ہے۔ پھر قرۃ العین حیدر کا تو سلسلہ ہی وہ ہے کیونکہ ان کی والدہ نے محمدی بیگم کے قرب میں لکھنا شروع کیا۔ ان کی والدہ کی پھوپھی بھی اسی گروہ سے متعلق تھیں۔ پھر حجاب امتیاز علی تو محمدی بیگم کی بہو تھیں حالانکہ انہوں نے ان کو کبھی دیکھا نہیں تھا۔ تو CONNECTIONS صاف اور واضح ہیں بلکہ......

IT'S ALMOST INCESTOUS, THESE DIRECT CONNECITIONS

قرۃ العین حیدر نے ان کے بارے میں لکھا بھی ہے مگر بائیوگرافیکل حوالے سے۔ عصمت چغتائی کا جو مضمون ہے قرۃ العین حیدر کی بہت برائیاں کی ہیں لیکن ان کی والدہ کی بہت تعریف ہے' اور یہ کہا ہے کہ اپنے زمانے کی سچی ترقی پسند تو وہ تھیں۔

سوال : آپ نے ذکر کیا عطیہ حسین کا۔ ان کا حوالہ بھی اردو والوں کے ہاں کم ملتا ہے۔ حالانکہ اس زمانے کا جو مسلمان ماحول تھا' اس کی جیسی عکاسی انہوں نے کی ہے' شاید ہی کسی اور نے کی ہو۔

عامر حسین : خاص طور سے ان کی پہلی کتاب جو شاید پارٹیشن کے چار سال بعد لکھی گئی' اور وہ تمام مواد جو پروگریسوز استعمال کرتے تھے یا استعمال کرنا چاہتے تھے اور نہیں کرپائے' وہ سب ان کے ہاں ہے اور ایک ایسا فارم جو کسی طرح سے بھی واہیات یا ناپختہ نہیں ہے۔ ان کی زبان اور بیان بھی بہت SOPHISTICATED ہے۔ ان کی دوسری کتاب نے ایک تاریخی لمحے کو بہت ہی خوبصورتی سے گرفت میں لیا ہے۔ عصمت چغتائی کی کتاب بھی اسی زمانے میں لکھی گئی اور وہ تقریباً اسی زمانے کے بارے میں ہے جس زمانے میں لکھی گئی اس لیے اس میں وہ DISTANCE نہیں ہے جو عطیہ حسین کے ہاں اس وجہ سے پیدا ہو گیا کہ وہ بیس سال کے فرق سے لکھ رہی ہیں۔ عصمت چغتائی کی اس کتاب میں ANALYSIS بھی ذرا کم ہے' بلکہ PHENOMENOLOGY

زیادہ ہے۔

سوال : "ٹیڑھی لکیر" کی بات کر رہے ہیں آپ؟

عامر حسین : جی' میں "ٹیڑھی لکیر" کی بات کر رہا ہوں جس کی PHENOMENOLOGY بہت خوبصورت ہے۔ مگر علیہ حسین کی کتاب میں کچھ فاصلہ اور کچھ ٹھنڈک ہے۔

سوال : تقریباً یہی زمانہ قرۃ العین حیدر کی ابتدائی تحریروں کا بھی ہے۔ ان کی ناول نگاری کے بارے میں آپ کیا محسوس کرتے ہیں۔

عامر حسین : چوں کہ میں ان کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں اپنے بچپن سے' اس لیے میں نے بہت ڈرتے ڈرتے ان کی کتابیں پڑھیں اور بڑی عمر میں آکر پڑھیں۔ ایک آدھ چیز پہلے پہل پڑھ رکھی تھی اور مجھ پر ان کا رعب تھا کہ میں ان کی تحریر پڑھ نہیں پاتا تھا۔ ان کی بہت خوصورت کہانی ہے "ڈالن والا" وہ میں نے انگریزی میں پڑھی تھی CHILDHOOD TALES OF AN INDIAN کے نام سے۔ تو اس کے تقریباً دو برس بعد میں نے LITTLE TALES لکھی تو میری کہانی پر اس کا اثر پڑا۔ میں نے قرۃ العین حیدر کی کہانی پڑھی بھی نہیں بلکہ سنی۔ ایک مجلس میں وہ اس کو پڑھ کر سنا رہی تھیں۔ وہاں سے جاکر میں نے اس کا اردو ورژن ڈھونڈا اور پڑھا۔ اس میں بچپن کا مزہ بھی ہے اور ایک طرح سے بچپن کے بارے میں دیو مالائی احساس بھی ہے۔ LARGER THAN LIFE کردار ہیں اور ایک بچہ جو بڑی بڑی آنکھوں سے آس پاس کا منظر دیکھ رہا ہے' وہ مجھے بہت پسند آیا اور مجھ پر اس کا اثر بھی ہوا۔ پھر جب انہوں نے میری یہ کہانی پڑھی تو انہوں نے ایک دم سے کہا کہ وہ اس کا ترجمہ کرنا چاہ رہی ہیں تو میں نے کہا کہ اس کہانی پر آپکا اثر ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا ہاتھ ہے اس کہانی پر تو اپنے بہت ہی مخصوص انداز میں کہنے لگیں کہ ' ہاں ہے' وہ شاید سمجھ گئی تھیں اور شاید نہیں سمجھی تھیں۔ پھر میں نے جب ان کی کہانیاں پڑھیں تو اب میں سمجھتا ہوں کہ ان کی کچھ کہانیاں دنیا کی بہترین کہانیوں میں شامل ہیں۔ مجھے "پت جھڑ کی آواز" بہت پسند ہے۔ مجھے "جلاوطن" بہت پسند ہے۔ "ہاؤسنگ سوسائٹی" کو میں مختصر ناول سمجھتا ہوں۔ فارم کے لحاظ سے "آخر شب کے ہم سفر" بہت پسند ہے کیونکہ ایک بہت ہی مشکل موضوع کو لے کر پیچیدہ طریقے سے پیش کیا ہے جو بہت خوبصورت ہے۔

سوال : میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آپ نے کئی کتابوں کا نام لیا لیکن ان میں "آگ کا دریا" کا ذکر نہیں کیا۔

عامر حسین : میں نے "آگ کا دریا" ابھی تک نہیں پڑھا ہے۔ معاف کیجیے گا' مگر میں اسے ابھی تک ختم نہیں کر سکا۔

سوال : ہمارے ہاں فکشن سے عام طور پر رکھنے والے بہت سے لوگ "آگ کا دریا" کے شیدائی ہیں۔ بلکہ پاکستان میں تو قرۃ العین حیدر کے بہت سے مداح "آگ کا دریا" پر رکے ہوئے ہیں کیوں کہ ہم اسی آگ کے دریا کو پار نہیں کر سکے ہیں۔ اس کے پار کیسے اتریں۔

عامر حسین : شاید اسی لیے میں نے ختم نہیں کی ہے۔ وہ ان کی بھی اپنی پسندیدہ کتاب نہیں ہے۔ کچھ کتابیں انہوں نے میری والدہ کو دی تھیں جو میں نے لے کر پڑھیں۔ ان میں "آخر شب کے ہم سفر" بھی تھی۔ ان کی پہلی کتاب میں نے یہی پڑھی تھی۔ "گردش رنگ چمن" اور "چاندنی بیگم" پڑھی۔ پھر ان کی کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھیں۔ کبھی میں ان سے کسی افسانے کی تعریف کرتا ہوں تو وہ کہتی ہیں کہ نہیں' اس سے تو وہ والا بہتر ہے' تو پھر میں ڈھونڈ کر نکالتا ہوں اور پڑھتا ہوں۔ مگر میں نے پڑھی نہیں ہے' تو یہ کتاب۔ "آگ کا دریا" بھی کسی دن پڑھوں گا۔ "آگ کا دریا" اور "HUNDRED YEARS OF SOLITUDE" اور "یولی سیز" تین کتابیں ہیں جن کے بارے میں سب لوگ' جو اردو اور انگریزی پڑھتے ہیں' وہ ان کے بارے میں بات کرتے ہیں اور یہ تین کتابیں میں نے پوری نہیں کریں' حالانکہ اکثر میرے ہاتھ میں آئی ہیں۔

سوال : یہ تو اردو ادب کی بات ہوئی۔ مغربی ادب کا جو آپ کا مطالعہ رہا ہے' کیونکہ آپ اس سے براہ راست واقف ہیں اور وہاں رہ کر کام کر رہے ہیں تو وہاں کے کون سے ادیب آپ کو...

عامر حسین : وہاں رہ کر اور اس ادب کے اندر کام کر رہا ہوں۔

سوال : جی ہاں' اس روایت کے اندر شامل ہیں۔ تو وہاں کے کون کون سے ادیب جن سے آپ RELATE کرتے ہیں یا جن کی تحریریں آپ کو اہم معلوم ہوئیں اپنے DEVELOPMENT کے حوالے سے...

"عامر حسین : اگر کوئی افسانہ لکھنے والا یا ناول لکھنے والا اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ شروع کرتا ہے تو پہلے تو یہ کہنا پڑے گا کہ وہ اپنی زندگی کے واقعات کے بغیر تو نہیں لکھ سکے گا۔ مگر میں نے جب شروع کیا تو میں بہت زیادہ متاثر ہوا مغربی رائٹرز سے اور انہوں نے ہی مجھے راستہ دکھایا جس پر میں نے چلنا شروع کیا۔ مجھے شروع شروع میں امریکی جنوب (SOUTH) کے لکھنے والے بہت پسند تھے' مثلاً یوڈورا ویلٹی (EUDURA WELTY) مجھے بہت زیادہ پسند تھی۔ ٹینی سی ویلیمز کے ڈرامے بہت پسند تھے اور فلیری او کانر FLANNERY O CONNER اس زمانے میں بہت پسند تھیں۔ اب شاید میرا ذوق ذرا اس طرف سے ہٹ گیا ہے۔ لیکن یہ اکیلا پن کسی پرانے گھر میں جو عجیب چیزوں سے بھرا ہوا ہے مگر اس کے آس پاس زندگی کی رو بھی ہے اور گھٹن بھی ہے' ایک ساتھ یہ دونوں چیزیں اور ان کی کشمکش' یہ SOUTHERN کہانیوں سے میں نے حاصل کیا اور کہانی کہنے کے اس انداز سے' اور اس آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا' اپنی زندگی کو دیکھا۔ اور پھر اپنی زندگی کو تبدیل کیا کیونکہ اس وقت مجھے اپنی زندگی کے بارے میں زیادہ بات نہیں کرنی تھی لیکن اندر کی جو زندگی تھی' IMAGINATIVE اور خیالی زندگی' اس کا بیان شاید میں نے ان سے سیکھا۔ میں نے اس طرح سے لکھنا شروع کیا کہ مجھے تیس سال کی عمر میں معلوم پڑا کہ یہی میرا راستہ ہے لکھنے کا۔ لیکن دو تین سال بعد تک میں نے اپنی

اور نسل کے پاکستانیوں کو یہ بات یاد ہوگی کہ وہ اس طرف سے آئے تھے- اس طرح کی چیزیں ہیں SUBJECTIVE اور OBJECTIVE بھی- ہم میں سے جو لوگ افسانہ لکھتے ہیں' ہمیں معلوم ہے کہ ہم ہمیشہ SUBJECTIVITY کے آئینے میں تاریخ اور سیاست کو دیکھ کر اور کسی کردار کے سانچے میں ڈھال کر بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں-

سوال : اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سانچا بہت اہم ہے-

عامر حسین : میرے خیال میں تو بہت اہم ہے-

سوال : آپ نے اپنی وں کا ذکر کیا- خاص طور پر ایشیا کے ان ممالک سے' اور پھر کتابیں جو پڑھیں' افسانہ نگاروں کا مطالعہ کیا...

عامر حسین : سفر اور سفر بھی بہت کیے ہیں میں نے-

سوال : مطالعہ اور سفر- تو ان سب چیزوں کے باوجود اگر دیکھا جائے تو آپ کا تحریری سرمایہ بہت کم ہے- یعنی آپ نے خاصا ٹھہر ٹھہر کر اور وقفوں کے ساتھ لکھا ہے- اس کا کوئی خاص سبب ہے- کیا یہ شعوری طور پر ہوا ہے-

عامر حسین : شعوری ہی ہوگا- کیونکہ جس وقت یہ ہوتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ لاشعوری ہے اور ہم اسے WRITER'S BLOCK کہتے ہیں یا کبھی کبھی کہتے ہیں- کہ اور چیزیں ہم پر بوجھ بن کر ہمیں لکھنے سے روک رہی ہیں' اور میری زندگی میں یہ بھی ہوا کہ میں نے تنقید بے حد اور بے انتہا لکھی ہے- میرے یہ اہم تھا' میرے ریڈرز کے نہ ہوگا- مجھے لگتا تھا کہ میں ہمیشہ کسی نہ کسی کتاب پر تبصرہ لکھ رہا ہوں' کسی ادیب سے بات کر رہا ہوں' ادب پڑھا رہا ہوں' اردو بھی پڑھاتا ہوں میں' یہ سب بھی چیزیں تھیں- مگر میرے خیال میں جب تک کہانی پہلے ذہن میں' پھر کاغذ پر اور پھر دوبارہ کاغذ پر تیار نہ ہو.... اور برف کی طرح پگھل کر دوبارہ نہ جمے' تب تک مجھے وہ کہانی مکمل نہیں لگتی- اس میں نے کبھی نہیں چاہا کہ میری کہانیاں اس وقت تک چھپیں جب تک کہ میں تیار نہ ہوں- یہ کتاب بھی جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے' میں آٹھ سال تک ان کہانیوں کو لکھتا رہا- آپ ان کہانیوں کو دیکھیں تو یہ زیادہ تر ۱۹۹۱ تک سب ختم ہو چکی تھیں مگر میں نے ۹۲ اور ۹۳ تک کسی ناشر کو نہیں دیں کیونکہ مجھے لگا کہ یہ تیار نہیں ہیں-

سوال : مغرب کے جس ادبی ماحول میں آپ لکھ رہے ہیں' وہاں عام طور پر یہ خیال ہوتا ہے کہ افسانوں کی پہلی کتاب کے بعد' افسانوں کی قدرے معقول کتاب کے بعد' یہ دباؤ سا ہوتا ہے- یا تقاضہ ہوتا ہے کہ ناول لکھا جائے- تو آپ نے کبھی ناول کے بارے میں نہیں سوچا؟

عامر حسین : اس کتاب میں ایک لمبی کہانی ہے جو پہلے ناول تھی' جسے میں نے کاٹ کر ایک طرح سے ناول کو برباد کر کے' اس کی ہڈیوں میں سے' اس کی پسی ہوئی ہڈیوں سے یہ مجسمہ بنایا جو یہ کہانی ہے- اس کہ وہ ناول مجھے خاصی ڈھیلی لگی اور اس میں شاید بہت زیادہ آپ بیتی تھی جس کے بارے میں میں نے سوچا کہ بہت ہی SELF-INDULAGENT ہے اور جس وقت میں نے پہلے

کہانیوں کو چھپوانے کی زیادہ کوشش نہیں کی اور ایک چھپی تو مجھے زیادہ پسند نہیں آئی کیونکہ مجھے لگا کہ یہ شاید DERIVATIVE ہے- لیکن میں اس زمانے میں پڑھتا رہا' نقاد کا کام بھی میں کافی کرتا رہا ہوں اور اس میں فرانسیسی ادب کا کافی اثر ہے- مجھے DURAS بہت پسند ہے- ایک زمانے میں شاید بچپن میں سارتر بہت پسند رہا ہے اور فلسفے کا بھی بہت اثر ہے- اطالوی ادب میں نے اطالوی زبان میں کافی پڑھا ہے- مجھے نٹالا گنزبرگ (GINZBERG) بہت پسند ہے' چیزرے پاویسے PAVESSE بہت پسند ہے- ان سب کا اثر تو نہیں مگر جسے INSPIRATION کہتے ہیں' وہ ان سب سے حاصل ہوا ہے- لیکن مجھے شاید ہمیشہ سے یہ معلوم تھا---- لیکن یہ دوسری بات ہے- مغربی ادب مجھے پسند بھی ہے- اسے پڑھتا بھی ہوں اور پڑھاتا بھی رہا ہوں لیکن بغیر اپنی زبان کے' اور اس زبان کے ادب کے' شاید میں اس طرح نہ لکھ سکتا جس طرح اب لکھتا ہوں اور اپنی زبان کے علاوہ مجھ کو چین اور جاپان اور کوریا اور انڈونیشیا' ان کی کتابوں اور فلموں میں بہت ہے اور ان کا ضرور اثر ہوا ہوگا- میں ان کو دیکھتا رہتا ہوں- میں اپنے آپ کو صرف پاکستانی نہیں بلکہ ایشیا کا رائٹر سمجھتا ہوں-

سوال : یہ بات آپ کے حوالے سے خاصی اہم ہے- مشرقی ایشیا کے جو ممالک ہیں' یہ آپ کی بعض کہانیوں کے پس منظر میں بھی ہیں' بعض کرداروں کا تعلق بھی یہاں سے ہے تو ان سے اور واقفیت کی کیا سطح ہے-

عامر حسین : شاید میں نے کسی زمانے میں کوئی فلم دیکھی ہو یا ہاں سوئن HAN SUYIN جنھوں نے میری کتاب کا پیش لفظ لکھا تھا- ان سے ملاقات بہت پہلے ہوئی تھی' دس سال پہلے میں نے ان کی کتابیں پڑھی تھیں اور ان پر ایک مضمون لکھا تھا جو انھیں بہت پسند آیا تھا اور وہ چاہتی تھیں کہ میں ان کو پبلک میں انٹرویو کروں- تو ان سب چیزوں نے مجھے دکھایا کہ وہ مسائل جنھیں POST COLONIAL کہا جاتا ہے' وہ بہت وسیع تھے اور صرف ہمارے نہیں تھے یعنی برصغیر جنوبی ایشیا کے نہیں بلکہ تمام ایشیا کے تھے اور ایک حد تک وہ POST-COLONIAL نہیں بلکہ POST-INDEPENDENCE یا POST-NATIONALIST تھے- کیونکہ کسی نے کسی حد تک ہر ملک میں جنگ کے بعد ۴۵ سے لے کر ۴۸ تک بہت سی تبدیلیاں آئیں- تو سب پر اثر ہوا اور یہ اثر الگ الگ طرح سے ہوا- لیکن پھر بھی اگر آپ کسی کورین ادیب سے بات کریں جس نے اپنے ملک کا بٹوارہ دیکھا ہو' تو اس میں کچھ ایسا تجربہ ہوگا جسے میں سمجھ سکتا ہوں اچھی طرح سے- ایک واقعہ میرے کورین دوست نے مجھے سنایا تھا کہ اس کے والدین سرحد تک جاتے ہیں ایک مخصوص دن' جس دن اجداد کی روح کو سلام کا دن کہا جاتا ہے' وہ سرحد تک جا کر پکارتے ہیں سرحد کے پار کیونکہ ان کے والدین وہاں اس طرف سے آئے تھے- وہ سرحد سے پار نہیں جا سکتے اس وہاں تک جا کر ان کو یاد کرتے ہیں اور اجداد کی روح کو سلام والے دن سلام کرتے ہیں- یہ بات کئی پاکستانیوں کو' ہماری نسل کے تو نہیں مگر ایک

پہل یہ لکھی تھی' دس اور چھ سال کے بیچ تو میں اس وقت POLITICAL CORRECTNESS کا بھی بہت لحاظ کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے میں تھا کیونکہ لوگ ان چیزوں کے بارے میں بکواس بہت کرتے ہیں اور آپ کو بتاتے ہیں کہ آپ کو کیا لکھنا چاہیئے اور کیا نہیں لکھنا چاہیئے اور شاید ہم لوگ لاشعوری طور پر PROGRESSIVE WRITERS کے پرانے مینی فیسٹو سے بھی کافی متاثر ہیں۔ تو مجھے ہمیشہ یہ خیال تھا کہ اگر میں بورژوا ہوں تو مجھے غریبوں کے متعلق لکھنا چاہیئے' اور برباد زندگیوں کے بارے میں لکھنا چاہیئے۔ لیکن جب میں نے ایسا لکھا تو کبھی شعوری طور پر نہیں کیا۔ جب وہ چیخنے لگے' چلانے لگے' ان کی روحیں تڑپنے لگیں میرے اندر' تب میں نے ان کے بارے میں لکھا۔ میں نے یہ سوچ کر کبھی نہیں لکھا کہ اس طرح لکھنا چاہیئے' اپنے ملک کے بارے میں لکھنا چاہیئے۔ یا ایک بار یہ ہوا کہ میں نے کہانی لکھی جس کا نام ہے YOUR CHILDREN جو خاصی سیاسی ہے اور اسی زمانے میں مجھ سے کہا گیا کہ تصور خدا کے بارے میں کہانی لکھ کر دکھاؤ تو میں نے جو کہانی لکھی' اس کے بارے میں کہا گیا کہ یہ خدا کے حوالے سے نہیں ہے اور تم FUNDAMENTALISM کے بارے میں کیوں نہیں لکھتے۔ میں نے کہا کہ مجھے قطعی کوئی نہیں ہے FUNDAMENTALISM سے' نہ اس کے بارے میں برا لکھنے سے یا اچھا لکھنے سے۔ اسی زمانے میں گلف وار ہوا اور مغرب میں رہتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ان لوگوں نے اسے اسلامی یا مسلمان جنگ کہا' جو وہ قطعی نہیں تھی اور وہی لوگ جو اس میں مسلمانوں کا ساتھ دے رہے تھے وہی مسلمانوں کے خلاف بھی تھے۔ اس میں مسلمان کی جو ایک طرح کی پکار سنائی دی مغرب میں' وہ مسلمان جو کہہ رہا تھا کہ یہ سب میرے خلاف کیا جا رہا ہے' اس کو میں نے سمجھنے کی کوشش کی اور اس آگ میں ایک کہانی لکھی' اور اس کہانی میں' اب پانچ سال ہو گئے اس کو لکھے ہوئے' اس میں شاید اپنی دو اطراف دیکھ سکتا ہوں۔ ایک جو AGNOSTIC اور آزاد خیال ہے اور دوسری جو روایت اور مذہب اور قدیم احساس میں اب تک جکڑا ہے۔ ان دونوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ میں نہ تو اس میں سے پوری طرح پہلا ہوں اور نہ دوسرا۔ لیکن یہ چیزیں مجھ میں پائی جا سکتی ہیں' اور میں ان چیزوں میں اپنے آپ کو پا سکتا ہوں۔ اس کہ یہ چیزیں ہمیشہ میرے ذہن میں چلتی رہتی ہیں' اس میں کم لکھتا ہوں۔ جان کر کم لکھتا ہوں۔ مجھے شوق نہیں کہ میں زیادہ لکھوں۔ اگر میں تین کہانیاں ایک سال میں لکھ لوں تو مجھے لگتا ہے کہ کافی ہیں۔ پچھلے سال میں نے تین یا چار کہانیاں لکھ لیں اس میں کافی خوش ہوں اور اب چھ مہینے سے میں نے کچھ نہیں لکھا۔ اب شاید واپس جا کر کچھ لکھوں۔

سوال : آپ نے ابھی ذکر کیا خلیج کی جنگ کا اور یوروپ میں رہ کر آپ نے اس کے بارے میں ایک نقطہ نظر اختیار کیا۔ اچھا' بعض مرتبہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایشیائی ممالک سے جو لوگ یوروپ گئے ہیں اور انگریزی میں لکھ رہے ہیں' ان کے اوپر ایک خاص قسم کا لیبل لگ جاتا ہے۔ پڑھنے والے اور نقاد اور ریویو لکھنے والے اور ادبی انعامات کا فیصلہ کرنے والے ان کو ایک ہی لکڑی سے ہانک دیتے ہیں۔ کیا آپ کو کبھی اس رویے کا سامنا کرنا پڑا۔

عامر حسین : ہاں' بے انتہا! مجھے کہا گیا یہ سب.... پہلے تو کہا گیا انڈین رائٹر' پھر ساؤتھ ایشین رائٹر' پھر پاکستانی رائٹر' پھر پاکستانی مسلم رائٹر' پھر بلیک برٹش BLACK BRITISH رائٹر' پھر ایشین رائٹر' یہ سب کہا گیا۔ پھر اس کا انحصار موڈ پر بھی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی میں کہتا ہوں کہ میں یہ بھی نہیں ہوں' یہ بھی نہیں ہوں۔ کبھی کہتا ہوں کہ ہاں میں سب ہوں۔ سب ٹھیک ہوں۔ صرف مجھے بلیک برٹش ذرا عجیب لگتا ہے کہ میں اس نسل کا نہیں ہوں جو وہاں پیدا ہوئی' جنھوں نے لکھنا وہاں اور اسی ماحول میں شروع کیا۔ میں تو یہاں کراچی میں تھا تو لکھنا شروع کر چکا تھا اور ہندوستان میں بھی لکھتا تھا۔ میں تو لکھتا چلا آیا ہوں ہمیشہ سے' اور میں نے انگریزی یہاں سیکھی' انگریزی بولنا اور انگریزی پڑھنا یہاں سیکھا۔ برطانیہ آنے سے پہلے۔ اس بلیک برٹش میرے ٹھیک نہیں ہے۔ برٹش جب مجھے کہتے ہیں تو میں ٹھیک سمجھتا ہوں اس کہ میں وہاں پر لکھتا ہوں اور وہاں پر میری تحریریں چھاپتے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ PLEASE, SAY THAT I AM OF PAKISTANI ORIGIN تو یہ تجربہ میرے ساتھ بہت ہوا ہے۔ کبھی کبھی غصہ بھی آتا ہے۔

سوال : اس قسم کے لیبل سے یہ نقصان ضرور ہوتا ہوگا کہ آپ کی کہانیوں کے جو مرکزی موضوعات ہیں ان پر سے توجہ ہٹ جاتی ہے اور لکھنے والے کی کھال کی رنگت زیادہ اہم ہو جاتی ہے کہ اس کھال کا مخصوص شیڈ کیا ہے۔

عامر حسین : آخری تجزیے میں نہیں' اس کہ جن لوگوں نے تشریح اچھی کی ہے یا جن پڑھنے والوں نے میری حمایت کی ہے اور جو لکھنے والے میرے آس پاس ہیں' وہ ان چیزوں کو نہیں دیکھتے۔ خاص طور پر انگریز ادیب۔ جو اچھا انگریز ادیب ہے وہ ہمیشہ اس طرح کہے گا کہ تم جو لکھتے ہو وہ محبت کے بارے میں ہو سکتا ہے یا LOSS کے بارے میں ہو سکتا ہے' تم فراق اور جلاوطنی کے بارے میں لکھتے ہو۔ تم نہ اپنے ملک کے بارے میں لکھتے ہو نہ اپنے رنگ کے بارے میں لکھتے ہو۔ حالاں کہ یہ چیزیں تم میں موجود ہیں اور موجود رہیں گی لیکن تم ان چیزوں کو جو تمھاری ہیں' استعمال کرتے ہو تاکہ تم سچ لکھ سکو۔

سوال : ایک شکایت یہاں کے پڑھنے والوں کو عام طور سے ہوتی ہے' وہ یہ کہ جن لکھنے والوں کا تعلق یہاں سے تھا اور اب انگریزی میں لکھ رہے ہیں وہ ایک خاص قسم کا رویہ اپنا لیتے ہیں جو مغرب کے لوگوں کو زیادہ پسند آئیں۔ یہ میں آپ کے حوالے سے نہیں کہہ رہا بلکہ ایک عمومی بات کہہ رہا ہوں۔ لوگوں کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ پھر انگریزی میں لکھنے کے بعد یہاں کی ہر چیز مضحکہ خیز اور قابل حقارت کیوں معلوم ہوتی ہے۔ غربت' بیماری' ناداری' کرپشن اور یہاں کی سیاسی سماجی حقیقت کا تضحیک کے ساتھ ذکر۔ یعنی صرف وہ کچھ کہنا یا لکھنا جو مغرب سننا چاہتا ہے۔ اس پورے گروہ سے یہ شکایت کی جاتی ہے۔ کیا آپ کو اس بات سے اتفاق ہے۔

عامر حسین : کئی موقعوں پر یہ بات صحیح ہے۔ خاص طور سے آپ شاید وی ایس نائپال (NAIPAUL) کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔ کسی حد تک رشدی نے یہ کیا ہے، لیکن یہ جو PRONOUNCEMENTS ہوتے ہیں لوگوں کے کہ ہم اس یہاں ہیں کہ ہمارا وہاں پر دم گھٹتا ہے، ہم بول نہیں سکتے ہیں اور ہمیں اجازت نہیں ملے گی اور خاص طور پر زبان کے بارے میں کہتے ہیں کہ ہماری زبان چلی گئی اس ہمیں انگریزی میں لکھنا پڑتا ہے، اسی لیئے ہمیں یہاں رہنا پڑتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ باتیں سچ نہیں ہیں۔ آج کل یہ ادیب زیادہ تر مغرب میں اس لیئے رہتے ہیں کہ وہاں اکیڈمک انسٹی ٹیوشنز ہیں ان کو اچھے خاصے وظیفے دیتے ہیں پڑھانے کے لیئے یا پبلشنگ کا نیٹ ورک ہے وہ اچھے خاصے معاوضے دیتا ہے۔ تو آپ ECONOMIC MIGRANTS کی بات کر رہے ہیں۔ ایسے MIGRANTS جو یہاں اسی طرح رہتے ہیں جیسے کوئی ویک اینڈ پر اپنے گھر جاتا ہے۔ اپنے ماں باپ کے پاس رہنے کے لیئے پھر ان سے تھک کر بھاگ جاتا ہے اسی طرح سے کئی ادیب ہیں جو یہاں آتے رہتے ہیں۔ "یہاں" جب میں کہہ رہا ہوں تو میری مراد ایشیا سے ہے، میں ایشیا کی بات کر رہا ہوں۔ یہ ادیب آتے جاتے رہتے ہیں اور پھر واپس مغرب میں جاکر اس غربت کے بارے میں بات کرتے ہیں یہ سمجھانے کے لیئے کہ ہم وہاں کیوں نہیں رہ سکتے۔ وہاں سے ان کی مراد ایشیا ہوتی ہے۔ میرا یہ تجربہ نہیں ہے۔ اس کہ میں سوچ سمجھ کر یوروپ نہیں گیا۔ میں پندرہ سال کا تھا اور میرے خاندان کے لوگ زیادہ تر وہیں جاکر پڑھ رہے تھے، اور پھر ایک طرح سے میں پھنس گیا، اور جب میں نے واپس آنا شروع کیا تب مجھے معلوم پڑا کہ میں ذرا زیادہ دور ہو گیا ہوں، مجھے یہ نہیں معلوم کہ میری جگہ کون سی ہے یہاں پر، حالانکہ ایک طرح سے دیکھا جائے تو میرے دل کے کچھ حصے ہیں یہاں پر۔ مگر میں اپنا دل یہاں مکمل کر سکتا ہوں، نہ وہاں۔ اس مجھے یہ کام کرنے کی ضرورت نہیں کہ مذاق اڑاؤں یا غربت کا ذکر کروں۔ میرا موضوع انسان کا دل ہے۔ شہر کی سڑکیں نہیں ہیں۔

سوال : یہ آپ نے بہت معنی خیز بات کی۔ میں اس فقرے کی وضاحت چاہوں گا۔ آپ کے خیال میں آپ کے افسانوں کا موضوع کیا ہے۔

عامر حسین : ایک زمانے میں میں سمجھتا تھا۔ اس کہ مجھ سے یہ کہا گیا کہ جلاوطنی میرا موضوع ہے، اس کہ EXILE VERY ATTRACTGO TO تھا۔ میں نے یہ ہمیشہ سمجھنے کی کوشش کی کہ کس میری روح اتنی آوارہ ہے اور کس میں انگلینڈ میں کبھی اپنے آپ کو AT HOME محسوس نہیں کر سکوں گا۔ تو میں نے ہمیشہ ان لوگوں کو ڈھونڈا اور ان سے باتیں کیں جو مجھ سے بہت زیادہ اونچے درجے پر جلاوطن ہوئے تھے اور سچے جلاوطن تھے جنہیں بھجوایا گیا تھا، جنہیں دھتکارا گیا تھا، جن پر تھوکا گیا تھا، جو بھاگے تھے... مختلف ملکوں سے۔ اس طرح کے لوگوں سے مجھے ایک طرح کا لگاؤ سا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ اس طرح جلاوطنی میرا موضوع ہے۔ لیکن جب آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں تو میں کہوں گا کہ اور انسان کی انسان سے دغابازی، محبت کی تلاش، خاص طور سے وہ محبت جو جنسی محبت سے زیادہ گہری اور وسیع ہو..... یہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں، حالانکہ میں نہیں چاہتا کہ ایسا ہو، لیکن یہ کہنا پڑے گا کہ میرے افسانوں میں ایک نوحہ ہے۔ وہ نوحہ شاید زندگی اور دنیا کا نوحہ ہے، اور ہم بہت ہی چھوٹے ہیں۔ ہماری زندگی بہت چھوٹی ہوتی ہے۔ ہمارا بدن بہت چھوٹا ہے۔ ہمارا دل بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ کانچ کی طرح نازک۔ وہ جب اس نوحے سے بھر جاتا ہے تو ٹوٹنے لگتا ہے۔ پھر اس نوحے کو کسی نے کسی طرح سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے۔ ◢◢

گزارشات

- شب خون سے متعلق خط و کتابت دفتر شب خون کے پتے پر ہی کریں۔
- شب خون، ہر ماہ کے آخری عشرہ میں پوسٹ کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شمارہ اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ تک نہ ملے تو دفتر کو فوراً عدم وصولیابی کی اطلاع دیں۔
- جواب طلب امور کے لئے ڈاک ٹکٹ لگا ہوا لفافہ یا پوسٹ کارڈ ضرور بھجوائیں۔

کریما

عامر حسین ترجمہ : آصف فرخی

سنو بھائی' وہ کہتی ہے 'تم اردو پڑھ سکتے ہو' پڑھ سکتے ہوں ناں؟ میرے لیئے یہ پڑھ دو۔ یہ تصویر' اس کے نیچے لکھے الفاظ کیا کہتے ہیں؟ اس میں جو آدمی ہے' تم سمجھے' ہاں' نعیم' وہ جھگڑوں کے بعد ڈھاکہ سے کراچی چلا گیا تھا اور وہ بہاری ہے' اس کے ماں باپ کیمپ میں تھے اور اب اس کو دیکھ لو' کتنا بڑا اسٹار بن گیا ہے اور کیا اچھا گاتا ہے۔ میں نے اسے ٹی وی پر دیکھا ہے اور ہمیشہ اس کے کیسٹ بھی سنتی ہوں۔ کیا وہ و۔میلی آرہا ہے؟ نہیں' میں وہاں نہیں جا سکتی۔ نہیں' بس اتنی سی بات ہے کہ وہ میرے شہزاد جیسا ہے۔

(کریما۔ وہ سامنے والی دکان میں کام کرتی تھی۔ میں وہاں شام گئے جاتا تھا' لکھتے لکھتے یا سوچتے سوچتے تھک جاتا تو سگریٹ کا پیکٹ خریدنے وہاں چلا جاتا۔ مجھے پتہ نہیں کہ آغاز کیسے ہوا لیکن ایک رات ہم باتیں کرنے لگے اور جلد ہی وہ اپنے خط لکھوانے کے لیئے میرے پاس آنے لگی۔ کبھی کبھار کراچی یا پنڈی میں کسی کے نام اور کبھی' مگر بہت کم' ڈھاکے کے کسی پتے پر' اس کے خط کا مضمون ہمیشہ وہی ہوتا۔ میں ٹھیک ہوں' محنت بڑی ہے' افسوس کہ اس مرتبہ زیادہ پیسے نہیں بھیج سکتی' میں گھر نہیں آسکتی' اس سال بھی نہیں' بچو کیسا ہے؟ اب تک تو خوب بڑا ہو گیا ہوگا۔ اس کا اپنا کوئی پتہ نہیں تھا اس لیئے جوابی ڈاک ہمارے پتے پر بھیجی جائے اور پھر بالکل آخر میں وہ شہزاد کی خیر خبر پوچھتی۔)

شہزاد میرا بیٹا تھا' وہ کہتی ہے' اس وقت پیدا ہوا جب میں خود بھی لڑکی سی تھی۔ اس کا باپ بادشاہ کہلاتا تھا۔ مجھ سے ذرا بڑا ہوگا۔ مگر وہ پہلے ملک میں پیدا ہوا تھا' پٹنہ میں' جب اس کے ماں باپ اور میرے ماں باپ وہاں سے گئے نہیں تھے اور طاقتور لوگوں نے دیس کا بٹوارہ نہیں کیا تھا۔ میں تو ڈھاکہ میں پیدا ہوئی تھی۔ میں تو سدا سے اس کو جانتی تھی' سدا سے جانتی تھی کہ میری شادی اسی سے ہوگی۔ اس کے ماں باپ کی کریانے کی دکان تھی مگر وہ کمینک تھا۔ وہ بہت محنت کرنے لگا تھا۔ جب میری اس کے ساتھ شادی ہوئی' ماں اور چھوٹے بھائی کی دیکھ بھال بھی وہی کرتا تھا۔ اس نے باپ کی دکان بیچ دی اور اس پیسے سے اپنا کاروبار جما لیا۔ ہم اچھے طریقے سے رہتے تھے۔ مجھے کام نہیں کرنا پڑتا تھا' حالانکہ پاس پڑوس کی کتنی ساری عورتوں کو کرنا پڑتا تھا اور بعض پڑوسنیں مجھ سے حسد کرتی تھیں۔ شام کو میں بھڑک دار رنگ کی تازہ دھلی ہوئی سوتی ساڑھی باندھ لیتی اور بالوں میں سفید یا سرخ پھول گوندھ لیا کرتی۔ کبھی کبھی وہ رکشہ میں بٹھا کر مجھے سینما دکھانے لے جاتا۔ سب مجھے چھیڑا کرتے' بعض مرتبہ تو بدتمیزی پر اتر آتے جب میرا مرد سامنے نہیں ہوتا تھا۔ لوگ ہمیں ' شاہی خاندان' کہنے لگے تھے اس لیئے کہ ہم اچھا کھاتے تھے اور ہمارے چہروں پر خوشی ہوتی۔ ہمارے اپنے لوگوں میں سے کوئی بھی چادر سے زیادہ پاؤں نہ پھیلاتا تھا لیکن بس ہم کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ ہم حد سے باہر نکل گئے ہیں' اور جب میرا بیٹا پیدا ہوا تو میں نے اس کا نام شہزاد رکھا اس لیئے کہ میں سوچتی تھی کہ بادشاہ کا بیٹا شہزادہ ہی تو ہونا چاہیئے' اس لیئے کہ میں لوگوں کے طعنوں کو اپنے لیئے دعاؤں میں بدل لینا چاہتی تھی' اس لیئے کہ میں چاہتی تھی کہ اس کی تقدیر ہم سے سوگنی زیادہ اچھی ہو۔ اس کا باپ چاہتا تھا کہ ہم کراچی چلے جائیں۔ اصل کمائی تو وہیں تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ لوگ شروع ہی میں وہاں چلے گئے ہوتے' وہ کہتا تھا۔۔۔ وہاں کے لوگ ہماری زبان بولتے ہیں' وہیں پر اصلی پاکستان ہے۔ یہ بنگالی' وہ کہتا تھا کہ اس کی سمجھ میں ان کی بات ہی نہیں آتی تھی۔ ہم گھر میں ہمیشہ اردو بولتے تھے۔ وہ یہ زبان لکھ پڑھ بھی سکتا تھا۔ مگر میری سمجھ میں اس کی بات نہیں آتی تھی۔ شاید میری عمر بہت کم تھی' اور میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئی تھی' مجھے تو بس اسی جگہ کی خبر تھی' میں تو بنگلہ اپنی زبان کی سی روانی کے ساتھ بول سکتی تھی۔ یہاں کے لوگ بھی اپنے جیسے لگتے تھے۔ لیکن یہ تو مردوں کی باتیں تھیں اور بڑے بوڑھے' جن کو پرانا ملک یاد تھا' ان کو کسی بہتر زمانے کی یاد تھی اور وہ ہم کو بتایا کرتے تھے کہ ہم کو اس نئے ملک تک لے کر آنے میں انھیں کیا قربانیاں دینی پڑیں' یہ ملک جہاں ہم امن و سکون کے ساتھ اپنے عقیدے پر قائم رہ سکیں۔ امن و سکون کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکیں۔ لیکن امن و سکون بھی کیسا؟ میرا بیٹا دو سال کا تھا جب گڑبڑ شروع ہو گئی۔ شاید میرے شوہر کو اپنے ملک سے اتنی شدید محبت نہیں کرنا چاہیئے تھی۔ اس لیئے کہ اچانک اب مشرقی پاکستان اس کا ملک نہیں رہنے والا تھا۔ ملک اپنا نام بدل رہا تھا۔

(کریما' ان محرور عورتوں میں سے ایک ہے جن کا بدن اور ناک نقشہ

آبنوس کے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ بال کھول لیتی تو لگتا کہ گھٹا اُمڈ آئی ہے۔ وہ ڈھاکے کی تیز، تیز بہاری اردو بولتی تھی لیکن جتنے عرصے میری اس سے ملاقات رہی، اس میں بنگالی لہجہ حاوی ہوتا گیا اور انگریزی الفاظ کی مقدار بھی بڑھ گئی۔ اس کی عمر اب کیا ہوگی؟ کیا وہ واقعی تینتیس سال کی تھی جب ہم سے پہلی بار ملنے آئی تھی، بہت برس پہلے، جب ہم نے کاغذات تیار کرنے میں اس کی مدد کی تھی، جب اس کے آدمی نے اسے تھپڑ مار دیا تھا، اور ان تمام مواقع پر جب زندگی اس کے لیے ناقابل برداشت ہونے لگتی تھی؟ یا تقریباً۔۔۔ اس لیے کہ زندگی کبھی بھی کریما کے لئے ناقابل برداشت نہیں ہوگی۔ میں نے مکان تبدیل کرلیا اور اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا، میری زندگی اب مجھے اکثر اس کی طرف لے کر نہیں جاتی۔ مسلم دشمن کتابچے، بی جے پی، فرقہ پرستی اور بنیاد پرستی، خلیجی جنگ کے بارے میں جاں گاہ مایوسی۔۔۔ اپنی تحریروں کا کمپیوٹرائزیشن، مشین فوکو کی تحریریں پڑھنے میں ناکامی، دریدا اور ساختیات شکنی کی ناپسندیدگی اور پھر بھی میری کہانیوں نے میرے لیے گھر واپسی کا کرایہ تک کما کر نہیں دیا۔ ذرا سا بھی وقت فالتو نہیں کہ کریما کے لیے خط لکھ سکوں۔ مایا کو کبھی کبھار وہ شیلٹر میں نظر آتی، سال میں دو مرتبہ عید کے دن اپنے آدمی کو لے کر کمیونٹی سینٹر آتی اور بچوں کی نگہداشت میں ہاتھ بٹاتی اگر اسے اپنی دکان میں آدھی آدھی رات تک کام نہ کرنا ہوتا۔ لیکن پھر مایا نے شیلٹر چھوڑ کر میڈیا کی نوکری کرلی اور زندگی اب اسے اکثر اس طرف لے کر نہیں جاتی۔

(کریما۔۔ وہ اتنی آزادی سے باتیں کرتی کہ کبھی کبھار تو میں ہکا بکا رہ جاتا۔ لیکن ایسی باتیں بھی تھیں جن کا وہ ذکر ہی نہیں کرتی تھی۔ میں نے بہت کچھ دیکھ رکھا ہے، وہ کہتی، اور خاموش ہو جاتی۔)

بھائی، مجھ سے نہ کہنا کہ میں تم کو کیمپ کے بارے میں بتاؤں، وہ کہتی ہے، تم آخر مجھ سے بھلا یہ توقع کیوں کرتے ہو کہ میں اس کے بارے میں کچھ یاد رکھوں گی؟ لوگوں کی بھرمار، غلاظت، بھوک، شکایتیں کرتے ہوئے لوگ۔ ہمارا سب کچھ چھن گیا تھا۔ بعد میں، دوسری عورتوں کے ساتھ میں بھی شہر میں چھوٹی موٹی چیزیں بیچنے جانے لگی۔ پنسلیں، پرندوں کے پر، جو چیز بھی ہمارے ہاتھ لگتی۔ جب کہ ہمارے مرد شہر کے کارخانوں میں کام ڈھونڈنے لگے، وہ کام کرنے لگے جو اس دولت مند شہر کے مرد کبھی نہ کرتے۔ لوگ ہمیں، مہاجر، کہتے تھے۔ لیکن ہم بھلا مہاجر کیسے ہو سکتے تھے؟ جس واحد جگہ کو ہم نے اپنا گھر سمجھا تھا اگر وہ بھی ہمیں دربدر کردے اس لیے کہ اچانک ہم، غیر ملکی، ہو گئے تھے تو آخر ہم یہاں پاکستان میں غیر ملکی کیسے ہو گئے کہ ہم تو اس ملک کے رہنے والے سمجھے جاتے تھے۔ یہاں بھی بے گھر، وہاں بھی بے گھر۔ کبھی کبھی تو ان کیمپوں میں بسی ہوئی گوبر کی بو میرے نتھنوں میں سما جاتی ہے اور میں اسے خوف کی بو سمجھ کر پہچانتی ہوں۔

پاکستان زندہ باد۔ وہ یہی الفاظ چیخ رہا تھا۔ جس وقت وہ پڑا ہوا مر رہا تھا، میرا مرد۔ ڈھاکہ کے وہ آخری ہولناک دن۔ میرا لڑکا دو سال کا تھا۔ پہلے سمندر پار سے پنجابی سپاہی آئے تو شہر کے کونے کھدروں میں لوٹ مار کرنے لگے، لوگ یہی کہتے تھے اور لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ بنگالیوں اور بہاریوں دونوں کو اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ جانا چاہیئے۔ پھر قتل عام کی سنی سنائی باتیں تھیں۔ طالب علم، کسان، راہ گیروں کا قتل۔ لیکن بادشاہ کہتا تھا کہ یہ سپاہی ہمارے دوست ہیں اور ہمیں ان خون آشام بنگالیوں سے بچانے کے لیے آئے ہیں۔ پھر تو پڑوسی بھی ہمارے مخالف ہو گئے۔ وہ شروع سے مجھ سے پیار کرتے آئے تھے۔ میں نوجوان تھی، خوبصورت تھی، کھانا پینا ان کے ساتھ مل بانٹ کر کرتی تھی اور ان کی چھینز چھاڑ پر برا نہیں مانتی تھی۔ میں پیلا رنگ بہت پہنتی تھی اس لیے وہ کہتے کہ میں بہار کے موسم جیسی لگتی ہوں اور مجھے بسنتی کہہ کر بلاتے تھے۔ لیکن اب ان کے چہرے بدل گئے۔ ناپاک بہاریو، وہ کہنے لگے، اپنے ملک واپس جاؤ ورنہ ہم تم سے نمٹ لیں گے۔ اس دن ان کا ایک گروہ وہاں آیا، لمبے چوڑے، سارے مرد۔ ان میں سے کچھ تو ان عورتوں کے لڑکے تھے جن کو میں جانتی تھی۔ دفع ہو جاؤ، دفع ہو جاؤ، جاؤ اپنے قاتل پنجابی آقاؤں کے پاس جاؤ، وہ چیخنے لگے۔ لیکن ہم تو کسی کو نقصان نہیں پہنچا رہے، یہ تو ہمارا اپنا گھر ہے، میرے مرد نے بنگلہ میں کہا۔ تو پھر کہو، جوئے بانگلہ، جوئے نکتی باہنی۔۔۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ان میں سے ایک نے مجھے باریک ساڑھی میں اور چیختے ہوئے بچے کو گود میں لے کر دبکتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور وہ میری طرف بڑھا۔ بادشاہ جیسے پاگل ہو گیا۔ باہر نکلو، غدار بنگالیو، وہ اردو میں چیخنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی بوتل تھی۔ یہ پاکستان ہے۔ پاکستان زندہ باد۔ میں پاکستان میں جیوں گا اور پاکستان میں مروں گا۔ تو پھر مرو، اس شخص نے کہا جو مجھ پر حملہ کرنا چاہتا تھا، اور اس نے میرے مرد کو جلا ڈالا۔ میں قسم کھاتی ہوں اس نے یہی کہا۔ جلتے ہوئے گوشت کی بو اب تک میرے دماغ میں سمائی ہوئی ہے۔ میں نے اپنے بادشاہ کو آگ کے شعلوں میں بھسم ہوتے ہوئے دیکھا اور چیختے ہوئے سنا، پاکستان زندہ باد۔ اس نے مجھ سے کہا کہ بھاگو۔ کم از کم مجھے تو یہی لگتا ہے کہ اس نے کہا ہوگا۔ کیوں کہ ان حرامیوں نے بھی مجھے جانے دیا اور ان میں سے ایک نے اردو میں کہا، بچہ اٹھاؤ اور بھاگو۔ پھر میں نے یہی کیا۔ جلتے ہوئے گھروں کے شعلوں میں سے، جلتی ہوئی لاشوں کے سامنے سے اور بے شری کے دھوئیں میں چھپے ہوئے آسمان کے ستاروں تلے، بھائی کے ہاتھوں بھائی کا گلا کٹنے کے عین بیچوں بیچ میں بھاگی۔ جہاں خدا مجھے لے گیا۔ وہ خود بھی رو رہا ہوگا۔ یا شاید اس نے منہ پھیر لیا ہوگا اور اس کا کیا قصور اگر اس کی مخلوق یہ سب کرنے لگے؟

اس کے بعد مجھے پاکستان کی طرف روانہ ہونے والے جہاز کا سفر یاد ہے۔ اپنی ساس اور شوہر کے بھائی کے ساتھ کیمپ کی یادیں دھندلا گئی ہیں لیکن اس کے ساتھ واقع شہر خشک اور رات کے وقت خنک تھا، اس کا رنگ خاکستری تھا، اس طرح کا سبز نہیں تھا، جیسا سبز اور نم ڈھاکہ تھا جہاں سورج سردی کے موسم میں بھی آپ کو سینک کر رکھ دیتا ہے۔ یہ احساس، آگ اور برف، میری ہڈیوں کو اچھی طرح یاد ہے۔ ظاہر ہے اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ قسمت ٹھٹھہ ہے

قصوں کی طرف سے جاتے گی۔ میں کچھ سوچتی بھی تو اپنے غم اور زندہ بچ جانے کے بارے میں، اور جب میرے ہوش و حواس ٹھکانے آنے لگے تو میں نے اپنے بچے کے مستقبل کے بارے میں سوچا۔ اس لیئے جب میرے شوہر کا بھائی رحیم نظروں میں طلب لیئے میری طرف دیکھنے لگا تو میں بھی اس کی طرف دیکھنے لگی۔ میرے چاروں طرف جو عورتیں تھیں ـــــ ان میں سے زیادہ تر کو مردوں کے بارے میں مجھ سے کہیں زیادہ معلوم تھا، بازار جاتیں تو ساڑھی ایسے کس کر باندھ لیتیں اور گاہکوں کی طرف دیکھ کر مسکراتیں، آنکھ مارتیں ـــ میرے چاروں طرف موجود عورتوں نے مجھے بتایا کہ تمہارا اس سے بھی برا حشر ہو سکتا ہے اور پھر اس آدمی کا میرے بیٹے سے خون کا رشتہ تو تھا۔ وہ مجھ سے چھوٹا تھا، کم از کم تین سال چھوٹا۔ مجھے اس کی بچھڑے جیسی آنکھیں یاد ہیں، اور میل کی پپڑیوں بھرے گھٹنے اور سنے ہوئے پاؤں جب میں اس کی ماں کے گھر دلہن بن کر آئی تھی۔ اس وقت بھی وہ میرے لیئے چنبیلی کی کلیاں اور کچے پکے امرود لایا کرتا تھا۔ اب اس نئے ملک میں، پہلی بار میں نے اسے مرد کے روپ میں دیکھا۔ ہم نے بہت کچھ دیکھ لیا تھا، ہماری نظریں بدل چکی تھیں۔ عمر رسیدہ ہو گئی تھیں اور پھر میری عمر ہی کیا تھی۔ یہی اکیس سال، میرا مرد مر چکا تھا، میرا بچہ بول نہیں پاتا تھا اور بس یہ میرے بے ہنر ہاتھ جن کے سہارے مجھے جینا تھا، اور جوان خون کی بھی اپنی ضرورتیں ہوتی ہیں، تم جانو بہن اور میرے شوہر کا بھائی رحیم دیکھنے میں اچھا تھا۔ لیکن میں اپنے بادشاہ کو کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔

تو پھر میں نے دوسری شادی کرلی۔ ظاہر ہے کہ میری ساس خوش نہیں تھی لیکن پہلے پہل میں سمجھی کہ میری خوشی کا لمحہ اس کے لیئے بیٹے کی موت کا صدمہ تازہ کر گیا ہے۔ میں سمجھی کہ پوتے کا ساتھ اس کا صدمہ مندمل کردے گا اور ایک مرتبہ پھر، ایک نئے شہر میں ہم اس کے لیئے خاندان کی موجودگی اور ایک نئی زندگی کا احساس پیدا کردیں گے، کمزور ہی سہی۔ اس لیئے کہ اب ہم کراچی میں تھے، میرے تصور سے بھی بڑا شہر، جس میں اونچی اونچی عمارتیں اور بدبودار اونٹ اور قریب واقع سمندر کی نمکین، باسی بساندھ ہمارے نتھنوں میں گھسے جاتی، اس کو بھرے جاتی۔ میرے شوہر کا بھائی جو اب میرا شوہر تھا، مجھے ایک مرتبہ سمندر کنارے کلفٹن لے گیا جہاں دھات کے گھوڑوں پر جھولے کی سواری تھی اور پنجابی لباس پہنے ہوئے آدمی نمک لگی اور بغیر چھلی مونگ پھلیاں بیچتے تھے اور سنہری بالوں والے بچے اپنی ماؤں کے کپڑے پکڑ کر کھینچتے تھے۔ میں اک گھنٹے تک خوش رہی، لیکن پھر مجھے رونا آنے لگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ رونا اس وجہ سے تھا کہ مجھے بادشاہ کی کمی محسوس ہو رہی تھی جو مجھے گھمانے اور سیر کرانے لے جاتا تھا، یا اس لیئے کہ چاروں طرف موجود بھاری بھرکم مردوں کی موجودگی نے مجھے ان پنجابی سپاہیوں کی یاد دلادی جن کو میں نے ڈھاکہ میں دیکھا تھا، یا پھر اس لیئے کہ اتنے سارے اجنبی لوگوں کے درمیان میں نے اپنے آپ کو عجیب اور پردیسی اور مفلس پایا۔ ہم بہت پست قد اور دبلے اور سانولے تھے اور جو اردو ہم بولتے تھے وہ یہاں کے لوگوں کے لیئے اجنبی تھی، وہ ہماری بات ہی نہیں سمجھ پاتے تھے حالانکہ ہم جانتے تھے کہ ہم ان ہی کی زبان بول رہے ہیں اور ہم ان کی بات صاف سمجھ لیتے تھے۔ بنگالی لوگ، وہ ہم کو کہتے، جب کہ ہم بہاری اور پاکستانی تھے، ہم اپنے آپ کو اس طرح سمجھتے تھے حالانکہ ہم نے کبھی بہار دیکھا بھی نہیں تھا اور پاکستان ہمارے لیئے نیا تھا، اور میرے پیٹ میں رحیم کا بچہ تھا اور بھاری پیٹ مجھے بہت رلاتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں، مجھے معلوم تھا کہ میرے لڑکا ہوگا۔ جب میرا دوسرا بیٹا پیدا ہوا تو اس کے باپ نے اس کا نام حبیب رکھا لیکن دل ہی دل میں، میں اسے بادشاہ کہتی آئی ہوں، اس کے تایا کے نام پر جو اس کا باپ بھی ہو سکتا تھا، اور جب اس کی دادی اسے "بچہ" کہہ کر پکارنے لگیں تو میں یہ سوچا کرتی کہ ہم دونوں میں اس کے لیئے ایک خفیہ نام مشترک ہے، اور یہ کہ ہمارے بچھڑے ہوئے نے اپنی نشانی بھیجی ہے۔

رحیم نے ڈیفنس سوسائٹی کی ایک کوٹھی میں ڈرائیور کے طور پر کام شروع کردیا اور جوں ہی میں بچہ کا دودھ چھڑا سکی میں بھی اس گھر میں کام کرنے لگی، آیا گیری، استری، سینا پرونا اور بیگم صاحب کی چھوٹی موٹی ضرورتوں کا خیال۔ کئی برس تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ میری ساس میرے لیئے ظالم تھی مگر مجھ سے بڑھ کر وہ میرے بڑے بیٹے کے حق میں ظالم تھی۔ وہ غصے کے مارے آسمان سر پر اٹھا لیتی، اس پر چیختی چلاتی، طرح طرح کے الزام لگاتی۔ اس کا طیش اس وقت انتہا کو پہنچ جاتا جب وہ اس پر الزام لگاتی کہ اس کی بدولت خاندان پر تباہی آئی ہے اور وہی اپنے باپ کی زندگی کھا گیا۔ جیسے بڑھیا کو تو یاد ہی نہیں رہا کہ دو سال کا بچہ تھا جب اس کا باپ مرا اور یہ اوپر والے بڑے لوگ تھے جو اکٹھا ہو گئے تھے کہ ملکوں کو تقسیم کرلیں اور بھائی کو بھائی کے خلاف کردیا کہ ایک دوسرے کے گلے گھونٹ ڈالیں اور بہنوں کی کوکھ نوچ کر رکھ دیں۔ آج بھی بنگلہ دیش سے ہمارے رشتہ دار ہمیں خط لکھتے ہیں، التجائیں کرتے ہیں کہ پیسے بھجوا دو۔ اپنے پاس بلوالو، کسی طرح کراچی بلوالو، دبئی بلوالو، لندن بلوالو ـــ کہیں بلوالو۔ اور خدایا تیرے یہ سیلاب اور طوفان، یہ کسی کو نہیں بخشتے مگر یہ ہم غریبوں پر بڑے مہربان ہیں!

ہم پر مصیبت کے نئے دن آگئے۔ رحیم کی تھکن، اس کا یہ احساس کہ وہ اپنے بھائی کے خوابوں پر پورا اتر نہیں سکا ہے، اور اس نئے ملک سے اس کی مایوسی جہاں وہ زینے کے نیچے دو چھوٹے چھوٹے کمروں میں رہتا تھا اور احاطے کے سارے نوکروں کے لیئے غسل خانہ، پاخانہ ایک ہی تھا، ان سب نے اسے اس بچے سے اس کا دل پھیر دیا جو اس کا اپنا نہیں تھا اور جو شاید اسے بڑے بھائی کی یاد دلاتا تھا، جو اس مفلسی میں ایک عدد اور تھا کہ اس کا پیٹ بھرا جائے، تن ڈھانپا جائے اور اسکول میں پڑھایا لکھایا جائے۔ میرا اصرار تھا کہ اپنے باپ کی طرح شہزاد بھی پڑھنا لکھنا سیکھ لے، اس کا باقاعدہ کوئی پیشہ ہو اور کم از کم اسی طرح اپنے باپ کے خوابوں کے مطابق جی لے، چاہے وہ بھی اس سے آگے نہ بڑھ سکے جہاں تک اس کا باپ پہنچ گیا تھا۔ ہم نے تو ہمیشہ یہی سنا تھا کہ یہ مال دولت کا دیس ہے، یہاں بڑے مواقع ملتے ہیں لیکن رحیم کا خیال تھا کہ ہمارے

پاس بس ایک بچے کی گنجائش ہے اور یہ ایک ہی بچہ' اس کا اپنا بیٹا ہوگا۔ مجھے ایسا لگا کہ بچہ بھی مجھ سے چھنتا جا رہا ہے۔ میں سارا دن کام کرتی اور بچے کو اس کی دادی رکھتی۔ ماں جی کے دل میں بھی رحیم کی طرح ساری محبت بچہ کے لیئے تھی۔ وہ اسکول سے واپس آتا تو وہ اسے کھانے کو کچھ نہ دیتیں بلکہ اکساتیں کہ کوٹھی کے باورچی خانے میں جا کر خانساماں سے بچے کھچے کھانے کی بھیک مانگے۔ اس لیئے میں شہزاد پر اور زیادہ توجہ دینے لگی' اس کے لیئے سب کچھ بچا کر رکھتی' اپنا پیسہ اور اپنی محبت بھی۔

آبلہ ایک دن پھوٹ گیا جب کوٹھی کے بچوں نے دعوت کی تھی۔ انھوں نے شہزاد کو بلوا بھیجا اور ماں جی بھی بچہ کے ساتھ چلی گئیں کہ سارے بچوں پر نظر رکھ سکیں۔ رحیم کی ذمہ داری تھی کہ تلی ہوئی چیزیں اور [illegible] کیک اور گلابی پیسٹریاں مہمانوں کو دے جب کہ میں گھر کے اندر اونچی اونچی بیگمات کی خدمت کر رہی تھی۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ صائمہ' ننھی مس صاحبہ جن کی سالگرہ کی دعوت تھی' بڑا سا ٹیپ رکارڈر چلا کر سارے مہمانوں سے پاپ میوزک کی دھن پر رقص کروا رہی تھیں۔ کسی لمحے انھوں نے شہزاد کو آواز دی اور اس سے بھی ناچنے کو کہا۔ بچہ اپنی موٹی موٹی ٹانگوں سے بھدر بھدر بھاگتا ہوا آیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ چل کر دیکھیئے' کیا تماشا ہو رہا ہے۔ میں باہر نکل کر باغ میں آگئی جہاں سورج ڈوب رہا تھا۔ تالی بجاتے' نعرے لگاتے بچوں کے حلقے میں شہزاد تھرک رہا تھا' مٹک رہا تھا' اس کے قدم اٹھتے بڑھ جاتے' موسیقی نے اس پر کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ ذرا دیکھ اپنے لاڈلے کو' اس کی دادی نے کہا۔ رنڈیوں کی طرح ناچ رہا ہے' ہیجڑوں کی طرح ناچ رہا ہے۔ میرے بیٹے نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اسٹار بننا چاہتا ہے' ٹی وی پر چمکیلی صدریاں پہننے والے لوگوں کی طرح یا فلموں کے ان ہیروز کی طرح جن کے ایک ایک قدم پر گانا اور تھرکنا ہوتا ہے' لیکن میں نے کبھی اس کی باتوں پر یہ سوچ کر دھیان نہیں دیا تھا کہ یہ بچے کے اچھے اچھے خواب ہیں۔

میں نے اسے کان سے پکڑا اور گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں لے آئی۔ وہاں آکر میں نے اس کی پٹائی کی اور ماں جی خوش ہوتی رہیں۔ یہ پہلی مرتبہ تھی کہ میں نے اسے مارا تھا لیکن میں قسم کھا سکتی ہوں کہ اس کو مارتے ہوئے مجھے ایسا لگا کہ یہ ہاتھ جو اس پر اٹھا ہے میرا نہیں' اس کے چچا کا ہے۔ جب میں تھک کر رکی تو ماں جی آکر اپنی باری سنبھال لیتیں اور ایک الٹا ہاتھ میں نے ان کے بھی لگا دیا۔ جب رحیم اس رات صاحب کو کلب سے لے کر گھر آیا تو اس نے ہم سب کو روتے اور چیختے ہوئے پایا اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' دو چار ہاتھ کس کس کر شہزاد کے جڑ دیئے اور ایک آدھ ہاتھ بچہ کے بھی لگا دیا۔ اگلے دن صبح سویرے ہی شہزاد غائب تھا اور کئی ہفتے گزر گئے تب کہیں جا کر ہمیں اس کی خبر ملی۔ اس نے کسی کمینک کے ہاں اٹھا بیٹھی کا کام ڈھونڈ لیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر بارہ سال تھی۔

(پنجاب کے انقلاب کی ناکامی کے بارے میں ایک کتاب' میں نے اتوار کی دوپہر اپنے ایک دوست کے گھر سے اٹھائی اور سکھ کسانوں کے بارے میں پڑھنے لگا کہ ان کی بے اطمینانی کا موجب مذہبی اختلافات نہیں تھے۔ بلکہ بے زمینی اور محرومی تھا۔ تین دن بعد اس کتاب کا مصنف ٹیلی ویژن کے ڈبے میں نمایاں تھا' ملائشیا کے حکمراں ماہاتر کی حمایت میں شمال کے ملکوں کے ہاتھوں جنوب کی استحصالی پر رطب اللسان تھا جب کہ اسکرین پر قلی ہینو لوگوں کی ا یمیجز کوڑے کے ڈھیر میں سے غذا کی تلاش کرتے ہوئے ہمارے حصہ پر ماری جا رہی تھیں۔ جنھیں کولا سرمایہ داری کا اقتدار۔ کرۂ ارض کی چوٹی کانفرنس قریب ہے۔ غصے کا آتش فشاں دونوں جانب دہک رہا ہے۔ تقدیروں کے امیر مالک' محروموں کے نام پر گالیوں کا تبادلہ کر رہے ہیں۔ تیسری دنیا' ایک پر سہولت درجہ بندی' اپنے حقوق سے محروم۔ اور میں بے گھری کے بارے میں لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تحقیق کر رہا تھا' ذہنی فیلڈ ورک کر رہا تھا۔ عوام الناس کے سامنے کسی پلیٹ فارم پر یا کسی ذاتی قرطاس پر نثر و نظم میں' ہم اپنی جلاوطنی اور خانماں بربادی کے سہ پارے رقم کرتے ہیں' ایک بے وطن حتی پن کو ادب کی پناہ قرار دیتے ہیں اور بے گھری کو انسانی روح کی ناقابل تنسیخ حالت قرار دینے کے نغمے گاتے ہیں۔ اپنے خام مواد اور اپنی موجودہ حالت کے درمیان تفاوت کا جشن مناتے ہیں۔ نہایت فخر کے ساتھ ہم محروموں کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ کیا کذب و افترا ہے' کیا اداکاری ہے۔ مدت ہو گئی جب اس کے بارے میں سوچا تھا۔ میں سکھ کسانوں کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا تھا لیکن مجھے دور ہوئے بہت دن ہو گئے۔ داخلی منظرنامے کی خوشبو ختم ہو گئی۔ جو ان مٹ تھا وہ چیخی چنگھاڑتی پچھوری باتوں تک سمٹ کر رہ گیا۔ بے گھری کے لیئے ان دنوں وظیفے اور انعامات موجود نہیں ہیں۔' گھر' واپسی کے ٹکٹ کی قیمت بچانے کے منصوبے' پیسے کے دھندے کاروبار میں مکمل مل جاتے ہیں۔ بلکہ' گھر' کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیئے کہ یہ ان دنوں اشکیچرل فیشن میں نہیں ہے۔ حرف سے عاری آوازیں اس زبان کے انوکھے پن سے جنگ کر رہی ہیں جو اتنی بعید ہے کہ ان کو اپنے اندر سمیٹ بھی نہیں سکتی۔ جمت بازی آج کل ' آؤٹ' ہے' فکشن' کی نرم بنت اس درد کو چھپا لیتی ہے جس کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ بہت بلند بانگ' اشتعال انگیز یا جذباتی' بس سر کے اوپر سے گزر جائے۔ یہ کوئی کہانی نہیں ہے' میرے بھیا' تم دستاویزی اسلوب کے ٹکڑوں میں سے کچھ نکالنے کی بے کار کوشش کر رہے ہو' یہ صحافت ہے' پمفلٹ بازی ہے۔

میں نے پنجاب میں سبز انقلاب کی ٹکنالوجی پر ایک دستاویزی فلم کا آخری ٹکڑا دیکھا' ایک بہاری کسان "بھیاؤں" میں سے ایک کو دیکھا جو ان معاشی مہاجرین میں سے ہے جو ان دنوں کام کی تلاش میں پنجاب کی طرف نقل مکانی کر رہے ہیں۔ بہار میں ان کی اپنی زمین نہیں ہے حالانکہ ان کے ہاتھ میں دوسروں کی زمین پر کاشت کرنے کا ہنر ہے اور یہ جو پیسے گھر بھیجتے ہیں اس سے وہاں کے لوگوں کی گزر اوقات ہوتی ہے۔ "یہ ""کا لہجہ اور جملے میں دبے دبے افعال نے کریما کی آواز دوبارہ یاد دلا دی جو اپنے خط کو اپنے سوال اور

اپنی کہانیاں میرے پاس لے کر آتی تھیں۔ اس عورت کے گواہ رہنا' میں نے اس [illegible] کہا' ان بدیسی لفظوں میں جن کو وہ سمجھ نہیں سکتی۔)

[illegible] میں شروع کے دن اتنے برے نہیں تھے بھائی' وہ کہتی ہے۔ میری تنخواہ روپیوں میں وہاں گھر پر جا رہی تھی اور اس کا ایک حصہ شہزاد کو بھی جاتا تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ گھر لوٹ آئے گا۔ اسکول کا سلسلہ جاری رکھے گا۔ یہ تھوڑے دنوں کے لیے ہی ہو سکا۔ بیگم صاحبہ کے بیٹے کو ایک عجیب بیماری ہو گئی کہ نہ چل سکتا تھا نہ ٹھیک سے بول سکتا تھا اور وہ علاج کے لیے اسے یہاں لے آئیں۔ ایک دو سال' پھر میں واپس چلی جاؤں گی۔ کام کا بوجھ یہاں کراچی سے بھی کم تھا۔ میں بچوں کے کمرے میں سوتی اور وڈیو پر ایک دن میں دو تین فلمیں دیکھ سکتی تھی۔ کھانا اچھا تھا۔ سہ پہر میں' میں بچوں کو پارک لے جاتی' لڑکے کو بچہ گاڑی میں بٹھالیتی' وہاں مجھے کچھ اور عورتیں بھی مل جاتی تھیں۔ ان میں سے کچھ بتاتیں کہ وہ یہاں پر قیدیوں کی طرح سے ہیں' ان کے مالکوں نے ان کی زندگی کیسے اجیرن کر رکھی ہے۔ ان میں سے دو ایک بنگالین بھی تھیں۔ سڑک کے اس پار حلال گوشت بیچنے والا قصائی بھی بنگالی تھا اور وہ مجھے ان عورتوں' مردوں کے بارے میں بتاتا جو کسی نہ کسی بہانے سے یہاں آتے' پھر غائب ہو جاتے اور مٹھائی کی دکانوں' ریستورانوں' سامان کی دکانوں کی پوری ایک زیرِ زمیں دنیا میں گم ہو جاتے' پاؤنڈ میں کمائی کرتے اور اتنی رقم گھر بھیجتے جس کا پہلے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ مشکل زندگی' لیکن آخر میں فائدہ مند [illegible]۔ مجھ پر زیادہ اثر نہیں ہوا اس وقت' لیکن پھر میں نے سوچا کہ کسی طرح میں شہزاد کو یہاں لے آؤں اور چاہے مجھے خود واپس جانا پڑے' وہ یہاں رہ جائے اور بنگالی قصائی کی طرح کا کوئی آدمی اس کے جیسے تندرست لڑکے کو کام دے سکتا ہے۔ وہ مجھ سے برابر کہے جاتا کہ تھوڑی دیر کے لیے آکر اس کی دکان میں کام کروں اور میرے جیسی ہوشیار عورت سے کام میں مدد ملے گی اور خود میں بھی غیر ملکی رقم کما سکتی تھی لیکن جب میں نے بیگم صاحبہ سے بات کرنی چاہی تو وہ سننے پر تیار نہیں ہوئیں اور ان کو یہ لگا کہ میں احسان فراموش ہوں۔

مجھے یہاں آئے چھ مہینے ہوئے تھے تو بیگم صاحبہ نے کہا' تمہارا ویزا ختم ہو گیا ہے' تمہیں واپس جانا ہوگا۔ میں نے کہا' بہن جی' اگر میری تنخواہ آپ پر بوجھ بن رہی ہے تو مجھے پڑوسیوں کے ہاں کام کے لیے بھجوا دیں' آپ کو تو پتہ ہے کہ ان کو کام والی کی ضرورت ہے' یا پھر میں قصائی کے ہاں کچھ دیر کام کر لوں گی' ہفتے یا اتوار کے دن۔ لیکن کریما' وہ کہتی ہیں' میں تو خود واپس جا رہی ہوں' چھوٹے بابا کی طبیعت اب پہلے سے اچھی ہے اور سردی شروع ہو گئی ہے اور تمہارا شوہر چاہتا ہے کہ تم واپس گھر آجاؤ' تمہارے پاس تمہارا دس سال کا بچہ ہے اس کے بارے میں سوچو اور تمہاری ساس بوڑھی اور بیمار ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن میرا پہلا بچہ' بہن جی' آپ تو جانتی ہیں میں اس کے اسکول کے لیے پیسے بھجواتی ہوں۔۔۔ انھوں نے میری بات کاٹ دی۔ کریما' وہ کہنے لگیں' ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ تمہارا بیٹا۔ گاڑی۔۔۔ رحیم۔ کب؟ میں نے پوچھا۔ میرے

پاؤں وزنی چٹانیں بن گئے تھے۔ میری آنکھوں میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ ارے۔۔۔ چھ ہفتے' ایک مہینہ' میرے خیال میں ہوا ہوگا؟ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔۔۔ صاحب کہنے لگے کہ تمہارے لوگوں نے سوچا کہ بہتر یہی ہوگا کہ میں تم کو کچھ نہ بتاؤں' آخر کو گھر جاکر تمہیں سب کچھ پتہ چل جائے گا' اور میں نے ان سے کہا کہ رحیم کو کچھ رقم دے دیں۔۔۔ وہ' تم جانو' نماز وغیرہ کے لیے۔۔۔

میں چپ رہی۔ میں کہتی بھی تو کیا؟ جلتے گوشت کی بو' کیچڑوں والی گوبر کی بو' ٹانگوں کے چہرے اور اس شخص کی آنکھیں جو ڈر کر بھاگ رہا تھا' یہ سب میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔ یہ سب کچھ میرے اندر زندہ رہا۔ میں نے ایک پورا دن انتظار کیا۔ پھر میں نے پندرہ پاؤنڈ اور آدھے دن کی چھٹی مانگی کہ کچھ چیزیں خرید لوں' اپنے شوہر کے بھائی کے لیے۔۔۔ ہاں' میں نے یہی کہا اور بیگم صاحبہ نے غور بھی نہیں کیا۔۔۔ اور اپنے چھوٹے لڑکے کے لیے۔ میں نے اپنی ساری چیزیں فلیٹ میں چھوڑ دیں' چابی لی اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں آہستہ آہستہ اور بڑے غرور کے ساتھ چلی پھر میں بھاگ نکلی۔ کھلا بازار ڈھاکہ کا جلتا ہوا شہر تھا اور اگر میں سکون کے ساتھ آگے نہیں بڑھی تو ایک طرف کے لوگ یا دوسری طرف کے لوگ مجھے پکڑ لیں گے۔ میں راستہ بناتی ہوئی قصائی کی دکان پر آئی۔ اس کی آنکھوں نے مجھے ساری کہانی سنادی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے وہاں ٹھہرنے کی قیمت تو ادا کرنی ہوگی' شروع میں تو وہ بس چھپنے کی جگہ ہوگی۔ پہلے پہل میں بہت خوف زدہ تھی کہ بیگم صاحبہ امیگریشن کے حکام کو میرے پیچھے لگا دیں گی اس لیے کہ کچھ سوچے سمجھے بغیر میں ان کی چابی ساتھ لے آئی تھی۔ یہ ارادہ بھی تھا کہ بعد میں وہاں جاکر اپنا سامان لے آؤں گی' لیکن ظاہر ہے کہ یہ ارادہ ترک کر دیا اور کوئی بھی میرے پیچھے نہیں آیا۔ اس کے بعد؟ میں اب بھی کانپ جاتی ہوں۔ یہ دوسری کہانی ہے۔

سات سال سے میں اس قصائی کے ساتھ ہوں۔ جب وہ بنگلہ دیش جاتا ہے تو میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔ اس ڈر سے کہ اگر کسی نے مجھے پہچان لیا اور اندازہ لگالیا کہ میں اس کی بیوی نہیں ہو سکتی اور وہ لوگوں کو کیسے سمجھائے گا کہ لندن سے وہ ایک اجنبی بہاری بیوی لے کر آیا ہے اور پھر میرے لیے ڈھاکہ میں اب کیا رکھا ہے؟ اور پھر میں ایک بنگالی مرد کے ساتھ اس شہر میں کیسے جا سکتی ہوں جس نے میرے بادشاہ کو مار ڈالا؟ لیکن یہاں ہم سب ایک جیسے ہیں' بہاری ہوں یا بنگالی۔ اس نے بس ایک مرتبہ مجھے مارا تھا جب اس نے مجھے اپنے اندازے سے زیادہ پیسے نکالتے ہوئے پکڑ لیا تھا' کیونکہ میں کراچی والوں کو اب بھی پیسے بھیجتی ہوں' بچہ کے لیے اور تھوڑے سے پیسے شہزاد کے لیے بھی شامل کر دیتی ہوں کیونکہ وہاں سے کبھی بھی کسی نے مجھے یہ نہیں لکھا کہ وہ چلا گیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ میں انھیں اپنا پتہ نہیں لکھ سکتی۔ اس لیے کہ خدا جانے کیا ہو جائے؟ رحیم کو ہوش آجائے کہ اس کی ایک بیوی ہے اور مجھے ڈھونڈنے کے لیے یہاں آجائے۔ لیکن شاید جو پیسے میں بھیجتی رہتی ہوں' ان کی وجہ سے

ایک

شارا

روشنی قید ہے اندھیرے میں
ایک ہی شب کی یہ اسیری ہے
تیرگی سر کو یوں اٹھائے ہوئے
جیسے اک سلطنت کا شہزادہ
ایک جانب سے دوسری جانب
فرش پر ہفت آسماں پر بھی
ایک ہی شب کی بادشاہت پر
اپنی خوش فہمیوں پہ ہو نازاں
ویسے بھی آج تو اماوس ہے
کل سے باری ہے پھر ستاروں کی
چاند کے ہم سفر اجالوں کی

اس نے مجھے معاف کردیا ہے' اگر معافی کی کوئی بات ہے تو آخر میں تو سارا معاملہ میرے اور میرے خدا کے بیچ ہے۔ ظاہر ہے کہ میں بچہ کو یاد کرتی ہوں لیکن وہ تو شروع ہی سے میرا نہیں تھا اور شاید وہ اپنے باپ کے ساتھ ٹھیک ٹھاک رہ رہا ہے۔ یہاں ہم لوگوں کے لیئے زندگی آسان نہیں ہے' لوگ گھورتے ہیں اور سڑکوں پر گالیاں دیتے ہیں اور دکان پر رات گئے دھمکاتے ہیں اور کام کا وقت بہت لمبا ہے۔ یہ ہمارے بچوں کے لیئے کوئی اچھی جگہ نہیں ہے' اگر سوچو تو۔

جب قصائی نے مجھے مارا تو میں نے سامان باندھ لیا اور اس جگہ چلی آئی جس کے بارے میں بنگالی عورتوں نے مجھے بتایا تھا کہ عورتیں ہی اسے عورتوں کے لیئے چلاتی ہیں۔ ان میں سے کچھ عورتیں اردو بھی بولتی تھیں۔ میں تھوڑے دن یہاں رہی پھر سکے والے فون سے قصائی کو فون کیا اور اس کو بتا دیا کہ کہاں آکر مجھ سے مل سکتا ہے۔ جب اس نے کہا کہ وہ سڑک کے دوسری طرف والے ڈاک خانے سے مجھے لینے آرہا ہے تو ساری عورتوں نے کہا' میں پاگل ہوں جو اس کے پاس جا رہی ہوں لیکن میں نے ان کو سمجھایا کہ میں نے اس سے کہہ دیا ہے' اگر پھر کبھی مجھے مارا تو تمہاری چھری سے تمہاری بوٹیاں کرڈالوں گی اور آمدنی سے مجھے مناسب حصہ نہیں دیا تو معمولی سے معمولی جرم کے لیئے بھی تمہاری رپورٹ کرتی رہوں گی۔ میرے الفاظ اتنے سخت نہیں تھے لیکن پھر بھی میں نے اتنا کہہ دیا کہ اس کے دل میں خدا کا خوف پڑ گیا اور میں سمجھتی ہوں کہ وہ اپنے طریقے سے مجھے خوش رکھنا چاہتا تھا۔

مجھے ان سردیوں سے نفرت ہے' خاص طور پر جب قصائی گیا ہوا ہوتا ہے' میرے لوگوں کے پاس سے خط تو بہت ہی کم آتا ہے اور میں سوچتی ہوں کہ میں جو پیسے انہیں بھیجتی ہوں وہ ملتے بھی ہیں یا نہیں۔ میں بچہ کی خیریت معلوم کرنے کے لیئے تڑپتی ہوں۔ میرے پاس اس کی ایک تصویر ہے جو ماں جی نے ترس کھا کر کبھی بھجوادی تھی لیکن مجھے سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ جلدی میں' میں شہزادی کی تصویریں ساتھ لینا بھول گئی۔ اس سے بچھڑنے کے بعد میں نے پاکستان کے لیئے کچھ محسوس کرنا بھی چھوڑ دیا۔ کسی کسی رات میں خواب میں اسے دیکھتی ہوں کہ مجھ سے باتیں کررہا ہے' مجھے بتا رہا ہے کہ وہ مرا نہیں' اب ٹی وی میں رہتا ہے اور وہاں گاتا ہے۔ اسی لیئے میں گلوکار نعیم کی جتنی تصویریں دیکھتی ہوں' جمع کرکے اپنے البم میں لگالیتی ہوں۔ وہ بھی دبلا پتلا اور مضبوط ہے اور اس کی جلد بھی دھوپ میں تانبے کی طرح چمکتی ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ میرا بچہ بھی اگر مر دبن گیا ہوتا تو ایسا ہی ہوتا' اس لیئے کہ اس کا باپ اسی طرح کا تھا اور شہزادہ بالکل میرے بادشاہ جیسا تھا۔

● شمارہ ۲۰۹ میں فاروقی صاحب کا مضمون گو کہ ایک خاص موقع و ادائے رسم کے لئے ہے تاہم اس میں چند ایسے بنیادی نکات اٹھائے گئے ہیں جن کی وجہ سے یہ مضمون بڑی اہمیت کا حامل ہے البتہ مضمون میں کتابت کی غلطیاں بہت تکلیف دہ ہیں۔

غزل کے علامتی نظام پر بحث کرتے ہوئے انیس اشفاق نے ظفر اقبال کی شاعری کا جو جائزہ لیا ہے وہ خوب ہے۔ ظفر اقبال جیسے پہلودار اور Challenging شاعر پر لکھنا آسان بات نہیں۔ انیس اشفاق کے زیر بحث مضمون کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو ظفر اقبال کے لب و لہجہ کی جدت اور پیچیدگی کی وجہ سے اس کی شاعری سے پوری طرح مانوس و لطف اندوز نہیں ہو سکتے وہ نئی غزل کے اس اہم شاعر سے مانوس و متعارف ہو سکیں گے۔

انیس اشفاق نے ظفر اقبال کے مختلف اشعار کی جو تشریحات کی ہیں ان سے بہت سے قارئین کو یہ دھوکا بھی ہو سکتا ہے کہ ان اشعار کا بس وہی مفہوم ہے جو کہ شارح نے بیان کر دیا ہے جبکہ بیشتر اشعار اپنی ٹھوس تجریدیت اور تہہ داری کے سبب ایک سے زیادہ مفاہیم کے حامل ہیں اور یہی ان کی بلاغت و خوبی ہے۔ خود صاحب مضمون نے ایک جگہ اس کا اظہار و اعتراف کیا ہے۔ مزید بر آں کچھ اشعار کی تشریح سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ شعر۔

آئینہ عکس رخ رنگ سے خالی ہے کہ ہوں
سات پردوں کے سوا آٹھواں حائل میں بھی

میرے نزدیک اس شعر میں ظفر اقبال نے قریب قریب وہی بات کہی ہے جو غالبؔ کے شعر۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

میں کہی گئی ہے! یہ اور بات ہے کہ ظفر اقبال صاحب کا شعر غالب کے شعر سے آگے نکل گیا ہے۔ ظفر اقبال کے شعر میں سات پردوں، کا فقرہ حقیقت کے بہت زیادہ مستور اور نا قابل ادراک ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے مزید یہ کہ عکس رخ رنگ، کی ترکیب تو ایسی نادر ہے کہ شاید بیدل کے یہاں ملے تو ملے۔

تاہم انیس اشفاق کا مضمون نہایت کامیاب ہے اور اسی لئے میں موصوف سے درخواست کروں گا کہ اگر ہو سکے تو وہ ایک مستقل مضمون میں ظفر اقبال کی پوری شاعری کا مفصل جائزہ لیں اور یہ واضح کریں کہ ظفر اقبال اپنے دیگر معاصرین سے کیوں اور کس طرح مختلف ہے اور اس کا مابہ الامتیاز کیا ہے۔

ایسا کوئی مضمون ظفر اقبال اور جدید غزل دونوں کی تفہیم کے لئے مفید ہوگا۔

غزل کے علامتی نظام پر انیس اشفاق کا یہ سلسلہ مضامین بجائے خود نہایت اہم اور مفید ہے۔

الہ آباد — ابواللیث صدیقی

● شمارہ ۲۰۶ اور ۲۰۷ ملے، ان دنوں میں وکرم سیٹھ کے طویل ناول "A Suitable boy" میں ڈوبا ہوا تھا شکر ہے کہ "شب خون" پہنچ گیا اور مجھے اس "محض ناول" سے نجات مل گئی۔

شمارہ ۲۰۶ کہانیوں سے بھرا ہوا ملا، تمام کہانیاں پڑھ چکا ہوں بعض اچھی لگیں اور چند ایسی بھی، جن سے تکلیف پہنچی۔ خالدہ حسین کی دونوں کہانیاں مجھے (ہو سکتا ہے کہ صرف مجھے) بہت خراب محسوس ہوئیں۔ گارسیا مارکیز نے کافکا کی ایک کہانی پڑھ کر سوچا تھا کہ کیا اس طرح بھی لکھا جا سکتا ہے!! اور میں خالدہ حسین کو پڑھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ: "کیا اتنا خراب لکھنا ممکن ہے۔" انور قمر کی بمبئی میں مجھ پر شفقت رہی ہے لیکن سچ اس کے باوجود کہنا چاہیے کہ وہ متواتر کمزور کہانیاں ہی تخلیق کر رہے ہیں۔

زاہدہ حنا کا انداز اتنا پیارا لگا کہ میں نے ان کا مجموعہ "قیدی سانس لیتا ہے" منگا لیا ہے، ہاں اگر وہ "جذباتی کالم نگاری کی خطابت" سے خود کو یہاں بچا لیتیں تو یہ کہانی عمدہ کہلاتی۔ رشید امجد کی کہانی بھی یوں ہی سی ہے۔ مرزا حامد بیگ کی کہانی "دستک"، "نیند میں چلنے والا لڑکا" سے اچھی ہے، منیر الدین احمد کی کہانی "نقد سودا" بھی ٹھیک ہے۔ مجھے مظہر الزماں خاں کی کہانی انتہائی بو گس لگی، بلکہ ایسی ہی کہانیاں شب خون کے معیار کو مشکوک کرتی ہیں، بہتر ہے کہ Establishم کی خراب کہانی پر نئے لکھنے والے کے experiment کو ترجیح دی جائے۔ صدی ٹوکی کی کہانی پڑھنے میں اچھی لگتی ہے مگر اس کے باوجود آرٹ کی چیز کم لگتی ہے۔ مصطفےٰ کمال کی کہانی کا موضوع بہت گھِسا ہو چکا ہے اور منصور رضا نے سوائے ایک جملے "کھنڈرات بتاتے ہیں عمارت حسین ہوگی" کے علاوہ سارا افسانہ یوں ہی سا لکھا ہے۔ خیر جو دو کہانیاں خاصے کی چیز ہیں (یا مجھے لگتی ہیں) وہ اودے پرکاش کا افسانہ (ترجمہ: حیدر جعفری سید) اور آصف فرخی کا ترجمہ۔ "پال گومرا کا اسکوٹر" بہت پیارا افسانہ ہے، اور جو افسانہ زیادہ اثر انداز ہے وہ اس افسانے کی بین السطور میں جاری و ساری جدید ہندوستانی فرد کی کسمپرسی اور Dangling حالت اور عدم اطمینان و استحکام کی ماہیت ہے۔ بس چند مقامات پر اودے پرکاش کی ذاتی مداخلت گراں گزرتی ہے۔ آصف کی ترجمہ کی گئی کہانی پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی، وہ جملہ "تمہارے پاس رونے کی بہت سی وجوہ ہوں گی۔" پڑھ کر میں کتنی ہی دیر مغموم، نیلے اور سبز سمندر کے گرد بھٹکتا رہا۔ "کہتی ہے خلق خدا" اور فاروقی صاحب کے ترجمہ کئے گئے

"اقتباسات" شب خون کا "دل" ہیں۔ میں بار بار انھیں پڑھتا رہتا ہوں۔ بھگوان داس اعجاز کے خط اور پھر اس پر کنور سین کے حاشیے جملوں کو پڑھ کر اچھا نہیں لگا۔ تنقید کیا ایک دوسرے کو insults کرنے کے لئے ہوتی ہے؟ آرٹ کی سطح پر عدم اتفاق ہو سکتی ہے لیکن اس کا اظہار شائستہ انداز اور تقابلی دلائل سے ہونا چاہئے۔ یہ ضرور ہوا ہے کہ دو تین مقامات پر اقبال مجید کا بیانیہ سخت ہوا ہے لیکن اس کی نفسیاتی وجوہ موجود ہیں۔ یہ ناولٹ صرف اردو ہی کا نہیں بلکہ جدید ہندوستانی فکشن میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ سوائے فرقہ ساز ذہنوں کے یہ ناول کسی کی دل آزاری نہیں کرتا۔

شمارہ ۲۰۷ میں بس شاعری نے مزہ آیا۔ عرفان صدیقی، کرشن کمار طور اور انور سین رائے نے کیا پیارا کلام پیش کیا ہے۔ انوپا کو پڑھ کر چشم خون بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا۔ اسے بار بار چھپنا چاہئے۔

آصف فرخی کس ذہنی و روحانی نا آسودگی سے گزر رہے ہیں؟ گزشتہ برسوں ان کی جو کہانیاں (دو مجموعوں پر مشتمل) آئی ہیں وہ بھی انتشار اور زود بیانی کی شکار ہیں، یہاں جو نظمیں دیکھیں وہ بھی انتہائی منتشر اور زوال کی شکار ہیں۔ کیا ہم اتنے شارپ اور ذہین ادیب کو یوں منتشر ہوتے ہوئے دیکھ سکیں گے؟

بحرین — رحمن عباس

● اس بار شمارہ ۲۰۹ میں سب سے پہلے چودھری ابن النصیر کا تبصرہ پڑھا۔ انھوں نے ناصر بغدادی کے سامنے اتنے اہم اور اچھے سوال رکھے ہیں کہ اگر وہ ان کا جواب نہیں دیتے تو ان کی دیانتداری پر حرف آئے گا کیونکہ ہر مدیر مضمون، غزل نظم افسانہ اور تبصرہ و تنقید چھاپتا تب ہی ہے جب وہ اس سے سو فی صد یا ۸۰ فیصد متفق ہو۔ ہمارے بر صغیر کا یہ وطیرہ عام زندگی میں بھی بن چکا ہے کہ دوسرے کے عیب گنتے رہئے آپ محفوظ رہیں گے۔ مولوی عبدالحق۔ آل احمد سرور، شمس الرحمن فاروقی، محمود ایاز، جمیل الدین عالی یہ سارے لوگ تو اب ان حدوں سے نکل چکے جنکا تذکرہ "بادبان" کے حوالے سے ان کے تبصرے میں ملتا ہے پھر واقعی دوسرے لوگوں کے پھپھولے اپنے رسالے کے اوراق پر پھوڑنے اور چھیلنے سے کیا فائدہ اردو رسالے تو یوں بھی عام آدمی کے لئے نہیں چھاپے جاتے اور جن لوگوں کے لئے چھپتے ہیں ان کا اپنا بھی ایک نظریہ ہوتا ہے وہ آپکے کہہ دینے سے فاروقی کو بقراط اور ایاز کو افلاطون نہیں مان لیں گے اور نہ آپکے کہنے سے ان محترم حضرات کو معتوب ٹھہرائیں گے۔

رسالہ نکالنے کا کیا یہی مقصد رہ گیا ہے؟

فاروقی صاحب نے خطبہ تفکر میں بہت عالمانہ اور دکھ بھری باتیں کیں یہ سچ ہے کہ فاروقی صاحب کو انعام اردو کے لئے بے پناہ خوشی کی بات ہے مگر آئندہ ایسے کام کی امید کس سے لگائیں یا یہ جملہ ہماری اردو دانیگی کے لئے بہت ہے۔

انیس اشفاق دیر۔ دیر میں آتے ہیں مگر جب بھی آتے ہیں کسی ایسے

کام کو انجام دے جاتے ہیں جو برسوں یاد رکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ ظفر اقبال پر ایسے کام کی "اودھر" بہت ضرورت تھی اس مضمون سے بہت سے جانے صاف ہوں گے بہت سا علم حاصل ہوگا۔ ظفر اقبال کی حیثیت قائم کرنے میں آئندہ بہت وقت تک یہ مضمون معاون ثابت ہوگا۔ اس مضمون میں ایسا مادہ موجود ہے کہ یہ ایک کتاب بن سکتا ہے۔ انیس اشفاق کو بہت بہت مبارک۔

نجیب آباد — مرغوب علی

● کلاسیکی غزل پر آپ کا مضمون معلومات کے ساتھ ساتھ بصیرت میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ صرف چند ناقدین ہی ایسے ہیں جن کی تحریریں نیند کی گولی کا نعم البدل نہیں بنتیں۔ ان میں سے آپ ایک ہیں۔

شموگہ — ساجد حمید

● "میر اردو اور میں" بہت ہی صحیح جگہ صحیح لوگوں اور صحیح وقت میں پڑھا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ مشاہیر زمانہ جو وہاں موجود تھے انھیں ایک بار پھر یہ یقین ہو گیا ہوگا کہ اعزاز درست ہاتھوں میں گیا ہے۔ آپ اختصار میں بھی Di-mentions of Top relivence بڑے عالمانہ انداز میں نکال لیتے ہیں۔ مہدی جعفر کے مضمون نے اردو والوں پر آج کے پیچیدہ علوم کا ایک دوسرے سے انسلاک، ربط اور تعلق کا نقشہ ایک بار پھر واضح کر دیا ہوگا صرف میر غالب پڑھنے والا اتنا بھرپور Demonstration نہیں دے سکتا تھا افسانوں میں ابھی صرف انظار الاسلام کی "واپسی" پڑھی ہے۔ کہانی قاری کو باندھتی تو ہے مگر انجام کار جوگندر پال "بمبئی کے باہر" کے پرانے اور پٹے ہوئے چکر میں پھنس جاتی ہے۔

بھوپال — اقبال مجید

● "شب خون" کا شمارہ نمبر ۲۰۶ افسانہ نمبر ہے اس ایک شمارے میں تازہ بہ تازہ اتنی تعداد میں افسانے پڑھنے کو ملے کہ دوسری جگہ ہمیں کئی سال میں پڑھنے کو نہ ملتے۔ اس شمارہ میں مرزا حامد بیگ صاحب کے دو افسانے شامل ہیں اور دونوں کافی متاثر کرتے ہیں۔ اس شمارہ میں "شب خون" کے پرانے لکھنے والوں کے علاوہ بعض نئے افسانہ نگار بھی شامل ہیں۔ جیسے مصطفےٰ کمال کا افسانہ "تقسیم" ہے جس کو وہ ایک ایسے موڑ پر ختم کرتے ہیں کہ عنوان سے مطابقت کے ساتھ اس میں گہری معنویت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے افسانوں کے متعلق کیا پوچھنا جو اس رسالے میں برابر چھپتے رہتے ہیں۔ شب خون کا شمارہ نمبر ۲۰۷ شاعری نمبر ہے حالاں کہ آپ نے کہیں اسکی نشاندہی نہیں کی ہے۔ نظمیں اور غزلیں اتنی بڑی تعداد میں اس شمارے میں شامل ہیں کہ اتنے شعرا کا کلام ایک جگہ کسی دوسرے رسالے میں شاید ہی کبھی ملا ہو۔ اس شمارے میں پرانے لکھنے والوں کے علاوہ دو ایسے شعرا کا کلام پیش کیا گیا ہے جو مجھے پہلی مرتبہ اس رسالے میں نظر آئے۔ وہ ہیں تھیا اور انوپا، اور ان کی نظمیں بھی تعداد میں زیادہ ہیں خاص کر انوپا کی نظمیں تو شب خون کے کئی اوراق گھیرتے ہیں لیکن وہ اوراق کافی کار آمد کہے جا سکتے ہیں ان کی نظموں میں

وابستہ ہے جس نے ان میں سے بعض نظموں میں شعریت بھی زیادہ پیدا ہو
ں خاص کر "تیسرا کے" "بعض مصرعے" تو اس لحاظ سے ذہن پر گہرا اثر چھوڑ
باتے ہیں۔ شب خون کا شمارہ نمبر ۲۰۸ اپنے دامن میں نظم و نثر دونوں کو
یٹے ہوئے ہے لیکن اس میں نثر کا پلہ بھاری معلوم ہوتا ہے۔ اس میں کئی
ضامین ہیں اور سبھی اپنے اندر اعلیٰ پائے کا مواد رکھتے ہیں اور دلکش اور بھرپور
داز میں پیش بھی کرتے ہیں۔ غزل پر آپ کا مضمون میں نے دو مرتبہ پڑھا
یوں کہ آپ نے اس میں اردو غزل کی نئی روداد پیش کی ہے وہ Convincing
ی ہیں اور دلچسپ بھی۔ میری خواہش ہے کہ آپ "جدید تر غزل" پر کوئی مقالہ
ب خون میں لکھتے۔ اس سے اس دور کے قاریوں کو غزل کے نئے رموز و اسرار
و سمجھنے میں کافی مدد ملتی اس کے علاوہ جہاں آپ شعرا کا مختصر تعارف لکھتے ہیں
ن کے موجودہ پتے بھی لکھ دیا کریں تا کہ قاری ان سے براہ راست بھی تعلق
قائم کر سکے تو رسالے کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا۔

اشفاق احمد
اعظم گڈھ

• شب خون کے شمارہ نمبر ۲۰۹ میں آپ کو تقریر "میر اردو اور میں" جو
۱۹۹۰ کے "سرسوتی سمان" کے موقع پر آپ نے کی تھی اسے شائع کر کے آپ
نے تمام قارئین کو اس انجمن میں شریک کر دیا۔ تقریر کی بلاغت ایک طرف
آپ نے اردو کے اہم مسائل فی الموقع سربراہین مملکت کے سامنے پیش کرنے
کا کام انجام دیا ہے۔ یہ کوشش جس طرح سے ہونی چاہئے آپ نے اس کی پہل کر
دی ہے۔ اور یہ کام براہ راست نہ کر کے میر کی شخصیت ہندوستانیت تخلیقی
صلاحیت اور تنقیدی شعور کی راہ اپنائی ہے۔ یہ راہ مشکل اور خارزار ہے مگر اس پر
آپ نے چلنے کا جو عزم اٹھایا ہے اور پوری تاریخ جت کے ساتھ۔ مثلاً

"مجھے یہ جاننے میں بہت دیر لگی کہ اردو ادب اور اس کی تاریخ کی نو
آبادیاتی تعبیروں کا کام دراصل سیاسی تھا، ادبی نہیں۔ نو آبادیاتی حاکم نے
ہندوستانی آواز پر تو بڑا بچھا دیا اور اصل آواز کی جگہ ایک نقلی، بنی ہوئی آواز رکھ
دی جو سامراج کی ضرورتوں کو پورا کرتی تھی۔ ہندوستانی ادب جیسا کہ فانن
FANON نے کسی اور سیاق میں کہا تھا "کسی اور کا امکان (Leomeone)
بن گیا، اپنا وجود کھو بیٹھا۔ اس میں معنی اسی حد تک تھے جس حد تک وہ نو آبادیاتی
اصولوں کے مطابق با معنی تھا۔

مثال کے طور پر --- میر کی کچھ تخلیقات تو ذرا شرمندہ سی
کراہت کے ساتھ یہ کہہ کر ٹال دی جاتی تھیں کہ وہ "غیر اخلاقی" یا "فحش"
ہیں اور مہذب محفلوں کے لائق نہیں ہیں۔ "میر کے کلام کے ایک بہت ہی
بڑے حصے کے بارے میں معذرت خواہانہ انداز میں کہا جاتا تھا کہ وہ "بڑی
خراب قسم کا ہے" میر کی تنقید میں ایک بڑا مانا ہوا جملہ یہ تھا کہ "میر کا پست حد
سے زیادہ پست ہے لیکن ان کا بلند کلام بہت بلند ہے"۔۔۔ اسی طرح اگرچہ میر
کے بارے میں سب کی رائے یہی تھی کہ وہ شاید ہمارے سب سے بڑے شاعر
ہیں، لیکن کوئی بھی یقین سے یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ ان کی عظمت ہے کس چیز

میں ؟۔

اس سلسلے میں آپ نے میر کے دور (اور اس کے آگے) کی صورت
حال کا اندازہ لگاتے ہوئے جو نتیجہ نکالا ہے وہ قابل غور ہے۔ "میر کی شاعری
کے بارے میں جو کچھ مروج تنقیدوں میں لکھا گیا تھا وہ میر کی اس محدود حقیقت
کے بھی میل نہ کھاتا تھا جو میر کے انتخابوں میں نظر آتی تھی۔۔۔ ساٹھ کی دہائی کا
وسط آتے آتے یہ بات مجھ پر صاف ہو چکی تھی کہ ہم لوگ اپنی کلاسیکی شاعری
جس طرح پڑھتے آرہے تھے اس میں کوئی بہت بڑی کمی تھی۔ اس شاعری میں
بہت سی ایسی باتیں تھیں جن کی تعبیر یا تجزیہ مغربی شعریات کی روشنی میں
ہو ہی نہیں سکتا تھا۔"

میری سمجھ میں ایک بات اور آتی ہے اور جو آپ کی باتوں سے
مختلف نہیں ہے وہ یہ کہ مغربی ناقد، تعبیر یا تجزیہ کار اردو کلاسیکی شاعری کے "
ساقی" "شراب" اور "حسن و عشق" بیشتر سیدھے سیدھے معنوں میں لے لے
گا اور اس بات پر خوش ہو گا کہ شاعر اپنے مذہب سے غیر مربوط اور مختلف باتیں
کہہ رہا ہے۔ "مسجد اور شراب"۔ واہ واہ۔ ایسی شعریات کی صرف مشرقی تعبیر و
تجزیہ ممکن ہے۔ اور پھر میر ہیں جنکی تخلیقی بلند پروازی تک رسائی حاصل کرنا
جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ظاہر ہے میر نے تجربے کیے ہیں اور اپنے
تجربوں کی حسی معنویت کو، فنی معنویت کو، اخلاقی معنویت کو نئی شکلوں میں
پہچاننا چاہتے ہیں۔ مخالف پیکروں میں پینٹ کرتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ
امکانی نقطہ عروج کے بعد نشیب اگلا قدم ہے۔ کرائسس کے آگے جائیے تو نظر
سے او جھل راہ برعکس ہو گی۔ میر موج امکانی کی تلاش میں اگلا قدم نئے پانی
میں رکھنے کی جرات کرتے ہیں۔ میر کے یہاں نئے پیرائیہ اظہار کی تلاش کے
تجربے ہیں جنہیں "فحش" "غیر اخلاقی" وغیرہ کہا جاتا رہا ہے اور جس میں اس
طرح کی چیزیں نہیں ہے۔ ظاہر کا دھوکہ اور باطن کی حقیقت ہے۔

مہدی جعفر
بھوپال

• شب خون ۲۰۹ میں بادبان پر چودھری ابن النصیر کا تبصرہ پڑھا۔
گیان چند نے اپنے تاثراتی مضمون میں واقعی نازیبا باتیں لکھی ہیں۔ میں ان سے
متفق ہوں۔ میں نے ایک شمارہ بادبان کو بھی لکھا ہے۔ لگتا ہے گیان چند نے
رام لعل سے اپنا بغض نکالا ہے۔ یہ کام ان کی زندگی میں تو وہ نہیں کر سکتے تھے۔
اتنی ہمت گیان چند جیسے لوگوں میں نہیں ہوتی۔ اور پھر مرنے والے کا ایسا
بکھان۔ بادبان میں فاروقی صاحب کا ایک مراسلہ بھی شائع ہوا ہے۔ یہ اس بات
کا ثبوت ہے کہ فاروقی کوئی ادبی تعصب نہیں رکھتے۔ فاروقی کا ظرف اعلیٰ ہے۔
اختر یوسف کی نظمیں بہت اچھی لگیں۔ اختر یوسف کے لہجے کا تیکھا پن اس کو
اپنے ہم عصروں سے الگ کرتا ہے۔ وہ جتنا اچھا شاعر ہے اتنا ہی زیادہ Ignore
بھی ہوا ہے۔ ادب میں ہمیشہ میڈیا کر کا دور رہا ہے۔

شوکت احمد
پٹنہ

• شب خون کی پابندی سے جی خوش ہو رہا ہے۔ شمارہ ۲۰۹ میں نظم و

نثر نے بے حد متاثر کیا۔ شب خون میں تخلیقات اپنے اعلیٰ ادبی معیار سے نیچے نہیں آتیں آپ کو سرسوتی سمان ملنا حق بہ حق دار رسید کے مترادف ہے۔ آپ نے دہلی میں یہ کہہ کر اردو حلقوں کو ایک نیا زاویہ فکر عطا کیا ہے کہ اردو کو لشکری زبان کہنا صحیح نہیں، یہ انگریزوں کی چال تھی جسے اردو والوں نے بھی خوب تشہیر کی۔

فیروز اختر
ہوڑہ

• شب خون کے مطالعے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں شائع ہونے والے قلمکاروں کی تخلیقات کمزور نہیں ہوتیں جبکہ یہی قلمکار جب دوسرے رسالوں میں شائع ہوتے ہیں تو ان کا رنگ بڑا پھیکا پھیکا لگتا ہے۔ ایک ہی تخلیق کار کے یہاں تخلیقی عمل یا تخلیقات میں تضاد کا سبب سمجھ میں نہیں آتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے کڑے انتخاب کے سبب لوگ کمزور چیزیں دوسرے رسالوں کو بھیج دیتے ہیں اور آپ کے یہاں ٹھوس مال دیتے ہیں۔ شب خون میں شائع ہونے والے بیشتر ناموں کے ساتھ میں نے ایسا پایا ہے شمارہ ۲۰۹ میں جو تخلیقات شامل ہیں ان کے اعلیٰ معیار کی ضمانت ہر سنجیدہ ادبی قاری دے سکتا ہے۔

ایم ایف حمیر
آسنسول

• کلاسیکی شعریات پر فاروقی صاحب کے مضامین نہ صرف مزہ دے رہے ہیں بلکہ ذہن کو منور بھی کر رہے ہیں۔

فیاض راز
سری نگر

• تازہ شمارہ میں آپ کا خطبہ 'میر اردو اور میں' بہت خوب ہے۔ گجرال صاحب کے بارے میں آپ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "وہ اردو ادب کے شیدائی ہیں اور اردو زبان کے عمدہ جاننے والے ہیں"۔ میں نے جب "مرقع جامعہ اردو" شائع کی تھی تو خود ان کے ہاتھ کا اردو میں لکھا ہوا خطبہ ان سے مجھے موصول ہوا تھا۔ یہ خط اس کتاب میں شامل ہے۔

مرزا خلیل احمد بیگ
علی گڑھ

• شب خون ۲۰۸ میں مہر افشاں فاروقی کا ترجمہ نہایت عمدہ اور معیاری ہے۔ ان سے آپ اس طرح کے اور دوسرے مضامین بھی ترجمے کرائیے۔ ہمارے یہاں معیاری ترجموں کا فقدان ہے۔ آپ ریاض لطیف کو مسلسل چھاپ رہے ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ اس کی شاعری میں Depth بھی ہے اور انداز بھی منفرد ہے۔ "پہلی تعبیر سائبر اسپیس میں" جیسی نظم لکھنے کے لئے ریاض لطیف کو اور چھاپنے کے لئے شب خون کو مبارکباد۔

قمر صدیقی
بمبئی

• اس برس کا ادب کا نوبل انعام NOBEL PRIZE اٹلی کے ڈرامہ نگار ڈاریو فو DARIO FO کو ملا ہے۔ ڈاریو فو (پیدائش: ۱۹۲۶) خود بھی اداکار ہیں اور انھوں نے سویڈش اکیڈمی کے زیر اہتمام منعقد کئے جانے والے کئی ڈراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ اس کے ڈراموں میں Mistero Buffo اور Accidental Death of an Anarchist بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ نوبل انعام کے لئے فو کے نام کا اعلان بہتوں کے لئے حیرت کا سبب بنا کیونکہ اس کا نام نقادوں کی اس فہرست میں عام طور پر شامل نہیں تھا جس میں اہم لکھنے والوں کے نام تھے۔ نوبل انعام کمیٹی نے اپنے فیصلے میں کہا: "فو نے اپنی طنز و مزاح سے بھرپور تحریروں کے ذریعہ ہمارے سماج میں پھیلی ہوئی بد عنوانیوں اور ناانصافیوں پر کھل کر حملے کئے ہیں جو وسیع تاریخی پس منظر میں فو کے کارنامے ہماری آنکھیں کھول دیتی ہیں۔ ہم ڈاریو فو کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

• برطانیہ کا ممتاز ترین اور باوقار ادبی "بوکر انعام" "BOOKER PRIZE" اس برس ہندوستانی خاتون ناول نگار ارون دھتی رائے ARUNDHATI ROY کو اس کے ناول The God of Small Things پر دیا گیا ہے۔ ۳۷ سالہ ارون دھتی رائے کے اس ناول کی ڈیڑھ لاکھ کاپیاں انعام ملنے سے پہلے بک چکی تھیں۔ بوکر انعام کی چھ ناولوں کی مختصر فہرست میں The God of Small Things کو کئی اہم نقادوں نے انعام کے لئے سفارش کی تھی۔ اس سے پہلے ادبی انعام دو ہندوستانی نژاد ادیبوں سلمان رشدی اور وی ایس نیپال کو مل چکا ہے لیکن ارون دھتی کو اس انعام کے ملنے پر ہمیں اس لئے فخر و مسرت ہے کہ وہ پہلی بوکر انعام یافتہ ہیں جو ہندوستان میں رہتی ہیں اور یہ ناول جدید بھارت کے بارے میں ہے۔ ہمیں مزید خوشی اس لئے بھی ہے کہ کسی ہندوستانی خاتون کی ادبی خدمات کا بین الاقوامی سطح پر اعتراف کیا گیا ہے۔ ہم ارون دھتی رائے کو اس کامیابی پر تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

• رام پور رضا لائبریری کے ایڈیشنل ڈائرکٹر اور مشہور محقق ادیب و شاعر اکبر علی خاں عرشی زادہ کا ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۷ کو حسب معمول لائبریری میں مصروف کار رہنے کے دوران دل کا دورہ پڑنے سے بعمر ۵۸ برس انتقال ہو گیا۔ مرحوم مشہور محقق مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے صاحبزادے تھے اور اردو تحقیق کے کاموں میں ان کو دلچسپی اور لگن وراثت میں ملی تھی۔ ان کی کتابوں میں "دیوان غالب بہ زبان غالب" کو بڑی مقبولیت ملی تھی جو غالب کے فارسی کلام کا انگریزی ترجمہ ہے۔ انھوں نے اردو سے ناواقف لوگوں کے لئے قاعدہ اردو بھی بنایا تھا۔ ہم ان کے غم میں سوگوار ہیں۔

• غالب اکیڈمی نئی دہلی کے سابق سکریٹری اور مشہور ادیب ذہین نقوی ۸۴ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ ہم ان کے غم میں ماتم گذار ہیں۔

ادارہ ان مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

• احمد محفوظ کا چند دنوں پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے شعبہ اردو میں بحیثیت لکچرر تقرر ہوا ہے۔

• حامدی کاشمیری کی نئی کتاب "شیخ العالم، حیات و کارنامے" ابھی حال میں شائع ہوئی ہے۔ ان دنوں وہ ایک سہ ماہی رسالہ "جہات" کے نام سے شائع کرنے کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔

• حبیب حق کی انگریزی کتاب ابھی حال میں چھپ کر آئی ہے۔

• خدا بخش ابڑو کی نظمیں ہم نے پہلے بھی شائع کی ہیں اور یہ بتا چکے ہیں کہ وہ سندھی کے ممتاز شاعر ہیں اور مصوری بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے یہ نظمیں اردو میں لکھی ہیں۔

• شفق نے کچھ عرصے کے بعد اب پھر تیزی سے لکھنا شروع کر دیا ہے۔ ادھر انھوں نے کئی اہم خاکے لکھے ہیں۔ الیاس احمد گدی پر یہ ان کا تازہ خاکہ ہے۔

• شمس الرحمن فاروقی سے پریم کمار نظر کا یہ مکالمہ انگریزی زبان کے رسالہ URDU ALIVE میں شائع ہو چکا ہے۔ گفتگو کی ادبی افادیت کے پیش نظر اردو قارئین کے لئے اسے چودھری ابن النصیر نے ترجمہ کیا ہے۔

• عامر حسین انگریزی میں لکھتے ہیں۔ ان کا تعلق ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں سے رہا ہے۔ اب لندن میں مقیم ہیں اور وہیں کے تعلیمی ادارے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز سے جزوقتی طور پر وابستہ ہیں۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ MIRROR TO THE SUN چھپ چکا ہے۔ افسانوں کے علاوہ تنقیدی مضامین اور تبصرے بھی لکھتے ہیں۔ آصف فرخی نے ان سے یہ انٹرویو اور ان کا افسانہ بطور خاص "شب خون" کے لئے بھیجا ہے۔ ہندوستان میں پہلی بار وہ اردو قارئین سے متعارف ہو رہے ہیں۔

• محمد علوی تین چار سال کی بے کیفی اور خاموشی کے بعد اب دوبارہ شاعری کی طرف مائل ہوئے ہیں۔

• من موہن تلخ کا چوتھا شعری مجموعہ "تخییل" تقریباً بیس برسوں کے وقفے کے بعد اسی مہینے شائع ہو رہا ہے۔

• منیر الدین احمد کا تیسرا افسانوں کا مجموعہ "بہت حرام اور دوسرے افسانے" زیر طبع ہے۔

شاعری، ترمیم اور جبری دباؤ

تخیل جیسا کہ وکو VICO نے سمجھ لیا تھا اور فرائڈ نے سمجھ پایا تھا انسان کی ان صلاحیتوں میں سے ایک ہے، جن کے ذریعہ وہ اپنے تحفظ اور بقا کا انتظام کرتا ہے۔ اس لئے ادب کا نقاد اگر فرائڈ کا استعمال کرنا چاہے تو اس کا مناسب طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ ادب پر فرائڈ کا اطلاق کرے یا فرائڈ کے خیالات میں کچھ ترمیم اور تبدیلی کرے تاکہ دونوں میں سے کسی ایک کے نتیجے میں وہ شعر و ادب کی تاریخ کی ایسی تعبیر پیدا کر سکے جو ایڈپس (Oedipus) کے اسطورہ سے مطابقت رکھتی ہو... جب ہم شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دماغ کا مطالعہ نہیں کرتے بلکہ لاشعور کا مطالعہ کرتے ہیں (اگر لاشعور نام کی کوئی چیز ہے بھی) ہم تو دراصل ریاضی جیسی کسی شے کا مطالعہ کر رہے ہیں جس کے اپنے اصول ہیں اور یہ اصول اس کے اپنے اندر موجود ہیں۔ یہ ایسے اصول ہیں جن کو باطن سے خارج میں لایا جا سکتا ہے اور منظم اور مرتب طور پر جن کا سبق دوروں کو بھی پڑھایا جا سکتا ہے۔ فرائڈ نے اپنی زندگی میں جو کچھ کیا وہ ایک سخت نظم ہے۔ اور وہ اصول جو اس کے اندر چھپے ہوئے ہیں، ہم نقادوں کے لئے زیادہ کار آمد ہیں، نہ کہ وہ اصول جو اس کی سطح پر موجود ہیں اور جو ہم سے اکثر تعبیر کا تقاضا کرتے ہیں۔ فرائڈ کا ارادہ اور مقصد کچھ بھی رہا ہو لیکن اس کے اصول دراصل کچھ نہیں ہیں، صرف خوشنما اور لطیف کی غلط قرأت کا نتیجہ ہیں... ہر طاقت ور نظم اگر پیٹرارک[۱] کے زمانے سے نہیں تو کم سے کم ہمیشہ سے اس بات کو جانتی ہے جسے نطشے نے ہمیں صاف صاف کر کے سمجھا دیا کہ کچھ اور شے نہیں ہے، محض تعبیر ہے، اور ہر تعبیر کسی پہلے کی تعبیر کا جواب دیتی ہے اور اسے کسی آئندہ تعبیر کے لئے جگہ بھی خالی کرنی پڑتی ہے۔۔۔ ہر نظم دراصل ایک منظر اور موقع ہوتی ہے جہاں شاعر ہدایت حاصل کرتا ہے اور وہیں پر نظم کو بھی اپنا واجب مقصود یا مطلوب حاصل ہوتا ہے۔ یعنی ہم سب سے پہلے کسی نہ کسی شاعر یا نظم سے متاثر ہوتے ہیں اور اس اثر کے نتیجے میں اپنی تخلیقی آزادی کو جبراً دبا دیتے ہیں۔ اور اس طرح دوبارہ بطور شاعر ہمارا جنم ہوتا ہے۔ پھر ہم اس جبری دباؤ کو اپنے طور پر ترمیم اور تبدیلی کے عمل سے گزارتے ہیں۔ یہی ایک صورت ہے جس کے ذریعہ کوئی شاعر مضبوط بن سکتا ہے اور اپنی مضبوطی قائم رکھ سکتا ہے۔

HAROLD BLOOM, 1976

۱- PETRARCH (۱۳۰۴ تا ۱۳۷۴) اطالوی زبان کا مشہور شاعر و عالم، جسے سانیٹ کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔

دسمبر ۱۹۹۷

مدیر، پرنٹر، پبلشر: عقیلہ شاہین
فون نمبر: ۶۲۲۶۹۳، ۶۲۳۱۳۷
مطبع: بھارگو پریس، الہ آباد
فی شمارہ: پندرہ روپئے

سرورق: چودھری ابن النصیر
سرنامہ کی خطاطی: عادل منصوری
کمپوزنگ: شاداب مسیح الزماں، الہ آباد-۳

جلد: ۳۱ شمارہ: ۲۱۲
ترسیل زر کا پتہ: ۳۱۳-رانی منڈی، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس-۱۳، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
بارہ شمارے: ایک سو ساٹھ روپئے

ترتیب و تہذیب

شمس الرحمٰن فاروقی

شان الحق حقی

دل کو غم سے کہاں سبھاری
چھا جاتے رہے کہ اندھیاری

کب بدلتے ہیں زندگی کے طور
وہی دنیا ہے اور دلآزاری

ابھی سینے تھے اور بھی کچھ وار
ایک بھی زخم دل نہ تھا کاری

کیا خبر تھی کہ آندھیاں بن کر
وندناۓ گا ابر آزاری

دیں پناہوں سے مانگتی ہے پناہ
سر نگوں دل گرفتہ دینداری

کچھ نشاں کوچوں نہ گھروں کا
چھوڑ بیٹھے ہیں بن کو ہواری

پریت اپنے گھر سے دور کہیں
چپ رہی ہے فراق کی ماری

اب لوا کیجئے خراج بیاج
طوق اک اور پڑ گیا بھاری

خندہ زن گل ہیں بلبلیں خوش کام
کیا سہانا ہے خواب بیداری

ہاۓ کیا کیا دہان تشنہ سے
چشمہ جانفزا ہوۓ جاری

ہوگئے کتنے ہم صفیر آزاد
اپنی بھی آہی جاۓ گی باری

جان جب تک ہے حرز جاں رکھیے
آرزو کوئی جان سے پیاری

شہریار

قرار ہجر میں آیا سکون درد کے ساتھ
بڑا عجیب سا رشتہ ہے ایک فرد کے ساتھ

طلوع ہوتا ہے دن اس لئے دھند بڑھے
ہر ایک رات ہے منسوب ماہ زرد کے ساتھ

سمٹ رہا ہے علاقہ ہماری وحشت کا
ہے اعتراف ہمیں اس کا رنج و درد کے ساتھ

اسی کی شرطوں پہ طے شام کا سفر ہوگا
یہ عہد کل ہی کیا راستے کی گرد کے ساتھ

ہے کوئی جو کبھی پوچھے یہ جا کے سورج سے
کہ اور رہنا ہے کب تک ہوائے سرد کے ساتھ

یہ جو دھند سی ہے ذرا ہٹا

کسی ایک چھت کی منڈیر سے
مجھے تک رہا ہے جو دیر سے
مرے حافظے مرا ساتھ دے
یہ جو دھند سی ہے ذرا ہٹا
کوئی اس کا مجھ کو سراغ دے
کہ میں اس کو نام سے دوں صدا

عجب آزاد مرد تھا

حسن منظر

پچھلے دنوں اختر الایمان کی موت پاکستان میں ایسی رہی جیسے دریا پر جھکے ہوئے درخت سے ٹوٹ کر سوکھے پتے کے پانی پر گرنے کی آواز، کیونکہ انہوں نے کسی ادبی گروہ سے اپنا رشتہ نہیں جوڑا تھا اور جس ادبی گروہ کا انہیں فرد سمجھا جاتا تھا۔ انہیں بھارت میں مرتد نظریہ سمجھتے ہیں۔ پاکستان میں جب ترقی پسند تحریک میں جان تھی اختر الایمان کا نام سننے میں آتا تھا۔ جب وہ نہ رہی تو تمام ادیب اور ناقد خود کو ترقی دینے کے کام میں لگ گئے اور چونکہ اختر الایمان کی زندگی کا سب سے کمزور شعبہ تعلقات عامہ تھا جس میں انہوں نے کبھی توجہ نہ دی اسلئے کسے فرصت تھی کہ ایک بھارت میں رہ جانے والے اردو شاعر کی طرف توجہ دیتا۔

یہ پوچھنا غلط ہے کہ اختر الایمان کن کن کے بعد سب سے بڑے جدید شاعر تھے۔ جدیدیت کو بھی انہوں نے بھی اپنے سے آدھ یا ایک دھائی پہلے کے شاعروں کی طرح خود کھوج کر نکالا تھا۔ دلّی میں دینی مدرسے سے نکل کر جب انہوں نے جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس کسی کو گا گا کر اپنا کلام بیچتے سنا تھا تو پہلی بار انہیں خیال آیا تھا کہ ایسے تو میں بھی لکھ سکتا ہوں۔ یعنی اختر کو اپنے اندر اس وقت ایک شاعر کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اسکے بعد دلّی کی ادبی دنیا میں انکی رسائی ہوئی گئی جو ہر لحاظ سے قدیم تھی۔ اس دور کی شاعری سے انکا واسطہ ایک بار جب پڑا تھا جب استاد فاضل برنالوی کے ایک شاگرد نے ان کا یہ شعر پرواز تخیل کی داد کے لئے اختر کو سنایا تھا۔

پہنچے جو رات خواب میں انکے مکان پر
سوئے زمیں پر آنکھ کھلی آسمان پر

بجائے داد کے دو کلمات کے اختر کی زبان سے نکلا جل جلالہ، شاعر کے 'جل جلالہ، کہ اٹھنے اور پرانے شاعر کے ہمارے ڈھب کا نہیں کہنے، میں ایک عہد کا فرق ہے۔ دلی کے پرانے قلعے اور کناٹ پلیس کا فرق۔

آہستہ آہستہ اختر نے محسوس کیا پرانی شاعری محض تفنن طبع کا ذریعہ تھی۔ نئے عہد کے مسائل اور دکھوں کو اپنے میں جا دے کر ماحول کو خراب نہیں کرنا چاہتی تھی اسلئے اس سے وہ سنجیدگی وابستہ ہی نہیں کی جا سکتی تھی جس کے موجودہ دور میں تخلیقی کام کا بڑا گہرا رابطہ ہے۔ مروجہ شاعری کیا ظاہر نہیں کرتی تھی، کتنی حالات زندگی کے مشاہدات اور تجربے سے عاری تھی، اس حقیقت کو اختر نے اچھی طرح اپنے کالج کے دور ہی میں پہچان لیا تھا، مشاعروں سے خود کو دور رکھنے، مروج جنت سے بیزاری اور جنسی تلذذ کے اظہار سے رغبت نہ ہونے نے انہیں غزل سے دور کر دیا جو اردو کا سب سے محبوب صنف سخن ہے اور جسکے بارے میں غلط ہی سہی، اختر نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ دور حاضر کے تقاضوں کے اظہار کے لئے ناکافی تھی اور وہ اسکے لئے نہیں بنے تھے۔ بعد میں جب وہ فلم انڈسٹری میں پہنچے اور ان سے فلموں کے گیت لکھنے کے لئے کہا گیا تو وہ خود کو اس مصالحت کے لئے بھی تیار نہ کر سکے۔

زندگی میں اختر الایمان اگر پورے طور سے کسی چیز کے بارے میں سنجیدہ تھے تو وہ تھی شاعری۔ یہی نہیں باوجود مالی پریشانیوں کے انہوں نے اپنی نظموں کو بھی فلم کے لئے بیچنا پسند نہیں کیا۔ یوں مشاعروں سے اجتناب، غزل سے کشیدگی خاطر اور نظم کو اپنا کر اختر نے شہرت حاصل کرنے کے مواقع زندگی بھر بڑی پابندی سے گنوائے۔ عورت اور جنس کا اظہار انکے ہم عصر جس طور کر رہے تھے وہ طور بھی اختر کو ناپسند تھا۔ اسی طرح سیاسی نعرہ بازی کو انہوں نے اپنے مسلک میں جگہ نہ دینے کا فیصلہ بہت پہلے کر لیا تھا۔ اگر فلمی دنیا میں خود پر وہ یہ قید لاگو نہ کئے ہوتے کہ کوئی سنجیدہ شاعر اپنے کلام کی متاع کو تجارتی مقصد کے لئے استعمال نہیں کر سکتا ہے اور اگر ایسا کرے تو نصف شاعر رہ جاتا ہے تو یقیناً جو شہرت انہیں ملی وہ اس سے دس گنا ہوتی جو اسکرین پلے اور فلمی مکالمے لکھنے سے نصیب ہوئی۔

اسکول اور کالج کے دور کی اسی دلی میں اگر بے مقصد غزل کوئی کوچہ بازار میں رائج تھی تو وہ مدھم آواز بھی وہیں کہیں گونج رہی تھی جو حالی اور آزاد کی جلائی ہوئی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ طبقہ بھی ابھر رہا تھا جو مغربی شعرا کو پڑھ رہا تھا اور انکی فطرت کے اظہار کے اسلوب کا گرویدہ ہوتا جاتا تھا۔ اس نئی نظم میں مقصد بھی تھا، سچائی بھی اور اپنا ایک حسن بھی۔ یہ نئی شاعری اپنے

"میاں اچھا کہتے ہو مگر ہمارے ڈھب کا نہیں کہتے"

انکے یہاں پرانا دور نئے دور کو جا دینے کو تیار نہیں تھا۔ ایک نئے

امکانات کے ساتھ فکر کرنے والے دماغوں کو اپنا رہی تھی اور جس کو برتنے والے کچھ شعرا لاہور سے دلی بھی بسلسلہ ملازمت پہنچ رہے تھے۔ بوڑھے اس نئے رنگ کی شاعری پر ناک بھوں چڑھاتے تھے اور کہتے درڈزورتھ اور ٹینی سن کے کلام کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن ایسا کہنے والے صرف وہ ہی ہو سکتے تھے جو انگریزی شاعری سے آشنائی پیدا کر چکے تھے۔ پھر یہ بھی تھا کہ نئے عہد کے شعرا کے یہاں عورت کا ذکر جس بے باکی سے ہونے لگا تھا اسے فحش قرار دیا جا رہا تھا۔ خیال کے اظہار کی یہ آزادی گو اپنے سے پچھلے دور کا بندشوں کے رد عمل میں تھی لیکن تھی بے حجابی کی حد تک بڑھتی ہوئی۔ اخترالایمان کی فکر اور اسکے نتیجے میں ابھرنے والا ذوق سخن ان ادبی موافق اور مخالف دھاراؤں کا پیدا کردہ تھا۔ ایک لحاظ سے شعور کا عمل۔ کیا قبول کیا جائے، کس سے دور رہا جائے اور اسی دلی میں وہ عناصر بھی تھے جو اسکے قائل تھے کہ بوڑھے اپنی طرز کی غزلیں کہتے ہیں لیکن نئی پود کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملنا چاہیئے۔ اور ان سے بڑھ کر کچھ اور بھی روادار لوگ تھے جو نئے شعرا کو چھاپنے کے لئے بھی تیار تھے۔ ان میں سے شاہد احمد دہلوی کا نام سرفہرست آتا ہے جنھوں نے اخترالایمان کا طالب علمی کے دور ہی میں انکا پہلا مجموعہ کلام چھاپا تھا۔ یقیناً اس نئے کلام کے چھپنے پر دلی اور اس سے متعلق ادبی دنیا میں بھونچال آیا ہوگا۔ لیکن اختر کی ادبی حیثیت مسلم ہو گئی۔

اپنے ان ساتھیوں کے برخلاف جنھوں نے غزل کبھی نہ کہنے کا عہد کیا تھا اور بعد میں اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکے اختر نے تا عمر اپنی ایک ہی محبوبہ سے وفا قائم رکھی جسکے لئے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ جو ادبی تجارت کے کام میں لگ گئے اور فلموں کے لئے سچویشن کی مناسبت سے اور ڈائرکٹر کے حکم پر غزلیں اور گیت لکھنے لگے ان کی اپج اور کلام کا زوال ہمارے سامنے ہے۔ ایسے شعر گویوں کے لئے اخترالایمان نے اپنی اس صاف گوئی کے ساتھ جسکے لئے وہ مشہور تھے بعد میں کہا تھا "اگر یہ لوگ فلمی دنیا میں نہ بھی گئے ہوتے تو ان کا کلام اس سے بہتر نہ ہوتا جیسا انھوں نے فلموں کے لئے کہا۔" یہ بات تقریباً اختر کے دور کے سب ہی افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں پر بھی صادق آتی ہے اور شاعروں اور فکشن نگاروں کو جو فلمی دنیا میں داخل ہونا چاہتے ہیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ وہاں کی دنیا غیر محتاط اور فن کی کم گرویدگی رکھنے والوں کو کس آسانی سے صنعتی دور کی ایک لکھنے والی مشین میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اختر کے کلام سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ یہ اصطلاحاً وہ گیت ہیں جو سیٹریو سے مطابقت میں لکھے گئے ہیں۔ اختر کی فلموں میں پورے پورے برہ اور بیٹھ کے لئے گیت جانے کے سین جابجا نظر آتے ہیں لیکن انکو جوں کا توں اگر فلمایا گیا ہوتا تو روح کہیں باہر رہ جاتی یا بکھر سکتی، لفظ اور اسکے پیچھے چھپے ہوئے جذبات کو پوری طور سے اسکرین پلے میں ڈھالنے کے لئے ایک اچھے ہی بڑے ڈائرکٹر کی ضرورت ہوتی۔ میرے خیال میں اخترالایمان کو اگر ایک حقیقت میں بڑا فلم ڈائرکٹر ملا ہوتا تو وہ اپنی بہترین نظمیں اسکے سپرد کرنے سے انکار نہ کرتے۔

دیکھا جائے تو غزل سے اختر کو پرخاش نہ تھی لیکن ان یہ تجربہ بڑی حد تک درست تھا کہ غالب میں غزل اپنا سب کچھ ڈھونڈ چکی تھی اور غالب کے بعد شعرا کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اس سے بہتر خراج غالب کو نہیں دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان الفاظ میں تقاضائے غزل کا شکوہ ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اختر کو اعتراف تھا کہ ایسے مضامین جو خیال کی پرواز اور معنی میں سمندر ہوں اور پھر بھی جنہیں دو مصرعوں کے کوزے میں بند کیا جا سکے اور جو زندگی کے ہر پہلو کو محیط کئے ہوئے ہوں غالب پر ختم ہو گئے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ غزل میں غالب کے بعد انحطاط آ گیا تھا جو اختر لایمان کے کالج کے دور تک پہنچتے پہنچتے اپنی انتہا پر تھا۔

اختر کے اس رجحان کی ایک وجہ تو وہی رد عمل تھا جو دلی کے اساتذہ کی شاعری سن کر ان پر ہوا تھا۔ غزل سے بے زاری کا سبب یہ بھی تھا کہ ان کا ساتھ اس دور میں اردو کے ان دوسرے غزل گویوں کا نہ ہوا جن کی آواز دلی سے باہر کی دنیا میں گونج رہی تھی اور جن کی شاعری نہ حسن شگفتگی سے عاری تھی نہ بے مقصد۔ مثلاً اصغر، جگر، حسرت، آرزو اور فانی۔ یہ اور بات ہے کہ جس طور پرانا دور نئے دور سے بے اعتنائی برت رہا تھا اسی طرح سے نئے شعر ان (مستند غزل گو شعرا کو ایک طرح میں اپنے منشور کے تحت نہ سننے کو تیار تھے نہ اپنے رسائل میں جگہ دینے کو۔ اگر اختر کو ان غزل کے شعرا کا ساتھ میسر ہوتا تو یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے غزل نہ کہنے کا عہد نہ کیا ہوتا اور تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی، اسکے وا ہوتے ہوئے گوشے آزادی کی جدو جہد، پھر آزادی پیدا ہونے والی پژمردگی اور مغربی تعلیم سے آشنائی ان سے نظمیں ہی لکھواتی رہتی۔

غور کیا جائے تو غزل سے یہ بیزاری اس دور کی گھٹی ہوئی فضا سے بے زاری تھی جس کے شکار دلی اور صوبجات متحدہ کے شائستہ گھرانے تھے۔ اردو شاعری میں ابھرتی ہوئی آوازیں، بدلتے ہوئے ہندوستان کی روح سے ہم آہنگ تھیں جو آزادی کی راہ پر گامزن تھا اور یہ روح پر اس چیز کے خلاف تھی جو اپنے ارتقا کا سفر مکمل کر چکی تھی۔ نئی شاعری میں ایسے موضوع جگہ پاتے تھے جنہیں غزل میں شعرا نے یا تو جگہ نہیں دی تھی یا جگہ نہیں دے پاتے تھے مثلاً مذہبی اور نسلی تعصب کا بیان اور اسکے خلاف جنگ، شدید معاشرتی ناہمواری اور سب سے بڑھ کر عام بے نام انسانوں کی حسرتوں اور امنگوں کا ذکر جس ضمن میں عورت کے حسن سے بڑھ کر اسکی بے چارگی اور مال تجارت بنائے جانے کو بھی رکھا جا سکتا ہے۔

اخترالایمان نے فطرت کو بچپن سے بہت قریب سے دیکھا تھا اور گھر کے افراد سے گہرا ذہنی تعلق نہ ہونے کی وجہ سے فطرت ہی ان کے اوراک کا کل بن گئی تھی۔ اس کا ذکر انھوں نے یوں کیا ہے "جنگل سے میرا بہت پرانا رشتہ رہا ہے۔ جن دنوں میں جس بستی میں رہتا تھا اور پوڑیہ کے اسکول میں پڑھتا تھا ان دنوں روز جنگل سے گذرتا تھا۔ میکھ بستی کے شمال پر ایک بہت بڑا

باغ تھا۔ واپسی میں اکثر بیٹھ جاتا تھا۔ باغ کے کنارے پر اک جوہڑ تھا۔"

فطرت سے اس نزدیکی ہی نے انھیں ایسے استعارے بخشے جن سے اردو شاعری پہلے نا آشنا تھی۔ ڈھلتی شام، کہانی کہتے ہوئے درخت، پانی، ختم ہوتی ہوئی رات اور صبح کی ہلکی روشنی جس طرح انکے کلام میں آئے ہیں کسی اور شاعر کے یہاں کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ جوش کی طبع پر بھی یہ محرکات اثر انداز ہوئے تھے اور وہ بھی بنیادی اعتبار سے نظم کے شاعر تھے لیکن ایک ہی بات کو مختلف انداز میں دہرائے جانے سے انکی نظم کی روانی مجروح ہوتی تھی، لگتا یہی تھا شاعر الفاظ میں کھو کر رہ گیا ہے۔ یہ بات انکے اولین دور کے کلام پر بھی صادق آتی ہے اور بعد کے ادوار پر بھی۔ اختر الایمان کی گرفت الفاظ پر کم نہیں تھی۔ لیکن انھیں یاد رہتا تھا کہ وہ کیا کہنے چلے ہیں اور یہ سارا عمل فطرت اور ماحول اور انکے درمیان رابطہ کے طور پر ہوتا تھا اور جہاں یہ گفتگو ختم ہو جاتی تھی نظم بھی اپنے قدرتی اختتام کو پہنچتی تھی۔ علاوہ گفتگو جو اس نظم میں ہے

اپنی مجبوری کا شاید مجھے احساس نہیں
ایک دھندلی سی کرن بھی نہ ملے مانگے سے
لب ہلائیں تو یہ سورج یہ قمر بھی چھن جائے
ہاتھ اٹھائیں تو دعاؤں سے اثر بھی چھن جائے

اور جب چار شعروں میں بات پوری ہو جاتی ہے تو ختم ہو جاتی ہے اور احساس کی دنیا اپنے پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔

"تبدیلی" اس دور کی نظم ہے جب بچپن کا ماحول بہت پیچھے رہ گیا تھا لیکن فطرت کا جو اثر ان پر بچپن میں ہوا تھا اس وقت بھی انکے ساتھ تھا، انکی آرزو تھا:

پاس کے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر
گھنٹوں اک دوسرے کی سنیں اور کہیں

جنگ پر ان کی نظم قرآن پاک کی اس آیت کے ترجمے کے تحت ہے "اور جب ان سے کہا جاتا ہے زمین پر فساد نہ پھیلاؤ تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں" امن انسانی زندگی کا بنیادی تصور ہے اسے زک پہنچتے دیکھ کر خاموش رہنا شاعر کے مزاج میں نہیں ہے نہ مشرق میں نہ مغرب میں لیکن یہ احتجاج بآسانی اکثر شعرا کے یہاں ایک وقتی نعرے میں ڈھل جاتا ہے۔ اختر نے جنگ کو ایک کسان کی نظر سے دیکھا ہے اور انکے یہ اشعار ابدی حیثیت رکھتے ہیں:

دہقاں سنوارتا ہے مٹی
رگ رگ کے بکھیرتا ہے دانے
اور سوچتا جا رہا ہے جی میں
پھر آئے کی جنگ آزمانے

بچپن کی اس طبع کو سنوارنے والی فضا سے نکل کر اختر الایمان نے انسانوں کی مخلوق کو سانس گھوٹنے والا پایا اور جس ملک میں بھی جب بھی موقع ملا خود کو

فطرت کے حوالے کر دیا۔

ایسا کیوں ہوا؟! اسکے لئے ان بچپن اور اسکول کے دور پر اک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

اختر کا گھرانا شمال مغربی اتر پردیش کے ایک گاؤں کا قدامت پرست گھرانا تھا جس کی اپنی سیاست تھی اور اپنے شعار۔ ہر لحاظ سے یہ گھرانا آج کی اصطلاح میں ایک ٹوٹا ہوا گھرانا تھا۔ دادا کے انتقال پر دو تایاؤں نے زمین، مکان اور دکان کو آپس میں بانٹ لیا اور اختر کے باپ اور انکے چھوٹے بھائی کے ہاتھ میں کچھ نہ آیا۔ باپ نے ایک دینی مدرسے میں پناہ کی جہاں سے وہ فارغ التحصیل ہوئے اور یہی تعلیم انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی کو بھی دلائی۔ بعد میں جب اس خاندان کی یہ دو شاخیں ایک بار پھر ایک دوسرے سے ملیں تو تایائے اعظم نے اختر کے والد کو مکان بنوانے کے لئے زمین کا ایک ٹکڑا پیش کیا اور اپنے بڑے بیٹے کے لئے اختر کی سب سے بڑی بہن کا ہاتھ مانگا۔ حقیقت میں یہ شادی تایا کے اس بیٹے کی دوسری شادی تھی۔ وہ ذات شریف یا انکے گھرانے والے ان کی پہلی بیوی کو کسی دور کے گاؤں میں بیچ چکے تھے اور دوسرا کوئی گھرانا نہیں اپنی لڑکی دینے کو تیار نہ تھا۔ اپنی بہن کے ایسے شخص کے دیئے جانے کا جو اثر اختر کے دماغ پر پڑا ہو گا اس کا اندازہ کرنا مشکل بات نہیں ہے۔

ماں اور اختر کا ساتھ بھی زیادہ دن نہ رہ سکا جو خیالات میں نرمی اور توازن پیدا کرتا۔ وہ ان پڑھ تھیں اور اس حد تک کہ جب بیٹے کو باپ دلی اپنے ساتھ مستقل طور سے لے گئے تو وہ خط بھی نہیں لکھ پاتی تھیں۔ گھریلو زندگی سے اختر نا آشنا بھی رہے اور متنفر بھی۔ بڑے میاں کو کو اپنوں سے محبت نہیں ملی تھی وہ اپنے بچوں کو محبت کیا دیتے۔ اختر کو جو انکی پہلی اولاد تھے اور واحد بیٹے وہ اس لاوارثی سے بچانا چاہتے تھے جو باپ کے نہ رہنے پر انکے حصے میں آئی تھی۔ مستقبل کا تصور انکے ذہن میں بس ایک مولوی اور حافظ کا تھا اور اسکے لئے وہ اختر کو شفقت سے زیادہ مار پیٹ سے تیار کر رہے تھے۔ ایک دفعہ جب پٹنے سے بچنے کے لئے اختر کتاب چھوڑ کر بھاگے تو بزرگوار نے انھیں بھاگ کر پکڑا اور وہ ماری جو تا عمر انھیں یاد رہی۔ اختر کو ان سے پیار صرف ایک بار ملا تھا جب مٹی کا لوٹا (بدھنا) توڑ بیٹھنے پر خوف سے اختر بستے میں منہ چھپا کر لیٹ رہے تھے اور باپ نے آکر انھیں چکارا تھا۔ یہ واقعہ گاؤں کے گھر کا ہے جہاں ہر چیز مٹی کی تھی۔ مٹی کی ہنڈیاں، مٹی کے پانی کے برتن اور مٹی کار کابیاں۔ چنانچہ تا عمر اختر کے پیر بھی مٹی (زمین) پر ہی رہے۔ ابہام ان کے کلام میں کہیں نظر نہیں آتا، جو کچھ ہے انسانی دنیا کی حقیقت ہے۔

بزرگوں بالخصوص باپ کی موجودگی میں اختر کے گلے کو جو تالا لگا وہ عمر کے ساتھ ساتھ دلی میں باپ کی نظروں سے دور ہوتے ہی کھل سکا تھا۔ چنانچہ بولنے والے نے جب بولنا شروع کیا تو وہ ایک شعلہ بیان، مقرر ثابت ہوا جسکی ولولا انھیں ناگپور میں جناح صاحب سے بھی ملی اور جس نے انھیں دلی سے باہر کی دنیا سے بھی روشناس کرایا جہاں وہ مشاعروں میں شرکت کرنے نہیں

جاتے تھے بلکہ تقریری مقابلوں میں حصہ لیتے۔ اور جس جس شہر میں گئے پہلا انعام انکے لئے وقف ہو تا تھا۔ ان مقابلوں میں وہ تاریخ اور فلسفے سے مدد لے کر دوسروں کا قافیہ تنگ کر دیتے تھے۔ یہ وہ کام تھا جو انہوں نے شعری مقابلوں میں انجام نہیں دیا تھا۔ اس شعلہ بیانی نے اس وقت ایک نیا رخ اختیار کیا جب انہیں ایک شہر میں دوسرا انعام دیا گیا اور اسے انہوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ "آپ حضرات نے غلط فیصلہ کیا ہے"۔

اس دور میں وہ باپ کے سامنے کتنا بول پاتے ہوں گے اس کا اندازہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ باپ کے سامنے لب بستہ رہنا اور گھر کے باہر کی دنیا میں کچھ لگی لپٹی نہ رکھنا اخترالایمان کے ایمان کا جزو بنتا گیا اور یہ صاف گوئی آخر عمر تک قائم رہی۔

دلی میں طالب علمی کے دور میں انہوں نے وہ کام بھی کئے جن کے لئے انہیں باپ سے شاباشی ملی۔ چلئے کسی طور تو بیٹے کو باپ کی محبت ملی اور انہوں نے بیٹے کو سراہا۔ مثلاً اسلامی مدرسوں میں بلا معاوضہ پڑھانا۔

طالب علمی کے دور میں ایک لاابالی اختر کا احساس تو ہوتا ہے لیکن اسکے ساتھ ہی ایک محنتی، خود کو سنبھالنے والے اختر کا بھی انہوں نے ٹیوشن دے کر اپنا گذارہ کیا اور تعلیم و تدریس کے متعلق اداروں کے فعال کارکن بھی بن کر رہے۔ یہ روش کالج کے زمانے میں بھی قائم رہی۔ وہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر تھے اور بعد میں جب اس کا نام مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن ہوا تو اس کے روح رواں بھی وہ رہے۔ کالج طلبا کی ایک کامیاب ہڑتال جو طلبا پر بلا جواز جرمانے کے خلاف تھی اور ایک ایسے طالبعلم کے حق میں تھی جسے پرنسپل کے پسندیدہ امیدوار کے خلاف اختر کا اعانت سے زبردست کامیابی ہوئی تھی۔ انھیں اس کامیابی کی پاداش میں کالج چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا تھا۔ ساتھ ہی میں اخترالایمان کو بھی پرنسپل اور ہارے ہوئے امیدوار کے حامی سے بہت کچھ سننا پڑا تھا۔ اس ہڑتال کی تفصیل اختر کے ذہن کا دورخ سے پتہ دیتی ہے۔ ان کی زبردست تنظیمی صلاحیت اور کامیابی کی صورت میں دشمن کے خلاف غیر ضروری مطالبوں سے دست بردار ہو جانا۔ بالآخر لیاقت علی خاں مرحوم نے اختر کو طلبا کی شکایات سننے کے لئے بلایا لیکن اختر نے کہا ہم ہڑتال پر ہیں، وہ خود آئیں۔ اور یہی ہوا۔ لیاقت علی خاں نے آکر جرمانے ختم کرائے، نکالے ہوئے طالبعلم کے واپس لئے جانے کا حکم دیا، اور وہ جو مطالبہ تھا کہ پرنسپل اور پروفیسر اختر سے معافی مانگیں، جیت کی صورت میں اختر نے نظر انداز کر دیا۔ یہ در گزری تا عمر اختر کی فطرت کا خاصہ رہی مثلاً ایک فلم پروڈیوسر ڈائرکٹر کے خلاف مقدمہ جیت کر اس کی طرف سے ہرجانے کی ادائگی کو بھول جانا۔ اور اسی طرح کے ان گنت واقعات سے اختر کی زندگی مرصع ہے۔

بعد میں جب پاکستان کا ظہور میں آنا اتنا ہی واضح ہو چکا تھا جتنا شب کے بعد صبح کا، لیاقت علی خاں مرحوم نے جو اختر کی شعلہ بیانی سے بھی واقف تھے اور تنظیمی صلاحیت سے بھی، ان سے کہا پاکستان کے بننے کے بعد مجھ سے ملنا تو اختر نے اپنے مستقبل کو بھاڑ میں جھونکتے ہوئے اپنی فطری سچائی اور بے باکی سے کہا:

مگر میں تو تقسیم ملک ہی کے خلاف ہوں۔

یہ کہنا اتنا درست نہ ہوگا کہ اگر وہ پاکستان آگئے ہوتے تو شاعری سے بے وفائی انکا مقدر ہوتی اور انکی جگہ پاکستان کو ایک سیاسی لیڈر یا بیوروکریٹ مل جاتا۔

زندگی بھر یہ صاف گوئی ہر جگہ اخترالایمان کو زک پہنچاتی رہی۔ ریڈیو کی ملازمت میں ایک جرمانہ ہونے کی اطلاع ملنے پر انہوں نے بے اختیار کہا "اسکی آدھی رقم ن۔ م۔ راشد کو ادا کرنی چاہئے" کیونکہ جس تحریر پر راشد کو اعتراض تھا یہ انکی نظر سے بھی گزری تھی۔ راشد کی جگہ اگر کوئی کھلے دل کا آدمی ہوتا تو اپنے ماتحت کی ایسی طفلانہ صاف گوئی پر کھل کر ہنستا۔ لیکن وہ افسر تھے اور دہلی ریڈیو اسٹیشن کے اعلیٰ ترین افسر۔ اختر وہاں سے نکال باہر کئے گئے لیکن ہمیشہ کی طرح اختر کے دل میں انکے لئے بھی کینہ نہیں رہا جس کا اظہار انہوں نے سجاد ظہیر سے اپنی ایک گفتگو میں بھی کیا تھا۔ وہ گفتگو ۱۹۶۷ء میں افریقی ایشیائی ادیبوں کی کونفرنس کے موقع پر بیروت میں ہوئی تھی اور یوں تھی۔

"بنے بھائی نے مجھ سے پوچھا "تم کیوں خاموش ہو، کچھ بولو"

میں نے کہا "بنے بھائی ملک کی نمائندگی کے وقت جب نظریئے کا خیال رکھا جائے گا تو نہ ملک کا بھلا ہوگا نہ نظریئے کا۔ آپ تو اردو کے آدمی ہیں مگر اشتراکی ادیبوں شاعروں کے علاوہ آپ کسی کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتے۔ ایسا نہیں کہ آپ منٹو، بیدی، راشد، میراجی سے واقف نہیں مگر جب ان کا نام لینے نہ لینے کو آپ اصول بنالیں گے تو ادب کی نمائندگی کیسے کریں گے؟ جن ادیبوں کا آپ ذکر کرتے ہیں وہ تو واجبی واجبی ہیں، ہندوستان کی پوری تصویر ہی آپ کے ذہن میں صاف نہیں تو آپ پیش کیا کریں گے۔؟

بقول اختر "میری باتیں سن کر کوئی خوش نہیں ہوا۔"

سجاد ظہیر کی کتاب "روشنائی" میں اخترالایمان کا نام شاید صرف ایک بار آیا ہے اور وہ بھی فلمی اصطلاح میں ایک ایکسٹرا کے طور پر۔

ایسے ان گنت واقعات سے اختر کی زندگی کی کتاب بھری پڑی ہے۔ باپ سے وہ ڈرتے تھے لیکن باپ کی محبت کبھی انکے دل سے کم نہیں ہوئی تھی۔ ایک زمانے میں باپ پوسٹ آفس کے سامنے بیٹھ کر نامہ نویسی کرنے لگے تھے۔ اختر کو پتہ چلا تو وہ انہیں وہاں سے اٹھا کر لے گئے اور ماہانہ رقم انہیں ادا کرنے لگے۔

اخترالایمان کو اپنا کلام سنانے کا شوق ایک محدود حد تک تھا اور خاص طور سے انہیں جن کے بارے میں وہ سمجھتے تھے کہ سخن فہم نہیں ہیں بالکل نہیں تھا۔ اسکی ایک مثال یہ واقعہ ہے۔

لڑکیاں اختر کی زندگی میں بہت آئیں اور یہ کہا جائے کہ دوسروں کے حصے کی بھی آئیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اور آئیں اس طرح جس طرح رومانی

باگوں کی ہیروئینیں اپنے ہیروں چل کر اس مرد کی زندگی میں آتی ہیں جسے وہ اپنانا چاہتی ہیں۔ لیکن ان سب کے بارے میں اختر وہیں ہی میں رہے کہ انکے بارے میں رشتہ ازدواج کی حد تک سوچا جا سکتا ہے یا نہیں۔ انکی اس سوچ میں انکی پہلی ان گھڑ، جاہل، خودسر بیوی بھی تھی جسکے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس سے اختر نے شادی کو Consummate نہیں کیا کیونکہ میلان طبع نہیں تھا۔ بعد میں جب سنا گیا کہ وہ لڑکی انھیں بیوی نمبر ایک، اختر کے نمبر دو تایا کے اوباش بیٹے کے ساتھ گاؤں میں آزاد ہوتی جا رہی ہے تو اختر نے جو اس سے دور ، دور دہلی، میرٹھ، علی گڑھ اور بمبئی میں رہ رہے تھے اطمینان کا سانس لیا اور بالآخر جب مطلوبہ لڑکی ملی جسکے بارے میں بڑے غور و فکر سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ان صاحبہ سے ازدواجی تعلقات کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے تو انہوں نے ماں، بیوی (نمبر ایک) اور رقیب کو دلی بلوایا اور رقیب سے پوچھا "کیا تم اس سے شادی کرنے کو تیار ہو؟"۔ جب اس نے "ہاں" کہی تو اختر نے بیوی کو طلاق دی، اسی وقت عدت کی مہلت دیئے بغیر اسکا نکاح پڑھوایا اور مع سازو سامان، رقیب کے ساتھ رخصت کیا۔ گھر والے بہت جھلائے لیکن اختر کو معلوم ہوگا کہ وہاں عدت کا جواز ہی نہ تھا۔ نہ پہلی بیوی کو ادھر میں چھوڑا نہ اسکا دوسرا گھر بنانے میں دیر کی۔ اس سے زیادہ ان حالات میں کوئی شخص کیا پریکٹیکل ہو سکتا تھا۔

بات ہو رہی تھی سخن نافہموں کو کلام سنانے سے اجتناب کی اور چونکہ اسمیں ذکر ایک سکھ لڑکی کا بھی آتا ہے جو امرتسر کی تھی اور کچھ کور ہوگی ہو ذہن اختر کی پہلی بیوی کی طرف چلا گیا جس کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اختر کو شعر پڑھتے تو کیا گنگناتے بھی نہیں سنا ہوگا۔ کور ان تین لڑکیوں میں ایک تھی جو اختر کے کلام پر مرمٹی تھیں۔ لکھتے ہیں "انکی باتوں سے اندازہ ہوا تھا جیسے اسے اپنی سخن فہمی پر بڑا ناز ہے" بعد میں نجانے اختر کو یہ غلط فہمی کیسے ہو گئی کہ وہ اس لڑکی کو اختر کے خلاف بھڑکاتی رہی ہے جس سے انکے تعلقات استوار ہو چلے تھے اور جو ان تین میں سے ایک تھی۔ اختر کو کور پر غصہ آنے لگا اور انہوں نے سوچا کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی کالج کے جلسے میں اس سے ضرور ملاقات ہوگی اور بھڑاس نکال لونگا۔ اس ملاقات پر سنانے کے لئے انہوں نے جو نظم کہی اسکی کچھ سطریں یوں تھیں:

تھرتھرائی لو، مدو جزر گذر گاہ خیال
پاسبان عقل ، بنیاد تمدن، کینہ دار
بسمہ بر دوش ایوان شبستاں یم بہ یم
سر فروزاں کوہ معنی سے گریزاں ہر زہ کار

لا کالج کے ایک تقریری مقابلے کے بعد جب اختر الایمان نے وہ نظم پڑھی تو سننے والے الفاظ کی گھن گرج میں کھو گئے اور خوب واہ، واہ کی۔ کور نے بھی داد دی۔ داد کے شور کے بعد اختر نے بگڑ کر سامعین سے کہا، آپ شاعری واعری کچھ نہیں سمجھتے۔ یہ بے معنی نظم ہے جسمیں ردیف، قافیہ،

آہنگ سب کچھ ہے مگر معنی نہیں ان کا اشارہ کور کی طرف تھا۔ ہال پر سناٹا چھا گیا اور اختر ہال سے باہر نکل آئے کہ کور سے بدلہ لے لیا۔ نا سخن فہمی سے نافہموں کو بغیر کلام کو سمجھے سر ہلانے پر شاید ہی کسی نے ٹوکا ہو۔

برسوں بعد ششدھر مکھر جی جو اپنے دور کے اہم فلم پروڈیوسر تھے اور اختر الایمان کو بغیر انکے کلام سے شناسائی کے اپنی کمپنی میں لینے کو تیار تھے، ملاقات ہونے پر ان سے اشعار سنانے کی فرمائش کر بیٹھے۔ اور اختر نے یہ سمجھ کر کہ وہ بنگالی ہیں اردو کتنی جانتے ہونگے ٹکا سا جواب دے دیا کہ وہ آپکی سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

بعد میں اختر کو یہ بات معلوم ہوئی کہ ششدھر مکھر جی بنگالی ضرور ہیں لیکن اتنے ہی جتنے اشوک کمار یعنی الہ آباد کے تعلیم یافتہ اور اردو اتنی صاف بولتے ہیں جتنا کوئی اتر پردیش والا۔ خیر شعر سنائے، پھر بھی انکے ساتھ کام کرنے کو راضی نہیں ہوئے اور دوسری بیوی سے ڈانٹ کھائی کہ آمدنی کا اب معتبر ذریعہ کھو دیا۔

دوسری شادی انہوں نے سلطانہ سے ۳ مئی ۱۹۴۷ کو کی تھی۔ انھیں پڑھنے لکھنے کا شوق تھا، رنگ اور نقشہ اچھا تھا، جس گھرانے کا وہ تھیں اسکی فضا میں قدامت پرست مسلمانوں جیسا کٹر پن تھا۔ ان کی ماں جنھیں وہ بوا کہتی تھیں اختر کو بیٹے کی طرح چاہنے لگیں اور اختر کو اس گھرانے میں وہ ملا جو اپنے گھر میں نہیں ملا تھا۔ اس نو عمر لڑکی نے ۱۹۴۷ میں سکھوں کے ہاتھوں دلی میں مسلمانوں کا قتل عام دیکھا تھا اور جب بمبئی پہنچی تو اختر کو لگا ڈری ڈری سی رہتی ہے۔ جب سلطانہ نے اختر سے سکھوں سے اپنے اس ڈر کا ذکر کیا تو وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر سکھوں کو اپنے گھر لانے لگے جن میں سے ایک بوڑھا اپنی افادیت سے بے خبر سلطانہ سے بیٹی، بیٹی کہہ کر بات کرتا تھا۔ یوں اختر الایمان نے سلطانہ کو سکھ فوبیا Sikh phobia سے desensitize کیا۔ علی گڑھ کے زمانے میں انہوں نے خود کو سانپ کے خوف سے جو بچپن سے انکا ساتھی تھا ننگے پیر گھاس میں چل چل کر آزاد کیا تھا اور یہ بھی اپنی نوعیت کا Paradoxical Intention کا ایک دلچسپ خود دریافت کردہ طریقہ علاج تھا۔

بعد میں نو عمر سلطانہ نے میراجی کی بڑی خدمت کی جب وہ زندگی کی آخری منزل میں تھے اور یہ بھول کر کہ انکی شادی حال ہی میں ہوئی ہے۔ وہ ان کا بول و براز بھی صاف کرتی تھی۔ جب میراجی کی طبیعت کچھ سدھری تو انہیں مصروف رکھنے کے لئے اختر نے رسالہ خیال جاری کیا اور میراجی اسکے ایڈیٹر ہوئے۔ وہ دور ایسا تھا کہ اسمیں جس گروپ سے اختر وابستہ سمجھے جاتے تھے۔ یعنی ترقی پسند تحریک اسکے بڑوں کو اس بات کا بہت خیال رہتا تھا کہ چھوٹے کس سے ملتے ہیں؟ سکہ بند خیالات سے اپنی روزمرہ کی زندگی یا تحریریں انحراف تو نہیں کرتے؟ چنانچہ میراجی کو خیال کی ایڈیٹری سونپنے پر سرزنش کے لئے انہیں ترقی پسند تحریک کے بزرگوں کی عدالت میں پیش ہونا پڑا جہاں علی سردار جعفری نے ایک بڑے جلسے میں پوچھا:

"تم نے میراجی کو 'خیال' کا ایڈیٹر کیوں بنایا"؟

اختر کہتے ہیں "میں نے ان سے بالکل سیدھے سادے لفظوں میں یوں پوچھا" آپ صاحبان کون ہیں؟ پرچہ میرا، روپیہ میرا، ادارہ میرا، نظم و نسق میرا، آپ یہ سوال کس حیثیت سے کر رہے ہیں؟"

عدالت برخواست ہوئی لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اختر الایمان کی طرف ترقی پسند ناقدوں کی جو تھوڑی بہت توجہ تھی وہ بھی جاتی رہی۔ اس دور کے رسالے ہم اٹھا کر دیکھیں تو ان میں شاید ہی کوئی مضمون اختر الایمان کے کلام کے بارے میں ہو۔

اختر کا قلم صرف باپ کے سامنے گرا تھا ورنہ تا عمر اپنے اوپر کسی کی حکومت انہیں نہیں بھائی، خواہ وہ حلقہ ارباب ذوق کے بڑے ہوں، خواہ ترقی پسند تحریک کے۔ ترقی پسند انہیں راہ سے بھٹکا ہوا سمجھتے رہے اور حلقہ ارباب ذوق والے ان کی اس افتاد طبع کے خلاف تھے جو انہیں ادب کو سماج کی ناہمواری اور زیست کے کرب سے دور نہیں ہونے دیتی تھی۔

اب اس نظم پر غور کیجیے:

کوئی چور رہتا ہے رہنے دو مصلحت کا شکار
چلو کہ جشن بہاراں منائیں گے سب یار
چلو نکھاریں گے اپنے لہو سے عارض گل
یہی ہے رسم وفا اور من چلوں کا شعار
جو زندگی میں ہے وہ زہر ہم ہی پی ڈالیں
چلو ہٹائیں گے پلکوں سے راستوں کے خار
یہاں تو سب ہی ستم دیدہ غم گزیدہ ہیں
کرے گا کون بھلا زخم ہائے دل کا شمار
چلو کہ آج رکھی جائے گی نماد چمن
چلو کہ آج بہت دوست آئیں گے سر دار

یہ نظم اختر کے ترقی پسند رجحان کا نمائندہ ہے اور ۱۹۵۳ کے لگ بھگ کہی گئی تھی۔ لیکن اپنے خلاف ادبی عدالت میں (۱۹۳۹) وہ بجائے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے کہ کیوں ایک ایسے شخص کو تم نے اپنے رسالے کا ایڈیٹر بنایا جس کے خلاف حیدرآباد دکن کی ۱۹۴۳ کی کانفرنس میں رجعت پسندی کا فتویٰ دیا جا چکا تھا وہ یہ فیصلہ سنا چکے تھے کہ انہیں اپنا راستہ اختیار کرنے کا حق ہے۔ پھر بھلا اس کو کیسے ترقی پسند نظم تسلیم کیا جاتا۔ اور نظم کے غیر ترقی پسند قرار دیے جانے کا بھی کوئی جواز نہیں تھا کیونکہ اس میں انسان کی دروں تنہائی کے بجائے نماد چمن کے رکھے جانے کی بات ہے، لہو سے عارض چمن کو نکھارنے کا عزم ہے اور پلکوں سے دوسروں کے لئے راستوں کے خار ہٹانے کا عہد ہے۔ یہ مقصدیت ن۔م۔ راشد اور میراجی اسکول کے رجحانات سے متضاد ہے بھی ہو اور یہاں اس کا ذکر مقصود بھی نہ ہو تو بھی حلقے کے طرز کلام کی روح سے مطابقت نہیں رکھ سکتی ہے۔ ◢◢

غزل

حامدی کاشمیری

یہ اب کے کیسی مشکل ہو گئی ہے
بھٹکتی موج ساحل ہو گئی ہے

میسر قربتیں اب بھی ہیں لیکن
کوئی دیوار حائل ہو گئی ہے

ہے حافظ اب خدا ہی ولولوں کا
بلائے کوہ نازل ہو گئی ہے

یہ غم میرے لئے کچھ کم نہیں ہے
وہ میرے غم میں شامل ہو گئی ہے

کہیں کوئی ستارہ بجھ گیا ہے
شکستہ رنگ محفل ہو گئی ہے

اسی سے کر لو اندازہ سفر کا
قریب آ دور منزل ہو گئی ہے

ریڈ کلف، ماؤنٹ بیٹن، اور آڈن کی نظم

شمس الرحمٰن فاروقی

۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہمارا ملک آزاد بھی ہوا اور تقسیم بھی۔ تقسیم کے نتیجے میں فوری طور پر جو آفت دونوں ملکوں کے بے گناہوں پر ٹوٹی اس کے داغ ابھی پوری طرح دھندلے نہیں ہوئے۔ اور گذشتہ پچاس برس میں بھی دونوں ملکوں کے سیاسی تعلقات کی داستان کشت و خون اور آپسی عدم اعتماد اور سرد مہری سے بھری ہوئی ہے۔ اب بہت سے لوگ کہنے لگے ہیں کہ تقسیم غیر ضروری تھی۔ اور پورے برصغیر کے لئے نقصان دہ تو وہ بہر حال ثابت ہوئی۔ لیکن تقسیم کے متعلق بعض سوال ابھی سرحد کے دونوں طرف ٹھیک سے بحث میں نہیں آئے ہیں، بلکہ شاید اٹھائے ہی نہیں گئے۔ مغرب میں بعض سوال گذشتہ چند برسوں میں زیر گفتگو آئے ضرور ہیں، لیکن ان کے جواب میں کوئی قول فیصل ابھی نہیں کیا جا سکا ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے آزادی کی تاریخ جون ۱۹۴۸ سے آگے کر کے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کیوں کر دی؟ ایسی جلدی کیوں کی گئی؟ ماؤنٹ بیٹن فروری ۱۹۴۷ میں یہاں پہنچا تھا۔ کس بنا پر انگریزی حکومت نے طے کیا کہ اسے اگلے چند مہینوں میں ہی ہندوستان چھوڑ دینا چاہئے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ دونوں ملکوں کی سرحدیں متعین کرنے کے لئے لندن کا ایک ایسا وکیل سر سرل ریڈ کلف (Sir Cyril Radcliffe) کیوں چنا گیا جسے ہندوستان کے بارے میں کچھ خاص معلومات نہ تھی؟ اور جسے اس ملک سے شاید کچھ خاص ہمدردی بھی نہ تھی۔ اسے ایک برصغیر کا بٹوارہ کرنے کے لئے صرف سات ہفتے دیئے گئے جب کہ معمولی جائدادوں کی تقسیم میں مہینوں بلکہ برسوں لگ جاتے ہیں۔ کہا گیا کہ وہ وائسرائے اور اس کے اسٹاف سے بالکل کوئی تعلق نہ رکھے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جب تک ہندوستان میں رہا، وائسرائے ہاؤس سے رابطہ بنائے رہا۔ واپس جاتے ہی اس نے اپنے سارے کاغذات ضائع کر دیئے۔ ایسا کیوں ہوا؟ ماؤنٹ بیٹن نے ریڈ کلف کے فیصلے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کے بعد کیوں شائع کئے۔ اور لوگوں کو وقت آخر تک اپنی تقدیر کے بارے میں مبتلائے شک کیوں رکھا؟ تقسیم کے پہلے ہی کشت و خون شروع ہو گیا تھا، لیکن حکومت نے اس کا تدارک کچھ نہ کیا۔ حکومت کے خفیہ ایجنسیوں نے آنے والے تاخت و تاراج کی خبر دی تھی کہ نہیں؟ اگر نہیں، تو ان لوگوں کو کیا سزا دی گئی؟ اور اگر ہاں، تو حکومت نے کشت و خون اور غارت گری کی روک تھام کے لئے بروقت اور مناسب اقدام کیوں نہ کیا؟ ایک سوال یہ بھی ہے کہ ریڈ کلف نے کس دباؤ کے تحت اتنے کم وقت میں اور ناقص کاغذات کی بنیاد پر دونوں ملکوں کی سرحد سازی کا کام قبول کیا؟ نئی سرحدوں کا اعلان ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کے بعد کرنے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ غیر منقسم ہندوستانی فوج، جو اپنی کارکردگی اور نظم و ضبط کے لئے بجا طور پر مشہور تھی، فسادات کو روکنے اور فسادیوں کو سزا دینے کے سلسلے میں یک جا ہو کر کام نہ کر سکی۔

تقسیم کے موضوع پر اردو میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ کچھ اس میں اعلیٰ درجے کا بھی ہے، لیکن زیادہ تر کا تعلق ان انسانیت سوز حالات سے ہے جو تقسیم کے فوراً پہلے اور بعد رونما ہوئے۔ تقسیم کے پیچھے جو سوالات اور شکوک و شبہات ہیں، ان پر کوئی تحریر (تخلیقی یا تاریخی) نہیں ملتی۔ آڈن کی یہ نظم کئی اعتبار سے اہم ہے۔ ایک تو یہ کہ اس میں بعض بنیادی سوالوں کی طرف اشارہ ہے۔ دوسری بات اس کا طنزیہ، استہزائیہ، لیکن کاٹ دار لہجہ ہے، جو ہمارے لکھنے والوں کے لئے مشعل راہ کا کام کر سکتا ہے کہ سیاسی موضوعات پر یوں لکھتے ہیں۔ تیسری طرف اس کا اسلوب ہے۔ لمبے لمبے مقفیٰ مصرعوں پر مشتمل اس نظم کا آہنگ کسی پڑھے لکھے شخص کی گفتگو اور ذاتی روزنامچے کے درمیان کا بے تکلف لیکن متین آہنگ ہے جس میں تھوڑی سی رنجیدگی کے ساتھ بہت ساری حقارت اور طنز کے جوہر نمایاں ہیں۔ آخری بات یہ کہ اس نظم کا مصنف انگریز ہے۔ اسے تقسیم ہند سے براہ راست کچھ لینا دینا نہ تھا۔ بلکہ اگر وہ خوش ہو کر اپنے ملک کے رہنماؤں کی تعریف کرتا کہ انھوں نے ہندوستان کو آزاد کر دیا، تو غلط نہ ہوتا۔ لیکن آڈن کی نظر اس انسانی المیے اور خوفناک سیاسی غلطی تک پہنچی جو تقسیم کی پیدا کردہ تھی اور تقسیم جس میں آلودہ تھی۔ کم لوگوں کو ایسی اصابت نظر اور منصفانہ انسان دوستی نصیب ہوتی ہے۔

عرصہ ہوا جی۔ ایس فریزر (G.S.Fraser) نے لکھا تھا کہ یہ طے کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ آڈن بڑا شاعر ہے کہ نہیں۔ اور اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ اب نہ فریزر اس دنیا میں ہے اور نہ آڈن۔ لیکن یہ طے کرنا مشکل نہیں کہ وہ آڈن جس نے یہ نظم لکھی تھی بڑا شاعر تھا۔ اس نظم کا بڑا سبق آج کے انسان کے لئے یہ بھی ہے کہ اور کسی شے میں سچی اور حقیقت ہوں یا نہ ہوں لیکن انسانی اقدار بہر حال سچی اور برحق ہیں۔

ڈبلیو۔ ایچ۔ آڈن   ترجمہ شمس الرحمٰن فاروقی

"وقت"، لندن میں دوران ہدایت ان پر واضح کیا گیا،
"کم ہے۔ بہت دیر ہو چکی، اب امکان نہیں کہ
آپس میں مزید مشورہ ہو یا معقولیت اور منطق پر مبنی بحث مباحثہ ہو۔

اب تو ایک ہی حل ہے: دونوں کو الگ کر دیا جائے۔ اور وائسرے
کا خیال یہ ہے، جیسا کہ آپ کو ان کے مکتوب سے معلوم ہوگا ——————

آپ ان کے آس پاس جتنا کم نظر آئیں اتنا ہی اچھا ہوگا۔ اس لئے
ہم نے آپ کے قیام کا الگ انتظام کیا ہے ——"

تو پھر ایک سنسان حویلی میں، چار طرف سے بند، پولیس والے دن رات
باغ میں پہرے پر مستعد، کہ کہیں کوئی قاتل نہ آ دھمکے،
وہ کام میں جٹ گئے۔ اور کام تھا کروڑوں انسانوں کی تقدیر
کا فیصلہ کرنا۔ جو نقشے انھیں مہیا تھے سب پرانے اور سال خوردہ تھے
اور مردم شماری کے اعداد و شمار، تقریباً یقینی ہے کہ غلط تھے۔

لیکن انھیں چھان بین اور تصدیق کرنے کا وقت ہی کہاں تھا؟ اور نہ

ہی متنازعہ جگہوں کے موقعہ معائنے کا وقت تھا۔ اور پھر گرمی
بھی بلا کی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ انھیں پیچش پڑنے لگی اور
بار بار جائے ضرور جانا لگ گیا۔

لیکن کام سات ہفتوں میں مکمل ہو ہی گیا۔ سرحدیں طے ہو گئیں،
ایک براعظم، بھلے یا برے منقسم ہو گیا۔

اور اگلے دن انھوں نے انگلستان کی راہ لی، جہاں وہ فوراً ہی
سارے معاملے کو بھول گئے، جیسا کہ اچھے وکیلوں کو کرنا ہی چاہیئے۔ واپس
جانے کو وہ تیار نہ تھے۔ جیسا کہ انھوں نے اپنے کلب میں بتایا، انھیں
ڈر تھا کہ کوئی انھیں گولی نہ مار دے۔

محمد اظہار الحق

وقت کو میں راس نہیں آیا
اسی لئے اس نے میرے خلاف
محاذ بنالیا

مجھ سے ایک بوڑھے مرد اور ایک بوڑھی عورت نے
محبت کی
لیکن وقت نے انہیں یوں تھپکیاں دیں کہ وہ سو ہی گئے
اور میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا

پھر مجھ سے ایک عورت اور ایک مرد نے دل لگایا
لیکن وقت نے انہیں بوڑھا کر دیا
اور ان کے دل رقیق ہو گئے

میں نے ایک جوان عورت سے محبت کی
لیکن جب حسن کمال کو پہنچا
اور زلف دل تک پہنچی
تو وقت نے ہمیں ادھیڑ عمر کر دیا
یہاں تک کہ کنج جھاڑ جھنکار سے بھر گئے

میں نے دودھ پیتے بچوں سے محبت کی
لیکن جب وہ بڑے ہوئے
تو وقت نے ان کے مشاغل میں تنوع پیدا کر دیا
اور انہوں نے میرے اوپر فرسودگی کی چادر تان دی
وہ بکی چھوٹی پہاڑی
زمرد اور لاجورد کی تو نہیں تھی
مٹی اور پتھروں ہی کی تو تھی
جس کے دامن میں
شہتوت کا سدا بہار درخت تھا
اور بکی چھوٹی پہاڑی
اور شہتوت کے سدا بہار درخت کے
درمیانی نشیب میں
ایک حوض تھا
اور پار وہ اونچا میدان تھا

جس میں ہم شام ڈھلے تک کھیلتے تھے
اور جہاں رات کو ڈر لگتا تھا
یہ سب کچھ وہیں ہے جہاں تھا
لیکن وقت نے اس سب کچھ کو
ساتویں جہت میں رکھ دیا
اور اب مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا

وقت کو میں راس نہیں آیا
اس لیے اس نے میرے خلاف
محاذ بنالیا
جہاں میری گواہی کی ضرورت تھی
وہاں سے وقت نے مجھے ہٹادیا
اور جہاں مجھے نہیں ہونا چاہیے تھا
وہاں وقت نے مجھے موجود کیا

اور سرکنڈوں سے بنی ہوئی گول ٹوکری میں
جس بچے کو لے جایا جارہا تھا
جس کی آنکھوں کے پپوٹوں کے اندر کی طرف
آبلے تھے
جنہیں کھدر کے کھردرے تہ کپڑے سے پھاڑ دیا گیا تھا
اور آنکھوں نے لہو بہایا تھا
اور خلقت نے بینائی جانے پر
اور تقدیر نے بینائی نہ جانے پر
ماتم کیا تھا
وہ کون تھا
اور وہ ٹوکری جس عورت کے سر پر تھی
وہ کس کی اصل تھی؟
اور کون اس کا عکس تھا؟
اور جب طاعون اترا تھا
اور سہمے ہوئے لوگ بستی سے دور جھونپڑیوں میں
اٹھ آئے تھے
تو میں وہاں نہیں تھا

اور جب شکنجے میں دو انسان کسے جارہے
اور اس نے بھرے دربار میں انہیں رہ[illegible]
کے لیے کہا تھا
تو میں وہاں نہیں تھا
اور جب دو بستیوں میں جنگ ہوئی تھی
وہاں جہاں پہاڑ کٹا ہوا ہے
اور ایک شخص نے گردن پر
اپنا کٹا ہوا سر دوبارہ رکھوایا تھا
تو میں وہاں نہیں تھا

اور جب وہ آدھی رات کو
گھاٹی کے نشیب میں اترا
جہاں جنات مچھوں کی شکل میں
ننگے پنڈوں اور برہنہ سرینوں کے ساتھ
دائرے کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے
دائرے کے درمیان میں
لالٹین جل رہی تھی
تو میں وہاں نہیں تھا

لیکن جب وہ آخر بار
رنگین پٹکا کمر سے باندھ کر
طلے والی نوکدار جوتی پہنے
مشکی گھوڑے پر سوار ہوا
اور خادم عصا زمین پر ٹیکتا
اس کے جلو میں تھا
اور وہ مغرب کی طرف روانہ ہوا
اور پھر شمال کی طرف مڑا
اور اس گورستان میں
جس کے خاردار درختوں کے ساتھ
رنگین چیتھڑے اٹکے ہوئے تھے
چپ کر کے
ایک قبر میں سو گیا
تو میں وہیں تھا

محمد اظہار الحق

زہر ہے کہ جاتا نہیں

پیاز کھانے سے
سانپ کا زہر اثر نہیں کرتا
لیکن شرط یہ ہے
کہ سانپ نے ایڑی پر نہ کاٹا ہو
اور سانپ چھوٹا نہ ہو

مجھے سانپ نے ایڑی پر نہیں کاٹا تھا
اس نے میرے لہو میں کاٹا تھا
مجھے کاٹنے والا سانپ چھوٹا بھی نہ تھا
میں مسلسل پیاز کھا رہا ہوں
صحت مند گول پیاز
جنہیں میں ایک ایک کر کے
چارپائی کے پائے پر رکھ کر
مکے کی ضرب سے توڑتا جا رہا ہوں
سفید براق ٹکڑے
سوکھی روٹی
اور مدقوق گائے کے دودھ سے بنی ہوئی لسی
تیز کڑوے پیاز کھاتے صدیاں بیت گئی ہیں
ہونٹوں سے تالو تک کا علاقہ
زخموں کی سرزمین بن چکا ہے
لیکن زہر ہے کہ جاتا نہیں

نظم

پیر بہوٹیاں
(جن پر میں نے کبھی پاؤں نہ رکھے تھے)
آہستہ خرام سفید کیڑیاں
(جو کچلے جانے کے بعد زرد مرہم کی

شکل اختیار کر لیتی تھیں)

جگنو
(جن کی ٹانگیں لمبی ہوتی تھیں اور جو کڑی دوپہروں کو
بھی سوتے نہ تھے)
عورتیں
(جو سروں پر سفید چنیاں اور کمر کے ساتھ کالے پٹکے
باندھ کر بین کرتی تھیں)
مرد
(جو راتوں کو چراغوں کی روشنی میں رقص کرتے تھے)

محمد اظہار الحق

درخت کے تنے کے ارد گرد
گول دائرہ تھی
اور دائرہ میں عجیب طلسماتی رنگ گھوم رہے تھے
یہ جاننا ممکن نہ تھا کہ رنگ سیال حالت میں تھے
یا وہ ٹھوس تھا
بس رنگ تھے
ہر طرح کے
آپس میں ملے ہوئے
اور تیزی سے درخت کے تنے کے ارد گرد گھوم رہے تھے
سڑک کے غربی کنارے
کٹے ہوئے پہاڑ کے شمال میں
اور اس وقت میرا سن بچپن کا تھا

دہائیاں گزرتی رہیں
اور میں — تعبیر ڈھونڈتا رہا
نہ ملی تو بناتا رہا
اسی درخت کے قرب و جوار، کھیتوں میں
اور بستیوں میں
اور میدانوں اور پہاڑوں میں
اور دنیا کے مختلف حصوں میں
لیکن تعبیر
ڈھونڈنے سے ملی نہ بنانے سے بنی

میں یہ کام کرتا رہوں گا

اس وقت تک
جب تک جیوں گا
مجھے نہیں معلوم میں کب تک جیوں گا
یوں تو اس خاندان میں
جہاں زمانے نے
نہیں، زمانے کی کیا حیثیت ہے
قسام ازل نے
مجھے پیدا کیا
بعض کی عمریں طویل بھی ہوئی ہیں
لیکن کیا خبر کس وقت کیا ہو جائے
اس لئے کہ
حضرت علیؓ کی غیر فاطمی اولاد کے ساتھ
کچھ بھی ہو سکتا ہے
ایسی صورت میں
میری اولاد پر فرض ہے
کہ وہ اس تعبیر کی تلاش جاری رکھے
اور اگر ڈھونڈنے سے نہ ملے
تو بنانے کی کوشش کرتی رہے
اس درخت کے قرب و جوار، کھیتوں میں
اور بستیوں میں
اور میدانوں اور پہاڑوں میں
اور دنیا کے مختلف حصوں میں

محمد اظہار الحق

کیا تم نے کبھی

بیری کی خشک ٹہنیوں سے
جو بکریوں کے لیے کاٹ کر لائی جاتی ہیں
سوکھے ہوئے بیر چن چن کر کھائے ہیں ؟
کیا تم نے چارہ کترنے والے کالو کو دیکھا ہے ؟
جس کے ہر وار پر اس کا دل باہر آجاتا ہے
اور پھر جب ٹوکا اوپر اٹھتا ہے تو دل واپس چلا جاتا ہے
کیا تم نے چارہ کترنے والے کے سر کی جنبش کو
ٹوکے کی ضرب کے آہنگ سے ملا کر
رقص کیا ہے ؟
کیا تم نے بے ہنگم تالابوں کے کنارے
پتھروں اور ٹوٹی ہوئی اینٹوں سے بنے ہوئے
چولہوں کو
شام کے وقت
دیکھا ہے ؟
ان کی راکھ اس وقت
پوری ٹھنڈی نہیں ہوتی
اور وہ رو رہے ہوتے ہیں

کیا تم نے سورج ڈوبتے وقت
کچی دیوار سے
کچھ سوچتے ہوئے
کبھی بھوسے کا تنکا توڑا ہے ؟
کیا تم نے کسی قاتل پہاڑی ندی کے کنارے
اگنے والے جنگلی پھولوں کو
بیس سال بعد سونگھا ہے ؟
اور اگر ایسا کیا ہے
تو کیا خوشبو کو
مختلف پایا ہے ؟؟

محمد اظہار الحق

جب طبل پر چوٹ پڑی تھی
اور علم لہرا دیا گیا تھا
میں اپنے تین جری بیٹوں کے ساتھ وہاں موجود تھا
تین جری بیٹے
جن کی پشتیں گھر کی طرف
اور سینے میدان کی طرف تھے

اس وقت
ان کے ہم سن
ماؤں کے زانوؤں سے لگ کر بیٹھے ہوئے تھے
اور انھیں شام کے اندھیرے میں گھروں سے نکلتے ہوئے
خوف آتا تھا

میں اپنے تین جری بیٹوں کے ساتھ وہاں موجود تھا
اس لیے کہ میں نے بیٹوں کو چرم میں پیوند لگانا سکھایا ہے
اور ان کے ہاتھوں میں لگامیں دی ہیں
میں نے انھیں زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانا
اور مٹی کے پیالے سے پانی پینا
اور پتھروں پر چلنا
اور نشانہ باندھنا سکھایا ہے
میں نے انھیں نصف دائرے میں بٹھا کر
جنگ کے درس دیے ہیں
اور انھیں وہ سارے مقامات دکھا دیے ہیں
جن کو میری موت کے بعد انھوں نے زندہ رکھنا ہے
اس لیے کہ گھاٹی کے کنارے پر
پہاڑی کے جنوب میں
وہ درخت ابھی تک موجود ہے
جس کے ساتھ میرے باپ نے گھوڑے کو باندھا تھا
اور جس کے سائے میں چادر بچھا کر
چلچلاتی دھوپ میں
مجھے وہ بات بتائی تھی جو مجھے یاد ہے
اور ہوا اس دن بھی
درخت سے گھاٹی کی طرف چل رہی تھی

تم جو میرے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہو
تم میں سے کتنوں کے بیٹوں کے ہاتھ
لگاموں سے آشنا ہیں
اور کتنے نصف دائرے میں بیٹھنا سیکھے ہیں؟

انور شعور

خواب میں روشن وہ چہرہ کرلیا
کرلیا ہم نے سویرا کرلیا

جب ذرا فرصت ملی بیکار سے
اس گلی کا ایک پھیرا کرلیا

اپنی محدودات میں رہتے ہوئے
کرنے والوں نے جو چاہا کرلیا

ہم نے ہر الزام کی تردید سے
اور بھی اپنے کو رسوا کرلیا

پیار تو ہر شخص کرتا ہے شعور
تم نے اپنا حال یہ کیا کرلیا

بند آنکھوں کا دریچہ کرلیا
اور دنیا کا نظارہ کرلیا

ہم نے اپنی استطاعت دیکھ کر
کچھ نہ کرنے کا ارادہ کرلیا

میں نے اور اس نے وفا کے نام پر
اپنا اپنا وقت پورا کرلیا

میں جواباً کچھ نہ کر پایا مگر
مفسدوں کے بس میں جو تھا، کرلیا

اے شعور ایسی بھی کیا سادہ دلی
جو ملا اس پر بھروسا کرلیا

اتفاق اپنی جگہ، خوش قسمتی اپنی جگہ
خود بناتا ہے جہاں میں آدمی اپنی جگہ

کہہ تو سکتا ہوں مگر مجبور کرسکتا نہیں
اختیار اپنی جگہ ہے، بے بسی اپنی جگہ

کچھ نہ کچھ سچائی ہوتی ہے نہاں ہر بات میں
کہنے والے ٹھیک کہتے ہیں سبھی اپنی جگہ

صرف اس کے ہونٹ کاغذ پر بنا دیتا ہوں میں
خود بنا لیتی ہے ہونٹوں پر ہنسی اپنی جگہ

دوست کہتا ہوں تمھیں شاعر نہیں کہتا شعور
دوستی اپنی جگہ ہے، شاعری اپنی جگہ

انور شعور

سب کچھ تھا مگر کوئی نہیں تھا
سایہ تھا وہ آدمی نہیں تھا

آدم کے بغیر زندگی تھی
ہنگامۂ زندگی نہیں تھا

تھی جس سے امید معذرت کی
اس شخص کو یاد بھی نہیں تھا

چپ چاپ گزار لی جدائی
اعلان تو لازمی نہیں تھا

جس روگ نے میری جان لے لی
وہ روگ مجھے کبھی نہیں تھا

ناقابل اعتبار تھا وہ
ناقابل دوستی نہیں تھا

تھی بات شعور ٹھیک لیکن
اظہار کا وقت ابھی نہیں تھا

تفصیل کیا بتاؤں کہ کیا کررہا ہوں میں
جو کچھ بھی کررہا ہوں، برا کررہا ہوں میں

کوئی عجب نہیں جو اٹھالیں ستم سے ہاتھ
اپنے ستم گروں کو خفا کررہا ہوں میں

حالانکہ آگیا ہوں میں چالیس کے قریب
وعدہ جو کرلیا تھا، وفا کررہا ہوں میں

اس شہر رنگ رنگ کے نقار خانے میں
اپنی ہر ایک بات سنا کر رہا ہوں میں

ہر لمحۂ حیات یہ کہتا گزر گیا
انور شعور تجھ سے گلہ کررہا ہوں میں

انور شعور

کیا بیاباں میں گھر کرلیا ہے
تم نے خود کو کھنڈر کرلیا ہے

غیر ممکن نہ تھا ڈھونڈ لینا
صبر میں نے مگر کرلیا ہے

رہ گئی ہے طلب دیکھنے کی
مدعا مختصر کرلیا ہے

اس سے کہتا کہ دور جوانی
میں نے تھا بسر کرلیا ہے

پیار کے ساتھ کار جہاں بھی
اکثر و بیشتر کرلیا ہے

اس سے مل کر تو اپنے کو میں نے
اور زیر و زبر کرلیا ہے

مشورہ مانگ کر کیا کروگے
فیصلہ ہی اگر کرلیا ہے

جانے کیوں خود کو اہل خبر نے
بے خبر بے خبر کرلیا ہے

سر اٹھاؤ شعور انجمنوں سے
صبح کو دوپہر کرلیا ہے

زندگی کا زہر پینے آئے ہیں
مرنے آئے ہیں کہ جینے آئے ہیں؟

“گر قبول افتد زہے عز و شرف”
لے کے اشکوں کے نگینے آئے ہیں

خود نہیں آئے کبھی دربان ہم
جب بلایا ہے کسی نے، آئے ہیں

باغیوں کی صورتیں کیا دیکھنا
گولیاں برساؤ، سینے آئے ہیں

آئے ہیں پستی سے اجرام فلک
یا بلندی سے یہ زینے آئے ہیں؟

آؤ دیکھیں، کون آیا ہے شعور
ساحلوں پہ کچھ سفینے آئے ہیں

انور شعور

جو سینہ سپر ہو جاتے ہیں
وہ مر کے امر ہو جاتے ہیں

گم اکثر لوگ کہیں تجھ میں
اے راہ گزر ہو جاتے ہیں

دنیا میں جدھر چلتی ہے ہوا
ہم لوگ ادھر ہو جاتے ہیں

آنسو تو اندھیری راتوں میں
خورشید و قمر ہو جاتے ہیں

اسباب سفر کی کیا پروا
اسباب سفر ہو جاتے ہیں

ظالم نہیں ہوتے شانت کبھی
مظلوم مگر ہو جاتے ہیں

زنداں میں ہوا کیا آتی ہے
وا خلد کے در ہو جاتے ہیں

کافی ہے غزل میں شعر اچھے
دو چار اگر ہو جاتے ہیں

آخر یہ سب موجود شعور
معدوم کدھر ہو جاتے ہیں

شعور! لوگ تمہارا مذاق اڑاتے ہیں
نشہ حرام ہے ان پر جو لڑکھڑاتے ہیں

ہمارے منہ سے نکلتی ہے بات تو سچی
خبر نہیں کہ ہنساتے ہیں یا رلاتے ہیں

منافقین کو جی بھر کے بھونک لینے دو
مرادفات لغت کچھ ہمیں بھی آتے ہیں

ادب ہی شوق، ادب ہی وسیلۂ روزی
یہ بات الگ ہے، لٹاتے ہیں یا کماتے ہیں

شعور! چاہنے والی نظر نہیں چھپتی
وہ اور ہوتے ہیں بدنام جو چھپاتے ہیں

انور شعور

مآل عمر فانی حیف صد حیف
وفات ناگہانی حیف صد حیف

ہمارے بعد آئے گی ہماری
حیات جاودانی حیف صد حیف

رلاتی ہے ہنسانے سے زیادہ
محبت کی کہانی حیف صد حیف

کسی دن ختم ہو جاتی ہے ہر شے
نئی ہو یا پرانی حیف صد حیف

تفاوت آدمی اور آدمی میں
غلامی، حکمرانی حیف صد حیف

کب آیا اور کب گزرا نہ جانے
مرا دور جوانی حیف صد حیف

شعور اک عمر کی محنت کا حاصل
یہ الفاظ و معانی؟ حیف صد حیف

دروازہ کھلا تھا نہ دریچہ ہی کھلا تھا
آواز لگانے سے بھلا فائدہ کیا تھا

ختداں تھیں زمینیں، مجسم تھے سماوات
صحراؤں میں دیوانہ کوئی چیخ رہا تھا

ہر بار بچھڑتے ہوئے ہوتا ہے عجب حال
گویا کبھی یہ واقعہ پہلے نہ ہوا تھا

اب آدمی ہے آدمی کا قاضی حاجات
فائز کبھی اس منصب اعلا پہ خدا تھا

مدت سے شعور اس کا مکاں ڈھونڈ رہا ہوں
جو شخص مجھے برسر بازار ملا تھا

ذی شان ساحل

مجھے شکریہ ادا کرنا ہے
اس کا جس نے
میری تاریک زندگی کو
ستاروں بھری گیند بنا دیا ہے
ایک ایسی گیند جس سے
اس کے علاوہ کوئی نہیں کھیل سکتا
اسے بھی یہ بات معلوم ہے
شاید اسی لیے وقت بے وقت
میری زندگی سے کھیلتی رہتی ہے
اپنے اس کھیل میں
وہ جب بھی چاہتی ہے
میری تنہائی لے لیتی ہے
اور جب بھی چاہتی ہے
میری آنکھوں کی روشنی

شہر سے باہر جاتے ہوئے
کبھی کبھی وہ میرے دل کی دھڑکنیں بھی
اپنے ساتھ لے جاتی ہے

جب میں سانس لینا چاہتا ہوں
جب میں اپنے آس پاس
کسی کو دیکھنا چاہتا ہوں
یا جب میں اپنے اکیلے پن سے
ایک قلعہ بنا کے ہمیشہ قید رہنا چاہتا ہوں
اس کے خوابوں کے سوا
مجھے کہیں جگہ ہی نہیں ملتی

جس زمین پر
تمہارے پیروں کے نشان ہیں
ہاں مجھے وہی پسند ہے

جو آسمان
تمہارے رنگوں سے بھرا ہوا ہے
بس مجھے وہی اچھا لگتا ہے

جو زندگی
تمہاری محبت سے بھری ہوئی ہے
شاید میں گزار رہا ہوں

جو کھڑکی
صرف تمہارے خوابوں کی طرف
کھلتی ہے
اب میں اسی سے دیکھتا رہتا ہوں

نصیر احمد ناصر

مجذوب خواہش کا خمیازہ

تباشیری دنوں میں وہ
خود اپنے روپ کا بہروپ لگتا ہے
پڑا رہتا ہے چپ اوڑھے
اسے جو بھوک لگتی ہے
تو یادوں کے سڑے سوکھے نوالے
توڑتا اور پھانک لیتا ہے
تو باسی خواہشوں کو چاٹتا ہے
سانس لیتا ہے
تو یوں لگتا ہے جیسے اس کے سینے میں
سمندر بھاپ بن کر اڑ رہا ہو
دھوپ لگتی ہے
تو تن کی لوستی، تپتی زمیں پر
شب کی چادر تان لیتا ہے
وہ گہری نیند میں بھی
جاگنے کا ورد کرتا، خواب چنتا ہے
انوکھے، بدمزہ سے خواب
پلکوں کے گھنے جنگل میں
شب شب بارشوں کا راگ سنتا ہے
اچانک دھوپ میں لت پت کوئی منظر گزرتا ہے
تو آنکھیں میچ لیتا ہے
سبھی کہتے ہیں
ایسا تو نہیں تھا وہ
مگر اس نے کسی مجذوب عورت کی طرف
شہوت بھری نظروں سے دیکھا تھا

وقت کی بدرو میں گرتے خواب

دور تک بہتی سڑک
آبنائے شہر میں

ہوٹلوں، شاپنگ پلازوں، پارکوں میں
خوشنما چہروں کا اک سیلِ رواں
کولون کی خوشبو
لکیریں، دائرے، قوسیں بناتی
زاویہ در زاویہ ملبوس جسموں کی ثقافت
تارکولی خواہشیں
تیزاب رشتے
وقت کی بدرو میں گرتے خواب
گدلے آنسوؤں کا زہر
آنکھوں میں سلگتی، ادھ بجھی نیندیں
تھکن سے چور بدنوں کی بساند
خواب گاہوں کی برودت
فاصلوں کے ساتھ لپٹی قربتوں کا قہر ہے

دور تک بہتی سڑک
آبنائے شہر ہے ——

نصیر احمد ناصر

WEEP HOLES

ہمیں دیوار مت سمجھو!
کہ جب دیوار کے پیچھے کی مٹی بھیگ جائے گی
تو ہم بوجھل نمی کا دکھ بہائیں گے!

ابھی مٹی درختوں کی جڑوں کو چوستی ہے
پانیوں کا دکھ
ابھی دیوار کے پیچھے کی مٹی تک نہیں پہنچا
زمیں نے آسماں کا غم زدہ چہرہ نہیں دیکھا
ابھی دیوار کو رونا نہیں آیا

ہوا چیزوں کا رستہ دیکھتی ہے
بے ثمر سڑکوں پہ پہلی سمت کی خالی لفافے
سرسراتے ہیں

خود اپنے موسموں کا خون پی کر
لوگ جز قوموں کی صورت پل رہے ہیں
تابکاری کے الاؤ جل رہے ہیں

بد نمائی کے دھوئیں سے
پھول کالے، تتلیوں کے پر سلیٹی ہو چکے ہیں
خوابوں کا چہرہ دباؤ سے تڑخ کر ٹوٹ جائے گا
نمی کو راستہ دو!
درد کی بارش برسنے دو!!
زمیں پر آسماں کا دکھ اترنے دو!!!

ہمیں دیوار مت سمجھو!
ہمیں بیکار مت سمجھو!
کہ جب دیوار کے پیچھے کی مٹی بھیگ جائے گی
تو ہم بوجھل نمی کا دکھ بہائیں گے
ہماری آنکھ میں آنسو نہیں خوابوں کی کیچڑ ہے

اپنے قاتل کے لئے ایک نظم

اگر میرے سینے میں خنجر اتارو
تو یہ سوچ لینا
ہوا کا کوئی جسم ہوتا نہیں

ہوا تو روانی ہے
عمروں کے بہتے سمندر کی
لمبی کہانی ہے
آغاز جس کا نہ انجام جس کا

اگر میرے سینے میں خنجر اتارو
تو یہ سوچ لینا
ہوا موت سے ماورا ہے
ہوا ماں کے ہاتھوں کی تھپکی
ہوا لوریوں کی صدا ہے
ہوا ننھے بچوں کے ہونٹوں سے
نکلی دعا ہے

تاریخ کا جنمانتر

نصیر احمد ناصر

تم مجھے کہاں رکھو گی ؟
دل میں، آنکھوں میں
دھنک رنگ ہونٹوں کی نیم وا قوسوں میں
دودھیا پھولوں سے بھری گھاٹیوں میں
آدھی ادھوری نظموں میں
یا کسی بے نام کہانی کے لفظوں میں ؟ ؟

میں تمہاری نیندوں کی
گزرگاہوں میں جاگتا ہوا
صدیوں پرانا ان دیکھا خواب ہوں
خواب ہمیشہ صدیوں پرانے ہی ہوتے ہیں
ہم گزرے زمانوں میں ملتے ہیں
یا آنے والے وقتوں میں
حال، جس میں ہم زندہ ہیں
محض ایک قوسی پل ہے
دو انتہاؤں کو ملاتا اور جدا کرتا ہوا
جسے کراس کرتے ہوئے
ہم چلنا بھول جاتے ہیں
خواب لکھنے اور پوسٹ کرنے کا کوئی سے نہیں ہوتا
میں ہر عہد میں تمہاری راہ دیکھتا رہا ہوں
وقت کا ڈر کیا روز گزرتا ہے
کسی یُگ، کسی جنم، کسی عمر، کسی صدی میں
تم جب بھی خود کو پوسٹ کرو گی
میں تمہیں وصول کر لوں گا
جنم دن کے تحفے کی طرح
لیکن تاریخ اور محبت کا کوئی جنم دن نہیں ہوتا
یہ تو خود دنوں کو جنم دیتی ہیں

کسی ہمدم دیرینہ سے ملاقات کی طلب
مہرباں لفظوں کو چھونے کی خواہش
کیا خواب میں دم گھٹنے کی اذیت سے بہتر نہیں ؟
رونا ہی برحق ہے
تو پھر آؤ!
مل کر ایک ہی بار رو لیں
سارے جنموں کا رونا
اپنے معتبر و مقدس آنسوؤں کی شبنم
میری پلکوں پر گرنے دو
مجھے اپنی آنکھوں سے رونے دو
کائنات بھی ایک آنسو ہے
خدا کی آنکھ سے ٹپکا ہوا
مجھے اجازت دو

میں تمہارا ہاتھ تھامے ہوئے
پل صراط سے گزرنا چاہتا ہوں
مرنے سے پہلے مر کر
خدا کے سامنے سرخرو ہونا چاہتا ہوں
تم میرے اندر کا صحرا نہیں پاٹ سکتیں
میں تمہاری آنکھوں کا جنگل عبور نہیں کر سکتا
میرا سفر اتنا طویل مت کرو
کہ میں تمہارے پاس بھی رکنا بھول جاؤں
مجھے ٹھہرنے کا اذن دو

ہم لاعلمی کی چادر اوڑھے
علم کے جوتے پہنے چل رہے ہیں
تم جانتی ہو
درد کی ڈوری کا آخری سرا کہاں گم ہوا ہے
مجھے معلوم ہے
اسے کہاں سے تلاشنا ہے
اس گُنجل میں
کون کہاں الجھا ہے
ہم کو پتہ ہے
لیکن پاؤں کے جوتے تنگ ہو جاتے ہیں
ڈرائنگ روم میں بچھے راستے طے کرنے میں
عمریں کم پڑ جاتی ہیں
خود سے لپٹ کر بیٹھے
ہم اپنی اپنی اصل کو دور سے دیکھتے رہتے ہیں
محبت اور دانش میں
ایک ادھوری نظم کا فاصلہ حائل رہتا ہے

گزرے وقتوں میں
فرمانِ شاہی سے
لوگ اپنا قبیلہ، حسب نسب بدل سکتے تھے
مجھے حکم دو
کہ میں اپنے جسم کا جغرافیہ بدل کر
تمہاری روح، تمہاری اصل میں شامل ہو جاؤں
مجھے ہجر میں پروانۂ وصل دو

تاکہ جب کبھی میرا یہ متروک بدن
ناکردہ گناہوں کی پاداش میں قتل کیا جائے
تو میں تمہاری محبت کا فرمان دکھا کر
اپنی اصل کی امان پاؤں
اور تم خود پر رونے سے بچ سکو ـــــ

نصیر احمد ناصر

پانی میں گم خواب

خواب اور خواہش میں
فاصلہ نہیں ہوتا
عکس اور پانی کے
درمیان آنکھوں میں
آئینہ نہیں ہوتا
سوچ کی لکیروں سے
شکل کیا بناؤ گے
درد کی مثلث میں
زاویہ نہیں ہوتا
بے شمار نسلوں کے
خواب ایک سے لیکن
نیند اور جگراتا
ایک سا نہیں ہوتا

جوہری نظاموں میں
نام بھول جاتے ہیں
کوڈ یاد رہتے ہیں
ایٹمی دھماکوں سے
تابکار نسلوں کے
خواب ٹوٹ جاتے ہیں
شہر ڈوب جاتے ہیں
مرکزے بکھرتے ہیں
دائرے سمٹتے ہیں
رقص کے تماشے میں
ارض و حس ہوتے ہیں
اور خدا نہیں ہوتا

صد ہزار سالوں میں
ایک نور لمحے کا
ٹوٹ کر بکھر جانا
حادثہ تو ہوتا ہے
واقعہ نہیں ہوتا
ہسٹری تسلسل ہے
ایک بار ٹوٹے تو
دوربیں نگاہیں بھی
تھک کے ہار جاتی ہیں
گمشدہ زمینوں سے
منقطع زمانوں سے
رابطہ نہیں ہوتا

ننھے منے بچوں کے
نوبہار ہاتھوں میں
پھول کون دیکھے گا
آنے والی صدیوں میں
تیری میری آنکھوں کے
خواب کون دیکھے گا
زیر آب چہروں کا
کچھ پتہ نہیں ہوتا

مہمان پرندوں کو الوداع

الوداع مہماں پرندو الوداع!
اگلے برس تک
الوداع!!
اگلے برس جب تم اڑانوں کے صحیفے لے کے آؤ گے
تو جھیلوں کے کنارے
ہم تمھارے منتظر ہوں گے
تمھارے خوبصورت نرم نرمیلے پروں کا
لمس پاتے ہی
زمیں پر پھر محبت لوٹ آئے گی
مگر اگلے برس تک

پانیوں میں
کائی کی موٹی تہوں کا بھی اضافہ ہو چکا ہوگا
ہوائیں دھول سے،
کالی کثافت کے دھوئیں سے
گرد سے لبریز ہوں گی
کھیت، بیلے، گھاس کے میداں، گھنے جنگل
نئی سڑکوں کی آری سے
کئی ٹکڑوں کی صورت کٹ چکے ہوں گے
شکاری موسموں کی سازشیں بھی تیز ہوں گی
الوداع مہماں پرندو الوداع!
اگلے برس تک
ہم تمھارے لوٹ آنے کی خوشی کا دکھ منائیں گے

حارث خلیق

نظم

وہ کساؤ تھا بدن میں اک زمانہ بھول جائے
اک نظر جو خنجر ڈالے راہ چلتا بھول جائے
آنکھ بھر کر دیکھ لے اس کو مگر کس کی مجال
ایک بے اندازہ خیرہ جنگ جو آنکھوں میں تھا
وہ کسی کے بس میں آجائے کہاں کس کے نصیب
ہاں مگر کل رات وہ ان ناتواں ہاتھوں میں تھا

یونہی

ابھی بچھڑے نہیں ہیں ہم
مگر اس دل کو کیا کیجے
کہ جب وہ سامنے بھی ہو
تو مجھ کو یاد آتا ہے!

مسافرت

ویسے تو کوئی بات نہیں
کٹ رہے ہیں دن
لیکن کبھی کبھی
کسی انجان شہر میں
جی چاہتا ہے کوئی کہے
آؤ گھر چلیں

زندگی

کچھ کام تھے اپنی مرضی کے
کچھ کام فقط مجبوری تھے
پھر وقت بہت ہی تھوڑا تھا
اور سارے کام ضروری تھے

جمیل الرحمٰن

سبھی چراغ بکف اور تیرگی ہے عجب
فغاں کہ دیدۂ بینا کی بے بسی ہے عجب

نچوڑ رہا ہے وہ کیوں رنگ گفتگو پہ مرے
وہ جانتا ہے مری جان پر بنی ہے عجب

گھرے ہوئے ہیں بگولوں میں زخم خوردہ غزال
فضائے دشت کی جب سے ہمہ ہمی ہے عجب

لگا کے ساتھ جنہیں لے گیا ہجوم صدا
پلٹ کے آئے ہیں تو ان کی خامشی ہے عجب

جب آئینہ بھی کسی عکس کی پناہ میں ہو
جمیل روبرو ہونے کی بے کلی ہے عجب

وہ جب یہ ثابت و سیار گاں سمیٹے گا
مسافرت کی عجب داستاں سمیٹے گا

یہ کار عشق عجب سہی نا تمام سی ہے
تو اس کی فکر میں کیا کیا زیاں سمیٹے گا

کرے گی تازہ اسے زندہ موسموں کی ہوا
اٹھے گا خاک سے اور آسماں سمیٹے گا

نہ اس شمار میں تو ہے نہ اس شمار میں ہے
یہ دنیا مل بھی گئی تو کہاں سمیٹے گا

جمیل جس میں بگولے اٹھے چراغ بکف
وہ دشت شہر کی تاریکیاں سمیٹے گا

جمیل الرحمٰن

بدل گئے ہوں زمیں آسماں تو کیا کیجئے
یہ ہجر تمیں بھی ہوں آزار جاں تو کیا کیجئے

ہمارے عکس کسی آئینے کو ڈھونڈتے ہیں
اور آئینہ ہو سراسر گماں تو کیا کیجئے

یہ کیسا شہر ہے جس میں کوئی سرائے نہیں
لبوں پہ اترے کوئی داستاں تو کیا کیجئے

ہم ایسے وحشی کہ سیاح تھے نہ تاجر تھے
ہوئے نہ واقف رسم جہاں تو کیا کیجئے

جمیل پائے طلب شل ہے راہ خوابیدہ
چمک اٹھے کہیں اس کا نشاں تو کیا کیجئے

دل ضبط فراواں سے اتنا بھی نہ بھر جائے
رخ پھیرے وہ اپنا جس غم پہ نظر جائے

کچھ تو ہے جسے چن کرلے جائے ہے چپکے سے
بھر کر مری آنکھوں میں جو روز سحر جائے

وہ بے کل و آسودہ پھرتا ہے بہت گھر میں
جب تک مرے ہونے کی دستک پس در جائے

اب راحت منزل بھی درمیاں نہیں کلفت کا
کھوئے ہوئے مل جائیں تو رنج سفر جائے

آنگن سے جمیل اس کے اٹھتی ہے کوئی خوشبو
ٹوٹے ہوئے زینے سے جب دھوپ اتر جائے

صدیق عالم

جھرنا ہیمبرم کی آنکھوں میں سیلن بہت آسانی سے اترتی تھی۔ اتنی آسانی سے کہ صبح نیند سے جاگ کر دونوں پپوٹوں کو الگ کرنے کے لئے اسے انگلیوں کا اچھا خاصا زور لگانا پڑتا۔ آج تو اس کی داہنی آنکھ آدھی کھل پائی تھی اور اسی حالت میں وہ ادھر ادھر گھوم رہی تھی، صبح کے کام کاج کر رہی تھی، سور کے لئے ناند صاف کر رہی تھی۔ اور اسکی داہنی آنکھ میں تھا کہ دن گھستا چلا آرہا تھا۔ اسے کسی طور اس آنکھ کو پوری کھولنا ہوگی تاکہ آسانی سے بند کر سکے۔ اس نے کئی بار آنکھوں پر پانی کے چھینکے مارے، انگلیاں گھسا گھسا کر پپڑیاں چھڑانے کی کوشش کی مگر پپوٹوں کے کنارے پھر بھی جڑے رہے۔ آخر میں تھک کر اس نے ایک بیڑی سلگالی جسے وہ خود بناتی تھی اور بھک بھک دھواں نکالتے ہوئے اپنے مجروح دانتوں سے تنکے کھینچ کھینچ کر بانس کی ٹوکری بننے لگی۔ اس کے بیٹے رائسن، ہیمبرم کو شہر نے مانگ لیا تھا اور اب وہ ریل کی پٹری کے کنارے کنارے اپنے ہتھوڑے اور دوسرے اوزار لے کر گھومتا۔ اسکے شوہر منگرو نے مہوے کا شراب پی پی کر اپنا پیٹ اتنا بڑا کر لیا تھا کہ اسے شہر کے سرکاری اسپتال میں اندر سے چیر کر ٹھیک کرنا پڑا۔ مگر پھر وہ زیادہ دن تک زندہ نہ رہ پایا۔ اس نے اتنا غصہ اپنے اندر بھر لیا تھا کہ وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔ ایک دن اس نے اپنی رکھیل آرتی سردار کو اتنا مارا اتنا مارا کہ وہ ادھ موئی ہو گئی۔ اس دن گاؤں والوں نے فیصلہ کیا کہ منگرو شرابی ہو گیا ہے۔ اور منگرو مرنے والا ہے اور اب منگرو کسی بھی دن جنگلی بد روحوں کے شکنجے میں ہوگا جو اسے اڑا کر ڈھاک کے جنگل میں لے جائیں گی، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پیڑوں کے کھو کھلوں میں بھٹکتا رہے گا اور راہگیروں پر عجیب و غریب چیزیں برساتا رہے گا۔

ایک دن منگرو کا بھوت آئے گا! جھرنا ہیمبرم خود سے کہہ رہی تھی۔ اور وہ ہر کام آسان کر دے گا۔ وہ سوروں کے طویلے میں رہنا شروع کر دے گا اور سوروں کی گرمی بڑھ جائیگی۔ وہ مرغیوں کے ڈربے میں رہنا شروع کر دے گا اور مرغوں کی گرمی بڑھ جائیگی۔ وہ بکریوں کے تھنوں میں دودھ بھر دے گا اور ان کے لئے ہرے ہرے پتے پیڑ اور جھاڑیوں کے نچلے حصوں میں اگائے گا۔ اور سلائی کنڈ کے بڑے بڑے پتھر سے پھوٹتے جھرنے میں پانی ہی پانی ہوگا۔ میں نے منگرو کے لئے بجا کے کھو کھلے صاف کروائے ہیں تاکہ اپنے آرام کے لئے اسے ڈھاک کے جنگل کی طرف لوٹنا نہ پڑے بلکہ انھیں میں سے کسی میں وہ آرام سے لیٹا رہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح جب وہ زندہ تھا لیٹا رہتا تھا۔

وہ لوگ کانا پہاڑ کے باشندے تھے۔ اسے کانا پہاڑ اسلئے کہتے تھے کہ جب سورج اسکی چوٹی کو چھو کر ڈوبتا تو کان آنکھ کی شکل اختیار کر لیتا۔ کانا پہاڑ کے بارے میں بہت ساری باتیں تھیں۔ مثلاً اس پر بسے ہوئے چھوٹے چھوٹے قبائیلی گاؤں اب اپنے پرانے رکھ رکھاؤ سے بچتے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ پر عیسائی مشنری حاوی ہو گئے ہیں اور کچھ نے ہندو دیوی دیوتاؤں کو اپنا لیا ہے۔ مگر جو افواہ سب سے زیادہ گرم تھی اور جس نے لوگوں کو مضطرب کر رکھا تھا وہ یہ تھی کہ اب کانا پہاڑ سے روحیں منتقل ہو رہی ہیں۔ وہ یہاں کے لوگوں سے ناخوش ہیں اور ایک دن آئے گا جب پہاڑ کے گربھ سے آگ ابلے گی اور پیڑ پودے گھر اور پرانی اس طرح جلیں گے جس طرح جنگل میں آگ پھیلنے سے کیڑے مکوڑے جلتے ہیں۔

شاید یہی وجہ تھی کہ منگرو کے اندر اس قدر غصہ بھرا ہوا تھا۔

اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے تیر اور بھالے تیز کیا کرتا۔

مگر اس نے کبھی تیر نہیں چلائے، بھالا نہیں اٹھایا۔ وجہ بے وجہ مہوا پیتے پلاتے رہنا، ڈھلان میں ہفتہ وار ہاٹ میں مرغے لڑانا اور ہاڑیا کھیلنا جہاں سے وہ بہت سارے پیسے جیت کر آتا اور کبھی کبھار ہار کر بھی۔ مگر جھرنا ہیمبرم جانے کیسی جادوگرنی تھی، دو وقت کا ابلا ہوا اناج اور گوشت اسکے برتن میں عین وقت پر دھرا ہوتا جن کی طرف منگرو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا، مگر کھائے جاتا، جیسے یہ سب کچھ اسے اچھا نہ لگ رہا ہو، جیسے اسکے اندر کی آتما اسے پھٹکار رہی ہو۔ اور جب اس اندرونی ملامت سے وہ ہار جاتا تو آرتی کے پاس چلا جاتا۔ آرتی جو جانے انجانے کتنوں ہی کی مشترک رکھیل تھی اور جسے مہوے سے شراب کشید کرنے کا فن آتا تھا اور جس کا شوہر اسے ہر کسی کے پاس بھیجنے کے لئے بے چین رہتا۔

"بہت کراری بہو ہے، بس ایک باٹلی ٹھرا سرکار اور دس روپے" وہ اکثر پہاڑی راستے سے گذرنے والے سیاحوں کی گاڑیوں کے سامنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کی بغل میں آرتی سر جھکائے کھڑی رہتی، اپنی ہنسی چھپانے کی کوشش کرتی رہتی۔ اپنی ساڑی کے پلو کو منہ میں ٹھونستی جاتی۔

یہ شہری لوگ!" وہ دل ہی دل میں سوچتی

اور جب جمرنا ہیبرم اکیلی رہ گئی تو کتنوں نے ہی اسے گو دنے کی
ش کی۔ وہ ٹوکریاں اچھی بنتی تھی۔ اسکے جانور بیماری سے نہیں مرتے تھے اور
ل کے ان گوشوں سے وہ بخوبی واقف تھی جہاں بدلتے موسموں کی مناسبت
ے سوکھی لکڑیوں کی بہتات ہوتی۔ اسکے بالوں میں چاندی کے تار جاگنے لگے
ے اور اس جیسی تجربہ کار عورت کا سارا گاؤں قبائلیوں کی ہمیشہ کی ضرورت
ا ہے۔

صرف جمرنا ہیبرم کو ان کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح
ج بھی منگرو کے ساتھ اپنی زندگی گذار رہی تھی۔ صرف منگرو کہیں اور تھا اور
ہیں اور۔ جنگل میں کیکر، شہتوت اور مکوستی کی جھاڑیوں میں جہاں سانپ
، کینچلی چھوڑ جاتے وہ منگرو کے پیروں کے نشان ڈھونڈتی۔ مگر پھر اسے یاد
ا۔ آتماؤں کے پیر نہیں ہوتے۔ نہیں پیر تو ہوتے ہیں، مگر انھیں زمین پر
ینے کی ضرورت نہیں ہوتی کبھی کبھی جمرنا ہیبرن خود بھی پریت آتما کی شکل
یار کر لیتی اور اسے لگتا وہ کیکر کی جھاڑیوں پر بہ آسانی چل سکتی ہے۔ اسکے اندر
ے آزمانے کی ہمت تو نہ تھی مگر وہ آتماؤں کا مذاق بھی اڑانا نہیں چاہتی تھی۔

جس دن راکسن اپنے سے بھی دوگنی عمر کی ایک عورت کے ساتھ
ر د ہوا جس سے اس نے بیاہ کر لیا تھا تو بڑے غصے میں دکھائی دیا۔ اس دن پہلی
جمرنا ہیبرم کو منگرو کی بہت ضرورت محسوس ہوئی۔ اسے پہلی بار لگا کہ وہ
لی ہو گئی ہے۔

"یہ سب کچھ اب زیادہ دن نہیں چلنے کا ماں، راکسن نے گھر کے اندر
م رکھنے سے پہلے ہی اعلان کر دیا تھا۔ اب زیادہ دن نہیں ہے جب بواری ماں
ے گی اور ہمیں اگلے دنوں کے بارے میں بھی سوچنا چاہئے۔"

"اگلے دن؟" جمرنا ہیبرم نے معصومیت سے پوچھا۔

"میرے ریلوے کوارٹر میں دو کمرے ہیں" راکسن نے سگریٹ
اتے ہوئے کہا۔ وہ کھانس بھی رہا تھا۔ "اور بواری جب ماں بنے گی تو ہمیں
، نہ کسی کی ضرورت تو ہو گی ہی۔ رہا ایک کمرا تو اسے ہم کرائے پر دے سکتے
ں۔"

دو ہفتے راکسن اور بواری جمرنا ہیبرم کے ساتھ رہے۔ بواری اور
رنا ہیبرم کسی حد تک ہم عمر بھی کہی جا سکتی تھیں۔ اسلئے دونوں گھل مل
ں۔ بواری کے کولہے پیچھے کی طرف نکلے ہوئے تھے اور اسکے سامنے کی تین
ت نقلی تھے جنہیں رات کے وقت کھول کر اسے پانی کے پیالے میں ڈبو کر
نا پڑتا تھا۔ وہ بیار بار اپنے دونوں کان جھاڑتی اور نقلی دانتوں سے ہنستی۔

"میرا باپ شروع میں میرے بیاہ سے خوش نہیں تھا جیسا کہ
ے باپ کو ہونا چاہئے۔ وہ میرے لئے اور بھی اونچے سپنے دیکھتا تھا۔ مگر
ی سوتیلی ماں نے میرا ساتھ دیا۔ ہم نے بنوماں چوک کے مندر میں شادی
۔ میری تین بہنیں ہیں اور سب کی سب میری ہی طرح سندر ہیں۔ ہمیں
ں کا کیا کال ہے۔"

جمرنا ہیبرم زیادہ تر اس کی باتوں کا سرا ٹھیک سے پکڑ نہ پاتی۔ مگر پھر
بھی اسے پتہ تو تھا کہ اسکے بیٹے کی بہو اپنے دل کا بوجھ اسکے سامنے ہلکا کر رہی
ہے۔ راکسن تو جھونپڑی سے تھوڑی دور بانس کے جھنڈ کے سامنے بچھی چار
پائی پر لیٹا لیٹا سگریٹ پھونکتا رہتا اور اپنی انگلیاں چٹخاتا رہتا۔ اور یہ وہی جگہ تھی
جہاں دس سال پہلے تک چیتا اور بن سور آیا کرتے تھے۔

"ارے، یہ سب کتنی بکواس ہے" وہ بیچ بیچ میں چلا اٹھتا "اس کا نا پید
میں ڈھنگ سے جینے کا کچھ تو ساد ھن ہونا چاہئے۔"

بواری ضرورت سے زیادہ کھاتی تھی اور اسے ہر وقت لوٹا لے کر
جھاڑیوں کے پیچھے گڑھیا کی طرف جانا پڑتا۔

"مجھے تو لگتا ہے ماں، مجھے جلد سے جلد اسے پیٹنا شروع کر دینا
چاہئے۔" راکسن ماں کو آنکھ مار کر کہتا۔ "اس جیسی عورت کے لئے اس سے بہتر
اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ مگر اس کا باپ سالا انجن کا خلاصی تھا جو اسٹیم انجن سے
ریٹائر تو ہو چکا ہے مگر انگاروں کی سی آنکھیں رکھتا ہے۔ صرف بواری اس سے
نہیں ڈرتی۔ اور اس کی یہی بات تو مجھے بھاتی ہے"۔

گاؤں میں جتنے بھی جھونپڑے تھے سب ایک دوسرے سے الگ
الگ مختلف اونچائیوں پر کھڑے تھے۔ ایک دو جگہ باڑھ کے اندر مکئی اور سورج
مکھی کے پودے تھے۔ جمرنا ہیبرم کے کتے ٹھمپا نے بواری کو شروع سے ناپسند
کر دیا تھا۔ وہ بلا جھجک دور کھڑا اس پر بھونکتا رہتا۔ سور ناند میں جھینکتے رہتے،
جمرنا ہیبرم ٹوکری بنتی رہتی اور راکسن چارپائی پر سگریٹ کی نیلی سی راکھ کو
دھیرے دھیرے ہوا میں منتشر ہوتا دیکھتا رہتا۔

واقعی یہ سب کوری بکواس ہے وہ دل ہی دل میں سوچتا۔ اور اسے
کو مہمانوں کی قدر کرنی چاہئے۔ میری غیر حاضری میں اس گھر کا تو کباڑہ ہی ہو
گیا ہے گویا بڈھو کے مرنے کے بعد کچھ تو نہیں سدھرا ہے یہاں۔

اور دو ہفتے بعد، راکسن ہیبرم اپنی بیوی بواری اور ماں جمرنا ہیبرم کو
لے کر گاؤں سے چلا گیا۔

اور بس میں تین گھنٹے اور رکشا میں پندرہ منٹ کے سفر کے بعد تینوں
ریلوے کے ایک پرانے کوارٹر کے دروازے پر پہنچ گئے جس کی قدیم طرز کی
کھپریلی چھت پر جھاڑیاں اور پیپل کے پودے اگے ہوئے تھے۔ یہاں آنکھوں
کے سامنے ریلوے کی پٹریاں چمک رہی تھیں اور جمرنا ہیبرم کو سانس لینے میں
دشواری ہو رہی تھی۔ کوئلہ جلانے کا اتنا تیز دھواں جانے کہاں سے نکل رہا تھا
اور یہاں پیڑ پودوں پر ایک عجیب سی ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ زمین تختے کی
طرح سپاٹ اور سیاہ تھی اور جدھر بھی نظریں اٹھاؤ صرف کوے ہی کوے تھے
اور انسان ہی انسان جو کوؤں کی طرح ہی کالے تھے اور کالک سے لپٹے ہوئے کانوں
کی طرح جاسوس نظر آ رہے تھے۔ پہلے دن سے ہی جمرنا ہیبرم کو گھر کا پورا کام
کاج سنبھالنا پڑا اور پوچھ کہ کرائے دار ابھی مل نہ پایا تھا راکسن نے دوسرے کمرے

تالا دے رکھا تھا۔ اسلئے جھرنا ٹیمبرم کو اپنا بستر باورچی خانہ کے دروازے کے پاس آدھے گھرے ہوئے برآمدے پر لگانا پڑا جہاں سے پٹریوں کے اوپر پھیلے ہوئے کالک زدہ تار اور تاروں بھرا آسمان دکھائی دیتے تھے۔

اندر کمرے سے بواری اور راکسن کے کھلکھلا کر ہنسنے، چومنے اور ایک دوسرے کو پیار بھری فحش گالیوں سے نوازنے کی آوازیں آتی رہتیں۔ آدھی رات سے قبل دونوں باری باری سے جھرنا ٹیمبرم کے سوتے ہوئے جسم کو لانگھ کر غسل خانے کے اندر جاتے۔ مگر جھرنا زیادہ تر وقت جاگتی رہتی اور وہ ایسے لوٹ پلنگ وقت میں سو جاتی جب بواری کو اس کی ضرورت ہوتی۔

"جب سے کوارٹر آئی ہے، بڑھیا کو تو مزا ہی مل گیا ہے۔" بواری کوسنے دیتی۔ "ڈھنگ سے دو وقت کا کھانا بنانا تو آتا نہیں، پسر کر یوں سوتی ہے جیسے سارا جگ جیت آئی ہو۔"

اب تو راکسن نے نل سے پانی لانا بند کر دیا تھا۔ نل پر پانی کے لئے بڑا ہنگامہ ہوتا۔ اکثر ٹیمبرم خالی ڈول کے ساتھ واپس لوٹتی۔ اور اس پر بواری کا عتاب نازل ہوتا۔

"غیر کو تو آدمی گالی بھی دے لے، مگر اپنے پر کیسے تھوکے؟" بواری اپنے خصم کو سناتی۔ "اجی میں تو کہتا ہوں، آپ تو ادھر توجہ دیتے ہی نہیں، بس اکیلے مجھے ہی جھیلنا پڑتا ہے۔ بڑھیا تو خالی ڈول لے کر واپس آجاتی ہے اور مجھے نل پر جا کر گالی گلوچ کرنی پڑتی ہے۔"

"سب بکواس سن رہا ہوں" راکسن کہتا "میرا خیال ہے بڑھیا جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتی۔ جلد ہی سیکھ جائے گی۔ ارے اب اس میں چلانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ تم بواری بس جلد سے جلد ایک بچہ دے دو، یہ گھر بھر جائیگا۔ کیوں نہ آج ہم ایک نیا طریقہ اپنائیں؟"

اور پچھلے پورے دو سال سے دونوں اسی کوشش میں ہی تو مصروف تھے۔ جھرنا ٹیمبرم کے آنے کے بعد اب تو دن میں بھی وہ ایک آدھ کوشش کر لیتے۔ فرصت کے وقت جھرنا کوارٹر کے دروازے کے باہر اکڑوں بیٹھی زمین پر کسی تنکے سے لکیریں کھینچتی رہتی، ٹرینوں کو گذرتے دیکھتی رہتی۔ اسے دھواں اگلتے ہوئے اسٹیم انجن زیادہ اچھے لگتے جن کے ڈرائیور سر پر غلیظ رومال باندھے رہتے اور اس عجیب و غریب بڑھیا کی طرف تاکتے رہتے جسے اس شہر کی بھاشا بھی نہیں آتی تھی۔ پٹریوں پر بھاگتے کتوں کو دیکھ کر اسے اپنا بھتنا یاد آجاتا۔ سوروں کو تو اس نے پڑوسیوں کو امانت کے طور پر سونپ دیا تھا، مگر بھتنا کو کون سنبھالتا! کتنی دور تک وہ پہاڑی راستے پر بھاگتا آیا تھا اور بس کے پیچھے پیچھے اس نے دوڑ بھی لگائی تھی۔ جھرنا کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور وہ دبی دبی آواز میں کوئی پہاڑی گیت گانے لگتی جسے وہاں کوئی سمجھ نہ پاتا، یہاں تک کہ اندر سے بواری کی پکار سنائی دیتی۔

"بڑھیا، باہر کیا خصم پھانس رہی ہے، کب تک آنکھیں سی ہوئی ہیں؟ کتنا درد ہے میرے بدن میں۔ مگر کوئی مجھے اپنی بیٹی کی نظر سے دیکھے تب تا۔"

رات کو اکثر راکسن دیر سے شراب پی کر لوٹتا اور باورچی خانہ کے دروازے پر پڑے ہوئے جسم سے اسے ٹھوکر لگ جاتی۔

"جی چاہتا ہے، ایک لات جماؤں اسے۔ یہ بھی سونے کا کوئی وقت ہے ماں؟ اور کھانا کون کھلائے گا؟ یہ سب تیرے کارن ہے کہ بواری کے پیٹ میں بچہ ٹھہر نہیں پا رہا ہے۔"

"اور کیا"۔ بواری اندر سے تائید کرتی۔ "ذرا سمجھاؤ اسے، کبھی جو مالش کا تیل گرم کر کے میرے بدن پر لگایا ہو۔ میری تو کمر کا درد بڑھتا جا رہا ہے۔"

"ارے گھبرانے کی بات نہیں، پہلے کچھ کھا لینے دو، بڑی بھوک لگی ہے۔ پھر میں تیری کمر کا درد ٹھیک کر دیتا ہوں۔ میرے پاس ایک خاص نسخہ ہے۔" راکسن آنکھ مار کر کہتا۔ "اور ذرا دیکھ، کیا لایا ہوں تیرے لئے۔ بہت ہی خستہ مال پوے ہیں۔ پسند ہیں نا تجھے، پر اتنا بھی نہ کھا لینا کہ پھر سے لوٹانے کر دوڑنا پڑے۔"

"ارے، میرے پیٹ میں تو کچھ پچتا ہی نہیں۔"

"اس کی ضرورت ہی کیا ہے، گھر کے اندر سنڈاس جو ہے۔"

کبھی کبھی بواری باپ کے گھر چلی جاتی۔ اس وقت گھر میں سناٹا رہتا اور دونوں ماں بیٹے کی دیرینہ محبت لوٹ آتی۔

"ارے لاں، بواری سے کہونا اب کے بازار سے تمہارے لئے تانت کی ساڑی لائے۔ اور یہ سڑی گلی چیل، مجھ سے تو یہ برداشت نہیں ہوتی، جانے تم کیسے انھیں سگی پھرتی ہو؟"

"ارے لاں ذرا ٹھیک سے کھایا کرو، تم تو سوکھتی جا رہی ہو۔ یہی حال رہا تو تمہارے باقی کے دانت بھی جھڑ جائینگے۔"

"ارے لاں، اب کے بواری سے کہونا تمہیں ریلوے ٹاکیز میں سنیما دکھا کر لائے۔"

مگر بواری دن بدن شکی ہوتی جا رہی تھی۔ اسنے ٹونا ٹوٹکا بھی کر کے دیکھ لیا تھا۔ سادھو سنت اور پیر فقیر کے مزاروں کے درشن بھی کر لئے تھے، شٹا بھوت والے برگد پر سیندور کی پوجا بھی کی تھی اور تجربہ کار چھنال بوڑھیوں سے سن سن کر راشن کے ساتھ ہر وہ طریقہ آزما لیا تھا جو بچہ پیٹ میں رکھنے کے لئے ضروری ٹھہرتا ہے، مگر تھی وہ بانجھ کی بانجھ۔ اور آخر کار اس کی بجلی جھرنا ٹیمبرم پر ہی ٹوٹتی۔

"یہ سب اس کے کارن ہے، اس نے اپنے مرد کو کھایا اور اب میرے پیٹ سے بچے چرا رہی ہے۔"

"چپ رہو رنڈی" راکسن چلاتا "میری پیاری رنڈی"

"میں کہتی ہوں، ضرور اس میں کچھ بات ہے۔ میں نے اکثر کچھ سائے آنگن میں چلتے دیکھے ہیں۔"

"میں کہتی ہوں، کبھی تم غور سے بڑھیا کو نہیں دیکھتے۔ کل صبح میں نے جب اسے دیکھا تو وہ مری پڑی تھی۔ مگر اسے جب ہلایا تو اس نے اپنی سیلن بھری آنکھیں کھول دیں اور اپنے سفید دانتوں سے بھوتنی کی طرح ہنس دی"

"میں کہتی ہوں یہ رات کو نیند میں چلتی ہے اور اپنے گیتوں کے ذریعے بدروحوں کو بلایا کرتی ہے۔"

"بواری، تو تو پاگل ہو گئی ہے"۔

مگر راکسن زیادہ دن تک ماں کا دفاع نہ کر سکا۔ اب تو بواری نے کھلے عام جھرنا کو گالی دینا شروع کر دیا تھا۔

"ہر رات اس چڑیل کو مجھے لانگھنا پڑتا ہے۔"

"ہر صبح اس کی لاش دیکھنی پڑتی ہے۔"

"ہر دوپہر، جب میں سوتی ہوں، جانے یہ کہاں جاتی ہے، لوگوں نے اسے مڑے ہوئے پیروں سے چلتے دیکھا ہے۔"

اور جب بات حد سے گذر گئی تو ایک دن راکسن نے جی بھر کر شراب پی۔ گھر آیا اور ماں کے جھونٹے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر لے جا کر ریل کی پٹری پر ڈال دیا۔ جھرنا اٹھی اور لنگڑاتے لنگڑاتے، تاروں کی ناکافی روشنی میں اس سمت ہو لی جدھر اس کی دانست میں اسکے پہاڑ تھے۔

گھر پہنچنے میں اسے تین دن لگے۔ اس ایک سال کے عرصے میں اس کے اور بھی بہت سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ جب پہاڑ نے ہیبرم کو دیکھا تو اس نے اپنی جھاڑیوں اور پیڑوں والی باہیں پھیلا دیں اور سورج کانا پہاڑ پر گویا ہمیشہ کے لئے ٹھہر گیا اور رنگین سر والے گرگٹ سوکھے پتوں پر بھاگتے بھاگتے رک گئے اور اپنے سر موڑ موڑ کر جھرنا ہیبرم کو تاکنے لگے۔ اور جب جھرنا ہیبرم گاؤں سے کچھ دور، جہاں تک بس کے کنڈکٹر نے ترس کھا کر اسے لفٹ دی تھی، ایک چٹان پر بیٹھی اپنے بالوں سے تنکے نوچ نوچ کر نکال رہی تھی تو اسے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔

تھما سورج کو سر پر اٹھائے کھڑا تھا۔

"گھر لوٹ کر آگئی مالکن؟" کتے نے کہا۔

"ہاں رے۔" جھرنا ہیبرم نے کتے کے سر کو تھام کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "میرا بچہ بڑا دکھی ہے تھما، مجھے جلد سے جلد انصاف مانگنے ڈھاک کے جنگل جانا ہوگا۔"

ڈھاک کا جنگل! ڈھاک کا جنگل!! تھما رات بھر بھونکتا رہا۔

کبھی ڈھاک کے جنگل میں صرف ڈھاک کے پیڑ رہے ہوں گے، مگر حال کے برسوں میں دوسری قسم کے پیڑ بھی جگہ جگہ اگ آئے تھے۔ انھیں میں سے چیان کے ایک پیڑ پر منگرو نے قبضہ جما رکھا تھا۔ وہ اسکی کھوکھلی شاخ پر ہاتھ پر سر رکھے لیٹا رہتا اور اپنی مڑی ہوئی ٹانگ ہلایا کرتا۔ یہاں وہاں بھونیا کے پیڑوں میں گلابی پھول کھلے ہوئے تھے اور املتاس کے پھل لانبے اور

عجیب انداز میں جھولتے رہتے اور ڈھاک کے بونے پیڑوں میں دھول اور ہوا سرگوشیاں کرتی رہتیں جن میں کمتر درجہ کی روحیں بلبلایا کرتیں۔

"خاموش رہو بے مطلب کے پاجو، منگرو کی آواز سے روحیں دہل جاتیں اور وہ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے پیڑوں اور جھاڑیوں کے پیچھے پناہ لینے لگتیں۔ یہ بھی کوئی زندہ انسانوں کی جگہ ہے کہ دانت نکوس رہے ہو؟ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کے علاوہ تم آتماؤں کو اور کچھ آتا بھی ہے؟

"بغاوت!" روحیں دوبارہ چلا تیں۔

اور ان نعروں کو سن کر منگرو کا پیٹ ہنسی سے پھولنے لگتا۔ وہ چیان کے پیڑ سے زمین پر چھلانگ مارتا اور ڈھاک کے پیڑوں کی آڑ سے نکلی ہوئی روحوں کے کولھوں پر لات لگایا کرتا۔

"تم اسی قابل ہو۔" وہ کہتا۔ "اور شاید یہ لات تھوڑی بہت عقل تمہارے پیٹ میں ڈال دے۔"

مگر جھرنا ہیبرم جب ڈھاک کے جنگل میں وارد ہوئی تو روحوں کی آپس میں صلح ہو چکی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے ڈھاک بن میں سرے سے روحوں کا وجود ہی نہ ہو۔

منگرو نے چیان کی کمزور شاخ سے سر موڑ کر جھرنا ہیبرم کو دیکھا اور مسکرایا۔

"آ گئی میری صوا کی ترنگ۔ ذرا دیکھو، مرنے کے بعد بھی اسے میری ضرورت ہے جیسے زندگی بھر کا دکھ لے کر بھی جی نہیں بھرا۔ آہ، ہماری ناریوں کو اور کتنا بوجھ چاہیئے۔"

تھما کا سینہ کانپ رہا تھا۔ وہ سر کو زمین پر گاڑ کر غرا رہا تھا۔ اسکی دم ٹانگوں کے بیچ کھچتی جا رہی تھی۔ اسے بدروحیں کبھی پسند نہیں تھیں۔ اسے ان کی عادت بھی نہ تھی۔

"وہ دکھی ہے۔ بہت دکھی ہے" جھرنا گھٹنوں کے بل گر کر رو رہی تھی، مٹی چہرے پر مل رہی تھی۔

"اچھا!" منگرو کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "تب تو میں بھی دکھی ہوں"۔

"آہ منگرو، ایک سال تک میں نے ان کا دکھ دیکھا۔ آہ، ہمارے بچے دکھی ہیں۔"

منگرو کود کر چیان کے پیڑ سے نیچے اترا اور جھرنا کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اسکے سر کے بال کانٹے کر کھڑے ہو گئے۔ بہت ساری روحوں نے پتوں اور جھاڑیوں کے پیچھے سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ وہ اپنی لانبی زبانوں سے دانت چوس رہی تھیں اور منگرو کی مصیبت سے خوش تھیں۔

"عورت! میرے قریب نہ آنا ورنہ میں تیرا ٹینٹوا دبا دوں گا۔ میں پہاڑ پر گدھوں کو اترنے کی اجازت نہیں دے سکتا جیسا کہ تم چاہتی ہو۔"

"چاہے وہ اپنا بچہ ہو؟" جھرنا ہیبرم نے بڑھ کر منگرو کا کرتا پکڑنا چاہا۔

"دور ہٹ" منگرو کود کر پیچھے ہٹ گیا اور اپنی ایڑیوں پر بلند ہوتا چلا گیا جسے دیکھ کر کمتر آتماؤں کے دل کانپنے لگے۔ "مجھ سے یہ سب دیکھا نہیں جاتا۔ اتنی کمزوری کے ساتھ زندہ رہنا کیا مطلب رکھتا ہے۔ عورت اپنے ناخن تیز رکھے اور زبان کی نوک پر انگارے۔ سانپوں میں مجھے کوبرا سب سے زیادہ پسند ہے۔"

"انہیں چھوڑ دے دو منگرو۔ ان کی زندگی آسان ہو جائیگی۔"

"ہرگز نہیں۔" منگرو دانت پیس رہا تھا۔ "تو پہاڑ سے نیچے گئی اور انہوں نے تیرے بال سفید کر ڈالے۔"

"منگرو!"

"تجھے زندہ رہنے کے لئے کسی کی ضرورت تو نہیں تھی جمرنا؟ تو ریچھ کی طرح طاقتور تھی۔ تو تو اکیلی پہاڑ کی رکھوالی کر سکتی تھی۔ پھر بھی جب تو کمزور پڑ ہی چکی ہے تو میں تجھے لڑنے کے لئے ایک ہتھیار دیتا ہوں۔" وہ جنگل کی طرف بھاگا۔ وہ ایک دیوار کے سے تنے پر چڑھتا نظر آیا۔ اس نے اپنی آنکھیں خار دار جھاڑیوں پر ٹانک دیں اور کان پتوں پر لٹکا دیئے۔ اسکے دانت پتھروں پر گرتے چلے گئے اور اسکے بال الگ الگ رینگنے لگے۔ جمرنا ایبرم نے اپنے سامنے ایک چھوٹے سے نقارے کو پڑا پایا۔ منگرو اسکے سامنے کھڑا ہانپ رہا تھا۔ نقارے کے چمڑے کی کھال پر اپنی سوکھی ہڈیوں والا ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"اس نقارے کے لئے ہم روحوں نے کڑی محنت کی تھی۔ اسے مٹی کے نقاب پہن کر ناچنے والوں سے چھپنا تھا جب ان کی جنتا پیچھے شہر کی طرف جا رہی تھی اور نشے میں تھی۔ جب بھی تیرا دکھ تجھے چاٹے تو اپنی ساری چوٹ اسکو دینا۔ یہ تیرا دکھ بانٹ لے گا، تیرا کام آسان کر دے گا۔ اسے بجانے کے لئے ایک مڑی ہوئی لکڑی بنا لینا اور اسے تیل پلانا جس کی ہم روحوں کو قطعی ضرورت نہیں ہوتی۔"

منگرو چٹان کے پیڑ کی طرف اڑتا دکھائی دیا۔ روحوں نے اپنے سر جھاڑیوں اور پتوں کے اندر کر لئے۔ منگرو نے سر کے پیچھے ہاتھ رکھ کر اپنی ایک ٹانگ ہمیشہ کی طرح موڑلی اور سیٹی بجانے لگا۔

"چل بھاگ بھتنا۔" اس نے کہا

نقارے کی آواز زیادہ تر رات کی تنہائی میں سنائی دیتی۔ اس نقارے کی چوٹ سے جمرنا ایبرم نے گاؤں کے لوگوں کو حیران کر دیا تھا۔ کہاں سے ملا اسے یہ نقارا۔ یہ بڑھیا عجیب و غریب کارنامے دکھاتی ہے۔ ایک سال بعد بھی اسکے تمام کے تمام سور زندہ رہے تھے اور تمہارے تین جنگلوں کو کاٹ کھایا تھا جو گوشت کے لئے اسکا اغوا کرنا چاہ رہے تھے۔ مگر یہ نقارا ایک عجیب واقعہ تھا۔ اسے سمجھنا مشکل تھا۔ مگر بڑھیا ہر رات جس دلجمعی سے اسے بجاتی وہ اس سے بھی زیادہ عجیب تھا۔ بوڑھا منگل باسکے ایک دن لنگڑاتا ہوا جمرنا ایبرم کے

دروازے پر پہنچا۔ اس نے بیڑی تمول کی اور کھانستا رہا۔ جمرنا نے ٹکڑا نکال کر اسکے سامنے رکھ دیا۔ ایسا کرنا ضروری تھا۔ بوڑھا باسکے سارے گاؤں اور اسکے چھ نمبردار کی طرف سے آیا تھا۔

"اسکا چمڑا مضبوط ہے اور لکڑی کا تو جواب نہیں جس پر یہ تنا ہوا ہے۔" منگل باسکے نے بیڑی پیتے ہوئے کہا۔ "کوئی وجہ تو ہوگی کہ تم اسے اس طرح راتوں کو بجاتی ہو؟"

"میرے رائسن کو اسکی ضرورت ہے۔"

"شاید۔" منگل باسکے اٹھ کھڑا ہوا۔ "ہمیں اس سے کیا لینا۔ ہر کسی کو اپنے ڈھنگ سے دکھ جھیلنے کا حق ہے۔"

لگتا ہے بیٹے کی مار کھا کر دماغ پھر گیا ہے۔ اس نے گاؤں والوں کو بتایا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑا جا سکتا ہے۔

اور گاؤں والوں نے جمرنا ایبرم کو معاف کر دیا۔ مگر جمرنا کی ہر رات امیدوں بھری تھی۔ وہ دل لگا کر آدھے گھنٹے تک نقارہ پیٹتی اور تھوڑا کا سینہ کانپتا رہتا۔ اور پھر واقعی معجزہ ہو گیا۔ نقارے نے چمتکار دکھایا۔

جاڑے کی ایک کہر آلود صبح رائسن دروازے پر کھڑا تھا۔ جمرنا اس سے لپٹنا چاہتی تھی، مگر رائسن سرد مہری کے ساتھ چپ چاپ کھٹیا پر بیٹھ گیا اور بیڑی پھونکتا رہا۔ اس نے وقت پر کھانا کھایا اور بانس کے جھنڈ کے پیچھے جا کر زمین پر لیٹ کر دھوپ کھانے لگا۔ اگلے پورے ہفتے تک اس نے بہت کم بات کی۔ وہ گاؤں میں آوارہ گھومتا پھرا۔ اس نے کسی سے بات نہیں کی۔

"بواری کیسی ہے؟" آخر ایک دن جمرنا ایبرم نے پوچھ ہی لیا۔

"اچھی ہے۔" رائسن نے بتایا۔ اسکے گالوں پر ہلکی ہلکی گھنگھریالی داڑھی اگ چلی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ لگ رہا تھا اندر ہی اندر اسے کچھ کھرچ رہا تھا۔ اس نے نقارے کو تعجب اور تمسخر سے دیکھا۔

"تو اب اس کی بھی ضرورت پڑنے لگی ہے؟ کیا بکواس ہے۔"

مگر بیٹے کے آنے کے بعد جمرنا کو نقارے کی ضرورت نہ تھی۔ اسی لئے اس نے اسے بانس کی ایک پرانی چٹائی کے اندر لپیٹ کر رکھ دیا۔ اب وہ پہلے کی جیسی جمرنا ایبرم بن گئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں منگرو کی شکر گذار تھی۔

"شاید اب میں واپس نہ جاؤں۔ ان شہروں میں کوئی زندگی نہیں ہے بال۔" ایک دن رائسن نے اعلان کیا۔

"بواری کو کب لا رہے ہو؟"

رائسن نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر ایک ہفتے کے اندر یہ جواب جمرنا ایبرم کو دوسری طرح سے مل گیا جب شہر سے پولس کا ایک دستہ آ کر رائسن کو حراست میں لے کر چلا گیا۔ رائسن پر بواری کے خون کا الزام تھا جس کے مردے کو اس نے ریل کی پٹری پر ڈال دیا تھا تاکہ اسے ایک حادثہ قرار دے سکے۔ مگر وہ اس وقت اتنا پیئے ہوئے تھا کہ اسے آس پاس کا ہوش نہ تھا اور کئی

لوگوں نے تناسے بواری کے جسم کو چھڑی پر ڈالتے دیکھا تھا۔

اسکے جانے کے بعد جھمرنا لٹی لٹی سی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھی رہی، بانس کے جھنڈ کے اوپر پھیلے ہوئے نیلے آسمان میں پرندوں کو چکر لگاتے دیکھتی رہی۔ اس رات گاؤں والوں نے پھر نقارے کی آواز سنی اور یہ آواز رک رک کر رات رات بھر سنائی دیتی رہی۔ مہینوں بیت گئے۔ جھمرنا کے نرم بدن پر گوشت برائے نام رہ گیا اور اسکے چہرے کی ہڈیاں باہر نکل آئیں۔ ہر وقت اس کی آنکھیں بے چینی لئے اپنے گڈھوں میں گھومتی رہیں۔ اسکے آدھے سور بیماری سے مر گئے اور جس دن وہ تھمپا اور بیٹے ہوئے نقارے کے ساتھ ڈھاک کے جنگل کی طرف گئی اس دن آسمان پر گھنے کالے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ڈھاک کا جنگل سنسان پڑا تھا۔ اس نے نقارے کو منگرو کے چھتان کے پیڑ سے لٹکا دیا اور منگرو کو جنگل میں ڈھونڈتی رہی۔ ڈھاک کا جنگل خاموش تھا۔

"منگرو!" اس کی آواز پہاڑ کے اوپر سے دوسرے پہاڑ تک جا کر لوٹ آئی جیسے تیز ہوا اسے کاندھوں سے ڈھو کر لے گئی ہو اور واپس لے آئی ہو۔

"منگرو! یہ نقارہ تو اب کچھ بھی نہیں کرتا۔"

ڈھاک کا جنگل اب پہلی طرح خاموش بھی نہ تھا۔ ڈھاک کے چوڑے پتوں پر بارش کی موٹی موٹی بوندیں ٹپ ٹپ کر رہی تھیں۔ اسے لگا جیسے پتوں کے پیچھے کچھ سرسرا رہا ہو۔ مگر کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے ہوا تیز ہو گئی آسمان بجلی کے کڑکنے سے گونج گونج اٹھا۔ آندھی جھکڑ چلنے لگے اور تیز بارش اور ہوا میں پیڑ زمین بوس ہوتے گئے۔ جھمرنا اور تھمپا نے ڈھاک کے ایک پیڑ کے تنے سے لپٹ کر سر کو دونوں بانہوں کے اندر کر لیا۔ ان کی پیٹھ اور کولہے پر بارش تازیانے لگا رہی تھی۔ اولے برسا رہی تھی۔

"واپس نہ چلیں مالکن؟" تھمپا بیچ میں جھمرنا سے سرگوشی کر رہا تھا۔ مگر واپسی ناممکن تھی جب تک طوفان فرو نہ ہو جائے۔ اور جب طوفان فرو ہوا تو سارا پہاڑ گیلا، اداس اور خاموش تھا۔ اپنے سارے پانی برسا کر بادل بدمست ہاتھیوں کی طرح واپس جا رہے تھے۔ جھمرنا اور تھمپا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ڈھاک کے جنگل میں اب صرف ڈھاک کے پیڑ رہ گئے تھے۔ املتاس، بھونیا اور چھتان کے سارے پیڑ جن پر آتمائیں رہتی تھیں اور وہ بھی جس پر منگرو رہتا تھا، اپنے نقارے کے ساتھ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ ◢◢

ضروری اطلاع

شب خون کے لئے چیک / ڈرافٹ صرف SHABKHOON کے نام سے بھیجیں۔

ادارہ

غزل

بلقیس ظفیر الحسن

جینا ہے خوب اوروں کی خاطر، جیا کرو
اک آدھ سانس خود بھی تو لیتے رہا کرو

کیا حرج ہے جو دل کی بھی سن لو کبھی کبھی
یوں اپنے آپ سے نہ ہمیشہ لڑا کرو

یہ بار زیست جھیلتے رہنا ہے عمر بھر
اپنی تھکن پہ ٹک کے کبھی سو لیا کرو

ہے بسکہ خاک اڑانے کی آوارگی کو خو
رخت سفر میں گھر کو بھی باندھے پھرا کرو

ابھی بھی سو رہے ہیں چنبیلی کی چھاؤں میں
نو وارد چمن ہو سنبھل کر چلا کرو

کتنا کہا تھا تم سے کہ مت کھیلو آگ سے
اب جو لگ پڑی ہے تو چپکے جلا کرو

اس تار تار جیب میں ٹکتا ہی کچھ نہیں
اب کیا رفو کرو اسے کتنا سیا کرو

گھبرا گئے ہیں روز بدلتی رتوں سے ہم
جھیلیں نہ اب کوئی سی بھی رت، یہ دعا کرو

اے وائے آگہی نہ رہی کوئی جستجو
پانا بھی کچھ نہیں ہے نہ کھوتا تو کیا کرو

نظارگی کو کب ہے تجلی کی احتیاج
عالم تمام جلوہ ہے دیکھا کیا کرو

کب تک سنیں جنوں کی حکایات خونچکاں
بلقیس اپنے ہوش کی اب کچھ دوا کرو

اے جاتے ہیں کیسے کیسے کہ چشم وا کرو (میر)

مرزا خلیل احمد بیگ

لسانیات کی روشنی میں ادبی فن پارے کی تشریح و توضیح کو 'اسلوبیات' کا نام دیا گیا ہے۔ لسانیات زبانوں کے سائنسی مطالعے کا نسبتاً ایک جدید علم ہے۔ اس شعبۂ علم کا اپنا ایک مخصوص طریق کار ہے جسے بروئے عمل لاتے ہوئے یہ زبانوں کے مطالعے اور تجزیے کا کام انجام دیتا ہے۔ لسانیاتی طریق کار کا اطلاق جب ادب کے مطالعے میں کیا جاتا ہے تو یہ مطالعہ اسلوبیات یا اسلوبیاتی مطالعہ کہلاتا ہے۔ اسلوبیات، اسلوب، کے سائنسی مطالعے کا بھی نام ہے۔ چوں کہ ادب کا ذریعۂ اظہار زبان ہے اس لیے اسلوب کی تشکیل و تعمیر، زبان کے اشتراک کے بغیر ناممکن ہے۔ اسی اسلوب کو ادبی فن پارے کی ان لسانی خصوصیات سے تعبیر کیا جاتا ہے جو اسے انفرادیت بخشتی ہیں اور جن کی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ فلاں مصنف کی تخلیق ہے۔ زبان کا بنیادی ڈھانچا اگرچہ ایک ہوتا ہے، لیکن زبان کے استعمال کی نوعیت ہر شاعر اور ادیب کے یہاں جداگانہ ہوتی ہے۔ اسی لیے ہر ادبی فن کار کا اسلوب بھی جداگانہ ہوتا ہے اور جب اس کا اسلوب اس درجہ مخصوص ہو جاتا ہے کہ وہ اس پہچان بن جاتا ہے تو اسے صاحب اسلوب کہا جانے لگتا ہے۔

تکنیکی اعتبار سے ہم 'اسلوبیات' کو کسی ادبی فن پارے کی لسانیاتی خصوصیات کا مطالعہ کہیں گے۔ یہ اسلوبیاتی مطالعہ لسانیات کی مختلف سطحوں مثلاً صوتی، صرفی، لغوی، نحوی اور معنیاتی سطح پر کیا جاتا ہے۔ لسانیاتی علم و بصیرت کے بغیر ادبی فن پارے کے اسلوبیاتی مطالعے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے مغرب میں اسلوبیات کا ارتقا لسانیات کے ارتقا کے بعد عمل میں آیا۔ لسانیات یا لسانیات جدید بیسویں صدی کے نصف اوّل کی پیداوار ہے اور اسلوبیات کا ارتقا بیسویں صدی کے نصف دوم میں عمل میں آتا ہے۔ ۱۹۵۰ کے بعد یورپ اور امریکہ کی دانش گاہوں میں ماہرینِ لسانیات کی توجہ ادبی زبان، اسلوب اور اسلوبیات کی جانب منعطف ہوتی ہے۔ لسانیاتی ادب میں اسلوبیات کو ادبی اسلوبیات سے ممیز کرنے کے لیے بعض اوقات 'لسانیاتی اسلوبیات' کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔

چوں کہ ادب کے اسلوبیاتی مطالعے کی بنیاد لسانیات پر قائم ہے، اس لیے ۱۹۵۰ کے بعد سے اسلوبیات کو اطلاقی لسانیات کے ایک اہم شعبے کی حیثیت سے فروغ دینے کی منظم کوششوں کا آغاز ہوتا ہے۔

اس سلسلے کی سب سے پہلی کوشش ۱۹۵۳ میں کی گئی جب امریکہ کی انڈیانا یونیورسٹی میں زبان اور ادب کے موضوع پر ایک سمینار منعقد ہوا جس میں ادب بالخصوص شاعری کے مطالعے میں لسانیات کے اطلاق اور دیگر اسلوبیاتی مسایل پر اظہار خیال کیا گیا اور مقالے پڑھے گئے۔ اس سمینار کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں ادب کے معروضی مطالعے کے لیے چند مسلمات قائم کیے گئے، مثلاً اس بات پر زور دیا گیا کہ ادب بنیادی طور پر ایک کلماتی اظہار (Utterance) ہے، اسی لیے یہ ایک لسانی عمل (Language Act) بھی ہے جس کی اپنی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اسے دوسری نوع کے لسانی عمل سے ممیز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلے سے ایک بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ جب ادبی فن پارہ ایک لسانی عمل ہے تو اس کی لسانی ساخت بھی ہے جو صوتی، صرفی، لغوی اور نحوی ساختوں پر مشتمل ہے جن کا مطالعہ لسانیات کے علم کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ زبان و ادب کے موضوع پر منعقد ہونے والے اس سیمینار کی رپورٹ انڈیانا یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے پروفیسر ہیرلڈ وہائٹ ہال اور مشی گن یونیورسٹی کے پروفیسر آر کی بالڈ اے۔ ہل نے مشترکہ طور پر شائع کی ہے۔[۱]

انڈیانا یونیورسٹی ہی میں ایک دوسری کانفرنس سوشل سائنس ریسرچ کونسل کے زیر اہتمام اپریل ۱۹۵۸ میں 'اسلوب' کے موضوع پر منعقد ہوئی جس میں ادب میں اسلوب کی اہمیت، نوعیت اور خصوصیات کو زیر بحث لایا گیا اور ادبی و شعری اسلوب کے صوتی، صرفی، نحوی اور معنیاتی پہلوؤں پر غور کیا گیا۔ نیز بحور و اوزان کے مسایل پر لسانیاتی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی۔ اس کانفرنس میں جن اسکالرز نے مقالات پیش کیے ان میں روجر براؤن (میسا چوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی)، جان بی کیرل (ہارورڈ یونیورسٹی)، سیمور بی۔ چیٹمن (یونیورسٹی آف پنسلوانیا)، رچرڈ ایم۔ ڈوسن (انڈیانا یونیورسٹی)، آرکی بالڈ اے۔ ہل (یونیورسٹی آف مشی گن)، ڈیل ایچ ہائمز (ہارورڈ یونیورسٹی)، آئی۔ اے۔ رچرڈز (ہارورڈ یونیورسٹی)، ٹامس اے۔ سیبیوک (انڈیانا یونیورسٹی)، سال سپورٹا (انڈیانا یونیورسٹی) اور چارلز ای۔ اوس گڈ (یونیورسٹی آف ایلی نوائے) کے نام خصوصیات کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اس کانفرنس میں پڑھے جانے والے مقالات ٹامس اے۔ سیبیوک نے ۱۹۶۰ میں کتابی

صورت میں Style in language کے نام سے شائع کر دیے ہیں۔ ۳ ~

ادبی اسلوب پر ایک اور اہم بین الاقوامی سمپوزیم راک فلر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام اگست ۱۹۶۹ میں اٹلی میں منعقد ہوا۔ اس سمپوزیم میں امریکہ، انگلستان اور دیگر یورپی ملک کے دبستان فکر کی سر کردہ شخصیات نے شرکت کی اور اس میدان میں جو نئی تحقیقات سامنے آئی تھیں ان سے متعلق مقالات پیش کیے۔ یہ سمپوزیم ایک طرح سے ۱۹۵۸ میں انڈیانا یونیورسٹی میں منعقد ہونے والی کانفرنس کا تسلسل کہا جا سکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کانفرنس میں صرف امریکی اسکالرز نے شرکت کی تھی جب اٹلی کے اس سمپوزیم میں امریکہ کے علاوہ دس یورپی ممالک کے نمائندے بھی شریک ہوئے تھے جن میں رولاں بارت (پیرس)، سیمور چٹمن (برکلے)، ژاں استاروبنسکی (سوئزرلینڈ)، اسٹیفن المن (آکسفرڈ یونیورسٹی)، رینے ویلک (ییل یونیورسٹی)، نلز ایرک انکوسٹ اور رچرڈ اوہمن کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اس سمپوزیم کا مرکزی موضوع لسانیات اور ادبی نظریے کے درمیان رشتہ، نیز اسلوبیاتی مطالعات کا مستقبل تھا۔ اس کے علاوہ اسلوب کیا ہے؟ اسلوبی خصوصیات کس طرح ظہور پذیر ہوتی ہیں؟ کیا لسانیات ادبی اسلوب کی توضیح کے لیے کافی ہے؟ کیا اسلوبیات محض لسانیات کا ایک شعبہ ہے؟ وغیرہ سوالات بھی اٹھائے گئے اور ایک مخصوص صنف ادب کے اسلوب، ایک مخصوص عہد کے اسلوب اور ایک مخصوص مصنف یا شاعر کے اسلوب سے بھی بحث کی گئی اور تجزیہ پیش کیا گیا۔ اس سمپوزیم میں پیش کیے جانے والے مقالات اور ان پر ہونے والی بحثیں سیمور چٹمن نے یکجا کر کے کتابی صورت میں Literary Style: A Symposium کے نام سے ۱۹۷۱ میں آکسفرڈ یونیورسٹی پریس سے شائع کر دی ہیں ۳ ~۔ سیبوک اور چٹمن کی مرتب کردہ یہ دونوں کتابیں اسلوبیاتی مطالعات میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کتابوں کی مدد سے مغرب میں اسلوبیات کے ارتقا کی رفتار اور جہات و ابعاد کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

زبان و ادب کے باہمی رشتوں، نیز مطالعہ اسلوب اور اسلوبیات پر اس وقت سے لے کر اب تک کئی اور مذاکرے اور کانفرنسیں مختلف ممالک میں منعقد ہو چکی ہیں اور ان موضوعات و مسائل پر متعدد امریکی اور یورپی عالموں نے سنجیدہ غور و فکر سے کام لیا ہے اور نظریہ سازی کے فرائض انجام دیے ہیں۔ ایسے عالموں میں ٹامس اے۔ سیبوک، روجر فاؤلر۔ رولاں ویلز، آرکی بالڈ اے۔ ہل، سیموئل آر لیون، ہیوفری لیچ، ڈیل ایچ۔ ہائمز، ایم۔ اے۔ کے۔ ہیلیڈے، رچرڈ ڈیکس، سیمور چٹمن، نلز ایرک انکوسٹ، ڈونلڈ سی۔ فریمن وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے چند عالموں کے اسلوبیاتی نظریات کو یہاں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے:

(۱) نلز ایرک انکوسٹ (Nils Erik Enkvist)

نلز ایرک انکوسٹ آبو اکاڈمی (فن لینڈ کی سوئیڈش بولنے والوں کی یونیورسٹی) میں انگریزی زبان و ادب کے ڈانر پروفیسر (Donner Professor) تھے۔ یہ اس اکاڈمی کے ریکٹر بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے لسانیات اور ادبی موضوعات پر کثرت سے لکھا ہے۔ انکوسٹ Linguistics and Style (لسانیات اور اسلوب،) کے جو ۱۹۶۴ میں آکسفرڈ یونیورسٹی پریس (لندن) سے شائع ہوئی، جزوی مصنف ہیں۔ انھوں نے نظریہ اسلوب پر بھی سوں کام کیا ہے۔

انکوسٹ نے نظریہ اسلوب پر اپنے مونوگراف ۴ ~ On Defining Style میں اسلوب کی ان تمام تعریفوں سے بحث کی ہے جو شاعر و ادیب، مفکر، نقاد اور ادبی اسکالر وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہے ہیں۔ ان کے خیال میں اسلوب کو کبھی مصنف کے زاویہ نظر سے دیکھا گیا ہے تو کبھی اسے قاری کے تاثرات سے متعین قرار دیا گیا ہے اور کبھی اسے متن یا ادبی فن پارے کی خصوصیت کی معروضی چھان بین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان تمام تعریفوں کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد انکوسٹ نے زبان کے حوالے سے اسلوب کی دو تعریفیں نہایت تفصیل کے ساتھ مدلل انداز میں بیان کی ہیں:

(الف) انکوسٹ کے نزدیک اسلوب کی پہلی تعریف وہ ہے جس میں متبادل اظہارات کے درمیان انتخاب The choice between alternative expression سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ انتخاب لسانی سطح پر ہوتا ہے اور قواعد کے دائرے میں رہ کر کیا جاتا ہے۔ اسی لیے یہ قواعدی انتخاب کہلاتا ہے۔ قواعدی انتخاب اسلوبیاتی انتخاب (Stylistic Choice) بھی ہو سکتا ہے اور غیر اسلوبیاتی (Non- stylistic choice) بھی۔ جب دو مختلف المعنی الفاظ کے درمیان انتخابی عمل پیش آتا ہے تو یہ غیر اسلوبیاتی انتخاب کہلاتا ہے۔ انکوسٹ نے یہ بات ذیل کی دو مثالوں سے واضح کی ہے:

1. It is pouring.

2. It is drizzling.

یہاں دو الفاظ ,pouring اور "drizzling" الگ الگ معنی بیان کرتے ہیں، اس لیے یہ اگرچہ قواعدی انتخاب ہے لیکن غیر اسلوبیاتی انتخاب کہلائے گا۔ قواعدی انتخاب، اسلوبیاتی انتخاب اس وقت کہلائے گا جب دو ہم معنی یا متحد المعنی الفاظ کے درمیان انتخابی عمل پیش کیا ہو، مثلاً:

1. He is a fine man.

2. He is a nice chap.

یہاں 'fine man' اور 'nice chap' کے درمیان انتخاب اسلوبیاتی انتخاب کہلائے گا کیوں کہ یہ دونوں معنی کے اعتبار سے ایک ہیں۔

اردو میں اسلوبیاتی اور غیر اسلوبیاتی انتخاب لفظی کو ذیل کے تین جملوں کی مدد سے بخوبی واضح کیا جا سکتا ہے:

(۱) آفتاب طلوع ہوتے ہی ہر سمت روشنی پھیل گئی۔

(۲) آفتاب غروب ہوتے ہی ہر سمت تاریکی چھا گئی۔

(۳) سورج ڈوبتے ہی ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

اوپر کی مثالوں میں نمبر (۱) اور (۲) کو غیر اسلوبیاتی انتخاب کہیں گے اور نمبر (۲) اور (۳) کو اسلوبیاتی انتخاب، کیوں کہ آخر الذکر دونوں جملے اگرچہ اپنی لسانیاتی ساخت کے اعتبار سے الگ الگ ہیں لیکن بہ اعتبار معنی یکساں ہیں۔

اردو شعر و ادب میں اسلوبیاتی انتخاب کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اس کی ایک عمدہ مثال میر انیس کے کلام میں دیکھنے کو ملتی ہے جہاں وہ 'اوس' اور 'شبنم' کے درمیان لفظی انتخاب کرتے ہیں:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

اور:

شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

شعری سطح پر اسلوبیاتی انتخاب کی مثالیں اردو میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اکثر دو شاعروں کے خیالات میں مطابقت ہوتی ہے، لیکن ان کے لسانی اظہار میں فرق پایا جاتا ہے۔ یہی فرق دونوں شاعروں کے درمیان اسلوبیاتی فرق بن جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر شاعر کی پہچان اس کے اسلوب کے حوالے سے قایم کی جاتی ہے۔ شیخ امام بخش ناسخ کا ایک شعر ہے:

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لیے خاک سے ہوتے گلستاں پیدا

ناسخ نے اس شعر میں جو بات کہی ہے تقریباً وہی بات غالب نے اپنے اس شعر میں دوسرے انداز سے کہی ہے:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یہ دونوں اشعار مفہوم اور مضمون کے اعتبار سے تقریباً یکساں ہیں، لیکن ناسخ اور غالب کے کہنے کے انداز میں یعنی ان کے لسانی اظہار میں فرق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی فرق دونوں شاعروں کے درمیان یا دونوں اشعار کے درمیان اسلوب کا فرق بن جاتا ہے۔

اسی طرح میر تقی میر اور غالب کے بعض اشعار میں خیالات کی ہم آہنگی اور مفہوم کی مطابقت پائی جاتی ہے لیکن لسانی اظہار میں فرق کی وجہ سے دونوں کا اسلوب جدا گانہ ہے، مثلاً میر کا ایک شعر ہے:

کون کہتا ہے نہ غیروں پہ تم امداد کرو
ہم فراموش ہوؤں کو بھی کبھی یاد کرو

غالب نے اسی مضمون کو یوں باندھا ہے:

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی [illegible] رہو تو کیا گناہ ہو

انکوسٹ نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اسلوبیاتی انتخاب صرف الفاظ کی

سطح پر ہی نہیں واقع ہوتا بلکہ صوتی، صرفی، لغوی، نحوی اور فقروں اور جملوں نیز عبارت کی سطح پر بھی اسلوبیاتی انتخاب کی مثالیں پائی جاتی ہیں:

(۱) صوتی سطح پر دو مصمتوں (Consonants) یا دو مصوتوں Vowels کے درمیان انتخاب جو معنی کی تبدیلی کا سبب نہ ہو، اسلوبیاتی انتخاب قرار پا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

- ○ اب اور اپ ا کے درمیان انتخاب مثلاً، بادشاہ/پادشاہ۔
- ○ اد اور اذ ا کے درمیان انتخاب مثلاً، استاد/استاذ۔
- ○ اپ اور اف ا کے درمیان انتخاب مثلاً، سپید/سفید۔
- ○ مختصر اور طویل مصوتے کے درمیان انتخاب مثلاً، نگہ/نگاہ، شہ/شاہ، مہ/ماہ، گنہ/گناہ، رہ/راہ، سیہ/سیاہ، خموش/خاموش وغیرہ۔

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم تھی

(غالب)

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی

(اقبال)

(۲) صوتی سطح کے علاوہ اردو میں قواعدی سطح پر بھی اسلوبیاتی انتخاب کی بے شمار مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

- ○ فعلی شکلیں: آیئے/آئیں، بیٹھیے/بیٹھیں، فرمایئے/فرمائیں، پوچھو ہو/پوچھتے ہو، آوے/آئے، آئے ہے/آتا ہے، جلے ہے/جلتا ہے، وغیرہ:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو (میر)
جلے ہے دیکھ کے بالین یار پر مجھ کو (غالب)
جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے (غالب)
آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب (غالب)

- ○ تراکیب لفظی: حسن ظاہری/ظاہری حسن، لشکر شاہی/شاہی لشکر، ابر سیاہ/سیاہ ابر، وجہ خاص/خاص وجہ، آہ سرد/سرد آہ، نشہ دولت/دولت کا نشہ، تازگی خیال/خیال کی تازگی، باعث فخر/فخر کی باعث، شب و روز/رات دن، نشیب و فراز/اتار چڑھاؤ، بود و باش/رہن سہن وغیرہ۔
- ○ نحوی ساخت و ترتیب: ان کی آمد پر/ان کی تشریف آوری پر، شروع قصے کا، ('باغ و بہار')، سرگذشت آزاد بخت پادشاہ کی، ('باغ و بہار')، رہائی طلسم سے اس گرفتار محبت کی، ('فسانہ عجائب') وغیرہ۔

(۳) اسلوبیاتی انتخاب نہ صرف آوازوں، لفظوں، فقروں اور جملوں نیز دیگر اجزائے کلام پر مشتمل ہوتا ہے بلکہ جملوں سے بڑی اکائی نیز عبارت کی سطح پر بھی اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اس کی ایک عمدہ مثال مرزا رجب علی بیگ سرور کی کتاب "فسانہ عجائب" میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ جہاں رات کے خاتمے کے بعد صبح کی آمد کا منظر ایک طویل عبارت میں یوں بیان کیا گیا ہے:

"جس وقت زاغ شب نے بیضہ ہائے انجم آشیانہ مغرب میں چھپائے اور صیادان سحر خیز دام بر دوش آئے اور سیمرغ زریں جناح، طلا بال غیرت لعل قفس مشرق سے جلوہ افروز ہوا، یعنی شب گذری روز ہوا۔"

اس مفہوم کو اسمٰعیل میرٹھی نے بالکل سیدھے سادے انداز میں یوں ادا کیا ہے:

رات گذری نور کا تڑکا ہوا

یہاں اظہار کے دونوں طریقوں میں اسلوب کا فرق نمایاں طور واضح ہے۔

(ب) انکوسٹ نے اسلوب کی تعریف 'نارم' سے انحراف eviations from a norm کی حیثیت سے بھی کی ہے۔ نارم (Norm) سے یہاں زبان کی تسلیم شدہ اور مروجہ اصول و ضوابط مراد لیے جاتے ہیں جن کی خلاف ورزی کو 'انحراف' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عام زبان ایک مقررہ ڈگر پر چلتی ہے اور بندھے ٹکے اصولوں پر کام کرتی ہے۔ اسی زبان کو جب کوئی شاعر یا ادیب اپنے تصرف میں لاتا ہے تو وہ اس میں انوکھا پن پیدا کرتا ہے اور نئے لہجے، نئے پیرائیہ بیان اور نئے طرز اظہار کی تلاش میں وہ نئے نئے لسانی سانچے، پیٹرن اور تلازمات تشکیل دیتا ہے اور زبان میں تراش خراش اور توڑ پھوڑ سے بھی کام لیتا ہے۔ اظہار کی جدتیں، متنوع اور نئے لسانی تجربے، نیز تصرفات زبان کو ایک نہج پر قائم نہیں رہنے دیتے جن کی وجہ سے زبان اپنی مروجہ ڈگر سے ہٹ جاتی ہے۔ زبان میں تصرف کے اسی عمل کو 'انحراف' قرار دیا گیا ہے جو نئی زبان کی تشکیل میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ اسی انحراف کی وجہ سے زبان میں تازگی، ندرت اور امتیازی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔

اسلوبیاتی انتخاب کی طرح نارم سے انحراف کی بھی کئی لسانی شکلیں ہیں، لیکن سب سے نمایاں اور دلکش انحراف وہ ہوتا ہے جو زبان کے سلسلے میں انتخابی ضابطوں (Selectional Rules) کو نہ ماننے اور انتخابی پابندیوں (Selec-tional Restrictions) کی خلاف ورزی کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ انحراف نہ صرف اسلوب کی تشکیل کا سبب بنتا ہے بلکہ اسلوب میں ندرت، تازگی اور جدت بھی پیدا کرتا ہے۔ یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ انحراف سے نہ تو غیر معیاری، بے قاعدہ یا بگڑی ہوئی زبان مراد ہے اور نہ ہی اصول و قواعد زبان کی شکست و ریخت اس کی منشا ہے۔ بلکہ انحراف سے یہاں متن (Text) کی وہ خصوصیات مراد ہیں جو محض زبان میں جدت و تصرف اور ایجاد و اختراع یا پیرائیہ اظہار کے نئے سانچوں کے طور پر معرض وجود میں آئی ہیں اور جن کا استعمال ایک متن (یا ادبی فن پارے) کو دوسرے متن سے، یا ایک مصنف کو دوسرے مصنف سے یا ایک دور کے ادب کو دوسرے دور کے ادب سے ممیز و ممتاز کر دیتا ہے۔ انکوسٹ کا خیال ہے کہ جب دو متون میں نارم سے انحراف کی بنیاد پر فرق پایا جائے تو دونوں متون کا اسلوب جداگانہ ہوگا۔ ۵

اردو شعر و ادب میں لسانی نارم سے انحراف اور انتخابی ضابطوں اور پابندیوں کی خلاف ورزی کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ایسی بعض مثالوں کا

ذکر یہاں بیجا نہ ہوگا۔

(۱) 'رات' ایک ہندی نژاد لفظ ہے۔ اردو میں اس کی جمع فاعلی حالت میں 'راتیں' اور مفعولی حالت میں 'راتوں' تشکیل دی جاتی ہے۔ اردو میں رات کے لیے فارسی، شب، کا استعمال بھی پایا جاتا ہے، لیکن اردو قاعدے کے مطابق تشکیل دی گئی اس کی جمع 'شبیں' اردو میں مستعمل نہیں ہے۔ انور شعور نے اس لسانی نارم سے انحراف کرتے ہوئے اپنی غزل کے ایک شعر میں "شبیں" کا استعمال کیا ہے:

تمھارے ساتھ گذاری ہوئی شبیں اب تک
مجھے جگائے ہوئے ہیں، شبیں ہی ایسی تھیں

(۲) اردو میں لفظ 'پانی' اسم واحد کے طور پر ہی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً 'پانی برس رہا ہے'۔ اردو محاوروں میں بھی 'پانی' ہی مستعمل ہے، مثلاً 'شرم سے پانی پانی ہونا' لیکن اکثر شاعروں نے اس لفظ کی جمع بنائی ہے اور اشعار میں 'پانیوں' باندھا ہے جو لسانی نارم سے انحراف ہے۔ مثال کے طور پر صبا اکرام کا یہ شعر دیکھیے:

ہے اب تو خیر اسی میں کہ پانیوں میں رہو
کبھی جو سطح پہ آئے تو ڈوب جاؤ گے

(۳) اردو کے جو فعلی مادے الف یا واؤ پر ختم ہوتے ہیں ان کا فعل مستقبل کا صیغہ بناتے وقت 'گا' یا 'گی' سے پہلے 'ے' کا اضافہ کیا جاتا ہے، مثلاً جائے گا/جائے گی یا سوئے گا/سوئے گی۔ لیکن فعلی مادے 'ہو' کے ساتھ 'گا' سے پہلے 'ے' کا اضافہ نہیں کیا جاتا، مثلاً 'ہوگا'۔ مظفر حنفی نے اس لسانی نارم سے انحراف کرتے ہوئے اپنی ایک غزل کی ردیف ہی 'ہوئے گا' قائم کی ہے:

پھر سنا جاتا ہے گلستان صحرا ہوئے گا
کانپتا بیٹھا ہے دیوانہ کہ اب کیا ہوئے گا

اک ستارہ ٹوٹ کر آیا مظفر کی طرف
آپ نے شاید اسے پیغام بھیجا ہوئے گا

(۴) اردو میں مصدر کی علامت 'نا' ہے جس سے اردو میں کثیر تعداد میں مصادر بنائے گئے ہیں۔ مثلاً آنا، جانا، چلنا، کرنا، ڈرنا۔ مرنا۔ وغیرہ۔ لیکن 'ہجرنا' اردو کا کوئی مصدر نہیں ہے۔ عادل منصوری نے یہ جدت پیدا کی ہے کہ لفظ ہجر (جو اسم ہے) میں 'نا' لگا کر مصدر "ہجرنا" بنایا۔ پھر کرتا ہوا۔ ڈرتا ہوا، مرتا ہوا کے انداز پر 'ہجرتا ہوا' بنالیا جو لسانی نارم سے انحراف ہے۔ ان کی ایک غزل کا یہ شعر دیکھیے:

تو داد اگر نہ دے، نہ سہی، گالیاں سہی
اپنا بھی کوئی عیب ہجرتا ہوا سا ہو

اس غزل کا مطلع یوں ہے:

پہلو کے آر پار گذرتا ہوا سا ہو
اک عکس آئینے میں اترتا ہوا سا ہو

(۵) اردو میں فعل 'اُگنا' اور اس کے مشتقات کا استعمال بالعموم سبزہ، پودا یا
ر نباتاتی اشیاء کے زمین سے بتدریج نمودار ہونے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اسی
رح لفظ 'چاند' کے لیے نکلنا، ڈوبنا، چھپنا، وغیرہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔
ن مظفر حنفی نے اپنی ایک غزل کے مطلع میں چاند کے ساتھ اُگنا کا فعلی صیغہ
تعمال کیا ہے جو معنیاتی بے قاعدگی (Semantic Anomaly) کا مظہر ہے
۔ جس سے انتخابی ضابطے اور پابندی کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ جب چاند کا
قاب کر لیا گیا تو اس کے بعد افقی سطح (Syntagmatic Level) پر
سرے لفظ کے انتخاب میں متکلم پر بعض پابندی عائد ہو جاتی ہے۔ دوسرے
ز کا انتخاب وہ اپنی مرضی سے نہیں کر سکتا، اسے بہت سی باتوں مثلاً قواعد،
عنیاتی مطابقت اور روزمرہ وغیرہ کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً اگر کلام کی ابتدا میں
ظ 'لڑکا، آیا ہے' تو اس کے ساتھ فعل آیا، آتا ہے، آئے گا وغیرہ ہی استعمال
گا۔ کیوں کہ 'لڑکا' کا انتخاب متکلم کو اس بات پر مجبور کرتا ہے اور اس امر کا
ند بناتا ہے کہ وہ فعل مذکر استعمال کرے۔ اس انتخابی پابندی کو قواعدی
ابقت کا نام دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں کلام میں انتخاب لفظی کو معنیاتی مطابقت کا
ل حامل ہونا ضروری ہے۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ لڑکی روئی یا لڑکی ہنس دی تو
اں قواعدی مطابقت کے علاوہ معنیاتی مطابقت بھی پائی جاتی ہے اور انتخابی
بطوں کی پوری پوری پابندی کی گئی ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ کرسی روئی یا
ی ہنس دی یا ماچس کی ڈبیا نے سیب کھا لیا تو یہاں اگرچہ قواعدی مطابقت ہے
ن معنیاتی مطابقت کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انتخابی
بطے کی صریحاً خلاف ورزی کی گئی ہے۔ کیوں کہ رونا اور ہنسنا دونوں انسانی
تیں ہیں جو غیر ذی روح اشیاء سے منسوب نہیں کی جا سکتیں۔ اسی طرح
انے کا عمل بھی ذی روح مخلوق سے منسوب ہے۔ غیر ذی روح یا بے جان
یاء سے کھانے کا عمل منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ کرسی روئی، کرسی ہنس دی، یا
س کی ڈبیا نے سیب کھا لیا وغیرہ جملوں میں معنیاتی مطابقت کو نظر انداز کر دیا
ہے اور انتخابی ضابطے اور پابندی کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ شاعری میں اس
م کی مثالیں جہاں معنیاتی مطابقت سے کام نہ لیا گیا ہو اور انتخابی ضابطوں کی
ف ورزی کی گئی ہو بہت پائی جاتی ہے۔ اس ضمن میں مظفر حنفی کے جس شعر
کر اوپر کیا گیا تھا، یہ ہے:

چاند اگا ہے، پروا سنکی، چلنا ہے تو چل
مہکانے پھلواری من کی، چلنا ہے تو چل

(۶) اردو میں 'نے' کا استعمال علامت فاعل کے طور پر ہوتا ہے، مثلاً میں
نے کھانا کھایا، تم نے کتاب پڑھی، اس نے اخبار خریدا، وغیرہ۔ لیکن بعض
عروں نے 'نے' کے استعمال میں اس لسانی نارم سے انحراف کیا ہے۔ مثلاً
راو احمد کی ایک غزل کا یہ شعر دیکھیے:

سورج سے کہو یہیں ٹھہر جائے
ہم نے سایے کو ناپنا ہے

(۴) ڈیل ایچ۔ ہائمز (Dell H. Hymes)

ڈیل ایچ۔ ہائمز ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے اور اعلیٰ تعلیم انڈیانا یونیورسٹی میں پائی۔ ہائمز ادب، بشریات اور لسانیات تینوں علوم کے طالب علم رہے ہیں۔ انھوں نے کچھ دنوں تک ہارورڈ یونیورسٹی میں سماجی بشریات کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ ادھر کچھ عرصے سے وہ ورجینیا یونیورسٹی میں بشریات اور انگریزی کے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ہائمز کی دلچسپی بشریات کے علاوہ اسلوبیات اور سماجی لسانیات سے بھی ہے، ان علوم میں ان کے کارنامے قابل قدر ہیں۔

اسلوبیات کے میدان میں ڈیل ہائمز کا نام اس وقت مشہور ہوا جب ۱۹۶۰ میں ان کا معرکتہ الآرا مقالہ :Phonological Aspects of Style Some English Sonnets شائع ہوا ہے۔ اس مقالے میں ہائمز نے بیس انگریزی سانیٹس (دس ورڈز ورتھ کی اور دس کیٹس کی) کا صوتیاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس تجزیے سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ صوت و معنی کے درمیان ایک باہمی رشتہ ہوتا ہے جو صوتی رمزیت (Sound Symbolism) کی شکل میں شاعری میں پورے طور پر آشکارا ہوتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی نظموں (جیسے کہ کیٹس اور ورڈز ورتھ کی سانیٹس) میں پائی جانے والی غالب یا کثیر الوقوع آوازیں (صوتیے) نظم کے مجموعی تاثر کی پورے طور پر عکاسی کرتی ہیں۔

ڈیل ہائمز کے صوتیاتی تجزیے کا طریق کار یہ تھا:

(۱) نظم کا انتخاب (نظم چھوٹی ہو جس میں لریکل (Lyrical) شاعری کی خصوصیات پائی جاتی ہوں۔

(۲) نظم کو صوتیاتی تحریر (Phonetic Transcription) کا جامہ پہنانا۔

(۳) نظم میں پائے جانے والے صوتیوں (Phonemes) یعنی مصمتوں اور مصوتوں (Consonants and Vowels) کی الگ الگ بالترتیب فہرست تیار کرنا اور ہر صوتیے کے سامنے زیر تجزیہ نظم میں اس کی تعداد وقوع درج کرنا۔

(۴) مصمتوں اور مصوتوں کی دونوں فہرستوں میں غالب یا کثیر الوقوع (High-ranking) صوتیوں کو چھانٹنا اور ان کی ایک مشترکہ فہرست اس طرح تیار کرنا کہ جو صوتیہ سب سے زیادہ بار استعمال ہوا ہے وہ سب سے اوپر درج کیا جائے، اس کے بعد دوسرا، پھر تیسرا، پھر دیگر کثیر الوقوع صوتیے درج کیے جائیں۔

(۵) غالب یا کثیر الوقوع صوتیوں کی مدد سے ایک ایسا لفظ یا فقرہ تشکیل دینا جو زیر تجزیہ نظم میں استعمال ہوا ہو۔ اگر یہ لفظ اس نظم کے مجموعی تاثر اور Theme کو بیان کرتا ہے تو اسے جمعی لفظ (Summative Word) کہیں گے

جمعی لفظ میں تین خصوصیات کا پایا جانا لازمی ہے:

(الف) صوتی سطح پر یہ لفظ کثیر الوقوع آوازوں سے مل کر بنا ہو۔

(ب) اس کا استعمال زیر تجزیہ نظم میں ہوا ہو۔
(ج) معنیاتی سطح پر یہ لفظ اس نظم کے مجموعی تاثر اور Theme کو ظاہر کرتا ہو
اگر جمعی لفظ زیر تجزیہ نظم میں مناسب مقام پر واقع ہوا ہے تو اسے کلیدی
لفظ (key Word) بھی کہہ سکتے ہیں۔

اردو میں ڈیل ہائمز کے اس صوتیاتی تجزیے کے طریق کار کا اطلاق سب
سے پہلے راقم الحروف نے اقبال اور فیض کی دو نظموں پر کیا ہے۔ ان
دونوں نظموں کا عنوان "تنہائی" ہے۔ فیض کی نظم "تنہائی" ایک داخلی انداز کی
نظم ہے جو یوں شروع ہوتی ہے:

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا

اس نظم کے صوتیاتی تجزیے سے جو کثیر الوقوع صوتیے (مصمتے اور
مصوتے) برآمد ہوئے انھیں ترتیب دینے پر "کوئی نہیں آئے گا" کی تشکیل
عمل میں آئی۔ یہ جمعی (summative) فقرہ اگر صوتیاتی سطح پر فیض کی نظم "
تنہائی" کے کثیر الوقوع صوتیوں (مصمتی اور مصوتی آوازوں) سے حل کرتا ہے
تو معنیاتی سطح پر یہ اس نظم کے مرکزی خیال اور مجموعی تاثر کی عکاسی کرتا ہے۔
فیض کی اس نظم میں مایوسی، ناامیدی، اداسی، شکستہ دلی اور حزن و ملال کی کیفیات
کا بڑی خوبی کے ساتھ اظہار کیا گیا ہے اور یہ تمام کیفیات اس چھوٹے سے
فقرے میں مجتمع ہو گئی ہیں۔ اسی لیے یہ فقرہ نظم کے مرکزی خیال کو بڑی خوبی
کے ساتھ بیان کرتا ہے اور نظم کے آخر میں نہایت موزوں مقام پر واقع ہوا
ہے:

اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

چوں کہ یہ فقرہ پوری نظم کے مفہوم کی تلخیص پیش کرتا ہے، لہٰذا اسے
سب سے آخر میں ہی آنا چاہیے تھا۔

اقبال کی جس نظم کے صوتیاتی تجزیے کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اس کا عنوان
بھی "تنہائی" ہے، لیکن یہ ایک بالکل دوسرے موڈ کو ظاہر کرتی ہے۔ اس میں
جن خارجی اشیاء اور مظاہر کا ذکر آیا ہے وہ فطرت سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً شب،
انجم، آسمان، چاند، دشت، دریا، کہسار، وغیرہ۔ نظم کا آغاز اس شعر سے ہوتا
ہے:

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا
انجم نہیں تیرے ہم نشیں کیا

اور نظم ختم ہوتی ہے اس شعر پر:

کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل
قدرت تری ہم نفس ہے اے دل

اس نظم کے غالب یا کثیر الوقوع صوتیوں (آوازوں) کی ترتیب سے جو
جمعی لفظ تشکیل پاتا ہے وہ "تنہائی شب" ہے۔ یہ ایک مرکب لفظ ہے اور
صوتیاتی سطح پر نظم کی غالب آوازوں سے حل کرتا ہے۔ نیز معنیاتی سطح پر یہ نظم
کے مفہوم کو بڑی خوبی کے ساتھ واضح کرتا ہے۔

ڈیل ہائمز کے اس صوتیاتی تجزیے کے طریق کار کا اطلاق پروفیسر مسعود
حسین خاں نے بھی اقبال کی دو نظموں "ایک شام" (دریائے نیکر (ہائڈل
برگ) کے کنارے پر) اور "حقیقت حسن" کے صوتیاتی تجزیوں پر کیا ہے۔ یہ
دونوں تجزیے ان کی کتاب "اقبال کی نظری و عملی شعریات" (سری نگر،
۱۹۸۳) میں شامل ہیں۔ ان تجزیوں کے بارے میں وہ اپنے ایک مضمون میں
لکھتے ہیں:

"خود میں نے اقبال کی دو نظموں: "ایک شام"
اور "حقیقت حسن" کا صوتیاتی تجزیہ "اقبال کی نظری و عملی
شعریات" میں پیش کیا اور ڈیل ہائمز کے انداز میں اس کے
جمعی (Summative) لفظ کا تعین پہلی نظم میں "خاموش" اور
دوسری میں "حسن" کیا۔" ۸

ڈیل ہائمز صوت و معنی کے باہمی رشتے یا صوتی رمزیت پر زور دیتا ہے اور
نظم کے مجموعی صوتی تاثر کو نظم کے مفہوم سے اس طرح مربوط کرتا ہے کہ
نظم کی صوتی کلیت اس کے اندر چھپے ہوئے مفہوم کو بالکل واضح کر دے۔ ڈیل
ہائمز کے خیال میں کسی بھی نظم میں کوئی ایسا لفظ یا فقرہ ضرور موجود ہوتا ہے
جس کے عناصر ترکیبی میں صوتی سطح پر ایسی تمام آوازیں شامل ہوتی ہیں جن کا
استعمال اس نظم میں بالمقابل دوسری آوازوں کے کثرت سے ہوتا ہے اور جو
اس نظم کی غالب آوازیں ہوتی ہیں۔ معنیاتی سطح پر یہی لفظ نظم کے نفس
مضمون یا اس کے بنیادی خیال اور مفہوم کی ترجمانی کرتا ہے۔

(۳) رولاں ویلز (Rullon Wells)

رولاں ویلز ۱۹۱۹ میں پیدا ہوئے اور امریکہ کی یونیورسٹی آف اوا میں
تعلیم پائی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ۱۹۴۲ء میں ہارورڈ یونیورسٹی سے حاصل کی۔
کچھ دنوں پنسلوانیا یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد
وہ ییل یونیورسٹی میں لسانیات کے اسوسی ایٹ پروفیسر پھر پروفیسر مقرر ہوئے۔
رولاں ویلز ماہر لسانیات و اسلوبیات ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر ہندیات بھی
ہیں۔ انھیں انڈک زبانوں، ویدوں، اپنشدوں، نیز یہاں کے فلسفے سے گہری
دلچسپی ہے۔ تقابلی ہند یورپی لسانیات اور فائلالوجی بھی ان کی دلچسپی کا خاص
میدان ہے۔

اسلوبیات کے ضمن میں اسمیہ اور فعلیہ اسلوب رولاں ویلز کی دلچسپی کا
خاص موضوع رہا ہے۔ انھوں نے اپنے گراں قدر مقالے ۹ 'Nominal
and Verbal Style میں انگریزی زبان کے حوالے سے اسمیت اور فعلیت
کا نظریہ پیش کیا ہے۔ ان کے خیال میں کسی مصنف کے اسلوب کا تجزیہ اسمیہ اور
فعلیہ طرز اظہار کے حوالے سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسمیہ اسلوب میں اسم کو
فعل پر، اور فعلیہ اسلوب میں فعل کو اسم پر ترجیح دی جاتی ہے۔ کسی مصنف کے

یہاں اسمیہ اور فعلیہ دونوں اسالیب مل سکتے ہیں اور ایک بات جو اسمیہ اسلوب میں کہی گئی ہے فعلیہ اسلوب میں بھی کہی جا سکتی ہے یا جو بات فعلیہ اسلوب میں کہی گئی اسمیہ اسلوب میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ کسی مصنف کے یہاں اسلوبیاتی امتیاز اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک اسلوب کو دوسرے اسلوب پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اگر سچ پوچھا جائے تو لسانی ترجیحات ہی امتیازی اسلوبیات کا سبب بنتی ہیں۔

رولاں ویلز کے تجزیے کے مطابق بہ حیثیت مجموعی انگریزی زبان میں فعلیہ اسلوب کو اسمیہ اسلوب پر ترجیح دی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی میں اسمیہ اسلوب کے مقابلے میں فعلیہ اسلوب کی طرف جھکاؤ زیادہ ہے۔ رولاں ویلز کا یہ بھی خیال ہے کہ انگریزی کے اسمیہ جملے، فعلیہ جملوں کے مقابلے میں طویل ہوتے ہیں، کیوں کہ انگریزی میں بہت سے اسم فعلی مادّوں سے مشتق ہیں جن میں لاحقہ ہوتا ہے، مثلاً جب ہم ذیل کے دو فقروں کو دیکھتے ہیں :

1- When we arrive,

2- At the time of our arrival,

تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ پہلا فقرہ فعلیہ ہے جب کہ دوسرا اسمیہ فقرہ ہے اور فعلیہ فقرے کے مقابلے میں طویل ہے۔ پہلے فقرے میں حروف اور الفاظ نیز الفاظ کے درمیان وقفوں کی تعداد کم ہے۔ جب کہ دوسرے فقرے میں حروف، الفاظ اور ان کے درمیان وقفے نسبتہً زیادہ ہیں۔ رولاں ویلز نے اسمیہ اور فعلیہ اسلوب کے درمیان فرق کو اسم اور فعل کے امتیاز تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ ان دونوں اسالیب کے درمیان امتیازات کو جملوں کے طول، جملوں میں فقروں کی تعداد نیز دیگر صرفی و نحوی خصوصیات کے حوالے سے بھی پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً فعلیہ اسلوب کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اس میں اظہار کے لیے دو فقرے (Clauses) استعمال کیے جاتے ہیں جب کہ وہی بات اسمیہ اسلوب میں ایک فقرے (جس میں صرف ایک فعل ہوتا ہے) میں ادا کی جا سکتی ہے، مثلاً :

1. If he does that, he will be sorry.

2. In the event of his doing that, he will be sorry.

اردو میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے نظریہ اسمیت اور فعلیت کی روشنی میں اقبال کے کلام کا مطالعہ و تجزیہ پیش کیا ہے ۱۰۔ اسمیت اور فعلیت کو انھوں نے کلام اقبال کی صرفی و نحوی امتیازات کا ایک "پہلو" قرار دیا ہے۔ وہ "مسجد قرطبہ"، "ذوق و شوق" اور دیگر نظموں کے صرفی و نحوی تجزیوں سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اقبال کے کلام میں فعلیت (Verbalization) کی طرف جھکاؤ زیادہ ہے۔ "مسجد قرطبہ" کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اس کے پہلے، دوسرے، تیسرے اور پانچویں بند میں اسمیت (Nominalization) کا انداز ہے، جب کہ چوتھے اور چھٹے بند میں افعال کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ ساتویں بند میں افعال کی تعداد اور زیادہ ہو گئی ہے اور نظم کے آخری بند کے "ہر ہر شعر میں فعل کا عمل دخل دیکھا جا سکتا ہے"۔ "مسجد قرطبہ" کے پہلے بند کے ابتدائی تین مصرعے ملاحظہ ہوں جن میں ایک بھی فعل استعمال نہیں ہوا ہے :

سلسلہ روز و شب، نقش گر حادثات

سلسلہ روز و شب، اصل حیات و ممات

سلسلہ روز و شب، تار حریر دو رنگ

اس نظم کا "آخری بند، پہلے بند کی اسمیت سے بالکل متضاد کیفیت رکھتا ہے" اور اس کے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی فعل ضرور پایا جاتا ہے۔ اس بند کے ابتدائی تین شعر دیکھیے :

وادیٔ کہسار میں غرق شفق ہے سحاب

لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

سادہ و پر سوز ہے دختر دہقاں کا گیت

کشتیٔ دل کے لیے سیل ہے عہد شباب

آب روان کبیر تیرے کنارے کوئی

دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

بقول گوپی چند نارنگ فعلیت کی یہی کیفیت "ذوق و شوق" میں بھی ملتی ہے۔ کلام اقبال میں اسمیت اور فعلیت کے اس تجزیے سے نارنگ صاحب یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "اقبال اگرچہ اسمیت سے کام لیتے ہیں اور ایک مضبوط تخلیقی حربے کے طور پر اس کو استعمال کرتے ہیں، لیکن اس کے محدود امکانات کی کمی کے خطروں کا بھی انھیں وجدانی طور پر احساس تھا، اس لیے اس سے گریز بھی کرتے ہیں اور جلد اس تنگنائے سے باہر فعلیت کی کھلی فضا میں آجاتے ہیں۔ ان کے موضوعی محرکات اور کشاکش خیال یعنی Discourse کے تقاضے بھی اسی کے حق میں ہیں۔ شعر اقبال کی حرکی اور پیغامی لے اسلوبیاتی اعتبار سے فعلیہ احساس ہی کے ذریعے صورت پذیر ہو سکتی تھی۔" ۱۱

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کلام اقبال کے صرفی و نحوی تجزیے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ اقبال فعلیت کو اسمیت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس طرح فعلیہ اسلوب کلام اقبال کا ایک امتیازی اسلوبیاتی وصف قرار پاتا ہے۔ اس سلسلے میں نارنگ صاحب نے اردو زبان کے مزاج کی روشنی میں اسمیت اور فعلیت کی جس لسانی درک و بصیرت کے ساتھ وضاحت کی ہے وہ قابل تحسین ہے، مثلاً :

۱۔ اسمیت سے اختصار اور فعلیت سے جملے میں پھیلاؤ آتا ہے۔

۲۔ فعلیت سے ترسیل معانی میں زیادہ مدد ملتی ہے۔

۳۔ فعلیت زیادہ پر تاثیر ہے۔

۴۔ سچے فعلیہ اسلوب کی تخلیق، سچے اسمیہ اسلوب کی تخلیق سے زیادہ مشکل ہے۔ اس میں تہ داری اور معنی آفرینی کی گنجائش زیادہ ہے۔

۵۔ اسمیت میں اسلوبیاتی تنوع کا زیادہ امکان نہیں، فعلیت میں تنوع کے امکانات لامحدود ہیں، اور کوئی بھی اچھا اسلوب ان امکانات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

(۴) جیوفری لیچ (Geoffrey Leech)

جیوفری لیچ ایک ممتاز ماہر لسانیات و اسلوبیات ہیں۔ معنیات ان کا خصوصی علمی میدان رہا ہے۔ اس موضوع پر ان کی کتاب Semanties (۱۹۷۴) کو علمی دنیا میں پایہ و اعتبار حاصل ہے۔ لیچ کچھ عرصے تک یونیورسٹی کالج لندن میں انگریزی کے لیکچرر اور کمیونی کیشن سنٹر کے اسسٹنٹ سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ وہ ان دنوں لنکاسٹر یونیورسٹی میں لسانیات اور جدید انگریزی زبان کے پروفیسر ہیں۔

جیوفری لیچ نے ڈیلن ٹامس (Dylan Thamas) کی نظم This Bread I Break کا اسلوبیاتی تجزیہ پیش کر کے عملی اسلوبیات کی ایک بہترین مثال پیش کی ہے ۱۲۔ اس تجزیے کے ذریعے لیچ نے اپنے اسلوبیاتی نظریے کو بھی واضح کیا ہے۔ لیچ کے نزدیک ادبی متن کے مطالعے کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ لسانیاتی توضیح (Linguistic Description) کہلاتا ہے اور دوسرا طریقہ تنقیدی تشریح (Critical Interpretation) ہے۔ بہ ظاہر یہ دونوں طریقے الگ الگ ہیں لیکن ان میں ربط پایا جاتا ہے۔ لیچ نے اس تجزیے میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح لسانیاتی توضیح بالواسطہ طور پر تنقیدی تشریح کی مدد کر سکتی ہے۔ کسی ادبی فن پارے میں "معنی" کی اتنی تہیں اور جہتیں ہوتی ہیں کہ کسی دوسرے Discourse یا کلامیہ میں ان کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ گویا ادب پارہ، مجموعہ معنی کا طلسم، ہوتا ہے، لیچ نے مذکورہ انگریزی نظم کے حوالے سے ادبی اظہار کی تین خصوصیات کا ذکر کیا ہے جو معنی کی تمام جہات و ابعاد کی نمائندگی کرتی ہیں۔ "معنی" کو لیچ عام مفہوم میں استعمال نہیں کرتا، بلکہ وہ اس سے وسیع معنی مراد لیتا ہے۔ معنی میں وہ ہر طرح کے لسانیاتی انتخاب (Linguistic Choice) کو شامل کرتا ہے خواہ وہ معنیاتی انتخاب ہو یا لغوی، قواعدی اور صوتیاتی۔

ڈیلن ٹامس کی مذکورہ نظم کے تجزیے کے سلسلے میں لیچ سب سے پہلے لسانیاتی توضیح کے ایک پہلو اتصالیہ (Cohesion) کا ذکر کرتا ہے جس کی ادبی متون کے مطالعے میں خاص اہمیت ہے۔ اتصالیہ سے لیچ کی مراد قواعدی اور لغوی نوعیت کے اندرون متن وہ لسانیاتی رشتے ہیں جو کسی ادبی فن پارے کے مختلف اجزاء کا کلامیہ (Discourse) کی مکمل اکائی کی صورت میں باہم مربوط کرتے ہیں اور اس طرح بہ اعتبار مجموعی یہ رشتے متن کے مفہوم کر ترسیل کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادبی فن پارے میں قواعدی اور لغوی سطح پر جو لسانیاتی انتخابات بروئے عمل لائے جاتے ہیں ان میں باہم ارتباط اور لسانیاتی اتصال پایا جاتا ہے جس سے پوری نظم میں معنیاتی رشتوں کا ایک جال سا بن جاتا ہے۔ لغوی سطح پر اتصالیہ الفاظ کی تکرار میں پایا جاتا ہے یا ان الفاظ کے استعمال میں جن میں بعض معنیاتی خصوصیات مشترک ہوتی ہیں، مثلاً مذکورہ نظم میں bread-oat-crop یا wine-tree-fruit-grape-vine-drink-day-night-summer-sun وغیرہ۔

ادبی فن پارے کی لسانیاتی توضیح کا دوسرا پہلو فورگراؤنڈنگ Foregrounding ہے۔ اس سے مراد زبان کے مروّجہ قاعدوں اور نارم سے دانستہ انحراف ہے۔ ہر زبان کا اپنا ایک چلن ہوتا ہے ایک عام روش اور روایتی پس منظر (Back ground) ہوتا ہے۔ اگر ان لسانی ضابطوں اور قاعدوں یا چلن کی خلاف ورزی کی جاتی ہے تو اسے "انحراف" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی چیز "فورگراؤنڈنگ" کہلاتی ہے ۱۳۔ ادب بالخصوص شاعری کی زبان کافی حد تک Foregrounded ہوتی ہے۔ فورگراؤنڈنگ سے نہ صرف اظہار میں جدّت پیدا ہوتی ہے بلکہ زبان کی توسیع بھی ہوتی ہے اور زبان کی جمالیاتی اور اظہاری استعمال کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ فورگراؤنڈنگ کو لیچ جمالیاتی ترسیل کا بنیادی اصول قرار دیتا ہے۔ ڈیلن ٹامس کی مذکورہ نظم میں لسانی نارم سے انحراف کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں، مثلاً "the oat was merry" یہاں غیر ذی روح اسم کو ایسی خصوصیت کا حامل بتایا گیا ہے جو ذی روح بلکہ انسانوں سے نسبت رکھتی ہے۔ اس قسم کے اظہار کو زبان کے عام چلن اور مروّجہ روش سے انحراف تصور کیا جاتا ہے۔ زبان کا عام چلن the man was merry کو تو قبول کر سکتا ہے لیکن "the oat was merry" کو کسی صورت انگیز نہیں کر سکتا۔

ادبی فن پارے کی لسانیاتی توضیح کی تیسری جہت فورگراؤنڈنگ کا اتصال ہے۔ اس سے لیچ یہ مراد لیتا ہے کہ ادبی متن میں پائی جانے والی زبان کی مختلف النوع انحرافی شکلوں میں کس طرح باہمی ربط قائم کیا جا سکتا ہے اور کس طرح اندرون متن انھیں پیٹرن کی صورت دی جا سکتی ہے۔

حواشی

۱۔ دیکھیے ہیر لڈبی۔ ایلن (مرتب)، Readings in Applied English Linguistics، ہندوستانی ایڈیشن (نئی دہلی: امیرنڈ پبلشنگ کمپنی، ۱۹۷۱)، ص ۹۲۔۷۷۴

۲۔ ٹامس اے سیبوک (مرتب)، Style in language (کیمبرج، میساچوسٹس: آئی۔ ٹی۔ پریس، ۱۹۶۰)
بار دوم (کیمبرج، میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی، ۱۹۶۴)

۳۔ سیمور چیٹمین (مرتب)، Literary Style:A Symposium (نیویارک: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۱)۔

۴۔ On Defining Style:An Essay in Applied Linguistics مشمولہ Linguistics and Style مرتبہ جان اسپنسر (لندن، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۴)۔ ص ۵۶۔۳

۵۔ ملاحظہ کریں اکوسٹ کے ان اسلوبیاتی نظریات سے میں نے اپنے ایک مقالے "اسلوب: تعریف، توضیح اور تشکیل" میں تفصیل سے بحث

کی ہے۔ دیکھیے میری کتاب "زبان، اسلوب اور اسلوبیات" (علی گڑھ: ادارۂ زبان و اسلوب، ۱۹۸۳)، ص ۱۸۸۔۱۵۷

۶۔ مشمولہ تامس اے۔ سیبوک (مرتب)، محولہ بالا کتاب، ص ۱۳۱۔۱۰۹۔

۷۔ دیکھیے میرا مضمون "شعری اسلوب کا صوتیاتی مطالعہ: دو اردو نظمیں"، شعر و حکمت (حیدرآباد)، نمبر ۷ (۱۹۷۲)، ص ۲۴۶۔۲۱۷

۸۔ مسعود حسین خاں، "لسانیاتی اسلوبیات اور شعر"، آجکل (نئی دہلی)، جلد ۴۹، شمارہ ۱۱ (جون ۱۹۹۱)، ص ۴۔۳

۹۔ مشمولہ ڈونلڈ سی۔ فریمن (مرتب)، Linguistics and literary Style نیو یارک: ہالٹ رائن ہارٹ اینڈ ونسٹن، آئی این سی، ۱۹۷۰ء)، ۳۰۶۔۲۹۷۔

۱۰۔ دیکھیے گوپی چند نارنگ کا مضمون "اسلوبیات اقبال: نظریۂ اسمیت اور فعلیت کی روشنی میں (صرفیاتی و نحویاتی نظام)"، مشمولہ ادبی تنقید اور اسلوبیات از گوپی چند نارنگ (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۹) ص ۱۷۵۔۱۵۴۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۷۴

۱۲۔ دیکھیے جیوفری لیچ کا مضمون This Bread I Break"—Language and Interpretation مشمولہ ڈونلڈ سی فریمن (مرتب)، محولہ بالا کتاب، ص ۱۸۲۔۱۱۹

۱۳۔ فورگراؤنڈنگ کو دورِ جدید کے اردو بہ نقاد نظر تحسین دیکھتے ہیں اور شعراء کے کلام میں اس کی کمی یا فقدان کا گلہ کرتے ہیں، مثلاً ممتاز نقاد شمس الرحمن فاروقی نے شہریار کے شعری مجموعے "نیند کی کرچیں" پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ "زبان اور محاورے کے تئیں شہریار کا رویہ ابھی اور ڈھیٹ اور بے پروا ہونا چاہیے تاکہ ان کی تخلیقی قوت پرے سے بند پوری طرح اٹھ سکے،" پھر وہ مزید لکھتے ہیں کہ "آہنگ میں مزید تنوع لانے کے لیے انھیں زبان میں بھی تنوع لانا ہوگا۔ انھوں نے جان بوجھ کر فارسی تراکیب اور نسبتاً نامانوس الفاظ سے گریز کیا ہے تو اس کا بدل مروج زبان میں تھوڑی بہت توڑ پھوڑ کی صورت میں انھیں حاصل کرنا چاہیے۔"
(پیش لفظ، "نیند کی کرچیں"، ص ۱۸۔۱۷)

غزل

مظفر حنفی

یکسر جو صفات ہو رہی تھی
مصلوب وہ ذات ہو رہی تھی

کیا سانحہ گزرا، پانی پانی
کیوں نہر فرات ہو رہی تھی

چہروں پہ جمی ہوئی بارود
اور امن کی بات ہو رہی تھی

مرکز میں نہیں تھی مرکزیت
تسخیر جہات ہو رہی تھی

وہ قتل ہوا تو چپ رہا میں
لاکھوں کی نجات ہو رہی تھی

گھر سے نہ ہلا وہ شاہ شطرنج
بازی تھی کہ مات ہو رہی تھی

سکتے میں تھی شاعری مظفر
جب ساعتیات ہو رہی تھی

غلام مرتضیٰ راہی

جب دھوپ میں فصل پک رہی تھی
ہر آنکھ چمک دمک رہی تھی

احساس کی لو گھٹالی میں سے
میری ہی طرف لپک رہی تھی

شیشے میں غبار ساعتوں کا
پتھر میں صدی جھلک رہی تھی

سرحد کی لکیر دیکھ آئے
خنجر کی طرح چمک رہی تھی

جب آگ میں ہم پنہ گزیں تھے
اشجار کو برف ڈھک رہی تھی

دیوار کے رخنۂ کرم سے
دنیائے دروں جھلک رہی تھی

میدان غبار سے اٹا تھا
تلوار لہو چھڑک رہی تھی

میرا دشمن اگر زمانہ ہو
ایک بس مرکز نشانہ ہو

راہ سے سنگ و خشت ہٹ جائیں
نیکیوں کا اگر زمانہ ہو

چھوڑ کر مجھ کو یکہ و تنہا
قافلہ شوق سے روانہ ہو

اٹھ چکا ہے زمین سے لوپ
اب جہاں میرا آب و دانہ ہو

دیکھنے سننے کا مزہ جب ہے
کچھ حقیقت ہو کچھ فسانہ ہو

اتنی جلدی میں ہوں تو ممکن ہے
آنے والا مرا زمانہ ہو

موت ہر وقت آنا چاہتی ہے
کوئی حیلہ، کوئی بہانہ ہو

مظہر الزماں خاں

ایک لمبے عرصے کے بعد سعید بن سعد جب اپنے عزیز دوست خالد بن عزیز کے عظیم الشان گھر پہنچا تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں کہ وقت نے خالد بن عزیز کے گھر کو کیا سے کیا بنا دیا تھا کہ ہر طرف چشمہ زا۔ جگہ جگہ سرسبز چھاؤں درخت۔ آئینہ کی طرح چمکتی ہوئی دھوپ۔ سفید اور سبز درو دیوار۔ ہر زمین کے بیشمار اچھے برے مہمان۔ ان گنت سپید وسیاہ ملازمین۔ چنانچہ خوشی سے سعید بن سعد کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور وہ ایک خوبصورت بڑے سے ہال میں بیٹھا اپنے دوست خالد بن عزیز کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک وہ مسکراتے ہوئے ہال میں داخل ہوئے اور سعید بن سعد کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ کہو میرے بھائی۔ اتنے لمبے عرصے کے بعد ہم تمھیں کیسے یاد آ گئے ؟ یہ یکایک موسم کیسے سرسبز ہو گیا۔

"یاد تو آپ ہمیشہ ہی آتے رہتے ہیں دوست۔ لیکن زمین اور سفر اپنی اپنی جگہ دیوار تھے یعنی وقت اپنی جگہ اٹل تھا۔ پاؤں زنجیر تھے اور زمین غیر مطمئن تھی۔ اس لیے ہم مجبور تھے۔ ورنہ آپ تو ہمارے اندر پہلے بھی موجود تھے اور آج بھی موجود ہیں۔"

"ہاں میرے عزیز ! وقت' سفر اور زمین تینوں کا ساتھ بہت ضروری ہے۔ لیکن ان تینوں میں وقت سب سے زیادہ اہم ہے کہ وہ تمام کائناتوں کی تیز تر سانسوں پر مسلط ہے کہ ہوائیں اس کی گرفت میں ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں میرے دوست۔ سعید بن سعد نے کہا کہ ہر چیز وقت کی مٹھی میں قید ہے کہ وقت سمندروں کی موجوں کی سانسوں کا مسلسل سلسلہ ہے کہ وقت ہواؤں کے جسموں کی لگاتار حرکتوں کا سفر ہے کہ وقت سیاروں کی آنکھوں میں پوشیدہ تصویر ہے کہ وقت موسموں کی تیز تر تمام تر آہٹوں کا چہرہ ہے کہ وقت پھولتی' سکڑتی اور اترتی چڑھتی ہوئی سانسوں کا آخری منظر ہے کہ وقت متواتر' بے تکان اور بے سمت دوڑتے ہوئے ان گنت گھوڑوں کا نامکمل خواب ہے کہ وقت مسلسل اگتے اور ٹوٹتے ہوئے درختوں کا گھنا جنگل ہے کہ وقت چکراتی' گھومتی اور غبار بنتی ہوئی ہواؤں کا بے قرار جسم ہے۔"

"ہاں میرے دوست۔ خالد بن عزیز نے کہا۔ تم نے تو وقت پر خاصا وقت لگا دیا۔ لگتا ہے کہ تم نے وقت کو بہت غور سے دیکھا' سمجھا اور پڑھا ہے۔"

"ہاں میرے رفیق۔ ہم نے وقت کو دیکھ لیا ہے کہ ہم اس کی رفتار سے خوب واقف ہیں۔ سعید بن سعد نے کہا۔ آج اور گزرے ہوئے کل کو دیکھ لو بلکہ ہر اس لمحے کو دیکھو جو آ رہا ہے اور جا رہا ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو کہ وقت ہی سب کچھ ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ زندگی نے تمھیں کون کون سے راستے اور موڑ دکھائے۔ یعنی عمر کا اتنا لمبا عرصہ کیسا گزرا؟"

"دنیا نے اپنا پاؤں ہمارے پاؤں پر رکھ دیا تھا۔ سعید بن سعد نے کہا" اور جب اس نے اپنا پاؤں ہمارے پاؤں پر سے اٹھا لیا تو حالات بدل گئے کہ یہ دنیا جب بھی اپنا پاؤں کسی کے پاؤں پر رکھ دیتی ہے' وہ زمین ہو جاتا ہے۔ اور جب اٹھا لیتی ہے وہ آسمان ہو جاتا ہے کہ یہی اس کی تاریخ ہے۔ یہی اس کی فطرت اور یہی اس کا مزاج ہے۔"

"بچوں کا کیا حال ہے ؟" خالد بن عزیز نے پوچھا" تمھارے ساتھ ان کا سلوک کیسا ہے؟"

"اب بڑے ہو گئے ہیں۔ سعید بن سعد نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔" اپنے سایوں سے لڑتے رہتے ہیں۔ پہلے ہماری انگلی تھام کر چلتے تھے۔ اب انگلی چھوڑ دی ہے۔ بے انتہا ہجوم میں بھی اکیلے اکیلے گھومتے ہیں۔ بے پناہ ٹریفک میں بغیر خوف کے دوڑتے ہیں۔ پرانے درختوں کے سایوں پر دھوپ بچھاتے ہیں۔ بہرحال اب ہم پر ان کی انگلی تھام کر چلنے کا موسم آ گیا ہے لیکن وہ ہمیں اپنی انگلی پکڑنے ہی نہیں دیتے۔ بیچ راستوں پر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اس لیے ہمارے اندر مسلسل خوف پل رہا ہے۔ بڑھ رہا ہے اور اس خوف اور ڈر کو لیے ہم اپنے راستے پر پاؤں پاؤں چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حالانکہ تمام راستے پتھروں سے اٹے ہوئے ہیں۔ زمین پریشان' ناہموار اور اوپر نیچے ہے کہ آنکھیں ابھی دیکھتی ہیں۔ سمجھتی اور محسوس کرتی ہیں لیکن احتیاط کے باوجود کبھی کبھی ٹھوکر لگ ہی جاتی ہے اور بے بھروسہ پاؤں گرتے گرتے سنبھل جاتے ہیں۔ اور پھر سنبھل کر چلنے لگتے ہیں کہ بڑھاپا شیر خوار ہو گیا ہے۔ بہرحال یہی ہماری زندگی کے شب و روز ہیں۔ حالانکہ اس عرصے میں دولت میں کچھ اور

اضافہ ہوا ہے مگر بہت ساری چیزیں کم ہو کر رہ گئی ہیں۔ کاش دولت کے بجائے بہت سی دوسری اہم چیزوں میں اضافہ ہو جاتا تو کم از کم اس عمر میں بچوں کی انگلیاں تو ہمیں مل جاتیں ـــــ آپ کی مصروفیات تو خاصی بڑھ گئی ہوں گی۔ پہلے کچھ نہیں تھا تو مصروفیات نہ تھیں' اب تو سب کچھ آگیا ہے۔"

"ہاں" خالد بن عزیز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "گھروں کی دیواروں کو روغن کروانا۔ ان کی دیکھ بھال اور تحفظ کرنا۔ مختلف زمینوں سے آئے ہوئے مہمانوں کی خاطر مدارت کرنا۔ ان کا پوری طرح خیال رکھنا۔ مختلف موسموں کا استقبال کرنا۔ اور بہت سے ادھورے کاموں کو پورا کرنا۔ خدائے برتر کے آگے سربہ سجود ہونا۔ اس کے علاوہ اپنے بعض عزیزوں کے تیزی سے بڑھتے ہوئے ناخن کٹوانا۔ چنانچہ ایسے بہت سے کام ہیں جو سانسوں کی آمد و رفت کی طرح چلتے رہتے ہیں کہ بس یہی ہمارے صبح شام ہیں اور انھی صبح شام کے درمیان ہم گھوم رہے ہیں۔"

"انھیں مسائل کے درمیان تو ساری زمین اور ساری قوم گھوم رہی ہے کہ اب مسائل' حالات اور تمام موسم اندھے آئینے کی طرح ہو کر رہ گئے ہیں کہ اب اس میں کچھ نظر آتا ہی نہیں۔" سعید بن سعد نے کہا "ابھی ابھی جو ایک آدمی یہاں کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر ہمیں یوں لگا کہ وہ کچھ سہا سہا۔ ڈرا ڈرا سا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ اپنے سائے سے بھی بدک رہا ہے۔ اندر اور باہر سے غریب ہو گیا ہے۔ کچھ یوں لگتا ہے کہ اندر سے کوئی چیز اسے پکڑ کر کھینچ رہی ہے۔ روک رہی ہے۔ لگتا ہے کہ اسے اپنے کمتر ہونے کا شدید احساس ہے۔ زندگی سے فرار ہو جانے کی کوشش اور گر کر ٹوٹ جانے والے کھلونے کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے اور کیا کرتا ہے؟"

"یہ ایک سوالی ملازم ہے میرے بھائی۔ بڑا خوف زدہ رہتا ہے اور اس کے اندر ہی اندر یہ خوف مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔" خالد بن عزیز نے کہا۔ "اس کا یہ بے وجہ انکسار اس کے احساس کمتری اور اندر چھپی ہوئی غربت کی علامت ہے۔"

اور دفعتاً تبھی ایک گلدار پورے گھر میں گھومتا ہوا خالد بن عزیز کے قریب آکر بیٹھ گیا اور پھر ان کی انگلی کو اپنی زبان سے چاٹنے لگا تو سعید بن سعد نے خوف کے مارے اپنے دونوں پاؤں کرسی کے اوپر رکھ لیے اور سرد موسم میں بھیگے ہوئے آدمی کی طرح تھر تھر کانپنے لگا۔ خالد بن عزیز نے محبت آمیز نگاہوں سے گلدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ڈرو نہیں مرے دوست۔ یہ کچھ نہیں کرے گا۔ پالتو ہے۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ بہت بے ضرر ہے۔ ہمارے گھر کے سبھی افراد اس سے بڑی محبت کرتے ہیں اور ہمارا بھی یہ بڑا خیال رکھتا ہے۔ بہت نگہبانی کرتا ہے ہمارے گھر کی۔"

"ہمیں تو بڑا ڈر لگ رہا ہے بھائی۔ اسے دور ہٹائیے۔" سعید بن سعد نے کہا۔ "دیکھیے آپ کی انگلی پر لگی تازہ خراش کو وہ کس طرح اپنی زبان سے چاٹ رہا ہے۔ سچ پوچھیے تو ہمیں اس کا اس طرح آزادانہ گھر میں گھومنا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ پتہ نہیں کب۔ آپ اسے یہاں سے ہٹائیے یا پھر اس کے گلے میں زنجیر ڈال دیجیے۔"

"آپ بے کار خوف کھا رہے ہیں۔" خالد بن عزیز نے کہا "میں نے کہا نا کہ یہ کچھ نہیں کرے گا۔ بہت سمجھدار اور بڑا مخلص ہے۔ اور پھر اپنے گلے میں وہ کسی بھی زنجیر کو برداشت نہیں کرتا کہ زنجیر کو وہ غلامی سمجھتا ہے۔"

"کیا یہ یوں ہی سارے گھر میں آزادانہ گھومتا پھرتا ہے ؟" سعید بن سعد نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ "کیا آج تک کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ؟"

"نہیں میرے دوست۔ یہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ آپ بے فکر رہیے۔"

"ہوں !" سعید بن سعد نے سانس کو آہستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔ "آپ کا یہ پالتو گلدار روز آپ کا کتنا گوشت کھاتا ہے۔ یعنی میری مراد ہے کہ کیا اس کی خوراک میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے یا پھر وہ اپنی مقرر خوراک پر ہی اکتفا کرتا ہے۔"

"اکثر وہ اپنی روز مرہ کی خوراک ہی پر اکتفا کرتا ہے۔" خالد بن عزیز نے کہا۔ "ویسے کبھی کبھی زیادہ بھی کھا لیتا ہے۔ مگر ایسا اتفاق بہت کم ہوا ہے۔ لیکن میرے عزیز آپ اس سے اس قدر خائف کیوں ہیں کہ ابھی تک کانپ رہے ہیں ؟ کوئی دوسری بات کرو کہ اس اس گلدار کے سوا اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ اتنے لمبے عرصے کے بعد ملے ہو۔ کچھ اپنی اور کچھ اپنے گھر کی باتیں کرو۔ اس بیچارے جانور کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ یہ اب ہمارے گھر کا ایک فرد بن چکا ہے۔ اور پھر ہمیں دیکھ کر بہت سے لوگ بھی اپنے اپنے گھروں میں اپنی اپنی حفاظت کے لیے گلدار یا شیر پال رہے ہیں یا پالنے کی سوچ رہے ہیں۔"

"لیکن مجھے تو اس سے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ جب سے میں اسے آپ کے اس عظیم گھر میں اس طرح آزادانہ گھومتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ میرے تو ہوش اڑ گئے ہیں۔ دیکھیے وہ مجھے کس قدر خونخوار آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ لگتا ہے موقع ملتے ہی کھا جائے گا۔ اب مجھے تو اجازت دیجیے۔ انشاء اللہ تعالی زندگی باقی رہی تو پھر آپ سے ملاقات ہوگی۔ ویسے میں آپ کے اس شاندار مکان کو دیکھنے کا ایک عرصے سے آرزو مند تھا۔ بڑا اشتیاق تھا آپ سے ملنے کا اور آپ کو دیکھنے کا سو دیکھ لیا۔ مل لیا۔"

"نہیں میرے عزیز تم ڈرو نہیں۔ کہا نا کہ یہ کچھ نہیں کرے گا۔" خالد بن عزیز نے گلدار کی پیٹھ اور گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو میرا ہاتھ وہ کس طرح مسلسل چاٹ رہا ہے۔ ویسے کبھی کبھی غراتے بھی لگتا ہے۔ مگر اس کی غراہٹ میں محبت شامل ہے۔"

"میری آپ سے گذارش ہے۔ کچھ دیر کے لیے ہی سہی آپ اسے یہاں سے ہٹائیے۔" سعید بن سعد نے کہا۔ "دیکھیے وہ مجھے پھر گھور رہا ہے۔"

"پھر وہی بات" خالد بن عزیز نے کہا۔ "میرے دوست بچپن میں تم کس

قدر بزدل تھے اور اب آخری عمر میں اس قدر ڈرپوک کیوں ہو گئے؟ ہم نے کہا تھا کہ یہ جانور گھر کا محافظ ہے۔ اور ہم نے بڑی ہی جان سے اس کی پرورش کی ہے۔ اس کی ہر بات کا خیال رکھتے ہیں۔ ڈرو نہیں "اطمینان سے بیٹھو اور سکون سے باتیں کرو۔ تم ہمارے بہت عزیز دوست ہو۔"

"آپ روز اس گدھ کو کتنا گوشت کھلاتے ہیں؟" سعید بن سعد نے کہا۔

"بہت گوشت کھاتا ہے۔" خالد بن عزیز نے اس کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ اسے خون آلودہ گوشت کھلا رہے ہیں یا بغیر خون کا۔ یعنی دھویا ہوا گوشت ؟" سعید بن سعد نے گدھ کی لپلپاتی ہوئی زبان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے دنیا کے بہت سے ملک اس گدھ کے وطیرے ہوئے ہیں اور کچھ گوشت کے بہت سے خون آلود ٹکڑے بنے اس کی ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں۔"

"بغیر خون کا۔" خالد بن عزیز نے کہا۔ "لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں ؟"

"کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ آپ کی خراش لگی انگلی کو مسلسل چاٹ رہا ہے۔" سعید بن سعد نے کہا۔ "اور یہ خراش شاید کچھ عرصہ پہلے آپ کے ایک عزیز کی وجہ سے آئی ہے ؟"

"ہاں !" خالد بن عزیز نے کہا۔ "وہ ہمارے زخم کو دیکھ نہیں سکتا۔ اس لیے چاٹ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی اور جانور ہمارے اس مکان کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھ لے تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑتا۔ اور پھر آج کل زمین پر کتے بہت پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لیے شیر اور گدھ پالنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

"میں نے راستے میں یعنی ہماری زمینوں کے بیچ ایک ایسی قوم دیکھی جو ڈھلتی دھوپ میں اپنی پرچھائیں پر کوڑے مار رہی تھی۔" سعید بن سعد نے کہا "لگتا ہے کہ وہ اپنے سائے سے ڈرتی ہے۔"

"ہاں میرے دوست۔" خالد بن عزیز نے کہا "وہ شروع ہی سے بڑی بے اعتبار قوم ہے۔ اس قوم کو خود پر اعتبار ہے اور نہ اپنے پیدا کرنے والے پر بھروسا ہے کہ وہ صدیوں سے ایک بے اعتبار اور ناشکری قوم ہے اور مسلسل ہماری زمینوں پر اپنے خواب دیکھتی ہے۔ خوابوں کو بچانے کی کوشش کرتی ہے اور دوسری زمینوں کے خوابوں کو جلانے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ ہر زمین کی ملوں اور سرسبز خوابوں کو آگ لگاتی ہے اور جب خواب جلنے لگتے ہیں تو وہ جشن مناتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ سروں کے سروں پر خنجریں چلاتی ہے کہ یہی اس قوم کا کاروبار ہے۔ آج سے تین دہائی قبل اس قوم نے ہمارے گھر میں بھی داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت ہم نے ایک روبوٹ (Robot) کو اپنے پاس رکھا تھا۔ لیکن وہ بڑا کمزور تھا سو ہم نے اس بیکار Robot کو باہر ڈال دیا۔ اب حال ہی میں اس روبوٹ کے تمام اعضا بکھر گئے ہیں کہ اس کا بکھر جانا ہی بہتر تھا۔ مصنوعی جسم بھلا کب تک باقی رہ سکتا ہے ؟ سو ٹوٹ گیا اور

ایسا ٹوٹا کہ اس کے پرزے پرزے الگ ہو گئے۔"

"تو دیکھیے کہ آپ کا گدھ پھر میری طرف خونخوار آنکھوں سے دیکھ کر اندر ہی اندر غرا رہا ہے۔" سعید بن سعد نے کہا۔ "کیا بھوکا ہے ؟"

"نہیں" خالد بن عزیز نے کہا۔ "اسے پابندی سے غذا دی جاتی ہے۔"

"اچھا اب مجھے اجازت دیجیے" سعید بن سعد نے پھر اٹھتے ہوئے کہا۔ "اپنا گھر چھوڑے مجھے پر تین دن اور تین راتیں گزر چکی ہیں اور اب اپنے گھر کی دیواریں مجھے آواز دے رہی ہیں۔ اگر زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہو گی میرے دوست۔ خدا حافظ !"

"اللہ حافظ !"

اور سعید بن سعد سفر کے بعد جب اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو گدھ کی خونخوار آنکھیں ہنوز اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھیں۔ چنانچہ اسی رات سعید بن سعد نے خواب میں دیکھا کہ خالد بن عزیز اپنی خواب گاہ میں خالی ہاتھ اکیلا لیٹا ہے اور اس کے سینے پر وہی گدھ بیٹھا ہوا غرا رہا ہے۔ ◢◢

عبداللہ کمال

لاالہ

وہ جب کمند ہوا سے نکلا
تو ہاتھ کھولے
تو اس نے دیکھا
کھلی ہتھیلی پہ ایک ننھا سا نور ریزہ
چمک رہا تھا
سیاہ بلائیں جھپٹ رہی تھیں
سیاہ آندھی کا غلغلہ تھا
وہ مسکرایا

مہیب جنگل ہے دور تک
وحشت ظلمات ہے
کہ کیا ہے
مگر یہ طے ہے
وہ شاہزادہ
کچھ ایسی تاریک وادیوں میں بھٹک رہا ہے
جہاں کے سارے شجر حجر سے
تمام خشک اور تمام تر سے
اک ایک ویران رہگذر سے
فقط اندھیرا ابل رہا ہے
تمام صوت و صدا کے شہپر
سیاہ آتش کدوں کے ایندھن
بیان و حرف و نوا میں ہر سمت
صرف کالے ہی پل رہے ہیں
نہ آنکھ پر کوئی عکس
نہ لوح دل پر ہی کوئی نقش چمکے
نوائے روشن
وہ تیرگی ہے
کہ قلب شیطاں پناہ مانگے

وہ ایک خواہش
جو خون میں زہر ذائقہ تھی
جو ریڑھ کی ہڈیوں میں تعمیر کی غذا تھی
شکستہ راتوں میں
صبح کی تازہ دم دعا تھی
مگر وہ خواہش بھی آج بے نام مر رہی ہے
کہ میرے اندر
پھر آج اک شام مر رہی ہے

وہ لامقامی دیکھنا
کہ اب عدم وجود ایک ہیں
جبینیں بے شمار
خوش امیدیوں کا مرکز سجود ایک ہے
کہ جسم جسم اب صدا ہے بس
ہر اک صدا میں ارتعاش
ایک ایک پل
ہزار بازگشت
موج موج
لہر لہر
بن رہی ہے
مٹ رہی ہے
کہ شاخ شاخ کونپلوں میں پھول پھول قہقہے لہولہو ٹپک
رہے ہیں جھیل میں
قلیل چہرگاں
جمیل گل رخاں
دھواں دھواں

سوال یہ نہیں
کہ ہر سوال تشنۂ جواب ہے
مگر لہو جو بہہ چکا
لہو جو بہہ رہا ہے، بے حساب ہے
محاسبو
تم اپنی اپنی کرسیوں کو جو لہو پلا چکے
کچھ اس کو بھی حساب ہے ؟
تمہارے روز و شب پہ آج
میرے خواب و خون کا عذاب ہے
تمہاری آنکھیں
عجز دید سے پگھل گئیں
مگر نہ کھل سکا
کہ یہ منافقت
بدن کی تھی
نظر کی تھی
کہ رنگ کائنات کی
حیات کی
ممات کی
کہ منظروں کے رنگ بے ثبات کی ؟
مگر یہ طے ہے
یہ منافقت بھی اک شناخت ہے

مرے تسلسل حیات میں
تمام تاب و تب
تمام روز و شب
اک اک گلاب لب
وصال و ہجر سب
عبادت اک ہوا سے ہے
ہوائے مدعا سے ہے
خدا سے ہے

مری مراد اس صدا سے ہے
جو لفظ لفظ عام ہے
جو صبح صبح شام ہے
ازل ازل سلام ہے
ابد ابد کلام ہے
جو ہر جگہ ہے، پھر بھی لا مقام ہے

یہ تاریکی
نہ جانے کس جنم سے ابلتی ہے
مری آنکھوں میں منظر چیختے ہیں
کس وضاحت کے لیے ؟
ہیولے
سرد، دھندلے، بے خد و خال
اپنے نقش و رنگ سے باہر نکل کر
پیش منظر رقص کرتے ہیں
پس منظر
کوئی شے، اجنبی سی

بکھر کر ریزہ ریزہ اڑ رہی ہے
فضا میں دیو پیکر اک پرندہ ہے
کہ پرچھائیں کسی بے اصل پیکر کی
چٹانیں منتظر ہیں ضرب تیشہ کی
تو میں خود اپنے سر کو
اپنے تن سے جدا کر کے کروں شکوہ
تو شاید بات بن جائے
تو میرا جسم بھی
ان سیکڑوں بے سر کے جسموں میں گنا جائے
جو کل شکوہ کناں تھے، آج پتھر ہیں

نہ جانے کتنی صدیاں پہلے
اک ساحر نے یوں ہی
کسی بستی کے سب بچوں کو پتھر کر دیا تھا
وہ بچے اب جواں ہو کر چٹانیں بن گئے ہیں
چٹانیں جو ہنسکتی ہیں
ہر اک رہ رو پہ جیسے
وہ ان کے ساتھ چلنا چاہتی ہوں
وہ ان سے بات کرنا چاہتی ہوں
یہ کہنا چاہتی ہوں
کہ بچپن ان کے سینوں سے نکل کر
گذرتے موسموں کے رزق میں شامل ہوا کیسے ؟
چٹانیں اپنی پتھر آنکھیں کھولے دیکھتی ہیں
جوانی ہنستی ہے
جوانی شور کرتی ہے
تو اک آتش فشاں بیدار ہوتا ہے
تو پھر اک زلزلہ آتا ہے بستی میں
مگر موسم کہ شاید بے بصارت، بے سماعت ہے
ٹھہر کر دیکھتا ہے اور نہ سنتا ہے
چٹانیں جو ہنسکتی ہیں ہر اک رہرو پہ شاید
سنانا چاہتی ہیں
تتلیوں اور جگنوؤں کے ساتھ بیتی ساعتوں کے پھول نغمے
مہرباں سرگوشیاں شب کی ستارہ گیت جگنو
چٹانیں منتظر ہیں

نہ جانے کون سے آزر کی، کیسی ضرب تیشہ کی
نئے آزر نے تیشے آزمائے
نئے پیکر تراشے
سماعت سے مگر محروم رکھا
نہ گفتار ان کو دے پائے
نہ رفتار ان میں آپائی
چٹانیں منتظر ہیں

آج بھی ان رنگ برنگی تتلیوں اور جگنوؤں کی، جو
اسیر سحر ہیں اب تک
ہزاروں فٹ کی بستی میں
اسی بستی میں جس میں
انھیں محبوس کر کے
وہ ساحر خود کسی اندھے کنویں میں سو رہا ہے
اور اس کی جان بوڑھے گدھ کی آنکھوں میں چمکتی ہے

چٹانیں منتظر ہیں
کہ اک شہزادہ اس بستی میں بھی آئے
مقدس لوح پر منقوش پاکیزہ ہدایت ساتھ لائے
طلسمی گدھ کی آنکھیں پھوڑے
سارے سحر توڑے
کہ ساری تتلیاں آزاد ہو جائیں
ہزاروں فٹ بلندی پر اڑیں
ساکت چٹانیں جی اٹھیں
اور پھر سے بچے بن کے
اڑتی تتلیوں کے پیچھے بھاگیں
مگر وہ تتلیاں
صدیوں کی بے پروازیوں کے بعد
اڑ پائیں گی کیسے ؟
وہ بچے، جو ہزاروں سال کی بے حرکتی سے
جم کے پتھر ہو گئے ہیں
وہ اپنے منجمد پتھر قدم سے
تتلیوں کے پیچھے کیسے بھاگ پائیں گے ؟

تو بہتر ہے
کہ میں ہی اپنے خنجر سے
خود اپنا سر جدا کر کے
شکایت کی روایت زندہ کر دوں
کہ میرا جسم بھی
ان سیکڑوں بے سر کے جسموں میں گنا جائے
جو پتھر ہو چکے ہیں
زباں کا مسئلہ اپنی جگہ ہے
مگر آنکھوں میں منظر چیختے ہیں
میں ان کی کچھ وضاحت کر نہیں سکتا

وہ ساحر
یوں ہی سو رہا ہے کنویں میں
وہ گدھ یوں ہی منڈلا رہا ہے سروں پر
کہاں ہے، مرے آسماں، تو کہاں ہے
کہ میں پھر سے بے آسماں ہو رہا ہوں
کوئی تازہ جھونکا ہوا کا تو آئے
چمکتا نہیں کیوں
کوئی چاند سورج، ستارہ
کوئی ریزۂ نور بھی اب نہیں ہے
فقط اک غلاظت بھری تیرگی
اور اندھیروں میں لتھڑی ہوئی
سنسناہٹ پروں کی
وہی تیرہ و تار اک سنسناہٹ پروں کی
وہ ساحر یونہی سو رہا ہے کنویں میں
مگر اس کے پرہول خراٹے لب کو چھوتے ہیں فضا میں
اور اس کی اک اک سانس سے
عجب لیجلجی سی
گیلی سی مخلوق
زقندیں لگاتی، کنویں سے نکلتی ہے
اور چیختی، منمناتی ہوئی پھیل جاتی ہے ساری زمیں پر

خود کلامی

تو اے فلسطین
ترے لیے پھر اداس ہوں میں
صدائے ایوبی آج
معدوم ہو گئی ہے۔
تری نوا پر فلک ہے گریاں
کہ تیرے شاہیں بچوں کے پنجوں میں
اب نہ پتھر ہے اور نہ قرآں
کہ بیت مقدس کے بام و در سے
لٹک رہی ہیں
سیاہ چمگادڑیں وہ منقار زرد پیکر
—— ابھی تک افغان
طالبانِ خدائے برتر کی رہ گذاروں کو
خار زاروں میں بھر رہے ہیں
کہ الجزیرہ بھی ایک پرچھائیں بن گیا ہے
کہ روشنی پشت پر ہے شاید
اگرچہ نیزہ بدست کرنیں
جھپٹ رہی ہیں سیاہ پرچھائیوں پہ لیکن
سیاہ پرچھائیوں کا غلبہ ہی بڑھ رہا ہے
طلوعِ حق پر منائیں کچھ اور تنگ تر ہیں

بوسنیا، اے بوسنیا
تو چیچنیا کیوں بن نہ سکا؟

کیوں گردوں میں پیدا نہیں ہوتا پھر کوئی
سلطان صلاح الدین ایوبی؟

ایران و عراق کی سرحد پر
یلغار سگاں
اک خطۂ عرب
بے مایہ سا اک پارچۂ لحم خوک طلب
اک موجۂ خوں
اک بحر جنوں

سن میرے خدا ـــــ سن میرے خدا
جو دیکھتا ہے اور سنتا ہے
تاریک شبوں میں

مور سیاہ کی لرزش پا ـــ
خاموش صدا
کیوں فیل و فلک کی زد پہ رہا
اک گھر ہی ترا؟
سن میرے خدا
نزدیک ہے جو شہ رگ سے مری
معبود ہزاروں کیوں ہیں مرے
جب ایک ہے تو اور ایک ـــــ
فقط اک سر ہے مرا؟

الا اللہ

یہ بلائیں جھپٹ رہی ہیں
سیاہ آندھی کا غلغلہ ہے
کہ نور ریزہ ہے اس کی مٹھی میں
کہ اس کی مٹھی ہے سب کی زد پر
کہ اس کی مٹھی کی زد پہ سب ہیں
سیاہ آدمی کی زد پہ تھا وہ
نڈھال تھا لقمۂ ہوا سے
کہ دفعتاً کوئی رعد گرجا
کہ برق چمکی
اور ایک سکتے میں آگئے سب
یہ بلائیں ٹھٹھک گئیں اور
سیاہ آندھی بھی تھم گئی اور
سب نے دیکھا
کہ بند مٹھی تو کھل چکی ہے
مگر وہ ننھا سا نور ریزہ؟
وہ گم ہے، لیکن
کھلی ہتھیلی پہ اس کے ہونے کی
اک ان مٹ دلیل روشن
کہ نور ریزہ تو اک امانت تھا
اس کے دل کی
اور اس کے دل میں اتر چکا ہے
وجود میں اس کے کھل چکا ہے

اسی سے اس کا وجود روشن
اسی سے اس کے قدم ہیں روشن
قلم بھی روشن

گھر چلانے والی

احمد یوسف

لڑکے کی عمر کوئی ۱۰ سال کی ہو گی۔ اس کا چہرہ بے حد خشک اور بے
تھا، اور وہ خاصا کمزور بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی ماں آسیہ بتا رہی تھی
پڑوس کے ایک ٹیلر ماسٹر کے یہاں کام کرتا ہے۔ وہاں اسے ساڑھے چار
ہفتہ ملتا ہے۔

ساڑھے چار روپے ہفتہ؟

آسیہ کہنے لگی۔ "اصل میں بابو جی ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ کسی کام میں
ہے۔ گھر پر رہے گا تو چھوٹے بھائی بہن سے لڑتا رہے گا۔ گلی میں چھوکروں
اتھ ہڑ بونگ مچائے گا، اور تھوڑی دیر بعد کھانے کو مانگے گا۔ اس
بڑا ہے، وہ تو آج چار سال سے کام کر رہا ہے، ٹھیک اسی کے سن سے کام
ے لگا تھا۔

میرے پوچھنے پر وہ بولی۔ "پڑھ لکھ کے کیا کرتا۔ ہمارے یہاں تو بچہ
تے ہیں روٹی مانگنے لگتا ہے، اسی لئے ذرا بولنے چالنے لگے، تو اسے کام پر
ی اچھا ہوتا ہے۔ دونوں بھائی مل کر مہینے میں سو روپے اٹھا لیتے ہیں۔
ے کو ماسٹر دوپہر میں کھانا دیتا ہے۔ ادھر بڑے کا کارخانہ دار بھی اس کے
رے کھانا منگوا دیتا ہے۔ ان کا باپ بوٹ پالش کے کام میں تیس چالیس
روز کما لیتا تھا۔ لیکن کیا بتائیں بابو جی اسے جوا کھیلنے اور لاٹری کے ٹکٹ
ے کا شوق ہو گیا۔ کبھی کبھار پی بھی لیتا ہے۔ میرا تو اس سے خوب جھگڑا
ہے۔ اس پر اس کی ماں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"بابو جی یہ بڑی ظالم ہے، اپنے مرد پر ہاتھ اٹھاتی ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا "سچ ہے؟"

کہنے لگی۔ "بابو جی کبھی کبھی اس پر بہت غصہ آتا ہے۔ آپ ہی
اسے ہم نہ سمجھائیں گے تو کون سمجھائے گا؟"

میں نے دل میں حساب کیا۔ اگر بوٹ پالش والا بیس روپے روز بھی
ا، تو گھر میں پانچ چھ سو روپے ماہ بہ ماہ آ جاتے ہوں گے۔

آسیہ کہ رہی تھی۔ "پھر ہم دونوں ماں بیٹی کام کرتے ہیں۔ قدرے
ے بعد اسی نے پھر گفتگو شروع کی۔ "دو جگہ ہم لوگوں نے کام لگا رکھا
یک جگہ نوے ملتے ہیں اور دوسری جگہ سو۔ برتن دھونا، صفائی، جھاڑو
۔۔۔ یہی ہمارے کام ہیں۔"

اسی پر میں نے اس سے دریافت کیا۔ "تمہارے گھر میں کتنے لوگ
ہیں؟"

"ہم دو ماں بیٹی، ابا، اس کا باپ (اس نے بچے کی طرف اشارہ کر کے
کہا) اور اس کا ایک جوان چچا جو بالکل نکھٹو ہے، کوئی کام دھام نہیں کرتا۔ پھر
ایک میری بہن ہے، اور میرے بچے ہیں۔ یہ لوگ چار بھائی بہن ہیں۔"

"خیر یہ تو بچے ہے"

"ارے بابو جی یہ سچ ہے۔ ہاتھ پاؤں سلائی، پیٹ تھرالی۔ سچی
بات تو یہ ہے کہ یہ چاروں بھائی بہن بڑوں کے برابر کھاتے ہیں۔"

اس سے بڑا چودہ سال کا ہے، بہن آٹھ سال کی ہے اور سب سے
چھوٹا بھائی چھ سال کا ہے۔"

"ہم دونوں بیٹی جہاں کام کرتے ہیں، وہاں ہمیں صبح کا ناشتہ اور دو
وقت کا کھانا بھی مل جاتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو بڑی اچھی بات ہے"

آسیہ نے کہا "بابو جی کھانے کا آجکل بڑا ویلیو ہے" (یہ انگریزی لفظ
اس نے کسی سے سن رکھا تھا)۔ "فیکٹری میں عورتوں کو کئی طرح کے کام مل
جاتے ہیں، جو وہ لوگ مزے میں گھر بیٹھے کر لیتی ہیں، لیکن یہ دونوں وقت کا پکا
پکایا کھانا اور ناشتہ کارخانے میں کہاں؟

"سب سے زیادہ فکر تو ابا کی رہتی ہے۔" ابا کے ذکر پر اس کی ماں
چپکے چپکے بسورنے لگی۔

میں نے پوچھا "ابا کو کیا ہوا؟"

"ارے بابو جی بڑھاپے کا جسم۔ ادھر کئی مہینے سے کھانسی، سینے کے
درد اور بخار میں پڑے ہیں۔"

مجھے یاد آیا کہ آسیہ پچھلی بار آئی تھی تو کہہ رہی تھی کہ برسات میں
ایک طرف کی دیوار گر گئی۔

نہ گرتی دیوار بچائی جا سکتی ہے، اور نہ گرتی صحت۔

"جب تک ٹھیک رہے، ایک اسکول کا رکشا چلاتے تھے۔ چھوٹے
بچوں کو گھر سے اسکول پہنچا دیتے اور اسکول سے گھر۔ ڈیڑھ سو روپے کی بندھی
بندھائی آمدنی تھی۔ کچھ بازار کی سواریاں مل جاتی تھیں۔ پلنگ سے لگ گئے تو وہ

پیسے تو آنا بند ہی ہو گئے اس پر دوا دارو کا خرچ الگ۔"

ڈاکٹر نے کہا کہ ایکسرے کراؤ، انھیں دودھ انڈا اور پھل کھلاؤ۔ اب آپ ہی بتائیں ہم لوگ ایکسرے کرا سکتے ہیں؟ انھیں دودھ انڈا اور پھل کھلا سکتے ہیں؟ اچھے ڈاکٹر کو دکھانے کے لئے ہمارے پاس پیسے ہیں نہیں۔ بابو جی اسپتال میں ہم لوگوں کو کون پوچھتا ہے۔ ڈاکٹر تک تو آتے نہیں ہیں۔ بڑا برا انتظام ہے وہاں کا۔"

"بس اللہ میاں کا شکر ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال لیتے ہیں۔ اور آپ لوگوں کے یہاں کے اتارے ہوئے کپڑوں سے اپنا تن ڈھانک لیتے ہیں۔ رمضان میں کچھ اللہ کے بندے ہم لوگوں کو نئے کپڑے بھی پہنا دیتے ہیں۔"

"بابو جی یہ جو رہ رہ کر چوٹ پڑتی ہے وہ ہم لوگوں کو مار ڈالتی ہے۔ اب بیماری آزاری تو ہوتی ہی رہتی ہے، ابا کی آمدنی ختم ہو گئی۔ اس کے باپ کو جوا کھیلنے اور لاٹری کے ٹکٹ خریدنے کا چسکا لگ گیا۔ پہلے تو کبھی کبھی پینتیس چالیس روپے تک لے آتا تھا۔ مگر اب تو پندرہ بیس روپے سے زیادہ نہیں لاتا۔ پوچھو تو یہی کہتا ہے کہ آجکل بازار مندا ہے۔ اس کا چچا کوئی کام نہیں کرتا ہے۔ جب کھانا بند کر دیتے ہیں، تو دو چار دن رکشا چلا لیتا ہے، پھر چھوڑ دیتا ہے۔ کہتا ہے "رکشا چلانے میں آدمی کو سو روگ لگ جاتے ہیں۔ اپنے ابا کو ہی دیکھ لو۔"

آسیہ ایک بات کو کئی کئی طرح سے کہنے کی عادی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ سننے والا حالات کی سنگینی سے بخوبی واقف ہو جائے۔"

بتائیے بابو جی اگر محنت مزدوری کرنے والے بیماری دکھی سے ڈرتے رہے تو پھر تو کام ہو چکا۔ پڑھے لکھے لوگوں کے لئے بہت کام ہے، لیکن ان پڑھوں کے لئے کونسا کام ہے؟"

میں نے سوچا، ٹھیک ہی بات پڑھے لکھے لوگ، ان پڑھوں کے لئے کہتے ہیں۔

"ہم لوگوں کو گھروں سے جو ناشتہ کھانا ملتا ہے، اسی میں ہم لوگ چار کوری کما لیتے ہیں۔ پھر بھی پانچ چھ آدمیوں کا کھانا پکانا پڑتا ہے۔ بارہ چودہ روٹی بنا لیتے ہیں ساتھ میں دال پکا لیتے ہیں، جس دن دال نہیں ہوتی اس دن مرچ کا کوٹا بنا لیتے ہیں۔ آٹا، چاول، دال، ہر چیز میں آگ لگی ہوئی ہے۔ بہن بھی شادی کے قابل ہو گئی ہے بابو جی اس کا کیسے بیاہ ہو گا، ہم لوگ تو سوچ سوچ کر پریشان ہیں۔ ایک مہینہ ذرا بہتر رشتہ آیا تھا۔ مہینہ میں آمدنی اچھی ہے۔ لڑکے میں کوئی خرابی بھی نہیں تھی، لیکن وہ کمبخت ٹی۔ وی۔ مانگتا تھا۔ "پھر کہتا تھا کہ لڑکی نکی بنی نہ آئے، اور یہ کہ شادی میں پچاس براتی لائے گا۔"

اس بار تو اس کی ماں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ لیکن آسیہ کی آنکھیں خشک تھیں، اور وہ ایک جہاندیدہ عورت کی طرح اسے بار بار سمجھا رہی تھی کہ رونے دھونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ "اللہ سے دعا کرو کہ اس کا عزت کے ساتھ بیاہ ہو جائے۔

آسیہ نے ماں کے آنسو پونچھ کر پھر اپنی گفتگو شروع کر دی۔

"بس بابو جی یہ دونوں بھو کرے کچھ کام سیکھ لیتے تو بڑا اچھا ہوتا۔ چھوٹا سال بھر سے ٹیلر ماسٹر کے یہاں کام کر رہا ہے لیکن اسے ایک بٹن ٹانکنا بھی نہیں آتا۔ خلیفہ سے کہا کہ اسے کچھ کام سکھاؤ، ہاتھ میں ہنر ہو گا تو اس کی زندگی سدھر جائے گی، اس پر اس نے بڑی روکھائی سے جواب دیا۔ کام میں جی ہی نہیں لگاتا ہے۔ لیکن ایک دن بازار میں اس کے ایک کاریگر سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا یہ دن بھر تو خلیفہ کے گھر کی دوڑ لگاتا رہتا ہے۔ وہ کبھی اس کے پاس اپنی گھر والی کو پیسے بھجواتا ہے، کبھی اس سے سودا سلف کرواتا ہے۔ پھر جب گھر جاتا ہے تو اس کی بیوی اس سے کام کراتی ہے۔ بتائیے کنویں سے پانی بھرنے کو کہتی ہے۔ کموڑا دس سال کو تو ہے ہی، ڈر لگتا ہے کہ کہیں کسی دن کنویں میں نہ گر جائے۔

بڑا چودہ سال کا ہو گیا۔ ایک پلاسٹک کے کارخانے میں کام کرتا ہے، چار سال سے کام کر رہا ہے، لیکن مالک نے اب تک اسے مشین پر نہیں بھیجا ہے۔ کہتا ہے ابھی بہت چھوٹا ہے"

"دن بھر کارخانے میں کاریگروں کے لئے چائے پان لاتا ہے، صفائی ستھرائی کرتا ہے، اور جب کوئی کام نہیں ہوتا تو مالک کے پاؤں دباتا ہے۔"

"مالک کے پاؤں دبانے میں کوئی ہرج نہیں ہے، لیکن اسے مشین پر تو بھیجتا۔ اس طرح وہ کام بھی سیکھ جاتا اور اس کی مزدوری بھی بڑھ جاتی۔"

چند لمحے اس کی گفتگو کا سلسلہ منقطع رہا اور پھر اچانک وہ کھڑی ہو گئی، ساتھ ہی اس کی ماں اور اس کا دس سالہ بچہ بھی کھڑا ہو گیا۔

"اچھا بابو جی" اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ تب ہی ایکدم سے اسے کچھ یاد آگیا۔

بابو جی آپ کی بڑی مہربانی ہو گی، اگر آپ ان بچوں کو کسی ایسی جگہ پر رکھوا دیں، جہاں یہ کچھ ہنر سیکھ کر کام کے آدمی ہو جائیں۔ سنا ہے آپ کے کارخانے والے دوست کے یہاں ــــ"

علی ظہیر

سڑک پار کرتے وقت

گھر سے نکل کر
کچھ دور چل کر
سڑک پار کرنا تھا
ٹھہرے رہے ہم
قدم
دو دفعہ
نیچے اترے
پھر اوپر پلٹ آئے
مگر تیسری بار
اس پار سے اس پار تک چلے آئے ہم

سڑک پار کرنے کے بعد
گردن سے
ریڑھ کی ہڈی کے آخری نقطے تک
ایک جھنجھناہٹ سی محسوس ہوئی
یہ یقیناً اعصابی تناؤ کے اکدم
ڈھیلے پڑنے کی وجہ سے ہوئی ہوگی
ایسا کیوں ہوتا ہے؟
کیا مرنے کا خوف؟
پتہ نہیں
یہ زندگی کی جبلی خواہش ہوگی
یا اعصابی نظام کا کوئی خودکار پروگرام

ہمیں دراصل سگریٹ خریدنا تھی
فخرو میاں کی دکان سے
سگریٹ لے کر
ہم پھر سڑک کے کنارے آ گئے
اس دفعہ شائد آگے کہیں سگنل پر
ٹریفک رکا ہوا تھا
آسانی سے ہم سڑک پار کر گئے
سڑک پار کرنے کے بعد یاد آیا
کہ فخرو میاں کو ہم نے پچاس کا نوٹ دیا تھا

باقی پیسے تو ادھر ہی رہ گئے
فوراً پلٹ کر پھر ہم نے سڑک پار کی
اس دفعہ ٹریفک شروع ہو چکا تھا
لیکن ہم بغیر کسی حادثے سے دوچار ہوئے
پھر فخرو میاں کی دکان پر تھے
ریڑھ کی ہڈی میں کچھ بھی نہیں ہوا

ایک عالم اکبر ہے

زندگی

یہ لمحہ جواب کیا ہے
بالکل نیا ہے
پرانے سارے لمحے
لپیٹ لئے گئے
کسی آسمان
یا سمندر کی گہرائی میں
محفوظ کر دیے گئے
پھر بھی
دن اور رات تو وہی ہیں
جو ہمیشہ ہوتے آئے ہیں
لیکن ہر دن نیا ہے
ہر لمحہ نیا
دن اور رات کے فریم میں
زندگی کی ریل مسلسل چل رہی ہے

میں بڑی مشکل میں ہوں

جس محل میں میں رہنا چاہتا ہوں
اس پر پہرے بیٹھا دیے گئے ہیں
محل کے اندر ایک شخص رہنے لگا ہے
جو خود کو بادشاہ کہتا ہے

وسلاوا شمبورسکا۔ ترجمہ: شمس الرحمٰن فاروقی

سو میں سے

باون، بہتر سمجھنے والے
زیادہ جاننے والے، ہمیشہ

ہر ہر قدم پر
بے یقینی کا شکار
باقی تقریباً سب کے سب

مدد کو تیار
اگر کام بہت لمبا نہ ہو
ایک کم پچاس

ہمیشہ نیک کام کرنے والے
کہ اور کچھ ان کے بس ہی میں نہیں
چار۔۔ اچھا شاید پانچ

شک کے بغیر
تحسین پر قادر
اٹھارہ

غلطی کر جانے والے
جوانی کے باعث (جو گزر جانی ہے)
ساٹھ سے کچھ زیادہ

ایسے
جن سے الجھنا ٹھیک نہیں
چالیس اور چار

ہر وقت خوف میں مبتلا
کسی شخص کے، کسی شے کے
ستر اور سات

مسرت کی صلاحیت والے
بیس ایک، یا دو
بہت سے بہت

تنہا ہوں تو
بے ضرر، اور بھیڑ میں
وحشی، درندے نصف سے زیادہ، بے شک

حالات مجبور کریں تو
ظلم پر مجبور، ایسوں کی
گنتی نہ جاننا ہی اچھا، تخمیناً بھی نہیں

موقع نکل جائے تو دانا
ایسوں کی گنتی
پیش بینی والوں سے بڑھ کر نہیں

زندگی سے کچھ نہ پانے والے، چیزوں کے سوا
تیس
(یہ اندازہ غلط ہو تو کیا خوب)

درد کی شدت سے گیند کی طرح اینٹھے ہوئے
اور اندھیرے میں ٹارچ کے بغیر
تراسی، جلد یا بدیر

وہ جو انصاف پسند ہیں
بہت سے
پینتیس

لیکن اگر سمجھنے کے لئے کچھ محنت کرنی پڑے تو
تین

جن کا درد اس لائق ہے کہ
ہم بھی اسے محسوس کریں
ننانوے

فانی
سو میں سو
اس شمار میں آج تک کوئی فرق نہیں

رفیق راز

زرد موسم کی ہوا اس دن بہت بپھری ہوئی تھی
شاخ پر تھی ایک ہی چڑیا مگر سہمی ہوئی تھی

چیر کر صحرائے ظلمت کو نشانے تک تو پہنچی
چشم بینا کی کرن لیکن بہت میلی ہوئی تھی

ہر طرف خوشبو ہی خوشبو تھی عجب یکسانیت تھی
میری خوشبو جانے کس کی خوشبو سے مہکی ہوئی تھی

جیسا تک سانسوں نے سیلاب بلا کا روپ دھارا
درمیاں میں خامشی کچھ اور بھی گہری ہوئی تھی

میرے منظر کے سوا معدوم ہر منظر ہوا تھا
دشت بینائی پہ جانے دھند کیا چھائی ہوئی تھی

اک بھیانک رقص شعلوں نے کیا تھا نیم شب کو
پہلے یہ سر سبز بستی شام تک خالی ہوئی تھی

پھل تو سارے گر چکے تھے خوف کی آندھی سے لیکن
باغباں کی لاش اب بھی پیڑ پر لٹکی ہوئی تھی

خواہش دیدار کے شعلے بھی کچھ بھڑکے ہوئے تھے
جلوۂ صد رنگ کی دہشت بھی کچھ پھیلی ہوئی تھی

حشر برپا ہے پوری بستی پر
پھر کھلے ہیں گلاب شبنم پر

پیاسے کھیتوں میں گل کھلیں گے اب
جنگ اب چھڑ گئی ہے پانی پر

ابر چھایا ہوا ہے کچھ دن سے
آسمان مزاج عالی پر

اس قلندر میں بات کچھ ہے ضرور
راکھ ملتا ہے جسم خاکی پر

سب کے ہاتھوں میں جام جم تھا مگر
سب کی آنکھیں بھی تھیں ساقی پر

گیت گاتا ہے ذرہ ذرہ یہاں
زور چلتا ہے کس کا آندھی پر

رفیق راز

سوچ میں ڈوبا ہوا ہوں شاید خاموشی بھی گہری ہے
ریت کے اک ذرے میں جیسے ساری دنیا سمٹی ہے

تیرا ہونا تیرے ہونے کی پہنائی پر ہے محیط
میری ٹوٹی سوچ کہ پھر بھی جال بچھائے رہتی ہے

خوف خزاں تو ہر موسم میں رہتا ہے سر سبز مگر
ایک ہری آواز پہ اکثر زردی چھائی رہتی ہے

کام تھمیں کٹتی ہے تیری یاد کہ پیاسا ہوتا ہوں
شام ڈھلے تنہائی بھوکے گھر پہ حملہ کرتی ہے

میں تو تیری خوشبو کی آہٹ پہ دھیان لگائے ہوں
کچھ نہ سمجھ پاتا ہوں، مجھ سے باد صبا کیا کہتی ہے

یوں تو میں نے خواب کئی دیکھے ہیں دکھائے کچھ اس نے
رات کے خواب نے روح میں لیکن دہشت پھیلا رکھی ہے

لگتا ہے فردوس کی مٹی سے کچھ اس کا رشتہ ہے
اس کے بدن میں خوشبو کی اک ندی سی بہتی رہتی ہے

تمہاری ذات کا سایہ ہے استعاروں پر
سمندروں کی حکومت ہے ریگزاروں پر

رواں تھا روح کا دریا کہ میں نے پوچھ لیا
یہ کیا شور بپا ہے ترے کناروں پر

یہ بجلی چمکی ہوئی کس کے غور و فکر کی ہے
یہ نور کس کی نظر کا ہے ان نظاروں پر

یہ کس نے میری شب ہجر کو نکھار دیا
یہ کس نے خاک سیہ ڈال دی ستاروں پر

مکاں بھی راکھ میں تبدیل ہو رہے تھے اور
ہوا بھی ناچ رہی تھی ترے اشاروں پر

حصار لفظ سے نکلے تو خوشبوؤں کی طرح
یہ راز آج کھلا تیرے غم کے ماروں پر

عاصم شہنواز شبلی

نیا اک سانحہ ہونے کو ہے تیار
مرا دشمن مرا ہونے کو ہے تیار

ہوا خوشبو صبا ہونے کو ہے تیار
وہ کب سے ماورا ہونے کو ہے تیار

مری سمت سفر کو دیکھ کر اب
مرا گھر راستہ ہونے کو ہے تیار

وہ جس کا روٹھنا سوہان جاں تھا
اسی سے دل خفا ہونے کو ہے تیار

تڑپ جس کی تھی برسوں سے وہی اب
مری خاطر فنا ہونے کو ہے تیار

نواح جاں میں جو روشن لو تھا
وہی مجھ سے جدا ہونے کو ہے تیار

جمال اویسی

کون کہتا ہے اشکبار ہیں ہم
ہاں مگر یہ کہ سوگوار ہیں ہم

ابھی سوتی تھی رات جاگ اٹھی
اپنے نالے پہ شرمسار ہیں ہم

زندگی قید با مشقت ہے
قید خانے کے تاجدار ہیں ہم

یاد آئی خزاں رسیدہ حیات
موسم گل میں سوگوار ہیں ہم

آج زنداں کی رات ہلکی ہے
آج محو خیال یار ہیں ہم

آفتاب شمسی

عرشی زادہ کی نذر

اس گھر سے جو ملا بے عار لے گیا
طوفان رات آیا تھا دیوار لے گیا

شب بھر لڑا تھا موج سے اب ریت پر پڑا
حیران ہے کہ کون اسے پار لے گیا

بت بن کے مجھکو رہنا تھا اس شہر میں یہاں
کیوں اپنے ساتھ جرأت اظہار لے گیا

در آئی یوں روایت منصور شہر میں
ہر مبتدی بھی خود کو سر دار لے گیا

ہیرو پہ سب کی آنکھ تھی اور اختتام پر
ناول کو اک مرا ہوا کردار لے گیا

شمسی انا کے وہم سے خالی کرو دماغ
آزار یہ تو کتنے ہی بیمار لے گیا

چھپ نہیں سکتا مرا رنگ اگر میرا ہے
تم مری نسل پہ دیکھو گے اثر میرا ہے

کشتیاں تیری ہوائیں تری دریا تیرے
پھر میں کس طرح نہ سمجھوں یہ سفر میرا ہے

دیکھئے کون پہنچتا ہے سلامت گھر تک
اس کی تلوار ہے اور کاسہ سر میرا ہے

میں نے یہ راہ نکالی ہے حریفوں سے الگ
کیوں ادھر آتے ہو یہ راہگذر میرا ہے

اٹیلو کیلوینو   ترجمہ: مصطفےٰ کریم

"برف کے ساتھ"؟"ہاں؟" میں برف لانے کچن میں جاتا ہوں۔ اور فوراً لفظ برف میرے اور اسکے درمیان پھیل جاتی ہے۔ جدا کرتی ہے یا شاید جوڑتی ہے۔ جس طرح برف کی نازک چادر منجمد جھیل کو کناروں سے جوڑتی ہے۔

اگر مجھے کسی چیز سے نفرت ہے تو برف بنانے سے۔ یہ کام میری گفتگو کے آغاز کو اچانک نازک موقعے پر توڑ دیتا ہے۔ یعنی جب میں اس سے پوچھ رہا ہوتا ہوں۔۔۔ "وہسکی کی بس ایک بوند؟" اور وہ کہتی ہے۔ شکریہ۔ بس ایک بوند۔ "اور میں کہتا ہوں۔ "برف کے ساتھ؟۔" اور میں کچن کی جانب جلاوطن ہو جاتا ہوں۔ میں خود کو برف کے ان ٹکڑوں کے ساتھ جھگڑتے دیکھ رہا ہوں جو برف کی ٹرے سے جکڑے ہوئے ہیں۔

کوئی مشکل نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں۔ صرف ایک سیکنڈ میں۔ اور یہ سچ ہے۔ گلاس کے ساتھ برف کے ٹکرانے کی آواز میری ساتھی بن جاتی ہے۔ مجھے اس شور سے جدا کرتی ہے جو پارٹی میں بے شمار لوگوں کی گفتگو سے بلند ہوتا ہے۔ مجھے یہ آواز ہر قسم کی دیگر صداؤں سے بھی جدا کر دیتی ہے۔ اور یہ آواز مدوجزر کی طرح آتی ہے۔ جب وہ پہلی بار مجھے نظر آئی تو اس نے خود کو صداؤں اور شور سے الگ کر لیا تھا۔ میرے دوربین جیسے وہسکی کے گلاس میں وہ الٹی نظر آرہی ہے۔ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرے اور نغموں سے گونجتے دونوں کمروں کے درمیان گیلری میں اسکی رنگت میری جانب بڑھ رہی ہے۔ اس نے گلاس میں پڑی برف کی شفاف سطحوں میں میرے بگڑے ہوئے سائے کو دیکھا۔ مجھے نہیں معلوم اس نے اس شور میں مجھے کچھ بولتے سنا یا نہیں۔ یا شاید میں خاموش رہا تھا۔ میں نے گلاس کو ہلایا۔ گلاس سے برف کے ٹکرانے کی ہلکی آواز آئی۔ وہ بھی اپنے گلاس میں کچھ بول رہی تھی۔ یقیناً۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ آج کی رات میری پارٹی میں آئے گی۔

میں نے فریزر کو کھولا۔ نہیں۔ بند کیا۔ پہلے مجھے برف کے لئے بالٹی کو تلاش کرنا پڑے گا۔ میں ایک لمحے میں تمہارے پاس ہوں گا۔ فریزر ایک قطبی غار ہے۔ جہاں پانی کے قطرے ٹپک کر منجمد ہو گئے ہیں۔ طشت کو فریزر کے اندر منجمد کرنے جکڑ دیا ہے۔ میں طشت کو بڑی طاقت سے الگ کرتا ہوں میری انگلیاں سفید پڑ گئی ہیں۔ اگلو (IGLOO) میں اسکیمو بیوی اپنے شکاری خاوند کی منتظر ہے جو سیل (SEAL) کی تلاش میں برفیلی پہاڑیوں کے درمیان گم ہو گیا ہے۔ اب صرف ہلکی جنبش سے برف کے ٹکڑوں کو ٹرے کے خانوں سے نکالنا ہے۔ لیکن ٹرے بالکل ٹھوس ہے۔ اسے میں الٹا کرتا ہوں تب بھی برف کے ٹکڑے باہر نہیں نکلتے۔ میں اسے سنک میں رکھ دیتا ہوں اور گرم پانی کھول کر اس پر ڈالتا ہوں۔ دھار کے گرنے سے آہنی ٹرے چھنکنے لگتی ہے۔ میری انگلیاں سفید سے سرخ ہو جاتی ہیں۔ میری قمیض کی آستین بھیگ گئی۔ مجھے غصہ آگیا۔ اگر مجھے کسی چیز سے نفرت ہے تو اس بھیگی بے شکل آستین سے جو کلائی سے چپکی ہوتی ہے۔

"کوئی ریکارڈ لگا دو۔ میں بس برف لے کر آرہا ہوں۔ سن رہی ہو؟" نلکے سے گرتے پانی کی وجہ سے وہ نہیں سنتی۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ ہمیں ایک دوسرے کو سننے یا دیکھنے نہیں دیتا۔ وہ گیلری میں باتیں کر رہی ہے۔ اسکے بال چہرے پر آگئے ہیں۔ اور وہ اپنے گلاس کے کنارے پر بول رہی ہے، میں نے برف کی سطح پر اسکے دانتوں کو ہنستے سنا۔ وہ بار بار کہہ رہی ہے۔ میں نے اسے جو کچھ بھی کہا ہے اسے بس یہی یاد رہ گیا ہے۔ میرے چہرے پر بھی میرے بال بکھر رہے ہیں۔

میں نے ٹرے کو سنک کی دیوار کے ساتھ ٹکرا لیا۔ برف کا ایک ٹکڑا اچھل کر سنک کے باہر آپڑا۔ اب یہ فرش پر ننھا سا تالاب بنا دے گا۔ مجھے اسے اٹھانا پڑے گا۔ وہ الماری کے نیچے چلا گیا ہے۔ میں جھک کر الماری کے نیچے ہاتھ ڈالتا ہوں۔ برف کی ڈلی میری انگلیوں کے درمیان پھسل جاتی ہے۔ آخر کار اسے نکال کر میں اسے سنک میں پھینک دیتا ہوں، میں نے برف سے بھری ٹرے کو الٹ کر نلکے سے گرتے پانی کے نیچے کر دیا ہے۔

وہ مخص میں تھا جسے اس نے بڑے گلیشیر بننے کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ گلیشیر ایک بار پھر بن رہا ہے اور پوری سرزمین پر پھیل جائے گا۔ آج کے انسان کی تاریخ دو برفیلے ادوار کے درمیان نمایاں ہوئی۔ وہ زمانہ اب ختم ہو چکا ہے۔ آفتاب کی ٹھنڈی ہوئی کرنیں زمین کی اس سطح تک بمشکل پہنچتی ہیں جس پر کہر رخشندہ ہے۔

اچانک برف کے تین چار ٹکڑے ٹرے سے نکل کر ٹوٹ کر سنک میں گرتے ہیں۔ قبل اسکے کہ میں ٹرے کو سیدھا کروں سارے برف کے ٹکڑے اس سے نکل کر گر پڑے۔ انہیں اٹھا کر برف کی بالٹی میں ڈال دیتا ہوں۔ بالٹی میں جو برف کے ٹکڑے میں نے ڈالے ہیں انہیں ایک ایک کر کے مجھے

دھوتا ہے۔ گرم پانی سے نہیں ٹھنڈے پانی سے۔ ڈلیوں نے پگھلنا شروع کر دیا ہے۔ بالٹی میں برف کی تہہ پر برف کا پتلا پردہ بن رہا ہے۔

بحر منجمد شمالی پر بہتے ہوئے برف کے بڑے بڑے چٹان خلیج پر جمع ہو رہے ہیں۔ وہ وہاں سے گذر کر گرم سمندروں کی جانب رواں ہیں۔ دیو قامت بطخوں کے جھنڈ کی طرح۔ وہ دریاؤں کے دہانوں پر سے گذرتے ہیں۔ بندرگاہوں کے منہ بند کر دیتے ہیں۔ اسکائی اسکریپر کی طرح طویل قامت وہ اپنے بڑے اور موٹے تودوں کو ایک دوسرے میں پیوست کر رہے ہیں۔ برف گلاس کی دیوار کو رگڑنے لگتی ہے۔ شمال کی راتوں کی خاموشی دراڑوں کی گرج سے ٹوٹنے لگتی ہے۔ وہ شہروں کو نگلنے کے لئے منہ پھاڑے ہوئے ہیں۔ پگھلتے ہوئے برف کی پھنکار سے سبھی کچھ مردہ، چپ اور نرم ہو جاتا ہے۔

میں سوچتا ہوں، وہ وہاں کیا کر رہی ہے۔ اس قدر خاموش زندگی کا نام و نشان نہیں۔ وہ میرا ہاتھ بٹا سکتی تھی۔ ہے نا؟! تھکی رہی۔ اسے خیال بھی نہیں آیا کہ ذرا میری مدد کر دے۔ خدا کا شکر ہے میرا کام ختم ہوا۔ میں کچن کے تولیے سے ہاتھ خشک کروں گا۔ لیکن اس تولیے کی بو کو اپنے ہاتھوں پر میں محسوس کرنا نہیں چاہتا۔ بہتر ہے اپنے ہاتھوں کو دوبارہ دھوؤں۔ پھر انہیں کس طرح خشک کروں گا؟ مسئلہ یہ ہے کہ کیا آفتاب کی حرارت جو مستقبل کے برفانی دور میں کرۂ ارض میں جذب ہوگی، وہ مخلوق کے اجسام کو گرم رکھنے کے لئے کافی ہوگی اور اسکیمو کے اگلو میں شراب بنانے کے لئے بھی کافی ہوگی۔؟

میں اسکے پاس واپس آتا ہوں تاکہ ہم دونوں آرام سے وہسکی پی سکیں۔ دیکھیں وہ خاموش کیا کرتی رہی ہے۔ اس نے اپنے کپڑے اتار دیے ہیں اور چری صوفے پر برہنہ ہے۔ میں اسکے قریب جانا چاہتا ہوں۔ لیکن کمرے پر برف نے حملہ کر دیا ہے۔ وہ قالین پر شیشے کی طرح چمک رہی ہے اور فرنیچر بھی اسی طرح روشن ہے۔ چھت سے اگی لڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر میرے اور اسکے درمیان چادر تان رہی ہیں۔ ہم دونوں کے جسم برف کی چٹانوں میں مقید ہیں۔ ہم بہ مشکل ایک دوسرے کو چمکتی برچھیوں کے درمیان دیکھ سکتے ہیں جن پر سورج کی کرنیں دمک رہی ہیں۔

غزل

ذکاء الدین شایاں

روشنی معصوم تھی الزام جیسے لکھ دیا
ہم نے اس چہرے پہ اپنا نام جیسے لکھ دیا

اک سیاہی نے مٹائے جیسے سب روشن سبق
ایک خوشبو نے کوئی پیغام جیسے لکھ دیا

حادثہ بر دوش انساں، دھند کے لوچے سفر
آسماں پر لفظ خوش انجام جیسے لکھ دیا

دل میں سورج کو اتارا پھول کے پلٹے ورق
سات رنگوں سے نیا اک نام جیسے لکھ دیا

کھڑکیوں میں بجلیوں کے جاگتے بجتے بدن
اجڑی سی شب کو زیر بام جیسے لکھ دیا

انتظار

اسد

گلی کے منہ پر پہنچ کر وہ رہ گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دور دور تک اندھیرا نظر آرہا تھا اور اندھیرے میں کوئی نہیں تھا۔ یہ بات اور تھی کہ اگر کوئی ہوتا تب بھی اسے دکھائی نہ دیتا۔ شاید اسی لئے اس نے یہ یقین کر لینا بہتر سمجھا کہ گلی میں کوئی نہیں ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں کسی شے کے وجود کا پتہ پانے کی سعی کرتا، اس نے اپنا رخ پھر سامنے کر لیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے گلی کا پورا راستہ طے کر گیا۔ گلی میں آگے جا کر وہ گم ہو گیا۔

گلی میں کہیں سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ایک مکان کے سامنے والے کمرے کی کھڑکی کھلی۔ پھر کمرے میں دیا سلائی جلنے سے تیز روشنی ہوئی جو لمحہ بھر بعد غائب ہو گئی۔ ذرا دیر بعد کمرے میں دوبارہ روشنی پھیل گئی۔ شاید لالٹین کی بتی نے اب آگ پوری طرح پکڑ لی تھی اور اس کی لو ٹھہر چکی تھی۔ اس نے اسی کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ پوری گلی کا جائزہ لیا۔ باہر گلی میں اندھیرا تھا اور اندھیرے میں کوئی نہ تھا۔ کمرے میں واپس آکر وہ لالٹین کی لو ایک ٹک دیکھنے لگا۔

آخر باقی لوگ کہاں رہ گئے؟ اسے معلوم تھا عموماً لوگ دھیمی رفتار سے چلتے ہیں۔ لوگوں کو پیچھے رہ جانے کا افسوس نہیں ہوتا۔ انہیں ساتھ چلنے والوں کے آگے نکل جانے پر دکھ نہیں ہوتا۔ ممکن ہے لوگ اندھیرے کی وجہ سے دھیرے چل رہے ہوں۔ لوگ اندھیرے میں چلنے سے ڈرتے ہیں۔ اندھیرے میں چلتے ہوئے کسی چیز سے ٹکرا جانے سے ڈرتے ہیں۔ ٹکرا کر گر جانے سے ڈرتے ہیں۔ کیوں کہ گرنے سے پہلے سنبھل سکنے کی سکت ہر کسی میں نہیں ہوتی۔ لوگ گر کر چوٹ کھانے سے ڈرتے ہیں۔ چوٹ کے درد سے ڈرتے ہیں۔ اپنے جسم کی چوٹ سے رستے تازہ خون سے، چوٹ پک جانے پر بدبودار گھنونے مواد سے اور پھر جسم کے سڑ گل جانے سے خوف زدہ ہیں۔ اسی لئے لوگ آہستہ آہستہ، سنبھل سنبھل کر، بغیر گرے اس کے پاس آرہے ہوں گے۔

لگاتار آگ کو دیکھنے سے روشنی اس کی آنکھوں میں چبھنے لگی تھی۔ جب وہ دوبارہ کھڑکی پر پہونچا، اسے باہر گلی کوشش کے باوجود نظر نہیں آئی۔ اس کی گھبراہٹ بڑھ گئی۔ کھڑکی سے مڑ کر وہ لالٹین کی بتی نیچی کرنے لگا۔ وہ

جوں جوں لو کم کرتا گیا کمرے میں پھیلا اجالا لالٹین کے گرد سمٹتا گیا۔ روشنی کا دائرہ گھٹتے گھٹتے شیشے میں قید ہو گیا۔ روشنی کا یوں اشاروں پر ناچنا اسے عجیب سا لگا اور وہ مسکرا دیا۔ بس اتنی روشنی کافی ہے۔ اتنی روشنی میں وہ سب لوگوں کی شناخت کر لے گا۔ محض چہرے پہچانتے ہیں۔ وہ نفسیات خوب سمجھتا ہے۔ یوں بھی چہروں کی تحریر پڑھنے کے لیے روشنی غیر ضروری ہے۔ کیوں کہ روشنی تیز ہونے سے نفسیات بدلا نہیں کرتی۔

اس بار وہ کھڑکی سے جلد واپس نہیں آیا۔ گلی اب بھی پہلے کی طرح اندھیرے میں ڈوبی ہوئی اور ویران تھی۔ اس مرتبہ اس نے نگاہیں اوپر بھی اٹھائیں۔ وہاں آسمان سے ٹوٹ کر گرتا ہوا ستارہ دیکھا۔ صرف ٹوٹتا ہوا ستارہ دیکھ کر پلٹ آتا تو دیر نہ لگتی۔ اس نے دیکھا ٹوٹ کر گرتا ہوا ستارہ کالے آسمان میں جس راہ سے گزرا تھا وہ راہ یک بارگی تیز روشنی کی لکیر میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے فوراً بعد وہ جگہ جہاں ستارہ تھا اور وہ راہ اتنی سیاہ پڑ گئی کہ کالے آسمان میں وہ اس سیاہی کو دیکھتا رہ گیا۔ یہ بھی سوچنے لگا کہ کسی شے کا کہیں وجود ہو اور پھر وہاں سے اس شے کا وجود ختم کر دیا جائے تو وہاں صرف خالی جگہ نہیں بچتی بلکہ خالی جگہ کے علاوہ ختم شے کے وجود کا خالی پن بھی باقی بچتا ہے۔

لوگوں نے آنے میں بہت دیر کر دی ہے۔ یہاں آنے کے لیے سب ساتھ روانہ ہوئے تھے۔ اس میں اور لوگوں میں اتنا فاصلہ نہیں تھا کہ پہونچنے میں اتنا فرق پڑے۔ کہیں وہ سب اس کے کمرے کا پتہ نہ بھول گئے ہوں اور شہر کی لاانتہا پیچیدہ سڑکوں پر بھٹکتے ہوئے ایک دوسرے سے اس کا پتہ نہ دریافت کر رہے ہوں؟ یا پتہ نہ بھی بھولے ہوں تو بھی یوں ہی ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لوگ آتے آتے یکایک رک گئے ہوں۔ جیسے راستے میں لچھمن ریکھا کھنچ گئی ہو۔ اس بار ہجوم ساکت کھڑا ہو گیا ہے۔ اس بار وہ سونے کے ہرن کا روپ لے کر بے تحاشا دوڑ رہا ہے۔ ریگستان میں پیاسے ہرن کو پانی کی تلاش ہے۔ مگر پانی ہے کہ آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ چاندی کی چادر بن کر نظر کو برابر دھوکا دے رہا ہے۔ کبھی کانچ کا پانی اور کبھی پانی نما ریت۔

شاید اس بار فرصت سے رکے ہوئے لوگ اس کے خلاف سازش کرنے لگے ہیں۔ کیا یہ ان کی سازش کا حصہ ہے جو اب تک نہیں آئے اور اب

آئیں ہیں نہیں؟۔ ویسے لوگ پہلے بھی نہیں آئے۔ وہ صدیوں سے ان کی راہ دیکھتا رہا ہے۔ پھر اپنی لڑائی خود لڑتا آیا ہے۔ لوگ اکتا کب ہوئے ہیں؟ آدمی کو لوگوں کے خلاف خود مجتمع ہونا پڑتا ہے۔ تبھی آدمی کی لوگوں پر فتح ہوتی ہے۔ وہ پلٹا اور کھڑکی پرسے او جھل ہو گیا۔

وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کھڑکی میں سے کمرے کی دیوار کا جو حصہ نظر آرہا تھا اس حصہ پر اس کی پرچھائیں عجیب و غریب روپ لینے لگی۔ سایہ کبھی بڑا ہو جاتا، کبھی اور بڑا، کبھی سکڑ کر چھوٹا اور کبھی غائب۔ کمرے کے اندر وہ نہیں بدلا، روشنی بھی وہی تھی۔ بس روشنی سے اس کی گھٹتی بڑھتی دوریاں اور نزدیکیاں دیوار پر منقش ہو رہی تھیں۔ وہ رک کر دیوار پر اپنے سایے کو دیکھنے لگا۔ اسے یاد آیا لوگ کہتے ہیں کہ تمام عمر کا اگر کوئی ساتھی ہے جو ہر پل اس کا ساتھ نبھاتا ہے تو وہ اس کا سایہ ہے۔ اس کے برعکس، اس نے محسوس کیا کہ جب دور دور تک کہیں روشنی کا وجود نہیں ہوتا اور وہ گھنے اندھیرے میں گھر جاتا ہے تب اس کا سایہ یقیناً اس کے جسم کو تنہا چھوڑ جاتا ہے۔ ایسے میں اپنی اندر خود روشنی پیدا کرنی ہوتی ہے۔ روشنی کی پہلی کرن کی ایجاد کے ساتھ سایہ آموجود ہوتا ہے۔ جیسے کبھی الگ ہی نہ ہوا ہو۔ مگر روشنی کے بعد سایے کی کوئی ضرورت نہیں بچتی۔

اپنے سایے سے نظریں ہٹا کر وہ اپنے ذہن میں کوندتے ہوئے خیالوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ نہیں۔ لوگ اس کے خلاف سازش نہ کر رہے ہوں گے۔ بلکہ اس کے کمرے تک پہونچنے کے بہانے سوچ رہے ہوں گے۔ مگر بہانوں کی کیا ضرورت ہے۔ تب کچھ اور سوچ رہے ہوں گے۔ بغیر سمجھے سوچ رہے ہوں گے۔ یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ ان کے یہاں نہ آنے پر میں کیا سوچ رہا ہوں اور ان کے آجانے کے بعد کیا سوچوں گا۔ جس طرح میں یہ سوچ رہا ہوں کہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔ شاید اتنی دیر انھیں سب وجوہ سے ہو رہی ہے۔

اس نے کمرے کے اندر ہی سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اس لئے نہیں کہ اسے کھڑکی کے راستے سے لوگوں کے کمرے میں چلے آنے کا خدشہ تھا۔ بلکہ ان اسے یقین ہو گیا تھا کہ گلی میں اندھیرا ہے اور اندھیرے میں کوئی نہیں ہے۔ پھر وہ کھڑکی کے چوکھٹ نما کینوس میں پیوست آسمان کو وہیں سے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے غور کیا کہ گلی میں سناٹا برقرار تھا۔ وہاں لوگوں کے قدموں کی ذرا بھی آہٹ نہیں تھی۔ آسمان کا رنگ پہلے کی طرح کالا تھا۔ اس دفعہ کوئی ستارہ نہیں ٹوٹا اور آسمان کی سیاہی بے داغ رہی۔ اب نیچے گلی میں اور اوپر آسمان میں کافی حرکت باقی نہیں بچی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں کھڑکی سے ہٹالیں۔

کمرے میں اندر آکر اس کی آنکھیں مکڑیاں بن گئیں اور چھت سے جا چپکیں، مکڑیوں نے جالے بننے شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر میں ساری چھت جالوں سے بھر گئی۔ کچھ اور دیر بعد جالے چھت سے لٹکنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا کمرہ جالوں سے اٹ گیا۔ اس کی نظریں جالوں کے ڈوروں کے سہارے پورے کمرے میں دوڑنے لگیں۔ چھپنے اور الجھنے لگیں۔ گول جالوں میں پھرکی کی طرح ناچنے لگیں۔ وہ بہت دیر تک اس میلا جال کو تکتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی پلکوں پر وزن بڑھتا محسوس کیا۔ جب آنکھیں کھولے رکھنا نا ممکن ہو گیا اس وقت اچانک سب کچھ خلا میں تحلیل ہو گیا۔

اب کے کمرے کے اندر سے کسی نے کھڑکی کی طرف نہیں دیکھا۔ کھڑکی سے باہر بھی کوئی نہیں جھانکا۔

گلی میں ایک مکان کے سامنے والے کمرے میں پہلے اندھیرا ہوا۔ پھر کمرے کی کھڑکی بند ہو گئی۔ گلی میں کہیں سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ کچھ دیر بعد گلی میں وہ نمودار ہوا۔ اس نے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے گلی کا پورا راستہ طے کیا۔ تیز چال چلتے ہوئے وہ انتظار کی حد پار کر گیا اور شہر کی لاانتہا پیچیدہ سڑکوں میں سے ایک سڑک پر آکر لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔ ◢◢

آشا پربھات

میرا شہر

میرا شہر
اینٹوں کا جنگل
روز بہ روز فلک کو چھونے کو بے قرار
اور پھیلتا جاتا
امر بیل کی طرح
آفتاب بھی یہاں
صرف عمارتوں کو دیکھتا ہے
جھونپڑیوں کو للچاتا ہے
فلک بوس عمارتوں میں بچے
پردے ہٹا کر
آفتاب کا نظارہ کرتے ہیں
پھر پردہ گرا کر رات اوڑھ لیتے ہیں

میرے شہر کے
سینے پر بھیڑ
پانی کی دھار کے مانند بہتی ہے
اور حادثے یہاں بے اجازت
گھس آتے ہیں
من مانی کرتے ہیں
دن بھر بھاگتے دوڑتے
اور رات کو لوٹتے اس شہر کی
کچھ گلیاں ہنستی ہیں
کچھ سسکتی ہیں کراہتی ہیں
اس کے فٹ پاتھ
رات گہراتے ہی
گدگدے بستر میں
تبدیل ہو جاتے ہیں

ان کہی باتیں

ان کہی باتوں کا
وہ جو سلسلہ تھا
کچھ تمہاری آنکھوں میں اگا تھا
کچھ میری آنکھوں میں ——
اور ہونٹ
لرزتے رہے تھے مسلسل
لاشعور کے نہاں خانوں میں
جھلملاتی قندیلوں کی طرح
وقت کی کرچیوں کو
ہم نے انگلیوں پر جنہیں گنا تھا
سچ جانو
ازل کا یہ مکمل سفر
میں نے تنہا ہی طے کیا ہے

ر چھوڑوں رشتے اپناؤں ماں بن جاؤں
ن اندر کی بچی کو کیا سمجھاؤں

م کے ماتھے پر جگنو کا دیپ جلاؤں
. پھر لفظوں کے اندھیروں سے ڈر جاؤں

ئی انوکھی بات نہیں ہوئی برسوں سے
.چ رہی ہوں اپنے خول سے باہر آؤں

کھ اٹھا کر دیکھوں تو سب اپنے ہی ہیں
پھر جھکا کر سوچوں تو کس کی کہلاؤں

ں شب سے میں اپنی سوچ کا مرکز خود ہوں
: جو اکیلا پن تھا کس کو یاد دلاؤں

اسنیٰ بدر زبیری

میں پتھر کی لڑکی ہوں
آنسو بھری لکیر نہیں

وقت نے میرے ہاتھوں میں
قلم دیا شمشیر نہیں

دیکھے طوق قلم پر ڈال
پیروں میں زنجیر نہیں

دیکھ کے بڑھ جانے والے
زندہ یوں تصویر نہیں

فلموں اور کتابوں میں
رونے والی ہیر نہیں

شکیل اعظمی

گھڑی وہ آئی کہ چپ ہیں زبان والے بھی
سڑک پہ رہنے لگے اب مکان والے بھی

خلا کے اوپری حصے پہ کیا عذاب آیا
زمیں پہ اترے ہیں اب آسمان والے بھی

ہمیں نہ پوچھ کہ سیلاب لے گیا ہم کو
شناخت کھونے لگے اب نشان والے بھی

نہ جانے وہ کھلی کشتی میں کس طرح ہوگا
یہاں تو ڈوب گئے بادبان والے بھی

کبھی کبھار جو ہم کو ترا خیال آیا
تو یاد آئے بہت خاندان والے بھی

شکیل ایک ہمیں فاقہ مست ہیں ورنہ
امیر ہو گئے سورت میں پان والے بھی

راجیش ریڈی

رہ کے بھی سب کے سامنے حاضر نہیں ہوں میں
دراصل میں وہ ہوں جو بظاہر نہیں ہوں میں

مجھ سے یہ کہہ چکی ہے کئی بار زندگی
میرے لیے ہے تو تری خاطر نہیں ہوں میں

یہ اور بات ہے کہ جدا ہے میری نماز
اللہ جانتا ہے کہ کافر نہیں ہوں میں

ہونٹوں پہ آ ہی جاتی ہے ہر بار کیا کروں
سچائی کو چھپانے میں ماہر نہیں ہوں میں

منزل مری الگ ہے مرا راستہ الگ
اک عام سے سفر کا مسافر نہیں ہوں میں

--

ایک دنیا میں ہوں میں اور ایک دنیا مجھ میں ہے
یعنی اک دریا میں ہوں اور ایک دریا مجھ میں ہے

میں ہی اپنے آپ کا دشمن ہوں میں ہی دوست بھی
میرا قاتل مجھ میں ہے میرا مسیحا مجھ میں ہے

جستجو میں اس کی میں بھٹکوں بھلا کیوں دربدر
جب مری منزل ہے مجھ میں میرا رستہ مجھ میں ہے

سوچتا کچھ ہوں میں لیکن مجھ سے ہو جاتا ہے کچھ
ہر قدم پر کچھ نہ کچھ الجھا ہوا سا مجھ میں ہے

زندگی میری ہے لیکن اس پہ حق اوروں کا ہے
کیا بتاؤں اب تجھے کس کس کا حصہ مجھ میں ہے

راشد انور راشد

دیکھتا کیا ہوں کہ بستی میں عجب کہرام ہے
اب میں سمجھا میری رسوائی کا قصہ عام ہے

ہر قدم پر ٹوکتا تھا یہ کرو ، وہ نہ کرو
جب سے بیچ آئے ضمیر اپنا بہت آرام ہے

اب مزہ آئے گا میرا بھی نہیں ثانی کوئی
اور سنتے ہیں کہ وہ بھی شہر میں بدنام ہے

ہاں اسی باغی پرندے کا یہ قصہ ہے سنو
شاخ سے کر اڑ گیا تھا آج تک گمنام ہے

میں نے جذبوں کی تجارت چھوڑ دی راشد میاں
اب بہت مصروف ہوں جلدی کہو کیا کام ہے

عزیز الرحمٰن

جوانی سے بڑھاپے تک

مرا جی چاہتا ہے توڑ دوں ہر ڈور بندش کی
اتاروں جسم پر رکھا ہوا پیمان کا پتھر
اٹھا کر پھینک دوں اس جسم سے لپٹی ہوئی پہچان کی چادر
کسی انجان دنیا کی طرف بھاگوں
گلی کوچوں میں گھوموں
گروں ، اٹھوں
لگاؤں جست دوڑوں
پلٹ کر کچھ نہ دیکھوں پھر افق کی نیلی وادی میں
سمٹ جاؤں

● شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون "ایرانی فارسی، ہندوستانی فارسی اور اردو۔ مراتب کا معاملہ" پڑھا۔ دل روشن ہو گیا۔ برسوں سے کئی گتھیاں ذہن میں پڑی تھیں جو اس مضمون سے سلجھ گئیں۔ معلومات کے علاوہ یہ مضمون خود اعتمادی بھی عطا کرتا ہے جس کے بغیر زبان والے زبان و ادب میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ ہندوستانی فارسی کے عروج و اقبال کے تنزل کے زمانے کی شناخت جن بنیادوں پر کی گئی ہے ان کا تجزیہ بڑے ہی سائنٹیفک انداز میں ہوا ہے۔ بارہ صفحات کا یہ مضمون اردو الفاظ کے استعمال سے متعلق کئی تسلیم شدہ کلیوں کو یکسر نہیں تو بیشتر مسترد کرتا ہے۔

اردو زبان میں اصطلاحات کی تحریکوں سے متعلق جو کتابیں اور مضامین شعبہ ہائے اردو میں رائج ہیں، اس مضمون کی روشنی میں ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے گو اس کی امید مستقبل قریب میں کم ہی نظر آتی ہے۔

ایرانی فارسی کی مرعوبیت کے زیر اثر تہذیبی مراکز سے اٹھنے والی زبان و بیان کی اصطلاحات کی تحریکوں کو علمی قصبوں میں رہنے بسنے والے صوفیائے کرام نے منہ نہیں لگایا۔ وہ زبان کے ارتقا کی فطری رفتار میں سد راہ نہیں بنے۔ مشہور صوفی شاعر صاحب البرکات حضرت شاہ برکت اللہ عشقی (ہندی میں پیمی) وفات ۱۱۴۲ھ گھروں میں رائج عام ضرب الامثال کو جس کتاب میں تشریح و تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں اس کا نام "عوارف ہندی" ہے۔ یہ ضرب الامثال وہ ہیں جن میں عربی اور فارسی کے الفاظ بے تکلف استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً بلی کے بختوں چھینکا ٹوٹا، شرکت کی ہانڈی بازار میں پھوڑی، ٹاٹ کا جامہ مونج کی بخیہ وغیرہ لیکن اس کتاب کا نام شاہ موصوف نے عوارف ہندی ہی رکھا۔

آپ کی پیش کردہ خلاقانہ آزادی والی تھیوری کی تصدیق اس مصرعے سے بھی ہوتی ہے۔

جب اینٹ زیر سیس دھری تب سمجھ پری

یہاں اینٹ اور سیس کا تعلق فارسی طریقے سے پیدا کیا ہے جو اہل اصلاح کے نزدیک محمود نہیں ہے۔ ان کے وصال پر ان کے ایک جیّد میر غلام علی آزاد بلگرامی نے "مآثر الکرام" میں تاریخ وصال یوں کہی ہے

تاریخ وصال او خرد کرد رقم

صاحب برکات و اصل منزل قدس

دوسرے مصرعے میں پانچوں الفاظ عربی کے ہیں لیکن ان کے درمیان فارسی ترکیب کا قاعدہ برتا گیا ہے۔

صاحب البرکات کے پوتے سید حمزہ حسینی مارہروی (وفات ۱۱۹۸ ہجری) اپنے دادا کے وصال کے تک بھگ ساٹھ برس بعد یعنی تقریباً ۱۱۸۵ء میں یہ شعر کہتے

نظر آتے ہیں جو ان کے مشہور زمانہ قصیدۂ غوثیہ کا مطلع ہے

غوث اعظم ہمن بے سرو ساماں مددے

قبلۂ دیں مددے کعبۂ ایماں مددے

قبلہ، دین، کعبہ، ایمان۔ یہ سب عربی الفاظ ہیں لیکن ان کو فارسی ترکیب کے طریقے سے جوڑا گیا ہے۔

عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ زبان کے بڑے مراکز میں زبان کے فطری ارتقا کو روکنے کی کوششیں "اصلاح زبان" کے باوقار نام پر ہوتی رہیں۔ لیکن ان صوفیائے کرام نے زبان کے خلاقانہ استعمال میں اصلاح زبان کی پابندیوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔

میں نے اپنے دادا حضرت آل عبا (حضرت آوارہ) اور والد محترم احسن العلماء علیہ رحمۃ والرضوان سے کئی بار سنا کہ لفظ محبت اصلاً عربی ہے اور بفتح میم ہے لیکن اردو میں میم پر پیش لگا کر پڑھنا ہی فصیح ہے۔

اس با معنی، مفید، اس موضوع پر اولیت کا شرف رکھنے والے دور اثر مضمون پر ایک بار پھر مبارک باد قبول فرمائیں۔

ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ صفحہ ۱۹ پر مصحفی کا یہ شعر درج ہوا ہے۔

ہر جائے گوش چشم بنا ناک کان کو

اپنی زبان سمجھے ہیں اردو زبان کو

اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

"یہاں مصحفی ان لکھنؤ والوں کی برائی کر رہے ہیں جو اردو میں بے وجہ فارسی الفاظ ٹھونستے ہیں، یعنی ناک کان کی جگہ گوش چشم استعمال کرتے ہیں "گوش چشم کا ترجمہ تو کان آنکھ ہوگا۔ مصحفی سے شعر کہتے وقت غالباً جوش جذبات میں سہو ہو گیا۔

تشریح کرتے وقت فاروقی صاحب نے کیوں مصحفی کا اتباع کیا؟

پروفیسر نیر مسعود کو صدر مملکت کی سند اعزاز پر مبارک باد۔ یک موضوعی افسانے اچھے لگے۔ مقدر حمید کے افسانے نے دل چھو لیا۔

بمبئی — سید محمد اشرف

● سید محمد اشرف نے اپنے مکتوب میں بڑی معلومات افزا اور پتے کی باتیں کہی ہیں۔ "گوش چشم" کا معاملہ یہ ہے کہ فارسی میں "گوش چشم، چشم گوش" بطور فقرہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ جس طرح ہمارے یہاں "ناک کان" بطور فقرہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ، فارسی والوں نے چشم کو گوش کی تشبیہ بھی قرار دیا ہے۔ ("بہار عجم") لہٰذا میں نے مصحفی کے مصرعوں کی تشریح یوں کی ہے کہ "جہاں ہم لوگ "ناک کان" لکھتے ہیں وہاں یہ لوگ فارسیت کے جوش میں "گوش چشم" لکھ دیتے ہیں۔

آخر میں چشم گوش کے تعلق سے غنی کاشمیری کا ایک لاجواب شعر قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

شاید زگرد رہ سد آواز پا سے او
شد مدتے کہ چشم براہ ابن گوش را

شمس الرحمٰن فاروقی
الہ آباد

● ایک غزل اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ اس میں یہ شعر بھی ہے

اب ادا کیجئے خراج بیاج
طوق اک اور پڑ گیا بھاری

اسے صنعت طمع کی توسیع سمجھئے یا ایک بے جا بندش کا ازالہ۔ میں نے ایسی مخلوط تراکیب پر مشتمل ایک مجموعہ مرتب کر لیا ہے (جواہر مالا) یہ ابھی چھپوایا نہیں۔ لیکن ایک مقالہ اس موضوع پر لکھ کر کئی دہائی پہلے چھاپ دیا تھا (اردو الفاظ میں چھوت چھات) جو میرے پہلے مجموعہ مضامین "نکتہ راز" میں بھی شامل تھا (۱۹۷۲)۔ بیشک ترکیبیں بے تکی، بھونڈی اور زبردستی کی نہیں ہونی چاہئیں۔ بے ساختگی اور خوش آہنگی شرط ہے خصوصاً نظم میں میں اسے بدعت کہتا ہوں نہ بداعت کیونکہ مثالیں ہمارے ادب میں موجود ہیں جو سند بن سکتی ہیں۔ دیکھئے آپ کے قارئین اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ آپ نے پسند کیا تو میں "جواہر مالا" میں سے کچھ کلام آپ کو بھجواؤں گا جو ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ اس میں تخلص بھی دوسرا ہے۔

ست رنگ لگ رہے ہو بڑے بد سبھاؤ سے
سب خاک ہو کے شہرت حسن بیاں اڑی

"بد چلن" قبول ہو سکتا ہے تو بد سبھاؤ کیوں نہیں؟ البتہ شاید تناقص معلوم ہو۔ ابھی اس کلام پر نظر ثانی نہیں کی ہے۔ لیکن اردو بولنے والے سبھاؤ کو محض بھاؤ ہی کے معنی میں لیتے ہیں۔ س کے ساتھ کو نظر انداز کرتے ہیں۔

شان الحق حقی
مانٹریال، کناڈا

● میں جناب شان الحق حقی کے اس خیال سے بالکل متفق ہوں کہ "خراج بیاج" اور "بد سبھاؤ" جیسی ترکیبیں اور فقرے بالکل بجا ہیں۔ جیسا کہ میرے مضمون مطبوعہ "شب خون" ۲۱۰ سے واضح ہوا ہوگا، میں اردو کو فارسی یا عربی کا محکوم نہیں مانتا۔ "خراج بیاج" اور "بد سبھاؤ" جیسے استعمالات پرانی اردو میں عام تھے۔ ہم نے انھیں تعصب اور زبان کی اصلیت سے بے خبری کے باعث ترک کر دیا اور اب ضروری ہے کہ اس ترک کو ترک کیا جائے۔ حقی صاحب کا خیال ہے کہ "ترکیبیں بے تکی، بھونڈی اور زبردستی کی نہیں ہونی چاہئیں۔ بے ساختگی اور خوش آہنگی شرط ہے۔" عملی مشورے کے طور پر تو اس خیال میں صداقت ہو سکتی ہے، لیکن اصولی طور پر نہیں۔ اصولی بات یہ ہے کہ جو چیز عام اور مروج ہو جاتی ہے وہ بے ساختہ اور خوش آہنگ بھی معلوم ہوتی ہے۔ غالب کا مصرع

بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہئے

آج ہمیں بھونڈا، بھدا اور بد آہنگ معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ "بھوں پاس" جیسے فقرے اب مستعمل نہیں ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ غالب کے زمانے میں (یہ غزل ۱۸۲۱ کی ہے، بحوالہ مولانا عرشی اور کالی داس گپتا رضا) یہ مستعمل رہا ہوگا یا سراسر نامرغوب نہ رہا ہوگا۔ ہمارے یہاں استادوں کا جبر دیکھئے کہ پہلے تو بعض الفاظ و تراکیب کو متروک قرار دینے کا حکم دیا اور جب کم و بیش متروک ہو گئے تو یہ حکم لگایا کہ چونکہ یہ مستعمل نہیں ہیں، اس لئے روزمرہ کے خلاف ہیں۔

یہ حقی صاحب کا کشف ہی ہے کہ شمارہ ۲۱۰ میں مطبوعہ میرے مضمون میں جو باتیں اٹھائی گئی ہیں، ان میں سے ایک کو انھوں نے از خود اٹھا کر اہل "شب خون" کو دعوت بحث دی۔ ہم شکر گزار ہوں گے اگر حقی صاحب اس پر مزید تفصیل سے لکھیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی
الہ آباد

● "شب خون" میں ماہ بہ ماہ شائع ہونے والی عمدہ تخلیقات کی درجہ بندی ہمیشہ مشکلوں میں ڈالتی ہے۔ "شب خون" ۲۱۰ بھی حسب معمول اعلیٰ و منفرد تخلیقات کا مرقع ہے مگر شمس الرحمٰن فاروقی کا مقالہ "ایرانی فارسی، ہندوستانی فارسی اور اردو" حاصل شمارہ اور معلومات کا خزانہ ہے۔ یہ مضمون اردو کی تاریخ، نیز ہندوستانی فارسی شاعری کے مقام و مرتبے کے سلسلے میں اب تک تمام مفروضات اور غلط فہمیوں کا ازالہ کرتا ہے اور انکشافات کا درجہ رکھتا ہے۔ اس مضمون کا مطالعہ میرے لئے ایک نہایت ہی خوبصورت اور قابل قدر تجربہ ثابت ہوا۔ تیموریوں کے عہد کمال میں اپنی زبان کی تاریخ اور اس سے متعلقہ باتوں سے آگاہی "شب خون" کے قارئین کو یقینی انتہائی مسرت بخشے گی۔

جلاوطنی کے افسانے کے تحت چاروں افسانوں نے بھی غیر ملکی پس منظر میں، ترک وطن کرنے والوں کے مسائل اور ان کی زندگی کے رویوں کی اچھی کامیاب اور فنکارانہ تصویر کشی ہے

شب خون کا وصف خاص یہی تو ہے کہ اس کا ہر شمارہ کچھ نہ کچھ نیا ضرور پیش کرتا ہے۔

پرکاش فکری
رانچی

● "شب خون" کے تازہ شمارہ (نمبر ۲۱۰) میں فاروقی کا معرکۃ الآرا مضمون دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ میرے خیال سے یہ ان کے بہترین مضامین میں سے ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ انھوں نے میرے دل کی بات کہی ہے تو امید ہے کہ آپ اسے تعلّی پر محمول نہ کریں گے۔ اگر ہندی فارسی گویان وقعت سے گر گئے اور زبان ہندوی اردو کے درجے تک پہنچتے پہنچتے لغات و تراکیب، محاورات و معنی آفرینی میں فارسی اور عربی کی جانب زیادہ چلتی چلی گئی تو ایسا کیوں ہوا، اس کا جواب غالباً سماجی عوامل اور تبدیلیوں کی روشنی میں بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

غالب سے مجھے عشق رہا ہے اور غالب کی فارسی دانی سے بھی، ان کی انا اور ہٹ دھرمی سے بھی۔ غلطیاں ان سے بلاشبہ سرزد ہوئیں۔ لیکن ان کا

...ہن ہمیشہ شگفتہ اور تلاش معنی میں مشغول رہا۔ مجھے ان کی "ایران غلامی، ذرا ... پسند آئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس امر کو بخوبی جان گئے تھے کہ ایک عام ...ندوستانی فارسی داں ان ایرانیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا جن کی مادری زبان ...رسی ہے۔ چاہے ہم کچھ بھی کہیں ایک ایرانی، اگر اس کے اندر جوہر موجود ...ہ، تو وہ زبان فارسی کو بہتر طور پر سمجھ اور استعمال کر سکتا ہے۔ غالب کو فارسی ...ے 'ازلی لگاؤ' تھا اس لئے بھی کہ جس ماحول میں انھوں نے آنکھیں کھولی تھیں ...اں کی علمی / تہذیبی / ادبی زبان سراسر فارسی تھی۔ وہ زیادہ تر ہندی فارسی ...یوں کے مخالف اس لئے رہے (کلکتہ کے حادثہ نے انھیں مزید ضدی اور ...نت بنادیا) کہ وہ حضرات ہندوستانی تراکیب و عادرات کو فارسی میں بس ترجمہ ...کے ان کے اعتبار سے زبان کی ریڑھ مار رہے تھے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ...موں نے خسرو اور ایک حد تک فیضی کے علاوہ اور کسی ہندی فارسی نویس کو ...بل اعتنا نہیں سمجھا۔ قتیل کے قبیل کے لکھنے والوں اور ہندی فارسی لغت ...یسوں (حالاں کہ آخری عمر میں ان کا ترکہ محض ناہنجار دکنی اور ملائے مکتبی ...یاث الدین پر گرا ہے) اور ان کی انا نے انھیں عام ہندی فارسی گویوں سے الگ ...تھا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ابتدائے جوانی میں انھوں نے ان فارسی گویوں کو ...رسے پڑھا ہوگا۔ آخر کار طرز بیدل انھیں محبوب رہا تھا۔

لیکن سب سے اہم سوال جس کی جانب فاروقی نے ہماری توجہ ...بذول کی ہے، یہ ہے کہ ہندوستانی ارباب حل و عقد نے فارسی دانی کے سلسلے ...ں اٹھارہویں صدی کے آخر سے خود کو اس قدر مجبور و مقہور کیوں کر لیا۔ ...ال ادب سے زیادہ سماجی رشتوں، سماجی تبدیلیوں، اور ذات کی پراگندگی سے ...لق رکھتا ہے (ذات کی پراگندگی آئینہ ہے معاشرے میں خلفشار کا) یہ بات تو ...و جیش طے ہے کہ فارسی اور اردو (ہندی / ہندوی) کے مغنیان زیادہ تر طبقہ ...راف سے تعلق رکھا کرتے تھے۔ مزید یہ کہ ان کا رشتہ سلطنت مغلیہ سے گہرا ...ا۔ اورنگ زیب بادشاہ کے وصال کے کوئی ایک پشت کے اندر اندر اس عظیم ...لطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا۔ اس تخریب نے نہ صرف سماجی رشتوں کو درہم ...ہم کر دیا، بلکہ ہندوستانی اذہان شکست و ریخت کے عمل میں گرفتار ہو گئے۔ ...موں کی تہذیبوں پر نظر ڈالنے سے ایسا لگتا ہے کہ جب قوموں پر زوال کی ...یاں آتی ہیں تو ان کے تہذیبی / ثقافتی / شعوری / علمی چراغوں کو لویں، کم ...کم ایک عرصہ کے لئے، تیز ہو جایا کرتی ہیں۔ ایسا ہم نے اس برصغیر پر بھی ...یم زمانوں میں دیکھا ہے، عراق و مصر میں بھی دیکھا ہے، اور چین میں بھی، ...ود بریں ہندوستان میں زوال تخریب کے ساتھ ساتھ (دلچسپ بات یہ ہے ...اس زوال کے دوران ہندوستانی تجارت نے، خصوصاً غیر ملکی تجارت نے، ...ر معمولی ترقی کی تھی) ایران اور وسط ایشیا میں بھی بربادی کے بادل انتہائی ...عت سے منڈلانے لگے تھے۔ میں وہاں کی ثقافتی کارگزاریوں سے کما حقہ، ...قفیت نہیں رکھتا ہوں، لیکن میرا اندازہ ہے کہ ان ہی دنوں غالباً سبک ہندی کی ...نت کے باعث (لعنت، کا لفظ میں نے ایرانی کلاسیکی پسندوں کے اعتبار سے

استعمال کیا ہے) فارسی ادب پر بھی زوال آ گیا تھا۔ قابل قدر ہستیوں کا فقدان تھا۔ جمود کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ جب کسی قوم کی زبان مصنوعی ہونے لگتی ہے تو اس کا سنبھالنا اور اسے مناسب طور پر استعمال کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ملارمے اور والیری کے بعد سے فرنچ شاعری میں ایسا انحطاط آیا کہ ہزار کوششوں کے باوجود فرنچ شاعری اب تک کلاسیکی عروج تک پہنچ نہیں سکی ہے۔ یوں بھی سبک ہندی روایت سے بغاوت کی ایک عمدہ مثال رہی ہے۔

ساتھ ساتھ ایک بات اور بھی ہے۔ مسلمانوں کے ابتدائی عہد سے ایران و توران سے سورماؤں کے علاوہ عالم و شاعر بھی آتے رہے ہیں، اور مختلف ہندوستانی حکومتوں سے وابستہ ہوتے رہے ہیں۔ اور انھوں نے گویا ہندوستانی فارسی گویوں میں تازہ خون کی آمیزش جاری رکھی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے بعد سے اگر ایسے اہل علم ہندوستان آئے تو وہ ان رگوں میں خون کی مانند دوڑ نہ سکے جس کی ان رگوں کو ضرورت تھی۔ کئی ایک سماجی وجوہات ہیں۔ علاوہ بریں، خصوصاً فارسی زبان و ادب کے سلسلے میں ہندوستانی ارباب فکر نے ہمیشہ اور زیادہ تر، ان اہل زبان کو سند جانا، اور ہندی میں نکمتا دوئم درجے کی بات مانی گئی۔ مسعود سعد سلمان نے بھی ہندوی میں دیوان مرتب کیا تھا، خسرو نے بھی، اور خان خاناں نے بھی۔ لیکن کیا ان کے ادوار میں اس کلام کی اتنی ہی اہمیت تھی جتنی ان کے فارسی تخلیقات کی؟ اگر ہم، خطا، چینیوں سے اس سلسلے میں مقابلہ کریں تو، بدھ دھرم و افکار کو قبول کرنے کے باوصف، ان کا اپنا کردار نمایاں نظر آتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندی فارسی اور اردو گویوں کے لئے ایرانی فارسی غیر ملکی، اور ایک اعتبار سے مقدس زبان بنتی چلی گئی۔ ایسا تصور عمومی طور پر ہمیشہ قائم رہا۔ خان آرزو جیسا جید عالم خالص فارسی کا ماننے والا ہے، حالاں کہ انھوں نے الفاظ کی تشریح سبک ہندی کی اصطلاح میں بھی کی ہے۔ ہندوستان کے فارسی لغات نویسوں کو اسی طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ ایک غیر ملکی، اور مقدس، زبان کو جاننے کے عمل میں مصروف تھے۔ وہ مصنوعی و ساحری الفاظ کے طلسم میں صاحب برہان، اور غالب کی مانند گرفتار بھی ہو گئے تھے۔ احساس شکست و خود ملامت نے ان کا وہی نفسیاتی مزاج بنا دیا جو بہت بعد میں انگریزی زبان کی جانب بھی ہندوستانیوں کا مزاج بن گیا تھا۔

نو آبادیت کے مختلف روپ ہمیشہ جاری رہے ہیں۔ لازمی طور پر ہم ہندوستانیوں میں ایسا اجتماعی شعور رواج پا گیا کہ اگر اردو والے عربی فارسی الفاظ و محاورات کو اپنی زبان میں استعمال کرتے ہیں تو انھیں عربی و فارسی قواعد و نحو کے اعتبار سے استعمال کریں۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوا ہے کہ اردو کے عظیم شعرا نے مکمل طور پر اس رواج کو جاری رکھا ہو۔ غالب جیسے فارسی داں کے یہاں (اور وہ کم از کم علامہ شبلی سے بڑھ کر اہل زبان تھے) ایسی تراکیب خوب ملتی ہیں جو کہ خالص / عام اردو قاعدے پر بنی ہیں۔ ان کے بعد کے، خصوصی طور پر لکھنؤ کے شعرا کے یہاں بھی ایسا رواج عام ہے۔ اقبال کی فارسی غیر معمولی طور پر عمدہ تھی، لیکن ان کے اردو اشعار میں بھی ایسا "سقم" پایا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ غالب ہوں یا دوسرے ہندی فارسی اور اردو گو،
ں نے غالباً اصولی طور پر 'خالص' فارسی کی اطاعت تو قبول کر لی لیکن استعمال
دوران، عموماً ان اصولوں سے ذرا لا پروائی برتی۔ یہ 'وبا' مغل حکومت کے
ں کے بعد زیادہ عام ہو گئی تھی، اس لئے کہ اردو نے اپنی اہمیت منوالی تھی۔
خیال عام ہو گیا کہ کلاسیکی فارسی، اور، ایک حد تک عربی ادب سے مستعارلی
چیزیں ان ہی زبانوں کے قاعدوں پر چلیں تو بہتر ہے۔ لا محالہ طور پر ان
وں کے سلسلے میں اردو والوں نے احساس کم تری کا درجہ قبول کر لیا۔
وستانی ارباب فکر و فہم نے ابتدائی دنوں ہی سے مان لیا تھا کہ ہندی رہندوی
۔ فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی، مسلمان حکمرانوں کے تسلط میں آنے
بعد ہی مخصوص طور پر ظہور میں آئی تھی۔ اگر وارستہ سیالکوٹی فارسی زبان
طبع آزمائی کر سکتے تھے، تو اردو بھی ان ہی کی تحریری زبان تھی، اگر تقریری
ں۔ اگر شبلی، غالب کو اہل زبان نہیں گردانتے تو اس کی وجہ، اور باتوں کے
د، یہ بھی ہے کہ چاہے زبان فارسی سے انھیں کتنی ہی مناسبت کیوں نہ ہو،
ران کے نہیں۔ دلی کے ہیں۔

ہم اس صورت حال کو ہندوستانی انگریزی کے تناظر میں بھی دیکھ
؛ ہیں۔ کم از کم سلمان رشدی کے عروج میں آنے تک، معدودے چند
وستانی انگریزی ادیبوں کو چھوڑ کر، سارے کے سارے ہی لکھنے والے نہ
ف انگلستان و امریکہ میں کم تر (بلکہ غلط) درجے کے تسلیم کئے جاتے تھے،
خود ہندوستانی فضلا ہندوستانی انگریزی دانوں کو قابل اعتبار نہ سمجھتے تھے۔
۔ جانتے تھے کہ ہندوستانی زبانوں نے انگریزی زبان کو ہزاروں الفاظ عطا کئے
۔ اگر آر۔ کے۔ نارائین مغرب میں پسند کئے گئے تو اس لئے کہ گریہم گرین
، انگریزی دانشوروں کی پشت پناہی انھیں حاصل تھی۔ ہاں تین چار شعرا (
ن سے پہلے مثلاً تورودت اور سروجنی نائیڈو، جن پر الزام لگا کہ ان کی زیادہ تر
یب نری انگریزی ہے) ضرور دلچسپی کے ساتھ پڑھے گئے، اس لئے کہ یا تو
رے طور پر انگریز، بن چکے تھے، یا اس ہندوستانی چیخ چیخ کو اپنی نظموں میں
ے تھے جسے رشدی اور اس قبیل کے دوسرے پس نو آبادیاتی ادیبوں نے
خوبی سے استعمال کیا۔ اور پھر زمانے نے بہت ساری تبدیلیاں بھی دیکھ لی
ں۔ مغرب کا نو آبادی "گناہ" منظر عام پر آرہا تھا، جس نے مقامی تہذیب
فت کا بھس بھر دیا تھا۔

سارا مسئلہ غالباً اسی طور کا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے ختم ہونے تک
تو آبادیت نے اپنے کرشمے دکھانے شروع کر دیئے تھے۔ ملک انقلاب سے
رہا تھا، اتہ پتہ کچھ نہ دیکھا جا سکتا تھا، جس کا اظہار بعد میں "مسدس حالی"
ہوا۔ بچی کچی چیزوں کو سینے سے لگا کر رکھنے کی اشد ضرورت تھی۔ اسی کش
اور ہیجان کے دوران ادبی اذہان نے ایرانی فارسی کی بالادستی بھی قبول کر لی۔

جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اسے مختصراً یوں بیان کروں گا:

الی ہندوستان میں ترک حکمرانوں کے داخل ہونے کے ایام ہی سے ایران
اور وسط ایشیا کی فکری رثقافتی رادبی بالادستی قبول کر لی گئی تھی (جنوبی ہند میں
عرب حکمرانوں کے طور پر داخل نہیں ہوئے تھے۔ عربی الفاظ کو مقامی بولیوں
نے ابتدا ہی سے قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔)

۲۔ گو ترک وسط ایشیا اور افغانستان سے ہو کر آئے تھے، لیکن فارسی ان کی مادری
زبان نہ تھی۔ فارسی لیجوا فرینکا تھی، عربی مقدس زبان تھی۔

۳۔ چوں کہ فارسی زبان نظم و ضبط قرار پا گئی (ہمیں بہت ہی کم معلوم ہے کہ
پنجاب میں محمود غزنوی کی حکومت کے دوران دیسی زبانوں میں حکومتی کام
کیوں کر انجام دیئے جاتے تھے۔ سندھ و ملتان میں تو غالباً ایک مخلوط سی عربی
رائج تھی۔ مسعود سعد سلمان کیا بیوی بچوں سے فارسی میں باتیں کرتا تھا یا پنجابی
کی ایک قسم میں؟)

۴۔ ضروری یہ ہو گیا تھا کہ نہ صرف فارسی پر عبور حاصل کیا جائے بلکہ کوشش
کی جائے کہ زبان کو اعلا Sophisticated طور پر استعمال کیا جائے۔

۵۔ لیکن پھر بھی لکھنے والوں نے مقامی الفاظ خوب استعمال کئے۔

۶۔ چوں کہ مغلوں کے دور عروج تک، بلکہ اورنگ زیب کے انتقال تک،
ایران و توران سے با اثر دانشوران وارد ہوتے رہے، اور زبان کی خدمت میں
لگے رہے، اور گو کہ مخصوص اثرات کے تحت سبک ہندی کا رواج عام ہوا
(ضرورت ہے کہ آپ جیسے اہل علم سبک ہندی کے انقلابی اثرات پر نظریں
ڈالیں) پھر بھی 'خالص' فارسی بولنے رلکھنے والوں نے ہندی دانشوروں پر اپنی
گرفت ڈھیلی نہ ہونے دی، اور ساتھ ساتھ ایسا بھی ہوا کہ ہندی دانشوران نے
زبان پر اپنی گرفت کمزور نہ ہونے دی۔

۷۔ ہندی دانشوران میں خان آرزو جیسے زبان داں بہت ہی کم وجود میں آئے۔
جنھوں نے ہندوستانی فارسی دانی کا لوہا منوانے کی سعی کی۔ زیادہ تر مقلد رہے۔

۸۔ جہاں تک ہندوستانیوں کی فارسی فرہنگ نویسی کی زبردست کوششیں ہیں،
ان کے وجوہات مخصوص سماجی، ثقافتی، ادبی وجوہات کی بنا پر ہے۔ پھر بھی
صاحب برہان قاطع، جیسا نسبتاً محتاط فرہنگ نویس وساتیر کے جعلی الفاظ ہیں،
مرزا غالب کی مانند پھنس کر رہ گیا۔

۹۔ تقریباً ۱۷۵۰ کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا کہ مغل سلطنت کے کمزور
پڑنے کے ساتھ ساتھ چہار عالم میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ وقت
بدل رہا تھا، پرانے اقدار پاش پاش ہو رہے تھے۔ نئی قدریں، نئے احساسات،
نئے افکار پنپ نہیں پڑ رہے تھے۔ فارسی زبان کے تئیں لازم تھا کہ اسے مقدس
ولائق تحریم تسلیم کر لیا جائے، اور اس لئے ضروری ہوتا جا رہا تھا کہ ایرانی قواعد
وتراکیب، محاورات وبیانیہ کی برتری تسلیم کر لی جائے۔

۱۰۔ ہندی رہندوی، جو کہ دور غزنوی سے ابھر رہی تھی، اور زیادہ تر غیر تحریری
میں رواج پا رہی تھی، تیزی سے اپنی ادبی وجود کا اعلان کر رہی تھی۔ اور گو کہ اس
کا زیادہ تر حصہ برصغیر کی مختلف بولیوں سے مل کر وجود میں آیا تھا، لیکن صحیح
ہندوی راردو کے لئے لازم ہوتا چلا جا رہا تھا کہ فارسی و عربی تراکیب وغیرہ کو

اپنے اندر سمو کر ادبی زبان بن جائے۔ ساری ادبی زبانوں کے ساتھ ایسا ہوتا آیا ہے۔ موجودہ ہندی زبان تیزی سے اردو، فارسی الفاظ کو اپنے اندر جذب کر رہی ہے۔

۱۱۔ غیر معمولی تبدیلیوں کے دوران اکثر ایسا ہوا کرتا ہے کہ تاریخ ایسی حرکات کے تابع ہو جاتی ہے جنھیں پراسرار، انوکھا اور عجیب کہا جا سکتا ہے۔ جاگیردارانہ نظام شکستہ نہ ہوا تھا، لیکن سارے آثار ایسے تھے کہ ارباب قوت و اقتدار نئی قوتوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ اس سنسنی خیز فضا میں، مذہب کے علاوہ، ان اقدار کو ہاتھوں سے نہ جانے دیا جا رہا تھا جو کہ قدیم طرز حیات کے شائبہ کو برقرار رکھ سکتے تھے۔

۱۲۔ نفسیاتی تبدیلیاں مجبور کر رہی تھیں کہ ایسا ذہن بن جائے کہ معاملات زبان و ادب میں کلاسیکی شعور کی اہمیت کو برقرار رکھا جائے۔ ولی ہوں یا میر ہوں سب کے سب اپنی انقلابی فراست کے ساتھ ساتھ، اردو کو محض فارسی کا چربہ سمجھنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ صہبائی، غالب اور مومن کا زمانہ آنے تک تو فارسی، عربی کی مانند گویا زبان مقدس بن گئی تھی۔

۱۳۔ کسی پیچیدہ عمل کے ظہور میں آنے کی وجہ واضح کرنا ہمیشہ دشوار رہا ہے۔ ایسا کیوں کر ہوا کہ ۱۷۹۰ کے درمیان انگلستان میں نہ صرف ادبی تبدیلیاں رونما ہوئیں، بلکہ انگریزی محنت کش (مزدور) طبقہ ابھرنے لگا؟ جس چیز نے مسعود سعد سلمان کے اردو دیوان کو ناپید کر دیا، اسی نے غالب کو مجبور کیا کہ لوگوں سے کہیں کہ ان کی فارسی زبان دانی پر غور کریں، سماجی نفسیات اور سیاسی اقتصادیات کی کہانی عجیب و غریب اور انتہائی ناقابل وضاحت رہی ہے۔

پوسا   حبیب حق

● فاروقی کا مضمون ''ایرانی فارسی ہندوستانی فارسی اور اردو'' پڑھ کر غالب کا یہ مصرع بے اختیار ذہن میں ابھر آیا۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

واقعی جی خوش ہو گیا۔ حسن اتفاق سے جب رسالہ ملا تو میں ہندی کے روزنامہ اخبار ''راشٹریہ سہارا'' کے لیے اپنا مضمون ''اردو اور ہندی کا سوال'' مکمل کر کے ویسے ہی آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ مضمون پڑھا تو اس میں سے وہ پیرا جس میں انھوں نے اردو کے بارے میں انگریزوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ذکر کیا ہے، اسے باکس کی صورت میں مضمون میں شامل کر لیا۔

زبانوں کی تشکیل اور نشو و نما اور بعد ازاں آنے والی تبدیلیوں کا موضوع ایک ایسے سمندر کی طرح ہے کہ آدمی جتنا بھی دور نکل جائے لگتا ہے کہ کنارے کے آس پاس ہی ہے، کچھ حقائق، آپ کے علم میں اضافے کے لیے نہیں، اپنے مطالعے کی تصدیق کے لیے یہاں درج کر رہا ہوں۔ آج سے کوئی دو ڈھائی ہزار سال پہلے جب اہل ہند اور اہل مصر کے درمیان کا ساز و سامان کے لین دین کا سلسلہ شروع ہوا تھا تو اسی وقت مصر میں جو چار زبانیں بولی جاتی تھیں ان میں قبطی زبان نہ صرف یہ کہ بے حد مقبول عام تھی بلکہ مصر میں کئی سو سال سے بولی جا رہی تھی۔ دہلی میں مصر کے سفارت خانے کے کلچرل اتاشی نے دی متولیہ اور ہر زلیہ نام بھی لیے جو کہ ہو سکتا ہے قدیم عبرانی کے ہوں کیونکہ مصر کی قدیم زبانوں پر اس زبان کے اثرات کافی نمایاں تھے۔ بہر حال ٹھیک اس وقت ہندوستان میں براہمن اور کشتریہ سنسکرت بولتے تھے اور باقی کے لوگ یا پراکرت یا براہمی لپی کی بھاشا بولتے تھے جن میں براہمی لپی کی بھاشا بہت زیادہ مقبول تھی۔ یہی لپی ہندوستان کی کئی علاقائی زبانوں کے رسم الخط کی بنیاد بنی۔ تو جب قبطی دور برہمی لپی کی بھاشا بولنے والوں میں رابطہ قائم ہوا تو دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھانے کے لئے جو بھی پیرایہ اظہار اپنایا اس عمل میں دونوں زبانوں نے ایک دوسری کا اثر قبول کیا ہوگا۔ قدیم برہمی لپی کے ایک کتبے میں آج کی اردو کا ۴، ۲ اور ۸ کا ہندسہ بھی شامل ہے اور آج کی انگریزی کے ⅱ اور ⅰ کے حروف بھی شامل ہیں۔ برہمی لپی میں یہ علامات کس زبان سے آئیں اور یہ علامتیں کس حرف کے کس آہنگ کو ظاہر کرتی تھیں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن بعد ازاں جب برہمی لپی ملک کی کئی علاقائی زبانوں کا رسم الخط بنی تو یہ علامتیں آج ہماری کسی بھی علاقائی زبان کے رسم الخط میں شامل نہیں ہیں، ممکن ہے کہ بیرونی علامتیں ہونے کے باعث نکال دی گئی ہوں۔

فارسی ظاہر ہے کہ ایران کی زبان تھی۔ جس عہد میں بھی اہل ایران اور اہل ہند ایک دوسرے کے قریب آئے، فارسی اور سنسکرت میں بھی ایک حیرت انگیز اور خوشگوار سنگم ملتا ہے، جیسے سنسکرت میں گھوڑے کا اش و، (अश्व) کہتے ہیں، فارسی میں اسپ کہتے ہیں، ماں کو سنسکرت میں ماتر کہتے ہیں، فارسی میں مادر کہتے ہیں۔ باپ کو سنسکرت میں پتر کہتے ہیں فارسی میں پدر کہتے ہیں، یہی نہیں ہم نے فارسی الفاظ کا مفہوم بھی بدلا ہے، 'ہم' فارسی کا لفظ ہے لیکن اردو میں اس کا مفہوم بالکل ہی بدل دیا گیا۔ اردو میں فاصلہ 'میدان کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا۔ فارسی لغات میں ذہنیت کا جو مفہوم درج ہے، ہم لفظ ذہنیت اس مفہوم میں نہیں بلکہ مذمت کے مفہوم میں بولتے ہیں۔

اردو تو کہیں باہر سے آئی نہیں، اسی ملک کی کھڑی بولی کی دین ہے۔ انگریزوں کی ذہنیت اور نیت تو یہیں سے ظاہر ہے کہ ۱۹۴۴ کے آس پاس شمالی ہندوستان کے ریلوے سٹیشنوں پر برٹش سرکار نے ہندو روٹی، ہندو پانی، مسلم روٹی مسلم پانی کی آوازیں لگوا کر دونوں فرقوں کے کھانے پینے تک میں نفرت پیدا کی تھی۔ انگریز تو چلے گئے اب اس کا کیا جائے کہ آج ۱۹۹۷ میں اس ملک میں ہندو اردو اور مسلم اردو سر اٹھا رہی ہے۔ اس رجحان کی اگر فوراً روک تھام نہ کی گئی تو یہ اردو کے تابوت میں آخری کیل بھی ہو سکتا ہے۔ اردو والوں کو اس بات کی سخت شکایت اور تکلیف ہے کہ ہندی والوں نے اردو اور فارسی کے ان گنت عام فہم الفاظ کے ہجے بھی بدل دیے ہیں اور تلفظ بھی، میں اس ضمن میں محض دس دن پہلے کا ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔ میں ایک رشتہ دار کو لکھنؤ کی گاڑی پر سوار کرانے کے لیے ریلوے اسٹیشن گیا تھا۔ اسی ڈبے میں ایک معمر

مسلم خاتون بھی تھیں جن کا کوئی جوان بیٹا یا رشتہ دار پلیٹ فارم پر کھڑے کچھ دوسرے لوگوں سے بات کر رہا تھا کہ گارڈ نے سیٹی دی۔ اور اس معمر خاتون نے چلا کر کہا تھا۔ "اے احمد گاڑی چھوٹنے والی ہے، تمھاری باتاں نہ پوری ہوئیں"

دراصل جذبے اور اظہار کا نام ہی زبان ہے۔ لفظ باتاں۔ میں اس خاتون کی جو جھنجھلاہٹ اور پریشانی ظاہر ہوئی "باتیں" میں شاید ہی ہوتی۔ ایک زبان کے لیے دوسری زبان کی چیز ذہنی دیوالیے پن اور جذبے کی کنگالی کو سوائے اور کچھ نہیں ہے۔ قدیم سنسکرت ادب میں شبد، ارتھ اور بات کے روپ کے بارے میں جو انمول خزانہ ہے بہتر ہے سب کے سامنے لایا جائے اس سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔ میں کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا، مضمون بے انتہا اچھا لگا سو یہ سب کچھ لکھ دیا، ورنہ مئی کے مہینے میں ہی "کتاب نما" کا اداریہ لکھ کر میں نے جیسی جیسی گالیاں سنی ہیں۔ بھئی میں باز آیا۔ ایک بات بتایئے کیونکہ آپ ہمیشہ دبنگ انداز میں بات کرتے ہیں، میرے اس اداریے میں ایسی کیا بات تھی کہ خطوں میں بابری مسجد اور بی۔ جے۔ پی کی دہائی دے کر نہ صرف مجھے بلکہ ملک کے قومی کردار تک کو مغلظات سنادی گئیں۔

نئی دہلی — من موہن تلخ

● شمارہ ۲۱۰ میں "ایرانی فارسی، ہندوستانی فارسی اور اردو" نے اردو کے تعلق سے دل و دماغ میں اٹھتے ہوئے ان گنت خیالات کو زبان عطا کر دی جو مجھ جیسے بیسوں اردو مادری زبان رکھنے والوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

حیدر آباد — علی ظہیر

● ادھر کچھ دنوں سے میرا عجیب عالم ہے۔ جب کوئی بہت اچھی چیز نظر سے گزرتی ہے تو بے ساختہ کوئی مصرع / شعر یاد آجاتا ہے یا کوئی کہاوت۔ یا دونوں۔ شمارہ ۲۱۰ موصول ہوا تو حسب معمول پہلے صفحہ اول پر نظر ڈالی۔ مگر خلاف معمول نظر وہیں رک گئی اور دیر تک رکی رہی۔ کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کر۔ اور ساتھ ہی "کوزہ میں سمندر" والی کہاوت بھی ذہن میں گونجی۔

اٹھارہ انیس سطروں میں آزادی کے بعد کے پچاس برسوں کا اتنا حقیقی جائزہ، معروضی تجزیہ، رجائیت، عہد و پیمان اور علیٰ کل شئیٍ قدیر سے دعائیں، ایجاز و اختصار اور تجزیہ پر اثری۔ کیا کچھ نہیں ہے اس میں۔ مرض کی تشخیص اور علاج کے ضمن میں جو پیمانہ استعمال کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ صادق کوئی پیمانہ ہے ہی نہیں۔ اور انداز بیان و زبان کیا خوب ہیں۔

خالص پور۔ اعظم گڈھ — ابرار اعظمی

● "شب خون" برابر مل رہا ہے۔ "شب خون" ایک مکتب کا نام ہو گیا ہے۔ یقیناً اس کا ہر شمارہ تاریخ ساز ہوتا ہے۔

ادھر کے شمارہ میں، مثلاً شمارہ ۲۰۵ میں اپنے دونوں مضامین میں فاروقی نے شاعری، جدیدیت اور جدید شاعری سے متعلق تیز روشن نکتے پیش کئے ہیں۔ "مابعد جدیدیت تشخیص اور علاج" جدیدیت سے متعلق غلط فہمیاں پھیلانے والوں کو غور و فکر پر مجبور کرے گا۔ حیرت کی بات ہے کہ "مابعد جدیدیت" والے فن کار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن دوسری طرف جدیدیت کی پر زور مخالفت بھی کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک عجیب تضاد ہے۔ انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہر دور کا Genuine فن کار جدید رہا ہے۔ لہٰذا جدیدیت تو ایک مستقل ادبی Phenomenon ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس کے مختلف Shades رہے ہیں۔ مثلاً ترقی پسندی کا بھی ایک Genuine حصہ جدیدیت کا ہی ایک Shade رہا ہے۔ سماجی، معاشی اور نفسیاتی مسائل وغیرہ وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور یہ عین فطری بھی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جدیدیت کا عمل بھی فطری ہے۔ جدیدیت تو ادب کو enrich کرنے کا نام ہے۔ زندہ ادب اور جدیدیت لازم و ملزوم ہیں۔ ادھر مگر طرح طرح کے ہوائی شگوفے دیکھنے میں آرہے ہیں۔ کوئی کہہ رہا ہے آج کا آدمی تنہا نہیں ہے۔ اس کے سماجی سروکار بڑھ گئے ہیں۔ لیکن آدمی فن کار بھی ہوگا تو بہر حال فن میں تازہ کاری کے عمل کا منکر نہیں ہوگا۔ اب یہ دیگر بات ہے کہ "سیاسی سروکار کو بڑی چالاکی سے "سماجی سروکار" کا نام دیا جارہا ہے۔ ریاکاری کو "سماجی سروکار" کہنے والے آج یہ فتویٰ بھی صادر کر رہے ہیں کہ "لایعنیت" کا دور ختم ہوا اور اب مابعد جدیدیت کا دور شروع ہوا۔ یہ تو وہی ہوا جیسے کوئی کہے آم کا موسم ختم ہوا، اب املی کا موسم آیا۔ بھئی، ادب میں آم، املی اور نارنگی کے موسم تو نہیں ہوتے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ کچھ تاجران فواکہ نے آج اپنے ایک ٹوکرے پر "مابعد جدیدیت" کا بھی لیبل چسپاں کر رکھا ہے۔ بہر حال۔۔۔ جدیدیت کے سلسلے میں آج یہ بھی کہا جارہا ہے کہ یہ establishment پر یقین رکھتی ہے۔ یہ الزام جاہلانہ اور گمراہ کن ہے۔ میر اور غالب سے لے کے اب تک جدیدیت کی کارگذاریوں پہ جو حضرات نگاہ رکھتے ہیں، وہ ایسے گمراہ کن بیانات کو اردو دشمنی پہ محمول کرتے ہیں۔ جدیدیت تو ادب میں ہمیشہ نئی معنویت اور نئے آفاق کی تلاش و جستجو کا نام ہے۔ جدیدیت فن اور فن کار کو ترجیح دیتی ہے۔

تیسری دنیا اور پچھڑے ہوئے لوگوں اور ان کے مسائل کا تشخص جدیدیت کے ہی دائرۂ عمل میں آتا ہے، کیوں کہ جدیدیت، تخلیقی دانشوری کا دوسرا نام ہے۔ جدیدیت نے ہمیشہ آدمی کی آزادی پر اصرار کیا ہے۔ یہ فرقہ پرست سامراجی اور فسطائی طاقتوں کی جعل سازی کو خوب سمجھتی ہے۔ دراصل مابعد جدیدیت کا ریکٹ کھڑا کر کے چند اردو والے اردو زبان و ادب اور اس کی تہذیب کو مسلسل نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ آج اردو کے ادیبوں کا ایک طبقہ ان کی سازشوں، ان کے انعامات، اکرامات، اور ان کے پیدا کردہ کنفیوژن کا شکار ہو گیا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ جدیدیت اور اردو کے تازہ اور تخلیقی ادب کا کوئی نقصان نہیں ہوگا کہ اردو نے ہمیشہ ناسازگار اور ناموافق حالات میں ہی رہ کے تازہ اور منفرد ادب پیدا کیا ہے۔ واضح ہو کہ اردو کے ساتھ اس طرح کی سازش قبل بھی ہو چکی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے پس پشت جو سازش تھی اس کے نتیجے میں ترقی پسند ادب کا ایک بڑا حصہ فن اور اس کی قدروں کو بالائے طاق رکھ شور و غوغا اور گھٹیا قسم کی رومانیت اور سطحیت کا

شکار ہو گیا۔ اردو ادب کو جو اس سے نقصان ہوا، وہ عیاں ہے۔ یہ تحریک مختلف مذاہب اور ان کی روحانی قدروں کے لئے بھی زیاں کا باعث ہوئی۔

ہمارے یہاں ادیبوں کا ایک طبقہ برابر رہا ہے جو کسی نہ کسی طور سے ادب میں یا کبھی معاشرے میں اپنے اقتدار کو بنائے رکھنے کے لئے کبھی صیہونیت سے ہاتھ ملا لیتا ہے اور کبھی فسطایت سے۔ ضرورت ہے اس سے باخبر رہنے کی جو بڑی ہوشیاری اور مکاری سے اردو ادب کی بیخ کنی کرنا چاہتا ہے۔ ایسے حالات میں جدیدیت کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ ادب میں تخلیقی دانش وری اور فن کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے تازہ تخلیقات / امکانات کو منظر عام پر لاتے رہنا جدیدیت کا ہی منصب ہے۔

اختر یوسف

رانچی

● "شب خون ۲۱۰" آج ہی ملا پہلی فرصت میں فاروقی صاحب کا مضمون پڑھا۔ وہ اس لئے کہ آجکل میں "مابعد جدیدیت اور مشرقی شعریات" پر کام کر رہا ہوں۔ آپ کے مضامین سے بڑی مدد مل رہی ہے۔ خاص کر "اردو غزل کے اہم موڑ" سے۔

رائج اردو تلفظ کے بدلے فارسی / عربی تلفظ پر بہ ضد لوگ آج بھی بکثرت مل جاتے ہیں اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں میں کئی ایک تو جدیدیت اور آپ کے مداح بھی ہیں۔ پچھلے دنوں ایک نمائندہ جدید شاعر اور میرے دوست نے میرے "صفر" بروزن "قمر" باندھنے پر سخت اعتراض کیا اور وہ آج بھی بضد ہیں کہ میں "صفر" اور "نفی" بروزن "درد" باندھوں۔ آپ ہی بتایئے میں انھیں کیا جواب دوں؟[1]

ان دنوں آپ مسلسل مشرقی شعریات پر کام کر رہے ہیں اور یہ ضروری بھی ہے کہ ہم جیسے طالب علم اب سے پہلے مشرقی شعریات کے بارے میں کچھ خاص نہیں جانتے تھے۔ مابعد جدیدیت نے معنی کی وحدت سے انکار کر کے ایک طرح سے ہماری کلاسیکی شعریات اور کلاسیکی شاعری کے مطالعے کے لئے کچھ نئے باب وا کئے ہیں۔ حالانکہ یہ کام اس طرح کے نعروں کے بغیر بھی کیا جا سکتا تھا (جیسا کہ آپ کر رہے ہیں) لیکن اگر یہ کام مابعد جدیدیت کے جھنڈے تلے بھی ہو تو کیا برا ہے۔ ویسے میں مابعد جدیدیت کو جدیدیت کا ایک حصہ یا جدیدیت کی توسیع ہی سمجھتا ہوں۔

قمر صدیقی

بمبئی

[1]ان کو وہی جواب دیں جو آتش نے اپنے معترض کو دیا تھا کہ ہم اردو لکھ رہے ہیں۔ ترکی لکھیں گے تو ترکی تلفظ کا لحاظ رکھیں گے

(شب خون)

● "شب خون" اب برابر مل رہا ہے اور دیکھئے یہاں آپ اسے کتنا دستاویزی بناتے جا رہے ہیں۔ رسالہ ملتا ہے تو میں خوش ہو اٹھتا ہوں اور اس وجود کی تلخ گفتگو سے کنارہ سا مل جاتا ہے۔ فاروقی صاحب نے یہ بہت بڑی اور قابل عمل مثال قائم کی ہے کہ اکادمی یو۔پی کی صدارت، اصولوں کی خاطر

ٹھکرا دی۔ لوگ بائے ہیں کہ اکادمیوں میں چھوٹے موٹے عہدوں کے لئے قطار در قطار کھڑے نظر آتے ہیں۔ حیرت تو یہاں ہوئی کہ اپنے آپ کو مارکسی نظریات کا علم بردار کہنے والا شخص فسطائیت کی بنیاد پر مستحکم حکومت، جس کا نصب العین مسلمانوں کے تشخص کو ختم کرنا ہے۔ اس کے ذریعے انعام حاصل کر رہا ہے۔

میں ان دنوں عربی ادیبوں کی انجمن "اسرۃ" کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ "دو جدید عربی شاعروں احمد العجمی اور قاسم حداد کا ترجمہ اردو میں کر رہا ہوں۔ یہ دونوں بہت ہی نادر، باغی اور بہت زیادہ پڑھے جانے والے شاعر ہیں۔ قاسم حداد چھ برس کی سزا کاٹ چکے ہیں ان پر اشتعال انگیزی کا الزام رہا ہے اور انھیں قتل کرنے کی کوشش بھی رہی ہے مگر بیرونی عرب دنیا کے دباؤ اور ان کی مقبولیت کی وجہ سے اب تک صحیح سلامت ہیں۔ احمد العجمی کا پانچواں مجموعہ "عاشق" "ابھی ابھی" بیروت، سے چھپا ہے۔ انھیں آپ جدید قیس کہہ سکتے ہیں۔

● ۲۰۸ میں فاروقی صاحب کا مضمون بہت کار آمد ہے۔ جب میں یونیورسٹی میں تھا اس وقت فاروقی صاحب کا ذکر بھی کلاس روم میں آتا تھا تو اساتذہ کہتے تھے کہ وہ صرف جدیدیت کے بانی ہیں اور اردو کی روایت کو ناپسند کرتے ہیں بلکہ اس کے خلاف ہیں۔ اب جب کہ "شعر شور انگیز" کی چار جلدیں منظر عام پر آ چکی اور "اردو غزل کے اہم موڑ" بھی شائع ہو گئی ہے میرا مشورہ ہے کہ وہ اساتذہ جو بمبئی یونی ورسٹی میں اجارہ داری اور حاکمیت جمائے بیٹھے ہیں فاروقی صاحب کی ان کتابوں کا مطالعہ کریں اور اس نوعیت کے اور مضامین پڑھیں۔ اور یہ اندازہ لگائیں کہ فاروقی صاحب کو جو دسترس تاریخ اور روایت کی باریکیوں پر ہے اور وہ جس تجزیے کی قدرت رکھتے ہیں، اتنی استعداد ہماری زبان کے کسی دوسرے نقاد کے یہاں نہ رہی اور نہ ہے۔

کہانیوں میں اکرام باگ کی کہانی بہت پسند آئی۔ اس کی گرہیں کھلتی جاتی ہیں تو گم گشتہ۔ وقت کے سمندر اور ان کا المیہ زیادہ روشن ہونے لگتا ہے۔ صدیق عالم کی کہانی بھی اچھی ہے۔ اسد محمد خاں نے جو چیز لکھی ہے وہ بھی دلچسپ ہے۔ بس "کہانی" وہ کم ہے۔ این میری شمل کی تقریر کا ترجمہ شائع کر کے آپ نے بہت عمدہ کام کیا ہے۔ اس طرح کی تقریریں خود ہمارے "کینوس" کو بھی وسیع کرتی ہیں۔ احمد جاوید اور تقی حسین خسرو کے افسانے بھی ٹھیک ہیں۔ شہریار، رونق نعیم، ریاض لطیف، راشد جمال فاروقی اور سخاوت شمیم کی نظمیں بہت عمدہ ہیں۔

۲۰۹ میں فاروقی صاحب کی تقریر اس تاریخی عمل سے ہمیں باخبر کرتی ہے جس نے فاروقی صاحب کے ذہن میں لہریں اور کروٹیں لی ہیں اور ان کی فکر اور تنقیدی نظریات کا میر اور غزل کی شعریات کو دنیا کے سامنے آشکار کیا ہے۔

اقبال مجید کی کہانی "ممو خان دوبارہ" (ناولٹ کے پس منظر کے باوجود) پڑھتے ہوئے بھی الگ کہانی لگتی ہے۔ اظہار الاسلام کی "واپسی" ٹھیک

ہے۔ سب سے اہم مضمون انیس اشفاق نے تو ظفر اقبال کی خوبیوں پر لکھا ہے۔ ہم سب ظفر اقبال کو کئی برس سے پڑھ رہے ہیں۔ یہ مضمون ابتدا ہے اور عمدہ ہے۔ تراجم یوں ہی سے لگے۔ البتہ اختر یوسف کی نظم اچھی ہے۔ مہدی جعفر کے مضمون پر دوستوں کی گفتگو پڑھنے کے لئے بے قرار ہوں۔

بحرین رحمٰن عباس

● "شب خون" کے تازہ ترین شمارے میں شکیل اعظمی نے سرسری طور سے ظفر اقبال اور محمد صلاح الدین پرویز پر اپنی رائے پیش کی ہے۔ ان دو شاعروں نے ادب کے لئے اپنی زندگیاں تج دیں اور اتنا کچھ اردو ادب کو دیا کہ جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ شکیل اعظمی صاحب کا خط پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ کسی حاسد نے ان سے یہ خط لکھوایا ہے۔ اگر انھوں نے یہ خود لکھا ہے تو میری ان سے گذارش ہے کہ وہ ادب کو سنجیدگی سے پڑھیں۔ خود کو اس میں سمو دیں تب انھیں گیان ہوگا کہ شاعری کیا ہے۔ محمد صلاح الدین پرویز طویل نظمیں کیوں لکھتے ہیں؟ اس لئے کہ چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھنے والے تو بہت سے شاعر ہیں، جن کے پاس وسعت نہیں ہے، لفظ نہیں ہے۔ نظم کو ایک افق تک لے جانے کی طاقت نہیں ہے۔ چھوٹی نظمیں چٹکلوں کی طرح ہوتی ہیں۔

اعظمی صاحب کہتے ہیں محمد صلاح الدین پرویز کی نظمیں ایسی ہیں جیسے کھودا پہاڑ نکلا چوہا اور کبھی چوہا بھی نہیں نکلتا۔ یہ کیا رائے ہوئی؟ میں سمجھتی ہوں صلاح الدین پرویز کی نظم کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ آپ سے محنت چاہتے ہیں اگر آپ اس کے اہل ہوں اور اگر آپ اس پہاڑ کو کھودنے میں کامیاب ہو گئے تو آپ کو وہاں ایک زندہ نظم بیٹھی ہوئی محسوس ہوگی۔

مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ ایسے لوگوں کے خطوط جو رسالے میں کسی بھی طرح اپنا نام دیکھنا چاہتے ہیں نہ چھاپیں گے۔ محمد صلاح الدین پرویز اور ظفر اقبال کو پڑھنے کے لئے علم، تیاگ، ریاضت اور شاعری کا بنیادی وصف یعنی عشق کا جاننا ضروری ہے۔

علی گڈھ عاطفہ علی

● شمارہ ۲۰۸ میں فاروقی صاحب کا مضمون مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ فی زمانی فاروقی صاحب کلاسیکی شعریات کی تاریخ، پس منظر اور اصول انتقاد پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ ان جیسے علم و فکر کے بغیر تنقید کرنا صرف گمراہ کن تصورات پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ ایسا ماضی میں ہو چکا ہے۔ چنانچہ بعض حضرات اب بھی جوش کو بڑا شاعر اور اقبال کو محض مفکر، فلسفی اور پیامبر تصور کرتے ہیں۔ اردو شاعری اور تنقید کا اس سے بڑھ کر کیا المیہ ہو سکتا ہے۔

شان الحق حقی کی غزلوں کے چند اشعار لب اعجاز تک پہنچے ہیں۔ سید امین اشرف نے داستان طرازی کا خوب مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی غزلیں خوب ہیں مگر دوسری غزل کے آخری شعر کے مصرع ثانی میں (غالباً کمپوزر کی غلطی سے) "اسی" کی "اس" چھپا ہے۔ جس کی وجہ سے مصرع بحر سے خارج ہے۔ شہریار کی غزل میرے لئے تبرک کی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر اس کے مطلع کا مصرع ثانی (غالباً کیا بلکہ یقیناً) کمپوز کی غلطی سے بے وزن ہو گیا ہے۔ یکہ صورت فضا ابن فیضی کی غزل کے مطلع کے مصرع اولیٰ اور شعر ۸ کے مصرع اولیٰ کی ہے۔ ان کی غزل میں قافیہ کی بعض جگہوں پر ندرت پیدا ہو گئی ہے۔

فرید پربتی کی غزل میں وزن، زبان اور بیان تینوں کا نقص ہے۔ مثلاً مطلع ہی کا مصرع ثانی لیجئے، مجھی کو مجھ سے رخصت کر گیا وہ ۔۔۔ رخصت کرنا کے معنی اجازت دینا، روانہ کرنا، بھیجنا، موقوف کرنا، ٹالنا ہے۔ پربتی صاحب نے نہ جانے کس قاعدے کی رو سے رخصت کرنے کو جدا کرنے کے معنوں میں برتا ہے۔ اسی طرح شعر ۳ اور ۴ ملاحظہ کریں۔ زینت کرنا یا اکارت کرنا دونوں میں سے کوئی محاورہ نہیں۔ اردو میں زینت بخشنا یا زینت ہونا اور اکارت ہونا محاورہ ہے۔

بہر حال غزلوں میں مصور سبزواری، مظفر حنفی، افتخار نسیم اور شمیم قاسمی کی غزلیں خوب ہیں۔ اس بار شہریار اور صلاح الدین پرویز کو چھوڑ کر نظموں کا حصہ کمزور ہے۔ خدا کرے پرویز صاحب جلد ہی شفایاب ہوں۔ انھوں نے معاصر اردو نظم کو ایک روحانی انقلاب سے روشناس کرایا ہے۔ این میری شمل کی تقریر چھاپ کر آپ نے قارئین تک ایک لائق مطالعہ چیز پہنچائی ہے۔ مہر افشاں فاروقی نے خوب ترجمہ کیا ہے۔ افسانوں کی نشست بھی کچھ کچھ ٹھیک ہے۔ تبصروں کی کمی رہ گئی۔ The Post Colonial Studies Reader کے مزید اقتباسات کا انتظار رہے گا۔

لیہہ (لداخ) شفق سوپوری

● میری پہلی غزل کے چند مصرعوں میں کمپوزنگ کی کئی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ مثلاً غزل کے دوسرے شعر کے مصرع ثانی میں "موڑ" کی جگہ ؟ چھپ گیا ہے ؎

ہر گلی ہر موڑ پہ منظر نیا روشن ہوا

اسی طرح، چوتھے شعر کے پہلے مصرع میں ایک لفظ "کی" نہ ہونے کی وجہ سے مصرع ناموزوں ہو گیا ہے ؎

ان کی تخت یا تحوں نے کی تعمیر قصر شاہ کی

آخری شعر کے پہلے مصرع میں بجھادیں ہے جبکہ بجھائیں چھپا ہے ؎

دشمنوں نے سب بجھادیں مشعلیں جب راہ کی

کوئٹہ احتشام اختر

● شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے مضمون "ایرانی فارسی، ہندوستانی اور اردو" کو پڑھنے کے بعد ایک کیفیت سی طاری ہوئی۔ ذہن کے بند دریچے کھلنے لگے اور اردو زبان کی ابتدائی تاریخ سے روشناسی ہوئی کئی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا۔ فرید پربتی کی غزلیں خاص طور پر پسند آئیں۔ لیکن کبھی کبھی دکھ ہوتا ہے جب اس معیاری جریدے میں غیر معیاری شاعری پڑھنے کو ملتی ہے۔ اس شمارے میں اسنیٰ بدر کی غزل کو ہی لیجئے۔ غزل کمزور ہے اور کچھ اشعار خارج بحر بھی ہیں مثلاً

آگ میں پاؤں دے ہم نے ۔۔۔ راہ میں ہزار باڑ رہے

شعر کے دونوں مصرعے غیر موزوں ہیں۔ پھر "آگ میں پاؤں دینا" کونسا محاورہ ہے؟ اب ذرا اسی غزل کے ایک اور شعر پر توجہ فرمایئے۔

تم نے آنسو بنا دیا ہم کو
پیرن وصول کا تھا پتھر تھے

پہلا مصرع موزوں مان لیتے ہیں۔ اب ذرا دوسرے مصرعے پر غور فرمایئے "پیرن" کو اگر پیرہن مان لیا جائے تو موزوں ہو جائے پھر بھی شعر کے معنی سمجھنے سے قاصر ہوں۔

سری نگر — اشرف عادل

۱۔ اسنی بدر کے دونوں شعروں میں کتابت کی غلطی ہے۔ اصل مصرعے یوں ہیں۔ (۱) تم نے آنسو بنا دیا ہم کو۔۔۔ پیرہن پھول کا تھا پتھر تھے
(۲) آگ میں پاؤں رکھ دیئے ہم نے۔۔۔ "دینا" بمعنی "ڈالنا" بھی ہے۔ ملاحظہ ہو platts کا لغت

(شب خون)

● "شب خون" اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے تمام مشمولات معیاری ہوتے ہیں۔ اور پہلا صفحہ (یا اداریہ) تو ایسا بلند پایہ ہوتا ہے کہ اردو ادب میں ایسے اداریے بمشکل ہی دیکھنے میں آئیں گے۔

کویت — غلام علی وفا

● "شب خون" کا شمارہ ۲۱۰ پڑھ کر اس وجہ سے خوشی ہوئی کہ آج پہلی دفعہ آپ نے ایک سچے کشمیری شاعر کا کلام اپنے موقر جریدہ میں زیور اشاعت سے آراستہ کیا۔ فرید پر بتی کلاسیکی ادب پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہاں کے بیشتر ادیب و شعرا ان سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔ ان کا کلام بطور خاص عمدہ معلوم ہوا۔ عالم خورشید کی دوسری غزل کے بیشتر اشعار ناموزوں ہیں۔ یعنی انھوں نے مفتعلن کی جگہ بسا اوقات مستفعلن رکھ دیا ہے ۱۔

سری نگر — شمیم شبنم

۱۔ یہ بحث کئی بار اٹھ چکی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ رجز مثمن مطوی مخبون میں مطوی کی جگہ سالم کبھی کبھی لانے میں کوئی قباحت نہیں

(شب خون)

● "ایرانی فارسی، ہندوستانی فارسی اور اردو" سے متعلق مقالہ محققانہ اور "شب خون" کے صفحات پر ایک گل درخشاں ہے۔ جیلانی کامراں کا مضمون بھی فکر کی نئی راہیں کھولتا ہے۔ منیر نیازی اور حمید امام کی نظموں نے متاثر کیا لیکن رونق نعیم کی نظمیں ایک تازہ کار اسلوب کی کہکشاں ہیں۔ اس شمارے میں مجھے غزلیں سب اچھی لگیں۔ غلام مرتضی راہی۔ صائمہ بتول بہت خوب ہیں لیکن زبیر شفائی کی غزلوں میں توانائی کچھ اور ہی ہے۔ اقتدار جاوید کی نظمیں بھی کامیاب ہیں۔

امپور — درد چاپداتوی

● "شب خون" شمارہ ۲۱۰ میں سب سے قیمتی نگارش "ایرانی فارسی، ہندوستانی فارسی اور اردو: مراتب کا معاملہ ہے۔ ان دنوں آپ عالم خورشید کی غزلوں کو "شب خون" کے صفحات پر تسلسل سے پیش کر رہے ہیں۔ عالم خورشید کا شعری مزاج اپنی نسل کے تمام شعرا میں منفرد ہے۔ شمارہ ۲۰۹ میں سہ ماہی "بادبان" پر چودھری ابن النصیر کے تبصرے کا چرچا ابھی تک ہو رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ان کو مدیر "بادبان" سے کسی بات کی چڑ ہے تو کسی کا یہ کہنا ہے کہ انھوں نے ایماندار مبصر کا فرض ادا کیا ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ مجھے خوشی ہو گی اگر آپ قارئین "شب خون" کو یہ اطلاع دے دیں کہ میں نے نثار احمد نثار کے بجائے اب اپنا نام نثار حسیب رکھ لیا ہے۔

سمستی پور — نثار حنیف

● "شب خون" شمارہ ۲۱۰ میں فاروقی صاحب کا مضمون میرے لئے بہت مفید ہے۔ میں نے اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھا ہے اور قلم سے جگہ جگہ نشان لگا دیئے ہیں تاکہ چند بیانات میرے ذہن میں ہمیشہ محفوظ رہیں۔ اس مضمون نے اردو زبان کی پیدائش کے سلسلے میں پرانی تحقیق پر نظر ثانی کی دعوت دی ہے۔ اردو کے سلسلے میں ان کے پیش کردہ تاریخی شواہد ماہرین لسانیات کو سوچنے پر مجبور کریں گے اور عین ممکن ہے کہ چند محققین اختلاف بھی کریں۔

"بادبان" پر چودھری ابن النصیر کے تبصرے کی گونج سنائی دے رہی ہے۔۔ ناصر بغدادی نے یہ غلط کیا کہ سوغات ۱۱ کے اداریئے کا صرف وہ حصہ شامل کر لیا جس میں فاروقی صاحب کی تنقید سے اختلاف تھا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناصر بغدادی بادبان کو فاروقی صاحب کے خلاف ایک پلیٹ فارم بنانا چاہتے ہیں۔

دربھنگہ — جمال اویسی

● "شب خون" ۲۰۹ میں 'بادبان' کراچی پر چودھری ابن النصیر کا تبصرہ بہت عمدہ ہے۔ پاکستانی رسائل پر آئندہ بھی 'شب خون' میں تبصرے دیتے رہیئے۔ ہندوستانی رسائل پر تبصرے عموماً ہندوستان کے سبھی رسالے میں مل جاتے ہیں لیکن اس قسم کے تبصرے ہندوستان کے دوسرے رسائل میں نہیں ہوتے۔ سرحد پار کے رسالے چونکہ ہم لوگوں کی پہنچ سے دور ہوتے ہیں، اس لئے ان کے بارے میں جاننے کا شوق اور تجسس کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ آپ کم سے کم کسی ایک پاکستانی رسالہ پہ ہر ماہ 'شب خون' میں تبصرہ دیا کریں، ایک طرح کی یہ "شب خون" میں انفرادیت ہی ہو گی۔

تمریا قاضی ٹولہ (مدھوبنی) — ابرار احمد صدیقی

● "شب خون" میں شائع ہونے والے تمام مضامین، نظم و نثر اپنی الگ ہی پہچان اور الگ ہی کیفیت رکھتے ہیں۔ مختلف ادبی موضوعات پر آپ کے مضامین اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے ہمیشہ توجہ طلب ہوتے ہیں۔ گزشتہ شمارے میں علامت کے بارے میں وزیر آغا کا مضمون بھی خوب تھا۔ اسی طرح ایک اور شمارے میں اقبال مجید کا ناولٹ ایک سے زیادہ بار پڑھے جانے پر اصرار کر رہا ہے۔

کراچی — ادا جعفری

● حکومت بہار کا مظہر الحق ایوارڈ جو توصیف نامہ اور ایک لاکھ اکیاون ہزار روپے پر مشتمل ہے۔ جناب سردار جعفری کو دیا گیا ہے۔ سردار جعفری پہلے شخص ہیں جنھیں یہ انعام اپنی موجودہ شکل میں حاصل ہوا ہے۔ پہلے اس کی رقم صرف اکیاون ہزار روپے تھی۔ ہم جناب سردار جعفری کو مبارک باد دیتے ہیں۔

● کچھ دن ہوئے کمیونسٹ رہنما ای۔ایم۔ایس نمبودری پد نے اروندھتی رائے کے بوکر انعام یافتہ ناول The God of Small Things کی سخت مذمت کی تھی کہ یہ ناول "کمیونزم کے خلاف" ہے اور اس میں ناول نگار نے باپ کی شخصیت کا مذاق اڑایا ہے۔ اس پر بس نہ کر کے ابھی حال میں جناب نمبودری پد نے اس ناول پر جنس پرستی کا بھی الزام لگایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ روس کے پارہ پارہ ہونے کے بعد بھی ہمارے آدرش پرست "کمیونسٹ رہنماؤں کے ذہن سے یہ خیال نکلا نہیں ہے کہ جو ادب کمیونسٹ آئیڈیالوجی کی تبلیغ نہ کرتے وہ اچھا ادب نہیں ہے۔ ان دنوں ہمارے ادبی حلقوں میں بھی بعض حضرات آئیڈیالوجی کو ہر چیز پر فوقیت دینے کا راگ الاپنے لگے ہیں۔ ان کے لئے اس واقعے میں لمحہ فکریہ ہے اگر وہ غور کریں۔

● قارئین کا یاد ہوگا کہ جرمن ناشرین کا امن انعام برائے ۱۹۹۵ این میری شمل (Annemarie Schimmel) کو دیا گیا تھا تو یورپ کے بڑے بڑے ادیبوں نے بھی اس کی مخالفت کر کے اپنی تنگ نظری کا ثبوت دیا تھا۔ (اس سلسلے میں این میری شمل کے مضمون کا ترجمہ از مہر افشاں فاروقی "شب خون" شمارہ ۲۰۸ میں ملاحظہ فرمائیں) اب ۱۹۹۷ کا یہی انعام ترکی کے مشہور ناول نگار یاسر کمال کو دیا گیا ہے۔ اس موقع پر گنٹر گراس Gunter Grass نے جو آج جرمنی کا سب سے بڑا ناول نگار قرار دیا جاتا ہے، جرمن اور مغربی نظام اخلاق کی سخت مذمت کر کے پرانے واقعات کی تھوڑی بہت تلافی کر دی ہے۔ گنٹر گراس نے کہا کہ آج جرمنی میں پناہ گزیں یا قیام پذیر غیر ملکی لوگوں خاص کر ترکی الجیریا اور نائجیریا کے رہنے والوں کے ساتھ جو زیادتی جرمن معاشرے میں ہو رہی ہے، وہ اس کی نسل پرستی کی بدترین مثال ہے۔ گنٹر گراس نے یہ بھی کہا کہ عام جرمن قوم نے ہٹلر نظام کے دوران بے گناہوں کا خون بہانے میں ہٹلری سپاہیوں اور حکام کا ساتھ دیا تھا۔ گنٹر گراس کے اس بیان پر جرمنی کے سرکاری حلقوں میں بہت ناراضگی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ہم بہر حال یاسر کمال اور گنٹر گراس دونوں کو مبارک باد دیتے ہیں۔

● گذشتہ دنوں آسٹریا کے مشہور ماہر نفسیات وکٹر فرینکل (VIK-TOR FRANKL) کا بعمر ۹۲ سال انتقال ہو گیا۔ فرینکل کے باپ، ماں، بھائی اور اس کی بیوی ہٹلر نظام کے قائم کردہ قیدیوں کے کیمپ Concentration Camp میں جاں بحق تسلیم ہوئے۔ خود فرینکل نے ایک سخت قیدی کیمپ میں جس کا نام آشوتس (AUSCHWITZ) ہے میں چار سال بڑی مشقت سے کاٹے۔ اس نے اپنے تجربات اور محسوسات کی بنا پر ایک کتاب "انسان معنی کی تلاش میں" (MAN'S SEARCH FOR MEANING) لکھی جس میں اس نے نفسیات کا یہ نکتہ بیان کیا کہ انسان اگر خود کو کسی کام میں لگائے تو اسے مسرت کا احساس ہوتا ہے اور وہ سخت ترین مصیبت کے عالم میں بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کی اس کتاب نے تمام دنیا کے اہل علم اور اہل فکر پر گہرا اثر ڈالا۔ نوے سال کی عمر میں بھی اس کا یہ عالم تھا کہ اسے روزانہ اوسطاً ۲۳ خط ملتے تھے جن کے لکھنے والوں کا یہ کہنا تھا کہ ان کی زندگیاں وکٹر فرینکل کی بدولت تبدیل ہو گئیں۔

● چند ہفتے ہوئے امریکہ کے مصور ROY LICHTNES TEIN رائے لختن ٹائن کا بعمر ۷۳ سال انتقال ہو گیا۔ لختن ٹائن نے جدید مصوری کی فضا بالکل بدل ڈالی تھی۔ اس نے اپنی تصویروں کو COMIC کی شکل میں بنانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی تصویروں میں مزاح اور طنز اور انسانی ہمدردی کے ساتھ ساتھ آج کی زندگی کی سطحی معیاروں پر بھی رائے زنی ہوتی تھی۔

● ۱۹۹۷ میں انگریزی کے مشہور بھیانک ناول DRACULA کی اشاعت کو پورے سو سال ہو گئے۔ DRACULA کا موضوع ویمپائر VAM-PIRE میں، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مردہ ہیں لیکن، انسانی خون پی کر زندہ رہتے ہیں۔ حسن اتفاق یہ کہ یہ سال اس کے مصنف BRAM STOKER کی پیدائش کا ایک سو پچاسواں سال بھی ہے۔ موقع کی مناسبت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دنیا کے مختلف ملکوں مثلاً آئر لینڈ، کناڈا، انگلستان، امریکہ اور بعض یورپی ملکوں نے ایسے ڈاک ٹکٹ جارے کئے ہیں جن میں DRAULA یا VAMPIRE کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جدید زمانے میں VAM-PIRE کے موضوع پر لکھنے جانے والے سب سے مقبول ناول نگار ایک خاتون ANA RICE ہیں جو امریکہ میں رہتی ہیں۔

● اسد، بھوپال کے نئے افسانہ نگار ہیں اور بینک میں ملازمت کرتے ہیں۔
● حسن منظر کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ "سوئی بھوک" چند دنوں پہلے کراچی سے شائع ہوا ہے۔
● ذی شان ساحل کی نظموں کا تیسرا مجموعہ، کراچی اور دوسری نظمیں" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔
● شان الحق حقی کناڈا سے کراچی واپس آ گئے ہیں۔ ان کی ایک نظم کا ترجمہ بین الاقوامی شاعری کے انگریزی مجموعے میں شامل کیا گیا ہے۔
● صدیق عالم ان دنوں ایک منظوم ناول لکھ رہے ہیں۔
● عاصم شہنواز شبلی کلکتہ سے دارجلنگ منتقل ہو گئے ہیں جہاں وہ گورنمنٹ کالج میں شعبہ اردو میں ہیں۔
● عزیز الرحمٰن بھاگل پور (بہار) کے شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔
● مرزا خلیل احمد بیگ کی نئی کتاب "لسانی تناظر" حال میں شائع ہوئی ہے۔
● نصیر احمد ناصر، میر پور (پاکستان) سے ایک سہ ماہی ادبی رسالہ "تسطیر" کے نام سے شائع کرتے ہیں۔

Regd. with Registrar of
Newpapers No. 12476/66

Urdu Monthly
Shabkhoon

Regd. No. AD/42

Issue No : 212
December 1997

P.O. BOX NO. 13
ALLAHABAD - 211 003

Price per copy
Rs. 15-00

ممالک غیر میں شب خون

بیرون ہند کے پڑھنے والے حسب ذیل پتوں پر شب خون کا تعاون بھیج سکتے ہیں
رقم کی وصولیابی کی اطلاع ملتے ہی پرچہ ان کے نام بذریعہ ہوائی ڈاک جاری کر دیا جائے گا

(۱) ریاست ہائے متحدہ امریکہ (پچیس ڈالر) جناب عادل منصوری

1. MR. ADIL MANSURI
POST BOX 922
HOBOKEN NJ-07030 U S A

(۲) کناڈا (تیس ڈالر) جناب محمد حفظ الکبیر قریشی

2. MR. M.H.K. QURESHI
12, HARVEY COURT
RICHMOND HILL ONT
L4C-5R2-CANADA

(۳) پاکستان (پانچ سو روپے پاکستانی یا پندرہ ڈالر امریکن)
جناب صبا اکرام

3. MR. SABA EKRAM
NADEEM CORNER
FLAT NO B-3 SECTOR 16
BLICK - N
NORTH NAZIMABAD
KARACHI - 33 (PAKISTAN)

(۴) سعودی عرب اور مشرق وسطی (پچیس امریکن ڈالر) جناب حنیف شاہ خاں

4. DR. HANEEF S KHAN (M.D.)
P.O BOX - 378
'AR 'AR - NORTH (K S A)

(۵) یورپ بشمول برطانیہ (پندرہ پونڈ اسٹرلنگ) جناب ساقی فاروقی

5. MR. SAQUI FARUQI
100 SUNNY GARDENS ROAD
LONDON - NW

اردو ماہنامہ شب خون پوسٹ باکس نمبر ۱۳ الہ آباد ۲۱۱۰۰۳